یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ھیں

مو منین بھی اس سے استفادہ حاصل کر سکتے ھیں.
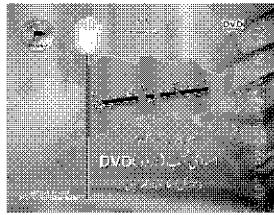
منجانب.

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان

بسم اللہ الرحمن الرحیم
سیرت امیر المومنینؑ
جلد اوّل دوم
ترجمہ و تالیف
حجۃ الاسلام مولانا مفتی جعفر حسین صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ
ناشر
امامیہ کتب خانہ
مغل حویلی اندرون موچی دروازہ
لاہور

سیرۃ المرء صحیفۃ اعمالہ

سیرتِ امیر المومنینؑ

جلد اوّل

ترتیب و تالیف

حجۃ الاسلام مولانا مفتی جعفر حسین صاحب قبلہ مدظلہ

ناشر

امامیہ کُتب خانہ مغل حویلی

اندرون موچی دروازہ۔ لاہور

ترجمہ

نہج البلاغہ

اس عظیم الشان کتاب کے کئی اُردو ترجمے اور شرحیں معرضِ تحریر میں آئیں اور اس کے انمول موتیوں کو اُردو کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی۔ مگر اصل کی خصوصیات ترجموں میں نہ آسکیں اور اربابِ ذوق کی تشنگی بڑھتی ہی گئی۔ الحمد للہ کہ علامہ مفتی جعفر حسین صاحب قبلہ نے اس طرف توجہ فرمائی اور شارحانہ حواشی کے ساتھ اس کا ایک اصح و سلیس ترجمہ فرمایا جو صحت و سلاست اور حل نکات اور تشریح مطالب کے لحاظ سے تمام تراجم و شروح میں ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کتاب کا مقدمہ حضرت سید العلماء مولانا سیّد علی نقی النقوی صاحب قبلہ دام ظلہ نے تحریر فرمایا ہے۔ جو ان کی تحقیقی و تدقیقی کاوشوں کا نتیجہ اور علمی دنیا میں بیش بہا اضافہ ہے۔ اہل علم اور نہج البلاغہ کے حقائق پرور ایمان افروز مطالب سے ذوق و شوق رکھنے والے آج ہی آرڈر بھیج کر طلب فرمادیں۔ ورنہ اگلے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا۔ سائز ۷½×۱۰" حجم تقریباً ۹۵۰ صفحات کاغذ لکھائی چھپائی عمدہ ہدیہ مجلد ولایتی ڈائیدار سنہری

صحیفۂ کاملہ

سید الساجدین حضرت زین العابدین علی ابن الحسین علیہما السلام کی ادعیہ کا بیش بہا مجموعہ ہے۔ یہ عظیم ترین کتاب اہلِ فکر کی غفلت سے ایک مخفی خزانہ کی حیثیت سے گھروں اور کتب خانوں میں موجود ہے۔ جسے صرف حاجت طلب کرنے اور توبہ و استغفار کے لئے دُعاؤں کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور حقائق و معارف کی نظر سے بہت کم دیکھا گیا ہے حالانکہ علمِ نبوّت کے وارث اور دینِ قیّم کے محافظ نے ان دُعاؤں کے پردہ میں دینی حقائق اور اسلام کے زندہ جاوید تعلیمات پیش کیے ہیں۔ چنانچہ کچھ عرصہ پیشتر مرکز علم و ادب مصر کے بلند پایہ علماء و مفکرین نے اسکے علمی و ادبی اور دینی و اخلاقی پہلو پر نظر کرتے ہوئے اس پر مبسوط مقالے لکھے اور دنیا کو اسکے حقائق پرور مضامین کی طرف متوجہ کرتے ہوئے دعوتِ فکر و عمل دی لیکن موجودہ تراجم سے اربابِ ذوق کی تشنگی دُور نہ ہو سکتی تھی اسلئے ضرورت تھی کہ اردو دان طبقہ کے لئے ضروری تشریحات کے ساتھ اس کا ایک صحیح اور معیاری ترجمہ پیش کیا جاتا۔ اس ضرورت کے پیش نظر علامہ مفتی جعفر حسین صاحب قبلہ مدظلہ نے اس کا ترجمہ اور عصر حاضر کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس پر حواشی تحریر کئے ہیں جس سے صحیفہ کی عظمت اور اقوال و افادات آل محمد کی اہمیت کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ آفسٹ طباعت۔ کاغذ عمدہ ہدیہ مجلد

فہرست مندرجات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَالصَّلوٰۃُ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ الصلوٰۃ والسلام اس معمورۂ عالم کی وہ عظیم اور منفرد شخصیت ہیں جن کی عظمت و بلندی جامعیت و ہمہ گیری اور عالمی و آفاقی برتری کے اپنے، بیگانے، دوست دشمن سب ہی معترف ہیں اور کسی کو ان کے بلند امتیازات اور نمایاں خصوصیات سے انکار نہیں ہے۔ آپ قریش کے ایک ممتاز ترین گھرانے میں پیدا ہوئے۔ سرزمین حرم میں خانہ کعبہ کے اندر ولادت کا شرف حاصل کیا، نبوت کی تجلیوں میں آنکھیں کھولیں، رسالت کی فضاؤں میں پلے بڑھے، پیغمبر اسلام کے سایۂ تربیت میں پروان چڑھے، انہی کے نقش قدم پر قدم رکھ کے بچپنے سے چلے پھرے۔ سفر و حضر میں سایہ کی طرح ساتھ ساتھ رہے، خلوت و جلوت میں ان کے فیضان صحبت سے فیضیاب ہوئے، اُنہی کے مکتب رشد و ہدایت میں تعلیم و تربیت کی منزلیں طے کیں اور اُنہی کے عمل و کردار کے نقوش کو قلب و نظر میں جگہ دی اور صفائے طینت و کمال تربیت کے نتیجہ میں اوج و عروج کے اس نقطۂ بلند تک پہنچے کہ مہ و پروین کی بلندیاں بھی ان کی گزرگاہ میں گردِ راہ ہو کر رہ گئیں۔

یہ ایک عمومی تاثر ہے اور ایک حد تک صحیح بھی ہے کہ گرد و پیش کی اچھی یا بُری فضا انسان کے ذہن و نفسیات پر اثر انداز ہوتی ہے۔ مگر دُنیا میں ایسے بلند نظر و روشن فکر افراد بھی دیکھنے میں آتے ہیں جو عوامی عقائد و توہمات اور گرد و پیش کے غلط نظریات سے قطعاً متاثر نہیں ہوتے۔ اور ان کا اندازِ فکر جُدا، طرزِ عمل علیحدہ اور راہ و روش دُوسروں سے کلیۃً مختلف ہوتی ہے۔ علی ابن ابی طالب بھی انہی افراد میں کی ایک نمایاں فرد تھے جو ماحول سے متاثر ہونے کے بجائے ماحول پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور اپنی بصیرت، قوتِ فہم اور تائید ربانی سے حق و باطل میں امتیازی حدود قائم کر کے ایک نئی تہذیب اور نئے طرزِ فکر کی داغ بیل ڈالتے ہیں۔ اور دُوسروں کی راہ پر چلنے کے بجائے راہروانِ منزل کے لئے اپنے نشانِ قدم چھوڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ اُس کفر پرور دَور میں جہاں بُت پرستی عام شعار تھی آپ معبودِ حقیقی کے علاوہ کسی اور کے سامنے سر نہیں جھکاتے اور اس تاریک معاشرہ میں اپنی تابندہ و تابناک پیشانی کو صنم پرستی سے آلودہ نہیں ہونے دیتے اور فکر و عمل میں انہی خطوط پر گامزن رہتے ہیں جو پیغمبر اکرم نے ان کے لئے متعین کر دیئے تھے۔ اسی فکری و عملی اتحاد کا نتیجہ ہے کہ پیغمبر اکرم کی زبان سے اعلانِ رسالت سنتے ہی ایمان کا اقرار کرتے اور اُن کے ساتھ نمازوں میں شریک ہو کر حق پسندی و حق پرستی کا ثبوت دیتے ہیں۔

آپ اوائل عمر ہی میں اسلام کی عالمی تحریک کو پروان چڑھانے کی خاطر پیغمبر کے معین و معاون اور مخالف طاقتوں کے مقابلہ میں اُن کے دست و بازو بن کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ چنانچہ دعوتِ عشیرہ میں جبکہ قریش کے مجمع پر خاموشی

چھائی ہوئی تھی اور تمام رؤسائے مکہ حق کی آواز کو دبانے کی فکر میں تھے آپ بزرگانِ قریش کی قہر آلودہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور بے جھجک رسالت کی تصدیق کرتے کھلے بندوں آنحضرتؐ کی نصرت و حمایت کا یقین دلاتے اور کٹھن سے کٹھن مرحلوں میں اپنے عہد و پیمان پر ثابت قدم رہتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ مکہ کی پُرآشوب زندگی میں جبکہ کفارِ قریش کی دل آزاری و ایذا رسانی حد سے بڑھ گئی تھی اور پہاڑ کی ایک گھاٹی کے علاوہ کہیں سر چھپانے کی جگہ نہ رہی تھی، آپ اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر پیغمبرؐ کے سینہ سپر رہے اور ایک لمحہ کے لیئے بھی اُن سے علیحدگی گوارا نہ کی۔ سخت سے سخت آزمائشوں کا مقابلہ کیا اور کامیاب ہوے۔ نہ ابتلاؤں کے ہجوم سے گھبرائے نہ دشمن کی دھمکیوں سے مرعوب ہوئے بلکہ مصائب کے زلزلوں میں ثبات قدم مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا اور خطرات کے امنڈے ہوے طوفانوں میں فداکاری و جاں سپاری کا جذبہ اُبھرتا اور عزم و استقامت کا حُسن نکھرتا رہا۔ خطروں میں اِس طرح پھاندے کہ ماتھے پر شکن نہ پڑی۔ اور مصیبتوں کو اس طرح جھیلا کہ تیوریوں پر بل نہ آئے۔ اور مدنی زندگی میں جبکہ عرب کے باہم دست و گریباں قبائل اپنے باہمی اختلافات ختم کرکے پیغمبرِ اسلام کی دشمنی پر متحد ہو چکے تھے اور مشرکینِ قریش نیزوں، تلواروں اور ہتھیاروں سے مسلح ہو کر مقابلہ پر اُتر آئے تھے آپ آہنی دیوار بن کر میدانِ حرب و ضرب میں کھڑے ہو گئے اور غیر معمولی استقلال و جرأت کے ساتھ دشمنانِ دین کی یلغاروں کو روکتے، سرکشانِ قریش کے غرور و طنطنہ کو خاک میں ملاتے اور کفر و شرک کے فلک بوس گنبدوں پر صاعقہ بن کر گرتے رہے۔ اور دُنیا نے دیکھ لیا کہ جو بزعم خویش قصرِ رسالت کے گرانے اور اسلام کی اینٹ سے اینٹ بجانے کے درپے تھے خود ہی اس طرح گرے کہ پھر سنبھل نہ سکے۔ اور جو سنبھلے وہ ہتھیار ڈالنے اور اسلام کی کھلی مخالفت کے بعد اِسلام کی آڑ لینے پر مجبور ہو گئے۔

پیغمبرِ اسلامؐ کی رحلت کے بعد اگرچہ فضا آپ کے لیئے سازگار نہ رہی۔ شوقِ جہاں بانی نے مرکزِ اقتدار بدل دیا خلافتِ الٰہیہ مادی حکومت کے سانچے میں ڈھل گئی اور حالات نے آپ کو عزلت گزینی و گوشہ نشینی پر مجبور کر دیا مگر جب بھی اسلامی مفاد کے تحفظ کا سوال پیدا ہوتا آپ احساسِ فرض کے ماتحت غزوات اور ملکی مہمات کے سلسلہ میں مشورے دیتے، دینی و معاشرتی گتھیاں سلجھاتے، اسلامی علوم و معارف کی آبیاری کرتے اور جذبات کے دباؤ سے آزاد رہ کر شخصی حقوق پر نوعی مفاد کو ترجیح دیتے اور امکانی حد تک وحدت و اجتماعیت کے سانچوں کو شکست و ریخت سے محفوظ رکھتے۔ اور جب اٹھاون برس کی ادھیڑ عمر میں مسندِ خلافت پر متمکن ہوے تو حالات دگرگوں ہو چکے تھے۔ غیر ملکی تاخت و تاراج اور دولت کی ریل پیل کے نتیجہ میں عرب کا قومی مزاج بدل چکا تھا۔ طرز بود و ماند میں فقر پسندی و سادگی کے بجائے ثروت پسندی و جاہ طلبی کے عناصر کارفرما ہو چکے تھے۔ اگرچہ ان حالات میں طبائع کا رُخ سابقہ اخلاقی و تہذیبی قدروں کی طرف موڑنا آسان کام نہ تھا مگر آپ ان نامساعد حالات میں بھی مفاسد کی راہ روکنے میں پُوری تندہی و جانفشانی سے کوشاں رہے اور شورش پسندوں کے شور و شر اور باطل قوتوں کے ٹکراؤ کے باوجود اسلام اور اس کے اخلاقی، تہذیبی اور فکری نظریات کی حفاظت کرتے رہے جس کا ثبوت ان حقائق و

معارف کی صورت میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے جو آپ کے حکمت آگیں کلمات و خطبات سے مستنبط ہیں۔ غرض آپ کا پورا دورِ حیات ادائے فرض کی تکمیل، دینِ اسلام کے احیاء اور اس کے تحفظ و استحکام میں گزرا۔

اس سلسلہ میں آپ کے خدمات اور بے لوث مجاہدات اپنی عظمت و افادیت کے اعتبار سے تاریخ اسلام کا ایک گرانبہا سرمایہ ہیں۔ آپ نے رزم و بزم میں یکساں نصرتِ اسلام و ہدایتِ خلق کا فریضہ انجام دیا اور اسلام کے فروغ و ارتقاء کے سلسلہ میں ایک مثالی و دوامی کردار ادا کیا۔ چنانچہ دعوتِ عشیرہ ہو یا تبلیغ برأت۔ فتح مکہ ہو یا تطہیر کعبہ۔ غزوۂ بدر ہو یا احد۔ معرکۂ خندق ہو یا خیبر۔ ہر مورد پر آپ کے خدمات ایک نمایاں اور انفرادی خصوصیت رکھتے ہیں۔ اور اسلام کی تعمیر و ترقی اور اس کے تحفظ و بقا میں بنیادی حیثیت کے حامل ہیں جنہیں کوئی مورخ نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اگر ان خدمات کا تذکرہ تاریخ اسلام سے الگ کر دیا جائے تو اسلامی تاریخ کا ہر واقعہ ادھورا اور ہر نقش دھندلا نظر آئے گا۔ کیونکہ آپ کے یہ عظیم کارنامے تاریخ اسلام کا ناگزیر تکملہ اور اس کے ترکیبی عناصر میں عنصرِ غالب کا درجہ رکھتے ہیں اور تاریخ اسلام میں اس طرح رچے بسے اور سموئے ہوئے ہیں کہ اگر کتر بیونت کر کے انہیں صفحاتِ تاریخ سے چھانٹ دیا جائے تو واقعات کا ربط و تسلسل باقی نہیں رہ سکتا۔ اور واقعاتی تسلسل کے بغیر نہ حقائق اپنی اصلی صورت میں سامنے آسکتے ہیں اور نہ تاریخ کے پس منظر اور اس کے اسباب و محرکات کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اگرچہ ہر دور میں معاندین آپ کے خدمات اور ذاتی اوصاف پر پردے ڈالتے رہے اور اس سلسلہ میں سلطنت و حکومت کی پشت پناہی بھی انہیں حاصل رہی مگر دشمنی و عناد کا اٹھتا ہوا غبار آپ کے کارہائے نمایاں کو چھپا نہ سکا اور آخر ان کے علمی و عملی آثار اس طرح زندہ و پائندہ اور افقِ اسلام پر درخشندہ و تابندہ رہے کہ شپرہ چشم بھی انہیں دیکھنے پر مجبور رہے۔

امیر المومنین نے ایک طرف علم کی سرپرستی سے نوعِ انسان کے کارواں کو آگے بڑھایا اور دوسری طرف عمل کے وہ روشن نمونے پیش کئے جو ہر منزل میں شمعِ راہ کا کام دیتے اور زندگی کی اعلٰے قدروں سے روشناس کرتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ آپ کی زندگی اور اس کے روشن آثار کی پیروی کی جائے، آپ کے افکار و نظریات سے روشنی لی جائے اور آپ کے ہدایات و تعلیمات پر عمل کی راہیں متعین کی جائیں اور مادہ پرست ذہنیت کی شکست اخلاقی و روحانی قدروں کے ارتقاء اور اسلامی تصورات کے احیاء کے لئے اس مصلحِ اعظم کی تابناک زندگی کے نقوش کو مشعلِ راہ بنایا جائے اور ان کے اصول زندگی کی غیر متزلزل بنیادوں پر معاشرہ کی تشکیل و تعمیر کی جائے تاکہ انفرادی و اجتماعی زندگی دینی تقاضوں سے ہم آہنگ اور اخلاقی رفعتوں سے ہمکنار ہو سکے۔

اسی مقصد کے پیشِ نظر آپ کی سیرت و زندگی کے یہ تحریری نقوش پیش کئے جا رہے ہیں۔ ان میں نہ رنگ آمیزی سے کام لیا گیا ہے نہ مبالغہ آفرینی سے نہ ان میں ناروا عصبیت کار فرما ہے اور نہ بے جا جنبہ داری بلکہ حقائق و واقعات اور تاریخی مسلمات کی روشنی میں انہیں اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ آپ کی زندگی و سیرت کے مختلف گوشوں پر روشنی پڑ سکے۔ تاریخی واقعات کو تاریخ ہی کی زبان میں دہرایا گیا ہے اور انہیں غلط رنگ

دینے یا مسخ کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اور اختلافی مسائل کو صرف تجزیہ تاریخ و نقد روایت تک محدود رکھا ہے۔ اور حتی الامکان باہم آویزیوں سے بچ کر رہنے کی کوشش کی گئی ہے۔ خدا کرے کہ یہ عصبیت و تنگ نظری کی زنجیروں کو توڑ کر آزادانہ تحقیق و جستجو کا ولولہ پیدا کرنے اور آپ کی بلند شخصیت کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے میں معین ثابت ہوں۔ وما توفیقی الا باللہ وبہ استعین۔

مولد و منشا

"خطۂ عرب" برِّ اعظم ایشیا کے جنوب مغرب میں دُنیا کا سب سے بڑا جزیرہ نما ہے۔ اس کے شمال میں مملکتِ شام واقع ہے اور مغرب میں بحرِ احمر، مشرق میں بحرِ عمان و خلیج فارس اور جنوب میں بحرِ ہند کی نیلگوں موجیں متلاطم ہیں۔ بحرِ احمر کا ساحلی علاقہ بنجر اور شور ہے۔ اور ساحل سے ہٹ کر خشک پہاڑوں ریتیلے ٹیلوں اور کفِ دست ریگستانوں کا سلسلہ حدِ نظر تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ ریگستانی و صحرائی خطہ حجاز کہلاتا ہے۔ اس خطہ میں نہ زراعت و کاشتکاری کی کوئی صورت تھی اور نہ سیرابی کا کوئی سامان تھا۔ اگر بارش ہوئی تو پہاڑوں میں پیچ و خم کھاتی ہوئی وادیوں میں پانی بہہ نکلا یا کسی نشیبی حصہ میں گڑھوں کے اندر جمع ہو گیا۔ ورنہ میلوں تک کہیں پانی کا نام و نشان نہ تھا۔ ایسے خشک اور بے گیاہ علاقہ میں جہاں ہر طرف شور و ویرانہ، بنجر اور بیہڑ زمین اور دھوپ میں تپتے ہوئے پہاڑ ہوں جہاں نہ پانی ہو اور نہ زندگی و معیشت کا کوئی سامان وہاں کسی آبادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ حدودِ حرم کے باہر عمالقہ صحرائی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان صحرانوردوں کا کوئی مستقل ٹھکانا نہ ہوتا تھا بلکہ گھاس اور پانی کی تلاش میں بادِ سموم کے جھلسا دینے والے جھونکوں سے ٹکراتے ہوئے صحراؤں میں سرگرداں رہتے تھے اور جہاں پانی اور تھوڑی بہت سرسبزی و شادابی نظر آتی وہاں اُتر پڑتے اور جب پانی اور چوپاؤں کے چرنے کا چارا ختم ہو جاتا تو آب و گیاہ کی تلاش میں آگے بڑھ جاتے۔

اس وسیع ریگستان کی وادئ بطحا میں مستقل آبادی کی ابتداء ذرّیت ابراہیمی سے ہوئی۔ حضرت ابراہیمؑ طوفان نوح سے ۱۰۸۱ برس بعد سرزمین بابل میں پیدا ہوئے۔ باپ کا انتقال بچپنے میں ہو گیا۔ چچا نے تربیت کی جو آدار کہلاتا تھا۔ آدار کے معنی صنم کدہ کے نگرانِ اعلےٰ کے ہیں اور اسی لفظ نے بعد میں آزر کی شکل اختیار کر لی۔ حضرت ابراہیمؑ جو آزر کے ہاں رہتے سہتے تھے ایک ایسے معاشرہ میں پلے بڑھے جس میں بُت تراشے جاتے اور پوجے جاتے تھے اور سورج، چاند اور ستاروں کی بھی پرستش ہوتی تھی اور حاکمِ وقت معبود کا درجہ حاصل کئے ہوئے تھا۔ مگر اس صنم پرستی و صنم تراشی کے مرکز میں رہتے ہوئے آپ بچپن سے بُت پرستی کے خلاف اور مشرکانہ راہ و رسم سے بیزار تھے۔ آپ نے اپنی قوم کی راہ و روش پر کڑی نکتہ چینی کی اور اصنام پرستی کی مذمت کرتے ہوئے انہیں خدائے واحد کی پرستش کی دعوت دی مگر کسی نے ان کی آواز پر لبیک نہ کہی۔ بلکہ بتوں ہی کو اپنا کرتا دھرتا سمجھتے اور انہی کے سامنے سر عبودیت خم کرتے رہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے انہیں بُت پرستی سے کنارہ کش ہوتے نہ دیکھا تو چاہا کہ بتوں کی بے بسی و درماندگی کا عملاً ثبوت پیش کر کے انہیں سمجھائیں کہ اصنام پرستش کے قابل ہرگز نہیں ہیں۔ آپ اس کے لئے موقع کی تلاش میں تھے کہ انہی دنوں میں اہل شہر مراسم عید بجا لانے کے لئے صحرا میں جمع ہوئے۔ آپ نے شہر کو خالی پایا تو صنم کدہ کا رُخ کیا اور ایک بیٹے

بُت کے علاوہ تمام چھوٹے بڑے بُتوں کو توڑ پھوڑ دیا۔ اور جس تبر سے بُت توڑے تھے اُسے بڑے بُت کی گردن میں آویزاں کر کے باہر نکل آئے۔ جب اہلِ شہر پلٹ کر آئے تو دیکھا کہ بُت خانہ کا نقشہ بگڑا ہوا ہے اور بتوں کے ٹکڑے اِدھر اُدھر بکھرے پڑے ہیں۔ انہوں نے مستفسرانہ نگاہوں سے ایک دُوسرے کو دیکھا اور کہا کہ ہو نہ ہو یہ ابراہیمؑ کی کارستانی ہے جو برابر ہمارے بتوں کو بُرا بھلا کہتے رہتے ہیں۔ انہوں نے حضرت ابراہیمؑ کو بُلایا اور کہا کہ یہ تم نے کیا کیا؟ آپ نے کہا:

بل فعلہ کبیرھم ھذا فسئلوھم ان کانوا ینطقون۔ — یہ حرکت ان بتوں کے بڑے کی ہے اگر یہ بول سکتے ہوں تو انہی سے پُوچھ لو"

انہوں نے حضرت ابراہیمؑ کی زبان سے یہ انہونی بات سُنی تو کہنے لگے کہ اے ابراہیمؑ کیا بُت بھی بولا کرتے ہیں؟ فرمایا کہ جو نہ زبان ہلا سکیں اور نہ اپنا بچاؤ کر سکیں وُہ کسی اور کے کیا کام آ سکتے ہیں کہ تم انہیں معبُود قرار دے کر اُن کے آگے جھولیاں پھیلاتے اور انہیں سجدے کرتے ہو۔ اُن بُت پرستوں کا عقیدہ تو یہ تھا کہ بارش برسائیں تو بُت، کھیتیاں اُگائیں تو بُت، رزق و روزی کا سامان کریں تو بُت اور مصیبت و آفت سے بچائیں تو بُت اور ادھر ان کی بے بسی و بے چارگی کا یہ عالم کہ نہ حملہ آور کا ہاتھ روک سکے اور نہ زبان سے کچھ بول ہی سکے اگر ان صنم پرستوں میں عقل و شعور ہوتا تو وُہ حضرت ابراہیمؑ کے اس حسّی و مشاہداتی استدلال پر غور کرتے مگر غور و فکر کے بجائے وُہ غم و غصّہ میں پیچ و تاب کھانے لگے اور انہیں بُت شکنی کے جُرم میں نمرُود کے سامنے پیش کیا۔ اس نے جواب طلبی کرتے ہوئے کہا کہ تمہیں بُتوں پر ہاتھ اٹھانے کی جُرأت کیونکر ہوئی۔ اور پھر تمہارے سر میں ہوائے تکبّر اتنی بھر گئی ہے کہ تمہیں میرے اُلوہی اقتدار سے بھی انکار ہے۔ فرمایا کہ تمہارے بُت ہیں ہی کیا۔ انسانی ہاتھوں کے تراشے ہوئے پتھر، ضعیف سے ضعیف مخلوق سے بھی ضعیف تر۔ اور پھر تمہیں خدا کیونکر تسلیم کروں جبکہ تم اپنی مَوت و زیست پر بھی قادر نہیں ہو۔ حضرت ابراہیمؑ کے اس بیباکانہ رویہ کو دیکھ کر نمرود کے تیور بدلے۔ شہنشاہیت کا دبدبہ، حکومت کا شکوہ اور عوام کا زور حق کی آواز کو دبانے کے لیئے حرکت میں آ گیا اور انہی کے چچا نے انہیں پتھروں سے کچل دینے کی دھمکی دی۔ اور نمرود نے حکم دیا کہ انہیں زندہ جلا کر خاکستر کر دیا جائے۔ چنانچہ انہیں جلا دینے کے لیئے بڑے پیمانہ پر آگ روشن کی گئی۔ جب انگارے بھڑک اُٹھے اور شعلے بلندیوں کو چھُونے لگے تو انہیں آگ میں جھونک دیا گیا۔ مگر اُن کا ایک بال بھی بیکا نہ ہو سکا۔ گویا آگ نہ تھی کھلا ہوُا لالہ زار اور لہلہاتا ہوُا گلزار تھا۔ اس اعجاز کو دیکھ کر نمرود دم بخود ہو کر رہ گیا۔ مگر اُس کے انتقام کی آگ ٹھنڈی نہ ہوئی۔ اس نے حکم دیا کہ ان کے مال مویشی ضبط کر کے انہیں جلاوطن کر دیا جائے۔ حضرت ابراہیمؑ نے یہ شاہی فرمان سُنا تو نمرود سے کہا کہ تمہیں میرے مال مویشی کے چھین لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ کہا کہ یہ چیزیں تم نے ہماری مملکت میں رہ کر پیدا کی ہیں۔ فرمایا کہ پھر میں نے جتنی عُمر تمہارے شہر میں صرف کی ہے وُہ مجھے واپس پلٹا دو اور یہ مال لے لو۔ نمرود سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ کہا کہ ان کا مال انہی کے پاس رہے اور

انہیں شہر بدر کر دیا جائے۔
حضرت ابراہیمؑ اپنی اہلیہ جناب سارہ اور اپنے بھتیجے حضرت لُوطؑ کو لے کر سرزمین بابل سے نکل کھڑے ہوئے اور حلب و دمشق سے ہوتے ہوئے فلسطین میں چلے آئے جو اُس دَور میں کنعان کہلاتا تھا۔ فلسطین میں آپ کا مسکن یروشلم سے گیارہ میل کے فاصلہ پر مقام حبرون تھا۔ آپ نے کچھ عرصہ یہاں گزارا اور پھر دعوتِ توحید کے لئے مصر تشریف لے گئے۔ شاہ مصر رقیون نے آپ کے ہمراہ جناب سارہ کو دیکھا تو اُس کی نیّت میں فتور پیدا ہوا۔ اس نے دست درازی کے لئے ہاتھ بڑھایا مگر اس کا بڑھا ہوا ہاتھ شل ہو کر وہیں کا وہیں رہ گیا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر اس نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا، معافی مانگی اور اس جُرم کی تلافی کے لیئے کچھ تحائف پیش کئے جن میں ایک کنیز ہاجرہ نامی بھی شامل تھی جو بعد میں خلیلِ خدا کے حرم میں داخل ہوئیں اور ان پرستارانِ توحید کی مقدس جماعت میں ایک فردِ خاندان کی حیثیت سے شامل ہوگئیں۔ مؤرّخ طبری نے لکھا ہے کہ ہاجرہ، فرعونِ مصر علوان ابنِ سنان کی بیٹی تھیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے مصر سے واپسی کے بعد حبرون کو اپنا مستقل مسکن قرار دے لیا اور اپنے پروردگار سے اولاد کی دُعا کی تاکہ مقصد کی تکمیل میں اُن کا ہاتھ بٹا سکے۔ قدرت نے ان کی دُعا قبول کی اور چھیاسی برس کی عُمر میں ہاجرہ کے بطن سے پہلا بیٹا اسمٰعیلؑ عطا کیا۔ اور پھر کچھ عرصہ کے بعد جناب سارہ کے بطن سے جو اولاد سے مایوس ہو چکی تھیں، اسحاقؑ پیدا ہوئے۔
جب جناب سارہ کی گود ہری ہوئی تو اُنہوں نے حضرت ابراہیمؑ سے کہا کہ آپ ہاجرہ اور اسمٰعیلؑ کو کہیں اور مُنتقل کر دیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس پر آمادگی ظاہر کی اور ان دونوں کو لے کر نکل کھڑے ہوئے۔ قدرت کی رہنمائی اور مشیّت کی کارفرمائی انہیں صحرائے حجاز کے ایک ویران گوشے میں لے آئی۔ اگرچہ یہ ویرانہ انسانی آبادی اور زندگی کے سر و سامان سے یکسر خالی تھا مگر کارفرمائے قدرت نے روزِ ازل سے یہ طے کر رکھا تھا کہ اسے آبادی سے بیگانہ نہ رہنے دے گا بلکہ اُسے اُم القرٰی (آبادیوں کا سرچشمہ) قرار دے گا۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے ہاتھوں آبادی کا نقش اُبھرا اور آپؑ نے جناب ہاجرہؑ اور اپنے فرزند اسمٰعیلؑ کو وہاں پر ٹھہرا دیا اور اِس طرح قدرت نے اُس بنجر اور خشک وادی کو آبادی سے رُوشناس کیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے فلسطین سے نکلتے وقت جناب سارہ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ اِن دونوں کو کسی محفوظ مقام پر پہنچا کر فوراً واپس ہوں گے۔ چنانچہ خلیلِ خدا ان دونوں کو تنہا چھوڑ کر واپسی کے ارادہ سے پلٹے لیکن فرمانبردار و وفا شعار بیوی اور نُورِ نظر کی جُدائی دِل کو متاثر کئے بغیر نہ رہ سکی۔ جب کوہ کداء کے موڑ پر پہنچے تو پلٹ کر ہاجرہؑ و اسمٰعیلؑ کی طرف دیکھا۔ ان کی تنہائی و بے سرو سامانی پر نظر کی اور گڑگڑا کر بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا:۔

ربّنا انی اسکنت من ذرّیتی بواد	پروردگارا! میں نے تیرے مقدس گھر کے پاس ایسی
غیر ذی زرع عند بیتک المحرم	سرزمین پر جہاں کھیتی باڑی نہیں ہوتی اپنی کچھ
ربّنا لیقیموا الصّلوٰۃ فاجعل	ذُرّیت کو لا بسایا ہے۔ اے ہمارے پروردگار تاکہ

افئدۃ من الناس تھوی الیھم وارزقھم من الثمرات لعلھم یشکرون۔

وہ نماز قائم کریں تو لوگوں کے دلوں کو اُن کی طرف جھکا دے اور اُن کے لئے پھلوں کی روزی کا سامان کر تاکہ وہ تیرے شکر گزار ہوں"۔

خلیلِ خدا کو قدرت کی کارسازی پر اطمینان تو تھا ہی پھر بھی اس دُعا نے قلبِ مطمئن میں اطمینان کی لہر دوڑا دی، اور آپ جدھر سے آئے تھے اُدھر روانہ ہو گئے۔ جناب ہاجرہؑ نے چادر تان کر سایہ کیا اور اسمٰعیلؑ کو لے کر اس کے نیچے بیٹھ گئیں۔ اگرچہ چاروں طرف خاموشی اور سناٹا تھا مگر یہ بلند ہمت خاتون ذرا ہراساں نہ ہوئیں اور اللہ پر بھروسا کرتے ہوئے اس صحرائی زندگی کو خندہ پیشانی کے ساتھ گوارا کر لیا۔ نہ ماتھے پر شکن ڈالی اور نہ دل میں تشویش کو راہ دی۔ اس صحرائے لق و دق میں پانی کی ایک چھاگل آپ کے ہمراہ تھی جو ایک آدھ دن کے بعد خالی ہو گئی۔ اب پانی کی فکر ہوئی۔ کچھ دیر صبر و ضبط سے کام لیا مگر جُوں جُوں سُورج کی تپش بڑھنے لگی۔ پیاس کی شدت بھڑکنے لگی۔ بچے کے سوکھے ہوئے چہرے پر نظر پڑتے ہی جناب ہاجرہؑ بیتاب ہو گئیں اور اس خیال سے کہ شاید کسی سمت پانی نظر آ جائے، اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ صفا و مروہ کی چوٹیوں پر چڑھ کر اِدھر اُدھر دیکھا اور ان پہاڑیوں کے درمیان سات چکر کاٹے لیکن اس دوڑ دھوپ کے باوجود کسی سمت پانی نظر نہ آیا۔ جب پیاس اور تھکن سے بے حال ہو کر واپس آئیں تو دیکھا کہ سنگریزوں سے ڈھکی ہوئی زمین سے پانی رس رہا ہے۔ کنکروں پتھروں کو ہٹایا تو تپتے ہوئے ریگستان کے سینہ سے سرد و شیریں پانی کا دھارا بہہ نکلا۔ یہ دیکھ کر مرجھائے ہوئے چہرے پر خوشی دوڑ گئی اور بیساختہ زبان سے لفظ زم زم نکلی جس کے معنی عبرانی زبان میں "رُک جا" کے ہیں اور اسی لفظ نے بعد میں نام کی حیثیت اختیار کر لی اور وہ چشمہ زمزم کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ جناب ہاجرہؑ نے اس سرد و شیریں پانی سے اپنی اور اپنے بچے کی پیاس بجھائی اور پتھروں کو جمع کر کے اس کے چاروں طرف ایک منڈیر بنا دی تاکہ پانی اس میں جمع ہوتا رہے اور ضائع نہ ہونے پائے۔ پانی کو دیکھ کر فضا میں اُڑنے والے پرندے سمٹ آئے اور چشمہ کے گرد منڈلانے لگے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے خشک پہاڑوں اور سرزمینوں اور مُردہ ریگزاروں میں زندگی کے آثار اُبھر آئے۔

اسی زمانہ میں بنی جرہم کا ایک قافلہ یمن سے شام جاتے ہوئے پہاڑیوں کے اُوپر سے گزرا۔ اس نے وادی میں پرندوں کے جھنڈ دیکھے تو حیرت میں کھو گیا کیونکہ اس سے پہلے یہاں پرندوں کو پرواز کرتے ہوئے نہ دیکھا تھا۔ اور جہاں نہ پانی ہو اور نہ سبزہ وہاں پرندوں کا کیا کام۔ بڑھتا ہوا قافلہ رُک گیا اور پہاڑ کی بلندیوں سے نیچے اُترا۔ دیکھا کہ ایک خاتون ایک بچے کے ہمراہ سر جھکائے بیٹھی ہیں اور پاس ہی پانی کا چشمہ اُبل رہا ہے۔ چشمہ کو دیکھ کر اُنہوں نے جناب ہاجرہ سے کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو ہم آپ کے اڑوس پڑوس میں آباد ہو جائیں۔ جناب ہاجرہ تو چاہتی ہی تھیں کہ یہ ویرانہ آباد ہو جائے۔ کہا کہ مجھے اپنے شوہر خلیلِ خدا سے پُوچھے بغیر کسی کو یہاں بسانے کا اختیار تو نہیں ہے مگر تم کچھ دن توقف کرو جب وہ آئیں گے تو اُن سے پُوچھ کر

تمہیں اجازت دے دی جائے گی۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے معمول کے مطابق آئے تو جناب ہاجرہ نے اُن سے دریافت کرکے انہیں قرب و جوار میں آباد ہونے کی اجازت دے دی اور چند جھونپڑیوں اور خیموں کی ایک مختصر سی آبادی قائم ہوگئی اور دنیا کے نقشہ پر ایک متبرک ترین شہر کے ابتدائی خطوط اُبھر آئے۔

حضرت ابراہیم نے حسب فرمانِ قدرت اسی گوشۂ ویران میں خانہ کعبہ کی تعمیر شروع کی۔ حضرت اسمٰعیل بھی اس کام میں شریک ہوگئے۔ وُہ اپنے کندھوں پر پتھر ڈھو ڈھو کر لاتے اور حضرت ابراہیمؑ پتھروں کو چُن کر دیواریں کھڑی کرتے اور اس طرح دونوں باپ بیٹوں نے مل کر خانہ کعبہ کی تعمیر کو تکمیل تک پہنچایا۔ حسن نیّت و خلوص عمل کا کرشمہ تھا کہ بہت جلد اسے تمام عرب میں مرکزی عبادت گاہ کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ اس گھر کے تعلق سے ہر گوشہ اور ہر سمت سے لوگ کھنچ کھنچ کر آنے لگے رفتہ رفتہ آبادی بڑھتی گئی اور قلب جزیرۃ العرب میں ایک پُر رونق بستی آباد ہوگئی جو بکہ کے نام سے موسوم ہوئی اور یہی اس کا اصلی اور قدیمی نام ہے چنانچہ زبور میں اسے وادیٔ بکہ ہی کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور قرآن مجید میں بھی تعمیر کعبہ کے وقت اسے بکہ ہی کہا گیا ہے:۔

ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبارکا وھدی للعالمین۔	"پہلا گھر جو لوگوں کے لئے بنایا گیا وہ بکہ میں تھا جو بابرکت اور سارے جہانوں کے لئے ذریعہ ہدایت ہے"

بکہ کا دُوسرا عام اور زبان زد خلائق نام مکہ ہے۔ ضحاک کا قول ہے کہ مکّہ کی میم کو با سے بدل دیا گیا ہے اور یہ ایک ہی مقام کے دو نام ہیں۔ اور بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس جگہ پر خانہ کعبہ تعمیر ہوا ہے اُس کا نام بکہ ہے اور جہاں شہر آباد ہے اُس کا نام مکہ ہے۔ ان دونوں ناموں کی وجہ تسمیہ میں مختلف اقوال بیان کئے گئے ہیں مگر جس کی تائید ارشاد آئمہ طاہرین سے ہوتی ہے وُہ یہ ہے کہ بکہ بکاء بمعنی گریہ سے ماخوذ ہے۔ اور یہ نام اس بنا پر تجویز ہُوا کہ جب اطراف عرب کے لوگ یہاں حج و زیارت کے لئے جمع ہوتے تھے تو خانہ کعبہ کے گرد نالہ و بکاء کرتے تھے۔ چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے:۔

سمیت مکۃ بکۃ لان الناس کانوا یتباکون فیھا (علل الشرائع)۔	"مکہ کا نام بکہ اس بنا پر ہُوا کہ وہاں پر لوگ جمع ہو کر گریہ و بکاء کرتے تھے"۔

اور مجاہد کا بھی یہی قول ہے۔ چنانچہ وُہ کہتے ہیں:۔

انما سمیت بکۃ لان الناس یتباکون فیھا الرجال والنساء	"مکہ کو بکّہ اس لئے کہا جاتا تھا کہ وہاں پر زن و مرد جمع ہو کر روتے چلاتے تھے"۔

(دُرِ منثور۔ ج ۲۔ ص ۵۲)۔

اور مکہ مکاء سے مشتق ہے اور مکاء کے معنی چیخنے چلانے اور سیٹی بجانے کے ہیں۔ اسے مکہ اس لئے کہا گیا کہ یہاں حج کے زمانہ میں لوگ شور و غل مچاتے اور سیٹیاں بجاتے تھے۔ چنانچہ امام رضا علیہ السلام کا ارشاد ہے:۔

سمیت مکۃ مکۃ لان الناس کانوا یمکون بہا۔ (علل الشرائع)
مکہ کو مکہ اس لیئے کہا جاتا ہے کہ وہاں پر لوگ چیختے چلاتے تھے"۔

یہ چیخ پکار اور شور و غل بھی اُن کے نزدیک عبادت میں داخل اور جزوِ نماز تھا۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:۔

وما کان صلوا تھم عند البیت الامکاء وتصدیہ
خانہ کعبہ کے پاس اُن کی نماز سیٹیاں بجانا اور تالیاں پیٹنا تھا"۔

قرآن مجید میں مکہ کو اُمّ القریٰ کے نام سے بھی یاد کیا گیا ہے۔ ام کے معنی اصل و بنیاد کے ہیں۔ اور اس کا اطلاق ہر اُس چیز پر ہوتا ہے جو اساسی و بنیادی حیثیت رکھتی ہو۔ اسے اُمّ القریٰ (آبادیوں کی اصل و بنیاد) کہنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس سے انسانی سیلاب کا سرچشمہ امنڈا جو ویران خطوں اور اُفتادہ زمینوں سے گزرتا ہوا اطراف عالم میں پھیل گیا۔ چنانچہ جب حضرت اسمٰعیل نے قبیلۂ بنی جرہم کے سردار مضاض ابن عمرو کی دختر سے شادی کی تو اس سے ان کی اولاد پھولی پھلی اور تھوڑے ہی عرصہ میں تہامہ نجد اور حجاز سے لے کر فلسطین و یمن تک پھیل گئی اور عرب عاربہ یعنی عرب کے قدیم باشندوں کے مقابلہ میں عرب مستعربہ کے نام سے موسوم ہوی۔ اور نو آبادیوں کے سلسلے قائم کرتی ہوی دُنیا کے گوشہ گوشہ میں بس گئی۔ یہ سرزمین حرم آبادیوں کی اصل و بنیاد ہونے کے علاوہ دین و ہدایت کا بھی مرکز ہے۔ اسی سرزمین پر اللہ تعالیٰ کا پہلا گھر تعمیر ہوا۔ اسی مقام سے اسلام کی عالمی دعوت نشر ہوی، توحید کا آوازہ بلند ہوا اور اللہ تعالیٰ کے آخری دین کی بنیاد پڑی۔ اسی خطہ میں نزولِ قرآن کا آغاز ہوا اور ہدایت کی کرنیں پھوٹیں اور اسی کے اُفق سے وُہ آفتاب نبوّت طلوع ہوا جس کی ضو پاش کرنوں سے نہ صرف ریگزار عرب کے ذرات لَو دینے لگے بلکہ اس کی شعاعیں تاریک گوشوں کو منور کرتی ہوئیں ایشیا کے مرغزاروں سے لے کر افریقہ کے ریگزاروں تک پہنچ گئیں۔ اور اسی سرزمین کو مولائے کائنات حضرت علیؑ ابن ابی طالب کی جائے ولادت ہونے کا فخر حاصل ہے۔ یہیں پر آپ کا بچپن اور اوائل شباب کا زمانہ گزرا، یہیں کے در و دیوار سے پہلے پہل مانوس ہوئے، اسی کے ریگزاروں اور خشک پہاڑوں میں چلے پھرے اور اسی کے کوہ و صحرا کے وسیع دامنوں میں نشو و نما پائی اور یہیں سے یثرب کی جانب ہجرت فرما ہوئے۔

یہ چیز تجربہ و مشاہدہ سے ثابت ہو چکی ہے کہ زمین کے مختلف خطے اپنی آب و ہوا، ہیئت و ساخت اور جغرافیائی محلّ وقوع کے لحاظ سے مختلف اثرات کے حامل ہوتے ہیں۔ چنانچہ جو چیز ایک سرزمین پر اور ایک آب و ہوا میں پروان چڑھتی ہے وُہ دوسری زمین اور دوسری آب و ہوا میں پھلتی پھولتی نہیں ہے حالی مرحوم نے کہا ہے ؎

جا کے کابل میں آم کا پودا　　کبھی پروان چڑھ نہیں سکتا
آ کے کابل سے یہاں بہی و انا　　ہو نہیں سکتے بار ور زنہار

اسی طرح ایک ہی قطعۂ زمین کے مختلف ٹکڑے سخت یا نرم، بنجر یا زرخیز ہونے کی صورت میں مختلف اثرات رکھتے ہیں۔ چنانچہ زرخیز زمین میں کوئی چیز کاشت کی جائے تو وُہ پُوری طرح نشوونما پائے گی۔ اور بنجر زمین میں کوئی چیز بوئی جائے تو وُہ زمین کے اندر ہی گل سڑ جائے گی۔ اسی طرح سخت اور نرم زمین کے نباتات میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ نرم زمین میں اُگنے والے پودے کمزور ہوتے ہیں اور سخت اور پتھریلی زمین میں اُگنے والی جھاڑیاں قوی و مضبُوط ہوتی ہیں۔ کیونکہ صحرائی جھاڑیوں کو دُھوپ، تیز روشنی اور گرم و خشک موسم کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اُن کی جڑوں کو زمینی رطوبت کے جذب کرنے کے لیئے زمین کی گہرائیوں میں اُترنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیئے قدرت نے اُن میں فطرۃً اتنی طاقت ودیعت فرما دی ہے کہ وُہ سنگلاخ زمین میں جگہ پیدا کرنے اور بڑھنے میں زمین کی سنگینی کا مقابلہ کر سکیں اور اس کی سختی و صلابت سے ٹکرا کر اُس کے اندر اپنے ریشوں کا جال پھیلا سکیں۔ امیر المومنین نے بھی صحرائی زمین کی اس خاصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:-

الا وان الشجرۃ البریۃ اصلب	یاد رکھو کہ جنگل کے درخت کی لکڑی مضبُوط ہوتی
عودا والروائع الخضرۃ ارق	ہے اور تر و تازہ پیڑوں کی چھال کمزور اور پتلی
جلودا والنباتات البدویۃ اقوی	ہوتی ہے۔ اور صحرائی جھاڑیوں کا ایندھن زیادہ
وقودا وابطا خمودا۔ (نہج البلاغہ)	بھڑکتا ہے اور دیر میں بُجھتا ہے۔"

اسی طرح زمین، آب و ہوا اور طبعی ماحول کا اثر انسانوں کی ذہنی و جسمانی ساخت اور اُن کے اخلاق و کردار پر بھی پڑتا ہے۔ اور جو جس سرزمین پر پیدا ہوتا ہے وہاں کی فضا اس کے اخلاق و عادات پر اثر انداز ہوتی ہے۔ چنانچہ وحشی و صحرائی قبائل میں صحرائی فضا کے زیر اثر سختی، تندخوئی اور وحشت و بربریت ہوتی ہے اور شہری باشندوں میں نرم روی، شگفتہ مزاجی اور امن پسندی کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ اور جب ماحول میں تبدیلی رُونما ہوتی ہے اور صحرائی باشندے غیر متمدن ماحول کو چھوڑ کر شہری فضا کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں تو رفتہ رفتہ اُسی شہری ماحول میں ڈھل جاتے ہیں اور اُن کی خشونت نرمی سے اور وحشیانہ زندگی متمدن زندگی سے بدل جاتی ہے۔ یُونہی مختلف خطوں اور اقلیموں کے رہنے والوں کا ایک خاص مزاج اور ایک خاص افتاد طبع ہوتی ہے۔ اور ان خطوں کا جائزہ لینے کے بعد وہاں کے باشندوں کے مقامی صفات و خصوصیات سے بڑی حد تک آگاہ ہوا جا سکتا ہے۔

اس ارضی خاصیت کی روشنی میں پتھریلے اور گرم مقامات کے باشندوں کا جائزہ لیا جائے تو وُہ نرم و ہموار زمین کے رہنے والوں کی بہ نسبت زیادہ قناعت پسند، باہمت، پُرزور اور جفاکش ثابت ہوں گے۔ کیونکہ گرم و خشک اور ریگستانی علاقہ میں قدم قدم پر نامساعد حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے ان حالات سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت ان میں طبعاً اُبھر آتی ہے اور وُہ بآسانی حوادث و شدائد جھیل

لے جاتے ہیں۔

امیرالمومنین میں قوت و توانائی اور تحمّلِ شدائد کا جوہر خداداد تو تھا ہی مگر جنبۂ بشری کے اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو اس قوّت و توانائی کے نمو و نمود میں صحرائے عرب کی تعب افروز و مشقت آموز زندگی کو بھی ایک حد تک معاون و سازگار سمجھا جاسکتا ہے۔

نسب و خاندان

یہ قانونِ فطرت ناقابلِ انکار ہے کہ اصل کے خصوصیات فرع کی طرف منتقل ہوتے ہیں اور ہر انسان آبائی موثرات کی پیداوار اور اپنے اسلاف کی شکل و شمائل کا ورثہ دار ہوتا ہے۔ چنانچہ ہر فرد کے خدوخال میں اس کے آباؤ اجداد کے خطوط و نقوش کی جھلک کم و بیش پائی جاتی ہے۔ اگرچہ عام نگاہیں خط و خال کی باریکیاں نہیں دیکھ سکتیں مگر قیافہ شناس نگاہیں جسم کی ساخت، چہرہ کے خطوط، اندازِ تکلم اور حرکات و سکنات کے آئینہ میں بہت سی حقیقتیں دیکھ لیتی ہیں اور انہیں کسی کے آباؤ اجداد اور قوم و قبیلہ کی تشخیص میں قطعاً کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ خصوصاً سرزمین عرب کے بعض قبائل ژرف نگاہی و باریک بینی میں نمایاں امتیاز اور قیافہ شناسی میں حیرت انگیز دستگاہ رکھتے تھے۔ اور پہلی ہی نظر میں بھانپ لیتے تھے کہ کون کس باپ کا بیٹا اور کس خاندان کی فرد ہے۔ چنانچہ قبیلۂ بنی لہب و بنی مدلج کی قیافہ شناسی کے سلسلہ میں صاحب مستطرف نے تحریر کیا ہے کہ اگر کسی بچے کے بارے میں شبہ ہوتا تو اُسے بنی مدلج کی کسی فرد کے سامنے پیش کیا جاتا وہ ایک نظر بچے پر اور ایک نظر متعدد آدمیوں پر ڈال کر فوراً بتا دیتا کہ فلاں اس بچے کا باپ ہے اور دونوں کے خاندانی علامات اور مشترکہ خطوط کی نشان دہی کر دیتا۔ ایک مرتبہ ایک تاجر زادہ اونٹ پر سوار ہو کر اس قبیلہ کی طرف سے گزرا۔ اس قبیلہ کے ایک شخص نے اُسے اور اُس کے غلام کو جو آگے آگے چل رہا تھا دیکھا تو کہا کہ یہ سوار اس غلام سے کس قدر مشابہ ہے۔ اُس سوار نے یہ الفاظ سُنے تو اپنے متعلق شبہ میں پڑ گیا۔ اور دل میں ایک خلش لئے گھر پہنچا اور اپنی ماں سے اس واقعہ کا تذکرہ کر کے تحقیقِ حال کی تو معلوم ہوا کہ وہ اس باپ کا بیٹا نہیں ہے جس کی طرف منسوب ہے بلکہ اُسی غلام کا بیٹا ہے اور اُس کی ماں کی خیانت نے اُسے جنم دیا ہے یُونہی زید اور اُن کے فرزند اُسامہ مسجد نبوی میں سر مُنہ ڈھانپے لیٹے ہوئے تھے کہ مجزز ابن اعور مدلجی کا اُدھر سے گزر ہوا۔ اُس نے اِن دونوں کے کُھلے ہوئے پیروں کو دیکھ کر کہا کہ یہ باپ کے پیر ہیں اور یہ بیٹے کے۔ حالانکہ وہ ان دونوں کی شخصیت اور اُن کے باہمی رشتہ سے بے خبر تھا۔ صرف پیروں کو دیکھ کر معلوم کر لیا کہ ان میں ایک باپ ہے اور ایک بیٹا۔

یہ قانونِ فطرت صرف انسانوں ہی میں کارفرما نہیں ہے بلکہ نباتات و حیوانات میں بھی جاری و ساری

ہے۔ چنانچہ آسٹریلیا کے ایک پادری مینڈل نے نبات و حیوان پر تجربات کرتے ہوئے بتایا کہ اس نے مٹر کے لانبے اور چھوٹے قد والے پودوں کے زر دانوں کو ملا کر بیج تیار کیا۔ اور جب انہیں بویا تو تمام پودے لانبے قد والے پیدا ہوئے۔ پھر اُس نے ان لانبے پودوں کو آپس میں ملا کر بیج حاصل کیا اور انہیں بویا تو یہ دیکھا کہ سو میں پچھتر لانبے اور پچیس چھوٹے قد والے پودے اُگ آئے ہیں۔ اسی طرح اُس نے جانوروں پر بھی تجربہ کیا اور ایک سفید مرغ کو جس پر خال نما سیاہ دھبّے تھے ایک سیاہ رنگ کی مرغی سے ملایا اور اُس کے انڈے سے بچہ نکلوایا وُہ بچّہ نیلے رنگ کا مرغ نکلا۔ پھر اس نیلے رنگ والے مرغ کو دوسری مرغی سے ملا کر انڈے حاصل کئے۔ اُن انڈوں میں سے جو بچّے نکلے ان میں سے دو نیلے رنگ کے مرغ تھے ایک سیاہ رنگ کی مرغی اور ایک سفید مرغ تھا جس پر ویسے ہی خال نما سیاہ دھبے تھے جیسے پہلے مرغ پر تھے۔ اس نباتی و حیوانی تجربہ سے اُس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ نسلی خصوصیت ایک نسل میں دب بھی جائے تو اگلی نسل میں ضرور اُبھر آتی ہے۔

یہ مماثلت صرف شکل و صورت نک سک اور نوک پلک ہی میں نہیں ہوتی بلکہ اولاد خو خصلت اور افتاد و نہاد کے لحاظ سے بھی اپنے اسلاف کی آئینہ دار ہوتی ہے اور اُن کے طبعی خصائل و شمائل اس کی طرف منتقل ہوتے ہیں۔ چنانچہ علوم جدیدہ نے تجزیہ و تحقیق کے بعد بتایا ہے کہ عورت و مرد کے تخم کے امتزاج سے بننے والا خلیہ دار جسم اور اس کے ذرّات لونیہ جن سے دوسرے خلیوں کی تخلیق ہوتی ہے آباؤ اجداد کے طبعی خصائص و اوصاف ساتھ لے کر آتے ہیں۔ ان خلیوں میں سے ہر خلیہ کے اندر چھیالیس ہزار کروموزم ہوتے ہیں جو اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ انہیں عام خوردبینوں سے دیکھا نہیں جا سکتا۔ اس چھوٹے سے کروموسوم کے اندر کم از کم تیس ہزار جینز ہوتے ہیں۔ اور یہی جینز آبائی و خاندانی اثرات کو اولاد کی طرف منتقل کرتے ہیں اس اعتبار سے شکم مادر ہی میں آبائی خط و خال کے ساتھ آبائی خصوصیات کے نقوش بھی اُبھرنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اور جب نومولود دُنیا میں آتا ہے تو وُہ نہ صرف جسمانی لحاظ سے بلکہ ذہنی ساخت کے اعتبار سے بھی اپنے والدین اور اسلاف سے مشابہ ہوتا ہے اور پیدا ہونے کے بعد اس کے ہاتھ پیر کی حرکتیں اُسی ذہنی قوت کی تحریک کا نتیجہ ہوتی ہیں جسے وُہ ماں باپ سے ورثہ میں لے کر آتا ہے۔ یہ واضح رہے کہ جو صفات کسب و تحصیل سے تعلق رکھتے ہیں جیسے علوم و فنون اور حرفت و صنعت کاری وغیرہ وُہ اولاد کو وراثت میں نہیں ملتے بلکہ صرف فطری و طبعی خصائص ہی اولاد کی طرف منتقل ہوتے ہیں اور وُہ بھی قوت و استعداد کی صورت میں۔ اور ان خصائص و صفات کی تکمیل مناسب ماحول اور مناسب تربیت کے زیر اثر ہوتی ہے۔ اور مناسب ماحول یا طبعی استعداد ہی نہ ہو تو وُہ صفات دب جاتے ہیں۔ لیکن آگے بڑھ کر پوتوں پڑپوتوں یا اُن کی اولاد میں کہیں نہ کہیں ضرور اُبھر آتے ہیں بشرطیکہ ماحول اور گرد و پیش کے نامناسب حالات نے آباؤ اجداد کی طرف سے منتقل ہونے والی قوت و استعداد کو بیگانگی و بے تعلقی کی حد تک ختم نہ کر دیا ہو۔

اس توارث صفات کی بنا پر اگر کسی کے آباؤ اجداد مذموم وناپسندیدہ صفات کے حامل ہوتے ہیں تو اولاد بھی بُرے اثرات سے خالی نہیں رہ سکتی۔ اور اگر کسی کے اسلاف بلند ملکات و اعلےٰ صفات کے مالک ہوتے ہیں تو اولاد کی شخصیت کے تعمیری عناصر میں ان صفات کی اثر اندازی و کارفرمائی بھی ضروری ہے۔ لہٰذا کسی شخصیت کو پرکھنے اور جانچنے میں اس کے اسلاف کے صفات و خصائل کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا بلکہ انہی کے خصائص وصفات کی روشنی میں اس کے ذہنی و فکری رجحان کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ اور جس شخص کا آبائی سلسلہ اندھیرے میں ہو اس کی فطری صلاحیت اور طبعی رجحان کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ من لم یعرف النسب لم یعرف الناس۔ جو نسب سے واقف نہیں ہے وہ انسان کے صحیح خدوخال نہیں پہچان سکتا۔" امیر المومنین کی شخصیت اور ان کی نسبی و خاندانی رفعت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ کے ان اسلاف پر بھی ایک نظر کی جائے کہ جن کی پشتوں میں نسلاً بعد نسل منتقل ہوتے رہے ہیں۔ تاکہ نسلی خصوصیات اور ان خصائص وصفات کا اندازہ ہو سکے جو انہیں اپنے آباؤ اجداد سے بتقاضائے بشریت ورثہ میں ملے اور ان کی عظیم شخصیت کی تعمیر میں ایک مناسب وساز گار عنصر کی حیثیت سے کارفرما ہے۔

حضرت کا سلسلۂ نسب یہ ہے:۔ علی ابن ابی طالب ابن عبد المطلب ابن ہاشم ابن عبد مناف ابن قصی ابن کلاب ابن مرہ ابن کعب ابن لوی ابن غالب ابن فہر ابن مالک ابن نضر ابن کنانہ ابن خزیمہ ابن مدرکہ ابن الیاس ابن مضر ابن نزار ابن معد ابن عدنان۔

تاریخ عرب شاہد ہے کہ اس سلسلۂ جلیلہ کا تمام فرد اپنے اپنے عہد میں دُنیا کی بڑی اور عظیم شخصیتیں تھیں اور ان میں کا ہر فرد اپنے آداب وطرز معاشرت میں ایک تہذیب خاص کا حامل مسلک ابراہیمی کا پیرو، اصلاح و تجدید کا پیغامبر، ذہنی و عملی انقلاب کا داعی اور بے داغ کردار کا مالک تھا۔ انہوں نے کفرستانِ عرب کی تاریکی و تیرگی میں دینِ حنیف کی شمعیں بلند رکھیں وحشت، جہالت اور اخلاقی زبوں حالی کے دور میں اخلاقی اقدار کی حفاظت کی اور اپنے عمل و کردار سے عظمتِ انسانی کے نقوش روشن کئے۔ تہذیب و شائستگی کے فروغ معاشرہ کی اصلاح و ترقی اور عمرانی و اجتماعی عدل اور انسانی حقوق کے تحفظ کو اپنی زندگی کا اہم ترین مقصد قرار دیا۔ شرّ و فساد کے عناصر کو کچلنے۔ انسانیت، اخوت اور ہمدردی کے جذبات پیدا کرنے میں اپنے مساعی کو سرگرم عمل رکھا۔ تفرقہ بندیوں کو ختم کرنے کے لئے جماعتی تنظیم کی بنیاد ڈالی۔ تجارت کو فروغ دے کر معاشی فلاح و بہبود کا سامان کیا۔ مظلوموں کی حمایت و حق رسی کا بیڑا اُٹھایا اور دُور و دراز سے آنے والے حاجیوں کی مہمان داری اور مسافروں اور بے نواؤں کی خدمت و اعانت کا ذمہ لیا۔ یہی وہ امتیازات تھے جن کی وجہ سے عوام کے دلوں میں شایانِ شان مقام حاصل کیا اور غیر معمولی عظمت و توقیر کی نظروں سے دیکھے گئے۔

ذیل میں ان عظیم اور تاریخ ساز شخصیتوں کے حالاتِ زندگی مختلف تاریخی کُتب سے اختصار کے ساتھ درج کئے جاتے ہیں تاکہ ان کی بلند سیرتوں اور قابلِ فخر کارناموں پر روشنی پڑ سکے۔

عدنان ابنِ ادد :۔ آپ حضرت اسمٰعیل کے فرزند قیدار کی اولاد میں ایک نمایاں شخصیت تھے۔ قیدار کی اولاد حجاز ہی میں سکونت پذیر رہی اور آپ بھی حجاز میں پیدا ہوے۔ بنی اسمٰعیل کے مشہور قبائل انہی کی نسل سے ہیں۔ اسی بناء پر اُنہیں آلِ عدنان اور آلِ مضر کہا جاتا ہے۔ آپ وجیہہ خوش صورت اور بچپن ہی سے عمدہ و پاکیزہ اخلاق کے مالک تھے۔ چہرے سے فطانت و ذہانت کے آثار جھلکتے تھے اور پیشانی سے اقبال و ہوشمندی کی کرنیں پھُوٹتی تھیں۔ ماتھے کی چمک اور چہرے کی تابندگی غمازی کرتی تھی کہ ان کی نسل سے ایک نُورِ قدسی کا ظہُور ہوگا جو اپنے رُخِ روشن کی چھُوٹ سے عالم کو منوّر و تاباں کرے گا۔

آپ اس دَور کے باوقار و پُرتمکنت سردار مشہور ترین شجاع تلوار کے دھنی اور میدانِ جنگ کے یکہ تاز شہسوار تھے اپنی شجاعت و دلیری کی وجہ سے ایک نمایاں مقام حاصل کیا اور عرب کی ریاست و سربراہی کے بلند عہدہ پر فائز ہوئے۔ بطحاء و یثرب کے باشندوں کے علاوہ صحرائی قبائل نے بھی ان کی ریاست و سیادت کو تسلیم کیا اور ان کے پرچمِ اقتدار کے نیچے جمع ہو گئے۔ آپ نے خانہ کعبہ کی عظمت و توقیر کے پیشِ نظر ایک پردہ تیار کروایا اور اُسے کعبہ پر آویزاں کرنے کا شرف حاصل کیا۔ بلاذری نے لکھا ہے :۔

اول من کسا الکعبة عدنان — عدنان نے سب سے پہلے خانہ کعبہ پر غلاف چڑھایا"

(انساب۔ ج ۱۔ ص ۱۵)

جب کلدانی فرمانروا بخت نصر بیت المقدس فتح کرنے کے بعد بلاد عرب کی طرف تاخت و تاراج کے لئے بڑھا اور سرزمین حجاز پر حملہ آور ہؤا تو آپ نے امکانی حد تک اس کا مقابلہ کیا مگر آپ کے ہمراہیوں کے قدم اُکھڑ گئے اور جان بچا کر بھاگ کھڑے ہوے۔ آپ اکیلے یا چند آدمیوں کے ساتھ دُشمن کی افواج قاہرہ کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ آپ نے حجاز چھوڑنے ہی میں مصلحت سمجھی اور اپنے بیٹوں کو لے کر یمن چلے آئے اور یہیں پر طرحِ اقامت ڈالی اور یہیں پر وفات پائی۔ آپ نے دس فرزند چھوڑے جن میں سب سے زیادہ نامور اور بلند مرتبت معد ہیں۔

معد ابن عدنان :۔ آپ کی والدہ کا نام مہدد بنت اللہم تھا جو قبیلۂ بنی جرہم سے تھیں۔ آپ اپنے والد کے ہمراہ یمن میں سکونت پذیر تھے وہیں پر پلے بڑھے اور وہیں پر تعلیم و تربیت پائی۔ جب بخت نصر دُنیا سے چل بسا اور عرب کی فضا پُرسکون ہوی تو قبائل عرب نے انھیں حجاز واپس آنے کی دعوت دی اور ایک شخص کو خصوصی طور پر ان کے لانے کے بھیجا اور آپ اس کے ہمراہ حجاز چلے آئے۔ اور ایک روایت یہ ہے کہ جب بخت نصر نے عرب پر اقتدار حاصل کر لیا تو حضرت ارمیاء انہیں اپنے ساتھ شام لے گئے اور وہیں پر رہتے سہتے رہے۔ جب بخت نصر کے مرنے سے فتنے تھمے تو آپ حجاز چلے آئے اور عرب کی ریاست و سرداری کے منصب پر فائز ہوے۔ یعقوبی نے لکھا ہے کہ اولادِ اسمٰعیلؑ میں کوی فرد عزت و شرف کے لحاظ سے اُن کے مرتبہ کو نہ پہنچ سکی۔ اپنی حق گوئی، راست بیانی اور خوش اطواری کی بدولت ایک بلند مقام حاصل کیا اور عرب میں

انتہائی عزّت و احترام کی نظروں سے دیکھے گئے۔ آپ بھی اپنے والد گرامی کی طرح شجاع، نبرد آزما اور فنونِ جنگ میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ نہ کبھی دُشمن کو پیٹھ دکھائی اور نہ کبھی شکست سے دو چار ہوے بلکہ ہمیشہ حریف کے مقابلہ میں فاتح و غالب رہے۔ صاحب تاریخ خمیس نے لکھا ہے:۔

لو یحارب احداً الارجع بالنصرو الظفر (تاریخ خمیس ج۱۔ ص۱۴۷)۔	جس سے جنگ کی اس کے مقابلہ میں فتح و کامرانی کے ساتھ پلٹے۔"

آپ نے سب سے پہلے اُونٹوں پر کجاوہ رکھنے اور اُسے تنگ سے باندھنے کا رواج دیا اور سرزمین حرم کے حدود پر پتھر نصب کر کے ہمیشہ کے لیئے اس کی حد بندی کر دی۔

آپ کے چار فرزند تھے۔ قضاعہ، نزار، قنص اور ایاد۔ قضاعہ بڑا بیٹا تھا، اسی کے نام پر ان کی کنیت ابو قضاعہ قرار پائی۔ ان بیٹوں میں نزار شرف خصوصی کے حامل ہوے۔

نزار ابن معد:۔ آپ کی والدہ کا نام معانہ بنت جوشم تھا جو قبیلۂ بنی جرہم سے تھیں۔ نزار کی ولادت انتہائی مسرّت و شادمانی کے جلو میں ہوی کیونکہ معد آپ کی تابندہ و تابناک پیشانی کو دیکھ کر سمجھ گئے تھے کہ یہی بچہ حاملِ نُورِ نبوّت و وِرثہ دار امانتِ خلیل ہے۔ انہوں نے اس ولادت کی خوشی میں ہزار اُونٹ ذبح کئے۔ اور بڑے پیمانہ پر قبائلِ عرب کی دعوت کی اور مولودِ نو سے مخاطب ہو کر کہا:۔

لقد استقللت لك هذا القربان وانه نزر قليل	تمہارے مرتبہ کو دیکھتے ہوئے میں اس قربانی کو کم سمجھتا ہوں اور یہ ہے بھی بہت کم۔

(تاریخ خمیس ج۱۔ ص۱۴۸)

اور چونکہ نزار کے معنی تھوڑے اور کم کے ہیں اس لیئے بچّے کا نام ہی نزار پڑ گیا۔ آپ حُسنِ صُورت اور عقل و دانش کے اعتبار سے اپنی مثل و نظیر نہ رکھتے تھے۔ دیار بکری نے لکھا ہے:۔

خرج اجمل اهل زمانه واكثرهم عقلا۔ (تاریخ خمیس ج۱۔ ص۱۴۸)۔	آپ اپنے دَور میں حسن و جمال اور عقل و دانش میں سب سے بڑھے ہوئے تھے۔"

معد کے انتقال کے بعد قبائلِ عرب کی قیادت و سرداری انہی سے متعلق ہوی اور آپ اپنے فرائض پُوری ذمہ داری سے ادا کرتے رہے۔ انہوں نے سب سے پہلے عَربی تحریر کی ابتداء کی اور عَربی رسم الخط ایجاد کیا۔ زندگی کے آخری ایام میں اپنے بیٹوں سمیت صحرا میں مقیم تھے۔ جب مَوت کے آثار دیکھے تو وہاں سے اُٹھ کر مکّہ میں چلے آئے اور وہیں پر انتقال کیا۔ صاحبِ تاریخ خمیس نے لکھا ہے کہ آپ مدینہ کے قریب ذات الجیش میں دفن ہوئے۔ آپ نے چار فرزند چھوڑے۔ ربیعہ، انمار، مضر اور ایاد۔ ان میں مضر اس سلسلہ جلیلہ کی ایک کڑی ہیں۔

مضر ابن نزار:۔ آپ کی والدہ کا نام سودہ بنت عک تھا۔ آپ ملّتِ ابراہیمی سے وابستہ اور دینِ حنیف

کے پیرو تھے۔ اور دُوسروں کو بھی دینِ حنیف کی پیروی کی تلقین کرتے تھے۔ اس دینِ حنیف سے وابستگی کے سلسلہ میں پیغمبرؐ اکرم کا ارشاد ہے:۔

انہما کانا علیٰ دین ابراھیم (تاریخ یعقوبی ج۔ ص۲۲۶) ربیعہ اور مضر دونوں ابراہیمؑ کے دین پر تھے"۔

اور ایک دُوسری حدیث میں ارشاد فرمایا ہے:۔

لاتسبّوا مضر فانہ کان قد اسلم۔ (طبقات ابن سعد ج۱۔ ص۵۸)۔ مضر کو بُرا نہ کہو اس لئے کہ وُہ مسلمان تھے"۔

مضر جود و کرم اور عقل و فہم میں یگانہ اور ہر لحاظ سے اپنے بھائیوں میں ممتاز تھے۔ اگرچہ نزار کے چاروں بیٹے عقل و دانش اور فہم و فراست میں مانے ہوئے تھے مگر مضر میں معاملہ فہمی، حقیقت رسی اور مردم شناسی کا خصوصی جوہر تھا۔ بلاذری نے تحریر کیا ہے کہ جب نزار کا انتقال ہوگیا تو ربیعہ اور مضر نے فرمانروائے وقت کے ہاں جانے کا ارادہ کیا تاکہ وُہ قبیلہ کی سرداری ان دونوں میں سے کسی ایک کے نام کرے۔ ادھر مضر سامانِ سفر کی فراہمی میں مصروف ہوئے۔ اُدھر ربیعہ چُپکے سے نکل کھڑا ہُوا اور بادشاہ کے ہاں پہنچ گیا اور اس سے اچھی خاصی راہ و رسم پیدا کرلی اور اس کے جلد روانہ ہونے کا مقصد بھی یہی تھا کہ بادشاہ سے مراسم پیدا کرکے اُسے اپنی طرف مائل کرے اور زیادہ سے زیادہ انعام و اکرام حاصل کرے۔ چند دنوں کے بعد مضر بھی سامان سفر کی تکمیل کے بعد پہنچ گئے مگر اپنی خودداری کی بنا پر بادشاہ سے اس حد تک راہ و رسم پیدا نہ کرسکے جس حد تک ربیعہ پیدا کرچکا تھا۔ جب ان دونوں کی واپسی کا وقت قریب آیا تو بادشاہ نے اُن سے کہا کہ تم اپنے ضروریات بتاؤ تاکہ انہیں پُورا کردیا جائے۔ مضر سمجھ رہے تھے کہ ربیعہ کو ان پر ترجیح تو دی ہی جائے گی۔ کہا کہ آپ جو مجھے دیں اس سے دو گنا زائد ربیعہ کو دیں کیونکہ وُہ سن و سال میں مجھ سے بڑے ہیں۔ بادشاہ نے کہا کہ ایسا ہی ہوگا۔ تم اپنے ضروریات بیان کرو۔ کہا کہ مَیں صرف یہ چاہتا ہوں کہ میری ایک آنکھ پھوڑ دی جائے۔ بادشاہ پہلے تو اُن کی بات سُن کر حیران ہُوا اور پھر اُن کے مقصد کو سمجھ کر مُسکرایا اور کہا کہ آپ فکر نہ کریں میں دونوں سے یکساں برتاؤ کروں گا اور ایک کو دُوسرے پر ترجیح نہیں دوں گا۔ یہ تھی مضر کی فراست کہ پہلے تو وُہ بات کہی جو بادشاہ کے دِل کو لگتی تھی۔ اور پھر ایسی بات کہہ دی کہ وُہ اِن دونوں میں انصاف کرنے پر مجبور ہوگیا۔ اور اس طرح انہوں نے نہ اپنے حصہ میں کمی ہونے دی اور نہ اپنی قدر و منزلت میں۔

اِس فہم و فراست کے علاوہ آپ بڑے خوش گلو اور خوش آواز تھے یہانتک کہ حیوان بھی اُن کی خوش آوازی سے متاثر ہُوئے بغیر نہ رہتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ اُونٹ پر سے گر پڑے جس سے ہاتھ پر سخت چوٹ آئی اور پُرسوز لے میں زبان سے نکلا یا یداہ یا یداہ (ہائے میرا ہاتھ ہائے میرا ہاتھ) اس آواز کو سُن کر آس پاس کے چرنے والے اُونٹ اُن کے گرد جمع ہوگئے۔ جب ہاتھ ٹھیک ٹھاک ہوگیا تو اُونٹ پر سوار ہونے کے بعد اپنی زبان کو نغمہ ریز رکھتے جس سے اُونٹ جھُومنے لگتا اور اس کے قدموں میں تیزی آجاتی۔ اسی سے عرب

میں حدی خوانی کا رواج ہوا اور اسے رجز کا نام دیا گیا۔ ان رجزیہ اشعار کے وزن میں اور اونٹ کی چال میں پوری مطابقت وہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اور یہی ہم آہنگی تیز رفتاری کی محرک ہوتی ہے۔ اور بعض حدی خوانوں نے تو مضر کے الفاظ کو حدی کا جزو قرار دے لیا۔ چنانچہ ایک حدی خواں کہتا ہے:۔

یا ھادیا یا ھادیا ویا یداہ یا یداہ

محمد ابن عبداللہ الازرقی نے "اخبار مکہ" میں لکھا ہے کہ بنی جرہم کے بعد آپ نے خانہ کعبہ کی تعمیر نو کی۔ نیکی و ہدایت کے سلسلہ میں اپنے بیٹوں کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا:۔

من یزرع شرا یحصد ندامة	جو شر کا بیج بوتا ہے وہ ندامت و شرمندگی
خیر الخیر اعجله فاحملوا	سمیٹتا ہے۔ عمدہ بھلائی وہ ہے جو فوراً ہو۔
انفسکم علیٰ مکروھھا فیما	اپنے نفسوں کو ان ناگوار چیزوں پر ابھارو جو
اصلحکم واصرفوھا عن	تمہاری اصلاح و درستی کریں اور ان پسندیدہ
ھواھا فیما افسدکم فلیس	چیزوں سے روکو جو خرابی کا باعث ہوں اس لئے
بین الصلاح والفساد الا	کہ صبر اور ضبطِ نفس ہی وہ چیز ہے جو صلاح اور
صبر و وقایة (تاریخ یعقوبی ج ا ص ۲۳۶)	فساد کے درمیان حدِ فاصل ہے"۔

آپ نے دو فرزند چھوڑے ایک عیلان اور دوسرے الیاس۔

الیاس ابن مضر:۔ آپ کا اصلی نام حبیب تھا۔ اور جب پیدا ہوئے تھے تو مضر پر ضعیفی و یاس کا عالم طاری تھا۔ اس بنا پر الیاس کے نام سے موسوم ہو گئے۔ والدہ کا نام رباب بنت حیدہ تھا۔ مضر کے بعد قبائل عرب کے رئیس و سردار قرار پائے اور کبیر القوم اور سید العشیرہ کے لقب سے یاد کئے گئے ان کی زندگی پر ملتِ ابراہیمی کا گہرا سایہ تھا اور ایک ایک عمل دینِ حنیف کا آئینہ دار تھا۔ چنانچہ پیغمبر اکرمؐ نے ان کے ایمان کی شہادت دیتے ہوئے فرمایا:۔

لا تسبوا الیاس فانه کان	الیاس کو برا نہ کہو اس لئے کہ وہ
مومنا۔ (سیرۃ حلبیہ ج ا ص ۱۸)	صاحب ایمان تھے۔

اپنے حسن خدمات کے نتیجہ میں جتنی توقیر و عظمت اور عزت و شہرت انہوں نے حاصل کی اس کی مثال اس دور میں کہیں نظر نہیں آتی دیار بکری نے تحریر کیا ہے:۔

لم تزل العرب تعظم الیاس	عرب الیاس ابن مضر کی اسی طرح تعظیم کرتے تھے
ابن مضر تعظیم اھل الحکمة	جس طرح لقمان اور ان کے پایہ کے دوسرے
کلقمان واشباھه (تاریخ خمیس ج ا ص ۱۴۹)	حکماء اور دانشمندوں کی"۔

قبائل عرب ان کی سوجھ بوجھ اور اصابت رائے پر مکمل اعتماد رکھتے تھے اور قبائلی معاملات اور دوسرے نزاعی امور

انہی کی صوابدید سے طے ہوتے تھے۔ ان کی زندگی کا درخشاں کارنامہ یہ ہے کہ اُس تاریک دَور میں جبکہ دینِ ابراہیمی میں سے جو آثار رہ گئے تھے وُہ مٹتے اور ختم ہوتے جا رہے تھے نظر و فکر کی روشنی پیدا کی اور اپنے آباؤ اجداد کے طریق و مسلک کا کھوج نکالا اور اس میں جو تغیّر و تبدّل ہو چکا تھا اُسے مٹایا، اور ملّتِ ابراہیمی کی تجدید کر کے اولادِ اسمٰعیل کو اس کا پابند بنایا اور اس طرح دینِ حنیف کی حفاظت اور ملّتِ ابراہیمی کے تحفّظ کا فریضہ ادا کیا۔ یعقوبی نے تحریر کیا ہے:۔

کان اول من انکر علی بنی اسمٰعیل ماغیروا من سنن آباءھم و ظھرت منہ امور جمیلۃ حتی رضوا بہ رضا لم یرضوہ باحد من ولد اسمٰعیل بعد ادد فردھم الی سنن آباءھم حتی رجعت السنۃ تامۃ علی اوّلھا۔ (تاریخ یعقوبی جلد ۱ صفحہ ۲۲۶)۔

الیاس پہلی فرد ہے جس نے بنی اسمٰعیل کی اس روش پر نکتہ چینی کی کہ انہوں نے سُنّتِ آبائی کو بدل ڈالا ہے اور ایسے اچھے کام انجام دیئے کہ تمام لوگ اس سے اتنا خوش ہوئے کہ ادد کے بعد اولادِ اسمٰعیل میں سے کسی سے اتنا خوش نہ ہوئے تھے۔ اس نے اولادِ اسمٰعیل کو آبائی سُنّت کی طرف پلٹایا یہاں تک کہ تمام سنن و احکام، سابقہ شکل و صورت میں عود کر آئے۔

الیاس مرضِ سِل میں مُبتلا تھے۔ ان کی اہلیہ لیلیٰ بنتِ حلوان نے جو خندف کے لقب سے مشہور تھیں یہ قسم کھائی کہ اگر الیاس کو اس مرض سے شفا نہ ہوئی اور وُہ وفات پا گئے تو اپنی بیوگی کا زمانہ جنگلوں اور صحراؤں میں گزاریں گی اور کسی چھت یا سایہ کے نیچے نہ بیٹھیں گی۔ جب الیاس اس مرض سے جانبر نہ ہو سکے تو لیلیٰ صحرا و بیابان کی طرف نکل گئیں اور وہیں رونے دھونے میں اپنا رنڈاپا کاٹا خصوصاً پنجشنبہ کے دن طلوعِ آفتاب سے لے کر غروبِ آفتاب تک نوحہ و زاری میں گزارتی تھیں۔ کیونکہ پنجشنبہ کے دن الیاس فوت ہوئے تھے۔ آخر اسی ... غم و اندوہ اور قلق و اضطراب میں اپنی زندگی کے دن گزار دیئے۔

الیاس نے اپنے بعد تین فرزند چھوڑے۔ عمرو، عامر اور عمیر۔ یہ تینوں بالترتیب مدرکہ، طابخہ اور قمعہ کے ناموں سے یاد کئے جاتے ہیں۔ الیاس کے بیٹے اور اُن کی طرف منسوب ہونے والے قبائل بنی خندف کہلاتے ہیں۔

مدرکہ ابنِ الیاس:۔ ان کا اصلی نام عمرو اور کنیت ابوالہذیل تھی۔ اور والدہ کا نام لیلیٰ بنت حلوان قضاعیہ تھا۔ مدرکہ کی وجہ تسمیہ کے سلسلہ میں یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ آپ کے والد الیاس بال بچوں کو لے کر صحرا کی طرف گئے۔ جب وہاں پر منزل کی تو اُونٹوں کی قطار میں ایک خرگوش گھس آیا اور اُونٹ بدکنے لگے۔ عمرو نے اس خرگوش کا پیچھا کیا اور اُسے پا لیا۔ اس لیئے اُن کا نام مدرکہ (پا لینے والا) رکھ دیا گیا۔ اور ایک قول یہ ہے کہ یہ نام اس بنا پر تجویز ہوُا کہ انہوں نے اپنے اجداد کے تمام محاسن و

کمالات کو پالیا تھا۔ چنانچہ دیار بکری لکھتے ہیں:۔

انما سمی مدرکۃ لانہ ادرک کل عز کان فی ابائہ۔ (تاریخ خمیس ج ۱ ص ۱۵۱)	"ان کا نام مدرکہ اس لئے ہوا کہ انہوں نے اپنے باپ دادا کی تمام عزتوں کو حاصل کر لیا تھا۔"

آپ اپنے بلند پایہ اجداد کی عظمتوں کے امین اور اُن کی رفعتوں کے وارث تھے اور اس شرف و امتیاز کی وجہ سے عرب کی سیادت و ریاست کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ یعقوبی نے لکھا ہے:۔

کان مدرکۃ ابن الیاس سید ولد نزار قد بان فضلہ وظھر مجدہ۔ (تاریخ یعقوبی ج ۱۔ ص ۲۲۹)۔	"مدرکہ ابن الیاس اولاد نزار کے سردار تھے اور ان کی فضیلت عیاں اور بزرگی نمایاں ہے۔"

آپ نے اپنے بعد دو فرزند چھوڑے:۔ ہذیل اور خزیمہ۔

خزیمہ ابن مدرکہ:۔ ان کی کنیت ابو الاسد اور والدہ کا نام سلمیٰ بنت اسلم قضاعیہ تھا۔ دینِ حنیف کی پابندی اس سلسلہ عالیہ کا شعار تھا۔ آپ بھی اپنے آباؤ اجداد کی طرح مسلکِ ابراہیمی پر گامزن رہے۔ عرب میں قبائلی حکومت کا رواج تھا اور پشتوں سے یہ حکومت اس خاندان میں چلی آرہی تھی۔ آپ بھی قبائلِ عرب کی سرداری و سربراہی کے منصب پر فائز ہوئے۔ یعقوبی نے لکھا ہے کہ آپ عرب کے فرمانرواؤں میں ایک ممتاز فرمانروا اور بزرگی و فضیلت کے جوہر سے آراستہ تھے۔ عرب ان کے کمالِ فضیلت کے معترف اور ان کی رفعت و سربلندی کے سامنے سرنگم تھے۔

آپ نے تین فرزند چھوڑے۔ اسد، ہون اور کنانہ۔

کنانہ ابن خزیمہ:۔ آپ کی کنیت ابو نضر اور والدہ کا نام عوانہ بنت سعد تھا۔ خزیمہ کے بعد قبائلِ عرب کی سرداری ان کے پائے نام ہوئی۔ اس سرداری و ریاست کے ساتھ محاسن و مکارم میں بھی اپنی مثل و نظیر نہ رکھتے تھے۔ اور اتنی خوبیوں کے مالک تھے کہ ان کا شمار نہیں ہو سکتا۔ عرب ان کے علم و فضل اور جود و سخا کی وجہ سے انہیں انتہائی عزت و احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے اور اُن کی رفعت و بلندی کا اعتراف کرتے تھے۔ علامہ حلبی نے لکھا ہے:۔

کان شیخا حسنا عظیم القدر تحج الیہ العرب لعلمہ وفضلہ	"کنانہ بلند کردار و بلند منزلت بزرگ تھے۔ اور اپنے علم و فضل کی وجہ سے مرجع عرب تھے۔"

(سیرتِ حلبیہ ج ۱۔ ص ۱۶)۔

مورخین نے ان کے جود و کرم کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ کبھی تنہا کھانا نہ کھاتے تھے بلکہ کسی نہ کسی کو اپنا مہمان بناتے اور اس کے ساتھ مل کر کھانا کھاتے۔ اور اگر کوئی ساتھ کھانے والا نہ ہوتا تو ایک لقمہ خود کھاتے اور ایک لقمہ کسی پتھر کو مہمان تصور کرتے ہوئے اس کے آگے ڈالتے جاتے اور یوں بقول شاعر: وللارض من

کاس الکرام نصیب"۔ اپنے تقاضائے کرم کو پورا کرتے۔
ان کے حکیمانہ کلمات میں سے چند کلمے یہ ہیں:-

رب صورۃ تخالف المخبرۃ وقد	بہت سی صورتیں اپنے ظاہری جمال سے فریب دیتی
غرت بجمالها واختبر قبیح	ہیں حالانکہ ان کا ظاہر کچھ ہوتا ہے اور باطن کچھ۔
فعالها واحذر الصور و	بُرے افعال کو جانچو۔ ظاہری صُورت پر نہ جاؤ اور
اطلب الخبر۔ (سیرۃ حلبیہ ج۔ ص۱۶)	سیرت پر نظر رکھو"۔

آپ کی متعدد اولادیں تھیں جن میں سے نضر نُورِ نبوّت کے حامل و امین قرار پائے۔

نضر ابن کنانہ:- آپ کا اصل نام تو قیس تھا۔ مگر حُسن و جمال اور چہرے کی رونق و شادابی کی وجہ سے نضر (خوشرو) کے نام سے مشہور ہوئے۔ کنیت ابو یخلد اور والدہ کا نام برہ بنت مر تھا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ پہلے پہل انہی کا لقب قریش قرار پایا۔ اور آپ ہی کی نسل جو مختلف شاخوں اور قبیلوں میں تقسیم ہوی قریش کہلاتی ہے۔ انہیں قریش کے لقب سے یاد کئے جانے کے چند وجوہ بیان کئے گئے ہیں۔ ایک وجہ یہ ہے کہ آپ کے قبیلہ و خاندان کے افراد صبح و شام آپ کے وسیع دستر خوان پر جمع ہوتے تھے اس اجتماع کی وجہ سے آپ کا لقب قریش ہؤا اس لئے کہ تقرش کے معنی یکجا ہونے کے ہیں۔ اور ایک وجہ یہ ہے کہ آپ فقراء و مساکین کے ضروریات کا ڈھونڈ ڈھونڈ کر کھوج لگاتے اور پھر انہیں پُورا کرتے تھے، اس بنأ پر اُن کا لقب قریش پڑ گیا کیونکہ تقریش کے معنی تلاش و تفحص کے ہیں۔ اور ایک قول یہ ہے کہ آپ ایک مرتبہ کشتی پر سوار ہو کر کہیں جا رہے تھے کہ آپ کے ہمراہیوں نے ایک بہت بڑے دریائی جانور کو جسے قریش کہا جاتا تھا دیکھا آپ نے تلوار سے حملہ کرکے اُسے مار ڈالا۔ لوگ اُسے اُٹھا کر مکّہ میں لے آئے اور کوہ ابو قبیس کی چوٹی پر رکھ دیا جو اُسے دیکھتا حیرت سے کہتا قتل النضر قریشا۔ نضر نے قریش کو مار ڈالا۔ اس بناء پر خود انہی کا نام قریش پڑ گیا۔ چنانچہ ایک شاعر نے کہا ہے:-

وقریش هی التی تسکن البحر   بها سمیت قریش قریشا

(ترجمہ) قریش ایک حیوان ہے جو سمندر میں رہتا ہے۔ اور اسی کے نام پر قریش کا نام قریش ہؤا"۔

ابو حنیفہ دینوری نے اخبار الطوال میں لکھا ہے کہ جب سکندر اپنے فتوحات کے سلسلہ میں یمن سے مکّہ معظمہ میں وارد ہوا تو نضر ابن کنانہ سے ملاقات کی۔ اس وقت بنی خزاعہ مکہ کے اقتدار پر قابض تھے۔ سکندر نے بنی خزاعہ کو حکم دیا کہ وُہ مکّہ چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں۔ اور مکہ کا نظم و نسق اور حرم کی نگہداشت نضر اور اُن کے بھائیوں سے متعلق کی اور معد ابن عدنان کی اولاد کو ہدایا و انعامات سے نوازا۔

نضر نے حکومت و ریاست پر فائز ہونے کے بعد اخلاقی و معاشی اصلاح پر توجہ دی۔ بے راہرویوں پر کڑی نظر رکھی، ظلم و استبداد کو مٹایا اور عظمت و بزرگی میں بڑا نام پیدا کیا۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ قتل پر

سَو اُونٹوں کی دیت کا نفاذ انہی نے کیا تھا۔
آپ نے اپنے بعد دو فرزند چھوڑے۔ مالک اور یخلد۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ ایک فرزند اور بھی تھا جس کا نام صلت تھا۔
مالک ابن نضر:۔ آپ کی کنیت ابوالحارث۔ اور والدہ کا نام عاتکہ بنت عدوان تھا بعض مورخین نے ماں کا نام عکرشہ لکھا ہے اور بعض نے یہ وضاحت کی ہے کہ عاتکہ نام ہے اور عکرشہ لقب ہے۔ آپ اپنے والد نضر کے بعد عرب کے باثمر اور ممتاز حکمران تسلیم کئے گئے۔ دیار بکری نے لکھا ہے:۔

انما سمی مالکا لانہ ملك العرب	آپ کا نام مالک اسی بنا پر تھا کہ آپ اقتدار عرب کے مالک تھے"۔
(تاریخ خمیس ج۱ ص۱۵۲)	

آپ دینِ ابراہیمی کے پیرو اور اپنے اسلاف کی راہ پر گامزن تھے۔ اپنے بعد تین فرزند چھوڑے۔ حارث شیبان اور فہر۔
فہر ابنِ مالک:۔ آپ کی کنیت ابوغالب اور والدہ کا نام جندلہ بنت حارث جرہمیہ تھا۔ بعض مؤرخین کے نزدیک فہر لقب تھا اور اصل نام قریش تھا۔ اور انہی پر سلسلۂ قریش منتہی ہوتا ہے اور انہی کی اولاد قریش ہے۔ ابن عبد ربہ نے تحریر کیا ہے:۔

اما قبائل قریش فانما تنتھی الی فھر ابن مالك لا تجاوزہ۔	قبائل قریش فہر ابن مالک پر منتہی ہوتے ہیں اور اُن سے آگے نہیں بڑھتے"۔

(عقد الفرید ج۱ ص۲۰۹)

آپ فضل و کمال کے جوہر سے آراستہ اور اپنے والد کی زندگی ہی میں اپنی عظیم شخصیت کی تعمیر کر چکے تھے۔ والد کی رحلت کے بعد اُن کے قائم مقام قرار پائے اور عرب کی ریاست و امارت پر فائز ہوئے علم و فضیلت میں نام پیدا کیا اور شجاعت و بسالت میں شہرہ آفاق ہوئے۔ انہی کے دورِ حکومت میں حاکم یمن حسان ابن عبد کلال، حمیریوں اور یمنیوں پر مشتمل ایک لشکر گراں لے کر مکہ پر حملہ آور ہوا تاکہ خانہ کعبہ کو مسمار کر کے اس کے پتھر وغیرہ یمن منتقل کر دے اور وہیں پر خانہ کعبہ تعمیر کرے۔ اور اس طرح مکہ کی تقدیس و مرکزیت کو ختم کر کے یمن کو ادائے حج کا مقام قرار دے۔ جب فہر کو یمنی لشکر کے ارادوں کا علم ہوا تو انہوں نے قبائل عرب کو جمع کر کے ایک لشکر ترتیب دیا اور اُس کے مقابلہ کے لئے میدان میں اُتر آئے۔ دونوں فریق میں بڑی خونریز جنگ ہوی جس میں فہر کا ایک بیٹا حارثہ بھی کام آگیا۔ آخر یمنیوں کو شکست فاش ہوی۔ حسان گرفتار کر لیا گیا اور تین سال قید و بند میں رہنے کے بعد فدیہ دے کر آزاد ہوا اور یمن جاتے ہوے راستہ میں مر کھپ گیا۔ اور اس طرح قدرت نے دشمن کعبہ کو تباہ و برباد اور اس کے لشکر کو تتر بتر کر کے نگہبانِ کعبہ کی سطوت و ہیبت کا سکّہ دلوں پر بٹھا دیا۔

آپ کے حکیمانہ کلمات میں سے ایک کلمہ یہ ہے جو اپنے فرزند غالب کو درس قناعت دیتے ہوئے فرمایا:۔

قلیل مافی یدیك اغنیٰ لك	تمہارے ہاتھوں میں جو تھوڑا سا مال ہے وہ اس
من کثیر اخلق وجهك و	مال فراواں سے کہیں بہتر ہے جس سے تمہاری
ان صار الیك۔ (سیرۃ حلبیہ ج۱ ص۱۶)	آبرو میں فرق آئے۔"

فہر کی چار اولادیں تھیں۔ غالب، محارب، حارث اور اسد۔

غالب ابن فہر:۔ آپ کی کنیت ابوتیم اور والدہ کا نام لیلیٰ بنت حارث تھا۔ اپنے والد فہر کے انتقال کے بعد قبائل عرب کی حکومت پر فائز ہوئے۔ اور شرف و عزّت کے اعتبار سے اتنا بلند مقام حاصل کیا کہ آسمانِ عزّ وجاہ کے نیّر تاباں بن گئے۔ آپ کے دو بیٹے تھے۔ تیم اور لوی۔

لوی ابن غالب:۔ لوی لای کی تصغیر ہے جس کے معنی نور و درخشندگی کے ہیں۔ آپ کی کنیت ابوکعب اور والدہ کا نام عاتکہ بنت یخلد تھا۔ اپنے والد کے بعد قبائل عرب کے سربراہ منتخب ہوئے اور فضل و کمال میں نمایاں امتیاز اور عزّ و شرف میں بلند مقام حاصل کیا۔ حرم کے باہر ایک کنواں کھودا جو ایسیرہ کے نام سے موسوم تھا۔ اس سے مقامی و غیر مقامی سب سیراب ہوتے تھے۔

آپ کے چار بیٹے تھے۔ کعب، عامر، سامہ اور عوف۔

کعب ابن لوی:۔ آپ کی کنیت ابو ہصیص اور والدہ کا نام ماویہ بنت کعب خزاعیہ تھا۔ آپ کے اخلاق و اطوار پاکیزہ اور کردار انتہائی بلند تھا۔ مظلوموں کی داد رسی کرتے، کمزوروں اور مصیبت زدوں کی دستگیری فرماتے۔ عرب کے مسلم الثبوت سردار قریش کی عظمتوں کے مرکز اور اپنے خانوادہ میں سب سے بڑھ کر ذی شرف و بلند مرتبت تھے۔ ان کی عظمت اسی سے ظاہر ہے کہ ان کی وفات سے سنہ کا اجرا ہوا جو عام الفیل تک باقی رہا۔ اور عرب سنہ کا اجرا کسی عظیم شخصیت کے اٹھ جانے یا کسی غیر معمولی حادثہ کے رونما ہونے سے کرتے تھے۔ یہ سنہ ۵۲۰ برس تک رائج رہا اور یہی آپ کی وفات اور واقعہ فیل کا درمیانی عرصہ ہے۔ آپ سے قبل عرب روزِ جمعہ کو عروبہ کہا کرتے تھے۔ آپ نے عروبہ کا نام جمعہ تجویز کیا، اور اس میں اجتماعات کی بنیاد ڈالی۔ ان اجتماعات میں خطبہ دیتے اور خطبہ میں "امابعد" سب سے پہلے آپ ہی نے استعمال کیا۔ البتہ خطوط و مکاتیب میں قس ابن ساعدہ ایادی نے اسے لکھنا شروع کیا۔ بہر حال آپ اپنے دور کے ایک سحر بیان خطیب تھے۔ جمعہ کے خطبوں کے علاوہ ایام حج میں جب اطراف و جوانب سے لوگ سمٹ کر مکہ میں جمع ہوتے تھے آپ کے خطبات فضائے بطحاء میں گونجا کرتے تھے۔ ان خطبوں میں وفائے عہد، صلۂ رحم، حسن سلوک اور بیت اللہ کی تعظیم و تکریم کی تلقین کرتے اور پیغمبرِ آخر الزمان کی آمد کی نوید سناتے۔ چنانچہ ایک خطبہ میں فرمایا:۔

صلوا ارحامکم و احفظوا اصہارکم	صلہ رحمی کرو، سببی قرابتوں کا لحاظ رکھو، وعدہ پورا کرو۔

واوفوا بعهد کم وثمروا اموالکم فانھا قوام مروا تکم ولا تصونوھا عما یجب علیکم واعظموا ھذا الحرم وتمسکوا بہ نبأ ویبعث منہ خاتم الانبیاء بذالک .... جاء موسیٰ وعیسیٰ ــ !
(انساب الاشراف ۔ج۱ ۔ ص۴۱)

اور اپنے مال کو (تجارت سے) بڑھاؤ اس لئے کہ مال ہی سے مروت و حسن سلوک کو باقی رکھا جا سکتا ہے ۔ جہاں مال صرف کرنے کی ضرورت ہو وہاں صرف کرنے میں دریغ نہ کرو ۔ اس حرم کی عظمت کو پہچانو اس سے وابستہ رہو ۔ عنقریب اس سے ایک عظیم خبر ظاہر ہو گی اور اسی مقام سے خاتم الانبیاءؐ مبعوث ہوں گے ۔ اور یہی خبر موسیٰؑ اور عیسیٰؑ لے کر آئے تھے "۔

آپ کے تین فرزند تھے ۔ مرہ ، عدی اور ہصیص ۔

مرہ ابن کعب :۔ آپ کی کنیت ابو یقظہ اور والدہ کا نام مخشیہ بنت شیبان تھا ۔ عرب کے بلند پایہ سردار اور نامور قائد تھے ۔ آپ نے عرفہ کے قریب ایک کنواں کھودا جسے الروا کہا جاتا تھا اور اہل مکہ ادھر ادھر سے گزرنے والوں کو سیراب کرتا تھا ۔

آپ کے تین فرزند تھے ۔ کلاب ۔ یقظہ اور تیم ۔

کلاب ابن مرہ :۔ آپ کا اصلی نام حکیم کنیت ابو زہرہ اور والدہ کا نام ہند بنت سریر تھا ۔ کلاب کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ آپ اکثر کلاب (کتوں) کے ساتھ شکار کھیلا کرتے تھے ۔ قبائل عرب میں ان کی شخصیت بڑی بلند اور اہم تھی ۔ آبائی شرف کے ساتھ مادری نسبت سے بھی شرف و امتیاز رکھتے تھے ۔ فہم و فراست اور تدبر و اصابت رائے میں مشہور تھے ۔ عرب اپنے اختلافات مٹانے کے لئے انہی کی طرف رجوع ہوتے اور انہی کے مشوروں پر عمل کرتے ۔ آپ نے رفاہ عامہ کے لئے مکہ کے باہر تین کنوئیں خم ۔ رم اور حفر کھودے ۔

آپ کے دو فرزند تھے : زہرہ اور قصی ۔

قصی ابن کلاب :۔ آپ کا اصلی نام زید ۔ کنیت ابو مغیرہ اور والدہ کا نام فاطمہ بنت سعد تھا ۔ کلاب ابن مرہ کی وفات کے بعد فاطمہ بنت سعد نے ربیعہ ابن حرام عذری سے عقد ثانی کر لیا اور اپنے شوہر کے ہمراہ بنی عذرہ کی بستیوں کی طرف چلی گئیں ۔ کلاب کا بڑا بیٹا زہرہ جوان تھا ۔ وہ مکہ ہی میں رہا ۔ اور قصی کمسن ہونے کی وجہ سے اپنی ماں کے ساتھ چلے گئے ۔ اور چونکہ اپنے افراد خاندان سے جدا اور مکہ سے دور ہو گئے تھے اس لئے قصی (دور افتادہ) کے نام سے یاد کئے جانے لگے اور اسی نام سے شہرت عام حاصل کی ۔ قصی بنی عذرہ ہی میں پلے بڑھے اور اسی قبیلہ کی ایک فرد شمار ہوتے رہے ۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ بنی عذرہ کے ایک شخص سے کسی بات پر نزاع ہو گئی ۔ اس نے طنز آمیز لہجہ میں کہا کہ تم ہمارے قبیلہ میں آ شامل ہوئے ہو ورنہ اس قوم و قبیلہ سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے ۔ قصی نے کہا کہ پھر کس قبیلہ سے ہوں ؟ کہا کہ یہ اپنی ماں سے دریافت کرو ۔ قصی کبیدہ خاطر ہو کر اپنی والدہ کے پاس آئے اور واقعہ بیان کر کے ان سے اپنے قوم و قبیلہ اور حسب و نسب کے بارے میں پوچھا

انہوں نے کہا:۔

یا بنی انت اکرم منه نفسا و ابا۔ انت ابن کلاب ابن مرة وقومك بمكة عند البيت الحرام۔ (تاریخ کامل۔ ج۲۔ ص۱۱)	اے بیٹے تم ذاتی جوہر کے لحاظ سے اور باپ کے اعتبار سے اس عذری سے کہیں زیادہ شریف تر اور باوقار ہو۔ تم کلاب ابن مرہ کے بیٹے ہو اور تمہارا قبیلہ مکّہ میں خانہ کعبہ کے پاس آباد ہے۔"

قصی کو جب معلوم ہوا کہ ان کا آبائی وطن مکّہ ہے تو انہوں نے وہاں جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ فاطمہ بنت سعد نے کہا میں تمہیں روکنا نہیں چاہتی بلکہ تمہیں وہاں جانا ہی چاہئے۔ وہیں تمہارے بھائی بند اور عزیز و اقارب ہیں لیکن کچھ دن انتظار کرو۔ جب بنی قضاعہ کا قافلہ حج کے لئے روانہ ہوگا تو تمہیں ان کے ہمراہ بھیج دیا جائے گا۔ جب حج کا زمانہ قریب آیا تو قصی اپنے سوتیلے بھائی زراج ابن ربیعہ کے ہمراہ بنی قضاعہ کے قافلہ میں شریک ہو کر مکّہ آ گئے اور اپنے بھائی زہرہ ابن کلاب کے ہاں مقیم ہوئے۔ اس وقت مکّہ بنی خزاعہ کے زیرِ اقتدار تھا اور حلیل ابن حبشیہ خزاعی مسندِ فرمانروائی پر متمکن تھا۔ قصی نے مکہ میں قیام کرنے کے بعد حلیل سے اس کی بیٹی حبّی کا رشتہ طلب کیا۔ حلیل ان کی ذاتی و خاندانی شرافت سے متاثر تو تھا ہی۔ اس نے فوراً اس رشتہ کو قبول کر لیا اور مراسمِ نکاح کے بعد اپنی بیٹی کو رُخصت کر دیا۔ حبی کے بطن سے قصی کے چار فرزند پیدا ہوئے جو عبد مناف، عبد العزیٰ، عبد القصی اور عبد الدار کے ناموں سے موسُوم ہوئے۔ جب یہ بچے جوان ہوئے تو حلیل نے کہا کہ قصی کے بیٹے میرے بیٹے ہیں کیونکہ وُہ میری دختر کے فرزند ہیں لہٰذا آیندہ وہی خانہ کعبہ کے متولی اور مکہ کے حکمران ہوں گے۔ چنانچہ قصی کو اپنا وصی و جانشین قرار دیا۔ ابنِ سعد نے لکھا ہے:۔

فاوصی بولاية البيت والقيام بامر مكة الى قصى وقال انت احق به۔ (طبقات۔ ج۱۔ ص۶۸)	حلیل نے وصیت کی کہ خانہ کعبہ کی تولیت اور مکّہ کی امارت قصی سے متعلق ہوگی۔ اور اُن سے کہا کہ تم ہی اس کے حقدار ہو۔"

کتبِ تاریخ میں یہ روایت بھی درج ہے کہ جب حلیل کا وقت آخر قریب آیا تو اُس نے وصیت کی کہ خانہ کعبہ کی تولیت اس کی بیٹی حبّی سے متعلق ہوگی اور ابو غبشان الملکانی اس منصب میں اس کا شریک ہوگا۔ چنانچہ خانہ کعبہ کا دروازہ ایک دن ابو غبشان کھولتا اور ایک دن حبّی کی طرف سے قصی۔ جب اس طریق کار پر عمل کرتے ہوئے کچھ عرصہ گزر گیا تو قصی نے حبّی سے کہا کہ تولیت کعبہ کی صحیح حقدار اولادِ اسمٰعیل ہے لہٰذا یہ منصب عبد الدار کے حوالے کر دینا چاہئے تاکہ تولیتِ کعبہ اولادِ اسمٰعیل ہی کے ہاتھوں میں رہے۔ حبّی نے کہا کہ عبد الدار میرا بیٹا ہے مجھے اس سے کیا انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن اس منصب میں ابو غبشان میرا برابر کا شریک ہے اور اُس کا رضامند ہونا مشکل ہے۔ قصی نے کہا کہ اس کی رضامندی و نارضامندی کو مجھ پر چھوڑ دیئے میں اُس سے نمٹ لوں گا۔ جب حبّی اپنے بیٹے کے حق میں تولیت سے دستبردار ہونے پر رضامند ہو گئیں تو قصی نے طائف کا رُخ کیا

جہاں ابو غبشان ٹھہرا ہوا تھا۔ طائف میں وارد ہونے کے بعد ایک رات اس کے ہاں گئے دیکھا کہ محفل ناؤنوش گرم ہے، شراب کا دور چل رہا ہے اور ابو غبشان نشہ میں بدمست پڑا ہے۔ آپ نے اُسے جھنجھوڑا اور تولیت کعبہ کے سلسلہ میں اُس سے بات چیت کی اور کچھ مول تول کے بعد ایک اونٹنی اور ایک مشکیزہ شراب کے عوض خانہ کعبہ کی تولیت اُس سے خرید لی۔ جب نشے سے اُسے ہوش آیا تو اپنے کیئے پر بہت پچھتایا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ تولیت اُس کے ہاتھوں سے جاتی رہی تھی اور کچھ بنائے بنتی نظر نہ آتی تھی۔ قصی اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر واپس آ گئے اور بھرے مجمع میں خانہ کعبہ کی کلید عبدالدار کے سپرد کر دی۔ جب بنی خزاعہ و بنی بکر نے یہ دیکھا کہ ابو غبشان کی حماقت و بدمستی کے نتیجہ میں خانہ کعبہ کی تولیت اُن کے ہاتھوں سے جاتی رہی ہے اور قصی حسنِ حیل سے کامیاب ہو گئے ہیں تو وہ تولیتِ کعبہ کی واپسی پر مصر ہوے اور لڑنے مرنے پر اُتر آئے۔ قصی بھی اُن کے مقابلہ میں ہیٹنے نہ تھے انہوں نے بھی جنگ کی ٹھان لی۔ قریش اور بنی کنانہ تو اُن کے ساتھ تھے ہی زراج ابن ربیعہ اور اُس کے بھائی بھی بنی قضاعہ کی ایک جماعت کے ساتھ اُن کی مدد کو پہنچ گئے فریقین میں جنگ چھڑ گئی۔ جب دونوں طرف کے اچھے خاصے آدمی مارے گئے تو کچھ لوگ بیچ میں پڑے اور یہ طے پایا کہ فریقین کی رضامندی سے کسی کو ثالث مقرر کیا جائے اور اُس کے فیصلہ پر عمل درآمد کیا جائے چنانچہ یعمر ابن عوف کو ثالث قرار دیا گیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ خانہ کعبہ کی تولیت اور مکہ کی امارت پر قصی کا حق فائق ہے۔ ان کے ساتھیوں میں سے جو آدمی مارے گئے ہیں ان کا خونبہا ادا کیا جائے اور بنی خزاعہ و بنی بکر میں سے جو قتل ہوے ہیں ان کا خون رائیگاں تصور ہو۔ اس فیصلہ پر عملدرآمد ہوا اور قصی بلا شرکت غیرے حرم کے عہدوں پر فائز ہوے اور مکّہ کے خود مختار حکمران تسلیم کیئے گئے۔ ابن اسحاق کہتے ہیں:۔

ولی قصی البیت وامر مکۃ و جمع قومہ من منازلھم الی مکۃ وتملك علیٰ قومہ واھل مکۃ فملکوہ فکان قصی اول بنی کعب اصاب ملکا اطاع لہ بہ قومہ فکانت الید الحجابۃ والسقایۃ والرفادۃ والندوۃ واللواء فحاز شرف مکۃ کلہ۔	قصی خانہ کعبہ کے متولی اور مکّہ کے حکمران ہوے۔ انہوں نے اپنے قوم و قبیلہ کو مختلف جگہوں سے مکّہ میں جمع کیا اور اپنی قوم اور مکّہ والوں پر اقتدار حاصل کیا اور سب نے اُن کے اقتدار کو تسلیم کیا۔ کعب کی اولاد میں قصی پہلے حکمران ہیں جن کے سامنے ان کی قوم نے سر اطاعت خم کیا۔ کلیدداری حاجیوں کو پانی پلانے اور کھانا کھلانے کی خدمت مجلس کی صدارت اور لشکر کی علمبرداری ان سے متعلق ہوی۔ غرض وہ سارے عہدے حاصل کئے جو مکّہ میں شرف و امتیاز کا باعث تھے۔"
(تاریخ خمیس جلد ۱ صفحہ ۱۵۵)	

خانہ کعبہ کی تولیت اولادِ اسمٰعیلؑ ہی کے پائے نام تھی۔ چنانچہ اسمٰعیل کے بعد اُن کے فرزند نابت خانہ کعبہ

کے متولی و نگران قرار پائے۔ لیکن نابت کے بعد یہ تولیت بنی اسمٰعیل کے ہاتھوں سے نکل گئی اور نابت کے ننھیال بنی جرہم کی طرف منتقل ہو گئی۔ بنی جرہم اقتدار کے نشہ میں کھو کر ظلم و ستم پر اُتر آئے اور جُوں جُوں اُن کے اقتدار کی بنیادیں مضبوط ہوتی گئیں اُن کے مظالم بڑھتے گئے۔ اُن کے ہاتھوں نہ لوگوں کی عزّت محفوظ تھی اور نہ اُن کے املاک و اموال۔ آخر دوسری صدی عیسوی میں جب یمن سیلاب کی زد میں آیا تو خزاعہ نامی ایک شخص یمن سے مکہ چلا آیا۔ اس نے رفتہ رفتہ اتنی قوت و طاقت بہم پہنچائی کہ وُہ مکّہ کے اقتدار پر قابض ہو گیا اور اس طرح بنی خزاعہ کی سلطنت کی بُنیاد پڑی جو تقریباً دو سو برس تک قائم رہی۔ خزاعہ نے مکّہ پر اقتدار حاصل کرنے کے بعد وہاں کے باشندوں کو باہر نکال دیا اور اولادِ فہر کو بھی اطراف و جوانب میں دھکیل دیا۔ جب بنی خزاعہ سے اقتدار قصی کی طرف منتقل ہوُا تو انھوں نے اولادِ فہر کو جو پہاڑوں کے دامنوں اور صحراؤں میں بکھری ہوئی تھی اور خانہ بدوشوں کی سی زندگی بسر کرتی تھی جمع کر کے مکہ کے مختلف حصّوں میں آباد کیا اور اُن میں اتحاد و یکجہتی پیدا کی۔ اسی جمع آوری کی وجہ سے مجمع (جمع کنندہ) کے لقب سے یاد کئے گئے۔ چنانچہ حذافہ ابن غانم نے اپنے اس شعر میں اس کا تذکرہ کیا ہے:۔

ابوکم قصی کان یدعی مجمعا　　بہ جمع اللہ القبائل من فہر

"تمہارے باپ قصی وُہ ہیں جو مجمع کے لقب سے پکارے جاتے تھے اور انہی کے ذریعہ اللہ نے فہر کی مختلف شاخوں کو ایک جگہ جمع کیا۔"

اس جمع آوری کی وجہ سے آپ کا لقب قریش پڑ گیا۔ کیونکہ قریش تقریش سے ماخوذ ہے اور تقریش کے معنی جمع اور یکجا کرنے کے ہیں۔ اگرچہ اس میں اختلاف ہے کہ یہ نام کس سے چلا اور پہلے پہل کون اس لقب سے یاد کیا گیا۔ بعض تاریخ نگاروں کا نظریہ یہ ہے کہ مضر کی اولاد قریش ہے۔ اور بعض کا خیال ہے کہ الیاس کی اولاد قریش ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ یہ لقب پہلے پہل نضر ابن کنانہ کو ملا اور ایک قول یہ ہے کہ سب سے پہلے یہ لقب فہر ابن مالک کو ملا۔ لیکن اربابِ تحقیق کا نظریہ یہی ہے کہ یہ لقب سب سے پہلے قصی کو ملا اور انہی کی اولاد قریش کہلا سکتی ہے۔ چنانچہ علّامہ طبری نے لکھا ہے:۔

لما نزل قصی الحرم و غلب علیہ فعل افعالا جمیلۃ فقیل لہ القرشی فھو اول من سمی بہ۔ (تاریخ طبری۔ ج۲۔ ص۲۳۔)

جب قصی حرم میں وارد ہوئے اور اقتدار حاصل کیا تو عمدہ کارنامے انجام دیئے۔ اس وجہ سے انہیں قرشی کہا جانے لگا۔ اور سب سے پہلے انہی کا نام قرشی قرار پایا۔"

عبدالملک ابن مروان نے محمد ابن جبیر سے دریافت کیا کہ قریش کو کب سے قریش کہا جاتا ہے؟ کہا کہ جب سے وُہ حرم میں آباد ہوئے قریش ہی کہلاتے رہے۔ اس لئے کہ قریش تقرش سے ماخوذ ہے اور تقرش کے معنی یکجا ہونے کے ہیں۔ عبدالملک نے کہا:۔

ما سمعت هذا ولكن سمعت ان قصيا كان يقال له القرشي ولم تسم قريش قبله۔

میں نے تو ایسا نہیں سُنا۔ بلکہ میرے سُننے میں یہ آیا ہے کہ قصی کو قرشی کہا جاتا تھا اور اس سے پہلے کسی کو اس نام سے یاد نہیں کیا گیا۔"

(طبقات ابن سعد جلد۱۔ صفحہ۷۱)

خود ابن سعد کی بھی یہی رائے تھی۔ چنانچہ وُہ تحریر کرتے ہیں:۔

بقصی سمیت قریش قریشا و کان یقال لهم قبل ذلك بنو النضر۔ (طبقات جلد۱۔ صفحہ۷۱)

قصی کی وجہ سے قریش کو قریش کہا جاتا ہے ورنہ ان سے پہلے وُہ بنو نضر کہلاتے تھے۔"

بہرحال قصی نے اولادِ فہر کو خانہ کعبہ کے جوار میں بسا کر اُن کی عظمت رفتہ کو پھر سے زندہ کیا اور انہیں متمدن زندگی سے ہمکنار کر کے قدر و منزلت کی انتہائی رفعتوں پر پہنچا دیا۔ اسی بنا پر اولادِ فہر اور دُوسرے قبائل انہیں عظمت و احترام کی نگاہوں سے دیکھتے اور اُن کے ہر حکم کے سامنے اس طرح سر تسلیم خم کرتے جس طرح دینی و مذہبی احکام کے آگے سر جھکایا جاتا ہے۔ بلاذری نے لکھا ہے:۔

کان امر قصی عند قریش دینا یعملون به ولا یخالفونه۔ (انساب الاشراف جلد۱۔ صفحہ۵۲)

قریش کے نزدیک قصی کا ہر حکم دین و مذہب کے حکم کا درجہ رکھتا تھا جس پر وُہ عمل پیرا ہوتے اور سر مُو اس کی مخالفت نہ کرتے۔"

اولادِ فہر کو بسانے اور یکجا کرنے کے علاوہ آپ نے اپنے دورِ اقتدار میں سقایہ و رفادہ کے عہدے قائم کئے تاکہ زائرانِ بیت اللہ کو کھانا، پانی اور دُوسری آسائشیں مہیا ہو سکیں۔ چنانچہ اہلِ مکہ کے اشتراکِ عمل سے دُور و دراز سے آنے والے حاجیوں کو کھانا کھلاتے، پانی پلاتے اور اُن کے دُوسرے ضروریات و حوائج کا خیال رکھتے اور اہلِ مکہ کو حجاج کی خدمت و اعانت پر آمادہ کرتے ہوئے اپنے خطبات میں فرماتے:۔

انكم جيران الله واهل بيته وان الحاج ضيف الله وزوار بيته وهم احق الضيف بالكرامة فاجعلوا لهم طعاما وشرابا ايام الحج۔ (تاریخ کامل جلد۲۔ صفحہ۱۱)

تم لوگ اللہ کے ہمسائے اور اس کے حرم میں بسنے والے ہو یہ حجاج اللہ کے مہمان اور اس گھر کے زائر ہیں اور سب مہمانوں سے بڑھ کر عزت و تکریم کے مستحق، لہذا حج کے دنوں میں ان کے کھانے اور پینے کا سر و سامان کرو۔"

آپ نے اپنی متحرک و باعمل زندگی میں بہت سے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ چنانچہ خانہ کعبہ کی عمارت کو گروا کر از سرِ نو تعمیر کروایا اور اُس پر کھجور کی لکڑیوں کی چھت ڈلوائی۔ عرفات و منیٰ کے درمیان ایک عمارت تعمیر کی اور اُسے مشعر الحرام کے نام سے موسوم کیا۔ ایام حج میں اُس پر چراغ جلائے جاتے تھے تاکہ

حجاج کو وہاں تک پہنچنے میں آسانی ہو۔ ابن عبد ربہ نے تحریر کیا ہے:۔

ھو الذی بنی المشعر الحرام کان یسرج علیہ ایام الحج۔	قصی نے مشعر الحرام تعمیر کیا جس پر حج کے دنوں میں چراغ جلائے جاتے تھے"۔

(عقد الفرید۔ ج۲۔ ص۲۰۹)

مزدلفہ میں رات کے وقت آگ کے روشن کرنے کا انتظام کیا تاکہ عرفات سے آنے والے حاجیوں کے قافلے منزل سے بھٹکنے نہ پائیں۔ ابن اثیر نے لکھا ہے:۔

وقصی اول من احدث وقود النار بالمزدلفۃ وکانت توقد علی عھد رسول اللہ ومن بعدہ۔ (تاریخ کامل ج۲۔ ص۱۸)۔	قصی نے سب سے پہلے مزدلفہ میں آگ جلانے کا انتظام کیا۔ اور پھر رسول اللہ کے زمانہ میں اور اُن کے بعد بھی روشن کی جاتی رہی"۔

آپ سے پہلے حدودِ مکہ میں مکانات تعمیر نہیں کئے جاتے تھے بلکہ لوگ جھونپڑیاں بنا کر رہتے تھے۔ آپ نے سب سے پہلے خانہ کعبہ کے قریب ایک گھر تعمیر کیا جس کا دروازہ خانہ کعبہ کی طرف کھلتا تھا۔ یہ گھر دار الندوہ کے نام سے مشہور ہوا۔ یعقوبی نے تحریر کیا ہے:۔

بنی دارہ بمکۃ وھی اول دار بنیت بمکۃ وھی دار الندوۃ۔	قصی نے اپنا گھر مکہ میں تعمیر کیا۔ اور یہ پہلا گھر تھا جو مکہ میں تعمیر ہوا اور "دار الندوہ" کہلایا"۔

(تاریخ یعقوبی۔ ج۱۔ ص۲۳۹)

قریش اس گھر کو بڑی عظمت و تقدیس کی نظروں سے دیکھتے تھے اور تبرّکاً شادی بیاہ کے رسوم اسی گھر میں انجام دیتے اور قومی و ملّی معاملات طے کرتے اور آپس کے جھگڑے چکانے کے لئے یہیں پر جمع ہوتے اور جنگ کے لئے نکلتے تو لوائے جنگ یہیں آراستہ کرتے۔ قصی کے وارد مکّہ ہونے سے پہلے اہل مکہ لوی ابن غالب کے کنوئیں الیسیرہ اور مرہ ابن کعب کے کنوئیں الروا اور ان جوہڑوں سے پانی حاصل کرتے تھے جن میں بارشوں کا پانی جمع ہوتا تھا۔ آپ نے اہل مکہ کی ضرورت کے پیش نظر حدود مکہ کے اندر ایک کنواں کھدوایا جسے عجول کہا جاتا تھا۔ یہ کنواں اس مقام پر تھا جہاں اُم ہانی بنت ابی طالب کا مکان تھا۔ غرض خانہ کعبہ اور دیگر مشاعر کی تعمیر اولادِ فہر کی آبادکاری اور اُن کے سود و بہبود کے سلسلہ میں جو کارنامے انجام دیئے وہ ان کی عظمت اور غیر معمولی کارکردگی کی روشن مثال ہیں۔ جب تک اُن کے قائم کردہ آثار باقی ہیں اُن کا نام بھی زندہ و پائندہ ہے۔

ان تعمیری یادگاروں کے علاوہ ان کے کلمات کو بھی سرمایہ حکمت و دانش سمجھ کر محفوظ رکھا گیا ہے۔ یہ کلمات صرف دوسروں ہی کو روشنی نہیں دکھاتے بلکہ ان کے آئینہ میں خود اُن کے اخلاق و عادات اور طرزِ زندگی کی جھلک بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کے حکیمانہ کلمات میں سے چند کلمے یہ ہیں:۔

من اشرك لئيما اشركه فی لؤمه	جو کسی ذلیل وکمینہ آدمی کا ہمنوا ہوگا وہ اُس کے
ومن استحسن قبیحا نزل الی	کمینہ پن میں شریک ہوگا۔ جو برائی کو اچھی نظروں سے
قبحه ومن لو تصلحه الکرامة	دیکھے گا وُہ برائی میں مُبتلا ہوگا۔ جس کی احترام واکرام
اصلحه الهوان ومن طلب	سے اصلاح نہ ہو اُس کی درستی تذلیل وتحقیر ہی کے
فوق قدره استحق الحرمان	ذریعہ ہوگی۔ جو اپنی حیثیت سے زیادہ کا طلبگار ہوتا
والحسود العدوّ الخفی۔	ہے وُہ محرومی کا حقدار قرار پاتا ہے۔ حاسد چھپا ہوا
(سیرت حلبیہ ج۱ ص۱۳)	دُشمن ہے۔"

زندگی کے آخری لمحوں میں اپنی اولاد کو وصیّت کرتے ہوئے فرمایا:۔

اجتنبوا الخمرة فانها تصلح	شراب سے پرہیز کرنا۔ اگرچہ اس سے جسموں
الابدان وتفسد الاذهان۔	کی اصلاح ہوتی ہے مگر عقل وشعور کو تباہ کر
(سیرت حلبیہ ج۱ ص۱۳)	دیتی ہے۔"

آپ نے ۴۸۰ء میں مکہ مکرمہ میں وفات پائی اور کوہِ حجون کے دامن میں دفن ہوئے۔ عرب نے اپنے محبُوب فرمانروا اور عظیم محسن کا بڑا سوگ منایا اور اُن کی قبر کی زیارت کرکے اظہارِ عقیدت کرتے۔ بلاذری نے لکھا ہے:۔

لما مات دفن بالحجون فكانوا	جب انہوں نے وفات پائی تو کوہِ حجون میں دفن
یزورون قبره ویعظمونه۔	ہوئے۔ لوگ اُن کی قبر کی زیارت کو آتے اور اُن
(انساب الاشراف ج۱ ص۵۲)	کی عظمت کا اعتراف کرتے۔"

عبد مناف ابن قصی:۔ آپ کا اصل نام مغیرہ اور کنیت ابو عبد شمس تھی۔ حُسنِ صورت کی وجہ سے قمر البطحاء، جود وسخا کی وجہ سے فیاض اور عظمت وشرف کے لحاظ سے السیّد کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے خانہ کعبہ کی کلید داری کے عہدہ پر اگرچہ قصی کا بڑا بیٹا عبد الدار فائز تھا مگر قریش کی سربراہی عبد مناف کے پائے نام ہوئی۔ بلکہ وُہ اپنے حُسنِ عمل اور بلند اخلاق کی بدولت اپنے والد قصی کی زندگی ہی میں قومی قیادت کے منصب پر فائز اور سیادت سے ہمکنار ہو چکے تھے۔ دیار بکری نے لکھا ہے:۔

ساد عبد مناف فی حیاة ابیه	عبد مناف اپنے باپ کی زندگی ہی میں امارت
وکان مطاعا فی قریش۔	پر فائز ہو چکے تھے اور قریش میں اُن کا ہر حکم
(تاریخ خمیس ج۱ ص۱۵۵)	مانا جاتا تھا۔"

آپ اپنے نامور باپ کے طور طریقوں پر گامزن رہے اور اُن کے قائم کردہ رفاہی اداروں کو باقی و برقرار رکھا۔ آپ نے چار فرزند چھوڑے۔ ہاشم، مطلب، عبد شمس اور نوفل۔ ہاشم اور مطلب کو "البدران"

دو چاند کہا جاتا تھا۔

ہاشم ابن عبد مناف:۔ آپ کا اصل نام عمرو تھا اور علو مرتبت کی وجہ سے عمرو العلاء کہا جاتا تھا۔ کنیت ابو نضلہ، لقب سیّد البطحاء اور ابو البطحاء، اور والدہ کا نام عاتکہ تھا۔ نام اور کنیت کے بجائے ہاشم کے لقب سے مشہور و متعارف ہوئے۔ اس لقب سے یاد کئے جانے کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے ایک مرتبہ قحط سالی کے دنوں میں بڑی تعداد میں روٹیاں پکوائیں اور انہیں اونٹوں پر لاد کر شام سے مکہ میں لائے۔ ان اونٹوں کو ذبح کیا اور روٹیاں توڑ کر شوربے کے بڑے بڑے پیالوں میں بھگوئیں اور اہل مکّہ اور مکّہ میں آنے والوں کو شکم سیر کھلائیں اُس وقت سے ہاشم کے لقب سے یاد کئے جانے لگے کیونکہ ہشم کے معنی توڑنے کے ہیں۔

ہاشم اور عبد شمس جڑواں پیدا ہوئے تھے اس طرح کہ ایک کا پنجہ دوسرے کی پیشانی سے پیوست تھا۔ دونوں تلوار سے کاٹ کر جُدا کئے گئے۔ اس موقع پر یہ پیشینگوئی کی گئی کہ ان دونوں کی اولاد میں تلوار چلے گی اور ایک دُوسرے کے خلاف برسرِ پیکار رہے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہُوا اور ان دونوں کی اولادوں میں ہمیشہ ان بن اور باہمی نزاع رہی اور انہی دونوں سے دو متحارب خاندان بنی ہاشم و بنی اُمیّہ وجُود میں آئے جو کیا بلحاظ سیرت و اخلاق اور کیا بلحاظ افکار و نظریات ایک دُوسرے کی ضد تھے۔ پہلا ٹکراؤ ہاشم اور عبد شمس کے بیٹے اُمیّہ میں ہوا پھر عبد المطلب ابن ہاشم اور حرب ابن اُمیہ میں تصادم رہا۔ حرب کے بعد اُس کا بیٹا ابو سفیان پیغمبرؐ اسلام کے مقابلہ میں اُٹھ کھڑا ہوا اور مختلف محاذوں پر جنگ کے شعلے بھڑکاتا رہا۔ ابو سفیان کے بعد اُس کا بیٹا معاویہ حضرت علیؑ سے نبرد آزما ہوا اور کئی خونریز جنگیں لڑیں۔ اور پھر یزید ابن معاویہ نے حضرت حسینؑ ابن علیؑ اور اُن کے افرادِ خاندان اور رفقاؤ انصار پر ہر قسم کے مظالم توڑے اور اس دشمنی و عناد کو آخری حدوں تک پہنچا دیا۔ غرض بنو اُمیّہ اور بنو ہاشم کی باہمی عداوت پُشت در پُشت چلتی رہی اور مصلحتہً اسلام لانے کے بعد بھی بنو اُمیہ کی کینہ توز طبیعتوں میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوسکی اور وہ ہمیشہ بنی ہاشم کی بیخ کنی کی فکر میں لگے رہے۔

ہاشم اور عبد شمس اگرچہ ایک ہی باپ دادا کی اولاد تھے مگر اُن میں اتنا ہی تفاوت تھا جتنا ایک ہی شاخ میں کھلنے والے پھُول اور اُگنے والے کانٹے میں ہوتا ہے۔ حضرت ہاشم بلند کردار اور انتہائی اہم شخصیت تھے۔ عالی ظرفی و کریم النفسی میں اپنی مثال نہ رکھتے تھے۔ مظلوموں اور بے نواؤں کا ان کے گرد جھرمٹ رہتا تھا۔ وُہ مظلوموں کی دادرسی کرتے، بے نواؤں کی طرف دست تعاون بڑھاتے، اپنے قبیلہ کے ناداروں کی اعانت فرماتے اور اُن کی معاشی اصلاح کی بھی فکر و تدبیر کرتے۔ چنانچہ قریش کی اقتصادی برتری اور معاشی بلندی بڑی حد تک اُن کی مساعی کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے قریش کے ذہنوں میں تجارت کی خوبیوں کو بٹھا کر انہیں ترقی و بہبود کی راہ پر لگایا۔ حضرت ہاشم سے پہلے بھی قریش کا ذریعہ معیشت تجارت تھا۔ اور ایک قول کی بنا پر انہیں قریش کہا جاتا تھا تو اس لیئے کہ یہ لفظ تقرش سے ماخوذ ہے اور تقرش کے معنی کاروکسب اور تجارت کے ہیں۔ مگر ان کی تجارت صِرف مکّہ اور اُس کی مضافاتی بستیوں تک محدود تھی۔ آپ نے تجارت کو ترقی دی اور اپنا کاروبار شام و حبشہ تک

پھیلا دیا۔ اور ساتھ ہی قریش کو بھی حرکت و عمل کی دعوت اور جاڑوں میں یمن و حبشہ کی طرف اور گرمیوں میں شام بلکہ غزہ وانقرہ تک قریش کے تجارتی قافلے لے جانے لگے۔ قیصر روم اُن کا انتہائی احترام کرتا تھا۔ انہوں نے اپنے اثر ورسوخ سے کام لے کر قیصر سے یہ لکھوا لیا کہ قریش کے مالِ تجارت پر محصول عائد نہیں کیا جائے گا، آمدورفت کی سہولتیں مہیا کی جائیں گی اور تجارتی گزرگاہوں میں حفاظت کا سامان کر کے انہیں بے خطر بنایا جائے گا۔ اِن کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش پوری دلجمعی کے ساتھ تجارت کی طرف لگ گئے، ان کی اقتصادی حالت کہیں سے کہیں پہنچ گئی اور آسودگی و مرفہ حالی سے ہمکنار ہو گئے۔

قصی کے حالات میں لکھا جا چکا ہے کہ انہوں نے خانہ کعبہ کا متولی اپنے بڑے بیٹے عبدالدار کو قرار دیا تھا مگر وہ اس اہم منصب کا اپنے کو اہل ثابت نہ کر سکا اور نہ اُس کی اولاد میں سے کوئی اس تولیت کی ذمہ داری نباہ سکا۔ دن بدن حالات بگڑتے گئے اور ہر شعبہ میں ابتری محسوس کی جانے لگی۔ ہاشم نے جب دیکھا کہ بنو عبدالدار سے یہ کام نہیں سنبھل سکتا تو اُنہوں نے اپنے بھائیوں مطلب، نوفل اور عبدشمس سے مشورہ کیا اور سب نے باتفاق رائے یہ طے کیا کہ حرم کے عہدے اولادِ عبدالدار کے ہاتھ سے لے لئے جائیں اور انہیں معزول و برطرف کر دیا جائے۔ کیونکہ جب تک وُہ ان عہدوں پر قابض رہیں گے حالات سلجھنے کے بجائے اُلجھتے ہی چلے جائیں گے۔ جب اولادِ عبدالدار کو علم ہوا کہ انہیں تولیت سے بے دخل کیا جا رہا ہے تو وُہ مسلح تصادم پر اُتر آئے، ادھر اولادِ عبدمناف بھی ٹکراؤ پر آمادہ ہو گئی۔ قبائل عرب بھی دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ بنی اسد، بنی زہرہ، بنی تمیم اور بنی حارث اولادِ عبدمناف کے طرفدار بن گئے؛ اور بنی مخزوم، بنی سہم اور بنی عدی اولادِ عبدالدار کے ہمنوا ہو گئے۔ بنو عبدمناف اور اُن کے حامی قبائل مطیّبین کہلائے اور بنو عبدالدار اور اُن کے ہمنوا قبائل احلاف کے نام سے موسوم ہوئے۔ قریب تھا کہ مطیّبین اور احلاف میں جنگ چھڑ جائے کہ کچھ امن پسند اور صلح جو افراد بیچ میں پڑے اور کہا کہ بہتر یہ ہے کہ باہمی گفت و شنید سے فیصلہ کر لیا جائے۔ اور اگر جنگ چھڑ گئی تو اس کے نتائج بڑے ہولناک ہوں گے چنانچہ اس امر پر فریقین میں تصفیہ ہو گیا کہ سقایہ و رفادہ کے عہدے اولادِ عبدمناف کے سپرد کر دیئے جائیں اور ندوہ حجاب اور لواء کے عہدے اولادِ عبدالدار کے پاس بدستور رہیں۔ جب یہ فیصلہ ہو گیا تو اولادِ عبدمناف نے رفادہ و سقایہ کے لئے آپس میں قرعہ ڈالا۔ قرعہ ہاشم کے نام پر نکلا اور یہ دونوں منصب اُن کے سپرد کر دیئے گئے۔

حضرت ہاشم نے ان عہدوں کو سنبھالنے کے بعد نظم و نسق کی خرابیوں کو دُور کیا، رفادہ و سقایہ کو وسعت دی، حاجیوں کے کھانے پینے کے انتظامات کئے۔ سجلہ اور بذر دو کنوئیں کھدوائے اور اپنے دادا قصی کے کاموں کو فروغ دے کر منتہائے کمال پر پہنچایا۔ جب حج کا زمانہ قریب آتا تو قریش کو خانہ کعبہ پاس جمع کرتے اور انہیں حاجیوں کے بارے میں ہدایات دیتے ہوئے فرماتے:۔

یا معشر قریش انکم جیران	اے جماعت قریش تم اللہ کے پڑوس میں بسنے
اللہ واھل بیتہ وانہ یاتیکم	والے اور اس گھر کے رہنے سہنے والے ہو۔ وُہ

فی موسکم ھذا نزوّار اللہ تبارك ذکرہ یعظمون حرمۃ بیتہ وھم اضیافہ واحق الناس بالکرامۃ فاکرموا اضیافہ وزوار کعبتہ۔
(انساب الاشراف۔ ج۱۔ ص۵۶)

زمانہ آگیا ہے کہ اللہ کے گھر کے زائر مراسم تعظیم بجالانے کے لئے تمہارے ہاں جمع ہوں۔ وُہ سب کے سب اللہ تبارک و تعالیٰ کے مہمان ہیں اور سب سے بڑھ کر عزّت و احترام کے مستحق ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے مہمانوں اور خانہ کعبہ کے زائروں کا اکرام و احترام کرو۔"

خطبہ سے فارغ ہو کر سرمایہ فراہم کرتے۔ کچھ قریش سے لیتے اور زیادہ تر اپنے پاس سے دیتے۔ اور دُور و دراز سے آنے والے حاجیوں کے کھانے پینے کا سیر چشمی سے سر و سامان کرتے۔ مکّہ و منیٰ میں دستر خوان چُن دیئے جاتے۔ چمڑے کے حوضوں میں پانی بھر دیا جاتا اور واردانِ حرم ان کے وسیع دستر خوان سے شکم سیر ہو کر کھاتے اور سرد و شیریں پانی سے سیراب ہوتے۔

اسود ابن شعر کلبی نے اس عمومی دعوت کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وُہ بیان کرتا ہے کہ میں جب اپنے قبیلہ کی ایک مالدار خاتون کا کارندہ تھا تو مالِ تجارت لے کر مختلف مقامات پر آیا جایا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ میرا گزر حج کے دنوں میں منیٰ و عرفات کی طرف ہوا۔ رات کا وقت تھا اور اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ میں نے ایک جگہ رات بسر کی۔ جب صبح ہوئی تو میں نے کچھ فاصلے پر دیکھا کہ طائف کے چمڑے کے اُونچے اُونچے خیمے نصب ہیں۔ آگے بڑھا تو دیکھا کہ دیگیں کھنک رہی ہیں چولہوں میں آگ جل رہی ہے۔ کچھ جانوروں کو ذبح کیا جا چکا ہے اور کچھ جانوروں کو ذبح کرنے کے لئے لایا جا رہا ہے۔ نوکر چاکر چل پھر کر مختلف خدمات انجام دے رہے ہیں۔ یہ شاہانہ ٹھاٹ باٹ اور وسیع انتظامات دیکھ کر میں حیرت میں کھو گیا اور میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں اس قبیلہ کے سردار کو دیکھوں جس نے اس بڑے پیمانہ پر دعوت کا اہتمام کیا ہے۔ میں ابھی خاموش کھڑا تھا کہ ایک شخص نے میرے ارادے کو بھانپ کر مجھے آگے بڑھنے کے لئے کہا۔ میں نے آگے بڑھ کر دیکھا کہ ایک بلند و بالا اور آراستہ شامیانے کے نیچے فرش بچھا ہوا ہے اور اُس پر رؤسائے قریش و سردارانِ عرب حلقہ باندھے خاموش بیٹھے ہیں اور ان کے وسط میں ایک پُر وقار شخصیت مسند پر جلوہ افروز ہے۔ چہرے پر عظمت و شرافت کا جلال برس رہا ہے اور پیشانی کی درخشندگی سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ستارۂ شعریٰ اپنے افق سے طلوع ہو رہا ہے۔ ہاتھ میں عصا سر پر سیاہ عمامہ اور عمامہ کے نیچے سے لانبی کاکلیں شانوں پر لہرا رہی ہیں۔ میں اس منظر کی تابانیوں میں کھو گیا۔ اتنے میں دیکھا کہ ایک شخص بلندی پر سے پکار رہا ہے: اے اللہ کے گھر میں آنے والو کھانے کے لئے آؤ۔" اور دُوسری سمت دو شخص پکار کر کہہ رہے ہیں: جو شخص دوپہر کا کھانا کھا چکا ہے وُہ جائے اور رات کے کھانے پر پھر آئے۔" اسود کہتا ہے کہ میں نے علماءِ یہود سے سُن رکھا تھا کہ یہی وُہ زمانہ ہے جس میں نبیِ اُمّی کا ظہور ہوگا۔ میں اس عظیم شان و شکوہ اور فیاضانہ دعوت کو دیکھ کر یہ خیال کرنے لگا کہ کہیں آنے والا نبی یہی تو نہیں ہے

مَیں نے ایک شخص سے پُوچھا کہ یہ مسند نشین سردار کون ہے ؟ اُس نے کہا کیا تم نہیں پہچانتے۔ یہ ابونضلہ ہاشم ابن عبد مناف ہیں۔ مَیں نے یہ سُن کر کہا:۔

ھٰذا واللہ المجد لامجد اٰلِ جفنۃ۔ (تاریخ یعقوبی ۔ ج ۔ ص ۲۴۳)۔	خدا کی قسم عظمت و بزرگی اسے کہتے ہیں نہ آلِ جفنہ (شاہانِ شام) کی بزرگی کو"۔

ہاشم کی اس فیاضی و بلند ہمتی نے ان کی عظمت و اجلال کا سکہ قبائل عرب کے دلوں پر بٹھا دیا اور فضائے عرب میں ان کی نیکنامی و شہرت کے پھریرے لہرانے لگے۔ امیہ ابن عبد شمس جو پست فطرت اور چھچھوری طبیعت کا تھا اس کی نظروں میں ہاشم کی یہ شہرت و ہردلعزیزی خار بن کر کھٹکنے لگی اور احساسِ کمتری نے اُسے بُری طرح حسد میں مُبتلا کر دیا۔ اُس نے چاہا کہ ہاشم کو عوام کی نظروں سے گرائے اور خود قوم و قبیلہ میں وُہ مقام حاصل کرے جو ہاشم کو نصیب ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی دولت و ثروت کا سہارا لے کر عمومی دعوتوں کا سامان کیا۔ مگر طبعی جذبۂ کرم اور ہے اور دُوسرے کو نیچا دکھانے اور شہرت حاصل کرنے کے لئے مظاہرۂ جود و سخا اور ہے۔ اس نے لاکھ دریا دلی دکھائی مگر ہاشم کی سی بات کہاں۔ آخر ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا اور ایک آدھ دعوت کا اہتمام کر کے ہمت ہار بیٹھا۔ یہ بات اس کے لئے اور ذلت و رُسوائی کا باعث ہوی اور "نہ کردن یک" کے طعنے مہنے سے بچ کر "کردن صد" کے پھندے میں پھنس گیا۔ لوگوں نے آوازے کسے، مضحکہ اُڑایا اور اُس کی دعوتوں میں سَو عیب نکالے۔ اُمیہ پہلے ہی سے جلا بھنا بیٹھا تھا، لوگوں کی طنزیہ باتوں سے اور سیخ پا ہوا اور طیش میں آ کر ہاشم کی شان میں گستاخی کی اور ایسے الفاظ تک کہے جو تہذیب و شائستگی کے خلاف تھے۔ اور اُس زمانہ کے رسم و دستور کے مطابق منافرہ کی دعوت دی یعنی کسی ثالث سے فیصلہ کرایا جائے کہ ان دونوں میں عظیم اور فخریہ کاناموں کے لحاظ سے کس کا پایہ بلند ہے۔ ہاشم کی شخصیت اس سے بلند تر تھی کہ وُہ اپنی بلندی و برتری کے ثبوت کے لئے ایسی چیزوں کا سہارا لیتے۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ مگر قریش نے انتہائی اصرار کر کے انہیں آمادہ کر لیا۔ ہاشم آمادہ تو ہو گئے مگر اس کے ساتھ یہ شرط عائد کر دی کہ جس کے خلاف فیصلہ ہو وُہ پچاس سیاہ چشم اُونٹنیاں دُوسرے کو دے اور دس برس کے لئے مکہ سے ترکِ سکونت کر کے کہیں اور چلا جائے۔ اُمیّہ اس شرط پر بھی راضی ہو گیا۔ اور دونوں نے کاہن خزاعی کو ثالث قرار دیا۔ جب دونوں نے اُس کے سامنے اپنا معاملہ پیش کیا تو اُس نے سُنتے ہی ہاشم کی بلندی و برتری کا فیصلہ دے دیا۔ ہاشم نے حسبِ معاہدہ امیّہ سے پچاس ۵۰ اُونٹنیاں لیں اور انہیں ذبح کر کے اہلِ مکّہ کی بڑے پیمانہ پر دعوت کی۔ اور اُمیّہ مکّہ چھوڑ کر اُردن کے علاقہ میں صفوریہ کی طرف چلا گیا۔ جہاں اُس نے دس سال جلاوطنی میں گزارے۔ اس واقعہ سے دونوں خاندانوں میں دشمنی و عناد کی بنیاد پڑ گئی۔ اور افتراق و اختلاف کی وسیع خلیج حائل ہو گئی۔ بلاذری نے لکھا ہے:۔

فتلک اوّل عداوۃ وقعت بین ھاشم وامیۃ۔ (انساب الاشراف ج ۱ ص ۶۱)	"یہ دشمنی وعناد کا پہلا شاخسانہ تھا جو ہاشم اور اُمیّہ میں رُونما ہوا"۔

بہر حال حضرت ہاشم اپنے دَور کی وُہ عظیم ترین شخصیت تھے جن کی ذاتی عظمت نسبی رفعت اور بلند نفسی و بلند نظری اپنے مقام پر ایک مسلّمہ حقیقت ہے۔ انہوں نے نہ صرف حجاز میں بلکہ بیرونِ حجاز بھی اپنے جود و ایثار اور رفاہی کارناموں کی بدولت شہرت حاصل کی۔ اور عوام تو عوام شاہانِ وقت تک انہیں انتہائی عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ اور شاہِ رُوم اور نجاشی حبشہ تو انہیں اپنی لڑکیوں کا رشتہ دینے کے خواہشمند تھے مگر انہوں نے حجاز کے باہر رشتہ جوڑنا گوارا نہ کیا اور عرب ہی کے قبائل میں مختلف اوقات میں شادیاں کیں۔ ان شادیوں میں بقائے نسل و ظہورِ نورِ نبوّت کے لحاظ سے سب سے اہم شادی وُہ تھی جو قبیلۂ خزرج کی ایک شاخ بنی نجار میں کی۔ حضرت ہاشم کچھ عرصہ سے محسوس کر رہے تھے کہ قدرت نے جس نورِ رسالت کا انہیں امین قرار دیا ہے وُہ نور ابھی اُن سے جُدا نہیں ہوا۔ اسی فکر میں تھے کہ انہیں خواب میں سلمیٰ بنتِ عمرو سے جو یثرب میں مقیم تھیں عقد کرنے کی بشارت ہوئی۔ یہ خاتون پاکیزہ سیرت اور نجابت و شرافت کے اعتبار سے بلند پایہ تھیں۔ دیار بکری نے لکھا ہے:۔

کانت فی زمانہا کخدیجۃ فی زمانہا لہا عقل وحلم۔	سلمیٰ عقل و حلم سے آراستہ اور اپنے زمانہ میں اُسی پایہ کی خاتون تھیں جس پایہ کی خاتون اپنے دَور میں حضرت خدیجہ تھیں"۔

(تاریخ خمیس جلد ۱ - ص ۱۵۸)

ہاشم یہ خواب دیکھنے کے بعد اپنے چند عزیزوں کے ساتھ مدینہ روانہ ہو گئے اور عمرو ابن زید کے ہاں اُترے۔ اُس نے ان معزّز مہمانوں کی بڑی تعظیم و تکریم کی اور لوازمِ مہماں نوازی بجا لایا۔ اور تشریف آوری کی وجہ پُوچھی۔ جب اُس کو مقصد سے آگاہ کیا گیا تو اُس نے کہا کہ مجھے رشتہ دینے سے انکار نہیں ہے مگر شرط یہ ہے کہ اگر سلمیٰ کے ہاں بچہ پیدا ہو گا تو وُہ یثرب ہی میں قیام کریں گی۔ ہاشم نے اس شرط کو منظور کر لیا اور ابتدائی مراحل کی تکمیل کے بعد عقد ہو گیا۔ اس تقریب کے بعد ہاشم اپنے کاروبار کے سلسلہ میں شام چلے گئے۔ جب شام سے پلٹ کر آئے تو سلمیٰ کو یثرب سے مکّہ لے آئے۔ کچھ عرصہ کے بعد سلمیٰ اُمّید سے ہوئیں تو ہاشم شام جاتے ہوئے سلمیٰ کو یثرب میں چھوڑ گئے اور خود شام چلے گئے۔ ہاشم کا یہ سفرِ تجارت سفرِ آخرت ثابت ہوا اور پھر انہیں وطن کی جانب پلٹنا نصیب نہ ہوا۔ وہیں پر چند دن صاحبِ فراش رہنے کے بعد ہمیشہ کے لئے مَوت کی آغوش میں آنکھیں بند کر لیں اور عسقلان سے چھ میل کے فاصلہ پر مقامِ غزہ میں پیوند خاک ہوئے۔

جب ہاشم کے شرکاءِ سفر ہاشم کی خبرِ مرگ لے کر واپس پلٹے تو مکّہ و یثرب کے گھروں میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ ہر شخص رنجیدہ و سوگوار نظر آتا تھا اور ہر زبان پر اُن کی مہماں نوازی، غرباء پروری اور ہمدردی و مواسات کے تذکرے تھے۔ سلمیٰ نے یہ اندوہناک خبر سُنی تو دل پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ زندگی پر غم و اندوہ کے بادل چھا گئے۔ دُنیا تیرہ و تار ہو گئی اور خزاں دیدہ چمن میں بہار کی آمد کی توقع نہ رہی۔ مگر دُنیا میں حزن و مسرّت توأم ہیں۔ کبھی رنج و غم کے بادل چھا جاتے ہیں اور کبھی مسرّت و شادمانی کے مُسکراتے سحاب سایہ فگن ہوتے ہیں۔ سلمیٰ کا دل اگرچہ بجھ چکا تھا مگر بجھے ہوئے دل کو روشنی کی کرن نظر آئی اور گود مولودِ نو کی آمد سے آباد ہو گئی۔ یہ مولودِ نو عبد المطلب کے نام سے موسوم ہو کر

ہاشمی تاج کا آویزہ اور اُن کے جمال و کمال کا آئینہ ثابت ہوا۔

حضرت ہاشم کے متعدّد بیٹے تھے مگر اُن میں سے دوّ بیٹوں کے ہاں اولادیں ہوئیں ایک اسد اور دُوسرے عبدالمطلب۔ اسد کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام حنین تھا مگر اس کی نسل آگے نہیں چلی۔ اور ایک صاحبزادی پیدا ہوئیں جن کا نام فاطمہ تھا۔ یہ حضرت ابو طالب کے عقد میں آئیں اور ان سے حضرت علیؑ اور ان کے دُوسرے بھائی پیدا ہوئے۔ البتہ عبدالمطلب کا سلسلۂ اولاد آگے بڑھا اور انہی سے ہاشمی نسل کا سلسلہ دُنیا میں قائم ہوا۔ ابن قتیبہ نے لکھا ہے:۔

لیس فی الارض ھاشمی الامن ولد عبدالمطلب۔ (المعارف۔ ص ۳۳)

رُوئے زمین پر جو ہاشمی ہے وُہ عبدالمطلب ہی کی اولاد ہے۔"

عبدالمطلب ابنِ ہاشم:۔ آپ کا اصل نام عامر اور کنیت ابوالحارث تھی۔ جب پیدا ہوئے تھے تو وسطِ سر میں کچھ سفید بال تھے۔ اور بالوں کی سفیدی کو شیب کہتے ہیں اس لیئے شیبہ اور شیبۃ الحمد کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ آپ کے والد حضرت ہاشم عالمِ غربت و مسافرت میں دُنیا سے چل بسے تھے اور آپ پدری محبّت و شفقت سے نا آشنا ہی رہے۔ اپنے ننھیال مدینہ میں ماں کی آغوش شفقت میں پلے بڑھے اور سات آٹھ برس کی عُمر تک وہیں رہے۔

عرب میں شہسواری، شمشیر زنی اور تیر اندازی تربیت کا لازمی جزو تھے اور شروع ہی سے بچّوں میں اِن چیزوں کا مذاق پیدا کر دیا جاتا تھا۔ شیبہ بھی بچپنے میں تیر اندازی کی مشق کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ یثرب کے کھلے میدان میں بچّوں کے ساتھ مل کر تیر اندازی کر رہے تھے اور جب تیر نشانہ پر لگتا تو بے ساختہ پکار اُٹھتے انا ابن سید البطحاء "میں سردارِ مکّہ کا بیٹا ہوں"۔ بنو حارث کا ایک شخص اُدھر سے گزرا۔ اُس نے یہ الفاظ سُنے تو پوچھا کہ تم کون ہو اور کس کے بیٹے ہو؟ کہا میرا نام شیبۃ الحمد ہے اور میں ہاشم ابن عبد مناف کا بیٹا ہوں۔ وہ شخص مکّہ میں واپس آیا اور شیبہ کے چچا مطلب سے یہ سارا واقعہ بیان کیا۔ مطلب نے کہا کہ مجھ سے بڑی کوتاہی ہوئی کہ میں نے اب تک نہ اپنے یتیم بھتیجے کی خبر لی اور نہ اُسے دیکھنے یثرب گیا۔ اب میں سیدھا یثرب جاؤں گا اور شیبہ کو اپنے ساتھ لاؤں گا۔ چنانچہ اُسی وقت اُٹھ کھڑے ہوئے اور یثرب پہنچ کر بنی نجار کے محلّہ میں گئے۔ وہاں چند بچّوں کو کھیلتے دیکھا جن میں شیبہ بھی تھے۔ آپ نے شیبہ کو دیکھ کر فوراً پہچان لیا اور بنی نجار کے چند لوگوں سے پوچھا کہ کیا ہاشم کا بیٹا یہی ہے؟ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ اِتنے میں اُن لوگوں نے بھی پہچان لیا کہ یہ شیبہ کے چچا مطلب ہیں۔ پُوچھا کہ کیا آپ شیبہ کو لے جانا چاہتے ہیں؟ فرمایا ہاں۔ کہا کہ پھر یہیں سے لے جائیے ہم آپ کو روکیں گے نہیں۔ اور اگر شیبہ کی والدہ کو خبر ہو گئی اور اُس نے نہ چاہا تو پھر ہمارا فرض ہو جائے گا کہ آپ کو روکیں اور شیبہ کو لے جانے سے مانع ہوں۔ آپ نے اپنا ناقہ بٹھایا اور شیبہ سے کہا کہ مَیں تمہارا چچا ہوں آؤ میرے ساتھ اس ناقہ پر بیٹھ جاؤ۔ شیبہ بغیر کسی حیل و حجت کے اُونٹنی پر بیٹھ گئے اور مطلب انہیں مکہ میں لے آئے۔ جب شہر میں داخل ہوئے

تو قریش نے آپ کے ہمراہ ایک بچے کو دیکھا تو کہا: ھٰذا عبد المطلب "یہ مطلب کا غلام ہے"۔ مطلب نے کہا کہ یہ میرا غلام نہیں ہے بلکہ ہاشم کا بیٹا اور میرا بھتیجا ہے۔ مگر یہ نام زبانوں پر چڑھ گیا اور شیبہ کے بجائے عبد المطلب کے نام سے یاد کئے جانے لگے۔

اس دور میں تعلیم و تربیت کے لئے نہ کوئی مکتب تھا نہ مدرسہ اور نہ لکھنے پڑھنے کا رواج۔ دو چار آدمیوں سے زیادہ لکھے پڑھے ہوئے آدمی نہ تھے۔ عبد المطلب نے باوجودیکہ سر پر باپ کا سایہ نہ تھا خود ہی دوسرے فنون عرب کے ساتھ لکھنا پڑھنا بھی سیکھ لیا جس پر اُن کی بعض تحریریں شاہد ہیں۔ چنانچہ ابن ندیم نے لکھا ہے:۔

کان فی خزانۃ مامون کتاب بخط	مامون کے خزانہ میں ایک چرمی جلد پر عبد المطلب
عبد المطلب ابن ھاشم فی جلد ادم	ابن ہاشم کے ہاتھ کی لکھی ہوئی دستاویز تھی
فیہ ذکر حق عبد المطلب ابن ھاشم	جس میں ایک حمیری پر آپ کے ایک مطالبہ کا
من اھل مکۃ علی فلان ابن فلان	تذکرہ تھا"۔
الحمیری۔ (فہرست ابن ندیم۔ ص۱۳)	

اس ملکہ نوشت و خواند اور فنون مروجہ میں مہارت کے علاوہ ظاہری اعتبار سے بھی وجیہ صورت، کشیدہ قامت اور جذاب و پرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ ابن عباس کہتے ہیں:۔

سمعت ابی یقول کان عبد المطلب	میں نے اپنے والد کو کہتے سنا ہے کہ عبد المطلب
اطول الناس قامۃ واحسنھم	دراز قامت اور سب سے زیادہ وجیہ اور
وجھا ما رأہ احد قط الا احبہ	خوبصورت تھے۔ جو انہیں دیکھتا اُن کا
(تاریخ الاسلام ذہبی۔ ص۳۵)	گرویدہ ہو جاتا"۔

حضرت ہاشم کے بعد اُن کے حسب وصیت مُطلب قریش کی امارت اور حرم کے عہدوں پر فائز تھے۔ مطلب نے چاہا کہ اپنی زندگی ہی میں یہ عہدے عبد المطلب کے سپرد کر دیں اور خود ان عہدوں سے دستبردار ہو جائیں۔ چنانچہ جب انہوں نے یمن جانے کا ارادہ کیا تو عبد المطلب سے کہا کہ تم اپنے باپ کے وارث و جانشین ہو اور اس قابل ہو گئے ہو کہ ان عہدوں کو سنبھال سکو۔ لہٰذا یہ منصب تمہارے سپرد کرتا ہوں۔ مطلب قریش کی امارت اور حرم کے عہدے عبد المطلب کے سپرد کر کے یمن چلے گئے اور وہیں پر مقام ردمان میں وفات پا گئے۔

عبد المطلب میں امارت و قیادت اور عوام کی رہنمائی کے تمام جوہر موجود تھے۔ انہوں نے حرم کے عہدوں پر فائز ہونے کے بعد ملکی و معاشرتی خامیوں کی اصلاح کی، رفادہ و سقایہ کو ترقی دے کر حاجیوں کے کھانے پینے اور آرام و آسائش کی طرف توجہ فرمائی اور چاہ زمزم جو صدیوں سے زمین کے نیچے دب کر بے نشان ہو چکا تھا، اُس کا کھوج نکالا اور اُسے کھود کر استفادہ کے قابل بنایا۔ زمزم اس طرح ناپید ہو چکا تھا کہ عرب میں اس کا نام ہی تکتم پڑ گیا تھا جس کے معنی خفاء و پوشیدگی کے ہیں۔ چنانچہ علامہ زمخشری نے تکتم کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے

تحریر کیا ہے:۔

لانہا کانت مکتومۃ قد اندفنت بعد ایام جرہم حتی اظہرھا عبدالمطلب

"بنی جرہم کے بعد چاہِ زمزم زمین میں گم ہو کر رہ گیا تھا یہاں تک کہ عبدالمطلب نے اُسے ظاہر کیا"۔

(رفائق۔ ج ۱۔ ص ۱۴۶)

اس کی مختصر کیفیت یہ ہے کہ جب مکہ کے سابقہ فرمانروا بنی جرہم، بنی خزاعہ سے مغلوب ہو کر مکہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تو اُن کے سردار عمرو ابن حارث جرہمی نے سونے کے دو ہرن جو اسفندیار ابن گشتاسب نے بطورِ نذرانہ بھیجے تھے اور خانہ کعبہ کے چڑھاوے کی سات تلواریں اور پانچ زرہیں چاہِ زمزم میں پھینک کر اُسے مٹی پتھر سے اس طرح بھر دیا کہ اس کا نشان تک باقی نہ رہا۔ اور خود بنی جرہم کے ساتھ یمن چلا گیا۔ سالہا سال تک کسی نے اس طرف توجہ نہ کی۔ اور بعد کے آنے والوں کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ زمزم کہاں پر واقع تھا۔ عبدالمطلب کو خواب میں اس جگہ کی نشاندہی کی گئی۔ آپ نے اُن نشانات کی روشنی میں محلِ وقوع کا کھوج لگایا اور اپنے فرزند حارث کو ساتھ ملا کر کھدائی شروع کی۔ تین دن کی محنت شاقہ کے بعد کنوئیں کے آثار دکھائی دیئے۔ آپ نے اُن آثار کو دیکھ کر اللہ کی عظمت و کبریائی کا نعرہ لگایا۔ اور تھوڑی سی کھدائی کے بعد پانی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اس کنوئیں میں سے عمرو ابن حارث کی پھینکی ہوئی تلواریں، زرہیں اور سونے کے ہرن بھی برآمد ہو گئے۔

قریش جو اَب تک اس کام کو چنداں اہمیت نہ دیتے تھے اور نہ اس محنت و کاوش میں شریک تھے، ان چیزوں کو دیکھ کر عبدالمطلب کے گرد جمع ہو گئے اور کہنے لگے کہ یہ چیزیں ہمارے آباؤ اجداد کی ملکیت تھیں لہٰذا انہیں آدھوں آدھ تقسیم ہونا چاہئے۔ آدھا آپ لیں اور آدھا ہمیں دیں۔ عبدالمطلب نے کہا کہ یہ میری محنت و ریاضت کا ثمرہ ہے اور تمہارا کوئی حق نہیں ہے۔ پھر بھی تم چاہو تو قرعہ پر فیصلہ کر لو۔ قریش اس پر راضی ہو گئے، اور قرعہ خانہ کعبہ، قریش اور عبدالمطلب کے نام پر ڈالا گیا۔ سونے کے ہرن خانہ کعبہ کے نام پر اور زرہیں اور تلواریں عبدالمطلب کے نام پر نکلیں اور قریش مُنہ تکتے رہ گئے۔ عبدالمطلب نے زرہیں اور تلواریں فروخت کر دیں، اور خانہ کعبہ کا دروازہ تعمیر کرایا اور طلائی ہرنوں کو پتروں کی صورت میں ڈھلوا کر خانہ کعبہ پر جڑوا دیا۔ ابنِ اثیر نے لکھا ہے:۔

فکان اول ذھب حلیت بہ الکعبۃ۔ (تاریخ کامل ج۔ ص)

"یہ خانہ کعبہ پر پہلی طلاکاری تھی"۔

قریش کو جب اِن چیزوں کے حاصل کرنے میں ناکامی ہوئی تو انہوں نے کنوئیں کے متعلق دعوٰی کیا کہ ہمیں اس میں مالکانہ حیثیت سے شامل کیا جائے۔ عبدالمطلب نے کہا کہ یہ میری سعی و کوشش کا نتیجہ ہے اور اللہ نے صرف مجھے عطا کیا ہے۔ تم جب چاہو اس سے پانی لے سکتے ہو مگر ملکیت کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ مگر قریش اپنے دعوٰی پر بضد ہوئے اور آخر یہ طے پایا کہ شام جا کر بنی سعد کی کاہنہ کی طرف رجوع کیا جائے اور وہ

جو فیصلہ کرے فریقین اُسے تسلیم کریں۔ عبدالمطلب اس پر رضامند ہوگئے اور اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ قریش کے قافلہ میں شریک ہوکر شام روانہ ہوگئے۔ ابھی راستہ میں تھے کہ عبدالمطلب اور ان کے ہمراہیوں کے مشکیزے خالی ہوگئے۔ انہوں نے قریش سے پانی طلب کیا۔ قریش کے پاس پانی تھا مگر انہوں نے انکار کردیا اور کہا کہ ہمارے پاس پانی کا ذخیرہ کم ہے اگر اس میں سے تمہیں دے دیں تو ہمیں اپنی جانوں کے تلف ہونے کا اندیشہ ہے۔ جب اس تپتے ہوئے صحراء میں عبدالمطلب اور اُن کے ساتھیوں پر پیاس کی شدّت انتہا کو پہنچ گئی تو انہوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ تم میں سے ہر شخص اپنی اپنی قبر کھود لے تاکہ ہم میں سے جو مر جائے اُسے دُوسرے دفن کر دیں۔ آخر میں ایک باقی رہ جائے گا تو ایک کا بے گور رہنا سب کے بے گور رہنے سے بہتر ہے۔ اِن تشنہ کاموں نے اپنے ہاتھوں سے اپنی قبریں کھود لیں اور مَوت کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ ابھی بیٹھے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ عبدالمطلب نے کہا کہ اس طرح ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جانا بُزدلی ہے۔ ابھی نہ ہمارے ہاتھ پیروں نے ہمارا ساتھ چھوڑا ہے اور نہ ہماری طاقت نے جواب دیا ہے۔ اللہ کی رحمتِ بے پایاں پر بھروسا کرکے اُٹھو۔ ہمّتِ مردانہ سے کام لو اور پانی تلاش کرو شاید کسی سمت پانی نظر آجائے اور ہم اس بے کسی کی مَوت سے بچ جائیں یہ کہہ کر جُستجوئے آب کے لئے اُونٹنی پر سوار ہوئے۔ ابھی اُونٹنی نے قدم اُٹھایا تھا کہ اُس کے پیروں کے نیچے سے شیریں و شفاف پانی کا چشمہ اُبل پڑا۔ چشمہ کو دیکھ کر عبدالمطلب کے ساتھی اُچھل پڑے پانی پینے کے بعد اپنے مشکیزے بھرے اور قریش سے کہا کہ آؤ تم بھی پانی پیو اور اپنے خالی مشکیزے بھر لو۔ قریش نے جب یہ اُبلتا ہوا چشمہ دیکھا تو عبدالمطلب سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ جھگڑا نمٹا دیا ہے جس نے اس صحرائے بے آب میں آپ کے لئے پانی کا سروساماں کیا ہے اُسی نے آپ کو چاہِ زمزم عطا کیا ہے۔ اب ہمیں کاہنہ کے ہاں جانے کی ضرورت نہیں رہی۔ اُٹھئے مکّہ واپس چلئے۔ چنانچہ دونوں فریق وہیں سے مکّہ واپس آگئے۔ نزاع ختم ہوگئی اور زمزم پر عبدالمطلب کا قبضہ مسلّم ہوگیا۔ چاہِ زمزم کی بنیاد اگرچہ حضرت اسمٰعیلؑ سے قائم ہوی تھی مگر اس کی تجدید عبدالمطلب کے ہاتھوں ہوی۔ عبدالمطلب کے دَور میں مکّہ میں اور کنوئیں بھی کھُد چکے تھے مگر جو بات زمزم میں تھی وُہ کسی میں نہ تھی۔ اہلِ مکّہ اور باہر سے آنے والے حجاج اسے متبرّک و بابرکت سمجھتے ہوئے زیادہ تر اسی سے پانی حاصل کرتے اور اسی سے سیراب ہوتے۔ اسی بناء پر اسے شباعہ بھی کہا جاتا تھا کیونکہ اسے پینے والا سیر و سیراب ہو جاتا تھا۔ اور شباعہ کے معنی سیری کے ہیں۔ اور اب بھی ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں مکہ جانے والے حجاج اس سے سیراب ہوتے اور تبرّکاً اس کا پانی اپنے اپنے شہر اور قریہ میں لے جاتے ہیں۔ اگر یہ ایک اعتبار سے حضرت اسمٰعیلؑ کی نشانی ہے تو ایک حیثیت سے عبدالمطلب کی بھی یادگار ہے۔

ابن واضح اور دُوسرے مورّخین نے طائف کے کنوئیں کے متعلق بھی اسی طرح کا ایک واقعہ لکھا ہے۔ یہ کنوُاں ذوالہرام کے نام سے موسوم تھا جسے عبدالمطلب نے بڑی کد و کاوش سے کھودا تھا۔ آپ کبھی کبھار وہاں جاتے اور چند دن ٹھہرتے۔ ایک مرتبہ آئے تو دیکھا کہ بنی کلاب و بنی رباب کے کچھ لوگ ڈیرے ڈالے پڑے ہیں۔ آپ نے اُن سے

پوچھا کہ تم کون ہو اور کس لئے یہاں فروکش ہو؟ کہا کہ ہم اس کنوئیں کے مالک بنی کلاب و بنی رباب ہیں۔ عبدالمطلب نے کہا کہ یہ کنواں میرا ہے۔ تم یہاں ٹھہر سکتے ہو تو میری اجازت سے۔ اُنہوں نے اپنی ملکیت کے دعوے کو دُہرایا اور دونوں طرف بات بڑھنے لگی۔ آخر عبدالمطلب نے بات ختم کرنے کے لئے کہا کہ تم جسے چاہو اُسے حَکَم ٹھہرا لو میں اس کا فیصلہ تسلیم کر لوں گا۔ اُنہوں نے سطیح غسانی کا نام لیا جو عرب کا مشہور کاہن تھا۔ دونوں فریق میں یہ شرط طے پائی کہ سطیح غسانی جس کے خلاف فیصلہ دے گا اُسے دوسرے فریق کو سو اُونٹ اور سطیح کو بیس اُونٹ دینا ہوں گے۔ اس قرارداد کے بعد وہ لوگ اور عبدالمطلب اپنے دس ہمراہیوں سمیت سطیح غسانی کی طرف چل دیئے۔ اس سفر میں بھی یہ اتفاق پیش آیا کہ عبدالمطلب اور اُن کے ساتھیوں کا پانی ختم ہو گیا۔ آپ نے قبیلہ بنو کلاب و بنو رباب سے پانی مانگا۔ انہوں نے کہا کہ پانی ہی پر تو ہمارا جھگڑا ہے۔ ہم ہرگز پانی نہیں دیں گے۔ عبدالمطلب نے کہا کہ میں یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ میرے ساتھیوں کی جانیں پیاس سے ضائع ہوں۔ اگر تمہیں پانی دینے سے انکار ہے تو میں پانی تلاش کروں گا خواہ اس کی تلاش میں میری جان جاتی رہے۔ یہ کہہ کر آپ ناقہ پر سوار ہوئے اور ایک سمت چل دیئے۔ جب کچھ فاصلہ پر پہنچے تو اُن کی اُونٹنی ایک دم گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئی۔ اُونٹنی کے اس طرح بیٹھنے سے کچھ لوگ یہ سمجھے کہ عبدالمطلب چل بسے۔ مگر اُن کے ساتھیوں نے کہا کہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ دُوسروں کی جانیں بچانے کے لئے تگ و دو کریں اور اللہ انہیں بے کسی کی موت سُلا دے۔ جب لوگ دیکھ بھال کے لئے وہاں پہنچے تو دیکھا کہ اُونٹنی ٹھنڈی ریت پر سینہ ٹیکے بیٹھی ہے اور پاس ہی پانی کا چشمہ اُبل رہا ہے۔ پانی کو دیکھ کر سب کی جان میں جان آئی۔ بنو کلاب و بنو رباب نے بھی پانی لنڈھا کر مشکیزے خالی کر لئے تاکہ ٹھنڈا اور تازہ پانی بھریں۔ عبدالمطلب کے ساتھیوں نے دیکھا تو وہ پانی لینے سے مانع ہوئے اور کہا کہ تم نے ہمیں پانی دینے سے انکار کیا تھا اب ہم بھی تمہیں پانی نہیں لینے دیں گے۔ عبدالمطلب نے کہا انہیں پانی لینے دو پانی سے کسی کو روکا نہیں جا سکتا۔ وہ لوگ عبدالمطلب کی عالی ظرفی و فراخ دلی سے متاثر تو ہوئے مگر اپنے دعوٰی سے دستبردار ہونے اور جھگڑا ختم کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ جب سطیح کے ہاں پہنچے تو مختلف طریقوں سے اُسے آزمانے کے بعد کہا کہ یہ بتائیے کہ ہمارے درمیان جھگڑا کس چیز پر ہے اور پھر اُس کا فیصلہ کیجئے۔ کہا کہ تم طائف کے کنوئیں کے بارے میں جسے ذوالہرام کہا جاتا ہے فیصلہ چاہتے ہو۔ وہ کنواں عبدالمطلب کا ہے اور تمہارا اس پر کوئی حق نہیں ہے، لہٰذا سو اُونٹ عبدالمطلب کے حوالے کرو اور بیس اُونٹ مجھے دو۔ انہوں نے اُونٹ دونوں کے حوالے کئے اور کنوئیں سے بے دخلی کا اعلان کر کے واپس چلے گئے۔

جب عبدالمطلب پلٹ کر مکہ میں وارد ہوئے تو اعلان کیا کہ اے اہلِ مکہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم میں سے کچھ لوگوں نے یہ نیت کی تھی کہ اگر میرے خلاف فیصلہ ہوا اور مجھے اُونٹ دینے پڑے تو وہ مجھے کچھ اُونٹ دے کر تاوان میں میرا ہاتھ بٹائیں گے۔ وہ آئیں اور جتنے اُونٹ مجھے دینے کا ارادہ کیا تھا اُتنے اُونٹ لے جائیں۔ چنانچہ کچھ لوگ آئے اور کوئی ایک، کوئی دو اور کوئی تین اُونٹ لے گیا۔ پھر بھی کچھ اُونٹ بچ رہے۔ آپ نے اپنے فرزند ابوطالب

سے کہاکہ ان اُونٹوں کو لے جاؤ اور انہیں نحر کرکے کوہِ ابو قبیس کی چوٹیوں پر ڈال دو تاکہ صحرائی جانور بھی اپنا پیٹ بھرلیں۔ ابو طالب نے ایسا ہی کیا اور اس موقع پر یہ شعر کہا:-

ونطعم حتی یاکل الطیر فضلنا　　اذا جعلت ایدی المفیضین ترعد

"ہم دُوسروں کو کھلاتے ہیں یہاں تک کہ پرندے بھی ہمارے بچے ہوئے میں سے کھاتے ہیں جبکہ برتنوں کو پُر کرنے والوں کے ہاتھ کانپنے لگتے ہیں۔"

عبدالمطلب کا دستُور تھا کہ دسترخوان پر سے جو کھانا بچ رہتا تھا وہ گھر میں واپس جانے کے بجائے پہاڑوں کی چوٹیوں پر ڈال دیا جاتا تھا تاکہ صحرائی پرندے بھی کھائیں اور اپنا پیٹ بھریں۔ اسی دستور کی بناء پر انہیں مطعم الطیر (پرندوں کو دانہ پانی دینے والا) کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس ہمہ گیر جود و سخا کے ساتھ مصیبت زدوں کی مصیبت میں کام آنا اپنا اخلاقی و منصبی فریضہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب کوئی مصیبت کا مارا اُن سے پناہ طلب کرتا یا ان کے پاس فریاد لے کر آتا تو فوراً اس کی امداد پر کمر بستہ ہو جاتے اور اُسے مصیبت سے چھٹکارا دلا کر دم لیتے۔ ایک مرتبہ قبیلۂ حزام کے کچھ لوگ مکّہ میں حج کے لئے آئے۔ جب پلٹنے لگے تو اُن کا ایک آدمی قتل ہو گیا۔ انہوں نے اپنے آدمی کے عوض حذافہ ابن غانم عدوی کو پکڑ لیا۔ حذافہ نے راستہ میں عبدالمطلب کو جو طائف سے پلٹ رہے تھے دیکھا اور اُن سے فریاد کی۔ عبدالمطلب نے اپنی سواری کو روکا اور واقعہ پر مطلع ہونے کے بعد اُن لوگوں سے کہا کہ تم حذافہ کو چھوڑ دو اور میں اس کے عوض بیس اوقیہ (۵۵ تولہ) سونا، دس اُونٹ اور ایک گھوڑا دُوں گا۔ اور اس مال کی ادائیگی تک میری چادر[1] رہن رکھ لو۔ انہوں نے چادر رکھ لی اور حذافہ کو چھوڑ دیا۔ آپ اُسے اپنے اُونٹ پر بٹھا کر مکہ لائے اور اُن لوگوں سے جو وعدہ کیا تھا اُسے پُورا کیا اور چادر واپس لے لی۔

---

[1] ایک معمولی چادر کی ضمانت پر حذافہ کو چھوڑ دینا عبدالمطلب کی شخصیت اور اُن کے ایفائے عہد کی شہرت کی بناء پر تھا۔ اور دوسرے اس میں عرب کا یہ دستور بھی کار فرما تھا کہ وُہ جس طرح بن پڑتا اپنی رہن رکھی ہوئی چیز کو ضرور چھڑاتے خواہ وُہ کتنی حقیر و بے قیمت کیوں نہ ہوتی۔ اسی دستور کی بناء پر کسریٰ نے حاجب ابن زرارہ کی کمان بطور ضمانت رکھ کر اس سے پُرامن رہنے کا عہد لیا تھا۔ اس کا واقعہ یہ ہے کہ جب بنی تمیم اپنے ہاں کی پیہم خشک سالیوں سے تنگ آکر عراق کی چراگاہوں کی طرف گئے تو ان کا سردار حاجب ابن زرارہ کسریٰ کے دربار میں پہنچا اور اس سے کہا کہ ہمیں کچھ عرصہ کے لئے اُونٹوں کے چرانے کی اجازت دی جائے۔ کسریٰ نے کہا کہ تم لوگ بد عہد اور شر پسند ہو۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تم کوئی نہ کوئی فتنہ ضرور کھڑا کرو گے، اور میری رعایا کو نقصان پہنچاؤ گے۔ حاجب نے کہا کہ مَیں اس کا ذمہ لیتا ہوں کہ میرے قبیلہ کا کوئی فرد شر انگیزی نہیں کرے گا۔ کسریٰ نے کہا کہ تمہارے اس قول و قرار کی ضمانت کیا ہے؟ کہا کہ میری یہ کمان رہن رکھ لیجئے۔ اس پر کسریٰ اور اُس کے درباری ہنسنے لگے اور اس کی بات کو کوئی وزن نہ دیا۔ انہی درباریوں میں سے ایک شخص نے کہا کہ اس کی کمان (باقی صفحہ ۴۶ پر)

مکّہ میں اذینہ نامی ایک یہودی تاجر تھا جو مالِ تجارت لے کر شہر اور اس کے مضافات میں پھیری لگاتا تھا۔ اُس نے آپ سے پناہ طلب کی۔ آپ نے اُسے پناہ دے کر اُس کی حفاظت کا ذمّہ لے لیا۔ حرب ابنِ اُمیّہ اُس کے درپے ایذا ہوا اور قریش کے چند اوباشوں کو بھڑکایا جنہوں نے اُسے قتل کر کے اس کا مال و اسباب لُوٹ لیا۔ عبدالمطلب کو معلوم ہوا تو انہیں قاتلوں کی فکر ہوئی۔ آخر ٹوہ لگاتے ہوئے قاتلوں کا سراغ مل گیا۔ اور یہ ثابت ہو گیا کہ حرب ابن امیہ کی انگیخت پر عامر ابن عبدمناف ابن عبدالدار اور صخر ابنِ عمرو نے اُسے قتل کیا ہے اور اب وُہ اُسی کے ہاں چھُپے ہوئے ہیں۔ آپ نے حرب سے مطالبہ کیا کہ قاتلوں کو اُن کے حوالے کیا جائے۔ اس نے قاتلوں کو پیش کرنے سے انکار کیا اور سخت کلامی پر اُتر آیا۔ ان دونوں میں خاندانی کشیدگی تو پہلے ہی سے تھی، اب رنجش اور بڑھ گئی۔ حرب کو اپنی طاقت اور مالی قوت پر بڑا گھمنڈ تھا۔ اس نے آپ کو منافرہ (باہمی تقابل) کی دعوت دی۔ عبدالمطلب پہلے تو اُس کی شوخ چشمی پر حیران ہوئے اور پھر اُس کی دعوت قبول کر لی۔ اور یہ طے پایا کہ شاہِ حبشہ کو ثالث قرار دیا جائے مگر شاہِ حبشہ نے ثالث بننے سے انکار کر دیا۔ آخر نفیل ابن عبدالعزیٰ کو حَکَم بنایا گیا۔ اس نے عبدالمطلب کی فوقیت و برتری کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ حرب اس فیصلہ پر بہت تلملایا اور طیش میں آ کر نفیل کو بُرا بھلا کہا، اور عبدالمطلب کے خلاف بھی لب کشائی کی اور پوچ حرکتوں پر اُتر آیا۔ مقصد یہ تھا کہ اس طرح انہیں مرعوب کر کے قاتلوں کے مطالبہ سے دستبردار ہونے پر مجبور کر دے۔ مگر عبدالمطلب آسانی سے دبنے والے نہ تھے۔ انہوں نے کسی طرح اُس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اور اُس سے سَو اُونٹ دیت کے لے کر مقتول کے وارثوں کو

(بقیہ از صفحہ ۴۵) کو رہن رکھ لینا چاہئے۔ اس لئے کہ عرب اپنا عہد پُورا کرنے کے لئے اگر کسی چیز کو رہن رکھتے ہیں تو اُسے ضرور پُورا کرتے ہیں۔ چنانچہ وُہ کمان رہن رکھ لی گئی اور انہیں اُونٹ چرانے کی اجازت دے دی گئی۔ جب خشک سالی جاتی رہی اور بنی تمیم کی زمینیں سرسبز و شاداب ہو گئیں تو انہوں نے واپسی کی تیاری کی۔ اس عرصہ میں حاجب دُنیا سے چل بسا تھا۔ اور اُس کا بیٹا عطارد موجود تھا۔ وُہ کسریٰ کے پاس آیا اور کہا کہ ہم نے اپنا عہد پُورا کیا ہے اور کسی فتنہ انگیزی کے مرتکب نہیں ہوئے۔ لہٰذا میرے باپ کی کمان واپس دی جائے۔ کسریٰ نے کہا کہ تم نے تو کوئی چیز میرے سپرد نہیں کی تھی۔ کہا کہ میرے باپ نے کمان رہن رکھی تھی۔ اور میں اپنے باپ کا وارث ہوں۔ اگر آپ نے وُہ کمان مجھے واپس نہ دی تو میں تمام عرب میں رُسوا ہو جاؤں گا۔ اور اس سے بڑھ کر ذلت و رسوائی ہو بھی کیا سکتی ہے کہ رہن رکھی ہوئی چیز چھڑائی نہ جائے۔ کسریٰ اس کے احساسِ ذمہ داری سے خوش ہوا اور کمان بھی واپس دی اور اس کے ساتھ ایک خلعت بھی دیا۔

بعض جرائد میں دیکھا ہے کہ برٹش کولمبیا کے لوگوں میں اب بھی دستور ہے کہ جب وُہ بڑی مقدار میں قرضہ لیتے ہیں تو اپنا نام گروی رکھ دیتے ہیں۔ اور جب تک قرضہ ادا نہیں کرتے کہیں بھی اپنا نام استعمال نہیں کرتے اور جب قرضہ اتار دیتے ہیں تو پھر اپنا نام استعمال کرنے کے مجاز ہو جاتے ہیں۔ ۱۲

دیئے اور مقتول کے مال کا بیشتر حصہ بھی نکلوا لیا۔ اور جو نہ مل سکا اس کی قیمت اپنے پاس سے ادا کر کے عدل و انصاف اور پناہ دہندگی کے تقاضے کو پورا کیا۔

آپ ہی کے زمانہ ریاست میں نجاشی حبشہ کے سپہ سالار اور والیٔ یمن ابرہہ ابن اشرم نے کوہ پیکر ہاتھیوں اور خود سر فوجوں کے ساتھ مکہ پر چڑھائی کی اور خانہ کعبہ کو مسمار کرنے کا ارادہ کیا۔ اہلِ مکّہ کے لئے یہ انتہائی خطرناک لمحات تھے۔ ایک طرف ہتھیاروں میں ڈوبی ہوئی فوجیں اور دُوسری طرف نہ لڑنے کی طاقت اور نہ بڑھتے ہوئے سیلاب عساکر کو روکنے کی قوت۔ جب یمنی فوجوں نے مکّہ کے قریب پڑاؤ ڈالا تو دیکھنے والوں کے دل دہل گئے۔ مکّہ والوں کے قدم اُکھڑ گئے اور اپنے اہل و عیال کو لے کر پہاڑوں کے دروں اور صحراؤں میں منتشر ہو گئے۔ اس موقع پر عبدالمطلب نے جس ثباتِ قدم کا مظاہرہ کیا اس کی مثال تاریخ قبل اسلام میں کہیں نظر نہیں آتی۔ وُہ نہ حملہ آوروں کو دیکھ کر ہراساں ہوئے اور نہ گھر بار چھوڑنے پر آمادہ۔ کچھ لوگوں نے اُن سے کہا کہ آپ بھی مکّہ چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں۔ مگر آپ نے پُوری عزیمت و خود اعتمادی کے ساتھ فرمایا:۔

لا ابرح من حرم اللہ ولا اعوذ بغیر اللہ۔ (تاریخ یعقوبی۔ ج۔ ص۲۵۲)	میں اللہ تعالےٰ کے حرم کو نہیں چھوڑوں گا اور نہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے پناہ مانگوں گا۔"

اس اثناء میں ابرہہ نے چند آدمی لُوٹ مار کے لئے اِدھر اُدھر بھیجے جنہوں نے عبدالمطلب کے دو سو اُونٹ جو صحرا میں چر رہے تھے پکڑ لئے۔ عبدالمطلب کو معلوم ہوا تو وُہ ابرہہ کے پاس آئے۔ ابرہہ اُن کی پُروجاہت و پُرعظمت شخصیت کو دیکھ کر اُن کی تعظیم کئے بغیر نہ رہ سکا۔ تخت سے نیچے اُتر کر انہیں اپنے قریب بٹھایا اور پُوچھا کہ اے سردارِ قریش کیسے آنا ہوا؟ فرمایا کہ تمہاری فوج کے کچھ لوگ میرے اُونٹ ہنکا لائے ہیں وُہ اُونٹ مجھے واپس کئے جائیں۔ ابرہہ نے یہ سُنا تو پیشانی پر بل ڈالا اور کہا کہ میں تو یہ سمجھا تھا کہ آپ خانہ کعبہ کے بارے میں کچھ کہیں گے جو قریش کی عزت و عظمت کا مرکز ہے۔ مگر آپ نے خانہ کعبہ کے تحفظ کی سفارش کے بجائے اپنے چند اُونٹوں کا مطالبہ کر دیا۔ فرمایا:۔

انا رب الابل فاطلبھا وللبیت رب یمنعہ۔ (تاریخ ابوالفداء۔ ج۔ ص۱۰۹)	میں اِن اُونٹوں کا مالک ہوں اس بنا پر انہیں طلب کرتا ہوں۔ اور اس گھر کا بھی ایک مالک ہے وُہ خود اس کی حفاظت کرے گا۔"

ابرہہ اس بیباکانہ جواب سے بہت متاثر ہوا اور حکم دیا کہ عبدالمطلب کے اُونٹ انہیں واپس کر دیئے جائیں۔ عبدالمطلب اپنے اُونٹوں کو ہنکا کر مکّہ میں لائے اور اُن پر وقفِ بیت اللہ کی علامت لگا کر انہیں حرم میں کھُلا چھوڑ دیا اس خیال سے کہ اب اُونٹوں کو کوئی گزند پہنچا یا ان میں سے کوئی دُشمن کے ہاتھ سے زخمی ہوا تو حملہ آور عذابِ خداوندی کی قاہرانہ گرفت سے بچ کر نہ جا سکیں گے۔

عبدالمطلب نے اس موقع پر جو کردار ادا کیا وُہ ان کے اعتماد علی اللہ کا آئینہ دار ہے۔ انہوں نے صرف

اپنے اُونٹوں کی واپسی کا مطالبہ کیا اور اپنے مال کی واپسی کا مطالبہ ہر انسان کا بنیادی حق ہے جس سے شرفِ انسانی مجروح نہیں ہوتا۔ لیکن خانہ کعبہ کے متعلق کچھ کہنے سُننے کا مطلب یہ تھا کہ انہیں قدرت کی کارفرمائی پر یقین و اعتماد نہیں ہے کہ وُہ اُسے چھوڑ کر ایک متکبّر و خود سر کے آگے جھولی پھیلانے اور اس کے زیر بارِ احسان ہونے پر آمادہ ہو جاتے۔ اس سے نہ صرف ان کے یقین کو ٹھیس لگتی بلکہ ان کی حمیت و خودداری پر بھی حرف آتا۔

عبد المطلب کی اس گفتگو سے ابرہہ کے دِل پر مبہم سا خوف چھا گیا اور وُہ قدم آگے بڑھانے اور خانہ کعبہ پر حملہ کرنے سے ہچکچانے لگا۔ مشیروں اور حاشیہ برداروں نے ہمّت بندھائی اور وُہ اُن کے کہنے سُننے سے مکّہ کی جانب بڑھا۔ ادھر کوی مقابلہ کرنے والا نہ تھا۔ ایک عبد المطلب تھے جو خانہ کعبہ کے در پر کھڑے ہوئے کہہ رہے تھے کہ پروردگارا! یہ تیرا گھر ہے اور تُوہی اِس گھر کا محافظ و پاسبان ہے۔ اُدھر ابرہہ کا لشکر خانہ کعبہ کو گرانے کے ارادہ سے بڑھا ادھر مغرب کی سمت سے سیاہی اُٹھی۔ خیال گزرا کہ بادل منڈلا رہے ہیں۔ جب غور سے دیکھا تو پرندوں کے جُھنڈ کے جُھنڈ فضا پر چھائے ہوئے نظر آئے جو چونچوں اور پنجوں میں کنکریاں لئے ہوے تھے۔ قدرت کی یہ مسلح فوج ابرہہ کی فوج کے مقابلہ میں صف بستہ ہوگئی اور انہی کنکریوں کے سہارے حملہ آور ہوی۔ اور اس طرح تاک تاک کر کنکریاں ماریں کہ کوی بے جُرم زد میں نہ آیا، اور کوی مجرم جان بچا کر بھاگ نہ سکا۔ اِن کنکریوں کے مقابلہ میں نہ آہنی خود اور زرہیں آڑے آئیں نہ چمکتی ہوی تلواریں اور لچکتے ہوے نیزے کار آمد ثابت ہوے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا لشکر پس کر رہ گیا۔ ابرہہ اپنی جان بچا کر بھاگا اور یمن جاتے ہوے راستہ میں مرگیا۔

یہ دَور وُہ تھا کہ عوام کے دل و دماغ پر بتوں کی جھُوٹی عظمت کا کہر چھایا ہوا تھا۔ ہر مصیبت و آفت کے وقت انہی کو پُکارا جاتا اور انہی کے آگے گڑگڑایا جاتا۔ مگر عبد المطلب کی زبان سے نہ لات و ہبل کا نام نکلتا ہے اور نہ منات و عزیٰ کا۔ بلکہ لَو لگاتے ہیں تو اللہ سے اور بھروسا کرتے ہیں تو اسی کی کارسازی پر۔ اور اُسی سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے اللہ تُوہی اس گھر کا مالک اور تُوہی اس کا محافظ و نگہبان ہے۔" اور پھر ایسے خطرناک موقع پر جبکہ ہر شخص کو اپنی جان کے لالے پڑے ہوے تھے اور مکّہ کے عوام و خواص پہاڑوں پر چڑھ گئے تھے یا پتھروں کی آڑ میں چھپ گئے تھے۔ آپ نہ اللہ کا گھر چھوڑتے ہیں نہ اُس کا در۔ اور اُسی پر اعتماد کرتے ہوے پُورے سکونِ قلب کے ساتھ یُوں ثابت قدم رہتے ہیں جیسے سیسہ پلائی ہوی دیوار۔ یہ عبد المطلب کے ثباتِ قدم ہی کا تاثر تھا کہ جب پیغمبرؐ اکرم جنگِ حنین میں گنتی کے چند آدمیوں کے ساتھ ڈٹے رہے تو عبد المطلب کی طرف اپنی فرزندی کی نسبت دیتے ہوے فرمایا:-

انا النبی لا کذب ! انا ابن عبد المطلب

"مَیں نبیؐ ہوں جس میں جھُوٹ نہیں ہے۔ میں عبد المطلب کا بیٹا ہوں"۔

مُطلب یہ تھا کہ جس طرح میرے دادا عبد المطلب نے اصحابِ فیل کے مقابلہ میں ثبات قدم دکھایا تھا

اور اُن کے قدم نہیں اُکھڑے تھے اسی طرح میرے قدم بھی اکھڑ نہیں سکتے اس لئے کہ میں اُنہی کا بیٹا ہوں۔
اس ارشادِ نبوی سے نہ صرف عبد المطلب کی شجاعت و ثباتِ قدمی ظاہر ہوتی ہے بلکہ ان کے موحد و خدا پرست ہونے پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اس لئے کہ اگر وُہ کافر و مشرک ہوتے تو پیغمبرؐ اکرم کفارِ حنین کے مقابلہ میں ان سے نسبی وابستگی کی بناء پر فخر نہ کرتے اور نہ کفار کے مقابلہ میں ایک کافر سے انتساب پر تفاخر زیب دیتا ہے۔ تاریخ کے اوراق اس کے شاہد ہیں کہ انہوں نے اپنی زندگی میں نہ کبھی بتوں کی پرستش کی، نہ بتوں کے نام کا ذبیحہ کھایا اور نہ کبھی مشرکانہ رسم و راہ اختیار کی۔ بلکہ خدا کی وحدانیت کے قائل اور حشر و نشر کے معتقد تھے۔
چنانچہ علامہ حلبی نے لکھا ہے کہ آپ کے دَور میں شام کا ایک ظالم و خونخوار شخص دُنیا میں ظلم کی سزا بھگتے بغیر مر گیا۔ لوگوں نے عبد المطلب سے کہا کہ آپ تو فرمایا کرتے تھے کہ ظالم اس وقت تک نہیں مرتا جب تک اُسے ظلم کی سزا مل نہیں جاتی۔ فرمایا:۔

واللہ ان وراء ھذہ الدار دارا یجزی فیھا المحسن باحسانہ و یعاقب المسئ باساءتہ۔ (سیرت حلبیہ ج۱۔ ص۷)	خدا کی قسم اس دارِ دُنیا کے بعد ایک دارِ آخرت بھی ہے جہاں نیک کو نیکی کی جزا اور بد کو بدی کی سزا ملے گی۔"

مسعودی نے لکھا ہے:۔

کان عبد المطلب یوصی ولدہ بصلۃ الارحام واطعام الطعام ویرغبہم فعل من یراعی فی المتعقب معادا و بعثا و نشورا۔ (مروج الذہب ج۲۔ ص۳۱۳)	عبد المطلب اپنی اولاد کو صلۂ رحمی کی تعلیم دیتے (مہمانوں کو) کھانا کھلانے کی ہدایت کرتے اور اس شخص کے مانند ان چیزوں پر زور دیتے جو انجامِ کار پر نظر رکھتا اور قیامت اور حشر و نشر کا قائل ہو۔"

اس عقیدۂ مبدأ و معاد کے ساتھ آپ دینِ ابراہیمؑ کے پابند اور ان کی شرع پر کاربند تھے۔ اکثر اوقات طوافِ خانہ کعبہ میں مصروف رہتے۔ خلوت و جلوت میں اللہ سے لو لگاتے، ذکر و فکر میں کھوئے رہتے اور رمضان کے مہینہ میں دنیا و مافیہا سے بے پروا اور سارے جھنجھٹوں سے آزاد ہو کر غارِ حرا میں قیام کرتے اور یکسوئی کے ساتھ اللہ کے جلال و عظمت کی اتھاہ گہرائیوں میں غور و فکر کرتے۔ ابنِ اثیر نے لکھا ہے:۔

ھو اول من تحنث بحرا فکان اذا دخل شھر رمضان صعد حراء اطعم المساکین جمیع الشھر۔ (تاریخ کامل ج۲۔ ص۹)	آپ ہی نے سب سے پہلے کوہِ حرا میں اللہ کی عبادت میں راتیں گزاریں۔ جب ماہِ رمضان شروع ہوتا تو آپ کوہِ حرا پر چڑھ جاتے اور سارا مہینہ مسکینوں کو کھانا دیتے۔"

آپ نے صرف اپنی زندگی ہی کو حُسنِ عمل کے جوہر سے آراستہ نہیں کیا بلکہ ایک انقلاب آفریں مصلح کی طرح اجتماعی زندگی کو بھی صحیح خطوط پر تعمیر کرنے کے لئے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے رہے اور اصلاحِ معاشرہ و تربیتِ اخلاق کے لئے ایسے اصلاحات نافذ کئے جو اپنی قدر وقیمت اور افادیت کی بناء پر اسلامی احکام کا جزو قرار دے دیئے گئے اور اس طرح انہیں ابدی و آفاقی حیثیت حاصل ہو گئی۔ چنانچہ علامہ حلبی تحریر کرتے ہیں:۔

وتوثر عنه سنن جاء القرآن باكثرها وجاءت السنة بها۔
(سیرت حلبیہ۔ ج۱۔ ص۴)

"آپ سے ایسے اصلاحات وارد ہوئے ہیں جن میں سے اکثر قرآن میں بیان ہوئے اور سُنّتِ رسُولؐ میں درج ہوئے۔"

علامہ مجلسی اور دُوسرے سیرت نگاروں نے تحریر کیا ہے کہ پیغمبرِ اکرمؐ نے فرمایا کہ عبدالمطلب نے زمانۂ قبلِ اسلام میں ایسی پانچ چیزوں کا اجرا کیا جنہیں اسلام نے جوں کا توں باقی و برقرار رکھا۔ انہوں نے باپ کی بیویوں کو اولاد پر حرام قرار دیا اور خداوند عالم نے اسے برقرار رکھتے ہوئے فرمایا:۔ ولا تنکحوا ما نکح اٰباؤکم۔ (جن عورتوں سے تمہارے باپ داداؤں نے نکاح کیا ہو تم اُن سے نکاح نہ کرو۔) انہوں نے ایک خزانہ کے دستیاب ہونے پر اس کا پانچواں حصّہ الگ کر کے فقراء و مساکین پر تقسیم کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔ واعلموا انما غنمتم من شئ فان للہ خمسہ۔ (تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ جو مال تمہیں بطورِ غنیمت حاصل ہو اُس کا پانچواں حصّہ اللہ تعالیٰ کے لئے ہے) انہوں نے چاہِ زمزم کھودا تو اُسے سقایۃ الحاج سے تعبیر کیا۔ اور قدرت نے فرمایا:۔ اجعلتم سقایۃ الحاج۔" انہوں نے قتل کی دیت سَو اُونٹ قرار دی اور اسلام نے اسی تعداد کو برقرار رکھا۔ قریش کے ہاں طواف کے چکروں کی تعداد مقرر نہ تھی۔ آپ نے طواف کے سات چکر قرار دیئے اور اسلام نے بھی اسے برقرار رکھتے ہوئے طواف کے سات چکر معیّن کئے۔ علامہ مجلسی نے اس ارشادِ نبوی کے ذیل میں لکھا ہے:۔

فعل هٰذه الامور بالالهام من الله تعالیٰ او كانت فی ملة ابراهیم فترکتها قریش فاجراها فیهم۔
(بحار الانوار۔ ج۔ ص۳۸)

"عبدالمطلب نے اِن اُمُور کا اجرا الہامِ خداوندی سے کیا یا یہ کہ یہ چیزیں ملّتِ ابراہیمی میں موجود تھیں اور قریش نے انہیں پسِ پُشت ڈال دیا تھا۔ اور آپ نے انہیں از سرِ نو جاری کیا۔"

ان امور کے علاوہ اخلاقی و معاشرتی اصلاح کے لئے ایسے قوانین نافذ کئے جن کی اہمیت و افادیت ناقابلِ انکار ہے۔ ابن واضح یعقوبی نے لکھا ہے کہ عبدالمطلب نے وفاءِ نذر قطع ید سارق قرعہ اور مباہلہ کا اجرا اور قتل پر سَو اُونٹوں کی دیت کا نفاذ کیا۔ مہمان نوازی، کسبِ حلال اور محترم مہینوں کے احترام پر زور دیا۔ دُختر کُشی اور محارم سے نکاح کی ممانعت کی۔ فواحش و منکرات کا انسداد کیا۔ شراب نوشی اور زنا کاری پر سزا

تجویز کی اور حجاج کو ترغیب دی کہ وُہ پاک وپاکیزہ اور حلال کمائی سے حج کریں۔ عرب کا دستور تھا کہ طواف سے پہلے کپڑے اُتار کر ایک جگہ رکھ دیتے اور برہنہ طواف کرتے۔ اگر قریش کسی کو تن ڈھانکنے کے لئے کپڑا دے دیتے تو وُہ پہن لیتا ورنہ عُریاں ہی طواف کرنا پڑتا۔ آپ نے اس اخلاق سوز رسم کو بند کیا۔ اور حکم دیا کہ کپڑے پہن کر طواف کیا جائے اور یہی اسلام نے ہدایت کی۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:۔

خذوا زینتکم عند کل مسجد　　　عبادت کے ہر موقع پر کپڑے پہن لیا کرو۔"

اسی طرح عرب میں مرسوم تھا کہ وُہ حج کے بعد گھروں میں دروازوں کے بجائے پچھواڑے سے داخل ہوتے آپ نے انہیں ہدایت کی کہ وُہ گھروں میں پچھواڑے کے بجائے دروازوں سے آئیں۔ اور اسلام نے بھی یہی تعلیم دی:۔

واتوا البیوت من ابوابھا۔　　　گھروں میں آؤ تو دروازوں سے آؤ۔"

یہ ہدایت افروز تعلیمات ایسے ہی بلند نظر مصلح کے شایانِ شان ہو سکتے ہیں جو گزشتہ انبیاء کے تعلیمات سے آگاہ اور اُن کے سنن و احکام اور اوامر و نواہی سے واقف ہو۔ اگرچہ آپ نبی نہ تھے مگر ان بلند پایہ تعلیمات اور پیغمبرانہ اصلاحات کی بناء پر انہیں بڑی عظمت و توقیر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا اور ابراہیم الثانی کے نام سے یاد کئے جاتے تھے۔

آپ کئی جہات سے اپنے جد حضرت ابراہیمؑ سے مماثلت رکھتے تھے۔ سن و سال اور اولاد کی تعداد میں قریب قریب یکسانیت تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے تیرہ فرزند تھے اور عبدالمطلب کے دس بیٹے اور چھ بیٹیاں تھیں۔ عادات و اطوار میں بھی بہت سے پہلو مشترک تھے۔ غریبوں کی دستگیری کرنا، بھوکوں کو کھانا کھلانا، مہمانوں کو ہاتھوں ہاتھ لینا دونوں کا دستور تھا۔ اسی لئے حضرت ابراہیمؑ کو ابوالاضیاف اور عبدالمطلب کو فیاض اور مطعم الطیر کہا جاتا تھا۔ جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے مصر و شام کی شاہراہ پر چاہ شبع کھودا اسی طرح آپ نے وادیٔ غیر ذی زرع (مکّہ) میں چاہ زمزم کھود کر مسافروں اور راہ نوردوں کی سیرابی کا سامان کیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے سب سے پہلے شیب (بالوں کی سفیدی) کو دیکھا اور آپ پیدا ہونے کے بعد شیبہ کے نام سے یاد کیئے گئے۔

حضرت ابراہیمؑ جامعیت و ہمہ گیری کے لحاظ سے پُوری ایک اُمّت تھے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:۔ ان ابراھیم کان اُمّة (ابراہیمؑ تنہا ایک اُمّت ہے) اسی طرح آپ اپنی متنوع اور ہمہ گیر شخصیت کے اعتبار سے اُمّت کہے گئے۔ چنانچہ ارشادِ نبوی ہے:۔

ان اللہ یبعث جدی عبدالمطلب امة واحدة فی ھیئة الانبیاء و زی الملوک۔

(تاریخ یعقوبی۔ ج۲۔ ص۱۴)

خداوند عالم میرے دادا عبدالمطلب کو نبیوں کی ہیئت اور بادشاہوں کی وضع قطع میں اس طرح اُٹھائے گا کہ وُہ اپنی شخصیت کے لحاظ سے ایک امت شمار ہوں گے۔"

دونوں مستجاب الدعوات، صبر و عزیمت میں ممتاز اور جذبۂ فداکاری میں نمایاں تھے۔ چنانچہ جس عزم و ارادہ کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ اپنے فرزند اسمٰعیلؑ کی قربانی پر کمر بستہ ہوئے اسی عزم و ارادہ کے ساتھ آپ اپنے محبوب ترین فرزند عبداللہ کی قربانی پر آمادہ ہوئے۔ چنانچہ امام رضا علیہ السلام کا ارشاد ہے:۔

ان عزمہ علیٰ ذبح ابنہ عبداللہ شبیہ بعزم ابراھیمؑ علےٰ ذبح ابنہ اسمٰعیلؑ۔
(بحار الانوار۔ جلد۶۔ ص۳۹)

"جس عزم مستحکم کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ اپنے فرزند اسمٰعیلؑ کو ذبح کرنے پر تیار ہوئے، اسی عزم مصمم کے ساتھ عبدالمطلب اپنے فرزند عبداللہ کی قربانی پر آمادہ ہوئے۔"

اس قربانی کی مختصر رُوداد یہ ہے کہ زمزم کی کھدائی کے موقع پر عبدالمطلب کا صرف ایک ہی بیٹا تھا جو اس کام میں اُن کا ہاتھ بٹا سکا۔ اور کوئی دوسرا معاون و مددگار نہ تھا۔ آپ نے اس موقع پر منّت مانی کہ اگر خدا مجھے دس بیٹے دے گا تو میں ایک بیٹا اس کی راہ میں قربان کروں گا۔ قدرت نے ان کی دُعاء قبول کی اور دس بیٹے دیئے جن کے نام یہ تھے: عبداللہ، زبیر، ابو طالب، عباس، ضرار، حمزہ، مقوم، ابولہب، حارث اور غیداق۔" آپ نے چاہا کہ اپنی منت ادا کریں۔ چنانچہ اپنے دسوں بیٹوں کو جمع کیا اور اُن سے کہا کہ میں نے منت مانی تھی کہ اگر اللہ مجھے دس بیٹے دے گا تو میں ایک بیٹے کو قربان کروں گا۔ خدا نے میری دُعا سن لی ہے۔ اب مجھے اپنا وعدہ پُورا کرنا چاہیئے تاکہ اللہ تعالےٰ کے سامنے سرخرو ہو سکوں۔ لہٰذا تم میں کون ہے جو بخوشی ذبح ہونے کے لئے تیار ہو؟ پہلے تو اُن سبھوں نے ایک دُوسرے کو حیرت سے دیکھا، پھر سر اطاعت خم کرتے ہوئے کہا کہ ہم حاضر ہیں آپ جسے چاہیں ذبح کے لئے منتخب کر لیں۔ جب انہوں نے اپنے بیٹوں کو آمادہ پایا تو خانہ کعبہ کے پاس آئے اور اُن دسوں بیٹوں پر قرعہ ڈالا۔ قرعہ سب سے چھوٹے فرزند عبداللہ کے نام پر نکلا۔ عبداللہ گھر والوں کی آنکھ کا تارا اور خاندان بھر میں ہر دلعزیز تھے۔ سب ہی ان کے ذبح سے مانع ہوئے۔ عبدالمطلب نے کہا کہ میرے لئے ایفائے عہد ضروری ہے اگرچہ اپنے ہاتھوں اپنے جگر بند کو ذبح کرنا آسان نہیں ہے۔ فرزندانِ عبدالمطلب اور اکابرِ قریش نے کہا کہ ایک بار پھر قرعہ ڈالیئے شاید کسی اور کا نام نکل آئے۔ دُوسری بار قرعہ ڈالا گیا وُہ بھی عبداللہ کے نام نکلا۔ اب عبدالمطلب اپنے پارۂ جگر کو اپنے ہاتھوں سے ذبح کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ عکرمہ ابنِ عامر نے کہا کہ اے سردار قریش! اگر آپ نے اپنے بیٹے کو ذبح کر ڈالا تو پھر بیٹوں کو ذبح کرنے کی رسم چل نکلے گی۔ اور اس رسم کے بانی آپ ہوں گے۔ بہتر ہے کہ آپ اس سے دستبردار ہو جائیں اور کسی کاہن سے مشورہ کریں۔ سب نے کہا کہ عکرمہ کی رائے صحیح ہے اس پر عمل کرنا چاہیئے۔ چنانچہ ایک کاہنہ کی طرف رجوع کیا گیا۔ اس نے واقعہ پر مطلع ہونے کے بعد پُوچھا کہ تمہارے ہاں ایک آدمی کا خونبہا کیا ہے؟ اسے بتایا گیا کہ دس اُونٹ۔ کہا کہ پھر دس اُونٹوں اور عبداللہ پر قرعہ ڈالو۔ اگر قرعہ عبداللہ کے نام پر نکلے تو دس دس اُونٹوں کا اضافہ کر کے قرعہ ڈالتے جاؤ۔ اگر سو اُونٹوں کے مقابلہ میں بھی قرعہ عبداللہ کے نام پر نکلے تو پھر اُسے ذبح کر دینا۔

چنانچہ پہلے دس اُونٹوں پر قرعہ ڈالا گیا، قرعہ عبداللہ کے نام پر نکلا۔ پھر دس دس اُونٹوں کا اضافہ ہوتا رہا اور قرعہ عبداللہ کے نام پر نکلتا رہا۔ اور جب اُونٹوں کی تعداد سَو تک پہنچی تو قرعہ اُونٹوں پر نکل آیا۔ یہ دیکھ کر سب کے دلوں میں اطمینان و مسرت کی لہر دَوڑ گئی۔ مگر عبدالمطلب مطمئن نہ ہوئے۔ فرمایا کہ دوبارہ قرعہ ڈالا جائے۔ دُوسری بار بھی قرعہ اُونٹوں پر نکلا۔ فرمایا مزید اطمینان کے لئے ایک مرتبہ اور قرعہ ڈالا جائے۔ جب تیسری مرتبہ بھی قرعہ اُونٹوں پر نکلا تو اطمینانِ قلب حاصل ہوا اور اُسی وقت سَو اُونٹ نحر کر کے تقسیم کر دیئے اور خود اُنھوں نے اور اُن کے بیٹوں نے اس گوشت کو نہ کھایا نہ چکھا۔ ابن سعد نے لکھا ہے:۔

لم یأکل منہا ھو ولا احد من ولدہ شیئاً۔ (طبقات۔ ج۔ ص۸۹)۔	عبدالمطلب اور اُن کے کسی بیٹے نے اُن اُونٹوں کے گوشت میں سے نہیں کھایا۔

اِس قربانی نے جہاں انسانی جان کی قدر و قیمت میں دس گنا اضافہ کر دیا وہاں عزم و ثبات، وفائے عہد، ایفائے نذر، جاں سپاری و وفاداری اور اطاعت و سرافگندگی کی انمٹ مثال بھی قائم کر دی۔ عبدالمطلب نے جس بلند حوصلگی اور عزم و استقلال کا مظاہرہ کیا اس کی مثال سابقین میں کہیں نظر آتی ہے تو خلیل خدا حضرت ابراہیمؑ ہیں؛ اور جنابِ عبداللہ نے اطاعت و سرافگندگی کا جو کردار پیش کیا اس کی جھلک ماضی کے آئینہ میں کہیں دکھائی دیتی ہے تو حضرت اسمٰعیلؑ ہیں۔ دونوں اس ابتلاؤ آزمائش کے موقع پر صغیر السن تھے۔ جناب اسمٰعیلؑ کا سن تیرہ برس تھا اور عبداللہ کا سن گیارہ برس۔ دونوں انتہائے صبر کا جوہر دکھاتے ہیں۔ نہ تہِ خنجر سر رکھنے سے ہچکچاتے ہیں اور نہ رشتۂ حیات کے قطع ہونے سے ڈرتے ہیں۔ اور باپ کے حکم کے سامنے سر جھکا کر تسلیم و رضا، اور ایثار و قربانی اور ثبات و استقلال کا فقید المثال کردار پیش کرتے ہیں۔ آخر دونوں اس قربانی کے صلہ میں ذبیح کے لقب سے سرفراز ہوئے۔ چنانچہ پیغمبرؐ اکرم کا ارشاد ہے:۔ انا ابن الذبیحین (میں دو ذبیحوں کا فرزند ہوں) ایک ذبیح سے مُراد آنحضرتؐ کے جدّ حضرت اسمٰعیلؑ ہیں اور دوسرے ذبیح سے مراد آپؐ کے پدر بزرگوار حضرت عبداللہ ہیں۔

جناب عبداللہ کو قدرت کی طرف سے یہ شرف و امتیاز حاصل ہوا کہ ان کے صلب سے تاجدارِ رُسل حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیدا ہوئے؛ مگر اس گُلِ سرسبد رسالت کو دیکھنا نصیب نہ ہوا، اور واقعۂ فیل کے کچھ دنوں بعد شام سے پلٹتے ہوئے مدینہ میں انتقال کر گئے اور وہیں دفن ہوئے۔ عبدالمطلب اس حادثۂ جانکاہ سے بہت متاثر ہوئے اور ہر وقت رنجیدہ و دل گرفتہ رہنے لگے۔ مگر چند دنوں کے بعد جب یہ مژدۂ جانفزا سُنا کہ عبداللہ کے گھر میں بیٹا پیدا ہوا ہے تو افسردہ چہرے پر بہار آگئی۔ اپنے بیٹے کی اکلوتی نشانی کو دیکھ کر مرجھائی ہوئی کلی کھل گئی۔ محبت بھری نگاہوں نے مولودِ نو کا طواف کیا۔ نظروں میں کھب جانے والے خد و خال کا جائزہ لیا۔ امانتِ الٰہیہ کو ہاتھوں پر اٹھا کر خانہ کعبہ کے پاس لائے۔ اللہ سے اس کے پھلنے پھولنے کی دُعا مانگی اور ساتویں دن عقیقہ کر کے مُحَمَّدؐ (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) نام تجویز کیا۔

آنحضرتؐ کے سر سے باپ کا سایا تو اٹھ ہی چکا تھا ماں کا کنارِ عاطفت بھی زیادہ عرصہ تک نصیب نہ ہوا۔ چھ برس کی عمر ہی کیا ہوتی ہے کہ آپ کی والدۂ گرامی جناب آمنہؑ بھی دُنیا سے رحلت فرما گئیں۔ اب یتیم عبداللہ براہِ راست عبدالمطلب کی کفالت و تربیت میں آ گئے۔ عبدالمطلب نے اس طرح محبت و شفقت سے پالا پوسا کہ زندگی کے لمحات اُن کی دیکھ بھال کے لئے وقف کر دیئے۔ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے اور کسی لمحہ نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیتے۔ اور یہ معمول قرار دے لیا کہ جب تک وُہ کھانے میں شریک نہ ہوتے کسی کو کھانے کی اجازت نہ دیتے اور نہ خود کھاتے۔

آنحضرت کے طور طریقے اتنے شستہ و پاکیزہ تھے کہ دلوں کو موہ لیتے اور اُن کی عظیم شخصیت کا پتہ دیتے تھے۔ عبدالمطلب بھی ان کے عادات و اطوار کو دیکھ کر سمجھ چکے تھے کہ اُن کا مستقبل درخشاں اور زندگی عظمت کا کوہِ گراں ثابت ہوگی۔ اور اُن کا یہ ذہنی تصور لفظوں میں ڈھل کر ان کی زبان پر بھی آ جاتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ عبدالمطلب کے لئے حسبِ معمول خانہ کعبہ کے پاس مسند بچھائی گئی۔ عبدالمطلب کے آنے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ عمائدِ قریش اور اُن کے بیٹے مسند کے گرد حلقہ باندھ کر بیٹھے تھے۔ آنحضرت ادھر نکل آئے اور بے جھجک آگے بڑھ کر دادا کی مسند پر بیٹھ گئے حالانکہ اُن کی مسند پر کسی کو خواہ وُہ اُن کا بیٹا ہو یا کوئی رئیسِ قریش، قدم رکھنے تک کی اجازت نہ تھی۔ اتنے میں عبدالمطلب بھی آ گئے۔ کچھ لوگوں نے فرزندِ عبداللہ کو وہاں سے اُٹھا کر مسند کو خالی کرنا چاہا۔ عبدالمطلب نے تہدید آمیز لہجے میں کہا:۔

دعوا ابنی الی مجلسی فانّہ	میرے بیٹے کو میری مسند پر بیٹھا رہنے دو اس
تحدثہ نفسہ بملک عظیم	کے دل و دماغ میں ایک عظیم سلطنت پر فائز
وسیکون لہ شان۔	ہونے کا ولولہ موجزن ہے۔ عنقریب اس کی
(سیرتِ حلبیہ۔ ج۱۔ ص۱۲۹)	خاص شان ہوگی۔"

آنحضرت کے حرکات و سکنات میں آثارِ عظمت کے ساتھ روحانیت و تقدیس کی جھلک بھی نمایاں تھی۔ اسی پاکیزگی و تقدیس کی بنا پر عبدالمطلب ہر مصیبت و ابتلاء کے موقع پر انہی کو اپنا دعاؤں کا وسیلہ بناتے، اور انہی کے نورانی پیکر کا واسطہ دے کر بارش طلب کرتے۔ چنانچہ ایک سال مکہ میں بارش کے نہ ہونے سے قحط پڑ گیا لوگ سراسیمہ و پریشان حال ہو گئے۔ انہوں نے عبدالمطلب سے التجاء کی کہ وُہ بارش کے لئے دُعاء مانگیں تاکہ قحط کی سختیوں سے نجات ملے۔ عبدالمطلب نے آنحضرت کو جن کا سن سات برس کا ہو چکا تھا، اپنے کاندھوں پر اُٹھایا اور کوہِ ابوقبیس پر چڑھ کر اور اس سراپا رحمت کا واسطہ دے کر بارانِ رحمت کی دُعاء کی۔ ابھی پلٹ کر خانہ کعبہ تک نہ پہنچے تھے کہ فضاء پر بادل چھا گئے اور اس طرح جھوم جھوم کر برسے کہ وادیاں چھلک اُٹھیں اور ہر طرف پانی ہی پانی نظر آنے لگا۔ اس موقع پر رقیقہ بنت صیفی نے چند اشعار کہے اُن میں کا ایک شعر یہ ہے:۔؎

بشیبۃ الحمد اسقی اللہ بلدتنا   لما فقدنا الحیا واجلوذ المطر

"اللہ تعالیٰ نے شیبۃ الحمد کی دُعا سے ہمارے شہر کو سیراب کر دیا جبکہ ہم بادلوں سے محروم تھے اور مدت سے بارشوں کا سلسلہ رُکا ہوا تھا۔"

یتیم عبداللہ سے عبدالمطلب کی محبت و شیفتگی اس بنا پر تو تھی ہی کہ وُہ اُن کے فرزند کی اکلوتی یادگار ہیں، مگر اس محبت و عقیدت کا اصل سرچشمہ یہ تھا کہ آپ عالموں اور مذہبی پیشواؤں سے یہ سُنتے آرہے تھے کہ یہی وُہ زمانہ ہے جس میں نبی خاتم کا ظہور ہو گا۔ اور اس نبیؐ کے جو اوصاف و شمائل اور عادات و خصائل عالموں سے سُنے اور آسمانی صحیفوں میں دیکھے وُہ تمام کے تمام فرزندِ عبداللہ میں دیکھتے تھے۔ اور یہ علم و یقین حاصل کر چکے تھے کہ یتیم عبداللہ ہی مستقبل کے نبی اور سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی ہیں۔ چنانچہ شاہ یمن سیف ابن ذی یزن سے ملاقات کے موقع پر اپنے اس یقین کا اظہار بھی کر دیا۔ اس ملاقات کا تذکرہ قریب قریب ہر مؤرخ اور سیرت نگار نے کیا ہے۔ یہ ملاقات اُس موقع پر ہوی جب مُلکِ یمن شاہ حبش کے قبضہ سے نکل گیا اور سیف ابن ذی یزن نے اہلِ حبش کو مغلوب کر کے یمن پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ مکہ میں جب اس انتقال اقتدار کی خبر پہنچی تو عبدالمطلب نے رؤساء قریش سے کہا کہ سیف کے ہاں ہمارا ایک تہنیتی وفد جانا چاہئے۔ سب نے اس پر اتفاق کیا اور آپ کی زیرِ قیادت ستائیس افراد کا ایک وفد ترتیب دیا گیا۔ اس وفد میں اُمیّہ ابنِ عبدشمس، اسد ابن عبدالعزیٰ، عبداللہ ابن جدعان، وہب ابن عبدمناف اور قصی ابنِ عبدالدار بھی شریک تھے۔ جب یہ وفد اس کے ہاں قصرِ غمدان میں پہنچا تو عبدالمطلب نے قائدِ وفد کی حیثیت سے کلمات تہنیت پیش کرنے کی اجازت طلب کی۔ سیف نے کہا کہ اگر یہ سمجھتے ہو کہ تم اس مرتبہ و حیثیت کے مالک ہو کہ شاہوں کے سامنے لب کشائی کر سکو اور انہیں تہنیت دے سکو تو ہماری طرف سے اجازت ہے۔ عبدالمطلب نے تہنیت کے چند کلمات کہے اور اس کی کامیابی و کامرانی پر اس خوش اسلوبی سے اپنے تاثرات کا اظہار کیا کہ سیف جھُوم اُٹھا اور اُن کے پُرشکوہ لب و لہجہ، قرشی زورِ خطابت اور ہاشمی اندازِ تکلم سے متاثر ہو کر پُوچھا کہ آپ کون ہیں؟ کہا میں عبدالمطلب ابن ہاشم ہوں۔ یہ سُنتے ہی اُس نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر انہیں اپنی مسند پر بٹھایا، اور کہا کہ آپ تو میرے بھانجے[1] ہوتے ہیں۔ فرمایا کہاں ایسا ہی ہے۔

---

[1] عبدالمطلب کی والدہ سلمیٰ بنت عمرو آلِ قحطان سے تھیں اور سیف بھی آلِ قحطان میں سے تھا۔ اسی بنا پر اُس نے عبدالمطلب کو بھانجا کہا۔ اور عرب اپنے قبیلہ و خاندان کی ہر عورت کو بہن اور اس کی اولاد کو بھانجا کہہ کر یاد کرتے تھے۔ چنانچہ جب شمر ابنِ ذی الجوشن وارد کربلا ہوا تو اس نے حضرت عباس ابن علی اور اُن کے بھائیوں کو اس طرح مخاطب کیا انتم یا بنی اختی اٰمنون۔ (اے میرے بھانجو تم امان میں ہو) اس سے بعض سطحی نظر رکھنے والوں نے یہ سمجھ لیا کہ شمرؔ عباس ابنِ علی اور اُن کے بھائیوں کا ماموں ہوتا تھا۔ حالانکہ یہ خطاب اس بنا پر تھا کہ وُہ اسی قبیلہ سے تھا جس (باقی صفحہ ۵۶ پر)

سیف نے عبدالمطلب کا انتہائی اعزاز و اکرام کیا اور دُوسرے ارکان وفد کو بھی احترام سے مہمان خانہ میں ٹھہرایا۔ اسی دَورانِ قیام میں سیف نے ایک دن عبدالمطلب کو تنہائی میں بُلایا اور اُن سے کہا کہ میں ایک ایسے امر عظیم پر اطلاع رکھتا ہوں جو آپ کے لئے اور آپ کے خاندان کے لئے سرمایۂ صد افتخار ہے۔ لہٰذا میں نے ضروری سمجھا کہ آپ کو اس سے آگاہ کروں۔ پُوچھا کہ وُہ عظیم بات کیا ہے جو میرے لئے باعثِ افتخار اور وجہِ شرف ہے؟ کہا کہ تہامہ میں ایک بچّہ پیدا ہوگا جس کے دونوں شانوں کے درمیان نبوّت کا نشان ہوگا۔ اس کا نام بھی رہتی دُنیا تک باقی رہے گا اور اُس کی شریعت بھی قیامِ قیامت تک قائم رہے گی۔ اور یہی زمانہ اس کے پیدا ہونے کا ہے اور ممکن ہے کہ وُہ پیدا ہو چکا ہو یا پیدا ہونے والا ہو۔ اُس کے خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ بچپن میں اُس کے ماں باپ دونوں وفات پا جائیں گے اور اس کا دادا اور چچا اس کی دیکھ بھال کریں گے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہی اُن کے دادا اور مربی ہیں۔ عبدالمطلب جو پیشین گوئیوں اور آسمانی صحیفوں کے ذریعہ سب کچھ جانتے تھے سیف کی زبان سے یہ نوید سُن کر سجدۂ خالق میں جُھک گئے اور اس نعمتِ عظمیٰ پر اظہارِ تشکّر کے بعد سیف سے کہا کہ تمہاری اس اطلاع سے میرے علم و یقین پر جلاء ہوی ہے۔ وُہ بچّہ پیدا ہو چکا ہے، اور جن علامتوں کا تم نے ذکر کیا ہے وُہ سب اس کے اندر موجُود ہیں۔ اُس کے ماں باپ فوت ہو چکے ہیں اور میں اور اس کا ایک چچا اس کے مربّی و کفیل ہیں۔ سیف نے کہا کہ پھر یہود سے اُن کی حفاظت کیجئے گا ایسا نہ ہو کہ وُہ اُسے گزند پہنچائیں یا اُس کی ہلاکت کے درپے ہوں۔

جب وفد کی واپسی کا وقت قریب آیا تو سیف نے سب کو غلام، کنیزیں، سونا، چاندی، عنبر، اُونٹ اور خلعت دیئے اور دُوسروں سے دس گنا زائد عبدالمطلب کو دیا۔ عبدالمطلب کے ہمراہیوں نے آپ کے حاصل کردہ انعام کو رشک آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ آپ نے فرمایا اے گروہِ قریش! تمہیں اس انعام و اکرام پر رشک نہ کرنا چاہئے۔ یہ چیزیں تو فنا ہو جانے والی ہیں البتہ اس چیز پر رشک کرو جس کی شہرت چار دانگ عالم میں ہوگی اور میری آئندہ آنے والی نسلیں بھی اس پر فخر کریں گی۔ پُوچھا کہ وُہ کیا ہے؟ فرمایا:-

سیظھر بعد حین۔	تھوڑے وقفہ کے بعد تمہیں خود ہی معلوم ہو جائے گا۔

(عقد الفرید ج۲۔ ص۱۷۱)

عرب کے قیافہ شناسوں نے بھی عبدالمطلب کو آنحضرتؐ کا چہرہ مہرہ، خدوخال اور نقشِ قدم دیکھ کر اُن کی غیر معمولی عظمت و شہرت کے بارے میں بتا دیا تھا۔ چنانچہ ایک موقع پر بنی مدلج کے چند افراد نے اُن سے کہا:-

احفظ بہ فانا لم نر قدما اشبہ بالقدم التی فی المقام منہ۔	آپ اس بچّے کی پُوری حفاظت کیجئے اس لئے کہ اس کے قدموں سے بڑھ کر کسی کے قدم مقامِ ابراہیمؑ

(بقیہ از ص۵۵) قبیلہ سے حضرت عباس کی والدہ گرامی ام البنین تھیں۔ دونوں کا تعلق قبیلہ کلاب سے تھا۔ ۱۲

کے نشان قدم سے مشابہ دیکھتے ہیں نہیں آتے"۔ (طبقات ابن سعد ج۔ ص۱۱۸)

عبد المطلب نے یہ الفاظ سُنے تو ابو طالب کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھا اور فرمایا: اسمع مایقول ھولاء۔ ان کی بات سُن لو"۔ ابو طالب کو ادھر توجہ دلانے کی ضرورت اس لئے محسوس کی کہ انہیں یہ نظر آرہا تھا کہ ان کے بعد آنحضرتؐ کی دیکھ بھال اور تربیت و پرورش کرنے والے یہی ہوں گے لہذا ان کی عظمت و علو مرتبت سے باخبر رہیں اور تربیت و نگہداشت میں اس امر کو ملحوظ رکھیں کہ وُہ صرف اُن کے حقیقی بھائی کی یادگار اور عزیز ترین بھتیجے ہی نہیں ہیں بلکہ مستقبل کی ایک عظمت بکنار شخصیت ہیں اور اُن کے قدم ہی قدمِ خلیلؑ کے مظہر نہیں بلکہ سرتاپا آئینہ دارِ جمال و کمالِ خلیلؑ ہیں۔

عبد المطلب ایک صدی سے زیادہ زندگی کی بہاریں دیکھ چکے تھے مگر بڑھاپے میں بھی چہرے پر شکوہ و جلال کے آثار نمایاں تھے بالوں کے سفید ہو جانے کی وجہ سے خضاب لگاتے تھے۔ کمر سیدھی تھی اور اس میں زرا جھکاؤ نہ تھا۔ البتہ آخر عمر میں آنکھوں کی بصارت جاتی رہی تھی۔ مگر چلنے پھرنے میں عصا کا سہارا لینا گوارا نہ کرتے تھے۔ ایک دفعہ خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے کسی کا دھکا لگا۔ پوچھا یہ کون تھا؟ بتایا گیا کہ بنی بکر کا ایک شخص تھا۔ فرمایا کہ میں تو آنکھوں سے معذور تھا اور وُہ تو دیکھ سکتا تھا۔ اب مجھے سنبھلنے کے لئے عصا کی ضرورت پڑے گی۔ پھر خود ہی فرمایا کہ اگر طویل عصا ہاتھ میں رکھتا ہوں تو اُس کا اٹھانا مجھے گراں گزرے گا۔ اور اگر چھوٹا عصا رکھتا ہوں تو اُس کے لئے مجھے اپنی کمر جھکانا پڑے گی اور یہ جھکاؤ ذلّت ہے۔ ان کے بیٹوں نے یہ سُنا تو کہا کہ آیندہ ہم میں سے کوی نہ کوی ہر وقت آپ کے پاس موجود رہا کرے گا۔ آپ اس کا سہارا لے کر جہاں جانا چاہیں گے چلے جایا کریں۔ چنانچہ اس کے بعد اپنے بیٹوں میں سے کسی ایک کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنے کاموں میں آتے جاتے تھے۔

جب امتداد زمانہ نے اعضاؤ جوارح مضمحل کر دیئے تو اس اضمحلال نے علالت کی صورت اختیار کر لی، اور صاحب فراش ہو گئے۔ اس عالم میں اگر کوی فکر تھی تو یہ کہ یتیمؐ عبد اللہ کا زمانہ یتیمی کیسے گزرے گا اور کون اُن کی دیکھ بھال کرے گا۔ چنانچہ آخری لمحوں میں بستر بیماری پر کروٹیں بدلتے ہوئے پُوچھا کہ ابو طالب کہاں ہیں۔ ابو طالب آگے بڑھے۔ فرمایا میں تمہیں یتیم عبد اللہ کے بارے میں خصوصی طور پر وصیت کرتا ہوں، دیکھنا اُن کی تربیت و کفالت میں سہل انگاری سے کام نہ لینا۔ ابن سعد نے لکھا ہے:۔

لما حضرت عبد المطلب الوفاۃ	جب عبد المطلب کا وقتِ وفات قریب آیا تو
اوصی ابا طالب بحفظ رسول اللہ	انہوں نے ابو طالب کو آنحضرتؐ کی حفاظت و
صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم وحیاطتہ	نگہداشت کے بارے میں وصیت فرمائی"۔

(طبقات۔ ج۔ ص۱۱۹)

جب ابو طالب کو تربیت کی ذمہ داری سونپ کر اپنا ذہنی بار ہلکا کر چکے تو آخری ہچکی لی اور دم توڑ دیا۔ آپ کی رحلت سے فضائے مکہ سوگوار ہو گئی۔ یوں تو آپ کی وفات سے ہر آنکھ پُرنم اور ہر دل افسردہ و سوگوار تھا مگر

یتیم عبداللہ کو جو ابھی آٹھ ہی برس کے تھے، انتہائی رنج و قلق ہوا۔ انہیں ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت دادا ہی سے ملی تھی۔ میت کو دیکھ کر ضبطِ گریہ نہ کر سکے۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اور جب جنازہ کو آبِ خالص و آبِ کافور سے غسل دے کر اور یمن کی قیمتی چادروں کا کفن پہنا کر دفن کے لئے لے چلے تو آپ بھی آنسو بہاتے ہوئے جنازہ کے ساتھ ساتھ رہے۔ اور جب کوہِ حجون کے دامن میں انہیں سپردِ لحد کر چکے تو واپس ہوئے۔

اہلِ مکہ نے اپنے محسن و سردار کی وفات کا بڑا غم منایا۔ شعراء نے دردناک مرثیے لکھے اور مکہ میں کئی دن کاروبار بند رہا۔ علامہ حلبی نے لکھا ہے:۔

لو یبك احد بعد موته ما بكي	کسی مرنے والے پر اتنا گریہ و بکا نہیں ہوا
عبد المطلب بعد موته ولم یقم	جتنا عبد المطلب کے مرنے پر ہوا۔ اور اُن کی
لموته بمكة سوق ایاما	رحلت پر بہت دنوں تک مکہ کے بازار
كثيرة۔ (سیرت حلبیہ ج ۱ ص ۱۸۶)	بند رہے۔"

آپ کی وفات ایک سو بیس برس کی عمر میں واقعۂ فیل کے آٹھ سال بعد مکہ معظمہ میں ہوئی۔

اس سلسلۂ جلیلہ کی ایک ایک فرد اپنے دور میں اگرچہ امتیازی حیثیت کی مالک اور قومی قیادت کی حامل رہی ہے مگر جو شرف و امتیاز ہاشم و عبد المطلب کو حاصل ہوا وہ کسی ایک کو حاصل نہ ہو سکا۔ ان کی شخصیتیں اتنی بلند و بالا اور قد آور تھیں کہ ان کی طرف انتساب عزت و شرف کا معیار قرار پا گیا اور عرب کے خود سر قبائل جن کی ذہنیتیں کسی کی سربلندی و سرفرازی کو قبول نہ کرتی تھیں ان کے آگے سرنگوں ہو گئے۔ صاحبِ عقد الفرید نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ پیغمبرِ اسلام حضرت علی اور ابو بکر کے ہمراہ قبائلِ عرب کی طرف جاتے ہوئے ایک بستی کے قریب سے گزرے۔ حضرت ابو بکر نے آگے بڑھ کر ان بستی والوں سے پوچھا کہ تم کس قبیلہ سے ہو؟ انہوں نے کہا کہ قبیلۂ ربیعہ سے۔ ابو بکر نے کہا کہ قبیلہ ربیعہ کی کس شاخ سے؟ کہا ذہل اکبر سے۔ پوچھا کیا عوف ابنِ محلم تم میں سے تھا؟ کہا نہیں۔ پوچھا کیا جساس ابن مرہ تم میں سے تھا؟ کہا نہیں۔ غرض اس طرح کی کئی باتوں باتوں کے جواب میں جب انہوں نے "نہیں" کہا تو ابو بکر نے کہا کہ پھر تم ذہل اکبر نہیں بلکہ ذہل اصغر ہو۔ یہ سن کر اس قبیلہ کا ایک لڑکا (دغفل ابن حنظلہ) کھڑا ہو گیا اور حضرت ابو بکر سے پوچھا کہ تم کس قبیلہ سے ہو کہا قبیلہ قریش سے۔ پوچھا قبیلہ کی کس شاخ سے؟ کہا تیم ابن مرہ کی اولاد سے۔ پوچھا کیا قصی ابن کلاب تم میں سے تھے جنہوں نے بکھرے ہوئے لوگوں کو یکجا کر کے مکہ میں آباد کیا؟ کہا نہیں۔ پوچھا کیا ہاشم تم میں سے تھے جن کے بارے میں ایک شاعر (مطرود ابنِ کعب خزاعی) نے کہا ہے:۔

عمرو العلا هشم الثريد لقومه ورجال مكة مسنتون عجاف

"وہ بلند مرتبہ عمرو (ہاشم) جنہوں نے شوربے میں روٹیاں بھگو کر اپنی قوم کو کھانا کھلایا جبکہ اہلِ مکہ

تباہ حال اور قحط سالی سے نڈھال تھے"۔
کہا نہیں۔ پوچھا کیا عبدالمطلب تم میں سے تھے؟ جن کے دستر خوان پر اڑنے والے پرندے بھی مہمان ہوتے تھے اور جن کا چہرہ یوں چمکتا تھا جیسے اندھیاریوں میں چراغ۔ کہا نہیں۔ کہا کیا تم اُن لوگوں کی اولاد ہو جو حاجیوں کو مزدلفہ سے جانے کی اجازت دیتے تھے؟ کہا نہیں۔ پوچھا کیا تم ان کی اولاد ہو جو حاجیوں کو پانی پلانے کا فریضہ ادا کرتے تھے؟ کہا نہیں۔ ابھی وُہ کچھ اور پوچھنا چاہتا تھا کہ حضرت ابوبکر گفتگو کو ادھورا چھوڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور پلٹ کر رسولؐ اللہ کے سامنے ساری گفتگو دُہرائی۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ باتیں دلچسپی سے سُنیں اور مسکرا کر خاموش ہو گئے۔

اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ قبائل عرب میں اسی سلسلہ کو اہمیت دی جاتی تھی جس میں قصی، ہاشم اور عبدالمطلب کے نام منسلک ہوتے تھے۔ اور جن سلسلوں میں ان کا نام نہ آتا تھا وُہ چنداں درخور اعتناء نہ سمجھے جاتے تھے بلکہ جن شاخوں میں قصی کا نام تو آجاتا ہے مگر ہاشم وعبدالمطلب کے ناموں سے خالی ہیں وُہ شاخیں بھی عام قبائل کی سطح سے بلند نہ ہو سکیں۔ غرض قدرت نے جو امتیاز ہاشمی ومطلبی نسل کو دیا وُہ کسی کو نصیب نہ ہو سکا اور نہ بلند اوصاف میں کوئی اُن کی برابری کا دعوٰی کر سکا۔ یہی وُہ سلسلۂ جلیلہ ہے جو نسلی آلودگیوں سے مبرا اور شرف و برگزیدگی کے تاج ونگیں سے آراستہ رہا۔ چنانچہ پیغمبر اکرمؐ کا ارشاد ہے:۔

ان اللہ اصطفٰی من ولد ابراھیم اسمٰعیل واصطفٰی من ولد اسمٰعیل بنی کنانۃ واصطفٰی من بنی کنانۃ قریشا واصطفٰی من قریش بنی ھاشم واصطفانی من بنی ھاشم۔	خداوندِ عالم نے حضرت ابراہیمؑ کی اولاد سے اسمٰعیلؑ کو اور اسمٰعیلؑ کی اولاد سے بنی کنانہ کو اور بنی کنانہ سے قریش کو اور قریش سے بنی ہاشم کو اور بنی ہاشم میں سے مجھے منتخب کیا"۔

(ترمذی۔ جؐ۔ صؐ۲۲۱)

اس اصطفاؤ برگزیدگی میں حضرت علیؑ بھی شریک ہیں اس لئے کہ آنحضرتؐ اور آپ دونوں ہم نسب اور دونوں کے آباؤ اجداد ایک ہیں۔ دونوں ایک ہی سلسلہ کے اصلاب و ارحام سے منتقل ہوتے ہوئے حضرت ہاشم تک اور پھر عبدالمطلب تک منتہی ہوتے ہیں۔ حضرت عبدالمطلب کے مختلف ازواج سے دس فرزند تھے ان فرزندوں میں سے عبداللہ اور ابو طالب حقیقی بھائی تھے۔ دونوں کی والدہ فاطمہ بنت عمرو مخزومیہ تھیں۔ عبداللہ سے رسولؐ خدا پیدا ہوئے اور ابو طالب سے حضرت علیؑ۔ جو اپنے دادا عبدالمطلب پر رسولؐ خدا سے مل جاتے ہیں۔ اس بناء پر دونوں مطلبی دونوں ہاشمی دونوں قرشی اور دونوں ایک ہی معدن کے گوہرِ شاہوار اور ایک ہی شجرہ کے برگ وبار تھے ؎

ہیں اس طرح نسب میں نبیؐ وعلیؑ بہم　　　　دو نام گو ہیں ایک ہے پر کعبہ وحرم

غرض حضرت علیؑ کے حصہ میں نسل و خاندان کی ہر وُہ فضیلت آئی جو رسُولِ خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پائے نام تھی۔ اور آنحضرتؐ سے اتحادِ نسل کے اعتبار سے اور سلسلۂ آباؤ اجداد کے لحاظ سے اور شیخ البطحاء ابو طالب کے ذریعہ جو شرف و امتیاز انہیں حاصل ہے وُہ جلالت نسبی کے ماتھے کا جھومر اور شرافت حسبی کے کلاہ کا طرۂ درخشاں ہے۔

ابو طالب ابنِ عبد المطلب

حضرت ابو طالب کا اصلی نام اپنے جدّ اعلےٰ کے نام پر عبد مناف تھا۔ اور بعض تذکرہ نگاروں نے عمران لکھا ہے۔ اور اکثر متقدمین کے نزدیک ابو طالب ہی کنیت تھی اور ابو طالب ہی نام تھا۔ آپ پیغمبرؐ اکرم سے پینتیسؔ برس عمر میں بڑے تھے۔ آنحضرت عام الفیل میں پیدا ہوُے اور آپ واقعۂ فیل سے پینتیس سال قبل مکۂ معظمہ میں متولد ہوُے۔ تینتالیس برس حضرت عبد المطلب ایسی عظیم شخصیت کے زیر سایہ رہے۔ انہی سے حکمت و اخلاق کے سبق لئے اور علم و ادب کے درس پائے۔ اور اس تعلیم و تربیت کے نتیجہ میں علمی و ادبی رفعتوں کے نقطۂ کمال پر فائز ہوئے اور اپنے دَور میں ایک بلند پایہ ادیب، ممتاز سخن طراز، عظیم مفکر اور بالغ النظر قائد تسلیم کئے گئے۔ اس علمی، ادبی اور فکری کمال کے ساتھ وجیہ صورت، کشیدہ قامت، بھاری بھرکم، پُر عزم و پُر وقار اور بارُعب شخصیت کے مالک تھے۔ چہرے مہرے سے ہاشمی تمکنت اور خدو خال سے قرشی سطوت جھلکتی تھی زبان سے فصاحت و بلاغت کے سوتے پھُوٹتے اور علم و حکمت کے سرچشمے اُبلتے تھے۔ اپنے اسلاف کے اعلےٰ کردار و بلند اوصاف کے ورثہ دار اور اولادِ عبد المطلب میں سب سے زیادہ عادات و اطوار میں اپنے پدر بزرگوار سے مشابہ تھے۔

حضرت عبد المطلب کے بعد حرم کے عہدے رفادہ و سقایہ انہی سے متعلق ہوُے اور شیخ ابطح سید بطحاء اور رئیس مکّہ ایسے وقیع القاب سے یاد کئے گئے۔ دیار بکری لکھتے ہیں:-

وکان عبد المطلب بعد ھاشم یلی الرفادہ فلمّا توفی قام بذٰلک ابو طالب فی کل موسم حتی جآء الاسلام۔ (تاریخ خمیس ج ۱ ص ۱۵۷)۔	ہاشم کے بعد حاجیوں کو کھانا دینے کی خدمت عبد المطلب سے متعلق ہوی اور عبد المطلب کی وفات کے بعد ظہورِ اسلام تک ہر سال یہ خدمت ابو طالب انجام دیتے رہے"۔

دُنیا میں حصولِ منصب کے لئے دولت ایک بڑا ذریعہ ہے۔ مگر آپ کی قیادت و سربراہی اور منصبی سر بلندی دولت کی رہینِ منت نہ تھی بلکہ ان کی فرض شناسی، حُسنِ عمل اور کردار کی انفرادیت نے انہیں عزت عظمت اور سرداری کے بام تک پہنچایا۔ حضرت علیؑ فرماتے ہیں:-

ابی ساد فقیرا وما ساد فقیر قبلہ۔ (تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۱۴)

میرے والد نادار ہوتے ہُوئے سردار قرار پائے حالانکہ ان سے پہلے کوئی نادار سردار نہیں ہُوا۔"

اگرچہ ابو طالب کی مالی حالت کمزور اور اُن کے وسیع حوصلوں کا ساتھ نہ دے سکتی تھی پھر بھی جس طرح بن پڑتا محتاجوں اور ناداروں کی اعانت کرتے، حاجیوں کے لئے بڑی نفاست سے کھانے پکواتے، پانی کے بڑے بڑے حوضوں میں کھجوریں اور کشمش ڈلوا دیتے تاکہ اللہ کے مہمانوں کو خوش ذائقہ و خوش مزہ پانی پینے کو ملے۔ ایک سال آپ معمول سے زیادہ تنگ دست تھے اور دور و دراز سے آنے والے حاجیوں کے خورد و نوش کے انتظامات سے قاصر، آپ نے اپنے بھائی عباس ابن عبدالمطلب سے دس ہزار درہم قرض لئے اور وُہ ساری رقم حاجیوں کے کھانے پینے میں صَرف کر دی۔ اگلے سال پھر یہی صورت پیش آئی کہ نہ کھانے پینے کا سامان مہیا کر سکے اور نہ قرضہ ہی اُتار سکے۔ آپ نے دوبارہ عباس سے چودہ ہزار درہم طلب کئے تاکہ سرزمین حرم کے مہمانوں کی خاطر داری وضیافت کر سکیں۔ عباس اس شرط پر قرضہ دینے کے لئے آمادہ ہُوئے کہ اگر سال آئندہ تک یہ تمام قرضہ ادا نہ ہُوا تو یہ منصب اُن سے لے لیا جائے گا۔ ابو طالب سال آئندہ تک بھی اس بار سے سبکدوش نہ ہو سکے اور یہ منصب عباس کے سپرد کر دیا، جو اُن کی اولاد میں منتقل ہوتا رہا۔ آپ نے منصب سے دست کش ہونا گوارا کر لیا مگر یہ گوارا نہ کیا کہ مکہ میں آنے والے حجاج بھُوکے پیاسے رہیں یا سادہ و بدمزہ پانی پئیں۔

ابو طالب اپنے پہلو میں ایک درد مند اور حساس دِل رکھتے تھے جو دُوسروں کے دلوں کی دھڑکنیں سُنتا اور مصیبت زدوں کی مصیبت سے متاثر ہُوئے بغیر نہ رہتا۔ اسی جذبۂ ہمدردی و انسان دوستی کو دیکھتے ہُوئے پریشان حال انسانوں کے قافلے ان کے حریم امن کے گرد چکر لگاتے اور وُہ دل و جان سے اُن کی مدد کرتے اور اُن کے دُکھ درد میں شریک ہوتے۔ مظلوم و ستم رسیدہ اُن کے دامن میں پناہ مانگتے اور وُہ اُن کے سینہ سپر بن کر کھڑے ہو جاتے اور انہیں پناہ دے کر اُن کی حفاظت کا ذمّہ لے لیتے۔ چنانچہ ابو سلمہ مخزومی جب حبشہ سے پلٹ کر مکہ آیا اور بنی مخزوم اسلام کی بنا پر اس کے درپے ایذا ہُوئے تو ابو سلمہ آپ سے پناہ کا طلبگار ہُوا۔ آپ نے اُسے پناہ دے کر اُس کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ بنی مخزوم کو معلوم ہُوا تو وُہ ابو طالب کے پاس آئے اور کہا کہ آپ نے اپنے بھتیجے محمدؐ کو بھی پناہ دے رکھی ہے اور اب ابو سلمہ کو بھی اپنی حفاظت اور پناہ میں لے لیا ہے۔ اسے ہمارے حوالے کیجئے۔ فرمایا کہ وُہ میرا بھانجا ہے۔ جب اس نے مجھ سے پناہ طلب کی تو میری حمیت نے گوارا نہ کیا کہ اسے پناہ میں لینے سے انکار کر دوں۔ اگر میں اپنے بھانجے کو پناہ نہ دُوں گا تو اپنے بھتیجے کو بھی پناہ نہ دے سکوں گا۔ اب اسے پناہ میں لینے کے بعد اس کی حمایت سے کنارہ کش نہیں ہو سکتا۔ یہ صاف جواب سُن کر بنی مخزوم خاموش ہو گئے اور مزید کچھ کہنے کی جراُت نہ کر سکے۔

---

[۱] ابو سلمہ برہ بنت عبدالمطلب کے بطن سے عبدالاسد کا بیٹا اور ابو طالب کا حقیقی بھانجا تھا۔ ۱۲

اِس تاریک معاشرہ میں جبکہ انسانیت کی قدریں دم توڑ رہی تھیں اور اخلاق پستی کی آخری حدوں کو چھو رہے تھے، آپ نے اخلاقی رذائل سے اپنے دامن کو آلودہ نہ ہونے دیا۔ اور جبکہ جگہ جگہ جُوا کھیلا جاتا تھا اور گھر گھر شراب پی جاتی تھی آپ نے نہ کبھی قمار بازی کی طرف رُخ کیا اور نہ کبھی شراب کو مُنہ لگایا۔ احمد ابن زینی دحلان نے تحریر کیا ہے:۔

کان ابو طالب ممن حرم الخمر علیٰ نفسہ فی الجاھلیۃ کابیہ عبدالمطلب۔ (سیرت نبویہ۔ صفحہ ۸۰)	ابو طالب نے اپنے باپ عبدالمطلب کی طرح زمانۂ جاہلیت میں بھی شراب اپنے اُوپر حرام کر لی تھی۔"

ابو طالب خود ہی فواحش و منکرات سے گریزاں نہ تھے بلکہ جہاں تک بن پڑتا دُوسروں کو بھی عیوب و قبائح سے اجتناب کی تلقین کرتے۔ معاشرہ کی اصلاح اور ملک و قوم کی فلاح و بہبود میں کوشاں رہتے۔ تجارت اور کسبِ حلال پر زور دیتے۔ خانہ کعبہ کی تعمیر نَو کے وقت انہی نے قریش کو اس طرف متوجہ کیا تھا کہ وُہ اس کی تعمیر پر مالِ حرام و مشتبہ نہ لگائیں بلکہ جائز و حلال مال صرف کریں۔ چنانچہ قبلِ اسلام جب خانہ کعبہ کی دیواریں سیلاب سے متاثر ہو کر بیٹھنے لگیں اور اُس کے منہدم ہونے کا خطرہ لاحق ہُوا تو قریش نے چاہا کہ اسے منہدم کر کے از سرِ نو تعمیر کریں۔ جب اس کی دیواریں گرائی گئیں تو بنیادوں کے قریب ایک پھنکارتا ہوا اژدہا نظر آیا۔ لوگ اُسے دیکھ کر خوفزدہ ہو گئے اور کام وُہیں کا وُہیں رُک گیا۔ قریش کوئی ترکیب سوچ ہی رہے تھے کہ ابو طالب نے کہا:۔

ان ھٰذا لایصلح ان ینفق فیہ الا من طیب المکاسب فلا تدخلوا فیہ من ظلم وعدوان (تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۹)	یہ تعمیر اِس لائق ہے کہ اس پر صرف پاک و پاکیزہ اور حلال کمائی لگائی جائے۔ لہٰذا وُہ مال نہ لگاؤ جو ظلم و زیادتی سے حاصل کیا گیا ہے"۔

ان لوگوں نے ایسا ہی کیا اور کسبِ حلال سے کمایا ہُوا سرمایہ تعمیر کے لئے مخصوص کر دیا۔ اب جو کعبہ کے قریب آئے تو دیکھا کہ ایک پرندہ اس اژدہے پر جھپٹا اور اُسے اپنے پنجوں میں جکڑ کر بلندی کی طرف پرواز کر گیا اور تعمیر کے لئے راستہ صاف ہو گیا۔

ابو طالب اپنے معاشرہ میں ایسا نظام برُوئے کار لانا چاہتے تھے جس کی اساس عدل و انصاف پر استوار ہو۔ نہ کسی کی حق تلفی ہو اور نہ کسی پر بے جا زیادتی۔ چنانچہ اسی جذبہ کے پیشِ نظر انہوں نے عمرو ابن علقمہ کے خون کے بارے میں قسامت[1] کا طریقہ جاری کیا۔ اسلام نے بھی اس طریق کار کی افادیت کے پیشِ نظر اسے برقرار رکھا۔ ابن ابی الحدید

---

[1] قسامت کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی فرد قتل ہو جائے اور اُس کے ورثہ میں سے کوئی دعویٰ کرے کہ فلاں (باقی صفحہ ۶۳ پر)

نے تحریر کیا ہے:۔

وابو طالب اول من سن القسامۃ	زمانۂ جاہلیت میں ابو طالب نے عمرو ابن علقمہ کے
فی الجاھلیۃ فی دم عمرو ابن	خون کے بارے میں پہلے پہل قسامت کا طریقہ
علقمۃ ثم اثبتھا السنۃ فی	رائج کیا۔ پھر اسلام نے بھی اُسے اپنے احکام
الاسلام۔(شرح ابن الحدید ج۳ ص۴۶۱)	میں جگہ دے دی۔"

ابو طالب دوستی ہو یا دُشمنی کسی موقع پر حق و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ اور عام حالات ہی میں ظلم و زیادتی کے خلاف نہ تھے بلکہ جنگ کی معرکہ آرائیوں میں بھی غیر ضروری کشت و خون اور ناروا خونریزی کے شدید مخالف تھے۔ چنانچہ قبل اسلام قریش اور قبیلۂ قیس میں ایک جنگ لڑی گئی جو حرب فجار کے نام سے موسُوم ہے۔ اِس جنگ میں قریش کے ساتھ بنی ہاشم بھی شریک ہُوئے۔ پیغمبرؐ اکرم ابھی کمسن تھے۔ وُہ بھی اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ آتے مگر نہ جنگ میں حصّہ لیتے اور نہ کسی پر ہاتھ اُٹھاتے۔ جس دن ابو طالب آتے، قریش کا پلہ بھاری رہتا۔ قریش اُن کی شمولیت کو وجہِ کامرانی سمجھتے ہُوئے کہتے کہ آپ لڑیں یا نہ لڑیں صرف ہمارے پاس موجود رہا کریں اس لئے کہ آپ کی موجُودگی میں ہمیں ڈھارس رہتی ہے اور فتح و ظفر کے آثار نظر آتے ہیں۔ آپ نے فرمایا:۔

اجتنبوا الظلم والعدوان و	تم ظلم، بے جا زیادتی، قطع رحمی اور الزام تراشی
القطیعۃ والبھتان فانی لا	سے بچ کر رہو گے تو میں تمہاری نظروں سے
اغیب عنکم۔(تاریخ یعقوبی ج۲ ص۱۹)	اوجھل نہیں ہوں گا۔"

یہ تھی حضرت ابو طالب کی بلند نظری کہ جنگ و قتال کے پُر جوش ہنگاموں میں انتقامی اور دفاعی اقدامات کے حدود میں فرق و فاصلہ برقرار رکھتے ہوئے ظلم و زیادتی کو بُری نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اور صرف اسی حد تک جنگ کے روادار رہتے ہیں جہاں تک جنگ اصُول حرب و ضرب کے حدود کے اندر رہ کر لڑی جائے اور اُسے وحشت و بربریت اور درندگی و خونخواری سے تعبیر نہ کیا جا سکے۔

ابو طالب اعتدال پسندی، انصاف پروری اور حلم و بردباری کے جوہر سے آراستہ تھے اور عرب

(بقیہ از صفحہ ۶۲) اس کا قاتل ہے اور اثباتِ دعوٰی کے لئے دو عادل گواہ پیش نہ کر سکے۔ مگر ایسے قرائن و شواہد موجود ہوں جن سے مدعی کے دعوٰی کی تائید ہوتی ہو تو مدعی اور اس کے قبیلہ والوں سے پچاس قسمیں لی جائیں گی کہ فلاں قاتل ہے۔ اور اگر قسم کھانے والوں کی گنتی پچاس سے کم ہو تو اُن سے کئی بار قسمیں لے کر پچاس کا عدد پُورا کیا جائے گا۔ مثلاً پچیس افراد ہوں تو ہر ایک سے دو دو بار قسم لے کر پچاس کی گنتی پُوری کی جائے گی اور...... مدعا علیہ کو قاتل قرار دے دیا جائے گا اور اس طرح مقتول کا خون رائیگاں نہ جانے پائے گا۔ ۱۲

کے نامور حکماؤ دانشمند اُن سے استفادہ کرتے اور اُن سے اخلاق فاضلہ کے درس لیتے تھے۔ چنانچہ احنف ابن قیس سے جو عرب میں علم و بردباری کے لحاظ سے شہرہ آفاق تھا پُوچھا گیا کہ تم نے یہ حلم و بردباری کس سے سیکھی ہے اس نے کہا کہ قیس ابن عاصم المنقری سے۔ اور قیس ابن عاصم سے پُوچھا گیا کہ تم نے حلم و بردباری کا سبق کس سے لیا ہے؟ کہا حکیم عرب اکثم ابن صیفی سے اور اکثم ابن صیفی سے پُوچھا گیا کہ تم نے حکمت، ریاست، حلم اور سرداری و سربراہی کے اصُول کس سے سیکھے ہیں؟ کہا:-

من حلیف الحلم والادب سیّد العجم	سردارِ عرب و عجم، سراپا حلم و ادب ابوطالب
والعرب ابی طالب ابن عبدالمطلب	ابن عبدالمطلب سے۔"

(ہدیۃ الاحباب ص ۲۵۲)

آپ اپنے دَور میں ایک مدبّر و معلّم اخلاق اور مفکّر و دانشمند ہی نہ تھے بلکہ ایک بلند پایہ شاعر و سخن داں بھی تھے۔ اور ایک دیوان "دیوان شیخ الاباطح" کے علاوہ ان کے اشعار کا ایک کافی و وافی ذخیرہ تاریخ و سیر کی کتابوں میں بکھرا پڑا ہے۔ یُوں تو عرب شعر و شاعری کا گہوارہ تھا اور مجلسوں، بازاروں اور میلے ٹھیلوں میں تفاخر و خودستائی کی آوازیں قصائد کی صُورت میں گونجا کرتی تھیں مگر معانی و مطالب کے لحاظ سے آپ کی راہ دُوسروں کی راہ سے مختلف تھی۔ ان کے اشعار میں نہ بے جا خودستائی کا شائبہ تھا اور نہ ابتذال اور بازاری پن کی جھلک۔ بلکہ روانی و سادگی اور متانت و حُسنِ نظم کے ساتھ ان میں اخلاقی تعلیمات اور حق پرستی و حق نوازی کے زرّین درس ہوتے تھے۔ اسی لئے حضرت علیؑ اُن کے اشعار کو علمی و اخلاقی سرمایہ سمجھتے ہوئے فرماتے تھے:-

تعلموہ وعلموہ اولادکم فانّہ	ان کے اشعار پڑھو اور اپنی اولاد کو پڑھاؤ۔
کان علٰے دین اللہ وفیہ علم کثیر	اس لئے کہ وُہ دینِ خدا پر تھے اور اُن کے کلام
(بحار الانوار ج ۹ ص ۲۴)	میں علم کا بڑا ذخیرہ ہے۔"

ان امتیازات کے علاوہ نسبی و خاندانی بلندی کے لحاظ سے اور رسُولِ خدا کی تربیت اور اسلام اور بانئ اسلام کے گرانقدر خدمات کے اعتبار سے بھی ان کی عظمت مسلّم ہے۔ پیغمبر اکرمؐ نے انہی کے دامنِ عاطفت میں پرورش پائی، اور انہی کے زیرِ سایہ زندگی کا بیشتر عرصہ بسر کیا۔ آنحضرتؐ کے والد ماجد جناب عبداللہ آپ کی ولادت سے پہلے ہی انتقال فرما چکے تھے اور جب چھ برس کے ہوئے تو آپ کی والدہ ماجدہ جناب آمنہ نے بھی انتقال فرمایا اور آپ اپنے دادا عبدالمطلب کے آغوشِ شفقت میں پرورش پانے لگے۔ لیکن دو ہی برس گزرے تھے کہ دادا نے بھی دُنیا سے رحلت فرمائی۔ مگر زندگی کے آخری لمحوں میں ابوطالب سے خصوصی طور پر وصیت فرما گئے کہ وُہ آنحضرتؐ کی کفالت و نگہداشت میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھیں۔ ابوطالب خود بھی یتیم عبداللہ سے اتنی محبت و الفت رکھتے تھے کہ جس کے بعد کسی وصیت کی احتیاج نہ تھی۔ چنانچہ جب انہوں نے آنحضرتؐ کے بارے میں اپنے پدر بزرگوار کی وصیت کو سُنا تو کہا:-

یاابت لا توصنی بمحمدؐ فانه ابنی و ابن اخی۔ (مناقب۔ ج ۱۔ ص ۳۲)

"بابا مجھے محمد (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بارے میں وصیت کی ضرورت نہیں ہے۔ وُہ تو میرے بیٹے اور میرے بھتیجے ہیں"۔

حضرت عبدالمطلب کثیر الاولاد تھے اور آخر وقت اُن کے تمام عزیز و اقارب اور بیٹے اُن کے گرد و پیش جمع تھے۔ اور اُن میں سے ہر ایک بآسانی اس بارِ کفالت کا متحمل ہو سکتا تھا۔ مگر آپ نے انتہائی بصیرت و دُور اندیشی سے کام لیتے ہوئے تربیت و کفالت کا ذمہ دار ابو طالب کو ٹھہرایا کیونکہ انہوں نے آنحضرتؐ کے ساتھ ابو طالب کے طرزِ عمل اور برتاؤ سے بخوبی اندازہ کر لیا تھا کہ جو محبت و شیفتگی انہیں یتیمِ عبداللہ سے ہے وُہ کسی دُوسرے کو نہیں ہے۔ اور تربیت کی تکمیل کے لئے محبت و شفقت کے جذبات از بس ضروری ہیں۔ لہٰذا ان سے بہتر کوئی دوسرا اس خدمت کو سرانجام نہ دے سکے گا۔ اور بعد کے حالات نے بتا دیا کہ جو توقعات اُن سے وابستہ کئے گئے تھے وُہ غلط نہ تھے بلکہ ان توقعات سے کہیں بڑھ چڑھ کر ثابت ہوئے۔ اس کے علاوہ اس امر سے بھی انتخاب کو تقویت پہنچی ہو گی کہ چونکہ ابو طالب اور عبداللہ میں صرف صلبی یگانگت ہی نہیں بلکہ بطنی یگانگت بھی ہے۔ لہٰذا جس ہمدردی و غمگساری اور خلوص و ایثار کی ان سے توقع ہو سکتی ہے وُہ دُوسرے مختلف البطن بھائیوں سے نہیں ہو سکتی۔ اور کیا بعید ہے کہ آسمانی صحیفوں میں آنے والے نبی کے بارے میں پیشینگوئیوں کو پڑھ کر اور ابو طالب میں اسلام پروری و ایمان نوازی کے جوہر دیکھ کر اس دُعائے خلیلؑ و نوید مسیحاؑ کو ان کے آغوش کے سپرد کیا ہو۔ اور بعض مؤرخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ ابو طالب اور زبیر ابن عبدالمطلب میں قرعہ اندازی کی گئی ہو اور قرعہ ابو طالب کے نام نکلا۔ اور ایک قول یہ ہے کہ جب ان دو میں معاملہ دائر ہوا تو آنحضرتؐ نے ابو طالب کا دامن پکڑ لیا اور انہی کے کنارِ عاطفت میں رہنے کی خواہش کی۔ بہر حال یہ انتخاب کسی بنا پر ہوا ہو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ اللہ کے خصوصی لطف و کرم کا کرشمہ تھا اور مشیت ایزدی بھی یہی چاہتی تھی کہ یہ امانت ابو طالب کے سپرد ہو اور انہی کے پاکیزہ آغوش میں پروان چڑھے۔ چنانچہ قدرت نے آنحضرتؐ پر جو جو احسانات فرمائے ان میں سے اس احسان کا خاص طور پر تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے: الم یجدك یتیما فاوی۔ (کیا اس نے تمہیں یتیم پا کر پناہ نہ دی) مفسرین کا اتفاق ہے کہ اس پناہ سے مراد حضرت ابو طالب کا سایۂ عاطفت و آغوشِ شفقت ہے۔

غرض ابو طالب نے اپنے مرنے والے باپ کی وصیت کے مطابق آنحضرتؐ کو اپنے آغوشِ تربیت میں لے لیا اور وُہ تمام فرائض جو ایک مربی و نگران کے ہو سکتے ہیں نہایت حُسن و خوبی سے انجام دیئے اور اس طرح محبت و دلسوزی سے تربیت کی کہ ہر مؤرخ کے قلم نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ ابن سعد نے تحریر کیا ہے:۔

کان یحبه حبا شدیدا لایحب ولده وکان لاینام الاالی جنبه

ابو طالب رسولِ خدا سے بے انتہا محبت کرتے، اور اپنی اولاد سے زیادہ انہیں چاہتے تھے۔

ویخرج فیخرج معہ وصب بہ ابوطالب صبابۃ لم یصب مثلہا بشیٔ قط۔
(طبقات۔ ج ۱۔ ص ۱۱۹)

ان کے پہلو میں سوتے۔ جب کہیں باہر جاتے تو انہیں ساتھ لے جاتے اور دنیا جہان کی ہر چیز سے زیادہ اُن پر فریفتہ و گرویدہ تھے۔"

ابوطالب نے ابتداء سے آنحضرتؐ کی زندگی کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اُن کی افتادِ طبع اور اطوار و عادات کو اچھی طرح دیکھا بھالا تھا کہ وہ کم سخن، کم آمیز اور تنہائی پسند ہیں۔ نہ کھیل کود میں دلچسپی لیتے ہیں نہ سیر و تفریح میں۔ نہ اُن سے کوئی ناسزا بات سُننے میں آتی ہے اور نہ کوئی ناروا چیز دیکھنے میں۔ اور پھر عبدالمطلب کی مثالی خودداری اور رکھ رکھاؤ کے باوجود، یتیم عبداللہ کے ساتھ اُن کا پُرشفقت و عظمت آمیز رویہ بھی دیکھا تھا۔ ان تمام چیزوں نے ابوطالب کو اس قدر متاثر کیا تھا کہ وہ شروع ہی سے آنحضرتؐ کی غیر معمولی شخصیت کے متعلق سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اور جب آپ سے خوارق عادات اور مافوق العادہ آثار ظاہر ہوتے دیکھے تو بخوبی سمجھ گئے کہ یہ بچہ عام بچوں کی سطح سے بلند تر اور غیر معمولی عظمت و رفعت کا مالک ہے۔ اسی لئے جہاں محبت ان کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھی وہاں عقیدت و ارادت بھی اُن کے دل میں گھر کر گئی اور اسی محبت و عقیدت نے انہیں ہر قسم کی قربانی دینے پر آمادہ کر دیا۔

ابوطالب نے آنحضرتؐ سے جو کرامات و خوارق عادات دیکھے اُن میں سے یہ چیز تو ہر روز مشاہدہ کرتے کہ جب آنحضرتؐ دسترخوان پر موجود ہوتے تو کھانا خواہ کتنا کم ہوتا سب شکم سیر ہو جاتے اور کوئی بھی بھوکا نہ رہتا۔ اس لئے آپ نے یہ معمول قرار دے لیا تھا کہ اگر آنحضرت کھانے کے وقت کہیں اِدھر اُدھر ہوتے تو نہ خود کھاتے اور نہ کسی کو کھانے کی اجازت دیتے۔ اور فرماتے کہ جب تک میرا بھتیجا نہ آجائے کوئی کھانے کو نہ چھوئے۔ جب وہ آتے تو سب مل کر کھانا کھاتے۔ اگر دسترخوان پر سے کوئی دودھ کا پیالہ اُٹھاتا تو کہتے کہ ٹھہرو پہلے میرے بھتیجے کو پینے دو۔ جب وہ پی لیتے تو پھر دوسرے پیتے۔ اور سب سیر و سیراب ہو جاتے۔ ابوطالب یہ دیکھ کر آنحضرتؐ سے کہتے اِنَّکَ لَمُبَارَکٌ۔ تم تو بڑے ہی بابرکت ہو۔"

آپ ایک مرتبہ آنحضرتؐ کے ہمراہ کہیں جا رہے تھے جب عرفہ سے تین میل کے فاصلہ پر مقام ذی المجاز میں پہنچے تو پیاس محسوس کی۔ آنحضرتؐ سے کہا کہ اے میرے بھتیجے کیا آس پاس کہیں پانی مل سکتا ہے؟ آنحضرتؐ اُونٹ سے نیچے اُترے اور ایک پتھر پر ٹھوکر ماری اور زبان مبارک سے کچھ فرمایا۔ اِدھر الفاظ ختم ہوئے اُدھر پتھر سے پانی کا دھارا بہہ نکلا۔ فرمایا چچا پانی پی لیجئے۔ جب پی چکے تو آنحضرتؐ نے دوبارہ ٹھوکر ماری اور اُبلتا ہوا چشمہ خشک ہو گیا۔ انہی آثار خیر و برکت کو دیکھ کر ابوطالب انہیں اپنی دُعاؤں کا وسیلہ بناتے اور ان کے صدقہ سے بارانِ رحمت طلب کرتے۔ چنانچہ ایک دفعہ مکہ میں بارش کے نہ ہونے سے شدید قحط پڑ گیا۔ لوگ خشک سالی سے گھبرا اُٹھے کوئی کہتا لات و عزیٰ سے التجا کریں، کوئی کہتا منات کے آگے گڑگڑائیں کہ ایک خوش وضع و خوش فکر بزرگ نے کہا:۔۔۔

انی تؤفکون وفیکم باقیة	کہاں بھٹک رہے ہو حالانکہ تمہارے اندر
ابراھیم وسلالۃ اسمٰعیلؑ۔	یادگارِ ابراہیمؑ و فرزندِ اسمٰعیلؑ موجود
(تاریخ الاسلام ذہبی۔ ص ۳۶)	ہیں "۔

لوگوں نے کہا کیا اس سے تمہاری مراد ابو طالب ہیں؟ کہا کہ ہاں۔ یہ سنتے ہی لوگ ابو طالب کے ہاں آئے اور کہا کہ اے سردارِ قریش ہم قحط اور خشک سالی سے تباہ حال ہو چکے ہیں۔ ہمارے لئے بارش کی دعا کیجئے آپ نے یتیم عبداللہ کا ہاتھ پکڑا اور خانہ کعبہ کے پاس آئے اور آنحضرتؐ کو دیوارِ کعبہ کے پاس بٹھایا اور اُن کی انگشت مبارک کو اُوپر اُٹھا کر حرکت دی۔ بارش کے کوئی آثار نہ تھے لیکن دیکھتے ہی دیکھتے تیز و تند ہوائیں چلنے لگیں۔ ابرِ رحمت جھوم کے اُٹھا اور اس شدّت سے پانی برسا کہ سوکھی ہوئی زمین سیراب ہو گئی اور خشک صحراؤں میں شادابی آگئی۔

ابو طالب گیہوں اور عطر کے معروف تاجر تھے اور قریش کے دستور العمل کے مطابق سال میں ایک بار تجارت کی غرض سے شام جاتے تھے۔ جب ان کے سفرِ شام کا زمانہ قریب آیا تو انہوں نے آنحضرتؐ سے اپنے سفر کا ذکر تو کیا مگر آپ کو ساتھ لے جانے کا خیال ظاہر نہ کیا۔ کیونکہ اس وقت آپ کی عمر بارہ سال کی تھی اور دُور و دراز کے سفر کی صعوبتیں جھیلنے کے قابل نہ تھے۔ جب آنحضرتؐ کو معلوم ہوا کہ چچا انہیں ساتھ لے جانا نہیں چاہتے تو وہ اُن سے لپٹ گئے اور ساتھ چلنے کی پُر زور خواہش کی۔ ابو طالب کو بھی اُن کی جدائی گوارا نہ تھی آخر انہیں ساتھ لے جانے پر آمادہ ہو گئے اور فرمایا:-

واللہ لاخرجن بہ معی و لا	خدا کی قسم میں انہیں ساتھ لے جاؤں گا۔
یفارقنی ولا افارقہ ابدا	اور ہم کبھی ایک دوسرے سے جدا
(تاریخ خمیس ج ۱۔ ص ۲۵۷)	نہ ہوں گے "۔

جناب ابو طالب نے انہیں ساتھ لے لیا اور شام کی جانب روانہ ہو گئے۔ جب ان کا تجارتی قافلہ شام کے جنوبی حصہ میں بصریٰ پہنچا تو وہاں کے ایک راہب جرجیس ابن ابی ربیعہ نے جو بحیرا کے نام سے مشہور ہے آنحضرتؐ کو اس قافلہ میں دیکھا اور ان میں ایسے آثار مشاہدہ کئے جو نبی خاتم کے لئے مخصوص تھے۔ اس نے انہیں قریب سے دیکھنے کے لئے تمام اہلِ قافلہ کو اپنے ہاں دعوت دی۔ قریش نے آنحضرتؐ کو سامان کے پاس چھوڑا اور اس کے ہاں پہنچ گئے۔ بحیرا نے جب آنحضرتؐ کو نہ دیکھا تو پوچھا کہ کوئی اور بھی ہے؟ کہا کہ صرف ایک بچہ باقی رہ گیا ہے جسے سامان کی حفاظت کے لئے چھوڑ آئے ہیں کہا کہ اسے بھی بلایا جائے۔ جب آنحضرت تشریف لائے تو بحیرا نے انہیں سر سے پیر تک بغور دیکھا اور پُشت مبارک سے پیراہن ہٹا کر مُہرِ نبوت پر نگاہ کی اور اُن سے خواب و بیداری کی مختلف باتیں دریافت کرنے کے بعد ابو طالب سے پوچھا کہ یہ بچہ آپ کا کیا ہوتا ہے؟ ابو طالب نے کہا کہ میرا بیٹا ہے۔ بحیرا نے کہا کہ یہ آپ کا بیٹا تو ہو نہیں سکتا۔ اور ان کے سراپا پر نظر کرنے کے بعد

میں کہہ سکتا ہوں کہ ان کے والد کو زندہ نہ ہونا چاہئیے۔ ابوطالب نے کہا کہ یہ میرا بھتیجا اور میرا پروردہ ہے۔ اِن کے والد کا انتقال ان کی پیدائش سے پہلے ہی ہو چکا ہے۔ بحیرا نے کہا کہ انہیں یہیں سے واپس لے جائیے ایسا نہ ہو کہ یہود ان کے درپے آزار ہوں اور انہیں گزند پہنچائیں۔ یہ ہدایت کے پیغامبر اور نبی مرسل ہیں۔ اہلِ قافلہ میں سے کچھ لوگوں نے پُوچھا کہ تم نے کیونکر جانا کہ یہ نبی و رسول ہوں گے؟ کہا کہ جب تمہارا قافلہ پہاڑ کی بلندی سے نیچے اُتر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ تمام درخت اور پتھر سجدے میں جُھک گئے ہیں۔ اور جدھر یہ بچہ جاتا ہے ابر سایہ کئے ہوئے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے خدوخال شکل و شمائل اور حسب و نسب کا تذکرہ مَیں نے آسمانی صحیفوں میں پڑھا ہے۔ اس بنا پر کہا ہے کہ یہ اللہ کے رسُولؐ اور سردارِ انبیاء ہیں۔

"سالے کہ نکوست از بہارش پیدا"

جب آنحضرتؐ کا سن بیس برس کا ہوا تو ایک دن انہوں نے ابوطالب سے ذکر کیا کہ مَیں خواب میں تین نورانی پیکروں کو دیکھتا ہوں کہ اُن میں سے ایک میری طرف اشارہ کر کے اپنے دونوں ساتھیوں سے کہتا ہے کہ یہ ہے وُہ جس کی نصرت وقت آنے پر تمہیں کرنا ہو گی، اور اس کے علاوہ کوی بات نہیں کرتا۔ ابوطالب نے مکہ کے ایک عالم سے اس کا تذکرہ کیا۔ اس نے آنحضرتؐ کو غور سے دیکھا اور کہا کہ خدا کی قسم یہ پاکیزہ رُوح کے حامل اور پاکیزہ نبی ہیں۔ ابوطالب نے اُس سے کہا کہ چُپ رہئیے اور اسے ظاہر نہ کیجئے۔ ایسا نہ ہو کہ انہی کی قوم رشک و حسد کی بناء پر ان کی دشمن ہو جائے۔ تم نے جو کہا ہے صحیح کہا ہے اور مَیں اس سے بے خبر نہیں ہوں۔

لقد انبأنی ابی عبدالمطلب بانہ النبی المبعوث و امرنی ان استر ذٰلك لئلا یغری بہ الاعادی۔	میرے والد عبدالمطلب مجھے بتا گئے تھے کہ یہ اللہ کے بھیجے ہوئے نبی ہیں۔ اور مجھے ہدایت کی تھی کہ میں اس بات کو پردۂ خفا میں رکھوں تاکہ دشمن اُن کے خلاف بھڑک نہ اُٹھیں"
(تاریخ یعقوبی۔ج ۲۔ص ۱۲)	

یہ واقعات و حالات ابوطالب کے لئے تصدیقِ نبوّت کی راہیں ہموار کر چکے تھے اور آفتابِ نبوّت کے برافگندہ نقاب ہونے سے پہلے ان کے دِل پر پرتوِ رسالت کی چھوٹ پڑ رہی تھی۔ اور وُہ علم الیقین رکھتے تھے کہ یتیمِ عبداللہ مستقبل کے نبی ہیں۔ اسی لئے ان کی خدمت، تربیت اور دیکھ بھال میں مادی مسرّت سے کہیں زیادہ رُوحانی کیفیت و سرور محسوس کرتے پروانہ وار اُن کے گرد و پیش رہتے، شب و روز انہیں نظروں میں رکھتے اور اُن کی فلاح و بہبود میں کوشاں رہتے۔ آنحضرتؐ بچپن کے حدود سے نکل کر جوان ہو چکے تھے۔ اب ابوطالب کو تربیت کے ضمن میں ان کے روزگار و معیشت کی فکر ہوی۔ قریش کا ذریعہ معیشت تجارت تھا مگر سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے کوی کاروبار نہ کیا جا سکتا تھا۔ اس وقت مکہ میں ایک معزز و مال دار خاتون خدیجہ بنت خویلد تھیں۔ جو خرید و فروخت کے لئے اپنے کارندے دُوسرے شہروں میں بھیجا کرتی تھیں۔ آپ نے آنحضرتؐ کو خدیجہ کا

کاروبار سنبھالنے کا مشورہ دیا اور خود جناب خدیجہ سے جا کر کہا کہ وہ جن شرائط پر دوسروں کو مالِ تجارت دے کر بھیجتی ہیں محمّد ابن عبد اللہ (صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم) کو بھی بھیجیں۔ خدیجہ نے اسے منظور کر لیا اور شرائط تجارت طے کرنے کے بعد مالِ تجارت آنحضرتؐ کے سپرد کیا۔ آپؐ کچھ عرصہ ان کا کاروبار کرتے رہے اور اس میں انتہائی کامیابی حاصل کی۔ خدیجہ اُن کے کاروبار سے مطمئن اور اُن کی دیانت، راستبازی و خوش معاملگی سے بہت متاثر ہوئیں اور انہیں کسی ذریعہ سے شادی کا پیغام بھجوایا۔ آپ نے اپنے چچا ابو طالب سے مشورہ کرنے کے بعد اس رشتہ کو منظور فرمایا۔ ابتدائی مراحل طے ہونے کے بعد ابو طالب، حمزہ، عباس اور دوسرے بنی ہاشم و اکابر قریش کے ہمراہ حضرت خدیجہ کے مکان پر آئے۔ بزمِ عقد آراستہ ہوی اور جناب ابو طالب نے خطبۂ نکاح پڑھا:۔

الحمد لله الذی جعلنا من ذریة ابراهیم و زرع اسمٰعیل و ضئضئ معد و عنصر مضر و جعلنا حضنة بیته و سواس حرمه و جعله لنا بیتا محجوجا و حرما امنا و جعلنا حکام الناس ثم ان ابن اخی هذا محمدؐ ابن عبد الله لا یوزن به رجل الا رجح به شرفا و فضلا و عقلا و ان کان فی المال قل فان المال ظل زائل و امر حائل و عاریة مسترجعة و هو والله بعد هذا له نبأ عظیم و خطر جلیل۔

تمام حمد اس اللہ کے لئے ہے جس نے ہمیں ذریّتِ ابراہیمؑ، نسلِ اسمٰعیلؑ، اولادِ معد اور صلبِ مضر سے پیدا کیا اور ہمیں اپنے گھر کا نگہبان اور اپنے حرم کا پاسبان بنایا اور اُسے ہمارے لئے حج کا مقام اور جائے امن قرار دیا اور ہمیں لوگوں پر حاکم بنایا۔ یہ میرے بھتیجے محمّدؐ ابن عبد اللہ ہیں، جس کسی سے ان کا مقابلہ و موازنہ کیا جائے گا تو شرف و نجابت اور عقل و فضیلت میں ان کا پلّہ بھاری رہے گا۔ اگرچہ دولت ان کے پاس کم ہے لیکن دولت تو ایک ڈھلتی ہوی چھاؤں، پلٹ جانے والی چیز اور واپس لے لی جانے والی عاریت ہے۔ خدا کی قسم! ان کا مستقبل عظمت بکنار اور ان سے ایک عظیم خبر کا ظہور ہوگا۔"

(سیرت حلبیہ ج ۱ ص ۱۳۹)

یہ خطبہ اگرچہ مختصر ہے مگر اس سے اُن کے عقائد و نظریات اور آنحضرتؐ کے متعلق اُن کے خیالات کا بڑی حد تک اندازہ ہو جاتا ہے۔ انہوں نے خطبہ کی ابتداء اللہ تعالٰے کی حمد و ثناء سے کی ہے جس سے اُن کی توحید پرستی پر روشنی پڑتی ہے۔ حمد و ثناء کے بعد ذریّت ابراہیمی و نسلِ اسمٰعیلی سے اپنی وابستگی کا اظہار کر کے خانۂ کعبہ کی نگرانی، حرم کی پاسبانی اور عامۃ الناس پر حکمرانی کا ذکر کیا ہے۔ اس سے صرف یہی امر واضح نہیں ہوتا کہ وہ نسلِ ابراہیمؑ میں سے ہونے کی بناء پر ان منصبوں اور عہدوں پر فائز ہوتے چلے آ رہے تھے، بلکہ اس امر کی بھی

نشاندہی ہوتی ہے کہ وُہ حرم کے عہدوں کے علاوہ ان کے تعلیمات کے بھی ورثہ دار تھے۔ اگر وُہ اُن کے تعلیمات سے بے گانہ اور اُن کے دین و آئین سے بے تعلق ہوتے تو اس انتساب پر فخر کا کوئی مورد ہی نہ تھا۔ اس شرف انتساب اور خصوصی امتیازات کے بعد آنحضرتؐ کے کمالِ فہم و فراست اور بلندیٔ عقل و دانش کا تذکرہ کیا ہے اور اُن کے محاسن و کمالات کے مقابلہ میں مالِ دُنیا کی بے قدری و بے وقعتی کو واضح کیا ہے۔ اس طرح کہ اُسے ڈھلتے ہوئے سایہ سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی جس طرح سایہ اپنا کوئی مستقل وجود نہیں رکھتا اور اس کا گھٹنا، بڑھنا سمٹنا، پھیلنا دُوسری شے کے تابع ہوتا ہے اسی طرح مالِ دُنیا بھی غیر مستقل اور عارضی ہے۔ آج ایک کے پاس ہے اور کل دُوسرے کے پاس۔ لہذا اس مال کے ذریعہ جو عزت و سربلندی حاصل ہوگی وُہ سایہ کے مانند ناپائیدار ہوگی۔ آخر میں نبأ عظیم کے الفاظ سے آنحضرتؐ کے درخشندہ مستقبل، علومنزلت اور عالمگیر نبوت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وُہ عنقریب آسمانِ ہدایت پر نیّرِ درخشاں بن کر چمکیں گے اور اپنے تعلیمات کی روشنی میں بھٹکی ہوئی انسانیت کو سیدھی راہ دکھائیں گے۔

جب آنحضرتؐ کاروانِ حیات کی چالیس منزلیں طے کر چکے تو قدرت نے جس مقصد کے لئے انہیں خلق کیا تھا اس مقصد کی تکمیل کے لئے مامور فرمایا اور ہدایتِ عالم کا بارِ گراں ان کے کاندھوں پر رکھا۔ آپ کفر و شرک کی گھٹا ٹوپ اندھیاریوں میں ہدایت کے دیئے جلانے اور اسلام کا پیغام گھر گھر پہنچانے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بعثت کے ابتدائی سالوں میں دائرۂ تبلیغ محدود اور دعوتِ اسلام بڑی حد تک مخفی تھی۔ گنے چنے چند افراد کے علاوہ دُوسروں سے اظہارِ اسلام میں احتیاط برتی جاتی تھی۔ نماز کے لئے تنہائی کے مواقع ڈھونڈے جاتے تھے کبھی مکانوں میں چھُپ کے عبادت کرتے اور کبھی حضرت علیؑ کو ساتھ لے کر پہاڑوں کی کھائیوں کی طرف نکل جاتے اور وہاں نماز ادا کرتے۔ ایک مرتبہ ابو طالب نے ان دونوں کو پہاڑ کی ایک کھائی میں نماز پڑھتے دیکھ لیا۔ آپ نے علیؑ کو بلایا اور اُن سے پُوچھا کہ یہ کون سا دین ہے؟ جو تم نے اختیار کیا ہے۔ کہا کہ میں اللہ اور اس کے رسُول محمد ابن عبد اللہ (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دین پر ہوں۔ ابو طالب نے یہ سُنا تو کہا:-

انہ لا یدعوك الا الی خیر فالزمہ۔ (تاریخ طبری۔ ج۲۔ ص۵۸)۔

"تم ان سے چمٹے رہو یہ تمہیں نیکی و ہدایت ہی کی راہ بتائیں گے۔"

اگر ابو طالب کفر پسند اور اسلام دشمن ہوتے تو آنحضرتؐ سے یہ کہتے کہ میں نے بیشک اپنے فرزند کو آپ کے حوالے کیا تھا لیکن یہ آئینِ اخلاق و مروّت کے خلاف ہے کہ آپ مجھ سے پُوچھے بغیر میرے بچّے کی ذہنی ناپختگی سے فائدہ اُٹھائیں اور اُسے اپنے نئے مذہب کی راہ پر لگائیں اور اس طرح باپ بیٹے کے درمیان ذہنی و نظریاتی تفرقہ ڈالیں، اور علی سے بھی یہ کہتے کہ تم اس اُٹھا بیٹھی کو چھوڑو اور اپنے باپ کے دین و آئین پر قائم رہو اس لئے کہ ہر انسان اپنی اولاد کو اسی دین و مذہب پر دیکھنا چاہتا ہے جس کا وُہ خود پابند ہوتا ہے۔ مگر ابو طالب پیغمبرؐ کو کچھ کہنے یا علی کو روکنے کے بجائے انہیں آنحضرتؐ کی پیروی کا حکم دیتے ہیں۔ یہ

اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ وُہ کفّار و مشرکین کے مشرکانہ عبادات و رسُوم کو پسندیدہ نظروں سے نہ دیکھتے تھے ورنہ بُت پرستی کے مقابلہ میں اِس طرزِ عبادت کو خیر سے تعبیر نہ کرتے اور علیؑ سے یہ نہ کہتے کہ محمدؐ (صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم) کے طریق و مسلک پر مضبوطی سے جمے رہو وُہ تمہیں نیکی اور بھلائی ہی کا راستہ دکھائیں گے۔ اس سے یہ حقیقت بڑی حد تک آشکارا ہو جاتی ہے کہ ابو طالب ذہنی طور پر اسلام سے پُورے ہم آہنگ اور ہمہ تن اُس کی پذیرائی کے لئے آمادہ تھے۔

آنحضرتؐ کو در پردہ تبلیغ کرتے ہوئے تین برس گزر گئے۔ جب چوتھا سال شروع ہوا تو علانیہ تبلیغ اسلام کا حکم آیا۔ آپ نے ابو طالب کے مکان پر ایک دعوت کا اہتمام کیا اور اپنے عزیز و اقارب کو جمع کر کے اُنھیں اللہ کا پیغام سُنایا کہ وُہ بتوں کی پُوجا چھوڑ کر خدائے واحد کی پرستش کریں۔ ابو طالب قریش کے تیوروں سے سمجھ رہے تھے کہ وُہ اپنے قدیم رسم و رواج کے خلاف کوئی آواز سُننا گوارا نہ کریں گے۔ اور لامحالہ آنحضرتؐ کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں گے آپ نے ان کی مخالفت کے زور پکڑنے سے پہلے یہ مناسب سمجھا کہ ان کے گوش گزار کر دیں کہ وُہ ابنِ عبداللہ کو تنہا و بے سہارا نہ سمجھیں بلکہ ہم اُن کے دست و بازو بن کر اُن کے ساتھ ہوں گے اور ہر لمحہ اُن کے سینہ سپر رہیں گے۔ چنانچہ آپ نے جذبۂ حق پرستی سے متاثر ہو کر پُراعتماد لہجے میں کہا:۔

واللہ لنمنعنہ ما بقینا۔! "خدا کی قسم ہم جب تک زندہ رہیں گے دشمنوں سے ان کی حفاظت کریں گے۔"

(تاریخ کامل۔ج۲۔ص۴۱)

جب پیغمبرؐ اکرم کی آواز گھر کی چار دیواری سے نکل کر مکّہ کی کُفر پرور فضا میں گونجی تو ردِّ عمل کے طور پر مخالفت کے طوفان اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جو لوگ دیدہ و دل فرش راہ کرتے تھے آنکھیں دکھانے اور جو پھول برساتے تھے کانٹے بچھانے لگے۔ قریش نے قدم قدم پر تبلیغِ حق میں مشکلات پیدا کیں۔ وُہ کون سی رُکاوٹ تھی جو آپ کے راستے میں کھڑی نہ کی ہو اور وُہ کون سا حربہ تھا جو اُٹھا رکھا ہو۔ مگر پیغمبرؐ نے کسی مشکل کو مشکل نہ سمجھا اور قریش کی معاندانہ سرگرمیوں کے باوجود ہمہ تن اپنے تبلیغی کاموں میں مصروف رہے۔ قریش نے یہ صورت حال دیکھی تو وُہ ایک وفد کی صُورت میں ابو طالب کے پاس آئے اور کہا کہ آپ فرزندِ عبداللہ کے طور طریقے دیکھ رہے ہیں انہوں نے چند کم حیثیت لوگوں کو بہلا پھسلا کر اپنے دین میں داخل کر لیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اُن سے رُو در رُو بات چیت کریں اور آپ بھی انہیں سمجھائیں کہ وُہ اپنا رویّہ بدلیں اور اس نئی اپج سے باز آئیں۔ ابو طالب اُٹھ کر آنحضرتؐ کے پاس آئے اور کہا کہ چند رؤسائے قریش آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں اگر مناسب سمجھیں تو اُن کی بات سُن لیں۔ آنحضرتؐ باہر تشریف لائے اور اُن لوگوں سے پُوچھا کہ کیا کہنا چاہتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم یہ بات آپ کے گوش گزار کرنا چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے بُتوں سے کوئی سروکار نہ رکھیں۔ انہیں بُرا بھلا نہ کہیں اور نہ ہمارے دین و مذہب پر حملہ کریں۔ اگر آپ نے ہمارا یہ مطالبہ مان لیا تو ہم آپ کے کسی کام میں دخل نہیں دیں گے آپ جانیں اور آپ کا کام۔ فرمایا کہ مَیں یہی تو کہتا ہوں کہ اللہ ایک ہے اُسی کی

عبادت کرو اور اُسے چھوڑ کر اپنے خود ساختہ خداؤں کی پرستش نہ کرو۔ اور یہ میرا فرض منصبی ہے کہ میں بُت پرستی کی مذمّت اور خدا پرستی کی تبلیغ کروں۔ قریش نے کہا کہ یہ تو عجیب بات ہے کہ ہم اپنے باپ دادا کے مسلک کو چھوڑ کر اور تمام معبُودوں سے مُنہ موڑ کر بس ایک خدا کے ہو رہیں۔ یہ کہہ کر تیوریوں پر بل ڈالے اور مُنہ لٹکا کر چل دیئے۔

اس موقع پر ابو طالب نے اپنی حکمتِ عملی اور حُسنِ تدبّر سے کام لیتے ہوئے ایسا رویہ اختیار کیا کہ قریش کے بھڑکے ہوئے جذبات اور بھڑکنے نہ پائیں۔ اگر نرم روی کے بجائے سخت رویہ اختیار کیا جاتا تو دُشمنی و عناد کی آگ اور بھڑک اُٹھتی اور کفار کی تشدّد پسند طبیعتیں اور سختی و تشدّد پر اُتر آتیں۔ اس مصلحت کے علاوہ دعوتِ فکر کا اہم مقصد بھی اس میں شامل تھا کہ قریش سیخ پا ہونے کے بجائے ٹھنڈے دل سے آنحضرتؐ کی باتیں سُنیں، اُن پر غور کریں اور اپنے معتقدات اور اُن کے تعلیمات کا جائزہ لے کر حق و باطل کا فیصلہ کریں اور جس طرح دُوسرے معاملات میں اُن کی راستگوئی و صدق بیانی تسلیم کرتے آئے ہیں، دین کے بارے میں بھی اُن کی سچّائی کا اعتراف کریں۔ اور سوچیں کہ جس نے چالیس سال کی عُمر تک نہ کبھی جھُوٹ بولا ہو اور نہ کبھی غلط بیانی کی ہو وُہ یکبارگی اتنا بڑا جھُوٹ کیسے بول سکتا ہے کہ رسالت اور اللہ کی نمائندگی کا ادعا کرنے لگے۔ مگر قریش اپنے معتقدات سے دستبردار ہونے کو تیار نہ تھے اور نہ اُن کی منجمد طبیعتوں میں بآسانی تبدیلی ہو سکتی تھی۔ انہوں نے دیکھا کہ ان کے عقائد کا تحفّظ اُسی صُورت میں ہو سکتا ہے جب اس داعیٔ حق کا خاتمہ کر دیا جائے۔ مگر ابو طالب کے ہوتے ہوئے انہیں آنحضرت پر حملہ کرنے کی جرأت بھی تو نہ تھی۔ انہوں نے ابو طالب کی حمایت و سرپرستی کو ختم کرنے کے لئے یہ کھیل کھیلا کہ قریش کے ایک خوبصورت نوجوان عمارہ ابن ولید کو ابو طالب کے پاس لائے اور کہا کہ آپ اسے اپنا بیٹا بنا لیجئے اور محمدؐ کی حمایت سے دستبردار ہو جائیے۔ ابو طالب نے اُن کی یہ انوکھی فرمائش سُنی تو فرمایا:۔

اتعطونني ابنكم اغذوه لكم و اعطيكم ابني تقتلونه هذا والله لا يكون ابدا۔ (تاریخ کامل ج ۲۔ ص ۴۳)	یہ اچھا انصاف ہے کہ میں تمہارے بیٹے کو لے کر پالوں اور اپنا بیٹا تمہارے حوالے کر دوں، تاکہ تم اُسے قتل کرو۔ خدا کی قسم یہ کبھی نہیں ہو گا۔"

قریش کا یہ مطالبہ انسان کے فطری لگاؤ اور جذبۂ محبّت سے بے خبری یا اس سے عمداً بے رُخی پر مبنی تھا کہ ابو طالب اپنے حقیقی بھتیجے اور پروردہ کو خونخوار درندوں کے حوالے کر دیں اور ایک اجنبی اور بیگانے کو لے کر پالیں پوسیں۔ ایک معمولی سطح کا انسان بھی اسے گوارا نہیں کر سکتا چہ جائیکہ ابو طالب ایسا باحمیت انسان جو پناہ مانگنے والوں کے لئے بھی مضبوطی و تندہی سے جم جاتا ہو وُہ اپنے جگر بند کو اس آسانی سے خون آشام تلواروں کے سپرد کر دے اور اپنی حمیت، مروّت اور شرف کا کچھ بھی پاس و لحاظ نہ کرے۔

قریش کی اس پیشکش سے اُن کی پست ذہنیتوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وُہ آنحضرتؐ کی دشمنی میں کس حد تک ہوش و خرد کے تقاضوں سے دُور ہو چکے تھے کہ ایسی پوچ اور بے طرح باتوں پر اُتر آئے تھے۔ یہ امر غور طلب ہے کہ ایسے کج فکر لوگوں کو سمجھانا بجھانا اور ان کے ارادوں کو ناکام بنانا کتنا دُشوار تھا۔ اور ان دشواریوں کے دُور کرنے میں کیا ابو طالب کے علاوہ کسی اور کا بھی عمل دخل تھا؟ تاریخ کسی اور کا نام بتانے سے قاصر ہے۔
غرض قریش کا یہ حربہ بھی ناکام ہو گیا اور اُن کی سخت گیریوں اور ستم رانیوں کے باوجود اسلام کی آواز دبنے کے بجائے اُبھرتی ہی گئی۔ اب انہیں یہ فکر لاحق ہوی کہ اگر آنحضرتؐ کی آواز سے متاثر ہو کر لوگ اسی طرح دائرۂ اسلام میں داخل ہوتے رہے اور یہ سلسلہ یُونہی بڑھتا رہا تو یہ مختصر جماعت آگے بڑھ کر مکّہ کی سیاست پر چھا جائے گی اور انہیں پیروں تلے روند کر اُن کے اقتدار کو ملیامیٹ کر دے گی۔ جب انہیں انقلابِ نَو کے زیرِ اثر اپنا اقتدار خطرہ میں نظر آیا تو اُن کے چند شیوخ و عمائد ابو طالب کے پاس پھر آئے اور کہا کہ ہم پہلی مرتبہ تو خاموش چلے گئے تھے مگر اب ہمارا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا ہے۔ ہم کہاں تک آپ کی بزرگی و عظمت کا پاس و لحاظ کریں گے آخر ہمیں وُہ قدم اُٹھانا پڑے گا جو اب تک اس توقع پر نہیں اٹھایا کہ شاید یہ آواز دب جائے مگر یہ آواز خود سے دبتی نظر نہیں آتی۔ آپ اپنے بھتیجے کو سختی سے سمجھائیں کہ وُہ خاموش بیٹھ جائیں اور ان آسمانی باتوں کا سلسلہ ختم کریں۔ ورنہ آپ درمیان سے ہٹ جائیں اور ہمیں دو ٹوک فیصلہ کر لینے دیں۔ ابو طالب نے اُن کے بُرے ارادے اور بگڑے ہوئے تیور دیکھے تو گھبرائے ہوئے آنحضرتؐ کے پاس آئے اور کہا کہ سردارانِ قریش پھر جتھا باندھ کر آئے ہیں۔ آپ ایسا طریق اختیار کریں کہ اُن کے جذبات مشتعل نہ ہوں۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ وُہ اچانک آپ کو قتل کر دیں گے۔ میں ایک اکیلا کہاں تک اُن کا مقابلہ کر سکتا ہوں اور اُن کی بڑھتی ہوئی طغیانی و سرکشی کو روک سکتا ہوں آنحضرتؐ نے ابو طالب کی زبان سے یہ الفاظ سُنے تو آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور بھرائی ہوی آواز میں فرمایا:۔
چچا میں تو انہیں نیکی اور خدا پرستی کی دعوت دیتا ہوں اور میرے منصب کا تقاضا یہی ہے کہ میں انہیں اللہ کے احکام بتاؤں، ناشائستہ اعمال سے روکوں۔ اگر وُہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر سُورج اور دُوسرے ہاتھ پر چاند لا کر رکھ دیں جب بھی میں اعلانِ حق اور ادائے فرض سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ یہ کہہ کر آپ وہاں سے چل دیئے۔ ابو طالب نے پیغمبرؐ کو جاتے دیکھا تو بُوڑھے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ آواز دے کر پیغمبرؐ کو روکا اور اُن کے عزم و استقلال سے متاثر ہو کر پُوری خود اعتمادی کے ساتھ کہا:۔

اذھب یا بن اخی فقل ما	برادر زادے جائیے اور جو چاہے کہیئے۔
احببت فو اللہ لا اسلمك	خدا کی قسم میں کبھی آپ کا ساتھ نہیں
لشئ ابدا۔ (تاریخ طبری ج ۲ ص ۶۷)	چھوڑوں گا۔"

ابو طالب کے اس جرأت آفریں جواب سے پیغمبرؐ کے آنسو پنچھ گئے۔ پُرعزم دِل کا حوصلہ بڑھ گیا اور تنہائی و بے یاری کا احساس جاتا رہا۔ اس تجدیدِ عہد کے بعد ابو طالب نے قریش کی طرف رُخ کیا اور کہا

کہ آپ لوگ کیا کھڑے ہیں جائیے۔

واللہ ما کذب ابن اخی قط — خدا کی قسم! میرے بھتیجے کی زبان کبھی جھوٹ سے آشنا نہیں ہوی۔ (اصابہ۔ ج۴۔ ص۱۱۶)

قریش کے ان وفدوں میں اگرچہ ابوطالب کو ایک واسطہ و ذریعہ ٹھہرایا جاتا رہا ہے مگر وُہ کسی موقع پر قریش کے مسلک کی تائید و ہمنوائی کرتے نظر نہیں آتے۔ اگر وُہ اُن کے نظریات کے ہمنوا ہوتے تو جہاں پیغمبرؐ کو قریش کا پیغام پہنچاتے تھے وہاں یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ آپ اُن کے مذہب کے خلاف کچھ نہ کہیں اور نہ بتوں کی مذمت کریں۔ آخر میں بھی انہی کے مذہب و آئین پر ہوں۔ مگر تاریخ یہ بتانے سے قاصر ہے کہ آپ نے کبھی اُن کی ہمنوائی کی ہو۔ بلکہ صرف ایک پیغامبر کی حیثیت سے پیغام پہنچا دیتے تھے۔ اور کچھ کہتے بھی تھے تو قریش کے خلاف پڑتا تھا۔ قریش بھی ان کے طرزِ عمل سے سمجھ گئے تھے کہ ان کی تمام ہمدردیاں اپنے بھتیجے کے ساتھ ہیں اور اُن سے کبھی یہ اُمید نہیں کی جا سکتی کہ وُہ آنحضرتؐ کی نصرت و حمایت سے دستبردار ہو کر اُن کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ لہٰذا انہوں نے مزید کچھ کہنا سُننا بے سُود سمجھا اور ایک محاذ قائم کر کے پیغمبرِ اکرمؐ کو ستانا اور اذیتیں دینا شروع کر دیں۔ کبھی ڈھیلے مارتے، کبھی کوڑا کرکٹ پھینکتے، کبھی کاہن و مجنون اور آسیب زدہ کہتے؛ اور جب آپ نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو آوازے کستے اور مذاق اُڑاتے۔

پیغمبرِ اکرمؐ ایک دن خانہ کعبہ کے پاس مصروفِ نماز تھے کہ ابوجہل نے حرم میں بیٹھے ہوئے چند آدمیوں سے کہا کہ تم میں کون ہے جو ان کی نماز خراب کرے۔ عبداللہ ابن الزبعری اُٹھا اور خون اور گوبر لے کر آپ کے چہرہ اقدس پر مل دیا۔ آنحضرتؐ نماز سے فارغ ہوئے تو سیدھے ابوطالب کے پاس آئے۔ اور اُن کے سوا کون تھا جو اُن کی حالت پر کڑھتا اور دُکھ درد سُنتا۔ ابوطالب نے پیغمبرؐ کی یہ حالت دیکھی تو اُن کا خون کھولنے لگا۔ پُوچھا کہ یہ کس کی حرکت ہے؟ فرمایا عبداللہ ابن الزبعری کی۔ ابوطالب نے تلوار ہاتھ میں لی اور خانہ کعبہ کی طرف چل دیئے۔ عبداللہ ابن الزبعری اور دُوسرے لوگوں نے جیسے ہی ابوطالب کو آتے دیکھا تو کھسکنا چاہا۔ آپ نے گرج کر کہا کہ اگر تم میں ایک بھی اپنی جگہ سے ہلا تو اس کی جان کی خیر نہیں ہے۔ یہ سُن کر وُہ جہاں بیٹھے تھے وُہیں دبک کر بیٹھ گئے۔ آپ نے خون اور گوبر لے کر ایک ایک کے چہرے پر ملا اور نفرین و ملامت کرتے ہوئے واپس آئے۔

ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ پیغمبرِ اکرمؐ شام تک گھر نہ پلٹے۔ ابوطالب کو فکر دامنگیر ہوی کیونکہ ان حالات میں یہ اندیشہ تھا کہ قریش آنحضرتؐ کو کہیں غائب کر دیں یا قتل کر ڈالیں۔ آپ نے جہاں جہاں آنحضرتؐ کے ملنے کا امکان تھا ڈھونڈھ ڈالا مگر کہیں پتا نہ چل سکا۔ آپ نے چند ہاشمی نوجوانوں کو بُلایا اور اُن سے کہا کہ تم اپنی آستینوں میں تیز دھار خنجر چھپا کر سردارانِ قریش میں سے ایک ایک کے پہلو میں بیٹھ جاؤ اور ایک ابوجہل کے پاس بیٹھ جائے۔ اگر یہ سُنو کہ محمدؐ قتل کر دیئے گئے ہیں تو تم ایک دم اُن پر ٹوٹ پڑنا اور سب کو

بے دریغ قتل کر دینا۔ ہاشمی نوجوانوں نے خنجر سنبھالے اور سرداران قریش کو اپنی زد میں لے کر بیٹھ گئے۔ ابوطالب تلاش میں سرگرداں تھے کہ کوہ صفا کی جانب سے زید ابن حارثہ کو آتے دیکھا پوچھا کہ تم نے میرے بھتیجے کو کہیں دیکھا ہے؟ کہا کہ ہاں میں ابھی ابھی اُن کے پاس سے آرہا ہوں۔ وُہ کوہِ صفا کے دامن میں تشریف فرما ہیں۔ فرمایا انہیں ابھی بُلا کر لاؤ۔ میں جب تک انہیں زندہ و سلامت دیکھ نہ لوں گا گھر واپس نہیں جاؤں گا۔ زید نے آنحضرتؐ کو ابوطالب کی پریشانی کی خبر دی۔ آپ فوراً اُٹھ کر چچا کے پاس آئے۔ ابوطالب نے انہیں صحیح و سالم دیکھا تو اطمینان ہوا۔ دُوسرے دن آپ پیغمبرؐ اکرم اور ہاشمی نوجوانوں کو لے کر قریش کے پاس آئے اور ان نوجوانوں سے کہا کہ جو چیز تم چھپائے ہوئے ہو اُسے ظاہر کر دو۔ سب نے آستینوں سے خنجر نکال کر دکھائے۔ قریش نے پوچھا کہ یہ خنجر کیسے ہیں؟ کہا کہ کل محمدؐ دن بھر غائب رہے۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں وُہ قتل نہ کر دیئے گئے ہوں۔ میں نے ان ہاشمی نوجوانوں کو مامور کیا تھا کہ اگر محمد (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے قتل کی خبر آئے تو سرداران قریش پر حملہ کر دینا۔ وران میں سے کسی کو ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑتا۔ لہٰذا ان تیز دھار خنجروں کو اچھی طرح دیکھ بھال لو۔

واللہ لو قتلتموہ مابقیت	اگر تم محمدؐ کو قتل کر دیتے تو خدا کی قسم!
منکم احدا حتی نتفانی	مَیں تم میں سے ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑتا۔
نحن وانتم۔	ہم بھی مر جاتے اور تمہیں بھی مَوت کے گھاٹ
(طبقات ابن سعد۔ جلد۔ صفحہ ۲۰۳)	اُتار دیتے۔"

قریش اور بنی ہاشم میں رقیبانہ چشمک تو پہلے ہی سے تھی اور اب ان کی معاندانہ روش کے نتیجہ میں اختلاف کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہو گئی اور ان کی دُشمنی و عداوت کھل کر سامنے آگئی۔ قریش کا عناد اس حد تک بڑھا کہ انہوں نے بنی ہاشم سے قطع مراسم کا فیصلہ کر لیا اور انہیں مجبور کر دیا کہ وُہ شہر سے باہر ایک پہاڑ کی گھاٹی میں پناہ لیں۔ یہ مقام بھی قریش کی پہنچ سے باہر نہ تھا۔ اور ہر وقت یہ خطرہ رہتا تھا کہ اچانک کسی سمت سے حملہ نہ ہو جائے، اور رات کے وقت یہ خطرہ اور بڑھ جاتا تھا۔ اس خطرہ کے پیش نظر ابوطالب راتیں جاگ کر کاٹتے، پیغمبرؐ کے بستر پر اپنے بچوں میں سے کسی کو اور علے العموم اپنے چھوٹے فرزند علیؑ کو سُلا دیتے تاکہ رات کے اندھیرے میں حملہ ہو تو اُن کا کوئی بیٹا کام آجائے اور پیغمبرؐ پر آنچ نہ آئے۔ یہ دَور وُہ تھا جب خطۂ عرب میں گنے چُنے چند آدمیوں کے علاوہ پیغمبرؐ کا نہ کوئی حامی تھا اور نہ کوئی مددگار کیا اپنے اور کیا بیگانے سب ہی دشمنی پر آمادہ اور مخالفت پر تُلے ہوئے تھے۔ اس سخت ترین دَور میں ایک ابوطالب تھے جو پیغمبرؐ کی حمایت و پُشت پناہی پر کوہ آسا جمے رہے۔ نہ کسی موقع پر اُن کا ساتھ چھوڑا اور نہ اُن کی نصرت و اعانت سے ہاتھ اٹھایا۔ یہ انہی کی حمایت و پاسداری کا نتیجہ تھا کہ قریش اپنے ارادوں کو عملی جامہ نہ پہنا سکے اور آنحضرتؐ ان کے دسترس سے باہر اور خطروں سے محفوظ رہے۔ وُہ نرمی کے موقع پر

نرمی سے اور سختی کے موقع پر سختی سے دفاع کرتے رہے اور اپنے اثر و نفوذ سے کام لے کر ان کے شیطانی منصوبوں کو ناکام بناتے رہے۔ غرض ہر ممکن طریقہ سے قریش کی شر انگیزیوں کو دبایا اور معاشی مقاطعہ کے بعد اپنی اولاد کو خطرہ میں ڈال کر آنحضرتؐ کے تحفظ کا انتظام کیا۔ اگر وہ عرب کے چیرہ دستوں اور قریش کے فتنہ پردازوں کے ظلمِ ناروا کو روکنے کے لئے کھڑے نہ ہوتے تو مظالمِ قریش کی تاریخ موجودہ تاریخ سے کہیں زیادہ دردناک و الم انگیز ہوتی۔

ابوطالب کی فداکاری و جاں نثاری اور پیغمبرؐ کی نصرت و حمایت میں پامردی وہ مسلمہ حقیقت ہے کہ جس سے آج تک کسی کو انکار کی جرأت نہیں ہو سکی۔ البتہ کچھ لوگوں نے اس نصرت کو دوسرا رنگ دے کر اس کی اصل روح کو مضمحل کر دینا چاہا ہے۔ چنانچہ اس بات پر زور دیا جاتا رہا ہے کہ یہ نصرت مذہبی و اعتقادی جذبہ کے زیرِ اثر نہ تھی بلکہ اس میں قرابت و عزیز داری کے جذبات کارفرما تھے۔ اور عرب تو دور کی قرابت کو بھی نظر انداز نہ کرتے تھے اور پیغمبرؐ تو آپ کے پروردہ اور حقیقی بھتیجے تھے وہ کیونکر ان کی حمایت و پاسداری نہ کرتے اور کیوں اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر اُن کے سینہ سپر نہ ہوتے۔ یہ بات اس حد تک تو صحیح ہے کہ پیغمبرؐ آپ کے قریبی عزیز، پروردۂ خاص اور حقیقی بھائی کی یادگار تھے۔ اور یہ بھی مسلم کہ عرب قرابتداری کا پاس و لحاظ کرتے تھے مگر کتنی بھی عزیز داری کیوں نہ ہو کوئی شخص اپنے مذہب کے مقابلہ میں قرابت و رشتہ داری کا خیال نہیں کرتا چہ جائیکہ اپنے معتقدات کے خلاف آواز اُٹھانے میں تعاون کرے اور اپنے معبودوں کی تذلیل و توہین کے سلسلہ میں ہاتھ بٹائے۔ اور ابوطالب تو بتوں کو برا بھلا کہنے میں پیغمبرؐ کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اور اسلامی نظریات کی تبلیغ و اشاعت میں اُن کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ اسے تو کسی صورت میں پاسِ قرابت کا نتیجہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اور اگر یہ سب کچھ بربنائے قرابت تھا تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بیٹوں سے زیادہ قرابت ہوتی ہے یا بھتیجے سے؟ ظاہر ہے کہ جو قرابت اپنی اولاد سے ہوتی ہے وہ بھائی کی اولاد سے نہیں ہو سکتی۔ تو اگر اس نصرت میں نسبی قرابت کا تقاضا ہی کارفرما ہوتا تو بیٹوں کی جانوں کا خطرہ مول لے کر انہیں پیغمبرؐ کے بستر پر سونے کا حکم نہ دیتے بلکہ ان کا تحفظ پیغمبرؐ کے تحفظ پر مقدم رکھتے۔ اور پھر تاریخ عالم سے ایک مثال بھی ایسی پیش نہیں کی جا سکتی کہ کسی نے ایک ایسے شخص کی خاطر جس کے نظریات کو باطل اور دعویٰ کو غلط سمجھتا ہو محض قرابت کی بنا پر اپنی اولاد کو ہلاکت میں ڈھکیل دیا ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس نصرت میں جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے منفرد تھی قرابت کا جذبہ کارفرما نہ تھا بلکہ دینی و مذہبی رابطہ تھا جو انہیں نصرت میں سرگرم عمل رکھے ہوئے تھا۔ اور دین و مذہب کا رابطہ سب روابط سے قوی تر ہوتا ہے اور اس کے مقابلہ میں تمام روابط مضمحل ہو جاتے ہیں۔ آخر پیغمبرؐ اور ابولہب میں بھی رشتہ تھا۔ وہ بھی پیغمبرؐ کا چچا تھا۔ وہ نسبی قرابت کی بنا پر کیوں نصرت و حمایت کے لئے کھڑا نہ ہوا۔ یا کم از کم اس قریبی رشتہ کی بنا پر دشمنی و عناد کے مظاہروں ہی سے باز رہا ہوتا۔ اسی طرح آذر اور حضرت ابراہیمؑ میں رشتہ تھا۔ وہ بھی خلیلؑ خدا کا

چچا ہی تھا۔ وُہ اُن کی ایذا رسانی کے کیوں درپے ہوا۔ یُونہی نوحؑ اور اُن کے فرزند میں اس رشتہ سے بھی قوی تر رشتہ تھا۔ وُہ کفار کی ہمنوائی میں باپ کو چھوڑ کر کیوں الگ ہو گیا۔ نوحؑ اور لوطؑ اور اُن کی بیویوں کے درمیان رشتہ تھا اُن میں منافرت کی خلیج کیوں حائل رہی۔ اسی لئے نا کہ اُن میں مذہبی اتحاد نہ تھا۔ غرض ابو طالب کی نصرت و حمایت کو قرابت پر محمول کر کے ایک طرح سے اُن پر ظلم ڈھانا اور اُن کی کاوشوں اور جانفشانیوں پر پانی پھیرنا ہے۔

جناب ابو طالب کے اس طرزِ عمل کو دیکھنے کے بعد کہ انھوں نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ آنحضرتؐ کی خدمت، نصرت اور حمایت کے لئے وقف کر دیا۔ ہر متوازن ذہن یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ اگر وہ پیغمبرؐ کی صداقت کے قائل اور کفار و مشرکین کے عقائد و اعمال سے بیزار نہ ہوتے تو آنحضرتؐ کی نصرت و حمایت پر اس تندہی سے آمادہ نہ ہوتے اور نہ ان کی وجہ سے پُرسکون زندگی کو تج کر قوم و قبیلہ اور دُنیا جہان کی دُشمنی مُول لیتے۔ یہ ایک واضح ثبوت ہے کہ ان کا دل یقین کی شعاعوں سے روشن اور صدق و صفا کی ضو پاشیوں سے منور تھا اور اُن کے صفحۂ قلب پر اللہ کی وحدانیت اور پیغمبرؐ کی رسالت کے نقوش ثبت تھے اور وُہ دل کی گہرائیوں سے نبوّت کی تصدیق کر چکے تھے۔ اور اسی تصدیقِ قلبی و یقینِ باطنی کا نام ایمان ہے۔ چنانچہ قاضی عضد الدین نے تحریر کیا ہے:۔

"ہمارے نزدیک ایمان یہ ہے کہ اُن چیزوں میں رسُولؐ کی تصدیق کی جائے جن کا شریعت میں وارد ہونا صراحتہً ثابت ہے۔ اور یہی اکثر ائمہ کا مسلک ہے جیسے قاضی (باقلانی) اور استاد (ابو اسحاق اسفرائنی)۔"	فھو عندنا وعلیہ اکثر الائمۃ کالقاضی والاستاذ التصدیق للرسول فیما علم مجیئہ بہ ضرورۃ۔ (شرح مواقف۔ ص۷۱۵)

جب اکابر علماء و جمہور محققین کے نزدیک قلبی تصدیق اور باطنی اعتقاد ہی کا نام ایمان ہے تو پھر حضرت ابو طالب کے ایمان سے انکار کی کیا وجہ؟ جبکہ نشرِ اسلام، تبلیغ دین اور نصرتِ رسُول کے سلسلہ میں اُن کا کردار اُن کی تصدیقِ قلبی کا زندہ ثبوت اور اُن کے ایمان کی واضح شہادت ہے۔ بلکہ اُن کے عمل و کردار اور خلوص و ایثار کی نظیر ان لوگوں میں بھی نظر نہیں آتی جنہوں نے برملا ایمان کا اقرار اور آنحضرتؐ کی رسالت کا اعتراف کیا تھا۔ پھر اظہارِ ایمان تو منافقت کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے اور ایسے لوگوں کی کبھی کمی نہیں رہی جنہوں نے زبان سے اسلام کا اقرار کیا، بڑے بلند بانگ دعوے کئے اور جب مُسلمانوں پر کوئی مصیبت پڑی تو گھر کے گوشہ میں دبکے بیٹھے رہے یا دُشمنوں سے ساز باز کرتے رہے اور اس طرح اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچاتے رہے۔ سچّا ایمان وُہ ہے جو دِل کی گہرائیوں سے ہو نہ صرف نوکِ زبان سے۔ کیونکہ ایمان اعتقاد کا نام ہے اور اعتقاد کی منزل دِل ہے نہ حنجرہ و حلق۔ اگر صرف زبانی اقرار ہی کا نام ایمان ہوتا تو ایسے ایمان لانے والوں سے

ایمان کی نفی نہ کی جاتی۔ ارشادِ خداوندی ہے:۔

ومن الناس من یقول اٰمنّا باللہ وبالیوم الاخر وماھم بمؤمنین۔	کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو زبان سے کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لائے حالانکہ وُہ ایمان لانے والے نہیں ہیں"۔

البتہ قلبی تصدیق اور عقیدہ وُہ چیز ہے جس میں منافقت و دُو رُخی کا گزر نہیں ہو سکتا۔ اور ہر عمل ایمان کا آئینہ دار اور اُس کے تقاضوں کے مطابق ہوتا ہے۔ اور انہی اعمال کو دیکھ کر ایمان کا حکم لگایا جاتا ہے اس لئے کہ ایمان کے معنی یقین و اعتقاد کے ہیں۔ اور یقین اپنے اثرات سے اور اعتقاد، اعتقاد پر مرتب ہونے والے اعمال سے پہچانا جاتا ہے۔ ابو طالب کی زندگی اور اُن کے عمل و کردار پر نظر کرنے کے بعد اس سے انکار کی گنجائش نہیں ہے کہ ان کی کوششیں اسلام کے استحکام میں بُنیادی پتھر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انہوں نے ہر طرح کی مصیبتیں سہہ کر اسلام کے نشر و فروغ کی راہیں ہموار کیں اور پُورے خلوص و دیانت کے ساتھ پیغمبرؐ کے خدمات و کارِ متعلقہ انجام دیتے رہے اور مشرکانہ رسُوم و بُت پرستی سے الگ رہ کر اسلام کے تعلیمات پر عمل پیرا رہے۔ جب وُہ عملاً اسلامی احکام کے پابند اور دینِ حنیف کے پیرو تھے۔ اور اُن کی زندگی کے واقعات سے اسلام دوستی اور پیغمبرؐ کی اطاعت و پیروی عیاں ہے تو پھر کسی کو یہ حق کہاں سے پہنچتا ہے کہ انہیں دائرۂ اسلام سے خارج قرار دے جبکہ قرآن یہ کہتا ہے کہ اگر کسی کا طور طریقہ اسلامی اور اس کے اعمال مُسلمانوں کے سے ہوں تو اُسے کُفر کی زد میں نہ لے آؤ۔

ولا تقولوا لمن القیٰ الیکم السلام لست مؤمنا۔	جو شخص تمہیں سلام کرے (اور اپنے کو مسلمان ظاہر کرے) تو تم یہ نہ کہہ دیا کرو کہ تُو ایماندار نہیں ہے"۔

اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ انہوں نے علانیہ اظہارِ اسلام نہیں کیا تو جمہور علماء کے نزدیک اعلانِ اسلام شرطِ اسلام نہیں ہے خصوصاً جبکہ اسلام کے مخفی رکھنے میں کوئی مصلحت کارفرما ہو یا کوئی ضرورت اظہار سے مانع ہو۔ چنانچہ ابتدائے بعثت میں کہ جب دعوتِ اسلام مخفی تھی پیغمبرؐ مسلمانوں کو اظہارِ اسلام سے خود منع کرتے تھے۔ اور یہ اسلام کے تحفّظ کا ایک حکیمانہ طریق کار تھا۔ اس ہدایت کے پیشِ نظر بیشتر مسلمان چند سالوں تک اپنے اسلام کو پوشیدہ رکھتے رہے اور کوئی بھی اُن کے اسلام سے آگاہ نہ تھا۔ وُہ اُسی حد تک اسلامی امُور کا لحاظ کرتے تھے جہاں تک اُن کے حالات اجازت دیتے تھے اور اُن کے اختیار میں ہوتا تھا۔ بلکہ جب اسلام ایک جماعتی صُورت اختیار کر رہا تھا اور کم کم یہ جماعت آشکارا ہوتی جا رہی تھی اُس وقت بھی کچھ مسلمان ایسے تھے جو اپنے ایمان کو مخفی رکھتے تھے اور لوگوں کے اندر غیر مُسلم کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ وُہ اپنے حالات کی کمزوریوں یا بعض خاندانی مصلحتوں کی بناء پر اپنے ایمان کو مخفی رکھنے پر مجبُور تھے۔ اگرچہ وُہ کفار کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے اور بظاہر انہی میں شمار ہوتے تھے لیکن وُہ اسلامی عقائد کے پُورے معتقد تھے۔ تاریخ بتاتی ہے

کہ حضرت عمرؓ کی بہن فاطمہ جو سعید ابن زید سے بیاہی ہوی تھیں اور اپنے شوہر کے ساتھ اسلام لا چکی تھیں وُہ اپنے اسلام کو مخفی رکھتی تھیں۔ اسی طرح نعیم ابن عبداللہ جو قبیلہ بنی عدی سے تھے مُسلمان ہو چکے تھے مگر اپنے قبیلہ کے ڈر سے اپنے اسلام کو پوشیدہ رکھتے تھے۔ یُوں ہی اور چند قبیلوں کے افراد اسلام لا چکے تھے مگر قبائلی پابندیوں اور سخت گیریوں کی وجہ سے اپنے اسلام کو چھپاتے تھے۔ ہجرتِ پیغمبرؐ کے بعد کہ جب مدینہ میں ایک گونہ اسلامی حکومت کی تشکیل ہو چکی تھی مکہ میں مُسلمانوں کی ایک ایسی جماعت موجود تھی جو بظاہر مسلمان نہ تھی مگر در پردہ اسلام کی پابند تھی۔ عمِ رسُولؐ عباس ابن عبدالمطلب بھی اسی جماعت کی ایک فرد تھے۔ چنانچہ ابو رافع کہتے ہیں کہ:۔

کُنت غلاما للعباس ابن عبدالمطلب وکان الاسلام قد دخلنا اھل البیت واسلمت ام الفضل واسلمت وکان العباس یھاب قومہ ویکرہ ان یخالفھم وکان یکتم اسلامہ۔ (تاریخ طبری۔ جؒ۔ ص۱۵۹)

"مَیں عباس ابن عبدالمطلب کا غلام تھا اور پیغمبرؐ کے عزیزوں کے گھروں میں اسلام آ چکا تھا چنانچہ ام الفضل (زوجہ عباس) اور میں اسلام لا چکے تھے اور عباس اپنی قوم سے ڈرتے تھے اور اُن کی مخالفت پسند نہ کرتے تھے اور اپنے اسلام کو چھپائے رکھتے تھے۔"

یہ لوگ اپنے اسلام کو چھپا کر مسلمانوں کی ایسی خدمات انجام دیتے تھے جو اظہارِ اسلام کے بعد ممکن نہ تھیں چنانچہ انہی لوگوں کے ذریعہ قریش کی نقل و حرکت کی خبریں اور دُشمن کے جنگی عزائم کی ایسی اطلاعیں مدینہ پہنچتی تھیں جن سے اسلام کا اجتماعی مفاد وابستہ ہوتا تھا اور پیغمبرؐ اکرم پیش آیند حالات میں اُن سے فائدہ اُٹھاتے تھے۔ اور ہمیشہ اُن لوگوں سے رابطہ قائم رکھتے تھے۔ ابن عبدالبر نے عباس ابن عبدالمطلب کے بارے میں تحریر کیا ہے:۔

کان یکتب باخبار المشرکین الی رسُولؐ اللہ وکان المسلمون یتقوون بہ بمکۃ وکان یحب ان یقدم علے رسُولؐ اللہ فکتب الیہ رسُولؐ اللہ ان مقامک بمکۃ خیر۔ (استیعاب جؒ۔ ص۴۸۵)

"وُہ مُشرکین کے بارے میں تمام خبریں پیغمبرؐ اکرم کو تحریراً بھیجتے جس سے مسلمانوں کو تقویت حاصل ہوتی۔ عباس چاہتے تھے کہ رسُولؐ اللہ کے پاس چلے جائیں۔ مگر آنحضرتؐ نے انہیں تحریر کیا کہ تمہارا مکّہ ہی میں قیام بہتر و سُود مند ہے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ ان لوگوں کا اخفائے اسلام پیغمبرؐ کی اجازت سے تھا۔ اور اگر اخفائے اسلام آئینِ اسلام کے خلاف ہوتا تو آنحضرتؐ اس کی اجازت نہ دیتے۔ بہرحال اخفائے اسلام، اسلام کے منافی نہیں ہے

اور مخفی اسلام بھی دینِ پیغمبرؐ میں اسی طرح موردِ اعتبار و اعتماد ہے جس طرح علانیہ اقرارِ اسلام۔
اگر اثباتِ ایمان کے لئے زبانی اقرار و اعلان کو بھی ضروری قرار دیا جائے تو یہ شرط تو بہرحال غیر ضروری ہوگی کہ وُہ مخصوص لفظوں میں ہو تو معتبر ہے ورنہ نا قابلِ اعتبار۔ جب یہ قید ضروری نہیں ہے تو ابو طالب کے اقرارِ رسالت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ انھوں نے مختلف الفاظ و عبارات میں آنحضرتؐ کی نبوّت کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ پیغمبرؐ اکرم ایک مرتبہ اُن کے ہاں عیادت کے لئے آئے تو آپ نے عرض کیا:-

یا ابن اخی ادع ربّك الذی بعثك يعافينی۔ (اصابہ۔ جؔ۴۔ صؔ۱۱۴)

اے میرے بھتیجے اپنے پروردگار سے دُعا کیجئے جس نے آپ کو مبعوث کیا ہے کہ مجھے شفا بخشے۔"

آنحضرتؐ نے دستِ بدعا ہو کر کہا اللّٰھم اشف عمی۔ خدایا میرے چچا کو شفا دے۔" اس دُعا کے نتیجہ میں آپ فورًا شفایاب ہو گئے اور بسترِ بیماری سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اگر آپ آنحضرتؐ کو خدا کا فرستادہ رسُولؐ نہ سمجھتے ہوتے تو ان کی رسالت و بعثت کو بیچ میں لا کر دُعا کے طلبگار نہ ہوتے۔ کیا بعثت کا اعتراف رسالت کا اعتراف نہیں ہے اور کیا دُعا کے نتیجہ میں فورًا شفایابی سے ان کے یقین پر جلا نہ ہوئی ہوگی؟ اس کے علاوہ آپ کے وُہ اشعار اقرارِ رسالت کے ثبوت میں بہت کافی ہیں جن میں اسلام کی صداقت دین کی حقانیت اور آنحضرتؐ کی رسالت کا واضح لفظوں میں اعتراف کیا گیا ہے اور وُہ اشعار اس کثرت سے ہیں کہ ابن شہر آشوب مازندرانی نے متشابہات القرآن میں سورۃ حج کی آیت ولینصرنہ اللہ من ینصرہ۔ کے ذیل میں تحریر کیا ہے کہ حضرت ابو طالب کے وُہ اشعار جو ان کے ایمان و تصدیقِ رسالت پر روشنی ڈالتے ہیں تین ہزار سے زائد ہیں۔ ابن ابی الحدید نے آپ کے مختلف اشعار درج کرنے کے بعد تحریر کیا ہے:-

ھٰذہ الاشعار جاءت مجیٔ التواتر لانہ ان لم یکن احادھا متواترۃ فمجموعھا یدل علی امر واحد مشترك وھُوَ تصدیق محمّد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلّم ومجموعھا متواتر۔ (شرح ابن ابی الحدید جؔ۳ صؔ۳۱۵)

یہ اشعار تواتر کے طور پر نقل ہوتے آئے ہیں اگر متفرق طور پر ان میں تواتر نہ بھی ہو مگر مجموعی طور پر بہرحال متواتر ہیں کیونکہ وُہ مجموعی طور پر ایک ہی امر کی نشان دہی کرتے ہیں جو ان سب میں قدرِ مشترک ہے۔ اور وُہ قدرِ مشترک محمّد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی صداقت کا اعتراف ہے۔"

ذیل میں حضرت ابو طالب کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں۔ یہ اشعار ان کے عقائد و نظریات کی پُوری ترجمانی کرتے ہیں اور مؤرخین نے انہیں صحت و وثوق کے ساتھ نقل کیا ہے۔
جب کفارِ قریش نے پیغمبرؐ کی طرف کذب بیانی کی نسبت دی تو آپ نے آنحضرت کو مخاطب کر کے یہ اشعار کہے:-

انت الامین امین اللہ لاکذب　　والصادق القول لالھو ولالعب

آپؐ امین اور اللہ کے امین ہیں جس میں جھوٹ نہیں۔ اور لچر اور پوچ باتوں سے پاک اور راست گفتار ہیں۔"

انت الرسول رسول اللہ نعلمہ　　علیک تنزل من ذی العزۃ الکتب

آپؐ وُہی اللہ کے رسولؐ ہیں جن کا ہمیں علم ہے۔ اور آپؐ ہی پر تو رب العزت کی طرف سے قرآن نازل ہوا۔" (مناقب شہر آشوب ج۔ ص۳۹)

جب قریش نے آپ سے یہ کہا کہ پیغمبرؐ کو خاموش کیجئے ورنہ ہم سختی و تشدد کریں گے، تو آپ نے یہ اشعار کہے:

واللہ لن یصلوا الیک بجمعھم　　حتیٰ اوسد فی التراب دفینا

خدا کی قسم جب تک میں زیرِ زمین دفن نہ کر دیا جاؤں قریش اپنے جتھوں سمیت آپؐ کے قریب پھٹک نہیں سکتے۔"

فاصدع بامرک ماعلیک غضاضۃ　　وابشر بذاک وقرمنک عیونا

بے کھٹکے اللہ کے احکام بیان کیجئے اور اس طرح خوش و خرم رہ کر اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کیجئے۔"

ودعوتنی وعلمت انک ناصحی　　ولقد دعوت وکنت ثم امینا

آپ نے مجھے دعوتِ اسلام دی اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ میرے خیر خواہ ہیں اور پھر آپ امین بھی تو ہیں۔"

ولقد علمت بان دین محمدؐ　　من خیر ادیان البریۃ دینا

مجھے یقین ہے کہ محمّد (صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کا دین دُنیا کے تمام دینوں سے بہتر ہے۔" (تاریخ ابن کثیر ج۳۔ ص۴۲)

جب شعبِ ابوطالب میں پناہ لی تو ایک سو بیس اشعار کا ایک طویل قصیدہ کہا۔ اس قصیدہ کے چند شعر یہ ہیں:

کذبتم وبیت اللہ نبزی محمدؐا　　ولما نطاعن دونہ وننا ضل

خانہ کعبہ کی قسم تمہارا خیال غلط ہے کہ ہم محمدؐ کے بارے میں دبا دیئے جائیں گے اور اُن کے سینہ سپر ہو کر نیزے اور تیر نہیں چلائیں گے۔"

ونسلمہ حتی نصرع حولہ　　ونذھل عن ابناءنا والحلائل

ہم اُس وقت تک انہیں دُشمنوں کے حوالے نہیں کریں گے جب تک اُن کے سامنے مر نہ جائیں اور اپنے بیوی بچوں کو بھول نہ جائیں۔"

حدبت بنفسی دونہ وحمیتہ　　ودافعت عن بالزرا والکلاکل

میں نے دل و جان سے اُن کی حفاظت کی اور اپنے دست و بازو اور سینہ کے زور سے اُن کا دفاع کیا۔"

فایدہ رب العباد بنصرہ　　واظھر دینا حقہ غیر باطل

پروردگارِ عالم اپنی نصرت سے اُن کی دستگیری کرے اور اس دین کو جو سراسر حق، اور باطل کی

آمیزش سے پاک ہے غلبہ دے۔" (سیرۃ ابن ہشام۔ ج۱۔ ص۲۹۱)

ابن ہشام نے اس قصیدہ کے متعدد اشعار درج کرنے کے بعد تحریر کیا ہے کہ ایک سال اہل مدینہ بارش کے نہ ہونے سے قحط کی سختیوں میں مبتلا ہو گئے پریشان و سراسیمہ حال پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور التجا کی کہ آپ دعا فرمائیں کہ اللہ بارش برسائے اور قحط سالی دور کرے۔ پیغمبر اکرمؐ نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی ابھی دعا کے الفاظ ختم ہوئے تھے کہ افق پر گھٹائیں چھا گئیں اور اس طرح جھوم کر برسیں کہ جل تھل بھر گئے۔ برستے پانی کو دیکھ کر آنحضرت کو ابو طالب یاد آئے اور فرمایا: لو ادرك ابو طالب هذا اليوم لسرہ۔" اگر آج ابو طالب زندہ ہوتے تو بہت خوش ہوتے۔" ایک شخص نے کہا شائد آپ کو ان کا یہ شعر یاد آگیا ہے جو آپ کے بارے میں کہا تھا:

وابيض يستسقى الغمام بوجهه ثمال اليتمى عصمة للارامل

وہ روشن چہرے والے جن کے روئے مبارک کا واسطہ دے کر باران رحمت طلب کی جاتی ہے جو یتیموں کی ڈھارس اور بیواؤں کا سہارا ہیں۔"

فرمایا کہ ہاں میرا اشارہ اسی طرف تھا۔

پیغمبر کے دل پر ابو طالب کی محبت و خلوص کے نقوش اتنے گہرے تھے کہ وہ کسی لمحہ انہیں فراموش نہ کرتے تھے اور زندگی کے آخری لمحوں میں بھی ان کی یاد تازہ کی۔ بلاذری نے لکھا ہے کہ جب آنحضرت پر مرض کی شدت ہوئی اور جناب فاطمہ نے آپ کی حالت دگرگوں دیکھی تو کہا میری کائنات آپ پر فدا، خدا کی قسم آپ ویسے ہی ہیں جیسا کہنے والے نے کہا ہے:۔

وابيض يستسقى الغمام بوجهه ثمال اليتمى عصمة للارامل

آنحضرت نے یہ سن کر آنکھیں کھول دیں اور فرمایا:۔

هذا قول عمی ابی طالب (انساب الاشراف ج۱ ص۵۵۳) یہ تو میرے چچا ابو طالب کا شعر ہے۔"

ابو طالب کے اشعار ان کے جذبۂ ایمان، جوش عقیدت، اعتراف صداقت اور اسلام و بانیٔ اسلام سے والہانہ محبت کے آئینہ دار ہیں۔ اور ایک ایک شعر ان کے ایمان کی ناطق برہان اور روشن آیت ہے۔ اگر تعصب و تنگ نظری سے کام نہ لیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کے ایمان سے انکار کیا جائے یا اس میں شک و شبہ کیا جا سکے۔ انصاف سے کہیئے کہ اگر ان اشعار میں سے ایک آدھ شعر کسی اور کی طرف منسوب ہوتا تو کیا اسے اس کے ایمان کی دستاویز بنا کر پیش نہ کیا جاتا اور ایک ناقابل شکست دلیل کا درجہ نہ دیا جاتا۔ پھر کس گناہ کی پاداش میں ابو طالب ایسے جاں نثار پیغمبرؐ کے ایمان سے صریح انکار کیا جاتا ہے۔ کیا اس جرم پر کہ انہوں نے آنحضرتؐ کو پالا پوسا اور پروان چڑھایا، یا اس جرم پر کہ انہوں نے کفار قریش سے ان کا تحفظ کیا، یا اس قصور پر کہ انہوں نے مشرکین کی سازشوں کو ناکام بنایا یا اس خطا پر کہ انہوں نے جان، مال اور اولاد کی قربانی تک سے دریغ نہ کیا یا اس جرم پر کہ انہوں نے اپنے اشعار کے ذریعہ نبوت کا پیغام عرب کے گوشہ گوشہ میں پہنچایا۔ اگر کفر اس کا نام ہے تو ملأ اعلے سے روح ابو طالب پکارے گی کہ: ———— "نازم بہ کفر خود کہ بہ ایمان برابر است"

حقیقت یہ ہے کہ ابوطالب کا جُرم ایک اور صرف ایک ہے۔ اور وُہ یہ کہ وُہ حضرت علیؑ کے والد ہیں ورنہ ہر چشم بینا تاریکی و روشنی کا فرق محسوس کرتی اور کفر و ایمان میں امتیاز کر سکتی ہے۔ اگر روشنی کی شعاعیں نظروں کو کھینچ رہی ہوں اور کسی تاریک نظر انسان کو ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آئے اور روشنی کی کرن تک دکھائی نہ دے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ نور و روشنی کا وجود نہیں ہے۔ وُہ تو اپنے مقام پر ایک حقیقت ثابتہ ہے۔ اسی طرح ابوطالب کا ایمان بھی ایک تابندہ حقیقت ہے جس سے وُہی انکار کرے گا جو سپیدۂ سحر اور ضیائے انجم کے انکار کا عادی ہو۔ ابن ابی الحدید نے کیا خُوب کہا ہے:۔

وماضر مجد ابی طالب جهول لغا او بصیر تعامی

کسی جاہل کی بیہودہ گوئی اور واقفِ حال کی عمداً چشم پوشی سے ابوطالب کی عظمت و بزرگی گھٹ نہیں سکتی"۔

کما لا یضر ایاة الصباح من ظن ضوء النهار الظلاما

جس طرح دن کے اُجالے کو اندھیرا سمجھ لینے سے صبح کی درخشندگیوں پر بُرا اثر نہیں پڑتا"۔

حضرت ابوطالب کے ایمان کا اثبات انہی شعروں پر منحصر نہیں ہے بلکہ اشعار سے بڑھ کر اہمیت ان اقوال و ارشادات کی ہے جو پیغمبر اکرمؐ اور آئمۂ اہلبیتؑ نے اُن کے ایمان کے سلسلہ میں فرمائے ہیں۔ یہ ارشادات دو اعتبار سے اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک یہ کہ آئمۂ اہلبیت اُنہی کی اولاد اور اُنہی کے خاندان کے افراد ہیں اور ہر شخص کی زندگی کا ورق اس کی اولاد اور خاندان کے سامنے کُھلا ہوتا ہے وُہ اُن سے نہ اپنا عقیدہ مخفی رکھ سکتا ہے اور نہ اپنے اعمال و افعال۔ اس لئے ان کی شہادت زیادہ اعتماد و اعتبار کے قابل ہوگی۔ دُوسرے یہ کہ شرعی نقطۂ نظر سے بھی ان کے اقوال و ارشادات سند قرار دیئے گئے ہیں جس کے بعد نہ اُنہیں جنبہ داری پر محمول کیا جا سکتا ہے نہ خاندانی عصبیت پر۔ چنانچہ محدث دہلوی نے حدیث نبوی ما ان اخذتم به لن تضلوا کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

المراد بالاخذ لهم التمسك بمحبتهم و محافظة حرمتهم والعمل بروایتهم والاعتماد علی مقالتهم۔

(حاشیۂ مشکوٰۃ۔ ص۵۶۹)

اخذ سے مُراد یہ ہے کہ اہلبیتؑ کی محبت سے وابستہ رہا جائے، اُن کی عزت و حرمت کا پاس و لحاظ رکھا جائے، اُن کی روایات پر عمل کیا جائے اور اُن کے اقوال پر اعتماد کیا جائے"۔

آئمۂ اہلبیت میں سے کسی ایک نے بھی ابوطالب کے ایمان میں شک و شُبہ کا اظہار نہیں کیا۔ بلکہ سب کے سب اُن کے ایمان پر متفق و متحد ہیں۔ اس اتفاق و اتحاد کو اجماع اہلبیتؑ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور یہ اجماع علماءِ اسلام کے نزدیک ایک مستند ماخذ تسلیم کیا جاتا ہے اور حجت و سند کا درجہ رکھتا ہے۔ چنانچہ

ابو الکرام عبد السّلام ابن محمدؒ کہتے ہیں:۔

اتفق ائمۃ اھل البیت ان ابا طالب مات مسلمًا و خلاف اھل البیت فی الاسلام غیر معتبر۔ (ارجح المطالب۔ ص۲۶۸)۔	ائمۂ اہل بیتؑ اس امر پر متفق ہیں کہ ابو طالب مسلمان مرے۔ اور جو بات اہل بیتؑ کے مسلک کے خلاف ہو وہ اسلام میں غیر معتبر ہے"۔

علماءِ شیعہ میں سے علامہ طبرسی تحریر کرتے ہیں:۔

قد ثبت اجماع اھل البیتؑ علےٰ ایمان ابی طالب واجماعھم حجۃ۔ (مجمع البیان۔ ج۷۔ ص۳۸)۔	ابو طالب کے ایمان پر اہل بیت کا اجماع ثابت ہے اور ان کا اجماع حجت و سند ہے"۔

ذیل میں پیغمبرؐ اسلام اور آئمۂ اہلبیتؑ کے متعدد ارشادات میں سے چند ارشاد درج کئے جاتے ہیں جو اس امر کا واضح ثبوت ہیں کہ آنحضرتؐ اور اہلبیتؑ اطہار ابو طالب کے ایمان اور اُن کی نجات اُخروی پر یک رائے و یک زبان تھے۔

عباس ابن عبد المطلب نے پیغمبر اکرمؐ سے عرض کیا کہ کیا آپ ابو طالب کی نجات کے متوقع ہیں؟ فرمایا:۔

کل الخیر ارجو من ربی (طبقات ابن سعد۔ ج۱۔ ص۱۲۴)۔	میں اُن کے لئے اپنے پروردگار سے ہر قسم کی بھلائی کا متوقع ہوں"۔

حضرت علی ابن ابی طالب کا ارشاد ہے:۔

ما مات ابو طالب حتیٰ اعطی رسولؐ اللہ من نفسہ الرضا۔ (شرح ابن ابی الحدید۔ ج۳۔ ص۳۱۲)	ابو طالب اس وقت تک موت سے ہمکنار نہیں ہوے جب تک رسولؐ خدا کو اپنی طرف سے راضی و خوشنود نہیں کر لیا"۔

امام زین العابدین علیہ السّلام سے ایمانِ ابو طالب کے بارے میں پُوچھا گیا تو آپؑ نے فرمایا:۔

واعجبا ان اللہ نھی رسولہ ان یقر مسلمۃ علےٰ نکاح کافر و قد کانت فاطمۃ بنت اسد من السابقات الی الاسلام و لم تزل تحت ابی طالب حتیٰ مات۔ (شرح ابن ابی الحدید۔ ج۳۔ ص۳۱۲)	تعجّب ہے کہ اللہ نے تو رسولؐ خدا کو یہ حکم دیا کہ وُہ کسی مُسلمان عورت کو کافر کے نکاح میں نہ رہنے دیں، اور فاطمہ بنت اسد جو اسلام میں سبقت کرنے والی خواتین میں سے تھیں وُہ ابو طالب کے مرتے دَم تک ان کی زوجیّت میں رہیں"۔

اس مقام پر یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ فاطمہ بنتِ اسد اوائل بعثت میں اسلام لائیں اور بعد اسلام دس برس تک

حضرت ابو طالب کی زوجیت میں رہیں۔ اگر ان دونوں میں مذہبی اختلاف ہوتا تو اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ دونوں میں آئے دن تکرار اور مذہبی نزاع رہتی۔ مگر کوئی تاریخ یہ نہیں بتاتی کہ ان میں کبھی لڑائی جھگڑا یا نظریاتی ٹکراؤ پیدا ہوا ہو۔

امام محمد باقر علیہ السّلام کا ارشاد ہے:۔

مات ابو طالب ابن عبدالمطلب مسلما مومنا۔ (الحجۃ ابن معد ص۲۷)

ابو طالب ابن عبدالمطلب دنیا سے مسلم و مومن اٹھے۔"

امام جعفر صادق علیہ السّلام سے ایک شخص نے کہا کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ابو طالب کافر مرے؟ فرمایا وہ لوگ جھوٹے ہیں۔ وہ تو پیغمبرؐ کی نبوت کا اعتراف و اقرار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

الم تعلموا انا وجدنا محمدًا نبیا کموسٰی خط فی اول الکتب

"کیا تمہیں نہیں معلوم کہ ہم نے محمدؐ کو ویسا ہی نبی پایا ہے جیسے موسٰیؑ تھے جن کا تذکرہ پہلی کتابوں میں موجود ہے۔" (اصول کافی۔ ص۲۴۴)

امام موسٰی کاظم علیہ السّلام سے درست ابن ابی منصور نے ایمان ابو طالب کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا:۔

اقر بالنبی وبما جاء بہ۔ (اصول کافی۔ ص۲۴۲)

انہوں نے پیغمبرؐ کا اور جن چیزوں کو وہ لے کر آئے سب کا اقرار کیا۔"

امام رضا علیہ السّلام نے ابان ابن محمود کو اس کے ایک مکتوب کے جواب میں تحریر فرمایا:۔

ان لم تقر بایمان ابی طالب کان مصیرك الی النار۔ (مرأۃ العقول۔ ج۔ ص۲۶۴)

اگر تم ابو طالب کے ایمان کا اقرار نہیں کرو گے تو تمہاری بازگشت دوزخ کی طرف ہو گی۔"

امام حسن عسکری علیہ السّلام کا ارشاد ہے:۔

ان ابا طالب کمومن آل فرعون یکتم ایمانہ۔ (الحجۃ ابن معد ص۱۱۵)

ابو طالب مومن آلِ فرعون کی مانند تھے جو اپنے ایمان کو مخفی رکھتے تھے۔"

ابتدائے زمانۂ بعثت میں ابو طالب کا اپنے ایمان کو پردۂ خفا میں رکھنا اور کفار قریش کے سامنے کھل کر اپنے عقیدہ کا اظہار نہ کرنا ان کی انتہائی فراست و موقع شناسی کا نتیجہ تھا۔ اگر وہ اعلان رسالت کے ساتھ ہی اسلام کا اعلان کر دیتے تو کفار قریش نے جس طرح آنحضرتؐ کے خلاف علانیہ محاذ قائم کر لیا تھا اسی طرح ان کی دشمنی پر بھی کھلم کھلا اتر آتے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ جس طوفان مخالفت کو وہ اپنے تدبر اور حکمت عملی سے روکے ہوئے تھے نہ روک سکتے، بلکہ قریش کو اپنا حریف بنا کر اس نہج پر پیغمبرؐ کی مدد نہ کر

سکتے جس نہج پر انہوں نے کی ہے۔ اگرچہ کفار قریش سے یہ بات ڈھکی چھپی ہوئی نہ تھی کہ ابو طالب ہر موقع پر پیغمبرؐ کا ساتھ دیتے اور اُن کی تائید و حمایت کرتے ہیں جس کی وجہ سے اسلام کی آواز اُبھر رہی ہے اور مسلمانوں کا دائرہ وسیع ہو رہا ہے۔ مگر اُن کے پاس بظاہر کوی وجہ جواز نہ تھی کہ وُہ اُن سے اُلجھتے اور انہیں اپنا حریف ٹھہراتے۔ اس مدبرانہ روش کا نتیجہ یہ ہؤا کہ انہیں کفار کو سمجھانے بجھانے اور اسلام کی خوبیوں سے آگاہ کرنے کے مواقع ملتے جس سے حق پسند افراد اسلام کی طرف کھنچتے اور پیغمبرؐ کے ہدایت آفرین کلمات کان دھر کر سُنتے۔ اگر ابو طالب یہ طریق کار اختیار نہ کرتے تو اس کفر پرور فضا میں جبکہ قریش اپنی کثرت اور طاقت کے بل بوتے پر حق کو دبانے اور اسلام کو کچلنے پر تُلے ہوئے تھے کبھی اسلام کو اُبھرنے کا موقع نہ ملتا۔ بلا شُبہ قریش کی معاندانہ کارروائیوں اور مخالفت کی طوفان انگیزیوں میں آنحضرتؐ کو تبلیغ اسلام کا جو بھی موقع ملا وُہ ابو طالب کی حمایت و طرفداری اور ان کے مُدبّرانہ طریق کار اور حکیمانہ روش کی بدولت ملا۔ اگر ان کا دم نہ ہوتا تو ظاہری اسباب و حالات کی بناء پر اسلام کا آوازہ فضائے مکہ میں بلند نہ ہوتا، اور حق کی آواز باطل کے شور و شغب میں دب کر رہ جاتی۔ یہ انہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ اسلام کا چراغ کفر کی تیز آندھیوں کے تھپیڑوں سے محفوظ رہا اور کفار و مشرکین کی سینہ زوریوں کے باوجود اس کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ فرقہ معتزلہ کے مشہور عالم ابن ابی الحدید نے ایمان ابو طالب میں سکوت اختیار کرنے کے باوجود ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہُوئے کہا ہے:۔

ولولا ابوطالب وابنه لما مثل الدین شخصا وقاما

اگر ابو طالب اور اُن کے فرزند (علیؑ) نہ ہوتے تو اسلام کبھی اپنے پیروں پر جم کر کھڑا نہ ہوتا۔"

فذاك بمكة اوى وحامى وهذا بيثرب خاض الحماما

ان میں سے ایک نے مکہ میں حمایت و پُشت پناہی کی اور دُوسرے نے مدینہ میں اپنی جان کو خطروں میں ڈالا۔"

فلله ذا فاتحا للهدى ولله ذا للمعالى ختاما

کیا کہنا اُس کا جس نے ہدایت کا فتح باب کیا، اور کیا کہنا اُس کا جس پر بزرگیوں کا خاتمہ ہُوا۔"

یہ امر انتہائی تعجب انگیز ہے کہ ایک طرف تو یہ اعتراف کیا جاتا ہے کہ حضرت ابو طالب کی جانبازیوں اور عملی کوششوں کے نتیجہ میں اسلام کی آواز بلند ہوی اور انہوں نے پُورے ثبات و استقلال کے ساتھ اپنی زندگی کا طویل عرصہ آنحضرتؐ کی نصرت و حمایت میں صرف کیا اور دُوسری طرف اُن کے کفر پر بھی زور دیا جاتا ہے اور اُن کی تمام خدمات کو بے اثر بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور یہ کوششیں ان لوگوں کی طرف سے ہوتی ہیں جو کمزور سے کمزور قرائن و شواہد کو اثبات ایمان کے لئے کافی سمجھتے ہیں اور بعض افراد کے

ایمان میں باوجودیکہ وُہ نبوّت میں شک کرتے رہے، شُبہ تک نہیں کرتے۔ مگر یہاں ذہنی وفکری رجحان دُوسرا راستہ اختیار کرتا ہے اور اس جانباز و جاں نثارِ اسلام کو اس کی محنتوں، کاوشوں اور دینی خدمتوں کے باوجود دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا جاتا ہے حالانکہ اُن کے کلام پر نظر کی جائے تو اس میں توحید و رسالت کے اعتراف کے جواہر ریزے جگمگاتے نظر آتے ہیں۔ اور اس اقرار و اعتراف کے ساتھ اُن کے افعال و اعمال وُہ ہیں کہ کسی ایک عمل کو بھی اسلام کے خلاف ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ کیا ایمان کے اجزاء اعتقاد بالجنان، تصدیق باللسان اور عمل بالارکان میں کوئی جُزو ایسا ہے جو ان میں نظر نہ آتا ہو؟ ابوطالب کا اخفاء بھی اظہار اور خاموشی بھی گویائی تھی۔ اس لئے کہ ان کی عملی زندگی سراپا اسلام کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ اور ان کا ایک ایک عمل تصدیقِ نبوّت کا آئینہ دار اور صداقتِ اسلام کے اعتراف کا زندہ ثبوت ہے۔ انہوں نے قولاً و عملاً اس طرح پیغمبرؐ اسلام کی نصرت و حمایت کی کہ جو نظریاتِ اسلام کے خلاف رہ کر ممکن ہی نہ تھی اور نہ اُبھرے ہوئے فتنوں کو دبانا، قریش کی سازشوں کو کچلنا اور پیغمبرؐ کے سینہ سپر رہ کر اسلام کے پھلنے پھُولنے کی راہیں ہموار کرنا، کفر و شرک کے عقیدہ سے میل کھاتا ہے۔ کیا ان کی تکفیر سے پیغمبرؐ اور اہلبیتؑ اطہار کی تکذیب لازم نہ آئے گی اور کیا پیغمبرؐ کو یہ امر ناگوار نہ ہوگا کہ ایک مسلمان کو کافر گردانا جائے اور اُن کے ناصر و دوست پر دُشمنی کا شُبہ کیا جائے۔

اگر ان تمام شواہد و براہین کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو اس سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ابوطالب پیغمبرِ اکرمؐ سے شیفتگی کی حد تک محبت رکھتے تھے اور عشقِ رسُولؐ اُن کے رگ و پے میں خون کے ساتھ ساتھ گردش کرتا تھا۔ یہ محبّت و وارفتگی خود اُن کے اسلام کا ایک بیّن ثبوت ہے۔ اس لئے کہ محبتِ رسُولؐ اور بغضِ اسلام یکجا نہیں ہو سکتے جس طرح بُغضِ رسُولؐ اور اسلام دوستی یکجا نہیں ہو سکتی۔ اگر دل میں محبّتِ رسُولؐ رچی بسی ہو تو اسلام بھی ہے۔ اور اگر دل جذب و عشقِ رسولؐ سے خالی ہو تو اسلام کا دعوٰی ہو بھی تو وُہ صرف ایک دعوٰی ہی ہوگا جس میں صداقت نہ ہو اور ایک کالبد ہو گا جس میں زندگی و حیات نہ ہو۔ کیونکہ عشقِ رسُولؐ ہی اصلِ اسلام، روحِ اسلام بلکہ عینِ اسلام ہے ؎

اگر ہو عشق تو ہے کُفر بھی مُسلمانی نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

ایک طبقہ اگرچہ ذہنی طور پر اُن کے کفر کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہے۔ مگر چند بے سر و پا روایتوں کی بناء پر کھُل کر اُن کے اسلام کا اعتراف بھی نہیں کرتا۔ حالانکہ یہ روایتیں صحت کے معیار پر پُوری نہیں اُترتیں اور اُن پر وضعیت کے آثار اتنے نمایاں ہیں کہ اُن کے موضوع و خود ساختہ ہونے میں شُبہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان روایات کے کھوکھلا پن کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ دسیسہ کاروں اور اموی ہوا خواہوں نے محسنِ اسلام و مربّیِ پیغمبرؐ کی خدمات پر پردہ ڈالنے اور اُن کے فرزند حضرت علیؑ کے پدری امتیاز کو ختم کرنے کے لئے ایسی روایتیں وضع کر لیں جن سے ان کے کفر کا اثبات ہو اور اس طرح حضرت علیؑ کو بھی اس صف میں کھینچ لائیں

جس میں دُوسرے نظر آتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان روایتوں پر ایک نظر کی جائے تاکہ نقد و تجزیہ کی روشنی میں ارباب بصیرت خود فیصلہ کر سکیں کہ یہ اصُولِ صحت کے معیار پر پُوری اترتی ہیں یا وضعی و خود ساختہ ہیں اور کہاں تک ان سے استناد و احتجاج کیا جا سکتا ہے۔

پہلی روایت یہ ہے کہ جب ابو طالب کا وقتِ آخر آیا تو پیغمبر اکرمؐ اُن کے ہاں تشریف لے گئے۔ وہاں پر ابو جہل اور عبداللہ ابن اُمیہ بھی موجود تھا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا چچا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پڑھئے تاکہ میں آپ کے ایمان کی شہادت دے سکوں۔ ابو جہل اور عبداللہ ابن اُمیہ نے ابو طالب سے کہا کیا آپ ملّت عبدالمطلب سے رُوگرداں ہو جائیں گے۔ ابو طالب نے کہا: اَنَا عَلٰی مِلَّةِ عَبْدِالْمُطَّلِبْ۔ میں عبدالمطلب کی ملت ہی پر ہوں اور کلمہ نہ پڑھا اس پر آنحضرتؐ نے فرمایا لاستغفرن لك مالم انه عنه۔ اگر مجھے منع نہ کیا گیا تو میں آپ کے لئے دُعائے مغفرت کرتا رہوں گا۔ جس پر یہ آیت نازل ہوی۔

ما كان للنبي والذين امنوا	نبی اور اہلِ ایمان کو چاہئے کہ وُہ مشرکوں کے
ان يستغفروا للمشركين	لئے دُعائے مغفرت نہ کریں اگرچہ وُہ اُن کے
ولو كانوا اولي قربي من بعد ما	قرابت دار کیوں نہ ہوں جبکہ اُن پر یہ امر واضح
تبين لهم انهم اصحاب	ہو چکا ہے کہ وُہ دوزخی ہیں
الجحيم۔	

یہ روایت متعدد وجوہ سے محلِ نظر ہے۔

اوّلاً یہ کہ اس کا راوی مسیب ہے۔ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب التہذیب میں تحریر کیا ہے کہ مسیب ان رواۃ میں سے ہے جو ابو سفیان ابن حرب اور اپنے باپ حزن سے روایت کرتا ہے اور اس سے صرف اُس کا بیٹا سعید روایت کرتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اُس دور میں نہ اس کی روایت کو اہمیت دی جاتی تھی اور نہ اس پر اعتماد و وثوق کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ فتح مکّہ کے موقع پر مسلمان ہُوا۔ اور حضرت ابو طالب کی وفات کے وقت نہ تو یہ مسلمان تھا اور نہ اس موقع پر اس کے موجود ہونے کے قرائن ہیں اور نہ کسی نے اس کی موجودگی کا دعوٰی کیا ہے۔ اگر اُس نے یہ واقعہ کسی سے سُنا تھا تو جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ کس سے سُنا تھا نہ اس روایت کا کوی وزن ہو سکتا ہے اور نہ اس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے جبکہ یہ واقعہ اس کے زمانہ کفر کا ہے۔ اور پھر مسیب سے اس کے بیٹے سعید نے روایت کی ہے جو حضرت عمر کے زمانۂ خلافت میں پیدا ہُوا اور اُن لوگوں میں شمار ہوتا تھا جو حضرت علیؑ اور اہلبیت اطہارؑ سے منحرف سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ ابن ابی الحدید نے تحریر کیا ہے:

كان سعيد ابن المسيب منحرفا	سعید ابن مسیب حضرت علیؑ سے منحرف و
عنه۔ (شرح نہج۔ ج۔ ص۳۷۰)	برگشتہ تھا۔

اس کی اہلبیت دُشمنی کا یہ واقعہ شاہد ہے کہ جب امام زین العابدین علیہ السّلام نے رحلت فرمائی اور اُن کا جنازہ مسجد نبوی میں لایا گیا تو تمام لوگ نماز جنازہ میں شریک ہُوئے مگر یہ مسجد میں بیٹھا رہا اور نماز میں شریک نہ ہُوا اس سے کہا گیا کہ کیا تم اس مرد صالح کی نماز میں شریک نہیں ہو گے؟ اس نے جواب دیا:۔

اصلی رکعتین فی المسجد احبّ	میں اس متبرک جگہ میں ایک مرد صالح کی نماز
الی من ان اشھد ھذا الرّجل	جنازہ پڑھنے سے دو رکعت نماز پڑھ لینا
الصالح فی البیت الصالح۔	زیادہ پسند کرتا ہوں"۔

(طبقات ابن سعد ج۵۔ ص۲۲۲)

اس دُشمنی و کج ذہنی کی کوئی حد ہے کہ اہلبیت کی ایک جلیل القدر ہستی پر نماز جنازہ بھی گوارا نہیں کی جاتی کیا ایسے شخص کی روایت پر کسی کے مومن و غیر مومن ہونے کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے خصوصاً حضرت ابوطالب کے ایمان کے بارے میں اس کی روایت کا کوئی وزن ہو سکتا ہے جبکہ اولادِ ابوطالب کے ساتھ اس کا بُغض و عناد اس حد تک ہو۔

دُوسرے یہ کہ یہ روایت اس روایت سے متعارض ہے جس میں اس امر کی صراحت ہے کہ حضرت ابوطالب نے زندگی کے آخری لمحوں میں اپنے لبوں کو جنبش دی اور کلمۂ توحید پڑھا۔ یہ روایت متعدد علماؤ مورّخین نے اپنی کتابوں میں درج کی ہے۔ چنانچہ مورّخ ابوالفداء تحریر کرتے ہیں:۔

لما تقارب من ابی طالب الموت	جب ابوطالب کا وقتِ وفات قریب آیا تو انہوں
جعل یحرك شفتیه فاصغی	نے اپنے ہونٹوں کو جنبش دی۔ عباس نے کان
الیه العباس وقال واللہ یا	لگا کر سُنا تو آنحضرتؐ سے کہا اے برادر زادے
ابن اخی قال الکلمة التی	خدا کی قسم! ابوطالب نے وُہ کلمہ پڑھا ہے جو آپ
امرته ان یقولھا فقال	ان سے پڑھوانا چاہتے تھے۔ آنحضرتؐ نے
رسولؐ اللہ الحمد للہ الذی	سُنا تو فرمایا اے چچا اللہ کا شکر ہے کہ اس نے
ھداك یا عم۔ (تاریخ ابوالفداء ج۱ صفحہ ۱۲۰)	آپ کو ہدایت کی"۔

اس روایت کو صرف سابقہ روایت سے تعارض دکھانے کے لئے تحریر کیا گیا ہے۔ ورنہ جو ابتدائے بعثت سے آنحضرتؐ کو صادق و امین اور خدا کا فرستادہ رسولؐ سمجھتا رہا ہو اُن کی سچّائی اور راست بیانی کا معترف ہو اور اپنی زندگی کا نصب العین ہی پیغمبرؐ کی نُصرت و حمایت اور ترویج و تبلیغ اسلام قرار دے چکا ہو اور جس کے قول و عمل کا محور صرف احیائے اسلام اور اعلائے کلمۃ الحق ہو اس سے اقرار لینے اور کلمہ پڑھوانے کے معنی ہی کیا ہوتے ہیں۔ اور اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ آنحضرتؐ نے اُن سے کلمہ پڑھنے کے لئے کہا تو یہ ایسا ہی تھا جیسے ہر مومن کو آخر وقت کلمہ پڑھنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ ور وُہ کلمہ پڑھتا ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اب اس سے

توحید و رسالت کا اقرار لے کر اُسے مسلمان کیا جا رہا ہے۔

تیسرے یہ کہ اس روایت سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ آیت مذکورہ حضرت ابو طالب کے انتقال کے فوراً بعد نازل ہوئی ہوگی تاکہ پیغمبرؐ کو ایک فعل نامشروع سے روک دیا جائے۔ حالانکہ یہ آیت سُورۃ براءۃ کی ہے اور سُورۂ براءۃ بالاتفاق فتح مکّہ کے بعد نازل ہوا۔ اور حضرت ابو طالب ہجرت سے تین سال وفات پا چکے تھے یعنی اس سُورۃ کے نازل ہونے سے تقریباً دس برس پہلے۔ اس سے ہر صاحب نظر اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس آیت کا تعلق ابو طالب سے کہاں تک ہو سکتا ہے۔ روایت ساز نے نہ اس پر نظر کی کہ یہ آیت کب نازل ہوئی اور نہ اِدھر نگاہ دوڑائی کہ ابو طالب نے کب انتقال کیا۔ اُسے تو اس آیت کا مصداق ابو طالب کو ثابت کرنا تھا۔ لہٰذا ایک واقعہ گڑھ کر اسے چابک دستی سے اس آیت کے ساتھ جوڑ دیا تاکہ ظاہر بین افراد یہ سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے حق میں دُعائے مغفرت کرنے سے اپنے رسُولؐ کو منع کر دیا تھا اب ان کے کفر میں کیا شک و شبہ ہو سکتا ہے۔ اگر اس آیت کو ابو طالب کے متعلق مانا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ پیغمبر اکرمؐ دس برس تک ابو طالب کے حق میں حسب وعدہ دُعائے مغفرت کرتے رہے اور قدرت کو اس بے اثر و بے ثمر دُعا سے روکنے کی ضرورت محسُوس نہ ہُوئی۔ اور جب پیغمبرؐ کو دُعا کرتے ہوئے ایک طویل مدّت گزر گئی تو ادھر توجہ دلانے کی ضرورت محسُوس ہُوئی اور دُعائے مغفرت سے روکنے کے لئے آیت نازل کر دی اور پیغمبرؐ اتنا عرصہ ایک ایسے فعل کے مرتکب ہوتے رہے جو تقاضائے اسلام اور منشائے خداوندی کے سراسر خلاف تھا۔ کیا ایسی بے سر و پا روایت پر کسی عقیدہ کی بُنیاد رکھی جا سکتی ہے یا اس کی صحت پر اعتماد کرتے ہُوئے کسی کے کفر و ایمان کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

چوتھے یہ کہ اس آیت کے نزول سے پہلے بہت سی ایسی آیتیں نازل ہو چکی تھیں جن میں واضح طور پر کفار و منافقین کے لئے دُعائے مغفرت سے روکا جا چکا تھا۔ مثلاً یہ آیت اور اس قبیل کی دُوسری آیتیں:۔

سواء علیھم استغفرت لھم ام لم تستغفر لھم لن یغفر اللہ لھم۔

تم اُن کے لئے دُعائے مغفرت مانگو یا نہ مانگو اُن کے لئے برابر ہے۔ خدا تو انہیں ہرگز نہیں بخشے گا۔

یہ سُورۂ منافقون کی آیت ہے اور یہ سُورۂ چھٹی ہجری میں سُورۂ براءۃ سے قبل نازل ہُوا۔ لہٰذا جب پیغمبرؐ کو پہلے سے کفار و مشرکین کے لئے دُعائے مغفرت سے منع کیا جا چکا تھا تو پھر پیغمبر کے یہ کہنے کا کیا محل تھا کہ اگر مجھے منع نہ کیا گیا تو میں اُن کے حق میں دُعائے مغفرت کرتا رہوں گا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ممانعت کی آیتوں کے بعد کسی مشرک و کافر کے لئے دُعائے مغفرت کریں اور اس طرح ایک امرِ ممنوع کے مرتکب ہو کر قرآنی آیات کی خلاف ورزی کریں۔ لہٰذا یہ تسلیم کرنا ناگزیر ہو گا کہ اس آیت کا ابو طالب سے دُور کا تعلق بھی نہیں ہے۔ اور پیغمبرؐ اکرم انہیں مومن و مسلم سمجھ کر ان کے حق میں دعائے مغفرت کرتے رہے تھے۔ ورنہ اُن کے کافر ہونے کی صورت میں اُن کے

لئے دُعائے مغفرت کا کوئی جواز نہ تھا۔ اور اگر اسی پر اصرار ہو کہ اسلام سے منحرف ہونے کے باوجود ان کے لئے دُعائے مغفرت کا سلسلہ جاری رکھا تو اس سے پیغمبرؐ کا دامن عصمت داغدار اور پیراہن نبوت تار تار ہو جائے گا اس لئے کہ قرآنی تعلیمات کے خلاف عمل پیرا ہونے سے عدالت بھی برقرار نہیں رہتی چہ جائیکہ نبوّت۔ کیا اثبات کفر کی ایسی روایتیں توجہ و التفات کے قابل سمجھی جا سکتی ہیں جن سے نبوّت کی توہین اور دامن رسالت کی پاکیزگی و تقدیس بھی محفوظ نہ رہتی ہو۔

پانچویں یہ کہ ترمذی نے اپنی صحیح کے باب التفسیر میں اس آیت کے شان نزول کے سلسلہ میں تحریر کیا ہے کہ حضرت علیؑ نے ایک شخص کو اپنے کافر ماں باپ کے حق میں دُعائے مغفرت کرتے سُنا تو اس سے کہا کہ تم ایسے والدین کے لئے دُعا کرتے ہو جو کافر و مشرک مرے تھے۔ اس نے کہا کیا حضرت ابراہیمؑ نے اپنے چچا آزر کے لئے دُعائے مغفرت نہیں کی تھی حالانکہ وُہ مشرک و بُت پرست تھا۔ حضرت علیؑ کہتے ہیں کہ میں نے پیغمبرؐ اکرم کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ تمام واقعہ بیان کیا جس پر یہ آیت نازل ہوی اور مسلمانوں کو اپنے کافر و مشرک عزیزوں کے لئے دُعائے مغفرت سے منع کر دیا گیا۔

اس روایت میں چند امور فکر طلب اور قابلِ توجہ ہیں:۔

پہلا امر یہ کہ اگر کافر و مشرک عزیزوں کے لئے دُعائے مغفرت جائز ہوتی تو حضرت علیؑ جو اسلام کے اوامر و نواہی اور احکام و سنن کے عالم اور ان کے حِکَم و مصالح پر حاوی تھے کبھی اس پر معترض نہ ہوتے اور نہ اسے ٹوکنے کی ضرورت محسوس کرتے۔ امیر المومنینؑ کا اس کی دُعا پر حیرت و استعجاب اس امر کو واضح کر دینے کے لئے کافی ہے کہ کفار و مشرکین کے حق میں دُعائے بخشش کسی مسلمان کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔

دوسرا امر یہ کہ اس شخص نے اپنے عمل کے جواز کے لئے حضرت ابراہیم کے عمل سے استناد کیا کہ انہوں نے بھی تو اپنے مشرک چچا کے لئے دعائے مغفرت کی تھی حالانکہ اُسے ماضی کے اوراق اُلٹ کر استناد دُور جانے کی ضرورت نہ تھی بلکہ حضرت ابراہیم کے عمل سے استناد کرنے کے بجائے پیغمبر کے عمل سے استناد کرنا چاہئے تھا کہ انہوں نے بھی تو اپنے مشرک چچا کے لئے دُعائے مغفرت کی تھی مگر اس کا عمل پیغمبر کو پیش نہ کرنا بتاتا ہے کہ اس کے ذہن میں ابو طالب کے مشرک ہونے کا تصوّر بھی نہ تھا اور نہ اس دور میں انہیں کوی کافر و مشرک سمجھتا تھا اور نہ ان کے کفر و شرک کے متعلق اکابر صحابہ سے کوی روایت وارد ہوی ہے۔

تیسرا امر یہ کہ اس شخص نے اپنے مُردہ ماں باپ کے حق میں دُعائے مغفرت کے جواز کی سند حضرت ابراہیمؑ کے عمل میں تلاش کی حالانکہ حضرت ابراہیمؑ نے آزر کے مرنے کے بعد اس کے لئے دُعا نہیں فرمائی بلکہ جب انہیں یہ یقین ہو گیا کہ وُہ راہِ ہدایت پر آنے والا نہیں ہے تو اپنی زبان بند کر لی جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

وما کان استغفار ابراھیم لابیه الا عن موعدة وعدھا	ابراہیمؑ کا اپنے باپ کے لئے مغفرت کی دُعا مانگنا اس وعدہ کی بناء پر تھا جو انہوں نے اپنے

اياه فلما تبين له انه عدو لله تبرا منه۔ باپ سے کیا تھا۔ اور جب اُن پر واضح ہو گیا کہ وُہ دشمن خدا ہے تو اُس سے بیزار ہو گئے"۔

حضرت ابراہیمؑ کی دُعاء محض طلب ہدایت کے لئے تھی اور وُہ یہ چاہتے تھے کہ اسے ہدایت نصیب ہو تاکہ آخرت میں بخشش و آمرزش کا مستحق قرار پائے۔ اس لئے کہ انسان زندگی میں خواہ کتنا بے راہ اور کفر و ضلالت میں ڈوبا ہُوا ہو اُس کے راہ راست پر آنے سے مایوسی نہیں ہوتی۔ اور یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ شائد وُہ ضلالت و گمراہی سے نکل کر حق و ہدایت کی راہ پر آ جائے اور مرنے کے بعد تو ہدایت کے حاصل کرنے کا کوئی موقع ہی نہیں ہو تاکہ اس کے لئے ہدایت و مغفرت کی دُعاء کی جا سکے۔ لہٰذا اس دُعائے خلیلؑ سے حالتِ کفر میں مر جانے والوں کے لئے دُعائے مغفرت کا جواز ثابت نہ ہو گا۔ ان شواہد سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ کفار کے لئے دُعائے مغفرت سے ممانعت اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے ہو چکی تھی اور کسی کافر کے لئے اس کے مرنے کے بعد نہ دُعا کا کوئی محل ہے اور نہ کوئی وجہ جواز۔ لہٰذا پیغمبرؐ کے بارے میں یہ تصوّر کیونکر کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ابوطالب کو کافر سمجھنے کے باوجود اُن سے یہ کہا ہو گا کہ "اگر مجھے منع نہ کیا گیا تو میں آپ کے لئے دُعائے مغفرت کرتا رہوں گا"۔ کیونکہ دُعائے مغفرت اُمیدِ بخشش سے وابستہ ہے اور ایک کافر کے لئے بخشش کی اُمید کیونکر کی جا سکتی ہے جبکہ اللہ کا فیصلہ کافروں کے جہنمی ہونے کا ہو چکا ہے۔ لہٰذا یہ ماننے بغیر چارہ نہیں کہ پیغمبرؐ انہیں مومن و مسلم سمجھ کر اُن کے حق میں دُعائے مغفرت کرتے تھے، اور اس دُعائے مغفرت کے بعد کوئی وجہ نہیں کہ ابوطالب کے کفر پر اصرار کیا جائے جبکہ دُعائے پیغمبرؐ اُن کے ایمان کی دلیل اور اُن کی مغفرت کی ناقابلِ تردید سند ہے۔

چھٹے یہ کہ اس آیت کے شانِ نزول کے بارے میں روایت مذکورہ کے علاوہ اور بھی مختلف و متعارض روایات ہیں اور روایات کے اختلاف سے واقعیت مشکوک ہو جایا کرتی ہے۔ اور کوئی بھی روایت استناد و احتجاج کے قابل نہیں رہتی۔ چنانچہ ایک روایت یہ ہے کہ جب آنحضرتؐ اپنی والدہ کی قبر کے پاس سے گزرے تو اللہ تعالیٰ سے زیارتِ قبر اور دُعائے مغفرت کی اجازت مانگی۔ اللہ نے زیارتِ قبر کی اجازت دے دی اور دُعائے مغفرت سے اس آیت کے ذریعہ روک دیا۔ اور ایک روایت یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے اپنے والد کے لئے دُعائے مغفرت کا ارادہ کیا جس سے روکنے کے لئے یہ آیت نازل ہوئی اور ایک روایت یہ ہے کہ کچھ مسلمانوں نے پیغمبر اکرم سے اپنے کافر بزرگوں کے لئے جو مر چکے تھے دُعائے مغفرت کی اجازت طلب کی جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ غرض کوئی اسے آنحضرت کے چچا ابوطالب کے متعلق بتاتا ہے کوئی آنحضرت کے والد جناب عبداللہ کے متعلق اور کوئی آنحضرت کی والدہ جناب آمنہ کے متعلق اور کوئی مسلمانوں کے کافر بزرگوں کے متعلق۔ جہاں اتنے مختلف اقوال ہوں اور ہر قول ہیں ... واقعہ کی نوعیت مختلف طریقوں سے بیان کی گئی ہو اور روایات کے تعارض اور رواۃ کی کثرت تعبیر نے اسے خواب پریشان بنا کر رکھ دیا ہو اور پھر اس میں بھی اختلاف ہو کہ آیا استغفار سے مراد دُعائے مغفرت ہے یا نمازِ جنازہ

جو حضرت ابو طالب کی وفات تک مشروع ونافذ ہی نہ ہوی تھی۔ وہاں اس کا مورد صرف ابوطالب کو قرار دے کر ان کے کفر پر اصرار کرنا کہاں تک حق وانصاف کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو سکتا ہے۔ کیا ہمیں یہ اختیار دے دیا گیا ہے کہ ہم اپنی مرضی سے جسے چاہیں اُسے مُسلمان اور جسے چاہیں اُسے کافر قرار دے لیں۔

دُوسری روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ جب ابو طالب کا وقتِ رحلت قریب آیا تو پیغمبرؐ نے اُن سے فرمایا کہ چچا کلمہ پڑھئیے تاکہ میں اللہ کے سامنے آپ کے ایمان کی گواہی دے سکوں۔ ابو طالب نے انکار کیا اور کہا کہ اگر قریش کے طعن وتشنیع کا ڈر نہ ہوتا تو میں کلمہ پڑھ لیتا جس پر یہ آیت نازل ہوی:۔

انّك لا تهدی من احببت و	تم جسے دوست رکھتے ہو اُسے تم ہدایت نہیں
لکن اللہ یهدی من یشاء۔	کرتے مگر خدا جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔"

یہ روایت بھی متعدد وجوہ سے درخور اعتناء نہیں ہے۔

اوّلاً یہ کہ یہ روایت محمد ابن عباد، ابن ابی عمر وغیرہ کے واسطہ سے ابوہریرہ دوسی سے اور عبدالقدوس شامی اور ابوسہل السری کے واسطہ سے ابن عمر اور ابن عباس سے نقل کی گئی ہے اور یہی امر اس کی افسانوی حیثیّت کو بے نقاب کرنے کے لئے کافی ہے اس لئے کہ ان میں سے ابوہریرہ ابو طالب کے انتقال کے موقع پر اپنی جنم بھومی یمن میں تھے اور ۷ھ میں جبکہ حضرت ابوطالب کو انتقال کئے دس برس گزر چکے تھے اسلام لائے تھے۔ لہذا ابو طالب کی نزعی حالت کے موقع پر ان کے موجود ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ اس واقعہ کے عینی شاہد ہوں اور پیغمبرؐ کو تلقین کرتے اور ابوطالب کو انکار کرتے اپنے کانوں سے سُنا ہو۔ اگر کسی سے سُن لیا تھا تو اُس کا نام لینے میں کیا امر مانع تھا جبکہ یہ واقعہ اُن کے زمانۂ کفر اور مکہ میں عدم موجودگی کا ہے۔ اور پھر ابو طالب کے بارے میں ان کی روایت اس اعتبار سے بھی ساقط الاعتبار ہے کہ وُہ معاویہ کے خصوصی مصاحبوں اور حاشیہ نشینوں میں سے تھے اور یہ مصاحبت ووابستگی حضرت علیؑ سے دُشمنی وعناد کی دلیل ہے۔ کیونکہ ان سے انحراف وعناد کے بغیر نہ دربارِ شام میں تقرب حاصل ہو سکتا تھا اور نہ معاویہ کی مصاحبت کا شرف۔ ابن ابی الحدید نے اس دُشمنی وعناد کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ جب وُہ معاویہ کے ہمراہ کوفہ میں آئے تو راتوں کو باب کندہ کے پاس آکر بیٹھ جاتے کچھ لوگ بھی اُن کے گرد وپیش جمع ہو جاتے۔ ایک مرتبہ اصبغ ابن نباتہ بھی ان کے حلقہ میں آکر بیٹھ گئے اور اُن سے کہا کہ کیا تم نے علیؑ کے بارے میں پیغمبرؐ کا یہ ارشاد سُنا ہے:۔ اللھم وال من والاہ وعاد من عاداہ۔" خدایا اُسے دوست رکھ جو علیؑ کو دوست رکھے اور اُسے دُشمن رکھ جو علی کو دُشمن رکھے۔" کہا ہاں سُنا ہے۔ اس پر اصبغ نے کہا:۔

فاشهد باللہ لقد والیت عدوہ و عادیت ولیہ۔ (شرح نہج ۔ ج ۔ ص ۳۶۰)

تو پھر میں اللہ کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ تم نے اُن کے دُشمنوں سے دوستی گانٹھ رکھی ہے اور اُن کے دوستوں سے دُشمنی پر اُتر آئے ہو۔"

اسی دُشمنی کا نتیجہ تھا کہ معاویہ نے انہیں مدینہ کی حکومت سونپ دی اور ہمیشہ ان پر نظرِ خصوصی رکھتے تھے اور ان کے مرنے کے بعد بھی ان کے وارثوں سے حُسنِ سلوک کرتے رہے۔ چنانچہ جب اُن کے مرنے کی اطلاع آئی تو اپنے عامل ولید ابنِ عقبہ کو لکھا:۔

انظر من ترك فادفع الی ورثتہ عشرۃ آلاف درھم واحسن جوارھم وافعل الیھم معروفا فانہ کان ممن نصر عثمان وکان معہ فی الدار۔ (طبقات ابن سعد ۔ ج ۴ ۔ ص ۳۴۰)

اس کے وارثوں کو تلاش کر کے انہیں دس ہزار درہم دو اور اُن سے حُسنِ سلوک اور نیک برتاؤ کرو۔ اس لئے کہ وُہ اُن لوگوں میں سے تھا جنہوں نے حضرت عثمان کی نصرت کی اور محاصرہ کے دنوں میں ان کے گھر میں موجود رہے۔"

معاویہ سے وابستگی اور اموی خاندان سے لگاؤ کے ساتھ کثیر الروایہ بھی تھے اور پیغمبر اکرمؐ کی صحبت میں انتہائی کم عرصہ رہنے کے باوجود روایتِ حدیث میں ان تمام لوگوں سے سبقت لے گئے جو مدتوں پیغمبرؐ کی صحبت میں اُٹھتے بیٹھتے رہے اور اُن کے ارشادات سے مستفید ہوتے رہے تھے۔ اس کثرتِ روایت نے ان کی روایات کو مشکوک و بے اعتماد بنا دیا تھا۔ اور حضرت عمرؓ نے بھی ان کی روایات کی سُبکی و بے وزنی کو محسوس کرتے ہوئے انہیں کثرتِ روایت پر سرزنش کی تھی اور کہا تھا:۔

لتترکن الحدیث عن رسول اللہ او لالحقنك بارض دوس۔ (سیر اعلام النبلاء ۔ ص ۴۳۴)

حدیث بیانی کو چھوڑ دو۔ اگر تم نے اس پر عمل نہ کیا تو میں تمہیں قبیلۂ دوس کی سرزمین کی طرف چلتا کروں گا۔"

یہ اس صورت میں کہ ابھی احادیث کا بیشتر ذخیرہ ان کے حافظہ کی تہوں میں محفوظ پڑا تھا اور اُسے "ناگفتہ بہ" سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ چنانچہ خود ہی کہتے ہیں:۔

لو انبأتکم بکل ما اعلم لرمانی الناس بالخزف وقالوا ابو ھریرۃ مجنون۔ (طبقات ابن سعد ج ۴ ۔ ص ۳۳۱)

جو کچھ میں جانتا ہوں اگر سب بتانے لگوں تو لوگ مجھے ٹھیکرے ماریں اور کہیں کہ ابو ہریرہ تو باؤلا ہے۔"

حضرت علیؑ بھی نقلِ حدیث میں ان کی راستگوئی و صدق بیانی کے قائل نہ تھے بلکہ انہیں دروغ گو سمجھتے تھے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا:۔

الا ان اکذب الناس علیٰ رسول اللہ ابوھریرۃ الدوسی۔	ابو ہریرہ سب سے زیادہ رسولؐ اللہ پر جھوٹ باندھتا تھا۔"

(شرح ابن ابی الحدید ج۔ ص۳۶۰)

اسی طرح ابن عمر کا بھی وفاتِ ابوطالب کے موقع پر موجود ہونا قرین قیاس نہیں ہے کیونکہ وُہ بعثت کے تین سال بعد پیدا ہُوے۔ اس لحاظ سے ابوطالب کے انتقال کے وقت ان کی عمر سات سال بنتی ہے۔ اور ایک سات برس کے بچّے کا ایسے مقام پر گزر ہی کہاں ہو سکتا ہے جہاں سردارِ قریش حالتِ احتضار میں پڑا ہو اور بنی ہاشم و عمائد قریش اس کے گرد و پیش جمع ہوں۔ اور اگر گُزر ہُوا بھی ہو تو آنحضرتؐ اور ابوطالب کی گفتگو سُننا، اُسے سمجھنا اور محفوظ رکھنا اس سے زیادہ بعید از قیاس ہے۔ لہٰذا وُہ بھی اس واقعہ کے عینی شاہد نہیں ہو سکتے۔ اور جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ انہوں نے کس سے سُنا اُن کی روایت کو کوئی وزن نہیں دیا جا سکتا اور نہ اس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے جبکہ ابن عمر اُن لوگوں میں سے تھے جنہوں نے خلیفۂ ثالث کے بعد حضرت علیؑ کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے انکار کر دیا تھا اور ہمیشہ اُن سے منحرف و برگشتہ ہی رہے۔ باقی رہے ابن عباس تو وُہ ہجرت سے تین سال قبل شعب ابوطالب میں پیدا ہُوے تھے اور اسی سال حضرت ابوطالب نے انتقال فرمایا تھا۔ لہٰذا ان کے بھی وہاں موجود ہونے اور گفتگو سُننے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ کون باور کرے گا کہ ایک دُودھ پیتے بچّے نے حضرت ابوطالب کی زبان سے کچھ سُنا اور اُسے بیان کیا۔ اگر انہوں نے کسی سے سُنا تھا تو اُس کا نام لیتے تاکہ اُسے دیکھ کر روایت کا وزن قائم کیا جاتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ معاندین نے اس روایت کو گھڑ کر ابن عباس کی طرف منسُوب کر دیا ہے تاکہ دیکھنے والے اُن کا نام دیکھ کر خاموش ہو جائیں اور اُن کی جلالتِ قدر کے پیشِ نظر یہ غور کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کریں کہ وفاتِ ابوطالب کے وقت اُن کی عُمر کیا تھی اور وُہ روایت کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے تھے یا نہیں۔

اس کے علاوہ ابوہریرہ کے سلسلۂ روایت میں محمد ابن عباد ہوں یا ابن ابی عمر یا ابن کیسان مجہُول ہیں یا مشتبہہ۔ اور ابن عمر اور ابن عباس کے سلسلۂ روایت میں عبدالقدوس شامی ہوں یا ابوسہل سری یہ دونوں علماءِ رجال کے نزدیک حدیث ساز ہیں اور کاذب۔

دُوسرے یہ کہ جب پیغمبرِؐ اسلام آیۂ قرآنی، وانذر عشیرتک الاقربین۔ "اپنے قریبی عزیزوں کو ڈراؤ"۔ کے تحت اپنے رشتہ داروں اور کنبہ والوں کو خصوصی طور پر دعوتِ اسلام دینے پر مامور تھے اور آپ نے اس آیت کے نزول کے بعد علانیہ تبلیغ ابوطالب ہی کے گھر سے شروع کی تھی، تو پھر کیا وجہ ہے کہ دُوسرے عزیزوں اور قریبیوں کو دعوت اسلام دیتے رہے اور ابوطالب کو تبلیغ کرنے اور اُن سے کلمہ پڑھوانے کا خیال اس وقت آتا ہے کہ جب وُہ بستر بیماری

پر موت و حیات کی کشمکش میں تھے اور دس سال کے طویل عرصہ میں انہیں دعوتِ اسلام دینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے کیا آنحضرتؐ نے فریضۂ تبلیغ کی ادائیگی میں عمداً کوتاہی و سہل انگاری سے کام لیا یا ابوطالب کی امداد و تعاون کو برقرار رکھنے کے لئے انہیں اپنے معتقدات بدلنے کی ہدایت نہیں کی تاکہ وُہ بددل ہو کر ان کی حمایت و نصرت سے دستکش نہ ہو جائیں۔ پہلی صورت میں یہ لازم آتا ہے کہ پیغمبرؐ نے ادائے فرائض میں غفلت برتی اور حکمِ خصوصی کے باوجود انہیں دعوتِ اسلام دینے میں تعویق کی۔ اور یہ ایک نبی کے شایانِ شان نہیں ہوسکتا کہ وُہ فرائض میں کوتاہی کا مرتکب ہو اور حکمِ خدا کی خلاف ورزی کرے۔ اور دُوسری صُورت میں خود غرضی کا پہلو نمایاں ہے کہ آپ نے صرف مطلب برآری و مقصد جوئی کے لئے انہیں اپنے عقائد بدلنے کے نہیں کہا۔ اور یہ خود غرضانہ روش کسی بھی بلند سطح انسان کو زیب نہیں دیتی چہ جائیکہ پیغمبر مداہنت و خود غرضی سے کام لیں اور کسی کی طرفداری سے فائدہ اُٹھانے کے لئے اُسے غلط نظریات و عقائد پر باقی رہنے دیں اور تبلیغ و دعوت کے بجائے خاموشی اختیار کریں۔ اب ایک صورت یہ رہ جاتی ہے کہ پیغمبر اُن کے اسلام و ایمان پر شروع سے مطمئن تھے اور ان کے اعمال و افعال کو ان کے عقائد کی ترجمانی کے لئے کافی و وافی سمجھتے تھے اور بلاشبہ ان کا ہر فعل و عمل اسلام کے نظریات کے عین مطابق تھا جس کے بعد ضرورت ہی نہ تھی کہ آخر وقت میں جبکہ ایمان تو درکنار، توبہ بھی قابلِ قبول نہیں ہوتی ان سے کلمہ پڑھواتے اور اس لفظی اقرار پر ان کے ایمان کی شہادت کو اٹھا رکھتے۔

تیسرے یہ کہ اس آیت کے شانِ نزول کے سلسلہ میں اور بھی متعدد روایات اور مختلف اقوال ہیں۔ ان میں سے ایک روایت یہ ہے کہ جنگِ اُحد میں جب آنحضرتؐ کے دندان مبارک شہید ہوُے تو آپ نے دست بدعا ہو کر کہا یا رالٰہا تو اِن لوگوں کو ہدایت فرما یہ جاہل و بے خبر ہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوی۔ اور ایک روایت یہ ہے کہ یہ حارث ابن نعمان کے بارے میں نازل ہوی آنحضرتؐ چاہتے تھے کو وُہ مسلمان ہو جائے مگر وُہ اسلام سے گریزاں ہی رہا۔ اور حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ:۔

نزلت انك لا تهدي من احببت و انا مع النبيؐ في اللحاف۔ (مرقاۃ برحاشیہ ترمذی: جلد۲۔ صفہ ۹۶)	آیت "انك لا تهدي من احببت" اُس وقت نازل ہوی جب میں رسُولؐ اللہ کے ساتھ لحاف میں تھی۔"

غرض اس طرح کی اور بھی روایات ہیں جو ایک دُوسرے سے متعارض و مختلف ہیں۔ اس اختلاف کو دیکھتے ہُوے زیرِ نظر روایت کی صحت مشکوک ہو جاتی ہے خصوصاً جبکہ اس کے رواۃ بھی پایۂ اعتبار سے ساقط اور ناقابلِ اعتماد ہیں۔ اور پھر پہلی روایت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیت ابوطالب کی وفات کے

چھ برس بعد نازل ہوی اس لئے کہ جنگ اُحد ۳ھ میں واقع ہوی اور ابو طالب ہجرت سے تین سال پہلے وفات پا چکے تھے اور حضرت عائشہ کے قول سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیت ابو طالب کی وفات کے تین چار سال بعد نازل ہُوی اس لئے کہ حضرت عائشہ کی رُخصتی ۱ھ میں عمل میں آئی اور ابو طالب کو وفات پائے تین چار سال کا عرصہ گزر چکا تھا لہذا کسی طرح اس آیت کا تعلق ابو طالب سے نہیں ہو سکتا جبکہ وُہ نزولِ آیت کے موقع پر دُنیا میں موجود ہی نہ تھے اور دُنیا سے اُٹھ جانے کے بعد نہ ہدایت کرنے کا کوی موقع ہوتا ہے اور نہ انکار کرنے کا کوی محل۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ آیت اُس موقع پر بھی نازل ہوی اور بعد کے مواقع پر بھی تو تکرارِ نزول کو خلاف اصل ہونے کی بنا پر اس وقت تک تسلیم نہیں کیا جا سکتا جب تک اس پر کوی دلیل قائم نہ ہو۔

چوتھے یہ کہ اگر اس آیت کو ابو طالب کے بارے میں تسلیم کر لیا جائے جب بھی اُن کے ایمان کی نفی نہیں ہوتی اس لئے کہ اس آیت کا نہج و اسلوب وُہ ہے جو آیۂ قرآنی ما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ (اے رسُولؐ جب تم نے تیر پھینکا تو تم نے نہیں پھینکا بلکہ خدا نے پھینکا) کا ہے۔ اس میں ما رمیت سے رمی کی نفی بھی ہے اور اذ رمیت سے اثبات بھی۔ اثبات اس بنا پر کہ یہ عمل پیغمبرؐ کے ہاتھوں انجام پایا اور نفی اس بنا پر کہ درحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کی کارفرمائی تھی۔ اسی طرح آیت میں ہدایت کا اثبات بھی ہے اور ہدایت کی نفی بھی۔ نفی کی نسبت رسولؐ کی طرف ہے اور اثبات کی نسبت اللہ کی طرف۔ مطلب یہ ہے کہ اگرچہ یہ ہدایت بظاہر پیغمبرؐ کی تبلیغ و تلقین کے ذریعہ ہُوی مگر حقیقۃً اللہ تعالیٰ کی امداد و تائید کا نتیجہ ہے کیونکہ اللہ ہی ہدایت کا اصل سرچشمہ ہے۔ اگر اس کی توفیق و تائید شامل حال نہ ہو تو کوی بھی راہِ ہدایت پر نہیں آ سکتا اور نہ اس کے ارادہ و مشیّت کے بغیر ہدایت و رہنمائی کسی کے بس کی بات ہے۔ اور پیغمبرؐ اس ہدایت کے سلسلہ میں صرف ایک واسطہ و ذریعہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اب آیت کے معنی یہ نہیں ہوں گے کہ جنہیں آنحضرتؐ دوست رکھتے ہیں انہیں ہدایت کرنے سے قاصر ہیں یا ان کی ہدایت ان پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ بلکہ معنی یہ ہوں گے کہ جنہیں رسولؐ دوست رکھتا ہے انہیں رسُولؐ ہدایت نہیں کرتا بلکہ اللہ انہیں ایمان کی راہ دکھاتا ہے اور یہی معنی زیادہ نمایاں اور واضح ہیں اور اسی کی قرآنی آیات سے تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:۔

لیس علیک ھداھم و	اے رسُولؐ! ان لوگوں کی ہدایت کی ذمہ داری
لکن اللہ یھدی من یشاء	تم پر نہیں ہے لیکن خدا جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے"۔

اس ہدایت کی نسبت خصوصی سے اس کی خصوصی و امتیازی حیثیت بھی کھل کر سامنے آ جاتی ہے اس طرح کہ ابو طالب کا ایمان پیغمبرؐ کی دعوتِ عمومی کی بنا پر نہ تھا بلکہ اس میں اللہ کی مشیت بھی کارفرما تھی لہذا اس

آیت سے نفیِ ایمان کے بجائے ان کے ایمان و یقین کی فوقیت کا بھی اثبات ہو گا۔ چنانچہ اُن کے اسلامی خدمات ان کے رسوخِ ایمان کے آئینہ دار اور یقین کی بلند پائیگی کا واضح ثبوت ہیں۔

پانچویں یہ کہ اس آیت کو ابو طالب کے بارے میں مان لینے کی صورت میں یہ تسلیم کرنا ناگزیر ہو گا کہ آنحضرتؐ انہیں دوست رکھتے تھے اور واقعات بھی اس کے شاہد ہیں کہ پیغمبرؐ ان سے بے حد محبّت و وابستگی رکھتے تھے۔ بلکہ اس محبّت کی نسبت سے عقیل سے بھی محبّت کرتے تھے۔ چنانچہ ابو طالب کی وفات کے بعد عقیل سے ایک موقع پر فرمایا:۔

انی احبك حبين حباً لقرابتك منی وحباً لحب ابی طالب ایاك۔

"میں تمہیں دو جہتوں سے دوست رکھتا ہوں۔ ایک تم سے قرابت کی بنا پر اور دوسرے ابو طالب کی محبّت کی وجہ سے کہ وہ تمہیں دوست رکھتے تھے"۔

(تاریخ الاسلام ذہبی۔ ج ۲۔ ص ۲۳۳)

یہ محبّتِ ابو طالب کے ایمان کا واضح ثبوت ہے اس لئے کہ پیغمبر کسی کافر و مشرک کو دوست نہیں رکھ سکتے خواہ وہ آپ کا کتنا ہی قریبی عزیز کیوں نہ ہو۔ چنانچہ خداوندِ عالم کا ارشاد ہے:۔

لا تجد قوما یومنون باللہ و الیوم الآخر یوادون من حاد اللہ و رسوله ولو کانوا اٰباءهم او ابناءهم او اخوانهم او عشیرتهم۔

"جو لوگ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں تم انہیں اللہ اور اُس کے رسولؐ کے دُشمنوں سے دوستی کرتے ہُوئے نہ پاؤ گے اگرچہ وہ اُن کے باپ یا بیٹے یا بھائی یا قوم قبیلے والے ہی کیوں نہ ہوں"۔

جب اہلِ ایمان کو کفار و مشرکین سے دوستی و محبّت اور راہ و رسم رکھنے سے منع کیا گیا ہے اگرچہ وہ ان کے عزیز و اقارب اور قوم و قبیلہ والے کیوں نہ ہوں۔ تو پیغمبر اکرمؐ سے کیونکر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک مشرک و غیر مومن سے محبّت و دوستی روا رکھیں گے جبکہ کافر و مشرک دُشمنِ خدا ہے اور دُشمنِ خدا اس کے رسول کا محبوب نہیں ہو سکتا۔ تو درصورتیکہ ابو طالب سے پیغمبرؐ کی محبت ناقابلِ انکار ہے تو پھر ان کے ایمان سے انکار کا جواز بھی پیدا نہیں کیا جا سکتا۔

چھٹے یہ کہ یہ امر درایت کے سراسر منافی ہے کہ جس نے اپنی زندگی کے لمحات پیغمبرؐ کی نصرت و حمایت کے لئے وقف کر دیئے ہوں علانیہ اسلام کی تائید کرتے رہے ہوں، قریش کے بھرے مجمعوں میں آنحضرتؐ کے دین کو بہترین دین کہا ہو، انہیں انبیائے سلف کی طرح کا ایک نبی مانا ہو، اُن سے حفاظتِ دین کا عہد کیا ہو اور کٹھن سے کٹھن موقعوں پر کسی قوّت و طاقت سے مرعوب نہ ہُوئے ہوں اور نہ اعلانِ حق میں کبھی خوف و ہراس محسوس کیا ہو وہ آخر وقت محض قریش کی خاطر یا ان کے طعن و تشنیع سے گھبرا کر کلمۂ توحید

پڑھنے سے انکار کردیں اور اس دین سے منہ موڑلیں جسے ہمیشہ سچا سمجھا اور سچا کہا ہو اور جسے کڑیاں جھیل کر پروان چڑھایا ہو۔ تیسری روایت یہ ہے کہ ابن عباس سے ایک شخص نے سُنا کہ آیت، وھم ینھون عنہ وینأون عنہ ابوطالب کے بارے میں نازل ہوئی اور اسے ابوطالب پر منطبق کرنے کے لئے اس کے معنٰی یہ کئے گئے ہیں کہ "وُہ رسُولؐ سے کفار کی ایذا رسانیوں کو روکتے ہیں اور خود رسُولؐ سے دُور بھاگتے ہیں"۔ اور اُن کے نزدیک ابوطالب کی یہی حالت تھی کہ وُہ مشرکین وکفار سے پیغمبر کا دفاع تو کرتے رہے مگر اُن پر ایمان نہ لائے اور معنوی لحاظ سے ان سے دُور رہے۔

یہ روایت بھی پایۂ اعتبار سے ساقط اور ناقابل احتجاج واعتماد ہے۔

اوّلاً یہ کہ یہ روایت مرسل ہے اور اس میں اُس شخص کی نشاندہی نہیں کی گئی جو ابن عباس اور اس کے راوی حبیب ابن ابی ثابت کے درمیان واسطہ ہے۔ جب راوی نے خود ابن عباس سے اسے نہیں سُنا اور نہ اس شخص کا نام لیا ہے جس نے ابن عباس سے سُنا تھا، تو ایک مجہول الاسم والرسم شخص کی روایت پر اعتماد کرتے ہوُئے اسے ابوطالب کے متعلق کیونکر تسلیم کیا جاسکتا ہے جبکہ حبیب ابن ابی ثابت علماء رجال کے نزدیک جعل ساز اور افتراء پرداز بھی ہے۔ دُوسرے یہ کہ آیت کا مورد ومحل اور سیاق وسباق سے صاف ظاہر ہے کہ یہ آیت کفار ومشرکین کے ایک گروہ کے متعلق ہے۔ جو قرآن کو اساطیر الاوّلین "پرانے لوگوں کے قصّے کہانیوں" سے تعبیر کرتا تھا۔ چنانچہ صاحب کشاف اور علاّمہ بیضاوی نے تحریر کیا ہے کہ ابوسفیان ولید، عتبہ، شیبہ، ابوجہل، نضر ابن حارث اور چند دُوسرے مُشرکین نے آنحضرتؐ کو قرآن مجید کی آیتیں پڑھتے سُنا تو انہوں نے نضر ابن حارث سے پُوچھا کہ محمّد (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ کیا پڑھتے ہیں؟ اس نے کہا کہ اساطیر الاولین "پہلے لوگوں کے قصّے کہانیاں"۔ اور اس آیت کے پہلے ٹکڑے میں اسی کا تذکرہ ہے:۔ ویقول الذین کفروا ان ھی الا اساطیر الاولین۔ کافر یہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن اگلے لوگوں کے قصّے کہانیوں کے سوا کچھ نہیں ہے"۔ اور آیت کے آخری ٹکڑے میں ان کی بے راہرویوں اور گمراہیوں کے نتیجہ میں اُن کی ہلاکت وتباہی کا تذکرہ ہے:۔ وان یھلکون الا انفسھم ومایشعرون۔ اور وُہ خود ہی اپنے کو ہلاکت میں ڈالتے ہیں اور کچھ شعور نہیں رکھتے"۔ ان دو ٹکڑوں کے درمیان وھم ینھون عنہ وینأون عنہ کا ٹکڑا ہے۔ اگر ینھون عنہ کا مطلب یہ لیا جائے کہ وُہ پیغمبرؐ سے ایذارسانیوں کو روکتے ہیں تو پُوری آیت بے ربط اور اس کا تسلسل درہم وبرہم ہو جائے گا۔ اس لئے کہ آیت میں اُنہی چیزوں کا ذکر ہوتا آرہا ہے جو مذموم وقابل نفرین ہیں اور جن کی پاداش میں ہلاکت وتباہی ضروری ہے۔ مگر پیغمبرؐ سے ایذاؤ گزند کو روکنا اور انہیں کفار کی شرانگیزیوں سے بچانا ایک غیر مذموم اور قابل ستائش عمل اور اس کا پہلے اور آخری ٹکڑے سے کوئی ربط نہیں ہے۔ لہذا وھم ینھون عنہ کا یہ ترجمہ کہ وُہ لوگوں کو پیغمبرؐ کے اتباع یا قرآن کے سُننے سے روکتے ہیں"۔ صحیح ودرُست ہوگا اور ماقبل ومابعد سے مرتبط ہوگا۔

چنانچہ ابن کثیر اور فخر الدین رازی نے انہی معنوں کو ترجیح دیتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ آیت اُن مشرکین کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو اتباعِ پیغمبرؐ سے روکتے اور قرآن کے سننے سے مانع ہوتے تھے۔ لہٰذا جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ ابو طالب لوگوں کو آنحضرتؐ کے اتباع یا قرآن کے سننے سے روکتے تھے اس آیت کا تعلق اُن سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن حضرت ابو طالب کے متعلق قرآن کے سننے یا پیغمبرؐ کی اطاعت سے روکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ دوست و دشمن سبھی معترف ہیں کہ انہوں نے کسی موقع پر نہ قرآن سننے سے منع کیا اور نہ آنحضرتؐ کے اتباع سے روکا، اور نہ خود اُن کے ہدایات و تعلیمات سے سرمو انحراف کیا۔ بلکہ اپنی پوری زندگی آنحضرتؐ کی حمایت اور اُن کے اتباع و پیروی میں گزار دی۔ اسے دیکھتے ہوئے یہ چیز دیانت سے بمراحل دور ہوگی کہ آیت میں تحریفِ معنوی کر کے اسے ابو طالب پر چسپاں کرنے کی کوشش کی جائے اور آیت کا ماقبل و مابعد سے ربط توڑ کر اور اُسے من مانے معنی پہنا کر ابو طالب ایسے جاں نثارِ اسلام کا کفر ثابت کیا جائے۔ آخر انہوں نے کس موقع پر پیغمبرؐ سے دوری اختیار کی اور اُن سے منہ موڑ کر علیحدہ ہوئے؟ کیا نصرتِ رسولؐ و دفاعِ اسلام کا نام کفر ہے؟

"یہ اگر کفر ہے پھر کیا ہے مسلماں ہونا"

چوتھی روایت وہ ہے جسے عباس ابن عبد المطلب سے نسبت دی گئی ہے کہ انہوں نے آنحضرتؐ سے کہا کہ ابو طالب آپ کی حمایت و نصرت میں سرگرمِ عمل رہے ہیں کیا انہیں اس سے کوئی فائدہ پہنچے گا یا اُن کی یہ ساری محنتیں اور کاوشیں رائیگاں جائیں گی؟ آنحضرتؐ نے فرمایا وہ ٹخنوں تک دوزخ کے اندر ہیں۔ اگر میں اُن کی سفارش نہ کرتا تو وہ جہنم کے نیچے والے طبقہ میں ہوتے۔

یہ روایت بھی موضوع اور خود ساختہ ہے۔

اوّلاً یہ کہ یہ روایت عباس ابن عبد المطلب سے منسوب کی جاتی ہے حالانکہ عباس کی یہ روایت درج کی جا چکی ہے کہ ابو طالب نے رسولؐ اللہ کے کہنے سے کلمہ پڑھا اور توحید و رسالت کا اقرار کرنے کے بعد دنیا سے رخصت ہوئے کیا ایک ہی شخص کی طرف اسلام اور کفر دو متضاد باتوں کی نسبت سے روایت کا کوئی وزن باقی رہ جاتا ہے؟

دوسرے یہ کہ اس روایت اور اس مطلب کی دوسری روایتوں میں نفسِ مضمون کے لحاظ سے ایک گونہ تعارض و اختلاف پایا جاتا ہے۔ کسی روایت میں یہ ہے کہ شفاعت ہو چکی ہے اور وہ جہنم کی اوپر والی سطح پر پہنچ چکے ہیں اور کسی روایت میں ہے کہ یہ شفاعت قیامت کے دن ہوگی اور کسی میں صرف عذاب میں تخفیف کا ذکر ہے اور شفاعتِ رسولؐ کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ اس قسم کے اختلاف سے روایت کی صحت مشکوک ہو جایا کرتی ہے اور اس پر اعتماد و وثوق نہیں رہتا۔

تیسرے یہ کہ ان روایتوں کے راوی کذاب، جعل ساز اور ناقابلِ اعتماد ہیں۔ چنانچہ ذہبی نے میزان الاعتدال

ہیں ان روایتوں کے رواۃ میں سے سفیان کے بارے میں یکتب عن الکذابین (جھوٹوں سے روایت نقل کرتا ہے) اور عبدالملک ابن عمیر کے بارے میں ضعیف یغلط (ضعیف اور غلط بیان ہے) اور عبدالعزیز دراوردی کے متعلق سئی الحفظ (حافظہ صحیح نہیں ہے) کے آراء نقل کئے ہیں۔ اور اسی طرح کے چند رواۃ اور ہیں جو مجہول الحال اور علماء رجال کے نزدیک ساقط الاعتبار ہیں۔ لہٰذا ایسے لوگوں کی روایت پر بنأ کرتے ہوئے نہ کسی کے کفر و اسلام کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے اور نہ جنّتی و دوزخی ہونے کا۔

چوتھے یہ کہ یہ روایت بتاتی ہے کہ آنحضرتؐ نے ابوطالب کے عملِ پیہم اور جہدِ مسلسل کے پیشِ نظر اُن کے حق میں شفاعت کی جس کے نتیجہ میں اُس عذاب میں جس کے وُہ مستحق تھے تخفیف ہوئی حالانکہ کفّار و مشرکین کے حق میں نہ شفاعتِ رسولؐ کا سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ تخفیفِ عذاب کا۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:۔

ونسوق المجرمین الی جہنّم وردا لا یملکون الشفاعۃ الا من اتخذ عندالرحمٰن عھدا۔

ہم گنہگاروں کو جہنّم تک پیاسے جانوروں کی طرح ہنکا لے جائیں گے اُس وقت شفاعت کا حاصل کرنا اُن کے بس میں نہ ہوگا مگر وُہ جس سے خدا نے اقرار (توحید) لے لیا ہو۔"

دُوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے:۔

والذین کفروا لھم نار جھنّم لا یقضی علیھم فیموتوا و لا یخفف عنھم من عذابھا

جو لوگ کافر ہوُئے اُن کے لئے دوزخ کی آگ ہے۔ نہ اُن کی قضا آئے گی کہ وُہ مر جائیں اور نہ اُن کے عذاب میں تخفیف کی جائے گی"۔

ابن اثیر نے لکھا ہے:۔

قال القاضی عیاض انعقد الاجماع علی ان الکفار لا تنفعھم اعمالھم و لا یثابون علیھا بنعیم و لا تخفیف عذاب

قاضی عیاض کہتے ہیں کہ اس پر اجماع ہے کہ کفّار کو ان کے اعمال فائدہ نہیں دیں گے اور نہ انہیں نعمت کی صُورت میں اجر ملے گا نہ تخفیفِ عذاب کی صُورت میں"۔

(جامع الاصول۔ ج۔ ص۳۵۹)

جب یہ روایت قرآن مجید کے نصوص واضحہ اور اجماعِ اُمّت کے سراسر خلاف ہے تو اس پر اعتماد کیسا۔ بلکہ اس کے راوی ثقہ و عادل بھی ہوتے جب بھی اس پر اعتماد صحیح نہ تھا چہ جائیکہ قرآن کے خلاف ہونے کے ساتھ اس کے راوی بھی غیر ثقہ اور نا قابل اعتماد ہیں۔

پانچویں یہ کہ وُہ نبیٔ رحمت و پیکرِ رأفت (صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) اتنا نہ کر سکتے تھے کہ جب اُن کے حق میں سفارش کر کے انہیں جہنم کی تہ سے نکال کر اُوپر والی سطح پر لے آئے تھے تو اُن کی اسلامی خدمات اور کم از کم

اسلام دوستی کی بنا پر کہ جس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا انہیں جہنم سے نکال کر جنت میں نہ سہی اعراف میں پہنچا دیتے۔ جبکہ اس قسم کی مراعات کفر کے باوجود نوشیروان کے لئے اس کی عدالت کی وجہ سے اور حاتم کے لیئے اس کی سخاوت کی وجہ سے تجویز کی جاتی ہے بلکہ ایک طرح کی مراعات ابولہب ایسے کافر و دشمن اسلام کے لئے بھی تجویز کی گئی ہے۔ چنانچہ مشہور عالم اہلحدیث وحید الزمان نے کتب صحاح سے نقل کیا ہے کہ:

"ایک شخص نے ابولہب کو خواب میں دیکھا۔ اُس نے بیان کیا کہ پیر کے دن کچھ پانی پینے کے لئے مجھ کو مل جاتا ہے۔ یہ اس کی جزا ہے۔ جو میں نے ثویبہ کو آنحضرتؐ کی ولادت کی خوشی میں آزاد کر دیا تھا۔" (لغات الحدیث باب الضاد۔ صفحہ ۱۲) اور ایک روایت اس طرح ہے کہ آنحضرتؐ نے ابولہب کو خواب میں دیکھا کہ وہ پیاس سے بے حال ہے۔ لیکن کچھ سیرابی کا بھی سامان ہے۔ آنحضرتؐ نے پوچھا کہ یہ سیرابی کس بنا پر ہے؟ کہا:۔

بعتقی ثویبۃ لانھا ارضعتك (تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ ص ۹) ثویبہ نے آپ کو دودھ پلایا تھا اور میں نے اُسے آزاد کر دیا تھا۔ یہ اُس کی جزا ہے۔"

کتنی حیرت انگیز ہے یہ چیز کہ ابولہب کے لئے اتنی سی بات پر سیرابی کو تجویز کیا جاتا ہے کہ اُس نے اپنی کنیز ثویبہ کو آنحضرتؐ کی ولادت کی خوشی میں یا انہیں دودھ پلانے کی وجہ سے آزاد کر دیا تھا حالانکہ ابولہب رسولؐ اللہ کے دشمنوں کی صف اوّل میں تھا اور انہیں جھٹلانے، ایذا دینے اور اُن کا تمسخر اُڑانے میں پیش پیش تھا اور زندگی کی آخری گھڑیوں تک کفر و عناد پر قائم رہا تھا۔ اور ابو طالب جو اپنی زندگی آنحضرتؐ کی حفاظت و نصرت کے لئے وقف کیئے ہوئے تھے اُن کی محنت و جانفشانی کے صلہ میں اتنا بھی نہیں ہوتا کہ اُن کے لئے بھی تھوڑی بہت سیرابی کو تجویز کر دیا جاتا۔ کیا رسولؐ کی تربیت و کفالت اور اسلام کی نصرت و حمایت کا درجہ ایک کنیز کے آزاد کر دینے سے بھی کمتر ہے۔ اور پھر شفاعت کے بعد حضرت ابو طالبؑ کے عذاب کی جو نوعیت تجویز کی گئی ہے کیا اس سے شفاعت پیغمبرؐ کی بے وزنی و بے اثری ثابت نہیں ہوتی جبکہ اس قسم کی روایات میں یہ تک کہا گیا ہے کہ "اگرچہ وہ جہنم کی اُوپر والی سطح پر ہوں گے مگر اُن کا بھیجا پگھل پگھل کر اُن کے پیروں پر بہہ رہا ہو گا۔ کیا شفاعت رسولؐ کے بعد اس ہولناک اور لرزہ انگیز عذاب کا تصوّر صحیح ہو سکتا ہے۔ اور کیا یہ بہتر نہ تھا کہ ان کے لئے شفاعت کو تجویز ہی نہ کیا جاتا تاکہ شفاعت کی سبکی و بے قدری ظاہر نہ ہوتی۔ اور پھر اس جاں نثاری و جانفشانی کے صلہ میں اُن کے لئے جہاں تخفیف عذاب کی شفاعت تجویز کی جاتی ہے وہاں یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ پیغمبرؐ اُن کے لئے دُعا کرتے کہ خدا اُنہیں ایمان کی توفیق دے جبکہ پیغمبرؐ کی یہ دلی خواہش بھی تھی کہ وہ ایمان سے سرافراز ہوں اور اس طرح کی دُعا دوسروں کے حق میں کر بھی چکے تھے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہؒ تحریر کرتے ہیں:۔

دعا لام ابی ھریرۃ فامنت فی یومھا (حجۃ اللہ البالغہ۔ ج ۲۔ ص ۱۸۵) آنحضرتؐ نے ابو ہریرہ کی ماں کے لئے دُعا فرمائی اور وہ اُسی دن مسلمان ہو گئی۔"

یہ تو نہ ہو سکتا تھا کہ ابو ہریرہ کی ماں کے بارے میں تو اُن کی دُعا قبول ہو جاتی اور ابو طالب کے بارے میں بے اثر ہو کر رہ جاتی جبکہ اُم ابو ہریرہ کی کوئی خصوصیت بھی نظر نہیں آتی سوائے اس کے کہ وُہ ابو ہریرہ کی ماں تھی اور ابو طالب کے اور خدمات سے قطع نظر کرتے ہُوئے بھی دیکھا جائے تو صرف تربیتِ رسُول ؐ کے سلسلہ میں ان کے خدمات کا مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ کیا پیغمبرؐ کی تربیت و کفالت میں ان کی تندہی و جانفشانی ان کی نجات کی ضامن نہیں ہو سکتی جبکہ آنحضرتؐ کا یہ ارشاد زبان زدِ خلائق ہے کہ انا و کافل الیتیم فی الجنّۃ کھاتین (ترمذی ص ۲۸۵) میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنّت میں ساتھ ساتھ ہوں گے۔" کیا ابو طالب سے بڑھ کر یتیم کی کفالت میں کسی کا درجہ بلند تر ہو سکتا ہے جنہوں نے اپنی اولاد کو بھُو کا رکھ کر یتیمِ عبد اللہ کی پرورش کی ہو اپنا خُون پسینہ ایک کر کے انہیں پروان چڑھایا ہو اور اپنی جان و مال اور اولاد کے نثار کرنے میں بھی دریغ نہ کیا ہو۔

پانچویں دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ حدیثِ نبوی میں وارد ہُوا ہے کہ لا توارث بین اھل ملّتین "دو جُدا گانہ ملتوں میں باہمی توارث نہیں ہوتا" چنانچہ کافر مسلمان کا اور مسلمان کافر کا وارث نہیں ہو سکتا۔ اگر ابو طالب مسلمان ہوتے تو حضرت علیؑ اور جعفر طیار کو بھی اُن کے ترکہ میں سے حصّہ ملتا۔ اور وُہ اپنے حصّے کا مطالبہ کرتے۔ لیکن ان دونوں نے اس بنا پر انکار کر دیا کہ مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوا کرتا۔ اور عقیل اور طالب چُونکہ اُس وقت تک مُسلمان نہیں ہُوئے تھے اس لئے وُہی ان کے وارث قرار پائے۔

یہ دلیل صرف ایک مغالطہ ہے جسے نظر فریب بنانے کے لئے پہلے تو ایک بے سند روایت پیش کی جاتی ہے کہ علیؑ اور جعفرؓ نے ابو طالب کی میراث میں سے حصّہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اور پھر ایک حدیث سے اس مطلب کو تقویت دی جاتی ہے کہ یہ انکار ابو طالب کے کفر کی بناء پر تھا حالانکہ نہ حدیث کا یہ مفہوم ہے اور نہ کسی صحیح سند سے یہ ثابت ہے کہ انہوں نے میراث سے انکار کیا تھا۔ اس حدیث کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ اگر وارث و مورث میں اتحادِ مذہب نہ ہو تو ان میں باہمی توارث نہیں ہوتا۔ اس طرح کہ اگر باپ مسلمان ہو اور بیٹا کافر تو کافر وارث نہیں ہو گا۔ اور اگر باپ کافر ہو اور بیٹا مسلمان ہو تو بیٹا وارث نہیں ہو گا۔ یعنی عدمِ توارث اس وقت صادق آئے گا جب مسلمان کافر کا اور کافر مُسلمان کا وارث قرار نہ دیا جائے۔ حالانکہ اگر ایک وارث ہو اور دُوسرا وارث نہ ہو بایں صُورت کہ کافر مُسلمان کا وارث نہ ہو اور مُسلمان کافر کا وارث ہو تو اس صورت میں بھی عدمِ توارث صادق آتا ہے کیونکہ جب توارث کے معنی یہ ہیں کہ دو آپس میں ایک دُوسرے کے وارث ہوں تو درصورتیکہ ایک وارث ہو اور دُوسرا وارث نہ ہو تو یہ بھی عدمِ توارث ہے اس لئے کہ توارث طرفین کی نفی کی ایک صورت یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے وارث نہ ہوں۔ اور ایک صورت یہ ہے کہ ایک وارث ہو اور دُوسرا وارث نہ ہو۔ لہذا اگر مسلمان کافر کا وارث ہو اور کافر مسلمان کا وارث نہ ہو تو ان میں توارث کی نفی صحیح ہو گی۔ اور فقہاء امامیہ کے نزدیک صورتِ مسئلہ بھی یہی ہے کہ مُسلمان کافر کا بھی وارث ہوتا ہے اور مُسلمان کا بھی۔ اور کافر صرف کافر کا

وارث ہوتا ہے اور مسلمان کے ترکہ میں سے کچھ نہیں پاتا تاکہ اسلام کی بالادستی قائم رہے جیسا کہ حدیث میں وارد ہوا ہے:۔ الاسلام یعلو ولا یعلی علیہ۔ اسلام کو سب پر تفوق حاصل ہے اور اس پر کسی کو بالادستی حاصل نہیں"۔ لہٰذا ابو طالب کو اگر کافر بھی فرض کر لیا جائے تو یہ کفر اس کا باعث نہیں ہو سکتا کہ ان کی مسلمان اولاد اُن کے ترکہ سے محروم رہے اور اسلام کو بھی کفر کی طرح موجب حرمان ارث قرار دے کر اسلام کے آگے ایک دیوار کھڑی کر دی جائے۔ اگر اسلام کا قانونِ وراثت یہی ہوتا کہ مسلمان کسی کافر کا وارث نہیں ہو سکتا۔ تو وُہ صحابہ جن کے والدین کفر کی حالت میں مرے تھے انہیں اپنے ماں باپ کا وارث نہ ہونا چاہیئے تھا حالانکہ تاریخ ایک فرد کی بھی نشاندہی نہیں کرتی جو اسلام کی بناء پر کافر ماں باپ کے ورثہ سے محروم قرار دی گئی ہو۔ تو کیا یہ میراث سے محرومی خاندان پیغمبرؐ ہی کے لئے مخصوص تھی؟ پھر اس کا کیا ثبوت ہے کہ اگر حضرت علیؑ نے ابو طالب کے ترکہ میں سے کچھ نہیں لیا تو اُن کے کفر کی بنا پر جبکہ یہ بھی احتمال ہے کہ انہوں نے اپنی قناعت پسندی، سیر چشمی اور عدم احتیاج کی بنا پر نہ لیا ہو اور سب کچھ عقیل کے لئے چھوڑ دیا ہو یا عقیل نے قبضہ کر لیا ہو اور انہوں نے اُن سے کوئی تعرّض نہ کیا ہو۔ اور تاریخ سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ مورّخین نے لکھا ہے کہ جب پیغمبرؐ اکرم مکّہ سے ہجرت کر کے مدینہ آ گئے تو عقیل نے آنحضرتؐ کے ترکِ وطن سے فائدہ اُٹھایا اور حضرت خدیجہؓ کا مکان اور وُہ مکانات جو عبدالمطلب سے ابو طالب کی طرف منتقل ہوئے تھے ابو سفیان کے ہاتھ بیچ ڈالے۔ اس موقع پر نہ پیغمبرؐ موجود تھے نہ علیؑ اور جعفر کہ انہیں روکتے یا قیمت فروخت میں سے اپنے حصّہ کا مطالبہ کرتے۔ اور جب فتح مکّہ کے بعد کچھ کہنے سننے کا موقع آیا تو درگزر سے کام لیا۔ اس درگزر کو تنہا عقیل کے استحقاقِ میراث کی دلیل نہیں قرار دیا جا سکتا جبکہ اُن کا یہ تصرّف حالات سے فائدہ اُٹھانے کے نتیجہ میں تھا نہ میراث کی بنا پر۔ چنانچہ ابن شہاب کہتے ہیں:۔

الحق ان عقیلا رضی اللہ عنہ انما استولی علیٰ بیوت عبد المطلب بعد الھجرۃ کما استولت کفار قریش علی سائر دور المھاجرین ولو کان استحقاق عقیل لھا بالارث لما ساغ لہ بیع بیت خدیجہ بنتِ خویلد رضی اللہ عنھا۔	حق بات یہ ہے کہ عقیل رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہجرتِ رسولؐ کے بعد عبدالمطلب کے گھروں پر قابض ہو گئے تھے جس طرح کفارِ قریش نے مہاجرین کے متروکہ گھروں پر قبضہ جما لیا تھا۔ اور فتح مکّہ کے بعد نہ پیغمبر اکرمؐ نے اور نہ مہاجرین میں سے کسی نے ان گھروں کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ اگر ان مکانوں پر عقیلؓ کا استحقاق ورثہ کی بنا پر تھا تو پھر انہوں نے خدیجہ بنتِ خویلد رضی اللہ عنہا

کا مکان کس حق وراثت کی بناء پر فروخت کیا تھا۔" (برحاشیہ فائق۔ ج۱۔ ص۱۸۱)

چھٹی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ کسی ضعیف روایت سے بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ابوطالب نے اکیلے یا پیغمبرؐ کے ساتھ کبھی نماز پڑھی ہو حالانکہ وہ آنحضرتؐ کے اعلانِ رسالت کے بعد دس برس تک زندہ رہے۔ اگر وہ مسلمان ہو چکے ہوتے تو کبھی نہ کبھی تو نماز پڑھتے جبکہ نماز اسلام کا ایک لازمی فریضہ ہے اور اُس کی پابندی ضروری ہے۔

یہ دلیل بھی کوئی وزن نہیں رکھتی۔ اس لئے کہ ایسے ماحول میں جہاں ان کے کفر کے اثبات کے لئے حدیثیں وضع کی جاتی ہوں اور انہیں خارج از اسلام ثابت کرنے کے لئے دلائل تراشے جاتے ہوں اگر کوئی ایسی روایت موجود نہ ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ تاہم اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اوائلِ بعثت میں جب انہوں نے اپنے فرزند حضرت علیؑ کو پیغمبرؐ کے ساتھ نماز پڑھتے دیکھا تو اس پر اپنی خوشنودی و رضامندی کا اظہار کیا اور اس طریقِ عبادت کو عملِ خیر سے تعبیر کر کے انہیں پیغمبرؐ سے وابستہ رہنے کی تاکید کی اور ایک مرتبہ علیؑ کو پیغمبرؐ کی داہنی جانب کھڑے ہو کر نماز پڑھتے دیکھا تو اپنے فرزند جعفر سے جو اسلام لا چکے تھے فرمایا:۔

صل جناح ابن عمك فصل علٰی یسارہ۔ — تم بھی اپنے ابنِ عم کی بائیں جانب کھڑے ہو کر نماز پڑھو۔" (سیرت نبویہ دحلان ص۱۰۱)

اگر انہوں نے بالفرض نماز میں شرکت نہیں کی تو اس لئے کہ قریش کی فتنہ سامانیوں کی روک تھام اور اُن کی شرانگیزیوں سے پیغمبرؐ کا تحفظ کر سکیں۔ اور پھر ان کی زندگی میں نماز کو وجوبی حیثیت حاصل ہی نہ تھی اور نہ اس کی کوئی شکل متعین ہوئی تھی بلکہ صرف بطورِ نفل و استحباب پڑھی جاتی تھی۔ لہذا اُن کے نماز نہ پڑھنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اسلام سے منحرف تھے۔

ساتویں دلیل یہ ہے کہ اگر وہ مسلمان ہوتے اور اسلام پر اُن کا خاتمہ ہوتا تو پیغمبر اسلام اُن کی نمازِ جنازہ پڑھتے یا کسی کو پڑھنے پر مامور کرتے۔ اس لئے کہ یہ بھی اسلامی فرائض و دینی شعائر میں شامل ہے۔ حالانکہ کسی روایت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آنحضرتؐ نے یا کسی اور نے اُن کی میت پر نماز ادا کی ہو۔

یہ شبہہ سرے سے بے محل ہے اس لئے کہ نمازِ میت کا حکم اُن کے مرنے کے بعد نافذ ہوا اور اس دور کے مرنے والوں میں سے کسی کی نماز جنازہ نہیں پڑھی گئی۔ چنانچہ حضرت ابوطالب کی رحلت کے کچھ دنوں بعد ام المومنین حضرت خدیجہؓ نے انتقال فرمایا تو اُن کی نماز جنازہ بھی نہیں پڑھی گئی۔ حالانکہ ان کا نہ صرف اسلام مسلّم ہے بلکہ اسلام میں سبقت بھی شک و شبہہ سے بالاتر ہے۔ بلاذری نے تحریر کیا ہے:۔

نزل رسول اللہ فی قبرھا — رسول اللہ حضرت خدیجہؓ کی قبر میں اُترے

ولم یکن سنت الصلوٰۃ علی — اور اُس وقت میت پر نمازِ جنازہ کا حکم

الجنائز یومئذ۔ (انساب الاشراف ج ص ۴۰۶) نافذ نہ ہوا تھا"۔

یہ ہے روایات و شبہات کا وُہ پلندہ جو ابوطالب کے کفر کے اثبات کے لئے فراہم کیا گیا ہے اور انہی روایتوں اور من گڑھت دلیلوں پر اعتماد کرتے ہوئے ان کے کفر و شرک پر اصرار کیا جاتا ہے حالانکہ ان کے صریحی اعترافِ ایمان پیغمبر اکرمؐ کی شہادت اور ائمۂ اطہار کے اجماع و اتفاق کے بعد ان کے ایمان سے انکار کا کوئی محل نہیں رہتا۔ اور ہر صاحب بصیرت ان بے سر و پا روایتوں اور خود ساختہ دلیلوں کو دیکھ کر فیصلہ کر سکتا ہے کہ ان میں مغالطہ آفرینیوں اور ابلہ فریبیوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔

حضرت ابوطالب دین کے محافظ اسلام کے پُشت پناہ اور پیغمبرؐ اسلام کے لئے ایک دفاعی حصار اور مستحکم قلعہ تھے۔ انہوں نے شدید سے شدید مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور کسی موقع پر نہ حرف شکایت لب پر آیا اور نہ جبین پر شکن آئی۔ اور اپنی جوانی و پیرانہ سالی میں ایک لمحہ بھی پیغمبرؐ کی حفاظت میں فروگزاشت اور اسلامی خدمات میں کوتاہی کے مرتکب نہیں ہُوئے۔ بلکہ بستر مرگ پر بھی اُن کا ذہن اسلام اور بانئ اسلام کے تحفّظ کی فکروں سے خالی نہ تھا۔ چنانچہ جب شعب ابوطالب کی پیہم و مسلسل جان گداز مصیبتوں کے نتیجہ میں صحت نے جواب دے دیا اور موت کے آثار نظر آنے لگے تو شیوخ و عمائدِ قریش کو طلب کیا اور انہیں امانت، صدق بیانی، صلۂ رحم، فقراء کی اعانت و دستگیری اور خانہ کعبہ کے احترام کی ہدایت کے بعد آنحضرتؐ کی حفاظت و نصرت کی وصیت کرتے ہوئے فرمایا:۔

انا اوصیکم بمحمدؐ خیرا
فانه الامین فی قریش و
الصدیق فی العرب وهو جامع
لکل ما اوصیکم به وقد
جاء بامر قبله الجنان و
انکره اللسان مخافة الشنان
وایم الله کانی انظر الی
صعالیك العرب واهل البر
فی الاطراف والمستضعفین
من الناس قد اجابوا دعوته
وصدقوا کلمته وعظموا امره
فخاض بهم غمرات فصار
رؤساء قریش وصنادیدها

مَیں تمہیں محمدؐ کے ساتھ بھلائی کی وصیت کرتا ہوں
وُہ قریش میں امین اور عرب میں صدّیق ہیں اور
اُن میں وُہ تمام صفتیں موجود ہیں جن کی میں نے
تمہیں وصیّت کی ہے۔ وُہ ایسی چیز لے کر آئے ہیں
جن کے دل معترف ہیں اور زبانیں عداوت کے
ڈر سے چُپ ہیں۔ خدا کی قسم گویا یہ منظر میں اپنی
آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ عرب کے فقراء
اور اطراف و جوانب کے بادیہ نشین اور کمزور
افراد اُن کی آواز پر لبّیک کہہ رہے ہیں۔ محمدؐ
انہیں لے کر سختیوں کے بھنور میں اُتر پڑے
ہیں اور قریش کے سر بلند پست اور سردار
ذلیل ہو گئے ہیں اُن کے گھر اُجڑ گئے ہیں۔
اور کمزور و ناتوان افراد بر سرِ اقتدار آ گئے ہیں

اذنابا ودورها خرابا و
ضعفاءها اربابا واذا اعظمهم
علیه احوجهم الیه وابعدهم
منه احظاهم عنده قد
محضته العرب ودادها
واصفت له فوادها واعطته
قیادها دونکم یا معشر قریش
ابن ابیکم کونوا له ولاۃ و
لحزبه حماۃ و واللہ لا
یسلك احد سبیله الارشد
ولا یاخذ احد بهدیه الاسعد
ولو کان لنفسی مدۃ ولاجلی
تاخیر لکفیت عنه الهزاهز
ولدفعت عنه الدواهی۔
(ثمرات الاوراق۔ ج۲۔ ص۱۳)

باعظمت لوگ اُن کے دست نگر ہو گئے ہیں اور دُور والے فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ عرب اُن کے مخلص دوست اور دل کی پاکیزگی کے ساتھ ہمنوا ہو گئے ہیں اور انہیں اپنی قیادت سونپ دی ہے۔ اے گروہ قریش تم بھی محمّد (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلّم) کے دوست اور اُن کی جماعت کے مددگار بن جاؤ۔ خدا کی قسم جو بھی اُن کے بتائے ہُوئے راستے پر چلے گا وُہ ہدایت پائے گا اور جو بھی اُن کے طریقہ پر عمل کرے گا خوش بخت ہو گا اگر مجھے کچھ اور زندگی باقی اور میری مَوت میں تاخیر ہوتی تو مَیں اُن سے دُشمن کے حملوں کو روکتا اور مصیبتوں سے اُنہیں بچاتا۔"

اس عمومی وصیّت کے بعد اولاد عبد المطلب سے خطاب کرتے ہُوئے فرمایا:۔

لن تزالوا بخیر ما سمعتم
من محمدٍ وما اتبعتم
امرہ فاتبعوہ واعینوہ
ترشدوا۔ (طبقات ابن سعد ج۱۔ ص۱۲۳)

جب تک تم محمّدؐ کی بات سُنتے رہو گے اور اُن کے احکام کی پیروی کئے جاؤ گے خیر و سعادت سے بہرہ ور رہو گے اُن کی پیروی کرو اُن کا ہاتھ بٹاؤ ہدایت یافتہ رہو گے۔"

زندگی کے آخری لمحوں میں پیغمبرؐ کی صداقت و امانت کی گواہی دُنیا اور خیر و سعادت اور رُشد و ہدایت کو اُن کے اتباع سے وابستہ کرنا اعترافِ رسالت و تصدیقِ نبوّت نہیں ہے تو کیا ہے۔ اور کیا یہ ہدایت آموز و ایمان افروز کلمات اُن کے اسلام کے آئینہ دار نہیں ہیں؟

جب وصیّت کر کے اپنے فریضہ سے سبکدوش ہو گئے تو مَوت کے آثار ظاہر ہُوئے چہرے کا رنگ بدل گیا، پیشانی پر پسینہ آیا اور پیغمبرؐ کا سب سے بڑا ناصر و مددگار اور سرپرست و غمگسار چھیاسی برس کی عُمر میں جوارِ رحمت میں پہنچ گیا۔ آنحضرتؐ پر کوہِ غم و الم ٹوٹ پڑا، آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آئے اور گلوگیر آواز میں علیؑ سے فرمایا:۔

اذھب فغسلہ وکفنہ و وارہ غفر اللہ ورحمہ (طبقات ابن سعد۔ ج ۱۔ ص ۱۰۵)۔	جاؤ انہیں غسل دو کفن پہناؤ اور دفن کا سامان کرو۔ خدا انہیں مغفرت کرے اور اپنی رحمت اُن کے شاملِ حال رکھے"۔

آنحضرتؐ نے غسل وکفن کی انجام دہی پر حضرت علیؑ کو مامور فرمایا حالانکہ آپ اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ عقیل اور طالب اس وقت تک زمرۂ اہلِ اسلام میں شمار نہ ہوتے تھے۔ اور ابو طالب ایسے مُسلم ومومن کا غسل وکفن کسی غیر مسلم سے متعلق نہیں کیا جا سکتا تھا۔ حضرت جعفرؓ اگرچہ اسلام لا چکے تھے مگر اُس موقع پر وُہ بلادِ حبشہ میں تھے۔ اب اولادِ ابو طالب میں ایک علیؑ ہی ایسے تھے جو اس فریضہ کو انجام دے سکتے تھے۔ یہ چیز بھی ابو طالب کے ایمان پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس لئے کہ اگر ابو طالب کافر ہوتے تو اُن کا غسل وکفن حضرت علیؑ کے بجائے اُن کی ہم مذہب وہم مسلک اولاد سے متعلق کیا جاتا۔ کیونکہ ایک مُسلمان سے یہ خدمت نہیں لی جا سکتی کہ وُہ ایک کافر کو غسل وکفن دے۔ غرض حضرت علیؑ نے غسل وکفن دیا۔ آنحضرتؐ تشریف فرما تھے، اپنے محسن ومربی چچا کو کفن میں لپٹا ہوا دیکھ کر بہت روئے۔ اور فرمایا:۔

یا عم ربیت صغیرا وکفلت یتیما ونصرت کبیرا جزاک اللہ عنی خیرا۔ (تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ ص ۲۶)۔	اے چچا آپ نے بچپن میں پالا، یتیمی میں میری کفالت کی، بڑا ہونے پر میری نصرت وحمایت کی خداوندِ عالم میری طرف سے آپ کو جزائے خیر دے"۔

جب جنازہ اُٹھا کر لے چلے تو آپ کندھا دیتے ہوُے شروع سے آخر تک شریکِ جنازہ رہے اور اس کوہِ صبر وثبات کو کوہِ حجون کے دامن میں دفن کر کے واپس ہوئے۔

آنحضرتؐ کے لئے ابو طالب کی مُوت ایک عظیم سانحہ تھی۔ ان کا سب سے بڑا حامی وپُشت پناہ جاتا رہا تھا اور آپ خونخوار دشمنوں کے نرغہ میں بے یار ومددگار رہ گئے تھے۔ اگرچہ مسلمانوں کی تعداد بڑھ گئی تھی مگر ان میں ابو طالب ایسا باأثر کوئی نہ تھا جو قریش کے بڑھتے ہوُے مظالم کا انسداد کر سکے چنانچہ اُن کے اُٹھ جانے کے بعد قریش کے مظالم میں شدّت پیدا ہو گئی اور آپؐ پر ظلم وستم کے اتنے پہاڑ توڑے کہ ابو طالب کی زندگی میں اس قدر مظالم ڈھانے کی انہیں جُرأت وجسارت نہ ہو سکتی تھی۔ ابن ہشام نے تحریر کیا ہے:۔

فلما ھلک ابوطالب نالت قریش من رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم من	جب ابو طالب وفات پا گئے تو قریش نے آنحضرتؐ کو اتنی تکلیفیں دیں کہ ابو طالبؑ کی زندگی میں ستانے کی اتنی ہوس

الاذی مالو تکن تطمع فی حیات ابی طالب۔ | اُن کے دلوں میں پیدا نہ ہو سکتی تھی"۔

(سیرت ابن ہشام۔ ج۲۔ ص۵۸)

ابو طالبؑ کی وفات کا غم ابھی تازہ ہی تھا کہ اُن کی رحلت کے ایک مہینہ پانچ دن بعد جناب خدیجہؓ نے بھی انتقال فرمایا۔ اس حادثہ کا بھی رسولؐ اللہ کو انتہائی رنج و قلق ہوا اور آپؐ نے ان دونوں کے مرنے کا یکساں غم منایا۔ اور اپنے غم و حزن کی یاد باقی رکھنے کے لئے اس سال کا نام "عام الحزن" (غم و اندوہ کا سال) رکھا۔ اور فرمایا:۔

اجتمعت علیٰ ھٰذہ الامۃ فی ھٰذہ الایّام مصیبتان لا ادری بایھما انا اشد جزعاً۔ (تاریخ یعقوبی۔ ج۲۔ ص۲۶) | ان دنوں میں اس اُمّت پر دو عظیم حادثے ایک ساتھ وارد ہوئے ہیں۔ مَیں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ان دونوں صدموں میں سے کون سا صدمہ میرے لیئے زیادہ رنج و کرب کا باعث ہے"۔

آنحضرتؐ نے حضرت ابو طالبؑ اور حضرت خدیجہؓ کی وفات کو اپنی اُمّت کے لئے ایک حادثۂ عظمیٰ و مُصیبتِ فاجعہ قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ ابتدائے بعثت میں یہی وہ دو ہستیاں تھیں جنہوں نے اسلام کے نشر و فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا اور پیغمبر اکرمؐ کی نصرت و حمایت کا بیڑا اُٹھایا تھا۔ ایک نے اپنی ساری دولت آنحضرتؐ کے قدموں پر نچھاور کردی اور دُوسرا استبدادی طاقتوں کے مقابلہ میں سینہ سپر بن کر کھڑا ہوگیا۔ اگر احسان شناسی کا جذبہ اور حُسنِ خدمات کا احساس ہو تو یہ دونوں موتیں جو پیغمبرؐ کی زندگی کا عظیم حادثہ تھیں، اُمّت کے لئے بھی ایک ناقابلِ فراموش المیہ ہوں گی۔

اہلِ مکہ نے سردارِ قریش، یادگارِ عبدالمطلب، رئیسِ بطحا ابو طالبؑ کے مرنے پر سوگ منایا اور حضرت علیؑ نے اپنے اس عظیم باپ کی وفات پر پُر اندوہ مرثئے کہے۔ ایک مرثیہ کے چند اشعار یہ ہیں:۔

اباطالب عصمة المستجیر | وغیث المحول ونور الظلم

اے ابو طالب آپ پناہ مانگنے والوں کے لئے دار الامان، قحط سالی میں ابرِ باراں اور تاریکیوں میں شمعِ درخشاں تھے"۔

لقد ھد فقدك اھل الحفاظ | فصلی علیك ولی النعم

آپ کی مَوت سے اربابِ غیرت و حمیّت کو انتہائی صدمہ ہُوا۔ خداوندِ عالم آپ پر رحمتِ فراواں نازل کرے"۔

ولقاك ربك رضوانه | فقد کنت للطھر من خیر عم

آپ کو اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی نصیب ہو آپ نبیؐ پاک کے بہترین چچا تھے۔"
(تذکرۂ سبط ابن جوزی ص۶)

فاطمہ بنت اسد

فاطمہ بنتِ اسد حضرت علیؑ کی والدہ گرامی تھیں۔ اسد، قیلہ بنتِ عامر کے بطن سے حضرت ہاشمؑ کے فرزند تھے اس لحاظ سے آپ ہاشمؑ کی پوتی اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پھوپھی اور حرمِ ابو طالبؑ ہونے کی بناء پر چچی ہوئیں۔ جب آنحضرتؐ ابو طالب کی کفالت میں آئے تو انہی کی گود پیغمبرؐ ایسے ہادئ اکبر اور رہنمائے اعظم کی گہوارۂ تربیت بنی اور انہی کی آغوشِ محبت و شفقت میں پرورش پائی۔ اگر حضرت ابو طالبؑ نے تربیت و نگہداشت میں باپ کے فرائض انجام دیئے تو فاطمہ بنت اسد نے اس طرح محبت و دلسوزی سے دیکھ بھال کی کہ یتیم عبداللہ کو ماں کی کمی کا احساس نہ ہونے دیا۔ اپنے بچوں سے زیادہ اُن کا خیال رکھتیں اور اُن کے مقابلہ میں اپنی اولاد تک کی پرواہ نہ کرتیں۔ ان کی محبت و التفات کا یہ عالم تھا کہ جب خرما کے درختوں میں پھل آتا تو صبح کے تڑکے اُٹھ کر خرموں کے کچھ دانے چُن کر علیحدہ رکھ دیتیں۔ اور جب اُن کے بچے اِدھر اُدھر ہوتے تو وہ خرمے آنحضرتؐ کو پیش کرتیں۔ اور جب دستر خوان بچھتا تو اُس پر سے کچھ کھانا اُٹھا کر الگ رکھ دیتیں کہ اگر کسی وقت وہ کھانا مانگیں تو انہیں دے سکیں۔

پیغمبر اکرمؐ بھی انہیں ماں سمجھتے، ماں کہہ کر پکارتے اور ماں ہی کی طرح عزت و احترام کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی شفقت و محبت کا اعتراف کرتے ہوئے فرمایا:۔

لم یکن بعد ابی طالب ابربی منها۔ (استیعاب۔ ج۔ ص۷۷۴)	ابو طالب کے بعد اُن سے زیادہ کوئی مجھ پر شفیق و مہربان نہ تھا"

آنحضرتؐ اُن کی مادرانہ شفقت و نظرِ محبت سے اتنا متاثر تھے کہ منصبِ رسالت پر فائز ہونے کے بعد اپنے فرائضِ منصبی سے وقت نکالتے، اُن کے ہاں آتے اور اکثر دوپہر کے اوقات انہی کے ہاں گزارتے۔ ابن سعد نے لکھا ہے:۔

کان رسول اللہؐ یزورها و یقیل فی بیتها۔ (طبقات ج۸ ص۲۲۲)	رسول اللہؐ آپ کی زیارت کو آتے اور دوپہر کو اُنہی کے ہاں استراحت فرماتے"۔

آپ کے بطن سے ابو طالب کی سات اولادیں ہوئیں جن میں تین صاحبزادیاں تھیں: ریطہ، جمانہ اور فاختہ جو اُمّ ہانی کی کنیت سے معروف ہیں۔ اور چار صاحبزادے تھے: طالب، عقیل، جعفر اور علیؑ۔ طالب عقیل سے دس سال بڑے تھے اور عقیل جعفر سے دس سال بڑے تھے اور جعفر حضرت علیؑ سے دس سال بڑے تھے۔ جناب ابو طالب ہاشمی تھے اور فاطمہ بنتِ اسد بھی ہاشمیہ تھیں اور مادری

پدری دونوں نسبتوں سے ہاشمی ہونے کا شرف سب سے پہلے ابو طالب و فاطمہ ہی کی اولاد کو حاصل ہوا ابن قتیبہ نے تحریر کیا ہے :۔

هی اوّل هاشمیة ولدت الهاشمی۔ (المعارف۔ ص۸۸)

فاطمہ بنت اسد پہلی ہاشمیہ خاتون ہیں جن سے ہاشمی اولاد ہوی۔"

فاطمہ بنت اسد اسی دودمان ہاشمی کی فرد تھیں جو اخلاق و کردار، طرزِ بود و ماند اور تہذیب و معاشرت کے اعتبار سے دوسرے خاندانوں سے مختلف جاہلیت کے اثرات سے بیگانہ اور انسانی اقدار کا نمائندہ تھا۔ آپ میں موروثی صفات و خاندانی خصوصیات پوری طرح راسخ تھیں۔ اپنے آباؤ اجداد کی طرح مسلک ابراہیمی کی پابند، دین حنیف کی پیرو اور کفر و شرک کی آلائشوں سے پاک و صاف تھیں۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ سے صلبی و خلقی اشتراک کے سلسلہ میں فرمایا :۔

ان الله عزوجل نقلنا من صلب اٰدم فی اصلاب طاهرة الی ارحام زکیة فما نقلت من صلب وعلی نقل معی فلم نزل کذلك حتی استودعنی خیر رحم وهی اٰمنة واستودع علیا خیر رحم وهی فاطمة بنت اسد۔ (کفایة الطالب ص۲۶)

خدائے بزرگ و برتر نے ہمیں حضرت آدمؑ کی صلب سے پاکیزہ صلبوں اور پاکیزہ شکموں کی طرف منتقل کیا۔ جس صلب سے میں منتقل ہوا اُسی صلب سے ایک ساتھ علیؑ منتقل ہوے یہاں تک کہ خداوند عالم نے مجھے آمنہؑ کے شکم اطہر میں اور علیؑ کو فاطمہ بنت اسد کے پاکیزہ شکم میں ودیعت فرمایا۔"

جناب فاطمہ خاندانی رفعت، نسبی شرافت اور پاکیزگیٔ سیرت کے ساتھ اسلام، بیعت اور ہجرت میں بھی سبقت کا شرف رکھتی ہیں۔ ابن صباغ مالکی نے تحریر کیا ہے :۔

اسلمت وهاجرت مع النبیؐ وکانت من السابقات الی الایمان۔ (فصول المهمه۔ ص۱۳)

فاطمہ بنت اسد اسلام لائیں، پیغمبرؐ کے ساتھ ہجرت کی اور سابق الاسلام خواتین میں سے تھیں۔"

ابو الفرج اصفہانی تحریر کرتے ہیں :۔

عن الزبیر ابن العوام قال سمعت النبیؐ یدعو النساء الی البیعة حین انزلت هذه الاٰیة "یا ایها النبیّ اذا جاءك

زبیر ابن عوام کہتے ہیں کہ جب آیۂ یا ایہا النبی اذا جاءك المومنات۔ نازل ہوا تو میں نے پیغمبرؐ اکرم کو عورتوں کو بیعت کی دعوت دیتے ہوے سُنا اور فاطمہ بنت اسد پہلی

المومنات بیایعنك كانت فاطمة بنت اسد اوّل امراءة بایعت رسول اللہ۔
(مقاتل الطالبین۔ صـ۴)

خاتون تھیں جنھوں نے اس آواز پر لبیک کہتے ہوئے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی۔"

آپ غزوۂ بدر میں اُن خواتین میں شامل تھیں جو مجاہدین کو پانی پلاتی اور زخمیوں کی دیکھ بھال کرتی تھیں اس اسلامی جذبۂ خدمت کے ساتھ ایک منتظم اور سلیقہ مند خاتون کی طرح گھر کا نظم قائم رکھتیں اور گھر اور باہر کے کام زیادہ تر خود انجام دیتیں۔ البتہ جب ۲ھ میں جناب فاطمہ زہرا دُلہن کی حیثیت سے گھر میں آئیں تو دونوں میں تقسیم عمل اس طرح ہوا کہ گھر کا کام کاج جناب سیدہ کرتیں اور باہر کے کام آپ انجام دیتیں۔ چنانچہ حضرت علیؑ نے اُن سے کہا:۔

اکفی فاطمة سقایة الماء والذھاب فی الحاجة و تکفیك الطحن والعجن۔
(اصابہ۔ جـ۴۔ صـ۳۹۹)

فاطمہؑ بنتِ رسولؐ آٹا پیسنے اور گوندھنے سے آپ کو بے نیاز کر دیں گی۔ اور پانی اور دوسرے ضروریات کے لئے باہر جانا آپ سے متعلق ہوگا۔"

گھر اور گھر کے باہر کے کاموں کے لئے ایک کنیز بھی آپ کے ہاں تھی۔ مگر آپ یہ چاہتی تھیں کہ اس کی غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر اُسے آزاد کر دیں۔ چنانچہ ایک دن رسولؐ اللہ سے کہا کہ میں چاہتی ہوں کہ اس کنیز کو آزاد کر دوں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اگر آپ اُسے آزاد کر دیں گی تو خداوندِ عالم اس کے ہر عضو بدن کے بدلے آپ کے ہر جزوِ بدن کو دوزخ کی آگ سے آزاد کر دے گا۔ ابھی اس آزادی کی نوبت نہ آئی تھی کہ سخت بیمار پڑ گئیں۔ آپ نے حالتِ مرض میں پیغمبر اکرمؐ کو اس کی آزادی کے بارے میں وصیت کرنا چاہی مگر زبان لڑکھڑا گئی اور قوتِ گویائی ساتھ نہ دے سکی۔ پیغمبرِ اکرم کی طرف اشارہ کیا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ میں آپ کی وصیّت و خواہش کے مطابق اُسے آزاد کر دوں گا۔

آپ ریاضت و عبادت زہد و ورع اور تقویٰ و طہارت میں بلند درجہ رکھتی تھیں۔ جب فشارِ قبر، حشر و نشر اور حساب و کتاب کا ذکر سنتیں تو لرز جاتیں اور خوفِ آخرت سے کانپ اُٹھتیں۔ ایک مرتبہ پیغمبر اکرمؐ سے سُنا کہ لوگ قیامت کے دن برہنہ محشور ہوں گے۔ کہا کہ یہ تو بڑی رُسوائی کی بات ہے۔ فرمایا کہ میں اللہ سے دُعاء کروں گا کہ وُہ آپ کو بے پردہ محشور نہ کرے۔ اور ایک دفعہ فشارِ قبر کا ذکر سُنا تو کہا کہ میں ضعف و ناتوانی کی وجہ سے اُسے کیسے برداشت کروں گی۔ پیغمبرؐ نے فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ سے التجاء کروں گا کہ وُہ اپنی رحمت و رأفت سے آپ کو فشارِ قبر سے محفوظ رکھے۔ جب دارِ دُنیا سے رحلت فرمائی تو حضرت علیؑ روتے ہوئے رسولِ خدا کو اطلاع دینے آئے۔ آنحضرتؐ نے علیؑ کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تو پوچھا کہ کیا بات ہے؟ عرض کیا

کہ ابھی ابھی میری ماں نے انتقال کیا ہے۔ آنحضرتؐ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا خدا کی قسم وُہ میری بھی ماں تھیں۔ اور اُسی وقت اُٹھ کھڑے ہوئے۔ صحابہ بھی سر جھکائے ساتھ ہو لئے۔ جب اُن کے ہاں آئے تو پیراہن اُتار کر دیا اور فرمایا کہ یہ پیراہن انہیں کفن کے طور پر پہنا دیا جائے۔ اور جب غسل و کفن کے بعد جنازہ باہر نکلا تو آپ نے آگے بڑھ کر کاندھا دیا۔ کبھی میّت کے سرہانے کی طرف سے کاندھا دیتے اور کبھی پائنتی کی طرف سے۔ اور جنّتہ البقیع تک پا برہنہ جنازہ کے ساتھ رہے۔ آنحضرتؐ نے چند آدمیوں کو قبر کھودنے پر مامُور فرمایا تھا۔ جب قبر کھُد چکی تو خود بنفسِ نفیس قبر میں اُترے۔ اسے کناروں سے کھود کر کشادہ کیا اور اپنے ہاتھ سے لحد کھودی اور اُسے ہموار کر کے مٹی باہر نکالی۔ پھر کچھ دیر کے لئے لحد میں لیٹ گئے اور دائیں بائیں کروٹ لینے کے بعد باہر آئے اور روتے ہوئے فرمایا:۔

جزاك الله من ام خيرا لقد كنت خيرام۔ (تاریخ خمیس ج ۱ صفحہ ۵۲۶)	اے مادرِ گرامی خدا آپ کو جزائے خیر دے آپ بہترین ماں تھیں۔

پیغمبرؐ کے اس امتیازی برتاؤ کو دیکھ کر کچھ لوگوں نے کہا کہ یا رسُول اللہؐ کسی اور کے لئے یہ چیزیں آپ سے دیکھنے میں نہیں آئیں۔ فرمایا کہ میرے چچا ابو طالب کے بعد اس خاتون کے سب سے زیادہ مجھ پر احسانات ہیں۔ یہ خود بھُوکی رہتی تھیں اور مجھے کھانا کھلاتی تھیں۔ خود پھٹے پُرانے کپڑوں میں گزارہ کرتی تھیں اور مجھے اچھا لباس پہناتی تھیں۔ اپنے بچّوں کو پراگندہ مو رکھتی تھیں اور میرے سر میں تیل ڈالتی تھیں۔ اور خود تکلیفیں اُٹھاتی تھیں اور میرے لئے راحت و آرام کا سامان کرتی تھیں۔ میں نے اپنا پیراہن انہیں اس لئے پہنایا ہے تاکہ پردہ پوش محشور ہوں۔ اور لحد میں اس لئے لیٹا ہوں تاکہ فشارِ قبر سے محفوظ رہیں۔ عالمِ اہلسنت شیخ علی المرزوقی نے تحریر کیا ہے:۔

انّ النّبي تولى دفن فاطمة بنت اسد وكان اشعرها قميصا له فسمع وهو يقول ابنك فسئل فقال انما سئلت عن ربّها فاجابت وعن نبيّها فاجابت وعن امامها فلجلجت۔ فقلت ابنك ابنك۔ (کتاب الازمنۃ والامکنۃ ج ۲ صفحہ ۲۸۰)	پیغمبرِ اکرمؐ نے فاطمہ بنت اسد کو خود دفن کیا اور انہیں اپنے پیراہن کا کفن دیا۔ اس موقع پر آنحضرتؐ کو فرماتے سُنا گیا کہ "آپ کا فرزند"۔ جب آنحضرت سے اس کے بارے میں پُوچھا گیا تو فرمایا کہ فاطمہ بنتِ اسد سے پروردگار کے بارے میں پُوچھا گیا تو انھوں نے بتا دیا اور نبی کے بارے میں پُوچھا گیا تو اس کا جواب دے دیا۔ پھر امام کے بارے میں سوال ہُوا تو ان کی زبان لڑکھڑائی میں نے کہا: آپ کا فرزند آپ کا فرزند۔

آپ نے ۴ھ میں وفات پائی اور جنّۃ البقیع میں دفن ہوئیں۔ مگر جنّۃ البقیع کے گرد چار دیواری

کھینچ دینے سے یہ قبر موجودہ حدودِ جنۃ البقیع سے باہر ایک خستہ وخراب رہگزر پر واقع ہے۔ جب حجاج وزائرین ادھر سے گزرتے ہیں تو اس قبر پر بھی فاتحہ خوانی کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں جو ابھی تک دستبردِ زمانہ سے محفوظ ہے اور خدا نہ کرے کہ راستوں کی توسیع کی تجویز اسے اپنے تصرف میں لے لے۔

ولادت باسعادت

خانہ کعبہ ایک قدیم ترین عبادت گاہ ہے جس کی نیو آدمؑ نے ڈالی، اور جس کی دیواریں ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ نے اُٹھائیں۔ اگرچہ یہ گھر بالکل سادہ، نقش ونگار سے معرا، زینت و آرائش سے خالی اور چُونے اور پتھروں کی سیدھی سادی عمارت ہے مگر اس کا ایک ایک پتھر برکت وسعادت کا سرچشمہ اور عزت و حُرمت کا مرکز و محور ہے۔ خداوند عالم کا ارشاد ہے:۔

جعل الله الكعبة البيت الحرام۔	اللہ تعالےٰ نے خانہ کعبہ کو محترم گھر قرار دیا ہے۔"

خانہ کعبہ کی یہ عزت و حُرمت دائمی و ابدی ہے جو نہ پہلے زمانہ و وقت کی پابند تھی اور نہ اب ہے بلکہ روزِ تعمیر سے اسے بلند ترین عظمت اور غیر معمولی مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے اور اب بھی اس کی مرکزیت و اہمیت بدستور قائم ہے جس کا اظہار مختلف اسلامی عبادات کے ذریعہ ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ ہر مُسلمان چاہے وُہ مشرق کا باشندہ ہو یا مغرب کا عرب کا رہنے والا ہو یا عجم کا جب بھی نماز کے لئے کھڑا ہوگا اُسے ہی عبادت کی مرکزی سمت قرار دے گا۔ اور اس کے گرد چکر لگانا اور طواف کرنا اس احتیاط کے ساتھ کہ شانے اس کی سمت سے منحرف نہ ہونے پائیں، حج کا ایک بڑا رُکن اور اس کی عظمت وتقدیس کا ایک خاص مظاہرہ ہے۔

حضرت علیؑ اسی متبرک و باعظمت گھر میں روز جمعہ تیرہ رجب تیس عام الفیل میں پیدا ہوئے۔ اور یہ شرفِ خاص نہ ان سے پہلے کسی کو ملا اور نہ ان کے بعد کسی کو حاصل ہوگا۔ محدثین و اہلِ سیر نے اُسے حضرت امیرالمومنینؑ کے مختصات میں شمار کرتے ہوئے اپنے کتب و مصنفات میں اس کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ حاکم نیشاپوری تحریر کرتے ہیں:۔

تواترت الاخبار ان فاطمة بنت اسد ولدت امیرالمومنین علی ابن ابی طالب کرم الله وجهه فی جوف الکعبة۔ (مستدرک ج ۳ ص ۴۸۳)	اخبار متواترہ سے ثابت ہے کہ امیرالمومنین علی ابن ابی طالبؑ کرم اللہ وجہہ وسط خانہ کعبہ میں فاطمہ بنتِ اسد کے بطن سے متولد ہوئے۔"

شاہ ولی اللہ نے بھی اُسے نقل کیا ہے اور اس امر کی صراحت کی ہے کہ ان سے پہلے اور ان کے بعد کسی کو یہ شرف نصیب نہیں ہُوا۔ چنانچہ وُہ تحریر کرتے ہیں :۔

تواترت الاخبار ان فاطمۃ بنت اسد ولدت امیر المومنین علیا فی جوف الکعبۃ فانہ ولد فی یوم الجمعۃ ثالث عشر من شھر رجب بعد عام الفیل بثلثین سنۃ فی الکعبۃ ولم یولد فیھا احد سواہ قبلہ ولا بعدہ

"متواتر روایات سے ثابت ہے کہ امیر المومنین علیؑ روزِ جمعہ تیرہ رجب تیس عام الفیل کو وسطِ کعبہ میں فاطمہ بنت اسد کے بطن سے پیدا ہُوئے اور آپؑ کے علاوہ نہ آپ سے پہلے اور نہ آپ کے بعد کوئی خانہ کعبہ میں پیدا ہُوا۔"

(ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۲۵۱)

عصرِ نو کے مصنف عباس محمود عقاد نے اس مبارک پیدائش کو خانہ کعبہ کی عظمتِ پارینہ کی تجدید اور خدائے واحد کی پرستش کے دَورِ جدید سے تعبیر کیا ہے۔ وُہ لکھتے ہیں :۔

ولد علیؑ فی داخل الکعبۃ و کرم اللہ وجھہ عن السجود لاصنامھا فکانما کان میلادہ ثمۃ ایذانا بعھد جدید للکعبۃ وللعبادۃ فیھا (العبقریۃ الاسلامیۃ ص ۸۶۳)

"علی ابن ابی طالبؑ خانہ کعبہ کے اندر پیدا ہُوئے اور خداوندِ عالم نے اُن کے چہرے کو بتانِ کعبہ کے آگے جھکنے سے بلند تر رکھا۔ گویا اس مقام پر حضرت کی پیدائش کعبہ کے نئے دَور کا آغاز اور خدائے واحد کی پرستش کا اعلانِ عام تھا۔"

اس طرح تقریباً ہر مؤرخ و سیرت نگار نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔ البتہ کچھ لوگوں نے اس کی صحت کو تسلیم کرتے ہُوئے ایسے گوشے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جس سے اس کی امتیازی و انفرادی حیثیت ختم ہو جائے اور یہ شرف، شرف نہ رہے یا علیؑ سے مخصوص نہ رہے۔ چنانچہ کبھی یہ کہا گیا کہ خانہ کعبہ کے اندر ولادت میں رکھا ہی کیا ہے جبکہ وُہ اس وقت ایک بُت خانہ کی حیثیت رکھتا تھا اور چاروں طرف سے بُتوں میں گھرا ہُوا تھا۔ اس کا جواب تو اتنا ہی کافی ہے کہ اگر مسجد کو مندر یا کلیسا میں تبدیل کر دیا جائے تو وُہ حکمِ مسجد سے خارج نہیں قرار پاتی بلکہ اُس کی حُرمت و تقدیس بدستور باقی رہتی ہے۔ اسی طرح بُتوں کے عمل دخل سے خانہ کعبہ کی بھی حُرمت و توقیر زائل نہیں ہو سکتی اور نہ اُس کے دامنِ تقدیس پر حرف آ سکتا ہے۔ چنانچہ جب اُسے عالمِ اسلام کا قبلہ قرار دیا گیا تو اُس وقت بھی اُس کے گرد و پیش بُت رکھے ہُوئے تھے۔ مگر یہ بُت اس کے قبلہ قرار پانے سے مانع نہ ہو سکے۔ اور کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ عام الفیل سے تیرہ سال قبل فاختہ بنتِ زہیر کے بطن سے حکیم ابنِ حزام بھی خانہ کعبہ میں پیدا ہُوا تھا تو اس میں شرف ہی

کیا جبکہ ایک کافر بھی وہاں پیدا ہو سکتا ہے۔
یہ واقع اُن وسیع النظر علماء مورخین کے تصریحات کے خلاف ہے جنہوں نے صاف الفاظ میں اعتراف کیا ہے کہ حضرت علیؑ سے پہلے اور اُن کے بعد کوئی خانہ کعبہ کے اندر پیدا نہیں ہوا۔ اور پھر یہ مقامِ شرف ہے تو مسلم کے واسطے نہ کافر کے لئے۔ لہٰذا اگر کوئی کافر وہاں پر پیدا ہوتا ہے تو اس کے لیئے یہ سببِ اعزاز و افتخار نہیں ہو سکتا۔ اس لئے، کہ کفر کے ساتھ اس قسم کے امتیازات موردِ فخر نہیں قرار پا سکتے اگر کفر کی حالت میں زیارتِ رسولؐ وجہِ شرف نہیں اور زیارتِ کعبہ قابلِ تعریف نہیں تو اس میں پیدائش کیونکر وجہِ نازش ہو سکتی ہے۔ البتہ اگر ایمان کے ساتھ ایسا ہوتا تو سببِ امتیاز ہو سکتا تھا۔ اور علی ابن ابی طالبؑ کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا اس لئے کہ وُہ نہ محکوم بالکفر تھے اور نہ کافر پیدا ہوئے۔ چنانچہ کتبِ اہلسنّت میں یہ روایت موجود ہے کہ جب آپ شکمِ مادر میں تھے اور ماں بُتوں کے آگے سرنگوں ہونا چاہتی تھیں تو آپ شکمِ مادر میں اس طرح پیچ و تاب کھاتے کہ وُہ بُتوں کے آگے جُھک نہ سکتی تھیں۔ اگرچہ یہ روایت شیعہ نقطۂ نظر سے قابلِ تسلیم نہیں ہے مگر اتنا تو واضح ہو گیا کہ ان کے نزدیک بھی علیؑ کی زندگی کا کوئی لمحہ بطنِ مادر سے لے کر آغوشِ لحد تک کفر و شرک میں نہیں گزرا۔ اور پھر جنہوں نے ابن حزام کی ولادت کے متعلق لکھا ہے انہوں نے اسے ایک اتفاقی حادثہ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے جس سے کسی شرف و بلندی کو ثابت نہیں کیا جا سکتا مگر امیر المومنینؑ کی ولادت کسی اتفاقی حادثہ کی بجائے مشیّتِ ایزدی کی کارفرمائی کا نتیجہ تھی۔ چنانچہ عباس ابن عبد المطلب بیان کرتے ہیں کہ وُہ اور یزید ابن قعنب اور بنی ہاشم و بنی عزیٰ کے چند افراد خانہ کعبہ کے پاس بیٹھے تھے کہ فاطمہ بنتِ اسد تشریف لائیں اور خانہ کعبہ کے قریب آکر کھڑی ہو گئیں۔ ابھی ایک آدھ لمحہ گزرا تھا کہ اُن کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نمودار ہوئے۔ لرزتے ہوئے ہاتھ دُعا کے لئے اُٹھائے، مضطرب نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھا اور بارگاہ خداوندی میں عرض کیا: "اے میرے پروردگار! مَیں تجھ پر اور تیرے نبیوں پر اور تیری نازل کی ہوئی کتابوں پر ایمان رکھتی ہوں۔ تو اِس باعزّت گھر، اس گھر کے معمار اور اِس مولود کے صدقہ میں جو میرے شکم میں ہے میری مشکل حل کر اور اس کی ولادت کو میرے لئے آسان کر دے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مولود تیرے جلال و عظمت کی نشانیوں میں سے ایک روشن نشانی ہے اور تُو ضرور میری مشکل آسان کرے گا۔" عباس کہتے ہیں کہ جب فاطمہ بنتِ اسد اس دُعا سے فارغ ہوئیں تو ہم نے دیکھا کہ خانہ کعبہ کی عقبی دیوار شق ہُوئی اور وُہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے فوراً اس نئے در سے اندر داخل ہو گئیں اور دیوارِ کعبہ شگافتہ ہونے کے بعد پھر اپنی اصلی حالت پر پلٹ آئی گویا اس میں کبھی شگاف پڑا ہی نہ تھا۔
اس واقعہ کی صحت کو علماء شیعہ کے علاوہ علماء اہلسنّت نے بھی تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ علماء اہلِ تشیع میں سے ابو جعفر طوسی نے امالی میں علامہ مجلسیؒ نے بحار میں اور علماء اہلسنّت میں سے میر صالح کشفی نے مناقب میں اور مولوی محمدؐ مبین نے وسیلۃ النجاۃ میں اسے درج کیا ہے۔ اس واقعہ سے صاف ظاہر ہے کہ یہ صورت

یکایک اور اتفاقیہ طور پر پیش نہیں آئی۔ اگر یہ اتفاقی حادثہ ہوتا تو نہ خرقِ عادت کے طور پر دیوار شق ہوتی اور نہ بنتِ اسد دیوار کے شگاف سے درانہ و بیباکانہ اندر داخل ہوتیں۔ بلکہ یہ غیبی طاقت ہی کا کرشمہ اور قدرت کی کارفرمائی ہی کا نتیجہ تھا۔ اس ولادت کے تین دن بعد تک فاطمہ بنتِ اسد بیت اللہ میں رہیں اور چوتھے دن مولودِ نو کو گود میں لئے ہوئے باہر آئیں ؂

درپسِ پردہ آنچہ بود آمد اسد اللہ در وجود آمد

پیغمبرؐ اکرم جو منتظر و چشم براہ تھے آگے بڑھے اور اپنے محسن و مربی چچا کے لختِ جگر کو ہاتھوں پر لے کر سینہ سے لگایا۔ بچے نے شمیم نبوت سونگھ کر آنکھیں کھول دیں اور سب سے پہلے جمال جہاں آرائے حبیبِ خدا (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اپنی آنکھوں کو روشن کیا۔ پیغمبرؐ نے اپنی زبان نومولود کے منہ میں دے کر آبِ وحی سے چمنِ امامت کی آبیاری کی۔ علمِ نبوت لعابِ دہنِ رسولؐ میں حل ہو کے علیؑ کے رگ و پے میں اُترا۔ اور زبانِ پیغمبرؐ نے گواہی دی کہ خصنی بالنظر وخصصتہ بالعلم۔ "اس نے مجھے پہلی نگاہ کے لئے منتخب کیا میں نے اُسے علم کے لئے منتخب کر لیا۔

حضرت علیؑ کو خانہ کعبہ سے کئی نسبتیں حاصل ہیں۔ پیغمبرؐ نے انہیں مثیلِ کعبہ فرمایا انہی کے آبا و اجداد نے اُسے تعمیر کیا اور وُہی ہمیشہ اس کے پاسبان و نگہبان رہے اور اُسے طاغوتی طاقتوں کی دستبرد سے بچاتے رہے۔ چنانچہ حسان ابن عبد کلال نے اسے مسمار کرنا چاہا تو فہر ابن مالک نے اُسے شکست دے کر گرفتار کر لیا۔ ابرہہ ابن اشرم نے ہاتھیوں کے ساتھ حملہ کیا تو حضرت عبدالمطلب درِ کعبہ پر جم کر کھڑے ہو گئے۔ اگر بُت پرستوں نے اُسے صنم کدہ بنا ڈالا تو انہی کے ہاتھوں نے پیغمبرؐ کے دوش پر بلند ہو کر اس کی تطہیر کی اور ایک ایک بُت کو توڑ پھوڑ کر باہر پھینکا اور یہی ان کا مولد قرار پایا اور اس طرح ان کی ولادت کعبہ کی طہارت کی تمہید بن گئی۔

اگر آپ کی ولادت کو مکانی لحاظ سے یہ شرف حاصل ہے کہ بنائے خلیل مطاف خلق اور مامن عالم میں پیدا ہوئے تو زمانی لحاظ سے بھی یہ شرف ہے کہ آپ ماہِ رجب میں پیدا ہوئے جو حُرمت والے مہینوں میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی محترم مہینہ کی ستائیسویں تاریخ کو پیغمبر اکرمؐ کی بعثت ہوئی اور دعوتِ اسلام کا آغاز ہوا۔ یہ ولادت و بعثت کا زمانی اتحاد علیؑ اور اسلام کے اتحادِ باہمی کا آئینہ دار ہے۔ چنانچہ کردارِ علیؑ "اسلامی تعلیمات کا عکس بردار" اور اسلامی تعلیمات سیرتِ علیؑ کا آئینہ ہیں۔ دونوں ایک ساتھ پیغمبرؐ کے سایہ میں پروان چڑھے اور دونوں ایک دُوسرے کی عظمت و رفعت کے پاسبان رہے۔

نام، لقب، کنیت

حضرت ابوطالب نے اپنے جد قصی ابن کلاب کے نام پر آپ کا نام زید رکھا اور فاطمہ بنت اسد نے

اپنے باپ اسد کے نام پر "حیدر" نام تجویز کیا۔ (اسد اور حیدر دونوں کے معنی شیر کے ہیں) چنانچہ آپ نے جنگِ خیبر میں مرحب کے رجز کے جواب میں فرمایا: انا الذی سمتنی امی حیدرہ۔ "میں وہ ہوں کہ میری ماں نے میرا نام حیدر رکھا ہے"۔ اور پیغمبر اکرمؐ نے قدرت کے ایماء پر آپ کو علیؑ کے نام سے موسوم کیا۔ اور ایک قول یہ ہے کہ حضرت ابوطالب ہی نے آپ کا نام علیؑ رکھا۔ اور سند میں اُن کا یہ شعر پیش کیا جاتا ہے ؎

سمیتہ بعلی کے یدوم لہ　　عز العلو و فخر العز ادومہ

"میں نے اُن کا نام علیؑ رکھا ہے تاکہ رفعت و سربلندی کی عزت ہمیشہ اُن کے پائے نام رہے۔ اور عزت ہی وہ سرمایۂ افتخار ہے جو ہمیشہ رہنے والا ہے"۔

یہ نام جو اپنے اندر علو و بلندی کے معنی رکھتا ہے اسم بامسمّٰی ثابت ہُوا اور ہمیشہ کائنات میں بلند و بالا، پستی سے ناآشنا، رزم و بزم میں وردِ زباں اور زمین کی فضاؤں سے لے کر آسمان کی بلندیوں تک گونجتا رہا۔ اگرچہ اموی حکمرانوں نے حضرتؑ کے نام اور کنیت پر پہرا بٹھا دیا تھا اور اس پر ناک بھوں چڑھاتے تھے۔ چنانچہ ابونعیم اصفہانی نے حلیۃ الاولیاء میں تحریر کیا ہے کہ عبداللہ ابن عباس کے فرزند کا نام علیؑ اور کنیت ابوالحسن تھی۔ ایک دن علی ابن عبداللہ، عبدالملک کے ہاں گئے تو اُس نے کہا کہ میں تمہارا یہ نام اور کنیت گوارا نہیں کر سکتا۔ انہوں نے اپنا نام تو نہ بدلا مگر کنیت ابوالحسن کے بجائے ابومحمد رکھ لی۔ اسی ذہنیت کے زیر اثر صدیوں تک اسلامی حکمرانوں میں سے کسی کا نام علی نہ ہو سکا۔ مگر آج محمدؐ کے بعد مسلمانوں میں سب سے زیادہ علی ہی کے نام پر نام رکھے جاتے ہیں اور صدیوں تک متروک اور سب و شتم کا ہدف قرار دیئے جانے کے باوجود آخر یہ نام اسلام کے ساتھ ساتھ ہر گوشۂ عالم میں پہنچ کے رہا۔

آپ کے القاب آپ کے متنوع اور گوناگوں اوصاف کے لحاظ سے متعدد ہیں جن میں سے مرتضےٰ وصی اور امیر المومنینؑ زبان زد خلائق ہیں۔ اور مشہور و معروف کنیت ابوالحسن اور ابوتراب ہے۔ پہلی کنیت بڑے بیٹے حسنؑ کے نام پر ہے۔ اور عرب عموماً فرزند اکبر ہی کے نام پر کنیت رکھا کرتے تھے۔ جیسے حضرت ابوطالب کی کنیت اپنے بڑے فرزند طالب کے نام پر ابوطالب اور حضرت عبدالمطلب کی کنیت اپنے بڑے بیٹے حارث کے نام پر ابوالحارث تھی۔ اور دوسری کنیت پیغمبر اکرمؐ نے تجویز فرمائی تھی۔ چنانچہ سیرت ابن ہشام میں ہے کہ غزوۂ عشیرہ کے موقع پر حضرت علیؑ اور عمار ابن یاسر بنی مدلج کے ایک چشمہ کی طرف نکل گئے اور درختوں کے سایہ میں ایک نرم و ہموار زمین پر لیٹ گئے۔ ابھی لیٹے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ پیغمبر اکرمؐ بھی ادھر آگئے اور علیؑ کا بدن خاک میں اٹا ہوا دیکھ کر فرمایا مَا لَكَ يَا اَبَا تُرَاب۔ "اے ابوتراب یہ کیا حالت ہے؟" اور اس دن سے آپ کی کنیت ابوتراب قرار پائی۔ علامہ حلبی نے تحریر کیا ہے:۔

وکنی صلے اللہ علیہ وسلم فیھا　　غزوۂ عشیرہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے

علیاً بابی تراب حین وجدہ نائماً ھو وعمار ابن یاسر وقد علق بہ التراب۔ (سیرت حلبیہ جلد ۲ ۔ ص ۱۴۲)

حضرت علیؑ کی کنیت ابو تراب رکھی جبکہ رسولِ خدا نے انہیں اور عمار ابن یاسر کو سوتے ہوئے پایا اور علیؑ خاک میں اٹے ہوئے تھے۔"

سب سے پہلے یہ کنیت آپ ہی کے لئے تجویز ہوی اور آپ سے قبل کسی کی یہ کنیت نہ تھی۔ چنانچہ شیخ علاء الدین نے تحریر کیا ہے:۔

اول من کنی بابی تراب علی ابن ابی طالب۔ (محاضرۃ الاوائل۔ ص ۱۲۳)

سب سے پہلے علی ابن ابی طالب ہی ابو تراب کی کنیت سے پکارے گئے۔"

اس سلسلہ میں بخاری نے اپنی صحیح میں یہ روایت درج کی ہے کہ ایک مرتبہ پیغمبر اکرمؐ جناب سیدہؑ کے گھر میں تشریف لائے اور علیؑ کو وہاں موجود نہ پاکر دریافت کیا کہ علیؑ کہاں ہیں؟ جناب سیدہؑ نے کہا کہ میرے اور اُن کے درمیان کچھ شکر رنجی ہو گئی ہے اور وُہ غصہ میں بھرے ہوُئے باہر چلے گئے ہیں۔ آنحضرتؐ نے ایک شخص سے کہا کہ جاکر دیکھو کہ علیؑ کہاں ہیں۔ اس نے مسجد میں حضرت علیؑ کو لیٹے ہوُئے دیکھا تو آنحضرتؐ سے پلٹ کر کہا کہ وُہ مسجد میں سو رہے ہیں۔ پیغمبرؐ مسجد میں تشریف لائے اور علیؑ کے خاک آلودہ بدن سے گرد جھاڑی اور فرمایا قُم یا ابا تراب۔ ابو تراب اُٹھئے۔" اس کے بعد آپ ابو تراب کی کنیت سے یاد کئے جانے لگے۔

یہ روایت پہلی روایت سے مقام اور واقعہ کے اعتبار سے مختلف ہونے کے علاوہ درایۃً بھی صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ اس لئے کہ حضرت علیؑ اور جناب فاطمہؑ کی گھریلو زندگی کے واقعات یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ جناب فاطمہؑ ایک لمحہ کے لئے بھی علیؑ کی شکوہ سنج ہوی ہوں اور ان دونوں میں ان بن یا رنجش وکشیدگی کی صُورت پیدا ہوی ہو۔ بلکہ ان کی گھریلو زندگی اتحاد و یکجہتی کا معیاری نمونہ تھی۔ حضرت عمار یاسر کی روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے حضرت علیؑ کی کنیت ابو تراب جمادی الثانیہ ۲ سنہ ھ میں تجویز کی تھی کیونکہ غزوۂ عشیرہ اسی مہینہ میں ہوُا تھا۔ اور جناب سیدہ سے حضرت علیؑ کا عقد غزوۂ بدر کے بعد یکم ذی الحجہ ۲ سنہ ھ میں ہوُا تھا یعنی اس کنیت کے تجویز ہونے کے چھ ماہ بعد۔ تو اس صورت میں نہ رنجش و کشیدگی کا کوی سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ خفگی کی بنا پر گھر چھوڑ کر مسجد میں لیٹنے کا جبکہ اُس وقت جناب سیدہؑ آپ کے نکاح میں تھیں ہی نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت اموی حکمرانوں کو خوش کرنے کے لئے گڑھی گئی ہے جو تنقیص و مذمت اور سب و شتم کے موقع پر حضرت کو اس کنیت سے یاد کرتے تھے۔ اگر یہ کنیت اسی مفروضہ رنجش کے موقع پر تجویز ہوتی تو جس نام کے ساتھ کوی تلخ یاد یا ناگوار واقعہ وابستہ ہوتا ہے وُہ نام کبھی مرغوب و پسندیدہ نہیں ہوتا۔ حالانکہ حضرتؑ کو یہ کنیت اپنے تمام ناموں سے زیادہ پسندیدہ تھی۔

چنانچہ سہل ابن سعد کہتے ہیں:۔

ما کان لعلی اسم احب الیہ من ابی تراب۔ (صحیح بخاری جزو۵۔ ص۶۳) حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سب ناموں سے زیادہ محبوب نام ابوتراب تھا۔"

حلیہ و سراپا

اعضاء شناسی علم نفسیات کی ایک شاخ ہے جو مسلسل تجربات و مشاہدات سے اخذ نتائج پر مبنی ہے۔ اس سے آنکھ، ناک، پیشانی اور دوسرے اعضاء بدن سے انسان کے عادات و اطوار اور اس کے کردار کے جاننے میں مدد لی جاتی ہے۔ چنانچہ ماہرین فن اعضاء کی ساخت، ڈیل ڈول، ناک نقشہ، اور رفتار و گفتار سے انسان کی شخصیت کے متعلق بہت کچھ معلومات حاصل کر لیتے ہیں۔ ان اعضاء شناسوں کے نزدیک ماتھے کا کھلا اور پیشانی کا ابھرا ہونا فہم و ادراک کی، بازوؤں کا طویل و پُر گوشت ہونا بزرگی و ریاست کی، بالوں کی سختی شجاعت کی اور آنکھوں کا بڑا ہونا تیزی طبع کی علامت ہے۔ اسی طرح گردن کا کوتاہ ہونا مکر و تشدد پسندی کی، پنڈلیوں کا پُر گوشت ہونا حماقت کی، آنکھوں کا چھوٹا اور اندر کو دھنسا ہونا خبث و فریب کی، شانوں کا نازک و باریک ہونا کمزوریٔ عقل کی اور دانتوں میں دراڑوں کا ہونا کمزوری وضعف کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ ظنی و تخمینی علامات ہیں جنہیں قطعی و یقینی نہیں کہا جا سکتا تاہم ظاہر، باطن کا ایک حد تک عکاس و آئینہ دار ضرور ہوتا ہے:

سیمائے آدم آئینۂ حال باطن است

کتب تاریخ و سیر کی رُو سے امیرالمومنینؑ کا حلیہ مبارک یہ تھا: "جسم بھاری بھرکم، رنگ کھلتا ہوا گندم گوں، خد و خال انتہائی موزوں اور دلکش، چہرہ متبسم اور چودھویں رات کے چاند کی طرح درخشاں۔ ابوالحجاج مدرک کہتے ہیں: کان من احسن الناس وجھا "سب لوگوں سے زیادہ وجیہ اور حسین تر تھے" پیشانی کشادہ۔ ابن عباس کہتے ہیں: ما رأیت احسن من شرصۃ علی "میں نے علیؑ کی کنپٹیوں سے حسین تر کسی کی کنپٹیاں نہیں دیکھیں"۔ ماتھے پر سجدوں کی کثرت سے گھٹا پڑا ہوا ستواں ناک، آنکھیں بڑی اور سیاہ اور ان میں عزم و ایقان کی چمک۔ ابوالحجاج کہتے ہیں کہ میں نے حضرتؑ کی آنکھوں میں سرمہ کے نشان بھی دیکھے ہیں، پتلیاں روشن، بھویں قوس نما، پلکیں لانبی، دانت سلک منظم کی طرح ضیا بار، ضرار ابن ضمرہ کنانی کہتے ہیں: ان تبسم فعن مثل اللولوء المنظوم "اگر مسکراتے تو دانت موتی کی لڑیوں کی طرح چمکتے"۔ گردن موٹی صراحی دار، سینہ چوڑا چکلا اور اس پر بال، بازوؤں کی مچھلیاں اُبھری ہوئیں، شانے بھرے بھرے، کلائیاں ٹھوس۔ کلائیوں اور بازوؤں میں جوڑ کا پتہ نہ چلتا تھا۔ دونوں کندھوں کی ہڈیاں چوڑی اور مضبوط، ہتھیلیاں سخت، پنڈلیاں نہ لاغر اور نہ پُر گوشت، پیٹ کچھ نکلا ہوا، ریش مبارک گھنی اور عریض، سر اور داڑھی کے

بال سفید۔ محمدؒ ابن حنفیہ کہتے ہیں: اختضب علی بالحناء مرۃ ثم ترکہ۔ حضرت علیؑ نے ایک دفعہ مہندی کا خضاب لگایا اور پھر چھوڑ دیا۔" خود کے کثرتِ استعمال سے سر کے اگلے حصہ پر سے بال اُڑے ہوُے۔ قد میانہ سے کچھ نکلتا ہوُا۔ حضرتؑ خود فرماتے ہیں:۔ خلقتی معتدل لا اضرب القصیر فاقدہ واضرب الطویل فاقطہ۔" اللہ تعالیٰ نے مجھے قد و قامت میں اعتدال بخشا ہے۔ اگر میرا حریف پست قامت ہوتا ہے تو میں اس کے سر پر ضرب لگا کر اُس کے دو ٹکڑے کر دیتا ہوں اور اگر دراز قامت ہوتا ہے تو بیچ سے دو ٹکڑے کر دیتا ہوں۔" آواز پر شکوہ، رفتار پیغمبرؐ کی رفتار سے مشابہہ پُر وقار اور کچھ آگے کو جُھکی ہوی۔ جب میدانِ جنگ میں دُشمن کی طرف بڑھتے تو تیزی کے ساتھ چلتے اور آنکھوں میں سُرخی دَوڑ جاتی تھی۔

ابن قتیبہ نے المعارف میں لکھا ہے کہ ایک عورت نے حضرتؑ کو دیکھ کر کہا کانہ کسر ثم جبر۔ اس جملہ کے لفظی معنی یہ ہیں "گویا توڑے گئے ہیں اور دوبارہ جوڑے گئے ہیں۔" اس جملہ سے یہ سمجھ لیا گیا کہ آپ غیر متوازن اور بے ڈھنگے تھے۔ حالانکہ یہ عربی زبان کا ایک محاورہ ہے جس کے ظاہری معنی مراد نہیں ہیں۔ چنانچہ سید محسن عاملی نے اعیان الشیعہ میں اور عمر ابو النصر نے الزہرا میں ابن عائشہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ جملہ اس شخص کے لئے استعمال ہوتا ہے جس کے بازو بھرے ہوُے اور نظریں زمین کے اندر گڑی ہوں، نہ اس شخص پر جس کا جسم بے جوڑ، بے ڈھنگا اور غیر متوازن ہو۔

اخلاق و عادات

امیر المومنینؑ خندہ جبیں، شگفتہ مزاج، بے غرضی و اخلاص کا پیکر، غریبوں کے ہمدرد، یتیموں کے غمخوار اور اخلاقِ نبوی کا مکمل نمونہ تھے۔ اعلیٰ و ادنیٰ سے یکساں خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے۔ غلاموں سے عزیزوں کا سا برتاؤ کرتے۔ مزدوروں کو بوجھ اُٹھانے میں مدد دیتے۔ خود بینی و خود نمائی سے نفرت کرتے۔ انتہائی سادہ زندگی بسر کرتے۔ عام لوگوں کی طرح سادہ اور معمولی خوراک کھاتے اور انہی کی طرح عام اور معمولی لباس پہنتے۔ اکثر کام اپنے ہاتھ سے انجام دیتے۔ اپنی جُوتیاں خود گانٹھتے، کپڑوں میں پیوند خود لگاتے اور بازار سے سودا سلف خود خرید کر لاتے۔ کھیتوں میں ایک مزدور کی طرح کام کرتے۔ اپنے ہاتھ سے چشمے کھودتے۔ درخت لگاتے اور اُن کی آبیاری کرتے۔ مال سمیٹ کر رکھنے کے بجائے غریبوں اور ناداروں میں تقسیم کر دیتے۔ رنگ و نسل کا امتیاز اور طبقاتی تفریق گوارا نہ کرتے۔ حاجتمندوں کے کام آتے۔ مہمانوں کو بڑے احترام سے ٹھہراتے کسی سائل کو خالی ہاتھ نہ پھراتے۔ بُغض و کینہ اور انتقامی جذبات کو پاس نہ پھٹکنے دیتے۔ حیرت انگیز حد تک عفو و درگزر سے کام لیتے۔ دینی معاملات میں سختی برتتے اور عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتے۔ حق و صداقت کے جادہ پر گامزن رہتے اور کسی کی رو رعایت نہ کرتے۔ دُشمن کے مقابلہ میں مکر و فریب اور داؤں پیچ سے کام نہ لیتے۔ رات کا

بیشتر حصہ مناجات و نوافل میں گزارتے۔ صبح کے تعقیبات کے بعد قرآن و فقہ کی تعلیم دیتے۔ خوفِ خدا سے لرزاں و ترساں رہتے۔ اور دُعاؤ مناجات میں اِتنا روتے کہ ریش مبارک تر ہو جاتی۔

ایک مرتبہ ضرار ابن ضمرہ ضبائی معاویہ کے ہاں آئے۔ معاویہ نے کہا کہ تمہیں تو علیؑ کی صحبت میں رہنے اور انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے کچھ اُن کے متعلق بیان کرو۔ ضرار نے معذرت چاہی۔ جب اصرار زیادہ ہُوا تو کہا :۔

كان والله شديد القوى
يقول فصلا ويحكم عدلا
يتفجر العلم من جوانبه
وتنطق الحكمة من نواحيه
ويستوحش من الدنيا و
زهرتها ويستأنس
بالليل و وحشته وكان
غزير العبرة طويل الفكرة
يعجبه من اللباس ما
قصر و من الطعام ما خشن
كان فينا كاحدنا يجيبنا
اذا سألناه وينبئنا اذا
استنبأناه ونحن والله مع
تقريبه ايانا و قربه لنا لا
نكاد نكلمه هيبةً له
يعظم اهل الدين ويقرب
المساكين لا يطمع القوى
فى باطله ولا ييئس الضعيف
من عدله و اشهد انّه
لقد رأيته فى بعض
مواقفه وقد ارخى الليل
سدلته و غارت نجومه قابضا

خدا کی قسم اُن کے ارادے بلند اور قولی مضبُوط تھے فیصلہ کُن بات کہتے اور عدل و انصاف کے ساتھ حکم کرتے۔ ان کے پہلوؤں سے علم کے سوتے پھُوٹتے اور کلام کے گوشوں سے حکمت و دانائی کے نغمے گونجتے تھے۔ دُنیا اور اُس کی رونق و بہار سے وحشت کھاتے۔ رات اور اس کے سناٹوں سے جی بہلاتے۔ آنکھوں سے ٹپاٹپ آنسو گرتے اور فکر اور سوچ میں ڈوبے رہتے لباس وہ پسند آتا جو مختصر ہوتا اور کھانا وُہ بھاتا جو رُوکھا پھیکا ہوتا۔ وُہ ہم میں ایک عام آدمی کی طرح رہتے سہتے۔ ہم کچھ پُوچھتے تو جواب دیتے اور کچھ دریافت کرتے تو بتاتے۔ خدا کی قسم باوجود قُرب کے ان کی ہیبت و جلال کے سامنے ہمیں لب کشائی کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ اہلِ دین کی تعظیم کرتے مسکینوں کو قرب کا شرف بخشتے۔ طاقتور کو یہ توقع نہ ہوتی تھی کہ بے راہروی میں اُن کی ہمدردی حاصل کر سکے گا اور کمزور کو اُن کے انصاف سے مایُوسی نہ ہوتی تھی۔ خدا شاہد ہے میں نے بعض مقامات پر جبکہ رات کے پردے آویزاں اور ستارے پنہاں ہوتے تھے انہیں دیکھا ہے کہ اپنی ریش مبارک کو ہاتھوں میں پکڑے ہوُئے اس طرح تڑپتے تھے

علی لحیتہ یتململ تململ السلیم ویبکی بکاء الحزین ویقول یا دُنیا غری غیری الی تعرضت ام الی تشوقت ھیھات ھیھات قد باینتک ثلاثا لا رجعۃ فیھا فعمرک قصیر وخطرک حقیر آہ من قلۃ الزاد وبعد السفر و وحشۃ الطریق۔ (استیعاب۔ ج۲۔ صہ۴۶۳)

جس طرح کوئی مار گزیدہ تڑپتا ہے اور اس طرح روتے تھے جیسے کوئی غمزدہ روتا ہے۔ اور کہہ رہے تھے اے دُنیا جا کسی اور کو فریب دے کیا میرے سامنے اپنے کو لاتی ہے یا مجھ پر فریفتہ ہو کر آئی ہے۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ میں تو تین بار تجھے طلاق دے چکا ہوں جس کے بعد رجوع کی صورت نہیں۔ تیری عمر چند روزہ اور تیری اہمیت بہت کم ہے۔ افسوس زادِ راہ تھوڑا، سفر دُور و دراز اور راستا وحشتناک ہے۔"

یہ وُہ آوازِ حق تھی جو امیرِ شام ایسے دُشمن کے دربار میں بلند ہوی جہاں حکومت کے کاسہ لیس اور دولت کے پرستار جمع تھے مگر کسی کی زبان تردید میں نہ کھل سکی بلکہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ لوگ اس طرح دھاریں مار مار کر روئے کہ گلے میں پھندے پڑ گئے اور معاویہ کی آنکھیں بھی ڈبڈبا آئیں۔ یہ تھا حُسنِ سیرت وحُسنِ عمل کا مقناطیسی اثر جس کے تذکرہ نے اغیار تک کے دِل موم کر دیئے اور ہنستی کھیلتی محفل کا رنگ بدل دیا۔ امیرؑ المومنین ہیبت وصولت اور رحم ورافت کے امتزاج کا ایک دلکش پیکر اور پہاڑ کے مانند سخت اور اُڑتے ہوُے بادلوں کی طرح نرم تھے۔ حضرتؑ کے ایک صحابی صعصعہ ابن صوحان عبدی کہتے ہیں:۔

کان فینا کاحدنا لین جانب وشدۃ تواضع وسھولۃ قیاد وکنا نھابہ مھابۃ الاسیر المربوط للسیاف الوقف علی راسہ۔ (مقدمۂ شرح ابن ابی الحدید)

حضرتؑ ہم میں ایک عام آدمی کی طرح رہتے سہتے۔ خوش خلقی، انتہائی انکسار اور نرم روی کے باوجود، ہم اُن کے سامنے اس طرح خائف و ترساں رہتے جس طرح وُہ جکڑا ہُوا قیدی جس کے سر پر جلّاد تلوار لئے کھڑا ہو۔"

حضرت کے اسی دبدبہ وہیبت اور جذبۂ محبت وعطوفت کو دیکھتے ہوُے ملا علی آذربائیجانی نے کیا خوب کہا ہے:۔

اسد اللہ اذا صال وصاح ابو الایتام اذا جاد وبر

دشمن کو للکارتے اور اس پر حملہ آور ہوتے تو اللہ کے شیر۔ اور بخشش و احسان کرتے تو یتیموں کے باپ نظر آتے۔"

پوشش و لباس

امیرالمومنینؑ سیدھی سادی وضع کا عام اور کم قیمت لباس پہنتے تھے جو عرب میں اس دور کا غریب اور متوسط طبقہ پہنتا تھا بلکہ بعض اوقات اس سطح سے بھی گر جاتا تھا۔ لباس سے صرف تن پوشی مطلوب تھی نہ نمود و نمائش۔ اس لئے اس میں کوئی امتیاز گوارا نہ کرتے اور نہ گرمی و سردی کے موسم کا لحاظ رکھتے۔ گرمیوں میں سردی کا اور سردیوں میں گرمی کا لباس پہن لیتے۔ ضرورت کے وقت کبھی چمڑے کا اور کبھی لیف خرما کا پیوند لگوا لیتے اور اس میں کوئی سبکی و عار محسوس نہ کرتے۔ ایک مرتبہ ایسا کرتہ پہنے ہوئے تھے جس میں جابجا پیوند لگے ہوئے تھے۔ کچھ لوگوں نے اس پر نکتہ چینی کی تو فرمایا "ایسا لباس پہننے سے دل میں عجز و فروتنی کا احساس پیدا ہوتا ہے اور اہل ایمان مجھے اس لباس میں دیکھیں گے تو لباس کی سادگی میں میری پیروی کریں گے۔ مسعودی نے لکھا ہے کہ آپ نے اپنے زمانۂ خلافت میں کبھی نیا لباس نہیں پہنا۔ عام پوشش تہہ بند، کرتہ اور چادر تھی۔ سر پر عمامہ زیادہ پسند کرتے اور فرماتے:۔

العمائم تیجان العرب۔ (سیرۃ ابن ہشام ج۲ ص۲۸۶) عمامہ عربوں کا تاج ہے"

ذیل میں چند لوگوں کے بیانات درج کئے جاتے ہیں جنہوں نے مختلف اوقات میں امیرالمومنین کو دیکھا اور ان کے لباس کی نوعیت اور وضع قطع کا ذکر کیا۔

جابر مولی جعفی کہتے ہیں کہ میں نے امیرالمومنین کے سر پر سیاہ رنگ کا عمامہ دیکھا اس کا ایک سرا سینہ پر پڑا تھا اور ایک سرا پشت پر لٹک رہا تھا۔

عمرو ابن مروان کہتے ہیں کہ مجھ سے میرے والد نے بیان کیا کہ میں نے حضرت کو دیکھا آپ کے سر پر سیاہ عمامہ تھا جس کا شملہ دونوں کاندھوں کے درمیان پشت پر پڑا تھا۔

یزید ابن حارث فزاری کہتے ہیں کہ میں نے حضرت کو دیکھا آپ سر پر ایک سفید مصری ٹوپی اوڑھے ہوئے تھے۔

ابو حیان کہتے ہیں کہ میں نے حضرتؑ کے سر پر باریک کپڑے کی ٹوپی دیکھی ہے۔

ایوب ابن دینار کہتے ہیں کہ میرے والد کہا کرتے تھے کہ میں نے حضرت علیؑ کو دیکھا تھا آپ آدھی پنڈلیوں تک تہبند باندھے ہوئے اور ایک چادر شانوں پر ڈالے ہوئے تھے۔ اور ایک مرتبہ دیکھا کہ آپ نجران کی دھاری دار دو چادریں اوڑھے ہوئے تھے۔

ابحر ابن حرموز کہتے ہیں کہ میرے والد نے حضرتؑ کو مسجد کوفہ سے باہر نکلتے دیکھا آپ تہبند باندھے ہوئے تھے جو نصف ساق تک تھا اور ایک چادر اوڑھے ہوئے تھے۔

اس دور میں موسم گرما کا عموماً یہی لباس ہوتا تھا۔ چنانچہ غدیر خم کے موقع پر جب رسولؐ خدا نے حضرت علیؑ کو اپنے ہاتھوں پر بلند کیا تو روایت میں ہے کہ اتنا اونچا کیا کہ سفیدئ بغل ظاہر ہو گئی۔ اس کی وجہ

یہی تھی کہ پیغمبرؐ اکرم صرف چادر اوڑھے ہُوئے تھے جو حضرت علیؑ کو اُٹھاتے وقت سرک گئی اور سفیدیٔ بغل نمایاں ہو گئی۔

نوف بکالی کہتے ہیں کہ مَیں نے حضرتؑ کو دیکھا کہ آپ کے جسم مبارک پر ایک کُرتہ تھا اور پیروں میں کھجور کی چھال کے جُوتے تھے۔

ابن عباس کہتے ہیں کہ مَیں نے حضرت کے پیروں میں ایک پھٹا پُرانا جُوتا دیکھا جسے اپنے ہاتھ سے گانٹھ رہے تھے۔

عطاء ابی محمد کہتے ہیں کہ مَیں نے آپ کے جسم پر دُھلے گاڑھے کا کُرتہ دیکھا۔

خالد ابی اُمیہ کہتے ہیں کہ مَیں نے حضرتؑ کو دیکھا آپ کا تہبند گھٹنوں تک تھا۔

عبداللہ ابن ابی الھذیل کہتے ہیں کہ مَیں نے آپ کے جسم پر گاڑھے کا لمبی آستینوں والا کُرتہ دیکھا۔ اگر اس کی آستینیں چھوڑ دیتے تھے تو اُنگلیوں کے سروں کو مس کرتی تھیں۔

عبدالجبار ابن مغیرہ کہتے ہیں کہ مجھ سے اُم کثیرہ نے بیان کیا کہ میں نے حضرتؑ کو دیکھا آپ کا تہبند موٹے گاڑھے کا تھا جو نصف ساق تک اُونچا تھا، اور موٹے گاڑھے کا کُرتہ پہنے اور ایک چادر اوڑھے ہُوئے تھے۔

ابو العلاء مولی اسلم کہتے ہیں کہ مَیں نے دیکھا کہ حضرتؑ نے ناف کے اُوپر سے تہبند باندھ رکھا ہے۔

ابو ملیکہ کہتے ہیں کہ مَیں ایک مرتبہ حضرتؑ کی خدمت میں حاضر ہُوا دیکھا کہ آپؑ عبا، تہبند کی طرح باندھے ہُوئے ہیں اور اس پر رسّی لپیٹ رکھی ہے۔

قدامہ ابن عتاب کہتے ہیں کہ مَیں نے حضرتؑ کو دیکھا آپ سفید اُونی کُرتہ پہنے اور مقام قطر کی سُرخ دھاریوں والی دو چادریں اوڑھے اور سر پر باریک کپڑے کا عمامہ باندھے ہُوئے تھے۔

ابو ظبیان کہتے ہیں کہ مَیں نے حضرتؑ کو دیکھا کہ آپ زرد رنگ کا تہبند باندھے اور بیل بُوٹے والی سیاہ کملی اوڑھے ہوئے تھے۔

زید ابن وہب کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ حضرتؑ گھر سے باہر نکلے اور اُن کے تہبند میں جا بجا پیوند لگے ہُوئے تھے۔

محمد ابن عبدالرحمٰن کہتے ہیں:

ان علیا کان یتختم بالیمین — حضرت علیؑ داہنے ہاتھ میں انگوٹھی پہنتے تھے۔

(کفایۃ الطالب ص۲۵)

۱؎ دائیں ہاتھ   انگوٹھی پہننا مسنون و مستحب ہے۔ پیغمبرؐ اکرم داہنے ہاتھ ہی میں انگوٹھی پہنا کرتے تھے۔ (باقی برص۱۲۶)

انگوٹھی کا نگینہ کبھی یاقوت کبھی فیروزہ کبھی حدید چینی اور کبھی عقیق کا ہوتا تھا اور نقش خاتم الملک للہ تھا۔ اور بعض روایات میں ہے کہ للہ الملک تھا۔ دست مبارک میں تازیانہ یا دُرّہ رکھتے تھے اور خطبہ دیتے وقت کمان یا تلوار پر ٹیک لگا لیتے تھے۔

طعام اور آداب طعام

پوشش و لباس کی طرح حضرت کا کھانا بھی رُوکھا پھیکا اور انتہائی سادہ ہوتا تھا۔ عموماً جَو کے اَن چھنے آٹے کی روٹی اور ستو پر قناعت کرتے۔ روٹی کے ساتھ نانخورش کے طور پر کبھی نمک ہوتا کبھی سرکہ کبھی ساگ پات اور کبھی کبھار دودھ، گوشت کا استعمال بہت کم کرتے۔ ابن ابی الحدید نے تحریر کیا ہے:۔

کان یائتدم اذا ائتدم بخل اوملح فان ترقی من ذلك فبعض نبات الارض فان ارتفع عن ذلك فبقليل

اگر روٹی کے ساتھ کوی چیز استعمال کرتے تو وُہ سرکہ ہوتا یا نمک۔ اس سے آگے بڑھتے تو کوی سی سبزی۔ اور اس سے بھی آگے بڑھتے تو تھوڑا سا اُونٹنی کا دُودھ۔ اور گوشت بہت کم کھاتے تھے

(بقیہ از ص۱۲۵) چنانچہ ابن اثیر جزری نے تحریر کیا ہے:۔

ان رسُول اللہ کان یتختم فی یمینہ۔ (جامع الاصول۔ ج۵۔ ص۴۰۶)۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنا کرتے تھے۔"

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:۔

کان رسُول اللہ یتختم فی یمینہ وقبض علیہ الصّلوۃ والسّلام والخاتم فی یمینہ۔ (مستطرف ج۲۔ ص۲۷)۔

رسُول اللہ داہنے ہاتھ میں انگوٹھی پہنا کرتے تھے اور جب دُنیا سے رحلت فرمائی تو اُس وقت بھی آپ کے داہنے ہاتھ میں انگوٹھی تھی۔"

آنحضرتؐ کے بعد معاویہ نے اِس طریق رسُولؐ کو بدل دیا اور دائیں ہاتھ کے بجائے بائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننا شروع کر دی۔ چنانچہ صاحب مستطرف نے تحریر کیا ہے:۔

ذکر السلامی ان رسُول اللہ کان یتختم فی یمینہ والخلفاُ بعدہ فنقلہ معاویۃ رضی اللہ عنہ الی الیسار واخذ الامویۃ بذلك۔ (مستطرف ج۲۔ ص۲۵)

سلامی نے بیان کیا ہے کہ رسُول اللہ اور اُن کے بعد خلفاء دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنا کرتے تھے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے بائیں ہاتھ میں پہننا شروع کر دی۔ اور امویوں نے اسے اپنا شعار بنا لیا۔"

من الباْن الابل ولا یاکل اللحم الا قلیلا و یقول لا تجعلوا بطونکم قبور الحیوان۔ (مقدمہ شرح نہج البلاغہ)

اور فرمایا کرتے تھے کہ اپنے شکموں کو حیوانوں کا گورستان نہ بناؤ۔"

امام محمد باقر علیہ السّلام فرماتے ہیں کہ امیرالمومنین مہمانوں کو گوشت اور روٹی کھانے کو دیتے اور خود جَو کی روٹی سرکہ یا روغن زیتون کے ساتھ کھاتے۔

حضرت روٹی کے سُوکھے ٹکڑے اور ستّو ایک تھیلی میں بند رکھتے تھے اور اُس پر مُہر لگا دیتے تھے کچھ لوگوں نے کہا کہ آپ عراق ایسی سرزمین پر رہتے ہُوئے ایسا کرتے ہیں جبکہ یہاں غلّہ کی کوئی کمی نہیں ہے فرمایا کہ میں کمی کی بنا پر ایسا نہیں کرتا بلکہ اس وجہ سے کہ:۔

لا احب ان ید خل بطنی الا ما اعلم۔ (تاریخ کامل)

مجھے یہ پسند نہیں ہے کہ میں اس چیز سے پیٹ بھروں جسے میں جانتا نہیں ہوں۔"

عمرو ابن حریث کہتے ہیں کہ ایک دن دوپہر کے وقت مجھے حضرت کی خدمت میں حاضر ہونے کا اتفاق ہُوا۔ مَیں نے دیکھا کہ ایک مُہر شدہ تھیلی آپ کے آگے رکھی ہے۔ آپ نے اس میں سے سُوکھی روٹی کے ٹکڑے نکالے اور انہیں پانی میں بھگو کر اور اُن پر نمک چھڑک کر کھانے لگے۔ میں نے روٹی کے ٹکڑوں کو دیکھ کر فضہ سے کہا کہ تم سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ گوندھنے سے پہلے آٹا چھان کر بھوسی الگ کر دیا کرو فضہ نے کہا کہ مَیں نے ایک دفعہ آٹا چھانا تھا مگر حضرت نے آئندہ ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ اور مَیں نے اس تھیلی میں سُوکھے ٹکڑوں کے علاوہ کھانے کی کچھ اور چیزیں بھی رکھ دی تھیں۔ مگر حضرت نے اس پر مُہر لگا دی تاکہ اس میں کسی اور چیز کا اضافہ نہ کر سکوں۔

عدی ابن حاتم کہتے ہیں کہ مَیں نے ایک دفعہ دیکھا کہ حضرت کے آگے جَو کی روٹی کے سُوکھے ٹکڑے اور نمک رکھا ہے اور ایک چھاگل پانی سے بھری رکھی ہے۔ مَیں نے عرض کیا کہ آپ دن کے اوقات میں مصروف جہاد اور راتوں کے لمحات میں مشغول عبادت رہتے ہیں اور پھر یہ کھانا کھاتے ہیں؟ حضرت نے میری طرف دیکھ کر فرمایا کہ "نفس کو ریاضت کا خوگر بنانا چاہیئے تاکہ وُہ طغیانی و سرکشی پر نہ اُتر آئے۔ اور پھر یہ شعر پڑھا

علل النفس بالقنوع و الا   طلبت منك فوق ما یکفیها

(مناقب ابن شہر آشوب)

"اپنے نفس کو قناعت کا خوگر بناؤ ورنہ وُہ ضرورت سے زیادہ کا خواہشمند ہوگا۔"

سوید ابن غفلہ کہتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہُوا دیکھا کہ آپ کے آگے تُرش دہی کا ایک پیالہ رکھا ہے اور ہاتھ میں جَو کی ایک روٹی ہے جس پر جَو کے چھلکے جھلک رہے ہیں۔ آپ اس روٹی کو کبھی ہاتھ سے اور کبھی گھٹنے پر رکھ کر توڑتے تھے۔ اور ایک دفعہ عید کے موقع پر حاضر ہوا تو دیکھا

کہ حضرتؑ کے آگے دستر خوان بچھا ہے اور اس پر روٹی اور خطیفہ[1] رکھا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ عید کے دن بھی ایسا کھانا کھاتے ہیں؟ حضرتؑ نے فرمایا: انما ھذا عید لمن غفر لہ "عید اس کی ہے جسے اللہ نے بخش دیا ہو۔"

حضرتؑ ایک وقت میں کبھی دو قسم کے کھانے نہیں کھاتے تھے۔ اگر کسی موقع پر مختلف کھانے سامنے رکھ دیئے جاتے تو ان کھانوں کو آپس میں ملا لیتے۔ چنانچہ ایک مرتبہ عید کے موقع پر مختلف کھانے آپ کے سامنے جمع ہو گئے۔ آپ نے ان کھانوں کو ایک دوسرے میں ملا کر ایک کھانا بنا لیا۔ ایک دفعہ حضرت کے سامنے کھانا آیا جس میں گوشت تھا مگر اس میں روغن نہیں ڈالا گیا تھا۔ آپ سے کہا گیا کہ اگر فرمائیں تو اس میں روغن ڈال دیا جائے۔ فرمایا:-

انا لا ناکل ادامین جمیعا "ہم ایک وقت میں دو قسم کی چیزیں نہیں کھاتے۔" (کفایۃ الطالب)

حضرتؑ نے ہمیشہ اس کی پابندی کی اور زندگی کے آخری ایام میں جب آپ کی دختر جناب ام کلثوم نے جَو کی روٹی کے ساتھ نمک اور دودھ رکھا تو آپ نے دودھ اٹھوا دیا اور نمک سے روٹی کھائی۔

آپ نے کمال تقویٰ اور تاسیٔ رسولؐ کی بنا پر ان چیزوں سے بھی ہمیشہ اجتناب برتا جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں کھائی تھیں۔ چنانچہ عدی ابن ثابت کہتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرتؑ کے سامنے فالودہ پیش کیا گیا تو آپ نے اس کے کھانے سے انکار کر دیا اور فرمایا:-

شیٔ لم یاکل منہ رسولؐ اللہ لا احب ان اٰکل منہ۔ (ریاض النضرہ) "جس چیز کو رسولؐ اللہ نے نہ کھایا ہو اس کا کھانا مجھے پسند نہیں ہے۔"

حضرتؑ نے اس انتہائی سادہ غذا اور ترکِ لذائذ کے ساتھ کبھی شکم سیر ہو کر نہیں کھایا۔ ابن ابی الحدید نے لکھا ہے:-

ما شبع من طعام قط۔ "آپ نے کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔" (مقدمہ شرح نہج البلاغہ)

امیرالمومنین جہاں زندگی کے اور شعبوں میں اسوۂ رسولؐ کے پیرو تھے وہاں کھانے پینے میں بھی آدابِ نبوی کے پابند تھے۔ یہاں تک کہ دستر خوان پر نشست کی وضع، لقمہ اٹھانے کا طریقہ اور کھانے کا انداز بھی رسولِ خدا سے ملتا جلتا تھا۔ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:-

کان امیرالمومنین علیہ السّلام "امیرالمومنین علیہ السّلام کھانے کے معاملہ میں سب سے

---

[1] عرب کا ایک کھانا ہے جو آٹے کو دودھ میں جوش دے کر تیار کیا جاتا ہے۔ ۱۲

اشبہ الناس طعمۃ برسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ ۔ (صافی) زیادہ رسُولِ خدا صلے اللہ علیہ وآلہ سے مشابہ تھے"۔

دستر خوان پر بیٹھنے سے پہلے اور فارغ ہونے کے بعد ہاتھ دھوتے اور فرماتے کہ کھانے سے قبل اور بعد ہاتھ دھونے سے ہاتھوں کی چکناہٹ دُور ہوتی ہے اور آنکھوں میں جلا پیدا ہوتی ہے۔ کھانے کے وقت گھٹنوں کے بل دوزانو بیٹھتے اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اور آلتی پالتی مار کر بیٹھنے کو ناپسند کرتے۔ کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھتے۔ اور فرماتے کہ اگر کسی کو کھانے کے وقت بسم اللہ یاد نہ آئے تو کھانے کے دوران جب یاد آئے پڑھے۔ کھانے کا آغاز نمک سے کرتے۔ کھانا گرم ہوتا تو اُس کے ٹھنڈا ہونے کا انتظار کرتے۔ کھانا پانچوں اُنگلیوں سے کھاتے اور ادھر اُدھر ہاتھ ڈالنے کے بجائے سامنے سے کھاتے اور ثرید (شوربے میں بھگوئے ہوئے روٹی کے ٹکڑے) کو درمیان سے نہ اُٹھاتے بلکہ کناروں کی طرف سے کھاتے۔ مشروبات میں سادہ پانی خصوصاً بارش کا پانی پسند کرتے اور فرماتے کہ بارش کے پانی سے امراض کا دفعیہ اور بدن کی تطہیر ہوتی ہے۔ دستر خوان پر سے روٹی کے ریزے پھینکنے کے بجائے چُن کر کھا لیتے اور فرماتے کہ یہ باعثِ شفا ہے۔ لوٹے یا بدھنے کی ٹونٹی سے منہ لگا کر پانی نہ پیتے اور نہ برتن کے ٹوٹے ہُوئے کنارے کی طرف سے پیتے۔ کھانے پینے کی چیزوں پر پھونک مارنا پسند نہ فرماتے۔ ایک مرتبہ آپ نے اپنے خادم "مسلم" سے پینے کے لئے پانی طلب کیا۔ وُہ پیالہ بھر کر پانی لایا۔ جب حضرتؑ کے سامنے آیا تو اُس نے تنکا وغیرہ ہٹانے کے لئے اُس میں پھُونک ماری۔ آپ نے فرمایا کہ یہ پانی اب تم پیو اور میرے لئے دوسرا لاؤ۔

عہدِ طفولیت

انسان کی زندگی کے تین ادوار ہیں۔ بچپنا، جوانی اور بڑھاپا۔ ہر سن کے تقاضے جُدا اور ہر دَور کے مشغلے مختلف ہوتے ہیں۔ بچپنا کھیل کُود کا زمانہ ہے جس میں کھیل کُود کے سوا کسی اور بات کا خیال نہیں ہوتا۔ اس دَور میں نہ فہم ہی کامل ہوتا ہے اور نہ شعور ہی پختہ۔ اور بچّوں کے مشاغل سے ان کے شعور کی ناپختگی کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ وُہ اچھے بُرے سے آنکھ بند کر کے جن کھیلوں میں اپنے ہمسنوں کو دیکھتے ہیں وُہی کھیل کھیلتے اور انہی سے دلچسپی اور شغف رکھتے ہیں۔

فرزند ابوطالب کی روشِ عام بچوں کی روش سے مختلف تھی۔ وُہ نہ کبھی کھیل کُود میں نظر آئے نہ لہو و لعب میں دکھائی دیئے۔ اور ان تمام مشغلوں سے جو عام طور پر بچّوں کی دلچسپی کا باعث ہوتے ہیں کنارہ کش رہے۔ انہیں نہ اس سے غرض تھی کہ لہو کسے کہتے ہیں اور نہ اس سے کوی مطلب تھا کہ لعب کیا ہے۔ ان کے

تیوروں سے ہمت وجرأت کے ولولے عیاں اور حرکات وسکنات سے عظمت ووقار کے آثار نمایاں تھے اور کیا جسمانی اور کیا ذہنی دونوں اعتبار سے ان کا بچپنا دُوسرے بچوں کے عہدِ طفولیت سے میل نہ کھاتا تھا۔ ان کی جسمانی نشو ونما کی رفتار دُوسروں سے تیز تر تھی۔ اور ایک دن میں اتنا بڑھتے جتنا دُوسرے بچے ایک مہینہ میں اس قوتِ نمو کی فراوانی کا اثر تھا کہ جسم مضبُوط، فہم وادراک قوی اور ظاہری وباطنی حاسے تیز تھے۔ صاحب ارجح المطالب نے نجم الدین فخر الاسلام ابو بکر ابن محمد المرندی کی کتاب مناقب الاصحاب کے حوالہ سے حیدرؑ کی وجۂ تسمیہ کے سلسلہ میں تحریر کیا ہے کہ حضرت علیؑ ابھی شیر خواری کے زمانہ میں تھے کہ ان کی والدہ انہیں گھر میں تنہا چھوڑ کر کسی کام سے باہر گئیں۔ یہ گھر ایک پہاڑی کے دامن میں واقع تھا۔ اس پہاڑی سے ایک سانپ اُترا اور آپ کے قریب پہنچ کر پھنکارنے لگا۔ آپ نے ہاتھ بڑھا کر اُسے پکڑ لیا یہاں تک کہ وُہ آپ کے ہاتھوں ہی میں مر گیا۔ جب آپ کی والدہ واپس آئیں تو علیؑ کی گرفت میں مُردہ سانپ دیکھ کر کہنے لگیں: حیاك الله یا حیدرہ۔ "اے میرے شیر خدا تجھے زندہ رکھے"۔ جب بڑے ہُوئے اور چلنے پھرنے لگے، تو وزنی پتھروں کو بڑی آسانی سے اُٹھا لیتے اور پہاڑ کی چوٹیوں پر سے اُٹھا کر لے آتے اور بتوں کی توڑ پھوڑ میں لگے رہتے۔

عرب کے دستُورِ تربیت کے مطابق حضرت ابو طالبؑ اپنے بچوں کو تیر اندازی، شہسواری اور کُشتی لڑنے کا فن سکھاتے، اور اپنے بیٹوں، بھتیجوں کو جمع کر کے انہیں بھڑاتے اور داؤ پیچ کی تعلیم دیتے۔ حضرت علیؑ اگرچہ اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے مگر کسی کی گاؤ زوری نہ چلنے دیتے۔ اور اپنے سے سن و سال میں بڑوں کو داؤں پر رکھ کر چاروں خانے چت گراتے اور اچھے اچھے شہ زوروں سے اپنی قوت وطاقت کا لوہا منوا لیتے۔ یہ قوّتِ خداداد ہی کا کرشمہ تھا کہ ان ابتدائی مشقوں سے لے کر بڑے سے بڑے معرکوں تک کسی سورما ساونت سے زیر نہیں ہُوئے۔ اور جس سے بھڑے اُسے پچھاڑے بغیر نہیں چھوڑا۔ ابن قتیبہ نے لکھا ہے:۔

لم یصارع قط احدا الا صرعہ۔ (المعارف۔ صـ۹۱) — جس سے کشتی لڑے اُسے پچھاڑ کر چھوڑا۔

اس جسمانی قوت کے ساتھ ذہنی وشعوری ارتقاء کے لحاظ سے بھی بہت آگے تھے۔ بچپنے ہی میں حق وباطل میں امتیاز کا جوہر پیدا ہو گیا۔ پہلی ہی نظر میں معبُودِ حقیقی کو پہچانا۔ بُت پرستی کے مرکز میں رہتے ہُوئے بُتوں کو پرستش کے قابل نہ سمجھا۔ اور جبکہ لوگوں کو اعلانِ نبوّت کے بعد بھی نبوّت کے تسلیم کرنے میں تامّل تھا آپ اعلانِ نبوّت سے قبل مقامِ نبوّت کو سمجھ چکے تھے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں:۔

اری نور الوحی والرسالۃ واشم ریح النبوۃ۔ (نہج البلاغہ) — میں وحی ورسالت کی روشنی دیکھتا تھا اور نبوّت کی خوشبو سُونگھتا تھا"۔

آپ کی نگاہِ بلند نے نُورِ نبوّت کو دیکھا اور قوت شامہ نے شمیمِ رسالت کو سُونگھا ہی نہ تھا بلکہ آنحضرتؐ کی بعثت کے قبل ان کے طریقِ کار کو اپنا دستور العمل بنا کر دُوسروں کے لئے آئینۂ عمل بن گئے تھے۔ غرض حضرتؑ کا بچپن بھی اُن کی جوانی و پیری کی طرح عظمتوں کا کوہِ گراں تھا۔ اور اُن کے اس دَورِ صغرسنی پر نظر کرنے کے بعد یہ حقیقت آئینہ ہو جاتی ہے کہ عظیم انسان عظمت بکنار پیدا ہوتا ہے۔ اور اِدھر اُدھر سے مانگ تانگ کر عظمت حاصل نہیں ہوتی بلکہ یہ عطیۂ الٰہیہ ہے جو بقدرِ ظرف و بحدِّ وسعت و اماں نصیب ہوتا ہے۔

"دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر"

تعلیم و تربیت

حضرت علی ابن ابی طالب کو تعلیم و تربیت کا جیسا گہوارہ نصیب ہُوا وہ دُنیا میں کسی کو نصیب نہ ہو سکا۔ انھوں نے رسُولِ خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گود میں آنکھیں کھولیں، اُنہی کی پاکیزہ آغوش میں پرورش پائی، اور بچپنے سے لے کر جوانی کا پُورا زمانہ اُنہی کے ساتھ گزارا۔ اِنہی کے سرچشمۂ علم و ہدایت سے فیضیاب ہُوئے اور اُنہی کی زبان چُوس کر پھُولے پھلے اور پروان چڑھے۔ چنانچہ جناب فاطمہ بنتِ اسد فرماتی ہیں:-

لما ولدته سماه صلے اللہ علیہ وسلم علیا و بصق فی فیہ ثم انه القمه لسانه فما زال یمصه حتی نام قالت فلما کان من الغد طلبنا له مرضعة فلم یقبل ثدی احد فدعونا له محمدا فالقمه لسانه فکان کذلك ماشاء اللہ تعالیٰ۔

(سیرۃ نبویہ دحلان ص۱۴۶)

جب علیؑ پیدا ہُوئے تو پیغمبرؐ نے ان کا نام علیؑ رکھا اور اپنا لعابِ دہن اُن کے مُنہ میں ٹپکایا اور اپنی زبان اُن کے مُنہ میں دے دی جسے چُوستے چُوستے سو گئے۔ جب دُوسرا دن ہُوا تو ہم نے دایہ تلاش کی مگر علیؑ نے کسی کی چھاتی کی طرف مُنہ نہ بڑھایا۔ ہم نے محمّد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یاد کیا۔ آپ نے اپنی زبان علیؑ کے مُنہ میں دی اور وُہ میٹھی نیند سو گئے۔ اور جب تک خدا نے چاہا ایسا ہی ہوتا رہا۔

اگرچہ زمانۂ رضاعت میں آپ ماں ہی کی گود میں پرورش پاتے تھے مگر اس نومولود کی دیکھ بھال زیادہ تر پیغمبر اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم خود کرتے۔ اپنے ہاتھ سے نہلاتے دُھلاتے۔ پہروں گود میں لئے رہتے سوتے تو خود جھُولا جھُلاتے۔ جاگتے تو لوری دیتے اور غیر معمولی محبّت و گرم جوشی کا اظہار کرتے اور ماں باپ سے بڑھ کر نگرانی و تربیت میں حصّہ لیتے۔ بلکہ چھ برس کے سن میں علیؑ مستقل طور پر پیغمبرؐ کی تربیت و کفالت میں آگئے اور ماں باپ دونوں ان کی طرف سے کلیتہً بے فکر ہو گئے۔

پرندہ اپنے پوٹے میں جمع کی ہوی غذا جوں کی توں اپنے بچے کے منہ میں منتقل کرتا ہے۔ اسی طرح پیغمبر نے وُہ تمام علوم، وُہ شریعت کے ہوں یا حکمت کے، قرآن کے ہوں یا سُنت کے، اخلاق کے ہوں یا سیاست کے۔ ظاہر کے ہوں یا باطن کے۔ حاضر کے ہوں یا غائب کے جُوں کے توں اُن کے سینہ میں منتقل کر دیئے اور اُن میں کوی تغیر و تبدل اور ردّ و بدل نہیں ہُوا۔ اس تربیتِ علمی کی تکمیل کے بعد اعلم اُمتی کی سند دی اور انا مدینۃ العلم و علی بابھا۔ "مَیں شہرِ علم ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں"۔ کا تمغا جبینِ امامت پر آویزاں کیا اور اس طرح اپنے علم تک پہنچنے کا ذریعہ بتایا۔ یعنی جس طرح شہر میں داخل ہونے کا ذریعہ دروازہ ہوتا ہے اسی طرح میرے علم تک رسائی کا ذریعہ علیؑ ہیں۔ علیؑ وُہ ہیں جن کا شجرۂ علم، علمِ نبوت سے بلا واسطہ ملتا ہے اور علمِ نبوت کا شجرہ علمِ خدا سے براہِ راست ملتا ہے۔ لہذا جو اس در سے بے خبر ہوگا وُہ خدا اور رسُولؐ کے تعلیمات سے بے خبر رہے گا۔ فردوسی مرحوم نے کیا خوب کہا ہے ؎

چہ گفت آں خداوندِ تنزیل و وحی | کہ من شہرِ علمم علیم در است! | گواہی دہم کایں سخن رازِ اُوست
خداوند امر و خداوند نہی | درست ایں سخن قولِ پیغمبرؐ است | تو گوئی دو گوشم برآوازِ اُوست

اولیّتِ اسلام

اسلام وہ ضابطۂ حیات ہے جو انسانی فطرت اور مزاجِ کائنات سے ہم رنگ و ہم آہنگ ہے۔ اور زندگی کے کسی موڑ پر فطری تقاضوں کو نظر انداز نہیں کرتا بلکہ جو فطرت کے تقاضے ہیں وہی اسلام کے تقاضے ہیں۔ دونوں کا نصب العین ایک اور دونوں کی راہ و منزل ایک ہے۔ اسی لئے قرآن میں دین کو "اسلام" بھی کہا گیا ہے۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللہِ الْاِسْلَام۔ "دین اللہ کے نزدیک صِرف اسلام ہے۔" اور فطرۃ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے:۔

فاقم وجھک للدین حنیفاً فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا۔ — ہر چیز سے مُنہ موڑ کر دِین کی طرف رُخ کر لو۔ یہ خدا کی وُہ فطرت ہے جس پر لوگوں کو پیدا کیا ہے۔"

پیغمبر اکرمؐ کا ارشاد ہے:۔

کل مولود یولد علی الفطرۃ۔ — ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔"

(وافی)

امام جعفر صادقؑ سے پُوچھا گیا کہ فطرت کیا ہے؟ فرمایا ھی الاسلام۔ "فطرت اسلام ہی تو ہے"۔ جب اسلام عینِ فطرت اور فطرت عینِ اسلام ہے تو فطرت پر پیدا ہونے کے معنی یہ ہوں گے کہ ہر بچہ وُہ

مسلمان کے ہاں پیدا ہو یا کافر کے ہاں۔ پرستارِ توحید کے ہاں جنم لے یا کسی مشرک کے ہاں۔ سر زمینِ اسلام میں پیدا ہو یا سر زمینِ کفر میں اصل خلقت و فطرت کے لحاظ سے مسلم ہوگا۔ اور جب تک اُس پر غیر مسلم ماں باپ کے عقائد و نظریات کا سایہ نہیں پڑتا وُہ مسلم ہی رہتا ہے۔ اور جب کافر ماں باپ اور غیر مسلم معاشرہ کے افکار و آراء اور غیر اسلامی نظریات اُس پر اثر انداز ہوتے ہیں تو وُہ اُن سے متاثر ہو کر وُہی راستہ اختیار کرتا ہے جو اُس معاشرہ و ماحول سے سازگار ہوتا ہے اور شاہراہِ فطرت سے بے راہ ہو کر ماں باپ کی راہ پر چل پڑتا ہے اور انہی کا دین و مذہب اختیار کر لیتا ہے۔ اور اگر کسی بچّے کو فطرت سے سازگار ماحول مل جائے تو فطرتِ اسلام پر پیدا ہونے کے بعد اسی دینِ فطرت پر باقی سمجھا جائے گا اور باطناً اور ظاہراً محکوم بالاسلام ہوگا۔

حضرت علیؑ دینِ فطرت پر پیدا ہوئے اور ایسے ماحول میں تربیت پائی جو پوری طرح فطرت سے ہم آہنگ تھا حضرتؑ خود فرماتے ہیں:۔

ولدت علی الفطرۃ وسبقت الی الایمان والھجرۃ۔ (نہج البلاغۃ)

"میں دینِ فطرت پر پیدا ہُوا اور ایمان و ہجرت میں سبقت لے گیا۔"

آپ اوائل عمر سے پیغمبرؐ کے ساتھ ساتھ رہے، انہی کی آغوش میں پرورش پائی اور انہی کے عقائد و نظریات پر اپنے عقائد و نظریات کی بنیاد رکھی اور کبھی کفر و شرک سے واسطہ ہی نہیں رہا۔ چنانچہ احمد ابن زینی دحلان نے لکھا ہے:۔

لم یتقدم من علی رضی اللہ عنہ شرک ابدا لانہ کان مع رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فی کفالتہ کاحد اولادہ وتبعہ فی جمیع امورہ۔ (سیرت نبویہ ص۱۷۱)

"حضرت علیؑ رضی اللہ عنہ کو کبھی شرک سے سابقہ نہیں پڑا۔ کیونکہ وُہ رسولؐ خدا کی تربیت و کفالت میں مثل اُن کی اولاد کے رہے۔ اور تمام اُمور میں اُنہی کی پیروی کرتے تھے۔"

لہٰذا جس کی ولادت اسلام پر اور تربیت بانیٔ اسلامؐ کے زیرِ سایہ ہو اور تمام افعال و اعمال میں نبیؐ کا تابع رہا ہو اُسے قانونِ فطرت و حکمِ تربیت کی رُو سے ایک لمحہ کے لئے بھی کافر و مُشرک تصوّر نہیں کیا جا سکتا اور نہ اُن کے بارے میں اس سوال کی کوی گنجائش ہے کہ وُہ کب اسلام لائے اور کس عمر میں مسلمان ہوئے ایک مرتبہ سعید ابن مسیب نے امام زین العابدینؑ سے پُوچھا کہ حضرت کس عمر میں ایمان لائے تھے آپ نے فرمایا:۔

او کان کافرا قط انما کان لعلی حیث بعث اللہ تعالیٰ رسولہ

کیا وُہ کبھی کافر بھی رہے ہیں (جو یہ پوچھتے ہو۔) البتہ جب اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم

صلی اللہ علیہ والہ وسلم عشر سنین ولم یکن یومئذ کافرا۔ (وافی)

کو مبعوث فرمایا تو اُن کی عمر دس برس کی تھی اور وُہ اُس وقت کافر نہ تھے"۔

یہ سوال تو اُن لوگوں کے بارے میں ہو سکتا ہے جو کافر و مُشرک رہے ہوں اور پھر کفر و شرک کے دائرے سے نکل کر حلقۂ اسلام میں داخل ہُوے ہوں نہ اُس کے بارے میں جو کبھی کفر سے آشنا ہی نہ ہُوا ہو۔ حضرت علیؑ کو اگر سابق الاسلام اور اوّل مُسلم کہا جاتا ہے تو اس اعتبار سے کہ انہوں نے پیغمبرؐ کے مبعُوث برسالت ہونے کے بعد سب سے پہلے اقرارِ نبوّت و تصدیقِ رسالت کرتے ہوئے اظہارِ اسلام کیا ورنہ دعوتِ اسلام کے موقع پر علیؑ اسی مذہب و ملّت پر تھے جس مذہب و ملّت پر پیغمبر اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم قبل بعثت تھے۔

آنحضرت نے مبعُوث برسالت ہونے کے بعد دعوت و تبلیغ کا آغاز گھر کے افراد ہی سے کیا تھا۔ اور گھر والوں سے زیادہ کسی کی اخلاقی پاکیزگی و راست بیانی کو دُوسرا نہیں جان سکتا۔ چنانچہ ابھی اسلام کی آواز گھر کی چار دیواری سے باہر نہ نکلی تھی کہ جناب خدیجۃ الکبریٰ اور علی مرتضےٰ جو اُس ساعت ہمایوں فال کے مُنتظر تھے فورًا اس آواز پر لبیک کہتے ہوُے حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ اُنہیں نہ پیغمبر کی صداقت میں شبہ ہُوا اور نہ اس دعوےٰ پر حیرت و استعجاب۔ یہی وُہ دوؔ ہستیاں تھیں جو سب سے زیادہ پیغمبرؐ سے قریب اور اسلام میں سابق تھیں۔ امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں:۔

لم یجمع بیت واحد یومئذ فی الاسلام غیر رسول اللہ صلے اللہ علیہ والہ وخدیجہ وانا ثالثھما۔ (نہج البلاغہ)

اُس وقت رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ اور (اُم المومنین) خدیجہ کے گھر کے علاوہ کسی گھر کی چار دیواری میں اسلام نہ تھا۔ البتہ تیسرا اُن میں مَیں تھا"۔

اِس سبقتِ ایمانی کے ساتھ نماز میں اولیّت کا شرف بھی انہی دونوں کے لیئے مخصوص ہے اور بعثت کے ایک عرصہ بعد تک ان دوؔ کے علاوہ صفِ ماموین میں کوئی اور نظر نہیں آتا۔ چنانچہ اسمٰعیل ابن ایاس کہتے ہیں کہ میرے دادا عفیف بیان کرتے تھے کہ میں بسلسلۂ تجارت مکّہ آیا جایا کرتا تھا اور عباس ابن عبدالمطلب کے ہاں مہمان ہوتا تھا۔ ایک دفعہ میں نے خانہ کعبہ کے پاس ایک وجیہہ صورت جوان کو دیکھا اس نے پہلے سُورج کی طرف نگاہ کی اور پھر خانہ کعبہ کی طرف رُخ کر کے اللہ اکبر کہا۔ اتنے میں ایک بچّہ آیا اور اُس کی داہنی جانب کھڑا ہو گیا۔ پھر ایک خاتون آئی اور اُن دونوں کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔ اُس نوجوان نے رکوع کیا تو اُس کے ساتھ اُس بچّے اور خاتون نے بھی رکوع کیا۔ اُس نے سر اُٹھایا تو ان دونوں نے بھی سر اُٹھا لیا۔ پھر اُس نے سجدہ کیا، اس کے ساتھ اِن دونوں نے بھی سجدہ کیا۔ مَیں اس پُرعظمت طریقِ عبادت سے متاثر ہُوا اور عباس

سے پُوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ کہا یہ جوان میرا بھتیجا محمدؐ ابن عبد اللہ ہے اور یہ بچہ میرا بھتیجا علی ابن ابی طالبؑ ہے۔ اور یہ خاتون محمدؐ کی بیوی خدیجہ بنتِ خویلد ہے۔ اور محمدؐ نے مجھ سے بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے اس طریق پر نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے۔

وایم اللہ ما اعلم علیٰ ظہر الارض کلھا احدا علیٰ ھذا الدین غیر ھولاء الثلثہ۔ (تاریخ طبری ج ۲۔ ص ۶۵)۔	خدا کی قسم مجھے علم نہیں ہے کہ تمام رُوئے زمین پر ان تین کے علاوہ کوی اور بھی اِس دین پر ہو"۔

عفیف جب مُسلمان ہو گئے تو بڑی حسرت سے کہتے تھے:۔

لیتنی کنت اٰمنت یومئذ فکنت ثالثا۔ (طبری۔ ج ۲۔ ص ۶۵)	کاش مَیں اُس دن ایمان لے آتا تو ایمان لانے والوں میں تیسرا ہوتا"۔

عفیف نے یہ منظر اُس وقت دیکھا تھا جبکہ مصلائے زمین کے اُوپر اور محرابِ فلک کے نیچے ان تین کے سوا کوی اور خدا کی عبادت کرنے والا نہ تھا اور ہمیشہ اُن کے دل میں یہ حسرت رہی کہ اگر توفیق رہنمائی کرتی اور اُس دن ایمان لے آتے تو ایمان لانے والوں کی صفِ اوّل میں ہوتے اور علیؑ اور خدیجہ کے بعد ان کا نام آتا۔ اگر اُس دَور میں کوی اور بھی اسلام لایا ہوتا تو وُہ اُس کا بھی تذکرہ کرتے، اور عباس بھی ان تینؑ کے علاوہ دُوسروں سے دین کی نفی نہ کرتے۔ امیر المومنینؑ کی سبقتِ ایمانی کا قریب قریب ہر مورخ نے ذکر کیا ہے۔ چنانچہ ابن ہشام تحریر کرتے ہیں:۔

کان اوّل ذکر من الناس اٰمن برسول اللہ وصلی معہ وصدق بما جاءہ من اللہ تعالیٰ علی ابن ابی طالب ابن عبد المطلب ابن ھاشم رضوان اللہ وسلامہ علیہ وھو یومئذ ابن عشر سنین۔ (سیرتِ ابن ہشام۔ ج ۱۔ ص ۲۶۲)۔	مردوں میں جو سب سے پہلے رسُول اللہ پر ایمان لایا اور اُن کے ساتھ نمازوں میں شریک ہُوا اور جو کچھ اللہ کی طرف سے رسُولؐ لے کر آئے اُس کی تصدیق کی وُہ علی ابن ابی طالب سلام اللہ علیہ تھے۔ اور اُس وقت آپ کی عمر مبارک دس سال تھی"۔

اِس سلسلہ میں پیغمبر اکرم اور صحابہ کبار کی چند شہادتیں بھی درج کی جاتی ہیں تاکہ حضرت کا سابق الاسلام ہونا روزِ روشن کی طرح واضح وعیاں ہو جائے اور اس میں کسی شک وشبہہ اور چون وچرا کی گنجائش نہ رہے۔

پیغمبر اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ کا ارشاد ہے:۔

اولکم اسلاما علی ابن ابی طالبؑ۔ (الاستیعاب۔ ج ۲۔ ص ۴۵۷)	تم لوگوں میں اول مُسلم علی ابن ابی طالب ہیں"۔

امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں :۔

انا اول من اسلم مع النبی۔ (تاریخ خطیب بغدادی ج۴ ص۲۳۳)

سب سے پہلے میں نے نبی اکرمؐ کی آواز پر اسلام قبول کیا۔

عبد اللہ ابن عباس کہتے ہیں :۔

اوّل من اسلم علی ابن ابی طالب (استیعاب ج۲ ص۴۵۸)

سب سے پہلے علی ابن ابی طالب اسلام لائے۔

سلمان فارسی کہتے ہیں :۔

اول ھذہ الامۃ وروداً علیٰ نبیھا الحوض اولھا اسلاماً علی ابن ابی طالب۔ (استیعاب ج۲ ص۴۵۷)

اس امت میں سب سے پہلے پیغمبر کے پاس حوض کوثر پر وارد ہونے والے اور سب سے پہلے اسلام لانے والے علی ابن ابی طالب ہیں۔

ابو ذر غفاری کہتے ہیں :۔

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول لعلی انت اول من امن بی وصدق۔ (ریاض النضرہ ج۲ ص۲۰۵)

میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو علی سے یہ کہتے سنا "تم سب سے پہلے مجھ پر ایمان لائے اور میری تصدیق کی"۔

ابو ایوب انصاری کہتے ہیں :۔

اوّل النّاس اسلاماً علی ابن ابی طالب۔ (شرح التقریب ج۱ ص۸۵)

رسول خدا پر سب سے پہلے ایمان لانے والے علی ابن ابی طالبؑ تھے۔

زید ابن ارقم کہتے ہیں :۔

اوّل من اسلم مع رسول اللہ علی ابن ابی طالبؑ۔ (مسند احمد ج۴ ص۳۶۸)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سب سے پہلے ایمان لانے والے علی ابن ابی طالب تھے۔

اس اسلامی سبقت کے ساتھ نماز میں تقدم کا شرف بھی انہی کے لئے مخصوص ہے۔ اور تاریخ یہ بتانے سے قاصر ہے کہ اوائل زمانہ بعثت میں جناب خدیجہ اور حضرت علی کے علاوہ کوئی اور بھی پیغمبر کے ساتھ شریک نماز ہوا ہو۔ اگر اس دور میں کوئی اور بھی اسلام لایا ہوتا تو کبھی نہ کبھی تو نماز میں شریک ہوتا۔ جبکہ نماز اسلام کی علامت اور اس کا عملی اعتراف ہے۔ بلکہ سات برس تک ان دو کے علاوہ اور کوئی صف نماز

میں نظر نہیں آتا۔ چنانچہ حضرت علیؑ کا قول ہے :۔

صلیت مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبل الناس بسبع سنین۔ (تاریخ کامل ج۲ ص۳)	"میں نے دوسرے لوگوں سے سات برس پیشتر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نمازیں پڑھی ہیں"۔

اس تقدم و اولیت کے مزید ثبوت کے لئے چند اقوال درج کئے جاتے ہیں :۔

انس ابن مالک کہتے ہیں :۔

بعث رسول اللہ یوم الاثنین وصلی علی یوم الثلاثاء۔ (ترمذی ج۲۔ ص۲۱۴)۔	"پیر کے دن پیغمبر اکرم مبعوث ہوئے اور منگل کے دن علیؑ نے نماز پڑھی"۔

بریدہ اسلمی کہتے ہیں :۔

اوحی الی رسول اللہ یوم الاثنین وصلی علیؑ یوم الثلاثاء۔ (مستدرک حاکم۔ ج۳۔ ص۱۱۲)۔	"دوشنبہ کے دن رسول اللہ پر وحی نازل ہوئی اور سہ شنبہ کے دن علیؑ نے نماز ادا کی"۔

جابر ابن عبد اللہ انصاریؓ کہتے ہیں :۔

بعث النبیؐ یوم الاثنین وصلی علیؑ یوم الثلاثاء۔ (تاریخ کامل۔ ج۲۔ ص۲۲)۔	"دوشنبہ کے دن پیغمبر مبعوث برسالت ہوئے اور سہ شنبہ کے دن علی نے نماز پڑھی"۔

مجاہد کا قول ہے :۔

اول من صلی علیؑ وھو ابن عشر سنین۔ (طبقات ابن سعد۔ ج۳۔ ص۱۳)	"سب سے پہلے علی نے نماز پڑھی اس وقت آپ کی عمر دس سال تھی"۔

ان شواہد کے بعد حضرت کی سبقت و اولیت میں کسی شک و شبہ اور اختلاف کی گنجائش نہ ہونا چاہئے تھی۔ مگر کچھ لوگوں نے سن و سال کے اختلافات اور دوسرے اعتبارات سے سبقت کو تقسیم کر کے دوسروں کے لئے بھی سبقت کی گنجائش پیدا کرنے اور ایک مسلمہ حقیقت کو اختلافی مسئلہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ یہ کہا جاتا ہے کہ مردوں میں حضرت ابوبکر، عورتوں میں حضرت خدیجہ، بچوں میں حضرت علی اور غلاموں میں زید ابن حارثہ سب سے پہلے اسلام لائے اور ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے گروہ میں سابق ہے۔ اس تفصیل سے سابقیت کے خدوخال نکھرنے کے بجائے اور دھندلا کر رہ گئے ہیں اور اس نظریہ سے یہ مسئلہ صاف نہ ہو سکا کہ واقع میں کون سابق الاسلام تھا۔ اس تقسیم کا مقصد تو

یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؑ کی سابقیت و اوّلیت کو مشکوک بنا کر کسی اور کو سابق الاسلام یا کم از کم سبقت میں شریک ثابت کیا جائے مگر یہ نظریہ خود دعوے کی کمزوری کا آئینہ دار اور دلیل سے تہی دامنی کا غماز ہے اس لئے کہ اگر کسی اور کی اولیت و سابقیت مسلم ہوتی تو اس پر دعوی اجماع کیا جاتا، دلائل پیش کئے جاتے اور بلحاظ سن و سال سبقت کو تقسیم کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی جاتی۔ اور پھر یہ صرف ایک مزعومہ ہی تو ہے جس کا نہ کوئی ماخذ ہے اور نہ اس کی تائید اس دور کے کسی شخص کے قول سے ہوتی ہے۔ بلکہ جن جن لوگوں نے حضرت کی سبقت اسلامی کا تذکرہ کیا ہے بلا قید و بلا استثناء کیا ہے اور علی الاطلاق انہیں مسلم اوّل مانا ہے۔ اور یوں بھی علیؑ کو بچوں میں سابق الاسلام قرار دینے کے کوئی معنی نہیں ہوتے جبکہ اس دور میں اس کی نشاندہی کی جاسکتی کہ وہ بچے کون تھے اور کن کے تھے جو اسلام لائے تھے۔ ظاہر ہے کہ جب بڑے اسلام نہ لائے تو بچوں نے کہاں اسلام لانا تھا۔ لہذا جب کوئی بچہ اسلام لایا ہی نہ تھا تو وہ بچے آئیں گے کہاں سے جن پر علی کو سابق قرار دیا جا رہا ہے۔ اور بغیر مسبوق کے کسی کو سابق کہنا بے معنی سی بات ہے۔ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حضرت ابوبکر بالغ مردوں میں سب سے پہلے اسلام لائے تھے تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ وہ حضرت علی سے بھی پہلے اسلام لا چکے تھے اس لئے کہ انہیں بالغ مردوں میں سابق قرار دیا گیا ہے اور حضرت علی بالغ مردوں کی صف میں آتے ہی نہیں ہیں وہ بالاتفاق سن بلوغت سے پہلے اسلام لائے اور ایک نابالغ بچے کا حضرت ابوبکر سے پہلے اسلام لانا اس خود ساختہ نظریہ سے کہ حضرت ابوبکر بالغ مردوں میں سب سے پہلے اسلام لائے متصادم و متعارض نہیں ہوتا کیونکہ اس نظریہ کی رو سے یہ امر محلِ نزاع نہیں ہو سکتا کہ حضرت علی سابق الاسلام تھے یا حضرت ابوبکر۔ البتہ یہ امر محلِ نزاع ہو سکتا ہے کہ حضرت ابوبکر بالغ مردوں میں سب سے پہلے اسلام لائے تھے یا بالغ مردوں میں سے کوئی اور بھی ان سے پہلے اسلام لا چکا تھا۔ لیکن تاریخ تو اسے بھی تسلیم نہیں کرتی کہ وہ بالغ مردوں میں سب سے پہلے اسلام لائے تھے بلکہ ایک کثیر جماعت ان سے پہلے اسلام لا چکی تھی۔ چنانچہ محمد ابن سعد کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سعد ابن ابی وقاص سے دریافت کیا:۔

اکان ابوبکر اولکم اسلاما فقال لا ولقد اسلم قبلہ اکثر من خمسین۔ (تاریخ طبری ج ۲ ص ۲۱۶)	کیا آپ لوگوں میں اسلام کے لحاظ سے سابق ابوبکر تھے؟ کہا نہیں۔ بلکہ پچاس سے زیادہ آدمی اُن سے پہلے اسلام لا چکے تھے۔"

سعد ابن ابی وقاص کبار صحابہ اور عشرہ مبشرہ میں شمار ہوتے ہیں اور صحابی کے قول کے مقابلہ میں کسی تبع تابعی یا تابعی کی رائے کو کوئی وزن نہیں دیا جاتا۔ تو پھر یہاں ایک صحابی کے قول کے مقابلہ میں کسی کی قیاس آرائی کیونکر سند سمجھی جا سکتی ہے۔ اور اس نظریئے کو کیا اہمیت دی جا سکتی ہے۔ حضرت ابوبکر کے سابق الاسلام ہونے کا سوال اس وجہ سے بھی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ بعثتِ رسولؐ کے موقع پر مکہ میں موجود ہی نہ تھے بلکہ یمن

میں تھے اور وہاں سے وارد مکہ ہونے کے بعد انہیں بعثتِ رسولؐ کی خبر ملی جبکہ پیغمبرؐ کے دعوائے نبوت کی خبر عام طور پر پھیل چکی تھی۔ چنانچہ ابن اثیر نے لکھا ہے:۔

قال ابوبکر فقدمت مکۃ وقد بعث النبیؐ فجاءنی عقبۃ ابن ابی معیط وشیبہ و ربیعۃ و ابوجھل و ابوالبختری و صنادید قریش فقلت لھم ھل نابتکم نائبۃ او ظھر فیکم امر قالوا یا ابابکر اعظم الخطب یتیم ابی طالب یزعم اللہ بنی مرسل۔

ابوبکر کہتے ہیں کہ جب میں مکہ میں واپس آیا اس وقت نبی اکرمؐ مبعوث برسالت ہو چکے تھے۔ عقبہ ابنِ ابی معیط، شیبہ، ربیعہ، ابوجہل اور ابوالبختری اور سرداران قریش میرے پاس آئے۔ میں نے اُن لوگوں سے پوچھا کیا تم پر کوئی افتاد پڑی ہے یا کوئی حادثہ رونما ہوا ہے؟ انہوں نے کہا اے ابوبکر! سب سے بڑی اندوہناک خبر یہ ہے کہ یتیم ابوطالب یہ گمان کرنے لگا ہے کہ وہ اللہ کا فرستادہ نبیؐ ہے۔"

(اسد الغابہ۔ ج۳۔ ص۲۰۵)

لہٰذا جب وہ بعثت کے موقع پر مکہ میں موجود ہی نہ تھے تو پھر اُن کا اسلام علیؑ کے اسلام سے کیونکر سابق ہو سکتا ہے۔ جبکہ اقوالِ صحابہ سے یہ ثابت ہے اور جس سے کسی مورخ کو انکار نہیں ہے کہ حضرت علیؑ بعثت کے دوسرے دن پیغمبرؐ کے ساتھ شریکِ نماز ہوئے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ بعثتِ رسولؐ کے دن یا کم از کم بعثتِ رسول کے دوسرے دن ایمان لے آئے تھے۔

ان واقعات و شواہد کو سامنے رکھنے کے بعد امیرالمومنینؑ کی سبقتِ ایمانی کا اعتراف ناگزیر ہے۔ اگر اس سے انکار کی گنجائش ہوتی تو نہ بلوغ و عدم بلوغ کا شاخسانہ کھڑا کیا جاتا اور نہ اس کی اہمیت کم کرنے کی کوشش کی جاتی۔ چنانچہ کچھ متعصب و تنگ نظر افراد کو حضرت کی سبقت اسلامی سے انکار کی گنجائش نظر نہ آئی تو انہوں نے یہ کہہ کر اس سبقت کا پلہ سبک کرنا چاہا کہ علی صغیر السن اور نابالغ تھے۔ انہوں صرف اپنے مربی کے زیرِ اثر اسلام قبول کیا۔ اس میں اگر سبقت ہو بھی تو یہ باعثِ امتیاز و فضیلت نہیں ہو سکتی کیونکہ صغر سنی کا اسلام علم و تحقیق پر مبنی نہیں ہوتا بلکہ بزرگوں کی پیروی و تقلید کے نتیجہ میں ہوتا ہے۔ البتہ جن لوگوں نے بعد بلوغ اسلام قبول کیا ان کا اسلام تحقیق اور حقیقت رسی پر مبنی تھا۔ اور تقلیدی اسلام سے تحقیقی اسلام کا درجہ بلند تر ہے لہٰذا اس دور کے مسلمانوں کا اسلام اگرچہ علیؑ کے اسلام سے متاخر تھا مگر تحقیق کی بنا پر علیؑ کے اسلام سے زیادہ مستحکم و بلند پایہ تھا۔ کہنے کو تو یہ کہہ دیا مگر یہ سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی کہ بلوغ کا لحاظ ہوتا ہے تو احکام شرعیہ میں اور ایمان کا تعلق امور عقلیہ سے ہے جس میں عقل و شعور کا اعتبار ہوتا ہے اور عقل و شعور بلوغ ہی سے وابستہ نہیں ہے اور نہ عدم بلوغ کمال شعور و خرد کے منافی ہے۔ چنانچہ کبھی نابالغ، بالغ مردوں سے زیادہ بافہم و باشعور ثابت ہوتا ہے۔ اسی کمال فہم و شعور کی بنا پر حضرت یحییٰؑ کے بارے میں ارشاد باری ہے: واتیناہ الحکم

صبیا۔ ابھی وُہ بچّے ہی تھے کہ ہم نے انہیں حکم و فہم سلیم عطا کیا۔" اور حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں ہے کہ انہوں نے گہوارے کے اندر سے کہا:۔ انی عبد اللہ اتانی الکتاب وجعلنی نبیا۔ "میں خدا کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے"۔ یہاں شعور اپنے عروج پر نظر آتا ہے حالانکہ بلوغ کی منزل ابھی دُور تھی۔ امیر المومنینؑ اگرچہ سن کے لحاظ سے نابالغ تھے مگر عقل و شعور کا جوہر اسی سے ظاہر ہے کہ انہوں نے صغر سنی میں اللہ کے علاوہ نہ کسی کو اپنا معبود بنایا اور نہ کسی بُت کے آگے سرنگوں ہُوے۔ علامہ سیوطی نے تحریر کیا ہے:۔ لم یعبد الاوثان قط لصغرہ۔ (تاریخ الخلفاء۔ ص۱۱۶) علیؑ نے بچپن میں بھی کبھی بُتوں کی پُوجا نہیں کی"۔ حالانکہ اُس وقت بالغ و سن رسیدہ افراد اپنی بے شعوری کا مظاہرہ کرتے ہُوے بے شعور پتھروں کو اپنا دیوتا سمجھتے اور اُن سے مُرادیں مانگتے تھے۔ اگر بلوغ کے ساتھ اُن میں عقل و شعور بھی ہوتا تو وُہ نہ ترشے ہُوے پتھروں کی پرستش کرتے اور نہ بے جان بتوں سے حاجت طلبی کرتے۔ اس لئے کہ یہ چیز کسی صورت میں عقل و شعور کے تقاضوں سے سازگار نہیں ہے۔

یہ پھر بھی ایک حد تھی کہ بچپن کے ایمان کو بلوغ کے ایمان کے مقابلہ میں پست ثابت کرنا چاہا ہے۔ مگر ابو عثمان جاحظ اور ابن تیمیہ اور اُن کے ہم مسلک افراد نے تو صغر سنی کی بنا پر حضرت کے ایمان کو پایۂ اعتبار ہی سے گرا دیا ہے اور یہ کہا ہے کہ عدم بلوغ کی بنا پر انہیں حکم اسلام کا مورد قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یعنی وُہ اسلام لانے کے باوجود غیر مسلم ہی رہے۔ یہ عقیدہ اُسی کا ہو سکتا ہے جو نواصب کے عقیدہ کا ہمنوا ہو۔ اگر ایسا ہی ہے جیسا اُن کا خیال ہے تو کیا پیغمبر اکرمؐ نے انہیں اسلام کی دعوت دی تھی یا وُہ از خود ایمان لائے۔ اگر از خود اسلام لائے تو اُنہیں کیونکر یہ معلوم ہوُا کہ پیغمبرؐ کی آواز پر لبیک کہنا ضروری اور اُن پر ایمان لانا واجب ہے۔ اور اگر پیغمبر اکرمؐ نے انہیں دعوت اسلام دی تو اگر اُن کا اسلام قابلِ قبول ہی نہ تھا تو انہیں دعوتِ اسلام کیوں دی اور اُن کے اسلام کو کیوں قبول فرمایا۔ ظاہر ہے کہ پیغمبرؐ نے اُن کے اسلام کو صحیح سمجھتے ہُوے دعوتِ اسلام دی ہوگی۔ اور اگر ایمان کے لئے بلوغ کی شرط ہوتی تو پیغمبرؐ کبھی انہیں دعوتِ اسلام نہ دیتے جبکہ وُہ اسلام قابلِ اعتبار ہی نہ تھا۔ لہذا دعوتِ اسلام اگر صحیح ہے تو علیؑ کے ایمان کو بھی صحیح و معتبر ماننا پڑے گا۔ اور اگر دعوتِ اسلام صحیح نہیں ہے تو علیؑ کے ایمان کا جائزہ لینے کے بجائے اپنے اسلام کا جائزہ لینا ہوگا کہ پیغمبرؐ کی طرف ایسی بے نتیجہ دعوت کی نسبت دینا کہ جسے مانا جائے جب غیر مسلم اور نہ مانا جائے جب غیر مسلم کیا اسلامی نقطۂ نظر سے اسلام کے منافی نہیں ہے؟ اگر حضرت علیؑ کا یہ اسلام صغر سنی کی بنا پر غیر معتبر تھا تو اس غیر معتبر اسلام کے بعد حضرتؑ کے لئے ضروری تھا کہ بعد بلوغ تجدید اسلام کر کے اس کا تدارک کرتے مگر کوئی ضعیف تو درکنار کوئی غلط روایت بھی یہ نہیں بتاتی کہ آپ نے پھر کسی موقع پر تجدید اسلام کی ضرورت محسوس کی ہو۔ اس صورت میں علیؑ کے اسلام کو غیر معتبر قرار دینے کے معنی یہ ہوں گے کہ انہوں نے آخر تک اسلام قبول ہی نہیں کیا۔ اور یہ وُہی کہہ سکتا ہے جسے خود اسلام سے کوئی واسطہ نہ ہو۔ امر واقعہ یہ ہے کہ

جب کچھ لوگوں کو حضرتؑ کی سبقت کھلی تو صغر سنی و عدم بلوغ کا سہارا لے کر کبھی اُسے تقلیدی اسلام کہا گیا اور کبھی غیر معتبر۔ اور اس حقیقت سے آنکھ بند کر لی کہ اس وقت نہ تکلیفِ شرعی میں بلوغ کی شرط تھی اور نہ ایمان میں۔ بلکہ اسلام اور اس کے احکام تمیز و رشد سے وابستہ تھے۔ چنانچہ علامہ حلبی نے لکھا ہے:۔

انما صح اسلام علیؑ مع انهم اجمعوا علی انه لم یکن بلغ الحلم ومن ثم نقل منه انه قال سبقتکموا الی الاسلام طرا صغیرا ما بلغت اوان حلمی لان الصبیان کانوا اذ ذاك مکلفین لان القلم انما رفع عن الصبی عام خیبر۔ وعن البیهقی ان الاحکام انما تعلقت بالبلوغ فی عام الخندق وفی لفظ فی عام الحدیبیة وکانت قبل ذلك منوطة بالتمییز۔

(سیرۃ حلبیہ۔ ج۱۔ ص۲۶۹)

حضرت علیؑ کا اسلام اس بنا پر صحیح تھا حالانکہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ وُہ سن بلوغ کو نہ پہنچے تھے۔ چنانچہ آپ کا قول ہے کہ میں ابھی بچہ ہی تھا اور سن بلوغ کو نہ پہنچا تھا کہ اسلام میں سب پر سبقت لے گیا۔ کیونکہ اس وقت بچے بھی مکلف تھے اور بچوں سے قلم تکلیف خیبر والے سال برطرف ہوا۔ اور بیہقی نے کہا ہے کہ خندق والے سال میں احکام بلوغ سے وابستہ ہوئے اور ایک قول یہ ہے کہ حدیبیہ والے سال میں بلوغ سے متعلق ہوئے اور اس سے پہلے صرف تمیز و رشد سے وابستہ تھے"۔

بعثتِ رسولؐ کے وقت حضرت علیؑ کی عمر دس یا بارہ برس کی تھی اور یہ پورے طور پر رشد و تمیز کا زمانہ ہے۔ لہٰذا جب ظاہر شریعت کے معیار پر بھی ان کا اسلام پورا اُترتا ہے تو اُسے کمزور کر کے دکھانے کی کوشش صحیح جذبات کی عکاسی نہیں کرتی۔

دعوتِ عشیرہ

پیغمبر اکرم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے منصب رسالت پر فائز ہوتے ہی مخفی طور پر تبلیغ کا آغاز کر دیا اور جب رازداری کے ساتھ تبلیغ کرتے ہوئے تین برس گزر گئے اور چوتھا سال شروع ہوا تو علانیہ دعوت و تبلیغ کا حکم آیا: وانذر عشیرتك الاقربین "اپنے قریبی رشتہ داروں کو تبلیغ کرو" اس آیت کے نازل ہونے کے بعد آنحضرتؐ نے حضرت ابو طالبؑ کے مکان کو مرکزِ تبلیغ قرار دیا۔ اور حضرت علیؑ سے فرمایا کہ وُہ اولادِ عبد المطلب کے کھانے کا سامان کریں اور انہیں پیغام دیں کہ وُہ شریکِ دعوت

ہوں۔ حضرت علیؑ نے ایک ران گوشت ایک پیالہ دُودھ اور تین سو تین سیر آٹے کی روٹیوں کا بندوبست کیا اور اولادِ عبد المطلب کو کھانے پر طلب کیا۔ مقررہ وقت پر کم و بیش چالیس افراد جمع ہو گئے۔ اُن میں آنحضرتؐ کے چچا ابو طالب، حمزہ ابن عباس اور ابولہب بھی شامل تھے۔ اگرچہ کھانے والوں کی تعداد کو دیکھتے ہُوئے کھانا کم تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اس تھوڑے سے کھانے میں اتنی برکت دی کہ سب نے کھلے خزانے کھایا پھر بھی کھانا بچ رہا۔ جب یہ لوگ کھا پی کر فارغ ہوئے تو آنحضرت نے کھڑے ہو کر چاہا کہ اپنی رسالت کا اعلان کر کے انہیں خدا پرستی کی دعوت دیں کہ ابولہب نے مجمع سے مخاطب ہو کر کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمہیں بہکانا اور تمہارے آباؤ اجداد کے دین سے تمہیں بے راہ کرنا چاہتے ہیں۔ دیکھو ان کی باتوں پر کان نہ دھرنا ورنہ اندیشہ ہے کہ تم ان کی سحر کاریوں سے متاثر ہو کر بے راہ ہو جاؤ گے۔ ابولہب کی اس شرانگیزی کا نتیجہ یہ ہُوا کہ مجمع میں انتشار پیدا ہو گیا۔ کچھ لوگ اُٹھ کھڑے ہُوئے اور اُن کی دیکھا دیکھی دُوسرے بھی اُٹھ کھڑے ہُوئے اور پیغمبر اکرم جو کہنا چاہتے تھے نہ کہہ سکے۔ دُوسرے دن پھر حضرت علیؑ کے ذریعہ انہیں دعوت دی۔ وُہ لوگ دوبارہ کھانے پر جمع ہُوئے۔ جب کھا پی چکے تو پیغمبرؐ اکرم فریضۂ تبلیغ ادا کرنے کے لئے کھڑے ہُوئے۔ ابولہب نے پھر رخنہ اندازی کرنا چاہی مگر ابو طالب نے اس کی معاندانہ روش دیکھ کر اُسے ڈانٹا اور کہا: یا اعور ما انت وھذا۔ (فائق۔ ج ۲۔ ص ۹۸) اے بدبخت! تجھے اِن باتوں سے کیا واسطہ"۔ یہ سُن کر ابولہب کو روکنے ٹوکنے کی ہمّت نہ ہوئی اور گھٹنوں میں سر دے کر چُپ بیٹھ گیا۔ آپ نے مجمع سے مخاطب ہو کر کہا کہ تم اپنی اپنی جگہ پر اطمینان و سکون سے بیٹھے رہو۔ اور پیغمبرؐ سے کہا آپ جو کہنا چاہتے ہیں شوق سے کہیں ہم آپ کی ایک ایک بات غور سے سُنیں گے اور اُس پر عمل کریں گے۔ آنحضرتؐ کی ڈھارس بندھی اور آپ نے اولادِ عبد المطلب سے خطاب کرتے ہُوئے فرمایا:۔

یا بنی عبد المطلب انی واللہ ما اعلم شابا فی العرب جاء قومہ بافضل مما قد جئتکم بہ انی قد جئتکم بخیر الدنیا والآخرۃ وقد امرنی اللہ تعالیٰ ان ادعوکم الیہ فایکم یوازرنی علیٰ ھذا الامر علیٰ ان یکون اخی ووصیی وخلیفتی فیکم۔ (تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص ۶۳)

"اے فرزندانِ عبد المطلب خدا کی قسم میں نہیں جانتا کہ عرب میں کوئی جوان اس چیز سے بہتر چیز لایا ہو جو مَیں تمہارے لئے لے کر آیا ہُوں۔ مَیں تمہارے لئے دُنیا و آخرت کی بھلائی لایا ہوں اور خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اس بھلائی کی طرف تمہیں دعوت دُوں۔ تم میں کون شخص ہے جو اس سلسلہ میں میرا معاون و مددگار بننے کے لئے تیار ہو؟ میں وعدہ کرتا ہوں کہ وُہی میرا بھائی، میرا وصی اور میرا جانشین قرار پائے گا۔"

دو چار آدمیوں کے علاوہ کوئی بھی اس اعلان پر خوش نہ تھا چہ جائیکہ ان میں سے کوئی دستِ تعاون بڑھاتا، یا

نصرت وحمایت کا وعدہ کرتا۔ سب سر نہوڑائے چُپ بیٹھے رہے کہ دفعتہً اس خاموش فضا میں علیؑ کی آواز سکوت اور سناٹے کو توڑتی ہوی گونجی کہ یا رسُول اللہؐ اگرچہ میں نو عمر اور ان سب سے کمسن ہوں مگر آپؐ کا معاون و مددگار اور سینہ سپر رہوں گا۔ اگر کسی نے آپ کو ترچھی نظر سے دیکھا تو اُس کی آنکھیں پھوڑ دُوں گا۔ اور کسی نے شرانگیزی کی تو اُس کا پیٹ پھاڑ ڈالوں گا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا اے علیؑ تم ذرا توقف کرو شاید ان بڑوں میں سے کوی میری آواز پر لبیک کہے۔ جب تین مرتبہ کہنے سُننے کے باوجود کسی نے کوی جواب نہ دیا تو آپ نے علیؑ کو قریب بُلا کر اُن کے سر پر ہاتھ رکھا اور فرمایا:۔

ان ھذا اخی و وصیی وخلیفتی	یقیناً یہ میرا بھائی میرا وصی اور میرا جانشین ہے
فیکم فاسمعوا لہ واطیعوا	تم سب کو لازم ہے کہ اس کی بات مانو اور اس
(تاریخ طبری۔ ج۲۔ ص۶۳)	کی اطاعت کرو۔

قریش نے یہ اعلان سُنا تو اُن کے لبوں پر ایک تحقیر آمیز مسکراہٹ ظاہر ہوی۔ کنکھیوں سے ایک دُوسرے کو دیکھا اور اسے ایک مضحکہ خیز بات سمجھ کر اُس کا مذاق اُڑایا اور کچھ منچلوں نے ابوطالبؑ سے کہا کہ لو تم بھی اپنے بیٹے کی بات مانو اور اس کی اطاعت کرو۔ اگرچہ اُس وقت حضرت علیؑ کی آواز کو کوی وزن نہیں دیا گیا اور سرسری اور بے سروپا بات سمجھ کر اُس کا تمسخر اُڑایا گیا مگر دُنیا نے ڈرا دھمکا کر دیکھ لیا۔ ترکِ موالات و قطع تعلقات کر کے دیکھ لیا کہ اس کمسن اور نوخیز بچے نے قریش کی بھری محفل میں جو وعدہ کیا تھا اُسے پُوری طرح نباہا۔ کٹھن سے کٹھن موقع پر پیغمبر کا سینہ سپر رہا اور دُشمنوں کے نرغہ میں تلواروں سایہ میں اور دُشمنوں کے حصار میں نصرت وحمایت کا فریضہ ادا کیا، اور دُنیا پر ثابت کر دیا کہ پیغمبرؐ کے اعلان کے مطابق آنحضرت کی اُخوت وحمایت اور قائم مقامی کا اس سے بڑھ کر کوی حقدار نہیں ہے۔

امیر المومنینؑ کے ایفائے عہد کے نتیجہ میں پیغمبر اکرمؐ پر بھی یہ فرض عائد ہوتا تھا کہ وُہ علیؑ کی نیابت و خلافت کا عمومی اعلان کر کے دُنیا کو بتا دیں کہ اگر علیؑ نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر اپنے وعدہ کی تکمیل کی ہے اور نصرت و اعانت میں کوی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا ہے تو میں بھی اپنے وعدہ کو پُورا کر کے دُنیا سے رُخصت ہونا چاہتا ہوں۔ چنانچہ اسی احساسِ فرض کے پیشِ نظر آپ نے حجۃ الوداع سے پلٹتے ہُوئے غدیر خم کے مقام پر من کنت مولاہ فعلی مولاہ۔ (جس کا میں مولا ہوں اُس کے علیؑ بھی مولا ہیں) کہہ کر علی کی خلافت وحاکمیت کا اعلان کیا۔ یہ اعلان اسی دعوتِ عشیرہ کے وعدہ کی صدائے بازگشت اور علیؑ کے ایفائے عہد و حسنِ خدمات کا عملی اعتراف تھا۔

اس دعوتِ عشیرہ کے اعلان سے حضرت علیؑ کی خلافت کی بنیادی حیثیت پر بھی روشنی پڑتی ہے اس طرح کہ پیغمبر اکرمؐ نے اس عمومی دعوت اسلام کے موقع پر صرف تین چیزوں کا اعلان کیا۔ ایک توحید دُوسرے رسالت اور تیسرے حضرت علیؑ کی وصایت وخلافت۔ توحید و رسالت کے اعلان کے ساتھ ساتھ اس نیابت وخلافت کا

اعلان اس کی اساسی و بنیادی حیثیت کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے۔ لہذا توحید و رسالت اگر اصُولِ اسلام میں داخل ہیں تو حضرت علیؑ کی امامت بھی اسلام کا ایک اہم رُکن شمار ہو گی۔ اور جس طرح اسلام کے لئے توحید و رسالت کا اقرار ضروری ہے اسی طرح علیؑ کی وصایت و نیابت کا اقرار بھی لازمی ہو گا۔

نصرتِ رسُولؐ کا آغاز

پیغمبرِ اسلام نے جب علانیہ تبلیغِ اسلام کا آغاز کیا تو قریش کو حضرت ابو طالب کا تھوڑا بہت پاس و لحاظ تھا انہوں نے براہِ راست مزاحمت کرنے کے بجائے اپنے لڑکے بالوں کو یہ سکھایا کہ وُہ آنحضرتؐ کو جہاں پائیں ستائیں اور ان پر اینٹ پتھر برسائیں تاکہ وُہ تنگ آکر بُت پرستی کے خلاف کہنا چھوڑ دیں اور اسلام کی تبلیغ سے کنارہ کش ہو کر گھر میں بیٹھ جائیں۔ چنانچہ جب پیغمبر اکرم گھر سے باہر نکلتے تو قریش کے لڑکے پیچھے لگ جاتے۔ کوئی خس و خاشاک پھینکتا اور کوئی اینٹ پتھر مارتا۔ آنحضرتؐ آزردہ خاطر ہوتے اذیتیں برداشت کرتے مگر زبان سے کچھ نہ کہتے۔ اور نہ کچھ کہنے کا محل تھا۔ اس لئے کہ بچّوں سے اُلجھنا اور اُن کے مُنہ لگنا کسی بھی سنجیدہ انسان کو زیب نہیں دیتا۔ ایک مرتبہ علیؑ نے آپ کے جسمِ مبارک پر چوٹوں کے نشانات دیکھے تو پُوچھا کہ یا رسُول اللہ یہ آپ کے جسم پر نشانات کیسے ہیں؟ پیغمبرؐ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا کہ اے علی قریش خود تو سامنے آتے نہیں اپنے بچّوں کو سکھاتے پڑھاتے ہیں کہ وُہ مجھے جہاں پائیں تنگ کریں۔ مَیں جب بھی گھر سے باہر نکلتا ہوں تو وُہ گلیوں اور بازاروں میں جمع ہو جاتے ہیں اور ڈھیلے پھینکتے اور پتھر برساتے ہیں۔ یہ اُنہی چوٹوں کے نشانات ہیں۔ علیؑ نے یہ سُنا تو بے چین ہو کر کہا کہ یا رسُولؐ اللہ آئندہ آپ تنہا کہیں نہ جائیں۔ جہاں جانا ہو مجھے ساتھ لے جائیں۔ آپ تو ان بچّوں کا مقابلہ کرنے سے رہے مگر مَیں تو بچہ ہوں مَیں اُنہیں اینٹ کا جواب پتھر سے دُوں گا اور آئندہ انہیں جرأت نہ ہو گی کہ وُہ آپ کو اذیت دیں یا راستا روکیں دُوسرے دن پیغمبرؐ گھر سے نکلے تو علیؑ کو بھی ساتھ لے لیا۔ قریش کے لڑکے حسبِ عادت ہجوم کر کے آگے بڑھے دیکھا کہ پیغمبرؐ کے آگے علیؑ کھڑے ہیں۔ وُہ بچّے بھی علیؑ کے سن و سال کے ہوں گے انہیں اپنے ہمسن کے مقابلہ میں تو بڑی جرأت دکھانا چاہیئے تھی مگر علیؑ کے بگڑے ہُوئے تیور دیکھ کر جھجکے۔ پھر ہمت کر کے آگے بڑھے۔ ادھر علیؑ نے اپنی آستینیں اُلٹیں اور بپھرے ہُوئے شیر کی طرح اُن پر ٹوٹ پڑے۔ کسی کا بازو توڑا کسی کا سر پھوڑا، کسی کو زمین پر پٹخا اور کسی کو پیروں تلے روندا۔ بچّوں کا ہجوم اپنے ہی سن و سال کے ایک بچّے سے پٹ پٹا کر بھاگ کھڑا ہُوا اور اپنے بڑوں سے فریاد کی کہ "قضمنا علیؑ" "علیؑ نے ہمیں بُری طرح پیٹا ہے"۔ مگر بڑوں کو بھی جرأت نہ ہو سکی کہ فرزندِ ابو طالب سے کچھ کہیں اس لئے کہ یہ سب کچھ الہٰی کے ایماء پر ہوتا تھا۔ اس دن کے بعد بچّوں کو بھی ہوش آگیا اور جب وُہ پیغمبرؐ کے ہمراہ علیؑ کو دیکھتے تو کہیں دبک کر بیٹھ جاتے یا ادھر اُدھر منتشر ہو جاتے۔

اور پھر پیغمبر کو ستانے اور اینٹ پتھر پھینکنے کی جرأت نہ کر سکے۔

اس واقعہ کے بعد علیؑ کو قضیم کے لقب سے یاد کیا جانے لگا۔ جس کے معنی ہیں ہڈی پسلی کا توڑ دینے والا"۔ چنانچہ جنگِ اُحد میں جب آپ طلحہ ابن ابی طلحہ کے مقابلہ کے لئے نکلے تو اس نے پُوچھا کہ میرے مقابلہ میں آنے والا کون ہے؟ آپ نے فرمایا میں علی ابن ابی طالب ہوں۔ طلحہ نے جب دیکھا کہ اس کا مقابلہ علیؑ سے ہے تو کہا:۔

قد علمت یا قضیم انہ لایجسر علی احد غیرك۔ (اعیان الشیعہ)

"اے قضیم! میں سمجھتا تھا کہ میرے مقابلہ میں آنے کی جرأت تمہارے علاوہ کسی کو نہ ہو گی"۔

اس موقع پر طلحہ نے آپ کو اسی بچپن والے لقب سے یاد کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قریش کے بچوں میں یہ بھی شریک رہا ہو گا اور علیؑ کے ہاتھ سے ہڈی پسلی تڑوا چکا ہو گا۔ جب ہی تو یہ نام اس کے حافظہ میں محفوظ رہ گیا۔ اور اسی نام سے حضرت کو مخاطب کیا۔

مقاطعۂ قریش

جب قریش نے اسلامی تحریک کو کچلنے اور پیغمبرِ اسلام کی آواز کو دبانے میں اپنی کوششوں کو ناکام ہوتے دیکھا اور بزعمِ خود انہیں راہِ راست پر لانے سے نا اُمید ہو گئے تو اُنہوں نے تبادلۂ خیال اور سوچ بچار کے بعد یہ طے کیا کہ جب تک محمدؐ کو ہمارے سپرد نہیں کیا جاتا بنو ہاشم سے تمام تعلقات ختم کر دیئے جائیں اور اُن سے ایک دم معاشی و معاشرتی مقاطعہ کیا جائے۔ نہ اُن کے ہاتھ کوئی چیز فروخت کی جائے نہ اُن سے رشتہ ناطہ کیا جائے اور نہ باہمی میل جول رکھا جائے۔ اس فیصلہ کو قومی معاہدہ کا درجہ دینے کے لئے منصور ابن عکرمہ عبدری نے باتفاقِ رائے ایک دستاویز قلمبند کی جس پر اسّی سردارانِ قریش نے اپنی مُہریں ثبت کیں اور اُسے ابوجہل کی خالہ ام الجلاس کے سپرد کر دیا کہ وُہ اسے ایک قیمتی دستاویز کی طرح بحفاظت تمام رکھے تاکہ اس کے ہوتے ہُوئے کوئی خلاف ورزی کی جرأت نہ کر سکے۔

جب بنو ہاشم کو اس معاہدہ کا علم ہُوا تو اُنہیں مکّہ میں زندگی گزارنا مشکل نظر آیا۔ انہوں نے شہر سے دُور ایک درّۂ کوہ میں جو شعبِ ابوطالب کے نام سے موسُوم تھا پناہ لے لی اور وُہ اہلِ مکّہ سے، اور اہلِ مکّہ اُن سے بے تعلق ہو گئے۔ بلکہ قریش کے اس باہمی معاہدہ کا اثر دُوسرے قبائل پر بھی پڑا اور کسی کو اُن سے راہ و رسم رکھنے اور اُن کے ہاتھ کوئی چیز بیچنے یا کھانے پینے کا سامان پہنچانے کی ہمت نہ ہو سکی۔ البتّہ ابوالعاص ابن ربیع حکیم ابن حزام اور ہشام ابن عمرو کبھی کبھار چوری چھپے اُونٹوں پر غلّہ لاد کر انہیں شعب کی طرف ہنکا دیتے یا حج کے دنوں میں تھوڑا بہت غلّہ مہنگے داموں خرید لیا جاتا اور اس سے گزر بسر کی جاتی۔ اس گراں خریداری

اور مسلسل بیکاری کے نتیجہ میں رہی سہی پونجی ختم ہوگئی فاقوں پر فاقے ہونے لگے اور درختوں کے پتے چبانے کی نوبت آ گئی۔ بڑے تو صبر کر لیتے تھے مگر بچے بھوک سے بلبلاتے اور اُن کے رونے چیخنے کی آوازیں دُوسرے سُنتے تھے۔ مگر اُن پر نہ کسی کو ترس آتا تھا اور نہ کسی کا دل پسیجتا تھا۔ قریش اُن کی بے کسی و خستہ حالی سے متاثر ہونے کے بجائے خوش ہوتے اور رسد رسانی کے ذرائع پر کڑی نظر رکھتے۔ قریش کی تشدّد پسند طبیعتوں کا تقاضا یہی تھا اور اُن سے اسی کی توقع کی جاسکتی تھی۔ مگر تعجب اس پر ہے کہ مکہ میں مسلمانوں کی ایک جماعت موجود تھی جن میں کچھ متموّل اور کھاتے پیتے افراد بھی تھے۔ مگر تاریخ یہ بتانے سے قاصر ہے کہ قید و بند کے اس طویل عرصہ میں کسی نے اُدھر جھانک کر بھی دیکھا ہو کہ پیغمبر اور اُن کے عزیز و اقارب کس حال میں ہیں یا چوری چھپے کوی مدد امداد کی ہو جبکہ چند افراد جو اُس وقت تک اسلام نہ لائے تھے کسی نہ کسی طرح مدد کر دیتے تھے۔ آرام و راحت کے دنوں میں محبت و دوستی کے دعوے کہاں اور فقر و پریشاں حالی میں یہ بے رُخی کہاں۔

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست در پریشاں حالی و درماندگی

قریش اپنے مقام پر یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ بنی ہاشم ان شدائد کو برداشت نہ کر سکیں گے اور پیغمبر کا ساتھ چھوڑ کر الگ ہو جائیں گے۔ اور جب وُہ اکیلے رہ جائیں گے تو بڑی آسانی سے اُن کی آواز کو دبا دیا جائے گا۔ مگر بنی ہاشم نے ایک لمحہ کے لئے بھی ان کا ساتھ چھوڑنا گوارا نہ کیا اور پُوری جرأت و پامردی سے تکالیف و شدائد کا مقابلہ کرتے رہے۔ اس محاصرہ میں ابو طالب کا کردار ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ نہ اُن کے پائے استقامت میں جنبش آئی اور نہ اُن کے استقلال میں کوی فرق آیا۔ بلکہ بڑی خندہ پیشانی سے ان جانگداز مصیبتوں کو برداشت کرتے رہے۔ اس قید و بند میں انہیں کوی فکر تھی تو یہ کہ کہیں دشمن اچانک حملہ کر کے پیغمبرؐ کو گزند نہ پہنچائے یا انہیں قتل نہ کر دے۔ دن تو کسی نہ کسی طرح کٹ جاتا تھا البتہ رات کے اندھیرے میں خطرہ بڑھ جاتا تھا۔ آپ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر آنحضرت کے گرد پہرا دیتے یا انہیں سوتے سے جگا کر کسی دُوسری جگہ پہنچا دیتے اور اُن کے بستر پر اپنے بیٹوں میں سے کسی کو سُلا دیتے تاکہ حملہ ہو تو اُن کا کوی بیٹا کام آجائے اور آنحضرتؐ پر آنچ نہ آئے۔ علامہ حلبی نے تحریر کیا ہے:۔

وکان ابو طالب فی کل لیلة	ابو طالب ہر شب آنحضرت سے کہتے کہ اپنے
یامر رسول اللهؐ ان یاتی	بستر پر جائیے اور آرام فرمائیے۔ اور جب
فراشه ویضطجع به فاذا	دُوسرے لوگ سو جاتے تو پیغمبرؐ کو اُٹھاتے
نام الناس اقامه وامراحد	اور اپنے کسی بیٹے یا بھائی یا ابن عم سے کہتے
بنیه او غیرهم ای من اخوته	کہ وُہ آنحضرتؐ کے بستر پر سو جائے اس
او بنی عمه ان یضطجع مکانه	اندیشہ سے کہ آپ کے بدخواہوں میں سے

خوفاً علیه ان یغتاله احدٌ من یرید به السوء۔ (سیرتِ حلبیہ ج ا ص ۳۴۲)
کوئی اچانک حملہ کر کے انہیں قتل نہ کر دے۔"

یہ خدمت اکثر و بیشتر حضرت علیؑ سے لی جاتی اور اُنہی کو آنحضرت کے بستر پر سُلاتے۔ چنانچہ ابن ابی الحدید نے تحریر کیا ہے:۔

کان ابوطالب کثیراً مایخاف علی رسول اللہ البیات اذا عرف مضجعه فکان یقیمه لیلاً من منامه ویضجع ابنه علیاً مکانه۔ (شرح ابن ابی الحدید ج ۳ ص ۳۱۰)
جب پیغمبرؐ کی خوابگاہ کا کسی کو علم ہو جاتا تو ابوطالب کو خطرہ محسوس ہوتا۔ آپ رات کے کسی حصہ میں انہیں سوتے سے جگاتے اور اپنے بیٹے علی کو اُن کی جگہ پر سُلا دیتے۔"

یہ قید و بند کا سلسلہ بعثت کے ساتویں سال یکم محرّم سے شروع ہوا اور بعثت کے دسویں سال جبکہ بنو ہاشم کو مصائب و شدائد برداشت کرتے ہوئے تین برس گزر چکے تھے کچھ لوگوں کو قریش کے ظلم و ستم اور بنو ہاشم کی مظلومیت کا احساس ہُوا اور انہوں نے چاہا کہ اس معاہدہ کو ختم کر کے پیغمبرؐ اور اُن کے عزیز و اقارب کو اُن کے گھروں میں آباد ہونے کی اجازت دے دی جائے۔ چنانچہ مکّہ کی ایک بااثر شخصیّت ہشام ابن عمرو نے سلسلہ جنبانی کی اور زہیر ابن عبداللہ مخزومی سے کہا کہ اے زہیر تمہاری والدہ عاتکہ، عبدالمطلب کی بیٹی تھیں۔ تمہیں کیونکر گوارا ہوتا ہے کہ تم کھاؤ پیو اور مزے کرو اور عبدالمطلب کی اولاد فاقوں پر فاقے کرے اور قید و بند کی سختیاں جھیلے۔ زہیر نے کہا کہ مجھے یہ گوارا تو نہیں مگر یہ سوچ کر چُپ ہو جاتا ہوں کہ میں ایک اکیلا کیا کر سکتا ہوں۔ ہشام نے کہا کہ تم اکیلے نہیں ہو میں تمہارے ساتھ ہوں۔ ہم دونوں کو مل کر کوشش کرنا چاہئے کہا کہ یہ دو آدمیوں کے بس کی بات نہیں ہے ایک آدھ اور بھی ہونا چاہیئے۔ کہا کہ مطعم ابن عدی کے طور طریقوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمارا ساتھ دے گا۔ چلو اس کا عندیہ معلوم کریں۔ جب انہوں نے اس سے بات چیت کی تو اس نے بڑی گرمجوشی سے ان دونوں کی رائے سے اتفاق کیا ان لوگوں کے کھل کر سامنے آنے سے ابوالبختری ابن ہشام اور زمعہ ابن ابی الاسود بھی ان کے ہمخیال ہوگئے۔ اب یہ پانچوں مل کر رؤسائے قریش کی مجلس میں آئے اور کہا کہ اے سردارانِ قریش ہم اس مقصد سے آئے ہیں کہ تم لوگوں سے بنو ہاشم کی رہائی کا مطالبہ کریں۔ یہ بڑی ناانصافی ہے کہ ہم آرام چین سے زندگی گزاریں اور عبدالمطلب کی اولاد قید و بند اور فقر و فاقہ میں دن کاٹے۔ ہم اُس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک دستاویز کو پارہ پارہ نہ کر دیں گے اور بنو ہاشم کو اُن کے گھروں میں لا کر نہ بسائیں گے۔ ابوجہل نے پیشانی پر بل ڈال کر کہا کہ ہم اس کی کبھی اجازت نہیں دیں گے کہ وہ اپنے گھروں میں واپس آئیں۔ ان پر مکّہ کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیئے گئے ہیں ادھر سے بھی سختی کا جواب سختی سے دیا گیا۔ قریش اپنی بات پر اڑ گئے اور

کسی قیمت پر مقاطعہ سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہ ہوئے۔ قریب تھا کہ دونوں فریق آپس میں دست و گریباں ہو جائیں کہ دُور سے ابو طالب کو اپنی سمت آتے دیکھا۔ اس خلاف توقع آمد سے ابوجہل یہ سمجھا کہ بنی ہاشم قید و بند کی سختیوں سے گھبرا کر محمدؐ (صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم) کو ہمارے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔ جب ابو طالب وارد مجلس ہوئے تو سرداران قریش نے پوچھا کہ کیسے آنا ہوا فرمایا:-

ان ابن اخی قد اخبرنی ولم یکذبنی قط ان اللہ قد سلط علے صحیفتکم الارضۃ فلحست کل ما کان فیہا من جور او ظلم او قطیعۃ رحم و بقی فیہا کل ما ذکر بہ اللہ فان کان ابن اخی صادقاً نزعتم عن سوء رایکم وان کان کاذباً دفعتہ الیکم فقتلموہ او استحییتموہ۔	میرے بھتیجے نے مجھے خبر دی ہے اور میں نے اُن کی زبان سے کبھی جھوٹ نہیں سُنا کہ اللہ نے تمہاری دستاویز پر دیمک کو مسلط کر دیا ہے اور اللہ کے نام کے علاوہ ظلم و جور اور قطع رحمی پر مشتمل تمام عبارت کو چاٹ لیا ہے۔ اگر وُہ سچے ثابت ہوں تو تم اپنے غلط رویہ سے باز آجاؤ اور اگر جھُوٹے ثابت ہوں تو میں انہیں تمہارے حوالے کر دُوں گا۔ خواہ تم انہیں قتل کرنا یا زندہ رہنے دینا۔"

(طبقات ابن سعد جلد ۱ صفحہ ۲۰۹)

قریش نے ابو طالب کی اس منصفانہ پیشکش کو مان لیا اور دستاویز کو منگوا کر دیکھا۔ انہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ پیغمبرؐ کے قول کے مطابق سر نامۂ تحریر بسمک اللّٰھم کے علاوہ تمام عبارت دیمک چاٹ چکی ہے اور ایک لفظ بھی خواندگی کے قابل نہیں رہا۔ اب قریش پیچ و تاب کھانے لگے اور حیل و حجت کر کے اپنی کہی ہوئی بات سے پہلو بچانے لگے۔ ابوجہل آخر تک یہی کہتا رہا کہ ہم ترکِ موالات کا معاہدہ ختم نہیں ہونے دیں گے۔ مگر ہشام ابن عمرو اور اُس کے ساتھیوں نے اُس کی ایک نہ چلنے دی اور مطعم ابن عدی نے اُس دستاویز کو اُٹھا کر پارہ پارہ کر دیا۔ معاہدہ کالعدم قرار دے دیا گیا اور بنی ہاشم درّہ کوہ سے باہر نکل کر دوبارہ اپنے گھروں میں آباد ہو گئے۔

بنی ہاشم کے لئے یہ دُور انتہائی مشکلات کا دُور تھا۔ ادھر قریش مادی طاقت کے بل پر ظلم و تشدد پر تُلے ہوئے تھے اور ادھر چند فاقہ کش ایک درّۂ کوہ میں دبکے سہمے پڑے تھے جو سامان راحت تو درکنار عام ضروریاتِ زندگی سے بھی محروم کر دیئے گئے تھے۔ بچے ہراساں، بڑے پریشان، خوف و دہشت کا عالم۔ اور ہر وقت یہ کھٹکا لگا رہتا ہے کہ کہیں دُشمن اچانک حملہ نہ کر دے یا سوتے میں شبخون نہ مارے۔ ایسی پریشان حالی میں ہمتیں پست اور قوتیں مضمحل ہو جاتی ہیں اور اپنے بیگانے سب ہی ساتھ چھوڑ دیا کرتے ہیں مگر ان محصورین نے اس طویل عرصہ میں پیہم کڑیاں جھیلیں، فاقوں پر فاقے کئے مگر کسی حال میں پیغمبرؐ کا ساتھ چھوڑنا

گوارا نہیں کیا اور کمال ہمدردی و مواسات کے نمونے چھوڑ گئے۔ خصوصاً ابو طالب کا جذبۂ ایثار و قربانی اور علیؑ کا ولولۂ سرفروشی تاریخ کا ایک عدیم النظیر مثالیہ ہے۔ باپ بیٹے کو موت کے منہ میں دے کر مطمئن نظر آتا ہے اور بیٹا اپنے کو موت کے خطرے میں ڈال کر پُر سکون رہتا ہے۔ اگر چند افراد اس کے خلاف آواز نہ اٹھاتے اور تحریری معاہدہ دیمک کی نذر نہ ہو جاتا تو بظاہر حالات اس قید و بند سے چھٹکارے کی کوئی صورت ہی نہ تھی۔

قریش کے لئے یہ ایک موقع تھا کہ دستاویز کو دیکھ کر بصیرت و بصارت سے کام لیتے۔ مگر وہ اپنی آنکھوں سے غیبی طاقت کا کرشمہ دیکھتے ہیں اور ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ حالانکہ چاہیئے تو یہ تھا کہ جب انہوں نے پیغمبرؐ کی دی ہوئی خبر کو حرف بحرف درست پایا تھا تو عصبیت و تنگ نظری سے بالاتر ہو کر یہ سوچتے کہ دستاویز کی لپٹی ہوئی تہوں میں دیمک کی نقل و حرکت کو وہی آنکھیں دیکھ سکتی ہیں جن میں نورِ نبوّت کی روشنی ہو۔ یہ تو کہا نہیں جا سکتا کہ پیغمبرؐ کی یہ قیاس آرائی تھی کہ اتنے عرصہ تک ایک کاغذی دستاویز دیمک کے حملہ سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔ اس لئے کہ دیمک لگنے کا خطرہ سرد و مرطوب مقامات پر ہوتا ہے نہ عربستان ایسے گرم و خشک علاقہ میں۔ اور اگر ایسا اتفاقیہ ہی ہوا ہوتا تو دیمک نے جہاں ساری تحریر کو چاٹ کر خاک کر دیا تھا وہاں سرنامۂ دستاویز بسمک اللّٰھم کو بھی چاٹ کر ختم کر دیتی۔ اگرچہ قریش نے آنحضرت کی نبوّت کا اعتراف نہ کیا اور نہ اس واقعہ سے کوئی اثر لیا مگر کچھ حق پسند اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے چنانچہ ابن واضح یعقوبی نے تحریر کیا ہے کہ "اس واقعہ سے کچھ لوگ اتنا متاثر ہوئے کہ اسی وقت دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔" جب کچھ لوگوں نے کرم خوردہ دستاویز کو دیکھنے کے بعد آنحضرتؐ کی صدق بیانی کا اعتراف کر کے اسلام قبول کر لیا ہو تو حضرت ابو طالب جنہوں نے دستاویز کو دیکھنے سے پہلے ہی قولِ پیغمبرؐ کی صحت و صداقت پر اعتماد و وثوق کا اظہار کیا ہو وہ آنحضرتؐ کے دعوائے نبوّت کی صحت میں کیونکر شک و شبہہ کر سکتے تھے یا اسلام سے الگ تھلگ رہ سکتے تھے۔

ہجرت مدینہ

شعب ابو طالب کی قید و بند سے رہائی کے بعد قریش کے ولولے سرد پڑ گئے۔ اگرچہ اُن کے سینوں میں غیظ و غضب کی چنگاریاں بھڑک رہی تھیں مگر ابو طالب کا تھوڑا بہت پاس و لحاظ مانع تھا اس لئے اُن کی معاندانہ سرگرمیوں میں تیزی نہ آ سکی۔ ابو طالب ضعیف ہو چکے تھے اور اس ضعیفی میں محاصرہ کی سختیوں نے انہیں اتنا متاثر کیا کہ صحت جاتی رہی، اعضاء کمزور پڑ گئے اور شعب سے نکلنے کے تھوڑا عرصہ بعد دنیا سے رحلت فرما گئے۔ اب قریش کو کھل کھیلنے کا موقع مل گیا۔ پیغمبر کا سہارا جاتا رہا تھا۔ اہل مکہ جس طرح چاہتے

بے روک ستاتے اور بیبا کانہ مظالم ڈھاتے۔ نہ کسی میں روکنے ٹوکنے کی ہمت تھی اور نہ منع کرنے کی جرأت۔ قریش کی ایذا رسانیوں میں روز بروز شدت پیدا ہونے لگی اور پیغمبرؐ کے ساتھ مسلمان بھی ستائے جانے لگے۔ انہیں طرح طرح سے پریشان کیا جاتا اور گوناگوں اذیتیں اور تکلیفیں دی جاتیں۔ پیغمبر اکرمؐ اُن کی مظلومیت و بے کسی پر کڑھتے، کبیدہ خاطر و ملول ہوتے مگر گنتی کے مسلمانوں کے مقابلہ میں کفار کی کثرت و قوت دیکھ کر خاموش ہو جاتے۔

جب قریش کی ستم کیشی و ستم رانی حد سے بڑھ گئی تو آپ مکہ سے نکل کھڑے ہوئے اور طائف کا رُخ کر لیا جو مکہ سے ساٹھ میل کے فاصلہ پر ایک پُر رونق و آباد بستی تھی۔ ابوالحسن مدائنی کی روایت کی بنا پر حضرت علیؑ اور زید ابن حارثہ بھی اس سفر میں آپ کے ہم رکاب تھے۔ پیغمبرؐ کا مقصد تو یہ تھا کہ اہل طائف کو اسلام کی دعوت دیں شاید وہ حق کی آواز سے متاثر ہو کر قریش کے خلاف ان سے تعاون کریں۔ مگر یہاں کے لوگ اہل مکہ سے بھی زیادہ نابکار و ناہنجار ثابت ہوئے۔ انہوں نے پیغمبرؐ کی بات تک سُننا گوارا نہ کی اور اوباشوں کا ایک گروہ آپ کے پیچھے لگ گیا جو آپ پر ڈھیلے پھینکتا اور پتھر برساتا۔ آنحضرتؐ نے جوں توں کر کے ایک مہینا یہاں گزارا اور آخر اُن اوباشوں نے آپ کا پیچھا کر کے آپ کو شہر سے باہر نکال دیا۔ جب کہیں جائے پناہ نظر نہ آئی تو پھر مکہ کا رُخ کیا اور شہر کے قریب پہنچ کر کوہِ حرا پر منزل کی۔ حدودِ شہر میں کسی کی حمایت و پناہ کے بغیر قدم رکھنا خطرہ سے خالی نہ تھا۔ آپ نے ایک شخص کے ذریعہ مطعم ابن عدی سے پناہ مانگی اُس نے پناہ دینے کی حامی بھری تو آپ اس کی حمایت و ذمہ داری کی آڑ لے کر مکہ میں داخل ہوئے۔ یہاں پھر انہی دقتوں اور تکلیفوں کا سامنا تھا۔ مگر ان کاہشوں اور کاوشوں کے باوجود آپ اپنے منصبی فرائض برابر انجام دیتے اور اسلام کی تبلیغ کرتے رہے اور آس پاس کی بستیوں میں بھی تشریف لے جاتے جہاں مختلف قبائل کو اسلام کے محاسن سے آگاہ کر کے دعوتِ اسلام دیتے۔ قریش بھی پیچھا کرتے اور جادوگر اور مجنون کہہ کر آپ کی بات کو بے اثر بنانے کی کوشش کرتے۔ مگر آپ صبر و استقلال اور عزم و ثبات کے ساتھ اپنی آواز دُوسروں تک پہنچاتے رہے۔

پیغمبر اکرمؐ کا معمول تھا کہ حج کے موقع پر جب مختلف شہروں اور دیہاتوں کے لوگ مکہ میں جمع ہوتے تو آپ انہیں اسلام کی دعوت دیتے۔ اُن میں جو سلیم الفطرۃ ہوتے وُہ آپ کی آواز پر لبیک کہتے اور اسلام قبول کر لیتے۔ بعثت کا دسواں سال تھا کہ یثرب سے کچھ لوگ حج کے لئے مکہ آئے۔ پیغمبرؐ تبلیغ کرتے ہوئے منیٰ میں پہنچے تو عقبہ کے پاس اُن میں کے چھ آدمیوں کو دیکھا۔ آپ اُن لوگوں کے پاس آئے اور پُوچھا کہ تم کون ہو اور کس قبیلہ سے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم یثرب سے آئے ہیں اور قبیلۂ خزرج سے تعلق رکھتے ہیں۔ آنحضرتؐ انہی کے حلقہ میں بیٹھ گئے اور قرآن مجید کی چند آیتیں تلاوت کرنے کے بعد انہیں اسلام کی دعوت دی۔ انہوں نے اسلامی تعلیمات کی پاکیزگی سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔ اُن لوگوں کے اسلام لانے سے یثرب میں اسلام

کا چرچا ہونے لگا۔ سال آئندہ یثرب سے بارہ آدمی آئے اور آپ کے ہاتھوں پر بیعت کر کے مسلمان ہو گئے۔ اگلے سال پھر تہتّر آدمیوں کی ایک جمعیت آئی اور بیعت کے بعد اسلام سے وابستہ ہو گئی۔ ان لوگوں نے آنحضرتؐ سے کہا کہ ہماری دلی خواہش ہے کہ آپ مکّہ کے بجائے مدینہ میں رونق افروز ہوں اور اُسے نشرِ اسلام کا مرکز قرار دیں ہم آپ کی حمایت و حفاظت کے لئے ہر طرح تیار ہیں۔ مکّہ میں اسلام کے پنپنے کی کوئی صُورت نہ تھی۔ آپ نے مسلمانوں سے کہا کہ وُہ مکّہ سے ہجرت کر کے مدینہ چلے جائیں۔ مسلمان قریش کے مظالم سے تنگ آچکے تھے۔ جب انہیں جائے امن نظر آئی تو ایک ایک کر کے ہجرت کرنے لگے۔ جب قریش نے یہ دیکھا کہ مُسلمانوں کو اہلِ یثرب کی حمایت و پُشت پناہی حاصل ہو گئی ہے اور وُہ ترکِ وطن کر کے جا رہے ہیں تو اُنہیں یہ فکر لاحق ہوئی کہ اگر پیغمبرؐ بھی یہاں سے چلے گئے تو یہ پاشان و پریشان جماعت مجتمع ہو کر ہمارے خلاف اُٹھ کھڑی ہوگی انہوں نے جانے والوں کو پریشان کرنا شروع کیا اور ان کی راہ میں رُکاوٹیں کھڑی کر دیں۔ کسی کے بال بچّوں کو روک لیا، کسی کا روپیہ پیسہ چھین لیا کسی کو ڈرایا دھمکایا مگر ان کی یہ تمام کوششیں بے سُود ثابت ہوئیں اور دو چار آدمیوں کے علاوہ سب مدینہ پہنچ گئے۔

قریش کو مُسلمانوں کے روک لینے میں ناکامی ہوئی تو اُنہوں نے باہمی مشورہ کے لئے ایک مجلس منعقد کی جس میں بنی ہاشم کے سوا تمام قبیلوں کے سر کردہ افراد نے شرکت کی۔ بنو عبد شمس سے عتبہ شیبہ اور ابو سفیان، بنو نوفل سے طعیمہ ابن عدی جبیر ابن مطعم اور حارث ابن عامر، بنو عبد الدار سے نضر ابن حارث، بنو اسد سے ابو البختری ابن ہشام زمعہ ابن اسود اور حکیم ابن حزام، بنو مخزوم سے ابو جہل ابن ہشام، بنو سہم سے نبیہ اور منبہ پسران حجاج، بنو جمح سے امیہ ابن خلف ان عمائد و شیوخ کے علاوہ اور لوگ بھی شریک ہُوئے اور نجد کا ایک بوڑھا بھی آکر ان میں شامل ہو گیا۔ ایک شخص نے کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ تم لوگوں کو معلوم ہے کہ مسلمانوں نے باہر کے لوگوں سے رابطہ قائم کر لیا ہے اور وُہ کسی وقت بھی بڑی طاقت بن سکتے ہیں۔ ہمیں سر جوڑ کر بیٹھنے اور اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر اس کی روک تھام نہ کی گئی تو قوی اندیشہ ہے کہ وُہ ایک نہ ایک دن محمّد (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی قیادت میں ہم پر چڑھائی کر دیں گے۔ لہٰذا کوئی ایسی تدبیر کرنا چاہیئے کہ اسلام کا قصّہ پاک ہو جائے اور محمّدؐ کو ایسی عبرتناک سزا دی جائے کہ آئندہ کسی کو ہمارے دین و مذہب کے خلاف لب کشائی کی جرأت نہ ہو سکے۔ عاصی ابن وائل، اُمیہ ابن خلف اور ابی ابن خلف نے کہا کہ ہماری رائے یہ ہے کہ محمّدؐ کو طوق و زنجیر میں جکڑ کر کسی کوٹھڑی میں بند کر دیا جائے یہاں تک کہ قیدِ تنہائی میں بھوک پیاس کی تکلیف سے تڑپ تڑپ کر مر جائیں۔ شیخ نجدی نے کہا کہ یہ رائے صائب و درست نہیں ہے۔ اگر ایسا کیا گیا تو اُن کے قوم قبیلے اور ماننے والے حملہ کر کے اُنہیں نکال لے جائیں گے اور تم مُنہ دیکھتے رہ جاؤ گے۔ عتبہ، شیبہ اور ابو سفیان نے کہا کہ انہیں جلا وطن کر دینا چاہیئے تاکہ ہمارے معبُودوں کے خلاف کوئی آواز ہمارے کانوں میں نہ پہنچے۔ شیخ نجدی نے اس رائے سے بھی

اختلاف کیا اور کہا کہ وُہ جہاں جائیں گے اپنی چرب زبانی وطلاقت لسانی سے لوگوں کو اپنے گرد و پیش جمع کر لیں گے اور انہیں اپنا ہمنوا بنا کر تمہارے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ پھر نہ تم انہیں روک سکو گے اور نہ اُن کا مقابلہ کر سکو گے۔ ابوجہل نے کہا کہ میری رائے یہ ہے کہ ہر قبیلہ میں سے کڑیل گبراں ڈیل جوان منتخب کئے جائیں اور وُہ سب مل کر یکبارگی اُن پر ٹوٹ پڑیں اور انہیں قتل کر دیں۔ اس صورت میں کسی ایک شخص یا ایک قبیلہ کو ملزم قرار نہ دیا جا سکے گا بلکہ تمام قبائل اس میں شریک سمجھے جائیں گے۔ اور بنی ہاشم کے امکان سے یہ باہر ہو گا کہ وُہ تمام قبائل عرب سے جنگ چھیڑیں اور خون کا بدلہ خون چاہیں لہٰذا وُہ قصاص کے بجائے دیت پر راضی ہو جائیں گے اور ہم سب مل کر بڑی آسانی سے دیت ادا کر دیں گے۔ یہ رائے سب نے پسند کی اور شیخ نجدی نے بھی اسے سراہا۔ اس قرارداد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے یہ طے کیا کہ سرِشام آنحضرتؐ کے مکان کے گرد پہرا بٹھا دیا جائے جو اُن کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھے تاکہ وُہ حملہ کی سُن گُن پا کر کہیں اِدھر اُدھر نہ ہو جائیں۔ اور جب رات کا اندھیرا چھا جائے تو تمام نوجوان گھر کے اندر گھُس کر اُنہیں قتل کر دیں۔ اِدھر کفارِ قریش آنحضرتؐ کے قتل کے منصوبے باندھ رہے تھے اُدھر قدرت نے ان کے ناپاک عزائم سے پیغمبرؐ کو باخبر کر دیا اور اُن کے منصوبے کو ناکام بنانے کی تدبیر بتا دی۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:۔

واذ یمکر بك الذین لیثبتوك او یقتلوك او یخرجوك ویمکرون ویمکر الله والله خیر الماکرین۔

اُس وقت کو یاد کرو جب کفار تمہارے خلاف تدبیریں کر رہے تھے کہ تمہیں کسی جگہ بند کر دیں یا قتل کر ڈالیں یا جلاوطن کر دیں۔ وُہ اپنی تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ اپنی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔"

آنحضرتؐ نے اللہ کی بتائی ہوئی تدبیر کو عملی جامہ پہنانے کے لئے علیؑ کو بُلا کر کہا کہ اے علیؑ قریش نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آج کی رات مجھے قتل کر دیں۔ اور میرے اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں مکہ چھوڑ کر مدینہ چلا جاؤں اور تمہیں اپنے بستر پر سُلا دوں۔ مجھے انتہائی گراں ہے کہ میں دُشمنوں کے نرغے میں تمہیں تنہا چھوڑ کر جا رہا ہوں مگر خدا کا حکم یہی ہے لہٰذا:

نم علی فراشی واتشح ببردی الحضرمی الاخضر فنم فیه فانه لایخلص الیك شیء تکرهه۔ (تاریخ کامل۔ ج۲۔ ص۷۲)

تم میری حضرمی سبز چادر اوڑھ کر میرے بستر پر سو جاؤ اور تمہیں اُن کی طرف سے کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔"

حضرت علیؑ نے بجائے اس کے کہ اپنے بارے میں مزید اطمینان کیا ہو یا یہ کہا ہو کہ آخر میری جان بھی تو خطرہ میں پڑ جائے گی یا کسی اور کو سُلانے کا مشورہ دیا ہو یا کوئی عذر و بہانہ تلاش کیا ہو یہ پُوچھا کہ

یا رسولؐ اللہ کیا میرے سو جانے سے آپ کی جان بچ جائے گی؟ فرمایا کہ ہاں اگر تم میرے بستر پر سو جاؤ گے تو میں مشرکین کی گرفت سے آزاد ہو کر نکل جاؤں گا۔ یہ سن کر علیؑ نے ادائے شکر کے لئے اپنی پیشانی زمین پر رکھ دی۔ ابن شہر آشوب مازندرانی نے لکھا ہے:۔

فکان اوّل من سجد للہ شکرا واوّل من وضع وجھہ علی الارض بعد سجدتہ۔ (مناقب ج ۱ ص ۱۲۷)

علیؑ وہ ہیں جنہوں نے سب سے پہلے سجدۂ شکر ادا کیا اور سب سے پہلے سجدہ کے بعد اپنا چہرہ کرۂ خاک پر رکھا۔

سجدۂ شکر سے سر اُٹھانے کے بعد عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ آپ تشریف لے جائیں میں رات آپ کے بستر پر سوؤں گا۔ پیغمبر اکرمؐ کفار قریش کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہوئے جبل ثور کی طرف راہ پیما ہو گئے اور علیؑ آنحضرتؐ کی چادر اوڑھ کر بے کھٹکے ان کے بستر پر سو گئے۔ علامہ دیار بکری لکھتے ہیں:۔

ان لیلۃ بات علی ابن ابی طالب علی فراش رسولؐ اللہ اوحی اللہ الی جبرئیلؑ و میکائیلؑ انی اخیت بینکما وجعلت عمر احدکما اطول من عمر الاخر فایکما یوثر صاحبہ بحیاۃ فاختار کلاھما الحیات واحباھا فاوحی اللہ الیھما افلا کنتما مثل علی ابن ابی طالب اخیت بینہ وبین محمدؐ فبات علیؑ فراشہ یفدیہ بنفسہ و یوثرہ بالحیاۃ اھبطا الی الارض فاحفظاہ من عدوہ فکان جبرئیلؑ عند راسہ ومیکائیلؑ عند رجلیہ ینادی بخ بخ من مثلک یا ابن ابی طالب تباھی بک الملئکۃ فانزل اللہ تعالیٰ "ومن الناس من یشری نفسہ ابتغاء مرضات اللہ واللہ رؤف

ہجرت کی شب جب علیؑ ابن ابی طالب بستر رسولؐ پر سوئے تو اللہ تعالیٰ نے جبرئیلؑ و میکائیلؑ کی طرف وحی کی کہ میں نے تم دونوں میں رشتۂ اُخوت قائم کیا ہے اور ایک کی زندگی دوسرے سے دراز کی ہے۔ تم میں کون ہے جو دوسرے کے لئے زندگی کا ایثار کرے۔ ان دونوں نے اپنے لئے زندگی ہی کو چاہا۔ خدا نے ان دونوں پر وحی کی کہ تم علیؑ کے مثل کیوں نہ ہوئے۔ میں نے انہیں محمدؐ کا بھائی بنایا۔ وہ اپنی جان پر کھیل کر اُن کے بستر پر سو رہے ہیں۔ تم دونوں زمین پر اُترو اور جا کر دشمنوں سے اُن کی حفاظت کرو۔ چنانچہ جبرئیل سرہانے اور میکائیلؑ پائنتی کی جانب بیٹھ گئے اور کہنا شروع کیا "مبارک ہو اے فرزند ابو طالب! کون ہے تمہارا مثل کہ تمہارے سبب سے اللہ فرشتوں پر فخر کرتا ہے"۔ اور اللہ نے یہ آیت نازل کی "ایسے بھی لوگ ہیں جو رضائے الٰہی کی طلب میں اپنی جان بیچ ڈالتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر

یا العباد" (تاریخ خمیس ج۱ ۔ ص۳۲۵) بہت مہربان ہے"

رسولؐ خدا کے روانہ ہونے کے بعد حضرت ابوبکر آپ کے مکان پر آئے اور انہیں موجود نہ پا کر حضرت علیؑ سے پوچھا کہ رسولؐ اللہ کہاں ہیں؟ فرمایا کہ وہ جبل ثور کی طرف چلے گئے ہیں۔ اگر کوئی ضروری کام ہو تو ادھر چلے جائیے۔ حضرت ابوبکر وہاں سے اٹھے اور رسولؐ اللہ کے عقب میں روانہ ہو گئے۔ مورخ طبری نے لکھا ہے کہ:

فسمع رسولؐ اللہ جرس ابی بکر فی ظلمۃ اللیل فحسبہ من المشرکین فاسرع رسولؐ اللہ المشی فانقطع قبال نعلہ ففلق ابہامہ حجر فکثر دمہا و اسرع السعی۔	جب رسولؐ اللہ نے رات کے اندھیرے میں ابوبکر کے قدموں کی آہٹ سنی تو یہ خیال کیا کہ مشرکین میں سے کوئی تعاقب میں آ رہا ہے۔ آپ نے رفتار تیز کر دی۔ آپ کی جوتی کا تسمہ ٹوٹ گیا اور ایک پتھر سے ٹھوکر کھائی جس سے انگوٹھا زخمی ہو گیا اور بہت سا خون بہہ گیا مگر آپ تیزی کے ساتھ چلتے رہے

(تاریخ طبری ۔ ج۲ ۔ ص۱۰۰)

حضرت ابوبکر کو محسوس ہوا کہ وہ پیغمبرؐ کے لئے اذیت کا باعث ہو رہے ہیں انہوں نے بلند آواز سے آنحضرت کو پکارا۔ آپ ابوبکر کی آواز پہچان کر ٹھہر گئے اور انہیں ساتھ لے کر صبح ہوتے جبل ثور پر پہنچ گئے اور دونوں ایک غار میں چھپ کر بیٹھ گئے۔

ادھر کفار قریش رات بھر گھر کا محاصرہ کئے پڑے رہے اور اندر جھانک کر جب پیغمبرؐ کی خوابگاہ دیکھتے تو یہ سمجھ کر مطمئن ہو جاتے کہ پیغمبرؐ چادر اوڑھے سو رہے ہیں۔ جب پو پھٹی تو تلواریں سونت کر اندر داخل ہوئے۔ حضرت علیؑ نے آہٹ پا کر چادر الٹ دی۔ انہوں نے پیغمبرؐ کے بجائے علیؑ کو دیکھا تو چہروں کے رنگ اڑ گئے۔ حیرت زدہ ہو کر پوچھا کہ محمدؐ کہاں ہیں۔ علیؑ نے کہا کہ کیا میرے سپرد کر گئے تھے جو مجھ سے پوچھتے ہو؟ اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ کہاں ہیں۔ کفار اس جواب پر جز بز ہوئے مگر اس کی تردید بھی تو نہ ہو سکتی تھی۔ ان کے عزائم ناکام ہو چکے تھے۔ پیغمبرؐ ان کے ہاتھوں سے بچ کر جا چکے تھے انہوں نے جھلا کر اپنی ناکامی کا بدلہ علیؑ سے لینا چاہا اور سختی و تشدد کے ذریعہ پیغمبرؐ کا راز اگلوانا چاہا۔ مگر وہ پوچھ گچھ میں کامیاب نہ ہو سکے۔ آخر خود ہی کہا کہ ہمیں علیؑ سے کیا سروکار انہیں چھوڑو اور محمدؐ کے تعاقب میں چلو۔

مشرکین قریش کو اب تک تو یہ اطمینان تھا کہ اگر مسلمان یہاں سے جا چکے ہیں تو پیغمبرؐ اکرم تو یہاں موجود ہیں۔ اگر مسلمانوں نے یثرب میں قوت و طاقت حاصل کر بھی لی تو وہ ہمارے خلاف جتھا بندی کی جرأت نہ کر سکیں گے۔ کیونکہ پیغمبرؐ تو ہمارے قبضہ میں ہیں۔ مگر جب پیغمبر اکرم بھی چلے گئے تو انہیں تشویش

ہوی۔ اور انہوں نے اِدھر اُدھر آدمی دوڑائے تاکہ آنحضرتؐ کو تلاش کر کے واپس لائیں۔ کچھ لوگ کھوج لگاتے ہوئے غارِ ثور تک پہنچ گئے۔ غارِ ثور سے آگے نہ کوی نشان قدم تھا اور نہ غار کے اندر داخل ہونے کے آثار۔ غار کے منہ پر مکڑی نے جالا تن دیا تھا اور کبوتروں نے آشیانہ بنا لیا تھا۔ اُن کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ آنحضرت زمین میں سما گئے یا آسمان پر چڑھ گئے۔ آخر وہاں سے ناکام پلٹے۔ ابوجہل نے اعلان کیا کہ جو آنحضرت کو واپس لائے گا اُسے سو اونٹ بطور انعام دیئے جائیں گے۔ سراقہ ابن مالکؓ انعام کے لالچ میں آنحضرت کے تعاقب میں گیا۔ اُس نے آنحضرتؐ کو دیکھ بھی لیا۔ مگر ہیبت و جلالِ نبوتؐ سے مرعوب ہو کر واپس آگیا۔ آپ نے تین شبانہ روز غار میں قیام کیا اور ۸ ربیع الاوّل کو مدینہ کی سمت روانہ ہوئے اور مدینہ سے تین میل ادھر بنی عمرو ابن عوف کی بستی قبا میں ٹھہر گئے اور حضرت علیؑ کے آنے تک وہیں ٹھہرے رہے۔

پیغمبر اکرمؐ کی ہجرت کے بعد حضرت علیؑ تین دن مکّہ میں رہے اور جن لوگوں کی امانتیں آنحضرتؐ کی تحویل میں تھیں انہیں واپس کیں اور چوتھے دن فاطمہؑ بنت محمدؐ فاطمہ بنت زبیر اور فاطمہ بنت اسد کو محملوں پر سوار کر کے مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ قریش کو جب یہ معلوم ہوا کہ علیؑ بھی مکّہ چھوڑ کر جا چکے ہیں تو انہیں اپنی ذلت کا احساس ہوا اور انہیں روک لینے کے لئے آٹھ سواروں کی ایک دوڑ ان کے تعاقب میں روانہ کی تاکہ انہیں راستہ میں روک لیں اور مجبور کر کے واپس لائیں۔ جب علیؑ مکّہ سے پچیس میل کے فاصلہ پر کوہ ضجنان کے قریب پہنچے تو یہ لوگ بھی پہنچ گئے۔ ان لوگوں کو دیکھ کر آپ نے عورتوں کی محملیں پیچھے کی جانب دامن کوہ میں ٹھہرا دیں اور خود آگے بڑھ کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے آپ کو گھیرے میں لے کر سخت لہجے میں کہا کہ آپ مکّہ واپس چلیں اور اگر آپ چلنے پر آمادہ نہ ہوئے تو ہم آپ کو زبردستی لے جائیں گے۔ حضرتؑ نے سُنی ان سُنی کر دی اور حصار توڑ کر آگے بڑھے۔ حرب ابن امیہ کے غلام جناح نے تلوار نیام سے کھینچ لی اور راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ حضرتؑ کے تیور بدلے۔ تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھا اور قدم آگے بڑھائے۔ جناح نے حملہ کیا آپ نے اس کا وار خالی دے کر تلوار چلائی اور اس کے دو ٹکڑے کر دیئے اس کے ہمراہیوں نے یہ منظر دیکھا تو خوفزدہ ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے اور جدھر سے آئے تھے اُدھر واپس چلے گئے۔ حضرتؑ نے وہ رات کوہ ضجنان کے دامن میں بسر کی اور صبح ہوتے مدینہ کی طرف چل دیئے۔ گرمی کا موسم، بادِ سموم کے تھپیڑے، جھلسے ہوئے ریگزاروں اور تپتے ہوئے صحراؤں کا پا پیادہ اور طویل سفر۔ تلووں میں چھالے پڑ گئے تکان و خستگی سے بے حال ہو گئے مگر ایک لگن تھی جو آگے بڑھائے لئے جا رہی تھی اور ایک ولولہ تھا جو کھینچے لئے جا رہا تھا۔ آخر منزلوں پر منزلیں طے کر کے مقام قبا میں آنحضرتؐ کی خدمت میں باریاب ہوئے۔ رسولؐ خدا نے آگے بڑھ کر انہیں سینے سے لگایا آنکھوں میں آنسو چھلک آئے اپنے ہاتھوں سے جسم پر پڑی ہوی گرد جھاڑی اور انہیں ساتھ لے کر مدینہ میں وارد ہوئے۔

حضرت علیؑ نے بستر رسولؐ پر سو کر جس سر فروشی و جانبازی کا مظاہرہ کیا وُہ تاریخ میں اپنی مثال نہیں رکھتا انہیں پیغمبرؐ کی زبانی معلوم ہو چکا تھا کہ کفارِ قریش آنحضرتؐ کے قتل کا فیصلہ کر چکے ہیں اور وُہ آج ہی کی رات ہے جس میں وُہ اپنے ناپاک ارادہ کی تکمیل کریں گے۔ ایسے پُرہول و پُرخطر موقع پر جبکہ چاروں طرف خون کے پیاسوں کا نرغہ تھا کھنچی ہوی تلواروں کا گھیرا تھا اور ہر آن دشمن کے حملہ آور ہونے کا اندیشہ تھا۔ آپ اطمینانِ قلب و سکونِ خاطر کے ساتھ پیغمبرؐ کی چادر اوڑھ کر اُن کے بستر پر سو گئے۔ نہ دشمن کے عزائم سے خوفزدہ ہُوئے نہ تلواروں کی چمک سے ہراساں۔ نہ کسی قسم کا حزن و کرب تھا نہ خوف و اضطراب۔ اگر کچھ بھی خوف و خطر محسوس کرتے تو سونے کے بجائے چوکنا ہو کر بیٹھ جاتے یا صرف آنکھیں بند کر کے لیٹے رہتے۔ مگر آج کی رات اپنی جان سے بے نیاز ہو کر تحفظ رسالت کا فریضہ ادا کرنا تھا اور جاگنے کے بجائے سو کر اطمینان و بے خوفی اور عزم جاں سپاری کی جھلک دکھانا تھی۔ انہیں کوی تشویش تھی تو یہ کہ پیغمبرؐ کی زندگی پر آنچ نہ آنے پائے اور وُہ دشمنوں کے نرغہ سے نکل کر صحیح و سالم منزلِ مقصود پر پہنچ جائیں اپنی جان رہے یا جائے ؎

من و دل گر فنا شدیم چہ باک غرض اندر میاں سلامت اوست

اگر اس موقع پر علیؑ آڑے نہ آتے اور اپنی جان کی بازی لگا کر بستر رسولؐ پر نہ سوتے یا اُن کے سامنے سو جاتے اور اُن کے جانے کے بعد بستر چھوڑ کر کسی گوشہ میں چھپ جاتے تو کفار بستر رسولؐ کو خالی پا کر اُسی وقت تعاقب میں نکل کھڑے ہوتے اور غار میں پناہ لینے سے پہلے اپنی گرفت میں لے لیتے۔ اس کا نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ یا تو پیغمبرؐ کی زندگی ختم کر دی جاتی یا ظاہر اسباب کی بنا پر ہجرت کا ارادہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچتا اور اسلام کے نشر و فروغ کی راہیں جو اس ہجرت کے نتیجہ میں کھلیں نہ کھلتیں اور وُہ فتوحات جو اس ہجرت کے بعد حاصل ہُوئے کبھی حاصل نہ ہوتے۔ حضرت علیؑ ہی نے تلواروں کے سایہ میں سو کر فتح و نصرت کی راہیں ہموار کیں اور پرچم اسلام کی سربلندی کا سامان کیا۔ بلاشبہ اسلام کا فروغ و استحکام ہجرت کا ثمرہ ہے اور ہجرت کی تکمیل علیؑ کے جان پر کھیلنے کا نتیجہ ہے۔

مواخات

مدینہ میں منتقل ہونے کے بعد مہاجرین و انصار آپس میں اس طرح گھل مل گئے گویا ان میں قومی و وطنی تفرقہ تھا ہی نہیں۔ ان کے رہن سہن اور باہمی تعلقات سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب ایک ہی کنبہ کے افراد اور ایک ہی خاندان سے وابستہ ہیں۔ ان کا مال مشترک، عزت و ناموس مشترک اور دُکھ سُکھ مشترک تھا اور پُوری زندگی یگانگت و یکجہتی کا مکمل نمونہ تھی۔ آنحضرتؐ نے اس یگانگت و اخوت کو مضبوط تر کرنے کے لئے جس طرح مکہ میں مسلمانوں کے درمیان مواخات قائم کی تھی۔ مدینہ میں بھی مہاجرین و انصار کے درمیان بھائی چارہ قائم کیا اور ایک کو دُوسرے کا بھائی بنایا تا کہ رنگ، نسل اور قومیت و وطنیت کے

امتیازات ختم کرکے ان میں مساوات و برابری کا احساس پیدا کریں اور نتیجۃً وُہ تعلقات کی خوشگواری کو قائم رکھتے ہُوئے ایک دُوسرے کے دُکھ درد میں شریک ہوں اور محبّت، شفقت اور ہمدردی و ایثار کے تقاضوں پر عمل پیرا ہو کر اتحاد و یکجہتی کا نمونہ قرار پائیں۔

حکماء کے نزدیک اخوت کے روابط متحد الطبائع افراد ہی میں مستحکم ہو سکتے ہیں۔ اور اگر طبائع میں اتحاد نہ ہو تو وقتی طور پر کسی غرض یا مصلحت کی بنا پر اُخوت کا رشتہ جوڑا بھی جائے تو اس میں دوام و استحکام پیدا نہیں ہو سکتا۔ پیغمبرِ اکرمؐ نے اسی اتحاد و یکرنگیٔ مزاج پر اُخوت کی بنیاد رکھی اور رشتۂ اخوت قائم کرنے سے پہلے مختلف افراد کے طبعی رجحان و ذہنی میلان کا جائزہ لے لیا ہو گا اور جن دُو فردوں کے اخلاق و عادات میں مماثلت دیکھی ہو گی انہیں آپس میں ایک دُوسرے کا بھائی بنایا ہو گا۔ چنانچہ مکہ میں ابوبکر اور عمر میں، عثمان اور عبدالرحمٰن ابن عوف میں، طلحہ اور زبیر ابن عوام میں بھائی چارا قائم کیا اور اُن کی ہم آہنگی و یک رنگی خلافت، شوریٰ اور جمل کے واقعات سے واضح و عیاں ہے۔ اسی طرح مدینہ میں ذہنی و طبعی رجحانات کو دیکھتے ہُوئے حضرت ابوبکر کو خارجہ ابن زید کا، حضرت عمر کو عتبان ابن مالک کا، حضرت عثمان کو اوس ابن ثابت کا، ابوعبیدہ کو سعد ابن معاذ کا، عبدالرحمٰن ابن عوف کو سعد ابن ربیع کا، زبیر کو سلمہ ابن سلامہ کا، طلحہ کو کعب ابن مالک کا، عمار ابن یاسر کو قیس ابن ثابت کا، سلمان فارسی کو ابوالدرداء کا بھائی قرار دیا۔ غرض جو جس سے افتادِ طبع کے لحاظ سے میل کھاتا نظر آیا اُسے اُس کا بھائی بنایا۔ اور جو جس فضیلت و شرف کا مالک تھا اسی مرتبہ و حیثیت کا بھائی اس کے لئے منتخب فرمایا۔ اس موقع پر پیغمبرؐ نے پینتالیس یا پچاس مہاجرین اور اتنے ہی انصار کو آپس میں بھائی بنا کر اُخوت کے مضبوط بندھنوں سے جوڑ دیا۔ مگر کوئی شخص ایسا نظر نہ آیا جس سے علیؑ کا رشتۂ اخوت جوڑا جاتا۔ اور کسی سے رشتۂ اخوت جوڑا بھی نہ جا سکتا تھا اس لئے کہ دعوتِ عشیرہ کے قول و قرار کی رُو سے پیغمبرؐ کے بھائی قرار پا چکے تھے۔ پھر بھی اُس عہدِ اخوت کی تجدید کے لئے جس طرح مکہ میں سلسلۂ اخوت قائم کرتے ہُوئے انہیں بھائی قرار دیا تھا مدینہ میں بھی انہیں شرفِ اخوت سے سرفراز فرمایا۔ چنانچہ ابن عبدالبر نے تحریر کیا ہے:۔

اخی رسولؐ اللہ بین المھاجرین ثم اخی بین المھاجرین و الانصار و قال فی کل واحد منھما لعلیؑ انت اخی فی الدنیا والاٰخرۃ۔ (استیعاب۔ ج۔ ص ۲۷۳)	رسُولؐ اللہ نے ایک دفعہ مہاجرین کے درمیان بھائی چارا قائم کیا اور ایک دفعہ مہاجرین و انصار میں۔ اور دونوں مرتبہ حضرت علیؑ سے فرمایا تم دُنیا و آخرت میں میرے بھائی ہو۔"

اس اخوت سے مراد عام اسلامی اخوت نہیں ہے جو آیۂ انما المومنون اخوۃ (اہلِ ایمان آپس میں بھائی بھائی ہیں) کی رُو سے سبھی اہلِ ایمان کو حاصل تھی بلکہ ایک ایسی اخوت مراد ہے جو عام اخوت کی سطح سے بلند تر

اور انتہائی قربت و وابستگی کی آئینہ دار ہے۔ اگر اس سے عام اخوت مراد ہوتی تو علیؑ کو مومن ہونے کے اعتبار سے پہلے ہی سے حاصل تھی بلکہ ابنِ عم ہونے کی وجہ سے نسلی اخوت بھی حاصل تھی۔ پھر اس مظاہرہٗ اخوت کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اور کوئی وجہ نہ تھی کہ حضرت علیؑ شروع میں اخوت کے لئے منتخب نہ ہونے پر آزردہ خاطر ہوتے اور پیغمبرؐ سے گلہ کرتے۔ چنانچہ جب آنحضرتؐ نے صحابہ کو ایک دوسرے کا بھائی بنایا اور علیؑ کو اخوت کے لئے منتخب نہ کیا تو حضرت کے دل کو ٹھیس لگی اور آنکھوں میں آنسو لئے ہوئے آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ آپ نے مہاجرین و انصار کو ایک دوسرے کا بھائی بنایا ہے مگر مجھے نظر انداز کر دیا ہے اور کسی کی اخوت کے قابل سمجھا ہی نہیں۔ آنحضرت نے یہ شکوہ سُنا تو علیؑ کو سینہ سے لگایا اور فرمایا:-

یا علیؑ انت اخی فی الدنیا و الآخرۃ۔ (ترمذی۔ ج۲۔ ص۲۱۳) — "اے علیؑ تم دُنیا میں بھی میرے بھائی ہو اور آخرت میں بھی"۔

اس اخوت نے نہ صرف نسبی اخوت پر جلا کی بلکہ تمام مہاجرین و انصار کے مقابلہ میں علیؑ کی فضیلت و برتری اور اخلاق و کردار میں پیغمبرؐ سے مماثلت کو بھی واضح کر دیا اس لئے کہ یہ انتخاب اس کا ثبوت ہے کہ صرف علیؑ ہی آنحضرتؐ کے صفات کے آئینہ دار اور شرفِ اُخوت کے سزاوار تھے اور ان کے علاوہ کوئی دوسرا اس اخوت پر فائز ہونے کا اہل نہ تھا۔ اگر ہوتا تو پیغمبرؐ کی نظر اس پر پڑتی اس لئے کہ اس انتخاب کا تعلق نسبی قرابت سے نہیں ہے بلکہ صفات اور عمل و کردار سے ہے۔ اور حضرت علیؑ بھی اسے ایک خصوصیت خاصہ اور معیارِ امتیاز سمجھتے ہوئے اپنے دَورِ حکومت میں منبر پر بلند ہو کر فرمایا کرتے تھے:-

انا عبد اللہ و اخو رسولؐ اللہ (تاریخ ابوالفدا۔ ج۱۔ ص۱۲۷) — "میں اللہ کا بندہ اور اُس کے رسُول کا بھائی ہوں"۔

خانہ آبادی

حضرت فاطمہ زہراؑ جناب خدیجہ کبریٰ کے بطن سے پیغمبرِ اسلام کی عزیز ترین بیٹی تھیں۔ بعثت کے پانچویں سال مکّہ میں ولادت ہوئی۔ اور ابھی پانچ ہی برس کا سن تھا کہ خدیجۃ الکبریٰ دُنیا سے رحلت فرما گئیں ماں کی آغوشِ شفقت چھننے کے بعد تربیت کی تنہا ذمّہ داری پیغمبرؐ پر آپڑی۔ آپ شب و روز کی کاوشوں اور رسالت کی مصروفیتوں کے باوجود اس گوہرِ یکتائے عصمت و طہارت کی دیکھ بھال بھی کرتے اور تعلیم و تربیت میں بھی پُوری توجّہ فرماتے اور ان کے فطری جوہر کو اپنے علمی و عملی تعلیمات سے اس طرح نکھارا کہ کمسنی ہی میں زنانِ عالم کے لئے نمونۂ عمل قرار پائیں۔ اگر ایک طرف شکل و صُورت میں پیغمبرؐ کی تصویر تھیں تو دُوسری طرف اُن کے محاسن و کمالات کا بھی کامل ترین مرقع تھیں۔ اگر چلتی تھیں تو پیغمبر کے چلنے کا شبہ ہوتا تھا، اور

بولتی تھیں تو ترجمانِ وحی کے بولنے کا دھوکا ہوتا تھا۔ اور دامنِ رسالت میں پرورش پاکر اس مرتبۂ عالیہ پر فائز ہوئیں کہ پیغمبرؐ انہیں عدیلۂ مریم اور سیدۃ نساء العالمین کے لقب سے یاد فرماتے۔ اور جب پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں آتیں تو آنحضرتؐ بے ساختہ تعظیم کے لئے کھڑے ہو جاتے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں:۔

کانت اذا دخلت علیہ قام الیھا فقبلھا و رحب بھا و اخذ بیدھا فاجلسھا مجلسہ (مستدرک حاکم۔ ج۳۔ ص۱۵۴)	جب جناب فاطمہؑ رسولؐ خدا کے پاس آتیں تو آنحضرت کھڑے ہو جاتے۔ بوسہ دیتے۔ خوش آمدید کہتے اور ہاتھ تھام کر انہیں اپنی مسند پر بٹھاتے۔"

مدینہ منوّرہ میں ورود کے بعد جب جناب سیدہؑ سنِ بلوغ کو پہنچیں تو قریش کے سرکردہ افراد کی طرف سے خواستگاری کے پیغام آنے لگے۔ ایک صاحب کو اپنی دولت پر غرہ تھا اُس نے گرانبہا مہر کی پیشکش کر کے خواستگاری کی مگر آنحضرتؐ نے کچھ لوگوں کے پیغام پر مُنہ پھیر لیا اور صاف جواب دے دیا۔ اور کچھ لوگوں کے جواب میں فرمایا۔ ان امرھا الیٰ ربھا ان شاء ان یزوجھا زوجھا۔ " فاطمہؑ کا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے وُہ جہاں چاہے گا نسبت ٹھہرا دے گا۔" جب رسولؐ کی طرف سے کسی کو ہمت افزا جواب نہ ملا تو بعض صحابہ نے حضرت علیؑ کو مشورہ دیا کہ آپ پیغمبرؐ کے ابن عم اور قریب ترین عزیز ہیں آپ کا خون ایک اور خاندان ایک ہے آپ بھی پیغام دیجئے اور خواستگاری کیجئے۔ کوئی وجہ نہیں کہ آپ درخواست کریں اور پیغمبرؐ انکار کر دیں۔ فرمایا کہ مجھے آنحضرتؐ سے عرض کرتے ہُوئے حجاب محسوس ہوتا ہے۔ ان لوگوں نے اصرار کیا تو کہا اچھا کسی مناسب موقع پر آنحضرتؐ سے عرض کروں گا۔ چنانچہ ایک دن ضروری کاموں سے فارغ ہو کر آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہُوئے اور ایک گوشہ میں سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ پیغمبرؐ نے آپ کو خاموش دیکھا تو سمجھ گئے کہ اس خاموشی کے پردہ میں کوئی عرضداشت چھُپی ہوئی ہے۔ فرمایا کہ علیؑ کچھ کہنا چاہتے ہو؟ عرض کیا کہ ہاں۔ فرمایا کہ پھر کہو۔ علیؑ کے چہرے پر شرم کی سُرخی دوڑ گئی۔ نگاہوں کو نیچا کر کے دبی زبان میں کہا کہ یا رسُولؐ اللہ آپ نے مجھے بچپن سے پالا پوسا ہے مجھ پر آپ کے احسانات ماں باپ سے بھی بڑھ کر ہیں۔ اب مَیں مزید احسان کا اُمیدوار ہو کر حاضر ہُوا ہوں۔ یہ سُن کر آنحضرت کے چہرے پر مسرّت کی لہر دوڑ گئی۔ فرمایا کچھ دیر توقف کرو مَیں ابھی آتا ہوں۔ یہ کہہ کر گھر کے اندر تشریف لے گئے اور فاطمہ زہراؑ سے کہا کہ بیٹی! علیؑ رشتہ کی درخواست لے کر آئے ہیں تمہاری کیا مرضی ہے؟ فاطمہؑ سر جھکائے خاموش بیٹھی رہیں اور کوئی جواب نہ دیا۔ پیغمبرؐ نے فرمایا سکوتھا اقرارھا۔ "خاموشی اظہارِ رضامندی ہے۔" اور باہر تشریف لا کر علیؑ سے بشاشِ چہرے کے ساتھ فرمایا کہ ہاں ایسا ہی ہوگا۔ اب تم زرِ مہر کا سرو سامان کرو۔ حضرت علیؑ نے کہا کہ یا رسُولؐ اللہ میرے پاس زرہ، تلوار اور ایک اُونٹ ہے۔ فرمایا کہ تلوار اور اُونٹ رہنے دو۔ زرہ زائد ہے اُسے فروخت کر ڈالو۔ آپ نے وُہ زرہ حضرت عثمانؓ کے ہاتھ چار سو اسّی درہم میں فروخت کر دی اور اس رقم کو بطور مہر آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی خدمت میں پیش کر دیا۔ آپ نے ان درہموں میں سے کچھ درہم

حضرت ابوبکر کو دیئے اور عمار یاسر اور چند صحابہ کو اُن کے ہمراہ کر دیا تاکہ وُہ گھر گرہستی کا سامان خرید لائیں اور کچھ درہم بلالؓ کو دیئے اور فرمایا کہ اس رقم سے خوشبُو کا سامان عطر و غالیہ خرید لاؤ۔

ماہِ ذی قعدہ ۲ھ کو مسجد نبوی میں محفلِ عقد آراستہ ہُوئی۔ صحابہ نے شرکت فرمائی۔ آنحضرتؐ نے خطبہ پڑھا۔ فصاحت کی کلیاں چٹکیں۔ بلاغت کے پھُول کھلے اور طرفین سے ایجاب و قبول ہُوا اور یہ مبارک تقریب انتہائی سادگی کے ساتھ آنحضرتؐ کی دُعائے خیر و برکت پر ختم ہُوئی۔ ماہِ ذی الحجہ ۲ھ میں رخصتی عمل میں آئی۔ پیغمبرؐ نے دعوتِ ولیمہ کے سلسلہ میں گوشت اور روٹیوں کا سر و سامان کیا اور علیؑ نے روغن اور کھجوریں مہیا کیں۔ دعوت کا اعلانِ عام تھا۔ سب مہاجر و انصار شریک ہُوئے زن و مرد نے شکم سیر ہو کر کھایا۔ اللہ نے اُس کھانے میں ایسی برکت دی کہ سب نے سیر ہو کر کھایا، پھر بھی کھانا بچ رہا۔ اس بچے ہُوئے کھانے میں سے ایک طبق علیؑ و فاطمہؑ کے لئے مخصوص کر دیا گیا اور ایک ایک خوان ازواجِ پیغمبرؐ کے گھروں میں تقسیم کے لئے بھیجا گیا۔

سردارِ دو عالمؐ کی دُختر اور سرزمین حجاز کی متمول ترین خاتون جناب خدیجہ کی بیٹی کو جو جہیز دیا گیا وُہ یہ تھا:۔

ایک پیراہن ایک اوڑھنی ایک خیبری سیاہ سر پیچ ایک کھجور کی رسّیوں سے بُنی ہوئی چارپائی دو توشکیں ایک میں اُون بھری ہوئی اور دُوسری میں کھجور کی چھال۔ طائف کے چمڑے کے چار تکئے جن میں گیاہِ اذخر کے ریشے بھرے ہُوئے تھے۔ ایک چٹائی ایک صُوف کا پردہ ایک چکی ایک تانبے کا لگن ایک چھوٹا مشکیزہ ایک بڑی مشک ایک گھڑا ایک بڑا پیالہ ایک لوٹا اور مٹی کے چند پیالے۔ ان تمام چیزوں کی مجموعی قیمت اسّی درہم تھی۔ جب آنحضرت نے اپنی عزیز بیٹی کے جہیز کو دیکھا تو آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ایک ایک چیز کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور سر آسمان کی طرف اُٹھا کر فرمایا: اللّٰھم بارك لقوم جل آنیتھم الخزف۔ خدایا اُن لوگوں کو برکت دے جن کے برتن زیادہ تر مٹی کے ہوتے ہیں۔"

جب دن نے اپنا دامن سمیٹا، رات نے اپنے سیاہ پردے آویزاں کئے عقدِ پروین نے جبینِ فلک پر افشاں چُنی اور مشاطۂ فطرت نے عروسِ سپہر کو ستاروں سے آراستہ کیا تو پیغمبر اکرم نے جناب فاطمہؑ کو اپنے خچر "شہباء" پر سوار کیا۔ تکبیر کی آوازوں سے فضائے مدینہ گونج اُٹھی۔ ہر طرف سے خیر و برکت کی صدائیں بلند ہوئیں تحمید و تقدیس کے نغمے در و دیوار سے ٹکرائے۔ انصار و مہاجرین کی عورتیں رجز پڑھتی ہوئیں ساتھ ساتھ، سلمان فارسی باگ پکڑے ہوئے آگے آگے، پیغمبر اکرمؐ اور تمام بنی ہاشم تلواریں علم کئے پیچھے پیچھے۔ اس شان و شکوہ سے یہ جلوس روانہ ہُوا اور مسجدِ نبوی کا طواف کرنے کے بعد منزلِ مقصود پر پہنچا۔ آنحضرت نے اپنی بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر علیؑ کے ہاتھ میں دیا اور فرمایا: بارك الله لك في ابنة رسول اللهؐ "علی تمہیں دُخترِ رسُولؐ مبارک ہو۔" پھر پانی کا ایک پیالہ طلب کیا اور اس میں سے ایک گھونٹ مُنہ میں لے کر اسی میں انڈیل دیا اور علیؑ و فاطمہؑ کے سر و سینہ پر چھڑکا اور فرمایا:

اللّٰھم بارك فیھما و بارك　　　بارِ الٰہا! ان دونوں کو برکت دے ان دونوں پر

علیھما وبارك فی نسلھما — برکت نازل کر اور ان کی نسل و اولاد میں بھی برکت دے۔"
(اصابہ۔ ج۴۔ ص۳۶۶)۔

اس تقریب پُر تبریک کے بعد جب علیؑ و فاطمہؑ کے ہاں آئے تو پھر اُن کے حق میں خیر و برکت کی دُعاء کی اور یادگارِ خدیجہ کو اپنے گھر میں بستے آباد ہوتے دیکھ کر خوش خوش واپس ہوئے۔

ابناءِ رسُول

یہ رشتۂ ازدواج اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ ایک طرف اس سے نسلِ رسُولؐ کا سلسلہ قائم رہا اور دُوسری طرف اُن دُشمنانِ دین کی رُوسیاہی کا سامان ہُوا جنہوں نے آنحضرتؐ کو ابتر بے اولاد کا خطاب دے رکھا تھا۔ اگرچہ پیغمبرؐ کی نرینہ اولاد زندہ نہ رہی مگر حسنؑ و حسینؑ فرزندانِ دُختر ہونے کے اعتبار سے ابناءِ رسُول قرار پائے اور انہی دونوں سے آپ کی نسل پھُولی پھلی دُنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلی اور پیغمبرؐ کی نسبت سے ذرّیتِ رسُولؐ کہلائی۔ چنانچہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

ان اللہ عزوجل جعل ذریۃ کل نبی فی صلبہ وان اللہ تعالیٰ جعل ذریتی فی صلب علیؑ ابن ابی طالبؑ۔ (صواعق محرقہ۔ ص۱۵۴)۔

خداوندِ عالم نے ہر نبی کی ذرّیت کو اس کے صلب میں قرار دیا اور میری ذریت کو علیؑ ابن ابی طالبؑ کے صلب میں قرار دیا ہے۔"

اولاد صلبی ہو یا دُختری دونوں اولاد کا درجہ رکھتی ہیں۔ اولادِ دُختری کو اولاد نہ سمجھنا زمانۂ جاہلیت کے غلط نظریات کی پیداوار ہے۔ اُس دَور میں بعض افراد اس کو برداشت ہی نہ کر سکتے تھے کہ وُہ اپنی لڑکیوں کا ازدواجی رشتہ قائم کرکے انہیں دُوسروں کی کنیزی میں دے دیں یہاں تک کہ بعض قبائل میں لڑکیوں کو زندہ دفن کر دینا عزّت کا معیار قرار پا چکا تھا۔ اور جن قبائل میں لڑکیاں ہلاکت سے بچ کر بیاہی جاتی تھیں اُن کی اولاد کو اولاد ہی نہ سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ عرب کا ایک شاعر عرب ذہنیت کی نمائندگی کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

بنونا بنو ابنائنا وبناتنا ۔ بنوھن ابناء الرجال الاباعد

"ہمارے بیٹوں کے بیٹے ہمارے بیٹے ہیں۔ رہے ہماری لڑکیوں کے بیٹے تو وُہ اجنبی لوگوں کے فرزند ہیں۔"

پیغمبرِ اسلام نے فرزندانِ دُختری کو فرزند قرار دے کر دَورِ جاہلیت کی غلط ذہنیت پر کاری ضرب لگائی اور اس حقیقت کو عملاً نمایاں کیا کہ جس طرح پسر کی اولاد اولاد ہوتی ہے اسی طرح دختر کی اولاد بھی اولاد ہے اور نسبتِ مادری بھی اعتبار کے اسی درجہ پر ہے جس درجہ پر نسبتِ پدری۔ چنانچہ پیغمبر اکرمؐ جب بھی فرزندانِ زہراؑ کا ذکر کرتے تو انہیں بیٹا کہہ کر یاد کرتے؛ اور حسنین علیہما السّلام بھی انہیں باپ کہہ کر خطاب کرتے۔ اور امیرالمومنینؑ

کو باپ کے بجائے یا ابا الحسن کہہ کر پکارتے۔ البتہ وفات پیغمبرؐ کے بعد انہیں باپ کہہ کر پکارنا شروع کیا اور امیر المومنینؑ بھی انہیں اولادِ فاطمہؑ ہونے کی بنا پر فرزندانِ رسولؐ سمجھتے تھے۔ چنانچہ جنگ صفین میں جب امام حسن علیہ السّلام قتال کے لئے بڑھے تو آپ نے فرمایا:۔

املکوا عنی ھٰذا الغلام لا یھدنی فانی انفس بھذین علی الموت لئلا ینقطع بھما نسل رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ ۔ (نہج البلاغہ)	میری طرف سے اس جوان کو روک لو اس کی موت مجھے خستہ وبے حال نہ کردے کیونکہ میں ان دونوں نوجوانوں (حسن وحسین) کو موت کے منہ میں دینے سے بخل کرتا ہوں کہ کہیں ان کے مرنے سے رسول اللہ کی نسل قطع نہ ہو جائے"۔

ایک مرتبہ ابوالجارود نے امام محمدؑ باقر علیہ السّلام کی خدمت میں عرض کیا کہ میں نے امام حسن وامام حسین کے فرزندانِ رسولؐ ہونے پر آیۂ مباہلہ ابناء نا وابناء کم سے ثبوت پیش کیا تو کچھ لوگوں نے کہا کہ دختر کی اولاد اولاد تو ہوتی ہے مگر صلبی اولاد نہیں ہوتی۔ امام علیہ السّلام نے فرمایا کہ خداوندِ عالم نے قرآن مجید میں حرام عورتوں کے سلسلہ میں فرمایا ہے:۔

وحلائل ابناءکم الذین من اصلابکم۔	اور تمہارے صلبی لڑکوں کی بیویاں (تم پر حرام کی گئیں۔)"

تم ان معترضین سے دریافت کرو کہ کیا پیغمبر کے لئے حسنین علیہما السّلام کی بیویوں سے نکاح جائز تھا؟ اگر وہ یہ کہیں کہ جائز تھا تو یہ صریحاً غلط ہے۔ اور اگر یہ کہیں کہ جائز نہیں تھا تو وجہِ حرمت اس کے سوا کیا ہے کہ وہ آنحضرت کی صلبی اولاد کی ازواج تھیں جنہیں اللہ نے اس آیت میں حرام ٹھہرایا ہے۔

ابن بابویہ قمی رحمہ اللہ نے تحریر کیا ہے کہ جب امام موسیٰ کاظم علیہ السّلام ہارون رشید کے ہاں طلب کئے گئے تو اُس نے کہا کہ کیا وجہ ہے کہ تم اولادِ رسول کہلاتے ہو حالانکہ تم اولادِ علیؑ ہو۔ اور سلسلۂ نسب باپ سے چلتا ہے نہ ماں سے۔ حضرت نے فرمایا کہ اگر رسولؐ اکرم دوبارہ دُنیا میں تشریف فرما ہوں اور تم سے رشتہ طلب کریں تو کیا تم اُسے قبول کروگے؟ کہا سر آنکھوں پر۔ یہ رشتہ ہمارے لئے عرب وعجم میں باعث صد افتخار ہوگا۔ یہ سُنکر حضرت نے فرمایا:۔

لکنہ لا یخطب الی ولا ازوجہ لانہ ولدنی ولم یلدك۔ (عیون الاخبار)	لیکن وہ ہم سے رشتہ طلب نہیں کر سکتے اور نہ ہم انہیں رشتہ دے سکتے ہیں۔ کیونکہ ہم اُن کی اولاد ہیں اور تم ان کی اولاد نہیں ہو"۔

محمد ابن طلحہ شافعی نے مطالب السؤل میں تحریر کیا ہے کہ حجاج ابن یوسف ثقفی کو معلوم ہوا کہ شعبی جب بھی حسن وحسین علیہما السّلام کا ذکر کرتے ہیں تو انہیں فرزندانِ رسولؐ کہہ کر یاد کرتے ہیں حجاج اس پر برافروختہ

ہُوا اور انہیں بازپرس کے لئے اپنے ہاں طلب کیا۔ جب شعبی اس کے ہاں پہنچے تو دیکھا کہ مجلس میں کوفہ و بصرہ کے علماؤ اعیان جمع ہیں۔ حجاج نے شعبی سے مخاطب ہوکر کہا کہ مَیں نے سُنا ہے کہ تم حسنؑ اور حسینؑ کو فرزندانِ رسُولؐ کہتے ہو حالانکہ وُہ اُن کے بیٹے نہ تھے بلکہ اُن کی بیٹی فاطمہؑ کے بیٹے تھے اور سلسلہ نسب ماں سے نہیں چلا کرتا۔ شعبی کچھ دیر خاموش رہے اور پھر اس آیت کی تلاوت کی:۔

ومن ذریتہ داؤد وسلیمان وایوب ویوسف وموسٰی و ھارون کذلک نجزی المحسنین وزکریا ویحیی وعیسٰی و الیاس کل من الصالحین۔	اور ابراہیمؑ کی نسل میں سے داؤدؑ، سلیمانؑ، ایوبؑ یوسفؑ، موسٰیؑ اور ہارونؑ کو بھی ہدایت کی اور ہم یونہی نیکو کاروں کو صلہ دیتے ہیں۔ اور زکریاؑ، یحییٰؑ، عیسٰیؑ اور الیاسؑ کو ہدایت کی یہ سب خدا کے نیک بندوں میں سے تھے۔“

اس آیت کی تلاوت کے بعد کہا کہ اس میں حضرت عیسٰےؑ کو بھی ذریت ابراہیمؑ میں شمار کیا گیا ہے اور یہ اس وجہ سے کہ وُہ مادری سلسلہ سے ان تک منتہی ہوتے ہیں۔ جب مریم بنتِ عمران کی نسبت سے حضرت عیسٰی کو ذریت ابراہیمؑ میں شمار کیا جا سکتا ہے تو فاطمہؑ بنتِ رسُولؐ کی نسبت سے حسنؑ و حسینؑ کو ذریت رسُولؐ میں سے کیوں نہیں سمجھا جا سکتا جبکہ صُورت یہ ہے کہ جناب مریمؑ اور حضرت ابراہیمؑ میں تین پشتوں کا فاصلہ حائل ہے اور یہاں فاطمہؑ اور رسُولؐ میں کوئی واسطہ حائل نہیں ہے۔ یہ سُنکر حجاج خاموش ہو گیا اور اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

ایک مرتبہ عمرو ابن عاص نے بھی امیرالمومنین پر نکتہ چینی کرتے ہُوئے کہا کہ وُہ حسنؑ و حسینؑ کو فرزندانِ رسُولؐ کہتے ہیں حالانکہ وُہ فرزندانِ رسُولؐ نہ تھے۔ حضرتؑ نے سُنا تو فرمایا کہ اس دُشمنِ خدا و رسُولؐ سے کہو کہ اگر وُہ فرزندانِ رسُولؐ نہیں ہیں تو پھر آنحضرتؐ ابتر (بے اولاد) قرار پائیں گے جیسا کہ اس کا باپ عاصی ابنِ وائل آنحضرتؐ کو اسی لفظ ابتر سے یاد کیا کرتا تھا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ کے بجائے ان کے دُشمنوں کو ابتر کہا ہے۔

معاویہ کا غلام ذکوان بیان کرتا ہے کہ ایک مرتبہ معاویہ نے کہا کہ حسنؑ و حسینؑ کو فرزندانِ رسُولؐ کہنے کے بجائے فرزندانِ علیؑ کہنا چاہیئے کیونکہ وُہ صلبِ رسُولؐ سے نہیں ہیں بلکہ صلبِ علیؑ سے ہیں۔ ذکوان کہتا ہے کہ اس کے بعد معاویہ نے مجھے مامور کیا کہ میں اُن کی اولاد کی فہرست ترتیب دے کر پیش کروں۔ مَیں نے اُن کے بیٹے بیٹوں اور پوتوں کے نام لکھ کر پیش کر دیئے۔ معاویہ نے فہرست کو دیکھا تو کہا کہ تم نے میرے نواسوں کے نام درج نہیں کئے؟ مَیں نے کہا کہ وُہ تمہاری اولاد کی فہرست میں کیسے آ سکتے ہیں وُہ تو تمہاری بیٹی کے بیٹے ہیں۔ معاویہ نے میری بات کو تاڑ کر کہا کہ خاموش رہو۔ ”ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد۔“

حیرت ہے کہ معاویہ نے اپنے باپ کی ناجائز اولاد زیاد ابن سمیہ کو تو ابو سفیان کا بیٹا تسلیم کر لیا جو سراسر آئینِ اسلام کے خلاف تھا۔ مگر جنہیں اللہ نے بھی فرزندِ رسولؐ کہا ہو اور خود رسولؐ نے بھی، اُن کی فرزندی سے ہمیشہ انکار ہی رہا۔

خطبۂ بنت ابی جہل

حضرت علیؑ نے جناب فاطمہؑ زہرا کی زندگی میں کوئی دوسرا عقد نہیں کیا اور نہ ہی اُن کی موجودگی میں دُوسرے عقد کا ارادہ کیا۔ مگر کچھ وسیسہ کاروں نے حضرت علیؑ کو مطعون کرنے کے لئے ایک بے سروپا روائت گڑھ لی کہ حضرت علیؑ نے ابوجہل کی بیٹی سے جس کا نام جویریہ یا جمیلہ بیان کیا جاتا ہے عقد کرنا چاہا اور یہ امر پیغمبرؐ کو انتہائی ناگوار گزرا اور آپ نے اس کی سخت مخالفت کی۔ چنانچہ مسور ابن مخرمہ بیان کرتا ہے کہ حضرت علیؑ نے ابوجہل کی لڑکی سے رشتہ کرنا چاہا جب جناب فاطمہؑ کو علم ہُوا تو وُہ رسُولؐ اللہ کے پاس شکوہ لے کر آئیں اور کہا کہ آپ کے قوم وقبیلہ والے آپ کے متعلق یہ خیال کرنے لگے ہیں کہ آپ اپنی بیٹیوں کی زرا پاسداری نہیں کرتے اب علی آپ کی بیٹی پر سوت لا رہے ہیں اور ابوجہل کی لڑکی سے رشتہ جوڑ رہے ہیں آنحضرتؐ نے یہ سُنا تو چہرے پر ناگواری کے آثار ظاہر ہُوئے اور آپ نے منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا:۔

انی لست احرم حلالا ولا احل	مَیں حلال کو حرام اور حرام کو حلال تو نہیں کرتا لیکن
حراما ولکن واللہ لا تجتمع	خدا کی قسم رسُولؐ کی بیٹی اور دُشمنِ خدا کی بیٹی
بنت رسُولؐ اللہ وبنت عدو	دونوں ایک شخص کے نکاح میں جمع نہیں ہو
اللہ عند رجل واحد۔ (تاریخ خمیس۔ ج۱۔ ص۴۱۲)	سکتیں"۔

اس سلسلہ کی ایک روایت یوں ہے کہ مسور ابن مخرمہ نے آنحضرتؐ کو منبر پر فرماتے سُنا کہ بنی ہشام ابن مغیرہ نے مجھ سے اجازت مانگی ہے کہ وُہ اپنی بیٹی کا رشتہ علی ابن ابی طالبؑ سے کریں:۔

فلا اذن ثم لا اذن ثم لا اذن	مَیں اجازت نہیں دیتا مَیں اجازت نہیں دیتا مَیں
الا ان یحب ابن ابی طالب	اجازت نہیں دیتا مگر یہ کہ فرزندِ ابوطالبؑ
ان یطلق ابنتی وینکح ابنتھم	چاہے تو میری بیٹی کو طلاق دے دے اور
(تاریخ خمیس۔ ج۱۔ ص۴۱۲)	اُن کی لڑکی سے نکاح کر لے"۔

اس قسم کی اور بھی مختلف ومضطرب روایتیں ہیں جو مسور ابن مخرمہ پر منتہی ہوتی ہیں۔ یہ شخص عبدالرحمٰن ابنِ عوف کا بھانجا تھا اور ہجرت کے دو سال بعد مکّہ میں پیدا ہوا اور ۸ھ کے اواخر میں مدینہ آیا۔ ابن حجر عسقلانی نے تحریر کیا ہے:۔

ولد بمكة بعد الهجرة بسنتين فقدم به ابوه المدينة في عقب ذي الحجة سنة ثمان (تہذیب التہذیب ج۔ ص۱۵۱)

ہجرت کے دو سال بعد مکہ میں پیدا ہوا اور اواخر ذی الحجہ ۸ھ میں اپنے باپ کے ساتھ مدینہ آیا۔"

صاحب اصابہ نے تحریر کیا ہے:-

كان مولده بعد الهجرة بسنتين و قدم المدينة في ذي الحجة بعد الفتح سنة ثمان وهو غلام يفع ابن ست سنين۔ (اصابہ ج۳۔ ص۳۹۹)

ہجرت کے دو برس بعد پیدا ہوا اور فتح مکہ کے بعد ذی الحجہ ۸ھ میں مدینہ آیا اور اس وقت وُہ چھ برس کا نوخیز بچہ تھا۔"

مکہ ۸ھ میں فتح ہوا اور یہ خواستگاری کا واقعہ بھی ۸ھ میں یا اس کے بعد ہُوا ہو گا کیونکہ فتح مکہ سے پہلے ابوجہل کی اولاد اسلام نہ لائی تھی۔ چنانچہ فتح مکہ کے موقع پر جب بلال نے خانہ کعبہ میں کھڑے ہو کر اذان دی تو اسی جویریہ بنت ابی جہل نے اپنے کُفر کا مظاہرہ کرتے ہُوئے کہا:-

لقد اكرم الله ابي حين لم يشهد نهيق بلال فوق الكعبة۔ (تاریخ ابوالفداء۔ ج۔ ص۱۴۵)

خدا نے میرے باپ کو اس سے محفوظ رکھا کہ وُہ کعبہ میں بلالؓ کی بے ہنگم آواز سُنتا۔"

اور کسی کافرہ و مشرکہ سے تو نکاح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حیران کُن امر یہ ہے کہ بزرگ صحابہ تو خاموش نظر آتے ہیں اور ایک زائد سے زائد چھ سال کا بے شعور بچہ جو ان معاملات کو سمجھنے کی اہلیت بھی نہیں رکھتا بڑے شدومد سے اس اہم واقعہ کا ذکر کرتا ہے۔ اور تعجب بالائے تعجب یہ ہے کہ حدیث قرطاس کے سلسلہ میں ابن عباس کی صغر سنی پر جرح و قدح کرنے والے علماء اس مجہول و نامعروف بچے کی طفلانہ شوخی کو اُٹھائے پھرتے ہیں حالانکہ یہ ایک ایسا معاملہ تھا جو مخفی رہ ہی نہیں سکتا تھا اور جس کی شہرت عام ہونا چاہیئے تھی خصوصاً عورتوں کے طبقہ میں اس کا عام چرچا ہونا چاہیئے تھا۔ اس کے باوجود اس زمانہ کے زن و مرد کا خاموش رہنا اس امر کی دلیل ہے کہ یہ واقعہ سرے سے غلط ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو امیر شام جنہوں نے برائی ڈھونڈھ نکالنے کا کوئی گوشہ نہ چھوڑا تھا کسی موقع پر تو اس کا ذکر کرتے۔ اور ام المومنین حضرت عائشہ کو اپنی زندگی میں اکثر ایسے مواقع پیش آئے کہ اگر یہ واقعہ ہوا ہوتا تو وُہ ضرور اس کا ذکر کرتیں۔ مگر ان کا بھی اس معاملہ میں سکوت ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ یہ قطعاً من گھڑت بچوں کی کہانی ہے۔

اس کے علاوہ حضرت علیؑ کی سیرت پر نظر کرنے سے بھی یہ واقعہ غلط معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ حضرت کی تاریخ حیات میں ایک نظیر بھی ایسی نہیں ملتی کہ آپ نے پیغمبر اکرم کے حکم یا مشورہ کے بغیر کوئی قدم اٹھایا ہو

یا کوئی ایسا اقدام کیا ہو جس میں پیغمبرؐ کی ذرا سی ناگواری کا اندیشہ محسوس کیا ہو اور نہ آپ کی پاکیزہ فطرت اس کی روادار ہو سکتی تھی کہ آپ ایسی بات کا تصور بھی کریں جو رسولؐ اللہ کی ادنیٰ ناراضی کا باعث ہو سکتی ہو تو ایسی صورت میں یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ آپ نہ اپنے ولی و سرپرست سے پوچھنے کی ضرورت محسوس کریں اور نہ اُن کی رضا و عدم رضا کا خیال کریں اور بالا ہی بالا رشتہ طے کرنے لگ جائیں جبکہ ابوجہل کی اولاد کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وُہ آنحضرت کا عندیہ معلوم کریں شاید انہیں یہ گوارا نہ ہو کہ اُن کی دُختر پر سوت آئے۔ اور پھر اس واقعہ کے سلسلہ میں جو کلمات آپ کی طرف منسوب کئے گئے ہیں ان کی صحت پر وہی اعتماد کرے گا جو منصب نبوّت کے تقاضوں سے بے خبر ہو۔ منصب نبوّت کا تقاضا تو یہ تھا کہ آپ جذبات سے بلند تر ہو کر حلال خدا کو حلال کہیں اور حرام خدا کو حرام اور ذاتی لگاؤ کی بنا پر اس میں کوئی تفریق پیدا نہ کریں۔ لہذا ہماری عقلیں یہ باور نہیں کر سکتیں کہ جس رسولؐ نے شرعی احکام کے سلسلہ میں کبھی ذاتی تعلقات کا لحاظ نہ کیا ہو وُہ محض اپنی بیٹی کی محبت میں خدا کے حلال کردہ امر کی مخالفت کریں گے۔ رسولؐ تو بڑی ہستی ہیں جبکہ احکام خدا و رسولؐ کا تھوڑا سا پاس و لحاظ رکھنے والے شہنشاہ جن کا غرور شاہی احکام خدا و رسولؐ کو پس پُشت ڈالنے کے لئے آمادہ رہتا ہو وُہ بھی ایسے موقع پر بیٹی کی محبت کا خیال نہ کرتے ہُوئے احکام خدا و رسولؐ کی اہمیت کو مدّنظر رکھتے ہیں۔ چنانچہ تاریخ اسلام کے مشہور شہنشاہ مامون عباسی نے اپنی بیٹی امّ الفضل کا عقد امام محمد تقیؑ سے کیا اور امام اُسے اپنے ہمراہ مدینہ لے گئے۔ مدینہ سے اس نے اپنے باپ مامون کو تحریر کیا کہ امام محمد تقیؑ نے کچھ کنیزیں بھی اپنے گھر میں ڈال لی ہیں۔ مامون نے سیخ پا ہونے کے بجائے اپنی بیٹی کو تنبیہہ کرتے ہُوئے لکھا

انا لم نزوجك له لنحرم عليه	ہم نے اُن سے تمہارا عقد اس لئے نہیں کیا تھا
حلالا فلا تعودی لمثله۔	کہ اُن کے لئے حلال خدا کو حرام قرار دیں لہذا آئندہ
(صواعق محرقہ۔ج۔ص۱۲۳)۔	ایسی بات نہ دُہرائی جائے“۔

جب مامون ایسے حکمران اور دنیوی فرمانروا کو حلال خدا کا اتنا پاس ہو کہ وُہ اپنی بیٹی کی شکایت کو درخور اعتنا نہ سمجھے تو پیغمبر اکرمؐ جو حلال و حرام خدا کی تعلیم دینے آئے تھے اُن کے متعلق کیونکر یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ وُہ حلال خدا کا کوئی پاس و لحاظ نہ کریں گے اور اپنی بیٹی پر سوت آجانے کے خیال سے اتنا برافروختہ ہوں گے کہ مسلمانوں کے بھرے مجمع میں منبر پر اپنی خفگی و ناراضی کا اعلان فرمائیں گے۔ کیا آنحضرتؐ حضرت علیؑ کو سمجھا چکے تھے اور وُہ مخالفت و نافرمانی پر اصرار کر رہے تھے کہ اب منبر پر اس کا ذکر ضروری ہو گیا تھا یا یہ بھی کوئی شرعی حکم کی حیثیت رکھتا تھا جس کی علانیہ تبلیغ ضروری تھی کہ رسولؐ کی بیٹی اور دشمن خدا کی بیٹی ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں۔ کیا اس موقع پر یہ سوال نہیں پیدا ہوتا کہ جب کہنے والوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ رسولؐ خدا کی بیٹیاں کافروں اور خدا کے دُشمنوں سے بیاہی گئیں تو ایک دُشمن خدا کی بیٹی جو مسلمان بھی ہو چکی ہو دختر رسولؐ کے ساتھ کیوں جمع نہیں ہو سکتی۔ اور پھر خود رسولؐ اللہ کے ازواج میں کافر و مسلم باپ کی بیٹیاں موجود تھیں اور آپ نے

ام حبیبہ بنت ابوسفیان اور صفیہ بنت حیی سے عقد کے وقت یہ خیال نہ کیا کہ یہ دشمنان خدا کی بیٹیاں ہیں۔ تو جس چیز پر آنحضرتؐ نے خود عمل فرمایا ہو اور اُسے بُرا نہ سمجھا ہو اُسے دُوسرے کے لئے معیوب قرار دینا کہاں تک روا اور انصاف کا متقاضی ہو سکتا ہے۔

امر واقعہ تو یہ ہے کہ جب کچھ لوگوں کو امیر المومنین میں کوی نقص و عیب ڈھونڈھے سے نہ مل سکا اور کوی بات بنائی بھی تو اس کا تار پود بکھر گیا تو انہوں نے تنقیص کا وُہ طریقہ اختیار کیا جو کسی کی تنقیص کا موثر ترین ہو سکتا ہے اور وُہ یہ کہ تنقیص کا پیرایہ بیان ہمدردانہ ہو۔ چنانچہ یہاں پر راوی تاثر تو یہ دیتا ہے کہ وُہ جناب سیدہؑ کی فضیلت اور پیغمبرؐ کی نگاہوں میں ان کی اہمیت دکھانا چاہتا ہے مگر تنقیص کرتا ہے علیؑ کی اور وُہ بھی پیغمبر اکرم کی زبان سے اگر صرف حضرت علیؑ کی تنقیص ہوتی تو ممکن ہے کہ کچھ لوگوں کے آنسو پنچھ جاتے مگر یہاں تو اس نے خود رسُولؐ کی بھی تنقیص کر دی اس طرح کہ حضورؐ نے حضرت علیؑ کو الگ بُلا کر سمجھانے کے بجائے ایک مجمع کر کے خطبہ دے ڈالا اور خطبہ بھی ایسا جو قرآنی اجازت کے بھی خلاف اور خود عمل رسُولؐ کے بھی خلاف۔ روایت کے اس پہلو اور اس کے اضطراب و اختلاف کو دیکھ کر ارباب بصیرت خود ہی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ یہ روایت کسی واقعہ پر مبنی نہیں ہے بلکہ صرف اس ہستی کی توہین و تنقیص کے لئے وضع کی گئی ہے جس سے رسُولؐ آخر وقت تک خوش اور انتہائی خوش رہے۔ اس لحاظ سے یہ روایت اس قابل نہ تھی کہ اس کا تذکرہ کیا جاتا اور بہتر بھی یہی تھا کہ جو شے اکابر صحابہ کی زبان پر نہیں آئی وُہ ہماری زبانِ قلم پر بھی نہ آتی مگر اس خیال سے کہ صحاح سے لے کر شعراء کے قصائد تک میں اس کا ذکر آیا ہے اور ایک طبقہ نے اسے خوب خوب اُچھالا ہے اس پر اجمالی تبصرہ کیا گیا ہے۔

ازواج و اولاد

امیر المومنین نے جناب فاطمہ زہراؑ کی عظمت و منزلت کے پیش نظر ان کی زندگی میں کوی دوسرا عقد نہیں کیا البتہ ان کے انتقال کے بعد مختلف اوقات میں مختلف قبائل میں چند عقد کئے ان ازواج سے متعدد اولادیں ہوئیں۔ حضرت کی ازواج و اولاد کی تفصیل یہ ہے:۔

حضرت فاطمہ زہرا صلواۃ اللہ وسلامہٗ علیہا:۔ ان کے بطن اطہر سے ۱۵ رمضان المبارک ۳ھ میں امام حسنؑ اور ۳ یا ۵ شعبان المعظم ۴ھ میں امام حسینؑ پیدا ہوے۔ تاریخ میں ایک تیسرے صاحبزادے کا بھی ذکر آتا ہے جن کا نام محسن تھا۔ بعض کے نزدیک وُہ صغر سنی میں انتقال کر گئے اور بعض کے نزدیک قبلِ ولادت ایک حادثہ میں ساقط ہو گئے۔ یہ حادثہ تاریخ اسلام کا ایک المیہ ہے جو وفاتِ پیغمبرؐ کے ایک آدھ دن بعد پیش آیا۔ اور دوُ صاحبزادیاں پیدا ہوئیں ایک زینب کبریٰ جن کا لقب عقیلہ تھا اور ایک زینب صغریٰ جن کی کنیت ام کلثوم تھی۔ جناب زینب کبریٰؑ کی شادی عبداللہ ابن جعفر سے ہوی اور جناب ام کلثوم کا

عقد محمد ابن جعفر سے ہُوا۔

امامہ بنت ابی العاص ۔ حضرتؑ نے جناب سیدہؑ کی وصیت کے مطابق اِن سے عقد کیا۔ اِن کے بطن سے محمد الاوسط متولّد ہُوئے جو جنگِ کربلا میں لڑ کر شہید ہُوئے۔

ام البنین بنت حزام کلابیہ۔ امیرؑ المومنین نے اپنے بھائی عقیل سے کہا کہ آپ انساب عرب سے خوب واقف ہیں۔ میرے لئے ایسی خاتون کا انتخاب کیجئے جو عرب کے شجاع و بہادر خاندان سے تعلّق رکھتی ہو تاکہ اس سے جو اولاد ہو وُہ بھی دلیر و شجاع ہو۔ عقیل نے کہا کہ آپ ام البنین کلابیہ سے عقد کریں کیونکہ اُن کے آباؤ اجداد سب کے سب عرب کے مانے ہُوئے دلیر اور شجاع گزرے ہیں۔ چنانچہ حضرتؑ نے ام البنین سے عقد کیا جن سے چار فرزند پیدا ہُوئے عباس، عبداللہ، عثمان اور جعفر۔ عباس ۲۶ھ میں پیدا ہُوئے اور اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ پھر عبداللہ پیدا ہُوئے پھر عثمان جو عبداللہ سے دو برس چھوٹے تھے اور پھر جعفر جو عثمان سے دو برس چھوٹے تھے۔ یہ چاروں کے چاروں کربلا میں یزیدی لشکر کی خون آشام تلواروں سے شہید ہُوئے۔

لیلیٰ بنت مسعود دارمیہ۔ ابن اثیر نے کامل میں اور ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے کہ ان کے بطن سے دو صاحبزادے ابوبکر اور عبیداللہ پیدا ہُوئے اور بعض نے اِن دونوں کو ایک ہی قرار دیا ہے۔ شیخ عباس قمی نے منتہی الآمال میں تحریر کیا ہے کہ ان سے محمد الاصغر اور ابوبکر پیدا ہُوئے۔ سیّد محسن امین نے اعیان الشیعہ میں لکھا ہے کہ بظاہر یہ دونوں ایک ہی ہیں۔ محمد الاصغر نام ہے اور ابوبکر کنیت ہے۔ شیخ مفید رحمہ اللہ نے بھی اسے کنیت ہی قرار دیا ہے۔ یہ بھی جنگ کربلا میں شہید ہُوئے۔

اسماء بنت عمیس خثعمیہ۔ ابن اثیر نے کامل میں تحریر کیا ہے کہ محمد الاصغر انہی کے بطن سے متولّد ہُوئے ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے کہ ان سے یحییٰ اور عون پیدا ہُوئے۔ یحییٰ حضرتؑ کی زندگی ہی میں انتقال کر گئے اور عون معرکۂ کربلا میں شہید ہُوئے۔

ام حبیب صہبا بنت ربیعہ تغلبیہ۔ ان کے بطن سے ایک صاحبزادہ عمر الاطرف اور ایک صاحبزادی رقیہ کبریٰ جڑواں پیدا ہُوئے۔ رقیہ کبریٰ، مسلم ابن عقیل سے بیاہی گئیں۔

خولہ بنت جعفر حنفیہ۔ ان کے بطن سے محمد پیدا ہُوئے جو ابنِ حنفیہ کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کی کنیت ابوالقاسم تھی۔ ۸۱ھ میں طائف میں وفات پائی۔

ام سعید بنت عروہ ثقفیہ۔ ابنِ شہر آشوب نے تحریر کیا ہے کہ ان کے بطن سے نفیسہ، زینب صغریٰ، اور رقیہ صغریٰ متولّد ہوئیں۔ اور سیّد محسن امین نے لکھا ہے کہ ان سے ام الحسن اور ام کلثوم صغریٰ پیدا ہوئیں اور بعض نے لکھا ہے کہ ام کلثوم نفیسہ ہی کی کنیت تھی۔

ام شعیب مخزومیہ۔ ابن شہر آشوب نے لکھا ہے کہ ام الحسن اور رملہ دو صاحبزادیاں ان سے پیدا ہوئیں۔

مخباۃ بنت امرأ القیس ۔ ان سے ایک صاحبزادی پیدا ہوئیں جو بچپن میں وفات پا گئیں۔
اِن ازواج کے علاوہ متعدد کنیزیں بھی تھیں جن سے چند لڑکیاں پیدا ہوئیں جن کے نام یہ ہیں:۔ ام ہانی، میمونہ، زینب صغریٰ، رملہ صغریٰ، فاطمہ امامہ خدیجہ، ام الکرام ام سلمہ ام جعفر، جمانہ اور نفیسہ۔
حضرت کی شہادت کے وقت امامہ، اسماء بنت عمیس اور ام البنین ازواج میں سے اور اٹھارہ کنیزیں موجود تھیں آپ کی اولاد امجاد امام حسنؑ، امام حسینؑ، محمد ابن حنیفہ عباس اور عمر الاطرف سے چلی۔ اولاد ذکور واناث کی تعداد بعض نے پچیس بعض نے ستائیس بعض نے اٹھائیس بعض نے تینتیس اور بعض نے چھتیس تک لکھی ہے۔
اس اختلاف کی بظاہر وجہ یہ ہے کہ بعض نے نام اور کنیت کو دیکھتے ہوئے دو الگ الگ اولادیں قرار دے لیں۔ اور بعض نے انہیں ایک ہی شمار کیا۔ اسی طرح بعض نے محسن کو شمار کیا ہے اور بعض نے شمار نہیں کیا۔

تعمیر مسجد و فتح باب

پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ میں نزول اجلال فرمانے کے بعد سات ماہ تک ابوایوبؓ انصاری کے مکان پر قیام فرما رہے۔ اس عرصہ میں نہ نماز کے لئے کوئی جگہ مخصوص تھی اور نہ رہائش کے لئے کوئی مستقل منزل تھی۔ آپؐ نے گھر کی تعمیر کے ساتھ مسجد کی تعمیر بھی ضروری سمجھی اور ابوایوب کے مکان سے متصل ایک افتادہ زمین جس میں مویشی بندھے رہتے تھے تعمیر مسجد کے لئے منتخب فرمائی۔ یہ زمین جناب عبدالمطلب کے ننھیال بنی نجار کی تھی۔ آنحضرتؐ نے اُن سے بہ قیمت خریدنا چاہی مگر انہوں نے قیمت لینے سے انکار کر دیا اور زمین کی پیشکش کرتے ہوئے کہا کہ ہم قیمت کے بجائے ثواب اُخروی چاہتے ہیں۔ آنحضرتؐ نے اُسے قیمت ادا کئے بغیر لینا گوارا نہ کیا کیونکہ دراصل وُہ زمین بنی نجار کے دو یتیم بچوں کی تھی جن کے نام سہل اور سہیل تھے اور اسعد ابن زرارہ کی زیر تربیت تھے۔ آنحضرتؐ نے اسعد کے ذریعہ وُہ زمین بہ قیمت خرید فرمائی اور اُسے ہموار کر کے اس پر مسجد کی تعمیر شروع کر دی جو چند دنوں میں قد آدم چار دیواری کی صُورت میں تیار ہو گئی اور بعد میں لکڑی کے کھمبے کھڑے کر کے اس کے ایک حصّہ پر گھاس پھونس کی چھت ڈال دی گئی۔ مسجد کی ایک سمت ازواج کے لئے دو حجرے بھی تعمیر کئے گئے جن میں حسب ضرورت بعد میں اضافہ ہوتا رہا۔ انہی حجروں کے وسط میں علی ابن ابی طالبؑ کا گھر تعمیر کیا گیا اور مکّہ سے آنے والے مہاجرین نے بھی مسجد کی دوسری سمتوں میں گھر بنا لئے۔ ان گھروں کے دروازے مسجد میں کھلتے تھے اس لئے مسجد ہی کی طرف سے اُن کی آمد و رفت تھی اور لوگ جس حالت میں ہوتے اُدھر سے آتے جاتے اور اسی سے گزرگاہ کا کام لیتے رہے۔ پیغمبر اکرمؐ نے اسے مسجد کی تقدیس کے منافی سمجھتے ہوئے حکم دیا کہ مسجد کی طرف کھلنے والے تمام دروازے بند کر دیئے جائیں صرف حضرت علیؑ کو اجازت دی کہ وُہ اپنے گھر کا دروازہ مسجد کی طرف کھلا رکھیں اور اُدھر ہی سے آیا جایا کریں۔ ترمذی نے تحریر کیا ہے:۔

انّ النبیؐ امر بسدّ الابواب الا باب علیؑ۔ (صحیح ترمذی ج۲۔ ص۲۱۴)	پیغمبرؐ نے حکم دیا کہ علیؑ کے دروازے کے علاوہ تمام دروازے بند کر دیئے جائیں۔

یہ حکم بعض طبیعتوں پر شاق گزرا۔ کچھ پیشانیوں پر بل پڑے، کچھ زبانیں کھلیں اور آپس میں چہ گوئیاں ہونے لگیں۔ پیغمبرؐ اکرم کو صحابہ کی اس ناگواری کا علم ہوا تو آپ نے انہیں جمع کر کے فرمایا:۔

ما انا سددت ابوابکم و لا فتحت باب علیؑ ولکن اللّٰہ سدّ ابوابکم وفتح باب علیؑ (خصائص نسائی۔ ص۳۴)	میں نے تمہارے دروازوں کو بند نہیں کیا اور نہ میں نے علیؑ کے دروازہ کو کھلا رہنے دیا ہے بلکہ اللہ نے تمہارے دروازوں کو بند کیا ہے اور علیؑ کے دروازہ کو کھلا رہنے دیا ہے۔

آنحضرتؐ کے بعض عزیزوں نے بھی چاہا کہ ان کے گھروں کے دروازے کھلے رہیں۔ چنانچہ انہوں نے شکوہ کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے علیؑ کو اجازت دے دی ہے اور ہمیں منع کر دیا ہے۔ آپ نے فرمایا:۔

ما انا اخرجتکم واسکنتہ ولکن اللّٰہ اخرجکم واسکنہ (مستدرک حاکم۔ ج۳۔ ص۱۱)	میں نے نہ تمہیں نکالا ہے اور نہ علیؑ کو ٹھہرایا ہے بلکہ اللہ تعالےٰ نے تمہیں نکالا ہے اور علیؑ کو ٹھہرایا ہے۔

حضرت عمر بھی اسے امیر المومنینؑ کے امتیازی خصوصیات میں سے شمار کرتے ہوئے کہا کرتے تھے:۔

لقد اعطی علی ابن ابی طالب ثلاث خصال لان تکون لی خصلۃ منہا احب الی من ان اعطی حمر النعم قیل وماھن یا امیر المومنین؟ قال تزوجہ فاطمۃ بنت رسول اللّٰہ وسکناہ المسجد مع رسول اللّٰہ یحل لہ فیہ ما یحل لہ والرایۃ یوم خیبر۔ (مستدرک حاکم۔ ج۳۔ ص۱۲۵)	علی ابن ابی طالبؑ کو تین۳ ایسی خصوصیتیں حاصل تھیں کہ اگر ان میں سے ایک بھی مجھے حاصل ہوتی تو وہ مجھے سُرخ بالوں والے اونٹوں سے زیادہ پسند ہوتی۔ پوچھا گیا کہ اے امیر المومنین وہ خصوصیتیں کیا ہیں؟ کہا ایک تو یہ کہ فاطمہؑ بنتِ رسولؐ اللہ اُن کے عقد میں آئیں، دوسرے یہ کہ انہیں رسولؐ اللہ کے ساتھ مسجد میں رہائش پذیر ہونے کا شرف حاصل ہوا اور جو امور رسولؐ کے لئے اس میں جائز تھے وہ اُن کے لئے بھی جائز قرار پائے اور تیسرے یہ کہ انہیں خیبر کے دن علم دیا گیا۔

ابراہیم حموینی نے فرائد السمطین میں تحریر کیا ہے کہ حدیث فتح باب کو تقریباً تیس۳۰ صحابہ نے روایت کیا ہے اور اسے امیر المومنینؑ کی منقبت خاصّہ قرار دیا ہے مگر کتب اہلسنّت میں جہاں یہ روایت درج ہے

وہاں یہ روایت بھی ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا:۔

لا تبقین فی المسجد خوخۃ الا خوخۃ ابی بکر۔	ابوبکر کی کھڑکی کے علاوہ مسجد میں اور کوئی کھڑکی باقی نہ رہے۔"

جب پہلی روایت کی تضعیف یا اس سے انکار کی گنجائش نہ نکل سکی تو ان دونوں روایتوں میں تطبیق دینے کی کوشش کی گئی اور یہ کہا گیا کہ پہلی روایت ہجرت کے سال اول کا واقعہ ہے اور دوسری روایت کا تعلق پیغمبرؐ کے آخری زمانۂ حیات سے ہے یعنی آنحضرتؐ نے جب پہلی مرتبہ دروازوں کے چنوانے کا حکم دیا تو حضرت علیؑ کے علاوہ سب کے دروازے چنوا دیئے۔ اور جب وقتِ وفات قریب آیا تو حضرت ابوبکر کے دریچہ کے علاوہ تمام دریچے بند کرا دیئے اور اس طرح یہ سمجھ لیا گیا کہ دونوں روایتوں کی گرہ کشائی ہو گئی۔ لیکن دو مختلف روایتوں میں تطبیق کی ضرورت تو وہاں پر ہوتی ہے جہاں دونوں روایتوں کا پلہ سنداً اور درایۃً برابر ہو اور یہاں دوسری روایت غریب ہونے کے علاوہ درایت کے بھی سراسر خلاف ہے اس لئے کہ حضرت ابوبکر کا کوئی مکان مسجد سے متصل تھا ہی نہیں کہ کھڑکی کے کھلا رکھنے یا بند کرنے کی نوبت آئے وُہ ہجرت کے بعد بنی عبد عوف کے ہاں مقیم ہُوئے اور پیغمبرؐ کے آخر زمانۂ حیات میں مدینہ سے باہر ایک گاؤں سنخ میں رہتے تھے جو مسجد سے ایک میل کے فاصلہ پر تھا۔ اور پیغمبرؐ کے زمانۂ علالت میں انہیں دیکھنے کے لئے وہیں سے آتے تھے اور پھر وہیں چلے جاتے تھے۔ چنانچہ مورخ طبری نے لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر پیغمبرؐ کی وفات کے دن مدینہ آئے اور پیغمبرؐ کی حالت دیکھی کہ:۔

قد افاق من وجعہ فرجع ابوبکر الی اھلہ بالسنح۔ (تاریخ طبری ج۲۔ ص۴۴۲)۔	آنحضرتؐ کو درد سے افاقہ ہے تو وُہ سنخ میں اپنے گھر والوں کے پاس چلے گئے۔"

حیرت ہے کہ جب وُہ مقام سنخ میں رہتے سہتے تھے اور وفاتِ پیغمبرؐ کے موقع پر بھی مدینہ میں موجود نہ تھے اور نہ مسجد سے متصل ان کا کوئی مکان تھا تو کھڑکی کہاں سے لائی گئی اور کہاں نصب کی گئی۔ اور پھر جبکہ یہ واقعہ پیغمبرؐ کے آخری ایام کا بتایا جاتا ہے جیسا کہ ترمذی کے حواشی پر تحریر ہے کہ آنحضرتؐ کی وفات میں تین دن یا اس سے کم دن باقی ہوں گے کہ آنحضرتؐ نے تمام کھڑکیوں کو بند کرنے اور حضرت ابوبکر کی کھڑکی کے کھلا رہنے کا حکم دیا تو اس بنا پر جمعہ یا ہفتہ کے دن یہ فرمان نبوی صادر ہوا ہوگا اس لئے کہ پیر کے دن آنحضرتؐ کی وفات ہُوئی ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہے کہ یہ حکم واقعہ قرطاس کے بعد کا ہے کیونکہ واقعۂ قرطاس جمعرات کو ہُوا جبکہ پیغمبرؐ نے صحابہ کو باہمی نزاع اور شور و شغب سے منع کیا اور انہیں اُٹھ جانے کا حکم دیا۔ اگر کاغذ اور قلم کے طلب کرنے پر پیغمبرؐ کے لئے اختلال حواس تجویز کیا جا سکتا ہے تو اس کے بعد والے حکم کے لئے کیوں یہ رائے قائم نہیں کی گئی جبکہ گھر کے بغیر کھڑکی کے کھلا رکھنے کا حکم سمجھ میں آنے والی بات ہی نہیں ہے۔

یہ روایت خلاف درایت ہونے کے علاوہ لفظاً و معناً مضطرب بھی ہے اس لئے کہ کہیں لفظ خوخہ (کھڑکی) ہے اور کہیں لفظ باب (دروازہ) ہے اور دونوں کا مفہوم الگ الگ اور معنی جُدا جُدا ہیں یہ اضطراب و اختلاف روایت کو مشکوک اور پایۂ اعتبار سے ساقط کرنے کے لئے کافی ہے اور درصورتیکہ روایت میں لفظ خوخہ کے بجائے باب تسلیم کیا جائے تو دونوں روایتوں میں تطبیق کی جو صُورت پیدا کی گئی ہے وُہ یہاں منطبق نہ ہوسکے گی اس لئے کہ اگر پیغمبر اکرمؐ نے ابتدائے زمانۂ ہجرت میں حضرت علیؑ کے علاوہ سب کے دروازے چنوا دیئے تھے تو آخری ایام میں تمام دروازوں کے بند کرتے اور حضرت ابوبکر کے دروازہ کو کُھلا رکھنے کا حکم دینا کیا معنی رکھتا ہے جبکہ بشمول ابوبکر سب کے دروازے چنوا دیئے گئے تھے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ ابتداء ہی میں دونوں کے دروازوں کو کُھلا رکھنے کا حکم دیا تھا تو یہ روایات و واقعات کے سراسر خلاف ہے۔ اور اگر ایسا ہوتا تو جنہوں نے فتح باب کے سلسلہ میں حضرت علیؑ کا ذکر کیا ہے وُہ حضرت ابوبکر کا بھی ذکر کرتے اور حضرت عمر بھی اسے علیؑ کے خصوصیات و امتیازات میں سے قرار نہ دیتے۔

اس امر پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ دُوسروں کے دروازوں کو چنوانے اور علیؑ کے دروازہ کو کھلا رکھنے میں کیا مصلحت کارفرما تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کی غرض و غایت مسجد کی تقدیس و پاکیزگی کا اظہار تھا چونکہ صحابہ کے گھروں کے دروازے صحنِ مسجد میں کُھلتے تھے اور وُہ ادھر ہی سے ہر حالت میں آتے جاتے تھے اور یہ امر مسجد کی تقدیس کے منافی تھا لہٰذا پیغمبرؐ نے مسجد میں کُھلنے والے تمام دروازے چُنوا دیئے تاکہ مسجد ظاہری و باطنی نجاستوں سے پاک رہے اور لوگ حالتِ جنابت میں اُدھر سے گزرنے اور اس میں ٹھہرنے نہ پائیں۔ اور چونکہ حضرت علیؑ کی یہ خصوصیت خاصہ تھی کہ وُہ طیّب و طاہر اور ظاہری و معنوی نجاستوں سے پاک تھے اس لئے اُن کے لئے کسی حالت میں مسجد میں آنے جانے اور اس میں ٹھہرنے کی ممانعت نہ تھی جس طرح کہ خود پیغمبر اکرمؐ کے لئے کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ چنانچہ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے:۔

یا علیؑ لا یحل لاحد ان یجنب فی ھٰذا المسجد غیری و غیرك۔ (مشکوٰۃ ص۵۶۴)	اے علیؑ اس مسجد میں میرے اور تمہارے علاوہ کسی کے لئے حالتِ جنب میں ہونا جائز نہیں ہے“۔

اسی طہارت و تقدیس کی بناء پر اوروں کے دروازے چنوا دیئے اور اپنا اور علیؑ کا دروازہ کھلا رہنے دیا اور جس طرح حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کے گھر کو ان کے لئے مسجد قرار دیا گیا تھا اسی طرح پیغمبرؐ اور وصیؑ پیغمبرؐ کے لئے جو مثیلِ موسیٰؑ و ہارونؑ تھے مسجد کو قیام گاہ قرار دیا گیا۔ چنانچہ ارشادِ نبویؐ ہے:۔

اِنّ اللہ امر موسیٰ ان یبنی مسجداً طاھراً لا یسکنہ الا ھو و ھارون و انّ اللہ	خداوند عالم نے حضرت موسیٰؑ کو حکم دیا کہ وُہ ایک پاک و پاکیزہ مسجد تعمیر کریں اور اس میں موسیٰؑ اور ہارونؑ کے علاوہ کوئی اور سکونت اختیار نہ

امرنی ان ابنی مسجدا طاھرا لایسکنہ الا انا وعلیؑ و ابناء علیؑ۔
(خصائص سیوطی۔ ص۲۴۳)۔

کرے اور مجھے بھی اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ میں ایک پاکیزہ مسجد تعمیر کروں جس میں میرے اور علیؑ اور اُن کے دونوں بیٹوں کے علاوہ کوئی اور رہائش نہ رکھے۔"

جب یہ امر صرف پیغمبرؐ، علیؑ اور اُن کی اولاد اطہار کے لئے مخصوص تھا اور کوئی اس شرف و پاکیزگی میں اُن کا شریک و سہیم نہ تھا تو کسی اور کے لئے دروازہ یا کھڑکی کے کھُلا رکھنے کی اجازت کیونکر دی جا سکتی تھی۔ اگر حضرت ابوبکر کو بھی یہ خصوصیت حاصل ہوتی تو البتہ اُن کے لئے بھی دروازہ یا کھڑکی کا کھلا رکھنا تجویز ہو سکتا تھا۔ مگر جب وُہ اس خصوصیت کے حامل ہی نہ تھے تو اُن کے لئے کھڑکی یا دروازہ کے کھُلا رکھنے کے معنی ہی کیا ہیں جبکہ وُہ حکم عمومی کے ماتحت ادھر سے گزرنے کے مجاز نہ تھے۔ اور پھر لفظ خوخہ کے معنی کھڑکی کے کب ہیں کہ اُدھر سے آنے جانے کی صُورت پیدا کی جا سکے بلکہ اس کے معنی روشندان کے ہیں جیسا کہ فیروز آبادی نے قاموس میں لکھا ہے: کوۃ تودی الضوء الی البیت۔ "وُہ سُوراخ جس سے گھر کے اندر روشنی آتی ہے۔" اور عادۃً روشندان سے گزرگاہ کا کام کس طرح لیا جا سکتا ہے جبکہ روشندان دیوار کے بالائی حصّہ میں ہوتا ہے۔ لہٰذا جب روشندان سے آمد و رفت ہی نہیں ہو سکتی تو پھر اس سے کون سی فضیلت کا اثبات مقصود ہے۔

عہدِ نبویؐ کے غزوات

آنحضرتؐ بعثت کے بعد تیرہ برس تک مشرکین مکہ کے مظالم سہتے رہے۔ اور جب مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ میں تشریف فرما ہُوئے تو کفار و مشرکین کے خلاف انتقامی کارروائی کا کوئی تصوّر آپؐ کے ذہن میں نہ تھا لیکن مشرکین قریش جو اپنے منصوبوں کی ناکامی پر پیچ و تاب کھا رہے تھے اور آنحضرتؐ کے جان بچا کر نکل جانے پر کفِ افسوس مل رہے تھے فتنہ و شورش کے لئے اُٹھ کھڑے ہُوئے اور مسلمانوں کو گھر سے بے گھر کرنے کے بعد انہیں اطمینان و جمعیت خاطر سے محروم کرنے اور اسلام کی توسیع و ترقی کو روکنے کے لئے حرب و پیکار پر اُتر آئے اور اس بے سرو ساماں جماعت کو اپنی طاغوتی طاقتوں سے کچلنے کا تہیہ کر لیا۔ پیغمبرؐ اسلام جنہوں نے مکّہ میں پُر امن طریقہ سے ذہنی انقلاب پیدا کرنا چاہا تھا اور مدینہ میں قبائل یہود سے صلح و امن کا تحریری معاہدہ کیا تھا وُہ قریش کی شرانگیزیوں کے باوجود یہ نہیں چاہتے تھے کہ جنگ کی نوبت آئے اور کشت و خون کی گرم بازاری ہو۔ مگر قریش کی شرپسندی و فتنہ انگیزی نے جب مسلمانوں کے سکون و اطمینان کو ختم کر دینا چاہا اور جنگ ان کے سروں پر مسلط کر دی تو اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ جارحانہ حملوں کے خلاف مدافعانہ قدم اُٹھایا جائے۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے اس وقت تک جنگ کا نام نہیں لیا اور نہ کسی کو لڑنے بھڑنے کی اجازت دی جب

تک قریش و یہود نے آپ کو جنگ کے لئے مجبور نہیں کر دیا اور قدرت نے کفار کے بڑھتے ہوئے ظلم و تشدد کو روکنے کے لئے جہاد کی اجازت نہیں دے دی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا و ان اللہ علیٰ نصرھم لقدیر

جن (مسلمانوں) کے خلاف (کافر) لڑا کرتے ہیں اب انہیں بھی جنگ کی اجازت ہے اس بناء پر کہ ان پر مظالم ہوئے اور یقیناً اللہ تم ان کی مدد پر قادر ہے۔"

یہ بات ڈھکی چھپی ہوئی نہیں ہے کہ کفار نے پہلے مسلمانوں کو جلاوطن کیا اور پھر ان کے ٹھکانوں پر حملہ آور ہو کر انہیں ختم کرنے کی ٹھان لی۔ اس صورت میں اگر ان کے خلاف اعلانِ جنگ نہ کیا جاتا تو خود مسلمانوں کی ملی بقا خطرہ میں پڑ سکتی تھی۔ بیشک اسلام امن و سلامتی کا محافظ اور صلح و آشتی کا پیغامبر ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ دشمن کی چیرہ دستیوں اور شورش انگیزیوں کو دیکھتے ہوئے خاموش رہا جائے اور انہیں من مانی کارروائیاں کرنے کی کھلی چھٹی دے دی جائے۔ اللہ نے مظلوم و ستم رسیدہ لوگوں کو حق دیا ہے کہ وہ دشمن کی بڑھتی ہوئی ستیزہ کاریوں کے انسداد اور اپنی جان و مال کے تحفظ کے لئے امکانی جدوجہد کریں اور جس جماعت سے جینے اور سانس لینے تک کا حق چھین لیا جائے اور اسے تباہی و ہلاکت کے گڑھے میں دھکیلنے کا فیصلہ کر لیا جائے اس کے لئے جنگ کے علاوہ چارۂ کار ہی کیا رہ جاتا ہے۔ اگر جنگ مذموم اور قابلِ نفرت ہے تو اس امرِ مذموم کے ارتکاب کا الزام اس پر عائد ہو گا جس نے از خود جنگ چھیڑ کر انسانی حقوق پر دست درازی کی ہو اور کمزور و ناتوان کو اپنے مظالم کا نشانہ بنایا ہو۔ لیکن جو مظلوم کی حمایت فتنہ کے انسداد جماعتی حقوق کے تحفظ اور اعتقاد و عمل کی آزادی کے لئے دشمن سے ٹکرائے وہ ہرگز ہرگز موردِ الزام قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اسلام "سلم" سے مشتق ہے جس کے معنی 'صلح' کے ہیں۔ اس نام ہی سے ظاہر ہے کہ اسلام بنیادی طور پر خونریزی کا مخالف، حرب و پیکار کا دشمن اور تمام عالم کے لئے امن و سلامتی کا پیغام ہے اور اس میں رنگ و نسل اور قوم و وطن کے تعصب اور عقائد کے اختلاف کی بناء پر فوج کشی و صف آرائی کی قطعاً گنجائش نہیں ہے اور نہ ملک گیری کو اسلام اور اسلامی تعلیمات سے دور کا واسطہ ہے۔ اسلام صرف دو صورتوں میں جنگ کی اجازت دیتا ہے۔ ایک یہ کہ دشمن مسلمانوں کے استیصال کے لئے مرکزِ اسلام پر حملہ آور ہو اور جنگ کے بغیر جان و مال اور ناموس کا تحفظ ممکن نہ ہو۔ اور دوسری صورت یہ کہ دشمن جنگی تیاریوں میں سرگرم عمل ہو اور ڈھیل دینے کی صورت میں اس کی عسکری قوت و مادی وسائل کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہو۔ چنانچہ انہی دو صورتوں میں جبکہ جنگ ناگزیر تھی پیغمبر اسلام نے علمِ جنگ بلند کیا اور مسلمانوں کو اجازت دی کہ وہ حفاظتِ خود اختیاری اور حیاتِ ملی کے قیام و بقا کے لئے دشمن سے لڑیں۔ اگرچہ ابتداء میں مسلمان کفار کے مقابلہ میں ہر لحاظ سے کمزور تھے مگر دشمن کی کثرت و قوت اور اپنی بے سروسامانی کے باوجود میدان حرب و ضرب میں اتر آئے کبھی بدر کے کنوؤں پر ان سے ٹکرائے کبھی احد کی پہاڑیوں میں لڑے اور کبھی مدینے کے

حدود میں رہ کر مدافعت کی۔ یہ مقامات محل وقوع کے لحاظ سے دار الاسلام مدینہ سے قریب اور دار الکفر مکّہ سے فاصلہ پر واقع ہیں۔ ان جنگی محاذوں کا نقشہ دیکھ کر ہر با بصیرت انسان بآسانی فیصلہ کر سکتا ہے کہ جارحانہ اقدام کس کی طرف سے ہوا اور مدافعانہ قدم کس نے اٹھایا۔ اگر اسلام کا اقدام جارحانہ ہوتا تو جنگوں کی جائے وقوع کو دشمن کے مسکن سے قریب ہونا چاہئیے تھا اور مسلمانوں کے محل و مقام سے دور تر۔ لیکن ہر محاذِ جنگ اسلام کے مرکز سے قریب نظر آتا ہے اور کفار کے مرکز سے دور۔ جو اس امر کی واضح دلیل ہے کہ پیشقدمی دشمن کی جانب سے ہوی اور مسلمان ان کی پیشقدمی کو روکنے کے لئے صف آرا ہوئے۔ البتہ خیبر ایک ایسی جگہ ہے جو اسلامی مرکز سے دور اور یہودیوں کی جائے قرار تھی۔ مگر امر واقعہ یہ ہے کہ یہ وہی لوگ تھے جو عہد شکنی کے نتیجہ میں مدینہ سے نکالے گئے تھے اور اب ایک گراں لشکر کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کے لئے پر تول رہے تھے اور اڑوس پڑوس کے قبیلوں سے معاہدہ کر کے جنگی تیاریاں مکمّل کر چکے تھے۔ اگر پیغمبر اسلامؐ پیشقدمی نہ کرتے اور آگے بڑھ کر اُن کا راستہ نہ روکتے تو وُہ جنگی ہتھیاروں اور دل بادل فوجوں کے ساتھ مدینہ پر حملہ آور ہوتے اور مسلمانوں کے لئے اس امنڈتے ہُوئے سیلاب کو روکنا مشکل ہو جاتا۔

اسلام نے اگرچہ ان ناگزیر حالات میں جنگ کی اجازت دی ہے مگر جنگ کے مختلف مراحل آغاز، اثنا، اور اختتام کے لئے ایسے ہدایات دیئے ہیں جو اسلام کی امن پسندی اور انسان دوستی کے آئینہ دار ہیں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے کسی خونریز اقدام سے پہلے دعوتِ اسلام دینا ضروری ہے تاکہ محارب گروہ اگر اسلام سے متاثر نہ بھی ہو تو کم از کم اس پر یہ واضح ہو جائے کہ جنگ کا مقصد انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتارنا، مالِ غنیمت سمیٹنا یا بچے کھچے لوگوں کو غلام بنانا نہیں ہے بلکہ اسلامی تعلیمات کو عام کر کے ایک امن پسند معاشرہ تعمیر کرنا ہے۔ اور جنگ چھڑ جانے کی صُورت میں اپاہجوں، مزدوروں، امن پسندوں، عورتوں، بوڑھوں اور بچوں پر ہاتھ اٹھانے اور اندھا دھند خون بہانے سے منع کیا ہے۔ چنانچہ جنگِ حنین میں جب خالد ابنِ ولید نے ایک عورت کو قتل کر دیا تو آنحضرتؐ نے اپنی خفگی و برہمی کا اظہار کرتے ہُوئے انہیں کہلوا بھیجا کہ وُہ کسی عورت، بچے یا مزدور پر ہاتھ نہ اُٹھائیں۔ ایک مرتبہ پیغمبر اکرمؐ نے صحابہ کو ہدایات دیتے ہُوئے فرمایا کہ جنگ کے دوران مشرکین کے بچوں کو قتل نہ کرنا۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ وُہ تو مشرکوں کی اولاد ہیں۔ فرمایا: اوَ لیس خیارکم اولاد المشرکین "کیا تم میں کے اچھے لوگ مشرکوں کی اولاد نہیں ہیں"۔ اسلام اس کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ دشمن کے سامانِ رسد کھانے پانی وغیرہ میں رُکاوٹ پیدا کی جائے انہیں ضروریاتِ زندگی سے محروم کیا جائے اور بلا وجہ اُن کے باغوں، کھیتوں کو اُجاڑا پھل دار درختوں کو کاٹا اور عمارتوں کو گرایا یا جلایا جائے۔ اسی طرح اسلامی تعلیمات کی رُو سے مقتولین کے اعضاء کی قطع و برید اور انہیں جلانا اور برہنہ کرنا انتہائی ناپسندیدہ عمل ہے۔ اسلام نے مفتوحین و بقیۃ السیف کے ساتھ بھی بہتر طرزِ عمل اختیار کرنے کا حکم دیا ہے اور اُن سے

فدیہ لے کر یا انہیں ممنونِ احسان کرکے چھوڑ دینے کی تعلیم دی ہے۔ اور اگر بعض حالات میں انہیں اسیری و غلامی کی صورت میں رکھنا پڑے تو اُن کے ساتھ خصوصی مراعات کی تاکید کی ہے۔

اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پیغمبر اسلام کے بعد اسلام کے نام پر کچھ جارحانہ جنگیں بھی لڑی گئیں جن میں اخلاقی حدود اور جہاد اسلامی کے شرائط و آداب کو نظر انداز کیا گیا۔ اگرچہ ایک طبقہ نے قہر و غلبہ کو حق کا معیار قرار دے کر اس قسم کی جنگوں کو بھی جہادِ اسلامی میں شامل کر لیا ہے اور قتل و خونریزی کے ذریعہ سے حاصل ہونے والی کامیابی کو حق و صداقت کی کامیابی کا نام دیا ہے۔ مگر اسلام نہ ایسے اقدامات کا حامی ہے اور نہ ان جنگوں کی ذمہ داری اسلام پر عائد ہوتی ہے اس لئے کہ نہ وُہ اسلامی تعلیمات کے زیرِ اثر لڑی گئیں اور نہ اُن میں کوئی اسلامی مفاد مضمر تھا۔ اسلام کا واضح اعلان ہے لا اکراہ فی الدین "دین کے معاملہ میں زبردستی نہیں ہے۔" اور قرآن مجید میں جس قدر آیتیں جہاد کے متعلق وارد ہوئی ہیں وُہ انہی مواقع کے لئے ہیں جہاں دُشمن اسلام کی آواز کو قوت و طاقت سے دبانے اور مُسلمانوں کی جمعیت کو کچلنے کے لئے لشکر کشی کرتا ہے۔ اسلام کی طرف سے نہ جارحانہ اقدام کی اجازت ہے اور نہ زبردستی اپنے عقائد ٹھونسنے کی۔ ان جنگوں کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے تو ان شہنشاہوں پر جنہوں نے ملک گیری و کشور کشائی کے لئے فوج کشی کی اور گرد و پیش کے امن پسند ملکوں کو جہاد کی آڑ میں پامال کیا اور اس طرح امنِ عامہ میں خلل ڈال کر اسلام کی صلح جوئی و امن پسندی کو داغدار کر دیا اور اپنے مردم آزار طرزِ عمل سے کچھ لوگوں کو یہ کہنے کا موقع دیا کہ اسلام کا پھیلاؤ تلوار اور دباؤ کا مرہونِ منت ہے۔

ان تمہیدی کلمات کے بعد عہدِ رسالت کے چند مشہور غزوات کا ذکر کیا جاتا ہے تاکہ ایک طرف ان جنگوں کا دفاعی پہلو اجاگر کیا جا سکے اور دوسری طرف ان غزوات کے فاتح و علمبردار حضرت علیؑ کی مثالی کارکردگی اور عدیم النظیر شجاعت پر روشنی پڑ سکے۔ حضرت علیؑ نے تبوک کے علاوہ تمام جنگوں میں پورے جوش و ولولہ سے حصہ لیا اور اپنی خداداد قوت سے دشمنوں کے پرے اُلٹے مگر کسی مرحلہ پر نہ اخلاقی قیود کو توڑا اور نہ اسلامی حدود کے باہر قدم رکھا۔ چنانچہ نہ کسی عورت اور بچے پر ہاتھ اٹھایا، نہ کسی بھاگنے والے کا پیچھا کیا نہ کسی زخمی پر ہاتھ ڈالا اور نہ کسی کی پردہ دری کی۔ اور تاریخ میں ایسی مثالیں چھوڑ گئے جنہیں ہمیشہ اسلام کی اُصول پرستی، صلح پسندی اور امن دوستی کے ثبوت میں پیش کیا جاتا رہے گا۔

غزوۂ بدر

قریش مسلمانانِ مکہ کے درپے ایذا تو تھے ہی۔ ہجرت کے بعد انصارِ مدینہ بھی ان کے عتاب کی زد میں آ گئے۔ انہوں نے انصارِ مدینہ پر یہ فردِ جرم عائد کی کہ انہوں نے پیغمبرؐ کو اپنے ہاں پناہ دے کر نہ صرف ان کی حمایت و حفاظت کا ذمہ لیا ہے بلکہ اسلام کی روز افزوں ترقی کا بھی سامان کر دیا ہے۔ قریش جس دین کو اپنے ہاں

پھلتا پھولتا نہ دیکھ سکتے تھے وہ کب گوارا کر سکتے تھے کہ اسے کہیں اور ترقی، عروج اور فروغ حاصل ہو اور مسلمان ان کی قاہرانہ گرفت سے نکل کر آزادانہ سانس لیں۔ انہوں نے تہیہ کر لیا کہ وہ اپنے معاشرتی و روایتی آداب و رسوم کے تحفظ کے لئے اس نئے دین کو پنپنے نہ دیں گے اور مسلمانوں کے خلاف اس وقت تک لڑتے رہیں گے جب تک انہیں صفحۂ ہستی سے مٹا نہ دیں یا اسلام سے دستبردار ہونے پر مجبور نہ کر دیں۔ چنانچہ قرآن مجید ان کے عزائم کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

ولا یزالون یقاتلونکم حتی	یہ کفار ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ اُن
یردوکم عن دینکم ان استطاعوا	کا بس چلے تو تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں۔"

یہودِ مدینہ نے اگرچہ پیغمبر اکرمؐ کی آمد پر اُن سے یہ معاہدہ کر لیا تھا کہ اگر مدینہ پر حملہ ہوا تو وہ دشمن کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔ مگر پیغمبرؐ کی بڑھتی ہوئی قوت و طاقت کو دیکھ کر انہیں خود اپنا اقتدار خطرہ میں نظر آیا تو انہوں نے قریش سے رابطہ قائم کر لیا اور قریش نے بھی ان سے گٹھ جوڑ کر کے ایک مشترکہ محاذ بنا لیا اور مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔ چنانچہ فتنہ و باہم آویزی کو ہوا دینے کے لئے کرز ابن جابر فہری نے مدینہ کی چراگاہوں پر حملہ کیا اور اہل مدینہ کے مویشی ہنکا کر اپنے ساتھ لے گیا۔ آنحضرتؐ نے وادیٔ سفوان تک اُس کا پیچھا کیا مگر وہ ہاتھ نہ آیا۔ ان حالات میں ضرورت تھی کہ ان لوگوں کی نقل و حرکت پر نظر رکھی جائے تاکہ بروقت اُن کی فتنہ انگیزیوں کا تدارک کیا جا سکے۔ اسی دیکھ بھال کے لئے آنحضرتؐ نے عبداللہ ابن جحش کو چند آدمیوں کے ہمراہ نخلہ کی جانب روانہ کیا جو مکہ اور طائف کے درمیان ایک مشہور جگہ تھی۔ جب یہ لوگ نخلہ میں وارد ہوئے تو قریش کا ایک قافلہ جو طائف سے مالِ تجارت لے کر آ رہا تھا فروکش ہوا۔ عبداللہ ابنِ جحش کے ہمراہیوں میں سے ایک شخص واقد ابن عبداللہ تمیمی نے عمرو ابن الحضرمی کو تیر مار کر ہلاک کر دیا اور عثمان ابن عبداللہ اور حکم ابن کیسان کو گرفتار کر لیا گیا۔ عبداللہ ابن جحش ان دونوں اسیروں اور قافلہ کے مال و متاع کو سمیٹ کر مدینہ چلے آئے۔ یہ واقعہ چونکہ ماہِ رجب کی آخری تاریخ میں ہوا تھا جس میں جنگ و قتال ممنوع ہے اس لئے آنحضرتؐ نے عبداللہ ابن جحش کو سرزنش کی اور دونوں اسیروں کو آزاد اور قافلہ کا لوٹا ہوا مال واپس کر دیا۔ اگرچہ یہ ایک انفرادی فعل تھا جو پیغمبرؐ کی اجازت کے بغیر سرزد ہوا مگر اس سے قریش کو جنگ چھیڑنے کا بہانہ مل گیا اور انہوں نے ابن الحضرمی کے قصاص کا ڈھنڈورا پیٹ کر جنگی تیاریاں شروع کر دیں اور یہ طے کیا کہ ابوسفیان کی واپسی پر مسلمانوں پر حملہ کر دیا جائے۔ ابوسفیان تجارتی قافلہ لے کر شام گیا ہوا تھا اور اُسے واپسی پر مدینہ کی سمت سے گزرنا تھا کیونکہ مدینہ قریش کے قافلوں کی گزرگاہ تھا۔ ادھر اہل مکہ اس کی واپسی کے منتظر تھے کہ اس نے شام سے پلٹتے ہوئے اہل مکہ کو ضمضم ابن عمرو غفاری کے ذریعہ یہ غلط اور شر انگیز پیغام بھیجا کہ مسلمان دھاوا بول کر مالِ تجارت لوٹنا چاہتے ہیں لہٰذا تم جنگی ہتھیاروں کے ساتھ نکل کھڑے ہو۔ قریش پہلے ہی سے جنگ کے لئے آمادہ تھے فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ادھر ابوسفیان

نے عام راستا چھوڑ کر ساحل سمندر کا راستا اختیار کیا اور پانچ دن میں جدہ اور جدہ سے تین دن میں مکہ پہنچ گیا۔
جب قریش کا لشکر بدر کے قریب پہنچا تو اُسے قافلہ کے صحیح و سالم پہنچنے کی اطلاع ملی۔ بنی زہرہ کے چند آدمیوں نے کہا کہ قافلہ تو آچکا ہے اب جنگ کی کیا ضرورت ہے ہمیں واپس پلٹ جانا چاہئے۔ مگر ابوجہل جنگ سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہ ہُوا اور اپنی ضد پر اڑا رہا۔ ابوجہل کی ضد اور ہٹ دھرمی سے صاف ظاہر ہے کہ قریش کے پیش نظر قافلہ کا بچاؤ نہ تھا بلکہ وُہ ہر حالت میں جنگ چھیڑنا اور اہلِ مدینہ پر تاخت و تاراج کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ قریش کی اس روش کو دیکھ کر بنی زہرہ واپس چلے آئے اور جنگ میں شریک نہ ہُوے۔

مدینہ میں یہ خبر تو عام ہو چکی تھی کہ ابوسفیان کا قافلہ بار بردار اُونٹوں پر سامانِ تجارت لاد کر ادھر سے گزرے گا مگر اس کے ساتھ یہ خبریں بھی پہنچ رہی تھیں کہ لشکرِ قریش پُورے جنگی ساز و سامان کے ساتھ مدینہ پر حملہ آور ہونے کے لئے پر تول رہا ہے۔ مُسلمان کم اور بے سرو سامانی کی حالت میں تھے اور قریش کی مسلح و منظم فوج سے دوبدو ہو کر لڑنے سے بچنا چاہتے تھے اور رہ رہ کر اُن کی نظریں رہگزر کی طرف اُٹھتی تھیں کہ ابوسفیان کے کارواں سے مڈبھیڑ ہو جائے تو بہتر ہے۔ ایک تو گنتی کے چند آدمیوں کا مقابلہ دُشوار نہ ہوگا اور دُوسرے مالِ فراواں آسانی سے ہاتھ لگے گا۔ قرآن اس کی شہادت دیتے ہُوے کہتا ہے:-

واذ یعدکم اللہ احدی الطائفتین انہا لکم و تودون ان غیر ذات الشوکۃ تکون لکم۔	جب اللہ نے تمہیں اطلاع دی کہ کفار مکہ کے دو گروہوں میں سے ایک سے تمہارا سامنا ہوگا اور تم لوگ یہ چاہتے تھے کہ جو قوت و طاقت نہیں رکھتا وُہ تمہارے حصہ میں آئے۔"

عام طور پر مورخین نے اموی ہوا خواہوں کی روایات پر اعتماد کرتے ہُوے یہ لکھ ڈالا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ ابوسفیان کے قافلہ کو لُوٹنے کے ارادہ سے نکلے تھے مگر کاروانِ تجارت کے بجائے اچانک لشکرِ قریش کا سامنا ہو گیا اور جنگ چھڑ گئی۔ بیشک بعض لوگوں کی نظریں مالِ دُنیا پر تھیں اور وُہ قافلہ کو لُوٹنا چاہتے تھے۔ مگر تاریخ نویسوں کی یہ ستم ظریفی ہے کہ انہوں نے پیغمبر اکرمؐ کو بھی اس میں شریک کر لیا اور صرف کارواں کو لُوٹنا ہی اس مہم کا مقصد قرار دے لیا۔ چنانچہ محمد ابن اسمٰعیل بخاری تک نے یہ روایت لکھ دی ہے کہ:-

انما خرج رسول اللہؐ یرید عیر قریش حتی جمع اللہ بینہم و بین عدوھم علی غیر میعاد۔	رسُولؐ اللہ تو قریش کے تجارتی قافلہ کے ارادہ سے نکلے تھے مگر اللہ نے ناگہانی طور پر ان کا اور ان کے دُشمنوں کا سامنا کرا دیا۔"

(صحیح بخاری۔ ج ۳۔ ص ۳)

یہ نظریہ قرآنی تصریحات کے خلاف ہے۔ قرآن مجید میں واقعاتِ بدر کے سلسلہ میں ارشادِ باری ہے:-

کما اخرجک ربک من بیتک	جس طرح تمہارے پروردگار نے تمہیں حق کے ساتھ

بالحق وان فریقا من المومنین لکارھون یجادلونک فی الحق بعد ما تبین کانما یساقون الی الموت وھم ینظرون۔

گھر سے باہر بھیجا اس حالت میں کہ مسلمانوں کا ایک گروہ جنگ سے ناگواری محسوس کر رہا تھا اور حق کے ظاہر ہونے کے بعد حق کے بارے میں تم سے جھگڑ رہا تھا گویا اُن کی آنکھوں کے سامنے انہیں موت کی طرف ڈھکیلا جا رہا ہے۔"

اگر پیغمبر اسلامؐ کا یہ اقدام کارواں کو لوٹنے کی غرض سے ہوتا تو یہ مسلمانوں کی خواہش کے عین مطابق تھا لہٰذا کوئی وجہ نہ تھی کہ وُہ قافلہ سے دوچار ہونے سے گھبراتے، لڑنے بھڑنے سے پہلو بچاتے اور یہ سمجھتے کہ وُہ موت کے مُنہ میں ڈھکیلے جا رہے ہیں جبکہ ابوسفیان کے قافلہ میں چالیس سے زیادہ افراد نہ تھے اور مسلمانوں کی تعداد تین سو سے اُوپر تھی۔ یہ خوف و ہراس اور احساس ناگواری ہو سکتا ہے تو قریش کے لشکر سے جس کے دفاع کی سکت اپنے اندر نہ پاتے تھے۔ قرآن مجید کے اس بیان کی روشنی میں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ آنحضرتؐ کارواں کے تعاقب میں نہیں نکلے تھے بلکہ قریش کی پیش قدمی کی خبر سُن کر صف آرا ہوئے تھے۔ چنانچہ حضرت علیؑ فرماتے ہیں:۔

وکان النبیؐ یتخبر عن بدر فلما بلغنا ان المشرکین قد اقبلوا سار رسول اللہ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم الی بدر وبدر بئر فسبقنا المشرکین الیھا۔ (تاریخ طبری۔ ج۲۔ ص۱۳۳)۔

پیغمبر اکرم صلے اللہ علیہ واٰلہ وسلم بدر کے بارے میں پُوچھا کرتے تھے جب ہمیں معلوم ہُوا کہ مشرکین آگے بڑھ آئے ہیں تو رسُول اللہ صلے اللہ علیہ واٰلہ وسلم بدر کی جانب روانہ ہُوئے۔ بدر ایک کنوئیں کا نام ہے جہاں ہم مشرکین (قریش) سے پہلے پہنچ گئے۔"

یہ کفر و اسلام کے درمیان پہلا معرکہ رونما ہونے والا تھا۔ مسلمان اسلحۂ جنگ کے لحاظ سے کمزور اور کفار کی متوقع تعداد کے مقابلہ میں کم تھے اس لئے پیغمبر اکرم صلے اللہ علیہ واٰلہ وسلم نے ضروری خیال کیا کہ انصار و مہاجرین کا عندیہ معلوم کریں کہ وُہ کہاں تک عزم و ثبات کے ساتھ دشمن کا دفاع کر سکتے ہیں۔ چنانچہ آنحضرت کے استفسار پر لوگوں نے مختلف جوابات دیئے۔ کچھ ہمّت شکن تھے اور کچھ ہمّت افزا۔ صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے جواب پر آنحضرت نے مُنہ پھیر لیا۔ مقداد ابن اسود نے پیغمبر کے چہرے پر تکدر کے آثار دیکھے تو کہا کہ یا رسُولؐ اللہ ہم بنی اسرائیل نہیں ہیں جنہوں نے حضرت موسیٰؑ سے کہا تھا: اذھب انت وربک فقاتلا انا ھھنا قاعدون۔ تم جاؤ اور تمہارا خدا اور تم ہی دونوں لڑو ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔" اس ذات گرامی کی قسم جس نے آپ کو خلعت رسالت پہنایا ہے ہم آپ کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں رہ کر لڑیں گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ آپ کو فتح و نصرت عطا کرے۔ اس

جواب سے پیغمبرؐ کا تکدر جاتا رہا اور آپ نے مقداد کے حق میں دعائے خیر فرمائی۔ پھر انصار کی طرف رُخ کر کے پوچھا کہ تم لوگوں کی کیا رائے ہے؟ سعد ابن معاذ انصاری نے بڑی گرم جوشی سے کہا کہ یا رسولؐ اللہ ہم آپ پر ایمان لائے اور اطاعت کا عہد و پیمان کیا لہذا ہم آپ کے ساتھ ہیں اگر آپ سمندر میں پھاندیں گے تو ہم آپ کے ساتھ پھاندیں گے اور کوئی چیز ہماری راہ میں حائل نہ ہوگی۔ آپ اللہ کا نام لے کر اٹھ کھڑے ہوں۔ ہم میں کی ایک فرد بھی پیچھے نہیں رہے گی۔ پیغمبرؐ اس جواب پر انتہائی خوش ہوئے اور فرمایا:۔

واللہ لکانی انظرالی مصارع القوم۔ (تاریخ طبری۔ ج۲۔ ص۱۴۰) "خدا کی قسم! اب میں دشمن کے گر کر مرنے کی جگہوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں"۔

پیغمبر اکرمؐ تین سو تیرہ آدمیوں کی ایک مختصر جمعیت کے ساتھ جن میں ۷۷ مہاجر اور باقی انصار تھے، مدینہ سے نکل کھڑے ہوئے اور چاہ بدر سے کچھ فاصلہ پر پڑاؤ ڈال دیا۔ یہ اندیشہ تو تھا ہی کہ کہیں دشمن اچانک حملہ نہ کر دے یا رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر شب خون نہ مارے۔ آپ نے پیش بندی کرتے ہوئے حضرت علیؑ، سعد ابن ابی وقاص اور زبیر ابن عوام کو حکم دیا کہ وہ آگے بڑھ کر دشمن کا کھوج ٹھکانا معلوم کریں اور دیکھیں کہ وہ یہاں سے کتنے فاصلہ پر ہیں۔ یہ تینوں دیکھتے بھالتے ہوئے چاہ بدر تک پہنچ گئے وہاں پر چند آدمیوں کو دیکھا جو انہیں دیکھتے ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔ حضرت علیؑ نے تعاقب کر کے ان میں سے دو غلاموں کو پکڑ لیا اور انہیں اپنے ساتھ لے آئے۔ صحابہ انہیں دیکھتے ہی اُن کے گرد جمع ہو گئے اور پوچھا کہ تم کون ہو؟ کہا کہ ہم قریش کے سقے ہیں انہوں نے ہمیں پانی لانے کے لئے بھیجا ہے۔ صحابہ نے قریش کا نام سُنا تو اُن کے تیور بگڑ گئے اور مار پیٹ کر اُن سے یہ کہلوانا چاہا کہ وہ قریش کے غلام نہیں ہیں بلکہ ابوسفیان کے آدمی ہیں۔ انہوں نے ڈر کے مارے کہہ دیا کہ ہم ابوسفیان کے آدمی ہیں۔ پیغمبرؐ نماز میں مشغول تھے۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو کہا کہ یہ عجیب بات ہے کہ وہ سچ بولتے ہیں تو تم انہیں پیٹتے ہو اور جھوٹ بولتے ہیں تو چھوڑ دیتے ہو۔ یہ قریش ہی کے بھیجے ہوئے آدمی ہیں۔ پھر آنحضرتؐ نے اُن سے پوچھ گچھ کی تو انہوں نے ابوسفیان کے قافلہ سے لاعلمی کا اظہار کیا اور یہ بتایا کہ قریش کا لشکر یہاں سے تین میل کے فاصلہ پر موجود ہے آنحضرتؐ نے پوچھا کہ لشکر کی تعداد کیا ہے؟ کہا کہ ہمیں تعداد کا صحیح علم نہیں ہے البتہ کبھی نو اور کبھی دس اونٹ نحر کئے جاتے ہیں۔ فرمایا کہ پھر اُن کی تعداد نو سو سے لے کر ایک ہزار تک ہے۔ پھر دریافت فرمایا کہ ان میں نمایاں و سرکردہ افراد کون کون ہیں؟ انہوں نے چند سرداران قریش کے نام لئے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: هذه مكة قد القت افلاذ كبدها۔ "مکہ نے تو اپنے جگر پاروں کو میدان میں لا ڈالا ہے"۔

قریش کی آمد کی خبر سُن کر لشکر اسلام نے حرکت کی اور چاہ بدر کی جانب روانہ ہو گیا۔ لشکر قریش وادئ بدر کے آخری کنارے پر ریت کے ایک ٹیلے کے پاس پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ ان کی تعداد ایک ہزار کے لگ بھگ تھی اور سات سو اونٹ اور تین سو گھوڑے اُن کے ساتھ تھے اور نیزوں تلواروں اور ہتھیاروں کی کوی

کمی نہ تھی اس کے برعکس مسلمان تعداد میں کم اور سامانِ جنگ کے لحاظ سے انتہائی کمزور تھے۔ ان کے پاس اسلحۂ جنگ میں سے چند تلواریں اور گنتی کی چند زرہیں تھیں اور باربرداری اور سواری کے لئے ستر اونٹ اور دو گھوڑے تھے۔ اور جہاں پڑاؤ ڈالا تھا وہاں زمین کی یہ حالت تھی کہ اس پر پیر رکھتے تھے تو ریت میں دھنس جاتے تھے مگر اللہ کی کارسازی آڑے آئی اور رات کو خوب بارش ہوئی جس سے ریت بھی جم گئی اور پینے کے لئے پانی کی بھی فراوانی ہو گئی۔ اس قدرتی تائید سے مسلمانوں کی ہمت بندھ گئی دل بڑھ گئے اور پوری مجاہدانہ سرجوشی کے ساتھ دشمن سے ٹکرانے کے لئے آمادہ ہو گئے۔

ابن اثیر، طبری اور دوسرے مورخین نے واقعاتِ بدر کے سلسلہ میں یہ روایت درج کی ہے کہ جب پیغمبر اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم وادیٔ بدر میں وارد ہوئے تو سعد ابن معاذ نے کہا کہ یا رسولؐ اللہ ہم کھجور کی شاخوں کا ایک چھپر ڈالے دیتے ہیں آپ اس میں قیام فرمائیں۔ اس چھپر کے قریب آپ کی سواری موجود رہے گی۔ اگر ہم دشمن پر غالب آئے تو بہتر اور اگر ہمیں شکست سے دوچار ہوتے دیکھیں تو آپؐ سواری پر بیٹھ کر مدینہ واپس چلے جائیں وہاں ہماری قوم کے لوگ موجود ہی ہیں وہ آپ کے سینہ سپر رہیں گے۔ اگر انہیں یہ گمان ہوتا کہ آپ کو جنگ سے واسطہ پڑے گا تو وہ کبھی پیچھے نہ رہتے۔ آنحضرتؐ نے سعد کے حق میں دعائے خیر کی اور چھپر بنانے کی اجازت دے دی اور اس میں قیام فرما ہوئے۔

اگر روایات کی جانچ پرکھ میں درایت کا دخل ہے تو آنکھ بند کر کے اس روایت کی صحت پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا کیونکہ نہ واقعاتِ بدر سے اس کی تائید ہوتی ہے اور نہ سیرتِ رسولؐ ہی سے سازگار ہے۔ اوّل تو یہی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ کھجور کی اتنی شاخیں کہاں سے لائی گئیں جن سے چھپر تعمیر ہوا جبکہ بدر کے آس پاس کہیں کھجور کے درخت تھے ہی نہیں۔ چنانچہ ابن ابی الحدید نے تحریر کیا ہے:۔

لا عجب من امر العریش من این کان لهم او معهم من سعف النخل ما یبنون به عریشاً و لیس تلك الارض اعنی ارض بدر ارض نخل۔ (شرح ابن ابی الحدید ج ۳۔ ص ۳۳۰)۔

مجھے عریش (چھپر) کے معاملہ میں بڑی حیرت ہے کہ کھجور کی اتنی شاخیں جن سے چھپر بنایا گیا کہاں سے مہیا کی گئیں جبکہ بدر کی سرزمین پر کھجور کے درخت ہوتے ہی نہ تھے۔"

اگر یہ کہا جائے کہ مدینہ سے لاد کر ساتھ لائے تھے تو یہ بھی بعید ہے کیونکہ باربردار سواریوں کی پہلے ہی کمی تھی اور نہ وہاں سے چلتے وقت چھپر کے تعمیر کرنے کا انہیں کوئی خیال تھا۔ اس کے علاوہ پیغمبرؐ کی سیرت ہمیشہ یہ رہی ہے کہ وہ ہر مرحلہ پر مسلمانوں کے ساتھ اُن کے کاموں میں شریک ہوتے تھے خواہ وہ معمولی سے معمولی کام کیوں نہ ہوتا چنانچہ مسجد کی تعمیر اور جنگ احزاب میں خندق کی کھدائی تک میں حصّہ لیا۔ اور ان کی قیادت و سربراہی کا تقاضا بھی یہ تھا

کہ وُہ مسلمانوں کے شانہ بشانہ سرگرمِ عمل رہیں اس لئے کہ اگر قائد شریکِ عمل نہ ہو تو سعی و عمل کا ولولہ مضمحل ہو جاتا ہے اور اس کی شرکت سے جوش و سرگرمی بڑھ جایا کرتی ہے۔ اور جنگ میں تو کامیابی کا انحصار ہی جوش و ولولہ اور قوتِ معنوی پر ہوتا ہے۔ پھر کیونکر یہ تصوّر کیا جا سکتا ہے کہ آنحضرتؐ نے مسلمانوں کی صفوں میں شامل ہو کر اُن کے جوش و ولولہ اور عزم و ہمّت کو ڈھارس دینے کے بجائے عافیت کوش بن کر ایک گوشہ میں بیٹھ جانا گوارا کیا ہوگا۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ شکست کی صورت میں بقیۃ السّیف کو نرغۂ اعدا میں چھوڑ کر اپنے فرار کا راستا ہموار کر لیا ہوگا حالانکہ اسی جنگ کی کامیابی سے مسلمانوں کی عزّت و عظمت اور اُن کا قومی و ملّی تحفظ وابستہ تھا۔ واقعاتِ بدر شاہد ہیں کہ پیغمبرؐ نے لشکر کی صف بندی کی، میمنہ و میسرہ ترتیب دیا، موقع و محل کے مطابق جنگ کے احکام صادر کئے دشمن کے قتل ہو ہو کر گرنے کے مقامات کی نشاندہی کی اور ایک ماہر و آزمودہ کار سپہ سالار کی طرح فوج کی کمان کی۔ علامہ طبری نے تحریر کیا ہے:۔

رؤی رسول اللهؐ فی اثر المشرکین یوم بدر مصلتا السیف یتلو هذه الآیة "سیهزم الجمع ویولون الدبر"۔ (تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص ۱۴۲)۔	بدر کے دِن پیغمبر اکرمؐ تلوار علم کئے مشرکوں کا پیچھا کرتے دیکھے گئے اور یہ آیت پڑھتے جاتے تھے "عنقریب لشکر شکست کھائے گا اور پیٹھ پھرا کر چل دے گا"۔

یہ تمام امور لشکر سے علیحدہ رہ کر اور ایک چھپر میں بیٹھ کر انجام نہیں دیئے جا سکتے۔ ان امور کی انجام دہی اور فتح و کامرانی کی پیشینگوئی کے بعد جو یقیناً وحیِ الٰہی کی بنا پر تھی فرار کا سامان مہیا رکھنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

امیرالمومنینؑ نے بھی آنحضرتؐ کی سرگرمی و سرجوشی پر روشنی ڈالتے ہُوئے فرمایا ہے:۔

لما ان کان یوم بدر وحضر الناس اتقینا برسول اللهؐ فکان من اشد الناس بأسا وما کان منا احد اقرب الی العدو منه۔ (تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص ۱۳۵)۔	جب بدر کا دِن آیا اور لوگ حاضر ہُوئے تو ہم رسُول اللہؐ کے دامن میں پناہ لیتے تھے آپ کا دبدبہ سب لوگوں سے زیادہ تھا اور ہم سب کی بہ نسبت دُشمن سے زیادہ قریب تھے"۔

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ آنحضرتؐ چھپر کا گوشہ منتخب کرنے یا شکست کی صورت میں فرار کی سبیل ڈھونڈ رکھنے کے بجائے لشکر میں شامل تھے اور کسی خوف و خطر کا احساس کئے بغیر دشمن کی صفوں سے قریب تر تھے۔ اِس روایت کا آخری ٹکڑا کہ "اگر مدینہ میں رہ جانے والوں کو یہ گمان ہوتا کہ آپ کو جنگ سے سابقہ پڑے گا تو وُہ گھروں میں بیٹھے نہ رہتے"۔ اس روایت کی کمزوری کا آئینہ دار ہے اس لئے کہ قرآن مجید میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ گھروں سے نکلتے وقت مسلمانوں کا ایک گروہ ناگواری محسوس کر رہا تھا اور یہ سمجھ رہا تھا کہ اُسے

موت کے منہ میں ڈھکیلا جا رہا ہے"۔ اگر انہیں جنگ کا سان گمان نہ تھا تو یہ خوف و اضطراب کس بنا پر تھا اور کیوں ڈرے سہمے جا رہے تھے۔

قریش کے لشکر میں کچھ افراد ایسے بھی تھے جن کا رویہ پیغمبرؐ کے ساتھ زیادہ معاندانہ نہ رہا تھا اور وہ کفر کے باوجود کچھ نہ کچھ آنحضرتؐ کا پاس و لحاظ کرتے تھے اسی طرح کچھ لوگ اسلام لا چکے تھے اور ابھی تک اعلانِ اسلام نہ کیا تھا یہ لوگ جنگ میں شریک ہونا نہ چاہتے تھے مگر قریش کھینچ تان کر انہیں اپنے ساتھ لے آئے تھے آنحضرتؐ نے ضروری سمجھا کہ جنگ چھڑنے سے پہلے ان لوگوں کے بارے میں لشکرِ اسلام کو متنبہ کر دیں۔ چنانچہ آپ نے فرمایا کہ مجھے معلوم ہے کہ بنی ہاشم اور غیر بنی ہاشم میں سے کچھ افراد اگرچہ لشکرِ کفار میں شامل ہیں مگر وہ ہم سے جنگ و مخاصمت کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ لہٰذا تم میں سے کوئی ابو البختری ابن حارث، عباس ابن عبد المطلب یا کسی ہاشمی کو دیکھے تو اُسے قتل نہ کرے۔ اس لئے کہ وہ جبراً لائے گئے ہیں"۔ پیغمبر اکرمؐ کے اس اعلان پر بعض لوگ تلملائے اور اپنی ناگواری کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ ابو حذیفہ ابن عتبہ نے آنحضرتؐ سے کہا کہ ہم اپنے باپ بیٹوں بھائیوں اور عزیزوں کو تہ تیغ کریں اور عباس کو چھوڑ دیں۔ خدا کی قسم اگر میں اُن سے دو بدو ہُوا تو انہیں قتل کئے بغیر نہیں رہوں گا۔ پیغمبرؐ نے حضرت عمر سے کہا کہ سُنتے ہو یہ ابو حذیفہ کیا کہہ رہا ہے۔ کیا یہ میرے چچا پر تلوار چلائے گا۔ حضرت عمر نے کہا:۔

یا رسولؐ اللہ دعنی فلاضرب عنقہ فواللہ لقد نافق۔	یا رسولؐ اللہ مجھے اجازت دیجئے میں تلوار سے اس کی گردن ماروں خدا کی قسم یہ منافق ہے"۔

(تاریخ طبری۔ ج۲۔ ص۱۵۱)۔

اس ضروری ہدایت کے بعد فوج کی صفیں اور میمنہ و میسرہ ترتیب دے کر انصار کا عَلَم سعد ابن عبادہ کو اور مہاجرین کا رایت علی ابن ابی طالب کو دیا۔ ابن کثیر نے تحریر کیا ہے:۔

دفع النبی الرایۃ یوم بدر الی علیؑ وھو ابن عشرین سنۃ	نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بدر کے دن رایت جنگ علیؑ کو دیا اور اس وقت آپ کی عمر بیس برس کی تھی"۔

(البدایہ والنہایہ۔ ج۷۔ ص۲۲۳)۔

دشمن بھی صفیں باندھے ہتھیار سنبھالے میدان میں اُتر آیا اور عتبہ ابن ربیعہ اس کا بھائی شیبہ اور بیٹا ولید قریش کی صفوں سے نکل کر مبارز طلب ہُوئے۔ مسلمانوں کے لشکر سے عوف ابن حارث معوذ ابن حارث اور عبد اللہ ابن رواحہ مقابلہ کے لئے نکلے۔ عتبہ نے پُوچھا کہ تم کون ہو؟ کہا کہ ہم انصار مدینہ ہیں۔ عتبہ نے پیشانی پر بل ڈال کر کہا کہ تم ہمارے ہم رُتبہ نہیں ہو تم واپس جاؤ۔ اور آنحضرت سے مخاطب ہو کر کہا:۔ یا محمدؐ اخرج الینا اکفاءنا من قومنا۔ "اے محمدؐ ہمارے مقابلہ میں ہمارے ہمسر لوگوں کو بھیجئے جو ہماری قوم میں سے ہوں۔ یہ تینوں اپنی صفوں میں واپس آ گئے۔ آنحضرتؐ نے جب قریش کی یہ متمردانہ ذہنیت دیکھی کہ وہ انصار کو اپنا

حریف و مد مقابل نہیں سمجھتے تو اُن کی جگہ عبیدہ ابن حارث حمزہ ابن عبد المطلب اور علی ابن ابی طالب کو بھیجا۔ عتبہ کا مطالبہ تو یہ تھا کہ اُن کے مقابلہ میں قریش آئیں مگر پیغمبرؐ نے نہ صرف قریش بلکہ عبد المطلب کے جگر پاروں کو منتخب کیا تاکہ کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ پیغمبرؐ نے اپنے قریبیوں اور عزیزوں کو روک کے رکھا اور دوسروں کو جنگ کے شعلوں میں جھونک دیا۔ حالانکہ حضرت عبیدہ ستر سال کے بوڑھے تھے اور حضرت علیؑ ابھی نوخیز تھے اور پہلی مرتبہ ایک نبرد آزما کی حیثیت سے میدان کارزار میں اُترے تھے۔ جب عتبہ کو معلوم ہُوا کہ علیؑ، حمزہ اور عبیدہ لڑنے کے لئے آئے ہیں تو کہا کہ یہ برابر کا جوڑ ہے۔ حضرت عبیدہ، عتبہ سے، حضرت حمزہ شیبہ سے اور حضرت علیؑ ولید سے دو دو ہاتھ کرنے کے لئے آگے بڑھے۔ ولید نے تلوار سونت کر حملہ کرنا چاہا مگر علیؑ نے ایک تیر مار کر اُسے بے بس کر دیا اور اس قابل نہ چھوڑا کہ وُہ حملہ کر سکے۔ تیر کھاتے ہی اپنے باپ عتبہ کے دامن میں پناہ لینے کے لئے دوڑا مگر فرزند ابو طالبؑ نے اس طرح گھیر ڈالا کہ جان توڑ کوشش کے باوجود تلوار کی زد سے بچ نہ سکا اور باپ کی گود میں پہنچنے سے پہلے مَوت کی آغوش میں سوگیا۔ جب امیر المومنینؑ ولید کے قتل سے فارغ ہُوئے تو مسلمانوں نے پکار کر کہا کہ اے علیؑ شیبہ آپ کے چچا حمزہ پر چھایا جا رہا ہے۔ حضرتؑ نے آگے بڑھ کر دیکھا کہ دونوں آپس میں گتھے ہوُئے ہیں تلواریں کند ہو چکی ہیں اور ڈھال کے ٹکڑے بکھرے پڑے ہیں۔ آپؑ نے بڑھ کر شیبہ پر وار کیا اور تلوار سے اُس کا سر اُڑا ڈالا۔ اب حضرت علیؑ اور جناب حمزہ عتبہ کی طرف بڑھے جو جناب عبیدہ سے نبرد آزما تھا۔ دیکھا کہ عبیدہ عتبہ کے ہاتھ سے گھائل ہو کر تاب مقاومت کھو چکے ہیں۔ قریب تھا کہ عتبہ تلوار لے کر جھپٹے اور انہیں شہید کر دے کہ حضرت علیؑ اور حمزہؓ کی تلواریں چمکیں اور اس کا لاشہ خاک و خون میں تڑپتا نظر آنے لگا۔ حضرت عبیدہ شدید زخمی ہو چکے تھے حضرت علیؑ اور حمزہؓ دونوں نے مل کر انہیں اٹھایا اور آنحضرتؐ کی خدمت میں لائے۔ پیغمبرؐ نے دیکھا کہ عبیدہ کا پیر کٹ چکا ہے اور پنڈلی کی ہڈی سے گودا بہہ رہا ہے۔ آپ نے عبیدہ کے سر کو زانو پر رکھا۔ آنکھوں میں آنسو آگئے جو عبیدہ کے چہرے پر گرے۔ اُنہوں نے آنکھیں کھول کر پیغمبرؐ کی طرف دیکھا اور کہا یا رسُولؐ اللہ کیا میں بھی شہیدوں میں محسُوب ہوں گا؟ فرمایا کہ ہاں آپ بھی شہیدوں میں شمار ہوں گے۔ عبیدہ نے کہا کاش آج ابو طالب زندہ ہوتے تو دیکھتے کہ ہم نے اُن کی بات کو جھوٹا نہیں ہونے دیا۔

ونسلمه حتی نصرع دونه وتذهل عن ابناءنا والحلائل

"ہم محمدؐ کو اس وقت دشمنوں کے حوالے کریں گے جب لڑتے ہوئے اُن کے سامنے مر جائیں اور بیوی بچوں کی یاد سے غافل کر دیئے جائیں۔"

عبیدہ میدان بدر سے پلٹتے ہوئے وادیٔ روحا یا صفرا میں انتقال فرما گئے اور وُہیں دفن ہوُئے۔

قریش کے ان مانے ہوُئے سُورماؤں کے قتل سے کفار پر خوف و ہراس چھا گیا۔ ابو جہل نے ان کی ہمت کو پست ہوتے دیکھا تو چیخ چیخ کر انہیں ابھارا اور دم دلاسا دے کر اُن کی ہمت بندھائی۔ طعیمہ ابن عدی کو جوش آیا

اور وُہ فیلِ مست کی طرح جھومتا ہوا نکلا۔ حضرت علیؑ نے اس پر نیزہ مارا جس سے وُہ سنبھل نہ سکا۔ لڑکھڑا کر زمین پر گرا اور کچھ دیر ایڑیاں رگڑنے کے بعد دم توڑ دیا۔ حضرتؑ نے فرمایا:۔

واللہ لایخاصمنا فی اللہ بعد الیوم ابدا۔ (اعلام الورٰی۔ ص۸۹)۔	خدا کی قسم آج کے بعد یہ کبھی اللہ کے بارے میں ہم سے جنگ و خصومت پر نہ اُترے گا"۔

طعیمہ کے بعد عاص ابن سعید ہتھیار سج کر میدان میں اُترا۔ حضرتؑ نے اُسے بھی تلوار کی ضرب سے مَوت کے گھاٹ اُتار دیا۔ پھر عبداللہ ابن منذر اور حرملہ ابن عمر گرجتے دندناتے ہُوئے نکلے۔ اور دونوں حضرت کی تلوار سے لقمۂ اجل ہو گئے۔ اسی طرح حنظلہ پیچ و تاب کھاتا ہُوا نکلا۔ حضرتؑ نے اس کے سر پر تلوار کا ایسا بھر پور ہاتھ چلایا کہ اس کا سر دو پارہ ہو گیا آنکھیں حلقۂ ہائے چشم سے باہر آ گئیں اور تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ یہ حنظلہ ابو سفیان کا بیٹا اور معاویہ کا بھائی تھا اور اس سے پہلے اس کا نانا عتبہ اور ماموں ولید حضرت کے ہاتھ سے مارے جا چکے تھے۔ چنانچہ حضرتؑ کے دورِ خلافت میں جب معاویہ نے انہیں جنگ کی دھمکی دے کر مرعوب کرنا چاہا تو آپ نے معاویہ کو اس کے نانا، ماموں اور بھائی کا انجام یاد دلاتے ہُوئے تحریر فرمایا تھا:۔

فانا ابو الحسن قاتل جدک	میں (کوئی اور نہیں) وہی ابو الحسن ہوں جس نے
وخالک واخیک شدخا	تمہارے نانا عتبہ تمہارے ماموں ولید اور تمہارے
یوم بدر۔ (نہج البلاغہ)	بھائی حنظلہ کے پرخچے اڑا کر بدر کے دن مارا تھا"۔

کفار کی ان نامی گرامی شخصیتوں کے قتل ہو جانے سے دُشمن کی صفوں میں کھلبلی مچ گئی اور اکیلے دُکیلے میدان میں اُترنے سے جی چرانے لگے۔ انہوں نے سمجھ لیا کہ اس طرح ایک ایک کر کے میدان میں نکلتے رہے تو کوئی بھی شیرِ خدا کی تلوار سے بچ کر زندہ نہ پلٹے گا۔ اور ایک ایک کر کے سب مَوت کے گھاٹ اُتر جائیں گے۔ اب انہوں نے جنگ مغلوبہ کے لئے بڑھنا شروع کیا۔ مسلمانوں نے اُن کی بڑھتی ہوئی یلغار دیکھ کر قدم آگے بڑھانا چاہا مگر پیغمبر اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں حکم دیا کہ وُہ اپنی صفوں کو درہم و برہم نہ کریں اور قریش کے حملہ کو تیروں سے روکیں۔ اور خود بارگاہِ احدیت میں دستِ بدعا ہو کر عرض کیا:۔

اللھم ان تھلک ھذہ العصابۃ	بار الٰہا! اگر مسلمانوں کی یہ جماعت ہلاک ہو گئی تو
من اھل الاسلام لا تعبد فی	رُوئے زمین پر تیری پرستش کرنے والا کوئی نہ
الارض اللھم انجزلی ما وعدتنی	رہے گا۔ پروردگارا اپنے وعدۂ فتح و نصرت
(تاریخ کامل ج۲۔ ص۸۸)۔	کو پُورا کر"۔

پھر نیند کی ایک جھپکی لی اور آنکھیں کھول کر فرمایا خدا کا شکر ہے اُس نے میری دُعا قبول فرمائی اور ہماری امداد کے لئے فرشتے بھیج دیئے۔ چنانچہ ارشادِ ربّ العزّت ہے:۔

اذ تستغیثون ربکم فاستجاب	جب تم اپنے پروردگار سے فریاد کر رہے تھے اُس

لکم انی ممدکم بالف من الملٰئکۃ مردفین۔

نے تمہاری دُعا قبول کی اور جواب دیا کہ میں ایک ہزار فرشتوں سے جو پے درپے آئیں گے تمہاری مدد کروں گا۔"

جب قریش تیروں کے جواب میں تیر برساتے ہوئے لشکرِ اسلام کے قریب آئے تو آنحضرتؐ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وُہ ایک دم حملہ کر کے دشمن پر ٹوٹ پڑیں۔ چنانچہ ایک ساتھ تلواریں بے نیام ہُوئیں کمانیں کڑکیں، تیر رہا ہُوئے اور ایسا گھمسان کا رن پڑا کہ تلواروں کی جھنکار اور تیروں کی بوچھار سے میدان گونج اُٹھا۔ مُسلمان تلواریں چلاتے صفوں کو چیرتے اور دُشمنوں کو تہ تیغ کرتے ہُوئے آگے بڑھتے رہے۔ آخر حضرت علیؑ اور جناب حمزہ کے پُرزور حملوں سے کافروں کے قدم ڈگمگا گئے اور اس طرح تتر بتر ہُوئے جس طرح شیر کے حملہ آور ہونے پر بھیڑیں تتر بتر ہوتی ہیں۔ سعد کہتے ہیں:۔

رایت علیاً یوم بدر یحمحم کما یحمحم الفرس ویقول الشعر فما رجع حتی خضب سیفہ دما۔ (کنز العمال۔ ج۵۔ ص۲۷۰)

مَیں نے بدر کے دِن علیؑ کو لڑتے دیکھا اُن کے سینہ سے گھوڑے کے ہنہنانے کی سی آواز نکل رہی تھی اور برابر رجز پڑھتے جاتے تھے۔ اور جب پلٹے تو اُن کی تلوار خون سے رنگین تھی۔"

اس معرکۂ کارزار میں نوفل ابن خویلد جو پیغمبر اکرمؐ کا انتہائی دشمن تھا حضرت علیؑ کے سامنے سے گزرا۔ آپؑ نے اس کے سر پر تلوار ماری جو خود کو کاٹتی اور سر کو توڑتی ہُوئی جبڑے تک اُتر آئی اور پھر دُوسرا وار اُس کی ٹانگوں پر کیا جس سے اُس کے دونوں پیر کٹ گئے۔ آنحضرتؐ اس دُشمنِ دین کے قتل ہونے سے خوش ہُوئے اور فرمایا کہ اللہ کا شکر ہے کہ اُس نے میری دُعاء کو شرفِ قبولیت بخشا۔ جنگ آخری مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ کفار کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ ابو جہل، اس کا بھائی عاص ابن ہشام اور دُوسرے سردار تہ تیغ ہو چکے تھے۔ دشمن شکست کی آخری منزل پر پہنچ گیا۔ زوالِ آفتاب کے بعد اس نے ہتھیار ڈال دیئے اور اپنا مال و اسباب چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ مُسلمانوں نے بھاگنے والوں کا پیچھا کیا اور انہیں قتل کرنے کے بجائے پکڑ پکڑ کر اسیر کرنا شروع کر دیا تاکہ اُن کے عوض قریش سے زرِ فدیہ حاصل کر سکیں۔ سعد ابن معاذ نے جب دیکھا کہ مُسلمان کفار کو تہ تیغ کرنے کے بجائے زندہ گرفتار کر رہے ہیں تو وُہ مُسلمانوں کی حرکت پر پیچ و تاب کھانے لگے اور اتنے کبیدہ خاطر ہُوئے کہ اپنی ناگواری کو چھُپا نہ سکے۔ پیغمبرؐ نے اُن کے چہرے پر ناگواری کے آثار دیکھے تو فرمایا کیا مسلمانوں کا یہ طرزِ عمل تمہیں بُرا معلوم ہوتا ہے؟ عرض کیا کہ:۔

یا رسول اللہ اول وقعۃ اوقعہا اللہ بالمشرکین کان الاثخان احب الی من استبقاء الرجال۔ (تاریخ کامل۔ ج۲۔ ص۸۸)

یارسُول اللہ یہ پہلا معرکہ تھا جس میں اللہ نے مشرکوں کو شکست دلائی ہے۔ ان لوگوں کو زندہ چھوڑ دینے کے بجائے انہیں اچھی طرح کچل دینا مجھے زیادہ پسند تھا۔"

ستّر کفار کے لاشے میدان میں بکھرے پڑے تھے۔ آنحضرتؐ نے ان لاشوں کو چاہ بدر میں پھنکوادیا اور انہیں مخاطب کرکے کہا کہ "میں نے اپنے پروردگار کے وعدے کو سچّا پایا ہے، کیا تم نے بھی اپنے رب کے وعدے کو سچا پایا ہے"۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ یا رسولؐ اللہ آپ مُردوں سے باتیں کرتے ہیں کیا مُردے بھی سُنا کرتے ہیں؟ فرمایا:۔

ما انتم باسمع لما اقول منھم	وُہ تم سے زیادہ میری بات سُنتے ہیں مگر
ولکنھم لا یستطیعون ان	جواب دینے سے عاجز ہیں"۔

یجیبونی۔ (تاریخ کامل۔ جؒ۔ صؒ۹)۔

ان امور سے فارغ ہوکر آنحضرتؐ نے حکم دیا کہ مالِ غنیمت ایک جگہ پر جمع کردیا جائے۔ یہ حُکم بعض طبیعتوں پر گراں گزرا۔ کیونکہ وُہ چاہتے تھے کہ دستورِ عرب کے مطابق جو جس نے لُوٹا ہے وُہ اُسی کے پاس رہے۔ مگر پیغمبر اکرمؐ نے اس کی اجازت نہ دی اور تمام مالِ غنیمت یکجا کرکے عبداللہ ابن کعب کی نگرانی میں دے دیا اور اسیرانِ جنگ کو حراست میں لے کر مدینہ روانہ ہوگئے۔ جب وادیٔ صفراء میں پہنچے تو آپ نے مالِ غنیمت شرکاءِ جنگ پر مساوی تقسیم کردیا۔ یہ کام مدینہ پہنچ کر بھی انجام دیا جاسکتا تھا مگر ممکن ہے کہ بعض لوگوں نے صبر آزما انتظار سے بچنے کے لئے جلدی کی ہو اور آپ نے یہی مناسب سمجھا ہو کہ اسے یہیں پر تقسیم کردیا جائے۔ جب مدینہ میں پہنچے تو آپؐ نے اُن اسیروں کو مختلف لوگوں کے ہاں ٹھہرادیا اور اُن سے حُسنِ سلوک کی ہدایت فرمائی۔ چنانچہ جب تک وُہ مسلمانوں کی تحویل میں رہے اُن کے ساتھ بہتر سے بہتر سلوک کیا جاتا رہا جس کا بعض اسیروں نے خود بھی اعتراف کیا۔ اور پھر ان قیدیوں میں سے جو صاحبِ حیثیت تھے ان سے فدیہ لے کر اور جو نادار تھے انہیں ویسے ہی آزاد کردیا۔ آنحضرتؐ کی بعثت کے وقت قریش میں صرف سترہ آدمی تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ آپ نے اس کمی کو محسوس فرماتے ہوئے ان لوگوں سے جو مالی اعتبار سے کمزور اور لکھنا پڑھنا جانتے تھے یہ طے کیا کہ وُہ مدینہ کے دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں۔ اور اس کے عوض انہیں رہا کردیا جائے گا۔ ان اسیرانِ بدر کے بارے میں یہ روایت بھی ہے کہ آنحضرتؐ نے حضرت ابوبکر، حضرت عمر، اور حضرت علیؑ سے مشورہ کیا کہ انہیں قتل کیا جائے یا اُن سے مالی معاوضہ لے کر رہا کردیا جائے حضرت ابوبکر نے یہ مشورہ دیا کہ ان سے فدیہ لے کر انہیں چھوڑ دینا چاہیئے۔ اور حضرت عمر نے اِس رائے کے خلاف رائے دیتے ہوُے کہا:۔

لا واللہ ما اری الذی رأی	خدا کی قسم مجھے ابوبکر کی رائے سے اتفاق نہیں
ابوبکر ولکنی اری ان تمکننی	ہے۔ آپ مجھے حکم دیں کہ میں فلاں کی گردن اُڑا
من فلان فاضرب عنقہ و	دوں۔ اور حمزہ سے کہیئے کہ وُہ اپنے بھائی
تمکن حمزۃ من اخ لہ فیضرب	(عباس) کی گردن ماریں۔ اور علیؑ سے کہیئے

عنقه وتمکن علیاً من عقیل — کہ وہ عقیل کو قتل کریں۔"
فیضرب عنقه۔ (تاریخ طبری ج۲ ص۱۶۹)

آنحضرتؐ نے اپنے "اجتہاد" سے کام لے کر حضرت عمر کے مشورہ پر عمل کرنے کے بجائے حضرت ابوبکر کے مشورہ کو ترجیح دی اور فدیہ لے کر اسیروں کو رہا کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلہ کے دُوسرے دن حضرت عمر پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہُوئے دیکھا کہ رسُول خدا صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور حضرت ابوبکر دھاروں دھار رو رہے ہیں۔ حضرت عمر نے پُوچھا کہ یا رسُولؐ اللہ آپ دونوں کیوں رو رہے ہیں۔ اگر رونے کی کوی بات ہے تو مَیں اس رونے دھونے میں شریک ہو جاؤں۔ فرمایا کہ فدیہ کے قبول کرنے پر مجھے عذاب منڈلاتا ہوا نظر آیا ہے جو اِس درخت سے بھی زیادہ نزدیک تھا اور ایک درخت کی طرف اشارہ کیا، اور یہ تہدید آمیز آیت نازل ہُوی ہے:۔

ماکان لنبی ان یکون له اسری	نبی کو نہیں چاہیئے کہ اچھی طرح خونریزی کئے بغیر
حتی یثخن فی الارض تریدون	لوگوں کو قیدی بنائے۔ تم لوگ مال دُنیا چاہتے ہو
عرض الدنیا والله یرید الاخرة	اور اللہ آخرت کی بھلائی چاہتا ہے اور اللہ غالب
والله عزیز حکیم لولا کتاب من	اور حکمت والا ہے۔ اگر خدا کا نوشتہ پہلے سے
الله سبق لمسکم فیما اخذتم	موجود نہ ہوتا تو تم جو کچھ سمیٹتے اس پر تمہیں بڑا
عذاب عظیم۔	عذاب ہوتا۔"

حضرت عمر کہتے ہیں کہ اِس فدیہ ہی کے نتیجہ میں دُوسرے سال جنگِ اُحد میں رسُولؐ اللہ کے ستّر صحابی شہید ہُوے، ستّر اسیر کئے گئے، آنحضرتؐ کے دندان مبارک ٹوٹے، چہرہ اور سر زخمی ہُوا اور آپ کے اصحاب آپ کا ساتھ چھوڑ کر چلے گئے۔

یہ امر غور طلب ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کو صحابہ سے مشورہ لینے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ کیا قرآن مجید میں اسیروں کے بارے میں کوی ہدایت موجود نہ تھی؟ ایسا تو نہیں ہے بلکہ قرآن مجید میں واضح طور پر جنگی اسیروں کے احکام اور اُن سے فدیہ لے کر انہیں آزاد کرنے کی تعلیم موجُود ہے۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:۔

اذا لقیتم الذین کفروا فضرب	جب تم کافروں سے لڑو تو اُن کی گردنیں مارو یہانتک
الرقاب حتی اذا اثخنتموهم	کہ جب انہیں زخموں سے چُور چُور کر دو تو اُن کی
فشدوا الوثاق فامامنا بعد	مُشکیں کس لو۔ پھر اُن پر احسان کرتے ہُوے اُنہیں
واما فداء حتی تضع الحرب	چھوڑ دو یا معاوضہ لے کر رہا کر دو یہاں تک کہ دشمن
اوزارها۔	جنگ کے ہتھیار رکھ دے۔"

یہ سُورہِ محمّد کی آیت ہے جو بالاتفاق جنگ بدر سے پہلے نازل ہوی۔ لہٰذا جب قرآن میں اسیروں کے بارے

میں پہلے سے حکم آچکا تھا کہ انہیں یُونہی چھوڑ دیا جائے یا اُن سے فدیہ لے کر اُنہیں آزاد کر دیا جائے۔ تو پیغمبرؐ نے اس حکمِ قرآنی کے پیشِ نظر جب کچھ لوگوں سے فدیہ لے لیا اور کچھ لوگوں کو یُونہی چھوڑ دیا اور کچھ لوگوں کو تعلیم کتابت کے عوض آزاد کر دیا تو اس پر عتاب کیوں اور عذاب کی دھمکی کس جُرم کی پاداش میں۔ ظاہر ہے کہ اس نصِ صریح کے ہوتے ہُوئے صحابہ سے مشورہ لینا اور پھر اپنے اجتہاد سے کام لے کر ایک کا مشورہ قبول کر لینا اور ایک کا مشورہ مسترد کر دینا کوئی معنی ہی نہیں رکھتا جبکہ پیغمبرؐ کا وظیفہ ہی یہ ہے کہ وُہ وحی الٰہی پر عمل پیرا ہو اور اس کے مقابلہ میں کسی کے مشورہ و رائے پر عمل نہ کرے۔ اگر وحی کے ہوتے ہُوئے کسی کے مشورہ پر عمل پیرا ہونے کا جواز ہو تو وحی الٰہی کی ضرورت اور افادیت ہی ختم ہو جاتی ہے۔ باقی رہا حضرت عمر کا یہ مشورہ کہ حمزہ سے کہئے کہ وُہ عباس کو قتل کریں اور علیؑ سے کہئے کہ وُہ عقیل کی گردن ماریں، خدا جانے پیغمبرؐ نے اس کا کیا جواب دیا جبکہ وُہ میدانِ جنگ میں بنی ہاشم اور عباس کو قتل کرنے سے منع کر چکے تھے۔ اور اللہ جانے کہ حضرت عمر نے یہ مشورہ کیسے دیا جبکہ وُہ ابو حذیفہ کو کہ جب اُس نے عباس کو قتل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا، منافق کہہ چکے تھے۔ کیا حضرت عمر کے ذہن سے یہ دونوں باتیں اُتر چکی تھیں یا میدانِ جنگ میں تو اُن کا قتل ناجائز تھا اور اب جائز ہو گیا تھا؟

اگر اس روایت کی بنا پر یہ فرض کر لیا جائے کہ فدیہ قبول کرنے کی وجہ سے عذاب منڈلاتا نظر آیا تو پیغمبرؐ اس عذاب کی جھلک دیکھنے کے بعد اس فدیہ کو مسترد کر دیتے جبکہ یہ واقعہ فدیہ کو قبول کرنے کے دوسرے دن کا بتایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان قیدیوں کے پاس زرِ فدیہ موجود تو نہ تھا کہ انہوں نے فوراً ادا کر کے رہائی حاصل کر لی ہوگی۔ بلکہ تاریخ بتاتی ہے کہ اس کے منگوانے اور حاصل کرنے میں ڈیڑھ دو ماہ کا عرصہ لگ گیا تھا۔ اور پھر اُحد کی ہزیمت صحابہ کے فرار اور ستّر مسلمانوں کی شہادت کو اس فدیہ کی پاداش قرار دینا ایک عجیب سی بات ہے۔ یہ سزا تو انہیں ملنا چاہیئے تھی جنہوں نے یہ رقم فدیہ لی تھی۔ کیا اس سے عدلِ الٰہی پر حرف نہیں آتا کہ جُرم کوئی کرے اور سزا کوئی بھگتے۔ بہر حال یہ روایت موضوع ہے اور بظاہر اس کے گڑھنے کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُحد میں صحابہ کے فرار کو قدرت کی طرف سے ایک طے شدہ امر قرار دے کر ان کے فرار عن الزحف کے جُرم کو ہلکا کر کے دکھایا جائے اس طرح کہ یہ فرار اس جُرم کی پاداش میں تھا جس میں معاذ اللہ پیغمبرؐ بھی شریک تھے اور وہی فدیہ قبول کر کے اس فرار و ہزیمت کا باعث ہُوئے تھے۔ لہٰذا اس میں بھاگنے والوں کا کیا قصور۔ نہ پیغمبرؐ فدیہ قبول کرتے اور نہ صحابہ کے میدان چھوڑنے کی نوبت آتی۔ اور ساتھ ہی فدیہ کی خاطر مشرکوں کو زندہ گرفتار کرنے کی کارروائی کو اس طرح ڈھانپ دیا جائے کہ آیت کے تہدیدی لہجے کا رُخ پیغمبر کی طرف مُڑ جائے کہ انہوں نے اجتہادی غلطی کے نتیجہ میں فدیہ لینے پر رضامندی ظاہر کی جس پر قدرت نے اپنا عذاب دکھایا اور تنبیہ کے لئے آیت نازل فرمائی۔ حالانکہ آیت میں پیغمبرؐ پر عتاب کا شائبہ تک نہیں ہے۔ بلکہ اُن لوگوں پر عتاب ہے جنہوں نے فدیہ بٹورنے کے لئے مشرکوں کو قتل کرنے کے بجائے اسیر بنایا۔ چنانچہ آیت کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ پیغمبرؐ کے شایانِ شان یہ نہیں ہے کہ وُہ کفر کی طاقت کو کچلنے اور اس کا زور توڑنے سے پہلے کافروں کو گرفتار کرنے لگے۔ مگر تم نے

دنیوی مفاد کی خاطر پکڑ دھکڑ شروع کر دی تاکہ زر فدیہ حاصل کر سکو۔ بیشک تمہیں فدیہ لینے کی اجازت دی جا چکی ہے مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ دشمن کا قلع قمع کرنے میں کوتاہی کی جائے اور فدیہ کی خاطر ہاتھ روک لیا جائے اور مال کی جمع آوری ہی کو جہاد کا مقصد قرار دے لیا جائے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ نے صحابہ ہی کو موردِ عتاب سمجھتے ہوئے تحریر کیا ہے:۔

کان میلھم للافتداء مخالفا لما احبہ اللہ من قطع دابر الشرك فعوتبوا ثم عفی عنھم۔
(حجۃ اللہ البالغہ۔ ج۲۔ ص۱۳۵)

صحابہ فدیہ لینے کی طرف مائل تھے اور یہ اللہ کی پسندیدہ چیز کے خلاف تھا۔ اللہ تو یہ چاہتا تھا کہ شرک کی جڑ کٹ جائے۔ اسی وجہ سے اُن پر عتاب ہُوا اور پھر انہیں معاف کر دیا گیا"۔

مال و دولت کی ہوس یُوں تو انسان کی طبعی کمزوری ہے مگر جہاں ایک طرف دین کے استحکام اور دشمنانِ دین کے استیصال کا سوال ہو اور دوسری طرف مالی مفاد کا وہاں مالی مفاد کو نظر انداز کر دینا ہی دین کا بنیادی تقاضا ہے۔ مگر مال و زر کی ہوس عرب کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی اور اسلام کے بعد بھی اس دیرینہ ذہنیت میں تبدیلی نہ ہُوئی تھی اور اس کا مظاہرہ اس موقع پر بھی ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ ابتداء ہیں قریش کے لشکر سے بھڑنے اور اس کی فکر کرنے کے بجائے ابوسفیان کے کاروان کی جستجو میں رہے جو شام سے لدا پھندا ہُوا آ رہا تھا اور جنگ کے خاتمہ پر اپنے سمیٹے ہُوئے مال پر اپنا حق جتانے بیٹھ گئے۔ لوٹنے والے کہتے کہ یہ ہماری ملکیت ہے اور لڑنے والے کہتے کہ یہ ہماری وجہ سے ملا ہے اس لئے ہم اس کے حقدار ہیں۔ اور اسی دولت کے لالچ میں آ کر کفار کا استیصال کرنے سے پہلے انہیں پکڑ پکڑ کر قیدی بنانے لگے جس پر سعد ابن معاذ انصاری نے اپنی ناگواری کا اظہار کیا اور رسُولؐ اللہ سے کہا کہ کافی خونریزی سے پہلے کفار کو اسیر بنانا مجھے قطعاً پسند نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ نے بھی اگرچہ مشرکوں کو قتل کر دینے کا مشورہ دیا مگر اس وقت کہ جب انہیں اسیر بنا کر مدینہ لایا جا چکا تھا اور اُن کے قتل کا کوئی موقع و محل نہ رہا تھا۔ چنانچہ نہ قرآن میں ہے اور نہ کسی حدیث میں کہ جنگ کے ختم ہونے کے بعد اسیروں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے اور نہ آیت کا عتاب اس بناء پر تھا کہ اُن سے فدیہ لینے کے بجائے انہیں قتل کیوں نہ کر دیا گیا، بلکہ وجہِ عتاب یہ تھی کہ میدانِ جنگ میں پُوری طرح خونریزی سے پہلے انہیں اسیر کیوں بنایا گیا اور اب جبکہ انہیں اسیر بنایا جا چکا تھا تو سُورۂ محمدؐ کی آیت کی رو سے ان سے فدیہ لے کر انہیں چھوڑ دینا عین منشائے الٰہی کے مطابق تھا۔

اس غزوہ میں جو اسلام کا پہلا غزوہ تھا، کفار کو بُری طرح زک اُٹھانا پڑی۔ اُن کے ستر آدمی قتل اور ستر اسیر ہُوئے اور باقی ماندہ افراد نے راہِ فرار اختیار کر کے اپنی جانیں بچائیں۔ مسلمانوں میں سے صرف چودہ آدمی شہید ہوئے جن میں چھ مہاجر اور آٹھ انصار تھے۔ امیر المومنینؑ کی تلوار سے ہلاک ہونے والوں کی تعداد پینتیس تھی یعنی جتنی تعداد کل مُسلمانوں کے ہاتھ سے ہلاک ہوئی اتنی ہی تعداد تنہا حضرتؑ کے ہاتھ سے ماری گئی خصوصاً سردارانِ قریش شیبہ،

ولید، حنظلہ، نوفل ابن خویلد، عاص ابن سعید، مغیرہ ابن ولید وغیرہ۔ حضرتؑ کے مقتولین کی تعداد اس امر کی شاہد ہے کہ آپ نے نہ مال غنیمت سمیٹنے کی فکر کی اور نہ اسیر بنانے کے لئے بھاگنے والوں کا پیچھا کیا بلکہ ہمہ تن دشمنان دین کے استیصال اور کفر و شرک کی بیخکنی میں لگے رہے اور شجاعت و فنی مہارت کا وہ بے نظیر مظاہرہ کیا جس سے دشمن کے دلوں پر اسلام کی قوت و برتری کی ہمیشہ کے لئے دھاک بیٹھ گئی اور مسلمانوں کے لئے فتح و کامرانی کی راہیں ہموار ہو گئیں۔ اگر اس مرحلہ پر مسلمانوں کو شکست ہو جاتی تو وہ کفار کے مقابلہ میں مرعوبیت کا شکار ہو جاتے اور یہ احساس شکست انہیں دشمن سے ٹکرانے اور میدان جنگ میں اترنے سے پست ہمت بنا دیتا اور یاس و کم ہمتی کا نتیجہ ہمیشہ شکست و ہزیمت ہی کی صورت میں ظاہر ہوا کرتا ہے۔ مگر فتح بدر کے نتیجہ میں مسلمان ایک بڑی طاقت سمجھے جانے لگے اور اسی شہرت نے مسلمانوں کو فاتحین کی صفِ اول میں لا کھڑا کیا۔ بلاشبہ تمام اسلامی فتوحات اس فتح و کامرانی کا نتیجہ و ثمرہ ہیں۔ اور یہ فتح جو حق و صداقت، عدل و انصاف اور عزم و عمل کی فتح تھی علیؑ کے دست و بازو کی رہینِ منت ہے اور انہی کے سر اس کامیابی و کامرانی کا سہرا ہے۔

یہ جنگ روزِ جمعہ ۱۷ رمضان ۲ھ میں واقع ہوئی۔

غزوۂ اُحد

بدر میں قریش کے ستّر نامور سورما مارے گئے، ستّر اسیر کئے گئے اور باقی ہزیمت اٹھا کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ اس شکستِ فاش سے مکّہ کی فضاء میں ایک سکون سا پیدا ہو گیا تھا لیکن یہ سکون عارضی اور سمندر کی اس خاموش سطح کے مانند تھا جس کے نیچے طوفانی لہریں موجزن ہوں یا اس خاموش آتش فشاں کے مانند تھا جس کے اندر ہی اندر لاوہ سلگ رہا ہو اور زمین کی تہوں اور چٹانوں کو چیر کر پھوٹ نکلنے کے لئے بے قرار ہو۔ قریش کے دلوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑی ہوئی تھی اور سینوں میں انتقام کی آگ سلگ رہی تھی اور اس خیال سے کہ کہیں جوشِ انتقام سرد نہ پڑ جائے مقتولین بدر پر رونے سے منع کر رکھا تھا اور یوں بھی عرب کا دستور تھا کہ عورتیں اس وقت تک اپنے مقتولین پر نہ روتی تھیں جب تک اُن کا انتقام نہ لے لیا جاتا تھا۔ اس ضبطِ گریہ جانی و مالی نقصان، شکست و ہزیمت کی شرمندگی اور انتقامی جذبہ نے انہیں فیصلہ کن جنگ لڑنے پر ابھارا۔ ابوسفیان جو قیادت و سربراہی کے خواب دیکھ رہا تھا اسے ابوجہل اور دوسرے سرکردہ افراد کے مارے جانے سے آگے آنے کا موقع مل گیا۔ اس نے عوام کے جذبات کو متاثر کرنے کے لئے قسم کھائی کہ میں اُس وقت تک سر میں تیل نہیں لگاؤں گا جب تک قریش کے کشتوں کا بدلہ نہیں لے لوں گا۔ چنانچہ ذی الحجہ ۲ھ کو دو سو کی ایک جمیعت کے ساتھ مدینہ پر تاخت و تاراج کے ارادہ سے نکل کھڑا ہوا۔ جب مدینہ کے قریب پہنچا تو قبیلہ انصار کے دو آدمیوں کو جو کھیتوں میں کام کر رہے تھے قتل کر دیا اور کھجوروں کے ایک باغ میں آگ لگا دی پیغمبر اکرمؐ کو خبر ہوئی تو آپ نے مقام کدر تک اُس کا تعاقب کیا مگر وہ نکل جانے میں کامیاب ہو گیا۔

یہ حملہ ایک بڑے حملہ کی تمہید تھا جس کی تیاری بدر کے بعد سے کی جارہی تھی اور عکرمہ ابن ابی جہل، صفوان ابن اُمیہ، عبداللہ ابنِ ربیعہ اور دُوسرے سرکردہ لوگوں نے گزشتہ سال کی تجارت کا مشترکہ منافع جو پچاس ہزار مثقال سونا اور ایک ہزار اُونٹوں کی صورت میں تھا اور ابھی تک شرکا میں تقسیم نہ ہوا تھا جنگی مصارف کے لئے مخصوص کردیا تاکہ مالی اعتبار سے مضبوط ہوکر مسلمان سے جنگ لڑی جاسکے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اُن کے بارے میں ارشاد ہے:-

اِنّ الذین کفروا یُنفقون اموالھم لیصدوا عن سبیل اللہ فسینفقونھا ثم تکون علیھم حسرۃ ثم یغلبون والّذین کفروا الی جھنم یحشرون۔

"یہ کفار اپنے مال کو اس لئے خرچ کرتے ہیں کہ اس کے ذریعہ لوگوں کو خدا کی راہ سے روک دیں۔ یہ عنقریب اسے خرچ کریں گے پھر یہی مال اُن کے لئے حسرت و اندوہ کا باعث ہوگا پھر یہ شکست کھا جائیں گے اور جنہوں نے کفر اختیار کیا ہے وُہ سیدھے جہنّم میں پہنچا دیئے جائیں گے"۔

قریش کو مخارج جنگ کی طرف سے تو اطمینان تھا ہی البتہ جنگجو افراد کی کمی کا احساس تھا۔ اس کا تدارک انہوں نے یُوں کیا کہ چند آتش بیان شاعروں کو اپنا نمائندہ بناکر مختلف قبائل کی طرف بھیج دیا تاکہ مسلمانوں کے خلاف اُن کے جذبات اُبھار کر انہیں قریش سے تعاون پر آمادہ کریں۔ مکّہ کا ایک شاعر ابوعزہ عمرو ابن عبداللہ تہامہ میں آیا اور اہل تہامہ اور بنی کنانہ کو اپنے کلام سے متاثر کرکے قریش کا ہمنوا بنالیا اور اُن کے سات سو آدمی قریش کے لشکر میں شامل ہوگئے۔ اس طرح بڑھتے بڑھتے لشکر کی تعداد تین ہزار تک پہنچ گئی جس نے سر دھڑ کی بازی لگا کر جنگ سر کرنے کی ٹھان لی۔

ہند زوجۂ ابوسفیان جس کا باپ عتبہ، بھائی ولید اور چچا شیبہ جنگ بدر میں مارے گئے تھے اُس نے بھی سُلگتی ہوی چنگاری کو بھڑکتا ہوا شعلہ بنانے میں کوی کسر اُٹھا نہ رکھی اور چودہ عورتوں کی سرگروہ بن کر فوج میں شامل ہوگئی۔ ان عورتوں میں خالد ابن ولید کی بہن فاطمہ، عمرو ابن عاص کی بیوی ریطہ، عکرمہ ابن ابی جہل کی زوجہ ام حکیم بنتِ حارث، سفیان ابن عویف کی بیوی قتیلہ بنتِ عمرو، عزاب ابن سفیان کی بیوی عمرہ بنتِ حارث، طلحہ ابن عثمان کی بیوی سلافہ بنتِ سعد، حارث ابن سفیان کی بیوی رملہ بنت طارق اور صفوان ابن اُمیہ کی بیوی برہ بنتِ مسعود بھی شریک تھیں۔ ان عورتوں کے شامل ہونے کا مقصد یہ تھا کہ وُہ میدانِ کارزار میں جنگ آزماؤں کے جذبات کو بھڑکائیں اور پسپائی کی صُورت میں انہیں جوش و غیرت دلاکر واپس میدان میں لائیں۔

جب یہ لشکر ابوسفیان کی قیادت میں مکّہ سے نکل کھڑا ہوا تو عباس ابن عبدالمطلب نے اس خیال سے کہ اگر اس لشکرِ گراں نے بے خبری کے عالم میں مدینہ پر حملہ کردیا تو مسلمان اس منظم و مسلح فوج کا مقابلہ نہ کرسکیں گے، بنی غفار کے ایک شخص کے ذریعہ آنحضرتؐ کو پیغام بھیجا کہ قریش کا لشکر مدینہ پر حملہ آور ہونے کے لئے مکّہ سے نکل چکا ہے۔

آپ اس بڑھتی ہوی یلغار کو روکنے کا بندوبست کرلیں ایسا نہ ہو کہ وُہ اچانک حملہ کر دے۔ اس بروقت اطلاع کے ملتے ہی آنحضرتؐ نے دوؔ آدمیوں کو مدینہ کے باہر بھیجا کہ وہ دیکھیں بھالیں کہ یہ خبر کہاں تک دُرست ہے۔ اُنہوں نے پلٹ کر بتایا کہ عباس کی بھیجی ہُوی اطلاع صحیح ہے اور قریش کا لشکر مار دھاڑ کرتا ہوا اطراف مدینہ میں پہنچ چکا ہے اور کسی وقت بھی حملہ آور ہو سکتا ہے۔ اگرچہ یہ وہی بدر کے شکست خوردہ لوگ تھے مگر پہلے سے زیادہ تیار ہو کر آئے تھے اور اہل تہامہ اور بنی کنانہ کے شامل ہو جانے سے ان کی تعداد بھی بڑھ گئی تھی مسلمانوں کو دشمن کے سر پر پہنچ جانے کی خبر ہوی تو اُن میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ کچھ لوگوں کی رائے یہ تھی کہ چونکہ مسلمان تعداد میں کم ہیں اور کفار کی تعداد زیادہ ہے لہٰذا دفاعی صورت اختیار کرنا بہتر ہوگا اس طرح کہ جنگجو افراد تیروں تلواروں اور نیزوں سے راستوں کے ناکوں پر انہیں روکیں۔ اور اگر اُن میں کے کچھ لوگ سینہ زوری کر کے حدودِ شہر میں داخل ہو جائیں تو عورتیں، بچّے اور بُوڑھے چھتوں پر سے سنگباری کر کے انہیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیں اور جب دُشمن کا زور ٹوٹ جائے تو پھر اس کے مقابلہ میں صف آرا ہو کر لڑا جائے۔ اور کچھ لوگوں کی رائے یہ تھی کہ شہر کے اندر محصور رہ کر صرف دفاعی جنگ لڑی جا سکتی ہے۔ اور دفاعی جنگ اس صورت میں اختیار کی جایا کرتی ہے جب دشمن سے زور آزما ہونے کا حوصلہ نہ ہو۔ لہٰذا دشمن کو اپنی کمزوری و بے طاقتی کا تاثر دینے کے بجائے ہمیں شہر سے باہر نکل کر محاذِ جنگ قائم کرنا چاہئے۔ جو لوگ حدودِ شہر سے نکل کر جنگ کرنے کا مشورہ دے رہے تھے ان میں حضرت حمزہؓ، سعد ابن عبادہ اور وُہ افراد شامل تھے جو جنگ بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے اور اب شہر کی تنگ و تاریک گلیوں کے بجائے کھلے میدان میں دادِ شجاعت دینا چاہتے تھے۔ اور جو شہر میں محصور ہو کر مقابلہ کرنا چاہتے تھے ان میں عبداللہ ابن ابی مشہور منافق پیش پیش تھا۔ ذہن اس چیز کو تو قبول نہیں کر سکتا کہ اس کی یہ تجویز مسلمانوں کی ہمدردی و خیر خواہی کے پیش نظر ہوگی جبکہ وُہ اور اُس کا گروہ یہ چاہتا تھا کہ مُسلمانوں کا شیرازہ درہم و برہم ہو کر رہ جائے اور ذلت و خواری کے ساتھ مدینہ سے نکال باہر کئے جائیں۔

مورخین نے عام طور پر یہ لکھ دیا ہے کہ پیغمبر اکرم بھی مدینہ میں محصور رہ کر جنگ لڑنا چاہتے تھے۔ مگر رائے عامہ سے متاثر ہو کر مدینہ سے نکل کھڑے ہوُے تھے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ پیغمبر کی یہی رائے تھی تو اس پر عملدرآمد کرنے میں مانع ہی کیا تھا جبکہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جو لوگ باہر نکلنے پر اصرار کر رہے تھے انہوں نے پیغمبرؐ کو ہتھیار سج کر باہر نکلتے دیکھا تو عرض کیا کہ یا رسُولؐ اللہ اگر آپ مدینہ میں رہ کر دُشمن کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس سے انکار نہیں ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا:۔

ما ینبغی لنبی اذا لبس لامتہ ان یضعھا حتی یقاتل ۔۔۔!	نبیؐ کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ جب وُہ جنگ کا لباس پہن لے تو پھر جنگ کئے بغیر اُسے اُتارے۔"

(تاریخ طبری۔ جـ۲۔ صـ۱۹۰)۔

یہ الفاظ اطمینان، استقلالِ مزاج اور دشمن سے جہاد کے غیر متبدل عزم وارادہ کے عکاس ہیں۔ جس سے یہ صاف عیاں ہے کہ پیغمبرؐ کسی خارجی دباؤ کے زیرِ اثر شہر سے نکلنے پر مجبور نہ ہوئے تھے بلکہ جوشِ عمل اور ولولہ جہاد کا تقاضا ہی یہ تھا کہ غنیم سے کھلے میدان میں مقابلہ کیا جاتا اور شہر میں محصور رہ کر دشمن کو مدینہ پر تاخت و تاراج کا موقع نہ دیا جاتا۔ پیغمبرؐ کا یہ ارشاد نہ صرف ان کے ناقابلِ تسخیر عزم اور بلند حوصلگی کا ترجمان ہے بلکہ مسلمانوں کے لئے بھی عزم و عمل کا ایک زرین درس ہے کہ وہ دشمن کے مقابلہ میں بد دلی کا مظاہرہ نہ کریں۔ اور جب جنگ ناگزیر ہو چکی ہے تو اس میں عملی کمزوری کا گذر نہ ہونے دیں۔ اور کتنی ہی ناگوار صورتوں کا مقابلہ کرنا پڑے دشمن کو پیٹھ نہ دکھائیں اور اُس کی قوت و کثرت کو نظر انداز کر کے آخر دم تک لڑتے رہیں۔

آنحضرتؐ نے ابن ام مکتوم کو مدینہ میں منتظم و نگران مقرر کیا اور ۱۴ر شوال ۳ھ کو نمازِ جمعہ کے بعد ایک ہزار کی جمعیت کے ساتھ مدینہ سے نکل کھڑے ہوئے اور ایک قریب کے راستے سے کوہِ اُحد کی جانب روانہ ہو گئے جہاں قریش کا لشکر ۱۲ر شوال سے پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ ابھی پیغمبرؐ نے آدھا راستہ طے کیا ہو گا کہ عبداللہ ابن ابی اپنے تین سو ساتھیوں سمیت لشکر سے کٹ کر واپس مدینہ آگیا۔ اور عذر یہ تراشا کہ چونکہ میری رائے پر عمل نہیں کیا گیا کہ اندرونِ شہر رہ کر جنگ لڑی جائے لہٰذا میں حدودِ شہر سے باہر نکل کر اپنے ساتھیوں کی جانیں خطرہ میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ اب مسلمانوں کی تعداد سات سو رہ گئی جنہیں تین ہزار جنگجوؤں سے مقابلہ کرنا تھا۔ ان سات سو میں سے انصار کے دو قبیلے بنی سلمہ و بنی حارثہ بھی واپسی کے منصوبے باندھنے لگے مگر پھر سنبھل گئے اور پلٹنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ قرآن مجید میں انہی کے بارے میں ارشاد ہوا ہے:۔

اذھمت طائفتان منکم ان تفشلا۔	جب تم میں سے دو گروہوں نے (یہیں سے) پسپا ہونے کی ٹھان لی۔

پیغمبرِ اسلامؐ نے انہی سات سو لشکریوں کے ساتھ دامنِ کوہ میں پڑاؤ ڈال دیا۔ آج کا دن تو گزر ہی چکا تھا، دوسرے دن ۱۵ر شوال روزِ شنبہ دونوں طرف کی فوجوں نے اپنے اپنے مورچے سنبھال لئے۔ مشرکین کی تعداد بہت زیادہ تھی اور اسلحۂ جنگ بھی اُن کے پاس فراواں تھا۔ ان کے لشکر میں سات سو زرہ پوش تھے اور مسلمانوں کے پاس کُل ایک سو زرہیں تھیں۔ اُن کے پاس تین ہزار اُونٹ اور دو سو کوتل گھوڑے تھے اور یہاں صرف دو گھوڑے۔ ایک رسُول اللہؐ کے پاس اور ایک ابو بردہ کے پاس اور بس۔ فوج کی قلت اور سامانِ جنگ کی کمی کی وجہ سے ضرورت تھی کہ لشکر کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ دشمن کو ہر سمت سے حملہ کرنے کا موقع نہ مل سکے چنانچہ تحفظی تدابیر کے پیشِ نظر آنحضرتؐ نے کوہِ اُحد کو پس پُشت رکھا اور مدینہ کو سامنے کے رُخ پر۔ اور بائیں جانب کوہِ عینین کے ایک تنگ درہ پر پچاس کمانداروں کا ایک دستہ عبداللہ ابن جبیر کی زیرِ نگرانی کھڑا کر دیا اور اُسے تاکید کی کہ خواہ فتح ہو یا شکست جب تک اُسے حکم نہ دیا جائے کسی حالت اور کسی صورت میں اپنا مورچہ نہ چھوڑے۔ جنگی

اعتبار سے یہ کارروائی نہایت ضروری تھی اگر یہ انتظام نہ کیا جاتا تو کفار اس سمت سے حملہ آور ہو کر لشکرِ اسلام کو اپنے محاصرہ میں لے لیتے اور مسلمانوں کے لئے ان کے حصار کو توڑ کر اپنی جانیں بچا لے جانا مشکل ہو جاتا۔ اس نظم و انصرام کے بعد بقیہ لشکر کی صف بندی کی۔ میمنہ پر سعد ابن عبادہ کو اور میسرہ پر اسید ابن حضیر کو متعین کیا۔ لواء مصعب ابن عمیر کو دیا اور رایت جنگ حضرت علیؑ کے سپرد کیا جو جنگ بدر میں بھی علمبردار تھے اور بعد کے غزوات میں بھی علمبردار رہے۔

کفار نے بھی اپنے لشکر کو میمنہ و میسرہ میں تقسیم کیا۔ میمنہ کا سردار خالد ابن ولید کو بنایا اور میسرہ کا عکرمہ ابن ابی جہل کو۔ سواروں کا افسر عمرو ابن عاص کو مقرر کیا اور تیر اندازوں کا عبداللہ ابن ربیعہ کو۔ اور قلب لشکر میں جہاں قریش نے اپنا مشہور بُت ہبل ایک اُونٹ پر لاد رکھا تھا ابوسفیان جا کھڑا ہوا اور عَلَم لشکر بنی عبدالدار کی ایک فرد طلحہ ابن عثمان کے سپرد کیا گیا۔ جب کیل کانٹے سے لیس ہو گئے تو قریش نے اعل ھبل (ہبل کا بول بالا) کا نعرہ لگایا۔ اور ہند اور دُوسری عورتیں صفوں کے آگے کھڑی ہو گئیں اور لشکریوں میں جوش پیدا کرنے کے لئے دف پر ٹھمک ٹھمک کر گانے لگیں: ۔

نحن بنات طارق　　نمشی علی النمارق　　مشی القطا النوازق

ہم ستاروں کی بیٹیاں ہیں۔ قالینوں پر ناز و انداز سے اس طرح چلتی ہیں جس طرح سُبک رو قطا پرندہ چلتا ہے۔"

والمسك فی المفارق　　والدر فی المخانق　　ان تقبلوا نعانق

مانگ میں مشک بھری ہے۔ اور گردنوں میں موتی جگمگا رہے ہیں۔ اگر تم آگے بڑھو گے تو ہم تمہیں گلے سے لگائیں گے۔"

ونفرش النمارق　　او تدبروا نفارق　　فراق غیر وامق!

اور تمہارے لئے مسندیں بچھائیں گے۔ اور پیٹھ پھرائی تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے اس طرح کہ گویا تم سے کبھی چاہت تھی ہی نہیں۔"

اس ترانہ کے ختم ہوتے ہی طبل جنگ بجنے لگا اور دست بدست لڑائی کا آغاز ہو گیا۔ قریش کا علمبردار طلحہ ابن عثمان ہتھیار سج کر بڑے کر و فر سے میدان میں آیا اور طنز آمیز لہجہ میں کہنے لگا مسلمانو! تمہارا یہ خیال ہے کہ اگر تم میں سے کوی مارا جائے تو وُہ جنّت میں جاتا ہے اور ہم میں سے کوی مارا جائے تو اُس کا ٹھکانا دوزخ ہوتا ہے۔ لہٰذا تم میں جو جنت جانا چاہے یا مجھے دوزخ میں بھیجنے کا خواہشمند ہو وُہ آئے اور مجھ سے لڑے حضرت علیؑ تلوار لہراتے اور رجز پڑھتے ہُوئے اُس کے مقابلہ کے لئے نکلے اور دونوں شمشیر بکف آپس میں بھڑ گئے۔ طلحہ نے تلوار سے حملہ کیا، حضرتؑ نے اس کا وار خالی دے کر اس پر جوابی حملہ کیا اور بیک ضرب شمشیر اُس کی دونوں ٹانگیں کاٹ کر رکھ دیں۔ طلحہ لڑکھڑا کر زمین پر گرا۔ پیغمبرؐ نے اُسے گرتے اور علم کفار کو سرنگوں ہوتے

دیکھا تو صدائے تکبیر بلند کی اور اس کے ساتھ مسلمانوں نے بھی اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ حضرتؑ نے اُس کا سر کاٹنا چاہا تو دیکھا کہ وُہ برہنہ ہو چکا ہے۔ آپ نے اس حالت میں اُس پر دوسرا وار کرنا گوارا نہ کیا اور اُسے تڑپتا سسکتا چھوڑ دیا۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ آپ نے اسے ختم کئے بغیر کیوں چھوڑ دیا؟ فرمایا کہ جب وُہ بے پردہ ہو گیا تو مجھے اس پر حملہ کرتے ہُوے شرم آئی۔ اور پھر اُس نے مجھے قرابت وعزیزداری کا واسطہ بھی تو دیا تھا۔ آخر اُس نے تھوڑی دیر زمین پر سر پٹک کر دم توڑ دیا۔ طلحہ کے مارے جانے سے مشرکین کے حوصلے پست ہو گئے اور عام بے دلی سی پیدا ہو گئی اور ایک ایک کر کے میدان میں نکلنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ اب انہوں نے ایکدم ہلہ بول دیا۔ مسلمانوں نے آگے بڑھ کر اُن کے ریلے کو روکا۔ دونوں طرف سے کمانیں کڑکیں، تلواروں سے تلواریں ٹکرائیں اور گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی۔ ابو دجانہ انصاری جناب حمزہ اور حضرت علیؑ اور دوسرے مجاہدین نے حملوں پر حملے کئے اور دشمن کی صفوں میں تہلکہ مچا دیا۔

رسُولؐ خدا نے اس معرکہ میں ابو دجانہ کو ایک تلوار مرحمت فرمائی تھی۔ ابو دجانہ نے سر پر سُرخ پٹکا باندھا اور تلوار لے کر دشمن کی صفوں میں گھُس گئے اور صفوں کو چیرتے ہُوے اس مقام پر پہنچ گئے جہاں کفار کی عورتیں دف بجا بجا کر اپنے نغموں سے فوج میں جوش پیدا کر رہی تھیں۔ آپ نے ہند بنت عتبہ پر تلوار اُٹھائی اور چاہا کہ اس کے پرخچے اڑا دیں مگر اس خیال سے ہاتھ روک لیا کہ رسُولؐ کی دی ہُوی تلوار کو ایک عورت کے خون سے رنگین کرنا مناسب نہیں ہے۔

حضرت حمزہ کی تلوار صاعقہ بار بھی دشمن کے سروں پر پیہم چل رہی تھی۔ طلحہ ابن عثمان کے مارے جانے کے بعد عثمان ابن ابی طلحہ نے قریش کا علم بلند کیا تھا آپ نے تلوار سے اس پر حملہ کیا اور اس کا کام تمام کر دیا۔

حضرت علیؑ دونوں صفوں کے درمیان علم کو فضا میں لہراتے ہُوے حملوں پر حملے کئے جا رہے تھے اور لشکر قریش میں سے جو بھی علم ہاتھوں میں لیتا اُسے تہ تیغ کر کے پرچم کفر سرنگوں کر دیتے یہاں تک کہ آٹھ علمبرداروں کو یکے بعد دیگرے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اور جب بنی عبدالدار میں سے کوی پرچم اُٹھانے والا نہ رہا تو اُس کے قبیلہ کے ایک غلام صواب نے علم سنبھال لیا۔ حضرتؑ نے آگے بڑھ کر اُس کی کمر پر تلوار کا وار کیا اور اُس کے دو ٹکڑے کر دیئے اور اس طرح تمام پرچم برداروں کا خاتمہ کر دیا ہے۔ ابن اثیر نے تحریر کیا ہے:۔

کان الذی قتل اصحاب اللوا علیؑ۔ (تاریخ کامل۔ ج۲۔ ص۱۰۷) جس نے علمبرداران لشکر کو تہ تیغ کیا وُہ علیؑ تھے۔"

علمبرداران لشکر کے قتل سے قریش کا دم خم جاتا رہا۔ مسلمانوں کے حوصلے بڑھ گئے اور کفار کے مقابلہ میں ایک چوتھائی سے بھی کم ہونے کے باوجود بڑی بے جگری سے لڑتے سینوں کو چھیدتے اور صفوں کو اُلٹتے ہُوے آگے بڑھتے رہے یہاں تک کہ دشمن کے پاؤں جم نہ سکے اور شکست کھا کر میدان چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ ابوسفیان علم کو سرنگوں اور ہبل کو خاک بسر چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہُوا اور قریش کی عورتیں بھی پائنچے سمیٹے دوڑ پڑیں۔ مسلمانوں نے

جب کفار کو دوڑتے اور میدان خالی کرتے دیکھا تو اُن پر حرص و طمع کی کمزوری غالب آگئی اور دشمن کی طرف سے غافل ہو کر مالِ غنیمت پر ٹوٹ پڑے۔ درۂ کوہ کے محافظوں نے جب مالِ غنیمت لٹتے دیکھا تو اُن کے مُنہ میں پانی بھر آیا۔ عبد اللہ ابن جبیر نے انہیں پیغمبرؐ کا حکم یاد دلایا اور درّہ کو خالی چھوڑ کر جانے سے منع کیا مگر دس یا اس سے کم آدمیوں کے علاوہ کسی نے اُن کی بات نہ سُنی اور مالِ غنیمت لُوٹنے کے لئے دَوڑ پڑے۔ علامہ طبری نے لکھا ہے:۔

جعلوا یقولون الغنیمۃ الغنیمۃ فقال عبد اللہ مھلا اما علمتم ما عھد الیکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فابوا فانطلقوا۔ (تاریخ طبری۔ ج۲۔ ص۱۹۳)۔	وُہ لوگ غنیمت غنیمت پکارنے لگے۔ عبد اللہ نے کہا ٹھہرو۔ کیا تمہیں رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا فرمان یاد نہیں ہے۔ مگر انہوں نے ٹھہرنے سے انکار کر دیا اور مالِ غنیمت لوٹنے کے لئے چل دیئے۔"

کمانداروں کی اس بے صبری و ناعاقبت اندیشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ خالد ابن ولید اور عکرمہ ابن ابی جہل نے درۂ کوہ کو خالی پاکر دو سو کی جمعیت کے ساتھ عقب سے حملہ کر دیا۔ عبد اللہ ابن جبیر نے اپنے دو چار آدمیوں کے ساتھ بڑی جوانمردی سے مقابلہ کیا مگر چند آدمی اس یلغار کو روک نہ سکتے تھے ایک ایک کر کے سب شہید ہو گئے۔ خالد کے اس کامیاب حملہ کو دیکھ کر بھاگنے والے پلٹ آئے۔ سرنگوں علم کو بنی عبد الدار کی ایک عورت عمرہ بنت علقمہ حارثیہ نے اٹھا لیا۔ کفار نے اپنی بکھری ہوی طاقت کو از سر نو جمع کیا اور مسلمانوں کے منتشر لشکر پر حملہ کر دیا۔ مُسلمان حملہ سے بے خبر مالِ غنیمت سمیٹنے میں لگے ہوُے تھے کہ ایک طرف سے پسپا ہونے والی فوج اور دوسری طرف سے خالد کے دستہ نے گھیرا ڈال لیا اور تلواریں لے کر اُن پر ٹوٹ پڑے۔ اس دُو طرفہ یلغار سے مسلمان حواس باختہ سے ہو گئے اور کچھ خوف و دہشت اور کچھ گرد و غبار کی وجہ سے اپنے آدمیوں کے چہرے بھی نہ پہچان سکے اور بے دیکھے بھالے ایک دُوسرے پر تلواریں چلانے لگے۔ چنانچہ اسید ابن حضیر کو ابو بردہ ابن نیار نے زخمی کر دیا اور ابو بردہ ابو زعنہ کی تلوار سے زخمی ہو گئے۔ اور اس افراتفری میں حذیفہ کے والد یمان حذیفہ کے چیخنے چلانے کے باوجود مُسلمانوں کی تلواروں سے مارے گئے۔ جنگ کا نقشہ پلٹ گیا، جیتی ہوی جنگ شکست میں بدل گئی۔ کچھ مُسلمان شہید ہو گئے کچھ زخمی ہوُے اور کچھ حملہ کی تاب نہ لاکر بھاگ کھڑے ہوُے۔ موٗرخ طبری نے تحریر کیا ہے:۔

کان المسلمون لما اصابھم ما اصابھم من البلاء اثلاثا ثلث قتیل ثلث جریح وثلث منھزم (تاریخ طبری۔ ج۲۔ ص۱۹۷)	جب مُسلمانوں پر یہ مصیبت پڑی تو اُن میں سے ایک تہائی قتل ہو گئے، ایک تہائی زخمی ہو گئے اور ایک تہائی بھاگ کھڑے ہوُے۔"

اس ہنگامۂ رست وخیز میں سباع ابن عبد العزیٰ حضرت حمزہ کے سامنے سے گزرا۔ آپ نے اُسے یا ابن مقطعۃ البظور "اے ختنہ کرنے والی کے بیٹے" کہہ کر خطاب کیا اور شمشیر لے کر اس پر جھپٹے اور وہیں پر اُسے

ٹھنڈا کر دیا۔ جبیر ابن مطعم جس کا چچا طعیمہ ابن عدی جنگ بدر میں حضرت علیؑ کے ہاتھ سے مارا گیا تھا اس نے اپنے غلام وحشی سے عہد کیا تھا کہ اگر وہ محمدؐ، علیؑ یا حمزہؓ کو قتل کر دے گا تو اُسے آزاد کر دیا جائے گا اور ہند بنت عتبہ نے بھی اُسے زر و جواہر سے نہال کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ وحشی کے لیئے پیغمبرؐ اور علیؑ پر حملہ کرنا تو مشکل تھا اس نے حضرت حمزہؓ کو شہید کرنے کی ٹھان لی۔ اور موقع تاک کر پُوری چابکدستی سے اپنا بھالا اُن کی طرف پھینکا جو ناف پر لگا اور پیٹ کو چیرتا ہُوا دوسری طرف نکل گیا۔ آپ اس مہلک ضرب کے باوجود اس کی طرف لپکے مگر قوت نے ساتھ نہ دیا اور زمین پر گر کر شہادت عظمیٰ کے درجہ پر فائز ہُوے۔

ابن اثیر نے اسد الغابہ میں تحریر کیا ہے کہ حضرت علیؑ نے فرمایا کہ جب عام بھگدڑ مچی تو پیغمبر اسلام میری نظروں سے اُوجھل ہو گئے۔ مَیں نے مقتولین کے لاشوں میں دیکھا بھالا مگر کہیں نظر نہ آئے۔ مَیں نے دل میں کہا کہ ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ آپ میدان چھوڑ کر چلے جائیں اور جہادِ راہِ خدا سے مُنہ موڑ لیں۔ کہیں اللہ نے مسلمانوں کی نازیبا حرکت پر غضبناک ہو کر انہیں زندہ آسمانوں پر نہ اُٹھا لیا ہو۔ اب میرے لئے یہی بہتر ہے کہ لڑتے لڑتے قتل ہو جاؤں۔ چنانچہ میں نے تلوار کا نیام توڑ ڈالا اور دُشمن کی صفوں پر ٹوٹ پڑا۔ جب کفار کا پرا چھٹا تو میں نے دیکھا کہ پیغمبرؐ میدان میں ثابت قدم کھڑے ہیں۔ غرض اس ہنگامۂ دار و گیر میں آپ نے ایک لمحہ کے لئے بھی میدان چھوڑنا گوارا نہ کیا اور جان سے بے نیاز ہو کر دُشمن کی صفوں پر حملہ آور ہوتے، تیر و تلوار کے وار سہتے اور انہیں درہم و برہم کرتے رہے اور پُورے ثبات قدم کا مظاہرہ کرتے ہُوے پیغمبرؐ کے سینہ سپر رہے۔

ابن سعد نے تحریر کیا ہے:۔

وکان علیؑ ممن ثبت مع رسول اللہ یوم احد حین انھزم الناس وبایعہ علی الموت۔ (طبقات جـ۳ـ صـ۲۳)۔	"اُحد کے دن جب لوگ بھاگ کھڑے ہُوے تو علیؑ رسولؐ اللہ کے ساتھ ثابت قدم رہنے والوں میں سے تھے اور موت پر پیغمبرؐ کی بیعت کی"۔

اس اثناء میں پچاس سواروں کا ایک دستہ آنحضرتؐ پر حملہ آور ہونے کے لئے بڑھا۔ آپؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا کہ اے علیؑ دُشمن حملہ کے لئے بڑھ رہا ہے اسے آگے بڑھ کر روکو۔ علیؑ نے شیرانہ حملہ کر کے انہیں منتشر کر دیا۔ پھر دوسری سمت سے مشرکین نے حملہ کرنا چاہا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اے علی اب انہیں روکو حضرتؑ نے انہیں بھی تتر بتر کر دیا۔ غرض جدھر سے ہجوم بڑھتا اُدھر علیؑ آہنی دیوار بن کر کھڑے ہو جاتے اور دُشمن کے پرے توڑ کر رکھ دیتے۔ ان حملوں میں شیبہ ابن مالک عامری اور سفیان ابن عویف کے چاروں بیٹوں ابو الشعثاء، خالد، ابو الحمراء اور غراب کو قتل کر کے پیغمبرؐ کو خون آشام تلواروں سے محفوظ رکھا۔ حضرتؑ کی اس جانثاری و فداکاری کو دیکھ کر جبرئیلؑ امین نے پیغمبرؐ سے کہا:۔

یا رسول اللہ ان ھذہ للمواساۃ (تاریخ طبری۔ جـ۲ـ صـ۱۹۷)۔	"یا رسولؐ اللہ ہمدردی و غمخواری اسے کہتے ہیں"۔

پیغمبرؐ نے فرمایا کہ کیوں نہ ہو جبکہ علیؑ میرے ہیں اور میں اُن کا ہوں جبرئیلؑ نے کہا اور میں آپ دونوں کا ہوں۔ اسی موقع پر لا سیف الا ذوالفقار ولا فتیٰ الا علیؑ۔ کی آواز فضا میں گونجی اور فرش سے عرش تک تحسین و آفرین کی صدائیں بلند ہوئیں۔

حضرت علیؑ میدانِ جنگ میں مصروف پیکار تھے کہ مشرکین نے پیغمبرؐ پر ہجوم کیا اور عبداللہ ابن شہاب، عتبہ ابن ابی وقاص، ابن قمیئہ لیثی، ابی ابن خلف اور عبداللہ ابن حمید نے براہِ راست آپ پر حملہ کر دیا۔ عبداللہ ابن شہاب نے آپ کی پیشانی اقدس پر ضرب لگائی۔ عتبہ ابنِ ابی وقاص نے یکے بعد دیگرے چار پتھر پھینکے جس سے آپ کے چار دانت شہید اور ہونٹ شگافتہ ہو گئے۔ ابن قمیئہ نے قریب آکر تلوار کی ضرب لگائی جس سے خود کی کڑیاں پیشانی میں گڑ گئیں۔ چہرہ مبارک خون سے رنگین ہو گیا۔ ابی ابن خلف نے آگے بڑھ کر حملہ کیا آنحضرتؐ نے ایک صحابی حارث ابن صمہ کے ہاتھ سے نیزہ لے کر اُس کی گردن پر مارا جس سے ہلکا سا زخم آیا مگر وُہ اس زخم سے جانبر نہ ہو سکا اور پلٹتے ہُوئے مقام سرف تک پہنچا تھا کہ مر گیا۔ ان حملہ آوروں میں سے عبداللہ ابن حمید کو ابو دجانہ نے تہ تیغ کیا۔ قبیلہ انصار کے چند آدمیوں نے پیغمبرؐ پر حملہ ہوتے دیکھا تو وُہ آگے بڑھ کر حائل ہُوئے۔ انصار کو دیکھ کر کفار پیچھے ہٹے اور تھوڑے فاصلہ سے تیر برسانے شروع کئے۔ ابو دجانہ انصاری تیروں کی بوچھار میں پیغمبرؐ کے سینہ سپر بن گئے اور آنحضرتؐ پر جھک کر اپنی پیٹھ پر تیر کھاتے رہے۔ پیغمبرؐ کے قریب ہی مصعب ابن عمیر دشمن کے حملوں کو روکنے میں مصروف تھے کہ ابن قمیئہ نے حملہ کر کے انہیں شہید کر دیا۔ اور یہ سمجھ لیا کہ اُس نے پیغمبرؐ کو قتل کر دیا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی صفوں کے قریب پہنچ کر فخریہ لہجہ میں کہا کہ میں نے محمدؐ (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو قتل کر دیا ہے۔ یہ سُنتے ہی لوگوں نے شور مچا دیا کہ الا ان محمداً قد قتل۔ (محمدؐ قتل کر دیئے گئے) مسلمانوں میں سے کچھ تو پہلے ہی منتشر ہو چکے تھے اور جو رہ گئے تھے اس خبر کو سُن کر اُن کی ہمّت جواب دے گئی۔ اور ایک عام بھگدڑ مچ گئی۔ کچھ لوگ دُور چٹانوں کی اوٹ میں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ گئے اور کچھ لوگوں نے مدینہ میں پہنچ کر دم لیا۔ طبری نے تحریر کیا ہے:۔

تفرق عنه اصحابه ودخل	آنحضرتؐ کے اصحاب آپ کو چھوڑ کر الگ ہو گئے
بعضهم المدينة وانطلق	اُن میں سے کچھ مدینہ پہنچ گئے کچھ پہاڑ کے اُوپر
بعضهم فوق الجبل الى الصخرة	ایک چٹان پر چڑھ گئے اور وہیں پر ڈیرے ڈال
فقاموا عليها وجعل رسول الله	دیئے۔ پیغمبرؐ خدا انہیں پکارتے تھے "اے
يدعو الناس الى عباد الله الى	بندگانِ خدا اے اللہ کے بندو میرے پاس آؤ
عباد الله۔ (تاریخ طبری ج ۲ ص ۲۰۱)۔	میرے پاس آؤ"۔

قرآن مجید میں اس کا تذکرہ ان الفاظ میں ہے:۔

اذ تصعدون ولا تلوون	جب تم پہاڑ پر چڑھے جا رہے تھے اور

علیٰ احد والرسول یدعوکم فی اخراکم۔ | رسولؐ پیچھے سے تمہیں پکار رہا تھا مگر تم کسی کو مڑ کر بھی نہ دیکھتے تھے۔"

اس افراتفری اور نفسا نفسی کے عالم میں انس ابن نضر کا گزر اُس پہاڑ کی چوٹی کی جانب ہُوا جہاں چند مہاجر و انصار سر چھپائے بیٹھے تھے۔ آپ نے حیرت و استعجاب سے انہیں دیکھا اور کہا کہ تم لوگ یہاں کیوں جمع ہو؟ انہوں نے کہا کہ رسولؐ تو قتل کر دیئے گئے ہیں، کہا کہ اُن کے بعد تم زندہ رہ کر کیا کرو گے۔ اٹھو اور جس دین کی خاطر انہوں نے جان دی ہے تم بھی اپنی جانیں دے دو۔ یہ کہہ کر انس میدان کی طرف بڑھے۔ میدانِ جنگ میں سعد ابنِ معاذ دکھائی دیئے اُن سے کہا کہ کوہِ اُحد کی سمت سے میرے مشام میں جنّت کی خوشبو آرہی ہے۔ یہ کہہ کر تیروں کی بوچھار اور تلواروں کی جھنکار میں دُشمن کی سپاہ پر حملہ کر دیا اور تیر و تلوار کے ستّر زخم کھا کر شہادت سے ہمکنار ہو گئے۔ علّامہ طبری نے چٹان پر بیٹھنے والوں میں حضرت عمرؓ اور طلحہ ابن عبید اللہ کا خصوصیت سے نام لیا ہے اور اُن کی باہمی گفتگو بھی درج کی ہے جس سے اُن خیالات کی ترجمانی ہوتی ہے جن میں غلطاں و پیچاں تھے۔ وُہ لکھتے ہیں:-

قال بعض اصحاب الصخرۃ لیت لنا رسولا الی عبد اللہ ابن ابی فیاخذ لنا امنۃ من ابی سفیان یاقوم ان محمدًا قد قتل فارجعوا الی قومکم قبل ان یاتوکم فیقتلوکم۔	چٹان پر بیٹھنے والوں میں سے کچھ لوگوں نے کہا کہ کاش ہمیں کوئی قاصد مل جاتا جسے ہم عبد اللہ ابن ابی کے پاس بھیجتے جو ہمارے لئے ابوسفیان سے امان کی درخواست کرتا اے لوگو محمدؐ تو قتل ہو گئے اب اپنی قوم (قریش) کی طرف واپس چلو قبل اس کے کہ وُہ آئیں اور تمہیں قتل کر دیں"۔

(تاریخ طبری۔ ج۲۔ ص۲۰۱)

قرآن مجید میں ان لوگوں کے بارے میں ارشاد ہُوا ہے:-

افأن مات اوقتل انقلبتم علیٰ اعقابکم ومن ینقلب علی عقبیہ فلن یضر اللہ شیئا سیجزی اللہ الشاکرین۔	اگر پیغمبرؐ (اپنی موت) مر جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو کیا تم اُلٹے پیروں کُفر کی طرف پلٹ جاؤ گے اور جو اُلٹے پاؤں پلٹے گا وُہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اور خدا جلد ہی شکر گزاروں کو اچھا بدلہ دے گا"۔

آنحضرتؐ نے مصعب کی شہادت کے بعد لوا حضرت علیؑ کے سپرد کر دیا تھا۔ آپ دُشمن کو پیچھے ڈھکیلنے میں مصروف تھے کہ رسُولِ خدا صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خبرِ شہادت سُن کر چونکے۔ صفوں کو چیرتے ہُوئے اس مقام پر آئے جہاں پیغمبرؐ زندہ و سلامت موجود تھے۔ اگرچہ خود بھی زخموں سے چُور چُور تھے مگر پیغمبرؐ کی

حالت دیکھ کر اپنی حالت بھول گئے اور آنحضرتؐ کو سہارا دے کر ایک گھاٹی کی طرف لے چلے۔ کعب ابن مالک کی نظر آنحضرتؐ پر پڑی تو انہوں نے خوش ہو کر بے ساختہ کہا یہ رہے رسولِؐ خدا۔ آپ نے انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور بچے کھچے مسلمانوں کے ساتھ گھاٹی میں تشریف فرما ہوئے۔ امیرؑ المومنین پیغمبرؐ کو گھاٹی میں پہنچا کر چشمۂ مہراس سے ڈھال میں پانی بھر کر لائے۔ اتنے میں جناب فاطمہ زہراؑ چند خواتین کے ہمراہ یہ سُن کر کہ پیغمبرؐ شہید کر دیئے گئے ہیں اُس گھاٹی میں تشریف لے آئیں۔ باپ کو زندہ و سلامت دیکھ کر اطمینان ہُوا۔ مگر چہرہ و پیشانی کو خون سے رنگین دیکھ کر رونے لگیں اور بے ساختہ باپ سے لپٹ گئیں اور علیؑ کے ساتھ مل کر زخموں کو دھویا اور بوریئے کا ٹکڑا جلا کر زخموں پر رکھا جس سے خون تھم گیا۔

جنگ عملاً ختم ہو چکی تھی۔ کفار اپنی فتحیابی اور مسلمانوں کی ہزیمت پر خوش تھے۔ ابوسفیان نے پہاڑ کی ایک چوٹی پر چڑھ کر مسلمانوں سے پُوچھا کہ کیا محمدؐ زندہ ہیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اسے کوئی جواب نہ دے اُس نے پھر پُوچھا کہ کیا ابن ابی قحافہ ہیں کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر پُوچھا کہ کیا عمر ابن خطاب ہیں۔ اس پر بھی کوئی جواب نہ دیا گیا تو اس نے اپنے ہمراہیوں سے کہا کہ یہ تو سب مارے گئے۔ حضرت عمر پیغمبرؐ کے منع کرنے کے باوجود خاموش نہ رہ سکے اور کہا کہ ہم سب زندہ موجود ہیں۔ ابوسفیان نے اعل ھبل کا نعرہ لگایا۔ مسلمانوں نے پیغمبرؐ کی ہدایت پر اللہ اعلیٰ واجلّ (اللہ بزرگ و برتر ہے) کہہ کر اس کے نعرہ کا جواب دیا۔ ابوسفیان نے کہا کہ لنا العزی ولا عزی لکم (ہم عزیٰ رکھتے ہیں اور تم عزیٰ نہیں رکھتے) مسلمانوں نے کہا: اللہ مولانا ولا مولیٰ لکم (اللہ ہمارا والی ہے اور تمہارا کوئی والی نہیں ہے)۔ اُس نے پھر کہا کہ کل تم جیتے تھے اور آج ہم جیتے ہیں۔ ہم نے مقتولین بدر کا بدلہ تمہارے مقتولین سے لے لیا ہے۔ اب سالِ آیندہ اسی مہینہ میں بدر کے مقام پر تم سے مڈبھیڑ ہوگی۔ مسلمانو! تمہارے ہاں کی کچھ لاشوں کو مثلہ کیا گیا ہے مگر میں نے نہ اس کا حکم دیا تھا اور نہ اس سے منع کیا تھا۔ یہ کہہ کر اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ مکہ روانہ ہو گیا۔

اس خونیں معرکہ میں دو عورتوں کا کردار جو میدانِ جنگ میں زخمیوں کی مرہم پٹی اور پانی پلانے کے لئے آئی تھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سے ایک ام عمارہ نسیبہ بنت کعب ہیں جن کا شوہر زید ابن عاصم اور دو بیٹے حبیب اور عبداللہ اس جنگ میں لڑتے ہُوئے شہید ہُوئے تھے۔ اس خاتون نے جب دیکھا کہ پیغمبرؐ اسلام تیروں کی زد میں ہیں تو آنحضرتؐ کے آگے کھڑی ہو گئیں اور تیروں کو اپنے سینہ پر روک کر پیغمبرؐ کا بچاؤ کرتی رہیں۔ اور جب ابن قمیئہ تلوار لے کر آنحضرتؐ پر حملہ آور ہُوا تو تلوار لے کر اُس کے مقابلہ میں کھڑی ہو گئیں یہاں تک کہ بازو زخمی ہو گیا۔ اور دُوسری خاتون ام ایمن ہیں جنہوں نے مسلمانوں کو جنگ سے پیٹھ پھرا کر بھاگتے دیکھا تو اُن کی غیرت ایمانی جوش میں آئی۔ اور تو ان کا کوئی بس نہ چلا مٹی اٹھا اٹھا کر ان کے چہروں پر پھینکتی جاتی تھیں اور یہ کہتی جاتی تھیں:۔

هاك المغزل فاغزل به وهلم — لے یہ تکلا لیتا جا اور گھر میں بیٹھ کر سُوت کات

السیف (سیرۃ حلبیہ۔ ج ۲۔ ص ۲۵۲)۔ اور اپنی تلوار مجھے دیتا جا۔"

ان عورتوں کے کردار کے مقابلہ میں مردوں کے کردار پر نظر کی جائے تو میدان چھوڑنے والوں کی فہرست میں ایسے ایسے لوگوں کے نام بھی صفحاتِ تاریخ پر ثبت ہیں جن سے اس کٹھن مرحلہ پر ثباتِ قدم کی امید کی جاسکتی تھی۔ مگر حضرت علیؑ، ابو دجانہ انصاری، سہل ابنِ حنیف، عاصم ابنِ ثابت، مقداد ابن عمرو، سعد ابن معاذ، اسید ابن حضیر، طلحہ ابن عبید اللہ اور زبیر ابن عوام کے علاوہ کوئی ثابت قدم نظر نہیں آتا۔ بلکہ ان میں سے بھی اکثر میدان سے روگرداں ہوگئے تھے اور پھر واپس ہوئے تھے۔ ان پلٹ کر آنے والوں میں سے ایک حضرت ابو بکر بھی تھے چنانچہ وہ خود کہتے ہیں:۔

لما صرف الناس یوم احد عن رسول اللہ کنت اوّل من جاء النبیؐ۔ (تاریخ خمیس۔ ج ۱۔ ص ۴۸۵)۔

جب اُحد کے دن لوگ رسول اللہ کو چھوڑ کر چلے گئے تو میں سب سے پہلے پلٹ کر آنحضرتؐ کے پاس آیا۔"

اگرچہ اس قول میں یہ صراحت نہیں ہے کہ یہ واپسی کس وقت ہوئی۔ لیکن واقعات سے ظاہر ہے کہ یہ واپسی خاتمۂ جنگ کے بعد ہوئی۔ اس لئے کہ اگر دورانِ جنگ میں ہوتی تو کسی نہ کسی موقع پر ضرب لگانے یا کھانے والوں میں ان کا نام آتا جبکہ لڑنے والوں میں سے جو بھی مجروح ہوا اس کا نام تاریخ میں آئے بغیر نہیں رہا یہاں تک کہ طلحہ کی ایک انگلی پر خراش آگئی تو تاریخ نے اُسے بھی محفوظ کر لیا البتہ ان کا نام آتا ہے تو اس موقع پر جب دونوں طرف کی فوجوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور پیغمبرؐ چند لوگوں کے ہمراہ گھاٹی میں تشریف فرما ہوئے۔

حضرت عمر کے متعلق لکھا جا چکا ہے کہ وہ پہاڑ کی چوٹی پر دیکھے گئے تھے۔ چنانچہ وہ خود بھی کہتے ہیں:۔

تفرقنا عن رسول اللہ یوم أحد فصعدت الجبل۔

ہم اُحد کے دن رسول اللہ سے الگ ہوگئے اور مَیں پہاڑ کے اُوپر چڑھ گیا۔"

(ازالۃ الخفاء۔ ج ۱۔ ص ۱۶۸)۔

حضرت عثمان اس گروہ میں شامل تھے جو تین دن کے بعد مراجعت فرما ہوا۔ چنانچہ ابن اثیر تحریر کرتے ہیں:۔

فیھم عثمان ابن عفان وغیرہ الی الاعوص فاقاموا بہ ثلاثا ثم اتوا النبیؐ فقال لھم حین رأھم لقد ذھبتم فیھا عریضۃ

(تاریخ کامل۔ ج ۲۔ ص ۱۱۰)

ان بھاگنے والوں میں عثمان ابن عفان اور دوسرے لوگ شامل تھے۔ جو اعوص میں تین دن ٹھہرنے کے بعد نبیؐ اکرم کے پاس آئے۔ آپ نے انہیں دیکھا تو فرمایا تم لوگ تو بہت دُور نکل گئے۔"

حضرت علیؑ اس غزوہ میں جس پامردی و ثباتِ قدمی سے لڑے وہ اسلامی جہاد کا ایک عظیم نمونہ اور تاریخ کا ایک مثالی کارنامہ ہے۔ آپ اس وقت جبکہ دشمن کی یورش سے گھبرا کر لشکر کے قدم ڈگمگا گئے تھے تن تنہا

دشمن کی صفوں پر حملہ آور ہوتے رہے اور اپنے زورِ بازو سے اُن کی بڑھتی ہوئی یلغار کو روک کر اسلام اور بانئ اسلام کا تحفظ کرتے رہے اور جب تک معرکہ کارزار گرم رہا ایک لمحہ کے لئے نہ ہاتھ قبضۂ شمشیر سے الگ ہُوا اور نہ پائے عزم و ثبات کو جنبش ہوئی۔ حالانکہ پے در پے حملوں سے نڈھال اور تیروں اور تلواروں کے وار سے گھائل ہو چکے تھے۔ علامہ سیوطی نے لکھا ہے:۔

اصابت علیّا یوم احد ست عشرۃ ضربۃ۔ (تاریخ الخلفا صـ۱۱۴) — اُحد کے دن حضرت علیؑ کو تلوار کی سولہ ضربیں لگیں"۔

اس غزوہ میں مسلمانوں کو فتح تو حاصل نہ ہو سکی پھر بھی حضرت علیؑ، جناب حمزہ اور دوسرے دو چار جانبازوں کی ثبات قدمی نے مسلمانوں کو شکست کی بدترین صورت سے بچالیا۔ شکست کی یہ پیش آمدہ صورت کسی ناگہانی حادثہ کی وجہ سے رونما نہیں ہُوئی بلکہ اختلاف رائے اور بے ضابطگی کا قہری نتیجہ تھی۔ چنانچہ مسلمان پہلے محاذِ جنگ ہی کے سلسلہ میں دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ مدینہ میں رہ کر لڑنا چاہتا تھا اور دوسرا گروہ شہر سے باہر نکل کر نبرد آزما ہونے کا خواہشمند تھا۔ اور جب پیغمبرؐ کے نکل کھڑے ہونے پر باہر نکلنا طے پا گیا تو پھر کچھ لوگوں کی رائے نے پلٹا کھایا اور ایک گروہ کٹ کر مدینہ واپس آ گیا جس نے مسلمانوں کے عزم و ثبات اور جماعتی یکجہتی کو متاثر کیا اور انصار کے دو قبیلے بنی سلمہ و بنی حارثہ جنگ سے مُنہ موڑ کر واپس مدینہ چلے جانے پر آمادہ ہو گئے۔ ان واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ شروع ہی سے مُسلمانوں کے طرزِ عمل میں کمزوری رونما ہو چکی تھی اور جہاد میں جس جوش و ولولہ اور وحدتِ عزم و عمل کی ضرورت ہوتی ہے وُہ ناپید تھی اور آخر اس ذہنی پراگندگی اور عملی کمزوری کے نتیجہ میں مجموعی طور پر شکست و ہزیمت اور ناقابل تلافی جانی نقصان سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ ہزیمت مسلمانوں کی قلت اور کفار کی عددی کثرت کا نتیجہ نہ تھی بلکہ اس میں عزم کی کمزوری اور فرض کے عدم احساس ہی کا دخل تھا۔ چنانچہ جب تک مسلمانوں میں تھوڑا بہت ادائے فرض کا احساس اور مجاہدانہ ولولہ رہا تعداد میں کم ہونے کے باوجود دُشمن انہیں مغلوب کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ بلکہ انہوں نے کفار کو ان کی کثرت و قوت کے باوجود پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ اور جب انہوں نے صبر و استقلال اور جماعتی تنظیم کو ختم کر کے خود ناکامی کو دعوت دی تو پھر کس طرح شکست و ہزیمت سے بچ کر رہ سکتے تھے۔ چنانچہ اس ہزیمت و ناکامی کو قریب تر لانے اور قیمتی جانوں کے ضیاع کا باعث وہی لوگ ہُوئے جو درّۂ کوہ کی حفاظت پر متعین تھے۔ مگر انہوں نے نظم و ضبط کو خیر باد کہہ کر اپنی جگہ چھوڑ دی اور وقتی فتح کو مستقل فتح سمجھ کر مالِ غنیمت کے لُوٹنے میں مصروف ہو گئے۔ انہوں نے نہ رسُولؐ خدا کا تاکیدی فرمان یاد رکھا نہ اپنے سربراہ کا حکم مانا، نہ انجام کار پر نظر کی اور مالِ دُنیا کی طمع میں آ کر دشمن کو حملہ آور ہونے کا موقع دے دیا۔ اگر یہ لوگ ناعاقبت اندیشی سے کام نہ لیتے اور اپنا مورچہ خالی نہ چھوڑتے تو شکست کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔ قرآن مجید میں ان لوگوں کی دُنیا طلبی کے بارے میں ارشاد ہے:۔

ومنکم من یرید الدنیا ومنکم من یرید الاٰخرۃ۔	تم میں کچھ لوگ دنیا کے طالب ہیں اور کچھ آخرت کے خواستگار ہیں۔"

علامہ طبری نے لکھا ہے کہ طالبانِ دُنیا سے مراد وُہ لوگ ہیں جو درّہ کو خالی چھوڑ کر غنیمت پر لُوٹ پڑے اور طلبگارانِ آخرت سے مُراد وُہ ہیں جنہوں نے کہا کہ ہم ہر حال میں رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کریں گے اور اس جگہ کو خالی نہیں چھوڑیں گے۔ ابن مسعود کہتے ہیں:۔

ما شعرت ان احدا من اصحاب النبیؐ کان یرید الدنیا و عرضہا حتی کان یومئذ۔	"میں نہیں سمجھتا تھا کہ اصحاب رسُولؐ میں سے کوی دُنیا و مالِ دُنیا کا بھی پرستار ہو سکتا ہے یہاں تک کہ یہ دن دیکھنے میں آیا۔"

(تاریخ طبری ج ۲ ۔ ص ۱۹۳)۔

اس محافظ دستہ کے علاوہ ان لوگوں پر بھی شکست کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے جو رسُولؐ خدا کو دشمنوں کے نرغہ میں چھوڑ کر میدانِ کارزار سے بھاگ کھڑے ہوُے اور پیغمبرؐ کے پیہم پکارنے پر بھی اُن کے قدم نہ رُکے حالانکہ خداوند عالم کا ارشاد ہے کہ:۔

یا ایھا الذین اٰمنوا اذا لقیتم الذین کفروا زحفا فلا تولوھم الادبار۔	"اے ایمان دارو جب تم سے اور کافروں سے میدانِ جنگ میں مڈبھیڑ ہو تو خبردار اُن کی طرف سے پیٹھ پھرا کر چلے نہ جانا۔"

اگرچہ مسلمانوں کو کثیر جانی نقصان اٹھا کر اپنی غلطی کا خمیازہ بھگتنا پڑا مگر اس تباہی و ناکامی نے انہیں یہ درس بھی دیا کہ وُہ اپنی صفوں میں انتشار رونما نہ ہونے دیں، ہر قیمت پر نظم و ضبط برقرار رکھیں اور امیر و سربراہ کے احکام کی پابندی کریں۔ کیونکہ انتشار، خود غرضی اور نزاع و بد دلی شکست کا پیش خیمہ ہوتی ہے اور عزم و نظم ہی سے دشمن پر قابُو پایا جا سکتا ہے۔ اس شکست سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ ظاہری فتح و شکست حالات و اسباب کے تابع ہوتی ہے اسے حق و باطل کا معیار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کبھی حق پر ہوتے ہوُے شکست سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور کبھی باطل پر ہونے کے باوجود مادی اعتبار سے فتح ہو جاتی ہے۔ اس لئے اسلام نہ قوّت و اقتدار کو حق کا سرچشمہ قرار دیتا ہے اور نہ مادی شکست کو باطل کا نتیجہ۔ اس کے علاوہ یہ فائدہ بھی ہُوا کہ نفاق کی دبیز تہوں میں چھپے ہوُے چہرے بے نقاب ہو گئے جنہوں نے تھوڑی دیر کے لئے ساتھ دیا اور پھر اپنا راستہ الگ کر لیا اور ان تھڑدلوں کا بھی حال معلوم ہو گیا جو دشمن کے مقابلہ میں جم کر لڑنے کے بجائے تلواروں کو دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوُے اور جہاد راہِ خدا میں عملی اعتبار سے کمزوری دکھائی۔

اس غزوہ میں ستّر مسلمان شہید ہوُے اور بائیس کفار موت کے گھاٹ اُتارے گئے۔ مشرکین قریش نے

اگرچہ مقتولینِ بدر کا بدلہ لے لیا مگر ان کا جوشِ انتقام فرو نہ ہُوا اور فتح و کامرانی کی سرمستیوں میں کھو کر شہداء کے لاشوں سے بھی بدلہ لیا۔ چنانچہ معاویہ ابن مغیرہ ابن ابی العاص نے حضرت حمزہؓ کی میّت کی ناک کاٹی اور ھند بنتِ عتبہ نے ان کا پیٹ چاک کر کے کلیجہ نکالا اور اسے اپنے دانتوں سے چبایا اور اعضاء و جوارح کاٹ کر اُن کا ہار بنایا۔ اس کی دیکھا دیکھی دُوسری عورتوں نے بھی شہیدوں کے ناک کان کاٹے اور رسّی میں پرو کر ہاتھوں میں سجے۔ اور ابوسفیان نے بھی تہذیب و شرافت کو بالائے طاق رکھ کر حضرت حمزہؓ کے لاشہ کی بے حرمتی کی اور نیزے کی انی ان کے چہرے پر ماری جس پر بنی کنانہ کی ایک فرد حلیس ابن علقمہ نے چیخ کر کہا دیکھو یہ ابوسفیان ایک شریف قوم کے لاشہ سے کیا شرمناک سلوک کر رہا ہے۔ ابوسفیان نے سُنا تو شرمندہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔

ابوسفیان کی دشمنی و عناد اور انتقامی جذبہ اسلام لانے کے بعد بھی بدستور قائم رہا۔ چنانچہ حضرت عثمان کے دورِ خلافت میں اس نے حضرت حمزہؓ کی قبر پر ٹھوکر ماری اور کہا:۔

یا ابا عمارہ ان الامر الذی	اے ابوعمارہ (حمزہؓ) وُہ حکومت جس پر ہم آپس
اجتلدنا علیہ بالسیف	میں تلواریں چلاتے تھے آج ہمارے لڑکے
امسی فی ید غلماننا یتلعبون	بالوں کے ہاتھ میں ہے جس سے وُہ کھیل
بہ۔ (شرح ابن ابی الحدید ج۴ ص۵۱)۔	رہے ہیں"۔

یہ تھی ابوسفیان کی انتقام پسندی و کینہ جوئی جو اس کے مرنے کے بعد بھی اس کی اولاد میں اسی جوش و خروش کے ساتھ باقی رہی۔ چنانچہ ابوسفیان کے بیٹے معاویہ نے میدانِ صفین میں عبداللہ ابن بدیل کے لاشہ کو مثلہ کرنا چاہا جس پر انہی کے گروہ کی ایک فرد عبداللہ ابنِ عامر نے کہا:۔

لا یمثل بہ وفی روح۔ (شرح	میرے جیتے جی اسے مثلہ نہیں کیا جا سکتا"۔

ابن ابی الحدید جزو ۵۔ ص۱۷۷)۔

آخر معاویہ کو ہاتھ روکنا پڑا۔ یونہی اس کے پوتے یزید ابن معاویہ نے امام حسین علیہ السّلام کے سرِاقدس کی بے حرمتی کرتے ہُوئے اپنے باپ دادا کے عمل کو دُہرایا اور بنی اُمیّہ کی بدفطرتی و بدطینتی کو بے نقاب کر کے واقعۂ کربلا میں جذبۂ انتقام کی کارفرمائی کا ثبوت دیا۔

پیغمبر اکرمؐ سُن چکے تھے کہ شہیدوں کی لاشیں مثلہ کی گئی ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میرے چچا حمزہ کی لاش کا پتا کیا جائے کہ وُہ کس حالت میں ہے۔ حارث ابن صمہ نے کہا کہ مَیں اُن کی جائے شہادت دیکھ چکا ہوں ابھی جا کر خبر لاتا ہوں۔ یہ کہہ کر وُہ دامنِ کوہ میں آئے۔ حضرت حمزہؓ کے لاشہ کو دیکھا مگر جو حالت تھی پلٹ کر پیغمبرؐ سے بیان نہ کر سکے۔ آپ نے حضرت علیؑ کو بھیجا مگر انہوں نے بھی پلٹ کر گوارا نہ کیا کہ آنحضرتؐ کو اُن کے مثلہ کئے جانے کی کیفیت سے آگاہ کریں۔ آخر پیغمبر اکرمؐ خود وہاں پر تشریف لے گئے۔ اور جب حضرت حمزہؓ کا لاشہ دیکھا اور اُن کے کٹے پھٹے اعضاء پر نظر کی تو دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ ابن

مسعود کہتے ہیں:۔

ما رأینا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم باکیا اشد من بکائہ علےٰ حمزۃ رضی اللہ عنہ۔	ہم نے رسُول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کو اتنا روتے کبھی نہیں دیکھا جتنا حضرت حمزہؓ پر روتے دیکھا"۔

(سیرۃ حلبیہ۔ ج۔ ص۲۷۳)۔

جب کچھ لوگوں نے بتایا کہ ہند نے ان کا کلیجہ دانتوں سے چبایا تھا تو پُوچھا کیا اس میں سے کچھ کھایا بھی تھا؟ کہا کہ صرف چبایا مگر نگل نہ سکی اور اگل دیا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا:۔

ما کان اللہ لیدخل شیئاً من حمزۃ النار۔ (طبقات ابن سعد ج۔ ص۱۳)	اللہ تعالےٰ یہ گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ حمزہؓ کا کوی جزوِ بدن دوزخ میں ڈالے"۔

حضرت حمزہؓ کی خبر شہادت جب مدینہ پہنچی تو اُن کی بہن صفیہ بے تابانہ نکل کھڑی ہوئیں اور احد میں پہنچ گئیں۔ آنحضرتؐ نے چاہا کہ صفیہ جناب حمزہؓ کا لاشہ نہ دیکھیں، مگر صفیہ نے کہا کہ مجھے روکنے سے کوی فائدہ نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ اُن کی لاش کے ساتھ کیا بہیمانہ سلوک ہُوا ہے۔ آخر پیغمبرؐ نے حمزہؓ کی لاش پر اپنی چادر ڈالی۔ چادر چھوٹی تھی پیر کُھلے رہ گئے۔ آپ نے پیروں پر گھاس پھونس ڈال کر انہیں چھپا دیا اور صفیہ کو لاش پر جانے کی اجازت دے دی۔ صفیہ نے جب لاشہ دیکھا تو زبان سے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ کہا اور صبر وضبط کے باوجود بے ساختہ رونے لگیں اور پیغمبرؐ بھی اس گریہ وزاری میں شریک ہُوے۔

اب شہداء کی میّتوں کی تدفین کا مرحلہ درپیش تھا۔ آنحضرتؐ نے سب سے پہلے حضرت حمزہؓ کی میّت پر کرب واندوہ کی حالت میں نماز جنازہ ادا کی اور پھر دُوسرے شہداء پر نماز پڑھی اس طرح کہ ہر نماز میں حمزہؓ بھی شریک کئے جاتے۔ اور پھر دو دو کر کے تمام شہداء اپنے خون آلُودہ کپڑوں میں دفن کر دیئے گئے۔ حضرت حمزہؓ کے ساتھ ان کے ہمشیر زادہ عبد اللہ ابن حجشؓ کو دفن کیا گیا۔ اور ایک روایت یہ ہے کہ انہیں تنہا دفن کیا گیا۔ شہدائے اُحد کے کچھ لاشے مدینہ کے قبرستان جنۃ البقیع میں بھی دفن ہیں جو پیغمبر اکرمؐ کے منع کرنے سے پیشتر ان کے ورثہ اٹھا لائے تھے اور یہاں پر سپُردِ خاک کر دیا تھا۔

آنحضرتؐ ۲۲ شوال روز شنبہ مدینہ کی طرف مراجعت فرما ہُوے۔ جب انصار کے محلّہ کی طرف سے گزُرے تو خواتین کے رونے اور نوحہ وماتم کی آوازیں سُنیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہُوا کہ انصار کی عورتیں اُحد میں شہید ہونے والے عزیزوں پر گریہ وبکا کر رہی ہیں۔ یہ سُن کر پیغمبرؐ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور فرمایا: لکن حمزۃ لا بواکی لہ۔ "مگر حمزہؓ پر رونے والیاں نہیں ہیں"۔ انصار نے سُنا تو اپنی مستورات سے کہا کہ وُہ حضرت حمزہؓ پر پرسہ کے لئے جائیں اور اُن پر نوحہ وماتم کریں۔ چنانچہ خواتینِ انصار جناب فاطمہؑ کے ہاں جمع ہوئیں اور اپنے عزیزوں کی طرح حضرت حمزہؓ پر گریہ وبکا کیا۔ آنحضرتؐ مسجد میں تشریف فرما تھے

اُن کے رونے کی آوازوں کو سُن کر اور اُن کے جذبۂ ہمدردی و غمگساری سے متاثر ہو کر اُن کے حق میں دُعائے خیر کی۔ ابن سعد نے تحریر کیا ہے:۔

فھن الی الیوم ان مات المیّت من الانصار بدأ النساء یبکین علیٰ حمزۃ ثم یبکین علیٰ میّتھن (طبقات۔ ج۔ ص۴۴)

انصار کی عورتوں میں آج تک یہ دستور چلا آرہا ہے کہ جب اُن کے ہاں کوئی میت ہو جاتی ہے تو پہلے حضرت حمزہؓ پر گریہ و بکا کرتی ہیں اور پھر اپنے مرنے والے پر روتی ہیں"

یہ واقعہ ان لوگوں کے لئے آئینۂ بصیرت ہونا چاہئے جنہوں نے عملِ پیغمبرؐ کے خلاف یہ نظریہ قائم کر لیا ہے کہ ؎

روئیں وُہ جو قائل ہیں مماتِ شہدا کے ہم زندۂ جاوید کا ماتم نہیں کرتے

غزوۂ اُحد سے واپسی پر لشکرِ کفار کے دُو آدمی گرفتار کئے گئے جو اپنے کیفرِ کردار کو پہنچائے گئے۔ ان میں سے ایک ابوعزہ جمحی تھا جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے کہ اُس نے اپنے زورِ بیان سے اہلِ تہامہ و بنی کنانہ کو متاثر کر کے قریش کے جھنڈے کے نیچے جمع کیا تھا۔ یہ بدر کے اسیروں میں شامل تھا اور پیغمبرؐ نے اس کی ناداری و عیالداری پر ترس کھاتے ہوئے اُسے بلامعاوضہ رہا کر دیا تھا اور اُس سے یہ عہد لیا تھا کہ وُہ آئندہ مسلمانوں کے خلاف کوئی اقدام نہیں کرے گا۔ اب اس نے پھر پیغمبر اکرمؐ کی خوشامد درآمد کی مگر آپ نے فرمایا

لا یلسع المومن من جحر مرتین۔ (تاریخ کامل۔ ج۲۔ ص۱۱۴)۔

مومن ایک سُوراخ سے دُو دفعہ ڈسا نہیں جاتا"۔

آخر غدر و عہد شکنی کی پاداش میں قتل کر دیا گیا۔ اور دُوسرا معاویہ ابن مغیرہ تھا جس نے حضرت حمزہؓ کو مثلہ کرنے میں حصّہ لیا تھا۔ اُس نے خاتمۂ جنگ پر رات تو مدینہ کے اطراف میں گزاری اور صبح کے وقت چھپتا چھپاتا اپنے عزیز حضرت عثمان کے مکان پر آیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہُوا کہ وُہ گھر پر موجود نہیں ہیں کہا کہ میں نے اُن سے ایک اُونٹ خرید کیا تھا اُس کی قیمت ادا کرنے کے لئے آیا ہوں۔ لہذا وُہ جہاں بھی ہوں انہیں ڈھونڈ کر لایا جائے چنانچہ انہیں ڈھونڈ ڈھانڈ کر لایا گیا۔ حضرت عثمان نے دُشمنِ خدا و رسُولؐ کو اپنے دروازہ پر دیکھا تو بہت گھبرائے۔ پُوچھا کہ کیسے آنا ہُوا؟ کہا کہ آپ میرے عزیز اور قریبی رشتہ دار ہیں مجھے اپنے ہاں پناہ دیجئے۔ حضرت عثمان اُسے گھر کے اندر لے گئے اور مکان کے ایک تاریک گوشہ میں چھپا دیا اور خود گھر سے نکل کر پیغمبرؐ کے پاس چلے آئے اور اُنہیں یہ فرماتے ہُوئے سُنا کہ معاویہ مدینہ کے اندر موجود ہے اور آج صبح بھی یہیں تھا۔ اُسے ڈھونڈو اور تلاش کرو۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ عثمان کے علاوہ اور کہاں ہو گا۔ چنانچہ کچھ لوگ حضرت عثمان کو پیغمبرؐ کے پاس چھوڑ کر اُن کے گھر پر آئے اور معاویہ کو دریافت کیا۔ اُن کے گھر والوں نے زبان سے تو کچھ نہ کہا اس گوشہ کی

طرف اشارہ کر دیا جہاں وہ چھپا بیٹھا تھا۔ اُن لوگوں نے آگے بڑھ کر اُسے پکڑ لیا اور پیغمبرؐ کی خدمت میں لائے۔ حضرت عثمان نے جب دیکھا کہ راز فاش ہو چکا ہے تو رسولِ خداؐ سے کہا کہ یا رسولؐ اللہ میں صبح صبح اس لئے حاضر ہوا تھا کہ آپ سے معاویہ کے لئے امان کی درخواست کروں۔ آپ اس کی جان بخشی فرمائیں اور اُسے چھوڑ دیں۔ آنحضرتؐ نے حضرت عثمان کے کہنے سُننے سے اُسے تین دن کی مہلت دی کہ وہ اس عرصہ میں حدودِ مدینہ سے باہر نکل جائے ورنہ قتل کر دیا جائے گا۔ حضرت عثمان نے اُس کے لئے سواری اور زادِ راہ کا بندوبست کر دیا تاکہ جہاں جانا چاہتا ہے بآسانی چلا جائے۔ لیکن معاویہ تین دن گزرنے کے بعد بھی حدودِ مدینہ میں رہا۔ چوتھے دن آنحضرتؐ نے فرمایا کہ معاویہ ابھی تک مدینہ کے گرد منڈلا رہا ہے اس کا تعاقب کر کے اُسے گرفتار کرو اور قتل کر دو۔ یہ سُنتے ہی زید ابن حارثہ اور عمار یاسر اُٹھ کھڑے ہوئے اور رجمار کے قریب اُسے جا لیا۔ عمار یاسر نے اُس پر تیر مارا اور زید نے تلوار سے حملہ کر کے اُسے کیفرِ کردار تک پہنچایا۔ اور ایک قول یہ ہے کہ حضرت علیؑ نے اُسے قتل کیا چنانچہ بلاذری نے لکھا ہے:۔

انّ الذی قتل معاویۃ ابن المغیرۃ علی علیہ السّلام۔	علی علیہ السّلام نے معاویہ ابنِ مغیرہ کو قتل کیا۔"

(انساب الاشراف۔ ج۱۔ ص۳۳۸)

بعض مورخین نے لکھا ہے کہ معاویہ مدینہ سے نکل چکا تھا مگر راستہ بھول کر دوبارہ مدینہ میں آگیا اور اس خیال سے کہ حضرت عثمان پھر سفارش کر کے چھڑا لیں گے انہی کے ہاں آچھپا۔ مگر مسلمانوں نے حضرت عثمان کی سفارش سے پہلے ہی اُسے گرفتار کر کے قتل کر دیا۔ روایت کا یہ حصّہ کہ وہ راستا بھٹک کر دوبارہ مدینہ پہنچ گیا، کچھ بعید معلوم ہوتا ہے۔ آخر مدینہ کے گرد کون سا صحرائے تیہ تھا کہ جس میں بھٹکتا رہا یا کون سی بھول بھلیاں تھیں جو اسے ہر پھر کر وہیں لے آئیں جہاں سے چلا تھا۔ اس کا مقصد تو مدینہ اور اطرافِ مدینہ ہی میں رہنا تھا تاکہ مسلمانوں کے جنگی انتظامات اور اُن کی نقل و حرکت پر نظر رکھے اور قریش کے لئے اطلاعات فراہم کرے۔

غزوۂ بنی نضیر

ماہِ صفر ۴ھ میں قبیلۂ بنی عامر کا ایک سردار ابو براء نجد سے مدینہ میں آیا۔ پیغمبرِ اکرمؐ نے اُسے اسلام کی دعوت دی۔ اُس نے کہا کہ مجھے اسلام کے قبول کرنے میں کوئی باک نہیں ہے لیکن بہتر یہ ہو گا کہ آپ مسلمانوں کی ایک جماعت میرے ہمراہ نجد روانہ کریں جو وہاں کے باشندوں کو دعوتِ اسلام دے۔ فرمایا کہ اہلِ نجد سے اندیشہ ہے کہ وہ میرے آدمیوں کو گزند پہنچائیں گے کہا کہ وہ میری پناہ میں ہوں گے اور

میں اُن کی حفاظت کا ذمّہ دار ہوں۔ آنحضرت ؐ نے ستّر صحابیوں کو جو عابد و پرہیزگار اور صلاح و تقویٰ میں ممتاز تھے ایک مکتوب دے کر نجد روانہ کیا۔ انہوں نے سرزمین نجد میں پہنچ کر بئر معونہ میں منزل کی اور حرام ابن ملحان کو آنحضرت ؐ کا مکتوب اقدس دے کر ابو براء کے بھتیجے عامر ابن طفیل کے پاس بھیجا۔ اُس دشمن خدا نے خط کا پڑھنا تو درکنار اس کے لینے سے بھی انکار کر دیا۔ حرام ابن ملحان نے یہ صورت عناد دیکھی تو کہا کہ مجھے امان دی جائے تاکہ میں کچھ کہہ سکوں۔ ابھی وُہ کچھ کہنے نہ پائے تھے کہ عامر ابن طفیل کا اشارہ پا کر ایک شخص نے اُن کی پُشت پر نیزہ مارا جو سینہ کو چیر کر نکل گیا۔ آپ زمین پر گرے اور رُوح ملاءِ اعلیٰ کی طرف پرواز کر گئی۔

اس قتل ناروا کے بعد عامر نے اپنے قبیلہ والوں کو بئر معونہ میں مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کی ترغیب دی مگر انہوں نے ابو براء کے عہد و پیمان کی بناء پر اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ اُس نے دو چار دُوسرے قبیلوں کی مدد سے مسلمانوں کے گرد گھیرا ڈالا اور دو آدمیوں کے علاوہ سب کو قتل کر دیا۔ ان دو میں سے ایک کعب ابن زید تھے جنہیں مقتول سمجھ کر چھوڑ دیا گیا اور دُوسرے عمرو ابن اُمیہ تھے جنہیں اسیر کر لیا گیا اور بعد میں عامر ابن طفیل نے اپنی ماں کی ایک نذر کے سلسلہ میں انہیں آزاد کر دیا۔ عمرو ابن اُمیہ مدینہ واپس آتے ہُوئے قرقرۃ الکدر میں پہنچے تو بنی عامر کے دو آدمیوں کو دیکھ کر اُن کی تاک میں لگ گئے اور جب وُہ ایک درخت کے سایہ میں سو گئے تو اپنے ساتھیوں کے قصاص میں انہیں قتل کر دیا اور مدینہ چلے آئے۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہُوا کہ ان دونوں کو رسُول ؐ اللہ تحریراً امان دے چکے تھے۔ آنحضرت ؐ اس واقعہ پر مطلع ہُوئے تو فرمایا کہ جو کچھ ہوا ہے غلطی کی بناء پر ہُوا ہے، ہمیں ان دونوں کا خونبہا دینا چاہیئے۔

پیغمبر اسلام ؐ قبائل یہود بنی قینقاع، بنی قریظہ اور بنی نضیر سے باہمی تعاون و سازگاری کا معاہدہ کئے ہُوئے تھے۔ آپ نے چاہا کہ ان دونوں مقتولوں کے خونبہا کے سلسلہ میں بنی نضیر سے کچھ رقم بطورِ قرض یا بطورِ اعانت لیں۔ چنانچہ زرِ دیت کی بابت انہیں پیغام بھجوایا۔ انہوں نے کہلوا بھیجا کہ آپ ہمارے مہمان ہوں اور جیسا فرمائیں گے اُس پر عمل کیا جائے گا۔ پیغمبر ؐ چند صحابہ کے ہمراہ بنی نضیر کی آبادی میں جو مدینہ سے متصل تھی تشریف لے گئے اور اُن کی گڑھی کے باہر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ بنی نضیر پہلے ہی سے بدنیّت تھے انہوں نے ایک شخص عمرو ابن جحاش کو کہا کہ وُہ اس دیوار پر چڑھ کر جس کے نیچے آنحضرت ؐ تشریف فرما ہیں ایک بڑا سا پتھر اُوپر سے گرا دے تاکہ پیغمبر ؐ کا کام تمام ہو جائے۔ الہامِ غیبی نے پیغمبر ؐ کو آگاہ کیا اور آپ فوراً وہاں سے اُٹھ کر مدینہ واپس آ گئے اور محمد ابن مسلمہ کے ذریعہ انہیں پیغام بھیجا کہ تم نے غداری و بدعہدی کی ہے اور معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہُوئے میرے قتل کا اقدام کیا ہے لہٰذا دس دن کے اندر اندر اپنا تمام جمع جتھا سمیٹ کر یہاں سے نکل جاؤ اور کسی دُوسری جگہ پر سکونت اختیار کرو۔

بنی نضیر نے پیغمبر ؐ کا یہ تہدیدی حکم سُنا تو وُہ خائف و مرعوب ہو کر فوراً مدینہ چھوڑنے پر آمادہ ہو گئے مگر عبد اللہ ابن ابی نے جو اُن کا معاہد و حلیف تھا انہیں کہلا بھیجا کہ تم اپنے گھروں میں دلجمعی سے بیٹھے رہو اور کسی دُوسری جگہ

جانے کا ارادہ ترک کر دو۔ میں دو ہزار کی جمعیت کے ساتھ تمہاری مدد کروں گا اور اس موقع پر بنی قریظہ بنی غطفان اور اُن کے حلیف قبائل بھی تمہارے ساتھ تعاون کریں گے اور تمہیں بے گھر اور بے در نہ ہونے دیں گے۔
بنی نضیر نے اپنی پُشت پر معاون و مددگار دیکھے تو جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور آنحضرتؐ کو کہلوا بھیجا کہ ہم اپنے گھروں کو خالی نہیں کریں گے اور نہ یہاں سے کہیں اور جائیں گے۔ آپ سے جو بن پڑتا ہے کیجئے۔ یہ ایک طرح سے دعوتِ جنگ و قتال تھی جس پر خاموش نہ رہا جا سکتا تھا۔ آنحضرتؐ نے ایک مختصر سا لشکر ترتیب دیا اور اُن کے قلعوں کی طرف حرکت کی۔ طبری نے لکھا ہے کہ:۔

کانت رایتہ یومئذ مع علی ابن ابی طالب علیہ السّلام۔	اس دن علمِ پیغمبرؐ علی ابن ابی طالب علیہ السّلام کے ہاتھوں میں تھا۔"

(تاریخ طبری۔ جلد۔ ص ۲۲۶)۔

بنی نضیر نے جب سپاہِ اسلام کو آتے دیکھا تو قلعہ بند ہو گئے۔ مسلمانوں نے قلعہ کے گرد محاصرہ ڈال دیا۔ بنی نضیر نے اپنے گرد گھیرا دیکھا تو قلعہ کے اندر سے تیر اور پتھر برسانے شروع کئے مگر محاصرہ اُٹھانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ایک رات چند یہودی قلعہ سے باہر نکلے تاکہ مُسلمانوں پر تیر باراں کر کے انہیں محاصرہ اٹھا لینے پر مجبور کر دیں۔ اُن میں سے ایک شخص نے پیغمبرؐ کا خیمہ تاک کر تیر چلایا۔ آنحضرتؐ نے کھلی جگہ کے بجائے ایک پہاڑی کے دامن میں خیمہ نصب کرنے کا حکم دیا۔ ادھر پیغمبرؐ نے جگہ تبدیل کی اُدھر حضرت علیؑ چپکے سے اس تیر انداز کا پتا لگانے کے لئے اُٹھ کھڑے ہُوئے۔ صحابہ نے حضرتؑ کو نہ دیکھا تو پیغمبرؐ سے پُوچھا کہ علیؑ کہاں ہیں؟ فرمایا کسی کام ہی سے گئے ہوں گے ابھی آتے ہوں گے۔ اتنے میں علیؑ ایک یہودی کا سر لئے ہُوئے آئے اور پیغمبرؐ کے قدموں میں ڈال کر کہا کہ یہ ہے وُہ بدبخت جس نے آپ کے خیمہ پر تیر چلایا تھا۔ یہ یہودیوں کا مشہور تیر انداز غلول ہے۔ اور ابھی اس کے نو ساتھی قلعہ کے باہر گھوم پھر رہے ہیں۔ اگر چند آدمی میرے ساتھ چلیں تو انہیں بھی پکڑ کر لایا جا سکتا ہے۔ آنحضرتؐ نے ابو دجانہ، سہل ابن حنیف اور دو چار آدمی آپ کے ساتھ کر دیئے۔ آپؑ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ نکل کھڑے ہُوئے۔ ابھی تھوڑی ہی دُور گئے ہوں گے کہ اُن یہودیوں کو قلعہ بند ہونے سے پہلے گھیرے میں لے لیا اور وہیں پر سب کو مَوت کے گھاٹ اُتار دیا۔
بنی نضیر نے جب یہ دیکھا کہ اُن کے چند آدمی مارے گئے ہیں اور نہ بنی غطفان و بنی قریظہ مدد کو آئے ہیں اور نہ عبداللہ ابن ابی کے دو ہزار آدمیوں کا کچھ پتا ہے تو انہوں نے شکست و ہزیمت کا اعتراف کرتے ہُوئے آنحضرتؐ کو پیغام بھجوایا کہ اگر آپ ہماری جان بخشی کر یں تو ہم اس سرزمین کو چھوڑنے کے لئے تیار ہیں۔ آنحضرتؐ نے اس پر اپنی رضامندی کا اظہار کرتے ہُوئے فرمایا کہ انہیں اسلحۂ جنگ ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ ہتھیاروں کے علاوہ جو چیزیں وُہ لے جانا چاہتے ہیں لے جائیں۔ چنانچہ یہودنے اپنے ہاتھوں سے اپنے گھروں کو مسمار کیا، مکانوں کے دروازے کھڑکیاں اور جو کچھ وُہ لاد سکتے تھے چھ سو

اُونٹوں پر لادا اور گاتے دف بجاتے ہُوئے چل دیئے۔ اُن میں سے کچھ لوگ شام کے علاقہ کی طرف چلے گئے اور ایک گروہ جس میں سلام ابن ابی الحقیق، کنانہ ابن ربیع اور حیی ابن اخطب بھی شامل تھے، مدینہ سے جانب غرب خیبر میں آکر آباد ہو گیا۔

بنی نضیر کی زمینیں اور باغات مال فے ہونے کی بنا، پر پیغمبرؐ کی ملکیت قرار پائے۔ چنانچہ حضرت عمر کہتے ہیں:۔

كانت اموال بني النضير مما افاء الله على رسوله ولم يوجف المسلمون عليه بخيل و لا ركاب فكانت له خالصة۔

بنی نضیر کے اموال جو اللہ نے اپنے رسولؐ کو دلوائے وہ رسُولؐ اللہ کی ملکیت خاصہ تھے اس لئے کہ انہیں حاصل کرنے میں مسلمانوں نے نہ گھوڑے دوڑائے اور نہ اُونٹ"۔

(فتوح البلدان۔ صفحہ ۲۶)

یہ واقعہ ربیع الاوّل ۴ھ میں غزوۂ اُحد کے چھ ماہ بعد ہُوا۔

غزوۂ احزاب

بنی نضیر مدینہ سے جلاوطن ہو کر خیبر میں آ بسے مگر اُن کی شر پسند طبیعتوں نے انہیں نچلا نہ بیٹھنے دیا۔ جلاوطنی کا بدلہ لینے کے لئے ہمہ وقت بے چین رہتے اور غم و غصّہ سے پیچ و تاب کھاتے۔ خود تو اُن میں اتنا دم خم نہ تھا کہ اہل اسلام کے مقابلہ میں صف آرا ہوتے اور اُن سے نمٹنے میں کامیاب ہو جاتے انہوں نے اپنی عسکری قوّت کو بڑھانے کے لئے ہاتھ پیر مارے اور یہ طے کیا کہ قریش کو اپنے ساتھ ملا کر اور مختلف قبائل سے فوجی امداد لے کر مدینہ پر چڑھائی کی جائے اور مسلمانوں کو اس طرح کچل دیا جائے کہ وُہ آیندہ سر نہ اُٹھا سکیں۔ چنانچہ ان میں کے بیس آدمی جن میں حیی ابن اخطب، کنانہ ابن ربیع، سلام ابن مشکم اور سلام ابن ابی الحقیق بھی شامل تھے اور بنی وائل کے چند سردار مکہ آئے اور ابوسفیان اور دُوسرے سردارانِ قریش سے جنگ کے سلسلہ میں بات چیت کی۔ قریش اسلام دُشمنی میں یہود سے کم نہ تھے۔ دونوں نے اپنے سینے دیوارِ کعبہ سے مس کر کے اور قسمیں کھا کر باہم عہد و پیمان کیا کہ وُہ مُسلمانوں کے خلاف اُس وقت تک جنگ جاری رکھیں گے جب تک اُن کا استیصال نہیں ہو جاتا۔ جب قریش سے قول و قرار ہو چکا تو یہود نے بنی غطفان کا رُخ کیا اور انہیں بھی طمع و لالچ دے کر اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گئے۔ اسی طرح بنی کنانہ اور دُوسرے قبائل سے ساز باز کر کے چار ہزار کی جمیعت فراہم کر لی اور مدینہ پر حملہ آور ہونے کے لئے نکل کھڑے ہُوئے۔ راستے میں بنی سلیم، بنی اسد بنی فزارہ، بنی مرہ، اور بنی اشجع کے لشکر آ آ کر ملتے رہے اور بڑھتے بڑھتے اُن کی تعداد دس ہزار تک پہنچ گئی

اُن کے پاس سواری و باربرداری کے لئے تین سو گھوڑے اور چار ہزار اُونٹ تھے اور اسلحۂ جنگ اور سامانِ رسد بھی فراوانی سے تھا۔

ان اسلام دُشمنوں نے اگرچہ اپنی جنگی تیاریوں کو پوشیدہ رکھ کر بے خبری میں حملہ کرنا چاہا تھا مگر بنی خزاعہ کے چند سواروں کے ذریعہ پیغمبر اکرمؐ کو اُن کی پیش قدمی کی اطلاع ہو گئی۔ آپؐ نے دُشمن کی کثرت و قوت کو دیکھتے ہُوئے صحابہ کو جمع کیا اور دفاع کے طریق کار کے بارے میں مشورہ فرمایا۔ سلمان فارسیؓ نے کہا کہ اہلِ عجم کا دستور ہے کہ جدھر سے دشمن کے حملہ آور ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے اُدھر سے خندق کھود لیتے ہیں۔ ہمیں بھی اسی طریق کار پر عمل کرنا چاہیئے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ خندق ہمارے لئے دفاعی قلعہ کا کام دے گی اور دشمن اُسے بآسانی عبور کر کے یکبارگی حملہ آور نہ ہو سکے گا۔ اس تجویز پر عام طور پر پسندیدگی کا اظہار کیا گیا اور آنحضرتؐ نے بھی اسے پسند فرماتے ہُوئے اس پر عملدرآمد کا حکم دے دیا۔ مدینہ تین اطراف سے مکانوں کی دیواروں پہاڑیوں اور نخلستانوں کی وجہ سے محفوظ تھا۔ البتہ شرقی جانب سے کوئی روک نہ تھی اور ادھر ہی سے دشمن کے حملہ آور ہونے کا خطرہ تھا۔ آنحضرتؐ نے عورتوں اور بچوں کو مدینہ کی مختلف گڑھیوں میں ٹھہرا دیا اور خود تین ہزار صحابہ کے ساتھ کوہِ سلع کے دامن میں قیام فرما ہُوئے۔ اور مدینہ کے اسی رُخ پر خطوط کھینچ کر خندق کے حدُود قائم کئے اور تقسیم کار کے اصول پر مہاجرین و انصار کے دس دس آدمیوں پر چالیس چالیس ہاتھ زمین تقسیم کر دی۔ صحابہ نے کمریں کس لیں اور پھاوڑے اور کدال لے کر پُوری سرگرمی سے زمین کی کھدائی شروع کر دی۔ آنحضرتؐ نے خود بھی بنفسِ نفیس اس میں حصہ لیا اور شام و رُوم اور فارس و یمن پر اسلامی پرچم کے لہرانے کی پیشینگوئی فرمائی۔

عرب خندق اور اس کی تعمیر و ساخت سے ناواقف تھے۔ سب سے پہلے فریدون کے پوتے منوچہر نے جنگی تدابیر کے سلسلہ میں خندق ایجاد کی تھی اور عرب میں اس کی داغ بیل سلمان فارسی کے مشورہ کے بعد پڑی اس لئے وُہی اس کے ناظر و نگران قرار دیئے گئے۔ آپ کا کام صرف دیکھ بھال ہی نہ تھا بلکہ اس مستعدی سے زمین کھودتے تھے کہ تنہا ان کا کام دس آدمیوں کے کام کے برابر ہوتا تھا۔ اسی مہارت اور کام کی تیز رفتاری کو دیکھ کر مہاجرین و انصار نے انہیں اپنے گروہ میں شامل کرنا چاہا۔ چنانچہ مہاجرین نے کہا کہ سلمان منا۔ "سلمان ہم میں سے ہیں"۔ اور انصار نے کہا کہ سلمان منا "سلمانؓ ہم میں سے ہیں"۔ پیغمبر اکرمؐ نے سُنا تو فرمایا۔

سلمان منا سلمان منا اھل البیت۔ (تاریخ کامل۔ ج۲۔ ص۱۲۲)۔ "سلمان ہمارے ہیں سلمان ہمارے اہلبیت میں شامل ہیں"۔

بہر حال مسلمانوں نے جو گنتی میں تین ہزار تھے رات دن ایک کر کے ایک سرے سے دُوسرے سرے تک پانچ گز چوڑی پانچ گز گہری اور تین ساڑھے تین میل لمبی خندق کھود کر تیار کر لی۔ آنحضرتؐ نے خندق کے اندرونی کنارے پر آٹھ حفاظتی چوکیاں قائم کیں اور ہر چوکی پر ایک انصاری اور ایک مہاجر کی زیرِ نگرانی چند افراد متعین کر دیئے تاکہ دُشمن اگر خندق عبور کرنے کی کوشش کرے تو اس پر سنگباری کر کے اسے آگے بڑھنے سے روک دیں۔

جب یہود و مشرکین نواح مدینہ میں پہنچے تو خندق کو اپنے راستے میں حائل دیکھ کر بہت سٹپٹائے اور کہنے لگے

واللہ ان ھذہ لمکیدۃ ما کانت العرب تکیدھا۔ (سیرت ابن ہشام ج۳۔ ص۲۳۵)۔

خدا کی قسم یہ ایسی چال ہے جو اب تک عرب نے نہ چلی تھی"۔

یہود و قریش اپنی فوجی برتری اور ہتھیاروں کی فراوانی کی بنا پر یہ یقین رکھتے تھے کہ وہ مدینہ پہنچتے ہی مسلمانوں کو گھیرے میں لے کر تلوار کی باڑ پر رکھ لیں گے۔ مگر اس نئی جنگی تدبیر نے اُن کے بڑھتے ہوئے قدم روک دیئے۔ سوچے سمجھے منصوبے خاک میں ملا دیئے اور اُن کی کثرت و قوت کے مقابلہ میں مسلمانوں کی کمی و ضعف حالی کا بڑی حد تک تدارک کر دیا۔

پیغمبر اسلامؐ نے مدینہ میں جن قبائل سے معاہدہ کیا تھا ان میں یہود کا ایک قبیلہ بنی قریظہ بھی تھا اور وہ معاہدہ کی رُو سے پابند تھے کہ دُشمن کے خلاف مسلمانوں سے تعاون کریں۔ ابو سفیان کو یہ فکر ہوی کہ اگر بنی قریظہ معاہدہ کی بنا پر مسلمانوں کی صف میں شامل ہو گئے تو ان کی قوت و طاقت بڑھ جائے گی لہذا انہیں کسی نہ کسی طرح معاہدہ شکنی پر اُکسانا چاہیئے۔ چنانچہ اس نے بنی نضیر کے ایک سردار حیی ابن اخطب کو اُن کے ہاں بھیجا' تاکہ انہیں مسلمانوں کے تعاون سے باز رکھنے کی کوشش کرے۔ حیی بنی قریظہ کے سردار کعب ابن اسد کی گڑھی پر آیا جو مدینہ کی مشرقی سمت واقع تھی اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ کعب نے پُوچھا کہ کون ہے کہا میں حیی ابن اخطب ہوں۔ کعب سمجھ گیا کہ وہ اس طرح چوری چھپے کس مقصد سے آیا ہے۔ اس نے دروازہ کھولنے اور بات چیت کرنے سے انکار کر دیا۔ حیی نے کہا کہ تم دروازہ کھولو میں تمہیں یہ خوشخبری سُنانے آیا ہوں کہ قریش اور تمام قبائل عرب مُسلمانوں سے لڑنے کے لئے متحد ہو چکے ہیں۔ اگر تم سرخروئی اور عرب میں نیکنامی چاہتے ہو تو مُسلمانوں کے خلاف ہمارا ساتھ دو۔ کعب نے کہا کہ ہم نے محمدؐ (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے خیر و نیکی اور وفائے عہد کے علاوہ کوی چیز نہیں دیکھی۔ ہم بلاوجہ عہد شکنی نہیں کریں گے۔ اور تُو ہمارے لئے نیکنامی کا پیغام لے کر نہیں آیا بلکہ ہمیں رُسوا و ذلیل کرنا چاہتا ہے۔ اور قبائل عرب کے جس متحدہ محاذ پر تُو اترا رہا ہے وُہ اس ابرِ تیز رو کے مانند ہے جو گرجتا ہے اور بن برسے چھٹ جاتا ہے۔ حیی نے کہا کہ مہمان کے لئے دروازہ بند رکھنا عرب کی خصلت نہیں ہے۔ تم دروازہ کھولو اور مجھ سے رُو در رُو بات کرو۔ حیی کے اصرار پر کعب نے دروازہ کھول دیا اور دونوں میں پھر بحث چھڑ گئی۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ حیی نے اپنی چرب زبانی سے اُسے بہلا پھسلا کر اپنا ہم خیال بنا لیا۔ اور بنی قریظہ سے وعدہ کیا کہ یہود و قریش کے پسپا ہونے کی صورت میں اگر اُن پر کوی افتاد پڑی تو وُہ انہیں مصیبت میں چھوڑ کر واپس نہیں جائے گا بلکہ انہی کے ہاں فروکش رہے گا اور جو حشر اُن کا ہو گا وہی اس کا ہو گا۔ چنانچہ پیغمبرؐ سے کیا ہُوا تحریری معاہدہ چاک کر دیا گیا اور بنی قریظہ علانیہ قریش کے معاون و مددگار بن گئے۔

جب پیغمبر اکرمؐ کو بنی قریظہ کی بد عہدی و عہد شکنی کا علم ہُوا تو آپ نے سعد ابن معاذ کو اُن کے ہاں بھیجا تاکہ انہیں سمجھا بجھا کر راہِ راست پر لائیں اور معاہدہ کی خلاف ورزی سے روکیں۔ مگر سعد کے سمجھانے بجھانے کا اُن پر کوی اثر نہ ہُوا اور انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ ہم کسی کو جانتے پہچانتے نہیں ہیں اور نہ ہمارا کسی سے کوی معاہدہ ہے۔ یہ لوگ چونکہ مدینہ کے اندر ہی آباد تھے اس لئے شہر میں رہ جانے والے بچوں اور عورتوں کے لئے مستقل خطرہ بن گئے۔ مسلمان سخت ہراساں اور پریشانی و کشمکش کے عالم میں تھے۔ ایک طرف دُشمن کا محاصرہ شدّت اختیار کئے ہُوے تھا اور دُوسری طرف بنی قریظہ کے نقضِ عہد سے کفار کا دباؤ بڑھ گیا تھا اس دوطرفہ یلغار کے نتیجہ میں مُسلمانوں کے خوف و اضطراب کا نقشہ قدرت نے ان الفاظ میں کھینچا ہے:۔

اذ جاؤکم من فوقکم و من اسفل منکم و اذ زاغت الابصار و بلغت القلوب الحناجر و تظنون باللہ الظنونا ھنالك ابتلی المومنون و زلزلوا زلزالا شدیدا۔	جس وقت وُہ لوگ تم پر تمہارے اُوپر سے اور تمہارے نیچے کی طرف سے آپڑے اور جس وقت تمہاری آنکھیں پتھرا گئیں اور دل کھنچ کر گلوں میں آگئے اور تم خدا کے متعلق مختلف گمان کرنے لگے تب مُسلمانوں کی آزمائش کا وقت آگیا اور انہیں بڑی سختی سے جھنجوڑ دیا گیا"۔

اس موقع پر مسلمانوں کو گھبراہٹ ہونا ہی چاہیئے تھی جبکہ دشمن کی دل بادل فوجیں گھیرا ڈالے پڑی تھیں اور شہر کے اندر بنی قریظہ گھات لگائے بیٹھے تھے۔ پھر مسلمانوں میں ایک اچھی خاصی تعداد منافقوں اور تھڑ دلے مسلمانوں کی بھی تھی جو خود بھی ڈرے سہمے جا رہے تھے اور دُوسروں میں بھی بد دلی و بے حوصلگی پیدا کر رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے حیلے بہانے کرکے میدان سے کھسکنا شروع کر دیا اور پیغمبرؐ سے کہا کہ ہمارے گھر کھلے پڑے ہیں چوری چکاری کا اندیشہ ہے ہمیں اپنے گھروں میں واپس جانے کی اجازت دی جائے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے:۔

و اذ قالت طائفۃ منھم یا اھل یثرب لا مقام لکم فارجعوا و یستاذن فریق منھم النبی یقولون ان بیوتنا عورۃ و ما ھی بعورۃ ان یریدون الا فرارا۔	اور جب ان میں کا ایک گروہ کہنے لگا کہ اے اہل مدینہ تمہارا یہاں کوی ٹھکانا نہیں لہذا پلٹ چلو اور ان میں سے ایک گروہ پیغمبرؐ سے اجازت طلب کرتے ہُوے کہتا تھا کہ ہمارے گھر خالی پڑے ہیں حالانکہ وُہ خالی اور غیر محفوظ نہ تھے وُہ تو اس بہانے سے بھاگنا چاہتے تھے"۔

یہاں تک کہ معتب ابن قشیر نے جو بدری ہونے کا امتیاز رکھتا تھا یہ کہہ دیا کہ:۔

کان محمدؐ یعدنا ان ناکل کنوز	محمدؐ ہم سے یہ وعدے کرتے تھے کہ ہم کسریٰ و

کسریٰ وقیصر واحدنا الیوم لا یامن علیٰ نفسہ ان یذھب الی الغائط۔ (سیرت ابن ہشام ج ۳ ص ۲۳۳)

قیصر کے خزانوں پر ہاتھ صاف کریں گے اور آج یہ حالت ہے کہ اگر ہم میں سے کوئی رفع حاجت کے لئے جانا چاہے تو وہ اپنی جان کو محفوظ نہیں سمجھتا۔"

البتہ کچھ مخلص ارباب ایمان ایسے بھی تھے جو نہ دشمن کی کثرت کو خاطر میں لاتے تھے اور نہ سختیوں سے دوچار ہونے سے گھبراتے تھے بلکہ شدائد و آلام میں گھر کر ان کا یقین و ایمان بڑھتا اور خود اعتمادی کا جوہر نکھرتا جاتا تھا۔ چنانچہ قرآن مجید میں ان کے بارے میں ارشاد ہوا ہے:۔

ولما رآ المومنون الاحزاب قالوا ھٰذا ما وعدنا اللہ و رسولہ و صدق اللہ و رسولہ وما زادھم الا ایمانا وتسلیما۔

جب سچے ایمانداروں نے کفار کے جتھوں کو دیکھا تو کہنے لگے یہ وہی چیز ہے جس کا اللہ اور اس کے رسولؐ نے وعدہ کیا تھا اور خدا اور اس کے رسولؐ نے سچ کہا تھا اور اس سے ان کا ایمان اور جذبۂ اطاعت اور زیادہ ہو گیا۔"

مسلمانوں کے لئے یہ کڑی آزمائش کا وقت تھا۔ سردی کی شدت اور فاقوں کی سختی سے خستہ و بے حال ہو چکے تھے اور کفار بھی پڑے پڑے اُکتا گئے تھے انہیں محاصرہ کئے ستائیس دن ہو چکے تھے اور خندق کے حائل ہونے کی وجہ سے دست بدست جنگ کی نوبت نہ آئی تھی صرف پتھروں اور تیروں کا تبادلہ ہوتا رہا تھا۔ جس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ آخر انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ کسی طرح پہرہ داروں کی نظروں سے بچ کر خندق پار کریں اور مسلمانوں کو تلواروں کی زد پر رکھ لیں۔ چنانچہ ان کے چند سردار دیکھتے بھالتے ہوئے خندق کے ایک ایسے حصہ پر پہنچے جو کم چوڑا تھا اور اس کی حفاظت کا بھی کوئی خاص اہتمام نہ تھا۔ انہوں نے اندازہ کر لیا کہ یہاں سے گھوڑوں کو مہمیز کر کے خندق کو عبور کیا جا سکتا ہے۔ اس کام کے لئے قریش کے نامور شہسوار عمرو ابن عبدود عامری، عکرمہ ابن ابی جہل، حسل ابن عمرو، منبہ ابن عثمان، ضرار ابن خطاب فہری، نوفل ابن عبداللہ اور ہبیرہ ابن ابی وہب منتخب کئے گئے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور خندق کو پھلانگنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس منزل کے سر ہونے سے کفار کے پژمردہ ولولوں میں کچھ توانائی آئی اور ابو سفیان اور خالد ابن ولید نے فوراً لشکر کی صف بندی کی تاکہ ان شہسواروں کے جوہر شجاعت دکھانے کے بعد فوجوں کو خندق کے اُس پار اُتاریں اور جنگ مغلوبہ شروع کر دیں۔ ان پھلانگنے والوں میں یوں تو سب ہی آزمودہ کار اور جنگ آزما تھے مگر ان سب سے زیادہ مشہور بہادر اور نامور شمشیر زن عمرو ابن عبدود تھا جو عماد عرب اور فارس یلیل کے نام سے پکارا جاتا اور میدان کارزار میں ایک مخصوص علامت سے پہچانا جاتا تھا۔ اسے فارس یلیل اس لئے کہا جاتا تھا کہ اس نے اس مقام پر ایک ہزار قزاقوں کو پسپا کر دیا تھا۔ چنانچہ اس موقع پر حضرت عمر نے پیغمبر اکرمؐ سے بیان کیا

کہ یا رسولؐ اللہ میں ایک کاروانِ تجارت میں شریک ہو کر شام جا رہا تھا اور یہ بھی ہمارا ہمسفر تھا۔ جب ہمارا قافلہ مقامِ یلیل پر پہنچا تو ایک ہزار رہزنوں نے قافلہ پر حملہ کر دیا۔ تمام اہلِ قافلہ اپنا سامان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے مگر یہ اپنی جگہ سے نہ ہٹا۔ اور اس طرح جی توڑ کر لڑا کہ رہزنوں کو بھاگتے ہی بن پڑی اور ہمارا قافلہ صحیح و سالم منزل پر پہنچ گیا۔ اس واقعہ کے بعد عرب کے دلوں پر اس کی شجاعت و شمشیر زنی کی ایسی دھاک بیٹھ گئی کہ اکیلا ہزار کے برابر سمجھا جانے لگا۔ ہزار آدمیوں کے برابر سمجھے جانے کے معنی یہ ہیں کہ اس کی شرکت سے فوج کا حوصلہ اتنا بڑھ جاتا تھا جیسے ایک ہزار کا اس میں اضافہ ہو گیا ہو۔ جب اُس نے آگے بڑھ کر پکارا کہ میرے مقابلہ میں کون آتا ہے تو کسی طرف سے کوئی جواب نہ ملا اور نہ کسی کو اس کے مقابلہ میں آنے کی جرأت ہو سکی۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا کہ من لھٰذا الکلب "کون ہے جو اس کُتے کو جواب دے"۔ حضرت علیؑ خندق کا کنارا چھوڑ کر آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا انا لہٗ یا نبیؐ اللہ۔ "یا رسولؐ اللہ میں اس کا مقابلہ کروں گا"۔ فرمایا بیٹھو شاید کوئی اور اس کے مقابلہ کی ہمت کرے۔ مگر جب کوئی صدا بلند نہ ہوئی تو آنحضرتؐ نے دوبارہ فرمایا کہ تم میں کون ہے جو اس کا مدمقابل ہو اور مسلمانوں کو اس کے شر سے بچائے۔ حضرت علیؑ نے پھر اجازت مانگی۔ فرمایا ابھی ٹھہرو۔ عمرو پھر للکارا اور کہا کون ہے جو میرے مقابلہ کو آتا ہے مگر کوئی آمادہ نہ ہوا۔ جب عمرو تیسری مرتبہ للکارا اور کوئی بڑھ کر اس کے سامنے نہ آیا تو اُس نے طنز کرتے ہوئے کہا کہ مسلمانو! تمہاری وہ جنت کیا ہوئی جس میں تمہیں مر کر جانا ہے اور وہ دوزخ کیا ہوا جو مرنے کے بعد ہمارا ٹھکانا ہے۔ آؤ یا تم جنت میں جاؤ یا مجھے دوزخ میں بھیجو۔ پھر گھوڑے کو ایڑ لگائی اور سپاہِ اسلام کے قریب آ کر رجز پڑھنے لگا۔

ولقد بححت من النداء بجمعکم هل من مبارز ۔۔ و وقفت اذ جبن المشیع موقف البطل المناجز

"چیختے چیختے میری آواز بیٹھ گئی ہے میں ان مقامات پر بھی ایک بہادر جنگجو کی طرح جم کر لڑتا ہوں جہاں اچھے اچھے شجاع کمزوری دکھا جاتے ہیں"۔

وکذلك انی لم ازل متسرعا نحو الهزاهز ۔۔ ان الشجاعة فی الفتی والجود من خیر الغرائز

جنگ کی طرف میرے قدم تیزی سے بڑھتے ہیں اور ایک جوانمرد کی سب سے بڑی خوبی سخاوت اور شجاعت ہی تو ہے"۔

عمرو کے بار بار للکارنے پر ایک سناٹا تھا جو ہر طرف چھایا ہوا تھا۔ ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھتے اور چپ سادھ لیتے۔ اور کسی کو ہمت و جرأت نہ ہوتی تھی کہ آگے بڑھ کر للکارتا اور اس کا غرور توڑتا۔ تاریخ نگاروں نے اُس وقت کی خاموشی و بے حسی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:۔ کان علیٰ رؤوسهم الطیر۔ گویا ان کے سروں پر[1]

---

[1] یہ ایک مثل ہے جو اُس موقع پر بولی جاتی ہے جب کوئی شخص دشمن کے للکارنے یا جواب طلب کرنے پر سر نہوڑائے خاموش رہے۔ چنانچہ عرب کا ایک شاعر کہتا ہے: اذا حلت بنو لیث عکاظا ۔ رأیت علیٰ رؤوسهم الغرابا۔ (باقی بر ط ۲۱۹)

پرندے بیٹھے ہوئے تھے"۔ حضرت علیؑ نے جب کفر کی مبارز طلبی اور مسلمانوں کی خاموشی دیکھی تو پیچ وتاب کھاتے ہوئے اُٹھے اور پیغمبر اکرمؐ سے عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ اب مجھے اس سے دو دو ہاتھ کرنے کی اجازت دیجئے۔ اس سے پہلے پیغمبرؐ دو مرتبہ علیؑ کو روک چکے تھے۔ یہ روکنا اس بنا پر نہ تھا کہ آپ عمرو کے مقابلہ میں انہیں کمزور و ناتواں سمجھتے تھے بلکہ آنحضرتؐ یہ چاہتے تھے کہ انہیں روک کر دوسروں کی ہمت وجوانمردی کی آزمائش کریں اور دیکھیں کہ کس کی رگ حمیت پھڑکتی اور خون شجاعت جوش مارتا ہے۔ اگر عمرو کی پہلی ہی للکار پر علیؑ کو اجازت دے دیتے تو دوسرے کہہ سکتے تھے کہ ہم بھی مقابلہ کے لئے تیار تھے مگر علیؑ کے میدان میں اُتر آنے سے ہم خاموش ہو گئے اور ہمیں زور آزمائی کا موقع نہ مل سکا۔ مگر عمرو کی پیہم للکار پر سکوت و بے حسی نے اُن کی ہمت و شجاعت کا پردہ چاک کر دیا۔ اس عمومی آزمائش کے بعد آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ کی جرأت و خود اعتمادی کا جوہر نمایاں کرنے کے لئے اُن سے کہا۔ ھٰذا عمرو ابن عبدود فارس یلیل "یہ شہسوار یلیل عمرو ابن عبدود ہے"۔ آپ نے کہا اگر وہ عمرو ہے تو ہوا کرے میں بھی تو علی ابن ابی طالب ہوں۔ آنحضرتؐ نے علیؑ کے سر پر اپنا عمامہ "سحاب" رکھا اپنی زرہ ذات الفضول پہنائی کمر میں ذوالفقار باندھی اور بارگاہ احدیت میں ہاتھ اُٹھا کر عرض کیا:۔

اللھم انک اخذت منی عبیدۃ	خداوندا تو نے عبیدہ کو بدر کے دن اور حمزہ
یوم بدر وحمزۃ یوم احد	کو اُحد کے دن اُٹھا لیا۔ اب ایک علیؑ ہیں
فاحفظ علی الیوم علیاً ربّ لا	تو ان کی حفاظت فرما۔ پروردگارا مجھے اکیلا
تذرنی فرداً وانت خیر الوارثین	نہ چھوڑنا اور تو بہترین وارث ہے"۔

(شرح ابن ابی الحدید۔ جـ۴۔ صـ۳۴۴)

اِدھر حضرت علیؑ نے پیغمبرؐ سے اجازت لے کر میدان کا رخ کیا اُدھر آنحضرتؐ کی زبان سے یہ کلمات فضا میں گونجے:۔ برز الایمان کلہ الی الشرک کلہ "کل ایمان کل شرک کی طرف بڑھ رہا ہے"۔ آپؑ نے آگے بڑھ کر عمرو کو للکارا اور اس کے رجزیہ اشعار کے جواب میں فرمایا:۔

لا تعجلن فقد اتاک مجیب صوتک غیر عاجز ذو نیۃ وبصیرۃ والصدق منجی کل فائز

(بقیہ از صـ۲۱۸) (ترجمۂ شعر) "جب بنو لیث بازار عکاظ میں اُترتے ہیں تو تم۔۔۔ اُن کے سروں پر کوّے بیٹھے ہوئے دیکھو گے"۔

اس کی اصل یہ ہے کہ جب اُونٹ کے سر یا کسی حصۂ جسم پر کوئی زخم آتا ہے اور کھجلی کی وجہ سے اس میں کیڑے پڑ جاتے ہیں تو وہ سر نیچے ڈال کر کسی گوشہ میں الگ تھلگ بیٹھ جاتا ہے اور پرندے اُس کے سر و جسم پر بیٹھ کر ان کیڑوں کو چُننے لگتے ہیں۔ اس موقع پر وہ اپنے سر کو جنبش نہیں دیتا اور نہ سر اُوپر اٹھاتا ہے تاکہ وہ پرندے اُڑ نہ جائیں۔ اسی سے یہ مثل اُس شخص کے لئے چل نکلی جو سر نیچے ڈالے چُپ چاپ بیٹھا رہے"۔

"ٹھہرو تمہاری للکار کا جواب دینے والا آگیا ہے جو کمزور نہیں ہے وہ صاحب عزم و بصیرت ہے اور سچائی ہی ہر رستگار کے لئے وجہِ کامرانی ہے۔"

انی لارجوان اقیم علیك نائحة الجنائز　　　من ضربة تغنی ویبقی ذکرها عند الهزاهز

مجھے اُمید ہے کہ میں تمہارے لئے بین کرنے والی عورتوں کا بندوبست کروں گا ایسی ضرب سے جو اپنا کام کر کے مٹ جائے گی مگر اس کا تذکرہ ہمیشہ معرکوں میں ہوتا رہے گا۔"

اب دونوں ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑے ہو گئے۔ عمرو نے دستورِ عرب کے مطابق پوچھا کہ میرا حریف و مدِ مقابل کون ہے؟ حضرت نے فرمایا میں ہوں علی ابن ابی طالب۔ عمرو نے کہا کیا لشکرِ اسلام میں تمہارے اعمام میں سے کوئی نہیں ہے جو مجھ سے لڑنے کے لئے آتا۔ تم ابوطالب کے بیٹے ہو اور وہ میرے دوست تھے میں نہیں چاہتا کہ اپنے دوست کے بیٹے پر ہاتھ اٹھاؤں اور اُسے قتل کروں۔ لہٰذا تم واپس جاؤ اور کسی بڑے کو میرے مقابلہ کے لئے بھیجو تاکہ تمہارے بجائے وہ میرے ہاتھ سے قتل ہو۔ حضرتؑ نے فرمایا: لکن واللّٰه احب ان اقتلك "لیکن میں تو تمہارا خون بہانا پسند کرتا ہوں"۔ اہلسنّت کے مشہور عالم مصدق ابن شبیب کہتے ہیں کہ عمرو نے ابوطالب سے اپنی دوستی کا اظہار محض اپنی جان بچانے کے لئے کیا تھا کیونکہ وہ جنگِ بدر میں دیکھ چکا تھا کہ جو بھی علیؑ کے مقابلہ میں نکلا وہ اپنی جان سلامت لے کر واپس نہ آسکا۔ اس لئے اس نے چاہا کہ علیؑ سے لڑنے کی نوبت نہ آئے اور ان کے بجائے کسی اور سے مقابلہ ہو۔ میدان میں اُترنے کے بعد جنگ سے پہلو تہی تو کر نہیں سکتا تھا اس لئے ابوطالب کی دوستی کی آڑ لی تاکہ لڑے بھی نہیں اور اس کی کمزوری پر پردہ بھی پڑا رہے۔

جب عمرو نے دیکھا کہ حیلے بہانوں سے جان چھڑانا مشکل ہے تو لڑنے پر تیار ہو گیا۔ حضرت نے دیکھا کہ وہ خود پیادہ ہیں اور عمرو سوار ہے اور پیادہ ہمیشہ سوار کی زد میں ہوتا ہے آپ نے چاہا کہ اُسے بھی گھوڑے سے نیچے اُتروالیں۔ فرمایا اے عمرو میں نے سُنا ہے کہ اگر حریف میدانِ جنگ میں تم سے تین باتوں کی درخواست کرتا ہے تو تم ایک ضرور مان لیتے ہو۔ کہا ہاں۔ فرمایا پھر میری پہلی خواہش یہ ہے کہ تم اسلام قبول کرو تاکہ مجھے تم سے لڑنے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ کہا یہ نہیں ہو سکتا کہ میں اپنے آبائی دین کو چھوڑ کر نیا دین اختیار کروں۔ فرمایا کہ پھر میری دوسری خواہش یہ ہے کہ تم اپنے لشکر سے علیحدہ ہو کر واپس چلے جاؤ۔ کہا میدان سے منہ موڑ نامردوں کا کام نہیں ہوتا میں یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ عورتیں میرے فرار پر مجھے طعنے دیں اور میری شجاعت پر حرف رکھیں۔ فرمایا اگر تم یہ بھی نہیں مانتے تو میری آخری خواہش یہ ہے کہ تم گھوڑے سے نیچے اُترآؤ اور مجھ سے جنگ کرو۔ یہ سُن کر عمرو غصہ سے پیچ و تاب کھاتا ہوا نیچے اُترا اور اُترتے ہی گھوڑے کے پیروں پر تلوار چلائی اور اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں بظاہر یہ ایک بے معنی سی بات معلوم ہوتی ہے مگر ایسا نہیں ہے۔ اس کا مقصد یہ تاثر دینا تھا کہ میں نے گھوڑے کے پاؤں کاٹ کر اپنے لئے فرار کی راہ بند کر دی ہے اب قتل کئے یا قتل ہوئے بغیر میدان سے ہٹنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا اور یہ غرض بھی ہو سکتی ہے کہ اس طرح اپنی قوت و طاقت اور تیغ زنی کا مظاہرہ کر کے حریف کو مرعوب و متاثر کرے تاکہ

وُہ مقابلہ سے جی چھوڑ بیٹھے کیونکہ نفسیاتی حیثیت سے اگر حریف کو اپنی قوت و توانائی سے متاثر کر لیا جائے تو اس کی قوت مقاومت مضمحل ہو جاتی ہے اور اس پر بآسانی قابو پایا جا سکتا ہے۔ مگر علیؑ بڑے سے بڑے بہادر و شہزور کو نظر میں نہ لاتے تھے وُہ اس سے کیا مرعوب و متاثر ہوتے۔ اور نہ ایمان کی یہ شان ہے کہ وُہ کفر کے مقابلہ میں کمزور پڑ جائے۔ آپ نے عمرو کے مظاہرۂ شمشیر زنی کو پر کاہ کے برابر بھی اہمیت نہ دی اور اُسے موقع دیا کہ وُہ پہلے حملہ کرے۔ چنانچہ وُہ تلوار لے کر حضرتؑ پر حملہ آور ہُوا۔ آپ نے سپر پر اس کا وار روکا مگر عمرو بلا کا تیغ زن تھا روکتے روکتے بھی تلوار کا اچٹتا ہُوا وار آپ کے سر پر لگا اور پیشانی خون سے رنگین ہو گئی۔ اب تیغ ایمان بار رگ کفر کو کاٹنے کے لئے بے نیام ہوی اور آپ جوابی حملہ کے لئے زخمی شیر کی طرح جھپٹے اور اس کے پیروں پر اس طرح تلوار ماری کہ اس کی دونوں ٹانگیں کٹ گئیں۔ عمرو لڑکھڑا کر زمین پر گرا۔ حضرتؑ نے تکبیر کا نعرہ لگایا اور اُس کے سینہ پر سوار ہو کر اس کا سر کاٹ لیا۔ صحابہ گرد و غبار کی وجہ سے کچھ دیکھ نہ سکے تھے۔ جب تکبیر کی آواز سُنی تو سمجھ گئے کہ علیؑ فاتح و کامران ہُوئے اور عمرو مارا گیا۔ اتنے میں گرد کا دامن پھٹا تو لوگوں نے یہ منظر دیکھا کہ علی مرتضٰےؑ ایک ہاتھ میں شمشیر خون آشام اور دُوسرے ہاتھ میں عمرو کا لہو میں ڈوبا ہُوا سر لئے اس طرح جھومتے چلے آ رہے ہیں جس طرح شیر ہلکی پھوار میں بَل کھاتا ہُوا چلتا ہے، اور زبان پر یہ ترانہ گونج رہا ہے:ـ

انا علی وابن عبد المطلب   الموت خیر للفتی من الھرب

"میں علیؑ ہوں اور عبد المطلب کا بیٹا ہوں۔ جوانمرد کے لئے بھاگنے سے مَوت بہتر ہے"۔

علیؑ کو اس طرح آتے دیکھ کر کچھ لوگوں نے کہا کہ علیؑ تو آج بڑی رعونت سے چل رہے ہیں۔ پیغمبرؐ نے سُنا تو فرمایا کہ میدانِ جنگ میں اللہ تعالیٰ کو یہی چال پسند ہے۔ غرض جب کفر و ایمان کا معرکہ سر کر کے پیغمبر کی خدمت میں باریاب ہُوئے تو آنحضرتؐ نے انہیں سینہ سے لگایا اور اُن کی اس عظیم خدمت کا اعتراف کرتے ہُوئے فرمایا:۔

ضربۃ علیؑ یوم الخندق افضل من عبادۃ الثقلین۔ (مستدرک حاکم ج ۳۔ ص ۳۲)۔

"خندق کے دن علیؑ کی ایک ضربت جن و انس کی عبادت پر بھاری ہے"۔

حضرت عمر نے جب یہ دیکھا کہ حضرت علیؑ نے عرب کی عام روش کے برخلاف نہ عمرو کی زرہ اُتاری ہے اور نہ اُس کی تلوار خود وغیرہ پر قبضہ کیا ہے تو اُن سے کہا ھلا سلبت درعہ یا علی! "اے علی آپ نے عمرو کی زرہ کیوں نہ اُتار لی"۔ فرمایا مجھے حیا آئی کہ مَیں اس کی لاش کو برہنہ کر کے زرہ اُتاروں۔ یہ تھی حضرت علیؑ کی سیر چشمی و بلند نگاہی کہ جہاں مال غنیمت مجاہد کی سب سے بڑی کمزوری ہے وہاں علیؑ کی بلند کرداری و عالی ظرفی کا جوہر یوں نمایاں ہوتا ہے کہ نہ جذبۂ جہاد میں طمع دنیوی کی آمیزش ہونے پاتی ہے اور نہ مقتول کی بیش قیمت زرہ پر نظر پڑتی ہے۔ اسی موقع کے لئے ایک عرب شاعر نے کہا ہے:ـ

ان الاسود اسود الغاب ھمتھا   یوم الکریھۃ فی المسلوب لا السلب

"معرکۂ کارزار میں شیرانِ بیشۂ شجاعت کی پُر عزم نگاہیں دُشمن کی طرف اُٹھتی ہیں نہ مالِ غنیمت کی طرف۔"

حضرتؑ کی اس بلند نظری کا اعتراف عمرو کی بہن نے بھی کیا۔ چنانچہ جب اُس نے یہ سُنا کہ قاتل نے عمرو کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا اور اُس کی زرہ تک نہیں اُتاری تو کہا ما قتلہ الا کفو کریہ۔ "اُس کا قاتل کوئی شریف اور عالی ظرف انسان ہے۔" پُوچھا کہ اس کا قاتل کون تھا؟ لوگوں نے بتایا کہ علی ابن ابی طالب۔ یہ سُن کر اُس نے برجستہ یہ دو شعر پڑھے:۔

لو کان قاتل عمرو غیر قاتلہ   لکنت ابکی علیہ آخر الابد!

اگر عمرو کا قاتل علیؑ کے علاوہ کوئی اور ہوتا تو میں رہتی دُنیا تک اس پر روتی۔"

لکن قاتلہ من لایعاب بہ   من کان یدعی ابوہ بیضۃ البلد

مگر اس کا قاتل تو وُہ ہے جس میں کوئی برائی نہیں ہے اور جس کا باپ سردارِ مکّہ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔"

عمرو کے مارے جانے سے اس کے ساتھیوں کے قدم اُکھڑ گئے اور پھر کسی کو مبارز طلبی کی جرأت نہ ہو سکی سب کے سب بدحواسی کے عالم میں خندق کی طرف بھاگ کھڑے ہُوئے۔ حضرت علیؑ نے آگے بڑھ کر گھیرا ڈالا اور عمرو کے بیٹے حسل پر تلوار ماری اور اُسے وہیں پر ڈھیر کر دیا۔ نوفل ابن عبداللہ خندق کو پھاندتے ہُوئے اس میں گرا۔ کچھ لوگوں نے اس کی بے بسی سے فائدہ اُٹھاتے ہُوئے اس پر پتھر برسانا شروع کئے۔ اس نے کہا کہ اگر مجھے مارنا ہی چاہتے ہو تو ذلّت سے نہ مارو۔ تم میں سے کوئی نیچے اُترے اور مجھ سے لڑ لے۔ حضرت علیؑ خندق میں اُترے اور ایک ہی ضرب میں اُس کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ منبہ ابن عثمان خندق کو عبور کرتے ہُوئے کسی کا تیر کھا کر زخمی ہوا اور مکّہ پہنچ کر مر گیا۔ عکرمہ نے اپنا نیزہ پھینک کر اپنا بوجھ ہلکا کیا اور ہبیرہ کے ساتھ خندق پھاند کر لشکر گاہ میں پہنچ گیا۔ ضرار ابن خطاب فہری کو حضرت عمر نے بھاگتے دیکھا تو اُس کا پیچھا کیا۔ ضرار نے پلٹ کر حملہ کرنا چاہا تو دیکھا کہ حضرت عمر ہیں اُس نے ہاتھ روک لیا اور یہ کہتا ہُوا آگے بڑھ گیا کہ اے عمر! میرے اس احسان کو یاد رکھنا اور خندق کو پھاند کر اپنے ساتھیوں سے جا ملا۔ یہ لوگ اپنے کشتوں کو تو ساتھ لے جا نہیں سکتے تھے۔ کفار نے آنحضرتؐ کو پیغام بھجوایا کہ عمرو اور نوفل کے لاشے ہمارے حوالے کر دیئے جائیں ہم اس کا عوض زرِ نقد کی صورت میں دینے کو تیار ہیں۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ھولکم ماناکل ثمن الموتی "یہ تمہارا ہی مال ہے۔ ہم مُردے بیچ کر نہیں کھایا کرتے۔" انہیں اجازت مل گئی تو وُہ لاشے اُٹھا کر لے گئے۔

ان چند نامور سورماؤں کے مارے جانے اور چند کے پسپا ہونے سے کفار کی ہمتیں پست ہو گئیں اور پھر کسی کو جرأت نہ ہو سکی کہ خندق کو پھاند کر آگے بڑھے یا صدائے ھل من مبارز بلند کرے۔ خوراک کی قلت

اور رسد کی نایابی کی وجہ سے ان کی حالت پہلے ہی نازک تھی اب وہاں پر پڑے رہنا ہلاکت و تباہی کو دعوت دینا تھا وُہ محاصرہ اُٹھانے کی سوچ ہی رہے تھے کہ اس اثناء میں ایک رات سخت طوفان باد و باراں آیا جس نے کفار کے خیمہ و خرگاہ کو تباہ و برباد کر دیا اُونٹوں اور گھوڑوں نے رسّیاں تڑوالیں اور ادھر اُدھر بکھر گئے۔ چولہوں پر چڑھی ہوی دیگیں اُلٹ گئیں۔ کھلا میدان سخت سردی آندھی اور جھکڑ کا زور ایک کو ایک سجھائی نہ دیتا تھا اور نہ کسی کو کسی کا ہوش تھا۔ اب اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا کہ محاصرہ اُٹھا کر اپنی راہ لیں۔ چنانچہ ابوسفیان نے کہا کہ اب یہاں ٹھہرنا بے سُود ہے۔ اتنے دِن ہم محاصرہ ڈالے پڑے رہے مگر نقصان ہی اُٹھایا۔ اب مناسب یہ ہے کہ ہم ڈیرے خیمے اُٹھالیں اور یہاں سے چل دیں۔ یہ کہہ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ دُوسروں نے اُسے جاتے دیکھا تو وُہ بھی اُٹھ کھڑے ہُوے اور راتوں رات میدان صاف ہو گیا۔ صبح کو جب مُسلمانوں نے میدان خالی پایا تو دُشمن کی پسپائی پر اللہ کا شکر بجالائے اور فتح و کامرانی کے نعرے لگاتے ہُوے خوش خوش اپنے گھروں کو واپس ہوئے۔

اس معرکہ میں مشرکین کے چار آدمی مارے گئے جن میں سے عمرو ابن عبدود، نوفل ابن عبداللہ اور حسل ابن عمرو حضرت علیؑ کے ہاتھ سے قتل ہُوے اور منبہ ابن عثمان زخمی ہو کر بھاگا اور مکّہ پہنچ کر ختم ہو گیا۔ مسلمانوں نے صرف اتنا کیا کہ نوفل جب خندق میں گرا تو اُس پر پتھر مارے اور منبہ پر دُور سے تیر چلائے اور حضرت عمر نے ضرار ابن خطاب کا پیچھا کیا مگر انہیں خود ہی ایک طرح سے اس کا ممنون احسان ہونا پڑا۔ کفار کے ان مانے ہُوے شجاعوں سے نمٹنے والے صرف حضرت علیؑ تھے جنہوں نے ضرب ید اللٰہی سے عمرو و نوفل ایسے سورماؤں کو قتل کر کے انہیں میدان چھوڑنے پر مجبور کر دیا اور مشرکین کا زور ایسا توڑا کہ آئندہ وُہ مدینہ پر چڑھائی کی جرأت نہ کر سکے۔ اُن کا دم خم جاتا رہا۔ تاب مقاومت چھن گئی اور اپنی ناکامی و نامرادی پر صبر کر کے گھروں کے گوشوں میں بیٹھ گئے۔

غزوۂ خندق اور محاربۂ طالوت و جالوت میں بڑی حد تک مماثلت و مشابہت پائی جاتی ہے اس لیے اس محاربہ کی بھی مختصر کیفیت درج کی جاتی ہے تاکہ دونوں کے مشترکہ پہلوؤں کو واضح کیا جا سکے۔ جالوت فرعون مصر کی اولاد میں سے بنی اسرائیل کا فرمانروا تھا اور اپنے ظلم و جور سے رعایا کا جینا مشکل کر رکھا تھا۔ بنی اسرائیل نے اس دَور کے نبی اشموئیل سے کہا کہ ہم جالوت کے ظلم و تشدد سے تنگ آچکے ہیں آپ اس کی ستم رانیوں سے ہمیں چھٹکارا دلائیں۔ اشموئیل نے قدرت کے ایماء سے طالوت کو جو غریب و نادار اور سقائی کا پیشہ کرتا تھا حکومت و شاہی کے لئے منتخب کیا۔

بنی اسرائیل اس پر معترض ہُوے اور کہا کہ طالوت میں خوبی ہی کون سی ہے۔ نہ اس کا کوی رُعب و دبدبہ ہے اور نہ اُس کے پاس مال و دولت ہے وُہ ہم پر کیا حکومت کرے گا۔ اشموئیل نے جو جواب دیا وُہ قرآن مجید کی ان لفظوں میں مذکور ہے:۔

قال ان اللہ اصطفٰہ علیکم و	کہا خدا نے اسے تم پر فوقیت و فضیلت دی ہے اور
زادہ بسطۃ فی العلم والجسم	علم کی وسعت اور جسم کا پھیلاؤ بھی اسی کا زیادہ کیا ہے
واللہ یؤتی ملکہ من یشاء۔	اور خدا جسے چاہتا ہے اُسے اپنا ملک دیتا ہے"۔

قدرت کے اس ارشاد سے حاکم کے طریقِ تقرر اور معیارِ حکومت پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ اللہ جسے چاہتا ہے اُسے مقرر کرتا ہے۔ اور یہ تقرر دولت و ثروت اور شان و شکوہ کی بناء پر نہیں ہوتا بلکہ فضیلت علم اور کمال شجاعت کی بناء پر عمل میں آتا ہے۔

جب جالوت نے یہ دیکھا کہ حکومت طالوت کی طرف منتقل ہو رہی ہے تو وُہ لشکر و سپاہ کو لے کر میدان جنگ میں اُتر آیا۔ طالوت بھی بنی اسرائیل کو لے کر فلسطین سے نکل کھڑا ہُوا اور اُردن کے علاقہ میں دُشمن کی فوجوں کے سامنے پڑاؤ ڈال دیا۔ طالوت کے ہمراہیوں کی تعداد کل تین سو تیرہ تھی۔ انہوں نے جب جالوت کی انبوہ در انبوہ فوجوں کو دیکھا تو اُن پر خوف و ہراس چھا گیا۔ اور جب جالوت ہاتھی پر سوار ہو کر للکارتا ہُوا میدان میں آیا تو کوی بھی اس سے زور آزمائی کے لئے تیار نہ ہُوا۔ طالوت نے جب اپنے ہمراہیوں کی کمزوری و بُزدلی کو دیکھا تو ان سے کہا کہ تم میں سے جو اُسے قتل کرے گا میں آدھا مُلک اُس کے نام کر دوں گا اور اپنی بیٹی بھی اس کے عقد میں دے دُوں گا۔ مگر کسی کو اس کڑیل گراں ڈیل سے لڑنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ حضرت اشموئیل نے کہا کہ یہ اُس کے ہاتھوں سے قتل ہو گا جو لاوی ابن یعقوبؑ کی اولاد میں سے ہو گا اور حضرت مُوسیٰؑ کی زرہ اس کے جسم پر ٹھیک اُترے گی۔ چنانچہ لاوی ابن یعقوب کی اولاد میں سے ایشا سے کہا گیا کہ وُہ اپنے دسوں بیٹوں کو پیش کرے جب وُہ آئے تو اُن میں سے ہر ایک نے زرہ پہن کر دیکھی مگر زرہ کسی کے جسم پر ٹھیک نہ بیٹھی۔ آخر میں اُس کے سب سے چھوٹے فرزند حضرت داؤدؑ کو پہنائی گئی۔ جب زرہ اُن کے قد و قامت پر راست آئی تو اُن سے کہا گیا کہ آپ ہی جالوت سے سر بر ہو سکتے ہیں اور کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ حضرت داؤدؑ زرہ پہن کر جالوت کے سامنے آئے۔ جالوت نے انہیں دیکھ کر کہا:۔

یا ھذا الصبی انت مع صغر سنک تبارزنی۔ (بدائع الزھور۔ صـ۱۵۹)۔	اے صاحبزادے تم اس سن و سال میں مجھ سے لڑو گے"۔

کہا کہ ہاں میں لڑنے ہی کے لئے آیا ہوں۔ جب حضرت داؤدؑ نے اُسے مارنے کے لئے گوپھن میں پتھر رکھا تو اس نے کہا کہ تم مجھے اس طرح مارو گے جس طرح کُتّے کو مارا جاتا ہے کہا کہ ہاں لانك اشر من الکلب" اس لئے کہ تم کُتّے سے بھی بدتر ہو"۔ جناب داؤدؑ نے گوپھن کو حرکت دے کر اس زور سے پتھر پھینکا کہ اُس کے سر کو توڑتا ہُوا نکل گیا۔ جالوت زمین پر گرا اور گرتے ہی ختم ہو گیا۔ جالوت کے مرنے سے اس کی فوج میں بھگدڑ مچ گئی اور میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہُوئی۔ اس حُسن کارکردگی کے صلہ میں حضرت داؤدؑ کو طالوت کی سلطنت ملی اور اُس کے داماد بھی ہوئے۔

اب غزوۂ خندق کا اس محاربہ سے موازنہ کیجئے اور دیکھئے کہ ان دونوں میں کتنی مشابہت پائی جاتی ہے۔ خندق میں مسلمانوں کی سپاہ کم اور کفار کی تعداد کئی گنا زائد تھی اسی طرح طالوت کی فوج مختصر اور اُس کے مقابلہ میں جالوت کا لشکر صحرائے اُردن پر محیط تھا جس طرح مسلمان دشمن کی کثرت و قوت سے ہراساں تھے اسی طرح سپاہ طالوت پر خوف و ہراس چھایا ہُوا تھا جس طرح عمرو اسلحہ سج کر اور گھوڑے پر سوار ہو کر مبارز طلب ہوا اسی طرح جالوت زرہ بکتر سے آراستہ اور ہاتھی پر سوار ہو کر میدان میں آیا جس طرح عمرو کے مقابلہ میں حضرت علیؑ کے علاوہ کسی کو ہمت نہ ہوی اسی طرح

جالوت کے مقابلہ میں حضرت داؤدؑ کے علاوہ کسی کو جرأت نہ ہوسکی۔ جس طرح حضرت داؤدؑ دشمن کے مقابلہ میں پیادہ تھے اسی طرح حضرت علیؑ حریف کے مقابلہ میں پیادہ پا تھے جس طرح حضرت داؤدؑ کے بدن پر حضرت موسٰیؑ کی زرہ ٹھیک اُتری اسی طرح حضرت علیؑ کے جسم پر پیغمبرؐ کی زرہ پوری آئی۔ جس طرح حضرت داؤدؑ اپنے بھائیوں میں سب سے کمسن تھے اسی طرح حضرت علیؑ اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ جس طرح حضرت داؤدؑ کی عمر تیس برس تھی اسی طرح حضرت علیؑ کا سن تیس برس کے لگ بھگ تھا۔ جس طرح جالوت نے حضرت داؤدؑ کی صغر سنی پر اعتراض کیا اسی طرح عمرو حضرت علیؑ کی کم سنی پر معترض ہُوا۔ جس طرح انبیاء میں حضرت داؤدؑ بڑے جنگجو اور بہادر تھے اسی طرح اولیاء میں حضرت علیؑ جوانمردی و شجاعت میں فرد فرید تھے۔ شیخ علی علاء الدین نے تحریر کیا ہے:۔

امام البسار زین من الانبیاء داؤد علیه السّلام و من الاولیاء علی ابن ابی طالب رضی الله عنه.	انبیاء میں داؤد علیہ السّلام اور اولیاء میں علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ جنگ آزماؤں کے امام و سرخیل تھے۔"

(محاضرۃ الاوائل۔ ص۲۰۲)۔

جس طرح پیغمبرؐ نے عمرو کو کلب کی لفظ سے یاد کیا اسی طرح حضرت داؤدؑ نے جالوت کو کُتّے سے بدتر قرار دیا۔ جس طرح جالوت کے مارے جانے سے تمام لشکر بھاگ کھڑا ہُوا اسی طرح عمرو کے قتل ہونے سے مشرکین کے قدم اُکھڑ گئے اور راتوں رات میدان خالی کر کے چل دیئے۔ جس طرح عمرو کا قاتل دامادِ پیغمبرؐ اور وارثِ مسندِ خلافت تھا اسی طرح جالوت کا قاتل طالوت کی سلطنت کا وارث اور اس کا داماد قرار پایا۔ ان وجوہ مماثلت کو دیکھنے کے بعد حافظ یحیٰی ابن آدم کے اس قول کی واقعیت نمایاں ہو جاتی ہے:۔

ما شبهت قتل علیؑ عمرا الا بقوله تعالٰی فهزموهم باذن الله وقتل داؤد جالوت۔	علیؑ کے عمرو کو قتل کرنے کی تشبیہ کسی واقعہ سے دی جا سکتی ہے تو اس واقعہ سے جس کا تذکرہ قرآن مجید کی اس آیت میں ہے: "پھر ان لوگوں نے اللہ کے حکم سے دشمنوں کو شکست دی اور داؤدؑ نے جالوت کو قتل کیا"۔
(سیرت دحلان برحاشیہ سیرۃ حلبیہ ج۲۔ ص۱۱۱)	

غزوۂ بنی قریظہ

جب غزوۂ احزاب یہود و مشرکین کے مشترکہ محاذ کی شکست و ہزیمت پر ختم ہُوا تو پیغمبر اکرمؐ نے دُشمن کے ناکام ہونے کے بعد بنی قریظہ کی طرف فوج بھیجنے کا ارادہ کیا جنہوں نے حیی ابن اخطب کی باتوں میں آکر مسلمانوں سے علانیہ غدّاری کی تھی اور معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہُوئے اس غزوہ میں کُھل کر حملہ آوروں کا ساتھ دیا تھا۔ آنحضرتؐ نے تیس خزرجیوں کا ایک ہراول دستہ حضرت علیؑ کی قیادت میں ان کی طرف بھیجا اور علم جنگ حضرت

کے سپرد کیا۔ طبری نے لکھا ہے:۔

قدم رسول اللہ علی ابن ابی طالب برایتہ الی بنی قریظۃ	پیغمبر اکرمؐ نے علی ابن ابی طالب کو رایتِ جنگ دے کر بطور مقدمۃ الجیش بنی قریظہ کی طرف بھیجا"
(تاریخ طبری۔ ج۲۔ ص۲۴۵)۔	

بنی قریظہ کو یہ اندیشہ تو تھا ہی کہ اس بدعہدی و عہد شکنی کی پاداش میں اُن سے مواخذہ ہوگا انہوں نے لشکر کفار کے پسپا ہونے کے بعد اپنے ایک قلعہ میں پناہ لے لی اور یہ سمجھ لیا کہ قلعہ کو سر کر لینا مسلمانوں کی قوت و طاقت سے باہر ہے۔ جب حضرت علیؑ اُن کے قلعہ کے پاس پہنچے اور زمین میں نیزہ گاڑا تو انہوں نے آنحضرتؐ کی شان میں نازیبا کلمات کہے اور گالی گلوچ پر اُتر آئے۔ آپ نے اُن کی بدزبانی سُنی تو واپسی کے ارادہ سے پلٹے تاکہ پیغمبرؐ کو قلعہ کے قریب جانے سے روک دیں۔ ابھی راستے ہی میں تھے کہ آنحضرتؐ تشریف لے آئے۔ حضرت علیؑ نے کہا کہ آپ قلعہ کے پاس نہ جائیں۔ فرمایا اس لئے کہ وُہ دُشنام طرازی پر اُتر آئے ہیں؟ عرض کیا کہ ہاں۔ فرمایا کہ جب وُہ مجھے دیکھیں گے تو بدزبانی کی جرأت نہ کر سکیں گے۔ آنحضرتؐ نے اُن کے ہاں پہنچ کر انہیں تنبیہہ و سرزنش کی اور قلعہ کے سامنے خیمہ نصب کرنے کا حکم دیا۔ مُسلمانوں نے قلعہ کو اپنے حصار میں لے لیا اور قلعہ والوں پر آمد و رفت کی راہیں بند کر دیں۔ ان محصورین میں حیی ابن اخطب بھی شامل تھا جس نے بنی قریظہ سے وعدہ کیا کہ وُہ شکست کی صُورت میں انہی کے ہاں ٹھہرے گا اور جو اُفتاد اُن پر پڑے گی اس میں برابر کا شریک ہوگا۔

رئیس بنی قریظہ کعب ابن اسد نے جب یہ دیکھا کہ مسلمانوں کا محاصرہ سخت سے سخت تر ہوتا جا رہا ہے تو اس نے اپنے قبیلہ والوں سے کہا کہ محمدؐ (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کا تذکرہ آسمانی کتابوں کے اندر موجود ہے لہذا بہتر یہ ہے کہ ہم ان کی نبوت کا اعتراف کر کے اسلام قبول کر یں اور اپنے جان و مال کا تحفظ کر لیں۔ انہوں نے اس مشورہ کو درخورِ اعتناء نہ سمجھا اور اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کعب نے کہا کہ اگر تم تبدیلیٔ مذہب کے لئے تیار نہیں ہو تو اپنے بچّوں اور عورتوں کو ٹھکانے لگاؤ اور قلعہ سے باہر نکل کر مقابلہ کرو اس صورت میں تمہارے ذہن بچّوں اور عورتوں کی فکر سے خالی ہوں گے اور پُوری یکسُوئی اور تندہی سے لڑ سکو گے۔ انہوں نے یہ بات بھی نہ مانی اور کہا کہ ہم اپنے بچّوں اور عورتوں کے خون سے ہاتھ رنگین نہیں کریں گے۔ کہا کہ پھر میری رائے یہ ہے کہ آج سبت کی رات ہے مسلمانوں کو یہ سان گمان بھی نہ ہوگا کہ آج کی شب ان پر حملہ ہو سکتا ہے لہٰذا ان کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر ان پر شب خون مارو۔ کہا کہ ہم سبت کی بے حرمتی گوارا نہیں کر سکتے جبکہ یہ ہمارے دین و آئین کے خلاف ہے۔ کہا کہ پھر تم عقل و خرد سے عاری اور اپنے بارے میں خوش فہمی میں مُبتلا ہو۔

یہود کو محاصرہ میں گھرے ہُوئے پچّیس دن ہو چکے تھے وُہ اتنے دنوں تک تیر اور پتھر برساتے رہے مگر مسلمانوں کا حصار توڑنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ جب محاصرہ کی شدّت سے تنگ آ گئے تو انہوں نے نباش ابن قیس کے ذریعہ پیغمبر سے درخواست کی کہ ہم ہتھیار ڈالنے کے لئے تیار ہیں بشرطیکہ ہماری جان بخشی کی جائے اور ہمیں اپنی عورتوں بچّوں

اور ہتھیاروں کے علاوہ اپنا مال واسباب اُونٹوں پر بار کر کے لے جانے کی اجازت دے دی جائے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ہمیں یہ منظور نہیں ہے۔ کہا کہ پھر ہم اپنا مال واسباب یہیں چھوڑے دیتے ہیں ہمیں صرف عورتوں اور بچوں کو لے کر نکل جانے کی اجازت دی جائے۔ فرمایا کہ یہ بھی نہیں ہو سکتا بلکہ تمہیں غیر مشروط طور پر اپنے آپ کو ہمارے سپُرد کرنا ہوگا اور ہم جو مناسب سمجھیں گے وُہ فیصلہ کریں گے۔ نباش نے پلٹ کر بنی قریظہ کو آنحضرتؐ کے جواب سے آگاہ کیا۔ انہوں نے رسُولؐ خدا کو پیغام بھیجا کہ ابو لبابہ انصاری کو ہمارے پاس بھیجئے تاکہ ہم اُن سے بات چیت کر کے کوئی آخری فیصلہ کریں۔ آنحضرتؐ نے ابو لبابہ کو اُن کے ہاں بھیجا۔ کہا کہ تمہاری کیا رائے ہے کیا ہم غیر مشروط طور پر اپنے آپ کو محمد (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سپُرد کر دیں؟ ابو لبابہ نے زبان سے تو ہاں کہا اور ساتھ ہی اپنے گلے پر ہاتھ پھیر کر اشارہ کیا کہ اگر تم نے اپنے آپ کو پیغمبرؐ کے سپُرد کر دیا تو سب کے سب قتل کر دیئے جاؤ گے۔ انہوں نے ابو لبابہ کا اشارہ پا کر اپنے آپ کو پیغمبرؐ کے سپُرد کرنے سے انکار کر دیا۔

ابو لبابہ کی یہ حرکت اصُولِ رازداری کے خلاف اور اُن کے منصب کے منافی تھی چنانچہ انہیں قرآن مجید کی اس اس آیت کے ذریعہ تنبیہ کی گئی:۔

یاایھا الذین اٰمنوا لاتخونوا اللہ والرسُول ولاتخونوا اماناتکم وانتم تعلمون۔	"اے ایماندارو اللہ اور اُس کے رسُولؐ کے معاملات میں خیانت نہ کرو اور نہ جانتے بُوجھتے ہُوئے امانتوں میں بددیانتی کا ارتکاب کرو۔"

جب بنی قریظہ کو یہ احساس ہُوا کہ غیر مشروط طور پر آنحضرتؐ کے فیصلہ پر انحصار کر لینے کا نتیجہ قتل ہوگا تو اُنہوں نے کہا:۔

ننزل علےٰ حکم سعد ابن معاذ۔ (تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص ۲۴۶)۔	"ہم سعد ابن معاذ کو ثالث تسلیم کرتے ہُوئے اُن کے فیصلہ پر انحصار کر لیں گے۔"

آنحضرت نے بھی سعد ابن معاذ کو ثالث قرار دیئے جانے کی اجازت دے دی اس طرح کہ ان کا فیصلہ دونوں فریق کے لئے قابلِ تسلیم ہوگا۔

ابن ہشام نے تحریر کیا ہے کہ جب بنی قریظہ نے اپنے آپ کو سپُرد کرنے سے انکار کیا تو حضرت علیؑ نے کہا:۔

واللہ لاذوقن ماذاق حمزۃ او لافتحن حصنھم۔ (سیرت ابن ہشام ج ۳۔ ص ۲۵۱)۔	"خدا کی قسم میں یا تو شہید ہو جاؤں گا جس طرح حمزہ شہید ہُوئے یا ان کا قلعہ فتح کر کے رہوں گا۔"

یہ کہہ کر زبیر ابن عوام کو ساتھ لیا اور قلعہ پر حملہ کرنے کے لئے بڑھے۔ بنی قریظہ نے انہیں حملہ کے ارادہ سے بڑھتے دیکھا تو بوکھلا اٹھے اور چیخ چیخ کر کہنے لگے:۔ یا محمدؐ ننزل علےٰ حکم سعد ابن معاذ۔ "اے محمدؐ ہم سعد ابن معاذ کے فیصلہ پر سرِ تسلیم خم کرتے ہیں"۔ سعد ابن معاذ جنگِ احزاب میں تیر سے زخمی ہو کر مسجدِ نبوی کے

قریب رفیدہ انصاریہ کے خیمہ میں پڑے تھے۔ جب انہیں سواری پر لایا گیا تو بنی اوس نے انہیں گھیر لیا اور اُن سے کہا کہ آنحضرتؐ نے بنی قریظہ کا فیصلہ آپ پر چھوڑا ہے اور بنی قریظہ نے بھی آپ کو حکم مانا ہے۔ وُہ ہمارے معاہد و حلیف رہ چکے ہیں لہٰذا اُن سے نرمی و مروّت کا برتاؤ کریں۔ سعد نے کہا کہ میں وُہی فیصلہ کروں گا جو حق و انصاف کا تقاضا ہے اور کسی کی رُو رعایت نہیں کروں گا۔ سعد کے اس جواب سے لوگ سمجھ گئے کہ فیصلہ بنی قریظہ کے خلاف ہوگا اور انہیں کسی رعایت کا مستحق قرار نہ دیا جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ بنی قریظہ کے مَردوں کو مَوت کے گھاٹ اُتار دیا جائے، عورتوں کو کنیز اور بچّوں کو غلام بنا لیا جائے اور اُن کے اموال و املاک مسلمانوں میں تقسیم کر دیئے جائیں۔ اس فیصلہ پر عملدر آمد ہوا اور اُن کے مرد قتل کر دیئے گئے۔ عورتیں اور بچّے اسیر کر لئے گئے اور مال تقسیم کر دیا گیا۔

قرآن مجید میں اس واقعہ کے متعلق ارشاد ہے:۔

وانزل الذین ظاھروھم من	اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے کفار کی مدد کی تھی اللہ
اھل الکتاب من صیاصیہم	انہیں قلعوں سے نیچے اُتار لایا اور اُن کے دلوں میں
وقذف فی قلوبھم الرعب	اَیسا رُعب بٹھایا کہ تم لوگ ایک گروہ کو قتل کرنے لگے
فریقا تقتلون و تاسرون	اور ایک گروہ کو اسیر بنانے لگے اور تمہیں ان لوگوں
فریقا واورثکم ارضھم ودیارھم واموالھم	کی زمینوں گھروں اور اُن کے اموال کا مالک بنایا"۔

بظاہر یہ سزا بڑی سخت اور انتہائی ہولناک نظر آتی ہے مگر حالات کا جائزہ لیا جائے اور اس سزا کا پس منظر دیکھا جائے تو ایک متشدّد سے متشدّد معترض کو یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ وُہ واقعاً اسی سزا کے مستحق تھے۔ آخر وُہ کون سی جائز رعایت تھی جس سے پیغمبرؐ نے انہیں محروم کیا ہو یا کون سی نیکی تھی جو ان کے لئے روا نہ رکھی ہو اور خود سردار بنی قریظہ کعب ابن اسد نے اس کا اعتراف بھی کیا تھا کہ ہم نے محمدؐ (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے نیکی اور وفائے عہد کے علاوہ کوئی چیز نہیں دیکھی۔ آپ نے مدینہ میں قیام فرما ہونے کے بعد ان سے خصوصی مراعات برتیں امن و صلح کا معاہدہ کیا اور اُس کا احترام ملحوظ رکھا انہیں مذہبی آزادی دی جان و مال کی حفاظت کا ذمّہ لیا اور اُن کے معاشی و معاشرتی حقوق کا تحفظ کیا۔ اور جب بنی نضیر نے معاہدہ شکنی کی اور انہیں مدینہ سے جلاوطن ہونا پڑا تو اُن سے معاہدہ کی تجدید کر کے اُن کے سابقہ حقوق برقرار رکھے لیکن اس کے باوجود انہیں جب بھی موقع ملا دغا و فریب سے باز نہ آئے اور دشمن کے دست و بازو بن کر اسلام کی بربادی پر تُلے رہے۔ چنانچہ جنگِ بدر میں دُشمنوں سے ساز باز کی اور اُن کے لئے ہتھیار بہم پہنچائے اور پھر جنگِ احزاب میں مسلمانوں کے خلاف یہود و مشرکین سے بھرپور تعاون کیا اور ان ناشائستہ حرکات پر نادم و شرمسار ہونے کے بجائے کھلم کھلا بغاوت پر اُتر آئے اور اپنی بدفطرتی کا ثبوت دیتے ہوئے پیغمبر اکرمؐ کو دُشنام طرازیوں کا نشانہ بنایا۔ ان حالات میں اگر انہیں زندہ چھوڑ دیا جاتا تو یقیناً اہلِ مدینہ کے لئے مستقل خطرہ بن جاتے اور بنی نضیر کی طرح جنہوں نے قریش کو اپنے ساتھ ملا کر لشکر کشی کی تھی یہ بھی دُوسرے دُشمنانِ اسلام سے مل کر اسلام کے خلاف فوج کشی کرتے اور جنگ و قتال سے مدینہ و اطراف مدینہ کے امن عامہ میں خلل انداز ہوتے رہتے

اور اس کے نتائج اتنے ہولناک ہوتے کہ اُن کے مقابلہ میں چند افراد کا قتل کر دیا جانا چنداں اہمیت نہ رکھتا تھا۔ اور پھر یہ دُنیا جہان سے کوئی انوکھی سزا نہ تھی۔ اگر عالمی تاریخ بغاوت اور اس پر مرتب ہونے والی سزاؤں پر نظر کی جائے کہ زمانہ قدیم سے لے کر اس متمدن دَور تک جرم بغاوت پر کیا کیا سزائیں دی گئی ہیں اور ان میں کیا کیا کرب و ایذاء کے پہلو پیدا کئے گئے ہیں تو ان عہد شکن اور سرکش باغیوں کی سزائے قتل پر کوئی حیرت و استعجاب نہ ہوگا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ باغیوں کو ایسی ایسی سزائیں دی جاتی تھیں کہ جنہیں سُن کر اب بھی انسان لرزہ براندام ہو جاتا ہے۔ کولھو میں پیلنا، شکنجے میں کھینچنا، آگ میں جھونکنا، ہاتھوں اور پیروں میں میخیں گاڑ کر الٹا لٹکانا بستیوں کی بستیاں جلا دینا، قبروں کو اُکھیڑ کر لاشوں کو روندنا باغیوں کی عام سزا تھی۔ اس کے برعکس یہاں قتل کی سزا تو تجویز کی جاتی ہے مگر اس میں کوئی کرب افزا پہلو پیدا نہیں کیا جاتا بلکہ ایک عام طریقہ سے انہیں موت کے گھاٹ اُتارا جاتا ہے۔ چنانچہ اس بغاوت کا محرکِ اوّل اور اسلام کا دُشمن اعظم حیی ابن اخطب جب قتل کے لئے حضرت علیؑ کے سامنے پیش ہوتا ہے تو اعتراف کرتا ہے کہ قتلۃ شریفۃ بید شریف۔ یہ ایک شریفانہ قتل ہے جو ایک شریف کے ہاتھوں انجام پا رہا ہے۔" اور پھر حضرت سے یہ فرمائش کرتا ہے کہ جب مجھے قتل کر دیں تو میرا لباس اُتار کر مجھے بے پردہ نہ کریں۔ جس پر حضرت نے فرمایا کہ دُشمن کو قتل کرنے کے بعد اُسے عریاں کرنا میرا شیوہ نہیں ہے چنانچہ آپ نے اپنے معمول کے مطابق اُسے قتل کرنے کے بعد اُس کا لباس نہیں اُتارا۔

معاہدۂ حدیبیہ

مکّہ رسولؐ خدا کا آبائی وطن اور مولد و مسکن تھا۔ یہیں پر آپ نے زندگی کے ترپن برس گزارے اور یہیں پر پہلے پہل وحی الٰہی کا خوش آہنگ نغمہ سُنا۔ اور پھر تیرہ برس تک یہ متبرک سرزمین وحی کی صداؤں سے گونجتی رہی۔ اگرچہ اہل مکّہ کے رویّہ سے تنگ آکر آپ کو گھر بار چھوڑنا پڑا مگر اکثر مکّہ کا تذکرہ اور اسے دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کرتے رہتے۔ وطن کی محبت و کشش فطری ہے چاہے انسان کو وطن میں سکون و آرام میسّر رہا ہو یا شدائد و محن سے واسطہ پڑا ہو وُہ اس کی یاد سے اپنے دل و دماغ کو خالی نہیں رکھ سکتا۔ اس فطری و طبعی وابستگی کے علاوہ دینی و مذہبی اعتبار سے بھی اس سرزمین سے ایک خصوصی لگاؤ تھا۔ اسی سرزمین پر خانہ کعبہ اور دوسرے مشاعر واقع تھے جن سے فریضۂ حج وابستہ ہے اور اسلامی نقطۂ نظر سے ان کی تعظیم و تقدیس ضروری ہے۔ یہ تڑپ صرف رسولؐ خدا ہی کے دل میں نہ تھی بلکہ صحابہ کے دلوں میں بھی مکّہ کے در و دیوار کو دیکھنے کی لگن تھی۔ انہیں مکّہ چھوڑے ہُوئے چھ برس ہو چکے تھے اور اب اس سرزمین پر قدم رکھنے اور عمرہ و طواف بجالانے کے لئے بے قرار تھے۔ ایک مرتبہ پیغمبرؐ نے اپنے ایک خواب کا تذکرہ کرتے ہُوئے فرمایا کہ میں نے دیکھا ہے کہ ہم مسجد الحرام میں داخل ہُوئے ہیں اور خانۂ کعبہ کا طواف کر رہے ہیں۔ یہ خواب سُن کر صحابہ کی بے چینی بڑھ گئی۔ انہوں نے پیغمبر اکرمؐ سے مکہ جانے اور عمرہ و طواف بجالانے کے لئے اصرار کیا۔ قریش کی طرف سے

یہ خیال ہوسکتا تھا کہ وُہ عمرہ وطواف بجا نہ لانے دیں گے مگر جنگِ احزاب کے نتیجہ میں اُن کے سکوت سے یہ سمجھا گیا کہ اُن کے جنگی ولولے سرد پڑ گئے ہوں گے اور اب عمرہ وطواف ایسی چیز سے جس کی ہر فرد اور ہر مذہب کو عمومی اجازت تھی مانع نہ ہوں گے۔ چنانچہ آنحضرت نے صحابہ کے اصرار اور اُن کے اشتیاق کو دیکھتے ہوئے مکّہ جانے کا ارادہ کرلیا اور مدینہ کے گرد و پیش کے لوگوں کو بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی کچھ لوگ اس خیال سے رُک گئے کہ کہیں پھر جنگ نہ چھڑ جائے اور کچھ لوگ جن کی تعداد چودہ سو یا پندرہ سو پچیس تھی آنحضرتؐ کے ہمرکاب جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ آپ اس جمعیت کو لے کر روز دوشنبہ اول ماہِ ذیقعدہ ۶ھ کو مدینہ سے نکل کھڑے ہوئے قربانی کے ستر اُونٹ ساتھ لے لئے وادیٔ ذی الحلیفہ سے احرام باندھے اور ہتھیار اُتار کر رکھ دیئے تاکہ قریش کو اطمینان ہو جائے کہ مسلمانوں کے پیشِ نظر جنگ و قتال نہیں ہے بلکہ صرف آداب و رسُومِ زیارت بجا لانا ہے۔

پیغمبر اکرمؐ اور صحابہ کی ہیئت اور اُن کے سرو سامان سے صاف ظاہر تھا کہ وُہ لڑائی کے لئے نہیں جا رہے ہیں۔ مگر قریش نے گوارا نہ کیا کہ انہیں مکّہ میں داخل ہونے اور مراسم زیارت بجا لانے دیں۔ چنانچہ جب یہ کاروان وادیٔ عسفان کے قریب پہنچا تو بسر ابن ابی سفیان کعبی آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہُوا اور کہا قریش آپ کی آمد کی خبر سُن کر وادیٔ ذی طوی میں جمع ہو چکے ہیں اور خالد ابن ولید کو ایک دستہ سپاہ کے ساتھ کراع الغمیم کی جانب بھیج دیا ہے تاکہ آپ کو آگے بڑھنے اور مکّہ میں داخل ہونے سے روکے۔ آنحضرتؐ نے وُہ راستا چھوڑ دیا اور ثنیۃ المرار کی طرف سے ہوتے ہُوئے حُدیبیہ میں جو مکّہ سے پندرہ میل کے فاصلہ پر ایک کنواں تھا اور اس کی نسبت سے آس پاس کی زمین اس نام سے موسُوم ہو گئی تھی، اُتر پڑے۔ اُدھر خالد ابن ولید نے مُسلمانوں کی جمیعت دیکھی تو اُس نے پلٹ کر قریش کو اطلاع دی کہ مسلمانوں نے راستا تبدیل کرلیا ہے اور حدیبیہ کی سمت چل دیئے ہیں۔ قریش نے بدیل ابن ورقا خزاعی کو بنی خزاعہ کے چند آدمیوں کے ہمراہ آنحضرتؐ سے گفت و شنید کے لئے بھیجا۔ اُس نے حدیبیہ میں پہنچ کر آنحضرتؐ سے کہا کہ آپ مکّہ میں داخل ہونے کا ارادہ ترک کردیں اور یہیں سے واپس چلے جائیں۔ اگر آپ نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو قریش مزاحم ہوں گے اور کسی صورت میں آپ کو مکّہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیں گے۔ آنحضرت نے فرمایا کہ ہم خانۂ کعبہ کا طواف اور مراسم زیارت بجا لانے کے لئے آئے ہیں قریش کو ہماری طرف سے مطمئن رہنا چاہئیے ہم نہ جنگ کے ارادہ سے آئے ہیں اور نہ جنگ لڑیں گے۔ بدیل نے پلٹ کر آنحضرتؐ کا پیغام قریش کو پہنچایا۔ قریش نے کہا کہ یہ مانا کہ اُن کا ارادہ جنگ کا نہیں ہے پھر بھی ہم انہیں حدودِ مکّہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ اگر وُہ سینہ زوری سے داخل ہونے کی کوشش کریں گے تو ہم پُوری قوت و طاقت سے انہیں روکیں گے۔ عروہ ابن مسعود ثقفی نے کہا کہ اس میں ہمارا بگڑتا ہی کیا ہے کہ وُہ آئیں، عمرہ اور طواف بجا لائیں اور پھر پلٹ جائیں۔ قریش نے کہا کہ عرب اسے ہماری کمزوری پر محمول کریں گے اور ہم دُوسروں کو اپنی کمزوری کا تاثر دینا نہیں چاہتے۔ عروہ نے کہا کہ پھر مجھے اجازت دی جائے کہ مَیں محمدؐ (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بات چیت کر کے اس معاملہ کو سلجھاؤں۔ قریش نے اُسے اجازت دی اور وُہ آنحضرت

کی خدمت میں حاضر ہُوا اور اُن سے کہا کہ اے محمدؐ (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) قریش آپ کا قبیلہ و خاندان ہے فرض کیجئے کہ آپ نے اُن کا قلع قمع کر دیا تو یہ عرب میں پہلی مثال ہو گی کہ کسی نے اپنے قوم و قبیلہ کو تباہ و برباد کیا ہو۔ قریش یہ نہیں چاہتے کہ آپ مکّہ میں داخل ہوں۔ اگر آپ نے زبردستی داخل ہونے کی کوشش کی تو اس کا لازمی نتیجہ جنگ ہے۔ اور جب جنگ چھڑے گی تو یہی لوگ جو آپ کے گرد و پیش منڈلا رہے ہیں بھاگتے نظر آئیں گے۔ اس پر حضرت ابوبکر نے اُسے ایک غلیظ سی گالی دی اور کہا کہ ہم کبھی رسُولؐ خدا کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ عروہ نے پُوچھا کہ یہ کون ہے۔ اُسے بتایا گیا کہ ابوبکر ہیں۔ کہا کہ اے ابوبکر تمہارا ایک احسان مجھے یاد ہے اگر وُہ احسان نہ ہوتا تو میں اس بدزبانی کا تمہیں جواب دیتا۔ عروہ کے ضبط و حلم اور احسان شناسی نے بات بڑھنے نہ دی ورنہ ممکن تھا کہ وُہ مشتعل ہو کر بات ادھوری چھوڑ دیتا اور پلٹ کر قریش کو بھڑکاتا اور انہیں لڑائی پر اُبھارتا۔ آنحضرتؐ نے بھی اُس کی متوازن طبیعت کا اندازہ کر لیا اور اُس کے منصفانہ جذبات کو جھنجوڑتے ہُوئے فرمایا کہ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ہمیں عمرہ و طواف سے روکا جائے اور قربانی کے اُونٹوں کو کعبہ تک لے جانے سے منع کیا جائے۔ ہم نہ جنگ کے ارادہ سے آئے ہیں اور نہ زبردستی جنگ چھیڑنا چاہتے ہیں۔ عُروہ آنحضرتؐ کی صلح پسندانہ گفتگو سے بہت متاثر ہُوا اور پلٹ کر قریش سے کہا کہ مَیں نے قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے پُر شکوہ درباروں کو دیکھا ہے مگر جو شان و شکوہ اور عقیدت و احترام کا جذبہ یہاں دیکھا ہے وُہ کہیں نظر نہیں آیا۔ ہمیں چاہئے کہ انہیں عمرہ و طواف سے نہ روکیں اور پُر امن رہتے ہُوئے انہیں مکّہ میں آنے کی اجازت دے دیں۔ مگر قریش نے اس کی ایک نہ سُنی اور اپنی ضد پر اڑے رہے۔ حلیس ابن علقمہ نے جب معاملہ رو براہ ہوتے نہ دیکھا تو کہا کہ مجھے اجازت دی جائے کہ میں حالات کا جائزہ لے کر مناسب تجویز پیش کروں۔ قریش نے اُسے اجازت دی اور وُہ حدیبیہ کی جانب روانہ ہُوا۔ جب اس نے مسلمانوں کے پڑاؤ کے قریب قربانی کے اُونٹ دیکھے جو بھُوک کے مارے بلبلا رہے تھے اور لبیّک اللّٰھم لبیّک کی آوازیں سُنیں تو وہیں سے پلٹ آیا اور قریش سے کہا کہ ان لوگوں کو طواف و زیارتِ کعبہ سے روکنا سراسر ظلم و زیادتی ہے اور کوئی وجہ جواز نہیں ہے کہ ہم مراسم زیارت کی بجا آوری سے مانع ہوں۔ مگر قریش ٹس سے مس نہ ہُوئے۔ حلیس نے ان کی ضد اور ہٹ دھرمی دیکھی تو کہا:۔

یا معشر قریش واللہ ما علیٰ ھٰذا حالفناکم ولا علیٰ ھٰذا عاقدناکم ان تصدوا عن بیت اللہ من جاءہ معظما لہ۔ (تاریخ طبری ج ۲ ص ۲۷۶)	اے گروہ قریش ہم تمہارے حلیف سہی مگر ہم نے اس بات پر تم سے عہد و پیمان نہیں باندھا تھا کہ جو خانہ کعبہ کے مراسم تعظیم بجا لانے کے لئے آئے تم اُسے روکو اور آنے سے منع کرو۔

جب ان سفارتوں کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو آنحضرتؐ نے خراش ابن امیہ خزاعی کو اپنے اُونٹ پر سوار کر کے قریش کے ہاں بھیجا تاکہ انہیں اطمینان دلائیں کہ پیغمبرؐ کا مقصد جنگ نہیں ہے بلکہ عمرہ و زیارتِ کعبہ ہے۔ خراش نے مکّہ پہنچ کر قریش سے بات چیت کی اور اُن سے کہا کہ وُہ طواف و مراسم زیارت کے بجا لانے سے مانع نہ ہوں مگر

قریش نے اُن کی بات نہ مانی اور اُن کے قتل کے در پے ہو گئے۔ حلیس اور اس کے زیر اثر قبائل نے جب یہ دیکھا کہ قریش انہیں قتل کیا چاہتے ہیں تو وُہ اُن کے سینہ سپر بن گئے اور انہیں تلواروں کے نرغہ سے نکال کر واپس بھیج دیا۔ البتہ قریش نے اپنی ذہنی شکست خوردگی کا مظاہرہ کرتے ہُوئے آنحضرتؐ کا اُونٹ کاٹ ڈالا۔ قریش نے اسی پر بس نہ کی بلکہ پچاس سر پھروں کو آنحضرتؐ کی قیامگاہ کی طرف بھیجا تاکہ مسلمانوں کو ہراساں کر کے واپسی پر مجبور کر دیں چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کے پڑاؤ کے قریب پہنچ کر تیروں اور پتھروں کی بارش شروع کر دی۔ مسلمان اتنے بے دست و پا نہ تھے کہ اُن سے مغلوب ہو جاتے انہوں نے گھیرا ڈال کر ان سب کو گرفتار کر لیا اور پیغمبر اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے پیش کیا۔ آپ نے امن پسندی کا ثبوت دیتے ہُوئے ان سے کوئی تعرض نہ کیا اور سب کو رہا کر دیا اور حضرت عمرؓ کو بلا کر کہا کہ تم مکّہ جا کر قریش کو واضح طور پر بتاؤ کہ ہم لڑنے کے لئے نہیں آئے بلکہ طوافِ کعبہ اور مراسم زیارت بجا لانے کے لئے آئے ہیں۔ حضرت عمر نے اپنی معذوری ظاہر کرتے ہُوئے کہا:-

لیس بمکّۃ من بنی عدی من	مکّہ میں میرے قبیلہ بنی عدی کی کوئی ایسی فرد نہیں ہے
یمنعنی وقد علمت قریش	جو میری حفاظت کا ذمہ لے اور قریش سے میری عداوت
عداوتی لہا وغلظتی علیہا و	اور اُن کے خلاف میری سختی و تشدد پسندی ڈھکی چھپی
اخافہا علی نفسی فارسل عثمان	ہوئی نہیں ہے۔ مجھے تو اُن سے اپنی جان کا خطرہ ہے
فھو اعزّ بہا منی۔ (تاریخ کامل ج۲ ص۱۳۸)	آپ عثمان کو بھیج دیجئے وُہ مجھ سے زیادہ با اثر ہیں۔"

اب پیغمبر نے حضرت عثمان کو بلایا اور انہیں اس کام پر مامور فرمایا اور اُن کے عقب میں دس مہاجرین کا ایک اور وفد بھیج دیا۔ جب یہ لوگ مکہ میں پہنچے تو حضرت عثمان نے ابوسفیان اور اکابر قریش کو آنحضرتؐ کی طرف سے پیغام دیا کہ وُہ بلا وجہ مزاحمت نہ کریں جبکہ وُہ زیارتِ کعبہ کے قصد سے آئے ہیں اور قطعاً جنگ کا کوئی ارادہ نہیں ہے مگر قریش نے ان کی بات سُنی ان سُنی کر دی اور انہیں واپس بھیجنے کے بجائے اپنے ہاں روک لیا۔ حضرت عثمان نے تو اپنے ایک عزیز ابان ابن سعید کی حمایت حاصل کر کے اپنا تحفّظ حاصل کر لیا البتہ باقی ماندہ لوگ قریش کے رحم و کرم پر رہ گئے ان لوگوں کے مکہ میں روک لئے جانے سے مسلمانوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ حضرت عثمان اور دُوسرے مہاجر قتل کر دیئے گئے ہیں۔ چونکہ یہ لوگ نبی اکرمؐ کی طرف سے بسلسلہ سفارت بھیجے گئے تھے اور سفیروں کا قتل مسلّمہ بین الاقوامی آئین کے خلاف تھا اس لئے اس غیر آئینی قتل پر مسلمانوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی اور کہنے لگے کہ ہم اس قتل کا بدلہ لئے بغیر مدینہ واپس نہیں ہوں گے۔ آنحضرتؐ نے مسلمانوں کو جنگ پر مصر دیکھا تو اس خیال سے کہ کہیں یہ وقتی و ہنگامی جوش و ولولہ نہ ہو انہیں ایک ببول[1] کے درخت کے نیچے جمع کیا اور اُن سے اس امر پر بیعت لی کہ وُہ جنگ چھڑ جانے کی صورت

---

[1] اس بیعت کے بعد یہ درخت متبرک سمجھا گیا اور مسلمان اُدھر سے گزرتے تو تبرکاً اس کے نیچے نماز پڑھتے اور بیعتِ رضوان کی یاد تازہ کرتے۔ جب حضرت عمر کو اپنے دَورِ خلافت میں اس کا علم ہُوا تو انہیں مسلمانوں کا یہ طرزِ عمل ناگوار گزرا۔ چنانچہ (باقی بر صفحہ ۲۳۳)

میں میدان سے منہ نہیں موڑیں گے اور پورے ثبات قدم کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کریں گے۔ چنانچہ جابر ابن عبداللہ کہتے ہیں:

بایعنا رسول اللہ علیٰ ان لا نفر۔ (تاریخ طبری۔ ج۲۔ ص۲۷۹)۔	ہم سے رسولؐ خدا نے اس بات پر بیعت لی کہ ہم فرار اختیار نہیں کریں گے۔"

اس بیعت کو بیعتِ رضوان بھی کہا جاتا ہے کیونکہ خداوند عالم نے اس پر رضا و خوشنودی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا ہے:۔

لقد رضی اللہ عن المؤمنین اذ یبایعونک تحت الشجرۃ۔	جس وقت ایمان لانے والے تم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے تو اللہ تم ان کی اس بات سے راضی ہوا۔"

اس بیعت کی تکمیل کے بعد معلوم ہوا کہ حضرت عثمان اور دوسرے مہاجرین کے قتل کئے جانے کی افواہ غلط تھی اور قبل اس کے کہ جنگ کی نوبت آئے وہ سب صحیح و سالم واپس آ گئے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا ہی تھا کہ مسلمانوں کے جذبات میں ٹھہراؤ پیدا ہو جائے اور جنگی ولولے سرد پڑ جائیں۔ ادھر مشرکین قریش بھی لڑائی کے حق میں نہ تھے وہ صرف اپنی بات کو بالا دیکھنا چاہتے تھے تاکہ قبائل عرب پر ان کی دھاک جمی رہے۔ چنانچہ اس واقعہ کے بعد انہوں نے حویطب اور سہیل ابن عمرو کو صلح کی گفتگو کے لئے بھیجا۔ پیغمبر اکرمؐ بھی امن پسند اور مجبوری کے علاوہ جنگ کے روادار نہ تھے۔ انہوں نے اس پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا اور صلح کی بات چیت کے لئے حضرت علیؑ کو مقرر فرمایا۔ علامہ طبری نے تحریر کیا ہے:۔

ان قریشا بعثوا سہیل ابن عمرو و حویطبا فولوہم صلحہم و بعث النبیؐ علیا علیہ السلام فی صلحہ (تاریخ طبری۔ ج۲۔ ص۲۷۵)	قریش نے سہیل ابن عمرو اور حویطب کو صلح کے اختیارات دے کر بھیجا اور آنحضرتؐ نے علی علیہ السلام کو صلح کی گفتگو کے لئے منتخب فرمایا۔"

جب دونوں فریق میں گفتگو شروع ہوئی تو قریش کے نمایندوں نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ فریق ثانی لڑنا نہیں چاہتا اس پر جا و بیجا شرائط عائد کرنا شروع کر دیں۔ چنانچہ بڑی رد و قدح کے بعد ان شرائط پر فریقین میں سمجھوتہ ہو گیا:۔

(۱) اس سال مسلمان عمرہ ادا کئے بغیر واپس چلے جائیں۔

(۲) آئندہ سال عمرہ کے لئے آ سکتے ہیں مگر تین دن سے زیادہ مکہ میں قیام نہیں کر سکتے۔

(بقیہ از ص۲۳۲) انہوں نے اعلان کیا کہ اگر کوئی شخص وہاں پر نماز پڑھے گا تو اسے قتل کر دیا جائے گا اور حکم دیا کہ اس درخت کو کاٹ دیا جائے۔ چنانچہ وہ درخت جس سے بیعت رضوان اور فتح مبین کی یاد وابستہ تھی قطع کر دیا گیا۔"

(۳) اپنے ہمراہ تلوار کے علاوہ جنگی ہتھیار نہیں لا سکتے اور تلوار بھی نیام کے اندر رہے۔"
(۴) قبائلِ عرب میں سے ہر قبیلہ کو اختیار ہوگا کہ وہ فریقین میں سے جس فریق سے چاہے معاہدہ کرلے اور حلیف و معاہد قبائل پر بھی ان شرائط کی پابندی لازمی ہوگی۔
(۵) مکہ والوں میں سے اگر کوئی شخص مسلمانوں کے ہاں چلا آئے گا تو مسلمان پابند ہوں گے کہ اسے واپس کریں اور اگر اُن کا کوئی آدمی قریش کے ہاں چلا آئے گا تو اُسے واپس نہیں کیا جائے گا۔
(۶) اس معاہدہ کی میعاد دس برس ہوگی۔ اس عرصہ میں نہ کسی کو آنے جانے سے روکا جائے گا اور نہ کوئی لڑائی جھگڑا ہوگا۔

یہ تمام شرطیں قریب قریب قریش ہی کے حق میں تھیں اور وہ ان شرائط کو منوائے بغیر کسی طرح صلح پر آمادہ نہ تھے۔ ان حالات میں صلح سے عہدہ برآ ہونا کوئی آسان کام نہ تھا جبکہ قریش کا بھی ایک طبقہ صلح کے حق میں نہ تھا اور مسلمانوں کی اکثریت بھی ان شرائطِ صلح پر مطمئن نہ تھی۔ اب دو ہی صورتیں تھیں۔ یا تو اُن کے مطالبات کو من و عن تسلیم کر لیا جاتا، یا اُن سے جنگ چھیڑ دی جاتی۔ پیغمبر اکرمؐ کی نظر جنگ کے نتائج پر بھی تھی اور صلح کے فوائد و مصالح پر بھی۔ اگر پیغمبرؐ ان شرائط کے مقابلہ میں جو مسلمانوں کی کمزوری و بے بسی کی آئینہ دار تھیں جنگ کرتے اور یہ مان لیا جائے کہ اس جنگ کے نتیجہ میں فاتح و کامران بھی ہوتے اور قریش کو مغلوب کر کے مکہ میں داخل بھی ہو جاتے مگر قریش اور مسلمانوں میں اتنی منافرت بڑھ جاتی کہ وہ کبھی اسلام کے قریب بھی نہ پھٹکتے اور ہمیشہ اسلام دشمنی پر تلے رہتے۔ نیز اس اقدام سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جاتا کہ پیغمبرؐ طبعاً صلح پسند نہ تھے بلکہ اپنی کمزوری و بے طاقتی کی بنا پر اب تک خاموش رہے تھے اور جب عسکری طاقت بہم پہنچالی تو دشمن کو کچلنے کے لئے چڑھائی کردی اور اس طرح یہ جنگ سابقہ دفاعی جنگوں کے مقابلہ میں جارحانہ قرار پاتی اور پیغمبرؐ کی امن پسندی و صلح جوئی پر حرف رکھنے کی گنجائش نکل آتی اس بنا پر آپ نے جنگ پر صلح کو ترجیح دی۔ اگرچہ شرائط کے سلسلہ میں کچھ دبنا پڑا مگر حقیقت یہ ہے کہ اسے دبنا بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اس لئے کہ پیغمبرؐ نے یہ شرائط کسی جنگ کی شکست کے نتیجہ میں تسلیم نہیں کیں بلکہ سابقہ جنگوں میں اپنی طاقت کی برتری منوانے کے بعد ان شرائط پر رضامندی دی چنانچہ بدر و احزاب میں قریش کو شکست فاش دی جا چکی تھی اور اب بھی آپ کے مقابلہ میں وہی شکست خوردہ لوگ تھے جنہیں با آسانی شکست دے کر فاتحانہ صورت میں آگے بڑھا جا سکتا تھا۔ مگر آنحضرت یہ چاہتے تھے کہ جنگی برتری کے ساتھ اپنی صلح پسندی کا بھی تاثر دیں اور قریش کی جہالت، عصبیت اور تنگ نظری کو بے نقاب کر کے اپنی وسیع القلبی اور امن جوئی کا ثبوت مہیا کریں۔

شرائطِ صلح کے طے ہو جانے کے بعد معاہدہ کی تحریر کا مرحلہ درپیش تھا۔ سہیل نے اس میں بھی قدم قدم پر الجھنیں پیدا کیں اور رکاوٹیں ڈالیں۔ چنانچہ جب حضرت علیؑ دستاویز تحریر کرنے لگے تو پیغمبر صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ سرِ عنوان بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھو۔ سہیل نے کہا کہ ہم نہیں جانتے کہ الرحمن کیا ہوتا ہے

اس کے بجائے باسمک اللّٰھم لکھئے جو ہمارے ہاں کا دستور چلا آرہا ہے۔ آنحضرت نے الجھنا مناسب نہ سمجھا۔ فرمایا کہ اچھا یہی لکھ دیا جائے۔ اس کے بعد حضرت علیؑ نے یہ فقرہ لکھا:۔ ھٰذا ما صالح علیہ محمد رسول اللّٰہ سھیل ابن عمرو۔ "یہ وہ معاہدۂ صلح ہے جو اللہ کے رسولؐ محمد (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سہیل ابن عمرو سے کیا ہے۔" سہیل نے پھر اس پر اعتراض کیا اور کہا کہ ہم انہیں اللہ کا رسول کب سمجھتے ہیں۔ اگر ہم انہیں اللہ کا رسول مانتے تو مکہ میں داخلے سے مانع نہ ہوتے۔ لہذا اس کے بجائے محمدؐ ابن عبد اللہ لکھا جائے۔ پیغمبرؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا کہ لفظ رسول اللہ قلمزد کر دو اور محمدؐ ابن عبد اللہ لکھ دو۔ حضرت علیؑ نے قلم ہاتھ سے رکھ دیا۔ اور کہا کہ خدا کی قسم میں لفظ رسولؐ اللہ نہیں کاٹوں گا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ لاؤ میں اسے خود مٹائے دیتا ہوں چنانچہ آپؐ نے لفظ 'رسولؐ اللہ' پر خط کھینچ دیا اور حضرت علیؑ سے مخاطب ہو کر فرمایا:۔

لتبلین بمثلھا۔ (تاریخ کامل۔ ج۲۔ ص۱۳۸)	ایک دن تمہیں بھی اس قسم کی آزمائش سے دوچار ہونا پڑے گا"

جب دستاویز قلمبند ہو گئی تو دونوں فریق کے گواہوں نے اس پر شہادتیں ثبت کیں اور اس کا ایک نسخہ رسولؐ اللہ کے سپرد کیا گیا اور ایک نسخہ سہیل ابن عمرو کو دیا گیا۔

اس صلح کی گفتگو سے لے کر تحریر معاہدہ تک کے تمام مراحل پیغمبر اکرمؐ نے اپنی صوابدید سے طے کئے اور اس پوری کاروائی میں نہ صحابہ کو شریک مشورہ کیا گیا اور نہ ان کی رائے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ البتہ ایک حضرت علیؑ تھے جو شرائط صلح طے کرنے اور معاہدہ کے تحریر کرنے میں پیغمبرؐ کے شریک کار تھے۔ اکثر صحابہ صلح اور اس کے شرائط کے سرے سے مخالف تھے۔ وہ تو یہ توقع لئے ہوئے تھے کہ کفار کے علی الرغم مکہ میں داخل ہو کر عمرہ وطواف بجالائیں گے۔ مگر جب قرارداد صلح کی رو سے یہیں سے واپسی طے پاگئی تو ان میں ایک ہیجان سا پیدا ہو گیا۔ اور یہ بے چینی اور ہیجانی کیفیت اس حد تک بڑھی کہ ان کے دلوں میں شکوک وشبہات نے جگہ لے لی۔ چنانچہ علامہ طبری تحریر کرتے ہیں:۔

قد کان اصحاب رسولؐ اللّٰہ خرجوا وھم لا یشکون فی الفتح لرؤیا راھا رسولؐ اللّٰہ فلما رأوا ما رأوا من الصلح والرجوع وما تحمل علیہ رسولؐ اللّٰہ فی نفسہ دخل الناس	پیغمبرؐ کے اصحاب جب مدینہ سے نکلے تھے تو انہیں فتح میں کوئی شک وشبہ نہ تھا اس خواب کی بناء پر جو آنحضرتؐ نے دیکھا تھا۔ مگر جب انہوں نے صلح اور واپسی کی صورت دیکھی اور یہ دیکھا کہ رسولؐ اللہ نے ذاتی طور پر شرائط منظور کر لئے ہیں تو ان لوگوں کے دلوں میں ایک بڑا خدشہ پیدا ہوا اور قریب تھا

لہ یہ جملہ سب سے پہلے امیہ ابن ابی الصلت ثقفی نے تحریر کیا اور قبل اسلام یہی جملہ خطوط ودستاویزات میں سرعنوان لکھا جایا کرتا تھا۔

من ذالك امر عظیم حتی کادوا ان یهلکوا۔ (تاریخ طبری۔ ج۲۔ ص۲۸۱)۔ — کہ وُہ ہلاکت میں مُبتلا ہو جائیں"۔

حضرت عمر اس صلح پر سب سے زیادہ برافروختہ تھے۔ اور ان کی ناراضگی اس حد تک بڑھی کہ وُہ غصہ میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے پیغمبر اکرمؐ کے پاس آئے اور کہا کیا آپ پیغمبر برحق نہیں ہیں فرمایا کہ ہاں میں اللہ کا رسولؐ ہوں۔ کہا کیا آپ نے یہ نہیں کہا تھا کہ ہم سب مسجد الحرام میں داخل ہوں گے اور خانۂ کعبہ کا طواف کریں گے۔ فرمایا کہ ہاں مَیں نے ایک خواب دیکھا تھا اور اس کی تعبیر یہ دی تھی کہ وُہ وقت آیا چاہتا ہے کہ ہم مسجد الحرام میں داخل ہوں اور خانہ کعبہ کا طواف بجالائیں۔ مگر یہ تو نہیں کہا تھا کہ یہ اسی سال ہوگا۔ یہ جو کچھ ہُوا ہے اللہ کے حکم سے ہُوا ہے اور مَیں اُس کے حکم کی نافرمانی نہیں کر سکتا۔ اور اللہ مجھے کبھی ضائع و برباد اور دُشمن کے ہاتھوں سے پامال نہ ہونے دے گا۔ پیغمبر اکرمؐ کے اس سمجھانے سے بھی حضرت عُمر کی اُلجھن کم نہ ہُوی اور وُہ غم و غصّہ میں بھرے ہُوئے حضرت ابوبکر کے پاس آئے اور اُن سے بھی وہی باتیں کہیں جو رسُولِؐ خدا سے کہی تھیں۔ اُنہوں نے کہا:۔

یا عمر الزم غرزہ فانی اشهد انه رسول الله۔ (تاریخ طبری۔ ج۲۔ ص۲۸۰)۔ — اے عمر تم اُن کی رکاب تھامے رہو میں گواہی دیتا ہوں کہ وُہ یقیناً اللہ کے رسُولؐ ہیں"۔

حضرت ابوبکر کو پیغمبر اکرمؐ کی رسالت کی یقین دہانی کی ضرورت اس لئے محسوس ہُوی کہ حضرت عمر کے اندازِ گفتگو سے صاف عیاں ہو رہا تھا کہ وُہ اس صلح سے اس حد تک متاثر و برافروختہ ہیں کہ انہیں پیغمبرؐ کی رسالت مشکوک و مشتبہ نظر آرہی ہے۔ چنانچہ حضرت عمر نے خود بھی اپنے شک و تذبذب کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:۔

واللہ ما شککت منذ اسلمت الا یومئذ۔ (تاریخ خمیس۔ ج۲۔ ص۳۲)۔ — خدا کی قسم مَیں نے جب سے اسلام قبول کیا ہے اس دن کے سوا کبھی شک نہیں کیا"۔

صحابہ کی ناراضگی کا یہ عالم تھا کہ جب آنحضرتؐ نے معاہدۂ صلح کو عملی جامہ پہناتے ہُوئے انہیں حکم دیا کہ قربانیاں کرو اور سروں کے بال منڈواؤ تو جو کچھ دیر پہلے پیغمبرؐ کے ہر حکم پر سرِ تسلیم خم کرتے اور اشارۂ چشم و ابرو پر دیوانہ وار دوڑ پڑتے تھے نافرمانی پر اُتر آئے اور بار بار کہنے کے باوجود نہ قربانی کرنے پر آمادہ ہُوئے اور نہ سر منڈوانے پر۔ مورّخ طبری نے لکھا ہے:۔

فواللہ ما قام منهم رجل حتی قال ذلك ثلاث مرات — خدا کی قسم آنحضرتؐ کے تین مرتبہ حکم دینے کے باوجود کوی بھی تعمیل کے لئے کھڑا نہ ہُوا"۔

(تاریخ طبری۔ ج۲۔ ص۲۸۳)۔

جب آنحضرتؐ نے یہ صورتِ حال دیکھی تو کبیدہ خاطر ہو کر اُٹھ کھڑے ہُوئے اور جناب اُمِ سلمہ کے خیمہ میں خاموشی کے ساتھ بیٹھ گئے۔ جناب ام سلمہ نے پیغمبر کے چہرہ پر آثارِ ملال دیکھے تو وجہ پُوچھی۔ آپ نے

صحابہ کی نافرمانی اور بے اعتنائی کا شکوہ کیا۔ اُم سلمہ نے کہا کہ آپ کسی کو مجبور نہ کریں اور خود جا کر قربانی کریں اور سر منڈوا کر احرام اُتار دیں۔ آنحضرتؐ نے باہر نکل کر قربانی کی اور سر منڈوا کر احرام اُتار دیا۔ جب صحابہ نے دیکھا کہ اب پیغمبر کے فیصلہ میں تبدیلی نہیں ہو سکتی تو کچھ لوگوں نے بادل ناخواستہ سر منڈوائے اور اکثر لوگوں نے صرف تھوڑے تھوڑے بال ترشوائے مگر اُن کا غم و غصہ کسی طرح کم نہ ہوا۔ علامہ طبری نے لکھا ہے:۔

جعل بعضهم يحلق بعضا حتى كاد بعضهم يقتل بعضا غمّا۔ (تاریخ طبری۔ ج۲۔ ص۲۸۳)۔	وہ آپس میں ایک دوسرے کے سر مونڈنے لگے مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ رنج و غم کی وجہ سے ایک دوسرے کو قتل کر دیں گے"۔

جب پیغمبرؐ نے سر منڈوانے والوں کو دیکھا تو فرمایا کہ خدا ان سر منڈوانے والوں پر رحم کرے۔ صحابہ نے عرض کیا کہ:۔

یا رسولؐ الله فلما ظاهرت الترحم للمحلقين دون المقصرين قال لانهم لم يشكوا۔ (تاریخ طبری۔ ج۲۔ ص۲۸۳)	یا رسولؐ اللہ آپ نے سر منڈوانے والوں کے لئے دعائے رحمت کی ہے اور بال ترشوانے والوں کے لئے کچھ نہیں کہا۔ فرمایا اس لئے کہ انہوں نے شک نہیں کیا"۔

صحابہ کے پیچ و تاب کھانے کے باوجود پیغمبر نے ان شرائط کی پوری پوری پابندی فرمائی۔ چنانچہ ابھی شرائطِ صلح پر گفتگو ہو رہی تھی کہ سہیل ابن عمرو کا بیٹا ابو جندل جو مسلمان ہو چکا تھا اور اس جرم کی پاداش میں قید و بند کی کڑیاں جھیل رہا تھا جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ پیغمبرؐ مکہ کے قریب تشریف فرما ہیں تو وہ نگہبانوں کی نظر بچا کر بھاگ نکلا اور پابہ زنجیر پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ اور عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ مجھے اپنے ہم رکاب رہنے کی اجازت دیجئے۔ جب نمائندہ قریش سہیل نے اپنے بیٹے کو دیکھا تو آنحضرتؐ سے کہا کہ ہمارے درمیان معاہدہ ہو چکا ہے کہ ہمارا جو آدمی بھاگ کر آئے گا اسے واپس کیا جائے گا لہذا ابو جندل کو واپس کیجئے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ابھی تو معاہدہ کی تکمیل بھی نہیں ہوی کہ تم نے اس کی پابندی کا مطالبہ شروع کر دیا ہے۔ سہیل نے کہا کہ آپ نے میرے بیٹے کو میرے حوالے نہ کیا تو ہم معاہدۂ صلح ختم کر دیں گے۔ آنحضرت نے فرمایا کہ اچھا تم اسے لے جاؤ۔ چنانچہ ابو جندل کو صبر و تحمل کی ہدایت کرتے ہوئے اُن کے حوالے کر دیا۔

جب ابو جندل اُٹھ کر جانے لگا تو حضرت عمر بھی اُس کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے اور اُس کا ہاتھ تلوار کے قبضہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا کہ ایک مشرک کا خون ایک کُتے کے خون سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ حضرت عمر کہتے ہیں کہ مجھے توقع تھی کہ وہ اپنے باپ پر حملہ کر کے اُسے قتل کر دے گا مگر ابو جندل نے کہا:۔

يا عمر ما انت باحرى بطاعة رسول الله صلے الله عليه وسلم منى۔ (تاریخ خمیس ج۲۔ ص۲۲)	اے عمر تم حکم رسول کی بجا آوری کا مجھ سے زیادہ حق تو نہیں رکھتے"۔

کفّار قریش نے اپنی اس شرط کو عملاً منوا کر یہ سمجھ لیا کہ انہوں نے میدان سر کر لیا ہے حالانکہ یہ شرط مسلمانوں کے لئے قطعاً ضرر رساں نہ تھی اس لئے کہ اگر کوی اسلام سے منحرف ہو کر قریش کے ہاں چلا جاتا ہے تو وہ ارتداد کے بعد زمرۂ مسلمین میں شامل کئے جانے کے قابل ہی کب رہتا ہے کہ اُس کے واپس لئے جانے پر اصرار کیا جاتا۔ اور اگر قریش کسی بھاگ نکلنے والے کی واپسی پر مصر تھے تو اُسے واپس کر دینے میں مُسلمانوں کا نقصان ہی کیا تھا جبکہ وُہ مکّہ میں رہ کر بھی مسلمان رَہ سکتا تھا۔ اور شرائطِ صلح کی رُو سے اسے کوی اسلامی اعمال وعبادات سے روکنے کا مجاز نہ تھا۔ البتہ یہ شرط قریش کے لئے انتہائی نقصان دہ ثابت ہوی اور اُن کے مال وجان کی تباہی کا باعث بن گئی۔ چنانچہ اس صلح کی تکمیل کے بعد قریش کا ایک آدمی ابو بصیر عتبہ ابن اسید مسلمان ہو کر چوری چھپے مدینہ چلا آیا۔ قریش نے دوؔ آدمیوں کو خط دے کر مدینہ روانہ کیا اور ابو بصیر کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ آنحضرت ؐ نے ابو بصیر کو بُلا کر کہا کہ تم اُن کے ہمراہ مکّہ واپس چلے جاؤ۔ ابو بصیر بادلِ ناخواستہ اُن کے ساتھ ہو لیا۔ جب یہ لوگ وادیٔ ذی الحلیفہ میں پہنچے تو ابو بصیر نے ان میں سے ایک کی تلوار کی بڑی تعریف کی۔ اُس نے کہا کہ ہاں واقعاً میری تلوار بڑی عمدہ ہے اور یہ کہہ کر تلوار نیام سے نکال لی۔ ابو بصیر نے دیکھنے کے بہانہ سے وُہ تلوار لے لی اور اُسی کی تلوار سے اُسے قتل کر دیا۔ جب دُوسرے آدمی نے دیکھا کہ اس کا ساتھی مارا گیا ہے تو وُہ ڈر کے مارے بھاگ کھڑا ہُوا اور مدینہ پہنچ کر رسُول ؐ اللہ سے کہا کہ ابو بصیر نے میرے ساتھی کو قتل کر دیا ہے اور مجھے بھی اس سے اپنی جان کا خطرہ ہے اتنے میں ابو بصیر بھی واپس آگیا اور پیغمبر ؐ سے کہا کہ یا رسُول ؐ اللہ آپ نے مجھے ان کے حوالے کر دیا تھا اور معاہدہ کی رو سے اب آپ پر کوی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی لہذا مجھے دوبارہ اس کے ہمراہ مکّہ جانے کے لئے نہ کہا جائے۔ پیغمبر اکرم ؐ نے فرمایا کہ یہ شخص جنگ کی آگ بھڑکانا چاہتا ہے اگر اس کی حمایت کی گئی تو قریش جنگ چھیڑے بغیر نہیں رہیں گے۔ ابو بصیر سمجھ گیا کہ پیغمبر اسے واپس کئے بغیر نہیں رہیں گے اس نے موقع تاک کر ساحلِ سمندر کا رُخ کر لیا اور وہیں پر سکونت اختیار کر لی۔ ادھر ابو جندل کو جو مکّہ میں نظر بند تھا یہ پتا چلا کہ ابو بصیر ساحلِ سمندر کی طرف نکل گیا ہے تو اُس نے بھی چُپکے سے اُدھر کا رُخ کر لیا اور رفتہ رفتہ یہ جگہ مکّہ سے بھاگ نکلنے والوں کی پناہ گاہ بن گئی اور مزید ستر مسلمان اُن سے آ کر مل گئے اور اپنی طاقت کو یکجا کر کے ایک مضبُوط جتھا بنا لیا۔ اور جب قریش کے قافلے شام جاتے ہوُے اُدھر سے گزرتے تو یہ اُن پر چھاپے مارتے اور اُن کا مال و اسباب لُوٹ لیتے۔ قریش جب اُن کے ہاتھوں تنگ آ گئے تو اُنہوں نے پیغمبر اکرم ؐ کو پیغام بھیجا کہ آپ ان لوگوں کو اپنے ہاں بُلا لیں ہم آیندہ کسی ایسے شخص سے تعرض نہیں کریں گے جو مُسلمان ہو کر آپ کے ہاں چلا آئے گا۔ آنحضرت ؐ نے ابو بصیر کو کہلوا بھیجا کہ وُہ مدینہ چلا آئے۔ ابو بصیر کو یہ پیغام اُس وقت ملا جب اُس پر نزع کی کیفیت طاری تھی۔ اس نے ابو جندل سے کہا کہ تم مدینہ چلے جاؤ۔ چنانچہ وُہ اپنے ساتھیوں کو مُنتشر کر کے مدینہ چلا آیا اور قریش کے لئے راستا بے خطر ہو گیا۔

اس صلح کے حِکَم ومصالح کو اکثر مسلمان اپنی کوتاہ نظری کی وجہ سے نہ سمجھ سکے تھے اور صلح کے موقع پر

بھی اور اس کے بعد بھی اس پر افسردہ و کبیدہ خاطر رہے۔ مگر جب اس کے نتیجہ میں انہیں دینی و سیاسی اعتبار سے وُہ کامیابیاں حاصل ہوئیں جن کی وُہ توقع بھی نہ کر سکتے تھے تو اُن کی آنکھیں کُھل گئیں اور انہیں پیغمبر اکرمؐ کی دُور اندیشی انجام بینی اور حقیقت رسی کا اعتراف کرنا پڑا۔ اس صلح پر جو فوائد مرتب ہُوئے اُن میں سے چند واضح اور روشن فوائد یہ ہیں :۔

پہلا فائدہ یہ ہُوا کہ تمام قبائل عرب پر قریش کی بے جا سخن پروری، ضد اور ہٹ دھرمی واضح ہو گئی کہ انھوں نے محض اس خیال سے کہ ان کی سُبکی نہ ہو مُسلمانوں کو عمرہ و طواف سے روک دیا حالانکہ خانہ کعبہ ایک عمومی عبادت خانہ اور مشترکہ معبد تھا جس سے اُن کے معاہد و حلیف قبائل بھی اُن سے بدظن ہو گئے اور جن کڑی شرطوں کو منوا کر انھوں نے اپنا جھوٹا وقار قائم کرنا چاہا تھا وُہی اُن کی ذلت و ناکامی کا باعث بن گئیں۔

دُوسرا فائدہ یہ ہُوا کہ وُہ مسلمان جو مکّہ میں اپنے اسلام کو پوشیدہ رکھنے پر مجبور تھے اور کفّار کے ڈر سے اظہارِ اسلام نہ کر سکتے تھے ان کے دلوں سے خوف وہراس جاتا رہا اور وُہ کھلے بندوں مسلمان کہلوانے اور اسلامی عبادات و احکام پر عمل کرنے لگے۔ بلکہ جو اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو کر مسلمان ہو جاتا قریش باہمی صلح کی بنا پر نہ اس سے کوئی تعرض کرتے اور نہ اسلام کے اختیار کرنے سے مانع ہوتے۔

تیسرا فائدہ یہ ہُوا کہ کفّار کو مسلمانوں سے میل جول کا موقع ملا اور آمد و رفت کی پابندیوں کے اُٹھ جانے سے قریش اور دُوسرے لوگ بے کھٹکے مدینہ میں آتے اور آنحضرتؐ کے اخلاق فاضلہ اور صفات قدسیہ سے متاثر ہوتے اسلام کے تعلیمات و احکام سُنتے اور ان پر ٹھنڈے دل سے غور کرتے اور جب یہ دیکھتے کہ لوگ کس طرح آنحضرت کے احکام کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے اور ان کے اشارۂ چشم و ابرو پر چلتے ہیں تو وُہ پلٹ کر اہل مکّہ سے اس کا ذکر کرتے جس سے ان کے دلوں پر آنحضرتؐ کی عظمت اور اسلام کی صداقت کا نقش ابھرتا اور جب مسلمان مکّہ میں آتے تو مشرکین سے آزادانہ ملتے جلتے اور اپنے عزیزوں اور ملنے جلنے والوں سے اسلام کے محاسن بیان کرتے اور اس کے آداب و اخلاق سنن و فرائض اوامر و نواہی اور مواعظ و عبر کا تذکرہ کرتے جس سے ان کے دل اسلام کی طرف کھنچتے اور برضاؤ رغبت اسلام قبول کر لیتے۔ چنانچہ دو سال کے قلیل عرصہ میں مسلمانوں کی تعداد دوگنی سے بھی زائد ہو گئی۔ مورخ طبری تحریر کرتے ہیں :۔

دخل فی تینک السنتین فی الاسلام مثل ما کان فی الاسلام قبل ذلک او اکثر (تاریخ طبری۔ ج۲۔ ص۲۸۳)	دو سالوں کے اندر ہی مُسلمانوں کی تعداد سابقہ تعداد سے دوگنا یا اس سے زیادہ ہو گئی۔"

چوتھا فائدہ یہ ہوا کہ اس سے ان لوگوں کے قول کی تردید ہو گئی جو اسلام کی صداقت کو مجروح کرنے کے لئے یہ کہتے ہیں کہ اسلام کی نشر و اشاعت تلوار کے ذریعہ ہوئی اس لئے کہ اگر اسلام کا فروغ وارتقاء تلوار کا مرہون منت ہوتا تو صلح کو اسلام کی ترقی میں سدِّراہ ہونا چاہیئے تھا حالانکہ جتنی ترقی اس صلح پسندی کے نتیجہ میں ہوئی وُہ برسرِ پیکار رہنے

کے نتیجہ میں نہ ہو سکی۔ وجہ یہ ہے کہ جنگ میں نفرت کے جذبات اس شدت سے بھڑک اٹھتے ہیں کہ حق بغض و عناد کی دبیز تہوں میں چھپ کر رہ جاتا ہے۔ اور صلح اور سکون کے لمحات میں جذبات میں توازن پیدا ہو جاتا ہے اور دل و دماغ حق کی پذیرائی کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں چنانچہ اس صلح نے دبی ہوی صلاحیتوں کو ابھار کر سعید الفطرت لوگوں کو اسلام کا حلقہ بگوش بنا دیا۔

پانچواں فائدہ یہ ہُوا کہ جب قریش کی نئی پود نے ایک طرف آنحضرتؐ کا مصالحانہ طرز عمل اور صلح پسندانہ روش دیکھی اور دُوسری طرف ابو جہل و ابو سفیان اور یہود و مشرکین کی اڑائی ہوی باتوں کا جائزہ لیا تو انہیں ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق نظر آیا۔ کہاں تو وُہ یہ سُنتے آ رہے تھے کہ پیغمبرؐ فتنہ پرور و جنگجو ہیں اور کہاں یہ کہ وُہ امن پسندی کا ایسا کردار اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں جو ایک جنگجو کی طبیعت سے قطعاً سازگار نہ تھا۔ اس سے انہیں یقین ہو گیا کہ وُہ آنحضرتؐ کے متعلق جو سُنتے آئے ہیں وُہ سراسر غلط اور صریحی بہتان تھا۔ اگر وُہ جنگجو ہوتے تو اُن کے لئے جنگ سے مانع ہی کیا تھا جبکہ اُن کے ہمراہ فوج پہلے سے کہیں زیادہ تھی اور وُہ قریش کو بدر و احزاب میں شکست بھی دے چکی تھی۔ یہ ایک ایسا تاثر تھا جس نے انہیں آنحضرتؐ کی صلح جوئی و امن پسندی کا معترف بنا دیا اور اُن پر یہ حقیقت بھی واضح کر دی کہ اب تک جتنی جنگیں لڑی گئی ہیں وُہ قریش ہی کے جارحانہ اقدام کے دفاع میں لڑی گئی ہیں اور آنحضرت نے اُن کے مقابلہ میں صفیں جمائیں تو حفاظت خود اختیاری اور اپنی جماعت کے تحفظ کے لئے۔

چھٹا فائدہ یہ ہُوا کہ قریش صلح کی بنا پر مطمئن رہے کہ معاہدہ کی مقررہ مدت کے اندر ان پر حملہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے انہوں نے ہتھیاروں کی فراہمی اور جنگی تیاریوں کی ضرورت محسوس نہ کی۔ مگر جب انہوں نے معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہُوئے بنی بکر و بنی خزاعہ کی جنگ میں حصہ لیا اور اپنے حلیف قبیلۂ بنی بکر کا ساتھ دیا اور مُسلمانوں کے حلیف قبیلۂ بنی خزاعہ کو قتل و غارت کیا تو مُسلمانوں کے لئے مکّہ پر چڑھائی کا جواز پیدا ہو گیا۔ اور جب اس عہد شکنی کے نتیجہ میں مسلمانوں کا لشکر مکّہ پر منڈلانے لگا تو قریش میں تابِ مقاومت ہی نہ تھی کہ وُہ مقابلہ کرتے اور مسلمانوں کو آگے بڑھنے سے روکتے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ مسلمانوں نے بغیر کسی مزاحمت کے آگے بڑھ کر مکّہ فتح کر لیا۔ اگر معاہدۂ صلح نہ ہوتا تو قریش ہمہ وقت چوکنا رہتے اور جنگی ساز و سامان مہیّا رکھتے۔ اس صورت میں مسلمان جنگ کئے بغیر مکّہ کو فتح کرنے میں کامیاب نہ ہو سکتے۔ چونکہ اس صلح کے زیر اثر مکّہ فتح ہُوا اور اسلامی اقتدار کی بنیاد پڑی اس لئے قدرت نے اسے فتح مبین اور پیغمبرؐ نے اعظم الفتوح سے تعبیر کیا ہے۔

اس معاہدۂ صلح سے جہاں پیغمبر اکرمؐ کی اصابت رائے امن پسندی اور عہد و پیمان کی پاسداری پر روشنی پڑتی ہے وہاں ایسے نتائج بھی اس سے اخذ کئے جا سکتے ہیں جو اسلامی نظریات و احساسات کی بلندی کا ثبوت دیتے اور بین الاقوامی معاہدات میں رہنما اصُولوں کا کام دے سکتے ہیں۔ چنانچہ اس سے جو نتائج حاصل ہوتے ہیں وُہ یہ ہیں :۔

ایک یہ کہ صلح کا امکان ہوتے ہُوے جنگ چھیڑی نہیں جا سکتی خواہ ایسے شرائط پر صلح کی نوبت آئے جن سے

جماعت کے جذبات کو ٹھیس لگتی ہو اور بظاہر قومی وقار مجروح ہوتا ہو بشرطیکہ اسلام کے بنیادی اصولوں پر زد نہ پڑتی ہو۔ چنانچہ یہاں کفار و مشرکین سے انہی کے پیش کردہ شرائط پر صلح کی گئی اور جنگ کی نوبت آنے دی گئی اب اس طرزِ عمل کو دُہرایا گیا ہو اور امام حسنؑ نے زمانہ کے حالات و مقتضیات کو دیکھتے ہوئے امیر شام سے صلح کر لی ہو تو اس پر نہ اعتراض کی گنجائش نکل سکتی ہے اور نہ اسے فریق ثانی کے حق بجانب ہونے کے ثبوت میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

دُوسرے یہ کہ معاہدہ کی پابندی بہرحال ضروری ہے اگرچہ معاہدہ کفار و مشرکین سے کیوں نہ کیا گیا ہو۔ چنانچہ پیغمبر اکرمؐ نے ابو جندل اور ابو بصیر کو کفار کے حوالے کر کے معاہدہ کا جو معیار قائم کیا وُہ دیانت، راست روی اور ایفائے عہد کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ البتہ جب قریش نے عہد شکنی کر کے مسلمانوں کے حلیف بنی خزاعہ کو تلواروں کی زد پر رکھ لیا تو پیغمبرؐ پر فرض ہو گیا کہ وُہ اپنے معاہد قبیلہ کی نصرت و امداد کے لئے قدم اُٹھائیں۔ اگر قریش اپنے عہد پر باقی رہتے تو پیغمبر اسلامؐ کبھی مکّہ پر لشکر کشی نہ کرتے۔ مگر قریش کی بدعہدی نے مکّہ پر حملہ کا جواز پیدا کر دیا۔ اسی سیرت پر عمل پیرا ہوتے ہوئے امیرالمومنینؑ نے اپنے دَورِ خلافت میں معاہدۂ تحکیم کی پابندی کی اگرچہ آپ پر خوارج نے پُورا پُورا زور ڈالا کہ اس معاہدہ کو ختم کر دیا جائے۔ مگر آپ نے اس وقت تک اسے توڑنا گوارا نہ کیا، جب تک خود اہل شام کی طرف سے اس کی خلاف ورزی ظہور میں نہ آئی۔

تیسرے یہ کہ پیغمبر جمہور کی رائے کا پابند نہیں ہوتا۔ چنانچہ جمہور صحابہ کی رائے آنحضرتؐ کی رائے کے خلاف تھی مگر آپ عوام کی رائے پر عمل پیرا ہونے کے بجائے اپنے فیصلہ پر قائم رہے۔ نہ اُن کی رائے کو قابلِ اعتنا سمجھا اور نہ اُن سے مشورہ لینے کی ضرورت محسوس کی۔ اس لئے کہ جہاں وحی ذریعۂ علم و بصیرت ہو وہاں کسی کے مشورہ کی احتیاج ہی نہیں رہتی۔ اور اگر کبھی مشورہ فرمایا بھی تو محض مسلمانوں کی دلجوئی اور اُن کے تالیفِ قلب کے لئے۔ لہٰذا جب اس مورد پر اُن کی رائے قابلِ عمل قرار نہ پائی تو اس سے اہم تر موارد کے لئے اُن کی رائے کیونکر سند ہو سکتی ہے۔

اس صلح حدیبیہ کے سلسلہ میں امیرالمومنینؑ نے جو عملی مظاہرہ کیا وُہ آپ کے تدبّر، معاملہ فہمی اور عزم و یقین کا روشن ثبوت ہے۔ آپ نے اس صلح کے مرحلہ کو اسی طرح طے کیا جس طرح جنگ کے دُشوار گزار مرحلوں کو سر کرتے رہے تھے حالانکہ جو لوگ جنگ آزما ہوتے ہیں وُہ جنگی معاملات ہی میں رائے دینے کے اہل ہوتے ہیں۔ انہیں نہ صلح سے دلچسپی ہوتی ہے اور نہ ان میں صلح کے معاملات سُلجھانے کی اہلیت۔ اور جو لوگ امن پسند اور صلح جو ہوتے ہیں وُہ حرب و ضرب کے معاملات سے بے خبر سمجھے جاتے ہیں۔ حضرت علیؑ جو صفِ اہل اسلام میں سب سے بڑے جنگ آزما تھے انہیں اس معاہدۂ صلح سے کوئی دلچسپی نہ ہونا چاہئے تھی اس لئے کہ صلح و جنگ دو متضاد چیزیں ہیں اور دونوں کے تقاضے الگ الگ ہیں۔ مگر آپ جس طرح جنگ کے نشیب و فراز اور اس کے داؤ پیچ سے واقف تھے اسی طرح صلح کی پیچیدگیوں سے بھی باخبر تھے۔ اسی لئے پیغمبر اکرمؐ نے صلح کی گفتگو صلحنامہ کی تحریر اور اس سلسلہ کے تمام امور آپ سے

متعلق کئے۔ شیخ مفید رحمہ اللہ نے تحریر کیا ہے:-

کان نظام تدبیر ھذہ الغزاۃ متعلقا بامیر المومنین وکان ماجری فیھا من البیعۃ وصف الناس للحرب ثم الھدنۃ و الکتاب کلہ لامیر المومنین۔

غزوۂ حدیبیہ کا تمام نظم و انصرام امیر المومنینؑ سے متعلق تھا۔ وُہ بیعتِ رضوان، ہو یا جنگ کے لئے لوگوں کی صف بندی۔ صُلح کی گفتگو ہو یا صلحنامہ کی تحریر یہ تمام اُمور آپ نے انجام دیئے۔"

(ارشاد۔ صـ۵۴)

آپ نے شروع ہی سے صلح کی حکمت و مصلحت کو محسوس کر لیا تھا اس لئے نہ شک و تذبذب میں پڑے اور نہ حکم رسُولؐ کی نافرمانی کے مرتکب ہُوئے۔ بلکہ جب دُوسروں کے عقائد متزلزل ہو رہے تھے اور رسالت کے متعلق دلوں میں شکوک و شبہات گزر رہے تھے آپ نے صفحۂ قرطاس سے بھی لفظ رسُول اللہ کو مٹانا سوءِ ادب سمجھا اور رسُولؐ اللہ کے فرمانے کے باوجود اس پر خط کھینچنا گوارا نہ کیا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی حضرت کے اس انکار پر تبصرہ کرتے ہُوئے تحریر کرتے ہیں:-

ایں امتناع علی از محو لفظ رسول اللہ نہ از باب ترک امتثال است کہ مستلزم ترکِ ادب است بلکہ عین امتثال و ادب و ناشی از غایت عشق و محبت است۔ (مدارج النبوۃ۔ جـ۲۔ صـ۲۳۶)۔

حضرت علیؑ کا لفظ رسُول اللہ مٹانے کے لئے آمادہ نہ ہونا نافرمانی و ترکِ ادب میں داخل نہیں ہے بلکہ یہ عین فرمانبرداری، ادب شناسی اور محبت و وارفتگی کا مظاہرہ تھا۔"

غزوۂ خیبر

صلح حدیبیہ کے بعد ہجرت کے ساتویں سال کے آغاز میں پیغمبر اکرمؐ نے خیبر پر چڑھائی کا قصد کیا۔ خیبر عبرانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی قلعہ و حصار کے ہیں اور ایک قول یہ ہے کہ عمالقہ میں یثرب اور خیبر نام کے دو بھائی تھے انہوں نے جہاں جہاں رہائش اختیار کی وُہ جگہیں اُن کے نام سے موسوم ہو گئیں۔ چنانچہ یثرب کے نام پر یثرب (مدینہ) آباد ہوا اور خیبر کے نام پر خیبر۔ خیبر مدینہ منورہ سے ۸۰ میل کے فاصلہ پر حجاز و شام کی سرحد پر واقع ہے اور اپنے نخلستانوں اور سرسبز و شاداب کھیتوں کی وجہ سے دُور دُور تک مشہور تھا۔ یہ علاقہ یہودیوں کی آبادی پر مشتمل اور ان کی جنگی قوت کا مرکز تھا انہوں نے دفاعی استحکام کے پیش نظر یہاں چھوٹے بڑے سات قلعے تعمیر کر رکھے تھے جو ناعم، کتیبہ، شق، نطاۃ، وطیح، سلالم اور قموص کے ناموں سے موسوم تھے۔ ان قلعوں میں دس ہزار یا چودہ ہزار یہودی آباد تھے جن میں وُہ یہودی بھی شامل تھے جو مدینہ سے جلاوطن ہو کر یہاں آباد

ہو گئے تھے اور مشرکین کے ساتھ مل کر پیغمبر اسلامؐ سے جنگ کی تھی۔ اور عسکری قوت اور عددی برتری کے باوجود شکست کھائی تھی۔ جب انہیں حدیبیہ کا حال معلوم ہُوا کہ مسلمانوں نے قریش سے دب کر صلح کر لی ہے اور اُن کے تمام شرائط بھی مان لئے ہیں تو اُنہوں نے یہ سمجھا کہ مسلمان اب لڑنے بھڑنے سے گھبرانے لگے ہیں اور دشمن سے ٹکرانے کی اُن میں ہمت نہیں رہی ہے۔ اس غلط فہمی اور غلط تاثر نے انہیں جرأت دلائی اور مُسلمانوں کی صلح پسندانہ روش کو کمزوری پر محمول کر کے اسلامی مرکز پر تاخت و تاراج کا منصوبہ بنایا تاکہ غزوۂ احزاب کی ناکامی کی خفت مٹائیں اور جلاوطنی کی ذلت کا دھبّا دھوئیں۔ یہودی اگرچہ تعداد کے لحاظ سے کم نہ تھے پھر بھی انہوں نے اپنی کثرت و قوت بڑھانے کے لئے بنی غطفان سے جو خیبر سے چھ میل کے فاصلہ پر آباد تھے معاہدہ کیا کہ اگر وُہ مسلمانوں کے خلاف جنگ میں اُن کا ساتھ دیں گے تو انہیں خیبر کی نصف پیداوار دی جائے گی۔ بنی غطفان نے اسے منظور کیا اور اُن کے چار ہزار نبرد آزما اُن کے پرچم کے نیچے لڑنے مرنے کے لئے تیار ہو گئے۔

جب پیغمبر اکرمؐ کو معلوم ہُوا کہ یہودِ خیبر مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے پَر تول رہے ہیں تو آپ نے تادیبی کارروائی ضروری سمجھی تاکہ فتنہ انگیز طاقتوں کو کچل کر امن کو برقرار رکھا جا سکے۔ چنانچہ حدیبیہ سے مراجعت کے بعد بیس دن مدینہ میں قیام فرمایا اور سولہ سَو صحابیوں کے ساتھ جن میں دو سَو سوار اور باقی پیادہ تھے خیبر کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب لشکرِ اسلام نواحِ خیبر میں پہنچا تو صبح کا وقت تھا۔ اہلِ خیبر پھاوڑے اور زنبیلیں لئے کھیتوں پر کام کرنے جا رہے تھے کہ لشکرِ اسلام کو آتے دیکھا۔ لشکر کو دیکھتے ہی بڑھتے ہُوئے قدم رُک گئے اور بدحواس ہو کر اپنے قلعوں کی طرف بھاگے۔ پیغمبرؐ نے انہیں بھاگتے دیکھا تو صدائے تکبیر بلند کی اور فرمایا:۔

خربت خیبر انا اذا نزلنا بساحة	خیبر برباد ہو گیا۔ ہم جب کسی قوم کی سرحد پر اُترتے
قوم فساء صباح المنذرین	ہیں تو جن لوگوں کو ڈرایا گیا تھا اُن پر کیا بُرا وقت
(صحیح مسلم۔ ج ۲۔ صد ۱۰۴)	پڑا"۔

پیغمبر اسلامؐ کو چونکہ معلوم ہو چکا تھا کہ بنی غطفان اہلِ خیبر کے حلیف و معاہد ہیں اور وُہ جنگ میں اُن کا ساتھ دیں گے اس لئے اہلِ خیبر اور بنی غطفان کی بستیوں کے درمیان مقام رجیع میں پڑاؤ ڈال دیا تاکہ بنی غطفان اہلِ خیبر کی مدد کو نہ پہنچ سکیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہُوا۔ جب وُہ مسلمانوں کی آمد کی سُن گن پا کر خیبر کے ارادہ سے نکلے تو مسلمانوں کو اپنے راستہ میں حائل دیکھ کر رُک گئے اور اپنے گاؤں کی تباہی کے پیش نظر اپنے گھروں میں واپس چلے آئے۔ بنی غطفان کے پلٹ جانے کے بعد مسلمان خیبر کے محاصرہ کے لئے آگے بڑھے۔ یہودیوں نے عورتوں اور بچّوں کو قلعہ کتیبہ میں محفوظ کر دیا اور خود دُوسرے قلعوں میں قلعہ بند ہو کر مسلمانوں پر تیر برسانے شروع کئے مُسلمانوں نے مختصر جھڑپوں کے بعد چند ایک گڑھیاں فتح کر لیں مگر جس قلعہ پر فتح کا دارومدار تھا وُہ ابن ابی الحقیق کا قلعہ تھا جو ایک ڈھلوان پہاڑی پر واقع تھا یہ پہاڑی قموص کہلاتی تھی جس سے یہ قلعہ بھی قموص کے نام سے مشہور ہو گیا اور یہی قلعہ تاریخ و حدیث میں قلعہ خیبر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے سامنے ایک گہری خندق

کھدی ہوئی تھی اور اپنی مضبوطی واستحکام کی وجہ سے ناقابل تسخیر تھا۔

غزوات میں سپہ سالاری کے فرائض عام طور پر پیغمبر اکرمؐ خود انجام دیتے تھے اور علمبرداری کا منصب امیر المومنینؑ کے سپرد کیا جاتا تھا۔ مگر پیغمبر اکرمؐ چند دنوں سے دردِ شقیقہ میں مبتلا تھے اور حضرت علیؑ آشوبِ چشم کی وجہ سے لشکر کے ساتھ نہ آسکے تھے اس سے کچھ لوگوں کو اپنی دھاک بٹھانے کا موقعہ مل گیا تھا اور انہوں نے خود سے علم لے کر قلعہ قموص کو فتح کرنے کی ٹھان لی۔ چنانچہ حضرت عمر نے علم ہاتھوں میں لیا اور ایک دستۂ فوج کے ساتھ قلعہ پر حملہ آور ہونے کے لئے بڑھے انھوں نے ہاتھ پیر مارے مگر ان کی کوشش کامیاب نہ ہوسکی اور ہزیمت اُٹھا کر واپس پلٹ آئے۔ پھر حضرت ابوبکر علم لے کر نکلے مگر ان کے بنائے بھی کچھ بن نہ پڑی اور ناکام واپس آگئے۔ پھر حضرت عمر نے دوبارہ علم لیا مگر اس مرتبہ بھی ناکام پلٹے اور اپنی ناکامی کی خفت مٹانے کے لئے فوج کو اس ہزیمت کا ذمہ دار ٹھہرایا لیکن فوج نے ان کی قیادت کو وجہ شکست قرار دیا۔ علامہ طبری تحریر کرتے ہیں:۔

نهض من نهض معه من الناس فلقوا اهل خيبر فانكشف عمر واصحابه فرجعوا الى رسول الله صلى الله عليه وسلم يجبنه اصحابه ويجبنهم (تاریخ طبری۔ ج۳۔ ص۱۳)	حضرت عمر کچھ لوگوں کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے اور خیبر والوں سے مڈبھیڑ ہوتے ہی حضرت عمر اور ان کے ساتھی بھاگ کھڑے ہوئے اور رسول اللہؐ کے پاس واپس چلے آئے اس موقع پر فوج والے کہتے تھے کہ عمر نے بزدلی دکھائی اور عمر کہتے تھے کہ فوج بزدل نکلی"۔

پیغمبر اکرم کے دردِ سر میں کچھ کمی ہوئی تو خیمہ سے باہر تشریف لائے اور اس شکست و ہزیمت سے فوج میں بددلی پھیلی ہوئی دیکھی تو فتح کی نوید دیتے ہوئے فرمایا:۔

اما والله لاعطين الراية غدا رجلا كرارا غير فرار يحب الله و رسوله ويحبه الله و رسوله يفتح الله على يديه (تاریخ خمیس۔ ج۲۔ ص۵۳)	خدا کی قسم میں کل اُس مرد کو علم دوں گا جو پیہم حملہ کرنے والا ہوگا اور راہ فرار اختیار کرنے والا نہ ہوگا۔ وہ خدا اور رسولؐ کو دوست رکھتا ہے اور خدا و رسول اُسے دوست رکھتے ہیں اور اسی کے دونوں ہاتھوں پر اللہ فتح دے گا"۔

آنحضرت نے سردارِ لشکر کے اس الزام کے باوجود کہ فوج نے کم ہمتی و بزدلی دکھائی۔ فوج میں کوئی ردّ و بدل نہیں کیا بلکہ سردارِ لشکر کی تبدیلی کا اعلان فرمایا اس لئے کہ فوج کا ثبات سردار کے ثباتِ قدم پر منحصر ہوتا ہے۔ جب اُس کے قدم اکھڑ جائیں تو پھر فوج کے قدم جما نہیں کرتے۔ اور حدیث کے الفاظ کرار غیر فرار سے بھی صاف ظاہر ہے کہ علمبردارِ فوج کے قدم اُکھڑے تھے ورنہ ضرورت ہی کیا تھی کہ جسے اب علم دینے والے ہیں اس کے خصوصی صفات میں اس صفتِ عدمِ فرار کا بھی تذکرہ کرتے۔ بہرحال یہ اعلانِ نبوی ایک روشن آئینہ ہے جس میں تصریح بھی ہے

اور تلمیح بھی۔ مدح بھی ہے اور طنز بھی۔ اس میں فاتح خیبر کے خدوخال بھی نظر آتے ہیں اور پلٹ کر آنے والوں کے چہرے مہرے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ عبارت کی گونج میں نوید فتح بھی ہے اور الفاظ کے پردہ میں اسباب شکست پر تبصرہ بھی۔ اس میں شروع میں حرف تنبیہ اور قسم اور قسم کے بعد لاعطینّ کے شروع میں لام اور آخر میں نون مشدّد تاکید بالائے تاکید کے لئے ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ کل ضرور بالضرور ایسا ہوگا۔ یہ حتم و جزم اور علم و یقین وحی ہی کے نتیجہ میں ہو سکتا ہے کیونکہ اگر یہ اعلان از خود ہوتا تو پیغمبرؐ اس طرح اطمینان و یقین کے ساتھ عطائے علم کو کل سے وابستہ نہ کرتے اور نہ اس طرح یقینی کامیابی و فتحمندی کا اعلان کرتے جبکہ انہیں حکم خدا یہ ہے کہ اگر وہ کسی امر کو کل سے وابستہ کریں تو حتمی طور پر یہ نہ کہا کریں کہ میں کل ایسا کروں گا۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:۔

ولاتقولن لشیٔ انی فاعل ذٰلك غدا الاان یشاء اللّٰه۔ "کسی چیز کی نسبت یہ نہ کہا کرو کہ میں کل ایسا کروں گا مگر یہ کہ اللہ چاہے تو"۔

مگر یہاں مشیت باری کے استثناء کے بغیر پورے حتم و وثوق سے فرماتے ہیں کہ میں کل ضرور بالضرور ایسا کروں گا۔ یہ اندازِ تکلم اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ عطائے علم میں قدرت کا اشارہ کارفرما تھا اور پیغمبرؐ کی زبان صرف منشائے الٰہی کی ترجمانی کر رہی تھی۔ اب نہ تردّد و تذبذب کی گنجائش تھی اور نہ ارادۂ مشیئت کے بعد استثنائے مشیئت کا محل۔

حدیث کے الفاظ اگرچہ مختصر ہیں مگر ایک ایک لفظ منقبت و فضیلت کا دفتر بے پایاں اور حامل رائیت کی افضلیت و اولویت اور اس کی انفرادیت پر شاہد ناطق ہے۔

پہلی صفت یہ ہے کہ وہ مرد ہوگا۔ یہ قید اگر توضیحی ہے تو مطلب یہ ہے کہ وہ ہمت و مردانگی کے جوہر سے آراستہ ہوگا اور تیغ و سنان کے سایہ میں مردانہ وار لڑے گا۔ اور اگر احترازی ہے تو یہ دوسروں کی شجاعت و مردانگی پر ایک طنز ہوگا کہ مرد ہونا اور ہے، اور مرد صورت ہونا اور ہے۔ مرد وہ ہے جو میدانِ جنگ میں اُترنے کے بعد پیچھے ہٹنا عار سمجھے اور دشمن کے مقابلہ میں نہ اُس کا دل دہلے اور نہ قدم لرزے۔ اور مرد صورت وہ ہے جو جنگ چھڑنے سے پہلے بڑے بلند بانگ دعوے کرے اور جب دشمن کا سامنا ہو تو جان بچا کر بھاگ نکلے۔

دوسری صفت یہ ہے کہ وہ کرّار غیر فرار ہوگا۔ کرّار کے بعد غیر فرار کہنے کی بظاہر ضرورت نہ تھی اس لئے کہ کرّار کے معنی پیہم حملہ آور کے ہیں۔ اور جو پیہم حملہ کرنے والا ہوگا وہ میدان چھوڑ کر جا نہیں سکتا۔ مگر یہ کہنے کی ضرورت اس لئے محسوس فرمائی کہ علم کی آس لگانے والے خود اپنا جائزہ لے لیں کہ ان کے قدم میدانِ جنگ میں ڈگمگائے تو نہیں۔ اگر قدم اُکھڑ چکے ہیں تو وہ اپنے دلوں کو علم کی آرزو سے خالی رکھیں اور آگے بڑھنے کی کوشش نہ کریں۔

تیسری صفت یہ ہے کہ "وہ خدا و رسولؐ کو دوست رکھتا ہے"۔ یہ محبت و دوستی ہی کا کرشمہ ہے کہ انسان اللہ کی راہ میں ہر مصیبت خوشی خوشی جھیل لیتا ہے اور جتنا یہ جذبۂ محبت زیادہ ہوتا ہے اتنا ہی جوشِ عمل زیادہ ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص محبت کی اعلےٰ ترین منزل پر فائز ہو جاتا ہے تو پھر اللہ کی ادنیٰ خوشنودی اور اُس کے دین کی سربلندی

کی خاطر باطل قوتوں سے ٹکرانا، خطروں میں پھاند پڑنا یا جان دے دینا اس کے نزدیک کوی بات ہی نہیں ہوتا۔ اور اگر دل اس جذبۂ عشق و شیفتگی سے خالی ہو تو نہ قدموں میں ثبات آتا ہے اور نہ میدانِ جنگ کی کڑیاں جھیلنے کی قوت پیدا ہوتی ہے۔

چوتھی صفت یہ ہے کہ خدا اور رسولؐ بھی اس کو دوست رکھتے ہیں۔ یہ نتیجہ ہے اُس دوستی کا جو بندے کو خدا اور رسولؐ سے ہوتی ہے اس لئے کہ جب اس کے اعمال اللہ کی دوستی و رضا طلبی کی خاطر ہیں تو پھر اللہ کی خوشنودی اور دوستی سے سرفرازی بھی یقینی ہے۔ اور پھر اس موقع کے اعتبار سے دیکھا جائے تو شجاعت وُہ صفت ہے جسے اللہ خصوصی طور پر دوست رکھتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ اللہ شجاعت کو دوست رکھتا ہے اگرچہ وُہ سانپ کے مارنے ہی سے کیوں نہ ظاہر ہو۔ جب یہ معمولی مظاہرۂ شجاعت اللہ کی دوستی کا باعث ہو سکتا ہے تو وُہ شجاعت جس کا اظہار دشمنانِ خدا اور رسولؐ کے مقابلہ میں ہو اُسے اللہ کیونکر دوست نہ رکھے گا۔ اور قرآن بھی گواہی دیتا ہے کہ دُشمنانِ دین کے مقابلہ میں جرأت و ہمت اور ثباتِ قدم بندے کو اللہ کا محبوب بنا دیتا ہے۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:۔

ان اللہ یحب الذین یقاتلون	اللہ اُن لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو اس کی راہ میں
فی سبیل اللہ صفا کانھم	پرا باندھ کر لڑتے ہیں گویا وُہ سیسہ پلائی ہوی دیوار
بنیان مرصوص۔	ہیں"۔

پانچویں صفت یہ ہے کہ خدا اس کے ہاتھوں پر قلعہ فتح کرے گا"۔ جب ثبات قدم ہو تو اللہ کی تائید بھی شامل حال ہوتی ہے اور تائید الٰہی کے نتیجہ میں فتح و کامرانی بھی ضروری ہے۔ یہ فتح اتنی یقینی تھی کہ حدیبیہ سے پلٹتے ہُوے پیغمبر اسلامؐ کو اس کی بشارت ان لفظوں میں دی جا چکی تھی: واثابھم فتحا قریبا۔ انہیں جلد ہی فتح دی جائے گی"۔ اسی لئے پیغمبرؐ کے الفاظ یفتح اللہ علی یدیہ۔ خدا اس کے ہاتھوں پر فتح دے گا"۔ فتح و ظفر کو صدائے بازگشت کی طرح لے کر پلٹیں گے۔ اور پیہم ہزیمتوں کے بعد فتح کا پرچم فضائے خیبر پر لہرائے گا۔ اللہ نے فتح کی خوشخبری دی اور پیغمبرؐ نے عَلم لینے والے کے ہاتھوں پر خیبر کشائی کی پیشینگوئی کی۔ اب جس کے ہاتھوں پر فتح ہو گی وُہ تنہا اس کی فتح نہ ہو گی بلکہ اسلام کی بھی فتح ہو گی اور پیغمبر اسلامؐ کی بھی کیونکہ اس فتح کے نتیجہ میں قرآنی آیت اور پیغمبرؐ کی پیشینگوئی کی صداقت ظہور میں آئی۔

پیغمبر اکرمؐ کے اس اعلان کے بعد ہر زبان پر اس کی گونج سُنائی دینے لگی اور اسی کے تذکرے اور چرچے ہونے لگے۔ ہر ایک کو یہ انتظار کہ دیکھئے کل عَلم کس کو ملتا ہے۔ صحابہ میں کوی نمایاں شخصیت ایسی نہ تھی جسے یہ توقع نہ رہی ہو کہ کل عَلم اسی کو ملے گا بلکہ وُہ افراد بھی کم اُمیدوار نہ تھے جو عَلم لے کر قسمت آزمائی کر چکے تھے۔ ابن اثیر نے لکھا ہے:۔

رجا کل واحد منھم ان یکون	قریش میں سے ہر ایک یہ اُمید رکھتا تھا کہ وُہی

صاحب ذٰلك۔ (تاریخ کامل ج۲ ص۱۴۹) علمدار ہوگا"۔

اگر انہوں نے الفاظِ حدیث پر غور کیا ہوتا اور اپنے ماضی کو پیشِ نظر رکھا ہوتا تو ایک ایک لفظ شمعِ اُمید کی بھڑکتی ہوئی لَو کو بجھا دینے کے لئے کافی تھی۔ مگر تفوّق پسند انسانوں کی طبیعت کا خاصہ ہے کہ وُہ امتیاز طلبی کے موقع پر پیچھے رہنا گوارا نہیں کیا کرتے خواہ کامیابی کی اُمید کتنی ہی موہوم کیوں نہ ہو۔ حضرت علیؑ کی طرف سے تو انہیں اطمینان تھا کہ وُہ میدان میں نہیں جا سکتے کیونکہ آشوبِ چشم کی وجہ سے وُہ قدم رکھنے کی جگہ بھی نہیں دیکھ سکتے چنانچہ وُہ ایک دُوسرے کو یہ کہہ کر اُمید دلاتے کہ علیؑ کی طرف سے مطمئن رہو اُن کی آنکھیں دُکھ رہی ہیں وُہ تو عَلَم لے کر میدان میں جانے سے رہے۔ اب ہم ہی میں سے کسی ایک کو عَلَم دیا جائے گا۔ ادھر یہ قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں اُدھر حضرت علیؑ سے پیغمبرؐ کے اس اعلان کا ذکر کیا گیا تو اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے:۔ اللّٰھم لا مانع لما اعطیت ولا معطی لما منعت "بار الٰہا جسے تو عطا کرے اُسے کوئی محروم نہیں کر سکتا اور جسے تو محروم رکھنا چاہے اُسے کوئی عطا نہیں کر سکتا"۔

کل کے انتظار میں صحابہ نے رات کروٹیں لے لے کر گزاری۔ صبح ہوئی تو پیغمبرؐ کے خیمہ کے سامنے جمع ہوئے اور درِ خیمہ پر نظریں جما کر بیٹھ گئے۔ محمد ابن اسمٰعیل بخاری رقمطراز ہیں:۔

فغدوا علٰی رسول اللّٰہ کلھم یرجون ان یعطاھا۔ (صحیح بخاری ج۱ ص۵۲۵)

وُہ صبح ہی صبح رسولؐ اللہ کے پاس جمع ہو گئے اور ہر ایک یہ اُمید لگائے ہُوئے تھا کہ عَلَم اُسی کو ملے گا"۔

پیغمبر اکرمؐ نمازِ صبح سے فارغ ہو کر ہاتھوں پر سفید پرچم لئے ہُوئے خیمہ سے باہر تشریف لائے۔ پرچم پر نظر پڑتے ہی لوگوں میں ہلچل مچی۔ کچھ لوگ صفوں کو چیرتے ہُوئے آگے بڑھے کسی نے گردن بلند کی اور کوئی گھٹنوں کے بل اُونچا ہُوا تاکہ پیغمبرؐ کی نظر اُن پر پڑ سکے۔ یوں تو ہر ایک عَلَم لینے کے لئے بے چین اور فتح کا سہرا اپنے سر باندھنے کے لئے بے قرار تھا مگر کچھ لوگوں کی بے چینی اس حد تک بڑھی کہ تاریخ میں اُن کے نام آئے بغیر نہ رہ سکے چنانچہ ان میں سے ایک حضرت عمر ہیں جو خود کہتے ہیں:۔

فما احببت الامارۃ قبل یومئذ فتطاولت لھا واستشرفت رجاء ان یدفعھا الیّ۔ (طبقات ابن سعد ج۲ ص۸۰)

مجھے اس دن سے پہلے کبھی سرداری کی خواہش نہیں ہُوئی مگر اُس دن میں اُونچا ہو کر اور گردن لمبی کر کے اُمید کر رہا تھا کہ عَلَم مجھے دیں گے"۔

بریدہ اسلمی جو غزوۂ خیبر میں موجود تھے اس سلسلہ میں انہوں نے حضرت عمر اور حضرت ابوبکر دونوں کے نام لئے ہیں۔ چنانچہ وُہ کہتے ہیں:۔

فلمّا کان من الغد تطاول لھا

جب دوسرا دن ہُوا تو ابوبکر اور عمر دونوں نے

ابوبکر و عمر۔ (تاریخ طبری۔ ج۔ ص۳) علم کے لئے گردنیں بلند کیں"۔

سعد ابن ابی وقاص بیان کرتے ہیں:۔

جئت فبرکت بحذاء النبیؐ وقمت ووقفت بین یدیہ (تاریخ خمیس ج ۲ ص ۵۱) میں پیغمبرؐ کے بالمقابل پلتھی مار کر بیٹھ گیا۔ پھر اُٹھا اور آپ کے سامنے کھڑا ہو گیا"۔

پیغمبر اکرمؐ سے کسی کے شجاعانہ کارنامے ڈھکے چھپے ہوئے نہ تھے کہ کسی کے گردن بلند کرنے یا گھٹنوں کے بل اُونچا ہونے سے متاثر ہوتے یا کسی کو عمداً نظر انداز کر دیتے یا نظروں سے اُوجھل ہونے کی وجہ سے بھول جاتے۔ آپ نے مجمع پر ایک نظر ڈالی اور فرمایا کہ علیؑ کہاں ہیں۔ کسی کو یہ سان گمان بھی نہ تھا کہ علیؑ کا نام لیا جائے گا۔ ہر طرف سے شور اُٹھا کہ اُن کی آنکھیں دُکھ رہی ہیں۔ فرمایا کہ کسی کو بھیجو اور انہیں بلاؤ۔ چنانچہ سلمہ ابن اکوع گئے اور انہیں لے کر آئے۔ آنحضرتؐ نے اُن کا سر اپنے زانو پر رکھ کر آنکھوں میں لعاب دہن لگایا اور فرمایا:۔ اللھم اذھب عنہ الحر والبرد وانصرہ علی عدوہ۔ یا الٰہا انہیں گرمی اور سردی کے اثرات سے محفوظ رکھ[1] اور دُشمن کے مقابلہ میں ان کی نصرت و امداد فرما"۔ لعاب دہن رسولؐ نے اکسیر شفا کا کام کیا اسی وقت آشوب چشم جاتا رہا اور سوزش و تکلیف ختم ہو گئی۔ اس موقع پر حسان ابن ثابت نے اظہار عقیدت کے طور پر یہ اشعار پڑھے:۔

وکان علیؑ ارمد العین یبتغی	دواء فلما لم یحس مداویا
رمد آلودہ آنکھیں تھیں علیؑ کی جنگ خیبر میں	دوائے چشم مضمر تھی پیمبر کے لب تر میں
شفاہ رسولؐ اللہ منہ بتفلۃ	فبورک مرقیا وبورک راقیا
بنا آب دہن اکسیر آنکھوں میں جلا آئی	مبارک تھی شفایابی مبارک تھی مسیحائی

[1] اس دُعائے پیغمبرؐ کے چند معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اگر گرمی ہو تو اُن پر گرمی کا اثر نہ ہو اور سردی ہو تو سردی کا اثر نہ ہو اس معنی کی تائید حضرت علیؑ کے اس قول سے ہوتی ہے کہ فما وجدت حرا ولا بردا منذ یومئذ۔ "اس دن کے بعد نہ مجھے گرمی کا احساس ہُوا اور نہ سردی کا"۔ دُوسرے یہ کہ سردی و گرمی کا جتنا احساس دُوسروں کو ہوتا ہے اتنا احساس انہیں نہ ہو نہ یہ کہ گرمی و سردی کا احساس کلیتہً جاتا رہے۔ اس معنی کی تائید ہارون ابن عنترہ کی روایت سے ہوتی ہے۔ وُہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرتؑ کو قصر خورنق میں دیکھا آپ ایک ہلکا کمبل اوڑھے ہُوئے سردی سے کانپ رہے تھے مَیں نے عرض کیا کہ بیت المال میں آپ کا بھی حق ہے آپ اس سے فائدہ کیوں نہیں اُٹھاتے۔ فرمایا میں یہ کمبل مدینہ سے لے کر آیا تھا اس کے ہوتے ہُوئے مجھے بیت المال سے لینے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ تیسرے یہ کہ آنحضرتؐ نے یہ دُعا آشوب چشم کے موقع پر فرمائی اور آشوب چشم عموماً شدید گرمی کے اثر سے ہوتا ہے لہٰذا بعید نہیں کہ یہ مقصد ہو کہ علیؑ گرمی و سردی کے اثرات بد سے محفوظ رہیں چنانچہ اس دُعا کے بعد کبھی آپ کی آنکھیں دُکھنے میں نہیں آئیں اور گرمی و سردی کا احساس نہ ہونے میں کوئی خاص خوبی کا پہلو بھی تو نہیں ہے بلکہ خوبی تو یہ ہے کہ احساس کے ہوتے ہُوئے اس سے چنداں متاثر و متاذی نہ ہُوا جائے۔ اور اس مفہوم کو سامنے رکھ کر پہلی اور دوسری روایت میں جمع آوری کی بھی صورت نکل سکتی ہے۔ ۱۲

وقال ساعطی الرایۃ الیوم صارما | کمیا محبا للرسول موالیا
کہا اس کو علم دُوں گا جو شمشیر دو پیکر ہے | دلیر و صف شکن جانباز و شیدائے پیمبر ہے
یحب الٰھی والا لہ یحبہ | بہ یفتح اللہ الحصون الاوابیا
وُہ سرمست ولائے داور و محبوب داور ہے | وُہی قلعہ کشاؤ فاتح درہائے خیبر ہے
فاصفی بھادون البریۃ کلھا | علیا وسماہ الوزیر المواخیا
زمانہ بھر میں اُس کو ہی نبی نے یہ شرف بخشا | کہ اپنی جانشینی اور اُخوت کا دیا تمغا

جب حضرتؑ کی آنکھیں روشن ہوگئیں تو پیغمبرؐ نے اپنے ہاتھ سے زرہ پہنائی تلوار کمر میں لگائی اور علم دے کر خیبر فتح کرنے کا حکم دیا۔ حضرتؑ علم لے کر اُٹھ کھڑے ہوُے اور جاتے ہوُے رخ موڑ کر پیغمبر اکرمؐ سے پُوچھا کہ کب تک لڑوں؟ فرمایا جب تک وُہ اسلام قبول نہ کرلیں۔ اگر تمہارے ذریعہ ایک شخص بھی راہ حق پر آگیا تو وُہ تمہارے لئے سُرخ بالوں والے اُونٹوں سے بہتر ہوگا۔ حضرت دوڑتے ہوے میدان کی طرف بڑھے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ ذرا ٹھہریئے ہم بھی ساتھ ہولیں مگر حضرتؑ نے جوشِ شجاعت میں توقّف نہ کیا اور قلعہ قموص کے قریب پہنچ کر رُکے اور عَلم سنگلاخ زمین میں گاڑ دیا۔ ایک یہودی نے قلعہ کے اُوپر سے یہ منظر دیکھا تو متحیّر ہوکر پُوچھا کہ آپ کون ہیں؟ کہا مَیں علی ابن ابی طالب ہوں۔ اس یہودی نے حضرتؑ کے تیور دیکھے تو کہا غلبتم یا معشر یھود۔ اے گروہِ یہود اب تمہاری شکست یقینی ہے"۔ یہودیوں کو قلعہ قموص کی مضبوطی پر بڑا ناز تھا اور پہلے پرچم برداروں کی ناکامی سے ان کے حوصلے بڑھے ہوُے تھے۔ مگر اپنی ہی جماعت کے ایک آدمی سے یہ حوصلہ شکن الفاظ سُنے تو ان میں کھلبلی مچ گئی اور دلوں پر رُعب چھا گیا۔ اب لشکرِ اسلام میں سے کچھ لوگ بھی حضرتؑ کے پاس پہنچ گئے اور قلعہ کے سامنے پرا جما کر کھڑے ہوگئے۔ سردارِ قلعہ مرحب کا بھائی حارث جو اس سے پہلے بھی میدان میں نکل چکا تھا ایک دستۂ فوج کے ساتھ قلعہ سے باہر آیا اور ایک دم حملہ کرکے دو مسلمانوں کو شہید کردیا۔ حضرتؑ نے بڑھ کر اس پر حملہ کیا اور اُسے مَوت کے گھاٹ اُتار دیا۔ مرحب نے جب دیکھا کہ اُس کا بھائی مارا جاچکا ہے تو اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اُس نے زرہ پر زرہ پہنی، سر پر پتھر کا ترشا ہُوا خود رکھا اور دو تلواریں اور تین بھال کا نیزہ لے کر قلعہ سے باہر آیا اور یہ رجز پڑھتے ہوُے مبارز طلب ہُوا:۔

قد علمت خیبر انی مرحب ! | شاکی السلاح بطل مجرب

اہلِ خیبر جانتے ہیں کہ مَیں مرحب ہوں جو ہتھیار بند بہادر اور آزمودہ کار ہے"۔

مرحب بڑا تنومند اور شہزور تھا اس کے للکارنے پر کسی کو جرأت نہ ہُوی کہ اُس کے مقابلہ کے لئے نکلے۔ دیار بکری نے لکھا ہے:۔

لم یقدر احد فی الاسلام ان یقاومہ فی الحرب۔ (تاریخ خمیس۔ ج۲۔ ص۵)۔ | مُسلمانوں میں سے کسی کے بس کی بات نہ تھی کہ جنگ میں اُس کا مدِّ مقابل ہوتا"۔

جناب امیر نے اُس کا رجز سُنا تو یہ رجز پڑھتے ہُوئے اُس کے مقابلہ کے لئے نکلے:۔

انا الذی سمتنی امی حیدرہ　　ضرغام آجام ولیث قسورہ

مَیں وُہ ہوں کہ میری ماں نے میرا نام حیدر رکھا ہے میں شیر نر اور اسد بیشۂ شجاعت ہوں"۔

عبل الذراعین غلیظ القصرہ　　کلیث غابات کریھہ المنظرہ

جس کی کلائیاں مضبوط اور گردن موٹی ہے جیسے جنگل کا وہ شیر جو دیکھنے میں ڈراؤنا ہو"۔

اضربکم ضربا یبین الفقرہ　　واترك القرن بقاع جزرہ

میں تم پر ایسا وار کروں گا جو جوڑ بند کو توڑ دے اور حریف کو درندوں کا لقمہ بننے کے لئے چھوڑ دے"۔

اضرب بالسیف وجوہ الکفرہ　　ضرب غلام ماجد حزورہ

میں ایک باعزّت اور طاقتور جوان کی طرح کفّار کی صفوں پر تلوار چلاؤں گا"۔

اکیلکم بالسیف کیل السندرہ

اور تمہیں تلوار سے وسیع پیمانے پر قتل کروں گا"۔

مرحب نے آگے بڑھ کر حضرتؑ پر تلوار کا وار کرنا چاہا مگر آپ نے اسے موقع نہ دیا اور پھر تاک کر تلوار اس کے سر پر ماری یہاں تک کہ تلوار خود کو کاٹتی اور سر کی ہڈی کو توڑتی ہوی جبڑوں تک اُتر آئی۔ مرحب زمین پر گرا اور گرتے ہی دم توڑ دیا۔ مرحب کے مارے جانے سے یہودیوں میں بد دلی پیدا ہو گئی۔ اور جب مرحب کے علاوہ چند اور نامور شجاع بھی حضرتؑ کے ہاتھ سے مارے گئے تو ان میں بھاگڑ پڑ گئی اور سب کے سب قلعہ کی جانب بھاگ کھڑے ہُوئے۔ حضرتؑ لڑتے ہُوئے آگے بڑھ رہے تھے کہ ایک یہودی نے آپ کے ہاتھ پر ضرب لگائی جس سے سپر چھُوٹ کر گر پڑی۔ آپ نے اعجازی قوّت و طاقت سے ایک دروازہ اٹھا کر اُسے سپر بنا لیا۔ یہ دروازہ اِتنا وزنی تھا کہ بعد میں آٹھ آدمیوں نے مل کر اُسے اٹھانا چاہا مگر اُن کی کوشش ناکام رہی۔ چنانچہ ابو رافع کہتے ہیں:۔

فلقد رأیتنی فی نفر سبعة معی　　میرے ہمراہ سات آدمی تھے اور مَیں
انا ثامنھم نجھد علی ان نقلب　　آٹھواں تھا۔ ہم سب نے پُوری
ذلك الباب فما نقلبه۔ (سیرۃ　　کوشش کی کہ اس دروازہ کو پلٹیں مگر
ابن ہشام۔ ج۳۔ ص۳۵۰)　　ہم اُسے پلٹ نہ سکے"۔

حضرت عمر کو بھی اس پر بڑی حیرت تھی۔ چنانچہ اُنہوں نے حضرت علیؑ سے کہا کہ آپ نے اپنے ہاتھوں پر بہت بڑا بوجھ اُٹھایا۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ:۔

ما کان الا مثل جنتی التی فی یدی　　وُہ مجھے اپنی سپر سے زیادہ وزنی معلوم
(مناقب۔ ج۱۔ ص۴۴۴)　　نہیں ہُوا"۔

یہودی حضرتؑ کے اس غیر معمولی مظاہرۂ قوت سے متاثر ہو کر قلعہ کے اندر داخل ہو گئے۔ حضرتؑ نے

آگے بڑھ کر قلعہ کے آہنی در کو جھٹکا دیا اور اُس کے دونوں پٹ اُکھڑ کر آپ کے ہاتھوں میں آگئے اور فتح نے جھُوم کر آپ کے دونوں قدم چُوم لئے۔ یہ حیرت انگیز قوت قوتِ رُوحانیہ ہی کا کرشمہ ہوسکتی ہے ورنہ عام انسانی قوت و طاقت اس کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ حضرتؑ خود فرماتے ہیں:۔

ما قلعت باب خیبر بقوت جسمانیہ ولکن بقوۃ الٰھیۃ۔ (تاریخ خمیس ج۲ ص۵۱)

میں نے خیبر کا دروازہ اپنی جسمانی قوت سے نہیں اُکھاڑا بلکہ ربّانی قوت سے اُکھاڑا ہے۔"

اسلامی خدمات کے سلسلہ میں اگر کوئی اہم خدمت انجام دیتا ہے تو اُس سے انکار کرنا یا اسے دُوسرے کی طرف منسُوب کر دینا اخلاقی نقطۂ نظر سے انتہائی سنگین جُرم ہے مگر اقتدار کے زیر اثر یہ سب کچھ ہوتا رہا ہے۔ اور واقعات میں تحریف و تبدّل سے کام لیا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ خیبر کے سلسلہ میں بھی یہ ناکام کوشش کی گئی ہے اور جابر ابن عبداللہ انصاری کے نام سے جو خیبر میں موجود نہ تھے۔ یہ روایت گڑھی گئی ہے کہ مرحب، محمد ابن مسلمہ انصاری کے ہاتھ سے مارا گیا حالانکہ قریب قریب تمام مستند تاریخیں اس امر کی شاہد ہیں کہ مرحب حضرت علیؑ کے ہاتھ سے قتل ہُوا۔ محمّد ابن مسلمہ کا نام اس سے پہلے شجاعانہ کارناموں کے سلسلہ میں آیا ہو یا نہ آیا ہو مگر ان لوگوں کے زمرہ میں ضرور آتا ہے جنہوں نے حضرت علیؑ کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے انکار کر دیا تھا اور علانیہ مخالفین میں شمار ہوتے تھے۔ غالباً اسی انکارِ بیعت اور انحراف کے صلہ میں انہیں قاتلِ مرحب ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے۔ اگر محمّد ابنِ مسلمہ نے مرحب کو قتل کیا تھا تو پھر فاتح خیبر بھی اُسی کو تسلیم کرنا ہوگا اس لئے کہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قلعۂ قموص قتلِ مرحب کے نتیجہ میں فتح ہوا لہٰذا جو قاتلِ مرحب ہوگا وہی فاتح خیبر قرار پائے گا اور در صورتیکہ محمد ابنِ مسلمہ کو فاتح خیبر تسلیم کر لیا جائے تو حدیثِ پیغمبرؐ یفتح اللہ علیٰ یدیہ "خدا اس کے ہاتھوں پر فتح دے گا" کی حیثیت کیا باقی رہ جاتی ہے۔ جبکہ بالاتفاق یہ ارشاد حضرت علیؑ کے بارے میں ہے۔ کیا اس سے تکذیبِ رسُولؐ لازم نہ آئے گی کہ پیغمبرؐ جس کے ہاتھ پر فتح کی نوید دیں وُہ تو فاتح نہ بنے اور اُس کے بجائے دُوسرا فاتح ہو جائے۔

قبائلِ یہود باوجودیکہ پیغمبر اکرمؐ سے پُرامن رہنے کا معاہدہ کر چکے تھے مگر جب بھی انہیں موقع ملتا تخریبی کاروائیوں سے باز نہ آتے یہاں تک کہ انہیں مدینہ سے جلاوطن کرنے کی نوبت آئی۔ مدینہ سے نکلنے کے بعد بھی ان کی سرگرمیوں میں کمی نہ آئی اور اسلام کی بربادی پر تلے رہے۔ اب اس کے سوا چارہ کیا تھا کہ ان دشمنانِ دین کو قرار واقعی سزا دے کر اُن کی جارحانہ حرکتوں اور امن سوز سازشوں کو ہمیشہ کے لئے کچل دیا جائے تاکہ آئندہ قیامِ امن اور نشرِ اسلام میں سدِّ راہ نہ ہوں۔ چنانچہ اسی مقصد کے لئے یہ اقدام عمل میں آیا اور اس کے نتیجہ میں ۱۵ مسلمان شہید ہُوئے اور ۹۳ یہودی مارے گئے اور کچھ عورتیں اسیر ہوئیں جن میں حیی ابن اخطب کی بیٹی صفیہ بھی تھیں جو آزاد ہونے کے بعد رسُولِ خداؐ کے حرم میں داخل ہوئیں اور باقی یہودیوں کو اس شرط پر رہا کر دیا گیا کہ وُہ خیبر کی زمینوں پر کاشتکار کی حیثیت سے کام کریں گے اور پیداوار کا نصف حصّہ خود لیں گے اور نصف حصّہ مسلمانوں کو دیا کریں گے۔

خیبر کا علاقہ بڑا سرسبز و شاداب تھا اور اہل حجاز کی غذائی ضروریات کا بیشتر حصہ یہیں سے فراہم ہوتا تھا۔ جب یہ علاقہ مفتوح ہو کر مسلمانوں کے قبضہ میں آیا تو اُن کے لئے معاشی وسعت کی راہیں کھُل گئیں اور وُہ مہاجرین جو مکہ سے نکلنے کے بعد فقر و افلاس سے دوچار تھے نہ صرف معاشی اعتبار سے آسودہ ہو گئے بلکہ زمینوں اور جاگیروں کے مالک بن گئے۔ عبداللہ ابن عمر کہتے ہیں:۔

ماشبعنا حتی فتحنا خیبر۔ (صحیح بخاری۔ ج۲۔ ص۶۰۹) — "فتح خیبر کے بعد ہمیں شکم سیر ہو کر کھانے کو ملا۔"

ام المومنین حضرت عائشہ کہتی ہیں:۔

لما فتحت خیبر قلنا الآن نشبع من التمر۔ (صحیح بخاری۔ ج۲۔ ص۶۰۹)۔ — "جب خیبر فتح ہُوا تو ہم نے کہا کہ اب ہم شکم سیر ہو کر کھجوریں کھا سکیں گے۔"

بلاذری نے فتوح البلدان میں لکھا ہے کہ خیبر کی پیداوار میں سے ازواج رسُول ص میں سے ہر زوجہ کو اسّی[1] وسق خرما اور بیس[2] وسق جو سالانہ ملتا تھا۔

اس غزوہ میں اگرچہ پیغمبر ص کے ہمراہ سواروں اور پیادوں کا جم غفیر تھا مگر جس کے زورِ بازو سے یہ مہم سر ہُوئی وُہ فاتح خیبر علی ابن ابی طالبؑ تھے۔ اگرچہ اور لوگ بھی علم لے کر فتح کے ارادہ سے نکلے تھے مگر انہیں شکست و ہزیمت ہی سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ اور ان پے در پے ہزیمتوں کے بعد پیغمبر اکرم ص کا اعلان، اور حامل علم کے خصوصی اوصاف کا بیان، اور آشوب چشم کا غیر متعارف طریق سے علاج یہ بتاتا ہے کہ یہ شرف علیؑ کے لئے اٹھا رکھا گیا تھا جنہوں نے اپنی خداداد قوّت و طاقت سے خیبریوں کو شکست فاش دے کر اسلام کی سربلندی کا سامان کیا اور یہودی سرمایہ داروں کو ایک باج گزار کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا اور جو لوگ وفاداری کے پیمان باندھنے کے بعد بدعہدی کرتے اور مخالف طاقتوں سے ساز باز کر کے تخریبی کاروائیوں پر اتر آتے ہیں آخر کار اُن کا انجام یہی ہُوا کرتا ہے۔

اراضیِ فدکؑ

فدک خیبر کے مضافات میں ایک زرخیز و شاداب بستی تھی جہاں پہلے پہل فدک ابن حام نے ڈیرے ڈالے اور اسی کے نام پر اس بستی کا نام فدک قرار پایا۔ خیبر کی طرح یہاں بھی یہود آباد تھے جنہوں نے آبپاشی کے وسائل مہیّا کر کے افتادہ زمینوں کو آباد کیا اور باغوں، نخلستانوں اور لہلہاتے کھیتوں سے اُسے جاذب نظر بنا دیا۔ یاقوت حموی نے لکھا ہے:۔

---

[1] ایک وسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے اور ایک صاع تین سیر کا۔ لہذا ہمارے ہاں کے مروّجہ اوزان کے لحاظ سے تین سو ساٹھ[۳۶۰] من خرما اور نوّے من جو ہوں گے۔ ۱۲

فیھا عین فوارۃ ونخیل کثیرۃ۔ (معجم البلدان۔ ج۱۴۔ ص۳۳۸)۔

اس قریہ میں اُبلتے ہُوئے چشمہ ہائے آب اور کثیر تعداد میں نخلستان تھے"۔

فتح خیبر کے بعد خیبر کے پڑوس میں بسنے والوں کے دلوں پر مسلمانوں کی قوّت و طاقت کا ایسا رُعب بیٹھا کہ انہوں نے بغیر جنگ کے اطاعت قبول کرلی۔ اس موقع پر اہلِ فدک نے بھی اپنا بچاؤ اسی میں سمجھا کہ اراضیٔ فدک کی ملکیت سے دستبردار ہو کر پیداوار کے آدھوں آدھ پر مصالحت کرلیں۔ چنانچہ انہوں نے پیغمبر اکرمؐ کو پیغام بھیجا کہ ہم لڑنا بھڑنا نہیں چاہتے بلکہ جن شرائط پر اہلِ خیبر کو ان کی زمینوں پر کھیتی باڑی کی اجازت دی گئی ہے ہمیں بھی اُنہی شرائط پر فدک کی زمینوں پر زراعت کی اجازت دی جائے۔ آنحضرتؐ نے اسے منظور فرمایا اور حضرت علیؑ کو ان کے سردار یوشع ابن نون کے پاس تفصیلات طے کرنے کے لئے بھیجا۔ دونوں فریق میں گفت و شنید کے بعد یہ طے پایا کہ فدک کے باشندے زمینوں کی ملکیّت سے دستبردار ہو کر بطور کاشتکار کام کریں گے اور نصف پیداوار خود لیں گے اور نصف پیداوار رسُولؐ اللہ کو دیں گے۔ اس مصالحت کے نتیجہ میں اراضیٔ فدک رسُولِؐ خدا کی ملکیت قرار پائیں کیونکہ اسلامی نقطۂ نظر سے جو علاقے مسلمانوں کی لشکر کشی کے نتیجہ میں فتح ہوتے تھے ان میں مسلمانوں کے حقوق ہوتے تھے۔ اور جو لڑے بھڑے بغیر مفتوح ہوتے تھے وُہ رسُولؐ خدا کی ملکیت قرار پاتے تھے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے:۔

وما افاء اللہ علیٰ رسولہ منہم فما اوجفتم علیہ من خیل و لا رکاب ولکن اللہ یسلط رسلہ علیٰ من یشاء واللہ علےٰ کل شیٔ قدیر۔

جو کچھ خدا نے اپنے پیغمبرؐ کو ان لوگوں سے دلوایا تم نے اس پر اُونٹ اور گھوڑے نہیں دوڑائے تھے لیکن خدا اپنے پیغمبروں کو جس پر چاہتا ہے تسلط عطا کرتا ہے۔ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے"۔

جو علاقے مُسلمانوں کی چڑھائی کے نتیجہ میں مفتوح ہوتے ہیں انہیں غنیمت کہا جاتا ہے اور جو جنگ و قتال کے بغیر حاصل ہوتے ہیں انہیں شرعی اصطلاح میں فے اور انفال سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ فدک بھی مال فے تھا جو مُسلمانوں کی مجاہدانہ سرگرمیوں کے بغیر مفتوح ہُوا تھا۔ اس لئے یہ خالص رسُولؐ اللہ کی ملکیّت تھا۔ جس میں مسلمانوں کا کوئی حق نہ تھا۔ علاّمہ طبری نے تحریر کیا ہے:۔

کانت فدک خالصۃ لرسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لانھم لم یجلبوا علیھا بخیل ولا رکاب۔

فدک خالص رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ملکیت تھا۔ کیونکہ اس پر نہ مُسلمانوں نے گھوڑے دوڑائے نہ اُونٹ"۔

(تاریخ طبری۔ ج۲۔ ص۳۰۲)۔

بلاذری نے تحریر کیا ہے:۔

كانت فدك لرسول الله صلى الله عليه وسلم لانه لم يوجف المسلمون عليها بخيل ولا ركاب۔ (فتوح البلدان۔ ص۳۷)

فدک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ملکیت خاصہ تھا کیونکہ اس پر مسلمانوں نے نہ گھوڑے دوڑائے اور نہ اُونٹ "۔

یاقوت حموی نے لکھا ہے :۔

افاءها الله على رسول الله صلى الله عليه وسلم فى سنة سبع صلحا۔ (معجم البلدان۔ ج۱۴۔ ص۲۳۸)۔

یہ گاؤں خداوند عالم نے پیغمبر اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو سات ہجری میں صلح کے نتیجہ میں دلوایا "۔

قرآن مجید کے واضح ارشاد اور علماء ملت کی تصریحات کے بعد اس میں قطعاً کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ فدک رسولؐ اللہ کی ملکیتِ خاصہ تھا جس میں انہیں ہر طرح کا حقِ تصرف حاصل تھا۔ چنانچہ اسی حقِ تصرف کی بناء پر آپ نے یہ گاؤں جناب فاطمہ زہراؑ کو اپنی زندگی میں ایک دستاویز کے ذریعہ ہبہ فرمادیا۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے تحریر کیا ہے :۔

اخرج ابن مردوية عن ابن عباس قال لما نزلت وآت ذا القربىٰ حقه اعطى رسولؐ الله فاطمة فدكا۔ (تفسیر دُرِ منثور۔ ج۴۔ ص۱۷۷)۔

ابن مردویہ نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ جب آیہ "اے رسولؐ اپنے قرابتداروں کو ان کا حق دے دو" نازل ہوا تو آنحضرتؐ نے فدک فاطمہؑ کو عطا کردیا "۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی تحریر کرتے ہیں :۔

اخرج الطبرانی وغيره عن ابی سعيد الخدرى قال لما نزلت وآت ذا القربىٰ حقه دعا رسول الله صلى الله عليه وسلم فاطمة فاعطاها فدك "۔ (تفسیر مظہری۔ ج۵۔ ص۴۳۳)۔

طبرانی وغیرہ نے ابوسعید خدری سے روایت کی ہے کہ جب آیہ "اے رسولؐ اپنے قرابتداروں کو اُن کا حق دے دو "۔ تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فاطمہؑ کو طلب کیا اور فدک انہیں دے دیا "۔

آنحضرتؐ کی زندگی تک فدک جناب سیّدہؑ کے قبضہ و تصرّف میں رہا۔ چنانچہ امیرالمومنینؑ نے اپنے مکتوب میں اس قبضہ و تصرف کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے :۔

كانت فى ايدينا فدك من كل ما اظلته السماء فشحت عليها نفوس قوم وسخت عنها نفوس قوم آخر

اس آسمان کے سایہ تلے لے دے کر ایک فدک ہمارے ہاتھوں میں تھا۔ اس پر بھی کچھ لوگوں کے مُنہ سے رال ٹپکی اور دُوسرے فریق نے اس کے جانے

ونعم الحکم للہ۔ (نہج البلاغہ)۔ کی پروا نہ کی۔ اور بہترین فیصلہ کرنے والا اللہ ہے۔"

لیکن وفات پیغمبرؐ کے بعد چند "ملکی مصالح" کے ماتحت اسے حکومت کی تحویل میں لے لیا گیا۔ جناب سیدہؑ نے حکومت کے خلاف مرافعہ کیا مگر ان کا دعوائے ہبہ مسترد کر دیا گیا اور فدک کے تمام حقوق حکومت کے پائے نام ہو گئے یہ امر تو "مسئلۂ فدک" کے ذیل میں تحریر ہو گا کہ کون حق بجانب تھا اور کون حق بجانب نہ تھا اور کن وجوہ کی بناء پر یہ دعویٰ خارج کیا گیا۔ مگر یہ کہاں کا انصاف تھا کہ جس کے خلاف مرافعہ تھا تصفیہ کا اختیار وہ خود سنبھال لے اور مدعا علیہ ہی مسند قضا پر بیٹھ کر مقدمہ فیصل کر دے۔

فیک الخصام وانت الخصم والحکم

اس عدل گستری و انصاف کیشی کے نتیجہ میں وہی فیصلہ ہونا تھا جو ہوا اور جناب سیدہؑ نہ ہبہ کے اعتبار سے فدک کی مالک تسلیم کی گئیں اور نہ وراثت کے لحاظ سے۔ اس احساس محرومی نے انہیں اس حد تک متاثر کیا کہ نمائندہ حکومت سے مقاطعہ و ترک کلام کیا اور زندگی کے آخری لمحوں تک اس کے خلاف احتجاج جاری رکھا۔

فتح مکّہ

حدیبیہ میں قریش اور اہل اسلام کے درمیان یہ معاہدہ طے پایا تھا کہ دونوں فریق دس برس تک جنگ و قتال سے کنارہ کش رہیں گے اور دونوں کے حلیف بھی اس معاہدہ کی پابندی کریں گے۔ اور اگر کسی ایک فریق یا اس کے حلیف نے خلاف ورزی کی تو دوسرا فریق معاہدہ صلح کا پابند نہ رہے گا۔ مسلمانوں کے حلیف بنو خزاعہ اور قریش کے حلیف بنو بکر میں پہلے سے چپقلش چلی آ رہی تھی اور دونوں آپس میں لڑتے بھڑتے رہتے تھے مگر قریش اور مسلمانوں کی باہمی جنگوں کی وجہ سے اُن کی آپس کی لڑائیاں کچھ عرصہ سے ملتوی تھیں اور دونوں اپنے اندرونی اختلافات کو نظر انداز کر کے اسلام کے مقابلہ میں متحد ہو چکے تھے۔ جب قریش اور اہل اسلام میں ایک طویل عرصہ کے لئے معاہدۂ صلح ہو گیا تو قریش کے حلیف بنو بکر نے ایک رات بنو خزاعہ پر حملہ کر دیا اور اُن کا ایک آدمی مار ڈالا۔ دبی ہوئی رنجشیں پھر سے اُبھر آئیں اور دونوں میں پھر سے جنگ کے شعلے بھڑکنے لگے۔ اگرچہ بنو خزاعہ بنو بکر سے نمٹنے کے لئے کافی تھے مگر قریش نے بنو بکر کو ہتھیار بہم پہنچائے اور عکرمہ ابن ابی جہل، صفوان ابن اُمیہ اور سہیل ابن عمرو جس نے قریش کی نمائندگی کرتے ہوئے صلحنامہ پر دستخط کئے تھے بنو بکر کے ساتھ ہو کر جنگ کرتے رہے بنو خزاعہ نے اپنی جانوں کے بچاؤ کے لئے خانہ کعبہ میں پناہ لی مگر سرزمین حرم بھی اُن کے خون سے رنگین کر دی گئی جب بنو خزاعہ سے کچھ بن نہ پڑا تو اُن میں کے چالیس آدمی عمرو ابن سالم کی سربراہی میں مدینہ آئے اور پیغمبر اکرمؐ کو قریش کی بد عہدی و پیمان شکنی کی اطلاع دی اور اپنی تباہی و بربادی کا حال سُنایا۔ آنحضرتؐ نے بنو خزاعہ کی فریاد و زاری پر نصرت کا وعدہ فرمایا اور قریش کو پیغام بھجوایا کہ وہ بنو خزاعہ کے مقتولین کا خونبہا ادا کریں یا بنو بکر کی حمایت سے دستبردار ہو جائیں۔ اور اگر ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات قبول نہ کریں تو پھر معاہدۂ صلح ختم سمجھیں۔ قریش نے

اِن دونوں باتوں کے ماننے سے انکار کردیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ ہم نہ خونبہا ادا کریں گے اور نہ بنو بکر کی حمایت سے دستبردار ہوں گے۔ قریش کی اس شوریدہ سری کے نتیجہ میں آنحضرتؐ نے اعلان کردیا کہ اب ہم سے اور قریش سے کوئی معاہدہ نہیں رہا۔

پیغمبرؐ کے اس اعلان سے قریش میں کھلبلی مچ گئی اور عہد شکنی کے ہولناک نتائج اُن کی نظروں کے سامنے آگئے۔ انہوں نے یہ دیکھتے ہوئے کہ مسلمانوں کا مقابلہ اُن کے بس سے باہر ہے معاہدۂ صلح کو برقرار رکھنا چاہا۔ چنانچہ انہوں نے ابوسفیان کو مدینہ بھیجا تاکہ وُہ حکمتِ عملی سے کام لے کر معاہدۂ صلح کی تجدید کرائے۔ جب ابوسفیان مدینہ میں آیا تو سیدھا اپنی بیٹی ام حبیبہ کے پاس گیا جو پیغمبر اکرمؐ کے حرم میں داخل تھیں۔ ام حبیبہ نے اپنے باپ کو آتے دیکھا تو رسُولِؐ خدا کا بستر تہہ کردیا۔ ابوسفیان نے کہا کہ تم نے ایسا کیوں کیا۔ کیا میں اس بستر کے قابل نہیں یا یہ بستر میرے لائق نہیں؟ ام حبیبہ نے کہا کہ یہ رسُولِؐ خدا کا بستر ہے اور مجھے یہ گوارا نہیں ہے کہ تم اس بستر پر بیٹھو جبکہ تم مشرک و ناپاک ہو۔ ابوسفیان مُنہ بسور کر واپس ہوا اور رسُولِؐ خدا کی خدمت میں حاضر ہو کر معاہدۂ صلح کی تجدید کی خواہش کی۔ مگر آنحضرتؐ نے اس کی کسی بات کا جواب نہ دیا اور سُنی اَن سُنی کردی۔ وُہ کچھ دیر ٹھہرا اور پھر اُٹھ کر حضرت ابوبکر کے پاس آیا اور کہا کہ آپ رسُولِؐ خدا سے ہماری سفارش کیجئے۔ حضرت ابوبکر نے اپنی معذوری کا اظہار کیا۔ پھر حضرت عمر کے پاس آیا اور اُن سے بھی کہا سُنا مگر انہوں نے بھی اُسے کوئی اُمید افزا جواب نہ دیا۔ جب ہر طرف سے مایوس ہوگیا تو حضرت علیؑ کے پاس آیا اور اُن سے کہا کہ آپ پیغمبرؐ سے ہماری سفارش کر دیجئے کہ وُہ معاہدۂ صلح کو برقرار رکھیں۔ حضرت علیؑ نے کہا کہ پیغمبر اکرمؐ جو ارادہ فرما چکے ہیں اس میں کسی کو دخل در انداز ہونے کا حق نہیں ہے لہٰذا ہم اُن سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ابوسفیان نے جناب فاطمہؑ سے جو وہاں تشریف فرما تھیں کہا کہ اے دُختر محمدؐ (صلی اللہ علیہ وآلہ) اگر آپ اپنے بیٹے حسنؑ کو حکم دیں کہ وُہ اتنا کہہ دیں کہ مَیں نے دونوں فریق میں بیچ بچاؤ کرادیا تو وُہ رہتی دُنیا تک سردارِ عرب کہلائیں گے۔ جناب سیّدہ نے فرمایا کہ حسن ابھی بچّہ ہے اور ایک بچّے کو ان باتوں سے کیا سروکار۔ ابوسفیان کو جب کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو حضرت علیؑ سے کہا کہ اگر آپ کچھ نہیں کر سکتے تو مجھے مشورہ ہی دیجئے کہ مجھے اس نازک صورتِ حال میں کیا کرنا چاہئے۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ تم خود ہی تجدیدِ صلح کا اعلان کردو اور پھر مکّہ چلے جاؤ۔ کہا کہ اس اعلان سے ہمیں کچھ فائدہ بھی پہنچے گا؟ فرمایا کچھ کہا نہیں جاسکتا کہ یہ تدبیر کارگر ہوگی یا بے نتیجہ ثابت ہوگی کہا کہ اچھا میں یہ اعلان کئے دیتا ہوں۔ چنانچہ اس نے مسجد میں کھڑے ہو کر کہا کہ میں دونوں فریق میں معاہدۂ صلح کی تجدید کرتا ہوں۔ اور یہ کہہ کر مکّہ روانہ ہوگیا۔

جب مکّہ میں پہنچا تو لوگوں نے پُوچھا کہ کیا کارنامہ سرانجام دے کر آئے ہو۔ کہا کہ مَیں محمّد (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس گیا مگر انہوں نے میری کسی بات کا جواب تک نہ دیا۔ پھر ابن ابی قحافہ کے پاس گیا اُن سے بھی کوئی کام نہ نکلا۔ پھر ابنِ خطاب کے پاس گیا وُہ بھی دُشمن ثابت ہوئے۔ پھر علیؑ کے پاس گیا تو اُن کا رویہ نرم رہا۔ اور اُن کے مشورہ پر میں نے بیچ بچاؤ کا اعلان کردیا۔ قریش نے کہا کیا محمّد (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بھی اسے تسلیم کر لیا ہے؟ کہا کہ

انہوں نے تو تسلیم نہیں کیا۔ کہا کہ تم ہوش و حواس رکھتے ہوئے اتنا نہ سمجھ سکے کہ تمہارے یکطرفہ اعلانِ صلح سے کیا ہوتا ہے جب تک دُوسرا فریق بھی اسے تسلیم نہ کرے۔ علیؑ نے تم سے اچھا خاصا مذاق کیا ہے جس کا ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔

پیغمبر اکرمؐ قریش اور بنو بکر کی خونریزی و بدعہدی سے بہت متاثر تھے اور معاہدہ کی رُو سے پابند تھے کہ بنو خزاعہ کی نصرت کریں۔ چنانچہ آپ نے اہل مکہ کو جنگ کی تیاری کا حکم دیا اور بیرون مدینہ کے لوگوں کو بھی پیغام بھیجا کہ وُہ جنگی ہتھیاروں کے ساتھ مدینہ پہنچیں۔ پیغمبرؐ کی آواز پر لوگ جوق در جوق مدینہ میں جمع ہونے لگے اور ہتھیاروں کی دیکھ بھال اور کُوچ کی تیاریوں میں لگ گئے۔ مگر یہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ کدھر جانا ہے اور کس سمت بڑھنا ہے۔ آنحضرتؐ نے اس کا پُورا اہتمام کیا تھا کہ اہل مکہ کو خبر نہ ہونے پائے اور ایکدم ان کے سروں پر پہنچ جائیں۔ صحابہ میں سے جنہیں یہ معلوم ہو چکا تھا کہ مکہ پر چڑھائی کا ارادہ ہے انہیں یہ تاکید فرما دی تھی کہ وُہ اسے مخفی رکھیں اور کسی سے اس کا تذکرہ نہ کریں تاکہ اہل مکہ کے کانوں تک اس کی بھنک نہ پڑنے پائے۔ مگر حاطب ابن ابی بلتعہ نے کہ جس کے اہل و عیال مکہ میں تھے اس راز کو فاش کرنے کی سعی مذموم کی۔ اور ایک خط لکھ کر عمرو ابن عبدالمطلب کی کنیز سارہ کو دیا کہ وُہ اسے مکہ پہنچا دے۔ اور اس میں تحریر کیا کہ رسُولؐ اللہ مکہ پر حملہ کی تیاری کر رہے ہیں۔ آنحضرتؐ کو وحی کے ذریعہ اس کی اطلاع ہو گئی۔ آپ نے فوراً حضرت علیؑ اور زبیر ابن عوام کو اس کنیز کے تعاقب میں بھیجا کہ وُہ اسے جہاں پائیں گرفتار کر کے لائیں ابھی وُہ وادیٔ حلیفہ تک پہنچی تھی کہ اُسے گرفتار کر لیا گیا۔ حضرت علیؑ نے اُس سے خط کے بارے میں دریافت کیا مگر اس نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ میرے پاس کوئی تحریر نہیں ہے۔ زبیر نے اس کے سامان کی تلاشی لی مگر اس میں سے کچھ نہ نکلا۔ حضرت علیؑ نے کہا کہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس کے پاس خط نہ ہو جبکہ رسُولؐ اللہ ہمیں خبر دے چکے ہیں اور اُن سے غلط بیانی کا امکان ہی نہیں ہے۔ یہ کہہ کر اس سے سختی کے ساتھ خط کا مطالبہ کیا اور کہا کہ اگر تم نے ذرا بھی حیل و حجت سے کام لیا تو تمہاری جامہ تلاشی لی جائے گی۔ اس دھمکی کا یہ اثر ہُوا کہ اُس نے سر کے بالوں میں سے خط نکال کر پیش کر دیا۔ حضرت علیؑ وُہ خط لے کر پیغمبرؐ کی خدمت میں آئے اور تمام سرگزشت بیان کی۔ آنحضرتؐ نے صحابہ کو جمع کر کے فرمایا کہ میں نے تاکیداً کہہ دیا تھا کہ اس اقدام کو مخفی رکھا جائے مگر تم میں سے ایک شخص نے اس راز کو فاش کرنے کی سعئ ناکام کی ہے اور قریش کو خط لکھ کر ہمارے ارادہ سے آگاہ کرنا چاہا ہے۔ وُہ خط پکڑا جا چکا ہے۔ لہٰذا جس نے یہ نامناسب حرکت کی ہے وُہ خود ہی بتا دے ورنہ وُہ رُسوا ہُوئے بغیر نہ رہے گا۔ حاطب نے یہ سُنا تو لرزاں و ترساں کھڑا ہوا اور کہا یارسُولؐ اللہ یہ غلطی مجھ سے سرزد ہوئی ہے۔ میں نے قریش کی دوستی اور اسلام کی دشمنی میں ایسا نہیں کیا بلکہ میں نے یہ سوچا تھا کہ اس طرح قریش کو ممنونِ احسان کر کے اپنے بال بچّوں کا تحفّظ کروں جو ابھی تک قریش کے رحم و کرم پر زندگی گزار رہے ہیں۔ اس پر حضرت عمر نے بگڑ کر کہا:۔

یارسُولؐ اللہ دعنی فلاضرب عنقہ فان الرجل قد نافق۔ (تاریخ طبری ج۲ ص۳۲۸)

"یارسُولؐ اللہ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس کی گردن اُڑا دوں یہ شخص منافق ہے"۔

مگر پیغمبر اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے درگزر سے کام لیا اور اُسے معاف کر دیا۔
قرآن مجید میں اس واقعہ کے متعلق ارشادِ باری ہے :۔

تسرون الیھم بالمودۃ وانا اعلم بما اخفیتم وما اعلنتم ومن یفعلہ فقد ضلّ سواء السّبیل۔

تم ہو کہ کفار کے پاس چوری چھپے دوستی کے پیغام بھیجتے ہو حالانکہ جو کچھ تم چھپا کر یا کھلم کھلا کرتے ہو میں اس سے بخوبی واقف ہوں۔ اور تم میں سے جو بھی ایسا کرتا ہے وُہ سیدھی راہ سے بھٹک گیا ہے۔"

۱۰ ماہ رمضان ۸ھ کو رسُولِ خدا دس ہزار مسلح مسلمانوں کے ساتھ نکل کھڑے ہُوئے۔ چار سو صحابہ گھوڑوں پر سوار تھے اور باقی پیادہ پا چل رہے تھے۔ جب لشکرِ اسلام کدید میں پہنچا تو پیغمبرؐ نے صحابہ کو روزہ افطار کر لینے کا حکم دیا اور خود بھی روزہ ختم کر دیا۔ کچھ لوگوں نے اس میں پس و پیش کیا۔ پیغمبرؐ کو معلوم ہوا تو فرمایا کہ یہ لوگ عاصی و گنہگار ہیں۔ اس پر سب نے روزہ افطار کر لیا۔ جب منزل بمنزل بڑھتے ہوئے ثنیۃ العقاب تک پہنچے تو عمِ رسُولؐ عباس ابن عبد المطلبؑ اپنے اہل و عیال کے ساتھ پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہُوئے۔ عباس نے اپنے متعلقین کو مدینہ بھجوا دیا اور خود پیغمبرؐ کے ساتھ ہو گئے۔ مکّہ سے بارہ میل کے فاصلہ پر آنحضرتؐ نے پڑاؤ ڈالا۔ تو عباس رسُولؐ خدا کے خچر پر سوار ہو کر باہر نکلے اس خیال سے کہ اگر کوئی آدمی مل جائے تو اس کے ہاتھ قریش کو یہ پیغام بھجوائیں کہ وُہ رسُولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہو کر امان کی درخواست کریں اور اسلام لا کر اپنی جانوں کا تحفظ کر لیں۔ قریش کو ابو سفیان کے ناکام واپس آنے کے بعد اس خطرہ کا احساس تو تھا ہی کہ مسلمان انہیں عہد شکنی کی سزا دینے کے لئے لامحالہ کوئی قدم اٹھائیں گے اس لئے وُہ راتوں کو مکّہ کے گرد چکر لگاتے اور حالات کا جائزہ لیتے۔ اسی مقصد سے ابو سفیان حکیم ابن حزام اور بدیل ابن ورقاء مکہ کے اطراف میں گشت کر رہے تھے کہ مرالظہران کی جانب آگ کی روشنی اور لوگوں کی نقل و حرکت دیکھ کر حیرت میں کھو گئے۔ ابو سفیان نے کہا کہ یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟ بدیل ابن ورقاء نے کہا کہ بنو خزاعہ کا لشکر ہو گا۔ ابو سفیان نے کہا کہ بنو خزاعہ میں اتنا دم خم کہاں کہ وُہ اپنے پرچم کے نیچے اتنا عظیم لشکر جمع کر سکیں۔ ابھی یہ لوگ قیاس آرائیاں کر رہے تھے کہ عباس ابن عبد المطلب سے ملاقات ہو گئی۔ ابو سفیان نے پُوچھا کہ تمہیں معلوم ہے کہ یہ فوج و سپاہ کیسی ہے؟ کہا کہ یہ فوج بیکراں پیغمبرؐ کے علاوہ اور کس کی ہو سکتی ہے۔ آنحضرتؐ دس ہزار مسلح مسلمانوں کے ساتھ مکہ کی جانب بڑھ رہے ہیں اور پو پھٹتے ہی مکہ پر حملہ کر دیں گے اور قریش میں سے کسی ایک کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ یہ سُن کر ابو سفیان کانپ اُٹھا اور کہا کہ پھر ہمارے بچاؤ کی کیا صورت ہو گی۔ عباس نے کہا کہ تم میرے پیچھے میری سواری پر بیٹھ جاؤ میں آنحضرتؐ سے کہہ سُن کر تمہیں امان دلوا دوں گا۔ جب عباس ابو سفیان کو لئے ہُوئے لشکرِ اسلام کی طرف سے گزرے تو حضرت عمر نے ابو سفیان کو دیکھ لیا۔ وُہ دوڑتے ہُوئے رسُولؐ اللہ کے پاس گئے اور کہا کہ یا رسُولؐ اللہ دشمن خدا آ رہا ہے مجھے حکم دیجئے کہ میں اس کی گردن مار دوں۔ عباس نے حضرت عمر کو قتلِ ابو سفیان پر زور دیتے ہُوئے دیکھا تو کہا:

مهلاً یا عمر فو اللہ ما تصنع بہ هذا الا انه رجل من بنی عبد مناف ولو کان من عدی ابن کعب ما قلت هذا۔ (تاریخ طبری۔ ج۳۔ ص۳۳۱)

ٹھہرو اے عمر! خدا کی قسم تم یہ اس لئے کہہ رہے ہو کہ وُہ اولادِ عبد مناف میں سے ہے۔ اگر وُہ تمہارے قبیلہ بنی عدی میں سے ہوتا تو تم کبھی ایسی بات نہ کہتے۔"

آنحضرتؐ نے عباس سے فرمایا کہ اسے آج کی رات اپنے خیمہ میں ٹھہراؤ اور کل صبح میرے پاس لاؤ۔ جب دُوسرے دِن اُسے رسُولؐ اللہ کے سامنے پیش کیا گیا تو فرمایا کہ اے ابوسفیان تمہیں اب بھی معلوم نہیں ہُوا کہ اللہ کے علاوہ کوی معبود نہیں ہے۔ کہا کہ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے اگر اللہ کے علاوہ کوی اور معبُود ہوتا تو اس آڑے وقت میں میرے کام آتا۔ فرمایا تم نے اب بھی نہیں پہچانا کہ میں اللہ کا رسُولؐ ہوں۔ کہا کہ اس کے بارے میں میرا ذہن صاف نہیں ہے۔ عباس نے کہا کہ اے ابوسفیان اگر اپنی جان کی خیر چاہتے ہو تو اسلام قبول کرو ورنہ کسی کے ہاتھ سے مارے جاؤ گے۔ جب اُسے مسلمان ہُوئے بغیر جان بچتی نظر نہ آئی تو بادلِ ناخواستہ کلمہ پڑھا اور مسلمانوں کے گروہ میں شامل ہوگیا۔ عباس نے سفارش کی کہ یارسُولؐ اللہ ابوسفیان جاہ پسند ہے اسے کوی امتیازی حیثیت دے کر اس کی دلجوئی کی جائے۔ فرمایا جو ابوسفیان[1] کے گھر میں پناہ لے اس کے لئے امان ہے اور جو مسجد حرام میں پناہ لے اُسے بھی امان دی جائے گی اور جو اپنے گھر کا دروازہ بند کرلے وُہ بھی محفوظ رہے گا۔" پھر فرمایا اے عباس اسے کسی ایسی جگہ پر لے جاکر کھڑا کرو جہاں سے یہ لشکرِ اسلام

---

[1] علامہ دمیری نے حیاۃ الحیوان میں تحریر کیا ہے کہ ایک عالم (ابن مجلی صاحب مشارف الضاع) نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو خواب میں دیکھا اور اُن سے کہا کہ جب آپ لوگوں نے مکہ فتح کیا تو ابوسفیان کے گھر کو پناہ گاہ قرار دیا اور جب ابوسفیان کی اولاد برسرِ اقتدار آئی تو اُس نے فرزند رسُولؐ کو اُن کے عزیز و اقارب سمیت بھُوکا پیاسا ذبح کر ڈالا اور کسی ایک کو بھی پناہ نہ دی۔ حضرت علیؑ نے فرمایا کیا تم نے ابن الصیفی (حیص بیص متوفی ۵۷۴ھ) کے اشعار تمہارے گوشگزار نہیں ہُوئے۔ میں نے عرض کیا کہ نہیں۔ فرمایا کہ تم اس کے ہاں جاؤ اور اس کا جواب سُن لو۔ میں صبح کو بیدار ہوا تو سیدھا ابن الصیفی کے ہاں گیا اور اس سے اپنا خواب بیان کیا اور اُن اشعار کے سنانے کی فرمائش کی جن کی طرف حضرتؑ نے خواب میں اشارہ کیا تھا۔ ابن الصیفی نے قسم کھا کر کہا کہ وُہ اشعار میں نے آج ہی کی رات کہے ہیں اور ابھی کسی کو سُنانے کی نوبت نہیں آئی۔ لو اب تم سُنو:۔

ملکنا فکان العفو منا سجیۃ   فلما ملکتم سال بالدم ابطح!

ہم برسرِ اقتدار تھے تو ہمارا شیوہ عفو و درگزر تھا اور تم برسرِ اقتدار آئے تو خُون سے وادیاں چھلک اُٹھیں۔

وحللتم قتل الاساری وطالما   غدونا علی الاسری فنعفو ونصفح

تم نے اسیروں کے قتل کو حلال جانا اور ہم نے اسیروں پر قابو پایا تو عفو و درگزر سے کام لیتے ہوئے انہیں معاف کر دیا۔

(باقی بر ص۲۶۰)

کے پھیلاؤ کو اچھی طرح دیکھ سکے۔ عباس لسے ایسی ہی جگہ پر لے گئے۔ اس نے جب انبوہ در انبوہ فوجوں اور اُن کے چمکتے ہُوے ہتھیاروں کو دیکھا تو لرز اُٹھا اور عباس سے کہا: لقد اوتی ابن اخیك ملكا عظیما۔ تمہارا بھتیجا تو ایک عظیم سلطنت کا مالک ہو گیا ہے۔" عباس نے کہا: انه لیس بملك انما هی النبوۃ "یہ سلطنت نہیں ہے بلکہ نبوّت کا شکوہ ہے۔" ابوسفیان نے کہا کہ مجھے اس کا خیال نہیں رہا ایسا ہی ہو گا۔

ابوسفیان لشکرِ اسلام کی جھلک دیکھ کر مکّہ آیا اور قریش سے کہا کہ محمدؐ ایک لشکر جرار کے ساتھ پہنچ گئے ہیں لوگوں نے کہا کہ تم وہاں گئے تھے اُنہوں نے کچھ کہا بھی ہے؟ کہا کہ انہوں نے فرمایا ہے کہ جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا اُسے امان دی جائے گی۔ لوگوں نے کہا کہ تمہارے گھر میں آدمی ہی کتنے آ سکتے ہیں۔ کہا کہ اُنہوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے بیٹھ جائے گا یا مسجد حرام میں پناہ لے گا اس کے لئے بھی امان ہے۔ پھر قریش سے مخاطب ہو کر کہا کہ اے گروہ قریش تم اُن کا مقابلہ تو کر نہیں سکتے بہتر ہے کہ اسلام قبول کر کے اپنی جانیں بچالو۔ اس کی بیوی ہند بنتِ عتبہ نے سُنا تو آگے بڑھ کر اس کی ڈاڑھی پکڑلی اور کہا: اقتلوا هذا الشیخ الاحمق۔ اے لوگو اس بوڑھے احمق کو قتل کر ڈالو"۔ ابوسفیان نے کہا کہ یاد رکھو کہ تم نے اسلام کے قبول کرنے میں ذرا بھی پس و پیش کیا تو تمہاری گردن بھی اُڑا دی جائے گی۔

قریش ابھی حیرت میں کھوئے ہوے سوچ ہی رہے تھے کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں کہ اسلام کے پرچم لہرانے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے مکّہ کی فضا پر چھا گئے۔ سعد ابن عبادہ رایت اسلام اُٹھائے حدودِ مکّہ میں داخل ہُوے تو اُن کی زبان سے یہ الفاظ نکلے:۔

اليوم يوم الملحمه   اليوم تستحل الحرمه

آج گھمسان کی لڑائی کا دن ہے۔   آج ہتک حرمت کا دن ہے"۔

سعد کے یہ الفاظ غمازی کر رہے تھے کہ وُہ آج قریش کے مظالم کا بدلہ چکائیں گے اور کشت و خون کئے بغیر آگے نہیں بڑھیں گے۔ عباس نے آنحضرتؐ سے کہا کہ سعد کے تیور بتا رہے ہیں کہ وُہ خونریزی پر آمادہ ہیں۔ پیغمبرؐ کا کوئی ارادہ جنگ کا نہ تھا اور نہ جنگ کی ضرورت ہی تھی۔ آپ نے مناسب سمجھا کہ سعد سے علم لے لیا جائے چنانچہ علیؑ کو بُلایا اور اُن سے کہا:۔

ادرکه فخذ الرایة وکن انت الذی تدخل بها۔ (تاریخ کامل ج۲ ص۱۶۶)

تم سعد کے پاس جاؤ اور اس سے علم لے لو اور تم ہی علم لے کر مکّہ میں داخل ہو"۔

جناب امیرؑ نے آگے بڑھ کر سعد سے علم لے لیا اور لشکر کی قیادت کرتے ہُوے مکّہ میں داخل ہُوے۔

(بقیہ از ص ۲۵۹)

وحسبكم هذا التفاوت بيننا   فكل اناء بالذی فیه ینضح

اس سے ہمارا اور تمہارا تفرقہ ظاہر ہے۔ اور ہر ظرف سے وہی ٹپکتا ہے جو اس کے اندر ہوتا ہے۔

قریش میں تابِ مقاومت ہی نہ تھی کہ مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے ریلے کو روکتے۔ اپنے گھروں میں دبک کر بیٹھ گئے اور کل جن کے لئے مکّہ کے دروازے بند کئے تھے آج اُن کے لئے فتح و کامرانی کے دروازے کھل گئے یہ اسلام کی امن پسندی اور حق و صداقت کی فتح تھی جس میں نہ جنگ کی نوبت آئی اور نہ جنگ کی ضرورت محسوس کی گئی۔ لیکن ہر جماعت میں کچھ افراد ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی افتادِ طبیعت امن پسندی کے خلاف ہوتی ہے۔ اور وُہ ضرورت ہو یا نہ ہو سختی و تشدّد کا مظاہرہ کئے بغیر نہیں رہتے۔ چنانچہ خالد ابن ولید جو فتح مکّہ سے کچھ ہی پہلے اسلام لائے تھے اور ابھی اسلام نے اُن کے دل و دماغ میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کی تھی مکّہ کے زیریں حصّہ سے آگے بڑھ رہے تھے کہ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ مل کر بنو بکر سے جنگ چھیڑ دی۔ پیغمبر اکرمؐ نے کوہِ حجون پر سے گزرتے ہوئے تلواروں کی چمک دیکھی تو سخت برہم ہوئے۔ فرمایا کہ فوراً اس کشت و خون کو بند کیا جائے۔ مگر اتنے میں بنو بکر کے متعدّد آدمی مارے جا چکے تھے۔

جب پیغمبر اکرمؐ مکّہ کی بالائی سمت سے شہر میں داخل ہوئے تو سیدھے خانہ کعبہ کے پاس آئے اور طواف بجا لائے۔ طواف سے فارغ ہوئے تو دیکھا کہ عمائدِ قریش سر نہوڑائے چپ سادھے کھڑے ہیں یہ وُہ لوگ تھے جنہوں نے پیغمبرؐ کی ایذا رسانی میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا تھا۔ آپ کو گھر سے بے گھر کیا اور غربت میں بھی چین سے بیٹھنے نہ دیا اور پیہم خونریز حملے کرتے رہے۔ آنحضرتؐ نے ان کی طرف نظر اُٹھائی اور فرمایا کہ تمہارا کیا خیال ہے کہ تم سے کیا سلوک کیا جائے گا؟ سب نے ندامت سے سر نیچے ڈال دیئے۔ خطیب قریش سہیل ابنِ عمرو نے کہا: نظن خیرا و نقول خیرا اخ کریم و ابن عم کریم۔ "آپ شریف بھائی اور شریف چچا کے بیٹے ہیں ہم آپ سے نیکی اور بھلائی ہی کی توقع رکھتے ہیں۔" فرمایا: لا تثریب علیکم الیوم اذھبوا فانتم الطلقاء۔ "آج تم سے کوئی مواخذہ نہیں کیا جائے گا۔ جاؤ تم سب آزاد ہو۔" یہ پیغمبرؐ کی بلند نفسی و وسعتِ قلبی کا کرشمہ تھا کہ جو لوگ ہر وقت دشمنی و عناد پر کمر بستہ رہتے تھے اور آپ کی آواز پر کان دھرنا بھی گوارا نہ کرتے تھے حلقہ بگوشِ اسلام ہو کر آپ کا کلمہ پڑھنے لگے اور کل کا یتیم اور آج کا فرمانروا نہ صرف ان کے جسموں پر بلکہ ان کے دل و دماغ اور ضمیر و وجدان پر حکومت کرنے لگا۔ قریش کی دھاک دم توڑ کر فنا ہو گئی کفر کا شیرازہ بکھر گیا۔ اور اسلام کا پرچم فضائے بطحا پر لہرانے لگا۔

اہلِ مکّہ اگرچہ اسلام لے آئے اور ان میں ایسے لوگ بھی ہوں گے جو اسلام کی صداقت سے پہلے ہی سے متاثر رہے ہوں گے اور اب صدقِ دل سے اسلام قبول کیا ہوگا۔ مگر بلاشبہ اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جنہوں نے بے بس ہو کر اسلام قبول کیا تھا۔ کیونکہ عقائد و نظریات میں یکلخت تبدیلی انسانی افتادِ طبائع کے خلاف ہے۔ ان اسلامی لبادہ اوڑھنے والوں کے علاوہ کچھ لوگ وُہ بھی تھے جو اپنے کفر پر بضد تھے اور وقتی طور پر مکّہ سے چلے گئے تھے یا اِدھر اُدھر چھپ گئے تھے۔ یہ لوگ اسلام کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتے تھے اس لئے ضرورت تھی کہ انہیں قرار واقعی سزا دے کر فتنہ و شر کو ابھرنے سے پہلے دبا دیا جائے۔ پیغمبرِ اسلامؐ نے

اگرچہ عمومی طور پر امان کا اعلان کر دیا تھا مگر چند مفسدہ پرداز عناصر کے متعلق حکم دیا تھا کہ انہیں جہاں پاؤ قتل کر دو خواہ وُہ خانہ کعبہ کے پردہ سے چمٹے ہوئے کیوں نہ ہوں۔ چنانچہ ان افراد میں سے عبداللہ ابن خطل اور اس کی کنیز جو رسولؐ اللہ کی ہجو گایا کرتی تھی حویرث ابن نقید اور مقیس ابن صبابہ اپنے کیفر کردار کو پہنچائے گئے اور کچھ لوگوں کی جان بخشی بھی کی گئی۔ چنانچہ عبداللہ ابن ابی سرح نے حضرت عثمان کی پناہ حاصل کر لی اور انہی کی سفارش پر اسے چھوڑ دیا گیا۔ عکرمہ ابن ابی جہل یمن کی طرف بھاگ گیا اور اس کی بیوی ام حکیم نے اس کے لئے امان کی درخواست کی تو اُسے بھی امان دے دی گئی۔ اور ہبار ابن اسود، عمرو ابن عبدالمطلب کی کنیز سارہ اور ابن خطل کی ایک دُوسری کنیز نے اسلام کی آڑ لے کر اپنی جانیں محفوظ کر لیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور لوگوں سے بھی شرانگیزی کا اندیشہ تھا جو مکہ ہی میں چھپے ہُوئے تھے۔ چنانچہ حضرت علیؑ کو یہ خبر ملی کہ حارث ابن ہشام اور قیس ابن سائب اور بنی مخزوم کے چند افراد ام ہانی بنت ابی طالب کے گھر میں موجود ہیں۔ آپ ام ہانی کے مکان پر آئے اور فرمایا کہ اس گھر میں جو لوگ چھُپے ہُوئے ہیں انہیں باہر نکالو۔ ام ہانی حضرت علیؑ کو پہچان نہ سکیں۔ کہا کہ اے شخص میں علیؑ کی حقیقی ہمشیرہ اور رسُولؐ اللہ کی چچیری بہن ہوں۔ اگر تم نے اُن لوگوں کو جو میری پناہ میں ہیں باہر نکلنے پر مجبُور کیا تو میں رسُولؐ اللہ سے تمہاری شکایت کروں گی۔ اتنے میں حضرت علیؑ نے سر سے خود اُتارا تو ام ہانی نے انہیں پہچان لیا۔ دَوڑ کر حضرتؑ کے پاس آئیں اور کہا کہ میں قسم کھا چکی ہوں کہ رسُولؐ اللہ سے شکایت کروں گی۔ فرمایا تم رسُولؐ خدا سے شکایت کر کے اپنی قسم پُوری کر لو۔ جناب ہانی اسی وقت رسُولِ خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئیں۔ آنحضرتؐ نے پُوچھا اے ام ہانی کیسے آنا ہُوا؟ عرض کیا کہ یا رسُولؐ اللہ میں نے اپنے سُسرال والوں میں سے کچھ لوگوں کو اپنے ہاں پناہ دے رکھی ہے علیؑ انہیں اپنی تحویل میں لینا چاہتے ہیں۔ فرمایا: اجرتُ من اجرتِ۔ "جسے تم نے پناہ دی اُسے مَیں نے پناہ دی"۔

فتح مکّہ کے واقعات کے سلسلہ میں حضرت علیؑ کا کردار از ابتداء تا انتہاء ایک مثالی حیثیّت رکھتا ہے۔ انہوں نے پیغمبر اکرمؐ کی اطاعت و فرمانبرداری کو ہر چیز پر مقدم سمجھا اور یہ جذبۂ اطاعت ان کے مزاج میں اس طرح رچ بس گیا تھا کہ اُن کا ہر قول و عمل حرکت و سکون اور خاموشی و گویائی آنحضرتؐ کے اشارۂ چشم و ابرو سے وابستہ ہو کر رہ گئی تھی۔ وُہ فتح مکہ کی تیاریوں کے سلسلہ میں پیغمبرؐ کے رازوں کے امین تھے مگر کسی موقع پر اپنی برتری جتلانے کے لئے لب کشائی نہیں کرتے جبکہ جنگ بدر اور بیعت رضوان میں شریک ہونے والا ایک ممتاز صحابی اپنی بیوی بچّوں کے تحفّظ کے پیش نظر اس راز کو افشاء کرنے کی ناکام کوشش کرتا ہے جس کا اخفاء لازمی تھا اور اس طرح قومی و اجتماعی جرم کا مرتکب ہوتا ہے۔ اسی طرح جب ابوسفیان نے آپ سے خواہش کی کہ صلح کے بارے میں آنحضرتؐ سے سفارش کیجئے تو آپ نے پیغمبرؐ کے عزم و ارادہ کو دیکھتے ہُوئے اشارۃً یا کنایۃً بھی کچھ کہنا گوارا نہ کیا۔ اور جب اس نے خود حضرت سے مشورہ طلب کیا تو حسنِ تدبّر کا ثبوت دیتے ہُوئے گفتگو میں وُہ طرز عمل اختیار کیا جو حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے طرزِ عمل سے مختلف تھا ان دونوں نے اسے سختی سے جھڑک دیا تھا۔ مگر آپ نے اپنا رویہ نرم رکھا جس کا

اعتراف خود ابوسفیان نے بھی مکہ پہنچ کر قریش کے سامنے کیا۔ اس نرم روی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ معاہدہ صلح کی تجدید سے پوری طرح مایوس ہو کر نہیں پلٹا۔ اگر وہ پوری طرح مایوس و ناکام ہو کر پلٹتا تو قریش کو یقین دلاتا کہ مسلمان حملہ آور ہوئے بغیر نہیں رہیں گے اور وہ مصلحت جو حملہ کو مخفی رکھنے میں ملحوظ رکھی گئی تھی فوت ہو جاتی۔ اور پھر ابوسفیان کے دریافت کرنے پر یہ بھی صاف صاف کہہ دیا کہ اس مشورہ پر عمل پیرا ہونے سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کچھ فائدہ بھی ہو گا۔ حضرت کا یہ مشورہ ایک دفع الوقتی کی حیثیت رکھتا تھا مگر اُس نے اسے بھی ڈوبتے کو تنکے کا سہارا سمجھ کر غنیمت جانا تاکہ پلٹ کر قریش سے کچھ تو کہہ سکے۔

اس موقع پر بھی علم فتح و نصرت حضرت ہی کے ہاتھوں میں تھا جو اس سے پہلے تمام جنگوں میں علمبردار ہوتے چلے آئے تھے۔ اگرچہ ابتداء میں علم سعد ابن عبادہ کو دیا گیا تھا مگر جب سعد کے طور طریقوں سے یہ اندازہ لگایا گیا کہ وہ انتقامی جذبات سے مغلوب ہو کر جنگ کرنا چاہتے ہیں تو آنحضرتؐ نے اُن سے علم لے کر حضرت علیؑ کے سپرد کر دیا۔ اگر پیغمبرؐ سعد سے علم لے کر کسی اور کو دینے کا ارادہ کرتے تو سعد اسے اپنی ذلت و توہین سمجھتے اور علم کے دینے میں پس و پیش کرتے۔ مگر علیؑ کو علم دینا تو ایسا ہی تھا جیسے خود رسولؐ اللہ کو دینا جس سے نہ سعد دل شکستہ ہوئے اور نہ آزردہ خاطر۔ امیرالمومنینؑ جنگ اور صلح دونوں حالتوں میں قیادت کی اہلیت رکھتے تھے اور یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ جوش میں آ کر کوئی ایسا اقدام کریں گے جو نبوت کی فتح کو کسرویت و قیصریت کی فتح میں تبدیل کر دے۔ حضرتؑ کی سیرت کا یہ جاذب نظر پہلو ہے کہ جنگ کا موقع ہو تو ایسے جنگ آزما جیسے کبھی صلح سے واسطہ ہی نہ پڑا ہو۔ اور صلح کا محل ہو تو ایسے امن پسند جیسے حرب و ضرب کی کبھی ہمت ہی نہ ہوئی ہو۔

اس موقع پر حضرتؑ نے اپنی اصول پسندی کا بھی ثبوت دیا اور فرائض کی بجا آوری کے سلسلہ میں اپنی حقیقی بہن کے گھر میں پناہ لینے والوں کو اُس وقت تک معاف نہیں کیا جب تک رسولؐ اللہ نے ام ہانی کی قدر افزائی کرتے ہوئے ان کی پناہ کو اپنی پناہ قرار نہیں دے لیا۔ یہ تھی حضرتؑ کی آئین پسندی کہ آئین و قانون کے مقابلہ میں نہ اپنے اور غیر کی تمیز کی اور نہ اپنے طرزِ عمل میں لچک پیدا ہونے دی۔

تطہیر کعبہ

عمرو ابن لحی خزاعی نے ۲۰۰ء میں مصر و شام کے علاقہ میں عمالقہ کو بت پرستی کرتے دیکھا تو اُسے بتوں کی پرستش میں اگرچہ کوئی فائدہ نظر نہ آیا تھا مگر تراشے ہوئے بتوں کی صنعت اُسے بھا گئی اور چند بت اٹھا کر مکہ لے آیا اور انہیں خانہ کعبہ کے گرد و پیش نصب کر کے لوگوں کو بت پرستی کی دعوت دی۔ رفتہ رفتہ اہل مکہ کی اکثریت نے بت پرستی اختیار کر لی اور خانہ کعبہ صنم کدہ اور مکہ بت پرستی کا مرکز بن گیا۔ قریش کا سب سے بڑا دیوتا ہبل تھا جو خانہ کعبہ میں بلندی پر نصب تھا۔ ور اُس کے آس پاس سینکڑوں بت ایک دوسرے سے جڑے بندھے رکھے

تھے اور سال کے ۳۶۰ دنوں میں ایک ایک دن ایک ایک کی پُوجا کے لئے خاص کر دیا گیا تھا۔ اہل مکّہ کی دیکھا دیکھی اطراف و جوانب کے لوگ بھی بُت پرستی کی طرف مائل ہو گئے۔ اور جب حج کے لئے مکّہ آتے تو حرم سے پتھر اٹھا کر ساتھ لے جاتے اور انہیں مکّہ کے بتوں کی شکل و صورت میں تراش کر اپنے ہاں نصب کر لیتے یہاں تک کہ تمام عرب میں بُت پرستی عام ہوگئی اور ہر قبیلہ نے اپنے لئے علیحدہ علیحدہ بُت بنا لیا۔ مکّہ سے ایک منزل کے فاصلہ پر مقام نخلہ میں عزیٰ کی مورتی نصب تھی جو قریش اور بنی کنانہ کی عقیدت کا مرکز تھی۔ طائف میں لات نصب تھا جو بنی ثقیف کا دیوتا تھا۔ مدینہ سے کچھ فاصلہ پر منات نصب تھا جو اوس و خزرج اور غسان کا دیوتا کہلاتا تھا۔ نجران میں قبیلہ ہمدان یعقوق کی پوجا کرتا تھا۔ ینبع کے اطراف میں بنی ہذیل کا بُت سواع نصب تھا۔ اور دومۃ الجندل میں بنی کلب کا دیوتا ود تھا۔ اسی طرح مختلف قبیلوں میں مختلف دیوتاؤں اور دیویوں کی پُوجا ہوتی تھی۔ کچھ بت پرست ان حس و حرکت سے خالی اور فہم و شعور سے عاری پتھروں کو اللہ کا شریک کار سمجھتے تھے اور اُن کے سامنے گڑگڑاتے، جھولیاں پھیلاتے اور مرادیں مانگتے تھے۔ اور یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ پتھر آخر پتھر ہے اس کی کیا طاقت کہ کسی کو کچھ دے سکے یا کسی سے کچھ چھین سکے۔ اور بعض انہیں وسیلہ مانتے ہُوئے یہ کہتے تھے کہ ہم ان کے ذریعہ اللہ کا قرب حاصل کرتے ہیں۔ قرآن مجید ان کی ترجمانی کرتے ہُوئے کہتا ہے:۔

مانعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفیٰ۔	ہم ان بُتوں کو اس لئے پُوجتے ہیں تاکہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں"

مکّہ پر فوج کشی کا یہ مقصد نہ تھا کہ پیغمبرؐ اپنی مملکت کے حدود کو وسعت دیں اور فاتح و کشور کشا کہلائیں بلکہ اصل مقصد بُت پرستی کو مٹا کر توحید کا پرچم بلند کرنا تھا۔ چنانچہ مکّہ کو زیر نگیں کرنے کے بعد سب سے پہلے بتوں کی شکست و ریخت کی طرف توجہ فرمائی۔ حالانکہ اس موقع پر یہ اندیشہ تھا کہ قریش کے بُت پرستانہ جذبات بھڑک نہ اُٹھیں اور وُہ اپنے بتوں کی تذلیل و توہین دیکھ کر حملہ نہ کر دیں مگر پیغمبرؐ نے اپنے فرض منصبی کے سامنے اس خطرہ کو قابلِ اعتناء نہ سمجھا اور پہلے دیواروں پر بنی ہوئی فرشتوں اور نبیوں کی تصویروں کو مٹایا اور پھر حضرت علی کے ساتھ مل کر نیچے والے بتوں کو توڑا جب نیچے والے بُت توڑے جا چکے تو اوپر والے بُتوں کو توڑنے کے لئے حضرت علیؑ سے فرمایا کہ اے علی تم میرے کاندھوں پر بلند ہو کر بتوں کو توڑو گے یا میں تمہارے شانوں پر سوار ہو کر انہیں توڑوں عرض کیا کہ یا رسُول اللہ آپ میرے کاندھوں پر سوار ہو کر انہیں توڑیں۔ جب پیغمبر آپ کے کاندھوں پر سوار ہُوئے تو آپ نے کمزوری و ضعف کا احساس کیا۔ پیغمبرؐ آپ کے کاندھوں سے اُتر آئے اور فرمایا کہ اے علی تم میرے کاندھوں پر سوار ہو جاؤ۔ حضرت علیؑ دوشِ پیغمبرؐ پر بلند ہُوئے اور چھوٹے موٹے بتوں کے علاوہ ہبل کو جو آہنی میخوں سے گڑا ہوا تھا جھٹکا دے کر اکھاڑ لیا اور زمین پر اس طرح پھینکا کہ پاش پاش ہوگیا۔ قریش کے لئے یہ منظر کتنا عبرت خیز ہوگا کہ کل تک جس کے آگے پیشانیاں رگڑتے رہے تھے اور اُحد میں جس کی جے کے نعرے لگائے تھے آج اُس کے ٹکڑے پیغمبر کے قدموں میں پڑے ہُوئے عجز و بے بسی کی تصویر بنے ہُوئے تھے۔

حضرت علی اس صنم اکبر کو توڑنے کے بعد میزاب کی طرف سے نیچے اُترے اور مُسکراتے ہُوئے پیغمبرؐ سے کہا کہ یا رسُولؐ اللہ میں اتنی بلندی پر سے کُودا ہوں مگر ذرا چوٹ نہیں آئی۔ فرمایا: "رفعک محمّد و انزل بک جبرئیل" ۔ "اے علی چوٹ کیونکر آتی جبکہ محمّد نے تمہیں بلند کیا ہے اور جبرئیل امین نے تمہیں اُتارا ہے"۔ یہ تھی علی کی رفعت و بلندی کہ جن کے ہاتھوں سے کائنات کو اوج و عروج حاصل ہُوا ان کے کاندھوں کا سہارا لے کر بلند ہُوئے اور جن ہاتھوں سے لوحِ محفوظ کی بلندیوں سے قرآن اُترا انہی ہاتھوں سے سرزمین حرم پر اُترے۔ گویا یہ علی کی معراج تھی جو صاحب معراج کے کاندھوں پر ہوئی۔ خود حضرت کا ارشاد ہے:۔

لو شئت لنلت افق السماء "اگر میں چاہتا تو آسمان کی بلندیوں کو چُھو لیتا"۔ ع

یہ رُتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

اس موقع پر اور لوگ بھی موجود تھے جنہیں یہ کام سپُرد کیا جا سکتا تھا یا اس میں شریک کیا جا سکتا تھا مگر پیغمبر نے اس کارِ نبوت کی انجام دہی میں علیؑ کے علاوہ کسی کی شرکت گوارا نہ کی کیونکہ ایک علیؑ ہی تھے جو کبھی بتوں کے آگے نہ جُھکے تھے اور ہمیشہ معبُودِ حقیقی کے آگے سجدہ ریز رہے تھے۔ اور ان کے علاوہ دُوسرے افراد زندگی کے کسی نہ کسی دَور میں مورتیوں کی پُوجا کرتے رہے تھے۔ اگر انہیں بُت شکنی کا کام سپُرد کیا جاتا یا اس میں شریک کیا جاتا تو ممکن تھا کہ بتوں پر ہاتھ اُٹھانے سے گھبراتے اور انہیں توڑنے میں جھجک محسوس کرتے جیسا کہ اہلِ طائف نے مسلمان ہونے کے بعد خود اپنے ہاتھوں سے بتوں کو توڑنا گوارا نہ کیا۔ چنانچہ انہوں نے پیغمبرؐ کے دستِ حق پرست پر بیعت کرتے ہُوئے کہا کہ یا رسُولؐ اللہ ہمارے بُتخانہ کو ایک سال تک باقی رہنے دیا جائے اور رسُولؐ خُدا نے اسے منظور نہ کیا تو کہا کہ پھر ہم اپنے ہاتھوں سے اسے نہیں توڑیں گے کسی اور سے فرمائیے کہ وُہ اسے توڑے۔

یومِ غمیصاء

فتح مکّہ کے بعد پیغمبرِ اسلام ابھی مکّہ ہی میں تشریف فرما تھے کہ آپ نے اطراف و جوانب میں مختلف وفدوں کے بھیجنے کا اہتمام کیا تاکہ وُہ لوگوں کو اسلام کی تعلیمات سے آگاہ کر کے دعوتِ اسلام دیں۔ اس سلسلہ میں خالد ابن ولید کو تین سو پچاس افراد کی جمعیت کے ساتھ بنی جذیمہ کے پاس بھیجا اور انہیں تاکید کر دی کہ وُہ کسی پر ہاتھ نہ اٹھائیں اور نہ جنگ و قتال کریں بلکہ اپنا دائرۂ کار تبلیغِ اسلام تک محدود رکھیں۔ ابنِ سعد تحریر کرتے ہیں:۔

بعثہ الی بنی جذیمۃ داعیا الی الاسلام ولم یبعثہ مقاتلا۔ (طبقات۔ ج۲۔ ص۱۴۷)

"پیغمبرؐ نے خالد ابنِ ولید کو بنی جذیمہ کے پاس دعوتِ اسلام کے لئے بھیجا تھا ان سے جنگ و قتال کے لئے نہیں بھیجا تھا"۔

زمانہ قبلِ اسلام میں خالد کا چچا فاکہہ ابن مغیرہ اور عبد الرحمٰن کا باپ عوف یمن سے واپسی کے بعد بنی جذیمہ کے چند نوجوانوں کے ہاتھوں سے مارے گئے تھے۔ قریش نے انتقام کے لئے اُن پر چڑھائی کی مگر انہوں نے

خونبہا دے کر صلح صفائی کر لی اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ اب خالد کو وفد کی سربراہی کرتے ہوئے اُن کے ہاں جانے کا اتفاق ہُوا تو اُن کے انتقامی جذبات اُبھر آئے اور وُہ اپنے کو انتقام کشی سے باز نہ رکھ سکے۔ چنانچہ جب یہ وفد مکّہ سے دو منزل کے فاصلہ پر چاہ غمیصاء پر پہنچا تو وہاں اُتر پڑا۔ یہ کُنواں بنی جذیمہ کی ملکیت تھا جس کے آس پاس وُہ آباد تھے۔ جب انہوں نے خالد کو لشکر کے ہمراہ اپنے کنوئیں پر پڑاؤ ڈالے دیکھا تو انہیں یہ اندیشہ ہُوا کہ خالد کہیں جنگ نہ چھیڑ دیں، اُنہوں نے پیش بندی کرتے ہُوئے ہتھیار باندھ لئے اور لڑنے بھڑنے پر تیار ہو گئے۔ خالد نے انہیں ہتھیار باندھے دیکھا تو کہا تم کون ہو؟ کہا کہ ہم مسلمان ہیں ہم نے اپنی آبادی میں مسجد تعمیر کر رکھی ہے جس میں اذانیں دیتے اور نمازیں پڑھتے ہیں۔ خالد نے کہا کہ جب تم مسلمان ہو تو یہ ہتھیار کیوں باندھ رکھے ہیں؟ کہا کہ ہم نے یہ ہتھیار اس خیال سے باندھے ہیں کہ سابقہ عداوت کی بناء پر تم جنگ و قتال پر نہ اُتر آؤ۔ کہا کہ تم مطمئن رہو ہم جنگ نہیں کریں گے اور اپنے ہتھیار اُتار کر رکھ دو۔ انہوں نے کہا کہ:

لا ناخذ السلاح علی اللہ ولا علی رسولہ ونحن مسلمون۔	جب ہم مسلمان ہیں تو اللہ اور اس کے رسولؐ کے خلاف ہتھیار نہیں اُٹھائیں گے۔"

(تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ ص ۴۷)

یہ کہہ کر انہوں نے ہتھیار اُتارنا چاہے کہ اُن کے قبیلہ کے ایک شخص جحدم نے کہا کہ ہتھیار اُتارنے سے پہلے سوچ سمجھ لو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خالد ہتھیار اُتروانے کے بعد تمہاری مشکیں باندھے گا اور پھر تمہیں تہ تیغ کر دے گا۔ میں ہرگز ہتھیار نہیں اُتاروں گا۔ اور تمہیں بھی یہ مشورہ دُوں گا کہ اپنے ہتھیار نہ اتارو۔ لوگوں نے اسے سمجھایا بجھایا کہ کیوں اپنی اور اپنے قبیلہ کی تباہی کا سامان کرتے ہو۔ جنگ کا دَور ختم ہو چکا اب وُہ بھی مُسلمان ہیں، اور ہم بھی اسلام لا چکے ہیں پھر اپنوں سے خطرہ کیا اور اندیشہ کس بات کا۔ غرض سب نے ہتھیار اُتار کر رکھ دیئے خالد نے جب دیکھا کہ سب بے دست و پا ہو چکے ہیں تو اُنہوں نے اپنے ہمراہیوں کو جو زیادہ تر انہی کے قبیلہ کے تھے حکم دیا کہ سب کی مشکیں کس لو اور ہتھیار چھین لو۔ چنانچہ انہیں رسیوں میں جکڑ کر ان کے ہتھیار چھین لئے گئے اور پھر ایک ایک کر کے سب کو قتل کر دیا گیا۔ عبدالرحمٰن ابن عوف جو اس مہم میں شریک تھے خالد کے اس اقدام پر بہت بگڑے اور دونوں میں تکرار شروع ہو گئی۔ عبدالرحمٰن نے کہا:۔

عملت بامر الجاھلیۃ فی الاسلام فقال انما ثأرت بابیك فقال عبد الرحمٰن بن عوف کذبت قد قتلت قاتل ابی ولکنك انما ثأرت بعمك الفاکھۃ ابن المغیرۃ۔ (تاریخ طبری ج ۲۔ ص ۳۴۲)	تم نے زمانہ اسلام میں دَورِ جاہلیت کی حرکت کی ہے۔ خالد نے کہا کہ مَیں نے تمہارے باپ عوف کا انتقام لیا ہے۔ عبدالرحمٰن نے کہا تم جھوٹ کہتے ہو مَیں نے خود اپنے باپ کے قاتل کو قتل کیا تھا۔ تم نے اپنے چچا فاکہہ ابن مغیرہ کے خون کا بدلہ لیا ہے۔"

مورخ یعقوبی نے تحریر کیا ہے :-

قال عبد الرحمٰن ابن عوف واللہ لقد قتل خالد القوم مسلمین فقال خالد انما قتلتہم بابیک عوف ابن عبد عوف فقال لہ عبد الرحمٰن و لکنک قتلت بعمک الفاکہۃ ابن المغیرہ۔ (تاریخ یعقوبی۔ ج۲۔ ص۴۷)۔

عبد الرحمٰن ابن عوف نے کہا کہ خدا کی قسم خالد نے ان لوگوں کو تہ تیغ کیا جو اسلام لا چکے تھے۔ خالد نے اُن سے کہا کہ مَیں نے تمہارے باپ عوف کے انتقام میں انہیں قتل کیا ہے۔ عبد الرحمٰن نے کہا کہ ایسا نہیں ہے بلکہ تم نے اپنے چچا فاکہہ ابن مغیرہ کا انتقام لیا ہے"۔

جب پیغمبر اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بنی جذیمہ کے قتل کئے جانے کی خبر ہوی تو بہت صدمہ ہُوا اور قبلہ رُخ کھڑے ہو کر اور اپنے دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھا کر تین مرتبہ فرمایا

اللّٰھم انی ابرء الیک مما صنع خالد ابن الولید۔ (تاریخ طبری ج۳ ص۱۲۴)

خداوندا میں تیری بارگاہ میں خالد ابن ولید کے اس فعل سے اظہار بیزاری کرتا ہوں"۔

پھر حضرت علیؑ کو بُلا کر فرمایا کہ تم یمن سے آیا ہُوا مال لے کر بنی جذیمہ کے پاس چاہ غمیضاء پر جاؤ اور ایک ایک آدمی کا خونبہا ادا کرو اور اُن کا جو نقصان ہوا ہے اُس کی تلافی کرو۔ حضرت علیؑ اُن کے ہاں گئے مقتولین کے وارثوں کو اُن کا خونبہا دیا اور اُن کے تمام نقصانات کی تلافی کی۔ جب سب کا خونبہا ادا کر چکے تو پُوچھا کہ اب کسی کا کوی مطالبہ باقی نہیں رہا؟ کہا کہ اب ہمارا کوی مطالبہ نہیں ہے۔ فرمایا کہ ابھی میرے پاس کچھ مال بچ رہا ہے میں اسے واپس لے جانا نہیں چاہتا وُہ بھی تمہیں رسُول اللہ کی جانب سے دیتا ہوں جب خونبہا اور باقی ماندہ مال تقسیم کر چکے تو واپس تشریف لائے اور پیغمبر اکرمؐ سے تمام واقعہ بیان کیا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا:۔

فداک ابی و امی ما فعلت احب الی من حمر النعم۔ (تاریخ یعقوبی۔ ج۲۔ ص۴۷)

میرے ماں باپ تم پر فدا ہوں تم نے جو کچھ کیا ہے وُہ مجھے سُرخ بالوں والے اُونٹوں سے بھی زیادہ پسند ہے"۔

خالد ابن ولید کا یہ اقدام سراسر اسلامی تعلیمات کے منافی تھا۔ اسلام اس کا قطعاً روادار نہیں ہے کہ کافر کو بھی بلاوجہ قتل کیا جائے۔ بلکہ میدانِ جنگ میں اگر کوی کافر تلوار دیکھ کر کلمہ پڑھ لے تو اس پر بھی حملہ آور ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ چنانچہ اسامہ ابن زید نے ایک مہم میں ایک ایسے شخص کو قتل کر دیا جس نے تلوار کو دیکھ کر کلمہ پڑھ لیا تھا۔ جب آنحضرتؐ کو معلوم ہُوا تو اسامہ کو سرزنش کی۔ اسامہ نے کہا کہ اُس نے تو تلوار کے ڈر سے کلمہ پڑھا تھا۔ فرمایا: ھلا شققت قلبہ؟ "کیا تم نے اس کے دل کے اندر جھانک کر دیکھ لیا تھا؟" چہ جائیکہ جو مسجدیں تعمیر کرتے، اذانیں دیتے اور نمازیں پڑھتے ہوں ان سے فریب اور غلط بیانی سے ہتھیار رکھوائے جائیں اور پھر دورِ جاہلیت کے خون کا بدلہ لینے کے لئے ان کے خون سے ہولی کھیلی جائے۔ حالانکہ پیغمبرؐ نے فتح مکّہ کے موقع پر دورِ جاہلیت کے قتل کے

انتقام کو ختم کرتے ہوئے فرمایا تھا:۔

کل دم اوماثرۃ اومال یدعی تحت قدمی ھاتین۔ (تاریخ کامل۔ج۲۔ص۱۷۱)	زمانہ جاہلیت کے خون کا انتقام، قومی مفاخر اور خونبہا میں نے اپنے قدموں کے نیچے روند ڈالے ہیں"۔

اس موقع پر امیر المومنین ؑ نے نہ صرف یہ کہ پیغمبر ص کے حکم سے ایک ایک کا خونبہا ادا کیا بلکہ اُن کے حق سے زیادہ دے کر ان کی دلجوئی کی۔ اگر حضرت ؑ اس طرح ان سے ہمدردی و مواسات نہ کرتے اور اُن پر یہ واضح نہ کر دیتے کہ آنحضرت ؐ اس قتل و خونریزی سے قطعاً بری الذمہ ہیں تو کچھ بعید نہ تھا کہ وُہ لوگ جو ابھی تازہ مسلمان ہُوئے تھے اسلام ہی سے بدظن ہو جاتے اور دُوسروں کے دلوں میں بھی اسلام کی طرف سے بے اعتمادی پیدا کرتے۔ لیکن آپ نے خونبہا کے علاوہ بقیہ مال بھی انہی پر تقسیم کر کے اِن کے زخمی دلوں پر مرہم رکھا اور پُوری طرح سے اُن کی تسلّی و تشفی کی۔

غزوۂ حنین

فتح مکّہ کے موقع پر قریش نے پیغمبر اسلام کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تو تمام قبائل عرب پر مسلمانوں کی دھاک بیٹھ گئی اور ان میں سے اکثر نے اسلام کے دامن میں پناہ لے لی۔ لیکن بنی ہوازن و بنی ثقیف کی شوریدہ سری میں ذرا کمی نہ آئی اور بدستور دشمنی و عناد پر تلے رہے۔ بنی ہوازن کے ایک سردار مالک ابن عوف نصری نے بنی جشم و بنی نصر کو اپنے ساتھ ملا کر لشکر ترتیب دیا اور فیصلہ کُن جنگ کا تہیّہ کر لیا۔ بنی ثقیف جنہوں نے پیغمبر اکرم ؐ پر پتھر برسا کر انہیں طائف سے باہر نکالا تھا وُہ بھی اُن کے معاون و مددگار بن کر اٹھ کھڑے ہُوئے۔ مالک ابن عوف نے بنی سعد کو بھی پیغام بھیجا کہ وُہ مسلمانوں کے خلاف جنگ میں اُن کا ساتھ دیں۔ بنی سعد نے جنگ پر آمادگی ظاہر نہ کی اور کہا کہ محمد ؐ ہمارے قبیلہ میں پلے بڑھے ہیں ہم نہیں چاہتے کہ اُن کے مقابلہ میں صف آرا ہوں مگر ان پر زور دینے سے اُن کے کچھ آدمی شریک ہو گئے اور لشکر کی تعداد چار پانچ ہزار تک پہنچ گئی۔ مالک ابن عوف سپہ سالار اور ابو جرول علمبردار لشکر مقرر ہُوا۔ اور بال بچوں مویشیوں اور بھیڑ بکری کے ریوڑوں کو ساتھ لے کر بڑے زور و شور سے نکل کھڑے ہُوئے۔ اس لشکر میں عرب کا مشہور ماہر فنون حرب درید ابن صمہ بھی شامل تھا۔ اس کی عمر ایک سو بیس برس کی تھی اور چلنے پھرنے سے معذور تھا مگر اُسے ہودج میں بٹھا کر اس غرض سے ساتھ لے لیا تا کہ بروقت اس کے تجربہ و اصابت رائے سے فائدہ اُٹھایا جا سکے۔ جب لشکر نے وادیٔ اوطاس میں منزل کی تو اُس نے پُوچھا کہ یہ کون سی جگہ ہے اسے بتایا گیا کہ یہ وادیٔ اوطاس ہے۔ اس نے کہا کہ یہ جگہ گھوڑوں کی آمد و رفت اور حرب و پیکار کے لئے موزوں رہے گی اس لئے کہ یہ نہ زیادہ پتھریلی اور سخت ہے اور نہ زیادہ ریتلی اور نرم۔ اتنے میں اس کے کانوں میں بچّوں کے رونے جھینکنے اور بھیڑ بکریوں کے ممیانے کی آوازیں آئیں۔ اس نے مالک ابن عوف کو بُلا کر پُوچھا کہ یہ آوازیں کیسی ہیں اُسے بتایا گیا کہ عورتیں

بچے بھی ساتھ ہیں۔کہا کہ انہیں کیوں ساتھ لائے ہو؟ کہا کہ بال بچوں کے ساتھ ہوتے ہُوے کوی میدان چھوڑنے کا ارادہ نہ کرے گا۔ کہا کہ جب میدان سے قدم اُکھڑ جاتے ہیں تو پھر عورتوں اور بچوں کا خیال اُکھڑے ہُوے قدموں کو روک نہیں سکتا۔ دانشمندی کا تقاضا یہ تھا کہ تم عورتوں اور بچوں کو ساتھ نہ لاتے۔ اگر شکست ہوی تو ایسی ذلت و رُسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا جسے پُشتوں تک مٹایا نہ جاسکے گا۔ پھر پُوچھا کہ کیا بنی کعب اور بنی کلاب بھی تمہارے ساتھ ہیں؟ کہا کہ وُہ تو شریک نہیں ہُوے۔ کہا کہ اگر تمہارا بخت یاور ہوتا تو وُہ بھی شریک ہوتے۔ میری رائے یہ ہے کہ ہم اپنی بستیوں میں واپس چلے جائیں۔ اگر مسلمان ہم پر حملہ آور ہُوے تو ہم اپنا بچاؤ بھی کر سکیں گے اور جن قبیلوں نے ہمارا ساتھ نہیں دیا اس صُورت میں وُہ بھی ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ مالک نے اس کی رائے سے اتفاق نہ کیا۔ درید نے کہا کہ تم جانو اور تمہارا کام میں آئندہ تمہارے کسی کام میں دخل نہیں دُوں گا۔ مالک تو یہ چاہتا ہی تھا کہ وُہ کسی کام میں دخل نہ دے تاکہ جنگ جیتنے کی صورت میں کامیابی کو اس کی رائے کا نتیجہ نہ سمجھا جائے۔ چنانچہ اس نے ایک صائب رائے کو ٹھکراتے ہُوے لشکر کو آگے بڑھنے کا حکم دے دیا۔

جب پیغمبر اکرمؐ کو اطلاع ہُوی کہ بنی ہوازن و بنی ثقیف جنگ کے ارادہ سے اُٹھ کھڑے ہُوے ہیں تو آپ نے عبداللہ ابن ابی حدرد کو ان کی طرف بھیجا تاکہ اُن کی نقل و حرکت کی خبر لائیں۔ انہوں نے گھوم پھر کر تمام حالات کا جائزہ لیا اور پلٹ کر آنحضرتؐ کو خبر دی کہ دشمن جنگ کا ارادہ کر چکا ہے ہمیں اس کی پیشقدمی کو روکنے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمر کو بُلایا اور ابن ابی حدرد سے جو سُنا تھا اُس کا ذکر کیا۔ حضرت عمر نے کہا کہ ابن ابی حدرد کی بات کا اعتبار ہی کیا یہ جھُوٹ کہتا ہے۔ اس پر ابن ابی حدرد نے حضرت عمر سے مخاطب ہو کر کہا:

ان تکذبنی فطالما کذبت بالحق یا عمر۔ (تاریخ طبری۔ ج۳۔ صفحہ ۳۴۶)

اے عمر اگر تم مجھے جھٹلاتے ہو تو تم حق کو جھٹلانے کے خوگر رہ چکے ہو۔"

آنحضرتؐ نے ابن ابی حدرد کی اطلاع پر اعتماد کرتے ہُوے لشکر کو صف بندی کا حکم دیا۔ صفوان ابن امیہ سے جو ابھی تک مسلمان نہ ہُوا تھا ایک سو زرہیں اور دُوسرا سامان جنگ عاریۃً لیا اور ۶ شوال ۸ھ کو بارہ ہزار کے لشکر کے ساتھ نکل کھڑے ہُوے۔ ان بارہ ہزار میں دس ہزار تو وُہی مسلمان تھے جو مدینہ سے آپ کے ہمراہ آئے تھے اور باقی دُو ہزار مکّہ کے تازہ مسلمان تھے۔ مسلمانوں کی تعداد کفار کے لشکر سے تین گنا زائد تھی۔ اس کثرت نے بیشتر مسلمانوں میں ایک نخوت کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ چنانچہ حضرت ابوبکر نے لشکر اسلام کی کثرت و قوّت کو دیکھ کر برملا کہا کہ لن نغلب الیوم من قلۃ۔ "آج تعداد کی کمی کی بناء پر ہم شکست نہیں کھائیں گے۔" دشمن نے وادئ حنین میں پہنچ کر پہلے ہی سے دروں اور کھوؤں میں مورچے سنبھال لئے تھے۔ حنین مکّہ و طائف کے درمیان پھیلے ہُوے پہاڑوں کے اندر ایک وادی کا نام ہے جس میں ایک طرف مسطح و ہموار میدان ہے اور دُوسری طرف گہرے کھڈ، پُر پیچ گھاٹیاں اور دُشوار گزار کھائیاں تھیں۔ جب مسلمان صبح ہی صبح وادئ حنین میں پہنچے اور تنگ اور ڈھلوان راستوں سے ہوتے ہُوے آگے بڑھے تو دشمن نے کمینگاہوں سے نکل کر یکبارگی تیروں اور پتھروں کی بارش شروع کر دی۔ مسلمان اس ناگہانی حملہ کے لئے تیار نہ

تھے لشکر میں عام بھگدڑ مچ گئی۔ سب سے پہلے مقدمۃ الجیش نے راہِ فرار اختیار کی جس کے سربراہ خالد ابن ولید تھے جب عقب میں آنے والوں نے خالد کو اپنے دستۂ سپاہ کے ساتھ بھاگتے دیکھا تو وہ بھی بھاگ کھڑے ہوئے یہاں تک کہ ایک کو دوسرے کی خبر نہ رہی اور جدھر جس کا رُخ ہوا اُدھر نکل گیا۔ ابو قتادہ جو ان بھاگنے والوں میں شامل تھے بیان کرتے ہیں:۔

انھزم المسلمون وانھزمت معھم فاذا بعمر ابن الخطاب فی الناس فقلت ما شان الناس قال امر اللہ (صحیح بخاری۔ ج۳ ص۱۰۵)۔

مُسلمانوں نے راہِ فرار اختیار کی اور میں بھی اُن کے ساتھ بھاگ نکلا۔ اچانک مَیں نے ان لوگوں میں عمر ابن خطاب کو دیکھا تو کہا کیا ہو گیا ہے ان لوگوں کو۔ کہا کہ اللہ کی مرضی۔"

حدیث وسیر کی کتابوں میں تو اس فرار کا تذکرہ ہُوا ہی ہے خود قرآن مجید نے بھی اس پر واشگاف لفظوں میں تبصرہ کیا ہے:۔

ویوم حنین اذ اعجبتکم کثرتکم فلم تغن عنکم شیئا وضاقت علیکم الارض بما رحبت ثم ولیتم مدبرین۔

اور حنین کا دِن یاد کرو جبکہ کثرتِ تعداد نے تمہیں مغرور بنا دیا تھا مگر اس کثرت نے تمہیں کوئی فائدہ نہ پہنچایا اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی اور تم پیٹھ پھرا کر چل دیئے"۔

ابو سفیان نے مسلمانوں کو بھاگتے دیکھا تو کہا لا تنتھی ھزیمتھم دون البحر" ابھی کیا ہے یہ لوگ شکست کھا کر سمندر تک بھاگیں گے"۔ کلدہ ابن حنبل نے کہا: الابطل السحر الیوم "آج اسلام کا سحر ٹوٹ گیا ہے"۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ آج لات وہبل نے اپنی پامالی کا بدلہ لے لیا ہے۔ یہ لوگ اگرچہ لشکرِ اسلام میں شامل تھے مگر دل سے شریک نہ ہوئے تھے اور نہ ان سے یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ جنگ کا نقشہ بگڑنے کی صورت میں بیٹھ نہیں دکھائیں گے۔ مگر تعجب تو اس پر ہے کہ بیعتِ رضوان میں شریک ہونے والے اور موت پر پیمان باندھنے والے بھی ثابت قدم نہ رہ سکے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بارہ ہزار کا جم غفیر چھٹ گیا اور پیغمبرؐ کے پاس معدودے چند آدمی رہ گئے۔ ایک روایت کی بنا پر علی ابن ابی طالبؑ، عباس ابن عبد المطلب، ابو سفیان ابن حارث اور عبداللہ ابن مسعود صرف چار آدمی ثابت قدم رہے اور ایک روایت کی بنا پر دس آدمی باقی رہے۔ علی ابن ابی طالب، عباس ابن عبد المطلب، فضل ابن عباس، ابو سفیان ابن حارث، ربیعہ ابن حارث، عبداللہ ابن زبیر ابن عبد المطلب اور عتبہ و معتب پسران ابولہب اور ایمن ابن عبید۔ پیغمبر اسلام خچر پر سوار میدان میں کھڑے تھے عباس اور فضل آپ کے دائیں بائیں ایستادہ تھے، ابو سفیان عقب سے زین پکڑے ہوئے تھے اور حضرت علی پیغمبر کے سامنے تلوار سے دشمن کی یلغار روک رہے تھے اور باقی جانباز آنحضرت کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے تھے۔ دشمن کا زور بڑھتا جا رہا تھا۔ مالک ابن عوف پیغمبر پر حملہ کے ارادہ سے بڑھا، ایمن ابن عبید نے اس کا حملہ روکا اور دفاع کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔

تاریخ کا بیان ہے کہ قوتِ برداشت، صبر و تحمل اور اطمینان و ثبات قدم میں پیغمبر سے بڑھ کر کوئی دیکھنے میں نہیں آیا۔ اُس وقت آپ کی زبان پر یہ الفاظ تھے جو آپ کے اطمینان و سکون قلب کے ترجمان ہیں:۔

انا النبی لا کذب　　　انا ابن عبد المطلب

"میں نبی ہوں جس میں جھوٹ نہیں　　　میں عبد المطلب کا فرزند ہوں"

آپ نے مسلمانوں کو میدان چھوڑ کر جاتے دیکھا تو داہنی طرف اور بائیں طرف رُخ کر کے انہیں آواز دی: الیّ این یا عباد اللہ۔ "اے اللہ کے بندو کہاں جا رہے ہو؟" جب اس آواز پر کوئی پلٹتا نظر نہ آیا تو عباس سے کہا کہ چچا تم انہیں بلند آواز سے پکارو۔ عباس نے یا معشر الانصار یا اصحاب الشجرۃ۔ "اے گروہِ انصار اے بیعتِ رضوان میں شریک ہونے والو" کہہ کر انہیں پکارا۔ اس آواز پر کچھ لوگ پلٹے۔ حضرت علی نے انہیں اپنے پرچم کے نیچے جمع کیا اور دشمن پر حملہ آور ہونے کے لئے بڑھے۔ ادھر دشمن بھی جنگ کے لئے تیار تھا۔ دونوں فریق ایک دوسرے پر تلواریں لے کر ٹوٹ پڑے۔ جب تلواریں سروں سے ٹکرا کر چنگاریاں برسانے لگیں تو آنحضرت نے فرمایا:۔ الآن حمی الوطیس۔ "اب جنگ کا تنور گرم ہوا ہے"۔ بنی ہوازن کا علمبردار ابو جرول اونٹ پر سوار تھا۔ سیاہ پرچم کو لہراتا جوش میں رجز پڑھتا اور حملوں پر حملے کرتا ہوا آگے بڑھا۔ حضرت علیؑ اس کی تاک میں تھے عقب سے اس کے اونٹ کے پیروں پر تلوار ماری، اونٹ زمین پر گرا ابو جرول ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ آپ نے اس پر تلوار کا وار کیا اور اس کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ ابو جرول کا قتل ہونا تھا کہ دشمن کی رہی سہی ہمت ختم ہو گئی۔ قدموں کا جماؤ اُکھڑ گیا اور گرتے پڑتے بھاگ کھڑے ہوئے۔ دشمن کی صفوں کو منتشر ہوتے دیکھ کر وہ لوگ جو کونے کھدروں میں دبکے پڑے تھے پلٹ آئے اور سب نے مل کر دشمن کو تلوار کی باڑ پر رکھ لیا۔ کچھ قتل ہوئے کچھ اسیر کر لئے گئے۔ ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ چاشت کا وقت ہو گیا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اب ہاتھ روک لیا جائے اور اسیرانِ جنگ کو قتل نہ کیا جائے۔ مگر پیغمبرؐ کے روکنے اور منع کرنے کے باوجود دو اسیر قتل کر دیئے گئے۔ ان میں سے ایک ابن اکوع تھا جو فتح مکہ کے موقع پر بنی ہذیل کی طرف سے جاسوسی کا کام کرتا رہا تھا۔ حضرت عمر نے اسے بے دست و پا دیکھا تو ایک انصاری کو اشارہ کیا اس نے اسے قتل کر دیا اور دوسرا جمیل ابن معمر تھا۔ یہ بھی ایک انصاری کے ہاتھ سے مارا گیا۔ جب رسولِ خدا نے اس سے جواب طلبی کی تو اُس نے کہا کہ مجھے عمر ابن خطاب نے کہا تھا کہ اسے قتل کر دو۔ آنحضرت نے فرمایا کیا میں نے تمہیں اسیروں کے قتل کرنے سے منع نہیں کیا تھا اور پھر خفگی و ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے حضرت عمر کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ آخر کچھ دنوں کے بعد عمیر ابن وہب کے کہنے سُننے سے ان کی اس غلطی سے درگزر فرمایا۔ اسی طرح ایک عورت کے قتل پر آنحضرت کبیدہ خاطر ہوئے اور اس کی لاش دیکھ کر پوچھا کہ اسے کس نے قتل کیا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ خالد ابن ولید نے۔ آپ نے ایک آدمی سے کہا کہ خالد کے پاس جاؤ اور اُسے کہو:۔

ان رسول اللہؐ ینہاک ان تقتل امراۃ او ولیدا او عسیفا۔ (تاریخ کامل ج۲ ص۱۸۱)

"رسولِ خدا تمہیں عورتوں، بچوں اور مزدوروں کو قتل کرنے سے منع کرتے ہیں"۔

جنگ ختم ہو گئی مگر مسلمانوں نے کفار کا تعاقب جاری رکھا اور اُن کے چوپاؤں بھیڑ بکریوں اور دوسرے ساز و سامان کو اپنی تحویل میں لے لیا اور بقیۃ السیف میں سے ایک بڑی تعداد کو جن میں عورتیں بچّے بھی شامل تھے جنگی اسیر بنا لیا۔ آنحضرت نے بنی سعد کے ایک شخص بجاد کے بارے میں حکم دیا تھا کہ اسے جہاں پاؤ زندہ گرفتار کر لو۔ چنانچہ مسلمانوں نے اسے اور اس کے خاندان والوں کو گرفتار کر لیا۔ ان اسیروں میں پیغمبر اکرمؐ کی رضاعی بہن شیما بنت حارث بھی تھیں جب قیدیوں کے ساتھ ان پر بھی کچھ سختی ہوئی تو انہوں نے کہا مسلمانو! میں تمہارے رسُول کی دُودھ شریک بہن ہوں میں نے تمہارے رسُولؐ کو کھلایا انہیں لوریاں دیں اور میری ماں نے انہیں دُودھ پلایا ہے۔ مسلمانوں کو اس پر یقین نہ آیا۔ جب انہیں رسُولؐ اللہ کے سامنے پیش کیا گیا تو اُنہوں نے کہا یا رسُولؐ اللہ میں آپ کی بہن شیما بنت حلیمہ ہوں آپ نے ایک مرتبہ میری پُشت پر کاٹا تھا اُس کا نشان اب تک باقی ہے۔ آنحضرتؐ نے انہیں پہچان لیا اور اپنی ردا بچھا کر اُس پر بٹھایا۔ اور کہا کہ تم ہمارے ہاں رہنا چاہتی ہو یا اپنے قبیلہ کے پاس جانا چاہتی ہو انہوں نے اپنے قبیلہ کے ہاں جانا پسند کیا۔ آنحضرتؐ نے انہیں ایک غلام کچھ اُونٹ اور چند بکریاں دے کر عزّت و احترام سے رُخصت کر دیا۔

اس غزوہ میں چار مسلمان شہید ہُوئے ستّر کفار مارے گئے اور ہزاروں اسیر ہُوئے۔ مالِ غنیمت بھی بڑی کثیر مقدار میں حاصل ہُوا۔ اس میں چوبیس ہزار اُونٹ چالیس ہزار سے زائد بھیڑ بکریاں اور چالیس ہزار اوقیہ چاندی شامل تھی۔ مالِ غنیمت اور اسیروں کو وادیٔ جعرانہ میں بدیل ابن ورقا خزاعی کی نگرانی میں محفوظ کر دیا گیا۔ جو لوگ جان بچا کر نکل جانے میں کامیاب ہو گئے ان میں سے اکثر طائف میں چلے آئے سردار بنی ہوازن مالک ابن عوف بھی انہی میں شامل تھا۔ ایک گروہ وادی اوطاس میں چلا آیا اور کچھ لوگ نخلہ کی طرف چلے گئے۔

غزوۂ حنین مسلمانوں کے لئے ایک کڑی آزمائش تھا۔ انہوں نے شروع میں دشمن کے اچانک حملہ سے ہراساں ہو کر پسپائی کا مظاہرہ کیا اور کثرت و قوت کے غرور میں یہ نہ سوچا کہ دشمن کھوؤں اور دروں میں چھپا ہو گا اور بے خبری میں حملہ آور ہو سکتا ہے۔ اگر وُہ احتیاط برتتے اور دُشمن کی طرف سے غافل نہ رہتے تو نوبت وہاں تک نہ پہنچتی جہاں تک پہنچی۔ بیشک لشکرِ اسلام میں فتح مکّہ کے نتیجہ میں مسلمان ہونے والوں کی بھی ایک جمیعت تھی جو اسلام کی سربلندی کے لئے جان کا خطرہ مُول لینے کے لئے تیار نہ تھی مگر اکثریت تو انہی مسلمانوں کی تھی جو فتح مکّہ سے پہلے اسلام لا چکے تھے، اور پیغمبرؐ کے ہمرکاب رہ کر جنگوں میں شریک بھی ہو چکے تھے۔ مگر فتح مکّہ سے پہلے کے مسلمان ہوں یا بعد کے کسی نے بھی اسلام کی شکست میں کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ اگر اس موقع پر پیغمبر اکرمؐ اور اُن کے گنتی کے چند عزیز و اقارب بھی میدان سے ہٹ جاتے تو پھر ایسی شرمناک شکست ہوتی کہ سابقہ فتوحات پر بھی پانی پھر جاتا اور مسلمانوں کی جو دھاک قبائل عرب پر بیٹھ چکی تھی ایک دم ختم ہو جاتی۔

اس فتح و کامرانی میں سب سے زائد حصّہ حضرت علیؑ کا ہے جنہوں نے ایک لمحہ کے لئے بھی میدان سے ہٹنا گوارا نہیں کیا اور پیغمبر کے سینہ سپر بن کر دشمن کے حملوں کو روکتے رہے بلکہ انہی کے استقلال و ثبات قدم کی وجہ سے باقی نو

آدمیوں کے قدم جمے رہے کیونکہ ان میں سے کوی نہ ہمت و شجاعت میں آپ سے بڑھ کر تھا اور نہ آپ سے زیادہ حرب و ضرب کے معرکے جھیلے ہُوے تھا۔ اور انہی کے ثبات قدم سے متاثر ہو کر جانے والے واپس پلٹے اور پھر آپ ہی نے لشکر کفّار کے علمبردار کو قتل کر کے مسلمانوں کے حوصلے بلند کئے اور ستر مقتولین میں سے چالیس جنگجوؤں کو تہ تیغ کر کے ایک طرف اپنی شجاعت و پُر جگری کی دھاک بٹھائی اور دُوسری طرف اسلام کو نمایاں فتح و کامرانی سے ہمکنار کیا غرض اللہ کی تائید و نصرت پیغمبرؐ کے استقلال و استقامت اور علی مرتضےٰؑ کی جرأت و نبرد آزمائی سے مسلمانوں کو ہزیمت کے بعد سرخروئی حاصل ہوی اور پھر طاغوتی طاقتوں کو اُن کے مقابلہ میں جتھابندی کی جرأت نہ ہو سکی۔

محاصرۂ طائف

بنی ثقیف اور اُن کے سردار مالک ابن عوف نصری نے حنین سے بھاگ کر طائف میں پناہ لی اور سال بھر کا سامان رسد اور آلات حرب و ضرب جمع کر کے قلعہ بند ہو گئے۔ لشکر اسلام نے آنحضرتؐ کی سر براہی میں طائف کا رُخ کیا اور قلعہ کے سامنے پڑاؤ ڈال کر انہیں محاصرہ میں لے لیا۔ دونوں طرف سے تیروں کا تبادلہ ہوتا رہا مگر مسلمان کھلے میدان میں پڑے تھے اور کفار قلعہ بند ہونے کی وجہ سے بڑی حد تک محفوظ تھے۔ انہوں نے قلعہ کے اُوپر سے اس قدر تیر برسائے کہ کچھ مسلمان شہید ہو گئے اور بہت سے زخمی ہُوے۔ جب دُشمن کو زیر کرنے کی کوی صورت نظر نہ آئی تو سلمان فارسی نے منجنیق کے ذریعہ قلعہ کی دیوار پر سنگ باراں کرنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ منجنیق کے ذریعہ پتھر برسا کر قلعہ کی دیوار میں شگاف ڈال دیا گیا۔ جب مسلمانوں نے اس شگاف کے راستے سے قلعہ کے اندر داخل ہونا چاہا تو کفار نے دہکتی ہُوی آہنی سلاخیں اوپر سے پھینکیں۔ مسلمان مجبور ہو کر پیچھے ہٹے اور قلعہ کو سر کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

اسی دوران میں پیغمبر اکرم نے حضرت علی کو طائف کے گردو نواح میں جانے کے لئے کہا اور انہیں مامور فرمایا کہ جہاں کہیں بُتخانہ نظر آئے اسے مسمار کر دیں۔ حضرت علیؑ ایک دستۂ سپاہ کے ساتھ چل دیئے ابھی رات کی تاریکی چھٹنے نہ پائی تھی کہ قبیلہ بنی خثعم کی طرف سے گزر ہُوا انہوں نے مزاحمت کی اور اُن میں کا ایک نامور جنگجو آگے بڑھ کر مبارز طلب ہُوا۔ حضرتؑ نے اپنے ہمراہیوں سے کہا کہ تم میں سے کوی آگے بڑھ کر اسے ٹھکانے لگائے مگر کسی کو ہمّت نہ ہوی۔ جب کوی آمادہ نہ ہُوا تو آپ خود تیار ہُوے۔ ابو العاص ابن ربیع نے آپ کو تیار ہوتے دیکھا تو کہا کہ آپ ٹھہرئیے میں جاتا ہوں۔ فرمایا اب مجھے ہی جانے دو۔ اگر میں کام آگیا تو اس دستہ کے سربراہ تم ہو گے۔ یہ کہہ کر حضرت اس پر جھپٹے اور پہلے ہی وار میں اسے قتل کر دیا۔ بنی خثعم نے اُسے قتل ہوتے دیکھا تو پیچھے ہٹ گئے اور پھر کسی کو مقابلہ میں آنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ حضرتؑ نے قدم آگے بڑھایا اور بنی ہوازن و بنی ثقیف کا جو بھی بُتخانہ نظر آیا اُسے توڑ پھوڑ کر خاک میں ملا دیا۔ جب تمام علاقہ بُتوں سے پاک ہو گیا تو واپس پلٹے۔ پیغمبر اکرمؐ نے انہیں آتے دیکھا تو بلند آواز سے تکبیر کہی اور اُن کا ہاتھ پکڑ کر ایک گوشہ میں لے گئے اور دیر تک کچھ راز و نیاز کی باتیں کرتے رہے۔ کچھ لوگوں کو یہ رازدارانہ اندازِ گفتگو ناگوار ہُوا۔ کہنے لگے: لقد طال نجواہ مع ابن عمہ۔ آج تو ابن عم

سے سرگوشیوں کا سلسلہ دراز ہوگیا ہے"۔ حضرت عمر سے نہ رہا گیا تو انہوں نے رسول اللہ سے برملا کہہ دیا آپ علی سے خلوت میں باتیں کرتے ہیں اور ہمیں قریب بھی پھٹکنے نہیں دیتے۔ فرمایا:-

ما انتجیتہ ولکن اللہ انتجاہ۔	میں نے علی سے راز کی باتیں نہیں کی ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے کی ہیں"۔
(صحیح ترمذی، ص۲۷۴)	

انہی ایام محاصرہ میں نافع ابن غیلان بنی ثقیف کے چند سواروں کو لے کر قلعہ سے باہر نکلا۔ حضرت علی نے اس کا تعاقب کرکے طائف کی ایک وادی وج میں اُسے قتل کر دیا اُس کے قتل ہوتے ہی اُس کے ساتھی بھاگ کھڑے ہوئے اور پھر محصورین میں سے کسی کو باہر نکلنے کی جرأت نہ ہوسکی۔ اس عرصہ میں طائف کے اطراف میں رہنے والوں نے اسلام قبول کرلیا۔ اور بنی ثقیف کے چند غلام بھی قلعہ سے باہر نکل کر آزادی کے وعدہ پر مسلمان ہوگئے۔ مسلمانوں کو محاصرہ کئے بیس دن سے زائد ہوچکے تھے اور ابھی تک قلعہ فتح ہوتا نظر نہ آتا تھا۔ آنحضرت نے نوفل ابن معاویہ دئلی سے محاصرہ کے طویل ہونے کا ذکر کیا تو اس نے کہا کہ یا رسول اللہ لومڑی اپنے بھٹ میں گھس گئی ہے اگر انتظار کیا جائے تو اُسے پکڑا جاسکتا ہے۔ اور چھوڑ دیا جائے تو کسی ضرر کا اندیشہ بھی نہیں ہے۔ آنحضرت نے بنی ثقیف کو ان کی حالت پر چھوڑ کر محاصرہ اٹھا لینا مناسب سمجھا اور اعلان فرمایا کہ کل ہم یہاں سے چل دیں گے۔ چنانچہ دُوسرے دِن صحابہ نے محاصرہ اُٹھا لیا اور واپسی کے ارادہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ عیینہ ابن حصن فزاری نے جب مسلمانوں کو محاصرہ اُٹھاتے اور بنی ثقیف کو اپنے تحفظ میں کامیاب ہوتے دیکھا تو بنی ثقیف کو اچھے الفاظ سے یاد کیا جس پر ایک شخص نے کہا کہ تم سپاہِ اسلام میں شامل ہوتے ہوئے دشمن کی مدح و توصیف کرتے ہو۔ کہا:-

انی واللہ ما جئت لا قاتل معکم ثقیفا ولکنی اردت ان یفتح محمدؐ الطائف فاصیب من ثقیف جاریۃ۔ (تاریخ طبری ج۳ ص۳۵۵)	خدا کی قسم میں اس لئے نہیں آیا تھا کہ تمہارے ساتھ مل کر بنی ثقیف سے لڑوں بلکہ میری غرض یہ تھی کہ محمدؐ طائف کو فتح کرلیں گے تو میں بنی ثقیف کی کسی عورت کو کنیزی میں لے سکوں گا"۔

کچھ لوگوں نے کہا کہ یا رسول اللہ بنی ثقیف کے لئے بددُعا ہی کرتے جائیے۔ آنحضرت نے بددُعا کے بجائے یہ الفاظ فرمائیے:-

اللھم اھد ثقیفا وائت بھم۔	خدایا بنی ثقیف کو ہدایت فرما اور انہیں میرے پاس حاضر کر"۔
(تاریخ کامل ج۲۔ ص۱۸۱)	

پیغمبر اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دُعا کی قبولیت تھوڑے ہی عرصہ بعد ظاہر ہوگئی اور بنی ثقیف کا ایک نمائندہ وفد مدینہ میں آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوگیا اور کہا کہ یا رسول اللہ ہم اسلام قبول کرتے ہیں مگر ہماری یہ استدعا ہے کہ تین برس تک بنی ثقیف کے بُت لات کو توڑا نہ جائے۔ پیغمبر نے اسے منظور نہ کیا تو پھر دُو سال پھر ایک سال اور پھر ایک ماہ کے لئے کہا مگر پیغمبر نے ہر مرتبہ انکار کیا۔ کہا اگر آپ یہ نہیں مانتے تو کسی اور کو حکم دیجئے کہ وُہ

اُسے توڑے ہم اپنے ہاتھوں سے نہیں توڑیں گے۔ آنحضرت نے اسے منظور فرمایا۔ پھر کہنے لگے کہ یا رسُول اللہ ہمیں نماز سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ فرمایا: لاخیر فی دین لا صلوٰۃ فیہ۔ "جس دین میں نماز نہ ہو اس میں کوئی بھلائی نہیں۔ پھر انہیں تنبیہہ و تہدید کرتے ہوئے فرمایا:۔

لتسلمن او لابعثن رجلا منی (او قال) مثل نفسی فلیضربن اعناقکم ولیسبین ذراریکم ویاخذن اموالکم۔	تم اسلام قبول کرو ورنہ میں اس شخص کو جو مجھ سے ہے (یا یہ فرمایا) کہ جو مثل میرے نفس کے ہے تمہاری طرف بھیجوں گا جو تمہاری گردنیں مارے گا تمہارے بچّوں اور عورتوں کو اسیر کرے گا اور تمہارا مال و متاع چھین لے گا"۔
(استیعاب۔ ج۲۔ ص۴۶۴)	

حضرت عمر کہتے ہیں کہ میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ آنحضرت میرے بارے میں فرمائیں کہ وُہ یہ ہے مگر آپ نے حضرت علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر دُو مرتبہ کہا ھٰذا ھو ھٰذا ھو۔ "وُہ یہ ہے وُہ یہ ہے"۔

اس وفد نے پلٹ کر اپنے قبیلہ سے یہ تمام گفتگو نقل کی اور وُہ سب کے سب غیر مشروط طور پر حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔

اس مہم میں بھی امیر المومنینؑ دوسری مہموں کی طرح اپنی کارکردگی کے اعتبار سے ممتاز نظر آتے ہیں اور فریضۂ جہاد کے ساتھ فریضۂ تبلیغ کی انجام دہی میں بھی مستعد دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے محاصرہ کے دوران میں بنی ثقیف و ہوازن کے بتوں کو توڑا اور اطراف و جوانب کے لوگوں میں ذہنی تبدیلی پیدا کر کے انہیں اسلام کی پذیرائی کے لئے آمادہ کیا بنی خثعم کے ایک جنگجو کو قتل کر کے انہیں پسپا ہونے پر مجبور کیا اور نافع ابن غیلان کو تہ تیغ کر کے بنی ثقیف کے سواروں کو مار بھگایا اور آخر میں انہی کے نام سے مرعوب و متاثر ہو کر انہوں نے اسلام کے دامن میں پناہ لی۔

اس موقع پر امیر المومنینؑ کی فضیلت کے بعض پہلو بھی صبحِ درخشاں کی طرح عیاں ہیں۔ پیغمبرؐ نے انہیں راز کی گفتگو کا شرف بخشا جس کی اہمیت اسی سے ظاہر ہے کہ دُوسروں کے چیں بہ جبیں ہونے پر آنحضرتؐ نے اس کی نسبت اللہ کی طرف دی کہ علیؑ صرف میرے رازوں کے امین نہیں بلکہ اللہ کے رازوں کے بھی امین ہیں اور پھر انہیں اپنے نفس کے مانند قرار دے کر دوسروں پر ان کی فضیلت کو واضح کیا۔ کیونکہ جو مثل نفسِ رسُولؐ ہو گا اس کی فوقیت بھی اسی طرح ناقابلِ انکار ہو گی جس طرح خود رسُول اللہ کی فضیلت و فوقیت ناقابلِ انکار ہے۔

تقسیمِ غنائم

جب پیغمبر اکرمؐ طائف سے پلٹ کر ذی قعدہ کو وادیٔ جعرانہ میں قیام فرما ہوئے تو بنی ہوازن کا ایک وفد اسلام لا کر آپ کی خدمت میں حاضر ہُوا اور التجا کی کہ ہمارے اسیروں کو رہا کر دیا جائے۔ بنی سعد کے ایک رئیس زہیر ابن صرد نے کہا کہ یا رسُول اللہ ان قیدیوں میں آپ کی پھوپھیاں اور خالائیں ہیں جنہوں نے آپ کو گودیوں میں کھلایا ہے

اگرکسی سردارِ عرب نے ہمارے قبیلہ کی کسی خاتون کا دُودھ پیا ہوتا تو وہ یقیناً اس کا لحاظ کرتا اور حسنِ سلوک سے پیش آتا۔ آپ بھی ہم سے حسنِ سلوک کریں اور آپ سے بڑھ کر حسنِ سلوک کی کس سے اُمید کی جا سکتی ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ جب مسلمان جمع ہوں تو تم اُن سے قیدیوں کی رہائی کے بارے میں کہنا میں بھی اس موقع پر اپنے اور اولادِ عبدالمطلب کے حصّہ میں آنے والے اسیروں کی رہائی کا اعلان کر دوں گا۔ چنانچہ جب مسلمان نمازِ ظہر سے فارغ ہوئے تو اُن لوگوں نے کہا کہ اے مسلمانو رسُولِ خدا نے ہمارے قبیلہ کی ایک خاتون کا دُودھ پیا ہے تم ہمارے اسیروں کو چھوڑ دو۔ پیغمبرؐ نے فرمایا کہ میں اپنا اور بنی عبد المطلب کا حصّہ تمہیں بخشتا ہوں۔ مہاجرین و انصار نے کہا کہ ہمارا مال رسُولؐ اللہ کا مال ہے، ہم ان قیدیوں سے دستبردار ہوتے ہیں۔ البتہ اقرع ابن حابس عباس ابن مرداس اور عیینہ ابن حصن نے اس میں کچھ پس و پیش کیا۔ جب اسیر رہا ہوگئے تو آنحضرتؐ نے ارکانِ وفد سے مالک ابن عوف نصری کے بارے میں پُوچھا کہ وُہ کہاں ہے کہا کہ وُہ بنی ثقیف کے ہمراہ طائف میں مقیم ہے۔ فرمایا کہ مالک کو پیغام بھیجو کہ اگر وُہ یہاں آئے گا تو اس کے اہل و عیال واپس کر دیئے جائیں گے جب مالک کو یہ پیغام ملا تو وُہ چپکے سے راتوں رات نکل کھڑا ہُوا اور جعرانہ میں پہنچ کر خدمتِ رسُولؐ میں باریاب ہوگیا اور اسلام قبول کر لیا۔ پیغمبرؐ نے اس کا مال اور اس کے اہل و عیال اس کے سپرد کئے اور سو اُونٹ بھی عطا فرمائے۔

جب اسیرانِ ہوازن کو واپس کر دیا گیا تو مسلمانوں نے مالِ غنیمت کی تقسیم پر اصرار کیا اور کہا یا رسُولؐ اللہ اُونٹوں اور بھیڑ بکریوں کو ہمیں پر بانٹ دیجئے۔ پیغمبرؐ نے اجازت دی اور تقسیم شروع ہوگئی۔ آنحضرتؐ نے اپنے حصّہ خمس میں سے تازہ مسلمانوں کو ان کی دلجوئی اور تالیفِ قلب کے لئے سو سو اُونٹ دیئے۔ ابوسفیان اور اس کے دونوں بیٹوں معاویہ اور یزید کو بھی سو سو اُونٹ دیئے۔ ان کے علاوہ اقرع ابن حابس، عیینہ ابن حصن اور کچھ اور لوگوں کو بھی سو سو اُونٹ ملے اور کچھ لوگوں کو پچاس پچاس۔ اور عام طور پر ہر شخص کو چار اونٹ اور چالیس بکریاں دی گئیں۔ انصار کو بھی یہی کچھ ملا جس پر انہوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ آنحضرتؐ نے اپنے قوم و قبیلہ والوں سے ترجیحی سلوک کیا ہے حالانکہ ہم نے اس وقت دستِ تعاون بڑھایا جب اُن کا کوئی معاون و مددگار نہ تھا اور وُہ قریش ہی تھے جو اُن کی جان کے دشمن بنے ہُوئے تھے۔ آنحضرتؐ کے کانوں تک انصار کا شکوہ پہنچا تو انہیں جمع کر کے سمجھایا کہ ان لوگوں سے یہ برتاؤ محض اس لئے کیا گیا ہے تاکہ وُہ ثابت قدم رہیں اور بددل ہو کر اسلام سے برگشتہ نہ ہو جائیں۔ اے گروہِ انصار تم اس پر خوش نہیں ہو کہ ان کے ہمراہ اُونٹ اور بکریاں ہوں اور تمہارے ہمراہ اللہ کا رسُولؐ ہو۔ یہ سُننا تھا کہ انصار کی آنکھوں میں آنسُو آ گئے اور کہنے لگے کہ یا رسُولؐ اللہ ہم اس تقسیم پر بدل و جان راضی ہیں کہ اُن کے حصّہ میں مال دُنیا ہو اور ہمارے حصہ میں آپ ہوں آنحضرتؐ نے انصار کے اس رویّہ سے خوش ہو کر اُن کے اور اُن کی اولاد کے حق میں دُعائے خیر فرمائی۔

عباس ابن مرداس اسلمی بھی عام حصّہ سے زیادہ کا خواہشمند تھا اور اس نے چند شکوہ آمیز اشعار کہہ کر اس تقسیم پر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ ان میں سے دو شعر یہ ہیں ؎

وما کان حصن ولا حابس یفوقان مرداس فی المجمع

حصن اور حابس کسی بزم میں میرے باپ مرداس سے فائق نہ تھے۔"

وما کنت دون امرء منہما ومن تضع الیوم لا یرفع

اور نہ میں ان دونوں (عیینہ اور اقرع) سے پست ہوں آج جسے آپ گرائیں گے وُہ بلند نہ ہو سکے گا۔"

آنحضرتؐ نے فرمایا اقطعوا عنی لسانہ "اس کی زبان قطع کرو"۔ پیغمبرؐ کا مقصد یہ تھا کہ اسے کچھ اور دے کر اس کی زبان درازی ختم کی جائے۔ مگر وُہ یہ سمجھا کہ پیغمبرؐ نے اس کی زبان قطع کرنے کا حکم دیا ہے۔ وُہ یہ سزا سُن کر کانپ اُٹھا اور جب حضرت علیؑ نے اسے اپنے ہمراہ چلنے کے لئے کہا تو اس نے پُوچھا کہ آپ مجھے کہاں لئے جاتے ہیں؟ فرمایا رسُولؐ اللہ نے جو حکم دیا ہے اس پر عمل کرنے کے لئے۔ چنانچہ وُہ آپ کے ساتھ ہو لیا اور اس جگہ پر پہنچ کر جہاں غنیمت کے اُونٹ چر رہے تھے۔ آپ نے کہا کہ ان اُونٹوں میں سے اور اُونٹ لے کر سو کی تعداد پُوری کر لو اور مولفۃ القلوب میں شامل ہو جاؤ یا انہی چار اُونٹوں پر قناعت کر کے مہاجرین میں شامل رہو کہا کہ میرے پاس وُہی چار اُونٹ رہنے دیجئے۔ جو میرے حصہ کے ہیں میں یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ زیادہ اُونٹ لے کر مُولفۃ القلوب میں شمار ہونے لگوں۔

امیرالمومنینؑ نے اس کے سامنے دونوں صورتیں اور ہر صورت پر مرتب ہونے والا نتیجہ واضح کر کے اسے اختیار دے دیا کہ چاہے وُہ شرفِ ہجرت کو برقرار رکھے اور چاہے اس شرف سے دستبردار ہو کر اُونٹوں کی گنتی بڑھا لے اگر حضرتؑ کچھ کہے سُنے بغیر فوراً اُونٹ اُس کے حوالے کر دیتے تو اُسے مال کی طبعی محبّت میں یہ نہ سُوجھتا کہ یہ طمع اور حرص اسے کس پستی میں لئے جا رہی ہے۔ مگر حضرتؑ نے اس کے ضمیر کو جھنجوڑ کر اُسے یہ سوچنے کا موقع دیا کہ وُہ کون سی راہِ عمل اختیار کرے وُہ کہ جس میں بلندئ نفس برقرار رہتی ہے یا وُہ کہ جس میں عزّتِ نفس پامال ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اسی احساس دلانے کا یہ اثر تھا کہ اس نے بلندی سے پستی میں گرنے سے اپنے کو بچا لیا اور چند اُونٹوں کی خاطر مولفۃ القلوب میں شمار ہونا گوارا نہ کیا۔

اس تقسیم سے فارغ ہو کر پیغمبر اکرمؐ مکّہ میں تشریف فرما ہُوئے اور مناسکِ عمرہ بجا لائے۔ عتاب ابن اسید کو عاملِ مکّہ مقرر کیا اور معاذ ابن جبل کو قرآن و احکامِ شرعیہ کی تعلیم پر مامور فرمایا اور مکّہ سے روانہ ہو کر اوائل ذی الحجّہ میں مدینہ پہنچ گئے۔

یمن میں نشرِ اسلام

سنہ ۸ھ میں پیغمبر اکرمؐ نے خالد ابن ولید کو صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ تبلیغ اسلام کے لئے یمن روانہ کیا جہاں اُن لوگوں نے چھ مہینے قیام کیا۔ اور اس عرصہ میں وہاں کے باشندوں کو دعوتِ اسلام دیتے رہے مگر اُن کی تبلیغی کوششیں بار آور ثابت نہ ہوئیں۔ نہ کسی نے ان کی باتوں پر کان دھرا اور نہ کسی نے کوئی اثر لیا۔ براُ ابن عازب

جو اس جماعت میں شریک تھے وُہ کہتے ہیں:۔

بعث رسول اللہ خالد ابن الولید	رسُولؐ خدا نے خالد ابن ولید کو اہل یمن کی طرف بھیجا
الیٰ اھل الیمن یدعوھم الی	تاکہ انہیں اسلام کی دعوت دیں۔ ان کے ساتھ
الاسلام فکنت فیمن سار معہ	جانے والوں میں مَیں بھی شامل تھا۔ وُہ چھ
فاقام علیہ ستۃ اشھر لا	مہینے وہاں ٹھہرے مگر کسی نے ان کی کوی
یجیبونہ الیٰ شئ۔ (تاریخ طبری ج۲ ص۳۸۹)	بات نہ مانی۔"

پیغمبر اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب اس تبلیغی مشن کی ناکامی کا علم ہوا تو آپ نے علی ابن ابی طالبؑ کو اس فریضہ کی انجام دہی کے لئے بھیجا۔ اور فرمایا کہ خالد اور اُن کے ہمراہیوں کو واپس بھیج دو اور اگر کوی اپنی مرضی سے تمہارے ساتھ رہنا چاہے تو وُہ رہ جائے۔ براء ابن عازب کہتے ہیں کہ مَیں نے واپس آنے کے بجائے حضرت کے ساتھ رہنا پسند کیا۔ جب اہل یمن کو یہ اطلاع ہوی کہ خالد اور اُن کے ہمراہی واپس جا رہے ہیں اور حضرت علیؑ ایک داعی و مبلغ کی حیثیت سے آئے ہیں تو وُہ سب ایک جگہ پر جمع ہو گئے۔ حضرت علیؑ نمازِ صبح سے فارغ ہو کر ان کے ہاں گئے اور رسُولؐ خدا کا خط جو اہلِ یمن کے نام تھا پڑھ کر سُنایا۔ اس کے بعد اسلام کے محاسن پر ایک خطبہ دیا۔ اس کا یہ اثر ہُوا کہ جو لوگ خالد کی چھ ماہ کی تبلیغ سے ٹس سے مس نہ ہُوئے تھے اسلام کی خوبیوں کے معترف ہو کر حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ مورّخ طبری نے تحریر کیا ہے:۔

اسلمت ھمدان کلھا فی یوم واحد	تمام قبیلۂ ہمدان ایک ہی دن میں مُسلمان
(تاریخ طبری۔ ج۲۔ ص۳۹۰)	ہو گیا۔"

حضرت علیؑ نے پیغمبرؐ اکرم کو قبیلۂ ہمدان کے اسلام لانے کی اطلاع دی تو آنحضرتؐ سجدۂ شکر بجالائے اور تین مرتبہ فرمایا: السّلام علےٰ ھمدان "ہمدان پر میرا اسلام ہو"۔

جنگ صفین میں یہ قبیلۂ ہمدان حضرت علیؑ کا بازوئے شمشیر زن تھا اور آپ نے ان کی جانفشانیوں اور معرکہ آرائیوں کو دیکھ کر فرمایا تھا:۔

ولو کنت بوابا علی باب جنۃ لقلت لھمدان ادخلوا بسلام

اگر میں جنّت کے دروازہ کا دربان ہوتا تو قبیلۂ ہمدان سے کہتا کہ سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔"

قبیلہ ہمدان کے اسلام لانے کے بعد یمن میں اسلام کی ترقی و فروغ کی راہیں کھُل گئیں لوگ جوق در جوق دائرۂ اسلام میں داخل ہونے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے کفر کی گھٹائیں چھٹ گئیں۔ آفتابِ ہدایت کی درخشندگیوں سے ظلمت کدۂ کفر میں اُجالا ہو گیا۔ ہر طرف توحید کی صدائیں گونجنے لگیں اور نسیم ایمان کے جھونکوں سے دل و دماغ تر و تازہ ہو گئے۔

❁ ❁ ❁

امارتِ یمن

حضرت علیؑ کی یک روزہ تبلیغ سے گو اہلِ یمن مسلمان ہو گئے مگر ابھی اسلام کے تعلیمات سے پوری طرح باخبر نہ ہوئے تھے اس لئے ضرورت تھی کہ انہیں حلال و حرام کی تعلیم دی جائے واجبات و محرمات بتائے جائیں اور اسلامی نقطۂ نظر سے ان کے مقدمات فیصل کئے جائیں۔ آنحضرتؐ نے ان امور کو سرانجام دینے کے لئے حضرت علیؑ کو دوبارہ یمن جانے کا حکم دیا۔ اس اہم منصب کے لئے ذہن رسا فکر بلند اور تجربہ و مہارت کی ضرورت ناقابلِ انکار ہے۔ حضرت علیؑ کی ذہنی و فکری بلندی سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا مگر سرزمین حجاز سے باہر نکل کر اس طرح کے کام کا پہلا تجربہ تھا اس لئے اس عظیم ذمہ داری کے قبول کرنے میں کچھ متردّد ہوئے اور پیغمبر اکرمؐ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ابھی میرا سن زیادہ نہیں ہے اور اس قسم کے کاموں سے نہ سابقہ پڑا ہے اور نہ ہی تجربہ ہے کیا کسی مشیرِ کار کے بغیر اس مہم کو سر کر لوں گا۔ آنحضرتؐ نے اپنا ہاتھ علیؑ کے سینہ پر رکھا اور فرمایا:-

اللّٰھم اھد قلبہ وسدد لسانہ — اے اللہ علیؑ کے دل کو ہدایت آشنا اور زبان کو عیب و غلطی سے پاک رکھ۔ (استیعاب۔ ج۳۔ ص۳۶)

حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد مجھے دو شخصوں کے درمیان فیصلہ کرنے میں کبھی شک و تردّد لاحق نہیں ہوا اور یقین و خود اعتمادی کا جوہر میرے اندر پیدا ہو گیا۔

اس موقع پر مہاجرین و انصار اور صحابہ کبار موجود تھے مگر پیغمبرؐ نے حضرت کو جوانی کی منزل میں ہونے کے باوجود امارتِ یمن کے لئے نامزد کیا۔ اس سلسلہ میں نہ کسی سے مشورہ لیا اور نہ کسی کی رائے دریافت کی اس لئے کہ پیغمبرؐ کو اعتماد و وثوق تھا کہ علیؑ اس منصب کے سزاوار ہیں اور جو کام انہیں سپرد کیا گیا ہے اُسے باحسن وجوہ سرانجام دیں گے۔ اسی اعتماد کی بنا پر پیغمبرؐ نے انہیں اپنی زندگی میں بھی امورِ اُمت کے حل و انصرام اور فصلِ قضایا کا کام سپرد کیا اور زندگی کے بعد کے لئے بھی ان امور کی انجام دہی آپ سے متعلق کر گئے۔ چنانچہ پیغمبر اکرمؐ کا ارشاد ہے:-

تبین لامتی ما اختلفوا فیہ بعدی۔ (مستدرک حاکم۔ ج۳۔ ص۱۲۲) — (اے علیؑ) تم میرے بعد میری اُمت کے باہمی اختلافات کا تصفیہ کرو گے۔

اگر امامتِ صلوٰۃ کو خلافت کی دلیل قرار دیا جا سکتا ہے تو امارتِ یمن سے حضرت علیؑ کے استحقاقِ خلافت پر کیوں دلیل قائم نہیں ہو سکتی جبکہ امامتِ نماز اور قیادتِ اُمت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اور امارت و خلافت کے فرائض ایک سے ہیں۔ چنانچہ اسلامی تمدن کا تحفظ مملکت کا نظم و انضباط اور فصلِ قضایا ایسے امور ہیں جو امارت سے بھی وابستہ ہیں اور خلافت سے بھی۔ لہذا جسے امارت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کا اہل قرار دیا تھا اُسے ہی خلافت کا اہل سمجھا جا سکتا ہے۔

سریہ وادی الرمل

وادی الرمل میں کچھ لوگوں نے جمع ہو کر مدینہ پر شبخون مارنے کا منصوبہ بنایا ابھی وہ مناسب موقع کی تلاش میں تھے کہ ایک شخص کے ذریعہ پیغمبر اکرمؐ کو اس کی اطلاع ہو گئی۔ یہ لوگ منظم اور باقاعدہ فوج کی صورت میں نہ تھے بلکہ راہزنوں اور قزاقوں کا ایک جتھا تھا جو قتل و غارت اور لوٹ مار کے لئے جمع ہو گیا تھا۔ آنحضرتؐ نے انہیں پراگندہ و منتشر کرنے کے لئے حضرت ابوبکر کو علم دے کر ایک دستہ سپاہ کے ساتھ اُن کے تعاقب میں بھیجا۔ جب یہ دستہ وادی الرمل میں پہنچا تو وہ کمین گاہوں چھپ گئے۔ مسلمانوں نے اِدھر اُدھر دیکھا بھالا مگر اُن میں سے کوئی دکھائی نہ دیا۔ مسلمانوں نے یہ سمجھا کہ وہ سپاہِ اسلام کو دیکھ کر یہاں سے چل دیئے ہیں۔ مسلمان تھکے ماندے تو تھے ہی رات بسر کرنے کے لئے وہیں پر اُتر پڑے۔ دشمن کی طرف سے مطمئن تو تھے ہی پڑ کر سو گئے۔ ابھی سوئے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ دشمن نے کمینگاہوں سے نکل کر اچانک حملہ کر دیا۔ سب ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے۔ ہتھیار ٹٹولے اور پھر سنبھل کر کچھ دیر لڑے مگر نتیجہ میں کچھ مارے گئے کچھ زخمی ہوئے اور کچھ بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان لوگوں کی واپسی پر آنحضرتؐ نے حضرت عمر کو علم دے کر بھیجا۔ دشمن کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے اُن نے فوج کو آتے دیکھا تو کمینگاہوں سے نکل کر حملہ آور ہوئے اور اس طرح تابڑ توڑ حملے کئے کہ مسلمانوں کے قدم اُکھڑ گئے۔ ان دو ہزیمتوں کے بعد عمرو ابن عاص نے پیغمبر اکرمؐ سے کہا کہ یا رسول اللہ مجھے اجازت دیجئے کہ میں دشمن کی سرکوبی کے لئے جاؤں۔ آنحضرتؐ نے اُن کی خواہش پر انہیں سردارِ لشکر بنا کر بھیجا مگر نتیجہ وہی ہوا جو اس سے پہلے ہو چکا تھا۔ ان پے درپے ہزیمتوں کے بعد آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ کو سالارِ لشکر بنا کر بھیجا اور ہزیمت خوردہ لوگوں کو بھی اُن کی سپاہ میں شامل ہونے کا حکم دیا۔ حضرت علیؑ نے پہلے تو یہ کیا کہ وہ راستہ تبدیل کر دیا جس راستے سے پہلے لوگ گئے تھے اور پھر دن کا قیام اور رات کا سفر اختیار کیا اور خاموشی سے آگے بڑھتے ہوئے اچانک دشمن کے سر پر پہنچ گئے۔ ابھی سورج کی کرنوں نے پہاڑوں کی بلند و بالا چوٹیوں کو چھوا نہ تھا کہ اُن کے سروں پر تلواریں چمکنے لگیں۔ دشمن اس ناگہانی حملہ کی تاب نہ لا کر بھاگ کھڑا ہوا اور مسلمان فتح کا پرچم لہراتے ہوئے مدینہ کی طرف چل دیئے۔ پیغمبر اکرمؐ نوید فتح سن کر مدینہ سے باہر استقبال کے لئے نکلے اور فتح و کامرانی پر اظہارِ مسرت کے بعد فرمایا:۔

یا علی لولا انی اشفق ان تقول	اے علیؑ اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ میری اُمت
فیك طوائف من امتی ماقالت	کے کچھ لوگ تمہارے بارے میں وہ کہیں گے
النصاریٰ فی المسیح عیسیٰؑ	جو عیسائی حضرت عیسٰی ابن مریمؑ کے بارے میں کہتے
ابن مریم لقلت فیك الیوم	ہیں تو میں تمہارے بارے میں وہ بات کہتا کہ تم
مقالا لاتمر بملاء من الناس الا	جدھر سے ہو کر گزرتے لوگ تمہارے قدموں کے
اخذوا التراب من تحت قدمیك	نیچے کی مٹی تک اُٹھاتے۔"

(ارشاد القلوب ج ۲ ص ۳۹)

اس مہم کی کامیابی حضرت علیؑ کے تدبّر اور جنگی سُوجھ بُوجھ کا نتیجہ تھی۔ انہوں نے سابقہ مہموں کی ناکامی کے وجوہ و اسباب پر نظر کی اور وُہ طریقہ اختیار کیا جس کے نتیجہ میں کامیابی کی صورت بآسانی نکل سکتی تھی۔ پہلی مہم نے سُستی و غفلت سے کام لیا اور دُشمن کی قیام گاہ پر پہنچ کر یہ خیال نہ کیا کہ وُہ یہیں آس پاس چُھپے ہوں گے۔ وُہ پہلے چُھپنے کی جگہوں کو دیکھتے اور پھر سب کے سب سو نہ جاتے بلکہ کچھ سوتے اور کچھ جاگتے تاکہ بروقت دشمن کے حملہ کو روک سکتے۔ مگر اس طرف توجہ نہ دی گئی اور آخر اس غفلت کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ اور دُوسری اور تیسری سپاہ سے یہ غلطی ہوی کہ اس نے وُہی عام راستا اختیار کیا جس پر دُشمن کی نگاہیں برابر لگی رہتی تھیں۔ امیر المومنینؑ نے جہاں راستا تبدیل کیا وہاں سفر کے اوقات بھی بدل دیئے اور اس وقت حملہ کیا جب دُشمن مطمئن اور اس کی آنکھوں میں رات کی نیند کا خمار باقی تھا تاکہ دُشمن کو سنبھلنے سے پہلے جکڑ لیا جائے۔ اگر آپ بھی وہی طریقِ کار اختیار کرتے جو پہلے اختیار کیا جاتا رہا تھا تو پھر اس آسانی سے کامیابی نہ ہوتی۔

سریۂ بنی طے

فتح مکّہ کے بعد خانہ کعبہ سے بُتوں کا صفایا ہو چکا تھا۔ غزوۂ طائف کے دَوران بنی ثقیف و بنی ہوازن کے بُت توڑے جا چکے تھے اور مختلف قبیلوں اور علاقوں کے صنم کدے ویران ہو چکے تھے مگر بنی طے کا بت خانہ ابھی جوں کا توں باقی تھا جس میں فلس نام کا ایک بُت اُن کی عقیدت و ارادت کا مرکز تھا۔ پیغمبر اکرمؐ نے اُسے بھی منہدم کرنے کا ارادہ کیا اور ربیع الآخر ۹ھ میں حضرت علیؑ کو بنی طے کی بستیوں کی طرف بھیجا تاکہ اُن کے بُت خانہ کو مسمار کریں اور صنم پرستی کی زنجیروں میں جکڑے ہُوے انسانوں کو خدائے واحد کی پرستش کی دعوت دیں۔ حضرت علیؑ نے ڈیڑھ سو انصار کی جمعیت کے ساتھ بنی طے کی بستیوں کا رُخ کیا۔ بنی طے کا سردار عدی ابن حاتم لشکرِ اسلام کی آمد پر اپنے اہل و عیال کو لے کر شام کی طرف نکل گیا اور وہاں پناہ لے لی۔ حضرتؑ نے محلہ آلِ حاتم پر حملہ کر کے اُن کے بتخانہ کو پیوند زمین کر دیا۔ اس بُتخانہ سے تین قیمتی زرہیں اور تین تلواریں رسوب، مخذم اور یمانی دستیاب ہوئیں ان میں سے رسوب اور مخذم عرب کی مشہور تلواریں تھیں جنہیں حارث ابن ابی شمر نے بتخانہ کی نذر کیا تھا۔ اس کے علاوہ بہت سا مالِ غنیمت چند اسیر اور بھیڑ بکریوں کے ریوڑ مسلمانوں کے ہاتھ لگے۔ حضرت علیؑ نے کچھ مالِ غنیمت شرکاءِ مہم پر حصہ رسدی تقسیم کر دیا اور بقیہ مال غنیمت اور اسیروں کو لے کر آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ ان اسیروں میں حاتم کی بیٹی سفانہ بھی تھی جسے مسجد سے متصل ایک جگہ جہاں کنیزیں ٹھہرائی جاتی تھیں ٹھہرایا گیا۔ انہی ایام میں پیغمبرؐ ادھر سے ہو کر گزرے تو اُس نے کہا کہ یا رسُولؐ اللہ میرا باپ مر چکا ہے اور کوی پرسان حال نہیں ہے۔ مجھ پر احسان کیجئے اور مجھے چھوڑ دیجئے خدا آپ کو اس احسان کا بدلہ دے گا۔ فرمایا تم کون ہو؟ کہا میں عدی ابن حاتم کی بہن سفانہ ہوں۔ فرمایا وہی عدی جو اللہ اور اُس کے رسُولؐ سے مُنہ موڑ کر چل دیا ہے اور یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے۔ دُوسرے دن پھر گزر ہوا تو اس نے رہائی کی التجا کی آپ نے وہی جواب دیا جو پہلے دے چکے تھے اور آگے نکل گئے۔ سفانہ کہتی

ہے کہ اب مجھے رہائی سے نااُمیدی ہوگئی۔ تیسرے دن جب رسُول اللہ اُدھر سے گزرنے لگے تو مجھے کچھ کہنے کی ہمّت نہ ہوئی کیونکہ دو دفعہ میری التجا کو ٹھکرایا جا چکا تھا۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ کچھ عرض کروں یا خاموش رہوں کہ آنحضرت کے عقب سے ایک شخص نے مجھے اشارہ کیا کہ میں پیغمبرؐ سے رہائی کے بارے میں پھر کہوں۔ میری ہمّت بندھی اور میں نے کھڑے ہو کر عرض کیا کہ یا رسُولؐ اللہ مجھے میری قوم میں رسوا نہ کیجئے۔ میں بنی طے کے سردار حاتم کی بیٹی ہوں میرا باپ فیاض اور سخی تھا۔ قیدیوں کو چھڑانا، بھوکوں کو کھانا کھلانا اور حاجتمندوں کی حاجت روائی کرنا اس کا کام تھا۔ فرمایا کہ اسے آزاد کر دیا جائے۔ یہ اس باپ کی بیٹی ہے جو کریم اور بلند اخلاق کا مالک تھا۔ پھر سفانہ کی طرف متوجّہ ہو کر فرمایا کہ تم چند دن صبر کرو جب قابلِ اعتماد لوگ مل جائیں گے تو تمہیں ان کے ساتھ بہ حفاظت تمہارے عزیزوں تک پہنچا دیا جائے گا۔ سفانہ کہتی ہے کہ مَیں نے لوگوں سے دریافت کیا کہ وُہ کون تھا جس نے مجھے اشارہ کیا تھا کہ میں پیغمبرؐ سے پھر درخواست کروں مجھے بتایا گیا کہ وُہ ابنِ عمِ رسُولؐ علیؑ ابنِ ابی طالبؑ تھے۔ چند دنوں کے بعد بنی قضاعہ کا ایک قافلہ مدینہ آیا سفانہ نے پیغمبر اکرمؐ سے عرض کیا کہ مجھے ان کے ساتھ جانے کی اجازت دی جائے پیغمبرؐ نے اس کے لئے زاد و راحلہ کا سر و ساماں کیا اور چند پارچے دے کر اُسے اُن لوگوں کے ساتھ روانہ کر دیا

جب سفانہ اپنے بھائی عدی کے پاس شام پہنچی تو پہلے اس سے شکوہ کیا کہ تم مجھے تنہا چھوڑ کر یہاں چلے آئے اور پھر حضرت علیؑ کے اشارہ کا جس کے نتیجہ میں رہائی نصیب ہُوئی تھی اور پیغمبر اکرمؐ کے حُسنِ سلوک کا ذکر کر کے کہا کہ میری رائے یہ ہے کہ تم جلد اُن کی خدمت میں پہنچ جاؤ۔ اگر وُہ نبی ہیں تو تمہیں ایمان لانے والوں کی صفِ اوّل میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہو گا۔ اور اگر وُہ بادشاہ ہیں تو تم اُن کے قرب سے دنیوی عزّ و وقار حاصل کر سکو گے عدی کہتا ہے کہ مجھے یہ رائے پسند آئی اور میں مدینہ کے لئے روانہ ہو گیا۔ جب مسجد نبوی میں آنحضرتؐ کی خدمت میں باریاب ہوا تو عرض کیا کہ میں عدی ابن حاتم ہوں۔ آنحضرتؐ میری آمد پر خوش ہُوئے اور مجھے ساتھ لے کر گھر کی طرف چل دیئے۔ راستے میں ایک ضعیفہ کے کہنے پر ٹھہر گئے اور دیر تک اس کی داد فریاد سُنتے رہے مَیں نے دِل میں کہا کہ ایسا آدمی جس میں ذرا سا شاہانہ رکھ رکھاؤ اور خو بو نہ ہو وُہ بادشاہ نہیں ہو سکتا۔ اور جب میں اُن کے ہمراہ گھر میں داخل ہوا تو میرے لئے اپنی مسند بچھا دی اور خود زمین پر بیٹھ گئے۔ مَیں نے پھر اپنے دِل میں کہا کہ یہ طرزِ عمل بھی شاہوں کا طرزِ عمل نہیں ہے۔ ابھی میں ذہنی طور پر کوئی فیصلہ نہ کر سکا تھا کہ آنحضرتؐ نے فرمایا اے عدی تم غنائم میں سے چوتھا حصّہ لیتے ہو حالانکہ تمہارے مذہب عیسوی میں اس کی اجازت نہیں ہے۔ شاید تم اس لئے اسلام سے گریزاں ہو کہ ہمارے ہاں غربت ہے اور گرد و پیش دشمنوں کی کثرت ہے۔ مگر یہاں بھی مال کی اتنی فراوانی ہو گی کہ ڈھونڈے سے بھی کوئی لینے والا نہ ملے گا عورتیں گھروں سے تن تنہا زیارت بیت اللہ کے لئے آئیں گی اور انہیں کوئی خطرہ نہ ہو گا اور تم سُنو گے کہ بابل کے قصرِ ابیض مفتوح ہو کر مُسلمانوں کی جولانگاہ بن گئے ہیں۔

عدی نے اپنی آنکھوں سے اس خلق مجسّم کے اخلاق و اطوار دیکھے اور دل میں اُتر جانے والی باتیں سنیں تو اُسی وقت آپ کے ہاتھوں پر بیعت کر کے مُسلمان ہو گیا اور پھر امیر المومنینؑ کے اصحاب مخلصین میں شامل ہو کر جمل و صفین

اور نہروان کے معرکوں میں آپ کے ہمرکاب رہا۔

غزوہ تبوک

شام کے ایک کاروانِ تجارت کے ذریعہ مدینہ میں یہ خبر پھیل گئی کہ قیصر روم ہرقل مدینہ پر فوج کشی کا ارادہ کر رہا ہے اور عیسائی قبائل بنی غسان بنی لخم بنی جذام اور بنی عاملہ اس کے پرچم کے نیچے جمع ہو گئے ہیں اور بنی غسان نے اپنی مملکتِ شام کو چھاؤنی قرار دے کر روم و شام کی فوجوں کو جمع کر لیا ہے اور مقدمۃ الجیش بلقاء کے حدود تک پہنچ چکا ہے۔ آنحضرتؐ نے ان اطلاعات کی بنا پر مقابلہ کی تیاریاں شروع کر دیں اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ دشمن کی پیشقدمی کو روکنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ مسلمانوں نے اب تک جتنی جنگیں لڑی تھیں وہ اندرونِ ملک تک محدود تھیں اور کسی بیرونی غنیم سے مقابلہ کی نوبت نہ آئی تھی۔ اور یہ جنگ نہ صرف بیرونِ ملک لڑی جانے والی تھی بلکہ اس دور کی سب سے بڑی شہنشاہیت سے تھی جس کی فتوحات کا سلسلہ فارس تک پہنچا ہوا تھا۔ انہوں نے پیغمبرؐ کا حکم سُنا تو جوش و سرگرمی کے بجائے افسردگی و بددلی کا مظاہرہ کیا۔ اس بددلی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کچھ عرصہ سے خشک سالی کے باعث پیداوار کم ہو رہی تھی اور اب کی خشک سالی جاتی رہی تھی۔ فصلیں تیار کھڑی تھیں اور کٹائی کے دنوں میں پکی ہوئی کھیتیوں اور پھلوں سے لدے ہوئے درختوں کو چھوڑ کر سفرِ جنگ پر نکلنا شاق گزرنا ہی تھا۔ اس کے علاوہ تڑاقے کی گرمی پڑ رہی تھی دُور کا سفر اور سواریوں کی بڑی قلت تھی۔ مسلمان ان صبر آزما حالات میں جی چھوڑ بیٹھے اور جنگ سے بچنے کے لئے حیلے بہانے کرنے لگے۔ قرآن مجید میں ان لوگوں کے بارے میں ارشاد ہے:۔

یاایھاالذین امنوا مالکم اذا قیل لکم انفروا فی سبیل اللہ اثاقلتم الی الارض ارضیتم بالحیٰوۃ الدنیا من الاٰخرۃ۔	اے ایمان لانے والو تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں نکل کھڑے ہو تو تمہارے قدم زمین میں گڑ جاتے ہیں۔ کیا آخرت کے بجائے تم اسی دُنیا کی زندگی پر خوش ہو گئے ہو۔"

جب تہدیدی آیتوں کے ذریعہ مسلمانوں پر دباؤ پڑا اور انہیں قدم بڑھائے بغیر کوئی چارہ نظر نہ آیا تو کچھ خوش خوش اور کچھ مارے باندھے اس مہم پر جانے کے لئے آمادہ ہو گئے اور کچھ جھوٹی سچی باتیں بنا کر گھروں کے گوشوں میں پڑے رہے۔ آنحضرتؐ نے مدینہ و اطراف مدینہ سے مالی و فوجی کمک لے کر تیس ہزار کا لشکر ترتیب دیا اور ماہِ رجب ۹ھ میں مدینہ سے حرکت کی اور ثنیۃ الوداع میں پہلا پڑاؤ ڈالا۔ عبداللہ ابن ابی بھی اپنے گروہ کو لے کر نکلا اور ثنیۃ الوداع کے نشیبی حصہ میں خیمہ زن ہوا۔ مگر جب رسولؐ اللہ لشکر کو لے کر آگے بڑھے تو وہ اپنی جماعت سمیت واپس آ گیا۔

مسلمانوں کی اس عظیم اکثریت کے چلے جانے کے بعد ان منافقین سے جو مدینہ میں رہ گئے تھے یا منزل پر پہنچے

سے پہلے راستے ہی سے واپس آرہے تھے یہ قوی اندیشہ تھا کہ اگر سپاہِ اسلام کو شکست ہوئی جیسا کہ عبداللہ ابن ابی کا خیال تھا یا سفر کی مدت طویل ہو گئی تو وہ آنحضرتؐ کا گھر بار لوٹ لیں گے اور اُن کے اہل و عیال کو شہر سے باہر نکال دیں گے اسی طرح اُن لوگوں سے بھی خطرہ تھا جو ابھی اسلام نہیں لائے تھے یا اہل اسلام کے مقابلہ میں شکست کھا چکے تھے کہ وہ اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے مدینہ پر تاخت و تاراج کریں اور اسلامی دارالسلطنت کی بنیادوں کو متزلزل کر دیں۔ اس صورتِ حال کے پیش نظر تدبّر و دُور اندیشی کا تقاضا یہ تھا کہ مدینہ کے اندر ایک ایسے شخص کو نگران کے طور پر چھوڑا جائے جو بہادر نڈر اور دشمن کے عزائم کو کچلنے پر قادر ہو۔ چنانچہ اسی ضرورت کی بنا پر پیغمبر اکرمؐ حضرت علیؑ کو جو اپنے زورِ بازو کی دھاک عرب پر بٹھا چکے تھے اپنا قائم مقام بنا کر مدینہ میں چھوڑ گئے تاکہ کفر و نفاق کی طاغوتی طاقتوں کو اُبھرنے کا موقع نہ ملے۔ اور اگر کچھ فتنہ پرداز فتنہ برپا کرنا چاہیں تو انہیں کچل کر رکھ دیا جائے۔ منافقین مدینہ کو حضرت کی یہ موجودگی بری طرح کھلی۔ وہ کوئی بات نہ بنا سکے تو یہ کہنے لگے

ماخلفہ الا استثقا لا لہ وتخففا منہ۔ (تاریخ طبری ج۲ ص۳۶۸)	پیغمبرؐ انہیں بار خاطر سمجھتے ہوئے اور اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے یہاں چھوڑ گئے ہیں"

حضرت علیؑ جو کفار کو پیہم شکست دیتے چلے آ رہے تھے اس غزوہ میں اپنی عدم شمولیت کو محسوس تو کر ہی رہے تھے جب منافقین کی زبان سے یہ طنزیہ بات سُنی تو آپ سے رہا نہ گیا فوراً ہتھیار سجے اور لشکر کے عقب میں چل دیئے اور مدینہ سے کچھ فاصلہ پر وادیٔ جرف میں پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آنحضرتؐ نے پوچھا کہ علی کیسے آئے؟ عرض کیا کہ یا رسول اللہ منافق یہ کہتے ہیں کہ آپ مجھے بار خاطر سمجھتے ہوئے پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ فرمایا وہ جھوٹ کہتے ہیں اور وہ اس سے پہلے بھی مجھ پر جھوٹ باندھتے رہے ہیں۔ میں تمہیں مدینہ اس لئے چھوڑے جاتا ہوں کہ اس کا نظم و ضبط میرے یا تمہارے بغیر برقرار نہیں رہ سکتا اور تم میرے اہلبیت اور میری اُمت میں میرے جانشین و قائم مقام ہو۔

اما ترضی ان تکون منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ الا انہ لا نبی بعدی۔ (صحیح بخاری ج۳ ص۵۸)	کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تمہیں مجھ سے وہی نسبت ہو جو ہارون کو موسیٰؑ سے تھی مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے"۔

حضرت علیؑ یہ نوید سن کر خوش خوش مدینہ واپس چلے آئے اور پیغمبر اکرمؐ لشکر کو لے کر سرحد شام کی جانب روانہ ہو گئے۔ اس راہ میں قوم ثمود کی ویران بستیاں پڑتی تھیں۔ جب پیغمبرؐ اس سرزمین پر پہنچے تو لشکر والوں کو حکم دیا کہ وہ یہاں کے کنوؤں سے پانی نہ لیں نہ اس سے وضو کریں اور نہ کھانے پینے کے کام میں لائیں۔ اور جب وہاں کے کھنڈروں پر نظر پڑی تو اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور سواری کو مہمیز کر کے تیزی سے آگے نکل گئے۔ دوسرے دن مسلمانوں کے پاس پانی نہ رہا تو انہوں نے پیغمبر اکرمؐ سے کہا کہ یا رسول اللہ آپ نے ہمیں پانی لینے سے منع کیا تھا اب اس صحرائے بے آب میں پانی کہاں سے آئے گا۔ آنحضرتؐ نے دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے دُعا کے ختم ہوتے ہی

افق پر بادل چھا گئے اور موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ لشکر والوں نے پانی پیا اور اپنے مشکیزے بھر لئے۔
یہ خشک اور بے آب صحراؤں کا طویل سفر انتہائی تکلیف دہ تھا۔ پندرہ بیس آدمیوں کے حصہ میں ایک سواری آتی تھی جس پر باری باری سوار ہوتے اور زیادہ مسافت پیادہ پا طے کرتے۔ پیٹ بھرنے کے لئے سُوکھے ٹکڑے تک میسّر نہ تھے اور پانی بڑی مشکل سے دستیاب ہوتا تھا۔ ان صعوبتوں کو جو لوگ برداشت نہ کر سکتے وُہ واپس چلے جاتے۔ آنحضرتؐ کو ان جانے والوں کی اطلاع دی جاتی تو فرماتے اگر ان میں بھلائی ہو گی تو پلٹ آئیں گے اور اگر نہیں تو ہمارے سر سے بوجھ اُترا۔ حضرت ابوذر غفاری اُونٹ کے خستہ ہو جانے کی وجہ سے پیچھے رہ گئے تو لوگوں نے اُن کے بارے میں بھی کہا کہ یا رسُولؐ اللہ ابوذر بھی گئے۔ آپ نے اُن کے بارے میں بھی یہی فرمایا کہ اگر ان میں نیکی کا جذبہ ہو گا تو وُہ تم سے آ کر مل جائیں گے۔ ادھر حضرت ابوذر نے جب یہ دیکھا کہ اُونٹ چلنے سے رہ گیا ہے تو انہوں نے اپنا سامان اپنی پُشت پر لادا اور پیادہ پا چل دیئے۔ لشکر کے کچھ آدمیوں نے انہیں دُور سے آتے دیکھا تو کہا کہ یہ کون ہو سکتا ہے جو اکیلا چلا آ رہا ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ابوذر ہوں گے۔ جب لوگوں نے غور سے دیکھا تو کہا ہاں یا رسُولؐ اللہ ابوذر ہی ہیں۔ فرمایا۔

یرحم اللہ اباذر یمشی وحدہ	خدا ابوذر پر رحم کرے وُہ اکیلے آ رہے ہیں:
و یموت وحدہ و یبعث وحدہ	اکیلے مریں گے اور اکیلے ہی قیامت میں
(تاریخ طبری۔ ج۲۔ ص۱۷۳)۔	اُٹھائے جائیں گے "۔

جب لشکرِ اسلام تبوک میں پہنچا تو وہاں پر پڑاؤ ڈال دیا۔ مگر دُور دُور تک نہ رومی عساکر نظر آئے اور نہ ایسے آثار دکھائی دیئے جن سے دُشمن کے جنگی عزائم کی نشاندہی ہوتی۔ پیغمبرؐ نے بیس دن وہاں قیام کیا مگر کسی سمت سے فوجوں کی نقل و حرکت کی خبر نہ آئی اور شامی تجار کی پھیلائی ہوئی خبر بے حقیقت اور ان کی غلط خیالی و غلط فہمی کا نتیجہ ثابت ہوئی۔ اس عرصہ میں آنحضرتؐ نے اطراف و جوانب کے سرداروں کے پاس وفود بھیجے کہ وُہ اسلام قبول کریں یا جزیہ دے کر اسلامی رعایا میں داخل ہوں۔ ایلہ کا سردار یوحنا ابن رؤبہ آنحضرتؐ کے آنے کی خبر سُن کر فوراً حاضر ہو گیا اور تین سو دینار جزیہ پر اس نے مصالحت کر لی اسی طرح جرباء، اذرح اور مقنا کے عیسائی جزیہ پر راضی ہو گئے اور پیغمبر اکرمؐ سے امان نامے حاصل کر لئے۔ دومتہ الجندل کے حاکم اکیدر ابن عبدالملک کو اسیر کر کے لایا گیا اور آخر اس نے بھی جزیہ قبول کر کے رہائی حاصل کر لی۔ جب پیغمبر اکرمؐ دشمن کی طرف سے مطمئن ہو گئے تو لشکر کو واپس مدینہ جانے کا حکم دے کر اُٹھ کھڑے ہوُے۔ لشکر بھی اُٹھ کھڑا ہوا اور مدینہ کی طرف راہ سپار ہو گیا۔
مدینہ و تبوک کی گذرگاہ میں ایک وادی پڑتی تھی جس کا نام مشقق تھا۔ یہاں ایک چشمہ تھا جس سے پانی کم مقدار میں رِستا تھا۔ آنحضرتؐ نے حکم دیا کہ جو لوگ وادیٔ مشقق میں ہم سے پہلے پہنچیں وُہ ہمارے پہنچنے سے پہلے پانی نہ پئیں مگر چند آدمی جو پہلے پہنچ گئے تھے انہوں نے تمام پانی جو رس رس کر جھری میں جمع ہو چکا تھا ختم کر ڈالا۔ جب پیغمبرؐ وہاں آئے تو دیکھا کہ گڑھا خالی پڑا ہے۔ پُوچھا کہ یہاں پہلے کون آیا تھا؟ لوگوں نے پہلے آنے والوں کے

نام لئے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کیا ہم نے انہیں منع نہیں کیا تھا کہ جب تک ہم آ نہ جائیں اس میں سے پانی نہ لیں۔
علامہ طبری لکھتے ہیں:۔

ثم لعنھم رسول اللہ ودعا علیھم (تاریخ طبری۔ ج۲۔ ص۳۰۳)	پھر رسولؐ اللہ نے ان پر لعنت کی اور انہیں بد دعا دی"۔

آنحضرتؐ نے پانی کی کمی کو دیکھتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو اس رستے ہوئے پانی کے نیچے اوک کی صورت میں پھیلا دیا جب ہاتھوں میں پانی بھر گیا تو دُعا پڑھ کر اسی میں انڈیل دیا۔ دُعا نے اپنا اثر دکھایا زمین کے بندھن ٹوٹے پانی جوش مارتا ہُوا پھوٹ نکلا اور خشک لبوں کی سیرابی کا سامان ہو گیا۔

اس واپسی کے موقع پر ایک اور افسوسناک واقعہ پیش آیا اور وہ یہ کہ جب پیغمبر اکرمؐ عقبۂ ذی فتق کے قریب پہنچے تو اس خیال سے کہ پہاڑیوں کے بیچ میں سے ہو کر گزرنے والا راستا پُر پیچ تنگ اور انتہائی خطرناک ہے اگر سواری دوسری سواریوں کو دیکھ کر بھڑک اُٹھی تو رات کے اندھیرے میں کسی کھڈ میں گرنے کا قوی اندیشہ ہے۔ آنحضرتؐ کی طرف سے اعلان ہُوا کہ کوئی شخص اس گھاٹی پر سے نہ گزرے جب تک رسولؐ اللہ کی سواری گزر نہ جائے۔ مگر کچھ لوگوں نے مل کر منصوبہ بنایا کہ آنحضرتؐ کی سواری کو بھڑ کا دیا جائے۔ چنانچہ پیغمبرؐ ناقہ پر سوار حذیفہ ابن یمان مہار تھامے اور عمار ابن یاسر پیچھے سے ہنکاتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے کہ بجلی کے کوندے میں بارہ سوار دکھائی دیئے جو چہروں پر نقاب ڈالے گھاٹی کی طرف بڑھے چلے آ رہے تھے حذیفہ نے آنحضرتؐ کو اُدھر متوجہ کیا۔ آپ نے ان لوگوں کو ڈانٹا ڈپٹا اور حذیفہ اور عمار نے ان کے اُونٹوں کو مار پیٹ کر انہیں بھگا دیا۔ آنحضرتؐ نے حذیفہ سے فرمایا کہ تم نے پہچانا کہ یہ کون لوگ تھے؟ حذیفہ نے عرض کیا کہ میں نے نہیں پہچانا۔ فرمایا کہ یہ منافق ہیں اور ہمیشہ منافق رہیں گے۔ یہ اس ارادہ سے آئے تھے کہ میری سواری کو بھڑکائیں اور اس طرح میرا خاتمہ کر دیں۔ پھر آپ نے حذیفہ کو ایک ایک کا نام بتایا اور انہیں تاکید کی کہ ان ناموں کو پردۂ خفا میں رکھیں مگر اس تاکید کے باوجود بعض لوگوں کے نام چھپ نہ سکے اور موقع بہ موقع ظاہر ہوتے رہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ امام حسنؑ نے معاویہ ابن ابی سفیان سے فرمایا:۔

یوم وقفوا لرسول اللہ صلے اللہ علیہ والہ وسلم فی العقبۃ لیستنفروا ناقتہ کانوا اثنی عشر رجلا منھم ابو سفیان۔ (شرح ابن ابی الحدید ج۲ ص۱۰۳)	تمہیں وُہ دن یاد ہو گا کہ جب کچھ لوگ گھاٹی میں رسولؐ اللہ کے ناقہ کو بھڑکانے کے لئے جمع ہُوئے تھے جو تعداد میں بارہ تھے اور اُن میں ایک ابو سفیان بھی تھا"۔

پیغمبر اکرمؐ جب تبوک کی طرف روانہ ہو رہے تھے تو کچھ بد باطن لوگوں نے آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ ہم نے ایک مسجد تعمیر کی ہے تاکہ بیمار اور لاچار جو بارش اور سردی کے دنوں میں دُور نہیں جا سکتے وہاں نماز پڑھ لیا کریں۔ آپ وہاں چل کر نماز پڑھا دیجئے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ میں اس وقت آمادہ سفر ہوں کسی دُوسرے

موقع پر دیکھا جائے گا۔ جب آپ تبوک کی مہم سے فارغ ہو کر مدینہ کے قریب مقام ذی اوان میں پہنچے تو یہ آیت نازل ہوئی:۔

والذین اتخذوا مسجدا ضرارا وکفرا وتفریقا بین المومنین	اور وہ لوگ بھی منافق ہیں جنہوں نے نقصان پہنچانے کفر کرنے اور مومنوں میں پھوٹ ڈلوانے کی غرض سے مسجد کی بنا ڈالی ہے۔"

آنحضرتؐ نے مالک ابن دخشم اور معن ابن عدی کو حکم دیا کہ وہ فوراً اس تو تعمیر مسجد کو گرا کر نذرِ آتش کر دیں جو مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کے لئے تعمیر کی گئی ہے۔ چنانچہ اس مسجد کو جلا دیا گیا۔

یہ مہم مسلمانوں کے لئے ایک سخت آزمائش تھی۔ جھلسا دینے والی گرمی میں باغوں کے رسیدہ پھلوں اور لہلہاتے کھیتوں کی پیداوار کو چھوڑ کر ریگزاروں اور تپتے ہوئے صحراؤں میں راہ پیما ہونا آسان مرحلہ نہ تھا۔ اس مرحلہ میں وہی لوگ ثابت قدم رہ سکتے تھے جو آخرت کی سرخروئی پر دنیا کی ہر نعمت اور ہر راحت کو قربان کر سکتے ہوں اور وہ لوگ جو دنیوی مفاد کی خاطر یا اسلام کی سطوت و شوکت سے متاثر ہو کر اسلام لے آئے تھے ان سے یہ توقع ہی بے سود تھی کہ وہ اسلام کی سربلندی کی خاطر اپنی جان جوکھوں میں ڈالیں گے۔ چنانچہ اس موقع پر منافقوں نے اپنے باطنی عناد کا ثبوت دیا حیلے بہانے کر کے گھروں میں پڑے رہے اور دوسروں کی ہمت شکنی کرتے رہے۔ اب تک تو وہ اپنے کفر کو نفاق کی دبیز تہوں میں چھپاتے آ رہے تھے اور اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی رہے تھے مگر اس موقع پر ان کی حیلہ تراشیوں اور ریشہ دوانیوں نے ان کے نفاق کا پردہ فاش کر دیا اور ان کی دلی حالت اور اندرونی کیفیت بے نقاب ہو گئی۔ اسی بنا پر اس مہم کو غزوۂ فاضحہ بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اس سے منافقین کی قلعی کھل گئی اور انہیں فضیحت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ اس موقع پر اپنے نفاق کو مخفی بھی رکھنا چاہتے تو مخفی نہ رکھ سکتے تھے کیونکہ نفاق اسی صورت میں چھپا رہ سکتا تھا جب گھروں کو خیرباد کہہ کر نکل کھڑے ہوتے اور دشمن کی کثرت و قوت سے آنکھ بند کر کے چل پڑتے۔ مگر یہ ان کے بس کی بات نہ تھی کیونکہ ایمان نہ ہو تو دین کی خاطر اس قسم کے خطرات کی طرف قدم بڑھا نہیں کرتا اگرچہ وہ بعض مصالح کے پیش نظر جنگوں میں شریک ہوتے رہے تھے مگر جب جان کا خطرہ نظر آتا تھا تو بھاگ کھڑے ہوتے تھے اور یہاں وطن سے کوسوں دور جانے کی وجہ سے رو بفرار ہونے کی کوئی صورت نہ تھی اور پھر اس لئے بھی انہیں اپنے اصلی روپ میں سامنے آنا پڑا کہ وہ یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ مسلمان ہزیمت اٹھائے بغیر نہیں رہیں گے کیونکہ اب ۔۔۔ مقابلہ یہاں کے منتشر و پراگندہ لوگوں سے نہیں ہے بلکہ روم ایسی عظیم سلطنت سے ہے جس کے سامنے بڑی سے بڑی طاقتیں ہتھیار ڈال چکی ہیں لہٰذا ایسے لوگوں کے لئے جن کی شکست آنکھوں کے سامنے ہے اپنے آپ کو کیوں خطرہ میں ڈالا جائے اس لئے کہ انسان خطرہ مول لینے کے لئے اسی صورت میں تیار ہوتا ہے جب اسے دنیوی فوائد نظر آ رہے ہوں یا اسے ایمان کا سہارا ہو اور جب کوئی فائدہ بھی نظر نہ آتا ہو اور ایمان سے بھی تہی داماں ہو تو محض مسلمین میں شمار ہونے کی خاطر جان کا خطرہ کیوں مول لے۔ یہ لوگ اگرچہ رسول اللہ کی مصاحبت

میں رہے مگر دل میں نفاق لے کے رسُول کے پہلو میں بیٹھ جانا مفید نہیں ہو سکتا جب تک زبان سے نکلی ہوی صدا دل کی آواز سے ہم آہنگ نہ ہو اور دل کی آواز کا اثر عمل و کردار سے ظاہر نہ ہو۔ اکبر الہ آبادی نے سچ کہا ہے:۔

امنوا میں تو سب سے ہیں آگے   اعملوا الصالحات مشکل ہے

غزوۂ تبوک ہی ایک ایسا غزوہ ہے جس میں فاتح بدر و حنین علی مرتضیٰ شریک نہیں ہوُے مگر یہ عدم شرکت جنگ سے جی چرانے اور جہاد سے پہلوتہی کرنے کی وجہ سے نہ تھی بلکہ حکمِ رسُول ہی یہ تھا کہ آپ مدینہ میں قیام فرما رہیں ریاست کا نظم و نسق سنبھالیں اور ان تمام فرائض کو انجام دیں جو آنحضرت کی موجودگی میں خود اُن پر عائد ہوتے تھے۔ یہ بھی جہاد کی طرح کا ایک فریضہ تھا جسے آپ نے پُوری فرض شناسی کے ساتھ انجام دیا اور اپنی انتظامی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر نظم و ضبط برقرار رکھا۔

پیغمبر اکرم جب کسی غزوہ یا مہم پر تشریف لے جاتے تھے تو کسی نہ کسی کو مدینہ کا نگران مقرر کر جاتے تھے اور اُسے ایک عام والی و عامل کی حیثیت دی جاتی تھی مگر اس تقرری کی نوعیّت عام حکام و ولاۃ کی تقرری سے جداگانہ تھی چنانچہ اسی جداگانہ حیثیت کو واضح کرنے کے لئے آنحضرت نے فرمایا کہ اے علی تمہاری منزلت میرے نزدیک وُہ ہے جو ہارون کی موسیٰ کے نزدیک تھی اور ہارون کی منزلت یہ تھی کہ وُہ موسیٰ کے وزیر قوت بازو نبوت میں شریک کار اور خلیفہ و جانشین تھے جیسا کہ قرآن مجید میں حضرت موسیٰ کی دُعا کے سلسلہ میں ارشاد ہے:۔

واجعل لی وزیرا من اھلی ھرون اخی اشدد بہ ازری واشرکہ فی امری۔	میرے گھر والوں میں سے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر بنا دے اور اس کے ذریعہ میری پُشت قوی کر اور اسے میرے کاموں میں میرا شریک بنا۔"

دوسرے مقام پر ارشاد ہے:۔

وقال موسیٰ لاخیہ ھرون اخلفنی فی قومی۔	موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا کہ تم میری قوم میں میرے جانشین ہو۔"

پیغمبر اکرم نے حضرت علی کو مثیل ہارون قرار دے کر یہ ظاہر کر دیا کہ جس طرح حضرت ہارون حضرت موسیٰ کے وزیر اور خلیفہ تھے اسی طرح علی میرے وزیر اور خلیفہ ہیں اور ان تمام مدارج پر فائز ہیں جن مدارج پر ہارون فائز تھے اور چونکہ حضرت ہارون نبی بھی تھے اس لئے لانبی بعدی کہہ کر نبوّت کا استثناء کر دیا۔ جب باستثنائے نبوّت تمام مدارج و خصائص میں حضرت کو مثیل ہارون قرار دیا گیا ہے تو پھر ان کے علاوہ کسی اور کو مثیل موسیٰ کا وارث و جانشین تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کہنا کہ حضرت موسیٰ نے حضرت ہارون کو طور پر جاتے وقت اپنا نائب بنایا تھا جو ایک محدود عرصہ کے لئے وقتی و ہنگامی نیابت تھی اسی طرح حضرت علی کی نیابت بھی وقتی تھی۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کسی اور کو نائب کیوں نہ بنا گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ انتخاب حضرت ہارون کی اہلیت اور امت پر برتری کی بناء پر تھا اور انہی سے اس منصب کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی توقع کی جا سکتی تھی۔ اگر وُہ حضرت موسیٰ کی زندگی میں

انتقال نہ کر جاتے تو وُہی اُن کے خلیفہ و جانشین ہوتے اس لئے کہ جو زندگی میں اپنے کو نیابت و قائم مقامی کا اہل ثابت کر چکا ہو اگر وُہ زندہ رہتا تو کسی کو اس کی نیابت کے تسلیم کرنے میں عذر نہ ہوتا۔ اسی طرح حضرت علی کی نیابت پیغمبرؐ کی زندگی ہی سے وابستہ نہ تھی کہ اُسے وقتی و عارضی کہہ کر نظر انداز کر دیا جائے۔ اگر یہ نیابت وقتی و ہنگامی ہوتی تو لا نبی بعدی کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس جملہ سے صاف ظاہر ہے کہ آنحضرتؐ انہیں اپنی زندگی کے بعد کے لئے بھی نامزد کر رہے تھے۔

تبلیغ سورۂ براءۃ

عرب کے کفار و مشرکین خانہ کعبہ کا حج کیا کرتے تھے اور فتح مکہ کے بعد بھی وُہ حج کے لئے آتے اور اپنے طریقہ پر حج بجا لاتے رہے۔ ان کے مراسم حج میں عریاں طواف کی بھی ایک اخلاق سوز رسم تھی جس کا انسداد ضروری تھا۔ پیغمبر اکرمؐ نے اب تک انہیں طواف اور دُوسرے ارکان حج کی بجا آوری سے منع نہیں کیا تھا مگر جب سورۂ براءۃ کی ابتدائی آیتیں کفار و مشرکین سے اظہارِ بیزاری کے سلسلہ میں نازل ہوئیں تو حکم خداوندی کے پیش نظر انہیں روکنا ضروری ہو گیا آنحضرتؐ نے وُہ آیتیں دے کر پہلے حضرت ابو بکر کو مکہ بھیجا اور پھر ان کے عقب میں حضرت علی کو اپنے ناقہ عضباء پر سوار کر کے روانہ کیا تاکہ وُہ کفار و مشرکین کو یہ آیتیں پڑھ کر سُنائیں۔ حضرت علی تیزی سے ناقہ کو ہنکاتے ہوُے ان تک پہنچ گئے۔ اور کہا کہ مجھے پیغمبرؐ نے حکم دیا ہے کہ میں تم سے آیتیں لے لوں اگر تم چاہو تو میرے ساتھ مکہ چلو ورنہ یہیں سے مدینہ واپس چلے جاؤ۔ ابن اثیر نے تحریر کیا ہے:۔

بعث النبی ببراءۃ مع ابی بکر ثم دعاہ فقال لا ینبغی لاحد ان یبلغ ھذہ الا رجل من اھلی فدعا علیا و اعطاھا ایاھا۔ (جامع الاصول۔ ج۹۔ ص۴۷۵)۔	پیغمبر اکرمؐ نے حضرت ابو بکر کو سورہ براءۃ دے کر بھیجا پھر انہیں واپس بُلا لیا اور فرمایا کہ اس کی تبلیغ کے لئے وُہ شخص مناسب ہے جو میرے گھر والوں میں سے ہو چنانچہ حضرت علی کو بلایا اور وُہ آیتیں ان کے حوالے کیں"۔

علامہ طبری نے اس واقعہ کو ذرا تفصیل سے لکھا ہے وُہ تحریر کرتے ہیں:۔

بعثھن رسول اللہ مع ابی بکر وامرہ علی الحج فلما سار فبلغ الشجرۃ من ذی الحلیفۃ اتبعہ بعلی فاخذھا منہ فرجع ابوبکر الی النبی فقال یا رسول اللہ بابی انت وامی انزل فی شانی شئی قال	رسُول اللہ نے حضرت ابو بکر کو سورۂ براءۃ کی آیتیں دے کر بھیجا اور انہیں امیر حج مقرر کیا۔ جب وہ وادی ذی الحلیفہ میں مسجد شجرہ تک پہنچے تو اُن کے پیچھے علی کو روانہ کیا جنہوں نے آیتیں اُن سے لے لیں۔ حضرت ابو بکر پیغمبرؐ کے پاس واپس چلے آئے اور کہا یا رسُول اللہ میرے ماں باپ آپ پر فدا کیا میرے

لا ولکن لا یبلغ عنی غیری او رجل منی۔ (تاریخ طبری۔ ج۲۔ ص۳۸۳)۔	بارے میں کچھ نازل ہوا ہے فرمایا نہیں لیکن ان آیتوں کی تبلیغ مجھ سے متعلق ہے یا اس سے جو مجھ سے ہو۔"

امیر المومنین نے مکہ پہنچ کر عرفات مشعر الحرام اور منیٰ میں کھڑے ہو کر ان آیتوں کی تلاوت کی اور اعلان فرمایا کہ جن مشرکین نے بد عہدی کی ہے ان سے کئے ہوئے معاہدے چار ماہ کے بعد ختم ہو جائیں گے اور کوئی کافر و مشرک ایمان لائے بغیر خانہ کعبہ کے حدود میں آنے طواف کرنے اور حج بجالانے کا مجاز نہ ہو گا لہذا سال آئندہ کوئی کافر و مشرک یہاں نہ آئے۔ اس اعلان سے کفار و مشرکین کی پیشانیوں پر بل پڑے مگر کسی کو روکنے ٹوکنے کی جرأت نہ ہو سکی بلکہ اسلام کے تسلط و اقتدار کے آگے بے بس ہو کر اسلام کی آڑ لینے پر مجبور ہو گئے۔ علامہ طبری نے لکھا ہے:۔

فرجع المشرکون فلام بعضھم بعضا و قالوا ما تصنعون و قد اسلمت قریش فاسلموا (تاریخ طبری۔ ج۲۔ ص۳۸۳)۔	مشرکین ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے ہوئے واپس ہوئے اور کہنے لگے کہ اب جبکہ قریش مسلمان ہو چکے ہیں تمہارے لئے چارہ کار ہی کیا ہے چنانچہ وہ بھی مسلمان ہو گئے۔"

یہ کام اتنا آسان نہ تھا جتنا آسان نظر آتا ہے۔ مشرکین سے معاہدے ختم کئے جا رہے تھے حج اور مسجد الحرام میں داخلہ سے انہیں روکا جا رہا تھا اس صورت میں ممکن تھا کہ وہ بغاوت و سرکشی پر اُتر آتے یا در پردہ سازش کر کے در پے ایذا ہوتے۔ انہی خطرات کے پیش نظر آنحضرتؐ حضرت علی کی طرف سے متفکر اور اُن کی واپسی کے بڑے بے چینی سے منتظر تھے۔ جب حضرت ابو ذر نے آپ کی آمد کی اطلاع دی تو فکر و پریشانی دُور ہوئی چہرہ مسرت سے کھِل اُٹھا خوش خوش اُٹھ کھڑے ہوئے اور شہر سے باہر نکل کر صحابہ کے مجمع کے ساتھ استقبال کیا اور انہیں ساتھ لے کر مدینہ میں داخل ہوئے۔

اس موقع پر ایک کا عزل اور دوسرے کا نصب پیغمبرؐ کی ذاتی رائے کا نتیجہ نہ تھا بلکہ وحی الٰہی کے تابع تھا اور قدرت کا کوئی کام حکمت و مصلحت سے خالی تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں بھی یہ مصلحت کار فرما ہی ہو گی کہ کام اور کام انجام دینے والے کی اہمیت کو نمایاں کر دیا جائے۔ چنانچہ اگر شروع ہی میں حضرت علی کو بھیج دیا جاتا تو کام کی اہمیت دب کر رہ جاتی اور کہنے والے یہ کہہ سکتے تھے کہ اس کام کے سرانجام دینے کی اہلیت حضرت علی میں بھی تھی اور دوسروں میں بھی اور ان میں سے کسی ایک ہی کو منتخب ہونا تھا اور وہ کسی وجہ سے علی ہو گئے مگر ایک کے عزل کے بعد دوسرے کے تقرر سے اور وہ بھی اس اعلان کے ساتھ کہ یہ کام نبی کے کرنے کا ہے یا اُس کے کرنے کا ہے جو نبی سے ہو اس کام کی اہمیت عیاں ہو گئی اور کام کی اہمیت ہی سے کام انجام دینے والے کی اہمیت کا اندازہ ہوا کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ امر بھی غور طلب ہے کہ جو ایک جزوی امر کی تبلیغ کے لئے سزاوار ثابت نہ ہو سکا ہو وہ پیغمبر کے بعد ان کی نیابت و جانشینی کا کیونکر اہل ہو سکتا ہے۔ حیرت ہے کہ رہبر عالم کے نگاہوں سے اوجھل ہونے کے بعد رائے عامہ کا سہارا لے کر نیابت و خلافتِ رسول کا تصفیہ کر لیا

جاتا ہے اور جو کارِ نبوت کی انجام دہی میں پیش پیش رہا ہو وہ دنیا والوں کی بے توجہی و سرد مہری کا شکار ہو کر کنج عزلت اختیار کر لیتا ہے حالانکہ یہ تقرر ان کے سب سے بڑھ کر سزاوار خلافت ہونے کا ثبوت تھا۔ مفسر قرآن ابن عباس بھی اس واقعہ سے آپ کے حقدار خلافت ہونے پر استدلال کیا کرتے تھے۔ چنانچہ بیعت سقیفہ کی تکمیل کے بعد جب حضرت عمر نے اُن سے کہا کہ اے ابن عباس لوگوں نے حضرت علی کو اس کا اہل نہ سمجھا کہ انہیں ولی امر بنائیں تو ابن عباس نے کہا:۔

واللہ ما استصغرہ رسول اللہ اذا اختارہ بسورۃ براءۃ یقرأھا علی اھل مکۃ۔ (کنز العمال ج۶۔ ص۳۹۱)۔

"خدا کی قسم رسولؐ اللہ نے تو صرف انہی کو اس کا اہل سمجھا تھا کہ وہ اہل مکہ کو سورۃ براءۃ کی آیتیں پڑھ کر سنائیں"۔

ابن عباس کا استحقاق خلافت کے سلسلہ میں سورہ براءۃ کی تبلیغ سے استدلال کرنا یہ بتاتا ہے کہ وہ اسے علی کی خلافت کا ثبوت اور نیابت و جانشینی کا عملاً اظہار سمجھتے تھے اور خود امیر المومنین نے بھی مجلس شوریٰ کے موقع پر اسے استحقاق خلافت کے ثبوت میں پیش کیا اور ارکان شوریٰ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا

افیکم من أوتمن علی سورۃ براءۃ وقال لہ الرسول صلے اللہ علیہ وآلہ انہ لایودی عنی الا انا او رجل منی غیری۔ (شرح ابن ابی الحدید ج۲۔ ص۶۱)

"کیا تم میں میرے علاوہ کوئی ہے جسے سورۂ براءۃ کی تبلیغ کے لئے امین منتخب کیا گیا ہو اور اس سے رسولؐ اللہ نے یہ فرمایا ہو کہ اسے میرے اور اس کے علاوہ جو مجھ سے ہو کوئی دوسرا نہیں پہنچا سکتا"۔

اگر حضرت ابوبکر کی خلافت پر نماز کی امامت سے استدلال کیا جاتا ہے تو کیا سورۂ براءۃ کی تبلیغ ان سے متعلق رہتی تو اسے ان کی خلافت کے اثبات کے لئے ایک قوی دلیل کی صورت میں پیش نہ کیا جاتا؟ انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ جواب ہاں ہو۔ تو پھر حضرت علی کی خلافت کے ثبوت میں اسے کیوں دلیل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

دعوتِ مباہلہ

نجران یمن کے شمالی کوہستان میں صنعاء سے دس منزل کے فاصلہ پر ایک زرخیز مقام تھا جو چھوٹی بڑی تہتر بستیوں پر مشتمل تھا ان بستیوں میں کم و بیش چالیس ہزار عیسائی بستے تھے جو پہلے تو اہل عرب کی طرح بُت پرست تھے مگر فیمیون نامی ایک مسیحی راہب جو معماری کے پیشہ سے گزر بسر کرتا تھا اپنا وطن روم چھوڑ کر یہاں آبسا تو اس نے یہاں کے باشندوں کو دینِ عیسوی کی تعلیم دی اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس کی بے لوث تبلیغ کے نتیجہ میں تمام آبادی نے عیسائیت قبول کر لی اور نجران عیسائیوں کا ایک اہم مرکز بن گیا۔ انہوں نے مذہبی مراسم بجالانے کے لئے ایک کلیسا بھی تعمیر کر لیا جو اونٹ کی کھالوں سے منڈھی ہوئی ایک بلند و بالا عمارت تھی اور اسے کعبۂ نجران کے نام سے موسوم

کیا۔ وُہ عبادت کے اوقات میں وہاں جمع ہوتے اور نذریں پیش کرتے۔ ان نذروں اور چڑھاووں کے علاوہ کلیسا کے اوقاف کی آمدنی دو لاکھ سالانہ تھی جس سے راہبوں اور مذہبی پیشواؤں کی پرورش ہوتی تھی۔

جب فتح مکہ کے بعد اسلام کو عروج حاصل ہوا اور متحارب گروہ سرنگوں ہو گئے تو آنحضرتؐ نے ان قبائل کو جو ابھی تک اسلام نہیں لائے تھے دعوت اسلام کے سلسلہ میں پیغامات بھیجے۔ ۱۰ھ میں نصاریٰ نجران کو بھی ایک نامہ تحریر فرمایا اور انہیں اسلام قبول کرنے یا جزیہ دے کر مملکت اسلامی کی رعایا بننے کی دعوت دی۔ جب نجران کے اسقف اعظم (بشپ) نے آنحضرتؐ کا مکتوب پڑھا تو اُس نے فوراً علاقہ کے تمام سربر آوردہ لوگوں کو جمع کر کے صورت حال سے مطلع کیا اور کہا کہ ہمیں سر جوڑ کر بیٹھنا چاہیئے اور غور و فکر سے کوئی حل تجویز کرنا چاہیئے اس خبر سے اگرچہ پوری آبادی میں ہلچل مچ گئی تھی مگر کچھ من چلے بڑھ چڑھ کر باتیں بنانے لگے۔ اسقف اعظم نے انہیں روکا اور کہا کہ ہمیں جوش کے بجائے ہوش سے کام لینا چاہیئے اور مشتعل ہو کر اپنی تباہی و بربادی کا سامان نہ کرنا چاہیئے جب لوگوں سے رائے لی گئی تو انہوں نے مختلف رائیں دیں اور آخر بڑی ردو کد کے بعد یہ طے پایا کہ ایک وفد مدینہ جائے اور پیغمبر اسلامؐ سے گفتگو کرے اگر بات چیت سے کوئی حل نکل آئے تو بہتر ورنہ کوئی اور تدبیر سوچی جائے۔ چنانچہ چودہ آدمیوں کا ایک وفد عاقب سید اور ابو حارثہ کی زیر قیادت مدینہ روانہ ہوا۔ ان میں ابو حارثہ دنیائے عیسائیت کا اسقف اعظم اور مشہور عالم تھا اور سید اور عاقب تدبر و فراست اور معاملہ فہمی میں ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ جب یہ وفد مدینہ میں وارد ہوا تو اہل مدینہ اُن کے زرق برق لباس ریشمیں عبائیں اور سج دھج دیکھ کر حیرت میں کھو گئے کیونکہ اس سے پیشتر کوئی وفد اس طنطنہ و طمطراق کے ساتھ یہاں نہیں آیا تھا۔ جب وُہ بنے ٹھنے مسجد نبوی کے قریب پہنچ کر سواریوں سے اُترے اور اینٹھتے اکڑتے مسجد میں داخل ہوئے تو آنحضرتؐ نے اُن کے ہاتھوں میں سونے کی انگوٹھیاں اور جسموں پر دیبا و حریر کے لباس فاخرہ دیکھ کر نفرت سے مُنہ پھیر لیا۔ اس دوران میں ان کی نماز کا وقت ہو گیا اور انہوں نے مشرق کی سمت رخ کر کے نماز شروع کر دی۔ کچھ لوگوں نے انہیں روکنا چاہا آنحضرتؐ نے فرمایا انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو اور اپنے طریقہ پر نماز پڑھنے دو۔ نماز سے فارغ ہو کر انہوں نے کچھ دیر توقف کیا۔ جب پیغمبرؐ نے ان کی طرف توجہ نہ فرمائی تو تیوریوں پر بل ڈالے اور باہر نکل آئے۔ مسجد کے باہر حضرت عثمان اور عبدالرحمٰن کو دیکھا تو حضرت عثمان سے شکوہ آمیز لہجہ میں کہا کہ محمد (صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم) نے ہمیں پیغام بھیجا اور جب ہم حاضر ہُوئے تو مُنہ پھیر لیا اور جواب سلام تک نہیں دیا۔ انہوں نے کہا کہ مجھے نہیں معلوم کہ ایسا برتاؤ کیوں روا رکھا گیا ہے۔ حضرت علی کے پاس جائیے وُہ اس کا سبب بتا سکیں گے چنانچہ وُہ دونوں اس وفد کو لے کر حضرت علی کی خدمت میں حاضر ہُوئے اور اُن سے پیغمبرؐ کی بے التفاتی کا ذکر کیا آپ نے فرمایا کہ تم یہ ریشمیں عبائیں اور سونے کی انگوٹھیاں اتار کر اور سیدھے سادے کپڑے پہن کر جاؤ آنحضرتؐ تمہیں باریاب ہونے کا موقع دیں گے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور پیغمبرؐ نے نماز عصر سے فارغ ہو کر مختلف مسائل پر ان سے گفتگو کی اور جب انہیں اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے کہا کہ ہم پہلے ہی سے مسلمان ہیں فرمایا تم مسلمان

کیونکر ہو سکتے ہو جبکہ خنزیر کا گوشت کھاتے ہو صلیب کی پرستش کرتے ہو اور مسیح کو ابن اللہ سمجھتے ہو۔ انہوں نے کہا کہ بیشک مسیح ابن اللہ ہیں۔ اگر وہ ابن اللہ نہیں ہیں تو آپ فرمائیے کہ اُن کا باپ کون تھا۔ اور کیا کوئی بغیر باپ کے بھی پیدا ہو سکتا ہے؟ آنحضرتؐ نے قرآن مجید کی اس آیت سے انہیں جواب دیا:۔

ان مثل عیسٰی عند اللہ کمثل آدم خلقہ من تراب ثم قال لہ کن فیکون۔	اللہ کے نزدیک عیسٰی کی مثال آدم کی سی ہے جسے مٹی سے پیدا کیا پھر کہا کہ ہو جا اور وُہ ہو گیا"۔

مطلب یہ تھا کہ عیسٰیؑ کا تو فقط باپ نہ تھا اور آدمؑ کا نہ باپ تھا اور نہ ماں تھی پھر انہیں خدا کا بیٹا کیوں نہیں کہتے۔ ان کے پاس اس کا تو کوئی جواب نہ تھا کٹھ حجتیوں اور کج بحثیوں پر اُتر آئے جب وُہ دلیل و حجت سے قائل ہوتے نظر نہ آئے تو اللہ کی طرف سے وحی ہوئی:۔

فمن حاجك فيه من بعد ما جاءك من العلم فقل تعالوا ندع ابناءنا وابناءكم ونساءنا ونساءكم وانفسنا وانفسكم ثم نبتهل فنجعل لعنة الله على الكاذبين۔	جب تمہارے پاس علم آچکا اس کے بعد بھی یہ لوگ عیسٰی کے بارے میں تم سے حجت کریں تو ان سے کہو کہ آؤ اس طرح فیصلہ کریں کہ ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں تم اپنے بیٹوں کو ہم اپنی عورتوں کو بلائیں تم اپنی عورتوں کو ہم اپنے نفسوں کو بلائیں تم اپنے نفسوں کو پھر اللہ کے سامنے گڑگڑائیں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت کریں"۔

آنحضرتؐ نے نصاریٰ کو یہ آیت پڑھ کر سُنائی اور انہیں مباہلہ کی دعوت دی۔ دعوتِ مباہلہ کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ اگر صرف گفت و شنید اور افہام و تفہیم پر معاملہ ختم کر دیا جاتا تو وُہ پلٹ کر یہ دعوٰی کرتے کہ ہم نے پیغمبر اسلامؐ سے بحث و مناظرہ کیا مگر ان کی باتوں سے نہ ہماری تشفی ہوئی اور نہ وُہ دلیل و برہان سے ہمیں قائل کر سکے۔ اب اُن کی زبان بندی کا یہی ایک طریقہ تھا کہ انہیں مباہلہ کی دعوت دی جاتی کیونکہ مباہلہ سے گریز یا اس کے نتیجہ میں شکست تو چھپنے والی بات ہی نہ تھی کہ باتوں کے ذریعہ اس پر پردہ ڈالا جا سکتا۔ اور فتح کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا۔ نصاریٰ پہلے تو اثبات حق کے اس طریق کار سے گھبرائے اور پھر کہا کہ ہمیں آج کے دن کی مہلت دیجئے کل ہم اس کے لئے تیار ہیں یہ کہہ کر وُہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے مقام پر پہنچ کر آپس میں تبادلۂ خیالات کیا کسی نے کچھ کہا اور کسی نے کچھ۔ ابو حارثہ نے کہا کہ اگر کل محمدؐ (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے اصحاب و اتباع اور لاؤ لشکر کے ساتھ سطوت و شکوہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے آئیں تو بے کھٹکے مباہلہ کرنا اور اگر اپنے بچوں اور کنبہ والوں کو لے کر عجز و انکسار کے ساتھ آئیں تو پھر مباہلہ نہ کرنا۔

مباہلہ کی قرار داد طے ہونے کے بعد پیغمبر اکرمؐ نے مدینہ کی آبادی سے متصل ایک جگہ مباہلہ کے لئے منتخب کی

جسے سلمان فارسی نے خس و خاشاک سے پاک و صاف کیا۔ دوسرے دن صبح ہوتے ہی نصاری مقام مباہلہ پر پہنچ گئے۔ مہاجرین و انصار بھی گھروں سے نکل آئے اور میدان میں جمع ہو گئے۔ جب پیغمبر اکرمؐ کو نصاری کے پہنچنے کی اطلاع ہوئی تو آپ نے علی مرتضٰی فاطمہ زہرا اور حسن و حسین کو مباہلہ میں شرکت کے لئے طلب کیا۔ سعد ابن ابی وقاص کہتے ہیں:-

لما نزلت هذه الآية ندع ابناءنا وابناءكم دعا رسول الله عليا و فاطمة وحسنا وحسينا فقال اللهم هولاء اهلي۔ (صحیح مسلم۔ ج ۲۔ ص ۲۷۸)۔

جب آیۂ مباہلہ نازل ہوا تو رسولؐ اللہ نے علی فاطمہؑ حسنؑ اور حسینؑ کو طلب کیا اور کہا اے میرے اللہ یہی میرے اہلبیت ہیں۔"

ابن واضح یعقوبی نے تحریر کیا ہے:-

غدا رسول الله اخذا بيد الحسن والحسين عليهما السلام تتبعه فاطمة وعلي ابن ابي طالب بين يديه۔ (تاریخ یعقوبی ج ۲۔ ص ۶۶)۔

رسولؐ خدا صبح صبح اس طرح نکلے کہ حسن و حسین علیہما السلام کا ہاتھ تھامے ہوئے تھے اور پیچھے پیچھے جناب فاطمہ اور آگے آگے حضرت علی تھے۔"

جب پیغمبرؐ میدان مباہلہ میں پہنچے تو ایک درخت کے نیچے دو زانو بیٹھ گئے اور علی کو آگے فاطمہ کو عقب میں اور حسن و حسین کو داہنے بائیں بٹھا لیا۔ اور اُن سے کہا کہ جب میں دعا کروں تو تم سب آمین کہنا۔ نصاری نے جب پیغمبرؐ کے ہمراہ ایک مرد ایک خاتون اور دو بچوں کو دیکھا تو پہلے تو حیرت زدہ ہوئے اور پھر ایک مبہم سا خوف ان پر طاری ہو گیا۔ ابو حارثہ نے کہا:-

يا معشر النصارى اني لارى وجوها لو شاء الله ان يزيل جبلا من مكانه لازاله بها فلا تباهلوا فتهلكوا۔ (تفسیر کشاف۔ پارہ ۳)

اے گروہ نصاری میں ایسے چہروں کو دیکھ رہا ہوں کہ اگر اللہ چاہے کہ پہاڑ کو اس کی جگہ سے سرکا دے تو وہ ان چہروں کی خاطر سرکا دے گا۔ ان سے مباہلہ نہ کرنا ورنہ تباہ و ہلاک ہو جاؤ گے۔"

جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ پیغمبرؐ کے ہمراہ آنے والے ان کے داماد اور ابن عم علی مرتضٰے اور بیٹی فاطمہ زہراء اور نواسے حسن و حسین ہیں تو صداقت و خود اعتمادی کے ان حسین پیکروں کو دیکھ کر ان پر برق خاطف گری اور چرخ نبوت کے نیر اعظم اور فلک ہدایت کے درخشندہ ستاروں کی تابانیوں سے ان کی نگاہیں خیرہ ہو گئیں اور مباہلہ سے پیچھا چھڑاتے نظر آنے لگے اور اس تصور نے انہیں اور پست ہمت بنا دیا کہ اگر پیغمبرؐ کو اپنی صداقت پر مکمل وثوق و اعتماد نہ ہوتا تو وہ اس پُر خطر منزل میں غیروں کو لے کر آتے اپنے جگر کے ٹکڑوں کو ساتھ نہ لاتے کیونکہ یہی وہ افراد تھے جن سے بقائے نسل رسول

وابستہ تھی اگر یہی بددعا کے نتیجہ میں ہلاک ہوجاتے تو نسل رسولؐ ہی ختم ہوجاتی ظاہر ہے کہ اس طرح کا اقدام وہی کر سکتا ہے جسے اپنی صداقت پر مکمل یقین اور اپنی حقانیت پر پورا بھروسا ہو۔ ابھی نصاریٰ تذبذب کے عالم میں تھے کہ ابو حارثہ کے بھائی کرز ابن علقمہ نے جو اسلام کی صداقت سے متاثر ہوچکا تھا کہا کہ اے گروہ نصاریٰ مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ محمدؐ ہی وہ نبی خاتم ہیں جن کا تذکرہ ہمارے مقدس صحیفوں میں ہے ہمیں ان سے مباہلہ نہ کرنا چاہئے اس لئے کہ جو نبیوں سے مباہلہ کرتا ہے وہ ہلاکت ابدی کے گڑھے میں گرے بغیر نہیں رہتا۔ ذرا آنکھیں کھول کر گردو پیش کا جائزہ لو کیا تمہیں فطرت کی جوشش غضب میں ابلی ہوئی نگاہیں عذاب کی آمد کا پتا نہیں دے رہیں اب جو نظریں اٹھیں تو دیکھا کہ سورج کی چمک دمک پھیکی پڑ چکی ہے فضا میں دھوئیں کے مرغولے اٹھ رہے ہیں شاخوں سے پتے جھڑ رہے ہیں اور پرندے آشیانوں سے بے آشیاں ہو کر زمین پر دبکے پڑے ہیں۔ کائنات کے ان خشمگیں تیوروں کو دیکھ کر نصاریٰ کے دل دہل گئے۔ مباہلہ سے دستبردار ہوکر صلح کی درخواست کی آنحضرتؐ نے ان کی درخواست کو شرف قبولیت بخشا اور حضرت علیؑ کو شرائط صلح طے کرنے کے لئے مامور فرمایا حضرت نے اس شرط پر صلح کی کہ وہ سال میں دو مرتبہ ماہ صفر اور ماہ رجب میں ایک ہزار پارچے بطور جزیہ دیا کریں گے اور ہر پارچہ چالیس درہم کا ہوگا اور اگر یمن میں کبھی جنگ چھڑی تو وہ جنگی امداد کے سلسلہ میں تیس زرہیں تیس نیزے اور تیس گھوڑے عاریۃً دیں گے اور اس کے صلہ میں وہ اپنی زمینوں پر بدستور آباد رہیں گے اور ان کے مال و جان کی حفاظت مسلمانوں کے ذمہ ہوگی۔

یہ فتح و سرفرازی تاریخ اسلام میں کیا تاریخ عالم میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے منفرد ہے کہ ایک طرف گنے چنے پانچ افراد ہیں جن میں ایک خاتون اور دو کمسن بچے بھی شامل ہیں جن کے جلو میں نہ مادی قوت و طاقت کے عساکر ہیں نہ ان کے سروں پر خود نہ جسموں پر زرہیں اور نہ ہاتھوں میں تلواریں ہیں۔ وہ صرف یقین کی قوت اور اعتماد کی طاقت سے نجران کے نمائندہ وفد کو بے دست و پا کرکے اپنی صداقت کا لوہا منوا لیتے اور ان کے تمرد و شکوہ کو کچل کر ان کی گردنوں میں باجگزاری کا جوا ڈال دیتے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ عیسائیوں نے مباہلہ سے انکار کرکے اپنی شکست اور اسلام کی فتح کا عملاً اعتراف کرلیا اور الوہیت مسیح کے سلسلہ میں اپنے عقیدہ و یقین کا پردہ چاک کردیا۔ اگر انہیں اپنے مسلک کی صحت اور اپنے عقیدہ کی صداقت پر اعتماد ہوتا تو کبھی مباہلہ سے گریز نہ کرتے اور جزیہ قبول کرکے اپنے عقائد کی ناپختگی کا ثبوت نہ دیتے۔

اس موقع پر انصار و مہاجرین عشرۂ مبشرہ و اصحاب بدر بیٹھے اور ان کی اولادیں موجود تھیں اور الفاظ قرآن میں بلحاظ جمع سب کے لئے گنجائش بھی تھی اور صحابہ اور ان کی اولاد و ازواج کو مباہلہ میں شریک کیا جاسکتا تھا مگر وسعت و گنجائش کے باوجود صرف حسن حسین فاطمہ زہرا اور علی مرتضےٰ منتخب ہوئے۔ اگر آیت کا مفہوم یہ ہوتا کہ دو بیٹوں ایک خاتون اور ایک اپنے دل و جان کو لے کر مباہلہ کے لئے نکلو تو پیغمبرؐ دوسروں سے یہ کہہ سکتے تھے کہ میں تمہیں بھی اس قابل سمجھتا تھا کہ مباہلہ میں شریک کرتا مگر حکم قرآن کے پیش نظر چار افراد سے زیادہ اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتا

اور دُوسرے بھی یہ کہہ سکتے تھے کہ اگر چار سے زائد افراد کے لے جانے کی گنجائش ہوتی تو وُہ بھی شریک مباہلہ کئے جاتے مگر الفاظ میں انتہائی وسعت کے ہوتے ہوئے کسی کو شرکت کی دعوت نہ دینا اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ مباہلہ میں شمولیت سے مانع الفاظ کی تنگدامانی اور تعداد کی قید نہ تھی بلکہ اس کے لئے جن اوصاف کی ضرورت تھی وُہ ان منتخب ہستیوں کے علاوہ کسی اور میں نہ تھے ورنہ پیغمبرؐ بلاوجہ کسی کو نظر انداز نہ کرتے۔

مباہلہ کی منزل میں قدم رکھنے کے لئے دو صفتیں از بس ضروری تھیں ایک یقین اور دوسرے صدق۔ یقین اس لئے کہ حسب ظاہر مباہلہ میں ہلاکت کا خطرہ تھا اور جب تک اپنے موقف کی صداقت پر یقین کامل اور اور اپنے دعویٰ کی صداقت پر وثوق تام نہ ہو کوئی عاقل معرض ہلاکت میں آکھڑا نہیں ہوتا ایسے پر خطرہ موقع پر وہی ثابت قدم رہ سکتا ہے جسکا یقین غیر متزلزل ہو۔ ورنہ بے یقینی کے نتیجہ میں قدم لرز جاتے اور دل دہل جاتے۔ اسی ضرورتِ یقین کے پیش نظر آنحضرتؐ نے ان افراد کو منتخب کیا جن کے یقین میں نہ کبھی کمزوری رونما ہوئی اور نہ شکوک واوہام کے غبار سے دھندلا ہوا اگر کوئی اور بھی یقین کی اس منزل پر فائز ہوتا تو نظر انتخاب اس پر بھی پڑتی مگر کسی اور کا نظر انتخاب میں نہ آنا اس امر کی دلیل ہے کہ پیغمبرؐ انہی کو یقین کے بلند ترین مرتبہ کا حامل سمجھتے تھے۔ دوسری صفت صدق ہے۔ یہ اس لئے ناگزیر تھی کہ کذب سے ٹکراؤ تھا اور کاذبین کے مقابلہ میں صادقین ہی کو لایا جاسکتا ہے کیونکہ جھوٹی قوتوں سے وہی افراد برسرِ پیکار ہو سکتے ہیں جو ہمیشہ سچائی کی راہ پر گامزن رہے ہوں۔ اور نصاریٰ نجران بنص قرآن کاذب تھے کیونکہ ان کے عقیدوں میں کذب کارفرما تھا اس طرح کہ وہ تین خداؤں کے قائل تھے اور باپ بیٹا اور روح القدس کو الوہیت میں شریک سمجھتے تھے۔ مگر عقیدۂ توحید اتنا فطری ہے کہ تین کہنے کے ساتھ ایک بھی کہتے تھے اس فطری اور اعتقادی تصادم کے نتیجہ میں تین ایک اور ایک تین کا پیچیدہ اور ناقابل فہم مزعومہ عقیدہ بن کر ان کے ذہنوں میں رچ بس گیا تھا یہ عقیدۂ تثلیث چند لوگوں کے ذہن کی پیداوار ہے جو انتہائی کوششوں اور کاوشوں کے باوجود ابھی تک لاینحل ہے اس لئے کہ کوئی انسان عقل و شعور کی روشنی میں یہ مسئلہ حل نہیں کرسکتا کہ ایک تین کیسے ہوسکتا ہے اور تین ایک کیسے ہو سکتے ہیں۔ یہ عقیدہ چونکہ واقع کے خلاف ہے کیونکہ واقع میں نہ تین خدا ہیں اور نہ ایک تین اور تین ایک کا کوئی مصداق اور جو چیز واقع کے خلاف ہو اسی کا نام کذب ہے۔ بلکہ اگر کوئی نظریہ واقع کے مطابق بھی ہو مگر زبان اس سے ہمنوا نہ ہو تو وُہ بھی کذب ہے جیسا کہ ارشاد باری ہے:۔

اذا جاءك المنافقون قالوا نشهد	جب تمہارے پاس منافق آتے ہیں تو وہ یہ کہتے
انك لرسول الله والله يشهد	ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسُول ہیں
ان المنافقين لكاذبون۔	اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں"۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر دل زبان سے الگ ہو اس طرح کہ دل میں کچھ ہو اور زبان پر کچھ ہو تو وُہ بھی جھوٹ ہے اگرچہ زبان پر آنے والے کلمات واقع کے مطابق کیوں نہ ہوں۔ اور صدق یہ ہے کہ دل زبان کی صدا سے

ہم آہنگ ہو اور جو زبان پر ہو وُہ واقع کے مطابق بھی ہو اب صادق وہ ہو گا جس کی زبان کی ہر لفظ دل کا ہر ارادہ اور عمل کی ہر جنبش واقع کے عین مطابق ہو۔ اس سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ آنحضرتؐ نے جن ذوات مقدسہ کو مباہلہ کے لئے منتخب کیا تھا ان کا ہر قول ہر عمل اور ہر ارادہ صداقت کا آئینہ دار تھا وُہ اعتقاداً قولاً اور عملاً ہر لحاظ سے سچے تھے نہ ان کے قول و عمل میں کبھی کوی غلطی دیکھی گئی اور نہ کبھی ان کے عقیدہ میں کوی لغزش نظر آئی۔ حضرت علی خود فرماتے ہیں :۔

ما وجد لی کذبۃ فی قول ولا	پیغمبرؐ نے نہ تو میری کسی بات میں جھوٹ کا شائبہ پایا
خطلۃ فی فعل۔ (نہج البلاغۃ)	اور نہ میرے کسی کام میں لغزش و کمزوری دیکھی۔"

اس انتخاب سے جہاں اہلبیت اطہار کی عصمت و صداقت اور دوسروں پر فوقیت و برتری کا اظہار ہوتا ہوتا ہے وہاں اسلام میں ان کی بنیادی و اساسی حیثیت پر بھی روشنی پڑتی ہے اس طرح کہ قدرت نے مباہلہ میں ان کی شرکت کو ضروری قرار دیا اور پیغمبرؐ نے اپنی دُعا کا تکملہ ان کی صدائے آمین کو قرار دیا اور انہی کے امتیازی کردار کی بدولت اسلام کو یہ فتح مبین حاصل ہوی۔ حیرت ہے کہ جو کار نبوت کے سرانجام دینے میں پیغمبرؐ کے شریک ہوں اور جن کی شرکت کے بغیر مباہلہ کی تکمیل نہ ہو سکتی ہو وُہ نیابت پیغمبرؐ کے سلسلہ میں اس طرح نظر انداز کر دیئے جائیں کہ ادھر نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا جائے اور مشورہ تک میں ان کی شمولیّت کو غیر ضروری سمجھا جائے۔

"دریں دیار مگر رسم باز دیدن نیست"

سریۂ بنی زبید

پیغمبر اکرمؐ تبوک سے پلٹ کر جب مدینہ میں تشریف فرما ہُوئے تو بنی مذحج کی ایک شاخ بنی زبید کا سردار عمرو ابن معدیکرب آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا آپ نے اسے اسلام کی دعوت دی۔ اس نے اور اس کے قبیلہ کے آدمیوں نے جو اس کے ہمراہ تھے اسلام قبول کر لیا۔ عمرو کا باپ معدیکرب دورِ جاہلیت میں مارا گیا تھا اس نے پیغمبر اکرمؐ سے کہا کہ میں اپنے باپ کے قاتل سے قصاص لینا چاہتا ہوں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ جاہلیت کے خون کا قصاص ختم کر دیا گیا ہے۔ اس وقت تو وُہ خاموش ہو گیا مگر وہاں سے پلٹ کر وُہ بغاوت و سرکشی پر اتر آیا اور بنی حارث ابن کعب پر حملہ کر کے انہیں قتل و غارت کیا اور اسلام سے منحرف ہو کر مرتد ہو گیا۔
پیغمبر اکرمؐ کو اس کے شرّ و فساد کی اطلاع ہوی تو آپ نے حضرت علی کو تین سو کے لشکر کے ساتھ یمن جانے کا حکم دیا تاکہ ان شورشوں کو دبائیں اور نصاری نجران سے جزیہ بھی وصول کریں۔ جب حضرت علی روانہ ہونے لگے تو پیغمبرؐ نے اپنے ہاتھوں سے علم سج کر آپ کو دیا اور اپنے ہاتھ سے اُن کے سر پر عمامہ باندھا جس کا ایک سرا سینہ پر تھا اور ایک سرا پشت پر اور فرمایا کہ اگر وُہ لوگ لڑائی چھیڑیں تو تم ان سے لڑنا ورنہ از خود ابتدا نہ کرنا۔

اس لشکر کے ساتھ ایک اور لشکر خالد ابن ولید کی ماتحتی میں قبیلۂ بنی جعفی کی طرف روانہ کیا اور خالد کو یہ ہدایت کی کہ اگر کسی مقام پر دونوں لشکر یکجا ہو جائیں اور دشمن سے جنگ چھڑ جائے تو دونوں لشکروں کے سردار علی ہوں گے ۔ حضرت علی نے فوج کے اگلے حصہ کا سردار خالد ابن سعید کو اور خالد ابن ولید نے ابو موسی اشعری کو مقرر کیا اور دونوں اپنے اپنے لشکروں کی قیادت کرتے ہوئے اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب خالد ابن ولید بنی جعفی کی طرف بڑھے اور انہیں لشکر اسلام کی آمد کا پتا چلا تو وہ دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ یمن چلا گیا اور ایک گروہ بنی زبید سے جا ملا۔ امیر المومنین کو بنی جعفی کے تقسیم ہو جانے کی اطلاع ہوی تو خالد کو کہلا بھیجا کہ جس مقام پر میرا قاصد تمہیں ملے وہیں پر رک جاؤ مگر خالد نے اس خیال سے کہ اگر دونوں لشکر ایک ہو گئے تو افسری جاتی رہے گی رکنے سے انکار کر دیا۔ حضرت نے خالد ابن سعید سے کہا کہ فوج کا ایک دستہ لے کر جاؤ اور خالد کو جہاں پاؤ روک لو۔ خالد ابن سعید نے آگے بڑھ کر انہیں روک لیا۔ امیر المومنین وہاں پر پہنچے تو خالد ابن ولید کو حکم عدولی پر سرزنش کی اور دونوں لشکروں کو ایک کر کے آگے چل دیئے۔ جب مقام کشر میں پہنچے تو بنی زبید سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ عمرو ابن معدیکرب مقابلہ پر اتر آیا خالد ابن سعید نے چاہا کہ اس سے جنگ آزما ہوں مگر حضرت نے انہیں روک دیا اور خود شمشیر بکف میدان میں نکل آئے۔ عمرو ابن معدیکرب اگرچہ عرب کا مشہور جنگ آزما اور تیغ زن تھا مگر حضرت علی کو اپنے مقابلہ میں آتے دیکھ کر اس کے قدم لڑکھڑا گئے اور میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کا ایک بھائی اور ایک بھتیجا مارا گیا اور اس کی بیوی رکانہ بنت سلامہ اور بچے اسیر کر لئے گئے ان کے علاوہ اور عورتیں بھی قید کی گئیں اور بہت سا مال غنیمت ہاتھ لگا۔ دشمن کو مغلوب و اسیر کرنے کے بعد حضرت حجۃ الوداع میں شریک ہونے کے لئے مکہ روانہ ہو گئے اور خالد ابن سعید کو وہاں چھوڑ گئے تاکہ بنی زبید سے صدقات جمع کریں اور اُن میں سے کوی مسلمان ہو کر امان طلب کرے تو اسے امان دیں۔ جب عمرو ابن معدیکرب کو معلوم ہوا کہ اس کے بیوی بچے اسیر کر لئے گئے ہیں تو وہ خالد ابن سعید کے پاس آیا اور دوبارہ اسلام قبول کر کے اپنے بیوی بچوں کو واپس لے لیا اور اس کے صلہ میں اپنی مشہور تلوار صمصامہ خالد ابن سعید کو نذر کر دی۔

امیر المومنین نے مال غنیمت کے خمس میں سے ایک کنیز لے لی تھی۔ خالد ابن ولید نے براء ابن عازب کے ہاتھ ایک خط پیغمبرؐ کی خدمت میں بھیجا جس میں حضرت علی کے اس اقدام کی سخت لب و لہجہ میں شکایت کی جب آنحضرت نے وہ تحریر پڑھی تو آپ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا اور براء سے مخاطب ہو کر فرمایا :-

ما تری فی رجل یحب اللہ و	تم اس شخص کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہو جو
رسولہ و یحبہ اللہ و رسولہ	اللہ اور اُس کے رسولؐ کو دوست رکھتا ہے اور اللہ و
(صحیح ترمذی ۔ ص ۲۱۵) ۔	رسول اسے دوست رکھتے ہیں"

براء نے پیغمبرؐ کے چہرے پر آثار غضب دیکھ کر کہا کہ یا رسول اللہ میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے غضب سے پناہ مانگتا ہوں میں تو صرف ایک پیغامبر کی حیثیت سے حاضر ہوا ہوں۔ یہ سن کر پیغمبر اکرمؐ خاموش ہو گئے۔

امیرالمومنین کو اس مال میں ہر طرح کا حق تصرف حاصل تھا اور اُن کا حصّہ بھی ایک خادمہ سے کہیں زیادہ تھا مگر وُہ لوگ جو اپنے دلوں میں عناد لئے ہُوئے تھے وُہ ایسے مواقع کی تلاش میں رہتے تھے کہ کوئی ایسی بات ہاتھ لگے جس سے پیغمبرؐ کو ان کے خلاف کیا جا سکے۔ چنانچہ اس موقع پر بھی پیغمبرؐ کے جذبات کو ان کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی گئی مگر علی کو موردِ طعن بنانے والے خود پیغمبرؐ کے غیظ و غضب کا ہدف بن گئے اور پیغمبرؐ نے یہ کہہ کر ان کی زبانوں کو بند کر دیا کہ علی خدا اور رسُول کے دوست ہیں اور خدا و رسُول ان کے دوست ہیں۔ مقصد یہ تھا کہ اگر یہ نا سزا و ناروا عمل ہوتا تو پھر نہ خدا ان کا دوست رہتا اور نہ اُس کا رسُول اور نہ وُہ خدا و رسُولؐ کے دوست رہتے۔

حجۃ الوداع

۶ھ میں پیغمبر اسلام عمرہ کے ارادہ سے نکلے مگر قریش سدِ راہ ہُوئے اور آپ حدیبیہ سے واپس پلٹ آئے اور مکہ پہنچ کر عمرہ بجا نہ لا سکے۔ ۷ھ میں پھر عمرہ کے لئے تشریف لے گئے مگر قریش سے معاہدہ کی بنا پر تین دن سے زیادہ مکہ میں قیام نہ کر سکے۔ ۸ھ میں مکہ فتح ہوا اور بتوں سے خانہ کعبہ کی تطہیر عمل میں آئی۔ ۹ھ میں حضرت علی کو سورۂ براۃ کی آیتیں دے کر رسوم حج کو شرک کی آلودگیوں سے پاک کرنے کے لئے بھیجا انہوں نے مشرکین سے بیزاری و لاتعلقی کا اعلان کر کے انہیں حرم کعبہ میں آیندہ قدم رکھنے سے منع کیا۔ ۱۰ھ میں ادائے فریضۂ حج کا قصد فرمایا اور دعوت حج کی صدا تمام اکناف عالم میں گونج اُٹھی:۔

اذن فی الناس بالحج یاتوك	لوگوں میں حج کے لئے پکارو تمہارے پاس دُور و
رجالا و علےٰ کل ضامر من	دراز کی راہوں سے پیادہ اور سفر سے تھکی ماندی
کل فج عمیق لیشھدو ا	سواریوں پر چڑھ کر آئیں گے تاکہ وُہ (دین و دنیا
منافع لھم۔	کے) فائدے حاصل کریں"۔

پیغمبر اکرمؐ کی آواز پر ہر سمت سے مسلمان کثیر تعداد میں مدینہ پہنچ گئے تاکہ پیغمبرؐ کے ساتھ فریضۂ حج بجا لائیں اور آداب و احکام حج سیکھیں آنحضرتؐ ۲۶ ذی قعدہ کو ہزاروں مسلمانوں کے جلو میں مدینہ سے نکل کھڑے ہُوئے۔ جناب فاطمہ زہراؑ اور ازواج رسُول بھی اس سفر میں شریک تھیں۔ جب ظہر کے قریب وادئ ذی الحلیفہ میں پہنچے تو غسل احرام کے بعد احرام باندھا۔ صحابہ نے بھی احرام باندھ لئے اور سب نے مل کر تلبیہ کیا تو لبّیك اللھم لبّیك کی آوازوں سے دشت و صحرا گونج اُٹھے۔

حضرت علی یمن ہی میں تھے کہ آنحضرتؐ نے انہیں تحریر فرمایا کہ وُہ مکہ پہنچ کر حج میں شریک ہوں۔ آپ اپنے دستۂ سپاہ کے ساتھ وہاں سے چل دیئے۔ راستے میں لشکر کی امارت ایک شخص کے سپرد کر کے آگے بڑھے اور وادی یلملم سے احرام باندھ کر آنحضرت کے وارد مکہ ہونے سے پہلے ان کی خدمت میں پہنچ گئے

پیغمبرؐ نے آپ کو دیکھا تو چہرہ فرطِ مسرّت سے دمک اُٹھا۔ پوچھا کہ اے علی تم نے کس نیت سے احرام باندھا ہے عرض کیا کہ آپ نے اس کے متعلق کچھ تحریر نہیں فرمایا تھا اس لئے میں نے اپنی نیت کو آپ کی نیت سے وابستہ کر دیا تھا کہ جو آپ کی نیت ہوگی وہی میری نیت ہوگی۔ میں اپنے پیچھے چونتیس اُونٹ قربانی کے چھوڑ آیا ہوں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ میرے ہمراہ قربانی کے چھیاسٹھ اُونٹ ہیں اور تم مناسک حج اور قربانی کے اُونٹوں میں میرے شریک ہو۔ اس کے بعد حضرت علیؑ نے یمن کی تمام روداد اور جزیہ اور غنائم و صدقات کی تفصیل بیان کی اور عرض کیا کہ میں اموال غنیمت و جزیہ لشکر کے سپرد کر کے شوق زیارت میں پہلے چلا آیا ہوں فرمایا کہ تم اپنے ہمراہیوں کے پاس جاؤ اور انہیں لے کر جلد مکہ پہنچ جاؤ۔ حضرت علی پیغمبرؐ سے رخصت ہو کر واپس پلٹے ابھی تھوڑا سا راستہ طے کیا ہوگا کہ لشکر کو آتے دیکھا۔ جب وُہ لوگ قریب پہنچے تو دیکھا کہ سب نے بندھی ہوئی گٹھریوں میں سے نئے جامے نکال کر احرام باندھ رکھے ہیں۔ آپ نے نگران لشکر سے پوچھا کہ تم نے میری اجازت کے بغیر یہ پارچے کیوں تقسیم کئے ہیں کہا کہ ان لوگوں نے اصرار کیا تھا کہ یہ پارچے انہیں دے دیئے جائیں اور بعد میں واپس لے لئے جائیں۔ فرمایا کہ انہیں آنحضرتؐ کی خدمت میں پیش کرنے سے پہلے استعمال میں نہیں لایا جاسکتا۔ پھر حکم دیا کہ یہ پارچے اتار دیئے جائیں اور انہیں بحفاظت رکھ دیا جائے۔ لوگوں نے پارچے اتار تو دیئے مگر انہیں یہ بات بہت ناگوار گزری۔ جب پیغمبرؐ کی خدمت میں پہنچے تو علی کا گلہ شکوہ کیا۔ آنحضرتؐ نے کھڑے ہو کر فرمایا:-

یا ایھا الناس لا تشکوا علیاً	اے لوگو علی کا گلہ نہ کرو وُہ اللہ
فواللہ انہ لاخشن فی ذات اللہ	کے معاملہ میں سخت گیر ہیں"۔
او فی سبیل اللہ۔ (تاریخ طبری ج۲ ص۴۰۲)	

حجۃ الوداع سے پیشتر دو قسم کے حج ہوتے تھے ایک حج افراد اور ایک حج قران۔ ان دونوں میں عمرہ ایک جداگانہ اور مستقل عمل کی حیثیت رکھتا ہے جو اعمال حج بجالانے کے بعد بجالایا جاتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ حج قران میں قربانی کے جانور ساتھ ہوتے ہیں اور حج افراد میں قربانی کے جانور ساتھ نہیں ہوتے اس موقع پر آیۂ واتموا الحجّ والعمرۃ للہ۔ "اللہ کے لئے حج اور عمرہ پورا کرو" نازل ہوا تو حج میں ایک تیسری قسم کا اضافہ ہوگیا جسے حج تمتع کہا جاتا ہے۔ حج تمتع میں عمرہ حج ہی کا ایک جزو ہوتا ہے جو ایام حج میں حج سے پہلے بجالایا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کی صورت یہ ہے کہ پہلے عمرہ بجالا کر احرام کھول دیا جائے اور آٹھ ذی الحجہ یوم ترویہ کو حج کا احرام باندھا جائے اور اعمال حج بجالائے جائیں اسے حج تمتع اس لئے کہا جاتا ہے کہ عمرہ و حج کے درمیانی وقفہ میں احرام کے قیود اُٹھ جاتے ہیں اور جو چیزیں احرام کی حالت میں جائز نہیں ہیں ان سے متمتع ہوا جاسکتا ہے۔ یہ حج اُن لوگوں کے لئے ہے جو مکہ سے اڑتالیس میل سے زیادہ فاصلہ کے رہنے والے ہوں۔ اور حج افراد و حج قرآن مکہ سے اڑتالیس میل یا اس سے کم مسافت کے رہنے والوں کے لئے ہے۔ اس سفر حج میں زیادہ تر وُہ لوگ تھے جن کے ساتھ قربانی کے جانور نہیں تھے۔ آنحضرتؐ نے انہیں حکم

دیا کہ وہ حج کی نیت کو عمرہ کی نیت سے بدل لیں اور عمرہ کے بعد احرام اتار دیں اور حج تمتع بجا لائیں اور جن لوگوں کے ہمراہ قربانی کے جانور ہیں وہ احرام باندھے رکھیں۔ آنحضرتؐ کے ہمراہ چونکہ قربانی کے اونٹ تھے اس لئے آپ کا حج، حج قران تھا اور حضرت علی کی نیت بھی پیغمبرؐ کی نیت حج کے تابع تھی اس لئے دونوں نے احرام نہ کھولے۔ جب لوگوں نے پیغمبرؐ کو احرام باندھے دیکھا تو احرام کھولنے میں پس وپیش کرنے لگے اور سابقہ طریق حج سے مانوس طبیعتوں پر یہ امر انتہائی شاق گزرا اور وہ بدستور احرام باندھے رہے۔ پیغمبر اکرمؐ نے انہیں تعمیل حکم سے پہلوتہی کرتے دیکھا تو سخت رنجیدہ ہوئے اور غیظ وغضب کی شکنیں ماتھے پر ابھر آئیں۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں:۔

قدم رسول اللہ لاربع مضین من ذی الحجۃ او خمس فدخل علی وھو غضبان فقلت من اغضبک یا رسول اللہ ادخلہ اللہ النار قال او ما شعرت انی امرت الناس بامر فاذا ھم یترددون لو انی استقبلت من امری ما استدبرت ما سقت الھدی معی حتی اشتریہ ثم احل کما حلوا	رسول اللہ ذی الحجہ کی چوتھی یا پانچویں تاریخ کو وارد ہوئے اور غیظ وغضب کی حالت میں میرے ہاں آئے میں نے کہا یا رسول اللہ کس نے آپ کو غضبناک کیا ہے خدا اُسے جہنم واصل کرے فرمایا کیا تمہیں خبر نہیں کہ میں نے لوگوں کو ایک حکم دیا تھا مگر وہ تردد وتذبذب میں پڑ گئے ہیں۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ صورت حال یہ پیش آنے والی ہے تو میں قربانی کے جانور اپنے ساتھ لانے کے بجائے یہاں سے خرید لیتا اور ان لوگوں کی طرح احرام کھول دیتا۔"

(صحیح مسلم ۔ج ۱ ۔ ص ۳۹۰)۔

جس طرح آنحضرتؐ کی زندگی میں کچھ لوگوں نے حج تمتع کی مخالفت کی اسی طرح پیغمبر کے بعد بھی اس کی مخالفت کرتے رہے اور حکم شرعی کے مقابلہ میں اپنی رائے کو ترجیح دیتے رہے۔ چنانچہ عمران ابن حصین کہتے ہیں:۔

نزلت ایۃ المتعۃ فی کتاب اللہ و امرنا بھا رسول اللہ ثم لم تنزل ایۃ تنسخ ایۃ متعۃ الحج ولو ینہ عنھا رسول اللہ حتی مات قال رجل برایہ بعد ما شاء۔ (صحیح مسلم ج ۱ ۔ ص ۴۰۴)	حج تمتع کی آیت قرآن مجید میں نازل ہوی ہے اور پیغمبر اکرمؐ نے ہمیں اس کا حکم دیا تھا اور بعد میں کوی ایسی آیت نازل نہیں ہوی جو حج تمتع کی آیت کو منسوخ کرتی اور نہ رسول اللہؐ نے مرتے دم تک اس سے منع کیا۔ البتہ ایک شخص نے اپنی رائے سے جو چاہا کہہ دیا۔"

شارح مسلم نواوی نے تحریر کیا ہے:۔

یعنی عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ لانہ اوّل من نھی عن المتعۃ	اس سے مراد عمر ابن خطاب ہیں اس لئے کہ سب سے پہلے انہی نے حج تمتع سے منع کیا

فکان من بعدہ من عثمان وغیرہ تابعا لہ فی ذلک۔ (حاشیہ مسلم جلد ۱ ص۴۰۲) تھا۔ باقی رہے حضرت عثمان وغیرہ تو وہ اس مسئلہ میں انہی کے تابع تھے"۔

بہر حال آٹھ ذی الحجہ روز پنجشنبہ آنحضرتؐ نے حکم دیا کہ جنہوں نے عمرہ کے بعد احرام کھول دیئے تھے وہ احرام حج باندھ لیں خود پیغمبر اکرمؐ پہلے سے احرام باندھے ہوئے تھے اور حضرت علی بھی آپ کے حسب ہدایت حالتِ احرام پر باقی تھے۔ جب احرام باندھے جا چکے تو مکہ سے نکل کھڑے ہوئے اور منیٰ میں تشریف لے آئے دوسرے دن نماز صبح کے بعد منیٰ سے عرفات کی طرف روانہ ہو گئے۔ قبل اسلام قریش نے یہ دستور بنا رکھا تھا کہ وہ مشعر الحرام پہنچ کر رک جاتے اور کہتے کہ ہم اہل حرم ہیں حرم سے باہر نہیں نکلیں گے البتہ دوسرے لوگ عرفات میں چلے جاتے قریش کا خیال تھا کہ پیغمبرؐ بھی منیٰ سے نکل کر مشعر الحرام میں رک جائیں گے اور آگے نہیں بڑھیں گے مگر حکم قرآن ثم افیضوا من حیث افاض الناس "جہاں سے دوسرے لوگ چل کھڑے ہوں تم بھی وہیں سے چل کھڑے ہو" کی بنا پر پیغمبرؐ مشعر الحرام سے آگے عرفات کی طرف چل دیئے اور وہاں پہنچ کر نمرہ میں خیمہ زن ہوئے ظہر و عصر کی نماز ایک ساتھ ادا کی غروب آفتاب تک وقوف فرمایا اور بعد غروب وہاں سے چل کر مشعر الحرام میں تشریف فرما ہوئے اور مغرب و عشا کی نماز ایک ساتھ پڑھی۔ مشعر الحرام میں رات گزرنے کے بعد روز عید صبح کے وقت منیٰ میں آئے اور جمرۂ عقبہ پر رمی کرنے کے بعد تیس اونٹ اپنے ہاتھ سے نحر کئے اور بقیہ اونٹوں کے نحر کرنے پر حضرت علی کو مامور فرمایا۔ جب اونٹ نحر ہو چکے تو ہر اونٹ میں سے گوشت کا ایک ایک ٹکڑا لے کر ایک دیگ میں پکوایا اور حضرت علی کے ساتھ مل کر اس میں سے کچھ کھایا اور باقی تقسیم کر دیا۔ قربانی سے فارغ ہو کر سر منڈوایا اور احرام کھول دیا اور اسی دن مکہ معظمہ میں پہنچ کر خانہ کعبہ کا طواف اور صفا و مروہ کی سعی بجا لائے اور منیٰ میں واپس آ گئے جہاں ۱۳ ذی الحجہ تک قیام فرمایا اور رمی جمرات کا فریضہ ادا کیا۔ جب اعمال حج سے فارغ ہو گئے تو ۱۴ ذی الحجہ کو مسلمانوں کی جمعیت کے ساتھ مدینہ روانہ ہو گئے۔

غدیر خم

پیغمبر اسلامؐ فریضۂ حج سے فارغ ہونے کے بعد جب مدینہ کی جانب روانہ ہوئے تو کم و بیش ایک لاکھ کا مجمع آپ کے ہمرکاب تھا جو مختلف شہروں اور بستیوں سے سمٹ کر جمع ہو گیا تھا اور اب فرض سے سبکبار ہو کر خوش خوش اپنے گھروں کو پلٹ رہا تھا۔ کچھ لوگ مدینہ پہنچ کر الگ ہونے والے تھے اور کچھ لوگوں کو راستے ہی سے علیحدہ ہو جانا تھا۔ جوں جوں اُن کی بستیاں قریب آتی جا رہی تھیں ان کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی کچھ لوگ شاداں و فرحاں آگے بڑھ گئے تھے اور کچھ افتاں و خیزاں چلے آ رہے تھے۔ غرض قافلہ رواں دواں تھا کہ مقام جحفہ سے تین میل کے فاصلہ پر ایک پُرخار وادی میں جو غدیر خم کہلاتی تھی انہیں ٹھہر جانے کا حکم دیا گیا۔ یہ حکم اتنا اچانک اور ناگہانی تھا کہ لوگ حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے کہ یہاں منزل کیسی کیونکہ یہ جگہ نہ تو قافلوں کے اترنے

کے لئے موزوں تھی نہ گرمی سے بچنے کا کوئی سامان تھا اور نہ دھوپ سے بچاؤ کے لئے سایہ اور نہ اُدھر سے گزرتے ہوئے عربوں کے کسی کارواں کو یہاں منزل کرتے دیکھا گیا تھا۔

اس کارواں کو روکنے کا مقصد یہ تھا کہ پیغمبر اکرمؐ مسلمانوں کو اللہ کے ایک اہم فیصلہ سے آگاہ کرنا چاہتے تھے اور اس کے عمومی اعلان کے لئے مناسب موقع و محل کے منتظر تھے اور اس سے مناسب تر کوئی اور موقع نہ ہوسکتا تھا کیونکہ چند لمحوں کے بعد یہ مجمع متفرق و پراگندہ ہو جانے والا تھا اور پھر اتنی عظیم جمعیت کے یکجا ہونے کی بظاہر حال کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ عالم اسلام کے ہر کونے اور ہر خطے کے لوگ جمع تھے اور ان کے منتشر ہونے سے پہلے یہ حکم ان کے گوشگزار کر دینا ضروری تھا۔ پھر اس صحرائے بے آب وگیاہ میں کارواں کو روک لینے میں یہ مصلحت بھی کارفرما ہوسکتی ہے کہ اگر معمولاً اس مقام پر قافلے ٹھہرا کرتے تو یہ سمجھا جاتا تاکہ آرام اور سفر کی تکان دور کرنے کے لئے منزل کی گئی ہے اور ضمناً ایک اعلان بھی کر دیا گیا ہے جس سے اس اعلان کی اہمیت کم ہو جاتی ۔۔۔۔ آنحضرتؐ نے اس کی اہمیت کو برقرار رکھنے کے لئے ایسی جگہ منتخب کی جو کبھی قافلوں کی فرودگاہ نہ رہی تھی تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ یہاں ٹھہرنے کا مقصد آرام و استراحت نہیں ہے بلکہ معاملہ کی اہمیت کا تقاضا یہ ہے کہ خواہ کتنی زحمت و تکلیف کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے اس جلتے ہوئے میدان میں چلتے ہوئے کارواں کو روک لیا جائے اور سب کو فیصلہ خداوندی سے آگاہ کر دیا جائے اور وہ فیصلہ آنحضرتؐ کی نیابت و جانشینی کے متعلق تھا۔

اس سے پیشتر دعوتِ عشیرہ کے ایک محدود دائرہ میں اور غزوۂ تبوک و تبلیغ سورۂ براۃ کے مواقع پر پیغمبر کی زبان سے مختلف پیراؤں اور اشاروں کنایوں میں ایسے کلمات سُنے جا چکے تھے جن سے ایک انصاف پسند اور غیر جانب دار انسان یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور تھا کہ ہو نہ ہو پیغمبرؐ علیؑ کو اپنا نائب و جانشین مقرر کرنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف یہ بھی دیکھنے میں آتا تھا کہ کچھ لوگوں کی زبانیں خواہ مخواہ علیؑ کے خلاف شکوہ ریز رہتی ہیں اور اوران کے معمولی منصب پر بھی ان کی دلی کدورتیں چہروں پر کھل جاتی ہیں وہ بھلا اسے کیونکر ٹھنڈے دل سے گوارا کریں گے اور اُسے عملی جامہ پہننے دیں گے۔ پیغمبر اکرمؐ بھی ان چیزوں سے خالی الذہن نہ تھے۔ وہ بعض چہروں کے اُتار چڑھاؤ سے ان کی دلی کیفیتوں کو بھانپ رہے تھے اور ان کے حرکات و سکنات سے ان کے ارادوں کو سمجھ رہے تھے کہ یہ مخالفت کئے بغیر نہیں رہیں گے اور ہر ممکن طریقہ سے روڑے اٹکائیں گے۔ اس لئے مزاج شناس قدرت یہ چاہتا تھا کہ قدرت کی طرف سے ان لوگوں کے شر سے تحفظ کا ذمہ لے لیا جائے تو پھر اس کا عمومی اعلان کیا جائے چنانچہ اللہ کی طرف سے تحفظ کی ذمہ داری کے ساتھ اس مقام پر یہ آیت نازل ہوئی:

یا ایھا الرسول بلغ ما انزل	لے رسولؐ تمہارے پروردگار کی طرف سے جو حکم
الیك من ربك وان لم	تم پر اُتارا گیا ہے اُسے پہنچا دو اور اگر تم نے
تفعل فما بلغت رسالته	ایسا نہ کیا تو گویا تم نے کوئی پیغام پہنچایا ہی نہیں

واللہ یعصمک من الناس۔ اور اللہ (ہر حال میں) تمہیں لوگوں کے شر سے بچائے گا۔"

علامہ قاضی شوکانی تحریر فرماتے ہیں:۔

عن ابی سعید الخدری قال نزلت ھذہ الآیۃ یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک علی رسول اللہ یوم غدیر خم فی علی ابن ابی طالب۔

(فتح القدیر ج ۳۔ ص ۵۷)۔

ابو سعید خدری کہتے ہیں کہ آیۂ یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک غدیر خم میں علی ابن ابی طالب کے بارے میں رسول اللہ پر نازل ہوا۔"

اس تہدید آمیز حکم کے بعد تاخیر کی گنجائش نہ تھی۔ پیغمبر اکرمؐ سواری پر سے اُترے ساتھ والے بھی اُتر پڑے حی علی خیر العمل کی آواز پر آگے بڑھ جانے والے پلٹے اور پیچھے رہ جانے والے تیزی سے بڑھے اور تمام مجمع سمٹ کر یکجا ہو گیا۔ دوپہر کا وقت باد سموم کے جھلسا دینے والے جھونکے جلتا ہوا ریگستان آفتاب کی تمازت اور گرمی کی شدت چند ببول کے درختوں کے علاوہ نہ کہیں سبزہ نہ کہیں سایہ۔ صحابہ نے عبائیں کندھوں سے اُتار کر پیروں کے گرد لپیٹ لیں اور اس جلتی ہوئی زمین پر ہمہ تن گوش بن کر بیٹھ گئے۔ آنحضرتؐ نے اونٹوں کے کجاوے جمع کر کے ببول کے دو درختوں کے درمیان ایک منبر تیار کروایا اور زیب دہ عرشہ منبر ہوئے۔ زید ابن ارقم کہتے ہیں:۔

قام رسول اللہ یوما فینا خطیبا بماء یدعی خما بین مکۃ و المدینۃ فحمد اللہ واثنی علیہ ووعظ وذکر ثم قال اما بعد الا یا ایھا الناس فانما انا بشر یوشك ان یاتی رسول ربی فاجیب و انا تارك فیکم الثقلین اولھما کتاب اللہ فیہ الھدی و النور فخذوا بکتاب اللہ واستمسکوا فحث علی کتاب اللہ ورغب فیہ ثم قال و اھل بیتی اذکرکم اللہ فی اھل بیتی

پیغمبر اکرمؐ مکہ اور مدینہ کے درمیان اس تالاب پر جو خم کہلاتا تھا خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے اور اللہ کی حمد و ثنا اور پند و تذکیر کے بعد فرمایا اے لوگو میں ایک بشر ہی تو ہوں وہ وقت دور نہیں ہے کہ میرے پروردگار کی طرف سے پیغامبر آئے اور میں اس کی آواز پر لبیک کہوں میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں ایک اللہ کی کتاب جس میں نور و ہدایت ہے لہذا کتاب خدا کو مضبوطی سے پکڑو اور اس سے وابستہ رہو۔ آپ نے کتاب خدا سے تمسک پر زور دیا اور اس کی طرف رغبت دلائی پھر فرمایا اور دوسرے میرے اہلبیت ہیں۔ میں تمہیں اہلبیت کے بارے میں اللہ یاد دلاتا ہوں میں تمہیں اہلبیت کے بارے میں اللہ یاد دلاتا ہوں

اذکرکم اللہ فی اھل بیتی اذکرکم اللہ فی اھل بیتی۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۷۹) | میں تمہیں اہلبیت کے بارے میں اللہ یاد دلاتا ہوں "۔

ان تمہیدی کلمات کے بعد تین مرتبہ بلند آواز سے فرمایا الست اولی بکم منکم بانفسکم "کیا میں تم پر خود تم سے زیادہ حق تصرف نہیں رکھتا"۔ سب نے ہم آواز ہو کر کہا اللھم بلیٰ "بیشک ایسا ہی ہے"۔ اپنی اولویت و حاکمیت کا اقرار لینے کے بعد حضرت علی کو بغلوں میں ہاتھ دے کر اوپر اُٹھایا اور فرمایا:۔

یا ایھا الناس ان اللہ مولای و انا مولی المومنین و انا اولی بھم من انفسھم فمن کنت مولاہ فھذا مولاہ اللھم وال من والاہ و عاد من عاداہ۔ (صواعق محرقہ ص ۴۱) | اے لوگو اللہ میرا مولا ہے اور میں تمام مومنوں کا مولا ہوں اور میں اُن کے نفسوں سے زیادہ اُن پر حاکم و متصرف ہوں۔ یاد رکھو کہ جس جس کا میں مولا ہوں اُس کے یہ بھی مولا ہیں خدایا اسے دوست رکھ جو انہیں دوست رکھے اور اُسے دشمن رکھ جو انہیں دشمن رکھے "۔

ابن عبد البر نے تحریر کیا ہے:۔

قال یوم غدیر خم من کنت مولاہ فعلی مولاہ اللھم وال من والاہ و عاد من عاداہ (استیعاب ج ۲ ص ۴۶)۔ | پیغمبرؐ نے غدیر خم کے دن فرمایا جس کا میں مولا ہوں اس کے علی مولا ہیں۔ اے اللہ جو انہیں دوست رکھے تو اُسے دوست رکھ اور جو انہیں دشمن رکھے تو اُسے دشمن رکھ "۔

اس اعلان کے بعد آنحضرتؐ فراز منبر سے نیچے تشریف لائے اور نماز ظہر با جماعت ادا کی۔ نماز سے فارغ ہو کر اپنے خیمہ میں تشریف لے گئے اور لوگوں کو حکم دیا کہ وہ گروہ در گروہ علی کے خیمہ میں جائیں اور انہیں اس منصب رفیع پر فائز ہونے کی مبارکباد دیں۔ چنانچہ صحابہ نے تبریک و تہنیت کے کلمات کہے۔ امہات المومنین اور دوسری خواتین نے بھی اظہار مسرت کرتے ہوئے مبارکباد دی اور حضرت عمر کے الفاظ تہنیت تو اب تک کتب تاریخ و حدیث میں موجود ہیں اور وہ یہ ہیں:۔

ھنیاً لک یا ابن ابی طالب اصبحت و امسیت مولیٰ کل مومن و مومنۃ۔ (مسند احمد حنبل ج ۴ ص ۲۸۱) | مبارک ہو اے فرزند ابو طالب آپ تو ہر مومن اور مومنہ کے مولا ہو گئے "۔

ادھر مبارکبادیوں کا سلسلہ جاری تھا ادھر جبرئیل امینؑ نے اُتر کر تکمیل دین و اتمام نعمت کا روح پرور مژدہ سنایا:۔

الیوم اکملت لکم دینکم و | آج میں نے تمہارے دین کو ہر لحاظ سے کامل کر دیا

اتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔

اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے دین اسلام کو پسند کیا"۔

جلال الدین سیوطی تحریر کرتے ہیں:۔

عن ابی سعید الخدری قال لما نصب رسول اللہ علیا یوم غدیر خم فنادی لہ بالولایۃ ھبط جبرئیل علیہ بھذہ الآیۃ الیوم اکملت لکم دینکم

ابو سعید خدری کہتے ہیں جب رسول اللہ نے غدیر خم کے دن علی کو اپنی جگہ پر نصب کیا اور اُن کی ولایت کا اعلان کیا تو جبرئیل امین آیۂ الیوم اکملت لکم دینکم لے کر آنحضرتؐ پر نازل ہوئے"۔

(تفسیر در منثور ج ۲ ص ۲۵۹)

واقعہ غدیر خم متواتر و مسلم اور شکوک و شبہات سے بالاتر ہے اس میں تاویلات سے تو کام لیا جاتا رہا لیکن اصل واقعہ کو جھٹلایا نہ جا سکا اور نہ الفاظ حدیث کی صحت سے انکار کیا جا سکا کیونکہ اس حدیث کے کثرت طرق پر نظر کرنے کے بعد وہی شخص انکار کر سکتا ہے جو مشاہدات و بدیہیات کے انکار کا عادی ہو۔ علم الہدیٰ سید مرتضیٰ نے فرمایا ہے کہ واقعۂ غدیر کا انکار چاند سورج اور ستاروں کے انکار کے برابر ہے۔ علامہ مقبلی نے کہا ہے کہ اگر واقعۂ غدیر یقینی نہیں ہے تو پھر دین کی کوئی بات یقینی نہیں ہے"۔ فریقین کے علماء محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ پیغمبرؐ نے ایک عظیم اجتماع کے اندر اپنی حاکمیت و اولویت کا اقرار لینے کے بعد فرمایا کہ جو مجھے اپنا مولا سمجھتا ہے وہ علی کو بھی اپنا مولا سمجھے مگر لفظ مولا کو حسب پسند معنی پہنا کر حقیقت کو نگاہوں سے اوجھل رکھنے کی کوشش کی گئی اس لئے کہ اگر یہ تسلیم کر لیا جاتا کہ اس حدیث کی رو سے جو حیثیت رسولؐ کی اُمت سے ہے وُہی حیثیت علی کی ہے تو سقیفہ بنی ساعدہ کی کاروائی کا کوئی جواز نہ رہتا۔ چنانچہ کبھی یہ کہا گیا کہ اس کے معنی دوست کے ہیں اور کبھی یہ کہا گیا کہ اس کے معنی ناصر و مددگار کے ہیں۔ لیکن سوچنے سمجھنے اور غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ایک جلتے ہوئے صحرا میں ہزاروں کے مجمع کو جو اپنے گھروں میں پہنچنے کے لئے بےچین تھا سمیٹنا جبکہ کارواں کا ایک حصہ عقب میں رہ گیا تھا اور اگلا ریلا تین میل آگے جحفہ کے حدود تک پہنچ چکا تھا کانٹوں کو سمیٹ کر جلتی زمین پر بیٹھنے کی جگہ بنانا پالانوں کو جمع کر کے منبر نصب کرنا اور پیغمبر کا اپنے حاکم و اولی بالتصرف ہونے کا اقرار لینا کیا صرف یہ بتانے کے لئے تھا کہ جس کا میں دوست ہوں اس کے علی بھی دوست ہیں یا جس کا میں مددگار ہوں علی بھی اس کے مددگار ہیں۔ کوئی بھی صاحب عقل و دانش یہ باور نہیں کرے گا کہ یہ اہتمام و انصرام محض اتنی سی بات کے لئے تھا کیا ان لوگوں سے علی کی رسول اللہ سے دوستی و وابستگی مخفی تھی یا اوائل عمر سے اسلام و اہل اسلام کی نصرت میں علی کے کارنامے ڈھکے چھپے ہوئے اور کسی تعارف کے محتاج تھے یا اللہ کا ارشاد:۔

المومنون والمومنات بعضہم اولیاء بعض۔	مومنین کیا مرد اور کیا عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔"

اس دوستی کے اظہار کے لئے کافی نہیں تھا اور کیا پیغمبرؐ اپنی حاکمانہ حیثیت منوائے بغیر اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکتے تھے۔ بلاشبہ دوست و ناصر کے معنی مراد لینے سے یہ تمام چیزیں بے معنی و بے مدعا ہو کر رہ جائیں گی۔ اور پھر اس پر بھی نظر ڈالئے کہ پیغمبرؐ کو نصرت و دوستی کے اعلان سے کیا خطرہ ہو سکتا تھا کہ قدرت کو یہ کہنا پڑا واللہ یعصمك من الناس۔ "اللہ تمہیں لوگوں کے شر سے بچائے رکھے گا"۔ اور پھر یہ خطرہ بیرونی خطرہ بھی نہیں ہو سکتا اس لئے کہ تمام بیرونی خطروں کا انسداد کیا جا چکا تھا اب اگر تھا تو اندرونی خطرہ تھا اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا تھا جب پیغمبرؐ کا اعلان ایک طبقہ کے سیاسی مصالح سے متصادم ہوتا اور ظاہر ہے کہ دوستی و نصرت کا اعلان تو خطرہ کو دعوت نہ دے سکتا تھا۔

یہ تمام قرائن و شواہد اس بات کا ثبوت ہیں کہ اس مقام پر مولا کے معنی حاکم و متصرف کے ہیں اور جس طرح آنحضرتؐ کی ولایت و حاکمیت کا اقرار ضروری ہے اسی طرح علیؑ کی ولایت و حاکمیت کا اقرار بھی لازمی ہے اور اسی معنی کی توضیح و تعیین کے لئے پیغمبرؐ نے اپنی حاکمانہ و متصرفانہ حیثیت کا اقرار لیا تھا ورنہ اس کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔ اور حضرت عمر نے مبارکباد پیش کی تو کچھ سمجھ کر ہی پیش کی ہوگی۔ اگر اس میں کسی نمایاں اعزاز کا اعلان نہ ہوتا تو تبریک کا محل ہی کیا تھا۔ اگر جنبہ داری سے ہٹ کر انصاف و حق پسندی سے کام لیا جائے تو اس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ یہ اعلان اسی اعلان کی صدائے بازگشت تھا جو واقعہ غدیر سے بیس برس قبل دعوت عشیرہ کے ایک محدود حلقہ میں کیا گیا تھا کہ:۔

ان ھذا اخی و وصیی و خلیفتی فیکم فاسمعوا لہ و اطیعوا (تاریخ کامل ج۲۔ ص۲۲)	یہ میرا بھائی میرا ولیعہد اور میرا جانشین ہے اس کی سنو اور مانو۔"

بہر حال اس اعلان سے نہ صرف مسئلہ خلافت واضح ہو جاتا ہے بلکہ پیغمبرؐ کے تمام تبلیغات و تعلیمات میں اس مسئلہ کی اہمیت اور بنیادی حیثیت بھی نمایاں ہو جاتی ہے۔ اگرچہ پیغمبر اکرمؐ نے بعثت سے ہجرت تک اور ہجرت سے حجۃ الوداع تک ان تمام احکام کی تبلیغ کی جو وقتاً فوقتاً آپ پر نازل ہوتے رہے اور مسلمان ہر ہر حکم پر عمل بھی کرتے رہے۔ چنانچہ وہ نمازیں پڑھتے روزے رکھتے زکوٰۃ دیتے اور جہاد میں شریک ہوتے تھے اور حج کے موقع پر جوق در جوق ادائے حج کے لئے بھی جمع ہو گئے تھے مگر آیۂ قرآنی وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ۔ "اگر تم نے یہ نہ کیا تو گویا تم نے کوئی پیغام پہنچایا ہی نہیں"۔ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس آخری تبلیغ کے بغیر تمام احکام کی تبلیغ ناتمام بلکہ کالعدم تھی حالانکہ اللہ نے کسی حکم کی تبلیغ کو دوسرے حکم کی تبلیغ پر موقوف نہیں رکھا مگر یہاں پیغمبر کی تئیس سالہ تبلیغ کو صرف اس تبلیغ پر منحصر کیا گیا ہے

اس طرح کہ اگر یہ تبلیغ نہ ہوتی تو دین ناتمام رہ جاتا اور کار رسالت پایۂ تکمیل کو نہ پہنچتا۔ اس سے دو چیزوں کا ثبوت ملتا ہے ایک تو یہ کہ اس حکم کی حیثیت اسلام میں اصل و اساس کی ہے اور دوسرے اعمال و احکام کی حیثیت فروع کی ہے۔ اور جس طرح بنیاد کے بغیر دیواروں میں استحکام نہیں آتا اور جڑ کے بغیر شاخیں پھلتی پھولتی نہیں اسی طرح اس آخری تبلیغ کے بغیر رسالت ناتمام رہتی اور دین اتمام واکمال کو نہ پہنچتا لہذا رسالت کو اگر اصول میں شمار کیا جاتا ہے تو جسے تکملۂ تبلیغ رسالت قرار دیا گیا ہے اُسے بھی اصُول میں داخل ہونا چاہئیے اور دوسرے یہ کہ جب اس امر کے نہ پہنچانے کے نتیجہ میں تمام احکام کا پہنچانا نہ پہنچانے کے برابر ہو جاتا ہے تو اس امر کے نہ ماننے کی صُورت میں ان تمام احکام کا سیکھنا اور ان پر عمل پیرا ہونا کیا بے نتیجہ ثابت نہ ہوگا؟

جیش اسامہ

پیغمبر اکرمؐ نے دعوت اسلام کے سلسلہ میں حارث ابن عمیر ازدی کو اپنا سفیر بنا کر حاکم بصری کے پاس بھیجا تھا مگر راستے میں حاکم بلقاء شرجیل ابن عمرو غسانی نے انہیں گرفتار کر کے قتل کروا دیا آنحضرتؐ کو اس کی اطلاع ہوی تو آپ نے تین ہزار کا ایک لشکر زید ابن حارثہ، جعفر ابن ابی طالب اور عبداللہ ابن رواحہ کی زیر سرکردگی ترتیب دیا اور فرمایا کہ اگر زید کام آجائیں تو جعفر ابن ابی طالب سردار لشکر ہوں گے اور اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو عبداللہ ابن رواحہ سپہ سالار ہوں گے۔ جب یہ لشکر معان میں پہنچا تو معلوم ہُوا کہ ہرقل روم، روم و شام کی فوجوں کے ساتھ بلقاء میں چھاؤنی ڈالے پڑا ہے۔ مسلمانوں کو دشمن کی کثرت و قوت کا پتا چلا تو ہراساں ہو کر معان میں رُک گئے اور کہنے لگے کہ ہمیں مدینہ سے مزید کمک طلب کرنا چاہئیے مگر عبداللہ ابن رواحہ نے لشکر کا حوصلہ بڑھایا اور کہا کہ ہمیں دشمن کی ٹڈی دل فوجوں کو خاطر میں نہ لانا چاہئیے اور آگے بڑھ کر مقابلہ کرنا چاہئیے۔ مسلمانوں کی ہمت بندھی اور انہوں نے قدم آگے بڑھا دیئے۔ جب بلقاء کے قریوں میں سے ایک قریہ مشارف میں پہنچے تو دشمن کی نقل و حرکت کو دیکھ کر موتہ کی طرف مُڑ گئے تاکہ کسی مناسب جگہ پر پڑاؤ ڈال کر دشمن سے نمٹیں۔ جب موتہ میں پہنچے تو ایک میدان میں صف بندی کی اور میمنہ و میسرہ ترتیب دیا۔ دُشمن نے بھی وہاں پہنچ کر صفیں جمادیں۔ زید ابن حارثہ ہاتھوں میں علم لے کر لڑنے کے لئے نکلے اور لڑتے ہُوے شہید ہو گئے۔ اب جعفر ابن ابی طالب نے علم لے لیا اور میدان میں اُتر آئے دُشمن سے لڑتے ہُوے کسی کی تلوار پڑی اور آپ کا داہنا ہاتھ قلم ہو گیا آپ نے بائیں ہاتھ سے علم سنبھالا اور جب بایاں ہاتھ بھی قطع ہو گیا تو علم کو سینہ سے لگا لیا اور اسّی سے زیادہ تیر و تلوار کے زخم کھا کر شرف شہادت سے ہمکنار ہُوے اور پیغمبرؐ نے انہیں ذوالجناحین (دو پروں والا) اور الطّیار فی الجنّۃ (جنّت میں پرواز کرنے والا) کے لقب سے یاد کیا۔ پھر عبداللہ ابن رواحہ نے علم سنبھالا اور جنگ کرتے ہُوے شہید ہو گئے۔ ان جلیل القدر علمبرداروں کے بعد کوی نامزد علمبردار نہ رہا تھا ایک انصاری

ثابت ابن ارقم نے علم اٹھالیا اور کہا کہ اپنے میں سے کسی ایک کو علمبردار منتخب کرلو لوگوں نے کہا کہ اب تم ہی علم لئے رہو کہا کہ میں اس کے لئے تیار نہیں ہوں کسی اور کو منتخب کرو۔ چنانچہ خالد ابن ولید نے علم لے کر سپہ سالاری کا منصب سنبھال لیا۔ انہوں نے کچھ دیر لڑائی کو جاری رکھا تھا کہ رات کا اندھیرا پھیلنے لگا اندھیرے کی وجہ سے جنگ رُک گئی۔ خالد نے اسے غنیمت سمجھا اور راتوں رات لشکر کو لے کر میدان سے ہٹ گئے اور مدینہ کا رُخ کرلیا۔ جب یہ شکست خوردہ لشکر مدینہ میں پہنچا اور لوگوں کو لشکریوں کے روبفرار ہونے کا پتا چلا تو مٹی اٹھا اُٹھا کر اُن کے چہروں پر پھینکنا شروع کی اور انہیں بھگوڑوں کے نام سے یاد کیا۔ یہ لوگ شرمندگی سے منہ چھپائے پھرتے تھے اور سلمہ ابن ہشام نے جو اس لشکر میں شریک تھے نماز جماعت میں آنا چھوڑ دیا اس لئے کہ جب مسجد میں آتے تھے تو لوگ یہ کہنے لگتے تھے:۔

افررتم فی سبیل اللہ۔ (تاریخ طبری۔ ج۲۔ ص۳۲۳)۔	کیا تم وہی ہو جو اللہ کی راہ سے بھاگ نکلے تھے"۔

یہ واقعہ جمادی الاولیٰ ۸ھ میں رونما ہوا تھا مگر ابھی تک شہداء موتہ کے قصاص کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبرؐ کسی مصلحت کی بناء پر اسے اپنی زندگی کے آخری دنوں کے لئے اُٹھا رکھنا چاہتے تھے چنانچہ اپنی بیماری کے ایام میں ایک اٹھارہ اُنیس سالہ نوجوان اسامہ ابن زید کی زیر سرکردگی ایک لشکر ترتیب دیا اور مہاجرین وانصار کو ان کی ماتحتی میں جانے پر مامور کیا۔ ابن سعد نے تحریر کیا ہے:۔

فلم یبق من وجوہ المہاجرین الاولین والانصار الا انتدب فی تلک الغزوۃ فیھم ابوبکر الصدیق وعمر ابن الخطاب و ابوعبیدۃ ابن الجراح وسعد ابن ابی وقاص وسعید ابن زید وقتادہ ابن النعمان وسلمۃ ابن اسلم ابن حریش۔ (طبقات ج۲۔ ص۱۹۰)۔	انصار ومہاجرین اولین میں سے کوئی نمایاں فرد ایسی نہ تھی جسے اس غزوہ میں شرکت کے لئے نہ کہا گیا ہو ان لوگوں میں ابوبکر صدیق عمر ابن خطاب عبیدہ ابن الجراح سعد ابن ابی وقاص سعید ابن زید قتادہ ابن نعمان اور سلمہ ابن اسلم ابن حریش بھی شامل تھے"۔

جب پیغمبرؐ نے علالت کے باوجود اپنے ہاتھ سے علم سج کر اسامہ کو دیا تو مسلمانوں نے اُن کے پرچم کے نیچے جانے کے بجائے اُن کی افسری پر لے دے شروع کردی اور کھلے خزانوں اعتراضات کرنے لگے۔ کبھی یہ کہا کہ یہ نوعمر اور ناتجربہ کار ہے اور کبھی یہ کہا کہ یہ ایک آزاد کردہ غلام کا بیٹا ہی تو ہے۔ پیغمبر اکرمؐ کے کانوں میں یہ نکتہ چینی کی آوازیں پہنچیں تو بخار کی حالت میں لپٹے لپٹائے سر پر پٹی باندھے باہر تشریف لائے اور

خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:۔

ان تطعنوا فی امرتہ فقد کنتم تطعنون فی امرۃ ابیہ من قبل وایم اللہ انہ کان لخلیقا للامرۃ وانہ کان لمن احب الناس الی وان ھذا احب الناس الی بعدہ (صحیح مسلم۔ ج۲۔ ص۲۸۳)۔

اگر تم اس کی امارت پر معترض ہو تو اس سے پہلے اس کے باپ کی امارت پر بھی طعنہ زنی کر چکے ہو خدا کی قسم وہ امارت کا سزاوار تھا اور میری نظروں میں دوسروں سے زیادہ پسندیدہ تھا اور اس کے بعد یہ بھی مجھے دوسروں سے زیادہ عزیز ہے"۔

اس کے بعد آپ گھر کے اندر تشریف لے گئے اور مرض نے شدت کی صورت اختیار کر لی مگر اس حالت میں بھی بار بار یہی فرماتے رہے: جھزوا جیش اسامۃ انفذوا جیش اسامۃ ارسلوا جیش اسامۃ "لشکر اسامہ کو جلدی بھیجو، لشکر اسامہ کو فوراً بھیجو، لشکر اسامہ کو فوراً روانہ کرو"۔ اسامہ پیغمبرؐ کو دیکھنے کے لئے آئے اور عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ یہ بہتر ہو گا کہ آپ کے صحت یاب ہونے کے بعد لشکر کی روانگی ہو۔ فرمایا نہیں تم لشکر کو لے کر فوراً چلے جاؤ اور اس میں ذرا تاخیر نہ کرو۔ اسامہ وہاں سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور جانے کی تیاری میں لگ گئے۔ ادھر پیغمبر پر مرض کا دباؤ بڑھ گیا اور غشی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ جب ذرا سنبھالا لیا تو دریافت فرمایا کیا لشکر روانہ ہو گیا ہے بتایا گیا کہ ابھی جانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں آنحضرتؐ کی تیوریوں پر بل آئے اور فرمایا:۔

جھزوا جیش اسامۃ لعن اللہ من تخلف عنہا۔ (کتاب الملل و النحل۔ ص۸)

اسامہ کے لشکر کو فوراً روانہ کرو خدا کی لعنت ہو اس پر جو لشکر میں شریک نہ ہو"۔

آنحضرتؐ کے بار بار کہنے اور زور دینے سے نکل تو کھڑے ہوئے مگر مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر وادی جرف میں جا کر رُک گئے۔ اتنے میں کسی نے خبر بھجوائی کہ پیغمبر کا دم واپسیں ہے یہ سُن کر اسامہ ابو عبیدہ اور حضرت عمر مدینہ میں چلے آئے۔ یہ دن رسولؐ اللہ کی زندگی کا آخری دن تھا جب آپ جوارِ حق میں پہنچ گئے تو دوسرے لوگ بھی واپس پلٹ آئے۔

اہلِ اسلام کے نزدیک پیغمبر اکرمؐ کا ہر حکم، حکمِ الٰہی کا آئینہ دار اور وحی الٰہی کا ترجمان ہوتا ہے اور اس کی مخالفت حکمِ خدا کی مخالفت ہے مگر اس کے باوجود پیغمبر کا یہ تاکیدی فرمان ٹال مٹول کی نذر ہو جاتا ہے اور مامورین میں سے کوئی اس پر عمل پیرا ہوتا نظر نہیں آتا۔ کاغذ و قلم کے طلب کرنے پر تو ہذیان کی آڑ میں خلاف ورزی کا جواز پیدا کر لیا گیا تھا مگر خدا جانے کہ اس حکم کی خلاف ورزی کے لئے کیا جواز ڈھونڈا جائے گا۔

اس تجہیزِ جیش کی مصلحت اور اس کی خلاف ورزی کے دواعی و اسباب کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے

کہ اس واقعہ کے پس منظر کا جائزہ لیا جائے اور ان حالات پر نظر کی جائے جن حالات کے ماتحت رسولِ خداؐ نے مہاجرین و انصار کو اسامہ کی زیر قیادت لشکر کشی کا حکم دیا تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ حجۃ الوداع کے بعد سے پیغمبرؐ کی طبیعت پژمردہ رہنے لگی تھی اس طبیعت کے اضمحلال نے بیماری کی صورت اختیار کر لی اور یہی بیماری موت کا پیش خیمہ بن گئی۔ آنحضرتؐ حجۃ الوداع اور غدیر خم کے خطبوں میں یہ خبر دے چکے تھے کہ میری موت کی ساعت قریب ہے اور میں جلد اس جہان فانی سے رخصت ہو جانے والا ہوں اور حجۃ الوداع سے پلٹنے کے بعد بھی آپ کی زبان سے ایسے کلمات سُنے گئے جو ایک طرح سے موت کا واضح اعلان تھے اور صحابہ بھی سمجھ رہے تھے کہ یہ رحمت و رأفت کا آسمان جو تئیس برس سے ان کے سروں پر سایہ فگن تھا پیوند زمین ہونے والا ہے عبداللہ ابن مسعود کہتے ہیں:۔

نعی الینا نبیّنا وحبیبنا نفسه	ہمارے پیغمبر نے رحلت سے ایک مہینہ
قبل موت بشهر۔ (تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص ۴۳۵)	پہلے اپنی موت کی خبر دے دی تھی۔"

پیغمبر ایک طرف سفر آخرت کے قرب کی خبر دے رہے تھے اور دوسری طرف ایسے فتنوں کے اُبھرنے کی پیشنگوئیاں بھی فرما رہے تھے جن کے مہیب سائے اُفق عالم پر چھائے جا رہے تھے اور شب تاریک کے مانند فضا کو تیرہ و تار بنانے کے لئے امنڈ آئے تھے چنانچہ آپ اپنی زندگی کے آخری ایام میں ایک رات لڑکھڑاتے سنبھلتے جنۃ البقیع میں تشریف لے گئے اور اہل قبور کے حق میں دُعائے مغفرت اور اُن پر سلام کرنے کے بعد فرمایا:

لیهن لکم ما اصبحتم فیه مما	جس حال میں زندہ لوگ ہیں اسے دیکھتے ہوئے
اصبح الناس فیه قد اقبلت	یہ حال تمہیں گوارا اور مبارک ہو اب تو کالی
الفتن کقطع اللیل المظلم یتبع	راتوں کی طرح کے فتنے پے در پے بڑھتے
اخرها اولها والاخرة شر من	چلے آ رہے ہیں اور جو فتنہ اُٹھے گا وہ
الاولیٰ۔ (تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص ۴۳۲)۔	پہلے فتنہ سے بدتر ہو گا۔"

ان حالات میں کہ ایک طرف دم واپسیں ہے اور دُوسری طرف تباہ کن فتنے سر اُٹھاتے نظر آ رہے ہیں کیا ان فتنوں کا انسداد زیادہ ضروری تھا یا موتہ کے ان شہیدوں کا قصاص زیادہ لازمی تھا جنہیں شہید ہوئے ڈھائی سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور اس عرصہ میں نہ ادھر کوئی توجہ کی گئی اور نہ کوئی عملی اقدام کیا گیا اگر دُشمن کی طرف سے چڑھائی کا اندیشہ ہوتا یا غنیم حملہ آور ہوتا تو اس صورت میں فوجکشی بہر حال لازمی تھی مگر ان میں سے کوئی ایک بات بھی نہ تھی نہ دشمن چڑھ آیا تھا نہ غنیم حملہ آور تھا اور نہ ہوس ملک گیری کا سوال پیدا ہوتا ہے پھر اچانک اس کی اہمیت کا اتنا احساس کیوں کہ جب غشی سے آنکھیں کھلتی ہیں بار بار یہی فرماتے ہیں کہ جس طرح بن پڑے لشکر کو بھیج دو اور میں اپنی زندگی میں سُن لوں کہ لشکر جا چکا ہے۔ اور پھر اس تاکید نے تہدید کی صورت اختیار کر لی اور فرمایا کہ جو لشکر میں شریک ہو کر

جانے سے گریز کرے وُہ اللہ کی لعنت کا سزاوار ہے۔ اس سے پہلے کبھی پیغمبر نے یہ تہدیدی لہجہ اختیار نہیں کیا
بلکہ جنگ وجہاد میں جانے سے کسی نے عذر کیا تو اس کا عذر منظور کر لیا کسی نے کوئی مجبوری ظاہر کی تو اُسے رُخصت
دے دی مگر یہاں نہ کوئی عذر مسموع ہوتا ہے اور نہ جھوٹی سچی مجبوری کو مجبوری سمجھا جاتا ہے بس ایک ہی اٹل
فیصلہ ہے کہ یہاں سے چل دو جس میں نہ ردّ و بدل کی گنجائش ہے اور نہ ترمیم کی حالانکہ زندگی کے آخری لمحات
میں انسان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کے یار و انصار اس کے گرد و پیش جمع رہیں تجہیز و تکفین میں حصّہ لیں
نماز جنازہ میں شریک ہوں اس کے قریبیوں اور عزیزوں کا غم بٹائیں اور انہیں تسلّی و تسکین دیں۔ اور پھر اُن
لوگوں کے لئے تو اس میں اور زیادہ الجھاؤ ہے جن کا نظریہ یہ ہے کہ پیغمبر نے اپنی نیابت و جانشینی کا کوئی
فیصلہ نہیں کیا تھا بلکہ اسے اُمّت کے ارباب حل و عقد پر چھوڑ دیا تھا اور اب جبکہ مستقبل قریب میں ان کے سر
جوڑ کر بیٹھنے کا وقت آرہا تھا انہیں مدینہ سے کوسوں دُور چلے جانے کا حکم دینا کیا معنی رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر
خلافت کا مسئلہ اہل شوریٰ و رائے کی صوابدید سے وابستہ ہوتا تو انہیں جانے کا حکم قطعاً نہ دیا جاتا تاکہ وُہ
آپ کی وفات کے بعد خلافت کا مسئلہ طے کریں اور اُمّت کو فتنہ و انتشار سے بچا سکیں۔ پھر کیا وجہ تھی کہ پیغمبرؐ
ان کے جانے پر زور دیتے رہے کیا وُہ مرکز میں رہ کر ان فتنوں کا سدباب نہ کرتے جن فتنوں کے سر اُٹھانے کی
پیشینگوئی فرما رہے تھے یا یہ کہ خود انہی سے کسی فتنہ کا اندیشہ تھا جس کے انسداد کے لئے ان سے مدینہ خالی
کرایا جا رہا تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آنحضرتؐ اپنے گرد و پیش والوں سے مطمئن نہ تھے چنانچہ کچھ لوگ تو آپ کی
خبر علالت سُن کر اسلام سے منحرف ہو رہے تھے اور کچھ لوگوں کے طور طریقے یہ بتا رہے تھے کہ وُہ اقتدار
کی راہیں ہموار کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں جس کے لئے معیار گڑھے جائیں گے اصول بنائے جائیں گے اور
ان خود ساختہ اصولوں کے نتیجہ میں مسلمان بٹ جائیں گے اور اسلام پارہ پارہ ہو جائے گا۔ اسلام کے تحفّظ کی
واحد ضمانت پیغمبر کے ہدایات پر عمل پیرا ہونے میں مضمر تھی۔ آنحضرت مختلف مواقع پر اور خصوصاً غدیر خم کے
موقع پر ہدایت فرما چکے تھے کہ ان کے بعد علی خلیفہ و ولی امر ہوں گے مگر اس کے ساتھ کچھ مشکلات بھی نظر آرہی
تھیں آپ دیکھ چکے تھے کہ بعض لوگوں کی نظروں میں علی کا معمولی سے معمولی امتیاز بھی کھٹکتا ہے اور وُہ بات بات
پر شکایات کا طومار باندھنے لگتے ہیں۔ وہ یقیناً دعوت عشیرہ کے عہد و پیمان اور غدیر خم کے اعلان کو عملی جامہ پہنائے
جانے میں مزاحم ہوں گے اور جنہوں نے آپ کے جیتے جی اسامہ کی امارت کو تسلیم نہ کیا ہو اور اُن کی نوعمری کی وجہ
سے انہیں قیادت کا اہل نہ سمجھا ہو وُہ علی کو بلا چون و چرا کس طرح نمائندہ اسلام اور خلیفۂ رسول تسلیم کر لیں گے
اور کیا ان کی کم عمری پر بھی اعتراض نہ ہو گا اگرچہ پیغمبرؐ نے ایک نوجوان کو امارت دے کر اس اعتراض کو اعتراض
نہیں رہنے دیا تھا پھر بھی حضرت علی اس اعتراض سے بچ نہ سکے اور یہ کہا گیا کہ وُہ ابھی جوان ہیں اور خلافت
و امارت کے لئے کوئی عمر رسیدہ آدمی ہی موزوں ہو سکتا ہے۔ اگر نظر غائر سے دیکھا جائے تو اس میں کوئی
شک و شبہ نہیں رہتا کہ اس تجہیز جیش میں جہاں یہ مقصد کارفرما تھا کہ شہداء موتہ کا قصاص لیا جائے وہاں یہ

اہم مقصد بھی اس میں مضمر تھا کہ جن جن سے یہ اندیشہ ہو سکتا تھا کہ وہ حضرت علی کی خلافت کی عملی تکمیل میں مزاحم ہوں گے انہیں اتنے عرصہ کے لئے مدینہ سے باہر بھیج دیا جائے کہ جب وہ پلٹ کر آئیں تو خلافت اپنے مرکز پر قائم ہو چکی ہو اور رخنہ اندازیوں کا سدباب ہو چکا ہو۔ اگرچہ پیغمبر اکرمؐ یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ لوگ جانے والے نہیں ہیں مگر پیغمبر کا پیغمبر ہونے کی حیثیت سے بہر حال یہ فرض تھا کہ وہ خاموش بیٹھنے کے بجائے پیہم جد و جہد کرتے رہیں اور لوگوں کی نافرمانی و خلاف ورزی سے گھبرا کر سپر انداختہ نہ ہوں۔ اس لئے کہ پیغمبرؐ کا کام ادائے فرائض ہے خواہ ان کی آواز پر کان دھرا جائے یا نہ دھرا جائے۔ اور پھر یہ اصرار رائیگاں بھی تو نہیں گیا اس سے کوئی اور مقصد حاصل ہوا ہو یا نہ ہوا ہو مگر اتنا تو ہوا کہ جنہوں نے حکم پیغمبر کی خلاف ورزی کے نتیجہ میں اقتدار حاصل کیا ان کے دلوں کے نہاں خانوں میں چھپی ہوئی ہوس اقتدار بے نقاب ہو کر سامنے آ گئی اور ان کے اقتدار کی شرعی حیثیت بھی واضح ہو گئی۔ بہر حال اس خلاف ورزی کا مقصد ہی یہ تھا کہ اگر چلے جانے کی صورت میں یہ بیل منڈھے چڑھ گئی اور اقتدار کا رخ دوسری سمت مڑ گیا تو اسے اپنی طرف موڑنے میں کامیابی نہ ہو سکے گی اس طرح یہ ایک اعصابی جنگ تھی جو اندر ہی اندر لڑی جا رہی تھی۔ ادھر پیغمبر جانے کے لئے کہتے ادھر جاتے اور پھر پلٹ آتے۔ کبھی مزاج پرسی کے حیلہ سے اور کبھی سامان کی فراہمی کے بہانہ سے، کچھ کن سوئیاں لینے کے لئے یہیں رہ جاتے اور کچھ لشکر گاہ کی طرف پلٹ جاتے۔ غرض پیغمبر نے لاکھ لاکھ کہا سنا مگر نہ جانا تھا نہ گئے یہاں تک کہ پیغمبر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

پیغمبر اکرمؐ کی زندگی میں تو ان کا حکم ہوس حکمرانی کے بوجھ کے نیچے دب کر رہ جاتا ہے اور پیغمبر کے بار بار کہنے کے باوجود بوجھل قدموں میں جنبش پیدا نہیں ہوتی مگر جب خلافت قائم کر لی جاتی ہے تو سب سے پہلے لشکر اسامہ کی روانگی کا بندوبست کیا جاتا ہے تاکہ اس طرح حکم رسول کی نافرمانی کا دھبا بھی دھل جائے اور یہ تاثر بھی دیا جا سکے کہ اللہ اللہ حکم رسول کا کتنا پاس و لحاظ تھا کہ اقتدار کی باگ ڈور ہاتھ میں لیتے ہی فوراً لشکر روانہ کر دیا۔ اگرچہ ایک کثیر تعداد نے اس کی مخالفت کی تھی مگر حضرت ابو بکر کو اصرار تھا کہ اسامہ کی زیر نگرانی لشکر کی روانگی ضرور عمل میں لائی جائے اور جسے چند دن پیشتر امارت کا اہل تصور نہ کیا گیا تھا اب اسے اہل سمجھ لیا گیا۔ انصار کی رائے یہ تھی کہ لشکر کی روانگی ملتوی کر دی جائے اور اگر ملتوی نہ کی جائے تو اسامہ کے بجائے کسی معمر و سن رسیدہ شخص کو لشکر کی امارت سپرد کی جائے۔ چنانچہ حضرت عمر نے انصار کی ترجمانی کرتے ہوئے حضرت ابو بکر سے کہا کہ اسامہ کو امارت سے برطرف کر دیا جائے جس پر حضرت ابو بکر بہت بگڑے اور حضرت عمر کی ڈاڑھی پکڑ کر کہا

ثکلتک امک وعدمتک یا ابن الخطاب استعملہ رسول اللہ وتامرنی ان انزعہ۔
(تاریخ طبری۔ ج۲۔ ص۴۶۲)

تم مر جاؤ اور تمہاری ماں تمہارے سوگ میں بیٹھے اے خطاب کے بیٹے اسے رسول اللہ نے امیر مقرر کیا تھا اور تم مجھے یہ کہتے ہو کہ میں اسے علیحدہ کر دوں۔"

اگر لشکر کی روانگی میں حکمِ رسُول کا احترام ملحوظ تھا تو اس احترام کا تقاضا یہ بھی تھا کہ اسامہ کی معزولی کا مطالبہ نہ کیا جاتا اس لئے کہ وُہ رسُول کے منتخب کردہ تھے اور رسول نے ان لوگوں سے خفگی کا بھی اظہار کیا تھا جنہوں نے اُن کی امارت پر نکتہ چینی کی تھی اگرچہ حضرت عمر انصار کے پیغامبر تھے مگر اس معزولی میں اُن کے ہمنوا تھے۔ اگر وُہ انصار کے ہمنوا نہ ہوتے تو وُہ اُن کی طرف سے پیغامبر بن کر آنے کے بجائے انہیں کہہ دیتے کہ اسامہ رسُول کے مقرر کردہ ہیں تم اُن کی معزولی کا مطالبہ کرنے والے کون ہوتے ہو یا یہ کہتے کہ تم خود ہی حضرت ابوبکر کے پاس چلے جاؤ اور انہیں کہو کہ وہ اسامہ کو برطرف کر دیں، اور حضرت ابوبکر بھی حضرت عمر پر بگڑنے کے بجائے انصار پر بگڑتے۔ ظاہر ہے کہ یہ خفگی اسی بنا پر ہو گی کہ انہیں انصار کا ہمنوا پایا ہو گا۔ بہر حال حضرت ابوبکر کے کہنے سُننے سے اسامہ کی امارت تو گوارا کر لی گئی مگر پھر بھی کچھ لوگوں نے عملاً ان کی امارت کو تسلیم نہ کیا اور لشکر میں شریک ہونے سے کنارہ کش رہے۔ حضرت ابوبکر تو حکومت کی ذمہ داریوں کی وجہ سے نہ گئے ہوں گے حضرت عمر بھی اسامہ سے اجازت لے کر رہ گئے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسامہ کو یہ حق پہنچتا تھا کہ جنہیں رسُول اللہ نے نام لے لے کر مامور فرمایا ہو وُہ انہیں اجازت دے کر رخصت کر دیں؟ ظاہر ہے کہ اُن کی حیثیت ایک سپہ سالار کی تھی اور وُہ قطعاً اس کے مجاز نہ تھے کہ جسے چاہیں ساتھ رکھیں اور جسے چاہیں چھوڑ جائیں۔ پھر اس اجازت طلب کرنے اور اجازت دینے کے معنی ہی کیا ہیں۔ اور اگر وُہ مجاز بھی فرض کر لئے جائیں تو حکومت کی سطوت و ہیبت کے سامنے اجازت دینے سے انکار بھی کیسے کر سکتے تھے۔

امامت نماز

پیغمبر اکرمؐ اپنے زمانۂ علالت میں جب تک قوت و توانائی ساتھ دیتی رہی برابر مسجد میں آتے جاتے اور نماز پڑھاتے رہے لیکن جب مرض نے انتہائی شدت اختیار کر لی تو یہ سلسلہ بند کرنا پڑا۔ چنانچہ دوشنبہ کے دن جب صبح کی اذان کے بعد بلال نے حاضرِ خدمت ہو کر نماز کے لئے عرض کیا تو فرمایا کہ میں اپنے اندر اتنی سکت نہیں پاتا کہ مسجد تک جا سکوں کسی شخص سے کہو کہ وُہ نماز پڑھا دے۔ حضرت عائشہ نے کہا کہ میرے باپ ابوبکر سے کہہ دیجئے کہ وُہ نماز پڑھا دیں حضرت حفصہ نے کہا کہ میرے باپ عمر سے فرمائیے کہ وُہ نماز پڑھائیں۔ پیغمبر اکرمؐ نے ان دونوں سے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کا نام سُنا تو پتا چلا کہ وُہ جیش اسامہ میں شامل ہونے کے بجائے مدینہ میں موجود ہیں آپ فوراً مرض کی سختی و سنگینی کے باوجود اُٹھ کھڑے ہُوئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان میں سے کوئی نماز پڑھا دے اور یہ امامت خلافت کا پیش خیمہ بن جائے اور فضل ابن عباس اور علی ابن ابی طالب کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر مسجد میں تشریف لے آئے دیکھا کہ حضرت ابوبکر محرابِ مسجد تک پہنچ چکے ہیں آپ نے انہیں ہاتھ کے اشارہ سے پیچھے ہٹنے کے لئے کہا اور خود آگے بڑھ کر نماز پڑھائی۔ واقعہ تو اتنا ہی ہے مگر اسے بنیاد قرار دے کر یہ قصّہ گڑھ لیا گیا کہ آنحضرت نے حضرت ابوبکر کو نماز پڑھانے پر مامور کیا تھا اور خود ان کے عقب میں نماز پڑھی اور اسی بنا پر انہیں منصب خلافت کے

لئے منتخب کیا گیا کیونکہ جسے پیغمبر نماز میں اپنا نائب قرار دیں وہی ریاست عامہ یعنی حدود و احکام شرعیہ کے نفاذ و اجراء میں اُن کا خلیفہ و جانشین ہو سکتا ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ کیا حضرت ابو بکر خود مصلائے رسول پر کھڑے ہو گئے تھے یا رسُول اللہ نے انہیں مامور فرمایا تھا اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ پیغمبر کے حکم سے کھڑے ہوئے تھے تو کیا نماز کی امامت خلافت کی دلیل بن سکتی ہے۔

اس سلسلہ میں جو روایات کتب تاریخ و احادیث میں درج ہیں وُہ اس قدر متعارض و متضاد ہیں کہ ان کی صحت پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ایک روایت کچھ کہتی ہے اور دُوسری روایت اس کے خلاف کچھ اور ہی کہتی ہے۔ اب کسے صحیح سمجھا جائے اور کسے غلط کہا جائے۔ حیرت یہ ہے کہ ان متضاد روایات میں سے اکثر حضرت عائشہ ہی سے مروی ہیں ان روایات کا تعارض و تضاد ہی اصل دعوی کو کمزور ثابت کرنے کے لئے بہت کافی تھا چہ جائیکہ وُہ نماز کے مسلّمہ اصول و ضوابط کے بھی منافی ہیں۔ اس مقام پر چند روایتیں درج کی جاتی ہیں تاکہ ارباب فکر و نظر خود ہی فیصلہ کر لیں کہ ان متضاد روایات سے کہاں تک اثبات مدعا میں مدد لی جا سکتی ہے۔ ابن ہشام تحریر کرتے ہیں:۔

دعاہ بلال الی الصّلوٰۃ فقال مروا من یصلی بالناس قال فخرجت فاذا عمر فی الناس وکان ابو بکر غائبا فقلت قم یا عمر فصل بالناس قال فقام فلما کبر سمع رسُول اللہ صوتہ وکان عمر مجھرا قال فقال فاین ابو بکر یابی اللہ ذٰلک والمسلمون یابی اللہ ذٰلک والمسلمون قال فبعث الی ابی بکر فجاء بعد ان صلی عمر تلک الصلوٰۃ فصلی بالناس۔

(سیرت ابن ہشام۔ ج ۴۔ ص ۳۰۲)

بلال نے آنحضرت سے نماز کے لئے عرض کیا تو عبد اللہ ابن زمعہ سے فرمایا کہ کسی کو کہو کہ وُہ نماز پڑھا دے۔ عبد اللہ کہتے ہیں کہ میں باہر نکلا تو دیکھا کہ لوگوں میں حضرت عُمر ہیں اور حضرت ابو بکر نہیں ہیں۔ میں نے حضرت عمر سے کہا کہ چلئے آپ نماز پڑھا دیجئے۔ جب انہوں نے تکبیر کہی اور ان کی آواز بلند تھی تو پیغمبر نے ان کی آواز سُن کر فرمایا کہ ابو بکر کہاں ہیں اللہ اور مسلمانوں کو انکار ہے کہ عمر نماز پڑھائیں اللہ اور مسلمانوں کو یہ گوارا نہیں ہے پھر حضرت ابو بکر کو بلوایا مگر وُہ اس وقت آئے جب حضرت عمر نماز پڑھا چکے تھے پھر حضرت ابو بکر نے لوگوں کو نماز پڑھائی۔"

اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت نے ابتداء میں کسی خاص شخص کو نماز کے لئے معیّن نہیں کیا تھا بلکہ عبد اللہ کی صوابدید پر چھوڑ دیا کہ وُہ جسے چاہیں اُسے کہہ دیں کہ وُہ نماز پڑھائے اس عمومی اجازت کی بنا پر عبد اللہ نے حضرت عمر کو نماز پڑھانے کے لئے کہہ دیا اور جب وُہ نماز شروع کر چکے تو آنحضرت نے ابو بکر کو بُلوا بھیجا کہ وُہ نماز پڑھائیں مگر اُن کے آنے تک حضرت عمر نماز پڑھا چکے تھے اور حضرت ابو بکر نے پھر سے نماز پڑھائی

اس روایت کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ جب آنحضرت نے عبداللہ سے کہہ دیا تھا کہ وُہ کسی سے کہیں کہ وہ نماز پڑھا دے اور ان کے کہنے پر حضرت عمر نے نماز پڑھا دی تو پھر حضرت ابوبکر کے پیچھے آدمی دوڑانے کی کیا ضرورت تھی کہ وُہ نماز پڑھائیں کیا حضرت عمر کے پیچھے نماز صحیح نہ تھی؟ اور اگر صحیح تھی تو اعادۂ نماز کیوں؟ اگر پیغمبر یہ چاہتے تھے کہ حضرت ابوبکر ہی نماز پڑھائیں تو وُہ عبداللہ سے فرما دیتے کہ وُہ ابوبکر سے نماز پڑھانے کے لئے کہیں تاکہ نہ حضرت عمر کو خجالت اُٹھانا پڑتی اور نہ اعادۂ نماز کی ضرورت ہوتی۔

ابن سعد تحریر کرتے ہیں:-

فلما کبر قال رسول اللہ لا لا این ابن ابی قحافۃ قال فانتقضت الصفوف وانصرف عمر فما برحنا حتی طلع ابن ابی قحافۃ وکان بالسنح فتقدم فصلی بالناس۔

(طبقات۔ جلد ۲۔ صفحہ ۲۲۳)۔

جب حضرت عمر نے تکبیر کہی تو رسُول اللہ نے کہا نہیں نہیں! فرزند ابو قحافہ کہاں ہیں یہ سُن کر صفیں درہم و برہم ہو گئیں اور حضرت عمر نماز چھوڑ کر الگ ہو گئے۔ راوی کہتا ہے کہ ابھی ہم اپنی اپنی جگہ پر تھے کہ حضرت ابوبکر سنح سے آ گئے اور انہوں نے آگے بڑھ کر نماز پڑھائی"۔

پہلی روایت میں یہ تھا کہ حضرت ابوبکر کے پیچھے آدمی بھیجا گیا اور اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وُہ خود سے آ گئے۔ پہلی روایت میں یہ تھا کہ وُہ نماز ختم ہونے کے بعد آئے اور اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وُہ دوران نماز ہی میں آ گئے۔ پہلی روایت میں یہ تھا کہ نماز ختم ہونے کے بعد اعادۂ نماز کیا گیا اور اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلی نماز توڑ دی گئی اور از سرِ نو نماز ہوئی۔ اس تضاد کے علاوہ اس میں ذہنی پریشانی کا یہ پہلو ہے کہ نماز کے توڑنے کا کیا جواز تھا۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ امام فاسق و غیر عادل تھا تو ایک گروہ کے نزدیک امامت کے لئے سرے سے عدالت کی شرط ہی نہیں ہے اور جس گروہ کے نزدیک عدالت شرط ہے ان کے نزدیک بھی قول راجح کی بنا پر نماز کے توڑنے کا جواز نہیں ہے بلکہ دوران نماز میں اگر امام کے فاسق و غیر عادل ہونے کا انکشاف ہو جائے تو ماموم جماعت کی نیت سے عدول کر کے فرادی کی نیّت کر لے اور نماز نہ توڑے۔

ابن جریر طبری تحریر فرماتے ہیں:-

مروا ابابکر یصلی بالناس قال فخرج یھادی بین رجلین وقدماہ تخطان فی الارض فلما دنی من ابی بکر تاخر

آنحضرت نے فرمایا کہ ابوبکر سے کہو کہ وُہ نماز پڑھائیں پھر خود دو آدمیوں کا سہارا لے کر نکلے اس طرح کہ آپ کے دونوں پیر زمین پر گھسٹتے جا رہے تھے۔ جب ابوبکر کے قریب

ابو بکر فاشار الیہ رسول اللہ ان قم فی مقامک فقعد رسول اللہ فصلی الی جنب ابی بکر جالسا قالت فکان ابو بکر یصلی بصلوٰۃ النبی وکان الناس یصلون بصلوٰۃ ابی بکر۔ (تاریخ طبری۔ جلد ۲۔ صفحہ ۴۳۹)	پہنچے تو ابو بکر پیچھے ہٹے آپ نے اشارہ کیا کہ اپنی جگہ پر رہو اور آپ نے ابو بکر کے پہلو میں بیٹھ کر نماز پڑھی۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ ابو بکر نبی اکرم کی اقتداء کر رہے تھے اور دوسرے نمازی ابو بکر کی اقتداء کر رہے تھے۔"

اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت نے حضرت ابو بکر کو کہلوا بھیجا تھا کہ وہ نماز پڑھائیں۔ اور جب وہ نماز کے لئے کھڑے ہو گئے تو خود بھی ضعف و نقاہت کے باوجود دو آدمیوں کا سہارا لے کر مسجد میں تشریف لے آئے اور حضرت ابو بکر کے پہلو میں بیٹھ کر نماز ادا کی۔ پیغمبر اکرم کا حضرت ابو بکر کو امامت پر مامور کرنا اور پھر خود بھی بلا توقف مسجد میں چلے آنا جبکہ خود سے چلنے پھرنے کی سکت نہ تھی ذہن میں یہ شبہ پیدا کئے بغیر نہیں رہتا کہ کیا پیغمبر نے انہیں کہلوایا تھا یا وہ از خود چلے آئے تھے۔ اگر پیغمبر نے کہلوا بھیجا تھا تو پھر مرض کی شدت کے باوجود خود مسجد میں آنے کی زحمت کیوں گوارا کی اور اگر پیغمبر نے نہیں کہلوایا تھا تو محراب مسجد تک کیسے پہنچ گئے۔ روایت یہ تو نہیں بتاتی کہ پیغمبر نے خود ان سے براہِ راست کہا تھا تو پھر ایسا تو نہیں ہے کہ جس طرح عبداللہ ابن زمعہ نے حضرت عمر سے کہہ دیا تھا اسی طرح کسی پیغامبر نے آنحضرت کی طرف سے انہیں بھی کہہ دیا ہو اور وہ مصلے پر آ کھڑے ہوئے ہوں اور جب پیغمبر کو اطلاع ہوئی ہو تو لڑکھڑاتے کانپتے اس لئے مسجد میں پہنچے ہوں تاکہ خود امامت کے فرائض انجام دیں ورنہ اس کے علاوہ مسجد میں آنے کی اور وجہ ہی کیا ہو سکتی ہے۔ اس روایت کا یہ جزو کہ ابو بکر رسول اللہ کے مقتدی تھے اور دوسرے لوگ حضرت ابو بکر کی اقتداء کر رہے تھے ایک بے معنی سی بات ہے اس لئے کہ اگر حضرت ابو بکر امام تھے تو وہ ماموم نہیں ہو سکتے اور اگر رسول اللہ امام تھے تو پھر حضرت ابو بکر مقتدی و ماموم ہی ہو سکتے ہیں کیونکہ ایک ہی نماز میں ایک شخص امام بھی ہو اور ماموم بھی صحیح نہیں ہے ورنہ تو ہر پچھلی صف والوں کو اگلی صف والوں کی اقتداء جائز ہونا چاہیئے۔

ابن جریر طبری ایک روایت یہ لکھتے ہیں:۔

قال رسول اللہ ابعثوا الی علی فادعوہ فقالت عائشۃ لو بعثت الی ابی بکر و قالت حفصۃ لو بعثت الی عمر فاجتمعوا	آنحضرت نے فرمایا کسی کو بھیج کر علی کو بلا دو حضرت عائشہ نے کہا کہ کاش آپ ابو بکر کو بلاتے حضرت حفصہ نے کہا کہ کاش آپ عمر کو بلاتے اتنے میں وہ سب پیغمبر کے پاس جمع ہو گئے۔ رسول اللہ نے

عندہ جمیعا فقال رسول اللہ انصرفوا فان تک لی حاجۃ ابعث الیکم فانصرفوا و قال رسول اللہ ان الصلوٰۃ قیل نعم قال فامروا ابابکر لیصلی بالناس فقالت عائشۃ انہ رجل رقیق فمر عمر فقال عمر ما کنت لاتقدم وابوبکر شاھد فتقدم ابوبکر ووجد رسول خفۃ فخرج فلما سمع ابوبکر حرکتہ تاخر فجذب رسول اللہ ثوبہ فاقامہ وقعد رسول اللہ فقرأ من حیث انتھی ابوبکر۔

(تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص ۴۳۹)

فرمایا کہ تم لوگ چلے جاؤ اگر مجھے ضرورت ہوگی تو تمہیں بلوا بھیجوں گا چنانچہ وہ اُٹھ کر چلے گئے۔ پھر رسُول اللہ نے پُوچھا کیا نماز کا وقت ہو گیا ہے؟ بتایا گیا کہ ہاں۔ فرمایا کہ ابوبکر کو کہو کہ وہ نماز پڑھا دیں حضرت عائشہ نے کہا کہ وہ نرم دل ہیں آپ عمر کو حکم دیں فرمایا اچھا عمر کو کہہ دو۔ حضرت عمر نے کہا کہ میں ابوبکر کے ہوتے ہوئے سبقت نہیں کر سکتا اتنے میں حضرت ابوبکر آگے بڑھے اتنے میں رسول نے کچھ افاقہ محسوس کیا تو حجرے سے باہر آئے ابوبکر نے آپ کی آہٹ محسوس کی تو پیچھے ہٹنا چاہا آپ نے ان کے دامن کو کھینچا اور جہاں وہ کھڑے تھے وہیں کھڑا رہنے دیا اور خود بیٹھ گئے اور جہاں سے ابوبکر نے قرات تمام کی تھی وہاں سے قرات شروع کر دی"۔

اس روایت میں چند باتیں ایسی بھی آگئی ہیں جن سے اصل واقعہ کے سمجھنے میں مدد لی جا سکتی ہے۔ ایک بات تو بالکل واضح اور عیاں ہے کہ آنحضرت نے حضرت علی کو بلوانے کی خواہش کا اظہار کیا مگر کیوں اور کس لئے اس سلسلہ میں روایت خاموش ہے لیکن روایت کا آخری حصّہ کہ پیغمبر نے دریافت کیا کہ کیا نماز کا وقت ہو چکا ہے جس کا جواب ہاں میں دیا گیا اس سے اتنا تو معلوم ہو گیا کہ حضرت علی کو اُس وقت بلایا گیا تھا جب نماز کا وقت ہو چکا تھا اور نماز کے وقت طلب کرنے کا مقصد اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ انہیں نماز کے لئے کہا جائے۔ یہ اتنی صاف بات تھی کہ حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ بھی سمجھ گئیں کہ انہیں نماز کے لئے بلایا جا رہا ہے اسی بنا پر انہوں نے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کا نام لیا کہ کاش انہیں بلایا جاتا۔ اگر پیغمبرؐ نے حضرت علی کو ملاقات یا کسی ذاتی کام کے لئے بُلوایا ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کا نام بیچ میں لایا جاتا نام تو اسی صورت میں لیا جا سکتا تھا جب بلوانے کا مقصد اور کام کی نوعیت ان پر واضح ہو چکی ہو اور وہ چاہتی ہوں کہ اس کام کی انجام دہی کا سہرا ان کے سر بندھے۔ یہ چیز بھی نظر انداز کئے جانے کے قابل نہیں ہے کہ ادھر ان کا نام لیا جاتا ہے ادھر وہ پہنچ بھی جاتے ہیں۔ اس بر وقت آمد سے یہ نتیجہ اخذ کیا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ وہ آنحضرت کے مرض کی سنگینی دیکھ کر یہ سمجھ رہے تھے کہ آپ خود تو نماز کے لئے

مسجد میں نہ پہنچ سکیں گے یہ خدمت کسی اور ہی کے متعلق کریں گے لہٰذا نماز کے وقت آس پاس رہنا چاہئے تا کہ حضرت عائشہ یا حضرت حفصہ کی طرف سے بلاوا آئے تو فوراً پہنچ جائیں اور آنحضرت ہمیں اجازت دے ہی دیں گے اور پھر اس بُنیاد امامت پر قصر خلافت بآسانی تعمیر کیا جا سکے گا مگر پیغمبر انہیں یہ کہہ کر رخصت کر دیتے ہیں کہ تم چلے جاؤ ضرورت ہوگی تو تمہیں بلوا لیا جائے گا۔ ان لفظوں سے صاف ظاہر ہے کہ پیغمبر اس وقت تخلیہ چاہتے تھے تاکہ جس مقصد کے لئے علی کو بلوا بھیجا ہے اس میں دخل در اندازی نہ ہونے پائے۔ اگر پیغمبر اکرم یہ چاہتے تھے کہ حضرت ابوبکر نماز پڑھائیں تو اس وقت مانع ہی کیا تھا انہیں نماز کے لئے کہہ دیتے جبکہ نماز کا وقت بھی ہو چکا تھا اور وہ موجود بھی تھے مگر ان سے اشارے کنائے میں بھی کچھ نہیں کہتے اور اِدھر وُہ حجرے سے باہر نکلتے ہیں کہ یہ پیغام دیا جاتا ہے کہ حضرت ابوبکر نماز پڑھائیں۔ اس مقام پر ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کے آنے پر انہیں کیوں نہ کہہ دیا گیا، دُوسرے سے کہلوانے میں کیا مصلحت سمجھی گئی۔ اور جس سے کہلوایا گیا وُہ تھا کون تو اس کا جواب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ انہیں نہ کہا گیا نہ کہلوایا گیا بلکہ جدھر سے اُن کا نام پیش ہوا تھا اُدھر سے کہلوا دیا گیا۔

اس موقع پر حضرت عائشہ نے حضرت ابوبکر کی نرم دلی کا عذر کر کے حضرت عمر کا نام لیا اور پیغمبر سے کہا کہ انہیں کہہ دیجئے کہ وُہ نماز پڑھائیں۔ اگر واقعاً وُہ یہی چاہتی تھیں کہ حضرت ابوبکر کے بجائے حضرت عمر نماز پڑھائیں تو جب پیغمبر نے حضرت علی کو بلوا بھیجا تھا تو حضرت ابوبکر کا نام نہ لیا ہوتا مگر اس وقت تو یہ کہا کہ کاش ابوبکر کو بلایا ہوتا اور اب ان کی نرم دلی کا عذر کر کے حضرت عمر کا نام پیش کر دیا جاتا ہے اور اس سے زیادہ ورطۂ حیرت میں ڈال دینے والی بات تو یہ ہے کہ پیغمبر بھی ہاں میں ہاں ملا کر کہہ دیتے ہیں کہ اچھا عمر ہی سے کہہ دیا جائے کہ وُہ نماز پڑھائیں حالانکہ عبداللہ ابن زمعہ کی روایت میں گزر چکا ہے کہ جب آپ نے حضرت عمر کی صدائے تکبیر سُنی تو برافروختہ ہو گئے اور فرمایا کہ ان کی امامت نہ اللہ کو پسند ہے اور نہ مسلمانوں کو اور اس روایت کی رُو سے بڑی خوشی کے ساتھ اجازت دی جا رہی ہے اب کس کو صحیح سمجھا جائے اور کس کو غلط۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ جس کی امامت سے اللہ بھی بیزار ہو اور مسلمان بھی اس کو حضرت عائشہ کے کہنے سے اجازت دے دی جائے۔ اور جب حضرت عمر سے کہا جاتا ہے کہ آپ نماز پڑھائیں تو وُہ کہتے ہیں کہ میں حضرت ابوبکر کے ہوتے ہُوئے کیسے نماز پڑھا دوں یہ ایک عملی اعتراف ہے اس امر کا کہ فاضل پر مفضول کو ترجیح نہیں دی جا سکتی تو پھر امامت نماز میں اسے تسلیم کر لینے کے بعد خلافت میں اسے نظر انداز کرنے کا کیا جواز ہو سکتا ہے۔ اس موقع پر یہ بات کسی مصلحت پر مبنی ہوگی ورنہ پہلی روایت کی بنا پر جب عبداللہ ابن زمعہ نے انہیں نماز پڑھانے کے لئے کہا تو انہوں نے یہ نہ کہا کہ حضرت ابوبکر یہیں کہیں ہوں گے انہیں دیکھ لو ایک آدھ لمحہ انتظار کر لو بلکہ فوراً تیار ہو گئے۔ یہ دُوسری بات ہے کہ پڑھی پڑھائی نماز نہ پڑھنے کے برابر ہو گئی یا بیچ میں ادھوری چھوڑنا پڑی اور اس روایت کی رُو سے انہوں نے حضرت ابوبکر پر سبقت مناسب نہیں سمجھی اور

انہیں آگے کھڑا کر دیا مگر وُہ نماز کے لئے کھڑے ہوُے ہی تھے کہ پیغمبر بھی پہنچ گئے ابھی ابھی تو انہوں نے مجبوری کا اظہار کیا تھا پھر کیوں چلے آئے۔ قرین قیاس یہ بات نظر آتی ہے کہ حضرت علی کی طلبی پر کچھ لوگوں کو یہ خدشہ ہوا کہ پیغمبر کہیں انہیں نماز کے لئے نہ کہہ دیں انہوں نے پیغمبر کی طرف سے حضرت ابوبکر کو کہہ دیا کہ آپ نماز پڑھائیں اور جب وُہ دُوسرے کے کہنے سے کھڑے ہوگئے تو پیغمبر انہیں روکنے کے لئے جس طرح بن پڑا مسجد میں چلے آئے اور خود نماز پڑھائی ورنہ عذر کر دینے کے بعد پھر مسجد میں چلے آنے کی اور کیا وجہ ہوسکتی ہے۔ اس روایت میں بڑی چابکدستی سے یہ جملہ بھی درج کر دیا گیا ہے کہ آنحضرت نے وہاں سے قراءت شروع کی جہاں سے حضرت ابوبکر نے ختم کی تھی تاکہ ان کی نماز کا پیوند رسُول کی نماز سے جڑا رہے اور یہ نماز بھی حضرت عمر کی نماز کی طرح کالعدم نہ سمجھی جائے مگر اتنا نہ سوچا کہ قراءت کو بیچ سے شروع کرنے سے قراءت ناتمام رہے گی اور قراءت کے ناقص و ناتمام ہونے کی صورت میں نماز ہی صحیح نہیں ہوتی۔

صاحب صحیح محمد ابن اسمٰعیل بخاری تحریر کرتے ہیں:۔

عن عائشة قالت لما مرض النبی مرضه الذی مات فیه اتاه بلال یوذنه بالصلوٰة فقال مروا ابابکر فلیصل قلت ان ابابکر رجل اسیف ان یقم مقامك یبکی فلا یقدر علی القراءة قال مروا ابابکر فلیصل فقلت مثله فقال فی الثالثة او الرابعة انکن صواحب یوسف فلیصل فصلی وخرج النبی یهادی بین رجلین کانی انظر الیه یخط برجلیه الارض فلما راه ابوبکر ذهب یتاخر فاشار الیه ان صل فتاخر ابوبکر وقعد النبی الی جنبه وابوبکر یسمع الناس التکبیر۔

(صحیح بخاری۔ ۱ؔ۔ ص ۹۵)

حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں کہ جب نبی اکرم مرض الموت میں مبتلا ہوے تو بلال نے حاضر ہو کر نماز کے لئے عرض کیا فرمایا کہ ابوبکر سے کہہ دو کہ وُہ نماز پڑھائیں۔ میں نے کہا کہ ابوبکر رقیق القلب ہیں اگر آپ کی جگہ پر کھڑے ہوں گے تو رونے لگیں گے اور قراءت نہ کر سکیں گے فرمایا کہ ابوبکر سے کہو کہ وُہ نماز پڑھائیں میں نے پھر وہی کہا جو پہلے کہہ چکی تھی۔ تیسری یا چوتھی مرتبہ کے تکرار پر فرمایا کہ تم صواحب یوسف (یوسف والیاں) ہو۔ ابوبکر نماز پڑھائیں چنانچہ وُہ نماز پڑھانے لگے اتنے میں پیغمبر دو آدمیوں کا سہارا لے کر نکلے وُہ منظر مجھے یاد ہے کہ آپ کے دونوں پیر زمین پر گھسٹتے جا رہے تھے جب ابوبکر نے آنحضرت کو دیکھا تو پیچھے ہٹنے لگے آنحضرتؐ نے انہیں اشارہ کیا کہ پڑھتے رہو۔ حضرت ابوبکر پیچھے ہٹ گئے اور پیغمبر ان کے پہلو میں بیٹھ گئے اور ابوبکر لوگوں کو تکبیر کی آواز سُنا رہے تھے۔"

اس روایت میں بھی حضرت ابوبکر کی نرم دلی کا تذکرہ اس اضافہ کے ساتھ ہے کہ جب وُہ محراب مسجد میں کھڑے ہوں گے تو رونے لگیں گے اس طرح حضرت عائشہ پیغمبر کے یہ ذہن نشین کرنا چاہتی تھیں کہ آپ کی بیماری کا جتنا احساس حضرت ابوبکر کو ہے وُہ کسی کو نہیں ہے وہ آپ کے مصلّے پر کھڑے ہو کر اس تصوّر سے کانپ اٹھیں گے کہ کیا رسُول پھر اس مصلّے پر کبھی رونق افروز نہ ہوں گے اور روتے روتے ان کی آواز گلوگیر ہو جائے گی اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وُہ ان کی طرف سے معذرت چاہ رہی ہیں مگر درحقیقت یہ تاثر دینا تھا کہ جب وُہ سب سے زیادہ ہمدرد شریک درد اور غمگسار ہیں تو پھر ان سے بڑھ کر نماز پڑھانے کا حق کس کو ہے اس پر پیغمبر نے انہیں صاحبۂ یوسف کہا۔ صاحب سیرت حلبیہ نے تحریر کیا ہے کہ آنحضرت نے حضرت عائشہ کو صاحبۂ یوسف (زلیخا) اس بنا پر کہا کہ جس طرح زلیخا نے زنانِ مصر کو اپنے ہاں ضیافت کے لئے جمع کیا تھا حالانکہ مقصد ضیافت نہ تھا بلکہ وُہ یہ چاہتی تھیں کہ زنانِ مصر یوسف کو دیکھ کر انہیں محبّت و وارفتگی میں معذور سمجھیں اسی طرح حضرت عائشہ دل سے تو یہ چاہتی تھیں کہ حضرت ابوبکر نماز پڑھائیں اور ظاہر یہ کرتی ہیں کہ وُہ ان کی امامت کی ذرا خواہشمند نہیں ہیں تو جس طرح وہاں پر ظاہر کچھ تھا اور باطن کچھ اسی طرح یہاں پر ظاہر میں استغناء و بے نیازی ہے اور باطن میں خواہش و طلبگاری۔

اس روایت میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت نے حضرت ابوبکر کی امامت پر اصرار کیا تھا مگر حیرت ہے کہ ایک طرف تو اصرار کیا جاتا ہے اور دوسری طرف حضرت ابوبکر کے کھڑے ہوتے ہی گرتے پڑتے دو آدمیوں کے سہارے پر مسجد میں چلے آتے ہیں اور بیٹھ کر خود نماز پڑھاتے ہیں۔ پیغمبر کے اس اقدام سے اصرار تو درکنار تقرر پر بھی کوئی انصاف پسند اعتماد نہیں کر سکتا۔ اگر یہ تقرر پیغمبر کی طرف سے ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ نماز شروع ہوتے ہی افتاں و خیزاں محراب مسجد میں پہنچ جاتے اور فرائض امامت خود ادا کرتے البتہ حضرت ابوبکر مکبر کا فریضہ انجام دیتے رہے جیسا کہ اس روایت کے آخر میں ہے یعنی جب پیغمبر رکوع یا سجدہ میں جاتے تو وُہ اونچی آواز میں تکبیر کہتے جاتے تھے تاکہ نمازیوں کو پتا چلتا رہے کہ اب پیغمبر رکوع میں گئے ہیں اور اب سجدہ سے سر اُٹھایا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مکبر کی حیثیت امام کی نہیں ہوتی کہ ان کے سر امامت کا سہرا باندھنے کی کوشش کی جائے۔

ان روایات اور ان کے باہمی تضاد کو دیکھ کر قطعاً اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا کہ آنحضرت نے حضرت ابوبکر کو نماز پڑھانے پر مامور کیا تھا اور نہ ان کے مامور کئے جانے کا سوال پیدا ہوتا تھا اس لئے کہ انہی دنوں میں آنحضرت نے حضرت ابوبکر حضرت عمر اور دیگر صحابہ کو اسامہ کی ماتحتی میں مدینہ سے باہر نکل کر لشکر کشی کا حکم دیا تھا اور زندگی کے آخری لمحوں تک تاکید پر تاکید کرتے رہے تھے۔ پھر یہ کیونکر تصور کیا جا سکتا ہے کہ ایک طرف مدینہ چھوڑنے کا حکم دیں اور دوسری طرف انہیں مدینہ میں نماز پڑھانے پر مقرر فرمائیں۔ یہ امامت کا شاخسانہ اس لئے کھڑا کیا گیا ہے تاکہ حضرت ابوبکر کی خلافت کی صحت پر دلیل قائم کی جا سکے اور ابن حجر مکی نے تو اس امامت کو ان کی خلافت پر نص کا درجہ دے دیا ہے چنانچہ وُہ لکھتے ہیں:۔

لھذا ادعی جمیع العلماء ان خلافتہ منصوص علیہا۔	اس امامت کی بناء پر تمام علماء اس کے قائل ہیں کہ حضرت ابوبکر کی خلافت نصی تھی۔"

(تطہیر الجنان ص۳)

اگر واقعاً پیغمبر اس سے حضرت ابوبکر کی خلافت پر نص کرنا چاہتے تھے تو پھر اس امر کا داعی کیا تھا کہ انتہائی ضعف و نقاہت کے عالم میں دو آدمیوں کا سہارا لے کر مسجد میں آئیں اور حضرت ابوبکر کے پہلو میں بیٹھ کر یا انہیں پیچھے ہٹا کر خود نماز پڑھائیں کیا یہ خلافت کی اہلیت پر نص کی جا رہی تھی یا اس کے خلاف ثبوت بہم پہنچایا جا رہا تھا اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ امامتِ نماز دلیلِ خلافت ہے تو جب پیغمبر نے حضرت عمر کی آوازِ تکبیر سن کر انہیں نماز پڑھانے سے روک دیا تھا تو پھر حضرت ابوبکر نے کس بنا پر انہیں اپنے بعد خلافت کے لئے نامزد کیا۔ امامت نماز کو نص قرار دینے سے پہلے ضروری ہے کہ امامت نماز اور خلافت میں تلازم ثابت کیا جائے۔ اگر تلازم نہیں ہے تو پھر یہ خلافت کی دلیل کیسے اور اگر تلازم ہے تو پھر ان لوگوں کو خلافت سے محروم رکھنے کا کیا جواز ہے جنہیں پیغمبر وقتاً فوقتاً نماز پڑھانے کا حکم دیتے رہے تھے۔ چنانچہ آنحضرت جب کسی غزوہ میں تشریف لے جاتے تو نماز کی امامت کسی نہ کسی سے متعلق کر جاتے تھے اور عموماً اس کام کے لئے ابن ام مکتوم کو جو نابینا تھے چھوڑ جاتے تھے۔ ابن قتیبہ تحریر کرتے ہیں:۔

وکان رسول اللہ یستخلفہ علی المدینۃ یصلی بالناس فی عامۃ غزواتہ۔ (المعارف ص۱۲۶)	رسول اللہ عام غزوات کے موقع پر ابن ام مکتوم کو مدینہ میں چھوڑ جاتے تھے تاکہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔"

کیا اس امامت سے جو حضرت ابوبکر کی امامت سے بلحاظ مدت طویل تر ہوتی تھی کسی کو یہ گمان بھی ہوا تھا کہ آنحضرت ابن ام مکتوم کو اپنا خلیفہ و جانشین منتخب کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے علاوہ اپنی موجودگی میں بھی مختلف مواقع پر مختلف اشخاص کو امامت کی خدمت سپرد کر دیتے تھے جن میں ابو لبابہ، سباع ابن عرفطہ، عتاب ابن اسید، سعد ابن عبادہ، ابوذر غفاری، زید ابن حارثہ، ابو سلمہ مخزومی، اور عبداللہ ابن رواحہ شامل تھے۔ کیا ان لوگوں میں سے جو بحکم رسول نماز پڑھاتے رہے تھے کسی ایک نے بھی اس نماز سے اپنے استحقاقِ خلافت کو ثابت کرنا چاہا تھا۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر اسی نماز کو دلیل خلافت قرار دینے کے کیا معنی جبکہ اسے دلیل خلافت سمجھنے والوں کے نزدیک یہ دلیل عدالت بھی نہیں بن سکتی کیونکہ ان کے نزدیک ہر فاسق و غیر عادل کے پیچھے نماز جائز ہے۔ چنانچہ ابوہریرہ دوسی پیغمبر سے روایت کرتے ہیں:۔

الصلوٰۃ واجبۃ علیکم خلف کل مسلم برا کان او فاجرا و ان عمل الکبائر (مشکوٰۃ ص۱)	نماز وہ فریضہ ہے جو ہر اچھے اور برے مسلمان کے پیچھے پڑھی جا سکتی ہے اگرچہ وہ گناہائے کبیرہ کا مرتکب کیوں نہ ہوتا ہو۔"

اگر یہ امامتِ نماز دلیلِ خلافت بن سکتی ہے تو اسامہ کی امارت بھی جن کی ماتحتی میں حضرت ابوبکر حضرت عمر اور دیگر مہاجرین و انصار تھے دلیل قرار دی جاسکتی ہے جبکہ یہ امارت اس امامت سے اہم بھی تھی اگر اہم نہ ہوتی تو انصار و مہاجرین اس پر نکتہ چینی نہ کرتے اور نہ اُن کے پرچم کے نیچے جانا اپنے لئے ذلّت و سبکی کا باعث سمجھتے۔ غرض اس وقتی امامت کو اگر استحقاقِ خلافت کے لئے پیش کیا جاسکتا ہے تو اسامہ کی قیادت و امارت کو بدرجۂ اولیٰ پیش کیا جاسکتا ہے۔

المیۂ قرطاس

اسلام پیغمبر اکرم کا سرمایۂ حیات تھا جس کی تبلیغ و ترویج میں آپ نے سعی و عمل کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا اور خون پسینہ ایک کرکے اسے تکمیل کی منزل تک پہنچایا تھا۔ ہر شخص کی فطری و طبعی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی محنت و ریاضت کا ثمرہ دستبردِ زمانہ سے محفوظ اور تخریب کاروں کی تاخت و تاراج سے بچا رہے وہ زندگی میں بھی اس کی نگہداشت کرتا ہے اور آخر وقت میں بھی اس کی طرف سے مطمئن ہوکر دُنیا سے رُخصت ہونا چاہتا ہے اور جہاں تک ممکن ہوتا ہے زبانی ہدایت کی صورت میں یا تحریری وصیت کی شکل میں اس کا مستقبل محفوظ کرجانا اپنا اہم وظیفہ سمجھتا ہے تو اس صورت میں کیا یہ تصوّر کیا جاسکتا ہے کہ آنحضرت اسلام کے تحفظ کی فکر سے اور اس کی حفاظت و بقا کی تدبیر سے غافل رہے ہوں گے جبکہ آپ کی فرض شناسی و منصبی ذمہ داری کا تقاضا یہ تھا کہ آپ ہر اس طریق کار کو بروئے کار لائیں جس سے اسلام کا مستقبل محفوظ اور اس کے خلاف ہر تخریبی کاروائی کا سدّباب ہوجائے اور اس صورت میں تو اس کی ضرورت اور زیادہ ناقابلِ انکار ہوجاتی ہے جبکہ ضلالت و گمراہی کے اندھیرے پھیلتے ہوئے نظر آرہے ہوں اور اس ظلمتکدہ عالم میں اور کوئی مشعلِ ثبوت روشن ہونے والی نہ ہو۔

اس اہم ضرورت کے پیشِ نظر آنحضرت نے سفرِ آخرت سے دو چار روز پہلے کاغذ و قلم طلب کیا تاکہ ایک نوشتہ لکھ کر چھوڑ جائیں جو رہتی دنیا تک منشورِ ہدایت کا کام دے اور اُمتِ مسلمہ ضلالت و گمراہی اور مختلف گروہوں میں بٹ جانے سے محفوظ ہوجائے۔ مگر کچھ لوگ اس تحریر میں آڑے آئے اور

قال عمر ان النبی غلبه الوجع وعندنا کتاب الله حسبنا۔
(صحیح بخاری۔ جلد۔ صفحہ ۲۵)

حضرت عمر نے کہا کہ پیغمبر پر درد کا غلبہ ہے ہمارے پاس اللہ کی کتاب موجود ہے وہ ہمارے لئے کافی ہے۔"

یہ بخاری کی روایت ہے۔ اور بخاری میں یہ واقعہ ان الفاظ میں بھی درج ہے:۔

قال ائتونی بکتاب اکتب لکم کتابا لن تضلوا بعده ابدا

آنحضرت نے فرمایا تم ایک کاغذ لاؤ میں تمہارے لئے ایک نوشتہ لکھ دوں جس کے بعد تم کبھی گمراہ

فتنازعوا ولا ینبغی عند نبی تنازع فقالوا اھجر رسول اللہ قال دعونی فالذی انا فیہ خیر مما تدعونی الیہ۔ (صحیح بخاری ج۲ ۔ ص۱۲۱)۔

نہیں ہوگے اس پر لوگ آپس میں جھگڑنے لگے حالانکہ نبی کے پاس جھگڑا مناسب نہ تھا۔ لوگوں نے کہا کہ رسول اللہ پر ہذیانی کیفیت طاری ہے۔ آنحضرت نے فرمایا مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں جس حال میں ہوں وُہ بہتر ہے اس سے جس کی طرف تم مجھے بلاتے ہو۔"

جب جھگڑے نے طول کھینچا اور شور و غل کی آوازیں بلند ہوئیں تو پس پردہ سے ازواج پیغمبر نے کہا:۔

ائتوا رسول اللہ بحاجتہ قال عمر فقلت اسکتن فانکن صواحبہ اذا مرض عصرتن اعینکن واذا صح اخذتن بعنقہ فقال رسول اللہ ھن خیر منکم۔ (طبقات ابن سعد۔ج۲۔ ص۲۴۴)۔

پیغمبر جو مانگتے ہیں دے دو۔ حضرت عمر کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ تم چُپ رہو تم وہی یوسف والیاں ہو جب پیغمبر بیمار پڑتے ہیں تو آنسو بہاتی ہو اور جب تندرست ہوتے ہیں تو ان کی گردن پر سوار ہو جاتی ہو۔ اس پر آنحضرت نے فرمایا کہ یہ تم سے تو بہتر ہی ہیں۔"

اندرون خانہ سے یہ آواز آتی رہی مگر کسی نے اس پر کان نہ دھرا اور قلم و کاغذ کے پیش کرنے سے مانع رہے۔ پیغمبر اکرم کو دُنیا والوں کی بے وفائی کا رنج حکم کی خلاف ورزی کا ملال ہذیان کی تہمت کا صدمہ اور اس پر تو تکار اور چیخ پکار کی درد سری آپ نے کبیدہ خاطر ہو کر کہا قوموا عنی "میرے پاس سے اُٹھ کر چلے جاؤ"۔ تاریخ اسلام کا یہ کتنا عظیم المیہ ہے کہ پیغمبر اکرم اپنی اُمّت کی بہبود اور گمراہی سے تحفظ کے لئے وصیت قلمبند کرنا چاہتے ہیں مگر اُن کی آواز شور و غل میں دب کر رہ جاتی ہے اور آخر حسرت و اندوہ کے عالم میں اس دُنیا سے کنارا کر جاتے ہیں۔ ابن عباس اس واقعہ کو یاد کر کے اتنا رویا کرتے تھے کہ سامنے رکھے ہوئے سنگریزے تر ہو جاتے تھے اور گلوگیر آواز میں کہتے:۔

الرزیۃ کل الرزیۃ ما حال بین رسول اللہ وبین ان یکتب لھم ذلک الکتاب من اختلافھم ولغطھم۔ (طبقات ابن سعد۔ج۲۔ ص۲۴۴)۔

یہ مصیبت کتنی بڑی مصیبت ہے کہ صحابہ کے اختلاف اور اُن کے شور و ہنگامہ کی وجہ سے رسُولِ خدا اور تحریر وصیت میں رکاوٹ پیدا ہو گئی۔"

اس واقعہ میں تاویلات کا سہارا ڈھونڈا گیا الفاظ کے معنی و مفہوم کو بدلنے کی کوشش کی گئی اور پورے مجمع کو اس جرم و جسارت کا مرتکب قرار دے کر اصل مرتکب پر پردہ ڈالا گیا مگر یہ سب کوششیں بے سُود

ثابت ہوئیں اور حقیقت چھپائے سے نہ چھپ نہ سکی۔ بخاری کی دونوں مندرجہ روایتوں کی یہی صورت ہے چنانچہ پہلی روایت میں جہاں پیغمبر پر درد کے غلبہ کا ذکر ہے کہنے والے کا نام حضرت عمر درج کیا گیا ہے اور دوسری روایت میں جہاں پیغمبر کی طرف ہذیانی گفتگو کی نسبت دی گئی ہے وہاں اُس کے قائل کو قالوا کے صیغہ جمع میں چھپا دیا گیا ہے یعنی جس روایت کے الفاظ ہلکے اور سبک ہیں وہاں کہنے والے کا نام ظاہر کردیا جاتا ہے اور جس میں الفاظ درشت اور نازیبا ہیں وہاں کہنے والے کا نام نہیں لیا جاتا مگر اس سے پردہ پوشی کا کام نکلتا نظر نہیں آتا اس لئے کہ جب سب ہی کہہ رہے تھے تو جس کا کردار ان سب میں نمایاں رہا ہو وُہ ان سے علیحدہ کیسے تصور کیا جاسکتا ہے اگر ایسا ہوتا تو تاریخ میں بڑی جلی سُرخیوں سے اس کا ذکر آتا اور مدح و ستائش کے پھول برسائے جاتے۔ البتہ بعض روایات میں کل کے بجائے بعض کی طرف نسبت ہے۔ ابن سعد تحریر کرتے ہیں:۔

قال بعض من کان عندہ ان نبی اللہ لیھجر۔ (طبقات۔ ج ۲۔ ص ۲۴۲)۔	کچھ لوگوں نے جو وہاں تھے یہ کہا کہ رسُول اللہ شدّت مرض میں بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں"۔

اس روایت میں کہنے والوں کا دائرہ پہلے سے محدود ہوگیا ہے مگر پھر بھی لفظ بعض سے قائل کی صحیح نشاندہی نہیں ہوتی البتہ شیخ شہاب الدین خفاجی نے بعض دُوسرے علماء کی طرح اس بعض پر سے پردہ اُٹھا کر صاف صاف لکھ دیا ہے:۔

فقال عمر ان النبی صلے اللہ علیہ وسلم لیھجر۔	حضرت عمر نے کہا کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں"۔

(نسیم الریاض۔ ج۴۔ ص ۲۷۸)۔

پیغمبر اکرم کی طرف ہذیانی کیفیت کی نسبت خواہ کسی کی طرف سے ہو انتہائی سوء ادبی کا مظاہرہ ہے۔ مقام نبوت کا ادنیٰ عرفان رکھنے والا بھی ان لفظوں کو سُن کر ایک مرتبہ تو لرز اُٹھتا ہے کہ زبان وحی ترجمان ہذیان آشنا کیسے ہوگئی۔ حیرت ہے کہ ایک طرف تو آپ کی ہر جنبش لب کو وحی الٰہی کے زیرِ اثر اور ہر حکم کو حکمِ ربانی کا ترجمان مانا جاتا ہے اور اُن کی زبان سے نکلی ہوئی ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف کو محفوظ کرلینا سعادت کا نشان سمجھا جاتا ہے اور دُوسری طرف ہذیان کو تجویز کرکے ان کے ارشادات کو بے اعتماد بناتے کی کوشش بھی کی جاتی ہے۔ انصاف سے کہئے کہ قلم و کاغذ کے طلب کرنے اور وصیت لکھنے میں بدحواسی کی بات ہی کون سی تھی بلکہ آپ کا ارشاد کہ "میں ایک نوشتہ لکھ دوں تاکہ تم کبھی گمراہ نہ ہو"۔ آپ کے کمالِ صحت عقل و صحت حواس کا واضح ترین ثبوت ہے۔ پھر ہذیان کی نسبت کا کیا جواز رہ جاتا ہے۔ اور اگر بفرض محال یہ تسلیم کرلیا جائے کہ آنحضرت پر ہذیانی کیفیت طاری تھی اور اسی کیفیت کے زیرِ اثر قلم و کاغذ

طلب کر رہے تھے تو اس میں مضائقہ ہی کیا تھا کہ آپ کی دلجوئی کے لئے قلم و کاغذ پیش کر دیتے وہ کوئی ایسی چیز تو مانگ نہیں رہے تھے جس میں خود اُن کے لئے یا حاضرین میں سے کسی کے لئے نقصان یا گزند پہنچنے کا احتمال ہوتا اس طرح وہ لوگ اتباعِ رسول و احترام رسُول کی ایک درخشاں مثال چھوڑ جاتے کہ انہوں نے پیغمبر کے اس حکم کی بھی خلاف ورزی گوارا نہ کی کہ جو ہذیانی حالت میں دیا گیا تھا۔

اس مقام پر حکم رسول سے سرتابی کا جواز پیدا کرنے کے لئے یہ کہا جاتا ہے کہ دین کی تکمیل ہو چکی تھی وحی کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا اب کسی تحریر کی ضرورت ہی کیا تھی۔ بیشک دین کی تکمیل ہو چکی تھی مگر تکمیل کے معنی یہ تو نہیں ہیں کہ اب اُمت گمراہی سے محفوظ بھی ہو چکی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو نہ مسلمانوں کے عقائد میں تصادم ہوتا نہ نظریات میں تضاد پایا جاتا اور نہ مختلف جماعتوں اور فرقوں میں بٹے ہوئے نظر آتے یہ باہمی تفرقہ اور گروہ بندی گمراہی ہی کا تو نتیجہ ہے جسے دین کی تکمیل روک نہ سکی۔ انہی فکری و اعتقادی گمراہیوں کا سدباب کرنے کے لئے پیغمبر نوشتہ تحریر کرنا چاہتے تھے اور یہ کہنا کہ اس کی ضرورت ہی کیا تھی تو ہمیں اس کی ضرورت و عدم ضرورت کا فیصلہ کرنے کے بجائے رسُول اللہ پر اس کا فیصلہ چھوڑ دینا چاہئے اگر وہ اس کی ضرورت و اہمیت نہ سمجھتے تو قلم دوات کیوں طلب کرتے اور جب انہوں نے ضروری سمجھا تو ہمیں غیر ضروری کہنے کا حق کہاں سے پہنچتا ہے اور یہ بات تو سراسر غلط اور بے بنیاد ہے کہ وحی منقطع ہو چکی تھی اس لئے یہ حکم وحی نہ تھا اس لئے کہ وحی کا سلسلہ آنحضرت کے آخری لمحۂ حیات تک جاری رہا۔ چنانچہ انس ابن مالک کہتے ہیں:۔

ان اللہ تبارک وتعالیٰ تابع الوحی	اللہ تبارک و تعالیٰ نے وحی کا سلسلہ پیغمبر کے قبل
علی رسُول اللہ قبل وفاتہ	وفات سے لے کر ان کے مرتے دم تک برابر
حتی توفی واکثر ما کان الوحی	جاری رکھا اور سب سے زیادہ وحی اس دن نازل
فی یوم توفی۔ (طبقات ابن سعد ج۲ ص۹۳)	ہوئی جس دن آپ نے رحلت فرمائی"۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ پیغمبر جو کچھ فرما رہے تھے اور جو کچھ تحریر کرنا چاہتے تھے وہ وحی کی ہدایت اور وحی کی تعلیم کے ماتحت تھا مگر سیاسی مصالح کے پیش نظر اس کے آگے نہ صرف دیوار کھڑی کر دی گئی بلکہ اسے ہذیان کہہ دیا گیا تاکہ رسُول اگر کچھ لکھ بھی جائیں تو اُسے یہ کہہ کر مسترد کیا جا سکے کہ یہ ہذیانی حالت کی لکھی ہوئی تحریر ہے جو قابلِ عمل نہیں ہے اور اس طرح اسے بے اثر بنا کر رکھ دیا جاتا اور لکھنا نہ لکھنا برابر ہو جاتا۔

اس پر بھی ایک نظر کرنے کی ضرورت ہے کہ آخر پیغمبر کیا لکھنا چاہتے تھے اور اس کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ کتب تاریخ و حدیث شاہد ہیں کہ پیغمبر بستر مرگ پر اور اس سے پہلے بھی بار بار فرماتے تھے:۔

انی تارک فیکم ما ان تمسکتم	میں تم میں (دو) چیزیں چھوڑے جاتا ہوں اگر تم
بہ لن تضلوا بعدی	ان سے وابستہ رہے تو میرے بعد کبھی گمراہ نہیں
احدھما اعظم من الاخر	ہو گے ان میں سے ایک دوسرے سے بڑھ کر ہے

كتاب الله حبل ممدود من السماء الى الارض وعترتي اهل بيتي ولن يفترقا حتي يردا على الحوض فانظروا كيف تخلفوني فيهما۔ (مشکوٰۃ۔ ص۵۶۹)۔	ایک اللہ کی کتاب ہے جو ایک (مضبوط) رسی ہے جس کا ایک سرا آسمان پر ہے اور ایک زمین پر اور دوسری میری عترت ہے جو میرے اہلبیت ہیں یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض کوثر پر وارد ہوں۔ تم خود ہی سوچو کہ تمہیں ان دونوں کے ساتھ کیا رویہ رکھنا چاہئے"۔

اور جب وفات کا وقت قریب آیا تو علی کو ہاتھ سے بلند کر کے فرمایا:۔

هذا علي مع القرآن والقرآن مع علي لا يفترقان حتي يردا على الحوض فاسألهما ما خلفتم فيهما۔ (صواعق محرقہ ص۱۲۶)	یہ علی قرآن کے ساتھ ہیں اور قرآن ان کے ساتھ ہے یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض کوثر پر پہنچیں میں ان دونوں سے پوچھوں گا کہ تم ان کے حق میں کیسے ثابت ہوئے"۔

اس حدیث سے پہلی حدیث میں پیغمبر اکرم نے قرآن و اہلبیت کے اتباع کو ضلالت و گمراہی سے تحفظ کی سپر قرار دیا ہے جیسے ان لفظوں میں بیان کیا ہے لن تضلوا بعدی (میرے بعد تم کبھی گمراہ نہ ہو گے) اور اس موقع پر بھی اپنی تحریر کو گمراہی سے بچاؤ کا ذریعہ بتاتے ہوئے بعینہ انہی الفاظ کا اعادہ کیا ہے لن تضلوا بعدہ۔ (اس کے بعد تم کبھی گمراہ نہ ہو گے) اس سے ہر ذی شعور و با فہم انسان یہ نتیجہ اخذ کر سکتا ہے کہ آنحضرت نے گمراہی سے تحفظ کے لئے جس چیز کا قولاً اعلان کیا تھا اسی کو عملاً تحریر میں لانا چاہتے تھے تاکہ ہر لحاظ سے حجت تمام ہو جائے اور آپ کے بعد رہنمائی کے لئے انہی پر انحصار کیا جائے یہ ایک طرح سے آپ کی نیابت و جانشینی کی دستاویز تھی جس کا پہلے سے اظہار کرتے چلے آ رہے تھے اور غدیر خم میں اس کا اعلان بھی کر چکے تھے۔ اس اعلان سے اگرچہ فریضۂ تبلیغ ادا ہو گیا تھا مگر جیش اسامہ میں بعض لوگوں کے تخلف و اعراض اور دوسرے قرائن سے ظاہر ہو رہا تھا کہ کچھ لوگ اس کی عملی تکمیل میں مانع ہوں گے اس لئے پیغمبر نے زبانی اعلان کو تقویت دینے کے لئے اسے تحریری صورت میں پیش کرنا ضروری سمجھا تاکہ اس تحریری دستاویز کے ہوتے ہوئے اس کے خلاف کوئی اقدام عمل میں نہ آئے۔ حضرت عمر اس سے بے خبر نہ تھے کہ پیغمبر قرآن کے ساتھ اہلبیت کے اتباع کو بھی ضروری سمجھتے ہیں اور لفظ لن تضلوا سے تو واضح طور پر سمجھ گئے تھے کہ آنحضرت علی کے بارے میں جنہیں قرآن کا قرین و مصاحب قرار دیا ہے وصیت تحریر کرنا چاہتے ہیں اور یہ چیز ان کے مستقبل کے عزائم میں سدّراہ ہو سکتی تھی اس لئے عندنا کتاب اللہ حسبنا

کہہ کر اس کی ضرورت ہی سے انکار کردیا۔ یہ جملہ اگرچہ ایک ہنگامی ضرورت کی بنا پر کہا گیا تھا مگر کچھ عرصہ بعد یہ برگ و بار لایا اور ایک فرقہ نے اپنے عقائد کی بنیاد اس پر رکھ دی اور قرآن کے علاوہ حدیث تک کی ضرورت سے انکار کردیا حالانکہ حضرت عمر حدیث پر عمل پیرا ہو کر عملاً قرآن کے ناکافی ہونے کا اعتراف کرتے رہے تھے چنانچہ جب خلافت کے سلسلہ میں مہاجرین و انصار میں نزاع کی صورت رونما ہوی تو قرآن کو رفع نزاع کا ذریعہ قرار دینے کے بجائے (الائمۃ من قریش (امام قریش میں سے ہوں گے) سے اپنے حق کی فوقیت کا اثبات کیا اور وراثت رسول کے سلسلہ میں قرآن سے دلیل ڈھونڈنے کے بجائے انا معاشر الانبیاء لانورث (ہم گروہ انبیاء کسی کو وارث نہیں بناتے) پر اعتماد کیا اور جن جن مواقع پر لولا علی لھلك عمر (اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہوجاتا) کہا گیا وہاں پر قرآن سے حل تلاش کرنے کے بجائے علی سے رہنمائی طلب کرتے رہے۔ اس سے یہ ظاہر ہے کہ وہ قرآن کو کافی کہنے کے باوجود عمل کے اعتبار سے صرف اسی پر انحصار نہ کرتے تھے بلکہ حدیث کو بھی مورد اعتماد و عمل سمجھتے تھے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ قرآن اپنی جامعیت کے باوجود اپنے حقیقی ترجمان کے بغیر کافی نہیں ہوسکتا ورنہ تو رسول کی ضرورت سے بھی انکار کرنا پڑے گا۔

پیغمبر کا سفر آخرت

آنحضرت نے وفات سے ایک دن پہلے حضرت علی کو قریب بلا کر فرمایا کہ اے علی اب میرے چل چلاؤ کا وقت قریب ہے میرے انتقال کے بعد تم ہی مجھے غسل دینا کفن پہنانا اور لحد میں اتارنا۔ میں نے جن لوگوں سے جو جو وعدے کر رکھے ہیں انہیں پورا کرنا لشکر اسامہ کی تیاری کے سلسلہ میں فلاں یہودی کا مجھ پر قرضہ ہے اسے ادا کردینا۔ پھر دست مبارک سے انگشتری اتار کر آپ کو دی اور فرمایا کہ اسے پہن لو اور اپنی تلوار خود زرہ پٹکا اور دوسرے ہتھیار آپ کو مرحمت فرمائے۔ آج کا دن گزر گیا اور دوسرے دن روز دوشنبہ ۲۸ صفر سنہ ۱۱ھ کو آنحضرت کی حالت غیر ہوگئی کاشانۂ نبوت پر موت کے بادل منڈلانے لگے نزع کی سی حالت طاری ہوگئی اور وہ لمحہ قریب تھا کہ نفس کی آمد و شد بند ہوجائے اور روح طیب اپنے مرکز کی طرف پرواز کر جائے کہ غشی سے آنکھیں کھولیں علی کسی کام سے ادھر ادھر ہوگئے تھے نظر نہ آئے تو فرمایا کہ میرے حبیب کو بلاؤ۔ حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں:۔

قال رسول اللہ لما حضرتہ الوفاۃ ادعوا الی حبیبی فدعوا لہ ابابکر فنظر الیہ ثم وضع راسہ ثم قال ادعوا الی حبیبی فدعوا لہ عمر فلما نظر الیہ وضع راسہ

جب پیغمبر کا وقت آخر قریب آیا تو آپ نے فرمایا کہ میرے حبیب کو بلاؤ کوی حضرت ابوبکر کو بلالایا آپ نے نظر اٹھا کر انہیں دیکھا اور سر نیچے رکھ دیا اور فرمایا کہ میرے حبیب کو بلاؤ اب کوی حضرت عمر کو بلالایا آپ نے انہیں دیکھا تو سر نیچے رکھ دیا اور فرمایا کہ میرے

ثم قال ادعوالی حبیبی فدعواله علیا فلما راٰہ ادخله معه فی الثوب الذی کان علیه فلم یزل یحتضنه حتی قبض ویدہ علیه۔ (ریاض النضرہ۔ ج۲۔ ص۲۳۷)۔

"حبیب کو بلاؤ اب علی کو بلا لایا آپ نے انہیں دیکھا تو اپنی چادر میں جسے اوڑھے ہوئے تھے لے لیا اور پہلو میں لئے رہے یہاں تک کہ آپ انتقال فرما گئے اور آپ کا ہاتھ حضرت علی کے اوپر رکھا تھا۔"

یہ حادثہ دُنیائے اسلام کا عظیم ترین حادثہ تھا۔ یوں تو ہر شخص اس سانحہ سے متاثر تھا مگر بنی ہاشم و افرادِ خاندان پر غم والم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ دُختر رسُول کا یہ حال تھا کہ گویا ان سے زندگی چھین لی گئی ہے اور ان کے بچے نانا کی شفقتیں یاد کر کے تڑپ رہے تھے اور علی کی دُنیا ہی بدل چکی تھی رگوں میں خون منجمد ہو کر رہ گیا اور صبر و ضبط کے باوجود آنکھوں سے سیل اشک جاری ہو گیا آپ نے روتے ہوئے اپنا ہاتھ آنحضرت کے چہرۂ اقدس سے مس کیا اور اپنے مُنہ پر پھیرا میّت کی آنکھوں کو بند کیا اور نعش اطہر پر چادر پھیلا دی اور حسب وصیت رسول غسل و کفن کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ابن سعد نے تحریر کیا ہے:۔

توفی رسُول اللہ وراسه فی حجر علی وغسله علی والفضل محتضنه واسامة یناول الفضل الماء۔ (طبقات۔ ج۲۔ ص۲۶۳)

"جب رسُول اللہ نے انتقال فرمایا تو آپ کا سر اقدس حضرت علی کی گود میں تھا اور علیؑ ہی نے آپ کو غسل دیا۔ فضل ابن عباس آنحضرت کو سنبھالے ہوئے تھے اور اسامہ انہیں پانی دیتے جا رہے تھے۔"

جب امیر المومنین غسل دینے سے فارغ ہو گئے تو کفن پہنایا اور تنہا نماز جنازہ پڑھی۔ مسجد میں جو لوگ جمع تھے وُہ آپس میں مشورے کر رہے تھے کہ کسے نماز جنازہ کی امامت کے لئے کہیں اور کون سی جگہ دفن کے لئے تجویز کریں۔ کچھ لوگوں کی رائے تھی کہ صحن مسجد میں دفن کئے جائیں اور کچھ لوگوں کی رائے تھی کہ جنۃ البقیع میں دفن ہوں۔ حضرت کو معلوم ہوا تو آپ نے حجرے سے باہر نکل کر فرمایا کہ پیغمبر زندگی میں بھی ہمارے امام و پیشوا تھے اور رحلت کے بعد بھی ہمارے امام و پیشوا ہیں لہذا ایک ایک جماعت اندر جائے اور فرادی نماز پڑھ کر باہر نکل آئے۔ رہا آنحضرت کے دفن کا سوال تو وہ اسی مقام پر دفن کئے جائیں جہاں انہوں نے رحلت فرمائی ہے۔ چنانچہ بنو ہاشم پھر مہاجرین اور پھر انصار نے نماز ادا کی البتہ ایک گروہ جو تشکیل حکومت کی فکر میں تھا تجہیز و تکفین میں شرکت اور نماز جنازہ کی سعادت سے محروم رہا۔ نماز جنازہ کے بعد اسی حجرے میں جہاں آنحضرت نے انتقال فرمایا تھا زید ابن سہل سے قبر کھدوائی گئی۔ حجرے کے اندر دفن کا انتظام کرنے والے حضرت علی، عباس ابن عبد المطلب فضل ابن عباس اور اسامہ ابن زید تھے۔ جب دفن کا وقت آیا تو انصار نے باہر سے پکار کر کہا کہ اے علی ہمارا ایک آدمی بھی اس میں شریک کر لیجئے تاکہ ہم اس شرف سے محروم نہ رہ جائیں۔ حضرت نے اوس ابن خولی کو شریک کر لیا اور انہیں قبر میں اُترنے کی اجازت دے دی۔ حضرت علی نے نعش اقدس کو دونوں ہاتھوں پر لے کر

قبر میں اُتارا جب لحد میں رکھا تو چہرے پر سے کفن ہٹایا اور نعش کو قبلہ رو کر کے رخسار مبارک خاک پر رکھا اپنے ہاتھوں سے قبر میں مٹی ڈالی اور قبر کو ہموار کر کے اس پر پانی چھڑکا۔

الا یا ضریحاً ضم نفساً زکیۃ علیک سلام اللہ فی القرب والبعد

تعمیل وصیّت

انسان اپنی زندگی میں جن چیزوں کی تکمیل نہیں کر پاتا یا ان پر عملدر آمد کا موقع ہی مرنے کے بعد آتا ہے تو وُہ انہیں بطور وصیت کسی ایسے شخص سے متعلق کر جاتا ہے جس پر اسے مکمّل اعتماد و یقین ہوتا ہے کہ وُہ اس کی وصیت سے انحراف نہیں کرے گا خواہ اسے کتنی ہی دُشواریوں سے دو چار ہونا پڑے اور ایک فرض شناس انسان کی فرض شناسی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ وصیت کی ذمہ داری قبول کرنے کے بعد ہر حال میں اس کی پابندی کرے۔ پیغمبر اکرم نے اسی اعتماد کی بنا پر حضرت علی کو اپنا وصی مقرر کیا تھا کہ ان پر جو ذمہ داریاں عائد کی جائیں گی وُہ انہیں ایک اہم فریضہ سمجھ کر پُورا کریں گے۔ چنانچہ حضرت نے ایک فرض شناس کی طرح وصیت کے ہر پہلو کو پیش نظر رکھا اور ایک ایک ہدایت پر عمل کیا۔ تجہیز و تکفین کے سلسلہ میں خود غسل دیا خود کفن پہنایا خود قبر میں اُترے اور گرد و پیش کے بدلے ہُوئے حالات سے آنکھیں بند کر کے ہمہ تن اُدھر ہی متوجہ رہے۔ ان عمومی فرائض کے علاوہ آنحضرت کے وعدوں کے ایفاء کا ذمہ اور ادائے حقوق و ادائے قرض کا بار بھی آپ پر تھا جیسا کہ حدیث پیغمبر میں ہے کہ علی ینجز عداتی و یقضی دینی "علی میرے کئے ہُوئے وعدوں کو پُورا کریں گے اور میرا قرضہ ادا کریں گے۔" آپ ان تمام ذمہ داریوں سے اس طرح عہدہ برآ ہُوئے کہ اس سے زیادہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ عبد الواحد ابن عوان کہتے ہیں:۔

ان رسول اللہ لما توفی امر علی صائحاً یصیح من کان لہ عند رسول اللہ عدۃ او دین فلیاتنی فکان یبعث کل عام عند العقبۃ یوم النحر من یصیح بذلک حتی توفی ثم کان الحسن ابن علی یفعل ذلک حتی توفی ثم کان الحسین یفعل ذلک وانقطع ذلک بعدہ

(طبقات ابن سعد جلد ۲۔ صفحہ ۳۱۹)

"جب پیغمبر اکرم کا انتقال ہوا تو حضرت علی نے ایک اعلان کرنے والے کو مامور کیا کہ وُہ اعلان کرے کہ جس کسی سے رسُول اللہ نے کوئی وعدہ کیا ہو یا جس کسی کا قرضہ ان کے ذمّہ ہو وُہ میرے پاس آئے اور ہر سال زمانہ حج میں کسی اعلان کرنے والے کو بھیجتے جو قربانی کے دن عقبہ کے پاس اعلان کرتا اور آپ کی زندگی تک ایسا ہی ہوتا رہا۔ آپ کے بعد حسن ابن علی زندگی بھر اس پر کاربند رہے اور اُن کے بعد حسین ابن علی کی طرف سے اعلان ہوتا رہا اور پھر یہ سلسلہ بند ہو گیا۔"

اس سے بڑھ کر احساس فرض و ادائے فرض کی اور کیا مثال ہو سکتی ہے کہ حج کے موقع پر جہاں ہر سمت کے لوگ سمٹ کر جمع ہو جاتے ہیں مسلسل پچاس برس تک یہ اعلان ہوتا رہا تاکہ کسی کا کوئی مطالبہ باقی نہ رہ جائے۔ اس سلسلہ میں حضرت علی نے نہ کسی تحریری دستاویز کی شرط رکھی اور نہ کسی گواہ کی ضرورت محسوس کی بلکہ عبدالواحد ابن عوان کہتے ہیں کہ جس نے جو طلب کیا اور جو مانگا آپ نے بلا حیل و حجت دے دیا خواہ اس نے سچ کہا ہو یا جھوٹ۔

امیرالمومنین کا یہ طرز عمل ان لوگوں کے لئے باعث عبرت ہونا چاہئے جنہوں نے بنت رسول کے قول کو قابل اعتماد نہ سمجھا اور نصاب شہادت کے ناتمام ہونے کا عذر تراش کر ان کا دعویٰ مسترد کر دیا۔ اس مقام پر یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ درصورتیکہ پیغمبر کے پسماندگان میں سے ان کے ترکہ کا کوئی وارث نہیں ہوتا اور ان کے متروکہ اموال و املاک کی مالک حکومت ہوتی ہے تو ان قرضوں کی ادائیگی بھی حکومت پر عائد ہونا چاہئے تھی جو پیغمبر کی نیابت کی دعوے دار تھی۔ یہ تو سمجھ میں آنے والی بات نہیں کہ متروکہ اموال حکومت کی تحویل میں چلے جائیں اور قرضوں کی ادائیگی کا بار کسی اور پر ڈال دیا جائے۔ خصوصاً جبکہ یہ قرضے شخصی نہ ہوں بلکہ ملی و ملکی مقاصد کی تکمیل کے لئے ہوں۔ اب یا تو یہ تسلیم کیجئے کہ جو قرضوں کی ادائیگی کا ذمہ دار تھا وُہی پیغمبر کے بعد ان کا نائب و کار پرداز تھا یا پیغمبر کے اموال و املاک کا حکومت کی تحویل میں لیا جانا صحیح نہ تھا۔

رسول اکرم کی وفات سے انکار

پیغمبر اسلام کی وفات سے مدینہ منورہ کی فضاؤں پر سوگوارانہ سکوت چھایا ہُوا تھا در و دیوار پر وحشت و سراسیمگی برس رہی تھی ہر گھر ماتمکدہ اور ہر شخص اشکبار تھا مسلمان پاشان و پریشان مسجد نبوی کے اندر اور اس کے گرد و پیش جمع تھے جن کی حسرت بھری نظریں رہ رہ کر اس حجرہ کی طرف اٹھ رہی تھیں جہاں ہادی عالم کی نعش مبارک رکھی تھی اور نالہ و شیون کی گونج میں غسل و کفن کے ابتدائی مراحل طے کئے جا رہے تھے ہر شخص غم و اندوہ میں ڈوبا ہوا اور فکر و تشویش میں کھویا ہوا تھا کہ ناگاہ اس غم انگیز فضا میں ایک آواز بلند ہوئی:۔

ان رجالا من المنافقین یزعمون ان رسول اللہ توفی و ان رسول اللہ واللہ ما مات ولکنہ ذھب الی ربہ کما ذھب موسٰی ابن عمران فغاب عن قومہ اربعین لیلۃ ثم رجع بعد ان قیل قد مات واللہ لیرجعن رسول اللہ	کچھ منافقوں کا یہ خیال ہے کہ رسُول اللہ وفات پا گئے حالانکہ خدا کی قسم وُہ مرے نہیں ہیں بلکہ اپنے پروردگار کے پاس گئے ہیں جس طرح موسےٰ ابن عمران گئے تھے اور چالیس راتیں اپنی قوم سے پوشیدہ رہنے کے بعد پلٹ آئے تھے اس وقت بھی کہا گیا تھا کہ موسٰی وفات پا گئے۔ خدا کی قسم رسُولِ خدا پلٹ کر آئیں گے اور ان لوگوں

فلیقطعن ایدی رجال و ارجلھم یزعمون ان رسول اللہ مات۔

کے ہاتھوں اور پیروں کو کاٹیں گے جو یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر وفات پا گئے "۔

(تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص ۴۴۲)۔

پھر تہدیدی لہجہ میں یہ آواز گونجی:۔

من قال ان رسول اللہ مات علوت راسہ بسیفی ھذا و انما ارتفع الی السماء۔

جو شخص یہ کہے گا کہ رسول اللہ مر گئے ہیں میں اپنی تلوار اس پر جڑ دوں گا۔ پیغمبر تو آسمان پر اٹھ گئے ہیں "۔

(تاریخ ابو الفداء۔ ج ۱۔ ص ۱۵۶)۔

یہ آوازیں حضرت عمر کے دہن سے نکل رہی تھیں جو اس امر پر بضد تھے کہ پیغمبر اکرم زندہ ہیں اور ان کی موت کی خبر منافقین نے اڑائی ہے انہوں نے ڈرا دھمکا کر اور تلوار گھما کر بجبر و قہر لوگوں کی زبانوں پر پہرا بٹھا دیا تاکہ کسی کے دہن سے اس کے خلاف آواز بلند نہ ہو۔ ابن کثیر رقم طراز ہیں:۔

وقام عمر ابن الخطاب یخطب الناس ویتوعد من قال مات بالقتل والقطع ویقول ان رسول اللہ فی غشیۃ لو قد قام قتل وقطع وعمرو ابن زائدہ فی موخر المسجد یقرء وما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل۔

حضرت عمر کھڑے ہو کر خطبہ دینے لگے اور پیغمبر کی وفات کے بارے میں لب کشائی کرنے والوں کو قتل اور ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کی دھمکیاں دینے لگے اور کہنے لگے کہ رسول اللہ بے ہوشی میں پڑے ہیں اگر اٹھ کھڑے ہوئے تو قتل کریں گے اور ہاتھ پیر کاٹیں گے اور عمرو ابن زائدہ مسجد کے پچھلے حصے میں یہ آیت پڑھ رہے تھے۔ "محمد اللہ کے رسول ہی تو ہیں ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں "۔

(البدایہ والنہایہ۔ ج ۵۔ ص ۲۴۲)۔

حضرت عمر کی اس آواز کا یہ قہری اثر ہونا ہی تھا کہ لوگوں کے خیالات پراگندہ ہو جائیں ذہنوں کے رُخ مڑ جائیں اور موضوعِ سخن بدل جائے۔ چنانچہ افسردہ و سوگوار مجمع حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگا اور اس غم آلودہ فضا میں یہ کھسر پھسر شروع ہو گئی کہ کیا پیغمبر واقعاً رحلت فرما گئے ہیں یا زندہ ہیں۔ اگرچہ سننے والوں کا ذہن اس اپج کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھا اور نہ تسلیم کرنے کی کوی وجہ تھی مگر دبی زبان میں اظہارِ خیال کے علاوہ کسی کو یہ جرأت نہ ہوی کہ وہ یہ کہے کہ اندر چل کر آنحضرت کی میّت دیکھ کر اطمینان کر لیا جائے کیونکہ زندگی کو اپنا وجود ثابت کرنے میں کسی مشکل کا سامنا کرنا نہیں پڑتا اور نہ موت کو اپنا ثبوت مہیا کرنے میں کوی دشواری پیش آتی ہے۔ سب چپ سادھے ہوئے ہیں اور حضرت عمر کو تلوار گھماتے دیکھ کر نہ

خلاف کہتے بنتی ہے اور نہ ہاں میں ہاں ملائی جاسکتی ہے اس لئے کہ حضرت عمر کبھی یہ کہتے کہ پیغمبر بیہوشی میں پڑے ہیں کبھی یہ کہتے کہ آسمان پر اُٹھ گئے ہیں اور کبھی یہ کہتے کہ وُہ موسیٰ ابن عمران کی طرح غیبت اختیار کر چکے ہیں اب کس بات کو صحیح کہا جائے اور کس کو غلط۔ اگر اسے بیہوشی کہا جائے تو بیہوشی اور موت میں واضح فرق ہے۔ بیہوشی میں سانس کی آمد و شد قائم رہتی ہے اگرچہ حس و حرکت نہیں رہتی اور موت میں حس و حرکت بھی جاتی رہتی ہے اور سانس کی آمد و شد کا سلسلہ بھی قطع ہو جاتا ہے۔ لہٰذا وہ اس واضح علامت سے دوسروں کو بھی بڑی آسانی سے بے ہوشی کا قائل کر سکتے تھے تلوار لے کر ڈرانے دھمکانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اور اگر آسمان پہ اُٹھ جانے والی بات کو صحیح سمجھا جائے تو یہ سمجھ میں آنے والی بات ہی نہیں ہے اس لئے کہ یہ ارتفاع صرف روح کا تھا یا اس میں جسم بھی شریک تھا۔ اگر صرف رُوح نے آسمان کی طرف پرواز کی تھی تو ظاہر ہے کہ اسی کا نام موت ہے اور اگر جسم بھی ساتھ تھا تو یہ مشاہدہ کے خلاف تھا کیونکہ جسد اطہر اپنے مقام پر موجود تھا۔ اور اگر یہ غیبت تھی تو کیسی غیبت تھی اور کیوں تھی کیا پیغمبر نے اپنی زندگی میں کبھی اس کا ذکر کیا یا اس کی طرف کوئی اشارہ فرمایا تھا اور پھر اس میں اور حضرت موسیٰ کی غیبت میں کیا مماثلت پائی جاتی تھی۔ حضرت موسیٰ تو جیتے جی جسم و روح کے ساتھ چالیس راتوں کے لئے طور پر گئے تھے اور تورات لے کر پلٹ آئے تھے اور یہاں پیغمبر اکرم کا جنازہ آنکھوں کے سامنے بے حس و حرکت موجود تھا۔ نہ کہیں نقل مکانی ہوئی اور نہ ان کا جسد اطہر نظروں سے اوجھل ہوا پھر وُہ کون سی چیز غائب ہُوئی تھی جس کے متعلق یہ کہا گیا کہ وُہ پلٹ آئے گی اور پھر اس غیبت کو حضرت موسیٰ کی غیبت سے تشبیہ دینے کا تقاضا تو یہ تھا کہ جس طرح حضرت موسیٰ غیبت کے دنوں میں اپنے بھائی ہارون کو اپنا نائب و جانشین بنا کر چھوڑ گئے تھے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:۔

وقال موسیٰ لاخیہ ھارون	موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا کہ تم میری قوم
اخلفنی فی قومی واصلح	میں میرے خلیفہ و جانشین رہو اور (لوگوں کی)
ولا تتبع سبیل المفسدین	اصلاح کرنا اور فساد کرنے والوں کی راہ پر نہ چلنا"

اسی طرح پیغمبر بھی کسی کو اپنا جانشین بنا کر اُمت میں چھوڑ جاتے اور پھر اُن کے مقرر کردہ نائب کی نشاندہی کی جاتی مگر ادھر ذہن کا رُخ نہیں مُڑتا یا مصلحتہً اس کا ذکر زبان پر نہیں آتا۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی اُلجھی ہوئی اور دریافت طلب ہے کہ وُہ منافق کون کون تھے جنہوں نے پیغمبر کی مُوت کی خبر اُڑائی تھی جبکہ یہ خبر پیغمبر کے گھر کے اندر سے آئی تھی جہاں ازواج پیغمبر جناب فاطمہ زہرا حضرت علی حضرت حسن حضرت حسین، عباس، عبداللہ ابن عباس فضل ابن عباس عبداللہ ابن جعفر اور دُوسرے بنی ہاشم موجود تھے کیا یہ افراد بھی منافقین میں شامل تھے اور پیغمبر پلٹ کر انہی کے ہاتھ پیر کاٹیں گے۔

پیغمبر اکرم کی موت کے بارے میں الجھاؤ تو پیدا ہو ہی چکا تھا اور خدا جانے کب تک یہ الجھاؤ باقی رہتا کہ حضرت ابوبکر جو مدینہ کے باہر مقام سنح میں رہتے تھے آنحضرت کی خبر وفات سُن کر مدینہ میں آئے اور

حضرت عمر کو وفات پیغمبر کی تردید کرتے سُنا تو اندر جا کر نعش اقدس کے چہرے پر سے چادر سرکا کر دیکھا اور باہر نکل کر حضرت عمر سے کچھ دیر بات چیت کی اور پھر لوگوں کو مخاطب کر کے کہا:-

من کان یعبد اللہ فان اللہ حی لایموت ومن کان یعبد محمدا فان محمدا قد مات ثم قرأ وما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل افان مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم ومن ینقلب علی عقبیہ فلن یضر اللہ شیئا وسیجزی اللہ الشاکرین	جو شخص اللہ کا پرستار ہے اُسے معلوم ہونا چاہیئے کہ اللہ زندہ ہے جسے موت نہیں ہے اور جو محمدؐ کی پرستش کرتا تھا اُسے معلوم ہونا چاہیئے کہ محمد وفات پا گئے (پھر یہ آیت پڑھی) محمد اللہ کے رسول ہی تو ہیں ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں اگر وُہ اپنی موت مر جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو تم اُلٹے پیروں کفر کی طرف پلٹ جاؤ گے اور جو اُلٹے پاؤں پلٹ جائے گا تو وُہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اور خدا جلد ہی شکر گزاروں کو بدلہ دے گا۔"

(تاریخ طبری۔ ج۳۔ ص۲۴۴)

حضرت عمر نے حضرت ابوبکر کی زبان سے یہ آیت سُنی تو حیرت و استعجاب کا اظہار کرتے ہوُئے کہا:-

او انہا فی کتاب اللہ ماشعرت انہا فی کتاب اللہ ثم قال یاایہا الناس ہذا ابوبکر ذو اسبقیۃ فی المسلمین فبایعوہ فبایعوہ	کیا یہ آیت قرآن مجید میں ہے؟ مجھے تو یہ علم ہی نہ تھا کہ یہ قرآن کی آیت ہے (پھر کہا) اے لوگو یہ ابوبکر ہیں جنہیں مسلمانوں میں سبقت حاصل ہے۔ ان کی بیعت کرو! ان کی بیعت کرو۔"

(البدایہ والنہایہ۔ ج۵۔ ص۲۴۲)

حضرت عمر جو ابھی ابھی پیغمبر کے زندہ ہونے پر زور دے رہے تھے اس آیت کو سُن کر فوراً آنحضرت کی وفات کا اعتراف کر لیتے ہیں۔ اس فوری تبدیلی کو دیکھتے ہوُئے یہ شک تو گزرتا ہی ہے کہ حضرت عمر واقعتاً یہ عقیدہ رکھتے بھی تھے یا نہیں کہ پیغمبر زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔ اگر یہ عقیدہ رکھتے تھے تو شروع ہی سے یہ سمجھتے آرہے تھے یا خبر وفات سُن کر انہوں نے یہ نظریہ قائم کیا تھا کہ پیغمبر مر نہیں سکتے اگر پہلے ہی سے یہ سمجھتے تھے تو آنحضرت کے قلم و کاغذ طلب کرنے پر یہ کہنے کے بجائے کہ آنحضرت پر درد کا غلبہ ہے یا ہذیانی کیفیت طاری ہے یہ کہنا چاہیئے تھا کہ وصیت کی ضرورت تو اُسے ہوتی ہے جس کا رشتۂ حیات ٹوٹ جانے والا ہو اور جو مرنے والا ہی نہ ہو اسے اپنے بعد کے لئے وصیت کی احتیاج ہی کیا ہے۔ لہٰذا یہ وصیت کیوں اور یہ تحریر کس لئے؟ اور اگر خبر مرگ سُن کر انہوں نے یہ رائے قائم کی تھی تو کون سا ایسا واقعہ رونما ہوُا جس سے اُن کے خیالات نے پلٹا کھایا یا کون سی ایسی دلیل اُن کے ہاتھ لگی کہ ایک دم اُن کا نظریہ بدل

گیا اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ آنحضرت کی موت واقع نہیں ہوی بلکہ یہ چند روزہ غیبت ہے۔ حضرت عمر نے اپنے موقف کی تشریح کرتے ہوئے ایک موقع پر کہا ہے:-

واللہ ان حملنی علیٰ ذلک الا انی اقرء ھذہ الآیۃ "وکذلک جعلنا کم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا فواللہ انی کنت لاظن ان رسول اللہ سیبقی فی امتہ حتی یشھد علیھا باخرا عمالھا۔ (تاریخ طبری ج ۲ ص ۴۵۱)

خدا کی قسم مجھے اس بات کے کہنے پر اس آیت نے آمادہ کیا تھا: "اسی طرح ہم نے تمہیں درمیانی امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ رہو اور رسول تم پر گواہ رہے"۔ خدا کی قسم مجھے یہ گمان غالب ہوا کہ رسول اپنی امت میں باقی رہیں گے۔ یہاں تک کہ امت کے ایک ایک عمل کی گواہی دیں۔"

اس سے یہ معلوم ہوا کہ آیت کے اندر لفظ شہید دیکھ کر انہیں یہ گمان ہوا کہ پیغمبر چونکہ امت کے اعمال کے نگران و شاہد ہیں لہذا وہ ہمیشہ دنیا میں باقی رہیں گے لیکن یہ بقول ان کے گمان ہی تو تھا جسے یقینی شواہد کے مقابلہ میں پادر ہوا ہو جانا چاہئے تھا جب وہ پیغمبر کو موت و حیات کی کشمکش میں دیکھ چکے تھے اور اب یہ بھی دیکھ لیا کہ آنحضرت میں آثار حیات ناپید ہیں گھر سے رونے دھونے کی آوازیں آرہی ہیں اور ہر شخص کی زبان پر آپ کی موت کا تذکرہ ہے تو انہیں یہ سمجھ لینا چاہئے تھا کہ شہید کا مفہوم وہ نہیں ہے جو انہوں نے سمجھا ہے مگر ہوتا یہ ہے کہ وہ مشاہدہ و قطعی ثبوت کے مقابلہ میں اپنے گمان کو ترجیح دیتے ہیں اور بار بار قسم کھا کر آنحضرت کی زندگی کا یقین دلانے اور اپنی بات کے منوانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انسان کی ذاتی رائے کچھ بھی ہو اس پر پہرا نہیں بٹھایا جا سکتا مگر دوسروں کو اپنی رائے کا پابند بنانے کا بھی کوی جواز نہیں ہے۔ اگر انہوں نے لفظ شہید کا یہ مفہوم پیدا کیا اور کوی دوسرا اس کا یہ مفہوم قرار نہ دے اور آیۂ انک میت وانھم میتون (اے رسول تم بھی مرنے والے ہو اور یہ لوگ بھی مرنے والے ہیں) کے تحت آنحضرت کو میت قرار دے تو کس جرم کی پاداش میں قتل یا ہاتھ پاؤں کے کاٹے جانے کی سزا کا مستحق قرار پائے۔ کیا کسی آئین میں میّت کو میّت کہنا جرم ہے اور پھر انہی سے اگر کوی یہ پوچھ لیتا کہ اگر لفظ شہید سے آنحضرت کی زندگی پر استدلال صحیح ہے تو پھر درمیانی امت کو بھی ایسی ہی زندگی کا حامل سمجھنا چاہئے کیونکہ اسے بھی شھداء علی الناس قرار دیا گیا ہے تو اس کا کیا جواب ہوگا۔ اس انکار کی بعض لوگوں نے یہ بھی توجیہ کی ہے کہ حضرت عمر وفات رسول کے سانحہ سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ شدت غم سے اوسان کھو بیٹھے اور ذہنی پراگندگی کے زیر اثر یہ کہنے لگ گئے کہ رسول زندہ ہیں مرے نہیں ہیں۔ یہ بات بھی کوی وزنی نہیں معلوم ہوتی اس لئے کہ اگر یہ انکار حواس کے متاثر ہونے کی بنا پر ہوتا تو وہ یہ کہنے کے بجائے کہ مجھے لفظ شہید سے پیغمبر کے زندہ ہونے کا

گمان ہُوا تھا یہ معذرت کرتے کہ میں نے وفاتِ رسول کے موقع پر جو کہا تھا وُہ اختلال حواس کا نتیجہ تھا اور پھر اس انکار کے علاوہ ان سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہیں ہوتی جس سے یہ ظاہر ہو کہ واقعاً ان کے ہوش و حواس پر اثر تھا۔ اور ان کی افتادِ طبیعت کو دیکھتے ہُوئے کون باور کرے گا کہ جو اثر کسی پر نہ ہوا ہو وُہ ان پر ہُوا ہو گا اگر واقعاً ان کے حواس معطل ہو گئے تھے تو حضرت ابو بکر کے آیۂ وما محمد الا رسول پڑھتے ہی ایک دم حواس بجا کیسے ہو گئے۔ اگر یہ اس آیت کا معجزانہ اثر تھا تو حضرت ابو بکر کی آمد سے پہلے عمرو ابن قیس مسجد میں یہی آیت تو پڑھ رہے تھے مگر اس وقت نہ اس کے آیۂ قرآنی ہونے کی طرف التفات ہوتا ہے اور نہ اس کا کوئی اثر ہی ظاہر ہوتا ہے اور وُہ برابر مسجد کے دروازے پر کھڑے ہو کر یہی کہتے رہے کہ پیغمبر زندہ ہیں اور وُہ ہرگز نہیں مریں گے۔ تعجّب کی بات تو یہ ہے کہ جب پیغمبر کی نزعی کیفیت اور وُہ آثار جو موت کا یقین دلانے کے لئے بہت کافی تھے انہیں مَوت کا یقین نہ دلا سکے تو اس آیت میں کون سی ایسی بات تھی جو مُوت کو یقینی طور پر ثابت کر رہی تھی جس سے انہیں فوراً موت کا یقین ہو گیا۔

اس آیت کا ایک ٹکڑا تو یہ ہے کہ "محمد اللہ کے رسول ہی تو ہیں اور ان سے پہلے بھی رسُول گزر چکے ہیں" اس کا واضح مفہوم یہ ہے کہ دُوسرے رسولوں کی طرح پیغمبر بھی ایک نہ ایک دن دُنیا سے اُٹھ جائیں گے اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ موت واقع ہو چکی ہے اگر اس سے مَوت کا ثبوت مہیّا ہُوا تھا تو پھر جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تھی اس وقت یہ کیوں نہ سمجھ لیا گیا کہ پیغمبر رحلت فرما چکے ہیں حضرت عمر کو تو اپنے یقین کی بنا پر جو انہیں پیغمبر کے زندہ ہونے کے بارے میں تھا یہ کہنا چاہئے تھا کہ یہ آیت تو اپنے مقام پر درُست ہے اور مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ پیغمبر ایک نہ ایک دن رحلت فرما جائیں گے لیکن ابھی تو وُہ زندہ ہیں اور جب تک نگرانیٔ اعمال کا فریضہ انجام نہیں دے لیں گے وفات نہیں پائیں گے۔ اور آیت کا دوسرا ٹکڑا یہ ہے کہ "اگر پیغمبر مر جائیں یا قتل کر دیئے جائیں" اس سے بھی مَوت کے واقع ہونے پر ثبوت مہیّا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ آیت میں موت یا قتل کا ذکر بطور شرط ہُوا ہے اور شرط کے لئے وقوع ضروری نہیں ہے جیسے یہ کہا جائے کہ اگر مینہ برسے تو کھیتیاں ہری ہو جائیں گی اس سے یہ کون سمجھ سکتا ہے کہ بارش ہو چکی ہے۔ اسی طرح آیت سے یہ نتیجہ کہاں نکلتا ہے کہ موت واقع ہو چکی ہے۔ پھر خدا جانے کس بنا پر اس آیت کے سُنتے ہی ان کے یقین کا تار پود بکھر جاتا ہے اور فوراً آنحضرت کی موت کا اعتراف کر لیتے ہیں۔

اس انکار اور انکار پر زور اور پھر فوری اعتراف کو دیکھ کر ہر غیر جانبدار یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ یہ انکار کسی مصلحت کے پیش نظر رہا ہو گا ورنہ جس پر خبر مرگ اس حد تک اثر انداز ہو کہ وُہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے وُہ اس قابل کب رہتا ہے کہ میت ابھی رکھی ہو اور وہ غسل و کفن اور دوسرے امور سے بے نیاز ہو کر حکومت کی فکر و تدبیر کرنے لگے اور صف ماتم سے اٹھ کر سقیفہ بنی ساعدہ میں چلا جائے اور انصار سے بحث و مباحثہ اور دھینگا مشتی کر کے اپنے حق کی فوقیت ثابت کرے اور یہ بھول جائے کہ پیغمبر کی میت ابھی غسل و کفن کے

مرحلہ سے نہیں گزری۔ جسے پیغمبر کی تجہیز و تکفین کی اتنی فکر نہ ہو جتنی کہ حکومت و اقتدار کی اس کے بارے میں یہ کیونکر تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ خبر مرگ سُن کر حواس کھو بیٹھا ہو گا اور بے اوسان ہو کر پیغمبر کی موت سے انکار کر دیا ہو گا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمر اتنے بے خبر نہ تھے کہ انہیں پیغمبر کی موت کا یقین نہ ہوتا یا اُن کے حواس اتنا متاثر ہوتے کہ وہ واقعہ و مشاہدہ کے خلاف کچھ کا کچھ کہنے لگتے بلکہ یہ انکار وقتی و ہنگامی اور بعض اہم سیاسی مصالح کی بناء پر تھا۔

اس سیاسی مصلحت کو سمجھنے کے لئے چند واقعات اور ان کے پس منظر پر ایک سرسری نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ حضرت علی دعوتِ اسلام کے دورِ آغاز سے لے کر زمانۂ اختتام تک اسلام کی خدمت و نصرت پر کمربستہ رہے اور پیغمبر انہی کے ذریعہ اسلام اور اسلامی تعلیمات کی حفاظت کا سامان کرنا چاہتے تھے جس کا اعلان دعوت عشیرہ سے لے کر حجۃ الوداع تک اور حجۃ الوداع سے لے کر زندگی کی آخری سانس تک مختلف طریقوں سے کرتے رہے اسی بناء پر صحابہ کرام کیا مہاجر اور کیا انصار کسی کو اس میں ذرا شبہ نہ تھا کہ علی ہی مسند خلافت پر متمکن ہوں گے۔ ابن ابی الحدید تحریر کرتے ہیں:۔

وکان عامۃ المھاجرین وجل الانصار لایشکون ان علیاً ھو صاحب الامر بعد رسول اللّٰہ صلے اللّٰہ علیہ والہ وسلم۔	مہاجرین اور انصار کی اکثریت کو اس میں کوئی شک و شبہ نہ تھا کہ پیغمبر کے بعد علی ولیِ امر ہوں گے۔"

(شرح ابن ابی الحدید۔ ج۔ ص۔)۔

اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ ایک گروہ نبوت و خلافت کو ایک ہی گھر میں دیکھنا پسند نہ کرتا تھا اس ناپسندیدگی کی وجہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ لوگ خود اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے چنانچہ انہوں نے پیغمبر کی زندگی ہی میں اقتدار کی راہ ہموار کرنا شروع کر دی اور ہر اس کارروائی کے آگے دیوار کھڑی کرنے کی کوشش کی جو اُن کے مقاصد کی تکمیل میں حائل ہو سکتی تھی۔ پیغمبر اکرم بستر مرگ پر قلم و دوات طلب کرتے ہیں مگر ہنگامہ کھڑا کر کے انہیں وصیت نامہ لکھنے نہیں دیا جاتا تاکہ علی کی نیابت کے متعلق تحریری دستاویز نہ چھوڑ جائیں۔ پھر انہی ایام میں ایک ایک کو حکم دیتے ہیں کہ وہ لشکر اُسامہ میں شریک ہو کر یہاں سے چلے جائیں مگر اُسے عملاً مسترد کر دیا جاتا ہے تاکہ ان کی عدم موجودگی کی وجہ سے خلافت کسی اور طرف منتقل نہ ہو جائے۔ اور جب پیغمبر دُنیا سے رحلت فرما جاتے ہیں تو اس خطرہ کا انسداد ضروری تھا کہ کہیں اندر ہی اندر علی کی بیعت کی تکمیل نہ ہو جائے اور ایسا ہو بھی جاتا اگر امیر المومنین یہ گوارا کر لیتے کہ پیغمبر کے غسل و کفن سے پہلے بیعت ہو جائے مگر ان کی حمیت آڑے آئی اور انہوں نے اسے گوارا نہ کیا۔ چنانچہ بلاذری نے تحریر کیا ہے:۔

لما قبض رسول الله اخرج حتی ابایعك علی اعین الناس لئلا یختلف علیك اثنان فابی وقال اومنهم من ینکر بحقنا ویستبد علینا فقال العباس ستری ان ذلك سیکون ۔

(انساب الاشراف ۔ ج۱ ۔ ص۵۸۳)

جب رسُول خدا رحلت فرما گئے تو عباس نے کہا کہ اے علی باہر نکلئے میں لوگوں کے روبرو آپ کی بیعت کروں تاکہ آپ کے بارے میں کوئی اختلاف نہ کرے ۔ مگر علی نے انکار کیا اور کہا کہ کون ہمارے حق سے انکار کر سکتا ہے اور کون ہم پر مسلط ہو سکتا ہے ۔ عباس نے کہا کہ پھر دیکھ لیجئے گا کہ ایسا ہو کر رہے گا ۔"

حضرت عمر جو اس گروہ کی ایک فرد تھے جو نبوّت و خلافت کو ایک گھر میں دیکھنا نہ چاہتا تھا انہیں یہ اندیشہ ہُوا کہ بیعت کی یہ تحریک کہیں عملی صورت نہ اختیار کر لے اس لئے وُہ اس تحریک کو اُبھرنے سے پہلے دبا دینا چاہتے تھے اس وقت کوئی اور تدبیر نہ سُوجھی تو پیغمبر کے زندہ ہونے کا شاخسانہ کھڑا کر دیا تاکہ کسی کی بیعت کا سوال ہی پیدا نہ ہو ۔ چنانچہ یہ تدبیر ایک حد تک کامیاب ثابت ہوئی اور لوگوں میں آنحضرت کی موت و حیات کا مسئلہ چھڑ گیا اور حضرت ابو بکر کے آنے تک اسی بحث میں اُلجھے رہے اور اُن کے آتے ہی وُہ تمام شور و ہنگامہ جو آنحضرت کو زندہ ثابت کرنے کے لئے تھا یکدم ختم ہو گیا اور انہوں نے ایسا افسوں پھُونکا کہ حضرت عمر نے فوراً اپنا موقف بدل لیا اور آنحضرت کی موت کے اعتراف کے ساتھ حضرت ابو بکر کی بیعت کا بھی مطالبہ شروع کر دیا ۔ یہ مطالبہ انہی تصوّرات کا ردِ عمل تھا جو خلافت کے سلسلہ میں ان کے ذہن میں نشوونما پا رہے تھے اور اُس قرارداد کے ماتحت تھا جو پہلے سے آپس میں طے شدہ تھی ورنہ جب دعوی یہ ہے کہ خلافت جمہور کی صوابدید اور اس کی رائے سے وابستہ ہے تو بیعت کے مطالبہ کا جواز ہی کیا تھا جبکہ نہ ابھی انتخاب عمل میں آیا تھا اور نہ رائے عامہ معلوم کی جا سکی تھی ۔ غرض اس مطالبۂ بیعت کے بعد یہ حقیقت چھپ نہیں سکتی کہ وفات رسول سے انکار نہ حواس کی پراگندگی کی بنا پر تھا اور نہ آیت قرآنی سے بے خبری و ناواقفیت کی وجہ سے بلکہ سیاسی ضرورت کے پیش نظر تھا تاکہ خلافت رسُول کے سلسلہ میں کوئی آواز بلند ہو تو اُسے دبایا جا سکے اور پھر جمہور کی آڑ میں اپنی مرضی کی حکومت قائم کی جائے ۔ چنانچہ واقعات سقیفہ بنی ساعدہ اس کے شاہد ہیں کہ انہوں نے پیغمبر کے دفن و کفن پر حکومت کی تشکیل کو مقدم سمجھا اور انصار کو سیاسی شکست دے کر حکومت قائم کر لی ۔ یہ کامیابی جمہور کی موافقت کی مرہونِ منت نہ تھی بلکہ ان کی سیاسی بصیرت اور موقع شناسی کی احسانمند تھی ۔

واقعات سقیفہ پر ایک نظر

پیغمبر اکرم کی وفات کے بارے میں جو اختلاف رونما ہُوا تھا ختم ہو گیا اور اسے ختم ہونا ہی چاہئے تھا

اس لئے کہ وُہ صرف دفع الوقتی کے لئے تھا۔ جب تک اس کی ضرورت رہی اسے باقی رکھا گیا اور جب اس کی ضرورت نہ رہی اسے ختم کر دیا گیا۔ مگر اس اختلاف نے انصار کے ذہنوں میں ہلچل ڈال دی اور انہیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ تحریر وصیت پر ہنگامہ جیش اسامہ سے تخلف اور موت ایسی واضح حقیقت سے انکار کیا ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں تو نہیں ہیں۔ یہ مسئلہ اتنا پیچیدہ نہ تھا کہ انہیں کسی نتیجہ پر پہنچنے میں دشواری ہوتی انہوں نے بڑی آسانی سے بھانپ لیا کہ یہ ساری تدبیریں خلافت کو اس کے مرکز سے ہٹا کر دوسری طرف منتقل کرنے کے لئے کی جا رہی ہیں۔ انہوں نے حالات کی تبدیلی اور موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے فوراً سقیفہ بنی ساعدہ میں ایک اجتماع کیا تاکہ انصار میں سے کسی ایک کے ہاتھ پر بیعت کر کے مہاجرین کے منصوبے کو ناکام بنا دیں۔ اگر انصار کو یہ یقین ہوتا کہ مہاجرین حضرت علی کے برسر اقتدار آنے میں مزاحم نہیں ہوں گے تو وُہ نہ یہ بزم مشاورت قائم کرتے اور نہ اس سلسلہ میں جلد بازی سے کام لیتے ان کے قلب و ضمیر کی آواز وہی تھی جو سقیفہ میں بیعت کے ہنگامہ کے موقع پر بلند ہوئی کہ لا نبایع الا علیاً" ہم علی کے علاوہ کسی کی بیعت نہیں کریں گے"۔

اس اجتماع میں انصار کے دونوں قبیلے اوس اور خزرج رقیبانہ چشمک کے باوجود شریک ہوئے اس لئے کہ اوس ہوں یا خزرج دونوں کو مہاجرین کے ایک طبقہ کی بالادستی گوارا نہ تھی اور نہ ان کے اقتدار کو اپنے حقوق کے تحفظ کی ضمانت سمجھتے تھے البتہ خزرج اس اجتماع کے انتظام و اہتمام میں پیش پیش تھے اور انہی میں کی ایک ممتاز شخصیت سعد ابن عبادہ میر مجلس تھے جو ناسازئ طبع کی وجہ سے ردا اوڑھے مسند پر بیٹھے تھے انہوں نے اپنی تقریر سے کاروائی کا آغاز کیا مگر ضعف و نقاہت کی وجہ سے آہستہ بول رہے تھے اور ان کے فرزند قیس بلند آواز سے ان کی تقریر دہراتے جاتے تھے تاکہ تمام حاضرین کے کانوں تک پہنچ جائے۔ انہوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا "اے گروہ انصار تمہیں دین میں جو سبقت و فضیلت حاصل ہے وُہ عرب میں کسی کو حاصل نہیں ہے پیغمبر اکرم دس برس تک اپنی قوم کو خدا پرستی کی دعوت دیتے رہے مگر گنتی کے چند آدمیوں کے علاوہ کوئی اُن پر ایمان نہ لایا اور چند آدمیوں کے بس کی یہ بات نہ تھی کہ وُہ آنحضرتؐ کی حفاظت کا ذمہ لے سکتے اور دین کی تقویت کا سامان کرتے اللہ نے تمہیں یہ توفیق بخشی کہ تم ایمان لائے اور پیغمبر اور اُن کے ساتھیوں کے سینہ سپر بن کر کھڑے ہو گئے۔ میدان کارزار میں اُترے اور دُشمنان دین سے لڑے۔ تمہاری ہی تلواروں سے عرب کے سرکشوں کے سر خم ہوئے اور تمہارے ہی زور بازو سے اسلام کو اوج و عروج حاصل ہوا۔ پیغمبر دُنیا سے رخصت ہو چکے ہیں اور وُہ آخر دم تک تم سے راضی و خوشنود رہے۔ ان خدمات کے پیش نظر تمہارے علاوہ منصب خلافت کا کون سزاوار ہو سکتا ہے لہٰذا اُٹھو اور خلافت پر اپنی گرفت مضبوط کر لو"۔ سب نے اس کی تائید کی اور کہا کہ ہم آپ ہی کو منصب خلافت پر فائز دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر یہ معاملہ تنہا انصار

کا ہوتا تو بیعت کی تکمیل کے بعد اس کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ مگر یہ خدشہ بھی ساتھ لگا ہوا تھا کہ اگر مہاجرین نے مخالفت کی تو یہ بیل کس طرح منڈھے چڑھے گی۔ چنانچہ سعد ابن عبادہ کی تقریر کے بعد اس ذہنی خلش کے نتیجہ میں یہ سوال اُٹھ کھڑا ہوا کہ اگر مہاجرین نے ان سے اتفاق نہ کیا تو اس معاملہ کو کس طرح سلجھایا جا سکے گا اور کون سی متبادل صورت اختیار کی جائے گی۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ اگر وہ نہ مانیں گے تو ہم یہ مطالبہ کریں گے کہ ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک اُن میں سے ہو۔ اس پر سعد نے کہا کہ یہ پہلی کمزوری ہے اور یہ واقعہ ہے کہ اگر ان کے عزم و ارادہ میں پختگی ہوتی تو وہ یہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ اقتدار آدھوں آدھ تقسیم کیا جا سکتا ہے بلکہ وہ فوراً اپنے ارادہ کو عملی جامہ پہناتے اور مہاجرین کی مزاحمت سے پہلے بیعت کر چکے ہوتے مگر انہوں نے احساسِ کمتری میں مبتلا ہو کر خود ہی موقع ہاتھ سے کھو دیا۔

اس اجتماع میں اگرچہ اوس بھی شریک تھے مگر ان کی شرکت اس غرض سے تھی کہ دوسروں کو یہ تاثر نہ دیں کہ انصار میں باہمی اتحاد و یکجہتی نہیں ہے ورنہ دل سے انہیں خزرج کا اقتدار گوارا نہ تھا اور نہ گوارا ہونے کی کوئی وجہ تھی اس لئے کہ یہ دونوں حریف و متحارب خاندان تھے اور اسلام لانے سے تھوڑا عرصہ پہلے ان میں ایک خونریز جنگ بھی ہو چکی تھی جو جنگ بعاث کے نام سے موسوم ہے۔ اگرچہ اسلام نے ان دونوں میں صلح و آشتی کی فضا پیدا کر دی تھی اور بڑی حد تک ان کی باہمی کدورتوں کو ختم کر دیا تھا مگر اسے انسانی کمزوری کہئے یا انسانی طبیعت کا خاصہ کہ وہ ایک دوسرے کو حریف و مدمقابل ہی کی نظروں سے دیکھتے رہے اور ایک کا امتیاز دوسرے کو کھٹکے بغیر نہ رہتا چنانچہ اس موقع پر بھی اوس کے دو آدمیوں نے مخبری کی اور حضرت عمر کو خفیہ طور پر اس اجتماع کی اطلاع دے دی جس پر حضرت عمر بہت سٹپٹائے اور اپنے دو ایک ہمنواؤں کے ساتھ اس اجتماع کو درہم و برہم کرنے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ ابن اثیر تحریر کرتے ہیں:۔

سمع عمر الخبر فاتی منزل النبی و ابو بکر فیه فارسل الیه ان اخرج الی فارسل الیه انی مشتغل فقال عمر قد حدث الامر لابد لك من حضوره فخرج الیه فاعلمه الخبر فمضیا مسرعین نحوهم و معهم ابو عبیدة۔	حضرت عمر نے یہ خبر سُنی تو حجرۂ نبوی پر آئے جہاں حضرت ابو بکر اندر موجود تھے حضرت عمر نے انہیں کہلوا بھیجا کہ ذرا باہر آئیے انہوں نے کہا کہ میں مصروف ہوں۔ کہا کہ ایک حادثہ ہو گیا ہے تمہارا آنا ضروری ہے۔ چنانچہ حضرت ابو بکر باہر نکلے اور انہیں اس واقعہ کی اطلاع دی اور وہ دونوں ابو عبیدہ کو ساتھ لے کر انصار کی طرف تیزی سے چل دیئے۔"

(تاریخ کامل۔ ج ۲۔ ص ۲۲۲)

حضرت عمر نے انصار کے اجتماع پر مطلع ہونے کے بعد صرف حضرت ابوبکر کو آگاہ کرنا ضروری سمجھا حالانکہ یہ کوئی شخصی و انفرادی معاملہ نہ تھا بلکہ ملک و ملت کے مجموعی مصالح سے متعلق تھا۔ اگر انصار کے اجتماع سے اُمّت مسلمہ کو کسی ضرر کے پہنچنے کا اندیشہ تھا تو دُوسرے سربرآوردہ افراد کو بھی اس کی خبر دینا چاہئے تھی۔ کیا عم رسول عباس، ابن عم رسول علی، زبیر ابن عوام اور دُوسرے بنی ہاشم و اکابر قریش میں سے کوئی اس قابل نہ تھا کہ انہیں صورت حال پر مطلع کر کے مشورہ لیا جاتا اور پھر جماعتی طور پر اس فتنہ کے انسداد کی تدبیر کی جاتی۔ اور حضرت عمر کسی قاصد کے ذریعہ پیغام بھیجنے کے بجائے خود اندر چلے جاتے اور ان تمام افراد کو جو غسل و کفن کا سامان کر رہے تھے انصار کے اجتماع اور ان کے عزائم سے آگاہ کرتے۔ مگر انہوں نے اسی میں مصلحت سمجھی کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے۔ اگر وُہ خود اندر چلے جاتے حضرت ابوبکر سے چپکے چپکے باتیں کرتے اور پھر انہیں ساتھ لے کر وہاں سے چل دیتے تو اندیشہ تھا کہ کوئی کھٹک جاتا اور ٹوہ لگانے کے لئے پیچھے لگ جاتا اور یہ بات صیغۂ راز میں نہ رہتی اور وُہ مقصد فوت ہو جاتا جو اُسے پردۂ راز میں رکھنے میں اُن کے پیش نظر تھا۔

جب یہ تینوں آدمی ہانپتے کانپتے سقیفہ بنی ساعدہ میں اچانک وارد ہُوئے تو انصار ششدر ہو کر رہ گئے۔ انہیں راز کے افشا ہو جانے سے اپنی کامیابی مشکوک نظر آنے لگی اور اوس کو بھی موقع مل گیا کہ وُہ ان مہاجرین کا سہارا لے کر اپنے حریف قبیلہ کے منصوبے کو ناکام بنائیں۔ حضرت عمر نے آتے ہی مجمع پر ایک نظر ڈالی اور سعد ابن عبادہ کو چادر میں لپٹے ہُوئے دیکھ کر پُوچھا کہ یہ کون ہے انہیں بتایا گیا کہ یہ سعد ابنِ عبادہ ہیں جو صدرِ مجلس اور خلافت کے اُمیدوار ہیں۔ حضرت عمر نے تیوری پر بل ڈالا اور پھر اس مجمع سے مخاطب ہو کر کچھ کہنا چاہا مگر حضرت ابوبکر نے اس خیال سے کہ ان کی تیزیٔ طبع کام نہ بگاڑ دے انہیں روک دیا۔ حضرت عمر بغیر کسی حیل و حجت کے یہ کہہ کر بیٹھ گئے کہ:۔

لا اعصی خلیفۃ النبی فی یوم مرتین۔ "میں ایک دن میں دو مرتبہ خلیفۂ رسُول کے حکم سے سرتابی نہیں کروں گا۔" (تاریخ طبری۔ ج۔ صـ۲۴۴)

حضرت ابوبکر خود اُٹھے اور تقریر کرتے ہُوئے کہا: "خداوند عالم نے پیغمبر کو اس وقت بھیجا جب ہر طرف بتوں کی پُوجا ہو رہی تھی آپ دُنیا کو بُت پرستی سے ہٹانے اور خدا پرستی کی راہ پر لگانے کے لئے اُٹھ کھڑے ہُوئے مگر اہل عرب نے اپنا آبائی دین و مذہب چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ خدا نے مہاجرین اولین کو جو رسُول اللہ کے ہم قوم و ہم قبیلہ ہیں ایمان و تصدیق رسالت کے لئے منتخب کیا۔ انہوں نے ایمان لانے کے بعد اپنے قبیلہ والوں کی ایذا رسانیوں پر صبر کیا۔ ان کے جھٹلانے کی پروا نہ کی اس وقت تو سب ہی لوگ مخالفت پر ایکا کئے ہُوئے تھے اور ہر طرح سے ڈراتے دھمکاتے تھے مگر تعداد میں کم ہونے کے باوجود ذرا ہراساں نہ ہُوئے انہوں نے روئے زمین پر پہلے پہل اللہ کی پرستش کی سب سے پہلے اللہ اور

اس کے رسُول پر ایمان لائے۔ یہ لوگ رسُول کے ولی و دوست اور اُن کے کنبہ کے افراد ہیں لہذا منصب خلافت کا ان سے بڑھ کر کوئی حقدار نہیں ہو سکتا جو اس معاملہ میں اُن سے جھگڑا کرے گا وُہ ظالم قرار پائے گا۔ اے گروہِ انصار تمہاری دینی فضیلت اور اسلامی سبقت بھی نا قابل انکار ہے اللہ نے تمہیں اسلام اور پیغمبر اسلام کا حامی و مددگار بنایا اور تمہارے شہر کو دار الہجرت قرار دیا۔ ہمارے نزدیک مہاجرین اوّلین کے بعد تمہارا مرتبہ سب سے بلند تر ہے لہٰذا ہم امیر ہوں گے اور تم وزیر ہو گے اور کوئی معاملہ تمہارے مشورہ کے بغیر طے نہیں پائے گا"۔

حضرت ابو بکر کا یہ خطبہ ان کی پیش بینی معاملہ فہمی اور سیاسی تدبر کا آئینہ دار ہے۔ یہ اُن کے تدبر ہی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے حضرت عمر کو افتتاحی تقریر سے منع کر دیا تاکہ ان کی زبان سے کوئی ایسا جملہ نہ نکل جائے جس سے انصار کے جذبات بھڑک اُٹھیں اور پھر انہیں اپنے ڈھرے پر لگانا مشکل ہو جائے۔ حضرت ابو بکر کی مصلحت اندیش نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ یہ محل سختی برتنے کا نہیں ہے بلکہ نرمی اور حکمت عملی سے کام نکالنے کا ہے چنانچہ انہوں نے اپنے تلے الفاظ سے انصار کو متاثر کر کے ان کا جوش کم کیا انہیں مہاجرین کا مشیر کار قرار دیا اور وزارت کی پیشکش سے ان کی دلجوئی کی۔ اس خطبہ کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ حضرت ابو بکر نے فریق مخالف ہوتے ہوئے اپنی ذات کو ایک فریق کی حیثیت سے پیش نہیں کیا بلکہ وہ انداز اختیار کیا جو ایک ثالث اور غیر جانبدار شخص کا ہوتا ہے اور ایک مبصّر کی طرح دونوں گروہوں کے مرتبہ و مقام کا جائزہ لیا تاکہ شعوری یا لاشعوری طور پر مہاجر و انصار کا سوال نہ پیدا ہو جائے۔ اگر مہاجر و انصار کا سوال اٹھ کھڑا ہوتا تو پھر کچھ نہ کہا جا سکتا تھا کہ حالات کیا رُخ اختیار کرتے۔ ممکن تھا کہ قومی و قبائلی عصبیت جو عرب کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی اُبھر آتی، ہر گروہ اقتدار پر چھا جانے کی کوشش کرتا، خانہ جنگی تک نوبت پہنچتی اور کامیابی مشکوک ہو کر رہ جاتی۔ اس سلسلہ میں مزید احتیاط یہ برتی کہ انصار کے مقابلہ میں عام مہاجرین کو لانے کے بجائے مہاجرین کے ایک خاص طبقہ کو جو اولین کہلاتا تھا پیش کیا تاکہ انصار کو یہ تاثر دیں کہ یہاں قومی و قبائلی تقابل نہیں ہے بلکہ بلحاظ فضیلت و اولیت شخصی جائزہ ہے اور پھر اس تاثر کو مستحکم تر کرنے کے لئے جہاں مہاجرین اولین کے اوصاف گنوائے وہاں انصار کے اوصاف گنوانے میں بھی فراخ حوصلگی سے کام لیا۔ یوں تو مہاجرین کے اور اوصاف بھی گنوائے جا سکتے تھے مگر استحقاق خلافت کے لئے صرف انہی اوصاف کا ذکر کیا جو نا قابل تردید تھے۔ انصار میں کون ایسا ہو گا جسے یہ اعتراف نہ ہو کہ مہاجرین اوّلین کا ایک گروہ انصار سے اسلام میں سابق ہے اور اُن کا قبیلہ بھی وہی ہے جو رسُول خدا کا قبیلہ ہے۔ اگر کسی اور فضیلت کا ذکر کرتے تو ممکن تھا کہ اس کی تردید میں آواز بلند ہوتی اور اس تردید کا اثر ان اوصاف پر بھی پڑتا اور اس کے نتیجہ میں استحقاق خلافت بھی متاثر ہوتا۔ البتہ اس سلسلہ میں یہ کہا جا سکتا تھا کہ مہاجرین کی سبقت بھی مسلم اور پیغمبر کا ہم قبیلہ ہونا بھی تسلیم مگر اس سے استحقاق خلافت

کا ثبوت کس دلیل شرعی کی رُو سے اور اگر یہ استحقاق خلافت کی دلیل ہے تو کیا علی مہاجرین اولین میں سابق اور قرابت کے لحاظ سے سب سے قریب تر نہیں ہیں پھر ان کے ہوتے ہوئے کسی اور کا استحقاق کیوں؟ اس اعتراض کو انصار کے حق وزارت کا اعلان کرکے دبا دیا گیا اس طرح کہ اگر انصار اس دلیل کو مسترد کرکے مہاجرین کے استحقاق خلافت پر معترض ہوتے تو اس دلیل کو بھی مسترد کرنا پڑتا جس سے ان کا استحقاق وزارت ثابت ہوتا تھا۔ اس وزارت کی پیشکش نے یہ خدشہ بھی ان کے دلوں سے دُور کر دیا کہ ان کے حقوق پر کوئی زد پڑے گی یا ان پر سختی و زیادتی ہوگی اس لئے کہ وزارت جو تکملۂ خلافت ہے ان کے حقوق کے تحفظ کی ضمانت ہے۔ یہ دُوسری بات ہے کہ وزارت کا عہدہ نہ حضرت ابوبکر کے عہد میں قائم ہو سکا اور نہ حضرت عمر کے طویل دور میں۔ اور جب عہدہ ہی نہیں ہے تو عہدہ پر تقرری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ حضرت عثمان کے عہدِ حکومت میں وزارت کے لگ بھگ کاتب کا عہدہ تھا مگر ایک اموی کے ہوتے ہوئے ایک انصاری کو یہ اعزاز کیسے مل سکتا تھا۔

حضرت ابوبکر کی تقریر سے اوس نے جو اپنے حریف قبیلہ کی سیادت و امارت پر خوش نہ تھے اچھا تاثر لیا اور سر نہوڑائے خاموش بیٹھے رہے اور اس کے خلاف کوئی آواز نہ بلند کی لیکن خزرج خاموش نہ رہے اور ان کے نمائندہ حباب ابن منذر نے تقریر کرتے ہوئے کہا "اے گروہ انصار تم اپنے موقف پر مضبوطی سے جمے رہو یہ لوگ تمہارے زیر سایہ آباد ہیں کسی میں یہ جرأت نہیں ہو سکتی کہ تمہارے خلاف کچھ کہے یا تمہاری رائے کی خلاف ورزی کرے۔ تمہارے پاس عزت ہے، ثروت ہے طاقت ہے، شجاعت ہے تم نہ گنتی میں ان سے کم ہو اور نہ تجربہ و جنگی مہارت میں لوگوں کی نظریں تم پر لگی ہوئی ہیں آپس میں متحد رہو اگر تم میں اتفاق و یکجہتی باقی نہ رہی تو ناکام ہو جاؤ گے۔ رسُول اللہ تمہارے شہر میں ہجرت کرکے آباد ہوئے تمہاری وجہ سے کھلے بندوں اللہ کی عبادت ہوئی اور عبادت گاہیں تعمیر ہوئیں تمہاری تلواروں سے قبائل عرب سرنگوں ہوئے اور اسلام کا بول بالا ہوا تم منصب خلافت کے غلط دعویدار نہیں ہو۔ اگر یہ لوگ تمہارا حق تسلیم نہیں کرتے تو پھر ایسا ہو کہ ایک امیر ہمارا ہو اور ایک امیر اُن کا ہو۔"

حباب نے جس جوش و ولولہ سے تقریر کا آغاز کیا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وُہ کسی صورت میں مہاجرین کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالیں گے اور نہ اپنے عزم و استقلال میں فرق آنے دیں گے مگر ایسا نہ ہو سکا اور وُہ سعد ابن عبادہ کے متنبہ کرنے کے باوجود یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک امیر ان میں سے ہو۔ کہاں تو وُہ شورا شوری اور کہاں یہ بے نمکی۔ اس سے بجائے اس کے کہ انصار کے مقصد کو تقویت حاصل ہوتی فریق ثانی کو اس کی تردید کرکے اپنے موقف کو مضبوط کرنے کا موقع مل گیا۔ چنانچہ حضرت عمر نے فوراً اس کی تردید کرتے ہوئے کہا: "یہ کہاں ہو سکتا ہے کہ ایک وقت میں دو حکمران ہوں۔ خدا کی قسم عرب اس پر قطعاً رضامند نہیں ہیں کہ تمہیں برسر اقتدار لائیں جبکہ نبی تم میں سے

نہیں ہیں لیکن عرب کو اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ حاکم و ولی امر اس گھرانے سے منتخب ہو جس گھرانے میں نبوت ہے۔ لہٰذا جو ہمارے حق کا انکار کرے گا ہم اس واضح دلیل سے اسے خاموش کر دیں گے اور جو پیغمبر کی سلطنت و امارت کے سلسلہ میں ہم سے ٹکرائے گا وہ غلط کار گنہگار اور خود ہی اپنے ہاتھوں تباہ ہونے والا ہے۔

حضرت عمر نے تقریر ختم کی تو حباب پھر اٹھ کھڑے ہوئے اور جوش بھرے لہجہ میں انصار سے مخاطب ہو کر کہا: "اے گروہ انصار تم اپنی بات پر قائم رہو اور ان لوگوں کی باتوں پر کان نہ دھرو یہ خلافت میں تمہارا کوئی حصہ رکھنا نہیں چاہتے۔ اگر یہ تمہارا مطالبہ تسلیم نہ کریں تو انہیں اپنے شہر سے نکال باہر کرو اور جسے چاہتے ہو اسے امیر منتخب کر لو۔ خدا کی قسم تم ان سے زیادہ خلافت کے حقدار ہو کیونکہ تمہاری تلواروں سے دین پھیلا اور لوگ اسلام کی طرف جھکے۔ خدا کی قسم اب کسی نے میری بات کی تردید کی تو میں اپنی تلوار سے اس کی ناک توڑ دوں گا۔

حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کے بیانات کے مقابلہ میں حباب کی تقریر ذہنوں کو متاثر کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اگرچہ حباب انصار میں صاحب رائے سمجھے جاتے تھے مگر عوامی تحریک کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے جس سوجھ بوجھ اور سیاسی شعور کی ضرورت ہوتی ہے اس کی جھلک ان کی تقریر میں نظر نہیں آتی۔ بیشک بعض مواقع پر پُرجوش لب و لہجہ اور گرجتا برستا انداز تقریر کام دے جاتا ہے مگر جو چیز ایک وقت میں موثر و مفید ثابت ہو ضروری نہیں ہے کہ دوسرے موقع پر بھی نتیجہ خیز ثابت ہو۔ اس مقام پر ضرورت تھی کہ دور جاہلیت کی عصبیت کا مظاہرہ کرنے کے بجائے اسلامی فضا میں بات چیت کی جاتی اور تشدد آمیز دھمکیوں سے اجتناب برتا جاتا۔ چنانچہ اس طرز عمل سے خود انہوں نے اپنے موقف کو کمزور کیا اور لوگوں کے جذبات کو اپنا ہمنوا بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ابو عبیدہ جو موقع و محل کی نزاکت کو سمجھ رہے تھے انہوں نے انصار کے دینی جذبات کو جھنجوڑتے ہوئے کہا: "اے گروہ انصار تم نے ہماری نصرت کی ہمیں اپنے ہاں پناہ دی اب اپنا طور طریقہ نہ بدلو اور سابقہ روش پر برقرار رہو۔" اس نرم روی کا نتیجہ یہ ہوا کہ خزرج کے لوگ بھی ڈھیلے پڑ گئے۔ اور بشیر ابن سعد خزرجی نے ہوا کا رخ دیکھ کر کہا: "اے گروہ انصار اگرچہ ہمیں یہ فضیلت حاصل ہے کہ ہم نے مشرکین سے جہاد کئے اور اسلام کے قبول کرنے میں سبقت کی مگر ہمارے پیش نظر صرف اللہ کی خوشنودی اور اس کے رسول کی اطاعت تھی یہ مناسب نہیں ہے کہ ہم دین کو دنیوی سربلندی کا ذریعہ بنائیں اور حکومت و اقتدار کی فکر کریں۔ دین تو اللہ کی دی ہوئی ایک نعمت تھی۔ پیغمبر اکرم قریش میں سے تھے لہٰذا ان کا قبیلہ ان کی نیابت کا زیادہ حقدار ہے خدا نہ کرے کہ میں ان سے جھگڑا کروں اور تم بھی اللہ سے ڈرو اور خواہ مخواہ ان سے نہ الجھو۔" بشیر کا یہ کہنا تھا کہ انصار کی یکجہتی درہم و برہم ہو گئی عوام کا رخ بدلنے لگا اور عوام کو بدلتے دیر ہی کیا لگتی ہے گھڑی میں کچھ گھڑی میں کچھ ابھی ایک کے ساتھ ہیں کہ کسی نے کوئی

شورش چھوڑا اور فوراً اس کا ساتھ چھوڑ کر الگ ہو گئے یا ابھی ایک کے خلاف سرگرم عمل ہیں کہ کسی کی جذباتی تقریر سے متاثر ہو کر فوراً اس کے موافق ہو گئے۔ وہ ذہنی انقلاب جو اچانک اور ناگہانی صورت میں رونما ہوتا ہے اس کے پیچھے عقل و شعور اور فکر و تدبر کارفرما نہیں ہوتا۔ سقیفہ کے اندر بھی یہی صورت پیدا ہوئی انصار اس لئے جمع ہوئے تھے کہ اپنے قبیلہ کی ایک ممتاز فرد سعد ابن عبادہ کو امیر منتخب کریں اور ان میں ویسا ہی جوش و ولولہ تھا جو ایسے موقعوں پر ہوا کرتا ہے مگر بشیر ابن سعد کی تقریر ان کے جوش کو بہالے گئی اور جو لوگ اس تحریک کو لے کر اُٹھے تھے وہی اس تحریک کو کچلنے پر آمادہ ہو گئے اور جسے اب تک فریق مخالف سمجھا جا رہا تھا رائے عامہ کا رُخ ادھر مڑتا نظر آنے لگا۔

انصار کی کمزوری و بے تدبیری کے نتیجہ میں جب ان کے دعوٰی کی بنیادیں ملنے لگیں تو مہاجرین کو موقع مل گیا کہ وہ ان کے وقتی تاثر سے فائدہ اٹھائیں۔ چنانچہ حضرت ابو بکر نے کھڑے ہو کر کہا یہ عمر ہیں اور یہ ابو عبیدہ ہیں ان میں سے کسی ایک کی بیعت کر لو۔ یہ ایک ایسا طریق کار تھا جس سے عوام کو الجھاؤ میں تو ڈالا جا سکتا تھا مگر نتیجہ خیز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ چنانچہ اس موقع پر عوام کی ذہنی کشمکش کی وہی صورت ہوئی جو اس مسافر گم کردہ راہ کی ہوتی ہے جو دوراہے پر ٹھٹک کر کھڑا ہو جاتا ہے اور یہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ ادھر جائے یا ادھر۔ لوگ ایک دوسرے کا مُنہ تکنے لگے اور ان دو میں سے ایک کو منتخب کرنے میں اُلجھ کر رہ گئے۔ اگر حضرت ابو بکر ان دو میں سے ایک کی طرف اپنا رجحان ظاہر کر دیتے تو انتخاب میں کوئی دشواری نہ رہتی کیونکہ عوام ایسے موقعوں پر اس شخص کے اشارۂ چشم و ابرو کو دیکھا کرتے ہیں جس نے ان کی رائے کو متاثر کیا ہو اور وہ آنکھ بند کر کے اُدھر چلے جاتے ہیں جدھر وہ لے جانا چاہتا ہے یا انہوں نے شروع ہی میں ایک کا نام تجویز کیا ہوتا یا ان دونوں میں سے ایک دُوسرے کے ہاتھ پر بیعت کر لیتا تو بھی انتخابی منزل آسان ہو جاتی۔ مگر حضرت ابو بکر نے نہ نام ہی ایک تجویز کیا نہ ان دو میں سے ایک کی طرف خصوصی رجحان ظاہر کیا اور نہ ابو عبیدہ حضرت عمر کی اور نہ حضرت عمر ابو عبیدہ کی بیعت کرتے نظر آئے۔ اس صورت میں ذہنی الجھاؤ ہونا ہی چاہیئے تھا اور یہ کوئی غیر متوقع نتیجہ نہ تھا بلکہ حضرت ابو بکر کی باریک بینی و دُور رسی کو دیکھتے ہُوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس نتیجہ سے باخبر تھے اور جانتے بُوجھتے ہُوئے یہ صُورت پیدا کی گئی تھی تاکہ لوگ اس مخمصے سے نکلنے کے لئے ان دونوں کو نظر انداز کر کے ادھر بڑھیں جدھر سے یہ تحریک ہوئی ہے۔ چنانچہ حضرت عمر نے لوگوں کی اس متذبذبانہ کیفیت کو بھانپ کر حضرت ابو بکر سے کہا کہ آپ کا حق ہم دونوں سے فائق ہے آپ ہاتھ بڑھائیے ہم آپ کی بیعت کریں گے حضرت ابو بکر نے بغیر کسی تردد و توقف کے ہاتھ آگے بڑھا دیا گویا ان دونوں کا نام تمہید یا رسمی پیشکش کے طور پر لیا گیا تھا اور در اصل مرکز اقتدار وہ خود تھے۔ حضرت عمر ابھی بیعت نہ کرنے پائے تھے کہ بشیر ابن سعد نے حضرت ابو بکر کے بڑھے ہُوئے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا اور بیعت کر لی پھر حضرت عمر اور ابو عبیدہ نے بیعت کی اور پھر خزرج کے لوگ بیعت کے لئے بڑھے۔

اوس اگرچہ سعد ابن عبادہ کے طرفدار بن کر آئے تھے مگر دل سے وُہ بھی گوارا نہ کرتے تھے کہ خزرج کی کوی فرد برسر اقتدار آئے۔ چنانچہ اوس کے نقیب اسید ابن حضیر نے خزرج کو بیعت کے لئے بڑھتے ہُوے دیکھا تو اپنے قبیلہ والوں سے کہا:-

واللہ لئن ولیتھا الخزرج علیکم مرۃ لازالت لھم علیکم بذلک الفضیلۃ و لاجعلوا لکم معکم نصیبا ابدا فقوموا فبایعوا ابا بکر۔	خدا کی قسم اگر خزرج ایک دفعہ تم پر حکمران ہوگئے تو انہیں ہمیشہ کے لئے تم پر فضیلت و برتری حاصل ہو جائے گی اور تمہیں اس امارت میں سے کبھی حصہ نہیں دیں گے لہٰذا اٹھو اور ابو بکر کی بیعت کر لو"۔

(تاریخ طبری۔ ج۔ ص۴۵۸)

اسید ابن حضیر کے کلمات سے صاف عیاں ہے کہ وُہ حضرت ابو بکر کی بیعت پر آمادہ ہُوے تو صرف اوس و خزرج کی باہمی چشمک اور رقابت کی بنا پر وُہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ خزرج میں سے کوی خلیفہ ہوکر ہمیشہ کے لئے اوس پر ان کی بالادستی قائم ہو جائے اس کے علاوہ خزرج کے برسر اقتدار آنے کی صورت میں انہیں حرماں نصیبی کے سوا کچھ نظر بھی نہ آرہا تھا اور دُوسری طرف وزارت انصار کے پائے نام ہو چکی تھی اور یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ اوس کو آمادۂ بیعت کرنے کے صلہ میں وزارت انہیں مل جائے مگر یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ انصار کو معمولی عہدوں کے سلسلہ میں بھی ہمیشہ نظر انداز کیا جاتا رہا اور وزارت کا عہدہ توسرے سے تھا ہی نہیں۔ اور حباب ابن منذر کی وُہ بات سچ ثابت ہوی جو انہوں نے انصار کو بیعت سے روکتے وقت کہی تھی کہ:- اے گروہ انصار میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے بچے مہاجر زادوں کے دروازوں پر جھولی پھیلائے کھڑے ہیں اور انہیں کوی پانی تک کو نہیں پُوچھتا"۔

اس بیعت کے ہنگامہ میں حباب ابن منذر تلوار لے کر کھڑے ہو گئے مگر ان کے ہاتھ سے تلوار چھین کر انہیں بے دست و پا کر دیا گیا۔ سعد ابن عبادہ پیروں تلے روند ڈالے گئے۔ حضرت عمر کی بن آئی تھی اور جو نرم لب و لہجہ شروع میں تھا اب سیاسی خطرے کے ٹل جانے کے بعد اس کی ضرورت نہ رہی تھی چنانچہ نرم روی نے سخت گیری کی صورت اختیار کر لی اور سعد ابن عبادہ سے تلخ کلامی ہاتھا پائی اور ڈاڑھی نوچنے نچوانے تک نوبت پہنچی اور حضرت عمر نے للکار کر کہا:-

اقتلوہ قتلہ اللہ فانہ صاحب فتنۃ۔ (عقد الفرید۔ ج۳۔ ص۶۳)	اسے قتل کرو خدا اسے مارے یہ فتنہ پرداز ہے"۔

تاریخ طبری کے الفاظ یہ ہیں:-

قتلہ اللہ انہ منافق۔ ج۲۔ ص۴۵۹	خدا اسے مارے یہ منافق ہے"۔

سعد ابن عبادہ جو انصار کی جلیل القدر فرد خزرج کے راس و رئیس اور افاضل صحابہ میں سے تھے اُن کا جُرم کیا تھا کہ انہیں گردن زدنی فتنہ گر اور منافق قرار دیا گیا۔ اگر وُہ خلافت کے اُمیدوار تھے تو دوسرے بھی تشکیلِ خلافت ہی کے لئے آئے تھے۔ اگر حضرت ابو بکر و حضرت عمر کا نظریہ یہ تھا کہ پیغمبر کی تجہیز و تکفین سے پہلے خلافت کا تصفیہ از بس ضروری ہے تاکہ مملکت کے نظم و نسق میں خلل نہ پڑے تو انصار کا اجتماع بھی تو اسی مقصد کی تکمیل کے لئے تھا اگر یہ اجتماع غیر آئینی اور غیر اسلامی تھا تو مہاجرین نے بھی تو اسی غیر آئینی و غیر اسلامی اجتماع کے ذریعہ خلیفہ کا انتخاب کیا تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ انصار کا اجتماع غیر نمائندہ تھا کیونکہ اس میں مہاجرین شریک نہ تھے تو ان تین آدمیوں کو کس نے حق نمائندگی دیا تھا کہ ان کی شرکت سے یہ غیر نمائندہ اجتماع نمائندہ ہو گیا اور پھر کیا بنی ہاشم کی شرکت کے بغیر اس اجتماع کو نمائندہ حیثیت دی جا سکتی ہے جبکہ خاندانی اتحاد کو خلافت کا معیار قرار دیا گیا تھا اور بنی ہاشم ہی صحیح معنی میں پیغمبر کے ہم قبیلہ و ہم خاندان تھے بہر حال اگر اسلامی ضابطہ یہ ہے کہ امت کے ارباب حل و عقد جمع ہو کر امیر و سربراہ کا انتخاب کریں تو سعد ابن عبادہ کے اقدام کو ضابطہ اسلام کے ماتحت صحیح ماننا ناگزیر ہو گا اور انہیں فتنہ گر اور منافق کہنے کا کوی جواز نہ ہو گا۔ اور اگر یہ اسلامی ضابطہ ہی نہیں ہے تو اس ضابطہ کے ماتحت جو کاروائی ہو گی غیر اسلامی متصور ہو گی۔ حقیقت یہ ہے کہ سعد ابن عبادہ کا جرم یہ نہ تھا کہ وُہ خلافت کے اُمیدوار تھے اور اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے یہ اجتماع کیا تھا بلکہ ان کا جرم یہ تھا کہ وُہ سیاسی جوڑ توڑ کا مقابلہ نہ کر سکے اور شکست کھا گئے۔ اگر وُہ کامیاب ہو کر برسر اقتدار آجاتے تو نہ فتنہ پرداز رہتے اور نہ منافق بلکہ امن کے دیوتا اور کشتیٔ اسلام کے ناخدا کہلاتے۔

ان واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت ابو بکر کی بیعت ہنگامی جذبات کے نتیجہ میں دفعۃً ظہور میں آئی۔ ایک طرف اوس و خزرج کی چپقلش اور دُوسری طرف دو خزرجیوں کے باہمی حسد و رقابت نے مہاجرین کو یہ موقع فراہم کر دیا کہ وُہ بیعت کے لئے کسی کو آگے لائیں۔ بشیر ابن سعد نے سعد ابن عبادہ کی امارت کا راستہ مسدود کرنے کے لئے بیعت میں پہل کی بشیر کی دیکھا دیکھی خزرج آگے بڑھے اور اوس نے بھی اس خیال سے کہ خزرج سے پیچھے نہ رہ جائیں بیعت کے لئے ہاتھ بڑھا دیئے۔ اس ہڑبونگ میں نہ مشورہ کرنے کی نوبت آئی نہ سنجیدگی سے سوچا سمجھا گیا اور اچانک بیعت کر لی گئی۔ حضرت عمر بھی اسے ہنگامی حالات ہی کی پیداوار سمجھتے تھے چنانچہ وُہ کہا کرتے تھے:۔

ان بیعۃ ابی بکر کانت فلتۃً لکن وقی اللہ شرھا فمن عادالی مثلھا فاقتلوہ۔
(صواعق محرقہ۔ ص۳۶)

ابو بکر کی بیعت فلتۃً یعنی بے سوچے سمجھے ناگہانی طور پر ہوی پھر بھی اللہ نے اس کے شر سے بچائے رکھا۔ آئندہ اگر کسی نے یہ طریق کار اختیار کیا تو اُسے قتل کر دینا۔"

الامر لو بنا زع فیہ احد ۔ یعنی علی ابن ابی طالب ۔ (تاریخ یعقوبی ۔ ج ۲ ۔ ص ۱۰۳)

کہ اگر وُہ خلافت کے لئے اُٹھ کھڑے ہوتے تو انصار کی ایک فرد بھی اُن کے خلاف نہ جاتی "۔

جمہوری نظریۂ خلافت کی رو سے اس ناگہانی طور پر ظہور پذیر ہونے والی خلافت کو جمہور کا انتخاب نہیں کہا جا سکتا۔ جمہوری انتخاب کا تقاضا تو یہ تھا کہ اسے عوام مسلمین کے سامنے پیش کیا جاتا اور سب کو اظہار رائے کا موقع دیا جاتا مگر ہوتا یہ ہے کہ پہلے تو خلافت کو مہاجرین میں محدود کر دیا جاتا ہے اور پھر مہاجرین میں سے ان تین افراد میں جو اس وقت سقیفہ میں موجود تھے۔ جمہوریت اور رائے عامہ کے احترام کا اقتضایہ تھا کہ جب ابتداء میں اکثریت سعد ابن عبادہ کے ساتھ تھی اور انصار ان کے حق میں رائے دے چکے تھے تو اکثریت کی ہمنوائی کی جاتی اور یہ تاثر دیا جاتا کہ اسلام خلافت کے سلسلہ میں قومی و نسلی امتیاز گوارا نہیں کرتا اور نہ خلافت کو کسی خاص قبیلہ سے وابستہ کر کے ایک طرح سے موروثی قرار دیتا ہے بلکہ ہر شخص کو آگے بڑھنے کا حق دیتا ہے خواہ انصاری ہو یا مہاجر، قرشی ہو یا غیر قرشی۔ جب خلافت بنی تیم و بنی عدی کو مل سکتی ہے تو انصار کو اس سے بے تعلق کر دینے کا کیا جواز ہو سکتا ہے۔ اور اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ خلیفہ وہی ہو سکتا ہے جو رسُول اللہ کے قبیلہ و خاندان سے ہو چنانچہ سقیفہ میں سارا زور اسی پر دیا گیا تو بنی ہاشم کو بے خبر رکھنے میں کیا مصلحت تھی جبکہ وُہ نسبی اعتبار سے ان لوگوں کے مقابلہ میں جو ساتویں اور نویں پُشت پر رسُول سے ملتے ہیں قریب تر تھے۔ امیر المومنین نے اسی موقع پر فرمایا تھا:-

استدلوا بالشجرۃ و اضاعوا الثمرۃ۔ (نہج البلاغہ)

انہوں نے شجرہ پر اپنے استدلال کی بنیاد رکھی اور اس کے پھلوں کو ضائع کر دیا"۔

سقیفہ بنی ساعدہ میں مدمقابل انصار تھے اس لئے یہ دلیل چل گئی کہ "عرب خلافت کو وہیں دیکھنا چاہتے ہیں جہاں نبوّت ہے"۔ اور اگر مقابلہ میں بنی ہاشم ہوتے تو سیاسی کاربداری کے لئے وہ کہا جاتا جو حضرت عمر نے ایک موقع پر ابن عباس سے کہا تھا:-

کرھوا ان یجمعوا لکم النبوۃ والخلافۃ۔ (تاریخ کامل ج ۳ ۔ ص ۲۴)

لوگ یہ پسند نہیں کرتے کہ نبوت و خلافت دونوں سمٹ کر تمہارے خاندان میں جمع ہو جائیں"۔

بیعت اور جبر و تشدّد

حضرت ابوبکر حضرت عمر اور ابو عبیدہ کی کوششیں بار آور ثابت ہوئیں اور وُہ اپنے حق میں خلافت کا فیصلہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ جب یہ مہم سر ہو گئی تو سقیفہ سے نکل کر مسجد کی طرف چل دیئے

کچھ لوگ بھی ساتھ ہو گئے اور ایسے موقع پر لوگ اقتدار سے متاثر ہو کر یا شاہی قرب حاصل کرنے کے لئے ساتھ ہو ہی جایا کرتے ہیں راستے میں جو لوگ نظر آتے انہیں بلاکر ان کے ہاتھوں کو حضرت ابوبکر کے ہاتھوں سے مس کرتے اور یوں بیعت لیتے اور اعلان خلافت کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ براء ابن عازب کہتے ہیں:۔

لا یمرون باحد الاخبطوہ و قدموہ فمدوا یدہ فمسحوہا علی ید ابی بکر یبایعہ شاء ذلک او ابی۔ (شرح ابن ابی الحدید۔ ج۱۔ ص۷۴)۔	جس کسی کے پاس سے ہو کر گزرتے اسے کھینچ کھانچ کر آگے لاتے اور بیعت کے لئے اس کا ہاتھ پکڑ کر ابوبکر کے ہاتھ سے مس کرتے خواہ وہ چاہے یا نہ چاہے۔“

جب مسجد میں وارد ہوئے تو چند کارندوں کو ادھر ادھر دوڑایا گیا کہ وہ لوگوں کو پکڑ پکڑ کر بیعت کے لئے لائیں چنانچہ لوگوں کو جمع کر کے لایا گیا اور مسجد نبوی میں جہاں پاس ہی ایک حجرہ میں پیغمبر کو غسل و کفن دیا جارہا تھا تکبیروں کی گونج میں بیعت ہونے لگی۔ بلاذری نے تحریر کیا ہے:۔

اتی بابی بکر المسجد فبایعوہ وسمع العباس و علی التکبیر فی المسجد ولم یفرغوا عن غسل رسول اللہ۔	حضرت ابوبکر کو مسجد میں لایا گیا اور لوگوں نے ان کی بیعت کی عباس اور علی نے مسجد سے تکبیر کی آوازیں سنیں اور ابھی وہ پیغمبر کے غسل سے فارغ نہ ہوئے تھے۔“

(انساب الاشراف۔ ج۱۔ ص۵۸۲)

یہ دنیا کی بے وفائی و سرد مہری کا انتہائی عبرت انگیز مرقع ہے کہ ایک طرف شہنشاہ دو عالم کی میت رکھی ہے اور ان کے عزیز و اقارب باہر کی دنیا سے بے خبر تجہیز و تکفین میں لگے ہوئے ہیں اور دوسری طرف حکمران طبقہ کے گرد بیعت کرنے والوں کا جمگھٹا ہے لوگوں کا تانتا بندھا ہوا ہے اور نعروں کی گونج میں بیعت کا سلسلہ جاری ہے ابھی کچھ دیر پہلے یہی لوگ مسجد میں سوگواروں کی صورت میں جمع تھے مگر اب نہ کسی کی آنکھ اشکبار ہے اور نہ کسی کے چہرے پر غم کے آثار گویا کوئی حادثہ ہوا ہی نہیں ہے۔ اس سے عوام کی ذہنیت کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ اقتدار کی قوت انہیں کتنی جلدی متاثر و مسحور کرتی ہے کہ عظیم سے عظیم حادثہ کے اثرات بھی مضمحل ہو جاتے ہیں اور وہ فوراً اپنے جذبات کو حکومت کی رضا جوئی سے وابستہ کر دیتے ہیں۔ اس صورت میں یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ یہ سوچنے بیٹھ جاتے کہ یہ انتخاب کیسے ہوا اور کیوں ہوا رائے عامہ کے استصواب سے ہوا یا ارباب حل و عقد کی صوابدید سے۔ اگر استصواب رائے سے ہوا ہے تو انہیں اظہار رائے کا موقع کب دیا گیا اور اہل حل و عقد کا فیصلہ ہے تو کیا مہاجرین میں صرف

تین ہی آدمی اہل حل وعقد تھے اور حضرت علی عباس ابن عبدالمطلب سلمان فارسی ابو ذر غفاری مقداد ابن اسود عمار ابن یاسر زبیر ابن عوام خالد ابن سعید ایسے عمائد دین واکابر ملت اور بنی ہاشم و اعزۂ رسولؐ ان میں شامل کئے جانے کے قابل نہ تھے۔ غرض لوگ بے سوچے سمجھے ہوا کے رُخ پر اُڑتے اور سیلاب کے بہاؤ پر بہتے چلے گئے۔ اگر کسی نے ذرا نفرت و بیزاری کا اظہار کیا یا اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تو ڈرا دھمکا کر یا لالچ دلا کر اسے خاموش کر دیا گیا اور جن لوگوں کی پُشت پر قوت و طاقت تھی انہیں وقتی طور پر نظر انداز کر دیا گیا۔ چنانچہ سعد ابن عبادہ سے حکومت کے استحکام سے پہلے الجھنا اور بیعت کا مطالبہ کرنا خلاف مصلحت سمجھا گیا اور جب حضرت عثمان عبدالرحمٰن ابن عوف سعد ابن ابی وقاص بنی امیہ و بنی زہرہ کی بیعت سے حکومت کی بنیادوں میں جماؤ آگیا تو انہیں بیعت کا پیغام بھجوا دیا گیا۔ انہوں نے اس پیغام کے جواب میں کہلا بھیجا:۔

لا واللہ لا ابایع حتی ارمیکم
بما فی کنانتی واقاتلکم
بمن تبعنی من قومی وعشیرتی
(طبقات ابن سعد ج ۳۔ ص ۶۱۶)۔

خدا کی قسم میں اس وقت تک بیعت نہیں کروں گا جب تک اپنے ترکش کے تیر تم پر چلا نہ لوں اور اپنے قوم و قبیلہ کے لوگوں کو لے کر تم سے جنگ نہ کر لوں۔"

حضرت ابوبکر یہ جواب سُن کر مصلحتہً خاموش ہو گئے مگر حضرت عمر نے برافروختہ ہو کر کہا کہ ہم اس سے بیعت لئے بغیر نہیں رہیں گے۔ اس پر بشیر ابن سعد نے کہا کہ اگر انہوں نے بیعت سے انکار کر دیا ہے تو قتل ہونا گوارا کر لیں گے مگر بیعت نہیں کریں گے۔ اور اگر وُہ قتل کئے گئے تو ان کا خاندان بھی ساتھ قتل ہو گا اور ان کا خاندان اس وقت تک قتل نہ ہو گا جب تک قبیلۂ خزرج قتل نہ ہو جائے اور خزرج اس وقت تک قتل نہ ہو گا جب تک قبیلۂ اوس موت کے گھاٹ نہ اتار دیا جائے۔ دُور اندیشی کا تقاضا یہ ہے کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے چنانچہ اس کے بعد ان سے کچھ نہ کہا سُنا گیا۔ حضرت ابوبکر کے دَور میں وُہ مدینہ ہی میں رہے مگر حکمران جماعت سے کوئی تعلق نہ رکھا نہ اُن کے ساتھ نمازوں میں شریک ہوتے نہ اُن کے ساتھ اعمال حج بجا لاتے اور نہ ان کی کسی مجلس میں شامل ہوتے۔ جب حضرت عمر برسر اقتدار آئے تو انہوں نے ایک دفعہ سعد کو راستے میں دیکھ کر کہا کہ تم وہی ہو نہ۔ کہا کہ ہاں میں وہی ہوں اور میرا موقف بھی وہی ہے۔ میں تمہارے قرب سے اَب بھی اتنا ہی بیزار ہوں جتنا پہلے تھا۔ کہا کہ پھر مدینہ چھوڑ کر چلے کیوں نہیں جاتے۔ سعد خطرہ تو محسوس کر ہی رہے تھے حضرت عمر کے تیوروں کو دیکھ کر سمجھ گئے کہ کسی وقت بھی انہیں موت کے گھاٹ اُتارا جا سکتا ہے۔ اس خدشہ کے پیش نظر وُہ مدینہ چھوڑ کر شام چلے گئے اور چند دنوں کے بعد مقام حوران میں کسی کے تیروں کا نشانہ بن گئے۔ ابن عبد ربہ الاندلسی تحریر کرتے ہیں:۔

بعث عمر رجلا الی الشام فقال

حضرت عمر نے ایک شخص کو شام روانہ کیا اور اسے

ادعه الی البیعة واحمل له بکل ما قدرت علیه فان ابی فاستعن الله علیه فقدم الرجل الشام فلقیه بحوران فی حائط فدعاه الی البیعة فقال لا ابایع قرشیا ابدا قال فانی اقاتلك قال وان قاتلتنی قال افخارج انت مما دخلت فیه الامة قال اما من البیعة فانا خارج فرماه بسهم فقتله۔	کہا کہ وُہ سعد سے بیعت کا مطالبہ کرے اور اس سلسلہ میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھے اور اگر وُہ انکار کریں تو ان کے خلاف اللہ سے مدد چاہے۔ وُہ شخص شام پہنچا اور مقام حوران میں ایک چاردیواری کے اندر سعد سے ملا اور انہیں بیعت کی دعوت دی انہوں نے کہا کہ میں کسی قرشی کی کبھی بیعت نہیں کروں گا۔ اُس شخص نے کہا کہ میں تم سے جنگ کروں گا۔ کہا کہ خواہ جنگ کرو۔ کہا کہ تم اس چیز سے باہر رہنا چاہتے ہو جس میں اُمت داخل ہو چکی ہے کہا کہ میں بیعت سے باہر رہنا چاہتا ہوں۔ اُس شخص نے تیر مارا اور انہیں قتل کر دیا۔"

(عقد الفرید۔ ج۳۔ ص۶۴)

یہ شخص محمد ابن مسلمہ یا مغیرہ ابن شعبہ بتایا جاتا ہے مگر مشہور یہ کر دیا گیا کہ انہیں کسی جن نے تیر مار کر ہلاک کر دیا اور ان کے مرنے پر یہ شعر پڑھا ۔

نحن قتلنا سید الخزرج سعد ابن عبادہ ۔ رمیناہ بسهم فلم یخط فوادہ

"ہم نے سردار خزرج سعد ابن عبادہ کو قتل کر دیا اور اس پر تیر چلایا جو اس کے دل میں پیوست ہو گیا"۔

دَور اوّل میں سعد ابن عبادہ کو نہ بیعت پر مجبور کیا گیا اور نہ ان پر سختی روا رکھی گئی لیکن کارپردازان خلافت نے حضرت علی سے جلد از جلد بیعت حاصل کرنے کی کاروائی شروع کر دی اور جبر و تشدّد اور ایذا رسانی میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ چنانچہ آپ دنیا کی نیرنگی اور زمانہ کے انقلاب سے افسردہ خاطر گھر میں بیٹھے تھے کہ حکومت کی طرف سے بیعت کا پیغام آیا۔ آپ نے اور آپ کے ساتھ ان تمام افراد نے جو گھر کے اندر موجود تھے بیعت سے انکار کر دیا جس پر حضرت عمر آگ بگولا ہو گئے اور گھر کو پھونک دینے پر اُتر آئے۔ بلاذری نے تحریر کیا ہے:۔

ان ابا بکر ارسل الی علی یرید البیعة فلم یبایع فجاء عمر ومعه فتیلة فتلقته فاطمة علی الباب فقالت یا ابن الخطاب اتراك محرقا علی بابی قال نعم۔ (انساب الاشراف۔ ج۱۔ ص۵۸۶)	حضرت ابو بکر نے حضرت علی کو بیعت کے لیے پیغام بھجوایا مگر حضرت علی نے بیعت نہ کی جس پر حضرت عمر جلتی ہوئی آگ لے کر آئے۔ حضرت فاطمہؑ نے عمر کو دیکھا تو کہا اے خطاب کے بیٹے کیا تم دروازے کو مجھ سمیت جلا دو گے کہا ہاں"۔

زبیر ابن عوام بھی اس گھر کے اندر موجود تھے اگرچہ وُہ حضرت ابوبکر کے داماد تھے مگر اپنی والدہ صفیہ ابن عبد المطلب کی طرف سے بنی ہاشم سے بھی عزیزداری رکھتے تھے انہوں نے یہ صورت دیکھی تو تلوار سونت کر مقابلہ کے لئے باہر نکل آئے مگر سلمہ ابن اشیم نے تلوار ان کے ہاتھ سے چھین لی اور انہیں نہتا کر کے گرفتار کر لیا گیا۔ مورخ طبری تحریر کرتے ہیں:۔

اتی عمر ابن الخطاب منزل علی وفیہ طلحۃ والزبیر ورجال من المھاجرین فقال واللہ لاحرقن علیکم اولتخرجن الی البیعۃ فخرج الیہ الزبیر مصلتاً بالسیف فعثر فسقط السیف من یدہ فوثبوا علیہ فاخذوہ۔ (تاریخ طبری ج ۳ ص ۴۴۳)	عمر ابن خطاب حضرت علی کے گھر پر آئے گھر میں طلحہ زبیر اور چند مہاجرین تھے حضرت عمر نے کہا کہ بیعت کے لئے باہر نکلو ورنہ خدا کی قسم میں تم سب کو آگ لگا کر پھونک دوں گا۔ زبیر نے تلوار کھینچ لی اور باہر نکل آئے مگر ٹھوکر کھائی اور ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی لوگ ان پر ٹوٹ پڑے اور انہیں گرفتار کر لیا“

حضرت عمر اور ان کے ہمراہی حضرت علی کو بھی کشاں کشاں حضرت ابوبکر کے پاس بیعت کے لئے لے آئے۔ آپ نے بیعت کے مطالبہ پر احتجاج کرتے ہوئے فرمایا:۔

انا احق بھذا الامر منکم لا ابایعکم وانتم اولی بالبیعۃ لی اخذتم ھذا الامر من الانصار واحتججتم علیھم بالقرابۃ من النبی وتاخذونہ منا اھل البیت غصباً الستم زعمتم للانصار انکم اولی بھذا الامر منھم فاعطوکم المقادۃ وسلموا الیکم الامارۃ وانا احتج علیکم بمثل ما احتججتم بہ علی الانصار نحن اولی برسول اللہ حیاً ومیتاً فانصفونا	میں تم لوگوں سے زیادہ خلافت کا حقدار ہوں۔ میں تمہاری بیعت نہیں کروں گا بلکہ تمہیں میری بیعت کرنا چاہئے تم نے انصار سے خلافت لی اور ان کے مقابلہ میں دلیل یہ دی کہ تمہیں نبی سے قرابت ہے اور اب تم زبردستی اہلبیت سے خلافت چھیننا چاہتے ہو کیا تم نے انصار کے مقابلہ میں یہ دعوی نہیں کیا تھا کہ تم خلافت کے ان سے زیادہ حقدار ہو جس پر انہوں نے قیادت و امارت تمہارے سپرد کر دی جس دلیل سے تم نے انصار کے مقابلہ میں اپنا حق ثابت کیا تھا اسی دلیل سے میں تمہارے مقابلہ میں اپنا حق ثابت کرتا ہوں ہم رسول اللہ سے ان کی زندگی و موت میں زیادہ خصوصیت رکھتے ہیں اگر تم ایمان لائے ہو تو

ان کنتم تؤمنون الا فیؤوا بالظلم وانتم تعلمون۔ — ہم سے انصاف کرو ورنہ تم بے خبر نہیں ہو کہ ظلم کے مرتکب ہو گے"۔

(الامامۃ والسیاسۃ ج ۱ ص ۱۱)

حضرت ابوبکر چپ سادھے بیٹھے رہے مگر حضرت عمر نے کہا کہ جب تک تم بیعت نہیں کرو گے تمہیں چھوڑا نہیں جائے گا۔ فرمایا خدا کی قسم نہ میں تمہاری بات کان پر دھروں گا اور نہ بیعت کروں گا۔ پھر رازِ درونِ پردہ کو بے نقاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

احلب حلبا لک شطرہ واللہ ما حرصک علی امارتہ الیوم الا لیوثرک غدا۔ — خلافت کا دودھ دوہ لو اس میں تمہارا بھی برابر کا حصہ ہے خدا کی قسم تم آج ابوبکر کی خلافت پر اس لئے جان دیئے دے رہے ہو تا کہ کل وہ خلافت تمہیں دے جائیں"۔

(انساب الاشراف ج ۱ ص ۵۸۷)

امیرالمومنین کے انکار بیعت پر ایذا و اہانت کا کوئی پہلو اٹھا نہ رکھا گیا آگ لگانے کا سامان کیا گیا گلے میں رسی ڈالی گئی اور قتل تک کی دھمکیاں دی گئیں یہ ایسا متشددانہ طرزِ عمل تھا کہ معاویہ ابن ابی سفیان ابوبکر کے فرزند محمد پر طنز کئے بغیر نہ رہ سکے اور انہیں ان کے ایک خط کے جواب میں تحریر کیا:۔

کان ابوک وفاروقہ اول من ابتزہ حقہ وخالفہ علی امرہ علی ذلک اتفقا واتسقا ثم انہما دعواہ الی بیعتہما فابطأ وتلکا علیہما فہمابہ الھموم واراد ابہ العظیم۔ — جنہوں نے سب سے پہلے علی کا حق چھینا اور خلافت کے سلسلہ میں ان کی مخالفت پر ایکا کیا وہ تمہارے باپ (ابوبکر) اور فاروق تھے انہوں نے علی سے بیعت کا مطالبہ کیا مگر علی نے بیعت میں توقف کیا اور ٹال دیا جس پر ان دونوں نے ان پر مصائب و آلام کے پہاڑ توڑنے کا تہیہ کر لیا"۔

(مروج الذہب ج ۲ ص ۶۰)

اس بیعت کے سلسلہ میں تشدد کی جو صورت روا رکھی گئی وہ سراسر غیر آئینی اور ناجائز تھی اس لئے کہ کسی آئین میں اس کی اجازت نہیں ہے کہ کسی کو اپنی رائے بدلنے پر مجبور کیا جائے اور جبر و تشدد کے ذرائع کام میں لا کر بیعت لی جائے اگر وہ لوگ یہ دیکھتے کہ حضرت علی پیغمبر کے زمانہ سے کسی جماعت کے قیام کی تیاری کر رہے ہیں اور اب اس جماعت کے تعاون سے متوازی حکومت قائم کر کے ان کے اقتدار کو خطرہ میں ڈالنا چاہتے ہیں یا شورش و ہنگامہ کھڑا کر کے امن عامہ کو تباہ کرنا چاہتے ہیں تو اس تشدد کا سیاسی جواز ہو سکتا تھا اور جب نہ ایسی کوئی صورت تھی اور نہ ٹکراؤ کے کوئی آثار تھے تو پھر بیعت پر اتنا اصرار کیوں ممکن ہے کہ اس میں یہ مصلحت کارفرما رہی ہو کہ اس طرح بیعت لے کر اپنے موقف اور طریق کار کے

حق بجانب ہونے کا ثبوت مہیا کریں تو اس طرح کی جبری بیعت کو بیعت ہی نہیں کہا جا سکتا کہ اس سے "جمہوری" خلافت کی صحت پر سند لائی جا سکتی۔

حضرت علی کا انکار جذبات کے زیر اثر نہ تھا بلکہ اصول کے ماتحت تھا۔ اگر تشدد آخری حد تک بھی پہنچ جاتا تو یہ ممکن نہ تھا کہ وہ جمہوریت کے نام پر قائم کی ہوئی حکومت کی بیعت کر کے ایک ایسے اصول کو تسلیم کر لیتے جس کی کوئی شرعی سند ہی نہ تھی۔ چنانچہ آپ نے پورے صبر و ضبط کے ساتھ ان تمام شدائد کو برداشت کیا مگر نہ جمہوری خلافت کو مانا اور نہ جمہور کے حق انتخاب کو اس کے بعد یہ تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا کہ جس اصول کی بنا پر آپ نے بیعت سے انکار کیا تھا اس اصول سے انحراف کر کے سپر انداز ہو جائیں گے اور بیعت کر کے اپنے سابقہ قول و عمل کی تردید کر دیں گے۔

امیرالمومنین کا مدبّرانہ سکوت

امیرالمومنین نے جمہوری خلافت کے خلاف علانیہ احتجاج کیا اور اپنے حق کی فوقیت اسی دلیل سے ثابت کی جس دلیل سے برسر اقتدار طبقہ نے انصار کو قائل کیا تھا۔ یہ احتجاج دراصل اس نظام سیاست کے خلاف تھا جس کے تحت انتخابی حکومت کو خلافت کا اور منتخب حکمران کو خلیفۂ رسُول کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ اس میں نہ حکومت کی ہوس کار فرما تھی اور نہ اقتدار کی خواہش مضمر تھی اگر امیرالمومنین کو حکومت و اقتدار کی ہوس ہوتی تو ان تمام حربوں کو کام میں لاتے جو سیاسی طاقت حاصل کرنے کے لئے کام میں لائے جاتے ہیں اور دست تعاون بڑھانے والوں کا تعاون حاصل کر کے حکومت وقت سے ٹکر لیتے اور اقتدار پر قابض ہونے کی کوشش کرتے مگر آپ نے اس سلسلہ کی ہر کاروائی کو نظر انداز کر دیا اور اپنے موقف سے نہ سر مو انحراف کیا اور نہ اپنا زاویۂ نظر بدلا۔

سقیفہ بنی ساعدہ میں جب حضرت ابوبکر کا انتخاب عمل میں لایا جا رہا تھا تو اموی سردار ابوسفیان مدینہ میں موجود نہ تھا۔ آنحضرت نے اپنی زندگی میں اسے کسی کام پر مامور کر کے مدینہ سے باہر بھیج دیا تھا جب وہ رحلتِ پیغمبر کے بعد پلٹ کر مدینہ آیا اور آنحضرت کے انتقال اور حضرت ابوبکر کے خلیفہ ہونے کی خبر سنی تو اس نے آسمان سر پر اٹھا لیا اور ایک ہنگامہ سا کھڑا کر دیا۔ بھاگا بھاگ عباس ابن عبدالمطلب کے ہاں گیا اور اُن سے مشورہ کرنے کے بعد حضرت علی کے پاس آیا اور چاہا کہ انہیں اپنے قبیلہ کے تعاون کا یقین دلا کر حکومت کے خلاف میدان میں لا کھڑا کرے۔ چنانچہ اس نے پُر اعتماد لہجہ میں کہا۔

مابال ھذا الامر فی اقل حی من قریش واللہ لئن شئت لاملانھا علیہ خیلا ورجالا۔ (تاریخ طبری ج۲)	ایسا کیوں ہوا کہ خلافت قریش کے ایک پست ترین خاندان میں چلی گئی اگر آپ چاہیں تو میں خدا کی قسم مدینہ کو سواروں اور پیادوں سے بھر دوں"

ایک عام انسان کے لئے جذبات کے دباؤ سے آزاد رہنا بہت مشکل ہوتا ہے اس سے یہی توقع کی جاسکتی ہے کہ وُہ اس مرحلہ پر تعاون پیش کرنے والے کے اصل مقصد کو سمجھتے ہُوئے بھی نظر انداز کردے گا یا خوش فہمی میں مبتلا ہوکر اسے ہمدردی و خیر خواہی کا نتیجہ سمجھ لے گا اور عواقب و نتائج سے آنکھیں بند کرکے وقتی امداد کے سہارے اٹھ کھڑا ہوگا مگر امیر المومنین نہ جذبات کے آگے سپر انداز ہوسکتے تھے اور نہ دوستی کا لبادہ اوڑھ کر انہیں فریب دیا جاسکتا تھا۔ آپ نے اپنی خداداد فراست سے فوراً بھانپ لیا کہ اس پیشکش میں ہمدردی و خیر خواہی کا جذبہ نہیں ہے بلکہ یہ مسلمانوں کو جنگ میں الجھا کر اسلام کی بنیادوں کو متزلزل کرنے کی ایک سازش ہے۔ آپ نے اس پیشکش کو ٹھکراتے ہُوئے اسے ڈانٹ کر جواب دیا:۔

واللہ ما اردت بھذا الا الفتنۃ	خدا کی قسم تمہارا مقصد صرف فتنہ انگیزی ہے تم
وانک واللہ طالما بغیت الاسلام	نے ہمیشہ اسلام کی بدخواہی کی ہے مجھے تمہاری
شرا لا حاجۃ لنا فی نصیحتک	ہمدردی و نصیحت کی ضرورت نہیں ہے۔

(تاریخ طبری۔ ج۲۔ ص۴۴۹)۔

یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ ابوسفیان کو حضرت ابوبکر سے کیا کد تھی کہ آتے ہی اُن کے خلاف سرگرم عمل ہوگیا حالانکہ ان دونوں کے باہمی تعلقات نہایت خوشگوار چلے آرہے تھے اور حضرت ابوبکر اس کے زمانۂ کفر میں بھی اس کے خلاف کوئی بات سُننا گوارا نہ کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ چند صحابہ جن میں سلمان صہیب اور بلال بھی شامل تھے ایک مقام پر بیٹھے تھے کہ ادھر سے ابوسفیان کا گزر ہوا انہوں نے اسے دیکھ کر کہا اس دشمن خدا کو اللہ کی تلواروں نے ابھی تک کیفر کردار تک نہیں پہنچایا۔ اس پر حضرت ابوبکر بگڑ گئے اور کہا کہ تم ایک بزرگ قریش و سردار قوم کے بارے میں ایسا کہتے ہو پھر وہاں سے اُٹھ کھڑے ہُوئے اور رسُول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوکر ان لوگوں کے الفاظ جو ابوسفیان کے بارے میں کہے تھے نقل کئے۔ آنحضرت نے فرمایا:۔

لعلک اغضبتہم ائن کنت اغضبتہم	شاید تم نے ان لوگوں کو ناراض کیا ہے اگر تم نے
لقد اغضبت ربک۔	انہیں غصہ دلایا ہے۔ تو یاد رکھو کہ تم نے اپنے
(انساب الاشراف ج۱۔ ص۴۸۹)۔	پروردگار کو غضبناک کیا ہے۔

حضرت ابوبکر نے پیغمبر کی زبان سے یہ کلمات سُنے تو پلٹ کر اُن لوگوں سے کہا کہ تمہیں میری بات بُری تو نہیں معلوم ہوئی انہوں نے اتنا کہا کہ اللہ تمہیں بخشے اور خاموش ہوگئے۔

یہ واقعہ ابوسفیان کے زمانۂ کفر ہی کا ہوسکتا ہے اس لئے کہ اگر وُہ کافر نہ ہوتا تو یہ ممتاز صحابہ اسے گردن زدنی نہ قرار دیتے اور نہ اُسے دُشمنِ خدا کی لفظوں سے یاد کرتے اور حضرت ابوبکر بھی اسے بزرگِ قریش کہنے کے بجائے یہ کہتے کہ تم ایک مُسلمان کے بارے میں یہ کہتے ہو۔ اور بعض مؤرخین نے یہ تصریح بھی

کردی ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر ۶ھ میں یہ واقعہ ہوا اور ابوسفیان ۸ھ میں فتح مکہ کے نتیجہ میں اسلام لایا تھا۔

اس واقعہ سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ نہ حضرت ابوبکر سے کوی عناد رکھتا تھا اور نہ حضرت ابوبکر اس سے نفرت رکھتے تھے پھر ان تعلقات کی خوشگواری کا تقاضا یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ ان کی حکومت کا تختہ اُلٹنے کی فکر کرتا اور اُن کے مقابلہ میں اپنے حریف قبیلہ کی اس فرد کو برسر اقتدار لانے کے لئے عملاً کوشاں ہوتا جس کی تلوار نے اس کے خاندان کے بیشتر افراد کو موت کے گھاٹ اتارا ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ اس نے یہ شوشہ اس لئے چھوڑا تھا کہ حکومت وقت کو اپنے ردعمل سے یہ تاثر دے کہ وہ حزب مخالف تیار کر کے موجودہ اقتدار کو خطرہ میں ڈال سکتا ہے اور اس طرح حضرت ابوبکر اور ان سے وابستگی رکھنے والوں کو ڈرا سہما کر ذاتی مفاد حاصل کرے اور مفاد پرست طبقہ ایسے موقعوں پر ایسے ہی ہتھکنڈوں سے اپنے مفادات حاصل کیا کرتا ہے چنانچہ یہ حربہ کارگر ثابت ہوا اور جب یہ خبر اڑی کہ ابوسفیان بنی ہاشم کو حکومت کے خلاف ابھار رہا ہے تو ارباب حکومت اس کے مزاج آشنا تو تھے ہی انہوں نے اُسے لالچ کے جال میں جکڑ کر خاموش کر دیا اور حضرت عمر نے ابوبکر سے کہا:۔

ان ھذا قد قدم وھو فاعل شرا وقد کان النبی یستالفہ علی الاسلام فدع لہ ما بیدہ من الصدقۃ ففعل فرضی ابوسفیان وبایعہ
(عقد الفرید۔ ج ۳۔ ص ۶۲)۔

ابوسفیان آپہنچا ہے یہ کوی نہ کوی فتنہ ضرور کھڑا کرے گا پیغمبر اکرم اسلام کے سلسلہ میں اس کی تالیف قلب کیا کرتے تھے جو صدقات اس کے قبضہ میں ہیں اسی کو دے دیئے جائیں چنانچہ ابوبکر نے ایسا ہی کیا اور ابوسفیان خوش ہو گیا اور اس نے بیعت کر لی"۔

ابوسفیان کو صرف اسی سے نہیں نوازا گیا بلکہ اس کے صلہ میں اس کے بیٹے یزید کو شام کی امارت بھی دے دی گئی جو اموی اقتدار کا سنگ بنیاد ثابت ہوی۔

اس موقع پر امیر المومنین کی خاموشی ان کے تدبر معاملہ فہمی اور سلامت روی کی آئینہ دار ہے۔ اگر آپ ابوسفیان کے اکسانے پر جنگ کے لئے آمادہ ہو جاتے تو اس جنگ کو اقتدار کی جنگ سے زیادہ اہمیت نہ دی جاتی اس سے ایک طرف دشمنان اسلام کے اس خیال کو تقویت حاصل ہوتی کہ پیغمبر نبوت کی آڑ میں اپنے خاندان کو برسر اقتدار لانا چاہتے تھے اور دوسری طرف جس غلط طریق کار کے خلاف آپ نے صدائے احتجاج بلند کی تھی بے اثر ہو کر رہ جاتی۔ بازؤں میں قوت و طاقت بھی تھی اور دل میں جوش و ولولہ بھی تھا۔ مگر حضرت کی دُور اندیش نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ چاروں طرف زہریلی فضا محیط ہے۔ فتنہ ارتداد سر اُٹھا رہا ہے نفاق سرگرم عمل ہے۔ شکست خوردہ یہود اور باج گزار نصاری اس تاک میں لگے ہیں کہ مسلمانوں میں پھوٹ پڑے

تو اُن سے اپنی شکست وہزیمت کا بدلہ لیں۔ اور منافقین اسلام کی نقاب اوڑھے تخریب اسلام کے درپے ہیں یہ تمام اسلام دشمن طاقتیں مسلمانوں کو دست وگریباں ہوتے دیکھ کر اسلام کے خلاف متحد ہو جائیں گی اور اسلام کی تباہی وبربادی میں کوی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں گی۔ امیرالمومنین کا دُنیائے اسلام پر یہ عظیم احسان ہے کہ انہوں نے خاموش احتجاج سے قدم آگے نہیں بڑھایا اور خانہ جنگی کا سدباب کر کے مخالف طاقتوں کو محاذ قائم کرنے کا موقع نہیں دیا ورنہ ایک دفعہ خلافت کے لئے جنگ چھڑ جاتی تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ہر دور میں خلافت کے لئے تلوار چلتی کشت وخون کا دروازہ کھل جاتا اور مسلمان ہمیشہ چکی کے دو پاٹوں میں پستے رہتے۔

امیرالمومنین جو عالم مزاج اسلام اور اسلام کی اصلاح پسندی کے علمبردار تھے وُہ یہ گوارا نہ کر سکتے تھے کہ زلزلہ فگن نعروں سے فضا میں ارتعاش پیدا کریں اور ہنگامہ آرائیوں سے انقلاب کو دعوت دیں۔ ایک انقلاب پسند نتائج سے آنکھیں بند کر کے جنگوں میں کود پڑتا ہے اور تلواروں سے کھیلنے لگ جاتا ہے چاہے اس کے نتیجہ میں مقصد کی پامالی کے سوا کچھ حاصل نہ ہو۔ مگر ایک مصلح مقصد پر نظر رکھتا ہے حالات کا جائزہ لیتا ہے نتائج پر نظر کرتا ہے اور جذبات کو عقل کے تابع رکھ کر ایسا قدم اٹھاتا ہے جس سے سازگاری کا ماحول پیدا ہو اور مقصد اور اصول پر کوی زد نہ پڑے۔ امیرالمومنین پر دین کا پاسبان ملّت کا محافظ اور ایک مصلح ہونے کی حیثیت سے یہ فریضہ عائد ہوتا تھا کہ وُہ ہر حالت میں اسلام کے مفادات پر نگاہ رکھیں اور کوی ایسا اقدام نہ کریں جس سے اسلام کو نقصان پہنچنے کا ادنیٰ احتمال ہو خواہ اس کے لئے صبر وضبط کی کتنی ہی کڑی منزلوں سے کیوں نہ گزرنا پڑے۔ یہ ایک ایسا اہم فریضہ تھا کہ جس کے مقابلہ میں حکومت کو کوی اہمیت نہ دی جا سکتی تھی جو اسلام کی خاطر تلواروں کے سایہ میں سو جائے جان جوکھوں میں ڈالے اور جوانی کے ایام حرب وپیکار کی نذر کر دے وُہ اسلام کے قیام ودوام کے لئے چند روزہ اقتدار کو بھی قربان کر سکتا ہے۔ چنانچہ آپ ماحول کی تلخیوں اور زمانہ کی نیرنگیوں سے متاثر ہوئے بغیر ہمہ تن اسلام کے فروغ وارتقاء اور علوم ومعارف کے احیاء اور تدوین احکام وجمع قرآن کا کام انجام دیتے رہے اور اس طرح اپنے اس فریضہ سے عہدہ برآ ہوئے جو بحیثیت امام وخلیفۂ رسُول ان پر عائد ہوتا تھا۔

مسئلہ فدک

فدک رسُول اللہ کی ملکیت خاصہ تھا اور جب آیۂ وآت ذاالقربیٰ حقہ نازل ہوا تو آپ نے ایک دستاویز کے ذریعہ اسے اپنی صاحبزادی فاطمہ زہراؑ کے نام منتقل کر دیا جو آنحضرت کی زندگی تک انہی کے قبضہ وتصرف میں رہا لیکن حضرت ابوبکر نے مسند خلافت پر متمکن ہونے کے بعد جناب فاطمہ زہراؑ کے مختار کار کو اراضیٔ فدک سے بے دخل کر دیا اور عمومی صدقات کے ماتحت اسے حکومت کی تحویل میں لے لیا۔ اس پر جناب سیّدہؑ نے مرافعہ کیا اور اثبات دعویٰ کے لئے حضرت علی اور ام ایمن کو بطور گواہ پیش کیا ان دونوں نے گواہی دی کہ جناب

فاطمہ اپنے دعویٰ میں حق بجانب ہیں اور رسُول اللہ اپنی زندگی میں انہیں فدک ہبہ کر گئے تھے۔ حضرت ابوبکر نے دعویٰ کو مسترد کرتے ہُوئے کہا:۔

یا بنت رسُول اللہ لا تجوز الا شہادۃ رجلین او رجل و امرأتین	اے دختر رسُول دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کے بغیر گواہی صحیح نہیں ہوتی۔"

(فتوح البلدان۔ ص ۳۸)۔

جناب سیّدہؑ نے جب یہ دیکھا کہ حضرت علی اور ام ایمن کی گواہی کو نا تمام قرار دے کر فدک کے ہبہ رسُول ہونے سے انکار کیا جا رہا ہے تو انہوں نے میراث کی بنا پر فدک کا مطالبہ کیا مقصد یہ تھا کہ اگر تم اسے ہبہ تسلیم نہیں کرتے تو نہ کرو مگر اس سے تو انکار نہیں کر سکتے کہ فدک مملوکہ رسول تھا اور میں شرعاً ان کی وارث ہوں لہٰذا فدک مجھے ملنا چاہئے۔ حضرت ابو بکر نے کہا کہ اموال رسُول میں وراثت کا نفاذ نہیں ہو سکتا کیونکہ پیغمبر فرما گئے ہیں کہ انا معاشر الانبیاء لا نورث ما ترکناہ صدقۃ۔ "ہم گروہ انبیاء کسی کو وارث نہیں بناتے ہمارا ترکہ صدقہ ہوتا ہے۔" اس پر جناب سیّدہ نے فرمایا:۔

افی کتاب اللہ ان ترث اباك ولا ارث ابی اما قال رسول اللہ المرء یحفظ فی ولدہ۔	کیا یہ اللہ کی کتاب میں ہے کہ تم اپنے باپ کی میراث پاؤ اور میں اپنے باپ کا ورثہ نہ پاؤں کیا رسُول اللہ نے نہیں فرمایا تھا کہ کسی شخص کے حقوق کی نگہداشت یہ ہے کہ اس کی اولاد کا تحفظ کیا جائے۔"

(تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ ص ۱۶۹)

حضرت ابو بکر کے فیصلہ پر حضرت فاطمہ کو اتنا رنج و ملال ہُوا کہ ان سے قطع کلام کر لیا اور ہمیشہ ان سے رنجیدہ و کبیدہ خاطر رہیں یہ رنجش و برہمی کسی ہنگامی جذبہ کا نتیجہ نہ تھی کہ وقتی غم و غصّہ کے فرو ہونے پر ختم ہو جاتی بلکہ دینی جذبات کے ماتحت تھی کہ قرآن کے عمومی حکم میراث کو پامال اور جنہیں پیغمبر نے مباہلہ میں حق و صداقت کا شاہکار قرار دیا تھا ان کی صدق بیانی کو مجروح کیا گیا ہے اس لئے اس رنجیدگی نے اتنا طول کھینچا کہ مرتے دم تک باقی رہی اور صلح و ہم کلامی کی نوبت نہ آسکی۔ امام بخاری تحریر کرتے ہیں:۔

ان فاطمۃ علیہا السّلام بنت رسُول اللہ سألت ابا بکر الصدیق بعد وفات رسُول اللہ ان یقسم لہا میراثہا ما ترك رسُول اللہ مما افاء اللہ علیہ فقال لہا ابو بکر ان رسُول اللہ قال لا نورث ما ترکناہ صدقۃ	فاطمہ بنت رسُول اللہ نے وفات پیغمبر کے بعد ابو بکر صدیق سے مطالبہ کیا کہ اللہ نے جو مال رسُول اللہ کو کفار سے لڑے بغیر دلوایا تھا اور آپ اسے بطور ترکہ چھوڑ گئے ہیں اس کی میراث مجھے پہنچتی ہے وُہ مجھے دلوایا جائے۔ ابو بکر نے کہا کہ رسُول اللہ فرما گئے ہیں کہ ہم کسی کو وارث نہیں بناتے ہم جو چھوڑ جاتے ہیں وُہ صدقہ ہوتا ہے۔ اس پر فاطمہ

فغضبت فاطمة بنت رسول الله فهجرت ابا بکر فلم تزل مهاجرته حتی توفیت ۔ (صحیح بخاری ۔ ج ۲ ۔ ص ۱۳۲) ۔

"بنت رسول اللہ غضبناک ہوئیں اور ابو بکر سے تمام راہ و رسم قطع کر لئے اور مرتے دم تک قطع تعلق کئے رہیں"۔

اگر فرض کر لیا جائے کہ فدک نہ ہبہ تھا اور نہ مال موروث تو اس میں کیا مضائقہ تھا کہ حضرت ابو بکر قرابت رسول کا پاس کرتے ہوئے فدک جناب سیدہ کے نام کر دیتے جبکہ حاکم و ولی امر کا یہ حق تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ ریاست کے اموال و املاک میں سے جسے چاہے اور جو چاہے اپنی مرضی سے دے سکتا ہے ۔ چنانچہ محمد الخضری مصری تحریر کرتے ہیں :۔

لم یمنع الشرع الامام ان ینفل من شاء من المسلمین مالم ینفل غیرہ ۔ (اتمام الوفاء ۔ ص ۲۰) ۔

"شرع اسلام حاکم کے لئے اس امر سے مانع نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں میں سے جسے چاہے عطیہ دے اور جسے چاہے اسے نہ دے"۔

استاذ محمود ابوریہ مصری لکھتے ہیں :۔

یجوز للخلیفة ان یخص من یشاء بما شاء ۔ (رسالة الاسلام ۔ شمارہ ۵۱۸ ۔ سال ۱۱) ۔

"خلیفہ کے لئے جائز ہے کہ وہ جسے چاہے اور جو چاہے دے دے"۔

چنانچہ حضرت ابو بکر نے زبیر ابن عوام کو وادئ جرف میں جاگیر دی اور حضرت عمر نے بھی انہیں وادئ عقیق میں جاگیر عطا کی اور حضرت عثمان نے اپنے دور اقتدار میں فدک مروان کو دے دیا تو کیا حضرت ابو بکر جناب فاطمہؑ کو فدک بطور جاگیر نہیں دے سکتے تھے تاکہ ان کی ناراضگی کی نوبت نہ آتی ۔ اور اس ناراضگی کی اہمیت پیغمبر کے اس ارشاد سے ظاہر ہے :۔

ان الله یرضی لرضاك ویغضب لغضبك ۔ (اصابہ ج ۴ ۔ ص ۳۶۶) ۔

"(اے فاطمہ) اللہ تمہارے غضب سے غضبناک اور تمہاری خوشنودی سے خوشنود ہوتا ہے"۔

اس فیصلہ پر حیرت ہوتی ہے کہ کس حکم شرعی کی بناء پر جناب سیدہؑ کے دعوائے ہبہ کو مسترد کیا گیا جبکہ پیغمبر قبضہ دے کر ہبہ کی تکمیل کر چکے تھے اگر قبضہ نہ ہوتا تو حضرت ابو بکر کہہ سکتے تھے کہ چونکہ قبضہ نہیں ہے لہذا یہ ہبہ نا مکمل ہے اور گواہوں کو طلب کئے بغیر دعوی مسترد کر دیتے مگر گواہوں کو طلب کرنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ قبضہ تسلیم کرتے تھے ۔ اور قبضہ چونکہ دلیل ملکیت ہے لہذا حضرت ابو بکر کو چاہئے تھا کہ وہ اس ہبہ کے خلاف ثبوت بہم پہنچاتے نہ یہ کہ جناب سیدہ سے گواہ طلب کرتے ۔ کیا جناب سیدہ کے بارے میں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ وہ فدک کی خاطر غلط بیانی سے کام لیں گی اور اس چیز پر اپنا حق جتائیں گی جس پر ان کا حق نہ تھا

جبکہ ان کی راست بیانی مسلّم ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہ کہتی ہیں:۔

ما رأیت احدا کان اصدق لھجۃ من فاطمۃ الا ان یکون الذی ولدھا۔ (استیعاب ج ۲ ص ۳۶۶) میں نے فاطمہ کے پدر بزرگوار کے علاوہ کسی کو فاطمہ سے بڑھ کر راستگو نہیں پایا"۔

پھر گواہوں کے طلب کرنے پر جناب سیدہؑ نے گواہ پیش کر دیئے تو ان کی شہادت کو ناتمام بھی نہیں کہا جا سکتا اس لئے کہ رسول اللہ ایک گواہ اور قسم پر فیصلہ کر دیا کرتے تھے اگر حضرت ابوبکر چاہتے تو حضرت علی سے قسم لیکر جناب فاطمہ کے حق میں فیصلہ کر سکتے تھے بلکہ کتب احادیث میں ایسے واقعات بھی ملتے ہیں جہاں گواہوں کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی اور صرف مدعی کی شخصیت کو دیکھتے ہوئے اس کے دعویٰ کو درست تسلیم کیا گیا یا صرف ایک ہی گواہ پر فیصلہ کر دیا گیا چنانچہ فرزندان صہیب نے جب مروان کی عدالت میں دعویٰ دائر کیا کہ رسول اللہ صہیب کو دو مکان اور ایک حجرہ دے گئے تھے تو مروان نے کہا کہ اس کا گواہ کون ہے انہوں نے کہا کہ ابن عمر۔ اس نے ابن عمر کو شہادت کے لئے طلب کیا

فشھد لاعطی رسول اللہ صھیبا بیتین وحجرۃ فقضی مروان بشھادتہ لھم (صحیح بخاری ج ۱ ص ۳۵۷) اس نے گواہی دی کہ رسول اللہ نے صہیب کو دو مکان اور ایک حجرہ عطا کیا تھا۔ مروان نے ابن عمر کی شہادت پر ان کے حق میں فیصلہ کر دیا"۔

اس موقع پر نہ ابن عمر کی گواہی کو ناتمام و غیر مؤثر کہا گیا اور نہ اس کے قبول کرنے میں پس و پیش کیا گیا تو کیا حضرت علی عدالت کے اس درجہ پر بھی فائز نہ تھے جس درجہ پر ابن عمر فائز تھا۔ ابن عمر پر تو بیعت یزید کی وجہ سے حرف گیری کی گنجائش بھی ہو سکتی ہے مگر جنہوں نے فدک کی گواہی دی تھی ان کی راست بیانی تو ہر دور میں شک و شبہہ سے بالاتر رہی ہے چنانچہ مامون عباسی نے ایک مرتبہ علماء وقت کو جمع کر کے ان سے دریافت کیا کہ جنہوں نے فدک کے ہبہ قرار پانے کی شہادت دی تھی تم ان کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہو۔ سب نے کہا کہ وہ صادق و راستباز تھے اور ان کی راستگوئی میں کوئی شبہہ نہیں کیا جا سکتا

فلما اجمعوا علی ھذا ردھا علی ولد فاطمۃ وکتب بذلک (تاریخ یعقوبی ج ۳ ص ۱۹۶) جب علماء نے ان کی صدق بیانی پر اتفاق کیا تو مامون نے فدک اولاد فاطمہ کے حوالے کر دیا اور ایک نوشتہ بھی لکھ دیا"۔

اس طرح جناب سیدہ کے دعوائے میراث کو رد کرنے کا کوئی جواز نہ تھا اس لئے کہ حضرت ابوبکر نے جس حدیث سے اپنے عمل کی صحت ثابت کی وہ قرآن کے عمومات کے صریحاً خلاف ہے۔ قرآن مجید کا واضح حکم ہے:۔

ولکل جعلنا موالی مما ترک الوالدان والاقربون جو ترکہ ماں باپ اور اقرباء چھوڑ جائیں ہم نے ان کے وارث قرار دیئے ہیں"

اس آیت کے عموم کی رو سے ترکہ رسول کو صدقہ قرار دے کر نفی ارث کا کوئی جواز نہیں ہے اگر اموال رسول صدقہ ہوتے تو پیغمبر اکرم کے لئے ان پر قبضہ رکھنا جائز ہی نہ تھا بلکہ جس وقت ان کی ملکیت میں آتے اسی وقت انہیں اپنی ملکیت سے الگ کر کے ان کے اصلی حقداروں کے حوالے کر دیتے مگر پیغمبر ان اموال پر ایک مالک کی طرح قابض و متصرف رہے بیشک آنحضرت ان اموال سے عزیز و اقارب اور فقراء و مساکین کی پرورش بھی کرتے تھے لیکن صرف خیر سے ملکیت کی نفی لازم نہیں آتی کہ ان مصارف

کی آڑ لے کر ملکیت سے انکار کر دیا جائے۔ اس ملکیت سے تو حضرت ابو بکر کو بھی انکار نہ تھا اگر انہیں ملکیت رسول سے انکار ہوتا تو حدیث لا نورث کا سہارا ڈھونڈنے کے بجائے یہ کہتے کہ فدک رسول اللہ کی ملکیت ہی کب تھا کہ اسے ترکہ قرار دے کر ورثہ کو دیئے جانے کا سوال پیدا ہو ظاہر ہے کہ ملکیت کے بغیر وراثت کی نفی کے کوئی معنی ہی نہیں ہوتے۔ جب پیغمبر کی ملکیت بلاشبہ ثابت ہے تو آیات میراث کی رو سے وارثوں کا حق بھی مسلم ہوگا۔ یہ حق ایک ایسی حدیث کی رو سے ساقط نہیں ہو سکتا جو حضرت ابو بکر کے علاوہ نہ کسی نے سُنی ہو نہ روایت کی ہو اور نہ فدک کے علاوہ مملوکات رسول میں کہیں اس پر عملدر آمد ہوا ہو حالانکہ اس حدیث کے الفاظ ما ترکناہ صدقۃ کے عموم کا تقاضا یہ تھا کہ پیغمبر کی تمام متروکہ اشیا کو صدقۂ عمومی قرار دیا جاتا اور منقولہ و غیر منقولہ اشیاء میں کوئی تفریق نہ کی جاتی۔ مگر منقولہ اشیاء کا پیغمبر کے وارثان سے بازگشت سے مطالبہ نہیں کیا جاتا صرف فدک کو اس حدیث کا مورد قرار دے لیا جاتا ہے اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس حدیث کا تعلق صرف اراضی و غیر منقولہ اشیاء سے تھا تو پھر ازواج رسول سے ان کے گھروں کو بھی واپس لے لینا چاہیئے تھا مگر ان سے واپسی کا مطالبہ تو درکنار ان کے مالکانہ حقوق تسلیم کئے جاتے ہیں اور اسی حق ملکیت کی بناء پر حجرۂ رسول میں دفن ہونے کے لئے حضرت عائشہ سے اجازت طلب کی جاتی ہے اور امام حسن کے دفن کے موقع پر ام المومنین نے بھی واشگاف لفظوں میں کہا۔

البیت بیتی و لا اذن ان یدفن فیہ۔ (تاریخ ابو الفداء ج۲ ص۱۸۳) — "یہ گھر میرا گھر ہے اور میں اجازت نہیں دیتی کہ وہ اس گھر میں دفن کئے جائیں۔"

اس مقام پر اگر یہ کہا جائے کہ وہ حجرے ازواج رسول کی ملکیت قرار پا چکے تھے اور اسی ملکیت کی بنا پر آیۂ قرآنی وقرن فی بیوتکن (اپنے گھروں میں ٹک کر بیٹھی رہو) میں ان گھروں کی نسبت ازواج کی طرف دی گئی ہے تو نہ یہ دعوی صحیح ہے اور نہ اس آیت سے ازواج رسول کی ملکیت پر استدلال صحیح ہے اس لئے کہ اگر اس آیت میں گھروں کی اضافت ازواج کی طرف ہے تو دوسری آیت میں ان گھروں کی نسبت رسول کی طرف بھی ہے

یا ایھا الذین امنوا لا تدخلوا بیوت النبی الا ان یوذن لکم۔ — "اے ایمان لانے والو نبی کے گھروں میں داخل نہ ہو مگر یہ کہ تمہیں اجازت دی جائے۔"

جب قرآن مجید میں ان گھروں کی اضافت ازواج کی طرف بھی ہے اور رسول اللہ کی طرف بھی تو اگر یہ اضافت ملکیت کی بنا پر ہو تو ایک چیز کے واقع میں دو مالک تو ہو نہیں سکتے لہذا ان دو اضافتوں میں سے ایک اضافت ملکیت کی بناء پر ہوگی اور ایک ان گھروں میں رہائش کی بنا پر۔ ظاہر ہے کہ پیغمبر کی طرف یہ اضافت ملکیت کی بنا پر ہوگی اور ازواج کی طرف رشتۂ زوجیت اور سکونت کی بنا پر اور عربی زبان میں ادنیٰ سا لگاؤ بھی صحت اضافت کے لئے کافی سمجھا جاتا ہے۔ اور اگر ازواج کے حق ملکیت کو تسلیم کر لیا جائے تو یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ ان کی ملکیت میں کیونکر آئے کیا رسول اللہ انہیں ہبہ کر گئے تھے تو اس صورت میں ان سے ہبہ کے گواہوں کا مطالبہ کیوں نہیں کیا گیا اور اگر کسی اور ذریعہ سے ان کی طرف منتقل ہوئے تھے تو وہ ذریعہ

کیا تھا۔ ورنہ یہی سمجھا جائے گا کہ یہ حدیث صرف جناب سیدہؑ کو فدک سے محروم کرنے کے لئے وضع کی گئی تھی۔

اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ پیغمبر کے ترکہ کا کوئی وارث نہ تھا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ پیغمبر متعلقہ افراد کو بے خبر رکھتے بلکہ آنحضرت نے جہاں میراث کے تمام احکام و جزئیات بیان فرمائے وہاں واضح طور پر انہیں یہ بتا دیتے کہ ان کے منقولہ و غیر منقولہ ترکہ کا کوئی وارث نہیں ہو گا۔ اگر تمام افراد کو اس پر مطلع کرنے میں کوئی امر مانع تھا تو کم از کم حضرت علی کو جنہیں اپنا وصی مقرر کیا تھا بتا جاتے اس لئے کہ یہ وصایت آنحضرت کی نیابت و جانشینی سے متعلق تھی یا اُن کے مالیات اور لین دین کے معاملات سے یا احکام شریعت سے اور ان سب صورتوں میں انہیں اپنے ترکہ کے حکم شرعی سے آگاہ کرنا ضروری تھا تاکہ وُہ اموال جو عامۃ المسلمین کے مفاد کے لئے تھے تصرف ناجائز سے محفوظ رکھے جا سکیں اگر اپنے وصی سے مخفی رکھنے میں کوئی مصلحت تھی تو اپنی عزیز ترین بیٹی ہی کو بتا جاتے کہ وُہ ان کے ترکہ میں سے کسی چیز کی وارث نہیں ہیں تاکہ وُہ اس چیز کا مطالبہ نہ کرتیں جس کا انہیں کوئی حق نہ تھا لیکن آنحضرت اپنی بیٹی کو بھی کچھ نہیں بتاتے اور انہیں بھی بے خبر رہنے دیتے ہیں جس کے نتیجہ میں انہیں سر دربار جھٹلائے جانے کی تلخیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ اگر بیٹی کو بتانے میں بھی کوئی امر مانع تھا تو اپنی بیویوں ہی کو بتا جاتے جو آپ کے ترکہ میں آٹھویں حصہ کی وارث تھیں مگر ان سے بھی یہ امر پوشیدہ رکھا جاتا ہے اور اسی بے خبری کی بنا پر انہوں نے حضرت عثمان کی وساطت سے اپنے حصہ کا مطالبہ کرنا چاہا چنانچہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں :۔

ان ازواج النبی حین توفی رسول اللہ اردن ان یبعثن عثمان ابن عفان الی ابی بکر فیسألنہ میراثھن من النبی قالت عائشہ لھن الیس قد قال رسول اللہ لا نورث ما ترکنا فھو صدقۃ۔	جب رسُول وفات پا گئے تو ازواج نبی نے چاہا کہ عثمان ابن عفان کو ابوبکر کے پاس بھیجیں اور اُن سے پیغمبر اکرم کی میراث کا مطالبہ کریں۔ حضرت عائشہ نے کہا کیا نبی اکرم یہ نہیں فرما گئے کہ ہم کسی کو وارث نہیں بناتے ہم جو چھوڑ جاتے ہیں وُہ صدقہ ہوتا ہے "۔

(صحیح مسلم۔ ج۲۔ ص۹۱)

اگر یہ حدیث ازواج رسُول کے گوشگزار ہو چکی ہوتی تو وُہ کبھی رسول اللہ کے ترکہ سے میراث طلب کرنے کا ارادہ نہ کرتیں اور اگر حضرت عثمان مطلع ہوتے تو مطالبۂ میراث کے لئے نظر انتخاب اُن پر نہ پڑتی۔ البتہ حضرت عائشہ ازواج رسُول سے یہ کہتی ہیں کہ پیغمبر نے فرمایا تھا کہ ہم کسی کو وارث نہیں بناتے۔ حضرت عائشہ کی یہ آواز حضرت ابوبکر ہی کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے ورنہ حضرت عائشہ کا نظریہ تو یہ تھا کہ میراث رسُول کے بارے میں حضرت ابوبکر کے علاوہ کسی کو کچھ معلوم ہی نہ تھا۔

چنانچہ ان کا قول ہے:۔

اختلفوا فی میراثہ فما وجدنا عند احد من ذلک علما فقال ابو بکر سمعت رسول اللہ یقول انا معاشر الانبیاء لا نورث ما ترکناہ صدقۃ۔

لوگوں نے پیغمبر کی میراث میں اختلاف کیا تو ہم نے ایک فرد کو بھی نہ پایا جسے اس مسئلہ کا علم ہوتا۔ البتہ ابو بکر نے کہا کہ میں نے رسول اللہ کو فرماتے سُنا ہے کہ ہم گروہ انبیاء کسی کو اپنا وارث نہیں بناتے ہم جو چھوڑ جاتے ہیں وُہ صدقہ ہوتا ہے۔"

(تاریخ الخلفاء ص ۵۴)

اگر تمام انبیاء سے نفی ارث کرنے کے بجائے صرف پیغمبر اکرم کے ورثہ کی نفی کی جاتی تو شاید کچھ بات بن جاتی اور اسے بھی آنحضرت کے خصائص میں سے قرار دے کر اس پر سکوت اختیار کر لیا جاتا مگر جب تمام نبیوں کے بارے میں یہ حکم لگا دیا گیا کہ ان کا کوی وارث ہوتا ہی نہیں ہے تو ذہن میں اطمینانی کیفیت پیدا ہونے کے بجائے بے اعتمادی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ سوال پیدا ہوُے بغیر نہیں رہتا کہ کیا انبیاء سابقین نے کسی موقع پر اپنے ورثہ کی نفی کی تھی اور اپنے وارثوں کو بتا گئے تھے کہ وُہ ان کے ترکہ کے حقدار نہیں ہیں اور کیا حضرت آدم سے لے کر حضرت عیسٰی تک تمام انبیاء کے وارث ورثہ سے محروم چلے آ رہے تھے اور نبوّت کو بھی کفر و قتل کی طرح موانع ارث میں سے شمار کیا جاتا تھا؟ عقل و انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اگر انبیاء کی اولاد ورثہ سے محروم ہی چلی آ رہی تھی تو اسے پردۂ خفا میں نہ رہنا چاہیئے تھا بلکہ امم سابقہ میں اس کی شہرت ہوتی ان کے صحف و کتب میں اس کا تذکرہ ہوتا ان کے علماؤ احبار کو اس کا علم ہوتا مگر کتب آسمانی ہوں یا کتب تاریخ و حدیث ایک کتاب بھی ایسے نبی کی نشاندہی نہیں کرتی جس کے وارث نبوت کی بنا پر محروم الارث قرار دیئے گئے ہوں بلکہ اس کے بر عکس قرآن مجید نے واضح لفظوں میں بیان کیا ہے کہ انبیاء کی میراث ان کے وارثوں کو پہنچتی ہے۔ چنانچہ حضرت داؤد کی وراثت کے بارے میں ارشاد ہے:۔

وورث سلیمان داؤد۔ "سلیمان (اپنے باپ) داؤد کے وارث ہوُے"۔

اس آیت میں یہ تاویل کی گئی ہے کہ اس سے ورثہ مالی مراد نہیں ہے بلکہ علم و نبوت کا ورثہ مراد ہے حالانکہ علم و نبوت وُہ ترکہ نہیں ہے جو وارثوں کو وراثت میں ملتا ہے۔ علاوہ بریں ورثہ وُہ ہوتا ہے جو مورث کے اٹھ جانے کے بعد وارث کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ اور حضرت سلیمان حضرت داؤد کی زندگی ہی میں علم و نبوّت پر فائز ہو چکے تھے لہذا اس سے ورثہ مالی ہی مراد ہو سکتا ہے جو حضرت داؤد کے بعد انہیں حاصل ہوا ابن قتیبہ نے تحریر کیا ہے:۔

توفی داؤد علیہ السلام وورث — داؤد علیہ السلام نے وفات پائی تو حضرت سلیمان

سلیمان ملکہ۔ (اخبار الطوال۔ صت۲) "ان کے ملک کے وارث ہوئے"۔

محمد ابن سائب کلبی بیان کرتے ہیں:۔

ان الصافنات الجیاد المعروضۃ علی سلیمان ابن داؤد علیہما السّلام کانت الف فرس ورثہا من ابیہ۔ (عقد الفرید۔ جلد۔ صت۴۲)۔

"وُہ عمدہ اور اصیل گھوڑے جو حضرت سلیمان کے سامنے پیش کئے گئے تھے وُہ ایک ہزار گھوڑے تھے جو سلیمان نے اپنے باپ سے میراث میں پائے تھے"۔

اسی طرح حضرت زکریّا کی زبانی قرآن مجید میں ارشاد ہے:۔

انی خفت الموالی من ورائی وکانت امرأتی عاقراً فھب لی من لدنک ولیا یرثنی و یرث من آل یعقوب واجعلہ رب رضیّا۔

"میں اپنے بعد اپنے بنی اعمام سے خطرہ محسوس کرتا ہوں اور میری بیوی بھی بانجھ ہے اے اللہ تو مجھے اپنی طرف سے ایک وارث عطا کر جو میرا اور آلِ یعقوب کا ورثہ پائے اور اے میرے پروردگار تو اسے پسندیدہ قرار دے"۔

اس آیت میں بھی ورثہ سے علم و نبوّت کا ورثہ مراد لینا صحیح نہیں ہے اس لئے کہ نہ علم و نبوّت میں وراثت کارفرما ہوتی ہے اور نہ نبوت کوئی موروثی چیز ہے اگر اس سے علم و نبوّت کا ورثہ مراد لیا جائے تو حضرت زکریا نے جس خوف و خطر کا اظہار کیا ہے بے معنی ہو جاتا ہے اس لئے کہ علم و نبوّت کے متعلق ابناءِ اعمام سے خطرہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کیا انہیں یہ خطرہ تھا کہ وُہ نبوّت پر حملہ آور ہو کر اُسے چھین لے جائیں گے اور زبردستی اس پر قابض و متصرّف ہو جائیں گے یا یہ اندیشہ تھا کہ نبوّت کی عدم صلاحیت کے باوجود انہیں نبوت مل جائے گی۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی چیز کا خطرہ نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا اس لئے کہ نبوت عطیۂ قدرت ہے جو نہ چھن سکتی ہے اور نہ کسی نااہل کو مل سکتی ہے البتہ اندیشہ ہو سکتا تھا تو اس بات کا کہ اولاد نہ ہونے کی صورت میں وُہ ان کے املاک و اموال پر قابض ہو جائیں گے اور حضرت زکریا یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کا ترکہ ان کے بنی اعمام کی طرف منتقل ہو اس لئے نہیں کہ انہیں مال دُنیا سے محبّت و وابستگی تھی بلکہ اس لئے کہ وُہ ان کی بے راہرویوں کو دیکھتے ہوئے یہ سمجھتے تھے کہ اگر یہ مال ان کے ہاتھ لگا تو وُہ اسے غلط کاریوں اور گناہ کے کاموں میں صرف کریں گے اس بناء پر انہوں نے ایک ایسے وارث کی دُعا مانگی جو خدا کے نزدیک پسندیدہ ہو تاکہ اس مال کو فسق و فجور میں صرف کرنے کے بجائے امور خیر میں صرف کرے اور ایک نبی کی کمائی نیک کاموں میں لگے۔

ان واضح شہادتوں کے بعد حدیث کی آڑ لے کر یہ کہنا کہ انبیاء کا کوئی وارث نہیں ہوتا حقائق سے عمداً گریز کرنا ہے جبکہ قرآن کے مقابلہ میں فرد واحد کی بیان کردہ حدیث کا کوئی وزن نہیں ہے اور اس حدیث

کا وزن ہی کیا ہو سکتا ہے جس کی صحت سے بنت رسُول اور وصئ رسُول نے انکار کر دیا ہو۔ اگر جناب فاطمہ نے اس حدیث کو حدیث رسُول سمجھا ہوتا تو کوی وجہ نہ تھی کہ وُہ حضرت ابوبکر پر غضبناک ہوتیں بلکہ اس سلسلہ میں انہیں مجبور و معذور قرار دیتیں۔ اور اگر حضرت علی نے اس حدیث کو مانا ہوتا تو جناب سیدّہ کی ہمنوائی کرنے کے بجائے انہیں اس بے محل ناراضگی سے منع کرتے بلکہ واقعات سے تو یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ خود حضرت ابوبکر کو بھی اس حدیث کی صحت پر اعتماد نہ تھا اور نہ اُن کے بعد آنے والے خلفاء نے اس کی صحت کو تسلیم کیا۔ چنانچہ ابتداء میں حضرت ابوبکر نے جناب فاطمہؑ کا حق وراثت تسلیم کر لیا اور دستاویز لکھ کر بھی دے دی مگر حضرت عمر کے دخل دینے سے انہیں اپنا فیصلہ بدلنا پڑا۔ علامہ حلبی تحریر کرتے ہیں:۔

کتب لها بفدك ودخل عليه عمر فقال ما هذا فقال كتاب كتبته لفاطمة ميراثها من ابيها قال ماذا تنفق على المسلمين وقد حاربتك العرب كما ترى ثم اخذ عمر الكتاب فشقه۔ (سیرۃ حلبیہ ج۳۔ ص۴۰۰)۔

حضرت ابوبکر نے جناب فاطمہ کو فدک کی دستاویز لکھ دی اتنے میں حضرت عمر آئے اور پوچھا کہ یہ کیا ہے حضرت ابوبکر نے کہا کہ میں نے فاطمہ کے لئے میراث کا وثیقہ لکھ دیا ہے جو انہیں باپ کی طرف پہنچتی ہے۔ حضرت عمر نے کہا کہ پھر مسلمانوں پر کیا صرف کرو گے جبکہ اہل عرب تم سے جنگ کے لئے آمادہ ہیں اور یہ کہہ کر حضرت عمر نے وُہ تحریر چاک کر ڈالی۔"

اگر حضرت ابوبکر کو اس حدیث کی صحت پر یقین ہوتا اور وُہ یہ سمجھتے کہ پیغمبر اکرم کا کوی وارث نہیں ہے تو اس حدیث کے پیش نظر اسی وقت فدک سے انکار کر دیتے اور وثیقہ تحریر کرنے کی نوبت نہ آتی۔ اور حضرت عمر مانع ہوُے تو اس بنا پر نہیں کہ جناب سیدہ کا دعوائی وراثت غلط ہے اور انبیاء کا کوی وارث نہیں ہوتا بلکہ ملکی ضروریات اور جنگی مصارف کے پیش نظر انہوں نے فدک روک لینے کا مشورہ دیا۔ اگر حضرت عمر کے نزدیک یہ حدیث قابل اعتماد و وثوق ہوتی تو وُہ پیش آمدہ جنگی ضروریات کو وجہ قرار دینے کے بجائے اس حدیث کی بنیاد پر مطالبہ کرتے اور یہ کہتے کہ یہ دعوٰی بنیادی طور پر غلط ہے اور فدک دینے کا کوی جواز نہیں ہے کیونکہ پیغمبر کا ترکہ مصالح عامہ کے لئے وقف ہوتا ہے اور وارثوں کو دیئے جانے کا کوی سوال پیدا نہیں ہوتا خواہ حکومت کو اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔ اس موقع اگرچہ حضرت عمر نے دستاویز چاک کی فدک کے دینے میں سدّ راہ ہوُے مگر حضرت ابوبکر کی پیشکردہ حدیث سے ان کی ہمنوائی ظاہر نہیں ہوتی اور کتب اہلسنت میں تو یہاں تک درج ہے کہ انہوں نے اپنے دور میں حق وراثت تسلیم کرتے ہوُے فدک حضرت علی اور عباس ابن عبدالمطلب کے سپرُد کر دیا تھا۔ چنانچہ یاقوت حموی نے تحریر کیا ہے:۔

کان علی ابن ابی طالب والعباس ابن عبد المطلب یتنازعان فیھا فکان علی یقول ان النبی جعلھا فی حیاتہ لفاطمۃ وکان العباس یابی ذلک و یقول ھی ملک لرسول اللہ و انا وارثہ فکانا یتخاصمان الی عمر فیابی ان یحکم بینھما ویقول انتما اعرف بشانکما اما انا فقد سلمتھا الیکما۔

(معجم البلدان۔ ج ۱۴۔ ص ۲۳۹)۔

حضرت علی اور عباس ابن عبد المطلب میں فدک کے بارے میں تنزاع پیدا ہوی حضرت علی کہتے تھے کہ رسُول خدا نے اپنی زندگی میں فدک جناب فاطمہؑ کو دے دیا تھا اور عباس اس سے انکار کرتے تھے اور کہتے تھے کہ فدک رسُول اللہ کی ملکیت تھا اور میں ان کا وارث ہوں۔ یہ جھگڑا حضرت عمر تک پہنچا انہوں نے کہا کہ تم اپنے معاملات کو بہتر سمجھتے ہو میں نے تو اسے تمہارے حوالے کر دیا ہے"

اس روایت کی رُو سے حضرت علی اور عباس میں مابہ النزاع یہ امر تھا کہ فدک ہبہ ہے یا ترکہ۔ حضرت علی کا موقف یہ تھا کہ آنحضرت نے فدک جناب فاطمہ کو ہبہ کر دیا تھا اور عباس کا دعوٰی یہ تھا کہ یہ ترکہ ہے اور میں عم رسُول ہونے کی حیثیت سے اُن کا وارث ہوں۔ اس صورت میں تصفیہ طلب یہ امر تھا کہ یہ ہبہ ہے یا ترکہ یا ان دونوں میں سے ایک بھی نہیں ہے بلکہ صدقہ عمومی ہے۔ اگر حضرت عمر کی نظروں میں ہبہ ثابت تھا تو حضرت علی کے حوالے کرتے اور اگر صدقہ تھا تو اسے مسلمانوں کے مشترکہ مال کی حیثیت سے باقی رہنے دیتے مگر انہوں نے نہ تنہا حضرت علی کے حوالے کیا کہ اسے ہبہ قرار دیا جائے اور نہ اسے مشترکہ صورت میں باقی رہنے دیا کہ اُسے صدقہ سمجھا جائے بلکہ ان دونوں کے سپرد کر دیا جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ انہوں نے نہ اسے ہبہ سمجھا اور نہ صدقہ بلکہ ترکہ اور مال موروث قرار دیا۔ اس فیصلہ سے ظاہر ہے کہ اگر وہ حدیث 'لا نورث' کو قابل اعتماد سمجھتے تو فدک پر میراث کا حکم جاری نہ کرتے۔ بعض لوگوں نے یہاں بھی تاویل کا سہارا ڈھونڈا ہے اور یہ کہا ہے کہ حضرت عمر نے فدک بر بنائے میراث نہیں دیا تھا بلکہ ان دونوں کو اپنا وکیل قرار دے کر اس سے فائدہ اٹھانے کا حق دیا تھا۔ اگر ایسا ہی تھا تو حضرت عمر یہ کہہ سکتے تھے کہ میں نہ اسے ہبہ تسلیم کرتا ہوں اور نہ اسے ترکہ و مال موروث سمجھتا ہوں لیکن تم دونوں کو وکیل متصرف قرار دیتا ہوں کہ اس سے استفادہ کرو۔ جب حضرت عمر نے ایسا نہیں کہا تو اس کو بر بنائے وکالت سمجھنا دعوی بلا دلیل اور ایک رکیک تاویل ہی تو ہے۔

اس روایت سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمر نے حق وراثت تسلیم کر لیا اور جہاں تک فدک کی عملاً واپسی کا تعلق ہے واقعات مابعد سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی بلکہ اس کی حیثیت ایک لاوارث مال کی ہو کر

رہ گئی اور برسراقتدار طبقہ نے جس طرح چاہا اس میں تصرف کیا اور جسے چاہا عطائے خسروانہ کے طور پر دے دیا۔ چنانچہ حضرت عثمان کا دور آیا تو انہوں نے ۳۰ھ میں اپنے داماد مروان کو عطا کر دیا۔ مورخ ابو الفداء نے تحریر کیا ہے:۔

واقطع مروان ابن الحکم فدك وهی صدقة رسول الله صلی الله علیه وسلم التی طلبتها فاطمة میراثا۔ (تاریخ ابو الفداء جلد ۱ ص ۱۶۸)	حضرت عثمان نے فدک مروان کو بطور جاگیر دے دیا حالانکہ وہ رسول اللہ کا صدقہ تھا جسے فاطمہ نے میراث میں طلب کیا تھا۔

جب معاویہ ابن ابی سفیان برسراقتدار آئے تو انہوں نے فدک اپنی تحویل میں لے کر ایک تہائی مروان کے نام پر رہنے دیا اور ایک تہائی عمر ابن عثمان اور ایک تہائی اپنے بیٹے یزید کے نام منتقل کر دیا اور جب مروان کو اقتدار حاصل ہوا تو اس نے دوبارہ تمام اراضی فدک پر قبضہ کر لیا اور اپنے بیٹے عبدالعزیز کو ہبہ کر دیا اور جب عمر ابن عبدالعزیز کو وراثت میں ملا تو انہوں نے اولاد فاطمہ کے حوالے کر دیا۔ چنانچہ یاقوت حموی نے تحریر کیا ہے:۔

فلما ولی عمر ابن عبد العزیز الخلافة کتب الی عامله بالمدینة یامره برد فدك الی ولد فاطمة رضی الله عنها۔ (معجم البلدان۔ ج ۱۴ ص ۲۳۹)	جب عمر ابن عبد العزیز خلافت پر فائز ہوئے تو انہوں نے عامل مدینہ کو ایک تحریر کے ذریعہ حکم دیا کہ وہ فدک فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد کو واپس کر دے۔

عمر ابن عبدالعزیز کے اس عملی اقدام سے ظاہر ہے کہ انہوں نے حدیث لا نورث کو قابل اعتماد نہیں سمجھا اور سابقہ خلفائے کے فیصلہ کو صریحاً غلط قرار دیا۔ ان کا یہ اقدام قابل صد تحسین ہے کہ انہوں نے حق و انصاف کے تقاضوں کو پورا کیا اور جناب سیدہ کا غصب شدہ حق ان کی اولاد کے سپرد کر کے ایک عظیم ذمہ داری سے سبکدوش ہوئے۔ لیکن ان کے بعد وہی ہوا جو ان سے پہلے ہوتا چلا آرہا تھا اور یزید ابن عبدالملک نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد فدک بنی فاطمہ سے واپس لے لیا اور بنی مروان کے دور تک خلفاء بنی امیہ ہی کے قبضہ میں رہا۔ جب اموی دور ختم ہو گیا اور ابو العباس سفاح تخت خلافت پر متمکن ہوا تو اس نے فدک عبداللہ ابن حسن ابن حسن ابن علی کے حوالے کر دیا۔ سفاح کے بعد منصور دوانیقی نے اپنے دور حکومت میں اسے اولاد حسن سے واپس لے لیا لیکن مہدی ابن منصور نے پھر فاطمیین کے سپرد کر دیا۔ اس کے بعد جب موسی ابن مہدی برسراقتدار آیا تو اس نے پھر حکومت کی تحویل میں لے لیا اور مامون رشید کے دور تک خلفاء بنی عباس ہی کے تصرف میں رہا۔ مامون نے تخت حکومت پر بیٹھنے کے بعد ماہ ذیقعدہ ۲۱۰ھ میں عامل مدینہ قثم ابن جعفر کو

تحریر کیا:-

قد كان رسول الله اعطى فاطمة بنت رسول الله فدك وتصدق بها عليها وكان ذلك امرا ظاهرا معروفا لا اختلاف فيه بين ال رسول الله ولم تزل تدعى منه ما هو اولى به من صدق عليه فرأى امير المومنين ان يردها الى ورثتها ويسلمها اليهم تقربا الى الله تعالى باقامة حقه وعدله والى رسول الله بتنفيذ امره و صدقته فامر باثبات ذلك فى دواوينه والكتاب به الى عماله فلأن كان ينادى فى كل موسم بعد ان قبض الله نبيه ان يذكر كل من كانت له صدقة او هبة او عدة ذلك فيقبل قوله وينفذ عدته ان فاطمة رضى الله عنها لاولى بان يصدق قولها فيما جعل رسول الله لها وقد كتب امير المومنين الى المبارك الطبرى مولى امير المومنين يامره برد فدك على ورثة فاطمة بنت رسول الله بحدودها وجميع حقوقها المنسوبة اليها وما فيها من الرقيق والغلات وغیرذالک۔ (فتوح البلدان ص۴۲)

رسول اللہ نے فدک اپنی بیٹی جناب فاطمہ کو عطا کیا تھا اور یہ ایسی کھلی ہوی اور واضح بات ہے جس کے متعلق آل رسول میں کوی اختلاف نہیں ہے۔ فدک امیرالمومنین (مامون) سے اسی امر کا متقاضی ہے جو رسول اللہ سے ان کے صدق و خلوص کے لحاظ سے مناسب تر ہے لہذا امیرالمومنین (مامون) نے یہی مناسب سمجھا ہے کہ فدک ان لوگوں کو جو اس کے صحیح وارث ہیں واپس دیا جائے اور ان کے حوالے کیا جائے اور اس طرح اللہ کے قائم کردہ حق و انصاف کے تقاضوں پر عمل اور رسول اللہ کے حکم اور اُن کے صدقہ کا نفاذ کر کے اللہ و رسول سے تقرب حاصل کریں۔ لہذا وُہ حکم دیتے ہیں کہ یہ فیصلہ ان کے دفتروں میں درج کر دیا جائے اور ان کے عمال کو اس کی اطلاع پہنچا دی جائے۔ جب وفات پیغمبر کے بعد ایسا ہوتا تھا کہ ہر حج کے موقع پر یہ اعلان کیا جاتا تھا کہ جسے کوی صدقہ دیا گیا ہو یا کوی چیز ہبہ کی گئی ہو وُہ آکر مطالبہ کرے اور اس کی بات مانی جاتی تھی اور وعدہ پُورا کیا جاتا تھا تو جناب فاطمہ بدرجۂ اولی مستحق تھیں کہ اس چیز کے بارے میں جو رسُول اللہ ان کے لئے مخصوص کر گئے تھے ان کی بات صحیح سمجھی جاتی۔ امیر المومنین (مامون) نے اپنے آزاد کردہ غلام مبارک طبری کو تحریری حکم دیا ہے کہ وُہ فدک کو اس کے مقررہ حدود اور ان تمام حقوق سمیت جو اسے حاصل ہیں مع غلاموں اور غلہ وغیرہ کے حضرت فاطمہ کے وارثوں کو واپس لوٹا دے"۔

چنانچہ مامون کے حسب فرمان فدک بنی فاطمہ کے حوالے کر دیا گیا اور جب متوکل عباسی نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تو پھر اُسے واپس لے لیا۔ بلاذری نے تحریر کیا ہے :۔

فلما استخلف المتوکل علی اللہ رحمہ اللہ أمر بردھا الی ما کانت علیہ قبل المامون۔	جب متوکل خلیفہ ہوا تو اس نے حکم دیا کہ فدک کو اسی حالت پر پلٹا دیا جائے جس حالت پر مامون سے پہلے تھا۔"

(فتوح البلدان۔ صا۴۶)

اس ردوبدل کو دیکھتے ہوئے کہ فدک پر کبھی حکومت وقت قابض ہے اور کبھی وابستگان حکومت کبھی بنی فاطمہ کی تحویل میں دے دیا جاتا ہے اور کبھی اُن سے واپس لے لیا جاتا ہے تو اس میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ حضرت ابوبکر کی پیش کردہ حدیث کی صحت پر اتفاق نہ تھا۔ اگر اسے قابل وثوق و اعتماد سمجھا گیا ہوتا تو فدک کسی دور میں بھی اولاد فاطمہ کی تحویل میں نہ دیا جاتا تا آخر عمر ابن عبد العزیز ایسا احساس دین رکھنے والا" اور مامون ایسا ذی اقتدار شہنشاہ اور بعض دوسرے خلفاء نے اس کے کسی کمزور پہلو کو دیکھ کر ہی فدک سے دستبرداری کا اعلان کیا ہوگا ورنہ ان کا مفاد تو اسی میں تھا کہ اس حدیث کی آڑ لے کر اس پر اپنا قبضہ باقی رکھتے جس طرح بعض خلفاء نے اس حدیث کا سہارا لیتے ہوئے اپنا قبضہ برقرار رکھا تھا۔

فتنۂ ارتداد

سقیفۂ بنی ساعدہ کی ہنگامی بیعت کے بعد اہل مدینہ کی اکثریت نے حضرت ابوبکر کی بیعت کر لی اور جمہوری نقطۂ نظر سے ان کی خلافت قائم ہو گئی مگر اطراف و جوانب میں جب یہ خبر نشر ہوی تو ناراضگی کی عام لہر پھیل گئی اور قبائل عرب کے دلوں میں بے چینی اور ذہنوں میں تشویش انگیز اضطراب نے جگہ لے لی جس نے ان کے احساسات کو متاثر کر کے حکومت سے عدم تعاون پر آمادہ کر دیا اور چند قبائل مرتدین کے پرچموں کے نیچے بھی جمع ہو گئے اور ہر طرف سے مخالفت کے طوفان امنڈ آئے۔ اس ہنگامہ و شورش میں قریش اور بنی ثقیف کے علاوہ قریب قریب تمام قبائل عرب شامل ہو گئے۔ ابن اثیر نے تحریر کیا ہے :۔

ارتدت العرب وتضرمت الارض نارا وارتدت کل قبیلۃ عامۃ اوخاصۃ الاقریشا وثقیفا۔	اہل عرب مرتد ہو گئے اور سرزمین عرب فتنہ و فساد کی آگ سے بھڑک اٹھی قریش اور بنی ثقیف کے علاوہ ہر قبیلہ تمام کا تمام یا اس میں کا ایک خاص گروہ مرتد ہو گیا۔"

(تاریخ کامل۔ ج۲۔ ص۲۳۱)

حضرت ابوبکر کے دور حکومت میں جن مرتدین نے سر اٹھایا ان کے سرگروہ پیغمبر اسلام کی زندگی ہی میں مرتد ہو چکے تھے چنانچہ اسود عنسی مسیلمہ کذاب اور طلیحہ ابن خویلد نے آنحضرت کے زمانۂ حیات ہی میں

اسلام سے منحرف ہو کر دعویٰ نبوت کیا اسود عنسی آنحضرت کی زندگی کے آخری دنوں میں فیروز دیلمی کے ہاتھ سے مارا گیا اور اس کے پیروکاروں نے بعد میں شرانگیزی کی۔ مسیلمہ حضرت ابوبکر کے دور میں لڑتا ہوا وحشی کے ہاتھ سے قتل ہوا اور طلیحہ نے حضرت عمر کے دور میں اسلام قبول کر لیا۔ اسی طرح علقمہ ابن علاثہ اور سلمیٰ بنت مالک نے پیغمبر کے دور میں ارتداد اختیار کیا اور آنحضرت کے بعد لشکر کشی کی البتہ لقیط ابن مالک پیغمبر کے بعد مرتد ہوا اور سجاح بنت حارث نے بھی آپ کی وفات کے بعد دعویٰ نبوت کیا۔ لقیط نے مسلمانوں سے بُری طرح شکست کھائی اور سجاح مسیلمہ کا ضمیمہ بن کر رہ گئی اور اس سے نکاح کر کے بقیہ زندگی گمنامی میں گزار دی۔ یہ تھے وہ مرتدین جنہوں نے حضرت ابوبکر کے دورِ حکومت میں ہنگامہ آرائی کی اور جن قبائل کو منکرین زکوٰۃ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے وہ یہی مدعیان نبوت اور اُن کے متبعین تھے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر نے طلیحہ ابن خویلد کے وفد ہی کے بارے میں کہا تھا:۔

لو منعونی عقالا لجاھدتھم علیہ۔ "اگر انہوں نے اس رسّی کے دینے سے بھی انکار کیا جس سے اُونٹ کے پیر باندھے جاتے ہیں تو میں اُن سے جہاد کروں گا"۔

(تاریخ طبری۔ ج۳۔ ص۲۴۶)۔

یہ فتنۂ ارتداد پیغمبر کی زندگی ہی میں اُٹھ کھڑا ہوا تھا اور بعد میں چند ایک قبائل بھی اس رو میں بہہ گئے لیکن یہ کہنا کہ پیغمبر کے بعد قریش و ثقیف کے علاوہ تمام قبائل مرتد ہو گئے نہ صرف خلاف واقع ہے بلکہ اسلام کی صداقت پر بھرپور حملہ ہے۔ یہ کیونکر قرین قیاس ہو سکتا ہے کہ پیغمبر کے انتقال کے فوراً بعد تمام قبائل یکلخت اسلام سے منحرف ہو کر مرتد ہو جائیں۔ کیا یہ قبائل اسلام کے فتوحات اور مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے مرعوب ہو کر اسلام لائے تھے اور پیغمبر کی رحلت سے مرعوبیت کا تاثر ختم ہو گیا تو اسلام کا جُوا اپنی گردنوں سے اُتار پھینکا۔ اس سے تو ان لوگوں کے نظریہ کو تقویت حاصل ہو گی جو یہ کہتے ہیں کہ اسلام کی اشاعت پیغمبر کی پُرامن تبلیغ کا نتیجہ نہ تھی بلکہ عربوں کو بنوک شمشیر مسلمان بنایا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ بعض قبائل سے جنگ چھیڑنے اور انہیں تہ تیغ کرنے کے لئے ارتداد کا نیا معیار بنا لیا گیا اور ان قبائل کو بھی مرتدین میں شمار کر لیا گیا جو اللہ کی وحدانیت اور پیغمبر کی رسالت کا عقیدہ رکھتے تھے مگر حاکم وقت کی بیعت بحیثیت خلیفہ رسول کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ اسی جرم کی پاداش میں انہیں ارتداد کی سند دے دی گئی اور اسلام سے خارج تصور کر لیا گیا۔ چنانچہ عمرو ابن حریث نے سعید ابن زید سے پوچھا کہ تم رسُول اللہ کی وفات کے موقع پر موجود تھے کہا کہ ہاں میں موجود تھا۔ پوچھا کہ حضرت ابوبکر کی بیعت کس دن ہوی کہا اسی دن جس دن رسُول خدا نے رحلت فرمائی پوچھا کسی نے اختلاف تو نہیں کیا کہا:۔

لا الا مرتد او کاد ان یرتد۔ "کسی نے اختلاف نہیں کیا مگر اس نے جو مرتد تھا یا مرتد ہونے والا تھا"۔

(تاریخ طبری۔ ج۳۔ ص۲۰۷)۔

یہ جواب اس امر کا غماز ہے کہ جنہوں نے حضرت ابوبکر کی بیعت سے انکار کیا تھا انہیں ذہنی طور پر مرتد یا مرتد ہونے والا قرار دے لیا گیا تھا حالانکہ اس انکار بیعت کے علاوہ کوئی اور چیز نظر نہیں آتی جس سے ان کا ارتداد ثابت ہوتا ہو۔ جہاں تک زکوٰۃ کے روک لینے کا تعلق ہے تو ان لوگوں نے جب حضرت ابوبکر کی خلافت ہی کو تسلیم نہیں کیا تو انہیں زکوٰۃ دینے سے بھی انکار کیا ہوگا۔ اس اعتبار سے انہیں مانعین زکوٰۃ کہا جا سکتا ہے مگر مرتدین اور منکرین زکوٰۃ کہنے کا کوئی جواز نہیں ہے کیونکہ انہوں نے زکوٰۃ کے وجوب اور اس کی مشروعیت سے انکار نہیں کیا بلکہ حکومت کو زکوٰۃ دینے سے مانع ہوئے۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ وُہ نمازیں پڑھتے تھے اور کسی نے ان پر ترک صلوٰۃ کا الزام عائد نہیں کیا اگر وُہ زکوٰۃ کے منکر ہوتے تو نماز کا بھی منکر ہونا چاہیئے تھا کیونکہ قرآن مجید میں ۸۲ مواقع پر نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ایک ساتھ ہوا ہے اور دونوں کو یکساں اہمیت دی گئی ہے تو پھر یہ کیونکر تصوّر کیا جا سکتا ہے کہ وُہ نماز کے وجوب کا عقیدہ رکھتے ہُوئے زکوٰۃ کی مشروعیت اور اس کے وجوب سے انکار کر دیں گے۔ البتہ اگر وُہ زکوٰۃ کے وجوب کا انکار کرتے تو ضروریات دین میں سے ایک امر ضروری کے انکار سے ان پر حکم ارتداد عائد ہوتا مگر زکوٰۃ روک لینے اور اسے حکومت کی تحویل میں نہ دینے سے انہیں مرتد نہیں کہا جا سکتا بلکہ اگر وُہ سرے سے زکوٰۃ ادا ہی نہ کرتے اور اس فریضۂ الٰہی کے تارک ہوتے جب بھی ان پر کفر و ارتداد کا حکم نہیں لگایا جا سکتا کیونکہ کسی امرِ واجب کے ترک سے ارتداد لازم نہیں آتا اور نہ اُن سے جنگ کا جواز پیدا ہوتا ہے اور نہ ان کا قتل مباح ہو سکتا ہے۔ اسی بنا پر جب حضرت ابوبکر نے ان لوگوں کے خلاف قدم اُٹھانا چاہا تو صحابہ کبار نے حضرت ابوبکر کی رائے سے اختلاف کرتے ہُوئے اس اقدام کی شدید مخالفت کی اور حضرت عمر نے بھی واضح لفظوں میں کہا:-

یا ابا بکر کیف تقاتل الناس	اے ابوبکر تم ان لوگوں سے کس بنا پر جنگ کرو گے
وقد قال رسول اللہ امرت	جبکہ رسُول اللہ فرما گئے ہیں کہ مجھے لوگوں سے اس
ان اقاتل الناس حتی یقولوا	وقت تک جنگ کرنے کی اجازت دی گئی ہے
لا الہ الا اللہ فقد عصم منی	جب تک وُہ کلمۂ توحید نہیں پڑھتے اور کسی حق
مالہ ونفسہ الا بحقہ وحسابہ	کے علاوہ ان کی جانیں اور ان کا مال محفوظ ہے
علی اللہ۔ (اتمام الوفاء صفحہ ۲۴)۔	اور ان کا حساب اللہ کے ذمّہ ہے۔

مگر اس موقع پر نہ صحابہ کے متفقہ فیصلہ کو درخور اعتنا سمجھا گیا نہ حضرت عمر کی بات مانی گئی اور حضرت ابوبکر نے اپنے موقف پر برقرار رہتے ہُوئے خالد ابن ولید کو قبائل عرب پر تاخت و تاراج کے لیے بھیج دیا چنانچہ انہوں نے مالک ابن نویرہ اور ان کے قبیلہ بنی یربوع کا قتل عام کر کے تاریخ اسلام میں ایک سیاہ باب کا اضافہ کیا اور بلا امتیاز سب کو اپنی تلوار کی زد پر رکھ لیا اور انہیں بے دست و پا کر کے

موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

مالک ابن نویرہ قبیلۂ بنی یربوع کے ایک بلند پایہ سردار تھے اور بنی یربوع کی کسی فرد کو ان کے حکم سے سرتابی کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ مدینہ منورہ میں پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام لائے اور انہی سے آداب مذہب و احکام شریعت سیکھے۔ آنحضرت نے ان کی دیانت پر وثوق و اعتماد کرتے ہوئے انہیں صدقات کی وصولی پر عامل مقرر کیا تھا۔ ابن اثیر نے تحریر کیا ہے:۔

بعث مالك ابن نويرة على صدقات بني حنظلة۔

آنحضرت نے مالک ابن نویرہ کو بنی حنظلہ کے صدقات کی وصولی پر مامور فرمایا تھا۔"

(تاریخ کامل۔ ج ۲۔ ص ۲۰۵)۔

ان کی سخاوت و شجاعت اور ہمت و جوانمردی ضرب المثل کی حیثیت رکھتی تھی۔ چنانچہ عرب میں بطور مثل کہا جاتا تھا "فتی ولا کمالك۔ جوان تو ہے مگر مالک ایسا کہاں"۔ ان کے مہمان خانہ میں رات بھر آگ روشن رہتی تھی۔ اگر کوئی بھولا بھٹکا مسافر ان اطراف میں آجاتا تو آگ کو دیکھ کر ادھر چلا آتا تھا۔ اگر کسی کے ہاں کوئی مہمان آتا تو اسے اپنے ہاں لے آتے اور اس طرح مسافر نوازی و مہمان پروری کا ثبوت دیتے۔ پیغمبر اسلام کے آخر زمانۂ حیات تک صدقات جمع کر کے بھجواتے رہے اور جب آنحضرت کے انتقال کی خبر ملی تو زکوٰۃ کی جمع آوری سے دستبردار ہو گئے اور اپنے قبیلہ والوں سے کہا کہ مال زکوٰۃ اس وقت تک اپنے پاس محفوظ رکھو جب تک یہ نہ معلوم ہو جائے کہ مسلمانوں کا اقتدار قابل اطمینان ہاتھوں میں آیا ہے۔ انہی ایام میں سجاح بنت حارث نے چار ہزار کی جمعیت کے ساتھ مدینہ پر چڑھائی کا ارادہ کیا جب وہ لشکر کی قیادت کرتے ہوئے بنی یربوع کی بستی بطاح کے قریب جبرون میں پہنچی تو اس نے مالک کو صلح کا پیغام بھیجا اور اُن سے ترک جنگ کا معاہدہ کیا۔ ابن اثیر نے لکھا ہے:۔

وكانت سجاح تريد غزو ابي بكر فارسلت الى مالك ابن نويرة تطلب الموادعة فاجابها وردها عن غزو ابي بكر وحملها على احياء من بني تميم فاجابته۔

سجاح نے حضرت سے ابوبکر سے جنگ کا ارادہ کیا اور مالک ابن نویرہ کو پیغام بھجوایا اور ان سے مصالحت و ترک جنگ کے معاہدہ کی خواہش کی جسے مالک نے قبول کیا اور اسے حضرت ابوبکر سے جنگ آزما ہونے سے باز رکھا اور اسے بنی تمیم کے قبیلوں پر حملہ آور ہونے کی ترغیب دی جسے سجاح نے منظور کیا"۔

(تاریخ کامل۔ ج ۲۔ ص ۲۳۹)

اس وقتی مصالحت اور معاہدہ ترک جنگ کو کسی صورت میں ارتداد سے تعبیر کرنا صحیح نہیں ہے۔ چنانچہ ابن اثیر جزری تحریر کرتے ہیں:۔

لما توفی النبی وارتدت العرب وظهرت سجاح وادعت النبوۃ صالحها الا انہ لم تظھر عنہ ردۃ۔	جب نبی اکرم وفات پا گئے اور اہل عرب مرتد ہو گئے اور سجاح نے دعوی نبوت کیا تو مالک نے اس سے مصالحت کی لیکن ان سے کوی ایسی چیز ظاہر نہیں ہوی جسے ارتداد کہا جا سکے۔"

(اسد الغابہ۔ ج۳۔ ص۹۶)

اس معاہدۂ صلح میں یہ مصلحت کار فرما تھی کہ سجاح کو غیر مسلم قبائل سے جنگ میں الجھا کر مرکز اسلام مدینہ پر حملہ آور ہونے سے روکا جا سکے۔ چنانچہ وُہ اس مصالحت کے ذریعہ اسے روکنے میں کامیاب ہو گئے اور اس کا رخ بنی تمیم کی بستیوں کی طرف موڑ کر اس سے علیحدہ ہو گئے۔ اگر اسے جرم قرار دیا جائے تو تنہا مالک اس کے مرتکب نہ ہوے تھے بلکہ وکیع ابن مالک جو انہی قبائل میں صدقات کی جمع آوری پر متعین تھے اس معاہدہ صلح میں شامل تھے لیکن ان سے کوی مواخذہ نہیں کیا گیا اور مالک اور اس کے قبیلہ بنی یربوع کو مرتد قرار دے دیا گیا اور خالد ابن ولید نے انہیں قتل و غارت کرنے کے لئے بطاح پر چڑھائی کر دی مالک نے بنی یربوع کو ادھر ادھر منتشر کر دیا تھا خالد نے ان کے تعاقب میں لشکر روانہ کیا اور انہیں گرفتار کر کے لایا گیا۔ جب بنی یربوع نے یہ صورت دیکھی تو انہوں نے ہتھیار سنبھال لئے۔ ابو قتادہ انصاری نے جو خالد کے لشکر میں شریک تھے انہیں ہتھیار باندھے ہوُے دیکھا تو کہا:۔

انا المسلمون فقالوا و نحن المسلمون فقلنا و ما بال السلاح معکم قالوا لنا ما بال السلاح معکم قلنا فان کنتم کما تقولون فضعوا السلاح قال فوضعوھا ثم صلینا و صلوا	ہم مسلمان ہیں انہوں نے کہا کہ ہم بھی مسلمان ہیں۔ کہا کہ پھر یہ ہتھیار کیوں باندھ رکھے ہیں انہوں نے کہا تم کیوں ہتھیار لئے ہوے ہو ہم نے کہا کہ اگر تم اپنے قول کے مطابق مسلمان ہو تو ہتھیار اتار ڈالو۔ چنانچہ انہوں نے ہتھیار اتار دیئے پھر ہم نے بھی نماز ادا کی اور انہوں نے بھی نماز پڑھی"۔

(تاریخ طبری۔ ج۳۔ ص۵۰۳)

جب بنی یربوع سے ہتھیار اتروا لئے گئے تو مالک ابن نویرہ کو گرفتار کر کے خالد کے سامنے لایا گیا مالک کی گرفتاری پر ان کی بیوی ام تمیم بنت منہال ان کے پیچھے باہر نکل آئی۔ ابن واضح یعقوبی لکھتے ہیں:۔

اتبعتہ امرأتہ فلما رآھا اعجبتہ	ان کی بیوی ان کے پیچھے پیچھے آئی خالد نے اسے دیکھا تو انہیں پسند آ گئی"

(تاریخ یعقوبی۔ ج۲۔ ص۱۱۰)

مالک جو خالد کی خو بو سے واقف تھے انہیں تیور برے نظر آئے تو سمجھ گئے کہ انہیں سنگ راہ سمجھ کر کسی بہانے راستے سے ہٹا دیا جائے گا۔ ابن حجر عسقلانی تحریر کرتے ہیں:۔

روی ثابت ابن قاسم فی الدلائل ان خالدا رأی امرأة مالك وکانت فائقة فی الجمال فقال مالك قتلتنی۔ (اصابہ ج۳۔ ص۳۳۷)۔

ثابت ابن قاسم دلائل میں روایت کرتے ہیں کہ جب خالد نے مالک کی بیوی کو دیکھا کہ جو حُسن وجمال میں بے مثال تھی تو مالک نے اس سے مخاطب ہو کر کہا کہ تو نے میرے قتل کا سروسامان کر دیا ہے"۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا اور خالد نے ایک بہانہ تلاش کر لیا جس سے قتل کا جواز پیدا کر لیا گیا اور وُہ یہ کہ گفتگو کے دوران مالک کی زبان سے ایک آدھ بار یہ جملہ نکلا:۔

ما اخال صاحبکم الا قال کذا وکذا۔ (تاریخ کامل ج۲ ص۲۴۳)۔

میرا خیال یہ ہے کہ تمہارے صاحب (ابوبکر) نے ایسا اور ایسا کہا ہوگا"۔

اس پر خالد نے بگڑ کر کہا کہ تم انہیں بار بار ہمارا صاحب کہتے ہو کیا تم انہیں اپنا صاحب نہیں مانتے اور ساتھ ہی ضرار ابن ازور کو اشارہ کیا کہ انہیں قتل کر دے چنانچہ اس نے آگے بڑھ کر تلوار چلائی اور انہیں قتل کر دیا۔ پھر سپاہ خالد بنی یربوع پر ٹوٹ پڑی اور دیکھتے ہی دیکھتے بارہ سو افراد موت کے گھاٹ اُتار دیئے گئے اور کٹے ہوئے سروں کے چولہے بنا کر ان پر دیگچیاں چڑھا دی گئیں۔ علامہ طبری نے تحریر کیا ہے:۔

ان اھل العسکر اثفوا برؤسھم القدور۔ (تاریخ طبری ج۲۔ ص۵۰۳)۔

لشکر والوں نے ان کے سروں کے چولہے بنا کر ان پر دیگچیاں چڑھا دیں"۔

اس قتل وخونریزی اور مظاہرہ بربریت کے بعد خالد ابن ولید نے مالک کی بیوی ام تمیم کے سلسلہ میں مزید اخلاق سوزی کا ثبوت دیا جس سے لشکر میں عام نفرت پھیل گئی اور ابوقتادہ انصاری اتنا متاثر ہوئے کہ خالد کا ساتھ چھوڑ کر مدینہ چلے آئے۔

وقد کان عھد اللہ ان لا یشھد مع خالد ابن الولید حربا ابدا بعدھا۔ (تاریخ طبری ج۲۔ ص۵۰۳)

اور اللہ سے یہ عہد کیا کہ وُہ اس کے بعد کبھی خالد ابن ولید کے ساتھ کسی جنگ میں شریک نہیں ہوں گے"۔

ابوقتادہ کی واپسی پر جب اس افسوسناک واقعہ کی خبر عام ہوی تو اہل مدینہ نے خالد کے اس فعل پر نفرین وملامت کی اور حضرت عمر بھی انتہائی برافروختہ ہوئے۔ چنانچہ جب خالد پلٹ کر آئے اور بڑی شان وشکوہ اور فاتحانہ انداز سے عمامہ میں تیر آویزاں کئے ہوئے مسجد میں داخل ہوئے تو حضرت عمر نے بڑھ کر ان کے عمامہ سے تیر کھینچ لئے اور توڑ پھوڑ کر پیروں تلے روند ڈالے اور بگڑ کر کہا:۔

قتلت امرأ مسلما ثم نزوت علی امرأته واللہ لارجمنك باحجارك۔ (تاریخ طبری۔ ج۲۔ ص۵۰۳)	تم نے ایک مرد مسلمان کو قتل کیا پھر اس کی بیوی پر مجرمانہ حملہ کیا۔ خدا کی قسم میں تمہیں سنگسار کروں گا۔"

حضرت عمر یہ چاہتے تھے کہ خالد کو زنا کے جرم میں سنگسار کیا جائے یا مالک کے قصاص میں قتل کیا جائے یا کم از کم انہیں معزول کر دیا جائے مگر حضرت ابو بکر نے یہ کہہ کر ٹال دیا:۔

هيه يا عمر تاول فاخطأ فارفع لسانك عن خالد۔ (تاریخ طبری ج۲۔ ص۵۰۳)۔	ٹھہرو اے عمر اس نے تاویل کی اور اس میں غلطی کی لہٰذا اس کے بارے میں لب کشائی نہ کرو۔"

اس واقعہ کے بعد مالک کے بھائی متمم ابن نویرہ مدینہ میں آئے۔ نماز صبح مسجد میں ادا کی اور نماز سے فارغ ہو کر اپنے بھائی کے فراق میں چند دردناک اشعار پڑھے۔ اور جب یہ شعر پڑھا:۔

ادعوته باللہ ثم قتلته لو هو دعاك بذمة لم يغدر

"تم نے اللہ کے نام پر اسے بلایا اور پھر اس سے غدر و بے وفائی کی اگر وہ تمہیں کسی امر کی دعوت دیتا تو کبھی بے وفائی نہ کرتا۔"

تو حضرت ابو بکر نے کہا کہ ماغدرته وما قتلته۔ "میں نے نہ اسے قتل کیا ہے اور نہ اس سے غداری کی ہے۔" اور پھر حکم دیا کہ اس بے گناہ خون کی دیت بیت المال سے ادا کی جائے۔ ابن اثیر نے لکھا ہے:۔

فامر ابو بكر برد السبي وودی مالكا۔ (تاریخ کامل۔ ج۲۔ ص۲۴۳)۔	حضرت ابو بکر نے حکم دیا کہ اسیروں کو واپس کیا جائے اور مالک کے خون کی دیت ادا کی۔"

ان واقعات کو دیکھنے کے بعد اس یکطرفہ جنگ کو جہاد سے تعبیر کرنا اسلامی جہاد کے مفہوم کو بدل دینے کے مترادف ہے۔ کیا اسلام اس کی اجازت دیتا ہے کہ مسلمانوں کو نہتا کر کے انہیں تہ تیغ کر دیا جائے ان کے کٹے ہوئے سروں سے چولہوں کا کام لیا جائے اور ان کی عزت و حرمت کو پامال کیا جائے۔ یہ اقدام نہ صرف اسلامی تعلیمات کے منافی تھا بلکہ حضرت ابو بکر کے صریحی احکام کے بھی خلاف تھا۔ حضرت ابو بکر نے خالد کو یہ ہدایت کر دی تھی کہ اگر کسی بستی سے اذان و اقامت کی آواز آئے تو اس پر حملہ نہ کیا جائے۔ چنانچہ علامہ طبری نے لکھا ہے:۔

وكان مما اوصى به ابو بكر اذا نزلتم منزلا فاذنوا و اقيموا فان اذن القوم واقاموا	حضرت ابو بکر نے منجملہ اور ہدایتوں کے ایک ہدایت یہ کی تھی کہ جب کسی مقام پر اترو تو اذان و اقامت کہو اگر وہاں کے لوگ بھی اذان و اقامت

فکفوا عنہم۔ (تاریخ طبری۔ ج۲۔ ص۵۰۲) کہیں تو ان پر حملہ آور ہونے سے باز رہو "۔
مگر یہاں ابو قتادہ انصاری عبداللہ ابن عمر اور دوسرے مسلمان بنی یربوع کو اذان و اقامت دیتے اور نمازیں پڑھتے دیکھتے ہیں اور اُن کے اسلام کی گواہی دیتے ہیں مگر اس کے باوجود انہیں بے دریغ قتل کر دیا جاتا ہے۔ علامہ طبری نے لکھا ہے:۔

وکان ممن شہد لمالك بالاسلام	ان لوگوں میں سے جنہوں نے مالک ابن نویرہ کے
ابو قتادہ الحارث ابن ربعی۔	اسلام کی گواہی دی تھی ایک ابو قتادہ حارث ابن
(تاریخ طبری۔ ج۲۔ ص۵۰۳)۔	ربعی تھے "۔

انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ غلط اقدام کو غلط سمجھا جائے اور ایک فرد کے اقدام کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے مسلمانوں کی ایک جمعیت کے ارتداد پر زور نہ دیا جائے کیا کسی مسلمان کو مرتد قرار دے لینا کوئی جرم نہیں ہے اگر خالد صحابی رسُول تھے تو مالک اور ان کے ہمراہی بھی تو زمرۂ صحابہ میں شامل تھے تعجب ہے کہ یہ مان لینے میں کوئی باک نہیں ہوتا کہ پیغمبر کے بعد ارتداد ہمہ گیر ہوگیا اور قبیلوں کے قبیلے اسلام سے منحرف ہو کر مرتد ہو گئے اور یہ کہنا گوارا نہیں کیا جاتا کہ انہوں نے ارتداد اختیار نہیں کیا بلکہ اس اقتدار کو تسلیم نہیں کیا جو ان کے سروں پر جمہوریت کے نام سے مسلط کر دیا گیا تھا۔ کیا اس انکار خلافت کے علاوہ کسی ایسی چیز کی نشاندہی کی جاسکتی ہے جس سے ان کا ارتداد ظاہر ہوتا ہو۔ رہا ادائے زکوٰۃ سے انکار تو وُہ انکار خلافت ہی کا لازمہ تھا اس لئے کہ جب ان کے نزدیک حکومت ہی ناجائز تھی تو اس کی تحویل میں زکوٰۃ دینا کیونکر جائز ہو سکتا تھا ورنہ وُہ نمازیں پڑھتے زکوٰۃ دیتے اور احکام اسلام پر کاربند تھے۔ چنانچہ حضرت عمر نے بھی ان کے اسلام کا اعتراف کیا اور حضرت ابو بکر نے بھی ان پر جرم ارتداد عائد نہیں کیا۔ اگر حضرت ابو بکر انہیں مرتد سمجھتے تو خالد ابن ولید کے بارے میں تاول فاخطأ (تاویل کی اور اس میں غلطی کی)، کے بجائے تاول فاصاب (تاویل کی اور درست کیا) کہتے اور متمم ابن نویرہ کے طلب قصاص پر یہ کہتے کہ قصاص کیسا وُہ تو ارتداد کے جرم میں قتل کئے گئے ہیں لیکن یہ کہنے کے بجائے بیت المال سے ان کی دیت دے کر ان کے اسلام کا اعتراف کرتے ہیں ورنہ کوئی وجہ جواز نہ تھی کہ ایک مرتد کے خون کی دیت بیت المال سے ادا کی جاتی۔ البتہ انہوں نے خالد کے جرم سے چشم پوشی کی اور اسے خطائے اجتہادی کے پردہ میں چھپا دیا۔ عموماً خطائے اجتہادی کی آڑ وہیں لی جاتی ہے جہاں جرم کو چھپانا اور مجرم کو جرم کی پاداش سے بچانا مقصود ہوتا ہے۔ ورنہ اسلام کے ایک واضح اور صریحی حکم کے خلاف اجتہاد کے معنی ہی کیا ہوتے ہیں۔ اگر اس قسم کے جرائم کی پردہ پوشی اجتہاد کے ذریعہ ہو سکتی ہے تو پھر دنیا میں کوئی جرم، جرم ہی نہ رہے گا اور بڑے سے بڑے جرم کو خطائے اجتہادی کہہ کر ٹال دیا جائے گا۔
یہ اسلام میں پہلا دن تھا جب تاویل کا سہارا لے کر ایک مجرم کی جرم پوشی کی گئی اور اس کے بعد تو

تاویل کا دروازہ پاٹوں پاٹ کھول دیا گیا اور ہر جرم کے لئے تاویل کی گنجائش پیدا کر لی گئی۔ چنانچہ تاریخ ایسے واقعات کی نشاندہی کرتی ہے جہاں خطائے اجتہادی کی آڑ میں ہزاروں مسلمانوں کے خون بہائے گئے سینکڑوں بستیاں نذر آتش کی گئیں اور شہروں کے شہر تباہ و برباد کر دیئے گئے مگر کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس کے خلاف زبان کھول سکے کیونکہ یہ تمام حوادث خطائے اجتہادی کا نتیجہ تھے اور خطائے اجتہادی جرم نہیں ہے خواہ نص صریح کو پس پشت ڈال کر محرمات کا ارتکاب کیا جائے یا مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جائے۔

حیرت ہے کہ حضرت ابو بکر نے کس اصول کی بنا پر خالد کے جرم کو تاویل کی غلطی کا نتیجہ قرار دیا اور انہیں مؤاخذہ سے بالاتر سمجھ لیا کیا قتل مسلم کے عدم جواز میں اور بیوہ کے لئے عدہ یا کنیز کے لئے استبراء کے وجوب میں عقل ورائے سے تاویل کی گنجائش نکل سکتی ہے کہ اسلام کے صریحی احکام کی خلاف ورزی کو خطائے اجتہادی قرار دے لیا جائے اور شریعت کو شخصی رجحانات اور ذاتی خواہشات کے تابع کر دیا جائے۔ بہرحال جرم، جرم ہے اور خطائے اجتہادی سے نہ کسی مسلمان کے قتل کو جائز قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ کسی امر حرام کو سبک ثابت کیا جا سکتا ہے۔ ابن ابی الحدید معتزلی نے باوجودیکہ خالد کی برائت ثابت کرنے کے لئے ہاتھ پیر مارے ہیں مگر آخر میں یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے:۔

ولست انزہ خالدا عن الخطأ واعلم انه کان جبارا فاتکا لا یراقب الدین فیما یحمله علیه الغضب وھوی نفسه ولقد وقع منه فی حیات رسول الله صلے الله علیه وآله مع بنی جذیمة اعظم ما وقع منه فی حق مالك ابن نویرة وعفا عنه رسول الله بعد ان غضب علیه مدة و اعرض عنه وذلك العفو ھو الذی اطمعه حتی فعل ببنی یربوع ما فعل بالبطاح۔

(شرح نہج البلاغہ۔ ج ۴۔ ص ۱۸۷)

میں خالد کو جرم سے بری قرار نہیں دیتا اور یہ سمجھتا ہوں کہ وہ جابر و سفاک تھا جس چیز پر اسے طیش اور نفسانی خواہش ابھارتی وہ اس میں دین کا لحاظ نہ کرتا تھا۔ چنانچہ پیغمبر اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ کی زندگی میں بنی جذیمہ کے ساتھ جو اس نے کیا وہ اس سے کہیں بڑھ کر تھا جو مالک ابن نویرہ کے ساتھ کیا۔ رسول اللہ ایک عرصہ تک اس پر غضبناک رہے اور اس سے منہ پھیرے رکھا۔ پھر درگزر سے کام لیا اور اسی درگزر کی وجہ سے اس کی ہمت بڑھی اور مقام بطاح میں بنی یربوع کے ساتھ وہ کیا جو اس نے کیا۔"

استخلاف

سقیفہ بنی ساعدہ میں جمہوریت پر خلافت کی نیو رکھی گئی تھی وہ جمہوریت جیسی کچھ بھی تھی بعد میں قائم نہ رہ سکی اور نمائندۂ جمہور کے ہاتھوں اس کا تار و پود بکھر گیا اور اس کی جگہ نامزدگی نے لے لی۔ چنانچہ حضرت ابوبکر نے بستر مرگ پر حضرت عمر کو نامزد کرنے کا فیصلہ کر لیا اور عبدالرحمٰن ابن عوف اور حضرت عثمان کو بلا کر ان کا عندیہ دریافت کیا۔ عبدالرحمٰن یہ کہہ کر خاموش ہو گئے کہ آپ کی رائے صائب ہے لیکن ان میں سختی و درشتی کا عنصر غالب ہے اور حضرت عثمان نے اس سے پوری ہمنوائی کی اور اُمت کے لئے اسے فال نیک قرار دیا۔ اس گفت و شنید کے بعد حضرت ابوبکر نے انہیں رخصت کر دیا اور پھر تنہائی میں حضرت عثمان کو وثیقہ خلافت قلمبند کرنے کے لئے طلب کیا جب وثیقہ لکھوانے بیٹھے تو ابھی سرنامہ ہی لکھوایا تھا کہ شدّت مرض سے بیہوش ہو گئے۔ حضرت عثمان جانتے تو تھے ہی کہ کیا لکھوانا چاہتے ہیں انہوں نے اس بے ہوشی کے وقفہ میں لکھ دیا کہ: قد استخلفت علیکم عمر ابن الخطاب "میں نے عمر ابن خطاب کو خلیفہ مقرر کیا ہے"۔ جب غشی سے افاقہ ہوا تو پوچھا کہ کیا لکھا ہے حضرت عثمان نے جو لکھا تھا پڑھ کر سُنا دیا۔ کہا کیا تم نے نام لکھنے میں جلدی اس لئے کی ہے کہ مبادا میں لکھوا نہ سکوں اور مسلمانوں میں انتشار و افتراق پیدا ہو جائے کہا کہ ہاں یہی وجہ تھی۔ کہا کہ خدا تمہیں اس کی جزائے خیر دے۔

اس وصیت نامہ کی تحریر کے بعد حضرت عمر کو بلا کر کہا کہ یہ وصیت نامہ اپنے پاس رکھو اور لوگوں سے کہو کہ جو فرمان اس کے اندر ثبت ہے اس پر عمل پیرا ہونے کا عہد و پیمان کریں حضرت عمر نے وہ وصیت نامہ لے لیا اور لوگوں سے عہد لیا کہ وہ دستاویزی حکم کے پابند رہیں گے۔ ایک شخص نے پوچھ لیا کہ اس میں لکھا کیا ہے حضرت عمر نے کہا کہ مجھے اس کا علم نہیں ہے البتہ جو کچھ اس میں درج ہے میں برضا و رغبت اسے تسلیم کروں گا۔ اس شخص نے کہا:۔

لکن واللہ ادری ما فیہ امرتہ عام اول و امرک العام۔ (کتاب الامامۃ والسیاسۃ ج۱ ص۲۳)

"لیکن خدا کی قسم مجھے معلوم ہے کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ تم نے گزشتہ سال انہیں خلیفہ بنایا تھا اور اب وہ تمہیں خلیفہ بنائے جاتے ہیں"۔

جب یہ خبر عام ہوئی تو کچھ لوگ "رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند" کے پیش نظر خاموش رہے اور کچھ لوگوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ چنانچہ مہاجرین و انصار کا ایک گروہ حضرت ابوبکر کے ہاں آیا اور کہا:۔

یا خلیفۃ رسول اللہ ماذا تقول لربک اذا قدمت علیہ وقد استخلفت علینا ابن الخطاب (تلخیص الحبیر ص۲۶۸)

"اے نائب رسول تم نے ابن خطاب کو خلیفہ بنا کر ہم پر حاکم ٹھہرا دیا ہے کل جب پروردگار کے حضور میں پیش ہو گے تو اسے کیا جواب دو گے"۔

طلحہ ابن عبید اللہ نے بھی اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا:۔

استخلفت علی الناس عمر	تم نے لوگوں پر عمر کو خلیفہ و حاکم مقرر کر دیا ہے
وقد رایت ما یلقی الناس	اور تم جانتے ہو کہ تمہارے ہوتے ہوئے لوگوں
منہ وانت معہ فکیف بہ	کو ان کے ہاتھوں کتنی ناگوار صورتوں کا سامنا
اذا خلا بھم وانت لاق ربك	کرنا پڑا۔ اور اب تو انہیں کھلی چھٹی مل جائے گی۔
فسائلك عن رعیتك۔	تم اپنے پروردگار کے حضور جا رہے ہو وہ تم سے
(تاریخ طبری۔ ج۲۔ ص۶۲۱)۔	رعایا کے بارے میں سوال کرے گا"۔

جمہوریت کی نمائش کرنے والی حکومتوں کا شیوہ رہا ہے کہ جب تک اقتدار حاصل نہیں ہوتا بڑے شد و مد سے انتخاب کا حق عوام کے لئے تسلیم کرتے ہیں اور جب اقتدار حاصل ہو جاتا ہے تو پھر حکمران عوام کی مرضی و منشا کو نظر انداز کر کے اقتدار کی قوت سے یہ حق اپنے لئے مخصوص کر لیتے ہیں اور جمہوریت سمٹ کر ایک فرد یا چند افراد میں محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ سقیفۂ بنی ساعدہ کی جمہوریت کا بھی یہی نتیجہ نکلا اور دو ڈھائی برس کی مختصر مدت میں نامزدگی کی صورت میں تبدیل ہو گئی۔ اگر یہ نامزدگی صحیح تھی تو یہ تسلیم کرنا ناگزیر ہو گا کہ خلیفہ کا انتخاب جمہور کی رائے کے تابع نہیں ہے۔ اور اگر جمہور کی رائے ہی سے وابستہ ہے تو اس نامزدگی کو کسی صورت میں صحیح نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ حضرت ابو بکر نمائندہ جمہور تھے اور جمہور نے انہیں سفید و سیاہ کا مالک بنا دیا تھا اسے اگر تسلیم بھی کر لیا جائے تو جمہور نے استخلاف و انتخاب کا حق تو ان کے سپرد نہیں کیا تھا اور نہ کسی جمہوری حکومت میں نمائندہ حکومت کو یہ حق تفویض کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت ابو بکر کا یہ انتخاب رائے عامہ کا ترجمان تھا اور انہوں نے جانچ پرکھ کر یہ اطمینان کر لیا تھا کہ عوام حضرت عمر ہی کو مسند خلافت پر دیکھنا چاہتے تھے۔ اگر ایسا ہی تھا تو رائے عامہ پر اعتماد کرتے اور نام کو صیغۂ راز میں رکھ کر عوام سے عہد اطاعت لینے کے بجائے ان کی رائے پر چھوڑ دیتے یا لوگوں کو اپنے ہاں جمع کر کے اعلان عام کرتے اور ان کا ردعمل دیکھ کر فیصلہ کرتے۔ انہوں نے اس کا اظہار بھی کیا تو حضرت عثمان اور عبد الرحمٰن ابن عوف سے جن میں سے ایک نے مخالفت کو بے سود سمجھ کر ہاں میں ہاں ملا دی اور دوسرے نے اقتدار نو کو اپنی وفاداری کا تاثر دینے کے لئے پُرزور تائید کر دی۔ ان دو آدمیوں کی ہمنوائی کو عوام کی رائے تو نہیں کہا جا سکتا۔ اگر اہل حل و عقد سے مشورہ ہی مطلوب تھا تو عباس ابن عبد المطلب تھے جن کے بارے میں پیغمبر نے فرمایا تھا کہ ھو عمی و بقیۃ ابائی۔ (وہ میرے چچا اور میرے آبا کی یادگار ہیں) حضرت علی بھی موجود تھے جنہوں نے پیغمبر اکرم کا ہاتھ بٹا کر اسلام کو تکمیل کی منزل تک پہنچایا تھا اور تمام آسائشوں کو تج کر اپنی ذات کو اسلام اور اہل اسلام کے مفاد کے لئے وقف کر دیا تھا۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں انہیں بلاوا نہ دینے کا تو عذر تھا کہ پیغمبر کی تجہیز و تکفین کو چھوڑ کر کیسے آتے مگر یہاں مشورہ لینے میں کیا مانع تھا

حیرت ہے کہ غزوات اور دُوسرے معاملات میں تو ان سے مشورے لئے جاتے رہے اور ان کی اصابت رائے اور بلند نفسی کا اعتراف کیا جاتا رہا مگر اس اہم معاملہ میں ان کی رائے کو غیر ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اگر ان کی بے غرضی و بے لوثی پر اعتماد تھا تو ان سے مشورہ لینے میں مضائقہ ہی کیا تھا کیا اس لئے انہیں نظر انداز کیا گیا کہ ارشادات پیغمبر کی روشنی میں اس ثانی ثقلین و سفینۂ نجات کا حق فائق تھا اور انہیں سطوت و اقتدار سے متاثر کر کے اپنا ہمنوا بنایا نہیں جا سکتا تھا۔

بہر حال جنہوں نے سقیفہ کی برائے نام جمہوریت کے آگے سر خم کر کے حضرت ابو بکر کو خلیفہ مان لیا تھا انہوں نے اس نامزدگی کے آگے بھی ہتھیار ڈال دیئے اور حضرت عمر کی خلافت کو تسلیم کر لیا۔ حضرت ابو بکر دو سال تین ماہ اور دس دن مسند خلافت پر متمکن رہنے کے بعد ۲۲ جمادی الثانیہ ۱۳ھ کو دُنیا سے رخصت ہو گئے اور اسی دن حضرت عمر نے زمام حکومت اپنے ہاتھوں میں لے لی۔

شوریٰ

حضرت عمر کو عالم اسلامی کی باگ ڈور سنبھالے دس سال چھ ماہ اور چار دن بیت چکے تھے کہ مغیرہ ابن شعبہ کے غلام ابو لؤلؤہ فیروز نے کسی بات پر بگڑ کر دو دھارے خنجر سے ان پر حملہ کیا اور انہیں بری طرح گھائل کر دیا۔ کچھ لوگ انہیں اٹھا کر گھر میں لائے دوا دارو کے لئے معالج بلایا گیا مگر شکم کا گھاؤ اتنا گہرا تھا کہ جب انہیں نبیذ پلائی گئی تو زخم کے راستے نکل گئی اور جانبر ہونے کی کوئی اُمید نہ رہی۔ اس ناگہانی حادثہ سے ہر شخص حیرت زدہ و دم بخود تھا۔ مسند خلافت خالی اور دس سالہ دورِ اقتدار ختم ہوتا نظر آ رہا تھا لوگ ایک دُوسرے کو مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھتے باہم سرگوشیاں کرتے اور حالات حاضرہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے کہ حضرت عمر اس کاری ضرب سے جانبر تو ہوتے نظر نہیں آتے خلافت کا بار کون اٹھائے گا خلیفہ کا انتخاب کس طرح عمل میں آئے گا کسی کو نامزد کریں گے یا رائے عامہ پر چھوڑ جائیں گے۔ کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ وُہ خود ہی کسی کو مقرر کر جائیں اور ہم انتخاب کے الجھیڑے بکھیڑے میں نہ پڑیں۔ چنانچہ چند اکابر صحابہ حضرت عمر کے ہاں احوال پُرسی کے لئے آئے اور ان کی حالت دگرگوں دیکھ کر انہیں مشورہ دیا کہ کسی کو خلافت کے لئے نامزد کر جائیے۔ حضرت عمر نے حسرت آمیز لہجے میں کہا کہ میں کسے نامزد کر دوں آج ابو عبیدہ زندہ ہوتے تو خلافت ان کے سپرد کر کے مطمئن ہو جاتا اور اللہ مجھ سے پوچھتا تو کہتا کہ میں نے خلافت اس کے سپرد کی ہے جسے تیرے نبی نے امین اُمت کہا تھا یا ابو حذیفہ کا غلام سالم زندہ ہوتا تو یہ منصب اس کے حوالے کرتا اور اللہ سے کہتا کہ میں نے مسلمانوں کی قیادت ایسے شخص کے ہاتھوں میں دی ہے جس کے بارے میں تیرے نبی نے فرمایا تھا کہ وُہ اللہ سے بے حد محبت کرنے والا ہے۔ ابن قتیبہ نے معاذ ابن جبل اور خالد ابن ولید کا نام بھی اس سلسلہ میں لکھا ہے کہ انہیں بھی خلافت کے لئے یاد کیا تھا۔ یزید ابن معاویہ کی ولیعہدی کے محرک اول

مغیرہ ابن شعبہ نے حضرت عمر کو مشورہ دیا کہ وُہ اپنے بیٹے عبداللہ کو نامزد کر جائیں۔ اس پر حضرت عمر نے کہا:۔

قاتلك الله والله ما اردت الله بهذا ويحك كيف استخلف رجلا عجز عن طلاق امرأته۔

(تاریخ طبری۔ ج ۳۔ ص ۱۹۲)

"خدا تمہیں غارت کرے بخدا تم نے یہ بات اللہ کو سامنے رکھ کر نہیں کہی میں اس شخص کو کیسے خلیفہ بنادوں جو اپنی بیوی کو طلاق دینے سے بھی عاجز و بے خبر ہو۔"

ابن حجر مکی نے تحریر کیا ہے:۔

اى لانه فى زمن رسول الله طلقها فى الحيض فقال لعمر مره فيراجعها۔

(صواعق محرقہ۔ ص ۱۰۱)

"یہ اشارہ ہے اس واقعہ کی طرف کہ عبداللہ نے پیغمبر کے زمانہ میں اپنی بیوی کو حالت حیض میں طلاق دے دی تھی جس پر آنحضرت نے حضرت عمر سے کہا کہ اسے کہو کہ وُہ رجوع کرے۔"

حضرت عمر نے مغیرہ کی بات کو رد کرنے کے بعد حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا کہ اگر میں کسی کو خلیفہ مقرر کروں تو کوئی حرج نہیں ہے اس لئے کہ ابو بکر نے مجھے خلیفہ مقرر کیا اور وُہ مجھ سے بہتر تھے۔ اور اگر مقرر نہ کروں تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے اس لئے کہ پیغمبر نے کسی کو جانشین مقرر نہیں کیا اور وُہ ہم دونوں سے بہتر تھے۔ اس عرصہ میں حضرت عائشہ نے عبداللہ ابن عمر کے ذریعہ انہیں یہ پیغام بھجوایا کہ وُہ اُمت کو انتشار و پراگندگی میں چھوڑنے کے بجائے کسی کو خلیفہ مقرر کر جائیں اور خود عبداللہ ابن عمر نے بھی جانشین کی نامزدگی پر زور دیا۔ حضرت عمر نے کہا کہ میں اس معاملہ کے تمام پہلوؤں پر غور کر چکا ہوں اور غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ علی ابن ابی طالب، عثمان ابن عفان، عبدالرحمٰن ابن عوف، سعد ابن ابی وقاص، زبیر ابن عوام اور طلحہ ابن عبیداللہ کو نامزد کر کے ایک مجلس شوریٰ ترتیب دوں۔ پیغمبر اکرم ان افراد سے زندگی کے آخری لمحوں تک راضی و خوشنود رہے یہ اس لائق ہیں کہ اپنے میں سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کر لیں۔ جب تنہائی ہوئی تو کہا کہ اگر یہ لوگ علی کی خلافت پر اتفاق کر لیں تو وُہ امت محمدیہ کو حق و صداقت کی راہ پر چلائیں گے۔ عبداللہ ابن عمر نے کہا کہ اگر علی کے بارے میں آپ کا یہ نظریہ ہے تو انہیں براہِ راست خلیفہ مقرر کر دیجئے۔ کہا:۔

اكره ان اتحملها حيا وميتا۔

(تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص ۲۰)

"مجھے یہ گوارا نہیں ہے کہ میں زندگی و موت دونوں حالتوں میں اس بوجھ کو اٹھاؤں۔"

مجلس شوریٰ کا خاکہ ترتیب دینے کے بعد منتخب ارکان کو اپنے ہاں طلب کیا تاکہ انہیں مجوزہ لائحہ عمل سے آگاہ کریں۔ جب ارکان شوریٰ ان کے ہاں جمع ہوئے تو کہا کہ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم میں سے ہر شخص طالب خلافت ہے اس پر زبیر خاموش نہ رہے اور کہا کہ ہمیں خلافت کی طلب ہونا ہی چاہئے۔ ہم سبقت میں قرابت میں مرتبہ و مقام میں تم سے کم نہیں ہیں۔ اگر تم خلیفہ ہو سکتے ہو تو ہمارے ہاتھوں میں بھی زمام خلافت

آسکتی ہے۔ ابن ابی الحدید نے کہا ہے کہ حضرت عمر زخمی پڑے تھے اس لئے زبیر کا انداز گفتگو بے باکانہ تھا اگر کوئی اور موقع ہوتا تو اس طرح کی بے باکی و جرأت کا مظاہرہ نہ کرتے۔ حضرت عمر اس بات پر تو خاموش رہے البتہ ارکان شوریٰ پر جو تبصرہ کیا اس سے ان کی برہمی کا اظہار ضرور ہوتا ہے۔ چنانچہ زبیر سے مخاطب ہو کر کہا اے زبیر تم حریص تنگدل اور کج خلق ہو۔ غصہ میں ہو تو کافر خوش ہو تو مومن اگر تمہیں خلافت مل گئی تو تم سیر آدھ سیر جو کے لئے لوگوں سے لڑتے جھگڑتے پھرو گے۔ پھر طلحہ کے بارے میں کہا کہ وُہ مغرور اور نخوت پسند ہے اس نے ایک موقع پر ایسی ناسزا بات کہی تھی جس سے پیغمبر اکرم کو بہت دکھ پہنچا تھا اور وُہ ہمیشہ اس سے ناخوش رہے۔ پھر سعد کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا کہ تم تیر انداز تو اچھے ہو مگر خلافت تمہاری زد سے باہر ہے اس لئے کہ تم قبیلۂ بنی زہرہ سے ہو اور بنی زہرہ کو خلافت سے کیا تعلق۔ اور عبدالرحمٰن ابن عوف سے کہا کہ تم آرام طلب اور آسائش پسند ہو اگر تم خلیفہ ہوئے تو خلافت کا کاروبار اپنی بیوی پر چھوڑ دو گے۔

ابن قتیبہ نے یہ الفاظ روایت کئے ہیں:۔

ما یمنعنی منک یا عبد الرحمن	اے عبدالرحمٰن میں تمہیں خلافت دینے کو تو دے دیتا
الا انک فرعون هذه الامة۔	مگر تم اس اُمت کے فرعون ہو"

(الامامة والسیاسه۔ ص۲۴)

حضرت عثمان سے کہا کہ اگر خلافت تمہارے سپرد کی گئی تو تم بنی اُمیہ و بنی عاص کو عوام کی گردنوں پر مسلّط کر دو گے اور بیت المال تمہارے قبیلہ کی جاگیر بن جائے گا۔ اور حضرت علی سے کہا کہ آپ ہر لحاظ سے خلافت کے لئے موزوں اور اس کے اہل ہیں مگر آپ کے مزاج میں ظرافت و خوش طبعی کا عنصر غالب ہے۔

اس نقد و تبصرہ کے بعد ارکان شوریٰ سے کہا کہ تم تین دن کے اندر اندر خلافت کا تصفیہ کر لینا اور حسن ابن علی، عبداللہ ابن عباس اور چند اکابر انصار کو بھی شرکت کی دعوت دینا مگر اُن کا خلافت میں کوئی حصہ نہیں ہے اور ابو طلحہ انصاری مجلس شوریٰ کے ناظم و نگران ہوں گے۔ اور ابو طلحہ کو یہ ہدایت کی کہ میرے انتقال کے بعد ارکان شوریٰ کو حضرت عائشہ کے حجرہ میں جمع کرنا اور انہیں پابند کر دینا کہ وُہ مقررہ مدت کے اندر خلافت کا فیصلہ کر لیں اور اس عرصہ میں امامت نماز کے فرائض صہیب رومی انجام دیں۔ اگر تمام ارکان باتفاق رائے ایک کو خلیفہ منتخب کر لیں تو بہتر ورنہ پانچ ایک طرف ہوں اور ایک مخالف ہو تو اس ایک کو قتل کر دینا اور اگر چار متفق ہوں اور دو مخالف ہوں تو ان دو کو قتل کر دینا۔ اور اگر تین ایک طرف ہوں اور تین ایک طرف تو میرے بیٹے عبداللہ کو ثالث ٹھہرانا وہ جس فریق کے بارے میں رائے دے خلیفہ کا انتخاب اس فریق میں سے کیا جائے۔ اور عبداللہ کو یہ تلقین کی:۔

یا عبد الله ابن عمر ان اختلف	اے عبداللہ اگر قوم میں اختلاف ہو تو تم اکثریت کا

القوم فکن مع الاکثروان کانوا ثلاثۃ وثلاثۃ فاتبع الحزب الذی فیہ عبدالرحمٰن۔	ساتھ دینا اور اگر تین ایک طرف ہوں اور تین ایک طرف تو تم اس فریق کا ساتھ دینا جس میں عبدالرحمٰن ہو۔"

(تاریخ طبری۔ ج ۳۔ ص ۲۶۵)

حضرت عمر تین دن موت و حیات کی کشمکش میں رہنے کے بعد دُنیا سے چل بسے۔ جب تجہیز و تکفین سے فراغت ہوی تو حضرت عائشہ کے حجرہ میں یا عبدالرحمٰن ابن عوف کے بھانجے مسور ابن مخرمہ کے مکان پر مجلس شوریٰ منعقد ہوی اور ابوطلحہ پچاس آدمیوں کی ایک جمعیت کے ساتھ دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ مغیرہ ابن شعبہ اور عمرو ابن عاص بھی اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے کے لئے دروازے پر آکر بیٹھ گئے۔ سعد ابن ابی وقاص نے انہیں دھرنا مار کر بیٹھے دیکھا تو ان پر کنکریاں پھینکیں اور کہا۔

تریدان ان تقولا حضرنا وکنا فی اھل الشوریٰ۔ (تاریخ طبری ج ۳۔ ص ۲۹۵)	"تم یہ چاہتے ہو کہ تمہیں یہ کہنے کا موقع ملے کہ ہم بھی اہل شوریٰ میں شامل تھے۔"

یہ دونوں ڈھیلے کھا کر وہاں سے چل دیئے اور شوریٰ کی کارروائی شروع ہو گئی۔ طلحہ اور سعد نے اپنا حق رائے دہندگی حضرت عثمان کو دے دیا اور زبیر نے اپنا حق حضرت علی کے حوالے کر دیا اب علی عثمان اور عبدالرحمٰن تین اُمیدوار رہ گئے۔ عبدالرحمٰن نے علی اور عثمان سے کہا کہ تم دونوں میں سے ایک اپنے حق سے دستبردار ہو کر بقیہ دو میں سے ایک کو منتخب کرنے کا حق لے لے یا میں اپنے حق سے دستبردار ہو کر تم دونوں میں سے ایک کو منتخب کئے لیتا ہوں علی اور عثمان دونوں میں سے کوی اپنے حق سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہ ہُوا عبدالرحمٰن نے کہا کہ پھر مجھے ثالث مان لو۔ حضرت عثمان عبدالرحمٰن کی ثالثی پر فوراً رضامند ہو گئے۔ حضرت علی نے انہیں ثالث تسلیم کرنے میں توقف کیا جب آپ پر زور دیا گیا تو فرمایا کہ میں اس صورت میں تمہاری ثالثی منظور کر سکتا ہوں کہ تم یہ عہد کرو کہ خواہش نفس سے مغلوب ہو کر حق سے بے راہ نہیں ہوگے اور قرابت و عزیزداری کا پاس نہیں کرو گے۔ عبدالرحمٰن نے کہا ..... کہ ہاں ایسا ہی ہوگا اور میں وہی فیصلہ کروں گا جو حق و انصاف کا تقاضا ہو گا۔ جب عبدالرحمٰن نے ثالثی کا اختیار لے لیا تو ارکان شوریٰ کے ساتھ مہاجرین و انصار کو مسجد میں جمع کیا اور ان سے کہا کہ تم کسے خلیفہ منتخب کرنا چاہتے ہو عمار ابن یاسر نے مہاجرین و انصار سے کہا کہ اگر تم لوگ یہ چاہتے ہو کہ مسلمانوں میں اختلاف و انتشار پیدا نہ ہو تو علی کی بیعت کر لو۔ مقداد ابن اسود نے اس کی تائید کی اور کہا کہ اگر تم علی کی بیعت کرو گے تو ہم اسے برضا و رغبت منظور کریں گے۔ عبداللہ ابن ابی سرح اور عبداللہ ابن ابی ربیعہ نے عثمان کے بارے میں رائے دی اس پر عمار اور ابن ابی سرح میں تلخ کلامی کی نوبت آگئی۔ عبدالرحمٰن نے جب بات بڑھتے دیکھی تو کہا لے لوگو خاموش ہو جاؤ۔ پھر حضرت

علی سے مخاطب ہو کر کہا:۔

علیك عهد الله و میثاقه لتعملن بكتاب الله و سنة رسوله و سیرة الخلیفتین من بعده۔ (تاریخ طبری۔ ج ۳۔ ص ۲۹۷)۔

آپ یہ عہد و پیمان کریں کہ اللہ کی کتاب رسول کی سنت اور دونوں خلیفوں کی سیرت پر عمل کریں گے۔"

حضرت علی نے فرمایا:۔

ارجوان افعل و اعمل بمبلغ علمی و طاقتی۔ (تاریخ طبری ج ۳)

میں امید کرتا ہوں کہ جہاں تک میرے علم و طاقت کی رسائی ہے اس کے مطابق عمل کروں گا۔"

پھر حضرت عثمان سے یہی بات کہی انہوں نے فوراً سیرت شیخین کی پابندی کا اقرار کر لیا جس پر عبدالرحمٰن نے حضرت عثمان کے ہاتھ پر بیعت کر کے ان کی خلافت کا اعلان کر دیا۔ حضرت علی نے یہ صورت دیکھی تو فرمایا:۔

لیس هذا اوّل یوم تظاهرتم فیه علینا فصبر جمیل و الله المستعان علیٰ ما تصفون و الله ما ولیت عثمان الا لیرد الامر الیك و الله كل یوم فی شان۔ (تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص ۳۷)

یہ پہلا دن نہیں ہے کہ تم نے ہم پر زیادتی کی ہو اب صبر جمیل کے علاوہ کیا چارہ ہے اور جو باتیں تم کرتے ہو اس پر اللہ ہی مددگار ہے۔ خدا کی قسم تم نے عثمان کو اس امید پر خلافت دی ہے کہ وہ اسے کل تمہارے حوالے کر جائے اور اللہ ہر روز (بندوں کے) کسی نہ کسی کام میں ہے۔"

حضرت عثمان کے ہوا خواہ اور بنی امیہ بیعت کے لئے بڑھے اور ان کے ہاتھوں پر بیعت کر کے اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ مغیرہ ابن شعبہ جو مصلحت کوش اور اقتدار پرست تھا حضرت عثمان سے کہنے لگا کہ اگر عبدالرحمٰن کسی اور کی بیعت کرتے تو ہم اسے کبھی تسلیم نہ کرتے۔ عبدالرحمٰن نے اس کی یہ خوشامدانہ روش دیکھی تو کہا:۔

كذبت یا اعور لو بایعت غیره لبایعته و لقلت هذه المقالة (تاریخ طبری۔ ج ۳۔ ص ۲۹۸)۔

اے بدبخت تو سراسر جھوٹ کہتا ہے اگر میں کسی اور کی بیعت کرتا تو تو بھی اس کی بیعت کرتا اور اس سے بھی یہی کچھ کہتا۔"

حضرت عمر کے اس شورائی نظام سے حسب ذیل چند نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں:۔

(۱) خلیفہ کے لئے قرشی ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ ایک آزاد کردہ عجمی غلام بھی خلیفہ ہو سکتا ہے اور حدیث الائمة من قریش۔ انصار کے مقابلہ میں وقتی ضرورت کے لئے وضع کی گئی تھی جس کی کوئی اصل و

بنیاد نہیں ہے۔

(۲) جمہور کے اتفاق رائے سے خلیفہ کا انتخاب غیر ضروری ضابطہ ہے بلکہ خلیفہ وقت اپنی رائے سے کسی کو نامزد کرنے یا خلافت کو دو چار آدمیوں میں محدود کر دینے کا مجاز ہے۔

(۳) اگر اکثریت کی رائے کے خلاف کوئی آواز بلند کرے تو وہ سزائے قتل کا مستحق ہے خواہ وہ صحابی رسول کیوں نہ ہو۔

(۴) امت تین دن تک بغیر خلیفہ کے رہ سکتی ہے اور یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک کے مرنے کے بعد فوراً دوسرے خلیفہ کا انتخاب عمل میں لایا جائے البتہ پیغمبر کی رحلت کے بعد جو تعجیل کی گئی اور آنحضرت کی تجہیز و تکفین کا بھی انتظار نہ کیا گیا تو وہ صرف وقتی مصالح اور سیاسی حالات کا تقاضا تھا۔

(۵) وہ عیوب و قبائح جو اصحاب شوریٰ میں گنوائے گئے جیسے غرور و نخوت حرص دنیا کنبہ پروری مالی خیانت اور ایذاء رسول وغیرہ استحقاق خلافت کے منافی نہیں ہیں اور نہ امامت و خلافت کے لئے علمی عملی اور اخلاقی اوصاف کی ضرورت ہے۔

اس شوریٰ اور اس کے قبل کے انتخابی طریقوں پر نظر کی جائے تو انتخاب کے سلسلہ میں نہ کسی خاص قاعدہ و قانون کا پتا چلتا ہے اور نہ کسی ضابطہ و اصول کی رہنمائی ہوتی ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ خلافت کا فیصلہ اہل حل و عقد یا جمہور کی رائے کے تابع ہے تو اکابر صحابہ جن میں ام المومنین حضرت عائشہ اور عبداللہ ابن عمر بھی شامل ہیں کس اصول کے ماتحت حضرت عمر کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ کسی کو نامزد کر جائیں کیا ان کے علم میں یہ چیز نہ تھی کہ خلیفہ کا تقرر اہل حل و عقد کی صوابدید اور جمہور کی رائے سے وابستہ ہے اور حضرت عمر اس کی تردید کرنے کے بجائے اس کا جواز حضرت ابوبکر کے عمل سے ثابت کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اگر ابو عبیدہ یا سالم زندہ ہوتا تو ان دو میں سے ایک کو خلیفہ مقرر کر جاتا اور اگر خلیفہ کا تقرر نامزدگی کے ذریعہ ہوتا ہے اور خلیفہ وقت کو یہ اختیار ہے کہ وہ کسی کو خلیفہ مقرر کر جائے تو پیغمبر کو یہ حق بدرجۂ اولیٰ ہونا چاہئے تھا کہ وہ کسی کو منتخب کر جاتے جبکہ ان کی نظر انتخاب دوسروں کی نگاہ انتخاب سے بہر حال بلند تر اور صائب تھی۔ حضرت عمر کہنے کو تو یہ کہتے ہیں کہ اگر میں کسی کو نامزد کروں تو سیرت ابوبکر کی پیروی ہوگی اور نامزد نہ کروں تو پیغمبر کی اقتداء ہوگی مگر عملاً ان دونوں راستوں کو چھوڑ کر وہ راستا اختیار کرتے ہیں جسے نہ رسول کی اقتداً کہا جا سکتا ہے اور نہ خلیفۂ اول کی پیروی نہ اسے فیصلہ جمہور سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور نہ نامزدگی سے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر نہ مصلحتہً کسی کا نام لینا چاہتے تھے اور نہ انہیں رائے عامہ پر اطمینان تھا کہ وہ وہی فیصلہ کرے گی جو خود ذہنی طور پر طے کئے ہوئے تھے۔ اس لئے چھ آدمیوں کا ایک محدود شوریٰ ترتیب دے دیا جو رائے عامہ سے آزاد اور طریق کار کے لحاظ سے کامیابی کی ضمانت تھا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے چند آدمیوں کے نام بھی لئے کہ ان میں سے کوئی زندہ ہوتا تو اسے خلیفہ مقرر کر جاتے ان میں سے ابو عبیدہ کے

بارے میں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ قرشی بھی تھے اور سقیفۂ بنی ساعدہ کی کاروائی میں شریک کار بھی رہ چکے تھے اس لئے ان کا بھی ایک طرح سے حق تھا کہ انہیں خلافت میں شریک کیا جاتا مگر اکابر صحابہ کی موجودگی میں سالم کو خلافت کا اہل کیونکر سمجھ لیا گیا جبکہ خلافت کے لئے قرشیت کو لازم قرار دے لیا گیا تھا اور اسی قرشیت کی بناء پر مہاجرین نے انصار پر اپنی فوقیت ثابت کی تھی اور سالم نہ قرشی تھا اور نہ عرب بلکہ ابو حذیفہ کی بیوی ثبیتہ بنت یعار کا آزاد کردہ عجمی غلام تھا اور اس سلسلہ میں معاذ ابن جبل اور خالد ابن ولید کا نام لیا جانا بعید معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ معاذ ابن جبل انصار کے قبیلۂ خزرج کی ایک فرد تھے اور حضرت عمر انصار کے حق خلافت سے انکار کر چکے تھے۔ رہے خالد ابن ولید تو حضرت عمر ان سے ایک لمحہ بھی خوش نہیں رہے اور برسر اقتدار آتے ہی پہلا قدم یہ اٹھایا کہ انہیں معزول کر دیا۔ اور جب انہیں اپنے ماتحت رکھنا بھی گوارا نہیں کیا تو انہیں مسلمانوں کی امارت و قیادت کا اہل کیونکر سمجھ سکتے تھے۔ ابن اثیر نے تحریر کیا ہے:۔

وكان اول كتاب كتبه الى ابى عبيدة ابن الجراح بتولية جند خالد وبعزله خالد لانه كان ساخطا عليه فی خلافة ابی بكر كلها لوقعته بابن نويرة وما كان يعمل فی حربه واول ما تكلم به عزل خالد وقال لا يلی لی عملا ابدا۔ (تاریخ کامل۔ ج ۲۔ ص ۲۹۳)۔

(خلافت کے بعد حضرت عمر نے پہلا تحریری فرمان ابو عبیدہ جراح کے نام جاری کیا کہ وہ خالد سے لشکر کی امارت لے لیں اور اُسے برطرف سمجھیں اس لئے کہ حضرت عمر حضرت ابو بکر کے زمانۂ خلافت سے اس پر ناراض چلے آ رہے تھے مالک ابن نویرہ پر حملہ آور ہونے اور ان افعال کی وجہ سے جن کا وہ جنگ میں مرتکب ہوا تھا۔ اور حضرت عمر نے پہلی بات بھی کی تو خالد کی برطرفی کے بارے میں اور یہ کہا کہ اسے میرے ماتحت کوئی عہدہ نہیں دیا جا سکتا۔"

اس سلسلہ میں حضرت علی کا نام بھی لیا تھا مگر اس سے یہ کہہ کر پہلو بچا لے گئے کہ میں اس ذمہ داری کا بوجھ اٹھانا نہیں چاہتا۔ حیرت ہے کہ ابو عبیدہ اور سالم کے زندہ ہونے کی صورت میں یہ بار باسانی اٹھایا جا سکتا تھا مگر حضرت علی کے تقرر کا بار ناقابل برداشت نظر آتا ہے اور ان کی اہلیت کا اعتراف کرنے کے باوجود شوریٰ پر بنا کی جاتی ہے اور خلافت کا رُخ دُوسری طرف موڑ دیا جاتا ہے۔ یہ درُست ہے کہ انہوں نے کسی کو نامزد نہیں کیا مگر یہ شوریٰ ایک طرح سے نامزدگی ہی تھا کیونکہ اس کا طریق کار ایسا تجویز کیا کہ تمام رائیں ایک رائے کے تابع ہو کر رہ جاتی ہیں جس کے بعد شوریٰ و نامزدگی میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ چنانچہ پہلے تو یہ تجویز کیا کہ خلیفہ کثرت رائے سے منتخب کیا جائے اور ارکان وُہ منتخب کئے جن میں سے اکثریت کی تائید حضرت عثمان ہی کو حاصل ہو سکتی تھی اس لئے کہ عبد الرحمٰن حضرت عثمان کے بہنوئی تھے ان کی زوجہ اُم کلثوم بنت عقبہ حضرت عثمان کی مادری بہن تھیں اور سعد ابن ابی وقاص عبد الرحمٰن کے ابن عم تھے ان دونوں کا تعلق قبیلۂ بنی زہرہ

لئے تھا اور طلحہ ابن عبید اللہ حضرت ابوبکر کے قبیلہ بنی تیم سے تھے اس وجہ سے حضرت علی سے پرخاش رکھتے تھے اور اس کا فائدہ حضرت عثمان ہی کو پہنچتا تھا البتہ زبیر ابن عوام کی رائے حضرت علی کے حق میں ہو سکتی تھی کیونکہ ان کی والدہ صفیہ بنت عبد المطلب حضرت علی کی پھوپھی تھیں اس صورت میں تین رائیں حضرت عثمان کے حق میں تھیں اور صرف ایک رائے حضرت علی کے حق میں تھی اور اگر طلحہ بھی آپ کے حق میں رائے دیتے تو دونوں فریق برابر ہو جاتے۔ اور دونوں فریق کے برابر ہونے کی صورت میں حضرت عمر یہ ہدایت دے گئے تھے کہ عبد اللہ ابن عمر کو ثالث بنایا جائے اور اسے مامور کر گئے تھے کہ وہ اس فریق میں سے خلیفہ منتخب کرے جس فریق میں عبد الرحمن ہوں اور عبد الرحمن کے متعلق انہیں یقین تھا کہ وہ حزب عثمان میں ہوں گے اب فریق مخالف کے لئے دو ہی صورتیں تھیں یا تو اپنے ہاتھوں اپنے قتل کا سامان کرے یا عبد الرحمن کی ہمنوائی کرتے ہوئے حضرت عثمان کی خلافت پر اتفاق کرلے۔ یہ تھا وہ چکر جس کے نتیجہ میں ہر پھر کے خلافت کی تان حضرت عثمان پر ٹوٹتی تھی اور تشکیل شوریٰ کا مقصد و مدعا بھی یہی تھا جو پہلے سے طے شدہ اور حضرت عمر کے ذہن میں محفوظ تھا چنانچہ صاحب ریاض النضرہ لکھتے ہیں :۔

قیل لعمر وھو بالموقف من الخلیفۃ بعدك قال عثمان ابن عفان ۔ (ریاض النضرہ ۔ ص ۱۵۳)	موقف حج میں حضرت عمر سے پوچھا گیا کہ آپ کے بعد خلیفہ کون ہو گا کہا عثمان ابن عفان ۔

امیر المومنین نے شوریٰ کی ہیئت و ساخت کو دیکھ کر شوریٰ کی کاروائی سے پہلے ہی اندازہ کر لیا تھا کہ خلافت حضرت عثمان کے پائے نام کی جا رہی ہے اور عباس ابن عبد المطلب سے کہہ دیا تھا :۔

عدلت عنا قال وما علمك قال قرن بی عثمان وقال کونوا مع الاکثر فان رضی رجلان رجلا و رجلان رجلا فکونوا مع الذین فیھم عبد الرحمن ابن عوف فسعد لا یخالف ابن عمہ و عبد الرحمن صھر عثمان ۔ (تاریخ طبری ۔ ج ۲ ۔ ص ۲۹۷)	خلافت کا رخ ہم سے موڑ دیا گیا ہے عباس نے کہا کہ آپ کو کیونکر معلوم ہوا فرمایا کہ میرے ساتھ عثمان کو بھی لگا دیا ہے اور یہ کہا ہے کہ اکثریت کا ساتھ دو اور اگر دو ایک پر اور دو ایک پر رضامند ہوں تو تم ان لوگوں کا ساتھ دینا جن میں عبد الرحمن ابن عوف ہو۔ چنانچہ سعد تو اپنے چچیرے بھائی عبد الرحمن کا ساتھ دے گا اور عبد الرحمن تو عثمان کا بہنوئی ہوتا ہی ہے ۔

اگر حضرت عثمان ہی کو برسر اقتدار لانا تھا تو بہتر تھا کہ شوریٰ ترتیب دینے کے بجائے انہیں براہ راست نامزد کر دیتے تاکہ فتنہ و فساد اور خانہ جنگیوں کی ذمہ داری سے اپنے کو بچا لے جاتے کیونکہ اسی رکنیت کی وجہ سے ارکان شوریٰ کے ذہنوں میں ہوس اقتدار نے کروٹیں لیں اور ان میں سے ہر فرد اپنے کو خلافت کا اہل تصور

کرنے لگا جس نے افتراق و انتشار اور ذہنی تصادم کی صورت پیدا کر دی اور اس ذہنی ٹکراؤ کے نتیجہ میں مسلمانوں میں خونریزی کا دروازہ کھل گیا اور طلحہ و زبیر اقتدار کی خاطر حضرت علی کے مقابلہ میں اُتر آئے حالانکہ زبیر شوری سے قبل حضرت علی کے ہمدرد و خیر خواہ تھے۔ غرض اس شوری سے جنگ و جدل کی بنیاد پڑ گئی اور جمل و صفین اور نہروان ایسے خون ریز معرکوں کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ ابن عبد ربہ نے تحریر کیا ہے کہ ایک مرتبہ ابن حصین، زیاد کے قاصد کی حیثیت سے معاویہ کے ہاں آیا۔ معاویہ نے ایک دن اسے تنہائی میں بلا کر پوچھا کہ مسلمانوں میں انتشار و پراگندگی کا سبب کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ قتل عثمان۔ معاویہ نے کہا کہ میں نے یہ سنا تھا کہ تم بڑے زیرک اور معاملہ فہم ہو مگر تمہارا جواب بالکل سطحی ہے کہا محاربہ صفین کہا یہ بھی کوی بات نہ ہوی کہا معرکہ جمل کہا یہ بھی درست نہیں ہے کہا کہ اس کے علاوہ اور کوی وجہ مجھے نظر نہیں آتی کہا کہ مسلمانوں کی پریشانی و پاشانی کا اصل سرچشمہ چھ آدمیوں کا شوری تھا جو حضرت عمر نے تشکیل دیا تھا۔

فلم یکن رجل الا رجا لنفسه	چنانچہ ان میں سے ہر شخص خلافت کی توقع کرنے لگا
ورجاها له قومه وتطلعت	اور اقتدار کی طرف اس کے نفس کا جھکاؤ ہو گیا اور
الی ذلک نفسه۔ (عقد الفرید ج۳ ص۷۵)	اس کا قوم قبیلہ بھی اس کے لئے خلافت کا خواہاں ہو گیا۔"

اس ہوس خلافت کی وجہ ارکان شوری کا تمول بھی تھا اس لئے کہ جہاں دولت کی فراوانی ہوتی ہے وہاں سیاسی اقتدار کی خواہش بھی قہراً ابھر آیا کرتی ہے۔ چنانچہ ارکان شوری کو دیکھا جاتا ہے تو تاریخ شاہد ہے کہ ایک علی ابن ابی طالب کے علاوہ سب کے سب انتہائی متمول اور سرمایہ دار تھے۔ اگر شوری ترتیب دینا ناگزیر تھا تو ایسے لوگوں کو منتخب کرنے کے بجائے جو صرف دولتمند طبقہ کی نمائندگی کرتے ہوں ایسے لوگوں کو منتخب کیا جاتا جو عوام کے جذبات کی ترجمانی کر سکتے اور پسماندہ طبقہ کے مفاد پر نظر رکھتے۔ سرمایہ داروں سے تو سرمایہ داری کے تحفظ ہی کی توقع کی جا سکتی ہے انہیں عوام کے سود و بہبود اور معاشرتی حقوق سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ اگر اسے سیاسی مصلحت کا تقاضا سمجھ کر نظر انداز بھی کر دیا جائے تو ان کی رایوں کو بنوک شمشیر ایک فرد کی رائے کے تابع کر دینے کا کیا جواز تھا کیا آزادی رائے کو سلب کرنے کے بعد اس شوری کو شوری کے نام سے تعبیر کرنا صحیح ہو سکتا ہے۔

حضرت عمر نے معیار انتخاب پیغمبر اکرم کی رضا و خوشنودی کو قرار دیا تھا اور یہ کہا تھا کہ آنحضرت ان چھ آدمیوں سے آخر وقت تک راضی و خوشنود رہے۔ لیکن یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا رسول اللہ بس انہی چھ افراد سے راضی تھے اور ان کے علاوہ اور کسی کو یہ شرف و امتیاز حاصل نہ تھا اور کیا حضرت عثمان کا انتخاب رسول اللہ کی رضا و خوشنودی کے نتیجہ میں ہوا تھا یا عبد الرحمن کی خوشنودی کے زیر اثر۔ قرآن مجید میں مومنین کے بارے میں ارشاد ہے:۔

لقد رضی اللہ عن المومنین اذ یبایعونك تحت الشجرۃ۔ — اللہ مومنین سے راضی ہوا جب وُہ درخت کے نیچے تمہاری بیعت کر رہے تھے۔"

یہ تو ہو نہیں سکتا کہ جن سے اللہ راضی ہو پیغمبر اُن سے راضی نہ ہوں۔ جب پیغمبر کی خوشنودی کا شرف اور لوگوں کو بھی حاصل تھا تو پھر پیغمبر کی رضا و خوشنودی کو چھ آدمیوں میں محدود کر دینے کے کیا معنی۔ کیا پیغمبر اکرم مہاجرین میں سے صرف چھ افراد سے خوش تھے اور انصار میں سے کسی فرد پر راضی نہ تھے۔ اگر آنحضرت ان سے خصوصی طور پر راضی تھے تو اس خصوصی رضامندی کو واضح کیا جاتا .... مگر اس کے بجائے ان کے عیوب و نقائص کی ایک فہرست پیش کر دی جاتی ہے جس سے رسُول خدا کی خوشنودی تو درکنار اس کی نفی ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی تضاد کو دیکھتے ہوئے ابو عثمان جاحظ نے کہا ہے:۔

لو قال لعمر قائل انت قلت ان رسول اللہ مات وھو راض عن الستۃ فکیف یقول الاٰن لطلحۃ انہ مات ساخطا علیك للکلمۃ التی قلتھا لکان لقد رماہ بمشاقصہ۔ — اگر کوئی کہنے والا حضرت عمر سے یہ کہتا کہ تم نے یہ کہا تھا کہ جب رسُول اللہ نے وفات پائی تو وُہ ان چھ آدمیوں سے راضی تھے اور اب کس بناء پر طلحہ سے یہ کہتے ہو کہ پیغمبر ایک بات پر مرتے دم تک تم سے ناراض رہے تو انہی کی بات سے انہیں لاجواب کر دیتا۔"

(شرح ابن ابی الحدید۔ ج۱۔ ص۳۷)۔

طلحہ کی وُہ بات جو پیغمبر کی ناراضگی کا باعث ہوئی یہ تھی کہ انہوں نے آیۂ حجاب کے اترنے پر کہا تھا کہ آج تو رسُول اللہ اپنی بیویوں کو پردہ میں رکھ رہے ہیں اور کل ہم انہی سے نکاح کریں گے۔ جس پر یہ آیت نازل ہوئی:۔

وما کان لکم ان تؤذوا رسول اللہ ولا ان تنکحوا ازواجہ ابدا۔ — تمہارے لئے جائز نہیں ہے کہ تم رسُول خدا کو اذیت دو اور نہ کبھی یہ جائز ہو سکتا ہے کہ تم ان کے بعد ان کی بیویوں سے نکاح کرو۔"

ایک وقت تھا کہ طلحہ کی زبان سے یہ نازیبا کلمات نکلے تھے جو یقیناً قابل گرفت تھے مگر خود حضرت عمر نے صلح حدیبیہ کے موقع پر جو مظاہرہ کیا یا پیغمبر کے آخر زمانۂ حیات میں جو تند و تیز الفاظ کہے وُہ طلحہ کے ان الفاظ سے کہیں زیادہ قابل گرفت تھے۔ اگر نبوت میں شک اور پیغمبر کی طرف ہذیان کی نسبت تجویز کرنے کے باوجود عرشۂ خلافت تک پہنچا جا سکتا ہے تو ان الفاظ کی بنا پر طلحہ کی اہلیت خلافت پر طعن کا کیا جواز ہے حضرت علی کے بارے میں جس رائے کا اظہار کیا اسے بھی ایک خود ساختہ بات سے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ پیغمبر کے بعد دورِ اوّل میں تو یہ کہا گیا کہ علی نو عمر ہیں اور خلافت کے لئے سن رسیدہ و پختہ کار آدمی

ہونا چاہئے مگر اب نوعمری کا عذر تو ہو نہیں سکتا تھا اس لئے یہ کہہ دیا گیا کہ ان میں مزاح و خوش طبعی پائی جاتی ہے۔ حضرت عمر کا یہ چھوڑا ہوا شوشہ دُوسرے معاندین کے ہاتھ لگ گیا اور انہوں نے اسے خوب خوب ہوا دی۔ چنانچہ عمرو ابن عاص نے شامیوں کے ذہن میں یہ چیز بٹھا دی کہ حضرت کا شیوہ ہی شوخی و بذلہ سنجی ہے جس پر امیر المومنین کو کہنا پڑا "مجھے نابغہ کے بیٹے پر حیرت ہے کہ وُہ میرے بارے میں اہلِ شام سے کہتا پھرتا ہے کہ مجھ میں مسخرہ پن پایا جاتا ہے اور میں کھیل تفریح میں پڑا رہتا ہوں۔ اس نے غلط کہا اور کہہ کر گنہگار ہُوا۔ خدا کی قسم مجھے موت کی یاد نے کھیل کُود سے باز رکھا ہے اور اسے عاقبت فراموشی نے سچ بولنے سے روک دیا ہے"۔ بے شک امیر المومنین خندہ جبین ہنس مُکھ اور شگفتہ مزاج تھے اور ترش روئی و تند خوئی سے کوئی واسطہ نہ تھا مگر وُہ مزاح جو لطیف اور سنجیدہ طبیعتوں پر گراں گزرتا ہے اس کا شائبہ تک نہ تھا بلکہ آپ کے مزاح میں پیغمبر کے مزاح کی جھلک ہوتی تھی پیغمبر کے مزاح کی یہ صورت تھی کہ نہ اس میں طنز کا پہلو ہوتا تھا اور نہ خلاف واقعہ کوئی بات ہوتی تھی اسی طرح امیر المومنین مزاحاً کوئی بات کہتے تو وُہ نہ واقع کے خلاف ہوتی اور نہ وقار و سنجیدگی کے منافی۔ اگر اس حد تک مزاح شانِ رسالت کے منافی نہیں ہے تو اسے منصب خلافت کے منافی کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر یہاں پر مزاح سے وُہ مزاح مراد ہے جس سے انسان کی قدر و قیمت کم ہو جاتی ہے یا رُعب و داب ختم ہو جاتا ہے تو ایک مثال بھی ایسی پیش نہیں کی جا سکتی کہ آپ کی زبان سے کبھی کوئی ایسا جُملہ نکلا ہو جس سے وقار مجروح ہوتا ہو یا متانت و سنجیدگی میں فرق آتا ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو دلوں سے آپ کا رعب و دبدبہ اُٹھ جاتا اور نظروں میں ان کا وقار گر جاتا حالانکہ آپ کے جلال و ہیبت اور وقار و عظمت کا یہ عالم تھا کہ کوئی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہ کر سکتا تھا۔ اور جب تک آپ گفتگو کا آغاز نہ کرتے کسی کو لب کشائی کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ ابن عباس کہتے ہیں:۔

کان امیر المومنین علی علیہ السلام	جب علی علیہ السلام تشریف فرما ہوتے تو ہمیں
اذا اتی ھبنا ان نبتدئہ بالکلام	جرأت نہ ہوتی تھی کہ ہم سلسلہ کلام شروع
(شرح ابن ابی الحدید ج۳ ص۱۷)	کریں"۔

حضرت اپنے وصیت نامہ فرماتے ہیں:۔

ایاک ان تذکر فی الکلام ما	خبردار اپنی گفتگو میں ہنسانے والی باتوں کا ذکر
یکون مضحکا وان حکیت	نہ آنے دینا اگرچہ وُہ نقل قول کی حیثیت سے
ذٰلک عن غیرک۔ (نہج البلاغہ)	کیوں نہ ہوں"۔

بہرحال حضرت علی کی طرف مزاح کی نسبت واقعات کی روشنی میں کسی طرح بھی صحیح نہیں سمجھی جا سکتی۔ آخر اس موقع پر حضرت عمر کو کچھ کہنا تھا اگر یہ نہ کہتے تو کچھ اور کہتے اور جہاں تک انہیں خلافت سے الگ رکھنے

کا تعلق ہے وُہ شوریٰ کی ہیئت اور اس کے طریق کار سے ظاہر ہے۔

شوریٰ کی تجویز اگرچہ حضرت عمر کے ذہن کی پیداوار تھی مگر اسے عملی جامہ پہنانے میں عبد الرحمٰن ابن عوف کی ہوشیاری و کارگزاری کا بہت دخل ہے انہیں خود تو خلافت کے ملنے کی توقع تھی نہیں انہوں نے امّیدواران خلافت کی صف سے اپنے کو الگ کر کے خلیفہ گری کا حق حاصل کر لیا حالانکہ حضرت عمر نے انہیں ثالثی کا حق نہیں دیا تھا یہ ثالثی کا حق عبد اللہ ابن عمر کا تھا مگر انہوں نے عبد اللہ کو اس کا موقع ہی نہ دیا اور خود ثالثی کا اختیار حاصل کر لیا اور پھر خلافت کا دھارا حضرت عثمان کی طرف موڑنے کے لئے کتاب و سُنّت کے ساتھ سیرت شیخین کا ضمیمہ لگا دیا جس کے متعلق انہیں یقین تھا کہ حضرت علی اسے کبھی قبول نہیں کریں گے اور حضرت عثمان کے لئے اس سیرت کی پذیرائی سے کوئی امر مانع نہ تھا یہ شرط نہ حضرت عمر نے خود عائد کی تھی اور نہ عبد الرحمٰن سے اس قسم کی شرط کے عائد کرنے کا مطالبہ کیا تھا اگر حضرت عمر بعد میں آنے والے خلیفہ پر پہلے خلیفہ کی سیرت پر عمل پیرا ہونا ضروری سمجھتے تو حضرت ابوبکر کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کسی کو نامزد کر جاتے مگر انہوں نے خلیفہ سابق کی سیرت کے خلاف قدم اٹھا کر یہ واضح کر دیا کہ بعد میں آنے والا خلیفہ پہلے خلیفہ کی سیرت کا پابند نہیں ہے بلکہ وُہ اپنی رائے اور صوابدید پر عمل پیرا ہوگا۔ اگر عبد الرحمٰن کتاب و سنت کے ساتھ سابقہ خلفا کی سیرت کی پابندی کو اتنا ہی ضروری سمجھتے تھے کہ اس کے بغیر خلافت کا انعقاد ہو ہی نہیں سکتا تو انہیں تشکیل شوریٰ کے موقع پر حضرت عمر کو یہ مشورہ دینا چاہیئے تھا کہ وُہ حضرت ابوبکر کی سیرت پر چلیں اور جس طرح انہوں نے آپ کو نامزد کیا تھا اسی طرح آپ بھی کسی کو نامزد کر جائیں یا یہ اپچ اسی موقع کے لئے اٹھا رکھی تھی۔ عبد الرحمٰن نے یہ شرط تو پیش کر دی مگر اس پر غور نہ کیا کہ ان دونوں کی سیرت پر کیونکر چلا جا سکتا ہے۔ یہ اس صورت میں تو ممکن تھا جب دونوں کی سیرت یکساں ہوتی اور دونوں کا نظریہ ایک ہوتا اور جبکہ متعدد موارد پر دونوں کی رائیں جُدا جُدا اور نظریات مختلف تھے پھر دونوں کی سیرت پر ایک ہی وقت میں یکساں عملدرآمد کیونکر ہو سکتا ہے چنانچہ مانعین زکوٰۃ سے جنگ کے جواز و عدم جواز میں اختلاف تھا خالد ابن ولید کی بحالی و برطرفی میں اختلاف تھا اسی طرح متعدد مواقع پر دونوں کی رائیں مختلف تھیں تو اب کسے مورد عمل قرار دیا جائے اور کسے نظر انداز کیا جائے۔

امیر المومنین نے اسلام کے ایک بنیادی ضابطہ کے پیش نظر سیرت شیخین کو تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا اس انکار کا اصل محور سیرت بحیثیت سیرت نہ تھی بلکہ وہ نظریہ تھا جس کی داغ بیل اس سیرت کے ذریعہ ڈالی جا رہی تھی اور وُہ یہ کہ کتاب و سنت کے ساتھ سیرت خلفاء کو بھی مذہبی و آئینی درجہ حاصل ہے حالانکہ سیرت شیخین ہو یا کسی اور کی سیرت قرآن و سُنّت کی آئینہ دار ہو یا قیاس و رائے کی پروردہ اسے نہ مذہبی و آئینی درجہ دیا جا سکتا ہے اور نہ اسے دینی ماخذ قرار دینا صحیح ہے اگر ایک دفعہ اس نظریہ کی

بنیاد پڑ جاتی تو حکام کی سیرت کو مستقل ماخذ و مدرک دینی کی حیثیت حاصل ہو جاتی اور قرآن و سنّت کی طرح ان کے طرزِ عمل کو بھی سند و حجت قرار دے لیا جاتا۔ امیر المومنین نے سیرتِ شیخین سے انکار کر کے اسلام کی اساس و بنیاد کو متزلزل ہونے سے بچا لیا اور اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا کہ کتاب و سنّت اور ہے اور سیرت اور ہے اسے دینی ماخذ قرار دینا آئینِ اسلام کے منافی ہے۔ اگر آپ اس شرط کو تسلیم کر لیتے تو ایک طرف سیرتِ خلفاء اسلام کی عملی تصویر سمجھی جاتی اور دوسری طرف حکام کا طرزِ عمل دینی احکام کا ماخذ و مدرک قرار پا جاتا اور نتیجۃً ان کے افعال و اعمال ہی کا نام اسلام ہو کر رہ جاتا۔

اس پر بھی ایک نظر کرنے کی ضرورت ہے کہ سیرتِ شیخین سے مراد کیا ہے۔ اگر اس سے وہ مسائل و احکام مراد ہیں جو انہوں نے اپنے فہم و اجتہاد سے مستنبط کئے اور ان پر عمل پیرا رہے تو انہیں من و عن تسلیم کر لینے اور ان پر عمل کی بنیاد رکھنے کے معنی یہی ہوں گے کہ شیخین کی تقلید کی جائے۔ چنانچہ ملا علی قاری نے اس سیرت کی پابندی کو تقلید ہی سے تعبیر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

فابی علی ان یقلدھما و رضی عثمان۔ (شرح فقہ اکبر۔ ص۸۲)

حضرت علی نے شیخین کی تقلید سے انکار کر دیا اور حضرت عثمان اس پر راضی ہو گئے۔"

اگر امیر المومنین کو امام مفترض الطاعۃ اور خلیفہ منصوص نہ بھی سمجھا جائے مگر کم از کم انہیں اس پایہ کا مجتہد تو تسلیم کیا ہی جائے گا جس پایہ کا مجتہد شیخین کو سمجھا جاتا ہے اور ایک مجتہد کو دوسرے مجتہد کے فتویٰ و رائے کا پابند کر دینا اصولی طور پر غلط ہے اور اس میں قطعاً کوئی معقولیت نہیں ہے کہ ایک مجتہد سے یہ کہا جائے کہ تمہیں عملاً وہ راہ اختیار کرنا ہو گی جو پہلے مجتہد کی تھی یہ پابندی ذہنی و فکری جمود کو دعوت دینے والی اور تفکر و اجتہاد کی روح کو مضمحل کر دینے والی ہے۔ جب آنکھیں ہیں تو دیکھنے کا حق ہے کان ہیں تو سننے کا حق ہے اور عقل ہے تو غور و خوض کے بعد خود راہ متعین کرنے کا حق ہے۔ کسی سے زبردستی یہ حق چھین کر یہ کہا جائے کہ تم اندھے بہرے بن کر ہماری متعین کردہ راہ پر چلتے رہو اسے نہ عقل و دانش سے کوئی تعلق ہے اور نہ اسلام ایسے حکیمانہ دین سے کوئی واسطہ ہے۔

اور اگر سیرت سے مراد شیخین کا وہ لائحہ عمل ہے جو احکام کے اجراء و نفاذ میں انہوں نے اختیار کیا تو اسے قابلِ تقلید و اتباع نہیں قرار دیا جا سکتا اس لئے کہ طریق کار وقتی حالات کے تابع ہوتا ہے جیسے حالات ہوں گے ویسا طریق کار اختیار کیا جائے گا اور حالات کبھی یکساں نہیں رہتے لہٰذا حالات کی تبدیلی کے ساتھ طریق کار کا مختلف ہونا ناگزیر ہو گا۔ مثال کے طور پر حضرت عمر کے عہد کو دیکھئے کہ ان کے دورِ حکومت میں روم و ایران فتح ہوئے اور ان فتوحات کے نتیجہ میں دولت کی ریل پیل شروع ہو گئی ذرائع آمدنی وسیع سے وسیع تر ہو گئے اور اس مالی فراوانی کی بنا پر وظائف کی مقدار بڑھ گئی اب ان کی سیرت کی پیروی کا تقاضا یہ تھا کہ خواہ آمدنی کے ذرائع مسدود ہو جائیں ان کے جاری کردہ وظائف بے کم و کاست

باقی رکھے جائیں حالانکہ ذرائع آمدنی کے کم یا نہ ہونے کی صورت میں یہ مطالبہ ناروا ہوگا۔ تو جو چیز حضرت عمر کے عہد میں روا اور قابل عمل تھی اب ناقابل عمل قرار پائے گی اس لئے کہ حالات بدل چکے ہیں اس عہد کا تقاضا اور تھا اور اس عہد کا تقاضا اور ہے۔ بعید نہیں ہے کہ حضرت عمر کے بعد آنے والے خلیفہ پر ان کی سیرت کی پابندی عائد کرنے کا مقصد یہ رہا ہو کہ جو وظائف ان کے دور میں ملا کرتے تھے وہ علٰے حالہ باقی رکھے جائیں اور ان میں کمی واقع نہ ہونے پائے خواہ سابقہ آمدنی کے ذرائع باقی رہیں یا نہ رہیں۔ اس اعتبار سے اس شرط کو دینی شرط کہنے کے بجائے اقتصادی شرط کہنا چاہیئے جو سرمایہ داروں کی طرف سے مالی مفاد کے تحفظ کے لئے عائد کی گئی تھی۔

شوریٰ کے واقعات پر نظر کرنے کے بعد امیر المومنین کی سیرت کے اس درخشاں پہلو سے آنکھ بند نہیں کی جاسکتی کہ آپ بیک جنبش لب سلطنت و اقتدار کو ٹھکرا دیتے ہیں اور کتاب و سنّت کے مقابلہ میں حکام کی راہ و روش کو اپنا لائحہ عمل بنانے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اگر آپ اس شرط کو قبول کرنے پر تیار ہو جاتے خواہ بعد میں اس پر عمل نہ کرتے آخر حضرت عثمان نے کب عمل کیا تھا تو بڑی آسانی سے ایک وسیع و عریض مملکت کی حکومت حاصل کر سکتے تھے مگر حضرت نہ ضمیر کے خلاف اقرار کرنا گوارا کرتے ہیں اور نہ اصول کے مقابلہ میں عظیم سے عظیم سلطنت کو درخور اعتنا سمجھتے ہیں حالانکہ دُنیا والے اقتدار کے لئے نہ وعدہ کو کوئی وزن دیا کرتے ہیں اور نہ قول و قرار کو بلکہ ہر قسم کے حیلہ و مکر کو سیاست و مصلحت بینی کا نام دے کر جائز قرار دے لیا کرتے ہیں۔ کیا دنیا میں اصول پرستی حق پسندی اور بلند نفسی کی اس سے بہتر مثال مل سکتی ہے۔

یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ جب حضرت کی نظروں میں سابقہ خلفاء کی سیرت اُن کے بعد ناقابل سند اور ناقابل عمل تھی تو ان کی زندگی میں ان کی سیرت کو صحیح اور قابل اتباع سمجھتے ہوئے ان کی بیعت کیونکر کر سکتے تھے اور پھر اس خلافت کو بھی کیونکر تسلیم کر سکتے تھے جو اُس سیرت کی بُنیاد پر قائم ہوئی ہو جس سیرت کو آپ رد کر چکے ہوں جب وُہ سیرت ناقابل قبول تھی تو وُہ خلافت بھی ناقابل قبول ہوگی جو اس سیرت پر عمل پیرا ہونے کے وعدہ پر ظہور میں آئی ہو۔

بیعتِ امیر المومنین

حضرت عثمان نے ۷۰ برس کی عمر میں یکم محرم ۲۴ھ کو حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ بدقسمتی سے ان کا دورِ حکومت امویوں کے علاوہ عام مسلمانوں کے لئے خوشگوار ثابت نہ ہوا۔ عوام سختیوں میں جکڑ دیئے گئے۔ بزرگ ترین صحابہ پر مظالم توڑے گئے عبداللہ ابن مسعود کی پسلیاں توڑی گئیں۔ عمار ابن یاسر کو زد و کوب کیا گیا۔ ابو ذر غفاری جلا وطن کئے گئے۔ جبر و استبداد کے سائے پھیلے ظلم و استحصال کی گھٹائیں چھائیں

اور خود سر عمال نے طاقت کے نشہ میں مدہوش ہو کر رعایا کو پامال کر کے رکھ دیا حضرت عثمان کے اس طرز عمل کے خلاف آوازیں بلند ہوئیں عوام کے جذبات بھڑک اٹھے اور دلوں میں غم و غصہ کی ایک عام لہر دوڑ گئی۔ اصحاب شوریٰ میں سے حضرت علی تو ان سے شاکی تھے ہی طلحہ اور زبیر بھی علانیہ ان کے خلاف ہو گئے اور عبدالرحمن ابن عوف جو سیرت شیخین کے زینہ سے انہیں خلافت کے بام بلند تک لے گئے تھے وہ اس حد تک بگڑے کہ ہمیشہ اپنے کئے پر پچھتاتے رہے اور زندگی کے آخری لمحہ میں بھی ان سے بات چیت کے روادار نہ ہوئے۔ ابن عبد ربہ تحریر کرتے ہیں:۔

دخل له عثمان عائداله فی مرضه فتحول عنه الی الحائط

عبدالرحمن کی بیماری کی حالت میں حضرت عثمان ان کی عیادت کے لئے آئے عبدالرحمن نے انہیں دیکھ کر اپنا منہ دیوار کی طرف پھیر لیا۔"

(عقد الفرید ج ۳ ص ۷۹)

آخر اس عام ناراضگی کے نتیجہ میں ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ کو گھر کے اندر قتل کر دیئے گئے۔

اس بارہ سالہ دور حکومت نے مسلمانوں کے سوئے ہوئے احساسات کو جھنجوڑا اور غلط قیادت کو آزمانے اور اس کے نتائج بھگتنے کے بعد ان کی آنکھیں کھلیں اور یہ احساس شدت سے ابھرا کہ قیادت اس شخص کے ہاتھوں میں ہونا چاہیئے جو عوامی فلاح و بہبود اور اجتماعی مفاد پر نظر رکھے اور مملکت کی دولت سمٹ کر اس کی ذات اور اس کے خاندان کے افراد تک محدود ہو کر نہ رہ جائے۔ چنانچہ مسند خلافت کے خالی ہوتے ہی اکابر صحابہ اور خواص و عوام کی نظریں حضرت علی کی طرف اٹھنے لگیں۔ اگر حضرت عثمان عام حالات میں طبعی موت مرتے تو خلافت نے سقیفائی و شورائی نظام کے ماتحت جو رخ اختیار کیا تھا اسے دیکھتے ہوئے یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ خلافت اپنے اصلی مرکز کی طرف پلٹ کر آئے گی اور حضرت علی کو مسند خلافت پر متمکن ہونے کا موقع دیا جائے گا اس لئے کہ حضرت عثمان کے اہالی موالی وہ لوگ تھے جو انہیں عمومی مفاد کے بجائے ذاتی مفاد میں استعمال کرنے کے عادی ہو چکے تھے اور وہ کبھی گوارا نہ کرتے کہ کسی ایسے شخص کو برسر اقتدار آنے دیا جائے جو ان کے بگڑے ہوئے اطوار پر قدغن لگائے اور انہیں اپنی سابقہ عادتوں میں تبدیلی پر مجبور کرے۔ یہ یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ معاویہ عمرو ابن عاص اور عثمانی حکام و عمال جو امیر المومنین کی متوازن و معتدل سیرت سے بخوبی واقف تھے ان کے اقتدار میں سد راہ ہوتے اور اس سلسلہ میں ام المومنین حضرت عائشہ کی بھی انہیں پوری تائید و حمایت حاصل ہوتی جو بڑی حد تک ملکی سیاست پر اثر انداز اور امیر المومنین کے مخالفین کی صف اول میں تھیں یہ لوگ اپنے امتیازات و مفادات کے تحفظ کے لئے حضرت عثمان کو نئی بزم شوریٰ کی تشکیل کا مشورہ دیتے اور ایسی تدبیر کرتے کہ خلافت انہی کے پسندیدہ افراد میں محدود ہو کر رہ جاتی یا حضرت عثمان شوریٰ کے چکر میں پڑے بغیر کسی نامزد کر جاتے جس کا جواز سیرت شیخین کی پابندی کو قبول کرنے کے بعد پیدا ہو چکا تھا مگر حالات نے

کچھ اس طرح پلٹا کھایا کہ اُن کے لئے یہ موقع ہی نہ رہا کہ وہ خلافت کے سلسلہ میں کوئی لائحہ عمل ترتیب دیتے یا کوئی خاص ہدایت کرتے۔ اور اگر کرتے بھی تو اس ہنگامہ و شورش میں ان کی سنتا کون جبکہ لوگ ان کی خویش نوازیوں اور ان کے عمال کی بے اعتدالیوں کی وجہ سے انہی کی خلافت کو انتہائی ناپسند کر رہے تھے اور انہیں جیتے جی یا قتل کر کے خلافت سے الگ کرنے پر تلے ہوئے تھے اور آخر ان بے اعتدالیوں کا نتیجہ ان کے قتل کی صورت میں ظاہر ہوئے بغیر نہ رہا۔

پیغمبر اکرم کے بعد امیر المومنین نے ایک طویل عرصہ جس بے غرضی و بے نفسی کے ساتھ گزارا اور جس اعتدال پسندی و اصول پرستی کا مظاہرہ کیا وہ دلوں کو متاثر کئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ اس تاثر نے عوام کے ذہن بدل دیئے اور گرد و پیش پر نظر دوڑانے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ علی ابن ابی طالب سے بہتر کوئی شخصیت نہیں ہے جو قیادت اُمت کا بار اٹھا سکے اور موجودہ انتشار بد امنی اور بگڑے ہوئے حالات پر قابو پا سکے۔ چنانچہ مہاجرین و انصار کے نمایاں افراد مسجد نبوی میں جمع ہوئے اور باتفاق رائے فیصلہ کیا کہ حضرت علی سے خلافت کی درخواست کی جائے۔ اس فیصلہ کے بعد ایک وفد جس میں طلحہ اور زبیر بھی شامل تھے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے زمام کار اپنے ہاتھوں میں لینے کی التجا کی۔ حضرت نے ان کی پیشکش کو قبول کرنے میں توقف کیا اور فرمایا کہ میں تمہارے معاملات میں دخیل ہونا نہیں چاہتا تم جسے چاہو اُسے اپنا امیر منتخب کر لو اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ ان لوگوں نے کہا:

انا لا نعلم احدا احق به منك ولا اقدم سابقة ولا اقرب قرابة من رسول الله (تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص ۹۸)۔	ہم آپ سے زیادہ کسی کو خلافت کا حقدار نہیں سمجھتے اور نہ سابقہ خدمات کے لحاظ سے آپ سے کوئی مقدم ہے اور نہ کوئی رسول اللہ سے قرابت میں آپ سے قریب تر ہے۔

آپ نے پھر انکار کیا مگر وہ لوگ باصرار آمادہ کرتے رہے اور جب یہ دیکھا کہ حضرت کسی طرح خلافت کے قبول کرنے پر تیار نہیں ہیں تو گڑگڑا کر کہنے لگے:

ننشدك الله الا ترى ما نحن فيه الا ترى الاسلام الا ترى الفتنة الا تخاف الله۔ (تاریخ کامل ج ۳۔ ص ۹۹)	ہم آپ کو اللہ کا واسطہ دیتے ہیں آپ دیکھ نہیں رہے کہ ہم کس عالم میں ہیں کیا آپ اسلام کی حالت اور فتنوں کو ابھرتے دیکھ نہیں رہے کیا آپ اللہ سے بھی نہیں ڈرتے۔

جب امیر المومنین نے دیکھا کہ اصرار حد سے بڑھ گیا ہے اور حالات لاکھ نامساعد سہی مگر اتمام حجت کے بعد اب ادائے فرض سے پہلو تہی نہیں کی جا سکتی تو آپ نے فرمایا:

قد اجبتكم واعلموا انی ان	مجھے منظور ہے مگر اس بات کو جان لو کہ یہ منظوری

اجبتکم رکبت بکم ما اعلم۔ | اس صورت میں ہے کہ میں تمہیں اس راہ پر چلاؤں
(تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص ۹۹) | جسے میں بہتر سمجھوں"۔

یہ عوامی رجحانات اور تبدیلیٔ حالات کا کرشمہ ہے کہ حضرت عمر کے بعد سیرت شیخین کی شرط عائد کر کے خلافت کی پیشکش کی گئی تھی جسے آپ نے رد کر دیا تھا اور اب حضرت عثمان کے بعد خلافت انہیں سونپی جاتی ہے تو بجائے اس کے کہ وہ حضرت کو کسی شرط کا پابند کریں حضرت انہیں اپنی شرط کا پابند بناتے ہیں کہ وہ دوسروں کی صوابدید کے بجائے اپنی صوابدید پر عمل پیرا ہوں گے اور انہیں بھی وہ راہ اختیار کرنا ہوگی جسے آپ تجویز فرمائیں اور بہتر سمجھیں۔ یہ حضرت کی اصول پسندی کی نمایاں فتح ہے جس کے سامنے مسلمانوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور بلا چون و چرا اسے تسلیم کر لیا اور صحیح اصول کی پاسداری دوسروں کو جھکنے پر مجبور کر ہی دیا کرتی ہے۔

حضرت کی منظوری کے بعد ۲۵ ذی الحجہ روز جمعہ ۳۵ھ کو عمومی بیعت کا اہتمام کیا گیا امیر المومنین بیت الشرف سے نکل کر مسجد کی طرف آئے جہاں لوگ کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ حضرت سادگی اور حد کی سادگی کے ساتھ سر پر ایک معمولی عمامہ رکھے ایک ہاتھ میں جوتے اٹھائے اور دوسرے ہاتھ میں عصا کے بجائے کمان لئے مسجد میں داخل ہوئے حضرت کی آمد پر مجمع میں حرکت پیدا ہوی آپ مجمع کو چیرتے ہوئے منبر کی طرف بڑھے اور اس مقام پر جہاں رسول اللہ بیٹھتے تھے جا بیٹھے کمان پر ٹیک لگائی اور بیعت کا سلسلہ شروع ہو گیا طلحہ اور زبیر نے پہل کی اور بیعت کے لئے ہاتھ بڑھائے۔ حسین دیار بکری تحریر کرتے ہیں:۔

اول من بایعہ طلحۃ والزبیر | سب سے پہلے طلحہ اور زبیر نے بیعت کی اور پھر
ثم سائر الناس۔ (تاریخ خمیس ج ۲ ص ۲۶۱) | دوسرے لوگوں نے"۔

طلحہ کا ایک ہاتھ جنگ احد میں ناکارہ ہو گیا تھا۔ جب جیب ابن ذویب نے انہیں بیعت کرتے دیکھا تو کہا:۔

اول من بدأ بالبیعۃ ید شلاء | ایک ناکارہ ہاتھ والے نے بیعت کی ابتداء کی ہے
لا یتم ہذا الامر۔ (تاریخ طبری ج ۳۔ ص ۱۵۰۴) | یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی"۔

اس کے بعد لوگ بیعت پر اس طرح ٹوٹ پڑے جس طرح پیاسے پانی پر ٹوٹ پڑتے ہیں اصحاب بدر میں سے کوئی فرد باقی نہ رہی جس نے بیعت نہ کی ہو۔ ابن حجر مکی نے تحریر کیا ہے:۔

فلم یبق من اہل بدر الا | اہل بدر میں سے کوی بھی باقی نہ رہا اور سب کے
اتی علیا فقالوا ما نری احدا | سب حضرت کے پاس آئے اور کہا کہ ہم آپ سے

احق منك مدیدك نبایعك فبایعوہ۔ (صواعق محرقہ۔ ص۱۸) زیادہ کسی کو خلافت کا حقدار نہیں سمجھتے ہاتھ بڑھایئے تاکہ ہم بیعت کریں چنانچہ انہوں نے بیعت کی"۔

ان بیعت کرنے والوں میں صرف اہل مدینہ ہی نہ تھے بلکہ یمن مصر اور عراق کے باشندے بھی تھے۔ سب نے خوشی سے بیعت کی اور اپنی وفاداری کا یقین دلایا اور اس طرح متفقہ طور پر آپ کی خلافت تسلیم کر لی گئی۔

بیعت کی تکمیل کے بعد خطیب انصار ثابت ابن قیس نے انصار کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہُوئے کہا

واللہ یا امیرالمومنین ولئن کانوا تقدموك فی الولایۃ فما تقدموك فی الدین ولئن سبقوك امس لقد لحقتھم الیوم ولقد کانوا وکنت لا یخفی موضعك ولا یجھل مکانك یحتاجون الیك فیما لا یعلمون ولا احتجت الی احد مع علمك۔ (تاریخ یعقوبی ج۲ ص۱۵۵)

خدا کی قسم اے امیرالمومنین اگرچہ وُہ لوگ حکومت میں آپ سے سابق تھے مگر دین میں آپ سے سبقت نہ لے جا سکے اگر وُہ کل آپ سے آگے بڑھ گئے تھے تو آج آپ بھی اسی مقام پر آ گئے ہیں ان کے ہوتے ہُوئے نہ آپ کا مرتبہ ڈھکا چھپا تھا اور نہ آپ کی منزلت انجانی تھی وُہ آپ کے محتاج تھے ان چیزوں میں جنہیں نہیں جانتے تھے اور آپ اپنے علم کی بنا پر کسی کے محتاج نہیں رہے"۔

انصار نے بیعت کے سلسلہ میں عمومی طور پر بڑی سرگرمی سے حصہ لیا مگر ان میں سے چند آدمیوں نے جو عثمانی گروہ سے تعلق رکھتے تھے بیعت سے گریز کیا چنانچہ حسان ابن ثابت، کعب ابن مالک، مسلمہ ابن مخلد ابوسعید خدری، محمد ابن مسلمہ، نعمان ابن بشیر، زید ابن ثابت، رافع ابن خدیج، فضالہ ابن عبید اور کعب ابن عجرہ نے بیعت نہیں کی۔ ان کے علاوہ کچھ اور لوگوں نے بھی بیعت سے پہلو تہی کی۔ چنانچہ قدامہ ابن مظعون، عبداللہ ابن سلام، مغیرہ ابن شعبہ، سعد ابن ابی وقاص، عبداللہ ابن عمر، صہیب ابن سنان، سلمہ ابن وقش اسامہ ابن زید اور رہبان ابن صیفی بیعت سے مُنہ موڑ کر گھروں میں بیٹھے رہے یہ لوگ بھی حضرت عثمان سے وابستہ رہے تھے اور یہی وابستگی ان کے لئے بیعت سے مانع رہی۔

امیرالمومنین نے کسی شخص کو آزادئ رائے کے حق سے محروم نہیں کیا بلکہ ہر شخص کو اس کی رائے پر آزاد چھوڑ دیا۔ نہ کسی پر دباؤ ڈالا اور نہ کسی پر سختی گوارا کی۔ جس نے برضا و رغبت بیعت کرنا چاہی اس سے بیعت لے لی اور جس نے بیعت سے علیحدگی اختیار کرنا چاہی اس سے مطالبہ نہ کیا البتہ سعد ابن ابی وقاص اور عبداللہ ابن عمر سے بیعت کے لئے کہا کیونکہ ان دونوں کے تیور بتا رہے تھے کہ وُہ صرف خود ہی بیعت سے علیحدہ نہیں رہیں گے بلکہ دوسروں کو بھی بیعت سے روکیں گے۔ چنانچہ سعد ابن ابی وقاص اور عبداللہ ابن عمر کو

طلب کیا اور ان سے بیعت کے لئے فرمایا۔ سعد نے دفع الوقتی کرتے ہوئے کہا کہ جب دوسرے لوگ بیعت کر لیں گے تو میں بھی بیعت کر لوں گا اور اگر بیعت نہ بھی کروں تو کھل کر مخالفت بھی نہیں کروں گا۔ حضرت نے دوبارہ ان سے کچھ نہ کہا اور انہیں ان کی مرضی پر چھوڑ دیا۔ اور عبداللہ ابن عمر نے بیعت سے انکار کیا تو اطمینان خاطر کے لیئے اتنا فرمایا کہ تم اس امر کی ضمانت دو کہ ملک کے نظم و نسق میں رخنہ اندازی کر کے فضا کو مکدر کرنے کی کوشش نہیں کرو گے۔ اس نے ضمانت دینے سے انکار کیا۔ اس پر مالک اشتر نے بگڑ کر کہا کہ یا امیرالمومنین مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس کا سر اڑا دوں حضرت نے فرمایا کہ تم اس سے کوئی تعرض نہ کرو میں خود اس کا ضامن ہوتا ہوں۔ یہ بچپن میں بھی کج خلق تھا اور بڑا ہو کر بھی کج خلق رہا۔

امیرالمومنین کے ہاتھ پر بیعت کرنے والوں میں کچھ افراد ایسے بھی تھے جنہوں نے بیعت کے موقع پر بڑی سرگرمی دکھائی مگر بعد میں بیعت سے منحرف ہو کر تخریبی کاروائیوں پر اتر آئے۔ ان تخریب پسندوں میں طلحہ اور زبیر بھی شامل تھے جنہوں نے مجمع عام میں بیعت کی اور جب انہیں اپنے توقعات پورے ہوتے نظر نہ آئے تو بیعت توڑ کر الگ ہو گئے اور بیعت شکنی کے جواز کے لئے عذر یہ تراشا کہ ہم نے تلوار کے سایہ میں مارے باندھے بیعت کی تھی اور اگر بیعت نہ کرتے تو قتل کر دیئے جاتے۔ امیرالمومنین کی بیعت جس صورت اور جن حالات میں ہوئی اسے پیش نظر رکھتے ہوئے کوئی بھی انصاف پسند یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا کہ جس ہستی نے مسلمانوں کے انتہائی اصرار کے بعد خلافت کی ذمہ داری قبول کی ہو اس نے بیعت کا آغاز سختی و تشدد سے کیا ہو گا اور لوگوں کو ہراساں و خوفزدہ کر کے ان سے بیعت لی ہو گی اور پھر ان دو کے علاوہ اور بھی ایسے افراد تھے جنہوں نے بیعت سے انکار کیا تھا مگر کسی پر جبر کرنا تو درکنار کچھ کہا سنا بھی نہیں جاتا تو صرف انہی دو آدمیوں پر جبر کس لئے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ ان دو سے بجبر بیعت لینے میں یہ مصلحت تھی کہ ان کے اثر و نفوذ کی بنا پر انہیں پابند بیعت کر کے سیاسی استحکام حاصل کیا جائے تو یہ مصلحت عبداللہ ابن عمر اور سعد ابن ابی وقاص کے بارے میں بھی ملحوظ ہونا چاہیئے تھی اور انہیں بھی بجبر پابند بیعت کرنا چاہیئے تھا جبکہ یہ دونوں اثر و رسوخ کے اعتبار سے طلحہ و زبیر سے کم نہ تھے عبداللہ ابن عمر خلیفہ زادہ اور سعد ابن ابی وقاص مجلس شوریٰ کے رکن تھے۔ جب ان پر سیاسی استحکام کی بنا پر جبر نہیں کیا گیا تو ان دونوں پر جبر کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ اگر امیرالمومنین بیعت کے سلسلہ میں جبر کرتے تو دور اول میں جو جبر ان پر کیا گیا تھا اسے حق بجانب ثابت کرنے کے لیئے یہ کہا جاتا کہ جب حضرت علی نے جبر و اکراہ سے بیعت لی تو اگر انہیں بیعت کے لئے مجبور کیا گیا تو وہ ظلم و زیادتی کیوں حالانکہ حضرت علی پر کئے جانے والے جبر کے جواب میں کسی نے یہ اشارۃً بھی نہیں کہا کہ آپ نے بھی بیعت کے سلسلہ میں جبر و تشدد روا رکھا تھا۔ لہٰذا یہی کہا جائے گا کہ ان دونوں نے بیعت کی ذمہ داریوں سے بچنے کے لئے بعد میں یہ بات بنائی جسے واقعیت سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔

امیر المومنین کی بیعت سے دینی و دنیوی اقتدار ایک مرکز پر جمع ہو گیا۔ دنیوی اقتدار کو حکومت سے اور دینی قیادت کو خلافت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حکومت کی تشکیل میں عوامی انتخاب کارفرما ہو سکتا ہے مگر خلافت میں نہ انتخاب کا دخل ہوتا ہے اور نہ کسی خود ساختہ اصول کے ماتحت اسے کسی کے سپرد کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ خلافت اللہ کی جانب سے اس کے احکام کے اجراء و نفاذ کے لئے وجود میں آتی ہے جو نبوت کی طرح عوام کے چناؤ پر منحصر نہیں ہوتی اس لئے کہ اسلام کا کوئی جزوی و فرعی حکم بھی ایسا نہیں ہے جسے عوام کی رائے پر چھوڑا گیا ہو تو خلافت ایسے اہم معاملہ کو جس پر حیات ملی اور بقائے دین کا انحصار ہے عوام کی رائے پر کیونکر چھوڑا جا سکتا ہے۔ اس اعتبار سے امیر المومنین کی خلافت جو نصوص قطعیہ سے ثابت ہے عوام کی رائے اور ان کی بیعت پر موقوف نہ تھی۔ اس مرحلہ پر جس خلافت کی پیشکش آپ کے سامنے کی گئی وہ صرف ایک انتخابی اصول کے ماتحت اقتدار کی منتقلی تھی جسے جمہوری خلافت سے تعبیر کیا جاتا ہے اسی لئے امیر المومنین نے اسے قبول کرنے سے انکار کیا تھا اور اصرار کے بعد اسے قبول کیا تو اس مقصد کے پیش نظر کہ قیام حجت کے بعد ان فرائض کو انجام دے سکیں جو بحیثیت امام و جانشین رسول ان پر عائد ہوتے تھے۔ چنانچہ اس مقصد کو حضرت نے ایک خطبہ میں بیان فرمایا ہے: "اگر بیعت کرنے والوں کی موجودگی اور مدد کرنے والوں کے وجود سے مجھ پر حجت تمام نہ ہو گئی ہوتی اور وہ عہد نہ ہوتا جو اللہ نے علماء سے لے رکھا ہے کہ وہ ظالم کی شکم پری اور مظلوم کی گرسنگی پر سکون و قرار سے نہ بیٹھیں تو میں خلافت کی باگ ڈور اسی کے کندھے پر ڈال دیتا اور اس کے آخر کو اسی پیالے سے سیراب کرتا جس پیالے سے اس کے اوّل کو سیراب کیا تھا۔" اگرچہ پیغمبر کے بعد آپ ظاہری اقتدار سے الگ رہے مگر خلافت الٰہیہ کے منصب جلیل سے ایک لمحہ کے لئے بھی آپ کو علیحدہ تصوّر نہیں کیا جا سکتا بلکہ اقتدار و عدم اقتدار دونوں صورتوں میں آپ خلیفۂ رسول اور امام منصوص ہونے کی حیثیت سے واجب الاطاعۃ تھے اس ظاہری خلافت سے تو بس اتنا ہوا کہ جو انہیں امام مفترض الطاعۃ نہیں سمجھتے تھے وہ بھی اطاعت کا جوا اپنی گردنوں میں ڈالنے پر مجبور ہو گئے اگرچہ ان دونوں گروہوں میں اطاعت قدر مشترک تھی مگر دونوں کے زاویہ ہائے نظر مختلف تھے ایک گروہ نے خلافت الٰہیہ کے اعتبار سے اطاعت کی اور ایک گروہ نے عوامی انتخاب کی رو سے سر اطاعت خم کیا۔ جنہوں نے خلیفۂ منصوص ہونے کی حیثیت سے اطاعت کی انہوں نے اس اطاعت کے پردہ میں الٰہی حاکمیت کا اعتراف کیا اور جنہوں نے بر بنائے اقتدار اطاعت کی انہوں نے فقط ملوکیت پرستی کے جذبہ کے زیر اثر سر جھکائے اور وہ ہر اس شخص کی جو کسی بھی طریق سے خواہ قوت و طاقت سے خواہ سیاسی حیلہ گری سے بر سر اقتدار آ جاتا اطاعت کرتے۔ یہ اطاعت و سر افگندگی اقتدار پرستی ہے اور خلافت الٰہیہ کے ماتحت اطاعت، اطاعتِ خدا و رسول ہے۔

دنیوی اقتدار اوروں کے لئے اوج و سربلندی کا باعث ہو تو ہو مگر امیر المومنین کی قدر و منزلت

اس سے بالاتر ہے کہ حکومت و اقتدار ان کے لئے وجہ افتخار بن سکے۔ اس ظاہری خلافت سے پہلے نہ آپ میں کوی کمی تھی اور نہ اب کوی اضافہ ہوا جہاں ہر بلندی سر بخم ہو وہاں تاج و تخت کی بلندی رفعت کا سامان مہیا نہیں کرتی اور جہاں امامت کا جوہر ضیا بار ہو وہاں شہنشاہیت کا کروفر زینت افزا نہیں ہوتا۔

زروئے خوب تو مشاطہ دست باز کشید　　　　که شرم داشت که خورشید را بیاراید

چنانچہ صعصعہ ابن صوحان عبدی نے بیعت کے موقع پر حضرت سے مخاطب ہو کر کہا:۔

واللہ یا امیرالمومنین لقد زینت الخلافۃ وما زانتك ورفعتھا وما رفعتك ولھی احوج الیك منك الیھا۔ (تاریخ یعقوبی۔ ج۲۔ ص۱۳۵)	خدا کی قسم اے امیرالمومنین آپ نے خلافت کو زینت بخشی ہے اس نے آپ کو زینت نہیں دی آپ اسے بلندی پر لے گئے ہیں اس نے آپ کا پایہ بلند نہیں کیا آپ کو اس کی ضرورت نہ تھی اسے آپ کی ضرورت تھی"۔

ایک مرتبہ امام احمد حنبل کے سامنے خلافت کی بحث چھڑی تو انہوں نے کہا:۔

یا ھؤلاء قد اکثرتم فی علی والخلافۃ والخلافۃ وعلی ان الخلافۃ لم تزین علیا بل علی زینھا۔ (تاریخ خطیب بغدادی ج۱۔ ص۱۳۵)۔	اے لوگو تم علی اور خلافت، خلافت اور علی کو طول دے رہے ہو خلافت نے علی کے لئے زینت کا سامان نہیں کیا بلکہ علی نے خلافت کو زینت دی ہے"۔

امیرالمومنین کا طرز جہانبانی

زمانۂ قدیم سے انسانوں پر شہنشاہی نظام مسلط رہا ہے جس کے نتیجہ میں انسانی مزاج اقتدار پرستی کا خوگر ہو گیا اور جذبۂ نیازمندی پرستش کی حد تک پہنچ گیا۔ چنانچہ قدیم مصریوں اور جاپانیوں نے اپنے حکمرانوں کے بارے میں یہ نظریہ قائم کر لیا تھا کہ وہ پیدا ہی حکومت و فرمانروائی کے لئے ہوتے ہیں اور دوسرے افراد پیدائشی طور پر ان کے غلام اور خدمت گزار ہیں۔ اس تصور نے عام انسانوں کے اندر احساس کمتری پیدا کر دیا اور سختیوں میں پیسے جانے اور استبدادیت کے پنجوں میں جکڑے رہنے کے باوجود یہ سمجھتے رہے کہ انہیں فرمانرواؤں کے خلاف لب کشائی کا کوی حق نہیں ہے ان کا مقصد حیات ہی یہ ہے کہ اپنے خون پسینے کی کمائی سے ان کے عیش و عشرت کا سامان کرتے اور ان کے شبستانوں کی رونق بڑھاتے رہیں۔

جب سرزمین عرب پر اسلام کی آواز بلند ہوی تو اس وقت کے حالات بھی کچھ ایسے ہی تھے۔ کمزور طاقتوروں کے سامنے بے بس تھے غریب سود خواروں کی گرفت میں اور غلام آقاؤں کے پنجے میں جکڑے

ہوئے تھے اسلام نے ان جکڑے بندھے انسانوں کو حریت و مساوات کا مژدہ سُنایا رنگ و نسل کا امتیاز مٹایا غلاموں کو انسانی حقوق سے بہرہ یاب کیا اور انسانی حکومت کو ختم کر کے حکومت الٰہیہ کا پیغام دیا حکومت الٰہیہ کا مطلب یہ ہے کہ صرف خدا کی حاکمیت اور اس کے اقتدار اعلےٰ کا اعتراف کیا جائے اور دل کی گہرائیوں میں یہ عقیدہ سمو لیا جائے کہ وہی ہمارا اور سب کا مالک ہے وُہ ہمارے ہر قول و فعل کا سننے اور دیکھنے والا ہے اور ہم اسی کے احکام کے پابند اور اسی کے سامنے جوابدہ ہیں۔ اس حاکمیت کا اعتراف استبدادیت کے بتوں کو پاش پاش کر کے دل و دماغ میں برادری و برابری کا احساس پیدا کرتا ہے اور تمام ناروا پابندیوں سے چھڑا کر فطری و طبعی آزادی کی راہ پر لے چلتا ہے۔

پیغمبر اسلام کا مطمح نظر حکومت یا سیاسی اقتدار نہ تھا بلکہ مقصد بعثت حکومت الٰہیہ کی تشکیل اور خداوندی اقتدار کا قیام تھا۔ چنانچہ انہوں نے درس توحید دے کر تمام انسانوں کو ایک مرکز وحدت پر جمع ہونے کی دعوت دی تاکہ اللہ کے احکام کا اجراء اور اس کے قوانین کا نفاذ کر کے ایک پاک و پاکیزہ اور معیاری معاشرہ قائم کریں جس میں ظلم کے بجائے عدل و انصاف کو جہالت کے بجائے علم و حکمت کو اور انسانوں کی حکومت کے بجائے اللہ کی حاکمیت کو فروغ حاصل ہو تاکہ فرزندان توحید اللہ کے علاوہ کسی اور کے آگے سرنگوں نہ ہوں۔ آنحضرت نے صرف اپنے دَور ہی میں حکومت الٰہیہ کی تشکیل نہیں کی بلکہ اپنے بعد کے لئے بھی ایک ایسے ابدی نظام کی رہنمائی فرما گئے جو اللہ کی حاکمیت پر مبنی تھا۔ اس نظام کا نام خلافت الٰہیہ ہے جس کے قیام کا ذمہ دار وُہ ہو گا جو اللہ کے اقتدار اعلےٰ کو تسلیم کرے اور اپنے قول و عمل سے عوام کو الٰہی حاکمیت کے تصور سے ادھر ادھر نہ ہونے دے اور ہر حرکت و سکون اور ہر قول و فعل میں اللہ کے احکام کا پابند اس کے قوانین کا نگراں اور اسی کا مقرر کردہ ہو تاکہ زمین میں اسے اللہ کا نمائندہ سمجھ کر اس کے احکام کے آگے سر اطاعت خم کیا جائے کیونکہ خدا کے احکام کی تعمیل اسی کے احکام کی بجا آوری میں مضمر ہوتی ہے چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:۔

اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم۔	اللہ کی اطاعت کرو اور رسُول کی اور جو تم میں سے صاحبان امر ہوں۔"

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ پیغمبر کے بعد جس کمزور جمہوریت پر حکومت کی اساس رکھی گئی تھی وُہ قیصری و کسروی طرز حکومت کا پیش خیمہ ثابت ہوی اور اللہ کی حاکمیت کی جگہ شخصی حکومت نے لے لی حالانکہ اسلام میں آمریت ملوکیت اور شخصی حکومت کی کوی گنجائش نہیں ہے اور نہ ایک انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کرنے کا کوی حق ہے خواہ وُہ تیغ و سنان کا سہارا لے کر بر سر اقتدار آیا ہو یا جمہور کی رائے ہموار کر کے۔ اس لئے کہ حکومت الٰہیہ کا معیار نہ قوت و طاقت ہے اور نہ ان عوام کی ہمنوائی جن کی اکثریت خود غرضی و مفاد پرستی کا شکار ہوتی ہے بلکہ جسے حکمران حقیقی اپنے نمائندہ کی حیثیت سے نگران ریاست

مقرر کرے گا وہی اسلامی مملکت کا رئیس و سربراہ متصوّر ہو گا جو الٰہی حاکمیت کی اساس پر حکومت کی تشکیل کرے گا اور اللہ کے احکام و قوانین کے نفاذ کا پابند ہو گا۔ بے شک مسند نشینانِ خلافت مسلمان کہلاتے اور حلقہ بگوش اسلام سمجھے جاتے تھے مگر اسلامی حکومت صرف مسلم افراد کے برسر اقتدار آجانے کا نام نہیں ہے بلکہ اس نظام حیات کے احیاء کا نام ہے جسے آنحضرت نے نافذ کیا اور اپنے بعد ایک ناقابل ترمیم لائحہ عمل کے طور پر چھوڑ گئے۔ اگر کوئی اس لائحہ عمل کے خلاف حکومت تشکیل دیتا ہے تو وہ لاکھ مسلمان کہلاتا اور مسلمان سمجھا جاتا ہو اُسے اسلامی حکمران نہیں کہا جا سکتا۔ چنانچہ یزید، مروان، عبدالملک اور اس قبیل کے دوسرے فرمانرواؤں کی حکومت کو اسلامی حکومت سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ حکومتیں اسلامی حکومت کا آئینہ دار ہونے کے بجائے ہرقلی و قیصری حکومتوں کا نمونہ تھیں جنہیں اسلامی حکومت کہنا اسلامی طرزِ حکومت سے بے خبری کی دلیل ہے۔

حضرت علی کی حکومت صحیح معنی میں اسلامی حکومت تھی اور آپ نے حکومت کی ذمہ داری اسی شرط پر قبول کی تھی کہ اسے اسلامی قالب میں ڈھالنے اور منہاج نبوت پر چلانے میں کوئی دخل انداز ہونے کی کوشش نہ کرے۔ چنانچہ آپ نے حالات کی تبدیلی اور انسانی مزاج کی تغیر پذیری کے باوجود حکومتِ ربانیہ کے تقاضوں کے مطابق حکومت کی تشکیل کی اور رسول اللہ کے طرز جہانبانی پر اپنی حکومت کی اساس رکھی اگرچہ آپ کا دورِ حکومت مختصر اور انتہائی مختصر اور وہ بھی شورشوں اور ہنگاموں کا آماجگاہ بن گیا تھا مگر اس تھوڑے عرصہ میں بھی اسلامی حکومت کے خد و خال کو اس طرح نمایاں کر کے دُنیا والوں کے سامنے پیش کیا کہ دورِ نبوی کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ اگر آپ زمام حکومت اپنے ہاتھوں میں نہ لیتے تو مسلمانوں پر حکومت اسلامیہ کا مفہوم واقعی روشن نہ ہوتا اور اسے بھی مادی حکومتوں کی طرح کی ایک حکومت تصور کر لیا جاتا جس کا مقصد ملک گیری و کشورکشائی کے سوا کچھ نہیں ہوتا مگر آپ نے اقتدار اپنے ہاتھوں میں لے کر ان تمام پردوں کو ایک ایک کر کے اٹھا دیا جو اسلامی حکومت پر ڈالے گئے تھے اور اپنے طرزِ عمل سے واضح کر دیا کہ اسلامی اصول و آئین کے ماتحت حکومت کا قیام اور ہے اور بتقاضائے سیاست اسلام کا نام لے کر حکومت کی تشکیل اور ہے۔

امیرالمومنین کی پوری زندگی اس کی شاہد ہے کہ ان کے ہر عمل میں للہیت کارفرما ہوتی تھی اور انہوں نے اقتدار کو قبول کیا تو اسی جذبۂ للہیت کے زیر اثر تاکہ افراد کی حکومت کے بجائے اللہ کی حکومت قائم کریں، اور لم یکن لہ شریک فی الملک کو صحیح معنی میں عملی جامہ پہنائیں۔ اگر حضرت کو ذاتی اقتدار کی خواہش ہوتی تو آپ کو مشورے دیئے جا رہے تھے کہ سابقہ حکومت کے عمال کو ان کے عہدوں سے نہ ہٹائیں تاکہ حکومت کے استحکام کو نقصان نہ پہنچے مگر آپ نے اس نقصان کو درخور اعتناء نہ سمجھا کیونکہ آپ سمجھتے تھے کہ اگر انہیں ان کے عہدوں پر بحال رہنے دیا گیا تو وہ خداوندی اقتدار کے بجائے اپنا اقتدار قائم کریں گے

اور آپ نے حکومت قبول کی تھی تو اسی شخصی اقتدار کو ختم کرنے کے لئے۔ اگر حضرت کو اپنا اقتدار عزیز ہوتا تو جائز و ناجائز سے آنکھیں بند کر کے تمام استحکامی تدبیروں پر عمل کرتے اور شر انگیز عناصر سے سازگاری کر کے اپنا دور کامیاب بناتے مگر حضرت کی نگاہوں میں شخصی حکومت کی کوی قدر و قیمت نہ تھی ان کی نظروں میں کسی چیز کی اہمیت تھی تو اُمّت کی عملی تربیت اور اسلامی شعائر کے احیاء کی۔ ایک مرتبہ اپنا جوتا گانٹھتے ہوُے ابن عباس سے پُوچھا کہ اس جوُتے کی قیمت کیا ہوگی کہا کہ اب تو اس کی قیمت کچھ بھی نہیں ہے۔ فرمایا:۔

واللہ لاحب الی امرتکم الا ان اقیم حقا او ادفع باطلا (نہج البلاغہ)	خدا کی قسم اگر میرے پیش نظر حق کا قیام اور باطل کا مٹانا نہ ہو تو تم لوگوں پر حکومت کرنے سے یہ جُوتا مجھے کہیں زیادہ عزیز ہے۔"

امیرالمومنین نے اسلامی حکومت کی غرض و غایت کو دو مختصر سے جملوں میں بیان کر دیا ہے ایک حق کا قیام اور دوسرے باطل کا استیصال۔ اور آپ نے اپنے عہد اقتدار میں انھی دو چیزوں کو پیش نظر رکھا اور اپنا دور حکومت حق کی سر بلندی اور باطل کی سرکوبی کے لئے وقف کر دیا اور اسلامی احکام کے اجرا اور اخلاقی اقدار کے تحفّظ ہی کو مقصد اولین قرار دیا اور جبکہ اقتدار کے مقابلہ میں اصول و آئین کی کوی قدر و قیمت نہ سمجھی جاتی تھی اور حکومت کی خاطر اسلامی اصولوں کو نظر انداز کیا جا رہا تھا اور کوی قانون ذاتی مفاد سے متصادم ہوتا تو اسے تاویلات کا ہدف بنا لیا جاتا تھا آپ نے کسی قیمت پر صحیح اصولوں سے انحراف گوارا نہ کیا اور نہ مخالفت کی تیز و تند آندھیاں آپ کے موقف میں تبدیلی پیدا کر سکیں۔ آپ نہ صرف اپنے موقف پر مضبوطی سے جمے رہے بلکہ اپنے طرز عمل سے منجمد طبیعتوں میں حرکت و عمل کا جذبہ پیدا کیا اور اسلامی تعلیمات سے روشناس کر کے ذہنی انقلاب کی راہ ہموار کی اگرچہ آپ ملک گیری کی طرف متوجہ نہیں ہوُے اور نہ اندرونی شورشوں کی وجہ سے اس کا کوی موقع تھا مگر دلوں کی تسخیر اور ذہنوں کی تعمیر کشورکشائی سے بڑا کارنامہ ہے۔ بیشک اور فرمانرواؤں نے لشکر کشی کر کے مملکت کے حدود وسیع کئے اور علاقوں پر علاقے فتح کر کے فاتح کہلائے مگر حضرت نے گلشن اسلام کی تازگی کے لئے کانٹوں کو چھانٹا اور ماؤف اعضاء کو کاٹ کر فاسد مواد کا اخراج کیا اور اسلامی نظام کو اس کی صحتمندانہ قدروں پر استوار کر کے دکھا دیا۔ پیہم ہنگاموں اور متواتر خانہ جنگیوں میں اسلامی خطوط پر معاشرہ کی تشکیل کوی آسان کام نہ تھا مگر امیرالمومنین نے گوناگوں مشکلات کے باوجود معاشرہ کی تطہیر کی رفاہ عامہ کے کام انجام دیئے استحصال کی روک تھام کی رعایا کی شکایات سنیں اور ان کا ازالہ کیا ناروا بندشوں کو ختم کر کے آزادانہ فضا میں سانس لینے کا موقع دیا تعمیری عناصر کی حوصلہ افزائی کی اور تخریبی قوتوں کا سر توڑ مقابلہ کیا عمال کی کارگزاریوں کا ہر پہلو سے جائزہ لیا خراج و زکوٰۃ کے کارندوں کے دائرۂ کار اور معاشرہ کے مختلف طبقات

کے حقوق و فرائض کا تعین کیا اور نسلی و ملکی امتیازات کو ختم کر کے معاشرتی عدل کو فروغ دیا۔

امیر المومنین کے پیش نظر ایک ایسا معیاری و مثالی معاشرہ تھا جس میں ظلم و جور، استحصال و زر اندوزی اور رشوت و خیانت کی قطعاً کوئی گنجائش نہ ہو اور نظام حکومت حق و انصاف قانونی مساوات و سائل معیشت کی آزادی انفرادی و اجتماعی فلاح اور اسلامی اقدار پر مبنی ہو۔ حضرت خود بھی ان چیزوں پر کاربند رہے اور عمال حکومت کو بھی ان پر کاربند رہنے کی تلقین کرتے اور ان میں احساس ذمہ داری پیدا کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً انہیں دینی اقدار اور اسلامی ضابطہ اخلاق کی طرف تحریراً متوجہ فرماتے رہتے ان تحریرات میں سر عنوان تقویٰ و پرہیزگاری کی ہدایت اور یوم حساب کی یاد دہانی ہوتی تاکہ تقویٰ ان کے دلوں میں عظمت الٰہی کا احساس اور آخرت کی یاد عمل کا جذبہ پیدا کرے اور اس طرح یقین و عمل کی روح ان کے رگ و پے میں سرایت کر جائے۔

یوں تو آپ کا ہر تحریری فرمان ایک دفتر ہدایت ہوتا تھا مگر مالک اشتر کو والی مصر مقرر کرتے وقت جو دستاویز لکھ کر دی وہ الہامی تعلیمات کی آئینہ دار اور دستوری شقوں پر اس حد تک حاوی ہے کہ آج تک ذہن انسانی اس سے آگے سوچ نہیں سکا اور نہ مزید ارتقائی مراحل طے کر کے اس میں بنیادی طور پر کسی شق کا اضافہ کر سکے گا۔ جورج جرداق مسیحی نے اس کی جامعیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

ھی من جلائل وصایاہ و	"آپ کے عہد ناموں میں سے یہ ایک عظیم منشور
اجمعھا للقوانین المدنیۃ	ہدایت ہے جو شہریت و مدنیت کے قوانین کا جامع
والحقوق العامۃ والتصرفات	اور عامۃ الناس کے حقوق اور خواص کے حدود کار
الخاصۃ۔ (صوت العدالہ ج۱ ص۳۳۵)	پر حاوی ہے"۔

اس دستاویز میں حضرت نے معاشرہ کے ادنیٰ طبقہ سے لے کر اعلیٰ طبقہ تک ایک ایک کے حقوق و فرائض وضاحت سے بیان فرمائے ہیں اور مزدوروں صنعت کاروں تاجروں لشکریوں قاضیوں مشیروں وزیروں اور اکتساب معیشت سے درماندہ افراد کے حقوق کا تعین کیا ہے اور صیغۂ مالیات حکومتی معاہدات داخلہ و خارجہ تعلقات اہل اسلام اور ذمیوں کے شہری و معاشرتی حقوق سیاسی و معاشی نظام عدلیہ و انتظامیہ کے قیام اور قضاۃ و عمال اور ان کے ماتحت عملہ کے فرائض پر روشنی ڈالی ہے۔

یہ منشور ہدایت اپنی افادیت و ہمہ گیری کے اعتبار سے کسی خاص دور کسی خاص طبقہ اور کسی خاص ملک سے مخصوص نہیں ہے بلکہ حضرت نے آج سے تقریباً چودہ سو برس پہلے جو راعی اور رعایا کا مقام متعین کیا اور مملکت کا جو لائحۂ عمل تجویز فرمایا وہ آج بھی اتنی ہی افادیت کا حامل ہے جتنا اس دور میں تھا اور ہر جمہوری و غیر جمہوری مملکت اس سے یکساں فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ اگر امن عالم اور تحفظ حقوق کی آواز بلند کرنے والی حکومتیں اسے اپنا لائحۂ عمل قرار دے لیں تو نہ زمیندار و کاشتکار میں کشمکش ہو سکتی ہے نہ مزدور کی حق تلفی اور سرمایہ کار کے ظلم کا سوال پیدا ہو سکتا ہے اور نہ دولت کی غیر متوازی تقسیم سے معاشی

ناہمواری جنم لے سکتی ہے بلکہ ایسا پرامن معاشرہ صورت پذیر ہو سکتا ہے جو باہمی سازگاری خوشحالی و معاشی برتری کا ایک اعلیٰ ترین نمونہ ہو۔

ہم اس منشور ہدایت کو یہاں نقل کرنے کے بجائے ترجمہ نہج البلاغہ باب مکاتیب کا حوالہ دے دینا کافی سمجھتے ہیں قارئین کرام چاہیں تو نہج البلاغہ کے صفحات پر دیکھ سکتے ہیں البتہ اس کتاب میں کہیں کہیں اس کے اقتباسات پیش کئے جائیں گے۔

اب حضرت کی حکومت کے مختلف شعبوں کا اجمالی تذکرہ کیا جاتا ہے جس سے یہ امر واضح ہو جائے گا کہ آپ کی سیاست عین اسلامی سیاست تھی اور چونکہ اسلامی سیاست ایک ایسا نظام ہے جس میں زندگی کے تمام شعبوں کو دین سے وابستہ کر دیا گیا ہے اس لئے حکومت علویہ کا کوئی شعبہ وہ معیشت سے متعلق ہو یا معاشرت سے رعایا سے متعلق ہو یا راعی سے دین کے حدود سے خارج تصور نہیں کیا جا سکتا۔

عمال کا معیار تقرر

تمدنی ارتقاء اور معاشرتی بلندی، ریاست کی تنظیم اور حکومت کی تشکیل سے وابستہ ہے خواہ شخصی حکومت ہو یا جمہوری اسلامی ہو یا غیر اسلامی حکومت ہی کے ذریعہ انسانی معاشرہ میں نظم و نسق پیدا کیا جا سکتا ہے اور اسی کے ذریعہ شورش و بدنظمی کا انسداد انسانی حقوق کا احترام اور ملکی اصلاحات کا نفاذ ممکن ہے۔ ریاست کا نظم و انضباط اور اس کی شیرازہ بندی سربراہ مملکت کے تدبر اور عمال کی انتظامی صلاحیتوں اور عملی کارگزاریوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اگر کسی ریاست میں عمال و نگراں کارنہ ہوں یا ہوں مگر خود غرض مفاد پرست اور ادائے فرض سے غافل ہوں تو نہ نظم و ضبط قائم رہ سکتا ہے اور نہ فتنہ و شر اور لاقانونیت کا استیصال کیا جا سکتا ہے۔ حکومت کے انتظامی و اصلاحی امور کا نفاذ انہی حکام و عمال کے ذریعہ عمل میں آتا ہے اور انہی کے ذریعہ رعایا کو ملکی قوانین و ضوابط کا پابند بنایا جاتا ہے۔ ان عمال کا تقرر ریاست کے مختلف علاقوں میں سربراہ مملکت کی صوابدید سے ہوتا ہے اگر حکومت اسلامی ہو گی تو وہ ان امور کے علاوہ جو اسلامی و غیر اسلامی حکومت میں مشترک ہیں جزیہ و زکوٰۃ کی جمع آوری حدود و تعزیرات کے اجرا اسلامی احکام کے نفاذ اور دینی و اخلاقی تربیت ایسے تعمیری فرائض کی انجام دہی کے بھی ذمہ دار ہوں گے۔

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ عوام اپنے حکام کے طرز عمل سے متاثر ہوتے ہیں اور وہی طور طریقہ اختیار کرتے ہیں جو ان حکام کا ہوتا ہے۔ اگر وہ بلند کردار نیک سیرت اور اسلامی تعلیمات کا عملی نمونہ ہوں گے تو عوام میں بھی حسن عمل کا جذبہ پیدا ہو گا۔ اور اگر خود غرض رشوت خور اور استحصال پسند ہوں گے تو رعایا بھی خود غرضی کی ڈگر پر چل نکلے گی اور تمام اخلاقی قدروں کو اپنے ذاتی مفاد پر بھینٹ چڑھا کر ملکی فضا کو مکدر کر کے رکھ دیگی

اور اس کا نتیجہ انتشار بے اطمینانی بد امنی اور آخر میں حکومت کی بربادی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ اس لئے مملکت کی بہبود اور عوام کی فلاح کا تقاضا یہ ہے کہ حکام و عمال کے تقرر میں باریک بینی سے کام لیا جائے ان کے عادات و اطوار پرکھ لئے جائیں اور معیار پر پورے اتریں تو اُن کا تقرر عمل میں لایا جائے۔

امیر المومنین تقویٰ دیانت اور صلاحیت کار ہی کو عہدوں کا معیار سمجھتے تھے اور اپنے دور حکومت میں کلیدی عہدے انہی لوگوں کے سپرد کئے جن کی امانت دیانت نیکی اور راست روی پر پورا اعتماد تھا۔ ابن عبد البر تحریر کرتے ہیں:۔

ولا یخص بالولایات الا اھل الدیانات والامانات۔	حضرت علی انہی لوگوں کو والی و حاکم مقرر کرتے جو امین اور دیانت دار ہوتے۔"

(استیعاب۔ ج۲۔ ص۴۷)

اس سلسلہ میں خاندانی اثرات قبائلی طاقت قرابت اور سفارش سے قطعاً متاثر نہ ہوتے تھے صرف دیانت اور نظم و ضبط کی اہلیت کو دیکھتے تھے اور ان عمال کو بھی ہدایت کرتے تھے کہ وہ سفارش پر عہدے نہ دیں۔ چنانچہ ایک موقع پر فرمایا:۔

لاتقبلن فی استعمال عمالك وامراءك شفاعة الا شفاعة الكفاية والامانة۔ (الف کلمہ)۔	کارندوں اور کارپردازوں کو عہدہ دینے میں کسی کی سفارش قبول نہ کرو بلکہ یہ دیکھو کہ وہ امین اور اس کام کے لئے موزوں ہیں۔"

امیر المومنین کے عمال میں چند عمال ہاشمی بھی تھے جیسے فرزندان عباس، عبد اللہ عبید اللہ اور قثم بعض لوگوں نے اس سے یہ تاثر لیا ہے کہ حضرت نے عہدہ داروں کے انتخاب میں قرابت کا پاس کیا ہے اور عزیزداری کو ملحوظ رکھا ہے لہذا حضرت عثمان نے اگر اپنے قبیلہ و خاندان سے عمال مقرر کئے تو ان پر حرف گیری کیوں کی جائے جبکہ حضرت علی پر نکتہ چینی نہیں کی جاتی اس سے حضرت علی کی شخصیت کا تحفظ پیش نظر نہیں ہے بلکہ حضرت عثمان کی اقربا نوازی کا جواز ثابت کرنا ہے مگر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت علی کے انتخاب میں اقربا پروری کا جذبہ شامل تھا تو حضرت عثمان خویش نوازی کے الزام سے بری کیسے ثابت ہو گئے جبکہ الزام کی نوعیت یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے عزیزوں کو برسر اقتدار لائے بلکہ الزام یہ ہے کہ ایسوں کو برسر اقتدار لائے جو خود سر نا عاقبت اندیش اور امور نظم و نسق سے بے خبر تھے جنہوں نے قبائلی عصبیت کو ابھارا سرمایہ داری کا رجحان پیدا کیا اور جبر و استحصال اور ظلم و تشدد سے انسانی قدروں کو پامال کر کے رکھ دیا۔ اگر ایسے لوگوں کو منتخب کرتے جو حق پسند انصاف پرور اور تقویٰ و دیانت کے پابند ہوتے تو اقربا نوازی ہوتی بھی تو لوگ اسے نظر انداز کر دیتے اور نوبت وہاں تک نہ پہنچتی جہاں تک پہنچی حضرت علی نے جن عزیزوں کو عہدے دیئے ان کی انتظامی صلاحیت اور تقویٰ و دیانت شک و شبہ سے

بالاتر ہے اس تفرقہ کے باوجود دونوں دَوروں کے عاملوں کو صرف قرابت میں اشتراک کی بنا پر ایک سطح پر سمجھنا اور اس سے حضرت عثمان کی بے غرضی و بے لوثی پر ثبوت لانا واقع کی صحیح ترجمانی نہیں ہے۔ پھر یہ بات اس وقت کہی جا سکتی تھی جب اموی عمال کی طرح ہاشمی عمال تمام صوبوں پر چھائے ہوتے اور تمام علاقوں کا درو بست ان کے ہاتھوں میں ہوتا۔ لے دے کر دو چار عمال ہاشمی تھے اور وہ بھی ایسے جن کی علمی و عملی جلالت سے کسی کو انکار نہیں ہے۔ حیرت ہے کہ پچیس برس کے طویل عرصہ میں کوئی ہاشمی کسی عہدہ پر نظر نہیں آتا۔ تو اسے اتفاق پر محمول کر کے قابل توجہ نہیں سمجھا جاتا اور امیر المومنین کے دَور میں چند ہاشمی منصب پر فائز ہو جاتے ہیں تو ذہنی کیفیت دگرگوں ہو جاتی ہے اور پیشانی پر سلوٹیں پڑ جاتی ہیں۔ کیا بنی ہاشم میں کوئی بھی کلیدی منصب کی اہلیت نہ رکھتا تھا۔ اور اگر ان میں اہلیت تھی تو پھر ہاشمیت کی بنا پر انہیں عہدوں سے محروم رکھنا کہاں کا انصاف ہوتا اگر بقول حضرت عمر نبوّت و خلافت ایک خاندان میں جمع نہ ہو سکتی تھی تو کیا خاندانِ نبوّت میں کسی عہدہ و منصب کی بھی گنجائش نہ تھی۔ کیا ان میں اہل افراد نہ تھے یا یہ بنی ہاشم سے بے التفاتی و سردمہری کا مظاہرہ تھا۔ امیر المومنین کی فرض شناسی و بے نفسی کو دیکھتے ہوئے یہ تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا کہ آپ نے قرابت سے متاثر ہو کر عدم اہلیت کے باوجود کسی ہاشمی کو کوئی عہدہ دیا ہو گا یا ان سے امتیازی برتاؤ روا رکھا ہو گا۔ حضرت کے نزدیک عہدوں کا معیار صرف اہلیت اور کردار کی پاکیزگی تھا اور جو اس معیار پر پورا اُترتا وہ ہاشمی ہو یا غیر ہاشمی مہاجر ہو یا انصار اسے اس کے حق سے محروم نہ کرتے اگر ان میں سے کوئی بے راہروی کا مرتکب ہوتا تو قرابت و عزیزداری کی بنا پر درگزر سے کام نہ لیتے بلکہ فوراً مواخذہ کرتے اور مناسب سزا دیتے۔

عمال کا محاسبہ

عمال حکومت مملکت میں تعمیر اور تخریب دونوں طرح کا کردار ادا کر سکتے ہیں۔ انہی کی تعمیری صلاحیتوں سے نظم مملکت سنورتا ہے اور انہی کی تخریبی کارروائیوں سے نظم و نسق بگڑتا ہے۔ حزم و احتیاط اور احساس فرض کا تقاضا یہ ہے کہ سربراہ مملکت عمال کے حالات و معاملات سے باخبر رہے ان کی تخریبی و تعمیری تمام کارروائیوں پر نظر رکھے اور سلطنت کا کاروبار ان پر چھوڑ کر مطمئن نہ ہو جائے اس لئے کہ عمال حکومت کتنے ہی بلند کردار اور پاکیزہ نفس کیوں نہ ہوں ان کے گرد عصمت کا حصار نہیں ہوتا کہ ان سے کسی لغزش و بے راہروی کا احتمال نہ ہو جبکہ دولت و اقتدار کے نشہ میں اچھے اچھوں کے قدم لڑکھڑا جاتے ہیں اور حرص و طمع کا شکار ہو کر رشوت، غبن اور خیانت ایسے جرائم کا ارتکاب کر گزرتے ہیں اور خدمت خلق کے بجائے ذاتی مفاد کو اپنا نصب العین بنا لیتے ہیں۔

امیر المومنین انسانی مزاج کی بے ثباتی کو خوب سمجھتے تھے اس لئے وہ آنکھ کان بند کر کے اعتماد کر لینے کے

قائل نہ تھے اور پھر سابقہ حکومت کے بھی دو ایک عمال حضرت کو اپنی اطاعت و فرمانبرداری کا یقین دلا کر اپنے عہدوں پر بحال تھے جیسے ابو موسیٰ اشعری، اشعث ابن قیس اور مصقلہ ابن ہبیرہ۔ لہذا ضرورت تھی کہ ان کی ایک ایک حرکت پر کڑی نظر رکھی جائے آمد و خرچ کا جائزہ لیا جائے اور ان کا پورا پورا احتساب کیا جائے چنانچہ امیر المومنین ان کے رہن سہن طور طریقہ اور چھوٹے بڑے معاملہ پر نظر رکھتے ان کی کارکردگیوں کی حوصلہ افزائی اور ان کی کوتاہیوں پر تنبیہہ و سرزنش کرتے بیت المال کا حساب جانچتے اور جائز و ناجائز مصرف کو وقت نظر سے دیکھتے اگر کسی کے متعلق خیانت کی خبر آتی تو نظریں آسمان کی طرف اٹھا کر بارگاہِ خداوندی میں عرض کرتے :۔

اللّٰھم انک تعلم انی لم آمرھم بظلم خلقک ولا بترک حقک

بارالٰہا تو جانتا ہے کہ میں نے انہیں تیری مخلوق پر ظلم کرنے اور تیرے حق کو نظر انداز کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔"

(استیعاب ج ۳ ۔ ص ۴۸)

اور پھر عملاً محاسبہ و مواخذہ کرتے اور جرم کی سبکی و سنگینی کے لحاظ سے کسی کو فقط تنبیہہ و سرزنش کرتے کسی سے غبن کیا ہوا سرمایہ اگلواتے اور کسی کو قید و بند کی سزا دیتے۔ اس سلسلہ کے متعدد واقعات میں سے چند واقعات اختصار کے ساتھ درج کئے جاتے ہیں تاکہ حضرت کی سیرت کا یہ رُخ نظروں کے سامنے آجائے۔

والی بصرہ عثمان ابن حنیف ایک دعوت میں شریک ہوئے حضرت کو معلوم ہوا تو انہیں تنبیہہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا: "مجھے اُمید نہ تھی کہ تم ان لوگوں کی دعوت قبول کرو گے جن کے یہاں سے فقیر و نادار دھتکارے گئے ہوں اور دولتمند مدعو ہوں۔ جو لقمے چباتے ہو انہیں دیکھ لیا کرو اور جس کے متعلق شبہ بھی ہو اسے چھوڑ دیا کرو اور جس کے پاک و پاکیزہ طریق سے حاصل ہونے کا یقین ہو اس میں سے کھاؤ۔ اے ابن حنیف! اللہ سے ڈرو اور اپنی روٹیوں پر قناعت کرو تاکہ جہنم کی آگ سے چھٹکارا پا سکو۔"

اشعث ابن قیس جو حضرت عثمان کے زمانہ سے آذر بائیجان کا حاکم چلا آرہا تھا حضرت کو اس کی بے راہروی کی اطلاع ملی تو جنگ جمل سے فارغ ہو کر اسے تحریر کیا کہ: "تمہارے ہاتھوں میں اللہ کا جتنا مال ہے تم اس وقت تک اس کے خزانچی ہو جب تک اُسے میرے حوالے نہ کردو۔" اشعث سمجھ گیا کہ اسے برطرف کیا جا رہا ہے اس نے یہ کیا کہ جتنا مال سمیٹ سکتا تھا سمیٹ لیا اور اپنے چند دوستوں سے حضرت کے خط کا ذکر کرنے کے بعد کہا کہ میرا ارادہ ہے کہ میں معاویہ کے ہاں چلا جاؤں انہوں نے کہا کہ تمہارے لئے مناسب نہیں ہے کہ اپنے قوم و قبیلہ کو چھوڑ کر شام جاؤ۔ اس نے دوستوں کے کہنے سننے سے شام جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور مال پی جانا چاہا۔ حضرت نے حجر ابن عدی کندی کو اس کے پاس بھیجا جو اُسے گھیر گھار کر کوفہ لے آئے۔ جب اس کا سامان دیکھا گیا تو اس میں سے چار لاکھ درہم برآمد ہوئے حضرت نے تیس ہزار درہم اس کے خدمات

کے صلہ میں اسے دیئے اور باقی مال بیت المال میں جمع کر دیا۔

منذر ابن جارود عبدی نے جو آپ کی طرف سے اصطخر کا حاکم تھا کچھ ہیر پھیر کیا آپ نے اُسے تحریر فرمایا: "مجھے تمہارے متعلق یہ معلوم ہوا ہے کہ تم آخرت گنوا کر دُنیا بنا رہے ہو اور دین سے رشتہ توڑ کر اپنے رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کر رہے ہو۔ تم اس قابل نہیں کہ تمہیں امانت میں شریک کیا جائے یا خیانت کی روک تھام کے لئے تم پر بھروسا کیا جائے۔ لہٰذا جب میرا خط ملے تو فوراً میرے پاس حاضر ہو جاؤ۔" جب منذر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو جانچ پڑتال کے بعد اس کے ذمہ ۲۰ ہزار درہم نکلے منذر نے انکار کیا اور کہا کہ میرے ذمہ کوئی رقم نہیں ہے۔ حضرت نے اُسے قسم کھانے کو کہا اس نے قسم کھانے سے بھی انکار کر دیا۔ آپ نے اسے جیل بھجوا دیا۔ آخر صعصعہ ابن صوحان کے کہنے سے اسے رہا کر دیا گیا

زیاد ابن سمیہ کے بارے میں جو بصرہ میں ابن عباس کا قائم مقام تھا کچھ بددیانتی کی خبریں آئیں۔ حضرت نے اسے تحریر کیا کہ "اگر مجھے یہ پتا چل گیا کہ تم نے مسلمانوں کے مال میں خیانت کرتے ہوئے کسی چھوٹی یا بڑی چیز میں ہیر پھیر کیا ہے تو یاد رکھو کہ میں تمہیں ایسی سزا دوں گا جو تمہیں تہی دست بوجھل پیٹھ والا اور بے آبرو کر کے چھوڑے گی۔"

اردشیر خرہ کے عامل مصقلہ ابن ہبیرہ کو تحریر کیا: "وُہ مال جسے مسلمانوں کے نیزوں کی انیوں اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے جمع کیا گیا تھا اور جس پر ان کے خون بہائے گئے تھے تم اپنی قوم کے ان بدوؤں میں بانٹ رہے ہو جو تمہارے ہوا خواہ ہیں۔ اگر یہ صحیح ثابت ہُوا تو تم میری نظروں میں ذلیل ہو جاؤ گے۔ اس مال میں وُہ مسلمان جو میرے ہاں ہیں یا تمہارے ہاں دونوں برابر کے شریک ہیں۔"

جب بنی تمیم کے کچھ افراد نے ابن عباس کے متشددانہ رویہ کا شکوہ کیا تو حضرت نے ابن عباس کو لکھا: "خدا تم پر رحم کرے رعیت کے بارے میں تمہارے ہاتھ اور زبان سے جو اچھائی یا برائی ہونے والی ہو اس میں جلد بازی نہ کیا کرو کیونکہ ہم دونوں اس ذمہ داری میں برابر کے شریک ہیں۔"

والی حلوان اسود ابن قطبہ کو تحریر کیا: "دیکھو جب حاکم کے رجحانات مختلف اشخاص کے لحاظ سے مختلف ہوں گے تو یہ امر اکثر انصاف پروری سے مانع ہو گا۔ لہٰذا حق کی رو سے سب لوگوں کا معاملہ تمہاری نظروں میں برابر ہونا چاہیئے۔ اپنے نفس کی حفاظت کرو اور مقدور بھر رعایا کی نگرانی رکھو۔"

محکمۂ قضاء

حکومت کے فرائض میں سے ایک اہم فریضہ یہ ہے کہ وُہ رعایا کے نزاعی امور کا بے لاگ فیصلہ کرنے کے لئے ایسی عدالت گاہیں قائم کرے جہاں ہر ادنیٰ و اعلےٰ اور امیر و غریب کو حصولِ انصاف کا یکساں موقع ہو۔ تاکہ کمزور کی حق تلفی نہ ہونے پائے اور مظلوم دادرسی سے محروم نہ رہے۔ اگر کمزور و درماندہ

افراد کو حکومت کی طرف سے یہ تحفظ نہ ہو تو نہ اجتماعی نظم باقی رہ سکتا ہے اور نہ امن کی صورت پیدا ہو سکتی ہے بلکہ کمزور افراد یہ محسوس کرنے پر مجبور ہوں گے کہ وُہ ایک ایسے معاشرہ میں جی رہے ہیں جس میں ظلم کے خلاف فریاد سننے والا اور ظالم کے پنجۂ استبداد سے چھڑانے والا کوئی نہیں ہے۔ اس سے ایک طرف ظالم کی حوصلہ افزائی ہوگی اور دُوسری طرف کمزور احساس کمتری میں مبتلا ہو کر ظلم و جور سہتے رہیں گے اور آخر اندرونی گھٹن انہیں آمادہ بغاوت کرے گی اور بغاوت کا آتش فشاں پھٹتا ہے تو حکومت کی بنیادوں کو متزلزل کئے بغیر نہیں رہتا۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ الملك يبقى مع الكفر ولا يبقى مع الظلم۔ کفر کے ساتھ ملک باقی رہ سکتا ہے اور ظلم کے ساتھ باقی نہیں رہ سکتا۔

دنیا کی آئینی حکومتیں عدل و انصاف کو بروئے کار لانے کے لئے دیوانی فوجداری خفیفہ اور عالیہ کے نام سے عدالتیں قائم کرتی ہیں مگر حصول انصاف کے لئے عدالتوں کے چکر لگانے پیشیاں بھگتنے وکیل کرنے اور کورٹ فیسوں کا بار اٹھانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ مگر اسلام نے محکمۂ قضا کی تشکیل اس طرح کی ہے کہ اگر اس کے مقرر کردہ قواعد و ضوابط ملحوظ رکھے جائیں تو نہ انصاف کے حصول میں دشواری پیش آسکتی ہے اور نہ مالی اعتبار سے زیر بار ہونا پڑتا ہے۔ نہ اس میں جنبہ داری کا سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ رشوت کی گنجائش ہے اس لئے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے اس منصب پر وہی لوگ فائز ہو سکتے ہیں جو تقوی و عدل سے آراستہ اور اسلامی قوانین پر اجتہادی نظر رکھتے ہوں۔ خودداری و عزت نفس انہیں عزیز ہو اور معاشرہ میں معزز و باوقار ہوں تاکہ رشوت ستانی سے اپنے دامن کو داغدار نہ ہونے دیں اور کسی دولتمند سے مرعوب و متاثر ہو کر عدل و انصاف سے انحراف نہ کریں۔

امیر المومنین نے اپنے دور خلافت میں محکمۂ قضا کو خاص اہمیت دی اور ہر مرکزی مقام پر اس کا شعبہ قائم کیا اور انہی لوگوں کو منصب قضا کے لئے نامزد فرمایا جو تقوی و دیانت اور علمی اہلیت کے لحاظ سے اسلام کے مقرر کردہ معیار پر پُورے اترتے تھے۔ حضرت خود بھی پیغمبر اکرم کے دور میں منصب قضا پر فائز رہے تھے اور اپنی انصاف پروری معاملہ فہمی اور نکتہ رسی کا سکہ دلوں پر بٹھا چکے تھے۔ اس عملی تجربہ کے بعد ان سے بہتر کون سمجھ سکتا تھا کہ محکمۂ قضا کن خطوط پر قائم ہونا چاہیئے حکام عدلیہ کے فرائض کیا ہیں اور کس نہج پر انہیں تربیت دینا چاہیئے کہ وُہ رشوت سفارش اور جنبہ داری سے بچ کر انصاف کے تقاضوں کو پُورا کر سکیں۔ چنانچہ انسان کی طبعی کمزوری کو دیکھتے ہُوئے اس کا پُورا لحاظ رکھا کہ قضاۃ کو اتنا وظیفہ ملنا چاہیئے کہ وُہ رشوت اور ناجائز آمدنی سے بے نیاز ہو کر آسودگی و خوش اسلوبی سے گزر بسر کر سکیں اور ضرورت و احتیاج انہیں غلط راہ پر نہ ڈال دے۔ مزید اطمینان کے لئے ان کی مالی حالت اور معیار زندگی پر نظر رکھتے املاک و جائیداد کا جائزہ لیتے اور آمد و خرچ کا موازنہ کرتے اگر صورت حال مشتبہ نظر آتی تو تنبیہہ و سرزنش کرتے یا برطرف کر دیتے۔ چنانچہ قاضی کوفہ شریح ابن حارث کے بارے میں جو حضرت عمر

کے دُور سے عہدۂ قضا پر فائز چلا آرہا تھا یہ معلوم ہُوا کہ اس نے ۸۰ دینار میں ایک مکان خرید کیا ہے۔ حضرت نے اسے طلب کیا اور فرمایا کہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ تم نے ایک مکان ۸۰ دینار میں خریدا ہے شریح نے کہا کہ ہاں ایسا ہی ہے۔ حضرت نے اسے غصّہ کی نظر سے دیکھا اور کہا "اے شریح ایسا تو نہیں ہے کہ تم نے اس گھر کو دُوسرے کے مال سے خریدا ہو یا حرام کی کمائی سے قیمت ادا کی ہو اگر ایسا ہے تو تم نے دُنیا بھی کھوئی اور آخرت بھی۔"

اسلام مذہب عدل ہے اور عدل ہی کو ہر شعبہ میں کارفرما دیکھنا چاہتا ہے اور محکمۂ قضا کا تو بنیادی مقصد ہی قیام عدل ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد باری ہے:-

واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل۔ — جب لوگوں کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کرو تو عدل و انصاف سے فیصلہ کرو۔"

اس عدل کا تقاضا یہ ہے کہ سماعت کے دوران فریقین سے یکساں طرزِ عمل اختیار کیا جائے اور دعوٰی و جواب دعوی پر یکساں توجہ کی جائے بلکہ اسلامی نقطۂ نظر سے اگر قاضی سلام کرے تو الگ الگ سلام کرنے کے بجائے ایک ساتھ سلام کرے اور جواب سلام دے تو ایک ساتھ جواب دے۔ کھڑا ہونے کے لئے کہے تو دونوں کو اور بیٹھنے کے لئے کہے تو دونوں کو اور کسی ایک فریق کی طرف اپنا میلان ظاہر نہ کرے تاکہ یکطرفہ التفات دُوسرے فریق کے دل میں انصاف سے محرومی کا احساس پیدا نہ کرے۔ فریقین میں مساوات و برابری کا برتاؤ امیرالمومنین کا ایک مستقل کردار تھا اور فریقین میں خواہ ایک ذمی ہو اور دُوسرا مُسلمان ادنیٰ امتیاز کے بھی روادار نہ ہوتے تھے اور اپنے قضاۃ و عمال کو بھی اس کا سختی سے پابند دیکھنا چاہتے تھے۔ صاحب وفیات الاعیان نے تحریر کیا ہے کہ حضرت ایک ذمی کے ساتھ فریق مقدمہ کی حیثیت سے قاضی شریح کی عدالت میں آئے قاضی شریح نے کھڑے ہو کر آپ کا خیر مقدم کیا اس پر آپ نے فرمایا "یہ تمہاری پہلی ناانصافی ہے"۔ ایک شخص آپ کے ہاں مہمان ہوا اور انہی مہمانی کے دنوں میں اس نے آپ کی عدالت میں ایک شخص کے خلاف دعوٰی دائر کر دیا۔ آپ نے فرمایا کہ تم فریق مقدمہ ہو اور پیغمبر اکرم فرما گئے ہیں کہ یہ امر تقاضائے انصاف کے خلاف ہے کہ فریقین مقدمہ میں سے ایک کو مہمان ٹھہرایا جائے اور دُوسرے کو مہمان نہ کیا جائے۔ لہٰذا تم میرے ہاں سے رخصت ہو جاؤ۔ کتب سیر میں درج ہے کہ آپ حضرت عمر کے دور حکومت میں ایک مقدمہ کے سلسلہ میں اُن کے ہاں گئے حضرت عمر نے آپ کو یا ابا الحسن کی کنیت سے اور آپ کے حریف کو نام سے مخاطب کیا اس پر حضرت کے چہرے پر ناگواری کے آثار ظاہر ہُوئے۔ وجہ پُوچھی گئی تو فرمایا کہ عدل کا اقتضا یہ تھا کہ فریقین مقدمہ کے طرزِ تخاطب میں یکسانیت ہوتی۔ ایک کو نام سے اور دُوسرے کو کنیت سے مخاطب کرنا تقاضائے عدل کے خلاف ہے۔

ان دو ایک واقعات کو دیکھنے کے بعد جو صرف مشتے نمونہ از خروارے ہیں یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ حضرت کی نگاہیں عدل کے جملہ پہلوؤں پر مرکوز رہتی تھیں اور کوئی نیم روشن یا ڈھکا چھپا گوشہ بھی اُن کی باریک بین نظروں سے اوجھل نہ رہتا تھا۔ مندرجہ واقعات میں یہ تفریق تو ایک حد تک عیاں ہے کہ ایک کا خیر مقدم کیا جائے اور دوسرے کا خیر مقدم نہ ہو یا ایک کو مہمان کیا جائے اور دوسرے کو مہمان نہ کیا جائے مگر ایک کو کنیت سے اور دوسرے کو نام سے مخاطب کرنے میں امتیاز کی جو جھلک پائی جاتی ہے اس پر اگر کسی باریک بین اور نکتہ رس کی نظر پڑ سکتی ہے تو غور و فکر کے بعد ہی پڑ سکتی ہے۔ مگر حضرت فوراً ان دونوں کے باہمی فرق کی طرف ملتفت ہو جاتے ہیں اور اس خیال سے کہ اس طرز تخاطب سے یہ تاثر لیا جا سکتا ہے کہ فیصلہ میں جھکاؤ بھی ادھر ہوگا جدھر تخاطب کا انداز تعظیمی ہے۔ آپ فوراً ادھر توجہ دلاتے ہیں کہ یا تو دونوں کو کنیت سے مخاطب کیا جاتا یا دونوں کو نام سے تاکہ اس تفریق کے نتیجہ میں کوئی غلط تاثر پیدا نہ ہونے پائے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ دنیا میں کون ایسا ہوگا جسے اپنے حق میں تعظیمی رویہ ناگوار گزرتا ہوگا جبکہ وہ واقع میں تعظیم کا سزاوار بھی ہو۔ مگر حضرت کی طبع عدل آشنا پر یہ تعظیمی لب و لہجہ بھی بار ثابت ہوتا ہے۔ کیا اس سے بڑھ کر عدل پسندی کی کوئی مثال پیش کی جا سکتی ہے؟

موجودہ دور میں اکثر حلقوں سے یہ آواز سننے میں آتی ہے کہ عدلیہ کو انتظامیہ کے دباؤ سے آزاد رہنا چاہیئے تاکہ عدلیہ حکومت کی مقصد براری کا ذریعہ نہ بن جائے اور عوامی مفاد کا تحفظ کرنے کے بجائے حکومت کے مقاصد کی پشت پناہی ہی اس کا کام نہ رہ جائے۔ بیشک اس حد تک عدلیہ کی آزادی عدل کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ضروری ہے اور اس کے دائرۂ کار کو وسیع ہونا ہی چاہیئے اس لئے کہ عدلیہ قانون کی ترجمان ہے اور قانون کی بالادستی عوام تک محدود نہیں ہے بلکہ ایک اصول و آئین کی پابند حکومت بھی اسی کے آگے جھکنے پر مجبور ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ عدلیہ کو آنکھ بند کر کے کھلی چھٹی دے دی جائے کہ وہ جس طرح چاہے اور جو چاہے فیصلے کرے اور اس کے غلط فیصلوں پر ٹوکنے والا اور صحت و سقم سے آگاہ کرنے والا کوئی نہ ہو جبکہ ایک حکومت عادلہ کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ عدالتی فیصلوں کو جانچے پرکھے اور غلط فیصلوں میں ردّ و بدل کرے یا انہیں سرے سے کالعدم قرار دے۔ چنانچہ امیر المومنین نے عدلیہ پر یہ پابندی عائد کر رکھی تھی کہ وہ اہم امور کے فیصلے ان کے علم میں لائے بغیر نہ کریں صاحب وسائل نے تحریر کیا ہے کہ آپ نے قاضی شریح سے فرمایا:۔

ایاك ان تنفذ قضیة فی قصاص او حد من حدود الله او حق من حقوق المسلمین حتی تعرض ذلك علی۔ (وسائل ج۳ ص۴۶۵)	خبردار! قصاص یا حدود الٰہیہ میں سے کسی حد کا اجرا اور مسلمانوں کے حقوق میں سے کسی حق کا فیصلہ اس وقت تک نہ کرنا جب تک وہ فیصلہ میرے سامنے پیش نہ کر دو۔"

البتہ جہاں تک عمومی فیصلوں میں آزادی اور بین الملی مساوات کا تعلق ہے تو حضرت اس کے سب سے بڑے حامی تھے آپ عدل کے اقتضا اور قانون کی بالادستی کے مقابلہ میں نہ کسی کی برتری کے قائل تھے نہ ترجیحی سلوک کے روادار تھے اور نہ اپنی ذات کو اس سے مستثنیٰ سمجھتے تھے۔ چنانچہ یہ واقعہ اس کا شاہد ہے کہ آپ صفین سے پلٹتے ہوئے ایک زرہ کھو بیٹھے۔ چند دنوں کے بعد ایک نصرانی کو وہی زرہ پہنے ہوئے دیکھا تو اس سے کہا کہ تم نے یہ زرہ کہاں سے لی ہے یہ زرہ تو میری ہے اس نے اسے اپنی ملکیت ظاہر کیا حضرت نے قاضی شریح کی عدالت میں دعوی دائر کر دیا۔ قاضی کے دریافت کرنے پر اس نصرانی نے کہا کہ یہ زرہ میری ہے اور میرا قبضہ دلیل ملکیت ہے۔ شریح نے حضرت سے مخاطب ہو کر کہا کہ آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ زرہ آپ کی ہے؟ آپ نے فرمایا ھذہ درعی لم ابع ولم اھب۔ "یہ زرہ میری ہے نہ میں نے اسے بیچا ہے اور نہ ہبہ کیا ہے" شریح نے دیکھا کہ ایک طرف یہ احتمال بھی نہیں ہے کہ غلط دعوی کیا ہوگا اور دوسری طرف شرعی قانون کا تقاضا یہ ہے کہ قبضہ کو دلیل ملکیت سمجھا جائے جب تک اس کے خلاف ثبوت مہیا نہیں ہوتا۔ فیصلہ حضرت کے خلاف جاتا تھا۔ قاضی کو آپ کے خلاف فیصلہ دینے میں تردد ہوا۔ حضرت نے اسے متردّد دیکھا تو فرمایا کہ تم وہی فیصلہ کرو جو منصب قضا کا تقاضا ہے۔ چنانچہ فیصلہ حضرت کے خلاف ہوا اور وہ زرہ اس نصرانی کو مل گئی۔

اس واقعہ کا تجزیہ کیا جائے تو عدل کے ایسے گوشے سامنے آتے ہیں جو حضرت کی عدل پسندی و نصفت شعاری کا روشن ثبوت ہیں۔ آپ خود بھی سربراہِ مملکت ہونے کی حیثیت سے اس کا فیصلہ کر سکتے تھے اور وہ فیصلہ آپ ہی کے حق میں ہوتا مگر آپ نے یہ پسند نہ کیا کہ مدعی اپنا فیصلہ خود کرے۔ اس لئے اس کا فیصلہ قاضی کے سپرد کیا اور قاضی سے یہ کہنے کے بجائے کہ اس نے چوری کی ہے یا چوری کرنے والے سے خریدی ہے یہ فرمایا کہ میں نے نہ اس کے ہاتھ بیچی ہے اور نہ ہبہ کی ہے اگرچہ مقصد یہی تھا کہ یہ سرقہ کا مرتکب ہوا ہے کیونکہ جب بیچی بھی نہیں گئی اور ہبہ بھی نہیں کی گئی تو پھر چوری ہی کے ذریعہ اس تک پہنچ سکتی ہے۔ اگر حضرت اس کی طرف چوری کی نسبت دیتے تو خلاف واقعہ نہ ہوتا مگر آپ اسے چور کہہ کر نہ اس کے جذبات کو ٹھیس لگانا چاہتے ہیں اور نہ اس کے وقار کو مجروح کرنا چاہتے ہیں اس لئے کہ آپ کی نظروں میں ایک زرہ کے مقابلہ میں انسانی اقدار کا تحفظ زیادہ عزیز تھا۔ اگرچہ فیصلہ آپ کے خلاف ہوا اور مقدمہ ہار گئے مگر حقیقتہً یہ حضرت کی اخلاقی جیت تھی جس کا ردعمل یہ ہوا کہ اس نصرانی کو جیت کے باوجود اپنی شکست کا احساس ہوا اس کے ضمیر نے اسے جھنجوڑا اور جب عدالت گاہ سے باہر نکلا تو حضرت سے آنکھیں چار نہ کر سکا دبے لہجے میں معذرت کرتے ہوئے کہا کہ یہ زرہ آپ کی ہے میں نے صفین کے راستے سے اسے اٹھایا تھا اب یہ زرہ حاضر ہے اور میں آپ کی بلند نفسی، عالی ظرفی اور عدل پسندی کو دیکھ کر اسلام قبول کرتا ہوں۔ حضرت زرہ کی واپسی پر تو کیا خوش ہوتے البتہ اس کے اسلام لانے پر خوش ہوئے اور وہ

زرہ اسے ہبہ کردی اور اس کے ساتھ ایک گھوڑا بھی مرحمت فرمایا۔

بنیادی حقوق کا تحفظ

ہر انسان دنیائے شعور میں قدم رکھنے کے بعد ایک طرف یہ محسوس کرتا ہے کہ اس پر کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں اور دوسری طرف یہ محسوس کرتا ہے کہ جس معاشرہ میں وُہ زندگی بسر کر رہا ہے اس میں کچھ معاشرتی حقوق بھی رکھتا ہے۔ اس احساس کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے فرائض کو پہچانے اور اپنے حقوق کا تحفظ کرے خواہ وُہ انفرادی ہوں یا اجتماعی اور اپنے حقوق کے ساتھ دوسروں کے حقوق کو بھی پامالی سے بچائے اور اگر ان حقوق میں کوی سدِ راہ ہو تو بقدرِ امکان انہیں آزاد کرانے کی کوشش کرے تاکہ ناجائز پابندیوں اور ناروا بندشوں کو توڑ کر اپنی فطری آزادی بحال رکھ سکے۔ ان حقوق کے تحفظ کی سب سے زیادہ ذمہ داری حکومت پر ہوتی ہے اور حکومتیں بھی اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے رسمی طور پر سہی دستوری دفعات میں حقوقِ عامہ کو جگہ دیتی ہیں تاکہ عوام کے دلوں میں عدمِ تحفظ کا احساس اور ملک میں بے اطمینانی بدامنی اور شورش پیدا نہ ہونے پائے۔

یہ حقوق بنیادی طور پر چار ہیں:۔

پہلا حق، حقِ حیات ہے یعنی ہر شخص کو اس دنیا میں جینے کا حق ہے اور کسی فرد یا گروہ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وُہ کسی کو زندگی سے محروم کر دے۔ اسلام جو پُرامن زندگی کا داعی اور حیاتِ انسانی کا پاسبان ہے قتل کو انتہائی سنگین جرم قرار دیتا ہے اور ایک خونِ ناحق کو اتنی اہمیت دی ہے جتنی سب لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیئے جانے کو اہمیت دی جا سکتی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے:۔

من قتل نفسا بغیر نفس او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعا۔	جو شخص کسی کو نہ جان کے بدلے میں اور نہ فساد انگیزی کے نتیجہ میں بلکہ یونہی قتل کر ڈالے تو گویا اس نے سب لوگوں کو قتل کر ڈالا۔"

اس آیت کے استثناء سے یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر کسی کو قتل یا فساد فی الارض کی پاداش میں قتل کر دیا جائے تو یہ قتل ناروا نہ ہو گا اس لئے کہ ایسے شخص نے خود ہی قتل اور فتنہ و فساد کے ارتکاب سے اپنے حقِ حیات کو کھو دیا ہے۔ عدل و حکمت کا تقاضا یہی ہے کہ اُسے قتل کر دیا جائے تاکہ انتقام در انتقام کی صورت میں قتل و خونریزی کا دروازہ نہ کُھل جائے۔ اسلام نے جان کے بدلے میں جان لینے کا حق دے کر قتل کے انسداد میں موثر قدم اٹھایا ہے اس لئے کہ قتل کو قتل کا خوف ہی روک سکتا ہے۔ اگر کوی شخص ارتکابِ قتل سے پہلے یہ سوچ لے کہ اسے بھی جان سے ہاتھ دھونا پڑیں گے تو وُہ اپنی جان کے بچاؤ کے لئے کبھی قتل کا مرتکب نہیں ہو گا اور نتیجۃً دونوں قتل سے محفوظ رہیں گے اسی لئے قرآن مجید میں قانون

قصاص کو زندگی و حیات سے تعبیر کیا گیا ہے:۔

ولکم فی القصاص حیاۃ۔ قصاص میں تمہارے لئے زندگی مضمر ہے۔"

اسی طرح کسی حملہ آور کا قتل بھی نا جائز نہ ہو گا جبکہ جان کا بچاؤ اس کے قتل پر منحصر ہو کیونکہ حملہ آور نے خود دوسرے کے حق پر حملہ کر کے اپنے حق کو ضائع کیا ہے اور اپنے قتل کا جواز پیدا کر دیا ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے صرف دُوسرے ہی کو قتل کرنا جرم نہیں ہے بلکہ اپنے ہاتھوں خود اپنی جان کو تلف کرنا اور خودکشی کا مرتکب ہونا بھی قتل ہی کی طرح کا سنگین جُرم ہے بلکہ اپنے اعضاء بدن میں سے کسی عضو کو قطع کرنا تک ناروا ہے اس لئے کہ انسان زندگی کا امین بنایا گیا ہے اور یہ عمل امانت میں خیانت اور تصرف ناجائز ہے۔ اگرچہ بعض ممالک میں خودکشی کو شجاعانہ اقدام تصوّر کیا جاتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ بزدلی اور حوادث زمانہ کے سامنے سپر اندازی کا نتیجہ ہے جسے شجاعت ایسی اخلاقی فضیلت سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ قرآن مجید نے اس اقدام سے واضح لفظوں میں روکا ہے:۔

ولا تقتلوا انفسکم ان اللّٰہ کان بکم رحیما۔ اپنی جانوں کو تلف نہ کرو کیونکہ اللہ تم پر بہر حال مہربان ہے۔"

امیرالمومنین جہاں انسانی اقدار کے محافظ تھے وہاں انسانی زندگی کی قدر و قیمت سے بھی آگاہ اور کسی صورت میں اتلاف جان اور خون ناحق کو گوارا نہ کرتے تھے۔ اگرچہ پیغمبر اکرم کے دور میں جنگوں میں سب سے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور اپنے عہد میں بھی خونریز جنگیں لڑیں مگر ان میں سے ہر جنگ دفاعی اور حفاظت خود اختیاری کے لئے تھی۔ پیغمبر اکرم نے اس وقت تلوار اُٹھائی جب دشمن آپ پر حملہ آور ہُوا اور حضرت نے اپنے دَور میں اس وقت قدم اٹھایا جب دشمن نے لشکر کشی کر کے امن عامہ کو تباہ کر دینا چاہا۔ اس صورت میں بھی آپ امکان بھر یہ کوشش کرتے رہے کہ جنگ کی نوبت نہ آئے اور کشت و خون کے بغیر حالات سدھر جائیں۔ جنگ چھڑنے سے پہلے صلح و آشتی کی دعوت دی پُرامن رہنے کی تلقین کی اور جب ساری کوششیں بے اثر ثابت ہوئیں اور فریق مخالف جنگ پر تل گیا تو اس وقت تک ہاتھ نہیں اٹھایا جب تک دشمن کی طرف سے پہل نہیں ہوی۔ اور جس حد تک دشمن کی پسپائی کے لئے جنگ ضروری تھی اس سے آگے نہیں بڑھے اور جنگ کے خاتمہ پر خون کے پیاسوں تک کی جان بخشی کر دی۔ چنانچہ جنگ جمل کے اختتام پر اہل بصرہ کو یکقلم معاف کر دیا۔ مروان، عبداللہ ابن زبیر وغیرہ سے کوی مواخذہ نہیں کیا اور ام المومنین کو حفاظت کے ساتھ مدینہ پہنچا دیا اور جنگ صفین میں جتنے شامی عراقیوں کی قید و بند میں تھے سب کو بلا شرط رہا کر دیا۔ اور جنگ نہروان کے خاتمہ پر خوارج کے زخمیوں کو جن کی تعداد چار سو

تھی ایک جگہ جمع کیا اور ان کے قبیلہ والوں کو طلب کرکے فرمایا کہ ان زخمیوں کو اُٹھا لے جاؤ اور ان کے زخموں کا علاج و مداوا کرو اور جب یہ تندرست ہو جائیں تو انہیں کوفہ پہنچا دو۔ حضرت کے اس طرزِ عمل سے ہر انصاف پسند یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ آپ کا مقصد صرف فتنہ و فساد کا انسداد تھا۔ اور جب اس کا انسداد ہو گیا تو پھر انسانی جانوں سے کھیلنا گوارا نہیں کیا حالانکہ ایسے موقع پر دشمن کے تڑپتے سسکتے زخمیوں کو ختم کر دیا جاتا ہے یا انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دیا جاتا ہے مگر اس کے برعکس یہاں ان کے علاج و معالجہ کی فکر کی جاتی ہے تاکہ بلاضرورت انسانی جانوں کا اتلاف نہ ہونے پائے اور اس طرح غیر ضروری کشت و خون سے اپنے دامن کو پاک رکھا۔ یہی وُہ کردار تھا جس نے آپ کے جوہرِ ذاتی کو جلابخشی اور دُنیا نے امن پسندی عدالت کیشی اور انسانی ہمدردی میں آپ کی انفرادیت کا اعتراف کیا۔

امیرالمومنین جہاں ناحق خونریزی کے شدید مخالف تھے وہاں یہ بھی گوارا نہ کرتے تھے کہ کسی کا خون رائیگاں جائے اور قاتل قصاص سے بچ رہے۔ چنانچہ جب حضرت عمر قتل کر دیئے گئے تو ان کے فرزند عبیداللہ نے ہرمزان اور چند بے گناہوں کو قتل کر دیا۔ حضرت عثمان نے اس سے چشم پوشی کی اور اُسے قتل کرنے پر آمادہ نہ ہُوئے۔ جب امیرالمومنین نے زمام اقتدار اپنے ہاتھوں میں لی تو اسے ہرمزان کے قصاص میں قتل کرنے کا ارادہ کیا مگر وہ اموی سامراج کے دامن میں پناہ لینے کے لئے شام بھاگ گیا۔ ابن اثیر نے تحریر کیا ہے:۔

لما ولی الخلافة اراد قتله	جب حضرت علی خلافت پر فائز ہُوئے تو عبیداللہ
فهرب منه الی معاویة بالشام	کے قتل کا ارادہ کیا مگر وُہ بھاگ کر معاویہ کے
(تاریخ کامل۔ جلد۳۔ صفحہ۴۲)	پاس شام چلا گیا"۔

اور آخر صفین میں امیرالمومنین کے مقابلہ میں لڑتا ہوا مارا گیا۔

دوسرا حق آزادی فکر ہے یعنی ہر شخص کی فکر کو خارجی دباؤ سے آزاد ہونا چاہئے تاکہ وُہ خود سے اچھے بُرے کی تمیز کرکے راہ عمل متعیّن کرے۔ اگر اس آزادی فکر کو سلب کر لیا جائے تو وُہ اسے خیر کہے گا جسے طاقت ور خیر کہے اور اسے شر سمجھے گا جسے بالادست قوت شر سمجھے اور اپنے شعور و عقل سے روشنی لینے کے بجائے دوسرے کی رائے کے تابع ہو جائے گا اور اس کے نتیجہ میں اس کی آزادیٔ عمل بھی چھن جائے گی اس لئے کہ حریت فکر حرکت و عمل کی آزادی کا سرچشمہ ہے اور تمام افعال و اعمال فکر کے اسی طرح تابع ہوتے ہیں جس طرح لوہے کا ٹکڑا مقناطیس کی حرکت کے تابع ہوتا ہے۔ اگر فکر آزاد ہے تو عمل بھی آزاد رہے گا اور فکر جکڑی بندھی ہے تو عمل بھی جکڑا بندھا رہے گا۔

اسلام اسی فکری آزادی کا پیغام لے کر آیا اور تمام تقلیدی بندشوں کو توڑ کر آزادانہ فکر کی دعوت دی اس نے نہ فکری آزادی پر پہرا بٹھایا اور نہ اس کی اجازت دی کہ مذہبیات میں جبر و اکراہ سے کام لیا جائے

اور کسی پر ایسا عقیدہ زبردستی ٹھونس دیا جائے جسے اس کی عقل و آزادانہ رائے تسلیم کرنے سے انکاری ہو۔ اسلام اپنی ہمہ گیر سچائی کو سچائی کے زور سے منوانا چاہتا ہے۔ اور اگر کوی غلط مسلک و عقیدہ اختیار کرتا ہے تو اُسے بجبر اپنے آئین کا پابند بنانا نہیں چاہتا۔ چنانچہ قرآن مجید نے واضح لفظوں میں اعلان کیا ہے:۔

لا اکراہ فی الدّین قد تبین الرشد من الغی۔ اسلام میں جبر نہیں ہے جبکہ گمراہی کے مقابلہ میں ہدایت واضح ہو چکی ہے۔"

امیر المومنین کا دَور حریت فکر کا شاہکار ہے آپ نے آزادی فکر کا پرچم بلند کیا اور انسان کو اس کی بھُولی بسری آزادی یاد دلاتے ہُوئے فرمایا۔ لا تکن عبد غیرك وقد جعلك الله حرا۔ جب اللہ نے تمہیں آزاد پیدا کیا ہے تو دُوسروں کی غلامی کا جؤا اپنی گردنوں میں نہ ڈالو" یہ آزادیٔ فکر کے بحال رکھنے ہی کا نتیجہ تھا کہ دور ثالث کے بعد جب لوگوں نے بیعت پر اصرار کیا تو آپ نے عجلت پسندی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے انہیں ایک آدھ دن نہیں بلکہ پورا ایک ہفتہ غور و فکر کے لئے دیا کہ وُہ اس بیعت کے نشیب و فراز کو سوچ لیں اور پھر کسی نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کریں۔ حضرت کے پیش نظر یہ چیز تھی کہ عوام کے وقتی جذبات میں عقل و شعور کا دخل نہیں ہوتا اور نہ جذباتی فیصلہ پائیدار ہوتا ہے عوام آج ایک فیصلہ کرتے ہیں اور کل اس کے خلاف رائے دینے لگ جاتے ہیں لہذا جذباتی فیصلہ کے بجائے وُہ فیصلہ ہونا چاہئے جسے فکر و تدبر کا حقیقت پسندانہ نتیجہ کہا جا سکے اگرچہ ہوشیار اور شاطر سیاستدان عوام کے جذبات کی بوقلمونی کے پیش نظر ان کے وقتی جذبات سے فائدہ اٹھا لے جاتے ہیں اور ان کی آراء کو متاثر کرنے کے لئے سیاسی حربوں سے بھی کام لیتے ہیں مگر امیر المومنین عوام کے رجحان سے فائدہ اٹھانے کے بجائے انہیں سوچنے سمجھنے کی دعوت دیتے ہیں نہ ان کے ذہنوں پر دباؤ ڈالتے ہیں نہ ان کی فکروں کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ آزادانہ فضا میں غور و فکر کا موقع دیتے ہیں کیا دُنیائے سیاست میں اس سے بڑھ کر حریت فکر کی کوی مثال پیش کی جا سکتی ہے؟

اسی طرح مذہبیات کے سلسلہ میں نہ آزادیٔ مسلک کی راہ بند کی نہ کسی پر تبدیلیٔ عقیدہ کے لئے جبر کیا اور نہ کسی فرد کے مذہبی معاملات میں وُہ یہودی ہو یا نصرانی صابی ہو یا مجوسی دخل دیا اور اپنے عمل و کردار سے واضح کر دیا کہ دین کی بنیاد دلیل و برہان پر ہے اسے نظریاتی طور پر تو منوایا جا سکتا ہے مگر قوت و طاقت سے نہیں۔ اس لئے کہ قوت و طاقت اور جبر و اکراہ سے نہ عقائد میں انقلاب آتا ہے اور نہ ذہنوں میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔

تیسرا حق آزادیٔ عمل ہے۔ یعنی انسان اپنے افعال و اعمال میں ایک حد تک آزاد ہے اور اسے اس کی مرضی کے خلاف نہ کسی کام پر مجبور کیا جا سکتا ہے اور نہ روکا جا سکتا ہے وُہ جس میں اپنے لئے بہتری سمجھے

اُسے کرے اور جس میں ضرر و نقصان دیکھے اُسے نہ کرے بشرطیکہ اس کے اعمال مفاد عامہ کے لئے مضر اور ملک و ملت کے لئے نقصان دہ نہ ہوں۔ اس لئے آزادی عمل کے ساتھ بعض پابندیاں بھی ناگزیر ہیں اور ہر متمدن معاشرہ میں ایسے اقدامات پر پابندی ضروری سمجھی جاتی ہے جو اخلاق کو تباہ اور ملکی امن کو برباد کرنے کا باعث ہوں۔

امیر المومنین فکری آزادی کی طرح عملی آزادی کے بھی حامی اور اس پر سختی سے عامل تھے انہوں نے کسی فرد کو ایسے عمل پر مجبور نہیں کیا جس پر اس کا دل آمادہ اور ضمیر مطمئن نہ ہو۔ چنانچہ جب کچھ لوگوں نے آپ کی بیعت سے انکار کیا تو کسی کو بیعت پر مجبور نہیں کیا۔ اور جب طلحہ و زبیر نے بیعت شکنی کے بعد یہ کہا کہ ہم نے یا دل ناخواستہ بیعت کی تھی تو فرمایا کہ تمہیں بیعت پر مجبور کس نے کیا تھا کہ تم اپنے ضمیر کے خلاف بیعت پر آمادہ ہوئے۔ اور جب انہوں نے مکہ جانے کی اجازت مانگی تو آپ نے کہا کہ میں بہتر تو یہی سمجھتا ہوں کہ تم دونوں مدینہ میں رہو اور جب انہوں نے اصرار کیا تو فرمایا کہ تم جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ میں تمہیں بزور روکنا نہیں چاہتا۔ حضرت عمر کے متعلق تاریخ بتاتی ہے کہ انہوں نے صحابہ کی نمایاں فردوں کو اس اندیشہ کے پیش نظر کہ وہ مرکز سے الگ ہو کر سیاسی جوڑ توڑ نہ کرنے لگ جائیں ہمیشہ مدینہ میں زیر نگرانی رکھا۔ مگر امیر المومنین اس امر کے سمجھنے کے باوجود کہ ان دونوں کے جانے کا مقصد فتنہ انگیزی کے سوا کچھ نہیں ہے ان کی آزادئ عمل کو سلب نہیں کیا البتہ جب انہوں نے حرب و پیکار کے لئے بصرہ کا رُخ کیا تو ان کی روک تھام ضروری ہوگئی۔ اسی طرح معاویہ نے شام میں علم بغاوت بلند کیا تو ان کے خلاف قدم اٹھایا۔ یہ اقدام اس لئے نہ تھا کہ انہوں نے بیعت سے انکار کیا تھا بلکہ اس لئے کہ وہ مملکت کے نظم و نسق میں خلل انداز اور شام میں آپ کے احکام کے نفاذ میں سد راہ تھے حالانکہ آپ خلیفۂ وقت تھے اور معاویہ کی حیثیت ایک صوبہ کے عامل سے زیادہ نہ تھی۔ یونہی خوارج کو بھی ان کی رائے پر آزاد چھوڑ دیا اور جب تک وہ قتل و غارت پر اُتر نہیں آئے نہ اُن سے کوئی تعرض کیا اور نہ ان کے مقابلہ میں تلوار اٹھائی۔

حضرت کی نظروں میں اس شخصی آزادی کا اتنا احترام تھا کہ نازک سے نازک موقع پر بھی اس آزادی پہ حرف نہیں آنے دیا اور جنگ کے موقع پر کہ جب ایک ایک آدمی پر کڑی نظر رکھی جاتی ہے یہ حق آزادی برقرار رکھا کہ چاہے کوئی آپ کے لشکر میں شامل رہے یا دشمن کے لشکر سے جا کر مل جائے حالانکہ ہنگامی حالات میں ملکی تحفظ کے لئے چند بندشیں شخصی آزادی کے منافی نہیں سمجھی جاتیں۔ مگر آپ نے ان حالات میں بھی نہ کسی کے روکنے کی فکر کی اور نہ کسی کے جانے کی پروا۔ چنانچہ اس موقع پر آپ کو اطلاع ملی کہ کچھ لوگ شام چل دیئے ہیں تو آپ نے والی مدینہ سہل ابن حنیف کو تحریر کیا:۔ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے یہاں کے کچھ لوگ چپکے چپکے معاویہ کی طرف کھسک رہے ہیں۔ تم اس تعداد پر جو نکل گئی ہے اور اس کمک پر جو جاتی رہی ہے ذرا افسوس نہ کرو۔ یہ دُنیا دار ہیں جو دُنیا کی طرف جھک رہے ہیں اور اسی کی طرف تیزی سے لپک

رہے ہیں انہوں نے عدل کو پہچانا دیکھا سُنا اور محفوظ کیا اور اسے خوب سمجھ لیا کہ یہاں حق کے اعتبار سے سب برابر سمجھے جاتے ہیں لہذا وُہ لوگ ادھر بھاگ کھڑے ہوُے جدھر جنبہ داری اور تخصیص برتی جاتی ہے "۔ ان چند واقعات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے کس حدتک شخصی آزادی کو برقرار رکھا اور دوست ہو یا دشمن قوی ہو یا کمزور اپنا ہو یا غیر کسی کو اس حق سے محروم نہیں کیا۔ یہ آزادی فکر و عمل کی آزادی ہے کاروکسب کی آزادی ہے معاشرتی و سماجی آزادی ہے نقل و حرکت کی آزادی ہے اور ایک حدتک مذہب و عقیدہ کی آزادی ہے۔ اور یہی وُہ آزادی ہے جو ایک متمدن ملک کی رعایا حکومت سے طلب کرتی ہے اور ایک عدل پسند و انصاف پرور حکومت اپنے ہاں کے باشندوں کو دے سکتی ہے۔ اس آزادی کا مقصد یہ نہیں ہے کہ انسان جو چاہے کرتا پھرے اس کے لئے کوی روک ٹوک نہیں ہے جبکہ کوی بھی حکومت اخلاقی بے راہروی قانون شکنی فتنہ پردازی اور مردم آزاری کی اجازت نہیں دے سکتی۔

چوتھا حق طبقاتی مساوات ہے۔ طبقاتی مساوات کا مطلب یہ ہے کہ لونی نسلی اور جغرافیائی امتیازات کو ختم کرکے انسان کو انسان ہونے کی حیثیت سے یکساں قابل احترام سمجھا جائے اور سب کے معاشرتی و معیشتی حقوق ایک سطح پر رکھے جائیں خواہ وُہ عربی ہو یا عجمی، امیر ہو یا غریب کالا ہو یا گورا کیونکہ تمام انسان ایک ہی خالق کے بندے اور ایک ہی نوع کی فردیں ہیں اور رنگ و نسل کا تفاوت قومیت و وطنیت کی تفریق خاندانی بلندی و پستی صرف دور جاہلیت کے امتیازات ہیں جنہیں ایک طبقہ نے اپنی بالادستی کے جواز کے لئے عوام کے ذہنوں میں راسخ کیا البتہ ایک کو دوسرے پر برتری ہو سکتی ہے تو تقوی و فرض شناسی کی بنا پر جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:-

یاایھا الناس انا خلقناکم	اے لوگو ہم نے تمہیں مرد اور عورت سے پیدا کیا
من ذکر و انثی وجعلناکم	ہے اور تمہیں مختلف خاندانوں اور قبیلوں میں
شعوبا و قبائل لتعارفوا	قرار دیا ہے تاکہ آپس میں شناسائی ہو اور اللہ
ان اکرمکم عند اللہ	کے نزدیک سب سے زیادہ معزز وُہ ہے جو تم میں
اتقاکم۔	سب سے زیادہ پرہیزگار ہے"۔

امیرالمومنین اسلامی نظریۂ مساوات کے علمبردار اور انسانی حقوق کے نگران تھے۔ انہوں نے قرشی غیر قرشی، عربی، عجمی، آزاد، غلام سب کے حقوق یکساں قرار دیئے اور قبائلی بلندی و خاندانی پستی کے اعتبار سے انسانی برادری میں افتراق و امتیاز گوارا نہیں کیا۔

تمیز رنگ و بو بر ما حرام است　　　که ما پروردۂ یک نو بہاریم

بیت المال میں جتنا ایک آزاد کا حق تھا اتنا ہی غلام کا جو برتاؤ ایک قرشی کے ساتھ روا رکھتے وہی برتاؤ غیر قرشی کے ساتھ جیسا عزیزوں کے ساتھ سلوک کرتے ویسا غیروں کے ساتھ نہ غیروں کو نظرانداز کیا

اور نہ عزیزوں کی پاسداری کی۔ ایک مرتبہ ایک عامل کے بارے میں معلوم ہوا کہ اس نے کچھ مالی ہیر پھیر کیا ہے تو اُسے تحریر کیا: "خدا کی قسم اگر حسن و حسین بھی وُہ کرتے جو تم نے کیا ہے تو میں ان سے بھی کوی رعایت نہ کرتا اور نہ وُہ مجھ سے اپنی کوی خواہش منوا سکتے"۔ یہ تھی وُہ مساوات اور حقوق میں برابر کا طرزِ عمل جو چودہ سو برس قبل فرمانروائے عرب و وارثِ مسندِ رسُول نے دنیا والوں کے سامنے پیش کیا۔ آج ہر مملکت میں انسانی حقوق کے منشور کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے جسے مرتب ہوُے زیادہ عرصہ نہیں گزرا مگر امیر المومنین نے اس وقت انسانی حقوق کا عملاً تحفظ کیا جب حقوق عامہ کا تصوّر ذہنوں سے ناپید تھا۔ نہ انسانی حقوق کی تعیین ہوی تھی اور نہ اس کی تدوین کی ضرورت محسوس کی گئی تھی۔

معاشی نظام

موجودہ دور میں معاشی نظام سرمایہ داری اور اشتراکیت کے گرد گھومتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام ایک آزاد معاشی نظام ہے جس میں ہر شخص کو کھلی چھٹی ہوتی ہے کہ وُہ تمام مذہبی اخلاقی اور رسمی قیود کو نظر انداز کرکے جس قدر دولت سمیٹ سکتا ہے سمیٹے۔ نہ اس کے جمع کرنے میں کوی اخلاقی روک ہے نہ سماجی بندشس۔ اس نظام میں اجتماعی مفاد پر شخصی مفاد کو اولیت حاصل ہوتی ہے اور سرمایہ دار کی نظر ذاتی منفعت اور جلب زر پر مرکوز رہتی ہے۔ یہ ہوس اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ سرمایہ دار مفادِ عامہ کو کچل کر اور دوسروں کے مفاد کو ٹھکرا کر خود غرضی و مفاد پرستی کی راہ اختیار کرلیتا اور دولت کی جمع آوری ہی کو اپنا مطمح نظر بنالیتا ہے نہ کسی پر ظلم ڈھانے سے اس کا ہاتھ رُکتا ہے اور نہ کسی کا خون چوسنے سے اس کا دل پسیجتا ہے۔ ان سرمایہ داروں کی بے راہروی و ناانصافی کے نتیجہ میں محنت کش طبقہ کے دلوں میں نفرت کے جذبات کا پیدا ہونا ناگزیر ہوتا ہے کیونکہ مزدُور یہ سمجھتا ہے کہ وُہ سرمایہ جو نفع کی صورت میں بچ بچا کر سرمایہ دار کی جیب میں پہنچ جاتا ہے وُہ اس کی محنت کا ثمرہ ہے۔ اور سرمایہ دار یہ سمجھتا ہے کہ یہ اس کی سُوجھ بوجھ اور سرمایہ کاری کا کرشمہ ہے اور مزدور اس کی مشینری کا ایک پُرزہ ہے جسے ناکارہ یا زنگ آلودہ ہونے کی صورت میں الگ کیا جاسکتا ہے۔ اس معاشی استحصال اور طبقاتی اختلاف کے مفاسد کا ردِ عمل اشتراکیت کی صورت میں ظاہر ہوُا۔ اشتراکیت کا مقصد انفرادی ملکیت کو ختم کرکے افراد معاشرہ میں دولت کی مساوی تقسیم ہے ان اشتراکیت پسندوں کے نزدیک انفرادی ملکیت کو ختم کئے بغیر معاشی ناہمواریوں اور ان سے پیدا ہونے والی خرابیوں کا ازالہ نہیں ہوسکتا۔

اشتراکیت کا نظریہ دورِ حاضرہ یا گزشتہ صدی کی پیداوار نہیں ہے بلکہ ..ہ ق م افلاطون نے یونان میں معیشت کی اونچ نیچ اور حکومت کے غلط رویہ سے متاثر ہوکر اس کی بنیاد رکھی اور تیسری صدی

عیسوی میں قباد کے دور حکومت میں مزدک نامی ایک شخص نے دولت و عورت کو مشترکہ سرمایہ قرار دے کر اشتراکیت کے اصولوں کی پرچار کی اور اس کے متبعین نے اسے عملاً قبول بھی کر لیا مگر ایک محدود حلقہ کے اندر ہی اس پر عملدرآمد ہو سکا اور کچھ عرصہ کے بعد خود ہی اپنی موت مر گئی۔ پھر انیسویں صدی کے اوائل میں اس کی صدائے بازگشت سنی گئی اور کچھ لوگوں نے اسے رائج کرنے کے لئے ہاتھ پیر مارے مگر ان کی کوششیں رائیگاں گئیں اور اسے عملی جامہ پہنانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ آخر ۱۸۴۷ء میں ایک جرمنی نژاد یہودی کارل مارکس نے نظریہ اقتصاد کے عنوان سے اس کے اصول وضوابط منضبط کئے اور اسے معیشتی و معاشرتی خرابیوں کا واحد حل بتایا یہ دور وہ تھا کہ روس میں ایک طرف دولت کی ریل پیل تھی اور متمول طبقہ سرمایہ کے ذریعہ سرمایہ کھینچ رہا تھا اور دوسری طرف بے روزگاری و معاشی بدحالی کی وجہ سے عام بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ عوام کی اکثریت کسانوں پر مشتمل تھی اور صنعت کے بروئے کار آنے سے مزدوروں کا ایک طبقہ بھی پیدا ہو چکا تھا۔ کسان جاگیرداروں کے رحم و کرم پر تھے اور مزدور صنعتکاروں کے محتاج و دست نگر تھے۔ صنعتکاروں اور جاگیرداروں کی بالادستی اور معیشت کی ناہمواری نے مزدوروں کو ہڑتالوں پر اور کسانوں کو ہنگاموں پر ابھارا آخر سرمایہ داروں کے خلاف نفرت کے جذبات ابھر آئے اور اشتراکیت کے لئے راہ ہموار ہو گئی۔ چنانچہ مارکس کے مرنے کے بعد ۱۹۱۷ء میں لینن اسے عملی طور پر نافذ کرنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا اور روسی نوجوانوں کو مساوی تقسیم کے پرکشش نعرہ سے اپنے گرد جمع کر لیا اور مخالف آوازوں کو تشدد و سختی سے دبا دیا۔ آخر اشتراکیت کی بنیادوں پر نظام نو کے قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس سے کچھ اور ملک بھی متاثر ہوئے اور اسے جزوی فرق کے ساتھ قبول کر لیا۔ نظام سرمایہ داری ہو یا اشتراکی دونوں کا دائرہ فکر صرف دنیوی معاش اور اقتصادی نشوونما ہے ان میں نہ مذہبی و اخلاقی قدروں کا وجود ہے اور نہ مادہ کے ماورا اقدار سے لگاؤ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ نظام سرمایہ داری میں معاشی آزادی اور ذاتی ملکیت کا حق ہوتا ہے مگر معاشی تحفظ کی ضمانت نہیں ہوتی اور اشتراکی نظام میں معاشی تحفظ حاصل ہو جاتا ہے مگر ذاتی حق ملکیت نہیں ہوتا۔

اسلام کا نظریۂ معیشت جو فطرت سے ہم آہنگ اور تمام معاشی مشکلات کا واحد حل ہے ان دونوں نظریوں سے مختلف ہے۔ یہ نظام نہ تجربات کا مرہون منت ہے اور نہ اقتصادی ماہروں کی ذہنی کاوش کا نتیجہ ہے بلکہ رب العالمین کا تجویز کردہ اور پیغمبر اسلام کا پیش کردہ ہے۔ اس نظام کی اساس شخصی یا گروہی مفاد کے بجائے عمومی مفاد پر ہے۔ کیونکہ اللہ کسی خاص فرد یا خاص گروہ کا رب نہیں ہے بلکہ ھو ربنا و ربکم۔ "وہ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے"۔ اور اس کی ربوبیت کا سایہ سب پر یکساں ہے اس لئے اس کے قائم کردہ نظام میں اجتماعی مفاد ہی ملحوظ ہو گا اور شخصی یا گروہی مفاد

کا شائبہ تک نہیں ہو سکتا۔

اسلامی نقطۂ نظر سے حقیقی مالک صرف اللہ ہے اور ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز اس کی ملکیت میں داخل ہے۔ چنانچہ اس نے مال کی نسبت اپنی ذات کی طرف دیتے ہوئے فرمایا ہے:۔

وَاٰتُوهُم مِّن مَّالِ اللّٰهِ الَّذِیْ اٰتٰكُم۔	خدا کے مال میں سے جو اس نے تمہیں دیا ہے اُن کو بھی دو۔"

اللہ کے مال میں بنیادی طور پر تمام انسانوں کو یکساں حق تصرف حاصل ہے اور اس سے فائدہ اُٹھانے میں یکساں مجاز ہیں کیونکہ تمام چیزیں جو زمین سے نکلتی ہیں یا زمین سے پیدا ہوتی ہیں یا دُنیا میں پائی جاتی ہیں سب کی سب بنی نوع انسان کی نفع رسانی کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُم مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا۔	وہی وُہ ذات ہے جس نے زمین کی تمام چیزوں کو تمہارے نفع کے لئے پیدا کیا ہے۔"

البتہ جو شخص جائز طریقوں سے ان اموال میں سے کم یا زیادہ مال حاصل کر لیتا ہے خواہ محنت و مشقت سے حاصل کیا ہو جیسے تجارت، زراعت، کاروکسب وغیرہ سے یا بغیر محنت کے اس کی طرف منتقل ہوا ہو جیسے ہبہ، وصیت اور میراث کے ذریعہ سے وُہ اسی سے مختص ہو جاتا ہے لیکن فرد اور معاشرہ میں توازن برقرار رکھنے کے لئے اس مال میں معاشرہ کا بھی ایک حصہ مقرر کر دیا گیا ہے تاکہ فرد جماعت سے اور جماعت فرد سے وابستہ رہے اور باہمی اخوت و مساوات کا رشتہ ٹوٹنے نہ پائے۔

اسلام نہ اس حد تک سرمایہ داری کا حامی ہے کہ کچھ لوگوں کو دولت پر اجارہ داری دے دے اور دوسروں کو اُن کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دے اور نہ اس حد تک مخالف ہے کہ اپنی پیدا کردہ املاک پر حق ملکیت نہ دے۔ بلکہ افراط و تفریط سے ہٹ کر اعتدال اور حقیقت پسندی پر نظام معیشت قائم کیا ہے۔ اس نظام میں نہ بے قید سرمایہ داری ہے جو مذہبی و اخلاقی قیود سے آزاد ہوتی ہے اور نہ اشتراکیت ہے جو انسان کے جائز حق ملکیت کو سلب کر کے اس کی محنت کو روٹی اور کپڑے کے عوض خرید لیتی ہے اور ایک خاص طبقہ اس کی کمائی کو اپنی صوابدید سے خرچ کرنے کا مجاز ہو جاتا ہے۔ اسلام نے نہ سرمایہ داری کی پشت پناہی کی ہے کہ ایک غیر عادلانہ طبقاتی نظام ظہور میں آئے اور معاشرہ غیر متوازن ہو کر رہ جائے اور نہ غیر فطری مساوات کی تعلیم دی ہے کہ حکومت تمام پیداواری وسائل کو اپنی تحویل میں لے کر قومی ملکیت قرار دے لے اور تمام افراد کی ضروریات کی یکساں طور پر کفیل ہو جائے۔ اس جبری مساوات سے کارکردگی کا جذبہ مضمحل اور سعی و طلب کا ولولہ سرد پڑ جاتا ہے کیونکہ ذاتی کام اور اجتماعی کام میں تفریق کئے بغیر کار و کسب میں یکساں دلچسپی لینا انسانی تقاضائے طبیعت کے خلاف ہے اور اس کا اثر جلد یا بدیر معاشرہ کی

مجموعی پیداوار پر پڑنا بھی ناگزیر ہے۔ اسلام نے اس جبری و غیر فطری مساوات کے بجائے ذرائع معیشت میں مساوات رکھی ہے اور ہر شخص کے لئے یکساں معاشی مواقع فراہم کئے ہیں تاکہ ہر فرد اپنی جدوجہد اور استعداد کار سے معیشت کا سرو سامان کرے اور اپنی محنت و کاوش کے مطابق ثمرہ و نتیجہ حاصل کرے چنانچہ قرآن مجید میں ہے:۔

لیس للانسان الا ما سعٰی۔ "انسان کو اپنی محنت ہی کا ثمرہ ملتا ہے۔"

اس نظام کے ماتحت یہ امر ناگزیر ہے کہ معیشت کے اعتبار سے افراد میں تفاوت بھی رہے کیونکہ تمام افراد میں استعداد و صلاحیت یکساں نہیں ہوتی۔ جب استعداد و قوت کار میں یکسانیت نہیں ہے تو اس کے نتائج میں یکسانیت کیونکر ہو سکتی ہے لہٰذا خارجی مساوات کو بروئے کار لانے کے بجائے اسلام نے امیر و غریب کے درمیانی فاصلے کم کرنے پر توجہ دی ہے اور انفرادی حقوق ملکیت کے ساتھ متمول طبقہ پر ایسے مالی فرائض بھی عائد کر دیئے ہیں جن کی پابندی کے بعد نہ معاشرہ غیر متوازن ہو سکتا ہے اور نہ کسی فرد کے ضروریات سے محروم رہنے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

اسلام نے معاشی آزادی کے ساتھ انفرادی ملکیت کا بھی حق دیا ہے۔ انفرادی ملکیت ایک ایسا جذبہ ہے جو انسانی فطرت میں سمو دیا گیا ہے اور اسلام تمام شعبہ ہائے حیات میں فطرت کا ہمنوا ہے اس لئے اسلامی نقطۂ نظر سے انفرادی ملکیت کا جواز ایک مسلمہ حقیقت ہے اور قرآن مجید میں متعدد مواقع پر اموال کی نسبت افراد کی طرف دے کر ان کے حق ملکیت کو واضح کیا ہے اور دوسروں کے اموال میں تصرف بے جا کو ناجائز قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:۔

ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل وتدلوا بھا الی الحکام لتاکلوا فریقا من اموال الناس بالاثم وانتم تعلمون۔ "آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھا جاؤ اور نہ حاکموں کو بطور رشوت دو تاکہ لوگوں کے مال میں سے جو کچھ ہاتھ لگے خورد برد کرنے لگ جاؤ حالانکہ تم جانتے ہو۔"

اسلام نے صرف شخصی ملکیت کا حق ہی نہیں دیا بلکہ اس حق کے تحفّظ و احترام پر بھی زور دیا ہے چنانچہ غصب، خیانت اور چوری، ڈکیتی پر تہدید و سزا اسی حق ملکیت کے تحفظ و احترام کی بنا پر تجویز کی ہے کیونکہ اسلام کا عدل پسند مزاج یہ گوارا نہیں کرتا کہ کسی کے مال کو خورد برد کیا جائے یا مالک کی رضامندی کے بغیر اس میں تصرف کیا جائے۔ چنانچہ پیغمبر اکرم کا ارشاد ہے:۔

لایحل مال امرء الا عن طیب نفس۔ "کسی شخص کا مال اس کی رضامندی کے بغیر جائز نہیں ہے۔"

اسلام نے اگرچہ شخصی ملکیت کا حق دیا ہے مگر وسائل معیشت پر ایسے قیود عائد کر دیئے ہیں کہ

بے قید سرمایہ داری کا انسداد اور اس سے پیدا ہونے والے مفاسد کا تدارک ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جائز و ناجائز اور حلال و حرام کی تفریق قائم کر کے دولت کو متوازن حد سے آگے نہیں بڑھنے دیا اور اندھا دھند جلب زر اور دولت کی اجارہ داری کے آگے ایک بند خود بخود بندھ جاتا ہے۔ اس بے قید سرمایہ داری کا ایک بڑا سبب سُودی کاروبار ہے۔ اسلام نے سرے سے سُود کو حرام قرار دے دیا ہے تاکہ سرمایہ داری کو تقویت حاصل نہ ہو چنانچہ قرآن مجید کا واضح اعلان ہے:۔

واحل الله البیع وحرم الربوا۔ — اللہ نے خرید و فروخت کو حلال اور سُود کو حرام قرار دیا ہے۔"

اسی طرح جؤا لاٹری سٹہ اور اس قبیل کی دُوسری چیزوں کو حرام کیا ہے کیونکہ جُوئے اور لاٹری میں دُوسرے کا مال بغیر معاوضہ کے ہتھیا لیا جاتا ہے جس سے ہارنے والے کے دل میں جیتنے والے کی طرف سے کدورت پیدا ہو جاتی ہے جو بعض اوقات فتنہ و فساد کو دعوت دے کر امن عامہ پر اثر انداز ہوتی ہے اور سٹہ میں خرید کیا ہُوا مال موجود ہی نہیں ہوتا بلکہ ایک غیر موجود چیز کے مقابلہ میں صرف بازار کے اُتار چڑھاؤ سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ان چیزوں کو عمل شیطان سے تعبیر کیا گیا ہے:۔

انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطٰن فاجتنبوه لعلکم تفلحون — شراب جؤا بت اور پانسے بڑے ناپاک شیطانی کام ہیں لہذا ان سے بچے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ۔"

یونہی اُن چیزوں سے بھی اکتساب زر حرام قرار دیا ہے جن کا مقصد لہو و لعب ہو جیسے آلات لہو و قمار وغیرہ یا جن کی غرض و غائت امر ناجائز ہو جیسے صنم تراشی و صلیب سازی وغیرہ ان چیزوں کا بنانا بیچنا خریدنا اور ان کے ذریعہ نفع کمانا حرام ہے۔ پیغمبر اکرم کا ارشاد ہے:۔

ان الله اذا حرم شیئا حرم ثمنه۔ — جب اللہ کسی چیز کو حرام کرتا ہے تو اس کے معاوضہ میں حاصل ہونے والا مال بھی حرام کر دیتا ہے۔"

بلکہ ان ممنوعہ چیزوں کے لئے خام مال کی فروخت بھی ممنوع ہے۔ چنانچہ صلیب، بُت اور آلاتِ لہو بنانے کے لئے لکڑی وغیرہ کی بیع اور شراب کشید کرنے کے لئے انگور کی فروخت بھی ممنوع ہے۔ اور ان چیزوں کی فروخت کے لئے جگہ کرایہ پر دینا بھی ناجائز ہے۔ چنانچہ امام جعفر صادق سے پوچھا گیا کہ

عن الرجل یواجر بیته فیباع فیه الخمر قال حرام اجرته۔ — ایک شخص اپنا مکان کرایہ پر دیتا ہے اور وہاں شراب فروخت ہوتی ہے فرمایا وہ رقم جو کرایہ کی صورت میں حاصل ہوتی ہے حرام ہے۔"

اسی طرح نفع اندوزی کے غلط اور ناروا طریقوں سے منع کیا ہے جیسے ناپ تول میں کمی کرنا۔ قرآن مجید میں ہے

ویل للمطففین۔ ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لئے بڑی تباہی ہے"
یا چیزوں کی مقدار بڑھانے کے لئے ان میں ملاوٹ کرنا۔ آنحضرت کا ارشاد ہے:۔

من غش مسلما فی بیع او شراء فلیس منا و یحشر مع الیھود یوم القیامۃ۔ جو شخص کسی مسلمان سے خرید و فروخت کے موقع پر کسی چیز میں آمیزش کرے وُہ ہم میں سے نہیں ہے بلکہ قیامت کے دن یہود کے ساتھ محشور ہو گا"۔

یا ضروریات زندگی کی مخصوص چیزوں کو گرانی کی امید پر روکے رکھنا۔ پیغمبر اکرم کا ارشاد ہے:۔

المحتکر ملعون۔ نفع کی غرض سے ضروری چیزوں کو روک لینے والا ملعون ہے"۔

معاشی نظام کی اصلاح میں میانہ روی کو بھی بڑا دخل ہے کیونکہ اکثر معاشی پریشانیاں مصارف کو نقطۂ اعتدال پر نہ رکھنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ اگر اس امر کا لحاظ رکھا جائے کہ خرچ آمدنی سے بڑھنے نہ پائے تو ذہنی و معاشی الجھنوں سے چھٹکارا پایا جاسکتا ہے۔ اسلام نے اسی متوازن طرز عمل پر زور دیا ہے کہ ضرورت کے موقع پر نہ جزرسی سے کام لیا جائے اور نہ ضرورت سے زیادہ اور بے محل خرچ کیا جائے چنانچہ قرآن مجید میں ہے:۔

والذین اذا انفقوا لم یسرفوا ولم یقتروا وکان بین ذلک قواما۔ وُہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ بخل سے کام لیتے ہیں بلکہ ان دونوں کے بیچوں بیچ اعتدال کی راہ پر چلتے ہیں"۔

ضرورت کے موقع پر ضرورت سے زائد صرف کرنا اسراف اور بلا ضرورت صرف کرنا تبذیر کہلاتا ہے قرآن مجید میں اسراف و تبذیر دونوں سے منع کیا گیا ہے۔ چنانچہ اسراف کے بارے میں ارشاد ہے:۔

ان اللہ لا یحب المسرفین۔ خدا اسراف کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا"۔

اور تبذیر کے بارے میں ارشاد ہے:۔

وات ذا القربی حقہ والمسکین وابن السبیل ولا تبذر تبذیرا۔ قریبیوں کا حق دو۔ نیز مسکین اور مسافر کے حقوق ادا کرو اور دولت کو بے موقع ضائع نہ کرو"۔

اس قرآنی حکم سے ظاہر ہے کہ اگر دولت مستحقین کی اعانت اور ادائے حقوق کے علاوہ نام و نمود ٹھاٹ بھاٹ یا غیر ضروری سامان تعیش پر صرف ہوگی۔ تو یہ ضیاع مال اور تبذیر ہے۔ اور قرآن مجید میں ہے:۔

ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین۔ بے موقع و بے ضرورت مال ضائع کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں"۔

اس بے موقع و بے ضرورت صرف سے روکنے کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ جو غریب و نادار آس پاس بستے ہیں ان میں احساس محرومی پیدا نہ ہو اور نہ ان کے جذبات مجروح ہوں اور دُوسرے وُہ دولت جو غیر ضروری مصارف پر خرچ ہوتی ہے وُہ عزیز و اقارب اور معاشرہ کے پسماندہ افراد کے کام آئے۔ اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ دولت کے ذخائر سمیٹ کر تجوریاں بھرلی جائیں اور سونا و چاندی کے انبار جمع کر لئے جائیں۔ یہ دولت کا اکتناز ہے اور دولت کا اکتناز اسی صورت میں ہوتا ہے جب ادائے حقوق سے گریز کیا جائے۔ اگر ملی واجبات ادا ہوتے رہیں تو دولت کے جمع رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس میں بڑھوتری کے بجائے کمی ہی ہوتی جائے گی اور آخر خود بخود ختم ہو جائے گی۔ اسلام اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا کہ سونا و چاندی سمیٹ کر رکھا جائے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:۔

والذین یکنزون الذھب و	وہ لوگ جو سونا و چاندی جمع کرتے رہتے ہیں
الفضۃ ولا ینفقونھا فی	اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے
سبیل اللہ فبشرھم بعذاب	اُن کو درد ناک عذاب کی خوشخبری
الیم۔	سُنا دو۔"

اسی اکتناز دولت کے سدّباب کے لئے اسلام نے سونے چاندی کے برتن اور مردوں کے لئے سونے کا استعمال ناجائز قرار دیا ہے کیونکہ یہ بھی اکتناز میں شامل ہے جس سے سرمایہ منجمد اور معیشت غیر متوازن ہو کر رہ جاتی ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ سونے چاندی کو منجمد صورت میں رکھنے کے بجائے گردش میں رکھا جائے تاکہ خود صاحب مال کے مال میں بھی وسعت ہو اور دُوسرے بھی اس گردش زر سے فائدہ اٹھا کر بے روزگاری سے متاثر نہ ہوں۔

معاشرہ میں محنت کش طبقہ کے مفادات کا تحفظ بھی ضروری ہے اور اسے اس کی محنت کا اتنا معاوضہ ملنا چاہیئے جس سے وُہ اپنی بنیادی ضروریات باحسن وجوہ پُوری کر سکے کیونکہ اسی کی محنت و کارکردگی سے پیداواری وسائل بروئے کار لائے جاتے ہیں اور انفرادی و اجتماعی ضروریات پُوری کی جاتی ہیں۔ اسلام نے اگرچہ اُجرت کی حد بندی نہیں کی اور نہ حد بندی ہو سکتی ہے کیونکہ کام کی نوعیت اور کارکردگی کی رفتار یکساں نہیں ہوتی مگر مالک و مزدور کو حقوق و فرائض کی زنجیروں میں اس طرح جکڑ دیا ہے کہ مزدُور بغیر کام کے اُجرت کا حقدار نہیں ہے اور مالک کے لئے اُجرت میں تاخیر تک روا نہیں ہے۔ آنحضرت کا ارشاد ہے:۔

اعط الاجیر اجرہ قبل ان یجف	مزدُور کو اس کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے
عرقہ۔	پہلے دے دو۔"

جہاں بھی مالک و مزدور اور اجیر و مستاجر میں تصادم کی صُورت پیدا ہوتی ہے وُہ اسلام کے

اسی حکم کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہے۔ اگر مالک مزدور کے کام کے مطابق اُجرت دے اور مزدور اُجرت کے مطابق کام کرے اور دونوں ایک دوسرے کا مفاد پیش نظر رکھیں تو نہ باہمی کشمکش کی صورت پیدا ہو اور نہ ایک طرف سے ہڑتال اور دوسری طرف سے تالابندی کی نوبت آئے۔

اسلام نے غریب و پسماندہ طبقہ کو جو ذرائع معیشت سے محروم یا کاروکسب کے قابل نہیں ہوتا کس مپرسی کی حالت میں نہیں چھوڑا بلکہ دولتمندوں کے اموال میں زکوٰۃ کی صورت میں ایک حصّہ اس کے لئے مخصوص کردیا ہے تاکہ کوئی فرد ضروریات زندگی سے محروم نہ رہے اور جن افراد کو پیمبر سے نسبی اتصال کی بنا پر بلندی و برتری حاصل ہے ان کے لئے زکوٰۃ کے بجائے خمس میں حصّہ قرار دیا ہے اس کے علاوہ عام صدقات و خیرات سے بھی محتاجوں کی خبرگیری کی پُرزور ہدایت کی ہے تاکہ معاشرہ میں کوئی بھوکا نہ رہ جائے۔ پیغمبر اسلام کا ارشاد ہے:۔

الخلق کلھم عیال اللہ و احبھم الی اللہ انفعھم لعیالہ۔	تمام مخلوق اللہ کے عیال میں داخل ہے اور اللہ کو وہی زیادہ محبوب ہے جو اس کے عیال کے لئے زیادہ نفع رساں ہو۔"

ان مالی واجبات اور انفاق فی سبیل اللہ کے بعد بھی کچھ جمع جتھا رہ جائے تو اسلام نے وصیت کی ہدایت کی ہے کہ مرنے سے پیشتر اپنے والدین اقرباء اور امور خیر کے لئے ایک حصّہ مخصوص کرجائے یہ حصّہ ترکہ کی ایک تہائی تک ہوسکتا ہے اور وارثوں کی رضامندی ہو تو اس سے بھی زائد ہوسکتا ہے قرآن مجید میں ہے:۔

کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرا الوصیۃ للوالدین والاقربین بالمعروف۔	تمہیں حکم دیا جاتا ہے کہ جب تم میں سے کسی ایک کو موت نظر آئے تو ماں باپ اور قرابتداروں کے لئے اچھی وصیت کرے بشرطیکہ وُہ کچھ مال چھوڑ جائے۔"

اس وصیت کے علاوہ شریعت نے قانون وراثت کا نفاذ کیا تاکہ دولت وارثان بازگشت میں تقسیم ہوجائے اور ایک ہاتھ سے نکل کر متعدد ہاتھوں میں پہنچ جائے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:۔

للرجال نصیب مما ترک الوالدان والاقربون و للنساء نصیب مما ترک الوالدان والاقربون مما قل او کثر نصیبا مفروضا۔	مردوں کے لئے حصّہ ہے ان چیزوں میں جو ان کے ماں باپ اور قرابتدار چھوڑ جائیں اور عورتوں کے لئے حصّہ ہے اُن چیزوں میں جو اُن کے ماں باپ اور اقرباء چھوڑ جائیں خواہ ترکہ کم ہو یا زیادہ ہر شخص کا حصّہ مقرر ہے۔"

یہ ہے اسلام کا وُہ نظام معیشت جس میں نہ سرمایہ داری کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور نہ سرمایہ سمٹ کر ایک جگہ جمع رہ سکتا ہے۔ اس میں نہ مزدور کی حق تلفی کی گنجائش ہے اور نہ غریب کی غربت کو نظر انداز کرنے کا جواز بلکہ معاشی جدوجہد کے ساتھ سماجی ذمہ داریوں کو بھی پوری اہمیت دی گئی ہے یہی وُہ حکیمانہ نظام ہے جو دنیوی بہبود کے ساتھ اخروی فلاح کا بھی ضامن ہے جس میں کسب معاش کے ساتھ اخلاقی اقدار کی پابندی اور تعاون و ہمدردی اور مروت و ایثار کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اسی سے معیشتی و معاشرتی خرابیوں کا ازالہ ہو سکتا ہے اور اسی کے ذریعہ معاشی ناہمواریوں کو دُور کیا جا سکتا ہے۔ اس نظام کے ہوتے ہوئے کسی دُوسرے نظام کے گرد طواف کرنے کی ضرورت نہیں ہے جبکہ معاشرتی سُود و بہبود اور دولت کی عادلانہ تقسیم کے تمام ضابطے اس کے اندر موجود ہیں۔

اسلامی نظام معیشت کا یہ خاکہ اس لئے پیش کیا گیا ہے تاکہ دَورِ امیرالمومنین کے معاشی نظام پر نظر کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ حضرت نے انہی اصُولوں پر معیشت کا نظام قائم کیا جو اسلام کے نظریاتی تقاضوں کے عین مطابق تھا اگرچہ وُہ دور اسلامی نظام معیشت کے نفاذ کے لئے سازگار نہ تھا کیونکہ سابقہ مُلکی فتوحات اور خزانۂ عامرہ کے عطیات کی بدولت مسلمانوں کے اندر سرمایہ داری کا رحجان پیدا ہو چکا تھا اور سرمایہ داروں کا ایک طبقہ بھی موجود تھا جو اسلام کی سادگی و سادہ معاشرت کو خیر باد کہہ کر محلاتی زندگی کا خوگر ہو چکا تھا۔ اور انسان جس زندگی کا خوگر ہو جاتا ہے اس میں تبدیلی آسانی سے گوارا نہیں کرتا۔ مگر حضرت نے اس طبقہ کو خاطر میں لائے بغیر معاشی انقلاب پیدا کرنے اور سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی بساط لپیٹ دینے کا تہیّہ کر لیا تاکہ معاشرہ کو ان تمام خرابیوں سے پاک و صاف کر دیں جو سرمایہ داری کے نتیجہ میں گھر گھر پھیل چکی تھیں۔ چنانچہ زمام حکومت ہاتھوں میں لیتے ہی سابقہ حکومت کی عطا کردہ جاگیروں کو واپس لے لینے کا حکم دیا اور فرمایا:" خدا کی قسم اگر مجھے ایسا مال بھی کہیں نظر آتا جو عورتوں کے مہر اور کنیزوں کی خریداری پر صرف کیا جا چکا ہوتا تو اُسے بھی واپس پلٹا لیتا"۔ چنانچہ حضرت عثمان کے ہاں سے تلواریں زرہیں اور صدقہ کے اُونٹ اپنی تحویل میں لے لئے اور اعلان عام کیا کہ جس جس کے پاس حضرت عثمان کا دیا ہوا مال ہو وُہ بیت المال میں جمع کر دے۔ اس اعلان سے امویوں اور سرمایہ داروں میں کھلبلی مچ گئی اور ولید ابن عقبہ نے حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ ہم آپ کی بیعت کئے لیتے ہیں بشرطیکہ وُہ مال جو حضرت عثمان کی داد و دہش کے نتیجہ میں ہمیں ملا ہے وہ ہم سے چھینا نہ جائے۔ حضرت نے فرمایا:

اما وضعی عنکم ما اصبتم	میں اس مال کو چھوڑ دوں جو تم لوگوں نے ہتھیالیا
فلیس لی ان اضع حق اللہ	ہے تو یہ میرے بس کی بات نہیں ہے کہ میں اللہ
عنکم ولا عن غیرکم۔	کے اس حق سے دستبردار ہو جاؤں جو تمہارے

اور تمہارے علاوہ دُوسروں کے ذمّہ ہے "۔ (شرح ابن ابی الحدید۔ ج۲۔ ص۱۷۱)۔

امیرالمومنین نظام معیشت کو صحیح خطوط پر چلانے کے لئے ضروری سمجھتے تھے کہ حاکم و رعایا ایک سطح پر ہوں۔ چنانچہ حضرت کا ارشاد ہے:۔ "خدا نے آئمۂ حق پر یہ فرض عائد کیا ہے کہ وہ اپنے کو مفلس و نادار لوگوں کی سطح پر رکھیں تاکہ مفلوک الحال اپنے فقر کی وجہ سے پیچ و تاب نہ کھائیں" آپ نے اپنا پورا دورِ اقتدار اسی نہج پر گزارا اور رہنے سہنے اور کھانے پہننے کا معیار وُہی رکھا جو ایک غریب و نادار کا ہوسکتا ہے۔ نہ اس سے بہتر کھانا پسند کیا اور نہ اس سے اچھا لباس پہننا گوارا کیا۔ حضرت خود فرماتے ہیں:۔ "کیا میں شکم سیر ہو کر پڑا رہا کروں درآنحالیکہ میرے گرد و پیش بھوکے پیٹ اور پیاسے جگر تڑپتے ہوں یا میں ویسا ہو جاؤں جیسا کسی شاعر نے کہا ہے:۔

وحسبك داءً ان تبيت ببطنة　　　وحولك اكباد تحن الى القد

تمہاری یہ بیماری کیا کم ہے کہ تم پیٹ بھر کر لمبی تان لو اور تمہارے گرد کچھ ایسے جگر ہوں جو سُوکھے چمڑے کو ترس رہے ہوں "

امیرالمومنین نظامِ معیشت کو عدل کی بنیادوں پر استوار کر کے طبقاتی تفریق کی راہ روکنا چاہتے تھے تاکہ معاشی اعتبار سے توازن و اعتدال کارفرما ہو اور معاشرہ غربت و امارت کے لحاظ سے دُو طبقوں میں اس طرح نہ بٹ جائے کہ ایک طرف فلک بوس عمارتیں ہوں اور دوسری طرف شکستہ جھونپڑے۔ ایک طرف فاخرہ ملبوسات ہوں اور دوسری طرف پھٹے پرانے چیتھڑے۔ ایک طرف امراء کے کتّے بھی ضرورت سے زیادہ شکم سیر ہوں اور دُوسری طرف فاقوں سے دم توڑتے ہوئے انسان۔ ایک طرف ملکی سرمایہ بے دریغ لُٹ رہا ہو اور دُوسری طرف پیغمبر کا ایک عظیم صحابی صحرائے ربذہ میں دوا و غذا کے بغیر بے کسی کی موت مر رہا ہو۔ یہ نتیجہ ہُوا کرتا ہے دولت کی جمع آوری اور غریبوں کی حق تلفی کا جیسا کہ حضرت نے فرمایا ہے:۔

ان الله فرض فى اموال الاغنياء اقوات الفقراء فما جاع فقير الا بما متع به غني والله تعالىٰ سائلهم عن ذٰلك ۔ (نہج البلاغہ)	خداوند عالم نے دولتمندوں کے مال میں فقیروں کی روزی کا حصہ رکھا ہے۔ اگر کوئی فقیر بھوکا رہتا ہے تو اس لئے کہ دولت مند نے دولت کو سمیٹ لیا ہے اور اللہ تعالیٰ ان سے اس کا مواخذہ کرنے والا ہے "۔

حضرت اس ناہموار معیشت کے بجائے نظام معیشت اس نہج پر قائم کرنا چاہتے تھے کہ ہر فرد کے ضروریات پُورے ہوں اور کوئی شخص خواہ کسی گوشہ میں پڑا ہو لوازم حیات سے محروم نہ رہے پیداواری وسائل اور معیشت کے جملہ شعبوں میں سب کے حقوق مساوی ہوں اور سب کو سعی و کاوش

اور کاروکسب کے یکساں مواقع مہیّا ہوں۔ یہی اسلامی نظریۂ مساوات ہے جو نفاذ پذیر ہونے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے اور تقاضائے عدل کے مطابق بھی ہے اور مساوات بایں معنی کہ دولت سب کو برابر برابر ملے اور افراد میں معاشی اعتبار سے اونچ نیچ نہ ہو تو اس خارجی مساوات کا اسلامی نظریہ سے کوئی تعلق نہیں ہے جیساکہ اسلام کے مالی فرائض زکوٰۃ خمس حج وغیرہ سے ظاہر ہے اور نہ اس قسم کی مساوات سے اجتماعی زندگی کو کسی مضبوط بنیاد پر استوار کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ حضرت کا ارشاد ہے:۔

لایزال الناس بخیر ماتفاوتوا	انسانوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ ان میں تفاوت
فان استووا ھلکوا (امالی صدوق)	رہے اور اگر سب برابر ہو جائیں تو ہلاک ہو جائیں"

ظاہر ہے کہ جب تمام انسان معاشی اعتبار سے ایک سطح پر ہوں گے تو ایک کو دوسرے کی احتیاج و ضرورت نہ ہوگی جس کے نتیجہ میں روابط کمزور اور معاشرتی تعلقات مضمحل ہو جائیں گے اور آخر مدنیت و اجتماعیت کا شیرازہ بکھر جائے گا جو سراسر ہلاکت و تباہی ہے۔

عہد امیر المومنین کے معاشی نظام پر نظر کی جائے تو یہ چیز بالکل روشن اور واضح ہو جاتی ہے کہ کاروباری آزادی کے ساتھ پیداواری وسائل عوام کی ملکیت تھے اور ہر شخص معیشت کے مختلف ذرائع زراعت تجارت دستکاری وغیرہ کے اختیار کرنے میں آزاد تھا۔ اور ایک بہترین نظام معیشت کی بنیادی قدر یہی ہے کہ ایک طرف مکمل معاشی آزادی ہو اور دوسری طرف مکمل معاشی تحفظ ہو تاکہ ہر شخص اپنی محنت و کارکردگی کے نتیجہ سے مطمئن ہو کر جدوجہد میں لگا رہے۔ حضرت یہ گوارا نہ کرتے تھے کہ کوئی شخص کاروکسب اور معاشی تگ و دو چھوڑ چھاڑ کر معاشرہ پر بار بن جائے اور اپنی کمائی کے بجائے دوسروں کی کمائی سے اپنا پیٹ پالے۔ البتہ جو شخص اپنی ضروریات کے فراہم کرنے سے عاجز ہوتا یا ضروریات سے اس کی آمدنی کم ہوتی تو بیت المال سے اس کی اعانت کی جاتی۔

حضرت زراعت اور تجارت کو معاشی فارغ البالی کا سرچشمہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ حضرت کا ارشاد ہے:۔

من وجد ماءً وترابا ثم	جسے زمین اور آبیاری کے لئے پانی میسّر ہو اور
افتقر ابعدہ اللہ۔	وہ پھر نادار رہے تو اللہ اُسے دُور ہی رکھے"۔

تجارت کے بارے میں فرماتے ہیں:۔

تعرضوا للتجارۃ فان فیھا	تجارت کرو اس لئے کہ تجارت ہی وہ سرمایہ ہے
غنی لکم عما فی ایدی الناس	جو تمہیں لوگوں کے مال و دولت سے مستغنی کر دیگا"

حضرت زراعت تجارت کی حوصلہ افزائی کے لئے خود بھی کھیتی باڑی اور کاروبار میں عملاً حصّہ لیتے تھے۔ چنانچہ افتادہ و بے آباد زمینوں کو آباد کرتے اور چشمے کھود کر باغوں اور نخلستانوں کی آبیاری کرتے۔ اسی طرح تجارت کی طرف رغبت دلانے کے لئے ایک مرتبہ اپنا تہبند فروخت کے لئے پیش

کرتے ہوئے فرمایا:۔

اشتریته بخمسة دراهم	میں نے یہ تہبند پانچ درہم میں خریدا تھا اگر کوئی
فمن اربحنی فیه درهما بعته	ایک درہم زیادہ دے تو اس کے ہاتھ بیچ دونگا

فرصت کے اوقات میں اپنے شاگرد میثم تمار کی دوکان پر بیٹھ جاتے اگر میثم ادھر اُدھر ہوتے تو گاہکوں کے ہاتھ کھجوریں بیچتے اور اس میں ذرا سبکی محسوس نہ کرتے۔

حضرت تجار اور کاروباری طبقہ پر نظر رکھتے تھے تاکہ بلاوجہ قیمتوں میں اضافہ نہ کریں۔ چنانچہ بازاروں میں گھوم پھر کر چیزوں کے نرخ دریافت کرتے ناپ تول کا جائزہ لیتے۔ ابوالصہبا کہتے ہیں:۔

رایت علیا بشط الکلا یسئل	میں نے شط کلا (بصرہ) میں دیکھا کہ حضرت نرخ
عن الاسعار۔	پوچھتے پھرتے ہیں"

ذخیرہ اندوزی کر کے مصنوعی قلت اور گرانی پیدا کرنا ایک معاشرتی جرم ہے۔ حضرت نے اس کی روک تھام کے لئے عام اعلان کر دیا تھا کہ کوئی شخص گراں فروشی کے ارادہ سے ضروریات زندگی کا ذخیرہ نہ کرے۔ چنانچہ مالک اشتر کو تحریر فرمایا:" ذخیرہ اندوزی سے منع کرنا کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے ممانعت فرمائی ہے۔ لہٰذا جو بھی ذخیرہ اندوزی کا مرتکب ہو اُسے مناسب حد تک سزا دینا"

معاشی نظام میں توازن اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے جب اسراف یعنی ضرورت سے زائد خرچ اور تبذیر یعنی بلا ضرورت خرید سے بچ کر رہا جائے حضرت ان دونوں چیزوں کو معاشی تباہی کا پیش خیمہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ بلا ضرورت خرچ کے بارے میں فرمایا:۔

فدع الاسراف مقتصدا و	میانہ روی اختیار کرتے ہوئے فضول خرچی سے
اذکر فی الیوم غدا۔	باز آؤ آج کے دن کل کو بھول نہ جاؤ"

اور غیر ضروری چیزوں کو سمیٹنے کے بارے میں فرمایا:۔

اذا استغنیت عن شئ فدعه	جس چیز کی ضرورت نہ ہو اُسے چھوڑ دو اور اسی
وخذ ما انت محتاج الیه۔	چیز کو حاصل کرو جس کی ضرورت ہو"

جب انسان میانہ روی کو چھوڑ کر ضرورت سے زائد خرچ کرتا ہے تو اس کا نتیجہ یہی دیکھنے میں آتا ہے کہ وہ محتاج و دست نگر ہو کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ شادی بیاہ اور مختلف تقریبات پر زمین و جائیداد بیچ کر یا سودی قرضہ لے کر اندھا دھند خرچ کرتا ہے اور کنبہ و برادری اور محلہ و شہر میں دریا دلی کی شہرت بھی حاصل کر لیتا ہے مگر آخر کار یا ذریعۂ معاش سے محروم ہو جاتا ہے یا سود در سود کے چکر میں پڑ کر اطمینان و سکون کھو بیٹھتا ہے۔ اسی طرح بلا ضرورت خرید بھی معیشت پر اثر انداز ہوتی ہے

چنانچہ جب ایک چیز بلا ضرورت خرید لی جاتی ہے تو وہ خریدنے والے کے کام تو آتی نہیں اب کسی اور ضرورت کو پورا کرنے کے لئے مقدور نہ ہو تو یا اس بے ضرورت چیز کو اونے پونے بیچے اور نقصان اُٹھائے یا اپنی ضرورت کی چیز سے دستبردار ہو جائے۔ اور اگر اس بلا ضرورت خرید کا رجحان بڑھ جائے تو اس سے معاشرہ بھی یقیناً متاثر ہوگا اس طرح کہ جس کے پاس وہ چیز ہے وہ اُس کے کام کی نہیں ہے اور جسے اس کی ضرورت ہے وہ طلب کے بڑھ جانے سے یا تو اُسے مہنگے داموں خریدے یا اس سے محروم رہے اس لئے کہ بلا ضرورت خرید سے طلب رسد سے بڑھ جاتی ہے اور چیزوں کی قیمتیں چڑھ جاتی ہیں اور قیمتوں کے چڑھاؤ سے افراط زر کا دباؤ بڑھ جاتا ہے جس کا نتیجہ معاشی تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

بیت المال کی تقسیم

پیغمبر اکرم زکوٰۃ و صدقات اور اموال غنائم کو جمع رکھنے کے بجائے اموال غنائم کو مجاہدین میں اور دوسرے اموال جس شہر اور جس علاقے سے وصول ہوتے وہیں کے مسلمانوں میں فوراً تقسیم کر دیتے اس لئے نہ بیت المال تشکیل دیا گیا اور نہ اس کی ضرورت محسوس کی گئی۔ آنحضرت کے بعد جب فتوحات کے نتیجہ میں روم و ایران کے خزانے مدینہ میں سمٹ آئے تو بیت المال کی بنیاد رکھی گئی اور اس کے نظم و انصرام کے لئے محکمۂ مالیات قائم کیا گیا اس محکمہ کے زیر نگرانی سرمایہ سمیٹ کر رکھا جاتا جس سے رفاہی امور انجام دیئے جاتے اور سالانہ وظائف کی تقسیم ہوتی۔ آنحضرت کے دور میں تقسیم کی بنیاد عدل و مساوات پر تھی اور سب سے یکساں برتاؤ ہوتا تھا مگر آپ کے بعد تقسیم بالسویہ کی پابندی ختم کر دی گئی۔ چنانچہ حضرت عمر کے دور میں بیت المال میں سے کسی کو کم اور کسی کو زیادہ وظیفہ ملتا تھا۔ ازواج پیغمبر کو دوسری خواتین پر ترجیح دی جاتی تھی اور حضرت عائشہ کو دوسری ازواج سے دو ہزار زائد دیا جاتا تھا۔ بدریین کے وظائف ان لوگوں سے زیادہ تھے جو بدر میں شریک نہ ہوئے تھے اور مہاجرین کو انصار پر فوقیت حاصل تھی۔ حضرت عثمان کے دور میں یہ درجہ بندی بھی باقی نہ رہی اور انہوں نے کتاب و سنت اور سیرت شیخین کی پابندی کا عہد کرنے کے باوجود نہ تقسیم بالسویہ ضروری سمجھی اور نہ تقسیم بالمدارج بلکہ مسلمانوں کا مشترکہ سرمایہ اموی عزیزوں دوستوں اور ہوا خواہوں کی تن پروری کے لئے مخصوص کر دیا اور جسے چاہا اور جس قدر چاہا بطور عطیہ بخش دیا۔

امیر المومنین نے جب بیت المال کا نظم و نسق اپنے ہاتھوں میں لیا تو عمل پیغمبر کے مطابق جس شہر میں جو مال جمع ہوتا اسی شہر کے مستحقین میں تقسیم کر دیتے اور اگر وہاں سے کچھ بچ کر آتا تو بیت المال میں سمیٹ کر رکھنے کے بجائے ہر جمعہ کو مستحقین میں تقسیم کر کے بیت المال خالی کر دیتے۔ جب بیت المال

خالی ہو جاتا تو اپنے ہاتھ سے اس میں جھاڑو دیتے دو رکعت نماز پڑھتے اور فرماتے کہ اللہ کا شکر ہے کہ میں جس طرح خالی ہاتھ اندر داخل ہوا تھا اسی طرح خالی ہاتھ باہر جارہا ہوں۔ ابن عبدالبر نے تحریر کیا ہے:۔

وکان لا یدع فی بیت المال	حضرت نے یہ نوبت نہیں آنے دی کہ رات گزاریں
مالا یبیت فیہ حتی یقسمہ	اور مال بیت المال میں پڑا رہے بلکہ رات سے پہلے
الا ان یغلبہ شغل فیصبح	اسے تقسیم کردیا کرتے تھے۔ البتہ اگر کوئی مانع ہوتا
الیہ۔ (استیعاب۔ ج۲۔ ص۵۰)۔	تو صبح ہونے دیتے۔"

ایک دفعہ اس وقت مال آیا جب رات کا اندھیرا شروع ہو چکا تھا۔ فرمایا کہ اس مال کو ابھی تقسیم کردیا جائے۔ لوگوں نے کہا کہ اب تو رات ہو چکی ہے اسے کل پر اٹھا رکھئے۔ فرمایا کیا تمہیں یقین ہے کہ میں کل تک زندہ رہوں گا۔ کہا کہ موت کا علم اللہ کے سوا کس کو ہوسکتا ہے۔ فرمایا کہ پھر دیر نہ کرو اور اسے ابھی تقسیم کردو چنانچہ چراغ روشن کئے گئے اور سارا مال راتوں رات تقسیم کردیا گیا۔

سابقہ حکومتوں میں بیت المال کی غیر مساویانہ تقسیم نے معاشی نظام کو غیر متوازن بنادیا تھا حضرت نے اس میں تبدیلی ضروری سمجھی اور غیر مساویانہ تقسیم کے بجائے اسلامی نظریۂ مساوات کو پھر سے زندہ کیا اور چھوٹے بڑے کا امتیاز ختم کرکے سب کا حصہ یکساں قرار دیا اگرچہ یہ طرز عمل امتیاز پسند ذہنیتوں پر شاق گزرا اور سرمایہ دار طبقہ کی طرف سے اس کی مخالفت ہوئی مگر حضرت کسی کو خاطر میں نہ لائے اور اپنے اصول سے جو عین اسلامی اصول تھا ہٹنا گوارا نہ کیا۔ چنانچہ عبداللہ ابن ابی رافع بیان کرتے ہیں کہ جب طلحہ اور زبیر نے یہ دیکھا کہ تقسیم مال میں ان کا امتیاز خطرہ میں ہے تو وہ حضرت کے پاس آئے اور کہا کہ یا امیرالمومنین حضرت عمر ہمیں بیت المال سے اتنا اور اتنا دیا کرتے تھے آپ بھی اس کا لحاظ رکھیں۔ حضرت نے فرمایا کہ اسے چھوڑو کہ فلاں تمہیں اتنا دیا کرتا تھا۔ یہ بتاؤ کہ رسول اللہ تمہیں کیا دیا کرتے تھے۔ یہ سن کر وہ دونوں چپ ہوگئے۔ حضرت نے انہیں خاموش دیکھا تو فرمایا کیا رسول اللہ تقسیم بالسویہ کے اصول پر کاربند نہ تھے کہا کہ ہاں وہ سب میں برابر برابر تقسیم کیا کرتے تھے۔ فرمایا کہ پھر سنت رسول زیادہ قابل عمل ہے یا سنت عمر؟ کہا کہ قابل عمل تو سنت رسول ہے مگر ہمیں اسلام میں سبقت کا شرف حاصل ہے ہم نے اسلامی غزوات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے اور ہمیں رسول اللہ سے قرابت بھی ہے فرمایا کہ اسلام میں تمہیں سبقت حاصل ہے یا مجھے کہا کہ آپ کو۔ فرمایا تم نے جہاد میں زیادہ حصہ لیا ہے یا میں نے کہا آپ نے۔ فرمایا تمہیں رسول اللہ سے زیادہ قرابت ہے یا مجھے کہا آپ کو۔ پھر حضرت نے ایک مزدور کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ اس مال میں میرا اور اس مزدور کا حصہ برابر ہے جب میں اپنے لئے امتیاز گوارا نہیں کرتا تو تمہارے لئے کیونکر گوارا کیا جاسکتا ہے۔

حضرت بیت المال میں اعلےٰ ادنیٰ قرشی غیر قرشی آزاد اور غلام سب کا حق مساوی سمجھتے تھے

اور رنگ ونسل اور قومیت ووطنیت کی بنا پر امتیاز گوارا نہ کرتے تھے اور یہ اعلان کر دیا تھا کہ میں سب امتیازات ختم کر دوں گا۔ عقیل نے یہ اعلان سُنا تو حضرت سے کہا کہ آپ مجھے اور مدینہ کے ایک حبشی غلام کو ایک سطح پر رکھیں گے۔ حضرت نے فرمایا:۔

اجلس رحمك الله وما فضلك عليه الا بسابقة او تقوى۔	بیٹھئے خدا تم پر رحم کرے اگر تم کو اس پر فضیلت ہو سکتی ہے تو تقویٰ اور سبقت کی بنا پر۔"

ایک مرتبہ حضرت کے پاس دو عورتیں آئیں حضرت نے ان دونوں کو برابر برابر دیا اس پر ایک نے کہا کہ میں عربیہ ہوں اور آزاد اور یہ غیر عربیہ ہے اور کنیز۔ اور آپ نے ہم دونوں کو ایک درجہ پر سمجھ لیا ہے حالانکہ میں مرتبہ کے لحاظ سے بلند تر ہوں۔ حضرت نے زمین پر سے مٹی اٹھائی اور اس پر نظر کرنے کے بعد فرمایا:۔

ما اعلم ان الله فضل احدا من الناس على احد الا بالطاعة والتقوى۔	میرے علم میں نہیں ہے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فوقیت دی ہو مگر اُسے جو طاعت و تقویٰ میں بڑھا ہوا ہو۔"

ایک دفعہ سہل ابن حنیف اپنے حبشی غلام کو لے کر حضرت کی خدمت میں آئے اور کہا کہ یہ بیت المال سے اپنا حصہ لینے کے لئے آیا ہے آپ اسے کیا دیں گے فرمایا کہ تمہیں کیا ملا ہے کہا کہ سب کو تین تین دینار ملے ہیں اور مجھے بھی تین دینار ملے ہیں۔ فرمایا کہ پھر اسے بھی تین دینار دیئے جائیں گے۔

ایک مرتبہ آپ کی ہمشیرہ ام ہانی بنت ابی طالب آپ کے ہاں آئیں آپ نے بیت المال میں سے بیس درہم انہیں دیئے انہوں نے واپس پلٹ کر اپنی ایک عجمیہ کنیز سے دریافت کیا کہ تمہیں امیر المومنین نے کیا دیا ہے اس نے کہا کہ بیس درہم یہ سُن کر جناب ام ہانی حضرت کے پاس آئیں اور کہا کہ آپ نے جو کنیز کو دیا ہے وہی مجھے دیا ہے حالانکہ میرا حق فائق ہے۔ حضرت نے فرمایا:۔

انی والله لا اجد لبنی اسمٰعیل فی هذا الفئ فضلا علی بنی اسحٰق۔	خدا کی قسم اس مال میں بنی اسمٰعیل کو بنی اسحاق پر فوقیت حاصل نہیں ہے۔"

امیر المومنین کی بلند نفسی اس کی قطعاً روادار نہ ہو سکتی تھی کہ وہ قرابت و عزیزداری کی بناء پر اپنے نظریۂ تقسیم اموال میں تبدیلی پیدا کریں اور جانبداری سے کام لے کر اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے امتیازی برتاؤ روا رکھیں خواہ بہن ہو یا بھائی بیٹا ہو یا بیٹی۔ چنانچہ آپ سے عقیل نے فقر و افلاس کا

شکوہ کرتے ہوئے کہا کہ مجھے بیت المال میں سے کچھ دیجئے۔ حضرت نے فرمایا کہ چند دن صبر کرو جب دوسروں کو ملے گا تو تمہیں بھی مل جائے گا۔ جب انہوں نے زیادہ اصرار کیا تو حضرت نے ایک شخص سے کہا کہ تم انہیں بازار میں لے جاؤ اور کسی دوکان کے سامنے کھڑا کر دو اور عقیل سے کہا کہ تم اس دوکان کا تالا توڑو اور جو کچھ اس کے اندر ہو سمیٹ کر گھر لے جاؤ۔ عقیل نے کہا کہ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں چوری کروں اور چور کہلواؤں۔ فرمایا تو پھر تم مجھے چور بنانا چاہتے ہو کہ میں مسلمانوں کے مال میں سے چوری کر کے تمہیں دوں۔

ایک دفعہ عقیل کے بچوں نے حضرت کو کھانے پر بلالیا جب کھانا سامنے رکھا گیا تو پوچھا کہ یہ کھانے کا سامان کہاں سے مہیا کیا ہے کہا کہ ہم چند دن اپنے حصّہ کے جو بچاتے رہے ہیں اس سے یہ سامان خریدا گیا ہے۔ فرمایا بچنے کا سوال اسی صورت میں پیدا ہوتا ہے جب تمہاری ضرورت سے زائد تھے لہذا تم جتنا روز بچاتے تھے آئندہ اتنا کم دیا جائے گا کیونکہ اس سے زیادہ دینے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اس پر عقیل بگڑ گئے۔ حضرت نے لوہے کے ایک ٹکڑے کو تپایا اور ان کے جسم کے قریب لے گئے عقیل ڈر کر پیچھے ہٹے۔ حضرت نے فرمایا کہ تم لوہے کے ایک گرم ٹکڑے کو دیکھ کر چیخ اٹھے ہو اور مجھے اس آگ میں جھونکنا چاہتے ہو جسے خدا نے اپنے غضب سے بھڑکایا ہے۔

ایک مرتبہ عبداللہ ابن جعفر نے حضرت سے کہا کہ یا امیرالمومنین مجھے بیت المال میں سے کچھ دیجئے میری حالت یہ ہے کہ میں اپنی سواری بیچے بغیر روزمرہ کا خرچ بھی نہیں چلا سکتا۔ حضرت نے فرمایا:۔

لا واللہ ما اجد لک شیئا	خدا کی قسم میرے پاس تمہیں دینے کے لیے کچھ
الا ان تامر عمک ان یسرق	نہیں ہے مگر یہ کہ تم اپنے چچا سے یہ کہو کہ وہ
فیعطیک۔	چوری کرے اور تمہیں دے۔

حضرت کوئی عزیز ہو یا غیر کسی کا ادنیٰ تصرّف بھی بیت المال میں گوارا نہ کرتے تھے حالانکہ اگر آپ درگزر سے کام لیتے تو کوئی آپ پر حرف گیری نہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ عمرو ابن سلمہ جو حضرت کی طرف سے اصفہان کے عامل تھے گھی اور شہد کی چند مشکیں لے کر آئے۔ جناب ام کلثوم نے ضرورت کی بنا پر عمرو ابن سلمہ سے تھوڑا سا گھی اور شہد طلب کیا انہوں نے ایک پیالے میں گھی اور ایک پیالے میں شہد بھجوا دیا۔ دوسرے دن جب یہ مشکیں حضرت کے سامنے لائی گئیں تو آپ نے دو مشکوں کو ان کی اصلی حالت پر نہ پا کر عمرو سے وجہ دریافت کی۔ عمرو نے کہا کہ جناب ام کلثوم نے تھوڑا سا شہد اور گھی طلب کیا تھا میں نے ان مشکوں کو کھلوا کر گھی اور شہد بھیج دیا تھا۔ امیرالمومنین نے دونوں مشکیں تخمینہ لگانے والوں کے پاس بھیج دیں اور ان سے پوچھا کہ ان مشکوں میں سے کتنا گھی اور شہد کم ہوا ہے اور ان دونوں چیزوں کی قیمت کیا ہو گی۔ انہوں نے اندازہ کرنے کے بعد بتایا کہ جتنا گھی اور شہد ان میں سے

نکالا گیا ہے اس کی قیمت پانچ درہم سے زیادہ نہ ہوگی آپ نے جناب ام کلثوم کو پیغام بھجوایا کہ وہ پانچ درہم بھیج دیں اور اس کے بعد تمام مال مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔

ایک دفعہ بصرہ کے خراج میں موتیوں کا ایک قیمتی ہار آیا آپ کی صاحبزادی جناب ام کلثوم نے خازن بیت المال ابو رافع سے کہا کہ وہ ہار تین دن کے لئے عاریۃً بھجوا دیں۔ ابو رافع نے وُہ ہار بھجوا دیا۔ امیر المومنین نے وُہ ہار دیکھا تو پُوچھا کہ یہ ہار یہاں کیسے آیا ہے؟ ام کلثوم نے کہا کہ میں نے انسے عاریۃً منگوایا تھا۔ فرمایا کہ اگر یہ عاریۃً نہ لیا ہوتا تو میں اس پر سزا دیتا۔ ام کلثوم نے کہا کہ بابا یہ ہار مجھے دے دیجئے فرمایا جب تک میں ہر مسلمان خاتون کے گلے میں ایسا ہار دیکھ نہ لوں اس وقت تک تمہیں نہیں دیا جا سکتا اور اتنے ہار آئیں کہاں سے۔ پھر حکم دیا کہ اسے فوراً بیت المال میں داخل کر دیا جائے۔

امیر المومنین احساس ذمہ داری کی بنا پر حقیر و بے قیمت چیز کو بھی اتنی ہی اہمیت دیتے تھے جتنی مالی اعتبار سے قیمتی چیز کو دی جا سکتی ہے۔ اور اس وقت تک چین سے نہ بیٹھتے جب تک اسے بانٹ نہ دیتے۔ چنانچہ بیت المال میں ایک رسّی دیکھی جو تقسیم کے بعد پڑی رہ گئی تھی فرمایا کہ اسے بھی لے جاؤ اور تقسیم کر دو۔ اصفہان سے مال آیا تو اس میں سے ایک روٹی بھی نکل آئی۔ آپ نے قبیلہ وارانہ تقسیم کے لئے جہاں مال کے سات حصّے کئے اس روٹی کے بھی سات ٹکڑے کئے اور ہر حصہ میں ایک ٹکڑا رکھ دیا اور ساتوں قبیلوں کے شیوخ کو بلا کر ایک ایک حصہ اُن کے حوالے کیا۔ ایک مرتبہ پارچوں کی تقسیم ہوی۔ امام حسن نے ان پارچوں میں ایک ٹوپی دیکھ کر کہا کہ بابا یہ مجھے دے دیجئے۔ آپ نے انکار کر دیا۔ جب پارچے تقسیم ہوئے تو وُہ ٹوپی ایک ہمدانی کے حصہ میں آئی۔ لوگوں نے اس سے کہا کہ امام حسن نے اس ٹوپی کو پسند کیا تھا مگر امیر المومنین نے انہیں دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس ہمدانی نے وُہ ٹوپی امام حسن کی خدمت میں بھیج دی۔

ان چند واقعات پر نظر کرنے کے بعد بخوبی انداز ہو سکتا ہے کہ حضرت نے تقسیم اموال میں وہی طرزِ عمل اختیار کیا جو پیغمبر اکرم کا طرز عمل تھا۔ نہ بیت المال میں مال جمع کر کے رکھا اور نہ تقسیم میں رنگ و نسل کا امتیاز کیا بلکہ عدل و مساوات کے جو پیمانے وضع کئے اور حق و انصاف کے جو معیاری نمونے پیش کئے دُنیا اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ کیا اس کی مثال کہیں نظر آتی ہے کہ حقیقی بھائی اپنے بچوں کی پرورش کے لئے بیت المال سے چند سیر جو کا مطالبہ کرے، بہن اپنے وظیفہ میں چند درہموں کا اضافہ چاہے، ابن عم اور داماد روزمرہ کی ضروریات کے سلسلہ میں مدد چاہے بیٹی گھی اور شہد کا ایک پیالہ لے یا ایک ہار عاریۃً منگوا لے اور بیٹا ایک معمولی سی ٹوپی کی خواہش کرے مگر اصول پرستی و حق پسندی کے مقابلہ میں محبت و قرابت کے تمام تقاضوں کو نظر انداز کر دیا جائے اور بیت المال سے عزیزوں کے ساتھ اتنی سی مراعات بھی گوارا نہ کی جائے حالانکہ حق ولایت سے قطع نظر حضرت مسلمانوں سے

اجازت لے کر یہ چند چیزیں اپنے عزیزوں کو دے سکتے تھے مگر آپ کی خودداری یہ گوارا نہیں کرتی کہ مسلمانوں پر یہ ادنیٰ سا بوجھ بھی ڈالیں یا اُن کے زیر بار احسان ہوں جبکہ حضرت اپنے ذاتی مصارف کے لئے غلہ تک مدینہ سے منگواتے تھے اور اپنے حق کے باوجود بیت المال پر اپنا بوجھ ڈالنا پسند نہ کرتے تھے۔ ہارون ابن عنترہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے خورنق میں حضرت کو ایک پرانا کمبل اوڑھے دیکھا جو سردی سے بچاؤ کے لئے کافی نہ تھا۔ میں نے کہا کہ یا امیرالمومنین اس بیت المال میں آپ کا حصّہ بھی تو ہے اس میں سے کوئی نیا کمبل لے لیجئے فرمایا:۔

واللہ ما ارزأکم شیئاً وما ھی الا قطیفتی التی اخرجتہا من المدینۃ۔ (تاریخ کامل ج ۳ ص ۲۰۱)	خدا کی قسم میں نے تمہارے مال میں سے کوئی چیز لینا گوارا نہیں کی اور یہ چادر جو اوڑھے ہوئے ہوں مدینہ سے لے کر آیا تھا"

نظام زکوٰۃ

زکوٰۃ ایک مالی عبادت ہے جو گیہوں، جو، خرما، کشمش، سونا، چاندی، گائے بھینسوں، بھیڑ بکریوں اور اُونٹوں میں ہر صاحب نصاب پر مقررہ مقدار میں واجب ہے۔ زکوٰۃ کے لغوی معنی طہارت و پاکیزگی کے ہیں اور شرعی معنی میں بھی پاکیزگی کا اعتبار کیا گیا ہے اور زکوٰۃ سے تطہیر مال ہی مراد ہے کیونکہ جب تک زکوٰۃ ادا نہ کی جائے مال طاہر نہیں ہوتا اور ادائے زکوٰۃ کے بعد مال بھی طاہر اور انسانی ذہن بھی بخل، طمع، حبّ مال اور ان سے پیدا ہونے والی کثافتوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے:۔

خذ من اموالھم صدقۃً تطھرھم وتزکیھم۔	ان کے مال سے زکوٰۃ لو اور اس کے ذریعہ انہیں پاک و صاف کر دو"

زکوٰۃ کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ضرورت مند افراد کی اعانت و دستگیری ہوتی رہے اور معاشرہ میں کوئی فرد ضروریات زندگی سے محروم نہ رہ جائے۔ چنانچہ زکوٰۃ کے آٹھ مصارف میں سے سات مصارف کا تعلق افراد سے ہے اور ایک مصرف کا تعلق اجتماعی و رفاہی امور سے ہے۔ قرآن مجید میں ہے:۔

انما الصدقات للفقراء و المساکین والعاملین علیہا والمولفۃ قلوبھم و فی الرقاب والغارمین و فی	صدقہ زکوٰۃ بس فقیروں کا حق ہے اور محتاجوں کا اور اس کے کارندوں اور اُن لوگوں کا جن کی تالیف قلب مقصود ہے اور غلاموں کی رہائی کے لئے اور قرضداروں کے ادائے قرض کے

سبیل اللہ وابن السبیل۔ لئے اور خدا کی راہ میں امور خیر کے لئے اور مسافروں کے لئے۔"

زکوٰۃ سے بڑی حد تک معاشی ناہمواریوں کو متوازن سطح پر لایا جا سکتا ہے کیونکہ ہر سال دولت کا ایک حصّہ دولتمندوں کے ہاتھوں سے نکل کر غریبوں اور محتاجوں کے ہاتھ میں پہنچ جاتا ہے اگرچہ اس سے امیر و غریب کا تفاوت ختم نہیں ہوتا مگر ایک حد تک اس میں کمی ضرور ہو جاتی ہے اور اس فریضۂ مالی کا مقصد بھی یہی ہے کہ دولت چند ہاتھوں میں جمع ہونے کے بجائے افراد میں بٹتی رہے اور سرمایہ داری کی طرف جھکاؤ پیدا نہ ہونے پائے۔ چنانچہ قرآن مجید میں صدقات و خیرات کی غرض و غایت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:۔

کے لا تکون دولۃ بین الاغنیآء منکم۔ تاکہ دولت ہر پھر کے تمہارے دولتمندوں ہی کے ہاتھوں میں نہ رہے۔"

بعض حلقوں میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ زکوٰۃ کی مقدار اتنی کم ہے کہ اس سے نہ معاشی تفریق ختم کی جا سکتی ہے اور نہ امیر و غریب کے درمیانی فاصلے کم ہوتے ہیں بلکہ محتاجوں اور ناداروں کی تعداد جوں کی توں رہتی ہے نہ ان کی ضرورتیں پوری ہو سکتی ہیں اور نہ ان کی احتیاج میں کمی ہوتی ہے۔ اس کا جواب تو وہی ہے جو امام جعفر صادق علیہ السلام نے دیا ہے کہ "اللہ نے دولتمندوں کے مال میں فقیروں کا اتنا ہی حق مقرر کیا ہے جو ان کی ضروریات کی کفایت کرتا ہے۔ اور اگر اللہ یہ جانتا کہ اس سے محتاجوں کی احتیاج برطرف نہیں ہو سکتی تو وہ اس کی مقدار زیادہ کر دیتا۔" بلکہ وہ چاہتا تو مالک کے مال میں فقیر کا حصّہ مالک کے برابر یا اس سے بھی زائد قرار دے سکتا تھا مگر حکمت الٰہیہ کا تقاضا یہ تھا کہ صاحب مال کا حصّہ وافر رکھا جائے کیونکہ یہ مال اس کی محنت و ریاضت اور کد و کاوش کا ثمرہ ہے اور غریب و نادار کا اس میں حق ہے تو مالک بھی ضرورت و احتیاج کے لحاظ سے فقیر کا شریک ہے تو جہاں اللہ نے فقیر کا اس کی غربت و احتیاج کی بنا پر حق رکھا ہے وہاں مالک کی ضرورت کے علاوہ اس کی محنت صرفہ اور حق ملکیت کی رعایت بھی ضروری تھی چنانچہ اس حکیم مطلق نے اسی حق کی بنا پر جہاں مالک کی محنت اور صرفہ کم ہوتا ہے زکوٰۃ کی مقدار زیادہ رکھی ہے اور جہاں محنت اور صرفہ زیادہ ہوتا ہے وہاں فقیر کا حصّہ کم کر دیا ہے کیونکہ انسان جس چیز کے حصول میں زیادہ محنت و مشقت کرتا ہے اتنا ہی اس کا زیادہ مستحق ہوتا ہے۔ چنانچہ گیہوں کی فصل اگر بارانی ہو تو مالک چونکہ آبپاشی کی محنت اور اس کے مصارف سے بچ جاتا ہے اس لئے فقیر کا حصّہ ۱/۱۰ قرار دیا ہے اور اگر فصل آبپاشی کے ذریعہ ہو تو چونکہ مالک آبپاشی کے اخراجات بھی برداشت کرتا ہے اس لئے فقیر کا حصّہ ۱/۲۰ قرار دیا گیا ہے۔ یونہی ان چوپاؤں میں جن کی پرورش کا بار مالک پر ہوتا ہے فقیر کا حق قرار نہیں دیا گیا اور جو صحراؤں اور چراگاہوں میں

چر کر خود ہی اپنا پیٹ پال لیتے ہیں ان میں فقراء کا حق قرار دیا گیا ہے۔ غرض اللہ نے مالک کے صرفہ و محنت اور فقیر کی احتیاج میں ایک نسبت قائم کر کے زکوٰۃ کی مقدار مقرر کی ہے کہ ایک طرف فقیر کو بقدر کفایت ملتا رہے اور دوسری طرف مالک پر اتنا ہی بار پڑے جسے وُہ خوشی خوشی گوارا کر لے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ مقدار کی کمی احتیاج کے باقی رہنے کا سبب نہیں ہے بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ دولتمندوں کا ایک طبقہ سرے سے اس فریضہ کو اہمیت ہی نہیں دیتا اور جو طبقہ اس فریضہ کو فریضہ سمجھتا ہے وُہ تھوڑی بہت زکوٰۃ دے کر ایک وافر حصہ حیلے بہانوں سے بچا لے جانے کا جواز پیدا کر لیتا ہے۔ اگر دیانت و احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہوے اس کی ادائیگی ہو تو کوی وجہ نہیں ہے کہ طبقاتی تفریق کو کم کر کے معاشی حالات پر قابو نہ پایا جا سکے اور پھر فقراء کی اعانت زکوٰۃ ہی پر کب منحصر ہے کہ مقدار کی کمی و بیشی کا سوال اٹھایا جائے۔ یہ مقدار تو زکوٰۃ واجبی کی ہے ورنہ زکوٰۃ مستحبی کے لئے نہ نصاب کی شرط ہے اور نہ مقدار کی حد بندی بلکہ جیسے حالات ہوں ان کے مطابق صدقات و خیرات سے عزیزوں ہمسایوں اور ناداروں کی خبر گیری کرنا انسانی فرائض میں داخل ہے۔

زکوٰۃ ایک فریضۂ شرعی ہے لہٰذا اس میں نیت تقرب اور ادائے فرض کا تقاضا کارفرما ہونا چاہیئے اور یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ کوی احسان ہے جو فقیر و نادار پر کیا جا رہا ہے بلکہ ایک اجتماعی حق ہے جس کا حقداروں تک پہنچانا ضروری ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے:۔

وفی اموالھم حق للسائل والمحروم۔ ”ان کے اموال میں مانگنے والے اور نہ مانگنے والے کا حق ہے“

پیغمبر اکرم کے زمانہ میں زکوٰۃ کا نظام اجتماعی تھا جو کارندوں کے ذریعہ جمع کی جاتی اور پھر مصارف معیّنہ پر اسے صرف کیا جاتا۔ امیر المومنین جو پیغمبر کے بعد ولی امر اور نگران حقوق تھے انھوں نے اپنے دَور میں اپنی زیر نگرانی زکوٰۃ کی وصولی و تقسیم کا محکمہ قائم کیا اور ان تمام امور کی پابندی کی جنہیں پیغمبر اکرم ملحوظ رکھتے تھے۔ چنانچہ زکوٰۃ کی جمع آوری پر ان لوگوں کا تقرر کرتے جن کی امانت و دیانت اور راست روی پر وثوق ہوتا انہیں تقوی و پرہیز گاری کی تلقین کرتے اور تاکید فرماتے کہ وُہ وصولی کے سلسلہ میں سختی و تشدد سے کام نہ لیں اگر کوی خود سے کہے یا پُوچھنے پر بتائے کہ اس کے ذمّہ زکوٰۃ ہے تو اس سے زکوٰۃ لی جائے اور اگر کوی یہ کہے کہ میرے ذمّہ زکوٰۃ نہیں ہے تو اس سے دُہرا کر نہ پُوچھا جائے کیونکہ یہ بے اعتمادی کا مظاہرہ ہوگا جو اُسے ناگوار گزرے گا۔ اور چراگاہوں میں چرنے والے اونٹوں اور بھیڑ بکریوں کے ریوڑ میں سے کسی خاص جانور کے لینے پر اصرار نہ کیا جائے بلکہ مالک کو یہ اختیار دینا چاہیئے کہ وُہ اپنا حصہ چھانٹ لے۔ البتہ جو جانور لنگ کرتا ہو یا کمر شکستہ ہو یا ناکارہ و بیمار ہو وُہ نہ لیا جائے۔ حضرت ان جانوروں کی دیکھ بھال کی بھی تاکید فرماتے تھے اور کارندوں کو یہ ہدایت کرتے تھے کہ

وُہ انہیں بے گیاہ راستوں کی طرف سے نہ لائیں بلکہ ایسے راستوں سے لائیں جہاں پانی اور سبزہ ہو اور انہیں پانی پینے اور چرنے اور ستانے کا موقع دیں اُونٹنی اور اس کے بچّے کو الگ الگ نہ رکھیں اور سارے کا سارا دُودھ نہ دوہ لیا کریں کہ بچّے کا حصّہ کم رہ جائے۔

حضرت کے یہ ہدایات اور طرزِ عمل بتاتا ہے کہ وُہ زکوٰۃ میں جبر و تشدّد کو روا نہ رکھتے تھے اور نہ اس کے لئے خون ریزی و لشکر کشی کا کوئی جواز سمجھتے تھے بلکہ لوگوں کے دلوں میں یہ جذبہ پیدا کرنا چاہتے تھے کہ وُہ عمال کی سخت گیری اور حکومت کے دباؤ سے متاثر ہونے کے بجائے محض رضائے الٰہی و خوشنودیٔ پروردگار کے لئے زکوٰۃ ادا کریں۔ اگر اس کی ادائیگی بھی جبر کے ماتحت ہو تو فریضۂ زکوٰۃ اور حکومت کے جبری ٹیکسوں میں فرق ہی کیا رہے گا۔

امیر المومنین مال زکوٰۃ کو انہی مصارف میں صرف کرتے تھے جو قرآن مجید میں بیان ہُوئے ہیں اور اسے محاصل حکومت کی دُوسری مدوں میں خلط ملط نہ ہونے دیتے تھے۔

نظامِ خراج

مسلمانوں کے مفتوحہ علاقوں میں سے کچھ علاقے وُہ تھے جن کے مالک حرب و ضرب سے مغلوب کئے گئے اور کچھ وُہ تھے جو لڑے بھڑے بغیر صلح سے مفتوح ہُوئے۔ وُہ علاقے جو قہر و غلبہ سے مفتوح ہُوئے ان علاقوں کی وُہ زمینیں جو شور افتادہ اور پہاڑوں اور دلدلوں کے نیچے واقع ہوں یا ذرائع آبپاشی کے فقدان سے ناقابل زراعت ہوں وُہ انفال میں داخل ہیں جو اللہ اور رسول سے مخصوص ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے:۔

یسئلونک عن الانفال قل الانفال للہ والرسول۔	تم سے انفال کے بارے میں پُوچھتے ہیں تم کہہ دو کہ انفال اللہ اور رسُول کے لئے ہیں۔"

پیغمبر کے بعد امام و ولی امر کو اختیار ہے کہ وُہ ان زمینوں اور زمینوں سے نکلنے والے معدنیات کو مصالح اہل اسلام یا مصالح عامہ میں جس طرح چاہے تصرّف میں لائے اور ولی امر یا اس کے نائبین کی اجازت خصوصی یا عمومی کے بغیر کسی کو ان میں حق تصرف نہیں ہے اور جو زمینیں فتح کے موقع پر زراعت کے قابل اور آباد ہوں وُہ ولی امر کی اجازت سے مسلمانوں میں بانٹ دی جائیں گی تاکہ وُہ ان میں کاشت کریں اور ملکی پیداوار بڑھائیں اور وُہ علاقے جو معاہدہ صلح کے نتیجہ میں مفتوح ہُوئے ہوں اگر وہاں کے باشندے اپنی مرضی و اختیار سے اسلام لے آئیں جیسے مدینہ، بحرین اور یمن کے بیشتر حصّے تو ان کا اپنی زمینوں پر قبضہ بدستور رہے گا اور وُہ زمینوں کی پیداوار سے زکوٰۃ ادا کریں گے اور اگر اپنے مذہب و مسلک پر باقی رہیں تو جن شرائط پر مصالحت ہوگی ان شرائط کی پابندی کی جائے گی اگر یہ معاہدہ ہو کہ

وُہ اپنی زمینوں اور جائیدادوں کے بدستور مالک رہیں گے تو انہیں ان کی زمینوں پر بحال رہنے دیا جائے گا البتہ انہیں ذمی قرار دے کر ان پر جزیہ عائد کیا جائے گا۔ اور اگر اس شرط پر صلح ہو کہ وُہ اپنی زمینوں سے دستبردار ہو کر مسلمانوں کو دے دیں تو وُہ زمینیں مسلمانوں میں تقسیم کر دی جائیں گی۔ جس علاقہ کے لوگوں پر جزیہ عائد کیا جاتا ہے اس علاقہ کی زمینیں اراضئ جزیہ کہلاتی ہیں اور جو زمینیں لڑ کر یا شرطِ صلح کی رو سے مسلمانوں میں بٹ جاتی ہیں وُہ اراضئ خراجیہ کہلاتی ہیں۔ انہیں اراضئ خراجیہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اُن میں کاشت کرنے والوں سے زکوٰۃ کے علاوہ کاشت کا معاوضہ بھی وصول کیا جاتا ہے اگر معاوضہ غلہ کی صورت میں ہو تو مقاسمہ کہلاتا ہے اور قیمت کی صورت میں ہو تو اُسے خراج کہا جاتا ہے خراج کی مقدار ولی امر کی صوابدید سے وابستہ ہے وہ حالات کے مطابق خراج کی تعیین کرے گا۔

امیرالمومنین نے اپنے دور میں خراج کی تحدید اور جمع آوری کا بندوبست کیا مگر حضرت کی نظر خراج سے زیادہ زمین کی آبادی پر تھی تاکہ رعایا مالی اعتبار سے فارغ البال ہو اور خراج کے بار کے نیچے دب کر نہ رہ جائے۔ چنانچہ مالک اشتر کو ہدایات دیتے ہُوئے تحریر فرمایا کہ "خراج کی جمع آوری سے زیادہ زمین کی آبادی کا خیال رکھنا کیونکہ خراج بھی تو زمین کی آبادی سے حاصل ہو سکتا ہے اور جو آباد کئے بغیر خراج چاہتا ہے وُہ ملک کی بربادی اور بندگانِ خدا کی تباہی کا سامان کرتا ہے اور اس کی حکومت تھوڑے دنوں سے زیادہ نہیں رہ سکتی"۔ حضرت خراج کی وصولی کے سلسلہ میں سختی برتنے کے خلاف تھے اور اپنے کارندوں کو تاکید کرتے تھے کہ وُہ خراج کی وصولی میں اپنا رویہ نرم رکھیں اور کسی پر جبر و تشدّد نہ کریں۔ چنانچہ آپ نے بنی ثقیف کے ایک شخص کو قادسیہ اور کوفہ کے بعض علاقوں میں وصولئ خراج کے لئے نامزد کیا تو اس سے فرمایا:۔

ایاك ان تضرب مسلما او یهودیا او نصرانیا فی درهم خراج او تبیع دابة عمل فی درهم فانما امرنا ان ناخذ منهم العفو۔ (بحار۔ ج ۹۔ ص ۵۳۸)	خبردار خراج کے درہموں کی خاطر کسی مسلمان، یہودی یا نصرانی کو اذیت نہ دینا نہ درہموں کے لئے کھیتی باڑی میں کام آنے والے چوپائے فروخت کرنا۔ ہمیں تو یہ حکم دیا گیا ہے کہ جو ان کے پاس ضرورت سے زائد ہو وُہ لیں"۔

حضرت نے خراج کی رقم بہت معمولی تجویز کی تھی جو کسی پر بار نہ تھی۔ بلاذری نے فتوح البلدان میں تحریر کیا ہے کہ مصعب ابن یزید نے بیان کیا کہ حضرت نے میرے والد کو فرات سے سیراب ہونے والے علاقہ میں خراج کی وصولی پر مامور فرمایا جس کی شرح یہ تھی:۔ گندم کی کاشت پر اگر فصل گھنی ہو تو فی جریب (بیگھہ) ۱½ درہم اور تین سیر غلہ اگر درمیانی ہو تو ایک درہم اور اگر ادنیٰ ہو تو ⅔ درہم اور جَو پر اس کا آدھا خراج تھا۔ باغات جن میں خرما اور دُوسرے پھل دار درخت ہوں فی جریب ۱۰ درہم

اور انگور کی بیلیں جب چوتھے سال میں داخل ہوں تو فی جریب ۸ درہم۔ اور کھیرا، سبزی، ترکاری، تل، رُوئی اور اکّے دکے پھل دار درختوں پر خراج نہ تھا۔

نظامِ جزیہ

اسلامی ریاست میں مسلمانوں کے دوش بدوش یہود نصاریٰ اور مجوس کو بھی تمام شہری حقوق حاصل ہوں گے بشرطیکہ وُہ رعایا بن کر رہنا پسند کریں اور مملکت کے وفادار رہیں نہ دُشمنانِ اسلام کے معاون و مددگار ہوں اور نہ اسلام کے خلاف جنگی عزائم رکھتے ہوں۔ اس صورت میں اُن سے حسنِ معاملت سے پیش آیا جائے گا اور حکومت ان کی جان و مال اور ناموس کے تحفظ کی ذمہ دار ہو گی۔ وُہ اپنے مذہب و عقیدہ پر باقی رہنے اور مذہبی مراسم کے بجالانے میں آزاد ہوں گے البتہ جدید عبادت گاہیں تعمیر کرنے ناقوس بجانے محرمات سے نکاح کرنے شراب پینے اور خنزیر کا گوشت کھانے کے مجاز نہ ہوں گے۔

اگر کسی نظریاتی ریاست میں کسی جماعت کے حقوق تسلیم کئے جاتے ہیں تو اس پر کچھ فرائض بھی عائد ہوں گے۔ چنانچہ ان معاشی و معاشرتی حقوق کے عوض ملکی قوانین کی پابندی کے علاوہ ایک جزوی ٹیکس بھی عائد ہوتا ہے جس کا نام جزیہ ہے۔ یہ لفظ جزاء سے ماخوذ ہے جس کے معنی بدلہ و عوض کے ہیں یا فارسی لفظ گزیدہ و گزیہ کی عربی شکل ہے۔ اس جزیہ سے رفاہی و دفاعی امور انجام دیئے جاتے ہیں جس سے مسلم و غیر مسلم یکساں فائدہ اٹھاتے ہیں اس اعتبار سے یہ غیر مسلموں پر ناروا بار نہ ہو گا جبکہ ان کا مفاد بھی اس سے وابستہ ہے اس کی مقدار بھی خراج کی طرح معین نہیں ہے بلکہ جیسے حالات ہوں گے ولی امر ان کے مطابق جزیہ کی رقم تجویز کرے گا۔ امیرالمومنین کے دورِ خلافت میں جزیہ کی شرح یہ تھی:- امراء سے ۴۸ درہم متوسط طبقہ سے ۲۴ درہم اور عوام سے ۱۲ درہم سالانہ۔ اور بچوں، بُوڑھوں، اندھوں، دیوانوں مفلسوں، اپاہجوں، عورتوں اور راہبوں کو جزیہ کی چھوٹ تھی۔

شہریت

انسانی زندگی اجتماعیت سے وابستہ ہے اور اجتماعی زندگی میں افراد زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دُوسرے سے مرتبط ہوتے ہیں۔ اس ربط و وابستگی کے نتیجہ میں کنبہ خاندان اور برادری کی وحدتیں وجود میں آتی ہیں اور یہی وحدتیں مل کر بستیاں بساتی اور شہر آباد کرتی ہیں۔ اس اجتماعی زندگی میں انسانی افتادِ طبع کی بنا پر حسد و رقابت، بغض و نفرت اور مسابقت و مزاحمت کے جذبات کا پیدا ہونا بھی ناگزیر ہے جس کا لازمی نتیجہ تصادم ٹکراؤ اور باہمی آویزش ہوتا ہے۔ اس لئے ضرورت تھی کہ ان جذبات کو متوازن سطح پر رکھنے کے لئے کچھ پابندیاں عائد کر دی جائیں تاکہ انسان جذبات کی طغیانیوں میں بہہ کر مردم آزاری

دغا و فریب اور جنگ و جدل پر نہ اُتر آئے اور ان پابندیوں کو توڑ کر اجتماعی زندگی کے شیرازہ کو درہم و برہم نہ کرے۔ انہی معاشرتی حدود و قیود کا نام شہریت ہے جو معاشرتی علوم کی ایک شاخ اور اپنی اہمیت و افادیت کی بنا پر تدریسی نصاب میں جگہ حاصل کر چکی ہے۔

اس شہریت اور اجتماعی زندگی کا اوّلین اصول یہ ہے کہ ایک دُوسرے کے جذبات کو سمجھا اور اُن کا احترام کیا جائے ایک دُوسرے کے حقوق کی نگہداشت اور تعاون و سازگاری کی فضا پیدا کی جائے تاکہ اس یکجہتی و ہم آہنگی سے اجتماعی مفادات حاصل کئے جا سکیں اور ایک معیاری معاشرہ تشکیل دیا جا سکے۔ اس شہریت کا تصوّر اس وقت تک عملی صورت اختیار نہیں کر سکتا جب تک معاشرہ کے افراد اپنے فرائض اور ذمّہ داریوں کا احساس نہ کریں اور ہر فرد ملنے جلنے اور رہنے سہنے کا ڈھنگ نہ سیکھے اس طرح کہ ہمسایہ ہمسایہ سے ہم پیشہ، ہم پیشہ سے مالک مزدور سے تاجر خریدار سے حاکم ماتحت سے کس طرح پیش آئے اور کن اخلاقی قدروں کو ملحوظ رکھے کہ وُہ معاشرہ میں ایک اہم اور مثالی فرد ثابت ہو سکے۔ ایک اچھے اور معیاری شہری کے لئے ضروری ہے کہ وُہ دُوسروں کی نفع رسانی کے لئے اپنی تمام قوتیں وقف کر دے قوم و ملت کی خدمت کو اپنا شعار اور حق و انصاف کو اپنا دستور بنائے۔ مظلوم و ستم زدہ کی مدد کرے اور کوئی امداد کے لئے پکارے تو اس سے پہلو بچا کر نہ نکل جائے۔ پیغمبر اکرم کا ارشاد ہے:۔

من سمع رجلا ینادی یاللمسلمین	کوئی شخص "اے مسلمانو" کہہ کر مدد کے لئے پکارے
فلم یجبه فلیس بمسلم۔	اور سُننے والا اس کی آواز پر لبیک نہ کہے تو وُہ مسلمان نہیں ہے"۔

اسی احساس شہریت کا نتیجہ ہے کہ جماعتی تنظیموں اور رفاہی و اصلاحی اداروں کا قیام عمل میں لایا جاتا ہے تاکہ عوام کو ان سے فائدہ پہنچے۔ اور شہریت کا مقصد بھی یہی ہے کہ انسان صرف اپنے ہی مفاد پر نظر نہ رکھے بلکہ جماعتی مصالح اور اجتماعی مفادات کو بھی اتنی ہی اہمیت دے جتنی اہمیت اپنے کاموں کو دیتا ہے۔ پیغمبر اسلام کا ارشاد ہے:۔

من لم یهتم بامور المسلمین	جو مسلمانوں کے معاملات کو اہمیت نہ دے وُہ
فلیس بمسلم۔	مسلمان نہیں ہے"۔

عبادت بجز خدمت خلق نیست   بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

مختلف ممالک نے جو شہریت کے اصول وضع کئے ہیں اگرچہ عمومی مفاد سب میں قدر مشترک ہے مگر ملکی روایات اور مقامی رسم و رواج کی بنا پر محدود اور قومیت و وطنیت کی زنجیروں میں جکڑے ہُوئے ہیں۔ مگر اسلام جو رنگ و نسل اور ملک و قوم کی سطح سے بلند تر اور عالمی فلاح و بہبود کا پیغامبر ہے اور تمام بنی نوع انسان کو مرکز وحدت سے وابستہ کرکے ایک رشتۂ اخوت میں منسلک کرنا چاہتا ہے اس نے عالمی

آفاقی اساس پر قومیت کی بنیاد رکھی ہے جس میں نہ رنگ کا امتیاز ہے اور نہ نسل کی تفریق۔ نہ محدود قومیت کا تصوّر ہے اور نہ جغرافیائی حد بندی بلکہ

ہر ملک ملکِ ماست کہ ملک خدائے ماست

اسلامی نقطۂ نظر سے شہریت کے جو اصول و قوانین بیان کئے گئے ہیں وُہ کسی خاص سرزمین یا کسی خاص مملکت تک محدود نہیں ہیں بلکہ زمان و مکان کے اعتبار سے عام و ہمہ گیر ہیں۔ چنانچہ امیر المومنین نے جو اسلام کی زبان اور اسلامی معارف کا سرچشمہ تھے اپنے کلمات حکمیہ میں شہریت کے بنیادی اصولوں پر روشنی ڈالی ہے یہ ہماری غفلت یا احساس کمتری کا نتیجہ ہے کہ جب اس "حکیم عرب" کی آواز گونجی تو گراں گوش بنے رہے اور جب اس کی صدائے بازگشت مغرب سے سُنی تو ہمہ تن گوش ہو گئے۔ یہ حقیقت ہے کہ مفکرین عالم نے اس سلسلہ میں جو اصول و قواعد ترتیب دیئے ہیں ان میں سے کوئی ضابطہ ایسا نہ ہوگا جس سے معاشرہ کی اصلاح وابستہ ہو اور حضرت نے اُسے بیان نہ کر دیا ہو۔ ان اصول و ضوابط کی چند دفعات مشتے نمونہ از خروارے درج کی جاتی ہیں۔

(۱) معاشرتی بہبود کا بنیادی عنصر عدل و انصاف ہے جس سے کمزور و طاقتور میں ایک متوازن حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ طاقتور احتساب کے ڈر سے کمزور پر ظلم ڈھانے میں جری و بیباک نہ ہوگا اور کمزور کو ڈھارس ہوگی کہ اگر قوی کا ہاتھ اس کی طرف بڑھا تو قانون عدل اس کی سپر بن جائے گا اس لئے جس معاشرہ میں عدل کارفرما ہوگا وہاں امن سایہ فگن رہے گا اور جہاں ظلم ہوگا وہاں غیظ و غضب کی چنگاریاں اندر ہی اندر سلگتی رہتی ہیں اور جب بھڑک اٹھتی ہیں تو زلزلہ فگن دھماکوں سے پورا قصر ظلم و استبداد ہل جاتا ہے۔ امیر المومنین کا ارشاد ہے "عدل کی روش پر چلو اور ظلم و بے راہروی سے کنارہ کش رہو کیونکہ بے راہروی کے نتیجہ میں گھر بار چھوڑنا پڑے گا اور ظلم تلوار اٹھانے کی دعوت دے گا۔

(۲) شہریت کا تقاضا ہے کہ ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کیا جائے اور جیسا برتاؤ اپنے لئے چاہتے ہو ویسا برتاؤ دُوسروں کے ساتھ کرو۔ حضرت کا ارشاد ہے "جو چیز اپنے لئے پسند کرتے ہو وہی دُوسروں کے لئے پسند کرو اور جس چیز کو اوروں کے لئے ناپسند کرتے ہو اس سے خود بھی پرہیز کرو۔

(۳) تفاخر اور تفوق پسندی سے اجتناب کیا جائے کیونکہ فخر و غرور سے دُوسروں کے دلوں میں بغض و تنفر کے جذبات اُبھر آتے ہیں جو باہمی روابط و تعلقات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ حضرت فرماتے ہیں اکبر الفخران لا تفخر "سب سے بڑا فخر یہ ہے کہ فخر نہ کرو"۔ اس لئے کہ فخر احساس کمتری کا نتیجہ ہوتا ہے اور بلند نفس انسان زبانی دعووں کے بجائے اپنے عمل سے بلند نفسی و عالی ظرفی کا ثبوت دیتا ہے۔

(۴) کمزور و پس ماندہ افراد سے ہمدردانہ برتاؤ کیا جائے۔ حضرت کا ارشاد ہے "اپنے کمزوروں سے ہمدردی کرو یہ ہمدردی تمہارے لئے اللہ کی رحمت کا باعث ہوگی"۔

(۵) اگر کسی کے بارے میں کوی بُری بات سُنو یا دیکھو تو اُس کا ڈھنڈورہ نہ پیٹو۔ حضرت فرماتے ہیں "جس نے کسی بُری بات کو سُنا اور اسے ظاہر کیا تو ایسا ہی ہے جیسے وُہ خود بُرائی کا مرتکب ہُوا ہو۔

(۶) کسی کی خوشحالی کے بعد معاشی بدحالی پر خوش نہ ہونا چاہئیے۔ حضرت کا ارشاد ہے "کسی کی تباہی حالی پر خوش نہ ہو کیا معلوم کہ کل زمانہ تمہارے ساتھ بھی یہی برتاؤ کرے"۔

(۷) جہاں تک ہو سکے لڑائی جھگڑا مول نہ لو۔ حضرت فرماتے ہیں:۔ "جو شخص اپنی عزت و ناموس کو محفوظ رکھنا چاہے اُسے لڑائی جھگڑے سے کنارہ کش رہنا چاہیئے"۔

(۸) ہر موقع پر بے اعتمادی کا اظہار نہ کرو کیونکہ باہمی اعتماد ہی پر معاشرتی زندگی کا انحصار ہے۔ حضرت کا ارشاد ہے:۔ "من لم یثق لم یوثق بہ۔ جو دُوسرے پر اعتماد نہیں کرتا اس پر بھی اعتماد نہیں کیا جاتا"۔

(۹) دوستی و تعلقات کی بنا پر کسی کے حق کو نظر انداز نہ کرو۔ حضرت کا ارشاد ہے:۔ "باہمی روابط کی بنا پر کسی بھائی کی حق تلفی نہ کرو۔ کیونکہ وُہ پھر بھائی کہاں ہے جس کا حق تم تلف کرو"۔

(۱۰) حاجتمند سے خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آؤ۔ حضرت کا ارشاد ہے "اگر کسی موقع پر لوگوں کو تمہاری احتیاج ہو تو ان سے عجز و انکسار اور خندہ جبینی سے پیش آؤ ہو سکتا ہے کہ کل تمہیں کوی حاجت لے کر اُن کے پاس جانا پڑے تو تمہیں اپنے طرزِ عمل پر معذرت کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

(۱۱) اسلام کے اہم فرائض میں سے ایک فریضہ نہی عن المنکر کا ہے۔ یعنی جہاں کوی برائی ہوتے ہُوئے دیکھو اس سے چشم پوشی نہ کرو بلکہ امکانی حد تک اس سے روکنے کی کوشش کرو۔ اگر اس پر عملدرآمد کیا جائے تو بہت سی کھلم کھلا اور علانیہ برائیوں کا سدِّباب ہو سکتا ہے کیونکہ خود یہ خیال برائی سے مانع ہوگا کہ کوی روکنے ٹوکنے والا ہے۔ اور اگر کوی روکنے ٹوکنے والا ہی نہ ہو تو برائیوں کو نشوونما پانے کا موقع ملے گا اور معاشرہ اخلاقی اعتبار سے پستی کی آخری حدوں تک پہنچ جائے گا۔ حضرت کا ارشاد ہے:۔ "جو شخص نہ زبان سے نہ ہاتھ سے اور نہ دل سے برائی کی روک تھام کرتا ہے وُہ زندوں میں چلتی پھرتی لاش ہے"۔

امیرالمومنین صرف زبانی پند و موعظت ہی پر اکتفا نہ کرتے تھے بلکہ عملاً ہر معاشرتی برائی کو کچلنے کے لئے آمادہ رہتے تھے کوی گری ہوی بات سُنتے یا کہیں لڑائی جھگڑا یا اللہ کی نافرمانی ہوتے دیکھتے تو فوراً اس کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوتے۔ اگر سرزنش کی ضرورت ہوتی تو سرزنش کرتے اور سزا کی ضرورت ہوتی تو سزا دیتے۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے آپ سے شکایت کی کہ فلاں شخص مجھے یہ کہہ کر تنگ کرتا ہے کہ میں تمہاری ماں سے محتلم ہوا ہوں۔ حضرت نے فرمایا کہ تقاضائے عدل تو یہ ہے کہ اُسے دُھوپ میں کھڑا کر کے اس کے سایہ پر تازیانے لگائے جائیں کیونکہ خواب سایہ کے مانند ہے مگر ہم اسے سزا دیں گے تاکہ وُہ

مسلمانوں کی تحقیر و تذلیل نہ کرے ۔ چنانچہ اُسے سزا دی گئی ۔ ایک دفعہ دو آدمیوں کو جھگڑتے ہُوئے دیکھا تو پُوچھا کہ تم کیوں ایک دوسرے سے اُلجھ رہے ہو؟ ان میں سے ایک نے کہا کہ یا امیر المومنین میں نے اس کے ہاتھ ایک پارچہ نو درہم میں بیچا ہے اور اس سے یہ شرط کی تھی کہ قیمت کھرے اور معیاری درہموں میں ادا کرے مگر اس نے خراب اور ٹوٹے پھوٹے درہم مجھے دینا چاہے ۔ میں نے ان سکّوں کے لینے سے انکار کیا تو اس نے مجھے طمانچہ دے مارا اور سر بازار میری ہتک و تذلیل کی ۔ حضرت نے اس واقعہ کی تصدیق کی جب تصدیق ہوگئی تو آپ نے دُوسرے شخص سے کہا کہ وُہ درہم تبدیل کر دے اس نے درہم بدل دیئے ۔ پھر پہلے شخص سے کہا کہ تم بھی اسے طمانچہ کے عوض طمانچہ مارو اس نے کہا کہ میں اسے معاف کرتا ہوں ۔ حضرت عفو و درگزر کو دوست رکھتے تھے اس درگزر پر خوش ہُوئے اور فرمایا کہ تمہیں اس کا اختیار ہے چاہے بدلہ لو چاہے چھوڑ دو ۔

اس فیصلہ پر معاملہ کو ختم ہونا چاہیئے تھا کیونکہ صاحب حق نے خود اپنا حق چھوڑ دیا تھا ۔ مگر اس حق کے علاوہ ایک حق اور بھی تھا اور وہ اجتماعی و معاشرتی حق تھا جس کا تقاضا یہ تھا کہ حکومت ایسے بداطوار لوگوں کو سزا دے تاکہ آئندہ انہیں مردم آزاری کی جرأت نہ ہو ۔ حضرت کی نظروں سے یہ حق اوجھل نہیں رہ سکتا تھا چنانچہ آپ نے اسے بدعہدی و ایذا رسانی کی پاداش میں پندرہ کوڑوں کی سزا دی ۔

معاشرتی خرابیوں میں سے یہ خرابی عام ہو چکی ہے کہ سر بازار چوسر شطرنج پانسہ وغیرہ کھیل کھیلے جاتے ہیں اور انہیں ایک طرح کا تفریحی مشغلہ سمجھا جاتا ہے حالانکہ یہ چیزیں میسر میں داخل ہیں جنہیں قرآن نے ناپاک اور عمل شیطان کہا ہے ۔ چنانچہ حضرت کا ارشاد ہے :۔ الشطرنج والنرد ھما المیسر " شطرنج پانسہ میسر ہی تو ہیں " ۔ جب نئی پود بڑوں کو یہ کھیل کھیلتے دیکھتی ہے تو وُہ بھی ان کی روش پر چل نکلتی ہے اور ضیاع وقت کے ساتھ قمار بازی کی راہ پر چل کر مالی و اخلاقی تباہی کا سامان کرتی ہے ۔ حضرت معاشرہ کی تطہیر کے لئے اس قسم کے کھیلوں کو بھی قابلِ سزا سمجھتے تھے ۔ چنانچہ ایک مرتبہ کچھ لوگوں کو شطرنج کھیلتے دیکھ لیا فرمایا یہ کیسے مہرے ہیں جن کے گرد حلقہ باندھے بیٹھے ہو ۔ پھر بساط اُلٹ دی اور انہیں دُھوپ میں کھڑا کر کے سزا دی ۔

یاقوت حموی نے معجم البلدان میں تحریر کیا ہے کہ حضرت نے ایک مرتبہ کوفہ کے باہر چند مکانوں پر مشتمل ایک آبادی دیکھی پوچھا کہ یہ کون سی جگہ ہے بتایا گیا کہ یہ کوفہ ہی کا ایک محلہ ہے جو زرارہ ابن یزید کے نام پر زرارہ کہلاتا ہے یہاں شراب کشید کی جاتی ہے اور فروخت ہوتی ہے ۔ حضرت فرات کو عبور کر کے اس بستی میں پہنچے اور حکم دیا کہ اسے جلا دیا جائے چنانچہ اُسے جلا دیا گیا ۔

معاشرتی زندگی کی اصلاح افراد کی اصلاح ہی پر منحصر ہوتی ہے انہی کے سنورنے سے معاشرہ سنورتا ہے اور انہی کے بگڑنے سے بگڑتا ہے ۔ افراد معاشرہ کے اجزاء ہوتے ہیں اور جس طرح اعضا سے ترکیب

پاکر جسم بنتا ہے یونہی افراد کے باہمی ارتباط سے معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ اگر اجزائے بدن میں سے ایک جزو کا بگاڑ پورے جسم کو خطرہ میں ڈال دے سکتا ہے تو چند افراد کے بگاڑ سے قومی و اجتماعی زندگی کے خط و خال بھی بگڑ سکتے ہیں۔ پیش کردہ واقعات سے ظاہر ہے کہ حضرت افراد کی ذہنی و عملی تبدیلی ہی کے ذریعہ معاشرہ میں تبدیلی لانا چاہتے تھے چنانچہ ان کی اخلاقی حالت کا جائزہ لیتے سختی سے محاسبہ کرتے اور معاشرتی اصولوں کا انہیں پابند بناتے۔ بیشک نرمی و درگزر ایک عمدہ صفت ہے۔ مگر جہاں نرمی معاشرتی تخریب کا باعث ہو وہاں نرمی برتنا تخریب کاری کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔

کاروباری طبقہ کی نگرانی

اسلامی نقطۂ نظر سے ہر شخص اپنے زیر تربیت افراد کی اخلاقی نگہداشت کا ذمہ دار ہوتا ہے وُہ باپ ہو یا بزرگِ خاندان، مربی ہو یا معلّم وُہ اپنے متعلقہ افراد کے بارے میں جواب دہ ہے۔ پیغمبر اکرم کا ارشاد ہے:۔

کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ۔	تم میں سے ہر شخص نگران ہے اور اپنی رعیّت کے بارے میں جواب دہ ہے۔"

جب ہر فرد اپنے کنبہ و خاندان اور زیر تربیت افراد کے بارے میں جواب دہ ہے تو جو اُمت کا نگران اور ملت کا سربراہ ہو وُہ کیونکر مسئولیت سے بالاتر ہو سکتا ہے یقیناً وُہ بھی ملت کی نگہبانی اور اس کی اخلاقی نگرانی کا ذمّہ دار ہوگا۔ اس ذمہ داری کا تقاضا یہ ہے کہ یہ کام کارندوں پر چھوڑ کر مطمئن اور آسودہ خاطر ہو کر نہ بیٹھ جائے بلکہ براہِ راست رعایا کے عادات و اطوار کا جائزہ لے اور اُن کے طرق کار کو دیکھے بھالے۔ یہ کام ایوانِ حکومت کے سرا پردوں میں رہ کر انجام نہیں دیا جا سکتا بلکہ اس کے لئے ضرورت ہے کہ عوام میں گھل مل کر رہا جائے اور ان پر کڑی نگرانی رکھی جائے۔

امیر المومنین کا طرزِ عمل یہ تھا کہ خود بنفس نفیس سیدھے سادے لباس میں کبھی چھُپ کر اور کبھی علانیہ گلی کوچوں اور بازاروں میں چکر لگاتے، تاجروں اور دستکاروں سے چیزوں کے بھاؤ پُوچھتے اور ایک معلّم اخلاقیات کی حیثیت سے مناسب ہدایات دیتے دیانتداری و خوش معاملگی کی تاکید کرتے بے اعتدالی بددیانتی اور ناپ تول میں کمی بیشی سے روکتے اور انہیں جھنجھوڑنے کے لئے یہ آیت تلاوت فرماتے:۔

تلک الدار الآخرۃ نجعلھا للذین لا یریدون علوا فی الارض ولا فسادا والعاقبۃ للمتقین۔	یہ آخرت کا گھر ہم نے ان لوگوں کے لئے قرار دیا ہے جو دُنیا میں نہ بلندی چاہتے ہیں نہ فساد پھیلاتے ہیں اور اچھا انجام پرہیز گاروں کے لئے ہے۔"

ایک دفعہ ایک قصاب کی دکان کی طرف سے گزرے تو ایک کنیز کو دیکھا جو دوکاندار سے کہہ رہی تھی کہ کچھ تو اور دو۔ حضرت نے سُنا تو فرمایا: "زدھا فانہ اعظم للبرکۃ۔ ہاں کچھ زیادہ دو یہ چیز بڑی باعث برکت ہے"۔

ایک مرتبہ بازار سے گزرتے ہوئے ایک درزی کی دُکان پر کھڑے ہو گئے اور اس سے فرمایا تاگا مضبوط استعمال کرو سلائی باریک رکھو اور ٹانکا دُوسرے ٹانکے سے ملا کر بھرو۔ اور سلائی کے بعد جو ٹکڑے بچ رہیں وُہ مالک کے حوالے کر دو۔ میں نے پیغمبر اکرم کو فرماتے سُنا ہے کہ قیامت کے دن کپڑے میں خیانت کرنے والے کو اس طرح لایا جائے گا کہ خیانت سے حاصل کئے ہوئے پارچے اس پر لدے ہوئے ہوں گے۔

ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں تحریر کیا ہے کہ ابو مطر بصری بیان کرتا ہے کہ مَیں مسجد کوفہ سے باہر نکل رہا تھا کہ پیچھے سے کسی نے آواز دی کہ چادر کا کنارا اُوپر اُٹھا کر چلو۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو ایک بادیہ نشین عرب ہاتھ میں درہ لئے ایک چادر باندھے اور ایک چادر اوڑھے ہوئے آرہا ہے۔ یہ سادگی اتنی پر عظمت تھی کہ میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ایک آدمی سے پُوچھا کہ یہ کون ہے اس نے کہا کہ تم نووارد معلوم ہوتے ہو کہا کہ ہاں میں بصرہ کا رہنے والا ہوں اور وہیں سے آرہا ہوں۔ کہا کہ اسی لئے تم نے پہچانا نہیں یہ امیر المومنین علی ابن ابی طالب ہیں یہ سُن کر میں لرز اُٹھا اور آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے کی طرف ہٹا اور آپ کے عقب میں چل دیا۔ میں نے دیکھا کہ آپ آگے بڑھ کر سودا سلف بیچنے والوں کے پاس کھڑے ہو گئے اور ان سے فرمایا: "بیعوا ولا تحلفوا فان الیمین تنفق السلعۃ وتمحق البرکۃ۔ بیچو مگر قسمیں کھا کر نہ بیچو کیونکہ قسم کھانے سے برکت اٹھ جاتی ہے اگرچہ مال بک جاتا ہے"۔ پھر خرما فروشوں کے بازار کا رُخ کیا وہاں پر ایک کنیز کو روتے دیکھ کر ٹھہر گئے اور اس سے رونے کی وجہ پُوچھی اس نے کہا کہ میں نے اس دکاندار سے ایک درہم کی کھجوریں خریدی تھیں میرے مالک نے ناپسند کیں اور کہا کہ انہیں واپس کر آؤ مگر یہ واپس نہیں لیتا۔ حضرت نے اس دکاندار سے کہا کہ یہ کنیز ہے اور مجبور۔ تم یہ کھجوریں واپس لے لو۔ اس نے انکار کیا تو میں نے کہا کہ اے شخص پہچانتے ہو کہ تمہیں کون کہہ رہا ہے یہ امیر المومنین ہیں۔ یہ سُننا تھا کہ اس نے فوراً کھجوریں لے لیں اور درہم کنیز کو واپس کر دیا۔ پھر حضرت نے دُکانداروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا: "اطعموا المساکین یربو کسبکم۔ مسکینوں کو کھانے کے لیے دو تمہارے کاروبار میں اضافہ ہو گا"۔ اس کے بعد مچھلی بیچنے والوں کے بازار میں آئے اور فرمایا خبردار حلال و حرام کا امتیاز کئے بغیر ایسی مچھلی فروخت نہ کرنا جو پانی کے اندر مر گئی ہو۔ پھر آگے بڑھے اور پارچہ فروشوں کے بازار میں آئے اور ایک دکاندار سے کہا کہ تین درہم تک کا کوئی کرتہ دکھاؤ اس نے حضرت کو پہچان کر آپ کا خیر مقدم کیا مگر آپ نے اُس سے کُرتہ نہ خریدا اور ایک دُوسری دُکان سے تین درہم میں کرتہ خرید فرمایا

جب حضرت واپس رحبہ میں تشریف لائے تو ایک شخص آیا اور اس نے ایک درہم پیش کیا پوچھا کہ یہ درہم کیسا ہے؟ کہا کہ یا امیرالمومنین مجھے دُکانداروں سے معلوم ہُوا کہ آپ میری دُکان پر تشریف لے گئے تھے اور میرے لڑکے سے کرتہ خرید کیا ہے۔ وُہ آپ کو پہچان نہ سکا اور دُو درہم کا کُرتہ تین درہم میں آپ کے ہاتھ بیچ دیا۔ یہ وہی درہم ہے جو آپ نے زائد دیا تھا۔ حضرت نے وُہ درہم واپس لینے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ اس نے اپنی مرضی سے بیچا ہے اور میں نے اپنی مرضی سے خریدا ہے اب یہ درہم واپس نہیں لیا جا سکتا۔

امیرالمومنین کے بازار میں آنے کا مقصد ہو سکتا ہے کہ کُرتے کی خریداری ہو مگر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض نظر انداز نہیں ہونے پاتا۔ اور یہ آپ کا دینی و منصبی فریضہ تھا کہ جہاں نیکی کی کوئی صورت دیکھیں اس کی ترغیب دیں اور جہاں بُرائی دیکھیں خواہ وُہ بظاہر کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو اس سے روکیں۔ چنانچہ ایک شخص کو دامن لٹکا کر چلتے دیکھا تو اسے دامن اٹھا کر چلنے کی ہدایت کی اس لئے کہ یہ انداز پوشش کبر و غرور کی علامت ہے۔ ایک کنیز کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر یہ گوارا نہیں کرتے کہ نظر بچا کر آگے نکل جائیں بلکہ جب تک اس کے آنسو پُنچھ نہیں جاتے آگے نہیں بڑھتے۔ اور دُکاندار پر حکومت کا رعب بٹھانے کے بجائے اس پر اخلاقی دباؤ ڈالتے ہیں کہ یہ کنیز مجبور و بے بس ہے تم اس کی مجبوری کو دیکھتے ہُوئے بیچا ہوا مال واپس لے لو۔ پھر تاجروں کو اعانت فقرا پر ابھارتے ہیں کہ وُہ راہِ خدا میں خرچ کریں تاکہ اُن کی تجارت پُھولے پھلے اور انہیں ہدایت کرتے ہیں کہ وُہ حرام چیزیں فروخت کے لئے بازار میں نہ لائیں اس لئے کہ حرام چیزوں کی خرید و فروخت بھی حرام ہے۔ جھوٹی سچّی قسمیں کھا کر سودا نہ بیچیں اس لئے کہ قسم سچّی بھی ہو تو یہ ایک طرح سے اپنی ذات پر بے اعتمادی کا اظہار ہے کیونکہ قسم کھانے والے کو یہ احساس ہوتا ہے کہ قسم کے بغیر اس کی بات سچّی نہیں سمجھی جا سکتی اور پھر بار بار قسم کھانے سے دُوسروں کی نظروں میں بھی ناقابلِ اعتماد ہو جاتا ہے۔ ایک پہچان لینے والے سے کرتہ خرید نا پسند نہیں کرتے اس خیال سے کہ اگر وہ قیمت نہ لے یا عام نرخ سے کم لے تو اُسے نقصان پہنچے گا اور آپ کسی کے ادنیٰ نقصان کے بھی روادار نہ ہوتے تھے۔ اور اس میں یہ درس بھی مضمر ہو سکتا ہے کہ عمالِ حکومت آپ کے طرزِ عمل کو دیکھ کر اپنے عہدہ و منصب سے غلط استفادہ نہ کریں اور پھر یہ تعلیم دی کہ بائع و مشتری میں معاملہ طے پا جائے تو کچھ زیادہ بھی دینا پڑ جائے تو اسے نظر انداز کیا جائے تاکہ عزّتِ نفس برقرار رہے بشرطیکہ غش و فریب سے کام نہ لیا گیا ہو۔

یتیموں بیواؤں اور ناداروں پر شفقت

اسلام عقائد و اعمال کے مجموعہ کا نام ہے اور اعمال صرف نماز، روزہ، حج وغیرہ ہی کا نام نہیں ہے

بلکہ یتیموں، بیواؤں اور مسکینوں کے ساتھ حُسنِ سلوک بھی اعمال صالحہ کا ایک اہم جزو ہے۔ اگر کوئی شخص مسکینوں اور ناداروں کو فقر و فاقہ میں چھوڑ کر تن پروری میں لگا رہتا ہے تو وُہ دین کے تقاضوں کو پُورا نہیں کرتا۔ چنانچہ پیغمبر اکرم سے دین کے بارے میں پُوچھا گیا تو آپ نے فرمایا:۔

الدین التعظیم لامر الله و الشفقة علےٰ خلق الله۔	دین نام ہے اوامر الٰہیہ کی تعظیم اور خلق خدا پر شفقت و مہربانی کا"۔

یوں تو ہر مسلمان کا اسلامی و انسانی فرض ہے کہ وُہ حسب استطاعت خلق خدا اور معاشرہ کے بے بال و پر اور شکستہ حال افراد کی خبرگیری کرے مگر رئیس مملکت پر اس کی ذمہ داری سب سے زیادہ عائد ہوتی ہے کہ وُہ ایسے افراد کی دیکھ بھال میں کوتاہی نہ کرے ان کی ضروریات پر نظر رکھے بے سہارا لوگوں کی طرف دست تعاون بڑھائے یتیموں کی کفالت کرے اور اُن سے شفقت و محبت کا ویسا ہی برتاؤ کرے جیسا برتاؤ ایک شفیق باپ اپنی اولاد سے کرتا ہے۔

امیر المومنین کا دل محبت و شفقت کے جذبات سے معمور تھا۔ جب کسی مفلوک الحال کو دیکھتے تو تڑپ اُٹھتے کسی بے نوا کی صدا سُنتے تو بے چین ہو جاتے اور یتیموں سے اس طرح پیش آتے کہ انہیں یتیمی کا احساس نہ ہونے دیتے۔ ایک مرتبہ حلوان اور ہمدان سے انجیریں اور شہد کے مشکیزے آئے حضرت نے اپنے عملہ کے چند آدمیوں کو حکم دیا کہ وُہ یتیم بچّوں کو جمع کر کے لائیں۔ جب بچے جمع ہو گئے تو آپ نے مشکیزوں کے مُنہ کھول کر ان بچّوں کے ہاتھوں میں دے دیئے اور پیالوں میں شہد بھر بھر تقسیم کرنا شروع کیا بچّے شہد بھی انڈیلتے جاتے تھے اور مشکیزوں کے دہانوں پر لگا ہوا شہد بھی چاٹتے جاتے تھے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ ان بچوں کو کیا ہو گیا ہے کہ اس طرح شہد چاٹ رہے ہیں اور امیر المومنین انہیں منع بھی نہیں کرتے۔ حضرت نے فرمایا:۔

ان الامام ابو الیتامیٰ و انما العقتھم ھذا برعایة الآباء	امام یتیموں کا باپ ہوتا ہے اور میں نے اسی پدری تقاضے کی بنا پر انہیں شہد چاٹنے دیا ہے"۔

ایک دفعہ امیر المومنین ایک گلی میں سے ہو کر گزرے تو دیکھا کہ ایک عورت مشکیزہ کاندھے پر اُٹھائے جا رہی ہے حضرت نے ازراہِ ہمدردی مشکیزہ اُس سے لے کر خود اُٹھا لیا اور اس سے پُوچھا کہ تمہارے گھر میں کوئی مرد نہیں ہے جو باہر کے کام انجام دے کہا کہ امیر المومنین نے میرے شوہر کو ایک مہم پر بھیجا تھا وُہ وہاں پر شہید ہو گیا اور میرے بچّے یتیم رہ گئے۔ میں خود ہی پانی بھرتی اور مزدُوری کر کے اپنا اور اپنے بچّوں کا پیٹ پالتی ہوں۔ حضرت مشکیزہ اس کے گھر پہنچا کر واپس آئے اور تمام رات قلق و اضطراب میں گزاری۔ جب صبح ہوئی تو خورد و نوش کا سامان لے کر اس کے ہاں پہنچے اور دروازہ کھٹکھٹایا اس نے پُوچھا کہ کون ہے؟ فرمایا کہ کل جو تمہارا مشکیزہ اٹھا کر لایا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا حضرت اندر

داخل ہوئے اور کھانے پینے کا سامان اُسے دیا اور فرمایا کہ تم آٹا گوندھو گی یا بچّوں کو بہلاؤ گی کہا کہ میں آٹا گوندھتی ہوں اور آپ بچوں کو بہلائیں۔ جب وُہ آٹا گوندھ چکی تو کہا کہ اے مرد با خدا اب آپ تنور روشن کریں۔ حضرت نے تنور میں لکڑیاں ڈالیں اور انہیں آگ لگائی جب شعلے بلند ہوئے تو حضرت نے تپش محسوس کی اور فرمایا:۔

ذق یا علی ھذا اجزاء من ضیع الارامل والیتمیٰ ۔! — اے علی یتیموں اور رانڈوں کی طرف سے بے خبر رہنے کا مزہ چکھو"

اس اثناء میں محلہ کی ایک عورت آئی اس نے امیر المومنین کو تنور روشن کرتے دیکھا تو اس عورت سے کہا کہ تمہیں شرم نہیں آتی کہ تم امیر المومنین سے خدمت لے رہی ہو۔ جب اس نے یہ سُنا تو اُس پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ معذرت کرتے ہوئے حضرت سے کہا کہ یا امیر المومنین میں شرمسار ہوں کہ آپ سے خدمت لیتی رہی ہوں اور آپ کو پہچان نہ سکی۔ حضرت نے فرمایا کہ میں خود نادم ہوں کہ تمہارے بارے میں کوتاہی برتی اور تمہیں اتنے دن تکلیف اٹھانا پڑی۔

ایں طریق عذر خواہی یاد گیر — توبہ ہائے بیگناہی یاد گیر!

ایک دفعہ نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے باہر نکلے تو دیکھا کہ ایک عورت دروازے پر کھڑی رو رہی ہے۔ حضرت نے اس سے رونے کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ میرا شوہر مجھ پر ظلم و زیادتی کرتا ہے اور زدوکوب سے باز نہیں آتا اور آج تو اس نے قسم کھائی ہے کہ مجھے جان سے مار ڈالے گا۔ فرمایا کہ ذرا دھوپ کی تپش کم ہونے دو تو میں تمہارے شوہر کو بلا کر سمجھاؤں گا۔ کہا کہ اس وقفہ میں خدا جانے وُہ کیا کر بیٹھے۔ حضرت نے فرمایا کہ اچھا میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ جب اس کے مکان پر پہنچے تو اُسے آواز دی وُہ باہر نکلا تو حضرت نے اس سے کہا کہ اے بندۂ خدا اللہ سے ڈر اور اپنے اہل خانہ پر ظلم نہ کر۔ وُہ شخص حضرت کو پہچان نہ سکا کہا کہ آپ ہمارے گھریلو معاملات میں دخل دینے والے کون ہوتے ہیں اگر نہیں بھی ستاتا تھا تو اب ستاؤں گا۔ اتنے میں چند ہمسائے بھی جمع ہو گئے انہوں نے امیر المومنین کو دیکھا تو اس شخص سے کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ یہ گستاخانہ گفتگو کس سے کر رہے ہو۔ یہ امیر المومنین ہیں۔ یہ سُننا تھا کہ اس کے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا اور لرزتے کانپتے ہوئے عذر خواہ ہوا اور اقرار کیا کہ آئندہ کبھی سختی نہیں کرے گا خواہ اس کی بیوی کی طرف سے کتنی ہی زیادتی کیوں نہ ہو۔ حضرت نے اس عورت کو گھر کے اندر بھجوایا اور اسے نصیحت کی کہ وُہ شوہر کی نافرمانی نہ کرے۔

اس خدمت خلق کے ساتھ ضرورتمندوں کو مالی امداد دیتے اپنی ضروریات کو نظر انداز کر کے دوسروں کی حاجت روائی کرتے اور کسی سائل کو اپنے ہاں سے خالی نہ پھراتے۔ مسعودی نے مروج الذہب میں لکھا ہے کہ ایک سائل نے حضرت سے سوال کیا آپ نے امام حسن سے فرمایا کہ گھر سے ایک درہم لا کر

اسے دے دو۔ امام حسن نے کہا کہ گھر میں چھ درہم ہیں جو آٹا خریدنے کے لئے ہیں فرمایا کہ مومن کو اپنے ہاں کی چیز سے اللہ کے ہاں کی چیز پر زیادہ اعتماد ہونا چاہیئے جاؤ اسے چھ کے چھ درہم لا کر دے دو۔ امام حسن نے وُہ درہم سائل کو لا کر دے دیئے۔ ابھی حضرت اپنی جگہ سے اُٹھے نہ تھے کہ ایک شخص اُونٹ ہنکاتا ہوا آیا حضرت نے پُوچھا کہ یہ اُونٹ فروخت کے لئے ہے اس نے کہا ہاں حضرت نے وُہ اونٹ ایک سو چالیس درہم میں خرید لیا اور ایک ہفتہ کے بعد قیمت ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ اتنے میں ایک شخص آیا اور اس نے دو سو درہم میں وُہ اونٹ خرید لیا۔ حضرت نے ایک سو چالیس درہم قرضخواہ کو دیئے اور بقیہ ساٹھ درہم لے کر گھر میں تشریف لائے۔ جناب سیدہ نے درہم دیکھے تو پُوچھا کہ یہ کہاں سے آئے ہیں؟ فرمایا کہ اللہ نے چھ درہموں کے بدلے میں ساٹھ درہم دلوائے ہیں اور اُس کا وعدہ سچا ہے کہ:۔

من جاء بالحسنة فله عشر امثالها۔ جو ایک نیکی کرے اُسے ویسی دس نیکیاں بدلے میں ملیں گی"۔

غلاموں سے برتاؤ

زمانۂ سابق میں دُنیا کے ہر گوشہ میں غلاموں کا وجود پایا جاتا تھا اور عرب میں بھی غلامی کا عام رواج تھا۔ اس غلامی کی ابتداء یوں ہوئی کہ طاقتور قبائل اپنی بالادستی منوانے کے لئے کمزوروں اور ناتوانوں پر حملہ آور ہوتے انہیں قتل و غارت کرتے اور بقیۃ السیف کے لئے آزادی کی راہیں بند کر کے انہیں غلام بنا لیتے اور پھر ان کی اولاد موروثی غلام قرار دے لی جاتی۔ رفتہ رفتہ انسانی معاشرہ میں غلاموں کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا اور کھیتی باڑی اور دُوسرے محنت طلب کاموں کے لئے ان کا وجود ضروری سمجھا جانے لگا یہاں تک کہ ارسطو و فلاطون ایسے بلند نظر مفکرین نے معاشرتی ارتقاء کے لئے ان کا وجود ضروری سمجھا اور آقاؤں کی بالادستی کو برقرار رکھنے پر زور دیا۔ ابتدائے دور غلامی سے انیسویں صدی کے وسط تک غلاموں کا یہ طبقہ اپنے مالکوں کے ظلم و تشدّد کا نشانہ بنا رہا ان سے سخت سے سخت کام لئے جاتے وزنی پتھر ڈھوتے جنگلوں سے درخت کاٹ کر لاتے کولھو اور ہل میں بیلوں کی جگہ جوتے جاتے اور اس محنت شاقہ کے باوجود نہ انہیں شکم سیر ہو کر کھانے کو دیا جاتا اور نہ پُورا تن ڈھانکنے کے لئے لباس میسّر ہوتا ذرا سی غلطی یا فروگزاشت پر کوڑوں سے پٹتے شکنجے میں کھینچے جاتے اگر مالک کے ہاتھ سے قتل ہو جاتے تو اس کی داد نہ فریاد اور نہ مالک سے کوئی باز پرس بلکہ رومن دستور میں اگر غلام کو قتل کرتے ہوئے مالک کا ہاتھ کانپ جاتا تو اُسے اخلاقی کمزوری اور انتہائی بزدلی سمجھا جاتا۔

اسلام اس غلامی کو مٹا کر انسانی حریت کو بحال کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس کی حکمت و مصلحت بینی کا تقاضا یہ تھا کہ غلامی کو یکلخت ختم کرنے کے بجائے رفتہ رفتہ ختم کیا جائے اور اس کے انسداد کے لئے ایسی تدابیر عمل میں لائی جائیں کہ اسلامی معاشرہ بالتدریج اس سے پاک و صاف ہو جائے۔ چنانچہ اسلام نے پہلے تو غلامی کو صرف ان کفار حربی میں محدود کر دیا جو جنگ و قتال کے نتیجہ میں اسیر کر لئے جاتے تھے۔ یہ ایک ناگزیر ضرورت تھی کیونکہ جو لوگ بغاوت و سرکشی سے امن عامہ کو خطرہ میں ڈال چکے ہوں اُن سے آئندہ بھی مطمئن نہ رہا جا سکتا تھا کہ وُہ اپنی بکھری ہُوئی طاقت کو مجتمع کر کے پھر سے حملہ آور ہوں اور امن عامہ کو تباہ کریں۔ دُنیا کی کوئی بھی حکومت ایسے باغیوں کو کھلی چھٹی نہیں دیا کرتی جو نظم و نسق مملکت کے تباہ کرنے کے درپے ہوں بلکہ ان کے لئے قتل یا حبس دوام کی سزا تجویز کی جاتی ہے۔ اسلام نے قتل یا حبس دوام کے بجائے سلب آزادی کی سزا تجویز کی جو حبس دوام کی ایک نرم صورت ہے۔ اس سلب آزادی میں یہ مصلحت بھی کارفرما تھی کہ دُشمنان اسلام کو نسلاً بعد نسل غلامی میں جکڑے جانے کا ڈر مسلمانوں کے خلاف محاذ جنگ قائم کرنے سے مانع ہو اور پھر پیغمبر اکرم نے غلاموں کو آزاد کرنے کی ترغیب دی اور بردہ فروشی کی حوصلہ شکنی کرتے ہُوئے فرمایا کہ شر الناس من باع الناس۔ "بدترین انسان وہ ہے جو بردہ فروشی کرے"۔ کفارہ میں غلاموں کی آزادی کو جگہ دی۔ مصارف زکوٰۃ میں سے ایک مصرف غلاموں کی آزادی کو قرار دیا۔ اگر کوئی غلام اندھا یا از کار رفتہ یا کوڑھ میں مبتلا ہو جاتا تو آزاد ہو جاتا۔ اگر کنیز صاحب اولاد ہو جاتی تو مالک کے مرنے کے بعد ہمیشہ کے لئے آزاد ہو جاتی اور جو غلامی پر باقی رہتے ان سے نہ صرف حسن سلوک بلکہ مساویانہ سلوک کی تاکید فرمائی۔ چنانچہ آنحضرت کا ارشاد ہے:۔

البسوھم مما تلبسون و	جو خود پہنتے ہو وُہ انہیں پہناؤ اور جو خود کھاتے
اطعموھم مما تاکلون۔ (مناقب)	ہو وُہ انہیں کھانے کو دو"۔

امیر المومنین غلاموں سے گہری ہمدردی رکھتے تھے آپ نے اپنی محنت کی کمائی ان کی آزادی اور فلاح و بہبود کے لئے مخصوص کر دی اور انہیں آزادی سے بہرہ یاب کر کے اس کا موقع دیا کہ وُہ ترقی کے منازل طے کر کے معاشرہ میں بلند مقام حاصل کریں اس لئے کہ ترقی کسی خاص نسل اور رنگ سے مخصوص نہیں ہے بلکہ ایک آزاد کو جتنا آگے بڑھنے کا حق ہے اتنا ایک غلام کو بھی حق حاصل ہے۔ امام جعفر صادق کا ارشاد ہے:۔

ان امیر المومنین اعتق الف	امیر المومنین نے اپنے ہاتھ کی کمائی سے ایک ہزار
مملوک من کد یدہ۔ (وسائل الشیعہ)	غلام خرید کر آزاد کئے"۔

حضرت صرف غلاموں کی آزادی ہی پر اکتفاء نہ کرتے تھے بلکہ ایسے غلاموں کی کفالت بھی اپنے ذمہ لے لیتے تھے جو کمسنی، بڑھاپے یا بیماری کی وجہ سے کاروکسب نہ کر سکتے تھے اور ہمیشہ اُن پر

نظر توجہ رکھتے تھے۔ آپ کی شفقت و مرحمت کا یہ عالم تھا کہ انہیں یہ گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ کسی کوتاہی یا سرتابی کی پاداش میں انہیں سزا دی جاسکتی ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک غلام کو کسی کام کے لئے آواز دی چند بار پکارنے پر جب وُہ نہ آیا تو آپ نے باہر جھانکا دیکھا کہ وُہ غلام دروازے پر کھڑا ہے فرمایا کہ میں نے تمہیں کتنی بار پکارا ہے کیا تم نے میری آواز نہیں سُنی کہا کہ میں اس لئے خاموش رہا کہ مجھے آپ کی طرف سے یہ خطرہ نہ تھا کہ میرے جواب نہ دینے پر آپ مجھے سزا دیں گے۔ حضرت نے یہ سُنا تو فرمایا:-

الحمد لله الذی جعلنی من تامنه خلقه انهض فانت حر لوجه الله۔	خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے ایسا قرار دیا جس کے گزند سے خلق خدا اپنے کو محفوظ سمجھتی ہے۔ اُٹھو تم راہِ خدا میں آزاد ہو"۔

حضرت کے ایک غلام قنبر مصری تھے جنہیں آپ انتہائی عزیز رکھتے تھے ایک مرتبہ انہیں لے کر بازار گئے اور فرمایا کہ مجھے ایک پیراہن خریدنا ہے اور تمہیں بھی پیراہن کی ضرورت ہے چنانچہ ایک پارچہ فروش کی دکان سے ایک سستا اور ایک اُس سے زیادہ قیمت کا کپڑا خرید لیا اور قنبر سے کہا کہ سستا کپڑا میرے لئے رہنے دو اور قیمتی کپڑا تم لے لو۔ قنبر نے کہا کہ آپ میرے آقا ہیں بہتر ہے کہ اچھا کپڑا آپ پہنیں۔ حضرت نے فرمایا:-

انت شاب ولك شره الشباب وانا استحی من ربی ان تفضل علیك۔ (مناقب)	تم جوان ہو اور تم میں جوانی کا ولولہ ہے مجھے اپنے پروردگار سے شرم آتی ہے کہ میں (پوشش میں) اپنا معیار تم سے بلند رکھوں"۔

شائد یہ بات نرالی اور انوکھی نہ سمجھی جائے کہ حضرت نے اپنے دورِ خلافت میں اپنے ایک غلام کے لئے عمدہ لباس پسند کیا کیونکہ دنیا میں فرمانرواؤں کا یہ دستور رہا ہے کہ وُہ شان وشکوہ کے مظاہر دل کے لئے اپنے غلاموں کو آراستہ و پیراستہ رکھتے تھے۔ چنانچہ شاہی درباروں میں ان کی سج دھج دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی ان کے جسموں پر زرق برق پوشاکیں سروں پر رنگین صافے کمر میں زرّین پٹکے جن میں موتی ٹنکے ہوُے گلے میں سنہری کنٹھے اور ہاتھ میں طلائی یا نقرئی عصا ہوتے تھے۔ ان فاخرہ ملبوسات سے ظاہری نمود و نمائش کا سامان تو ہو جاتا ہے مگر احساس غلامی ختم نہیں ہوتا بلکہ اس خاص طرز کی وضع قطع کو غلامی کا نشان سمجھ کر غلامی کا احساس اور اُبھر آتا ہے اور ہر غلام اس سج دھج کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہو گا اور اس کی تمنا یہ ہو گی کہ اسے تن ڈھانکنے کے لئے چیتھڑے ملتے مگر اس کے پیروں میں غلامی کی بوجھل زنجیریں نہ ہوتیں۔ امیرالمومنین جو انسانی نفسیات و احساسات پر نظر غائر رکھتے تھے اس خیال سے کہ قنبر کو یہ احساس نہ ہو کہ انہیں عمدہ لباس غلام نوازی کی بنا پر دیا

جا رہا ہے یہ کہہ کر ان میں غلامی کا احساس ابھرنے نہیں دیا کہ تم نوجوان ہو اور عمدہ لباس بوڑھوں کے بجائے نوجوانوں کو زیب دیتا ہے اور اس طرح ان کا ذہنی رُخ موڑ کر یہ تاثر دیا کہ سن و سال کے لحاظ سے تو انسان کے طبعی تقاضوں میں فرق ہو سکتا ہے مگر انسان ہونے کے اعتبار سے سب کے احساسات یکساں ہوتے ہیں۔ یہ وُہ طرزِ عمل تھا جس نے غلاموں کے قافلے کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا اور ان کے ذہنی شعور کو بیدار کر کے مخفی صلاحیتوں کو روبہ عمل لانے کی تحریک پیدا کی۔ چنانچہ اسی ذہنی نمو و نمود کے نتیجہ میں غلاموں میں کا ایک طبقہ غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر اپنی سعی و کاوش سے تختِ شاہی کی بلندیوں تک پہنچا اور سلطنتوں کا بانی قرار پایا۔

قیدیوں سے برتاؤ

قید و بند کی سزا کا دستور زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے اور حکومتیں جنہیں مجرم قرار دے لیتی تھیں انہیں قید خانوں میں ڈال دیتی تھیں۔ چنانچہ حضرت یوسف کے زندان میں بند کئے جانے کا تذکرہ قرآن مجید میں ہے:۔ فلبث فی السجن بضع سنین "یوسف کئی برس تک قید خانہ میں رہے" پیغمبر اکرم کے زمانہ میں باغیوں اور جنگی اسیروں کو زیرِ حراست رکھا جاتا تھا آنحضرت کے بعد خلفاء کے دور میں بھی لوگوں کو قید و بند کی سزا دی جاتی تھی مگر کسی عمارت میں بند رکھنے کے بجائے انہیں کنوؤں میں جھونک دیا جاتا تھا۔ امیر المومنین مجرموں کو کنوؤں میں رکھنے کے بجائے قید خانہ میں رکھتے تھے اور اسلام میں سب سے پہلے آپ ہی نے قید خانہ تعمیر کرایا۔ شیخ علاؤالدین نے تحریر کیا ہے:۔

اول من بنی السجن فی الاسلام علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ وکان الخلفاء یحبسون فی الآبار۔ (محاضرۃ الاوائل۔ ص۱۱۴)

"اسلام میں سب سے پہلے علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے قید خانہ کی بنیاد رکھی اور خلفاء (قیدیوں کو) کنوؤں میں بند کیا کرتے تھے۔"

حضرت نے پہلے سینٹھوں سے ایک احاطہ کی صورت میں محبس تیار کروایا اور پھر اسے پختہ عمارت کی صورت میں بدل دیا۔ علامہ زمخشری نے تحریر کیا ہے:۔

بنی سجنا من قصب فسماہ نافعاً فنقبہ اللصوص ثم بنی سجنا من مدر فسماہ مخیسا۔ (فائق ج۱۔ ص۱۸۸)۔

"حضرت نے سینٹھوں سے قید خانہ تعمیر کیا اور اس کا نام نافع رکھا اور جب چوروں نے اس میں نقب لگائی تو کنکروں پتھروں سے تعمیر کرایا اور اس کا نام مخیس رکھا۔"

اموی و عباسی دور میں جنہیں قید کی سزا دی جاتی تھی انہیں تہ خانوں میں بند رکھا جاتا تھا نہ کسی کو

ان سے ملنے جلنے کی اجازت ہوتی تھی اور نہ انہیں باہر کی دُنیا سے باخبر رکھا جاتا تھا ان پر اتنا تشدد کیا جاتا تھا کہ ان سختیوں کو جھیل کر کسی کے زندہ بچ کر نکلنے کی توقع نہ کی جاتی تھی۔

امیر المومنین کسی کو انتقامی جذبہ کی بنا پر قید کی سزا نہ دیتے تھے بلکہ ایسے لوگوں کو قید میں ڈالتے تھے جو خیانت و غصب کے مرتکب ہوتے اور یتیموں کے اموال کو خورد برد کرتے تھے۔ انہیں قید میں رکھنے کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ کچھ عرصہ کے لئے ان کی آزادی کو سلب کر کے ان کی مجرمانہ ذہنیت کی اصلاح کی جائے تاکہ معاشرہ میں اپنا کھویا ہوا مقام پھر سے حاصل کر سکیں۔ ان پر صرف اتنی ہی پابندی عائد کی جاتی تھی جتنی پابندی ان کی ذہنی اصلاح کے لئے ضروری سمجھی جاتی۔ انہیں مقررہ اوقات میں باہر نکلنے کی اجازت دی جاتی تھی نماز کے اوقات میں جیل کے دروازے عمومی طور پر کھول دیئے جاتے تھے تاکہ وُہ اطمینان و سکون سے نماز ادا کر سکیں۔ موسم کے لحاظ سے گرمیوں میں گرمی کا اور سردیوں میں سردی کا لباس انہیں دیا جاتا۔ اگر وُہ آسودہ حال ہوتے تو کھانے پہننے کا خرچ انہی پر ڈالا جاتا اور غریب و نادار ہوتے تو بیت المال سے اُن کے مخارج ادا کئے جاتے۔

ذمیوں سے برتاؤ

ذمی، اسلامی مملکت کے وُہ یہودی نصرانی اور مجوسی ہیں جو حکومت کو حسب معاہدہ جزیہ ادا کرتے ہیں اور اس کے عوض حکومت ان کے تمام معاشی و معاشرتی اور مذہبی حقوق کے تحفّظ کی ذمہ دار ہوتی ہے اور ان کے اموال و نفوس اسی طرح محترم قرار پا جاتے ہیں جس طرح مسلمانوں کے اموال و نفوس اور کسی مسلمان کو ان سے جنگ و قتال کرنے، انہیں گزند پہنچانے اور ان کے اموال چھین لینے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ان ذمیوں کے بارے میں امیر المومنین کا رویہ نہایت پُر شفقت تھا۔ آپ نے ان کے معاشی و معاشرتی حقوق مقرر کئے اور عصبیت و تنگ نظری سے بالاتر رہ کر انہیں مذہبی مراسم کے بجالانے کی پوری آزادی دی۔ نہ مذہبی اختلاف کی بنا پر ان کی تحقیر و تذلیل گوارا کرتے اور نہ اُن پر ظلم و زیادتی کے روادار ہوتے اور اپنے عمال کو بھی ہدایت فرماتے کہ وہ اُن کے حقوق کا لحاظ رکھیں انہیں کسی جائز حق سے محروم نہ کریں اور نہ ان پر تشدّد و سختی کریں۔ چنانچہ مالک اشتر کو جو عہد نامہ لکھ کر دیا اس میں تحریر فرمایا:۔

ولا تکن علیہم سبعا ضاریا تغتنم اکلھم فانھم صنفان اما اخ لك فی الدین اونظیر لك فی الخلق۔	ان کے لئے پھاڑ کھانے والا درندہ نہ بن جاؤ کہ انہیں نگل جانا غنیمت سمجھتے ہو اس لئے کہ رعایا میں دو قسم کے لوگ ہیں ایک تمہارے دینی بھائی اور دُوسرے تمہارے جیسی مخلوق خدا۔"

حضرت کے اس ارشاد سے ظاہر ہے کہ آپ ہر انسان کو انسان ہونے کے اعتبار سے ایک سطح پر سمجھتے تھے۔ اور انسانیت کے رشتہ کو بھی اتنی ہی اہمیت دیتے تھے جتنی اہمیت مذہبی اتحاد کو دی جا سکتی ہے۔ چنانچہ عقیدہ و مذہب کے اختلاف کی بنا پر نہ کسی کی حق تلفی کی اور نہ کسی سے نفرت و بددلی کا اظہار کیا۔ اسی حسن سلوک کی بنا پر اہل ذمہ ہمیشہ آپ کے دل سے وفادار رہے۔ ابن ابی الحدید نے تحریر کیا ہے:۔

ما اقول فی رجل تحبہ اہل	میں اس شخص کے بارے میں کیا کہوں جسے اہل
الذمۃ علیٰ تکذیبھم	ذمہ دل و جان سے چاہتے تھے حالانکہ وہ
بالنبوۃ۔ (مقدمہ ابن ابی الحدید صٓ)۔	(پیغمبر کی) نبوت کی تکذیب کرتے تھے۔"

ایک دفعہ امیرالمومنین کوفہ کی طرف راہ سپار تھے کہ راستے میں ایک ذمی آپ کا ہم سفر ہو گیا اس نے حضرت سے دریافت کیا کہ آپ کدھر جائیں گے فرمایا کوفہ۔ کچھ دُور تک دونوں ساتھ چلتے رہے جب اس ذمی نے اپنی منزل کی طرف مڑنا چاہا تو حضرت بھی اس کے ساتھ چل دیئے۔ اس نے کہا کہ یہ راستا تو کوفہ نہیں جاتا اور آپ کو کوفہ جانا ہے۔ فرمایا کہ مجھے معلوم ہے کہ یہ راستا کوفہ کو نہیں جاتا مگر حسن رفاقت اور ہمسفری کا تقاضا یہ ہے کہ میں چند قدم تمہارے ساتھ جاؤں اور تمہیں رخصت کروں اور ہمارے پیغمبر نے ہمیں یہی تعلیم دی ہے۔ اس نے کہا کیا واقعاً آپ کے پیغمبر کی یہ تعلیم ہے فرمایا ہاں۔ کہا وہ دین بہترین دین ہے جو ایسے اعلیٰ اخلاق کا درس دیتا ہے۔ اب میں آپ کے ہمراہ کوفہ جاؤں گا چنانچہ وہ حضرت کے ہمراہ کوفہ آیا اور جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ آپ امیرالمومنین ہیں تو حلقہ بگوش اسلام ہو گیا۔

اوقاف و تعمیرات خیریہ

انسانی اخوت و برادری کا تقاضا یہ ہے کہ انسان صرف اپنا مفاد ہی پیش نظر نہ رکھے بلکہ بنی نوع انسان کی راحت رسانی کا بھی سامان کرے اور عوامی فلاح و بہبود کے کاموں میں حصہ لے۔ اسلام نے اسی انسانیت عامہ کے شعور کو بیدار کرنے کے لئے جہاں اعمال و عبادات پر زور دیا ہے وہاں رفاہ عام کے کاموں کو بھی ضروری قرار دیا ہے اور زکوٰۃ ایسے اہم فریضہ میں ایک مصرف فی سبیل اللہ کا تجویز کیا ہے جو تمام رفاہی امُور کو شامل ہے جیسے کنوئیں اور چشمے کھدوانا مسافر خانے اور عبادت گاہیں تعمیر کرنا اور اس قبیل کے دُوسرے کام انجام دینا جن سے تمام انسانوں کو بلا امتیاز مذہب و ملت فائدہ پہنچے۔ امیرالمومنین نے اپنے مختصر دور حکومت میں بغاوت و خانہ جنگی ایسے سنگین مسائل سے دو چار ہونے کے باوجود عوام کی فلاح و بہبود سے چشم پوشی نہیں کی اور پُوری تندہی سے رفاہی امور انجام دیتے رہے۔ ابن شہر آشوب نے مناقب میں تحریر کیا ہے کہ امیرالمومنین نے حجاج کے لئے ینبع میں سو چشمے

کھودے۔ مدینہ، کوفہ اور بصرہ میں کنوئیں کھدوائے مکہ اور کوفہ کے درمیان سڑک تعمیر کی اور اس پر میلوں کے نشانات نصب کئے ان میلوں پر "ھٰذا میل علی" تحریر تھا اور حاجیوں کے لئے راہ میں متعدد کنوئیں کھدوائے۔ ایک کانجی ہاؤس تعمیر کروایا جس میں آوارہ جانوروں کو بند کیا جاتا اور انہیں بیت المال سے اتنا چارہ دیا جاتا کہ وہ نہ کمزور اور دُبلے ہونے پائیں اور نہ موٹے تازے۔ اگر کسی جانور کا مالک آتا اور ملکیت کا ثبوت مہیّا کرتا تو وہ جانور اُسے دے دیا جاتا ورنہ اسے وہیں بند رہنے دیا جاتا۔

حضرت نے اپنے ہاتھ سے متعدد چشمے کھودے باغات لگائے اور انہیں فقراءِ مسلمین پر وقف کر دیا۔ چنانچہ حضرت کے ایک آزاد کردہ غلام ابو نیزر بیان کرتے ہیں کہ حضرت ایک مرتبہ اپنی جاگیر عین ابی نیزر اور بغیبغہ پر تشریف لائے۔ میں نے جو روکھا سوکھا کھانا پیش کیا وہ کھایا اوک سے پانی پیا اور پھاوڑہ لے کر گڑھا کھودنا شروع کیا یہاں تک کہ پسینہ میں شرابور ہو گئے۔ جب گڑھا کھودتے ہوئے چشمہ پھوٹ نکلا تو فرمایا کہ یہ صدقہ جاریہ ہے اور اپنے ہاتھ سے یہ تحریر قلمبند کی:۔

ھٰذا ما تصدق عبد اللہ علی	یہ وُہ ہے جسے خدا کے بندے علی امیرالمومنین
امیرالمومنین تصدق بالضیعتین	نے صدقہ کیا ہے یہ دونوں جاگیریں عین ابی نیزر
بعین ابی نیزر والبغیبغہ علیٰ	اور بغیبغہ فقراء مدینہ اور مسافروں کے لئے صدقہ
فقراء اھل المدینۃ وابن السّبیل	کی ہیں تاکہ ان کے ذریعہ اپنے چہرے کو قیامت کے
لیقی بھما وجھہ حر النار یوم	دن جہنم کی آنچ سے بچائیں۔ ان دونوں جاگیروں
القیامۃ لا تباعا ولا توھبا حتی	کو نہ بیچا جا سکتا ہے اور نہ ہبہ کیا جا سکتا ہے
یرثھا اللہ وھو خیر الوارثین	یہاں تک کہ اس کی بازگشت اللہ کی طرف ہو اور
الا ان یحتاج الیھما الحسن	وہ بہترین وارث ہے۔ البتہ اگر حسن اور حسین
والحسین فھما طلق لھما و	کو ان کی احتیاج و ضرورت ہو تو ان کے لئے کوئی
لیس لاحد غیرھما۔	بندش نہیں ہے اور ان کے علاوہ اور کسی کو یہ حق
(معجم البلدان۔ ج ۱۴۔ ص ۱۷۶)۔	نہیں ہے"۔

یاقوت حموی نے تحریر کیا ہے کہ امام حسین مقروض ہو گئے تو معاویہ نے عین ابی نیزر کو دو لاکھ دینار میں خریدنا چاہا مگر امام حسین نے یہ کہہ کر بیچنے سے انکار کر دیا کہ میرے پدر بزرگوار نے اسے صدقہ کیا تھا تاکہ جہنم کی آنچ سے اللہ انہیں محفوظ رکھے میں ان دونوں جاگیروں کو کسی قیمت پر فروخت نہیں کر سکتا۔

چشمہ ابی نیزر اور بغیبغہ کے علاوہ ینبع، ارباجا، ارینہ، رغد، رزین اور رباح بھی حضرت کی وقف کردہ جاگیریں تھیں۔

حضرت نے تعمیر مساجد کی طرف بھی خصوصی توجہ فرمائی۔ مدینہ میں مسجد فتح تعمیر کی اور کوہ اُحد کے دامن

میں حضرت حمزہ کی قبر کے پاس ایک مسجد بنوائی۔ میقات میں ایک مسجد تعمیر کی اور کوفہ، بصرہ اور آبادان میں مسجدیں تعمیر کیں۔ صفین کی طرف جاتے ہوئے جب اقطار میں منزل کی تو وہاں ایک مسجد کی بنیاد رکھی۔

ملکی انتشار اور اس کے وجوہ و اسباب

امیرالمومنین کی بیعت کی ابھی تکمیل بھی نہ ہوئی تھی کہ تخریبی کاروائیاں شروع ہو گئیں اور آپ کے گرد و پیش سازشوں کا ایک جال بُن دیا گیا۔ ہر طرف سے فتنے اُٹھ کھڑے ہوئے ایک فتنہ کو کچلا جاتا تو دوسرا فتنہ اُٹھ کھڑا ہوتا اُسے دبایا جاتا تو کسی اور گوشہ سے نیا فتنہ اُبھر آتا یہاں تک کہ آپ کا مختصر دورِ حکومت انہی الجھنوں کو سلجھانے اور نت نئے فتنوں کو فرو کرنے میں گزر گیا۔ ان فتنوں اور پیہم خانہ جنگیوں کی بنا پر کچھ لوگوں نے یہ رائے قائم کر لی ہے کہ یہ شورش و بدنظمی سیاسی کمزوری کا نتیجہ تھی اور امیرالمومنین اصولِ سیاست سے ناواقف اور ملکی نظم و نسق کے قیام سے قاصر تھے۔ بیشک امیرالمومنین کا دور خانہ جنگی و ہنگامہ آرائی کی جولانگاہ بنا رہا اور باہم آویزیوں کی وجہ سے ملکی حدود میں توسیع نہ ہو سکی مگر اس انتشار و پراگندگی کی وجہ سیاسی کمزوری نہ تھی بلکہ یہ نتیجہ تھا ان ناگوار حالات کا جن کی داغ بیل سابقہ حکومتوں میں پڑ چکی تھی اور اب اپنے عروج پر پہنچ چکے تھے۔ واقعات شاہد ہیں کہ دولت کی فراوانی اقتدار کی محرک ہوتی ہے چنانچہ فتوحات کے نتیجہ میں حاصل ہونے والے اموال غنائم نے ذہنوں کے رُخ خلافت سے ملوکیت کی طرف موڑ دیئے اور ہوس جاہ و اقتدار نے پوری فضا کو مسموم کر کے رکھ دیا اور کوئی گوشہ بھی باقی نہ چھوڑا۔ اگر یہی حالات کسی اور مدبر و سیاست اندیش کو پیش آتے تو وہ ان ناگزیر نتائج سے اپنے کو محفوظ نہ رکھ سکتا جن نتائج سے حضرت دوچار ہوئے بلکہ بعید نہ تھا کہ دشمن کی ستیزہ کاریوں کا مقابلہ نہ کر سکتا اور اس کی طوفانی یلغاروں کے آگے سپر انداختہ ہو جاتا۔

امیرالمومنین مسند خلافت پر اس وقت بیٹھے جب مدینہ شورشوں کا آماجگاہ بنا ہوا تھا اطراف و جوانب اور دوسرے علاقوں سے انقلاب پسند سمٹ کر مدینہ میں جمع تھے۔ سابقہ عمال، حکومت کے خلاف ریشہ دوانیاں کر رہے تھے۔ معاویہ شام میں خود مختاری کے خواہاں تھے زبیر کوفہ میں اور طلحہ بصرہ میں اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتے تھے ان سب نے آپس میں گٹھ جوڑ کر کے ہر موڑ اور ہر دوراہے پر کاوٹیں کھڑی کیں لشکر کشی کر کے دعوت مبارزت دی اور جنگ کے شعلے بھڑکا کر ملکی امن کو تباہ کرنے کی ٹھان لی۔

یہ امیرالمومنین کے سیاسی فہم و تدبر اور سوجھ بوجھ کا نتیجہ تھا کہ فرائض نظم و نسق کی انجام دہی کے ساتھ ان بغاوتوں کو بھی کچلتے رہے حالانکہ جو لوگ آپ کے پرچم کے نیچے جمع تھے ان میں کی اکثریت نہ ہم رنگ و ہم آہنگ تھی اور نہ اسے حضرت سے خلوص ہی تھا۔ ان مختلف الآراء لوگوں کے خیالات و نظریات میں ہم آہنگی پیدا کر کے انہیں ایک وحدت بنانا اور انہیں لے کر دشمن کی دل بادل فوجوں سے ٹکرا جانا آسان مرحلہ نہ تھا

مگر حضرت انہی مختلف عناصر کو لے کر دشمن سے نبرد آزما ہوئے اور اسے شکست دی اور شامیوں کی شکست بھی یقینی تھی اگر وہ حیلہ و فریب سے حضرت کے لشکر میں پھوٹ نہ ڈلواتے۔ ان معرکوں اور صف آرائیوں کے باوجود حضرت نے جس حد تک ملکی اصلاحات کیں نظم و انضباط قائم کیا اور رعایا کے فلاحی امور پر نظر رکھی وہ آپ کی عظیم سیاسی بصیرت اور نظم و نسق کی اہلیت کا روشن ثبوت ہے۔ ابن ابی الحدید نے تحریر کیا ہے:-

قد قال بعض المتکلمین من اصحابنا ان سیاسۃ علی علیہ السلام اذا تاملھا المنصف متدبرالھا بالاضافۃ الی احوالہ التی دفع الیھا مع اصحابہ جرت مجری المعجزات لصعوبۃ الامر و تعذرہ۔ (شرح ابن ابی الحدید ج ۲۔ ص۱۸۴)

ہماری جماعت کے بعض متکلمین کا قول ہے کہ اگر کوئی انصاف پسند علی علیہ السلام کی سیاست پر نظر غائر ڈالے اور یہ دیکھے کہ آپ اپنے اصحاب کے ہاتھوں کس صورت حال سے دوچار تھے تو معاملات کی سختی و پیچیدگی کی بنا پر آپ کی سیاست ایک معجزہ سے کم نہ ہوگی۔"

اس ذہنی تبدیلی کے علاوہ مندرجہ ذیل اسباب و عوامل بھی ملکی انتشار و پراگندگی میں کارفرما تھے:۔
پہلا امر یہ تھا کہ حضرت کی سیاست خالص اسلامی سیاست تھی اور آپ کسی صورت میں اخلاقی و اسلامی قدروں کو حکومت و اقتدار پر قربان کرنے کے لئے تیار نہ تھے چہ جائیکہ حیلہ گری و دُنیا سازی سے کام لے کر اقتدار کے استحکام کی فکر کرتے یا دو رخی سیاست اور چکنی چپڑی باتوں سے اپنا مقصد نکالتے اگر حضرت بھی وہی طریق کار اختیار کرتے جو آپ کے مخالفین نے دیانت کے تقاضوں سے مُنہ موڑ کر اختیار کیا تھا تو جہاں آپ کو بظاہر ناکامی سے دوچار ہونا پڑا وہاں آپ کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہوتے مگر اس صورت میں حضرت کی حکومت ملوکیت قرار پاتی اس خلافت کا عملی نمونہ نہ ہوتی جس میں نہ مکر و فریب کی گنجائش ہے اور نہ عوام فریبی کا دخل ہے۔ ظاہر ہے کہ جہاں ایک طرف اخلاقی آئین اور دینی ضوابط کی پابندیاں راستا روکے کھڑی ہوں اور دوسری طرف ہر قسم کے مکر و فریب اور الزام تراشی میں باک محسوس نہ کیا جاتا ہو وہاں چیخ چیخ کر گلا پھاڑ پھاڑ کر فتنہ و شر کو ہوا دی جا سکتی ہے چنانچہ مخالفین نے یہ سمجھتے ہوئے کہ حضرت اپنے مسلمہ اصولوں میں لچک پیدا نہ ہونے دیں گے آپ کے خلاف ہر طرح کے سیاسی حربوں سے کام لیا اور آپ کی صاف دلی سے پورا فائدہ اٹھایا۔ احمد حسن الزیات نے تحریر کیا ہے:۔

لا یعرف الھوادۃ فی الدین ولا المرونۃ فی الدنیا فکانت

حضرت علی دینی معاملات میں لچک اور دنیوی اُمور میں زمانہ سازی سے آشنا ہی نہ تھے آپ

هذه الخلال الكريمة من انصار معاوية الداهية فى الخلاف عليه۔(ادب العربی ص۱۴۷)۔	کے یہی بلند عادات و اطوار وہ تھے جن سے معاویہ ایسے چالاک نے فضا کو آپ کے خلاف کرنے میں مدد لی۔"

دُوسرا سبب یہ تھا کہ حضرت خواص کی دلجوئی کے لئے عوام کے مفاد کو نظر انداز کرنا گوارا نہ کرتے تھے بلکہ ہمیشہ ان کے مفاد کو خواص و سر برآوردہ افراد کے مفادات پر ترجیح دیتے تھے اور اپنے عمال کو بھی یہی ہدایت فرماتے تھے۔ چنانچہ مالک اشتر کو تحریر فرمایا: "تمہیں سب طریقوں سے زیادہ وہ طریقہ پسند ہونا چاہیئے جو حق کے اعتبار سے بہترین انصاف کے لحاظ سے سب کو شامل اور رعایا کے زیادہ سے زیادہ افراد کی مرضی کے مطابق ہو کیونکہ عوام کی ناراضگی خواص کی رضا مندی کو بے اثر بنا دیتی ہے اور خواص کی ناراضگی عوام کی رضامندی کے ہوتے ہوئے نظر انداز کی جا سکتی ہے۔" یہ طرز عمل جاہ طلب و اقتدار پسند طبیعتوں پر شاق گزرا اور انہوں نے اپنا تفوق و امتیاز برقرار رکھنا چاہا اور جب انہیں معاشرہ میں اپنا مقام حاصل ہوتا نظر نہ آیا تو نظم و نسق کو درہم و برہم کرنے کے در پے ہو گئے اور عوام کو اپنے انقلاب آفرین نعروں سے متاثر کر کے ہنگامہ و شورش پر اتر آئے تاکہ ان کی بالادستی اور امتیازی حیثیت برقرار رہے۔

تیسرا سبب یہ تھا کہ حضرت مساویانہ تقسیم کے اصول پر کاربند تھے اور اعلیٰ و ادنیٰ اور عرب و عجم کی تفریق کے قائل نہ تھے۔ اس سے اگرچہ عوام اور موالی و اعجام کا طبقہ خوش ہو گیا مگر امتیاز پسند لوگوں کے دلوں میں گرہ پڑ گئی۔ وہ جس طرز عمل کے خوگر ہو چکے تھے اس کے خلاف کسی روش کو پسندیدہ نظروں سے نہ دیکھ سکتے تھے۔ چنانچہ وہ اس پر سیخ پا ہوئے پُرزور احتجاج کیا اور جب اُن کی آواز موثر ثابت نہ ہوئی تو شام کا رُخ کر لیا جہاں حضرت کے خلاف سازشوں کی پخت و پز ہوتی تھی۔ فضیل ابن جعدہ کہتے ہیں:-

احد الاسباب کان فی تقاعد العرب عن امیر المومنین امر المال فانه لم یکن یفضل شریفا علی مشروف ولا عربیا علی عجمی ولا یصانع الرؤساء وامراء القبائل کما یصنع الملوك ولا یستمیل احدا الی نفسه وکان معاویة	امیرالمومنین سے عرب کی روگردانی کا اصل سبب مال تھا حضرت اعلیٰ کو ادنیٰ پر اور عربی کو عجمی پر ترجیح نہ دیتے تھے اور نہ حکمرانوں کی طرح امرا و سرداران قبائل کی آؤ بھگت کرتے تھے اور نہ کسی کو اپنی طرف مائل کرتے تھے اور معاویہ کی روش اس کے برعکس تھی اس لئے لوگ علی کو چھوڑ کر معاویہ سے جا ملے۔"

بخلاف ذلك فترك الناس علياً
والتحقوا بمعاوية۔ (بحار الانوار
ج۹۔ ص۵۳۹)۔

جب امیر المومنین سے یہ کہا گیا کہ جن لوگوں سے فتنہ برپا کرنے کا اندیشہ ہے یا معاویہ سے وابستہ ہو جانے کا خطرہ ہے انہیں داد و دہش سے روک لیں تو آپ نے فرمایا:۔

اتامرونی ان اطلب النصر بالجور لا واللہ لا افعل ما طلعت شمس وما لاح فی السماء نجم واللہ لو کان مالہم لی لواسیت بینہم وکیف وانما ھو اموالھم۔ (مناقب ج۲۔ ص۳۳)

کیا تم مجھے اس امر کا پابند کرنا چاہتے ہو کہ بے راہروی سے کچھ لوگوں کی امداد حاصل کروں تو خدا کی قسم جب تک سورج نکلتا اور ستارہ آسمان پر چمکتا رہے گا میں ایسا نہیں کروں گا اگر مسلمانوں کا مال میرا ذاتی مال ہوتا جب بھی میں اسے سب میں برابر تقسیم کرتا چہ جائیکہ یہ مال انہی کا ہے"۔

امیر المومنین کی اس سیرت و روش کے مقابلہ میں معاویہ کا طرزِ عمل یہ تھا کہ وہ سیاسی مقصد براری کے لئے بے دریغ دولت لٹاتے اور خزانوں کے منہ کھول کر لوگوں کے دین و ایمان کا سودا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جاریہ ابن قدامہ، احنف ابن قیس، جون ابن قتادہ اور حتات مجاشعی معاویہ کے پاس آئے معاویہ نے حتات کو ستر ہزار اور دوسروں کو ایک ایک لاکھ درہم دیئے۔ حتات کو جب یہ معلوم ہوا تو اس نے معاویہ سے کہا کہ تم نے مجھے میرے قبیلہ میں رسوا کرنے کا سامان کیا ہے اوروں کو ایک ایک لاکھ اور مجھے ستر ہزار درہم دیئے ہیں۔ معاویہ نے کہا:۔

انی اشتریت من القوم دینہم (تاریخ کامل۔ ج۳۔ ص۲۳۱)

میں نے ان لوگوں سے اُن کا دین خرید کیا ہے"۔

حتات نے کہا کہ پھر میرا دین بھی خرید لیجئے۔

اب جہاں یہ صورت ہو کہ درہم و دینار کے بدلے دین و ایمان کا کھلم کھلا سودا ہوتا ہو اور لوگ روپیہ پیسہ کے عوض دین بیچنے پر آمادہ ہو جاتے ہوں وہاں یہ توقع کیونکر کی جا سکتی تھی کہ امیر المومنین کی محتاط روش انہیں خوش رکھ سکے گی اور وہ مال و دولت کو ٹھکرا کر محض دینی جذبہ کے زیر اثر حق سے وابستہ رہیں گے۔

چوتھا سبب یہ تھا کہ وہ امور جو خلاف شرع ہوتے ہوئے شرعی صورت اختیار کر چکے تھے اور دین کا جزو سمجھے جا رہے تھے۔ حضرت اپنی منصبی ذمہ داری کی بنا پر انہیں شرعی جواز دینے کے لئے تیار نہ تھے اور عوام کی حالت یہ ہوتی ہے کہ جو چیزیں اُن کے ذہنوں میں اُتر جاتی ہیں اُن سے دستبردار ہونا

گوارا نہیں کرتے اور نہ اس کے خلاف کوئی آواز سننا چاہتے ہیں چنانچہ ایک مرتبہ حضرت نے منبر پر کچھ کہہ دیا تو عبیدۃ السلمانی نے کھڑے ہو کر کہا:۔

"رایك مع الجماعة احب الینا من رایك وحدك۔ (شرح ابن ابی الحدید۔ ج۲۔ ص۱۸۴) | آپ ۔۔۔ ایک اکیلے کی رائے سے ہمیں آپ کی وہ رائے زیادہ پسند ہے جو جماعت کی رائے کے موافق ہو۔"

اس اختلاف رائے نے بھی انتشار کے اسباب فراہم کئے اور لوگ ایسی بات کو جو ان کے پہلے طرز عمل کے خلاف ہوتی لے اُڑتے اور لوگوں میں بدظنی پیدا کر کے فتنہ و شر پھیلاتے۔

پانچواں سبب یہ تھا کہ حضرت نے برسر اقتدار آتے ہی ان تمام عمال و حکام کی برطرفی کا اعلان کر دیا جو سابقہ حکومتوں کی طرف سے متعین تھے اس کا رد عمل یہ ہوا کہ ان عمال نے ان لوگوں سے جو عہدوں کے امیدوار تھے اور کامیاب نہ ہو سکے تھے گٹھ جوڑ کر کے قصاص خون عثمان کی تحریک چلائی اور حضرت کے خلاف محاذ جنگ قائم کر کے ملکی نظم و نسق کو تباہ کرنے میں بھرپور حصہ لیا۔

ان تمام محرکات فتنہ و انتشار کے باوجود حضرت نے جس حد تک ملکی حالات کو بگڑنے سے بچایا وہ صرف آپ کی سیاسی بصیرت معاملہ فہمی اور حسن تدبر کا نتیجہ تھا ورنہ شورش پسندوں نے تفرقہ و انتشار پھیلانے اور ملکی نظم کو درہم و برہم کرنے میں کون سی کسر اُٹھا رکھی تھی۔

عمال حکومت کی برطرفی اور اس کے وجوہ!

جب امیر المومنین برسر اقتدار آئے تو مملکت کے صوبوں پر سابقہ حکومت کے ان عمال و حکام کا عمل دخل تھا جنہوں نے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ جس طرح چاہتے رعایا کو ستاتے اور جو چاہتے کر گزرتے تھے نہ مرکز سے باز پرس کا اندیشہ تھا نہ پوچھ گچھ کی فکر۔ مسلمان ان کے مظالم سے تنگ آئے ہوئے تھے اور استبدادی گرفت میں جکڑے ہوئے پھڑپھڑا رہے تھے۔ حضرت نے عنان حکومت ہاتھوں میں لیتے ہی انہیں برطرف کرنے کا فیصلہ کر لیا اور دینی سیاست کا تقاضا بھی یہی تھا کہ اُن لوگوں کو یکقلم معزول کر دیا جائے جنہوں نے لوٹ کھسوٹ اپنا وتیرہ اور ظلم و تعدی اپنا شیوہ بنا رکھا تھا۔

اس عام معزولی کی بھنک مغیرہ ابن شعبہ کے کانوں میں پڑی تو وہ حضرت کے پاس آیا اور کہا میں آپ کا ہمدرد و بہی خواہ ہوں اور اس ہمدردی و خیر خواہی کا تقاضا یہ ہے کہ میں آپ کو یہ مشورہ دوں کہ آپ فی الحال معاویہ، عبداللہ ابن عامر اور عہد عثمانی کے دوسرے عمال کو اُن کے عہدوں پر بحال رہنے دیں اور جب وہ بیعت کر کے حلقۂ اطاعت میں داخل ہو جائیں تو پھر جیسا چاہیں ویسا قدم اٹھائیں خواہ انہیں بحال رہنے دیں خواہ انہیں برطرف کر دیں۔ حضرت نے اس کے جواب میں فرمایا کہ تمہاری یہ

رائے دنیا سازی کے اعتبار سے موزوں و مناسب ہے لیکن

واللہ لا اداھن فی دینی ولا	خدا کی قسم میں دین میں دو رخی نہیں برتوں
اعطی الدنیۃ فی امری ۔	گا اور نہ اپنی حکومت میں ذلت و پستی
(تاریخ طبری ج۳۔ ص۴۶۱)	گوارا کروں گا۔"

اب مغیرہ کو کچھ اور کہنے کی ہمت نہ ہوئی منہ لٹکا کر اُٹھ کھڑا ہوا اور واپس چلا آیا۔ اسے اپنے مشورہ کی بے قدری کا احساس تو تھا ہی دُوسرے دن پھر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میں نے کل جو رائے دی وُہ صائب نہ تھی مزید غور و فکر کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ انہیں معزول کر دینا ہی بہتر رہے گا۔ امیر المومنین ابھی اس "یک بام و دو ہوا" پر حیرت زدہ تھے کہ ابن عباس حاضر ہُوئے اور دریافت کیا کہ مغیرہ کس مقصد سے آپ کے ہاں آیا تھا فرمایا کہ وُہ مجھے مشورہ دینے کے لئے کل بھی آیا تھا اور آج بھی آیا ہے۔ کل اس نے یہ مشورہ دیا تھا کہ میں سابقہ عمال کو برقرار رہنے دوں اور ان میں کوئی ردو بدل نہ کروں اور آج یہ رائے دی ہے کہ میں انہیں معزول کر دوں۔ ابن عباس نے کہا کہ اس نے جو رائے کل دی تھی اُس میں ہمدردی و خیر خواہی کا جذبہ نظر آتا ہے اور آج کی رائے کل کی رائے کے ٹھکرائے جانے کا ردعمل اور مکر و فریب پر مبنی ہے۔ میں اس کی پہلی رائے سے اتفاق کرتا ہوں اور آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ آپ ابھی معاویہ کو ان کے عہدہ پر بحال رہنے دیں اور جب وُہ بیعت کر کے اطاعت کا اقرار کر لیں تو انہیں برطرف کر دیں۔ حضرت نے فرمایا:۔

ان اقررت معاویۃ مافی یدہٖ	اگر میں معاویہ کو اس کے عہدہ پر باقی رہنے
کنت متخذ المضلین عضدا	دوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں گمراہ کرنے
(استیعاب۔ ج۳۔ ص۲۵۹)	والوں کو اپنا دست و بازو بنا رہا ہوں۔"

اسی طرح زیاد ابن حنظلہ تمیمی نے بھی کچھ ایسا ہی مشورہ دیا مگر حضرت نے ان مشوروں کو قابل اعتناء نہ سمجھا اور ان مشیروں کی رائے کے خلاف اپنی اصابت رائے پر بھروسا کرتے ہُوئے انہیں یکلخت معزول کرنے کا فیصلہ بحال رکھا۔

بعض لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ اگر حضرت ان مشیروں کے مشوروں پر عمل پیرا ہوتے اور ان کے تجربہ معاملہ فہمی اور سیاسی بصیرت سے فائدہ اٹھاتے تو ان الجھنوں میں گرفتار نہ ہوتے جن الجھنوں سے انہیں دو چار ہونا پڑا اور جن خانہ جنگیوں میں ان کا دَورِ خلافت گزرا اس کی نوبت نہ آتی۔ مگر یہ صرف ناپختہ ذہنوں کی خام خیالی ہے۔ اگر حضرت اُن کے مشوروں پر چلتے اور عمال کو ان کے عہدوں پر بحال رہنے دیتے جب بھی الجھنوں اور پریشانیوں سے پیچھا چھڑانا مشکل تھا اور مملکت کو اُن کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ نہ رکھا جا سکتا تھا اس لئے کہ یہ عمال صرف معزولی کی بنا پر آمادۂ مخالفت نہ

ہوئے تھے بلکہ پہلے سے مخالف چلے آرہے تھے۔ اگرانہیں عہدوں پر باقی رہنے بھی دیا جاتا جب بھی حکومت اور اُن کے درمیان ذہنی تصادم اور نظریاتی ٹکراؤ رہتا اور وُہ حکومت کو اپنے مادی اغراض کی راہ میں حائل سمجھ کر اس کے خلاف اندر ہی اندر سازشوں کے جال بچھاتے امورِ مملکت میں رخنہ انداز ہوتے اور حضرت کے لئے مسلسل پریشانی و دردِ سری کا باعث بنے رہتے۔ جب بحالی و برطرفی دونوں صورتوں میں پریشانیوں اور پیچیدگیوں کا سامنا تھا تو آپ کی شرعی ذمہ داریوں کا تقاضا یہی تھا کہ اسی صورت کو اختیار کرتے جو دینی قدروں اور اسلامی تقاضوں سے موافقت رکھتی ہو خواہ اس کے لئے کتنی دشوار گزار گھاٹیوں سے گزرنا اور تیز آندھیوں اور طوفانوں سے ٹکرانا پڑتا۔ چنانچہ اس معزولی کے چند وجوہ یہ تھے جن سے اس اقدام کے حق بجانب اور دینی سیاست سے ہم آہنگ ہونے پر ثبوت لایا جا سکتا ہے۔

اوّلاً یہ کہ امیر المومنین کا مقصدِ اولین اسلامی حکومت کا قیام اور دینی نظام کا نفاذ تھا۔ اس نظام کو بروئے کار لانے کے لئے ضروری تھا کہ خود غرضی مفاد پرستی اور زر اندوزی کی راہیں بند کر کے معاشرہ کی تطہیر کی جائے اور جو غلط سیاست ملک پر چھائی ہوئی تھی اس کا پورا ڈھانچا بدل دیا جائے اور یہ مقصد صرف مسندِ خلافت کے خالی ہونے سے حاصل نہ ہو سکتا تھا جب تک ان عاملوں کو بھی الگ نہ کیا جاتا جو سیاسی جوڑ توڑ کا سہارا لے کر اقتدار پر چھائے ہوئے اور کنبہ پروری کے نتیجہ میں عہدوں پر قابض چلے آرہے تھے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ان شورہ پشت و شوریدہ سر عمال کی غلط کارانہ روش کے نتیجہ میں اسلامی طرزِ معاشرت کے نقوش مٹتے جا رہے تھے۔ حرص و ہوس نے استحصال کا بازار گرم کر رکھا تھا اور دنیا استبدادی شکنجوں میں جکڑی ہوئی کراہ رہی تھی۔ اگر ان لوگوں کو کلیدی عہدوں پر برقرار رہنے دیا جاتا تو اسلامی حکومت کی تشکیل ممکن ہی نہ تھی کیونکہ اسلامی حکومت دینی عناصر ہی کے ذریعہ پروان چڑھ سکتی ہے جو اسلام اور اس کے احکام سے واقفِ دین اور اس کے آئین کے پابند اور اسلامی و اجتماعی مفاد پر ذاتی مفاد کو قربان کرنے کے عادی ہوں۔

دُوسرے یہ کہ مسلمانوں کا حضرت عثمان سے یہی تو مطالبہ تھا کہ وُہ ان خود سر عاملوں کو معزول کر کے ان کے بجائے انصاف پرور نیک کردار اور خوش اطوار لوگوں کو عامل مقرر کریں اور جب ان کا یہ مطالبہ مسترد کر دیا گیا تو انہوں نے تبدیلیٔ حالات کے لئے انقلابی قدم اٹھایا۔ اگر حضرت ان لوگوں کی رائے کے خلاف سابقہ نظامِ حکومت علیٰ حالہ باقی رہنے دیتے تو پھر اسی ظلم و سفاکی اور بے راہروی کا دور شروع ہو جاتا جو اس انقلاب کا محرک تھا اور وُہ انقلاب پسند جنہوں نے سابقہ حکومت کا تختہ اُلٹا تھا اس حکومت کی تبدیلی کے بھی درپے ہو جاتے اور نتیجہ میں خون خرابہ ہوتا جنگ کے شعلے بھڑک اُٹھتے اور اس حکومت کا بھی وہی حشر ہوتا جو سابقہ حکومت کا ہو چکا تھا۔

تیسرے یہ کہ امیر المومنین خود ان عمال کے طور طریقوں کے شاکی تھے اور ان پر نکتہ چینی کرتے رہتے تھے اور حضرت عثمان کو متعدد بار یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ وہ معاویہ اور دوسرے خود سر عمال کو برطرف کر دیں مگر حضرت عثمان حیل وحجت سے کام لیتے اور معاویہ کے بارے میں یہ عذر پیش کر دیتے کہ وہ حضرت عمر کے مقرر کردہ والئ شام ہیں۔ اگر حضرت برسر اقتدار آنے کے بعد ان عمال کو ان کے عہدوں پر برقرار رہنے دیتے تو عوام اس سے یہ تاثر لیتے کہ عمال کی برطرفی کا مطالبہ مفاد عامہ کے لئے نہیں تھا بلکہ آپ اصلاح حالات کی آڑ میں حکومت کا تختہ الٹ کر خود برسر اقتدار آنا چاہتے تھے اور جب مقصد میں کامیابی ہوگئی اور اقتدار حاصل ہوگیا تو سیاسی مصالح کی بنا پر معاویہ اور دوسرے عمال کی علیحدگی ضروری نہیں سمجھی اور محض اس خیال سے کہ وہ حکومت کے خلاف بغاوت نہ کریں انہیں عہدوں پر بحال رہنے دیا۔ یہ روش ایک اقتدار پسند و دنیا پرست کی تو ہو سکتی ہے جو غلط سیاست اور غیر اسلامی وسائل کا سہارا لے کر اپنے اقتدار کی بنیادیں مستحکم کرنا چاہتا ہے مگر یہ اس کا کردار نہیں ہو سکتا جو اقتدار سے زیادہ اصول دیانت کی بقا عزیز رکھتا ہو اور آئین اسلام سے سرمو انحراف گوارا نہ کرتا ہو۔

چوتھے یہ کہ اگر حضرت اپنی حکومت و سیادت کے استحکام کے لئے معاویہ اور دوسرے عمال کو عہدوں پر بحال رکھتے تو یہ امر آپ کی سیاسی کمزوری پر محمول کیا جاتا اور کہنے والے یہی کہتے کہ آپ نے نظریاتی اختلاف کے باوجود ان لوگوں کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور ان کے اثر و نفوذ کو دیکھتے ہوئے انہیں برطرف کرنے کی جرأت نہیں کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ دوسرے لوگ بھی اس کمزوری کو تاڑ کر جا و بے جا مطالبات پیش کرتے اور مقصد برآری کے لئے ان تمام ہتھکنڈوں کو کام میں لاتے جو کمزور حکومت کو دبانے کے لئے کام میں لائے جاتے ہیں اور انجام کار حکومت ایک کھلونا بن کر رہ جاتی ملک میں خلفشار بڑھتا، امن عامہ تباہ ہوتا، نظم ونسق کا شیرازہ بکھرتا اور اس حکومت کا حشر بھی پہلی حکومت سے مختلف نہ ہوتا۔

پانچویں یہ کہ امیر المومنین نے خلافت کو پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ قبول کیا تھا جس کے بعد عمال سے سرزد ہونے والے مظالم سے انہیں بے تعلق نہیں سمجھا جا سکتا تھا بلکہ بڑی حد تک ان کے افعال و اعمال کی ذمہ داری انہی پر عائد ہوتی کہ انہوں نے جانتے بوجھتے ہوئے ان عمال کو لوگوں پر مسلط رہنے دیا جو استحصال پسند اور ظلم و ستمرانی کے خوگر تھے لہٰذا انہیں عہدوں پر برقرار رہنے دینا یا ان کی برطرفی میں تاخیر کرنا ان کے مظالم میں شرکت کے مترادف ہوتا اور حضرت یہ گوارا نہ کر سکتے تھے کہ ان کی غلط کاریوں کا ذمہ لے کر اپنا دامن داغدار کریں اس لئے آپ نے پہلے ہی مرحلہ پر ان غلط کار عمال سے اظہار بیزاری اور ان کے موقف سے بے تعلقی کا اعلان کرتے ہوئے

ان کی معزولی کو ضروری قرار دے لیا۔

چھٹے یہ کہ حضرت علی اور معاویہ دو مختلف و متضاد گروہوں سے تعلق رکھتے تھے۔ معاویہ اس گروہ کی فرد تھے جو دینی پابندیوں سے بے نیاز وقتی مصلحتوں کا پرستار اور مقاصد کی تکمیل کے لئے ہر حیلہ و فریب کو جائز سمجھتا تھا۔ اس کے برخلاف امیر المومنین کی سیاست مصلحت کی تہوں کے نیچے دبی ہوئی نہ تھی اور نہ ان کی سیاست کے اجزائے ترکیبی میں عیاری و فریب کاری داخل تھی۔ اس ذہنی تضاد اور نظریاتی اختلاف کی بنا پر معاویہ اپنے عہدہ کی بحالی پر مطمئن نہ رہ سکتے تھے بلکہ وُہ بخوبی سمجھتے تھے کہ حضرت علی انہیں اس منصب پر باقی رکھنا کبھی گوارا نہ کریں گے اور ایک نہ ایک دن انہیں امارت سے معزول کر دیں گے۔ اس صورت میں اگر انہیں کچھ دنوں کے لئے امارت پر برقرار رہنے دیا جاتا تو وہ یہ عرصہ مستقبل کی فکر سے بے نیاز ہو کر خاموشی سے نہ گزارتے بلکہ اپنے وقتی اقتدار سے فائدہ اُٹھاتے مالی و عددی طاقت بڑھاتے اور ضرورت محسوس کرتے تو ہمسایہ مملکت روم سے جنگی معاہدہ کرتے۔ اس متوقع صورت کے پیش نظر کیا یہی قرین مصلحت نہ تھا کہ انہیں مزید قوت و توانائی کے فراہم کرنے کا موقع دیئے بغیر معزول کر دیا جاتا۔

ساتویں یہ کہ معاویہ کے پیش نظر صرف امارت شام کا تحفظ نہ تھا بلکہ تمام قلمرو اسلام پر اپنا جھنڈا لہرانا چاہتے تھے اور اس مقصد کے لئے انہوں نے حضرت عثمان کی زندگی ہی میں اپنے گرد اعوان و انصار کا جم غفیر جمع کر لیا تھا تاکہ جب موقع دیکھیں ان مددگاروں کا سہارا لے کر اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیں۔ چنانچہ جب انہوں نے دیکھا کہ فضا حضرت عثمان کے خلاف ہو چکی ہے تو انہوں نے اس موقع سے فائدہ اُٹھانا چاہا اور حضرت عثمان سے کہا کہ آپ میرے ہمراہ شام چلئے وہاں کے باشندے آپ کے محافظ و سینہ سپر ہوں گے اور آپ کو کسی قسم کا گزند نہ پہنچ سکے گا اور اگر مدینہ میں رہے تو شورش پسند آپ کا کام تمام کر دیں گے۔ معاویہ کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح حضرت عثمان کو مرکز سے الگ کر کے ایک گوشہ میں بٹھا دیں اور اُن کے جیتے جی مملکت کا نظم و نسق اپنے ہاتھوں میں لے لیں تاکہ اس عارضی اقتدار کو آئندہ مستقل اقتدار کی صورت میں بے روک ٹوک منتقل کیا جا سکے مگر حضرت عثمان نے شام جانے سے انکار کر دیا اور یہ حربہ کارگر ثابت نہ ہو سکا۔ اور جب حضرت عثمان کے قتل کا حادثہ رونما ہوا تو انہوں نے اس قتل کو حصول اقتدار کا ذریعہ قرار دے لیا اور قصاص کے نام پر اپنی جدوجہد تیز کر دی۔ اگر حضرت ان سے کوئی تعرض نہ کرتے اور انہیں امارت شام پر برقرار رہنے دیتے تو وُہ امارت شام پر قناعت کر کے خاموش نہ بیٹھے رہتے بلکہ مرکز پر اپنی قوت و طاقت کا دباؤ ڈالتے جھوٹے سچے عذروں سے لوگوں کو حکومت کے خلاف بھڑکاتے اور عوام میں خوف و دہشت پھیلا کر حکومت کو ناکام بناتے اگر اس سے کام نہ چلتا تو ہنگامہ آرائی کے لئے کوئی اور عذر تلاش کرتے اور کچھ نہ سہی تو قتل عثمان کے سلسلہ

میں حضرت کو مورد الزام ٹھہراتے۔ اگر حضرت اس خون سے اپنی براءت کا ثبوت دیتے تو یہ شوشہ چھوڑتے کہ حضرت کا انتخاب غیر آئینی ہے کیونکہ یہ صرف اہل مدینہ کا انتخاب ہے اور انتخاب کا حق اہل مدینہ ہی کو کیوں ہو اہل شام کو کیوں نہ ہو جبکہ شام اپنی کثرت و طاقت کے لحاظ مرکزیت کا زیادہ سزاوار ہے۔ غرض انہیں منصب پر برقرار رکھنے کی صورت میں بھی ان کی الزام تراشی و حیلہ طرازی سے تحفظ کی کوئی ضمانت نہ تھی۔ جب منصب کی بحالی کی صورت میں بھی ان کی فتنہ انگیزیوں اور افترا پردازیوں سے محفوظ نہ رہا جا سکتا تھا تو انہیں منصب پر باقی رکھنے میں مصلحت ہی کیا ہو سکتی تھی کہ ان کی معزولی عمل میں نہ لائی جاتی۔

آٹھویں یہ کہ یہ عمال نظم و ضبط کی اہلیت اور عوام سے جذبۂ ہمدردی کی بنا پر منتخب نہیں ہوئے تھے بلکہ ان کا انتخاب خلیفۂ وقت سے وابستگی اور خاندانی قرابت کا مرہون منت تھا۔ چنانچہ حضرت عثمان نے کوفہ سے عمار یاسر کو معزول کر کے اپنے مادری بھائی ولید ابن عقبہ کو مقرر کیا بصرہ سے ابو موسٰی کو علیحدہ کر کے اپنے ماموں زاد بھائی عبد اللہ ابن عامر کو متعین کیا۔ مصر سے عمرو ابن عاص کو الگ کر کے اپنے رضاعی بھائی عبد اللہ ابن سعد کو مقرر کیا اور اسی طرح دوسرے عمال بھی زیادہ تر انہی کے خاندان کے افراد تھے۔ سعید ابن مسیب کہتے ہیں :-

کان کثیرا ما یولی بنی امیۃ من لم یکن لہ صحبۃ فکان یجئی من امرائہ ما ینکرہ اصحاب محمد۔ (تاریخ الخلفاء۔ ص۱۱۱)	حضرت عثمان بیشتر بنی اُمیہ کے انہی افراد کو امارت کے لئے نامزد کرتے تھے جنہیں پیغمبر کی صحبت کا شرف حاصل نہ ہوتا تھا اور اُن کے بارے میں ایسی خبریں آتی تھیں جنہیں اصحاب پیغمبر ناپسند کرتے تھے۔"

جب یہ انتخاب جنبہ داری خویش پروری اور اہل افراد کی حق تلفی کے نتیجہ میں عمل میں لایا گیا تو اسے جوں کا توں باقی رکھنا ایک غلط اقدام کی تائید کے مرادف ہوتا اور امیر المومنین سے یہ توقع نہ کی جا سکتی تھی کہ وُہ کسی امر باطل کی تائید کریں گے خواہ اس سے آپ کی مخالف جماعت میں اضافہ ہوتا یا مملکت کے استحکام کو دھچکا لگتا۔

نویں یہ کہ امیر المومنین یہ دیکھتے چلے آرہے تھے کہ سابقہ حکومتوں میں انصار و بنی ہاشم کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے یہاں تک کہ جس مجلس شوریٰ کے نتیجہ میں حضرت عثمان منتخب ہوُئے تھے اس میں بھی انصار کا کوئی حصّہ نہ تھا اور حضرت عثمان نے بھی عہدوں کی تقسیم کا معیار اموّیت کو قرار دے لیا تھا جس سے ایک طرف انصار و بنی ہاشم کو اپنے حق سے محرومی کا احساس ہو گیا تھا اور دُوسری طرف گروہی عصبیت ابھر آئی تھی اگر اس گروہی و قبائلی معیار کے بجائے اہلیت و استعداد کار کو معیار قرار دیا جاتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ انصار اور بنی ہاشم میں سے کوئی منتخب نہ ہوتا جبکہ ان میں اہل افراد کی کوئی کمی نہ تھی۔ اب اس کا

تدارک یونہی ہو سکتا تھا کہ سابقہ عمال کو معزول کر کے صرف اہلیت کی بنا پر انتخاب عمل میں لایا جاتا تاکہ امارت ایک طبقہ میں محدود ہو کر نہ رہ جائے اور نہ اہل افراد کو حق سے محرومی کا احساس ہونے پائے خواہ کوئی مہاجر ہو یا انصار ہاشمی ہو یا غیر ہاشمی۔

دسویں یہ کہ یہ عمال باوجودیکہ حضرت عثمان کے ساختہ پرداختہ اور احسان پروردہ تھے مگر ان کے محاصرہ کے دنوں میں جو ایک مہینہ انیس دن تک رہا کسی ایک نے بھی ان سے تعاون نہ کیا حالانکہ ان کے پاس فوج بھی تھی اور سامان حرب بھی تھا۔ جب ان لوگوں نے اپنے محسن و سرپرست کے ساتھ کچھ نہ کیا تو امیرالمومنین مملکت کے نظم و انصرام کے سلسلہ میں ان سے کیا توقع رکھ سکتے تھے کہ وہ آڑے وقت پر کام آئیں گے یا کسی مہم میں ہاتھ بٹائیں گے البتہ جب حضرت عثمان قتل کر دیئے گئے تو ان میں سے چند ایک قصاص کے نام پر اُٹھ کھڑے ہوئے حالانکہ انہیں اس وقت اپنے صوبوں سے نکلنا چاہیئے تھا جب ان کا نکلنا مفید ثابت ہو سکتا تھا مگر اس وقت سب منقار زیر پر دبکے پڑے رہے اور اس پہلو تہی کے جواز میں کوئی معقول عذر بھی پیش نہ کر سکے یہاں تک کہ معاویہ جو سخن سازی میں مہارت رکھتے تھے اور موقع پر بات بنا لینا بھی خوب جانتے تھے وُہ بھی کوئی بات نہ بنا سکے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ابوالطفیل کنانی ان کے ہاں آیا معاویہ نے اس سے کہا کہ تم قتل عثمان کے موقع پر کہاں تھے کہا کہ تھا تو مدینہ ہی میں مگر میں ان کی کوئی مدد نہ کر سکا۔ کہا کہ تم پر ان کی نصرت و حمایت واجب تھی اور تم نے اس سے کنارہ کشی کی۔ ابوالطفیل نے کہا:۔

منعني ما منعك اذ تربص به	جو مانع تمہارے لئے تھا وہی مانع میرے لئے
ريب المنون وانت بالشام۔	تھا تم شام میں بیٹھے رہے اور مصیبتوں کے
(مروج الذہب۔ جلد ۲۔ صفحہ ۶۲)	بادل اُن کے سر پر منڈلاتے رہے"۔

کہا کہ میری یہ نصرت و امداد کیا کم تھی کہ میں ان کے خون کے قصاص کے لئے لڑا۔ کہا کہ تمہارا اور عثمان کا معاملہ ایسا ہی ہے جیسا جعدی نے کہا ہے:۔

لا الفينك بعد الموت تندبني	وفي حياتي ما زودتني زادا
مر گیا میں تو زمانے نے بہت یاد کیا	زیست میں کوئی مرے حال کا پرساں نہ ہُوا

اب ان عمال میں سے چند نمایاں افراد کا اجمالی تعارف درج کیا جاتا ہے تاکہ ہمارے موقف کی مزید وضاحت ہو سکے۔

معاویہ ابن ابی سفیان

معاویہ ہند بنت عتبہ کے بطن سے ابوسفیان ابن حرب کے فرزند تھے۔ ہند پہلے فاکہہ ابن مغیرہ کی زوجیت میں تھی۔ جب فاکہہ بنی جذیمہ کے ہاتھ سے مارا گیا تو حفص ابن مغیرہ سے عقد کر لیا اور حفص کے

مرنے کے بعد ابوسفیان کے نکاح میں آئی۔ ہند مکہ کی بدنام عورتوں میں سرفہرست اور اسلام دشمنی میں پیش پیش تھی۔ غزوۂ احد میں جنگی ترانہ گا کر مسلمانوں کے خلاف جنگ کی ترغیب دیتی رہی اور عم رسول حضرت حمزہ کا کلیجہ دانتوں سے چبا کر وحشت و بربریت کی مثال قائم کی اور "اکلۃ الاکباد" (جگر خوارہ) کا لقب پایا۔ اسی طرح ابوسفیان بھی پیغمبر کا بدترین دشمن اور اس سازش میں شریک تھا جس سازش کے نتیجہ میں پیغمبر اکرم کو گھر بار چھوڑ کر مدینہ کی طرف ہجرت اختیار کرنا پڑی۔ ہجرت کے بعد بھی آنحضرت کے خلاف فوجکشی کرتا رہا اور بدر، اُحد اور احزاب کی جنگیں لڑیں۔ جب ۸ھ میں مکہ فتح ہوا تو اپنے بیٹے معاویہ کے ساتھ اسلام قبول کر لیا تاکہ اپنا اور اپنی اولاد کا تحفظ کر سکے۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے تحریر کیا ہے:۔

اسلم هو و ابوه یوم فتح مکة	معاویہ اپنے باپ ابوسفیان کے ساتھ فتح مکہ کے
وشهد حنینا و کان من المولفة	دن اسلام لایا اور غزوۂ حنین میں شریک ہوا اور
قلوبهم۔ (تاریخ الخلفاء۔ ص۱۳۵)	اس کا شمار مولفۃ القلوب میں ہوتا ہے"۔

مولفۃ القلوب سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اسلام کی صداقت سے متاثر ہوئے بغیر اسلامی سطوت سے مرعوب ہو کر یا جان کے ڈر سے اسلام کی آڑ لے لی تھی اور جس طرح ہر مفتوح فاتح کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے انہوں نے بھی پیغمبر کے آگے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ چنانچہ امیر المومنین نے ان لوگوں کے بارے میں فرمایا۔ واللہ ما اسلموا ولکن استسلموا۔ "خدا کی قسم یہ لوگ اسلام نہیں لائے تھے بلکہ سر جھکا دیئے تھے"۔ اس ظاہری اسلام کے باوجود آنحضرت نے انہیں اسلامی جماعت میں شامل کر لیا تاکہ رفتہ رفتہ اسلام سے متاثر اور اس کے تعلیمات و معارف سے آگاہ ہو سکیں بلکہ ان کی دلجوئی کے لئے عام مسلمانوں سے زیادہ ان کے ساتھ مراعات برتتے۔ چنانچہ غزوۂ حنین کے مال غنیمت میں سے عام مسلمانوں سے زیادہ انہیں دیا اور ابوسفیان اور اس کے دونوں بیٹوں یزید اور معاویہ کو بھی مولفۃ القلوب والا حصہ یعنی سو سو اونٹ دیئے جبکہ عام مسلمانوں کو چار چار اونٹ دیئے گئے تھے حالانکہ ابوسفیان مسلمانوں کی وقتی ہزیمت پر بغلیں بجاتا تھا اور خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔

شام پر معاویہ کے تسلط و اقتدار کی صورت یوں پیدا ہوئی کہ حضرت ابوبکر نے شام پر لشکر کشی کا ارادہ کیا اور عمرو ابن عاص، شرجیل ابن حسنہ، ابوعبیدہ جراح اور یزید ابن ابی سفیان کی زیر کمان چار لشکر ترتیب دیئے اور ان سرداران لشکر سے یہ معاہدہ کیا کہ فتح کے بعد ابوعبیدہ حمص پر، شرجیل ابن حسنہ اردن پر، عمرو ابن عاص اور علقمہ ابن مجزز فلسطین پر اور یزید ابن ابی سفیان دمشق پر حاکم ہوں گے۔ اس قرار داد کے بعد چاروں لشکر مختلف راستوں سے روانہ ہوئے اور مقام یرموک میں جمع ہو گئے۔ مسلمانوں کے سامنے رومیوں کا لشکر گراں تھا جس کے مقابلہ کی طاقت اپنے اندر نہ پاتے ہوئے انہوں نے حضرت ابوبکر سے مزید کمک طلب کی حضرت ابوبکر نے خالد ابن ولید کو نو ہزار کے لشکر کے ساتھ عراق سے یرموک جانے کا حکم دیا اور

لشکر کی تعداد چالیس ہزار یا زیادہ سے زیادہ چھیالیس ہزار تک پہنچ گئی۔ یزید کے لشکر میں سہیل ابن عمرو اور مکّہ کے چند شیوخ مشیر کی حیثیت سے شامل تھے اور علم لشکر معاویہ کے ہاتھ میں تھا۔

اس جنگ کے دوران ۲۱ جمادی الثانیہ ۱۳ھ کو حضرت ابوبکر وفات پا گئے اور حکومت حضرت عمر کی طرف منتقل ہو گئی۔ ان کے دور میں ماہ رجب ۱۴ھ کو چھ ماہ کے محاصرہ کے بعد دمشق فتح ہو گیا اور یزید ابن ابی سفیان دمشق کا حاکم قرار پایا۔ ۱۸ھ میں یزید مرض طاعون میں مبتلا ہو کر انتقال کر گیا اور حضرت عمر نے اس کی جگہ معاویہ ابن ابی سفیان کو جو دمشق میں موجود تھے امیر مقرر کر دیا۔ حضرت عمر کے انتقال کے بعد ۲۳ھ میں جب حضرت عثمان برسر اقتدار آئے تو انہوں نے دمشق کے علاوہ اُردن فلسطین لبنان حمص اور قنسرین بھی ان کے حوالے کر دیئے اور جس اقتدار کی طرح حضرت ابوبکر نے ڈالی تھی حضرت عمر نے اسے عملی صورت دی اور حضرت عثمان نے اسے تکمیل تک پہنچایا۔

یہ امر انتہائی تعجب خیز ہے کہ وہ اکابر صحابہ جن کی اہلیت کارِ مسلم اور اسلامی خدمات ناقابل انکار ہیں نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں اور ان لوگوں کو جو اسلام کے دشمن بنی ہاشم کے دیرینہ معاند اور پیغمبر اسلام کے مقابلہ میں صف آرا رہے اور فتح مکہ کے موقع پر مجبوری کی صورت میں اسلام لائے شام ایسی وسیع مملکت کا بااختیار حاکم بنا دیا جاتا ہے گویا:

منزل انہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

حضرت عمر نے معاویہ کو صرف امارتِ شام کا عہدہ ہی سپرد نہیں کیا بلکہ ان کے اقتدار کے دوام و استحکام کی بھی تدبیر کر گئے اور لوگوں کو یہ ہدایت دے گئے کہ وہ حالات میں تبدیلی رونما ہوتے دیکھیں تو ان کے گرد جمع ہو جائیں۔ چنانچہ ابن حجر مکّی تحریر کرتے ہیں:۔

ان عمر حض الناس علیٰ اتباع معاویۃ والھجرۃ الیہ الی الشام اذا وقعت فرقۃ۔	حضرت عمر لوگوں کو معاویہ کی پیروی پر اُبھارتے اور انہیں آمادہ کرتے کہ جب آپس میں پھوٹ پڑے تو ہجرت کر کے معاویہ کے پاس شام چلے جائیں۔"

(تطہیر الجنان۔ ص ۱۹)

یہ امر کسی ثبوت کا محتاج نہیں ہے کہ بنی امیہ کے دلوں میں بنی ہاشم کی طرف سے ہمیشہ بغض و عناد کارفرما رہا اور معاویہ کے دل میں اس موروثی دشمنی کے علاوہ حضرت علی کی طرف سے انتقامی جذبہ کی چنگاریاں بھی بھڑک رہی تھیں کیونکہ ان کا نانا عتبہ، بھائی حنظلہ اور ماموں ولید حضرت ہی کے ہاتھوں سے اپنے کیفر کردار کو پہنچے تھے اور عرب کی افتاد طبیعت کچھ ایسی ہی واقع ہوئی ہے کہ وہ انتقامی جذبات سے اپنے دل و دماغ کو خالی نہیں رکھ سکتے۔ اگرچہ اسلام نے اسے ختم کرنا چاہا مگر صدیوں کی رچی بسی ہوئی خو اپنا عمل مشکل ہی سے تبدیل کیا کرتی ہے۔ حضرت عمر کی دور رس نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ یہ انتقامی جذبہ افتراق و انتشار اور جنگ و

جمل کی صورت میں ابھر سکتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لوگوں کے ذہن پلٹا کھائیں اور اقتدار کا رخ حضرت علی کی طرف مڑ جائے۔ اس صورت میں معاویہ کا اقتدار خطرہ میں پڑ سکتا ہے۔ انہوں نے پیش بندی کرتے ہوئے لوگوں کو معاویہ کے اتباع اور شام کی طرف ہجرت کر جانے کی ہدایت کی تاکہ عوامی طاقت ان کی پشت پر رہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور حضرت کے برسر اقتدار آتے ہی لوگ جوق در جوق شام کی جانب چل دیئے اور معاویہ کے اشارۂ چشم و ابرو پر چلتے پھرتے نظر آنے لگے۔ اگر یہ افتراق حضرت عمر کے پیش نظر نہ تھا تو اور کون سی افتراق و انتشار کی صورت انہیں نظر آ رہی تھی کہ جس کی بنا پر حق کے اتباع کے بجائے معاویہ کے اتباع کا اور دار الہجرت مدینہ کی مرکزیت کو مضبوط کرنے کے بجائے شام کو دار الہجرت قرار دینے کا حکم دیا۔

حضرت عمر سے یہ امر مخفی نہ تھا کہ معاویہ جس طرزِ زندگی کو اختیار کئے ہوئے ہیں وہ قیصری و کسروی طرزِ زندگی ہے جسے اسلام اور اسلام کے سادہ طرز معاشرت سے دور کا لگاؤ بھی نہیں ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت عمر شام آئے تو معاویہ کے تزک و احتشام اور شان و شکوہ کو دیکھ کر کہا کہ تم تو عرب کے کسریٰ ہو اور میں نے سنا ہے کہ حاجتمند تمہارے دروازے پر کھڑے رہتے ہیں اور تم گھر میں پڑے رہتے ہو۔ معاویہ نے کہا کہ ہم ایک ایسی سرزمین پر ہیں جہاں دشمن کے جاسوس ہماری ایک ایک بات پر نظر رکھتے ہیں اور اپنے مرکز کو معلومات بہم پہنچاتے ہیں ہم چاہتے ہیں کہ سطوت و شکوہ کا مظاہرہ کر کے ان پر اپنا رعب و دبدبہ قائم رکھیں۔ حضرت عمر نے یہ جواب سنا تو کہا کہ یہ ایک زیرک آدمی کی سخن طرازی ہے علامہ طبری نے لکھا ہے کہ حضرت عمر کہا کرتے تھے:۔

تذکرون کسری و قیصر و دھاءھما و عندکم معاویۃ	تم کسریٰ و قیصر اور ان کی چالبازیوں کے تذکرے کرتے ہو حالانکہ معاویہ تمہارے درمیان موجود ہے"۔

(تاریخ طبری۔ ج۴۔ ص۲۴۴)۔

مگر اس کے باوجود ان کے لئے اقتدار کی راہ ہموار کی اور ان کے ذہن میں یہ بٹھا دیا کہ وہ باہمی اختلافات سے فائدہ اٹھا کر خلافت پر قبضہ کر سکتے ہیں اور اس طرح نفسیاتی طور پر انہیں خلافت کا امیدوار بنا دیا چنانچہ ابن ابی الحدید نے ابو عثمان جاحظ کی کتاب السفیانیہ کے حوالے سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمر نے اصحاب شوریٰ سے کہا:۔

انکم ان تعاونتم و توازرتم و تناصحتم اکلتموھا و اولادکم و ان تحاسدتم و تقاعدتم و تدابرتم و تباغضتم غلبکم	اگر تم نے باہمی تعاون دستگیری اور خیر خواہی کے جذبات سے کام لیا تو تم اور تمہاری اولادیں خلافت سے بہرہ اندوز ہوتی رہیں گی اور اگر تم نے آپس میں حسد و بغض رکھا اور ایک دوسرے کا

علےٰ ھٰذا الامر معاویۃ ابن ابی سفیان۔ (شرح ابن ابی الحدید جز ۹ ص ۳۱)

ہاتھ بٹانے میں کوتاہی کی تو پھر معاویہ ابن ابی سفیان تمہیں مغلوب کر کے خلافت ہتھیا لے گا"۔

یہ بات معاویہ کے گوشگزار ہوئی ہوگی تو طبعاً اُن کے خیالات نے کروٹ لی ہوگی اور ذہنی رخ خلافت کی طرف مُڑ گیا ہوگا۔ چنانچہ ان کے حرکات و سکنات سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ انہوں نے حضرت عثمان کے زمانۂ خلافت ہی میں اقتدار کے لئے بھاگ دوڑ شروع کر دی تھی اور ان کے قتل کے بعد تو اُن کی سرگرمیوں میں اور تیزی آگئی اور ہر جائز و ناجائز طریق کار سے اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔

جب شام پر اموی پھریرا لہرایا تو سلطنت روما کے زیر اثر رہنے کی وجہ سے اُس پر رومی تمدن چھایا ہوا تھا۔ حکومت کے اثرات دیرپا ہوتے ہیں اسلام کے بعد بھی وہاں کے لوگوں پر رومی اثرات غالب رہے اور معاویہ نے بھی اسلام کی سادہ زندگی کو چھوڑ کر وہیں کا طرزِ معاشرت اختیار کر لیا۔ اپنے تعمیر کردہ قصر خضراء میں بڑے ٹھاٹ سے رہتے دروازہ پر پولیس کا پہرہ زرین کمر غلاموں کا جھرمٹ مصاحبوں کا جمگھٹا اور دربار کا کر و فر قیصری و کسروی شان کا آئینہ دار تھا۔ یہ تمکنت و شکوہ اور نگاہوں میں خیرگی پیدا کرنے والا سامان آرائش عوام کو مرعوب و متاثر کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ لیکن جہاں انہیں یہ شبہ ہوتا کہ شاہی آن بان اور مادی ساز و سامان کا اثر نہیں لیا جائے گا تو وہاں اور طریقہ اختیار کیا جاتا۔

چنانچہ ایک مرتبہ عمرو ابن عاص مصریوں کے ایک وفد کے ہمراہ دمشق آئے اور چاہا کہ وفد کی نظروں میں معاویہ کی اہمیت گرائے اور ان کے کبر و غرور کو ٹھیس لگائے۔ عمرو نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ جب تم معاویہ کے ہاں جانا تو اُسے خلیفہ کہہ کر سلام کرنے کے بجائے عام طریقہ سے سلام کرنا اور گفتگو میں ایسا انداز اختیار کرنا کہ گویا تم ایک عام آدمی سے مخاطب ہو اور ان کے دبدبہ شاہی سے قطعاً مرعوب نہیں ہو اس طرح تمہارا وقار بڑھے گا اور قدر و منزلت زیادہ ہوگی۔ معاویہ نے پہلے ہی سے تاڑ لیا تھا کہ عمرو مصریوں کی نظر میں انہیں غیر اہم ثابت کرنا چاہتا ہے انہوں نے دربانوں کو بلا کر کہا کہ جب مصری وفد باریابی کے لئے آئے تو انہیں اس طرح جھنجھوڑنا کہ ان کے سارے کس بل نکل جائیں اور ان میں سے ہر شخص یہ سمجھنے لگے کہ اُسے موت کی طرف ڈھکیلا جا رہا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور جب وہ دربانوں کے ہاتھوں ذلیل ہو کر بوکھلائے ہوئے معاویہ کے سامنے آئے تو ابن خیاط نامی ایک شخص آگے بڑھا اور السلام علیك یا رسول اللہ کہہ کر انہیں سلام کیا اس کے بعد جو شخص آگے بڑھتا انہی لفظوں میں سلام کرتا اور جب دربار سے باہر نکلے تو عمرو نے برہم ہو کر کہا۔

لعنکم اللہ نھیتکم ان تسلموا علیہ بالامارۃ فسلمتم علیہ بالنبوۃ۔ (تاریخ طبری جز ۶ ص ۲۴۴)

"تم پر خدا کی پھٹکار میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ اسے خلیفہ کہہ کر بھی سلام نہ کرنا چہ جائیکہ تم نے اسے یا رسول اللہ کہہ کر سلام کیا"۔

یہ امر حیرت انگیز ہے کہ معاویہ اپنے بارے میں یا رسُول اللہ کے الفاظ سُنتے ہیں اور ان کی قوتِ سامعہ پر گراں نہیں گزرتے حالانکہ ان لفظوں سے کسی اور کو مخاطب کیا جاتا تو اس کی رُوح لرز اُٹھتی اور کان کے پردے پھٹ جاتے مگر وُہ چپ سادھ لیتے ہیں۔ اگر اس موقع پر خاموشی میں کوئی مصلحت تھی تو بعد میں اس کی تردید کرتے مگر وہ نہ اس کی تردید ضروری سمجھتے ہیں اور نہ کہنے والوں کو تنبیہہ و سرزنش کرتے ہیں۔ کیا بعید ہے کہ وُہ ڈرا سہما و فدا نہیں ربّ اعلےٰ کے الفاظ سے مخاطب کرتا جب بھی وُہ خاموش رہتے اور اس کی تردید غیر ضروری سمجھ کر ٹال دیتے۔

جہاں ذہن کی روش اس طرح کی ہو وہاں یہ تصوّر بھی نہیں کیا جاسکتا کہ اسلام کے اصول و ضوابط کا احترام یا اس کے اوامر و نواہی کی پابندی ضروری سمجھی جاتی ہوگی۔ چنانچہ ریشم جسے شریعت نے مردوں کے لئے حرام کیا ہے بے کھٹکے پہنا جاتا سونے اور چاندی کے برتن کھنکتے شراب کے دُور چلتے اور بے جھجک جام دُوسروں کے سامنے پیش کئے جاتے۔ عبداللہ ابن بریدہ کہتے ہیں کہ میں اپنے والد کے ہمراہ معاویہ کے ہاں گیا ہمیں فرش پر بٹھایا گیا اور کھانے کے بعد ہمارے سامنے شراب پیش کی گئی۔ میرے والد نے شراب کو دیکھا تو کہا:۔

ما شربته منذ حرمه رسول الله۔ (مسند احمد ابن حنبل ج۵ ص۳۴۷)	جب سے رسُول اللہ نے شراب کو حرام کیا ہے میں نے اسے مُنہ نہیں لگایا"۔

دین میں ان کے بدعات و اولیات کا سلسلہ بھی طویل ہے۔ چنانچہ اپنے باپ کی ناجائز اولاد زیاد ابن سمیہ کو فرزند ابو سفیان قرار دے کر ارشاد نبوی الولد للفراش وللزانی الحجر (بچہ شوہر کا ہوگا اور زانی کے لئے پتھر ہے) کا مذاق اُڑایا خطبات میں امیر المومنین پر سب و شتم کو رواج دیا نماز عیدین سے قبل اذان کا اجرا کیا خطبۂ عید کو نماز پر مقدم کر دیا کھڑے ہو کر خطبہ دینے کے بجائے بیٹھ کر خطبہ دینے کا آغاز کیا اور اُن کے بعد بنی امیہ نے اسے اپنا شعار بنا لیا۔ اموی دور کے بعد جب سفاح عباسی برسر اقتدار آیا اور اس نے کھڑے ہو کر خطبہ دیا تو مجمع نے پکار کر کہا:۔

یا ابن عم رسُول الله احییت السنة احیاك الله۔ (محاضرة الاوائل ص۸۴)	اے فرزند عم رسول تم نے پھر سے سنت کو زندہ کیا خدا تمہیں زندہ رکھے"۔

نماز میں بلند آواز سے بسم اللہ کا پڑھنا ترک کر دیا۔ محمد ابن عقیل تحریر کرتے ہیں:۔

هو اوّل من ترك الجهر بالتسمية فی الصّلوٰة بالمدينة حتیٰ انكر عليه المهاجرون والانصار وقالوا اسرقت التسمية یا	معاویہ نے مدینہ میں سب سے پہلے نماز میں بلند آواز سے بسم اللہ پڑھنے کو ترک کیا یہاں تک کہ مہاجرین و انصار نے اس کے خلاف آواز بلند کی اور کہا اے معاویہ تم نے بسم اللہ کی چوری

کی ہے"۔ معاویۃ۔ (نصائح کافیہ۔ ص۹۶)۔

اسلام کے واضح احکام میں ردوبدل کے ساتھ ان تقریبات و رسوم کو فروغ دیا جو غیر مسلموں میں رائج تھے۔ کلیدی عہدے غیر مسلموں کے سپرد کئے اور مدینہ کی مرکزیت کو مضمحل کرنے کی تدبیر کی۔ چنانچہ نوروز و مہرجان کے تہوار منائے جاتے اور تحائف کے نام پر رقمیں وصول کی جاتیں۔ مرکزی دفتر کا افسر ایک عیسائی سرجون رومی تھا اور حمص کے محکمہ خراج کا نگران اعلیٰ ابن اوثال بھی مسیحی تھا۔ ۵۰ھ میں حج کے بعد مدینہ آئے تو منبر رسول کو شام منتقل کرنے کا ارادہ کیا جب اسے اٹھانے کے لئے حرکت دی تو سورج کو گہن لگ گیا۔ دیکھنے والے دہشت زدہ ہو گئے اور آخر لوگوں کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر اپنا ارادہ بدل دیا اور بات یہ بنائی کہ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اسے دیمک تو نہیں لگ گئی۔

یہ واقعہ حسان ابن کلال عبدی کے واقعہ سے ملتا جلتا ہے۔ اس نے بھی یہ چاہا تھا کہ خانہ کعبہ کو مسمار کرکے اس کے پتھر یمن لے جائے مگر قدرت نے اسے ایسا جکڑا کہ وہ اپنے ارادہ میں ناکام و نامراد رہا۔ اسی طرح یہاں فطرت کے خشمگین تیور گہن کی صورت میں آڑے آئے اور منبر نبوی کو منتقل کرنے کی کوشش ناکام ہو گئی۔

معاویہ کے وہ افعال و اعمال جو اسلامی قدروں کو پامال اور امت مسلمہ کے شیرازہ کو منتشر کرنے کا باعث ہوئے یوں تو ان گنت ہیں مگر ان کا اپنے بدکردار اور ناہنجار بیٹے یزید کو ولیعہد بنانے کا اقدام ایک ایسا مہلک اقدام ہے کہ وہ گروہ جو صحابہ پر جرح و نقد اور ان کی باہم آویزیوں پر تبصرہ تک کا روادار نہیں ہے وہ بھی اس کے خلاف آواز اٹھائے بغیر نہ رہ سکا اور یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ ان کے اس اقدام نے خلافت کا رخ ملوکیت کی طرف موڑ دیا اور ایک ایسی بدعت کی داغ بیل ڈال گئے جو صدیوں تک اسلامی دنیا میں جاری و ساری رہی اور اس استبدادی و غیر آئینی کارروائی کے نتیجہ میں ہر فرمانروا جو خلیفۃ المسلمین کے نام سے مسند خلافت پر بیٹھا خلافت کو اپنی ملکیت و جاگیر سمجھتے ہوئے اپنے وارثوں کی طرف منتقل کرتا رہا۔

معاویہ کا یہ اقدام نہ صرف شرعی اعتبار سے غلط تھا بلکہ اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی قابل مذمت ہے کیونکہ انہوں نے امام حسن علیہ السلام سے معاہدہ صلح میں یہ شرط تسلیم کر لی تھی کہ وہ اپنے بعد کے لئے کسی کو خلیفہ نامزد نہیں کریں گے مگر ان کا یہ معاہدہ پادر ہوا ثابت ہوا اور انہوں نے عامۂ مسلمین کی ناپسندیدگی کے باوجود معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مسلمانوں کی زمام قیادت یزید کے ہاتھوں میں دے دی۔ معاویہ کا مطمح نظر شروع ہی سے موروثی سلطنت کا قیام تھا جس کے لئے انہوں نے شرعی حدود تک نظرانداز کر دیئے تھے تو پھر وعدہ کی خلاف ورزی کو کیا اہمیت دیتے اور لوگوں کی ناپسندیدگی کو کیا خاطر میں لاتے انہیں تو بہر صورت یہ قدم اٹھانا تھا اور وہ اٹھا کر رہے اور جن لوگوں کے بارے میں انہیں یہ کھٹکا

تھا کہ وہ اُسے تسلیم نہیں کریں گے یا اُسے عملی صورت دینے میں روڑے اٹکائیں گے اور اپنے اثر و نفوذ سے کام لے کر دوسروں کو بھی اپنا ہمنوا بنالیں گے ان میں سے کسی سے مصلحتہً کوئی تعرض نہ کیا اور کسی کو ڈرا دھمکا کر مہر بلب کر دیا اور کسی کو زر و مال یا عہدہ دے کر ہموار کر لیا اور جو کسی صورت میں رکتے نظر نہ آئے انہیں خفیہ طور پر زہر دلوا کر راستے سے ہٹا دیا۔ چنانچہ امام حسنؑ کو جعدہ بنت اشعث کے ذریعہ زہر دلوایا۔ مسعودی نے تحریر کیا ہے:۔

قد کان معاویۃ دس الیھا ان احتلت فی قتل الحسن وجھت الیك بمائۃ الف درھم و زوجتك یزید۔	معاویہ نے اسے چپکے چپکے یہ پیغام بھیجا کہ اگر تو کسی حیلہ سے حسن کا کام تمام کر دے تو میں تجھے ایک لاکھ درہم دوں گا اور یزید سے تیرا عقد کر دوں گا۔"

(مروج الذہب۔ ج ۲۔ ص ۵۰)

اس سازش کے ماتحت اس نے زہر سے امام حسنؑ کی زندگی کا خاتمہ کر دیا اور اس کے صلہ میں معاویہ نے اسے ایک لاکھ درہم بھجوا دیئے اور دوسرے وعدہ سے یہ کہہ کر گریز کیا کہ مجھے یزید کی زندگی عزیز ہے۔

اسی طرح خالد ابن ولید کے بیٹے عبدالرحمٰن کو زہر دلوا کر ختم کیا۔ ابن عبدالبر نے تحریر کیا ہے کہ معاویہ نے شام میں خطبہ دیتے ہوئے کہا کہ اے لوگو میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور موت کی ساعت قریب ہے میں چاہتا ہوں کہ اپنے بعد کے لئے کوئی انتظام کر جاؤں۔ معاویہ کا خیال تو یہ تھا کہ لوگ سطوت و قوت سے متاثر ہو کر یا خوشامد درامد کی بنا پر یزید کا نام لیں گے اور وہ رائے جمہور کی آڑ میں اس کی ولیعہدی کا اعلان کر دیں گے مگر لوگوں سے یزید کی بدعنوانیاں مخفی نہ تھیں اور وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ خلافت کے سلسلہ میں اس کا نام لیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے عبدالرحمٰن ابن خالد کا نام لیا۔ معاویہ نے یزید کے بجائے عبدالرحمٰن کا نام سنا تو اس کی طرف سے ان کے دل میں گرہ پڑ گئی اور چاہا کہ یزید کے راستے سے اس سنگِ گراں کو ہٹا دیں۔ چنانچہ عبدالرحمٰن کی بیماری کی خبر سنی تو اپنے ہاں کے ایک طبیب کو لالچ دے کر آمادہ کیا کہ:۔

ان یاتیه فیسقیه سقیة یقتله بھا۔ (استیعاب۔ ج ۲۔ ص ۴۰۱)	وہ اس کے ہاں جائے اور دوا پلا کر اس کا کام تمام کر دے۔"

چنانچہ اسے دوا کے بہانے زہر دے دیا گیا۔

عبدالرحمٰن ابن ابی بکر بھی اسی حربہ کا شکار ہوئے۔ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے کہ جب معاویہ نے یزید کی بیعت لینے کا ارادہ کیا تو عبدالرحمٰن ابن ابی بکر نے کہا:۔

اهرقلية كلما مات قيصر كان قيصر مكانه لا نفعل والله ابداً (اصابہ۔ج۲۔ص۴)	کیا وہی ہرقلی نظام کہ ایک قیصر مر جائے تو دوسرا قیصر اس کی جگہ لے لے۔ خدا کی قسم ہم اس کے لئے تیار نہیں ہیں"۔

معاویہ نے اُن کا مُنہ بند کرنے کے لئے ایک لاکھ درہم بھجوائے مگر انہوں نے وُہ درہم واپس کر دیئے اور کہا کہ میں دُنیا کے عوض دین نہیں بیچوں گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ مکہ جاتے ہُوئے ابھی دس میل کا فاصلہ طے کیا تھا کہ موت کی نیند سُلا دیئے گئے۔ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے:۔

كان موته فجأة من نومة نامها۔ (اصابہ۔ج۲۔ص۴)	عبدالرحمٰن سوتے میں ناگہانی طور پر مَر گئے"۔

عمرو ابن عاص

عمرو کا باپ عاصی ابن وائل تھا جسے قرآن نے ابتر (بے اولاد) اور دشمن رسُول کہا ہے۔ ماں کا نام سلمیٰ بنت حرملہ اور لقب نابغہ تھا۔ بنی عنزہ سے اسیر کر کے لائی گئی عکاظ کے بازار میں بکی فاکہہ ابن مغیرہ نے اسے خریدا اور پھر عبداللہ ابن جدعان کے ہاتھ بیچ ڈالا اور یُوں بکتی بکاتی عاصی ابن وائل تک پہنچ گئی اور اپنی کوکھ سے عمرو کو جنم دیا۔

عمرو نے اسلام دشمنی اپنے باپ عاصی سے ورثہ میں پائی تھی۔ چنانچہ دشمنان اسلام کی صف اوّل میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ پیغمبر اسلام کی شان میں ناسزا کلمات کہتا اور آپ کے خلاف جنگ و قتال کے معرکے گرم کرتا رہا۔ جب اسلام کے غلبہ و اقتدار کے آگے اپنے کو بے بس پایا تو اسلام قبول کر کے مسلمانوں کی صف میں شامل ہو گیا۔ حضرت عمر نے اپنے دور خلافت میں اسے فلسطین و اردن کا امیر نامزد کیا اور جب یہ علاقہ معاویہ کے زیر نگین کیا تو اُسے فوج دے کر مصر روانہ کر دیا۔ اس نے مصریوں سے جنگ کر کے اُسے فتح کر لیا اور مرکز کی طرف سے وہاں کا حاکم قرار پایا۔ حضرت عمر کے بعد حضرت عثمان نے بھی اسے کچھ عرصہ امارت پر بحال رکھا پھر ۲۶ھ میں اسے معزول کر کے اپنے دُودھ شریک بھائی عبداللہ ابن سعد کو وہاں کا والی بنا دیا جو لشکر کشی کے موقع پر میمنۂ لشکر کا سردار تھا۔ عمرو جو حضرت عثمان کا ہوا خواہ تھا اس برطرفی کی بنا پر ان کا شدید مخالف ہو گیا اور اسے مخالف ہونا ہی چاہیئے تھا اس لئے کہ اس کی دوستی مفاد و خود غرضی سے وابستہ تھی۔ یہ مخالفت اس حد تک بڑھی کہ اس نے محاذ قائم کر کے لوگوں کو ان کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا۔ ابن عبدالبر تحریر کرتے ہیں:۔

كان عمرو ابن عاص منذ عزله عن مصر يعمل حيلة في التاليب	حضرت عثمان نے عمرو ابن عاص کو مصر کی امارت سے الگ کیا تو وُہ لوگوں کو اُن کے خلاف بھڑکانے اور

والطعن علی عثمان۔ (استیعاب۔ ج ۳۔ ص ۳۲۲)۔ — اُن پر زبانِ طعن کھولنے لگا"۔

اس نے اسی پر بس نہ کی بلکہ طیش میں آکر اپنی بیوی اُم کلثوم بنت عقبہ کو جو حضرت عثمان کی مادری بہن تھی طلاق دے دیا اور اُن کی حکومت کا تختہ اُلٹنے کے لئے سرگرم عمل ہوگیا۔ حضرت عثمان نے اس کا یہ رویہ دیکھا تو اُسے بلا کر کہا کہ اے نابغہ کے بیٹے تم ان حرکات سے باز آؤ اور نفاق و دورخی چھوڑ کر شریفانہ طرزِ عمل اختیار کرو۔ عمرو نے بھی اسی لب و لہجہ میں جواب دیا اور ان پر اعتراضات کی بوچھار کردی۔ حضرت عثمان اس کی باتوں پر سٹپٹائے اور تنگ آکر کہا کہ تمہیں میرے کاموں پر نکتہ چینی اور میرے معاملات میں دخل اندازی کا کوئی حق نہیں ہے۔ میں زمانۂ جاہلیت میں بھی تم سے زیادہ محترم تھا اور اب بھی زیادہ باوقار ہوں۔ عمرو نے کہا کہ ہاں ہاں میں نے آپ کے باپ عفان کو دیکھا ہے وہ کسی لحاظ سے میرے باپ عاصی ابن وائل کا ہمپایہ نہ تھا۔ اس پر حضرت عثمان نے تو کچھ نہ کہا لیکن مروان پیچ و تاب کھانے لگا اور حضرت عثمان سے کہا اب آپ کی حیثیت یہ رہ گئی ہے کہ عمرو آپ کے باپ تک کو نہیں بخشتا۔ اس دو بدو تلخ کلامی کے بعد عمرو نے اپنی سرگرمیوں کو اور تیز کر دیا اور طلحہ و زبیر اور دوسرے لوگوں کو ان کے خلاف ابھارا اور جب عوام و خواص کے جذبات ان کے خلاف بھڑک اُٹھے اور اُن کے گرد گھیرا ڈال دیا گیا تو مدینہ سے نکل کھڑا ہوا اور فلسطین میں جہاں اس کا عالیشان محل اور وسیع جاگیر تھی چلا آیا تاکہ دُور رہ کر اپنی کوششوں کو بارآور ہوتے دیکھے اور نتائج کی ذمہ داری سے اپنے کو بچالے جائے۔

ایک دن اپنے قصر عجلان میں سلامہ ابن روح جذامی اور اپنے دونوں بیٹوں محمد اور عبداللہ سے مصروف گفتگو تھا کہ ادھر سے ایک سوار کا گزر ہوا اُسے بلا کر پوچھا کہ کہاں سے آرہے ہو کہا مدینہ سے کہا عثمان کا کیا حشر ہوا کہا کہ جب میں مدینہ سے نکلا تھا تو شدید محاصرہ میں تھے۔ اس کے بعد ایک اور سوار ادھر سے گزرا اسے بھی بلا کر پوچھا اس نے کہا کہ وہ قتل کر دیئے گئے ہیں۔ عمرو نے سُنتے ہی کہا:

انا ابو عبداللہ اذا حککت قرحۃ نکأتھا۔ (تاریخ طبری ج ۳ ص ۳۹۲) — میں بھی عبداللہ کا باپ ہوں جب کسی کام میں ہاتھ ڈالتا ہوں تو اُسے ادھورا نہیں چھوڑتا"۔

ابن اثیر نے لکھا ہے کہ جب انہیں قتل عثمان کی خبر ہوئی تو یہ کہا:۔

انا ابو عبداللہ انا قتلتہ وانا بوادی السباع ان یل ھذا الامر طلحۃ فھو فتی العرب — میں عبداللہ کا باپ ہوں میں نے وادی السباع (بڑ سبع) میں رہتے ہوئے عثمان کو قتل کیا ہے اگر طلحہ خلیفہ ہوئے تو وہ جود و سخا کے لحاظ

وان یل ابن ابی طالب فهو اکره من یلیه۔ (تاریخ کامل ج۳۔ ص۱۴۱)	سے عرب کے جوانمرد ہیں اور اگر ابن ابی طالب کو خلافت ملی تو وہ حکمرانی کے اعتبار سے ناپسندیدہ شخصیت ہیں۔"

ابھی وہ اپنی کامیابی کی سرمستیوں میں کھویا ہوا تھا کہ حضرت علی کے خلیفہ منتخب کئے جانے کی خبر سُنی سُنتے ہی سر پکڑ کر رہ گیا۔ اور کچھ دنوں کے بعد جب یہ معلوم ہوا کہ ام المومنین حضرت عائشہ اور طلحہ وزبیر حکومت کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں تو کچھ ڈھارس بندھی اور جنگ جمل کے نتیجہ کا منتظر رہا کہ دیکھئے اُونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے اور جب حضرت علی کی فتحیابی کی خبر سُنی تو رہی سہی آس بھی ٹوٹ گئی مگر جب یہ اطلاع آئی کہ معاویہ نے بیعت سے انکار کر دیا ہے تو یاس و حرمان کی اندھیاریوں میں اُمید کی کرن نظر آنے لگی۔ حکومت کی فکر تو تھی ہی کیونکہ حکومت و اقتدار کے کیف آفریں لمحوں میں ایک عرصہ گزر چکا تھا اور اب اگرچہ عمر کی آخری منزل میں پہنچ چکا تھا مگر جذبۂ جاہ پسندی ایسا نہیں ہے کہ عمر کے کسی حصّہ میں سرد پڑ جائے بلکہ ؎

جوانی سے زیادہ وقت پیری جوش ہوتا ہے   بھڑکتا ہے چراغ صبح جب خاموش ہوتا ہے

چنانچہ وہ حکومت مصر کی دیرینہ آرزو لے کر معاویہ کے ہاں پہنچ گیا اور وہاں کی حکومت کا سودا چکانے کے بعد اپنا تاریخی کارنامہ انجام دیا۔

عمرو ابن عاص سیاسی ہتھکنڈوں اور سازشی حربوں میں ماہر اور پھوٹ ڈلوا کر مقصد براری کے فن میں طاق تھا۔ اسی جوڑ توڑ اور سُوجھ بوجھ کے نتیجہ میں کامیابی کی راہیں پیدا کرتا رہا اگرچہ کامیابی کے لئے اسے دینی و اخلاقی قدروں کی قربانی دینا پڑی مگر حکمرانی و کشورستانی کی سیاست میں ان اقدار کو چنداں اہمیت نہیں دی جایا کرتی جبکہ سیاست کا مقصد ہی کامیابی قرار دے لیا گیا ہے خواہ وہ کذب و افترا پردازی سے حاصل ہو یا قتل و خونریزی سے۔ اور واقعات شاہد ہیں کہ ابن عاص کو ان امور کے ارتکاب سے کوئی باک نہ تھا۔ آخر ۹۰ برس کی طویل زندگی کے بعد ۴۳ھ میں عید الفطر کے دن وفات پائی۔ اس کے فرزند عبد اللہ نے پہلے نماز جنازہ پڑھائی اور پھر نمازِ عید ادا کی۔

عبداللہ ابن سعد

عبداللہ حضرت عثمان کا دُودھ شریک بھائی اور سعد ابن ابی سرح کا بیٹا تھا۔ سعد کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جو اسلام کی آڑ میں اسلام کے خلاف ریشہ دوانیاں کرتے اور اپنے طرز عمل کی بنا پر منافقین کے نام سے یاد کئے جاتے تھے۔ ابن قتیبہ نے تحریر کیا ہے:۔

وابوہ سعد من المنافقین۔ (المعارف ص۱۳۱)	عبداللہ کا باپ سعد منافقین میں شامل تھا۔"

عبداللہ گو صحابی رسول اور کاتب وحی تھا مگر اس کے فکر و عمل کی پشت پر اسی کے باپ کا ذہن کام کر رہا تھا جس کا ثبوت اس کا یہ طرز عمل ہے کہ جب پیغمبر قرآن کی آیات لکھواتے تو ان میں اپنی مرضی سے ردّ و بدل کر دیتا۔ چنانچہ الکافرین کی جگہ الظالمین اور عزیز حکیم کی جگہ علیم حکیم لکھ دیتا۔ ایک مرتبہ انسانی پیدائش کے سلسلہ میں ایک آیت لکھتے ہوئے آیت کے سیاق کی مناسبت سے اس کی زبان سے فتبارک اللہ احسن الخالقین کا جملہ نکل گیا آنحضرت نے فرمایا کہ یہ بھی اسی آیت کا ٹکڑا ہے اسے بھی لکھ لو۔ اس نے لکھنے کو تو لکھ لیا مگر شک میں پڑ گیا کہ قرآن اللہ کا نازل کردہ کلام ہے یا پیغمبر کا ساختہ اور پھر اس کی تشہیر کرنے لگ گیا کہ قرآن میں کوئی خاص ندرت اور بشری طاقت سے بلند تر جوہر بلاغت نہیں ہے ایسا کلام تو میں بھی پیش کر سکتا ہوں۔ اس پر یہ آیۂ قرآنی نازل ہوا۔

ومن اظلم ممن افتریٰ	اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ
علی اللہ کذبا او قال اوحی	تہمت باندھے اور کہے کہ میرے پاس وحی
الی ولم یوحَ الیہ شئ ومن	آتی ہے حالانکہ اس کے پاس وحی نہیں آئی
قال سانزل مثل ما انزل	یا وہ یہ دعویٰ کرے کہ جیسا قرآن اللہ نے اتارا
اللہ۔	ہے ویسا میں بھی نازل کئے دیتا ہوں"۔

پیغمبر اکرم نے اس کی یاوہ گوئی کی بنا پر اسے مدینہ سے نکل جانے کا حکم دیا چنانچہ وہ اسلام سے منحرف ہو کر مکہ میں آ گیا اور یہاں بھی لوگوں سے برملا کہنا شروع کیا کہ محمد خود آیتیں گڑھ لیتے ہیں اور وحی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ حضرت عثمان ایسے لوگوں کے پشت پناہ تو بن ہی جایا کرتے تھے انہوں نے آنحضرت سے سفارش کی کہ اسے مدینہ آنے کی اجازت دی جائے مگر پیغمبر نے کسی صورت میں اسے مدینہ آنے کی اجازت نہ دی۔ جب مکہ فتح ہوا اور آنحضرت فاتح کی حیثیت سے مکہ میں داخل ہوئے تو حکم دیا کہ عبداللہ ابن سعد کو قتل کر دو خواہ وہ خانہ کعبہ کے پردہ سے چمٹا ہوا کیوں نہ ہو۔ حضرت عثمان نے یہ فرمان نبوی سنا تو بہت گھبرائے اور اسے کہیں ادھر ادھر کر دیا۔ جب حالات پُر سکون ہوئے تو اسے لے کر آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ یہ عبداللہ ابن سعد بیعت کے لئے حاضر ہوا ہے اسے امان دی جائے اور اس سے بیعت لی جائے۔ مگر پیغمبر نے نہ بیعت لینے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا اور نہ زبان سے کچھ فرمایا اور دیر تک خاموش رہے۔ ادھر حضرت عثمان کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا۔ آخر پیغمبر اکرم نے اس کی جان بخشی کر دی۔ جب وہ اٹھ کر چلا گیا تو آنحضرت نے ان لوگوں سے جو وہاں موجود تھے فرمایا کہ میں اتنی دیر اس لئے چپ رہا کہ تم میں سے کوئی اٹھے اور اس کی گردن مار دے۔

اما کان فیکم من یقوم الی ھذا	کیا تم میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو اس کتے کی طرف بڑھتا
الکلب قبل ان او منہ فیقتلہ	اور قبل اس کے کہ میں اسے امان دیتا وہ اسے
(انساب الاشراف۔ ج۵۔ ص۳۵۸)	قتل کر دیتا۔"

حضرت عمر نے کہا کہ یا رسُول اللہ آپ نے آنکھ سے اشارہ کر دیا ہوتا تو ہم اُسے قتل کر دیتے۔ آنحضرت نے فرمایا:۔

انی ما اقتل باشارۃ لان الانبیأ	میں اشارہ سے قتل کا حکم نہیں دیا کرتا اور نہ
لایکون لھم خائنۃ الاعین۔	انبیاء آنکھ بچا کر اشارہ بازی کیا کرتے ہیں۔"
(انساب الاشراف۔ ج۵۔ ص۳۵۸)	

حضرت عثمان نے اپنے دورِ خلافت میں اس کی بد اعمالیوں سے چشم پوشی کر کے اسے مصر ایسی وسیع مملکت کا والی بنا دیا۔ گویا دحی میں خیانت اور ارتداد کوئی جرم ہی نہ تھا۔ اس نے امارت مصر پر قابض ہونے کے بعد وہی طرزِ عمل اختیار کیا جس کی اس سے توقع کی جا سکتی تھی۔ ہر طرف جبر و استحصال کے طوفان امنڈ آئے مُلکی خوش حالی نکبت و افلاس میں بدل گئی اور حضرت عثمان کے چند ہوا خواہوں کے علاوہ تمام اہل مصر اس کے مخالف ہو گئے اور عوام کے دلوں میں مرکز کی طرف سے بھی نفرت کے جذبات بھڑک اُٹھے۔ آخر محمد ابن ابی حذیفہ نے اس کی حکومت کا تختہ الٹ کر لوگوں کو اس کے چنگل سے نجات دلائی۔

محمد ابن ابی حذیفہ حضرت عثمان کے پروردہ تھے اور اپنے والد ابو حذیفہ کے جنگ یرموک میں مارے جانے کے بعد انہی کے زیر کفالت رہے۔ جب محمد بڑے ہُوئے تو حضرت عثمان سے کہا کہ مجھے موقع دیجئے کہ اسلام کی ترویج و ترقی میں حصہ لوں اور کسی لشکر میں شریک ہو کر دشمنوں سے جہاد کروں حضرت عثمان نے انہیں عبداللہ ابن سعد کے معاون و مددگار کی حیثیت سے مصر جانے کی اجازت دے دی اور وُہ اپنے چند ہمراہیوں کے ساتھ مصر آ گئے۔ محمد ابن حذیفہ بڑے عابد و متورع اور پرہیزگار تھے انہوں نے والئ مصر کی بے راہرویوں اور انتظامی خرابیوں کو دیکھا تو عبداللہ ابن سعد کو سمجھایا کہ وُہ اپنی روش کو بدلے مگر اس کے عادات و اطوار میں تبدیلی نہ آئی۔ جب وُہ بار بار جھنجھوڑنے پر بھی نہ سنبھلا تو انہوں نے علانیہ لوگوں کو اس کے خلاف کہنا سُننا شروع کر دیا اور حضرت عثمان پر بھی لے دے کی کہ انہوں نے ایک ایسے باغی انسان کو اہل مصر پر مسلط کر دیا ہے جس کا خون پیغمبر نے مباح کر دیا تھا۔ اہل مصر محمد کے تقویٰ و طہارت اور محتاط طرزِ عمل سے متاثر تو تھے ہی ان کے گرد وپیش جمع ہو گئے۔ عبداللہ ابن سعد پہلے ہی اہل مصر کی نظروں سے گرا ہُوا تھا اب اس کا رہا سہا وقار بھی جاتا رہا اور اس کی حکومت بے وزن ہو کر رہ گئی عبداللہ ابن سعد نے یہ صورت حال دیکھی تو حضرت عثمان کو تحریر کیا کہ آپ کے پروردہ ابن ابی حذیفہ نے یہاں کی فضا کو مکدر کر دیا ہے وُہ اُٹھتے بیٹھتے عوام کو حکومت کے خلاف آمادۂ بغاوت کرتے رہتے ہیں اگر اس کا

بندوبست نہ کیا گیا تو بگڑے ہوئے حالات پر قابو پانا مشکل ہو جائے گا۔ جہاں تک میرے بس میں تھا میں نے روک تھام کی مگر اب معاملہ میرے قابو سے باہر ہو گیا ہے۔ حضرت عثمان کو کوئی اور تدبیر نہ سوجھی تو انہوں نے مال و دولت سے اس سیلاب پر بند باندھنا چاہا۔ چنانچہ چند قیمتی پارچے اور تیس ہزار درہم ابن ابی حذیفہ کو بھجوائے مگر یہ تدبیر کارگر ثابت نہ ہوئی اور ابن ابی حذیفہ لالچ کا شکار نہ ہو سکے انہوں نے وہ پارچے اور درہم مسجد میں لاکر ڈھیر کر دیئے اور لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

یا معشر المسلمین الا ترون الی عثمان یخادعنی عن دینی ویرشونی علیہ۔ (تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص ۱۳۵)

اے گروہ مسلمین تم عثمان کی اس حرکت کو نہیں دیکھتے کہ وہ دین کے معاملہ میں مجھے فریب دینا چاہتے ہیں اور یہ مال رشوت کے طور پر مجھے بھیجا ہے۔"

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مخالفت اور شدید ہو گئی بغاوت کے جذبات ابھر آئے اور لوگوں نے علانیہ عبداللہ ابن سعد کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ حضرت عثمان کو اس کا پتا چلا تو انہوں نے ابن ابی حذیفہ کو تحریر کیا کہ مجھے تم سے یہ امید نہ تھی کہ تم میرے احسانات کو یکسر فراموش کر دو گے اور خود بھی علم بغاوت بلند کرو گے اور رعایا کو بھی میرے خلاف بغاوت پر اکساؤ گے۔ مگر ابن ابی حذیفہ پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ برابر عبداللہ کے خلاف تحریک چلاتے رہے۔ آخر اہل مصر کا ایک جتھا مدینہ روانہ ہو گیا تا کہ حضرت عثمان کو مجبور کرے کہ وہ عبداللہ ابن سعد کو اس کے عہدہ سے معزول کر کے کسی دوسرے کا تقرر کریں۔ اس جتھے میں محمد ابن ابی بکر بھی تھے جو مصر میں ابن ابی حذیفہ کے اس تحریک میں معاون تھے۔

اس وفد کے بعد عبداللہ ابن سعد نے بھی مدینہ کا رخ کر لیا اور مصر کا نظم و نسق ابن ابی حذیفہ نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ جب عبداللہ مدینہ جاتے ہوئے مقام ایلہ پر پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ مصریوں نے عراقیوں کے ساتھ مل کر حضرت عثمان کو محاصرہ میں لے لیا ہے اور وہاں جانا خطرہ سے خالی نہیں ہے وہ وہیں سے واپس مصر کی طرف پلٹا مگر ابن ابی حذیفہ نے اسے حدود مصر میں داخل ہونے سے روک دیا۔ جب اسے کوئی ٹھکانا نظر نہ آیا تو فلسطین کی طرف چل دیا اور فلسطین سے متصل مصر کی آخری سرحد پر پہنچ کر ٹھہر گیا اور اس انتظار میں رہا کہ دیکھئے حالات کیا رخ اختیار کرتے ہیں اور اس محاصرہ کا نتیجہ کیا ظاہر ہوتا ہے۔ اسی زمانۂ قیام میں ایک شخص ادھر سے گزرا اس سے دریافت کیا کہ تمہیں مدینہ کی شورش کے بارے میں کچھ علم ہے اس نے کہا کہ عثمان قتل کر دیئے گئے ہیں۔ یہ سنا تو انا للہ وانا الیہ راجعون کہا۔ اور پھر پوچھا کہ خلافت کے لئے کون منتخب ہوا ہے کہا علی ابن ابی طالب یہ سن کر اس نے پھر انا للہ وانا الیہ راجعون کہا۔ اس شخص نے کہا کہ تم حضرت عثمان کے قتل اور حضرت علی کی خلافت دونوں کو ایک طرح کا المیہ سمجھتے ہو۔ پھر غور سے اس کی طرف دیکھا اور کہا کہ تم عبداللہ ابن سعد

تو نہیں ہو کہا کہ ہاں میں عبداللہ ابن سعد ہوں۔ کہا کہ پھر بھاگ کر اپنی جان بچاؤ ورنہ امیر المومنین تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو تہ تیغ کردیں گے یا ملک سے نکال باہر کریں گے۔ عبداللہ وہاں سے دمشق کی طرف چل دیا اور کچھ عرصہ معاویہ کے زیر سایہ رہنے کے بعد ۳۶ھ یا ۳۷ھ میں عسقلان میں وفات پا گیا۔

ولید ابن عقبہ

ولید اروی بنت کریز کے بطن سے عقبہ ابن ابی معیط کا بیٹا اور حضرت عثمان کا مادری بھائی تھا۔ عقبہ بدر میں مسلمانوں کے خلاف محاذ جنگ قائم کرنے والوں میں شامل تھا مسلمانوں نے اُسے اسیر کرکے آنحضرت کے پیش کیا تو آپ نے اس کے قتل کا حکم دیا۔ چنانچہ اسے قتل کر دیا گیا۔ ولید اور اس کے بھائی عمارہ نے فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا یہ اسلام، حق کو حق سمجھنے کا نتیجہ نہ تھا بلکہ ایک طرح کی اطاعت وسپرافگندگی تھی جو مجبوری کی حالت میں اختیار کی جایا کرتی ہے۔

پیغمبر اکرم نے جب زکوٰۃ وصدقات کی وصولی کے لئے مختلف افراد مختلف قبائل کی طرف بھیجے تو ولید کو بنی مصطلق کی طرف بھیجا۔ جب وُہ ان کی بستیوں کے قریب پہنچا تو انہوں نے خیر سگالی کے طور پر اس کا استقبال کرنا چاہا اس نے انہیں آگے بڑھتے دیکھا تو خوفزدہ ہو کر واپس پلٹ آیا اور پیغمبر اکرم سے کہا کہ وُہ لوگ اسلام سے منحرف ہو چکے ہیں اور زکوٰۃ دینے سے انکار کرتے ہیں۔ آنحضرت نے اس پر حیرت واستعجاب کا اظہار کیا اور ان کی تادیب وسرزنش کے لئے قدم اٹھانا چاہا۔ بنی مصطلق کو خبر ہوی تو وُہ آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہُوے اور کہا کہ یا رسُول اللہ ہمارے بارے میں جھوٹ بولا گیا ہے اور ہم پر بہتان باندھا گیا ہے۔ ہم نہ اسلام سے منحرف ہُوے ہیں اور نہ زکوٰۃ دینے سے انکار کیا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوی:۔

ان جاءکم فاسق بنباء فتبینوا ان تصیبوا قوما بجھالۃ۔ — "اگر کوی فاسق تمہارے پاس کوی خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو ایسا نہ ہو کہ تم کسی قوم کو بے خبری کی بنا پر نقصان پہنچاؤ"۔

ایک مرتبہ اس نے حضرت علی سے کہا کہ میں شمشیر زنی وصف شکنی میں آپ سے کم نہیں ہوں حضرت نے فرمایا اسکت یا فاسق۔ "اے فاسق چُپ رہ"۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہُوی:۔

افمن کان مومنا کمن کان فاسقا لا یستوون۔ — "کیا جو شخص ایماندار ہو اس شخص کے برابر ہو جائے گا جو فاسق ہو یہ (دونوں) برابر نہیں ہو سکتے"۔

ابن عباس کہتے ہیں:۔

نزلت فی علی ابن ابی طالب و الولید ابن عقبہ۔ (استیعاب ج ۳۔ ص ۵۹۶)	یہ آیت علی ابن ابی طالب اور ولید ابن عقبہ کے بارے میں نازل ہوی۔"

ان دونوں آیتوں میں لسے فاسق کے لقب سے یاد کیا گیا ہے اور اس کے بعد ہر مجلس اور ہر اجتماع میں اسی نام سے یاد کیا جاتا رہا اور جب تک قرآن مجید پڑھا جاتا رہے گا اسی نام سے یاد کیا جاتا رہے گا۔

حضرت عثمان نے سعد ابن ابی وقاص کو جنہیں حضرت عمر نے مجلس شوری کا رُکن منتخب کیا تھا امارت کوفہ سے معزول کر کے اس فاسق کو کوفہ کی گورنری کے لئے نامزد کیا اور پروانہ حکومت دے کر ادھر بھیج دیا۔ جب یہ کوفہ پہنچا تو چلچلاتی دھوپ میں سعد کے مکان پر آیا سعد کو یہ سان گمان بھی نہ تھا کہ یہ برطرفی کا حکم لے کر آیا ہے۔ پوچھا کہ کیسے آنا ہوا کہا کہ مجھے عثمان نے والئ کوفہ بنا کر بھیجا ہے اور حکم دیا ہے کہ میں تمہیں امارت سے برطرف کر کے بیت المال اور تمہارے مقرر کردہ عمال کا جائزہ لوں۔ سعد نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں کہ تم لوگ زیادہ زیرک و دانا ہو گئے ہو یا ہم حماقت و سفاہت کا شکار ہو گئے ہیں۔ یہ ردو بدل اور نصب و عزل کا کیا چکر ہے۔ کہا کہ اس حکومت نے کس سے وفا کی ہے جو تم سے وفا کرتی یہ صبح کو کسی کی ہوتی ہے اور شام کو کسی کی۔ لہذا جو چیز صبح ہے اور شام نہیں اس کے جانے پر غم نہ کیجئے آخر اسے ایک نہ ایک دن جانا ہی تھا۔ سعد نے کہا کہ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے تم نے اس ملک کو اپنے باپ دادا کی چھوڑی ہوی جاگیر قرار دے لیا ہے کہ جسے چاہا بخش دیا اور جس سے چاہا چھین لیا۔

سعد کوفہ کی امارت ولید کے سپرد کر کے مدینہ واپس آ گئے۔ ولید برسر اقتدار آتے ہی اقتدار کے نشہ میں کھو گیا ناؤ نوش کی مجلسوں میں رونق آ گئی علانیہ شراب کے دَور چلنے لگے اور خم کے خم لنڈھائے جانے لگے۔ ابن عبد البر نے تحریر کیا ہے:۔

کان الاصمعی و ابو عبیدۃ و ابن الکلبی وغیرھم یقولون کان الولید ابن عقبۃ فاسقاً شریب خمر۔ (استیعاب۔ ج ۳۔ ص ۵۹۶)	اصمعی ابو عبیدہ، ہشام ابن کلبی اور دُوسرے لوگوں کا بیان ہے کہ ولید ابن عقبہ فاسق اور بلا کا شراب نوش تھا۔"

ولید کے مصاحبین میں ایک عیسائی ابو زبید طائی مصاحب خاص اور اس کا ہم نوالہ و ہم پیالہ تھا۔ ولید نے مسجد سے متصل ایک مکان لے کر اسے دے دیا تھا وہ مسجد کے صحن سے گزرگاہ کا کام لیتا اور اُدھر ہی سے آتا جاتا۔ لوگ ایک عیسائی کو شراب کے نشہ میں جھومتے لڑکھڑاتے آتے جاتے دیکھتے

تو پیچ و تاب کھاتے مگر کسی کو جرأت نہ ہوتی تھی کہ درباری ندیم کو روکے ٹوکے اور مسجد میں سے ہو کر گزرنے سے منع کرے۔ ایک دن ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ صبر و ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے اور دبی گھٹی آوازیں چیخ بن کر گونج اُٹھیں۔ ہُوا یہ کہ ولید نے نشہ کی ترنگ میں صبح کی نماز دو رکعت کے بجائے چار رکعت پڑھا دی اور نمازیوں سے کہا کہ آج ہم وجد و بے خودی کے عالم میں ہیں اگر کہو تو اور پڑھا دیں۔ اور نماز میں قرأت کے بجائے یہ شعر دُہراتا رہا ؎

علق القلب الربابا　　بعد ما شابت وشابا

"دل بھی بوڑھا ہو گیا اور رباب بھی بوڑھی ہو گئی مگر دل ابھی تک اسی میں اٹکا ہوا ہے"۔

اہل کوفہ نے تنگ آ کر حضرت عثمان سے شکایت کی اور ولید کی شراب نوشی پر گواہ پیش کئے۔ حضرت عثمان نے کوئی چارہ نہ دیکھا تو اُسے مدینہ طلب کیا اور کوڑے لگوائے اور اس کی جگہ سعید ابن عاص کو حاکم کوفہ بنا کر بھیج دیا۔ سعید نے کوفہ میں وارد ہونے کے بعد حکم دیا کہ جس منبر پر ولید ایسا نجس و ناپاک آدمی بیٹھتا تھا اُسے دھو کر پاک و صاف کیا جائے۔ اور جب تک اُسے دھویا نہ گیا سعید نے اس پر بیٹھنا گوارا نہ کیا۔ جب امیر المومنین بر سر اقتدار آئے تو ولید مدینہ کی سکونت چھوڑ کر بصرہ میں مقیم ہو گیا اور پھر وہاں سے رقہ کی طرف منتقل ہو گیا اور رقہ ہی میں وفات پائی اور وہیں پر ابو زبید طائی کے پہلو میں دفن ہُوا۔

سعید ابن عاص

سعید، عاص ابن سعید کا بیٹا تھا جو جنگ بدر میں حضرت علی کے ہاتھ سے قتل ہوا تھا۔ سعید نے اپنے باپ کے مارے جانے کے بعد یتیمی کا زمانہ حضرت عثمان کے زیر سایہ گزارا۔ فتح شام کے بعد معاویہ کے پاس چلا گیا۔ پھر شام سے مدینہ چلا آیا اور ۳۰ھ میں ولید کی برطرفی کے بعد کوفہ کا حاکم مقرر کیا گیا۔ سعید ایک خود پسند، خود سر اور متشدد قسم کا آدمی تھا۔ ابن عبد البر نے لکھا ہے:-

کان فی سعید تجبر و غلظة و شدة سلطان۔ (استیعاب ج ۲ ص ۹)	سعید جابر، درشت خو اور تشدد پسند تھا"۔

اس کی تند خوئی و درشت مزاجی کے ثبوت میں یہ واقعہ کافی ہے کہ ایک مرتبہ عید کے چاند کے بارے میں اس نے لوگوں کو اپنے ہاں جمع کیا اور اُن سے پوچھا کہ تم میں سے کسی نے چاند دیکھا ہے؟ ہاشم ابن عتبہ نے کہا کہ میں نے دیکھا ہے اور دوسرے لوگوں نے کہا کہ ہم نے نہیں دیکھا۔ اس پر سعید نے کہا کہ اس کانے نے تو چاند دیکھ لیا ہے اور تم لوگ نہیں دیکھ پائے۔ ہاشم کی ایک آنکھ جنگ یرموک میں جاتی رہی تھی۔ انہیں اس اندازِ تخاطب پر غصہ آیا اور کہا کہ تم میری یک چشمی پر کیا طنز کرتے ہو یہ آنکھ اللہ کی راہ میں جاتی رہی ہے

ہاشم تو یہ کہہ کر واپس آگئے مگر چاند کی تصدیق کے لئے لوگوں کا اُن کے ہاں تانتا بندھ گیا۔ سعید کو یہ امر ناگوار گزرا اس نے چند آدمیوں کو بھیج کر انہیں بُری طرح سے پٹوایا اور اُن کا گھر جلوا دیا۔ جب مدینہ میں یہ خبر پہنچی تو سعد ابن ابی وقاص نے حضرت عثمان سے کہا کہ اس ظلم و تشدّد کی روک تھام ہونا چاہئیے۔ اور جب کوئی تسلّی بخش جواب نہ ملا تو انہوں نے سعید کا گھر جو مدینہ میں تھا جلا دینا چاہا مگر حضرت عائشہ کے کہنے سُننے سے رُک گئے۔

سعید جتنا عرصہ برسر اقتدار رہا عوام اس کے ظلم و استحصال کا تختہ مشق بنے رہے۔ بیت المال کو ذاتی ملکیت سمجھ کر جسے چاہتا اور جو چاہتا بطور عطائے خسروانہ بخش دیتا۔ نہ اللہ کا ڈر تھا اور نہ مرکز کی طرف سے احتساب کا خطرہ۔ اگر اس کے خلاف کوئی آواز بلند کرتا تو اُسے سختی سے دبا دیتا۔ اس کی جرأت اس حد تک بڑھ گئی کہ ایک دفعہ جبکہ اعیان و اشراف کوفہ سے دربار چھلک رہا تھا برملا کہنے لگا۔

انما ھذا السواد بستان قریش — عراق کی زمینیں صرف قریش (بنی اُمیہ) کی ہیں۔ (تاریخ کامل جلد ۳ صفحہ ۲۷)

مالک ابن حارث اشتر یہ سُن کر خاموش نہ رہ سکے کہنے لگے کہ جو زمینیں ہماری تلواروں نے فتح کی ہوں وہ تمہاری اور تمہاری قوم کی جاگیر نہیں ہو سکتیں۔ اس پر پولیس کا ایک افسر عبدالرحمٰن ابن جیش اسدی بول اُٹھا کہ امیر سچ تو کہتے ہیں اور مالک اشتر سے اُلجھنے لگا اور سخت کلامی پر اُتر آیا۔ جب بات بڑھی تو مالک اشتر کا ایماء پا کر بنی نخع اور اشراف کوفہ نے اس کو زد و کوب کیا اور اس قابل نہ چھوڑا کہ پیروں پر چل کر اپنے گھر جا سکے۔ اس واقعہ کے بعد نفرت کی دبی ہوئی چنگاریاں بھڑک اٹھیں۔ جہاں چند لوگ جمع ہوتے سعید کو بُرا بھلا کہتے اور حضرت عثمان کو بھی کوستے جنہوں نے ایسے مطلق العنان لوگوں کو مسلمانوں پر مسلط کر دیا جو اُن کے اموال کو خورد برد کرنے میں ذرا باک محسوس نہ کرتے تھے۔ سعید اور تو کچھ نہ کر سکا ان لوگوں کا اپنے ہاں آنا جانا بند کر دیا اور حضرت عثمان کو لکھا کہ فلاں اور فلاں حکومت کے خلاف آمادۂ شورش و بغاوت ہیں اگر ان کا تدارک نہ کیا گیا تو وہ حکومت کے لئے خطرہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ حضرت عثمان نے جواباً تحریر کیا کہ ان لوگوں کو شام جلاوطن کر دیا جائے اور امیر شام معاویہ کو لکھا۔ کہ چند شر پسند اور فتنہ جو لوگ شام بھیجے جا رہے ہیں انہیں اس طرح جھنجھوڑو کہ آئندہ حکومت کے خلاف لب کشائی کی جرأت نہ کر سکیں۔ چنانچہ پکڑ دھکڑ شروع ہوئی اور انہیں بجبر و قہر شام روانہ کر دیا گیا۔

یہ لوگ جنہیں شر پسند اور فتنہ پرداز قرار دیا گیا کوفہ کے اعیان و اشراف قاریان قرآن حفاظ حدیث اور صحابہ و تابعین تھے جو اپنے زہد و اتقاء علم و عمل اور فضل و شرف کے اعتبار سے اسلام کا عظیم سرمایہ تھے ان میں مالک ابن حارث اشتر، مالک ابن کعب ارحبی، اسود ابن یزید نخعی، علقمہ ابن قیس نخعی، صعصعہ ابن صوحان عبدی، زید ابن صوحان، حارث ابن عبداللہ اعور، ثابت ابن قیس ہمدانی، کمیل ابن زیاد نخعی، جندب ابن زہیر

غامدی، جندب ابن کعب ازدی، عروہ ابن جعد اور عمرو ابن حمق خزاعی ایسے عمائد کوفہ شامل تھے۔ ان کا جرم جس کی پاداش میں انہیں دربدری و جلاوطنی کی سزا دی گئی یہ تھا کہ انہوں نے حق کے قیام کے لئے باطل کی ہمنوائی نہیں کی اور حکمران طبقہ کی بے راہرویوں پر صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے حریت ضمیر کو برقرار رکھا۔ اگر انہوں نے ایک ایسی حکومت میں جسے انتخابی و جمہوری حکومت کا نام دیا جاتا ہے اور جس میں آزادانہ اظہار رائے کا حق تسلیم کیا جاتا ہے حق گوئی و صاف بیانی سے کام لیتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ مسلمانوں کی مشترکہ زمینوں پر ایک مخصوص گروہ کا قبضہ و تسلط غلط ہے تو کیا غلط کہا۔ اگر یہی لوگ اقتدار کی ہاں میں ہاں ملانا اپنا شعار بنا لیتے اور سطوت و طاقت کے سامنے جھک کر ظلم کو عدل، بدی کو نیکی اور باطل کو حق کہنے لگتے تو غلط کار حکمرانوں کو ان کی غلط کاریوں پر روکنے ٹوکنے کی اُمید کس سے کی جا سکتی تھی۔ یہی تو وُہ لوگ تھے جو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ نظر انداز کر کے کبھی ظلم و عدوان سے رواداری برتنے پر آمادہ نہ ہو سکتے تھے۔ اور اگر اس سلسلہ میں انہوں نے کچھ تشدد آمیز رویہ اختیار بھی کیا تو یہ ان کے دینی احساس اور اخلاقی فرض کا تقاضا اور حکومت کی بے اثری و بے وقعتی کا کرشمہ تھا۔

جب یہ لوگ جلاوطن ہو کر دمشق پہنچے تو انہیں کنیسۂ مریم میں جگہ دی گئی اور معاویہ نے سخت گیری کے بجائے سیاسی لب ولہجہ میں انہیں ہمنوا بنانے کی کوشش کی اور کہا کہ تم لوگ اسلام کی بدولت ایک بلند مرتبہ و مقام پر پہنچے ہو اور دُوسری قوموں پر غلبہ و فتحمندی حاصل کی ہے۔ مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ تم قریش اور عُمال حکومت پر نکتہ چینی کرتے ہو اور انہیں علانیہ بُرا بھلا کہتے ہو اگر قریش نہ ہوتے تو تم ذلت و گمنامی کے گوشے میں پڑے رہتے اور تمہیں کوئی پُوچھتا بھی نہ۔ تمہارے حکمران تمہاری سپر ہیں اسے توڑنے کی کوشش نہ کرو۔ حکومت اب تک تمہاری نازیبا حرکتیں برداشت کرتی رہی ہے اگر تم باز نہیں آؤ گے تو اللہ تمہیں مصیبتوں میں جکڑ لے گا اور ذلت کی اتھاہ گہرائیوں میں پھینک دے گا۔ صعصعہ نے کہا کہ تم نے قریش کے تفوق و امتیاز کا ذکر کیا ہے تو قریش کسی دَور میں ہم سے گنتی میں زیادہ نہ تھے اور نہ ہم سے قوی و توانا تر تھے۔ رہا تمہارا یہ قول کہ فرمانروا ہماری سپر ہیں تو اسے ٹوٹنے دیجئے ہم خود اپنی سپر بن جائیں گے۔

اسی طرح بات چیت کا سلسلہ چلتا رہا اور آپس میں سوال و جواب ہوتا رہا۔ ایک مرتبہ معاویہ نے دَوران گفتگو میں کہا کہ قریش سے یہ بات ڈھکی چھپی ہوئی نہیں ہے کہ میرا باپ ابوسفیان قریش میں سب سے زیادہ معزز و باوقار تھا البتہ آنحضرت کو نبوّت مل گئی جو کسی اور کو نہ مل سکی۔ اگر تمام لوگ ابوسفیان کی اولاد ہوتے تو سب کے سب زیرک و دانا ہوتے۔ صعصعہ نے کہا کہ تم غلط کہتے ہو۔ حضرت آدمؑ جو ابوسفیان سے بہر حال بہتر تھے اللہ نے انہیں اپنے دستِ قدرت سے پیدا کیا ان میں اپنی رُوح

پھونکی اور فرشتوں کو ان کے سجدہ پر مامور فرمایا ان کی اولاد میں عقلمند بھی ہیں اور بے وقوف بھی اچھے بھی ہیں اور بُرے بھی۔ معاویہ سے کوئی جواب بن نہ پڑا اور چُپ سادھ لی۔ ایک اور ملاقات میں کہا کہ تمہیں اپنی بھلائی پر نظر کرنا چاہیئے اور وُہ طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیئے جو تمہارے اور تمہارے قبیلہ اور عامہ اہل اسلام کے لئے مفید ہو۔ صعصعہ نے کہا کہ یہ تم نے نیکی و ہدایت کا درس دینا کب سے شروع کیا ہے کیا اس میں کوئی فلاح و بہبود کا پہلو ہے کہ ہم اللہ کی معصیت کرتے ہوئے تمہاری اطاعت کریں۔ معاویہ نے کہا کہ میں نے یہی تو کہا ہے کہ اللہ سے ڈرو نبی کی پیروی کرو اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑو اور تفرقہ پردازی سے باز آؤ۔ صعصعہ نے کہا کہ تم نے کب رسُول کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کی اور تفرقہ و انتشار کو ہوا نہیں دی۔ معاویہ نے کہا کہ اگر ایسا ہُوا ہو تو میں توبہ کرتا ہوں اور اب تمہیں تقویٰ و طاعت اور جماعت سے وابستگی کا حکم دیتا ہوں تم اپنے حکمرانوں کی عزّت و توقیر کرو اور اُن سے تعاون کرتے ہوئے دوستی و خیر خواہی کی فضا میں انہیں مشورے دو۔ صعصعہ نے کہا کہ پھر ہم تمہیں خلوص نیت سے یہ مشورہ دیتے ہیں کہ تم امارت شام کے منصب سے الگ ہو جاؤ اور جو اس منصب کا تم سے زیادہ حقدار ہے اس کے لئے جگہ خالی کرو۔ کیا تم اس سے انکار کر سکتے ہو کہ عرب میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جن کے اسلامی خدمات تم سے کہیں زیادہ ہیں کہا کہ یہ صحیح ہے مگر اس وقت بارِ حکومت کے اُٹھانے کا مجھ سے زیادہ کوئی اہل نہیں ہے۔ اگر مجھ میں کوئی کمزوری ہوتی تو حضرت عمر میری پاسداری نہ کرتے اور مجھے اس عہدہ پر باقی نہ رہنے دیتے۔ لہٰذا امارت شام سے دستبردار ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ تمہارا یہ مشورہ شیطانی وسوسہ ہے اور شیطان کی اطاعت کا نتیجہ ذلت و رسوائی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اس پر صعصعہ اور دُوسرے لوگ بگڑ گئے اور معاویہ پر جھپٹے۔ معاویہ نے کہا کہ یہ کوفہ نہیں ہے سرزمین شام ہے اگر یہاں کے لوگوں کو تمہاری اس حرکت کا علم ہو گیا تو وُہ تمہیں قتل کئے بغیر نہیں رہیں گے۔ یہ کہہ کر وہاں سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور منزل پر پہنچ کر حضرت عثمان کو تحریر کیا کہ وُہ لوگ جو ہمارے ہاں آئے ہیں انہیں نہ عقل و شعور سے واسطہ ہے اور نہ دین و مذہب سے لگاؤ ان کا مقصد صرف فتنہ گری و شر انگیزی ہے مجھے اندیشہ ہے کہ اگر یہ لوگ یہاں رہے تو فتنہ و شر پھیلائیں گے اور شامیوں کو آمادۂ بغاوت کریں گے لہٰذا مناسب ہو گا کہ انہیں یہاں سے کہیں اور بھیج دیا جائے۔ حضرت عثمان نے لکھا کہ انہیں سعید ابن عاص کے پاس کُوفہ روانہ کر دیا جائے۔ چنانچہ انہیں واپس کوفہ بھیج دیا گیا۔ سعید سے کشیدگی تو تھی ہی یہاں آنے پر حالات رُو باصلاح ہونے کے بجائے اور بگڑ گئے۔ حضرت عثمان کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے مالک اشتر کو تحریر کیا کہ تم لوگ کوفہ خالی کر دو اور یہاں سے حمص چلے جاؤ۔ اشتر نے یہ فرمان پڑھا تو کہا۔

اللھم اسوأنا نظرا للرعیۃ و	بارالہا! ہم میں سے جو رعیت کا بد خواہ اور
اعملنا فیھم بالمعصیۃ فعجل	اس کے حق میں معصیت کار ہو اس پر جلد

لہ النقمۃ۔ (تاریخ طبری ج۳۔ ص۳۶۷) عذاب نازل کر"۔
یہ لوگ کوفہ سے حمص چلے آئے والیٔ حمص عبدالرحمٰن ابن خالد ابن ولید نے ان کی تذلیل و تحقیر میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی اور انہیں طرح طرح کے شدائد و آلام میں جکڑے رکھا۔ جب انہیں ایک مہینہ قید و بند میں سختیاں جھیلتے گزر گیا تو انہیں پھر کوفہ بھیج دیا گیا۔ اب رعایا کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا لوگ عثمانی عمال کے ہاتھوں پہلے ہی نالاں تھے کہ حضرت عثمان کے اس طرز عمل سے جو ان معزز و سربلند افراد کے ساتھ روا رکھا گیا ہر طرف غضب و انتقام کے شعلے بھڑک اُٹھے نظم مملکت تہ و بالا ہو کر رہ گیا۔ حضرت عثمان ان بدلے ہوئے حالات سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے تھے انہوں نے اس ہمہ گیر شورش کو دبانے کے لئے ۳۴ھ میں عمال و حکام کو مدینہ میں طلب کیا۔ سعید ابن عاص بھی کوفہ سے مدینہ آیا اور جب یہاں سے فارغ ہو کر کوفہ کی طرف پلٹا تو قادسیہ کے قریب جرعہ کے مقام پر اسے روک دیا گیا اور مالک اشتر اور ان کے ساتھیوں نے اس سے کہا کہ ہم تمہیں کوفہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے تم جدھر سے آئے ہو ادھر واپس چلے جاؤ۔ سعید نے کچھ حیل حجت کی مگر اس کی ایک نہ سُنی گئی اور سب نے کہا کہ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ واپس پلٹ جاؤ اب عوام کے ریلے کو روکنا تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔ چنانچہ وہ وہیں سے واپس مدینہ آ گیا۔ حضرت عثمان نے اس کی جگہ ابو موسیٰ اشعری کو بھیج دیا جن کی کارگزاریوں کا تذکرہ جمل اور تحکیم کے سلسلہ میں ہو گا۔

قصاص خون عثمان

قصاص یعنی خون کے بدلے خون ایک ایسا ضابطہ ہے جسے نہ عقل غلط کہتی ہے اور نہ شرع بلکہ تمام ملل و ادیان اس کی ضرورت پر متفق ہیں مگر ہر قاعدہ و قانون میں کچھ مستثنیات بھی ہوتے ہیں اور یہ ضابطہ بھی مستثنیات سے خالی نہیں ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص کسی جرم کی پاداش میں قتل کر دیا جاتا ہے یا کوئی شخص اپنی جان کے بچاؤ کے لئے حملہ آور کو قتل کر دیتا ہے جبکہ جان کا تحفظ اس کے قتل پر منحصر ہو تو ان دونوں صورتوں میں اگرچہ فعل قتل کا ارتکاب ہوا ہے مگر نہ شرع قصاص کا حکم دیتی ہے اور نہ عقل۔ اسی طرح متعدد ایسے موارد شمار کئے جا سکتے ہیں جہاں قصاص کا حکم عائد نہیں ہوتا جہاں تک نفس قصاص کا تعلق ہے اس کی مشروعیت میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے البتہ اس کے موارد میں اختلاف ہو سکتا ہے۔

امیرالمومنین کے مسند خلافت پر متمکن ہونے کے بعد جب قصاص خون عثمان کا مسئلہ چھڑا تو یہ مسئلہ بھی اختلافی بن گیا یا بنا دیا گیا اور لوگ دو مختلف اور متضاد گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ حضرت عثمان کے قتل کو جائز قرار دیتا تھا اس کے نزدیک قصاص کا کوئی سوال پیدا نہ ہوتا تھا اور ایک گروہ اس

قتل کو ناروا سمجھتا تھا اور قصاص کا پُر زور حامی تھا۔ اس سے بحث نہیں کہ یہ مطالبہ صحیح تھا یا غلط جو بھی صورت ہو عملی اعتبار سے یہ مسئلہ اتنا آسان نہ تھا کہ اس کا فوری حل نکل آتا اور ان پیچیدگیوں اور دشواریوں کو بآسانی دُور کیا جا سکتا جو اس راہ میں حائل تھیں اگر امیر المومنین اس قتل کو ناروا سمجھتے ہوئے قصاص کی طرف متوجہ ہوتے تو اس گروہ کے بگڑنے کا اندیشہ تھا جو اس قتل کو بر بنائے تاویل جائز سمجھتا تھا اور قصاص کے خلاف تھا۔ اور اگر قصاص سے پہلو تہی کرتے تو وُہ گروہ آمادۂ بغاوت نظر آتا تھا جو اس خون کو خون ناحق قرار دیتا تھا اس وقت ایک طرف جھکاؤ انتہائی خطرناک تھا اور حکومت میں ابھی اتنا دم خم نہ تھا کہ دونوں گروہوں کے جذبات کو متوازن سطح پر لا کر اس گتھی کو سلجھایا جا سکتا۔ ابھی نہ ملکی معاملات منضبط ہُوئے تھے نہ حکومت میں استحکام پیدا ہُوا تھا۔ ہر طرف کھینچا تانی اور افراتفری کا عالم تھا نہ قصاص طلب کرنے والوں کے جذبات کو فرو کیا جا سکتا تھا اور نہ بلوائیوں کو بآسانی گرفت میں لیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ جب طلحہ و زبیر اور اُن کے ہم خیال لوگوں نے حضرت سے قصاص کے بارے میں کہا تو آپ نے صورت حال کا جائزہ لیتے ہُوئے فرمایا "جو تم جانتے ہو میں اس سے بے خبر نہیں ہوں لیکن میرے پاس اس کی قوت و طاقت کہاں ہے جبکہ فوجکشی کرنے والے اپنے انتہائی زوروں پر ہیں وُہ اس وقت ہم پر مسلط ہیں ہم اُن پر مسلط نہیں اور عالم یہ ہے کہ تمہارے غلام بھی اُن کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہُوئے ہیں اور صحرائی عرب بھی اُن سے مل جل گئے ہیں اور اس وقت بھی وُہ تمہارے درمیان اس حالت میں ہیں کہ جیسا چاہیں تمہیں گزند پہنچا سکتے ہیں۔ کیا تم جو چاہتے ہو اس پر قابو پانے کی کوئی صورت تمہیں نظر آتی ہے"۔

حضرت نے اُس وقت کے حالات کا جو نقشہ کھینچا ہے تاریخ اُس کی شہادت دیتی ہے کہ اس وقت مدینہ پر بلوائی چھائے ہُوئے تھے اور ہر طرف انہی کا عمل دخل تھا۔ وُہ جو چاہتے کرتے کسی کو اُن کے خلاف عملی اقدام تو درکنار لب کشائی کی بھی جرأت نہ ہوتی تھی۔ اگر امیر المومنین اُس وقت قصاص کے لئے قدم اٹھاتے تو ایسا نہ تھا کہ وُہ چپکے سے تلوار کے آگے سر خم کر دیتے اور کوئی مزاحمت نہ کرتے بلکہ وُہ پُوری قوت و طاقت سے مقابلہ کرتے اور وُہ خونی ہنگامہ برپا ہوتا کہ مدینہ کے کوچہ و بازار لاشوں سے پٹ جاتے۔ آخر وُہ اتنے کمزور نہ تھے کہ بآسانی اُن پر قابو پا لیا جاتا۔ اگر وُہ اتنے ہی کمزور ہوتے تو محاصرہ کے دنوں میں یہی طالبانِ قصاص اہل مدینہ کے تعاون سے انہیں روکتے قتل سے مانع ہوتے اور اگر باز نہ آتے تو اُن سے جنگ کرتے مگر اُس وقت تو اُن کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور گھروں کے گوشوں میں دبک کر بیٹھ گئے۔ اور جب حضرت عثمان قتل کر دیئے گئے تو حضرت پر قصاص کے لئے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا حالانکہ ان بلوائیوں کی قوت و طاقت اور ان کے مقابلہ میں اپنی کمزوری و بے بسی کے یہ خود معترف تھے۔ چنانچہ جب ان لوگوں نے حضرت کے خلاف جنگ کا فیصلہ کیا اور حضرت عائشہ نے یہ رائے دی کہ مدینہ پر حملہ کرنا چاہیئے کیونکہ قاتلانِ عثمان مدینہ ہی میں ہیں تو طلحہ و زبیر اور دُوسرے لوگوں نے کہا:۔

یا ام المومنین دعی المدینة فان من معنا لایقرنون لتلك الغوغا التی بها و اشخصی معنا الی البصرة۔ (تاریخ طبری۔ ج۳۔ صفحہ ۴)	اے ام المومنین مدینہ کا ارادہ ترک کیجئے اس لئے کہ وہ لوگ جو ہمارے ساتھ ہیں ان بلوائیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے جو مدینہ میں ہیں آپ ہمارے ہمراہ بصرہ چلئے۔"

جب یہ لوگ سامان جنگ اور فوجی طاقت کے ہوتے ہوئے مدینہ میں جنگ نہیں چھیڑتے اور عذر یہ کرتے ہیں کہ ہم بلوائیوں کے مقابلہ کی قوت و طاقت اپنے اندر نہیں پاتے اور اگر یہی عذر حضرت پیش کریں تو اس کے تسلیم کرنے میں پس و پیش کیوں۔ اگر ان لوگوں کا مقصد قصاص ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ قاتلین کو مدینہ میں چھوڑ کر بصرہ کا رُخ کرتے ان کا مقصد تو قصاص کی آڑ میں حضرت کے خلاف محاذ جنگ قائم کرنا تھا تاکہ حکومت کا تختہ اُلٹ کر اپنے اقتدار کی راہ ہموار کریں ورنہ یہ لوگ بھی سمجھتے تھے کہ آخر قصاص کس سے لیا جائے جبکہ حضرت عثمان کے قتل کی ذمہ داری ایک یا دو چار گنے چُنے افراد پر عائد نہیں ہوتی بلکہ مدینہ، مصر، بصرہ اور کوفہ کے لوگ اس میں شریک تھے اور وہ صحابہ بھی اس میں ملوث تھے جنہوں نے خطوط لکھ لکھ کر بلوائیوں کو حضرت عثمان کے خلاف بھڑکایا تھا اور وہ مہاجرین و انصار اور صحابہ کبار بھی شامل تھے جنہوں نے بیرونی حملہ آوروں کی پُشت پناہی کی تھی۔ اگر وہ ان کی حمایت و پشت پناہی نہ کرتے تو انہیں خلیفۂ وقت کو محاصرہ میں لے کر قتل کرنے کی جرأت ہی نہ ہوتی۔

اب قصاص کی ایک صورت تو یہ تھی کہ ان تمام لوگوں کو جنہوں نے کسی نہ کسی صورت میں اس میں حصّہ لیا تھا تہ تیغ کر دیا جاتا خواہ کوئی صحابی ہو یا تابعی مدنی ہو یا مصری، کوفی ہو یا بصری۔ اور دوسری صورت یہ تھی کہ بلوائیوں کی جماعت میں سے اصلی قاتلوں کا پتا چلایا جاتا اور انہیں قصاصاً قتل کیا جاتا۔ پہلی صورت ممکن ہی نہ تھی اور نہ اس کا کوئی شرعی جواز تھا کہ ایک کے بدلے میں ہزاروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا اور دوسری صورت میں ضروری تھا کہ قاتلوں کی نشاندہی کی جاتی ان کے خلاف شہادتیں ہوتیں اور ثبوتِ جُرم کے بعد انہیں قتل کیا جاتا مگر ان کے خلاف گواہی کی نوبت تو اس وقت آتی جب کوئی موقع واردات پر موجود ہوتا۔ جو چند اموی حضرت عثمان کے گھر میں جمع تھے وہ تو حملہ کے وقت اِدھر اُدھر ہو گئے یا ام حبیبہ کے گھر میں جا چھپے اور جو رہ گئے وہ مارے گئے البتہ حضرت عثمان کی زوجہ نائلہ بنتِ فرافصہ موقع پر موجود تھیں تو وہ کسی کی نشاندہی نہ کر سکیں۔ چنانچہ امیر المومنین نے قاتلوں کے بارے میں اُن سے پوچھا تو انہوں نے کہا:۔

لا ادری دخل علیه رجلان لا اعرفهما و معهما محمد ابن ابی بکر (صواعق محرقہ۔ صفحہ ۱۱۸)۔	مجھے معلوم نہیں ہے البتہ محمد ابن ابی بکر کے ساتھ دو آدمی اندر گھسے تھے میں ان دونوں کو نہیں پہچانتی۔"

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ قاتل زندہ موجود تھے اور ان پر قتل کا جرم بھی ثابت تھا پھر بھی اس امر کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ وُہ کیا وجوہ تھے جن کی بنا پر وُہ قتل ایسے سنگین جرم پر اُتر آئے۔ یہ امر تو روز روشن کی طرح واضح ہے کہ یہ قتل ہنگامی جذبات کا نتیجہ نہ تھا بلکہ مسلسل گفت و شنید اور باہمی مفاہمت کی ناکامی کے بعد نوبت یہاں تک پہنچی۔ چنانچہ مختلف شہروں کے وفود حضرت عثمان کے ہاں آتے رہے عمال کی بے عنوانیاں ان کے گوش گزار ہوتی رہیں اور وُہ ہر مرتبہ رفع شکایات کے وعدے کرتے رہے مگر یہ وعدے کسی منزل پر پورے نہ ہوئے جب انہیں وعدے یاد دلائے گئے اور عمال کی برطرفی پر زور دیا گیا تو یہ جواب دیا:-

ان کنت مستعملا من اردتم وعازلا من کرھتم فلست فی شئ والامر امرکم۔ (تاریخ کامل۔ ج۳۔ ص۸۶)	جسے تم چاہو اُسے میں عامل مقرر کروں اور جسے تم نہ چاہو اُسے معزول کروں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ میں کوئی چیز ہی نہیں اور حکم چلتا ہے تو تمہارا چلتا ہے۔"

اس پر ان لوگوں کو برہم ہونا ہی تھا انہوں نے بگڑ کر کہا کہ اگر مظالم کا ازالہ اور عمال کی برطرفی آپ کے بس کی بات نہیں ہے تو خلافت سے دستبردار ہو کر گھر میں بیٹھ جائیے ہم آپ سے کوئی تعرض نہیں کریں گے۔ اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو ہم آخری قدم اٹھانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ حضرت عثمان نے کہا کہ تم کس جُرم کی پاداش میں مجھے قتل کرو گے۔ قتل سزا ہے ارتداد کی یا زنائے محصنہ کی یا قتل ناحق کی اور میں ان چیزوں میں سے کسی ایک کا بھی مرتکب نہیں ہُوا انہوں نے کہا کہ جو زمین میں فساد پھیلائے یا باغیانہ قدم اُٹھائے یا دُوسروں کے حقوق میں حائل ہو کر قتال کرے اُن کے لئے بھی کتاب اللہ میں قتل کا حکم ہے اور آپ ان تمام چیزوں کے مرتکب ہُوئے ہیں آپ نے حکومت کے بل پر معزز ترین صحابہ کو پٹوایا انہیں خوفزدہ کیا اور دربدر پھرایا رعایا پر مظالم ڈھائے لوگوں کے حقوق پامال کئے اور حق کا مطالبہ کرنے والوں کے سروں پر تلواریں آویزاں کیں۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ وُہ لوگ جو تلواریں لئے آپ کے سینہ سپر بنے ہُوئے ہیں آپ کی مرضی کے خلاف لڑ بھڑ رہے ہیں تو وُہ اسی لئے تو لڑ رہے ہیں کہ آپ مسند خلافت سنبھالے ہُوئے ہیں اگر آپ خلافت سے دستبردار ہو جائیں تو اُن کی تلواریں بھی کند ہو جائیں گی اور وُہ اپنے گھروں میں دبک کر بیٹھ جائیں گے۔ حضرت عثمان سے کوئی جواب بن نہ پڑا اور خاموشی کے ساتھ اندر چلے گئے۔

اس گفتگو سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ ان لوگوں نے آخری قدم اس وقت اٹھایا جب حضرت عثمان پر حجت تمام کر دی اور یہ سمجھ لیا کہ قرآن و سُنت کی رو سے اُن کا قتل جائز ہے اور اس جواز کو تقویت ان صحابہ کے قول و عمل سے بھی حاصل ہوئی جو اس قتل کے جواز پر متفق تھے۔ چنانچہ ام المومنین حضرت عائشہ

طلحہ ابن عبید اللہ، زبیر ابن عوام، عمرو ابن عاص اور دوسرے اکابر صحابہ قتل کے جواز کے فتوے دے رہے تھے۔ اگر جنگ جمل میں طلحہ و زبیر اور ام المومنین کے اقدام کو اجتہادی غلطی قرار دیا جاتا ہے تو اس موقع پر بھی ان کے اجتہاد کو تسلیم کرکے اسے کم از کم اجتہادی غلطی قرار دینا چاہئیے۔ بہر حال ان لوگوں نے قرآنی شواہد پیش کرنے کے بعد یہ اقدام کیا اور بر بنائے تاویل قتل کے مرتکب ہوئے اور جو قتل تاویل کی بنا پر ہو اس میں شرعاً قصاص کا جواز ثابت نہیں ہے۔ چنانچہ ملا علی قاری تحریر کرتے ہیں:-

انما لم یقتل علی قتلة عثمان لانهم کانوا بغاة اذا الباغی له منعة وتاویل وکانوا فی قتله متاولین وکان لهم منعة فانهم کانوا مستحلین ذلک بما نقموا من الامور والحکم فی الباغی اذا انقاد لامام اهل العدل ان لا یواخذ بما سبق من اتلاف اهل العدل وسفک دمائهم وجرح ابدانهم فلم یجب علیه قتلهم و لا دفعهم الی الطالب۔
(شرح فقہ اکبر ص۹۷)

حضرت علی نے عثمان کے قاتلین کو قتل نہیں کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ باغی تھے اور جو باغی ہوتا ہے وہ قوت و طاقت بھی رکھتا ہے اور اپنے اقدام کے جواز کی تاویل بھی۔ وہ لوگ حضرت عثمان کے قتل میں تاویل بھی رکھتے تھے اور حکومت سے ٹکراؤ کی قوت بھی اور حضرت عثمان کی ناپسندیدہ باتوں کی وجہ سے اس اقدام کو جائز و حلال سمجھتے تھے اور ایسے باغیوں کا حکم شرعی یہ ہے کہ جب وہ امام عادل کے مطیع ہو جائیں تو جو کچھ وہ پہلے اہل عدل کا نقصان کر چکے ہوں ان کا خون بہا چکے ہوں اور ان کے بدنوں کو مجروح کر چکے ہوں اُن سے اُن چیزوں کا مواخذہ نہیں ہوگا۔ لہٰذا حضرت علی کے لئے ضروری نہ تھا کہ وہ انہیں قتل کریں یا قصاص طلب کرنے والوں کے حوالے کریں۔"

جنگ جمل

جنگ جمل تاریخ اسلام کی وہ بلاخیز و ہلاکت آفریں جنگ ہے جو امیر المومنین کے اوائل عہد حکومت میں خون عثمان کے نام پر لڑی گئی اس خونریز جنگ کے نتائج و عواقب اور تفریق بین المسلمین کی ذمہ داری بڑی حد تک ام المومنین حضرت عائشہ اور طلحہ و زبیر پر عائد ہوتی ہے جو حضرت عثمان کے خون کا قصاص لینے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے تھے حالانکہ یہی لوگ ان کی زندگی میں ان کی سخت مخالفت کرتے اور لوگوں کو ان کے خلاف بھڑکاتے تھے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رسول اللہ کے نعلین اور پیراہن مبارک

کو حضرت عثمان کے سامنے رکھ کر برملا کہا کرتی تھیں کہ ابھی یہ چیزیں کہنہ بھی نہیں ہونے پائیں کہ تم نے رسول خدا کے دین اور اُن کے سنن و احکام کو سرے سے بدل کر رکھ دیا ہے۔ حضرت عائشہ عوامی مزاج کے سمجھنے میں کافی درک رکھتی تھیں انہوں نے عوام کے جذبات بھڑکانے کا وُہ طریقہ اختیار کیا جو موثر ترین ہوسکتا تھا وُہ سمجھتی تھیں کہ لوگ پیغمبر سے والہانہ عقیدت کی بنا پر آپ کے جسم مبارک سے مس ہونے والے آثار کو دیکھنے کی انتہائی تڑپ رکھتے ہیں اور جب یہ چیزیں ان کی نگاہوں کے سامنے آئیں گی تو ان میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہُوا اور ان چیزوں کو دیکھتے ہی لوگوں کے دلوں میں غم و غصہ کی آگ بھڑک اٹھی اور انہوں نے قصر خلافت کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ اور جب ام المومنین نے یہ دیکھا کہ محاصرین کی گرفت مضبوط ہو چکی ہے تو مروان ابن حکم، عبدالرحمٰن ابن عتاب اور زید ابن ثابت کے روکنے کے باوجود حضرت عثمان کو محاصرہ میں چھوڑ کر مکہ روانہ ہو گئیں اور دوران سفر میں بھی لوگوں کو ان کے خلاف کہتی سُنتی اور برانگیختہ کرتی رہیں۔ چنانچہ جب مدینہ سے سات میل کے فاصلہ پر مقام صلصل میں پہنچیں تو ابن عباس سے جو امیر حج کی حیثیت سے مکہ جا رہے تھے پر زور الفاظ میں کہا:۔

یا بن عباس انشدك الله فانك قد اعطیت لسانا ازعیلا ان تخذل الناس من هذا الرجل و ان تشكك فیه الناس فقد بانت لهم بصائرهم و انهجت و رفعت لهم المنار وتجلبوا من البلدان لامر قد حم وقد رایت طلحة ابن عبید الله قد اتخذ علی بیوت الاموال والخزائن مفاتیح فان یل یسر بسیرة ابن عمه ابی بکر۔ (تاریخ طبری ج ۳۔ ص ۴۳۴)

"اے ابن عباس تم کو گویائی و چرب زبانی کا جوہر عطا ہوا ہے میں تمہیں اللہ کا واسطہ دیتی ہوں کہ تم لوگوں کو اس شخص (عثمان) کی مدد سے روکو اور ان کے بارے میں لوگوں کو شک و شبہ میں ڈالو۔ یوں بھی لوگوں کی آنکھیں کھل چکی ہیں حقیقت کی راہ ہموار اور روشنی کا مینار بلند ہو چکا ہے لوگ مختلف شہروں سے فیصلہ کن امر کے لئے جمع ہو چکے ہیں آپ جانتے ہیں کہ طلحہ ابن عبیداللہ بیت المال اور خزانے کی کنجیوں پر قابض ہو چکا ہے اگر خلافت اس کے سپرد کی گئی تو وُہ قدم بقدم اپنے ابن عم ابوبکر کی سیرت پر چلے گا۔"

حضرت عائشہ حضرت عثمان کی خلافت کے ابتدائی چھ سالوں تک تو اُن کی خیر خواہی و ہمنوائی کرتی رہیں مگر اس کے بعد اُن سے ان بن ہو گئی اور علانیہ مخالفت پر اُتر آئیں۔ اس عناد و مخالفت کی

وجہ بظاہر یہی نظر آتی ہے کہ حضرت عثمان نے ان کا وُہ وظیفہ جو انہیں سابقہ حکومت کی طرف سے ملتا تھا کم کر دیا تھا۔ چنانچہ مورخ یعقوبی نے تحریر کیا ہے:۔

وکان بین عثمان وعائشة منافرة وذلك انه نقصها ما کان یعطیها عمر ابن الخطاب وصیرها اسوة غیرها من نساء رسول الله۔ (تاریخ یعقوبی۔ ج۲۔ ص۱۳۲)	حضرت عثمان اور حضرت عائشہ کے درمیان نفرت کی خلیج حائل تھی اور انہوں نے وُہ وظیفہ جو انہیں حضرت عمر دیا کرتے تھے کم کر دیا اور رسُول خدا کی دُوسری بیویوں کے برابر انہیں دینا شروع کر دیا۔"

حضرت عثمان اور ان کے عمال کی آمرانہ روش کی وجہ سے فضا کچھ تو پہلے ہی ان کے خلاف تھی کہ ام المومنین کی اشتعال انگیز باتوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

آتشم تیز است و داماں مے زنم

اس مخالفت نے زور پکڑ لیا اور لوگ ان کے خلاف سرگرم عمل ہو گئے خصوصاً طلحہ ابن عبید اللہ اور ان کا قبیلہ بنی تیم اس مخالفت میں پیش پیش تھا۔ طلحہ نے لوگوں کو ان کے خلاف بھڑکانے اور ان کے قتل کے اسباب فراہم کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ بلاذری نے تحریر کیا ہے:۔

لم یکن احد من اصحاب النبی اشد علیٰ عثمان من طلحة۔ (انساب الاشراف ج۵ ص۱۱)	اصحاب نبی میں طلحہ سے بڑھ کر حضرت عثمان پر سخت گیر کوئی نہ تھا۔"

چنانچہ انہی نے محاصرہ کے دنوں میں لوگوں کو ان تک پانی پہنچانے سے منع کیا انہی نے رات کے اندھیرے میں ان کے گھر پر تیر برسائے اور لوگوں کو ان کے خلاف مشتعل کیا اور گھیرا ڈالنے والوں کے سرگروہ اور بیعت رضوان میں شریک ہونے والے صحابی عبد الرحمٰن ابن عدیس کو تاکید کی کہ وُہ کسی کو ان کے گھر کے اندر جانے اور باہر نکلنے کی اجازت نہ دے۔ حضرت عثمان کو اس کا علم ہوا تو اُنہوں نے کہا:۔

اللّٰھم اکفنی طلحة ابن عبید الله فانه حمل علیٰ ھؤلاء والبھم (تاریخ طبری۔ ج۳۔ ص۴۱۱)	خدایا مجھے طلحہ ابن عبید اللہ کے شر سے بچائے رکھ اسی نے لوگوں کو میرے خلاف بھڑکایا ہے اور میرے گرد گھیرا ڈلوایا ہے۔"

طلحہ کا یہ رویہ حضرت عثمان کی زندگی تک ہی نہ تھا بلکہ ان کے قتل کے بعد بھی ان کی روش میں فرق نہ آیا اور ان کی نعش پر اور تجہیز و تدفین کرنے والوں پر پتھر برسوائے اور جنة البقیع میں

دفن ہونے سے مانع ہُوئے۔

اسی طرح زبیر جن کے گھر میں حضرت عائشہ کی ہمشیرہ اسماء تھیں محاصرہ کے دنوں میں لوگوں کو یہ کہتے سُنے گئے:۔

اقتلوہ فقد بدل دینکم۔ عثمان کو قتل کر دو اس نے تو تمہارا دین ہی بدل ڈالا ہے"۔

(شرح ابن ابی الحدید ج۔ ص)

انہی لوگوں نے حضرت عثمان کے قتل کی بنیاد رکھی اور ان کے خلاف ایسی فضا پیدا کر دی جس کے نتیجہ میں وُہ قتل کر دیئے گئے۔ اگر قتل عثمان جرم تھا تو ان لوگوں کو اس جُرم سے بری قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اعانت جرم بھی جرم ہوتی ہے۔ اگرچہ ام المومنین قتل عثمان کے موقع پر مدینہ میں موجود نہ تھیں مگر انہوں نے مدینہ قتل عثمان سے صرف بیس دن پہلے چھوڑا تھا جبکہ انہیں اپنے لگائے ہوئے پودے کے بار آور ہونے کا یقین ہو گیا تھا۔ اس موقع پر روانگی کا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ مدینہ کی شورش و ہنگامہ آرائی سے انہیں بے تعلق سمجھا جائے۔ اور جب وُہ قتل ہو جائیں تو طلحہ یا زبیر کو بر سر اقتدار لا کر اس مالی نقصان کی جو انہیں موجُودہ حکومت سے پہنچا تھا تلافی کر لیں مگر ام المومنین اپنے منصوبہ میں کامیاب نہ ہو سکیں اور اہل مدینہ نے ان کی عدم موجودگی میں حضرت علی کی خلافت کا فیصلہ کر لیا۔

طلحہ و زبیر حضرت عمر کی قائم کردہ مجلس شوریٰ کے نامزد رُکن تھے اور اس رکنیت کی وجہ سے اپنے ذہن کو خلافت کے تصوّر سے خالی نہیں رکھ سکتے تھے۔ چنانچہ قتل عثمان کے سلسلہ میں تگ و دو اسی مقصد کے حصول کے لئے تھی۔ مگر جب یہ دیکھا کہ لوگ حضرت علی کی خلافت پر مصر ہیں اور ان کے علاوہ کسی اور کی بیعت پر رضامند نہیں ہیں اور نہ اُن کے سوا کوئی دوسرا اُن کے معیار پر پُورا اُترتا ہے تو انہوں نے رائے عامہ کا رُخ دیکھ کر بیعت میں پیشقدمی کی اور اطاعت و سرافگندگی کا اظہار کرتے ہُوئے بیعت کر لی۔ اگر انہیں بر سر اقتدار آنے کی کچھ بھی گنجائش نظر آتی تو وُہ ہاتھ پیر مارتے اور آگے بڑھنے کی کوشش کرتے مگر عصمت بی بی از بے چادری انہیں چُپ سادھنا پڑی اور چپ کے سوا چارہ ہی کیا تھا کیونکہ اس وقت دو گروہوں میں سے ایک گروہ کی پُشت پناہی ضروری تھی اور انہیں کسی ایک گروہ کی بھی حمایت حاصل نہ تھی۔ ایک گروہ وُہ جو حضرت عثمان کے عادات و اطوار اور ان کے طرز عمل سے نالاں تھا اور ایک وُہ جو ان سے وابستگی کی بنا پر ان کا دوست و ہمنوا تھا۔ وُہ گروہ جو ان کے طرز عمل کا شکوہ سنج تھا وُہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی بر سر اقتدار لانا نہ چاہتا تھا اس لئے کہ ان کے طور طریقے بھی وہی تھے جن طور طریقوں کی وجہ سے لوگ حضرت عثمان کے خلاف ہوگئے تھے اور انہیں اپنا رویہ بدلنے یا خلافت سے دستبردار ہونے پر زور دیتے تھے۔ چنانچہ حضرت عثمان اگر دولت کی جمع آوری کی طرف مائل تھے

تو انہیں بھی زہد و قناعت سے کوئی ربط اور سادگی و سادہ معاشرت سے کوئی واسطہ نہ تھا بلکہ دولت کے بے پناہ ذخائر کے باوجود حرص و آز کے بندھنوں میں جکڑے ہُوئے تھے اور دولت پر دولت سمیٹتے چلے جا رہے تھے۔ چنانچہ طلحہ نے عراق و سراۃ میں کثیر جائیدادیں پیدا کیں کوفہ و بصرہ میں محلات تعمیر کئے اور بے شمار دولت ترکہ میں چھوڑ گئے۔ ابن عبد ربہ نے تحریر کیا ہے:-

لما قتل طلحة ابن عبید الله وجدوا فی ترکته ثلثمائة بهار من ذهب و فضة۔	جب طلحہ ابن عبید اللہ مارے گئے تو اُن کے ترکہ میں پُوری پوری کھال کے بنے ہُوئے تین سو تھیلے پائے گئے جن میں سونا اور چاندی بھری ہُوئی تھی۔"
(عقد الفرید۔ ج۳ ص۱۰۳)	

زبیر ابن عوام بھی اپنے دَور میں امیر الامراء اور عظیم سرمایہ دار تھے۔ چنانچہ ذہبی نے تحریر کیا ہے:-

کان له الف مملوك یؤدون الیه الخراج۔ (تاریخ الاسلام ج۲۔ ص۱۵۴)	ان کے ہاں ایک ہزار غلام تھے جو انہیں خراج ادا کرتے تھے۔"

انہوں نے اسکندریہ مصر بصرہ اور کوفہ میں قصر تعمیر کئے اور غلاموں کنیزوں اور اُونٹ گھوڑوں کے علاوہ ان کی سینت سینت کے رکھی ہوئی دولت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کی وصیت کے مطابق ایک تہائی ان کے پوتے کو دینے کے بعد:

صار لکل امرأة من نسائه۔ وکان له اربع نسوة۔ فی ربع الثمن الف الف ومائة الف۔	ان کی چاروں بیویوں میں سے ہر ایک کو گیارہ گیارہ لاکھ ملا جو آٹھویں حصّہ کی ایک چوتھائی تھا۔"
(عقد الفرید۔ ج۳۔ ص۱۰۴)	

اب رہا دوسرا گروہ جو حضرت عثمان کا ہوا خواہ تھا تو وہ ان دونوں کو قتل عثمان کے سلسلہ میں نمایاں کردار ادا کرنے کی وجہ سے مسند خلافت پر نہ دیکھ سکتا تھا۔ اگرچہ طلحہ نے حضرت عثمان کی زندگی ہی میں بیت المال کی کنجیوں پر قبضہ کرکے خلافت کی تمہید بٹھالی تھی مگر نہ انہیں کامیابی نصیب ہوئی اور نہ زبیر کو۔

جب مسند اقتدار کو خالی کروانے کے باوجود انہیں مقصد میں کامیابی نہ ہوئی تو جزوی اقتدار کی طرف رُخ کیا اور بیعت کے دُوسرے ہی دن حضرت سے یہ مطالبہ کردیا کہ انہیں کوفہ و بصرہ کی امارت دے دی جائے اور بیعت میں پیش قدمی کرنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ اس طرح حضرت کو ممنون احسان کرکے حکومت میں کوئی امتیازی عہدہ حاصل کرلیں مگر حضرت نے یہ گوارا نہ کیا کہ مملکت کے ان علاقوں کو

جو حکومت کے محاصل کا سرچشمہ تھے ان کی بڑھتی ہوئی حرص و ہوس کی آماجگاہ بننے دیں۔ چنانچہ آپ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں تمہارے معاملہ میں جو بہتر سمجھوں گا وُہ کروں گا فی الحال تم دونوں کا مرکز میں میرے قریب رہنا زیادہ بہتر ہے۔ ان کا خیال تو یہ تھا کہ چُونکہ انہیں کُوفہ و بصرہ میں اثر و نفوذ حاصل ہے اور انہی کی بھاگ دَوڑ سے وہاں کے لوگ مرکزی حکومت میں انقلاب لانے کے لئے جمع ہُوئے تھے اس لئے حضرت ان کے اثر و رسوخ کو دیکھتے ہُوئے بلا تامل انہیں کُوفہ و بصرہ کی حکومت کا پروانہ دے دیں گے اور رکن شوریٰ ہونے کی وجہ سے وُہ اسے اپنا جائز حق بھی سمجھتے تھے مگر انہیں یاس کے سوا کچھ حاصل نہ ہُوا اور انہوں نے سمجھ لیا کہ اس حکومت میں نہ انہیں من مانی کرنے کا موقع ملے گا اور نہ وُہ خصوصی مراعات حاصل ہوں گی جو سابقہ حکومتوں میں حاصل تھی۔ اب انہوں نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے غیر آئینی خطوط پر سوچنا شروع کر دیا اور اپنی نگاہوں کا رُخ حضرت عائشہ کی نقل و حرکت کی طرف موڑ دیا تا کہ ان کے عزائم کی روشنی میں مستقبل کا لائحہ عمل ترتیب دیں۔

حضرت عائشہ یہ چاہتی تھیں کہ حضرت عثمان کے قتل کے بعد طلحہ کو برسراقتدار لائیں اور اس طرح خلافت کو مستقل طور پر اپنے قبیلہ بنی تیم میں منتقل کر دیں اس لئے وُہ مکہ میں قیام کے بعد بلوائیوں کی یورش کا نتیجہ سُننے کے لئے بے چین رہتی تھیں اور ہر آنے جانے والے سے مدینہ کے حالات اور حضرت عثمان کے انجام کے بارے میں دریافت کرتی رہتی تھیں۔ اس اثنا میں مدینہ سے اخضر نامی ایک شخص مکّہ آیا۔ حضرت عائشہ نے اُسے بلوا کر پُوچھا کہ مدینہ کی شورش انگیزی کا کیا نتیجہ ہُوا اس نے کہا کہ حضرت عثمان نے مصر کے بلوائیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے اور ہنگامہ و شورش پر قابُو پا لیا ہے۔ ام المومنین تو دُوسرے ہی قسم کے تصوّرات کی پخت و پز میں مصروف تھیں کہ اس خبر نے ان کے خیالات کا شیرازہ درہم و برہم کر دیا اور انہوں نے تاسف آمیز لہجہ میں کہا:

انا للہ و انا الیہ راجعون۔	انا للہ و انا الیہ راجعون۔ کیا ان لوگوں کو قتل
ایقتل قوما جاؤ و ایطلبون	کر ڈالا ہے جو اپنا حق مانگنے اور ظلم کے
الحق وینکرون الظلم واللہ	خلاف آواز بلند کرنے کے لئے آئے تھے۔
لا نرضی بھذا۔ (تاریخ طبری ج ۳ ص ۴۶۸)	خدا کی قسم ہم اس پر راضی نہیں ہیں۔"

ابھی وُہ افسردگی و دل شکستگی کی حالت میں تھیں کہ ایک دُوسرے شخص نے آکر بتایا کہ اخضر کی دی ہوئی اطلاع غلط ہے مصریوں میں سے کوئی نہیں مارا گیا وُہ مدینہ میں کھلے بندوں دندناتے پھر رہے ہیں بلکہ حضرت عثمان اُن کے ہاتھ سے مارے گئے ہیں۔ یہ سُن کر ام المومنین کو ایک گونہ اطمینان ہُوا اور کہنے لگیں:

ابعدہ اللہ ذلک بما قدمت	خدا اُسے اپنی رحمت سے دُور رکھے یہ اُس کی

یدا ہ وما اللہ بظلام للعبید (شرح ابن ابی الحدید۔ج ۲ ص ۷۷) کرتوتوں کا نتیجہ ہے اور خدا تو اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔"

اب مکہ میں قیام کے بجائے مدینہ جانا اُن کے لئے ضروری ہوگیا تاکہ اپنے اثر و نفوذ سے مخالف رایوں کو دبا کر جسے برسر اقتدار لانا چاہتی تھیں اس کے لئے فضا سازگار بنائیں۔ چنانچہ فوراً سفر کا ساز و ساماں کیا اور مدینہ روانہ ہوگئیں۔ ابھی مکہ سے چھ میل کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ مقام سرف پر عبید ابن ابی سلمہ سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ آپ نے حضرت عثمان اور مدینہ کے سیاسی اوضاع کے بارے میں اس سے دریافت کیا اس نے کہا کہ حضرت عثمان قتل کر دیئے گئے ہیں۔ کہا کہ پھر کیا ہوا؟ کہا کہ اہل مدینہ نے حضرت علی کی بیعت کر لی ہے۔ سُننے کو تو یہ سُن لیا مگر زمین پیروں تلے سے کھسکتی اور آسمان دُھواں بن کر اُڑتا نظر آنے لگا۔ کانوں کو یقین نہ آیا تو پھر پُوچھا کہ کیا علی کی بیعت ہوگئی؟ کہا کہ ہاں علی کی بیعت ہوچکی اور اُن سے زیادہ اس مسند پر بیٹھنے کا سزاوار تھا بھی کون۔ اب ام المومنین کے لئے اپنے جذبات پر قابو رکھنا مشکل ہوگیا اور بے ساختہ اُن کی زبان سے نکلا:۔

لیت ھذہ انطبقت علی ھذہ ان تم الامر لصاحبك ردونی ردونی۔ (تاریخ کامل ج ۳ ص ۱۰۵) اگر علی کی بیعت ہوگئی ہے تو کاش یہ آسمان زمین پر پھٹ پڑے اب مجھے مکہ واپس جانے دو۔"

چنانچہ انہی قدموں پر مکہ کا رُخ کر لیا اور قتل عثمان پر اپنے رنج و افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا:۔

قتل واللہ عثمان مظلوما واللہ لاطلبن بدمہ۔ (تاریخ کامل ج ۳ ص ۱۰۵) خدا کی قسم عثمان مظلوم مارے گئے ہیں خدا کی قسم میں اُن کے خون کا انتقام لے کر رہوں گی۔"

عبید ابن ابی سلمہ اس فوری انقلاب اور متضاد طرز عمل کو دیکھ کر حیرت میں کھوگیا اور آگے بڑھ کر کہا کہ آپ تو عثمان کے بارے میں علانیہ اور بار بار کہا کرتی تھیں کہ

اقتلوا نعثلا فقد کفر۔ (تاریخ کامل ج ۳ ص ۱۰۵) اس نعثل کو قتل کر ڈالو یہ کافر ہوگیا ہے۔"

اور اب ایک دم آپ کی رائے میں تبدیلی کیسے آگئی؟ کہا کہ ہاں میں پہلے یہی کہا کرتی تھی اور میں کیا سب ہی یہ کہا کرتے تھے۔ مگر انہوں نے آخر وقت میں توبہ کر لی تھی اب میری یہ رائے پہلی رائے سے زیادہ صائب ہے۔

حضرت عائشہ کے اس عذر کی بھی ایک ہی رہی کہ حضرت عثمان نے توبہ کر لی تھی۔ ظاہر ہے کہ جب تک ام المومنین مدینہ میں موجود رہیں اس وقت تک تو توبہ کی نہ تھی ورنہ انہیں محاصرہ میں بلوائیوں کے

رحم و کرم پر چھوڑ کر مکّہ میں نہ آتیں۔ اور مکہ میں قتل عثمان کی خبر ملنے پر بھی اس توبہ کا علم حاصل نہ ہو سکا تھا ورنہ اس قتل پر اظہار اطمینان نہ کیا جاتا۔ پھر مکہ سے وادی سرف تک کی مختصر مسافت اور مختصر مُدّت میں بھی کوی ایسا ذریعہ نہ تھا جس سے انہیں توبہ کا علم حاصل ہوتا۔ پھر یک لخت امیرالمومنین کی خبر خلافت سُن کر حضرت عثمان کی مظلومیت بھی یاد آ گئی اور توبہ کا علم بھی ہو گیا۔ آخر وُہ کون سے ذرائع یا کون سے قرائن تھے جن سے انہیں توبہ کا علم ہوا جبکہ آخر وقت تک تمام معاملات جوں کے توں رہے اور اُن میں قطعاً کوی تبدیلی نہیں ہوی۔ لوگوں کی شکایتوں کا سلسلہ ویسے ہی رہا نہ مظلموں کو ختم کیا گیا اور نہ شکایات کا ازالہ ہوا۔ اور اگر دفع الوقتی کے لئے وعدہ کیا بھی تو وُہ آخر وقت تک شرمندۂ ایفاء نہ ہوا۔ جب ان کے طرز عمل میں کوی تبدیلی پیدا ہی نہیں ہوی تو توبہ کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ آخر محاصرین کا مطالبہ بھی تو یہی تھا کہ وُہ اپنی حرکتوں سے توبہ کریں اپنی روش بدلیں مظالم کو ختم کریں یا خلافت سے دستبردار ہو جائیں۔ اگر وُہ مظالم کے ختم کرنے کا اقدام کر چکے ہوتے تو ان کے قتل کی نوبت ہی کیوں آتی۔ امر واقعہ تو یہ ہے کہ جب ام المومنین اس تبدیلی کا کوی معقول عذر پیش نہ کر سکیں تو توبہ کی بات بنائی اور لے دے کے یہی ایک بات تو بنائی جا سکتی تھی۔ مگر وہ اس بات سے عبید ابن ابی سلمہ کو مطمئن نہ کر سکیں۔ چنانچہ عبید نے صاف صاف کہہ دیا:-

عذر و اللہ ضعیف یا اُمّ المومنین (کتاب الامامۃ والسیاسۃ ج۱۔ ص۵۲)

اے ام المومنین قسم بخدا یہ بالکل بودا عذر ہے"۔

ام المومنین جلد از جلد مکہ پہنچ جانا چاہتی تھیں انہوں نے عبید کی بات پر کوی توجہ نہ دی اور آگے بڑھ گئیں۔ جب مکہ میں وارد ہوئیں تو لوگوں نے کہا کہ اے ام المومنین ابھی تو آپ روانہ ہوی تھیں کہ پلٹ بھی آئیں۔ کہا کہ عثمان بے گناہ مارے گئے ہیں میں ان کا خون رائیگاں نہیں جانے دوں گی اور اس وقت تک واپس نہیں جاؤں گی جب تک ان کے خون کا انتقام نہ لے لوں گی لوگ ان کی موجودہ اور سابقہ روش کے تضاد پر نظر کرتے ہوُے حیران تو ہوے مگر کچھ کہنے کے بجائے خاموش ہو گئے۔

ام المومنین نے یہاں آتے ہی عثمان کی مظلومیت کا ڈھنڈورا پیٹ کر حضرت علی کے خلاف ایک مضبوط محاذ قائم کر لیا۔ جب طلحہ و زبیر کو معلوم ہوا کہ حضرت عائشہ مکہ میں عثمان کی مظلومیت کا پرچار کر رہی ہیں اور علی کو ان کے قتل کا ذمہ دار ٹھہرا رہی ہیں تو انہوں نے عبداللہ ابن زبیر کو چند خطوط دے کر ام المومنین کے پاس مکہ بھیجا اور اُن پر زور دیا کہ وُہ لوگوں کو عثمان کے بے گناہ مارے جانے کا یقین دلا کر انتقام کی تحریک چلائیں اور جس طرح بن پڑے انہیں علی کی بیعت سے روکیں۔ ان پیغامات نے ان کے ارادہ کو اور تقویت دی اور انہوں نے پوُرے زور و شور سے قصاص عثمان کے نام پر لوگوں کو دعوت

دینا شروع کر دی۔ سب سے پہلے عبداللہ ابن عامر حضرمی نے جو حضرت عثمان کی طرف سے والی مکہ تھا اس آواز پر لبیک کہی اور سعید ابن عاص، ولید ابن عقبہ اور دوسرے اموی اُن کے ہمنوا بن کر کھڑے ہو گئے۔

طلحہ و زبیر قصاص کی آڑ میں ہنگامہ کھڑا کر کے اپنی محرومی و ناکامی کا بدلہ لینا چاہتے تھے لیکن مدینہ کی فضا اس ہنگامہ آرائی کے لئے سازگار نہ تھی کیونکہ قتل عثمان کے سلسلہ میں اہل مدینہ ان کا کردار دیکھے ہوئے تھے جس کے بعد اس کی کوئی صورت نہ تھی کہ وہ انتقام کی آواز پر انہیں اپنے گرد جمع کر لینے میں کامیاب ہو جاتے۔ البتہ مکہ میں یہ تحریک کامیاب ہو سکتی تھی کیونکہ ام المومنین، سابق والی مکہ عبداللہ ابن عامر، مروان ابن حکم اور مدینہ سے نکل کھڑے ہونے والے بنی اُمیہ یہاں پر جمع تھے اور لوگوں کو حضرت کے خلاف کرنے میں پیہم مصروف تھے اور ایک طبقہ کو اپنا ہمنوا بنا بھی چکے تھے۔ چنانچہ ان دونوں نے چار مہینے جوں توں کر کے مدینہ میں گزارے اور پھر اپنی مہم کی تکمیل کے لئے مکہ جانے کا فیصلہ کر لیا اور حضرت سے کہا کہ ہمارا ارادہ عمرہ کا ہے ہمیں مکہ جانے کی اجازت دی جائے۔ آپ ان کے تیوروں کو دیکھ کر سمجھ رہے تھے کہ وہ بیعت کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہو کر مکہ کو اپنی جولانیوں کا مرکز بنانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے فرمایا:-

واللہ ما ارادا العمرۃ و	خدا کی قسم ان کا ارادہ عمرہ کا نہیں ہے بلکہ
لکنھما ارادا الغدرۃ۔	غدر و فریب پر اُتر آئے ہیں"

(تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۱۵۶)

امیر المومنین مکہ جانے کا خیال اُن کے ذہنوں سے نکال دینا چاہتے تھے مگر یہ خیال اُن کے ذہنوں سے نہ نکلا اور وہ برابر اصرار کرتے رہے۔ آخر حضرت نے ان سے دوبارہ بیعت لے کر انہیں مکہ جانے کی اجازت دے دی۔ ان دونوں نے مکہ پہنچ کر حضرت عثمان کے خون کی ذمہ داری حضرت پر عائد کر کے ام المومنین کے موقف کی تائید کی اور اُن کی جماعت کے سرگرم رُکن بن گئے۔

اس موقع پر ممکن ہے کہ بعض ذہنوں میں خیال پیدا ہو کہ جب حضرت یہ سمجھتے تھے کہ ان کا مقصد بیعت توڑ کر ہنگامہ آرائی کرنا ہے تو انہیں مکہ جانے کی اجازت ہی کیوں دی اس طرح تو حضرت نے خود اپنے خلاف حریف کو صف آرائی کا موقع دیا۔ اگر انہیں اجازت نہ دی جاتی تو وہ نہ فوجکشی کر کے مُلک کے نظم و نسق کو درہم و برہم کرتے نہ انتشار و بدامنی پھیلاتے اور نہ بصرہ کی خونریز جنگ کی نوبت آتی۔ مگر جب اس صورت کے علاوہ دوسری متبادل صورتوں کو دیکھا جاتا ہے تو پھر یہی ایک صورت قابل عمل اور تقاضائے وقت کے مطابق نظر آتی ہے ان متبادل صورتوں میں سے ایک صورت تو یہ تھی کہ پیش بندی کرتے ہوئے انہیں پابند مسکن کر دیتے اور کہیں آنے جانے سے روک دیتے۔ اور دوسری صورت یہ تھی کہ من و عن ان کا مطالبہ تسلیم کر کے انہیں کوفہ و بصرہ کی امارت سپرد کر دیتے۔

مگر یہ دونوں صورتیں ناقابلِ عمل تھیں۔ پہلی صورت کہ حضرت انہیں محصور یا نظر بند کر دیتے تو یہ اقدام سزا قبل جرم اور فکر و عمل کی آزادی کے سلب کرنے کے مترادف ہوتا اور یہ دونوں چیزیں نہ اسلام کے مزاج سے سازگار تھیں اور نہ امیر المومنین کی سیرت سے ہم آہنگ۔ پھر یہ کہ انہی ایام میں بنی اُمیہ کے وہ افراد جو کہیں آجا سکتے تھے کچھ مکہ چلے گئے اور کچھ شام روانہ ہو گئے۔ مگر حضرت نے نہ ان کی نقل و حرکت پر کوئی پہرا بٹھایا اور نہ انہیں مدینہ چھوڑ کر جانے سے منع کیا۔ اب اگر ان دونوں کو روک لیتے تو یقیناً ان کے ہمنوا چیخ اُٹھتے اور اس کے خلاف آواز اُٹھاتے کہ حضرت نے دوسروں کو جہاں وہ جانا چاہتے تھے جانے دیا اور ان دو بزرگ صحابیوں اور مجلس شوریٰ کے ممتاز رکنوں پر جو بظاہر بے گناہ ہیں قدغن لگا دی ہے اور اپنی حراست میں لے لیا ہے۔ مصلحت اندیشی کا تقاضا یہی تھا کہ انہیں روک کر اہل مدینہ اور ان کے ہمنواؤں کی مخالفت مول نہ لی جاتی خصوصاً ان حالات میں کہ ابھی حکومت کسی مضبوط بنیاد پر استوار نہیں ہوئی اور امیر شام ایسا ہوشیار و عیار حکومت کی بنیادوں کو متزلزل کرنے کی فکر میں ہے بے شک ظاہری مصالح کا لحاظ اس مقام پر جہاں اسلام کے کسی حکم سے تصادم ہوتا ہو درست نہیں ہے مگر جہاں قانون اسلام کی پابندی کے ساتھ کوئی مصلحت بھی کارفرما ہو تو اسے ملحوظ رکھنے میں کوئی مانع نہیں ہے۔ رہی دوسری صورت کہ حضرت انہیں کوفہ و بصرہ کی امارت سونپ دیتے آخر کسی نہ کسی کو وہاں کی حکومت سپرد کرنا ہی تھی مگر حضرت ان دونوں کے چہروں کے اتار چڑھاؤ سے سمجھ رہے تھے کہ انہیں نہ آپ کے زیر اقتدار رہنا پسند ہے اور نہ آپ کی اطاعت ہی گوارا ہے اس لئے کہ جو حکومت کا خود متوقع ہوتا ہے اُسے دوسرے کی جسے بزعم خود اپنے ہی درجہ کا سمجھتا ہو اطاعت شاق گزرا ہی کرتی ہے۔ اس صورت میں اگر انہیں بصرہ و کوفہ کی حکومت دے بھی دی جاتی جب بھی وہ اس جزوی اقتدار پر قناعت کر کے مرکزی حکومت کے تابع رہنا پسند نہ کرتے خصوصاً جبکہ زبیر کو اہل کوفہ کی اور طلحہ کو اہل بصرہ کی پشت پناہی بھی حاصل تھی اور وہ انہیں بحیثیت خلیفہ پوری مملکت پر فرمانروا دیکھنا چاہتے تھے اور اس کا اظہار بھی کر چکے تھے۔ ان حالات میں یہی ہوتا کہ وہ پاؤں جمانے کے بعد مرکز سے رشتہ توڑ لیتے اور اپنے زیر اثر عوام کے تعاون سے مستقل حکومت قائم کرتے اس طرح کہ کوفہ پر زبیر کی حکومت ہوتی اور بصرہ اور اس کے مضافات پر طلحہ کا اقتدار ہوتا اور شام میں معاویہ کا پرچم پہلے ہی سے لہرا رہا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ایک ہی ریاست میں قبائلی طرز کی متعدد حکومتیں قائم ہو جاتیں مرکزیت لامرکزیت میں بدل جاتی ہر طرف طوائف الملوکی پھیل جاتی اور اسلامی ریاست اس طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی کہ ان پاشان و پریشان ٹکڑوں کو یکجا کرنا مشکل ہو جاتا۔ اب ایک یہی صورت رہ جاتی ہے کہ جہاں وہ جانا چاہتے تھے انہیں جانے دیا جائے اور اس اجازت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ حکومت کے خلاف کوئی غلط قدم اُٹھائیں تو اس کے نتائج کی ذمہ داری انہی پر عائد ہو اور ان کے خلاف کوئی تادیبی کاروائی عمل میں

آئے تو حکومت کو موردِ الزام قرار نہ دیا جا سکے۔

غرض یہ لوگ ایک لگے بندھے منصوبہ کے ماتحت مکہ میں ڈیرے ڈال کر بیٹھ گئے اور بنی ہاشم اور خصوصاً حضرت علی پر قتل عثمان کا الزام عائد کرکے باقاعدہ قصاص کی مہم شروع کر دی۔ اس مہم کو روبکار لانے کے لئے سرمایہ کی بھی ضرورت تھی اس کا حل یوں نکل آیا کہ بصرہ کا معزول حاکم عبداللہ ابن عامر ابن کریز بیت المال کی جمع جتھا لے کر مکہ پہنچ گیا اور یمن سے یعلی ابن اُمیہ چھ لاکھ درہم اور چھ سو اونٹ اپنے ساتھ لایا اور یہ تمام سرمایہ جنگی اخراجات کے لئے مخصوص کر دیا گیا۔ ابوالفدا نے تحریر کیا ہے:۔

خرج یعلی و اخذ ما کان من المال ولحق بمکة وصار مع عائشة وطلحة والزبیر و سلم الیھم المال۔ (تاریخ ابوالفدا ج۱۔ ص۱۷۲)

یعلی تمام پونجی سمیٹ کر نکل کھڑا ہوا اور مکہ پہنچ کر حضرت عائشہ اور طلحہ و زبیر کے ساتھ ہو گیا اور وہ مال ان کی تحویل میں دے دیا۔"

اہل مکہ سے بھی سرمایہ فراہم کیا گیا اور مالی لحاظ سے مطمئن ہو گئے۔ جب یہ ابتدائی انتظامات مکمل ہو گئے تو حضرت عائشہ کی رہائش گاہ پر باہمی صلاح و مشورہ کے لئے جمع ہوئے۔ جنگ کا مسئلہ تو طے شدہ تھا البتہ محاذِ جنگ کا ابھی کوئی تصفیہ نہ ہوا تھا۔ حضرت عائشہ کی رائے تھی کہ مدینہ کو محاصرہ میں لے کر جنگ چھیڑ دی جائے مگر اسے یہ کہہ کر مسترد کر دیا گیا کہ بلوائیوں کے ہوتے ہوئے اہل مدینہ سے نمٹنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ اور کچھ لوگوں نے یہ مشورہ دیا کہ شام جانا چاہیئے۔ اس پر ابن عامر نے کہا:

قد کفاکم معاویة الشام۔ (تاریخ کامل۔ ج۳۔ ص۱۰۶)

شام میں معاویہ کے ہوتے ہوئے تمہاری ضرورت نہیں ہے۔"

شام کو محاذِ جنگ بنانے سے یہ امر بھی مانع تھا کہ معاویہ جنہوں نے حضرت عثمان کے ماتحت ہوتے ہوئے ان کی مدد سے گریز کیا ہو وہ ان لوگوں کی مدد پر کیوں آمادہ ہوتے اور جنہوں نے حضرت علی کی بیعت پر آمادگی ظاہر نہ کی ہو وہ ان کی کامیابی کے بعد طلحہ یا زبیر کی خلافت بلاچون وچرا کس طرح تسلیم کر لیتے۔ بیشک معاویہ ان کے ہمنوا تھے مگر اسی حد تک جس حد تک امیرالمومنین کو اقتدار سے الگ کرنے کا تعلق تھا۔ مگر اس مقصد میں کامیاب ہونے کے بعد طلحہ یا زبیر کی خلافت کو تسلیم کر لینا ان کی اقتدار پسند طبیعت سے ناممکن تھا۔ آخر بصرہ کے معزول حاکم عبداللہ ابن عامر کے کہنے سے بصرہ پر اتفاق رائے ہو گیا۔ بصرہ کو محاذِ جنگ قرار دینے میں جہاں یہ مصلحت کارفرما تھی کہ وہاں پر ان کے ہمنوا و ہم خیال کثرت سے موجود ہیں جو جنگ میں ان کا ساتھ دیں گے وہاں یہ فائدہ بھی نظر آ رہا تھا کہ حجاز کی ایک سمت شام واقع ہے اور دوسری سمت عراق۔ اگر بصرہ کو محاذِ جنگ بنا کر عراق پر تسلط قائم کر لیا گیا تو حجاز

اِن دو مخالف طاقتوں میں گھر کر رہ جائے گا جس کے بعد امیر المومنین کی سپاہ کو بآسانی شکست دے کر اقتدار پر قبضہ کیا جا سکتا ہے یا ان دو طاقتوں کے زیر اثر رکھا جا سکتا ہے۔

اس تجویز سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کے پیش نظر خون عثمان کا قصاص نہ تھا۔ اگر ان کا مقصد قصاص ہوتا تو بصرہ پر دھاوا کرنے کے بجائے مدینہ پر حملہ آور ہوتے جہاں یہ حادثہ رونما ہوا تھا اور جہاں اس حادثہ کے ذمہ دار افراد موجود تھے۔ اور بصرہ میں نہ حضرت عثمان کا کوئی قاتل تھا اور نہ وہاں کے باشندے ان کے مقصد میں حائل تھے کہ انہیں راہ سے ہٹانا ضروری ہوتا۔ غرض محاذ جنگ کے تصفیہ کے بعد کوچ کی تیاری شروع ہو گئی۔ یعلی نے قبیلۂ عرینہ کے ایک شخص سے چھ سو درہم میں ایک اونٹ خرید کر ام المومنین کی خدمت میں پیش کیا اور عمومی اعلان کیا کہ جس کے پاس سامان سفر ہتھیار اور سواری نہ ہو وہ آئے اسے تمام چیزیں مہیا کی جائیں گی۔ چنانچہ امیر المومنین نے یعلی کے بارے میں فرمایا:۔

کان یعطی الرجل الواحد	وہ میرے خلاف لڑنے کے لئے ہر شخص کو
الثلثین دینارا والسلاح	گھوڑا ہتھیار اور تیس تیس دینار
والفرس علی ان یقاتلنی۔	دیتا تھا۔"

(تاریخ الاسلام ذہبی۔ ج۲۔ ص۱۴۹)

طلحہ و زبیر نے عبد اللہ ابن عمر پر بھی زور دیا کہ وہ اُن کی موافقت و ہمراہی اختیار کرے مگر اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ:۔

ان بیت عائشۃ خیر لھا من	عائشہ کے لئے ہودے میں بیٹھنے سے گھر
ھودجھا وانتما المدینۃ	میں ٹکنا اور تمہارے لئے بصرہ جانے سے مدینہ
خیر لکما من البصرۃ۔ (الامامۃ	میں رہنا زیادہ بہتر ہے۔"

والسیاستہ۔ ج۱ ص۵۶)

حضرت عائشہ نے حضرت حفصہ اور دوسری امہات المومنین کو جو حج کے بعد مکہ میں قیام فرما تھیں اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی اور انہیں بھی اپنے ہمراہ جنگ میں حصہ لینے کی دعوت دی۔ حضرت حفصہ تو بلا تامل تیار ہو گئیں مگر بقیہ ازواج پیغمبر نے انکار کر دیا۔ اور آخر عبد اللہ ابن عمر کے منع کرنے سے حضرت حفصہ کو بھی رُک جانا پڑا۔ ابن اثیر نے تحریر کیا ہے:۔

وکان ازواج النبی معھا علی	ازواج رسول حضرت عائشہ کے ہمراہ مدینہ جانے
قصد المدینۃ فلما تغیر	کا ارادہ رکھتی تھیں لیکن جب حضرت عائشہ کی
رایھا الی البصرۃ ترکن ذلک	رائے بدل گئی اور وہ بصرہ جانے پر آمادہ ہوئیں

واجابتهم حفصة الی المسیر معهم فمنعها اخوها عبداللہ ابن عمر۔ (تاریخ کامل۔ ج ۳۔ ص ۱۰۱)

"تو ازواج نبی نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور حفصہ نے حضرت عائشہ کے ہمراہ جانا قبول کر لیا مگر ان کے بھائی عبداللہ ابن عمر نے انہیں روک دیا۔"

حضرت حفصہ کی آمادگی خلاف توقع نہ تھی بلکہ انہیں آمادہ ہونا ہی چاہئے تھا اس لئے کہ ان کے اور حضرت عائشہ کے نظریات میں بڑی حد تک وحدت و ہم آہنگی پائی جاتی تھی نہ ان کی رایوں میں تضاد ہو سکتا تھا اور نہ ان کی طبیعتوں میں اختلاف۔ اور اسی اتحاد مذاق کی وجہ سے دونوں ایک ہی حزب و گروہ سے وابستہ سمجھی جاتی تھیں۔ چنانچہ محمد ابن اسمٰعیل بخاری نے تحریر کیا ہے:۔

ان نساء رسول اللہ کن حزبین فحزب فیہ عائشة وحفصة وسودة والحزب الآخر ام سلمة وسائر نساء رسول اللہ۔ (صحیح بخاری۔ ج ۲ ص ۵۹)

"ازواج پیغمبر کے دو گروہ تھے ایک گروہ میں عائشہ حفصہ اور سودہ تھیں اور دوسرے گروہ میں ام سلمہ اور بقیہ ازواج رسول تھیں۔"

حضرت ام سلمہ کی تمام ہمدردیاں حضرت علی کے ساتھ تھیں جب حضرت عائشہ نے انہیں اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کی تو وہ حضرت کے خلاف کوئی بات سننا بھی گوارا نہ کر سکتی تھیں چہ جائیکہ حضرت کے خلاف قدم اٹھاتیں۔ انہوں نے حضرت عائشہ کے اس اقدام کی سخت مخالفت کی اور انہیں اس ارادہ سے باز رکھنے کے لئے تحریر کیا:۔

لو علم رسول اللہ ان النساء یحتملن الجهاد عهد الیك اما علمت انه قد نهاك عن الفراطة فی الدین فان عمود الدین لا یثبت بالنساء ان مال ولا یرأب بهن ان انصدع جهاد النساء غض الاطراف وضم الذیول وقصر الموادة ما کنت قائلة لرسول اللہ لو عارضك ببعض هذه الفلوات ناصة قعودا عن

"اگر رسول اللہ یہ جانتے کہ عورتیں جہاد کا بار اٹھا سکتی ہیں تو وہ تمہیں حکم دے جاتے کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ رسول اللہ تمہیں دینی معاملات میں تجاوز سے منع فرما گئے تھے وہ جانتے تھے کہ اگر دین کا ستون جھک جائے تو وہ عورتوں کے ذریعہ تھم نہیں سکتا اور اگر اس میں شگاف پڑ جائے تو عورتوں کے ذریعہ اس کی درستی و اصلاح نہیں ہو سکتی۔ عورتوں کا جہاد یہ ہے کہ وہ نگاہیں نیچی رکھیں اپنے دامن کو سمیٹیں اور تعلقات محدود رکھیں۔ اگر رسول اللہ تمہیں ان صحراؤں میں اونٹ دوڑاتے ہوئے ایک چشمہ سے دوسرے چشمہ

منهل الی منهل وغدا تردین علی رسول اللہ واقسم لو قیل لی یا ام سلمۃ ادخلی الجنۃ لاستحییت ان القی رسول اللہ ھاتکۃ حجابا ضربہ علی فاجعلیہ سترک وقائمۃ البیت حصنک۔ (عقد الفرید ج ۳ ص ۹۹)

تک جاتے ہوئے دیکھ پائیں تو تم انہیں کیا جواب دو گی۔ کل تمہیں رسول اللہ کے سامنے جانا ہی ہو گا۔ خدا کی قسم اگر مجھ سے کہا گیا کہ اے ام سلمہ جنت میں داخل ہو جاؤ تو اگر میں نے اس حجاب کو توڑ ڈالا ہو جس کا مجھے پابند بنا گئے تھے تو مجھے پیغمبر کا سامنا کرتے ہوئے شرم آئے گی لہٰذا تم پردہ کی پابند اور گھر کی چار دیواری میں بند رہو۔"

حضرت عائشہ نے جناب ام سلمہ کی نصیحت آموز تحریر سے اثر لینے کے بجائے یہ جواب دیا کہ میں دو متحارب گروہوں میں صلح و آشتی کی فضا پیدا کرنے کے لئے جا رہی ہوں اور فضا کو پُر امن رکھنے کے لئے یہ اقدام ناگزیر ہے۔ ام المومنین کا یہ جواب دفع الوقتی کے لئے تھا ورنہ یہ حقیقت ڈھکی چھپی ہوئی نہیں ہے کہ وہ اس نزاع میں خود ایک فریق کی حیثیت رکھتی تھیں اگر وہ گھر میں بیٹھی رہتیں اور لاؤ لشکر جمع کر کے بصرہ کا رُخ نہ کرتیں تو دو فریق پیدا ہی نہ ہوتے اور نہ اُن میں جنگ و قتال کی نوبت آتی اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہ دو مخالف گروہوں کے درمیان صلح و صفائی کا مقصد لے کر بصرہ جانے پر تیار ہوئی تھیں تو اس کے لئے سامان حرب و ضرب اور لشکر گراں کے جمع کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

ام المومنین سات سو کی جمعیت کے ساتھ جو اس وقت تک ان کے پرچم کے نیچے جمع ہو چکی تھی بصرہ کی سمت روانہ ہو گئیں راستے میں اور لوگ بھی کچھ بے سوچے سمجھے اور کچھ ان کی باتوں سے متاثر ہو کر ساتھ ہوتے گئے اور لشکر کی تعداد تین ہزار تک پہنچ گئی۔ جب یہ لشکر ذات عرق میں پہنچا جہاں سے بصرہ کی راہ لینا تھی تو سعید ابن عاص نے مروان اور اس کے چند مخصوص ہمنواؤں سے تنہائی میں گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ہم لوگ کدھر منہ اٹھائے چلے جا رہے ہیں اور ہمارا اس دشت پیمائی سے مقصد و مُدعا کیا ہے۔ مروان نے کہا کہ تمہیں معلوم ہی ہے کہ ہم بصرہ جا رہے ہیں اور مقصد قاتلان عثمان سے انتقام لینا ہے۔ کہا:-

ثارکم علی اعجاز الابل فاقتلوھم ثم ارجعوا الی منازلکم لا تقتلوا انفسکم۔ (تاریخ طبری ج ۳ ص ۴۷۲)

عثمان کے قاتل (طلحہ و زبیر) تمہارے ساتھ اُونٹوں پر سوار ہیں انہیں قتل کر دو اور اپنے گھروں کو واپس جاؤ اور ناحق ایک دوسرے کو قتل نہ کرو۔"

مروان نے کہا کہ اب گھروں کو کس منہ سے جائیں ہمیں بصرہ جانا ہی ہو گا تاکہ تمام قاتلان عثمان سے

انتقام لے سکیں۔ سعید ان سے گفتگو کرنے کے بعد طلحہ و زبیر کے پاس آیا اور اُن سے پوچھا کہ اگر تم نے یہ جنگ جیت لی اور مقصد میں کامیاب ہوگئے تو مسند خلافت پر کسے بٹھاؤ گے کہا کہ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے ہم دونوں میں سے جسے لوگ منتخب کرلیں گے وہی خلیفہ ہوگا۔ سعید نے کہا کہ جب تم قصاص عثمان کے لئے گھروں سے نکلے ہو تو تمہیں عثمان کے بیٹوں میں سے کسی کو خلیفہ بنانا چاہئے اور ان کے دونوں بیٹے ابان اور ولید لشکر میں موجود بھی ہیں۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو لوگ یہی سمجھیں گے کہ تم خون عثمان کے قصاص کا لبادہ اوڑھ کر اپنے لئے اقتدار کی راہ ہموار کرنے کے لئے نکلے تھے۔ طلحہ و زبیر دونوں نے یکزبان ہوکر کہا:۔

ندع شیوخ المهاجرین و نجعلها لابناءهم۔ (تاریخ طبری۔ ج ۳۔ ص ۴۷۲) کیا ہم سن رسیدہ مہاجرین کو چھوڑ کر ان کے لڑکے بالوں کو خلیفہ بنائیں "۔

سعید سمجھ گیا کہ یہ لوگ قصاص طلبی کے لئے نہیں نکلے بلکہ یہ سارا ہڑبونگ حکومت و اقتدار کے لئے ہے۔ چنانچہ وہ اُن سے الگ ہوگیا اور اس کے ساتھ عبداللہ ابن خالد، مغیرہ ابن شعبہ اور قبیلۂ بنی ثقیف کے لوگ بھی علیحدہ ہوکر طائف کی طرف چلے گئے اور باقی لشکر منزل کی طرف روانہ ہوگیا۔
اثنائے سفر میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ام المومنین کے عزم و ارادہ کو وقتی طور پر متزلزل کردیا اور وہ یہ کہ جب لشکر ایک چشمہ پر جو ایک عورت حوأب بنت کلب ابن وبرہ کے نام پر حوأب کہلاتا تھا شب بسری کے لئے فروکش ہوا تو حضرت عائشہ نے ایک سمت سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سُنیں یہ کوئی انوکھی اور غیر معمولی بات نہ تھی مگر ام المومنین کے ذہن میں کچھ الجھن سی پیدا ہوئی۔ پاس ہی ساربان کھڑا تھا اس سے پوچھ لیا کہ یہ کون سا مقام ہے اس نے کہا کہ یہ حوأب ہے۔ حوأب کا نام سُننا تھا کہ دہشت و خوف سے لرز اُٹھیں اور چیخ چیخ کر کہنے لگیں:۔

ردونی ردونی انا واللہ صاحبۃ ماء الحوأب۔ (تاریخ کامل ج ۳ ص ۱۰۱) مجھے واپس جانے دو مجھے واپس جانے دو خدا کی قسم میں ہی چشمۂ حوأب والی ہوں "۔

طلحہ و زبیر اور ساتھ والوں کو اس ایک دم تبدیلی پر حیرت ہوئی۔ کہا کہ یہ مقام حوأب ہے تو ہوا کرے آپ سراسیمہ و پریشان کیوں ہیں اور واپسی پر اصرار کس لئے ہے؟ کہا:۔

سمعت رسول اللہ یقول و عندہ نساؤہ لیت شعری ایتکن تنبحها کلاب الحوأب (تاریخ کامل ج ۳ ص ۱۰۱) ایک مرتبہ رسول اللہ کی بیویاں آپ کے گرد جمع تھیں کہ میں نے آپ کو فرماتے سُنا تم میں کون ہے جس پر حوأب کے کتے بھونکیں گے "۔

اب مجھے کوئی شک و شبہ نہیں رہا کہ اس سے میں ہی مراد تھی اور میری ہی طرف آنحضرت کا اشارہ

تھا لہٰذا مجھے یہیں سے واپس چلا جانا چاہیئے۔ جب ان کے ہمراہیوں نے کام بگڑتے دیکھا تو کہا کہ ساربان نے غلط کہا ہے یہ چشمۂ حواب نہیں ہے۔ اور عبداللہ ابن زبیر نے اڑوس پڑوس سے پچاس آدمیوں کو جمع کر کے اور انہیں کچھ دے دلا کر اس پر گواہی بھی دلوا دی۔ امام شعبی کہتے ہیں:۔

ھی اول شھادۃ زور اقیمت فی الاسلام۔ (تذکرہ خواص الامہ ص ۳۹)	یہ پہلی جھوٹی گواہی تھی جو اسلام میں دی گئی۔"

ابھی ام المومنین ذہنی کشمکش اور تذبذب کے عالم میں تھیں کہ ایک طرف سے یہ شور سُنائی دیا:

النجاء النجاء قد ادرککم علی ابن ابی طالب (تاریخ کامل ج ۳ ص ۱۰۱)	جلدی کرو جلدی کرو علی ابن ابی طالب تمہارے سروں پر پہنچ گئے ہیں۔"

اس آواز کے سُنتے ہی لوگ افراتفری کے عالم میں اُٹھ کھڑے ہوئے اور ام المومنین کے خیالات نے اس طرح پلٹا کھایا کہ نہ حواب یاد رہا اور نہ قول رسول بلکہ بجھے ہوئے جوش اور پژمردہ حوصلے میں پھر سے زندگی آ گئی اور پورے جوش و خروش کے ساتھ لشکر کی قیادت کرتے ہوئے بصرہ کی سمت چل دیں۔

ادھر امیر المومنین بغاوتِ شام کو فرو کرنے کی فکر میں تھے اور ایک لشکر ترتیب دے کر شام کی طرف حرکت کرنا چاہتے تھے کہ طلحہ و زبیر کی بیعت شکنی اور حضرت عائشہ کی لشکر کشی کی اطلاع مدینہ میں پہنچی۔ حضرت کو طلحہ و زبیر کی طرف سے تو یہ اندیشہ تھا کہ وُہ معاویہ سے ساز باز کر کے فتنہ و شر کو ہوا دیں گے۔ مگر حضرت عائشہ کی طرف سے یہ سان گمان بھی نہ تھا کہ وُہ معرکہ آرائی کے لئے فوجکشی کریں گی اور خدا و رسُول کے حکم کے خلاف گھر سے نکل کھڑی ہوں گی۔ مجبوراً آپ کو شام کا ارادہ ملتوی کرنا پڑا تا کہ پیش آیند صورت حال سے نمٹ سکیں۔ حضرت نے مدینہ کے سرکردہ اشخاص کو مسجد نبوی میں جمع کیا اور فرمایا کہ تمہیں طلحہ و زبیر کے باغیانہ اقدام کا علم ہو چکا ہے تم میرا ساتھ دو تا کہ ان لوگوں کو بصرہ پہنچنے سے پہلے راستہ میں روک لیا جائے۔ کچھ لوگ حضرت عائشہ اور طلحہ و زبیر ایسی با اثر شخصیتوں کے مقابلہ میں کھڑے ہونے سے ہچکچانے لگے اور کچھ لوگوں نے جن میں سعد ابن ابی وقاص، اسامہ ابن زید، محمد ابن مسلمہ اور عبداللہ ابن عمر شامل تھے صاف انکار کر دیا البتہ ہثیم ابن تیہان زیاد ابن حنظلہ ابو قتادہ انصاری وغیرہ نے حمایت حق کے جذبہ سے متاثر ہو کر بھرپور تعاون کا یقین دلایا اور ابو قتادہ نے پُرجوش لہجے میں کہا:۔

یا امیر المومنین ان رسول اللہ قلدنی ھذا السیف وقد اغمدتہ زمانا وقد حان	یا امیر المومنین یہ تلوار مجھے رسُول اللہ نے باندھی تھی اور ایک عرصہ سے یہ نیام میں بند پڑی ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ میں ان

تجریدہ علیٰ ھؤلاء القوم الظالمین الذین لا یالون الامۃ غشا۔ (تاریخ کامل جلد ۳ صفحہ ۱۱۱)

ظالموں کے خلاف اسے بے نیام کروں جو اُمت کو فریب دینے سے دریغ نہیں کر رہے "۔

حضرت ام سلمہ نے اپنے فرزند عمر ابن ابی سلمہ کو حضرت کی خدمت میں پیش کیا اور کہا:۔

قد دفعتہ الیک وھو اعز علیّ من نفسی فلیشھد مشاھدک حتی یقضی اللہ ماھو قاض فلولا مخالفۃ رسول اللہ لخرجت معک کما خرجت عائشۃ مع طلحۃ والزبیر۔ (انساب الاشراف جلد ۲ صفحہ ۳۳)

"میں اسے آپ کے سپرد کرتی ہوں یہ مجھے جان سے زیادہ عزیز ہے یہ تمام معرکوں میں آپ کے ہمرکاب رہے گا یہاں تک کہ خداوند عالم وہ فیصلہ کرے جو وہ کرنے والا ہے۔ اگر رسول اللہ کے حکم کی خلاف ورزی نہ ہوتی تو میں آپ کے ہمراہ جاتی جس طرح عائشہ، طلحہ و زبیر کے ساتھ نکل کھڑی ہوئی ہیں "۔

امیر المومنین نے مدینہ میں سہل ابن حنیف انصاری کو اور مکہ میں قثم ابن عباس کو اپنا قائم مقام مقرر کیا اور علیٰ اختلاف الروایۃ چھ سو سے ایک ہزار کی جمعیت کے ساتھ جس میں چار سو بیعت رضوان میں شریک ہونے والے صحابہ تھے شہر سے نکل کھڑے ہوئے۔ جب مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر مقام ربذہ میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ آگے جا چکے ہیں اور بصرہ سے ادھر دم نہیں لیں گے اب انہیں راستے میں روک لینے کا سوال پیدا نہ ہوتا تھا اور جنگ و قتال کے بغیر ان پر قابو پانا مشکل نظر آ رہا تھا۔ امیر المومنین نے جنگ کے امکان کے پیش نظر وہاں پر پڑاؤ ڈال دیا اور چند آدمیوں کو مدینہ بھیج کر وہاں سے اسلحۂ جنگ اور سواریاں طلب کیں اور فوج کی فراہمی کے لئے محمد ابن جعفر اور محمد ابن ابی بکر کو کوفہ روانہ کیا تاکہ وہاں کے لوگوں سے عسکری امداد حاصل کریں اور جنگ کی صورت میں انہیں دشمن کے خلاف لڑنے کی دعوت دیں۔ جب وہ کوفہ پہنچے اور اہل کوفہ کو امیر المومنین کا پیغام دیا تو والئ کوفہ ابو موسیٰ اشعری بیچ میں دیوار بن کر حائل ہو گیا اور یہ کہہ کر لوگوں کو روکنا شروع کیا کہ یہ اقتدار کی جنگ ہے جو دُنیا کا طلبگار ہو وہ جائے اور جو آخرت کا خواستگار ہو وہ گھر کے گوشہ میں بیٹھا رہے اور اس طرح امیر المومنین کا معاون و مددگار ثابت ہونے کے بجائے مخالفین کی تقویت کا باعث بن گیا۔ محمد ابن جعفر اور محمد ابن ابی بکر نے اسے بہتیرا سمجھایا بجھایا مگر وہ اپنی بات پر اڑا رہا آخر یہ دونوں بے نیل مرام واپس پلٹ آئے۔ حضرت ربذہ سے روانہ ہو کر فید، ثعلبیہ اور اساد سے ہوتے ہوئے مقام ذیقار میں جو کوفہ و واسط کے درمیان واقع ہے تشریف فرما تھے کہ ان دونوں نے حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر ابو موسیٰ کی رخنہ اندازیوں کی تفصیل بیان کی۔ امیر المومنین نے ذیقار سے ابن عباس اور مالک اشتر کو کوفہ بھیجا کہ اُسے

سمجھائیں کہ وُہ آنے والوں کے لئے سدّ راہ نہ ہو۔ ابھی یہ دونوں کوفہ ہی میں تھے کہ حضرت نے اُن کے عقب میں اپنے فرزند امام حسن اور عمار یاسر کو روانہ کیا۔ یہ دونوں بزرگوار کوفہ میں وارد ہونے کے بعد مسجد جامع میں فروکش ہُوئے اور لوگوں کو امیرالمومنین کی نصرت کی دعوت دی۔ ابو موسٰی کو امام حسن کے آنے کی اطلاع دی گئی تو وُہ حاضر ہوا امام حسن نے اس سے کہا کہ تمہارے متعلق یہ خبریں سُننے میں آ رہی ہیں کہ تم لوگوں کو امیرالمومنین کی نصرت سے منع کرتے ہو حالانکہ ان کا مقصد فتنہ و شر کا انسداد اور اصلاح بین الناس ہے۔ کہا کہ میں نے رسُول اللہ کو فرماتے سُنا ہے:۔

انها ستكون فتنة القاعد فيها خير من القائم والقائم خير من الماشي والماشي خير من الراكب۔ (تاریخ کامل ج۳ ص۱۱۱)

عنقریب ایک فتنہ برپا ہوگا جس میں بیٹھنے والا کھڑا ہونے والے سے اور کھڑا ہونے والا چلنے والے سے اور چلنے والا سوار ہونے والے سے بہتر ہوگا"۔

آخر وُہ لوگ ہمارے بھائی بند ہیں نہ ان کا خون بہانا ہمارے لئے مباح ہے اور نہ ان کا مال چھیننا ہمارے لئے جائز ہے۔ اس پر عمار یاسر نے بگڑ کر کہا:۔

انت فيها قاعدا خير منك قائما۔ (تاریخ کامل ج۳۔ ص۱۱۱)۔

بے شک تمہارا گوشہ میں بیٹھا رہنا تمہارے نکل کھڑے ہونے سے بہتر ہے"۔

اور دونوں ایک دُوسرے سے اُلجھنے لگے۔ ابُو موسٰی اسی پر اصرار کرتا رہا کہ یہ ایک فتنہ ہے اس سے کنارہ کشی ہی بہتر ہے۔ اِدھر یہ کشمکش جاری تھی اُدھر زید ابن صوحان نے مسجد کے دروازے پر کھڑے ہوکر دو تحریریں پڑھ کر سُنائیں جو حضرت عائشہؓ کی طرف سے ایک اُن کے نام تھی اور ایک اہل کوفہ کے نام۔ ان تحریروں میں درج تھا کہ "تم لوگ میری مدد کے لئے آؤ۔ اور اگر مدد کے لئے نہ آسکو تو لوگوں کو منع کرو کہ وُہ علی کی مدد کو نہ آئیں۔ ان تحریروں کو پڑھنے کے بعد مجمع سے مخاطب ہوکر کہا:۔

امرت ان تقرفي بيتها وامرنا ان نقاتل حتى لا تكون فتنة فامرتنا بما امرت به وركبت ما امرنا به۔ (تاریخ طبری کامل ج۳ ص۱۱۱)

انہیں حکم دیا گیا کہ وُہ اپنے گھر میں بیٹھیں۔ اور ہمیں حکم دیا گیا کہ ہم جنگ و قتال کریں تاکہ فتنہ کھڑا نہ ہو۔ لیکن جس چیز کا انہیں حکم دیا گیا وُہ ہمیں دے رہی ہیں (کہ ہم گھر میں بیٹھیں) اور جس چیز کا ہمیں حکم دیا گیا (کہ جنگ کریں) اس پر وُہ عمل کر رہی ہیں"۔

پھر ابو موسٰی سے مخاطب ہوکر کہا کہ اے ابو موسٰی اگر تم دریا کے بہاؤ کو روک سکتے ہو تو ان لوگوں کو بھی جانے سے منع کر سکتے ہو۔ بہتر یہ ہے کہ جو بات تمہارے اختیار سے باہر ہے اس سے دستبردار

ہو جاؤ اور لوگوں کو روکنے کے بجائے خاموشی کے ساتھ گھر میں بیٹھ جاؤ۔ مگر اس پر کسی کی بات کا اثر نہ ہوا اور وہ برابر یہ رٹ لگاتا رہا کہ یہ ایک فتنہ ہے اس سے بچ کر رہنا چاہیئے۔ امام حسن نے اس کا یہ معاندانہ رویہ دیکھا تو پُر غضب لہجے میں کہا:۔

اخرج من مسجدنا وامض	ہماری مسجد سے باہر نکلو اور جہاں دل چاہے
حیث شئت۔ (اخبار الطوال ص۱۴۵)	چلے جاؤ"۔

اور پھر منبر پر بلند ہو کر تقریر فرمائی اور لوگوں کو امیر المومنین کی نصرت پر آمادہ کیا۔ عمار ابن یاسر اور حجر ابن عدی کندی نے بھی لوگوں کو کہنا سُننا شروع کیا۔ اس کا یہ اثر ہُوا کہ اہل کوفہ نے کروٹ لی اور ہر طرف سے سمعاً و طاعۃً کی آوازیں آنے لگیں۔

جب کوفہ کی فضا سازگار ہو گئی تو مالک اشتر نے دارالامارہ کا رُخ کیا اور اندر داخل ہو کر ابو موسیٰ کے غلاموں کو مار پیٹ کر باہر نکال دیا اور قصر پر قبضہ کر لیا۔ ابو موسیٰ کے غلام بھاگم بھاگ مسجد میں آئے اور ابو موسیٰ سے فریاد کی کہ اشتر نے ہمیں ڈرا دھمکا کر دارالامارہ سے نکال باہر کیا ہے اور قصر پر قبضہ کر لیا ہے۔ ابو موسیٰ دوڑتا ہوا قصر کی طرف آیا اور اندر داخل ہونا چاہا مگر مالک نے اُسے روک دیا اور بلند آواز سے کہا:۔

اخرج من قصرنا لا ام لك	اے ابو موسیٰ تمہاری ماں مرے ہمارے قصر
اخرج الله نفسك فو الله	سے باہر نکلو خدا تمہیں نکالے خدا کی قسم تم
انك لمن المنافقين قديما	ہمیشہ منافقوں میں شامل رہے"۔

(تاریخ طبری ج۳ ص۵۰۰)

ابو موسیٰ نے گڑگڑا کر کہا کہ مجھے ایک رات کی مُہلت دیجئے۔ کہا کہ تمہیں عشاء تک کی مہلت دی جاتی ہے اور رات کو یہاں ٹھہرنے کی اجازت نہیں ہے۔ کچھ لوگوں نے چاہا کہ دارالامارہ میں گھس کر اس کا مال و اسباب لُوٹ لیں مگر مالک نے منع کیا اور کہا کہ تم اب اسے کچھ نہ کہو میں نے اسے نکل جانے کا حکم دے دیا ہے۔ لوگ اُن کے کہنے سے رُک گئے اور ابو موسیٰ رات کے اندھیرے میں قصر سے نکل کر کوفہ کے کسی گوشہ میں چھُپ کر بیٹھ گیا اور صبح ہوتے ہی شام کی طرف چل دیا۔ اِدھر اہل کوفہ گروہ در گروہ اٹھ کھڑے ہوے اور ابو موسیٰ کے روکنے اور حضرت عائشہ کے خطوط لکھنے کے باوجود بارہ ہزار ایک شمشیر زن مقام ذیقار میں امیر المومنین کے پرچم کے نیچے جمع ہو گئے۔

ابو موسیٰ کی ذہنی ساخت اور اس کے طرزِ عمل پر حیرت ہوتی ہے کہ ایک طرف تو وہ مملکت کے ایک کلیدی عہدہ پر تاحال فائز ہے اور دوسری طرف سربراہِ مملکت کے دشمنوں اور مُلکی تنظیم کے منتشر کرنے والوں کے ہاتھ مضبوط کرتا ہے۔ اگر وہ اپنی صوابدید میں اصحاب جمل سے جنگ کو ناجائز سمجھتا تھا تو

اسے پہلے اپنے عہدہ سے خود ہی دستبردار ہو جانا چاہیئے تھا اور پھر آزادانہ اپنی رائے کا اظہار کرنا چاہیئے تھا لیکن وُہ مملکت کا عہدہ دار اور آئینی طور پر رئیس مملکت کے احکام کا پابند ہونے کے باوجود علانیہ سرتابی کرتا ہے اور دست تعاون بڑھانے کے بجائے امن شکنوں کی حوصلہ افزائی کا سامان کرتا ہے۔ اس طرز عمل کا مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ وُہ در پردہ حضرت کے مخالفین سے ساز باز کئے ہوئے تھا اور کھلم کھلا مخالف جماعت میں شامل ہو کر عہدہ کو اپنے ہاتھ سے دینا نہ چاہتا تھا ورنہ کوی وجہ نہ تھی کہ منصب پر باقی رہتے ہُوے فریق مخالف کی تقویت کا سامان کرتا اور اپنے منصبی تقاضوں کا کوی پاس و لحاظ نہ کرتا اور اس پر مزید یہ کہ وُہ جارحانہ اقدام کے مقابلہ میں اس دفاعی و حفاظتی اقدام کو فتنہ سے تعبیر کرتا ہے اور حدیث پیغمبر کو اس پر چسپاں کر کے اپنے غلط موقف کا جواز ثابت کرتا ہے۔ آخر اس پر نظر کرنے کی ضرورت تھی کہ امیر المومنین کے لئے اس کے سوا اور چارۂ کار کیا تھا۔ کیا طلحہ و زبیر اور اس کے ہمراہیوں کو من مانی کرنے دیتے اور چپ سادھے رہتے اور ملک کے نظم و نسق کو درہم و برہم ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے۔ اگر مملکت کے خلاف سازش کرنے اور اس کے نظم و ضبط کو تباہ کرنے والوں کے خلاف دفاعی فریضہ کی انجام دہی فتنہ ہے تو پھر ہر دفاعی جنگ کو فتنہ سے تعبیر کرنا چاہیئے اور ان جنگوں کو بھی فتنہ قرار دینا چاہیئے جو رسُول اللہ کے بعد ان لوگوں سے لڑی گئیں جنہوں نے حاکم وقت کی بیعت سے انکار کر دیا تھا اور ادائے زکوٰۃ سے مانع ہُوے تھے۔ آخر اس کا کیا جواز ہے کہ اس حدیث کا مورد صرف حضرت کے اس اقدام کو قرار دیا جائے اور سابقہ جنگوں کو فتنہ کہنے سے گریز کیا جائے جبکہ قرب زمانہ کے اعتبار سے فتنہ الٰہی پر زیادہ صادق آتا ہے اور امیر المومنین کی یہ جنگ تو ان جنگوں میں سے ایک ہے جن کے لڑنے کی پیغمبر اکرم نے انہیں ہدایت کی تھی اور ان مہموں میں سے ایک مہم ہے جنہیں سر کرنے پر انہیں مامور فرمایا تھا۔ چنانچہ حضرت ایوب انصاری انصاری کہتے ہیں:۔

امر رسول اللہ علیا بقتال الناکثین والقاسطین و المارقین۔ (مستدرک حاکم ج ۳ ص ۱۳۹)

رسُول اللہ نے حضرت علی کو حکم دیا تھا کہ وُہ بیعت شکنوں (اصحاب جمل) بے راہروں (اصحاب صفین) اور بے دینوں (خوارج) سے جنگ کریں۔

اور پھر پیغمبر نے حضرت علی کے اس اقدام کو ایک مظلوم و حق پرست کا اقدام اور اس کے مقابلہ میں زبیر کی جنگ کو ظالمانہ و جارحانہ قرار دیتے ہُوے بطور پیشینگوئی فرمایا تھا:۔

لتقاتلنہ و انت لہ ظالم (تاریخ کامل۔ ج ۳ ص ۱۲۲)

اے زبیر تم علی سے جنگ کرو گے اور تم ان کے حق میں ظالم ہو گے۔

اور چشمۂ حوأب کے سلسلہ میں حضرت عائشہ کو متنبہ کرتے ہُوے فرمایا تھا:۔

وایاك ان تکونی انت یاحمیرا — خبردار اے عائشہ کہیں وہ تم ہی نہ ہونا"۔
(تاریخ یعقوبی ج۲ ص۱۵۷)

ان ارشادات پیغمبر کے علاوہ قرآن مجید میں بھی علم بغاوت بلند کرنے والوں کے خلاف واضح طور پر جنگ وقتال کا حکم آیا ہے۔ چنانچہ ارشاد الہٰی ہے:۔

وان طائفتان من المومنین	اگر ایمان والوں کے دو گروہ آپس میں آمادۂ
اقتتلوا فاصلحوا بینهما	جنگ وقتال ہوں تو ان میں صلح کراؤ اور اگر
فان بغت احدهما علی	ان میں سے ایک دوسرے گروہ پر زیادتی
الاخری فقاتلوا التی تبغی	کرے تو تم اس زیادتی کرنے والے گروہ سے
حتی تفئ الی امر الله۔	لڑو یہاں تک کہ وہ حکم خدا کی طرف پلٹ آئے"۔

ان نصوص کے ہوتے ہوئے پھر اسے فتنہ سے تعبیر کرنا عمداً حق پوشی یا صریحاً کج ذہنی کا ثبوت مہیا کرنا ہے۔

بہر حال جب ام المومنین کا لشکر چشمۂ حواب سے آگے بڑھ کر چاہ ابو موسیٰ پر پہنچا اور حاکم بصرہ عثمان ابن حنیف کو اس لشکر گراں کی آمد کی اطلاع ملی تو انہوں نے ابو الاسود دئلی اور عمران ابن حصین کو حضرت عائشہ کے پاس بھیجا کہ وہ ان سے بصرہ میں آنے کا سبب دریافت کریں۔ چنانچہ اس مقام پر پہنچ کر ابو الاسود نے حضرت عائشہ سے پوچھا کہ اے مادر گرامی آپ کس مقصد سے یہاں تشریف لائی ہیں اور یہ فوج وسپاہ آپ کے ہمراہ کیوں ہے۔ کہا کہ میں خون عثمان کا انتقام لینے آئی ہوں جنہیں لوگوں نے بے جرم وخطا گھر کے اندر قتل کر ڈالا ہے۔ ابو الاسود نے کہا کہ بصرہ میں تو ان کا قاتل کوئی نہیں ہے کہا کہ یہ صحیح ہے مگر میں اہل بصرہ کے تعاون سے ان کے قاتلوں سے انتقام لینا چاہتی ہوں جو علی کے گرد و پیش جمع ہیں۔ ابو الاسود نے کہا کہ آپ حرم رسول خدا ہیں وہ آپ کو گھر میں بیٹھنے کا حکم دے گئے تھے۔ آپ کو ان معرکہ آرائیوں سے کیا مطلب اور ان خونی ہنگاموں سے کیا سروکار یہ امر آپ کے شایان شان نہیں کہ آپ گھر کا گوشہ چھوڑ کر میدان کارزار گرم کرنے کے لئے نکل کھڑی ہوں۔ کہا کہ ہم سے دو بدو ہو کر لڑنے کی ہمت و جرأت کس کو ہو سکتی ہے۔ ابو الاسود نے کہا کہ ہم لڑیں گے اور دنیا دیکھے گی کہ اس طرح لڑا جاتا ہے۔

ام المومنین کا یہ یقین کہ ان کے مقابلہ میں صف آرا ہونے کی جرأت کسی کو نہ ہو گی شائد اس بنا پر ہو کہ حضرت علی کے ہمرکاب تو وہی گنے چنے چند افراد ہوں گے جنہیں آپ مدینہ سے لے کر چلے ہوں گے اور کوفہ جہاں سے جنگجو افراد فراہم ہو سکتے ہیں ابو موسیٰ کے زیر اثر ہے اور اس کے ہوتے ہوئے وہاں سے عسکری امداد کے حاصل ہونے کا بظاہر امکان نہیں ہے اس صورت میں حضرت کی مختصر سپاہ ان کے

لشکر گراں کے مقابلہ میں جم نہ سکے گی اور بن لڑے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جائے گی یا اس بنا پر ہو کہ حرم رسُول ہونے کی وجہ سے وُہ انتہائی عزت و توقیر کی مستحق ہیں اور لوگوں کے دلوں میں ان کی قدر و منزلت اور عزّت و احترام بھی ہے اس صورت میں کون ہو گا جو ان سے نبرد آزما اور بر سر پیکار ہو گا مگر انہوں نے جو سوچا تھا معاملہ اس کے برعکس ہوا اور اہل کوفہ جوق در جوق اٹھ کھڑے ہوُے اور امیر المومنین کی سپاہ میں شامل ہو کر پورے لشکر پر چھا گئے اور ابو موسیٰ مُنہ دیکھتا رہ گیا۔ البتہ دُوسرا خیال کہ اُن کی عزت و حرمت مقابلہ سے مانع ہو گی تو یہ خیال ایک حد تک درست ہو سکتا تھا بشرطیکہ وُہ خود اس احترام کا لحاظ رکھتیں اور گھر کا گوشہ چھوڑ کر فوج و سپاہ کے ساتھ نکل نہ کھڑی ہوتیں اور جب انہوں نے خود اپنے مرتبہ و مقام کا لحاظ نہ رکھا تو یہ توقع کیونکر رکھ سکتی تھیں کہ جو احترام انہیں گھر کے اندر رہنے کی صورت میں حاصل تھا وُہ اب بھی باقی و برقرار رہے گا۔

ابو الاسود حضرت عائشہ سے گفتگو کرنے کے بعد طلحہ و زبیر کے پاس آئے اور اُن سے بھی وُہی سوال کیا جو ام المومنین سے کر چکے تھے۔ انہوں نے بھی وہی جواب دیا جو ام المومنین دے چکی تھیں کہ ہمارے یہاں آنے کا مقصد خون عثمان کا قصاص ہے۔ ابو الاسود نے کہا کیا تم دونوں نے حضرت علی کی بیعت نہیں کی تھی کہا کی تو تھی مگر اس حالت میں کہ تلوار ہمارے سروں پر لٹک رہی تھی اور بیعت کئے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ ابو الاسود اُن کے انداز گفتگو سے سمجھ گئے کہ وُہ فتنہ و شورش پر آمادہ اور جنگ و قتال پر تلے ہوُے ہیں اور اُن سے مزید گفتگو کا کوئی نتیجہ نہیں ہے انہوں نے پلٹ کر عثمان ابن حنیف کو ان لوگوں کے عزائم سے آگاہ کیا اور دفاعی انتظامات کو مضبوط تر کرنے کا مشورہ دیا۔ عثمان ابن حنیف نے اہل شہر کو مسجد میں جمع کر کے حکم دیا کہ وُہ ہتھیار مہیّا رکھیں اور دفاع کے لئے مستعد رہیں۔

ام المومنین کے لشکر نے چاہ ابو موسیٰ پر کچھ توقف کرنے کے بعد حرکت کی اور حدود بصرہ میں داخل ہو کر مربد (اُونٹوں کی منڈی) میں پڑاؤ ڈال دیا۔ اہل شہر نے حضرت عائشہ اور طلحہ و زبیر کے آنے کی خبر سُنی تو چاروں طرف سے سمٹ کر مربد میں جمع ہو گئے اور اپنے اپنے خیال اور اپنے اپنے نظریئے کے مطابق تبصرے کرنے لگے۔ ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا کہ "یہ لوگ اگر کسی خوف و دہشت کی بنا پر اپنے گھروں سے نکلے ہیں تو یہ اس شہر سے آئے ہیں جہاں پرندوں تک کو امان حاصل ہے۔ اور اگر خون عثمان کے انتقام کے لئے آئے ہیں تو ہم اُن کے قاتل نہیں ہیں۔ اے اہل بصرہ میری بات غور سے سُنو اور انہیں یہیں سے واپس جانے پر مجبور کر دو۔ اس پر طلحہ و زبیر کے ہمنواؤں نے اس پر پتھر برسائے اور اُسے خاموش کر دیا۔ جاریہ ابن قدامہ نے ہمت کی اور آگے بڑھ کر حضرت عائشہ سے کہا:

یا ام المومنین واللہ لقتل	اے ام المومنین آپ کا اس ملعون اُونٹ پر
عثمان اھون علینا من	بیٹھ کر ہتھیاروں کا نشانہ بننے کے لئے نکل

خروجك من بيتك على	کھڑا ہونا قتل عثمان سے بڑھ کر مصیبت ہے
هذا الجمل الملعون عرضة	آپ کے لئے خدا کی طرف سے حجاب و احترام
للسلاح انه قد كان لك من	تھا مگر آپ نے اس پردے کو چاک کر ڈالا ہے
الله ستر و حرمة فهتكت	اور اپنا احترام کھو دیا ہے۔ جو شخص آپ سے
سترك و ابحت حرمتك انه	جنگ و قتال صحیح سمجھتا ہے وہ آپ کو قتل کرنے
من راى قتالك يرى قتلك	میں بھی باک نہیں کرے گا اگر آپ اپنی مرضی سے
ان كنت اتيتنا طائعة فارجعي	آئی ہیں تو اپنے گھر واپس جائیے اور اگر
الى منزلك و ان كنت اتيتنا	آپ کو مجبور کر کے لایا گیا ہے تو اس کے خلاف
مستكرهة فاستعيني بالناس	لوگوں سے مدد حاصل کیجئے"۔

(تاریخ طبری ج ۳۔ ص ۴۸۲)

ام المومنین نے ان باتوں کو قابل توجہ ہی نہ سمجھا چہ جائیکہ ان سے اثر لیتیں یا ان پر غور کرتیں انہوں نے تمام تر توجہ اپنی قوت بڑھانے اور لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے پر مرکوز کر دی تاکہ پوری توانائیوں کے ساتھ معرکہ آرائی کر سکیں۔ اہل بصرہ کو ہمنوا بنانے کے لئے ضروری تھا کہ ان کے یہ ذہن نشین کر دیا جائے کہ علی کی انگیخت پر عثمان قتل ہوئے ہیں اور چند شورش پسندوں کے بل پر انہوں نے خلافت پر قبضہ کیا ہے نہ انہیں اصحاب شوریٰ کا تعاون حاصل ہے اور نہ رائے عامہ کی تائید۔ چنانچہ ام المومنین اور طلحہ و زبیر نے عوام کو اس قسم کے تاثرات دینے کے لئے اس اجتماع سے خطاب کرنا چاہا اگرچہ چاروں طرف شور و غل مچا ہوا تھا اور کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی تاہم لوگوں کو خاموش کرنے کی کوشش کی گئی اور طلحہ نے تقریر کرتے ہوئے کہا "اے لوگو ہم عثمان کی خوشنودی کے دل و جان سے خواہاں تھے مگر چند بے وقوفوں نے عقلمندوں کو مغلوب کر کے انہیں قتل کر دیا اب ہم ان کے خون کا بدلہ لینا چاہتے ہیں"۔ ابھی یہیں تک کہنے پائے تھے کہ لوگوں نے کہا کہ اے ابو محمد (طلحہ) تمہارے خطوط تو اس کے خلاف ہمارے پاس آتے رہے ہیں۔ طلحہ کوئی جواب نہ دے سکے اور خاموش ہو گئے اب زبیر کی نوبت آئی اور انہوں نے کھڑے ہو کر کہا کہ میری طرف سے تو کوئی تحریر تمہارے پاس نہیں آئی۔ پھر انہوں نے قتل عثمان کے واقعات دہرائے اور امیر المومنین کو مورد الزام قرار دیتے ہوئے ان پر سخت لب و لہجہ میں نکتہ چینی کی۔ اس پر قبیلۂ عبد القیس کا ایک شخص کھڑا ہو گیا۔ اس کے کھڑے ہونے پر پھر شور مچا۔ کچھ لوگوں نے اسے منع کرنا چاہا مگر اس نے شور و شغب اور مخالف آوازوں کی پروا کئے بغیر تقریر شروع کر دی۔ تمہید میں اس نے تینوں خلافتوں کا ذکر کیا اور پھر امیر المومنین کی خلافت کے متعلق کہا کہ تم لوگوں نے ہم سے مشورہ کئے بغیر علی کی بیعت کر لی اور انہیں خلیفہ تسلیم کر لیا۔ اب کیا بات ہوئی ہے کہ تم ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہو ہمیں بتاؤ تاکہ ہم

بھی تمہارے ساتھ ہو کر ان سے لڑیں۔ کیا انہوں نے مال غنیمت دبا لیا ہے یا کوئی خلاف شرع قدم اُٹھایا ہے یا کوئی ایسا کام کیا ہے جسے تم ناپسند کرتے ہو۔ بتاؤ انہوں نے کیا کیا ہے تاکہ ہم بھی تمہارا ساتھ دیں۔ اگر یہ کچھ نہیں ہے تو پھر یہ شور و ہنگامہ بے معنی ہے"۔ ابھی وُہ یہیں تک کہنے پایا تھا کہ طلحہ و زبیر کے ساتھی اُس کی طرف لپکے تاکہ اُسے مار ڈالیں مگر اُس کے قبیلہ والے آڑے آئے اور اُسے بچا کر لے گئے۔ مگر دُوسرے دن ام المومنین کے آدمیوں نے حملہ کر کے اُسے اور اُس کے ستر ساتھیوں کو بے دریغ قتل کر دیا۔ مورخ طبری نے لکھا ہے:۔

لما کان الغد و ثبوا علیہ	دوسرے دن اس پر اور اُس کے ساتھیوں
وعلیٰ من کان معہ فقتلوا	پر حملہ کر دیا اور اُن میں کے ستر آدمی قتل
سبعین رجلا (تاریخ طبری ج ۳ ص ۴۸۶)	کر دیئے"۔

ان تقریروں کے بعد حضرت عائشہ کی باری آئی انہوں نے بڑے ہمدردانہ لہجہ میں حضرت عثمان کی مظلومیت و بے گناہی کا تذکرہ کیا اور لوگوں کو اُن کے انتقام پر اُبھارا اور دَوران تقریر میں کہا کہ ان کے قاتلوں کو ایک ایک کر کے قتل کر ڈالو اور خلافت کا مسئلہ حضرت عمر کے منتخب کردہ ارکان شوریٰ کے سپرد کر دو اور جو قتل عثمان میں متہم ہو اُسے شوریٰ میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔ ام المومنین کی یہ تجویز بڑی معنی خیز ہے۔ انہوں نے شوریٰ پر عمل پیرا ہونے کا مشورہ دے کر بڑی سُوجھ بُوجھ کا ثبوت دیا اور خلافت کا رُخ اُدھر موڑ دیا جدھر وُہ موڑنا چاہتی تھیں اس طرح کہ اس وقت شوریٰ کے صرف چار رکن باقی تھے۔ علی ابن ابی طالب، سعد ابن ابی وقاص، طلحہ اور زبیر۔ حضرت علی تو اُن کے نزدیک خون عثمان میں متہم تھے لہٰذا انہیں شوریٰ میں شامل کئے جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ رہے سعد ابن ابی وقاص تو وُہ ان کے حصول مقصد میں حائل نہ ہو سکتے تھے اس لئے کہ حضرت عمر نے طریق انتخاب یہ تجویز کیا تھا کہ جدھر اکثریت ہو خلیفہ کا انتخاب اُس میں سے ہو گا۔ طلحہ و زبیر میں کوئی بھی سعد کے حق میں رائے دینے کو تیار نہ تھا اس لئے کہ وُہ دونوں خود خلافت کی آس لگائے بیٹھے تھے اور اسی کے لئے یہ ساری ہنگامہ آرائی تھی۔ اب سعد ہی کو ان دو میں سے ایک کا ساتھ دینا تھا اگر وُہ طلحہ کا ساتھ دیتے تو وُہ خلیفہ ہوتے اور زبیر کا ساتھ دیتے تو انہیں خلافت ملتی اور ام المومنین کا مقصد دونوں طرح پُورا ہوتا تھا اس لئے کہ وُہ حضرت علی کو اقتدار سے الگ کر کے خلافت کو انہی دو میں منحصر دیکھنا چاہتی تھیں

ام المومنین کی اس تقریر کو مجمع نے بڑے سکون سے سُنا مگر خاتمہ تقریر پر ہنگامہ سا کھڑا ہو گیا اور مختلف زبانوں سے مختلف آوازیں بلند ہونے لگیں۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ ام المومنین صحیح کہتی ہیں اور کچھ لوگوں نے اس کے خلاف کہا۔ اور اہل بصرہ دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ طلحہ و زبیر کی حمایت پر اُتر آیا اور ایک گروہ عثمان ابن حنیف کا ہمنوا ہو گیا اور ایک دُوسرے پر ڈھیلے پھینکنے اور پتھر برسانے لگے البتہ ایک

گروہ خاموش ہو کر بیٹھ گیا اور کوئی فیصلہ نہ کر سکا کہ کس کا ساتھ دے اور کس کا ساتھ نہ دے۔ غرض ان لوگوں کی آمد سے گھر گھر میں پھوٹ اور بھائی بھائی میں تفرقہ پڑ گیا۔

اب ان لوگوں نے دائرۂ کار وسیع کرنے کے لئے مختلف جگہوں پر پیغامات بھیجے اور وہاں کے باشندوں سے تعاون کی خواستگاری کی۔ چنانچہ ام المومنین نے احنف ابن قیس کو جو قبیلۂ بنی تمیم کا سردار اور ان اطراف کے سر برآوردہ لوگوں میں سے تھا اپنے ہاں بلوایا اور اس سے کہا کہ تم قاتلان عثمان کے خلاف جہاد سے پہلو تہی کرتے نظر آتے ہو کل اپنی کوتاہی کا کیا عذر کرو گے اور اللہ کو کیا جواب دو گے جبکہ تمہارے قبیلہ میں نہ افراد کی کمی ہے اور نہ تمہاری کوئی بات رد کی جاتی ہے۔ احنف نے کہا اے ام المومنین ابھی کل کی بات ہے آپ ان پر لے دے کرتی تھیں اور انہیں مطعون کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی اور آج اُن کا قصاص لینے کے لئے میدان میں اُتر آئی ہیں۔ کہا کہ لوگوں نے انہیں اس طرح دھو ڈالا جس طرح برتن کو رگڑ رگڑ کر دھویا جاتا ہے۔ اور جب وُہ گناہوں سے پاک صاف ہو گئے تو انہیں قتل کر ڈالا۔ احنف نے کہا:

یا ام المومنین انی اخذ بامرک وانت راضیۃ وادعہ وانت ساخطۃ۔	اے ام المومنین میں آپ کا وُہ حکم تو مان سکتا ہوں جو آپ نے رضا مندی کی حالت میں دیا ہو اور وُہ حکم ماننے کو تیار نہیں جو آپ نے غیظ و غضب کے عالم میں دیا ہو۔
(استیعاب ج ۱ ص ۳۲)	

احنف نے تو ان کی طرفداری سے دامن بچا لیا لیکن بصرہ والوں کی اکثریت ان کے ساتھ ہو گئی۔ اب انہوں نے چاہا کہ امیر المومنین کے وارد بصرہ ہونے سے پہلے بیت المال اور شہر کے نظم و نسق پر قبضہ کر لیں۔ چنانچہ انہوں نے شہر کی طرف قدم بڑھایا۔ عثمان ابن حنیف بلا کسی پس و پیش کے شہر اُن کے حوالے کرنے پر تیار نہ تھے انہوں نے راستوں کی ناکہ بندی کر کے جہاں تک ممکن تھا شہر کا تحفظ کر لیا جملہ آور جس راستے سے بڑھتے عثمان کے ساتھی آہنی دیوار بن کر کھڑے ہو جاتے اور انہیں آگے بڑھنے سے روک دیتے اور کچھ لوگ چھتوں پر سے پتھر پھینک کر انہیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیتے لیکن فوجوں کے بڑھتے ہوئے ریلے کو کب تک روکا جا سکتا تھا ان گنتی کے آدمیوں میں نہ مسلح فوج کے مقابلہ کی طاقت تھی اور نہ مقابلہ میں کامیابی کی کوئی صورت تھی۔ عثمان نے جب یہ دیکھا کہ شہر کو ان لوگوں کی دستبرد سے محفوظ نہیں رکھا جا سکتا تو وُہ ایک دستہ فوج کو لے کر طلحہ و زبیر کے پاس آئے اور اُن سے کہا کہ تمہارا مطالبہ کیا ہے اور یہ شورش و ہنگامہ آرائی کیوں ہے کہا کہ ہم خون عثمان کا قصاص لینا چاہتے ہیں۔ کہا قصاص لینے کا یہ کوئی طریقہ نہیں ہے یہ کیوں نہیں کہتے کہ ہم خلافت کے لئے لڑ رہے ہیں۔ کہا کہ اگر ایسا ہو بھی تو علی ہم سے زیادہ خلافت کے اہل نہیں ہیں۔ آخر دونوں طرف سے بات بڑھنے لگی اور بڑھتے بڑھتے اس حد تک بڑھی کہ فریقین نے تلواریں نکال لیں اور خونریز جنگ چھڑ گئی۔ جب دونوں طرف سے اچھے خاصے آدمی مارے

گئے تو حضرت عائشہ نے امن پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جنگ رکوا دی اور فریقین میں یہ معاہدہ طے پایا کہ جب تک امیر المومنین تشریف نہیں لے آتے لڑائی بند کر دی جائے عثمان بدستور دار الامارہ میں رہیں اور حکومت کے انتظامی امور میں کوی ردوبدل نہ کیا جائے۔

اس معاہدہ کو طے پائے ابھی دو ہی دن گزرے تھے کہ ایک سرد و تاریک رات میں ان لوگوں نے عثمان پر شبخون مارا اور انہیں گرفتار کر کے چالیس کوڑے مارے اور ڈاڑھی بھووں اور پلکوں کے بال نوچ ڈالے۔ ابن اثیر نے لکھا ہے:۔

لم یلبث الا یومین او ثلاثة ایام حتی وثبوا علی عثمان عند بیت الرزق فظفروا به واراد وا قتله ثم خشوا غضب الانصار فنتفوا شعر راسه ولحیته وحاجبیه وحبسوه۔ (تاریخ کامل ج ۳ ص ۱۱۱)۔

ابھی دو یا تین دن گزرے ہوں گے کہ انہوں نے بیت الرزق کے نزدیک عثمان ابن حنیف پر حملہ کر دیا اور گرفتار کر کے چاہا کہ انہیں قتل کر دیں مگر اس خیال سے کہ کہیں انصار غضبناک نہ ہو جائیں اقدام قتل سے ڈر گئے مگر ان کے سر ڈاڑھی اور بھووں کے بالوں کو اکھیڑ کر انہیں قید میں ڈال دیا"۔

جب عثمان ابن حنیف گرفتار کر کے قید میں ڈال دیئے گئے تو ان کے بارے میں حضرت عائشہ کا مشورہ لینا ضروری تھا۔ چنانچہ حضرت عثمان کے فرزند ابان کو اُن کے ہاں بھیجا گیا تاکہ ان سے دریافت کرے کہ عثمان کو قید میں رہنے دیا جائے یا قتل کر دیا جائے حضرت عائشہ نے کہا کہ انہیں قتل کر دو ایک عورت نے یہ سُنا تو چیخ کر کہا کہ اے ام المومنین میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتی ہوں ان پر رحم کیجئے اور انہیں قتل ہونے سے بچائیے آخر وُہ رسُول اللہ کے صحابی ہیں کہا کہ اچھا ابان کو بلاؤ۔ ابان پلٹ کر آیا تو کہا کہ انہیں قتل نہ کرو اور قید میں رہنے دو۔ ابان نے یہ دُوسرا حکم سُنا تو کہا:۔

لو علمت انك تدعینی لهذا لم ارجع۔ (تاریخ طبری ج ۵ ص ۱۸۵)۔

اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ اس لئے بُلا رہی ہیں تو میں پلٹ کر نہ آتا"۔

ام المومنین کے حکم سے عثمان تو اُن کی خوں آشام تلواروں سے بچ گئے مگر ان کے ساتھیوں میں سے چالیس آدمی قتل کر دیئے گئے اس کشت و خون کے بعد انہوں نے بیت المال پر حملہ کیا اور بیت المال کے محافظ سپاہیوں کو جن کی تعداد پچاس تھی جکڑ باندھ لیا اور پھر انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کر دیا۔ حکیم ابن جبلہ کو جو بصرہ کی ایک ممتاز شخصیت تھے اس سفاکی و خونریزی اور عثمان پر ظلم و تشدد کی اطلاع ہوی تو وُہ تڑپ اُٹھے اور کہا کہ اگر میں نے اس موقع پر عثمان ابن حنیف کی مدد نہ کی تو گویا میں خوف خدا سے آشنا ہی نہیں ہوں۔ چنانچہ وُہ بنی بکر اور بنی عبد القیس کے تین سو آدمیوں کو لے کر

مدینۃ الرزق کی طرف بڑھے جہاں عبداللہ ابن زبیر اپنے آدمیوں میں غلہ تقسیم کر رہا تھا اس نے حکیم کو آتے دیکھا تو آگے بڑھ کر پوچھا کہ تم کیسے آئے ہو کہا کہ اس غلہ میں سے ہمارا حصہ ہمیں دیا جائے عثمان ابن حنیف کو رہا کیا جائے اور اس وقت تک انہیں دار الامارہ میں رہنے دیا جائے جب تک امیرالمومنین یہاں تشریف فرما نہیں ہوتے۔ خدا کی قسم اگر ہمارے پاس یار و انصار ہوتے تو ہم اس خونریزی و غارتگری پر خاموش نہ رہتے اور ان لوگوں کا ضرور انتقام لیتے جنہیں تم لوگوں نے بے جرم و خطا قتل کر ڈالا ہے۔ ابن زبیر نے کہا کہ ہم نے خونِ عثمان کا بدلہ لیا ہے۔ کہا کہ جن لوگوں کو تم نے قتل کیا ہے کیا وہ عثمان کے قاتل تھے تم لوگ اللہ کے غضب سے کیوں نہیں ڈرتے اور اس قتل و خونریزی کا سلسلہ کیوں نہیں روکتے کہا تم لاکھ چیخو چلاؤ نہ تمہیں اس میں سے کچھ دیا جائے گا اور نہ ابن حنیف کو رہا کیا جائے گا۔ ہاں اگر وہ علی کی بیعت توڑ دیں تو انہیں رہا کیا جا سکتا ہے۔ حکیم نے یہ صورت حال دیکھی تو کہنے لگے "بارالہا تو حاکم عادل ہے تو ان لوگوں کے ظلم و جور پر گواہ رہنا۔" پھر اپنے ہمراہیوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

لست فی شک من قتال ھولآء	مجھے ان لوگوں سے جنگ و قتال کے جواز میں
فمن کان فی شک فلینصرف	کوئی شبہ نہیں ہے جسے شک ہو وہ واپس چلا جائے۔

(تاریخ طبری ج ۳ ص ۴۹۱)

یہ کہہ کر حکیم نے تلوار نیام سے کھینچ لی اور اپنے گنے چنے ساتھیوں کو لے کر میدان میں اتر آئے۔ ادھر وہ لوگ بھی شمشیر بکف اٹھ کھڑے ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے جنگ کے شعلے بھڑکنے لگے اور تلواریں تلواروں سے ٹکرا کر خون برسانے لگیں۔ دوران جنگ میں ایک شخص نے حکیم کے پیر پر تلوار ماری اور اسے کاٹ دیا حکیم نے وہی کٹا ہوا پیر اٹھا کر اس زور سے اس کی طرف پھینکا کہ وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ حکیم گھٹنوں کے بل چلتے ہوئے اس کے قریب آئے اور اسے نیچے دبوچ کر اس پر بیٹھ گئے اور اس وقت تک الگ نہ ہوئے جب اس نے دم نہ توڑ دیا۔ حکیم جہاں تک ممکن تھا لڑتے رہے مگر ایک مختصر سا فوجی دستہ کہاں تک اس لشکر گراں کا مقابلہ کرتا آخر ایک ایک کر کے سب مارے گئے اور حکیم اور ان کے فرزند اشرف اور بھائی رعل ابن جبلہ بھی اس جنگ میں کام آ گئے۔ یہ جنگ جمل اصغر کے نام سے موسوم ہے جو ۲۵ ربیع الثانی ۳۶ھ میں ہوئی۔

حکیم اور اس کے ساتھیوں کو قتل کرنے کے بعد طلحہ و زبیر نے چاہا کہ عثمان کو بھی تہ تیغ کر دیں عثمان نے ان کے تیوروں سے بھانپ لیا کہ اب انہیں قتل کرنے کا ارادہ ہے انہوں نے کہا کہ اگر تم لوگوں نے مجھے قتل کر دیا تو یاد رکھو کہ میرا بھائی سہل ابن حنیف اس وقت حاکم مدینہ ہے وہ میرے خون کے بدلے میں وہاں تمہارے عزیزوں اور رشتہ داروں کو چن چن کر قتل کرے گا۔ انہوں نے یہ سنا تو اپنے عزیزوں کی جانوں کو خطرہ میں دیکھ کر انہیں چھوڑ دیا اور وہ جان بچا کر بصرہ سے نکل کھڑے ہوئے اور مقام ذیقار میں

امیرالمومنین کی خدمت میں پہنچ گئے۔ حضرت نے عثمان ابن حنیف کی حالت زار دیکھی تو آبدیدہ ہوگئے اور ان سے بصرہ کے حالات اور اصحاب جمل کے مظالم کے واقعات سُنے تو غیظ و غضب سے چہرہ سُرخ ہو گیا اسی وقت لشکر کی صف بندی کی میمنہ و میسرہ ترتیب دیا میمنہ پر عبداللہ ابن عباس کو میسرہ پر عمر ابن ابی سلمہ کو اور مقدمہ پر ابویعلی ابن عمر کو امیر نامزد کیا علم لشکر محمد ابن حنفیہ کے سپرد فرمایا اور بصرہ کی جانب روانہ ہوگئے۔ راستے میں قبیلہ عبدالقیس کے ہاں کچھ دیر کے لئے قیام فرمایا۔ یہ قبیلہ حضرت کا ارادتمند تو تھا ہی' پیش آیند مہم کو دیکھ کر آپ کے لشکر میں شامل ہو گیا۔

جب امیرالمومنین کا لشکر نواحی بصرہ میں پہنچا تو احنف ابن قیس جو قتل عثمان کے بعد آپ کے ہاتھ پر بیعت کر چکا تھا حاضر خدمت ہوا اور عرض کیا کہ یا امیرالمومنین میں دو باتیں پیش کرتا ہوں اگر حکم دیں تو میں آپ کے ہمرکاب رہ کر جنگ کروں یا چار ہزار تلواریں جو آپ کے خلاف کھنچی ہوی ہیں انہیں روک دوں۔ حضرت نے دوسری تجویز مان لی اور اُسے جانے کی اجازت دے دی۔ اب حضرت بصرہ کی شمالی سمت بڑھے اور مقام زاویہ میں منزل کی اور چند خطوط اور مختلف قاصد طلحہ، زبیر اور ام المومنین کے پاس بھیجے اور انہیں حرب و پیکار اور خانہ جنگی سے باز رہنے کی ہدایت کی مگر یہ بات ان کے ذہنوں میں اُتر نہ سکی کہ یوں تو تمام جنگیں تباہ کن ہوتی ہیں مگر خانہ جنگی تمام جنگوں سے زیادہ تباہ کن ہوتی ہے وُہ سمجھانے بجھانے کے باوجود جنگ سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہ ہُوے۔ جب امیرالمومنین کے قاصد مصالحت سے مایوس ہو کر پلٹ آئے اور یہ امر واضح ہو گیا کہ وُہ جنگ کے علاوہ کسی چیز پر رضامند نہیں ہیں تو زاویہ سے قدم آگے بڑھایا اور قصر عبیداللہ ابن زیاد کے پاس پہنچ کر پڑاؤ ڈال دیا۔ امیرالمومنین کے لشکر کی تعداد بیس ہزار تھی اور طلحہ و زبیر نے بنی ازد، بنی ضبہ، بنی حنظلہ، بنی سلیم وغیرہ مختلف قبائل کو اپنا ہمنوا بنا کر ان سے قصاص کے نام پر بیعت لے لی تھی اور اس طرح اُن کے لشکر کی تعداد تیس ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ جب دونوں طرف کے لشکر میدان میں اُتر آئے تو حضرت نے پھر انہیں جنگ کی تباہ کاریوں پر متنبہ کرتے ہُوے سمجھایا بجھایا مگر انہوں نے اپنی کثرت و قوت پر بھروسا کرتے ہُوے ان باتوں کا کوی اثر نہ لیا اور انجام سے آنکھیں بند کر کے یالثارات عثمان کے نعرے لگاتے ہُوے صف بستہ کھڑے ہو گئے۔ حضرت نے بھی اُن کی صفوں کے بالمقابل صفیں جما دیں اور اپنے لشکر کو ہدایات دیتے ہوے فرمایا "جب تک دشمن ابتداء نہ کرے تم آگے نہ بڑھنا اور جب تک وُہ حملہ نہ کرے تم وار نہ کرنا کسی بھاگنے والے کا راستہ نہ روکنا نہ کسی زخمی پر ہاتھ ڈالنا کسی صاحب عزّت کی پردہ دری نہ کرنا نہ کسی کے ہاتھ پیر کاٹنا نہ کسی کی لاش کی بے حرمتی کرنا اور نہ کسی عورت کو گزند پہنچانا"۔ جب لشکر کو یہ ہدایات دے چکے تو بے زرہ و سلاح گھوڑے پر سوار ہو کر صفوں سے باہر نکلے اور پکار کر کہا کہ زبیر کہاں ہے۔ زبیر پہلے تو سامنے آنے سے ہچکچائے اور پھر زرہ بکتر اور آلات حرب سے آراستہ ہو کر حضرت کے قریب آئے۔ آپ نے فرمایا اے زبیر بصرہ

ہیں کیوں آئے ہو اور یہ خطرناک قدم کیوں اُٹھایا ہے کہا خونِ عثمان کے قصاص کے لئے۔ فرمایا:۔

اتطلب منی دم عثمان وقد قتلته سلط اللہ علی اشدنا علیہ الیوم مایکرہ۔ (تاریخ طبری ج ۳۔ صفحہ ۵۲۰)

"کیا مجھ سے خونِ عثمان کا قصاص چاہتے ہو حالانکہ تم نے انہیں قتل کیا۔ خدا اُس پر موت ایسی ناگوار چیز کو مسلط کرے جو ہم میں سے ان پر زیادہ سختی و تشدّد کو روا رکھتا تھا۔"

زبیر اس کی تردید تو نہ کر سکے کہنے لگے:۔

لا ارالک لھذا الامر اھلا و لا اولی بہ منا۔ (تاریخ طبری۔ ج ۳ صفحہ ۵۱۹)

"ہم آپ کو خلافت کا اہل نہیں سمجھتے اور نہ آپ ہم سے زیادہ اس کے سزاوار ہیں۔"

حضرت نے فرمایا کہ آج تو تم ہمیں خلافت کا اہل نہیں سمجھتے اور ہم تو تمہیں عبدالمطلب ہی کی اولاد سمجھتے رہے ہیں یہاں تک کہ تمہارے ناہنجار بیٹے نے ہمارے اور تمہارے درمیان جدائی ڈلوا دی۔ اے زبیر میں تمہیں اللہ کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تم نے رسول اللہ کو یہ فرماتے نہیں سُنا کہ:۔

انک تقاتلنی و انت ظالم لی (تاریخ الاسلام ذہبی ج ۲ صفحہ ۱۵۱)

"تم مجھ سے جنگ کرو گے اور میرے حق میں ظالم ہو گے۔"

زبیر نے پیغمبر اکرم کی یہ پیشینگوئی سنی تو کہا کہ ہاں رسول اللہ نے فرمایا تو تھا۔ کہا پھر کیوں آئے ہو کہا بھول گیا تھا اس بھولی بسری بات کو سُن کر اور یہ دیکھ کر کہ عمار یاسر امیر المومنین کے لشکر میں موجود ہیں۔ جن کے بارے میں پیغمبر نے فرمایا تھا "اے عمار تمہیں ایک باغی گروہ قتل کرے گا" جنگ سے دستبردار ہونے کا فیصلہ کر لیا اور کہا کہ اب میں آپ سے نہیں لڑوں گا اور بن لڑے واپس چلا جاؤں گا۔ چنانچہ وہ مرجھائے ہوئے چہرے اور بجھے ہوئے دل کے ساتھ حضرت عائشہ کے پاس آئے اور کہا کہ میں نے اس وقت تک جو بھی قدم اُٹھایا سوچ سمجھ کر اٹھایا۔ مگر اس جنگ میں نہ میری عقل کام کرتی ہے اور نہ میری بصیرت میرا ساتھ دیتی ہے لہذا میں علی کے خلاف جنگ میں حصہ نہیں لوں گا اور واپس چلا جاؤں گا۔ حضرت عائشہ نے کہا کہ یہ کیسی اُکھڑی اُکھڑی باتیں کر رہے ہو۔ عبداللہ نے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ فرزندانِ عبدالمطلب کی چمکتی ہوئی تلواریں، لہراتے ہوئے پھریرے اور موت کو سر پر منڈلاتے دیکھ کر ڈر گئے ہیں۔ کہا کہ ایسا نہیں ہے بلکہ علی نے ایک بھُولی ہوئی بات یاد دلا دی ہے اب میں یہاں سے چلا جانا چاہتا ہوں اور کسی صُورت سے رُک نہیں سکتا۔ یہ کہا اور میدان چھوڑ کر چل دیئے اور بصرہ سے سات فرسخ کے فاصلہ پر وادی السباع میں عمرو ابن جرموز کے ہاتھ سے مارے گئے اور امیر المومنین کے اس قول کی تصدیق ہو گئی جو زبیر کے طلب قصاص کے جواب میں فرمایا تھا۔

زبیر کا یہ اقدام بجائے خود ایک ثبوت ہے کہ انہوں نے اپنے سابقہ موقف کو غلط سمجھا کیونکہ ان کا پہلا موقف صحیح ہو تو یہ دوسرا اقدام صحیح نہیں ہو سکتا اور اگر دوسرا اقدام درست تھا تو پہلا اقدام لامحالہ غلط ہوگا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ علی سے جنگ کرنا بھی صحیح ہو اور اُن کے مقابلہ میں جنگ سے گریز کرنا بھی درست ہو۔ چنانچہ ایک مرتبہ عبداللہ ابن زبیر نے ابن عباس پر طعن کرتے ہوئے کہا کہ تم لوگوں نے ام المومنین سے جنگ کی اور حواریٔ رسول زبیر سے لڑے تو انہوں نے زبیر کے اسی موقف کو سامنے رکھتے ہوئے کہا کہ حقیقت امر تو یہ ہے کہ تمہارے والد بزرگوار حضرت عائشہ کو گھر سے نکال کر میدان میں لائے اور علی کے مقابلہ میں صف آرا ہوئے۔ میں تم سے یہ دریافت کرتا ہوں کہ تم علی کو مومن سمجھتے ہو یا (معاذ اللہ) کافر اگر مومن سمجھتے ہو تو تم اُن سے جنگ لڑ کر گمراہ ہوئے اور اگر کافر سمجھتے ہو تو تمہارے والد (زبیر) گمراہ اور مستحق عذاب ٹھہرے اس لئے کہ انہوں نے ایک کافر کے مقابلہ میں جہاد سے منہ موڑا اور راہِ فرار اختیار کی اب تمہاری مرضی جسے چاہو اسے گمراہ سمجھو۔

زبیر کے بعد حضرت نے چاہا کہ طلحہ پر بھی حجت تمام کر دیں۔ چنانچہ انہیں مخاطب کر کے کہا:۔

یاطلحة جئت بعرس رسول اللّٰه تقاتل بها وخبأت عرسك في البيت اما بايعتني؟ (تاریخ طبری ج ۳ ص ۵۲۲)	اے طلحہ تم رسول اللہ کی بیوی کو جنگ و قتال کے لئے لے آئے ہو اور اپنی بیوی کو گھر کے اندر پردہ میں چھوڑ آئے ہو کیا تم نے میری بیعت نہیں کی تھی؟"

جب طلحہ پر اپنی بیعت کے ذریعہ اتمام حجت کر چکے تو آپ نے قرآن اپنے ہاتھوں میں لیا اور صفوں کا ایک چکر کاٹ کر بلند آواز سے کہا کہ تم میں کون ہے جو یہ قرآن لے کر صف اعداء کے سامنے جائے اور انہیں قرآن پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دے اور اسی کتاب کا واسطہ دے کر انہیں فتنہ انگیزی سے منع کرے۔ مگر یہ سمجھ لے کہ وہ موت کے منہ میں جا رہا ہے۔ کوفہ کے ایک جوان مسلم ابن عبداللہ مجاشعی نے کہا کہ میں جاؤں گا۔ حضرت کے تین مرتبہ کہنے پر جب مسلم کے سوا کوئی اور تیار نہ ہوا تو آپ نے اُسے دعائے خیر دی اور قرآن اُس کے حوالے کیا۔ وہ مصحف ہاتھوں پر اُٹھائے مخالف صفوں کے سامنے آیا اور انہیں قرآن کے اوامر و نواہی یاد دلائے اور ان پر عمل کرنے کی دعوت دی مگر اس کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی اور کسی نے توجہ نہ کی۔ اتنے میں حضرت عائشہ کے ایک غلام نے تلوار سے حملہ کیا اور اس کے دونوں ہاتھ کاٹ ڈالے۔ مسلم نے قرآن کو سینے سے لگا لیا اور تلوار کا وار کھا کر شہید ہو گیا اور قرآن بھی تیروں کی بوچھاڑ سے چھلنی ہو گیا۔ امیر المومنین نے یہ اسلام سوز منظر دیکھا تو فرمایا:۔

الان حل قتالهم۔ (تاریخ طبری ج ۳۔ ص ۵۲۲)	اب ان لوگوں سے جنگ کے جواز میں کوئی شبہ نہیں ہے۔"

مسلم مجاشعی کی اس مجاہدانہ سرفروشی کے بعد عمار ابن یاسر دشمن کی صفوں کے قریب آئے اور اُن سے مخاطب ہو کر کہا" اے لوگو! تم نے اپنی عورتوں کو گھروں کے اندر پردے میں بٹھا رکھا ہے اور پیغمبر اکرم کی بیوی کو تلواروں نیزوں اور بھالوں کے سامنے لے آئے ہو۔ تم خون عثمان کا انتقام لینے آئے ہو حالانکہ تمہیں بخوبی معلوم ہے کہ عثمان کے قاتل کون تھے اور ان کے قتل کی ذمہ داری کن پر عائد ہوتی ہے"۔ عمار اتنا ہی کہنے پائے تھے کہ تیروں کی بوچھار نے انہیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ پلٹ کر حضرت سے کہا کہ یا امیر المومنین اب کس بات کا انتظار ہے یہ لوگ جنگ کے علاوہ کوئی بات سننا ہی نہیں چاہتے۔

امیر المومنین کے صبر و سکوت اور صلح پسندانہ روش سے دشمن کے حوصلے بڑھ چکے تھے انہوں نے آپ کی صفوں پر تیروں کی بارش شروع کر دی۔ جانباز سپاہیوں کے سینے چھلنی ہو گئے اور زخموں سے نڈھال ہو کر زمین پر گرنے لگے۔ اس اثنا میں ایک شخص کو اٹھا کر حضرت کے سامنے لایا گیا جو تیروں سے چھلنی ہو کر جاں بحق ہو چکا تھا پھر ایک دوسرے شخص کو لایا گیا وہ بھی دشمن کے تیروں سے شہید ہو چکا تھا پھر عبداللہ ابن بدیل اپنے بھائی عبدالرحمٰن کو لائے جو تیر کھا کر دم توڑ چکا تھا۔ حضرت نے یہ کیفیت دیکھی تو پیشانی پر بل آیا تیور بدلے اور فرمایا انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اب میدان میں اُترے بغیر کوئی چارہ نہ تھا حجت ہر طرح سے تمام ہو چکی تھی صلح کے آثار ختم ہو چکے تھے اور دشمن کی طرف سے پہل ہو چکی تھی آپ نے پیغمبر خدا کی زرہ ذات الفضول طلب فرمائی اور اسے زیب تن کیا سر پر سیاہ عمامہ باندھا ذوالفقار ہاتھ میں لی میمنہ کی قیادت مالک اشتر کے اور میسرہ کی کمان عمار یاسر کے سپرد کی رسول اللہ کا سیاہ علم عقاب محمد ابن حنفیہ کو دیا اور فرمایا بیٹا آگے بڑھو۔ محمد علم لے کر آگے بڑھے تو تیروں کی بوچھار نے راستہ روکا حضرت نے آگے بڑھ کر علم محمد کے ہاتھ سے لے لیا ایک ہاتھ سے علم سنبھالا اور ایک ہاتھ تلوار کے قبضہ پر رکھا اور فوج مخالف پر ٹوٹ پڑے اور اس طرح لڑے کہ ہر طرف لاشوں کے ڈھیر اور سروں کے انبار لگ گئے۔ جب لشکر کو تہ و بالا کر چکے تو پلٹ کر علم محمد ابن حنفیہ کو دیا انہوں نے بھی اس طرح مردانہ وار حملہ کیا کہ لاشیں خاک و خون میں تڑپتی نظر آنے لگیں۔

اس ہنگامۂ دار و گیر میں مروان طلحہ کی تاک میں تھا کہ کسی طرح انہیں ختم کر کے خون عثمان کا انتقام لے کیونکہ قتل عثمان کی ایک حد تک ذمہ داری ان پر بھی عائد ہوتی تھی۔ اس انتقامی جذبہ کے علاوہ انہیں ٹھکانے لگانے میں ایک سیاسی مقصد بھی کار فرما تھا اور وہ یہ کہ مروان سمجھتا تھا کہ جب تک طلحہ و زبیر زندہ ہیں خلافت بنی امیہ کی طرف منتقل نہیں ہو سکتی البتہ ان دونوں کو ختم کرنے کے بعد اس کا امکان ہو سکتا ہے۔ زبیر تو محاذ جنگ سے جا چکے تھے اگر وہ میدان میں رہ جاتے تو بعید نہ تھا کہ مروان کے ترکش کا تیر انہیں بھی نشانہ بناتا۔ اس نے طلحہ کو ہلاک کرنے کا موقع ڈھونڈھ نکالا اور اپنے ایک غلام کی اوٹ لے کر زہر آلود تیر ان پر چلایا جو ان کی پنڈلی کو چیرتا ہوا گھوڑے کے شکم میں پیوست ہو گیا گھوڑا زخمی ہو کر بھاگ کھڑا ہوا اور ایک خرابہ میں جا کر رکا اور وہیں پر طلحہ نے دم توڑ دیا۔ ابن سعد تحریر کرتے ہیں:۔

ان مروان ابن الحکم رمی طلحۃ یوم الجمل وھو واقف الی جنب عائشۃ بسھم فاصاب ساقہ ثم قال واللہ لا اطلب قاتل عثمان بعدک ابدا۔

(طبقات ج۳ ص۲۲۳)

جمل کے دن مروان ابن حکم نے طلحہ کو جو حضرت عائشہ کے پہلو میں کھڑے تھے تیر مارا جو اُن کی پنڈلی پر لگا۔ پھر مروان نے کہا کہ خدا کی قسم تمہارے بعد مجھے قاتل عثمان کے ڈھونڈنے کی ضرورت پیش نہ آئے گی"۔

طلحہ کے مارے جانے اور زبیر کے میدان خالی کر جانے سے اصحاب جمل کے نہ حوصلے پست ہوئے اور نہ ولولے سرد پڑے بلکہ استقلال و پامردی سے میدان میں جمے اور لڑنے مرنے پر تلے رہے اس لئے کہ وُہ جنگ کا مرکزی کردار حضرت عائشہ کو سمجھتے تھے اور انہی سے ان کی عقیدتیں وابستہ تھیں۔ کوی رہے یا جائے ان سے انہیں کوی غرض نہ تھی۔ یہ عقیدت اس حد تک بڑھی ہوی تھی کہ وُہ ان کے اونٹ کی مینگنیاں اٹھا اٹھا کر ہاتھوں سے توڑتے انہیں سونگھتے اور کہتے کہ یہ ہماری مادر گرامی کے اونٹ کی مینگنیاں ہیں ان سے مشک و عنبر کی خوشبو آرہی ہے۔ وُہ اُونٹ کی حفاظت علم لشکر کی طرح کرتے اور ہمہ وقت اُس کے گرد حصار باندھے کھڑے رہتے اگرچہ مہار پکڑنے پر ہاتھ کٹتے سینے چھدتے خون بہتے مگر ثابت قدم رہتے اور اپنی جگہ سے جنبش نہ کرتے حضرت عائشہ ہودج کے اندر سے مہار پکڑنے والوں کو کٹ کٹ کر گرتے دیکھتی تھیں اور اُن کی ہمت افزائی کرتی تھیں اس ہمت افزائی کے نتیجہ میں جب بھی کوی گرتا فوراً اس کی جگہ پر دُوسرا آکھڑا ہوتا اور مہار اپنے ہاتھوں میں لے لیتا۔ ان مہار پکڑنے والوں میں زیادہ تر بنی ضبہ بنی ناجیہ بنی ازد اور قریش کے آدمی ہوتے تھے جو اپنی اپنی نوبت پر مہار پکڑتے رجزیہ اشعار پڑھتے اور بے جگری سے لڑتے ہُوئے جان دے دیتے۔ یوں تو اُن مہار پکڑنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے صرف قریش میں سے ستر آدمی مہار پکڑتے پر مارے گئے تھے مگر ان میں سے چند ایک کا ذکر تاریخ میں نمایاں ہے۔ ان میں سے ایک بصرہ کا قاضی کعب ابن سوار تھا اگرچہ وہ اس جنگ میں غیر جانبدار رہنا چاہتا تھا مگر طلحہ و زبیر نے حضرت عائشہ سے کہا کہ وُہ اسے بُلا کر یا خود اُس کے ہاں جا کر اُسے تعاون پر آمادہ کریں اس لئے کہ اگر کعب شریک نہ ہوا تو قبیلۂ بنی ازد میں سے کوی بھی ہمارا ساتھ نہیں دے گا۔ ام المومنین نے کسی کے ہاتھ اسے بلوا بھیجا مگر وُہ ٹال گیا۔ آخر ام المومنین خود اُن کے ہاں گئیں اور اُسے آواز دی مگر وُہ چپ سادھے بیٹھا رہا اور کوی جواب نہ دیا۔ حضرت عائشہ نے کہا کہ جواب کیوں نہیں دیتے کیا میں تمہاری ماں نہیں ہوں اس پر کعب نے دروازہ کھول دیا۔ ام المومنین نے اسے شریک جنگ ہونے کے لئے کہا اس نے کچھ دیر پس و پیش کیا اور آخر ہتھیار ڈال دیئے اور ام المومنین

اسے میدان حرب و ضرب میں کھینچ لائیں۔ اس کی وجہ سے بنی ازد بھی شریک ہو گئے۔ کعب میدان جنگ میں گلے میں قرآن حمائل کئے ایک ہاتھ میں عصا اور دُوسرے میں مہار پکڑے کھڑا تھا کہ ایک نامعلوم سمت سے سنسناتا ہوا تیر آیا جس نے اُسے وہیں پر ٹھنڈا کر دیا۔

جب عرب کے مشہور شمشیر زن عمرو ابن یثری نے مہار پکڑی تو امیرالمومنین کے لشکر سے ہند ابن عمرو اس سے لڑنے کے لئے نکلے۔ عمرو نے مہار اپنے بیٹے کے ہاتھ میں دی اور مقابلہ کے لئے سامنے آیا کچھ دیر تک دونوں زور آزمائی کرتے رہے آخر ابن یثری غالب آیا اور ہند اس کے ہاتھ سے مارے گئے۔ ہند کے بعد علباء ابن ہیثم اور زید ابن صوحان اس کے مقابلہ کے لئے نکلے اور دونوں اس کے ہاتھ سے شہید ہو گئے۔ عمار ابن یاسر نے یہ دیکھا تو ان کی رگوں میں خون شجاعت جوش مارنے لگا لیف خرما کی رسّی سے کمر کس کر باندھی ہتھیار سجے اور تلوار لے کر میدان کی طرف بڑھے۔ عمار نوے برس کے بوڑھے تھے اور حریف کے مقابلہ میں کمزور و ناتوان نظر آ رہے تھے۔ لوگوں نے انہیں دیکھا تو کہا کہ ان کا حشر بھی وہی ہو گا جو پہلے جانے والوں کا ہو چکا ہے۔ ابن یثری نے انہیں جنگ کے ارادہ سے آتے دیکھا تو اُونٹ کی مہار عمرو ابن بجرہ کے سپرد کی اور تیزی سے ان کی طرف لپکا اور قریب پہنچ کر تلوار کا بھرپور ہاتھ چلایا۔ عمار نے تلوار ڈھال پر روکی ڈھال کی ساخت کچھ اس قسم کی تھی کہ تلوار اس کی کڑیوں میں گڑ گئی اس نے جھٹکا دے کر اسے نکالنا چاہا تو عمار نے جھک کر اس کی ٹانگوں پر تلوار کا ایسا ہاتھ مارا کہ اس کی دونوں ٹانگیں کٹ گئیں۔ لڑکھڑا کر زمین پر گرا اور بے بس ہو گیا۔ لوگ اُسے اٹھا کر امیرالمومنین کے سامنے لائے حضرت نے تینوں شہیدوں کے قصاص میں اسے قتل کرنے کا حکم دیا۔

عمرو ابن بجرہ نے جب دیکھا کہ ابن یثری مارا گیا ہے تو وُہ مہار چھوڑ کر میدان میں نکل آیا ادھر سے ربیعہ عقیلی نکلے اور دونوں تلوار لے کر ایک دوسرے پر جھپٹے اور دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ سے مارے گئے۔

جب مہار دست بدست گردش کرتی ہوئی عوف ابن قطن ضبی کے ہاتھ میں آئی تو اس نے کہا کہ قتل عثمان کی ذمہ داری علی اور اُن کے بیٹوں پر عائد ہوتی ہے میں اس خون کا انتقام انہی سے لوں گا۔ چنانچہ یہ رجز پڑھا اور میدان میں نکل آیا۔

یا ام یا ام خلا منی الوطن   لا ابتغی القبر ولا ابغی الکفن

اے ماں! اے ماں وطن مجھ سے چھوٹ گیا اب نہ مجھے قبر کی خواہش ہے نہ کفن کی تمنا۔

من ھٰھنا یحشر عوف ابن قطن   ان فاتنا الیوم علی فالغبن!

اسی مقام سے عوف ابن قطن کا حشر و نشر ہو گا۔ اگر آج علی ہمارے ہاتھ سے بچ کر نکل گئے تو یہ سراسر نقصان ہے۔

او فاتنا ابناہ حسین وحسن   اذن امت بطول ھم وحزن

یا ان کے دونوں بیٹے حسن و حسین ہمارے ہاتھ سے بچ گئے تو میں اسی رنج و غم سے مر جاؤں گا"۔

اس رجز کے بعد حملہ آور ہوا اور کچھ دیر لڑتا رہا آخر محمد ابن حنفیہ کی شمشیر شرربار اس کے سر پر چمکی اور وہ علی و فرزندان علی کو قتل کرنے کی حسرت دل میں لئے ہوئے اپنی منزل پر پہنچ گیا۔

ان مہار پکڑنے والوں میں عبداللہ ابن ابزی بھی تھا اس نے پہلے مہار پکڑی اور پھر یہ رجز پڑھتا ہوا حضرت کی صفوں پر حملہ آور ہوا:۔

اضربھم ولا اری ابا الحسن ھا ان ھذا حزن من الحزن!

میں ان پر تلوار چلاؤں گا اور ابوالحسن کو بھی نگاہ میں نہیں لاؤں گا۔ یہ جنگ ایک المناک جنگ ہے امیرالمومنین نے آگے بڑھ کر اس پر نیزہ مارا اور فرمایا تمہیں ابوالحسن کو دیکھنے کی خواہش تھی کہو نہیں کیسا پایا اور نیزہ اسی کے سینہ میں گڑا رہنے دیا۔

اصحاب جمل میں کا ایک نامور سردار خباب ابن عمرو راسبی یہ رجز پڑھتا ہوا مبارز طلب ہوا:۔

اضربھم ولو اری علیا عممته ابیض مشرفیا

میں ان پر تلوار چلاؤں گا اور اگر میں نے علی کو دیکھ لیا تو انہیں چمکتی ہوئی تیز دھار تلوار کی لپیٹ میں لے لوں گا"۔

مالک اشتر آگے بڑھے اور تلوار کے ایک ہی وار سے اس کا کام تمام کر دیا۔

اس کے بعد عتاب ابن اسید جو اشراف قریش میں سے تھا یہ رجز پڑھتا ہوا نکلا:۔

انا ابن عتاب و سیفی ولول والموت عند الجمل المجلل

میں عتاب کا بیٹا ہوں میری تلوار کا نام ولول ہے اور میری موت اونٹ کے گرد و پیش ہے"

مالک اشتر نے حملہ کر کے اسے بھی موت کے گھاٹ اتار دیا اور یوں اس کی موت تو اونٹ کے قدموں میں ہوئی مگر اس کی تلوار جس پر اسے ناز تھا کسی کام نہ آئی۔

بصرہ کے ایک شہسوار عمرو ابن اشرف عتکی نے ایک ہاتھ میں مہار پکڑی اور دوسرے ہاتھ میں تلوار اور جو اس کے قریب آتا اسے تلوار کی زد پر رکھ لیتا اور یہ رجزیہ اشعار پڑھتا:۔

یا امنا یا خیر ام نعلم والام تغذو ولدھا و ترحم

اے ہماری ماں ہمارے علم میں آپ بہترین ماں ہیں ماں اپنے بچوں کو غذا دیتی اور ان پر ترس کھاتی ہے"۔

الا ترین کم شجاع یکلم وتختلی ھامته والمعصم!

کیا آپ دیکھتی نہیں ہیں کہ کتنے بہادر زخمی ہو رہے ہیں اور سر اور کلائیاں کٹ کٹ کر

گر رہی ہیں"۔
حارث ابن زہیر ازدی اس کے مقابلہ کے لئے نکلے دونوں ایک دوسرے پر حملہ آور ہوئے اور ایک دوسرے کی تلوار سے گھائل ہو کر گرے اور کچھ دیر تڑپنے کے بعد ختم ہو گئے۔ ابن اشرف کے ہمراہ اس کے گھر کے بھی تیرہ افراد کام آئے۔
عبداللہ ابن خلف خزاعی رئیس بصرہ جس کے ہاں ام المومنین وارد بصرہ ہونے کے بعد مقیم تھیں، میدان میں اُترا اور یہ رجز پڑھتے ہوئے حضرت علی سے مبارز طلب ہوا:۔
یا ابا تراب ادن منی فترا فاننی دان الیك شبرا وان فی صدری علیك غمرا
اے ابو تراب مجھ سے کچھ قریب ہو۔ تم جتنا قریب ہو گے میں اس سے زیادہ قریب ہوں گا۔ میرے سینہ میں تمہارے خلاف غم و غصّہ بھرا ہوا ہے"۔
حضرت نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر تلوار ماری اور اُسے دو پارہ کر دیا۔
عبداللہ ابن حکیم جو قریش کے دستہ کا علمبردار تھا مقابلہ کے لئے نکلا ادھر سے عدی ابن حاتم اس سے نبرد آزما ہونے کے لئے بڑھے اس نے عدی پر حملہ کیا اور نیزے سے ان کی ایک آنکھ پھوڑ دی اس صورت میں حریف کو زیر کرنا ان کے لئے مشکل ہو گیا۔ مالک اشتر نے آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ بٹایا اور دونوں نے مل کر اسے قتل کر دیا۔
ام المومنین ہر مہار پکڑنے والے سے پوچھ لیتی تھیں کہ تم کون ہو۔ اس دوران عبداللہ ابن زبیر نے مہار پکڑی تو معمول کے مطابق پوچھا کہ تم کون ہو اس نے کہا کہ میں آپ کا بھانجا عبداللہ ہوں عبداللہ کا نام سُنا تو تڑپ اٹھیں اور پر اندوہ لہجہ میں کہا واثکل اسماء ہائے اسماء کی کوکھ اُجڑ گئی عبداللہ مہار پکڑے ہوئے تھا کہ سامنے سے مالک اشتر گزرے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو تاکا اور تلوار تولتے ہوئے ایک دوسرے پر جھپٹے مالک نے عبداللہ کے سر پر ضرب لگائی اور اسے شدید مجروح کر دیا اور خود بھی اس کے ہاتھ سے معمولی زخمی ہو گئے دونوں زخم خوردہ آپس میں گتھ گئے اور مالک عبداللہ کو پچھاڑ کر اس کے سینہ پر سوار ہو گئے۔ عبداللہ نے جان بچتے نہ دیکھی تو چیخ چیخ کر کہنا شروع کیا اقتلونی و مالکا واقتلوا مالکا معی۔ (مجھے اور مالک دونوں کو قتل کر ڈالو) لوگوں نے اس آواز پر توجّہ نہ دی کیونکہ اکثر لوگ مالک کو اشتر ہی کے نام سے جانتے پہچانتے تھے اگر عبداللہ مالک کے بجائے اشتر کہتا تو لوگ یقیناً ان پر ٹوٹ پڑتے اور انہیں قتل کر دیتے۔ عبداللہ جوان اور تنومند تھا اور مالک بوڑھے تھے وہ زور کر کے ان کی گرفت سے آزاد ہو گیا اور اپنی جان بچا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ عبداللہ نے بھاگ کر اپنی جان تو بچالی مگر فرار کا دھبا ہمیشہ کے لئے اس کے دامن پر رہ گیا اور لوگوں میں اس کا چرچا بھی ہوتا رہا چنانچہ ایک مرتبہ اس نے عدی پر طنز کرتے ہوئے کہا کہ تمہاری

یہ آنکھ کب پھوٹی تھی عدی نے اس کے فرار کا واقعہ یاد دلاتے ہوئے کہا۔

یوم طعنتك فی استك وانت مول۔ (عقد الفرید ج ۲ ص ۳۵۴)	جب ہم نے تمہارے سرین پر نیزہ مارا تھا اور تم پیٹھ پھرائے بھاگے جا رہے تھے۔"

ام المومنین عبداللہ کی طرف سے انتہائی فکرمند تھیں۔ جب انہیں یہ خبر دی گئی کہ وہ بھاگ کر اپنی جان بچا لے گیا ہے تو ام المومنین نے اطمینان کی سانس لی اور خبر لانے والے کو چار ہزار درہم انعام دیئے۔

اسود ابن البختری قرشی بھی مہار پکڑنے پر مارا گیا۔ جندب ابن زہیر غامدی اور عبدالرحمٰن ابن اسید مالک کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ جب سب سے آخر میں مہار زفر ابن حارث کے ہاتھوں میں آئی تو گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی صفوں پر صفیں ٹوٹ پڑیں اور ہر طرف خون کا سیلاب امنڈ آیا ام المومنین نے یہ خونی منظر دیکھا تو کچھ کنکریاں لے کر حضرت کے لشکر کی طرف پھینکیں اور کہا شاھت الوجوہ۔ (یہ چہرے سیاہ ہوں) یہ حربہ تھا اس معجزانہ عمل کا جو جنگ حنین میں رسول اللہ سے ظہور میں آیا تھا۔ مگر وہاں پیغمبر کا عمل کفار کے مقابلہ میں اور وحی الٰہی کے ماتحت تھا۔ اور یہاں مقابلہ میں حضرت علی اصحاب بدر بیعن مبایعین تحت الشجرہ اخیار صحابہ اور ممتاز تابعین تھے۔ اس عمل کا اثر کیا ہونا تھا کسی نے اسے قابل توجہ بھی نہ سمجھا بلکہ ایک بگڑے دل سپاہی نے یہ آیت ذرا سے تغیر کے ساتھ پڑھ دی:۔

ما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمی۔ (شرح ابن ابی الحدید ج ۱ ص ۸۵)	جب تم نے کنکریاں پھینکیں تو تم نے نہیں پھینکیں بلکہ اللہ نے پھینکیں۔"

امیر المومنین نے مالک اشتر کو میمنہ لشکر پر اور ہاشم ابن عتبہ کو میسرہ پر حملہ آور ہونے کا حکم دیا۔ یہ دونوں اپنے اپنے دستوں کے ساتھ تلواریں علم کئے اٹھ کھڑے ہوئے اور اس شدت سے حملہ کیا کہ میمنہ کے قدم اکھڑ گئے اور میسرہ اپنی جگہ سے ہٹ کر قلب لشکر سے مل گیا۔ سردار میمنہ ہلال ابن وکیع مالک اشتر کے ہاتھ سے قتل ہوا اور لشکر بھاگ کر حضرت عائشہ کے گرد پناہ لینے پر مجبور ہو گیا۔ سپاہ امیر المومنین نے بھاگنے والوں کا پیچھا کیا اور اونٹ کے گرد گھمسان کا رن پڑنے لگا۔ بنی ازد بنی ناجیہ اور باہلہ اونٹ کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے اس کی حفاظت کر رہے تھے اور تیروں اور تلواروں کے وار سر و سینہ پر روک رہے تھے جنگ زوروں پر لڑی جا رہی تھی اور تیروں کی بوچھار اور تلواروں کی جھنکار سے میدان گونج رہا تھا۔ زمخشری نے کسی کا قول نقل کیا ہے کہ:۔

ما شبهت وقع السیوف علی الهام الا بضرب البیازر علی	سروں پر تلواروں کے پڑنے سے ایسی آوازیں آتی تھیں جیسے کپڑا دھونے کے پٹڑے پر چوب

المواجن۔ (فائق۔ج۔ ص۳۵)۔ مارنے کی آواز ہوتی ہے"۔

امیر المومنین نے دیکھا کہ جنگ ابھی فیصلہ کن مرحلہ میں داخل نہیں ہوئی اس لئے خود میدان میں اترنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ مہاجرین و انصار کے ایک دستہ کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ امام حسن اور امام حسین دائیں بائیں تھے اور محمد ابن حنفیہ علم لئے آگے آگے چل رہے تھے۔ آپ نے محمد ابن حنفیہ سے فرمایا کہ آگے بڑھو اور صفوں کو چیرتے ہوئے اس مقام پر پہنچ کر دم لو جہاں عائشہ کا اُونٹ کھڑا ہے۔ محمد علم لہراتے آگے بڑھے مگر دشمن کی طرف سے تیروں کی بارش شروع ہوگئی اور محمد کے قدم رک گئے۔ حضرت نے آگے بڑھ کر اپنا بایاں ہاتھ محمد کے داہنے کندھے پر رکھا اور محمد کے ہاتھ سے علم لے لیا۔ بائیں ہاتھ سے علم سنبھالا اور دائیں ہاتھ میں ذوالفقار لی اور دشمن کی صفوں پر ٹوٹ پڑے اور اس طرح حملہ کیا کہ لاشوں کے ڈھیر لگ گئے اور اس طرح تابڑ توڑ تلوار چلائی کہ اس میں خم آگیا۔ جب دشمن کی صفوں کو درہم و برہم کر چکے تو اپنی صفوں کے قریب آئے تلوار کو گھٹنے پر رکھ کر سیدھا کیا اور دوبارہ حملہ کے ارادہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ محمد ابن حنفیہ عمار ابن یاسر عدی ابن حاتم اور امام حسن و امام حسین نے عرض کیا کہ یا امیر المومنین آپ ٹھہریئے ہم میدان میں جاتے ہیں مگر آپ نے کسی کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھا اور نہ کسی کی بات کا جواب دیا چہرہ غیظ و غضب سے تمتما رہا تھا آنکھ سے شرارے برس رہے تھے اور سینہ سے شیر کے غرانے کی سی آواز آرہی تھی۔ اب کس میں جرأت تھی کہ کچھ کہے اور زبان کھولے سب خاموش ہوگئے۔ آپ نے علم محمد کے سپرد کیا اور اکیلے دشمن کی صفوں پر بپھرے ہوئے شیر کی طرح حملہ آور ہوئے اور صفوں کے اندر گھس کر اس طرح تلوار چلائی کہ صفیں الٹ گئیں میدان لاشوں سے پٹ گیا اور لڑتے لڑتے تلوار پھر ٹیڑھی ہوگئی۔ آپ اپنی صف کے قریب آئے اور گھوڑے سے نیچے اُتر کر تلوار سیدھی کی۔ جب آپ کے اعوان و انصار نے دیکھا کہ پھر میدان کی طرف بڑھنا چاہتے ہیں تو انہوں نے آپ کو قسم دی کہ اپنی حالت پر رحم کھائیے آپ نہ لڑیں ہم لڑیں گے۔ اگر آپ پر آنچ آئی تو دین پر بن جائے گی اور اسلام کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ حضرت نے ان لوگوں کے کہنے سننے سے ہاتھ روک لیا اور پلٹ کر محمد ابن حنفیہ سے کہا کہ دیکھو بیٹا اس طرح سے جنگ کی جاتی ہے۔ لوگوں نے کہا کہ یا امیر المومنین کس میں دم خم ہے جو آپ کی طرح لڑے اور کس کے بازوؤں میں کس بل ہے جو اس طرح تلوار چلائے۔

اس پر زور حملہ سے اصحاب جمل پر شکست کے آثار طاری ہو چکے تھے اگرچہ ان کے سروں پر تلواریں چل رہی تھیں سینوں کے اندر خنجر اتر رہے تھے اور سر بازو اور کلائیاں کٹ کٹ کر گر رہی تھیں مگر اس وقت تک میدان چھوڑنا گوارا نہ کر سکتے تھے جب تک اونٹ اُن کے درمیان کھڑا تھا اس کی بھی یہ کیفیت تھی کہ اس کی جھول اور ام المومنین کے کجاوہ میں تیر اس طرح پیوست تھے جس طرح

ساہی کے بدن پر کانٹے ہوتے ہیں اور وُہ اس خونی ہنگامہ کی تاب نہ لاکر اس طرح گھوم رہا تھا جس طرح چکی گھومتی ہے۔ حضرت نے دیکھا کہ جب تک اونٹ میدان میں کھڑا ہے جنگ ختم ہونے میں نہیں آئے گی ادھر بصرہ والے کسی کو اونٹ کے پاس پھٹکنے نہ دیتے تھے اور اس پر تلے ہوے تھے کہ جان جائے مگر اُونٹ کو کوی گزند نہ پہنچنے پائے۔ حضرت نے اسے میدان سے ہٹانے کا ارادہ کیا اور قبیلۂ نخع اور ہمدان کے جوانمردوں کو لے کر میدان کی طرف بڑھے۔ حضرت کو دیکھ کر فوجیں ہٹیں پرے ٹوٹے اور آپ اپنے ہمراہیوں سمیت اُونٹ کے قریب پہنچ گئے اور اپنی فوج کے ایک سپاہی بجیر ابن دلجہ نخعی سے کہا کہ آگے بڑھ کر اُونٹ کی کونچیں کاٹ ڈالو۔ بجیر نے آگے بڑھ کر اُونٹ کے پیروں پر وار کیا اُونٹ نے ایک مہیب چیخ ماری اور پہلو کے بل زمین پر گرا۔ اُونٹ کے گرتے ہی جنگ رُک گئی اور ایک عام بھگدڑ مچ گئی کسی کو سہروپا کا ہوش نہ رہا لاشوں اور کراہتے ہُوے زخمیوں کو روندتے ہُوے جدھر مُنہ آیا ادھر بھاگ کھڑے ہُوے اور دیکھتے ہی دیکھتے میدان پر سنّاٹا چھاگیا۔ محمد ابن ابی بکر اور عمار یاسر نے حضرت کے حکم سے اُونٹ کے تسمے کاٹے اور ہودج کو اتار کر زمین پر رکھ دیا۔ محمد ابن ابی بکر نے ہودج کے اندر ہاتھ ڈالا۔ ام المومنین نے بگڑ کر پوچھا کہ کون ہو کہا کہ آپ کا ناپسندیدہ بھائی کہا کیا خثعمیہ کے بیٹے ہو کہا ہاں۔ کہا خدا کا شکر ہے کہ تم زندہ ہو اور تمہیں کوی آنچ نہیں آئی۔ محمد نے کہا کہ امیر المومنین نے دریافت کیا ہے کہ آپ کو کوی گزند تو نہیں پہنچا کہا کہ ایک تیر بازو کو چھوتا ہُوا گزر گیا تھا اور کوی خاص گزند نہیں پہنچا۔ اس کے بعد عمار ابن یاسر ہودج کے قریب آئے اور کہا کہ اے مادر گرامی آپ نے اپنے بیٹوں کی جنگ دیکھ لی اس پر ام المومنین نے بگڑ کر کہا۔

لست لک بام۔ (تاریخ کامل ج۳ ص۱۳۱) میں تمہاری ماں نہیں ہوں"۔

عمار نے کہا کہ آپ ماں تو ہیں خواہ مانیں یا نہ مانیں۔

ام المومنین کا یہ انکار قرآن مجید کی رُو سے درُست نہیں سمجھا جا سکتا اس لئے کہ آپ بنص قرآن وازواجہ امہاتھم (پیغمبر کی بیویاں مسلمانوں کی مائیں ہیں) ماں تھیں جس سے کسی مسلمان کو انکار نہیں ہے اور نہ انکار ہو سکتا ہے۔ اس انکار کی بظاہر وجہ یہ ہے کہ جب عمار نے ان کے خلاف جنگ میں حصہ لیا ہے تو گویا انہوں نے مادری حقوق کے تقاضوں کو نظر انداز کر دیا ہے لہٰذا وُہ بیٹے کہاں رہے اور آپ ماں کہاں رہیں۔ لیکن یہ حرب و پیکار ماں کے ماں اور بیٹے کے بیٹا ہونے پر اثر انداز نہیں ہو سکتی اس لئے کہ بحیثیت حرم رسول ماں ہونا اور ہے اور ان کی اطاعت و ہمنوائی اور بات ہے۔ اگر کوی ان کی ہمنوائی نہیں کرتا تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وُہ بیٹا نہیں رہا اور آپ ماں نہیں رہیں۔ جہاں تک اطاعت و فرمانبرداری کا تعلق ہے وُہ صرف حقیقی ماؤں تک محدود ہے اور اس کی کوی دلیل نہیں ہے کہ ازواج رسول اگر اُمت کی مائیں تھیں تو حقیقی ماؤں کی طرح ان کی اطاعت بھی واجب تھی اس طرح کہ ان کے

حکم سے سرتابی معصیت قرار پائے ۔ وُہ مائیں ہیں تو اس لحاظ سے کہ پیغمبر کے گھر میں آنے کے بعد کسی دُوسرے کے گھر میں نہیں بیٹھ سکتیں اور اسی طرح حرام تھیں جس طرح مائیں اولاد پر حرام ہوتی ہیں ۔ چنانچہ حکم پردہ کے بعد جب کچھ لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ہم پیغمبر کے بعد ان کی بیویوں سے عقد کریں گے تو ان کی تنبیہہ و سرزنش کے لئے یہ آیت نازل ہوی:۔

وما کان لکم ان تؤذوا رسول	تمہارے لئے جائز نہیں ہے کہ تم رسول خدا کو
اللہ ولا ان تنکحوا ازواجہ	اذیت دو اور یہ بھی جائز نہیں ہوسکتا کہ تم ان کے
من بعدہ ابدا۔	بعد ان کی بیویوں سے نکاح کرو۔"

اس حرمت نکاح کے علاوہ وُہ احکام جو حقیقی ماں ہونے کی حیثیت سے اولاد پر اور اولاد ہونے کی حیثیت سے ماں پر عائد ہوتے ہیں یہاں ثابت نہیں ہیں مثلاً یہ کہ اولاد پر ماں کا نفقہ واجب ہوتا ہے اور بیٹا ماں کا اور ماں بیٹے کی وارث ہوتی ہے اور ماں کا اولاد سے پردہ نہیں ہوتا مگر یہاں نہ ان کا نفقہ امّت پر واجب تھا اور نہ وُہ امّت کی اور نہ اُمت ان کی وارث قرار پاتی ہے اور نہ وُہ حکم پردہ سے مستثنیٰ تھیں۔ اسی طرح حقیقی ماؤں کی طرح ان کی اطاعت و ہمنوائی بھی واجب نہ تھی۔ صرف حرمت عقد کے سلسلہ میں انہیں ماں کا درجہ دینے سے یہ نہیں سمجھا جاسکتا کہ ان پر حقیقی ماؤں کے تمام احکام بھی مترتب ہوتے ہیں۔ آخر رضاعی ماں کو بھی ماں قرار دیا گیا ہے مگر وُہ ماں ہونے کے باوجود نہ ورثہ پاتی ہے نہ واجب النفقہ ہوتی ہے اور نہ اولاد پر اس کی اطاعت ہی واجب ہے اسے صرف حرمت نکاح کے اعتبار سے ماں قرار دیا گیا ہے۔ اور پھر حقیقی ماں ہو یا رضاعی ماں یہودیہ بھی ہوسکتی ہے اور نصرانیہ بھی مگر اُن امور میں جو خلاف شرع اسلام ہوں ان کی اطاعت جائز نہیں ہے۔ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ام المومنین کی اطاعت ماں ہونے کی حیثیت سے اُمّت پر واجب تھی تو اس مورد پر جبکہ حقیقی ماں کی بھی اطاعت صحیح نہیں ہے ان کی اطاعت کیونکر ضروری ہوسکتی ہے کیونکہ ان کا یہ اقدام امام برحق کے خلاف جارحانہ حیثیت رکھتا تھا جو آئین اسلام کے خلاف اور کسی طرح جائز نہ تھا اور امر ناجائز میں اطاعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ پیغمبر اکرم کا ارشاد ہے:۔

لا طاعۃ فی معصیۃ انما الطاعۃ	اطاعت گناہ میں نہیں بلکہ صرف نیک کام میں
فی المعروف۔ (مشکوٰۃ۔ صفحہ ۳۱۹)	ہوتی ہے۔"

شائد ام المومنین کو بھی اس کا احساس تھا کہ ان کا یہ اقدام جارحانہ اور سفر بصرہ سفر معصیت ہے چنانچہ ان کے اس طرز عمل کے بارے میں کہ وُہ سفر میں نماز قصر نہیں کرتی تھیں۔ ایک تاویل یہ بھی کی گئی ہے کہ ان کا یہ عمل صرف سفر بصرہ کے دوران تھا اور وُہ اس سفر کو سفر معصیت سمجھتے ہُوئے نماز پوری پڑھتی تھیں کیونکہ قصر کا حکم سفر کے مباح ہونے کی صورت میں ہے۔ چنانچہ ابن حجر عسقلانی نے اس تاویل کے

سلسلہ میں ایک قول یہ نقل کیا ہے :-

انما اتمت فی سفرھا الی البصرۃ الی قتال علی و القصر عندھا انما یکون فی سفر طاعۃ۔
(فتح الباری ج ۲ ص ۴۶۱)

حضرت عائشہ حضرت علی سے بقصد جنگ بصرہ جاتے ہوئے نماز پوری ادا کرتی تھیں اور ان کے نزدیک قصر کا حکم صرف سفر اطاعت کی صورت میں تھا"

بہر حال ام المومنین ابھی میدان جمل ہی میں تھیں کہ امیر المومنین ہودج کے قریب آئے اور اسے لکڑی سے کھٹکھٹایا اور فرمایا اے حمیرا کیا رسول خدا نے آپ کو یہی حکم دیا تھا کہا ملکت فاسجح (آپ غالب آئے ہیں تو حسن سلوک کیجئے) آپ نے محمد ابن ابی بکر کو حکم دیا کہ ہودج کے اوپر ایک خیمہ نصب کر دو اور اس کی نگرانی کرو تا کہ کوئی شخص اس کے قریب نہ آنے پائے اور جب رات کا پچھلا پہر ہوا تو انہیں عبداللہ ابن خلف کی بیوہ صفیہ بنت حارث کے ہاں پہنچا دیا اور اونٹ کے بارے میں حکم دیا کہ اسے جلا دیا جائے اور اس کی راکھ ہوا میں اڑا دی جائے۔ چنانچہ اسے جلا کر اس کی راکھ ہوا میں اڑا دی گئی۔ پھر فرمایا خدا لعنت کرے اس چوپائے پر یہ بنی اسرائیل کے گوسالہ سے کتنی مشابہت رکھتا تھا اور اس آیت کی تلاوت فرمائی :-

وانظر الی الھك الذی ظلت علیه عاکفا لنحرقنه ثم لننسفنه فی الیم نسفا۔

"اپنے معبود کو تو دیکھو جس کی عبادت پر تم جمے ہوئے تھے ہم اسے جلا کر راکھ کر دیں گے اور پھر اسے پراگندہ کر کے دریا میں بہا دیں گے"۔

خاتمۂ جنگ پر حضرت نے اپنے لشکر میں اعلان فرمایا کہ کسی بھاگنے والے کا تعاقب نہ کرنا کسی زخمی پر ہاتھ نہ اٹھانا لوگوں کے گھروں میں داخل نہ ہونا۔ جو ہتھیار اتار کر رکھ دے اور جو گھر کا دروازہ بند کر لے اس کے لئے امان ہے۔ فریق مخالف کے اموال سے کوئی تعرض نہ کرنا البتہ جو ہتھیار برتن اور سواریاں میدان جنگ میں تمہارے ہاتھ لگیں وہ تمہارا مال ہے اس کے علاوہ کسی چیز کو روا نہ سمجھنا۔ اور عورتوں اور کنیزوں پر تمہارا کوئی حق نہیں ہے۔ اس پر کچھ لوگ معترض ہوئے اور کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ان کا خون بہانا تو ہمارے لئے مباح ہو اور انہیں غلام و کنیز بنانا جائز نہ ہو ہمیں مردوں اور بچوں کو غلام اور عورتوں کو کنیز بنانے کی اجازت ہونا چاہیئے۔ شائد یہ نظریہ اس بنا پر قائم کیا ہو کہ دورِ اول میں جب مانعین زکوٰۃ سے جنگ کی گئی تھی تو بقیۃ السیف کو غلام و کنیز بنا لیا گیا تھا لہٰذا یہاں فریق ثانی کو غلام و کنیز بنانے میں کیا امر مانع ہے۔ مگر حضرت نے انکار کیا اور فرمایا کہ میں نے وہی فیصلہ کیا ہے جو رسول اللہ نے فتح مکہ کے موقع پر کیا تھا اگر تم بضد ہو تو بتاؤ کہ تم میں کون ہے جو اپنی ماں عائشہ کو اپنے حصہ میں لینا چاہتا ہے یہ سننا تھا کہ کہنے والوں پر سناٹا چھا گیا اور سب کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور کہنے لگے کہ یا امیر المومنین آپ نے جو فیصلہ فرمایا ہے وہی صحیح ہے ہم ہی لوگوں نے غلط نظریہ قائم کیا تھا اور ناروا مطالبہ پیش

کیا تھا۔

حضرت تین دن تک میدان جمل میں تشریف فرما رہے اور مقتولین کو دفن کرنے کے بعد شہر میں داخل ہوئے اور سیدھے مسجد جامع میں تشریف لے گئے اور نماز سے فارغ ہو کر مصلّے کی دائیں جانب دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے اور اہل بصرہ کو ان کی بے راہروی و کج ذہنی پر سرزنش کرتے ہوئے فرمایا:۔

کنتم جند المرأة واتباع البهيمة رغا فاجبتم وعقر فهربتم اخلاقكم دقاق وعهدكم شقاق ودينكم نفاق وماؤكم زعاق والمقيم بين اظهركم مرتهن بذنبه والشاخص عنكم متدارك برحمته۔
(نہج البلاغہ)

تم ایک عورت کی سپاہ اور ایک چوپائے کے تابع تھے وُہ بلبلایا تو تم لبیک کہتے ہُوئے بڑھے اور وُہ زخمی ہُوا تو تم بھاگ کھڑے ہُوئے تم پست اخلاق و عہد شکن ہو تمہارے دین کا ظاہر کچھ ہے اور باطن کچھ۔ تمہاری سرزمین کا پانی تک شور ہے تم میں اقامت کرنے والا گناہوں کے جال میں جکڑا ہوا ہے اور تم میں سے نکل جانے والا اپنے پروردگار کی رحمت کو پالینے والا ہے۔"

خطبہ سے فارغ ہو کر اہل بصرہ سے بیعت لی اور انہیں فتنہ و شر انگیزی سے باز رہنے کی تلقین کرتے ہُوئے باہر نکلے اور ابوالاسود دئلی وغیرہ کے ہمراہ بیت المال میں تشریف لائے اور سرسری نگاہوں سے بیت المال کا جائزہ لیا اور حکم دیا کہ یہ تمام رقم شرکاء جنگ میں تقسیم کر دی جائے اور ہر سپاہی کو پانچ پانچ سو درہم دیئے جائیں۔ جب وُہ رقم تقسیم کی گئی تو نہ ایک درہم گھٹا اور نہ ایک درہم بڑھا اور سب پر برابر تقسیم ہو گئی۔ حبۃ العرنی کہتے ہیں کہ امیر المومنین نے بھی اپنا حصہ دوسروں کے برابر لیا اور جب لے چکے تو ایک شخص آیا اور عرض کیا کہ یا امیر المومنین میں جنگ میں شریک تو نہ ہو سکا مگر میرا دل آپ کے ساتھ تھا اور میری ہمدردیاں آپ سے وابستہ تھیں مجھے بھی اس مال میں سے حصہ ملنا چاہیئے۔ حضرت نے اپنے حصّہ کے پانچ سو درہم اسے دے دیئے اور خالی ہاتھ اُٹھ کھڑے ہُوئے۔

حضرت عائشہ ابھی تک بصرہ میں مقیم تھیں۔ حضرت نے ابن عباس کو اُن کے ہاں بھیجا کہ انہیں کہیں کہ وُہ مدینہ واپس جانے کی تیاری کریں اب نہ یہاں ان کا کوئی کام ہے اور نہ ان کا مدینہ سے زیادہ عرصہ تک باہر رہنا مناسب ہے۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ میں حضرت کا پیغام لے کر ان کے ہاں گیا اور اندر آنے کی اجازت طلب کی مگر انہوں نے اجازت دینے سے انکار کر دیا مجھے مجبوراً اجازت لئے بغیر اندر داخل ہونا پڑا اور ایک بوریا اٹھا کر اس پر بیٹھ گیا۔ ام المومنین نے پردہ کے پیچھے سے دیکھا تو کہا کہ اے ابن عباس تم نے آداب شریعت کا کوئی لحاظ نہیں کیا تم بغیر اجازت کے میرے مکان میں

داخل ہوئے اور بغیر اجازت کے اس بوریئے پر بیٹھ گئے۔ ابن عباس نے کہا کہ ہم بہتر سمجھتے ہیں آداب شریعت کو اور آپ نے آداب و احکام شریعت سیکھے ہیں تو ہم سے۔ یہ آپ کا گھر تو ہے نہیں کہ ہمیں آپ سے اجازت لینے کی ضرورت ہو آپ کا گھر وہ ہے جہاں رسول اللہ آپ کو چھوڑ گئے تھے۔ جب آپ اس گھر میں ہوں گی تو ہم آپ کی اجازت کے بغیر داخل نہیں ہوں گے۔ مجھے یہاں بہر صورت آنا تھا تاکہ امیر المومنین کا یہ فرمان آپ کے گوشگزار کر دوں کہ آپ یہاں سے جلد مدینہ روانہ ہو جائیں۔ کہا کہ امیر المومنین تو عمر ابن خطاب تھے کہا ہوں گے مگر میری مراد امیر المومنین سے علی ابن ابی طالب ہیں کہا کہ میں تو انہیں امیر المومنین نہیں مانتی کہا کہ آپ کے ماننے نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے اور آپ نے کب سے یہ منصب سنبھالا ہے کہ آپ امیر المومنین مانیں تو وہ امیر المومنین ہیں ورنہ نہیں ہیں اس پر ام المومنین رونے لگیں اور کہا کہ میں خود اس شہر کو چھوڑ کر جلد جانا چاہتی ہوں۔

فان ابغض البلدان الی بلد انتم فیہ۔ (عقد الفرید ج ۳ ص ۱۰۱)

اس لئے کہ وہ شہر مجھے انتہائی ناپسند ہے جس میں تم لوگوں کی بود و باش ہو"۔

ابن عباس نے کہا کہ یہ حق ناشناسی کی انتہا ہے۔ کیا یہ اس کا صلہ ہے کہ ہم نے آپ کو ام المومنین بنایا اور آپ کے والد بزرگوار صدیق کہلائے۔ کہا کیا تم رسول اللہ کے ذریعہ ہم پر تفوق و احسان جتلانا چاہتے ہو۔ کہا کہ آپ پیغمبر کی نو بیویوں میں سے ایک بیوی ہی تو ہیں مگر اتنی سی بات پر آپ کا ہر حکم مانا جاتا ہے اور آپ کی آواز پر لبیک کہی جاتی ہے اور ہم تو رسول اللہ کا گوشت و پوست ہیں اور انہی کا خون ہماری رگوں میں گردش کر رہا ہے اگر یہ چیز آپ کو حاصل ہوتی تو کیا آپ ہم پر تفوق و برتری نہ جتاتیں اس پر ام المومنین خاموش ہو گئیں اور کوئی جواب بن نہ پڑا۔ ابن عباس نے پلٹ کر یہ تمام گفتگو حضرت کے سامنے دہرائی۔ آپ سن کر خوش ہوئے اور یہ آیت پڑھی:۔

ذریۃ بعضہا من بعض و اللہ سمیع علیم۔

برگزیدہ کیا اللہ نے بعض کی اولاد کو بعض سے اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے"۔

ام المومنین نے جب واپسی کا ارادہ ظاہر کیا تو امیر المومنین نے سواری زاد راہ اور دوسری سہولتیں ان کے لئے مہیا کر دیں اور محمد ابن ابی بکر کو ان کے ہمراہ جانے کا حکم دیا اور انہیں بحفاظت تمام مدینہ روانہ کر دیا۔ یہ واپسی یکم رجب ۳۶ھ روز شنبہ کو ہوئی۔

امیر المومنین نے اس جنگ میں از اوّل تا آخر جس کردار کا مظاہرہ کیا ہے وہ آپ کی امن پسندی صلح جوئی اور بلند نفسی کی زندہ مثال ہے۔ اگرچہ آپ کو خونی فتنہ کے انسداد کے لئے خونریز جنگ لڑنا پڑی مگر آپ نے اس وقت تک نہ خود ہاتھ اٹھایا اور نہ کسی کو اٹھانے دیا جب تک دوسرے فریق نے تیر باراں کر کے جنگ شروع نہ کر دی حالانکہ ان لوگوں نے حضرت کے وارد بصرہ ہونے سے پہلے

آپ کے سینکڑوں دوستوں اور ہمنواؤں کو تہ تیغ کر دیا تھا۔ والئ بصرہ عثمان ابن حنیف پر شبخون مار کر عہد شکنی کی تھی۔ بیت المال اور بیت الرزق پر قبضہ کر لیا تھا اور قتل و غارت گری سے ہر طرف دہشت پھیلا دی تھی۔ ان چیزوں سے اگرچہ جنگ کا جواز پیدا ہو چکا تھا مگر آپ نے یہی کوشش کی کہ جنگ و قتال کی نوبت نہ آئے اور افہام اور تفہیم سے معاملہ طے ہو جائے۔ چنانچہ طلحہ زبیر اور ام المومنین کو سمجھایا بجھایا اور انہیں جنگ کے ہولناک انجام سے ڈرایا اور مسلم مجاشعی کے ہاتھ قرآن بھیج کر انہیں قرآنی احکام پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دی اور جب یہ تمام چیزیں بے اثر اور تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئیں اور آپ کی صلح جویانہ روش کو کمزوری پر محمول کیا جانے لگا اور پیغام صلح کا جواب تیر و سنان کی زبان میں دیا جانے لگا تو آپ نے مجبور ہو کر جنگ کی اجازت دی۔ اور جب جنگ چھڑ ہی گئی تو صفوں کے مقابلہ میں صفیں جما کر اس طرح لڑے کہ ان پر ثابت کر دیا کہ جنگ سے بچنے کی یہ تمام کوششیں کمزوری و بزدلی اور خوف و ہراس کی بنا پر نہ تھیں بلکہ اتحاد و یکجہتی کے برقرار رکھنے اور صلح و آشتی کی فضا پیدا کرنے کے لئے تھیں۔

امیر المومنین نے اپنی فوج کے سپاہیوں کو جن چیزوں پر کاربند رہنے کا حکم دیا تھا کہ جنگ میں پہل نہ کریں کسی زخمی پر ہاتھ نہ اٹھائیں کسی بھاگنے والے کا پیچھا نہ کریں اور چند ایک چیزوں کے علاوہ کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائیں۔ سب نے ایک ایک بات پر عمل کیا۔ چنانچہ جب تک تیروں کی بوچھار سے لاشیں گری نہیں جنگ کے لئے قدم نہیں بڑھایا اور جب میدان میں خون برسنے لگا تو کسی زخمی پر ہاتھ نہیں ڈالا اور جب فوج شکست کھا کر بھاگ کھڑی ہوی تو کسی کا تعاقب نہیں کیا اور نہ اس کے چھوڑے مال و اسباب کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔ دینوری نے تحریر کیا ہے:۔

جعلوا یمرون بالذھب و	وہ میدان جنگ میں سونا چاندی اور دوسرا ساز و
الفضۃ فی معسکرھم والمتاع	سامان دیکھتے مگر کوی ان چیزوں کی طرف نگاہ اٹھا
فلا یعرض لہ احد الا ماکان	کر بھی نہ دیکھتا سوائے فریق مخالف کے ان ہتھیاروں
من السلاح الذی قاتلوا بہ	اور سواریوں کے جنہیں وہ لڑائی کے موقع پر کام
والدواب التی حاربوا علیھا	میں لائے تھے۔"

(اخبار الطوال ص۱۵۱)

دنیا کی جنگوں کا دستور رہے کہ فاتح کامرانی و فتحیابی کے نشہ میں سرشار ہو کر حریف فوج کے افسروں کو بغاوت کے جرم میں گرفتار کر لیتا ہے یا موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے مگر حضرت نے انتقامی جذبات سے بلند تر ہو کر اہل بصرہ میں سے جنہوں نے جنگ میں نمایاں کردار ادا کیا تھا کوی باز پرس نہیں کی عبداللہ ابن زبیر، مروان ابن حکم، ولید ابن عقبہ، عبداللہ ابن عامر ایسے غارت گران امن کو بیک جنبش قلم معاف کر دیا اور ام المومنین کو جنہوں نے آپ کی مخالفت میں کوی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا ان کے شایان شان

حفاظتی انتظامات کے ساتھ مدینہ بھجوا دیا اور مسلمانوں سے جہاد اور کفار سے جہاد کے لطیف فرق کو اس طرح واضح کیا کہ جو لوگ مال غنیمت میں عورتوں کو شامل کرنا چاہتے تھے انہیں بغلیں جھانکنے کے سوا کوئی جواب نہ بن پڑا اور بصرہ کے بیت المال کو مرکز میں منتقل کرنے کے بجائے فوج و سپاہ پر تقسیم کر دیا جس سے ایک طرف یہ تاثر دیا کہ جنگ کا مقصد مال کی جمع آوری اور دولت کی فراہمی نہیں ہے اور دوسری طرف سپاہ کو مالی لحاظ سے مطمئن کر کے پیش آیند جنگوں میں ان کے جوش و ولولہ کو نفسیاتی طور پر مضمحل ہونے سے محفوظ کر دیا۔

ام المومنین جو عامۂ مسلمین کے نزدیک ایک عالمہ اور محدّثہ کا درجہ رکھتی ہیں اس سے بے خبر نہ تھیں کہ خون عثمان کے قصاص کا انہیں کوئی حق نہیں ہے کیونکہ یہ حکومت وقت کا حق ہے یا اولیاء مقتول کا اور حضرت عائشہ نہ مسلمانوں کے اقتدار کی مالک تھیں اور نہ حضرت عثمان کے وارثان بازگشت میں شامل اس کے باوجود وُہ قصاص کے نام پر حکومت وقت سے ٹکرانے کے لئے میدان میں اُتر آتی ہیں اور ایک عظیم جمیعت کو جنگ کے شعلوں میں جھونک دیتی ہیں حالانکہ ازواج رسول اپنے گھروں میں ٹھہرے رہنے کی پابند تھیں جیساکہ قرآن مجید میں ہے:۔

وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاهلیۃ الاولی۔	اپنے گھروں میں ٹک کر بیٹھی رہو اور سابقہ زمانۂ جاہلیت کی طرح بن ٹھن کر نہ نکلو۔"

اس حکم قرآنی کے پیش نظر ام المومنین زینب بنت جحش اور ام المومنین جناب سودہ نے مدینہ سے باہر نکلنا گوارا نہیں کیا اور زندگی بھر اس حکم کی سختی سے پابند رہیں یہاں تک کہ کچھ لوگوں نے جناب سودہ سے کہا کہ آپ حج و عمرہ کے لئے مکہ کیوں نہیں جاتیں کہا کہ میں فریضۂ حج سے سبکدوش ہو چکی ہوں اب تو مجھے اسی گھر میں رہنا ہو گا جس گھر میں مجھے رسُول اللہ بٹھا گئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے پیغمبر کے بعد حجرہ سے قدم باہر نہیں نکالا اور یہ عورتوں کا منصب بھی نہیں ہے کہ وُہ گھر کا گوشہ چھوڑ کر میدان حرب و ضرب میں پھاند پڑیں اور کشت و خون کا بازار گرم کریں۔ چنانچہ حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ:۔

استاذنت النبی فی الجهاد فقال جهادکن الحج۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۰۱)	میں نے پیغمبر اکرم سے جہاد کی اجازت چاہی تو انہوں نے فرمایا کہ تم عورتوں کا جہاد فریضۂ حج کی ادائیگی ہے۔"

اور خود ام المومنین کا قول ہے:۔

المغزل بید المرأۃ احسن من الرمح بید المجاهد فی سبیل اللہ۔ (عقد الفرید ج ۲ ص ۶)	عورت کے ہاتھ میں تکلا اس نیزے سے کہیں بہتر ہے جو راہ خدا میں لڑنے والے مجاہد کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔"

مگر ان تمام چیزوں پر مطلع ہونے کے باوجود وہ ہزاروں کے مجمع کے ساتھ مکہ سے بصرہ میں آئیں اور لشکر کی قیادت کرتے ہوئے میدان میں اتریں حالانکہ وہ دیکھ رہی تھیں کہ اس اقدام کے نتیجہ میں ہزاروں بچے یتیم رہ جائیں گے ہزاروں عورتیں اپنا سہاگ کھو بیٹھیں گی اور مسلمانوں کا خون مسلمانوں کی تلواروں سے پانی کی طرح بہے گا مگر انہوں نے نتائج و عواقب کی پروا کئے بغیر یہ قدم اٹھایا اور مسلمانوں کو مسلمانوں کی تلواروں کے سامنے لا کھڑا کیا۔ بلاشبہ اس اتلاف جان کی زیادہ تر ذمہ داری انہی پر عائد ہوتی ہے اور ان کے دور میں بھی یہی تاثر لیا جاتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ ام اوفی العبدیہ نے جن کے قبیلہ کے سینکڑوں آدمی امیر المومنین کی حمایت میں مارے گئے تھے حضرت عائشہ سے پوچھا کہ اے ام المومنین آپ اس عورت کے بارے میں کیا فرماتی ہیں جس نے اپنے ایک کمسن بچے کو مار ڈالا ہو کہا وہ دوزخ میں جائے گی۔ کہا پھر اس عورت کے بارے میں کیا حکم ہے جس نے اپنے بیس ہزار جوان سال بیٹے ایک ہی جگہ پر قتل کر دیئے ہوں۔ ام المومنین اس کے طنزیہ اشارہ پر بگڑ گئیں اور کہا۔

خذوا بید عدوۃ اللہ۔ (عقد الفرید۔ ج۳۔ ص۱۰۱) "اس خدا کی دشمن کو جانے نہ دینا"۔

ابو عثمان جاحظ نے ایک لطیف پیرایہ میں یہ مطلب یوں ادا کیا ہے:۔

کانھا فی فعلھا ھرۃ ترید ان تاکل اولادھا

"وہ اپنی اس کارگزاری میں اس گربہ مسکین کے مانند تھیں جو اپنے بچوں کو چیر پھاڑ کر کھا جاتی ہے"۔

بہر حال یہ اقدام کوئی قابل فخر کارنامہ نہ تھا اور ان کے خاندان کے افراد تو اسے باعث ننگ و عار سمجھتے تھے۔ چنانچہ ایک موقع پر ام المومنین نے اپنے بھتیجے ابن ابی عتیق سے کسی ضرورت کے لئے خچر طلب کیا اس نے ام المومنین کا پیغام سنا تو قاصد سے کہا کہ ام المومنین سے کہنا:۔

واللہ ما دحضنا عار یوم الجمل افترید ین ان تاتینا بیوم البغلۃ۔ (انساب الاشراف ج۱ ص۴۲۳) "خدا کی قسم ابھی تک تو ہم یوم جمل کا دھبا نہیں دھو سکے کیا اب یوم بغل (خچر) قائم کرنے کا ارادہ ہے"۔

ابن ابی عتیق نے تو طنزاً یہ بات کہی تھی مگر یوم جمل کے بعد یوم بغل بھی دنیا والوں نے دیکھ لیا۔ چنانچہ جب امام حسنؑ کی نعش مبارک کو حجرۂ رسول میں دفن کے ارادہ سے لایا گیا اور مروان ابن حکم اور ان کے ہمراہی ہتھیار باندھ کر دفن سے مانع ہوئے تو اس موقع پر حضرت عائشہ بھی اس گروہ کے ساتھ تھیں۔ چنانچہ ابن ابی الحدید معتزلی نے تحریر کیا ہے:۔

قال ابو الفرج فاما یحیٰی ابن الحسن صاحب کتاب النسب فانه روی ان عائشة رکبت ذلك الیوم بغلا و استنفرت بنی امیة مروان ابن الحکم و من کان هناك منهم و من حشمهم وهو قول القائل:-

"فیوما علی بغل ویوما علی جمل"۔

(شرح ابن ابی الحدید ج۴ ص۱۷)

ابوالفرج کہتے ہیں کہ یحییٰ ابن حسن صاحب کتاب النسب روایت کرتے ہیں کہ اس دن حضرت عائشہ خچر پر سوار ہوئیں اور مروان ابن حکم اور بنی امیہ اور ان کے اہالی موالی کو جو وہاں موجود تھے ابھار رہی تھیں اور اسی کے متعلق کسی نے کہا ہے:-

"گاہے اشتر پر سوار اور گاہے خچر پر سوار"۔

اس سلسلہ میں طلحہ و زبیر کا کردار بھی ام المومنین کے کردار سے کچھ کم نہیں ہے۔ انہوں نے قصاص عثمان کے نام پر بصرہ میں پہنچ کر قتل عام شروع کر دیا اور بے دیکھے بھالے کہ کون مجرم ہے اور کون مجرم نہیں ہے سب کو تلوار کی باڑ پر رکھ لیا حالانکہ انہیں یہ حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ اہل بصرہ کو قصاصاً قتل کریں جبکہ اسے وارثان مقتول کا حق اور خلیفۂ وقت کا فریضہ قرار دیا گیا ہے اور وہ نہ خلیفۂ وقت تھے اور نہ حضرت عثمان کے قرابتدار ہی تھے کہ انہیں بر بنائے قرابت حق قصاص پہنچتا۔ اور پھر حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ بیعت شکنی کو جائز اور اس جارحانہ اقدام کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے حضرت کو اس قتل کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں حالانکہ وہ اس سے بے خبر نہ تھے کہ قتل عثمان کے سلسلہ میں ان کا طرز عمل کیا تھا اور حضرت کا موقف کیا تھا چنانچہ حضرت کا ارشاد ہے:-

واللہ ان طلحة والزبیر وعائشة لیعلمون انی علی الحق وانهم مبطلون۔ (استیعاب ج۲ ص۲۱۴)

خدا کی قسم طلحہ زبیر اور عائشہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں حق پر ہوں اور وہ باطل پر ہیں"۔

اگر وہ واقعاً حضرت کو قتل عثمان میں شریک سمجھتے تھے تو بیعت سے پہلے یہ آواز اٹھاتے مگر نہ قتل عثمان کے موقع پر اور نہ اس سانحۂ قتل اور حضرت کی بیعت کے درمیانی عرصہ میں آپ کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے اور نہ آپ پر قتل یا اعانت قتل کا الزام عائد کیا جاتا ہے محمد ابن سیرین کہتے ہیں:-

ما علمت ان علیا اتهم فی دم عثمان حتی بویع فلما بویع اتهمه الناس۔ (عقد الفرید ج۳ ص۹۳)

مجھے نہیں معلوم کہ کسی نے حضرت علی پر قتل عثمان کی تہمت لگائی ہو یہاں تک کہ ان کی بیعت ہوئی اور جب بیعت ہو چکی تو لوگوں نے انہیں متہم کرنا شروع کر دیا"۔

ان متہم کرنے والوں کے سرغنہ یہی دونوں طلحہ وزبیر تھے اور ان کی زبانیں بھی اس وقت کھلتی ہیں جب ان کے مفادات پر ضرب لگتی ہے اور امیر المومنین انہیں کوفہ و بصرہ کی امارت دینے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اگر اس قصاص طلبی میں ہمدردی و خیر خواہی کا جذبہ کارفرما تھا تو ان کی ہمدردیوں کو قتل کے موقع پر ظاہر ہونا چاہئے تھا اور حضرت کی بیعت کے بجائے ان سے قصاص کا مطالبہ کرنا چاہئے تھا۔ مگر وہ اُس وقت تک خاموش رہتے ہیں جب تک انہیں امارت کی توقع رہتی ہے اور جب ادھر سے مایوسی ہو جاتی ہے تو آپ پر خون کا الزام عائد کر کے قصاص کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں تاکہ اس قصاص کی آڑ میں اپنے اقتدار کی راہ ہموار کریں۔ واقعات کی روشنی میں یہ بات بلا تردید کہی جا سکتی ہے کہ اس شورش و ہنگامہ آرائی کا مقصد صرف حصول اقتدار تھا۔ چنانچہ انہوں نے بیعت توڑ کر دوسروں کو بیعت شکنی پر اُبھارا اور حکیم ابن جبلہ سے واشگاف لفظوں میں کہا گیا کہ جب تک عثمان ابن حنیف حضرت کی بیعت نہیں توڑیں گے انہیں رہا نہیں کیا جائے گا اور خود حضرت کے سامنے بھی اس کا اظہار کیا کہ وہ انہیں خلافت کا اہل نہیں سمجھتے۔ اور سعید ابن عاص کے دریافت کرنے پر صاف صاف کہہ دیا کہ ہم عثمان کے لڑکوں کو خلیفہ نہیں بنائیں گے بلکہ ہم دونوں میں سے جسے لوگ منتخب کریں گے وہی خلیفہ ہوگا۔ اسی اقتدار کی خاطر انہوں نے حضرت عثمان کے قتل کا سروسامان کیا اور ان کے قتل کے بعد جب امیر المومنین بر سر اقتدار آئے تو قصاص کی آڑ میں ام المومنین کی عملی تائید کے سہارے مقابلہ پر اُتر آئے۔

غرض ام المومنین ہوں یا طلحہ و زبیر ان کے اس اقدام کا نہ کوئی اخلاقی جواز ہے اور نہ شرعی۔ ان کی شخصیتیں کتنی ہی اہم سہی مگر جرم بہر حال جرم ہوتا ہے خواہ اس کا مرتکب کوئی ہو بلکہ شخصیت کی نمود جرم کو اور سنگین بنا دیا کرتی ہے۔ انہوں نے ایک ایسا خونریز اقدام کیا جس سے نہ انکار کی کوئی گنجائش ہے اور نہ کشت و خون کی ذمہ داری سے انہیں بری ثابت کیا جا سکتا ہے البتہ ایک طبقہ نے صحابیت کے تحفظ کے لئے مختلف حیلے بہانوں سے اس جرم کی سنگینی کو ہلکا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کے جواز کے لئے خطائے اجتہادی کا سہارا ڈھونڈ نکالا ہے۔ یہ خطائے اجتہادی کی کارفرمائی صرف اسی مورد کے لئے نہیں ہے بلکہ یہ ایک عام حربہ ہے کہ جہاں کوئی جواب بن نہیں پڑتا وہاں اس کی آڑ لے لی جاتی ہے اور غلط سے غلط اقدام کے لئے جواز کا پہلو پیدا کر لیا جاتا ہے تاکہ وابستگان دامن کی عقیدتوں کو محفوظ رکھا جا سکے۔ اسے لاکھ خطائے اجتہادی سے تعبیر کیا جائے مگر ارباب فکر و نظر کو یہ ذہنی خلش ضرور محسوس ہوگی کہ اگر یہ خطائے اجتہادی ہے تو خطائے منکر اور خطائے غیر اجتہادی کس چیز کا نام ہے۔

اگر اس عظیم کشت و خون کو خطائے اجتہادی کے دامن میں پناہ مل سکتی ہے تو اس خطائے اجتہادی کے مرتکبین پر نقد و تبصرہ کیوں جائز نہیں ہے اور اگر ان کے خلاف رائے قائم کی جائے تو اسے خطائے اجتہادی پر محمول کر کے نظر انداز کرنے میں کیا مانع ہے۔ اور پھر یہ کہ یہ اجتہاد کون سے شرعی اصول و قواعد کے ماتحت

تھا اور کن دلائل سے ایک خون کے بدلے میں ہزار ہا بے گناہوں کا خون بہانا جائز ہوگیا تھا۔ کیا قرآن مجید کا کوئی حکم تھا یا پیغمبر اکرم کی کوئی حدیث تھی یا اہل حل وعقد کا اجماع تھا یا کسی مناط شرعی پر مبنی قیاس تھا اور یہی چاروں چیزیں مدعیان خطائے اجتہادی کے نزدیک اجتہاد کا ماخذ سمجھی جاتی ہیں اور جب ان میں سے کوئی چیز ثابت نہیں کی جاسکتی تو اجتہاد ہی کہاں رہا کہ اسے خطا پر محمول کرکے ان کے موقف کی صفائی پیش کی جاسکے۔

اس سلسلہ میں کچھ لوگوں نے یہ بات بنائی کہ امیر المومنین کے لشکر میں سے ان لوگوں کو جو قتل عثمان میں پیش پیش تھے فریقین میں صلح کے آثار نظر آئے تو انہوں نے صلح کو اپنے مقصد و مفاد کے خلاف سمجھتے ہوئے ابن سبا کی انگیخت پر منہ اندھیرے ام المومنین کے لشکر پر دھاوا بول دیا اور اصحاب جمل کا روپ دھا کر حضرت کے لشکر پر حملہ آور ہوئے اور ہر فریق اپنے مقام پر یہ سمجھا کہ دوسرے فریق نے جنگ کا آغاز کر دیا ہے اور اس طرح فریقین میں غلط فہمی کی بنا پر جنگ چھڑ گئی لہذا جنگ میں پہل کرنے کی ذمہ داری فریقین میں سے کسی فریق پر عائد نہیں ہوتی اگر کسی پر عائد ہوتی ہے تو اس سازشی گروہ پر جس کا سرغنہ ابن سبا تھا اور جو دونوں فریق کو جنگ میں الجھا کر اپنا تحفظ اور مفاد حاصل کرنا چاہتا تھا۔

یہ واقعہ ایک خود ساختہ افسانہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا اور روایت و درایت دونوں اعتبار سے مقدوح اور ناقابل اعتماد ہے۔ اس واقعہ کو پہلے پہل ابن جریر طبری نے اپنی مشہور تاریخ میں درج کیا اور طبری سے قبل نہ کسی مورخ نے اسے بیان کیا اور نہ اس کی طرف کوئی اشارہ کیا۔ البتہ بعد کے مورخین نے طبری کے حوالہ سے اس روایت کو خوب خوب اچھالا ہے اور ام المومنین اور طلحہ و زبیر کی تمام سرگرمیوں سے چشم پوشی کرکے اس جنگ کی تمام تر ذمہ داری ایسی مجہول شخصیت ابن سبا اور اس کے ساتھیوں پر ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ طبری نے اسے سیف ابن عمر تمیمی متوفی ۱۷۰ھ کے واسطہ سے روایت کیا ہے اور سیف ابن عمر تمام علمائے رجال کے نزدیک مفتری و کذاب اور پایۂ اعتبار سے ساقط ہے۔ چنانچہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں تحریر کیا ہے کہ یحییٰ کہتے ہیں فلس خیر منه (ایک کوڑی بھی اس سے بہتر ہے) ابو داؤد کہتے ہیں لیس بشئی (کوئی چیز ہی نہیں) ابو حاتم کہتے ہیں متروک (ناقابل روایت ہے) ابن حبان کہتے ہیں اتهم بالزندقه (بے دینی و الحاد سے متہم ہے) اور کسی ایک فرد نے بھی اس کی توثیق نہیں کی اور نہ اسے قابل روایت سمجھا ہے۔ لہذا ایک ایسے شخص کی روایت پر جو بالاتفاق ساقط عن الاعتبار ہو اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ اس روایت میں اگر کچھ بھی واقعیت ہوتی تو طبری سے پہلے کا کوئی مورخ اس کا ذکر کرتا۔ بلاذری صاحب انساب الاشراف ابن سعد صاحب طبقات اور طبری کے معاصر ابن اعثم صاحب تاریخ اس کا تذکرہ کرتے اور سیف ابن عمر کے سلسلہ کے علاوہ کسی اور واسطہ سے بھی اسے نقل کیا جاتا۔ بلکہ واقعہ کی نوعیت کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس کا عمومی چرچا ہوتا اور مختلف طبقوں میں عام طور پر

اس کا ذکر آتا۔ مگر اس کا ذکر آتا ہے تو اس شخص کے سلسلۂ روایت میں جس کی کذب بیانی مسلمہ حیثیت رکھتی ہے۔ کیا ایسی روایت پر آنکھ بند کر کے اعتماد کر لینا حقائق سے عمداً چشم پوشی کے مترادف نہیں ہے ؟

اب اس روایت کو درایۃً دیکھئے اور پرکھئے کہ کہاں تک صحیح تسلیم کئے جانے کے قابل ہے۔ جس شخص کے بھی سامنے واقعات جمل کے اسباب و علل اور اصحاب جمل کے عزائم و مقاصد ہیں وہ اس سے انکار نہ کر سکے گا کہ یہ روایت واقعات میں ایک غیر متعلقہ اضافہ اور حقائق کے دامن میں ایک بے جوڑ پیوند ہے جس کا مقصد اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے کہ اس جنگ کو غلط فہمی کا نتیجہ قرار دے کر اصحاب جمل کو معذور اور حق بجانب ثابت کیا جائے۔ کہنے کو تو یہ کہہ دیا گیا کہ یہ جنگ غلط فہمی کا نتیجہ تھی مگر تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ باقاعدہ جنگ کے چھڑنے سے پہلے حضرت علی اور فریق ثانی کے نمائندوں میں گفت و شنید اور افہام و تفہیم کا سلسلہ جاری رہا اور حضرت نے طلحہ و زبیر سے رُودر رُو گفتگو کی اور انہیں جنگی عزائم سے باز رہنے کی تلقین فرمائی۔ کیا وہ اس موقع پر یہ نہ کہہ سکتے تھے کہ ہم تو صلح پر آمادہ تھے آپ ہی کے لشکر نے ہم پر اچانک حملہ کیا اور جنگ چھیڑ دی مگر وہ اس کی طرف ادنیٰ اشارہ بھی نہیں کرتے حالانکہ اس موقع پر زبان بند رکھنے کے کوی معنی ہی نہ تھے۔ یا جنگ سے پہلے جب حضرت نے مسلم مجاشعی کو قرآن دے کر بھیجا تھا کہ وہ انہیں قرآن کے تعلیمات یاد دلائیں تو انہیں یہ کہنا چاہیئے تھا کہ اب علی نے قرآن کو بیچ میں لا کر معاملہ کو نمٹانا چاہا ہے اور مصالحت کی پیشکش کی ہے حالانکہ انہی کے لشکر نے اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر شبخون مارا ہے اور جنگ و قتال کا آغاز کیا ہے۔ مگر اس موقع پر بھی ان کی زبان سے اس قسم کی کوی بات نہیں نکلتی۔ اسی طرح ام المومنین اس کی طرف کبھی تو اشارہ کرتیں کہ ایسا غلط فہمی کی بنا پر ہوا ہے حالانکہ جنگ کے بعد جب ان سے اس اقدام کے بارے میں پوچھا جاتا تھا تو وہ خاموشی کے بجائے اس چیز کو اپنے موقف کے حق بجانب ہونے کے ثبوت میں پیش کر کے پوچھنے والوں کو ایک حد تک مطمئن کر سکتی تھیں۔ اور پھر اس مفروضہ شبخون سے پہلے جو کشت و خون کیا گیا تھا اور سینکڑوں آدمیوں کو تہ تیغ کر دیا گیا تھا وہ کس غلط فہمی کی بنا پر اور کس کی انگیخت پر ہوا تھا تو جو لوگ یوں بے گناہوں کو قتل و غارت کر سکتے ہیں انہیں جنگ لڑنے میں کیا باک تھا کہ یہ کہا جائے کہ فریقین غلط فہمی کا شکار ہو گئے تھے۔

اس سلسلہ میں جس مجہول شخصیت ابن سبا کو شبخون کا محرک قرار دیا جاتا ہے وہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری جورج جرداق اور دوسرے محققین کے نزدیک کوی تاریخی وجود ہی نہیں رکھتا اور نہ جس شخصیت کا نام قتل عثمان اور جنگ جمل میں ایک مرکزی کردار کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے اس کا نام صفین تحکیم اور جنگ نہروان کے موقع پر بھی سنائی دیتا اور ان موقعوں پر اس کا کوی کارنامہ نہ بھی ہوتا جب بھی اس کا نام تو کہیں نہ کہیں آتا مگر جنگ جمل کے بعد وہ صفحات تاریخ سے اس طرح ناپید ہو جاتا ہے کہ نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہوا اور نہ یہ پتا چلتا ہے کہ شبخون مارنے کے بعد کہاں غائب ہوا اور

کہاں مرکھپ گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ افسانوی شخصیت ہنگامہ آراؤں کی خونچکاں حرکتوں کا جواز پیدا کرنے کے لئے وقتی طور پر گڑھی گئی اور جب اس کی ضرورت نہ رہی تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفن کر دی گئی۔

جنگ جمل وسط جمادی الثانیہ ۳۶ھ (نومبر ۶۵۶ء) میں واقع ہوئی۔ مقتولین کی تعداد کے بارے میں مختلف روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ ام المومنین کے تیس ہزار کے لشکر میں سے دس ہزار یا سترہ ہزار یا بیس ہزار مارے گئے اور حضرت علی کے بیس ہزار کے لشکر میں سے پانچ ہزار یا ایک ہزار ستر شہید ہوئے اور یہ معارکہ ایک گروہ کی شکست اور دوسرے گروہ کی فتح پر ختم ہو گیا۔ اگرچہ یہ جنگ ایک وقتی حیثیت رکھتی ہے مگر اس کے نتیجہ میں ہمیشہ کے لئے دلوں میں گرہ پڑ گئی۔ اُمّت مختلف گروہوں میں بٹ گئی اور مسلمانوں میں پیہم خونریزیوں کا دروازہ کھل گیا۔ چنانچہ جنگ جمل کے بعد شام سے جنگ کے شعلے بھڑکے اور مسلمانوں کی تلواریں مسلمانوں کے سروں پر بے دریغ چلیں۔ اگر ام المومنین اور طلحہ و زبیر میدان جنگ میں نہ اُترتے تو معاویہ کو حضرت علی کے مقابلہ میں کبھی فوجکشی کی جرأت نہ ہوتی۔ مگر ان لوگوں کے صف آرا ہونے سے نہ صرف ان کی ہمت بندھی بلکہ انہیں اتنا موقع مل گیا کہ وہ جنگ کے لئے لشکر کی فراہمی اور سامان حرب و ضرب کی تکمیل کر سکیں اور حضرت سے برسر پیکار ہونے کا جواز تو انہیں جنگ جمل سے مل ہی چکا تھا اس طرح کہ اگر ام المومنین قبیلۂ بنی تیم سے ہوتے ہوئے انتقام خون عثمان کے لئے کھڑی ہو سکتی ہیں تو وہ کیوں کھڑے نہیں ہو سکتے جبکہ وہ حضرت عثمان کے ہم قبیلہ اور عزیز بھی تھے۔ یہ ایک ایسا مضبوط سیاسی حیلہ تھا جسے معاویہ نے جنگ کے جواز میں پیش کیا اور طلحہ و زبیر ایسی اہم شخصیتوں کے اقدام سے اپنے باغیانہ اقدام کے حق بجانب ہونے پر ثبوت مہیّا کر سکے چنانچہ انہوں نے قصاص عثمان ہی کے نام پر لوگوں کو بھڑکا کر جنگ صفین برپا کی اور پہلے اپنے علاقائی اقتدار کا تحفظ کیا اور پھر خلافت پر قابض ہو کر خلیفۃ المسلمین بن گئے پھر اس جنگ صفین کے نتیجہ میں خوارج کی جماعت ابھری جس نے امیر المومنین سے جنگ لڑنے کے بعد مدتوں تک اسلامی شہروں میں کشت و خون اور تاخت و تاراج کا بازار گرم رکھا اور ایسے ایسے خونی کھیل کھیلے کہ ریگستان عرب کے ذرات تک خون میں ڈوب گئے۔ غرض جنگ جمل سے جنگ صفین نے اور جنگ صفین سے جنگ نہروان نے جنم لیا اور ان جنگوں کے نتیجہ میں اسلام میں ایسے رخنے پڑے جو آج تک پُر نہ ہو سکے اور نہ آئندہ ان کے پُر ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے

پائے تخت کی تبدیلی

عہد ثانی میں جب حدود ایران پر فوجکشی کے نتیجہ میں ایرانی علاقے اسلامی مقبوضات میں داخل ہوئے تو مسلمانوں نے اپنی بود و باش کے لئے عراق میں دو نئے شہروں کی بنیاد ڈالی ایک بصرہ اور دوسرا کوفہ۔ بصرہ سمندر کے ساحل پر واقع ہے اور یہ نام بس راہ کی معرب صورت ہے جو راستوں کی

اس کا ذکر آتا۔ مگر اس کا ذکر آتا ہے تو اس شخص کے سلسلۂ روایت میں جس کی کذب بیانی مسلمہ حیثیت رکھتی ہے۔ کیا ایسی روایت پر آنکھ بند کر کے اعتماد کر لینا حقائق سے عمداً چشم پوشی کے مترادف نہیں ہے ؟

اب اس روایت کو درایۃً دیکھئے اور پرکھئے کہ کہاں تک صحیح تسلیم کئے جانے کے قابل ہے۔ جس شخص کے بھی سامنے واقعات جمل کے اسباب و علل اور اصحاب جمل کے عزائم و مقاصد ہیں وہ اس سے انکار نہ کر سکے گا کہ یہ روایت واقعات میں ایک غیر متعلقہ اضافہ اور حقائق کے دامن میں ایک بے جوڑ پیوند ہے جس کا مقصد اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے کہ اس جنگ کو غلط فہمی کا نتیجہ قرار دے کر اصحاب جمل کو معذور اور حق بجانب ثابت کیا جائے۔ کہنے کو تو یہ کہہ دیا گیا کہ یہ جنگ غلط فہمی کا نتیجہ تھی مگر تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ باقاعدہ جنگ کے چھڑنے سے پہلے حضرت علی اور فریق ثانی کے نمائندوں میں گفت و شنید اور افہام و تفہیم کا سلسلہ جاری رہا اور حضرت نے طلحہ و زبیر سے رُو در رُو گفتگو کی اور انہیں جنگی عزائم سے باز رہنے کی تلقین فرمائی۔ کیا وہ اس موقع پر یہ نہ کہہ سکتے تھے کہ ہم تو صلح پر آمادہ تھے آپ ہی کے لشکر نے ہم پر اچانک حملہ کیا اور جنگ چھیڑ دی مگر وہ اس کی طرف ادنیٰ اشارہ بھی نہیں کرتے حالانکہ اس موقع پر زبان بند رکھنے کے کوئی معنی ہی نہ تھے۔ یا جنگ سے پہلے جب حضرت نے مسلم مجاشعی کو قرآن دے کر بھیجا تھا کہ وہ انہیں قرآن کے تعلیمات یاد دلائیں تو انہیں یہ کہنا چاہیئے تھا کہ اب علی نے قرآن کو بیچ میں لا کر معاملہ کو نمٹانا چاہا ہے اور مصالحت کی پیشکش کی ہے حالانکہ انہی کے لشکر نے اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر شبخون مارا ہے اور جنگ و قتال کا آغاز کیا ہے۔ مگر اس موقع پر بھی ان کی زبان سے اس قسم کی کوئی بات نہیں نکلتی۔ اسی طرح ام المومنین اس کی طرف کبھی تو اشارہ کرتیں کہ ایسا غلط فہمی کی بنا پر ہوا، حالانکہ جنگ کے بعد جب ان سے اس اقدام کے بارے میں پوچھا جاتا تھا تو وہ خاموشی کے بجائے اس چیز کو اپنے موقف کے حق بجانب ہونے کے ثبوت میں پیش کر کے پوچھنے والوں کو ایک حد تک مطمئن کر سکتی تھیں۔ اور پھر اس مفروضہ شبخون سے پہلے جو کشت و خون کیا گیا تھا اور سینکڑوں آدمیوں کو تہ تیغ کر دیا گیا تھا وہ کس غلط فہمی کی بنا پر اور کس کی انگیخت پر ہوا تھا تو جو لوگ یوں بے گناہوں کو قتل و غارت کر سکتے ہیں انہیں جنگ لڑنے میں کیا باک تھا کہ یہ کہا جائے کہ فریقین غلط فہمی کا شکار ہو گئے تھے۔

اس سلسلہ میں جس مجہول شخصیت ابن سبا کو شبخون کا محرک قرار دیا جاتا ہے وہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری جورج جرداق اور دوسرے محققین کے نزدیک کوئی تاریخی وجود ہی نہیں رکھتا اور نہ جس شخصیت کا نام قتل عثمان اور جنگ جمل میں ایک مرکزی کردار کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے اس کا نام صفین تحکیم اور جنگ نہروان کے موقع پر بھی سنائی دیتا اور ان موقعوں پر اس کا کوئی کارنامہ نہ بھی ہوتا جب بھی اس کا نام تو کہیں نہ کہیں آتا مگر جنگ جمل کے بعد وہ صفحات تاریخ سے اس طرح ناپید ہو جاتا ہے کہ نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہوا اور نہ یہ پتا چلتا ہے کہ شبخون مارنے کے بعد کہاں غائب ہوا اور

کثرت کی بنا پر تجویز ہوا یا اس لئے کہ بصرہ کے معنی نرم و سفید پتھر کے ہیں اور یہاں اس قسم کے پتھروں کی بہتات تھی اور کوفہ حیرہ سے تین ۳ میل کے فاصلہ پر واقع ہے جہاں ۱۷ھ میں سعد ابن ابی وقاص نے مدائن سے نقل مکانی کر کے گھاس پھونس اور سینٹھوں کے چھپر ڈال کر ایک لاکھ آدمی آباد کئے تھے اس عظیم اجتماع کی بنا پر اس کا نام کوفہ یا کوفان قرار پایا۔ کیونکہ کوفہ تکوف سے ماخوذ ہے جس کے معنی اجتماع کے ہیں یا اس وجہ سے کہ وہاں کی زمین ریتیلی تھی جس میں سنگریزے بکھرے پڑے تھے۔ اور کوفہ یا کوفان اس سرزمین کو کہتے ہیں جس میں ریت مٹی کے علاوہ پتھر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہوں۔ کوفہ دریائے فرات کے قرب معتدل آب و ہوا باغات و نخلستان اور شادابی و زرعی پیداوار کی وجہ سے ریگستان حجاز کے باشندوں کے لئے اپنے اندر بڑی کشش رکھتا تھا۔ انہوں نے آتش زدگی کے ایک حادثہ کے بعد اینٹ پتھر کے پختہ مکانات تعمیر کر کے یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی اور جب امیر المومنین کے دورِ خلافت میں اسلامی ریاست کا دارالحکومت قرار پایا تو اس کی اہمیت بہت بڑھ گئی اور علماء رجال اسلام کے جمع ہو جانے سے علمی دینی اور سیاسی اعتبار سے عالم اسلام کا مرکز بن گیا۔

جنگ جمل میں اہل بصرہ نے اصحاب جمل کا اور اہل کوفہ نے حضرت کا ساتھ دیا تھا۔ آپ نے خاتمۂ جنگ پر عبد اللہ ابن عباس کو بصرہ کا حاکم اور زیاد کو خراج و بیت المال کا ناظم مقرر کر کے اہل کوفہ کی دلجوئی کے لئے کوفہ کا قصد فرمایا۔ جب بصرہ کے حدود سے نکل کر مربد میں جہاں حضرت عائشہ کے لشکر نے وارد بصرہ ہونے کے بعد پڑاؤ ڈالا تھا آئے تو بصرہ کی طرف رخ کر کے فرمایا:۔

الحمد للہ الذی اخرجنی من	تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے مجھے
شر البقاع واسرعها خرابا و	اس بدترین کرۂ زمین سے باہر کیا جو تیزی سے
اقربها من الماء وابعدها	تباہی کی طرف بڑھنے والا (سمندر کے) پانی سے
من السماء (اخبار الطوال ص۱۵۲)	قریب اور آسمان (کی برکتوں) سے دور ہے۔"

جب ۱۲ رجب ۳۶ھ کو کوفہ کے حدود میں داخل ہوئے تو وہاں کے اعیان و اشراف جنہیں فتح و کامیابی کی اطلاع پہنچ چکی تھی استقبال کے لئے شہر سے باہر نکل آئے اور حضرت کے ہمرکاب شہر میں داخل ہوئے اور عرض کیا کہ آپ دار الامارہ میں قیام فرمائیں مگر حضرت نے دار الامارہ میں قیام پسند نہ کیا اور سیدھے مسجد میں تشریف لائے اور دو رکعت نماز ادا کرنے کے بعد خطبہ دیا اور اہل کوفہ کی ہمدردی و تعاون پر تحسین آمیز کلمات کہے پھر محلہ رحبہ میں تشریف لائے اور ایک متوسط درجہ کے مکان میں قیام فرما ہوئے اور وقتی طور پر مدینہ کے بجائے کوفہ کو دارالحکومت قرار دینے کا فیصلہ کیا۔

یہ تبدیلی حسب ذیل وجوہ کی بنا پر عمل میں لائی گئی:۔

(۱) کوفہ اسلامی مملکت کے وسط میں واقع تھا جہاں سے چاروں طرف کے علاقوں کی نگرانی ہو سکتی تھی

فارس کی سرحد قریب تھی۔ بری و بحری سفر کی سہولتیں حاصل تھیں۔ رسل و رسائل اور آمد و رفت میں ہر طرح سے آسانی تھی مختلف شہروں کے باشندوں کی گزرگاہ ہونے کی وجہ سے مختلف مقامات کے حالات بآسانی معلوم ہو سکتے تھے اور مرکزی حکومت کے احکام بسہولت دوسری جگہوں پر پہنچائے اور دشمن کے حملہ آور ہونے کی صورت میں دفاعی اقدامات عمل میں لائے جا سکتے تھے۔ چنانچہ جب شامی فوجوں نے آپ کے مقبوضہ علاقوں پر یلغار شروع کی تو جتنا کوفہ سے اس کا تدارک ہو تا رہا مدینہ میں رہتے ہوئے اس سے بہتر طریق پر ممکن نہ تھا۔

(۲) امیر المومنین کو مسند خلافت پر بیٹھے اگرچہ سات ماہ ہو چکے تھے مگر معاویہ نے ابھی تک نہ آپ کی خلافت کو تسلیم کیا تھا اور نہ بیعت پر آمادگی کا اظہار کیا تھا۔ اس صورت میں ان کی ریشہ دوانیوں اور رخنہ اندازیوں سے مطمئن نہ رہا جا سکتا تھا بلکہ یہ خطرہ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ اپنے منصب کی بحالی کے لئے جنگی اقدامات اور کشت و خون سے بھی دریغ نہیں کریں گے لہذا ایک ایسی جگہ کا انتخاب ضروری تھا جہاں سے فوجی نقل و حرکت میں آسانی ہو اور بروقت مدافعانہ قدم اٹھایا جا سکے اس اعتبار سے کوفہ موزوں تر مقام تھا کیونکہ کوفہ معاویہ کے پایۂ تخت دمشق سے قریب تھا اور فوجوں کی نقل و حرکت میں کوئی دشواری نہ تھی۔ اس کے برعکس مدینہ دمشق سے کافی فاصلہ پر واقع تھا جہاں سے نہ فوجوں کی نقل و حرکت آسان تھی اور نہ بروقت رسد اور فوجی امداد مہیا ہو سکتی تھی۔

(۳) جنگ جمل سے بخوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ جتنی عسکری امداد کوفہ سے حاصل ہو سکتی ہے اتنی کمک کی توقع مدینہ سے نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ والیٔ کوفہ ابو موسیٰ کی انتہائی مخالفت کے باوجود کوفہ کی بڑی اکثریت نے حضرت کے ساتھ تعاون کیا تھا اور آپ کے پیغام پر بارہ ہزار شمشیر زن اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور مدینہ سے بمشکل ایک ہزار افراد نے جنگ میں حصہ لیا ہو گا اس صورت میں دور اندیشی کا تقاضا یہی تھا کہ کوفہ کو مستقر قرار دیا جائے تاکہ بروقت اہل کوفہ سے دشمن کے مقابلہ میں مدد حاصل کی جا سکے۔

(۴) کوفہ ایک چھاؤنی اور فوجی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا جہاں جنگجو لوگ آباد کئے گئے تھے اور ان کی اولاد بھی طبعاً جنگ و قتال کی طرف مائل اور فوجی خو بو رکھتی تھی۔ اور مدینہ کے اکثر لوگ دولت کی فراوانی کے نتیجہ میں آرام طلب و عافیت کوش ہو چکے تھے۔ چنانچہ جب حضرت نے کوفہ کو دار السلطنت قرار دیا تو اس کے خلاف اہل مدینہ نے کوئی آواز بلند نہیں کی بلکہ اس پر احتجاج کرنے کے بجائے ایک گونہ سکون محسوس کیا کہ اب وہ گھر کا پرامن ماحول چھوڑ کر میدان جنگ کی کڑیاں جھیلنے کے لئے مجبور نہیں کئے جائیں گے ان حالات میں جبکہ جنگ کے امکانات قریب سے قریب تر ہوتے جا رہے تھے ایسے لوگوں کو نظر انداز کر کے جو حرب و ضرب کے عادی اور معرکہ آرائی کے خوگر ہوں عافیت پسند لوگوں پر سہارا نہیں کیا جا سکتا تھا۔

(۵) امیر المومنین دیکھ چکے تھے کہ پیغمبر اکرم کی رحلت کے بعد گنے چنے افراد کے علاوہ اہل مدینہ نے آپ کے حق کی فوقیت کا اعتراف تو درکنار ایک طرح سے بے گانگی و سرد مہری کا برتاؤ کیا تھا اور پچیس[۲۵]

سال کے طویل عرصہ کے بعد جب حالات سُدھرتے نظر نہ آئے تو آپ کو خلافت کے قبول کرنے پر مجبور کیا اور بیعت کر لی مگر زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ ان میں کا ایک گروہ بیعت توڑ کر جنگ و قتال پر اُتر آیا اور جو لوگ بیعت پر قائم رہتے ہوئے اس گروہ میں شامل نہ ہوئے انہوں نے بھی بے حسی اور جذبات کی کمزوری ہی کا مظاہرہ کیا۔ چنانچہ قریش تعاون میں سرگرم عمل نظر نہیں آتے۔ بنی امیہ کے اکثر افراد معاویہ کے پاس شام چلے گئے اور وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ بنی تیم طلحہ کو برسر اقتدار لانے کے خواہشمند تھے بنی عدی عبداللہ ابن عمر کے ہوا خواہ تھے جس نے حضرت کی بیعت سے علیحدگی اختیار کر لی تھی اسی طرح مختلف اشخاص مختلف وجوہ کی بنا پر تعاون سے گریز کرتے رہے۔ اس ماحول میں کیونکر یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ وُہ آڑے وقت پر کام آئیں گے اور معاویہ سے جنگ چھڑنے کی صورت میں تعاون کریں گے۔

(۶) مدینہ اپنی حرمت و تقدیس کی وجہ سے اس حد تک خطرات میں گھرا ہوا نہ تھا جس حد تک عراق خطرات سے دوچار تھا۔ معاویہ کی نظریں عراق پر جمی ہوئی تھیں اور وُہ اسے ہر قیمت پر حاصل کرنے کی فکر میں تھے لہٰذا اس وقت تک عراق میں ٹھہرنا اور اسے مرکز قرار دے کر وہاں قیام کرنا ضروری تھا جب تک پیش آمدہ خطرات ٹل نہ جاتے اور مملکت کی فضا پُرسکون نہ ہو جاتی۔ مگر نہ وُہ خطرات ٹل سکے اور نہ شامیوں کی تاخت و تاراج کا سلسلہ ختم ہوا۔ ہر روز نت نئے فتنے اُٹھتے رہے اور اُن فتنوں کو فرو کرنے کے لئے آپ کو زندگی کے بقیہ ایام کوفہ ہی میں گزارنے پڑے۔

عمال مملکت کا تقرر

جب امیرالمومنین جنگ جمل سے فارغ ہو کر کوفہ میں فروکش ہوئے تو ملکی نظم و انضباط کے لئے عمال کے تقرر کی ضرورت محسوس کی اگرچہ جنگ جمل سے پہلے چند ایک علاقوں پر عمال مقرر کئے جا چکے تھے مگر بیشتر مقامات پر جنگی مصروفیات کی بنا پر عمال کے متعین کئے جانے کی نوبت نہ آئی تھی۔ چنانچہ حضرت نے اپنی قلمرو مملکت میں جس میں حجاز، مصر، عراق، یمن، ایران، آذربائیجان وغیرہ شامل تھے اپنی صوابدید سے ولاۃ و حکام متعین فرمائے اور ان میں پیش آئند حالات کی بنا پر وقتاً فوقتاً ردّ و بدل ہوتا رہا اور ایسا ہونا رعایا و مملکت کے حالات پر نظر رکھنے کا نتیجہ ہے۔ ان عمال میں سے چند نمایاں شخصیات کے مختصر سوانح حیات درج کئے جاتے ہیں ان سوانح کے ذیل میں ان جگہوں کا بھی تذکرہ ہو جائے گا جہاں جہاں وُہ مقرر کئے گئے۔

قیس ابن سعد۔ پیغمبر اکرم کے بلند مرتبہ صحابی اور رئیس خزرج سعد ابن عبادہ کے فرزند تھے۔ علم و عمل کی بلندیوں پر فائز ہونے کے ساتھ قد آور، وجیہہ صورت، چوڑے چکلے اور بڑے کلے جبڑے کے تھے۔ سخاوت و شجاعت اور خطابت ان کا خاص جوہر تھا اور دُور اندیشی و معاملہ فہمی میں یکتائے روزگار تھے۔ اس دَور میں پانچ آدمی سیاسی جوڑ توڑ میں ماہر اور چالاکی و ہوشیاری میں طاق سمجھے جاتے تھے۔ معاویہ ابن ابوسفیان، عمرو

ابن عاص، مغیرہ ابن شعبہ، عبداللہ ابن بدیل اور قیس ابن سعد ان میں سے عبداللہ ابن بدیل اور قیس ابن سعد امیرالمومنین کے طرفدار تھے۔ قیس اگرچہ سیاسی حربوں کو دوسروں سے بہتر سمجھتے تھے مگر دینی تقاضوں کو نظر انداز کر کے مکروفریب کی سیاست اختیار نہ کرتے تھے۔ چنانچہ ان کا قول ہے:۔

لولا الاسلام لمکرت مکرا لا تطیقه العرب۔ (اصابہ ج۳۔ ص۲۳۹) "اگر اسلام مانع نہ ہوتا تو میں ایسی چال چلتا جس کا توڑ عرب کے بس کی بات نہ ہوتا"

دس برس تک پیغمبر اکرم کی خدمت میں رہے انہی سے اسلام کے حقائق و معارف سیکھے۔ عہد نبوی کے تمام غزوات میں شریک ہو کر کارنمایاں انجام دیئے۔ بعض غزوات میں حامل لوائے پیغمبر رہے اور صدقات کی وصولی پر بھی مامور کئے گئے۔ جود و سخا ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ جیش عسرہ میں قرض کا بار اٹھا کر اور اپنی سواری کے اونٹوں کو ذبح کر کے لشکر کے کھانے پینے کا انتظام کرتے رہے۔ جب لشکر نے پلٹ کر پیغمبر اکرم سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا:۔

الجود من شیمة اهل ذلك البیت "سخاوت اس خانوادے کی عادت ہے"

(اصابہ ج۳۔ ص۲۳۹)

ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں تحریر کیا ہے کہ ہیثم ابن عدی نے بیان کیا کہ خانہ کعبہ کے پاس تین آدمی آپس میں باتیں کرتے ہوئے الجھ پڑے۔ ان میں سے ایک کہتا تھا کہ سب سے بڑھ کر سخی عبداللہ ابن جعفر ہیں دوسرا کہتا تھا کہ قیس ابن سعد ہیں اور تیسرا کہتا تھا کہ عرابۃ الاوسی ہیں۔ جب اس اختلاف نے نزاعی صورت اختیار کر لی تو ایک شخص نے کہا کہ تم لوگ کیوں جھگڑتے ہو ابھی اس کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ تم میں سے جو جس کی برتری کا قائل ہے اس کے پاس جائے اور سائل کا روپ دھار کر اس سے سوال کرے پھر خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ سخاوت میں کس کا پایہ بلند تر ہے۔ یہ رائے پسند کی گئی اور ان میں سے ایک عبداللہ ابن جعفر کے ہاں گیا دیکھا کہ وہ سوار ہو کر اپنی جاگیر کی طرف جانے والے ہیں اور رکاب میں پیر رکھ چکے ہیں۔ اس نے آگے بڑھ کر کہا اے ابن عم رسول میں مسافر ہوں میرے پاس زاد ہے نہ سواری۔ یہ سننا تھا کہ عبداللہ نے رکاب سے پیر نکالا اور نیچے اتر آئے اور کہا کہ تم اس سواری پر سوار ہو جاؤ اور جو مال اس پر بار ہے وہ تمہارا ہے اور دیکھنا اس سامان میں امیرالمومنین علی ابن ابی طالب کی تلواروں میں سے ایک تلوار بھی ہے اسے حفاظت سے رکھنا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ضائع ہو جائے۔ جب اس نے سامان کا جائزہ لیا تو اس میں چار ہزار دینار ریشمی چادریں اور متفرق اشیاء تھیں۔

دوسرا آدمی قیس ابن سعد کے مکان پر آیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ سو رہے ہیں۔ گھر میں سے ایک کنیز نے پوچھ لیا کہ تم کس غرض سے آئے ہو اور کیا کہنا چاہتے ہو کہا میں ایک بے سر و سامان مسافر ہوں اور ان سے کچھ مدد کا طالب ہوں۔ کنیز نے کہا کہ اس معمولی سے کام کے لئے انہیں جگایا نہیں جا سکتا گھر میں سات سو دینار

موجود ہیں وُہ لے لو اور اُن کے اصطبل میں چلے جاؤ اور وہاں سے ایک اونٹنی اور ایک غلام بھی لیتے جاؤ۔ قیس جب سو کر اُٹھے تو کنیز نے یہ واقعہ بیان کیا اور کہا کہ میں نہیں چاہتی تھی کہ سائل آپ کے در سے خالی ہاتھ جائے قیس نے کہا کہ تم نے مجھے جگا کیوں نہ دیا شاید تم نے جو اُسے دیا ہے وُہ اس کی ضرورت و احتیاج سے کم ہو پھر اُس کنیز کی فراخ حوصلگی سے متاثر ہو کر اُسے آزاد کر دیا۔

تیسرا آدمی عرابہ کے ہاں گیا۔ دیکھا کہ وُہ دو غلاموں کا سہارا لے کر نماز کے لئے جا رہے ہیں اس وقت ان کی بصارت جاتی رہی تھی اور سہارے کے بغیر کہیں آ جا نہ سکتے تھے۔ اس نے قریب پہنچ کر کہا اے عرابہ میں مسافر اور بے زاد ہوں میری مدد کیجئے۔ یہ سُننا تھا کہ عرابہ نے دونوں غلاموں کے کندھوں پر سے ہاتھ اُٹھایا اور ہاتھ پر ہاتھ مار کر کہا افسوس ادائے حقوق نے عرابہ کے پاس کچھ نہیں چھوڑا۔ تم یہ دونوں غلام لے لو۔ اس نے کہا کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ میں تمہارا سہارا چھین لوں اور تمہیں ٹھوکریں کھانے کے لئے چھوڑ دوں۔ عرابہ نے کہا کہ اگر تم نہیں لوگے تو میں انہیں آزاد کر دوں گا۔ اب لے لو یا انہیں آزاد کر دو۔ اس نے وُہ دونوں غلام لے لئے اور عرابہ دیوار کا سہارا لے کر مسجد کی طرف چل دیئے۔

جب یہ تینوں پلٹ کر آئے اور لوگوں نے ان کی روداد سُنی تو کہا کہ اگرچہ عبداللہ ابن جعفر نے سب سے زیادہ دیا ہے مگر ان کی شخصیت اور مالی حیثیت کو دیکھتے ہُوئے کوئی خاص بات نہیں ہے البتہ حضرت علی کی تلوار کو اپنے سے الگ کر دینا قابل ذکر ضرور ہے۔ کچھ لوگوں نے قیس کو زیادہ سراہا کہ ان کی کنیز نے ان سے پوچھے بغیر جتنی رقم گھر میں موجود تھی سب دے دی اور انہوں نے کنیز کے رویہ سے خوش ہو کر اسے آزاد کر دیا۔ آخر میں عرابہ پر سب نے اتفاق کیا کہ عرب میں وُہ سب سے زیادہ سخی ہے انہوں نے جو کچھ ان کے پاس تھا سب دے دیا اور معذور و نابینا ہونے کے باوجود غلاموں کا سہارا باقی رکھنا بھی گوارا نہ کیا۔

ایک مرتبہ قیس بیمار پڑے تو مزاج پرسی کے لئے بہت کم لوگ آئے وجہ پُوچھی تو انہیں بتایا گیا کہ چونکہ اکثر لوگ آپ کے مقروض ہیں اس لئے وُہ آتے ہُوئے جھجکتے ہیں کہا خدا اُس مال کو رُسوا کرے جو دوستوں کے آنے سے مانع ہو۔ پھر حکم دیا کہ مدینہ میں اعلان کر دیا جائے کہ جس جس کے ذمہ ہمارا قرضہ ہے وُہ ہبہ کر دیا گیا ہے اور دستاویزیں چاک کر دی گئی ہیں۔ اس اعلان کے ہوتے ہی لوگوں کا تانتا بندھ گیا اور اس کثرت سے لوگ آئے کہ دروازہ کی چوکھٹ ٹوٹ گئی۔

ابن عبدالبر نے استیعاب میں لکھا ہے کہ کثیر ابن صلت نے قیس سے تیس ہزار درہم کسی ضرورت کے لئے قرض لئے۔ جب وُہ قرضہ واپس کرنے کے لئے آیا تو قیس نے رقم واپس لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ تمہیں اشتباہ ہُوا ہے یہ رقم قرضہ نہ تھی بلکہ عطیہ تھی۔

جب امیرالمومنین برسر اقتدار آئے تو ماہ صفر ۳۶ھ میں قیس کو ان کی خاندانی وجاہت ذاتی جوہر اور سیاسی سوجھ بوجھ کی بنا پر مصر کی امارت کے لئے منتخب کیا اور انہیں بلا کر کہا کہ تم ایک فوج ترتیب

دے کر اپنے ساتھ لے جاؤ وہاں کی رعایا سے حسن سلوک سے پیش آنا لوگوں سے نرم رویہ رکھنا اس لئے کہ نرمی و میانہ روی یمن و برکت کا باعث ہوتی ہے البتہ جہاں نرمی سے کام بنتا نظر نہ آئے وہاں سختی برتنا بے جا نہ ہوگا۔ قیس نے کہا کہ یا امیر المومنین مجھے فوج و سپاہ کی احتیاج نہیں ہے فوج کا مرکز میں رہنا زیادہ ضروری ہے۔ مجھے صرف چند آدمی ساتھ لے جانے کی اجازت دی جائے۔ چنانچہ انہوں نے سات آدمی منتخب کر کے اپنے ہمراہ لے لئے اور مصر کی جانب روانہ ہو گئے۔ جب مصر میں وارد ہوئے تو تقرری کے سلسلہ میں امیر المومنین کا فرمان پڑھ کر سُنایا اور منبر پر خطبہ دیتے ہوئے کہا۔

الحمد للہ الذی جاء بالحق و	تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے حق کو
امات الباطل وکبت الظالمین	ظاہر کیا باطل کو کچلا اور ظالموں کو ذلیل و رسوا کیا
ایھا الناس انا قد بایعنا خیر	اے لوگو ہم نے اس ہستی کی بیعت کی ہے جو
من نعلم بعد نبینا فقوموا	ہمارے نبی کے بعد ان تمام لوگوں سے بہتر ہے
ایھا الناس فبایعوہ علی کتاب	جنہیں ہم جانتے ہیں اے لوگو اٹھو اور کتاب و
اللہ و سُنۃ رسولہ فان نحن	سنت کی شرط پر اس کی بیعت کرو اگر ہم تمہارے
لم نعمل لکم بذلك فلا بیعۃ	معاملات میں کتاب و سنت پر عمل نہ کریں تو پھر
لنا علیکم۔ (تاریخ طبری ج۳ ص۵۵۱)۔	تم پر اس بیعت کی کوی پابندی نہ ہوگی۔"

پھر لوگوں سے بیعت لی اس بیعت میں کسی نے پس و پیش نہیں کیا سوا قصبۂ خربتا کے باشندوں کے جو دس ہزار کی تعداد میں تھے اور سب کے سب عثمانی تھے انہوں نے بیعت سے انکار کیا اور یزید ابن حارث کنانی کے ذریعہ قیس کو پیغام بھجوایا کہ ہم کسی معاملہ میں آپ سے تعرض نہیں کریں گے یہ سرزمین آپ کی سرزمین ہے ہم باقاعدہ خراج ادا کرتے رہیں گے مگر جب تک حالات یکسو نہیں ہو جاتے ہم سے بیعت کا مطالبہ نہ کیا جائے۔ قیس نے انہیں کہلوا بھیجا کہ میں تمہیں بیعت پر مجبور نہیں کرتا البتہ تمہیں شور و شر اور فتنہ انگیزی کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اہل خربتا نے پُر امن رہنے کا یقین دلایا اور قیس نے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا مگر مسلمہ ابن مخلد جو قیس ہی کے قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا اس نے لوگوں کو خون عثمان کے انتقام پر اُبھار کر فتنہ و شر پھیلانا چاہا قیس نے اسے پیغام بھجوایا کہ تم نے میرے خلاف محاذ قائم کر کے ہنگامہ آرائی کی کوشش کی ہے میں اس فتنہ کو ختم کر سکتا ہوں لیکن مجھے یہ گوارا نہیں ہے کہ میں تمہارا خون بہاؤں خواہ مجھے مصر سے شام تک کی حکومت دے دی جائے۔ اس نے قیس کے اس نرم رویہ سے متاثر ہو کر انہیں کہلوا بھیجا کہ جب تک آپ والیٔ مصر ہیں میں حکومت کے خلاف کوی اقدام نہیں کروں گا۔ قیس کی اس سیاست و حکمت عملی سے ابھرتا ہوا فتنہ دب گیا۔ اور جتنا عرصہ مصر کی زمام حکومت ان کے ہاتھوں میں رہی حالات پر سکون رہے مگر اموی سیاست نے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ یکم ربیع الاول ۳۶ھ سے ۵ رجب ۳۶ھ تک چار ماہ پانچ دن

امارت مصر پر فائز رہنے کے بعد انہیں امارت سے الگ ہونا پڑا۔ اس برطرفی کے وجوہ واسباب کا تذکرہ بعد کے صفحات پر ہوگا۔

قیس نے اس مختصر سے دور میں ایک قصر مصر میں تعمیر کروایا۔ جب برطرفی کے بعد پلٹ کر واپس آئے تو کچھ لوگوں کو کہتے سُنا کہ قیس کا ایک مکان مصر میں ہے پُوچھا کہ کیسا مکان اور کس کا مکان لوگوں نے کہا کہ وہی جو آپ نے مصر میں تعمیر کیا ہے۔ کہا کہ میں نے وُہ مکان مسلمانوں سے مدد لے کر تعمیر کیا تھا وہ مسلمانوں ہی کی ملکیت ہے اور جو بھی مصر کا حاکم ہوگا وُہ اسی میں ٹھہرا کرے گا۔

۵۹ھ یا ۶۰ھ میں جبکہ حکومت معاویہ کا دور آخر تھا مدینہ میں وفات پائی۔

سہل ابن حنیف انصاری۔ انصار کے قبیلۂ اوس کی ایک ممتاز فرد والی بصرہ عثمان ابن حنیف کے بھائی پیغمبر اکرم کی صحبت سے شرفیاب اور امیرالمومنین کے مخلص اصحاب میں سے تھے۔ بدر اور اس کے بعد کے غزوات میں شریک ہوئے اور احد میں جبکہ اکثر لوگوں کے قدم اُکھڑ گئے تھے ان کے ثبات قدم میں لغزش نہیں آئی نہ پتھروں کی آڑ ڈھونڈی اور نہ راہِ فرار اختیار کی بلکہ پیغمبر کے ہاتھ پر موت کا عہد و پیمان باندھ کر لڑتے رہے۔

ابن ہشام نے تحریر کیا ہے کہ ہجرت کے بعد جب حضرت علی قبا میں آکر ٹھہرے تو آپ نے نصف شب کے بعد ایک شخص کو دیکھا جو ایک مسلمان عورت کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اور جب وُہ باہر نکلتی ہے تو چپکے سے ایک چیز اس کے حوالے کر دیتا ہے اور وُہ اُسے لے کر اندر چلی جاتی ہے۔ حضرت کے دل میں کھٹک پیدا ہوئی کیونکہ وُہ اکیلی اور بے شوہر کے تھی۔ آپ نے اس سے پوچھا کہ آدھی رات کے بعد کون ہے جو تمہارے ہاں آتا ہے کہا وُہ سہل ابن حنیف ہیں انہیں یہ معلوم ہے کہ میں ایک بے سہارا عورت ہوں جس کا کوئی کفیل و پرسان حال نہیں ہے۔ جب رات اندھیری ہوتی ہے تو وُہ اردگرد کے بُت خانوں پر چھاپا مارتے ہیں اور بتوں کو توڑ پھوڑ کر مجھے دے جاتے ہیں تاکہ میں انہیں ایندھن کے طور پر کام میں لاؤں۔ امیرالمومنین سہل کے اس عمل سے بہت خوش ہوئے اور اُن کے مرنے کے بعد بھی ان کے جذبۂ ہمدردی و غمخواری کی تعریف کرتے ہوئے اس واقعہ کا تذکرہ کرتے رہتے تھے۔

جب امیرالمومنین اصحاب جمل کی یورش کو دبانے کے لئے بصرہ روانہ ہوئے تو انہیں اپنی قائمقامی میں مدینہ کا حاکم مقرر کیا اور جنگ جمل سے فارغ ہو کر جب سپاہ شام کے مقابلہ کے لئے صفین کی طرف راہ سپار ہوئے تو انہیں اپنے ساتھ لے لیا۔ صفین سے واپسی پر فارس کا عامل مقرر کیا۔ اہل فارس معاویہ کی بغاوت سے متاثر ہو کر سرکشی و خودسری پر اُتر آئے اور خراج سے بچنے کے لئے سہل کو فارس سے باہر نکال دیا۔ حضرت نے جاریہ ابن قدامہ کے مشورہ سے زیاد ابن عبید کو وہاں بھیجا جس نے چالاکی و ہوشیاری سے کام لے کر انہیں آپس میں لڑوا دیا اور اس طرح ان کی طاقت کو کمزور کر کے اُن پر

قابو پا لیا۔

۳۸ھ میں سہل نے کوفہ میں انتقال کیا۔ امیر المومنین نے اپنے ہاتھ سے کفن پہنایا اور نماز جنازہ پڑھائی ابن سعد تحریر کرتے ہیں:۔

اخبرنا ابو جناب الکلبی قال سمعت عمیر ابن سعید صلی علی علے سہل ابن حنیف فکبر علیہ خمسا۔ (طبقات ج۳ ص۷۳)

ابو جناب کلبی کہتے ہیں کہ میں نے عمیر ابن سعید سے سُنا کہ حضرت علی نے سہل ابن حنیف کی نماز جنازہ پڑھائی اور پانچ تکبیریں کہیں"۔

حضرت نے سہل کے جنازہ پر متعدد مرتبہ نماز پڑھائی۔ جب ایک نماز سے فارغ ہوتے تو اور لوگ آجاتے اور کہتے کہ یا امیر المومنین ہم نماز جنازہ میں شرکت سے محروم رہ گئے حضرت اُن کے شرف و امتیاز کی بنا پر پھر نماز پڑھاتے یہاں تک کہ قبر تک پہنچتے پہنچتے پانچ مرتبہ نماز پڑھائی اور ہر نماز میں پانچ تکبیریں کہیں۔ امیر المومنین نے ان کی موت پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:۔

کان من احب الناس الی لو احبنی جبل لتہافت۔ (تنقیح المقال)

سہل مجھے سب لوگوں سے زیادہ محبوب تھے اگر پہاڑ بھی مجھے دوست رکھے گا تو ریزہ ریزہ ہو جائے گا"۔

مالک ابن حارث اشتر۔ مالک نام اور اشتر لقب تھا۔ شجاعان عالم میں ممتاز اور شمشیر زنی و نبرد آزمائی میں شہرہ آفاق تھے۔ جمل و صفین میں عظیم کارنامے انجام دیئے اور اپنے حریفوں تک سے اپنی تیغ زنی کا لوہا منوایا۔ امیر المومنین کے مخلص و معتمد اور بلند مرتبہ اصحاب میں شمار ہوتے ہیں۔ اور حضرت سے اس درجہ خصوصیت حاصل تھی کہ آپ فرمایا کرتے تھے کہ مالک کا میری نظروں میں وہی مرتبہ و مقام ہے جو رسُول اللہ کے نزدیک میرا مرتبہ و مقام تھا اور اپنے مقام و منزلت کے بارے میں فرمایا:۔

کانت لی منزلۃ من رسول اللہ مالو تکن لاحد من الخلائق۔ (مسند احمد ابن حنبل ج۱ ص۸۵)

رسُول اللہ کے نزدیک میرا وُہ مقام تھا جو کائنات میں کسی اور کو حاصل نہ ہو سکا"۔

جب حضرت ابوذر نے صحرائے ربذہ میں حکومت کے خلاف خاموش احتجاج کرتے ہوئے دم توڑا تو جن صلحاء مومنین نے ان کی تجہیز و تکفین کا سامان کیا تھا ان میں اگرچہ ہلال ابن مالک مزنی احنف ابن قیس تمیمی صعصعہ ابن صوحان عبدی اسود ابن قیس تمیمی ایسے عظیم المرتبت و جلیل القدر افراد موجود تھے مگر نماز جنازہ مالک اشتر نے پڑھائی جس سے ان کے علم و عدالت اور قدر و منزلت پر روشنی پڑتی ہے۔

امیر المومنین نے مالک کو جزیرۃ العرب پر عامل مقرر کیا جو موصل نصیبین میا فارقین دارا عانات سنجا

اور دوسرے شہروں پر مشتمل ایک وسیع علاقہ تھا۔ ۳۸ھ میں انہیں امارت مصر کے لئے منتخب کیا مگر مصر پہنچنے سے پہلے ایک اموی کارندے نے معاویہ کے ایماء پر انہیں شہد میں زہر دے کر شہید کر دیا۔ معاویہ کو ان کے انتقال کی خبر ہوئی تو خوش ہو کر کہا:۔

ان للہ جنداً من العسل۔ ”شہد بھی اللہ کا ایک لشکر ہے“

(مروج الذہب ج۲ ۔ ص۴۱)

عبد اللہ ابن عباس۔ پیغمبر اکرم کے ابن عم تھے۔ ہجرت سے تین سال پہلے پیدا ہوئے۔ امیر المومنین کے زیر سایہ تربیت پائی انہی سے علمی استفادہ کیا اور علم و حکمت اور فقہ و تفسیر میں بلند ترین درجہ پر فائز ہوئے۔ تشنگان علوم و معارف کا ان کے ہاں ہجوم رہتا تھا اور حبر الامہ اور ترجمان القرآن کے القاب سے یاد کئے جاتے تھے۔ جمل، صفین اور نہروان تینوں جنگوں میں حضرت کے ہم رکاب رہے۔ عثمان ابن حنیف کے بعد بصرہ کے حاکم مقرر کئے گئے۔ آخر عمر میں بینائی جاتی رہی تھی۔ ۶۸ھ میں طائف میں وفات پائی۔ محمد ابن حنفیہ نے نماز جنازہ پڑھائی اور سپرد لحد کیا۔

محمد ابن ابی بکر۔ اسماء بنت عمیس کے بطن سے حضرت ابو بکر کے فرزند تھے۔ حجۃ الوداع کے سال پیدا ہوئے۔ حضرت ابو بکر کے انتقال کے بعد حضرت علی نے اسماء سے عقد کر لیا تو محمد انہی کے زیر تربیت آگئے۔ آپ نے اپنی اولاد کی طرح ان کی تعلیم و تربیت پر توجہ دی اور انہوں نے وہی مسلک اختیار کیا جو اس تربیت کا تقاضا تھا۔ جمل و صفین کے معرکوں میں شریک رہے۔ قیس ابن سعد کی برطرفی کے بعد مصر کی امارت ان سے متعلق ہوئی۔ جب ۳۸ھ میں لشکر شام مصر پر حملہ آور ہوا تو دشمن کے ہاتھوں بڑی بے دردی سے شہید ہو گئے۔

ابو ایوب انصاری۔ ان کا نام خالد اور باپ کا نام زید تھا مگر اپنی کنیت سے شہرت حاصل کی۔ پیغمبر اکرم نے ہجرت کے بعد مدینہ میں انہی کے ہاں سات ماہ قیام فرمایا تھا۔ آپ متورع و پرہیزگار ہونے کے ساتھ بہادر و نبرد آزما بھی تھے۔ اسلامی غزوات میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا اور جمل، صفین اور نہروان میں امیر المومنین کی صفوں میں امتیازی حیثیت سے شامل رہے۔ حضرت کی طرف سے مکہ کے والی مقرر ہوئے۔ ۵۱ھ میں وفات پائی اور قسطنطنیہ میں دفن ہوئے۔ آپ کا مزار صدیوں سے زیارت گاہ خاص و عام چلا آرہا ہے۔

مخنف ابن سلیم ازدی۔ امیر المومنین کے معتمد اصحاب میں سے تھے۔ کربلا کا مشہور وقائع نگار ابو مخنف انہی کی اولاد میں سے تھا۔ ابو مخنف کا نام لوط اور شجرہ نسب یہ ہے: لوط ابن یحییٰ ابن سعید ابن مخنف ابن سلیم۔ امیر المومنین نے مخنف ابن سلیم کو ہمدان اور اصفہان کا عامل مقرر کیا۔ جب حضرت نے صفین کی طرف حرکت کرنے کا ارادہ کیا تو مخنف نے حضرت سے کوفہ آنے کی اجازت طلب کی تاکہ آپ کے ہم رکاب رہ کر شامیوں

سے جہاد کریں حضرت نے اُن کے ولولۂ جہاد کو دیکھ کر انہیں کوفہ آنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ وُہ حرث ابن ربیع کو اصفہان پر اور سعید ابن وہب کو ہمدان پر اپنا نائب مقرر کر کے حضرت کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور قبیلہ بنی ازد کا پرچم اپنے ہاتھوں میں لے کر جنگ صفین میں شریک ہوئے۔

قرظہ ابن کعب انصاری:۔ پیغمبر کے اصحاب میں سے تھے۔ احد اور اس کے بعد کے غزوات میں شریک ہُوئے۔ کوفہ میں سکونت اختیار کی اور حضرت کی طرف سے فارس کے حاکم مقرر ہُوئے۔ جمل صفین اور نہروان میں امیرالمومنین کی نصرت کا شرف حاصل کیا حضرت نے صفین میں انصار کا علم اُن کے سپرد کیا۔ حضرت ہی کے دورِ خلافت میں وفات پائی اور آپ ہی نے نماز جنازہ پڑھائی۔ ان کے ایک فرزند عمروؔ ابن قرظہ انصاری کربلا میں لڑ کر شہید ہُوئے۔

قثم ابن عباس۔ پیغمبر اکرم کے ابن عم اور صورت و شکل میں اُن سے بہت مشابہ تھے۔ آنحضرت کے دفن کے موقع پر قبر اطہر میں اُترے اور سب سے آخر میں باہر نکلے۔ کریم و سخی تھے سائلوں کو اپنے گرانقدر عطایا سے دوسروں کے آگے جھولی پھیلانے سے بے نیاز کر دیتے تھے۔ ایک شاعر داؤد ابن مسلم نے ان کے بارے میں کہا ہے:۔

اعفیت من حل و من رحلۃ　　　　یا ناق ان ادنیتنی من قثم

"اے میری اونٹنی اگر تو مجھے قثم کے پاس لے چلے تو آئے دن کے سفروں سے چھٹکارا پا جائے"۔

حضرت نے انہیں مکہ کا والی مقرر کیا اور ایک مکتوب میں انہیں تحریر فرمایا: "صبح و شام اپنی نشست قرار دو مسئلہ پوچھنے والے کو مسئلہ بتاؤ جاہل کو تعلیم دو اور عالم سے تبادلۂ خیالات کرو"۔ ان کلمات سے ان کی عدالت علمی منزلت اور اہلیت افتاء کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ امیرالمومنین کی شہادت کے بعد سعید ابن عثمان کے ہمراہ سمرقند چلے گئے اور جام شہادت پی کر جنت کو سدھارے۔

یزید ابن قیس ارحبی:۔ قبیلۂ ہمدان کی شاخ بنی ارحب کی ایک ممتاز فرد تھے۔ کوفہ میں سکونت تھی۔ جب حفاظ کوفہ نے حضرت عثمان کی روش کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے ایک جماعت کی تشکیل کی تو انہیں سربراہ منتخب کیا گیا۔ جنگ صفین میں اپنے بھائی سعید ابن قیس ہمدانی کے ساتھ شریک ہُوئے اور بڑی دلیری و جرأت سے لڑے۔ امیرالمومنین نے انہیں اصفہان ہمدان اور رے کا عامل مقرر کیا۔

کمیل ابن زیاد نخعی:۔ امیرالمومنین کے مخصوصین میں سے تھے۔ نہایت عابد و پرہیز گار اور علوم و معارف آل محمد کے امین تھے۔ حضرت نے انہیں ایک دُعا تعلیم فرمائی تھی جو "دُعائے کمیل" کے نام سے مشہور اور کتب ادعیہ میں موجود ہے۔ کوفہ میں سکونت رکھتے تھے۔ جنگ صفین میں حضرت کے ہمرکاب رہے اور شامیوں کے خلاف جہاد میں حصہ لیا۔

جب ۸۲ھ میں حجاج ابن یوسف ثقفی نے عبدالرحمٰن ابن محمد ابن اشعث کو شکست دے کر کوفہ پر

قبضہ کر لیا تو چُن چُن کر شیعیان امیرالمومنین کو تلوار کی باڑ پر رکھ لیا۔ شیعیان کوفہ میں کمیل کی شخصیت غیر معروف نہ تھی وُہ حجاج کے ظلم و تشدد اور خونریزی و سفاکی کو دیکھ کر کہیں روپوش ہو گئے۔ حجاج نے ان کے قبیلہ والوں سے ان کے بارے میں پُوچھ گچھ کی مگر کسی نے ان کا پتا بتانا گوارا نہ کیا۔ آخر حجاج نے ان سب کے وظائف روک لئے۔ جناب کمیل کو معلوم ہوا تو کہنے لگے کہ میں بہت جی چکا ہوں اب مجھے جینے کی آرزو نہیں ہے۔ میں چند روزہ زندگی کے لئے اپنی قوم کو بھوکا مرتا نہیں دیکھ سکتا۔ یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہُوئے اور حجاج کے ہاں پہنچ گئے۔ حجاج ان سے انتہائی سختی و درشتی سے پیش آیا کمیل نے بھی اس کی ہر بات کا جواب اسی کے لب و لہجہ میں دیا اور کہا کہ میں اس وقت تمہارے قبضہ میں ہوں تم جو چاہو میرے ساتھ کر گزرو کل میرا اور تمہارا فیصلہ اللہ کی بارگاہ میں ہو گا۔ مجھے موت کی پروا نہیں ہے۔ میرے سیّد و سردار علی ابن ابی طالب مجھے خبر دے گئے تھے کہ تم ایک ظالم و سفاک کے ہاتھ سے قتل ہو گے۔ حجاج نے کہا کہ مجھے تمہاری تلاش اسی غرض کے لئے تھی یہ کہہ کر حکم دیا کہ ان کی گردن مار دی جائے۔ چنانچہ وُہ اسی مقام پر ذبح کر دیئے گئے۔ شہادت کے وقت آپ کا سن ۹۰ برس کا تھا اور مزار کوفہ و نجف کے درمیان واقع ہے۔

ربیع ابن خثیم اسدی۔ امیرالمومنین کے مقربین اور اجلۂ اصحاب میں سے تھے۔ زہد و ورع اور تقویٰ و پرہیزگاری میں مشہور تھے۔ حضرت کی طرف سے قزوین کے عامل مقرر ہُوئے۔ جب امیرالمومنین صفین جانے کے لئے نخیلہ میں فروکش تھے تو ان کی آمد کے منتظر رہے اور جب وُہ رے سے چار ہزار کا لشکر لے کر پہنچے تو صفین کی طرف حرکت کی۔ ۶۱ھ یا ۶۳ھ میں ایک لشکر میں شامل ہو کر خراسان گئے اور وہیں پر وفات پائی اور روضۂ امام رضا علیہ السلام سے چھ میل کے فاصلہ پر مدفون ہیں۔ ان کا مدفن زیارت گاہِ خواجہ ربیع کے نام سے مشہور ہے۔ جب امام رضا علیہ السلام طوس میں وارد ہُوئے تو اکثر ان کی قبر پر تشریف فرما ہوتے اور فرماتے کہ خراسان آنے کا ماحصل خواجہ ربیع کی زیارت ہے۔

عمر ابن ابی سلمہ۔ جناب ام سلمہ کے بطن سے ابو سلمہ ابن عبدالاسد مخزومی کے فرزند تھے۔ ۲ھ میں حبشہ میں پیدا ہُوئے۔ وفات رسُول کے وقت ان کا سن نو برس کا تھا۔ جنگ جمل میں امیرالمومنین کے میسرۂ لشکر کے سردار تھے۔ حضرت نے انہیں بحرین کا والی مقرر کیا۔ جب صفین کا ارادہ کیا تو انہیں جنگ میں شرکت کی غرض سے بحرین سے واپس بلا لیا اور جنگ کے بعد فارس کے حاکم بنائے گئے۔ ۸۳ھ میں مدینہ منورہ میں انتقال کیا۔

نعمان ابن عجلان انصاری۔ قبیلۂ انصار کے سردار اور زبان آور شاعر تھے۔ امیرالمومنین کے حامی و طرفدار اور ان کے حق کی فوقیت کا اظہار اپنے اشعار میں کرتے تھے۔ حضرت نے عمر ابن ابی سلمہ کی جگہ انہیں بحرین و عمان کا والی مقرر کیا۔ جنگ صفین میں حضرت کی حمایت میں لڑے۔ ان کے بھائی نعیم ابن

عجلان انصاری حسینی لشکر میں شامل ہو کر روزِ عاشورا حملہ اولیٰ میں شہید ہوئے۔ انہوں نے امام حسنؑ کے دور خلافت میں وفات پائی۔

عثمانؓ ابن حنیف انصاری:۔ انصار کی ایک ممتاز شخصیت تھے۔ احد اور اُس کے بعد کے غزوات میں شریک ہوئے۔ امیر المومنین کے مخلص اصحاب میں سے تھے۔ حضرت نے جنگ جمل سے قبل انہیں بصرہ کا حاکم مقرر کیا۔ جنگ کے خاتمہ پر ان کی جگہ پر عبداللہ ابن عباس متعین ہوئے۔ آپ نے کوفہ میں سکونت اختیار کی اور معاویہ کے دَور میں وفات پائی۔

سعیدؓ ابن مسعود ثقفی:۔ مختار ابن ابی عبیدہ ثقفی کے چچا تھے۔ صفین میں اہل کوفہ کے سات دستوں میں سے ایک دستہ کے افسر مقرر ہوئے۔ حضرت کی طرف سے مدائن کے والی تھے۔ جب امام حسنؑ فوج کی بغاوت کے نتیجہ میں ابن بشیر اسدی کے ہاتھ سے زخمی ہوئے تو مدائن میں سعید ہی کے ہاں منزل کی اور انہی نے علاج معالجہ کا سرو سامان کیا۔

عبیداللہ ابن عباس:۔ پیغمبر اکرم کے ابن عم تھے۔ امیر المومنین نے انہیں یمن کی امارت سپرد کی اور افواج یمن کی سپہ سالاری کا عہدہ سعید ابن نمران ہمدانی کو دیا۔ جب بسر ابن ابی ارطاۃ نے یمن پر حملہ کیا تو یہ اس کے مقابلہ کی تاب نہ لا کر یمن سے نکل کھڑے ہوئے جس پر امیر المومنین نے انہیں سرزنش کی۔

حسانؓ ابن حسان بکری:۔ امیر المومنین کی طرف سے انبار کے والی تھے جب معاویہ نے عراقی شہروں پر تاخت و تاراج شروع کی تو سفیان ابن عوف غامدی نے چھ ہزار کے لشکر کے ساتھ انبار پر حملہ کیا اور حسان اور اُن کے تیس ہمراہیوں کو شہید کر دیا۔

ضحاک ابن قیس کی تاخت

امیر المومنین جنگ جمل میں اُلجھے ہوئے تھے کہ معاویہ نے موقع تاک کر جزیرۃ العرب کے چند شہروں حران، قرقیسیا اور رقہ پر فوجکشی کر دی اور وہاں کے باشندوں سے بیعت لے کر ضحاک ابن قیس فہری کو اس علاقہ کا گورنر مقرر کر دیا۔ جب امیر المومنین جنگ جمل سے فارغ ہو کر کوفہ میں وارد ہوئے تو معلوم ہوا کہ اُن شہروں کے باشندوں نے جو حضرت عثمان کے ہوا خواہ تھے معاویہ کی بیعت کر لی ہے اور ضحاک ابن قیس معاویہ کی طرف سے ان اطراف کا عامل قرار پا گیا ہے۔ حضرت نے مالک اشتر کو ایک دستہ فوج کے ساتھ بلاد جزیرہ کی طرف بھیجنے کا فیصلہ کیا کیونکہ حضرت اُن کی جنگی مہارت اور انتظامی صلاحیت کی بنا پر پُر اعتماد تھے کہ وُہ بگڑے ہوئے حالات پر قابو پالیں گے اور ضحاک کو حدودِ جزیرہ سے نکال باہر کریں گے۔ چنانچہ مالک فوراً ایک دستہ فوج کے ساتھ بلاد جزیرہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب حدودِ جزیرہ میں داخل ہوئے اور ضحاک کو ان کے آنے کی خبر ہوی تو اُس نے رقہ سے جو کوفہ و بصرہ کے عثمانیوں کی پناہ گاہ

تھا فوجی امداد طلب کی چنانچہ وہاں سے سماک ابن مخرمہ اسدی کی کمان میں ایک لشکر اس کی مدد کے لئے پہنچ گیا۔ جب مالک حران کے قریب پہنچے تو ضحاک اور سماک دونوں اپنی اپنی فوجوں کی کمان کرتے ہوئے مقابلہ کے لئے نکل کھڑے ہوئے اور رقہ اور حران کے درمیان مقام مرج میں جنگ چھڑ گئی۔ مالک اور ان کے ہمراہیوں کے پُرزور حملوں نے حریف کا زور توڑ دیا۔ جب ضحاک نے شکست کے آثار دیکھے تو لشکر کو لے کر بھاگ کھڑا ہوا اور قلعۂ حران میں پناہ لے لی۔ مالک نے لشکر کا تعاقب کیا اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ معاویہ کو اپنے لشکر کی ہزیمت اور قلعہ بند ہونے کی خبر پہنچی تو انہوں نے خالد ابن ولید کے بیٹے عبدالرحمٰن کو سواروں اور پیادوں کے لشکر گراں کے ساتھ بھیجا۔ مالک کو جب اس شامی لشکر کی آمد کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے محاصرہ اٹھا کر پہلے اس سے نمٹ لینے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ جس سمت سے لشکر آ رہا تھا ادھر بڑھے۔ جب دونوں لشکر ایک دوسرے کے بالمقابل ہوئے تو تلواریں نیاموں سے کھینچ کر ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے کچھ دیر تک جھڑپیں ہوتی رہیں آخر عبدالرحمٰن اور اس کے ہمراہیوں کے قدم اکھڑ گئے اور انہوں نے بھاگ کر رقہ میں پناہ لے لی۔ مالک نے چاروں طرف سے رقہ کا محاصرہ کر لیا۔ ضحاک کو عبدالرحمٰن کے لشکر کی پسپائی کا علم ہوا تو وہ قلعۂ حران سے نکل کر رقہ کی طرف بڑھا تاکہ شکست خوردہ فوج کو محاصرہ سے نکال لے جائے اس اثنا میں شامیوں کا ایک اور لشکر ایمن ابن حزیمہ کی زیر کمان آ پہنچ گیا اب ضحاک کی ہمت بڑھ گئی اور وہ پوری طاقت سے مالک کے لشکر پر حملہ آور ہوا۔ مالک اور اس کے ہمراہیوں نے ہتھیار سنبھال لئے اور خونریز جنگ شروع ہو گئی شامی کچھ دیر تک جی توڑ کر لڑتے رہے اور آخر عراقیوں کے تابڑ توڑ حملوں کی تاب نہ لا سکے اور گرتے پڑتے بھاگ کھڑے ہوئے۔ جزیرہ شامی فوجوں سے خالی ہو گیا اور مقامی باشندے جو اموی اقتدار کے پشت پناہ بنے ہوئے تھے دبک کر بیٹھ گئے۔ مالک نے ان باغیوں اور سرکشوں کی اچھی طرح گوشمالی کی اور ان سے اطاعت کا عہد و پیمان لے کر جزیرہ کا نظم و نسق اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

قیس ابن سعد کی برطرفی

جنگ جمل کے بعد معاویہ کو یہ خطرہ صاف نظر آ رہا تھا کہ امیرالمومنین انہیں امارت شام سے الگ کرنے کے لئے قدم اٹھائیں گے جسے وہ کسی صورت میں چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھے۔ یہ خطرہ مصر اور عراق دونوں طرف سے تھا۔ اگر ایک طرف سے قیس ابن سعد مصری فوجوں کے ساتھ اور دوسری طرف سے حضرت عراقیوں کے ساتھ شام پر حملہ آور ہوتے تو وہ اس دو طرفہ یلغار کا مقابلہ نہ کر سکتے انہوں نے چاہا کہ کسی طرح قیس کو اپنے ساتھ ملانے یا مصر کی امارت سے الگ کرنے کی تدبیر کریں۔ چنانچہ انہوں نے حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے قیس کو ایک خط تحریر کیا کہ "علی نے عثمان کا خون بہا کر ایک سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے اور تمہارا قبیلہ انصار بھی اس جرم میں ان کا معاون و مددگار تھا اگر تم اپنا بچاؤ چاہتے ہو تو طالبانِ قصاص کے گروہ میں

شامل ہوکر تحریک قصاص کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے میں ہمارا ہاتھ بٹاؤ اس کے صلہ میں تمہیں عراقین کی حکومت دی جائے گی اور تمہارے گھر والوں میں سے جسے تم چاہو گے حجاز کا حاکم بنا دیا جائے گا اور اس کے علاوہ بھی جو تم چاہو گے دیا جائے گا۔ میں تمہارے جواب کا منتظر ہوں"۔ معاویہ نے یہ دانہ تو پھینکا مگر قیس آسانی سے زیرِ دام آنے والے نہ تھے انہوں نے جواب دیا مگر نہ کھل کر انکار کیا اور نہ اقرار۔ اور یہی مناسب سمجھا کہ کچھ دن انہیں اُمید و یاس کے دوراہے پر کھڑا رہنے دیں۔ چنانچہ انہیں تحریر کیا کہ: "میں قتل عثمان کا مرتکب نہیں ہوا البتہ میرے قبیلہ کے لوگ اس سے بے تعلق نہیں رہے۔ تم نے حضرت علی کو اس خون میں شریک قرار دیا ہے تو میرے علم میں یہ چیز نہیں ہے۔ رہا تم سے وابستگی کا سوال تو اس کا فیصلہ بے سوچے سمجھے جلدی میں نہیں کیا جا سکتا تاہم میری طرف سے تمہیں مطمئن رہنا چاہیئے کہ میں کوئی قدم ایسا نہیں اٹھاؤں گا جو تمہیں ناگوار گزرے"۔ معاویہ نے یہ خط پڑھا تو کوئی فیصلہ نہ کر سکے کہ قیس اپنا ہاتھ کھینچ رہے ہیں یا دست تعاون بڑھا رہے ہیں۔ انہیں دوبارہ لکھا کہ میں سمجھ نہیں سکا کہ تم میرے مخالف ہو یا موافق اگر تم مجھے اندھیرے میں رکھ کر ٹال مٹول سے کام لینا چاہتے ہو تو میں آسانی سے فریب میں آنے والا نہیں ہوں وُہ وقت آیا چاہتا ہے کہ فوجیں میرے جلو میں ہوں گی اور گھوڑوں کی باگیں میرے ہاتھ میں پھر یہ حیلے حوالے کام نہیں دیں گے"۔

قیس نے یہ خط پڑھا تو سمجھ گئے کہ معاویہ کو آسانی سے ٹالا نہیں جا سکتا اور نہ باتوں سے بہلایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ انہیں صاف صاف لکھا کہ "مجھے تعجب ہے کہ تم مجھے سمجھ نہ سکے اور حکومت کا لالچ دے کر مجھے بہکانے لگے کیا تم یہ تصور بھی کر سکتے ہو کہ میں اس شخص کی امارت سے باہر ہو کر آمادۂ بغاوت ہو جاؤں گا جو سب سے زیادہ مسلمانوں کی قیادت و سربراہی کا اہل ہے اور جس کی حق پسندی راست روی اور رسُول اللہ سے قرابت و عزیزداری مسلم ہے۔ اور کیا تمہاری اطاعت کا جوأ اپنی گردن میں ڈال لوں گا جبکہ تمہیں نہ امارت و قیادت سے کوئی واسطہ اور نہ اللہ اور اس کے رسُول سے کوئی لگاؤ ہے۔ تم فریب کار گمراہ اور گمراہ کرنے والے کی اولاد اور ابلیس کے گروہ کی ایک فرد ہو۔ تم نے اپنے خط میں لشکر و سپاہ کا ذکر کیا ہے تو خدا کی قسم اگر تم میرے ہاتھ سے اپنی جان بچا لے جاؤ تو بڑے خوش نصیب ہو گے"۔ معاویہ نے یہ خط پڑھا تو بہت سیخ پا ہوئے اور اسی لب و لہجہ میں جواب دیا اور ادھر سے بھی ویسا ہی جواب آیا۔ آخر معاویہ قیس کی طرف سے بالکل مایوس ہو گئے کہ انہیں نہ طمع و لالچ سے پھانسا جا سکتا ہے اور نہ خوفزدہ کر کے ہمنوا بنایا جا سکتا ہے۔ جب اس طرح کام نکلتا نظر نہ آیا تو انہوں نے تقاضائے دیانت سے منہ موڑ کر ایک چالی چلی اور وُہ یہ کہ قیس کی طرف سے ایک جعلی خط بنایا جس میں تحریر تھا کہ "قیس ابن سعد کی طرف سے امیر شام معاویہ کے نام ہم نے سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہمیں ان لوگوں کا ساتھ نہ دینا چاہیئے جن کے ہاتھ ایک پرہیزگار و نیک کردار رہنمائے اسلام کے خون سے رنگین ہیں۔ ہم اپنے گناہوں سے توبہ و استغفار کرتے ہیں اور اللہ سے اپنے دین کی سلامتی کے خواستگار ہیں۔ ہم آپ کو اپنی اطاعت کا یقین دلاتے ہیں اور عثمان مظلوم کے قاتلوں

سے جنگ لڑنے پر تیار ہیں اور جلد ہی ہماری طرف سے فوجی و مالی امداد روانہ کر دی جائے گی"۔ اس تحریری جعلسازی کے ساتھ زبانی بھی لوگوں کو یہ کہنا شروع کر دیا کہ قیس کو برا نہ کہو وہ در پردہ ہمارے دوست اور خیر خواہ ہیں۔ تم دیکھ ہی چکے ہو کہ انہوں نے خربتا کے باشندوں کو ہر طرح کی سہولت و آزادی دے رکھی ہے اور تم میں سے کوئی اُن کے ہاں جاتا ہے تو اس سے اچھا برتاؤ کرتے ہیں۔

معاویہ نے اس فرضی خط کو صرف شام ہی میں مشتہر نہیں کیا بلکہ اپنے کارندوں کے ذریعہ کوفہ میں بھی اس کی تشہیر کی تاکہ وہاں کی فضا کو قیس کے خلاف کر سکیں۔ چنانچہ کوفہ میں اس کا عام چرچا ہوا اور امیر المومنین کے کانوں تک بھی یہ آواز پہنچ گئی آپ نے اپنے چند عزیزوں کو بلا کر ان سے مشورہ کیا۔ عبداللہ ابن جعفر اور دوسرے لوگوں نے کہا کہ قیس آپ سے برگشتہ ہو کر معاویہ سے ساز باز کئے ہوئے ہیں مناسب یہی ہے کہ انہیں برطرف کر دیا جائے۔ امیر المومنین سمجھ رہے تھے کہ یہ معاویہ کی چال ہے اور واقع میں ایسا نہیں ہے چنانچہ آپ نے ان لوگوں کے جواب میں فرمایا:۔

انی واللہ ما اصدق بھذا علی قیس۔ (تاریخ طبری۔ جلد ۳۔ صفحہ ۵۵۴) — خدا کی قسم میں قیس کے بارے میں ان باتوں کی تصدیق نہیں کر سکتا"۔

اس اثناء میں قیس کا ایک خط حضرت کے نام آیا جس میں تحریر تھا کہ ان اطراف میں کچھ عثمانی آباد ہیں جو بیعت سے کنارہ کش رہنا چاہتے ہیں ان کے نمائندوں نے مجھ سے کہا ہے کہ جب تک حالات یکسو نہیں ہو جاتے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ میں نے فی الحال یہ مناسب سمجھا ہے کہ اُن سے جنگ نہ کی جائے ممکن ہے کہ وہ غور و فکر کے بعد کسی صحیح نتیجہ پر پہنچ سکیں اور خود ہی راہ راست پر آجائیں۔ عبداللہ ابن جعفر اس خط پر مطلع ہوئے تو انہوں نے کہا کہ یا امیر المومنین مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قیس دفع الوقتی کے لئے ایسا کہہ رہے ہیں آپ انہیں لکھیں کہ وہ ان لوگوں سے بیعت لیں اور اگر وہ بیعت سے انکار کریں تو اُن سے جنگ کریں۔ دوسرے لوگوں نے بھی اس کی تائید کی۔ حضرت نے کوفہ کی فضا کو دیکھتے ہوئے قیس کو تحریر کیا کہ مصر کے جن لوگوں نے ابھی تک بیعت نہیں کی ہے ان سے بیعت لو اگر وہ بیعت پر آمادہ ہو جائیں تو بہتر ورنہ اُن سے جنگ کرو۔ جب قیس کو حضرت کا خط ملا تو انہوں نے جواب میں تحریر کیا کہ یا امیر المومنین اگر ان لوگوں سے جنگ لڑی گئی تو وہ آپ کے دشمنوں کے مددگار ثابت ہوں گے مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور اُن سے جنگ نہ چھیڑی جائے۔ قیس کے اس جواب سے لوگوں کو یقین ہو گیا کہ وہ معاویہ سے وابستہ ہو چکے ہیں اور اشعث ابن قیس، عبداللہ ابن جعفر، محمد ابن حنفیہ اور کوفہ کے دوسرے سرکردہ لوگوں نے اصرار کیا کہ انہیں معزول کر دیا جائے اور ان کے بجائے محمد ابن ابی بکر کو والی مصر مقرر کیا جائے۔ حضرت انہیں برطرف کرنے کے حق میں نہ تھے مگر جب آپ کو مجبور کر دیا گیا تو آپ نے قیس کی معزولی اور محمد ابن ابی بکر کی تقرری کا حکم دے دیا۔

معاویہ نے جو داؤ کھیلا تھا وُہ کامیاب رہا اور اس کا نتیجہ قیس کی معزولی کی صورت میں سامنے آ گیا۔ معاویہ نے پہلے تو قیس کو دم جھانسا دینا چاہا اور جب وُہ ان کے فریب میں نہ آئے تو فرضی خط کے ذریعہ ایسی فضا پیدا کر دی کہ امیر المومنین کے اعزہ و اصحاب ان سے بدظن ہو گئے اور اس طرح معاویہ نے امیر المومنین کے ساتھیوں ہی کے ذریعہ قیس کی معزولی کا سامان کر دیا۔ ابن حجر عسقلانی نے تحریر کیا ہے :-

قد امرہ علی علی مصر فاحتال علیہ معاویۃ فلم ینخدع لہ فاحتال علی اصحاب علی حتی حسنوا لہ تولیۃ محمد ابن ابی بکر فولاہ مصر۔ (اصابہ ج ۳ ص ۲۳۹)

حضرت علی نے قیس کو مصر کا حاکم مقرر کیا تو معاویہ نے قیس کو مختلف حیلوں سے ورغلانا چاہا مگر وُہ ان کے ورغلانے میں نہ آئے۔ پھر انہوں نے حضرت کے اصحاب کو بہکایا اور انہوں نے محمد ابن ابی بکر کے تقرر کو اس خوبصورت انداز میں پیش کیا کہ حضرت نے انہیں مصر کا والی مقرر کر دیا۔"

قیس مصر کی امارت سے دستبردار ہو کر مدینہ چلے آئے اور ان لوگوں کو جو ان کے جنگی داؤ پیچ، بے نظیر شجاعت اور زورِ بازو سے خائف تھے اطمینان ہو گیا۔ دُشمن نے مسرت کا اظہار کیا اور شماتت کرنے والوں کو شماتت کا موقع مل گیا۔ چنانچہ حسان ابن ثابت جو عثمانی گروہ کی ایک فرد تھے قیس کے پاس آئے اور کہا کہ تمہاری اچھی قدر افزائی ہوئی ہے کہ تمہیں امارت مصر سے معزول کر دیا گیا حالانکہ تم قتل عثمان میں شریک تھے۔ قیس نے بگڑ کر کہا:-

یا اعمی القلب والبصر واللہ لو لا ان القی بین رھطی ورھطک حربا لضربت عنقک اخرج عنی۔ (تاریخ طبری ج ۳ ص ۵۵۵)

اے بے بصیرت و بے بصارت یہاں سے دُور ہو جاؤ۔ اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ میرے اور تمہارے قبیلہ کے درمیان جنگ چھڑ جائے گی تو میں تمہاری گردن مار دیتا۔"

مروان ابن حکم اور اسود ابن البختری نے بھی ڈرایا دھمکایا اور جب انہیں قید و بند اور قتل کا خطرہ نظر آیا تو سہل ابن حنیف کے ہمراہ امیر المومنین کے پاس کوفہ چلے آئے۔ جب معاویہ کو معلوم ہُوا کہ قیس کوفہ چلے گئے ہیں تو بگڑ کر مروان اور اسود کو لکھا:-

امددتما علیا بقیس ابن سعد ورایہ ومکانہ فو اللہ لو انکما امددتماہ بمائۃ الف مقاتل ما کان ذلک باغیظ لی من اخراجکما قیس ابن سعد الی

تم دونوں نے قیس کے علی کے پاس جانے کا سرو سامان کیا خدا کی قسم اگر تم ایک لاکھ جنگجو سپاہیوں سے علی کی مدد کرتے تو مجھے اتنا صدمہ نہ ہوتا جتنا اس سے ہوا ہے اس طرح تم نے قیس اور ان کی رائے و تدبیر سے علی کے بازوؤں کو مضبوط تر کر دیا ہے

علی۔ (تاریخ طبری ج۳۔ صہ ۵۵۶)۔
مصر سے برطرفی کے بعد امیرالمومنین نے انہیں آذربائیجان کا عامل مقرر کر دیا اور سفر شام کے موقع پر حضرت کے فرمان کے مطابق عبداللہ ابن شبیل احمسی کو اپنا قائم مقام بنا کر کوفہ واپس آ گئے اور جنگ صفین میں شریک ہو کر اپنے زورِ بازو اور زورِ خطابت کی دھاک بٹھا دی۔
قیس ابن سعد کی معزولی کے سلسلہ میں عام طور پر امیرالمومنین کی سیاست کو ہدف بنایا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت کا یہ اقدام مصلحت اندیشی کے خلاف تھا انہوں نے قیس ایسے موقع شناس معاملہ فہم اور جنگ آزما کو مصر کی امارت سے اس وقت الگ کیا جب معاویہ کے جنگی عزائم کے پیش نظر وہاں کی قیادت کو مضبوط تر کرنے کی ضرورت تھی مگر اُسے قوی تر کرنے کے بجائے کمزور تر کر دیا گیا اور محمد ابن ابی بکر کو وہاں کی حکومت سونپ دی گئی جو نہ معاویہ کی دراندازیوں کو روک سکتے تھے اور نہ ملکی حدود کو دشمن کی تاخت و تاراج سے محفوظ رکھ سکتے تھے۔ چنانچہ ان کی کمزور سیاست کے نتیجہ میں مصر حضرت کے ہاتھوں سے جاتا رہا اور معاویہ کے مقبوضات میں شامل ہو گیا۔
بظاہر یہ اعتراض بڑا وزنی معلوم ہوتا ہے مگر کسی امر کا صحیح فیصلہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ جس دَور کا واقعہ ہو اس دَور کے حالات کا جائزہ لے کر فیصلہ کیا جائے۔ یہ واقعہ اس دور کا ہے جب مواصلات کا دائرہ محدود اور انتہائی محدود تھا ایک ہی مملکت کے اندر ایک جگہ کے واقعات و حوادث سے دُوسری جگہ کے لوگ بے خبر رہتے تھے اور خبر پہنچ بھی جاتی تھی تو واقعہ کی اصل نوعیت اور اس کا پس منظر واضح نہ ہوتا تھا۔ مصر کے سیاسی حالات کے پیش نظر قیس ابن سعد کا طریق کار کتنا ہی حزم و احتیاط کا حامل کیوں نہ ہو مگر وہاں سے جو اطلاعات پہنچتی تھیں ان سے قیس کے طرزِ عمل کا مشکوک سمجھا جانا کوئی بعید نہ تھا انہوں نے مصر پہنچنے کے بعد خربتا کے عثمانیوں سے کوئی تعرض نہ کیا اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا حالانکہ ایسے لوگ حکومت کے باغیوں میں شمار ہوتے ہیں اور باغیوں سے مراعات کا جواز کسی قاعدہ و قانون سے ثابت نہیں ہے۔ البتہ اس صورت میں انہیں ان کے حال پر چھوڑ دینے کا جواز نکل سکتا تھا جب انہیں دبانے کی قوت و طاقت نہ ہوتی۔ اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قیس دس ہزار عثمانیوں کو کچلنے کی طاقت بہم نہ پہنچا سکتے تھے۔ پھر جب معاویہ نے انہیں اپنے حزب میں شامل ہونے کی دعوت دی تو انہوں نے کھل کر نہ ان کی پیشکش کو ٹھکرایا اور نہ اُسے قبول کیا جس سے اُن کا موقف اور مشکوک ہو گیا۔ اور جب انہوں نے کھل کر دو ٹوک جواب دیا تو معاویہ کو کیا ضرورت تھی کہ ان کے خط کا اعلان کرتے جبکہ وُہ یہ تاثر دینے کی فکر میں تھے کہ قیس ان کے ہمخیال و ہمنوا ہیں۔ چنانچہ انہوں نے فرضی خط کے ذریعہ شامیوں اور کوفیوں کے ذہنوں میں یہ بٹھا دیا کہ قیس انہی کے آدمی ہیں۔ ان حالات میں اگر قیس کے بارے میں شبہ یا سُوءِ ظن پیدا ہو جائے تو اسے انسان کی ذہنی روش کے خلاف نہ سمجھنا چاہیئے بلکہ ایسا ہونا ہی چاہیئے تھا البتہ امیرالمومنین نے ان کے بارے میں اپنے اعتماد

کو بحال رکھا نہ کسی موڑ پر ان کی وفاداری میں شبہہ کیا اور نہ ان کے متعلق اڑتی ہوئی خبروں کی تصدیق کرنے پر آمادہ ہوئے۔ مگر اس کے باوجود انہیں امارت مصر پر بحال رکھنا مشکل تھا اس لئے کہ اہل کوفہ جن کے مزاج کی بے ثباتی ڈھکی چھپی ہوئی نہیں ہے وُہ اس کے خلاف ہنگامہ کھڑا کر دیتے اور مصر میں جنگ چھڑنے کی صورت میں عملی تعاون سے گریز کرتے اور کوفہ ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں سے ضرورت کے موقع پر کمک مہیا کی جا سکتی تھی اس عدم تعاون کا نتیجہ یہ ہوتا کہ قیس مصریوں کی سپاہ کے ساتھ شامیوں کے مقابلہ سے عہدہ برآ نہ ہو سکتے۔ اہل کوفہ نے تو محمد ابن ابی بکر کی جوان کی مرضی کے ماتحت والیٔ مصر مقرر کئے گئے تھے مدد نہ کی تو قیس کی مدد کے لئے کیا آمادہ ہوتے جبکہ وُہ ان کی معزولی و برطرفی کے حامی تھے۔ چنانچہ جب لشکر شام مصر پر چلا آور ہوا ہے تو محمد کے چیخنے چلانے اور فریاد کرنے کے باوجود ان میں سے کوئی ٹس سے مس نہ ہُوا۔ اور جب امیرالمومنین کے جھنجھوڑنے کے بعد جانے پر آمادہ ہُوئے تو اس وقت جب مصر پر شامیوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اس صورت حال کے پیش نظر امیرالمومنین قیس کو معزول کرنے پر مجبور ہو گئے حالانکہ وُہ دل سے ان کی برطرفی کے حق میں نہ تھے۔ اور پھر حضرت کے سامنے صرف مصر اور وہاں کے شوریدہ سر عثمانیوں ہی کا مسئلہ نہ تھا بلکہ معاویہ سے جنگ آزما ہونے کی کٹھن مہم بھی درپیش تھی جسے سر کرنے کے لئے قیس ایسے افراد کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا جن کی ہمّت و جرأت اور اصابت رائے کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی تھی۔ اسی لئے قیس کا حضرت کے پاس پہنچ جانا معاویہ کے لئے ایک المیّہ تھا۔ وُہ تو یہ سمجھ رہے تھے کہ قیس امارت سے الگ کر دیئے جانے کے بعد حضرت سے اپنی وابستگی ختم کر دیں گے اور ہمیشہ کے لئے ان سے علیحدگی اختیار کر لیں گے مگر یہ چھچھوری کم ظرف اور مفاد پرست طبیعتوں کا خاصہ ہے اور قیس کی حق پسندی و بلند نفسی یہ گوارا نہ کر سکتی تھی کہ وُہ منصب کے چھن جانے سے حق کا ساتھ چھوڑ دیں اور ایسے ہی موقعوں پر انسان کی بلندی کا معیار قائم ہوتا ہے اور اس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگایا جاتا ہے۔ اگرچہ معاویہ جعل و فریب کے ذریعہ قیس کو امارت مصر سے الگ کرنے میں کامیاب ہو گئے مگر امر واقعہ یہ ہے کہ انہیں قیس کا امارت مصر پر باقی رہنا اتنا ناگوار نہ گزرتا جتنا جنگ صفین میں حضرت کا دست و بازو بن کر شامل ہونا ناگوار گزرا ہو گا۔ چنانچہ صفین کے آخری معرکوں میں انہیں یہ کہتے سنا گیا کہ اگر جنگ بند نہ ہوئی تو کل قیس ہمیں صفحۂ ہستی سے مٹا کر دم لیں گے۔

جنگ صفین

شام اموی اقتدار کا گہوارہ اور معاویہ ابن ابی سفیان کا پائے تخت تھا جہاں وُہ خلافت ثانیہ کے زمانے سے اقتدار پر قابض تھے اور اس طویل عہد امارت کی وجہ سے انہوں نے مضبوطی سے قدم جما رکھے تھے اور ایک خود مختار حکمران کی طرح شام ایسے وسیع و زرخیز علاقہ پر اپنا پرچم لہرا رہے تھے۔ جب امیرالمومنین مسندِ

خلافت پر متمکن ہوئے تو انہوں نے قلمرو مملکت کے تمام عمال کو معزول کر کے نئے عمال مقرر کئے۔ چنانچہ مصر میں قیس ابن سعد یمن میں عبید اللہ ابن عباس اور البصرہ میں عثمان ابن حنیف بھیجے گئے اور انہوں نے بغیر کسی خاص روک رکاؤ کے عہدے سنبھال لئے کوفہ کی طرف عمارہ ابن شہاب کو اور شام کی طرف سہل ابن حنیف کو روانہ کیا گیا۔ عمارہ کوفہ جاتے ہوئے جب زبالہ کے مقام پر پہنچے تو طلحہ ابن خویلد اسدی مانع ہوا اور کہا کہ تم یہیں سے واپس چلے جاؤ ورنہ ہم تمہیں قتل کر دیں گے۔ چنانچہ وہ واپس چلے آئے اور سہل ابن حنیف شام جاتے ہوئے جب وادئ تبوک کے قریب پہنچے تو معاویہ کے مقرر کردہ ایک شامی دستہ نے ان کا راستا روک لیا اور پوچھا کہ تم کون ہو اور کہاں جانا چاہتے ہو کہا کہ میں امیر المومنین علی ابن ابی طالب کی طرف سے شام کا عامل ہوں۔ کہا کہ ہم معاویہ کے علاوہ کسی کو شام کا حکمران تسلیم نہیں کرتے تم جدھر سے آئے ہو ادھر واپس پلٹ جاؤ ورنہ ہماری تلواریں تمہیں آگے بڑھنے سے روکیں گی۔ سہل اس جمعیت کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے مجبوراً واپس چلے آئے اور حضرت کی خدمت میں پہنچ کر صورت حال بیان کی۔ امیر المومنین پہلے ہی سے سمجھ رہے تھے کہ معاویہ شام سے بآسانی دستبردار نہ ہوں گے اور ایک دن عراقیوں اور شامیوں کے درمیان جنگ کے شرارے بھڑکیں گے مگر آپ نے اتمام حجت سے پہلے ان کے خلاف قدم اٹھانا گوارا نہ کیا اور کوشش کی کہ گفت و شنید اور افہام و تفہیم سے معاملہ یکسو ہو جائے۔ چنانچہ آپ نے حجاج ابن غزیہ انصاری کو ایک خط دے کر معاویہ کے پاس بھیجا اور اُن سے مطالبہ کیا کہ وہ شامیوں کے وفد کے ساتھ مدینہ آئیں اور بیعت کریں۔ معاویہ نے خط پڑھا مگر اسے کوئی اہمیت نہ دی اور حجاج سے کہا کہ تم واپس چلے جاؤ میں اپنے آدمی کے ہاتھ جواب بھیج دوں گا۔ حجاج واپس چلے آئے اور معاویہ نے ایک پلندہ قبیصہ عبسی کو دے کر حضرت کے پاس بھیجا اس نے مدینہ پہنچ کر وہ پلندہ امیر المومنین کو دیا حضرت نے اسے کھولا تو اس میں فقط یہ لکھا تھا "معاویہ ابن ابی سفیان کی طرف سے علی ابن ابی طالب کے نام" حضرت نے اس سے دریافت کیا کہ اس کا مطلب کیا ہوا اس نے ایک نظر ان لوگوں پر ڈالی جو اس موقع پر جمع ہو گئے تھے اور ان سے پوچھا کہ تم میں بنی عبس کے بھی لوگ ہیں ان لوگوں نے کہا کہ ہاں وہ بھی ہیں کہا کہ اب میری بات غور سے سنئے اور نتائج پر نظر کیجئے میں جامع دمشق میں پچاس ہزار شیوخ و اکابر کو عثمان کے خون بھرے پیراہن کے نیچے روتا چھوڑ کر آیا ہوں ان کی ڈاڑھیاں آنسوؤں سے تر ہیں شور و شیون کی صدائیں بلند ہیں اور وہ اللہ سے عہد کئے ہوئے ہیں کہ جب تک قاتلان عثمان کے خون سے اپنی تلواریں رنگین نہیں کر لیں گے چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ اس پر خالد ابن زفر عبسی نے کہا:۔

بئس لعمر اللہ وافد الشام انت	خدا کی قسم تم شام کے بہت برے سفیر ہو۔ کیا
اتخوف المهاجرين والانصار	مہاجرین و انصار کو شام کے لشکر اور قمیص عثمان
بجنود اهل الشام وبكائهم على	پر ان کے رونے دھونے سے خوفزدہ کرنا چاہتے
قميص عثمان فو اللہ ما هو	ہو خدا کی قسم عثمان کا کرتہ یوسف کی قمیص نہیں ہے

بقمیص یوسف ولا بحزن یعقوب　　　اور نہ ان کا رنج و غم یعقوب کا حزن و اندوہ ہے"

(اخبار الطوال۔ صفحہ ۱۴۲)

حضرت نے معاویہ کے یہ رنگ ڈھنگ دیکھے تو ایک فوج جمع کی اور شام جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ابھی شام کی طرف کوچ نہ کیا تھا کہ طلحہ و زبیر کی شورش و ہنگامہ آرائی کی اطلاع پہنچی آپ نے شام جانے کے بجائے ان کا تعاقب کیا اور بصرہ میں خونریز جنگ لڑ کر اس فتنہ کو کچل دیا۔ جب اس بغاوت کو فرو کر کے کوفہ میں آئے تو معاویہ کی طرف کسی کو پیغامبر بنا کر بھیجنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ یمن کے معزول شدہ عامل جریر ابن عبداللہ بجلی نے اس خدمت کی انجام دہی کے لئے اپنے کو پیش کیا اور کہا کہ میں معاویہ سے اپنے دیرینہ تعلقات کی بنا پر بیعت لینے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ مالک اشتر نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ یہ در پردہ اہل شام کا ہمنوا اور معاویہ کا دوست ہے یہ شخص کام سنوارنے کے بجائے اور بگاڑے گا لہٰذا اسے نہ بھیجا جائے۔ حضرت نے فرمایا کہ اسے فی الحال جانے دیا جائے دیکھیں یہ کیا کارنامہ انجام دیتا ہے۔ چنانچہ اسے ایک خط دے کر شام روانہ کیا جس کا مضمون یہ تھا کہ "مہاجرین و انصار میرے ہاتھ پر بیعت کر چکے ہیں اب تمہارے لئے بیعت سے انکار کا کوئی جواز نہیں ہے تمہیں وہی طریق کار اختیار کرنا چاہیئے جو اہل مدینہ نے اختیار کیا ہے۔ رہا قصاص عثمان کا مسئلہ تو تم بیعت کے بعد اسے میرے سامنے پیش کرنا میں کتاب و سنت کے مطابق اس کا فیصلہ کروں گا۔" جب جریر یہ خط لے کر معاویہ کے ہاں گیا تو انہوں نے خط پڑھ کر جریر سے کہا:۔

اکتب الی علی ان یجعل لی الشام و انا ابایع له۔ (تاریخ الاسلام ذہبی ج ۲۔ صفحہ ۱۶۵)　　　تم علی کو لکھو کہ وہ شام کا علاقہ میرے نام کر دیں پھر میں بیعت کر لوں گا۔"

پھر کچھ سوچ بچار کے بعد کہا کہ تم کچھ دن توقف کرو تاکہ میں اہل شام سے بات چیت کر کے ان کی رائے معلوم کروں اور جو اُن کی رائے ہوگی وہی میرا آخری فیصلہ ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے بھائی عتبہ ابن ابی سفیان کو بُلا کر مشورہ کیا۔ عتبہ نے کہا کہ تم عمرو ابن عاص کو اپنے ہاں بلاؤ اور اس کی سوجھ بوجھ سے فائدہ اٹھاؤ وہ یقیناً تمہارا معاون و دوست راست ثابت ہوگا بشرطیکہ جو شرط وہ منوانا چاہے اسے مان لو۔ معاویہ کو یہ رائے پسند آئی اور اس نے عمرو ابن عاص کو تحریر کیا کہ "تمہیں معلوم ہو چکا ہوگا کہ علی نے طلحہ و زبیر اور ام المومنین کے ساتھ کیا برتاؤ کیا ہے اور اب میری طرف متوجہ ہوئے ہیں اور جریر ابن عبداللہ بجلی کو بیعت کے لئے میرے پاس بھیجا ہے۔ میں تم سے مشورہ کئے بغیر کوئی قدم اٹھانا نہیں چاہتا لہٰذا جلد از جلد میرے پاس پہنچنے کی کوشش کرو۔" عمرو نے یہ خط پڑھا تو سمجھ گیا کہ معاویہ بیعت کے سلسلہ میں تو مشورہ کے طالب نہیں ہیں اس لئے کہ بیعت کا لازمی نتیجہ امارت شام سے دستبرداری ہے اور وہ کسی قیمت پر امارت کو اپنے ہاتھ سے دینا

گوارا نہ کریں گے۔ یہ مشورہ علی کے مقابلہ میں محاذ جنگ قائم کرنے کے سلسلہ میں ہے اور صرف مشورہ ہی نہیں ہے بلکہ عملاً مجھے شریک جنگ کرنا چاہتے ہیں۔

عمرو نے ذہنی طور پر جانے یا نہ جانے کا فیصلہ کر لیا ہوگا تاہم اس نے اپنے فیصلہ کی تائید حاصل کرنے کے لئے اپنے دونوں بیٹوں عبداللہ اور محمد سے بھی اس خط کا ذکر کر کے ان کی رائے دریافت کی۔ عبداللہ نے کہا کہ آپ خلیفہ ہونے سے تو رہے بہتر یہ ہے کہ گھر کے گوشہ میں بیٹھے رہئے اور تھوڑی سی دنیا کے لئے دین کو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے۔ محمد نے اس کے برخلاف رائے دی اور کہا کہ ایسے زرین مواقع ہر روز میسّر نہیں آیا کرتے آپ جائیں اور ضرور جائیں۔ آپ عرب کی گمنام شخصیت نہیں ہیں آپ کی رائے کی قدر و قیمت ہے جدید حکومت کی تشکیل ہو رہی ہے اس میں آپ کی رائے کو شامل ہونا چاہئے ایسا نہ ہو کہ خلافت کا تصفیہ ہو جائے اور آپ کا کہیں ذکر تک نہ آئے۔ عمرو نے ان دونوں رایوں کو سنا تو کہا:۔

اما انت یا عبداللہ فامرتنی بما	اے عبداللہ تم نے وہ بات کہی ہے جو میرے لئے
ھو خیر لی و اخرتی و اسلم فی	آخرت کے لحاظ سے بہتر ہے اور جس سے میرا
دینی و اما انت یا محمد فامرتنی	دین بھی سلامت رہتا ہے اور اے محمد تم نے
بما ھو خیر لی فی دنیای و شر لی	وہ بات کہی ہے جو میرے لئے دنیوی اعتبار سے
فی اخرتی۔ (اخبار الطوال ص۱۴۱)	بہتر اور عقبیٰ کے اعتبار سے تباہ کن ہے"۔

عبداللہ اور محمد کی رائے معلوم کرنے کے بعد اس نے اپنے غلام وردان سے دریافت کیا کہ تمہاری کیا رائے ہے اس نے کہا کہ آپ ایک ایسے دوراہے پر کھڑے ہیں جہاں ایک طرف دنیا ہے اور دوسری طرف آخرت، دنیا معاویہ کے ساتھ ہے اور آخرت علی کے ساتھ۔ آپ کبھی دنیا کی طرف جھکتے ہیں اور کبھی آخرت کا خیال عناں گیر ہوتا ہے۔ بہتر تو یہی تھا کہ آپ گھر میں بیٹھے رہتے اور کسی کا ساتھ نہ دیتے مگر مجھے ایسا نظر آرہا ہے کہ آپ کا اندرونی تذبذب عارضی ہے اور انجام کار آپ آخرت کے مقابلہ میں دنیا اختیار کریں گے اور علی کے مقابلہ میں معاویہ کا ساتھ دیں گے۔ عمرو نے یہ سنا تو کہا:۔

یا قاتل اللہ وردانا و قدحتہ ابدی لعمرك ما فی النفس وردان

"خدا ہی وردان کو اس کی باریک بینی کی داد دے میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ وردان نے چھپی ہوئی حقیقت کو ظاہر کر دیا ہے"۔

عمرو ابن عاص کو امارت مصر کی دل سے خواہش تھی اور اس دیرینہ آرزو کی تکمیل کا اس سے بہتر موقع ہاتھ آنا مشکل تھا چنانچہ اس نے معاویہ کے ہاں جانے کا سر و سامان کیا اور اپنے دونوں بیٹوں اور وردان کو لے کر دمشق پہنچ گیا۔ معاویہ منتظر تو تھے ہی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور رسمی بات چیت کے بعد کہا کہ میں نے تمہیں اس لئے تکلیف دی ہے کہ مجھے اس وقت تین الجھنوں کا سامنا ہے اور ابھی تک ان کا

کوئی حل تلاش نہیں کر سکا۔ مجھے امید ہے کہ تم انہیں سلجھانے میں میری مدد کر سکو گے کہا کہ میں سنوں کہ وہ الجھنیں کیا ہیں کہا کہ ایک الجھن یہ ہے کہ مجھے یہ خبر دی گئی ہے کہ محمد ابن ابی حذیفہ قید خانہ کا دروازہ توڑ کر اپنے ساتھیوں سمیت نکل بھاگا ہے مجھے اس سے اور اس کے ساتھیوں سے خطرناک اقدام کا اندیشہ ہے۔ دوسری الجھن یہ ہے کہ قیصر روم شام پر چڑھائی کا منصوبہ باندھ رہا ہے تاکہ اُسے اپنے علاقہ میں شامل کر لے۔ اور تیسری الجھن یہ ہے کہ جریر ابن عبداللہ بجلی علی کا یہ پیغام لے کر آیا ہے کہ میں بیعت کر دوں یا جنگ کے لئے تیار ہو جاؤں۔ عمرو نے کہا کہ اگر ابن ابی حذیفہ جیل کا دروازہ توڑ کر نکل گیا ہے تو تمہیں اس کی طرف سے کوئی اندیشہ نہ ہونا چاہئے۔ تم کچھ سوار اس کے تعاقب میں بھیج دو اگر وہ گرفتار ہو گیا تو بہتر ورنہ وہ تمہارا کچھ بگاڑ نہ سکے گا۔ رہا قیصر روم کے حملہ آور ہونے کا اندیشہ، تو اس کی روک تھام کے لئے یہ کرو کہ جتنے رُومی تمہارے ہاں قید و بند میں ہیں انہیں رہا کر دو اور چند خوبصورت کنیزیں اور سونے چاندی کے ظروف اُسے بطور تحفہ بھجوا دو اور صلح کا پیغام دو وہ ان چیزوں کو رد نہیں کرے گا اور صلح پر آمادہ ہو جائے گا۔ البتہ علی ابن ابی طالب کا معاملہ ان دونوں سے مختلف ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ وہ ایک تجربہ کار جرنیل اور جس منصب پر فائز ہیں اس کے اہل ہیں اور تمہارا اور ان کا کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے۔ معاویہ نے کہا کہ مجھے ان کے فضل و شرف سے انکار نہیں مگر انہوں نے فتنہ و شر کو ہوا دی جماعت میں تفرقہ ڈالا اور قاتلان عثمان کی ہمت افزائی کی ہے لہٰذا ہمارا فریضہ ہے کہ ہم ان سے قصاص کا مطالبہ کریں اور اسی قصاص طلبی کے لئے میں نے تمہیں بلایا ہے۔ عمرو نے کہا کہ تم نے مجھے اس غرض سے بلوایا ہے کہ میں لوگوں کو بہلا پھسلا کر تمہارے پرچم کے نیچے جمع کروں اور تم نے مجھ ہی کو جل فریب دینا شروع کر دیا ہے۔ اس بات پر کون یقین کرے گا کہ تم قصاص عثمان کے لئے جنگ لڑنا چاہتے ہو جبکہ دنیا جانتی ہے کہ عثمان نے محاصرہ کے دنوں میں مدد مانگی تو تم نے عمداً پہلو تہی کی اور موت کو ان کے سر پر منڈلاتے دیکھ کر خاموشی اختیار کر لی اور میں بھی انہیں بے یار و مددگار چھوڑ کر فلسطین چلا آیا۔ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ تعاون کروں تو مجھ سے لاگ لپیٹ کی باتیں نہ کرو میں تمہیں خوب پہچانتا ہوں اور تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو۔ صاف بات یہ ہے کہ علی کے اسلامی خدمات علمی بلندی اور ہجرت و سبقت کے شرف کو دیکھتے ہوئے مجھے ان سے لڑنے کا حوصلہ نہیں ہوتا یہ کسی بڑے دل گردے والے ہی کا کام ہے۔ معاویہ سمجھ گئے کہ یہ ایک رسمی عذر خواہی ہے اگر وہ علی سے لڑنے پر اپنے کو آمادہ نہ پاتا تھا تو اسے ضرورت ہی کیا تھی کہ میرے پیغام پر فوراً پہنچ جاتا۔ اس نے سفر اختیار کیا ہے تو حالات کا بنظر غائر جائزہ لے کر اور یہ سمجھ کر کہ علی کے خلاف معرکہ آرائی میں حصہ لینا ہو گا اور اب اس سے دبے الفاظ میں معذرت کا مقصد اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ وہ معاملہ کی سنگینی و اہمیت کو واضح کر کے منہ مانگی قیمت مانگے اور اپنا مطالبہ منوائے۔ چنانچہ یہی ہوا اور عمرو نے کچھ پس و پیش کے بعد کہا:۔

ولکن مالی ان شایعتك علی امرك حتی تنال ما ترید (اخبار الطوال ص۱۵۸)	اگر میں تمہارے ساتھ اشتراک عمل کروں یہاں تک کہ تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ تو میرا اس میں حصہ کیا ہو گا؟"

معاویہ تو جانتے ہی تھے کہ یہ سودا بازی کئے بغیر آمادۂ تعاون نہیں ہو گا پوچھا کہ مجھے اس کی کیا قیمت ادا کرنا پڑے گی؟ کہا:-

اجعل لی مصر طعمة مادامت لك ولایة۔ (اخبار الطوال ص۱۵۸)۔	جب تک تمہاری حکومت رہے مصر کی حکومت میرے نام واگزار کر دو"۔

معاویہ نے یہ مطالبہ سنا تو بہت سٹپٹائے۔ قیمت توقع سے کہیں زیادہ تھی نہ اقرار کرتے بنتی تھی اور نہ انکار۔ نظر بھر کر عمرو کی طرف دیکھا اور کہا کہ اگرچہ میں تم سے جھوٹا وعدہ کر سکتا ہوں مگر غلط بیانی کر کے تمہیں فریب دینا نہیں چاہتا۔ عمرو نے کہا کہ مجھے فریب دے کر بھی دیکھ لیں میں تمہارے ہر داؤ پیچ کا توڑ جانتا ہوں۔ معاویہ نے کہا تم ذرا مجھ سے قریب ہو جاؤ میں تمہارے کان میں ایک راز کی بات کہنا چاہتا ہوں۔ عمرو آگے بڑھا اور اپنا کان معاویہ کے ہونٹوں کے قریب کیا۔ معاویہ نے شاطرانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا کہو کیسی رہی آ گئے نا جھانسے میں۔ کہا کب اور کیسے؟ کہا کہ اسی جگہ اور اسی وقت تم ذرا سوچتے کہ اس مقام پر میرے اور تمہارے علاوہ کوئی تیسرا آدمی موجود نہیں ہے اور نہ اندر کی آواز باہر سنائی دی جا سکتی ہے پھر راز کی بات کہنے کے لئے تمہیں قریب کرنے اور تمہارے قریب ہونے کے معنی ہی کیا ہوتے ہیں۔ جب تم چوکنا ہونے کے باوجود فریب میں آ سکتے ہو تو بعد میں بھی تمہیں بآسانی فریب دیا جا سکتا ہے۔ میں تمہیں یہ مشورہ دوں گا کہ تم اپنے مطالبہ پر نظر ثانی کرو۔ اگر تم اس پر مصر رہے تو لوگوں میں یہ چرچے ہوں گے کہ تم نے امارت مصر کی خاطر یہ قدم اٹھایا ہے عمرو نے کہا کہ لوگوں کی باتوں کو چھوڑئے اب ان حیلہ طرازیوں سے کام نہیں چلے گا اگر تمہیں یہ شرط منظور ہے تو میری تمام کوششیں تمہارے لئے وقف ہوں گی ورنہ تم جانو اور تمہارا کام میں اس معاملہ میں تمہارا ساتھ نہیں دوں گا۔ یہ کہہ کر عمرو اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی قیام گاہ پر چلا آیا۔

عتبہ ابن ابی سفیان کو معاویہ اور عمرو کی باہمی گفتگو کا علم ہوا تو اس نے معاویہ سے کہا:-

اما ترضی ان تشتری عمرا بمصر۔ (اخبار الطوال ص۱۵۸)	کیا تم اس پر راضی نہیں کہ مصر کے بدلے عمرو کو خرید لو"۔

معاویہ نے کہا کہ ابھی میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا آج رات اس پر غور کروں گا اور پھر کسی نتیجہ پر پہنچ سکوں گا۔ چنانچہ اس نے وہ رات سوچ بچار میں گزاری اور آخر یہ فیصلہ کیا کہ عمرو کی ہوشیاری و چالاکی سے فائدہ اٹھانے کے لئے اس سے مصر کی حکومت کا وعدہ کر لینا چاہئے۔ چنانچہ عمرو کو بلا کر اس سے

امارت مصر کا عہد و پیمان کیا اور رسمی طور پر ایک دستاویز تحریر کر کے دے دی۔ عمرو اس دستاویز کو لے کر خوش خوش اپنی منزل پر آیا اور اپنے ایک چچازاد بھائی سے اس دستاویز کا ذکر کیا اس نے پیشانی پر بل ڈال کر کہا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم قریش کو کیا مُنہ دکھاؤ گے اور کیونکر اپنے قبیلہ میں عزت و آبرو کی زندگی بسر کر سکو گے جبکہ تم نے دین فروشی کر کے اپنی شخصیت و شہرت کو داغدار کر لیا ہے۔ عمرو نے کہا کہ اگر میں علی کے ساتھ ہوتا تو میرے لئے گھر کی چار دیواری کافی تھی اور اب تو میں معاویہ کے ساتھ ہوں گھر کی چار دیواری پر قناعت کر کے نہیں بیٹھ سکتا۔ کہا کہ معاویہ نے کھلے بندوں تمہارا دین خرید لیا ہے اور تم دنیا کی خاطر اس کے پیچھے لگ گئے ہو۔ معاویہ کو اس گفتگو کا علم ہوا تو وہ بہت برہم ہوئے اور حکم دیا کہ اسے گرفتار کر لیا جائے تاکہ دوسروں کو بہکانے نہ پائے۔ اس نے گرفتاری کا حکم سنا تو چپکے سے نکل کھڑا ہوا اور جان سلامت لے کر امیر المومنین کی خدمت میں پہنچ گیا۔ اس کی زبانی عمرو و معاویہ کے معاہدہ کی خبر عام ہو گئی اور ان کے جنگی عزائم کھل کر سامنے آ گئے۔

اس معاہدہ کی تکمیل کے بعد عمرو نے معاویہ کو یہ دُور رس مشورہ دیا کہ ابھی خلافت کا ذکر نہ چھیڑا جائے بلکہ اہل شام کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی جائے کہ عثمان کے قتل کی ذمہ داری علی پر عائد ہوتی ہے انہی نے لوگوں کو ان کے خلاف بھڑکایا اور جب وہ قتل کر دیئے گئے تو ان کے قاتلوں کو اپنی پناہ میں لے لیا اور جب عوام کے ذہنوں میں یہ چیز اتر جائے تو ان کے تعاون سے جنگ چھیڑ دی جائے اور جنگ میں کامیابی کے بعد اقتدار کی راہ خود ہی ہموار ہو جائے گی۔ البتہ عوام کو ہمنوا بنانے کے لئے با اثر افراد کے تعاون کی ضرورت ہے اور اس وقت عبادہ ابن صامت انصاری شام میں موجود ہیں جن کا اہل شام پر بہت اثر ہے پہلے انہیں ہمخیال بنانا چاہیئے اگر ہم انہیں اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گئے تو شام کی ہر فرد ہمارے ساتھ اشتراک و تعاون کرے گی معاویہ نے اس تجویز کو سراہا اور ایک پیغامبر کے ذریعہ انہیں اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔ جب عبادہ ان کے ہاں آئے تو معاویہ اور عمرو ابن عاص دونوں پہلو بہ پہلو کندھے سے کندھا ملائے بیٹھے تھے عبادہ کو دیکھا تو دونوں تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے عبادہ آگے بڑھ کر ان دونوں کے درمیان بیٹھ گئے۔ معاویہ نے انہیں ہموار کرنے کے لئے ان کی بڑی تعریف کی اور پھر حضرت عثمان کے محاسن و فضائل بیان کر کے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ ان کا خون رائیگاں نہ جائے لہذا قصاص کے سلسلہ میں آپ ہمارا ساتھ دیں۔ عبادہ نے کہا کہ تم لوگوں نے جو کچھ کہا ہے میں نے سن لیا ہے مگر پہلے یہ بتاؤ کہ میں عام دستور کے برخلاف تم دونوں کے درمیان کیوں بیٹھا ہوں کہا کہ آپ کے فضل و شرف کا یہی تقاضا تھا کہ آپ ہم دونوں کے درمیان بیٹھیں اور ہم آپ کے دائیں بائیں بیٹھیں۔ کہا کہ یہ وجہ نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم غزوۂ تبوک میں رسول اللہ کی رکاب میں چل رہے تھے کہ انہوں نے تم دونوں کو ساتھ چلتے اور باتیں کرتے دیکھا تو اس موقع پر فرمایا:

اذا رأیتموهما اجتمعا ففرقوا بینهما فانہما لا یجتمعان علی خیر ابداً۔ (عقد الفرید ج۳ ص۱۱)

جب ان دونوں کو یکجا بیٹھا دیکھو تو انہیں الگ الگ کر دو اس لئے کہ یہ کبھی بھلائی کے کام کے لئے جمع نہیں ہوں گے۔"

لہٰذا میں تمہیں یکجا ہونے سے منع کرتا ہوں اور تم دونوں کے درمیان بیٹھنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ تم دونوں میں کچھ فاصلہ حائل ہو جائے۔ باقی رہا تمہاری ہمنوائی کا مسئلہ تو میں اس کے لئے تیار نہیں ہوں۔

اب معاویہ نے عمرو کے مشورہ سے شرجیل ابن سمط کندی کو اپنا ہمخیال بنانے کے لئے تحریر کیا کہ "کوفہ سے جریر ابن عبد اللہ بجلی بیعت کا مطالبہ لے کر آیا ہے یہ معاملہ ایسا نہیں ہے کہ تم سے مشورہ کئے بغیر اس کا فیصلہ کر لیا جائے لہٰذا جلد از جلد میرے پاس پہنچو۔" جب شرجیل کو یہ خط ملا تو اس نے چند نمایاں افراد سے مشورہ کیا کہ اسے جانا چاہیئے یا نہیں جانا چاہیئے کچھ لوگوں نے جانے کا مشورہ دیا اور کچھ لوگوں نے اس کے خلاف رائے دی۔ فقیہہ شام عبد الرحمٰن ابن غنم ازدی نے کہا کہ ہم سن چکے ہیں کہ عثمان کے قتل میں علی کا ہاتھ ہے۔ اگر واقعاً ایسا ہی ہے تو مہاجرین و انصار ان کے ہاتھ پر بیعت کر چکے ہیں اور یہ بیعت ہمارے لئے حجت ہے اور اگر قتل عثمان میں وہ شریک نہیں ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ تم معاویہ کے ہاں جاؤ اور بے سوچے سمجھے ان کے ساتھ ہو جاؤ۔ بہتر ہے کہ کسی غلط فہمی کا شکار ہونے کے بجائے تم علی کے پاس جاؤ اور ان کی بیعت کرو اور انہیں اپنے قوم و قبیلہ کی اطاعت و فرمانبرداری کا یقین دلاؤ مگر اس نے یہ مشورہ قابل قبول نہ سمجھا اور معاویہ کے ہاں جانے کے لئے آمادہ ہو گیا۔

معاویہ نے عمرو کے مشورہ سے ایک داؤ یہ کھیلا کہ شرجیل کے راستے میں مختلف جگہوں پر یزید ابن اسد، بسر ابن ارطاۃ، سفیان ابن عمر، مخارق ابن حارث، حمزہ ابن مالک، حابس ابن سعد اور چند رؤسائے یمن کو کھڑا کر دیا اور انہیں یہ ہدایت کی کہ جب شرجیل ادھر سے گزرے تو اپنی ملاقات کو اتفاقیہ ظاہر کر کے اسے یہ تاثر دیں کہ عثمان کے قتل کی ذمہ داری علی کے علاوہ کسی پر عائد نہیں ہوتی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اسے ہر منزل پر ان میں سے کوئی نہ کوئی آدمی ملتا اور باتوں باتوں میں اسے بتاتا کہ علی عثمان کے قتل میں برابر کے شریک ہیں۔ یہ لوگ شرجیل کے نزدیک نہایت درجہ قابل اعتماد و وثوق تھے جو حمص سے لے کر دمشق تک برابر اس کے کان بھرتے چلے آئے جس کے بعد اسے علی کے قاتل عثمان ہونے میں کوئی شبہہ نہ رہا۔ جب وہ حدود دمشق میں داخل ہوا تو معاویہ نے اکابر شام کو اس کی پیشوائی کے لئے کہا جنہوں نے آگے بڑھ کر اس کا پرجوش خیر مقدم کیا اور معاویہ کے حسب ہدایت اسے یہی تاثر دیا کہ قتل عثمان کی تمامتر ذمہ داری علی پر عائد ہوتی ہے۔ جب وہ استقبال کرنے والوں کے جھرمٹ میں معاویہ کے ہاں پہنچا تو معاویہ نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور رسمی گفتگو کے

بعد کہا کہ علی مجھ سے بیعت کے طالب ہیں مجھے ان کی بیعت سے انکار تو نہیں ہے مگر وہ عثمان کے قاتل ہیں شرجبیل نے کہا کہ پھر تمہاری کیا رائے ہے کہا کہ میری رائے وہی ہو سکتی ہے جو اہل شام کی رائے ہو۔ اگر وہ بیعت کے لئے کہیں گے تو بیعت کر لوں گا اور اگر بیعت سے روکیں گے تو رُک جاؤں گا۔ اور تمہیں بلایا ہے تو اسی غرض سے بُلایا ہے کہ تمہاری رائے دریافت کروں۔ کہا کہ مجھے تھوڑی سی مہلت دیجئے تاکہ میں یہاں گھوم پھر کر حالات کا جائزہ لوں اور قاتلین عثمان کے سلسلہ میں مزید اطمینان کر لوں معاویہ نے کہا کہ یہ مناسب رائے ہے۔ چنانچہ وُہ نکل کھڑا ہوا اور جس شخص سے بھی گفتگو کرتا وُہ یہی کہتا کہ علی عثمان کے قاتل ہیں۔ اور اس کے خلاف لب کشائی کی جرأت کون کرتا جبکہ زبانوں پر جبر و استبداد کا پہرا بیٹھا ہوا تھا اور ہر طرف معاویہ کے آدمی پھیلے ہوئے تھے جن کا کام ہی یہ تھا کہ انہیں ایک ایک بات کی خبر دیتے رہیں۔ جب شرجبیل ہر سمت سے یہی ایک آواز سُنتا ہوا واپس آیا تو اس کے جذبات پُوری طرح سے بھڑک چکے تھے۔ اس نے آتے ہی معاویہ سے تند و تیز لہجہ میں کہا۔

ابی الناس الا ان ابن ابی طالب قتل عثمان واللہ لئن بایعتہ لنخرجنك من الشام۔ (اخبار الطوال ۱۵۹)

کسی کو بھی اس سے انکار نہیں ہے کہ ابن ابی طالب نے عثمان کو قتل کیا ہے اگر تم نے ان کی بیعت کی تو ہم تمہیں شام سے نکال باہر کریں گے۔

معاویہ نے جب دیکھا کہ شرجبیل پر ان کا جادو چل گیا ہے اور اب اس کا یقین ڈانواں ڈول ہونے والا نہیں ہے تو اس کی آواز میں آواز ملاتے ہوئے کہا کہ جب تمہاری یہ رائے ہے تو ہماری بھی یہی رائے ہے اور یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ عثمان بے گناہ مارے جائیں اور ہم ان کے قاتلوں کی بیعت کریں۔ ہمارا اولین فریضہ یہ ہے کہ ہم ان کے خون کا انتقام لیں۔ لیکن انتقام کے لئے ضروری ہے کہ رائے عامہ ہمارے ساتھ ہو اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ عوام کو یہ بتایا جائے کہ علی، عثمان کے قاتل ہیں تاکہ ان کے تعاون سے خلیفہ مظلوم کے خون کا قصاص لیا جا سکے اور یہ کام تم ہی انجام دے سکتے ہو کیونکہ شام میں جتنا تمہیں اثر و نفوذ حاصل ہے وُہ کسی اور کو حاصل نہیں ہے ہر شخص تمہاری آواز پر لبیک کہے گا اور ایک دنیا سمٹ کر ہمارے گرد جمع ہو جائے گی۔ لہٰذا تم شام کے مختلف شہروں کا دورہ کرو لوگوں کو بتاؤ کہ علی عثمان کے قاتل ہیں اور انہیں قصاص پر اُبھارو۔ شرجبیل کے جذبات مشتعل تو تھے ہی فوراً تیار ہو گیا اور معاویہ سے رخصت ہو کر عوام کو ہمنوا بنانے کے لئے چل دیا۔

جب اہل کوفہ کو یہ خبر ہوئی کہ معاویہ عوام کو غلط فہمی میں ڈال کر جنگ پر آمادہ کر رہے ہیں تو انہوں نے حضرت سے کہا کہ معاویہ کی جنگی تیاریوں کی تکمیل سے پہلے ہمیں شام پر حملہ کر دینا چاہئے مگر حضرت نے فرمایا کہ جب تک جریر بیعت یا جنگ کا تصفیہ کر کے واپس نہیں آتا ہمیں حملہ کرنا مناسب نہیں ہے

جریر کو شام میں آئے چار ماہ گزر چکے تھے اور امیر المومنین اسے بار بار لکھ رہے تھے کہ تم دو ٹوک فیصلہ کر کے جلد واپس آؤ مگر معاویہ اسے حیلے بہانوں سے روکے رہے تاکہ اس عرصہ میں اہل شام کو جنگ پر آمادہ کر سکیں اور اپنی قوت و طاقت کا صحیح اندازہ لگالیں چنانچہ جب اسے شرجیل کی حمایت حاصل ہو گئی اور حالات سازگار نظر آئے تو جریر کو بُلا کر کہا:۔

الحق بصاحبك واعلمه انی واهل الشام لا نجیبه الی البیعة (اخبار الطوال ص۱۶۱)

تم اپنے امیر کے پاس واپس جاؤ اور انہیں بتا دو کہ میں اور اہل شام ان کی بیعت نہیں کریں گے۔"

ادھر شرجیل نے شام میں گھوم پھر کر شہر شہر اور بستی بستی میں یہ اعلان کیا کہ علی نے عثمان کو قتل کیا ہے اور ان لوگوں کو جو قصاص کے لئے کھڑے ہوئے تھے موت کے گھاٹ اُتار دیا ہے ان کا مال و اثاثہ چھین لیا ہے ان کی زمینوں اور شہروں پر قبضہ کر لیا ہے اب ایک شام ہی کا علاقہ ان کی دستبرد سے بچا ہوا ہے اور یہیں کے لوگ متفق ہو کر خون ناحق کا انتقام لے سکتے ہیں لہذا ایک دل اور ایک جان ہو کر اُٹھو اور خلیفہ مظلوم کے انتقام اور اپنی سرزمین کے حفظ کے لئے امیر شام کے پرچم کے نیچے جمع ہو جاؤ۔ شرجیل شام میں با اثر شخصیت کا مالک تھا۔ اس کی آواز پر مختلف شہروں کے لوگ سمٹ کر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ البتہ اسی کے شہر کے کچھ لوگوں نے مخالفت کی اور کہا کہ ہمیں اپنے گھروں اور مسجدوں سے مطلب ہے تم جانو اور تمہارا کام۔

اہل شام کے علاوہ بنی اُمیہ اور اُن کے ہمنوا بھی شام میں جمع ہو چکے تھے جن میں کے چند نمایاں افراد یہ تھے:۔ مغیرہ ابن شعبہ، عبداللہ ابن سعد، مروان ابن حکم، سعید ابن عاص، عبداللہ ابن عامر، ولید ابن عقبہ، عبیداللہ ابن عمر، سعید ابن عثمان، ابو ہریرہ، ابو حذیفہ، ابو امامہ باہلی اور نعمان ابن بشیر۔ ان میں سب سے پہلے نعمان ابن بشیر آیا تھا اور اپنے ساتھ حضرت عثمان کا خون بھرا کرتہ اور ان کی زوجہ نائلہ بنت فرافصہ کی کٹی ہوئی انگلیاں بھی لایا تھا اور معاویہ نے اسی پیراہن اور کٹی ہوئی انگلیوں کو جامع دمشق کے منبر پر آویزاں کر کے لوگوں کے جذبات کو بھڑکایا اور عثمان کی مظلومیت سے متاثر کیا تھا۔ اس جمعیت کے یکجا ہونے کے بعد جنگی ساز و ساماں کی تکمیل کی گئی اور یلغار کرنے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

جب امیر المومنین کو سپاہ شام کے اس اقدام کا علم ہوا تو آپ نے اس کی پیش قدمی کو روکنے کے لئے شام کی جانب لشکر کشی کا ارادہ کیا اور جمعہ کے دن منبر پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:۔

ایّها الناس سیرو الی اعداء السنن والقرآن سیروا الی

اے لوگو قرآن و سنت کے دشمنوں کی طرف چل دو مہاجرین و انصار کے قاتلوں کی طرف

قتلة المهاجرين والانصار سیروا الی الجفاة الطغام الذین کان اسلامهم خوفا وکرها سیروا الی المولفة قلوبهم لیکفوا عن المسلمین بأسهم۔
(اخبار الطوال ص۱۶۴)

نکل کھڑے ہو ان درشت خو اور کمینہ فطرت لوگوں کی طرف جنہوں نے ڈر کے مارے بادل ناخواستہ اسلام قبول کیا تھا اور جنہیں محض دلجوئی کے لئے مسلمانوں کی صف میں شامل کیا گیا تھا اُٹھ کھڑے ہو تاکہ وُہ مسلمانوں کی ہلاکت و بربادی سے باز آئیں"۔

قبیلۂ فزارہ کے ایک شخص اربد نامی نے یہ سُنا تو اُٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح ہمیں اپنے ہی بھائیوں کا خون بہانے کے لئے بصرہ لے گئے تھے اور ہم نے انہیں قتل کیا تھا اسی طرح اب شام پر چڑھائی کریں اور اپنے بھائیوں کے گلے پر خنجر چلائیں۔ خدا کی قسم ہم اس کے لئے قطعاً تیار نہیں۔ مالک اشتر سمجھ گئے کہ یہ معاویہ کا کارندہ ہے اور چاہتا ہے کہ اس طرح حضرت کے لشکر میں بددلی پیدا کر کے ان کی قوت و طاقت کو کمزور کرے۔ انہوں نے پکار کر کہا کہ اسے پکڑ لو مگر وُہ بھاگ کھڑا ہوا۔ کچھ لوگوں نے اس کا پیچھا کیا اور محلہ کناسہ تک پہنچا تھا کہ اسے پکڑ لیا اور اس طرح اسے پیروں تلے روندا کہ اس نے وہیں پر دم توڑ دیا۔ حضرت کو معلوم ہوا تو فرمایا کہ قاتل کا پتا نہیں چل سکتا لہٰذا اس کی دیت بیت المال سے ادا کی جائے۔ امیر المومنین اس واقعہ سے کچھ متاثر تھے کہ مالک اشتر نے کہا یا امیر المومنین آپ اس خائن و بدبخت کی بات سے بددل نہ ہوں ہم آپ کے مطیع و فرمانبردار ہیں عزم و ہمت سے لڑیں گے اور آپ کی نصرت سے مُنہ نہیں موڑیں گے۔ ہمیں یہ کب گوارا ہو سکتا ہے کہ ہم آپ کے بعد زندہ رہیں۔ جو موت سے ڈرتا ہے وُہ موت سے بچ کر نہیں رہتا اور جو زندگی و بقا چاہتا ہے وُہ اپنی آرزو میں کامیاب نہیں ہوتا۔ اسی طرح دوسرے لوگوں نے بھی استقامت و نصرت کا عہد و پیمان کیا۔

جب کوفہ کے جنگ آزما آپ کے پرچم کے نیچے جمع ہو گئے تو آپ نے عقبہ ابن عمرو انصاری کو اپنا نائب مقرر کیا اور نخیلہ کو چھاؤنی قرار دے کر مالک ابن حبیب یربوعی کو کوفہ میں قیام کا حکم دیا تاکہ وُہ پیچھے رہ جانے والوں کو لشکر گاہ کی طرف بھیجتے رہیں اور خود کوفہ سے نکل کر نخیلہ میں لشکر سمیت پڑاؤ ڈالا اور مختلف صوبوں کے عمال کو تحریر فرمایا کہ وُہ افواج و عساکر اور سامان حرب و ضرب کے ساتھ فوراً پہنچیں۔ چنانچہ عبداللہ ابن عباس بصرہ سے مخنف ابن سلیم اصفہان سے سعید ابن وہب ہمدان سے ربیع ابن خثیم اسدی رے سے اور دُوسرے عمال اپنے اپنے شہروں سے سواروں اور پیادوں کے ساتھ پہنچ گئے اور اس طرح بڑھتے بڑھتے لشکر کی تعداد چوراسی ہزار تک پہنچ گئی جن میں اصحاب بدرئین اور بیعت رضوان میں شریک ہونے والے صحابہ کی بھی ایک جمعیت تھی۔ حاکم نے تحریر کیا ہے:۔

شھد مع علی صفین ثمانون بدریا وخمسون ومائتان ممن بایع تحت الشجرۃ۔

"جنگ صفین میں حضرت علی کے ہمراہ اسّی بدر کے مجاہدین اور دو سو پچاس بیعت رضوان میں شریک ہونے والے صحابہ تھے"۔

(مستدرک۔ ج ۳۔ ص ۱۰۴)

وادیٔ نخیلہ فوجوں سے چھلک رہی تھی اور امیر المومنین اس عظیم لشکر کی تنظیم و ترتیب میں مصروف تھے کہ ایک عامل کے ذریعہ سے یہ اطلاع پہنچی کہ شامی فوجوں نے عراقی سرحدوں کی طرف بڑھنا شروع کر دیا ہے۔ حضرت نے آٹھ ہزار کا ایک ہراول دستہ زیاد ابن نضر حارثی کی زیر سرکردگی اور چار ہزار کا ایک دستہ شریح ابن حارث کی زیر قیادت سرحدوں کی حفاظت اور فوج مخالف کی قوت و طاقت کا اندازہ لگانے کے لئے روانہ کیا اور انہیں یہ ہدایت فرمائی کہ جب تک میرا حکم نہ پہنچے یا دشمن ابتداء نہ کرے تم جنگ نہ کرنا۔

امیر المومنین نے نظم و انضباط کے پیش نظر لشکر کو سات حصوں پر تقسیم کیا اور ہر حصہ پر ایک ایک افسر مقرر کر دیا اور ہراول دستہ کی روانگی کے چوتھے دن ۵ شوال سنہ ۳۶ھ کو اس لشکر جرار کی قیادت کرتے نخیلہ سے روانہ ہو گئے۔ جب نہر فرات کو عبور کر کے حدود کوفہ سے باہر تشریف فرما ہوئے تو نماز ظہر کا اعلان کیا اور فرمایا کہ جو لوگ اپنے عزیزوں اور دوستوں کو رخصت کرنے کے لئے آئے ہیں وہ پوری نماز پڑھیں اور جو ساتھ جانے کے ارادہ سے آئے ہیں وہ نماز قصر پڑھیں اور حضرت نے بھی نماز قصر ادا کی۔ نماز سے فارغ ہو کر آگے بڑھے اور کوفہ سے چھ میل کے فاصلہ پر دیر ابو موسے میں پہنچ کر عصر کی نماز پڑھی اور یہاں سے روانہ ہو کر کوفہ و حلہ کے درمیان مقام برس میں مغرب کی نماز ادا کی اور رات وہیں گزاری اور نماز صبح کے بعد نہر قبین کو پار کر کے مقام بیعہ میں قیام فرمایا تاکہ لوگ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو جائیں۔ جب یہاں سے روانہ ہو کر سرزمین بابل پر قدم رکھا تو شہر کے کھنڈر دیکھ کر اپنے ہمراہیوں سے فرمایا کہ گھوڑوں کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دو اور انہیں تیز چلاؤ تاکہ اس نامبارک سرزمین سے جلد نکل جائیں کیونکہ یہ شہر مورد عتاب رہا ہے اور کئی بار زمین میں دھنس چکا ہے۔ چنانچہ آپ نے باگیں ڈھیلی چھوڑ کر مہمیز لگائی اور دوسرے لوگوں نے بھی گھوڑوں کی رفتار تیز کر دی اور نہر صراۃ کو کشتیوں کے پل کے ذریعہ عبور کیا اور نہر کی دوسری سمت اتر کر نماز عصر باجماعت ادا کی۔ نماز سے فارغ ہو کر سوار ہوئے اور دیر کعب سے ہوتے ہوئے سرزمین کربلا پر وارد ہوئے اس زمین کو دیکھ کر چہرے پر غم و حزن کے آثار نمایاں ہوئے اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی تو حادثۂ فاجعہ کربلا کی خبر دی اور ان جگہوں کی نشاندہی کی جو سید الشہدا امام حسین اور ان کے اعزہ و انصار کے خون سے رنگین ہونے والی تھیں۔ یہاں سے روانہ ہو کر

ساباط میں منزل کی اور رات کو وہیں پر قیام فرمایا۔ اہل ساباط نے فوج کے لیے رسد اور چوپاؤں کے لئے چارہ کی پیش کش کی مگر حضرت نے انکار کیا اور فرمایا کہ تم لوگوں پر یہ بار نہیں ڈالا جا سکتا۔ ساباط کے قریب دجلہ کے کنارے شہر مدائن تھا مدائن کے لوگ ابھی تک حضرت کے لشکر میں شامل نہ ہوئے تھے آپ نے حارث ابن عبداللہ اعور کو حکم دیا کہ وہ مدائن والوں سے کہیں کہ ان میں کے جو اہل مرد جنگجو افراد نماز عصر میں شریک ہوں۔ جب وہ لوگ آئے تو فرمایا کہ مجھے تعجب ہے کہ تم ہمارے لشکر سے علیحدگی اختیار کئے ہو حالانکہ دشمن کی فوجیں ہماری طرف بڑھ رہی ہیں انہوں نے کہا کہ یا امیرالمومنین ہم آپ کے حکم کے منتظر تھے ہمیں جو حکم دیا جائے گا ہم بسر و چشم اُس کی تعمیل کریں گے۔ آپ نے عدی ابن حاتم اور اُن کے فرزند زید کو مامور فرمایا کہ وہ مدائن سے لشکر کی فراہمی کریں عدی نے تین دن کے قیام میں آٹھ سو اور زید ابن عدی نے چار سو افراد جمع کئے اور انہیں لے کر حضرت کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ امیرالمومنین نے مدائن سے تین ہزار کا ایک لشکر معقل ابن قیس کی ماتحتی میں آگے روانہ کیا اور ان سے کہا کہ میں رقہ جا رہا ہوں تم موصل (جو اس وقت صرف قافلوں کی فرودگاہ تھا) اور نصیبین سے ہوتے میرے پاس رقہ پہنچ جاؤ۔ امیرالمومنین مدائن سے روانہ ہو کر بہر سیر میں قیام فرما ہوئے۔ یہ جگہ شاہان عجم کی سیر گاہ تھی جہاں کبھی سایہ دار درختوں دلکش باغوں اور بلند و بالا عمارتوں کی بہتات تھی مگر دستبرد زمانہ سے باغات اُجڑ چکے تھے اور عمارتوں کی جگہ خاک کے تودے باقی رہ گئے تھے۔ حریز ابن سہم نے ان کھنڈروں اور اُجڑے باغوں کو دیکھا تو ابن یعقوب تمیمی کا یہ شعر پڑھا:۔

جرت الریاح علیٰ مکان دیارھم   فکانما کانوا علیٰ میعاد

"جہاں اُن کے گھر بار تھے وہاں چو بائی ہوائیں چل رہی ہیں گویا وہ ایک معیّنہ مدت کے لئے آباد کئے گئے تھے"۔

حضرت نے یہ شعر سُنا تو فرمایا کہ اس کے بجائے قرآن مجید کی یہ آیت پڑھو:۔

کم ترکوا من جنات وعیون	وہ لوگ کتنے باغات چشمے کھیت عمدہ مکان
و زروع و مقام کریم و	اور نعمتوں کا ساز و سامان جن میں وہ خوش خوش
نعمۃ کانوا فیھا فاکھین و	گزر بسر کرتے تھے چھوڑ گئے ایسا ہی ہے اور
اورثناھا قوما آخرین فما	ہم نے ان تمام چیزوں کا دوسروں کو مالک بنا
بکت علیھم السماء والارض	دیا ان لوگوں پر نہ آسمان رویا اور نہ زمین اور نہ ہی
وما کانوا منظرین"	انہیں مہلت دی گئی"۔

بہر سیر سے روانہ ہو کر انبار میں منزل کی یہاں کے عجمی باشندوں بنی خوشنوشک نے حضرت کو لشکر کے ہمراہ دیکھا تو اُچھلنے کودنے اور دوڑنے لگے۔ حضرت نے پوچھا کہ یہ کیا حرکت ہے

انہوں نے کہا کہ ہمارے ہاں حکمرانوں کی تعظیم و تکریم کے اظہار کا یہی طریقہ ہے۔ فرمایا کہ اس سے نہ تمہارے حکمرانوں کو کچھ فائدہ پہنچتا ہے اور نہ تمہیں کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ اس بے نتیجہ مشقت کو ختم کرو۔ اس رسمی استقبال کے بعد انہوں نے گھوڑے خچر اور چارہ کی پیشکش کی اور فوج کے کھانے کا انتظام کرنا چاہا مگر حضرت نے ان کے ہاں کا کھانا منظور نہ کیا البتہ گھوڑوں اور خچروں کو اس شرط پر قبول کر لیا کہ انہیں خراج میں محسوب کر لیا جائے گا۔ انبار میں دو دن قیام کرنے کے بعد ہیت کی طرف روانہ ہوئے اور وہاں سے چل کر اقطار میں قیام فرمایا اور پھر دریائے فرات عبور کر کے ارض جزائر میں داخل ہوئے یہاں نمر ابن قاسط نے قبیلۂ بنی تغلب کے ساتھ پرجوش استقبال کیا جب یہاں سے آگے بڑھے اور قرقیسا کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ زیاد ابن نضر اور شریح ابن ہانی جنہیں آپ نے نخیلہ سے بطور ہراول دستہ بھیجا تھا اپنے فوجی دستوں کے ساتھ یہاں پہنچ گئے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ اچھا ہراول دستہ ہے جو آگے بڑھنے کے بجائے ہمارے عقب سے آ رہا ہے۔ زیادہ اور شریح نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ ہم نخیلہ سے روانہ ہوئے تو دریائے فرات کے کنارے کنارے عانات پہنچے۔ وہاں پہنچ کر ہمیں معلوم ہوا کہ آپ دریا عبور کر کے ارض جزائر میں داخل ہو چکے ہیں ہمیں یہ اندیشہ ہوا کہ اگر معاویہ کے لشکر سے مڈبھیڑ ہو گئی تو ہمارا مختصر سا فوجی دستہ اس کے لشکر گراں کا مقابلہ نہ کر سکے گا اور دریا کے حائل ہونے کی وجہ سے آپ کی طرف سے بروقت کمک پہنچنے کی بھی کوئی صورت نہ تھی۔ ہم نے چاہا کہ عانات سے دریا عبور کر کے پار اتر جائیں مگر اہل عانات نے ہمیں دیکھ کر کشتیوں کا پل اتار دیا اور قلعہ بند ہو کر محفوظ و مطمئن ہو گئے ہمیں مجبوراً پیچھے پلٹنا پڑا اور مقام ہیت سے دریا عبور کر کے ادھر نکل آئے ہیں۔ حضرت نے ان کے عذر کو صحیح سمجھا اور انہیں ساتھ لے کر آگے روانہ ہو گئے۔ جب شہر رقہ کے قریب پہنچے تو نہر بلیخ کے کنارے پڑاؤ ڈالا۔ معقل ابن قیس جنہیں امیرالمومنین نے تین ہزار کے لشکر کے ساتھ مدائن سے نصیبین کے راستے روانہ کیا تھا وہ بھی رقہ پہنچ گئے۔ رقہ دریائے فرات کے مشرقی کنارے پر واقع تھا اور لشکر کو دریا عبور کر کے غربی کنارے پر اترنا تھا مگر رقہ کی آبادی عثمانیوں پر مشتمل تھی اور سماک ابن مخرمہ اسدی جو اپنے قبیلہ کے آٹھ سو آدمیوں کے ساتھ یہاں مقیم تھا اہل رقہ کی طرح اہل شام کا ہم مسلک تھا۔ یہ لوگ معاویہ کے ہاں جانے کے لئے کوفہ سے نکل کھڑے ہوئے تھے اور اُن سے ساز باز کر کے حضرت کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے دریا پر سے پل اُتار دیا اور گھروں میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ امیرالمومنین نے ان کی اس حرکت کے باوجود اُن سے اُلجھنا گوارا نہ کیا اور لشکر کو لے کر دریا کے کنارے کنارے آگے چل دیئے تاکہ مقام منبج پر پہنچ کر وہاں سے پل کے ذریعہ دریا پار کریں۔ مالک اشتر کو اسدیوں کی یہ معاندانہ روش نہایت ناگوار گزری۔ جب امیرالمومنین آگے نکل گئے تو انہوں نے اسدیوں کو للکارا اور انہیں ڈرایا دھمکایا اور کہا کہ اگر تم نے کشتیوں کو جوڑ کر پل نہ باندھا

تو میں پوری بستی کو جلا کر راکھ کر دوں گا اور تم میں سے کوئی بھی اپنی جان کو بچا کر نہ لے جا سکے گا۔ مالک کی یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی اور وہ ڈرے سہمے ہوئے گھروں سے باہر نکل آئے اور کشتیوں کو جوڑ کر پل باندھنے پر آمادہ ہو گئے۔ مالک نے امیر المومنین کو پیغام بھجوایا کہ آپ واپس پلٹ آئیں اہل رقہ پل باندھنے پر تیار ہو گئے ہیں۔ حضرت لشکر سمیت واپس پلٹے اور دریا عبور کر کے غربی کنارے پر اُتر گئے۔

امیر المومنین نے یہاں سے پھر زیاد ابن نضر اور شریح ابن ہانی کو بطور ہراول شام کی جانب روانہ کیا تاکہ پیش آمدہ حالات سے حضرت کو آگاہ کرتے رہیں۔ جب یہ دونوں منزلیں طے کرتے ہوئے سور روم کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ ابوالاعور سلمی پچیس ہزار شامیوں کے ساتھ چھاؤنی ڈالے پڑا ہے ان دونوں نے فوراً حارث ابن جمہان کو ایک خط دے کر حضرت کی خدمت میں بھیجا اور انہیں اطلاع دی کہ ابوالاعور سور روم کے قریب ایک لشکر گراں کے ساتھ فروکش ہے۔ حضرت نے صورت حال پر مطلع ہونے کے بعد مالک اشتر کو تین ہزار کے لشکر کے ساتھ جانے کا حکم دیا اور اُن سے فرمایا کہ تم وہاں پہنچ کر لشکر کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لینا اور جب تک دشمن پہل نہ کرے تم ابتداء نہ کرنا اور اُن پر حجت تمام کرنے سے پہلے ہاتھ نہ اُٹھانا اور جنگ چھڑ جائے تو تم قلب لشکر میں اپنی جگہ بنانا اور میمنہ زیاد کے اور میسرہ شریح کے سپرد کرنا۔ اور دشمن سے اتنا قریب نہ ہو تاکہ وہ یہ سمجھے کہ تم جنگ چھیڑنا چاہتے ہو اور نہ اتنا دور رہنا کہ وہ یہ خیال کرے کہ تم جنگ سے خائف و ترساں ہو اور میں بھی بقیہ لشکر کو لے کر تمہارے عقب میں آیا چاہتا ہوں۔

مالک فوراً روانہ ہو گئے اور زیاد اور شریح کے لشکر کو ساتھ ملا کر سپاہِ شام سے کچھ فاصلہ پر پڑاؤ ڈال دیا۔ اگرچہ دونوں لشکر آمنے سامنے تھے مگر مالک اور اُن کے ہمراہیوں نے امیر المومنین کی ہدایت کو پیش نظر رکھا اور جنگجویانہ انداز اختیار نہ کیا۔ ابوالاعور نے بھی کچھ ایسا ہی تاثر دیا کہ وہ جنگ چھیڑنا نہیں چاہتا۔ جب دن گزرا اور رات ہوئی تو مالک اور ان کا لشکر دشمن کی طرف سے مطمئن ہو کر سونے کی تیاری کرنے لگا۔ ابھی ایک آدھ جھپکی لی ہو گی کہ ابوالاعور نے رات کی تاریکی سے فائدہ اُٹھا کر شبخون مارا۔ مالک اور ان کے ہمراہی کھڑ بڑا کر اُٹھے تلواروں کے قبضے پر ہاتھ ڈالا اور جوابی حملہ کر کے انہیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔

دشمن کی طرف سے پہل تو ہو ہی چکی تھی صبح ہوتے ہی مالک اشتر اور ہاشم ابن عتبہ مرقال سواروں اور پیادوں کو لے کر میدان میں نکل آئے ادھر سے ابوالاعور بھی سوار اور پیادے لے کر مقابلہ پر آ گیا۔ جنگ چھڑ گئی اور سواروں نے سواروں پر اور پیادوں نے پیادوں پر حملہ کر دیا۔ کچھ دیر تک جنگ کے شعلے بھڑکتے رہے آخر شامیوں کا مشہور شہسوار عبداللہ ابن منذر تنوخی اپنے چند سواروں سمیت

انہوں نے کہا کہ ہمارے ہاں حکمرانوں کی تعظیم و تکریم کے اظہار کا یہی طریقہ ہے۔ فرمایا کہ اس سے نہ تمہارے حکمرانوں کو کچھ فائدہ پہنچتا ہے اور نہ تمہیں کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ اس بے نتیجہ مشقت کو ختم کرو۔ اس رسمی استقبال کے بعد انہوں نے گھوڑے خچر اور چارہ کی پیشکش کی اور فوج کے کھانے کا انتظام کرنا چاہا مگر حضرت نے ان کے ہاں کا کھانا منظور نہ کیا البتہ گھوڑوں اور خچروں کو اس شرط پر قبول کر لیا کہ انہیں خراج میں محسوب کر لیا جائے گا۔ انبار میں دو دن قیام کرنے کے بعد ہیت کی طرف روانہ ہوئے اور وہاں سے چل کر اقطار میں قیام فرمایا اور پھر دریائے فرات عبور کر کے ارض جزائر میں داخل ہوئے یہاں نمر ابن قاسط نے قبیلۂ بنی تغلب کے ساتھ پرجوش استقبال کیا جب یہاں سے آگے بڑھے اور قرقیسیا کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ زیاد ابن نضر اور شریح ابن ہانی جنہیں آپ نے نخیلہ سے بطور ہراول دستہ بھیجا تھا اپنے فوجی دستوں کے ساتھ یہاں پہنچ گئے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ اچھا ہراول دستہ ہے جو آگے بڑھنے کے بجائے ہمارے عقب سے آ رہا ہے۔ زیادہ اور شریح نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ ہم نخیلہ سے روانہ ہوئے تو دریائے فرات کے کنارے کنارے عانات پہنچے۔ وہاں پہنچ کر ہمیں معلوم ہوا کہ آپ دریا عبور کر کے ارض جزائر میں داخل ہو چکے ہیں ہمیں یہ اندیشہ ہوا کہ اگر معاویہ کے لشکر سے مڈبھیڑ ہو گئی تو ہمارا مختصر سا فوجی دستہ اس کے لشکر گراں کا مقابلہ نہ کر سکے گا اور دریا کے حائل ہونے کی وجہ سے آپ کی طرف سے بروقت کمک پہنچنے کی بھی کوئی صورت نہ تھی۔ ہم نے چاہا کہ عانات سے دریا عبور کر کے پار اتر جائیں مگر اہل عانات نے ہمیں دیکھ کر کشتیوں کا پل اتار دیا اور قلعہ بند ہو کر محفوظ و مطمئن ہو گئے ہمیں مجبوراً پیچھے پلٹنا پڑا اور مقام ہیت سے دریا عبور کر کے ادھر نکل آئے ہیں۔ حضرت نے ان کے عذر کو صحیح سمجھا اور انہیں ساتھ لے کر آگے روانہ ہو گئے۔ جب شہر رقہ کے قریب پہنچے تو نہر بلیخ کے کنارے پڑاؤ ڈالا۔ معقل ابن قیس جنہیں امیرالمومنین نے تین ہزار کے لشکر کے ساتھ مدائن سے نصیبین کے راستے روانہ کیا تھا وہ بھی رقہ پہنچ گئے۔ رقہ دریائے فرات کے مشرقی کنارے پر واقع تھا اور لشکر کو دریا عبور کر کے غربی کنارے پر اترنا تھا مگر رقہ کی آبادی عثمانیوں پر مشتمل تھی اور سماک ابن مخرمہ اسدی جو اپنے قبیلہ کے آٹھ سو آدمیوں کے ساتھ یہاں مقیم تھا اہل رقہ کی طرح اہل شام کا ہم مسلک تھا۔ یہ لوگ معاویہ کے ہاں جانے کے لئے کوفہ سے نکل کھڑے ہوئے تھے اور ان سے ساز باز کر کے حضرت کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے دریا پر سے پل اتار دیا اور گھروں میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ امیرالمومنین نے ان کی اس حرکت کے باوجود ان سے الجھنا گوارا نہ کیا اور لشکر کو لے کر دریا کے کنارے کنارے آگے چل دیئے تاکہ مقام منبج پر پہنچ کر وہاں سے پل کے ذریعہ دریا پار کریں۔ مالک اشتر کو اسدیوں کی یہ معاندانہ روش نہایت ناگوار گزری۔ جب امیرالمومنین آگے نکل گئے تو انہوں نے اسدیوں کو للکارا اور انہیں ڈرایا دھمکایا اور کہا کہ اگر تم نے کشتیوں کو جوڑ کر پل نہ باندھا

مارا گیا اور ابوالاعور ہزیمت اٹھا کر پیچھے ہٹا اور ایک محفوظ مقام پر پہنچ کر ٹھہر گیا۔ مالک نے چاہا کہ ابوالاعور سے دو دو ہاتھ کریں اور اُسے اصول جنگ کی خلاف ورزی کا مزا چکھائیں چنانچہ انہوں نے اپنے قبیلہ کے ایک نوجوان سنان ابن مالک نخعی سے کہا کہ تم ابوالاعور کے پاس جاؤ اور اُسے مقابلہ میں آنے کی دعوت دو۔ سنان نے کہا کہ اپنے مقابلہ کے لئے یا آپ کے مقابلہ کے لئے؟ مالک نے اُسے حیرت و استعجاب سے دیکھا اور کہا کہ اگر میں تمہیں اس کے مقابلہ کے لئے کہوں تو کیا تم اس کے لئے تیار ہو کہا کہ خدا کی قسم اگر آپ حکم دیں تو میں صفوں کو چیر کر اور تلواروں کے حصار کو توڑ کر اس پر ٹوٹ پڑوں اور اسے تہ تیغ کئے بغیر دم نہ لوں۔ مالک مسکرائے اور اس کی ہمت و جرأت کی تعریف کی اور کہا کہ تم اگرچہ عزت و شرف کے لحاظ سے کم نہیں ہو مگر ابھی نوجوان ہو اور وہ کسی نوجوان کے مقابلہ میں آنا اپنی توہین سمجھے گا تم میری طرف سے اسے مقابلہ کی دعوت دو۔ سنان اُٹھ کھڑا ہوا اور شامیوں کے پڑاؤ کے قریب پہنچ کر کہا کہ میں پیغامبر ہوں مجھے امان دی جائے۔ شامیوں نے اُسے امان دی اور وہ ابوالاعور کے پاس آیا اور مالک کا پیغام دیا۔ پہلے تو وہ کچھ دیر سر جھکائے خاموش رہا پھر کہا کہ مالک وہی تو ہیں جنہوں نے عثمان کے گھر پر حملہ کیا اور اُن کے قتل میں شریک ہوئے۔ وہ فتنہ انگیز ہیں اور یہ تمام فتنے انہی کے جگائے ہوئے ہیں۔ سنان نے کہا کہ پھر اس کا جواب بھی سن لو کہا کہ میں تمہاری کوئی بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوں اور نہ تمہارے لائے ہوئے پیغام کا کوئی جواب دوں گا۔ اس پر سنان نے کچھ کہنا چاہا تو شامی اس پر برس پڑے اور اسے وہاں سے باہر دھکیل دیا۔ مالک کی اس دعوت مبارزت سے ابوالاعور کے دل پر ایسا خوف بیٹھا کہ اسے ٹھہرنا مشکل ہو گیا اور جب رات کا اندھیرا پھیلا تو لشکر سمیت میدان چھوڑ کر چلا گیا اور مقام ایفیح میں جہاں معاویہ اور اُن کا لشکر خیمہ زن تھا پہنچ گیا۔

معاویہ نے جب عراقی فوجوں کی آمد اور جھڑپوں کا حال سُنا تو ابوالاعور اور سفیان ابن عمر سے کہا کہ تم دونوں آگے بڑھ کر جنگ کا کوئی میدان تلاش کرو اور مجھے فوراً اطلاع دو۔ وہ دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے اور فرات کی غربی سمت رقہ اور بالس کے درمیان مقام صفین کا انتخاب کیا اور جنگ کے لئے ایک مناسب جگہ منتخب کر کے پڑاؤ ڈال دیا۔ معاویہ بھی ان کے عقب میں لشکر کی کمان کرتے ہوئے پہنچ گئے اور آتے ہی ابوالاعور کو حکم دیا کہ:-

ان یقف فی عشرۃ آلاف من اھل الشام علی طریق الشریعۃ فیمنع من اراد السلوک الی الماء من اھل العراق۔ (اخبار الطوال) ۱۶۸	وہ دس ہزار شامیوں کو لے کر گھاٹ کے راستے پر کھڑا ہو جائے اور عراقیوں میں سے جو پانی لینے کے لئے آئے اُسے روک دے۔"

مارا گیا اور ابو الاعور ہزیمت اٹھا کر پیچھے ہٹا اور ایک محفوظ مقام پر پہنچ کر ٹھہر گیا۔ مالک نے چاہا کہ ابو الاعور سے دو دو ہاتھ کریں اور اسے اصول جنگ کی خلاف ورزی کا مزا چکھائیں چنانچہ انہوں نے اپنے قبیلہ کے ایک نوجوان سنان ابن مالک نخعی سے کہا کہ تم ابو الاعور کے پاس جاؤ اور اسے مقابلہ میں آنے کی دعوت دو۔ سنان نے کہا کہ اپنے مقابلہ کے لئے یا آپ کے مقابلہ کے لئے؟ مالک نے اسے حیرت و استعجاب سے دیکھا اور کہا کہ اگر میں تمہیں اس کے مقابلہ کے لئے کہوں تو کیا تم اس کے لئے تیار ہو کہا کہ خدا کی قسم اگر آپ حکم دیں تو میں صفوں کو چیر کر اور تلواروں کے حصار کو توڑ کر اس پر ٹوٹ پڑوں اور اسے تہ تیغ کئے بغیر دم نہ لوں۔ مالک مسکرائے اور اس کی ہمت و جرأت کی تعریف کی اور کہا کہ تم اگرچہ عزت و شرف کے لحاظ سے کم نہیں ہو مگر ابھی نوجوان ہو اور وہ کسی نوجوان کے مقابلہ میں آنا اپنی توہین سمجھے گا تم میری طرف سے اسے مقابلہ کی دعوت دو۔ سنان اٹھ کھڑا ہوا اور شامیوں کے پڑاؤ کے قریب پہنچ کر کہا کہ میں پیغامبر ہوں مجھے امان دی جائے۔ شامیوں نے اسے امان دی اور وہ ابو الاعور کے پاس آیا اور مالک کا پیغام دیا۔ پہلے تو وہ کچھ دیر سر جھکائے خاموش رہا پھر کہا کہ مالک وہی تو ہیں جنہوں نے عثمان کے گھر پر حملہ کیا اور ان کے قتل میں شریک ہوئے۔ وہ فتنہ انگیز ہیں اور یہ تمام فتنے انہی کے جگائے ہوئے ہیں۔ سنان نے کہا کہ پھر اس کا جواب بھی سن لو کہا کہ میں تمہاری کوئی بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوں اور نہ تمہارے لائے ہوئے پیغام کا کوئی جواب دوں گا۔ اس پر سنان نے کچھ کہنا چاہا تو شامی اس پر برس پڑے اور اسے وہاں سے باہر دھکیل دیا۔ مالک کی اس دعوت مبارزت سے ابو الاعور کے دل پر ایسا خوف بیٹھا کہ اسے ٹھہرنا مشکل ہو گیا اور جب رات کا اندھیرا پھیلا تو لشکر سمیت میدان چھوڑ کر چلا گیا اور مقام ایفح میں جہاں معاویہ اور ان کا لشکر خیمہ زن تھا پہنچ گیا۔

معاویہ نے جب عراقی فوجوں کی آمد اور جھڑپوں کا حال سنا تو ابو الاعور اور سفیان ابن عمر سے کہا کہ تم دونوں آگے بڑھ کر جنگ کا کوئی میدان تلاش کرو اور مجھے فوراً اطلاع دو۔ وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے اور فرات کی غربی سمت رقہ اور بالس کے درمیان مقام صفین کا انتخاب کیا اور جنگ کے لئے ایک مناسب جگہ منتخب کر کے پڑاؤ ڈال دیا۔ معاویہ بھی ان کے عقب میں لشکر کی کمان کرتے ہوئے پہنچ گئے اور آتے ہی ابو الاعور کو حکم دیا کہ:۔

ان یقف فی عشرۃ آلاف من اھل الشام علیٰ طریق الشریعۃ فیمنع من اراد السلوک الی الماء من اھل العراق۔ (اخبار الطوال ص ۱۶۸)	وہ دس ہزار شامیوں کو لے کر گھاٹ کے راستے پر کھڑا ہو جائے اور عراقیوں میں سے جو پانی لینے کے لئے آئے اسے روک دے۔"

مالک اشتر بھی فوج کی قیادت کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے اور جب صفین میں پہنچے تو شامیوں کی انبوہ در انبوہ فوجوں کو دیکھ کر ٹھٹکے اور ان سے تھوڑے فاصلہ پر پڑاؤ ڈال دیا۔ دوسرے دن امیرالمومنین بھی افواج و عساکر کے ساتھ پہنچ گئے۔ آپ نے دیکھا کہ شامیوں نے ایک ہموار میدان میں پڑاؤ ڈال کر گھاٹ پر قبضہ کر لیا ہے اور اس پر کڑا پہرا بٹھا دیا ہے۔ اور عراقیوں میں سے کوئی پانی لینے کے لئے جاتا ہے تو اسے سختی سے روک دیا جاتا ہے۔ آپ نے اس پر الجھنے کے بجائے چند آدمیوں سے کہا کہ وہ کوئی دوسرا گھاٹ تلاش کریں مگر تگ و دو کے باوجود آس پاس کوئی گھاٹ نظر نہ آیا۔ اگر تھا تو وہاں تک پہنچنا انتہائی دشوار تھا کیونکہ فرات کے کنارے کنارے دھسان اور دلدل تھی جس میں گھنی اور خاردار جھاڑیوں کا پھیلاؤ چھ سات میل تک چلا گیا تھا جہاں ایک طرف زمین میں پیر دھنس جاتے تھے اور دوسری طرف جھاڑیوں کے اندر کوئی پگڈنڈی یا راستا نہ تھا کہ اسے طے کر کے دوسرے گھاٹ تک پہنچا جا سکے۔ جب پانی کے حاصل کرنے کا کوئی اور ذریعہ نظر نہ آیا تو حضرت نے صعصعہ ابن صوحان کے ہاتھ معاویہ کو پیغام بھیجا کہ ہم حجت تمام کرنے سے پہلے جنگ کرنا پسند نہیں کرتے تم سواروں اور پیادوں کو لے کر جنگ کے لئے نکل کھڑے ہوئے ہو اور گھاٹ پر قبضہ کر کے ہمیں پانی سے روک دیا ہے بہتر ہے کہ تم پانی پر سے پہرا اٹھا لو اور جو چیز ہم میں وجہ نزاع ہے اس پر بات چیت کرو اگر تم یہ چاہتے ہو کہ مصالحت کی گفتگو چھوڑ کر پانی پر جنگ کی جائے تو ہم اس کے لئے بھی تیار ہیں مگر یاد رکھو کہ پھر جو غالب ہو گا وہی پانی پی سکے گا۔ معاویہ نے یہ پیغام سنا تو مشورہ لینے کے لئے اپنے مشیروں کو جمع کیا۔ ولید ابن عقبہ نے کہا:۔

امنعهم الماء كما منعوه امير المومنين عثمان اقتلهم عطشا قتلهم الله۔

(اخبار الطوال ص۱۶۸)

ان پر پانی بند رہنے دو اور انہیں پیاسا مارو خدا انہیں مارے آخر انہوں نے امیرالمومنین عثمان کے ساتھ بھی تو یہی برتاؤ کیا تھا۔"

عبداللہ ابن ابی سرح نے کہا:۔

امنعهم الماء الى الليل فانهم ان لم يقدروا عليه رجعوا وكان رجوعهم هزيمة امنعهم الماء منعهم الله اياه يوم القيامة۔ (تاریخ کامل ج۳ ص۱۴۵)۔

رات تک ان پر پانی بند رہنے دو۔ جب یہ پانی کے حاصل کرنے میں ناکام ہو جائیں گے تو واپس پلٹ جائیں گے اور یہ پلٹنا ان کی شکست و ہزیمت ہو گا ان پر پانی بند کر دو خدا انہیں قیامت کے دن پیاسا رکھے۔"

اس پر صعصعہ ابن صوحان نے بگڑ کر کہا:۔

انما یمنعہ اللہ الفجرۃ وشربۃ الخمر لعنك اللہ ولعن ھذا الفاسق۔ (تاریخ کامل ج۳ ۔ ص۱۴۵)

خداوند عالم تو فاجروں اور شراب خواروں کو سیرابی سے محروم کرے گا تجھ پر خدا کی پھٹکار اور اس فاسق (ولید) پر بھی خدا کی لعنت۔"

عمرو ابن عاص نے کہا کہ اے معاویہ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ علی اور ان کے ہمراہی جبکہ اُن کے ہاتھوں میں چمکتی ہوی تلواریں اور لچکتے ہُوئے نیزے ہیں کبھی پیاسے نہیں رہیں گے بہتر یہ ہے کہ تم انہیں پانی سے نہ روکو اور خود سے پہرا اٹھالو ورنہ وُہ تمہیں پہرا اٹھا لینے پر مجبور کر دیں گے۔

معاویہ نے کہا:۔

لا واللہ او یموتو اعطشا کما مات عثمان۔ (مروج الذھب۔ ج۲ ۔ ص۳۸)

خدا کی قسم انہیں پانی نہیں دیا جائے گا یہانتک کہ پیاسے مر جائیں جس طرح عثمان پیاسے سدھارے تھے۔"

بندش آب کا فیصلہ اگرچہ اہل شام کے لئے بڑا خوش آئند تھا کیونکہ سیر و سیراب فوج کی نسبت پیاسی فوج کو شکست دینا آسان ہوتا ہے مگر اخلاقی اعتبار سے یہ حرکت اتنی غیر انسانی اور وحشیانہ تھی کہ خود سپاہِ شام کے چند آدمیوں نے اس کی برملا مذمت کی۔ چنانچہ لشکر شام میں سے ایک شخص معری ابن اقبل ہمدانی نے اس اقدام پر اظہار ناپسندیدگی کرتے ہُوئے معاویہ سے کہا کہ اے امیر ہم نے پیش قدمی کر کے گھاٹ پر قبضہ کر لیا ہے اگر وُہ ہم سے پہلے پہنچ جاتے اور دریا پر قابض ہو جاتے تو کبھی ہمیں پانی سے منع نہ کرتے تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ان کے لشکر میں غلام مزدور سن رسیدہ ضعیف و کمزور اور بے گناہ افراد بھی ہیں ان پر پانی بند کرنا سراسر ظلم و زیادتی ہے لہذا اپنا فیصلہ واپس لیجئے اور انہیں پانی لینے کی اجازت دیجئے۔ معاویہ نے یہ الفاظ سُنے تو اسے سختی سے جھڑکا اور عمرو ابن عاص نے بھی اُسے سخت سُست کہا۔ اس مرد ہمدانی نے ان کا یہ طرزِ عمل دیکھا تو رات کے اندھیرے میں نکل کھڑا ہوا اور حضرت کی فوج میں آکر شامل ہو گیا اور اپنے جذبات کا اظہار ان اشعار میں کیا:۔

الا للہ درك یابن ھند   لقد ذھب الحیاء فلا حیاء

"اے ہند کے بیٹے تمہاری خوبیوں کا کیا کہنا جب شرم و حیا جاتی رہے تو پھر حیا کہاں!"

اتحمون الفرات علٰی رجال   وفی ایدیھم الاسل الظماء

"کیا ان جوانمردوں کو فرات سے روکنا چاہتے ہو جن کے ہاتھوں میں لچکتے ہُوئے پیاسے نیزے ہیں۔"

وفی الاعناق اسیاف حداد   کان القوم عندکم نساء

"اور ان کی گردنوں میں تیز دھار تلواریں لٹک رہی ہیں تم نے تو یہ سمجھ لیا ہے کہ وُہ مرد نہیں عورتیں ہیں"

فترجوا ان یجاورکم علی بلاماء وللاحزاب ماء

"کیا تم یہ توقع رکھتے ہو کہ علی تمہارے قرب میں پیاسے رہیں گے اور دوسرے لوگ پانی پئیں گے"

فرات شامیوں کے قبضہ میں تھا اور عراقی دُور سے فرات کی روانیوں کو دیکھ کر کلیجہ مسوس کر رہ جاتے تھے۔ اُدھر غرور و انانیت سے گردنیں اکڑی ہوی اور سینے تنے ہُوئے تھے اور ادھر جذبۂ امن پسندی جوشِ شجاعت کو روکے ہُوئے تھا۔ آخر جب ایک شبانہ روز پانی نہ ملا تو سپاہِ عراق کے تیور بدلے اور دشمن کی اس کمینہ حرکت پر پیچ وتاب کھاتے ہُوئے حضرت سے کہا کہ یا امیر المومنین ہم کب تک شامیوں کو سیراب ہوتے دیکھیں گے اور خود پانی کے لئے تڑپتے رہیں گے۔ حضرت نے فرمایا کہ اب پانی کے لئے جنگ ناگزیر ہے لہٰذا اٹھو اور تلوار کے زور سے پانی حاصل کرو۔ جب حضرت کی طرف سے اجازت مل گئی تو مالک اشتر اور اشعث ابن قیس نے لشکر میں اعلان کیا کہ گھاٹ پر سے دشمن کو ہٹانے کے لئے تیار ہو جاؤ اس آواز پر بارہ ہزار سپاہی جن کے ہاتھوں میں تلواریں اور کندھوں پر کمانیں تھیں آگے بڑھے مالک اشتر نے علم جنگ حارث ابن ہمام نخعی کے سپُرد کیا اور اشعث نے لوائے جنگ معاویہ ابن حارث کو دیا اور دونوں سپہ سالار اپنے اپنے دستوں کی قیادت کرتے اور گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے شامیوں کی صفوں کے قریب پہنچ گئے اور انہیں گھاٹ پر سے پہرا اُٹھانے کے لئے کہا انہوں نے کہا کہ ہم اس وقت تک گھاٹ نہیں چھوڑیں گے جب تک تمہارے خون سے اپنی تلواروں کی پیاس بجھا نہ لیں گے۔ ادھر بھی تھڑدلے اور جنگ سے جی چرانے والے نہ تھے کہ اہل شام کی خون آشام تلواروں سے مرعوب ہو جاتے۔ مالک للکارتے ہوئے بے دھڑک آگے بڑھے۔ شامیوں نے ہتھیار سنبھالے نیزے تانے اور راستا روکنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ ان میں کا ایک سوار صالح ابن فیروز مقابلہ کے لئے بڑھا مالک نے اس کے سینہ پر نیزہ مارا اور اسے وہیں پر ٹھنڈا کر دیا۔ پھر یکے بعد دیگرے مالک ابن ادہم، ریاح ابن عتیک، ابراہیم ابن وضاح جمحی، زامل ابن عبید خزاعی، اجلح ابن منصور کندی اور محمد ابن روضہ جمحی مقابلہ کے لئے نکلے اور مالک نے ان سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ان مقتولین کے بعد جب کسی اور کو مقابلہ کی جرأت نہ ہوی تو مالک اپنے ہمراہیوں کو لے کر دشمن کی صفوں پر ٹوٹ پڑے اور لشکر کو تلواروں کی زد پر رکھ لیا ادھر سے بھی کمانیں کڑکیں اور تیر برسا ہُوئے مگر دلیروں کے قدم نہ رُکے اور تابڑ توڑ حملے کرتے ہُوئے آگے بڑھتے رہے۔ جب شامیوں کے سروں پر تلوار برسنے لگیں تو اُن کے پاؤں اُکھڑ گئے اور پناہ لینے کے لئے

ادھر اُدھر دوڑ پڑے راستا صاف ہوگیا اور عراقیوں نے آگے بڑھ کر گھاٹ پر قبضہ کرلیا۔

جب گھاٹ امیر المومنین کی فوجوں کے قبضہ میں آگیا تو معاویہ کو یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں ان کے ساتھ بھی وہی سلوک نہ ہو جو سلوک انہوں نے عراقیوں کے ساتھ روا رکھا تھا۔ اسی فکر میں غلطاں و پیچاں تھے کہ عمرو ابن عاص نے ان کی پریشانی کو دیکھ کر کہا کہ تمہارا کیا خیال ہے کیا علی تم پر اور تمہاری فوج پر پانی بند کردیں گے اور جس طرح انہوں نے لڑ کر فرات لے لیا ہے تم بھی اسی طرح لڑ کر لے سکو گے معاویہ نے بگڑ کر کہا کہ یہ وقت ان طنز آمیز باتوں کا نہیں ہے تم سنجیدگی سے بتاؤ کہ کیا علی بھی ہم سے وہی سلوک کریں گے جو ہم نے کیا تھا یا ہمیں پانی لینے کی اجازت دیں گے۔ عمرو نے کہا:۔

ظنی انہ لایستحل منک ما استحللت منہ لانہ اتاک فی غیر امر الماء (اخبار الطوال ص ۱۶۹)

میرا خیال غالب یہ ہے کہ جس چیز کو تم نے ان کے لئے روا رکھا تھا وہ تمہارے لئے اُسے روا نہیں رکھیں گے اس لئے کہ ان کے آنے کا مقصد پانی نہیں ہے کچھ اور ہے"

عراقیوں کے دلوں میں معاویہ کی طرف سے غم و غصہ تو تھا ہی انہوں نے دریا پر قبضہ کرتے ہی کہہ دیا کہ ہم کسی شامی کو پانی لینے کی اجازت نہیں دیں گے اور جس طرح انہوں نے گھاٹ پر قبضہ کرکے ہمیں پانی سے روکا تھا اسی طرح ہم بھی انہیں پانی لینے سے روک دیں گے۔ امیر المومنین کے کانوں میں یہ آواز پڑی تو فرمایا کہ اگر اہل شام نے جاہلانہ قدم اٹھایا تھا تو تمہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ دینی و اخلاقی قدروں کو کچل کر پانی بند کرو اور اسی وقت معاویہ کو پیغام بھجوایا کہ اگرچہ فرات پر ہمارا قبضہ ہے مگر تم اور تمہاری فوج جب چاہے اور جتنا چاہے پانی لے سکتی ہے ہماری طرف سے کوئی بندش نہیں ہے۔ اس عمومی اجازت کے بعد شامی بغیر روک ٹوک کے گھاٹ پر آتے خود سیراب ہوتے جانوروں کو سیراب کرتے اور حسب ضرورت پانی لے جاتے۔

امیر المومنین کے لشکر نے دریا کے قریب پڑاؤ ڈال دیا اور دلجمعی سے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ اس اثناء میں ایک سنسناتا ہوا تیر آیا جس پر تحریر تھا کہ میں تمہارا ہمدرد و خیر خواہ ہوں اور اس خیر خواہی کا تقاضا یہ ہے کہ میں تمہیں بتا دوں کہ معاویہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ دریا کا بند توڑ کر پانی کا رُخ تمہاری طرف موڑ دے تاکہ تم سب کو بہا لے جائے۔ یہ تیر کوفہ کے ایک شخص کے ہاتھ لگا اُس نے یہ تحریر پڑھی تو تیر دُوسرے کے حوالے کردیا۔ دُوسرے نے تیسرے کو دیا اور یونہی دست بدست گردش کرتا ہوا امیر المومنین تک پہنچ گیا۔ حضرت فوراً سمجھ گئے کہ یہ معاویہ کی سجھائی ہوئی چال ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ عراقی ڈر کے مارے یہ جگہ خالی کردیں اور شامی فوجیں اس مقام پر آجائیں۔ مگر عراقیوں میں کھلبلی مچ گئی لوگ پریشان و سراسیمہ ہوگئے اور اپنا اپنا سامان سمیٹنا شروع کردیا۔ حضرت نے فرمایا کہ یہ

ادھر اُدھر دوڑ پڑے راستا صاف ہوگیا اور عراقیوں نے آگے بڑھ کر گھاٹ پر قبضہ کرلیا۔

جب گھاٹ امیر المومنین کی فوجوں کے قبضہ میں آگیا تو معاویہ کو یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں ان کے ساتھ بھی وہی سلوک نہ ہو جو سلوک انہوں نے عراقیوں کے ساتھ روا رکھا تھا۔ اسی فکر میں غلطاں و پیچاں تھے کہ عمرو ابن عاص نے ان کی پریشانی کو دیکھ کر کہا کہ تمہارا کیا خیال ہے کیا علی تم پر اور تمہاری فوج پر پانی بند کردیں گے اور جس طرح انہوں نے لڑ کر فرات لے لیا ہے تم بھی اسی طرح لڑ کر لے سکو گے معاویہ نے بگڑ کر کہا کہ یہ وقت ان طنز آمیز باتوں کا نہیں ہے تم سنجیدگی سے بتاؤ کہ کیا علی بھی ہم سے وہی سلوک کریں گے جو ہم نے کیا تھا یا ہمیں پانی لینے کی اجازت دیں گے۔ عمرو نے کہا:۔

ظنی انه لا یستحل منك ما استحللت منه لانه اتاك فی غیر امر الماء (اخبار الطوال صـ ۱۶۹)

میرا خیال غالب یہ ہے کہ جس چیز کو تم نے ان کے لئے روا رکھا تھا وہ تمہارے لئے اُسے روا نہیں رکھیں گے اس لئے کہ ان کے آنے کا مقصد پانی نہیں ہے کچھ اور ہے۔"

عراقیوں کے دلوں میں معاویہ کی طرف سے غم و غصہ تو تھا ہی انہوں نے دریا پر قبضہ کرتے ہی کہہ دیا کہ ہم کسی شامی کو پانی لینے کی اجازت نہیں دیں گے اور جس طرح انہوں نے گھاٹ پر قبضہ کرکے ہمیں پانی سے روکا تھا اسی طرح ہم بھی انہیں پانی لینے سے روک دیں گے۔ امیر المومنین کے کانوں میں یہ آواز پڑی تو فرمایا کہ اگر اہل شام نے جاہلانہ قدم اٹھایا تھا تو تمہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ دینی و اخلاقی قدروں کو کچل کر پانی بند کرو اور اسی وقت معاویہ کو پیغام بھجوایا کہ اگرچہ فرات پر ہمارا قبضہ ہے مگر تم اور تمہاری فوج جب چاہے اور جتنا چاہے پانی لے سکتی ہے ہماری طرف سے کوئی بندش نہیں ہے۔ اس عمومی اجازت کے بعد شامی بغیر روک ٹوک کے گھاٹ پر آتے خود سیراب ہوتے جانوروں کو سیراب کرتے اور حسب ضرورت پانی لے جاتے۔

امیر المومنین کے لشکر نے دریا کے قریب پڑاؤ ڈال دیا اور دلجمعی سے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ اس اثناء میں ایک سنسناتا ہوا تیر آیا جس پر تحریر تھا کہ میں تمہارا ہمدرد و خیر خواہ ہوں اور اس خیر خواہی کا تقاضا یہ ہے کہ میں تمہیں بتادوں کہ معاویہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ دریا کا بند توڑ کر پانی کا رُخ تمہاری طرف موڑ دے تاکہ تم سب کو بہا لے جائے۔ یہ تیر کوفہ کے ایک شخص کے ہاتھ لگا اُس نے یہ تحریر پڑھی تو تیر دُوسرے کے حوالے کردیا۔ دُوسرے نے تیسرے کو دیا اور یونہی دست بدست گردش کرتا ہوا امیر المومنین تک پہنچ گیا۔ حضرت فوراً سمجھ گئے کہ یہ معاویہ کی سجھائی ہوئی چال ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ عراقی ڈر کے مارے یہ جگہ خالی کردیں اور شامی فوجیں اس مقام پر آجائیں۔ مگر عراقیوں میں کھلبلی مچ گئی لوگ پریشان و سراسیمہ ہوگئے اور اپنا اپنا سامان سمیٹنا شروع کردیا۔ حضرت نے فرمایا کہ یہ

تمہیں اس جگہ سے ہٹانے کا پُر فریب حیلہ ہے تم اپنی جگہ نہ چھوڑو اور سکون و اطمینان سے بیٹھے رہو۔ کچھ لوگ مطمئن ہو گئے اور کچھ لوگ چیخ چیخ کر کہنے لگے کہ معاویہ کا عملہ بیلچے اور پھاوڑے لے کر پہنچ گیا ہے اور انہوں نے بند کاٹنا شروع کر دیا ہے اگر ہم نے نقل مکانی میں تاخیر کی تو سب کے سب بہہ جائیں گے۔ حضرت نے فرمایا کہ تم اطمینان رکھو معاویہ کے بس کی یہ بات نہیں ہے کہ وہ دریا کا رُخ تمہاری طرف موڑ دے۔ مگر فوج میں کم حوصلہ و بے ہمت لوگ بھی تھے وہ پیچھے ہٹے تو ان کی دیکھا دیکھی دوسروں نے بھی جگہ چھوڑ دی اور حضرت کے سمجھانے بجھانے کے باوجود میدان خالی کر کے پیچھے ہٹ آئے۔ معاویہ نے میدان خالی دیکھا تو شامیوں کو لے کر اس مقام پر آ گئے۔ جب عراقیوں نے سپاہِ شام کو اس جگہ پر آتے دیکھا تو جنہوں نے معاویہ کے دھوکے کو نہ سمجھا تھا وہ بھی سمجھ گئے کہ یہ جگہ خالی کرانے کا ایک حیلہ تھا اب انہیں احساس ہوا کہ انہوں نے جگہ چھوڑ کر غلط قدم اٹھایا ہے اور وہی لوگ جو جگہ چھوڑنے پر اصرار کر رہے تھے نادم و پشیمان ہو کر حضرت کے پاس آئے اور اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے جس بے تدبیری کا مظاہرہ کیا ہے اس کا تدارک کریں گے اور جس طرح بن پڑے گا شامیوں کو ہٹا کر اس جگہ کو واپس لیں گے۔ چنانچہ اشعث ابن قیس بنی کندہ کے پیادوں اور مالک اشتر سواروں کو لے کر شامیوں پر حملہ آور ہوئے اور انہیں بزورِ شمشیر خیمہ و خرگاہ اٹھا لینے پر مجبور کر دیا اور پھر واپس اپنے مقام پر آ گئے۔

فرات کی مہم سر ہو چکی۔ اہل عراق کو دریا پر قبضہ کئے دو دن گزر گئے مگر ان دو دنوں میں نہ کوئی گفت و شنید ہوئی اور نہ نامہ و پیام کی نوبت آئی۔ عراقی اپنی فتحیابی پر خوش اور دشمن سے بھڑنے کے لئے بے چین تھے مگر امیر المومنین کی خاموشی انہیں الجھن میں ڈالے ہوئے تھی اور وہ یہ سوچنے لگے تھے کہ کیا امیر المومنین جنگ سے بچنا چاہتے ہیں یا ان لوگوں سے جنگ کے جواز میں انہیں شبہ پیدا ہو گیا ہے حضرت کو معلوم ہوا تو فرمایا کہ اس کی وجہ نہ جنگ سے جی چراتا ہے اور نہ اس کے جواز میں کوئی شک و شبہ ہے بلکہ اس ڈھیل دینے کا مقصد یہ ہے کہ شاید اس وقفہ میں کوئی ضلالت و گمراہی کی تاریکی سے نکل کر رشد و ہدایت کی روشنی میں آ جائے یا کم از کم ہماری طرف سے ان پر حجت تمام ہو جائے۔ آخر اس توقف کے بعد یکم ذی الحجہ ۳۶ھ کو اتمام حجت کے لئے بشیر ابن عمرو انصاری، سعید ابن قیس ہمدانی اور شبث ابن ربعی تمیمی کو بُلا کر کہا کہ تم معاویہ کے پاس جاؤ اور اسے سمجھاؤ کہ وہ اسلامی اتحاد کو پارہ پارہ نہ کرے افتراق و انتشار سے باز آئے اور میری خلافت کو تسلیم کر کے بیعت کرے۔ بشیر ابن عمرو نے کہا کہ ہمیں توقع نہیں ہے کہ وہ ہماری بات پر کان دھرے اور بیعت پر آمادہ ہو جائے۔ فرمایا کہ تم جاؤ اور اسے قائل کرنے کی کوشش کرو۔ یہ تینوں اُٹھ کھڑے ہوئے اور معاویہ کے ہاں پہنچے۔ بشیر ابن عمرو نے گفتگو کا آغاز کیا اور معاویہ سے مخاطب ہو کر کہا "اے فرزندِ ابو سفیان اس دُنیا نے ہمیشہ کسی کا ساتھ نہیں دیا

اور تمہارا بھی ہمیشہ ساتھ نہیں دے گی۔ تمہیں ایک نہ ایک دن مرنا ہے اور اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے وہاں تمہارے اعمال کا محاسبہ ہوگا اور پھر جیسے اچھے بُرے اعمال ہوں گے ویسا بدلہ ملے گا۔ میں تمہیں اللہ کا واسطہ دیتا ہوں کہ تم فتنہ و شر سے باز آؤ اور اپنے منفی طرز عمل سے اُمّت میں تفرقہ پیدا نہ کرو"۔ معاویہ نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا کہ تم یہ نصیحت علیؑ کو کیوں نہیں کرتے۔ بشیر نے کہا کہ وُہ کہاں اور تم کہاں۔ وُہ سابق الاسلام پیغمبر کے قریبی عزیز اور عظمت و فضیلت کے تاجدار ہیں نہ اُن کا کوئی ہمپایہ ہے اور نہ اُن سے زیادہ کوئی خلافت کا اہل ہے۔ معاویہ نے کہا کہ آخر وُہ چاہتے کیا ہیں؟ کہا کہ وُہ یہ چاہتے ہیں کہ تم حق کو پہچانو اس کا ساتھ دو اور اس سے مُنہ نہ موڑو اس طرح تم دُنیا میں بھی سرخرو ہوگے اور آخرت میں بھی۔ معاویہ نے کہا:۔

ونترك دم ابن عفان لا واللہ لا افعل ذلك ابدا۔ (تاریخ کامل ج ۳۔ ص ۱۴۶)

"کیا ہم فرزند عفان کے قصاص سے دستبردار ہو جائیں۔ خدا کی قسم یہ کبھی نہیں ہوگا"۔

پھر شبث ابن ربعی نے معاویہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اے معاویہ ہم سے تمہارا اصل مقصد پوشیدہ نہیں ہے۔ تمہارے پاس لوگوں کو بہکانے اور اُن کے جذبات کو بھڑکانے کا لے دے کر یہی تو ایک حربہ ہے کہ تم اُن سے یہ کہو کہ اے لوگو! تمہارا امام مظلوم مارا گیا ہے اور میں ان کے خون کا قصاص لینا چاہتا ہوں۔ تم نے اس آواز پر چند جاہل اور خود سر لوگ اپنے گرد جمع کر لئے ہیں حالانکہ تم وہی ہو جس نے عثمان کی نصرت سے عمداً پہلو تہی کی اور یہ چاہا کہ وُہ قتل کر دیئے جائیں تاکہ ان کے قصاص کے نام پر جنگ چھیڑ کر اقتدار کی راہ ہموار کرو۔ یاد رکھو کہ دنیا میں کچھ لوگ وُہ ہیں جو کسی چیز کے خواہشمند ہوتے ہیں مگر اللہ ان کی خواہشوں میں انہیں کامیاب نہیں ہونے دیتا اور کچھ لوگ وُہ ہیں جو اپنی توقع سے کہیں بڑھ کر کامیاب ہوتے ہیں۔ لیکن تمہارے لئے کامیابی و ناکامی دونوں صورتوں میں فلاح و بہبود نہیں ہے۔ اگر تم اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوئے تو عرب میں تم سے زیادہ کوئی بدبخت و پراگندہ حال نہ ہوگا اور اگر تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے تو اس کے نتیجہ میں آخرت کی روسیاہی اور جہنم کے سوا کیا رکھا ہے۔ اے معاویہ اللہ سے ڈرو اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کو چھوڑو تمرد و سرکشی سے باز آؤ اور جو خلافت کا صحیح حقدار ہے اس سے اُلجھنے کی کوشش نہ کرو۔ معاویہ شبث کی بیباکانہ گفتگو سے بوکھلا اُٹھے اور کسی بات کی تردید کرنے کے بجائے تلخ کلامی پر اُتر آئے اور پُر غضب لہجہ میں کہا:۔

انصرفوا من عندی فلیس بینی و بینکم الا السیف۔ (تاریخ کامل ج ۳ ص ۱۴۶)

"تم میرے پاس سے چلے جاؤ اب ہمارے اور تمہارے درمیان تلوار ہی فیصلہ کرے گی"۔

اس پر سعد ابن قیس ہمدانی نے کہا۔

اتھول بالسیف اقسم باللہ لنعجلنھا الیک۔ (تاریخ کامل ج۳ ص۱۴۷) — کیا ہمیں تلواروں سے ڈراتے ہو خدا کی قسم ہم جلد ہی تلواریں لے کر تمہاری طرف بڑھیں گے۔

اس وفد کی واپسی کے بعد چند قراء و حفاظ معاویہ کے پاس آئے اور اُن سے کہا کہ تم چاہتے کیا ہو اور یہ لاؤ لشکر کیوں جمع کیا ہے؟ کہا کہ میرا مقصد قصاص خون عثمان ہے۔ کہا یہ قصاص کس سے لینا چاہتے ہو؟ کہا علی سے۔ کہا کیا علی نے انہیں قتل کیا ہے؟ کہا ہاں وہی تو قاتل ہیں۔ ان لوگوں نے پلٹ کر حضرت سے کہا کہ معاویہ آپ پر یہ الزام عائد کرتا ہے کہ آپ نے عثمان کو قتل کیا ہے۔ فرمایا یہ سراسر افترا اور بہتان ہے میں ہرگز قاتل نہیں ہوں۔ ان لوگوں نے معاویہ سے یہ جواب نقل کیا۔ انہوں نے کہا کہ اپنے ہاتھ سے تو قتل نہیں کیا بلکہ دوسروں کو اُن کے قتل پر اُبھارا ہے۔ ان لوگوں نے حضرت سے ذکر کیا آپ نے فرمایا کہ یہ بھی غلط ہے۔ انہوں نے معاویہ سے حضرت کا یہ جواب نقل کیا۔ معاویہ نے کہا کہ اگر علی سچ کہتے ہیں تو اُن کے قاتل ہمارے حوالے کریں جو ان کے لشکر میں موجود اور اُن کے قوتِ بازو بنے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں نے پلٹ کر حضرت سے اس کا ذکر کیا۔ فرمایا کہ جن لوگوں نے انہیں قتل کیا ہے وہ قرآن سے اُن کے قتل کے جواز پر دلیل لاتے ہیں اور جو قتل تاویلاً ہو اس کا قصاص نہیں ہے۔ جب معاویہ سے اس کا ذکر ہوا تو انہوں نے کہا کہ اگر ایسا ہی ہے تو علی کو یہ حق کہاں سے پہنچتا ہے کہ وہ ہمارے مشورہ کے بغیر مسند خلافت پر بیٹھ جائیں۔ حضرت نے اس کے جواب میں فرمایا کہ مہاجرین و انصار جو اہل حل وعقد ہیں ان کا یہ متفقہ فیصلہ ہے اور دوسرے مسلمان انہی کے فیصلہ کے پابند ہیں۔ معاویہ نے کہا کہ جو مہاجرین و انصار ہمارے ہاں ہیں انہوں نے نہ بیعت کی ہے اور نہ اس پر رضامندی کا اظہار کیا ہے۔ غرض وہ اس طرح کے حیلے حوالوں سے کام لیتے رہے اور بیعت سے کنارہ کشی کی کوئی معقول توجیہہ نہ کر سکے وہ سمجھتے تھے کہ اگر بیعت کر لیں گے تو پھر حضرت پر خون عثمان میں شرکت یا قاتلین کی اعانت کا الزام عائد نہ کر سکیں گے اور ان کے پاس لے دے کے یہی ایک حربہ تھا جس سے جنگ کا جواز ثابت کر سکتے تھے۔

اس سلسلہ میں ابوامامہ باہلی اور ابوالدرداء نے بھی معاویہ سے بات چیت کی اور ان سے کہا کہ تم کیوں علی سے برسرِ پیکار ہو جبکہ وہ تم سے زیادہ خلافت کے حقدار ہیں۔ کہا کہ میں خونِ عثمان کے قصاص کے لئے لڑ رہا ہوں۔ ان دونوں نے کہا کہ کیا علی ان کے قاتل ہیں؟ کہا انہوں نے خود تو قتل نہیں کیا لیکن ان کے قاتلوں کو اپنے ہاں پناہ دے رکھی ہے۔ اگر وہ انہیں ہمارے حوالے کر دیں تو میں سب سے پہلے ان کی بیعت کروں گا۔ یہ بات اُن کے دل کو لگی اور وہ اٹھ کر امیر المومنین کے پاس آئے اور معاویہ کی بات دُہرائی حضرت سمجھ گئے کہ وہ ایک ناممکن چیز کا مطالبہ کر کے انہیں فریب دینا چاہتا ہے تاکہ وہ اس کے

جال میں پھنسے رہیں آپ ان دونوں کو لے کر اپنے لشکر کی صفوں کے پاس آئے اور پوچھا کہ تم میں کون کون قاتل عثمان ہے لشکر میں سے بیس ہزار افراد نے باآواز بلند کہا:۔

نحن جمیعًا قتلنا عثمان۔ ہم سب نے عثمان کو قتل کیا ہے"۔

(اخبار الطوال صـ۱۷۱)

ابو امامہ اور ابو الدرداء نے سوچا کہ ایک فرد کے خون کے بدلے بیس ہزار افراد کا خون تو مباح ہو نہیں سکتا اور نہ ان لوگوں کو معاویہ کے حوالے کرنے کا کوئی جواز ہے وہ معاویہ کے ہاں جانے کے بجائے بعض ساحلی مقامات کی طرف چلے گئے اور فریقین میں سے کسی فریق کا ساتھ نہ دیا۔

امیر المومنین کی برابر یہ کوشش رہی کہ جنگ کی نوبت نہ آئے اور معاملہ افہام وتفہیم اور گفت و شنید سے طے ہو جائے مگر معاویہ سمجھتے تھے کہ صلح کا آخری نتیجہ بیعت اور اطاعت و فرمانبرداری ہے اور یہ ان کے لئے سراسر ہزیمت وشکست تھی اس لئے وُہ مصالحت کی ہر گفتگو سے پہلو بچا لے جاتے اور امیر المومنین کی صلح پسندانہ روش کو جنگ سے گریز پر محمول کر کے دھمکیوں سے مرعوب کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ آخر ان اشتعال انگیزیوں کے نتیجہ میں دبی ہوئی چنگاریاں بھڑک اٹھیں اور ابتدائی جھڑپوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اس طرح کہ دونوں طرف سے جنگ آزما میدان میں اُتر کر حریف کو للکارتے کچھ دیر جنگ کے شعلے بھڑکاتے اور اپنی صفوں میں واپس چلے جاتے۔ شامیوں کی طرف سے عبدالرحمٰن ابن خالد ابن ولید، ابو الاعور سلمی، حبیب ابن مسلمہ فہری، ابن ذی الکلاع حمیری، عبیداللہ ابن عمر شرجبیل ابن سمط کندی اور حمزہ ابن مالک باری باری فوجی دستوں کو لے کر میدان میں آتے۔ اور عراقیوں کی طرف سے مالک اشتر، حجر ابن عدی، شبث ابن ربعی، خالد ابن معمر، زیاد ابن نضر حارثی، زیاد ابن خصفہ تیمی، سعید ابن قیس ہمدانی، معقل ابن قیس ریاحی اور قیس ابن سعد انصاری اپنی اپنی نوبت پر مقابلہ کے لئے نکلتے اور دشمن کو نیزوں اور تلواروں کی زد پر رکھ کر پسپا ہونے پر مجبور کر دیتے۔

یوں تو یہ سب کے سب مانے ہوئے جنگجو اور نبرد آزما تھے مگر مالک اشتر سے اچھے اچھے شہزور پناہ مانگتے تھے اور انہیں میدان میں دیکھ کر ان کے چہروں کا رنگ اُڑ جایا کرتا تھا۔ چنانچہ انہی جنگ کے ابتدائی ایام میں سہم ابن ابی العیزار فوج مخالف سے باہر نکل کر مبارز طلب ہوا۔ یہ سپاہ شام کا مانا ہوا سُورما غیر معمولی قد و قامت اور بڑے ڈیل ڈول کا آدمی تھا۔ اس کوہ پیکر کو دیکھ کر بڑے بڑے ساونت پہلو کترا کر نکل جاتے تھے۔ مالک اشتر نے اس سے دو دو ہاتھ کرنے کا ارادہ کیا اور صفوں سے نکل کر آگے بڑھے لوگوں نے انہیں روکا کہ آپ نہ جائیں ایسا نہ ہو کہ وُہ اپنی جسامت اور قد و قامت کی وجہ سے آپ پر چھا جائے۔ مالک نے سُنی ان سُنی کر دی اور بے خوف وخطر آگے بڑھ کر اُسے للکارا۔ اسے اپنی قوت و طاقت پر گھمنڈ تو تھا ہی فورًا گھوڑا کدا کر سامنے آیا اور تلوار لے کر مالک پر جھپٹا

اس تاثر کو ختم کرنے کے لئے ان سفارتوں کے جواب میں حبیب ابن مسلمہ فہری، شرجیل ابن سمط کندی اور معن ابن یزید اسلمی کو حضرت کے پاس گفتگو کے لئے بھیجا۔ جب یہ تینوں حضرت کے ہاں آئے تو حبیب ابن مسلمہ نے کہا کہ اے علی حضرت عثمان خلیفہ راشد متقی و پرہیزگار اور قرآنی تعلیمات کے پابند تھے مگر تم لوگوں کو ان کا جینا گوارا نہ ہوا اور ہجوم کر کے انہیں بے جرم و خطا قتل کر ڈالا۔ ان کے قاتل ہمارے حوالے کیجئے تاکہ ہم انہیں قصاص میں قتل کریں۔ اور خلافت کو شوریٰ کے سپرد کر کے علیحدہ ہو جائیے تاکہ ہم اتفاق رائے سے کسی کو خلیفہ منتخب کریں۔ حضرت نے اس کا یہ طرزِ تخاطب دیکھا تو فرمایا:۔

وما انت لاام لك والعزل و	تو خلافت سے دستبرداری کا مطالبہ کرنے والا
هٰذا الامر فانك لست هناك	کون ہوتا ہے جبکہ تو اس معاملہ میں دخل دینے
ولا باهل۔ (تاریخ طبری ج ۶ ص ۴)	کا اہل ہی نہیں ہے"۔

حبیب پیچ و تاب کھاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ جب میرا اور تمہارا سامنا ہو گا تو پھر دیکھ لیجئے گا کہ میں کس طرح پیش آتا ہوں۔ حضرت نے فرمایا کہ تو سواروں اور پیادوں کے لشکر جرار کو لے کر بھی مجھ پر ٹوٹ پڑے تو میں تیری حقیقت کچھ نہیں سمجھتا جا جو بن پڑے کر۔ شرجیل نے کہا کہ میں بھی وہی کہنا چاہتا ہوں جو میرے ساتھی نے کہا ہے اور کیا مجھے بھی وہی جواب دیا جائے گا جو اُسے دیا گیا ہے ؟

حضرت نے فرمایا کہ میں نے اُسے جو جواب دیا ہے وہ اسی کا اہل تھا البتہ تمہیں دوسرا جواب دیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد حضرت نے رسول کی بعثت اور پہلے اور دوسرے دور کا ذکر کیا پھر فرمایا کہ جب عثمان خلیفہ ہوئے تو ان سے ایسی حرکتیں سرزد ہوئیں جنہیں لوگوں نے برا سمجھا ان پر نکتہ چینی کی اور انہیں سمجھایا بجھایا۔ اور جب کہنے سننے کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا تو اُن کے گرد گھیرا ڈالا اور انہیں قتل کر دیا۔ پھر لوگ جمع ہو کر میرے پاس آئے اور مجھ سے بیعت کے طالب ہوئے میں نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ انکار کر دوں۔ چنانچہ میں نے واضح الفاظ میں انکار کر دیا مگر انہوں نے اصرار کیا اور اصرار کی حد کر دی اور کہنے لگے کہ لوگ آپ کے علاوہ کسی کی بیعت پر رضامند نہیں ہیں اور ہمیں اندیشہ ہے کہ اگر آپ نے بیعت کے لئے ہاتھ نہ بڑھایا تو لوگوں میں پھوٹ پڑ جائے گی امن عامہ تباہ ہو جائے گا اور اسلام کو خطرناک صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑے گا ان حالات میں مجھے بیعت کے لئے مجبور ہونا پڑا اور جب بیعت ہو چکی تو دو شخص (طلحہ و زبیر) تمرد و سرکشی پر اُتر آئے حالانکہ وہ دونوں بخوشی میری بیعت کر چکے تھے پھر معاویہ نے علم بغاوت بلند کیا حالانکہ اُسے نہ دین میں کوئی سبقت اور نہ اسلام میں کوئی درجہ حاصل ہے وہ آزاد کردہ اور آزاد کردہ کا بیٹا ہے۔ اس کا باپ اور وہ خود ہمیشہ اللہ اور اس کے رسول کے دشمن رہے اور انہوں نے اسلام قبول کیا تو مجبوری کی صورت میں۔ مجھے تعجب ہے کہ تم نے اہلبیت رسول سے روگردانی اختیار کر لی ہے اور معاویہ کے دامن سے وابستہ ہو کر اس کے اشاروں پر چلنے لگے ہو

حالانکہ چاہئے تو یہ تھا کہ تم آلِ نبی کا ساتھ دیتے اور کسی کو ان کے مقابلہ میں نہ لاتے۔ میں تمہیں اللہ کی کتاب اور رسُول کی سُنّت کو زندہ کرنے دین کے آثار کو باقی رکھنے اور باطل کے خلاف جہاد کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ شمر جبیل نے اس آوازِ حق کو سُنا مگر اس سے کوئی اثر نہ لیا اور کہنے لگا کہ کیا آپ یہ مانتے ہیں کہ عثمان مظلوم مارے گئے ہیں فرمایا کہ میں نہ یہ کہتا ہوں کہ وُہ مظلوم تھے اور نہ یہ کہتا ہوں کہ وُہ ظالم تھے اس پر شمر جبیل اور معن ابن یزید بھڑک اُٹھے اور کہا کہ جو یہ عقیدہ نہ رکھے کہ عثمان مظلوم مارے گئے تھے ہم اس سے بیزار ہیں اور ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے یہ کہہ کر وُہ اُٹھ کھڑے ہُوئے اور واپس چلے گئے۔ حضرت کو ان لوگوں کے متاثر ہونے کی پہلے ہی سے کوئی توقع نہ تھی تاہم ان پر حجت تمام کر دی اور جب انہیں جاتے دیکھا تو یہ آیت پڑھی :۔

انک لا تسمع الموتی و لا تسمع الصم الدعاء اذا ولوا مدبرین وما انت بھادی العمی عن ضلالتھم ان تسمع الا من یؤمن بایاتنا فھم مسلمون۔	تم نہ مُردوں کو اپنی بات سُنا سکتے ہو اور نہ بہروں تک اپنی آواز پہنچا سکتے ہو اور نہ تم اندھوں کو اُن کی گمراہی سے راہ راست پر لا سکتے ہو۔ تم انہی لوگوں سے اپنی بات منوا سکتے ہو جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں اور یہی لوگ تو ماننے والے ہیں "۔

اس کے بعد حضرت اپنے اصحاب کی طرف متوجہ ہُوئے اور فرمایا :۔

لا یکن ھولاء اولی بالجد فی ضلالھم منکم بالجد فی حقکم و طاعۃ ربکم۔ (تاریخ طبری ج ۶ ص ۵)	ایسا نہ ہو کہ ضلالت و گمراہی میں ان لوگوں کی کوششیں تمہاری کوششوں سے بڑھ جائیں جبکہ تمہاری کوششیں حق اور اپنے پروردگار کی اطاعت کے سلسلہ میں ہیں "۔

جب محرم کا آخری دن گزرا اور افق پر صفر کا چاند دکھائی دیا تو امیرالمومنین نے صلح کی ہر کوشش سے مایوس ہو کر مرثد ابن حارث جشمی کو فریق مخالف کی طرف بھیجا جنہوں نے سپاہِ شام کے سامنے کھڑے ہو کر اعلان کیا :۔

الا ان امیر المؤمنین یقول لکم انی قد استدمتکم لتراجعوا الحق و تنیبوا الیہ واحتججت علیکم بکتاب اللہ عزوجل فدعوتکم الیہ فلم تناھوا	اے اہلِ شام امیرالمومنین تم سے فرماتے ہیں کہ میں نے تمہیں مہلت دی تاکہ حق کو دیکھو بھالو اور اس کی طرف رجوع کرو میں نے تم پر خدائے بزرگ و برتر کی کتاب سے حجت تمام کر دی اور اس کی پیروی کی تمہیں دعوت دی مگر تم تمرد

المشركين فلما رأى الله يعز دينه ويظهر رسوله اتى النبي فاسلم وهو فيما نرى راهب غير راغب ثم قبض الله عز وجل رسوله فوالله ان زال بعده معروفا بعداوة المسلم وهوادة المجرم فاثبتوا له وقاتلوه فانه يطفئ نور الله ويظاهر اعداء الله۔ (تاریخ طبری ج۶ ص۸)

پشت پناہی کی اور جب یہ دیکھا کہ اللہ نے اپنے دین کو استحکام بخشا ہے اور اپنے رسول کو غلبہ دیا ہے تو پیغمبر کے پاس آیا اور مسلمان ہو گیا ہم جانتے ہیں کہ یہ ڈر کے مارے مسلمان ہوا تھا اور اسے اسلام سے کوئی دلچسپی نہ تھی جب اللہ نے اپنے رسول کو دنیا سے اٹھا لیا تو خدا کی قسم یہ مسلمانوں کا دشمن اور کافروں کا دوست ہی رہا۔ لہذا اس کے مقابلہ میں ثابت قدم رہو اور اس سے جنگ و قتال کرو کیونکہ یہ اللہ کے نور کو بجھانا اور دشمنان خدا کو تقویت پہنچانا چاہتا ہے۔"

پھر اپنے ہمراہیوں کو لے کر اس شدت سے حملہ کیا کہ شامیوں کے قدم اکھڑ گئے اور عمرو جو بڑی آن بان سے سیاہ علم لہراتا ہوا میدان میں آیا تھا اپنی جگہ چھوڑ کر پچھلی صفوں میں روپوش ہو گیا۔ زیاد ابن نضر اپنے سواروں کے ساتھ شامی سواروں پر حملہ آور تھے کہ ایک سوار اُن کے مقابلہ کے لئے بڑھا زیاد نے پوچھا کہ تم کون ہو اُس نے کہا کہ میں معاویہ ابن عمرو عقیلی ہوں۔ زیاد یہ نام سُن کر حملہ کرنے میں متردد ہوئے کیونکہ وُہ ان کا مادری بھائی تھا۔ ان دونوں کی ماں قبیلۂ زبید کی ایک عورت ہند تھی انہوں نے لڑنا مناسب نہ سمجھا اور امیر المومنین سے اجازت لے کر واپس چلے آئے چوتھے دن محمد ابن حنفیہ فوج و سپاہ کے ساتھ میدان میں آئے اُدھر سے عبید اللہ ابن عمر ایک بڑی جمعیت کے ساتھ نکلا اور دونوں نے ایک دوسرے کے بالمقابل صفیں جمائیں۔ نیزوں کی طرف ہاتھ بڑھے تلواریں نیاموں سے نکل آئیں اور جنگ کے شعلے بھڑک اُٹھے۔ عبید اللہ ابن عمر نے ابن حنفیہ کو مقابلہ کی دعوت دی۔ محمد ابن حنفیہ اس کی آواز پر تڑپ کر باہر نکلے اور تیزی کے ساتھ آگے بڑھے۔ امیر المومنین نے دیکھا تو پوچھا کہ یہ کون ہے بتایا گیا کہ ابن حنفیہ ہیں جو عبید اللہ ابن عمر کے مقابلہ کے لئے جا رہے ہیں۔ حضرت نے یہ سُنا تو محبت کا جوش رُک نہ سکا فوراً گھوڑے کی رکاب میں قدم رکھا اور ابن حنفیہ کے قریب پہنچ کر نیچے اُترے اور فرمایا کہ تم میری سواری کی باگ تھامے رہو میں ابھی پلٹ کر آتا ہوں۔ یہ کہہ کر آپ ابن عمر کے قریب آئے اس نے ابن حنفیہ کے بجائے امیر المومنین کو دیکھا تو چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ کہنے لگا میں آپ سے لڑنا نہیں چاہتا اور یہ کہہ کر پچھلی صفوں میں چلا گیا۔ حضرت واپس ہوئے اور جب اپنی سواری کے پاس پہنچے تو

ابن حنفیہ نے کہا کہ بابا آپ نے مجھے کیوں روک دیا اگر مجھے جانے دیتے تو میں اُسے قتل کئے بغیر نہ پلٹتا۔ فرمایا مجھے تم سے یہی اُمید تھی مگر میں پوری طرح مطمئن نہ تھا کہ تم اسے مار گراؤ گے اس لئے مجھے خود جانا پڑا۔ کہا کہ بابا میں آپ کو روکنے کی جرأت نہ کر سکا ورنہ مجھے یہ گوارا نہ تھا کہ آپ اس ذلیل وکمینہ فطرت کے مقابلہ میں جاتے۔

پانچویں دن عبداللہ ابن عباس سواروں اور پیادوں کے دستے لے کر نکلے اور ادھر سے ولید ابن عقبہ اپنے سواروں اور پیادوں کی قیادت کرتا ہوا نکلا۔ اس نے جب ابن عباس کو دیکھا تو اپنی بدفطرتی وبدطینتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بنی عبدالمطلب پر زبان درازی شروع کر دی اور ابن عباس سے کہا:۔

یا ابن عباس قطعتم ارحامکم	اے ابن عباس تم لوگوں نے قطع رحم کیا اپنے
وقتلتم امامکم ولو تدرکوا	امام (عثمان) کو قتل کر ڈالا اور اپنی آرزوؤں میں
ما املتم (اخبار الطوال ص۱۷۵)	بھی ناکام رہے۔"

ابن عباس نے کہا کہ اس الزام تراشی ویاوہ گوئی کو چھوڑو اور میرے مقابلہ کے لئے آگے بڑھو مگر اسے آگے بڑھنے کی جرأت نہ ہوئی اور جو گرجتے ہیں سو برستے نہیں کچھ دیر چیخا چلایا اور پھر دبک کر بیٹھ گیا۔ ابن عباس اپنے ہمراہیوں کو لے کر شامیوں پر حملہ آور ہوئے۔ ظہر تک معرکہ کارزار گرم رہا۔

اسی دن سمرہ ابن ابرہہ حمیری قراء وحفاظ کی ایک معتد بہ جماعت کے ساتھ شامیوں سے الگ ہو کر امیرالمومنین کے لشکر میں شامل ہو گیا جس سے معاویہ کو اچھا خاصا دھچکا لگا کیونکہ یہ ان کے موقف کے خلاف انہی کی جماعت کی عملی شہادت تھی۔

چھٹے دن عراقیوں کی صف سے قیس ابن سعد انصاری اور شامیوں کے لشکر سے ابن ذی الکلاع حمیری میدان میں اترے ظہر تک جنگ کا سلسلہ جاری رہا اور پھر اپنی اپنی صفوں میں واپس آ گئے۔

ساتویں دن سپاہ امیرالمومنین کی طرف سے مالک اشتر اور ادھر سے حبیب ابن مسلمہ ایک دوسرے کے سامنے صف آرا ہوئے۔ سپاہ شام سے حجر الشر کندی گھوڑے پر سوار ہو کر مبارز طلب ہوا اس کے مقابلہ میں اس کے ہم نام اور ہم قبیلہ حجر ابن عدی جو حجر الخیر کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے نکلے۔ دونوں نیزے تان کر ایک دوسرے پر حملہ آور ہوئے اس اثناء میں لشکر شام کا ایک سپاہی خزیمہ ابن ثابت اسدی بیچ میں کود پڑا اور حجر الخیر پر حملہ آور ہو کر ان کا نیزہ توڑ ڈالا چند عراقی سپاہیوں نے یہ دیکھا تو آگے بڑھ کر خزیمہ اسدی کو قتل کر دیا اور حجر الشر جان بچا کر نکل گیا مگر کچھ دیر کے بعد پھر للکارتا ہوا میدان میں آیا۔ حکم ابن ازہر اس کے مقابلہ کے لئے بڑھے کچھ دیر اس سے

جنگ کی۔ آخر حجر الشر کے ہاتھ سے مارے گئے۔ حکم کے ابن عم رفاعہ ابن ظالم حمیری نے حکم ابن ازہر کو گرتے دیکھا تو پیچ و تاب کھاتے ہوئے صفوں سے باہر نکلے اور حجر الشر پر حملہ کر کے اسے تہ تیغ کر دیا۔ امیر المومنین نے دیکھا تو فرمایا خدا کا شکر ہے کہ حکم ابن ازہر کا قاتل مارا گیا۔

میدان میں تلواریں چل رہی تھیں اور عراقی و شامی ایک دوسرے پر حملے کر رہے تھے کہ عراقی دستہ کا ایک سپاہی ابو ایوب شامیوں پر حملہ کر کے صفوں سے باہر نکلا دیکھا کہ ایک شامی عراقیوں کی صف پر حملہ کر کے پلٹ رہا ہے جب دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوئے تو تلواریں کھینچ لیں اور حملہ کر دیا ابو ایوب نے اس کی گردن پر اس طرح چابکدستی سے تلوار ماری کہ گردن کو چیرتی ہوئی پار نکل گئی اور سر جوں کا توں اس کے دھڑ پر رکھا رہ گیا۔ دیکھنے والوں نے یہ سمجھا کہ وار خالی گیا ہے مگر جب اس کے گھوڑے نے حرکت کی تو سر دھڑ سے الگ ہو کر زمین پر گر پڑا لوگوں نے یہ دیکھا تو نعرہ لگایا اور دل کھول کر ابو ایوب کی تیغ زنی کی داد دی اور جب وہ پلٹ کر امیر المومنین کے سامنے آیا تو آپ نے فرمایا کہ شاعر کا یہ شعر تمہارے حسب حال ہے ؎

وعلمنا الضرب اٰباؤنا   ونحن نعلم ایضا بنینا

ہمارے آباؤ اجداد نے ہمیں تیغ زنی کی تعلیم دی ہے اور ہم بھی اپنے بیٹوں کو یہ تعلیم دیں گے"۔

ان خونی ہنگاموں میں بھی حضرت کی یہ کوشش رہی کہ یہ جنگ و خونریزی بند ہو اور صلح و آشتی کی کوئی صورت نکل آئے۔ اگرچہ امیر شام کی ضد اور ہٹ دھرمی کو دیکھتے ہوئے اس کی امید نہیں کی جا سکتی تھی پھر بھی مزید اتمام حجت کے لئے آپ نے مصحف ہاتھوں پر اٹھایا اور اپنے لشکر والوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم میں کون ہے جو اس مصحف کو لے کر شامیوں کے پاس جائے اور انہیں قرآن مجید کے فیصلہ پر عمل کرنے کی دعوت دے ایک نوجوان صفوں سے باہر نکل کر حضرت کے سامنے آیا اور کہا کہ میں اس کے لئے حاضر ہوں۔ حضرت نے دوبارہ دریافت کیا مگر اس نوجوان کے علاوہ کوئی تیار نہ ہوا۔ آخر حضرت نے اسی کو مصحف دے کر روانہ کیا اس نے مخالف صفوں کے قریب پہنچ کر کہا کہ اے لوگو امیر المومنین تمہیں قرآنی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دیتے ہیں آؤ ہم اس کے فیصلہ پر اپنے جھگڑے نمٹائیں اور قتل و خونریزی سے ہاتھ اٹھائیں مگر کسی نے اس کی بات پر کان نہ دھرا اور اس کا بھی وہی حشر ہوا جو میدان جمل میں مسلم مجاشعی کا ہوا تھا اور چند شامیوں نے ہجوم کر کے اسے قتل کر دیا۔

امیر المومنین نے یہ دیکھ کر کہ دونوں طرف کے لشکر جان لڑائے ہوئے ہیں اگر یہ جنگ و خونریزی جاری رہی تو عرب کا بہت بڑا حصہ فنا ہو کر رہ جائے گا لہٰذا دوسروں کو جنگ کے شعلوں میں جھونکنے کے

بجائے مجھے معاویہ کو مقابلہ کی دعوت دینا چاہئے تاکہ ہم آپس میں نمٹ لیں۔ چنانچہ حضرت نے دونوں صفوں کے درمیان کھڑے ہو کر بلند آواز سے پوچھا کہ معاویہ کہاں ہے۔ معاویہ نے سُنا تو کہا کہ پوچھو کہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ فرمایا کہ اُسے کہو کہ تھوڑی دیر کے لئے میرے سامنے آئے میں اس سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ معاویہ عمرو ابن عاص کو لے کر صفوں سے باہر نکلے اور حضرت کے قریب آکر کھڑے ہو گئے۔ آپ نے فرمایا کہ اے معاویہ تم لوگوں کا خون ناحق بہا رہے ہو آؤ ہم دونوں لڑ کر فیصلہ کر لیں اور ہم میں سے جو غالب آئے وُہ منصب خلافت سنبھال لے۔ عمرو ابن عاص نے کہا کہ علی نے سچ کہا ہے۔ یہی دونوں نزاع کا مرکز و محور ہیں انہیں آپس میں لڑ کر فیصلہ کر لینا چاہئے۔ معاویہ نے عمرو سے مخاطب ہو کر کہا:۔

ما انصفت وانك لتعلم انه	تم نے انصاف سے کام نہیں لیا حالانکہ تمہیں
لم يبارزه رجل قط الاقتله	بخوبی معلوم ہے کہ ان کے مقابلہ میں جو نکلا
(تاریخ طبری ج۴ ص۲۹)	انہوں نے اُسے قتل کئے بغیر نہیں چھوڑا"۔

عمرو نے کہا کہ میں یہ نہیں چاہتا کہ تم مقابلہ سے روگردانی کر کے اپنے کو لوگوں کی نظروں سے گراؤ معاویہ نے کہا کہ کیا میں تمہارے طیش دلانے سے اپنی جان سے ہاتھ دھو لوں تم تو یہ چاہتے ہی ہو کہ میں مارا جاؤں اور تم راج پاٹ سنبھال لو۔ اور یہ کہہ کر پیچھے کی طرف مڑے اور دھیرے دھیرے لشکر کی آخری صف میں پہنچ گئے۔ معاویہ کو عمرو کی اس حرکت پر غصّہ تو تھا ہی اُسے بلا کر سخت سُست کہا اور اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ عمرو نے ان کا غصّہ ٹھنڈا کرنے کے لئے کہا کہ اگر تم لڑنا نہیں چاہتے ہو تو میں علی سے لڑوں گا۔ چنانچہ اس نے مقابلہ کی ٹھان لی اور ایک موقع پر گرجتا برستا ہوا میدان میں نکلا اور حضرت کو مقابلہ کے لئے للکارا۔ حضرت نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اس کے سر پر پہنچ گئے جب تلوار بلند کی تو اس نے اپنے کو گھوڑے سے نیچے گرا دیا اور ایک ٹانگ اٹھا دی جس سے اس کی شرمگاہ کھل گئی۔ حضرت نے اس کی یہ ذلیل حرکت دیکھی تو مُنہ پھیر لیا۔ عمرو گرد جھاڑتا ہوا اٹھا اور اپنے لشکر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ معاویہ نے یہ واقعہ سُنا تو عمرو سے کہا:۔

احمد الله وسوداء استك	اے عمرو اللہ کا شکر کرو کہ تم اپنی شرمگاہ کی
یا عمرو (اخبار الطوال ص۱۷۷)	بدولت بچ گئے"۔

سپاہ شام کے ایک سپہ سالار ابرہہ ابن صباح حمیری نے بھی جنگ کی تباہ کاری سے متاثر ہو کر یہی بات کہی تھی کہ علی اور معاویہ آپس میں لڑ بھڑ کر فیصلہ کر لیں۔ چنانچہ اس نے اپنے قبیلہ والوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ اے اہل یمن ہم کب تک تیروں اور تلواروں کا نشانہ بنتے رہیں گے اس جنگ کو رکوانے کی کوئی تدبیر کرو اور علی اور معاویہ پر زور دو کہ وُہ آپس میں لڑ کر فیصلہ کر لیں اور ان دونوں میں

سے جو غالب آئے گا ہم اُس کے گروہ میں شامل ہو جائیں گے۔ امیرالمومنین تک یہ بات پہنچی تو فرمایا کہ خدا کی قسم میرے لئے اس سے زیادہ خوش آئند کوئی بات نہیں ہوسکتی کہ دونوں لشکر ایک طرف ہو جائیں اور ہم آپس میں نمٹ لیں۔ جب معاویہ نے ابرہہ کی یہ تجویز سُنی تو بہت سٹپٹائے اور قدم بقدم پیچھے ہٹتے ہُوئے آخری صفوں میں پہنچ گئے اور اپنے حاشیہ نشینوں سے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابرہہ کی عقل جاتی رہی ہے۔ لوگوں نے کہا کہ ایسا نہیں ہے وُہ زیرک و دانا اور بافہم ہے اور شجاعت و دلیری کے اعتبار سے بھی کسی سے کم نہیں ہے۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم علی سے دو بدو ہو کر لڑنے سے گھبراتے ہو۔ معاویہ تو خاموش رہے البتہ عروہ ابن داؤد کو جوش آیا اور کہنے لگا کہ اگر امیر لڑنا نہیں چاہتے تو میں علی سے دو دو ہاتھ کروں گا۔ یہ کہہ کر وہ دونوں صفوں میں کھڑا ہو کر للکارنے لگا اور حضرت کو دعوت مبارزت دی آپ نے اس کی سرکوبی کے لئے قدم بڑھایا۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ یا امیرالمومنین آپ اس دنی و ذلیل کے مقابلہ کے لئے نہ جائیں ہم میں سے کسی کو حکم دیں وُہ اسے ٹھکانے لگا دے گا مگر حضرت نے خود ہی آگے بڑھ کر اس کے سر پر اس طرح تلوار ماری کہ اس کا آدھا دھڑ ایک طرف اور آدھا دھڑ دوسری طرف گرا۔ لوگ حضرت کے زورِ بازو اور تلوار کی کاٹ پر لرز اُٹھے اور دیکھنے والوں پر دہشت سی طاری ہوگئی۔ جب عروہ دو ٹکڑے ہو کر گرا تو اس کے ایک ابن عم نے جذبۂ انتقام سے مشتعل ہو کر حضرت پر حملہ کیا حضرت نے اس کا وار خالی دے کر اس پر نیزہ مارا۔ نیزہ اس کے سینہ میں گڑ گیا اور اس نے زمین پر گر کر دم توڑ دیا۔

معاویہ نے اپنے دو آدمیوں کو قتل ہوتے دیکھا تو پیچ و تاب کھا کر کہا کہ تم میں کون ہے جو عروہ اور اس کے ابن عم کے قاتل علی سے دو بدو ہو کر لڑے یا موقع پا کر انہیں قتل کرے۔ ولید ابن عقبہ نے کہا کہ مناسب تو یہ تھا کہ تم خود اُن کے مقابلہ کے لئے نکلتے کہا کہ وُہ پہلے بھی مجھے للکار چکے ہیں۔ مگر یہ لشکر کا ہے کے لئے ہے اس کے ہوتے ہُوئے مجھے میدان میں نکلنے کی ضرورت نہیں ہے عقبہ ابن ابی سفیان نے کہا تمہاری رائے صائب ہے وُہ للکاریں بھی تو تم ٹال جاؤ۔ جب معاویہ کے بار بار کہنے پر بھی کسی نے حضرت کے مقابلہ میں نکلنے کی جرأت نہ کی تو انہوں نے بسر ابن ابی ارطاۃ سے کہا کیا تم ان سے لڑو گے کہا کہ بہتر تو یہ تھا کہ تم ہی ان سے دو بدو ہو کر لڑتے اور اگر تم یہی چاہتے ہو کہ میں لڑوں تو مجھے انکار نہیں ہے۔ بسر کے ایک قریبی عزیز نے یہ سُنا تو بسر سے کہا کہ معاویہ مر گئے تو اُن کا کوئی بھائی بند تخت و تاج کا وارث ہوگا تم اپنے کو کیوں خطرہ میں ڈالتے ہو۔ کہا کہ میں زبان سے کہہ چکا ہوں اب تو مجھے نکلنا ہی پڑے گا۔ اس شخص نے یہ سُنا تو بسر کو مخاطب کرتے ہُوئے یہ اشعار پڑھے:۔

تناز لہ یا بسر ان کنت مثلہ   و الا فان اللیث للشاء اکل

"اگر تم ان کے پایہ کے ہوتے تو بیشک ان سے لڑتے ورنہ یاد رکھو کہ شیر بکریوں کو کھا جایا کرتا ہے۔"

کانک یابسر ابن ارطاۃ جاھل　　باثارہ فی الحرب او متجاھل

"اے بسر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم علی کے جنگی کارناموں سے بے خبر ہو یا جان بوجھ کر بے خبر بن رہے ہو۔"

بسر نے کہا کہ آخر ایک دن مرنا ہے پھر کیوں بزدلوں کی موت مرا جائے میں ان کا مقابلہ کروں گا اور ضرور کروں گا۔ چنانچہ وہ لڑنے کے لئے میدان کی طرف بڑھا۔ امیر المومنین مالک اشتر کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے کسی ٹیلے کی تلاش میں بڑھ رہے تھے کہ بسر زرہ بکتر پہنے سر پر خود رکھے آپ کے قریب آ کر مبارز طلب ہوا۔ آپ بڑے اطمینان سے پلٹے اور قریب پہنچ کر نیزے کی انی اس کی زرہ میں گڑو کر اسے نیچے گرایا اور چاہا کہ نیزہ اس کے سینہ میں اتاریں۔ بسر نے جب جان بچتی نہ دیکھی تو اپنے ستر کو عریاں کرنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ حضرت نے منہ موڑ لیا اور پیچھے ہٹ آئے۔ مالک اشتر نے اسے پہچان کر کہا کہ یا امیر المومنین یہ دشمن خدا بسر ابن ابی ارطاۃ ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ اس پر خدا کی پھٹکار اس حرکت کے بعد اسے کیا کہا جائے چھوڑو اسے جانے دو۔ بسر جلدی سے اٹھا اور ستر ڈھانکتا ہوا بھاگ کھڑا ہوا۔ معاویہ نے اس کے کارنامہ پر مطلع ہونے کے بعد اس سے کہا کہ شرمانے کی کوی بات نہیں ہے عمرو ابن عاص نے بھی تو اسی طرح اپنی جان بچائی تھی۔

معاویہ اس خیال سے میدان میں کم نکلتے تھے کہ اگر حضرت کا سامنا ہو گیا تو جان بچانا مشکل ہو جائے گا۔ اور اگر نکلتے بھی تو اس سمت کا رخ نہ کرتے جدھر حضرت کے موجود ہونے کا شبہہ ہوتا۔ ایک مرتبہ لڑنے کے لئے نکلے اور میسرہ پر حملہ کیا۔ حضرت میسرہ کے اندر موجود تھے اور صفوں کو ترتیب دے رہے تھے حضرت نے انہیں دیکھا تو اس خیال سے کہ وہ آپ کو دیکھ کر بھاگ نہ کھڑے ہوں اپنا گھوڑا اور اپنی زرہ دوسرے کے گھوڑے اور زرہ سے تبدیل کی اور صف سے باہر نکلے۔ معاویہ حملہ کے ارادہ سے بڑھے تھے کہ　　پہچان لیا کہ مقابلہ میں امیر المومنین ہیں۔ انہوں نے فوراً رخ موڑ کر گھوڑے کو مہمیز لگائی اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ امیر المومنین نے کچھ دیر تک پیچھا کیا مگر وہ تیزی سے اپنی صفوں میں روپوش ہو گئے اور جان بچا لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔

معاویہ عموماً اپنے ایک آزاد کردہ غلام حریث کو اپنا بھیس بدلوا کر میدان میں بھیجتے تھے تا کہ دوسروں کو یہ تاثر دیں کہ وہ خود بھی عملاً شریک جنگ ہیں۔ چنانچہ جب وہ معاویہ کی زرہ پہن کر اور ہتھیار سج کر نکلتا تو لوگ یہی سمجھتے کہ معاویہ جنگ آزما ہیں۔ معاویہ نے اسے یہ تاکید کر دی تھی کہ مجھے تمہاری

جان عزیز ہے تم لاکھ طاقتور اور جنگجو سہی مگر علی کا مقابلہ نہ کرنا ورنہ تمہیں اپنی جان بچانا مشکل ہوجائے گا۔ اسی اثناء میں عمرو ابن عاص نے اسے بہکایا اور کہا کہ معاویہ تمہیں علی کے مقابلہ سے اس لئے منع کرتے ہیں کہ وہ نہیں چاہتے کہ تمہیں اُن سے دو بدو ہوکر لڑنے کا امتیاز اور قریش کے مقابلہ میں سربلندی حاصل ہو۔ اگر تم قرشی ہوتے تو وہ تمہیں ان کے مقابلہ سے کبھی منع نہ کرتے۔ حریث عمرو کے بہکانے سے طیش میں آگیا اور کہا کہ میں علی سے لڑے بغیر نہیں رہوں گا۔ چنانچہ اُس نے آگے بڑھ کر انہیں مقابلہ کے لئے للکارا آپ ایک دستہ فوج کی قیادت کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے کہ حریث کی صدائے مبارز طلبی سُنی۔ آپ نے تلوار کے قبضہ پر ہاتھ ڈالا اور اُسے مہلت دیئے بغیر اس پر تلوار کا وار کیا اور اس کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ معاویہ کو حریث کے مارے جانے کی خبر ہوی تو انہیں انتہائی رنج و غم ہوا اور عمرو ابن عاص کو برا بھلا کہا کہ اُس کے بہکانے سے حریث کی جان گئی اور لوگوں پر یہ بات بھی کھل گئی کہ معاویہ کے بھیس میں حریث نکلا کرتا تھا۔

معاویہ کا طرزِ عمل تو یہ تھا کہ وہ دوسروں کو اپنا بھیس بدلوا کر میدان میں بھیجتے اور امیر المومنین، عباس ابن ربیعہ یا کسی اور کا بھیس بدل کر میدان میں آتے تا کہ حریف انہیں مقابلہ میں دیکھ کر بھاگ نہ کھڑا ہو۔ چنانچہ ایک مرتبہ عباس ابن ربیعہ خود زرہ پہنے گھوڑے پر سوار ہوکر صف سے باہر نکلے۔ غراز ابن ادہم نے انہیں دیکھا تو جنگ کی دعوت دی۔ عباس نے کہا کہ میں گھوڑے سے نیچے اُتر آتا ہوں اور تم بھی نیچے اُتر آؤ تا کہ ہم میں سے کوی میدان چھوڑ کر نکل بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔ چنانچہ دونوں پیادہ ہوگئے اور تلوار لے کر ایک دوسرے پر جھپٹے۔ وار پر وار ہوتے مگر تلواریں ڈھالوں اور آہنی خودوں سے ٹکرا کر رہ جاتیں۔ ہر ایک اپنے حریف کو زیر کرنے کے لئے داؤں پیچ دکھاتا مگر کوی مغلوب ہوتا نظر نہ آتا اتنے میں عباس کو غراز کی زرہ کا ایک حلقہ ڈھیلا نظر آیا انہوں نے ہاتھ کی صفائی سے اس حلقہ کو تلوار کی نوک میں پرو لیا اور جھٹکا دے کر زرہ کے حلقے چیر ڈالے اور پھر تاک کر ایسا وار کیا کہ تلوار ہڈیوں کو توڑتی ہوی سینہ میں اُتر گئی غراز پیٹھ کے بل زمین پر گرا اور گرتے ہی بے حس و حرکت ہوگیا۔ عراقیوں نے عباس کی مہارت و چابکدستی پر اس زور سے تکبیر کا نعرہ بلند کیا کہ پوری فضا گونج اُٹھی۔ امیر المومنین نے تکبیر کی آواز سُنی تو پوچھا کہ یہ کون تھا جس نے دشمن کو مار گرایا ہے؟ لوگوں نے کہا کہ عباس ابن ربیعہ تھے۔ حضرت کے تیور بگڑے اور عباس کو بُلا کر کہا کہ میں نے تمہیں حکم دیا تھا کہ اپنی جگہ پر ٹھہرے رہو اور اسے خالی نہ چھوڑو کہا کہ یا امیر المومنین یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ مجھے مقابلہ کے لئے للکارا جائے اور میں خاموش رہوں۔ کہا کہ دُشمن کا مقابلہ اتنا ضروری نہیں ہے جتنا امام کے حکم کی پابندی ضروری ہے۔ پھر خود ہی فرمایا خداوندا عباس کو اس کارنامہ کی جزائے خیر دے۔ میں نے اس سے درگزر کیا تو بھی اس سے درگزر فرما۔

معاویہ کو غراز کے مارے جانے کا علم ہوا تو وُہ بہت برافروختہ ہُوئے اور لشکر والوں سے کہا کہ تم میں کوی ہے جو عباس کو قتل کر کے غراز کے خون کا بدلہ لے اس آواز پر قبیلۂ لخم کے دو شمشیر زن اُٹھ کھڑے ہُوئے اور عباس کو مقابلہ کے لئے للکارا۔ عباس نے ان کی للکار سنی تو اُن کی رگوں میں خون شجاعت جوش مارنے لگا مگر امیر المومنین کی اجازت کے بغیر اپنی جگہ بھی نہ چھوڑ سکتے تھے کہا کہ کچھ دیر توقف کرو میں اپنے امیر سے اجازت لے کر آتا ہوں۔ یہ کہہ کر حضرت کی خدمت میں آئے اور اُن سے لڑنے کی اجازت مانگی۔ حضرت نے فرمایا کہ خدا کی قسم معاویہ یہ چاہتا ہے کہ بنی ہاشم میں سے کوی متنفس رُوئے زمین پر زندہ نہ رہے تاکہ رشد و ہدایت کی شمعیں گل ہو جائیں اور اسے ضلالت و گمراہی کے پھیلانے کا موقع ملے مگر اللہ اس کے علی الرغم اپنے نور کو درخشندہ و تابندہ رکھے گا۔ پھر عباس سے فرمایا کہ تم اپنے ہتھیار اُتار کر مجھے دو۔ حضرت نے عباس کی زرہ اور بکتر پہنا سر پر خود رکھا اور انہی کے گھوڑے پر سوار ہو کر میدان میں آئے۔ حضرت کو دیکھ کر دونوں لخمی یہ سمجھے کہ عباس مقابلہ کے لئے آئے ہیں کیونکہ گھوڑا اور ہتھیار انہی کے تھے اور خود و مغفر سے چہرہ نظر نہ آتا تھا۔ کہا کہ کیا تم اپنے امیر سے اجازت لے آئے ہو۔ حضرت نے جواب میں اس آیت کی تلاوت کی:

اذن للذین یقاتلون	جن (مسلمانوں) کے خلاف (کافر) لڑا کرتے ہیں
بانہم ظلموا ان اللہ	اب انہیں بھی جنگ کی اجازت ہے کیونکہ
علیٰ نصرہم لقدیر۔	ان پر ظلم ہو رہا ہے اور اللہ اُن کی مدد پر یقیناً قادر ہے۔

اب ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر تلوار سے حملہ کیا حضرت نے اس کا وار خالی دے کر جوابی حملہ کیا اور تلوار کا ایسا بھرپور ہاتھ مارا کہ اس کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ پھر دوسرا جوشِ غضب میں حملہ آور ہوا حضرت نے اُسے بھی مُوت کے گھاٹ اُتار دیا اور پلٹ کر عباس کو ان کے ہتھیار دیئے اور فرمایا کہ اگر کوی تمہیں مقابلہ کے لئے للکارے تو مجھے خبر دو میں خود اس سے نمٹ لوں گا۔

امیر المومنین نے دیکھا کہ شامیوں کی طغیانی و سرکشی بڑھتی جا رہی ہے اور جب تک مجموعی قوت سے ان کی طاغوتی طاقتوں کو کچلا نہیں جائے گا لڑائی رُکنے میں نہیں آئے گی۔ چنانچہ آپ نے غروب آفتاب کے قریب اپنے لشکر میں خطبہ دیتے ہُوئے فرمایا:

الا وانکم لاقوا القوم غدا	دیکھو کل تمہیں دُشمن سے جنگ کرنا ہے لہذا
فاطیلوا اللیلۃ القیام واکثروا	آج کی رات نماز اور تلاوتِ قرآن میں گزارو
تلاوۃ القرآن واسئلوا اللہ	اور اللہ سے نصرت اور صبر و استقامت کی

النصر والصبر والقوھم بالجد والحزم وکونوا صادقین۔
(تاریخ کامل ج۳۔ ص۱۵۱)

دُعا مانگو اور پُوری تندہی و ہوشمندی سے دشمن سے ٹکرا جاؤ اور صحیح معنی میں راستباز ثابت ہو"۔

امیرالمومنین نے تمام رات جاگ کر جنگ کی تیاری اور فوجوں کی صف بندی میں گزاری میمنہ و میسرہ ترتیب دیئے رسالے اور دستے مرتب کئے اور لشکر والوں نے بھی ہتھیاروں کو جانچا پرکھا تلواروں پر صیقل کی تیروں کے بھال اور نیزوں کے پھل درست کئے اور صبح ہونے تک دشمن پر آخری حملہ کے لئے پُوری طرح تیار ہو گئے۔

حضرت علی کے اس اعلان سے معاویہ پر خوف و ہراس چھا گیا۔ انہوں نے سپہ سالاران لشکر کو لشکر ترتیب دے کر فوراً پیش ہونے کا حکم دیا۔ چنانچہ ابوالاعور سلمی اہل حمص کے لشکر کے ساتھ ابن عمرو سلمی اہل اردن کے ساتھ زفر ابن حارث اہل قنسرین کے ساتھ اور ضحاک ابن قیس فہری دمشق کے دستہ کے ہمراہ پیش ہوا اور اسی طرح دستوں پر دستے آتے رہے اور دیکھتے ہی دیکھتے شامیوں کے غول چاروں طرف پھیل گئے اور امیر شام کو پُوری جوانمردی اور ثبات قدمی سے لڑنے کا یقین دلایا۔

شب کی تاریکی کے چھٹتے ہی عراقی و شامی پرے جما کر کھڑے ہو گئے۔ حضرت نے میمنہ کی کمان عبداللہ ابن بدیل کے اور میسرہ کی کمان عبداللہ ابن عباس کے سپرد کی اور خود قلب لشکر میں تشریف فرما ہو کر ایک مشکیں گھوڑے پر پڑی جمائی تلوار کے قبضہ پر ہاتھ ڈالا اور گھوڑے کی باگ اٹھاتے ہی ایڑ لگائی اور دم کے دم میں دُشمن کی صفوں کے قریب پہنچ گئے اور عبداللہ ابن بدیل کو حملہ کرنے کا حکم دیا۔ ابن بدیل دُہری زرہ پہنے اور دو تلواریں لٹکائے میمنہ لشکر کو لے کر میسرہ شام پر حملہ آور ہُوے اور تابڑ توڑ حملوں سے صفوں پر صفیں اُلٹتے ہُوے آگے بڑھتے رہے یہاں تک کہ میسرہ شام کے قدم اُکھڑ گئے اور صفیں پراگندہ ہوگئیں۔ ابن بدیل نے میسرہ کو پسپا ہوتے دیکھا تو قلب لشکر کا رُخ کیا جہاں معاویہ پُورے حفاظتی سہرو سامان کے ساتھ مقیم تھے۔ اگرچہ ان کے گرد پانچ محافظ دستے آہنی دیوار کی طرح حصار باندھے کھڑے تھے مگر فوج کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو خوف و دہشت سے جسم پر کپکپی طاری ہوگئی۔ اپنی جگہ چھوڑ کر پیچھے ہٹے ان کے ساتھ قلب لشکر بھی پیچھے ہٹا اور پیچھے ہٹ کر پھر سے صفیں جمائیں اتنے میں میسرہ شام پسپائی کے بعد آگے بڑھا اور قلب لشکر کے ساتھ مل کر میمنۂ عراق پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ میمنۂ عراق کے قدم اکھڑ گئے اور جدھر جس کا مُنہ اٹھا اُدھر چل دیا۔ ابن بدیل کے ہمراہ صرف گنے چنے دو تین سو آدمی رہ گئے جو پیٹھ سے پیٹھ جوڑ کر سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح دشمن کے مقابلہ میں جمے رہے۔ ابن بدیل انہی گنتی کے چند

آدمیوں کو لے کر معاویہ کے خیمہ کی طرف بڑھے تاکہ انہیں ٹھکانے لگائیں ادھر سے کمانیں کڑکیں چلے کھنچے اور تیروں کی بوچھار شروع ہوگئی مگر ان جانبازوں کے قدم نہ رُکے اور دُشمن کی صفوں میں راستا بناتے ہُوے آگے بڑھتے رہے یہاں تک کہ چاروں طرف سے دشمن کے نرغہ میں گھر گئے۔

امیر المومنین نے جب اپنے میمنہ کو بکھرتے اور ابن بدیل کے ہمراہیوں کو منتشر ہوتے دیکھا تو انہیں موقع کی نزاکت کا احساس ہوا۔ آپ نے سہل ابن حنیف سے فرمایا کہ آگے بڑھ کر میمنہ کی مدد کرو مگر شامی سواروں نے حملہ کر کے انہیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ ادھر میمنہ کے منتشر ہونے سے قلب لشکر جس میں خود امیر المومنین تشریف فرما تھے متاثر ہُوا اور لوگ متفرق و پراگندہ ہوگئے۔ حضرت نے قلب لشکر کی یہ حالت دیکھی تو میسرہ لشکر کا رُخ کیا اس حالت میں کہ نہ بدن پر زرہ تھی اور نہ سر پر خود اور ہاتھ میں صرف ایک نیزہ تھا۔ امام حسن امام حسین اور محمد ابن حنفیہ آپ کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے تھے داہنے بائیں اور سر کے اُوپر سے تیر سنسناتے ہوے گزر رہے تھے مگر چمکتی ہوی تلواریں لچکتے ہُوے نیزے اور برستے ہُوے تیر آپ کے قدموں کو روک نہ سکے۔ اس اثناء میں بنی امیہ کا ایک آزاد کردہ غلام احمر سامنے آیا یہ تلوار کا دھنی اور مانا ہوا شہزور تھا۔ حضرت نے اس کی طرف بڑھنا چاہا کہ آپ کا ایک غلام کیسان اس کی طرف لپکا کچھ دیر مقابلہ کیا اور آخر اس کے ہاتھ سے شہید ہوگیا۔ اب اس نے امیر المومنین پر حملہ کرنا چاہا آپ نے اس کے حملہ آور ہونے سے پہلے آگے بڑھ کر اس کی زرہ کے اندر ہاتھ ڈال دیا اور زور کر کے گھوڑے کے اوپر سے اُسے اُٹھالیا اور اتنی زور سے زمین پر مارا کہ اس کی ہڈیاں پس کر سُرمہ ہوگئیں۔

حضرت دشمن کی کثرت اور گرد و پیش کے خطرات سے بے نیاز ہو کر تیزی سے آگے بڑھے امام حسن نے دشمن کی بڑھتی ہوی یلغار کو دیکھ کر کہا کہ بابا کیا یہ بہتر نہ تھا کہ آپ دشمن کی طرف بڑھنے کے بجائے اپنی صفوں کی طرف جاتے۔ حضرت نے فرمایا:-

ان اباك واللہ لا یبالی اوقع علی الموت ام وقع الموت علیہ
(تاریخ کامل ج ۳ ص ۱۵۲)

بیٹا! خدا کی قسم تمہارے باپ کو اس کی پروا نہیں کہ وہ موت کی طرف بڑھے یا موت اس کی طرف بڑھے۔"

جب امیر المومنین میسرہ کے قریب پہنچے تو لہراتے ہُوے پھریروں کو دیکھ کر پوچھا کہ یہ کن کے نشانات ہیں لوگوں نے کہا کہ یہ قبیلۂ ربیعہ کے پرچم ہیں فرمایا کہ یہ اللہ کی جماعت کے پرچم ہیں جس کے قدموں میں لغزش نہیں آئی اور جنگ کی سختیوں کے باوجود ثابت قدم رہی ہے۔ پھر ایک نوجوان حضین ابن منذر کو جو سُرخ پرچم اٹھائے ہُوے تھا اپنے قریب بُلایا اور فرمایا کہ تم اس علم کو لے کر ایک ہاتھ آگے نہیں بڑھتے۔ اس نے کہا ضرور ایک ہاتھ کیا دس ہاتھ۔ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا حضرت نے

اسے ضرورت سے زیادہ آگے بڑھتے دیکھا تو فرمایا کہ بس یہیں رُک جاؤ خدا تمہیں جزائے خیر دے۔ قبیلۂ ربیعہ نے حضرت کو اپنی صفوں میں دیکھ کر کہا کہ اے لوگو تم میں سے ایک شخص کے زندہ ہوتے ہوئے اگر امیرالمومنین کو کوئی گزند پہنچا تو تم تمام عرب میں ذلیل و رُسوا ہو جاؤ گے۔ یہ کہہ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور شامیوں کی صفوں کے مقابلہ میں صفیں جما دیں۔

حضرت میمنہ لشکر کے پسپا اور قلب لشکر کے منتشر ہونے کے بعد میسرہ میں تشریف فرما تھے کہ مالک اشتر کو میسرہ کی جانب آتے دیکھا۔ جب وُہ قریب آئے تو فرمایا اے مالک تم میدان چھوڑ کر جانے والوں کو آواز دو اور انہیں کہو کہ اگر حیات فانی کے دن ختم ہو چکے ہیں تو یہ فرار تمہیں موت سے نہیں بچا سکتا۔ مالک نے آگے بڑھ کر ان لوگوں کو آواز دی کہ اے لوگو میں مالک اشتر ہوں تم میدان چھوڑ کر کدھر جا رہے ہو۔ دشمن صرف دین کی بنا پر تم سے بر سر پیکار ہے وُہ چاہتا ہے کہ سنت کے آثار ختم کرے جاہلیت کا دَور پلٹائے اور تمہیں اسی مذہب و مسلک کا پابند بنائے جسے تم حسن بصیرت و حسن توفیق سے چھوڑ چکے ہو۔ اے لوگو دین کی خاطر اپنی جانوں کی قربانی دینے کے لئے آؤ۔ یاد رکھو کہ فرار دنیا کی روسیاہی اور آخرت کی تباہی کا باعث ہے۔ مالک کی اس آواز پر قبیلۂ بنی مذحج پلٹا اور کہا کہ ہمیں جو حکم دیا جائے گا ہم اس پر عمل کریں گے۔ مالک نے کہا کہ تم نے میدان چھوڑ کر اپنے کو رسوا کیا ہے اب اس کی تلافی کرو اور مجھے امیرالمومنین کے سامنے سرخرو ہونے کا موقع دو۔ یہ لوگ مالک کی سرکردگی میں میمنہ کی جانب بڑھے جو دُشمن کے حملوں کی تاب نہ لا کر پوری طرح بکھر چکا تھا اگرچہ میمنہ میں سبھی کے قدم ڈگمگا گئے تھے مگر قبیلۂ ہمدان نے سب سے آخر میں میدان چھوڑا تھا ان کے آٹھ سو جانباز سر دھڑ کی بازی لگا کر میدان میں جمے رہے اور جب ان میں سے ۱۸۰ آدمی کام آ گئے اور ۱۱ علمبردار یکے بعد دیگرے شہید ہو گئے تو اُن کے قدم بھی اکھڑ گئے۔ ان علمبرداروں میں کریب ابن شریح، شرجیل ابن شریح، مرثد ابن شریح، ہبیرہ ابن شریح، ہریم ابن شریح اور سمیر ابن شریح چھ حقیقی بھائیوں نے باری باری علم اٹھایا اور جاں نثاری کا حق ادا کرتے ہوئے شہید ہو گئے پھر سفیان ابن زید، عبد ابن زید اور کریب ابن زید نے علم بلند کیا اور یہ تینوں بھائی داد شجاعت دیتے ہوئے کام آ گئے۔ ان کے بعد عمیرہ ابن بشر اور حارث ابن بشر نے علم اٹھایا اور یہ دونوں بھائی بھی شہید ہو گئے۔ ان کے بعد جب وہب ابن کریب نے علم اپنے ہاتھوں میں لیا تو اس کے قبیلہ کے ایک آدمی نے کہا کہ اس علم کے نیچے بڑی کثرت سے لوگ مارے جا چکے ہیں تم اس علم کو لے کر میدان سے ہٹ جاؤ اور اپنی اور اپنے قبیلہ کی جانیں بچاؤ ورنہ تم میں سے ایک بھی زندہ نہیں بچے گا۔ اس نے دیکھا کہ مختصر جمعیت کے ساتھ شام کی طوفانی یلغاروں کو روکا نہیں جا سکتا مجبوراً پیچھے ہٹا اور اس کے ساتھ بچے کھچے لوگ بھی پیچھے ہٹے اور کہنے لگے کہ اگر ہمیں ایک ایسا گروہ مل جائے جو

ہم سے یہ معاہدہ کرے کہ ایک ایک کر کے قتل ہو جائیں گے اور میدان نہیں چھوڑیں گے تو ہم آگے بڑھ کر لڑیں گے یہاں تک کہ قتل ہو جائیں یا دشمن کو میدان چھوڑنے پر مجبور کر دیں۔ جب یہ لوگ مالک اشتر کے قریب سے گزرے تو انہوں نے ان کی بات سُن کر کہا کہ آؤ ہم تم سے عہد و پیمان کرتے ہیں کہ جیتے جی میدان نہیں چھوڑیں گے یا ہم قتل ہو جائیں گے یا دشمن کو ٹھکانے لگائیں گے اس معاہدہ کی تکمیل کے بعد وُہ مالک کی صفوں میں شامل ہو گئے۔ مالک نے از سر نو میمنہ کی صف بندی کی فوج میں جوش و ولولہ کی نئی روح بھری اور انہیں لے کر بپھرے ہُوئے شیر کی طرح دشمن کی سپاہ پر حملہ آور ہُوئے۔

مالک مصروف جنگ تھے کہ چند آدمیوں کو دیکھا کہ وہ ایک سپاہی کو ہاتھوں پر اُٹھائے لئے جا رہے ہیں۔ پوچھا کہ یہ کون ہے بتایا گیا کہ یہ زیاد ابن نضر حارثی ہیں جو عبداللہ ابن بدیل کے لشکر میں شامل تھے۔ جب ابن بدیل نرغہ میں گھر گئے تو انہوں نے علم بلند کیا اور لڑتے ہوئے زخموں سے چُور چُور ہو گئے ہیں۔ پھر دیکھا کہ ایک اور زخمی کو اٹھا کر لایا جا رہا ہے پُوچھا کہ یہ کون ہے؟ بتایا گیا کہ یہ یزید ابن قیس ارحبی ہیں جنہوں نے زیاد ابن نضر کے بعد علم اٹھایا اور لڑتے ہُوئے زخموں سے نڈھال ہو گئے ہیں۔ مالک نے کہا کہ خدا کی قسم یہ ہے ان جانبازوں کا صبر و استقلال اور ان کی جانفروشی کا زندہ ثبوت۔ انسان کو شرم آنا چاہیئے کہ وُہ جان لئے یا جان دیئے بغیر میدان سے مُنہ موڑے۔ یہ کہ کر آگے بڑھے اور صفوں کو درہم و برہم کرتے ہُوئے اس مقام پر پہنچ گئے جہاں عبداللہ ابن بدیل اپنے ہمراہیوں کے ساتھ زخموں سے بے حال پڑے تھے۔ جب ابن بدیل اور ان کے ہمراہیوں نے اپنے آدمیوں کو دیکھا تو ڈھارس بندھی اور ایک تازہ دم فوج کے مانند حملہ کے ارادہ سے اُٹھ کھڑے ہُوئے اور معاویہ کی قیامگاہ کا رخ کیا۔ مالک نے انہیں روکنے کی کوشش کی مگر وُہ نہ رُکے اور قدم آگے بڑھائے۔ شامیوں کے لشکر سدّ راہ ہوئے مگر اس بڑھتے ہُوئے سیلاب کو نہ روک سکے ان میں سے جو سامنے آتا ابن بدیل اُسے تہ تیغ کر دیتے یہاں تک کہ سات آدمیوں کو قتل کر کے سیدھے معاویہ کے خیمہ کی طرف بڑھے۔ معاویہ نے انہیں دیکھا تو لشکر والوں سے چلا کر کہا کہ اگر تم تیروں، تلواروں اور نیزوں سے انہیں نہیں روک سکتے تو ان پر پتھر برساؤ چنانچہ چاروں طرف سے پتھروں کی بارش شروع ہو گئی۔

ابن بدیل اور اُن کے ساتھی زخموں سے نڈھال ہو گئے۔ شامیوں نے سنگ باراں کر کے انہیں بے حال کر دیا تو تلواریں لے کر بڑھے انہوں نے بھی ہتھیار سنبھال لئے۔ مگر شامیوں کی بڑھتی ہوئی یلغار کو چند محصور اور زخمی نہ روک سکے۔ عبداللہ ابن بدیل اور ان کے ہمراہیوں میں سے کچھ لڑتے ہُوئے شہید ہو گئے اور کچھ جان بچا کر بھاگ نکلے۔ شامیوں نے ان بھاگنے والوں کا پیچھا کیا مگر مالک اشتر نے ابن جمہان جعفی کو ایک دستہ فوج کے ساتھ بھیجا جنہوں نے شامیوں پر حملہ کر کے انہیں پیچھے ہٹنے پر

مجح کردیا اور یہ لوگ مالک کے لشکر میں آکر شامل ہو گئے۔
مالک اشتر دُوسری سمت سے حملہ آور تھے اور اُن کے پرچم کے نیچے بنی مذحج اور قبیلہ ہمدان دشمن کے سروں پر تلواریں برسا رہے تھے۔ جب انہوں نے مل کر حملہ کیا تو شامی اس طرح بھاگ کھڑے ہُوئے جس طرح بھیڑیئے کو دیکھ کر بھیڑ بکریوں کے غول بھاگ کھڑے ہوتے ہیں اور عصر کے بعد ان صفوں میں جاکر شامل ہو گئے جو معاویہ کے گرد گھیرا ڈالے ہُوئے ان کی حفاظت کر رہی تھیں۔ مالک پیچھا کرتے ہُوئے آگے بڑھے اور ان گھیرا ڈالنے والی صفوں پر حملہ کر کے انہیں منتشر کرنا شروع کیا جب پانچ حفاظتی حلقوں میں سے صرف ایک حلقہ منتشر ہونے سے رہ گیا تو معاویہ نے گھوڑے کی رکاب میں پیر رکھ دیئے اور میدان چھوڑ کر نکل بھاگنے کا ارادہ کر لیا مگر پھر سنبھلے اور جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔
جب قبیلۂ ربیعہ کے افراد میدان میں پرچم لہراتے ہُوئے آئے تو شامیوں کی طرف سے ذوالکلاع حمیری قبیلۂ حمیر کے ساتھ اور عبیداللہ ابن عمر چار ہزار قاریان شام کی جمعیت کے ساتھ حملہ آور ہوئے یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ کمزور دل لوگوں کے قدم اکھڑ گئے اور جو ثابت قدم رہے وُہ جی توڑ کر لڑتے تو رہے مگر دشمن کے مقابلہ میں کمزور پڑ گئے۔ زیاد ابن خصفہ نے جب دیکھا کہ شامی قبیلۂ ربیعہ پر چھائے جا رہے ہیں تو انہوں نے قبیلۂ عبدالقیس سے کہا کہ ذوالکلاع اور عبیداللہ ابن عمر قبیلۂ ربیعہ کو ختم کئے دے رہے ہیں۔ اٹھو اور ان کی مدد کرو ورنہ وُہ سب کے سب موت کے گھاٹ اتار دیئے جائیں گے۔ قبیلۂ عبدالقیس نے ہتھیار سنبھالے اور گھوڑوں کو سرپٹ دَوڑاتے ہُوئے ربیعہ کی مدد کے لئے بڑھے اور دیکھتے ہی دیکھتے میدان پر اس طرح چھا گئے جس طرح مچلتی گھٹائیں اُفق پر چھا جاتی ہیں۔ قبیلۂ عبدالقیس کے آنے سے قبیلہ ربیعہ کی قوت و طاقت بڑھ گئی اور وُہ پوری پامردی سے دُشمن کے مقابلہ میں ڈٹ گئے۔ ذوالکلاع اور عبیداللہ جو بڑے جوش و خروش سے لڑ رہے تھے ٹھنڈے پڑ گئے اور قبیلۂ حمیر میں بھی وُہ دم خم نہ رہا۔
اس ہنگامۂ کارزار میں امیرالمومنین کے لشکر میں سے ابو شجاع حمیری نے قبیلۂ حمیر سے مخاطب ہو کر کہا کہ اے گروہ حمیر خدا تمہیں ذلیل و روسیاہ کرے تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم ایک طاغی و باغی کی حمایت میں علی سے برسرِ پیکار ہو اور یہ سمجھے بیٹھے ہو کہ معاویہ علی سے بہتر و افضل ہے۔ اور پھر ذوالکلاع سے مخاطب ہو کر کہا کہ اے ذوالکلاع ہم تمہارے متعلق یہ سمجھتے تھے کہ تم دینی جذبات رکھتے ہو کیا تم بھی یہی سمجھتے ہو کہ معاویہ علی سے افضل اور اُن کے مقابلہ میں حق بجانب ہے کہا کہ میں معاویہ کو علی سے افضل تو نہیں سمجھتا مگر خون عثمان کے قصاص میں مجھے ان سے لڑنا پڑ گیا ہے میں یہ نہیں چاہتا کہ عثمان کا خون رائیگاں جائے۔ ذوالکلاع حضرت علی افضلیت کا تو اقرار کرتا ہے

مگر قصاص کے جنون نے اُسے فہم و فراست سے اس حد تک دُور کر دیا تھا کہ لشکر شام کی ضلالت و کجروی کے بارے میں حدیثِ نبوی سُن کر بھی اس کی بصیرت نے کام نہ دیا۔ چنانچہ اس نے عمرو ابن عاص سے جنگ کے دَوران اور اس سے قبل پیغمبر اسلام کی یہ حدیث سُنی تھی کہ عمار کا قاتل ایک باغی گروہ ہو گا۔ اس حدیث کی وجہ سے وہ کچھ دیر کشمکش و پیچ میں رہا اور چاہا کہ وُہ اس جنگ میں عمار کا موقف معلوم کرے۔ چنانچہ وُہ حضرت کی صفوں میں اپنے قبیلہ کی ایک فرد ابو نوح حمیری کی تلاش میں آیا تاکہ اس سے عمار کے بارے میں دریافت کرے۔ جب اس سے مُلاقات ہُوی تو کہا کہ میں تم سے ایک بات پُوچھنا چاہتا ہوں گو تم لشکر مخالف کی ایک فرد ہو مگر تمہاری صدق بیانی و راستگوئی پر مجھے اعتماد ہے۔ کہا کہ پوچھو میں صحیح صحیح بات کہوں گا اور قطعاً غلط بیانی سے کام نہیں لوں گا۔ کہا کہ عمرو ابن عاص نے حضرت عمر کے دورِ خلافت میں یہ حدیث بیان کی تھی کہ شام اور عراق کے دو گروہ آپس میں ٹکرائیں گے اور وُہ گروہ حق بجانب ہو گا جس میں عمار یاسر ہوں گے۔ کیا عمار یاسر تمہاری صفوں میں موجود ہیں کہا کہ خدا کی قسم وُہ ہمارے لشکر میں موجود ہیں اور تم میں سے ایک ایک فرد کو مَوت کے گھاٹ اتارنے کی فکر میں ہیں۔ کہا کہ پھر تھوڑا وقت نکال کر میرے ساتھ عمرو ابن عاص کے خیمہ تک چلو اور اُسے بتاؤ کہ عمار یاسر تمہارے لشکر میں موجود ہیں شائد اس کے نتیجہ میں جنگ رُک جائے، صلح کی کوی صورت نکل آئے اور ہم ہلاکت و تباہی سے بچ جائیں۔ کہا کہ میں جانے کو تو جا سکتا ہوں مگر مجھے اندیشہ ہے کہ میں تمہارے غدر و فریب کا شکار نہ ہو جاؤں۔ ذوالکلاع نے کہا کہ میں اللہ اور اس کے رسول کو درمیان میں لا کر تم سے عہد کرتا ہوں کہ تمہیں کوی گزند نہیں پہنچے گا۔ نہ تمہیں قتل کیا جائے گا نہ تمہارے ہتھیار چھینے جائیں گے اور نہ تمہیں بیعت پر مجبور کیا جائے گا تم صرف عمرو ابن عاص کے سامنے اتنا کہہ دو کہ عمار تمہارے لشکر میں موجود ہیں۔ اس عہد و پیمان کے بعد دونوں عمرو ابن عاص کی قیامگاہ پر پہنچے۔ عمرو نے ذوالکلاع کے ہمراہ ایک اجنبی کو دیکھ کر پوچھا کہ یہ کون ہے مجھے تو یہ ابو ترابی معلوم ہوتا ہے۔ ابو نوح نے کہا کہ میرے چہرے سے پیغمبر اور دوستدارانِ پیغمبر کی عظمت و قدوسیت کے آثار نمایاں ہیں اور تمہارے اندر مجھے ابو جہل اور فرعون کے عادات و اطوار کی جھلک نظر آ رہی ہے اس پر ابو الاعور سلمی نے تلوار کی طرف ہاتھ بڑھایا اور کہا کہ یہ ذلیل اور جھوٹا ہمارے مُنہ پر ہمیں گالیاں دیتا ہے ہم اس بدزبانی کا اسے مزا چکھائیں گے۔ ذوالکلاع نے کہا کہ یہ میرا ابن عم ہے اور میں نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے اگر تم نے ہاتھ اٹھایا تو میں تمہاری ناک توڑ دوں گا۔ میں اسے اس غرض سے لایا ہوں کہ یہ تمہیں عمار کے بارے میں بتلائے۔ عمرو ابن عاص نے پوچھا کہ کیا عمار علی کے لشکر میں شامل ہیں۔ ابو نوح نے کہا کہ تم ان کے بارے میں کیوں پُوچھتے ہو؟ کہا کہ میں نے رسُول کو کو فرماتے سُنا تھا ان عمارا تقتله الفئة الباغية۔ "عمار کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا"۔ کہا کہ خدا کی قسم عمار ہمارے لشکر میں

موجود ہیں اور وہ تمہیں اور تمہاری سپاہ کو نیست و نابود کرنے کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ ذوالکلاع کو جب عمار کی موجودگی اور حدیث پیغمبر کی تصدیق ہوگئی تو کہا کہ پھر وہ باغی گروہ تو ہم ہوئے۔ عمرو نے کہا کہ وہ علی کے ساتھ ہیں تو کیا ہوا آخر میں وہ ہمارے ساتھ مل جائیں گے۔

یہ جواب صرف ایک طفل تسلی کی حیثیت رکھتا ہے جس سے سطحی ذہنوں سے تو کھیلا جا سکتا ہے مگر کسی بابصیرت شخص کے لئے اطمینان بخش نہیں ہو سکتا۔ آخر وہ کون سے قرائن تھے جن کے پیش نظر یہ دعوی کیا گیا کہ عمار امیرالمومنین سے کٹ کر سپاہ شام میں شامل ہو جائیں گے۔ کیا ان سے رسل و رسائل کا رابطہ تھا یا ان سے در پردہ کوی بات چیت ہو رہی تھی یا ان کے طور طریقوں سے اس کا اندازہ لگایا تھا؟ جب یہ کچھ نہ تھا تو یہ جواب ایک فریب کے سوا کیا ہو سکتا ہے جسے اس لئے گڑھ لیا گیا تاکہ سننے والوں کو اپنے دام میں جکڑے رکھیں۔ خدا جانے یہ جواب ذوالکلاع کو مطمئن کر سکا یا نہیں مگر وہ عملاً سپاہ شام ہی سے منسلک رہا حالانکہ لشکر ہی کی ایک فرد عبداللہ ابن عمر عنسی نے اس گفتگو کو سن کر ذوالکلاع کو رائے دی کہ وہ باغی گروہ کو چھوڑ کر علیحدہ ہو جائے مگر وہ نہ مانا۔ شائد اس نے اس نے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لی ہوگی کہ عمار ان کی صفوں میں شامل ہو جائیں گے البتہ عبداللہ ابن عمر عنسی لشکر شام سے الگ ہو کر امیرالمومنین کے لشکر میں شامل ہو گیا اور اس موقع پر چند اشعار کہے جن میں سے دو شعر یہ ہیں:۔

لا لا اقاتل عمارا علی طمع　　　بعد الروایة حتی ینفخ الصور

"اس روایت کے بعد میں کسی طمع و لالچ کی بنا پر صور کے پھنکنے تک عمار سے جنگ و قتال نہیں کروں گا۔"

ترکت عمرا و اشیاعا له نکدا　　　انی بترکهم یا صاح معذور

"میں نے ابن عاص اور اس کے باغی گروہ کو چھوڑ دیا ہے اور اے دوست میں انہیں چھوڑ دینے میں معذور ہوں۔"

معاویہ کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو وہ عمرو ابن عاص پر بہت بگڑے۔ عمرو نے کہا کہ میں نے تو حدیث رسول بیان کی تھی اب کوی چلا جائے تو اس کی ذمہ داری مجھ پر عائد نہیں ہوتی۔

ذوالکلاع عمار یاسر کی راہ تکتا رہ گیا اور میدان جنگ میں لڑتا ہوا قبیلۂ بکر ابن وائل کی ایک فرد خندف بکری کے ہاتھ سے مارا گیا۔ ذوالکلاع کے بیٹے کو جب باپ کے مارے جانے کا علم ہوا تو ایک شخص کے ذریعہ اشعث ابن قیس کو کہلوا بھیجا کہ اسے باپ کا لاشہ اٹھا لانے کی اجازت دی جائے۔ اشعث نے جواب میں کہا کہ اگر میں نے اجازت دے دی تو امیرالمومنین مجھے مشکوک نظروں سے دیکھیں گے اور میں پہلے ہی کون سا ثقہ و معتمد ہوں۔ تم سعید ابن قیس ہمدانی سے جو میمنۂ لشکر

ہیں موجود ہیں دریافت کرو۔ اگر وُہ اجازت دے دیں تو پھر تمہیں کوی روک نہیں سکتا۔ ابن ذی الکلاع نے سعید کے پاس آدمی بھیجا اور اُن سے اجازت طلب کی۔ سعید نے کہا کہ امیر المومنین کی اس پر نظر نہیں ہے کہ تم میں سے کون آتا ہے اور کون جاتا ہے تم بے کھٹکے آؤ اور اپنے باپ کا مُردہ اُٹھا لے جاؤ۔ ابن ذی الکلاع حضرت کے میمنۂ لشکر میں آیا اور باپ کا لاشہ ادھر ادھر تلاش کیا مگر کہیں نظر نہ آیا۔ پھر میسرہ لشکر کا رُخ کیا وہاں بھی کہیں دکھائی نہ دیا۔ آخر ڈھونڈتے ڈھانڈتے اس کی نظر ایک خیمہ پر پڑی دیکھا کہ ذوالکلاع کا لاشہ خیمہ کی طنابوں سے جکڑا پڑا ہے۔ اس نے خیمہ والوں سے کہا کہ مجھے اپنے باپ کی میّت اُٹھالے جانے کی اجازت دو۔ انہوں نے کہا کہ ہماری طرف سے اجازت ہے اور ہم تم سے معذرت کرتے ہیں اور اللہ سے بھی عذر خواہ ہیں۔ اگر تمہارا باپ امیر المومنین کا باغی نہ ہوتا تو اس حالت میں نہ پڑا رہتا۔ ابن ذی الکلاع اور اس کے ایک حبشی غلام نے چاہا کہ اُسے اُٹھائیں مگر اس پہاڑ کا اُٹھانا آسان کام نہ تھا ہمّت ہار کر بیٹھ گئے اور اہل خیمہ سے کہا کہ تم میں کوی ہے جو اس کے اٹھانے میں ہمارا ہاتھ بٹائے؟ خندف بکری نے کہا کہ تم دونوں پیچھے ہٹ جاؤ۔ کہا کہ اگر ہم پیچھے ہٹ گئے تو تم اکیلے اسے کیونکر اٹھا سکوگے۔ کہا کہ جس نے اسے اس حالت تک پہنچایا ہے وُہ اسے اٹھا بھی سکتا ہے۔ چنانچہ خندف نے اسے اٹھا کر خچر پر لادا اور رسیوں سے جکڑ دیا۔

ذوالکلاع کے مارے جانے سے حمیریوں کا جوش انتقام بڑھ گیا اور وُہ عبیداللہ ابن عمر کی صفوں میں آکر شامل ہوگئے۔ اس موقع پر عبیداللہ نے ایک دام فریب بچھایا اور امام حسن کو پیغام بھجوایا کہ میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں اسے سُن لیجئے۔ امام حسن کو یہ پیغام ملا تو آپ صفوں سے نکل کر اس کے سامنے آئے اور فرمایا کہ کیا کہنا چاہتے ہو؟ کہا کہ میں جو بات کہنے والا ہوں اس سے آپ ہی کا مفاد وابستہ ہے آپ کو معلوم ہے کہ قریش کو علی سے انتہائی صدمات پہنچ چکے ہیں وُہ آپ کی امارت تو گوارا کر سکتے ہیں مگر اُن کا اقتدار کسی صورت میں برداشت نہیں کر سکتے۔ آپ انہیں اقتدار سے الگ کرنے میں ہمارا ساتھ دیں ہم آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ ان کی برطرفی کے بعد خلافت آپ کے سپرد کردیں گے۔ امام حسن نے یہ بات سُنی تو نفرت و حقارت سے پیشانی پر بل ڈالا اور فرمایا کہ اے عبیداللہ تم آج نہیں تو کل مارے جاؤ گے۔ تمہیں شیطان نے بہکا کر اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے جہاں ہلاکت ہی ہلاکت اور تباہی ہی تباہی ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ میں امیر المومنین کے خلاف کسی سازش میں حصّہ لوں۔ تم نے یہ کہہ کر اپنی کم ظرفی اور عقل سے تہی دامانی کا ثبوت دیا ہے عبیداللہ نے یہ جواب سُنا تو اپنا سا مُنہ لے کر رہ گیا۔

اب اس نے پلٹ کر صف بندی کی اور عقبی جانب سے حضرت کے میسرہ پر حملہ کیا۔ میسرہ میں قبیلۂ ربیعہ کے جانباز پہلے ہی سے مستعد تھے انہوں نے تلواریں کھینچ لیں اور دشمن کی صفوں میں گھس

کر تہلکہ مچادیا۔ ظہر سے لے کر مغرب تک پیہم تلواریں چلتی رہیں اور خون کے سیلاب بہتے رہے۔ آخر میسرۂ عراق نے اس شدّت سے حملہ کیا کہ میمنۂ شام منتشر ہو گیا۔ مگر رات کے اندھیرے میں پھر سمٹ کر جمع ہوا قبیلہ ربیعہ نے حملہ کر کے پھر اسے منتشر کیا یہاں تک کہ شامیوں کے جھنڈے کے گرد صرف ایک ہزار آدمی رہ گئے جنہوں نے از سر نو اپنی صفیں درست کیں اور جان توڑ مقابلہ کے لئے آگے بڑھے۔ ادھر قبیلہ ربیعہ بھی جان لڑائے ہوئے تھا آگے بڑھ کر شامیوں سے گتھ گیا۔ شب بھر تلواروں پر تلواریں چلتی رہیں اور لاشوں کے ڈھیر لگتے رہے۔ اس خونی ہنگامہ میں نماز کا وقت آتا اور گزر جاتا اور اتنا موقع ہی نہ ملتا تھا کہ نماز ادا کی جا سکے۔ اوقات نماز میں صرف تکبیروں پر اکتفا کی جاتی تھی۔ جب اس بھیانک رات نے اپنا دامن سمیٹا اور افق پر صبح کی سفیدی نمودار ہوی تو حضرت کے لشکر میں اذان کی آواز بلند ہوی۔ حضرت نے صدائے اذان سُن کر فرمایا:-

یا مرحبا بالقائلین عدلا   و بالصلوٰۃ مرحبا و اھلا

اس معرکہ میں عبید اللہ ابن عمر، ہانی ابن خطاب یا محرز ابن صحصح یا حریث ابن جابر حنفی کے ہاتھ سے مارا گیا۔ شامیوں کی طرف سے عبید اللہ کا لاشہ حاصل کرنے کے لئے دس ہزار درہم کی پیشکش کی گئی مگر حضرت نے ان کی پیشکش کو ٹھکراتے ہوئے فرمایا:-

انما جیفتہ جیفۃ کلب لایحل بیعھا۔   "یہ ایک سگ مردہ کی لوتھ ہے اس کی بیع جائز نہیں ہے" (مروج الذہب ج۲ ۔ ص۲۴)

آخر اس کی دونوں بیویاں بحریہ بنت ہانی اور اسماء بنت عطارد اس کی میت لینے کے لئے آئیں کچھ لوگوں نے کہا کہ تم تو ان کی میّت اٹھانے سے رہیں اگر چاہو تو ہم اس کا لاشہ خچر کی دم سے باندھے دیتے ہیں اور اسے ہنکاتے ہوئے تمہارے خیمہ تک پہنچائے دیتے ہیں۔ اتنے میں زیاد ابن خصفہ خیمہ سے باہر نکلے تو بحریہ بنت ہانی نے ان سے میت لے جانے کے لئے کہا۔ انہوں نے لاشہ ایک خچر پر لدوادیا اور وہ اسے اپنے ہمراہ لے گئیں اس طرح کہ اس کے ہاتھ پیر زمین پر گھسٹتے جا رہے تھے۔

ذوالکلاع اور عبید اللہ کے مارے جانے سے معاویہ پر خوف و ہراس طاری ہو گیا۔ انہوں نے عمرو ابن عاص سے کہا کہ خدا جانے اب یہ عراقی کیا قدم اُٹھانے والے ہیں۔ عمرو نے کہا کہ تم قبیلۂ ربیعہ کے حملوں کو تو دیکھ ہی چکے ہو اگر انہوں نے علی کے گرد جمع ہو کر حملہ کیا تو ان کے مقابلہ میں شامیوں کے قدم مشکل ہی سے جم سکیں گے۔ معاویہ نے کہا کہ تم مجھے حوصلہ دلانے کے بجائے اور ہراساں کر رہے ہو۔ کہا کہ جو مجھے نظر آرہا ہے میں نے وہی کہا ہے۔ معاویہ کو جب کامیابی کی کوی صورت نظر نہ آئی تو انہوں نے خالد ابن معمر کو جو سپاہ ربیعہ کی کمان سنبھالے ہوئے لڑ رہا تھا یہ پیغام بھجوایا کہ اگر تم

میدان سے پیچھے ہٹ جاؤ گے تو میں کامیابی کے بعد تمہیں خراسان کی امارت دوں گا جس پر تم میری زندگی تک فائز رہو گے۔ چنانچہ جب ربیعہ کی پُرجوش فوجیں شامیوں کو دھکیلتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں اس نے اپنے قدم روک لئے اور فوجوں کو منتشر کر کے پیچھے ہٹ گیا۔ خالد نے ہوس اقتدار سے مغلوب ہو کر آخرت سے مُنہ موڑا مگر اسے دُنیا بھی نصیب نہ ہو سکی۔ چنانچہ جب معاویہ نے اس غداری کے صلہ میں اسے امارت خراسان کا پروانہ بھیجا تو وُہ خراسان پہنچنے سے پہلے مر گیا اور دُنیا و آخرت دونوں سے محروم رہا۔

اس حرب و ضرب کی گرم بازاری میں لشکر شام کا ایک تیغ زن کریب ابن صباح حمیری صفوں سے باہر نکل کر للکارا۔ سپاہِ عراق میں سے مرتفع ابن وضاح زبیدی اس کے مقابلہ کے لئے نکلے مگر تاب مقاومت کھو کر اس کے ہاتھ سے شہید ہو گئے۔ اس نے دوسری مرتبہ للکارا۔ اب حارث ابن جلاح اس کے مقابلہ کے لئے بڑھے مگر وُہ بھی اُسے زیر نہ کر سکے اور تلوار کا وار کھا کر دم توڑ دیا۔ اس کے تیسری مرتبہ پکارنے پر عائذ ابن مسروق ہمدانی میدان میں آئے اور وُہ بھی اس کے ہاتھ سے مارے گئے۔ ان تین آدمیوں کو شہید کرنے کے بعد کریب کا حوصلہ بڑھ گیا اس نے تینوں لاشوں کو ایک دُوسرے کے اوپر رکھا اور ان پر چڑھ کر للکارنے لگا۔ امیر المومنین نے اس کی یہ وحشیانہ حرکت دیکھی تو اس خیال سے کہ دیکھنے والے اس کی تیغ زنی سے مرعوب نہ ہوں کسی اور کو بھیجنے کے بجائے خود اس کے مقابلہ کے لئے بڑھے اور اس کے قریب پہنچ کر فرمایا اے کریب یاد رکھ کہ ہند جگر خوار کا بیٹا تجھے جہنم کے شعلوں میں جھونک دے گا میں تجھے اللہ کی کتاب اور رسُول کی سنت پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دیتا ہوں۔ اس نے کہا کہ ہم اس قسم کی باتیں بہت سُنتے چلے آ رہے ہیں آپ میری تلوار کی کاٹ تو دیکھ ہی چکے ہیں اگر حوصلہ ہے تو مجھ سے لڑ لیجئے۔ حضرت کے تیور بدلے اور آگے بڑھ کر اس پر تلوار کا وار کیا وُہ زخمی ہو کر زمین پر گرا اور کچھ دیر خاک و خون میں لوٹنے اور ایڑیاں رگڑنے کے بعد خاک کا ڈھیر ہو گیا۔ اسے ختم کرنے کے بعد حضرت نے دوسرا مبارز طلب کیا۔ فوج مخالف سے حارث ابن وداعہ حمیری میدان میں آیا حضرت نے اسے بھی زمین پر پچھاڑ دیا۔ پھر تیسری مرتبہ للکارنے پر مطاع ابن المطلب علبسی مقابلہ کے لئے نکلا حضرت نے اُسے بھی تہ تیغ کر دیا اور شامیوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اگر تم ابتدا نہ کرتے تو ہم بھی پہل نہ کرتے اور پھر اس آیت کی تلاوت فرمائی:۔

الشھر الحرام بالشھر الحرام	حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینہ کے مساوی
والحرمات قصاص فمن	ہے اور حرمت والی چیزوں میں برابر کا بدلہ ہے
اعتدیٰ علیکم فاعتدوا	لہذا جو شخص تم پر زیادتی کرے تو جیسی زیادتی اس نے
علیہ بمثل ما اعتدیٰ علیکم	کی ہے ویسی زیادتی تم بھی اس پر کرو اور اس بات

واتقوا اللہ واعلموا ان اللہ مع المتقین۔ | "خدا سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔"

اس واقعہ پر نظر کرنے سے حق و عدالت کی ایسی تصویر نظروں کے سامنے آتی ہے جس کی مثال تاریخ حرب و ضرب میں نظر نہیں آتی۔ آپ نے اس موقع پر تین جنگ آزماؤں کو تہ تیغ کرنے کے بعد اپنا ہاتھ روک لیا حالانکہ ایسے موقع پر جب تین جوانمرد قتل ہو چکے ہوں تو شجاعت کا ولولہ ابھر آتا ہے اور حوصلہ بڑھ جاتا ہے جس طرح کریب کا حوصلہ دیوانگی کی حد تک بڑھ گیا تھا۔ اگر آپ اس کے بعد بھی للکارتے اور دشمن کی صفوں سے نکلنے والے سورماؤں کو قتل کرتے رہتے تو شامیوں کی ایک اچھی خاصی تعداد ٹھکانے لگ سکتی تھی کیونکہ تلوار "شیر خدا" کے ہاتھ میں تھی مگر آپ نے حق و انصاف کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اتنے ہی افراد قتل کئے جتنے اس موقع پر دشمن کے ہاتھ سے مارے گئے تھے اور جتنی کریب کے ہاتھوں سے خونریزی ہوئی تھی اس سے زیادہ خونریزی گوارا نہ کی۔

تیغ بہر عزت دین است و بس | مقصد او حفظ آئین است و بس

اس محاربہ حق و باطل میں عمار ابن یاسر خاموش تماشائی کی حیثیت سے نہ رہ سکتے تھے وہ جنگ آزما تلوار کے دھنی اور مانے ہوئے مرد میدان تھے۔ بدر، احد، خندق اور دوسرے غزوات میں شریک ہو کر اپنی شجاعت کا لوہا منوا چکے تھے۔ اگرچہ اب ہاتھوں میں رعشہ، چہرے پر جھریاں اور کمر میں جھکاؤ آ گیا تھا اور عمر کی ترانویں منزلیں طے کر چکے تھے مگر انحطاط عمر کے باوجود جوانوں سے آگے نظر آتے تھے۔ رنگ گندم گوں، سینہ چوڑا چکلا، آنکھیں بڑی، قد لانبا، ریش سفید اور تیور شجاعانہ تھے۔

جب سے پیغمبر اکرم کی زبان مبارک سے اپنی شہادت کی خبر سنی تھی جذبۂ جہاد سے مخمور اور شوق شہادت میں سرشار رہتے تھے۔ شام کے باغیوں کو دیکھ کر پیغمبر کی صدائے حق یا عمار تقتلک الفئة الباغیہ۔ "اے عمار تمہیں ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔" کانوں میں گونجنے لگی۔ خمیدہ کمر میں پٹکا باندھا لٹکی ہوئی بھوؤں کو اوپر اٹھایا کانپتے ہاتھوں میں تلوار لی اور امیر المومنین کے سامنے آ کر اجازت طلب ہوئے۔ حضرت نے نظر بھر کر عمار کو دیکھا اور فرمایا مھلاً رحمک اللہ۔ "ٹھہرو خدا تم پر رحم کرے۔" عمار نے حضرت کو اذن جہاد دینے میں متردد دیکھا تو کہا کہ پیغمبر اکرم مجھے شہادت کی خبر دے گئے تھے اب میں عمر کی آخری منزل میں ہوں اور شہادت گاہ میری نظروں کے سامنے ہے لہٰذا مجھے اجازت دیجئے۔ حضرت نے عمار کے تیور دیکھے تو انہیں بادل ناخواستہ اجازت دی۔ عمار نے زرہ پہنی ہتھیار سجے گھوڑے پر پڑی جمائی اور سر آسمان کی طرف بلند کر کے کہا:۔

اللھم انک تعلم انی لو اعلم ان رضاک فی ان اقذف بنفسی | بار الہا! تو خوب جانتا ہے کہ اگر مجھے یہ علم ہو جائے کہ تیری رضا اس میں ہے کہ میں دریا میں

فی هذا البحر لفعلته اللهم انك تعلم انی لو اعلم ان رضاك فی ان اضع ظبة سیفی فی صدری ثم انحنی علیها حتی تخرج من ظهری لفعلته و انی لا اعلم الیوم هو ارضی لك من جهاد هولاء الفاسقین ولو اعلم ان عملا من الاعمال هو ارضی لك لفعلته۔
(تاریخ طبری ج ۶۔ ص ۲۶)

پھاند جاؤں تو میں ایسا کر گزرتا۔ اے خدا تو جانتا ہے کہ اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ تیری خوشنودی اس میں ہے کہ میں تلوار کی نوک اپنے سینہ پر رکھوں اور اتنا جھکوں کہ تلوار میرا سینہ چیر کر پُشت کے پار ہو جائے تو مجھے اس میں بھی دریغ نہ ہوتا۔ میں آج کے دن تیری خوشنودی کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی عمل نہیں سمجھتا کہ ان فاسقوں سے جہاد کروں اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اس عمل سے بڑھ کر کوئی عمل تجھے خوش کرنے والا ہے تو میں اس میں بھی کوتاہی نہ کرتا"۔

امیر المومنین نے ایک دستۂ فوج عمار کی زیر کمان ترتیب دیا علم لشکر ہاشم ابن عتبہ مرقال کے سپرد کیا اور اُن سے مسکراتے ہوئے فرمایا اے ہاشم تم کب تک روٹیاں توڑتے رہو گے اٹھو اور دشمنان دین سے جنگ کرو۔ ہاشم نے جو جواب دیا اس کی ترجمانی سعدی کا یہ شعر کرتا ہے ؎

آن نہ من باشم کہ روز جنگ بینی پشت من ایں منم کاندر میان خاک و خوں بینی سرم

ہاشم نے علم لینے کے بعد معاویہ کے لشکر کی طرف نظر دوڑائی اور ایک دستہ فوج کی طرف اشارہ کر کے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں بتایا گیا کہ یہ ذوالکلاع کا قبیلہ ہے۔ پھر ایک اور دستہ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا کہ یہ کون ہیں بتایا گیا کہ یہ قریش اور اہل مدینہ کا ملا جلا مجمع ہے۔ پھر دوسری سمت اشارہ کر کے پوچھا کہ اس گنبد نما خیمہ کے گرد و پیش کون لوگ ہیں؟ بتایا گیا کہ یہ معاویہ اور اُن کے حفاظتی دستے ہیں۔ کہا کہ خیمہ کے ادھر بھی کچھ لوگوں کی جھلک دکھائی دے رہی ہے بتایا گیا کہ یہ عمرو ابن عاص اس کے بیٹے اور اہالی موالی ہیں۔ جب فوجیں صف بستہ تیار ہو گئیں تو عمار یاسر نے ان سے خطاب کرتے ہوئے کہا اے جانبازو اٹھو اور ان فتنہ پردازوں سے جنگ کرو جنہوں نے خونِ عثمان کے قصاص پر جنگ چھیڑی ہے۔ وہ لوگوں کو فریب دینے کے لئے کہتے ہیں کہ عثمان مظلوم مارے گئے اور ہم ان کے قصاص کے طالب ہیں۔ انہیں قصاص سے کیا مطلب انہیں تو جنگ چھیڑنے کے لئے کوئی بہانہ چاہئے تھا اور یہ بہانہ ان کے ہاتھ لگ گیا جس سے وہ عوام کو ورغلا کر میدان میں لے آئے ہیں اس جنگ و قتال کا مقصد صرف اقتدار حاصل کرنا ہے انہیں نہ دین سے کوئی لگاؤ ہے اور نہ حق سے کوئی واسطہ وہ نہیں چاہتے کہ دین و مذہب کی پابندیاں اُن کے مادی لذائذ اور دنیوی تعیشات میں حائل ہوں۔

اس تقریر کے بعد ہاشم نے علم کو جنبش دی لشکر میں حرکت پیدا ہوی اور ہاشم اور عمار دونوں ایک ساتھ اُٹھ کھڑے ہوُے اور فوجوں کے جلو میں دشمن کی صفوں کی طرف بڑھے۔ عمار جس طرف سے ہو کر گزرتے صحابہ ہجوم کر کے ساتھ ہو جاتے۔ معاویہ نے جب اس جم غفیر کو بڑھتے دیکھا تو ابوالاعور سلمی کی قیادت میں تازہ دم فوجوں کو میدان میں اُتارا۔ عمار یاسر نے سپاہ شام میں عمرو ابن عاص کو دیکھا تو اُسے مخاطب کر کے کہا "تف ہے تیری اوقات پر تو نے مصر کی چند روزہ حکومت کی خاطر اپنا دین تک بیچ ڈالا اور یہ کوی نئی بات نہیں ہے تو نے ہمیشہ اسلام کے خلاف بغاوت کر کے اپنی کجروی کا ثبوت دیا ہے"۔ عمرو نے کہا کہ ہم خونِ عثمان کا بدلہ لے رہے ہیں۔ کہا کہ تو نے یہ قدم اللہ کو خوش کرنے کے لئے نہیں اُٹھایا۔ میں اس سے پہلے بھی تین مرتبہ پیغمبر اکرم کے لشکر میں شامل ہو کر تجھ سے لڑ چکا ہوں اور جس نظریہ کی بنا پر پہلے لڑا تھا آج بھی اسی نظریہ کو سامنے رکھ کر لڑ رہا ہوں۔ اے عمرو کیا تو پیغمبر کا یہ ارشاد بھول گیا کہ:۔ "اے عمار تمہیں ایک باغی گروہ قتل کرے گا تم اُسے جنت کی طرف بُلاؤ گے اور وہ تمہیں دوزخ کی طرف دعوت دے گا"۔ مجھے دیکھ اور پہچان میں عمار ہوں۔ عمرو کے پاس ان باتوں کا جواب ہی کیا تھا سُن کر چُپ ہو رہا۔

جب دونوں طرف کے لشکر بالمقابل کھڑے ہوُے تو تلواریں اور نیزے لے کر ایک دُوسرے پر ٹوٹ پڑے۔ جنگ کے شعلے بھڑک اُٹھے اور تلواریں تلواروں سے ٹکرانے لگیں۔ اس گھمسان کی جنگ میں ایک کو دُوسرے کی خبر نہ رہی۔ عمار اور ہاشم بھی اس ریلے میں بہہ کر ایک دُوسرے سے الگ ہو گئے۔ عمار پیری و ضعیفی کے باوجود کانپتے ہاتھوں سے تلوار چلاتے اور دُشمن کو روندتے ہوُے آگے بڑھتے رہے لڑتے لڑتے نظریں اٹھیں تو دیکھا کہ ہاشم کھڑے ہیں کہا اے ہاشم کیوں کھڑے ہو آگے بڑھو اور دشمن کی صفوں میں گھس کر حملہ کرو۔ آج جنت کے دروازے کھلے ہوُے ہیں اور جنت تیغ و سنان کے سایہ میں ہے۔ اگر یہ لوگ ہمیں پسپا کر کے بحرین کے نخلستان تک دھکیل لے جائیں جب بھی ہمیں یقین ہے کہ ہم حق پر ہیں اور یہ لوگ باطل پر ہیں۔ ہاشم نے علم لہرایا اور برق خاطف کی طرح دشمن کی صفوں پر ٹوٹ پڑے سروں پر تلواریں چمکیں سینوں میں نیزے اترے اور لاشوں پر لاشے گرنے لگے۔ عمرو ابن عاص نے دیکھا تو کہا کہ اگر یہ سیاہ جھنڈے والا یونہی لڑتا رہا تو عرب کا صفایا کر دے گا۔ ہاشم اور عمار کے پے درپے حملوں سے شامیوں کی پانچ صفوں میں سے تین صفیں منتشر ہو گئیں۔ جب چوتھی صف پر حملہ آور ہونے کی نوبت آئی تو وُہ جاں توڑ کر مقابلہ کے لئے اٹھ کھڑے ہوُے اور ان میں سے قبیلہ ازد اور بجیلہ نے قبیلہ ہمدان کے جوانوں پر بھرپور حملہ کیا جس سے وقتی طور پر اُن کے قدم اکھڑ گئے اور ایک ٹیلے پر چڑھ کر پناہ لینے کے لئے پیچھے ہٹے مگر بجیلہ اور ازد نے تعاقب کر کے انہیں میدان میں اُتار لیا۔ اب ہمدان کے جوانمردوں نے جم کر جو حملہ کیا تو ان کے تین ہزار آدمیوں کو تہ تیغ کر کے بقیۃ السیف کو پیچھے ہٹنے

پر مجبور کر دیا۔ عمار یاسر اپنے ہمراہیوں کو لے کر آگے بڑھے اور ان جتھوں کے قریب پہنچ گئے جو معاویہ کے گرد حصار باندھے کھڑے تھے۔ معاویہ نے انہیں آگے بڑھتے دیکھا تو حفاظتی دستوں کو حکم دیا کہ وُہ آگے بڑھ کر ان کا راستا روکیں۔ چنانچہ وُہ شمشیر بکف آگے بڑھے۔ ان لوگوں میں عمرو ابن عاص کا بیٹا عبداللہ بھی تھا جو ایک تلوار کمر میں لٹکائے اور ایک تلوار ہاتھ میں لئے ہوئے تھا۔ جب عمار نے اس سمت کا رُخ کیا جدھر عبداللہ تھا تو عمرو اپنے بیٹے کو دیکھ کر چلایا کہ ہائے میرا بیٹا۔ معاویہ نے کہا کہ حوصلہ سے کام لو کوی گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ کہا یہ میرا بیٹا ہے اگر تمہارا بیٹا یزید ہوتا تو میں دیکھتا کہ تم کس طرح صبر کرتے ہو۔ آخر عمرو کے چیخنے چلّانے کی وجہ سے چند شامی آگے بڑھے اور عبداللہ اور اس کے ساتھیوں کو صفوں سے باہر نکال لائے۔

عمار یاسر حملوں پر حملے کر رہے تھے کہ ایک شخص کے ہاتھ سے زخمی ہو گئے۔ قوت و طاقت نے جواب دے دیا اور آگے بڑھنے کی ہمت نہ رہی زخموں نے نڈھال اور پیاس کی شدّت نے بے حال کر دیا۔ آپ کے ایک غلام راشد نے دودھ میں پانی ملا کر پیش کیا آپ نے اس میں سے کچھ پیا اور کہا۔

صدق اللہ و رسولہ الیوم القی الاحبۃ محمدًا و حزبہ قال رسول اللہ ان اخر رزق من الدنیا ضیحۃ لبن۔ (تاریخ ابوالفداء جلد ۱ صفحہ ۱۷۶)	اللہ اور اس کے رسول کی ہر بات سچ ہے۔ میں آج اپنے دوستوں سے ملاقات کروں گا محمدؐ مصطفیٰ اور ان کے گروہ سے۔ رسُول اللہ فرما گئے تھے کہ اس دُنیا میں میرا آخری رزق پانی میں ملا ہُوا دُودھ ہوگا"۔

دُودھ پینے سے جسم لاغر میں کچھ توانائی آئی اور پھر حملہ کے ارادہ سے اُٹھ کھڑے ہُوے دل میں جان دینے اور مر مٹنے کا ولولہ تھا دنیا کی زندگی سے جی اُچاٹ ہو چکا تھا اور ہر قدم طلب شہادت میں اُٹھ رہا تھا آپ مصروف جہاد تھے کہ باغی گروہ کی ایک فرد ابوالغادیہ فزاری نے آپ پر نیزہ مارا اور ابن جون سکسکی نے آگے بڑھ کر تلوار سے سر قلم کر دیا۔

امیر المومنین کو عمار کی شہادت کی خبر ہوی تو آپ کو بہت صدمہ ہوا۔ آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے ان کی میت پر آئے اور لاش کو دیکھ کر یہ دُو شعر پڑھے۔

الا ایھا الموت الذی ھو قاصدی ارحنی فقد افنیت کل خلیلی

"اے موت آ اور مجھے سکون و راحت سے ہمکنار کر تُو نے میرے تمام دوستوں کو فنا کر ڈالا ہے اور مجھے بھی چھوڑنے والی نہیں ہے"۔

اراک بصیرا بالذین احبھم کانک تنحو نحوھم بدلیل

"مجھے یُوں نظر آتا ہے کہ تُو میرے دوستوں میں سے ایک ایک کو پہچانتی ہے گویا کوی

بتانے والا تجھے ان کی نشاندہی کر رہا ہے"۔

پھر انا للہ و انا الیہ راجعون کے بعد فرمایا کہ جو شخص عمار کی موت سے رنجیدہ خاطر نہیں ہے وہ اسلام سے بہرہ یاب نہیں ہے۔ اس کے بعد نماز جنازہ ادا کی اور انہی کپڑوں میں اسی سرزمین پر انہیں دفن کر دیا۔

عمار کی شہادت سے شامیوں کے ذہنوں میں انتشار پیدا ہوا اور ان کا باغیانہ موقف بے نقاب ہو گیا کیونکہ ان میں سے ایک طبقہ نے پیغمبر اکرم کا یہ ارشاد سن رکھا تھا:۔

تقتله الفئة الباغية الناكبة عن الطريق وان آخر رزقه ضياح من لبن۔ (تاریخ کامل ج۳ ص۱۵۷)

"انہیں ایک باغی گروہ قتل کرے گا جو سیدھی راہ سے منحرف ہوگا اور ان کا آخری رزق دودھ ہوگا جس میں پانی ملا ہوا ہوگا"۔

اسی حدیث کی بنا پر ذو الکلاع حمیری کو ذہنی پریشانی لاحق ہوئی تھی مگر عمرو ابن عاص نے یہ کہہ کر اسے اطمینان دلا دیا تھا کہ عمار ہماری طرف پلٹ آئیں گے۔ اب وہ زندہ ہوتا تو عمرو سے پوچھتا کہ تمہارا وہ دعویٰ کیا ہوا اور ممکن تھا کہ وہ اس واضح حقیقت کو دیکھ کر عمرو کے فریب کا پردہ چاک کرتا اور اپنے قبیلہ سمیت باغیوں کے گروہ سے علیحدہ ہو جاتا۔ چنانچہ عمرو نے عمار کی شہادت پر اس کا اظہار کرتے ہوئے کہا:۔

ما ادري بقتل ايهما انا اشد فرحا بقتل عمار او بقتل ذي الكلاع والله لو بقي ذو الكلاع بعد قتل عمار لمال بعامة اهل الشام الى علي۔ (تاریخ کامل ج۳۔ ص۱۵۸)

"مجھے نہیں معلوم کہ میں عمار کے قتل سے زیادہ خوش ہوں یا ذو الکلاع کے مارے جانے سے۔ خدا کی قسم اگر ذو الکلاع کے جیتے جی عمار قتل ہو جاتے تو وہ شامیوں کو لے کر علی کے لشکر میں شامل ہو جاتا"۔

خزیمہ ابن ثابت انصاری بھی عمار کی شہادت سے پہلے متردد اور حق و باطل کی تمیز سے قاصر رہے اور اس وقت تک تلوار اٹھانا گوارا نہیں کیا جب تک عمار شہید نہ ہو گئے۔ اور جب وہ شہید ہو گئے تو کہا کہ اب مجھے کوئی شبہہ نہیں رہا کہ باغی گروہ وہ ہے جس کا سرغنہ معاویہ ہے۔ یہ کہہ کر جہاد کے لئے میدان میں اتر آئے اور لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔

عمرو ابن عاص کے بیٹے عبد اللہ کے دل میں بھی کھٹک پیدا ہوئی اور اس نے اپنے باپ عمرو سے کہا کہ آج ہم نے اس شخص کو قتل کیا ہے جس کے چہرے سے پیغمبر اکرم نے اپنے ہاتھ سے گرد جھاڑتے ہوئے فرمایا تھا:۔

ویحك یابن سمیة الناس ینقلون
لبنة لبنة وانت تنقل لبنتین
لبنتین رغبة فی الاجر وانت
مع ذلك تقتلك الفئة الباغیة

اے سمیہ کے بیٹے لوگ تو ایک ایک اینٹ اُٹھا رہے ہیں اور تم اجر و ثواب کی خاطر دو دو اینٹیں اٹھاتے ہو۔ تمہیں ایک باغی گروہ قتل کرے گا"۔

(تاریخ کامل ج۳ ص۱۵۸)

ابن عاص نے معاویہ سے کہا کہ تم نے سُنا ہے عبداللہ کیا کہتا ہے معاویہ نے عبداللہ اور دوسرے عوام کی پریشاں ذہنی پر قابو پانے کے لئے فوراً کہا:۔

انحن قتلناہ انما قتلہ من جاء بہ۔ (تاریخ کامل ج۳ ص۱۵۸)

کیا ہم نے قتل کیا ہے قتل تو اس نے کیا ہے جو انہیں لے کر آیا ہے"۔

معاویہ کا یہ کہنا تھا کہ شامیوں میں سے ہر شخص یہ کہتا سُنا گیا انما قتل عمار من جاء بہ "عمار کا قاتل وُہ ہے جو انہیں لے کر آیا ہے"۔ حضرت علی نے یہ پُر فریب تاویل سُنی تو فرمایا کہ پھر حمزہ کے قاتل رسُول اللہ تھے جو انہیں میدان اُحد میں لے کر آئے تھے۔

ہاشم ابن عتبہ میدان میں اُترے ہُوئے تھے انہوں نے اپنے ساتھیوں کو دم لینے کے لئے رُکتے دیکھا تو انہیں جھنجوڑتے ہُوئے کہا کہ تم میں سے جو اللہ کی خوشنودی اور عقبیٰ کی سرخروئی چاہتا ہے وُہ دشمن سے ٹکرانے کے لئے آگے بڑھے۔ لشکر میں حرکت پیدا ہُوی اور نیزے تان کر آگے بڑھے جس سمت سے بڑھتے شامی فوجیں راستا روک کر کھڑی ہو جاتیں اور تلواروں سے تلواریں ٹکرانے لگتیں۔ اسی اثنا میں شامی فوجوں میں سے ایک غسانی نوجوان صفوں سے باہر نکلا اور یہ شعر پڑھا ؎

انی اتانی خبر فاشجان ان علیا قتل ابن عفان

"میں نے یہ اندوہناک خبر سُنی ہے کہ علی نے ابن عفان کو قتل کر ڈالا ہے"۔

پھر امیرالمومنین کو بُرا کہتا ہوا حملہ کے ارادہ سے آگے بڑھا۔ ہاشم نے اس کے تیوروں سے سمجھ لیا کہ یہ نوجوان فریب خوردہ اور قتل عثمان کے پس منظر سے بے خبر ہے۔ آپ نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے ہُوئے اس سے کہا کہ اے شخص اپنے موقف پر نظر کر اور اللہ سے ڈر کل تجھے اللہ کے رُوبرُو اس کا جواب دینا ہو گا۔ کہا کہ میں تم لوگوں سے جنگ کرنا دینی فریضہ سمجھتا ہوں اس لئے کہ نہ تم نماز پڑھتے ہو اور نہ تمہارا امیر نماز پڑھتا ہے اور تمہارے امیر ہی نے تم لوگوں کے تعاون سے عثمان کو موت کے گھاٹ اُتارا ہے۔ ہاشم نے کہا کہ تجھے عثمان سے کیا واسطہ انہیں صحابہ، صحابہ زادوں تابعین اور حفاظ قرآن نے قتل کیا ہے جو شریعت کے احکام بھی جانتے ہیں اور دین میں بصیرت بھی رکھتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تو نہ دین کے بارے میں سُوجھ بوجھ رکھتا ہے اور نہ اُمت کے اچھے بُرے کو

ویحك یا ابن سمیة الناس ینقلون	اے سمیہ کے بیٹے لوگ تو ایک ایک اینٹ
لبنة لبنة وانت تنقل لبنتین	اُٹھا رہے ہیں اور تم اجر و ثواب کی خاطر دو
لبنتین رغبة فی الاجر وانت	دو اینٹیں اٹھاتے ہو۔ تمہیں ایک باغی گروہ
مع ذلك تقتلك الفئة الباغیة	قتل کرے گا۔"

(تاریخ کامل ج۳ ص۱۵۸)

ابن عاص نے معاویہ سے کہا کہ تم نے سُنا ہے عبداللہ کیا کہتا ہے معاویہ نے عبداللہ اور دوسرے عوام کی پریشان ذہنی پر قابو پانے کے لئے فوراً کہا:۔

انحن قتلناه انما قتله من	کیا ہم نے قتل کیا ہے قتل تو اس نے کیا ہے
جاءبه۔ (تاریخ کامل ج۳ ص۱۵۸)	جو انہیں لے کر آیا ہے"۔

معاویہ کا یہ کہنا تھا کہ شامیوں میں سے ہر شخص یہ کہتا سُنا گیا انما قتل عمار من جاء بہ "عمار کا قاتل وُہ ہے جو انہیں لے کر آیا ہے"۔ حضرت علی نے یہ پُر فریب تاویل سُنی تو فرمایا کہ پھر حمزہؓ کے قاتل رسُول اللہ تھے جو انہیں میدان اُحد میں لے کر آئے تھے۔

ہاشم ابن عتبہ میدان میں اُترے ہُوئے تھے انہوں نے اپنے ساتھیوں کو دم لینے کے لئے رُکتے دیکھا تو انہیں جھنجھوڑتے ہُوئے کہا کہ تم میں سے جو اللہ کی خوشنودی اور عقبیٰ کی سرخروئی چاہتا ہے وُہ دشمن سے ٹکرانے کے لئے آگے بڑھے۔ لشکر میں حرکت پیدا ہُوی اور نیزے تان کر آگے بڑھے جس سمت سے بڑھتے شامی فوجیں راستا روک کر کھڑی ہو جاتیں اور تلواروں سے تلواریں ٹکرانے لگتیں۔ اسی اثنا میں شامی فوجوں میں سے ایک غسانی نوجوان صفوں سے باہر نکلا اور یہ شعر پڑھا۔

انی اتانی خبر فاشجان	ان علیا قتل ابن عفان

"میں نے یہ اندوہناک خبر سُنی ہے کہ علی نے ابن عفان کو قتل کر ڈالا ہے"۔

پھر امیر المومنین کو بُرا کہتا ہوا حملہ کے ارادہ سے آگے بڑھا۔ ہاشم نے اس کے تیوروں سے سمجھ لیا کہ یہ نوجوان فریب خوردہ اور قتل عثمان کے پس منظر سے بے خبر ہے۔ آپ نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے ہُوئے اس سے کہا کہ اے شخص اپنے موقف پر نظر کر اور اللہ سے ڈر کل تجھے اللہ کے رُوبرُو اس کا جواب دینا ہو گا۔ کہا کہ میں تم لوگوں سے جنگ کرنا دینی فریضہ سمجھتا ہوں اس لئے کہ نہ تم نماز پڑھتے ہو اور نہ تمہارا امیر نماز پڑھتا ہے اور تمہارے امیر ہی نے تم لوگوں کے تعاون سے عثمان کو مَوت کے گھاٹ اُتارا ہے۔ ہاشم نے کہا کہ تجھے عثمان سے کیا واسطہ انہیں صحابہ، صحابہ زادوں تابعین اور حفاظ قرآن نے قتل کیا ہے جو شریعت کے احکام بھی جانتے ہیں اور دین میں بصیرت بھی رکھتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تو نہ دین کے بارے میں سُوجھ بوجھ رکھتا ہے اور نہ اُمت کے اچھے بُرے کو

سمجھنے کی صلاحیت۔ کہا کہ میں جھوٹ کو برا سمجھتا ہوں۔ تم نے جو بات کہی ہے وہ درست ہے کہا کہ پھر جس چیز کا تجھے علم نہیں ہے اُسے جاننے والوں ہی تک محدود رکھ اور اندھیرے میں غلط قدم اٹھانے سے بچ کر رہ۔ تو نے جو یہ کہا ہے کہ ہمارا امیر نماز نہیں پڑھتا تو دُنیا جانتی ہے کہ سب سے پہلے انہوں نے رسُول اللہ کے ساتھ نماز پڑھی ہے۔ اور روئے زمین پر اُن سے بڑھ کر کون ہے جو اسرار دین کا سمجھنے والا اور احکام شرع کی پابندی کرنے والا ہو۔ انہیں رسُول اللہ سے قرب و قرابت کا وُہ شرف حاصل ہے جو کسی ایک کو بھی حاصل نہیں ہے۔ تو نے ہم پر یہ الزام عائد کیا ہے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تو کیا تجھے نظر نہیں آتا کہ ہمارے آدمی راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر مصلے بچھاتے نمازیں پڑھتے اور تلاوت قرآن کرتے ہیں۔ تجھے چند شوریدہ سر لوگوں نے بہکا دیا ہے جس کے نتیجہ میں تم نے حق کو باطل اور باطل کو حق سمجھ لیا ہے اور کورانہ اطاعت کرتے ہوُئے ضلالت و گمراہی کی راہ پر چل پڑے ہو۔ اس نوجوان نے یہ باتیں سُنیں تو اس کی آنکھوں سے پردہ اُٹھ گیا اور کہا کہ تم مجھے راستگو اور نیک کردار انسان نظر آتے ہو۔ اگر میں توبہ کر دوں تو کیا میری توبہ قبول ہو جائے گی؟ کہا کہ ہاں اللہ توبہ کا قبول کرنے والا اور خطاؤں سے درگزر کرنے والا ہے۔ یہ سُن کر وُہ نوجوان جنگ سے دستبردار ہو کر واپسی کے ارادہ سے پلٹا۔ ایک شامی نے اسے کہا کہ اس عراقی نے تمہیں فریب دیا ہے کہا کہ فریب اور ہے اور حق کی کشش اور ہے۔ اس نے مجھے باطل کی حمایت سے بچا کر ہمدردی و خیر خواہی کا ثبوت دیا ہے۔

ہاشم اپنے ہمراہیوں کے ساتھ میدان میں کھڑے تھے کہ شامیوں کی طرف سے قبیلہ تنوخ کا ایک دستہ آگے بڑھا ہاشم اپنے لشکر کو لے کر ان پر حملہ آور ہوُئے کچھ دیر تک تلواریں چلتی رہیں نو یا دس تنوخی ہاشم کے ہاتھ سے تہ تیغ ہوئے۔ اسی لڑائی کے دوران حارث ابن منذر تنوخی نے آپ کے پیٹ پر نیزہ مارا آپ بے حال ہو کر زمین پر گر پڑے۔ لشکر کی پیشقدمی رُک گئی اور ایک عام بے دلی سی پھیل گئی۔ امیرالمومنین نے بڑھتے ہوُئے لشکر کو رُکتے دیکھا تو ایک شخص کے ذریعہ ہاشم کو پیغام بھجوایا کہ علم لے کر آگے بڑھو۔ ہاشم نے پیغامبر سے کہا کہ ذرا میرے پیٹ کی طرف دیکھو دیکھا کہ پیٹ چاک ہو چکا ہے اور خون کا فوارہ ابل رہا ہے۔ کچھ دیر موت و حیات کی کشمکش میں رہنے کے بعد دم توڑ دیا اور خلد بریں کی راہ لی۔ ہاشم کے ہمراہ قبیلۂ اسلم کے حفاظ کی ایک جماعت بھی شہید ہو گئی۔ جب پیغامبر نے پلٹ کر امیرالمومنین کو ہاشم کی شہادت کی خبر دی تو آپ ہاشم اور دُوسرے شہداء کے لاشوں پر آئے اور یہ دو شعر پڑھے ؎

جزی اللہ خیرا عصبۃ اسلمیۃ   صباح الوجوہ صرعوا حول ھاشم

"خدا اس اسلمی جماعت کو جزائے خیر دے جو روشن چہروں والے اور ہاشم کے گرد و پیش لڑتے ہوُئے مارے گئے ہیں۔"

برید و عبد اللہ منہم و منقذ   و عروۃ ابنا مالک فی الاکارم

"اس جماعت میں برید عبد اللہ اور مالک کے دونوں بیٹے عروہ اور منقذ شامل ہیں یہ وہ تھے جن کا شمار شرفائے عرب میں ہوتا تھا۔"

اس اثناء میں امیر المومنین نے شامیوں کے پرچم کے نیچے ایک جتھا دیکھا پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں بتایا گیا کہ یہ قبیلۂ غسان ہے۔ فرمایا کہ یہ ابھی تک میدان میں جمے ہوئے ہیں جب تک ان کے سروں پر تلواروں کے بھرپور وار نہ ہوں گے اور نیزے ان کے سینوں میں نہ اتریں گے یہ اپنی جگہ سے نہیں ہٹیں گے۔ پھر اپنی صفوں کی طرف نظر کی اور پکار کر کہا کہ تم میں کون ہے جو ثواب آخرت پر نظر رکھ کر صبر و استقامت سے لڑے اس آواز پر فوج کا ایک دستہ آگے بڑھا۔ حضرت نے محمد ابن حنفیہ کو بلا کر کہا کہ تم اس دستۂ فوج کو لے کر آہستگی کے ساتھ آگے بڑھو اور نیزے تان کر دشمن کی صفوں کے آگے کھڑے ہو جاؤ اور میرے حکم کا انتظار کرو۔ محمد ابن حنفیہ کے روانہ ہونے کے بعد مالک اشتر کو ایک دستہ فوج کے ساتھ ان کی کمک کے لئے بھیجا اور حکم دیا کہ اب حملہ کر دو۔ محمد ابن حنفیہ اور مالک اشتر نے مل کر حملہ کیا جب ایک ساتھ نیزے اور تلواریں لے کر دشمن کی فوج پر جا پڑے تو غسانیوں کی صفیں ٹوٹ گئیں میدان لاشوں سے پٹ گیا اور اپنی جگہ چھوڑ کر پیچھے ہٹ گئے۔

اس جنگ کی گرم بازاری میں عراقیوں کے ایک ہزار سوار اپنے لشکر سے کٹ کر شامیوں کے گھیرے میں آگئے۔ یہ محاصرہ اتنا شدید تھا کہ فوج بے دست و پا ہو کر رہ گئی۔ امیر المومنین نے دشمن کو گھیرا ڈالے دیکھا تو اپنے ہمراہیوں سے کہا کہ تم میں کون ہے جو اپنی جان جوکھوں میں ڈالے۔ عبد العزیز ابن حارث جعفی نے کہا کہ آپ حکم دیں میں اپنی جان پر کھیل جاؤں گا۔ فرمایا کہ اللہ تمہارا مددگار ہو تم شامیوں کا حصار توڑ کر اپنے لشکر والوں کے پاس جاؤ اور انہیں کہو کہ وہ ادھر سے اللہ اکبر کا نعرہ لگائیں اور ادھر سے ہم نعرۂ تکبیر لگائیں اور ایک ساتھ گھیرا ڈالنے والوں پر حملہ کر دیں۔ عبد العزیز جعفی نے ہتھیار سجے گھوڑے پر پڑی جمائی باگیں اٹھائیں اور دم کے دم میں دشمن کی صفوں تک پہنچ گئے اور نیزے سے محاصرین کے سینے چھیدتے اور صفیں توڑتے ہوئے عراقیوں کے لشکر تک پہنچ گئے۔ لشکر نے انہیں دیکھا تو والہانہ انداز سے اُن کی طرف بڑھا۔ بے بسی و ناتوانی کا احساس جاتا رہا۔ پوچھا کہ امیر المومنین کس حالت میں ہیں؟ کہا کہ وُہ صحیح و سالم ہیں اور تمہیں حکم دیا ہے کہ ادھر سے تم نعرۂ تکبیر لگاتے ہوئے حملہ کرو اور ادھر سے ہم نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے حملہ کرتے ہیں۔ چنانچہ نعروں کی گونج میں حملہ ہوا۔ یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ دشمن کی صفوں میں تہلکہ مچ گیا حصار ٹوٹ گیا اور شامیوں کے سات سو سوار لقمۂ اجل ہو گئے۔ امیر المومنین نے عبد العزیز جعفی کے جرأت مندانہ اقدام کو بہت سراہا اور تحسین آفرین کے کلمات سے ان کی عزّت افزائی کی۔

امیر المومنین شامی صفوں کے مقابلہ میں پرا جمائے کھڑے تھے کہ شامیوں کا ایک سردار زرہ بکتر پہنے صفوں سے باہر نکلا اور پکار کر کہا کہ ابو الحسن کہاں ہیں حضرت اس کے سامنے آئے تو اس نے کہا اے فرزند ابو طالب آپ ایمان میں سابق، ہجرت میں سابق اور اسلامی غزوات میں بھی آپ پیش پیش رہے ہیں۔ اس خونریزی کو روکئے ہم عراق آپ کے لئے چھوڑے دیتے ہیں اور آپ شام کا علاقہ ہمارے لئے چھوڑ دیں۔ حضرت نے فرمایا:۔

یا ھذا انی قد ضربت انف ھذا الامر و عینیہ فلم اجدہ یسعنی الا القتال او الکفر بما انزل اللہ علی محمدؐ ان اللہ لا یرضی من اولیائہ ان یعصی فی الارض وھم سکوت لا یامرون بالمعروف و لا ینھون عن المنکر فوجدت القتال اھون من معالجۃ الاغلال فی جھنم ۔(اخبار الطوال ص۱۸۸)	اے شخص میں نے اس چیز کو اچھی طرح جانچا پرکھا ہے میرے لئے جنگ کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں ہے یا ان چیزوں کا انکار کر دوں جو اللہ نے پیغمبر اکرمؐ پر نازل کی ہیں۔ اللہ اپنے دوستوں سے یہ امر پسند نہیں کرتا کہ زمین میں اس کے احکام کی خلاف ورزی ہو اور وہ چپ سادھے بیٹھے رہیں نہ نیکی کا حکم دیں اور نہ برائی سے منع کریں۔ اسی بنا پر جہنم میں پابجولاں ہونے سے جنگ کی سختیاں مجھے سہل نظر آئیں"۔

میدان کارزار میں تلواریں چل رہی تھیں اور مختلف فوجی دستے آپس میں گتھے ہوئے تھے کہ حضرت نے حکم دیا کہ فوج کا ہر حصہ اپنے مقابل والے دستہ پر حملہ کر دے۔ چنانچہ تمام لشکر میدان میں امنڈ آیا اور ہر طرف جنگ کے شعلے بھڑکنے لگے۔ قعقاع ابن ابرد کا بیان ہے کہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بجلیاں کوند رہی ہیں پہاڑ ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہیں اور زمین زلزلوں کی لپیٹ میں ہے۔ امیر المومنین دشمن کی صفوں میں ڈوب کر ابھرے تو سر اور چہرہ خون سے رنگین تھا اور تلوار لہو میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس گھمسان کی جنگ میں علمبرداروں کے قدم اکھڑ گئے اور صفیں درہم و برہم ہو گئیں۔ عدی ابن حاتم جب لڑتے ہوئے ان صفوں کے قریب آئے جہاں حضرت کو چھوڑ گئے تھے تو آپ کو وہاں پر موجود نہ پایا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ آپ اس سمت ہیں جدھر جنگ ہو رہی ہے۔ عدی وہاں پر آئے حضرت کو دیکھا تو کہا:۔

یا امیر المومنین اما اذ کنت حیا فالامر امم و اعلم انی ما مشیت الیک الا علی اشلاء القتلی وما	یا امیر المومنین آپ زندہ ہیں تو ہر مصیبت آسان ہے۔ میں کشتوں کے کٹے ہوئے اعضاء کو روندتا ہوا آپ تک پہنچا ہوں آج تو نہ ہمارا کوئی

ابقی لنا ھذا الیوم ولا لھم عمیدا — سردار باقی رہا ہے اور نہ ان کا کوئی سردار بچا ہے۔"

(اخبار الطوال ص۱۸۶)

سعید ابن قیس ہمدانی نے میدان جنگ سے حضرت کو پیغام بھجوایا کہ یا امیر المومنین ہم اس وقت دشمن پر غلبہ حاصل کر چکے ہیں اگر کسی دستہ کو ہماری امداد کی ضرورت ہو تو ہم اس کی مدد کے لئے تیار ہیں۔ حضرت نے ان کی صفوں کے قریب قبیلہ ربیعہ اور ہمدان سے کہا کہ تم میرے لئے بمنزلہ نیزہ اور زرہ کے ہو اٹھو اور دشمن سے میدان خالی کرواؤ۔ اس آواز پر بارہ ہزار شمشیر زن اٹھ کھڑے ہوئے۔ حضرت نے رسول اللہ کا سیاہ عمامہ سر پر باندھا اور انہی کے گھوڑے پر جس کا نام ربیح تھا سوار ہوئے میمنہ مالک اشتر کے اور میسرہ ابن عباس کے سپرد کیا اور خود قلب لشکر میں تشریف فرما ہوئے اور ربیعہ اور ہمدان کے جوانوں کو لے کر اس طرح حملہ کیا کہ دشمن کے پرے ٹوٹ گئے اور اس طرح تلوار چلائی کہ سروں کے انبار لگ گئے۔ جب لڑتے لڑتے تلوار دوہری ہو گئی تو صفوں سے نکلے تلوار کو سیدھا کیا اور فرمایا کہ اگر تلوار دوہری نہ ہو جاتی تو لشکر سے الگ نہ ہوتا۔ پھر اٹھ کھڑے ہوئے اور فوجوں کے دل میں گھس کر حملہ کیا اور کشتوں کے پشتے لگا دیئے اور صفوں کو چیرتے اور دشمن کو تہ تیغ کرتے ہوئے معاویہ کے خیمہ کے قریب پہنچ گئے اور فرمایا:۔

اضربھم ولا اری معاویۃ — الجاحظ العین العظیم الحاویۃ

"میں ان دشمنوں پر تلوار چلاؤں گا اور معاویہ کو بھی نہیں چھوڑوں گا جو ابھری ہوئی آنکھوں اور بڑے پیٹ والا ہے۔"

معاویہ نے یہ صورت دیکھی تو گھوڑے کی رکاب میں پیر رکھ دیئے اور میدان چھوڑ کر چلے جانے کا ارادہ کر لیا۔ مگر ایک شخص کے للکارنے پر جب شامی فوجیں پلٹیں تو انہوں نے نکل بھاگنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اب شامی فوجوں نے مل کر حملہ کیا مگر قبیلۂ ربیعہ و ہمدان کے جوانمرد خون کے سیلاب بہاتے صفوں کو روندتے اور لاشوں کو کچلتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ امیر المومنین نے ان کی پیشقدمی کو سراہتے ہوئے فرمایا ہے:۔

یقودھم حامی الحقیقۃ ماجد — سعید ابن قیس والکریم یحامی

"انہیں آگے بڑھائے لئے جا رہے تھے سعید ابن قیس جو معزز اور قومی وقار کے پاسبان ہیں اور شریف انسان عزت و آبرو کی حفاظت کیا ہی کرتا ہے۔"

یہ پنجشنبہ کا دن اور جنگ کا نواں روز تھا۔ جب دن کا اجالا سمٹا اور لرزتا ہوا آفتاب اس خونی منظر کو دیکھتا ہوا غروب کی منزل کے قریب پہنچا تو وہ ہولناک اور دہشت انگیز رات آئی جو تاریخ میں لیلۃ الہریر کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ ہر طرف ایک حشر برپا تھا تلواروں کی جھنکار اور تیروں کی

بوچھار سے دل دہلے اور نعروں کی گونج اور گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سے کان کے پردے پھٹے جا رہے تھے ہر سمت تڑپتے لاشے اور کٹے پھٹے اعضاء اڑتے نظر آ رہے تھے۔ امیرالمومنین کبھی قلب لشکر میں ہوتے کبھی میمنہ کی طرف بڑھتے کبھی میسرہ کی طرف لپکتے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ میدان جنگ میں ہر مورچے پر موجود ہیں۔ جس طرف دشمن کا زور بڑھتا فوراً اُدھر کا رُخ کرتے اور تلواروں نیزوں اور بھالوں کے اندر کود پڑتے اور اس طرح حملہ کرتے کہ صفوں پر صفیں چڑھ جاتیں اور لاشوں پر لاشیں گرنے لگتیں۔ آخر اس معرکہ حرب و پیکار میں نیزے ٹوٹ گئے تلواریں ٹکڑے ٹکڑے ہو گئیں اور ایک دوسرے کو دانتوں سے کاٹنے تک کی نوبت آ گئی۔ اس رات میں پانچ سو تئیس مرتبہ حضرت کی صدائے تکبیر کو شمار کیا گیا اور صبح کو ان کے مقتولین کو دیکھا گیا تو ان کی تعداد بھی پانچ سو تئیس تھی اور ایک روایت یہ ہے کہ اس رات میں نو سو سے زائد شامی آپ کے ہاتھ سے قتل ہوئے اور مجموعی طور پر فریقین کے مقتولین کی تعداد تیس ہزار یا تینتیس ہزار تھی

جب رات کا اندھیرا چھٹا تو جنگ آخری مرحلہ میں داخل ہو چکی تھی۔ امیرالمومنین کی فوجیں مالک اشتر اور ابن عباس کی کمان میں برابر لڑ رہی تھیں حضرت قلب لشکر میں رونق افروز تھے اور چاروں طرف جنگ کے شعلے شامیوں کو بھسم کر رہے تھے۔ مالک اشتر تلوار لہراتے میمنہ لشکر کے جلو میں آگے بڑھے۔ جب تلوار کو جھکاتے تو یہ معلوم ہوتا کہ پانی برس رہا ہے اور اسے اونچا کرتے تو اس کی چمک سے آنکھوں میں خیرگی پیدا ہو جاتی۔ آپ نے پرچم حیان ابن ہوذہ نخعی کے سپرد کیا اور فوج لے کر شامیوں پر ٹوٹ پڑے اور صفوں کو منتشر کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ چند ہمراہیوں کے قدم رُکے تو پکار کر کہا کہ یہ مردوں کا کام نہیں ہے کہ وہ بکریوں کا دودھ دوہتے رہیں اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں مردانہ وار آگے بڑھو۔ سست قدموں میں تیزی آئی اور تازہ دم فوج کی طرح دشمن کی صفوں پر ٹوٹ پڑے۔ شامی ان تابڑ توڑ حملوں کی تاب نہ لا سکے اور گرتے پڑتے پیچھے ہٹے۔ امیرالمومنین نے اپنی فوجوں کو فتحیابی کے قریب دیکھا تو ان کی کمک کے لئے ایک اور دستہ بھیجا اور سب نے مل کر شامیوں کا رہا سہا زور ختم کر دیا۔ ادھر شامیوں کا لشکر پس رہا تھا ادھر امیرالمومنین کی آواز کانوں میں گونج رہی تھی کہ ہاں اے جوانمردو تم فتح کی منزل کے قریب پہنچ چکے ہو دشمن دم توڑ رہا ہے اب اسے ختم کئے بغیر دم نہ لینا معاویہ کے لئے یہ وقت بڑا کٹھن تھا۔ عراقی آگے بڑھتے چلے آ رہے تھے اور اب یہ توقع کی ہی نہیں جا سکتی تھی کہ شامی ان کی پیشقدمی کو روکنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ معاویہ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھایا ہوا تھا اور سر پر مایوسیوں اور ناامیدیوں کے بادل منڈلا رہے تھے انہوں نے گھبرا کر عمرو ابن عاص کی طرف دیکھا اور کہا کہ اب کیا ہوگا۔ اس نے کہا کہ گھبرانے کی کوی بات نہیں ہے میں نے اس موقع کے لئے پہلے ہی سے ایک تدبیر سوچ رکھی ہے۔ کہا کہ وہ تدبیر کیا ہے کہا کہ قرآن مجید کو نیزوں

پر بلند کر کے اسے ثالث بنانے کی تجویز اُن کے سامنے رکھی جائے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عراقیوں کا ایک گروہ ہمارا ہمنوا ہو کر جنگ رکوانا چاہے گا اور ایک گروہ جنگ کے جاری رکھنے پر زور دے گا اور اس طرح ہم ان میں پھُوٹ ڈلوا کر جنگ کے ملتوی کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ معاویہ کو اپنے جاسوسوں کے ذریعہ یہ اطلاع تو پہنچ ہی چکی تھی کہ اشعث ابن قیس جنگ کو کسی نتیجہ پر پہنچنے سے پہلے رکوانا چاہتا ہے اور وُہ اپنے قبیلہ والوں سے برملا کہہ رہا ہے:۔

قد رأیتم ما کان فی الیوم الماضی	تم نے روز گزشتہ دیکھ ہی لیا ہے کہ کتنی مُہلک و
من الحرب المبیرۃ واللّٰہ ان	تباہ کُن جنگ ہوی ہے۔ خدا کی قسم اگر ہم کل پھر
التقینا غداً انہ لبوار العرب	لڑے تو عرب کی ہلاکت اور عزت و ناموس کی
وضیعۃ الحرمات (اخبار الطوال ص۱۸۸)	پامالی یقینی ہے۔“

اب معاویہ نے بھی اشعث کی آواز سے آواز ملاتے ہوے کہا کہ اشعث سچ کہتا ہے اگر یہ جنگ جاری رہی تو فارس والے عراق پر چڑھائی کریں گے اور روم والے شام پر حملہ آور ہوں گے اور ہماری عزّت و ناموس کو پامال کر دیں گے لہٰذا اس تدبیر کو برُوئے کار لا کر جلد جنگ کو رُکوایا جائے اور قرآن کو نیزوں پر بلند کر کے اُسے ثالث قرار دیئے جانے کی دعوت دی جائے۔ چنانچہ شامیوں کی صف اوّل میں پانچ آدمیوں نے دمشق کا مصحف اعظم پانچ نیزوں پر بلند کیا اور اس کے علاوہ جتنے قرآن مہیا ہو سکے نیزوں پر اُٹھائے گئے اور کچھ لوگوں نے اینٹوں پر جزدان لپیٹ کر انہیں قرآن کی صورت میں نیزوں پر آویزاں کیا۔ جب معاویہ کی طرف سے قرآن بلند ہوُے تو اشعث ابن قیس جو اس سازش میں شریک تھا امیر المومنین کے پاس آیا اور کہا کہ شامیوں نے قرآن کو حَکم قرار دیا ہے اور لوگ قرآن کے علاوہ کوی بات ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں اگر آپ اجازت دیں تو میں معاویہ سے اس سلسلہ میں بات چیت کروں۔ حضرت نے فرمایا کہ بات چیت کر کے دیکھ لو۔ اشعث معاویہ کے پاس آیا اور اُن سے کہا کہ یہ قرآن نیزوں پر کیوں بلند کئے گئے ہیں کہا کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ایک حَکم ہماری طرف سے ہو اور ایک حَکم تمہاری طرف سے اور وُہ دونوں مل کر قرآن سے فیصلہ کریں۔ ان دونوں میں ملی بھگت تو تھی ہی کہا کہ یہ بات دُرست اور قابل تسلیم ہے۔ اس نے پلٹ کر حضرت کو معاویہ کی تجویز سے آگاہ کیا اور خود بھی قرآن لے کر دونوں صفوں کے درمیان آکھڑا ہوا اور قرآن کو حَکم مان لینے پر زور دینے لگا۔ عراقیوں نے معاویہ کے ساختہ پرداختہ لوگوں کی شہ پا کر کہنا شروع کیا کہ ہم قرآن کے فیصلہ پر راضی ہیں اور اُسے حَکم ماننے کے لئے تیار ہیں۔ امیر المومنین نے جب قرآن کے سایہ میں مکر و فریب کے جال بچھتے دیکھے تو فرمایا:۔

عباد اللّٰہ امضوا علی حقکم و	اے خدا کے بندو تم حق و صداقت کی جستجو

صدقکم وقتال عدوکم فان
معاویة وعمرا و ابن ابی معیط
وحبیبا و ابن ابی سرح والضحاک
لیسوا باصحاب دین ولا قرآن
انا اعرف بهم منکم قد صحبتهم
اطفالا ثم رجالا فکانوا شر
اطفال وشر رجال ویحکم
واللہ ما رفعوها الا خدیعة
ووهنا ومکیدة۔
(تاریخ کامل ج۳۔ ص۱۶۱)

پر چل رہے ہو اس پر چلتے رہو اور اپنے دشمن سے جنگ جاری رکھو۔ معاویہ ہو یا عمرو، ابن ابی معیط ہو یا حبیب ابن مسلمہ، ابن ابی سرح ہو یا ضحاک یہ لوگ نہ دین والے ہیں اور نہ قرآن پر عمل کرنے والے۔ میں تم لوگوں سے زیادہ ان لوگوں کو جانتا پہچانتا ہوں۔ بچپن اور جوانی دونوں میں میرا ان کا ساتھ رہ چکا ہے۔ یہ بچپن میں بھی بُرے اور جوانی میں بھی بُرے تھے۔ خدا کی قسم انہوں نے قرآن مکر و فریب کی بنا پر اور اپنی کمزوری پر پردہ ڈالنے کے لئے اٹھایا ہے۔"

امیر المومنین نے لشکر کو سمجھانے بجھانے کی بہتیری کوشش کی مگر اشعث ابن قیس اور اس کے ہمنواؤں کا جو درپردہ معاویہ سے ساز باز کئے ہُوئے تھے داؤ چل چکا تھا وُہ سمجھنے سوچنے کے بجائے بغاوت و سرکشی پر اُتر آئے اور مسعر ابن فدکی تمیمی اور زید ابن حصین طائی بیس ہزار آدمیوں کو لے کر آگے بڑھے اور حضرت سے کہا کہ اے علی اگر آپ نے قرآن کو حکم ماننے سے انکار کیا تو ہم آپ سے جنگ لڑیں گے آپ فوراً جنگ کے رُکوانے کا حکم دیں اور مالک کو پیغام بھیجیں کہ وُہ میدانِ جنگ سے واپس آئیں۔

حضرت نے جب دیکھا کہ فتنہ اٹھ کھڑا ہوا ہے اور لوگ شر و فساد پر آمادہ ہیں تو یزید ابن ہانی کے ہاتھ مالک اشتر کو پیغام بھجوایا کہ جس حالت میں ہو فوراً واپس چلے آؤ۔ مالک نے یہ پیغام سُنا تو حیرت میں کھو گئے اور کہا کہ امیر المومنین سے کہئے کہ دُشمن ایک آدھ لمحہ میں ہتھیار ڈال دے گا میں ابھی فتح کی خوشخبری لے کر حاضر ہوتا ہوں۔ یزید نے پلٹ کر مالک کا جواب عرض کیا تو لشکر والوں نے شور مچایا اور کہا کہ آپ نے درپردہ مالک کو جنگ جاری رکھنے کا حُکم دیا ہے۔ فرمایا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے تمہارے سامنے کہا ہے اس کا موقع ہی کہاں تھا کہ میں چوری چھپے کوئی بات کہتا۔ کہا کہ آپ یزید کو دوبارہ بھیجیں اور مالک کو فوراً واپس بلوائیں۔ اگر مالک نے پلٹنے میں تاخیر کی تو پھر شامیوں پر چلنے والی تلواریں آپ پر چلیں گی۔

حضرت نے یزید ابن ہانی کو دوبارہ بھیجا۔ انہوں نے مالک سے کہا کہ اگر تمہیں امیر المومنین کی جان عزیز ہے تو فوراً جنگ سے ہاتھ اُٹھا کر اُن کی خدمت میں پہنچ جاؤ۔ مالک افسردہ دلی کے ساتھ حضرت کے پاس چلے آئے اور اس ہڑبونگ کو دیکھ کر لوگوں کو بُرا بھلا کہا۔ مگر جو قدم اُکھڑ چکے تھے اب انہیں دوبارہ جمایا نہ جا سکتا تھا۔ امیر المومنین نے دیکھا کہ اگر جنگ کے التواء کا فیصلہ نہ کیا گیا تو آپس میں تلوار چلنے لگے گی آپ نے بادلِ ناخواستہ جنگ کے التوا کا حکم دے دیا اور مجبوراً تحکیم پر آمادہ ہو گئے۔

اس التوائے جنگ کے بعد عمرو ابن عاص نے معاویہ کو یہ مشورہ دیا کہ تمام جنگی قیدیوں کو جوان کی تحویل میں ہیں قتل کر دیا جائے۔ ان قیدیوں میں سے عمرو ابن اوس اودی نے یہ سُنا تو اس نے معاویہ کو کہلوایا کہ اگر قتل کی نوبت آئے تو مجھے قتل نہ کیا جائے اس لئے کہ میں ان کا بھانجا ہوں اور وُہ میرے ماموں ہیں اس کے قبیلہ بنی اود کے کچھ لوگوں نے بھی اس کی سفارش کی کہ ہمارے قبیلہ کے آدمی کو چھوڑ دیا جائے۔ معاویہ نے کہا کہ وُہ کہتا ہے کہ میں اس کا ماموں ہوں اگر وُہ سچا ثابت ہُوا تو تمہاری سفارش کے بغیر اُسے چھوڑ دیا جائے گا اور اگر جھوٹا ثابت ہوا تو تمہاری سفارش درکار ہوگی۔ چنانچہ معاویہ نے اُسے بلا کر پُوچھا کہ میں کیسے تمہارا ماموں ہوں کہا کہ اگر میں اس کا ثبوت دوں تو مجھے چھوڑ دیا جائے گا؟ کہا کہ ہاں۔ کہا کیا زوجۂ رسُول ام حبیبہ بنت ابی سفیان تمہاری بہن نہیں ہیں کہا کہ ہاں وُہ میری بہن ہیں کہا کہ پھر میں اُن کا بیٹا ہوں۔ معاویہ نے کہا کہ تمہارے علاوہ یہ بات کسی کو نہیں سوجھی تم نے صحیح کہا ہے اور اسے چھوڑ دیا۔ اسی اثناء میں وُہ شامی جو عراقیوں کی قید و بند میں تھے سب واپس آگئے۔ معاویہ نے انہیں دیکھا تو عمرو سے کہا کہ اگر میں تمہارے مشورہ پر عمل کرتا تو ان اسیروں میں سے ایک بھی زندہ بچ کر نہ آتا۔ اور تمام اسیروں کو رہا کر دیا۔

یہ جنگ یکم صفر ۳۷ھ کو شروع ہوی اور دس صفر ۳۷ھ کو روز جمعہ ختم ہوگئی۔ مقام صفین میں فوجوں کا قیام ایک سو دس دن رہا اور نوّے معرکے پیش آئے۔ امیرالمومنین کے لشکر میں سے پچیس ہزار افراد شہید ہوُے جن میں اسی اصحاب بدریین اور تریسٹھ بیعت رضوان میں شریک ہونے والے صحابہ تھے۔ اور معاویہ کے لشکر میں سے پینتالیس ہزار آدمی کام آئے۔

یہ خونی ہنگامہ معاویہ اور عمرو ابن عاص کے ذوقِ سر بلندی اور ہوسِ اقتدار کی پیداوار تھا۔ معاویہ حضرت عمر کے دَور سے شام پر حکومت کرتے چلے آرہے تھے اور عمرو مصر کا گورنر رہ چکا تھا۔ معاویہ اپنے اقتدار کو ہر قیمت پر بحال رکھنا چاہتے تھے اور عمرو مصر کے اقتدار رفتہ کو پھر سے حاصل کرنے کی فکر میں تھا۔ اور یہ اقتدار پسند افراد کا طبعی خاصہ ہے کہ وُہ ایک مرتبہ حکومت و امارت سے رُوشناس ہونے کے بعد ہر حیلہ و تدبیر سے اُسے باقی و برقرار رکھنا چاہتے ہیں خواہ اخلاق و دیانت کی قدروں کو کچل کر اور حق و انصاف کے تقاضوں سے مُنہ موڑ کر جنگ و خونریزی پر اُتر نا پڑے یا حیلہ و فریب کی راہ اختیار کرنا پڑے۔ چنانچہ معاویہ نے اپنے اقتدار کے تحفّظ کے لئے قصاص کا شاخسانہ کھڑا کیا اور عوام کو مشتعل کر کے جنگ کے شعلوں میں جھونک دیا اور عمرو ابن عاص نے امارت مصر کی خاطر ہر چیز داؤ پر لگا دی اور حق کو جاننے اور پہچاننے کے باوجود باطل کی ہمنوائی پر آمادہ ہوگیا۔ چنانچہ اس نے اپنی دُنیا طلبی کا واشگاف لفظوں میں اعتراف کرتے ہُوے معاویہ سے کہا۔

ام واللہ ان قاتلنا معک نطلب — خدا کی قسم اگرچہ ہم تمہارے ساتھ ہو کر قصاص

بدم الخلیفۃ عثمان انّ فی النفس مافیہا حیث تقاتل من تعلم سابقتہ وفضلہ وقرابتہ ولکنا انما اردنا ھذہ الدنیا
(تاریخ کامل جلد ۳ صفحہ ۱۴۱)

خون عثمان کے سلسلہ میں جنگ کر رہے ہیں مگر دل کے اندر جو ہے سو ہے جبکہ تم اس شخص سے برسرِ پیکار ہو جس کی سبقت فضیلت اور رسول اللہ سے قرابت کا تمہیں علم ہے لیکن ہم تو فقط اس دُنیا کے درپے ہیں۔"

معاویہ نے اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے خون عثمان کو ذریعہ قرار دیا اور فضا کو ہمنوا بنانے کے لئے عوام کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ قتل عثمان نے ان کی راتوں کی نیند حرام کر دی ہے اور جب تک وُہ قصاص نہیں لیں گے انہیں چین نہیں آئے گا حالانکہ تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ حضرت عثمان نے محاصرہ کے دنوں میں ان سے بار بار مدد مانگی مگر انہوں نے تعاون سے گریز کیا البتہ ایک مختصر سی فوج بھیجی مگر اسے یہ تاکید کر دی کہ وُہ حدودِ مدینہ سے باہر رہے اور عملاً کوئی قدم نہ اٹھائے اس سے مقصد یہ تھا کہ دُوسروں کو یہ تاثر دیں کہ انہوں نے خیل وسپاہ سے مدد کی مگر مدد کے پہنچنے سے پہلے ہی حضرت عثمان قتل کر دیئے گئے۔ وُہ سمجھتے تھے کہ ان کا مفاد اسی میں ہے کہ حضرت عثمان قتل کر دیئے جائیں تاکہ وُہ قصاص کے نام پر جنگ چھیڑ کر مستقل اقتدار کی راہ ہموار کریں۔ چنانچہ انہوں نے عمرو ابن عاص سے حکومت مصر کا وعدہ کر کے اسے اپنے ساتھ ملا لیا اور امیر المومنین پر خونِ عثمان کا الزام عائد کر کے ان سے قاتلین عثمان کا مطالبہ شروع کر دیا حالانکہ یہ چیز ان سے مخفی نہ تھی کہ قاتلین عثمان کا دائرہ حجاز مصر اور عراق تک پھیلا ہوا ہے جنہوں نے مدینہ پر ہجوم کر کے انہیں محاصرہ میں لے لیا تھا اور اڑوس پڑوس کی دیواریں پھاند کر انہیں قتل کر دیا تھا۔ ان کے محاصرین کے انبوہ کثیر میں سے قاتلوں کی نشاندہی کی کوئی صورت ہی نہ تھی بلکہ جو موقع واردات پر موجود تھے انہوں نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔ اس صورت میں کسی ایک کو قاتل قرار دینا مشکل تھا اور اس کا نہ کوئی امکان تھا اور نہ کوئی جواز کہ تمام محاصرہ کرنے والوں کو معاویہ کے سپرد کر دیا جاتا تاکہ وُہ ایک فرد کے بدلے میں ہزاروں افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیتے۔ چنانچہ قرآن مجید میں قانونِ قصاص کے بارے میں ارشاد ہے:۔

ومن قتل مظلوما فقد جعلنا لولیہ سلطانا فلا یسرف فی القتل۔

جو شخص مظلوم قتل کر دیا جائے ہم نے بیشک اُس کے ولی کو حق قصاص دیا ہے مگر قتل میں مقررہ حدود سے تجاوز نہ کرے۔"

معاویہ حضرت عثمان کے ابن عم تھے نگران کے بیٹوں کے ہوتے ہوئے وُہ کسی قاعدہ وقانون سے ان کے ولی نہ تھے کہ انہیں طلب قصاص کا حق ہوتا کیونکہ یہ اولیاءِ مقتول کا حق ہے یا حکومت وقت کا۔ اور معاویہ نہ اولیاءِ مقتول میں شامل تھے اور نہ مسلمانوں کے حکمران۔ وُہ صرف رعایا کا ایک فرد تھے یا

زیادہ سے زیادہ سابقہ حکومت کی طرف سے ایک صوبہ کے عامل۔ انہیں چاہئے تو یہ تھا کہ پہلے حضرت کو ولی امر مانتے ان کی حکومت تسلیم کرتے اور ان کے اقامۂ حدود کے حق کا اعتراف کرتے اور پھر ان سے مطالبہ کرتے کہ وُہ آئینی طور پر حکم قصاص کا اجراء کریں۔ اسی اصُول کی بنا پر حضرت نے معاویہ کو تحریر کیا تھا کہ پہلے بیعت کرو اور پھر قاتلین عثمان کا معاملہ میرے سامنے پیش کرو تاکہ میں کتاب و سُنّت کے مطابق اس کا فیصلہ کروں۔ مگر وُہ ایک طرف تو بیعت سے انکار کرتے رہے اور دوسری طرف قصاص پر زور دیتے رہے۔ یہ مطالبۂ قصاص صرف انکار بیعت کا ایک بہانہ تھا تاکہ اس طرح حضرت پر دباؤ ڈال کر امارت شام کی دستاویز حاصل کر لیں۔ چنانچہ جریر ابن عبداللہ بجلی سے صاف لفظوں میں کہا کہ اگر مجھے حکومت شام پر باقی رہنے دیا جائے تو میں بیعت کر لوں گا اس کے بعد اس میں قطعاً کوئی شبہہ نہیں رہتا کہ بیعت سے کنارہ کشی کا مقصد امارت شام کا تحفظ تھا اور وُہ امارت کے تحفظ کا یقین حاصل کر لینے کے بعد مطالبۂ قصاص سے دستبردار ہو جاتے اگر انہیں قصاص سے کچھ بھی دلچسپی ہوتی تو وہ اُم المومنین عائشہ اور طلحہ و زبیر کی جبکہ وُہ قصاص ہی کا نام لے کر کھڑے ہُوئے تھے مدد کرتے ان کی کمک کے لئے شام سے فوجیں بھیجتے طلحہ و زبیر کے مارے جانے پر اظہار اطمینان کرتے کیونکہ وُہ اس سے بے خبر نہ تھے کہ انہی لوگوں نے حضرت عثمان کے قتل پر بیرونی اور مقامی باشندوں کو بھڑکایا تھا مگر وُہ چُپ سادھے فریقین کی جنگ کو ایک خاموش تماشائی کی طرح دیکھتے رہے۔ ان کا مقصد بھی تو یونہی پُورا ہوتا تھا کہ علی اور طلحہ و زبیر آپس میں بھڑ جائیں اور ان میں سے جو فریق ہر جائے گا اس سے چھٹکارا مل جائے گا اور جو جیتے گا اس کی طاقت اتنی کمزور ہو چکی ہوگی کہ وُہ جنگ اقتدار میں ان سے ٹکر نہ لے سکے گا اور اس طرح وُہ اپنے حریفوں کی قوت و طاقت کو مضمحل کر کے کامیابی و کامرانی کی راہ پیدا کر لیں گے۔

اگر قصاص ان کے پیش نظر ہوتا تو جب وُہ امیر المومنین کی شہادت کے بعد ایک بڑی طاقت کے مالک بن چکے تھے عملاً نہ سہی زبانی ہی لب کشائی کرتے مگر انہوں نے ایسی چُپ سادھی کہ گویا کوئی حادثہ ہوا ہی نہ تھا حالانکہ جنہیں قاتل کہا جاتا تھا وُہ اسی طرح دندناتے پھر رہے تھے اور حضرت عثمان کی بیٹی عائشہ نے انہیں قصاص کی طرف متوجہ بھی کیا تھا مگر اس سے پہلو بچا لے گئے۔ چنانچہ ابن عبد ربہ الاندلسی نے عقد الفرید میں تحریر کیا ہے کہ عام الجماعہ کے بعد جب معاویہ مدینہ میں آئے تو حضرت عثمان کی بیٹی عائشہ کے ہاں گئے اس نے معاویہ کو دیکھا تو باپ کا نام لے کر گریہ و زاری شروع کر دی اور ان سے شکوہ کیا کہ تم نے میرے باپ کے قصاص کو نظر انداز کر دیا ہے۔ معاویہ نے کہا کہ اب وُہ لوگ ہمارے حلقۂ اطاعت میں داخل ہو چکے ہیں اور ہم نے ان سے امان کا وعدہ کر لیا ہے اگر ہم نے عہد شکنی کرتے ہُوئے انہیں چھیڑا تو وُہ ہماری طرف سے دلوں میں کینہ تو رکھتے ہی ہیں فوراً بھڑک اُٹھیں گے اور بیعت

توڑ کر مقابلہ میں اُٹھ کھڑے ہوں گے پھر خدا معلوم اس کا نتیجہ کیا ہو۔ اگر حکومت ہمارے ہاتھ سے نکل گئی تو تمہاری حیثیت ہی کیا رہے گی اور اب تو تم ایک خلیفہ کی بیٹی اور ایک خلیفہ کی بھتیجی ہو۔ اگر حرف بحرف یہی عذر امیر المومنین کی طرف سے پیش کیا جائے کہ وُہ لوگ آپ کے حلقۂ اطاعت میں داخل ہو چکے تھے آپ انہیں پناہ دے چکے تھے اور اگر انہیں چھیڑتے تو وُہ حرب و پیکار پر اُتر آتے اور خدا جانے اس جنگ کا نتیجہ کیا ہوتا تو پھر ان کے خلاف جنگ برپا کرنے کا کیا جواز رہ جاتا ہے۔

معاویہ نے قصاص کے نام پر ایک بھاری ہجوم اپنے گرد جمع کر کے جنگ تو چھیڑ دی مگر وُہ یہ سمجھتے تھے کہ اس کا نتیجہ عروج یا زوال تخت یا تختہ ہے اس لئے انہوں نے جنگ جیتنے کے لئے کوئی حربہ اٹھا نہ رکھا خواہ اس سے شرافت پر حرف آتا ہو یا انسانیت داغدار ہوتی ہو۔ چنانچہ صفین میں وارد ہوتے ہی پہلا قدم یہ اُٹھایا کہ فرات پر پہرا بٹھایا اور اس کے جواز میں یہ کہا کہ آخر ان لوگوں نے بھی تو عثمان پر پانی بند کیا تھا حالانکہ اگر انہیں پانی بند کرنے کا مشورہ دیا بھی جاتا تو انہیں یہ کہنا چاہئیے تھا کہ علی پر پانی بند نہ کیا جائے کیونکہ محاصرہ کے دنوں میں حضرت عثمان کے ہاں کسی نے پانی پہنچایا تھا تو وُہ علی تھے اس کے برعکس جب امیر المومنین کی فوجوں نے گھاٹ پر قبضہ کر لیا اور معاویہ کے طرزِ عمل کا جواب ویسے ہی طرزِ عمل سے دینا چاہا تو حضرت نے فرمایا کہ غلط روش کا جواب غلط روش نہیں ہے فوراً گھاٹ کو خالی کر دیا جائے اور کسی کو پانی سے نہ روکا جائے حالانکہ حضرت پانی روک کر اس کے جواز میں کہہ سکتے تھے کہ پہلے ان لوگوں نے پانی بند کیا پھر ہم نے جواباً پانی روکا ہے تو معاویہ کی من گھڑت وجہ جواز سے یہ وجہ جواز زیادہ قوی ہوتی مگر حضرت یہ گوارا نہ کر سکتے تھے کہ ایسا اقدام کریں جس سے ان کی بلند نفسی وسعت قلبی اور عالی ظرفی مجروح ہو۔ اسی طرح جب عمار ابن یاسر کی شہادت سے ان کا باغیانہ موقف بے نقاب ہوا تو انہوں نے فوراً بات بنائی کہ عمار کے قاتل علی ہیں جو انہیں لے کر آئے تھے۔ یہ اتنی کھلی ہوئی خلاف حقیقت بات تھی کہ اسے فریب و دغل بھی تو نہیں کہا جا سکتا اس لئے کہ فریب کاری میں حقیقت کے چہرے پر ایسے دبیز پردے ڈال دیئے جاتے ہیں کہ اس کے خط و خال ظاہری نظروں سے چھپ جاتے ہیں مگر یہاں بڑی ڈھٹائی کے ساتھ ایک واضح حقیقت کو جھٹلایا جاتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اہل شام اس پوچ اور لچر تاویل پر کیونکر مطمئن ہو گئے اگر ان میں کچھ بھی عقل و شعور ہوتا تو معاملہ دگرگوں ہو جاتا جنگ کا رخ پلٹ جاتا اور جو تلواریں ان کی حمایت میں چل رہی تھیں وُہ ان پر اور اُن کے خصوصی مشیروں کے سروں پر چلنے لگتیں اس لئے کہ ان کا اور اُن کے گروہ کا بنص رسول باغی گروہ ہونا روز روشن کی طرح واضح ہو چکا تھا باطل کے دھندلکے چھٹ چکے تھے اور حق پوری تابانیوں کے ساتھ چمک اٹھا تھا مگر شامیوں کی کج ذہنی و کج فکری نے ان کی آنکھوں سے نور بصارت چھین کر انہیں گھور اندھیروں میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا اور وُہ باغی گروہ کو پہچاننے کے بعد بھی اسی باغی گروہ سے چمٹے رہے۔ اگر اس تاویل کو ان کے دل

دماغ نے قبول کر لیا تھا تو اس تاویل کی رُو سے انہیں چاہیئے تھا کہ اپنی تلواروں کا رُخ معاویہ کی طرف موڑ دیتے اس لئے کہ شامیوں میں سے جتنے آدمی مارے گئے تھے انہی کی پیشکردہ تاویل کی بنا پر وُہ ان سب کے قاتل تھے وہی انہیں میدان میں لے کر آئے تھے اور انہیں نیزوں اور تلواروں کے سامنے کھڑا کیا تھا۔ جب حضرت عثمان کے قصاص میں ہزاروں آدمیوں کو قتل کیا جا سکتا ہے تو ان ہزاروں قتل ہونے والوں کا قصاص ایک فرد سے کیوں نہیں لیا جا سکتا۔

جب اس قسم کے حربوں کے باوجود شکست ناگزیر نظر آئی تو ایسی پُر فریب چال چلی گئی کہ جنگ کا پانسہ پلٹ گیا اور عین اس وقت جبکہ شامیوں کی شکست یقینی ہو چکی تھی میدان لاشوں سے پٹ چکا تھا اور بچے کھچے لوگ راہِ فرار ڈھونڈ رہے تھے کہ ان میں کے چند افراد قرآن لے کر نکل آئے اور چیخ چیخ کر کہنے لگے کہ ہمارے اور تمہارے درمیان یہ قرآن ہے آؤ اپنے جھگڑے اس کی روشنی میں نمٹائیں اور جنگ ختم کریں۔ یہ حربہ اتنا کارگر ثابت ہوا کہ بڑھتے ہُوئے قدم تھم گئے اور چلتی ہوی تلواریں رُک گئیں۔ امیرالمومنین نے عراقیوں کو دُشمن کے مکر و فریب سے آگاہ کیا مگر وُہ اپنی بات پر اڑ گئے۔ ان میں کچھ تو وُہ تھے جو معاویہ سے ساز باز کئے ہُوئے تھے اور کچھ اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے یہ سمجھ بیٹھے کہ واقعاً قرآن کی طرف دعوت دی جا رہی ہے اور اگر انہوں نے اس آواز پر لبّیک نہ کہی تو منکرین قرآن کی صف میں شمار ہونے لگیں گے مگر انہوں نے اتنا نہ سوچا کہ اگر یہ قرآن کی طرف دعوت دینے والے قرآن پر عمل کرنے والے ہوتے تو جنگ شروع ہونے سے پہلے دعوت دیتے جس طرح امیرالمومنین نے جنگ جمل میں آغاز جنگ سے پہلے قرآن کی طرف دعوت دی تھی یا جنگ کے دوران قرآن کے فیصلہ پر آمادگی ظاہر کرتے مگر انہیں قرآن اس وقت یاد آتا ہے جب شکست کے بادل اُن کے سروں پر منڈلانے لگتے ہیں اور حریف کی تلواروں سے بچاؤ کی کوی صورت نظر نہیں آتی۔

معاویہ کی اس کامیابی میں جو عناصر کارفرما تھے ان میں زور و فریب کے علاوہ اہل شام کی اطاعت و سرافگندگی کا بھی بڑا دخل ہے۔ انہوں نے نہ جنگ میں تامّل کیا اور نہ جنگ سے دستبرداری میں چون و چرا سے کام لیا۔ اور رعایا کی اطاعت کا یہی جذبہ حکمران کی قوت و طاقت کا اصل سرچشمہ ہے۔ اہل شام اپنی رائے پر اعتماد کرنے کے بجائے معاویہ کی چشم و ابرو کی گردش کو دیکھتے تھے اور جو ادھر سے اشارہ ہوتا تھا بے سوچے سمجھے اس پر چلنے لگتے تھے۔ ان کی اندھا دھند پیروی کا یہ عالم تھا کہ جب معاویہ نے صفین کی طرف جاتے ہُوئے بدھ کے دن نماز جمعہ پڑھا دی تو نہ کسی نے انہیں روکا اور نہ کوی اس پر معترض ہوا۔ مسعودی نے تحریر کیا ہے:۔

لقد بلغ من امرهم فی طاعتهم له انه صلی بهم عند مسیرهم	وُہ معاویہ کے یہاں تک مطیع و فرمانبردار تھے کہ انہوں نے صفین کی طرف جاتے ہُوئے بدھ کے

الیٰ صفین الجمعۃ فی یوم الاربعاء — دن نماز جمعہ پڑھادی"۔

(مروج الذہب ج۲۔ ص۲۷)

اہل شام کی اسلامی معاشرہ سے بیگانگی اور دین و مذہب سے بے خبری کی وجہ یہ ہے کہ جب اسلام کی شعاعیں عرب کے گوشہ گوشہ کو منوّر کر چکی تھیں سوادِ شام پر کفر کی تاریکیاں چھائی ہوئی تھیں اور جب حضرت عمر کے اوائل دورِ حکومت میں اسلام کے مفتوحہ علاقوں میں داخل ہوا تو اسلام سے روشناس ہونے کے بعد انہوں نے فرزندانِ ابوسفیان یزید اور معاویہ کو اسلامی نمائندہ کی حیثیت سے مسندِ امارت پر دیکھا یزید تو تھوڑے ہی دنوں بعد چل بسا اور معاویہ اپنے بیس سالہ دورِ اقتدار میں انہیں اسلام کے احکام و آداب سے کیا روشناس کرتے جبکہ وہ خود ہی اسلامی اوامر و نواہی کو چنداں اہمیت نہ دیتے تھے۔ اس کے علاوہ انہیں بے خبر رکھنے میں یہ سیاسی مصلحت بھی کارفرما تھی کہ اگر ان میں اسلامی شعور بیدار ہو گیا تو وہ حق و باطل اور جائز و ناجائز میں امتیاز کرنے لگ جائیں گے اور پھر ان کی بے شعوری و بے خبری سے جو فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے اس سے محروم ہونا پڑے گا۔ چنانچہ اگر انہیں دین و مذہب سے لگاؤ ہوتا تو وہ غلط اور صحیح اقدام میں فرق کرتے علی کے مقابلہ میں آنے سے ہچکچاتے اور ان کی عظمت و منزلت کو سمجھتے مگر انہیں تو جان بوجھ کر علی اور خاندانِ نبوت کے دوسرے افراد سے اندھیرے میں رکھا گیا تھا تاکہ معاویہ اور اُن کے خاندان کے علاوہ کسی اور کی طرف ان کی نظریں اُٹھنے ہی نہ پائیں یہی وجہ ہے کہ وہ نہ علی کو جانتے پہچانتے تھے نہ ان کی علمی و عملی منزلت سے واقف تھے اور نہ ان کے زہد و اتقا کی بلندی سے آگاہ تھے۔ چنانچہ صفین میں ایک شامی نے برملا کہا کہ ہم علی سے اس لئے برسرِ پیکار ہیں کہ نہ وہ نماز پڑھتے ہیں اور نہ اُن کے ساتھی نماز گزار ہیں۔ اس نے تو جو معاویہ اور اُن کے حواریوں سے سنا تھا وہی کہا مگر جب ہاشم ابن عتبہ نے اسے توجہ دلائی تو اس کی غلط فہمی دور ہوئی اور شامیوں کی صف سے کٹ کر الگ ہو گیا۔ اس دینی بے حسی و بے خبری کے ساتھ حکومت کی زرپاشیوں نے بھی انہیں معاویہ کا گرویدہ بنا رکھا تھا جس کے نتیجہ میں وہ بے سوچے سمجھے باطل کے برسرِ اقتدار آنے کا ذریعہ بن گئے۔

امیرالمومنین کے لشکر میں ایسے افراد بھی شامل تھے جو کسی مصلحت یا قبائلی دباؤ کے زیرِ اثر شریکِ جنگ تو ہو گئے تھے مگر نہ ان کے خیالات میں ہم آہنگی تھی اور نہ اطاعت و انقیاد کا جذبہ اور پھر اشعث ابن قیس اور خالد ابن معمر ایسے افراد معاویہ کے ہاتھ پر بکے ہوئے تھے انہیں قرآن کی آڑ میں شورش انگیزی کا موقع مل گیا اور انہوں نے جنگ کا نقشہ الٹ دینے میں شامیوں کی ہاں میں ہاں ملانا شروع کر دی۔ اشعث ابن قیس باوجودیکہ امیرالمومنین اسے متنبہ کرتے ہیں کہ یہ دھوکا ہے فریب ہے مگر وہ ایک نہیں سنتا اور قرآن لے کر صفوں میں آکھڑا ہوتا ہے اور چیخ چیخ کر کہتا ہے کہ اے لوگو علی کو مجبور کر دو کہ وہ قرآن کو حَکَم تسلیم کریں اور اس خونریزی کو روکیں۔ حیرت ہے کہ جب حضرت کی فوجیں فتحیابی کے قریب

پہنچ جاتی ہیں تو مسلمانوں کی باہمی خونریزی کو دیکھ کر اس کا کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔ اگر اس کا دل اس خون خرابہ سے اتنا ہی متاثر تھا تو اس کا اظہار اس وقت بھی کیا ہوتا جب تلواریں ایک سطح پر چل رہی تھیں اور ایک فریق دوسرے فریق پر غالب ہوتا نظر نہ آرہا تھا مگر اس کا دل دکھتا ہے تو حضرت کی فتح و کامرانی کے موقع پر کیونکہ اس فتحیابی میں اُسے کوی فائدہ نظر نہ آرہا تھا اور حضرت کو نا کام بنا کر ایک لاکھ کا انعام تو کہیں گیا نہ تھا اور ہو سکتا ہے کہ اس کے صلہ میں کسی صوبہ کی گورنری کی توقع بھی لئے ہوئے ہو۔

اس میں کسی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں ہے کہ معاویہ کا یہ اقدام خلیفہ برحق کے خلاف ایک جارحانہ و باغیانہ حیثیت رکھتا تھا مگر جہاں اصحاب جمل طلحہ و زبیر کے اقدام پر خطائے اجتہادی کا پردہ ڈالا گیا ہے وہاں معاویہ کے اس عظیم کشت و خون کو بھی خطائے اجتہادی کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ حیرت ہے کہ پیغمبر اکرم جس اقدام کو بغاوت سے تعبیر فرمائیں اس پر اجر و ثواب کا استحقاق ثابت کیا جائے۔ کیا پیغمبر کا یہ ارشاد ان کے گوشگزار نہ ہوا تھا:۔

ویح عمار تقتله الفئة الباغية عمار يدعوهم الى الله ويدعونه الى النار۔ (صحیح بخاری ج۲۔ ص۹۲)

عمار کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔ عمار انہیں اللہ کی طرف دعوت دیں گے اور وہ انہیں جہنم کی طرف بلائے گا"۔

پیغمبر کے اس ارشاد کے بعد اسے خطائے اجتہادی سے تعبیر کرنا اور اس کے مرتکب کو اجر و ثواب کا مستحق قرار دینا سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ اجتہاد نام ہے اس کے ماخذ و مدرک سے حکم شرعی کے استنباط کا پھر کس ماخذ سے اس جنگ کا جواز اخذ کیا گیا تھا جبکہ بغاوت کے معنی ظلم و فساد کے ہیں اور ظلم و طغیان کو اجتہاد سے کوی لگاؤ نہیں ہے۔ مگر جن لوگوں نے حضرت علی کے قتل تک کو خطائے اجتہادی کہہ دیا ہو وہ اُن سے جنگ و جدال کو خطائے اجتہادی سے تعبیر کریں تو کوی تعجب کا مقام نہیں ہے۔ چنانچہ ابن حزم اور اس کے ہمنواؤں نے عبدالرحمٰن ابن ملجم کے اقدام قتل کو خطائے اجتہادی قرار دے دیا ہے۔ ابن حجر عسقلانی تحریر کرتے ہیں:۔

وبالغ ابن حزم فقال لا خلاف بين احد من الائمة فى ان ابن ملجم قتل عليا متاولا مجتهدا مقدرا انه على الصواب۔

(التلخیص الحبیر ص۳۴۸)

ابن حزم نے یہ کہہ کر مبالغہ سے کام لیا ہے کہ آئمہ میں سے کسی ایک نے بھی اس میں اختلاف نہیں کیا کہ ابن ملجم نے علی کو اجتہاد کرتے ہوئے تاویلاً قتل کیا اور وہ اس قتل میں اپنے کو حق بجانب سمجھتا تھا"۔

حالانکہ پیغمبر نے ابن ملجم کے بارے میں اشقی ھذہ الامۃ (اس اُمّت کا شقی ترین فرد) فرمایا تھا اسی طرح یہ گروہ عمار ابن یاسر کے قاتل ابوالغادیہ فزاری کو بھی خطائے اجتہادی کا مرتکب قرار دیتا ہے حالانکہ پیغمبر کا ارشاد ہے کہ قاتل عمار وسالبہ فی النار (عمار کا قاتل اور ان کا سامان جنگ چھین لینے والا دوزخ میں جائے گا) تعجّب ہے کہ حضرت علی اور عمار یاسر کے قاتلوں کو مجتہد مخطی تجویز کر کے انہیں مستحق اجر و ثواب قرار دیا جاتا ہے اور حضرت عثمان کے قاتلین ومحاصرین کو ابن حزم اور ان کے ہم مسلک افراد صحابیت کی تمام قدروں کو نظر انداز کر کے باغی، ظالم، فاسق، مفتری، کاذب اور ملعون وغیرہ کی لفظوں سے یاد کرتے ہیں اور ان کے لئے خطائے اجتہادی کا ادنیٰ احتمال بھی گوارا نہیں کیا جاتا حالانکہ ان میں افاضل صحابہ اکابر مجتہدین اور صلحاء اُمّت شامل تھے۔

اس اجتہاد کی کارفرمائی کا یہ پہلو بھی قابل توجہ ہے کہ معاویہ اس موقع پر قیصر روم کو ہدایا و تحائف پیش کر کے صلح کا پیغام دیتے ہیں اور جن کے ہاتھوں پر انصار و مہاجرین نے بالاتفاق بیعت کر لی تھی اُن کے خلاف محاذ جنگ قائم کرتے ہیں۔ کیا اجتہاد اسی کا نام ہے کہ ایک کافر سے دوستی کی طرح ڈالی جائے اور علی، اصحاب بدریین، شرکاء بیعت رضوان اور انصار و مہاجرین اوّلین سے دو چار مؤلفۃ القلوب قسم کے صحابیوں اور بساط اسلام پر تازہ وارد ہونے والے شامیوں کو لے کر جنگ کی جائے غرض یہ دعوائے اجتہاد دنیا کی ایک نرالی اپچ ہے۔ مولانا جامی کہتے ہیں ؎

اختلافے کہ داشت باحیدر | در خلافت صحابیٔ دیگر!
حق در آنجا بدست حیدر بود | جنگ با او خطائے منکر بود

مرزا غالب دہلوی بھی اس اجتہاد پر تبصرہ کرتے ہوئے کہہ گئے ہیں ؎

یہ اجتہاد عجب ہے کہ ایک دشمن دیں | علی سے آکے لڑے اور خطا کہیں اس کو

قرار دادِ تحکیم

جب تحکیم کی قرار داد طے پا گئی تو عراق و شام کے قاریوں نے یہ فیصلہ کیا کہ دو حَکَم مقرر کئے جائیں ایک اہل شام نامزد کریں اور ایک اہل عراق، اور وہ دونوں قرآن وسُنّت کی روشنی میں جو فیصلہ کریں گے وہ فریقین کے لئے قابل تسلیم ہوگا۔ شامیوں نے عمرو ابن عاص کو اپنا نمائندہ مقرر کیا اور عراقیوں کی طرف سے اشعث ابن قیس، مسعر ابن فدکی، یزید ابن حصین اور اُن کے ہمخیال لوگوں نے ابوموسیٰ اشعری کا نام پیش کر دیا۔ جو شام ہی کے علاقہ میں مقام عرض میں ٹھہرا ہوا تھا۔ امیرالمومنین نے ابوموسیٰ کا نام سُنا تو فرمایا:۔

لست اثق برای ابی موسیٰ | مجھے ابوموسیٰ کی رائے اور اس کی سوجھ بوجھ پر

ولا بحزمه ولکن اجعل ذلك لعبد الله ابن عباس۔ (اخبار الطوال ص۱۹۲)۔

اعتماد نہیں ہے میں یہ حق نمائندگی عبداللہ ابن عباس کو دینا چاہتا ہوں"۔

اس پر ہلڑ مچا اور انہی لوگوں نے ابن عباس کے انتخاب پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ آپ اور ابن عباس ایک ہی ہیں کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کو حَکَم قرار دیا جائے۔ ہم ایسے شخص کو حکم قرار دینا چاہتے ہیں جو غیر جانبدار ہو اور دونوں فریق میں سے کسی فریق سے وابستہ نہ ہو۔ حضرت نے فرمایا کہ پھر تم لوگوں نے عمرو ابن عاص کے انتخاب پر کیوں اعتراض نہیں کیا وہ تو معاویہ کا خاص آدمی ہے۔ کہا کہ ہم اپنے کام کے ذمہ دار ہیں ان کے معاملہ میں دخل نہیں دے سکتے۔ فرمایا اگر تمہیں ابن عباس پر اعتراض ہے تو میں مالک اشتر کا نام پیش کرتا ہوں۔ کہا کہ وہی تو جنگ کے شعلے بھڑکانے والے ہیں وہ تو یہی چاہیں گے کہ تحکیم ناکام ہو تاکہ انہیں جنگ و خونریزی کا پھر موقع مل سکے۔ فرمایا کہ اگر تم ابو موسٰی ہی کو حکم بنانے پر مصر ہو تو پھر تم جانو اور تمہارا کام جو چاہو کرو اور جسے چاہو منتخب کر لو۔ احنف ابن قیس نے کہا کہ اے لوگو اگر عبداللہ ابن عباس اور مالک اشتر کا نام تمہیں پسند نہیں ہے تو مجھے حَکَم مقرر کر دو میں عمرو کے داؤ پیچ کو خوب سمجھتا ہوں وہ مجھے فریب دینے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اگر تم مجھے نہیں چاہتے تو کسی اور کو منتخب کر لو مگر ابو موسٰی کو کسی صورت میں یہ موقع نہ دو وہ کام سنوارنے کے بجائے اور بگاڑ دے گا مگر وہاں تو ایک سازش کے ماتحت پہلے ہی سے ابو موسےٰ کا نام طے کیا جا چکا تھا اس شور و ہنگامہ میں کسی نے کوئی بات نہ سنی اور آخر امیر المومنین کی رائے کے خلاف ابو موسٰی کا انتخاب ہو گیا۔

انتخاب حکمین کے بعد جب عبداللہ ابن ابی رافع شرائط معاہدہ قلمبند کرنے لگے تو انہوں نے معاہدۂ صلح کے شروع میں یہ جملہ لکھا: هذا ما تقاضی علیه علی امیر المومنین ومعاویه ابن ابی سفیان۔" امیر المومنین علی اور معاویہ ابن ابی سفیان نے یہ فیصلہ کیا ہے"۔ عمرو ابن عاص نے لفظ "امیر المومنین" پر اعتراض کیا اور کہا کہ وہ دوسروں کے امیر ہوں گے ہمارے امیر نہیں ہیں لہٰذا لفظ امیر المومنین کاٹ دی جائے اور اس کے بجائے علی اور اُن کے والد کا نام لکھا جائے۔ احنف ابن قیس نے حضرت سے کہا کہ آپ لفظ امیر المومنین کے کاٹنے کی ہرگز اجازت نہ دیں خواہ اس کے نتیجہ میں کشت و خون کی نوبت کیوں نہ آئے۔ آج یہ لفظ کاٹ دی گئی تو پھر امارت پلٹ کر کبھی آپ کی طرف نہیں آئے گی۔ اشعث ابن قیس اور اس کے حواری مصر تھے کہ اسے کاٹ دیا جائے۔ امیر المومنین ان سب باتوں سے بے نیاز چپ سادھے ماضی کے دھندلکوں میں کھوئے ہوئے تھے اور صلح حدیبیہ کا عکس حال کے آئینہ میں دیکھ رہے تھے آپ نے کچھ توقف کے بعد فرمایا کہ میں نے جب حدیبیہ کے

دن صلحنامہ لکھا اور آنحضرت کے اسم گرامی کے ساتھ لفظ رسول اللہ تحریر کی تو نمائندہ قریش سہیل نے کہا تھا کہ ہم انہیں اللہ کا رسول کب مانتے ہیں لہذا لفظ رسول اللہ مٹا دی جائے اور اس کے بجائے محمدؐ ابن عبداللہ لکھا جائے۔ میں نے لفظ رسول اللہ پر خط کھینچنے میں تامّل کیا تو آنحضرت نے فرمایا:-

اکتب فان لك مثلها تعطیها وانت مضطهد۔ (سیرت حلبیہ ج۳۔ ص۳۳) "یہی لکھ دو۔ اور ایک دن تمہیں بھی ایسا واقعہ پیش آئے گا اور تم بے بس و مجبور ہو گے"۔

اس پر عمرو نے بگڑ کر کہا کہ آپ ہمیں بھی ویسا ہی کافر سمجھتے ہیں جیسے وہ تھے فرمایا:-

یا ابن النابغة ومتی لم تکن للفاسقین ولیا وللمسلمین عدوا وھل تشبه الا امك التی وضعت بك۔ (تاریخ طبری۔ ج۴۔ ص۳۷) "اے نابغہ کے بیٹے تم کب فاسقوں کے دوست اور مسلمانوں کے دشمن نہیں رہے تم اپنی جننے والی ماں ہی کے مشابہ ہو"۔

ابن عاص نے کہا کہ بس آج کے بعد نہ ہم ایک جگہ مل کر بیٹھیں گے اور نہ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے کے روادار ہوں گے۔ حضرت نے فرمایا کہ میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ خداوند عالم میری مجلس کو تم سے اور تم ایسے لوگوں سے پاک و صاف رکھے۔

جب لفظ امیر المومنین کاٹ دی گئی اور از سر نو تحریر لکھی جانے لگی تو حضرت سے کہا گیا کہ آپ یہ اقرار کرتے ہیں کہ معاویہ اور اہل شام مسلمان ہیں حضرت نے فرمایا:-

ما اقر لمعاویة ولا لاصحابه انهم مومنون ولا مسلمون ولکن یکتب معاویة ما شاء بما شاء ویقر ما شاء بما شاء لنفسه واصحابه ویسمی نفسه بما شاء واصحابه۔ (شرح ابن ابی الحدید ج۱۔ ص۱۱) "میں معاویہ اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں یہ تسلیم نہیں کرتا کہ وہ مومن و مسلم ہیں لیکن معاویہ اپنے ساتھیوں کے بارے میں جو چاہے لکھے جس چیز کا چاہے اقرار کرے اور جو نام چاہے تجویز کرے"۔

آخر صلحنامہ قلمبند کیا گیا جو حسب ذیل دفعات پر مشتمل تھا۔

(۱) دونوں طرف کے حَکَم اس کے پابند ہوں گے کہ وہ قرآن مجید کی رو سے فیصلہ کریں اگر کتاب اللہ

سے کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکیں تو متفقہ سُنّت رسُول کی روشنی میں تصفیہ کریں۔
(۲) حکمین جو فیصلہ کریں گے دونوں فریق اس کے پابند ہوں گے بشرطیکہ فیصلہ کتاب وسُنّت کی بُنیاد پر کیا گیا ہو۔
(۳) حکمین کو اس ماہِ رمضان کے آخر تک فیصلہ کر دینا چاہیئے اور اگر مدت میں توسیع کی ضرورت محسوس کریں تو وُہ خود ہی اتفاق رائے سے مقررہ مدّت میں اضافہ کر سکتے ہیں۔
(۴) اگر فیصلہ کے لئے شہادتوں کی ضرورت پیش آئے تو وُہ مہیّا کی جائیں گی۔
(۵) تصفیۂ تحکیم تک جنگ بند رہے گی دونوں فریق حکمین کی جان ومال کی حفاظت کریں گے اور فریقین میں سے کسی فرد پر کہیں آنے جانے میں رکاوٹ پیدا نہیں کی جائے گی۔
(۶) اگر فیصلہ سے قبل کسی حکم کا انتقال ہو جائے تو اس کی جماعت اس کی جگہ پر دوسرا حکم منتخب کرے گی۔
(۷) یہ اجتماع ایسے مقام پر ہوگا جو عراق وشام کے درمیان واقع ہو۔

ان دفعات میں سے بیشتر دفعات کا تعلق طریق کار اور انتظامی ضوابط سے ہے اور بنیادی دفعہ صرف ایک ہے کہ حکمین کتاب وسُنّت کی بنا پر فیصلہ کریں گے اور انہیں اپنی ذاتی رائے یا ذاتی رجحان پر فیصلہ کرنے کا کوئی حق نہ ہوگا۔ اب اگر وُہ اس شرط کی پابندی نہ کریں یا اس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے فیصلہ کریں تو ظاہر ہے کہ نہ ان کی ثالثی حیثیت باقی رہ سکتی ہے اور نہ اُن کے فیصلہ کی پابندی کی جا سکتی ہے۔ واقعات پیش آئند اس کے شاہد ہیں کہ جس طرح قصاص کی آواز اٹھانا اور نیزوں پر قرآن بلند کرنا دھوکا اور فریب تھا اسی طرح تحکیم میں بھی فریب ہی فریب کار فرما رہا۔ نہ کسی نے کتاب اللہ کو دیکھا اور نہ کسی نے سنتِ رسُول پر نظر کی اور ایک حریف نے دوسرے حریف کو سیاسی پٹخنیاں دے کر چت کر دینا ہی اپنا کارنامہ سمجھا۔

تحکیم کے خلاف خوارج کا ہنگامہ

عراق وشام کی فوجیں ابھی صفین ہی میں موجود تھیں کہ معاہدہ تحکیم کے ضبط تحریر میں لائے جانے کے بعد عراقیوں نے تحکیم کے خلاف سرگوشیاں شروع کر دیں۔ چنانچہ جب اشعث ابن قیس نے مختلف قبائل کے جھنڈوں کے پاس جا کر قرارداد تحکیم کی عبارت پڑھ کر سُنائی تو تحکیم کے خلاف نفرت کے جذبات پُوری شدّت سے بھڑک اُٹھے اور وہی لوگ جو کچھ دیر پہلے تحکیم کے ماننے پر زور دے رہے تھے تحکیم کی بڑھ چڑھ کر مخالفت کرنے لگے۔ بنی عنزہ نے معاہدہ تحکیم کی تحریر سُنی تو ان میں سے دو حقیقی بھائیوں جعد اور معدان نے لاحکم الا للہ (حکم اللہ کے لئے مخصوص ہے) کا نعرہ لگایا اور تلوار لے کر میدان میں

نکل آئے اور لڑتے بھڑتے ہوئے قتل ہو گئے۔ بنی مراد نے یہ تحریر سُنی تو صالح ابن شقیق نے کہا: لا حکم الا للہ ولو کرہ المشرکون (حکم اللہ کے لئے مخصوص ہے اگرچہ مشرکین کو ناگوار گزرے) بنی راب کو یہ تحریر پڑھ کر سُنائی گئی تو انہوں نے تحکیم کی مخالفت کرتے ہوئے کہا:۔ لا یحکم الرجال فی دین اللہ (اللہ کے دین میں لوگوں کو حکم قرار نہیں دیا جا سکتا) اس تحکیم کی مخالفت کرنے والوں میں اکثریت بنی تمیم کی تھی۔ جب انہوں نے یہ تحریر سُنی تو عروہ ابن ادیہ تمیمی نے اشعث سے کہا:۔

اتحکمون الرجال فی دین اللہ ۔ فاین قتلانا یا اشعث ۔ (اخبار الطوال ص۱۹۶)

کیا تم نے دین میں لوگوں کو حکم قرار دے لیا ہے اے اشعث اگر یہی ہونا تھا تو ہمارے مقتولین کیوں قتل ہوئے۔"

پھر تلوار لے کر اشعث پر حملہ آور ہوا۔ اشعث نے تیزی سے سواری کا رُخ موڑا تلوار سواری کے پُٹھے پر پڑی اور وُہ اس کے ہاتھ سے بچ کر نکل گیا۔

اس جنگ بندی اور معاہدۂ تحکیم کے نتیجہ میں عراقیوں کی یکجہتی ختم ہو گئی ہر طرف فتنہ و شر اٹھ کھڑا ہوا۔ محرز ابن خنیس نے فضا کو بگڑتے ہوئے دیکھا تو امیر المومنین کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا امیر المومنین کیا اس معاہدہ کو ختم کرنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس کے نتیجہ میں ایک عظیم فتنہ اُٹھ کھڑا ہو گا اور آپ کو سُبکی و پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ حضرت نے فرمایا:۔

ابعد ان کتبناہ ننقضہ ؟ ھذا لایحِل۔ (اخبار الطوال ص۱۹۷)

کیا معاہدہ تحریر کرنے کے بعد ہم عہد شکنی کریں یہ کسی صورت میں جائز نہیں ہے۔"

جب امیر المومنین نے معاہدہ کی پابندی کرتے ہوئے، ہتھیار رکھ دینے کے بعد ہتھیار اُٹھانا گوارا نہ کیا تو نفاق کے جراثیم بغاوت و سرکشی کی صُورت میں اُبھر آئے اور علویہ و عثمانیہ کے علاوہ ایک تیسرے گروہ کی بنیاد پڑ گئی ان لوگوں کی دیکھا دیکھی اور لوگ بھی اس نئی تحریک کے پیچھے لگ گئے جن میں وُہ لوگ بھی شامل تھے جو جنگ کے جاری رکھنے پر مصر تھے اور وُہ بھی جو تحکیم کے منوانے میں پیش پیش تھے اور یہ نعرہ جو وقتی ہیجان کے نتیجہ میں دو نوجوانوں اور عروہ ابن ادیہ کی زبان سے نکلا تھا اس گروہ کا جماعتی نعرہ بن گیا۔ جب دونوں طرف کے لشکروں کی واپسی ہوئی اور امیر المومنین اپنے لشکر کے ہمراہ کوفہ کی جانب روانہ ہوئے تو ہر ایک کے تیور چڑھے ہوئے پیشانیوں پر بل اور آنکھیں غیظ و غضب سے اُبلی پڑتی تھیں۔ کچھ لوگوں کو یہ صدمہ کہ جیتی ہوئی جنگ اپنے ہاتھوں سے ہار دی اور کچھ لوگوں کو یہ غم کہ تحکیم کو کیوں مانا گیا اور مانا گیا تو اسے وہیں پر کیوں نہ مسترد کر دیا گیا۔ جماعت میں پھوٹ تو پڑ ہی چکی تھی آپس میں اُلجھتے اور پیچ و تاب کھاتے ہوئے جب کوفہ کے قریب پہنچے تو بارہ ہزار افراد نے

حدود شہر میں داخل ہونے سے انکار کر دیا اور جماعت سے کٹ کر کوفہ کے قریب مقام حرورا میں اُتر پڑے اور لاحکم الا للہ کی بُنیاد پر ایک مستقل اور خطرناک محاذ قائم کر لیا۔ یہ جماعت خوارج اور حروریہ کے نام سے موسُوم ہُوی اور جماعتی تنظیم کے پیش نظر انہوں نے شبث ابن ربعی کو امیر جنگ اور عبداللہ ابن کوا یشکری کو امام جماعت مقرر کر لیا۔

امیرالمومنین نے ان کی نافرمانی و سرکشی کے باوجود ان پر کسی قسم کی سختی گوارا نہ کی کیونکہ آپ انسانی افتاد طبیعت کو سمجھتے تھے کہ ایک باغی و سرکش جماعت کی کج فکری و کج ذہنی میں سختی و تشدّد سے اضافہ تو ہو سکتا ہے مگر اس کی ذہنی و فکری اصلاح نہیں ہو سکتی۔ البتہ جب نرمی و ملاطفت سے کام نہ نکلے اور سرکش جماعت کی کج ذہنی امن عامہ میں خلل کا باعث ہونے لگے تو پھر سختی و تشدّد کا جواز ہو سکتا ہے۔ چنانچہ آپ نے انہیں افہام و تفہیم اور دلیل و برہان سے قائل کرنے کا لائحہ ترتیب دیا اور خود ان کے ہاں جا کر انہیں راہِ راست پر لانے کا فیصلہ کیا اور جانے سے پہلے ابن عباس کو ان کے ہاں جانے کا حکم دیا اور ان سے فرمایا کہ تم خوارج کے ہاں پہنچ کر میرا انتظار کرنا اور میرے آنے سے پہلے ان سے اختلافی موضوع پر کوی بات چیت نہ کرنا۔ اس گفتگو پر بندش لگانے کا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ ممکن ہے کہ خوارج ان کے جواب سے مطمئن نہ ہوں یا ان کے طرزِ گفتگو اور طریق استدلال پر بھڑک اُٹھیں اور ذہنی طور پر آپ کی بات پر بھی کان نہ دھریں۔ جب ابن عباس ان کے ہاں پہنچے تو انہوں نے تحکیم کا ذکر چھیڑ دیا اور کہا کہ شرع میں زنا کی سزا سو تازیانے اور چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے۔ یہ اللہ کے مقرر کردہ حدود ہیں ان میں کسی کو ردّ و بدل کا اختیار نہیں ہے تو پھر دو آدمیوں کو حکم قرار دینا کہ وہ ایک دینی معاملہ کا فیصلہ کریں کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔ ابن عباس ضبط نہ کر سکے اور کہا کہ خداوند عالم نے حالت احرام میں جو شکار کیا جائے اس کے بارے میں فرمایا ہے:۔

ایمان والو جب تم احرام کی حالت میں ہو تو شکار نہ مارو اور جو کوی تم میں سے جان بوجھ کر مار ڈالے تو چوپاؤں میں سے جس جانور کو مارا ہے ویسا ہی اس کا بدلہ دینا ہوگا جو تم میں سے دو منصف آدمی تجویز کریں۔"	یا ایھا الذین امنوا لا تقتلوا الصید وانتم حرم ومن قتلہ متعمدا فجزاء مثل ما قتل من النعم یحکم بہ ذوا عدل منکم۔

خوارج نے کہا کہ اس صورت کو مسلمانوں کی خونریزی پر قیاس نہیں کیا جا سکتا اور پھر عمرو ابن عاص عادل کب ہے۔ کل تو ہم اُسے غیر عادل سمجھ کر اس سے لڑ رہے تھے اور آج وہ عادل کیسے ہو گیا تم لوگوں نے اللہ کے کام میں دو آدمیوں کو حکم ٹھہرا لیا ہے حالانکہ جب معاویہ اور اس کے ساتھیوں نے بغاوت کی تھی تو اُن کے بارے میں خدا کا حکم یہ تھا کہ یا انہیں قتل کیا جائے یا اُن سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے

نے اس کی تردید ضروری سمجھی اور منبر پر کھڑے ہو کر مجمع عام میں اعلان کیا کہ جو شخص میری طرف یہ نسبت دیتا ہے کہ میں تحکیم کے معاہدہ سے منحرف ہو گیا ہوں وُہ جھوٹ کہتا ہے۔ حضرت کے اس اعلان پر خوارج پھر بھڑک اُٹھے۔ ان کا پول کھُل گیا اور جھوٹ بے نقاب ہو گیا۔ انہوں نے احتجاجاً لا حکم الا للہ کا نعرہ لگایا اور پھر اس نعرہ کی گونج مسجد کے ہر کونے سے سُنائی دینے لگی اور ایک شخص نے حضرت کو مخاطب کر کے یہ آیت پڑھی:۔

لئن اشرکت لیحبطن عملك و لتکونن من الخاسرین۔ "اگر تم شرک کرو گے تو تمہارے تمام اعمال اکارت جائیں گے اور تم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گے"۔

امیر المومنین نے اس کے جواب میں یہ آیت پڑھی:۔

فاصبر ان وعد اللہ حق لا یستخفنك الذین لا یوقنون "صبر سے کام لو یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے اور یہ بے یقین لوگ تمہیں مغالطہ میں نہ ڈالیں"۔

اب جوں جوں حکمین کے اجتماع کا وقت قریب آنے لگا ان لوگوں کی شر انگیزی و دریدہ دہنی زور پکڑنے لگی۔ ان کے تیور بتا رہے تھے کہ اب وہ افہام و تفہیم کے حدود سے گزر کر تیغ و سنان کے ذریعہ فیصلہ کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ جب ابو موسیٰ کے روانہ ہونے کا وقت قریب آیا تو وُہ جنگ کا بہانہ تلاش کرنے کے لئے شوخ چشمی و اشتعال انگیزی پر اُتر آئے اور اُن کے دو نمائندے زرعہ ابن برج طائی اور حرقوص ابن زہیر اسدی حضرت کے پاس آئے اور حسب معمول لا حکم الا للہ کا نعرہ لگایا اور پھر حرقوص نے حضرت سے گستاخانہ لہجہ میں کہا کہ آپ گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں اس سے توبہ کیجئے اور تحکیم سے دستبردار ہو کر شام چلئے اور دشمن سے جنگ کیجئے۔ حضرت نے فرمایا کہ جب تم جنگ کے رکوانے پر مصر تھے تو میں نے جنگ کے جاری رکھنے پر زور دیا تھا مگر تم لوگوں نے میری مخالفت کی اور اپنی ضد پر اڑے رہے اور اب جبکہ عہد و پیمان ہو چکا ہے ہمارے لئے اس معاہدہ کی پابندی ضروری ہے جیسا کہ اللہ سبحانہٗ کا ارشاد ہے:۔

واوفوا بعھد اللہ اذا عاھدتم۔ "جب آپس میں قول و قرار کر لو تو اللہ کے عہد و پیمان کو پورا کرو"۔

حرقوص نے کہا کہ وُہ معاہدہ سرے سے گناہ تھا اور خلاف شرع معاہدہ کی پابندی کا کوئی جواز نہیں ہے۔ فرمایا کہ معاہدۂ تحکیم گناہ نہیں تھا بلکہ تم لوگوں کی فکر و رائے کی کمزوری کا نتیجہ تھا میں نے تحکیم سے تمہیں منع کیا تھا مگر تم نے میری بات نہ مانی اور جنگ سے ہاتھ اٹھا لیا۔ اس پر زرعہ ابن برج نے کہا کہ اے علی اگر آپ نے معاہدۂ تحکیم کو ختم نہ کیا تو ہم اللہ کی خوشنودی کی

خاطر آپ سے جنگ کریں گے۔ حضرت نے فرمایا:۔

بوسالك مااشقاك كانى بك قتيلا تسفى عليك الريح ۔ (تاریخ طبری ج ۴ ۔ ص ۵۳)	تیرا بُرا ہو تو کتنا بدبخت ہے میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ تو قتل کیا جا چکا ہے اور بادِ صرصر تجھ پر خاک ڈال رہی ہے"۔

اس نے کہا کہ میں یہی تو چاہتا ہوں یہ کہہ کر دونوں لاحکم الا للہ کا نعرہ لگاتے ہوئے باہر نکل گئے۔

اب خوارج نے مسجد کو شورش و ہنگامہ آرائی کا مرکز بنالیا اور جب بھی حضرت خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوتے تو ہر سمت سے نعرہ کا شور بلند ہونے لگتا۔ ایک مرتبہ انہوں نے نعرہ لگایا تو حضرت نے فرمایا اللہ اکبر! بات سچی ہے مگر ان کا مقصد غلط ہے۔ اگر یہ خاموش رہے تو ہم ان کے ساتھ بھلائی کرتے رہیں گے اگر یہ ہمارے خلاف بولیں گے تو انہیں دلائل سے چپ کریں گے اور اگر انہوں نے ہم پر خروج کیا تو ہم ان سے لڑیں گے۔ اس پر ایک خارجی یزید ابن عاصم محاربی تلملا کر اُٹھا اور کہنے لگا کہ اے علی آپ ہمیں قتل سے کیا ڈراتے ہیں ہمیں اُمید ہے کہ ہم عنقریب آپ پر تلواریں برسائیں گے ہم دین کے معاملہ میں ذلت گوارا نہیں کر سکتے کیونکہ دین میں ذلت کو گوارا کرنا غضب خدا کو دعوت دینا ہے۔ ایک دن خطبہ دیتے ہوئے مسجد کے ہر کونے سے نعروں کی آوازیں بلند ہونے لگیں تو حضرت نے فرمایا:۔

الله اكبر! كلمة حق يلتمس بها باطل اما ان لكم عندنا ثلاثا ما صحبتمونا لانمنعكم مساجد الله ان تذكروا فيها اسمه ولا نمنعكم الفئ ما دامت ايديكم مع ايدينا ولا نقاتلكم حتى تبدؤنا۔ (تاریخ طبری ج ۴ ۔ ص ۵۳)	اللہ اکبر! کلمہ حق ہے مگر مقصد باطل ہے۔ دیکھو جب تک تم ہمارے ساتھ رہو گے تمہارے تین حق ہمارے ذمہ ہوں گے ہم تمہیں مساجد میں اللہ کا ذکر کرنے سے منع نہیں کریں گے جہاد میں ہمارے ساتھ تعاون کرو گے تو تمہیں مال غنیمت سے محروم نہیں کریں گے اور اس وقت تک تم سے جنگ نہیں کریں گے جب تک تم پہل نہ کرو گے"۔

امیر المومنین کے حلم وضبط اور نرم روی سے اثر لینے کے بجائے خوارج تمرد وسرکشی پر اُتر آئے اور حضرت کے خلاف اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں۔ چنانچہ عبد اللہ ابن وہب راسبی کے گھر میں مستقبل کا لائحۂ عمل ترتیب دینے کے لئے جمع ہوئے اور اپنے محاذ کو مضبوط تر کرنے کی تدبیریں سوچنے لگے۔ عبد اللہ ابن وہب نے کہا کہ ہمیں اس شہر سے نکل کر پہاڑی علاقوں یا دُور افتادہ بستیوں کی طرف چل دینا

چاہیئے تاکہ یہاں کے ظالم باشندوں کے علی الرغم اللہ کی نافرمانیوں اور گمراہ کن بدعتوں کا انسداد کرسکیں حرقوص ابن زہیر نے اس کی تائید کی اور حمزہ ابن سنان نے اس تجویز سے موافقت کرتے ہوئے کہا کہ یہ کام جماعتی تنظیم کے ماتحت ہی انجام دیا جاسکتا ہے لہٰذا

ولوا امرکم رجلا منکم فانہ	اپنے لوگوں میں سے کسی کو ولی امر منتخب کرلو
لابد لکم من قائد وسائس۔	اس لئے کہ تمہارے لئے ایک قائد و سربراہ کا
(اخبار الطوال ص۲۰۲)	ہونا ضروری ہے"

اس پر بھی اتفاق رائے ہوا اور انہوں نے یزید ابن حصین طائی کو امارت کی پیشکش کی مگر اس نے امارت کے قبول کرنے سے انکار کردیا۔ پھر یکے بعد دیگرے حرقوص ابن زہیر، حمزہ ابن سنان اور شریح ابن اوفی عبسی کو قیادت کی پیشکش کی گئی مگر ان تینوں نے معذرت کی اور اس ذمہ داری سے پہلو بچا لے گئے۔ آخر میں عبداللہ ابن وہب سے کہا گیا۔ اس نے کہا کہ اگر میں امارت قبول کروں تو اس لئے نہیں کہ میں دُنیوی نام و نمود کا خواہشمند ہوں اور اگر قبول نہ کروں تو اس لئے نہیں کہ میں موت سے ڈرتا ہوں۔ جب امیر کا تقرر ضروری ہے تو مجھے بہرحال اس ذمہ داری کو قبول کرنا پڑے گا۔

اس انتخاب کے بعد شریح ابن اوفی کے مکان پر مزید صلاح و مشورہ کے لئے جمع ہوئے۔ عبداللہ ابن وہب نے کہا کہ جب ہمیں کوفہ چھوڑ ہی دینا ہے تو پھر اس شہر کا رُخ کرنا چاہیئے جہاں ہم بغیر کسی روک ٹوک کے اللہ کے احکام کا نفاذ کرسکیں۔ شریح نے کہا کہ اس مقصد کے لئے مدائن سے بہتر اور موزوں تر کوئی جگہ نہیں ہے ہم وہاں کے باشندوں کو باہر نکال کر شہر پر قبضہ کرلیں گے اور بصرہ میں جو ہمارے ہمخیال بھائی بند ہیں انہیں بھی مدائن چلے آنے کی دعوت دیں گے وہ یقیناً ہماری آواز پر لبیک کہیں گے اور اس طرح ہم قوت و طاقت میں معتدبہ اضافہ کرسکیں گے۔ یزید ابن حصین نے کہا کہ اگر ہم نے مدائن کا رُخ کیا تو وہاں کے لوگ پوری طاقت سے ہمارا مقابلہ کریں گے اور شہر میں داخل ہونے سے مانع ہوں گے لہٰذا ہمیں مدائن کے بجائے نہروان کی طرف جانا چاہیئے۔ اس تجویز پر اتفاق رائے کے بعد یہ طے پایا کہ ایک ساتھ نکلنے کے بجائے ایک ایک یا دو دو کرکے نکلیں تاکہ منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی روک نہ لئے جائیں۔ چنانچہ یہ لوگ مختلف راستوں سے اکیلے دکیلے نکل کھڑے ہوئے اور چھپتے چھپاتے نہروان کی طرف چل دیئے۔ اہل بصرہ کو اپنے عزائم سے آگاہ کرنے کے لئے عبداللہ ابن سعد عبسی کو بصرہ بھیجا اور انہیں تاکید کی کہ وہ جلد از جلد نہروان پہنچ جائیں۔ بصرہ والوں نے جواب دیا کہ ہم تم لوگوں کی رائے سے پوری طرح متفق ہیں اور جلد پہنچا چاہتے ہیں۔

ان خروج کرنے والوں میں عدی ابن حاتم کا بیٹا طرفہ بھی تھا وہ مقام سیب میں پہنچ کر یزید ابن حصین کی ٹولی میں شامل ہوگیا۔ عدی کو اپنے بیٹے کے خروج کا علم ہوا تو وہ بہت پریشان ہوئے اور

اس کے تعاقب میں مدائن پہنچے مگر وہاں خوارج میں سے کوئی نظر نہ آیا تو کوفہ کے ارادہ سے پلٹے جب مدائن سے نکل کر ساباطین وارد ہوئے تو عبد اللہ ابن وہب سے جو دیر عاقول سے دریا عبور کر کے نہروان جا رہا تھا مڈ بھیڑ ہو گئی۔ عبد اللہ ابن وہب نے عدی کو اکیلا پا کر انہیں قتل کر دینا چاہا مگر عمرو ابن مالک نبہانی اور بشر ابن یزید بولانی ان کے قتل سے مانع ہوئے اور ان کی جان بچ گئی۔ عدی نے خوارج کے اس جتھے کو دیکھ کر حاکم مدائن سعد ابن مسعود کو پیغام بھجوایا کہ خوارج کا ایک دستہ آگے بڑھ رہا ہے وہ اسے روکنے کا انتظام کریں۔ سعد نے اپنے بھتیجے مختار ابن ابی عبید کو مدائن میں اپنا نائب مقرر کیا اور پانچ سو سواروں کا دستہ لے کر خوارج کے تعاقب میں نکل کھڑے ہوئے۔ عبد اللہ ابن وہب کے ہمراہ صرف تیس سوار تھے اسے سعد اور ان کے ہمراہیوں کے آنے کی خبر ہوئی تو اس نے راستا بدل دیا اور بغداد کا رُخ کر لیا۔ سعد نے اس کا پیچھا کیا اور غروب آفتاب کے وقت اُسے کرخ میں جا لیا۔ کچھ دیر تک دونوں فریق بھڑتے رہے آخر سعد کے ساتھیوں نے کہا کہ انہیں چھوڑ دینا چاہیئے اس لئے کہ ہمیں امیر المومنین نے ان سے لڑنے کا حکم نہیں دیا البتہ امیر المومنین کو اس کی اطلاع دے دینا چاہیئے اگر وہ فرمائیں گے تو ان کا پیچھا کیا جائے گا ورنہ جہاں یہ جانا چاہتے ہیں انہیں جانے دیا جائے مگر سعد نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ ہمیں ان سے لڑنا چاہیئے ادھر رات ہو چکی تھی اور جنگ چھیڑی نہ جا سکتی تھی۔ صبح کے انتظار میں خوارج کے قریب پڑاؤ ڈال کر ٹھہر گئے۔ عبد اللہ ابن وہب اور اس کے ساتھیوں نے رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھایا اور راتوں رات دریا عبور کر کے جوخی پہنچ گئے اور وہاں سے نہروان کی طرف نکل گئے۔ خوارج نہروان کے پُل کے قریب پڑاؤ ڈالے پڑے تھے اور عبد اللہ ابن وہب اور اس کے ساتھیوں کا انتظار کرنے کے بعد یہ چاہتے تھے کہ حرقوص ابن زہیر یا یزید ابن حصین کو امیر منتخب کریں کہ یہ لوگ پہنچ گئے۔ اہل کوفہ میں سے قعقاع ابن قیس طائی، عبد اللہ ابن حکیم، سالم ابن ربیعہ عبسی اور چند افراد خوارج کی جماعت میں شامل ہونے کے لئے نہروان جانا چاہتے تھے مگر ان لوگوں کو ان کے گھر والوں نے روک دیا اور انہیں مجبوراً رک جانا پڑا اور سالم ابن ربیعہ کو امیر المومنین نے بلا کر منع کر دیا۔

بصرہ سے مسعر ابن فدکی تمیمی کی قیادت میں پانچ سو خوارج نہروان کے ارادہ سے نکل کھڑے ہوئے جب حاکم بصرہ ابن عباس کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے ابو الاسود دئلی کو ان کے تعاقب میں روانہ کیا تاکہ انہیں سمجھا بجھا کر واپس لائیں۔ ابو الاسود جب خوارج تک پہنچے تو رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا خوارج انہیں دیکھ کر جسر کے قریب ٹھہر گئے اور یہ تاثر دیا کہ وہ رات یہاں گزارنا چاہتے ہیں۔ ابو الاسود بھی رات کے اندھیرے میں کوئی قدم نہ اٹھا سکتے تھے وہ بھی صبح کے انتظار میں ٹھہر گئے مگر خوارج رات کی تاریکی میں چپکے سے نکل کھڑے ہوئے اور ان کی گرفت سے

نکل کر نہروان پہنچ گئے اور کوفہ و بصرہ اور اطراف و جوانب کے خوارج نے جمع ہو کر نہروان کو ہنگامہ و شورش کا آماجگاہ بنا لیا۔

خوارج کی اس جتھابندی کے پیش نظر امیرالمومنین کے مخلص اصحاب نے چاہا کہ حضرت کو اپنی دوستی و جاں نثاری کا یقین دلا کر تجدید بیعت کریں۔ چنانچہ وہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ ہم اس معاہدہ پر آپ کی بیعت کرتے ہیں کہ جو آپ کا دوست ہوگا ہم اسے دوست رکھیں گے اور جو آپ کا دشمن ہوگا ہم اسے دشمن رکھیں گے۔ حضرت نے ان لوگوں سے بیعت لی اور ربیعہ ابن ابی شداد خثعمی سے جو جمل و صفین میں آپ کے ہمرکاب رہ کر جنگ کر چکا تھا فرمایا کہ تم بھی کتاب و سُنّت کے اتباع کی بنیاد پر بیعت کرو۔ اس نے کہا کہ میں سنّت ابوبکر و عمر کی پیروی کی شرط پر بیعت کروں گا۔ حضرت نے فرمایا کہ کیا تمہیں اللہ کی کتاب اور رسُول کی سُنّت سے انکار ہے۔ اگر ابوبکر و عمر کی سُنّت کتاب و سنت کے خلاف ہو تو وہ قابل عمل ہی نہیں ہے پھر اس شرط کے پیش کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ پھر حضرت نے تیور بدل کر اس کی طرف دیکھا اور فرمایا:۔

اما واللہ لکانی بک وقد	خدا کی قسم میں یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ
نفرت مع ھذہ الخوارج	رہا ہوں کہ تم خوارج کے ساتھ نکل کھڑے ہوئے
فقتلت وکانی بک وقد	ہو اور گھوڑے اپنے سموں سے تمہیں روند
وطئتک الخیل بحوافرھا	رہے ہیں“۔

(تاریخ کامل ج۳۔ ص۱۷۱)

اگر یہ صحیح ہے کہ عملی تضاد ذہنی انتشار کا نتیجہ ہوتا ہے تو بلاشبہ خوارج ذہنی و فکری انتشار کا شکار تھے۔ انہوں نے نہ صرف تحکیم کو مانا بلکہ امیرالمومنین کو بھی تحکیم کے ماننے پر مجبور کر دیا۔ اور جب آپ نے تحکیم کی اجازت دے دی تو لاحکم الا للہ کا نعرہ لگاتے ہوئے تحکیم کی مخالفت کرنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے

”اُدھر سے اُدھر ہو گیا رُخ ہوا کا“

خوارج نے اپنے نعرہ کا استخراج آیتِ قرآنی ان الحکم الا للہ سے کیا ہے جو ابتداء میں صرف تحکیم کی مخالفت میں بلند ہوا اور پھر اس آیت کے ظاہر پر نظر کرتے ہوئے ان لوگوں نے یہ نظریہ قائم کر لیا کہ حکومت بھی اللہ کے لئے ہے اور بیعت بھی اللہ کے لئے اور اس کے علاوہ کوئی حاکم و فرمانروا نہیں ہو سکتا۔ اور اس طرح یہ نعرہ ایک جدید نظریۂ حکومت کی بنیاد قرار پا گیا۔ اور خوارج اس آیت کی آڑ میں یہ کہنے لگے کہ ہم حکومتِ الٰہیہ کا قیام چاہتے ہیں کیونکہ حکومت کا حق صرف اللہ کو ہے مگر انہوں نے اس پر غور نہ کیا کہ حکومتِ الٰہیہ کے معنی ابطال امارت کے نہیں ہیں بلکہ حکومتِ الٰہیہ

کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے احکام کا نفاذ الٰہی نمائندوں کے ذریعہ ہو اور ان نمائندوں کے مقابلہ میں کسی کو رائے زنی و قیاس آرائی کا حق حاصل نہ ہو لہٰذا آیت ان الحکم الا للہ کا یہ مفہوم قرار دینا کہ حکومت و فرمانروائی اللہ کے علاوہ کسی کی نہیں ہو سکتی اور دینی و دنیوی تنظیم کے لئے کسی امیر کی احتیاج نہیں ہے ایک غلط نظریہ ہے اور قرآنی آیت کا اس سے کوئی ربط نہیں ہے۔ یہ آیت حضرت یعقوب کے واقعات کے سلسلہ میں ہے اور پوری آیت اس طرح ہے:۔

وقال یا بنی لا تدخلوا من باب واحد وادخلوا من ابواب متفرقۃ وما اغنی عنکم من اللہ من شئ ان الحکم الا للہ علیہ توکلت و علیہ فلیتوکل المتوکلون۔

اور (یعقوب نے) کہا اے بیٹو تم سب کے سب ایک دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ متفرق دروازوں سے داخل ہونا اور میں تم سے اس مصیبت کو جو خدا کی طرف سے آئے ٹال نہیں سکتا حکم تو دراصل خدا ہی کے واسطے ہے میں نے اسی پر بھروسا کیا ہے اور بھروسا کرنے والوں کو اسی پر بھروسا کرنا چاہیئے۔"

اس آیت میں اس واقعہ کا تذکرہ ہے کہ جب حضرت یعقوب نے اپنے بیٹوں کو مصر روانہ کیا تو ان سے کہا کہ تم الگ الگ دروازوں سے داخل ہونا تاکہ نظر بد سے بچے رہو اور یہ ضروری نہیں ہے کہ اگر تم متفرق دروازوں سے داخل ہو گے تو ضرور بچے ہی رہو گے اس لئے کہ حکم چلتا ہے تو اللہ کا چلتا ہے اور وہ جس کام کا ارادہ کر لیتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے اس کے برخلاف دوسروں کے ارادے کبھی پورے ہوتے ہیں اور کبھی پورے نہیں ہوتے مگر پھر بھی اپنی طرف سے تدبیر و احتیاط ضروری ہے۔ یہ تھا اس آیت کا واضح مطلب۔ مگر خوارج نے نہ آیت کے مورد و محل کو دیکھا نہ اس کے معنی و مفہوم پر نظر کی اور اس کا مطلب یہ قرار دے لیا کہ سرے سے کوئی حاکم ہو ہی نہیں سکتا۔ امیرالمومنین نے خوارج کی اس من گڑھت تاویل کی رد میں فرمایا ہے "بات درست ہے مگر ان کی مراد باطل ہے بیشک حکم اللہ ہی کے لئے مخصوص ہے مگر یہ لوگ تو یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حکومت بھی اللہ کے علاوہ کسی کی نہیں ہو سکتی حالانکہ لوگوں کے لئے ایک حاکم کا ہونا ضروری ہے۔" چنانچہ خوارج کا یہ نظریہ نظریئے ہی کی حد میں رہا اور کسی دور میں اسے عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا۔ بلکہ خود خوارج بھی اس پر عملدرآمد نہ کر سکے اور کشود و بست کے لئے کسی نہ کسی کو اپنا امیر و سربراہ منتخب کرتے رہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ سیاسی و انتظامی نقطۂ نظر سے حکومت کا قیام لازمی اور ایک سربراہ مملکت کا ہونا ضروری ہے کیونکہ حکومت ہی شخصی و اجتماعی مفادات کی حفاظت کرتی اور معاشی و معاشرتی مسائل کا حل تلاش کرتی ہے۔ اگر حکومت نہ ہو تو نہ ریاست کی تنظیم ممکن ہے نہ اس کے مقاصد

کو عملی جامہ پہنایا جاسکتا ہے نہ نظم ونسق باقی رہ سکتا ہے اور نہ امن وامان برقرار رکھا جاسکتا ہے۔
اگر خوارج کا یہ نعرہ دیانت و نیک نیتی کے زیر اثر ہوتا تو وہ تحکیم کے جواز کی نفی کرنے کے بجائے یہ کہہ سکتے تھے کہ حکم قرار دینا تو جائز ہے جیساکہ پیغمبر اکرم نے بنی قریظہ کے بارے میں سعد ابن معاذ کو حکم مقرر کیا تھا مگر اس موقع پر جبکہ دشمن اس کے ذریعہ فریب دینا چاہتا ہے تحکیم ناروا اور خلاف مصلحت ہے تو اسے ایک حد تک ایک صحیح جذبہ کے تحت لایا جاسکتا تھا مگر انہوں نے تو شورش و ہنگامہ آرائی کا جواز پیدا کرنے کے لئے یہ نعرہ لگایا تھا تاکہ حکومت الٰہیہ کے پردے میں قبائلی عصبیت کو زندہ اور لاحکومت کا نعرہ لگا کر طوائف الملوکی کا اعادہ کرسکیں ورنہ حکومت الٰہیہ کا قیام ہی ان کے پیش نظر ہوتا تو امیر المومنین سے تعاون کرتے اس لئے کہ ان سے بہتر کون ہوسکتا تھا جو حکومتِ الٰہیہ کو الٰہی احکام و قوانین کی بنیادوں پر استوار کرتا اور دنیا کو انہی درخشاں خطوط پر چلاتا جنہیں پیغمبر اکرم نے وحی ربانی کی روشنی میں ترتیب دیا تھا۔

خوارج پر ایک نظر

خارجیت کے جراثیم پیغمبر اکرم کے زمانہ ہی میں پیدا ہوچکے تھے جو اندر ہی اندر بڑھتے اور پھیلتے رہے۔ یہ لوگ اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اسلام کے خلاف سازشیں کرتے تخریبی کاروائیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے اور ان کی گستاخی و شوخ چشمی کا یہ عالم تھا کہ پیغمبر اکرم کی عدالت و دیانت پر حملہ کرنے سے بھی نہ چوکتے۔ چنانچہ جب آنحضرت نے غزوۂ حنین کا مال غنیمت وادیٔ جعرانہ میں تقسیم فرمایا اور تازہ مسلمانوں کی دلجوئی کے لئے اپنے حصۂ خمس میں سے انہیں اوروں کی نسبت زیادہ دیا تو اس گروہ کی ایک فرد ذوالخویصرہ تمیمی نے گستاخانہ لہجہ میں آنحضرت سے کہا کہ آپ عدل وانصاف کریں جس پر آنحضرت نے فرمایا کہ اگر میں عدل نہ کروں گا تو پھر کون ہے جو عدل کرے گا۔ حضرت عمر بھی اس پر بگڑے اور کہا کہ یا رسول اللہ کیا ہم اسے قتل نہ کردیں آنحضرت نے فرمایا

دعه فان له اصحابا یحقر احدکم صلاته مع صلاته وصیامه مع صیامه یمرقون من الدین کما یمرق السهم من الرمیة۔ (صحیح بخاری ج۴۔ ص۱۳۲)	"چھوڑو اسے اس جیسے اور بھی اس کے ساتھی ہیں اگر تم میں سے کوئی ان کی نمازوں کے مقابلہ میں اپنی نمازوں کو اور ان کے روزوں کے مقابلہ میں اپنے روزوں کو دیکھے گا تو اپنی نمازوں اور روزوں کو حقیر و پست سمجھے گا۔ یہ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر شکار کو چیر کر نکل جاتا ہے"۔

یہ لوگ بظاہر شعائر اسلام اور احکام دین کے پابند اور نماز و روزہ اور تلاوتِ قرآن کے دلدادہ تھے مگر اسلام کی رُوح سے ناآشنا اور دین کی حقیقت سے بے خبر تھے۔ چنانچہ پیغمبر اکرم نے ان کے بارے میں فرمایا ہے:۔

تفترق امتی علی فرقتین تمرق بینہما فرقہ محلقون رؤوسہم محفون شواربہم ازرھم الی انصاف سوقہم یقرؤن القرآن لا یتجاوز تراقیہم یقتلہم احبہم الی واحبہم الی اللہ تعالیٰ۔	میری اُمّت دو فرقوں میں بٹ جائے گی اور ان دو میں سے ایک اور فرقہ نکل کھڑا ہو گا اس فرقہ کے لوگ سر منڈوائے مونچھیں باریک کٹوائے اور آدھی پنڈلیوں تک تہمد باندھے ہوں گے وہ قرآن کی تلاوت کریں گے مگر قرآن ان کے حلق سے نیچے نہیں اُترے گا انہیں وہ شخص قتل کرے گا جو مجھے اور اللہ کو سب سے زیادہ محبوب ہے۔"
(تاریخ بغداد ج ۱ ص ۱۶۰)	

ان کی اس ظاہری وضع قطع عبادات میں انہماک نمازوں میں خضوع و خشوع اور پیشانیوں پر پڑے ہوئے گھٹوں کو دیکھ کر اکثر لوگ ان کے فریب کا شکار ہو جاتے تھے۔ ان کی نمازوں کی یہ کیفیت تھی کہ صحابہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ آنحضرت نے ذوالخویصرہ کو سجدہ میں دیکھا آپ نماز پڑھ کر فارغ ہوگئے مگر وہ اسی طرح سجدہ میں پڑا تھا۔ آنحضرت نے پلٹ کر حضرت ابو بکر سے کہا کہ تم جاؤ اور ذوالخویصرہ کو قتل کر دو۔ حضرت ابو بکر نے اُسے بڑے خضوع و خشوع سے نماز پڑھتے دیکھا تو اُسے قتل کرنا مناسب نہ سمجھا اور واپس پلٹ آئے۔ پھر پیغمبر نے حضرت عمر کو اس کے قتل پر مامور کیا۔ وہ بھی اُسے نماز پڑھتے دیکھ کر واپس چلے آئے اور آنحضرت سے کہا کہ وہ تو نمازی ہے میرا دل نہیں مانا کہ اُسے قتل کروں۔ آخر آنحضرت نے حضرت علی کو بھیجا مگر امیر المومنین کے پہنچنے سے پہلے وہ وہاں سے چلا گیا۔ آپ نے پلٹ کر پیغمبر سے عرض کیا کہ وہ جا چکا ہے۔ فرمایا وہ آج قتل ہو جاتا تو فتنہ دب جاتا۔ وہ اس گروہ کا ایک فرد تھا جو دین سے اس طرح نکل جائے گا جس طرح تیر کمان سے نکل جاتا ہے۔

خوارج عرب کے صحرائی و بدوی باشندے تھے جن پر بدویت ہی کا رنگ غالب تھا اور طبعاً شورش پسند فتنہ جو اور قتل و غارت کے خوگر تھے۔ پیغمبر اکرم کے بعد انہیں مختلف جنگوں میں ڈھکیلا جاتا رہا اور وہ جنگ و قتال کے اتنے عادی ہو چکے تھے کہ اور کچھ نہ ہوتا تو آپس ہی میں لڑتے جھگڑتے رہتے۔ ان جنگی مصروفیات نے انہیں اتنا موقع ہی نہ دیا کہ وہ اسلام کی تعلیمات سے بہرہ ور اور اس کے اخلاق و آداب سے اثر پذیر ہوتے۔ فتح عراق کے بعد جب سرحدوں کی

حفاظت کے لئے کوفہ و بصرہ کی بنیادیں رکھی گئیں تو ان چھاؤنیوں کی آبادکاری کے لئے ایسے لوگوں کی ضرورت تھی جو طبعاً جنگجو اور جنگی خو بو رکھتے ہوں۔ چنانچہ ان لوگوں کو یہاں آباد کیا گیا اور یہ لوگ بہتر مستقبل کی امید میں یہاں بس گئے مگر شہری زندگی اختیار کرنے کے باوجود اجتماعی زندگی سے مانوس نہ ہو سکے اور انفرادیت اور قبائلی عصبیت جو بدوی زندگی کا خاصہ ہے ان میں رچی بسی رہی۔ جب امیر المومنین کو دشمن کے مقابلہ میں فوج کی ضرورت محسوس ہوی تو یہ لوگ سابقہ حکومتوں میں جنگی خدمات بجا لانے کے عادی تو تھے ہی حضرت کی آواز پر بھی اُٹھ کھڑے ہوئے اور آپ کے مخالفین سے جنگوں میں حصہ لیا۔ یہ حق کی تائید اور دین کی حمایت کے جذبہ کے زیر اثر نہ تھا بلکہ اس میں عصبیت جنگ پسندی اور مادی مقاصد کارفرما تھے۔

خوارج میں زیادہ تر بنی تمیم اور عرب کے موالی شامل تھے اور اُن کے سردار بھی عموماً بنی تمیم کے افراد تھے۔ چنانچہ عبد اللہ ابن اباض، عروہ ابن ادیہ، مستورد ابن سعد، ابو بلال مرداس ابن ادیہ، مسعر ابن فدکی وغیرہ اسی قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ قبل اسلام بنی تمیم مجوسی تھے اور فقر و افلاس کی بنا پر لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے۔ چنانچہ قیس ابن عاصم تمیمی جب اسلام لایا تو پیغمبر سے کہا کہ یا رسول اللہ میں نے زمانۂ جاہلیت میں اپنی آٹھ بیٹیوں کو زندہ دفن کیا تھا۔ اسلام لانے کے بعد بھی ان کی بہیمیت و دنائت طبع میں فرق نہ آیا اور دورِ جاہلیت کی تخریب پسندی اور مجوسیت کی خو بو ورثہ میں ساتھ لائے۔ طرماح نے ان کے عادات و اطوار پر نظر کرتے ہوئے صحیح کہا ہے ؎

تمیم بطرق اللوم اھدی من القطا   ولو سلکت سبل المکارم ضلت

"بنی تمیم پستی و دنائت کی راہوں کو نہیں بھولتے جس طرح قطا پرندہ اپنا راستا نہیں بھولتا۔ اگر انہیں بزرگی و شرافت کی راہوں پر چلنا پڑے تو بھٹک جائیں"۔

جب بنی تمیم وفد کی صورت میں مدینہ آئے اور پیغمبر اکرم کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام لانا چاہا تو اُن میں سے ایک شخص نے پکار کر کہا یا محمدؐ اخرج الینا (اے محمدؐ باہر نکلو) اس انداز تخاطب پر بنی تمیم کو تنبیہہ کرنے اور ان کی سفاہت و کم عقلی پر روشنی ڈالنے کے لئے یہ آیت اُتری:۔

ان الذین ینادونك من وراء الحجرات اکثرھم لایعقلون۔   وہ لوگ جو تمہیں حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں اُن میں سے اکثر بے عقل ہیں"۔

پیغمبر اکرم کے بعد ان کی اکثریت اسلام سے منحرف ہو کر مرتد ہو گئی اور مشہور مدعیہ نبوت سجاح بنت حارث بھی اسی قبیلہ سے تھی جس نے اسلام میں رخنہ اندازی کر کے انتشار و اختلاف کو ہوا دی۔ بنی تمیم کے اس قومی مزاج کو دیکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کے دلوں میں قطعاً اسلام راسخ نہ ہوا تھا اور ان کا باطنی نفاق کبھی ارتداد کی صورت میں اور کبھی خروج کی صورت میں ظاہر ہوتا رہا اور آخر

ان کی خودسری وشورہ پشتی نے انہیں امیرالمومنین کے مقابلہ میں لاکھڑا کیا۔
ایک گروہ نے خوارج کو شیعہ قرار دے کر یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ شیعوں نے حضرت کی کامیابی کو ناکامی میں بدل کر ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور پھر ان کے مقابلہ کے لئے میدان میں نکل آئے اور اسے امیرالمومنین کی سیاسی کمزوری کے ثبوت میں پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آپ اپنے ہی لوگوں پر قابو پانے میں ناکام رہے۔ بیشک یہ لوگ امیرالمومنین کے لشکر میں شامل رہے تھے مگر انہیں شیعۂ امیرالمومنین قرار دے کر شیعیت کو مورد الزام قرار دینا صحیح نہیں ہے اس لئے کہ حضرت کی صفوں میں ایک ہی مسلک و عقیدہ کے لوگ نہ تھے۔ ان میں ایک طبقہ ایسا ضرور تھا جو ان کی امامت کو منصوص سمجھتا تھا اور جانشین رسولؐ ہونے کی حیثیت سے ان کی اطاعت کو ضروری اور نافرمانی کو حرام جانتا تھا۔ یہ لوگ نہ کسی وقت بدلے اور نہ کسی حالت میں آپ کا ساتھ چھوڑا۔ اور ایک گروہ جو اکثریت میں تھا آپ کی خلافت کو جمہور کی آراء سے وابستہ سمجھتا تھا اور جس حیثیت سے پہلے خلفاء کو مانتا چلا آرہا تھا اسی حیثیت سے حضرت کو بھی چوتھے درجہ پر قرار دے کر ان کے ساتھ ہوگیا تھا۔ یہ لوگ امیرالمومنین کے برسر اقتدار آنے سے پہلے دوسروں سے منسلک رہے اور حضرت کے برسر اقتدار آنے کے بعد معاویہ کے مقابلہ میں ان کے ساتھ ہوگئے اور انہی میں ایک گروہ نے جب امیرالمومنین کو اپنی طبیعت و مزاج کے موافق نہ پایا تو تحکیم کا حیلہ تراش کر حضرت سے کٹ گیا اور جو لوگ موقع و وقت دیکھ کر ساتھ ہو جاتے ہیں وہ موقع و وقت دیکھ کر ساتھ چھوڑ بھی سکتے ہیں۔ یہ نہ اس وقت امیرالمومنین کے مخلص تھے جب اُن کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور نہ اس وقت شیعیانِ علی میں شامل تھے جب بیعت توڑ کر الگ ہوئے تھے۔ یہ لوگ تو سرے سے امیرالمومنین کی خلافت چاہتے ہی نہ تھے بلکہ کوفہ والے چاہتے تھے کہ زبیر خلیفہ ہوں اور بصرہ والے چاہتے تھے کہ طلحہ برسر اقتدار آئے۔ اور جب طلحہ و زبیر کی خلافت کی صورت پیدا نہ ہوسکی تو انہوں نے اہل مدینہ کے انتخاب سے موافقت کرتے ہوئے حضرت کی خلافت پر رضامندی کا اظہار کردیا۔ بہرحال جس فوج میں ایسے عناصر شامل ہوں اسے اتنے عرصہ تک دشمن کی صفوں کے مقابلہ میں ثابت قدم رکھنا امیرالمومنین کے حسنِ تدبر ہی کا کرشمہ ہوسکتا ہے ورنہ جہاں اندر ہی اندر بددلی پھیلائی جارہی ہو عہدوں پر بک جاتے ہوں اور روپیہ پیسہ کے لالچ میں اپنا موقف چھوڑ دیتے ہوں وہاں اس کے علاوہ اور توقع ہی کیا کی جاسکتی تھی کہ وہ عین فتح کے وقت ہتھیار رکھ کر فتح کو شکست سے بدل دیں۔

حکمین کا فیصلہ

۱۳ / ماہ صفر ۳۷ھ میں تحکیم کی قرارداد منظور ہوئی اور ماہ شعبان ۳۷ھ میں دونوں حکم ابوموسٰی

اور عمرو ابن عاص معان اور وادیٔ موسٰی کے درمیان مقام اذرح میں جمع ہوئے اور حسب قرار داد دونوں جماعتوں کے چار چار سو آدمی بھی پہنچ گئے۔ شامی وفد کا قائد ابو الاعور سلمی تھا اور عراقی وفد کے سربراہ عبداللہ ابن عباس اور شریح ابن ہانی تھے امامتِ نماز کا فریضہ ابن عباس سے متعلق تھا اور شریح وفد کی قیادت کے علاوہ عمرو ابن عاص کے نام حضرت کا ایک پیغام لے کر بھی آئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے عمرو ابن عاص سے ملاقات کی اور اس سے کہا کہ امیرالمومنین علی نے تمہیں پیغام دیا ہے کہ اللہ کے نزدیک بہترین انسان وُہ ہے جو باطل کی راہ سے مُنہ موڑ کر حق کی شاہراہ پر گامزن رہے اگرچہ باطل سے فائدہ اور حق سے نقصان کیوں نہ پہنچتا ہو۔ لہٰذا تم جان بُوجھ کر حق سے آنکھ بند نہ کرنا اور نہ دنیوی اقتدار کی خاطر اللہ اور اس کے رسُول کی دشمنی مُول لینا۔ اس دُنیا سے جو کچھ تمہیں حاصل ہو گا وُہ آخر تم سے چھن جائے گا۔ وُہ دِن دُور نہیں ہے جب تم بستر مرگ پر کروٹیں لیتے ہوئے اپنے ہاتھ کاٹو گے اور یہ کہو گے کہ کاش میں نے ظالموں سے تعاون کر کے کسی مردِ مُسلم کی عداوت مول نہ لی ہوتی اور رشوت کی پیشکش قبول کر کے غلط فیصلہ نہ کیا ہوتا۔ عمرو نے یہ پیغام سُنا تو کہا:۔

متی کنت اقبل مشورۃ علی	ایسا موقع کب آیا ہے کہ میں نے علی کا مشورہ
اوانتھی الی امرہ اواعتد	قبول کیا ہو یا اُن کی رائے پر عمل کیا ہو یا
برایہ۔ (تاریخ کامل ج۳ ص۱۶۷)	اُن کی رائے کو کوئی وزن دیا ہو"۔

شریح نے کہا کہ اے نابغہ کے بیٹے اگر تم امیرالمومنین کے مشورہ کو لائق اعتناء نہیں سمجھتے تو حضرت ابوبکر و حضرت عمر تک ان سے مشورے لیتے رہے ہیں جو بہر حال تم سے بہتر تھے۔ عمرو نے کہا کہ مجھ ایسا آدمی تم سے گفتگو کرنا گوارا نہیں کر سکتا۔ شریح نے کہا کہ یہ غرور و تمکنت عاصی ابن وائل کی طرف نسبت کی بنا پر ہے یا ماں کی شہرت کی بنا پر اور یہ کہہ کر اُٹھ کھڑے ہُوئے اور واپس چلے آئے۔

اس اجتماع سے قبل معاویہ نے عبداللہ ابن عمر، عبداللہ ابن زبیر، ابوالجہم ابن حذیفہ اور عبدالرحمٰن ابن عبد یغوث کو تحریر کیا تھا کہ تم لوگ جنگ صفین میں تو شریک نہیں ہو سکے لیکن تمہیں ایک مبصر کی حیثیت سے اذرح میں پہنچنا چاہیئے تاکہ تحکیم کی کاروائی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکو۔ چنانچہ یہ لوگ کاروائی کے شروع ہونے سے پہلے پہنچ گئے۔ ان کے علاوہ عبدالرحمٰن ابن ابی بکر، سعد ابن ابی وقاص اور مغیرہ ابن شعبہ بھی تحکیم کا جائزہ لینے کے لئے چلے آئے۔ مغیرہ نے اذرح میں پہنچ کر ابو موسی اور عمرو ابن عاص سے علیحدہ علیحدہ ملاقات کی اور ان کا عندیہ معلوم کیا اور پھر معاویہ کے ہاں دمشق پہنچ گیا۔ معاویہ نے پوچھا کہ تم نے حالات کا بنظرِ غائر جائزہ لیا ہو گا تمہارا کیا خیال ہے کہ حکمین کس کے حق میں فیصلہ کریں گے کہا کہ میں نے ابو موسٰی اور عمرو ابن عاص سے الگ الگ ملاقات کی تھی ابو موسی کی باتوں

سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وُہ علی کو خلافت سے علیحدہ کر کے کسی ایسے شخص کے سپرد کرنا چاہتا ہے جو جنگ سے کنارہ کش رہا ہو اس لئے کہ اس کا نظریہ یہ ہے کہ وہی لوگ قوم و ملت کے لئے مفید ثابت ہو سکتے ہیں جنہوں نے فریقین میں سے کسی فریق کا ساتھ نہ دیا ہو اور نہ اُن کے ہاتھ مسلمانوں کے خون سے رنگین ہوئے ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کا جھکاؤ عبداللہ ابن عُمر کی طرف ہے۔ اور عمرو ابن عاص کی افتاد طبیعت سے تم بخوبی واقف ہو اس کا نظریہ ابو موسٰی کے نظریہ سے بالکل مختلف ہے وُہ جنگ میں غیر جانبدار رہنے والوں کو غلط کار سمجھتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ خود خلیفہ بنے یا اپنے بیٹے عبداللہ کو خلیفہ بنائے کیونکہ وُہ اپنے اور اپنے بیٹے کے مقابلہ میں کسی کو خلافت کا اہل نہیں سمجھتا۔ معاویہ نے یہ سُنا تو پریشان ہو گئے۔ عمرو سے رابطہ قائم کیا تو اُس نے نامہ و پیام سے ان کو تسلی کر دی۔

فیصلہ صادر کرنے سے پہلے حکمین کا کسی متفقہ فیصلہ پر پہنچنا ضروری تھا۔ چنانچہ وُہ تبادلۂ خیالات کے لئے ایک مقام پر جمع ہوئے اور بات چیت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ عمرو ابن عاص نے ابو موسٰی سے کہا کہ تمہارا عثمان کے بارے میں کیا خیال ہے کیا وُہ مظلوم نہیں مارے گئے کہا کہ ہاں وُہ مظلوم مارے گئے اور اُن کا قتل ناروا تھا۔ کہا کہ معاویہ اُن کے ولی و وارث ہیں اور قرآن مجید میں ہے:۔

ومن قتل مظلوما فقد جعلنا لولیہ سلطانا۔ جو شخص مظلوم قتل کر دیا جائے ہم نے اس کے ولی کو حق قصاص دیا ہے۔"

اس کے علاوہ معاویہ کو جو خاندانی عظمت و بلندی حاصل ہے وُہ نہ تم سے پوشیدہ ہے اور نہ کسی اور سے مخفی ہے۔ وُہ پیغمبر کے صحابی دربار نبوت کے کاتب اور ام المومنین ام حبیبہ کے بھائی ہیں۔ لہذا ان پہلوؤں کو نظر انداز کر کے ہمیں ان کے خلاف فیصلہ نہیں کرنا چاہیئے۔ تمہیں اس امر کا بھی اندازہ ہو چکا ہو گا کہ اگر وُہ برسر اقتدار آ گئے تو جو فوائد ان سے حاصل ہو سکتے ہیں اُن کی توقع کسی اور سے نہیں کی جا سکتی۔ ابو موسٰی نے عمرو کی باتوں کے جواب میں کہا کہ تم نے جو یہ کہا ہے کہ معاویہ عثمان کا ولی ہے تو ان کے بیٹوں کے ہوتے ہُوئے وُہ ولی کیسے ہو گئے۔ عثمان کا ولی اُن کا بیٹا عمرو ہے یہ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ہم مہاجرین اولین کو نظر انداز کر کے اس شخص کو خلافت کے لئے منتخب کریں کہ جسے نہ اسلام میں سبقت حاصل ہے اور نہ کوئی فضیلت۔ اور جس خاندانی بلندی کا تم نے ذکر کیا ہے تو اگر ہم اسے ہی میعار خلافت قرار دے لیں تو پھر ابرہہ ابن صباح کی اولاد میں سے کسی کو خلیفہ بنانا چاہیئے اس لئے کہ وُہ ان بادشاہوں کی نسل میں سے ہو گا جو شرق و غرب عالم پر حکومت کرتے رہے ہیں۔ باقی رہا منافع کا سوال تو میں رشوت لے کر بک نہیں سکتا۔ میری رائے میں اس وقت موزوں ترین شخصیت عبداللہ ابن عمر کی ہے۔ ہم اُسے برسر اقتدار لا کر حضرت عمر کا نام زندہ کر سکیں گے۔ عمرو نے کہا کہ پھر میرا بیٹا عبداللہ کیا بُرا ہے وُہ صاحب علم و فضل بھی ہے اور صالح بھی ہے اور اُسے صحبت رسُول اور

ہجرت کا شرف بھی حاصل ہے کہا کہ یہ درست ہے مگر اس کے ہاتھ خون سے رنگین ہیں اور وہ تمہارے ساتھ شریک جنگ رہ چکا ہے میں عبداللہ ابن عمر ہی کو ترجیح دوں گا اس لئے کہ وہ جنگ سے علیحدہ اور غیر جانبدار رہا ہے۔ عمرو نے کہا کہ اقتدار تو اسی کو سونپا جا سکتا ہے جو صرف اپنا پیٹ بھرنا ہی نہ جانتا ہو بلکہ دوسروں کے پیٹ کا بھی خیال رکھے۔ ابوموسیٰ نے کہا کہ مسلمانوں نے ایک خونریز جنگ کے بعد یہ معاملہ ہمارے سپرد کیا ہے ہمیں فکر و تامل سے اسے سلجھانا چاہیئے اور کوئی نیا شاخسانہ کھڑا نہ کرنا چاہیئے۔ کہا کہ پھر تم ہی بتاؤ کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ کہا کہ میرے ذہن میں ایک تجویز یہ بھی ہے کہ علی اور معاویہ دونوں کو معزول کر دیا جائے اور مسلمانوں کو یہ اختیار دے دیا جائے کہ وہ شوریٰ کے ذریعہ جسے چاہیں منتخب کر لیں۔ عمرو نے کہا کہ یہ تجویز بری نہیں ہے میں اس سے متفق ہوں۔ چنانچہ دونوں ثالثوں نے اس تجویز پر اتفاق رائے کے بعد اس کے اعلان کا فیصلہ کر لیا۔

اس تصفیہ کے بعد جب دونوں الگ الگ ہوئے تو ابن عباس نے ابوموسیٰ سے کہا کہ اے ابوموسیٰ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو فیصلہ متفقہ طور پر تمہارے درمیان ہوا ہے عمرو اس کا پابند نہیں رہے گا وہ ہوشیار و چالاک ہے ضرور تمہیں فریب دے گا۔ لہٰذا جب اعلان کا موقع آئے تو پہلے اسے اعلان کرنے دینا اور بعد میں تم اعلان کرنا۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو یاد رکھو کہ وہ ایسا چکمہ دے گا کہ تم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گے۔ ابوموسیٰ نے کہا کہ ہم جس امر پر متفق ہوئے ہیں اس میں کسی فریب یا ہیر پھیر کی گنجائش نہیں ہے۔ جب اس تصفیہ کے دوسرے دن شام و عراق کے نمائندے مبصرین اور دونوں ثالث مسجد جامع میں جمع ہوئے تو عمرو نے ابوموسیٰ سے کہا کہ آپ اعلان کریں۔ عمرو نے پہلے سے یہ وتیرہ اختیار کر رکھا تھا کہ وہ ہر بات میں ابوموسیٰ کو مقدم کرتا اور اسے یہ تاثر دینے کی کوشش کرتا کہ چونکہ وہ بزرگ اور پہلے کا صحابی ہے لہٰذا اس پر سبقت کرنا ایک طرح سے سوء ادب اور ناقابل تلافی جرم ہے۔ اور ابوموسیٰ بھی اپنی روایتی سادہ لوحی کی وجہ سے یہ سمجھتا تھا کہ یہ آؤ بھگت اس کے مرتبہ و مقام کی وجہ سے ہے اس نے ابن عباس کی نصیحت کو نظر انداز کر دیا اور بڑی تمکنت سے اٹھا اور فراز منبر پر بلند ہو کر حمد و ثنا پر مشتمل خطبہ پڑھا اور پھر مجمع سے مخاطب ہو کر کہا اے لوگو ہم نے اُمت کی فلاح و یکجہتی کے پیش نظر بڑے غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہم دونوں علی اور معاویہ کو معزول کر دیں اور امر خلافت شوریٰ کے حوالے کر دیں۔ لہٰذا میں علی اور معاویہ دونوں کو برطرف کرتا ہوں اب تم جسے چاہو اسے سربراہ مملکت منتخب کر لو۔

یہ اعلان عراقیوں کے لئے بڑا حوصلہ شکن تھا مگر وہ بڑے ضبط و صبر سے بیٹھے رہے تاکہ عمرو ابن عاص کی زبان سے بھی یہ فیصلہ سن لیں۔ عمرو ابن عاص نے منبر پر کھڑے ہو کر حمد و ثناء کے بعد کہا اے لوگو ابوموسیٰ نے جو کچھ کہا ہے وہ تم نے سن لیا ہے وہ علی کے مقرر کردہ نمائندے ہیں انہوں نے علی کو

معزول کردیا ہے۔ مَیں بھی انہیں اسی طرح معزول کرتا ہوں جس طرح انہوں نے معزول کیا ہے لیکن معاویہ کو برقرار رکھتا ہوں کیونکہ وُہ عثمان کے ولی ان کے قصاص کے خواہاں اور اُن کی نیابت وجانشینی کے اہل ہیں۔ اس اعلان پر شامیوں نے نعرے لگائے، عراقیوں نے حیرت واستعجاب سے ایک دُوسرے کو دیکھا۔ اس پُرفریب اعلان پر بگڑے چیخے چلّائے مگر جو ہونا تھا وُہ ہوچکا فریب اپنا کام کرگیا۔ ابو موسیٰ جو اس غلط فیصلہ کا بڑی حدتک ذمّہ دار تھا وُہ بھی عمرو کی بدعہدی وفریب کاری پر سٹپٹایا اور اس سے کہا کہ اے ابن عاص خدا تجھ سے اپنی توفیقات کو سلب کرے تُو نے مجھے اندھیرے میں رکھا اور آخر میں دھوکا دیا تمہاری مثال کتے کی سی ہے وُہ ہانپے گا اور زبان نکالے گا چاہے اس پر حملہ کرو چاہے اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دو۔ عمرو نے بھی اس کی بزرگی وصحابیت کی بساط لپیٹ دی اور بگڑ کر کہا:۔

ومثلك كمثل الحمار يحمل اسفارا۔ (اخبار الطوال ص۲۰۰)	تمہاری مثال اس گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں لاد دی گئی ہوں"۔

شریح ابن ہانی اس مکارانہ کاروائی پر ضبط نہ کرسکے اور آگے بڑھ کر عمرو پر کوڑا برسایا۔ اس نے بھی کوڑا اٹھا لیا۔ کچھ لوگوں نے بیچ میں پڑ کر انہیں چھڑایا۔ شریح اس کے بعد کہا کرتے تھے:۔

ما ندمت على شئ ندامتى على ضرب عمرو بالسوط ولم اضربه بالسيف۔ (تاریخ کامل ج۳۔ ص۱۶۸)	میں کسی بات پر اتنا نہیں پچھتایا جتنا اس بات پر پچھتا تا ہوں کہ مَیں نے کوڑے کے بجائے عمرو پر تلوار کیوں نہ چلائی"۔

ابن عباس نے بھی پیچ وتاب کھاتے ہوئے ابو موسیٰ سے کہا کہ تم نے میری بات پر عمل نہ کرنے کا نتیجہ دیکھ لیا اور اس میں تمہارا قصور نہیں ہے تم سے اسی کی توقع ہوسکتی تھی۔ اس میں قصور ہے تو ان لوگوں کا جنہوں نے تمہیں نا اہل ہونے کے باوجود ثالث بنایا۔ عبد الرحمٰن ابن ابی بکر نے کہا:۔

لو مات الاشعرى قبل هذا اليوم لكان خيرا له۔ (تاریخ کامل ج۳ ص۱۶۸)	ابو موسیٰ کے لئے بہتر یہی تھا کہ وُہ اس دن سے پہلے ہی مر کھپ گیا ہوتا"۔

غرض اس طرح اور لوگوں نے بھی اس کی سادہ لوحی وفریب خوردگی کا رونا رویا اور اُسے بُرا بھلا کہا مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا اب کون دیکھتا تھا کہ فیصلہ کیا ہوا تھا اور اعلان کیا ہوا۔ شامی فتح وکامرانی کے نعرے لگاتے ہُوئے دمشق کی طرف روانہ ہوگئے اور وہاں پہنچ کر معاویہ کو خلافت

کسی نے انہیں اُمیدوار نامزد کیا تھا اور امیر المومنین کی خلافت کو شام کے علاوہ حجاز، مصر، یمن، خراسان تمام صوبوں کے باشندے تسلیم کر چکے تھے اور ان کا انتخاب بھی صحابہ کبار کی رائے سے عمل میں آیا تھا اس کے بعد خلافت کے سلسلہ میں دونوں کا یکساں نام لینا اموی سازش کا کرشمہ نہ تھا تو کیا تھا۔ امیر المومنین اس چیز کو سمجھتے تھے اسی لئے انہوں نے نمائندوں کے انتخاب کے موقع پر ابو موسیٰ پر عدم اعتماد کا اظہار کیا تھا اور جنگ جمل کے موقع پر اس کے کردار کو دیکھنے کے بعد اس پر اعتماد کیا بھی کیسے جا سکتا تھا۔ اس غلط انتخاب کی ذمہ داری انہی لوگوں پر عائد ہوگی جو اس کے انتخاب پر زور دیتے رہے تھے حالانکہ وہ اس امر سے بے خبر نہ تھے کہ ابو موسیٰ حضرت سے بغض و عناد کی بنا پر ان کے لئے مفید ثابت نہیں ہو سکتا۔

ابو موسی یہ بھی سمجھتا تھا کہ حضرت علی کے کامیاب ہونے کی صورت میں اُسے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا البتہ معاویہ کی حمایت کا صلہ کسی عہدہ کی صورت میں مل سکتا ہے۔ چنانچہ وہ معاویہ کے برسر اقتدار آنے کے بعد سر پر ایک لانبی ٹوپی رکھے ان کے ہاں پہنچ گیا اور بصد احترام السّلام علیك یا امین الله کہہ کر انہیں فرشی سلام کیا۔ معاویہ سمجھ گئے کہ یہ اپنی کارکردگی کا صلہ مانگنے آیا ہے جب وہ ادھر ادھر ہوا تو معاویہ نے درباریوں سے کہا:۔

قدم الشیخ لاولیه ولا والله لا اولیه۔	یہ بزرگ اس لئے آئے ہیں کہ میں انہیں کسی صوبہ کا حاکم بنا دوں مگر خدا کی قسم میں انہیں کوئی عہدہ نہیں دوں گا۔"

(تاریخ طبری ج ۶ ص ۲۴۵)

اس تحکیم اور اس کے بے ضابطہ فیصلہ کے نتیجہ میں اختلافات ویسے کے ویسے باقی رہے بلکہ امیر المومنین کے خلاف دو طرفہ محاذ قائم ہو گیا ایک طرف خوارج تھے اور دوسری طرف اہل شام اور اب ان دونوں سے نمٹنے کا مرحلہ درپیش تھا۔

جنگِ نہروان

ابو موسی نے امیر المومنین کی برطرفی اور عمرو ابن عاص نے اس برطرفی کے ساتھ معاویہ کے تقرر کا جو کھیل کھیلا اور جس طرح قرآن و سُنّت کے تقاضوں کو نظر انداز کیا اور عہد و پیمان کی دھجیاں اُڑائیں وہ تاریخ پر نظر رکھنے والوں سے مخفی نہیں ہے۔ وہ لوگ جو امیر المومنین کو میدان حرب و ضرب میں شکست نہ دے سکے وہ مکر و فریب کے میدان میں بازی لے گئے۔ اور حق و دیانت سے مُنہ موڑ کر معاویہ کے مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بن گئے۔

امیر المومنین کے لئے حکمین کا فیصلہ خلاف توقع نہ تھا بلکہ تحکیم کی قرارداد کو بروئے کار لائے

والے افراد کو دیکھ کر سمجھ رہے تھے کہ یہ دونوں معاویہ کی جنبہ داری اور اُن کے اقتدار کا تحفظ کریں گے اگرچہ خوارج فیصلۂ تحکیم سے پہلے آپ کو جنگی قدم اُٹھانے پر مجبور کرتے رہے مگر آپ نے معاہدہ کی خلاف ورزی گوارا نہ کی۔ اور جب حکمین نے اپنے حدودِ کار سے تجاوز کر کے قاتلانِ عثمان کے بارے میں فیصلہ کرنے کے بجائے خلافت کا فیصلہ کر دیا اور اس سلسلہ میں نہ قرآن کی طرف رجوع کیا اور نہ سنت رسُول کو پیش نظر رکھا حالانکہ یہ دونوں چیزیں قرار داد میں بنیادی حیثیت سے شامل تھیں تو آپ نے اہل شام سے دوبارہ جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا اس لئے کہ امیر المومنین کے لئے دو ہی صورتیں تھیں یا تو باطل کے آگے سر جھکا دیں یا شام پر دوبارہ چڑھائی کر دیں۔ پہلی صورت ممکن ہی نہ تھی کہ حق کو پامال ہوتے دیکھیں اور خاموش رہیں اور دُنیا کو یہ تاثر دیں کہ حکمین نے جو فیصلہ کیا ہے وُہ صحیح اور مطابق کتاب و سُنّت ہے۔ اب یہی ایک صُورت تھی کہ لشکر ترتیب دے کر شام کی طرف قدم بڑھائیں تاکہ معاویہ کی فریب کاری اور حکمین کی عہد شکنی عالم آشکارا ہو جائے۔

جب امیر المومنین نے شام پر چڑھائی کا ارادہ کر لیا تو چاہا کہ خوارج کو بھی جو شام پر حملہ آور ہونے کے لئے بے چین تھے شریک جنگ ہونے کی دعوت دیں۔ چنانچہ آپ نے عبد اللہ ابن وہب اور یزید ابن حصین کو تحریر کیا کہ "ہم نے جن دو آدمیوں کو حکم تسلیم کیا تھا انہوں نے کتاب خدا کی خلاف ورزی کی ہے اور نفسانی خواہشات کی رو میں بہہ گئے ہیں انہوں نے نہ قرآن پر عمل کیا اور نہ سنت رسول پر اب ہمارا موقف وہی ہے جو تحکیم سے پہلے تھا لہٰذا تم ہم سے تعاون کرو تاکہ اپنے مشترکہ دشمن کی طرف قدم بڑھائیں اور اُن سے جنگ کریں یہاں تک کہ اللہ ہمارے اور اُن کے درمیان فیصلہ کرے اور وُہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے"۔ خوارج نے جواب میں تحریر کیا کہ اب آپ خدا کی خوشنودی کی خاطر جنگ کے لئے کھڑے نہیں ہوئے بلکہ اپنے نفس کی خاطر جنگ لڑنا چاہتے ہیں اگر آپ اپنے کفر کا اعتراف کر کے توبہ کریں تو پھر ہم غور کریں گے کہ ہمیں آپ کا ساتھ دینا چاہیئے یا نہیں اور اگر آپ نے اقرار کفر کے بعد توبہ نہ کی تو ہم آپ سے لڑیں گے اور اللہ خیانت کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ جب امیر المومنین نے دیکھا کہ خوارج ساتھ دینے پر تیار نہیں ہیں تو انہیں نظر انداز کر کے فوج کی فراہمی میں مصروف ہو گئے اور اہل کوفہ کے ایک اجتماع میں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:-

"اے اہل کوفہ یاد رکھو کہ جو جہاد سے ہاتھ اٹھا لیتا ہے وُہ تباہی و بربادی سے دو چار ہوئے بغیر نہیں رہتا اٹھو اور اُن لوگوں کے مقابلہ میں کمر بستہ ہو جاؤ جو اللہ اور اُس کے رسُول کے دشمن ہیں اور خدا کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں یہ ظالم خطا کار اور راہِ حق سے برگشتہ ہیں۔ یہ نہ قرآن کو سمجھتے ہیں اور نہ دین میں سوجھ بوجھ رکھتے ہیں اور نہ خلافت کے اہل ہیں۔ خدا کی قسم اگر یہ لوگ برسر اقتدار آ گئے تو اسلامی قدروں کو پائمال کر کے ہرقلی و کسروی نظام قائم کریں گے اٹھو اور ان دشمنانِ دین سے جنگ کرو

اور کہا کہ قرآن کی رو سے اُن کا مطالبہ جائز ہے لہذا ہمیں ان لوگوں کو ان کے گھروں تک پہنچانا چاہیے چنانچہ انہیں ان کے گھروں تک چھوڑ گئے اور اس طرح واصل نے تقیہ کا سہارا لے کر اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جانوں کا تحفظ کیا۔

اسی طرح صحابی رسُول خباب ابن ارت کے فرزند عبداللہ گلے میں قرآن حمائل کئے ان کے قریب سے گذرے تو انہیں روک لیا اور پوچھا کہ تم کون ہو کہا کہ میں صحابئ رسُول خباب کا بیٹا عبداللہ ہوں کہا کہ اگر تم ہمیں دیکھ کر خوفزدہ ہو گئے ہو تو اپنے دل سے خوف و ہراس نکال ڈالو ہم چاہتے ہیں کہ تم سے وُہ حدیث سُنیں جو تم نے اپنے باپ سے روایت کی ہو کہا کہ میرے باپ نے رسُول اللہ کو فرماتے سُنا۔

تکون فتنة یموت فیها قلب الرجل کما یموت فیه بدنه یمسی فیها مومنا ویصبح کافرا ویصبح کافرا ویمسی مومنا۔ (تاریخ کامل ج۳ ص۱۷۲)

ایک فتنہ کھڑا ہو گا جس میں انسان کا دل مردہ ہو جائے گا جس طرح اس کا بدن مردہ ہو جاتا ہے وُہ شام کو مومن ہو گا اور صبح ہوتے کافر ہو جائے گا اور صبح کافر ہو گا اور شام ہوتے مومن ہو جائے گا"۔

خوارج نے کہا کہ ہم تمہاری زبان سے یہی حدیث سُننا چاہتے تھے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ علی کے بارے میں جبکہ انہوں نے نظریۂ تحکیم تسلیم کر لیا کیا کہتے ہو کہا:۔

انه اعلم بالله منکم واشد توقیا علی دینه وانفذ بصیرة۔ (تاریخ کامل ج۳ ص۱۷۲)۔

وُہ تم لوگوں سے زیادہ اللہ کو پہچانتے ہیں اور دین میں انتہائی محتاط اور کامل بصیرت رکھتے ہیں"۔

کہا کہ تم شخصیت پرست ہو اور کام کے بجائے نام سے متاثر ہو خدا کی قسم ہم تمہیں ہوائے نفس کی پیروی کی سزا دیں گے اور اس طرح قتل کریں گے کہ کسی اور کو یُوں قتل نہ کیا ہو گا۔ یہ کہہ کر ان کی مشکیں باندھ لیں اور انہیں اور اُن کی بیوی کو جو حاملہ تھیں ایک درخت خرما کے قریب لے آئے۔ اس درخت پر سے کھجور کا ایک دانہ زمین پر گرا جسے ایک خارجی نے اُٹھا کر مُنہ میں رکھ لیا۔ لوگوں نے شور مچا دیا حرام حرام۔ اس نے فوراً خرما منہ سے پھینک دیا۔ اتنے میں ایک خنزیر ادھر سے گزرا ایک خارجی نے اسے مار ڈالا۔ اس کے ساتھیوں نے کہا کہ یہ فساد فی الارض ہے اور اس وقت تک انہوں نے چین نہ لیا جب تک اس کے مالک کو بُلا کر راضی نہ کر لیا۔ عبداللہ نے ان کا یہ طرز عمل دیکھا تو کہا کہ جب تم لوگ ذرا ذرا سی بات میں اتنی احتیاط برتتے ہو تو مجھے تم لوگوں سے کوئی خطرہ نہ ہونا چاہیئے جبکہ میں مسلمان بھی ہوں اور کسی ایسے جرم کا مرتکب بھی نہیں ہوا جس کی سزا قتل ہو مگر انہوں نے کوئی بات نہ سُنی

اور انہیں زمین پر پچھاڑ کر نہایت بے دردی سے قتل کر دیا اور ان کی بیوی کا پیٹ چاک کر کے اُسے بھی موت کے گھاٹ اتار دیا اور بنی طے کی تین عورتوں اور ام سنان صیداویہ کو بھی ذبح کر ڈالا۔ اس بہیمانہ و سفاکانہ قتل سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے ایک عیسائی سے ایک درخت خرما کا پھل خریدنا چاہا اس نے کہا کہ مجھے قیمت نہیں چاہیئے تم یُونہی لے لو۔ کہا کہ ہم ایک ذمی کا مال قیمت ادا کئے بغیر نہیں لیں گے۔ اس نصرانی نے حیرت سے کہا کہ تم ابن خباب ایسے شخص کو بے گناہ مار ڈالتے ہو اور ایک درخت کا پھل بے قیمت لینا گوارا نہیں کرتے۔

ان وحشت و بربریت کے مظاہروں کے بعد انہیں ان کے حال پر چھوڑ دینا مملکت کے لئے انتہائی خطرناک تھا کیونکہ امیر المومنین دار الحکومت کوفہ کو خالی چھوڑ کر شام پر چڑھائی کے ارادہ سے نکلنے والے تھے اور کوفہ خوارج کے مرکز سے قریب تھا اور خود کوفہ میں بھی ان کے ہم خیال لوگ موجود تھے۔ ان حالات میں یہ قوی اندیشہ تھا کہ وہ حضرت کی عدم موجودگی میں بلا مزاحمت دار الحکومہ پر قبضہ کر لیں اور اپنے مخالفین کا قتل عام شروع کر دیں۔ حضرت کے لشکر میں اکثریت اہل کوفہ کی تھی ان کے اہل و عیال اور املاک و اموال خوارج کی دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکتے تھے اس لئے یہی مناسب سمجھا گیا کہ پہلے ان سے نمٹ لیا جائے اور پھر شام کا رُخ کیا جائے۔ چنانچہ لشکر والوں نے حضرت سے اس خیال کا اظہار کیا آپ نے خوارج کا جائزہ لینے کے لئے حارث ابن مرہ عبدی کو ان کے ہاں بھیجا مگر خوارج نے انہیں بھی قتل کر دیا۔ اب کوئی چارہ نہ تھا کہ پہلے خوارج سے نمٹا جائے اور پھر شام کی جانب کوچ کیا جائے۔ چنانچہ حضرت نے شام جانے کے بجائے نہروان جانے کا حکم دے دیا۔ جب لشکر روانہ ہونے لگا تو مسافر ابن عفیف ازدی نے کہا کہ یا امیر المومنین میں ستاروں کی گردش کو پہچانتا ہوں یہ نیک ساعت نہیں ہے جب تین گھڑی دن گزر جائے اس وقت سفر کا آغاز کیا جائے ورنہ لشکر کو شدید نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ تم بتا سکتے ہو کہ میری گھوڑی کے پیٹ میں کیا ہے؟ کہا کہ میں حساب لگا کر بتا سکتا ہوں۔ فرمایا جو تمہاری اس بات پر یقین کرے گا وُہ قرآن مجید کے جھٹلانے کا مرتکب ہوگا۔ قرآن یہ کہتا ہے:۔

ان اللہ عندہ علم الساعۃ و ینزل الغیث ویعلم ما فی الارحام	اللہ ہی کو قیامت کا علم ہے وہی مینہ برساتا ہے اور وہی جانتا ہے کہ شکموں کے اندر کیا ہے"

پھر اس منجم کو تہدید و سرزنش کی اور لشکر والوں سے فرمایا کہ ان چیزوں کو خاطر میں نہ لاؤ اور اللہ پر بھروسا کر کے چل کھڑے ہو۔

جب لشکر نے نہروان کی راہ لی تو آگے بڑھ کر متعدد آدمیوں کے ذریعہ معلوم ہوا کہ خوارج حلوان و بغداد کے درمیان نہر طبرستان کو عبور کر کے پار اُتر گئے ہیں۔ امیر المومنین کو جب اس کی اطلاع

دی گئی تو آپ نے فرمایا کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا وُہ ابھی اسی طرف ہیں اور دریا کے ادھر ہی رمیلہ کی سرزمین پر قتل کئے جائیں گے۔ اتنے میں مقدمۃ الجیش کا ایک سپاہی دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ میں نے اپنی آنکھوں سے انہیں پُل کے ذریعہ پار اُترتے دیکھا ہے۔ حضرت نے تین مرتبہ اُس سے دریافت کیا اس نے ہر مرتبہ قسم کھا کر یہی کہا کہ وُہ دریا کے اُدھر جا چکے ہیں۔ حضرت نے فرمایا:۔

واللہ ما عبروہ وان مصارعھم لدون الجسر و واللہ لا یقتل منکم عشرۃ ولا یسلم منھم عشرۃ (تاریخ کامل ج۳ ص۱۷۴)۔	خدا کی قسم انہوں نے نہر کو عبور نہیں کیا ان کے قتل ہو کر گرنے کی جگہ پل کے ادھر ہے۔ خدا کی قسم تم میں سے دس آدمی بھی قتل نہیں ہوں گے اور اُن میں سے دس بھی نہیں بچیں گے۔"

ایک طرف پے در پے یہ خبریں آ رہی تھیں کہ خوارج پار اُتر گئے ہیں اور ادھر امیر المومنین برابر یہ فرما رہے تھے کہ وُہ نہر کے ادھر ہی ہلاک ہوں گے اس سے بعض لوگوں کے دلوں میں شبہات پیدا ہُوئے اور ایک نوجوان نے تیور چڑھا کر یہاں تک کہہ دیا کہ اگر خوارج نے دریا عبور کر لیا ہو گا تو میں حضرت پر نیزہ تان کر کھڑا ہو جاؤں گا کہ اب آپ عالم غیب کی خبریں بھی دینے لگ گئے ہیں۔ امیر المومنین نے کچھ لوگوں کی یہ ذہنی کیفیت دیکھی تو گھوڑے کو ایڑ لگائی اور تیزی سے نہر کی طرف بڑھے۔ جب نہر کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ خوارج نہر کے ادھر ہی پڑاؤ ڈالے پڑے ہیں اور اسے عبور نہیں کیا ہے۔ اتنے میں لشکر بھی پہنچ گیا اس نے خوارج کو نہر کے ادھر دیکھا تو اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ حضرت نے لشکر سے مخاطب ہو کر فرمایا:۔

واللہ ما کذبت ولا کذبت (تاریخ کامل ج۳ ص۱۷۴)۔	خدا کی قسم نہ میں نے جھوٹ کہا ہے اور نہ مجھے جھوٹی خبر دی گئی تھی"۔

امیر المومنین نے خوارج سے تین میل کے فاصلہ پر پڑاؤ ڈال دیا۔ خارجیوں نے لشکر کو دیکھا تو لاحکم الا للہ کا نعرہ لگایا اور حضرت کو پیغام بھجوایا کہ اب بھی آپ تائب ہو جائیں تو ہم آپ کی بیعت کر لیں گے ورنہ خلافت سے علیحدہ ہو جائیے تاکہ ہم اپنا کوئی امام منتخب کریں۔ حضرت نے انہیں کہلوایا کہ ہمارے دوستوں کے قاتلوں کو ہمارے حوالے کرو تاکہ ہم ان سے قصاص لیں اور اس کے بعد جب تک ہم شام کی جنگ سے فارغ نہیں ہو جاتے تم سے کوئی تعرض نہیں کریں گے اور تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دیں گے شائد اس عرصہ میں اللہ تمہیں سوچنے سمجھنے اور حق کی طرف پلٹ آنے کی توفیق دے دے۔ خوارج نے جواب میں کہا کہ ہم سب نے آپ کے بھائی بندوں کو قتل کیا ہے اور ہم سب آپ کا اور اُن کا خون بہانا جائز و مباح سمجھتے ہیں۔

امیر المومنین نے خوارج کے اس جواب پر مشتعل ہونے کے بجائے انہیں پھر سمجھانے کی کوشش کی اور قیس ابن سعد انصاری کو ان کے ہاں بھیجا تاکہ انہیں فتنہ انگیزی سے روکیں انہوں نے

خوارج کے ہاں پہنچ کر ان سے کہا کہ اے لوگو تم گناہ عظیم کے مرتکب ہوئے ہو ہمیں بلاوجہ کافر قرار دیتے ہو تم قتل ناحق سے باز آؤ اور ہمارے ساتھ مل کر دشمن سے جہاد کرو۔ اس پر عبداللہ ابن شجرہ سلمی نے کہا کہ اب ہماری آنکھوں سے پردہ اٹھ چکا ہے باطل کے اندھیرے چھٹ گئے ہیں اور حق کے اجالے ہر سمت پھیل چکے ہیں اب ہم کسی حالت میں تمہارا ساتھ نہیں دیں گے۔ قیس نے کہا کہ میں تمہیں اللہ کا واسطہ دیتا ہوں تم فتنوں میں نہ پڑو اور اپنے ہاتھوں اپنی ہلاکت کا سامان نہ کرو۔ اس کے بعد ابوایوب انصاری ان کے ہاں گئے اور انہیں افتراق انگیزی اور فتنہ پردازی سے باز رکھنے کی کوشش کی اور کہا کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ بنائے مخاصمت کیا ہے اور تم کیوں جنگ و قتال پر اتر آئے ہو۔ اگر لڑنے بھڑنے کا اتنا ہی شوق ہے تو اٹھو اور ہمارے ساتھ مل کر دشمن سے جنگ کرو۔ خوارج نے کہا کہ اگر ہم تمہارا ساتھ دیں تو کل پھر ہم پر تحکیم مسلط کر دو گے۔ ابوایوب نے کہا کہ پہلے حال کی خبر لو پھر مستقبل کی بھی فکر کر لینا مگر خوارج ان سفارتوں اور پند و موعظت کی باتوں سے راہ راست پر آنے والے نہ تھے۔ سمجھانے والے سمجھا کر ہار گئے اور جھنجھوڑنے والے جھنجھوڑ کر تھک گئے مگر انہوں نے کروٹ نہ بدلی۔ آخر خود امیر المومنین ان کے ہاں تشریف لے گئے اور ان سے مخاطب ہو کر فرمایا "اے لوگو تم نافہمی و بداندیشی کی وجہ سے جماعت سے کٹ گئے ہو اور نفسانیت کی بنا پر حق سے بے راہ ہو گئے ہو میں تمہیں خبردار کئے دیتا ہوں کہ تم اس وادی اور اس وادی کے موڑوں میں قتل کئے جاؤ گے امت تم پر نفرین کرے گی اور ہر طرف سے تم پر پھٹکار پڑے گی اس لئے کہ تمہارا موقف سراسر غلط اور تمہارا اعناد بلاوجہ ہے۔ تمہیں یاد ہو گا کہ میں نے تمہیں تحکیم کے ماننے سے منع کیا تھا اور کہا تھا کہ یہ مکر و فریب ہے اس فریب میں نہ آؤ مگر تم نے میری بات تک نہ سنی اور جنگ سے ہاتھ اٹھا لئے۔ میں نے تحکیم کو مانا تو تمہاری ضد سے مجبور ہو کر پھر بھی آنکھ بند کر کے تحکیم کو تسلیم نہیں کیا بلکہ حکمین سے یہ عہد لے لیا کہ وہ کتاب و سنت کی روشنی میں فیصلہ کریں۔ مگر انہوں نے کتاب و سنت کے خلاف فیصلہ کیا لہٰذا ہم ان کا فیصلہ ٹھکرا دینے میں حق بجانب ہیں۔ خوارج نے کہا کہ بیشک ہم نے تحکیم کو مانا جس کے نتیجہ میں ہم کافر ہو گئے مگر ہم نے توبہ کر لی ہے آپ بھی اپنے کفر کا اعتراف کر کے توبہ کریں پھر ہم آپ کی بیعت بھی کریں گے اور آپ کے ساتھ ہو کر دشمن سے جنگ بھی لڑیں گے۔ فرمایا کیا اللہ کے رسول پر ایمان لانے ان کے ساتھ ہجرت کرنے اور اسلامی غزوات میں شریک ہونے کے بعد میں اپنے بارے میں کفر کی شہادت دوں یہ کیونکر ممکن ہے۔ اس پر خوارج نے شور مچایا اور کہا کہ اگر آپ کفر کا اقرار نہیں کرتے تو ہم آپ سے کوئی بات چیت نہیں کریں گے۔ حضرت نے فرمایا کہ ہلڑ ہنگامے میں نہ کوئی بات منوائی جا سکتی ہے اور نہ کسی صحیح نتیجہ پر پہنچا جا سکتا ہے آؤ یوں فیصلہ کریں کہ تم اپنا ایک نمائندہ منتخب کرو جو مجھ سے گفتگو کرے اگر اس نے مجھے قائل کر دیا تو میں اپنے کفر کا

اقرار کر کے توبہ کر لوں گا اور اگر میں نے اسے مطمئن کر دیا تو پھر تمہیں اس معاندانہ رویّہ کو ترک کرنا پڑے گا۔ خوارج نے پہلے تو اس میں پس و پیش کیا اور پھر تیار ہو گئے اور عبداللہ ابن کواء کو اپنا نمائندہ بنا کر پیش کیا۔ حضرت نے ابن کواء سے کہا کہ تم کس بات پر برہم و رنجیدہ ہو جبکہ تم میری امارت پر راضی اور میرے فرمانبردار تھے اور جنگ جمل میں میرے مخالفین سے لڑ بھی چکے ہو کہا کہ اس موقع پر تحکیم کی صورت پیدا نہ ہوئی تھی۔ فرمایا اے ابن کواء میرا فیصلہ زیادہ صحیح ہونا چاہیئے یا رسُول اللہ کا؟ کہا رسُول اللہ کا۔ فرمایا تم نے اللہ کا یہ ارشاد تو سُنا ہو گا:۔

فقل تعالوا ندع ابناءنا و	کہو آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں تم اپنے بیٹوں
ابناءکم و نساءنا و نساءکم	کو ہم اپنی عورتوں کو بلائیں تم اپنی عورتوں کو
و انفسنا و انفسکم ثم نبتھل	ہم اپنے نفسوں کو بلائیں تم اپنے نفسوں کو۔
فنجعل لعنۃ اللہ علی الکاذبین	پھر گڑگڑائیں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت کریں"

کیا اللہ نے اس لئے اپنے پیغمبر کو مباہلہ کا حکم دیا تھا کہ اسے پیغمبر کے سچا اور نصاریٰ کے جھوٹا ہونے میں شبہہ تھا اور وُہ اس مباہلہ کے ذریعہ اپنا شبہہ برطرف کرنا چاہتا تھا؟ کہا کہ نہ اللہ کو شبہہ تھا اور نہ اس کے رسُول کو یہ نصاریٰ کے مقابلہ میں ایک احتجاج تھا۔ فرمایا کہ پھر تحکیم بھی تو ایک طرح سے احتجاج تھی کہا کہ حُکم مان لینے کے معنی یہ ہیں کہ آپ کو اس امر میں شک ہوا کہ آپ حق پر ہیں یا نہیں حالانکہ جنگ اس بنیاد پر لڑی جا رہی تھی کہ آپ حق پر ہیں اور اہل شام باطل پر۔ چنانچہ آپ نے معاویہ سے واضح الفاظ میں کہا کہ اگر کتاب خدا ہمارے حق میں فیصلہ کرے تو تم ہماری پیروی کرنا اور اگر کتاب خدا تمہارے حق میں فیصلہ کرے تو ہم تمہارا اتباع کریں گے۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ آپ کو خود اپنے حق بجانب ہونے میں شبہہ ہوا اور جب آپ خود اپنے متعلق شک میں پڑ گئے تو ہمارے لئے زیادہ گنجائش ہے کہ ہم آپ کے حق بجانب ہونے میں شبہہ کریں۔ حضرت نے فرمایا کہ یہ اتباع مشروط تھا اور مشروط اتباع کے اقرار سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ ہمیں اپنے موقف کی صداقت میں شبہہ تھا اور ایسے مشروط اتباع کی پیشکش رسول اللہ نے بھی کی تھی۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے:۔

قل فاتوا بکتاب من	کہو کہ اللہ کی طرف سے کوئی نوشتہ لاؤ جو
عند اللہ ھو اھدی	(توراۃ و قرآن سے) زیادہ ہدایت انسانی
منھما اتبعہ ان کنتم	کے لئے بہتر ہو تاکہ میں اس کی پیروی کروں
صادقین۔	اگر تم سچے ثابت ہوئے"۔

ابن کواء نے کہا کہ یہ بات درست ہے مگر آپ نے حکمین مقرر کر کے اللہ کا کام دوسروں کے سپرد کر دیا اور اس طرح کفر کا ارتکاب کیا۔ حضرت نے فرمایا کہ میں نے صرف ابو موسیٰ کو حکم مقرر کیا تھا۔ کہا کہ ابو موسیٰ

کافر ہے۔ فرمایا کہ وُہ کب سے کافر ہوا جب اسے تحکیم کے لئے منتخب کیا گیا یا جب اس نے فیصلہ صادر کیا؟ کہا کہ جس وقت اُس نے فیصلہ کیا۔ فرمایا تو پھر تم نے تسلیم کر لیا کہ جب اسے حکم مقرر کیا گیا تھا وُہ مسلمان تھا اور تمہیں یہ امید تھی کہ وُہ اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ کرے گا لہٰذا اسے حکم مقرر کرنے میں کوئی امر مانع نہ تھا۔ ابن کواء نے کہا کہ جب اس نے فیصلہ کیا اس وقت تو وُہ کافر ہو گیا۔ فرمایا کہ اگر رسُول اللہ کسی مسلمان کو کفار کی طرف بھیجیں کہ وُہ انہیں اسلام کی دعوت دے اور وُہ اسلام کے بجائے ضلالت و گمراہی کی تعلیم دینے لگے تو کیا رسُول اللہ پر اس کی ذمہ داری عائد ہو گی؟ ابن کواء نے کہا نہیں فرمایا کہ پھر ابو موسیٰ کافر ہو گیا تو اس کا الزام مجھ پر کیوں عائد کرتے ہو اور تمہارے لئے یہ جواز کیونکر پیدا ہو گیا کہ تم تلواریں کندھوں پر رکھے مسلمانوں کو قتل و غارت کرتے پھرو۔ رہا دوسرا حکم عمرو ابن عاص تو اسے نامزد کرنے والا معاویہ تھا میں اسے کیونکر حَکم قرار دے سکتا تھا جبکہ اس کا بس چلتا تو وُہ میرے قتل کا فیصلہ کرتا۔ کہا کہ پھر آپ ایک مسلمان اور ایک کافر کی تحکیم پر کیوں رضامند ہوئے؟ فرمایا خداوند عالم نے زن و مرد کے اختلاف کی صُورت میں حکم قرار دینے کی اجازت دیتے ہُوئے فرمایا ہے:۔

وان خفتم شقاق بينهما	اگر تمہیں میاں بی بی کے درمیان تفرقہ کا اندیشہ
فابعثوا حكما من اهله و	ہو تو ایک ثالث مرد کے کنبہ میں سے اور ایک
حكما من اهلها۔	ثالث عورت کے کنبہ میں سے مقرر کرو"۔

اب اگر کوئی مسلمان کسی یہودی یا عیسائی عورت سے نکاح کر لیتا ہے اور پھر دونوں میں مناقشہ رونما ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ مرد کے کنبہ کا ثالث مسلمان ہو گا اور عورت کے کنبہ کا ثالث یہودی ہو گا یا عیسائی۔ تو کیا از روئے قرآن ایک مسلمان اور ایک کافر کے حکم قرار دیئے جانے کا جواز ثابت نہیں ہوتا؟

خوارج نے جب دیکھا کہ ابن کواء سے کوئی جواب بن نہیں پڑتا تو اسے کہلوا بھیجا کہ گفتگو ختم کر کے واپس چلے آؤ۔ چنانچہ وُہ بات چیت کو ادھورا چھوڑ کر واپس اپنی صفوں میں چلا گیا۔ امیر المومنین نے باوجودیکہ ان پر حجت تمام کر دی مگر ان کی متمردانہ روش میں کوئی فرق نہ آیا۔ اب جنگ کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا حضرت نے لشکر کو صف بندی کا حکم دیا اور میمنہ و میسرہ ترتیب دیئے۔ میمنہ کی کمان حجر ابن عدی کے اور میسرہ کی کمان شبث ابن ربعی کے سپرد کی اور سواروں پر ابو ایوب انصاری کو اور پیادوں پر ابو قتادہ انصاری کو افسر مقرر کیا اور اہل مدینہ کی قیادت جن کی تعداد سات سو یا آٹھ سو تھی قیس ابن سعد انصاری سے متعلق کی اور خود قلب لشکر میں تشریف فرما ہوے۔ خوارج نے اپنے لشکر کو اس طرح ترتیب دیا کہ میمنہ پر یزید ابن حصین کو اور میسرہ پر شریح ابن اوفی عبسی کو سالار مقرر کیا۔ سواروں پر حمزہ ابن سنان

اسدی کو اور پیادوں پر حرقوص ابن زہیر کو امیر قرار دیا۔

جب صفوں کے مقابلہ میں صفیں جم گئیں تو حضرت نے ابو ایوب انصاری کو ایک سفید پرچم دے کر دو ہزار کی جمعیت کے ساتھ خوارج کی طرف بھیجا انہوں نے آگے بڑھ کر اعلان کیا کہ اے لوگو امیر المومنین فرماتے ہیں کہ تم میں سے جو شخص اس علم کے نیچے چلا آئے یا کوفہ یا مدائن واپس چلا جائے یا اس جماعت کا ساتھ چھوڑ کر الگ ہو جائے اس کے لئے امان ہے۔ اس اعلان کا یہ اثر ہوا کہ فروہ ابن نوفل اشجعی نے جو رؤسائے خوارج میں سے تھا اپنے قبیلہ والوں سے کہنے لگا کہ خدا کی قسم ہمیں نہیں معلوم کہ ہم کس بنا پر علی کے مقابلہ میں صف آرا ہوئے ہیں۔ نہ ہمارے پاس اس محاربہ کے جواز کی کوئی دلیل ہے اور نہ اس خروج کی کوئی معقول وجہ۔ ہمیں ان لوگوں سے علیحدہ ہو جانا چاہئے اس کے بعد ہم سوچیں گے کہ ہمیں علی کی اطاعت کرنا چاہئے یا ان سے جنگ کرنا چاہئے۔ یہ کہہ کر وہ پانچ سو آدمیوں کے ساتھ خوارج سے الگ ہو کر بندنجین چلا گیا اور ایک گروہ کوفہ روانہ ہو گیا اور سو آدمی ابو ایوب کے پرچم کے نیچے آکر حضرت کی جماعت میں شامل ہو گئے۔ یہ حضرت کے موقف کی صحت، استدلال کی قوت اور مصالحانہ روش کا نتیجہ تھا۔

امیر المومنین نے بقیہ خوارج کو جنگ کے ہولناک نتائج سے متنبہ کیا مگر وہ جنگ سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہ ہوئے۔ اب جنگ کے شروع ہونے میں خوارج کے حملہ کا انتظار تھا کیونکہ حضرت نے اپنی فوج کو پابند کر دیا تھا کہ جب تک ادھر سے حملہ نہ ہو وہ حملہ نہ کرے آخر ایک خارجی اپنی صفوں سے نکلا اور حملہ کر کے حضرت کی سپاہ میں سے تین آدمیوں کو شہید کر دیا حضرت طیش میں آگے بڑھے اور تلوار سے اس پر حملہ کیا۔ جب تلوار اس پر پڑی تو کہنے لگا کہ جنت میں جانا کتنا گوارا اور شیریں ہے۔ عبداللہ ابن وہب نے یہ الفاظ سنے تو کہا کہ خدا کی قسم مجھے نہیں معلوم کہ تو جنت کی طرف جا رہا ہے یا دوزخ کی طرف۔ بنی سعد کے ایک خارجی نے یہ سنا تو کہا کہ میں عبداللہ ابن وہب کے ورغلانے سے یہاں چلا آیا اور اسے ابھی تک یہ علم نہیں کہ اس کا موقف صحیح ہے یا غلط اور اس کی جماعت کو جنت میں جانا ہے یا دوزخ میں اور یہ کہہ کر اپنی جماعت سمیت خوارج کی صفوں سے علیحدہ ہو گیا۔ خوارج ایک ایک کر کے لڑنے کے بجائے جلد ہی مجموعی حملہ پر اتر آئے۔ چنانچہ انہوں نے تلواروں کی نیامیں توڑ ڈالیں کمانوں میں تیر جوڑ لئے نیزے تانے اور "لاحکم الا للہ" کا نعرہ لگا کر ایک دم حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ سواروں کے قدم اکھڑ گئے۔ مگر پیچھے ہٹ کر سنبھلے اور نیزوں اور تلواروں کے آگے سینے تان کر کھڑے ہو گئے۔ حضرت نے پکار کر کہا ہاں اے جوانمردو! آگے بڑھ کر شیرانہ حملہ کرو یہ کہہ کر حضرت بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ اب جو فوج نے آپ کی کمان میں ایک ساتھ حملہ کیا تو ہر طرف خون برسنے لگا اور لاشوں پر لاشیں گرنے لگیں۔ اس پر زور حملہ سے دشمن کے پرے ٹوٹ گئے اور صفیں

درہم وبرہم ہوگئیں۔ حضرت کی تلوار بھی لڑتے لڑتے خم آگیا آپ نے اسے زانو پر رکھ کر سیدھا کیا اور پھر پورے جوش وخروش سے حملہ آور ہوئے۔ ادھر لشکر والے خوارج کے سروں پر تلواریں چلاتے اور پیچھے ہٹنے والوں پر تیر برساتے ہوئے آگے بڑھتے رہے یہاں تک کہ انہیں چاروں طرف سے نرغہ میں لے لیا اور راہ فرار اُن پر بند کر دی اور بپھرے ہوئے شیروں کی طرح ان پر ٹوٹ پڑے۔ تلواریں شعلے برسانے لگیں اور زندگی کی لو دم توڑتے نظر آنے لگی اور بقول شخصے اس طرح وہ گر گر کر مرنے لگے گویا کسی نے اُن سے کہہ دیا ہو کہ "مر جاؤ" اور وہ مر گئے۔ چار سو خوارج زخمی ہو کر جنگ کے قابل نہ رہے اور نو آدمیوں نے بھاگ کر جان بچائی جن میں سے دو عمان کی طرف دو سجستان کی طرف دو کرمان کی طرف اور دو جزیرہ کی طرف بھاگ گئے اور ایک یمن میں تل موزون میں پہنچ گیا اور باقی سب کے سب قتل ہوگئے۔ سرداران خوارج میں سے عبداللہ ابن وہب کو زیاد ابن خصفہ نے یزید ابن حصین طائی کو ابو ایوب انصاری نے حرقوص ابن زہیر کو جیش ابن ربیعہ کنانی نے عبداللہ ابن شجرہ سلمی کو عبداللہ ابن زحر خولانی نے اور شریح ابن اوفی کو قیس ابن معاویہ نے موت کے گھاٹ اُتارا۔ اور امیرالمومنین کے لشکر میں سے صرف آٹھ آدمی شہید ہوئے جن کے نام یہ ہیں:۔ رویبہ ابن وبر بجلی، سعید ابن خالد سبیعی، عبداللہ ابن حماد احجنی، فیاض ابن خلیل ازدی، کیسوم ابن سلمہ جہنی، عبید ابن عبید خولانی، جمیع ابن جعشم کندی، حبیب ابن عاصم اسدی۔

امیرالمومنین کے ہمراہیوں نے جب دیکھا کہ خوارج سب کے سب قتل ہو گئے ہیں تو کہنے لگے کہ اب صفحہ ہستی سے ان کا نام ونشان مٹ گیا ہے۔ حضرت نے فرمایا

کلا واللہ انھم نطف فی اصلاب الرجال وقرارات النساء کلما نجم منھم قرن قطع حتی یکون اخرھم لصوصا سلابین۔ (نہج البلاغہ)	ہرگز نہیں۔ ابھی تو وہ مردوں کی صلبوں اور عورتوں کے شکموں میں موجود ہیں۔ جب بھی ان میں کا کوی گروہ ابھرے گا تو اُسے کاٹ کر رکھ دیا جائے گا یہاں تک کہ اُن کی آخری فردیں چور اور ڈاکو ہو کر رہ جائیں گی"۔

جب جنگ ختم ہوگئی تو خوارج کی ایک فرد ذوالثدیہ کے لاشہ کی تلاش شروع ہوی کیونکہ امیرالمومنین ان کے خروج سے پہلے فرمایا کرتے تھے:۔

ان قوما یمرقون من الدین کما یمرق السھم من الرمیۃ علامتھم رجل مخدج الید (تاریخ کامل ج ۳ ص ۱۷۵)	ایک قوم دین سے اس طرح نکل جائے گی جس طرح تیر شکار کو چیر کر نکل جاتا ہے۔ ان لوگوں کی علامت یہ ہے کہ ان میں ایک شخص ناقص ہاتھ والا ہوگا"۔

درہم و برہم ہوگئیں۔ حضرت کی تلواریں لڑتے لڑتے خم آگیا آپ نے اسے زانو پر رکھ کر سیدھا کیا اور پھر پورے جوش و خروش سے حملہ آور ہوئے۔ ادھر لشکر والے خوارج کے سروں پر تلواریں چلاتے اور پیچھے ہٹنے والوں پر تیر برساتے ہوئے آگے بڑھتے رہے یہاں تک کہ انہیں چاروں طرف سے نرغہ میں لے لیا اور راہِ فرار اُن پر بند کر دی اور بپھرے ہوئے شیروں کی طرح ان پر ٹوٹ پڑے۔ تلواریں شعلے برسانے لگیں اور زندگی کی لو دم توڑتے نظر آنے لگی اور بقول شخصے اس طرح وہ گر گر کر مرنے لگے گویا کسی نے اُن سے کہہ دیا ہو کہ "مر جاؤ" اور وہ مر گئے۔ چار سو خوارج زخمی ہو کر جنگ کے قابل نہ رہے اور نو آدمیوں نے بھاگ کر جان بچائی جن میں سے دو عمان کی طرف دو سجستان کی طرف دو کرمان کی طرف اور دو جزیرہ کی طرف بھاگ گئے اور ایک یمن میں تل موروں میں پہنچ گیا اور باقی سب کے سب قتل ہو گئے۔ سرداران خوارج میں سے عبداللہ ابن وہب کو زیاد ابن خصفہ نے یزید ابن حصین طائی کو ابو ایوب انصاری نے حرقوص ابن زہیر کو جیش ابن ربیعہ کنانی نے عبداللہ ابن شجرہ سلمی کو عبداللہ ابن زحر خولانی نے اور شریح ابن اوفی کو قیس ابن معاویہ نے موت کے گھاٹ اُتارا۔ اور امیر المومنین کے لشکر میں سے صرف آٹھ آدمی شہید ہوئے جن کے نام یہ ہیں:۔ رویبہ ابن وبر بجلی، سعید ابن خالد سبیعی، عبداللہ ابن حماد ارحبی، فیاض ابن خلیل ازدی، کیسوم ابن سلمہ جہنی، عبید ابن عبید خولانی، جمیع ابن جعشم کندی، حبیب ابن عاصم اسدی۔

امیر المومنین کے ہمراہیوں نے جب دیکھا کہ خوارج سب کے سب قتل ہو گئے ہیں تو کہنے لگے کہ اب صفحہ ہستی سے ان کا نام و نشان مٹ گیا ہے۔ حضرت نے فرمایا

کلا واللہ انھم نطف فی اصلاب الرجال وقرارات النساء کلما نجم منھم قرن قطع حتی یکون اٰخرھم لصوصا سلابین۔ (نہج البلاغہ)	ہرگز نہیں۔ ابھی تو وہ مردوں کی صلبوں اور عورتوں کے شکموں میں موجود ہیں۔ جب بھی ان میں کا کوئی گروہ ابھرے گا تو اُسے کاٹ کر رکھ دیا جائے گا یہاں تک کہ اُن کی آخری فردیں چور اور ڈاکو ہو کر رہ جائیں گی"۔

جب جنگ ختم ہو گئی تو خوارج کی ایک فرد ذوالثدیہ کے لاشہ کی تلاش شروع ہوئی کیونکہ امیر المومنین ان کے خروج سے پہلے فرمایا کرتے تھے:۔

ان قوما یمرقون من الدین کما یمرق السھم من الرمیۃ علامتھم رجل مخدج الید (تاریخ کامل ج ۳ ص ۱۷۵)	ایک قوم دین سے اس طرح نکل جائے گی جس طرح تیر شکار کو چیر کر نکل جاتا ہے۔ ان لوگوں کی علامت یہ ہے کہ ان میں ایک شخص ناقص ہاتھ والا ہو گا"۔

کچھ لوگوں نے اسے ادھر اُدھر لاشوں میں تلاش کیا مگر اس کی لاش نہ مل سکی۔ انہوں نے پلٹ کر حضرت سے کہا کہ ہم نے تمام لاشیں دیکھ ڈالی ہیں مگر اس کی لاش کہیں نظر نہیں آئی۔ فرمایا خدا کی قسم اس کی لاش انہی لاشوں میں موجود ہے۔ یہ کہہ کر حضرت سلیمان ابن ثمامہ حنفی اور ریان ابن صبرہ کو ساتھ لے کر تلاش کے لئے کھڑے ہوئے۔ جب لاشوں کو دیکھتے بھالتے ہوئے نہر کے کنارے پر پہنچے تو دیکھا کہ ایک گڑھے میں چالیس پچاس لاشیں پڑی ہیں۔ جب ان لاشوں کو ہٹا کر دیکھا گیا تو ان کے نیچے ذوالثدیہ کی لاش بھی پڑی تھی۔ حضرت نے اپنے ہمراہیوں سے فرمایا:۔

اللہ اکبر، واللہ ما کذبت و	اللہ اکبر! نہ میں نے جھوٹ کہا اور نہ مجھے جھوٹی
لا کذبت اما واللہ لولا ان	خبر دی گئی۔ اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ تم عمل سے
تنکلوا عن العمل لاخبرتکم	روگرداں ہو جاؤ گے تو میں ان خوارج سے بصیرت
بما قضی اللہ علی لسان نبیہ	کے ساتھ جنگ کرنے والوں اور جس حق پر ہم ہیں
لمن قاتلھم مستبصرا فی	اس حق کے پہچاننے والوں کے لئے اللہ نے
قتالھم عارفا للحق الذی	اپنے پیغمبر کی زبان سے جس اجر و ثواب کا وعدہ
نحن علیہ۔ (تاریخ طبری ج۴ ص۶۶)۔	فرمایا ہے اس سے تمہیں آگاہ کرتا۔"

جب پلٹ کر خوارج کی لاشوں کی طرف سے ہو کر گزرے تو فرمایا تم پر افسوس ہے جس نے تمہیں فریب دیا اس نے تمہیں نقصان پہنچایا۔ لوگوں نے پوچھا کہ یا امیرالمومنین انہیں کس نے فریب دیا فرمایا کہ شیطان اور نفس امارہ نے ان دونوں نے فریب کا جال بچھایا امیدوں کے ذریعہ انہیں ورغلایا گناہوں کو سج کر ان کے سامنے پیش کیا اور یہ چیز ان کے ذہنوں میں بٹھا دی کہ وہ غالب و کامران رہیں گے۔

اس جنگ میں کامیابی کے بعد امیرالمومنین نے اپنے ہمراہیوں کو منجم کی وہ بات یاد دلاتے ہوئے جو اس نے ساعت کے بد ہونے کے متعلق کہی تھی، فرمایا:۔

لو سرنا فی الساعۃ التی امر	اگر ہم اس گھڑی میں نکلتے جس میں نکلنے کا مشورہ
بھا المنجم لقال الجھال	نجومی نے دیا تھا تو جاہل و بے خبر لوگ یہ کہتے
الذین لا یعلمون شیئا سار	کہ یہ فتح اس گھڑی میں نکلنے کا نتیجہ ہے جس کی
فی الساعۃ التی امر بھا المنجم	ہدایت اس نجومی نے کی تھی۔"
فظفر۔ (تاریخ کامل ج۳ ص۱۷۳)۔	

خوارج کا طرزِ عمل انتہائی تعجب انگیز ہے۔ انہوں نے صفین میں عین فتح کے موقع پر تلواریں روک کر اپنے سروں پر تلواروں کے چلنے کا سامان کیا۔ خود ہی تحکیم پر زور دیا اور خود ہی اس کے مخالف ہو گئے اتفاق و اتحاد کو پارہ پارہ کیا اور نت نئے فتنے اٹھائے۔ امیرالمومنین جن کا ہر قول و

عمل سراپا ایمان تھا ان سے برائت کا نام ایمان رکھا اور ان سے وابستگی کو کفر سے تعبیر کیا اور برابر اس پر اصرار کرتے رہے کہ آپ کفر کا اقرار کر کے توبہ کریں اور تحکیم کا معاہدہ توڑ کر جنگ کے لئے اُٹھ کھڑے ہوں۔ اگر یہ لوگ واقعاً تحکیم کے مخالف اور معاویہ سے جنگ کرنا چاہتے تھے تو تحکیم کے فیصلہ کے بعد اس کا موقع تھا کہ وُہ معاویہ سے جنگ کرتے مگر معاویہ سے لڑنے کے بجائے وُہ حضرت کے مقابلہ میں صف آرا ہو گئے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ معاویہ سے جنگ وقتال اُن کے نزدیک اتنا ضروری نہ تھا جتنا حضرت کی زبان سے کفر کا اعتراف اہم تھا ورنہ معاویہ بھی تو ان کے نزدیک کافر تھا پہلے اس سے نمٹ لیتے جبکہ اس سے نمٹنے کا موقع فراہم ہو گیا تھا اور پھر حضرت علی سے جنہیں بزعم خود کافر سمجھتے تھے نمٹتے۔ بلکہ وُہ اپنے نعرہ لاحکم الا للہ میں مخلص ہوتے تو انہیں پہلے معاویہ ہی کے مقابلہ میں اُترنا چاہئے تھا۔ اس لئے کہ وجہ کفر تو تحکیم تھی اور معاویہ اس تحکیم کا بانی و تجویز کنندہ تھا اور حضرت علی نے اسے مانا تھا تو مجبوری کی صورت میں۔ پھر معاویہ کو نظر انداز کر کے حضرت سے اقرار کفر کے مطالبہ کے معنی اس کے سوا کیا ہو سکتے ہیں کہ حضرت کو کفر و عہد شکنی کا مرتکب قرار دے کر دوسروں کی نظروں سے گرائیں۔ اور معاویہ سے لڑنے کا ولولہ اُن کے دلوں میں ہوتا تو فتح سے دستبردار ہو کر جنگ بندی پر اصرار ہی کیوں کرتے۔

خوارج کی غرض صرف امیر المومنین کی مخالفت تھی۔ انہوں نے آپ کے خلاف فتنہ و بغاوت کو ہوا دی طرح طرح کے الزام تراشے اور حق و صداقت کے مقابلہ میں ضلالت و گمراہی پر جمے رہے۔ حضرت نے انہیں سمجھانے بجھانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ نہ ان پر سختی روا رکھی اور نہ اُن کے معاشی وظائف میں کمی کی۔ اور جب ان کی طغیانی و سرکشی اس حد تک بڑھ گئی کہ انہوں نے بے دریغ مسلمانوں کو حق گوئی کے جرم میں قتل کرنا شروع کر دیا اور عورتوں تک کو ذبح کر ڈالا تو بحالت مجبوری ان کی طرف قدم اُٹھایا اور میدان جنگ میں بھی انہیں دلائل سے مطمئن کرنے کی کوشش کی اور جب دلائل کا ان پر کوئی اثر نہ ہُوا تو عمومی امان کا اعلان کیا اور جنہوں نے اس امان سے فائدہ اٹھایا انہیں کسی باز پرس کے بغیر جدھر وُہ جانا چاہتے تھے جانے دیا۔ ان تمام چیزوں کے باوجود جب وُہ جنگ سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہ ہوئے تو پھر اس کے علاوہ چارہ ہی کیا تھا کہ انہیں قرار واقعی سزا دی جائے اور جنگ لڑ کر ان کے کس بل نکال دیئے جائیں۔

اس جنگ سے قبل اور اس کے دوران امیر المومنین نے متعدد پیشینگوئیاں فرمائیں اور ہر پیشینگوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔ یہ پیشین گوئیاں کہانت و ستارہ شناسی پر مبنی نہ تھیں ورنہ ایک ماہر منجم کی پیشینگوئی کو ٹھکرانے کے بجائے اس کی صحت و سقم پر غور کرتے اور اپنے مقررہ قواعد پر جانچتے پرکھتے مگر آپ نے اسے تکذیب قرآن کے مترادف سمجھتے ہوئے مسترد کر دیا بلکہ یہ تمام امور وُہ تھے جن کا علم

پیغمبر اکرم کے ذریعہ اُن کے سینہ میں ودیعت تھا جس کے بعد نہ ان کی صحت میں کوی شک وشبہ ہوسکتا تھا اور نہ خلاف واقع ہونے کا وہم وگمان اس لئے ہر مورد پر آپ نے جو خبر دی یقین ووثوق کے ساتھ۔ گویا آپ کی آنکھیں غیب کے پردوں کو چاک کر کے مستقبل کے صفحہ پر ابھرنے والے نقوش کو دیکھ رہی ہیں۔ ذیل میں چند پیشینگوئیاں درج کی جاتی ہیں:۔

(۱) آپ نے زرعہ ابن برج طائی سے کہا تھا کہ تم قتل کئے جاؤ گے اور ربیعہ ابن شداد خثعمی سے کہا تھا کہ تمہاری نعش گھوڑوں کے سموں سے پامال ہوگی۔ چنانچہ یہ دونوں اس جنگ میں قتل کئے گئے اور ربیعہ کی لاش گھوڑوں کے سموں سے پامال ہو گئی۔ قبیصہ کہتے ہیں کہ جب میں نے دیکھا کہ گھوڑوں کے سموں سے ربیعہ کا چہرہ اور سر کچلا گیا ہے اور جسم کے ٹکڑے ہو گئے ہیں تو

فذکرت قول علی وقلت لله	مجھے حضرت علی کی بات یاد آئی اور میں نے کہا کہ
در ابی الحسن ماحرك شفتيه	ابو الحسن کی خوبیوں کا کیا کہنا انہوں نے جب بھی
قط بشئ الاکان کذلك۔	کوی بات کہی وہ اسی طرح ہو کر رہی "۔

(کتاب الامامۃ والسیاسۃ۔ ص۱۵۳)

(۲) خوارج کے بارے میں فرمایا کہ وہ پُل کے ادھر قتل ہوں گے اور نہر عبور کر کے پار نہیں اتریں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور وہ نہر کے ادھر اس قطعۂ زمین پر مارے گئے جسے رمیلہ کہا جاتا تھا۔

(۳) آپ نے خبر دی کہ آپ کے لشکر میں سے دس آدمی بھی مارے نہیں جائیں گے اور خوارج میں سے دس بھی نہیں بچیں گے۔ چنانچہ آپ کے لشکر میں سے آٹھ آدمی شہید ہوئے اور خوارج میں سے نو آدمیوں نے بھاگ کر جان بچائی۔

(۴) ذوالثدیہ کے بارے میں فرمایا کہ وہ یقیناً مارا گیا ہے اور اس کی نعش مقتولین میں موجود ہے۔ چنانچہ اس کی نعش لاشوں کے ڈھیر میں سے برآمد ہوی۔

(۵) آپ نے خوارج کے مارے جانے کے بعد فرمایا کہ وہ ختم نہیں ہوئے ابھی صلبوں اور شکموں میں موجود ہیں اور جب بھی سر اٹھائیں گے کچل دیئے جائیں گے۔ چنانچہ جنگ نہروان کے بعد وہ چھوٹے بڑے جتھوں کی صورت میں علم بغاوت بلند کرتے رہے اور حضرت کی فوج کے ہاتھوں مارے جاتے رہے اور پھر اموی وعباسی دور میں ہر حکومت سے ٹکرانے کے لئے اُٹھے اور مہلب ابن ابی صفرہ بارہ برس تک ان سے نبرد آزما رہا اور آخر ان میں پھوٹ ڈلوا کر اور انہیں آپس میں لڑوا کر انتہائی کمزور کر دیا اور عباسیوں نے انہیں اس طرح کچلا کہ ان اطراف میں ان کے لئے جینا مشکل ہو گیا اور تتر بتر ہو کر عمان وافریقہ کی طرف نکل گئے اور اب بھی مسقط وزنجبار میں جماعتی صورت میں موجود ہیں۔

(۶) آپ نے فرمایا کہ ان کی آخری فردیں رہزنوں اور قزاقوں کی صورت میں ابھرتی رہیں گی۔ چنانچہ

تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ قتل و غارت اور لوٹ کھسوٹ انہوں نے اپنا شیوہ بنا لیا جہاں موقع ملتا دھاوا بولتے اور جو ہاتھ لگتا لوٹ لے جاتے۔ ابن ابی الحدید نے تحریر کیا ہے:۔

وصح اخبارہ ایضاً انہ سیکون اخرھم لصوصاً سلابین فان دعوۃ الخوارج اضمحلت و رجالھا فنیت حتی افضی الامر الی ان صار خلفھم قطاع طریق متظاھرین بالفسوق والفساد فی الارض۔ (شرح ابن ابی الحدید ج۵ ص۲۴۸)

امیر المومنین کی یہ پیشینگوئی بھی صحیح ثابت ہوئی کہ خوارج رہزن و قزاق ہو کر رہ جائیں گے چنانچہ خارجیوں کی دعوت کمزور پڑ گئی اور ان کے جوانمرد فنا ہو گئے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ان کے بعد آنے والے رہزن ہو گئے جو علانیہ فسق و فجور کے مرتکب ہوتے اور زمین میں فتنہ و فساد پھیلاتے۔"

محاربات خوارج

جنگ نہروان سے فارغ ہو کر امیر المومنین شام جانے کا ارادہ تو رکھتے ہی تھے آپ نے اپنے لشکر سے فرمایا کہ اللہ نے تمہیں خوارج کے مقابلہ میں فتح و کامرانی دی ہے اب شام جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہو اور دشمن سے لڑ کر سرخروئی حاصل کرو۔ اشعث ابن قیس اور دوسرے چند آدمیوں نے کہا کہ یا امیر المومنین ہمارے تیر ختم ہو چکے ہیں تلواریں کند ہو گئی ہیں اور نیزوں کی انیاں ناکارہ ہو چکی ہیں کچھ دنوں کے لئے کوفہ تشریف لے چلئے تاکہ ہم سستا بھی لیں اور تلواروں پہ صیقل اور ہتھیاروں کی اصلاح و درستی بھی کر لیں۔ پھر تازہ دم ہو کر دشمن سے لڑیں گے۔ حضرت نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ ہماری اصل منزل شام ہے اب اس میں مزید تاخیر کرنا خلاف مصلحت ہے۔ حضرت نے بہت کچھ کہا سنا مگر وہ لوگ نہ مانے اور آپ کو واپسی پر مجبور کر دیا۔ امیر المومنین کوفہ کی جانب واپس تو ہوئے مگر شہر میں داخل ہونے کے بجائے نخیلہ میں قیام فرما ہوئے اور لشکر والوں کو بھی وہیں پر ٹھہرنے کا حکم دیا تاکہ وہ گھروں میں پہنچ کر دوسرے جھمیلوں میں نہ پڑ جائیں۔ یہ لوگ کچھ دن تو ٹھہرے رہے پھر کچھ حیلے بہانے کر کے اور کچھ چپکے چپکے کھسکنے لگے یہاں تک کہ چند گنے چنے آدمیوں کے علاوہ سب ہی چلے گئے۔ اب نخیلہ میں ٹھہرنا بیکار تھا حضرت بھی وہاں سے اٹھ کر کوفہ میں چلے آئے۔

جب کوفہ میں تشریف فرما ہوئے تو اور فتنے اٹھ کھڑے ہوئے ان میں ایک فتنہ خوارج بھی تھا اگرچہ جنگ نہروان میں ان کی ایک بڑی تعداد کو موت کے گھاٹ اتارا جا چکا تھا مگر پوری طرح ان کا قلع و قمع نہ ہوا تھا۔ بہت سے ان کے ہم مسلک و ہم عقیدہ کوفہ میں موجود تھے جو کسی مصلحت یا مجبوری کی بنا پر جنگ میں شریک

نہ ہو سکے تھے اب انہوں نے پر پُرزے نکالے اور جتھا بندی کر کے مملکت کے نظم و نسق کو درہم و برہم کرنے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ امیر المومنین اس فتنۂ خوارج اور دُوسری شورشوں کے دبانے میں مصروف ہو گئے اور شام پر لشکر کشی میں التواء ناگزیر ہو گیا۔

ان باغی گروہوں میں سے ایک گروہ خریت ابن راشد کا تھا جو بنی ناجیہ کے خوارج کا سرغنہ اور کوفہ ہی میں مقیم تھا۔ یہ ایک دن تیس آدمیوں کے ہمراہ امیر المومنین کے پاس آیا اور کہا کہ خدا کی قسم میں نہ آپ کا کوئی حکم مانوں گا نہ آپ کے پیچھے نماز پڑھوں گا اور کل سے آپ کا ساتھ چھوڑ دوں گا۔ حضرت نے فرمایا کہ تم کس بات پر اتنے برہم ہو کہا کہ آپ نے تحکیم کو مان کر اسلام کے حکم سے کھلم کھلا انحراف کیا ہے فرمایا کہ تم نے یہ بات بے سوچے سمجھے کہی ہے اگر تم سمجھنا چاہو تو تمہیں سمجھایا جا سکتا ہے کہا کہ آج تو میں جاتا ہوں کل کسی وقت آؤں گا اور اس سلسلہ میں بات چیت کروں گا۔ فرمایا کہ شیطان کے بہکانے میں نہ آنا اور غلط قدم اُٹھانے سے پہلے مجھ سے مل لینا۔ اگر میری باتوں سے تمہاری تسلی نہ ہوئی تو پھر تمہیں اختیار ہے جو چاہے کرنا۔ جب وُہ پلٹ کر اپنی منزل پر آیا تو قبیلۂ بنی ناجیہ سے کہا کہ میں نے علی سے کل ملنے کا وعدہ کیا ہے مگر مجھے ان کے ہاں جانے کی ضرورت نہیں ہے ہمیں جو قدم اٹھانا ہے اٹھا لینا چاہئیے اور یہاں سے چل دینا چاہئیے۔ حضرت نے دُوسرے دن اس کا انتظار کیا۔ جب وُہ نہ آیا تو عبداللہ ابن قعین ازدی کو اس کے پاس بھیجا۔ عبداللہ نے پلٹ کر بتایا کہ وُہ اور اُس کے قبیلہ کے لوگ کوفہ چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ حضرت نے یہ سُنا تو فرمایا "انہیں قومِ ثمود کی طرح خدا کی رحمت سے دوری ہو دیکھنا جب نیزوں کے رُخ اُن کی طرف سیدھے ہوں گے اور تلواروں کے وار اُن کی کھوپڑیوں پر پڑیں گے تو اپنے کئے پر پچھتائیں گے۔" زیاد ابن خصفہ نے کہا کہ ہمیں اُن کے چلے جانے پر رنج و افسوس نہ ہونا چاہئیے۔ نہ ان کے رہنے سے ہمیں کوئی فائدہ تھا اور نہ ان کے چلے جانے سے کمی کا احساس ہو گا۔ البتہ یہ اندیشہ ہے کہ وہ ان لوگوں کو جو آپ کی اطاعت میں ہیں بہکائیں گے اور امنِ عامہ میں خلل انداز ہوں گے اگر آپ اجازت دیں تو میں انہیں واپس لانے کی کوشش کروں۔ فرمایا تمہیں کیا معلوم کہ وُہ کس طرف گئے ہیں کہا کہ دریافت کرنے پر معلوم ہو جائے گا۔ فرمایا کہ میرے عمال ان کی نقل و حرکت کے بارے میں مجھے ضرور تحریر کریں گے تم جاؤ اور دیر ابی موسیٰ میں پہنچ کر میرے حکم کا انتظار کرو۔ زیاد اپنی منزل پر آئے اور اپنے قبیلۂ بکر ابن وائل کو جمع کیا اور تمام واقعہ ان سے بیان کر کے کہا کہ تم امیر المومنین کے انصار و اعوان ہو اس مہم میں میرا ساتھ دو تاکہ دشمن کو آگے بڑھنے سے روک سکیں اور انہیں واپس لائیں۔ اس آواز پر ایک سو تیس آدمی اٹھ کھڑے ہوئے۔ زیاد نے کہا کہ دشمن پر قابو پانے کے لئے اتنے آدمی بہت ہیں اور انہیں لے کر دیر ابی موسیٰ میں پہنچے اور امیر المومنین کے حکم کے انتظار میں ٹھہر گئے۔

اس اثناء میں حضرت کے ایک عامل قرظہ ابن کعب انصاری نے حضرت کو اطلاع دی کہ بنی ناجیہ کا

لشکر مقام نفر کی طرف نکل گیا ہے اور اُس نے راستے میں ایک مسلمان زاذان فروخ کو اس جُرم میں قتل کر دیا ہے کہ اس نے آپ کے بارے میں عقیدتمندانہ جذبات کا اظہار کیا اور ایک ذمی کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا ہے کہ اس کے قتل کا کوئی جواز نہیں ہے۔ جب حضرت کو یہ اطلاع ملی تو آپ نے ایک نوجوان عبداللہ ابن وال کے ذریعہ زیاد ابن خصفہ کو تحریراً اطلاع دی کہ خریت اور اس کے ہمراہی نفر کی طرف جا چکے ہیں انہوں نے ایک مردِ مُسلمان کو قتل کر ڈالا ہے۔ تم ان کا پیچھا کرو اور انہیں واپس لانے کی کوشش کرو۔ اگر وُہ واپس آنے پر تیار نہ ہوں تو اُن سے جنگ کرو کیونکہ ان کی امن سوز حرکات نے جنگ کا جواز پیدا کر دیا ہے۔ عبداللہ ابن وال خط لے کر چند قدم چلے ہوں گے کہ پلٹ کر حضرت سے کہا کہ یا امیرالمومنین کیا میں بھی زیاد ابن خصفہ کے لشکر میں شامل ہو سکتا ہوں؟ حضرت نے نظر اُٹھا کر اُسے دیکھا اور فرمایا کہ ہاں تم بھی شریکِ لشکر ہو جانا مجھے اُمید ہے کہ تم حق کے معاون اور ظالموں کے مقابلہ میں میرے ناصر و مددگار ثابت ہو گے۔ عبداللہ ابن وال کہتے ہیں کہ

فو اللہ ما احب ان لی بمقالة علی تلك حمر النعم۔ (تاریخ طبری جلد ۶ صفحہ ۹۰)	خدا کی قسم حضرت نے جن الفاظ سے مجھے یاد کیا ہے میں ان لفظوں کے بدلے میں سرخ بالوں والے اونٹوں کا لینا بھی گوارا نہ کروں گا۔"

جب عبداللہ نے دیرابی موسٰی میں پہنچ کر زیاد ابن خصفہ کو حضرت کا پیغام دیا تو زیاد نے عبداللہ ابن وال کی سواری، ہتھیار اور شجاعانہ تیور دیکھ کر کہا کہ کیا ہی اچھا ہو کہ تم میرے ساتھ رہو۔ عبداللہ نے کہا کہ میری بھی دلی خواہش یہی ہے اور میں امیرالمومنین سے اجازت لے کر آیا ہوں۔ چنانچہ وُہ زیاد کے دستہ میں شامل ہو گئے اور بنی ناجیہ کے تعاقب میں نفر کی طرف چل دیئے۔ جب وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ وُہ جرجرایا کی طرف چلے گئے ہیں۔ زیاد نے ان کا تعاقب کیا اور بصرہ و واسط کے درمیان مقام مذار میں انہیں جا لیا اور ان کے قریب ہی پڑاؤ ڈال دیا۔ خریت ان کے پڑاؤ کے پاس آیا اور پوچھا کہ تم کس مقصد سے آئے ہو کہا کہ ابھی ہمیں دم لینے دو کچھ دیر سستا لیں تو پھر تمہیں مقصد بھی بتا دیں گے۔ زیاد کچھ دیر سستانے اور گھوڑوں کو پانی پلانے کے بعد خریت کے پاس گئے اور کہا کہ تم کوفہ چھوڑ کر کیوں نکل کھڑے ہوئے ہو؟ کہا کہ مجھے علی کے طور طریقے ناپسند ہیں اور اُن کی امارت کھٹکتی ہے۔ اب میں ان لوگوں کا ساتھ دوں گا جو شوریٰ کے ذریعہ خلیفہ کا انتخاب کریں۔ کہا کیا انتخاب کے ذریعہ ایسا شخص مل سکتا ہے جو اسلام میں سابق کتاب و سنت کا سب سے بڑھ کر عالم اور رسول کا قرابتدار ہو کہا کہ یہ تو نہیں کہا جا سکتا۔ کہا کہ تم نے ایک مردِ مسلمان کو قتل کر دیا ہے تمہیں اس کا کیا حق پہنچتا تھا۔ کہا کہ میں نے قتل نہیں کیا میرے ہمراہیوں میں سے کسی نے قتل کیا ہو گا۔ کہا کہ ان قاتلوں کو ہمارے حوالے کرو تا کہ ہم اُن سے قصاص لیں کہا کہ ایسا نہیں ہو سکتا کہا کہ پھر تم بھی شریکِ جرم ہو۔ اب دونوں نے اپنے اپنے دستوں کی صف بندی کی

اور نیزے تان کر ایک دُوسرے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ظہر کے وقت ہتھیار حرکت میں آئے اور جنگ کا آغاز ہو گیا۔ نیزے سینوں میں گڑنے لگے اور تلواریں سروں پر چلنے لگیں۔ جب رات کا اندھیرا پھیلا تو خوارج اپنے پانچ لاشے میدان میں چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ زیاد کے دستہ میں سے دو آدمی سوید اور واقد ابن بکر شہید ہو گئے اور کچھ زخمی ہوئے۔ زیاد جو خود بھی زخمی ہو چکے تھے بصرہ میں چلے آئے اور امیر المومنین کو تحریر کیا کہ مقام مذار میں خریت سے مقابلہ ہوا ہے اس کے پانچ آدمی مارے گئے ہیں اور وہ اپنے کشتوں کو چھوڑ کر اہواز کی جانب چلا گیا ہے اور اس کی جمعیت دو سو تک پہنچ گئی ہے۔ ہمارے کچھ آدمی زخمی ہو گئے ہیں میں اُن کے علاج معالجہ کے لئے بصرہ میں ٹھہر گیا ہوں اور آپ کے حکم کا منتظر ہوں۔

امیر المومنین نے زیاد کو واپس بُلوا لیا اور معقل ابن قیس ریاحی کو دو ہزار کے لشکر کے ساتھ اہواز کی جانب روانہ کیا اور ابن عباس عامل بصرہ کو تحریر فرمایا کہ معقل کی کمک کے لئے دو ہزار جوانمرد اہواز کی جانب روانہ کر دو۔ جب معقل لشکر کی کمان کرتے ہوئے اہواز میں وارد ہوئے تو بصرہ کی سپاہ کے انتظار میں ٹھہر گئے۔ ادھر خریت نے اہواز کے کافروں قزاقوں اور اپنے ہم مسلک عربوں کو اپنے ساتھ ملا کر ایک کثیر جمعیت بہم پہنچا لی اور انہیں ساتھ لے کر رامہرمز کی پہاڑیوں کی طرف نکل گیا۔ معقل نے مزید انتظار غیر ضروری سمجھا اور خریت کے تعاقب میں چل دیئے۔ ابھی ایک دن کی مسافت طے کی ہو گی کہ بصرہ کا لشکر خالد ابن معدان طائی کی زیر قیادت پہنچ گیا اور دونوں لشکر ایک ہو کر آگے چل دیئے۔ جب رامہرمز کی پہاڑیوں کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ خریت اپنے لشکر سمیت پڑاؤ ڈالے پڑا ہے۔ معقل نے اپنے لشکر کی صف بندی کی میمنہ پر یزید ابن معقل کو اور میسرہ پر منجاب ابن راشد ضبی کو افسر مقرر کیا۔

خریت کا میمنہ عربوں پر اور میسرہ کافروں اور کردوں پر مشتمل تھا۔ جب صفیں آراستہ ہو گئیں تو دونوں نے ایک دُوسرے پر حملہ کر دیا اور گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی۔ معقل کے لشکر نے خوارج کو تلواروں کی باڑ پر رکھ لیا اور جب خریت کی فوج کے تین سو ستر آدمی مارے گئے تو اس کے قدم اکھڑ گئے اور ساحل بحر کی طرف جہاں اس کے قوم و قبیلہ کے کچھ لوگ آباد تھے چلا گیا۔ یہاں بھی لوگوں کو حضرت کے خلاف بھڑکانا شروع کیا اور بہلا پھسلا کر ایک کثیر جماعت کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گیا۔

خریت کے پسپا ہونے کے بعد معقل نے امیر المومنین کو تحریر کیا کہ خریت کے ہمراہیوں کی ایک کثیر تعداد قتل ہو چکی ہے اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔ امیر المومنین نے چند سر بر آوردہ لوگوں کو جمع کر کے واقعہ بیان کیا۔ سب نے رائے دی کہ آپ معقل کو تحریر فرمائیں کہ وہ خریت کا تعاقب کر کے اسے قتل کریں یا حدودِ مملکت سے باہر نکال دیں ورنہ وہ فتنہ انگیزی سے باز نہیں آئے گا۔ چنانچہ

امیر المومنین نے انہیں تحریر کیا کہ وُہ اس وقت تک اس کا پیچھا کریں جب تک اس کی جماعت کا قلع و قمع نہیں ہو جاتا۔ معقل کو جب یہ حکم پہنچا تو وہ لشکر کو لے کر ساحل بحر کی طرف چل دیئے۔ خریت کو اس تعاقب کی اطلاع ہوی تو اُس نے اپنی جمیعت بڑھانے کے لئے خوارج کے گروہ سے کہا کہ میں تمہارا ہم عقیدہ ہوں علی حَکَم قرار دینے کے مجاز نہ تھے، اور کوفہ والوں سے کہا کہ علی کو انہی کے نمائندہ (ابو موسیٰ) نے معزول کر دیا تو انہیں حق امارت کہاں رہا۔ اور عثمانیوں سے کہا کہ میں تمہارا ہم خیال ہوں عثمان قطعاً مظلوم مارے گئے تھے، اور خراج و صدقات روک لینے والوں سے کہا کہ تم یہ صدقات حکومت کے کارندوں کو دینے کے بجائے اپنے عزیز و اقارب پر صرف کرو اور اس طرح مختلف الخیال لوگوں کو بہلا پھسلا کر اپنے گرد جمع کئے رہا۔ اس گروہ میں نو مسلموں کی بھی ایک جماعت شامل تھی جو عیسائیوں سے مسلمان ہوے تھے انہوں نے جب خریت کے گروہ میں مختلف خیالات و نظریات کے لوگ دیکھے تو کہنے لگے کہ ان لوگوں کے دین سے تو ہمارا پہلا دین ہی اچھا تھا۔ یہ لوگ ایک امت اور ایک مذہب و مسلک پر ہوتے ہوے ایک دوسرے کا خون بہا رہے ہیں۔ خریت نے سُنا تو کہا کہ تم لوگ دوبارہ عیسائی ہو کر اپنی جانیں نہیں بچا سکتے اس لئے کہ اسلام لانے کے بعد جو شخص اسلام سے منحرف ہو جاتا ہے اسے قتل کر دیا جاتا ہے اب تلواروں سے بچنے کا یہی ایک ذریعہ ہے کہ تم ڈٹ کر مقابلہ کرو اور چلتی ہوی تلواروں کو تلواروں سے روکو ورنہ یہ لوگ تمہارے بال بچوں کو قتل کر دیں گے اور تمہاری عورتوں کو کنیزیں بنائیں گے۔ ایک شخص نے کہا کہ یہ ساری مصیبت تمہاری لائی ہوی ہے ہم آگے بڑھتے ہیں جب مُوت ہے اور پیچھے ہٹتے ہیں جب مُوت ہے۔

معقل نے اُن لوگوں کے پڑاؤ کے قریب جھنڈا گاڑ دیا اور اعلان کیا کہ جو لوگ اس جماعت میں تازہ شامل ہُوے ہیں وُہ الگ ہو جائیں اُن سے کوی باز پرس نہیں کی جائے گی۔ اس اعلان کا یہ اثر ہوا کہ بنی ناجیہ کے علاوہ دوسرے لوگ چھٹ گئے بنی ناجیہ میں ایک گروہ عیسائیوں کا تھا اور ایک گروہ وُہ تھا جو بعض مصالح کی بناء پر مسلمان ہو گیا تھا اور ایک گروہ وُہ تھا جو خراج دینا نہ چاہتا تھا۔ خریت نے ان مختلف عناصر کو منظم کر کے صف بندی کی اور مقابلہ پر اُتر آیا۔ معقل نے بھی اپنی صفیں ترتیب دیں اور ایک مختصر تقریر سے لشکر کا جوش بڑھایا اور پھر ایک دم حملہ کر دیا۔ نعمان ابن صہبان راسبی نے خریت پر نیزے کا وار کیا خریت گھوڑے سے زمین پر گرا اور پھر سنبھل کر تلوار سے حملہ آور ہُوا۔ نعمان نے اس کا وار خالی دے کر جو حملہ کیا تو اُسے مار گرایا۔ خریت کے گرتے ہی لشکر میں بھگدڑ مچ گئی اس کی فوج کے ایک سو ستر آدمی مارے جا چکے تھے اور باقی بھاگ کھڑے ہُوے۔

معقل نے ان کے مردوں بچوں اور عورتوں کو گرفتار کر لیا۔ ان میں سے جو مُسلمان تھے اُن سے بیعت لے کر انہیں رہا کر دیا اور جو مرتد ہو گئے تھے انہیں دوبارہ اسلام کی دعوت دی۔ ایک بُوڑھے

کے مارے جانے کا علم ہوا تو انہوں نے مصقلہ کو گھیر لیا اور کہا کہ تم اس کی موت کا باعث ہوئے ہو اسے زندہ کرو یا اس کی دیت دو۔ اس نے دیت ادا کر کے چھٹکارا حاصل کیا۔
خریت کے علاوہ اور چند جتھے مختلف اوقات میں تخریبی کاروائیوں کے لئے کھڑے ہوئے مگر عراقی دستوں نے انہیں شکست دے کر پراگندہ و منتشر کر دیا۔
ربیع الثانی ۳۸ھ میں اشرس ابن عوف شیبانی نے مقام دسکرہ میں علم بغاوت بلند کیا اور دو سو کی جمیعت کے ساتھ انبار کا رُخ کیا۔ امیر المومنین نے ابرش ابن حسان کو تین سو کے لشکر کے ساتھ اس کی سرکوبی کے لئے بھیجا جس نے آگے بڑھ کر خوارج کو تلواروں کی زد پر رکھ لیا۔ اشرس مارا گیا اور اس کی جماعت کے بچے کھچے لوگ منتشر ہو گئے۔
جمادی الاولیٰ ۳۸ھ میں ہلال ابن علفہ اور اس کے بھائی مجاہد نے دو سو کی جمیعت کے ساتھ خروج کیا امیر المومنین نے ان کے تعاقب میں معقل ابن قیس کو روانہ کیا جنہوں نے مقام ماسبذان میں خونریز جنگ لڑ کر ہلال اور مجاہد اور ان کے ہمراہیوں کو قتل کر کے شورش کو کچل دیا۔
جمادی الآخرہ ۳۸ھ میں اشہب ابن بشر نے ایک سو اسی آدمیوں کے ساتھ خروج کیا پہلے ماسبذان میں آیا جہاں ہلال ابن علفہ اور اس کے ساتھی مارے گئے تھے اس نے مقتولین کی میتوں پر نماز جنازہ پڑھی اور جتنی لاشوں کو دفن کر سکتا تھا انہیں دفن کیا پھر فتنہ و شورش کے لئے نکل کھڑا ہوا امیر المومنین نے اس کے مقابلہ کے لئے جاریہ بن قدامہ کو بھیجا جنہوں نے جوخی کے اطراف میں مقام جرجرایا میں انہیں جا لیا۔ دونوں فریق نے ایک دوسرے کو دیکھ کر تلواریں سونت لیں جنگ کے شعلے بھڑک اُٹھے اور اشہب اور اس کے تمام ساتھی موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔
ماہ رجب ۳۸ھ میں سعید ابن قفل تیمی نے بندنیجین میں علم بغاوت بلند کیا اور دو سو کی جمیعت کے ساتھ مقام درزنجان میں مار دھاڑ کرتا ہوا آیا۔ حاکم مدائن سعد ابن مسعود نے اس کا مقابلہ کیا اور سب کو تہ تیغ کر دیا۔
ماہِ رمضان ۳۸ھ میں ابو مریم سعدی تمیمی نے شہر زور میں خروج کیا اس کے ہمراہ دو سو یا چار سو آدمی تھے جن میں زیادہ تر غیر عرب موالی تھے اور عرب صرف چھ تھے۔ اس نے کوفہ سے پانچ فرسخ کے فاصلہ پر پڑاؤ ڈالا اور شہر کو تاخت و تاراج کرنے کے لئے پر تولنے لگا۔ امیر المومنین کو علم ہوا تو آپ نے ایک شخص کو اُن کے ہاں بھیجا تا کہ انہیں اس خروج و بغاوت کے انجام سے ڈرا کر بیعت پر آمادہ کرے اور سمجھا بجھا کر کوفہ میں لے آئے۔ مگر انہوں نے حضرت کے سفیر کو یہ جواب دیا کہ ہم لڑنے کے لئے آئے ہیں بیعت کے لئے نہیں آئے۔ جب سفیر واپس پلٹ آیا تو آپ نے ان کی پیشقدمی کو روکنے کے لئے سات سو کا ایک دستہ شریح ابن ہانی کی زیر قیادت بھیجا۔ ابھی یہ دستہ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ خوارج نے

ایک دم حملہ کر دیا یہ حملہ اتنا شدید اور ناگہانی تھا کہ شریح کے پانچ سو آدمی میدان چھوڑ کر ادھر اُدھر منتشر ہو گئے اور ان کے ہمراہ صرف دو سو آدمی رہ گئے جنہوں نے پاس ہی ایک آبادی میں پناہ لے لی۔ میدان چھوڑ کر جانے والوں میں کچھ تو کوفہ چلے گئے اور کچھ شریح کے پاس واپس پلٹ آئے۔ امیر المومنین کو فوج کے منتشر ہونے کی خبر ہوی تو جاریہ ابن قدامہ کو خوارج کے ہاں بھیجا تاکہ انہیں ڈرا دھمکا کر اطاعت پر آمادہ کریں۔ جاریہ کے عقب میں خود امیر المومنین بھی تشریف لے آئے اور انہیں سمجھایا بجھایا اور سرکشی و بغاوت کے نتائج سے آگاہ کیا مگر ان پر کسی بات کا اثر نہ ہوا اور وہ بدستور اپنے باغیانہ موقف پر جمے رہے۔ حضرت نے جب ان کی ضد اور ہٹ دھرمی دیکھی تو اپنے آدمیوں کو حملہ کرنے کا حکم دیا۔ انہوں نے تلواریں نیاموں سے نکال لیں اور دشمن کی صفوں پر ٹوٹ پڑے۔ خوارج کی اکثریت قتل ہو گئی صرف پچاس آدمی بچے جنہوں نے امان طلب کر کے اپنی جانیں بچائیں۔ ان پچاس آدمیوں میں چالیس افراد زخمی تھے جنہیں کوفہ میں لایا گیا اور ان کا علاج معالجہ کیا گیا۔ یہ خوارج کی سب سے زیادہ جری اور سرکش جماعت تھی جسے کیفر کردار تک پہنچایا گیا۔

سقوطِ مصر

قیس ابن سعد کے حالات میں تحریر کیا جا چکا ہے کہ جب تک وُہ مصر میں حکمران رہے انہوں نے نظم و نسق برقرار رکھا اور عثمانیوں کو شورش و ہنگامہ آرائی کا موقع نہ دیا۔ جب ان کی برطرفی کے بعد محمد ابن ابی بکر اس عہدہ پر فائز ہو کر مصر میں آئے تو وُہ ایک اٹھائیس سالہ پُرجوش نوجوان تھے انہوں نے مصر کی امارت سنبھالنے کے بعد ایک مہینا تو خاموشی سے گزارا اور اس کے بعد خربتا کے عثمانیوں کو کہلوا بھیجا کہ وُہ بیعت کر کے حلقۂ اطاعت میں داخل ہوں اور وفادار رعایا بن کر رہیں ورنہ اس مملکت سے نکل کر کسی اور جگہ آباد ہو جائیں مگر انہوں نے نہ اپنا علاقہ خالی کرنا گوارا کیا اور نہ بیعت پر آمادہ ہوے اور کہا کہ جب تک حالات یکسو نہیں ہوتے ہم بیعت نہیں کریں گے۔ پھر اسی پر بس نہ کی بلکہ اندر ہی اندر سازشوں کا جال پھیلانا شروع کر دیا۔ اور جب تحکیم کی قرارداد کا انہیں علم ہوا تو کھُلم کھلا بغاوت پر اُتر آئے اور حکومت کا نظم درہم و برہم کرنے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوے۔ محمدؐ نے ان کی شر انگیزیوں کو دیکھ کر یزید ابن حارث کنانی اور ابن جمہان کو ان کے ہاں بھیجا تاکہ انہیں فتنہ و شر سے روکیں مگر انہوں نے ان دونوں کو قتل کر دیا۔ محمد نے پھر ابن مضاہم کلبی کو بھیجا اور وُہ بھی ان کے ہاتھ سے مارے گئے۔ معاویہ ابن حدیج کندی جو اب تک خاموش رہا تھا فضا کو سازگار پا کر فتنہ انگیزی کے لئے اٹھ کھڑا ہوا اور قصاص خون عثمان پر لوگوں کو اُبھارنا شروع کیا اہل خربتا تو اس کے ساتھ تھے ہی دُوسرے لوگ بھی اس کے ہمنوا ہو گئے۔ ملکی حالات بگڑ گئے نظم و نسق کا شیرازہ

بکھر گیا اور محمد کے لئے اس بغاوت و بد امنی پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔
جب امیر المومنین کو مصر کے انتشار و بد نظمی کی خبر ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ مصر کے بگڑے ہوئے حالات پر قابو پانا قیس ابن سعد کا کام ہے یا مالک اشتر کا مگر قیس ابن سعد کو فیصلۂ تحکیم تک اپنے ہاں روکنا چاہتے تھے اور اس کے بعد انہیں آذربائیجان کا والی نامزد کر چکے تھے اور مالک نصیبین میں عامل تھے۔ آخر نظر انتخاب مالک پر پڑی اور آپ نے انہیں تحریر کیا کہ میں نے محمد ابن ابی بکر کو مصر کا حاکم مقرر کیا تھا مگر لوگوں نے ان کے خلاف بغاوت کر دی ہے وہ نوجوان اور جنگ و قتال میں ناآزمودہ کار ہے تم شبیب ابن عامر ازدی کو اپنا نائب مقرر کر کے فوراً میرے پاس پہنچو۔ مالک نے اسی وقت رخت سفر باندھا اور حضرت کی خدمت میں پہنچ گئے۔ آپ نے انہیں مصر کے اوضاع سے آگاہ کیا اور فرمایا کہ تم مصر پہنچ کر حکومت سنبھال لو اور حالات کا جائزہ لے کر اپنی صواب دید پر عمل کرو۔
جب معاویہ کو اپنے جاسوسوں کے ذریعہ یہ اطلاع ملی کہ مالک اشتر کو مصر کا عامل مقرر کر کے بھیجا جا رہا ہے تو وہ پریشان ہو گئے کیونکہ وہ عمرو ابن عاص سے امارت مصر کا وعدہ کئے ہوئے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ محمد ابن ابی بکر کو بڑی آسانی سے شکست دی جا سکتی ہے مگر مالک اشتر سے نمٹنا آسان کام نہیں ہے انہوں نے چاہا کہ مالک کے مصر پہنچنے سے پہلے ہی ان کا خاتمہ کر دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے علاقہ قلزم کے ایک باجگذار جایستار کو پیغام بھجوایا کہ:۔

ان الاشتر قد ولی مصر فان	مالک اشتر مصر کا حاکم مقرر ہوا ہے اگر تم اسے
کفیتنیہ لم اخذ منک خراجا	میرے راستے سے ہٹا دو گے تو جب تک میری
ما بقیت و بقیت۔ (تاریخ کامل	اور تمہاری زندگی باقی ہے تم سے خراج نہیں
ج۳ ص۱۷۶)	لوں گا۔"

یہاں یہ سوال بالکل بیکار ہے کہ اس اقدام کی شرعی حیثیت کیا ہے۔ یہ سوال تو وہاں ہو سکتا ہے جہاں شرعی حدود کا پاس و لحاظ کیا جاتا ہو اور جہاں جاہ و اقتدار قائم رکھنا ہی منتہائے مقصد ہو وہاں اخلاقی احکام اور شرعی اوامر کی پابندی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جایستار معاویہ کے حکم کی بجا آوری کے لئے قلزم پہنچ گیا۔ جب مالک اشتر مصر جاتے ہوئے وہاں پہنچے تو اس نے بڑی گرم جوشی سے اُن کا استقبال کیا اور آداب میزبانی بجا لانے کے بعد شہد کا شربت پیش کیا جس میں زہر کی آمیزش تھی۔ آپ نے شربت کا جام لے کر پی لیا مگر پیتے ہی حالت غیر ہو گئی اور کرب و بے چینی کی کروٹیں بدلنے کے بعد دم توڑ دیا۔ جب معاویہ کو اس کی اطلاع دی گئی تو انہوں نے منبر پر کھڑے ہو کر کہا:۔

کانت لعلی یمینان قطعت	علی کے دو ہاتھ تھے ایک صفین میں قطع ہو
احدا ھما بصفین یعنی عمار	گیا یعنی عمار ابن یاسر اور ایک آج

ابن یاسر۔ وقطعت الاخری قطع ہو گیا یعنی مالک اشترؓ۔
الیوم۔ یعنی الاشتر۔ (تاریخ کامل
ج۳۔ ص۱۷۸)

جب امیر المومنین نے مالک کی خبر شہادت سنی تو اناللہ وانا الیہ راجعون کے بعد فرمایا کہ مالک کا کیا کہنا وہ آپ اپنی مثال تھا اللہ اس پر رحمت نازل کرے اس نے اپنے عہد کو پورا کیا اور اپنے پروردگار کے حضور پہنچ گیا۔ ہمارے لئے سب سے بڑی مصیبت رسول اللہ کا سانحۂ ارتحال تھا اور اس کے بعد تو ہم ہر مصیبت پر صبر کرنے کے خوگر ہو گئے ہیں۔

محمد ابن ابی بکر اپنی برطرفی سے رنجیدہ وافسردہ خاطر تھے۔ جب امیر المومنین کو اُن کی افسردگی کی خبر ہوئی تو انہیں تحریر فرمایا کہ میں نے یہ تبدیلی اس لئے نہیں کی تھی کہ تمہیں کام میں سُست اور ادائے فرض میں کمزور پایا ہوئیں چاہتا تھا کہ تمہیں ایسی جگہ پر مقرر کروں جہاں تمہیں زحمت کم اُٹھانا پڑے۔ مَیں نے جسے تمہاری جگہ پر والیٔ مصر بنا کر بھیجا تھا وہ ہمارا دوست وخیر خواہ اور دُشمنوں کے لئے شمشیر قاطع تھا خدا اس پر رحمت کرے اس کی زندگی ختم ہو گئی اور وہ اس جہانِ فانی سے جوار پروردگار میں پہنچ گیا۔ ہم اس سے راضی تھے خدا اس سے راضی وخوشنود ہو۔ تم دشمن کے ریلے کو روکنے کے لئے تیار رہو خدا تمہاری مدد کرے گا۔ محمد نے جواب میں لکھا کہ میں آپ کی خوشنودیٔ خاطر کو ہر چیز پر مقدم سمجھتا ہوں آپ جو حکم دیں گے مَیں بسروچشم اس پر عمل کروں گا اور اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ دشمن سے لڑوں گا۔

معاویہ نے مالک کا رشتۂ حیات قطع کرنے کے بعد اپنے مشیران کار عمرو ابن عاص حبیب ابن مسلمہ بسر ابن ابی ارطاۃ، ضحاک ابن قیس، عبد الرحمٰن ابن خالد، ابو الاعور سلمی اور شرجبیل ابن سمط کندی کو طلب کیا اور ان سے کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ میں نے کس مقصد کے لئے تمہیں طلب کیا ہے انہوں نے کہا کہ یہ تو آپ ہی جانیں کہ کیوں بلایا ہے۔ عمرو نے کہا کہ اس وقت بلانے کا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ آپ مصر کے بارے میں ہماری رائے دریافت کریں۔ معاویہ نے کہا کہ ہاں اسی مقصد کے لئے بلایا ہے۔ عمرو نے کہا کہ ہماری رائے ڈھکی چھپی ہوئی نہیں ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ اگر مصر فتح ہو گیا تو آپ کا اور ہم سب کا وقار بڑھ جائے گا اور ہم اپنے دشمنوں اور مخالفوں کو سرنگوں کر کے اپنا پرچم بلند کر سکیں گے۔ معاویہ نے دوسرے لوگوں سے پوچھا کہ تمہاری کیا رائے ہے سب نے کہا کہ ہمیں عمرو ابن عاص کی رائے سے اتفاق ہے۔ معاویہ نے کہا کہ مصر میں ہمارے دوست وہمنوا موجود ہیں انہیں طمع ولالچ دینا چاہیئے تا کہ وہ اپنے موقف پر مضبوطی سے جمے رہیں۔ اور مخالفوں کو ڈرا دھمکا کر پست حوصلہ کر دینا چاہیئے تا کہ وہ لڑنے کی جرأت ہی نہ کر سکیں اور کیا اچھا ہو کہ یہ مرحلہ جنگ کے بغیر سر ہو جائے۔ عمرو نے کہا کہ جنگ ناگزیر ہے اور اس کے علاوہ کامیابی

کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

اس گفت و شنید کے بعد معاویہ نے مسلمہ ابن مخلد انصاری اور معاویہ ابن حدیج سکونی کے نام ایک خط لکھ کر اپنے غلام سبیع کو دیا اور اسے مصر روانہ کیا۔ اس خط میں ان دونوں کی کوششوں کو سراہتے ہوئے انہیں مزید سرگرم عمل ہونے کی تاکید کی اور انہیں حکومت میں شریک کئے جانے کا لالچ دیا۔ مسلمہ ابن مخلد نے اپنی طرف سے اور ابن حدیج کی طرف سے جواب دیا کہ ہم عاقبت سنوارنے کے لئے یہ قدم اٹھانا چاہتے ہیں ہمیں نہ منصب کی ضرورت ہے اور نہ اقتدار کی۔ تم سواروں اور پیادوں کے لشکر جلد بھیج دو۔ ہمارے مخالف ہمت ہارے بیٹھے ہیں اگر مدد پہنچ گئی تو اللہ ہمیں فتح دے گا۔ معاویہ کو یہ خط فلسطین میں ملا اس نے وہیں سے چھ ہزار کا لشکر عمرو ابن عاص کی قیادت میں مصر روانہ کر دیا۔ جب عمرو سرزمین مصر کے قریب پہنچا تو مصر کے عثمانی بھی اس کے گرد جمع ہو گئے۔ عمرو نے معاویہ کا ایک خط جو محمد ابن ابی بکر کے نام تھا انہیں بھیجا جس میں تحریر تھا کہ تم عثمان کے گرد گھیرا ڈالنے والوں میں شامل تھے تمہیں اس جرم کی پاداش میں سزا دی جائے گی اور خود عمرو نے بھی انہیں تحریر کیا کہ مصر کا علاقہ تمہارے خلاف ہو چکا ہے اور کوئی شخص بھی تمہارا ساتھ دینے کو تیار نہیں ہے لہٰذا تم اپنی جان بچاؤ اور سرزمین مصر سے نکل جاؤ۔ محمد نے یہ دونوں تحریریں امیر المومنین کو بھجوا دیں اور انہیں لکھا کہ عمرو ابن عاص مصر کے باہر چھاؤنی ڈالے پڑا ہے میں اپنے آدمیوں میں ولولہ و جوش نہیں پاتا لہٰذا آپ فوراً کمک روانہ کریں تاکہ دشمن کی فوج سے مقابلہ کیا جا سکے۔ حضرت نے تحریر فرمایا کہ تم جتنی فوج مہیا کر سکتے ہو مہیا کرو اور اسے تسلی دو کہ وہ صبر و استقلال سے ثابت قدم رہے میں یہاں سے فوج مرتب کر کے بھیجنا چاہتا ہوں محمد ابن ابی بکر نے چار ہزار کی فوج جمع کی اور اسے دو حصوں پر تقسیم کر دیا۔ ایک حصہ پر کنانہ ابن بشر کو افسر مقرر کر کے آگے روانہ کیا اور ایک حصہ اپنی کمان میں رکھا۔ جب کنانہ لشکر کی قیادت کرتے ہوئے آگے بڑھے تو عمرو نے ان کے مقابلہ کے لئے ایک کے بعد دوسرا دستہ بھیجنا شروع کیا مگر جو دستہ آگے بڑھتا کنانہ اس کا راستا روک کر اسے پیچھے ڈھکیل دیتے۔ آخر عمرو نے چھ ہزار کی فوج کو ناکافی سمجھتے ہوئے معاویہ ابن حدیج سے کمک طلب کی ابن حدیج اپنے آدمیوں کو لے کر آیا اور شامیوں کے ساتھ مل کر کنانہ اور اس کے لشکر کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ جب کنانہ نے دیکھا کہ ان کی فوج گھیرے میں آ چکی ہے تو وہ گھوڑے سے نیچے اتر آئے اور ان کے ساتھی بھی پیادہ ہو گئے اور تلواریں لے کر دشمن کی طرف لپکے مگر حصار توڑنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ محمد نے کنانہ کی فوج کو محاصرہ میں دیکھا تو لشکر کو لے کر آگے بڑھے تاکہ حصار کو توڑ کر اپنے ساتھیوں کو نکال لے جائیں مگر محمد کے ساتھیوں نے کنانہ کی فوج کا حشر دیکھا تو ان کا ساتھ چھوڑ کر چل دیئے۔ ادھر محاصرہ میں گھری ہوئی فوج پر دشمن نے یکبارگی حملہ کر کے سب کو تہ تیغ کر دیا۔ اب محمد کے لئے کوئی چارہ نہ تھا کہ چھپ چھپا کر کہیں نکل جائیں اور اپنی جان بچائیں۔ چنانچہ وہ نکل کھڑے ہوئے اور

ایک خرابے میں چھُپ کر بیٹھ گئے۔ معاویہ ابن حدیج کو جب یہ معلوم ہوا کہ محمد بچ کر نکل گئے ہیں تو وہ خود تلاش کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک مقام پر چند آدمیوں کو دیکھا تو اُن سے پُوچھا کہ تم نے ادھر سے کسی کو گزرتے دیکھا ہے اُن میں سے ایک نے کہا کہ میں نے ایک شخص کو اس خرابے میں دیکھا ہے۔ ابن حدیج نے کہا کہ پھر وہی ہوگا۔ چنانچہ اُس نے خرابے میں جھانک کر دیکھا تو وُہ محمد ہی تھے انہیں کشاں کشاں باہر نکالا اور جکڑ باندھ کر اپنے ساتھ لے لیا۔ جب عبدالرحمٰن ابن ابی بکر کو جو شامیوں کی سپاہ میں شامل تھا محمد کی گرفتاری کا علم ہوا تو اس نے عمرو ابن عاص سے کہا کہ تم ابن حدیج کو مجبور کرو کہ وُہ میرے بھائی کو قتل نہ کرے۔ عمرو نے ابن حدیج کو پیغام بھجوایا کہ محمد کو میرے پاس بھیج دو۔ ابن حدیج نے کہا کہ تم لوگوں نے میرے ابن عم کنانہ ابن بشر کو تو بے دریغ قتل کر دیا ہے اور محمد کو بچا لے جانا چاہتے ہو اب وُہ میرے ہاتھ سے بچ نہیں سکتا۔ محمد نے موت کو اپنے سر پر منڈلاتے دیکھا تو کہا کہ میں بہت پیاسا ہوں مجھے تھوڑا سا پانی پلا دو ابن حدیج نے پانی پلانے سے انکار کیا اور کہا کہ تم لوگوں نے عثمان کو پیاسا مارا تھا خدا مجھے سیراب نہ کرے اگر میں تمہیں ایک قطرہ پانی کا دوں۔ میں تمہیں موت کے گھاٹ اتاروں گا اور اللہ تمہیں جہنم کے کھولتے ہُوئے پانی اور پیپ سے سیراب کرے گا۔ محمد نے کہا کہ اے یہودیہ کے بیٹے یہ نہ تیرے بس کی بات ہے اور نہ عثمان کے بس کی اللہ اپنے دوستوں کو سیراب کرے گا اور تجھ ایسے لوگوں کو پیاسا ہی رکھے گا۔ خدا کی قسم اگر میرے ہاتھ میں تلوار ہوتی تو تیری یہ جرأت نہ تھی کہ مجھے اس آسانی سے گرفتار کر لیتا۔ ابن حدیج نے کہا کہ اب تو تم میرے قبضہ میں ہو میں پہلے تمہیں قتل کروں گا اور پھر تمہاری لاش گدھے کے پیٹ میں رکھ کر جلا دوں گا۔ محمد نے کہا کہ اگر تُو نے ایسا کیا تو یہ کوئی نئی بات نہ ہوگی تم لوگ ہمیشہ سے دوستانِ خدا کے ساتھ یہی برتاؤ کرتے چلے آئے ہو۔ میں اللہ سے اُمید رکھتا ہوں کہ وُہ اس آگ کو ٹھنڈا کر دے گا جس طرح ابراہیم خلیل اللہ پر ٹھنڈا کیا تھا اور تیرے دوست معاویہ اور عمرو ابن عاص کو جہنم کی دہکتی ہوئی آگ میں جھونکے گا اور جب اس کی آنچ مدھم ہونے لگے گی تو اسے اور بھڑکا دے گا۔ اس پر ابن حدیج نے غضبناک ہو کر تلوار ماری اور محمد خاک و خون میں تڑپنے لگے۔ ابھی رمقِ جان باقی تھی کہ انہیں مردہ گدھے کے پیٹ میں رکھ کر جلا دیا۔ ام المومنین حضرت عائشہ کو محمد کے مارے جانے کی خبر ہوئی تو وہ بے ساختہ رونے لگیں اور مرتے دم تک ہر نماز کے بعد ان کے قاتلوں پر نفرین کرتیں۔

امیر المومنین نے محمد کے کمک طلب کرنے پر انہیں تحریر کیا تھا کہ میں فوجی دستوں کی روانگی کا سر و سامان کر رہا ہوں۔ چنانچہ جب عبداللہ ابن قعین اور کعب ابن عبداللہ محمد کا پیغام لے کر آئے تو آپ نے اہل کوفہ کو مصر جانے کے لئے کہا اور فرمایا کہ وُہ کل کوفہ و حیرہ کے درمیان مقام جرعہ میں جمع ہو جائیں۔ دُوسرے دن امیر المومنین خود بھی وہاں پہنچ گئے اور صبح سے دوپہر تک منتظر رہے مگر اس عرصہ میں آنے والوں کی تعداد ایک سو تک بھی نہ پہنچ سکی۔ حضرت بددل ہو کر واپس پلٹ آئے اور شب کو اعیان و اشرافِ کوفہ کو جمع

کر کے فرمایا کہ میں تمہیں کوئی حکم دیتا ہوں تو تم منہ پھیر لیتے ہو اب تو میں تمہاری صحبت سے بیزار ہو چکا ہوں نہ تمہارے اندر ملکی حمیت ہے نہ دینی جذبہ معاویہ لوگوں کو پکارتا ہے تو لوگ اندھا دھند اس کی آواز پر لبّیک کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور میں تمہیں پکارتا ہوں تو تمہاری زبانیں گنگ ہو جاتی ہیں حالانکہ تم دانا و ہوشمند ہو۔ کعب ابن مالک ارحبی نے کہا کہ یا امیر المومنین میں اس مہم پر جانے کے لئے حاضر ہوں اور اہل کوفہ سے کہا کہ اے لوگو اللہ سے ڈرو اپنے امام کی آواز پر لبّیک کہو اور دشمن سے لڑنے کے لئے نکل کھڑے ہو۔ جب کعب اس مہم پر جانے کے لئے تیار ہوئے تو حضرت نے اپنے غلام سعد کو حکم دیا کہ وہ اعلان عام کرے کہ تمام لوگ کعب کے پرچم کے نیچے جمع ہو جائیں اور فوراً محمد کی مدد کے لئے پہنچیں مگر ان لوگوں نے ایک مہینا جمع ہونے میں گزار دیا اور جب کعب دو ہزار کا لشکر لے کر مصر روانہ ہوئے تو حضرت نے فرمایا کہ مجھے امید نہیں کہ تم بر وقت پہنچ سکو اور کسی کام آسکو۔

اس لشکر کو روانہ ہوئے دو چار دن ہوئے تھے کہ حجاج ابن غزیہ انصاری جو محمد ابن ابی بکر کے لشکر میں شامل تھے بچ بچا کر کوفہ آئے اور مصر کے سقوط اور محمد ابن ابی بکر کے قتل کی خبر دی اور عبد الرحمٰن ابن شبیب فزاری نے شام سے پلٹ کر بتایا کہ میں نے اہل شام کو اتنا خوش ہوتے کبھی نہیں دیکھا جتنا فتح مصر اور محمد کے قتل پر خوش ہوتے دیکھا ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ جتنی انہیں محمد کے مارے جانے پر خوشی ہوئی ہے ہمیں اس سے کئی گنا زائد رنج ہوا ہے۔ حضرت کو رنجیدہ و غمناک دیکھ کر کچھ لوگوں نے کہا کہ یا امیر المومنین آپ ان کے مارے جانے پر اتنے غمگین کیوں ہیں فرمایا

مایمنعنی انہ کان لی ربیبا و	کیوں رنجیدہ نہ ہوں وہ میرا پروردہ میرے
کان لبنی اخا و کنت لہ والدا	بیٹوں کا بھائی اور میں اس کا باپ تھا اور اسے
اعدہ ولدا (شرح ابن ابی الحدید	اپنا بیٹا شمار کرتا تھا۔"

ج۔ ص۳۲)

اب مصر جانے والے لشکر کا کوئی مصرف نہ رہا تھا حضرت نے عبد الرحمٰن ابن شریح کو کعب ابن مالک کے عقب میں روانہ کیا کہ وہ لشکر سمیت واپس پلٹ آئیں۔ چنانچہ وہ واپس آگئے اور مصر پر معاویہ کا اقتدار قائم ہو گیا۔

معاویہ جہاں شام پر اپنا تسلط و اقتدار برقرار رکھنا چاہتے تھے وہاں مصر پر بھی قبضہ کرنا چاہتے تھے اور اسی بنا پر انہوں نے عمرو ابن عاص سے امارت مصر کا وعدہ کیا تھا وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر ایک طرف سے اہل مصر اور دوسری طرف سے اہل عراق ایک ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے تو شام کا علاقہ چکی کے دو پاٹوں میں پس کر رہ جائے گا اس لئے شام کا تحفظ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک مصر کو اپنی مقبوضہ ریاست میں شامل نہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ مصر ایک شاداب و زرخیز علاقہ تھا اور وہاں کے خراج کی آمدنی بھی

احنف ابن قیس خاموش بیٹھے رہے اور کہا کہ ہمیں ان باتوں سے کوی مطلب و سروکار نہیں ہے البتہ قبیلۂ عبدالقیس کے ایک فرد عمرو ابن مرحوم نے کہا کہ اے لوگو تم اپنی سابقہ بیعت پر باقی رہو اور بیعت شکنی کرکے جماعت میں انتشار و افتراق پیدا نہ کرو۔ اگر تم بیعت توڑ کر اس شخص کی آواز پر اُٹھ کھڑے ہوُے تو یاد رکھو کہ ہلاکت و تباہی سے دوچار ہوُے بغیر نہیں رہو گے۔ عباس ابن صحار عبدی جو اپنے قبیلۂ عبدالقیس کی روش کے برخلاف امیر المومنین سے پرخاش رکھتا تھا کہنے لگا کہ ہم قولاً اور عملاً اس کا ساتھ دیں گے اور نصرت میں کوی کسر اُٹھا نہیں رکھیں گے۔ مثنی ابن مخربہ عبدی نے یہ سُنا تو ابن عامر سے کہا کہ تم ابن صحار کی باتوں میں نہ آجانا۔ بہتر ہے کہ تم جدھر سے آئے ہو اُدھر واپس چلے جاؤ ورنہ ہم تلواروں تیروں اور نیزوں سے تمہیں واپس پلٹ جانے پر مجبور کر دیں گے۔ کیا ہم ابن عم رسُول کی اطاعت سے مُنہ موڑ کر ایک باغی و طاغی کی بیعت کریں خدا کی قسم یہ کبھی نہیں ہو گا۔ ابن عامر نے جب اپنے مخالفین کی باتیں سُنیں تو خطرہ کے پیش نظر صبرہ ابن شیمان ازدی سے کہا کہ اے صبرہ تم بھی تو ہمارے ہمخیال ہو اور عرب کی عظیم شخصیت اور اپنے قبیلہ کے سردار ہو میری مدد کرو اور پناہ دینے کا وعدہ کرو۔ صبرہ نے کہا کہ اگر تم بنی تمیم کے ہاں سے اُٹھ کر ہمارے ہاں چلے آؤ اور میرے گھر میں ٹھہرو تو ہم مدد بھی کریں گے اور پناہ بھی دیں گے کہا کہ میں وہیں قیام کرنے پر مجبور ہوں جہاں مجھے قیام کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ صبرہ نے یہ سُنا تو پیشانی پر بل ڈال کر چل دیا۔

بصرہ کے حاکم عبداللہ ابن عباس تھے مگر وُہ محمد ابن ابی بکر کی تعزیت کے سلسلہ میں کوفہ جا چکے تھے اور بصرہ کی امارت زیاد ابن عبید کے سپرد کر گئے تھے۔ زیاد ابن عامر کی آمد پر ہراساں ہو گیا کیونکہ بنی تمیم اور دوسرے قصاص طلب اُس کی پُشت پر تھے۔ اس نے حضین ابن منذر اور مالک ابن مسمع کو دارالامارہ میں بلوایا اور اُن سے کہا کہ اے گروہ بکر ابن وائل تم امیر المومنین کے حامیوں میں شمار ہوتے ہو میں دشمن کی چیرہ دستی و فتنہ انگیزی سے مامون نہیں ہوں۔ جب تک امیر المومنین کی طرف سے کوی حکم نہیں آتا مجھے اپنے ہاں پناہ دو۔ حضین ابن منذر نے کہا کہ تم پناہ کے طالب ہو تو میں تمہیں پناہ دینے کے لئے تیار ہوں مگر مالک نے کہا کہ میں اپنے آدمیوں سے پُوچھے بغیر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ جب زیاد نے مالک کو پناہ دینے سے پہلو بچاتے دیکھا تو اپنا ارادہ بدل دیا اور صبرہ ابن شیمان ازدی کو کہلوا بھیجا کہ مجھے پناہ دو اور بیت المال کی حفاظت کا انتظام کرو صبرہ نے کہا کہ تم ہمارے ہاں چلے آؤ اور بیت المال بھی یہاں منتقل کر دو ہم تمہیں بھی پناہ دیں گے اور بیت المال کی بھی حفاظت کریں گے۔ چنانچہ زیاد راتوں رات ان کے ہاں چلا گیا اور بیت المال اور منبر بھی ادھر منتقل کر دیا۔

جب زیاد کے جانے کے بعد دارالامارہ خالی ہو گیا تو بنی تمیم اور ان کے ہمنواؤں نے چاہا کہ ابن عامر کو دارالامارہ میں لے جا کر اُتاریں۔ چنانچہ بنی تمیم ابن عامر کو لے کر دارالامارہ کی طرف بڑھے۔ بنی ازد نے

دیکھا تو وُہ بھی گھوڑوں پر سوار ہو کر آ گئے اور کہا کہ ہم ایک ناپسندیدہ شخصیت کو دارالامارہ میں اترنے نہیں دیں گے۔ جب ادھر سے اصرار بڑھا اور تصادم کا خطرہ پیدا ہوا تو احنف ابن قیس بیچ میں پڑے اور ابن عامر کے ہمراہیوں سے کہا کہ دارالامارہ پر تمہارا حق دُوسروں سے فائق نہیں ہے اور نہ تمہیں یہ حق پہنچتا ہے کہ دُوسروں پر ایک ایسے شخص کو مسلط کرو جسے وُہ ناپسند کرتے ہیں۔ احنف کے کہنے سُننے سے وُہ لوگ واپس پلٹ گئے اور بنی ازد نے بھی اپنے گھروں کی راہ لی۔

زیاد نے عبداللہ ابن عباس کو تحریر کیا کہ معاویہ کی طرف سے ابن عامر حضرمی یہاں وارد ہوا ہے اور بنی تمیم کے ہاں مقیم ہے اس نے لوگوں کو خونِ عثمان کے قصاص پر اُبھارا ہے اور اکثر اہل بصرہ اس کے ساتھ ہو گئے ہیں۔ مَیں نے صبرہ ابن شیمان ازدی کے ہاں پناہ لے لی ہے اور بیت المال بھی بنی ازد کے ہاں منتقل کر دیا ہے۔ شیعیان امیرالمومنین کا میرے ہاں آنا جانا ہے شیعیان عثمان، ابن عامر کے ہاں جمع ہیں اور دارالامارہ خالی پڑا ہے۔ آپ امیرالمومنین سے صورتِ حال بیان کریں اور وُہ جو حکم دیں اس سے مجھے آگاہ کریں۔

زیاد بنی ازد کے ہاں پہنچ کر ایک دن تو چھپا رہا اور شائد کچھ دن اور چھپا رہتا لیکن بنی ازد نے کہا کہ اب چھپنے سے کام نہیں چلے گا تمہیں نماز جمعہ بھی پڑھانا ہو گی اور خطبہ بھی دینا ہو گا۔ چنانچہ زیاد نے نماز جمعہ کھلے بندوں پڑھائی اور خطبہ دیتے ہُوئے کہا کہ اگر میں بنی تمیم کے ہاں پناہ لیتا اور ابن عامر تمہارے زیرِ حمایت ہوتا، تو میں ابن عامر پر قابو نہیں پا سکتا تھا۔ اور جبکہ میں تمہاری پناہ میں ہوں ابن عامر مجھے اپنی گرفت میں نہیں لے سکتا اور نہ ہند جگر خوارہ کا بیٹا معاویہ امیرالمومنین اور انصار و مہاجرین پر غلبہ حاصل کر سکتا ہے۔ اے بنی ازد میں نے جمل کے موقع پر تمہاری دلیری و شجاعت دیکھی ہے اگر اس دن باطل کی حمایت میں صبر و ثبات دکھایا تھا تو آج حق کی حمایت میں جرأت و پامردی کے جوہر دکھاؤ۔ اس پر صبرہ کے باپ شیمان نے کہا کہ اے گروہ بنی ازد جنگ جمل کے نتیجہ میں تمہیں ذلّت و رُسوائی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا اگر میں اس موقع پر موجود ہوتا تو تمہیں کبھی لڑنے کی اجازت نہ دیتا۔ اگر تم کل علی کے خلاف تھے تو آج اُن کی حمایت کر کے خلاف ورزی کے بدنما دھبوں کو دھو ڈالو۔ اگر بنی تمیم اپنے سردار کو لے کر میدان میں آئیں تو تم بھی اپنے سردار کو لے کر مقابلہ کرو اگر وہ معاویہ سے کمک مانگیں تو تم بھی علی سے مدد طلب کرو اگر وُہ مصالحت چاہیں تو تم بھی مصالحت پر آمادہ ہو جاؤ۔ پھر اس کا بیٹا صبرہ کھڑا ہوا اور کہا کہ ہمیں علی سے اتنا اندیشہ نہیں ہے جتنا معاویہ سے خطرہ ہے لہٰذا اب شمشیر بکف اُٹھ کھڑے ہو اور پناہ دہی کا حق ادا کر دو۔ بنی ازد نے کہا کہ ہم تمہارے تابع فرمان ہیں ہمیں جو حکم دیا جائے گا ہم بسر و چشم اس کی تعمیل کریں گے۔ زیاد نے کہا کہ اے صبرہ تمہیں یہ خطرہ تو نہیں ہے کہ تم بنی تمیم کا مقابلہ نہ کر سکو گے کہا کہ اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اگر وُہ احنف کو لے کر آئیں گے تو ہم اس کے مقابلہ میں ابو صبرہ کو پیش کریں گے اگر وہ حبات کو لائیں گے تو میں

ایک کالی کلوٹی حبشیہ عورت تھی سر سے چادر اُتار دی اور کہا کہ اگر تم باہر نہیں آؤ گے تو میں مجمع عام میں عُریاں ہو جاؤں گی ابن خازم مجبور ہو کر نیچے اُترا اور ماں کے ساتھ چلا گیا۔ ابن خازم کے جانے کے بعد جاریہ اور زیاد نے قصر کو محاصرہ میں لے لیا اور جب اُسے خالی کروانے کی کوئی سبیل نظر نہ آئی تو جاریہ نے اس میں آگ لگا دی اور ابن عامر اپنے ستر آدمیوں سمیت ہلاک ہو گیا۔ کچھ آگ میں جل گئے کچھ دیوار کے نیچے دب کر مر گئے اور کچھ بھاگنے کی کوشش کرتے ہوئے مارے گئے۔ ان ہلاک ہونے والوں میں عبدالرحمٰن ابن عمیر تمیمی اور وداع ابن بدر بھی شامل تھا۔

زیاد نے ظبیان ابن عمیر کو خط دے کر امیر المومنین کی خدمت میں بھیجا اور انہیں تحریر کیا کہ ہمیں فتح و کامیابی حاصل ہوئی ہے اور جاریہ کے ہاتھوں دشمن کا صفایا ہو گیا ہے۔ حضرت نے اس بغاوت کے فرو ہونے پر اظہار اطمینان کیا اور ظبیان سے پوچھا کہ بصرہ میں تمہارا مکان کس جگہ پر واقع ہے اس نے جگہ کی نشاندہی کی۔ فرمایا کہ تم بصرہ کے اطراف میں مکان بنوا کر وہاں منتقل ہو جاؤ۔ یہ بصرہ ہمیشہ آگ اور پانی کی زد میں رہے گا اور اس طرح غرق ہو گا کہ مسجد کے کنگروں کے علاوہ کوئی عمارت نظر نہ آئے گی۔ چنانچہ بصرہ دو دفعہ غرق ہوا ایک دفعہ قادر باللہ کے دور میں اور ایک دفعہ قائم بامر اللہ کے عہد حکومت میں اور بالکل یہی صورت پیش آئی کہ جامع مسجد کے کنگروں کے علاوہ کوئی چیز نظر نہ آتی تھی۔

معاویہ کا یہ اقدام سینہ زوری امن دشمنی اور ہوس ملک گیری کا نتیجہ تھا جس کا خمیازہ انہیں بدترین شکست کی صورت میں بھگتنا پڑا اور جس قبیلۂ بنی ازد پر انہیں وثوق و اعتماد تھا کہ وہ ساتھ دے گا وہی قبیلہ زیاد کی پناہ گاہ اور جاریہ کا بازوئے شمشیر زن ثابت ہوا اور آخر دشمن کو اس طرح کچلا کہ صفحۂ ہستی پر اس کا نام و نشان تک نہ چھوڑا۔ معاویہ کا اقدام بے سوچے سمجھے یا وقتی اشتعال کے زیر اثر نہ تھا بلکہ سوچ بچار اور صلاح و مشورہ کے بعد عمل میں لایا گیا تھا جس میں حسب ذیل وجوہ و مقاصد کار فرما تھے:۔

(۱) معاویہ نے فتح مصر سے یہ اندازہ لگایا کہ عراق میں حضرت علیؑ کی عسکری قوت کمزور پڑ چکی ہے ورنہ کوفہ سے محمد ابن ابی بکر کی مدد کے لئے فوج بھیجتے۔ اور جب مرکز میں فوجی طاقت نہیں ہے تو بصرہ میں کہاں ہو گی جو مزاحم ہو سکے۔

(۲) عبداللہ ابن عباس جو حضرت کے عزیز اور دوست و بازو ہیں وہ ان دنوں بصرہ میں موجود نہیں ہیں اور ان کا نائب زیاد جس کا اقتدار وقتی حیثیت رکھتا ہے وہ شہر کے بچاؤ کے لئے اپنی جان خطرہ میں نہیں ڈالے گا اور بے لڑے ہتھیار ڈال دے گا۔

(۳) بصرہ جنگ جمل کا میدان رہ چکا ہے اور وہیں کے لوگوں نے قصاص خون عثمان کے سلسلہ میں طلحہ و زبیر کا ساتھ دیا تھا اور اب بھی وہاں ایسے لوگوں کی کمی نہ ہو گی جنہیں قصاص کے نام پر برانگیختہ کیا جا سکتا ہے اور وہ بہر حال تعاون کریں گے۔ اور اگر تعاون نہ بھی کریں جب بھی فریق مخالف کا ساتھ نہ دیں گے۔

(۴) اہل بصرہ کے ان گنت افراد علی اور اُن کے لشکر کے ہاتھوں مارے گئے ہیں اور مقتولین کے وارثوں اور ان کے قبیلہ والوں کے سینوں میں انتقام کی آگ بھڑک رہی ہوگی اور وہ اس انتقامی جذبہ کے زیرِ اثر علی کی فوج کے مقابلہ میں اُن کے آدمیوں سے تعاون کریں گے۔
(۵) بصرہ اپنے محل وقوع کے لحاظ سے فارس کے علاقہ سے متصل ہے اگر بصرہ فتح ہوجائے تو یہ فتح مزید فتوحات کا پیش خیمہ بن سکتی ہے اور بڑی آسانی سے فارس پر جو علی کے مقبوضہ علاقوں میں شامل ہے قبضہ کیا جاسکتا ہے۔

شامیوں کے جارحانہ حملے

بصرہ کی ہزیمت کے بعد معاویہ کو اندازہ ہوگیا کہ عراق کے شہروں پر حملہ کرکے کامیابی حاصل کرنا مشکل ہے البتہ مضافاتی آبادیوں اور دُور افتادہ بستیوں میں قتل و غارت سے وحشت پھیلائی جاسکتی ہے چنانچہ انہوں نے امیر المومنین کے سرحدی قصبوں اور فوجی بارکوں پر تاخت و تاراج اور قتل و غارت کا سلسلہ شروع کردیا اور دیکھتے ہی دیکھتے پُر رونق و شاداب بستیاں ویرانوں میں بدل گئیں اور بے گناہوں کے خون کا سیلاب ہر طرف امنڈ آیا۔ ان غارت گریوں کا مقصد یہ تھا کہ حضرت کے قلمرو مملکت میں انتشار و بدامنی پھیلا کر اُسے کمزور سے کمزور تر کردیا جائے اور آپ کو انہی شورشوں اور ہنگاموں کے فرو کرنے میں الجھائے رکھا جائے تاکہ وہ کسی وقت اپنی بکھری طاقت کو یکجا کرکے ان کے مقابلہ میں کھڑے نہ ہوسکیں۔ چنانچہ ۳۹ھ میں نعمان ابن بشیر کو دو ہزار کے لشکر کے ساتھ عین التمر پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا یہاں امیر المومنین کا ایک اسلحہ خانہ تھا جس کے نگران مالک ابن کعب ارحبی تھے اور ان کی ماتحتی میں ایک ہزار کی جمعیت ہمیشہ یہاں موجود رہتی تھی مالک کو جب نعمان کی پیشقدمی کا علم ہوا تو اس وقت اُن کے پاس صرف ایک سو آدمی تھے اور باقی اجازت لے کر کوفہ جا چکے تھے انہوں نے امیر المومنین کو تحریر کیا کہ دو ہزار شامیوں کا لشکر حملہ کے ارادہ سے بڑھ رہا ہے اور یہاں جو لوگ موجود ہیں وہ اس یلغار کو روکنے کے لئے ناکافی ہیں لہٰذا فوراً ایک دستہ سپاہ روانہ کریں۔ امیر المومنین نے صورت حال پر مطلع ہوتے ہی حارث ہمدانی سے فرمایا کہ وہ کوفہ میں اعلان کریں کہ تمام لوگ رحبہ میں جمع ہوں۔ حضرت دوسرے دن نماز صبح سے فارغ ہوکر رحبہ میں تشریف لائے تو دیکھا کہ تین سو کے لگ بھگ آدمی جمع ہیں۔ آپ نے اہل کوفہ کی جنگ سے بے دلی دیکھی تو فرمایا اے اہل کوفہ میں نے تمہیں تمہارے بھائیوں ہی کی مدد کے لئے بلایا تھا مگر جب بھی شامیوں کے لشکر تمہارے سروں پر منڈلاتے ہیں تو تم جنگ سے جی چرانے لگتے ہو اور دروازے بند کرکے گھر کے گوشوں میں چھپ کر بیٹھ جاتے ہو۔ عدی ابن حاتم نے آپ کو افسردہ خاطر دیکھا تو کہا کہ یا امیر المومنین میرے قبیلہ بنی طے میں ایک ہزار افراد جنگجو موجود ہیں اگر آپ حکم دیں تو میں انہیں لے کر دشمن کی سرکوبی کے لئے جاؤں فرمایا کہ مجھے یہ

اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ دشمن کے مقابلہ میں ایک ہی قبیلہ کے لوگ جائیں اور اُسے یہ تاثر دیں کہ دوسرے قبائل تعاون سے گریزاں اور ہماری نصرت سے روگرداں ہیں تم نخیلہ میں جاکر دُوسرے لوگوں کو بھی جہاد کی دعوت دو۔ چنانچہ انہوں نے لوگوں سے کہا سُنا اور بنی طے کے علاوہ ایک ہزار افراد اور جمع ہو گئے عدی ابن حاتم لشکر ترتیب دے کر کوچ کرنا چاہتے تھے کہ مالک ابن کعب کا پیغام آیا کہ ہم نے دشمن کو اپنی سرحد کے نکال باہر کیا ہے اب فوجی کمک کی ضرورت نہیں ہے۔ ہوا یہ کہ مالک نے بایں خیال کہ شائد حضرت کی طرف سے مدد کے آنے میں تاخیر ہو جائے حُسن تدبر سے کام لیتے ہوئے عبداللہ ابن حوزہ ازدی کو قرظہ ابن کعب اور مخنف ابن سلیم کے ہاں بھیج دیا اور موجودہ صورت حال سے نمٹنے کے لئے اُن سے مدد طلب کی۔ قرظہ نے کہا کہ میں خراج کی جمع آوری پر متعین ہوں میرے ماتحت ایسے لوگ نہیں ہیں جنہیں میں بھیج سکوں البتہ مخنف ابن سلیم نے اپنے بیٹے عبدالرحمٰن کی قیادت میں پچاس آدمیوں کا ایک مختصر دستہ بھیج دیا۔ جب عصر کے وقت یہ دستہ عین التمر کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ مالک اور اُن کے ساتھی دیوار سے پُشت لگائے کھڑے اور تلواروں کے نیام توڑ کر مرنے مارنے پر آمادہ ہیں۔ نعمان نے اس دستہ کو دیکھا تو یہ سمجھا کہ یہ مقدمۃ الجیش ہے اور اس کے عقب میں فوج آرہی ہے اس نے فوراً واپسی کے ارادہ سے رُخ موڑا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ مالک نے پیچھا کر کے اس کے تین آدمیوں کو تہ تیغ کر دیا اور دشمن انہیں کوئی صدمہ نہ پہنچا سکا۔

اسی ۳۹ھ میں معاویہ نے سفیان ابن عوف غامدی کو چھ ہزار کی جمعیت کے ساتھ ہیت انبار اور مدائن پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا اور اُسے ہدایت کی کہ وُہ حضرت کے فوجی ٹھکانوں پر حملہ کر کے انہیں تباہ و برباد کر دے۔ سفیان نے حسب ہدایت پہلے ہیت کا رُخ کیا۔ ہیت کے عامل کمیل ابن زیاد نخعی تھے وُہ یہ سُن کر کہ قرقیسیا میں سپاہ شام کے کچھ لوگ جمع ہیں جو ہیت پر حملہ آور ہونا چاہتے ہیں شہر کو خالی چھوڑ کر اُن کے تعاقب میں جاچکے تھے حالانکہ انہیں امیرالمومنین کی طرف سے یہ اجازت نہ تھی کہ وُہ اپنا مرکز چھوڑ کر ادھر ادھر ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب سفیان کا لشکر ہیت پہنچا تو دیکھا کہ شہر خالی پڑا ہے اور اس کی پیشقدمی کو روکنے والا کوئی نہیں ہے وُہ بلا مزاحمت ہیت سے گزر کر انبار کی طرف بڑھا۔ یہاں پانچ سو آدمیوں کا ایک دستہ شہر کی حفاظت کے لئے متعین تھا مگر اس وقت صرف دو سو آدمی موجود تھے اور باقی اِدھر اُدھر جاچکے تھے۔ سفیان نے فوج کا اندازہ کرنے کے لئے وہاں کے چند نوجوانوں کو پکڑ کر ان سے دریافت کیا کہ یہاں فوج کے کتنے آدمی ہوں گے انہیں بتایا گیا کہ اس وقت دو سو کے لگ بھگ ہیں۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ فوج کی تعداد انتہائی کم ہے تو اس کی ہمت بڑھی اور اپنے لشکر کی صف بندی کر کے آگے بڑھا۔ ادھر سے اشرس ابن حسان بکری جو فوجی دستہ کے افسر اعلےٰ تھے اپنے گنے چنے ساتھیوں کو لے کر مقابلہ کے لئے نکل آئے۔ جب اُن کے ہمراہیوں نے دُشمن کی کثرت و قوت کو دیکھا تو ان دو سو میں سے بھی آدھے لوگ منتشر ہو گئے اور باقی ماندہ گلی کوچوں میں کبھی دُشمن سے دو بدو ہو کر لڑتے اور کبھی جھکائی دے کر ادھر ادھر ہو جاتے۔ اشرس نے جب دیکھا کہ اس طرح دشمن کو جھکائیاں

دے کر جانیں بچالے جانا مشکل ہے تو انہوں نے باہر نکل کر لڑنے کی ٹھان لی اور پکار کر کہا کہ جو اللہ کی راہ میں جان دینا چاہتا ہے اور اُس کی رضا و خوشنودی کا طالب ہے وُہ باہر میدان میں نکل آئے۔ اس آواز پر تیس آدمی نکلے جنہوں نے جاں بازی و جان نثاری کا ثبوت دیتے ہُوئے بڑی پامردی سے مقابلہ کیا اور لڑتے بھڑتے سب کے سب شہید ہوگئے اب شامیوں کی چیرہ دستیوں کو روکنے والا کوئی نہ تھا انہوں نے ایک ایک گھر کو لوٹا عورتوں کے زیورات تک اتروا لئے اور جو ہاتھ لگا سمیٹ کر چلتے بنے۔

جب امیرالمومنین کو دشمن کی غارت گری و تباہ کاری کا علم ہوا تو آپ نے کمیل ابن زیاد کو تہدید آمیز خط لکھا اور شہر کو حفاظتی دستہ کے بغیر چھوڑنے پر سرزنش کی اور منبر پر خطبہ دیتے ہُوئے لوگوں کو جہاد کی دعوت دی اور دشمن کے تعاقب میں جانے کے لئے کہا مگر کسی سمت سے لبیک کی آواز بلند نہ ہوئی۔ حضرت نے انہیں خاموش اور جنگ سے پہلو تہی کرتے دیکھا تو غم و غصہ میں اُٹھ کھڑے ہوئے اور تن تنہا دشمن کو کچلنے کے ارادہ سے چل دیئے۔ اب لوگوں کو بھی غیرت آئی اور وُہ حضرت کے پیچھے ہولئے جب وادئ نخیلہ میں پہنچے تو کہا کہ یا امیرالمومنین آپ واپس تشریف لے جائیں ہم دشمن سے نمٹنے کے لئے کافی ہیں۔ جب ان لوگوں کا اصرار بڑھا تو آپ کوفہ واپس آگئے اور سعید ابن قیس کی قیادت میں آٹھ ہزار کا لشکر دشمن کے تعاقب میں روانہ ہوگیا۔ جب یہ لشکر فرات کی جانب سے عانات پہنچا تو سعید نے ہانی ابن خطاب ہمدانی کو دشمن کا کھوج لگانے کے لئے آگے روانہ کیا وُہ کھوج لگاتے ہوئے حدود قنسرین تک گئے مگر سفیان کا لشکر آگے جا چکا تھا اور یہ تعاقب نتیجہ خیز ثابت نہ ہوا۔

جب سعید ابن قیس واپس پلٹے تو حضرت نے جہاد کی اہمیت کے بارے میں خطبہ دیا اور جنگ سے جی چرانے والوں کو دشمن کی سرکوبی پر ابھارا اس پر جندب ابن عفیف ازدی کھڑا ہوا اور کہا کہ یا امیرالمومنین میں اپنی ذات اور اپنے بھتیجے عبدالرحمٰن ابن عبداللہ پر اختیار رکھتا ہوں آپ ہم دونوں کو جو حکم دیں گے ہم اُسے بسر و چشم بجا لائیں گے۔ حضرت نے فرمایا کہ میں جو چاہتا ہوں وُہ تم دو آدمیوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ حضرت یہ چاہتے تھے کہ جن لوگوں نے ہیت اور انبار میں غارت گری کی تھی انہیں اس طرح کچلا جائے کہ آئندہ انہیں عراقی سرحدوں پر حملہ آور ہونے کی جرأت نہ ہو سکے۔ آپ نے سعید کی واپسی کے بعد چند دن توقف فرمایا اور پھر اہل کوفہ کو جمع کر کے خطبہ دیا اور فرمایا کہ اے لوگو تم انصار مدینہ سے تعداد میں کہیں زیادہ ہو انہوں نے کم ہونے کے باوجود پیغمبر اور مہاجرین کو اپنے ہاں پناہ دی انہوں نے کڑیاں جھیلیں مصیبتیں برداشت کیں مگر اسلام و اہل اسلام کی نصرت و حمایت سے ہاتھ نہ اُٹھایا یہاں تک کہ اسلام کا پرچم فضائے عرب پر لہرانے لگا اس پر ایک دریدہ دہن شوخ چشم اور دراز قامت شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ آپ نہ محمد ہیں اور نہ ہم انصار ہم پر اتنا ہی بوجھ ڈالئے جتنا ہم اٹھا سکیں۔ حضرت نے فرمایا کہ بات کو سمجھو اور سوچ کر بولو۔ میں نے یہ کب کہا ہے کہ میں محمد ہوں اور تم انصار ہو میں نے تو یہ مثال کے

طور پر کہا ہے تاکہ تم بھی انصار کی راہ و روش پر چل کر اپنے اندر ان کا سا جذبہ پیدا کرو اور حوزۂ اسلام کے تحفظ کے لئے آئے دن کی غارت گریوں کو روکو۔ اس پر ایک اور شخص نے کھڑے ہو کر کہا کہ آج امیر المومنین کو اصحاب نہروان کی ضرورت کا احساس ہُوا ہو گا جنہیں خود اپنے ہاتھوں موت کے گھاٹ اُتارا ہے پھر ہر طرف سے مختلف آوازیں آنے لگیں کوئی کچھ کہتا اور کوئی کچھ اور ایک ہڑ بونگ سا مچ گیا۔ ایک شخص نے کہا کہ آج مالک اشتر زندہ ہوتے تو ان لوگوں کو ہلڑ مچانے کی جرأت نہ ہوتی اور ہر شخص سوچ سمجھ کر مُنہ سے بات نکالتا۔ حضرت نے فرمایا کہ تم پر حیف ہے اشتر کا حق تو اتنا ہی تھا جتنا ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر ہوتا ہے اور میرے حقوق تو کہیں زیادہ ہیں جن کی نگہداشت تمہارے لئے واجب و لازم ہے۔ آخر سعید ابن قیس اور حجر ابن عدی نے کہا کہ آپ ہمیں جو حکم دیں گے ہم اس سے سرتابی نہیں کریں گے خواہ اس کی بجا آوری میں ہمارا مال و متاع چھن جائے اور عزیز و اقربا قتل کر دیئے جائیں۔ حضرت نے فرمایا کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم دشمن کی سرکوبی کے لئے اٹھ کھڑے ہو اور انہیں قرار واقعی سزا دے کر ہمیشہ کے لئے کچل دو۔ یہ کہہ کر منبر سے نیچے اتر آئے اور بیت الشرف میں تشریف لائے آپ کے عقب میں چند مخلص اصحاب بھی آپ کے ہاں پہنچ گئے آپ نے ان سے تبادلۂ خیالات کرتے ہوئے فرمایا کہ تمہاری نظروں میں ایسا شخص کون ہے جو خود بھی چاق چوبند ہو اور اہل عراق کو بھی جنگ پر مستعد کر سکے تاکہ اس کی سرکردگی میں لشکر کی روانگی کا سر و ساماں کیا جائے۔ سعید ابن قیس نے کہا کہ یا امیر المومنین اس مہم کو سر کرنے کے لئے معقل ابن قیس تمیمی سے موزوں تر کوئی دوسرا نہیں ہے وہ آپ کے مخلص دوست اور جری و شجاع ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ ہاں وُہ اس کام کے لئے مناسب ہیں اور پھر معقل کو طلب کر کے اس مہم پر بھیج دیا۔

اسی سال معاویہ نے عبداللہ ابن مسعدہ فزاری کو سترہ سو آدمیوں کے ساتھ تیماء کی جانب روانہ کیا اور اُسے حکم دیا کہ وُہ مکہ و مدینہ تک بڑھتا چلا جائے اور راستے میں جو بستیاں آئیں وہاں کے باشندوں سے زکوٰۃ و صدقات جمع کرے اور جو انکار کرے اُسے بے دریغ قتل کر دے۔ چنانچہ وُہ چل دیا اور اس کے قوم و قبیلہ کے لوگ بھی اس کے پرچم کے نیچے جمع ہو گئے حضرت کو جب اس کا علم ہوا تو آپ نے مسیب ابن نجبہ فزاری کو دو ہزار کے لشکر کے ساتھ اس کے مقابلہ کے لئے بھیجا۔ جب ابن مسعدہ مار دھاڑ کرتا ہوا تیماء میں پہنچا تو حضرت کا لشکر بھی پہنچ گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر تلواریں سونت لیں اور جنگ چھڑ گئی جو صبح سے ظہر تک جاری رہی۔ مسیب نے ابن مسعدہ پر جو اسی کے قبیلہ میں سے تھا تلوار کا وار تو کیا مگر اس کا بچاؤ کرتے ہوئے اور چپکے سے کہا کہ بھاگ کر اپنی جان بچاؤ چنانچہ وہ فوج کے ایک دستہ کو لے کر ایک قلعہ میں قلعہ بند ہو گیا اور بقیہ لشکر شام کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ ابن مسعدہ اور اس کے ساتھیوں نے زکوٰۃ و صدقات کے نام پر جو اونٹ لوگوں سے زبردستی چھینے تھے وُہ وہاں کے بادیہ نشین

عربوں نے چھین لئے ۔ جب ابن مسعدہ کو قلعہ بند ہوُے تین دن گزر گئے تو قلعہ کو آگ لگا دینے کی تجویز ہوی چنانچہ دروازہ پر لکڑیاں جمع کر کے آگ لگا دی گئی ۔ ابن مسعدہ نے دیکھا تو کہا اے مسیب تم اپنے ہی قبیلہ کے لوگوں کو جلائے دیتے ہو ۔ مسیب نے حکم دیا کہ آگ بجھا دی جائے چنانچہ آگ بجھا دی گئی ۔ آگ بجھوانے کے بعد اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ مجھے جاسُوسوں کے ذریعہ یہ اطلاع ملی ہے کہ شام کا ایک لشکر ہماری طرف بڑھ رہا ہے ۔ یہ سُن کر سب لوگ سمٹ کر ایک جگہ جمع ہو گئے ۔ ابن مسعدہ کو موقع مل گیا اور وہ رات کے اندھیرے میں اپنے لشکر سمیت شام کی طرف نکل بھاگا ۔ جب اس کے نکل بھاگنے کا پتا چلا تو عبدالرحمٰن ابن شبیب نے کہا کہ ہمیں ابن مسعدہ کا تعاقب کرنا چاہیئے مگر مسیب نہ مانا ۔ جس پر عبدالرحمٰن نے کہا کہ تم نے امیرالمومنین کے خلاف دشمن سے ساز باز کر رکھی ہے اور تمہارا رویّہ سراسر منافقانہ ہے ۔

اسی ۳۹ھ میں معاویہ نے ضحاک ابن قیس فہری کو حیرہ کی طرف چار ہزار کے لشکر کے ساتھ بھیجا اور اُسے حکم دیا کہ ان بادیہ نشین عربوں کو جو علی کی اطاعت قبول کر چکے ہوں قتل کرے اور ان کا مال و اسباب لوٹ لے ۔ چنانچہ وُہ آبادیوں کو روندتا اور بستیوں کو ویران کرتا ہوا ثعلبیہ تک پہنچ گیا اور حاجیوں کے ایک قافلہ پر حملہ کر کے ان کا سارا مال و اثاثہ چھین لیا اور پھر واقصہ اور شراف کی طرف سے ہوتا ہوا قطقطانہ کی طرف بڑھا اور یہاں عمرو ابن عمیس ابن مسعود اور اُن کے ساتھیوں کو قتل کر دیا ۔ امیرالمومنین کو جب ان غارتگریوں کی اطلاع ہوی تو آپ نے لوگوں کو اُن کے تعاقب میں جانے کے لئے کہا مگر انہوں نے بے حسی کا مظاہرہ کیا حضرت نے ان کے رویہ پر غم و غصہ کا اظہار کیا اور اُن کی غیرت و حمیت کو جھنجھوڑا ۔ آخر چار ہزار کا لشکر حجر ابن عدی کی قیادت میں اٹھ کھڑا ہوا اور دشمن کا تعاقب کرتے ہوے سماوہ میں پہنچا ۔ یہاں حجر نے حرم سیّدالشہدا جناب رباب کے والد امرالقیس ابن عدی سے ملاقات کی اور ان کے قبیلہ بنی کلب کے چند افراد راستا دکھانے اور چشموں کی نشاندہی کرنے کے لئے ساتھ ہو گئے ۔ جب حجر تیزی سے مسافت طے کرتے ہوُے تدمر کے اطراف میں پہنچے تو دیکھا کہ ضحاک کا لشکر ڈیرے ڈالے پڑا ہے ۔ جب آمنا سامنا ہوا تو دونوں فریق نے تلواریں کھینچ لیں اور جنگ چھیڑ دی ۔ اس معرکہ میں ضحاک کی فوج کے انیس آدمی مارے گئے اور حجر کے لشکر میں سے دوؔ آدمی شہید ہوُے ۔ اور جب رات کا اندھیرا پھیلا تو ضحاک اپنے لشکر کو لے کر بھاگ کھڑا ہوا اور حجر کوفہ واپس پلٹ آئے ۔

اسی سال معاویہ نے یزید ابن شجرہ رہاوی کو حج کے ایام میں مکہ بھیجا تاکہ وُہ امارت حج کے فرائض انجام دے اور امیرالمومنین کے مقرر کردہ عمال کو وہاں سے نکال کر معاویہ کے لئے بیعت لے ۔ چنانچہ وُہ تین ہزار سواروں کے جلو میں مکہ روانہ ہو گیا ۔ جب عامل مکہ قثم ابن عباس کو اس لشکر کی آمد کی اطلاع ہوی تو انہوں نے منبر پر کھڑے ہو کر کہا کہ اے اہل مکہ شامیوں کا لشکر سرزمین حرم پر خون ریزی کے ارادہ سے نکل چکا ہے

انہی دنوں میں معاویہ نے مسلم ابن عقبہ مری کو دومتہ الجندل بھیجا۔ یہاں کے لوگوں نے نہ حضرت علی کی بیعت کی تھی اور نہ معاویہ کی۔ حضرت کو جب مسلم ابن عقبہ کی نقل وحرکت کا علم ہوا تو آپ نے مالک ابن کعب ہمدانی کو ایک دستہ فوج کے ساتھ بھیجا۔ جب دونوں فریق کا آمنا سامنا ہوا تو جنگ چھڑ گئی جو دن بھر جاری رہی آخر ابن عقبہ شکست کھا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اُس کے جانے کے بعد مالک نے وہاں کے باشندوں سے حضرت کی بیعت کے لئے کہا مگر وُہ بیعت پر آمادہ نہ ہُوے اور کہا کہ جب تک لوگ ایک خلیفہ پر اتفاق نہ کر لیں گے ہم کسی کی بیعت نہیں کریں گے۔

ان واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کوفہ میں جہاں امیرالمومنین کے مخلص شیعہ اور جاں نثار تھے وہاں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہ تھی جو خارجیانہ ذہنیت رکھتے تھے۔ یہ لوگ بات بات پر الجھتے انتشار و بددلی پھیلاتے اور سلطنت کو کمزور سے کمزور تر کرنے کی فکر میں کھوئے رہتے۔ ایک طرف ان لوگوں کی دورخی اور بے راہروی داخلی انتشار کی صورت اختیار کئے ہُوے تھی اور دوسری طرف شامیوں کے جارحانہ حملے آپ کے لئے مستقل پریشانی و دردسری کا باعث بنے ہُوے تھے۔ اس دوطرفہ خلفشار اور ہنگامہ آرائیوں میں آپ نے جس حد تک حالات پر قابو رکھا وُہ آپ کی اعلےٰ سیاست اور غیر معمولی انتظامی صلاحیت کا واضح ثبوت ہے۔ اگر ان صبر آزما حالات سے کسی اور کو دوچار ہونا پڑتا اور وُہ نظم وضبط مملکت برقرار رکھنے میں کامیاب ہوتا تو پھر اس کے سیاسی تدبر کا ڈھنڈورہ پیٹنا زیب دے سکتا تھا مگر نہ کسی کو ان جیسے دشوار حالات سے گزرنا پڑا اور نہ ان جیسے لوگوں سے سابقہ پڑا جن کی بے حسی اور سردمہری ختم ہونے ہی میں نہ آتی تھی۔

بسر ابن ابی ارطاۃ کی تباہ کاریاں:

یمن جو امیرالمومنین کے قلمرو مملکت میں شامل تھا وہاں پر عثمانیوں کی بھی ایک خاصی جمیعت تھی جنہوں نے بظاہر حضرت کی بیعت کر لی تھی اور پُرامن رعایا کی طرح رہتے سہتے تھے مگر باطن میں مملکت کے بدخواہ اور حضرت سے عناد رکھتے تھے اور والئ یمن عبیداللہ ابن عباس سے بھی ان کا رویہ معاندانہ تھا۔ جب مصر میں محمد ابن ابی بکر قتل کر دیئے گئے اور شامیوں کے تابڑ توڑ حملوں کے نتیجہ میں عراق بھی انتشار کی زد میں آگیا تو انہوں نے پر پُرزے نکالے اور خون عثمان کے قصاص پر لوگوں کو بھڑکانا شروع کیا۔ عبیداللہ ابن عباس کو ان کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا علم ہوا تو انہوں نے چند سربرآوردہ لوگوں کو بلا کر کہا کہ میں تم لوگوں کے بارے میں یہ کیا سُن رہا ہوں انہوں نے کہا کہ آپ نے جو سُنا ہے صحیح ہے ہم قتل عثمان کو شروع ہی سے ایک المیہ سمجھتے رہے ہیں اور جنہوں نے اُن کے قتل کے اسباب فراہم کئے ان کے خلاف قدم اُٹھانا ہمارا فریضہ ہے۔ عبیداللہ ابن عباس نے فتنہ کو اُبھرتے ہُوے دیکھا تو انہیں نظر بند کر دیا تا کہ

ملکی فضا مکدر نہ ہونے پائے مگر یہ اقدام موثر اور نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکا۔ ان لوگوں نے فوج کے ان سپاہیوں کو جو اُن کے ہم خیال تھے یہ پیغام بھجوایا کہ ہنگامہ کھڑا کر کے فوج کے افسر اعلیٰ سعید ابن نمران کو عہدہ سے الگ کر دو۔ چنانچہ انہوں نے بغاوت کر کے فوجی کمان اُن کے ہاتھ سے لے لی اور فوج کا شیرازہ درہم و برہم ہو کر رہ گیا عسکری قوت کے کمزور ہو جانے سے وُہ لوگ جواب تک دبے ہُوئے تھے کھل کر سامنے آ گئے اور وُہ لوگ جو اُن کے ہم خیال تو نہ تھے مگر خراج و زکوٰۃ سے بچنا چاہتے تھے وُہ بھی اُن میں آ کر شامل ہو گئے اور حکومت کے خلاف ایک مضبوط محاذ قائم کر لیا گیا۔

عبید اللہ ابن عباس سعید ابن نمران اور شیعیان علی نے آپس میں مشورہ کر کے یہ طے کیا کہ ہمیں امیر المومنین کو ان حالات سے آگاہ کرنا چاہیئے اور جو وُہ فرمائیں اس پر عمل پیرا ہونا چاہیئے اگر ہم نے از خود ان عثمانیوں سے جنگ چھیڑ دی تو خدا جانے اس کا کیا نتیجہ ہو۔ چنانچہ امیر المومنین کو تمام حالات تحریر کئے گئے اور مستقبل کے اقدام کے بارے میں ان سے دریافت کیا گیا۔ حضرت نے یہ تحریر پڑھی تو پیشانی پر بل آیا اور عبید اللہ اور سعید کو تحریر فرمایا کہ یہ جو کچھ ہوا ہے وُہ تمہاری کمزور سیاست کا نتیجہ ہے ورنہ وُہ اس قابل کب تھے کہ انہیں اہمیت دی جاتی۔ نہ وُہ گنتی میں زیادہ تھے اور نہ قوت و طاقت میں۔ تم انہیں سمجھاؤ بجھاؤ اور تقویٰ و خوف الٰہی کی دعوت دو اگر وُہ راہ راست پر آ جائیں تو ہم اللہ کا شکر ادا کریں گے اور اگر جنگ ہی پر اُتر آئے ہوں تو ہم بھی لڑنے پر تیار ہیں۔ اس کے ساتھ عثمانیوں کو بھی قبیلۂ ہمدان کے ایک شخص کے ہاتھ یہ تحریری پیغام بھجوایا کہ مجھے تمہاری بغاوت و سرکشی کی اطلاع ملی ہے تم لوگ بغاوت سے دستکش ہو کر اپنے اپنے ٹھکانوں پر واپس چلے جاؤ۔ اگر تم نے اس میں کچھ پس و پیش کیا تو یاد رکھو کہ تمہاری سرکوبی کے لئے ایسا لشکر آ رہا ہے جو تمہیں پیس کر رکھ دے گا۔ مگر ان لوگوں نے اس دھمکی کی کوی پروا نہ کی اور اپنے موقف پر بدستور جمے رہے۔ امیر المومنین کے قاصد نے ان کی ضد اور ہٹ دھرمی دیکھی تو کہا کہ امیر المومنین یزید ابن قیس ارحبی کو ایک لشکر گراں کے ساتھ بھیجنے والے ہیں وُہ فقط میرے جواب کے منتظر ہیں۔ اگر تم نے اپنی روش نہ بدلی تو لشکر حرکت میں آ جائے گا اور پھر تمہارے روکے نہ رُکے گا۔ جب انہیں یہ احساس ہوا کہ یہ خالی دھمکی نہیں ہے بلکہ ایسا ہو کر رہے گا تو انہوں نے کہا کہ اگر عبید اللہ ابن عباس اور سعید ابن نمران کو یہاں سے برطرف کر دیا جائے تو ہم حلقۂ اطاعت میں داخل ہو جائیں گے۔ یہ بات صرف دفع الوقتی کے لئے تھی ورنہ یہ لوگ عمال کی تبدیلی پر اکتفا کر کے خاموش رہنے والے نہ تھے وُہ معاویہ کو پہلے ہی پیغام بھیج چکے تھے کہ وُہ یمن کے شیعوں سے نمٹنے کے لئے فوج بھیج دیں ہم اس سے تعاون کر کے حکومت کا تختہ اُلٹ دیں گے۔

معاویہ جو عراق کے مختلف شہروں پر تاخت و تاراج کا سلسلہ شروع کئے ہُوئے تھے یمنیوں کی اس تحریک پر خاموش نہ رہ سکتے تھے انہوں نے فوراً بسر ابن ابی ارطاۃ کو جو انتہائی ظالم وسفاک اور

درندہ صفت انسان تھا تین ہزار کے لشکر کے ساتھ بھیج دیا اور اسے حکم دیا کہ وہ مدینہ اور مکہ سے ہوتا ہوا یمن جائے اور راستے میں جن جن بستیوں سے اُس کا گزر ہو وہاں کے باشندوں کو ڈرا دھمکا کر بیعت لے اور شیعیان علی میں سے جو بیعت سے انکار کرے اُسے تہ تیغ کر دے اور اس کا گھر بار لوٹ لے۔ چنانچہ وُہ لشکر کی کمان کرتا ہوا مدینہ کی طرف چل دیا اور راستے میں جہاں کوئی چشمہ آتا وہاں اُتر پڑتا اور لوگوں کے اُونٹ ہنکا کر ساتھ لے لیتا۔ جب اس طرح لُوٹ مار کرتا ہوا مدینہ کے قریب پہنچا تو بنی قضاعہ نے اُسے خوش آمدید کہا اور اُونٹوں کو نحر کر کے تمام لشکر کے کھانے کا انتظام کیا۔ جب یہاں سے فارغ ہو کر حدودِ مدینہ میں داخل ہوا تو ابو ایوب انصاری جو امیر المومنین کی طرف سے والیٔ مدینہ تھے سپاہ شام کی کثرت و قوت سے ہراساں ہو کر نکل کھڑے ہُوئے اور کوفہ کی طرف چل دیئے۔ اب کوئی مزاحمت کرنے والا نہ تھا بسر سیدھا مسجد میں آیا اور لوگوں کو جمع کر کے انہیں ڈرایا دھمکایا سب و شتم کا نشانہ بنایا اور اس قدر ہراساں کیا کہ سب کو مُوت کا یقین ہو گیا کچھ لوگوں نے حویطب ابن عبد العزیٰ سے جس کے گھر میں بسر کی ماں تھی کہا کہ وُہ ان کی جانوں کے تحفظ کی کوئی تدبیر کرے۔ اس نے بسر سے کہا کہ اے بسر یہ لوگ رسُول اللہ کے انصار ہیں نہ یہ عثمان کے قاتل ہیں اور نہ ان کے قتل سے انہیں کوئی تعلق ہے ان سے درگزر کرو۔ بسر نہ مانا۔ اور جب ان لوگوں نے معاویہ کی بیعت پر آمادگی ظاہر کی تو اُن سے بیعت لے کر انہیں گھروں میں واپس جانے کی اجازت دے دی البتہ جن کے بارے میں اسے شُبہ تھا کہ وُہ معاویہ کی بیعت نہیں کریں گے ان کے گھروں کو جلا دیا۔ اِن گھروں میں ابو ایوب انصاری، عبداللہ ابن سعد، رفاعہ ابن رافع زرقی اور زرارہ ابن حرون کے مکانات بھی شامل تھے۔

بسر کی آمد پر بہت سے لوگ اپنے گھروں کو چھوڑ کر چلے گئے ان میں جابر ابن عبداللہ انصاری بھی شامل تھے وُہ اپنے گھر سے نکل کر دُوسری جگہ رُو پوش ہو گئے۔ بسر کو جب جابر نظر نہ آئے تو اس نے انصار کی ایک شاخ بنی سلمہ سے کہا کہ جب تک تم جابر کو حاضر نہیں کرو گے تمہیں جان و مال کے تحفظ کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ جب جابر کو یہ معلوم ہوا کہ ان کے قبیلہ والوں کی جانیں خطرہ میں ہیں تو وُہ رات کے اندھیرے میں چھپتے چھپاتے ام المومنین ام سلمہ کے ہاں آئے اور کہا کہ میں اس وقت اس غرض سے آیا ہوں کہ آپ مجھے مشورہ دیں کہ ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ انہوں نے کہا کہ اب اس کے سوا کیا چارہ ہے کہ معاویہ کی بیعت کر کے اپنی اور اپنے قبیلہ والوں کی جانیں بچاؤ۔ اگرچہ یہ بیعت سراسر ضلالت و گمراہی ہے اور میں نے اپنے بیٹے عمر ابن ابی سلمہ اور اپنے داماد عبداللہ ابن زمعہ سے بھی کہہ دیا ہے کہ وُہ بیعت کر کے اپنے کو ہلاکت سے بچائیں۔ چنانچہ جابر نے مجبوری کی بنا پر بیعت کر کے اپنی اور اپنے قبیلہ والوں کی جانوں کا بچاؤ کیا۔ بسر جتنے دن مدینہ میں ٹھہرا مدینہ پر خوف و ہراس کے بادل چھائے رہے جبر و استبداد کے سامنے عوام کی ہمتیں پست اور قوتیں مضمحل ہو گئیں اور جان کے اندیشہ سے بیعت کرنے

پر مجبور ہو گئے۔ بسر نے انہیں جان کی معافی دینے کے بعد کہاکہ اے اہل مدینہ تم اس قابل تو نہ تھے کہ تم میں سے ایک متنفس کو بھی زندہ چھوڑا جاتا اس لئے کہ تمہاری آنکھوں کے سامنے عثمان قتل کر دیئے گئے اور تم ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اگرچہ میں تمہیں اس دُنیا میں معاف کئے دیتا ہوں مگر مجھے اُمید ہے کہ آخرت میں تم اللہ کی رحمت سے محروم رہو گے۔ میں حکومتِ شام کی طرف سے ابوہریرہ کو تم پر حاکم مقرر کئے جاتا ہوں خبردار اس کے احکام کی خلاف ورزی نہ کرنا۔ اس کے بعد مکہ کی طرف روانہ ہو گیا اور جب خوف و دہشت پھیلاتا قتل و غارت کرتا اور بے گناہوں کا خون بہاتا ہوا مکہ کے قریب پہنچا تو حاکم مکہ قثم ابن عباس مکہ سے نکل گئے اور اکثر اہل مکہ بھی گھر بار چھوڑ کر ادھر اُدھر چل دیئے ان لوگوں میں ابو موسیٰ اشعری بھی شامل تھا۔ بسر کو جب یہ بتایا گیا کہ ابو موسیٰ بھی ڈر کے مارے بھاگ گیا ہے تو اُس نے کہاکہ اُسے کوی اندیشہ نہ ہونا چاہیئے تھا جس نے علی کا نمائندہ ہوتے ہوئے انہیں خلافت سے معزول کر دیا ہو اُسے قتل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بسر نے اہل مکہ کو ڈرایا دھمکایا اور انہیں خطاب کرتے ہوئے کہا خدا کا شکر ہے جس نے ہمیں غلبہ دیا اور ہمارے دشمنوں کو ذلیل و رسوا کیا۔ ابن ابی طالب ہی کو دیکھ لو کہ عراق کے ایک گوشہ میں اس طرح پڑے ہیں کہ خود اُن کی مملکت کی وسعتیں اُن پر تنگ ہو گئی ہیں۔ اللہ نے اُن کے گناہوں کی پاداش میں انہیں مصیبتوں میں جکڑ رکھا ہے اور اُن کے ساتھی بھی اُن سے بگڑ کر علیحدہ ہو چکے ہیں اس وقت مسلمانوں کے سربراہ معاویہ ہیں جو حضرت عثمان کے ولی اور اُن کے قصاص کے علمبردار ہیں۔ لہٰذا ان کی بیعت کرو اور ان کی اطاعت سے مُنہ موڑ کر اپنی جانوں کو خطرہ میں نہ ڈالو۔ لوگ خائف و ہراساں تو تھے ہی خوں آشام تلواروں کو دیکھ کر بیعت پر آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ اُن سے بیعت لی اور شیبہ ابن عثمان کو مکہ کا اقتدار سونپ کر طائف کی طرف چل دیا۔

جب بسر کچھ فاصلہ پر پہنچا تو ایک قرشی کو نبالہ کی طرف روانہ کیا اور اُسے کہاکہ وہاں پر شیعوں کی بڑی جمیعت موجود ہے تم انہیں ایک ایک کر کے قتل کر دو۔ چنانچہ اس نے نبالہ پہنچ کر شیعیان علی کو حراست میں لے لیا۔ ان لوگوں نے اس قرشی سے کہاکہ ہم لوگ تمہارے ہی قوم و قبیلہ کے افراد ہیں ہمیں اتنی مہلت دو کہ ہم میں سے کوی آدمی بسر کے پاس جائے اور اس سے امان کے لئے کہے اگر اس نے تحریراً امان دے دی تو بہتر ورنہ ہمیں قتل کر دینا۔ اس نے اجازت دے دی اور منیع باہلی طائف میں آیا جہاں بسر اس قرشی کے انتظار میں ٹھہرا ہوا تھا۔ منیع نے بسر سے امان کی خواہش کی اور طائف کے چند سرکردہ افراد نے بھی اس پر زور دیا ان لوگوں کے کہنے سُننے سے اُس نے امان کا وعدہ کر لیا مگر امان نامہ لکھ کر دینے میں ٹال مٹول کرتا رہا۔ اور جب یہ سمجھ لیا کہ اس کے آدمی نے سب کو قتل کر لیا ہو گا یا منیع کے واپس پہنچنے تک موت کے گھاٹ اُتار دیئے جائیں گے تو امان نامہ لکھ کر دے دیا۔ منیع فوراً واپسی کے ارادہ سے اُٹھ کھڑا ہوا اور جب اپنا سامان سفر لینے کے لئے اس خاتون کے مکان پر آیا جس کے ہاں بطور امانت رکھا تھا تو دیکھا کہ وُہ موجود نہیں ہے

اس نے انتظار گوارا نہ کیا اور اُونٹنی پر ایک چادر ڈال کر سوار ہو گیا اور اُسے سرپٹ دوڑاتا ہوا تبالہ کی طرف چل دیا۔ ادھر وُہ لوگ منیع کی واپسی سے مایوس ہو چکے تھے اور قرشی اور اُس کے ہمراہی انہیں قتل کرنے کے لئے میدان میں جمع کر چکے تھے بلکہ ان میں سے ایک پر تلوار اُٹھ بھی چکی تھی مگر اتفاق ایسا ہُوا کہ تلوار نے کام نہ کیا اور ٹوٹ گئی۔ انہوں نے آپس میں ایک دُوسرے سے کہا کہ تلواروں میں لچک پیدا کرنے کے لئے انہیں ہلاؤ جلاؤ۔ چنانچہ انہوں نے تلواروں کو دھوپ میں ہلانا جلانا شروع کیا۔ جب منیع ایک دن اور ایک رات لگاتار پُشتِ ناقہ پر گزارنے کے بعد بستی کے قریب پہنچا تو تلواروں کو چمکتے ہُوئے دیکھ کر یہ سمجھا کہ تلواریں چل رہی ہیں۔ اس نے سواری کو تیزی سے ہنکایا اور چادر ہلا ہلا کر انہیں اپنی آمد سے آگاہ کیا اور بڑی تگ و دو کے بعد ان تک پہنچ گیا۔ دیکھا کہ جس پر تلوار اُٹھائی گئی تھی وُہ اُسی کا بھائی تھا۔ اُس نے بڑھ کر امان نامہ دکھایا اور محنتِ شاقہ کے بعد اُن کی جانیں بچانے میں کامیاب ہو گیا۔

بسر طائف سے نکل کر بنی کنانہ کی بستیوں کی طرف بڑھا جہاں عبیداللہ ابن عباس کے دو کمسن بچے قثم اور عبدالرحمٰن اور ان بچوں کی ماں ام حکیم جوریہ بنت قارظ کنانیہ مقیم تھیں۔ بسر نے ان بچوں کو تلاش کرنے کے لئے آدمی دوڑایا تاکہ انہیں قتل کرے۔ عبیداللہ ابن عباس ان بچوں کو ایک کنانی کی زیرِ نگرانی چھوڑ گئے تھے اس نے جب یہ دیکھا کہ بسر ان بچوں کو قتل کرنا چاہتا ہے تو اس کی حمیت و غیرت نے گوارا نہ کیا کہ خاموشی سے ان بچوں کو موت کے مُنہ میں جانے دے اس نے تلوار کھینچ لی اور مرنے مارنے پر اُتر آیا۔ بسر نے اس سے کہا کہ ہمیں تم سے کوئی مطلب نہیں ہے اور نہ تمہیں قتل کرنے کا کوئی ارادہ ہے تم الگ رہو اور ان بچوں کے معاملہ میں دخل نہ دو۔ اس نے کہا کہ حق جوار کی پاسداری مجھے جان سے زیادہ عزیز ہے یہ کہہ کر تن تنہا دشمن پر ٹوٹ پڑا اور لڑتا ہوا قتل ہو گیا۔ بسر نے قثم و عبدالرحمٰن کو تلاش کر کے انتہائی سفاکی و بے دردی سے ذبح کر دیا۔ بنی کنانہ کی عورتوں نے سُنا تو وُہ گھروں سے باہر نکل آئیں اور ایک خاتون نے کہا کہ آج تک مردوں کو تو قتل کیا جاتا رہا ہے مگر اسلام تو اسلام دورِ جاہلیت میں بھی بچوں کو قتل نہیں کیا گیا۔ وُہ حکومت کبھی قائم نہیں رہ سکتی جس کی اساس ظلم و جور پر ہو اور جس میں بچوں اور بوڑھوں پر بھی ترس نہ کھایا جاتا ہو۔ بسر نے کہا کہ خدا کی قسم میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ان تمام عورتوں کو بھی تہ تیغ کر دوں کہا کہ خدا شاہد ہے کہ اگر تم ایسا کر گزرو تو ہمارے دل کی بے چینی کا مداوا ہو جائے۔ ام حکیم نے اپنے جگر پاروں کو خاک و خون میں غلطاں دیکھا تو اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھیں اور والہانہ طور پر اس طرح گھومتی پھرتی رہتیں گویا اپنے بچوں کو تلاش کر رہی ہیں اور حج کے دنوں میں اپنے دردناک اشعار سے سننے والوں کے کلیجے ہلا دیتیں۔

جب امیرالمومنین کو ان بچوں کے قتل کئے جانے کی خبر ہوئی تو آپ بہت غمگین و افسردہ خاطر ہُوئے اور بسر کے حق میں بد دُعا کرتے ہُوئے کہا:۔

اللھم اسلبہ دینہ وعقلہ۔ تاریخ کامل جلد ۳۔ ص ۱۹۳) خدایا اس سے دین اور عقل چھین لے "۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا اور وہ وقت آیا کہ اس کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ مگر اس بدحواسی کے عالم میں بھی یہ کہتا کہ مجھے تلوار دو۔ آخر لکڑی کی ایک تلوار اُسے دے دی گئی اور مشک میں ہوا بھر کر اس کے سامنے رکھ دی گئی وہ اس مشک پر تلوار چلاتا اور جذبۂ خوں آشامی کی تسکین کا سامان کرتا آخر اسی دیوانگی کے عالم میں مر کھپ گیا۔

غرض اسی طرح درندگی و خونخواری کا مظاہرہ کرتا ہوا نجران میں وارد ہوا اور عبداللہ ابن عبدالمدان حارثی اور اُن کے فرزند مالک کو قتل کیا۔ اہل نجران کو ہراساں کرنے کے بعد ارحب میں آیا اور ابوکرب کا خون بہایا جو امیرالمومنین کے مخلص شیعہ اور قبیلۂ ہمدان کے سردار تھے اس کے بعد یمن کے صدر مقام صنعاء کا رُخ کیا۔ عمرو ابن اراکہ ثقفی نے جنہیں عبیداللہ ابن عباس اپنا قائم مقام بنا گئے تھے بچی کھچی فوج کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا اور آخر اس خونریز تصادم کے نتیجہ میں مارے گئے۔ بسر نے شہر میں داخل ہو کر قتل عام کیا اور سینکڑوں بے گناہوں کو تہ تیغ کر دیا۔ اس طوفانی دورہ میں اس نے بستیوں کو اجاڑا لوگوں کا مال و اسباب لُوٹا گھروں کو جلایا اور تیس ہزار مسلمانوں کو قتل کر کے بربریت و بہیمیت کو انتہا پر پہنچا دیا۔

امیرالمومنین نے بسر کی تباہ کاریوں کا مُنہ توڑ جواب دینے کے لئے اہل کوفہ سے کہا مگر انہوں نے بے حسی کا ثبوت دیا اور دشمن کے تعاقب سے پہلو بچانے لگے۔ حضرت کے بار بار جھنجھوڑنے پر ابو بردہ ابن عوف ازدی نے کہا کہ اگر آپ لشکر کی قیادت کرتے ہُوئے ہمارے ساتھ چلیں تو ہم چلنے کے لئے تیار ہیں فرمایا تمہاری یہ رائے درست نہیں اور نہ یہ مناسب ہے کہ میں مرکز کا نظم و نسق دوسروں پر چھوڑ کر چند رہزنوں کے پیچھے بھاگتا پھروں۔ جاریہ ابن قدامہ سعدی نے کہا کہ یا امیرالمومنین میں دشمن کے تعاقب میں جانے کے لئے حاضر ہوں۔ فرمایا کہ تم بصرہ سے دو ہزار کا لشکر لے کر حجاز اور پھر یمن تک اس کا تعاقب کرو اور اسے قرار واقعی سزا دو۔ وہب ابن مسعود ثقفی نے عرض کیا کہ یا امیرالمومنین میں کوفہ سے دو ہزار کا لشکر فراہم کر کے دشمن کی سرکوبی کے لئے جاتا ہوں حضرت نے اُسے بھی اجازت دی اور یہ دونوں اپنے اپنے دستوں کے ساتھ روانہ ہوگئے۔ ان دونوں کے روانہ ہونے کے بعد اہل کوفہ کو احساس ہوا کہ انہوں نے حضرت کی آواز پر گرم جوشی سے لبیک نہیں کہی۔ چنانچہ چند سرکردہ افراد حضرت کی خدمت میں حاضر ہُوئے اور عرض کیا کہ یا امیرالمومنین ہم نادم و شرمسار ہیں کہ ہم نے دشمن کے مقابلہ سے پہلو تہی کی اور یہ ہماری کوتاہی اور کمزوری ہی کا نتیجہ ہے کہ دشمن کو ہمارے شہروں پر حملہ آور ہونے کی جرأت ہوئی ہے۔ ہمیں حکم دیجئے کہ ہم لشکر ترتیب دے کر دشمن کا پیچھا کریں اور اُسے کیفر کردار تک پہنچائیں۔ فرمایا کہ میں نے اس شخص کو بھیجا ہے جو دشمن کو

حدودِ مملکت سے نکالے بغیر نہیں پلٹے گا۔ البتہ تم ان جھڑپوں کے بجائے ایک فیصلہ کن جنگ کی تیاری کرو تاکہ ان آئے دن کے حملوں کا سدِ باب ہو سکے۔ اٹھو اور معاویہ ابن ابی سفیان کے مقابلہ میں صف بندی کرو اور اس فتنہ کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دو۔ سعید ابن قیس ہمدانی نے کہا کہ یا امیر المومنین ہم بسر و چشم حاضر ہیں اور میرا قبیلہ آپ کے کسی حکم سے سرتابی نہیں کرے گا۔ ہم حدودِ مملکت کے اندر رہ کر بھی اور حدودِ مملکت سے باہر نکل کر بھی دشمن سے ٹکرائیں گے اور جان پر کھیل کر ضلالت و گمراہی کے بتوں کو پاش پاش کر دیں گے۔ حضرت نے فرمایا کہ خدا تمہیں جزائے خیر دے تم نے جو کہا ہے صحیح کہا ہے۔ پھر زیاد ابن خصفہ نے اسی قسم کے الفاظ کہہ کر اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ امیر المومنین نے اہل کوفہ کے جوش و ولولہ کو دیکھ کر معقل ابن قیس کو حکم دیا کہ وہ افواج و عساکر کی فراہمی کا بندوبست کریں۔ اور اہل کوفہ کے ایک اجتماع میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اے اہل کوفہ میں شامیوں سے لڑنے کے لئے لشکر ترتیب دے رہا ہوں تم میں سے جو اللہ کی راہ میں جہاد کرنا چاہتا ہے وہ لشکر میں شامل ہو جائے۔ اہل کوفہ تلواروں کو صیقل اور ہتھیاروں کو درست کر کے جوق در جوق اُٹھ کھڑے ہوئے اور لشکر کی تعداد چالیس ہزار تک پہنچ گئی۔ حضرت نے دس ہزار کی سپاہ پر اپنے فرزند امام حسینؑ کو اور دس ہزار کی فوج پر قیس ابن سعد کو اور دس ہزار کے لشکر پر ابو ایوب انصاری کو افسر مقرر کیا اور اسی طرح مختلف دستوں پر مختلف افسروں کو نامزد کیا۔ آپ اس لشکر کو لے کر ایک ہفتہ کے بعد صفین کی طرف حرکت کرنا چاہتے تھے کہ ایک خارجی ابن ملجم مرادی نے آپ کے سرِ اقدس پر ضرب لگا کر آپ کو شہید کر دیا۔ اس سانحۂ عظمیٰ کے رونما ہونے سے حالات دگرگوں ہو گئے۔ افواج و عساکر کا شیرازہ درہم و برہم ہو گیا اور ایک استبدادی حکومت کو کھل کھیلنے کا موقع مل گیا۔ اس سانحہ کے دور رس نتائج پر نظر کرنے کے بعد ایک دردِ ملی رکھنے والا انسان اشک بہائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ عین اس وقت جبکہ طاغوتی طاقت کو کچلنے کا سر و سامان ہو چکا تھا ایک شقی ازلی کی تلوار اس کے آگے دیوار کھڑی کر دیتی ہے جس کے نتیجہ میں اس تاریک دور کا آغاز ہوا جو قہر و استیلاء اور ظلم و استبداد کا مثالیہ ہے جس میں اسلام کے خد و خال مسخ ہوئے دین کی قدریں ختم ہوئیں اور روحِ حریت پژمردہ ہو کر رہ گئی۔

ادھر جاریہ ابن قدامہ بصرہ سے لشکر لے کر یمن میں آئے۔ جب یمن کے عثمانیوں کو ان کے آنے کی خبر ہوئی تو وہ پہاڑوں اور صحراؤں کی طرف نکل گئے مگر جاریہ کے لشکر نے ان کا پیچھا کر کے انہیں گھیرے میں لے لیا اور ان میں سے چند آدمیوں کو تہ تیغ کر دیا۔ جاریہ نے بسر کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ بنی تمیم کی بستیوں کی طرف چلا گیا ہے۔ جاریہ نے اس کا تعاقب کیا۔ ظالم و خونخوار بزدل تو ہوتا ہی ہے آسے عراقی لشکر کے تعاقب کا پتا چلا تو وہ یمامہ کی طرف نکل گیا۔ اور پھر وہاں سے بھی بھاگ کھڑا ہوا اور کبھی کسی سمت نکل جاتا اور کبھی کسی سمت۔ لوگ اس کی خونخواریوں سے واقف تو ہو ہی چکے تھے جدھر سے گزرتا لوگ اس

پر ٹوٹ پڑتے اور بنی تمیم نے تو اس کا تھوڑا بہت مال و اسباب بھی لوٹ لیا۔ جاریہ تعاقب کرتے ہوئے مقام جرس میں پہنچے تو خستہ و درماندہ لشکر نے تقریباً ایک مہینہ یہاں قیام کیا اور پھر مکہ کی طرف روانہ ہو گیا مکّہ پہنچ کر جاریہ نے اہل مکّہ سے پوچھا کہ کیا تم نے معاویہ کی بیعت کی ہے انہوں نے کہا کہ بیعت تو کی تھی مگر اس صورت میں جب بیعت کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ کہا کہ اب بیعت کرو۔ کہا کس کی بیعت کریں امیرالمومنین تو دنیا سے چل بسے۔ کہا کہ پھر اصحاب علی نے جس کی بیعت کی ہے تم بھی اس کی بیعت کرو۔ چنانچہ اہل مکّہ نے امام حسن کی بیعت کی اور جاریہ مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہاں ابوہریرہ امامت نماز کا فریضہ انجام دیتا تھا جب اس نے جاریہ کی آمد کی خبر سنی تو روپوش ہو گیا۔ جاریہ نے اس کے بھاگ نکلنے کی اطلاع ہوئی تو کہا:۔

واللہ لو اخذت ابا سنوّر لضربت عنقه۔ (تاریخ طبری ج ۶۔ ص ۸۱)	خدا کی قسم اگر ابوہریرہ میرے ہاتھ لگ جاتا تو اس کی گردن اڑا دیتا۔

پھر اہل مدینہ سے کہا کہ وہ امام حسنؑ کی بیعت کریں تمام لوگوں نے بیعت کی اور جاریہ لشکر سمیت کوفہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ بسر بھی جان بچا کر شام پہنچ گیا اور اپنے سیاہ کارناموں پر معاویہ سے داد طلب ہوا۔

معاویہ ابن ابی سفیان نے اپنی مملکت کے دائرہ کو وسیع سے وسیع تر کرنے کے لئے امیرالمومنین کے مقبوضہ شہروں پر پیہم تاخت و تاراج کا سلسلہ جاری کیا اور ضحاک فہری و بسر ابن ابی ارطاۃ ایسے درندہ صفت انسانوں کی قیادت میں شامیوں کے غول بھیج کر امن عامہ کو تباہ کیا گھروں کو پھونکا بستیوں کو لوٹا بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتارا اور لوگوں سے زبردستی بیعت لی۔ اگرچہ یہ سب کچھ قصاص خونِ عثمان کی آڑ میں کیا جا رہا تھا مگر حقیقۃً یہ جارحانہ اقدامات ہوس ملک گیری کا نتیجہ تھے جنہیں قصاص سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ اسی توسیع مملکت کے لئے عمارتوں کو کھنڈر بستیوں کو ویران اور بچوں کو تہِ تیغ کیا گیا۔ سرزمین حرم اور دارالہجرۃ مدینہ کی حرمت و عظمت کو نظر انداز کر کے فضا میں خوف و ہراس پھیلایا گیا حالانکہ مکّہ وہ مقام امن ہے جہاں نہ خوف و ہراس پھیلانے کا جواز ہے اور نہ قتل و خونریزی کا یہاں تک کہ پیغمبر اکرم نے فتح مکّہ کے موقع پر امن عام کا حکم دے کر خون کے پیاسوں تک کو معاف کر دیا اور اس سلسلہ میں فرمایا:۔

لا یحل لامرء یومن باللہ و الیوم الاخر ان یسفك بها دما ولا یعضد بها شجرۃ۔ (صحیح بخاری ج ۱۔ ص ۱۶)	جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اُس کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ مکہ میں خون بہائے اور درخت کاٹے۔

اسی طرح مدینہ بھی حرم ہے اور اہل مدینہ کو خوفزدہ کرنا ان میں خوف و دہشت پھیلانا جرم اور انتہائی سنگین جرم ہے۔ اور پیغمبر اکرم نے مدینہ میں دہشت و ہراس پھیلانے اور وہاں کے باشندوں کو خوفزدہ کرنے والوں پر لعنت کی ہے۔ چنانچہ آپ کا ارشاد ہے:۔

من اخاف اهل المدينة ظلما اخافه الله و عليه لعنة الله والملئكة والناس اجمعين لا يقبل الله منه صرفا و لا عدلا۔ (وفاء الوفاء ج ۱۔ ص ۳۲)	جو شخص از روئے ظلم اہل مدینہ کو خوفزدہ کرے اللہ اسے خوف و ہراس میں مبتلا کرے گا اور اس پر اللہ کی اور فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہو اور خدا ایسے شخص کے نہ کسی فریضہ کو قبول کرے گا اور نہ کسی نافلہ کو۔"

شہادت

۴۰ھ میں جنگ نہروان کے چند بچے کھچے خوارج نے مکہ میں اجتماع کیا اور نہروان کے کشتوں پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے بھائی بندوں کے خون کی ذمہ داری علی معاویہ اور عمرو ابن عاص پر عائد ہوتی ہے لہٰذا ان تینوں کو قتل کر کے ہمیں اپنے کشتوں کا انتقام لینا چاہیئے۔ ان خوارج کی رگوں میں انتقامی خون تو کھول ہی رہا تھا سب نے اس پر اتفاق کیا اور برک ابن عبداللہ صریمی نے معاویہ کو عمرو ابن بکر تمیمی نے عمرو ابن عاص کو اور عبدالرحمٰن ابن ملجم نے حضرت علی کو قتل کرنے کا بیڑا اٹھایا اور یہ طے کیا کہ ایک ہی دن اور ایک ہی وقت حملہ ہونا چاہیئے تاکہ ان میں سے ایک کو دوسرے کی خبر نہ ہونے پائے ورنہ ایک کے قتل کی خبر دوسروں کو چوکنا و ہوشیار کر دے گی اور وہ حفاظتی تدابیر عمل میں لا کر اس تجویز کو ناکام بنا دیں گے۔ چنانچہ دن اور وقت کی تعیین کر کے برک ابن عبداللہ دمشق کی طرف، عمرو ابن بکر مصر کی طرف اور عبدالرحمٰن ابن ملجم کوفہ کی طرف چل دیا۔

اس خطرناک کام کے لئے ماہ رمضان کی انیسویں شب اور نماز صبح کا وقت مقرر کیا گیا تھا۔ چنانچہ برک ابن عبداللہ مقررہ تاریخ پر جامع دمشق آیا اور جب صبح کی جماعت کھڑی ہوئی تو وہ پہلی صف میں معاویہ کے عقب میں کھڑا ہو گیا۔ جب معاویہ رکوع کے لئے جھکے تو اس نے تلوار کا وار کیا جو ان کے عقبی حصہ پر پڑا گھاؤ معمولی تھا چند دنوں میں بھر گیا اور حملہ آور کو گرفتار کر لیا گیا۔ عمرو ابن بکر انیسویں شب کو جامع مصر میں آ کر ٹھہرا تاکہ صبح کی نماز میں ابن عاص کو قتل کرے مگر اتفاق ایسا ہوا کہ عمرو ابن عاص قولنج کے عارضہ میں مبتلا ہو گیا اور اس نے اپنی جگہ خارجہ ابن حذافہ سہمی کو نماز پڑھانے کے لئے بھیج دیا۔ عمرو ابن بکر اندھیرے میں پہچان نہ سکا اور اس نے خارجہ کو عمرو ابن عاص سمجھ کر قتل کر دیا۔ لوگوں نے اسے پکڑ لیا اور جکڑ باندھ کر عمرو ابن عاص کے پاس لائے۔ جب اسے معلوم ہوا کہ ابن عاص کے بجائے خارجہ اس کے ہاتھ سے قتل ہوا ہے تو اسے اپنی

ناکامی پر افسوس ہوا مگر اب کیا ہو سکتا تھا جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ عمرو ابن عاص نے اُسے مخاطب کرتے ہُوئے کہا کہ تم نے مجھے قتل کرنا چاہا تھا مگر تیر قضا کا رُخ خارجہ کی طرف مُڑ گیا اور تم اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ پھر خارجہ کے خون کے عوض اُسے قتل کر دیا گیا۔

عبد الرحمٰن ابن ملجم آخر ماہِ شعبان میں کوفہ آیا اور محلہ بنی کندہ میں خوارج کے ہاں قیام کیا مگر کسی کو اپنے خطرناک ارادہ سے آگاہ کرنا مناسب نہ سمجھا اور نہ اپنے طرز عمل سے اپنے موقف کو مشکوک ہونے دیا۔ اسی اثناء میں اس کی ملاقات ایک خارجیہ عورت قطام بنت اخضر تیمیہ سے ہوئی وُہ اسے دیکھتے ہی فریفتہ ہو گیا اور جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ وُہ بے شوہر کے ہے تو اس سے نکاح کی خواہش کی قطام کا باپ اور بھائی جنگ نہروان میں مارے گئے تھے اور وُہ حضرت علی سے انتقام لینا چاہتی تھی مگر کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی اس خواستگاری سے اس کے دل میں انتقام کی افسردہ آگ پھر سے بھڑک اُٹھی اور اُسے کامیابی کی جھلک نظر آنے لگی۔ چنانچہ اس نے کہا کہ میں راضی ہوں مگر میرا مہر تین ہزار درہم ایک غلام ایک کنیز اور علی ابن ابی طالب کا قتل ہے۔ ابن ملجم اس جرم کے ارتکاب پر تلا ہُوا تھا ایک تو وُہ اسی مقصد سے آیا تھا اور دُوسرے اس مقصد کے پیچھے ایک اور قوی محرک کار فرما ہو چکا تھا مگر بظاہر اس پر حیرت و استعجاب کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگا کہ علی کو قتل کرنا آسان کام نہیں ہے۔ قطام نے کہا کہ تم اچانک حملہ کر کے ان کا کام تمام کر سکتے ہو اگر تم کامیاب ہو گئے تو بہتر ورنہ وہ ثواب آخرت تو کہیں نہیں گیا جس کے تم بہر حال مستحق ہو گے۔ ابن ملجم نے جب دیکھا کہ قطام اس کے خیالات و نظریات سے پوری طرح ہم آہنگ ہے تو کہا کہ میں اسی ارادہ سے یہاں آیا ہوں اور علی کو قتل کر کے نہروان کے کشتوں کا انتقام لینا چاہتا ہوں۔ قطام نے کہا کہ پھر ہمت و جرات سے کام لو اور میں اپنے قبیلہ کے قابل اعتماد لوگوں سے کہوں گی کہ وُہ اس سلسلہ میں تمہاری مدد کریں۔ چنانچہ اس نے وردان ابن مجالد کو اس کی مدد کے لئے آمادہ کیا اور ابن ملجم نے شبیب ابن بجرہ اشجعی کو اپنا معاون اور اشعث ابن قیس کو اپنا ہمراز بنا لیا اور حملہ کے لئے دن اور وقت کا انتظار کرنے لگا۔

امیر المومنین اس ماہ رمضان میں باری باری اپنی اولاد اور عبد اللہ ابن جعفر کے ہاں روزہ افطار فرماتے غذا بہت کم ہو چکی تھی چند لقموں پر اکتفا کرتے اور پوچھا جاتا تو فرماتے:۔

احب ان یاتینی امر اللہ وانا خمیص۔ (تاریخ کامل ج۳۔ ص۱۹۵)

میں چاہتا ہوں کہ جب میری موت آئے تو میں خالی شکم ہوں۔"

انیسویں شب کو حضرت اپنی دختر جناب ام کلثوم کے ہاں تشریف فرما تھے انہوں نے جو کی دُو روٹیاں ایک پیالہ دُودھ کا اور ایک طشتری میں نمک رکھ کر پیش کیا۔ آپ نے اس کھانے کو دیکھا تو فرمایا کہ مَیں نے رسُول اللہ کی پیروی میں کبھی گوارا نہیں کیا کہ ایک وقت میں دستر خوان پر دُو قسم کی چیزیں ہوں

اے بیٹی دُنیا کے حلال میں حساب ہے اور حرام میں عقاب۔ کیا تم یہ چاہتی کہ تمہارا باپ دیر تک موقف حساب میں کھڑا رہے۔ ان دو چیزوں میں سے ایک چیز اٹھا لو جناب ام کلثوم نے دودھ کا پیالہ اٹھا لیا اور آپ نے چند لقمے نمک کے ساتھ تناول فرمائے۔ کھانے سے فارغ ہو کر حسب معمول مصلائے عبادت پر کھڑے ہو گئے مگر آج بار بار صحن میں نکلتے آسمان پر نظر کرتے اور ڈوبتے اور جھلملاتے ہوئے ستاروں کو دیکھتے اور فرماتے:۔

واللہ ما کذبت ولا کذبت و	خدا کی قسم میں جھوٹ نہیں کہتا اور نہ مجھے غلط
انھا اللیلۃ التی وعدت بھا	بتایا گیا ہے یہی وہ رات ہے جس کا مجھ سے
(صواعق محرقہ ص ۱۳۴)	وعدہ کیا گیا ہے۔"

آپ کرب و اضطراب کی حالت میں کبھی سورہ یٰسین کی تلاوت کرتے کبھی انا للہ وانا الیہ راجعون اور کبھی لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم پڑھتے اور کبھی کہتے اللھم بارك لی فی الموت۔ "خدایا موت کو میرے لئے بابرکت قرار دے۔" ام کلثوم نے یہ کیفیت دیکھی تو عرض کیا کہ بابا آج آپ اتنے پریشاں حال کیوں ہیں فرمایا کہ بیٹی آخرت کی منزل در پیش ہے اور میں اللہ کی بارگاہ میں جانے والا ہوں۔ ام کلثوم نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا کہ بابا آج آپ مسجد میں تشریف نہ لے جائیں جعدہ ابن ہبیرہ موجود ہیں انہیں حکم دیجئے کہ وہ نماز پڑھا دیں۔ فرمایا لا مفر من قضاء اللہ۔ قضائے الٰہی سے بچ نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔" ابھی کچھ رات باقی تھی کہ ابن ثباح مؤذن نے حاضر ہو کر نماز کے لئے عرض کیا۔ حضرت مسجد کے ارادہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ جب صحن خانہ میں آئے تو گھر میں پلی ہوئی بطوں نے پر پھڑ پھڑائے اور چیخنے چلانے لگیں۔ کسی نے ان بطوں کو ہٹانا چاہا تو فرمایا کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو ابھی کچھ دیر کے بعد نوحہ و بکا اور نالہ و شیون کی آوازیں بلند ہوں گی۔ امام حسنؑ یا ام کلثوم نے عرض کیا کہ بابا آج آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں فرمایا کلمۂ حق تھا جو میری زبان پر جاری ہو گیا ہے۔ پھر حضرت نے ام کلثوم سے فرمایا کہ بیٹی یہ بے زبان جانور ہیں ان کے آب و دانہ کا خیال رکھنا اور اگر ایسا نہ کر سکو تو انہیں رہا کر دینا تاکہ یہ زمین میں چل پھر کر اپنا پیٹ پال سکیں۔ جب دروازہ کے قریب پہنچے تو پٹکا کمر میں کس کر باندھا اور احیحہ انصاری کے یہ دو شعر پڑھے ؎

اشدد حیازیمك للموت　　فان الموت لاقیکا

"موت کے لئے کمر کس لو اس لئے کہ موت تمہارے سامنے آنے والی ہے۔"

ولا تجزع من الموت　　اذا حل بوادیکا!

"جب موت تمہارے ہاں ڈیرے ڈالے تو اس پر بیتابی کا مظاہرہ نہ کرو۔"

ام کلثوم نے آنسو بہاتے ہوئے باپ کو الوداع کہا۔ امام حسنؑ نے چاہا کہ مسجد تک حضرت کے

ہمرکاب جائیں مگر آپ نے منع کر دیا۔ جب مسجد میں تشریف لائے تو مسجد تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی آپ نے اندھیرے میں چند رکعات نماز پڑھی اور تعقیبات سے فارغ ہوئے تو خونریز سحر نمودار ہو چکی تھی آپ گلدستۂ اذان پر تشریف لے گئے اور صبح کی اذان دی یہ آپ کی آخری اذان تھی جو مسجد سے بلند ہوئی اور کوفہ کے ہر گھر میں سُنی گئی۔ اذان کے بعد الصلوٰۃ الصلوٰۃ کہہ کر لوگوں کو نمازِ صبح کے لئے بیدار کرنے لگے انہی لوگوں میں ابن ملجم بھی تھا۔ آپ نے اُسے اوندھا لیٹے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ یہ شیطان کے سونے کا انداز ہے داہنی کروٹ سو جو مومنین کا شعار ہے یا بائیں کروٹ لیٹ جو حکماء کا طریقہ ہے یا پیٹھ کے بل سو جو انبیاء کا طرزِ عمل ہے۔ اٹھ نماز پڑھ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ تُو کس ارادہ سے آیا ہے اور کیا چیز زیرِ دامن چھپائے ہوئے ہے۔

حضرت لوگوں کو بیدار کرنے کے بعد محرابِ عبادت میں کھڑے ہو گئے اور جب نافلۂ صبح کی پہلی رکعت کے سجدہ سے سر اٹھایا تو شبیب ابن بجرہ نے تلوار سے حملہ کیا مگر تلوار ستونِ مسجد سے ٹکرائی اور اس کا وار ناکام رہا۔ پھر ابن ملجم نے زہر میں بجھی ہوئی تلوار سر پر ماری جس سے فرقِ مبارک شگافتہ ہو گیا آپ نے بیساختہ فرمایا بسم الله وعلى ملة رسول الله فزت ورب الكعبة "ربِّ کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا ہوں" لوگو مجھے یہودیہ کے بیٹے ابن ملجم نے قتل کر ڈالا ہے۔ امام بمنزلۂ روحِ کائنات اور جانِ عالم ہوتا ہے جب جان پر بنتی ہے تو اعضاء متاثر و مضمحل ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ چنانچہ اس موقع پر آسمان کانپا زمین لرزی مسجد کے دروازے آپس میں ٹکرائے اور زمین و آسمان کے درمیان یہ آواز گونجی تهدمت والله اركان الهدى قتل ابن عم المصطفى قتل الوصى المجتبى قتل على المرتضى۔ خدا کی قسم رُکنِ ہدایت گر گئے ابن عم رسول قتل کر دیئے گئے وصی پیغمبر مارے گئے علی مرتضےٰ شہید کر دیئے گئے"۔ اس آواز نے کوفہ کی آبادی کو لرزا دیا تمام شہر کانپ اٹھا لوگ جوق در جوق گھروں سے باہر نکل آئے امام حسن اور امام حسین علیہما السّلام سراسیمہ و پریشان حال مسجد کی طرف دوڑے جہاں لوگ پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے اور چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ امیر المومنین شہید کر دیئے گئے۔ فرزندانِ رسُول نے آگے بڑھ کر دیکھا کہ محرابِ مسجد لہو سے تر ہے اور حضرت خاک و خون میں پڑے لوٹ رہے ہیں اور مٹی اٹھا اٹھا کر فرقِ مبارک پر ڈالتے اور اس آیت کی تلاوت فرماتے جاتے ہیں:-

منها خلقناكم وفيها نعيدكم ومنها نخرجكم تارة اخرى۔	ہم نے تمہیں زمین سے پیدا کیا اور زمین کی طرف پلٹائیں گے اور اسی سے دوبارہ نکالیں گے"۔

امیر المومنین کے چہرہ و سر کو خون میں رنگین دیکھ کر امام حسن نے گلوگیر آواز میں کہا کہ بابا آپ کا خون کس نے بہایا ہے حضرت نے سر اٹھا کر حسنؑ کو دیکھا اور فرمایا بیٹا پہلے نماز ادا کرو چنانچہ امام حسنؑ نے نماز

پڑھائی اور خود حضرت نے بیٹھ کر نماز ادا کی۔ نماز سے فارغ ہو کر حضرت کو محراب مسجد سے صحن میں لایا گیا۔ اس متوحش خبر کو سن کر لوگ سمٹ کر مسجد میں جمع ہو چکے تھے ہر چشم اشکبار اور ہر دل غم سے فگار تھا امام حسنؑ نے قاتل کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا مجھے ابن ملجم مرادی نے قتل کیا ہے اور باب کندہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ابھی اس دروازہ سے اُسے لایا چاہتے ہیں۔ اتنے میں باب کندہ کی طرف سے شور اُٹھا اور ابن ملجم گرفتار کر کے لایا گیا۔ مجمع غم و غصّہ سے بے قابو ہو رہا تھا آنکھوں سے غیظ و غضب کی چنگاریاں نکل رہی تھیں اور ہر شخص اس پر لعنت بھیج رہا تھا۔ جب اُسے امام حسنؑ کے سامنے لایا گیا تو آپ نے اس سے کہا کہ اے بدبخت و لعین تُو نے امیرالمومنین کو قتل کر دیا ہے کیا یہ ان احسانات کا بدلہ ہے جو انہوں نے ہمیشہ تم پر کئے۔ ابن ملجم سر جھکائے خاموش کھڑا رہا اور کسی بات کا جواب نہ دیا۔ امیرالمومنین نے غشی سے آنکھیں کھول کر اُسے دیکھا اور فرمایا کہ اے ابن ملجم کیا میں تیرا اچھا امام نہ تھا اور کیا میرے احسانات بھلا دیئے جانے کے قابل تھے۔ اس پر ابن ملجم نے کہا: افانت تنقذ من فی النار "کیا آپ اُسے چھڑائیں گے جو دوزخ کا سامان کر چکا ہو"۔ اس کے بعد آپ نے امام حسنؑ کی طرف رُخ کیا اور فرمایا کہ اے فرزند اگر میں زندہ بچ رہا تو مجھے اختیار ہو گا کہ اسے سزا دوں یا معاف کر دوں اور اگر اس ضربت کے نتیجہ میں چل بسا تو تم اسے قصاصاً قتل کر دینا اور ایک ضربت کے بدلے ایک ضربت لگانا اور قتل کے بعد اس کے ہاتھ پیر نہ کاٹنا کیونکہ میں نے رسُول خدا کو فرماتے سُنا ہے ایاکم والمثلۃ ولو بالکلب العقور "خبردار کسی کو مثلہ نہ کرنا اگرچہ کاٹنے والا کتا کیوں نہ ہو"۔ اور اس کے ایام اسیری میں جو خود کھانا وہ اسے کھانے کے لئے دینا اور جو خود پینا وہ اسے پینے کے لئے دینا۔

اب لوگ حضرت کو ہاتھوں پر اٹھا کر گھر میں لائے گھر کے اندر اور گھر کے باہر کہرام بپا تھا امام حسنؑ گریہ و زاری کی آوازیں سُن کر باہر تشریف لائے اور فرمایا کہ اے لوگو امیرالمومنین فرماتے ہیں کہ تم اپنے گھروں کو واپس جاؤ۔ اصبغ ابن نباتہ کہتے ہیں کہ لوگ منتشر ہو گئے مگر میرے دل نے گوارا نہ کیا کہ میں حضرت کو دیکھے بغیر واپس جاؤں وہیں پر کھڑا رہا اور جب امام حسنؑ دوبارہ باہر نکلے تو میں نے عرض کیا کہ فرزند رسولؐ میں امیرالمومنین کو دیکھے بغیر جانا نہیں چاہتا مجھے ایک نظر دیکھنے کی اجازت دی جائے۔ امام حسنؑ اندر تشریف لے گئے اور کچھ دیر کے بعد باہر نکلے اور مجھے اپنے ہمراہ اندر لے گئے۔ میں نے دیکھا کہ حضرت کے سر پر زرد رنگ کی پٹی بندھی ہوئی اور چہرے پر زردی چھائی ہوئی ہے۔ میں پٹی اور چہرے کی رنگت میں تمیز نہ کر سکا اور بیساختہ رونے لگا۔ حضرت نے مجھے روتے دیکھا تو فرمایا کہ اے اصبغ روؤ نہیں میں جنت کی طرف جا رہا ہوں۔ میں نے کہا کہ یا امیرالمومنین مجھے معلوم ہے کہ آپ جنت میں جائیں گے مگر میں تو آپ کی مفارقت پر روتا ہوں اب ہمارا کون پرسان حال

ہو گا اور یتیموں اور بیواؤں کی کون دستگیری کرے گا یہ کہہ کر اصبغ اُٹھ کھڑے ہوئے اور حضرت پر نقاہت طاری ہوگئی اور غشی کے دَورے پڑنے لگے کبھی ہوش میں آجاتے اور کبھی بے ہوش ہو جاتے۔ امام حسنؑ نے دُودھ کا ایک پیالہ پیش کیا آپ نے کچھ پیا اور فرمایا کہ ابن ملجم کو بھی دُودھ کا شربت دیا جائے۔
اس عرصہ میں کوفہ کے طبیب جمع ہوگئے ان میں مشہور جراح اور ماہر طبیب اثیر ابن عمرو سکونی بھی تھا اس نے زخم کا جائزہ لینے کے بعد کہا کہ اس کاری ضرب سے جانبر ہونے کی کوئی صورت نہیں ہے زہر آلود تلوار سے مغز سر بھی متاثر ہوا ہے اور جسم میں بھی زہر پھیل چکا ہے۔ یہ سُن کر سب کو حضرت کی زندگی سے ناامیدی ہوگئی سینوں میں دل بیٹھنے لگے اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ حضرت نے انیسویں اور بیسویں رات انتہائی کرب و تکلیف میں گزاری اور جب اکیسویں رات کا دو تہائی حصہ گزرا تو حالت دگرگوں ہوگئی پیشانی پر موت کا پسینہ آیا اور کلمۂ شہادت پڑھ کر جانؑ جان آفرین کے سپرد کر دی اور روح طیب عالم قدس کی طرف پرواز کر گئی۔ تقویٰ و راستبازی کا چراغ گل ہوگیا علم و عمل کا آفتاب گہنا گیا دُنیا تیرہ و تار ہوگئی۔ افسوس جس کی زیست کا ہر لمحہ حق کی نصرت اور باطل کے خلاف جہاد میں گزرا ایک شقی ازلی کی تلوار سے مجروح ہو کر دُنیا سے چل بسا اور جس کی زندگی کی راتیں محراب عبادت میں جاگ کر گزریں لحد کا گوشہ آباد کرنے کے لئے ابدی نیند سو گیا۔
قتل ایک جرم ہے مگر قتل کی نوعیت مقتول کی حیثیت اور اس پر مرتب ہونے والے نتائج و اثرات کے اعتبار سے اس کی سنگینی اور سزا کے درجوں میں فرق ہو سکتا ہے۔ ایک عام فرد کا قتل جرم اور بڑا جرم ہے مگر قتل مومن اس سے بھی بڑھ کر جرم ہے جس کی سزا نص قرآن کی رُو سے دوزخ کا دائمی عذاب ہے۔ اور امیر المومنین کا قتل تو ہر اعتبار سے سنگین جرم اور عظیم حادثہ تھا جس نے دینی حدود کو پامال اور اسلامی قدروں کو مجروح کر دیا اس لحاظ سے قاتل دُنیا و آخرت میں شدید ترین عذاب کا مستحق ہو گا۔ یہ ایک عابد شب زندہ دار کا قتل تھا جو محراب مسجد میں اور سجدہ کی حالت میں واقع ہوا۔ قاتل نے نہ مسجد کی تقدیس کا خیال کیا نہ نماز کا احترام ملحوظ رکھا نہ سجدہ کی حالت پر نظر کی اور اس نمازی کا خون بہایا جو اسلام کا پاسبان ثانیٔ قرآن اور سراپا ایمان تھا۔ اس سانحہ کا ایک افسوسناک پہلو یہ ہے کہ یہ حادثہ اس وقت رونما ہوا جب حضرت لشکر و سپاہ جمع کر چکے تھے اور دو چار دن کے بعد شام کی طرف کوچ کرنے والے تھے تاکہ ایک فیصلہ کن جنگ لڑ کر ضلالت کا سرچشمہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیں مگر ایسا نہ ہو سکا اور اس قتل کے نتیجہ میں غیر شرعی اقتدار کے قدم گڑ گئے اور افق اسلام پر ضلالت و گمراہی کی گھٹائیں چھا گئیں۔ کچھ بعید نہیں ہے کہ اس کی تہ میں کوئی سازش کارفرما ہو۔ اگر ایک باجگزار کے ذریعہ مالک اشتر کو اور جعدہ بنت اشعث کے ذریعہ امام حسنؑ کو زہر دے کر راستے سے ہٹایا جا سکتا ہے تو امیر المومنین کی زندگی ختم کرنے کا منصوبہ بھی بنایا جا سکتا تھا۔ بہرحال یہ اقدام کسی خاص تحریک کا نتیجہ ہو یا انتقامی جذبہ کا

قاتل کی شقاوت و محسن کشی تاریخ کا ایک مثالیہ ہے اور پیغمبر اکرم نے بھی اپنے ارشادات میں حضرت کے قاتل کو شقی ترین امت اور عاقر ناقۂ صالح کے مانند قرار دیا ہے۔ چنانچہ جابر ابن سمرہ کہتے ہیں:۔

قال رسول اللہ لعلی من اشقی الاوّلین قال عاقر الناقۃ قال فمن اشقی الآخرین قال اللہ و رسولہ اعلم قال قاتلک۔ (تاریخ خطیب بغدادی ج ۱ ص ۱۳۵)	رسول اللہ نے حضرت علی سے کہا کہ پہلے لوگوں میں شقی ترین مردم کون ہے کہا اونٹنی کو پے کرنے والا۔ فرمایا بعد والوں میں زیادہ شقی کون ہے کہا اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتا ہے فرمایا وہ تمہارا قاتل ہے"۔

ناقۂ صالح حضرت صالح کا معجزہ تھا اور علی ابن ابی طالب پیغمبر اسلام کا معجزہ تھے۔

"یکے از معجزات او علی بود"

اگر ناقۂ صالح کا پے کرنے والا جہنم کا مستحق قرار پا چکا ہے تو حضرت علی کا قاتل دوزخ کے عذاب سے کیونکر بچ سکتا ہے جبکہ دونوں نے یکساں نبوت کے معجزہ کو ختم کیا اور آیت الٰہیہ کو مٹایا اس کے بعد ابن حزم وغیرہ کی اس رائے کو کوئی وزن نہیں دیا جا سکتا کہ یہ قتل خطائے اجتہادی کا نتیجہ تھا اور نہ اس طرح جرم کی سنگینی کو ہلکا کر کے قاتل کو اجر و ثواب کا مستحق قرار دیا جا سکتا ہے۔

تجہیز و تکفین

اکیسویں رات کے چند لمحے باقی ہیں چاند کی پھیکی پھیکی روشنی فضا میں پھیلی ہوئی ہے ستارے تھرتھرا رہے ہیں اور کاشانۂ امامت میں خاموشی چھائی ہوئی ہے ایک طرف اعزہ کا مجمع ہے اور ایک جانب چند اصحاب حسرت و اندوہ کی تصویر بنے کھڑے ہیں اور آنسوؤں اور آہوں میں غسل و کفن کا سر و سامان کیا جا رہا ہے۔ امام حسن اور امام حسین علیہما السلام نے غسل دیا اس طرح کہ امام حسینؑ پانی ڈالتے تھے اور امام حسنؑ غسل دیتے تھے اور ایک روایت کی بنا پر محمد ابن حنفیہ پانی ڈالتے تھے اور حسنین علیہما السلام غسل دیتے جاتے تھے۔ غسل کے بعد اس کافور سے جو پیغمبر اکرم کے غسل سے بچ رہا تھا حنوط کیا گیا غسل و حنوط کے بعد سفید پارچوں کا کفن دیا گیا اور امیر المومنین کے حسب وصیت فرزندان امیر المومنین نے راتوں رات جنازہ اٹھایا اور دفن کے لئے کوفہ کی غربی جانب حیرہ کی طرف چل دیئے۔ جب حیرہ کے قریب سرزمین نجف میں پہنچے تو جنازہ زمین پر رکھ دیا اور امام حسنؑ نے سات تکبیروں یا پانچ تکبیروں کے ساتھ نماز جنازہ باجماعت ادا کی۔ دینوری نے تحریر کیا ہے:۔

دفن علی رضی اللہ عنہ وصلّی علیہ الحسن وکبّر خمساً۔ (اخبار الطوال ص ۲۱۶)	علی رضی اللہ عنہ مدفون ہوئے اور حسنؑ نے نماز جنازہ پڑھی اور پانچ تکبیریں کہیں"۔

نمازِ جنازہ کے بعد سفید پہاڑیوں کے درمیان ایک مقام سے مٹی ہٹائی تو قبر اور لحد تیار ملی۔ حسنین علیہما السلام محمد ابن حنفیہ اور عبداللہ ابن جعفر قبر میں اُترے اور نعش اقدس کو لحد میں اُتارا اور لحد کو اینٹوں سے بند کر کے مٹی ڈالی اور قبر زمین کے برابر کر دی۔

صلی الالہ علی جسم تضمنہ   قبر فاصبح فیہ العدل مدفونا

نجف کے ریگزار میں نعش اطہر کو خاموشی کے ساتھ سپُرد لحد کر دیا گیا اور لوگوں کو دفن کا علم اس وقت ہوا جب حسنین علیہما السلام اور دُوسرے اعزہ و اصحاب پلٹ کر کوفہ واپس آئے۔ اب عوام میں سر گوشیاں ہونے لگیں اور قیاس آرائیاں شروع ہوگئیں۔ کسی نے کہا کہ آپ دارالامارہ میں دفن کئے گئے ہیں کسی نے کہا کہ مسجد کوفہ میں کسی نے کہا کہ رحبۂ کوفہ میں اور کسی نے کہا کہ بغداد کے محلّہ کرخ میں مگر قبر کے محل وقوع کا صحیح علم امیرالمومنین کی اولاد اور ان مخصوص اصحاب کے علاوہ جو شریک جنازہ تھے کسی کو نہ تھا قبر کے مخفی رکھنے میں یہ مصلحت کار فرما تھی کہ خوارج اور اموی حکمران اس وحشیانہ طرز عمل کا اعادہ نہ کر سکیں جس کا مظاہرہ اُحد میں شہداء کے اعضائے جوارح کاٹنے کی صُورت میں ہو چکا تھا۔ جب اموی دور ختم ہو گیا اور وقتی طور پر فضا پُرسکون ہوی تو ابوالعباس السفاح کے دَور میں امام جعفر صادق عراق میں تشریف فرما ہُوے اور اپنے اصحاب میں سے ابو بصیر، عبداللہ ابن طلحہ، معلی ابن خنیس، یونس ابن ظبیان اور زرارہ وغیرہ کو قبر کے محل وقوع سے مطلع کیا جس کے بعد خواص شیعہ کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

امام جعفر صادق اور دُوسرے آئمہ اہلبیت کے اتفاق اور فرقۂ امامیہ کے اجماع کے بعد یہ امر روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ امیرالمومنین کا مدفن نجف اشرف میں ہے جو سلطنت عباسیہ کے اوائل سے لے کر اب تک زیارت گاہِ خاص و عام ہے اور علماء اہلسنت نے بھی اپنی کتابوں میں واضح طور پر اس کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ ابن اثیر تحریر کرتے ہیں:-

و الاصح ان قبرہ ھو الموضع الذی یزار و یتبرک بہ۔	"صحیح تر قول یہی ہے کہ آپ کی قبر وہی ہے جس کی زیارت کی جاتی ہے اور برکت کے حصول کا ذریعہ ہے۔"

(تاریخ کامل ج۳ ص۱۹۹)

ابن ابی الحدید نے تحریر کیا ہے کہ ابوالغنائم محمد ابن علی متوفی ۵۱۰ھ کہا کرتے تھے کہ

مات بالکوفۃ ثلثمائۃ صحابی لیس قبر احد منھم معروفا الا قبر امیرالمومنین وھو ھذا القبر الذی یزورہ الناس الآن۔	"کوفہ میں تین سو صحابیوں نے وفات پائی مگر امیر المومنین کی قبر کے علاوہ کسی کی قبر کا پتا نہیں ہے اور حضرت کی قبر وہی ہے جس کی اب لوگ زیارت کرتے ہیں۔"

(شرح ابن ابی الحدید ج۱ ص۴۵)

چند تاثرات

امیرالمومنین کی شہادت عالم اسلام کا ایک عظیم سانحہ تھی جس نے ہر اُس فرد کو جو انسانی اقدار سے آشنا تھا متاثر کیا خصوصاً کوفہ میں جہاں یہ رُوح فرسا المیہ رونما ہوا ہر شخص غمگین و افسردہ خاطر تھا۔ حضرت کے عزیزو اقارب کی نظروں میں تو دُنیا تاریک ہو ہی چکی تھی دوستوں کے ولولے بھی سرد پڑ گئے اور غم و رنج نے ان کا ذہنی سکون تہ و بالا کر دیا بلکہ دشمن بھی حضرت کی شخصیت اور کردار کی بلندی سے متاثر ہُوئے بغیر نہ رہ سکے اور ان کی زبانوں پر ایسے کلمات آگئے جن میں آپ کی عظمت کا واضح اعتراف پایا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں چند تاثرات درج کئے جاتے ہیں جنہیں صفحاتِ تاریخ نے محفوظ کر لیا ہے:۔

امام حسنؑ نے حضرت کے دفن سے فارغ ہو کر خطبہ دیتے ہُوئے فرمایا:۔

لقد قتلتم اللیلۃ رجلاً فی لیلۃ فیھا نزل القرآن وفیھا رفع عیسٰی وفیھا قتل یوشع ابن نون واللہ ما سبقہ احد کان قبلہ ولا یدرکہ احد یکون بعدہ۔ (تاریخ کامل ج۳ ص۲۰۱)

"تم نے ایک بزرگ کو اس رات میں قتل کیا جس میں قرآن نازل ہوا، عیسےٰ آسمان پر اُٹھائے گئے اور یوشع ابن نون قتل ہوئے۔ خدا کی قسم اگلے لوگوں میں سے کوئی ان پر سبقت نہ لے جا سکا اور بعد والوں میں سے کوئی ان کے مرتبہ و مقام کو نہ پا سکے گا۔"

عبداللہ ابن عباس نے کہا:۔

واللہ لقد کانت الدنیا اھون علیہ من شسع نعلہ لیث فی الوغا بحر فی المجالس حکیم فی الحکماء ھیھات قد مضی الی الدرجات العلی

"خدا کی قسم دُنیا ان کی نظروں میں جُوتی کے تسمے سے بھی زیادہ بے ارزش تھی وُہ رزم میں شیر بزم میں دریا اور صفِ حکماء میں حکیم و دانا تھے افسوس وُہ چل بسے اور درجات عالیہ پر فائز ہو گئے۔"

صعصعہ ابن صوحان عبدی نے قبر مطہر پر ہاتھ رکھ کر کہا:۔

اسئل اللہ ان یمن علینا باقتفاء اثرک والعمل بسیرتک والموالاۃ لاولیائک والمعاداۃ لاعدائک وان یحشرنا فی زمرۃ اولیائک فقد نلت مالم ینلہ احد و

"میں اللہ سے سوال کرتا ہوں کہ وُہ ہم پر یہ احسان فرمائے کہ ہم آپ کے نقش قدم پر چلیں آپ کی سیرت پر عمل کریں آپ کے دوستوں سے دوستی اور آپ کے دشمنوں سے دشمنی رکھیں اور اللہ ہمیں آپ کے دوستوں کی جماعت میں محشور

ادرکت مالو یدرکہ احد۔ کرے۔ جو مرتبہ آپ نے پایا وہ کوئی پا نہ سکا اور جو مقام آپ نے حاصل کیا وہ کوئی حاصل نہ کر سکا"۔

(بحار الانوار۔)

معاویہ نے حضرت کی خبر شہادت سُن کر کہا:۔

ذھب الفقھہ والعلم بموت ابن ابی طالب (استیعاب ج ۳ ص ۴۵) ابن ابی طالب کی موت سے فقہ و علم کا خاتمہ ہو گیا"۔

حضرت عائشہ نے خبر شہادت سُنی تو کہا:۔

لتصنع العرب ما شاءت فلیس لھا احد ینھاھا۔ (ریاض النضرہ ص ۲۳۳) اب اہل عرب جو چاہیں کریں اب کوئی نہیں ہے جو انہیں روکے ٹوکے"۔

ابن ملجم اور اس کے ساتھیوں کا انجام

امیر المومنین کے قتل میں چار افراد عبد الرحمٰن ابن ملجم، قطام بنت اخضر، شبیب ابن بجرہ اور وردان ابن مجالد شریک تھے۔ جب حادثۂ قتل کے بعد مسجد میں شور بلند ہوا اور لوگ محراب کی طرف بڑھے تو وردان بھاگ کر اپنے گھر میں آ گیا۔ اس کے ایک عزیز کو اس کے شریک قتل ہونے کا علم ہوا تو اس نے تلوار سے اُس کا کام تمام کر دیا۔ ابن ملجم حملہ کرنے کے بعد بھاگ نکلا تھا لوگوں نے اُسے بھاگتے دیکھا تو اس کا پیچھا کیا اس نے تعاقب کرنے والوں کو قتل کی دھمکی دی مگر قبیلۂ ہمدان کا ایک شخص اور مغیرہ ابن نوفل اُسے پکڑ کر مسجد میں لے آئے۔ امیر المومنین کے سپردِ لحد کئے جانے تک اُسے حراست میں رکھا گیا اور جب امام حسنؑ دفن سے فارغ ہو کر کوفہ میں آئے تو اسے طلب کیا اور اس سے کہا کہ اے دشمن خدا تم نے کس جرم کی پاداش میں امیر المومنین کو قتل کیا ہے کیا انہوں نے تم سے کوئی بُرا سلوک کیا تھا۔ کہا کہ میں نے خدا سے عہد کیا تھا کہ انہیں قتل کروں گا چنانچہ میں نے انہیں قتل کر کے اپنا عہد پورا کر دیا ہے اب آپ کو اختیار ہے چاہے قصاص لیں چاہے معاف کر دیں۔ اگر آپ امان دیں گے تو میں معاویہ کو قتل کر کے آپ کو ہمیشہ کے لئے مطمئن کر دوں گا۔ امام حسن نے فرمایا کہ تم اسی کے سزاوار ہو کہ تمہیں کیفر کردار تک پہنچایا جائے چنانچہ آپ نے اس کے قتل کا حکم دیا اور اُسے قتل کر دیا گیا۔ ہیثم بنت اسود نخعیہ نے کہا کہ اس کا لاشہ میرے حوالے کر دیا جائے چنانچہ اس کا لاشہ اُسے دے دیا گیا اور اس نے آگ روشن کر کے اسے جلا دیا اس کے بعد بپھرے ہوئے ہجوم نے قطام کے گھر کا رُخ کیا اور اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے نذر آتش کر دیا اور اس کا گھر بار لوٹ لیا۔

شبیب ابن بجرہ لوگوں کی بھیڑ میں شامل ہو کر بچ رہا تھا جب معاویہ بر سر اقتدار آنے کے بعد کوفہ میں آئے تو شبیب ان کے پاس آیا اور ان کا تقرب حاصل کرنے کے لئے کہا کہ میں علی کو قتل کرنے میں ابن ملجم

کا شریکِ کار تھا معاویہ نے یہ سُنا تو گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہُوئے اور اُن کے قبیلہ والوں کو پیغام بھجوایا کہ اگر میں نے پھر شبیب کو یہاں دیکھا تو تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا لہٰذا اسے کوفہ سے باہر نکال دو۔ اُس نے یہ سُنا تو رات کے اندھیرے میں نکل گیا اور جب مغیرہ ابن شعبہ کوفہ کا حاکم مقرر ہوا تو اس کے لشکر کے مقابلہ میں اپنے ساتھیوں سمیت مارا گیا۔

نجف کی آبادکاری

نجف کوفہ سے پانچ میل کے فاصلہ پر مغرب کی سمت واقع ہے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کسی زمانہ میں پانی کا ذخیرہ جمع تھا جو ان یانے کے نام سے موسوم تھا۔ جب پانی زمین کی گہرائیوں میں جذب ہوگیا تو ان جف یا نے جف کہا جانے لگا یعنی ان یانے خشک ہوگیا پھر کثرت استعمال سے نجف کہلانے لگا۔

نجف سے متصل ایک قدیم آبادی تھی جو کوفہ سے تین میل کے فاصلہ پر حیرہ کے نام سے موسوم تھی اور ان دونوں کے درمیان ایک وسیع ریگزار تھا جو ملطاط کہلاتا تھا۔ حیرہ کی بنیاد کلدانیوں کے فرمانروا بخت نصر نے رکھی اور سکندر مقدونی نے اس کی تعمیر و تجدید میں حصہ لیا۔ کچھ عرصہ کے بعد حیرہ کی آبادی انبار کی طرف منتقل ہوگئی اور حیرہ ویران ہوگیا۔ آبادیاں اجڑتی بستی رہتی ہیں چنانچہ ویرانی کے بعد اس کی آبادی کی پھر صورت نکل آئی اور مالک ابن فہم جو یمن کے غرق آب ہونے کا خطرہ محسوس کرکے وہاں سے نکل کھڑا ہوا تھا اس نے عراق میں طرح اقامت ڈالی اور وہاں اپنی سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا جذیمۂ ابرش برسرِ اقتدار آیا اور جب وہ زباء ملکۂ جزیرہ کے ہاتھ سے مارا گیا تو اس کا بھانجا عمرو ابن عدی ۲۴۰ء میں شاہ پور اول کے دور میں تخت و تاج کا وارث ہوا۔ عمرو نے زمام حکومت ہاتھوں میں لینے کے بعد حیرہ کو اپنی منزل قرار دیا جس کے بعد فرمانروایان عراق کا مستقلاً پایۂ تخت قرار پاگیا۔ گھنے باغوں اور نخلستانوں سے اس کی رونق بڑھی اور خورنق و سدیر ایسی فلک بوس عمارتیں تعمیر ہوئیں۔

یہاں کے باشندوں کا ذریعۂ معیشت کاشتکاری و باغبانی تھا مگر ایران کے زیرِ اثر اور اس کی سرحد پر آباد ہونے کی وجہ سے ایرانی سرحدوں اور تجارتی قافلوں کی حفاظت کا فریضہ بھی انجام دیتے اور ایران سے اس کا معاوضہ لیتے اور خوشحال زندگی بسر کرتے۔ جب فتح عراق کے بعد کوفہ کی بنیاد رکھی گئی تو یہاں کی آبادی کوفہ کی طرف منتقل ہوگئی اور اس کی عمارتوں کے اینٹ پتھر بھی کوفہ کی بعض عمارتوں کے کام میں آئے اور حیرہ جو سرسبز و شاداب مقام تھا ویران اور ریت کا میدان ہوکر رہ گیا۔ اور جب حیرہ کے جوار میں امیر المومنین مدفون ہُوئے تو پھر آبادی کا رخ ادھر ہوگیا اور دُوسری صدی ہجری کے وسط سے مختلف دیار و امصار کے لوگ ترک وطن کرکے یہاں آباد ہونے لگے اور یہ آبادی نجف مشہد اور غری کے نام سے یاد کی جانے لگی اور حیرہ کا نام صرف صفحات تاریخ پر باقی رہ گیا بلکہ کوفہ بھی اپنے پھیلاؤ کے باوجود اس کی

ایک ملحقہ آبادی ہو کر رہ گیا۔ غری کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ جذیمہ ابرش نے نجف کے قریب اپنے دو ندیموں مالک اور عقیل کی قبروں پر دو بلند و بالا عمارتیں تعمیر کی تھیں جنہیں غریین کہا جاتا تھا رفتہ رفتہ غریین کے بجائے زبانوں پر غری آنے لگا اور پھر سرزمین نجف کو قرب کی بنا پر غری کہا جانے لگا۔

جب شیعیان امیر المومنین نے یہاں مجاورت اختیار کی تو انہوں نے مرقد امیر المومنین کے گردو پیش حجرے اور جھونپڑیاں تعمیر کر لیں آبادی روز بروز بڑھتی گئی اور آبادی کے ساتھ تعمیرات میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور جہاں خاک اڑتی تھی وہاں شہر بس گیا۔ نجف سے شام تک خشکی کی راہ تھی اور بادیہ نشین عربوں سے لوٹ مار کا خطرہ رہتا تھا اس خطرہ کے پیش نظر امراؤ سلاطین شیعہ نے شہر کے گرد چار دیواری کی ضرورت محسوس کی۔ چنانچہ سب سے پہلے عضد الدولہ فنا خسرو نے ۳۶۷ھ اور ۳۷۲ھ کے درمیانی عرصہ میں مرقد امیر المومنین کی تعمیر شروع کی تو شہر کے گرد چار دیواری کی تعمیر کا بھی اہتمام کیا جس میں حسب ضرورت توسیع و ترمیم ہوتی رہی۔ چنانچہ ۴۰۰ھ میں سلطان الدولہ دیلمی کے وزیر ابو محمد ابن سہلان نے پہلی فصیل کو منہدم کر کے اس سے وسیع تر فصیل بنوائی۔ ابن اثیر جزری نے تحریر کیا ہے۔

مرض ابو محمد ابن سهلان فا شتد مرضه فنذر ان عوفی بنی سورا علی مشهد امیر المومنین علیه السلام فعوفی فامر ببنا سور علیه فبنی فی هذه السنة	ابو محمد ابن سہلان بیمار ہوگئے۔ جب بیماری نے شدت اختیار کی تو انہوں نے منت مانی کہ اگر انہیں شفا ہوی تو وہ امیر المومنین علی علیہ السلام کے مشہد کے گرد فصیل تعمیر کریں گے۔ چنانچہ انہیں صحت ہوگئی اور انہوں نے فصیل کی تعمیر کا حکم دیا اور وہ اسی سال (۴۰۰ھ) میں تعمیر کر دی گئی۔
(تاریخ کامل ج ۹ ۔ ص ۲۴۲)	

آخری فصیل فتح علی شاہ قاچار متوفی ۱۲۵۰ھ کے وزیر نظام الدولہ اصفہانی نے تعمیر کی مگر شہر کے پھیلاؤ کی بناء پر اس کا بیشتر حصہ منہدم ہو چکا ہے۔

نجف کی آبادی خالص شیعہ افراد پر مشتمل ہے جن میں ایک بڑی تعداد ان طلبۂ علوم دینیہ کی ہے جو مختلف ممالک سے سمٹ کر ہر دور میں یہاں مقیم رہتے ہیں اور اس مرکز افادہ و فیضان اور سرچشمۂ علم و عرفان سے اپنی تشنگی دور کرتے ہیں اگرچہ نجف بہت پہلے سے ایک معہد علمی قرار پا چکا تھا مگر ۴۴۸ھ میں جب شیخ الطائفہ ابو جعفر طوسی بغداد کے آئے دن کے جھگڑوں اور شورشوں سے تنگ آکر نجف میں چلے آئے تو باقاعدہ جامعۂ نجف کی بنیاد قائم ہوگئی اور یہ باب مدینۃ العلم کے برکات کا کرشمہ ہے کہ نجف ہمیشہ مرکز علم رہا اور آج بھی دنیائے اسلام کا سب سے بڑا تعلیمی مرکز ہے۔

مرقد علوی کی تعمیر

مرقد امیر المومنین کے محل و مقام کا علم آئمہ اہلبیت اور مخصوص افراد کے علاوہ کسی کو نہ تھا۔ اور علم ہوتا بھی تو کیونکر جبکہ قبر ایک ویران ٹیلے پر خاک کے اندر پنہاں تھی نہ نشان قبر تھا اور نہ لوح مزار۔ اس کا عمومی انکشاف اس وقت ہوا جب ہارون رشید عباسی ۱۷۰ھ میں بر سر اقتدار آنے کے بعد کوفہ کے اطراف میں آیا یہاں آنے کا مقصد سیر و شکار تھا۔ چنانچہ اس نے چند ہرن دیکھے تو ان کے پیچھے باز اور شکاری کتے چھوڑے مگر یہ دیکھ کر حیرت میں کھو گیا کہ جب باز اور شکاری کتے ہرنوں کا پیچھا کرتے ہیں تو وہ ایک ٹیلے پر چڑھ جاتے ہیں پھر نہ باز جھپٹتے ہیں اور نہ شکاری کتے آگے بڑھتے ہیں۔ اس نے حیرہ کے ایک شخص کو بلا کر پوچھا کہ یہ کون سی جگہ ہے اس نے بتایا کہ یہ امیر المومنین علی ابن ابی طالب کا مدفن ہے۔ ہارون نے اسے انعام دے کر رخصت کیا اور قبر کی زیارت کرنے کے بعد

ان هارون امر فبنی علیہ قبۃ واخذ الناس فی زیارتہ والدفن لموتاھم حولہ۔	حکم دیا کہ یہاں روضہ تعمیر کیا جائے چنانچہ ایک قبہ تعمیر کیا گیا اور لوگ اس کی زیارت کے لئے آنے اور اس کے گرد و پیش اپنے مردے دفن کرنے لگے"۔

(عمدۃ الطالب ص۴۴)

یہ عمارت ایک سرخ گنبد کی صورت میں تھی جس کے چاروں طرف چار دروازے تھے اور قبر کی دیواریں سفید اینٹوں سے اٹھائی گئی تھیں۔

محمد ابن زید حسنی والئ طبرستان نے معتضد باللہ عباسی کے دور میں قبہ چار دیواری اور قلعہ نما روضہ تعمیر کیا جس میں ستر طاق تھے۔ معتضد باللہ کا دور حکومت ۲۷۹ھ سے ۲۸۹ھ تک ہے۔

جب ۳۶۰ھ میں عضد الدولہ فناخسرو ابن رکن الدولہ بر سر اقتدار آیا تو اس نے بصرف کثیر روضہ کی پر شکوہ عمارت بنوائی دیواروں پر ساج کی لکڑی کے تختے جڑے اور سفید رنگ کا گنبد تعمیر کیا۔ حسین ابن حجاج بغدادی متوفی ۳۹۱ھ نے اپنے مدحیہ قصیدہ میں کہا ہے:۔

یا صاحب القبۃ البیضا علی النجف ۔۔۔ من زار قبرک واستشفی لدیک شفی

اے سرزمین نجف میں سفید گنبد کے مکیں جو شخص آپ کی قبر کی زیارت کرے اور شفا چاہے وہ شفایاب ہو گا"۔

اس تعمیر کے موقع پر عضد الدولہ نے وصیت کی تھی کہ اسے نجف میں حضرت کے جوار میں دفن کیا جائے چنانچہ ابن خلکان نے تحریر کیا ہے:۔

بنی علیہ المشھد الذی ھناک و غرم علیہ شیئاً کثیراً واوصی بدفنہ فیہ۔ (وفیات الاعیان ج ص۴۱۸)

عضد الدولہ نے صرف کثیر سے وہاں زیارت گاہ تعمیر کی اور وصیت کی کہ اسے بھی وہیں پر دفن کیا جائے۔"

چنانچہ جب اس نے ۱۸ شوال ۳۷۲ھ میں انتقال کیا تو اُسے روضۂ اطہر کی غربی جانب دفن کیا گیا۔

۷۵۵ھ میں آتشزدگی کا حادثہ رونما ہوا اور عمارت کا بیشتر حصہ منہدم ہو گیا مگر ۷۶۰ھ میں اسے پھر سے تعمیر کر دیا گیا۔

۹۱۴ھ میں شاہ اسمٰعیل صفوی متوفی ۹۳۰ھ نے فولادی ضریح بنوائی اور حرم میں طلائی قندیلیں آویزاں کیں۔

۱۰۳۲ھ میں شاہ عباس کبیر متوفی ۱۰۳۸ھ نے روضہ اقدس کی تعمیر کی اور صحن کو وسعت دی۔

۱۰۴۷ھ میں شاہ صفی صفوی متوفی ۱۰۵۲ھ نے روضہ کی تعمیر شروع کی اور اس کی تکمیل اس کے بیٹے شاہ عباس ثانی متوفی ۱۰۷۷ھ نے کی۔

۱۱۵۴ھ یا ۱۱۵۶ھ میں نادر شاہ افشاری نے فتح ہند کے بعد کاشی کی اینٹوں سے روضہ کی مرمت کی اور گنبد اور میناروں پر سونا چڑھایا۔

۱۲۰۷ھ میں محمد خاں قاچار نے ۱۲۳۲ھ میں فتح علی شاہ قاچار نے اور ۱۲۸۸ھ میں ناصر الدین شاہ قاچار نے روضہ کی تعمیر و تزیین میں حصہ لیا۔

۱۳۶۱ھ میں ملا طاہر سیف الدین رئیس جماعت بواہیر نے ایک خوشنما گنگا جمنی ضریح نصب کی

غرض ہر دور میں خصوصاً سلاطین دیالمہ جلائریہ ایلخانیہ حمدانیہ صفویہ اور قاچاریہ کے عہد میں روضۂ انور کی تعمیر و تزیین میں اضافہ ہوتا رہا اور اس چودھویں صدی کے نصف آخر میں ایک ایرانی تاجر نے خالص سونے کے دروازے لگوائے اور شاہِ ایران محمد رضا شاہ پہلوی کی طرف سے آئینہ کاری کی گئی اور انہی کی طرف سے روضہ کے اندر یہ رباعی آویزاں ہے:۔

گرد حرمت آئینہ کاری کردم　　کارے نہ سزائے شہریاری کردم

تا جلوۂ حق بہ بینم از طلعت تو　　درپیش رخت آئینہ کاری کردم

تم المجلد الاوّل من السیرۃ العلویۃ علیٰ صاحبہا افضل الصّلوٰۃ و اتم التحیّۃ

لئے احتراز کیا گیا ہے کہ اُردو دانوں کو زحمت نہ ہو۔ حوالہ جات کے لئے ہر مذہب و ملت کی کتابیں استعمال کی گئی ہیں جن کی تعداد تقریباً ۱۷۵ ہے گویا یہ کتاب' ان کتابوں کا نچوڑ ہے اس کی تحریر میں یہ پالیسی اختیار کی گئی ہے کہ جن معصومین کے حالات زیادہ مشہور ہیں ان سے کہیں زیادہ ان معصومین کے حالات پر زورِ قلم و تحقیق صرف کیا گیا ہے جن کے حالات زیادہ نمایاں نہیں ہیں۔ حضرت حجتہ علیہ السلام کے حالات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور آپ کی غیبت وغیرہ سے متعلق جو اعتراض کئے جاتے تھے ان کی بھرپور رد کردی گئی ہے ان لوگوں کے اسماء بھی لکھ دیئے گئے ہیں جنھوں نے حضرت حجتہؑ کو دیکھا ہے اور تقریباً تمام خلفاء کے انسانیت سوز کردار کو بھی واضح کر دیا گیا ہے اور ان کے کریکٹر پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے نیز یہ بھی لکھ دیا گیا ہے کہ ہر امام کے عہد میں کس قدر سادات قتل کئے گئے اور ان پر کیا کیا مظالم ڈھائے گئے نیز سادات کے خون کا گارا بنایا جانا۔ سادات کا دیواروں میں چنا جانا اور ان کے قتل عام کی داستان غم بھی بیان کی گئی ہے اور یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ ایران سے نکل کر سادات کس کے عہد میں ہندوستان آئے۔ حضرات معصومین کے اخلاقیات و کرامات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جسٹس امیر علی علامہ شبلی اور ابن خلدون نے جو مامون رشید کو امام علیہ السلام کے قتل سے بری کرنے کی سعی کی ہے۔ اسے مؤلف کی کتاب ہذا نے ناکام بنا دیا ہے اور مضبوط طریقے سے یہ ثابت کیا ہے کہ امام رضاؑ کا قاتل یقیناً مامون رشید عباسی ہی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ کتاب مرزا یوسف حسین صاحب قبلہ کی تحریر کے مطابق ملت اسلامیہ کے علمی خزانے میں ایک عظیم اضافہ ہے اس کتاب کا ہر شیعہ بلکہ ہر مسلمان کے گھر میں ہونا انتہائی ضروری ہے۔

سونے پر سہاگہ یعنی کتاب میں اضافہ اور آفسٹ طباعت

کتاب چودہ ستارے' اپنی افادیت کی وجہ سے جس قدر شہرت اور مقبولیت حاصل کر چکی ہے اس سے نہ صرف اہل تشیع بلکہ اہل تسنن بھی آگاہ ہیں۔ مزید براں اس ایڈیشن میں ۱۰۰ صفحات کا اضافہ کر دیا گیا ہے جو سونے پر سہاگہ ہے جس کی خاص خاص چیزیں یہ ہیں (۱) حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ابتدائی حالات کی توسیع (۲) رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سبب شہادت کی تحقیق (۳) جناب فضہؑ کے حالات زندگی (۴) ہندوستان میں اسلام کے پہونچنے کا ذریعہ اور سندھ سے آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعلق (۵) حضرت زینبؑ و ام کلثومؑ کے حالات زندگی نیز ان کی تاریخ ولادت و وفات اور مدفن کی تحقیق (۶) حضرت امام رضاؑ کی تعداد اولاد کی تحقیق (۷) جناب موسیٰؑ مبرقع کے حالات (۸) مختصر تاریخ قم اور معصومہ قم کے حالات (۹) ابتدا میں مکمل فہرست مضامین (۱۰) ملک کے معزز اور فحول علماء نیز مرجع تقلید اعلم العلماء مجتہد اعظم آقائے شریعتمدار قم ایران کی تقاریظ معہ تصاویر

نوٹ: ہمارے علم میں آیا ہے کہ کچھ ناعاقبت اندیش ناشر ہماری کتاب "چودہ ستارے معہ اضافہ" مؤلفہ علامہ السید نجم الحسن صاحب کراروی (جو کہ سوانح حیات چہاردہ معصومین علیہم السلام ہے) کے ٹائیٹل کو اپنی دوسری کتاب جو کہ کسی اور نام کی ہیں کو "چودہ ستارے" کے ٹائیٹل کے ساتھ فروخت کر رہے ہیں۔ لہٰذا ہم قارئین کرام سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ "چودہ ستارے معہ اضافہ" خریدتے وقت اس کے مصنف علامہ السید نجم الحسن صاحب کراروی اور پبلشر امامیہ کتب خانہ۔ مغل حویلی اندرون موچی دروازہ لاہور کی شائع کردہ خرید فرمائیں۔ اس میں سو صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے۔ لکھائی چھپائی بہترین حجم تقریباً چھ سو صفحات سائیز 7×10 سرورق رنگین (ہدیہ مناسب)

مومنین کے لئے سہولت
کتابوں کے کاروباری مرکز اُردو بازار۔ لاہور کے
خالد ایجوکیشنل سنٹر میں مومنین کی سہولت کے مدّنظر
''عمران کمپنی'' کے نام سے کاروبار کا آغاز کیا ہے۔
جہاں سے مومنین کرام ہر قسم کے قرآن مجید
(مولانا حافظ سید فرمان علی صاحب و دیگر)۔ مختلف اقسام کی
نئے سال کی جنتریاں۔ امامیہ کتب خانہ۔ کتب خانہ
اثنا عشری و دیگر اداروں کی دینی۔ مذہبی اور اسلامی
مطبوعات بازار سے بارعایت نرخوں پر دستیاب
ہیں۔ خود تشریف لائیں یا درج ذیل پتہ پر رجوع فرمائیں۔
عِمران کمپنی خالد ایجوکیشنل سنٹر نزد کربلا گامے شاہ۔
بالمقابل مسجد تھانہ لوئر مال 40۔ اُردو بازار، لاہور۔

سِیرۃ المرءِ صحیفۃ اعمالہٖ

سیرتِ امیر المومنینؑ

جلد دوم

ترتیب و تالیف

حجۃ الاسلام مولانا مفتی جعفر حسین صاحب قبلہ مدظلّہ

ناشر

امامیہ کتب خانہ مغل حویلی

اندرون موچی دروازہ۔ لاہور ۸

القرآن الحکیم
مترجم
عکسی رنگین
جلی قلم
ترجمہ وتفسیر از
مولانا حکیم حافظ سید فرمان علی صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامۂ
ترجمہ وتفسیر اصل نسخہ کے عین مطابق ۔ مثالی تصحیح ۔ آفسٹ چھپائی ۔ متعدد اقسام کے کاغذ ۔
اعلیٰ معیار کی پختہ و دیدہ زیب جلدیں حجم ۱۰۰۰ صفحات سے زائد ۔ طباعت اعلیٰ
سائز تقریباً ۷½ × ۱۱½ کتابت وکاغذ عمدہ ۔ ٹائیٹل نہایت خوبصورت ۔
سول ایجنٹ :- امامیہ کتب خانہ ۔ مغل حویلی ۔ اندرون موچی دروازہ لاہور

فہرست مضامین سیرت امیرالمومنینؑ جلد دوم

ازقلم:- جناب محمد شریف صاحب ریٹائرڈ انکم ٹیکس کمشنر۔ لاہور

مقدمہ

مفتی جعفر حسین اعلی اللہ مقامہ

جہاں میں اہل ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے

مفتی صاحب اعلی اللہ مقامہ کے سوانح حیات اور اُن کی زندگی کے ابتدائی ادوار کے کوائف سے یہ فقیر زیادہ آگاہی نہیں رکھتا اور نہ اس موضوع پر کبھی موصوف سے سیر حاصل گفتگو کے مواقع میسّر آئے۔ چنانچہ وہی چند تفاصیل جو وقتاً فوقتاً دستیاب ہوتی رہیں اور جو جستہ جستہ مختلف ذرائع سے حاصل کی جاسکیں ہدیۂ قارئین کی جاسکتی ہیں۔

مفتی صاحب کا مولد و منشاء گوجرانوالہ کا قصبہ تھا۔ وہی گوجرانوالہ جس کے اُفق پر ماضی میں یکے بعد دیگرے ایسے ایسے روشن و تابدار ستارے نمودار ہوتے رہے جن کی چمک دمک نے مدتوں برصغیر کی پوری فضا کو خیرہ کئے رکھا۔ موصوف کی ولادتِ باسعادت ۱۹۱۴ء میں اُردو بازار کے کوچہ حکیم شہاب الدین میں ایک ایسے خانوادہ کے ہاں ہوئی جو اپنی شرافت و دیانت، عزّت و وقار اور حلم و بُردباری کے ناطے پورے شہر میں ایک مخصوص شہرت کا حامل تھا۔ حکیم شہاب الدین طب میں مہارت تامہ رکھنے کے سبب دِن بھر مصروف رہنے کے باوجود تاریخ، ادب، شعر و سخن اور دوسرے کئی علوم و فنون کے چشموں سے مقدور بھر سیراب ہوتے رہنے کی جد و جہد سے کبھی غافل نہ رہتے۔ گلی محلّہ بلکہ اطراف و جوانب کے علم دوست احباب کا صبح و شام اُن کے درِ دولت پر جمگھٹا رہتا۔ ان کا پنجابی، اُردو اور فارسی کلام آج بھی مفتی صاحب کے برادرِ بزرگ حکیم محمد حسن ایڈووکیٹ لاہور ہائی کورٹ کے پاس خاصی مقدار میں اہلِ نظر کو دعوتِ فکر دینے کے لئے موجود ہے۔ حکیم شہاب الدین کے برادر خورد حکیم چراغدین کے ہاں جب مفتی جعفر حسین اپنے پانچ بہن بھائیوں میں دُوسرے نمبر پر اس عالمِ آب و گِل میں وارد ہوئے تو نومولود کے روشن مستقبل کی ایک جھلک اور آپ کی آئندہ ظاہر ہونے والی عظمت کا ایک نقش آپ کی روشن پیشانی پر پڑھ لینے میں حکیم شہاب الدین کو کوئی دقت محسوس نہ ہوئی۔ بچپنے میں جعفر حسین کی حرکات و سکنات اور آپ کے اُٹھنے بیٹھنے اور کھیل کُود کا انداز دوسرے ہم عمروں سے یکسر مختلف تھا

اور آپ کی دن بھر کی مصروفیات پر گھر کے دینی اور علمی ماحول کی ایک گہری چھاپ ایسی واضح نظر آتی تھی جسے دیکھنے والی کوئی آنکھ نظر انداز نہ کر سکتی دوست احباب کا کہنا تھا کہ "سالے کہ نکوست از بہارش پیدا" کے مصداق جملہ افرادِ خانہ اور عزیز و ں ، رشتہ داروں میں جعفر حسین کی ذات ابتداء ہی سے ایسی تھی جیسے سچے موتیوں کی لڑی میں ایک سرخ یاقوت یا تاروں کے جھرمٹ میں چاند ۔ بقولِ سعدی ؎

بالائے سرش ز ہوش مندی می تافت ستارۂ بلندی

چنانچہ جعفر حسین کی تعلیم و تربیت کی تمام تر ذمہ داری سنبھال لینے میں حکیم شہاب الدین نے کوئی تاخیر روانہ رکھی ۔ علم طب کے جملہ اسرار و رموز کے علاوہ شفیق تایا نے نہایت مختصر عرصہ میں اپنے اس ہونہار فرزند کو گلستان ، بوستان اور اخلاق جلالی ایسی کتابیں کم و بیش ازبر کروا دیں ۔ حکیم صاحب کی مساعیٔ جمیلہ کے علاوہ اس کارِ خیر میں اور بالخصوص فقہ و حدیث کی تعلیم و تدریس میں محلہ کی جامع مسجد کے اہلِ سنّت پیش امام مولانا چراغ علی صاحب ، ندوۃ العلماء لکھنؤ کے فارغ التحصیل قاضی عبدالرحیم صاحب اور بالخصوص مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سلفی کی شبانہ روز کی کاوشیں بھی برابر کی شریک تھیں ۔ اس کمسنی میں جعفر حسین کی ذہانت کا عالم یہ تھا کہ کافیہ جیسی کتاب کے درس کی ابتداء یکم رمضان المبارک کو ہوئی اور ستائیس شب آتے آتے یہ درس پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا تھا ۔ قارئین کے علم میں ہوگا کہ کافیہ نحو کی وہ مستند اور اساسی کتاب ہے جس کی شرحِ جامی سمیت ساڑھے تین صد سے زائد شرحیں لکھی جا چکی ہیں اور جس پر عبور حاصل کرنے کے لئے طلبہ کی اکثریت کو مہینوں اور بعض کو برسوں کی ضرورت ہوتی ہے ۔ حکیم شہاب الدین کا گھرانہ اگر ایک جانب مذہبی تعصب سے یکسر پاک اپنی صلح جوئی اور وسیع المشربی کے لئے معروف تھا تو دوسری جانب ولائے پنجتن اور مؤدت اہلِ بیتِ اطہار کی دولت سے اُن کا مالا مال ہونا بھی شہر کے کسی فرد سے پوشیدہ نہیں تھا ۔ اپنے نظریات و عقائد میں یہ لوگ اس قدر مضبوط و محکم تھے کہ مالی وسائل کی کمی اور گردشِ دوراں کے مدوجزر کے باوجود ننھے جعفر حسین کو علومِ دینیہ کے ایک نہایت بلند و بالا مقام پر دیکھنے کی خواہش ایک لمحہ بھر کے لئے بھی اُن کی نظر سے کبھی اوجھل نہ ہو سکی ۔ جملہ معترضہ کے طور پر یہاں یہ ذکر شاید غیر ضروری نہ ہوگا کہ احسان شناسی اور بار احسان سے سبکدوشی کا غالباً یہی جذبہ تھا جس کے تحت موت سے تھوڑا عرصہ قبل قلمبند کروائے ہوئے مفتی صاحب کے وصیت نامہ میں حکیم شہاب الدین کے حج بدل کی خاطر مختص کی گئی مبلغ دس ہزار روپیہ کی رقم کا تذکرہ بالوضاحت موجود ہے ۔

بارہ برس کی عمر کو پہنچتے پہنچتے جعفر حسین اُردو ، فارسی اور عربی زبان پر مضبوط گرفت رکھنے کے علاوہ نہ صرف فقہ و حدیث میں معتد بہ دسترس بہم پہنچا چکے تھے بلکہ ادب اور شعر و شاعری کے میدان میں بھی وقتاً فوقتاً اپنی جولانیٔ طبع کے جوہر دکھانا آپ کے خاص مشاغل میں شامل تھا ۔ دن رات تحصیلِ علم کے شوق میں جعفر حسین شہر کے مختلف اساتذہ کے درِ دولت پر حاضری دیتے اور کھانے پینے اور بچپنے کے دوسرے بہت سے مشاغل سے بے نیاز اپنی دُھن میں کھوئے رہتے ۔ اِدھر حکیم صاحب کا جذبۂ صادق اور اُدھر جعفر حسین کا اپنا ولولۂ کامل ، دلِ ناصبور کو جب یقین ہو گیا کہ پیاس کی شدت پر غالب آنے کے لئے گوجرانوالہ میں ذخیرۂ آب کم بلکہ بالکل ناکافی ہے تو جعفر حسین نے لکھنؤ پہنچنے کی تیاری شروع کر دی ۔ لکھنؤ اُن دنوں

پورے برصغیر میں ملّت جعفریہ کے لئے ایک عظیم علمی مرکز کی حیثیت کا حامل تھا۔ وہاں کا حوزۂ علمیہ پورے برصغیر میں اپنی مثال آپ تھا اور اکابرینِ دین اور علماء ومجتہدین کی ایک مضبوط جماعت وہاں صبح وشام طالبانِ علم کی پیاس بجھانے کے لئے مصروفِ جہاد تھی۔ چنانچہ مرزا احمد علی صاحب نے جو اُن دِنوں لاہور میں ملٹری اکوٗنٹس کے محکمہ میں ایک اہم عہدہ پر فائز تھے اعانت کی اور جعفر حسین عمر کی ناپختگی اور مالی وسائل کی تنگی کے باوجود صرف اُن دو پارچات میں جو آپ کے زیبِ تن تھے لکھنؤ پہنچ گئے۔

جعفر حسین پورے نو برس لکھنؤ میں مقیم رہے اور اس عرصہ میں نہ صرف انہوں نے جی بھر کر مفتی احمد علی صاحب، سید سبط حسین صاحب جونپوری اور قبلہ سید ابوالحسن المعروف مُنّن صاحب ایسے جید عُلماء سے کسبِ فیض کیا بلکہ رفتہ رفتہ آپ کو سرکار نجم الملّت اور سرکار ناصر الملّت کا خصوصی قُرب بھی حاصل ہوتا چلا گیا۔ مخصوص حلقوں میں جعفر حسین محض پیدائش کے لحاظ سے "آفتابِ پنجاب" کے لقب سے مشہور تھے ورنہ جہاں تک لکھنوی تہذیب وتمدّن کے اپنانے یا وہاں کے معاشرہ میں رچ بس جانے کا تعلق ہے انہیں کوئی دیکھنے والا پنجابی نہ پاتا۔ بول چال، لب ولہجہ، خورد ونوش اور لباس کی تراش خراش، غرض ہر پہلو سے جعفر حسین خالص لکھنوی دکھائی دیتے۔ آپ کا (مادرِ علمی) کہلوانے کا اعزاز مدرسۂ ناظمیہ کے حصّہ میں آیا اور اس مدرسہ نے ہمیشہ انہیں اپنا ایک مایۂ ناز سرمایہ تصوّر کیا۔ اس ادارہ کا حریف سُلطان المدارس تھا۔ کچھ ہی مدّت گزری تھی کہ جعفر حسین کی قابلیّت اور شہرت کا سکّہ وہاں بھی رواں ہوگیا۔ ان دونوں مدارس کے طلباء نے مشترکہ طور پر ایک شعری تنظیم قائم کر رکھی تھی جس میں وقفہ وقفہ سے محافل منعقد ہوتیں جہاں طلباء خود نوشتہ عربی قصائد باہمی مسابقت کے انداز میں پڑھتے، اس تنظیم کے رُوحِ رواں ایک مدت تک جعفر حسین رہے۔ مطالعہ کتب اُن کا اوڑھنا بچھونا اور رات دن ادبی اور علمی محافل میں شرکت اُن کا واحد مشغلہ تھا۔ کوئی دُھن تھی تو بس ایک اور سر میں اگر کوئی سودا تھا تو فقط یہ کہ علوم متداولہ میں حتی المقدور کمال حاصل کیا جائے اور ممکن ہوسکے تو علم وفضل کا پورا خُم زحمتِ جام اُٹھائے بغیر ایک ہی سانس میں نوشِ جان کر لیا جائے۔ نو برس کی طویل علمی ریاضت کے بعد جعفر حسین اگرچہ منزلِ مُراد سے دُور نہیں کہے جاسکتے تھے۔ لیکن موصوف خوب جانتے تھے کہ سیرابی کے لئے حقیقی چشمۂ فیض یہاں سے بہت دُور ملک عراق میں واقع ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء میں جب آپ کی عمر اکیس ۲۱ برس سے متجاوز نہیں تھی اور جب دوسروں کا دامن عنفوانِ شباب کی سرمستیاں کئی اور قسم کے مشاغل کی طرف کھینچتی ہیں جعفر حسین نے پھر رختِ سفر باندھا۔ سبب اس کا واضح تھا۔ جعفر حسین آج بھی اتنا ہی پیاسا اور ویسا ہی تشنہ لب تھا جتنا آج سے نو برس قبل وارِدِ لکھنؤ ہونے سے پہلے تھا۔

چنانچہ لکھنؤ کی چہل پہل اور وہاں کی ہنگاموں سے معمور فضا کو بادلِ نخواستہ خیرباد کہا اور حسرتوں اور ارمانوں کا ایک طوفان سینہ میں چھپائے موصوف بابِ مدینۃ العلم کے آستانِ قدس پر جا حاضر ہوئے۔ جاتے ہی وہاں جب چاروں جانب علوم وفنون کی ندیاں بہتی ہوئی ملیں اور ایک سے ایک زیادہ شیریں وشفاف چشمے نے خوش آمدید کہا تو علم وحکمت کا شیدائی اور عرفان وآگہی کا متوالا جعفر حسین دیکھتے ہی دیکھتے دنیا وما فیہا سے بے خبر اس سحر آگین ماحول میں ڈوب گیا۔ پورے پانچ برس آنکھ جھپکنے میں بیت گئے۔ فقہ وحدیث، تاریخ وفلسفہ، اُصول ومعانی اور تفسیر ورجال غرض علم کا کوئی شعبہ ایسا نہ

تھا جیسے جعفر حسین نے کھنگال نہ ڈالا ہو۔ شبانہ روز کی محنتِ شاقہ نے صحت کو بے حد متاثر کیا اور جسم ناتواں اور بھی لاغر ہوکر رہ گیا۔ لیکن اس طرف توجہ ہی کہاں تھی۔ فکر تھی تو بس ایک کہ پوری خاکِ نجف کا مقدس سرمہ کم سے کم وقت میں کاسہ ہائے چشم میں انڈھیل لیا جائے اور ریگزارِ کربلا و کاظمین کا کوئی ذرہ ایسا نہ رہ جائے جس پر پے بہ پے سجدوں سے لوحِ جبیں صیقل اور منور نہ ہو۔

ہر چند کہ ورُودِ نجف کے بعد بہت قلیل عرصہ میں موصوف درجۂ اجتہاد پر فائض ہو چکے تھے لیکن وہاں سے مراجعت کا تصور بھی اس وقت تک آپ نے دماغ میں نہ آنے دیا جب تک حوزہ کے کم و بیش تمام مراجع عظام سے تحریری سندات حاصل نہ کر لیں۔ اِن اساتذہ میں آقائے سید ابوالحسن اصفہانی، آقائے سیّد جوّاد تبریزی، آقائے مرزا محمد باقر زنجانی اور شیخ محمد ابراہیم رشتی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں:۔

۱۹۴۰ء میں جب آپکی عمر چھبیس برس تھی آپ نجفِ اشرف سے فارغ التحصیل ہوکر شیعی دنیا کے جیّد علماء و مجتہدین کی مرحمت کردہ سندات سے سرفراز ہوکر مفتی جعفر حسین جب نجفِ اشرف سے واپس لوٹے تو سیدھے لکھنؤ میں اپنے اُستادِ معظم سرکار نجم الملّت کے درِ دولت پر حاضر ہوئے۔ اپنے ہاتھ سے لگائے ہوئے اس نحیف پودے کو ایک تنومند شجرِ سایہ دار کی صورت میں دیکھ کر شفیق اُستاد کا دِل باغ باغ ہوگیا۔ چند روز کی مصاحبت کے بعد سرکار نے مفتی صاحب کو نوگاواں ضلع مراد آباد میں جاکر سلسلۂ رُشد و ہدایت جاری کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ تعمیلِ ارشاد میں سعادت مند شاگرد نے کوئی تاخیر روا نہ رکھی اور دو برس تک وہاں مدرسۂ باب العلم میں دینِ حنیف کی خدمت بجالانے کے بعد موصوف واپس اپنے وطنِ مالوف گوجرانوالہ تشریف لے آئے۔ خدمتِ دین کے اُسی جذبہ کے تحت جس کی تڑپ سے موصوف روزِ اوّل سے سرگرمِ عمل رہے تھے آپ نے یہاں بھی تعلیم و تدریس کے اجرا کے لئے جدوجہد شروع کر دی۔ جلد ایک دیندار بزرگ ماسٹر اللہ دتہ مرحوم نے ایک چھوٹا سا گھر اس مقصد کے لئے پیش کر دیا اور یوں وہاں مدرسۂ جعفریہ معرضِ وجود میں آگیا۔ اس مدرسۂ جعفریہ کے باقیات الصالحات میں علامہ حسین بخش صاحب جاڑا مرحوم مجتہد العصر کا نام نامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ علاّمہ حسین بخش جاڑا مفسرِ قرآن ہونے کے علاوہ کم و بیش پندرہ دوسری گرانقدر کُتب کے مصنّف تھے اور اپنے اُستادِ گرامی کے تبحرِ علمی اور پاکیزگیٔ کردار کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔ یاد رہے کہ یہی جاڑا صاحب بعد میں اس "جامعہ جعفریہ" کے جو مفتی صاحب نے آخر عمر میں جی۔ ٹی روڈ پر زرِ کثیر سے تعمیر کروایا تھا پرنسپل مقرر ہوئے

۱۹۴۹ء میں وزیرِ اعظم پاکستان خان لیاقت علی خان نے حکومتِ پاکستان کی دینی اور شرعی رہبری کے لئے جو تعلیماتِ اسلامیہ بورڈ قائم کیا اور جس میں سیّد سلیمان ندوی، مفتی محمد شفیع، مولانا عبدالخالق اور انصاری رپورٹ والے مولانا ظفر احمد انصاری ایسے جیّد علماء شریک رہے اس میں شیعانِ پاکستان کی نمائندگی کا فریضہ مفتی صاحب قبلہ ہی کو سونپا گیا۔ یہ بورڈ اپنی مدّتِ عمر پوری کر چکنے کے بعد جب دوبارہ تشکیل دیا گیا تو اس میں بھی مفتی صاحب ہی کی نامزدگی عمل میں آئی۔ بورڈ کے ٹوٹ جانے کے مدتوں بعد جب جنرل ایوب خان نے اسلامی مشاورتی کونسل قائم کی تو اس میں بھی شیعان پاکستان کی نمائندگی کے لئے نظرِ انتخاب مفتی صاحب پر ہی پڑی۔ اور پھر جب جنرل ضیاء الحق نے مشاورتی کونسل

کے بجائے ایک نئی اسلامی نظریاتی کونسل جسٹس تنزیل الرحمان کی صدارت میں قائم کی تو اس میں بھی ملت جعفریہ کی نمائندگی کا شرف مفتی صاحب ہی کے حصہ میں آیا۔ یونہی جب آئین پاکستان میں شامل قرار داد مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے پاکستان بھر کے اکتیس ۳۱ علماء نے متفقہ طور پر بائیس ۲۲ نکات مدوّن کئے تو اس کے دستخط کنندگان میں بھی حافظ کفایت حسین صاحب کے علاوہ دوسرے شیعہ عالم مفتی جعفر حسین ہی تھے۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ ان بائیس ۲۲ نکات کے ہمراہ جس تشریحی نوٹ کا یہ کہہ کر اضافہ کیا گیا تھا کہ کتاب وسنّت کا مفہوم ہر فرقہ کے لئے صرف وہی قابل قبول ہوگا جو اس فرقہ کے اپنے معتقدات کے مطابق صحیح اور مُسلّم ہوگا وہ اکثر وبیشتر انہی دو حضرات کی کدوکاوش کا نتیجہ تھا۔

جنرل ضیاء الحق نفاذ اسلام کی کوششوں میں ملت اسلامیہ اور بالخصوص ملت جعفریہ کے حق میں دیانت دار اور پُرخلوص نہیں تھے۔ چنانچہ جب اس نظریاتی کونسل نے اور اس کونسل کی ایماء پر حکومت وقت نے باوجود انتباہ کے ملت جعفریہ سے تعصب اور جانبداری کا سلوک روا رکھنے کی کوشش سے باز نہ آنے کا عمل جاری رکھنا چاہا تو مفتی صاحب قبلہ نے بی بی سی کو ایک واضح اور جرأت مندانہ انٹرویو دینے کے بعد اس کونسل کی رُکنیت سے اپنا استعفےٰ پیش کر دیا۔ حکومت نے ہر چند کوشش کی کہ مستعفی ہوجانے کے باوجود مفتی صاحب کونسل سے اور نہیں تو برائے نام ہی تعاون جاری رکھیں اور بغیر حاضری دیئے یا کچھ کام کئے ماہانہ تنخواہ وغیرہ وصول کرتے رہیں لیکن مفتی صاحب نے ایک نہ سُنی اور ایسی تمام دلفریب پیشکشوں کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا اور یوں شیعان پاکستان کی تاریخ کے اس نازک موڑ پر اپنی ملت کی قیادت کے تمام تقاضے پوری دیانتداری اور بے جگری سے پورے کرکے بعد میں آنے والوں کے لئے ایک سنہری مثال قائم کردی۔

اس کے بعد ملت جعفریہ نے ۱۹۷۹ء میں بھکر کے ایک ملک گیر کنونشن میں قیادت کا سہرا اس فقیر منش بوریہ نشین کے سر پر سجانے کی سعادت حاصل کی، اس فقیر نے ۶ جولائی ۱۹۸۰ء کو اپنے ایک مختصر سے لشکر کی سپہ سالاری کرتے ہوئے ایوان اقتدار میں زلزلہ پیدا کیا، اور حکومت سے فقہ جعفریہ کی پابندی کے معاہدہ پر دستخط لے کر اس نے ایک تاریخی فتح مبین حاصل کی، مختلف مراحل پر جان ومال اور عزت وآبرو آستان قدسیہ اہلبیتؑ پر نچھاور کر دینے سے دریغ نہ کرنے کا تمغہ اپنے سینہ بے کینہ پر سجایا اور ایک جابر متکبر اور مستبد حکومت سے ٹکرانے کے نتیجے میں آخر کار ۲۹ اگست ۱۹۸۳ء کی ایک جانگسل صبح کو اپنی نحیف جان کا نذرانہ بارگاہ مرتضوی میں پیش کرکے اس قلندر نے ابدی سرخروئی کا تاج انعام میں پایا۔ یہ سب واقعات وہ ہیں جو زمانہ حال کی تاریخ کا حصّہ ہیں اور جن سے اپنے پرائے سب پوری طرح آگاہ ہیں۔

مفتی صاحب اعلی اللہ مقامہٗ کی اور میری شناسائی ۱۹۴۹ء میں اس وقت ہوئی جب میں حیدر آباد سندھ میں بطور انکم ٹیکس آفیسر متعین تھا اور موصوف کا دو تین مجلسیں پڑھنے کے لئے وہاں ورودِ مسعود ہوا۔ ہماری یہ ملاقات کم وبیش اُسی روایتی ملاقات کی سی تھی جہاں چاہت کا تیر پہلی ہی نظر میں دو قطعی اجنبی شخصیتوں کو گھائل کرکے رکھ دیتا ہے۔ مجلس کے بعد جب چائے کا دَور چلا تو ہم دونوں کے مابین گفتگو اگرچہ مختصر اور ایک جانب سے عقیدت واحترام اور دوسری طرف سے علمی وقار کی آئینہ دار تھی تاہم اختتام محفل پر نہاں خانۂ دل میں ہم دونوں محسوس کر رہے تھے کہ اس گفتگو کے تہہ دامن ایک

ننھی سی چنگاری ضرور ایسی تھی جس کے سُلگنے کی آنچ ابتداء ہو چکی تھی۔ اس چنگاری نے کیونکر امتدادِ زمانہ کے ساتھ بھڑک کر ایک شعلۂ جوالہ کی صورت اختیار کی یہ ایک طویل داستان ہے جس کے تمام نقوش آج بھی اس بندۂ حقیر کے لوحِ دل پر روزِ اوّل کی طرح کندہ ہیں اور جن کا جائزہ یا اعادہ اُسے آٹھ آٹھ آنسو رُلانے پر مجبور کر دیتا ہے۔

اگلے برس یعنی ۱۹۵۰ء میں میرا تبادلہ حیدر آباد سے کراچی ہو گیا جہاں مفتی صاحب کچھ عرصہ پہلے سے حکومتِ پاکستان کی طرف سے بحیثیت ممبر تعلیمات اسلامیہ بورڈ تعینات ہو کر قیام پذیر ہو چکے تھے۔ مفتی صاحب کا رین بسیرا اُن دنوں پُرانی نمائش کے نزدیک جیکب لائنز کے ایک مختصر سے کوارٹر میں تھا جو اتفاق سے ہمارے دفتر سے کافی قریب واقع تھا۔ موصوف کی جاذبِ دل اور پُرکشش شخصیت مجھے مجبور کرتی کہ میں وقفۂ تفریح میں یا چھٹی کے بعد اُن کے درِ دولت پر گاہے گاہے حاضری دوں۔ صورتِ حال کے پیشِ نظر بہت جلد یہ ملاقاتیں گاہے گاہے سے ہفتہ وار اور پھر ہفتہ وار سے اور زیادہ متواتر ہوتی چلی گئیں۔ اور پھر چند ہی ماہ بعد صورت یہ تھی کہ کوئی جلسہ، مجلس، یا دینی اجتماع اگر تھوڑی سی بھی اہمیت کا حامل ہوتا تو موصوف شرکت کے لئے یا مجھے ہمراہ لے لیتے یا وہاں طلب فرماتے۔

کراچی میں مسلسل تقریباً پانچ برس کے قیام کے بعد مفتی صاحب قبلہ واپس اپنے وطن مالوف گوجرانوالہ تشریف لے آئے تو ہماری ملاقات کا وقتاً فوقتاً خط اور پیغام رسانی کا مرہونِ منت ہو کر رہ جانا ایک لازمی امر تھا۔ تاہم میرا جب کبھی پنجاب آنا ہوتا میں لازماً بلا استثنا گوجرانوالہ آپ کی خدمت میں حاضری دیئے بغیر واپس کراچی نہ لوٹتا۔ اور یونہی جناب کا اگر کراچی آنا ہوتا تو آپ میرے ہی غریب خانہ پر قیام فرماتے۔ ۱۹۵۸ء کے بعد میرے مستقل طور پر لاہور آجانے پر ان ملاقاتوں میں معتدبہ اضافہ ہو جانا اور ان کی طوالت و تکرار کا بدرجہا بڑھ جانا بجائے خود ایک فطری بات تھی اور پھر ۱۹۶۶ء میں جب میری تعیناتی اتفاق سے خود گوجرانوالہ شہر میں ہو گئی تو ایسے لگا جیسے بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹے۔ زلیخا کے شباب کی طرح بیتا ہوا سہانا اور خوشگوار دَور ایک دفعہ پھر پلٹ آیا۔ موصوف ذرا سی تنہائی محسوس کرتے یا کام کی زیادتی کے سبب طبیعت سیر و تفریح پر مائل ہوتی تو مجھے بلا بھیجتے۔ ظاہر ہے اُن کا یہ بلاوا میرے لئے شرف کا درجہ رکھتا اور تعمیلِ حکم میں مجھے ایک خاص لذت محسوس ہوتی۔ ہر دوسرے تیسرے روز شہر کی مختلف اطراف میں میلوں لمبی سیر پر نکل جانا ہمارا معمول ہو گیا اور ایسا کیوں نہ ہوتا جبکہ یہ سیر میرے لئے تفریح سے کہیں زیادہ تعلیم و تربیت کی ایک صورت اور فیضانِ علم بلکہ انشراحِ قلب و صدر کی بہترین سبیل ہوتی۔ سیر کے دوران علمی، سیاسی، دینی اور دُنیا بھر کے دوسرے موضوعات پر آپ ایسا جامع اور سیر حاصل تبصرہ کرتے کہ عقل دنگ رہ جاتی اور جب بعض ایسے دقیق مسائل و مباحث کو جن کے سمجھنے سمجھانے کے لئے دوسرے بزرگوں سے گھنٹوں مصروفِ گفتگو رہ کر بھی دل کی تشفی نہ ہو پاتی آپ چلتے چلتے ہلکے پھلکے انداز اور دل نشین پیرایہ میں بلا تکلف حل کرتے تو چشمِ تصور فوراً مجھے وہ منظر صاف دکھلا دیتی جب بازارِ کوفہ میں بوسیدہ چٹائی پر بیٹھے ہوئے ایک مزدور خرما فروش جناب میثم کو بابِ مدینۃ العلم ان کے پہلو میں اُسی چٹائی پر جلوہ افروز ہو کر کائنات اور ماورائے کائنات کے رموز و اسرار اور حکمت و معرفت کے پُرپیچ نکات اشاروں اشاروں میں تعلیم فرما دیتے۔

تین سالہ قیام گوجرانوالہ اور مابعد کے زمانہ کی تفصیلات زیادہ شرح و بسط سے بیان کرنا نہ تو اس وقت مقصود

خاطر ہے اور نہ ہی اس کی چنداں ضرورت ہے۔ آئینۂ دل پر یہ تمام نقوش اتنے گہرے ثبت ہیں کہ انہیں جتنا زیادہ کریدا جائے گا زخم دل اتنے ہی گہرے ہوتے چلے جائیں گے۔ شاید اتنا کچھ بھی میں عرضِ خدمت نہ کرتا اگر دردِ دل کی کسک کے ہاتھوں مجبور نہ ہوتا ؎

یادِ ماضی عذاب ہے یا رب　　　چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

قلم یہ سوچ کر اٹھایا تھا کہ دوست یا ہم جلیس ہونے کے ناطے سے مفتی صاحب قبلہ کی سیرت کے دو ایک ممتاز پہلوؤں پر اپنے تاثرات قلم بند کروں۔ غور کرنے پر کہ میں جناب کی سیرت کے کون سے پہلوؤں کو ممتاز اور کونسے دوسرے گوشوں کو غیر ممتاز قرار دوں بے بسی اور بے چارگی کے سوا مجھے کوئی اور راہ نظر نہیں آتی۔ حقیقت یہ ہے کہ

ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم　　　کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا این جا است

(سر سے لے کر پاؤں تک جہاں بھی نظر پڑے کرشمہ دامنِ دل کھینچ کر تقاضا کرتا ہے کہ دیکھنے کی اصل جگہ یہی ہے۔)

جو شخص سر تا پا حُسن ہی حسن ہو، جس کی صحبت میں سوائے خیر و برکت کے کبھی کچھ اور نہ ملا ہو، جس کی باغ و بہار شخصیت میں مدت العمر ڈھونڈھنے سے بھی کوئی کمی یا کجی دیکھنے میں نہ آئی ہو اس کی سیرت کے کس پہلو کو دوسرے پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔ میں نے جب بھی غور کیا مجھے موصوف میں جملہ صفاتِ انسانی اعلیٰ درجے پر نظر آئیں۔ صفات حمیدہ کا وہ ایک ایسا دل فریب اور حسین مجموعہ تھے جسے قدرت نے پیکرِ انسانی عطا فرما کر آج کے مادیت زدہ اور راہ گم کردہ دور کے لئے اپنا ایک نمونہ بنا دیا تھا۔ آئمہ معصومینؑ کا ذکر میں نہیں کرنا چاہتا۔ وہ تو دستِ قدرت کے خاص شاہکار تھے۔ اُن کا دنیا کے کسی دوسرے انسان سے مقابلہ یا موازنہ کرنا کسی کے لئے بھی جائز نہ ہوگا۔ وہ نفوسِ قدسیہ، وہ مخدومِ ملائکہ، سلکِ عصمت کے وہ انمول موتی، تسبیح طہارت کے وہ گنے چنے طیب دانے جنہیں بغیر وضو چھونا تو درکنار جن کی طرف نظر اٹھانا بھی جسارت ہو، وہ جن کے لئے شاعر نے کہا ہو ؎

ہزار بار بشوئم دہن ز عطر و گلاب　　　ہنوز نام تو بردن کمال بے ادبی است

(منہ اگر عطر و گلاب سے ہزار مرتبہ بھی دھولیا جائے تب بھی آپ کا اسم گرامی زبان پر لانا انتہائی بے ادبی ہوگا)۔

ہاں اگر اُن کے مخصوص غلاموں میں سے کسی ایک کی سیرت کا معمولی سا جلوہ آج کے پر آشوب دور میں آب و گل کے روپ میں کسی کو دیکھنا ہو تو وہ موصوف کو دیکھتا۔ لباس، خوراک اور رہائش کے حوالہ سے موصوف کی سادگی اور لاپرواہی، دولت مند اور رئیس فطرت افراد سے بے اعتنائی اور بے نیازی، حاکمانِ وقت سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اعلائے کلمۃ الحق کی جرأت، دوستوں اور ہم جلیسوں سے بے تکلفی، صاحبانِ علم و دانش سے فروتنی اور نیازمندی، ہم عصر اور ہم پیشہ علماء سے گہرائی و گیرائی کی حامل گفتگو، اربابِ ذوق ادبا و شعراء سے بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی و فقہی مسائل حل کرتے وقت حد درجہ احتیاط، سیاسی اور ملی مباحث میں بصیرت و دور بینی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ موصوف کی سیرت کے یہ وہ

چند پہلو تھے جو اُنہیں اپنے جملہ ہم عصر اور ہم پیشہ افراد پر پہلی ہی نظر میں ممتاز اور صاحب فوقیت قرار دینے کے لئے کافی تھے ان تمام پہلوؤں پر........ سیر حاصل تبصرہ کرنے کے لئے ایک دفتر درکار ہوگا۔ زیرنظر مقالہ میں نہ تو اس کی گنجائش ہے اور نہ ضرورت۔ مجھے اس وقت صرف اپنے اُن چند تاثرات یا مشاہدات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جنہیں یکسر فراموش کر دینا میرے بس کی بات نہیں' اور جن کی عوامی حلقوں میں سے یقیناً ہر وہ شخص تائید و توثیق کرے گا جس کا کسی نہ کسی جہت سے موصوف کے ساتھ تعلق رہا ہو۔

مرحوم کی سیرت کا ایک پہلو جس نے مجھے زندگی بھر متأثر ہی نہیں مسحور کئے رکھا وہ ان کا روزمرہ زندگی سے متعلق شرعی مسائل کو ہمیشہ آسان اور سہل العمل بناکر بیان کرنا تھا۔ ہم ایسے عام لوگوں میں کون ہوگا جسے زندگی میں روزمرّہ کے دینی اور فقہی مسائل اکثر علماء اور صاحبانِ منبر سے دریافت کرنے کے مواقع پیش نہ آئے ہوں۔ آپ نے دیکھا اور یقیناً محسوس بھی کیا ہوگا کہ اکثر صاحبانِ جُبہ و دستار جواب مرحمت فرماتے وقت اپنی فوقیت کا راز مسئلہ کو زیادہ پیچیدہ اور بوجھل بنانے میں ہی سمجھتے ہیں۔ برخلاف اس کے جب بھی موقع بلا زیرِبحث مسئلہ کو مفتی صاحب مرحوم نے مقدور بھر آسان اور سُبک ہی بناکر پیش کیا۔ میں نے اکثر اوقات روزمرّہ کے معمولی مسائل سے لے کر مقابلتاً گھمبیر اور مشکل باتوں پر اپنی معلومات بڑھانے کے لئے ان سے تبادلۂ خیال کیا اور دوسرے لوگوں کو بھی ان سے مختلف قسم کے مسائل دریافت کرتے ہوئے دیکھا۔ مجھے ہمیشہ یہی محسوس ہوا کہ آپ حتی الامکان کوشش کرکے مسئلہ کا حل اس قدر واضح، سہل اور ممکن العمل بناکر پیش کرتے کہ سائل شرعِ متین کو بوجھل اور ناقابلِ عمل سمجھ کر اپنی عافیت اس کے عائد کردہ فرائض سے کنارہ کشی میں ہی سمجھنے کے بجائے خود کو ہنسی خوشی کمال رضا و رغبت سے دُنیا و آخرت دونوں جگہ سرخرو اور سرفراز ثابت کرنے کی سعیٔ مسلسل میں مصروف ہوجاتا۔ یہ اور بات ہے کہ اس طرح دریافت کنندہ جناب کے دوسرے اکثر ہم عصر دوستوں کے برخلاف زبان و بیان کی لغوی اور منطقی پیچیدگیوں میں اُلجھ کر یا ان کے عمامہ و عبا سے مرعوب ہوکر آپ کو دُنیا کی کوئی دوسری اور علیحدہ مخلوق تصوّر کرنے سے قاصر رہتا۔

ملاقات کے لئے آنے والے کئی حاجیوں کو میں نے دیکھا جو ماضی قریب میں حج بیت اللہ کی سعادت سے مشرف ہوئے تھے اور جن کو ان کی نام نہاد کوتاہیوں کے عوض میں کئی کئی گوسفندوں کے کفارہ کی سزا تجویز کرکے ان کے مقامی مفتیوں نے ایک عجیب قسم کی ذہنی عقوبت میں گرفتار کر رکھا تھا اور جن کی گلوخلاصی مفتی صاحب قبلہ نے صرف فقہاء شریعت کا ایک قول یہ بتلاکر کر دی کہ اکثر اقسام کا کفارہ عاید ہونے کے لئے لازمی ہے کہ کوتاہی عمداً اور ارادتاً کی گئی ہو اور سہو میں یا بھولے سے اگر کوئی غلطی سرزد ہوگئی ہو تو وہ الرحم الراحمین کی نظر میں ناقابلِ گرفت ہے۔ اور یونہی میں نے بہت سے ایسے نیک سیرت نوجوانوں کو دیکھا جو خمس کی واجب الادا رقم ادا کرکے شریعت کا یہ بوجھ سر سے اُتار دینے کے دل سے خواہش مند تھے، لیکن ان کے مقامی مولانا صاحبان ان کے پورے اثاثۃ البیت کا صفایا کروانے کے بعد بھی انہیں رہائی کا پروانہ عنایت فرمانے کے لئے تیار نہیں تھے۔ مفتی صاحب نے ان کو اطمینان اور سکونِ قلب کی دولت سے صرف یہ بتلاکر مالامال کر دیا کہ چند علماء کے نزدیک خمس کی ادائیگی کے لئے سالانہ بچت کا تخمینہ حسنِ نیّت کے ساتھ شادی بیاہ یا تعمیرِ مکان اور دوسرے لازمی

یا ناگزیر اخراجات کو منہا کر کے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ انصاف سے کہئے کیا اقبال نے ایسی ہی صورتِ حال اور اسی قسم کی فقہی موشگافیوں کو ذہن میں رکھ کر نہیں کہا تھا کہ ؎

عشق نہ ہو تو شرع و دین بُت کدۂ تصوّرات

فقہی مسائل کے علاوہ بھی خود کو ملّت یا معاشرے کے ایک عام فرد کی حیثیت سے پیش کرنے کی خواہش موصوف کے ہر عمل اور ہر حرکت سے ظاہر ہوتی۔ مختلف النوع مسائل دریافت کرنے، اُصول و معانی کی اُلجھنوں سے نپٹنے اور فلسفہ و ادب کی گتھیاں سُلجھانے کی غرض سے امیر و غریب، اپنے پرائے، عالم و جاہل اور بچے بُوڑھے ہر قسم کے لوگ درِ دولت پر حاضر ہوتے۔ پلاسٹک سے منڈھے ہوئے دیوان یا پھٹے ہوئے فرشی قالین پر بیٹھے ہوئے یا کھرّی چارپائی پر نیم دراز لیٹے ہوئے جواب دیتے وقت آپ ہمیشہ کوشش کرتے کہ بات چیت مخاطب کی ذہنی سطح اسکی تعلیم و تربیّت، اور اس کے عام ماحول اور پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے کریں اور اسے کسی قسم کی ہچکچاہٹ، الجھن یا احساسِ کمتری سے دوچار نہ ہونے دیں۔ بارہا ایسا بھی دیکھنے میں آیا کہ دُور اُفتادہ دیہات میں بسنے والے کسی اَن پڑھ مرد یا عورت سے آپ کو ٹھیٹھ پنجابی زبان میں اسی کے لب و لہجہ میں گفتگو کرتے ہوئے دیکھ کر آپ کے کئی ایک احباب کا مُنہ حیرت و استعجاب سے کُھلے کا کُھلا اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ یا الٰہی کیا یہ وہی مفتی صاحب ہیں جنہیں ہم صبح و شام منبر پر سے کوثر و تسنیم سے دُھلی ہوئی دہلی اور لکھنؤ کی سکہ بند نستعلیق زبان میں فرازِ کوہسار سے بہتی ہوئی آبشار کی روانی کے ساتھ فصاحت و بلاغت کے موتی بکھیرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اور اسی طرح جب موصوف اپنے ایرانی نژاد مہمانوں سے فارسی زبان میں ہم کلام ہوتے تو آپ کو بے تکلف اور بے تکان دقیق سے دقیق مسائل پر بحث کرتے ہوئے دیکھ کر کسی کو شبہ تک نہ گزرتا کہ آپ ان لوگوں کے ہم زبان نہیں۔

حافظہ آپ نے بلا کا پایا تھا۔ لین دین کے معاملات کو اکثر احاطۂ تحریر میں لانے کی زحمت گوارا نہ کرتے۔ ضرورت پڑنے پر برسوں بعد نہ صرف گزرے ہوئے واقعات یاد دلانے میں آپ کو کوئی مشکل درپیش نہ آتی بلکہ بعض اوقات گفتگو کے الفاظ تک بلا تامّل من و عن دوہرا کر صاحبانِ معاملہ کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتے۔ گھر آئے مہمان کی خاطر مدارات میں آپ کوئی کسر اُٹھا نہ رکھتے اور اس کے لئے پُر تکلف اور لذیذ کھانے پکواتے حالانکہ آپ کی اپنی خوراک ہمیشہ ناقابلِ یقین حد تک سادہ بھی ہوتی اور مقدار میں قلیل بھی۔ دعوت میں تشریف لے جاتے تو حتی الامکان پُر تکلف کھانوں کو چھوڑ کر کم قیمت اور سادہ پکوان کی طرف رغبت کا اظہار کرتے۔ آپ کی اس عادت سے مجبور ہو کر مَیں نے اور مجھ ایسے بہت سے دوستوں نے رفتہ رفتہ یہ معمول بنا لیا تھا کہ دعوتوں میں مفتی صاحب سے دُور ہٹ کر بیٹھنے کی کوشش کرتے کیونکہ بارہا ایسا ہوا کہ دسترخوان پر آپ کے قریب کی نشست پر بیٹھ جانے کی پاداش میں ہمیں نیم گرسنہ یا بے مزہ کام و دہن کے ساتھ واپس گھر لوٹنا پڑا۔ کسی دوست کے ہاں جانا ہوتا تو کوشش کرتے کہ ماحضر ہی تناول فرمائیں اور میزبان کو بلاضرورت تکلف کرنے کی زحمت نہ دیں۔ میرے ہاں ایک مرتبہ کافی رات گئے اچانک تشریف لانے کا اتفاق ہُوا۔ مَیں نے عرض کیا ماحضر کے علاوہ اجازت ہو تو جلدی میں تھوڑا سا حلوہ تیار کروا لوں۔ ہنس کر فرمانے لگے کہیں میرے مولوی ہونے کے ناطے سے تو نہیں کہہ رہے؟ نماز کی اقتدا کرتے وقت بالالتزام حتی المقدور اختصار کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑتے۔ بعد نماز یا بعد مجلس اوّل تو حاضرین کو مصافحہ کرنے کی طرف

متوجہ ہی نہ ہونے دیتے اور اگر ضرورت ناگزیر ہوجاتی تو اس میں انتہائی عجز و انکسار کا مظاہرہ فرماتے منبر پر سے بلا واسطہ موعظہ بیان کرنے سے احتراز کرتے۔ پوچھنے پر ایک مرتبہ فرمایا موعظہ کرنے کا صحیح حق اسے پہنچتا ہے جو خود مثالی کردار کا حامل ہو اور جو تقویٰ کی اس بلند منزل پر فائز ہو جس کا تذکرہ امیر المومنینؑ نے نہج البلاغہ میں فرمادیا ہے۔

عزتِ نفس اور استغناء کا یہ عالم تھا کہ اگر کہیں مجلس وغیرہ پڑھنے تشریف لے جاتے تو اکثر اوقات اختتامِ محفل پر جلسہ گاہ سے اٹھتے ہی سیدھے منزل کی جانب روانہ ہوجاتے۔ بارہا ایسا ہوا کہ میزبان یا امیر مجلس آپ کی تلاش میں ریلوے اسٹیشن یا بس سٹینڈ پر پہنچا اور آپ کو مراجعت کے لئے سوار ہوتا ہوا دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ طالب علمی کے زمانہ میں گجرات کاٹھیاوار سے ایک مرتبہ سیٹھ غلام حسین جیٹھا بھائی گوکل لکھنؤ تشریف لائے اور انہوں نے مدرسۂ ناظمیہ کے تمام طلباء کو طلب فرمایا تاکہ سب کو مبلغ پانچ پانچ روپے نقد فی کس خمس کی مد میں ہدیۃً پیش کریں۔ گنتی کی گئی تو معلوم ہوا کہ واحد غیر حاضری مفتی جعفر حسین کی تھی۔ حالانکہ اُن دنوں آپ کا شمار ان چند طلباء میں تھا جن کے پاس سخت جاڑے کے ایام میں نہ ڈھنگ کا لحاف تھا نہ توشک اور پھر یہ زمانہ روپے کی گران مائیگی کے لحاظ سے وہ زمانہ تھا جب ایک روپیہ کی تین مرغیاں یا بتیس بٹیر خریدے جاسکتے تھے اور جب گندم ڈیڑھ روپیہ من، دیسی گھی ۱۴ آنے سیر اور برفی ۴ آنے سیر تھی۔

گورنمنٹ کے اداروں میں شرکت کے دوران آپ نے کبھی اپنی معینہ حیثیت کے ہوٹل یا ریسٹ ہاؤس میں قیام فرمانا گوارا نہ کیا۔ میٹنگ وغیرہ کے لئے جانا ہوتا تو اپنی پسند کے کسی دینی مدرسہ یا امام باڑہ میں ڈیرہ ڈال دیتے اور یہ ڈیرہ ڈالنا بھی کیا ہوتا؛ جاڑا ہو یا گرمی آپ نے نہ کبھی بستر ہمراہ اٹھانے کی زحمت گوارا کی اور نہ کوئی سوٹ کیس یا بریف کیس ساتھ لیا جانا دور ہو یا نزدیک اپنی اکلوتی بیٹی کے اصرار پر ایک چھوٹا سا تھیلہ ساتھ لے لیتے جس میں صرف ایک جوڑا لباس اور ایک لوٹھ پیسٹ کی ٹیوب کے سوا اور کچھ نہ ہوتا اور یہ مختصر سامانی اور بے بضاعتی آپ کے سینہ پر اس آقا کی غلامی کے تمغہ کی صورت میں دمکتی جس کی بارگاہ میں آپ کے کردار کے اس ایک پہلو کو حکیم الامت نے یہ کہہ کر خراجِ تحسین پیش کیا تھا کہ ؎

پادشاہ و کلبۂ ایوان اُو   یک حسام و یک زرہ سامان او

(ایسا شہنشاہ جس کا محل ایک ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی اور جس کے ساز و سامان کی پوری کائنات صرف ایک تلوار اور ایک زرہ تھی)۔

اور پھر دوسری جگہ یوں فرمایا ؎

حکمرانے بود و سامانے نداشت   دستِ اُو جز تیغ و قرانے نداشت

(وہ ایسا حکمران تھا جس کے پاس ساز و سامان ایسی کوئی شے نہ تھی۔ اور جس کے دستِ مبارک میں شمشیر اور قرآن پاک کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔)

سفر خرچ اور یومیہ وغیرہ کا آپ گورنمنٹ سے کبھی مطالبہ نہ کرتے اور جو کچھ حکومت کے متعلقہ اہل کار اپنی صوابدید سے اس مد میں آپ کو پیش کرتے آپ اسے بخوشی قبول فرمالیتے۔ پاکستان نظریاتی کونسل سے استعفٰے کے بعد حکومتِ وقت نے بار بار مقررہ مشاہرہ یا اعزازیہ آپ کے پتہ پر ارسال کرنے کی کوشش کی لیکن آپ نے ہمیشہ اسے شکریہ کے ساتھ

واپس لوٹا دیا۔

کسی فرد واحد یا ادارہ کی دینی یا کسی اور قسم کی کوئی خدمت بجالاتے تو دوست تو دوست کسی غیر تک سے کسی قسم کا مالی یا کوئی اور مطالبہ کرنے کا تصور تک ذہن میں نہ لاتے حالانکہ دوسرے لوگ اس ضمن میں باقاعدہ سودے بازی اور مول تول کر کے ضمیر فروشی کا کھلا مظاہرہ کرنے میں بھی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کرتے۔ وقت یا پروگرام کا جو تعین ایک مرتبہ کسی سے کر لیتے بارش ہو یا آندھی، زلزلہ ہو یا طوفان اس پر پورا اُترنے کی پوری پوری کوشش کرتے۔ بسا اوقات دوسروں کی غیر معمولی زحمت کے پیش نظر سواری منگوانے کے بجائے معینہ مقام پر خود پہنچ جانے کی پیشکش کرنے میں لذت محسوس فرماتے۔

آندھی اور طوفان کا ذکر آیا تو مَیں یہ بھی عرض کر دوں کہ آپ مہیب اور ہولناک قسم کے طوفانوں سے گھبرانے کی بجائے ان سے لطف اندوز ہونا زیادہ پسند کرتے۔ آپ کا کہنا تھا کہ عقل سلیم کے پاس کونسی دلیل ہے جس سے انسان زلزلے اور طوفان کو ایک لہلہاتے کھیت اور خوش خرام ندی سے قدرت کے کمتر درجہ کے مظاہر قرار دے۔ مفتی صاحب کو جو مناظر قدرت کے دلدادہ اور جمالیاتی ذوق سے بھرپور اہلبیتؑ کے حامل تھے مَیں نے بارہا گرجتے بادلوں، کڑکتی چمکتی بجلیوں اور لرزہ خیز طوفانوں سے جہاں بڑے بڑے شیر دل سورماؤں کا خوف و ہراس سے زہرہ آب ہو اور وہ سہم کر گھر کے تاریک کونوں میں دبک جانے کو ترجیح دیں ویسے ہی لطف اندوز اور خوش وقت ہوتے دیکھا جیسے برف پوش وادیوں، نغمہ ریز ندیوں، اور مہکتے پھولوں سے۔ ایک مرتبہ مجھے آپ کے ہمراہ سخت جاڑے میں مری جانے کا اتفاق ہُوا۔ یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ آپ معمول کی عبا و قبا میں یخ بستہ ہوا کے تھپیڑوں میں موزے کے بغیر کھلے سلیپروں کے ساتھ برف سے اَٹی ہوئی سڑکوں پر بے تکلف اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر گھوم پھر رہے تھے اور آپ کے چہرے پر طمانیت و انبساط کی ایک خاص کیفیت طاری تھی۔

اعلیٰ انسانی قدروں پر محیط، انتہائی خوشگوار سادگی اور فروتنی کا آئینہ دار، آپ کا یہ طرز عمل یقیناً امیرالمومنینؑ کی سیرت کے اس پہلو کی تاسی میں تھا جس کی تشریح دربار معاویہ میں ایک مرتبہ آپ کے ایک جلیل القدر صحابی نے یوں فرمائی تھی۔ تاریخ میں ہے کہ امیر شام نے ایک مرتبہ ضرار بن ضمرہ کو دربار میں طلب کیا اور ان سے امیرالمومنینؑ کی سیرت کے متعلق کچھ بیان کرنے کی خواہش کی۔ خیال اس کا یہ تھا کہ سطوت شاہی اور طنطنۂ خسروی کے زیر اثر ضرار سے وہ کچھ ایسے کلمات کہلوائے جن سے اپنے دل کے پھپھولے پھوڑ سکے۔ چنانچہ ضرار نے لیت و لعل سے کام لینا چاہا۔ جب اصرار حد سے بڑھا تو مولا کے بوڑھے صحابی نے لب لعل وا کئے اور فرمایا: امیر شام اس عرش مرتبہ انسان کی عظمت نفس کا کیا کہنا جس کا علمی وقار اور جس کا دبدبۂ کردار ایسا تھا کہ کوئی بڑے سے بڑا تاجدار یا متبحر عالم آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان سے ہم کلام ہونے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا لیکن حضور ہم ایسے مزدوروں اور بے مایہ لوگوں میں رہتے سہتے یوں تھے گویا ہم ہی میں کے ایک فرد تھے، اور بس۔

مفتی صاحب کے علمی مقام کا تعین کرنا میرے لئے کسی جہت سے مناسب نہ ہوگا۔ یہ ان لوگوں کا کام ہے جو اس میدان کے شہ سوار ہوں۔ ع

قدر زر زرگر بداند قدر جوہر جوہری

آپ کے علم وفضل کی حدود جاننے کے لئے یا آپ کی تصانیف پر نظر کرنا ہوگی اور یا آپ کے معاصرین اور ملک کے دوسرے دانشور حضرات اور اربابِ علم وفضل سے رجوع کرنا ہوگا۔ مفتی صاحب کا واسطہ زیادہ تر عربی زبان سے تھا جس سے میں قطعی طور پر ناواقف ہوں۔ تاہم آپ طلبِ علم میں کیوں کر ہمیشہ مستعد رہتے اور چشمہ علم وحکمت سے سیراب ہونے کے لئے کیونکر ہمہ وقت بے تابی و بیقراری کا مظاہرہ کرتے اس کا اندازہ مجھے اکثر ہوتا رہتا۔ انگریزی ادب میں سے جس سے آپ قطعی ناواقف تھے کوئی اچھا جملہ، ضرب المثل، شہ پارہ یا اچھوتا تخیل اگر اتفاق سے مجھے موقع ومحل کی مناسبت سے یاد آجاتا تو آپ نہ صرف پوری توجہ اور انہماک سے اسے سماعت فرماتے اور اس سے لطف اندوز ہوتے بلکہ ہمیشہ اصرار فرماتے کہ انگریزی ادب میں جتنا سرمایہ میرے پیشِ نظر ہے انہیں اس سے آگاہ کروں۔ یہ اور بات ہے کہ جب بھی میں نے اس قبیل کی کوئی بات ان کے علم میں لانا چاہی اکثر اوقات انہوں نے اسی تخیل یا نظریہ کا حامل حوالہ عربی یا فارسی ادب میں سے فی البدیہہ پیش کر دیا۔ یہ حوالے اکثر وبیشتر وہ امیرالمومنین کی نہج البلاغہ ہی سے جو انہیں تقریباً از بر یاد تھی۔ پیش فرمایا کرتے۔ اس بارے میں ان کا قول جسے وہ اکثر دوہراتے بھی رہتے اور بار بار ثابت بھی کیا کرتے یہ تھا کہ دنیا کے تقریباً تمام دانشوروں کا حقیقی ماخذ جنابِ ختمی مرتبتؐ اور امیرالمومنینؑ ہی کی ذوات گرامی ہیں۔

مفتی صاحب کے کردار کا ایک پہلو جسے میں روشن ہی نہیں روشن ترین کہوں گا خود کو فرشتہ کے بجائے ایک خاطی اور گنہ گار انسان کے روپ میں پیش کرنا تھا۔ قارئین خوب جانتے ہیں کہ اپنی کسی کمزوری یا کوتاہی کا برملا اعتراف انسان کے لئے کتنا کٹھن مرحلہ ہوتا ہے۔ فطرت ہر شخص کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے کردار کی عمارت کو جتنا ممکن ہو سکے حسین و دل کش بنا کر عوام کے سامنے پیش کرے تاکہ معاشرے میں اسے بلند اور منفرد مقام حاصل رہے۔ اس کے لئے لوگ منافقت اور ریاکاری کے نئے سے نئے لبادے اوڑھ کر اپنی کوتاہیوں کو خوبیاں اور کمزوریوں کو جوہر بنا کر پیش کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ اکثر سادہ لوح انسانوں کو تو اپنی غلطیوں یا غفلتوں کا صحیح احساس ہی نہیں ہو پاتا اور وہ مدت العمر خود فریبی کا شکار رہ کر احمقوں کی جنت میں بستے رہنے کو ہی ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن جہاں اپنی کمزوری یا فروگذاشت کا پورا پورا علم وعرفان ہو جائے وہاں بھی اس کا اعتراف اور پھر برملا اظہار عظمتِ نفس اور بلندیٔ کردار کی آخری منزل پر فائض ہونے کا مطالبہ کرتا ہے اور یہ تو تھا ایک عام انسان کا معاملہ۔ جس طبقے سے مفتی صاحب قبلہ کا تعلق تھا اس طبقے کے کسی انسان سے اس قسم کی توقع رکھنا دشوار ہی نہیں بالکل عبث ہوگا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اس طبقہ کے اکثر وبیشتر افراد کی وجاہت کی تمام تر اساس بالعموم عوام کی عقیدت واحترام اور ان کے اعتماد وحسنِ ظن پر ہی استوار ہوتی ہے۔ جہاں اس عقیدت کو ذرا سی ٹھیس پہنچی دنیوی وجاہت کی پوری عمارت دھڑام سے نیچے آگری۔ ادھر تہ دامن سے کسی غفلت یا فروگذاشت نے ذرا سا باہر جھانکا ادھر پارسائی اور نیکوکاری کا بنا بنایا کھیل الٹ کر رہ گیا۔ ایسے میں تحریک نفاذ فقہ جعفریہ کے بلند قامت قائد کے لئے کتنا مشکل اور کٹھن ہو سکتا تھا اپنی کسی غفلت یا فروگذاشت کا برملا اظہار۔ آخر مدتوں کی سعی پیہم سے استوار کی گئی مرتبہ ومقام کی فلک بوس عمارت کو اپنے ہاتھوں خود پاش پاش کر دینے کا خطرہ مول لینا کسی معمولی دل گردہ کے انسان کا کام کیونکر ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے تو سمندر سے زیادہ کشادہ سینہ اور پہاڑ سے زیادہ مضبوط دل درکار ہوگا۔

مفتی صاحب ایک مرتبہ دوپہر کو میرے ہاں تشریف لائے۔ ظہرین کی نماز ادا کرنے ہی والے تھے کہ جلدی سے وضو کرکے میں نے بھی شرکت کی خواہش کی۔ فرمانے لگے۔ شریف صاحب ذرا توقف کیجئے۔ مجھے ابھی صبح کی دو رکعت قضا پڑھنی ہے۔ یہ سُننا تھا کہ میں سناٹے میں آگیا۔ سُنا ہوا ضرور تھا کہ ؎

ہیچ کس بے دامن تر نیست الا پیش خلق　　باز می پوشند و ما بر آفتاب افگندہ ایم

(کارگاہِ ہستی میں کوئی انسان ایسا نہیں جس کا دامن آلودہ نہ ہو۔ ہاں البتہ لوگ اپنے دامنِ تر کو چھپا کر رکھتے ہیں اور ہم ہیں کہ ہم نے اسے سب کے سامنے باہر دھوپ میں پھیلا رکھا ہے)۔

لیکن کبھی سوچا نہ تھا کہ اس مرتبہ و مقام کا انسان اس کی عملی تفسیر یوں بے تکلفی سے بھی پیش کرسکتا ہے۔ یہ دو رکعتی نماز جو صبح قضا ہو چکی تھی وہ آئندہ کسی دوسرے وقت پر بھی اُٹھا رکھی جاسکتی تھی۔ اپنی مجبوری کے عذر میں چند در چند تاویلوں کا تانا بانا بھی بُنا جاسکتا تھا۔ لیکن اس مردِ درویش نے یہ گوارا نہ کیا کہ ان کی ضمیر کا صاف و شفاف آئینہ ریاکاری کی میل سے زنگ آلود ہو۔ آپ نے یہ تو گوارا کرلیا کہ شریف صاحب انہیں ایک سہل انگار اور غفلت کیش انسان تصور کریں۔ لیکن آپ نے یہ گوارا نہ کیا کہ حق و صداقت کے آبِ زلال میں تلبیس کی غلاظت تعفن پیدا کرے۔ کتنا سچ کہا تھا کسی نے کہ ؎

مُلا شدن چہ آسان انسان شدن چہ مشکل

ہر عظیم انسان یا قائد کی زندگی دو قسم کے واقعات پر مشتمل ہوتی ہے۔ ایک وہ جنہیں صرف گھر کے افراد یا دوسرے مخصوص دوست احباب ہی جانتے ہیں اور دوسرے وہ جن کا تعلق عوام سے ہوتا ہے۔ پہلی قسم کے بیسیوں نئے سے نئے واقعات ملک کے طول و عرض اور بیرونِ ملک آپ کے لاتعداد چاہنے والوں کی زبان سے آپ سُنیں گے اور ان میں سے ہر واقعہ آپ کی سیرت کے کسی نہ کسی نئے پہلو کی نشاندہی کرے گا۔ آپ کے حسنِ عمل اور حُسنِ کردار کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ آپ کا کوئی بھی دوست آج یہ باور کرنے کے لئے تیار نہیں کہ مفتی صاحب کا قرب کسی اور کو اس سے زیادہ حاصل تھا یا کسی اور سے ان کے زیادہ پُرخلوص مراسم تھے۔ دوسری قسم کے واقعات تاریخ کا حصہ بن کر قومی ملکیت قرار پاتے ہیں۔ ان میں آپ کی تصانیف شرح نہج البلاغہ، شرح صحیفہ کاملہ اور دو جلدوں پر مشتمل سیرت امیر المومنین کے علاوہ جو بجائے خود اپنی اپنی حدود میں علم و ادب کا مُنہ بولتا شاہکار ہیں سرفہرست چند ایک یہ ہیں:۔ قرارداد مقاصد کی تدوین میں آپ کا تشریحی نوٹ۔ تعلیمات اسلامیہ بورڈ کے ممبر کی حیثیت سے وفاقی وزیرِ پاکستان جناب سردار عبد الرب نشتر سے آپ کا تاریخی مکالمہ۔ بھکر کنونشن میں مخالفین کی ریشہ دوانیوں کے باوجود لاکھوں افراد کے اعتماد سے قائد تحریک نفاذ فقہ جعفریہ کی حیثیت سے آپ کا انتخاب۔ پاکستان نظریاتی کونسل سے اصُولی اختلاف کی بناء پر آپ کا استعفیٰ۔ نفاذِ اسلام میں حکومتِ وقت کے جانبدارانہ رَویہ کی تشریح میں بی۔ بی۔ سی کے نمائندہ سے انٹرویو، اسلام آباد کنونشن میں آپ کا تدبر و حکمت سے لبریز کردار، حکومت اور شیعانِ پاکستان کے مابین طے پانے والا شیعی تشخص کا آئینہ دار معاہدہ امن، روزنامہ جنگ کو بسترِ مرگ سے دیا ہوا تاریخ ساز انٹرویو اور جی۔ ٹی روڈ گوجرانوالہ پر ۴ ایکڑ قطعہ زمین پر ذاتی دیانت اور عوام و خواص کے اعتماد کے سہارے اور انفرادی سعی و کاوش کے بل بوتے پر تعمیر کی گئی جامع جعفریہ کی وسیع و عریض عمارت ...... اس مختصر سے مقالہ میں ان پر

تبصرہ وتنقید کی گنجائش ہے اور نہ ضرورت، یہ کام ان کے کسی بابصیرت اور دیانت دار سوانح نگار کے ہاتھوں سرانجام پانے کا ہے۔ اتنا بہرحال طے ہے کہ ان تمام کارناموں میں سے ایک بھی ایسا نہیں جسے مؤرخ پاکستان میں شیعیت کی تاریخ میں سنگِ میل سے کم کا درجہ دے سکے۔ یہ تمام کے تمام واقعات پاکستان میں بقائے شیعیت کی جدوجہد کے چھتیس سالہ سفر میں ان اہم موڑوں کی نشاندہی کرتے ہیں جہاں کاروانِ ملّی کے سربکف سپاہیوں اور دین فروش بھگوڑوں کے راستے الگ الگ ہوتے رہے، جہاں شمع حریت کے جانباز پروانوں اور سفلی کیڑوں مکوڑوں میں واضح پہچان ہوتی رہی اور جہاں دسترخوانِ اقتدار کے ریزہ چیں ایک صف میں اور کفن بر دوش مجاہد علیحدہ چھٹ کر دوسری صف میں شامل ہوتے نظر آتے رہے۔

نگاہ کی بلندی، عزم کی پختگی، مقصد کی لگن اور خلوصِ نیت میں آپ ایک طرح سے قائداعظم محمد علی جناح کی مثال تھے۔ انہی کی طرح آپ کا جسم نحیف و ناتوان اور سینہ ہمّت وحوصلہ کی آگ سے روشن تھا۔ انہی کی طرح باطل سے ٹکرانے اور طاغوت کو سرنگوں دیکھنے کے ولولہ سے آپ کے دل ودماغ سرشار رہتے تھے۔ انہی کی طرح آپ قوم کی کشتی بے وجہ خونریزی اور بے جا تصادم کی چٹانوں سے دُور ہٹا کر تدبر وحکمت کے بل بوتے پر ساحلِ مُراد تک پہنچانے کے قائل تھے۔ دونوں زندگی کے سفر میں ہر اہم موڑ پر ہمیشہ اقبال کے مردِ مومن کی ایک جیتی جاگتی تصویر نظر آئے۔ دونوں کو مخالفت کے طوفانوں کا اپنی ثابت قدمی اور اولوالعزمی سے مُنہ موڑ دینے میں یدطولیٰ حاصل تھا اور دونوں کو دُنیا نے ہمیشہ دمِ گفتگو نرم اور دمِ جستجو گرم پایا۔ قائداعظم نے ایک مدّت تک ہندو مسلم اتحاد کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دئے رکھا۔ اور آخر عمر میں ناگزیر وجوہات کے سبب آپ کو صرف مسلمانانِ ہند کی قیادت اختیار کرنا پڑی۔ بعینہٖ اسی طرح تخلیقِ پاکستان کے بعد ایک مدّت تک مفتی صاحب بھی شیعہ سُنّی اتحاد کے علمبردار رہے اور آپ نے ہمیشہ اُمّتِ مسلمہ کو فرقہ واریت کی وبا سے دُور رہنے اور اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھامے رکھنے کا پوری قوت کے ساتھ درس دیا۔ آخر عمر میں آپ کو بھی ناگزیر وجوہات کے سبب سوادِ اعظم سے کٹ کر صرف فرقہ جعفریہ کی قیادت کا پرچم تھامنا پڑا۔ اور پھر دُنیا نے دیکھا کہ قیادت کا یہ پرچم حکومت اور چند تخریب پسند عناصر کی مسلسل مخالفت کے باوجود آپ نے اس شان سے تھاما کہ جب تک جئے، قائداعظم کے مانند سوائے ناقابلِ ذکر چند مستثنیات کے، ملّتِ جعفریہ کے پورے تین کروڑ افراد کے دل کی دھڑکن بن کر جئے۔ اور اسے تائیدِ غیبی کہئیے کہ شبانہ روز کی تگ و دو کا اعجاز کہ جب قادرِ مطلق کے دربار میں حاضری کے لئے نقارہ بجا تو قائداعظم کی طرح ان کی قوم بھی جو کبھی ایک آوارہ ومنتشر گلۂ گوسفند سے زیادہ حیثیت کی مالک نہیں تھی، دشمن کی پے درپے عیاریوں اور چیرہ دستیوں کے شر کے خلاف اخوت واتحاد کے دانوں سے پروئی ہوئی ایک تسبیح اور غنیم کی بے پناہ یلغار کے رُوبرُو بھائی چارے اور یگانگت کی مضبوط بنیادوں پر استوار ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی شکل اختیار کر چکی تھی اور یہ قدرت کا ایک معجزہ نہیں تو اور کیا تھا کہ جس طرح قائداعظم محمد علی جناح کی صورت میں نہ میدانِ قتال گرم ہوا اور نہ دار ورسن کی صعوبت سہنے کی نوبت آئی اور مبداء فیاض نے فتح بلکہ فتح مبین محض پیہم جدوجہد کے طفیل ان کی جھولی میں ڈال دی عین اسی طرح شیعہ قوم کی چھتیس سالہ جدوجہد کی واحد فتح معاہدہ اسلام آباد کی شکل میں بہت سے کوتاہ نظر مشیروں کے مشورے کے برخلاف بغیر غارت گری اور خونریز تصادم کے کلکِ قدرت نے آپ کے دفترِ اعمال میں لکھ دی۔

عزم وہمت کا کیسا طوفان آپ کے قلب وجگر کو ہمہ وقت گرمائے رکھتا تھا اور جرأت واستقلال کی کونسی تڑپ آپ کو ہمیشہ بے قرار رکھتی تھی اس کی ایک جھلک اگر آپ کو دیکھنا ہو تو دو واقعات مجھ سے سُن لیں۔

ایک دفعہ سخت گرمی کا زمانہ تھا۔ ہم کمرے میں بیٹھے بات چیت میں مشغول تھے۔ دفعتاً بجلی منقطع ہوگئی اور پنکھا چلنا بند ہوگیا۔ حبس اس شدت کا تھا کہ نہ کمرے کے اندر سکون تھا اور نہ باہر صحن کی کُھلی فضا میں۔ دو تین مرتبہ جگہ بدلی لیکن کسی کل چین نصیب نہ ہوسکا۔ بلکہ طبیعت کی بے قراری میں اور اضافہ ہوتا گیا۔ مفتی صاحب کی گھبراہٹ کا اندازہ کرتے ہوئے میں نے ہنس کر عرض کیا۔ حضور یہ تو گھر ہے جہاں ہر قسم کی آسائش میسر ہے۔ نصیب دشمنان آپ کو تو شاید مستقبل قریب میں قائد تحریک نفاذ فقہ جعفریہ کی حیثیت سے حکومت کا مہمان بننا اور زندان کی مشقت جھیلنا پڑے۔ فوراً بات کاٹتے ہوئے بولے: شریف صاحب وقت تو آنے دیجئے۔ وہ محل امتحان ہوگا۔ خدا نے چاہا تو آپ خود دیکھ لیں گے کہ میں تائید ایزدی سے کیونکر وہاں سُنّتِ سیّد سجاد پر عمل پیرا ہو کر سرخرو ہوتا ہوں۔ جس فقیر نے پوری زندگی جیل کی طرح کاٹی ہو وہ ان مشکلات سے کیا گھبرائے گا۔

صدرِ مملکت نے اسلام آباد میں پہلی علماء کنونشن بُلائی۔ دعوت نامہ پر مزید استخارہ کرنے کے بعد مفتی صاحب بھی اسلام آباد پہنچے۔ اجلاس کے دوران آپ نے دیکھا کہ شرکائے محفل نفاذِ اسلام کی جدوجہد پر حکومتِ وقت کی ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر توصیف وتعریف کر رہے ہیں، جو مقرر اُٹھتا صاحبِ صدر پر تحسین وآفرین کے ڈونگرے برساتا۔ ایسے میں مفتی صاحب نے تقریر کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ لیکن تقاضائے وقت اور انتظامیہ کے اصرار پر آپ کو سٹیج پر آنا پڑا۔ حمد وثنائے باری تعالیٰ اور پیغمبر واہلِ بیتِ پیغمبر پر درود وسلام کے بعد آپ نے فرمایا۔ صاحبِ صدر! ارشادِ ختمی مرتبت ہے کہ کافر حکومت باقی رہ سکتی ہے لیکن ظالم حکومت کے لئے فنا مقدر ہے۔ میں آپ سے التماس کرتا ہوں کہ عدل وانصاف کے تقاضے پورا کرتے ہوئے آپ ۶ر جولائی کا ہم سے کیا ہوا وعدہ ایفا فرمائیں۔ والسلام۔ یہ کہہ کر آپ سٹیج سے نیچے اُتر آئے۔

موقع ومحل کی مناسبت سے لطیف ومختصر اور جامع وبلیغ فقرے برجستہ اور فی البدیہہ کہہ دینے میں مفتی صاحب کو یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ بعض اوقات لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی کی ایسی ایسی پھلجھڑیاں چھوڑتے کہ محفل کشتِ زعفران بن جاتی۔ آپ کے دوستوں اور ہم جلیسوں میں سے شاید ہی کوئی ایسا ملے جو آپ کی سیرت کے اس پہلو سے ناآشنا رہا ہو۔ مدرسہ ناظمیہ لکھنؤ میں زمانۂ طالب علمی کے دوران اپنے اُستادِ محترم جناب نجم الملت کی صحت یابی کے موقع پر حماسہ کے ایک مشہور قصیدہ کی بحر میں قلم بر داشتہ عربی میں قصیدہ کہہ کر ان سے اس چھوٹی سی عمر میں دادِ تحسین کے پھول وصول کرنا ان کے ہم عصروں میں سے کسے یاد نہ ہوگا۔

ہوسکتا ہے بعض کوتاہ نظر ناقد یا حسود آپ کی اس ظرافت یا حسِ مزاح پر یہ کہہ کر انگشت نمائی کریں کہ ایک عالمِ دین اور مفتی شرع متین کو مزاح زیب نہیں دیتا۔ ان کی خدمت میں میں عرض کروں گا کہ مفتی صاحب اعلیٰ اللہ مقامہٗ کی ظرافت آپ کا بعینہ وہ زیور تھا جس سے خود امیر المومنینؑ کی ذات گرامی آراستہ وپیراستہ تھی۔ تاریخ اسلامی کے کون سے طالب علم

کو یہ واقعہ یاد نہ ہوگا کہ ایک مرتبہ خلیفۂ دوئم نے اپنی مجلسِ خاص میں اپنی اس تشویش کا بطورِ خاص تذکرہ فرمایا جو انہیں اپنے جانشین کے تقرر کے سلسلہ میں لاحق تھی۔ آپ نے چار یا پانچ اُن افراد کا ذکر فرمایا جو آپ کے خیال میں اس منصبِ جلیلہ کے لئے موزوں اور مناسب ہوسکتے تھے۔ پھر آپ نے ان سب کے کردار کا باری باری تجزیہ کرنا شروع کیا۔ کسی کو اُمّت کا فرعون قرار دیا اور کسی کو خوشی و فراغت میں مومن اور غصّہ و پریشانی میں کافر کہہ کر مسترد کر دیا کسی کو آسائش کا دلدادہ اور ہمہ وقت بیوی کے زیراثر رہنے والا کہا اور کسی کو خویش پروری اور اقربا نوازی کے جنون میں مبتلا ٹھہرایا اور جب جناب امیر کی ذات والا صفات کی باری آئی تو فرمایا کہ وہ ہر ممکن لحاظ سے کرسئ خلافت کے لئے موزوں شخصیت ہیں۔ کوئی جوہر کردار ایسا نہیں جس سے وہ عاری ہوں۔ لیکن کیا کروں، وہ بات بات میں مزاح اور ظرافت پیدا کر دیتے ہیں۔

مولائے کائنات کے ایک ادنٰے جان نثار ہونے کے ناطے مفتی صاحب بھی بات بات میں لطافت پیدا کرنے میں اپنی مثال آپ تھے۔ اختصار کا دامن ہاتھ سے چھوڑے بغیر مرحوم کی کتاب زندگی کے چند ابواب جو واقعات کی شکل میں اس وقت میرے ذہن میں ہیں درج ذیل کرتا ہوں تاکہ قارئین کو احساس ہو جائے کہ آہنی اعصاب کے مالک اور علم و دانش کے عمیق سمندر اس نحیف و نزار انسان کے مزاج میں ہمّت و حوصلہ کے علاوہ لطافت و شگفتگی کا کیا عالم تھا۔

ایک مرتبہ مجھے کسی دوست نے ایک نہایت نادر قسم کا حنوط شدہ مرغ زریں مرحمت فرمایا۔ چند برس میرے ڈرائنگ روم کی زینت رہنے کے بعد اتفاق سے اس میں کوئی ایسی خرابی پیدا ہوئی جس سے اسکی شکل و صورت میں بگاڑ پیدا ہونے لگا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں یہ مرغ ناقابلِ استعمال ہو کر رہ گیا جس کا مجھے کافی قلق تھا۔ ایک دن اتفاق سے میں نے مفتی صاحب سے یونہی تذکرۃً دریافت کیا کہ اس مرغ کا اب کیا کیا جائے۔ ہنس کر فرمانے لگے۔ شریعت میں اب تک مرغ کی تجہیز و تکفین کے متعلق میری نظر سے کوئی احکام نہیں گزرے۔

کراچی میں قیام کے دوران مفتی صاحب نے ایک مرتبہ کہیں محفل میلاد پڑھنا تھی، ہم دونوں وہاں پہنچے تو دیکھا کہ شعراء اور قصیدہ خوانوں کا ایک جمِ غفیر موجود ہے۔ ایک کے بعد ایک اُٹھتا اور اپنی سی ہانک کر بیٹھ جاتا۔ طویل بوریت کے بعد مفتی صاحب کا نام اس وقت پکارا گیا جب سامعین بکسر تھک چکے تھے، کچھ کہہ رہے تھے اس موقع پر تقریر کا کیا معنیٰ کچھ کہہ رہے تھے نہیں نہیں اس سے مُنہ کا مزہ بدلے گا۔ اس گو مگو کی صورت میں آخر مفتی صاحب نے منبر پر آنے کا ہی فیصلہ کیا۔ ابھی اپنی جگہ سے اُٹھے ہی تھے کہ ایک جانب سے نعرہ لگا۔ "اُٹھیے اُٹھیے یہ محفل سرور ہے" دوسرے کونے سے کسی نے لُقمہ دیا "لیکن جانا بہت دُور ہے۔" مفتی صاحب جو اس اثنا میں منبر کے قریب پہنچ چکے تھے اس طرف مُڑے اور فرمایا "لیکن پڑھنا مجھے بھی ضرور ہے۔"

اور آخر میں اب دل چاہتا ہے میں ان آخری چند دل خراش لمحات کا بھی مجمل طور پر ذکر کر دوں جن کی یاد بقیہ ایامِ زندگی مجھے ہمیشہ تلخ کام رکھے گی۔ قبلہ کی مرض الموت کے دوران ملاقات کا کوئی موقع میں حتی الوسع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ ہسپتال کے آخری تین ہفتے میرے کرب میں ساعت بہ ساعت اور شاید پھر لمحہ بہ لمحہ اضافہ کر رہے تھے۔ مرض کی شدت نے آہستہ آہستہ گفتگو کا سلسلہ عملاً منقطع کر دیا تھا اور شمع زندگی واضح طور پر گُل ہوتی نظر آرہی تھی۔ آپ کی دنیوی زندگی کے آخری روز

میں حاضرِ خدمت ہوا تو انتہائی تھکی ہوئی اور نہایت نحیف و کمزور آواز میں رُک رُک کر میری روزانہ کی زحمت کشی کا شکریہ ادا کیا۔ میں نے عرض کیا۔ شکریہ کیسا؟ ہم آپ کے ادنیٰ خادم ہیں۔ فرمایا۔ خادم نہیں تم مخدوم ہو۔ میں نے عرض کیا۔ کمرے سے باہر شائق صاحب بھی حاضر ہیں۔ فرمایا۔ ہاں میں جانتا ہوں۔ آپ اور وہ دونوں ہمہ وقت حاضر رہنے والوں میں سے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد آپ نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ اُوپر اُٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے مجھے اور قریب آنے کا اشارہ کیا۔ لب ہلے۔ فرما رہے تھے۔ شریف صاحب ہمارا آخری سلام۔ مجھے فوراً یقین ہو گیا کہ مرحوم کو آج انہیں انعام میں ملنے والی ابدی نعمات کا جلوہ دکھا دیا گیا تھا۔ بہشتِ بریں میں اپنے قصرِ زرنگار کے باہر اپنے آنے والے مہمان کے انتظار میں کھڑے صف بستہ حور و غلمان کا منظر آج انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ میں تھوڑی دیر کے لئے جھکا گیا۔ اُن کے چہرے کی طرف جو پچھلے ایک برس سے بیماری کے دوران صبر و سکون کا پہاڑ بنا رہا تھا اور جس میں آج بھی ذرّہ برابر فرق نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے ایک حسرت بھری نظر ڈالی اور اشکوں سے چھلکتی ہوئی آنکھیں لئے ہوئے دونوں ہاتھوں سے سینہ تھامے کمرے سے باہر آ گیا۔

آخری رات انتہائی درد و کرب کے ماحول میں میں نے آپ کے اہلِ خانہ کے ہمراہ ہسپتال میں ہی بسر کی۔ صبح پانچ بجے ہسپتال کی چھوٹی سی مسجد میں نماز ادا کرنے کے بعد حسرت و یاس کا ایک اُمنڈتا ہوا طوفان سینے میں لئے ہوئے میں گھر لوٹا۔ دہلیز سے اندر قدم رکھے ہوئے ابھی تھوڑا ہی وقت گذرا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ کاسۂ دل چور کر دینے کے لئے یہ گھنٹی کافی تھی۔ لرزتے ہاتھوں سے میں نے فون اٹھایا۔ پیغام تھا: انا للہ و انا الیہ راجعون ؎

تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا ۔۔۔ یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

جنازہ کس دھوم سے اُٹھا اور اُس فرشتہ صفت مجاہد کو لاکھوں ماتم گساروں نے کیونکر اشکوں اور آہوں کے سیلِ بے پناہ میں سپردِ لحد کیا اور کیونکر پاکستان کے گوشہ گوشہ میں آپ کے چاہنے والوں نے عقیدت و احترام کے پھول اُن پر نچھاور کئے اس کی داستان قارئین اخباروں اور قومی جرائد میں پڑھ چکے ہیں۔ حکومتِ وقت نے خوش دلی سے یا بعض مجبوریوں کے ماتحت مختلف مراحل پر آپکی پذیرائی میں جس گرم جوشی کا مظاہرہ کیا وہ بھی آپ سے پوشیدہ نہیں۔ لندن میں متعینہ سفیر کو حکومت نے جس طرح عیادت کے لئے ہسپتال بھیجا اور آپ سے ان کی جو گفتگو ہوئی اور پھر یہاں نمازِ جنازہ میں شمولیت کی خاطر گورنر پنجاب کو جس طرح میت کی آمد میں تاخیر کے سبب اپنی دوسری مصروفیات کو التوا میں ڈال کر ایک گھنٹہ سے کہیں زیادہ جائے دفن پر انتظار کی گھڑیاں جھیلنا پڑیں ان تفصیلات سے بھی آپ آگاہ ہیں۔ رحلت کے بعد بی۔بی۔سی اور ریڈیو زاہدان نے آپ کی قائدانہ صلاحیتوں کے اعتراف میں جو قصیدہ خوانی کی اور ملکی ریڈیو اور ٹی۔وی نے آپ کی آخری رسومات کے مختلف مناظر اور دُوسری تفصیلات جس طرح قومی رابطہ پر پورے ملک میں نشر کیں وہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں حقیقت یہ ہے کہ صفحۂ گیتی پر تاریخ کا یہ پورا باب موت کے سرد ہاتھوں نے انمٹ نقوش میں لکھ دیا ہے۔ جسے زمانہ کی تند و تیز آندھیاں نہ اب مٹا سکتی ہیں اور نہ جسے بعد کے آنے والوں کو مرنے والے کی طرف سے حریت و ولولہ تازہ کا ایک ابدی پیغام پہنچانے سے روک سکتی ہیں۔ اب وہ نابغۂ روزگار ہستی جس کے کردار کی عظمت اور جس کے اخلاقِ حسنہ کی ابدیت کی نشان دہی

اقبالؔ نے یہ کہہ کر کر دی تھی کہ ؎

عمر ہا در کعبہ و بُت خانہ می سوزد حیات　　تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید برُوں

(کعبہ ہو کہ بُت خانہ ان میں زندگی کو مُدّتوں پگھلنا اور مبتلائے کرب رہنا پڑتا ہے۔ جب جاکر بزمِ عشق سے
ایک ایسا فرد واحد برآمد ہوتا ہے جو فی الواقعہ واقفِ کار یا دانائے راز کہلا سکے)۔

ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کربلائے گامے شاہ کے احاطہ میں لیل و نہار کے الٹ پھیر سے ماورا تا قیامِ قیامت محوِ استراحت رہے
گی۔ جب کبھی موقع میسّر آتا ہے دُنیا کے بکھیڑوں سے دامن چھڑا کر چند لمحوں کے لئے مَیں مزارِ اقدس پر اُس مہبطِ انوارِ الٰہی
اور اُس امینِ گنجینۂ فقر و پادشاہی، تودۂ خاک پر حاضری دینے کے لئے پہنچ جاتا ہوں۔ یہ چند لمحے پھر سے بیتی ہوئی صحبتوں
کی یاد تازہ کر دیتے ہیں اور پھر سے پرانے دو حریفانِ بادہ پیما کے درمیان گفتگو کا سلسلہ چل نکلتا ہے۔ گفتگو۔ جو گاہے
مختصر اور گاہے طولانی ہوتی ہے، لیکن ہوتی بہرحال بالمشافہ ہے۔ کیوں نہ ہو ؎

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

(اُس انسان کے لئے جس کا دل ایک مرتبہ نورِ عشق سے زندہ ہو گیا کبھی موت نہیں۔ پس صفحۂ گیتی پر
ہمارا نقشِ دوام رہتی دنیا تک کے لئے ثبت ہے)

محمد شریف
اے۔بی۔ سمن آباد۔ لاہور

یکم اپریل ۱۹۸۷ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمدللہ وکفیٰ والصلوٰۃ علیٰ محمّد المصطفیٰ و آلہ الاصفیاء

انسانی شخصیّت کی تعمیر و تشکیل انسان کی جسمانی ساخت ذہنی شعور فکری ارتقاء اور اخلاقی و روحانی اقدار سے وابستہ ہے۔ انہی جسمی و نفسی صفات کے آئینہ میں اسکی شخصیّت کے خدوخال کو دیکھا اور پرکھا جا سکتا ہے جہاں تک جسمی صفات کا تعلق ہے انہیں آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر نفسی و روحی صفات مشاہدہ کے حدود سے باہر ہیں۔ انہیں صرف آثار سے پہچانا جا سکتا ہے۔ اگرچہ تمام انسان جسمانی اعتبار سے ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ مگر ان میں بعض افراد اپنی غیر معمولی قوتوں اور فطری صلاحیتوں کے اعتبار سے اتنے ارفع مقام پر فائز ہوتے ہیں کہ ان کے صفات و خصوصیات عام انسانوں کے تصوّر کی گرفت میں نہیں آتے۔ اس لئے کہ انسان اسی صفت کا صحیح تعین کر سکتا ہے۔ جو خود اس کے اندر پائی جاتی ہو۔ اگر اس سے ملتی جلتی ہوئی صفت سے متصف نہیں ہوگا تو جس طرح کیف و سرور اور درد و الم ایسے کیفیات کو ان سے دوچار ہوئے بغیر سمجھا نہیں جا سکتا اسی طرح صفاتِ نفسیہ کو صحیح طور پر نہ سمجھ سکے گا اور نہ ان کی قدر و قیمت کا اندازہ کر سکے گا۔ مگر انسان کتنا بھی روشن فکر اور نابغۂ روزگار کیوں نہ ہو وہ تمام صفات و کمالات اپنے اندر پیدا نہیں کر سکتا کہ ہر صفت کو سمجھ سکے اور ہر کمال کو پرکھ سکے۔ بلکہ ایک کمال میں انتہائی بلندی پر ہوگا تو دوسرے کمالات کے اعتبار سے پستی میں نظر آئے گا یا پہلے کمال کے مقابلہ میں نمایاں مقام حاصل نہ کر سکے گا۔ کیونکہ انسان اپنی قوت و توانائی کو ایک آدھ جنبہ ہی پر مرکوز کر کے عملی سرگرمیاں جاری رکھ سکتا ہے اور ارتقائی مدارج طے کر سکتا ہے اور اگر قوت و استعداد کو مختلف کمالات کے حصول میں صرف کرے گا تو قوت و توانائی بٹ جائے گی اور نتیجتہً ہر جنبہ ناقص و ناتمام رہے گا اور کسی صفت کو بھی پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکے گا۔

مولائے کائنات امیرالمومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی شخصیّت اس اعتبار سے منفرد و یگانہ ہے کہ ان میں وہ تمام فضائل و کمالات جو نہ کسی میں یکجا ہوئے اور نہ ہونگے پوری آب و تاب کے ساتھ جمع تھے یہ اوصاف اپنے تنوع اور تباین کے اعتبار سے انسانی فہم سے بالاتر ہیں۔ اس لئے کہ نہ وہ اجتماعی صورت میں کہیں نظر آتے ہیں اور نہ متضاد صفتوں کے نشو و نما پانے اور ان میں ربط و ہم آہنگی پیدا کرنے کی صلاحیّت ہر ایک میں ہوتی ہے کہ کوئی نمونہ و مثال سامنے رکھ کر ان کے نفسی صفات و معنوی خصوصیات کو سمجھا جا سکے۔ البتہ مظاہر و آثار سے ان

صفات کی ہلکی سی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ چنانچہ آپ کی متنوع پر رنگ اور گوناگوں کمالات سے آراستہ شخصیت پر جتنی مرتبہ نظر کی جائے کمال و فضائل کے مختلف گوشے نظروں کے سامنے اُبھرتے اور عمل و کردار کے جوہر نکھرتے چلے آتے ہیں۔ گو دیکھنے میں آپ ایک شخصیت تھے۔ مگر مختلف صفات و کمالات کے اعتبار سے متعدد شخصیتوں کا مجموعہ تھے اور اس ایک ذات میں تمام فضائل و محاسن اپنی پوری دلآویزیوں کے ساتھ سمٹ کر جمع ہو گئے تھے اور یہی وہ طغرائے امتیاز ہے جس نے آپ کی بوقلموں شخصیت کو رفعتِ انسانی کا شاہکار اور کمالات و محاسن کے پھولوں کا گلدستہ صد رنگ و چمن صد بہار بنا دیا ہے۔ آپ رونق دہٗ بزم آب و گل بھی تھے اور جلوۂ طرازِ عالم انوار بھی علم و عرفان کا زرّیں صحیفہ بھی تھے اور حسن کردار کا ورق زرنگار بھی مسند قضا پر مشکل گتھیوں کے گرہ کشا بھی تھے اور محراب عبادت میں عابد شب زندہ دار بھی سخاوت میں فرد فرید بھی تھے اور شجاعت میں یکتائے روزگار بھی انشاء و تفنن کلام کے سرچشمہ بھی تھے اور خطابت و بیان کے قلزم زخار بھی ادبیات و فنون عربیہ کے گنج شائگاں بھی تھے اور علم کلام و فلسفہ الٰہیات کے خزینہ دار بھی قرآن کے جامع اور پہلے مفسّر بھی تھے اور دنیائے اسلام کے اوّلین مصنف و قلمکار بھی امن و آشتی کے پیغامبر بھی تھے اور دشمنانِ دین سے برسرِ پیکار بھی زینت افزائے عرشۂ خلافت بھی تھے اور اقلیم ولایت کے تاجدار بھی مشکل کشائے عالم بھی تھے اور نیرنگیٔ زمانہ سے دوچار بھی آلام حیات پر خندہ زن بھی تھے اور رات کے اتھاہ سناٹوں میں اشکبار بھی برق شعلہ ساماں بھی تھے اور ساون کی ہلکی پھوار بھی صحرا کی چلچلاتی دھوپ بھی تھے اور شجر سایہ دار بھی ہوائے تند کا تھپیڑا بھی تھے اور نسیم سبک رفتار بھی جلال قدرت کا آئینہ بھی تھے اور جمال فطرت کا سنگار بھی اشداء علی الکفار کی عملی تفسیر بھی تھے اور رحماء بینھم کا مثالی کردار بھی غرض جس صفت کمال پر نظر کی جائے وہ اس جامع اضداد ذات میں موجود ملے گی۔

ان متضاد صفات کے اجتماع اور ان کے ناقابلِ فہم امتزاج نے دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے اور جُوں جُوں آپ کی کتاب زندگی کے نقوش پر نظر کی جاتی ہے۔ حیرت و استعجاب میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے۔ یوں تو دُنیا میں ہزاروں انسانوں نے فضائل و کمالات کی کڑی منزلیں طے کیں اور ہر جادۂ کمال پر اپنے نشانات قدم چھوڑے۔ مگر جامعیت و ہمہ گیری کے اعتبار سے آپ کی شخصیت اتنی بلند و بالا ہے کہ قد آور شخصیتیں بھی ان کے سامنے پست نظر آتی ہیں اور ان کی عظمت کے نقوش اتنے روشن ہیں کہ زمان و مکان کے طویل فاصلوں کے باوجود ان کی تابندگی سے آنکھوں میں خیرگی آجاتی ہے۔ اگرچہ اموی فرمانرواؤں اور ان کے ہوا خواہوں نے تمام وسائل بروئے کار لا کر ان نقوش کو دھندلاہٹوں کی دبیز تہوں میں چھپانے کی کوشش کی۔ مگر اس آفتاب عظمت و جلال کی جگمگاہٹوں پر پردہ ڈالنے میں کامیاب نہ ہو سکے اور آپ ان کی باطل کوششوں کے باوجود کعبۂ ارادت و قبلۂ عقیدت بن کر رہے اور دنیا نے بلا امتیاز عقیدہ و مذہب انہیں اپنی عقیدتوں میں مرتکز اور ضمیر کی گہرائیوں میں جاگزیں پایا۔ چنانچہ آپ کی بلندیٔ فکر و عمل نے غیر مسلم افراد کے ذہنوں کو بھی متاثر کیا اور انہوں نے آپ کی علمی و ادبی رفعت اور دینی و سیاسی بصیرت پر بلند پایہ مقالے اور مبسوط کتابیں لکھ کر خراج تحسین ادا کیا جن میں میخائیل نعیمہ جورج جرداق پولس سلامہ عبدالمسیح

انطاکی استاد فواد فرام البستانی اور روکس ابن زائد العزیزی کے نام سرفہرست ہیں اور مسلمانوں نے بھی خواہ وہ کسی فرقہ و گروہ سے تعلق رکھتے ہوں۔ کسی نہ کسی اعتبار سے ان سے عقیدت و نیازمندی کا اظہار ضروری سمجھا۔ اہل تشیع تو شیعۂ علی کہلاتے اور انہیں جانشینِ رسُول و خلیفۂ منصوص سمجھتے ہی ہیں اہل سنّت کے نزدیک بھی وہ صحابۂ کبار عشرۂ مبشرہ اور خلفاءِ راشدین میں شامل ہیں۔ صوفیا و اہلِ طریقت کے پیشوا شبلی جنید بغدادی معروف کرخی سری سقطی ابویزید بسطامی وغیرہ سلسلہ تصوف کی کڑیاں ان سے ملاتے اور قادریہ چشتیہ سہروردیہ شاذلیہ اویسیہ وغیرہ انہی کے سرچشمۂ ولایت سے اپنی تشنگی بجھاتے ہیں۔ قراء سبعہ میں سے اکثر و بیشتر انہی کی قراءت پر اعتماد کرتے اور مفسرین ان کے تفسیری افادات کو تفسیر کا گراں بہا سرمایہ سمجھتے ہیں۔ محدثین ان کے سلسلہ روایت کو صحت حدیث کی سند قرار دیتے اور فقہاء استنباط احکام میں ان کے اقوال سے رہبری و رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ متکلمین ان کے کلامی مباحث پر علم کلام کی عمارت کھڑی کرتے اور قضاۃ ان کے فیصلوں سے فصل خصومات کے اصُول سیکھتے ہیں۔ علماءِ اخلاق اخلاقی قدروں کے درس اور کردار سازی کے سبق ان کے حکیمانہ کلمات میں تلاش کرتے اور فصحاء و ادباء ان کے چمن زارِ بلاغت کے سدا بہار پھُولوں سے معانی و بیان کے گلدستے سجاتے ہیں۔

نہ دانم آں گل رعنا چہ رنگ و بو دارد ۔۔۔ کہ مرغ ہر چمنے گفتگوئے او دارد

اس کارگاہِ عالم میں پیغمبر اکرم کے علاوہ اتنی وسیع النظر اور جامع علوم شخصیت کہیں نظر نہیں آتی جس کی فکری و نظری تجلیوں اور علمی و تحقیقی کرنوں سے ہر دبستان فکر و جہان دانش نے روشنی حاصل کی ہو۔ نظر و فکر کی کتنی راہیں تھیں جو آپ کی بدولت کھلیں اور علم و تحقیق کے کتنے مخفی گوشے تھے جو آپ نے بے نقاب کئے آج دنیا میں جہاں جہاں علم و حکمت کی شمعیں روشن اور فکر و دانش کے چراغ فروزاں نظر آتے ہیں وہ اسی قندیلِ درخشاں کی تابندگیوں کا کرشمہ اور اسی مشعل ضوفشاں کی درخشندگیوں کا پرتو ہے۔

یک چراغ است دریں خانہ کہ از پرتو آں ۔۔۔ ہر کجا مے نگری انجمنے ساختہ اند

امیرالمومنینؑ نے ملتِ اسلامیہ کو ایک عظیم علمی سرمایہ دیا جو توحید و خداشناسی علم کلام و فلسفۂ الٰہیات اور رموزِ دین اور اسرارِ احکام کا خزینۂ عامرہ ہے بلکہ اسلامی علوم کا شاید ہی کوئی شعبہ ایسا ہو جس کا سلسلہ آپ تک منتہی نہ ہوتا ہو اور شاید ہی کوئی مکتب فکر ایسا ہو جس نے آپ کی ذہنی توانائی و فکری رہنمائی سے بالواسطہ یا بلا واسطہ استفادہ نہ کیا ہو۔ آپ نے علمی دقائق کی گرہ کشائی کی فکر و فن کے چراغ روشن کئے اور علم کی ہر شاخ کی آبیاری کا ساماں کیا۔ قرآن کی جمع آوری کے ساتھ اس کے متعلقہ علوم قرأت تجوید اعراب رسم الخط اور تفسیر و تاویل کی طرف رہنمائی فرمائی۔ حدیث کے اقسام اور رواۃ کے اصناف پر روشنی ڈالی۔ استنباط احکام کے قواعد منضبط کئے۔ الٰہیات طبیعیات اور ریاضیات کی خشک سرزمین کو اپنے افادات کی بارش سے سیراب کیا۔ تہذیب اخلاق تدبیر منزل اور سیاست مدن کے حدود قائم کئے۔ حکمت نظریہ و حکمت عملیہ کے تفصیلی خاکے ترتیب دیئے۔ بلاغت کے اسلوب وضع کئے۔ نحوی قواعد کی بنیاد رکھی اور فلسفیانہ حقائق میں ادبیت کو سمو کر خیالات کے اظہار کا نیا سانچہ ایجاد کیا۔ بلاشبہ دنیائے اسلام میں

سے اتصال اور قرب کا جو شرف انہیں حاصل رہا وہ کسی ایک کو حاصل نہ تھا اور خلوت وجلوت میں استفادۂ علمی کے جتنے مواقع انہیں ملے وہ کسی ایک کو میسّر نہ آسکے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ صحابہ میں کوئی بھی آپ کے علمی مرتبہ تک نہ پہنچ سکا۔ امام فخر الدین رازی تحریر کرتے ہیں۔

ان علیا کان اعلم الصحابۃ واما ابوبکر فانہ انما اتصل بخدمتہ علیہ السلام فی زمان الکبر وایضا ماکان یصل الی خدمتہ فی الیوم واللیلۃ الازمانا یسیرا اما علی فانہ اتصل بخدمتہ فی زمان الصغر وقد قیل العلم فی الصغر کالنقش فی الحجر والعلم فی الکبر کالنقش فی المدر (اربعین ص ۴۶۶)

حضرت علیؑ صحابہ میں سب سے زیادہ علم رکھنے تھے رہے ابوبکر تو انہیں آنحضرت کی خدمت میں پہنچنے کا موقع بڑی عمر میں ملا اور یوں بھی شب و روز میں انہیں تھوڑا ہی وقت آنحضرت کی خدمت میں باریابی کا ملتا تھا مگر حضرت علی بچپنے ہی میں آنحضرت سے وابستہ ہو گئے تھے۔ اور عام مقولہ ہے کہ جو علم بچپنے میں سیکھا جاتا ہے وہ پتھر کی لکیر ہوتا ہے اور بڑھاپے میں سیکھا ہوا سبق ایسا ہوتا ہے جیسے ریت پر کھنچی ہوئی لکیریں۔

حضرت علیؑ نے دبستان رسالت میں تعلیم و تربیت پائی۔ نبوّت کی تجلیوں سے آئینۂ دل و دماغ پر جلا کی اور اس مرتبۂ علمی پر فائز ہوئے کہ علم و حکمت کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جو آپ کی نظروں سے اوجھل رہا ہو اور حقائق و معارف کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جو آپ پر منکشف نہ ہوا ہو۔ قرن اول اور اس کے بعد کے ادوار میں ایک فرد بھی ایسا پیش نہیں کیا جاسکتا جو علم میں آپ کا ہم پایہ ہو۔ عبد الملک ابن ابی سلیمان کہتے ہیں کہ

قلت لعطاء اکان فی اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم احد اعلم من علی قال لا واللہ لا اعلمہ (استیعاب ج ۳ ص ۴۰)

میں نے عطاء سے پوچھا کہ کیا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ میں علیؑ سے بڑھ کر کوئی عالم تھا کہا خدا کی قسم میں نہیں جانتا کہ ان سے بڑھ کر کوئی عالم ہو۔

حضرت کا علمی امتیاز و تفوق اتنا نمایاں تھا کہ مخالف و موافق دونوں اس کے معترف رہے اور کسی کو اس سے انکار کی جرأت نہ ہو سکی۔ چنانچہ ایک شخص نے معاویہ ابن ابی سفیان سے ایک مسئلہ دریافت کرنا چاہا۔ معاویہ نے کہا کہ مجھ سے پوچھنے کے بجائے علی سے پوچھو وہ مجھ سے زیادہ علم رکھتے ہیں اس نے کہا کہ میں آپ ہی سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ معاویہ نے کہا۔

ویحک کرھت رجلا کان رسول اللہ یغرہ بالعلم غرا وقد کان اکابر الصحابۃ یعترفون لہ بذلک (فتح القدیر ج ۳ ص ۴۶)

افسوس ہے کہ تم اس شخص سے پوچھنا ناپسند کرتے ہو جسے رسول اللہ نے پوری طرح علم بھرایا تھا اور جس کی علمی برتری کا اکابر صحابہ تک اعتراف کرتے رہے ہیں۔

صحابہ کبار نہ صرف آپ کی علمی برتری کے معترف تھے بلکہ پیش آئند مسائل میں انہی کی طرف رجوع کرتے اور آپ پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلوں کو بڑی آسانی سے حل کر دیتے تھے۔ حضرت عمر کو بھی کوئی مشکل مسئلہ درپیش ہوتا تو آپ سے رہنمائی حاصل کرتے اور اگر کوئی حکم دے چکے ہوتے اور حضرت علی اس کے خلاف رائے دیتے تو اپنے فیصلہ میں تبدیلی کر کے علانیہ کہتے۔

لولا علی لهلك عمر (ریاض النضرہ ج ۲ ص ۲۵۶) اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو چکا ہوتا۔

حضرت عمر امیر المومنین کے تلمیذ ابن عباس سے بھی علمی رہنمائی حاصل کرتے تھے چنانچہ شیوخ بدر کے ہمراہ ان کے ہاں آیا جایا کرتے تھے۔ انہی شیوخ میں سے بعض نے ان سے کہا کہ ابن عباس جوان ہیں۔ انہیں آپ کے ہاں آنا چاہیئے نہ یہ کہ آپ ان کے ہاں جائیں۔ حضرت عمر نے ابن عباس اور ان شیوخ کو اپنے ہاں بلایا اور ان سے بعض آیات کی تفسیر دریافت کی ان میں سے بعض خاموش رہے اور بعض نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ آخر ابن عباس نے آیات کی تفسیر بیان کی اور کسی کے لئے بولنے کی گنجائش نہ چھوڑی۔ حضرت عمر نے ان لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

انه من قد علمتم (ذخائر العقبیٰ ص ۲۲۸) اب تمہیں ان کے مرتبہ کا علم ہوا ہوگا۔

اس اعلیٰ علمی دستگاہ کے باوجود ابن عباس حضرت علی کے آگے زانوئے تلمذ تہ کرتے تھے۔ آپ کے علمی فیضان سے بہرہ یاب ہوتے تھے اور اکثر کہا کرتے تھے۔

وما علمی وعلم اصحاب محمد فی علم علی الا کفطرۃ فی سبعۃ ابحر (مناقب) میرے اور اصحاب پیغمبر کے علم کو علی کے علم سے وہی نسبت ہے جو ایک قطرہ کو سات سمندروں سے ہوتی ہے۔

امیر المومنین جس مرتبہ علمی پر فائز تھے اس مرتبہ پر نہ کوئی فائز ہوا اور نہ آئندہ ہوگا۔ شیخ الرئیس ابن سینا اس امر کی شہادت دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

کان علی من العلوم فی المحل الذی لا تحلق الیه البشر (الامام علی عزیزی) حضرت علی علوم میں اس بلند مقام پر فائز تھے کہ انسان کی قوت پرواز اس تک پہنچنے سے قاصر ہے۔

حضرت کے علمی تفوق کی یہ ایک روشن دلیل ہے کہ تاریخ وسیر کی کوئی کتاب یہ نہیں بتاتی کہ آپ نے کسی مسئلہ کے جواب میں وہ امور دینیہ سے متعلق ہو یا مسائل عقلیہ سے ریاضی سے متعلق ہو یا ہیئت سے فلسفہ سے متعلق ہو یا کلام سے طبیعیات سے متعلق ہو یا الٰہیات سے عجز و درماندگی کا اظہار کیا ہو یا غور و فکر کی ضرورت پڑی ہو یا کسی سے پوچھنے کی احتیاج محسوس کی ہو بلکہ جب بھی کوئی ایسا مسئلہ آپ کے سامنے پیش ہوتا جس کے جواب سے دوسرے عاجز و درماندہ ہوتے تو آپ اس آسانی سے اسے حل کر دیتے۔ گویا کوئی پیش پا افتادہ بات ہو اور اس کی نوبت ہی نہ آتی کہ یہ کہتے کہ مجھے سوچنے کا موقع دیا جائے یا کسی اور سے دریافت کیا جائے۔ ابن عباس بیان کرتے ہیں کہ ایک موقع پر حضرت عمر نے امیر المومنین سے کہا کہ یا ابا الحسن آپ سے جب بھی کوئی مسئلہ پوچھا جاتا ہے یا کسی قضیہ کا حل دریافت کیا جاتا ہے تو آپ فوراً اس کا جواب دے دیتے ہیں کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ آپ فکر و تامل کے بعد جواب دیا کریں۔ حضرت نے اپنا ہاتھ کھول کر ان کے سامنے کیا اور پوچھا کہ اس میں کتنی انگلیاں ہیں کہا پانچ۔ فرمایا تم غور و فکر اور سوچ بچار سے کام لینے کے بجائے فوراً کیوں بول اٹھے کہا کہ اس میں غور و فکر کی ضرورت ہی کیا تھی فرمایا کہ جس طرح انگلیوں کے شمار میں تمہیں غور و فکر کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اسی طرح تمام حقائق و مطالب میرے سامنے واضح و آشکارا ہیں اور کسی مرحلہ پر مجھے سوچ بچار کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

تاریخ شاہد ہے کہ عوام سے لے کر مسند نشینان خلافت تک آپ کے سرچشمۂ علم سے سیرابی کے محتاج رہے اور انہیں جب

بھی کسی مشکل مسئلہ میں الجھن پیدا ہوتی تو آپ کے در پر دستک دیتے اور آپ بغیر کسی ذہنی دباؤ کے اس الجھن کو دُور کر دیتے آپ کے اس علمی استغناء پر نظر کرتے ہوئے خلیل ابن احمد فراہیدی نے کتنا حقیقت کو لئے ہوئے یہ جملہ کہا ہے۔

استغنائه عن الکل و احتیاج الکل الیه دلیل علی انه امام الکل (تاسیس الشیعہ)

آپ کا دوسروں سے بے نیاز ہونا اور تمام لوگوں کا اپنی احتیاج کو ان سے وابستہ کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ آپؑ امام کُل ہیں۔

حضرت کا علم صرف قرآن و سنّت اور اسلام کے اوامر و نواہی تک محدود نہ تھا بلکہ آسمانی کتب اور سابقہ ملل و ادیان کی تعلیمات پر بھی گہری نظر رکھتے تھے چنانچہ آپ منبر پر فرمایا کرتے تھے۔

لو کسرت الی الوسادة ثم جلست علیها لقضیت بین اهل التوراة بتوراتهم وبین اهل الانجیل بانجیلهم وبین اهل الزبور بزبورهم وبین اهل الفرقان بفرقانهم (مطالب السئول ص ۸۹)

اگر میرے لئے مسند بچھا دی جاتی تو میں اہلِ تورات میں تورات کی رُو سے اہلِ انجیل میں انجیل کی رُو سے اہلِ زبور میں زبور کی رُو سے اور اہلِ قرآن میں قرآن کی رُو سے فیصلے کرتا۔

حضرت کے سینہ میں علم کا قلزمِ زخار موجزن تھا جو ابرِ باراں کی صورت میں برستا پیاسوں کو ڈھونڈتا اور خشک زمینوں کو سیراب کرتا تھا چنانچہ آپ اپنے صدر مبارک کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کرتے تھے۔

هاان هٰهنا لعلما جما لو اصبت له حملة (نہج البلاغہ)

میرے سینہ میں علم کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے کاش مجھے ایسے افراد مل جاتے جنہیں میں اس علم کا امین بناتا۔

آپ فرازِ منبر پر بلند ہو کر تشنہ کامانِ علم کو پکارتے اور دعوت عام دیتے کہ "سلونی قبل ان تفقدونی" جو پوچھنا ہو میری زندگی میں مجھ سے پوچھ لو" پوچھنے والے اپنی ذہنی پرواز کے مطابق پوچھتے رہے اور بقدر وسعت ظرف جواب حاصل کرتے رہے۔ یہ دعویٰ آپ کے لئے مخصوص ہے اور آپ کی زندگی میں .... اور آپ کے بعد کسی کو یہ دعویٰ کرنے کی جرأت نہ ہو سکی اور اگر کسی نے دعویٰ کیا بھی تو اسے خفت و شرمساری سے دوچار ہونا پڑا۔ سعید ابن مسیب کہتے ہیں۔

ماکان احد من الناس یقول سلونی غیر علی ابن ابی طالب (استیعاب ج ۳ ص ۴۰)

لوگوں میں سے کسی ایک نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ مجھ سے جو چاہو پوچھ لو سوائے علی ابن ابی طالب کے۔

امیر المومنین کا علمی ارتقاء قدرت کے فیضان اور پیغمبر اکرمؐ کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا ورنہ اس دور میں کہ جب عربوں کا علم ایام عرب انساب عرب گھوڑوں کی اصل و نسل اور قیافہ شناسی تک محدود تھا۔ اُن علمی و فلسفی اور طبیعیاتی و ماوراء الطبیعیاتی مسائل پر لب کشائی نہ کی جا سکتی تھی جو اکثر آپ کے خطبات و بیانات کا موضوع رہے ہیں۔ ان علمی و فنی مطالب کے ساتھ ادبی اسلوب بیان نے کلام کو اتنا جاذب و پر کشش بنا دیا ہے کہ کلام خدا و رسولؐ کے علاوہ کوئی کلام اثر آفرینی میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور ان پر ایسے اچھوتے انداز میں روشنی ڈالی ہے کہ جواہر کلام کے پرکھنے والے نقشِ حیرت بن کر رہ گئے ہیں۔

علم الٰہیات

علم الٰہیات سے مراد وہ علم ہے جو صانع عالم کے وجود اس کے صفات اور ان امور سے بحث کرتا ہے جو ذات الٰہی سے متعلق ہوتے ہیں۔ اسلام میں ہستیٔ باری کا اقرار اور اس کی یکتائی کا اعتراف اصل اصول کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی عقیدہ پر دوسرے عقائد کا دار و مدار اور تمام اعمال کی صحت کا انحصار ہے۔ اسی اہمیّت کی بنا پر علماء اسلام نے اسے خصوصی توجہ کا مرکز قرار دیا اس پر سیر حاصل بحثیں کیں اور تحقیقی و استدلالی کتابیں تحریر میں لائے۔ اگرچہ ان سب کی کاوشیں قابلِ قدر ہیں مگر حضرت علی وہ حکیم عالم اسلام ہیں جنہوں نے سب سے پہلے مسائل الٰہیہ میں عقلی و فلسفی استدلال کی طرح ڈالی دقیق گتھیوں کو آسان لفظوں میں سلجھایا اور ایک ایک مسئلہ پر ایسے لطیف انداز میں روشنی ڈالی کہ اس سے بہتر پیرایۂ بیان و طرزِ استدلال ممکن نہیں ہے آپ نے الٰہیاتی حقائق کے ان گوشوں کو بے نقاب کیا جو متکلمین کی نظروں سے اوجھل اور حکماءٔ فلاسفہ کی فکری و ذہنی پرواز سے بلند تر تھے اگرچہ حکماءِ یونان سقراط افلاطون اور ارسطو نے الٰہیاتی و مابعد الطبیعیاتی مسائل پر بحث کی ہے اور فطرت کی داخلی شہادت اور حادث کے لئے موجد کی ضرورت سے ایک ایسی ہستی کا اثبات کیا ہے جو تغیّر و تبدل سے بری ہر اعتبار سے کامل و اکمل اور کائنات کی محرکِ اوّل و سرچشمۂ وجود ہے مگر حضرت کے کلماتِ خدا شناسی وحدت ذات عینیت صفات اور تنزیہہ و تقدیس کے سلسلہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے اور اس کثرت سے حقائق و مطالب لئے ہوئے ہیں کہ قدیم حکماء و فلاسفہ کے کلام کو صرف ان کے مبادیات سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اور علماءِ اسلام نے انتہائی کد و کاوش سے جو الٰہیاتی مباحث مدون کئے وہ بھی آپ کے افادات سے سرمو آگے نہیں بڑھ سکے اور ہر پھر کر انہی مطالب کے گرد گردش کرتے ہیں جو آپ نے اپنے خطبات اور مختلف سوالوں کے جوابات میں بیان فرمائے۔

علم الہدیٰ سید مرتضیٰ تحریر کرتے ہیں۔

اعلم ان اصول التوحيد والعدل ماخوذة من كلام امير المومنين وخطبه فانها تتضمن من ذلك مالا زيادة عليه ولا غاية وراءه ومن تامل الماثور في ذلك من كلامه علم ان جميع ما اسهب المتكلمون من بعد في تصنيفه وجمعه انما هو تفصيل لتلك الجمل وشرح لتلك الاصول (غرر و درر)

تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ توحید و عدل کے اصول امیر المومنین کے کلمات و خطبات سے ماخوذ ہیں کیونکہ وہ تمام الٰہیاتی مطالب پر حاوی ہیں ان میں نہ اضافہ ممکن ہے اور نہ ان سے آگے کوئی حد ہے چنانچہ جو شخص آپ کے کلام پر نظر کرے وہ جان لے گا کہ آپ کے بعد متکلمین نے جن تفصیلی مباحث کی تالیف و تدوین کی وہ آپ ہی کے بیان کردہ مجملات کی تفصیل اور آپ ہی کے پیش کردہ اصول کی تشریح و توضیح ہیں۔

حضرت کے ان خطبات و جوابات میں مسائل بھی ہیں اور دلائل بھی حقیقت بھی ہے اور ادبیت بھی فلسفہ بھی ہے اور حسن اسلوب

بھی ہر شبہہ کا جواب بھی ہے اور ہر اعتراض کا رد بھی۔ آپ نے وحدت کو کثرت کی آمیزش سے پاک وصاف کر کے توحید کے خدو خال کو نکھارا، ذات وصفات کے تفرقہ کو باطل ثابت کر کے دوئی کے تصوّر کو مٹایا اور رویت بصری حلول واتحاد تمثیل وتشبیہ احتیاج وترکیب اور تعطیل وتجسیم ایسے غلط نظریات کی دلائل سے رد فرمائی۔ اور مشککین کے شکوک و شبہات کا ازالہ فرمایا۔ غرض خداشناسی کی منزل میں آپ کے ارشادات ایک دلیل راہ کی حیثیت رکھتے ہیں جو ایک ان دیکھی ہستی کے کمال ذات وصفات کی طرف رہنمائی کرتے اور خیالات وافکار کو زندقہ والحاد کے دھندلکوں میں بھٹکنے سے بچا لے جاتے ہیں۔

ذیل میں الہیات کے سلسلہ میں آپ کے چند ارشادات مختصر تشریح کے ساتھ درج کئے جاتے ہیں جو اسلام کی صحیح تعلیمات کے آئینہ دار اور مذاہب عالم کے عقیدہ الوہیت کے مقابلہ میں اسلامی عقیدہ الوہیت کی برتری کا واضح ثبوت ہیں۔

خداشناسی کے درجات

خداشناسی کے چند درجے ہیں جنہیں امیرالمومنین نے ذیل کے کلمات میں بیان فرمایا ہے۔

اول الدین معرفته وکمال معرفته التصدیق به وکمال التصدیق به توحیده وکمال توحیده الاخلاص له وکمال الاخلاص له نفی الصفات عنه (نہج البلاغہ)

دین کی ابتداء اس کی معرفت ہے کمال معرفت اس کی تصدیق ہے اور کمال تصدیق توحید ہے اور کمال توحید تنزیہہ واخلاص ہے اور کمال تنزیہہ واخلاص یہ ہے کہ اس سے صفتوں کی نفی کی جائے۔

پہلا درجہ یہ ہے کہ انسان کے ذہن میں ایک ان دیکھی اور غیر محسوس ہستی کا تصوّر پیدا ہو یہ تصوّر کیوں پیدا ہوتا ہے اس کے بارے میں دو نظریے ہیں۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ یہ تصوّر معاشرہ وماحول کی پیداوار ہے اور خاندانی ورثہ کے طور پر ایک ذہن سے دوسرے ذہن کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ چنانچہ اہل مذاہب میں پلنے بڑھنے والا بچہ اپنے دل ودماغ کو خدا کے تصوّر سے خالی نہیں رکھ سکتا اور دین ومذہب سے بیگانہ لوگوں میں آنکھ کھولنے والا بچہ خدا کے تصوّر سے دُور رہتا ہے اور اسی راہ پر چلتا ہے جس راہ پر اپنے گرد وپیش کے لوگوں کو چلتا دیکھتا ہے اور دوسرا نظریہ یہ ہے کہ جب انسان نے اس کارگاہِ ہستی میں آنکھ کھولی تو کچھ چیزوں کو مفید پایا اور کچھ چیزوں کو نقصان دہ، جن چیزوں کو مفید سمجھا انہیں حاصل کرنے کے اسباب و ذرائع تلاش کئے اور جن چیزوں کو نقصان دہ سمجھا ان سے بچنے کا سامان کیا مگر اس نے دیکھا کہ یہ اسباب و ذرائع بے نتیجہ بھی ثابت ہوتے اور کامیابی کے اسباب مہیا ہونے کے باوجود کامیابی نہیں ہوتی اور رنج وتکلیف سے بچاؤ کے سامان کے باوجود مصیبت سے چھٹکارا نہیں ملتا۔ اس ناکامی ونامرادی نے اسے حوادثِ زمانہ کے آگے ہتھیار ڈالنے اور اپنی کمزوری و بے بسی کا اعتراف کرنے پر مجبور کر دیا۔ جب اس نے اپنے کو عاجز ودرماندہ پایا تو اس احساس درماندگی کے نتیجہ میں اس کے ذہن میں یہ تصوّر پیدا ہوا کہ اس عالم میں کچھ بالادست طاقتیں کارفرما ہیں جو اس کے ارادوں پر حاوی اور کائنات کے خشک و تر پر حکمراں ہیں۔ وہی تکلیف وراحت فقر وامارت اور مرض وصحت پر اختیار رکھتی ہیں اور وہی دنیا میں پیش آنے والے وقائع وحوادث کی ذمہ دار ہیں۔ ان طاقتوں کو دیوتاؤں کا نام دیا گیا اور مختلف حوادث کے مختلف دیوتا مان لئے گئے۔ ان دیوتاؤں میں سوریہ (سورج) وایو (ہوا) اور اگنی (آگ) بھی شامل ہیں۔

علم الٰہیات

علم الہیات سے مراد وہ علم ہے جو صانع عالم کے وجود اس کے صفات اور ان امور سے بحث کرتا ہے جو ذات الٰہی سے متعلق ہوتے ہیں۔ اسلام میں ہستیٔ باری کا اقرار اور اس کی یکتائی کا اعتراف اصل اصول کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی عقیدہ پر دوسرے عقائد کا دار و مدار اور تمام اعمال کی صحت کا انحصار ہے۔ اسی اہمیّت کی بنا پر علماء اسلام نے اسے خصوصی توجہ کا مرکز قرار دیا اس پر سیر حاصل بحثیں کیں اور تحقیقی و استدلالی کتابیں تحریر میں لائے۔ اگرچہ ان سب کی کاوشیں قابلِ قدر ہیں مگر حضرت علی وہ حکیم عالم اسلام ہیں جنہوں نے سب سے پہلے مسائل الٰہیہ میں عقلی و فلسفی استدلال کی طرح ڈالی دقیق گتھیوں کو آسان لفظوں میں سلجھایا اور ایک ایک مسئلہ پر ایسے لطیف انداز میں روشنی ڈالی کہ اس سے بہتر پیرایۂ بیان و طرزِ استدلال ممکن نہیں ہے آپ نے الہیاتی حقائق کے ان گوشوں کو بے نقاب کیا جو متکلمین کی نظروں سے اوجھل اور حکماؤ فلاسفہ کی فکری و ذہنی پرواز سے بلند تر تھے اگرچہ حکماء یونان سقراط افلاطون اور ارسطو نے الہیاتی و مابعد الطبیعیاتی مسائل پر بحث کی ہے اور فطرت کی داخلی شہادت اور حادث کے لئے موجد کی ضرورت سے ایک ایسی ہستی کا اثبات کیا ہے جو تغیّر و تبدل سے بری ہر اعتبار سے کامل و اکمل اور کائنات کی محرکِ اوّل و سرچشمۂ وجود ہے مگر حضرت کے کلماتِ خدا شناسی وحدت ذات عینیت صفات اور تنزیہہ و تقدیس کے سلسلہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے اور اس کثرت سے حقائق و مطالب لئے ہوئے ہیں کہ قدیم حکماء و فلاسفہ کے کلام کو صرف ان کے مبادیات سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اور علماءِ اسلام نے انتہائیٔ کد و کاوش سے جو الہیاتی مباحث مدون کئے وہ بھی آپ کے افادات سے سرمو آگے نہیں بڑھ سکے اور ہر پھر کر انہی مطالب کے گرد گردش کرتے ہیں جو آپ نے اپنے خطبات اور مختلف سوالوں کے جوابات میں بیان فرمائے۔

علم الہدیٰ سید مرتضیٰ تحریر کرتے ہیں۔

اعلم ان اصول التوحید والعدل ماخوذة من كلام امير المومنين وخطبه فانها تتضمن من ذلك ما لا زيادة عليه ولا غاية وراءه ومن تامل المأثور فی ذلك من كلامه علم ان جميع ما اسهب المتكلمون من بعد فی تصنيفه وجمعه انما هو تفصيل لتلك الجمل وشرح لتلك الاصول (غرر و درر)

تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ توحید و عدل کے اصول امیر المومنین کے کلمات و خطبات سے ماخوذ ہیں کیونکہ وہ تمام الہیاتی مطالب پر حاوی ہیں ان میں نہ اضافہ ممکن ہے اور نہ ان سے آگے کوئی حد ہے چنانچہ جو شخص آپ کے کلام پر نظر کرے وہ جان لے گا کہ آپ کے بعد متکلمین نے جن تفصیلی مباحث کی تالیف و تدوین کی وہ آپ ہی کے بیان کردہ مجملات کی تفصیل اور آپ ہی کے پیش کردہ اصول کی تشریح و توضیح ہیں۔

حضرت کے ان خطبات و جوابات میں مسائل بھی ہیں اور دلائل بھی حقیقت بھی ہے اور ادبیت بھی فلسفہ بھی ہے اور حسن اسلوب

جب انسانی شعور نے ارتقائی منزلیں طے کیں تو اس نے دیکھا کہ .... اگرچہ مختلف دیوتا مختلف امور سرانجام دیتے ہیں مگر ان کے کاموں میں ایک نظم و ضبط اور ربط و تسلسل پایا جاتا ہے جس میں کبھی خلل رونما نہیں ہوتا۔ سطح سمندر سے بخارات اُٹھتے ہیں تو بارش برستی ہے اور بارش برستی ہے تو کھیتیاں ہری بھری ہوتی ہیں اگر بارش برسانے والے دیوتا اور کھیتیاں اگانے والے دیوتا میں اتحاد و یکجہتی نہ ہوتی تو ہو سکتا تھا کہ بخارات اُٹھتے اور بارش نہ ہوتی یا بارش ہوتی اور کھیتیاں ہری نہ ہوتیں۔ اس نظم و ہم آہنگی سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ان دیوتاؤں پر بھی ایک بڑا دیوتا حکومت کرتا ہوگا جو انہیں ادھر سے ادھر ہونے نہیں دیتا۔ اس سے ایک ان دیکھی ہستی کا تصور پیدا کر لیا گیا جو پرمیشور اور خدا کہی جاتی ہے۔ انسان دیوتاؤں کے آگے جھکنے کا خوگر تو تھا ہی اس ان دیکھے پرمیشور کے سامنے بھی سر بخم ہوگیا اور دیوتاؤں سے وابستگی برقرار رکھتے ہوئے اس سے بھی تصوراتی رشتہ جوڑ لیا۔ بہرحال یہ تصور اہل مذاہب سے سُن کر پیدا ہوا ہو یا دیوتاؤں کے اشتراک عمل سے مذہب سے وابستگی کا پیش خیمہ اور دین سے ارتباط کا نقطۂ آغاز ہے چنانچہ امیرالمومنین کے ارشاد "دین کی ابتدا اس کی معرفت ہے" میں معرفت سے مراد یہی ابتدائی تصور ہے اور دین سے دین اسلام یا کوئی خاص دین مراد نہیں ہے بلکہ زندقہ و الحاد کے مقابلہ میں کسی آئین کی ذہنی پابندی مراد ہے جو اسی تصور کی پیداوار ہے۔ یہ درجہ معرفت ناقص اور تصور کی حد تک محدود ہے اور تصور کوئی بھی ہو وہ اپنے اندر قطعیت نہیں رکھتا۔ ممکن ہے کہ وہ صحیح ہو اور ممکن ہے کہ وہ صرف ذہنی پیداوار ہو۔ اس وقت تک اسے صحت کا درجہ نہیں دیا جا سکتا جب تک دلیل و برہان سے اس کی قطعیت کا ثبوت بہم نہ پہنچا لیا جائے اور ذہن کو شکوک و شبہات کے دغدغوں سے پاک و صاف نہ کر دیا جائے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ اس تصور پر قانع نہ رہے بلکہ فکر و نظر سے کام لے کر غیر یقینی صورت کو یقینی صورت میں بدلے اور ادراک و تصدیق کی منزل تک پہنچے۔ وہ افراد جو سہل انگاری سے کام لیتے ہوئے اس تصور ہی کو کافی سمجھ لیتے ہیں اور غور و فکر کی تکلیف گوارا نہیں کرتے وہ تصدیق سے محروم رہ جاتے ہیں۔ حالانکہ اس تصور کے پیدا ہونے کے بعد ان پر یہ ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے کہ وہ فکر و نظر سے کام لیں اور آثار سے موثر کے وجود کا ثبوت بہم پہنچائیں جبکہ اس کے وجود کی نشاندہی کرنے والے آثار ہر طرف نمایاں اور ہر سطح کے ذہن کے لئے علم و ایقان کا ذریعہ ہیں۔ چنانچہ ایک سطحی نظر رکھنے والا عام آدمی زمین اور اس میں سبزہ و گل کی روئیدگی سر بلند پہاڑ اور مچلتے ہوئے سمندر گرتی ہوئی آبشاریں اور فضا میں اڑتے ہوئے ابر کے ٹکڑے چاند سورج کی چمک دمک اور ستاروں کی جگمگاہٹ طلوع و غروب کے پر کیف مناظر اور شب و روز کے سفید و سیاہ ورق دیکھ کر خالق عالم کی ہستی کا یقین اپنے اندر پیدا کر سکتا ہے اور ایک بلند نظر و باریک بیں انسان کائنات کی رعنائی و پہنائی اور اس میں لاکھوں نوری سال کے فاصلوں پر واقع سحابیئے فضا کی بلندیوں پر جگمگ کرتے سنہری جھمکے محیط عالم پر چھائی ہوئی کہکشاں کی وسعتیں اور سیاروں کی محوری و دوری گردشیں دیکھ کر یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کس نے یہ بزم عالم آراستہ کی کس نے چاند سورج کو ضیا بار بنایا اور کس نے قوتِ تجاذب و مدافعت پیدا کی۔ جس کے زیر اثر اجرام فلکی معینہ راہ پر گامزن اور رکے بندھے قانون پر راہ پیما ہیں۔ کیا یہ عظیم کائنات آپ ہی آپ پیدا ہو گئی اور خود بخود مقررہ راہوں پر رواں دواں ہے؟ مگر یہ کیسے جبکہ کوئی نقش بغیر نقاش کے اور کوئی اثر بغیر موثر کے وجود میں

نہیں آتا تو یہ کائنات کسی خالق کی کارفرمائی کے بغیر کس طرح موجود ہوگئی یقیناً اس کے پیچھے ایک ایسی ہستی کا ہاتھ کارفرما ہے جس سے کائنات کی تخلیق اور عالم کا نظم و نسق وابستہ ہے۔ جب فکر و نظر کی رہنمائی سے اس نتیجہ پر پہنچتا ہے تو شک و تذبذب کے حدود سے نکل کر تصدیق کے درجہ تک رسائی حاصل کر لیتا ہے اور جوں جوں فکری عمل بڑھتا ہے ہستیٔ باری کا عقیدہ پختہ ہوتا جاتا ہے۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ صانع عالم کو واحد و یگانہ مانا جائے۔ اگر اسے مان لینا ہی کافی ہوتا تو مشرکین قریش اور پیغمبر اسلام میں کوئی وجہ مخاصمت ہی باقی نہیں رہتی اس لئے کہ وہ سب اسے مانتے تھے اور کوئی بھی اس کا انکار نہیں کرتا تھا ان سے نزاع تھی تو اس بنا پر کہ وہ دوسروں کو بھی الوہیت یا الوہیت کے صفات میں شریک سمجھتے تھے چنانچہ مشرکین قریش خدا کو واحد و یکتا ماننا نہ چاہتے تھے بلکہ خدا کے ساتھ بتوں کو بھی شریک کرتے تھے اور پیغمبر اسلام سے اسی لئے آمادۂ پرخاش تھے کہ آپ نے ایک خدا کا تصور پیش کیا تھا۔ اگر آپ بتوں کے عمل دخل کی نفی نہ کرتے تو انکے جذبات برانگیختہ نہ ہوتے اس لئے کہ انہیں خدا سے نہیں بلکہ خدا کو ایک ماننے سے کد تھی اور اسی ایک کہنے سے وہ سیخ پا ہوتے تھے قرآن مجید میں ہے۔

اذا دعی اللہ وحدہ کفرتم	جب تنہا اللہ کو پکارا جاتا تھا تو تم انکار کرتے تھے
وان یشرک بہ تؤمنوا	اور اگر اس کے ساتھ اوروں کو شریک کیا جاتا تھا تو تم مان لیتے تھے۔

رہے دوسرے اہل مذاہب تو اگرچہ وہ اپنا رابطہ الہامی کتابوں سے رکھنے کے دعویدار ہیں اور بنیادی طور پر خدا پر عقیدہ رکھتے ہیں مگر یہ عقیدہ توحید سے خالی ہے کیونکہ وہ تصرف و تدبیر عالم میں دوسروں کو بھی شریک ٹھہراتے ہیں۔ چنانچہ یہود نے عزیر کو ابن اللہ قرار دے لیا۔ مسیحی ایک تین اور تین ایک کے چکر میں پڑ گئے اور باپ بیٹا اور روح القدس کے مجموعہ کو خدا ماننے لگے۔ ہندوؤں نے برہما کو پیدا کرنے والا وشنو کو زندہ رکھنے والا اور شیوا کو ہلاک کرنے والا فرض کر لیا اور پھر ان تینوں میں وحدت پیدا کرنے کے لئے ایک ہی مجسمہ میں ان تینوں کے سر الگ الگ دکھائے ہیں جسے تریمورتی کہتے ہیں۔ یہ بھی تثلیث ہی کی ایک صورت ہے۔ سناتن دھرمیوں نے خدا کے لاکھوں روپ بنا ڈالے جنہیں اوتار کہتے ہیں۔ آریہ توحید پرستی کا دعویٰ کرنے کے ساتھ روح اور مادہ کو بھی ایشور کی طرح قدیم اور ازلی سمجھتے ہیں بعض نفس، مادہ اولیٰ، دہر اور خلا کو قدیم مانتے ہیں۔ بعض اجرام فلکیہ میں ارواح کے قائل ہیں جنہیں آتماؤں سے تعبیر کرتے ہیں اور انہیں اجرام فلکیہ کی طرح قدیم سمجھتے ہیں۔ بعض نے مختلف حوادث و وقائع کے مختلف خدا مان لئے۔ جو ایک بڑے خدا کے ماتحت کام کرتے ہیں۔ بعض کا نظریہ یہ ہے کہ خدا نے کائنات کو خلق کرنے کے بعد اس کا نظم و انضباط دوسروں کے سپرد کر دیا ہے اور خود معطل و بےکار ہو کر رہ گیا ہے۔ ثنویہ دو خداؤں کے قائل ہیں ایک یزداں جو خالق خیر ہے اور ایک اہرمن جو خالق شر ہے۔ خالق خیر کو نور سے اور خالق شر کو ظلمت سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ بعض صوفیہ خدا کائنات اور انسان کو ایک وحدت قرار دیتے ہیں۔ بعض فلاسفہ اللہ کو صرف عقل اول کا خالق مانتے ہیں ان کا نظریہ یہ ہے کہ الواحد لا یصدر عنہ الا الواحد (ایک سے ایک ہی چیز صادر ہوتی ہے) چنانچہ اللہ نے عقل اول کو پیدا کیا اور عقل اول نے عقل ثانی

اور فلک اول کو اور اس طرح عقل عاشر نے جو کہ خدائے عالم طبیعت کے نام سے موسوم کی جاتی ہے اس جہان کو پیدا کیا۔
یہ مذاہب خدا کو دو ماننے والے ہوں یا تین یا زیادہ بہت سے خداؤں کے ضمن میں اللہ کی ہستی کا بھی اقرار کرتے ہیں اس لئے انہیں منکرین خدا کی صف میں تو شمار نہیں کیا جا سکتا مگر درحقیقت یہ ماننا نہ ماننے کے برابر ہے اس لئے کہ جسے مانا ہے وہ چند خداؤں میں کا ایک خدا ہے اور جسے ماننا چاہیئے تھا وہ چند خداؤں میں کا ایک نہیں ہے بلکہ ایسا ایک ہے جس کا دوسرا نہیں ہے۔ اس ماننے کو ماننا اسی وقت کہا جائے گا جب اللہ کو ہر لحاظ سے واحد و یکتا مانا جائے نہ اس کی قدامت و ازلیت میں کسی کو شریک ٹھہرایا جائے اور نہ اس کے افعال و اعمال میں کسی کو دخیل سمجھا جائے لہٰذا وہ مذاہب و ادیان جو دوسروں کو کسی اعتبار سے بھی خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں وہ خدا شناسی کی منزل سے نا آشنا قرار پائیں گے۔
چوتھا درجہ یہ ہے کہ خدا کو ایک ماننے کے ساتھ اسے صفات ممکنات جسم و جسمانیت نقل و حرکت زمان و مکان وغیرہ سے منزّہ و مبرّا سمجھا جائے جن لوگوں نے توحید کا عقیدہ رکھنے کے ساتھ یہ سمجھ لیا ہے کہ وہ ہماری طرح شکل و صورت جسم اور اعضاء رکھتا ہے عرش پر متمکن اور مادی چیزوں کی طرح قابل رویت ہے وہ خدا شناسی کی منزل سے بمراحل دور ہیں۔ اس لئے کہ اگر اسے زمان و مکان کا پابند حرکت و انتقال کا حامل اور جسم و جسمانیت کی سطح پر قرار دے لیا تو اسے ان تمام نقائص سے متصف مانا جو ممکنات میں پائے جاتے ہیں اور جب وہ نقائص سے خالی نہ رہا تو واجب الوجود ہی کہاں رہا۔ کیونکہ واجب الوجود وہی ہو سکتا ہے جو تمام نقائص سے بری اور ہر قسم کی احتیاج سے بلند تر ہو۔
پانچواں درجہ یہ ہے کہ اس کے صفات کو اس کی ذات سے الگ تصوّر نہ کیا جائے اس لئے کہ اگر ذات سے الگ صفات تجویز کئے گئے تو عقیدۂ توحید ناقص و ناتمام رہے گا کیونکہ صفات کو زائد بر ذات ماننے سے دوئی لازم آئے گی۔ ایک ذات اور ایک صفت اور دوئی کا ادنیٰ شائبہ بھی اس کی عظمت توحید کے منافی ہے جب اس کی ذات ہر اعتبار سے کامل اور احتیاج سے بری ہے تو اسے اظہار کمال کے لئے صفتوں کا سہارا لینے کی ضرورت ہی کیا ہے۔
معرفتِ خداوندی کے یہ پانچ مراتب ہیں جنہیں امیرالمومنین نے چند مختصر الفاظ میں سمو کر پیش کیا ہے اور ہر درجہ کو درجہ ماقبل کے اعتبار سے کامل قرار دیا ہے لہٰذا معرفت کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک ان پانچوں مراتب کو جزو عقیدہ نہ قرار دیا جائے اور اگر کسی درجہ پر بھی خطِ انکار کھینچا گیا تو نہ عقیدۂ الوہیت بے داغ رہ سکتا ہے اور نہ عقیدۂ توحید۔

اثباتِ وجودِ باری

امیرالمومنین نے اللہ کے وجود پر مختلف دلائل قائم کئے ہیں جو عقل و فطرت کے معیار پر پُورے اُترتے اور ہر صاحب شعور کو اقرار پر مجبور کر دیتے ہیں۔ وجود باری کے سلسلہ میں حضرت کے چند اقوال درج کئے جاتے ہیں۔

۱۔ وکلمۃ الاخلاص فانہا الفطرۃ (نہج البلاغہ) اللہ کی ہستی و وحدت کا عقیدہ فطرت کی آواز ہے۔
خدا کی ہستی کا عقیدہ انسان کی فطرت کا تقاضا ہے جو اسے ایک ان دیکھی اور غیر محسوس ذات کے اعتراف پر مجبور کرتی ہے۔ حضرت نے اس فطری و جبلی شہادت کو اللہ کے وجود کے ثبوت میں پیش کیا ہے اگرچہ ہم اسے مختلف طریقوں سے ثابت کرنے

کی کوشش کرتے اور اس کے لئے دلیلیں ڈھونڈتے رہتے ہیں مگر ثابت کرنے کی یہ کوششیں اس لئے نہیں کرتے کہ اس کے وجود کا اثبات ہماری دلیلوں پر منحصر ہے بلکہ ہمارے شعور میں اس کا تصوّر اس طرح رچا بسا ہوا ہے کہ کوئی دلیل نہ ملنے پر بھی ہمارے ایقان میں کوئی کمی نہیں آسکتی۔ یہ جذب اور طبعی اعتقاد خود سب سے بڑی اور غیر متزلزل دلیل ہے اور ایسے ذہنی شعور کی انکشافی کیفیت اور فطرت کی اندرونی شہادت سے تعبیر کیا جاتا ہے جو کسی حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے عقلی دلائل کا سہارا لینے کی محتاج نہیں ہے۔ اگر آئینۂ ضمیر و وجدان مادیت کے غبار سے دھندلا نہ گیا ہو اور ہوائے نفس کی پیروی نے توجہ فطری کو سلب نہ کر لیا ہو تو انسان فطرت کی روشنی ہی میں یہ محسوس کرے گا کہ اس کائنات کی خلقت میں آفریدگار مطلق کا دستِ توانا کارفرما ہے جس نے ہر چیز میں نظم و ترتیب قائم کر کے اپنی حکمت بالغہ کا ثبوت دیا ہے۔

وجود باری کے فطری ہونے کے سلسلہ میں بعض اعلام نے فرمایا ہے کہ آیۂ قرآنی الست بربکم قالوا بلیٰ (کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں سب نے کہا ہاں ایسا ہی ہے) میں خداوند عالم نے اپنے بندوں سے ربوبیت کا اقرار لیا ہے اور اپنی ہستی کا اقرار نہیں لیا۔ کیونکہ اس کی ہستی کا اعتراف فطری ہے اور ہر شخص فطرۃً اسے ماننے پر مجبور ہے۔

۲۔ الحمد للہ الدال علی وجودہ بخلقہ وبمحدث خلقہ علی ازلیتہ (نہج البلاغۃ)

تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جو خلق کائنات سے اپنے وجود کا اور پیدا شدہ مخلوقات سے اپنے قدیم و ازلی ہونے کا پتہ دینے والا ہے۔

انسان میں عقل کا جوہر ودیعت کیا گیا ہے تاکہ علت و معلول کے باہمی ربط سے ایک ابدی و ازلی وجود کا شعور حاصل کرے لہٰذا وجود باری کے سلسلہ میں عقل سے رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت ہے اور عقل ہی سے صانع عالم کے وجود پر دلیل لائی جاسکتی اور اس کی ہستی کا اثبات کیا جاسکتا ہے اس لئے کہ ان امور میں جو ماوراء الطبیعیات ہیں نہ ظاہری حواس کا گزر ہے اور نہ تجربات کا دخل ہے انہیں صرف عقل ہی سے ثابت کیا جاسکتا ہے۔ اگر عقل سے رابطہ ختم کر کے اللہ کے کلام سے اس کے وجود پر استدلال کیا جائے تو جس کا وجود ہی ابھی زیر بحث ہے۔ اس کے کلام سے استدلال کے کیا معنی، یہ تو دعویٰ کو دلیل کا درجہ دے دینا ہے اور پھر کسی چیز کو جو واقع میں سچ ہو سچا کہہ دینا کافی نہیں ہوتا۔ جب تک اس کی صداقت پر دلیل نہ قائم کی جائے بیشک فطرت اللہ کے وجود پر ایک ناطق برہان ہے مگر جن کی فطرت پر مادیت یا ماحول کے اثرات غالب آجاتے ہیں وہ فطرت کی رہنمائی سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے صرف عقل ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے انہیں اللہ کا قائل کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ حضرت نے وجود باری کے فطری و بدیہی ہونے کے باوجود عقل کو معیار قرار دیا ہے اور آثار قدرت و خلق کائنات سے اس کے وجود پر استدلال کیا ہے۔ اس استدلال کی بنیاد اس علم و یقین پر ہے جو زمین و آسمان اور کائنات کی وسعتوں میں غور و فکر سے انسان کے دل و دماغ میں پیدا ہوتا ہے اور ذہنوں کا رخ خالق و مدبر عالم کی طرف موڑ دیتا ہے۔ چنانچہ جو شخص ادنیٰ شعور رکھتا ہو اس سے انکار نہیں کرسکتا کہ کوئی نشان قدم بغیر رہرو کے نہیں ابھرتا اور کوئی عمارت معمار کے بغیر کھڑی نہیں ہوتی اور ہر مصنوع صانع کا دست نگر اور ہر مخلوق خالق کی محتاج ہے خواہ وہ ہماری نظروں کے سامنے ہو یا ہماری نگاہوں سے

ادجھل ہو۔ اسی بنا پر خداوند عالم نے کائنات میں غور و فکر کا حکم دیا ہے تاکہ اس کے نتیجہ میں اس کی ہستی کا اثبات کیا جاسکے ارشاد باری ہے۔

قل انظروا ماذا فی السموات والارض —— ان سے کہو کہ وہ زمین و آسمان کی چیزوں پر نظر ڈالیں۔

چنانچہ انسان جب اس کائنات کو دیکھے گا اور اس میں کارفرما حکمتوں پر نظر کرے گا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہ رہے گا کہ جب ہر مصنوع کے لئے صانع ہونا ضروری ہے تو اس کائنات کا بھی ایک خالق و صانع ہونا چاہیئے جو بذاتِ خود موجود ہو اور اپنے وجود میں کسی کا محتاج نہ ہو۔

۳۔ من عرف نفسہ فقد عرف ربہ (بحارالانوار) جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے پروردگار کو پہچان لیا۔

خداوندِ عالم کے آثار وجود انفس و آفاق میں پھیلے ہوئے ہیں اور چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز اس کی ہستی پر روشن و واضح برہان ہے ذرّہ ہو یا آفتاب قطرہ ہو یا سمندر پتی ہو یا گلشن جرمِ صغیر ہو یا عالمِ کبیر یکساں اس کے وجود کی ایک علامت اور اس کی یکتائی کی طرف ایک اشارہ ہیں۔

ہر گیاہے کہ از زمیں روید وحدہٗ لاشریک لہٗ گوید

یہ کائنات میں بکھری ہوئی علامتیں انسانی پیکر میں سمو دی گئی ہیں۔ گویا کائنات ایک تفصیلی صحیفہ ہے اور انسان ایک اجمالی صفحہ۔ امیرالمومنین فرماتے ہیں۔

اتزعم انک جرم صغیر وفیک انطوی العالم الاکبر

کیا تو یہ گمان کرتا ہے کہ تو ایک چھوٹا سا جسم ہے حالانکہ تیرے اندر عالمِ اکبر سمایا ہوا ہے۔

لہٰذا اشیائے کائنات پر نظر کرنے کے ساتھ اپنے نفسوں پر بھی نظر کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر انسان نفس کی کاروائی کو سمجھ لے گا تو کارفرمائے عالم کے عرفان کی راہ ہموار ہو جائے گی۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

سنریھم آیاتنا فی الآفاق وفی انفسھم حتی یتبین لھم انہ الحق۔ —— ہم انہیں اپنی نشانیاں اطرافِ عالم اور خود ان کے نفسوں میں دکھاتے ہیں تاکہ ان پر ظاہر ہو جائے کہ یقیناً وہی برحق ہے۔

یہ انسان جو ایک چھوٹی سی کائنات ہے جسم اور نفس پر مشتمل ہے جسم میں گھٹاؤ بڑھاؤ ہوتا رہتا ہے چنانچہ جب تک قوت نمو باقی رہتی ہے۔ ہڈیاں گوشت پوست اور اس کے ساتھ قد و قامت بڑھتا رہتا ہے اور جب زمانہ نمو ختم ہو جاتا ہے تو اعضاء تحلیل ہونا شروع ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ ہڈیوں پر سے گوشت تک اتر جاتا ہے ڈھانچہ بدل جاتا ہے اور صورت و ہیئت کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے مگر وہ خود بچپن ہو یا جوانی یا بڑھاپا ہر دور میں وہی رہتا ہے جو بدو خلقت سے تھا۔ ایسا نہیں ہوتا کہ بچپن میں کوئی اور ہو جوانی میں کوئی اور اور بڑھاپے میں کوئی اور۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان کا وجود و تشخص اس کے اعضاء سے نہیں بلکہ اس کے نفس سے وابستہ ہے جو شروع سے آخر تک ایک حالت پر باقی رہتا ہے۔ اگرچہ یہ نفس نہ آنکھ سے دکھائی دیتا ہے نہ حاسوں کی گرفت میں آتا ہے نہ

اللہ تمہارے ساتھ ہے کہا کہ میں اس کا کفارہ مسکینوں کو کھانا کھلا کر ادا نہ کروں فرمایا کہ تم نے اپنے پروردگار کی قسم ہی کب کھائی ہے کہ تم پر کفارہ عائد ہو۔

مقصد یہ ہے کہ خداوند عالم ہمارے حاسوں اور ادراکی قوتوں سے بالاتر ہونے کے باوجود اپنے آثارِ قدرت کے اعتبار سے ظاہر و نمایاں ہے اور ناقابلِ رویت ہونے کے باوجود اسکا وجود اتنا ہی قطعی و یقینی ہے جتنا کسی شے کا رویت کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔

۶۔ لیس باللہ من عرف بنفسہ ھو الدال بالدلیل علیہ والمودی بالمعرفۃ الیہ (احتجاج طبرسی)

جس کی حقیقت نفس الامری پہچانی جا سکے وہ خدا نہیں ہے وہ خود اپنے وجود کی دلیل ہے اور اسی نے اپنی معرفت کے وسائل پیدا کئے ہیں۔

خداوند عالم اپنے وجود کے اثبات میں کسی غیر کے توسط کا محتاج نہیں ہے بلکہ وہ خود اپنے وجود کی مستقل دلیل ہے۔ یہ درست ہے کہ کائنات اور اس کے مظاہر اس کی ہستی کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں مگر ان آثار و مظاہر سے اس کے وجود پر استدلال اسی کی عطا کردہ قوتِ فکر کا نتیجہ ہے بلکہ ہر چیز جو اس کے وجود کی طرف رہنمائی کرتی ہے اسی نے اس میں رہنمائی کا جوہر پیدا کیا ہے چنانچہ ضمیر و وجدان کی شہادت سے اسے پہچانا تو ضمیر و وجدان کی دولت اسی کی دی ہوئی ہے اگر عقل کے ذریعہ پہچانا تو یہ عقل اسی کا عطیہ ہے۔ انبیاء و آئمہ کے ذریعہ پہچانا تو انبیاء و آئمہ اسی کے فرستادہ و مقرر کردہ ہیں اگر کسی دلیل پر بنا کرتے ہوئے اس کی معرفت حاصل کی تو دلیل کی طرف رہنمائی کرنے والا وہی ہے۔ اگر خداوند عالم نے انسان میں قوائے فکری و عقلی ودیعت نہ کئے ہوتے تو وہ علت و معلول کے ربط کو نہ سمجھ سکتا اور نتیجۃً علۃ العلل یعنی خدا کے وجود پر دلیل قائم کرنے سے قاصر رہتا چنانچہ حضرت ابراہیم نے چاند سورج اور زہرہ کے طلوع و غروب سے جو اس کے وجود پر استدلال کیا اور اپنے کو مشرکین کی صف سے علیحدہ قرار دیا تو یہ اسی کی تعلیم و رہبری کا نتیجہ تھا۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

و تلک حجتنا آتینا ھا ابراھیم علی قومہ

یہ ہماری سجھائی بجھائی ہوئی دلیلیں ہیں جو ہم نے ابراہیم کو اپنی قوم پر حجت تمام کرنے کیلئے عطا کی ہیں۔

غرض جس چیز سے بھی اس کے وجود پر استدلال کیا جائے گا۔ وہ اپنے وجود میں اس کی محتاج اور اس کی ذات پر منتہی ہوگی۔ جب خود اس کی ذات اپنی ذات کی طرف رہنمائی کرتی ہے تو اسے اپنے وجود کے ثبوت میں ذات سے خارج کسی چیز کی احتیاج نہ ہوگی چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

اولم یکف بربک انہ علی کل شئ شھید

کیا تمہارا پروردگار اس کے لئے کافی نہیں کہ وہ ہر چیز پر گواہ ہے۔

اگرچہ اہلِ نظر کا طریقہ یہ ہے کہ وہ مخلوقات سے خالق کے وجود پر دلیل قائم کرتے ہیں اور اس میں کوئی شبہ بھی نہیں کہ ہر مصنوع صانع کے وجود پر ایک محکم برہان ہے مگر اہلِ عرفان کی بلند نگاہی اس پر اکتفاء نہیں کرتی اور

وہ مخلوقات سے خالق کے وجود پر استدلال کرنے کے بجائے خالق کو خالق کے وجود کا آئینہ سمجھتے ہیں اور اسی سے اسکی ذات کا عرفان حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ امیرالمومنین فرماتے ہیں۔

اعرفوا اللہ باللہ (توحید وصدوق) اللہ کو اللہ کے ذریعے پہچانو۔

حضرت خود بھی اس بلند مرتبہ معرفت پر فائز تھے چنانچہ ایک شخص نے آپ سے پوچھا کہ آپ نے کس چیز سے اللہ کو پہچانا فرمایا بما عرفنی نفسہ "اس چیز سے جس چیز سے خود اس نے اپنے کو پہچنوایا" پھر پوچھا کہ اس نے کیونکر پہچنوایا' فرمایا۔

لا تشبھہ صورۃ ولا یحس بالحواس ولا یقاس بالناس قریب فی بعدہ وبعید فی قربہ (توحید صدوق)

کوئی صورت اس کے مشابہ نہیں نہ حواس سے اسے معلوم کیا جا سکتا ہے اور نہ انسانوں پر اس کا قیاس ہو سکتا ہے وہ فہم وادراک سے دور ہونے کے باوجود قریب ہے اور قریب ہونے کے باوجود دور ہے۔

ایک مرتبہ جاثلیق مسیحیوں کے ایک گروہ کے ساتھ مدینہ آیا اور حضرت سے پوچھا کہ آپ نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ذریعہ اللہ کو پہچانا ہے یا اللہ کے ذریعہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ) کو پہچانا ہے فرمایا۔

ما عرفت اللہ بمحمد ولکن عرفت محمدا باللہ عزوجل (توحید صدوق)

میں نے خدا کو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ) کے ذریعے نہیں پہچانا بلکہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ) کو خدائے بزرگ و برتر کے ذریعہ پہچانا ہے۔

نظریہ مادیین اور اس کا رد

نظریہ مادیین کی رد میں امیرالمومنین کا ارشاد ہے۔

لم یخلق الاشیاء من اصول ازلیۃ ولا من اوائل کانت قبلہ ابدیۃ بل خلق ما خلق واتقن خلقہ وصور ما صور فاحسن صورتہ (توحید صدوق)

خداوند عالم نے اشیاء کو بنیادی اجزاء اور مادی عناصر سے جو ازلی و ابدی ہوں خلق نہیں کیا بلکہ جو چیز پیدا کی خود پیدا کی اور اس کی خلقت کو استحکام بخشا اور جس چیز کی صورت گری کی احسن طریقہ پر کی۔

اس جہان رنگ وبو میں جہاں خدا کے ماننے والے چلے آرہے ہیں وہاں منکرین خدا کا بھی ایک گروہ موجود رہا ہے۔ یہ گروہ مادیین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان مادیین کے ایک گروہ کا نظریہ یہ ہے کہ مادہ قدیم ہے اور اپنے وجود میں خالق سے بے نیاز ہے۔ البتہ وہ ہستی جسے خدا کہا جاتا ہے اس نے مادہ میں حرکت وصورت ودیعت کی ہے اور مادہ خود ہی قانون علیت کے ماتحت خلق کا سلسلہ جاری کئے ہوئے ہے اور ایک گروہ کا نظریہ یہ ہے کہ حرکت مادہ کا دائمی خاصہ ہے لہٰذا کسی ہستی کو جو محرک وصورت گر ہو ماننے کی ضرورت نہیں ہے پہلا گروہ اگرچہ خدا کو تحریک کی

ضرورت کے پیش نظر مانتا ہے مگر اسے معطل و بے کار سمجھتا ہے جو نہ ماننے کے برابر ہے اور دوسرا گروہ سرے سے خدا کے وجود اور اس کی ضرورت کا قائل ہی نہیں ہے۔ قرآن کریم ان کے نظریہ کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتا ہے۔

قالوا ما هي الا حياتنا الدنيا نموت و نحيي و ما يهلكنا الا الدهر۔

وہ کہتے ہیں یہی دنیوی زندگی ہماری زندگی ہے یہیں مرتے اور یہیں جیتے ہیں اور زمانہ ہی ہمیں موت کے گھاٹ اتارتا ہے۔

مادیین کے انکار کی بنیاد کسی دلیل و برہان پر نہیں ہے بلکہ انکار کے جواز میں یہ کہا جاتا ہے کہ خدا نہ مشاہدہ میں آیا ہے نہ تجربہ نے اسے ثابت کیا ہے اور نہ عقل ہی اس کے ماننے پر مجبور کرتی ہے پھر ایک موہوم ہستی کو کیوں مانا جائے۔ ان کے نزدیک تمام موجودات کی تخلیق مادہ سے ہوئی ہے جو ازل سے چلا آ رہا ہے جس میں گھٹاؤ ہوتا ہے نہ بڑھاؤ وہ خود سے ہے اور خود ہی اپنے سانچے بناتا اور ان میں ڈھلتا رہتا ہے جیسے پانی کہ کبھی سیال ہے کبھی منجمد اور کبھی گیس چیز ایک ہی ہے صرف نام اور صورتیں بدلتی رہتی ہیں۔

نظریۂ مادیین کے ابطال سے پہلے مادہ پر ایک نظر کرنے کی ضرورت ہے کہ مادہ ہے کیا یہ تو کسی نے نہیں بتایا اور نہ بتا سکتا ہے کہ مادہ کی اصل حقیقت کیا ہے جو کچھ بتایا گیا ہے وہ صرف مادہ کے خواص ہیں چنانچہ جو چیز جگہ گھیرتی وزن رکھتی اور حواس پنجگانہ میں سے کسی حاسہ سے محسوس ہوتی ہے اسے مادہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مادہ کے اجزائے ترکیبی کو عناصر اور اس کی چھوٹی سے چھوٹی اکائی کو جس میں مادہ کے تمام خواص موجود ہوتے ہیں سالمہ کہا جاتا ہے اور عنصر کا وہ آخری ذرّہ جس کی مزید تقسیم کی جائے تو وہ اپنے خواص عنصری پر باقی نہ رہے جوہر کہلاتا ہے چنانچہ پانی کی وہ اکائی جو مزید تقسیم کے بعد پانی نہ رہے پانی کا سالمہ ہوگی اور اس کے اجزائے ترکیبی آکسیجن اور ہائیڈروجن کا آخری ذرّہ جو مزید تقسیم کے بعد آکسیجن یا ہائیڈروجن نہ رہے جوہر ہوگا۔ ان سالموں کو جو پانی کے ایک قطرہ میں لاکھوں کی تعداد میں اور جوہروں کو جو ایک انچ کے ستر کروڑویں حصّہ سے بھی چھوٹے ہوتے ہیں بڑی سے بڑی طاقتور خوردبین سے بھی دیکھا نہیں جا سکتا۔

ان غیر مرئی ذرّات کا تصوّر سب سے پہلے ایک یونانی مفکّر دیمقراطیس (۴۶۰ - ۳۷۰ ق م) نے پیش کیا اور اسے ایٹم کا نام دیا جس کے معنی ناقابلِ تقسیم جزو کے ہیں۔ دوسرے حکماء و فلاسفہ بھی اسے ناقابل تقسیم و تحلیل سمجھتے تھے اس لئے اسے جزو لایتجزیٰ کہتے تھے لیکن اب جوہر کو ناقابلِ تقسیم نہیں سمجھا جاتا بلکہ اسے توڑا جا چکا ہے چنانچہ اس میں متعدد برقی ذرات دریافت ہو چکے ہیں جن میں مثبت برقیہ (پروٹون) منفی برقیہ (الیکٹرون) اور تعدیلی ذرّہ (نیوٹرون) کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ پروٹون اور نیوٹرون مرکز میں ایک جگہ پر مرتکز ہوتے ہیں اور الیکٹرون، پروٹون کے گرد برقی کشش سے اس طرح گردش کرتا ہے جس طرح سورج کے گرد سیارے مادہ ان ذرّوں کے سوا کچھ نہیں ہے جو جوہری اجزاء میں شعاعی صورت میں پائے جاتے ہیں۔ یہ شعاعیں انرجی (توانائی) کہلاتی ہیں اور انہی کی کیمیاوی ترکیب سے مادہ کی تشکیل ہوتی ہے اسی لئے کہا جاتا ہے کہ مادہ اور توانائی ایک دوسرے کی مختلف شکلیں ہیں۔ اگر یہ شعاعیں آزاد ہوں تو برقی پارے

ہیں اور نہ در نہ ہوں تو مادہ ہے ۔

سائنس دانوں کا نظریہ ہے کہ ابتداء میں صرف انرجی (توانائی) تھی جو تہ بر تہ ہو کر مادہ کی صورت میں تبدیل ہوگئی اور مادیین کے نزدیک انہی مادی ذرات کے میل جول اور تدریجی ارتقاء سے یہ کائنات وجود میں آئی ہے چنانچہ ابتداء میں مادہ گیس کی صورت میں تھا اس گیس سے سحابیوں کی تشکیل ہوئی سحابیوں سے ستارے بنے اور ستاروں سے سیاروں نے جنم لیا۔ اسی طرح دنیا کی دوسری چیزیں مادہ کے تحول و انقلاب سے بنتی بگڑتی رہتی ہیں۔ ان تمام چیزوں کا مادۂ خلقت ایک ہے ان میں رنگ خاصیت نرمی سختی وغیرہ کے اعتبار سے جو تفاوت نظر آتا ہے وہ ان کے جوہروں کی کمی بیشی کی بنا پر ہوتا ہے

مادیین اور قائلین خدا دونوں مادی ذرات کو مادی اشیاء کی علت مادیہ سمجھتے ہیں جس طرح زیور کے لیے سونا اور تخت کے لئے لکڑی فرق یہ ہے کہ مادیین علت مادیہ ہی کو علت فاعلیہ قرار دیتے ہیں اس طرح کہ مادہ خود ہی مختلف شکلیں اختیار کرتا رہتا ہے اور قائلین خدا علت مادیہ کو علت فاعلیہ کا درجہ نہیں دیتے بلکہ ایک قادر مطلق ہستی کو مادہ و مادی اشیاء کا خالق و موجد سمجھتے ہیں۔

سائنس کے اس نظریہ سے بھی اتفاق کیا جاسکتا ہے کہ ابتداء میں صرف برقی شعاعیں تھیں جن کی ترکیب و ترتیب سے مادہ کی تشکیل ہوئی بلکہ اس کی تائید امیرالمومنین کے بعض اقوال سے بھی ہوتی ہے چنانچہ آپ کا ارشاد ہے۔

اول ما خلق اللہ النور (بحار ج ۴ اص ۲۴۲)　　خدا نے سب سے پہلے نور کو پیدا کیا۔

اور یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ جوہر کو شکست در یخت اور تحلیل و تجزیہ سے برقی شعاعوں کی طرف منتقل کیا جاسکتا ہے۔ حضرت نے ان برقی شعاعوں کے انکشاف سے پہلے اپنے علم موہبی سے ان برقیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

لو شئت لجعلت الماء نورا　　اگر میں چاہوں تو پانی کو نوری شعاعوں میں بدل دوں۔

اس مقام پر پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب مادیین علم کو حواس کے دائرہ میں محدود سمجھتے ہیں اور صرف اسی چیز کا اعتراف کرتے ہیں جو محسوس و مرئی ہو تو انہیں مادہ کی ان برقی شعاعوں کا علم کیونکر ہوا جبکہ وہ غیر مرئی اور حواس کی گرفت سے بالاتر ہیں۔ اگر وہ یہ کہیں کہ ان کے خواص و آثار ان کے ماننے پر مجبور کرتے ہیں اگرچہ وہ آنکھ سے دیکھی اور حواس سے جانی نہیں جاسکتیں تو جب انہوں نے خواص و آثار سے غیر مرئی برقیوں کے وجود کو تسلیم کیا ہے تو اس کائنات میں ہر سو بکھرے ہوئے آثار سے خالق کائنات کے وجود کا اعتراف کیوں نہیں کرتے جبکہ یہ عقل کا قطعی فیصلہ ہے کہ کوئی چیز خود اپنے وجود کی خالق نہیں ہوسکتی بلکہ ہر معلول علت سے وابستہ اور ہر اثر موثر کی کارفرمائی کا نتیجہ ہوتا ہے۔

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان برقی شعاعوں میں مثبت برق (پروٹون) پہلے وجود میں آئی یا منفی برق (الیکٹرون) اگر مثبت برق پہلے وجود میں آئی تو اسے منفی برق کی احتیاج کا احساس کیونکر ہوا کہ اس نے منفی برق کو ایجاد کیا اور اگر منفی برق پہلے وجود میں آئی تو اسے یہ احساس کیونکر ہوا کہ اسے اپنے نظام کو متوازن رکھنے کے لئے مثبت برق کی ضرورت ہے جب کوئی چیز خود اپنے اجزاء کی خالق نہیں ہوسکتی تو مادہ اپنے اجزائے ترکیبی کا موجد کیونکر ہوسکتا ہے لہذا یہ اعتراف

کرنا پڑے گا کہ ایک حکیم و مدبر ذات ہے جس نے دو مختلف و متضاد چیزوں میں نظم و ترتیب اور توافق و ہم آہنگی پیدا کی ہے۔

مادیین کے نظریہ کی بنیاد مادہ کی قدامت اور اس کی حرکت پر ہے۔ مادہ کے قدیم و ازلی ہونے کی ان کے پاس اس کے علاوہ کوئی دلیل نہیں کہ مادہ ہمیشہ سے یونہی چلا آ رہا ہے اور کسی نے اسے عدم سے وجود میں آتے نہیں دیکھا لہٰذا جب تخریب و تعمیر کا سلسلہ ہمیشہ سے جاری و ساری ہے اور مادہ خود ہی مختلف روپ دھارتا اور مختلف شکلیں بدلتا رہتا ہے۔ نہ اس کا کوئی نقطۂ آغاز تجویز کیا جا سکا ہے اور نہ اس کے پیچھے کسی کا ہاتھ کارفرما نظر آیا ہے تو اسے قدیم ہی ماننا جائے گا۔ مادیین کی اس دلیل کا جواب تو اتنا ہی کافی ہے کہ اگر انہوں نے مادہ کو عدم سے وجود میں آتے نہیں دیکھا تو اس کی قدامت و ازلیت کا کب مشاہدہ کیا ہے جب حدوث و قدم دونوں مشاہدہ کے حدود سے باہر ہیں تو انہیں ان میں کسی ایک کا قطعی فیصلہ نہ کرنا چاہیئے تھا جبکہ مادہ کی قدامت کا نظریہ کسی صورت میں عقل و منطق سے سازگار نہیں ہے کیونکہ مادہ کی حرکت جس کے زیر اثر مادی ذرات ایک صورت سے دوسری صورت میں منتقل ہوتے اور متفرق و مجتمع ہو کر مختلف شکلیں بدلتے ہیں اس کے حدوث کی واضح دلیل ہے اس لئے کہ حرکت عرض حادث ہے اور اجتماع و افتراق کی صورتیں بھی حادث ہیں جب حرکت اور اتصال و انفصال اور تغیر و تبدل کی سب صورتیں اعراض حادثہ ہیں تو جس پر یہ اعراض طاری ہوں گے وہ بھی حادث ہوگا اس لئے کہ اعراض حادثہ اعیانِ حادثہ ہی پر طاری ہو سکتے ہیں لہٰذا مادہ محل حوادث ہونے کی وجہ سے نہ قدیم ہو سکتا ہے اور نہ مبداء کائنات قرار پا سکتا ہے۔

مادیین کے نزدیک مادہ حیات و شعور سے خالی اور فکری و شعوری اعمال سے عاری ہے مگر موجودات عالم میں ذی حیات بھی ہیں اور غیر ذی حیات بھی ذی شعور بھی ہیں اور غیر ذی شعور بھی ایک ذی عقل انسان یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ حیات و شعور کا سرچشمہ کہاں سے پھوٹا کس نے یہ زندگی دی اور کس نے یہ شعور بخشا۔ مادہ تو زندگی و شعور کا خالق ہو نہیں سکتا اس لئے کہ جو خود حیات و شعور سے محروم ہو وہ دوسرے کو حیات و شعور کہاں سے دے گا اور کسی غیر ذی حیات کو ذی حیات کا اور کسی غیر ذی ادراک کو ذی ادراک کا خالق مانا نہیں جا سکتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ حیات و شعور مادی اجزاء کی ترتیب کا نتیجہ ہیں جس طرح آٹومیٹک گھڑی کے پرزوں کی ترتیب سے گھڑی میں حرکت پیدا ہوتی ہے اسی طرح مادی اجزاء کی مخصوص ترتیب سے حس و حرکت پیدا ہو جاتی ہے تو یہ بھی صحیح نہیں ہے اس لئے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ زندہ انسان اور مُردہ انسان میں ترتیب مادی کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے مگر ایک میں حیات و شعور ہے اور دوسرے میں حیات و شعور نہیں ہے اگر حیات و شعور مادی ترتیب ہی کا نتیجہ ہوتا تو دونوں میں یکساں زندگی بھی ہونا چاہیئے تھی اور شعور بھی اور جب ایسا نہیں ہے تو ایک ایسا مبداء شعور و حیات ماننا ناگزیر ہوگا جو حیات و ادراک بھی رکھتا ہو اور قدیم و ازلی بھی ہو اور وہ ذات خداوندی ہے جو حی و مدرک بھی ہے اور قدیم و ازلی بھی۔

کائنات کے اجزاء میں توافق و ہم آہنگی اور مقصد کی کارفرمائی بھی اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ یہ کائنات ایک علم و ادراک اور ارادہ و قدرت کی مالک ہستی کی تخلیق کا نتیجہ ہے چنانچہ اس کارگاہِ عالم پر نظر کی جاتی ہے تو ہر شے دوسری شے سے اس طرح وابستہ نظر آتی ہے جس طرح زنجیر کی کڑیاں ایک دوسرے سے وابستہ و مرتبط ہوتی ہیں جب سطح سمندر

پر دھوپ پڑتی ہے تو بخارات وجود میں آتے ہیں اور بخارات کے ٹکڑے مل کر بادل کی شکل میں فضا پر چھا جاتے ہیں اور پھر موسلادھار برسنے لگتے ہیں جس سے زمین کی سیرابی اور دانہ کی روئیدگی کا سامان ہوتا ہے اس کے ساتھ زمین کی زرخیزی بیج کی استعداد آفتاب کی حرارت موسم کی اثر آفرینی اور ہوا کے جھونکے اپنے اپنے مقام پر ایک لگے بندھے قانون کے اندر شریک عمل ہوتے ہیں۔ اس نظم وضبط کو دیکھ کر مادہ کے منتشر ذرات کے اتفاقی اجتماع کو کائنات کا خالق قرار نہیں دیا جاسکتا۔ کیونکہ اتفاق کسی نظم و قانون کا پابند نہیں ہوتا اور نہ اس میں تسلسل و دوام پایا جاتا ہے لہٰذا جو چیز ہمیشہ ایک نہج سے ظہور میں آئے اسے اتفاق پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔ کیا یہ اتفاق کا کرشمہ ہے کہ ہمیشہ بہار کے موسم میں پتیاں پھوٹیں اور پھول کھلیں اور ہر پھول کی پتیاں طاق رہیں۔ موتی سیپیوں میں پیدا ہوں اور سیپیاں سمندر کی گہرائی میں پائی جائیں مچھلیاں پانی میں زندہ رہیں اور پرندے فضاؤں میں اڑیں۔ سورج مشرق سے طلوع ہو اور مغرب کی سمت غروب ہو۔ چاند مقررہ تاریخوں میں گھٹے بڑھے۔ سورج اور چاند گرہن معینہ دستور کے ماتحت لگے اور تمام کرے اور سیارے ہمیشہ اس رفتار سے اپنے مدار میں رواں دواں رہیں جو نظم کائنات اور نباتی و حیوانی زندگی کے لئے ضروری ہے چنانچہ زمین چوبیس گھنٹوں میں ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اپنے گرد چکر کاٹتی ہے اگر یہ رفتار ہزار میل کی بجائے سو میل رہ جائے تو شب و روز کا طول دس گنا زائد ہو جائے یعنی ۱۲۰ گھنٹے کا دن اور ۱۲۰ گھنٹے کی رات اس کے نتیجے میں دن اتنے گرم ہو جائیں کہ تمام نباتات جل جائیں اور راتیں اتنی ٹھنڈی ہو جائیں کہ ہر چیز منجمد ہو کر رہ جائے۔ اتفاق بہر حال اتفاق ہوتا ہے اس میں کسی نظم و ترتیب کی پابندی کا تصوّر نہیں کیا جاسکتا۔ اگر یہ سب کچھ اتفاق کی کرشمہ کاری ہے تو ہمیشہ ایک سا اتفاق کیوں ہوتا ہے اس چیز کو دیکھتے ہوئے کہ دنیا کی ہر چیز میں نظم و یک رنگی پائی جاتی ہے اور موجودات وہ ارضی اجسام ہوں یا فلکی اجرام سالمات ہوں یا جواہر مثبت برقئے ہوں یا منفی مقررہ حدود سے بال برابر ادھر سے اُدھر نہیں ہوتے یہ اعتراف ناگزیر ہو جاتا ہے کہ اس نظام کو چلانے والی کوئی مدبر و حکیم ہستی موجود ہے اسے بے شعور مادہ کی غیر ارادی حرکت کا نتیجہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اس نظم و ترتیب کے ساتھ جب اس چیز پر نظر کی جاتی ہے کہ ہر مخلوق میں وہی چیزیں ودیعت کی گئی ہیں جو اسکی نوع کے اعتبار سے ضروری اور اس کی زندگی و بقا کے لئے لازمی ہیں تو یہ تصوّر بھی نہیں کیا جاسکتا کہ یہ کسی غیر شعوری حرکت کا نتیجہ ہو سکتا ہے چنانچہ مچھلی میں گلپھڑے پیدا کئے گئے تاکہ وہ پانی کے اندر سانس لے سکے، پرندوں کو پَر دیئے گئے تاکہ وہ پرواز کر سکیں انسان کے جوڑوں میں لچک رکھی گئی تاکہ اسے اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے میں آسانی ہو درختوں میں رگ و ریشہ کے جال بچھائے گئے تاکہ ہر حصّہ میں غذا پہنچ سکے۔ کار و کسب اور . . . . . . آرام و راحت کے اوقات کا لحاظ کرتے ہوئے سورج کی روشنی تیز اور چاند کی روشنی دھیمی رکھی گئی غرض دنیا کی ہر چیز میں کوئی نہ کوئی مصلحت اور کوئی نہ کوئی مقصد کارفرما نظر آتا ہے اس سے ہر انسان یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ مادہ جو عدم شعور کی بنا پر مقصد کا پابند نہیں ہو سکتا اس بامقصد تخلیق کا خالق نہیں ہے بلکہ یہ مادہ کی بے معنی و بے مقصد کارفرمائی کے بجائے ایک علیم و حکیم ذات کی حکمت آفرینی کا کرشمہ ہے جس نے ہر چیز میں ترتیب تناسب اور مقصد کو

ملحوظ رکھا ہے۔

عقل و ادراک کی نارسائی

خدا کی کنہ حقیقت تک عقل کی نارسائی کے سلسلہ میں امیر المومنین کا ارشاد ہے۔

الحمد للہ الذی اعجز الاوھام ان تنال الا وجودہ و حجب العقول عن ان تتخیل ذاتہ فی امتناعھا من الشبھۃ والشکل (توحید صدوق)

تمام ستائش اس اللہ کے لئے ہے جس نے افکار و اوہام کو درماندہ کر دیا کہ وہ اس کے اصل وجود کے علاوہ اس کی حقیقت کو پاسکیں اور عقلوں کو اپنی ذات کے ادراک سے روک دیا ہے کیونکہ وہ شکل و شباہت سے بلند تر ہے۔

خالق کائنات کی کنہ حقیقت کا ادراک انسان کے دائرہ امکان سے باہر ہے خواہ وہ بالغ نظر اور علم و حکمت کی بلندیوں پر فائز کیوں نہ ہو اس لئے کہ انسان خود بھی محدود ہے اور اس کی فکری پرواز بھی محدود ہے اور خداوند عالم غیر محدود ہے جس کی نہ ابتداء ہے اور نہ انتہا اور محدود کسی صورت میں غیر محدود کا احاطہ نہیں کر سکتا کہ اس کی کنہ ذات تک رسائی کر سکے اور غیب الغیوب کے پردوں کو اٹھا کر حقیقت واقعیہ کی نقاب کشائی کرے۔ جب ایک نقش اپنے نقاش کو نہیں سمجھ سکتا حالانکہ وہ دوسروں کی بنی ہوئی چیزوں کاغذ رنگ اور مو باف کی مدد سے چند لکیروں کو ترتیب دے کر اسے ایک مخصوص شکل دیتا ہے تو انسان اس صانع و صورت گر کی کنہ حقیقت کو کیونکر جان سکتا ہے جس نے بغیر کسی نمونہ و مثال کے شکم مادر کی تاریکیوں میں اس کی نقش آرائی کی ہو۔ انسان تو اپنی ذات سے بھی تماماً وکمالاً آگاہ نہیں ہے چنانچہ آج تک کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکا کہ وہ مادہ روح اور حیات کی حقیقت کو سمجھ چکا ہے تو مادہ کے موجد اور روح و حیات کے خالق کی کنہ حقیقت کو کیا سمجھ سکتا ہے جبکہ وہ نہ زمان و مکان کی حدوں میں سما سکتا ہے نہ حواس کی گرفت میں آسکتا ہے۔ اور نہ اس کی کوئی مثل و شبیہ ہے۔ عام انسانوں کا تو ذکر ہی کیا انبیاء و اوصیاء بھی کمال معرفت کے باوجود اس کی کنہ ذات کے ادراک سے عجز کا اعتراف کرتے نظر آتے ہیں چنانچہ امیر المومنین کا ارشاد ہے۔

یا من لا یعلم ما ھو الا ھو — اے وہ ذات جسے اس کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں جانتا۔

عقل انسانی کی پرواز یہیں تک ہے کہ وہ مصنوع سے صانع اور آثار سے خالق کائنات کی طرف رہنمائی کرے کیونکہ یہ آثار اس کے وجود اور اس کے صفات کمالیہ علم و قدرت وغیرہ پر برہان ناطق کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہی آثار و اعمال سے انبیاء و رسل اس کے وجود پر استدلال کرتے اور خدا پرستی کی دعوت دیتے تھے چنانچہ جب فرعون نے حضرت موسیٰ سے پوچھا کہ فمن ربکما یا موسیٰ "اے موسیٰ تم دونوں کا پروردگار کون ہے" تو حضرت موسیٰ نے کہا۔

ربنا الذی اعطی کل شیء خلقہ ثم ھدی

ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر شے کی اس کے مناسب حال صورت گری کی پھر زندگی بسر کرنے کے طریقوں کی طرف رہنمائی فرمائی۔

فرعون نے تو رب کے بارے میں پوچھا تھا اس کے آثار و افعال کے بارے میں دریافت نہیں کیا تھا مگر حضرت موسیٰ اس کی ذات کے متعلق کچھ نہیں کہتے بلکہ ہر مخلوق کی جسمانی و ذہنی ساخت اور فطری و وجدانی رہبری کو جو قدرت کا عطیہ ہے اس کے وجود پر بطور شاہد پیش کرتے ہیں اور یوں اسے متوجہ کرتے ہیں کہ اللہ کی ذات کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جاسکتا اگر کچھ کہا جاسکتا ہے تو اسی کے آثار و اعمال کے بارے میں اور یہی مظاہر و آثار اس کی ہستی کا ناقابلِ انکار ثبوت ہیں۔

خدا کے صفات عین ذات ہیں

ذات و صفات کی وحدت کے سلسلہ میں امیرالمومنین کا ارشاد ہے۔

وکمال الاخلاص لہ نفی الصفات	کمال تنزیہ و اخلاص یہ ہے کہ اس سے صفتوں کی نفی کی جائے
عنہ لشہادۃ کل صفۃ انہا غیر الموصوف	کیونکہ ہر صفت شاہد ہے کہ وہ اپنے موصوف کی غیر ہے اور ہر
وشہادۃ کل موصوف انہ غیر الصفۃ	موصوف شاہد ہے کہ وہ صفت کے علاوہ کوئی چیز ہے۔

انسان کے صفات اس کی ذات سے جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو تمام انسان صفات کے اعتبار سے یکساں نظر آئیں۔ حالانکہ ان میں عالم بھی ہوتے ہیں اور جاہل بھی قادر و توانا بھی ہوتے ہیں اور عاجز و کمزور بھی، کیونکہ بعض میں علم و قدرت کی صفت پائی جاتی ہے اور بعض اس صفت سے عاری ہوتے ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوا کہ انسان کی ذات بحیثیت ذات علم و قدرت نہیں رکھتی بلکہ یہ صفتیں خارج سے اس میں آتی ہیں۔ اس کی ذات الگ ہے اور اس کے یہ صفات الگ ہیں اگر خدا کو بھی ایسا ہی مان لیا جائے کہ وہ اپنے کمالات کے اظہار میں صفات کا محتاج ہے تو ذات بحیثیت ذات کمالات کی حامل نہ رہے گی بلکہ صفات کی دست نگر قرار پائے گی حالانکہ وہ ہر لحاظ سے بے نیاز اور احتیاج سے بری ہے۔ اس کے علاوہ ذات کے ساتھ صفت تجویز کرنے سے دوئی کی جھلک پیدا ہو جائے گی کیونکہ مفہوم کے اعتبار سے صفت و موصوف میں مغایرت و بیگانگی ہوتی ہے صفت کا تقاضا ہی یہ ہے کہ وہ موصوف سے ایک الگ شئے ہو اور موصوف ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ صفت سے جداگانہ چیز ہو لہٰذا جب اسے صفت سے موصوف مانا جائے گا......

.... تو ذات کے ساتھ ایک اور چیز کو بھی ماننا ہوگا جو زائد بر ذات ہے اور جب اس کے ساتھ اور چیز کو بھی مانا تو وحدت حقیقیہ ختم ہو جائے گی اور جتنی صفتیں مانی جائیں گی اتنے زوائد اور ماننا ہوں گے۔ اگر یہ زوائد بھی ذات کی طرح قدیم ہوں گے تو جتنی صفتیں مانی جائیں گی اتنے قدیم اور ماننا پڑیں گے اور اگر یہ زوائد حادث ہیں تو ان کے وجود میں آنے سے پہلے وہ علم و قدرت سے عاری اور دوسرے صفات سے خالی قرار پائے گا اور یہ دونوں چیزیں بنیادی طور پر غلط ہیں غرض اس کے صفات کما لیہ اس کی ذات سے علیحدہ کوئی چیز نہیں ہیں اور وہ اسی طرح عین ذات ہیں جس طرح انسان کے لئے انسانیت عین ذات ہے بایں معنی کہ انسانیت ہی عین انسان ہے اسی طرح صفات باری عین ذاتِ باری ہیں اور اس سے الگ کوئی شئے نہیں ہیں۔

الفاظ صفاتِ باری کی تعبیر سے قاصر ہیں

امیرالمومنین کا ارشاد ہے۔

لیس لصفته حد محدود ولا نعت موجود اس کے کمال ذات کی کوئی حد معین نہیں اور نہ اس کیلئے توصیفی الفاظ ہیں۔

خداوند عالم کے صفات الفاظ میں ڈھل نہیں سکتے اور نہ لفظوں کے ذریعے ان کی حقیقت تک رسائی ممکن ہے اس لئے کہ الفاظ انسان کے وضع کردہ ہیں اور وہ انہی چیزوں کے لئے الفاظ بناتا اور وضع کرتا ہے جو اس کے علم و مشاہدہ میں آتی ہیں یا ان معانی و مفاہیم کے لئے جن کا شعور و ادراک اسے ہو سکتا ہے اور جو چیز انسانی فہم و ادراک سے بلند تر ہو اس کے لئے کوئی لفظ بھی وضع نہیں کی جا سکتی۔ آخر وہ کس چیز کے مقابلہ میں لفظ وضع کرے گا جبکہ وہ چیز نہ اس کی نظر سے گزری ہے اور نہ تنگنائے ذہن میں سما سکتی ہے البتہ جب اس نے زمین و آسمان اور وسیع کائنات پر نظر کی اور اس سے خالق کے وجود کا پتہ لگایا اور اس خلق کائنات سے یہ بھی جانا کہ خالق و وجود بخش عالم وہی ہو سکتا ہے جو بے خبر عاجز اور زندگی سے عاری نہ ہو تو ان منفی صفات کو علم قدرت اور حیات سے تعبیر کیا گیا یہ الفاظ چونکہ توصیفی معنی کے لئے وضع کئے گئے ہیں اور صفت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے موصوف کے مغایر ہو تو جہاں ذات الگ اور صفت الگ ہو گی وہاں تو یہ الفاظ اپنے معانی پر منطبق ہوں گے اور جہاں ذات وصفات میں امتیاز و علیحدگی نہ ہو بلکہ جو ذات ہو وہی صفت ہو اور جو صفت ہو وہی ذات ہو وہاں یہ الفاظ واقعی مفہوم کے ادا کرنے سے قاصر رہیں گے اگرچہ اسے عالم قادر اور حی کہا جاتا ہے مگر صفت بحیثیت صفت اس میں نہیں ہو سکتی بلکہ علم قدرت حیات اور ارادہ کے آثار دیکھے گئے تو اسے قادر حی اور مرید کے لفظوں سے یاد کیا اور انہی آثار کی بنا پر اسے صفات سے متصف مانا گیا۔ ان صفتوں کو صفات ثبوتیہ کا نام دیا گیا ہے مگر درحقیقت ان صفات کے ذریعے ان صفات کے اضداد کی نفی کرنا مقصود ہوتی ہے چنانچہ علم سے نفی جہل قدرت سے نفی عجز غنا و بے نیازی سے نفی احتیاج عدل سے نفی ظلم اور حیات سے نفی موت کی جاتی ہے اسی طرح اسے موجود کہا جاتا ہے تو اس معنی سے کہ وہ معدوم نہیں ہے اور واجب الوجود کہا جاتا ہے تو اس معنی سے کہ وہ ممکن الوجود نہیں ہے تاکہ سلب نقائص سے اس کے کمال ذات کی ایک حد تک نشاندہی کی جا سکے۔ چنانچہ امیرالمومنین نے اس مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

ان قیل کان فعلی تاویل الازلیۃ — اگر یہ کہا جائے کہ وہ تھا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ عدم

وان قیل لم یزل فعلی تاویل نفی العدم (توحید صدوق) — اس پر سابق نہیں ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ وہ ہمیشہ سے رہا ہے تو اس کے معنی عدم و نیستی کی نفی کے ہیں۔

صفات ثبوتیہ و سلبیہ

خداوند عالم کی ذات تمام صفات جمال و کمال سے آراستہ اور تمام عیوب و نقائص سے بری ہے ان صفات کی حد بندی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ اللہ کی ذات غیر محدود ہے اور یہ صفات اس کی ذات سے جداگانہ وجود نہیں رکھتے بلکہ اس کی ذات ہی ان صفات کا مبداء و منشا ہے لہٰذا

ہر وہ صفت جو جمال و کمال کی آئینہ دار اور اس کے شایان شان ہو وہ اس کے لئے ثابت ہو گی اور ہر وہ صفت جو نقص و حدوث کی مظہر ہو اس کے ساحت قدس سے الگ قرار دی جائے گی۔ اصطلاح متکلمین میں پہلی قسم کو صفات ثبوتیہ اور دوسری قسم کو صفات سلبیہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان صفات ثبوتیہ و سلبیہ میں سے چند نمایاں صفات ذکر کئے جاتے ہیں۔

علم باری

امیر المومنین کا ارشاد ہے۔

لا یعزب عنه عدد قطر الماء ولا نجوم السماء ولا سوافی الریح فی الهواء ولا دبیب النمل علی الصفا و مقیل الذر فی اللیلة الظلماء یعلم مسافط الاوراق وخفی طرف الاحداق
(نہج البلاغہ)

اس سے پانی کے قطروں اور آسمان کے ستاروں اور ہوا کے جھکڑوں کا شمار چکنے پتھر پر چیونٹی کے چلنے کی آواز اور اندھیری رات میں چھوٹی چیونٹیوں کے قیام کرنے کی جگہ کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔ وہ پتوں کے گرنے کی جگہوں اور آنکھ کے چوری چھپے اشاروں کو جانتا ہے۔

خداوند عالم کا علم ماکان و مایکون پر محیط ہے اور چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی کوئی چیز اس کے دائرہ علم سے خارج نہیں ہے وہ ہونٹ کی جنبشوں، چوری چھپے اشاروں اور دل میں گذرنے والے خیالات تک سے آگاہ ہے۔ جو شخص اللہ کو خالق عالم مانتا ہے وہ اسے عالم کائنات بھی تسلیم کرے گا اس لئے کہ جو کسی شئے کو جانتا ہی نہ ہو وہ اسے خلق نہیں کر سکتا۔ جب تمام عالم اس کا ایجاد کردہ ہے تو کون سی چیز اس کی نظروں سے اوجھل رہ سکتی ہے وہ ازل سے ہر چیز کا علم رکھتا ہے اس کا علم نہ معلومات کے تابع ہے اور نہ موجودات کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے کہ اشیائ موجود ہولیں تو وہ جانے بلکہ وہ ہر چیز کو اس کے موجود ہونے سے پہلے جانتا ہے اور اس پر طاری ہونے والے تطورات و کیفیات سے آگاہ ہے۔

امیر المومنین نے اس کے علم کی ہمہ گیری و وسعت پر روشنی ڈالنے کے لئے جزئیات کو بیان کیا ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ اس کا علم صرف کلیات میں منحصر نہیں ہے بلکہ تمام جزئیات کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اس سے ان فلاسفہ کی رد ہوتی ہے جن کا نظریہ یہ ہے کہ خدا کو جزئیات کا علم نہیں ہے اس لئے کہ جزئیات میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے اور جزئیات کے تغیر سے وہ محل حوادث قرار پائے گا۔ یہ نظریہ فلاسفہ کی غلط فہمی کا نتیجہ ہے اس لئے کہ جزئیات کے تغیر سے علم میں تغیر اس وقت لازم آتا ہے جب اسے ان تغیرات کا علم نہ ہو اور اگر تغیر و تبدل کی تمام صورتیں اس کے سامنے روشن ہوں تو یہ تغیر صرف معلومات میں ہو گا اور علم جو عین ذات ہے وہ اس سے متاثر نہیں ہو گا۔

علم الٰہی کے سلسلہ میں مسئلہ بدا بھی آتا ہے جو شیعی معتقدات میں سے ہے ایک گروہ نے فرقۂ امامیہ کی طرف یہ نسبت دی ہے کہ وہ بدا کے پردہ میں اللہ کے لئے جہل تجویز کرتا ہے۔ یہ غلط فہمی اس بنا پر ہوئی ہے کہ بدا کے لغوی معنی

کسی چیز کے مخفی ہونے کے بعد ظاہر ہونے کے ہیں اور اس سے یہ سمجھ لیا گیا کہ اللہ کو کسی امر میں غلطی کا احساس ہوتا ہے تو وہ اس میں تبدیلی کر دیتا ہے اور یہ غلطی جہل اور بے خبری ہی کی بنا پر ہوگی۔ فرقہ امامیہ کی طرف جہل باری کی نسبت سراسر غلط اور بے بنیاد ہے ان کے نزدیک نہ بدا کا یہ مفہوم ہے اور نہ اس معنی سے بدا کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف دی جا سکتی ہے بلکہ بدا کا مفہوم یہ ہے کہ جو چیز ہمارے لئے پردہ خفا میں تھی اس کا ظہور ہوا نہ یہ کہ اللہ پر کوئی چیز مخفی تھی اور وہ بعد میں اس پر ظاہر ہوئی۔ اگر ایسا ہو تو تمام اشیاء سے اس کی نسبت مساوی نہ رہے گی حالانکہ وہ اپنے عموم علم و قدرت کی بنا پر سب سے یکساں نسبت رکھتا ہے البتہ احوال و ظروف کے بدلنے یا اجرائے احکام کی مصلحت کے ختم ہونے سے جس طرح احکام میں ترمیم کر دیتا ہے جسے نسخ کہا جاتا ہے اسی طرح مصالح و مقتضیات کے بدلنے سے حوادث و تکوینیات میں بھی رد و بدل کرتا رہتا ہے اور ایسا نہیں ہے جیسا کہ یہود کا عقیدہ ہے کہ اللہ کو جو کرنا تھا وہ کر چکا اب اس کے ہاتھ بندھ چکے ہیں بلکہ وہ محو و اثبات پر اختیار تام رکھتا ہے چنانچہ جہاں محو کرنے میں مصلحت ہوتی ہے وہاں محو کر دیتا ہے اور جہاں ثبت کرنے میں مصلحت ہوتی ہے وہاں ثبت کر دیتا ہے اور رد و بدل کی یہ تمام صورتیں اس کے سامنے روشن ہوتی ہیں۔ اسی محو و اثبات کا نام بدا ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔

یمحو اللہ ما یشاء و یثبت وعندہ ام الکتاب	وہ جس چیز کو چاہتا ہے محو کر دیتا ہے اور جس چیز کو چاہتا ہے ثبت کر دیتا ہے اور اس کے پاس ام الکتاب (لوح محفوظ) ہے۔

اگر نسخ احکام سے جہل لازم نہیں آتا تو بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر تکوینیات میں رد و بدل ہو تو اسے نتیجۂ جہل قرار دے کر کسی کو مطعون کرنا تقاضائے دیانت و انصاف کے خلاف ہے۔

قدرتِ باری

حضرت نے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا ہے۔

وما الذی نری من خلقک ونعجب لہ من قدرتک ونصفہ من عظیم سلطانک وما تغیب عنا منہ وقصرت ابصارنا عنہ وانتہت عقولنا دونہ وحالت سواتر الغیوب بیننا و بینہ اعظم (نہج البلاغہ)	یہ تیری مخلوق کیا ہے جو ہم دیکھتے ہیں اور اس میں تیری قدرت کی کارسازیوں پر تعجب کرتے ہیں اور تیری عظیم فرمانروائی کی کارفرمائیوں پر توصیف کرتے ہیں حالانکہ وہ مخلوقات جو ہماری آنکھوں سے اوجھل ہے اور جس تک پہنچنے سے ہماری نظریں عاجز اور عقلیں درماندہ ہیں اور ہمارے اور جن کے درمیان غیب کے پردے حائل ہیں اس سے کہیں زیادہ باعظمت ہے۔

کائنات اور اس کی لا انتہاء وسعتیں اللہ کی قدرت بے پایاں کی شاہد ہیں اس لئے کہ یہ اسی کی تخلیق

ہے اور خلق و ایجاد ارادہ و اختیار سے وابستہ ہے اور ارادہ و اختیار قدرت کا منہ بولتا ثبوت ہے لہٰذا جو صانع و خالق ہوگا وہ صاحب ارادہ و اختیار بھی ہوگا' اور جو صاحب ارادہ و اختیار ہوگا وہ قادر و توانا بھی ہوگا۔ جب ایک مُردہ انسان سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ چلنے پھرنے لگے اور ایک نابینا سے یہ اُمید نہیں کی جاسکتی کہ وہ دیکھ سکے تو ایک عاجز و درماندہ سے یہ اُمید کیونکر کی جاسکتی ہے کہ وہ ایک ایسی کائنات ایجاد کر دے جس کی ایجاد پر وہ قدرت ہی نہ رکھتا ہو لہٰذا جب وہ خالق و صانع عالم ہے تو وہ خلق کائنات پر قدرت بھی رکھتا ہوگا۔ اگر اس نے قدرت و اختیار کے بغیر ہی ایسا عالم پیدا کر دیا جس کا کوئی نمونہ اس کے سامنے نہ تھا تو یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ وہ پروں کے بغیر پرواز کرتا آنکھوں کے بغیر دیکھتا اور کانوں کے بغیر سُنتا ہے کوئی بھی ذی شعور اس کے دعویٰ کو تسلیم نہ کرے گا اس لئے کہ اس میں اُڑنے دیکھنے اور سُننے کی طاقت ہی نہیں ہے جب بصارت و سماعت کی قوت کے بغیر دیکھا سُنا نہیں جاسکتا تو قدرت و اختیار کے بغیر یہ عالم کیونکر خلق کیا جاسکتا ہے جبکہ خلق قدرت کی کارفرمائی ہی کا نتیجہ ہوسکتا ہے بہر حال جو اسے خالق و صانع مانتا ہے وہ اس کے قادر ہونے سے انکار نہیں کر سکتا اور انکار ہو بھی کیونکر سکتا ہے جبکہ اس کی قدرتِ کاملہ کے آثار ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ زمین جس پر ہم رہتے سہتے ہیں اور جس میں دریا پہاڑ سمندر ہرے بھرے درخت قسم قسم کے حیوانات اور گوناگوں اقسام کے پرندے دکھائی دیتے ہیں اور فضا کی بلندیوں پر سُورج چاند اور ستارے چمکتے نظر آتے ہیں اس کی قدرت کا روشن ثبوت ہیں اور پھر کائنات اسی کرۂ خاکی اور نظر آنے والی اشیاء ہی کا نام نہیں ہے بلکہ اَن دیکھی کائنات کے مقابلہ یہ دیکھی بھالی دنیا تو بس اتنی ہی ہے جتنی سمندر کے پھیلاؤ کے مقابلہ میں ایک معمولی لہر جب اس دکھائی دی جانے والی کائنات میں قدرت کے آثار و مظاہر کا احاطہ نہیں ہوسکتا تو اَن دیکھی کائنات میں قدرت کی کارفرمائیوں کا کیا اندازہ ہوسکتا ہے۔ انسان لاکھ چاہے قدرت کی بے پایاں وسعتیں اس کے فہم و ادراک کی رسائی سے بالاتر رہیں گی نہ اس کی قدرت کی حد بندی ہوسکتی ہے اور نہ گنی چنی چیزوں میں محدود کی جاسکتی ہے بلکہ وہ ہر چیز پر یکساں قدرت رکھتا ہے ایسا نہیں ہے کہ بعض چیزوں پر اسے قدرت حاصل ہو اور بعض چیزیں اس کے احاطہ قدرت سے باہر ہوں اس لئے کہ تمام ممکنات سے اس کی نسبت یکساں ہے لہٰذا تمام چیزوں پر قدرت بھی یکساں ہونا چاہیئے ورنہ تخصیص بلا مخصص لازم آئے گی البتہ قدرت کے لئے یہ ضروری نہیں کہ فعل مقدور وقوع میں بھی آئے۔ کیونکہ قدرت اور چیز ہے اور وقوع فعل اور ہے اور ان دونوں میں تلازم نہیں ہے چنانچہ ایک شخص نے امیر المومنین کی خدمت میں حاضر ہوکر دریافت کیا کہ کیا اللہ اس پر قادر ہے کہ وہ اس زمین کو انڈے میں سمو دے اس طرح کہ نہ زمین کا حجم کم ہو اور نہ انڈا ٹوٹے۔ حضرت نے فرمایا۔

ویلک ان اللہ لا یوصف بالعجز	خدا میں عجز و کمزوری نہیں ہوسکتی اس سے بڑھ کر کون
ومن اقدر ممن یلطف الارض	قادر ہوگا جو چاہے تو زمین کو اتنا چھوٹا اور انڈے کو اتنا
ویعظم البیضۃ (توحید صدوق)	بڑا کر دے کہ زمین اس میں سما سکے۔

کلام باری

امیر المومنین فرماتے ہیں ۔

انما کلامه سبحانه فعل منه انشأه ومثله	اللہ سبحانہ کا کلام بس اس کا ایجاد کردہ فعل ہے اور
لم یکن من قبل ذلک کائنا ولو کان قدیما	اس طرح کا کلام پہلے سے موجود نہیں ہو سکتا اور اگر
لکان الها ثانیا (نہج البلاغہ)	وہ قدیم ہوتا تو دوسرا خدا ہوتا ۔

انسان جب کلام کرتا ہے تو حرف سے حرف جڑتے لفظ کی صورت میں ڈھلتے اور آواز کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ لب و دہن سے نکلتے ہیں یہ حرفوں کا جڑنا لفظوں میں ڈھلنا اور زبان کی حرکت سے یکے بعد دیگرے نکلنا یہ سب حدوث کی علامتیں ہیں اور کلام انہی حوادث حروف الفاظ اور صوت کا مجموعہ ہے لہٰذا خداوند عالم کو اس معنی سے تو متکلم نہیں کہا جاسکتا کیونکہ حادث ہی محل حادث ہو سکتا ہے اور خدا نہ حادث ہے کہ مرکز حوادث ہو اور نہ جوہر ہے کہ محل اعراض ہو بلکہ واجب الوجود اور قدیم و ازلی ہے ۔ اس کے متکلم ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ جس چیز میں چاہتا ہے کلام پیدا کر دیتا ہے اور اسے اپنی طرف نسبت دیتا ہے چنانچہ اس نے درخت میں آواز پیدا کر کے حضرت موسیٰ سے کہا یا موسی انی انا اللہ رب العالمین " اے موسیٰ بیشک میں ہی اللہ ہوں جو سب جہانوں کا پروردگار ہے "جب کلام اللہ کا پیدا کردہ ہے تو اسے قدیم و غیر مخلوق نہیں کہا جاسکتا بلکہ وہ حادث و مخلوق ہی ہوگا کیونکہ کلام لفظوں سے اور لفظ حرفوں سے مرکب ہوتا ہے اور جس میں اجزائے ترکیبی ہوں وہ حادث و مخلوق ہی قرار پائے گا مگر ایک گروہ کلام الٰہی کو قدیم و غیر مخلوق مانتا ہے اور کلام کو دو قسموں پر تقسیم کر دیا ہے ایک کلام نفسی اور ایک کلام ملفوظی، اس کلام نفسی و ملفوظی کو یوں سمجھنا چاہیئے کہ جب کوئی شخص کلام کرنا چاہتا ہے تو زبان پر الفاظ لانے سے پہلے دل میں الفاظ تجویز کرتا اور ذہن میں ان کی ترتیب قائم کرتا ہے اس طرح کلام کا ایک ذہنی وجود قائم ہو جاتا ہے یہ گویا کلام نفسی ہے اور جب ذہنی الفاظ زبان کی حرکت اور ہوا کے تموج سے کان کے پردوں سے ٹکراتے ہیں تو وہ کلام ملفوظی ہے۔ اس گروہ کا نظریہ یہ ہے کہ کلام نفسی ازل سے مرتب صورت میں ذات الٰہی کے ساتھ قائم تھا اور اسی کلام نفسی کے اعتبار سے جو اس کی صفت قدیم ہے وہ متکلم کہلاتا ہے ۔

یہ کلام نفسی کی اصطلاح تیسری صدی ہجری میں وضع کی گئی تاکہ اس کے کلام کو قدیم ثابت کیا جاسکے پہلے تو اس پر نظر کرنے کی ضرورت ہے کہ کیا خدا کی صفتیں اس سے الگ تصوّر کی جاسکتی ہیں کہ کلام کو ایک جداگانہ حیثیت دے کر قدیم مانا جائے۔ اگر اس کی صفتیں اس کی ذات سے جُدا مانی جائیں تو وہ قدیم ہوں گی یا حادث اگر حادث ہوں گی تو اللہ محل حوادث ٹھہرے گا اور قدیم ہوں گی تو قدیم ایک میں منحصر نہ رہے گا بلکہ جتنی صفتیں ہوں گی اتنے قدیم ماننا پڑیں گے اور یہ دونوں صورتیں باطل ہیں لہٰذا کلام کو ذات سے الگ قدیم صفت قرار دینا صحیح نہ ہوگا۔ اس موقع پر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ کلام نفسی اس کے علم کے علاوہ کوئی اور صفت ہے کہ اگر وہ کلام نفسی سے متصف نہ ہوتا تو حروف و الفاظ سے بے خبر رہ جاتا جب ایسا نہیں ہے بلکہ اس کا علم ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے تو علم

سے الگ کلام نفسی کے ماننے کی ضرورت ہی کیا ہے اور پھر یہ کلام نفسی، کلام نفسی کے حدود میں رہ کر کلام ہی نہیں ہے اور اللہ نے جسے وحی کی صورت میں اُتارا اور انبیاء کے گوش زد کیا وہ یہی کلام ملفوظی ہی تو تھا جس کا وہ خالق و موجد ہے اور اسی خلق وایجاد کی بنا پر اسے متکلم کہا جاتا ہے اور جو چیز خلق ہو گی وہ لامحالہ حادث ہو گی اگر کلام کو قدیم قرار دیا جائے گا تو ضروری ہے کہ وہ علت کا محتاج نہ ہو کیونکہ قدیم ایجاد و خلق سے بے نیاز ہوتا ہے نہ اس میں علت موجدہ کا عمل دخل ہوتا ہے جو اسے وجود میں لائے اور نہ علت مبقیہ کا جو اسے باقی و برقرار رکھے اس لئے کہ علت موجدہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ معلول سے سابق ہو اور جس پر کوئی چیز سابق ہو گی وہ قدیم نہ ہو گا اور علت مبقیہ، علت موجدہ ہی کے دوام و استمرار کا نام ہے جب علت موجدہ نہ ہو گی تو علت مبقیہ بھی نہ ہو گی۔ جب کلام اپنی قدامت کی بنا پر علت سے بے نیاز اور متکلم سے مستغنی ٹھہرا تو وہ اللہ کا فعل نہ رہا بلکہ دوسرا الٰہ ہو گیا اور اگر اللہ کا فعل ہے تو وہ بہر صورت اللہ کا ایجاد کردہ ہو گا اور جس چیز سے ایجاد کا تعلق ہو گا وہ حادث قرار پائے گی۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

ما یاتیھم من ذکر من ربھم محدث — جب ان کے پاس ان کے پروردگار کی طرف سے ذکر میں سے کوئی چیز آئی ہے جو حادث ہے۔

نفی رویت حضرت نے خداوند عالم کے غیر مرئی ہونے کے بارے میں فرمایا ہے۔

لم ینتہ الیک نظر و لم یدرک بصر ادرکت الابصار و احصیت الاعمار — نہ نظریں تیرے ساحت قدس تک پہنچ سکتی ہیں اور نہ نگاہیں تجھے دیکھ سکتی ہیں تو نے نظروں کو پا لیا ہے اور عمروں کا احاطہ کر لیا ہے۔

اللہ دنیا و آخرت میں نادیدنی اور نظر و بصر میں سمانے سے بلند تر ہے اسے نہ کسی نے دیکھا ہے اور نہ دیکھ سکے گا کیونکہ دیکھنے میں وہی چیز آتی ہے جو کسی سمت میں واقع ہو رنگ شکل اور جسم رکھتی ہو اور اللہ مکان سمت اعضاء و جوارح اور تمام لوازم مادہ سے پاک و صاف ہے۔ ایک گروہ کا نظریہ یہ ہے کہ وہ دنیا میں نظر آئے یا نہ آئے آخرت میں بہر حال دکھائی دے گا اور دنیا والے اسے اسی طرح دیکھیں گے جس طرح فضا کی بلندیوں پر چاند دیکھتے ہیں یہ نظریہ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ اللہ ذاتاً ناقابل رویت ہے اور ناقابل رویت ذات نہ دنیا میں نظر آ سکتی ہے اور نہ آخرت میں چنانچہ قرآن مجید میں عمومیت کے ساتھ رویت کی نفی کی گئی ہے۔

لا تدرکہ الابصار و ھو یدرک الابصار وھو اللطیف الخبیر — آنکھیں اسے دیکھ نہیں سکتیں اور وہ آنکھوں کو دیکھ رہا ہے اور وہ ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز سے آگاہ اور باخبر ہے۔

اگر رویت کے معنی علم و یقین کے لئے جائیں تو بے شک اہل عرفان کا ضمیر و وجدان اسے دیکھتا ہے۔ بایں معنی کہ انہیں اس ان دیکھی ہستی کا اتنا ہی یقین ہوتا ہے جتنا کسی دیکھی بھالی ہوئی چیز کا ہو سکتا ہے اس لئے

سے الگ کلام نفسی کے ماننے کی ضرورت ہی کیا ہے اور پھر یہ کلام نفسی، کلام نفسی کے حدود میں رہ کر کلام ہی نہیں ہے اور اللہ نے جسے وحی کی صورت میں اُتارا اور انبیاء کے گوش زد کیا وہ یہی کلام ملفوظی ہی تو تھا جس کا وہ خالق و موجد ہے اور اسی خلق و ایجاد کی بنا پر اسے متکلم کہا جاتا ہے اور جو چیز خلق ہو گی وہ لامحالہ حادث ہو گی اگر کلام کو قدیم قرار دیا جائے گا تو ضروری ہے کہ وہ علت کا محتاج نہ ہو کیونکہ قدیم ایجاد و خلق سے بے نیاز ہوتا ہے نہ اس میں علت موجدہ کا عمل دخل ہوتا ہے جو اسے وجود میں لائے اور نہ علت مبقیہ کا جو اسے باقی و برقرار رکھے اس لئے کہ علت موجدہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ معلول سے سابق ہو اور جس پر کوئی چیز سابق ہو گی وہ قدیم نہ ہو گا اور علت مبقیہ، علت موجدہ ہی کے دوام و استمرار کا نام ہے جب علت موجدہ نہ ہو گی تو علت مبقیہ بھی نہ ہو گی۔ جب کلام اپنی قدامت کی بنا پر علت سے بے نیاز اور متکلم سے مستغنی ٹھہرا تو وہ اللہ کا فعل نہ رہا بلکہ دوسرا الٰہ ہو گیا اور اگر اللہ کا فعل ہے تو وہ بہر صورت اللہ کا ایجاد کردہ ہو گا اور جس چیز سے ایجاد کا تعلق ہو گا وہ حادث قرار پائے گی۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

ما یاتیھم من ذکر من ربھم محدث	جب ان کے پاس ان کے پروردگار کی طرف سے ذکر میں سے کوئی چیز آئی ہے جو حادث ہے۔

نفی رویت

حضرت نے خداوند عالم کے غیر مرئی ہونے کے بارے میں فرمایا ہے۔

لم ینتہ الیک نظر و لم یدرکک بصر ادرکت الابصار و احصیت الاعمار	نہ نظریں تیرے ساحت قدس تک پہنچ سکتی ہیں اور نہ نگاہیں تجھے دیکھ سکتی ہیں تونے نظروں کو پالیا ہے اور عمروں کا احاطہ کر لیا ہے۔

اللہ دنیا و آخرت میں نادیدنی اور نظر و بصر میں سمانے سے بلند تر ہے اسے نہ کسی نے دیکھا ہے اور نہ دیکھ سکے گا کیونکہ دیکھنے میں وہی چیز آتی ہے جو کسی سمت میں واقع ہو رنگ شکل اور جسم رکھتی ہو اور اللہ مکان سمت اعضاء و جوارح اور تمام لوازم مادہ سے پاک و صاف ہے۔ ایک گروہ کا نظریہ یہ ہے کہ وہ دنیا میں نظر آئے یا نہ آئے آخرت میں بہرحال دکھائی دے گا اور دنیا والے اسے اسی طرح دیکھیں گے جس طرح فضا کی بلندیوں پر چاند دیکھتے ہیں یہ نظریہ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ اللہ ذاتاً ناقابل رویت ہے اور ناقابل رویت ذات نہ دنیا میں نظر آسکتی ہے اور نہ آخرت میں چنانچہ قرآن مجید میں عمومیت کے ساتھ رویت کی نفی کی گئی ہے۔

لا تدرکہ الابصار و ھو یدرک الابصار وھو اللطیف الخبیر	آنکھیں اسے دیکھ نہیں سکتیں اور وہ آنکھوں کو دیکھ رہا ہے اور وہ ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز سے آگاہ اور باخبر ہے۔

اگر رویت کے معنی علم و یقین کے لئے جائیں تو بے شک اہل عرفان کا ضمیر و وجدان اسے دیکھتا ہے۔ بایں معنی کہ انہیں اس ان دیکھی ہستی کا اتنا ہی یقین ہوتا ہے جتنا کسی دیکھی بھالی ہوئی چیز کا ہو سکتا ہے اس لئے

وہ اپنے یقین کی تعبیر رویت سے کرتے ہیں چنانچہ ذعلب یمنی نے امیر المومنین سے پوچھا کہ کیا آپ نے اپنے پروردگار کو دیکھا ہے فرمایا کیف اعبد ربا لم ارہ "میں اس رب کی کیونکر پرستش کر سکتا ہوں جسے دیکھا نہیں ہے اس نے دریافت کیا کہ آپ نے کیسے دیکھا ہے فرمایا۔

لم تزہ العیون بمشاهدۃ الابصار ولکن	آنکھیں اسے آنکھوں کے مشاہدہ سے نہیں دیکھتیں
رأتہ القلوب بحقائق الایمان (توحید صدوق)	بلکہ دل ایمانی حقیقتوں سے اسے دیکھتے ہیں۔

حضرت کے اس ارشاد سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ کے بارے میں جہاں جہاں نظر رویت اور لقاء کے الفاظ آئے ہیں وہاں رویت بصری مراد نہیں ہے بلکہ رویت قلبی مراد ہے جو علم و یقین کے معنی میں ہے۔

عدم مشابہت

حضرت کا ارشاد ہے۔

کذب العادلون بك اذ شبھوك	وہ لوگ جھوٹے ہیں جو تجھے دوسروں کے برابر سمجھ کر اپنے
باصنامھم و نحلوك حلیۃ المخلوقین	بتوں سے تشبیہ دیتے ہیں اور اپنے وہم میں تجھ پر
باوھامھم وجزاءوك تجزئۃ	مخلوقات کی صفتیں جوڑ دیتے ہیں اور اپنے خیال
المجسمات بخواطرھم	میں تیرے حصے بخرے کرتے ہیں جس طرح مجسم چیزوں
(نہج البلاغہ)	کے جوڑ بند الگ کئے جاتے ہیں۔

کوئی چیز اللہ کے مثل و مشابہ نہیں ہے نہ کسی چیز سے اس کی تمثیل دی جا سکتی ہے جس طرح یہود غیرت مند شوہر سے اور عیسائی مہربان باپ سے اس کی تمثیل دیتے ہیں اور نہ کسی چیز سے اس کی تشبیہ دی جا سکتی ہے کیونکہ جس چیز سے بھی اس کی تشبیہ دی جائے گی وہ انسانی ذہن کی تخلیق ہوگی اور انسانی ذہن کی پرواز دیکھی بھالی چیزوں تک محدود ہے اور اللہ ہر اس چیز سے بلند تر ہے جو ذہن میں سمائے اور مشاہدہ میں آئے چنانچہ خلاق عالم کا ارشاد ہے

لیس کمثلہ شئی — اس کے مانند کوئی چیز نہیں ہے۔

پھر جس چیز کو اس کے مشابہ قرار دیا جائے گا وہ حادث ہونے کی بنا پر نقائص حدوث کی حامل اور مختلف کیفیات کا آماجگاہ ہوگی اور اللہ ہر نقص سے بری اور ہر عیب سے پاک ہے مگر کچھ ظواہر پرست افراد نے اسے مختلف کیفیتوں کا حامل قرار دے لیا ہے اور اس کے لئے ایسی چیزیں بھی تجویز کر دی ہیں جو اس کے ساحت قدس کے منافی ہیں چنانچہ حضرت عائشہ سے یہ روایت کی جاتی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ سے پوچھا کہ کیا اللہ ہنستا بھی ہے۔ آپ نے فرمایا۔

والذی نفس محمد بیدہ انہ لیضحك	اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں محمدؐ کی
(تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۴۴)	جان ہے وہ ہنستا بھی ہے۔

اسی طرح ایک گروہ نے اسے انسانی شکل و صورت میں ڈھال لیا ہے اور انسانی اعضاء اس کے لئے تجویز

کر دیئے ہیں اور اس مقصد کے لئے یہ حدیث پیش کرتے ہیں ۔

ان اللہ خلق آدم علی صورتہ — اللہ نے آدم کو اپنی شکل و صورت پر پیدا کیا ۔

اس حدیث کا مطلب وہی لیا گیا ہے جو مذکورہ بالا ترجمہ سے ظاہر ہوتا ہے حالانکہ اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں ہے بلکہ تجسیم کے قائلین نے حدیث کا ابتدائی حصہ نظر انداز کر کے اس کا مفہوم ہی بدل ڈالا ہے چنانچہ امیر المومنین علیہ السلام اس حدیث کے مورد و محل کے سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو آدمیوں کو آپس میں جھگڑتے دیکھا اور ان میں سے ایک نے دوسرے کو کہا قبح اللہ وجھک ووجہ من یشبھک تمہارے چہرے پر اللہ کی پھٹکار اور اس کے چہرے پر بھی اللہ کی پھٹکار .... جو تم سے مشابہ ہو " آنحضرت نے یہ الفاظ سُنے تو فرمایا ۔

لا تقل ھذا فان اللہ خلق آدم علی صورتہ (توحید صدوق) — ایسا مت کہو اللہ نے آدم کو بھی اسی کی صورت پر پیدا کیا تھا ۔

اس مورد کو دیکھنے کے بعد یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ کس چابکدستی سے مورد حدیث کو حذف کر کے ضمیر کا مرجع بدل دیا گیا ہے اور حدیث کو من مانے معنی پہنا دیئے گئے ہیں ۔

خُدا پابند مکان و زمان نہیں ہے

امیر المومنین کا ارشاد ہے ۔

لم یسبقہ وقت ولم یتقدمہ زمان ولم یتعاورہ زیادۃ ولا نقصان ولم یوصف باین ولا بمکان (توحید صدوق) — وقت اس سے سابق نہیں ہے اور نہ زمانہ اس سے مقدم ہے اس پر زیادتی و کمی وارد نہیں ہوتی۔ اس کے بارے میں نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ کہاں ہے اور نہ یہ کہ وہ کس جگہ پر ہے ۔

ہر مادی چیز دوسری مادی چیز سے نزدیک ہو گی یا دُور نیچے ہو گی یا اُوپر دائیں بائیں ہو گی یا آگے پیچھے اسی طرح ایک چیز دوسری چیز سے پہلے وجود میں آئے گی یا بعد میں یا دونوں ایک ساتھ وجود میں آئیں گی پہلی حد بندی مکان کے اعتبار سے ہے اور دوسری حد بندی زمان کے لحاظ سے ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی چیز مادی ہو اور پھر مکان و زمان کے حدود سے باہر ہو جب مکان و زمان کی احتیاج اسے ہوتی ہے جو جسم رکھتا ہو اور جو جسم و جسمانیت کے صفات سے بری ہو جس میں نہ طول ہو نہ عرض اور نہ عمق وہ مکان و زمان کے حدود میں کیونکر آ سکتا ہے اگر اللہ کے لئے مکان و زمان تجویز کیا جائے گا تو اس کی اوّلیت ختم ہو جائے گی اس لئے کہ مکان و زمان کو اس سے پہلے ماننا ہو گا کیونکہ مکان ہو گا تو وہ ہو گا اور زمان ہو گا تو اس کا وجود ہو گا اور نتیجتہً زمان و مکان کا پابند ہو کر ممکنات کی سطح پر آ جائے گا نہ قدیم قرار پائے گا اور نہ واجب الوجود رہے گا ۔

خدا مجموعہ اجزاء نہیں ہے

امیر المومنین فرماتے ہیں۔

ولا یوصف بشئ من الاجزاء ولا بالجوارح والاعضاء (نہج البلاغہ)

اسے اجزاء اور اعضاء و جوارح میں سے کسی سے متصف نہیں کیا جاسکتا۔

خداوند عالم بسیط محض ہے اس کے لئے نہ اجزائے ذہنی تجویز کئے جاسکتے اور نہ اجزائے خارجی اگر وہ اجزاء سے مرکب ہوگا تو وہ ان اجزاء کے ترکیب پانے سے جو اس سے پہلے موجود ہوں گے وجود میں آئے گا۔ کیونکہ یہ مسلمہ امر ہے کہ جو چیز مرکب ہوتی ہے اس کے اجزاء پہلے سے موجود ہوتے ہیں۔ جب اس کے اجزاء اس پر مقدم ہوں گے تو وہ لامحالہ ان اجزاء کے بعد وجود پذیر ہوگا اس صورت میں نہ اس کا مستقل وجود رہے گا اور نہ اجزاء کی احتیاج سے بالاقرار پائے گا اور جو نہ اوّل و اقدم ہو اور نہ مستقلاً وجود رکھتا ہو بلکہ اجزاء کا محتاج اور ان سے متاخر ہو وہ قدیم و واجب الوجود کیونکر ہوسکتا ہے۔

اللہ حرکت وسکون سے بری ہے

امیر المومنین کا ارشاد ہے۔

لا یجری علیه السکون والحرکة وکیف یجری ما هو اجراه (نہج البلاغہ)

اس پر حرکت وسکون طاری نہیں ہوسکتا جو چیز اس نے مخلوقات پر طاری کی ہو وہ اس پر کیونکر طاری ہوسکتی ہے۔

اللہ حرکت وسکون سے بری ہے اس لئے کہ حرکت وسکون اسی چیز میں تجویز کیا جاسکتا ہے جس کے لئے محل و مقام اور نقل مکانی کا تصوّر کیا جاسکے اس لئے کہ کسی چیز کو اسوقت تک ساکن نہیں کہا جاسکتا جب تک وہ کسی ایک جگہ کی پابند نہ ہو اور اللہ کے لئے جگہ تجویز کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اسے محدود قرار دے لیا حالانکہ وہ غیر محدود اور مکان و زمان کے حدود سے بالاتر ہے اور متحرک اس وقت تک قرار نہیں دیا جاسکتا جب تک ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی عمل میں نہ آئے۔ اس منتقلی کے معنی یہ ہیں کہ ایک چیز ایک وقت میں ایک جگہ پر نہ تھی اور دوسرے وقت میں اس جگہ پر آگئی پھر اس جگہ سے معدوم ہوئی اور دوسری جگہ پر موجود ہوگئی اور اسی نیست کے بعد ہست اور ہست کے بعد نیست کے سلسلۂ پیہم کا نام حرکت ہے اور جو چیز نیستی سے ہستی اور ہستی سے نیستی میں آئے وہ لامحالہ حادث ہوگی۔ لہٰذا حرکت جو اس نیست و ہست کے مجموعہ کا نام ہے حادث ہوگی اور جس پر حرکت طاری ہوگی وہ بھی حادث ہوگا کیونکہ کسی چیز کے ساتھ اعراض کا پایا جانا اس کے حدوث کی دلیل ہے اور اللہ نہ حادث ہے اور نہ محل حوادث۔ اس لئے کہ حادث وہ ہے جو پردہ عدم سے وجود میں آئے اور خداوند عالم قدیم ہے جو مسبوق بالعدم نہیں ہوسکتا اور واجب الوجود ہے جس میں نیستی کا گزر ممکن نہیں ہے۔

ان صفات سلبیہ کے علاوہ بھی حضرت کے کلمات میں چند صفتوں کی نشاندہی کی گئی ہے جن کی ذاتِ خداوندی

سے نفی ضروری ہے جیسے اتحاد حلول احتیاج وغیرہ انہیں نظر انداز کیا جاتا ہے کیونکہ صفاتِ سلبیہ کے ذیل میں جو مختصر دلائل ذکر کئے گئے ہیں۔ انہی دلائل سے ان کی بھی نفی کی جاسکتی ہے۔

ہستیٔ باری کا اقرار عمل کا مقتضی ہے

امیر المومنین کا ارشاد ہے۔

لا تجعلوا علمکم جهلا و یقینکم شکا اذا علمتم فاعملوا واذا تیقنتم فاقدموا	اپنے علم کو جہل قرار نہ دو اور یقین کو شک نہ بناؤ جب جان چکے تو عمل کرو اور یقین پیدا کر چکے تو آگے بڑھو۔

دنیا میں ہر چیز کے کچھ خواص ہوتے ہیں جو اس سے الگ نہیں ہو سکتے مثلاً سنکھیئے کی خاصیت سمیت ہے اور شراب کی خاصیت نشہ ہے خواہ سنکھیئے کو سنکھیا سمجھ کر کھایا جائے یا نمک سمجھ کر یا شراب کو شراب سمجھ کر پیا جائے یا سرکہ سمجھ کر سنکھیا اپنی خاصیت کے مطابق اثر کرے گا اور شراب اپنی خاصیت کے مطابق اثر کرے گی۔ اسی طرح علم و یقین کے بھی کچھ خواص ہوتے ہیں خواہ علم و یقین واقع کے مطابق ہو یا واقع کے مطابق نہ ہو۔ چنانچہ ایک شخص اندھیرے میں کوئی چیز دیکھتا ہے اور اسے رسی سمجھ کر بے جھجک گزر جاتا ہے مگر واقع میں وہ رسی نہ تھی بلکہ سانپ تھا یا اسے سانپ سمجھ لیتا ہے اور لرزتا کانپتا دوسری طرف ہو جاتا ہے مگر واقع میں وہ رسی تھی۔ پہلی صورت میں اسے کسی قسم کا خوف ڈر محسوس نہیں ہوا کہ بچ کر نکلنے کی کوشش کرتا اور دوسری صورت میں ڈرے بغیر نہیں رہا اور اسی ڈر کی بنا پر اس نے راستا بدل دیا اور دوسری سمت چلا گیا یہ خوف اور بے خوفی واقع کا اثر نہیں۔ اگر واقع اثر انداز ہوتا تو بے خوفی کی جگہ خوف اور خوف کی جگہ بے خوفی ہوتی بلکہ یہ بے خوفی اثر ہے اس کا کہ سانپ کو رسی سمجھ لیا گیا اور خوف اثر ہے اس کا کہ رسی کو سانپ قرار دے لیا گیا۔ اگر کوئی یہ جانتے ہوئے کہ سامنے سانپ ہے نہ خوف کھاتا ہے اور نہ راستا بدل کر چلتا ہے تو اس کا جاننا نہ جاننا اور علم جہل ہو گا۔ اس لئے کہ اس نے تقاضائے علم کو نظر انداز کر دیا اور جس سے بچ کر نکلنے کی ضرورت تھی اس سے بچنے کی کوشش نہیں کی۔

ایمان کے معنی بھی علم و یقین کے ہیں اور اس کے تقاضے بھی وہی ہیں جو علم و یقین کے ہوتے ہیں لہٰذا اللہ پر ایمان اور اس کی ہستی پر یقین محکم ہو گا تو انسان کی عملی زندگی متاثر ہوئے بغیر نہ رہے گی اور اس یقین کے اثرات اس کے افعال و اعمال پر واضح طور پر مرتب ہوں گے کیونکہ ایمان ایک باطنی محرک ہے جس کا اثر ظاہری اعمال پر پڑتا ہے اور انہی ظاہری اعمال سے ایمان کی کمزوری و پختگی کا اندازہ ہوتا ہے اگر ایمان پختہ و راسخ ہو گا تو عمل کی تحریک قوی ہو گی اور ایمان کمزور ہو گا تو عمل کی رفتار بھی سست ہو گی۔ یہ دونوں آپس میں اس طرح مرتبط ہیں کہ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ ایمان کی حیثیت اساس و بنیاد کی ہے۔ اگر عقیدہ و ایمان نہ ہو تو عمل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اگر عمل نہ ہو تو عقیدہ کی پختگی کا ثبوت بہم پہنچانا مشکل ہو گا۔ چنانچہ امیر المومنین کا ارشاد ہے۔

الایمان والعمل اخوان توأمان ورفیقان	ایمان اور عمل دو جڑواں بھائی ہیں اور ایسے دو ساتھی

لا یفترقان لا یقبل اللہ احدھما الا بصاحبہ — ہیں جو ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتے اور اللہ ایک کو دوسرے کے بغیر قبول نہیں کرتا۔

اگر کوئی شخص صدقِ دل سے اللہ کی ہستی کا اقرار کرتا اور یہ یقین رکھتا ہے کہ ایک بالادست ذات موجود ہے جس سے خلوت و جلوت کے اعمال پوشیدہ نہیں ہیں تو وہ نہ اس کے احکام کی بجاآوری میں کوتاہی کرے گا اور نہ اس کے اوامر کی خلاف ورزی میں جری و بیباک ہوگا اور اگر اس کی ہستی کے اعتراف کے ساتھ جذبۂ عمل پیدا نہیں ہوتا تو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ابھی عقیدہ ناپختہ اور اعتراف صرف رسمی ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین کے ارشاد سے ظاہر ہے کہ وہ علم جو عمل سے عاری ہو وہ علم نہیں بلکہ جہل ہے اور وہ یقین جس پر یقین کے اثرات مرتب نہ ہوں وہ یقین نہیں بلکہ شک ہے۔

مسئلہ قضاؤ قدر

مسئلہ قضاؤ قدر ایک مشکل مسئلہ ہے اور بعض افراد کی ژولیدہ فکری و کج بیانی نے اسے اور مشکل بنا دیا ہے اور جوں جوں اسے حل کرنے اور اس کی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے حیرت و سرگشتگی بڑھتی ہی رہی ہے اور کاروان فکر صحیح راہ کو کھو کر جبر و تفویض کی وادیوں میں بھٹکتے رہے ہیں اسی لئے اس میں زیادہ غور و تعمق سے منع کیا گیا ہے تاکہ ذہن اس کی پیچیدگیوں میں الجھ کر غلط راہ کی طرف نہ مڑ جائیں چنانچہ امیرالمومنین سے قضاؤ قدر کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا۔

طریق مظلم فلا تسلکوہ و بحر عمیق فلا تلجوہ و سر اللہ فلا تتکلفوہ — یہ ایک تاریک راستہ ہے اس میں قدم نہ اٹھاؤ ایک گہرا سمندر ہے اس میں نہ اترو اور اللہ کا ایک راز ہے اسے جاننے کی زحمت نہ اٹھاؤ۔

حضرت نے عامۃ الناس کی ذہنی سطح کو دیکھتے ہوئے اس کی گہرائیوں میں جانے سے منع کیا ہے مگر اس کے ساتھ اگر کسی نے پوچھ لیا تو اس کے صحیح مفہوم کی طرف رہنمائی بھی فرمائی ہے اور مختلف عبارتوں اور اسلوبوں میں اس کے معنی کو اس طرح واضح کیا ہے کہ ارباب فکر و نظر نے یہ اعتراف کیا ہے کہ اس سے بلیغ تر اور حسین تر اندازِ بیان اور کہیں دیکھنے میں نہیں آیا چنانچہ حجاج ابن یوسف نے ابوالحسن بصری عمرو ابن عبید واصل ابن عطاء اور عامر شعبی کو تحریر کیا کہ وہ قضاؤ قدر کے بارے میں جو رائے رکھتے ہوں یا جو آراء ان تک پہنچی ہوں انہیں قلمبند کر کے مجھے بھیجیں ان سب کی متفقہ رائے یہ تھی کہ قضاؤ قدر کی تنگ و تار راہوں میں صرف امیرالمومنین کے کلمات شمع راہ کا کام دیتے ہیں اور منزل کی صحیح نشاندہی کرتے ہیں چنانچہ حسن بصری نے لکھا کہ میں نے قضاؤ قدر کے بارے میں جتنے اقوال دیکھے اور سنے ان میں سب سے بہتر امیرالمومنین علی ابن ابی طالب کا یہ قول ہے۔

اتظن ان الذی نہاک دہاک — کیا تمہارا یہ گمان ہے کہ جس نے تمہیں گناہوں سے

انما دھاك اسفلك واعلاك	ردکا ہے اس نے تمہیں گناہ پر مجبور کیا ہے تمہیں جنسی
واللہ بری من ذلك	قوتوں اور کام و دہن کی لذتوں نے مجبور کیا ہے اور خدا
	تو اس سے بری ہے کہ وہ ایسا کرے ۔

عمرو ابن عبید نے تحریر کیا کہ میں نے قضاؤ قدر کے بارے میں علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے اس قول کو سب سے بہتر پایا ہے ۔

لوکان الوزر فی الاجل محتوما	اگر گناہ قضائے حتمی کا نتیجہ ہو تو پھر مرتکب گناہ کو سزا
لکان الموزور فی القصاص مظلوما	دینا اس پر ظلم کرنا ہے ۔

واصل ابن عطاء نے تحریر کیا کہ میرے نزدیک قضاؤ قدر کے بارے میں علی ابن ابی طالب کا یہ ارشاد ہر اعتبار سے جامع ہے ۔

ایدلك علی الطریق	کیا یہ ہو سکتا ہے کہ وہ تمہیں راہ ہدایت دکھائے
ویاخذ علیك المضیق	اور (نجات و سعادت کا) راستہ تمہارے لئے بند کر دے ۔

عامر شعبی نے لکھا کہ قضاؤ قدر کے بارے میں علی ابن ابی طالب کے اس قول سے بہتر کوئی قول نہیں ہے ۔

کلما استغفرت اللہ تعالیٰ	ہر وہ کام جس سے تم اللہ سے توبہ و استغفار کرو وہ
عنہ فھو منك و کلما	تمہارا کیا دھرا ہے اور ہر وہ عمل جس پر تم اللہ کی حمد
حمدت اللہ تعالیٰ علیہ	و ستائش کرو وہ اس کی توفیق کے شامل حال ہونے کا
فھو منہ	نتیجہ ہے ۔

جب حجاج نے یہ کلمات پڑھے تو امیر المومنین سے دشمنی و عناد کے باوجود یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ

لقد اخذوھا من عین صافیہ	ان لوگوں نے یہ مطالب سرچشمہ علم لدنی سے
(مصابیح الانوار ج ا ص ۱۴۵)	حاصل کئے ہیں ۔

حضرت کے ان ارشادات سے ظاہر ہے کہ انسان پر اللہ کی طرف سے کوئی جبر نہیں ہے بلکہ اس سے جو افعال صادر ہوتے ہیں وہ اس کے ارادہ و اختیار سے صادر ہوتے ہیں اس طرح کہ وہ چاہے تو کرے اور چاہے تو نہ کرے اور فعل و ترک کی یہ دونوں صورتیں اس کے ارادہ و اختیار کے تابع ہیں لہٰذا اس کے افعال کی ذمہ داری اسی پر عائد ہو گی اگر یہ کہا جائے کہ اللہ نے انسان کو ایسا کیوں نہ بنایا کہ وہ برائی کرنے کے قابل ہی نہ ہوتا اور اس سے صرف نیکی ہی صادر ہوتی۔ اگر ایسا ہوتا تو انسان نیکی و بدی کے امتیاز سے محروم رہتا اور انسانیت کی سطح سے گر کر حیوانی سطح پر آ جاتا کیونکہ انسان کا اصل جوہر یہی ہے کہ وہ نیکی و بدی کو پہچانے اور با اختیار خود بدی سے منہ موڑ کر نیکی کی راہ اختیار کرے اور اچھے کاموں پر جزا کا اور برے کاموں پر سزا کا مستحق قرار پائے۔ اشاعرہ و جبریہ نے قضاؤ قدر سے دھوکا کھایا اور یہ سمجھ لیا کہ انسان سے جو اچھے برے افعال سرزد ہوتے ہیں وہ ان کے بجا لانے پر مجبور ہے کیونکہ قضاؤ قدر نے

انما دهاك اسفلك واعلاك والله بری من ذلك
روکا ہے اس نے تمہیں گناہ پر مجبور کیا ہے تمہیں جنسی قوتوں اور کام و دہن کی لذتوں نے مجبور کیا ہے اور خدا تو اس سے بری ہے کہ وہ ایسا کرے۔

عمرو ابن عبید نے تحریر کیا کہ میں نے قضاؤ قدر کے بارے میں علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے اس قول کو سب سے بہتر پایا ہے۔

لوکان الوزر فی الاجل محتوما لکان الموزور فی القصاص مظلوما
اگر گناہ قضائے حتمی کا نتیجہ ہو تو پھر مرتکب گناہ کو سزا دینا اس پر ظلم کرنا ہے۔

واصل ابن عطاء نے تحریر کیا کہ میرے نزدیک قضاؤ قدر کے بارے میں علی ابن ابی طالب کا یہ ارشاد ہر اعتبار سے جامع ہے۔

ایدلك علی الطریق ویاخذ علیك المضیق
کیا یہ ہو سکتا ہے کہ وہ تمہیں راہ ہدایت دکھائے اور (نجات و سعادت کا) راستہ تمہارے لئے بند کر دے۔

عامر شعبی نے لکھا کہ قضاؤ قدر کے بارے میں علی ابن ابی طالب کے اس قول سے بہتر کوئی قول نہیں ہے۔

کلما استغفرت الله تعالیٰ عنه فهو منك و کلما حمدت الله تعالیٰ علیه فهو منه
ہر وہ کام جس سے تم اللہ سے توبہ و استغفار کرو وہ تمہارا کیا دھرا ہے اور ہر وہ عمل جس پر تم اللہ کی حمد و ستائش کرو وہ اس کی توفیق کے شامل حال ہونے کا نتیجہ ہے۔

جب حجاج نے یہ کلمات پڑھے تو امیرالمومنین سے دشمنی و عناد کے باوجود یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ

لقد اخذوها من عین صافیه (مصابیح الانوار ج ۱ ص ۱۴۵)
ان لوگوں نے یہ مطالب سرچشمہ علم لدنی سے حاصل کئے ہیں۔

حضرت کے ان ارشادات سے ظاہر ہے کہ انسان پر اللہ کی طرف سے کوئی جبر نہیں ہے بلکہ اس سے جو افعال صادر ہوتے ہیں وہ اس کے ارادہ و اختیار سے صادر ہوتے ہیں اس طرح کہ وہ چاہے تو کرے اور چاہے تو نہ کرے اور فعل و ترک کی یہ دونوں صورتیں اس کے ارادہ و اختیار کے تابع ہیں لہذا اس کے افعال کی ذمہ داری اسی پر عائد ہوگی اگر یہ کہا جائے کہ اللہ نے انسان کو ایسا کیوں نہ بنایا کہ وہ برائی کرنے کے قابل ہی نہ ہوتا اور اس سے صرف نیکی ہی صادر ہوتی۔ اگر ایسا ہوتا تو انسان نیکی و بدی کے امتیاز سے محروم رہتا اور انسانیت کی سطح سے گر کر حیوانی سطح پر آجاتا کیونکہ انسان کا اصل جوہر یہی ہے کہ وہ نیکی و بدی کو پہچانے اور باختیار خود بدی سے منہ موڑ کر نیکی کی راہ اختیار کرے اور اچھے کاموں پر جزا کا اور برے کاموں پر سزا کا مستحق قرار پائے۔ اشاعرہ و جبریہ نے قضاؤ قدر سے دھوکا کھایا اور یہ سمجھ لیا کہ انسان سے جو اچھے برے افعال سرزد ہوتے ہیں وہ ان کے بجا لانے پر مجبور ہے کیونکہ قضاؤ قدر نے

اسے پابند بنا دیا ہے اور وہ ان خطوط سے سرمو ادھر سے اُدھر نہیں ہو سکتا جو اس کے لئے نوشتۂ ازل نے متعین کر دیئے ہیں یہ عقیدہ سراسر غلط اور خلاف عقل و وجدان ہے اور دلائل قاطعہ اس کے بطلان پہ شاہد ہیں۔

اولاً یہ کہ ہر ذی شعور انسان جانتا ہے کہ اس سے کچھ افعال باختیار صادر ہوتے ہیں جیسے چلنے پھرنے میں ہاتھ پیروں کی حرکت اور کچھ افعال بلا اختیار صادر ہوتے ہیں جیسے نبض کی جنبش اور دل کی دھڑکن وہ ان دونوں قسموں میں امتیاز کرتا اور یہ سمجھتا ہے کہ ہاتھ پیر کی حرکت اس کے اختیار و قدرت سے صادر ہوتی ہے اور نبض کی حرکت اور دل کی دھڑکن اس کے اختیار و قدرت سے باہر ہے بلکہ حیوان بھی یہ سمجھتا ہے کہ کون سا فعل اس کے مقدور میں ہے اور کون سا فعل اس کی قدرت سے باہر ہے چنانچہ اگر ایک تیز رفتار گھوڑے کے سامنے کوئی ندی یا چٹان آجائے تو وہ یہ سمجھ کر کہ اس ندی یا چٹان کو پھلانگنا اس کے بس میں نہیں ہے اپنے قدم روک لیتا ہے اور جب رکاوٹ برطرف ہو جاتی ہے اور راستہ ہموار دیکھتا ہے تو سمجھ جاتا ہے کہ دوڑ جاری رکھنا اس کے بس میں ہے اور وہ حسب معمول دوڑنے لگتا ہے۔ جب ہم اپنے اختیاری اور غیر اختیاری افعال میں فرق کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اختیاری افعال پہ قدرت رکھتے ہیں اور غیر اختیاری افعال ہمارے احاطۂ قدرت سے باہر ہیں تو اگر اپنے اختیاری افعال کی نسبت اللہ کی طرف دیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہمارے اختیاری اور غیر اختیاری افعال میں کوئی فرق ہی نہیں ہے اور جنہیں ہم اختیاری کہتے ہیں ان کے بجا لانے پر بھی اسی طرح مجبور ہیں جس طرح غیر اختیاری حرکات و اعمال میں بے بس ہیں اور یہ امر بدیہیات کے خلاف ہے۔

دوسرے یہ کہ اگر ہمارے افعال میں ہمارے ارادہ و اختیار کا کوئی دخل نہ ہوتا اور ہماری حیثیت اس اوزار کے مانند ہوتی جو کسی صنعت کار کے ہاتھ میں ہوتا ہے کہ وہ جس طرح چاہتا ہے اسے حرکت دیتا ہے یا لوہے کے اس ٹکڑے کے مانند ہوتی جو مقناطیس کے اثر سے حرکت کرتا ہے تو پھر ہو سکتا تھا کہ ہم کسی فعل کو ناپسند کرتے اور اسے نہ کرنا چاہتے تو وہ ہم سے قہراً صادر ہوتا اور کسی کام کو پسند کرتے اور اسے کرنا چاہتے تو وہ ہم سے صادر نہ ہوتا اس لئے کہ ان افعال کا فاعل تو اللہ ہے اور اس نے اپنے افعال کو ہمارے چاہنے اور نہ چاہنے کے تابع نہیں رکھا بلکہ یہ عین ممکن ہے کہ ہم ایک کام کرنا چاہیں اور وہ نہ چاہے یا ہم ایک کام نہ کرنا چاہیں اور وہ کرنا چاہے مثلاً ہم مشرق کی طرف جانا چاہیں اور وہ یہ چاہے کہ ہم مغرب کی طرف بڑھیں تو قہراً ہمارے قدم مغرب کی طرف اٹھنا چاہئیں یا اس کے برعکس ہم مغرب کی سمت کا ارادہ کریں اور وہ یہ چاہے کہ ہم مشرق کی طرف جائیں تو قہراً ہمارا رُخ مشرق کی سمت ہونا چاہیئے حالانکہ ایسا نہیں ہوتا بلکہ جس سمت کا ہم قصد و ارادہ کرتے ہیں ہمارے قدم اسی سمت اٹھتے ہیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہمارے افعال ہمارے قصد و ارادہ کے تابع ہیں جب ہم چاہتے ہیں تو وہ افعال وجود میں آتے ہیں اور جب نہیں چاہتے تو وقوع میں نہیں آتے اور کوئی خارجی قوت ہمیں فعل یا ترک پر مجبور نہیں کرتی۔

تیسرے یہ کہ اگر انسانی افعال اللہ کے ارادہ سے وقوع میں آتے ہیں خواہ اس نے ان کے بجالانے کا حکم دیا ہو یا ان سے منع کیا ہو تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا میں کفر و شرک، قتل و ظلم اور دوسرے قبیح امور اسی کے ارادہ سے وجود میں آئے ہوں اور جن اعمال خیر کا وقوع نہیں ہوا وہ اس کی نظروں میں ناپسندیدہ ہوں کیونکہ جن اعمال کے وقوع کا اس نے ارادہ ہی نہیں کیا وہ لامحالہ اس کے نزدیک ناپسندیدہ ہوں گے اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس نے ان افعال کے بجا

لانے کا حکم دیا جن کے وقوع کا اس نے ارادہ ہی نہیں کیا تھا اور ان کاموں سے منع کیا جن کو پسند کرتے ہوئے ایجاد کیا تھا لہٰذا نافرمان کفر و عصیان کی بنا پر مطیع قرار پائیں گے کیونکہ انہوں نے وہی کام انجام دئے جن کے وقوع کا اس نے ارادہ کیا تھا اور انہی کاموں سے کنارہ کش رہے جن کے وقوع کا اس نے ارادہ نہیں کیا تھا اور اسے کوئی بھی ماننے کیلئے تیار نہ ہوگا کہ کفر و عصیان مراد الٰہی ہوں اور ایمان و اطاعت اور اعمالِ خیر ناپسندیدہ قرار پائیں جبکہ اللہ کا ارادہ ایمان و اطاعت سے متعلق ہوتا ہے اور کفر و شرک اور معاصی کے وقوع کو ناپسند کرتا ہے چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

کل ذلك كان سیئه عند ربك مکروها — ان تمام باتوں میں جو بات بری ہے وہ تمہارے پروردگار کو ناپسند ہے۔

چوتھے یہ کہ تمام فرق اسلامیہ کا اس پر اتفاق ہے کہ ہر مسلمان کو قضا و قدر الٰہی پر راضی رہنا چاہیئے تو اگر تمام افعال اللہ کی طرف سے ہیں اور انسان مجبور محض ہے تو اگر وہ کفر اختیار کرتا ہے یا شرک کا مرتکب ہوتا ہے تو اسے بھی قضا و قدر کا فیصلہ سمجھ کر اس پر رضا مند رہنا چاہیئے اور اس کے خلاف کچھ نہ کہنا چاہیئے کیونکہ اس کے خلاف لب کشائی اللہ کے فیصلہ قضا و قدر پر نکتہ چینی و حرف گیری کے مترادف ہوگی حالانکہ کوئی بھی ذی عقل یہ نہیں کہہ سکتا کہ کفر و شرک پر راضی رہنا چاہیئے اور اسے بلا چون و چرا قبول کرلینا چاہیئے جبکہ اللہ بندوں کے لئے کفر کو پسند نہیں کرتا چنانچہ ارشاد الٰہی ہے۔

ولا یرضی لعبادہ الکفر — اللہ اپنے بندوں کے لئے کفر پر راضی نہیں ہے۔

پانچویں یہ کہ اگر اچھے برے افعال اللہ ہی کے ارادہ سے صادر ہوتے ہیں اور انسان اس کے ارادہ کے مطابق عمل کرنے پر مجبور ہے اس طرح کہ جس چیز کو وہ چاہتا ہے بجبر کرا دیتا ہے اور جس چیز کو نہیں چاہتا اس سے بجبر روک دیتا ہے تو اس صورت میں اوامر و نواہی کے نفاذ کی ضرورت ہی کیا تھی جبکہ بندوں کو فعل و ترک کے سلسلہ میں کوئی اختیار ہی نہیں ہے لہٰذا نہ انبیاء کے بھیجنے کی ضرورت تھی نہ کتابوں کے نازل کرنے کی حاجت اور نہ اوامر و نواہی کے نفاذ کی احتیاج اور پھر احکام کی پابندی پہ جزا اور خلاف ورزی پر سزا تجویز کرنے کا بھی کوئی جواز نہیں۔ کیونکہ جزا و سزا اختیاری افعال پر مرتب ہوتی ہے اور غیر اختیاری افعال پر جزاء یا سزا تجویز کرنا سراسر غلط ہے اس لئے کہ غیر اختیاری افعال کو نہ اچھا کہا جاسکتا ہے اور نہ برا۔ ان پر اچھائی یا برائی کا حکم اسی صورت میں لگایا جاسکتا ہے جب ان میں انسانی قدرت و اختیار کو دخل ہو لہٰذا وہ عقیدہ جس کے نتیجہ میں بعثت انبیاء عبث حشر و نشر بیکار نفاذ احکام باطل اور جزا و سزا غلط قرار پائے اسے کسی صورت میں اسلامی عقیدہ نہیں کہا جاسکتا۔ انہی غلط نتائج پہ نظر کرتے ہوئے ابوالعلاء معری نے کہا ہے۔

زعم الجھول ومن یقول بقولہ — ان المعاصی من قضاء الخالق

جاہل اور اس کے ہمنوا یہ گمان کرتے ہیں کہ گناہ خالق عالم کی قضا و قدر کا نتیجہ ہیں۔

ان کان حقا ما زعمت فلم قضی — حد الزناء و قطع کف السارق

اگر تمہارا یہ گمان صحیح ہے تو اس نے زنا پر حد کی اور چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا کیوں تجویز کی۔

اس عقیدۂ جبر کے بطلان کے بعد اس میں کوئی شک و شبہ نہ ہونا چاہیئے کہ انسان فاعل مختار ہے اور اس کے اچھے اور برے

افعال اسی کے ارادہ واختیار کے تابع ہیں۔ اللہ سبحانہ نے انہی اچھے اور بُرے افعال کو پہچنوانے کے لئے انبیاء و اوصیاء مامور فرمائے جنہوں نے خیر و شر اور نیکی و بدی کی نشاندہی کی اور بدی سے بچ کر رہنے اور نیکی کی راہ پر چلنے کی تلقین فرمائی۔ اب ہم بدی کا راستہ اختیار کرتے ہیں تو اس لئے نہیں کہ ہم نیکی کا راستا جانتے نہیں بلکہ یہ ہمارے غلط انتخاب کا نتیجہ ہے اور نیکی کی راہ اختیار کرتے ہیں تو یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ نیکی ہے۔ شعور و وجدان اس کا شاہد ہے کہ جہاں تک بدی کو بدی اور نیکی کو نیکی سمجھ کر اختیار کرنے کا تعلق ہے وہ ہمارے ارادہ واختیار ہی سے وابستہ ہے اور جس قوت سے ہم کوئی کام کر سکتے ہیں اسی قوت سے ہم اسے ترک بھی کر سکتے ہیں اس اعتبار سے ہم سے صادر ہونے والے افعال کا استناد ہماری طرف ہوگا اور اس اعتبار سے کہ قوت واختیار کا جوہر اللہ کا عطا کردہ ہے۔ ان افعال کا استناد اللہ کی طرف بھی صحیح ہے لیکن اس قوت اختیار کے دینے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس نے ہم سے اختیار چھین لیا ہے اور ہم مجبور کر دیئے گئے ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی بھوکے کو روٹی دیتا ہے اور وہ کھانے کے بجائے اسے پھینک دیتا ہے تو اس کی ذمہ داری روٹی دینے والے پر عائد نہ ہوگی بلکہ اس شخص کو ذمہ دار ٹھہرایا جائے گا جس نے روٹی پھینکی ہے کیونکہ یہ فعل اسی کے ارادہ واختیار سے صادر ہوا ہے۔

اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے وہ قضاؤ قدر سے باہر نہیں ہے مگر اس قضاء کا تعلق کبھی خلق وایجاد سے ہوتا ہے اور کبھی افعال عباد سے پہلی قسم قضائے تکوینی کہلاتی ہے اور دوسری قسم قضائے تشریعی قضائے تکوینی اپنے اندر لزوم رکھتی ہے کیونکہ کوئی طاقت اللہ کے ارادہ کے سامنے دیوار بن کر کھڑی نہیں ہو سکتی اور قضائے تشریعی انسان کے ارادہ واختیار سے وابستہ ہے۔ البتہ اللہ سبحانہ یہ جانتا ہے کہ انسان اپنے ارادہ واختیار سے یہ اور یہ کرے گا اور چونکہ علم کسی فعل کے وقوع کا سبب نہیں ہوتا اس لئے اللہ کے علم سابق سے یہ لازم نہیں آتا کہ انسان اپنے افعال میں مجبور قرار پائے چنانچہ ایک عراقی نے امیرالمومنین سے پوچھا کہ کیا شامیوں سے لڑنا اور صفین کی جانب ہمارا حرکت کرنا قضاؤ قدر کا نتیجہ تھا فرمایا کہ ہاں اس ذات کی قسم جس نے دانہ کو شگافتہ اور ذی روح کو پیدا کیا ہم نے جہاں قدم رکھا جس نشیب میں اترے اور جس بلندی پر چڑھے وہ قضاؤ قدر ہی کا فیصلہ تھا کہا کہ پھر ہمیں تو کسی اجر کا استحقاق نہ ہونا چاہیئے۔ حضرت نے فرمایا کہ تم نے اس قضا سے وہ قضا سمجھ لی ہے جس کے خلاف ممکن نہیں ہوتا۔ اگر ایسا ہو تو پھر ثواب وعقاب وعدو وعید امر و نہی سب عبث قرار پائیں گے اور اس صورت میں انسان نیکی پر مدح کا اور برائی پر مذمت کا مستحق نہ رہے گا اور یہ مجوسیوں اور قدریوں کا نظریہ ہے۔

ان اللہ امر تخییرا ونھی تحذیرا وکلف یسیرا ولم یعص مغلوبا ولم یطع مکرھا ولم یرسل الرسل الی خلقہ عبثا

اللہ نے کرنے اور نہ کرنے کا اختیار دے کر احکام دئے ہیں اور (بری باتوں کے عواقب و نتائج سے) ڈراتے ہوئے منع کیا ہے اس نے تکلیف شرعی میں آسانی رکھی ہے اس کی خلاف ورزی اس لئے نہیں کی جاتی کہ وہ مغلوب و عاجز ہے اور نہ بجبر اس کی اطاعت ہوتی

(مصابیح الانوار) ہے اور نہ اس نے مخلوق کی طرف رسولوں کو بیکار مبعوث کیا ہے۔

اس عراقی نے کہا کہ پھر وہ کون سی قضاء قدر تھی جس کے زیر اثر ہم نکلے فرمایا وہ اللہ کا حکم تھا اور پھر اس آیت کی تلاوت فرمائی۔

وقضی ربك ان لا تعبدوا الا ایاہ — تمہارے پروردگار نے تمہیں حکم دیا ہے کہ تم صرف اسی کی عبادت کرو۔

مقصد یہ ہے کہ اس مقام پر قضا کا تعلق افعالِ عباد سے ہے یعنی وہ اپنے بندوں کو مامور کرتا ہے کہ فلاں فلاں کام انجام دیں اور اس حکم کی تعبیر لفظ قضی سے کی ہے جیسا کہ آیت میں قضی کے معنی حکم دینے کے ہیں اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس نے ہمیں بجبر اس فعل کی بجا آوری پر آمادہ کیا ہے بلکہ یہ ہمارے ارادہ و اختیار سے وقوع میں آیا ہے۔ اور جب ہم نے اپنے ارادہ و اختیار سے اس کام کو انجام دیا ہے تو اس پر اجر و ثواب کے بھی مستحق ہوں گے۔

یہ واضح رہے کہ صرف ارادہ و اختیار ہی سے نیک اعمال وقوع میں نہیں آتے بلکہ اس کے ساتھ اسباب کا مہیّا ہونا اور موانع کا برطرف ہونا بھی ضروری ہے اور جب تک اس کی تکمیل کے اسباب فراہم اور موانع برطرف نہ ہوں گے۔ ارادہ عملی صورت اختیار نہ کر سکے گا یہ اسباب کی فراہمی اور موانع کی برطرفی اللہ کے ہاتھ میں ہے اور اسی کا نام توفیق ہے جس سے کسی صورت میں بے نیاز نہیں رہا جا سکتا۔ اسی توفیق کی دستگیری سے انسان اعمالِ خیر کو تکمیل تک پہنچاتا ہے اور جزاء ثواب کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ اس توفیق سے جبر کا توہم نہ ہونا چاہیئے اس لئے کہ کسی کام کی انجام دہی کے اسباب مہیّا کر دینا اور ہے اور اس کام پر مجبور کرنا اور ہے بہر حال اس حد تک اللہ کے دخل کا اعتراف ضروری ہے کہ وہ موانع کو برطرف کر کے اعمالِ خیر کی بجا آوری کے اسباب مہیّا کرتا ہے۔ اس کے برعکس فرقۂ معتزلہ کا نظریہ یہ ہے کہ بندوں کے افعال میں اللہ کا کسی اعتبار سے کوئی دخل نہیں ہے سوائے اس کے کہ اس نے بندوں کو قوت و طاقت دی ہے اور اعضاء و جوارح دئے ہیں جن سے وہ چلتا پھرتا دیکھتا سنتا اور دوسرے کام انجام دیتا ہے۔ یہ عقیدہ جو تفویض کے نام سے موسوم ہے عقیدۂ جبر کا ردعمل ہے جو جبر ہی کی طرح حقیقت و واقعیت سے دور ہے اس لئے کہ اس سے انسان کا اللہ سے مستغنی و بے نیاز ہونا لازم آتا ہے۔ صحیح مسلک وہی ہے جو افراط و تفریط کی ان دونوں سمتوں کے درمیان ہے اور جسے احادیث میں امر بین امرین سے تعبیر کیا گیا ہے اور امیر المومنین کے ارشادات سے بھی یہی مستفاد ہوتا ہے چنانچہ حضرت نے ایک شخص سے جو قضاء و قدر کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا فرمایا۔

ابا اللہ تستطیع ام مع اللہ ام بدون اللہ — کیا تم اللہ کی مدد سے قدرت و استطاعت رکھتے ہو یا اللہ کے ساتھ شریک ہو کر یا اللہ کے بغیر۔

اسے کوئی جواب نہ سوجھا تو آپ نے فرمایا۔

انك ان زعمت انك مع اللہ تستطیع فقد زعمت انك شریك اللہ معہ فی ملکہ وان — اگر تم یہ گمان کرو کہ تم اللہ کے ساتھ ہو کر استطاعت رکھتے ہو تو تم نے خدا کے ملک میں اس کا شریک ہونے

زعمت انک من دون اللہ تستطیع فقد کا گمان کیا اور اگر یہ کہو کہ تم اللہ کے بغیر خود مستقلاً
ادعیت الربوبیۃ (توحید صدوق) استطاعت رکھتے ہو تو تم نے ربوبیت کا دعوی کیا۔
اس شخص نے کہا لا بل باللہ استطیع "میں اللہ کی مدد و دستگیری سے استطاعت رکھتا ہوں۔" حضرت نے فرمایا کہ اگر تم اس کے علاوہ کچھ اور کہتے تو گردن زدنی قرار پاتے۔

اصُولِ خمسہ

دینِ اسلام کے اساسی عقائد کو اصول اور بنیادی اعمال کو فروع کہا جاتا ہے۔ یہ اصول پانچ ہیں، توحید، عدل، نبوت، امامت اور معاد۔ ان میں سے توحید، نبوت اور معاد کے اصول دین ہونے پر تمام فرقِ اسلامیہ کا اتفاق ہے اور عدل و امامت شیعہ عقائد میں شمار ہوتے ہیں۔ اصول اصل کی جمع ہے جس کے معنی جڑ کے ہیں اور فروع فرع کی جمع ہے اور اس کے معنی شاخ کے ہیں۔ عقائد کو اصول اور اعمال کو فروع اس لئے کہا جاتا ہے کہ جس طرح جڑ کے بغیر شاخیں پھلتی پھولتی نہیں اسی طرح اصول کو مانے بغیر فروع کے نشوونما پانے اور برگ و بار لانے کی کوئی صورت نہیں ہے اس لئے کہ فروع ان شرعی احکام کا نام ہے جو اللہ کی طرف سے نازل ہوئے اور پیغمبرِ اکرم کی تبلیغ سے ہم تک پہنچے اگر کوئی اللہ کی ہستی اور اس کی وحدت و یکتائی کا قائل ہی نہیں ہے اور نہ پیغمبرِ اسلام کی نبوت کو تسلیم کرتا ہے تو وہ ان احکام کو احکامِ خداوندی ماننے اور ان پر عمل کرنے کے لئے آمادہ ہی کیونکر ہوگا اور اگر ان احکام کی بجاآوری و خلاف ورزی پر جزاء و سزا نہ ہو تو ان احکام کی پابندی کا ثمرہ و نتیجہ ہی کیا جبکہ انجام کار مطیع و نافرمان دونوں برابر ہو جاتے ہیں اور اگر حشر و نشر کے ساتھ عدل کا عقیدہ نہ ہو تو اللہ کے لئے کون سا امر مانع ہے کہ وہ نیک و فرمانبردار بندے کو جہنم میں جھونک دے اور سرکش و نافرمان کو جنّت میں جگہ دے دے۔ لہٰذا اسے عادل نہ تسلیم کیا جائے تو جزاء و سزا کا نظریہ ہی بے معنی ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر احکام میں تحریف و تبدّل سے تحفّظ کا سر و سامان نہ ہو تو احکام اپنی اصلی حالت پر باقی نہیں رہ سکتے بلکہ اغراضِ فاسدہ کا نشانہ بن کر اپنی ہیئت و صورت کھو بیٹھیں گے اور ابلاغ و اعلام کے باوجود حجت ناتمام رہے گی اور اتمامِ حجت کے بغیر ثواب و عقاب کا استحقاق ختم ہو جاتا ہے اسی تحفّظ و نگہداشت کی ذمہ داری کا نام امامت ہے یہ اصول تمام تر عقل پر مبنی ہیں اور عقل ہی وہ معیار ہے جس پر صحیح و غلط کو پرکھا جا سکتا ہے اسی لئے قرآن مجید میں بار بار فکر و تدبّر کی دعوت دی گئی ہے تاکہ عقل و بصیرت کی روشنی میں عقائد کو پرکھا جائے اور جانچ پرکھ کر دل و دماغ میں جگہ دی جائے۔ ذیل میں اصول خمسہ کے بارے میں امیر المومنین کے چند ارشادات درج کئے جاتے ہیں جو حقائقِ دینیہ و معارفِ الٰہیہ کا سرچشمہ ہیں۔

توحید توحید کا مطلب یہ ہے کہ خالقِ کائنات ایک ہے اور ہر اعتبار سے واحد و یکتا ہے نہ اس کی ذات میں کوئی شریک ہے نہ صفات میں اور نہ افعال میں خلق و رزق موت و حیات اور نظمِ عالم میں اسی کا عمل دخل ہے اور نہ اس کے علاوہ کوئی معبود اور عبادت کا سزاوار ہے۔ اس لحاظ سے توحید کے چار اقسام ہوں گے توحید فی الذات

توحید فی الصفات، توحید فی الافعال اور توحید فی العبادات۔

توحید فی الذات کے بارے میں حضرت کا ارشاد ہے۔

واعلم یا بنی انه لوکان لربك شریك لاتتك رسله و لرائیت آثار ملکه وسلطانه و لعرفت افعاله وصفاته و لکنه اله واحد کما وصف نفسه لا یضاده فی ملکه احد و لا یزول ابدا۔ (نہج البلاغہ)

اے فرزند! یقین کرو کہ اگر تمہارے پروردگار کا کوئی شریک ہوتا تو اس کے بھی رسول آتے اور اس کی سلطنت و فرمانروائی کے بھی آثار دکھائی دیتے اور اس کے افعال وصفات بھی کچھ معلوم ہوتے مگر وہ ایک اکیلا خدا ہے جیسا کہ اس نے خود بیان کیا ہے اس کے ملک میں کوئی اس سے ٹکر نہیں لے سکتا وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

خداوندِ عالم کی وحدت و یکتائی پر یہ ایک کھلی ہوئی اور روشن دلیل ہے جس میں نہ اصطلاحی الفاظ صرف ہوئے ہیں اور نہ ترتیب مقدمات سے اخذ نتائج پر مبنی ہے بلکہ اتنی سادہ اور واضح ہے کہ ہر سطح کا ذہن اسے سمجھتا اور قبول کرتا ہے اس سے کسی فرد کو خواہ وہ کسی گروہ سے تعلق رکھتا ہو انکار نہیں ہو سکتا کہ ابتدائے آفرینش سے پیغمبر خاتم تک جتنے بھی انبیاء و رسل آئے سبھوں نے ایک ہی خدا کی نشاندہی کی اور ایک ہی خدا کا پیغام پہنچایا اگر اس ذات واحد کے علاوہ کوئی اور بھی خدا ہوتا تو اس کے واجب الوجود ہونے کا تقاضا یہ تھا کہ وہ علم و قدرت اور دوسرے صفات کمالیہ رکھتا اور ان صفات کمالیہ کا ظہور ہوتا اس کی قدرت کے آثار اور علم و حکمت کے مظاہر دیکھنے میں آتے اور انبیاء و رسل کے ذریعہ اس کے احکام ہم تک پہنچتے ان میں سے کچھ ایک خدا کی طرف سے آتے کچھ دوسرے خدا کی طرف سے مبعوث ہوتے اور اپنے اپنے خدا کی نمائندگی کرتے۔ مگر اول سے آخر تک ہر نبی کی زبان سے بغیر کسی اختلاف کے ایک ہی آواز بلند ہوتی ہے کہ وہ واحد و یکتا ہے اور ہم سب اسی ایک خدا کے فرستادہ ہیں جس کا کوئی شریک و مثیل نہیں ہے چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

وما ارسلنا من قبلك من رسول الا نوحی الیه انه لا اله الا انا فاعبدون۔

ہم نے تم سے پہلے جو بھی رسول بھیجا اسے وحی کے ذریعہ یہی تعلیم دیتے رہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے لہٰذا میری عبادت کرو۔

دنیا میں اور چیزوں کو بھی ایک کہا جاتا ہے مگر اللہ کی وحدت ان ایک کہی جانے والی چیزوں سے جداگانہ نوعیت رکھتی ہے وہ نہ گنتی میں سماتا ہے اور نہ شمار میں آتا ہے۔ چنانچہ حضرت کا ارشاد ہے۔

واحد لا بعدد (نہج البلاغہ) — وہ ایک ہے مگر نہ گنتی کے اعتبار سے

فن حساب میں عدد اسے کہا جاتا ہے جو اپنے ماقبل اور مابعد عدد کے مجموعہ کا نصف ہو چنانچہ دو کے پہلے ایک کا عدد ہے اور اس کے بعد تین کا عدد ہے اور ایک اور تین کا مجموعہ چار ہوتا ہے اور دو کا عدد چار کا نصف ہے اسی طرح

الله الذی خلقکم ثم رزقکم ثم یمیتکم ثم یحییکم ھل من شرکاءکم من یفعل من ذلکم من شئی سبحانہ وتعالی عما یشرکون

خدا وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا پھر تمہیں رزق دیا پھر وہی تمہیں مارے گا پھر وہی تمہیں جلائے گا کیا تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں میں کوئی ایسا ہے جو ان کاموں میں سے کوئی کام کر سکے یہ لوگ جسے اس کا شریک بناتے ہیں وہ اس سے پاک و منزّہ ہے۔

توحید فی العبادات کے بارے میں حضرت کا ارشاد ہے۔

الذی لا تحق العبادۃ لغیرہ الا لہ (تفسیر البرہان)

عبادت کا استحقاق اللہ کے علاوہ اور کسی کو نہیں ہے۔

اللہ معبود حقیقی ہے اور اس کے علاوہ سب اس کے بندے ہیں اس عبودیت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اسی کی عبادت کریں اور اسی کے آگے سجدہ ریز ہوں۔ ہر نبی اور ہر رسول نے اپنی امت کو خدائے واحد کی پرستش کی تعلیم دی اور پیغمبر اسلام نے بھی عبادت کو مقصد حیات انسانی قرار دیتے ہوئے اسی کو عبادت کا سزاوار ٹھہرایا اور خود ساختہ بتوں کی پرستش سے بشدت منع کیا توحید کا مقصد صرف یہ نہیں ہے کہ اللہ کو ایک مان لیا جائے بلکہ ایک ماننے کے ساتھ ہر بندگی اور ہر پرستش کو بھی اس کے لئے مخصوص کرنا ضروری و لازمی ہے اگر کوئی شخص اللہ کو ایک مانتا ہے مگر شعوری یا لاشعوری طور پر غیر اللہ کو بھی عبادت میں شریک کرتا ہے وہ آخرت کی کامیابی و کامرانی سے محروم رہتا ہے چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

من کان یرجو لقاء ربہ فلیعمل عملا صالحا ولا یشرک بعبادۃ ربہ احدا۔

جو شخص اپنے پروردگار کی لقاء کا امیدوار ہے اُسے چاہیئے کہ نیک عمل کرے اور اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

عدل

امیر المومنین کا ارشاد ہے۔

ارتفع عن ظلم عبادہ وقام بالقسط فی خلقہ وعدل علیھم فی حکمہ (نہج البلاغہ)

وہ اپنے بندوں پر ظلم کرنے سے بالاتر ہے وہ مخلوق کے بارے میں عدل سے چلتا ہے اور اپنے حکم میں انصاف برتتا ہے۔

خداوند عالم کے صفات میں عدل ایک بنیادی صفت ہے۔ عدل کے معنی یہ ہیں کہ ہر شئے کو اس کے مناسب حال محل و مقام پر رکھا جائے۔ یہ صفت اللہ کے تمام افعال و اوامر میں کارفرما ہے وہ نہ ظلم کا مرتکب ہوتا ہے نہ شر کا اور نہ اس سے کوئی ایسا فعل سرزد ہوتا ہے جو قبیح اور عبث ہو بلکہ اس کا ہر اقدام حکمت و مصلحت سے وابستہ اور ہر حکم مقصد کا حامل ہوتا ہے۔ اللہ سبحانہ نے قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں اپنی اس صفت کا ذکر کیا ہے کبھی

مثبت الفاظ میں جیسے

وتمت کلمة ربك صدقا وعدلا — تمہارے پروردگار کی بات سچائی اور عدل پر تمام ہوتی ہے۔

اور کبھی منفی انداز میں جیسے

ان الله لیس بظلام للعبید — اللہ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔

ان واضح نصوص کے بعد کوئی ایسا رخ اختیار نہ کرنا چاہئیے تھا جس سے عدل کی نفی ہوتی ہو مگر اشاعرہ نے حسن وقبح عقلی کا انکار کرکے عدل کا بھی ایک طرح سے انکار کر دیا ہے۔ حسن وقبح عقلی کا مطلب یہ ہے کہ اچھے اور برے افعال کے پرکھنے کا معیار عقل ہے چنانچہ انسان سے جو افعال صادر ہوتے ہیں ان میں کچھ اچھے ہوتے ہیں جیسے صدق مروت دیانت حفظ عہد وغیرہ اور کچھ برے ہوتے ہیں جیسے کذب فریب غصب ظلم وغیرہ ان افعال کی اچھائی اور برائی کا فیصلہ عقل ہی نے کیا ہے اور وہی اچھے افعال کو اچھا اور برے افعال کو برا سمجھتی ہے اور جن افعال کی اچھائی یا برائی کا فیصلہ نہیں کرپاتی ایسا نہیں ہے کہ ان میں اچھائی یا برائی نہ ہو بلکہ واقع میں ان میں اچھائی ہوتی ہے یا برائی اور شارع نے تشریح احکام میں اسی حسن وقبح کا لحاظ رکھا ہے اس طرح کہ جن چیزوں میں اچھائی ہوتی ہے انہیں واجب یا مستحب کا درجہ دے دیا جاتا ہے اور جن چیزوں میں برائی ہوتی ہے انہیں حرام یا مکروہ قرار دے دیا جاتا ہے چنانچہ امیرالمومنین کا ارشاد ہے۔

انه لم یامرك الا بحسن ولم ینهك — اللہ نے تمہیں انہی چیزوں کا حکم دیا ہے جو اچھی ہیں

الا عن قبیح (نہج البلاغہ) — اور انہی چیزوں سے منع کیا ہے جو بری ہیں۔

اشاعرہ کا نظریہ یہ ہے کہ افعال کی اچھائی یا برائی کا معیار عقل نہیں ہے کیونکہ افعال ذاتاً نہ اچھے ہوتے ہیں اور نہ برے بلکہ شرع جس فعل کے بجالانے کا حکم دے وہ اچھا ہے اور جس سے منع کرے وہ برا ہے اور عقل یہ تجویز کرنے سے قاصر ہے کہ کونسا فعل اچھا ہے اور کون سا فعل برا ہے کیونکہ حسن وقبح صرف حکم شریعت کے تابع ہے اور حکم شریعت سے قطع نظر کسی شے میں اچھائی ہے اور نہ برائی۔ اس نظریہ کی رو سے اگر اللہ کسی بری بات کا حکم دے تو وہ اچھی ہو جائے گی اور کسی اچھی بات سے منع کر دے تو وہ بری ہو جائے گی اس کے اوامر و نواہی میں واقعی اچھائی برائی اور مصلحت کا کارفرما ہونا ضروری نہیں ہے لہٰذا وہ نیکوکار بندوں کو جہنم میں ڈال دے اور بدکاروں کو جنت میں جگہ دے دے یا بندوں پر ایسے احکام عائد کرے جو بشری طاقت سے باہر ہوں تو اس سے نہ اس کے عدل پر حرف آئے گا اور نہ اس کا انصاف مجروح ہوگا اس لئے کہ وہ جو کرے وہ اچھا اور مطابق عدل ہے اور جو نہ کرے وہ برا ہے۔ اس عقیدہ کا لازمی نتیجہ نفی عدل ہے کیونکہ اس طرح اس کے اوامر و نواہی میں نہ مصلحت کا دخل ہوگا اور نہ عدل کے تقاضوں کا۔ اس کے برعکس حسن وقبح عقلی کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ انہی چیزوں کا حکم دیتا ہے جن میں کوئی خوبی پائی جاتی ہے اور انہی چیزوں سے روکتا ہے جن میں برائی مضمر ہوتی ہے لہٰذا نیکوکار کو جہنم میں ڈالنا صریحاً ظلم ہوگا اور ظلم قبیح ہے اور بندوں کو ایسے افعال کا پابند کرنا جو ان کی طاقت سے باہر ہوں تقاضائے حکمت کے منافی ہوگا اور جو فعل قبیح اور منافی حکمت ہو وہ اس سے سرزد نہیں ہوتا۔

اشاعرہ اپنے نظریہ کی یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ جب اللہ ہر چیز پر حق تصرف رکھتا ہے تو اس کے بعض تصرفات پر پابندی عائد کرنا اس کے دائرہ اختیارات کو محدود کر دینا ہے اور یہ اس کی شان الوہیت کے منافی ہے اشاعرہ کا یہ ایراد اس صورت میں وارد ہو سکتا تھا جب یہ کہا جاتا کہ وہ فعل قبیح یا عبث پر قادر ہی نہیں ہے اور جبکہ وہ اپنے ارادہ و اختیار سے ظلم اور دوسرے افعالِ قبیحہ کا مرتکب نہیں ہوتا کیونکہ یہ چیزیں اس کی شانِ قدوسیت کے خلاف ہیں تو اس سے نہ اس کی قوت و قدرت محدود ہوتی ہے اور نہ اس کے تصرفات پر پابندی عائد ہونے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

نبوّت

حضرت کا ارشاد ہے۔

لم یخل سبحانہ خلقہ من نبی مرسل او کتاب منزل او حجۃ لازمۃ او محجۃ قائمۃ رسل لا تقصر بھم قلۃ عددھم ولا کثرۃ المکذبین لھم من سابق سمی لہ من بعدہ او غابر عرفہ من قبلہ (نہج البلاغہ)

اللہ سبحانہ نے اپنی مخلوق کو بغیر کسی فرستادہ پیغمبر آسمانی کتاب یا دلیل قطعی یا طریق روشن کے کبھی یونہی نہیں چھوڑا ایسے رسول جنہیں تعداد کی کمی اور جھٹلانے والوں کی کثرت عاجز و درماندہ نہیں کرتی تھی ان میں کوئی سابق تھا جس نے بعد میں آنے والے کا نام و نشاں بتایا کوئی بعد میں آیا جسے پہلا پہچنوا چکا تھا۔

انسان کی زندگی کے دو پہلو ہیں ایک حیوانی اور دوسرا عقلی۔ اگر انسان اپنی زندگی کا مقصد دنیوی عیش و تنعم ہی کو قرار دے لے تو اسے اختیار ہے کہ جس طرح چاہے زندگی بسر کرے نہ اس کی نفسانی خواہشوں پر گرفت ہوگی اور نہ اس پر کوئی اخلاقی و اجتماعی پابندی عائد ہوگی یہ حیوانی زندگی ہے جسے انسانی و عقلی زندگی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا، اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسان اپنے کو ہمہ جہتی آزاد تصوّر نہ کرے کہ ہر قید و بند کو توڑ کر جو چاہے کرے یہ مادہ سے ماوراء عقلی و روحانی زندگی ہے جو چند حدود و قیود کی پابند ہے۔ یہ حدود و قیود حکومتوں کے وضع کردہ بھی ہو سکتے ہیں چنانچہ ہر حکومت ایسے قوانین نافذ کرتی رہتی ہے جو اخلاقی قدروں کے حامل تصوّر کیے جاتے ہیں مگر یہ قانون اور ضابطے آئے دن بنتے بگڑتے رہتے ہیں آج اچھائی کی کچھ قدریں ہیں اور کل ان کی جگہ دوسری قدریں لے لیتی ہیں آج اچھائی اور بُرائی کا معیار اور ہے اور کل اور ہوگا بلکہ ایک ہی وقت میں ایک معاشرہ میں ایک چیز اچھی سمجھی جاتی ہے اور دوسرے معاشرہ میں بری اور ایسا متحدہ لائحہ عمل جس پر تمام عقلاء روزگار متفق ہوں نہ ترتیب دیا گیا ہے اور نہ اختلاف طبائع کو دیکھتے ہوئے ترتیب دیا جا سکتا ہے اگر کسی مخصوص طبقہ کو وضع قوانین کا اختیار دے دیا جائے تو وہ ایسے ہی قوانین وضع کرے گا جو اسی طبقہ کے مفاد میں ہونگے اور اگر ہر شخص کو اسکی عقل و رائے پر آزاد چھوڑ دیا جائے کہ اس کیلئے وہی اچھائی ہے جسے وہ اچھا سمجھے اور وہی برائی ہے جسے وہ بُرا سمجھے تو پھر نہ نیکی کا کوئی معیار ہوگا اور نہ بدی کا

کوئی پیمانہ نہ بلکہ ہر شخص کی اپنی اپنی رائے ہوگی اور اپنا اپنا نظریہ اس کے نتیجہ میں نہ کوئی نصب العین طے پائے گا اور نہ انسانی معاشرہ میں وحدت و اجتماعیت پیدا ہو سکے گی لہٰذا وحدت و اجتماعیت کیلئے ایک ایسا ضابطہ و قانون ناگزیر ہے جو آفاقی و ہمہ گیر مفادِ عمومی کا حامل اور حقوقِ عامہ کے تحفّظ کا ضامن ہو ایسا قانون اسی کی طرف سے ہو سکتا ہے جو نوعِ بشر کے تمام افراد کے مصالح و حکم کا احاطہ کئے ہو اور ان کے سود و زیاں کا علم رکھتا ہو اور وہ صرف خداوند عالم ہے مگر وہ نہ دیکھا جا سکتا ہے نہ اس سے ہمکلام ہوا جا سکتا ہے اور نہ اس سے براہِ راست احکام لئے جا سکتے ہیں جیسا کہ خود اس کا ارشاد ہے۔

وما کان لبشر ان یکلمه الله الا وحیا	کسی آدمی کے لئے یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ اس سے
او من وراء حجاب او یرسل	ہمکلام ہو مگر وحی کے ذریعہ سے یا پردہ کے پیچھے
رسولا	سے یا فرشتے بھیج کر۔

لہٰذا خدا اور اس کے بندوں کے درمیان ایسے قابلِ اعتماد وسائط کی ضرورت ہے جو اس سے بذریعہ وحی احکام لیں اور انہیں جوں کا توں اس کے بندوں تک پہنچائیں۔ اس اخذ و ابلاغ کا نام نبوت و رسالت ہے اور ان وسائط کو نبی یا رسول کہا جاتا ہے۔ امیر المومنین کے ارشاد سے ظاہر ہے کہ خلاقِ عالم نے ہر عہد میں ابلاغ احکام و اتمام حجت کے لئے انبیاء بھیجے اور زمین کا کوئی خطہ اور بنی نوع انسان کا کوئی طبقہ ایسا نہیں ہے جس میں کوئی نہ کوئی نبی ہدایت خلق کے لئے نہ آیا ہو چنانچہ قرآنِ مجید میں ہے۔

ولقد بعثنا فی کل امة رسولا	ہم نے ہر قوم میں ایک نہ ایک رسول بھیجا۔

قولِ مشہور کی بنا پر ان انبیاء کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے جن میں سے حضرت نوح حضرت ابراہیم حضرت موسیٰ حضرت عیسیٰ علیہم السلام اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہ پیغمبران اولوالعزم تھے۔ پہلے چاروں نبیوں کی شریعتیں ختم ہو چکی ہیں اور خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ کی شریعت ہمیشہ باقی و برقرار رہنے والی ہے۔ ان تمام انبیاء پر خواہ ان کا ذکر قرآن میں آیا ہو یا نہ آیا ہو ایمان لانا اور انہیں ہر چھوٹے بڑے گناہ سے معصوم سمجھنا ضروری ہے۔

آنحضرت کی نبوّت کے اثبات کے لئے قرآنِ مجید اور آپ کی سیرت طیبہ کافی و وافی ہیں۔ قرآنِ مجید اللہ کا کلام ہے جس کی بے مثل فصاحت و بلاغت نے عرب کے فصحاء و ادباء کی زبانوں کو گنگ کر دیا۔ چنانچہ پیغمبر اکرم نے جب اسے خالق کے کلام کی حیثیت سے پیش کیا اس دعویٰ کے ساتھ کہ اس کی مثل و نظیر لاؤ تو زبان دانوں کی اجتماعی طاقتیں جواب دے گئیں اور زبان آوری کا جوہر دم توڑتا نظر آنے لگا۔ یہ عجز و درماندگی اس کا ثبوت ہے کہ یہ کلام بشری طاقت سے باہر اور آپ کی نبوت کا زندہ و پائندہ معجزہ ہے اسی طرح آپ کی سیرت آپ کی صداقت کی واضح دلیل ہے چنانچہ یہ امر روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ آپ کی زندگی شروع سے آخر تک صداقت و حق پسندی اور دیانت و راستبازی کا مکمل نمونہ تھی یہاں تک کہ کفار و مشرکین دشمنی و عناد کے مظاہروں کے باوجود آپ کی

راست گوئی وامانت داری پر حرف رکھنے کی جرأت نہ کر سکے جب آپ کی صدق بیانی مسلم اور ہر شک وشبہ سے بلند تر ہے تو جس نے زندگی کے کسی دور میں کوئی جھوٹی بات نہ کہی ہو اور نہ کوئی غلط کلمہ اس کی زبان سے نکلا ہو تو اس سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ غلط بیانی سے کام لے گا یا کوئی جھوٹا دعویٰ کرے گا۔

آنحضرت کا جوہر صرف صداقت و دیانت ہی نہ تھا بلکہ آپ کی سیرت کے جس پہلو پر نظر کی جائے وہ اتنا جذاب اور پرکشش ہے کہ ایک دنیا کی نظروں کو اپنی طرف کھینچ لینے کی طاقت رکھتا ہے آپ کی عظمت و رفعت شرف و فضیلت اور کمال نبوت کے سلسلہ میں امیر المومنین کے خطبات میں سے چند کلمے بطور مشتے از خروارے درج کئے جاتے ہیں جو ماخذ و حرفِ آخر کا درجہ رکھتے ہیں۔

پیغمبر اکرم کے حلیۂ مبارک کے بارے میں فرمایا ہے۔

کان حبیبی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ صلت الجبین مقرون الحاجبین ادعج العینین سہل الخدین اقنی الانف دقیق المسربۃ کث اللحیۃ براق الثنایا کان عنقہ ابریق فضۃ کان لہ شعیرات من لبتہ الی سرتہ ملفوفۃ کانہا قضیب کافور لم یکن فی بدنہ شعیرات غیرہا لم یکن بالطویل الذاہب ولا بالقصیر النزر کان اذا مشی مع الناس غمرہم نورہ وکان اذا مشی کان ینقلع من صخر او ینحدر من صبب کان مدور الکعبین لطیف القدمین دقیق الخصر۔

(بحار الانوار ج ۱۰ ص ۵ طبع جدید)

میرے حبیب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ کی پیشانی کشادہ ابرو پیوستہ آنکھیں سرگیں رخسار نرم و ہموار ناک ستواں سینہ پر روؤں کی دھاری ریش مبارک گھنی دانت چمکیلے گردن لانبی جیسے چاندی کی صراحی سینہ سے ناف تک کافور کی ڈلیوں کی طرح کے بال اس کے علاوہ جسم مبارک پر بال نہ تھے نہ زیادہ طویل القامت تھے اور نہ زیادہ پست قد جب لوگوں کے ہجوم میں نکلتے تو آپ کا نور سب پر چھا جاتا تھا چلتے تھے تو پیروں کو اوپر اٹھا کر گویا بلندی سے نیچے اتر رہے ہوں یا پانی کے بہاؤ میں بہ رہے ہوں پیروں کے دونوں ٹخنے گول پیر نازک اور کمر پتلی تھی۔

آنحضرت کی نسلی و خاندانی رفعت و سربلندی کے بارے میں فرماتے ہیں۔

حتی افضت کرامۃ اللہ سبحانہ الی محمد صلی اللہ علیہ والہ فاخرجہ من افضل المعادن منبتا واعز الارومات مغرسا من الشجرۃ التی صدع منہا انبیائہ وانتجب منہا امناءہ عترتہ خیر العتر واسرتہ خیر الاسر والشجرتہ خیر الشجر۔

یہاں تک کہ یہ شرف الٰہی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ تک پہنچا جنہیں ایسے معدنوں سے کہ جو پھلنے پھولنے کے اعتبار سے بہترین اور ایسی اصلوں سے کہ جو نشو و نما کے لحاظ سے بہت باوقار تھیں پیدا کیا اسی شجرہ سے کہ جس سے انبیاء پیدا کئے اور جس میں سے امین منتخب فرمائے ان کی عترت بہترین عترت اور قبیلہ

(نہج البلاغہ) بہترین قبیلہ اور شجرہ بہترین شجرہ ہے۔

آنحضرت کی افضلیت و برتری کے سلسلہ میں فرماتے ہیں۔

ما براء اللہ نسمۃ خیرا من محمد صلی اللہ علیہ والہ (فصول)

خداوند عالم نے کسی ذی روح کو محمد صلے اللہ علیہ وآلہ سے بہتر خلق نہیں کیا۔

آپ کی سادہ زندگی اور سادہ معاشرت کے بارے میں فرماتے ہیں۔

لقد کان صلی اللہ علیہ والہ یاکل علی الارض و یجلس جلسۃ العبد و یخصف بیدہ نعلہ و یرقع بیدہ ثوبہ و یرکب الحمار العاری و یردف خلفہ۔ (نہج البلاغہ)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ زمین پر بیٹھ کر کھانا کھاتے اور غلاموں کی طرح بیٹھتے تھے اپنے ہاتھ سے جوتی ٹانکتے تھے اور اپنے ہاتھوں سے کپڑوں میں پیوند لگاتے تھے اور بے پالان کے گدھے پر سوار ہوتے تھے اور اپنے پیچھے کسی کو بٹھا لیتے تھے۔

آپ کے اخلاق و اطوار کی شائستگی اور عادات و خصائل کی پاکیزگی کے سلسلہ میں فرماتے ہیں۔

ماصافح رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ احدا قط فنزع یدہ من یدہ حتی یکون ھوالذی ینزع یدہ وما فاوضہ احد قط فی حاجۃ اوحدیث فانصرف حتی یکون الرجل ینصرف وما نازعہ الحدیث حتی یکون ھوالذی یسکت وما رای مقدما رجلہ بین یدی جلیس لہ قط (مستدرک الوسائل)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ جب کسی سے مصافحہ کرتے تو اس وقت تک اپنا ہاتھ الگ نہ کرتے جب تک وہ اپنا ہاتھ نہ کھینچتا اور جب کوئی آپ سے کسی حاجت کے متعلق کچھ کہتا یا گفتگو کرتا تو جب تک وہ نہ پلٹتا آپ نہ پلٹتے اور جب تک وہ خاموش نہ ہوتا آپ کلام نہ کرتے اور مجلس میں اپنے کسی ساتھی کے سامنے اپنے پاؤں پھیلانا پسند نہ فرماتے۔

پیغمبر اکرم کے محامد و محاسن کا شمار ہو سکتا ہے اور نہ آپ کی اخلاقی عظمتوں کا احاطہ کیا جا سکتا ہے چنانچہ امیرالمومنین سے ایک یہودی عالم نے کہا کہ آپ اپنے ابن عم (پیغمبر اکرم) کے خصائل و اوصاف گنوائیں حضرت نے فرمایا کہ پہلے تم دنیا کی چیزوں کی گنتی بتاؤ کہا کہ دنیا کی چیزوں کا شمار ہماری قوت و طاقت سے باہر ہے۔ فرمایا دنیا کی چیزوں کے بارے میں قدرت کا ارشاد ہے قل متاع الدنیا قلیل "کہو کہ دنیا کا ساز و سامان تھوڑا ہے" اور آنحضرت کے اوصاف و محاسن کے بارے میں فرمایا ہے۔ انک لعلی خلق عظیم "تم خلق عظیم پر فائز ہو" جب قلیل کا احاطہ نہیں ہو سکتا تو عظیم کا شمار کیونکر ہو سکتا ہے۔

آپ پر نبوت کے اختتام پذیر ہونے کے بارے میں فرمایا۔

فقفی بہ الرسل وختم بہ الوحی

آپ کو سب رسولوں کے آخر میں بھیجا اور آپ کے ذریعہ وحی کا سلسلہ ختم کیا۔

امامت امیرالمومنین فرماتے ہیں۔

اللھم لا بد لك من حجج فی ارضك حجۃ بعد حجۃ یھدونھم الی دینك ویعلمونھم علمك

(وسائل الشیعہ ج ۳ ص ۳۷۹)

بار الٰہا! زمین میں تیرے مقرر کردہ حجج میں سے ایک حجت کے بعد دوسری حجت کا ہونا ضروری ہے جو تیرے دین کی طرف لوگوں کی رہنمائی کریں اور تیرے تعلیمات سے انہیں آگاہ کریں۔

امامت پیغمبر اسلام کی نیابت میں دینی و دنیوی سربراہی کا نام ہے اور اس منصب پر فائز ہونے والا امام کہلاتا ہے جس کی اطاعت و پیروی افراد امت پر واجب ہے۔ امام کے فرائض میں اسلامی مفاد کے تحفظ شرعی احکام کے نفاذ اور اجرائے حدود کے ساتھ مسلمانوں کی عملی تربیت اور حقداروں کی حق رسی بھی داخل ہے۔ ان فرائض کے سلسلہ میں امیرالمومنین فرماتے ہیں۔

انہ لیس علی الامام الا ما حمل من امر ربہ الابلاغ فی الموعظۃ والاجتہاد فی النصیحۃ والاحیاء للسنۃ واقامۃ الحدود علی مستحقیھا واصدار السھمان علی اھلھا

(نہج البلاغہ)

امام کا فرض تو بس یہ ہے کہ جو کام اسے اپنے پروردگار کی طرف سے سپرد ہوا ہے اسے انجام دے اور وہ یہ ہے کہ پند و نصیحت کی باتیں لوگوں تک پہنچائے سمجھانے بجھانے میں پوری پوری کوشش کرے سُنّت کو زندہ رکھے اور جو حد کے سزاوار ہیں ان پر حد جاری کرے اور غصب کئے ہوئے حصوں کو ان کے اصلی وارثوں تک پہنچائے۔

نصب امام کے وجوب میں خوارج کے علاوہ اسلامی مکاتب فکر میں سے کسی نے اختلاف نہیں کیا البتہ طریق نصب میں نظریات مختلف ہیں۔ اہلسنت کا نظریہ یہ ہے کہ امت پر نصب امام دلیل سمعی کی رو سے واجب ہے معتزلہ اور زیدیہ کہتے ہیں کہ امت پر نصب امام دلیل عقلی کی بنا پر واجب ہے اور امامیہ کا مسلک یہ ہے کہ امام کا تقرر منجانب اللہ ہوتا ہے اور اس میں جمہور امت کی رائے کا دخل نہیں ہے۔ امام کے منجانب اللہ تقرر پر عقل و نقل دونوں متفق ہیں چنانچہ عقل قطعی طور پر بتلاتی ہے کہ پیغمبر کے شریعت کے تحفّظ کے لئے کسی ایسے فرد کا تقرر ضروری ہے جو احکام دین کو تبدل و تحریف اور شیرازۂ اسلام کو انتشار و پراگندگی سے محفوظ رکھ سکے اور انسانی طبائع کے اختلاف اور آراء کے تباین کو دیکھتے ہوئے اسے عوام کی صوابدید پر چھوڑ دینا عمداً افتراق و انتشار اور باہمی تصادم کو دعوت دینا ہے۔ اس لئے کہ عوام انتخابی الجھیڑوں بکھیڑوں میں باہمی ٹکراؤ سے بچ کر نہیں رہ سکتے اور جبکہ پہلا چناؤ جو سقیفہ بنی ساعدہ کی چاردیواری میں ہوا وہ دھینگا مشتی سے خالی نہ رہ سکا تو اور انتخابات معرکہ آرائی سے کیا خالی رہیں گے پھر اکثر افراد اپنی رائے کا اظہار اسی کے حق میں کریں گے جس سے ان کا مفاد وابستہ ہوگا یا کوئی خاص لگاؤ ہوگا۔ یہ نہیں دیکھیں گے کہ اس میں اہلیت و صلاحیت بھی پائی جاتی ہے یا نہیں لہٰذا ایسی اکثریت کا فیصلہ جو ذاتی اغراض کی سطح سے بلند نہ ہو

عقلِ سلیم کے نزدیک قابل پذیرائی نہیں ہوسکتا پھر اکثریت کے منتخب کردہ رہنما کی رہنمائی پر اعتماد بھی تو نہیں کیا جا سکتا کیونکہ جسے منتخب کیا ہے اس سے رہنمائی میں یقیناً غلطیاں ہو سکتی ہیں اور ان غلطیوں سے ہدایت کا مقصد فوت ہو جائے گا لہذا خدا کے مقرر کردہ ہی سے صحیح رہنمائی کی توقع کی جا سکتی ہے کیونکہ اس کا ہر قول و عمل منشائے الٰہی کا ترجمان ہوتا ہے جس میں غلطی کا امکان ہی نہیں ہوتا اور قرآن مجید بھی اس امر کا شاہد ہے کہ نصب امام اللہ سے متعلق ہے چنانچہ ارشاد باری ہے۔

ان علینا للھدی — ہدایت کے ہم ذمہ دار ہیں۔

جب ہدایت اللہ کے ذمہ ہے تو جن افراد کے ذمہ ہدایت کا نشر و ابلاغ ہوگا ان کا تقرر بھی اللہ کی طرف سے ہونا چاہیئے ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہدایت اللہ کی طرف سے ہو اور ہادی کا تقرر ہمارے چناؤ پر منحصر ہو اگر ہم راہ ہدایت کا از خود تعین نہیں کر سکتے تو ہادی و رہنما کا تقرر بھی ہمارے دائرہ اختیار سے باہر ہوگا چنانچہ خداوند عالم نے بندوں کے حق انتخاب کی نفی کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

وربک یخلق مایشاء ویختار ماکان لھم الخیرۃ — تمہارا پروردگار جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے منتخب کرتا ہے ان لوگوں کو چناؤ کا کوئی حق نہیں ہے۔

جب عقل اور قرآن کی رو سے نصب امام ضروری قرار پایا تو لامحالہ اس کی معرفت اور اتباع بھی واجب ہوگا اس لئے کہ اگر اس کا قول و عمل واجب الاتباع نہیں ہوگا تو اس کے نصب کرنے کا فائدہ و نتیجہ ہی کیا اور اتباع اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک اس کی معرفت نہ ہو چنانچہ امیرالمومنین معرفت امام کے وجوب و لزوم کے سلسلہ میں فرماتے ہیں۔

انما الائمۃ قوام اللہ علی خلقہ وعرفاءہ علی عبادہ لا یدخل الجنۃ الا من عرفھم وعرفوہ ولا یدخل النار الا من انکرھم وانکروہ — بلاشبہ آئمہ اللہ کے ٹھہرائے ہوئے نمائندے ہیں اور اس کو بندوں سے پہچنوانے والے ہیں جنت میں وہی لوگ جائیں گے جنہیں ان کی معرفت ہو اور وہ بھی انہیں پہچانیں اور دوزخ میں وہی ڈالے جائیں گے جو نہ انہیں پہچانیں اور نہ وہ ان کو پہچانیں۔

حدیث نبوی میں وارد ہوا ہے کہ

من مات لم یعرف امام زمانہ فقد مات میتۃ جاھلیۃ (شرح عقائد نسفی ص ۱۱۰) — جو شخص اپنے زمانہ کے امام کو پہچانے بغیر مر جائے وہ جاہلیت کی موت مرا۔

یہ ارشاد پیغمبر اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ ہر زمانہ اور ہر دور میں وجود امام ضروری ہے اور اس کی معرفت جاہلیت کی موت سے بچانے کا کام دینے والی ہے۔ بعض افراد نے اس مقام پر امام سے قرآن مجید مراد لے کر ضرورت امام اور

اس کی معرفت کی اہمیت کو کم کرنا چاہا ہے۔ حالانکہ لفظ امام سے قرآن کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا جس طرح لفظ قرآن سے امام کی طرف ذہنی تبادر نہیں ہوتا اگر اس سے قرآن مجید مراد ہوتا تو اس معنی کی تعیین کے لئے قرینہ نصب کرنے کی ضرورت تھی اور جبکہ کوئی قرینہ نہیں ہے تو مفہوم وضعی سے عدول کرنا اور امام سے قرآن مجید مراد لینا صریحاً دھاندلی ہے جس کا کوئی جواز نہیں ہے اس کے علاوہ قرآن مجید مراد لینے کی صورت میں ہر زمانہ کے لئے الگ الگ قرآن ماننا ہوں گے ورنہ زمانہ کی تقیید لغو اور بے معنی قرار پائے گی حالانکہ قرآن ہر دور میں ایک رہا ہے اور ایک رہے گا اور زمانہ کے ساتھ اس میں تبدیلی نہیں آتی کہ یہ کہا جائے کہ فلاں زمانہ میں فلاں قرآن اور فلاں دور میں فلاں قرآن۔ یہ زمانہ کی قید ظاہر کرتی ہے کہ امام سے مراد وہ ہادی و رہنما ہیں جو یکے بعد دیگرے آئیں گے اور ایک حجت کے بعد دوسری حجت کا ظہور ہوتا رہے گا اس سلسلہ آئمہ کے کسی نہ کسی فرد کا ہر دور میں موجود ہونا ضروری ہے تاکہ حفاظت شریعت اور امت کی رہنمائی کا کام جاری رہے چنانچہ پیغمبر اسلام کے بعد گیارہ اماموں تک مسلسل یہ سلسلہ جاری رہا اور جب پیش آنے والے حوادث و واقعات کے لئے قولی و عملی نمونے پیش کر دیئے گئے تو حکمت الہیہ کے اقتضا نے آخری فرد کے ظہور کو آخری دور پر اٹھا رکھا چنانچہ امیر المومنین نے ان آئمہ کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

ان لیلۃ القدر فی کل سنۃ و انہ ینزل فی تلک اللیلۃ امر السنۃ و ان لذلک الامر ولاۃ بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ قال من ھم فقال انا و احد عشر من صلبی آئمۃ محدثون (فصول ص ۴۸)	ہر سال میں ایک لیلۃ القدر ہوتی ہے اور اس شب میں سال بھر میں رونما ہونے والے امور نازل ہوتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ کے بعد چند ولی امور ہوں گے (ابن عباس نے) عرض کیا کہ وہ کون ہیں فرمایا میں اور میری نسل سے گیارہ افراد جو امام و محدث ہیں۔

کتب اہلسنت میں بھی متعدد احادیث ایسی تحریر ہیں جن میں آئمہ و خلفاء کی تعداد بارہ بیان کی گئی ہے چنانچہ پیغمبر اکرم فرماتے ہیں۔

لایزال الدین قائما حتی تقوم الساعۃ و یکون علیھم اثنا عشر خلیفۃ کلھم من قریش (صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۱۹)	دین ہمیشہ باقی و برقرار رہے گا یہاں تک کہ قیامت آئے اور لوگوں میں بارہ خلفاء گزریں گے جو سب کے سب قریش میں سے ہوں گے۔

جابر ابن سمرہ کہتے ہیں۔

سمعت رسول اللہ قال یکون بعدی اثنا عشر خلیفۃ کلھم من قریش (مسند احمد ج ۱ ص ۹۲)	میں نے رسول اللہ کو فرماتے سنا کہ میرے بعد بارہ خلفاء ہوں گے اور وہ سب کے سب قریش میں سے ہوں گے۔

یہ اور اس قبیل کی دوسری حدیثیں آئمہ اہلبیت کے سوا اور کسی پر منطبق نہیں ہوتیں اس لئے کہ اگر ان خلفاء سے

خلفاء راشدین مراد لئے جائیں تو ان کی تعداد چار سے آگے نہیں بڑھتی اور اگر ان خلفاء کے ساتھ اموی خلفاء کو شامل کیا جائے تو ان کے آخری خلیفہ مروان ابن محمد پر خلفاء کی تعداد سترہ ہوتی ہے اور صرف اموی خلفاء مراد لئے جائیں تو ان کی تعداد تیرہ ہے اور اگر ان سے خلفاء بنی عباس مراد لئے جائیں تو خلفاء راشدین کو ان کے ساتھ منسلک کرنے کی صورت میں بھی اور الگ شمار کرنے کی صورت میں بھی ان کی تعداد بارہ سے دگنی تگنی ہو جاتی ہے اور اگر ان میں سے نیک و صالح افراد کا انتخاب کر کے بارہ کی گنتی پوری کی جائے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان غیر صالح خلفاء کے دور کے مسلمان انہی غیر صالح اور فساق و فجار خلفاء کی معرفت اور اتباع پر مامور تھے یا یہ کہ وہ معرفت کی تکلیف سے مستثنیٰ تھے پہلی صورت میں فساق و غیر صالح افراد قابل اتباع ٹھہریں گے اور یہ عقلاً و شرعاً قبیح اور ناقابلِ قبول ہے اور دوسری صورت میں عموم معرفت کا حکم اپنے عموم پر باقی نہ رہے گا۔

علمائے اہلسنّت نے خلفاء کی تعداد پوری کرنے کی راہ ڈھونڈ نکالی اور بارہ خلیفوں کی ایک فہرست ترتیب دے کر انہیں ان احادیث کا مصداق قرار دے دیا چنانچہ ملا علی قاری نے خلفاء اثنا عشر کی جو فہرست پیش کی ہے وہ یہ ہے۔

الخلفاء الراشدون الاربعة ومعاوية وابنه يزيد وعبد الملك ابن مروان و اولاده الاربعة وبينهم عمر ابن عبد العزيز (شرح فقہ اکبر ص ۸۴)

چاروں خلفاء راشدین (ابوبکر عمر عثمان اور علی) معاویہ اور اس کا بیٹا یزید عبد الملک ابن مروان اور اس کے چاروں بیٹے (ولید سلیمان یزید اور ہشام) اور عمر ابن عبد العزیز۔

اس فہرست پر نظر کرنے سے بآسانی یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ صرف حکومت و اقتدار کا نام خلافت رکھ دیا گیا ہے اور جو بھی برسر اقتدار آ جائے تو وہ خلیفہ و دینی رہنما قرار پا جاتا ہے اس کے لئے نہ علم کی ضرورت ہے اور نہ حسن عمل کی بلکہ ہر فاسق و فاجر دینی نیابت کے فرائض سر انجام دے سکتا اور مسند رسُول کا وارث و جانشین قرار پا سکتا ہے۔ اور علانیہ فسق و فجور کے ارتکاب سے بھی اس کی برطرفی کا جواز پیدا نہیں ہوتا چنانچہ شارح عقائد نسفی تحریر کرتے ہیں۔

لا ينعزل الامام بالفسق والجور لانه قد ظهر الفسق وانتشر الجور من الائمة والامراء بعد الخلفاء الراشدين والسلف كانوا ينقادون لهم ويقيمون الجمع والاعياد باذنهم

امام کو اس کے فسق و ظلم کی وجہ سے معزول نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ خلفاء کے بعد آئمہ و امراء علانیہ فسق و فجور کے مرتکب ہوتے رہے ہیں اور پہلے لوگ برابر ان کی اطاعت کرتے اور جمعہ و عید کی نمازوں میں ان کے ساتھ شامل ہوتے رہے ہیں۔

(شرح عقائد نسفی ص ۱۱۰)

یہ امر حیرت انگیز ہے کہ ظالم و فاسق حکمرانوں کو معزول کرنے کی طاقت کے فقدان یا مصلحت و مفاد کی خاطر

اهلی اخی علیا اشدد بہ ازری واشرکہ فی امری کی نسبحك کثیرا ونذکرك کثیرا انك کنت بنا بصیرا (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج ۱۱ ص ۳۳۷)	میرے بھائی علی کو میرا وزیر بنا اس کے ذریعہ میری پشت مضبوط کر اور میرے کاموں میں اسے میرا شریک ٹھہرا تاکہ ہم دونوں کثرت سے تیری تسبیح کریں اور کثرت سے تجھے یاد کریں اور تو ہماری حالت دیکھ ہی رہا ہے۔

لہٰذا پیغمبر اکرم کی نیابت و وزارت آپ ہی کے پائے نام ہونا چاہیئے۔
آنحضرت نے حجۃ الوداع سے پلٹتے ہوئے ایک اجتماع کثیر میں منبر پہ بلند ہو کر فرمایا۔

ایھا الناس انی تارك فیکم امرین لن تضلوا ان اتبعتموھا وھما کتاب اللہ و اھل بیتی عترتی (ثم قال) اتعلمون انی اولی بالمومنین من انفسھم (ثلث مرات) قالوا نعم فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم من کنت مولاہ فعلی مولاہ (مستدرک حاکم ج ۳ ص ۱۱۰)	اے لوگو میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں اگر تم ان کی پیروی کرو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے اور وہ اللہ کی کتاب اور میرے اہلبیت ہیں جو میری عترت ہے (پھر فرمایا) کیا تم جانتے ہو کہ میں مومنین کے نفسوں پر ان سے زیادہ حق تصرف رکھتا ہوں (یہ جملہ تین مرتبہ فرمایا) سب نے کہا کہ ہاں اس اقرار کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس کا میں مولا و آقا ہوں اس کے علی بھی مولا و آقا ہیں۔

پیغمبر اکرم نے علی کے مولا ہونے کے اعلان سے پہلے اپنے اولی بالتصرف ہونے کا اقرار لیا تاکہ ذہنوں میں یہ الجھاؤ پیدا نہ ہونے پائے کہ یہاں مولیٰ کے معنی اولی بالتصرف کے علاوہ بھی کچھ ہو سکتے ہیں اگر یہاں دوست مددگار وغیرہ معنی مراد ہوتے تو آنحضرت کو اس اعلان سے قبل اپنی اولویت کا اقرار لینے کی ضرورت ہی کیا تھی اور دوسرے عدم ضلالت کو اہلبیت کے اتباع سے وابستہ کرنے کے بھی یہی معنی ہیں اس لئے کہ جو واجب الاتباع ہوگا وہ اولی بالتصرف حاکم اور امام بھی ہوگا صرف لفظیں الگ الگ ہیں مفہوم دونوں کا ایک ہے۔

ان نصوص کے علاوہ وہ تمام اوصاف بھی بدرجہ اتم آپ میں موجود تھے جو امام کے لئے ضروری اور اس کے شایان شان ہیں چنانچہ ان اوصاف میں سے ایک صفت عصمت ہے یہ اس لئے ضروری ہے کہ امام قوانین الٰہیہ کا نگراں اور احکام شرعیہ کا پاسباں ہوتا ہے اور اس فریضہ سے اسی صورت میں عہدہ برآ ہو سکتا ہے جب وہ معصوم ہو اگر خطاکار اور غیر معصوم ہوگا تو اس کا غلط طرز عمل احکام شریعت پر اثر انداز ہو کر مفاد امامت کو مجروح کر دے گا۔ اور احکام تغیر و تبدل سے محفوظ نہ رہ سکیں گے اگر ابلاغ شریعت کے پیش نظر نبی کے لئے عصمت ضروری ہے تو تحفظ شریعت کے پیش نظر امام کے لئے بھی عصمت لازمی ہوگی۔ ان دلائل سے قطع نظر کرتے ہوئے جو حضرت کی عصمت پر شاہد ناطق کی حیثیت رکھتے ہیں صرف آپ کی زندگی پہ نظر کر لینا ہی آپ کی عصمت کے اثبات کے لئے کافی ہے

چنانچہ زندگی کے ابتدائی لمحوں سے لے کر عمر کی آخری ساعتوں تک آپ کا کوئی قول و فعل ایسا پیش نہیں کیا جا سکتا جو منافی عصمت ہو بلکہ دشمن و معاند سیاسی اختلاف کے باوجود آپ کی پاکدامانی اور بے داغ کردار کا اعتراف کرتے رہے ہیں۔ امیرالمومنین خود بھی آنحضرت کو اپنی عصمت کا شاہد قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

ما وجدلی کذبۃ فی قول ولا خطلۃ فی عمل (نہج البلاغہ)

آنحضرت نے نہ تو میری کسی بات میں جھوٹ کا شائبہ پایا اور نہ میرے کسی کام میں لغزش و کمزوری دیکھی۔

اگر آنحضرت نے آپ کے کسی قول یا فعل کو غلط سمجھا ہوتا تو منصب نبوت اور تربیت کی ذمہ داری کا تقاضا یہ تھا کہ آپ کو غلط روش پر متنبہ کرتے اور قول و عمل کی اصلاح فرماتے مگر اس کی نوبت نہیں آئی کہ خدا اور رسول کی منشا کے خلاف کوئی بات آپ کی زبان سے نکلی ہو یا کوئی ایسا فعل سرزد ہوا ہو جس پر آنحضرت نے تنبیہہ کی ضرورت محسوس کی ہو بلکہ آنحضرت نے آپ کے ہر قول و عمل کو بنظر استحسان دیکھا اور اس پر تحسین و آفرین کی۔

دوسری صفت علم ہے یہ اس لئے ضروری ہے کہ امام کے فرائض میں شرعی احکام کا بیان مشکل مسائل کا حل قضایا تصفیہ اور مذاہب باطلہ کی رد بھی داخل ہے اور اس کے لئے مختلف علوم پر احاطہ ضروری ہے اور فصل قضایا میں تو ہر قسم کے علم کی ضرورت پیش آسکتی ہے اگر امام علم سے عاری اور مسائل ضروریہ سے بھی ناواقف ہو تو وہ دوسروں کی علمی و دینی رہنمائی سے قاصر رہے گا اور اگر افراد امت میں کوئی اس سے زیادہ علم رکھتا ہو گا تو پھر اسے استحقاق امامت ہونا چاہیئے۔ امیرالمومنین کے بارے میں لکھا جا چکا ہے کہ صحابہ میں کوئی بھی آپ کے علمی پایہ تک نہ پہنچ سکا لہذا جو اعلم ہو گا وہی امامت اور امت کی قیادت کا اہل ہو گا۔

تیسری صفت ہمہ جہتی فضیلت ہے یہ اس لئے ضروری ہے کہ اگر کسی صفت میں بھی کوئی اس سے بڑھ کر ہو گا تو اس صفت سے متعلقہ امور کی انجام دہی میں اس کی صوابدید کا پابند ہو گا اور اس صورت میں متبوع ہونے کے بجائے تابع قرار پائے گا اور فاضل کو نظر انداز کرنے سے ترجیح مفضول لازم آئے گی جو عقلاً قبیح ہے اور ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ انتخاب سے جوہر فضیلت پیدا ہو جائے چنانچہ جاہل منتخب ہو گا تو وہ جاہل ہی رہے گا اور ظالم منتخب ہو گا تو اس کی طبیعت کا تقاضا بدل نہ جائے گا اور فاسق منتخب ہو گا تو انتخاب اس کے اندر صفت عدالت پیدا نہیں کرے گا۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ اقتدار کی طاقت اسے اور خود سر و مطلق العنان بنا دے۔

امیرالمومنین کی افضلیت اتنی واضح و آشکارا ہے کہ اس سے وہی انکار کر سکتا ہے جو جواہر پاروں اور سنگریزوں میں امتیاز کرنے سے قاصر ہو چنانچہ تاریخ و حدیث کے صفحات آپ کے فضائل سے چھلک رہے ہیں۔ ابن عبدالبر تحریر کرتے ہیں۔

قال احمد ابن حنبل و اسمعیل ابن اسحٰق القاضی لم یرو فی فضائل احد من الصحابۃ

احمد ابن حنبل اور اسماعیل ابن اسحاق قاضی کہتے ہیں کہ صحابہ میں سے کسی ایک کے بارے میں اتنے فضائل

بالاسانید الحسان ماروی فی فضائل علی ابن ابی طالب (استیعاب ج ۲ ص ۴۶۶) | وارد نہیں ہوئے جتنے صحیح السند علی ابن ابی طالب کے بارے میں وارد ہوئے ہیں۔

غرض امیر المومنین اور آئمہ اطہار جو ہر دور میں اپنے علم و عمل اور فضل و کمال میں منفرد حیثیت کے مالک تھے مقاصد دینیہ کی تکمیل کا فریضہ ادا کرتے رہے اور یہی ان کے منصب امامت کا تقاضا تھا انہوں نے مصیبتوں پر مصیبتیں اٹھائیں قید و بند کی سختیاں جھیلیں مگر اسلام کے قیام و بقا اور دینی اقدار کے تحفظ میں اپنی کوششوں کو جاری رکھا اور اپنے قول و عمل سے رہنمائی فرماتے رہے۔ یہ انہی کی فرض شناسی کا نتیجہ ہے کہ عصبیت و عناد کا غبار اسلام کے صحیح نقوش کو چھپا نہ سکا اور مخالفت کی تند و تیز آندھیاں شمع ہدایت کو بجھا نہ سکیں۔

وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

معاد امیر المومنین کا ارشاد ہے۔

اذا رجفت الراجفۃ وحقت بجلائلھا القیامۃ لحق بکل منسک اھلہ و بکل معبود عبدتہ وبکل مطاع اھل طاعتہ فلم یجز فی عدلہ وقسطہ یومئذ خرق بصر فی الھواء ولا ھمس قدم فی الارض الا بحقہ (نہج البلاغہ)

جب زمین زلزلہ میں اور قیامت اپنی ہولناکیوں کے ساتھ آجائے گی اور ہر عبادت گاہ سے اس کے پجاری ہر معبود سے اس کے پرستار اور ہر پیشوا سے اس کے مقتدی ملحق ہو جائیں گے تو اس وقت فضا میں شگاف کرنے والی نظر اور زمین میں قدموں کی ہلکی چاپ کا بدلہ بھی اس کی عدالت گستری و انصاف پروری کے پیش نظر حق و انصاف سے پورا پورا دیا جائے گا۔

دنیا میں کوئی چیز اتنی یقینی نہیں ہے جتنی یقینی و حتمی چیز موت ہے چنانچہ قرآن مجید میں اسے لفظ یقین سے تعبیر کیا گیا ہے۔

واعبد ربک حتی یاتیک الیقین | اپنے پروردگار کی عبادت میں لگے رہو یہاں تک کہ تمہارے پاس یقین (موت) آئے۔

یہ زندگی جو نفس کی آمد و شد پر قائم ہے چراغ سر راہ ہے جسے موت کا جھونکا ایک نہ ایک دن بجھا دے گا جو آئے وہ گزر گئے اور جو ہیں وہ گزر جائیں گے گویا آنا جانے کی تمہید اور پیدا ہونا مرنے کا پیش خیمہ ہے۔ خالق موت و حیات کے سوا سب کو مرنا اور فنا سے ہمکنار ہونا ہے۔ خداوند عالم کا ارشاد ہے۔

کل شئی ھالک الا وجھہ | ذات الٰہی کے علاوہ ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے۔

یہ زندگی دم توڑ کر ہمیشہ کے لئے ختم نہیں ہو جائے گی بلکہ اس زندگی کے بعد بھی ایک زندگی ہے یہ زندگی عمل کی زندگی ہے اور وہ زندگی جزا و مکافات کی زندگی ہے اور اس کا بگڑنا سنورنا یہاں کے اعمال پر منحصر ہے چنانچہ

خلاق عالم ایک دن سب اگلے پچھلے مرنے والوں کو زندہ کرے گا اور حساب و کتاب کے بعد نیک اعمال کی جزا اور برے اعمال کی سزا دے گا چنانچہ اللہ سبحانہ' کا ارشاد ہے ۔

ومن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ — جس نے ذرہ برابر نیکی کی وہ نیکی دیکھے گا اور جس

ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ — نے ذرہ برابر بدی کی وہ بدی دیکھے گا ۔

اس حشر و نشر اور زندگی بعد موت کا نام معاد ہے ۔ یہ عقیدہ اسلام کے تمام مکاتب فکر کا متفقہ عقیدہ ہے بلکہ دوسرے مذاہب بھی کسی نہ کسی اعتبار سے قانون مکافات اور نتائج اعمال کے قائل ہیں اگر اختلاف ہے تو صرف طریق کار میں ۔ چنانچہ ہنود اور بدھسٹ اواگون کے قائل ہیں اواگون کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے اعمال کے نتیجہ میں مختلف جونیں بدلتا ہے اگر اس کے اعمال اچھے ہوتے ہیں تو دوبارہ پیدا ہو کر خوشحالی و فارغ البالی کی زندگی بسر کرتا ہے اور برے اعمال ہوتے ہیں تو فقر و افلاس اور دریوزہ گری کی زندگی گزارتا ہے یا کسی حیوان کی جون میں جنم لے کر اپنے کئے کی سزا بھگتتا ہے ۔ بدھسٹوں کے ہاں یہ سلسلہ نروان (مبداء اوّل سے اتصال) تک پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے اور ہنود کے ہاں یہ سلسلہ کہیں بھی ختم ہونے میں نہیں آتا یہ عقیدہ جیسا کچھ بھی ہے ظاہر ہے تاہم جزاء و سزا کا تصوّر موجود ہے ۔ عیسائیوں کے ہاں بھی بنیادی طور پر حشر و نشر کا عقیدہ موجود ہے مگر اس کے ساتھ یہ نظریہ بھی قائم کر لیا گیا ہے کہ حضرت مسیح صلیب پر چڑھ کر ان کے اگلے پچھلے گناہوں کا کفارہ ہو چکے ہیں جس کے بعد نہ ان سے اعمال کی باز پرس ہو گی اور نہ پاداش گناہ کی سزا صرف اعتراف گناہ نجات کے لئے کافی ہے ۔ یہاں بھی عقیدہ معاد کی جھلک نظر آتی ہے ۔ اگرچہ اس کا مقصد فوت ہو گیا ہے ۔ قدیم فلاسفہ میں بھی ایسے افراد گزرے ہیں جنہوں نے اس عالم کے ماوراء دوسرے عالم کی نشان دہی کی ہے ۔

البتہ فلاسفہ کے ایک گروہ نے حیات بعد الموت کو عقلی اعتبار سے ناممکن بتایا ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ جب انسان مر جاتا ہے تو وہ معدوم ہو جاتا ہے اور اعادۂ معدوم محال ہے ۔ یہ نظریہ ان کے واہمہ کی پیداوار ہے اور حشر و نشر کو اعادۂ معدوم سے تعبیر کرنا غلط ہے اس لئے کہ موت عدم کا نام نہیں ہے بلکہ صرف روح و بدن کی علیحدگی اور اجزاء کی پراگندگی کا نام ہے اور حشر و نشر کے موقع پر انہی پراگندہ اجزاء کو یکجا کر دیا جائے گا اور اللہ کی قدرت کاملہ کو دیکھتے ہوئے اس میں کوئی استبعاد نہیں ہے کہ وہ متفرق اجزاء کو جمع کر کے ان میں از سر نو زندگی دوڑا دے اور قدرت نے اس کی ایک جھلک حضرت ابراہیم کی اعجاز نمائی کے سلسلہ میں دکھا بھی دی ہے چنانچہ ارشاد باری ہے ۔

واذ قال ابراھیم رب ارنی	اس واقعہ کو یاد کرو جب ابراہیم نے کہا کہ اے
کیف تحیی الموتی قال اولم تؤمن	میرے پروردگار تو مجھے دکھا دے کہ تو کیونکر مردوں
قال بلی و لکن لیطمئن قلبی	کو زندہ کرتا ہے اللہ نے فرمایا کیا تمہیں اس کا یقین
قال فخذ اربعۃ من ــــ	نہیں، کہا یقین تو ہے لیکن اطمینان قلب چاہتا ہوں

خلاق عالم ایک دن سب اگلے پچھلے مرنے والوں کو زندہ کرے گا اور حساب و کتاب کے بعد نیک اعمال کی جزا اور برے اعمال کی سزا دے گا چنانچہ اللہ سبحانہ' کا ارشاد ہے۔

ومن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ — جس نے ذرہ برابر نیکی کی وہ نیکی دیکھے گا اور جس

ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ — نے ذرہ برابر بدی کی وہ بدی دیکھے گا۔

اس حشر و نشر اور زندگی بعد موت کا نام معاد ہے۔ یہ عقیدہ اسلام کے تمام مکاتب فکر کا متفقہ عقیدہ ہے بلکہ دوسرے مذاہب بھی کسی نہ کسی اعتبار سے قانون مکافات اور نتائج اعمال کے قائل ہیں اگر اختلاف ہے تو صرف طریق کار میں۔ چنانچہ ہنود اور بدھسٹ اواگون کے قائل ہیں اواگون کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے اعمال کے نتیجہ میں مختلف جونیں بدلتا ہے اگر اس کے اعمال اچھے ہوتے ہیں تو دوبارہ پیدا ہو کر خوشحالی و فارغ البالی کی زندگی بسر کرتا ہے اور بُرے اعمال ہوتے ہیں تو فقر و افلاس اور دریوزہ گری کی زندگی گزارتا ہے یا کسی حیوان کی جون میں جنم لے کر اپنے کئے کی سزا بھگتتا ہے۔ بدھسٹوں کے ہاں یہ سلسلہ نزوان (مبداء اوّل سے اتصال) تک پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے اور ہنود کے ہاں یہ سلسلہ کہیں بھی ختم ہونے میں نہیں آتا یہ عقیدہ جیسا کچھ بھی ہے ظاہر ہے تاہم جزاء و سزا کا تصوّر موجود ہے۔ عیسائیوں کے ہاں بھی بنیادی طور پر حشر و نشر کا عقیدہ موجود ہے مگر اس کے ساتھ یہ نظریہ بھی قائم کر لیا گیا ہے کہ حضرت مسیح صلیب پر چڑھ کر ان کے اگلے پچھلے گناہوں کا کفارہ ہو چکے ہیں جس کے بعد نہ ان سے اعمال کی باز پرس ہوگی اور نہ پاداش گناہ کی سزا صرف اعتراف گناہ نجات کے لئے کافی ہے یہاں بھی عقیدہ معاد کی جھلک نظر آتی ہے۔ اگرچہ اس کا مقصد فوت ہو گیا ہے۔ قدیم فلاسفہ میں بھی ایسے افراد گزرے ہیں جنہوں نے اس عالم کے ماوراء دوسرے عالم کی نشان دہی کی ہے۔

البتہ فلاسفہ کے ایک گروہ نے حیات بعد الموت کو عقلی اعتبار سے ناممکن بتایا ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ جب انسان مر جاتا ہے تو وہ معدوم ہو جاتا ہے اور اعادۂ معدوم محال ہے۔ یہ نظریہ ان کے واہمہ کی پیداوار ہے اور حشر و نشر کو اعادۂ معدوم سے تعبیر کرنا غلط ہے اس لئے کہ موت عدم کا نام نہیں ہے بلکہ صرف روح و بدن کی علیحدگی اور اجزاء کی پراگندگی کا نام ہے اور حشر و نشر کے موقع پر انہی پراگندہ اجزاء کو یکجا کر دیا جائے گا اور اللہ کی قدرت کاملہ کو دیکھتے ہوئے اس میں کوئی استبعاد نہیں ہے کہ وہ متفرق اجزاء کو جمع کر کے ان میں از سرِ نو زندگی دوڑا دے اور قدرت نے اس کی ایک جھلک حضرت ابراہیم کی اعجاز نمائی کے سلسلہ میں دکھا بھی دی ہے چنانچہ ارشادِ باری ہے۔

واذ قال ابراھیم رب ارنی	اس واقعہ کو یاد کرو جب ابراہیم نے کہا کہ اے
کیف تحیی الموتی قال اولم تؤمن	میرے پروردگار تو مجھے دکھا دے کہ تو کیونکر مردوں
قال بلی ولکن لیطمئن قلبی	کو زندہ کرتا ہے اللہ نے فرمایا کیا تمہیں اس کا یقین
قال فخذ اربعۃ من	نہیں، کہا یقین تو ہے لیکن اطمینان قلب چاہتا ہوں

الطیر فصرھن الیک ثم اجعل علی کل جبل منھن جزء اً ثم ادعھن یاتینک سعیا

فرمایا چار پرندے لو اور انہیں پکارو پھر ان کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے ہر پہاڑ پر ایک ایک ٹکڑا ڈال دو اس کے بعد انہیں آواز دو۔ وہ سب کے سب دوڑتے ہوئے تمہارے پاس آئیں گے۔

اس پر حضرت ابراہیم نے چار مختلف قسم کے پرندے لئے انہیں ذبح کرنے کے بعد ان کے ٹکڑے کئے اور ان ٹکڑوں کو آس پاس کی چوٹیوں پر ڈال دیا اور اس کے بعد انہیں پکارا تو منتشر و پراگندہ اجزاء میں قوت پرواز پیدا ہوئی اور ایک جزء دوسرے جزء سے اس طرح پیوست ہوا کہ ہر پرندہ اپنی پہلی شکل وصورت پر آگیا۔ جس طرح ان بے روح پرندوں کے اجزاء معدوم نہیں ہوئے اسی طرح انسان مرنے کے بعد اگرچہ حیات سے محروم ہوجاتا ہے مگر اس کے اجزاء کسی نہ کسی صورت میں موجود رہتے ہیں۔ خداوند عالم انہی متفرق و پراگندہ اجزاء کو جمع کرے گا اور جس طرح پہلے ان میں رُوح دوڑا کر انہیں زندگی دی تھی اسی طرح دوبارہ انہیں زندہ کرے گا چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے۔

قال من یحیی العظام وھی رمیم قل یحییھا الذی انشاھا اول مرۃ

وہ کہنے لگا کہ ان ہڈیوں کو جو گل سڑ گئی ہیں کون زندہ کرسکتا ہے اس سے کہہ دو کہ ان کو وہی زندہ کرے گا جس نے ان کو پہلی مرتبہ زندگی بخشی تھی۔

جو شخص توحید و رسالت کا عقیدہ رکھتا ہے اس کے لئے معاد کا عقیدہ رکھنا بھی ناگزیر ہے اس لئے کہ دنیا میں جتنے انبیاء آئے انہوں نے اللہ کی طرف سے اچھے کاموں کے بجالانے کا حکم دیا اور بُرے کاموں سے منع کیا لہذا جنہوں نے اس کے احکام کی پیروی کرتے ہوئے اچھے کام کئے ان کو جزا ملنا چاہیئے اور جنہوں نے اس حکم سے سرتابی کرتے ہوئے بُرے کام کئے ان کی کوئی سزا ہونا چاہیئے اور اگر جزاء وسزا نہ ہو تو اس کی ضرورت ہی کیا تھی کہ انبیاء ومرسلین بھیجے جائیں اور اگر بھیجے ہی گئے تو اس کا ہماری عملی زندگی پر کیا اثر جبکہ ان کی بات ماننا اور نہ ماننا دونوں برابر ہیں اور پھر اللہ کو مانا جائے تو کیوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا جائے تو کس لئے جبکہ ہمارے افعال و اعمال کا نہ محاسبہ ہونا ہے نہ اچھائیوں کا کوئی انعام ہے اور نہ برائیوں پر سزا و عقوبت ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ دنیا ہی میں انسان کو اس کے اچھے اور بُرے کاموں کا بدلہ مل جاتا ہے تو بیشک بعض مجرموں کو اپنے کئے کی سزا دنیا میں مل جاتی ہے مگر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص دوسرے بے گناہ شخص کو قتل کردیتا ہے اور اس خونِ ناحق کے باوجود قانون کی گرفت سے بچا رہتا ہے ایک شخص دوسرے کے خرمن میں آگ لگا دیتا ہے اور اس کا بال تک بیکا نہیں ہوتا۔ ایک ایمانداری کو اپنا شعار بناتا ہے اور فقر و افلاس اور بدحالی میں مبتلا رہتا ہے اور دوسرا غصب و خیانت کا مرتکب ہوتا ہے اور بڑے ٹھاٹ سے زندگی گزارتا ہے اسی طرح دُوسرے مجرموں کو ان کے جرائم اور جرائم پر مرتب ہونے والے اثرات کی سزا دنیا میں نہیں ملتی لہذا عقل کا فیصلہ یہ ہے کہ ایک ایسا عالم ہونا چاہیئے جہاں انسان کو بدی کی قرار واقعی سزا اور نیکی کا پورا

پورا صلہ مل سکے۔

بعض لوگوں کی یہ بھی ذہنی اپج ہے کہ انسانی ضمیر کی تحسین و سرزنش ہی انسان کے افعال کی جزاؤ سزا ہے۔ چنانچہ جب انسان کوئی اچھا کام کرتا ہے تو اس کا ضمیر اس کی تحسین کرتا ہے اور کوئی بُرا کام اس سے سرزد ہوتا ہے تو اس پر ملامت کرتا ہے اور یہ تحسین نیکی کا اجر اور یہ سرزنش برائی کا بدلہ ہے جو اسی دنیا میں اسے مل جاتا ہے لہٰذا جزاؤ سزا کو آخرت پر اٹھا رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ یہ خیال سراسر فاسد ہے اس لئے کہ ایک شخص کا ضمیر جس فعل پر اس کی ملامت کرتا ہے اسی فعل پر دوسرے کی تحسین کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ایک چیز قابل تحسین بھی ہو اور لائق سرزنش بھی دوسرے یہ کہ جب انسان پہلی دفعہ کسی جرم کا مرتکب ہوتا ہے تو اس کا ضمیر ملامت کرتا ہے اور جب دوبارہ اس کا مرتکب ہوتا ہے تو ملامت میں اتنا زور نہیں رہتا جتنا پہلی دفعہ تھا اور جوں جوں اس جرم کو دہرایا جاتا ہے ملامت کم ہوتی جاتی ہے اگر اس ضمیر کی ملامت کو سزا سمجھ لیا جائے تو چاہیئے یہ تھا کہ جوں جوں جرم میں اضافہ ہوتا سزا بھی بڑھتی جاتی مگر یہاں اس کے برعکس جرم بڑھتا جاتا ہے اور سزا گھٹتی جاتی ہے یہاں تک کہ جب جرم کی عادت مستحکم ہو جاتی ہے تو سزا ختم ہو جاتی ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ ضمیر کی تحسین و سرزنش جزاؤ سزا نہیں ہے بلکہ تحسین نیکیوں کی محرک اور سرزنش برائیوں پر ایک تنبیہ ہے۔

عقیدہ معاد صرف نظریاتی عقیدہ نہیں ہے بلکہ ہماری دنیوی زندگی پر بھی اثر انداز ہوتا ہے چنانچہ انسان اگر یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اس زندگی کے بعد بھی ایک زندگی ہے جس میں اچھے اور بُرے کاموں کا محاسبہ ہوگا تو وہ عواقب و نتائج کو نظر انداز کر کے اپنے اعمال کا رُخ متعین نہیں کرتا بلکہ جہاں دنیا کے سُود و زیاں پر نظر رکھتا ہے وہاں دائمی نفع و نقصان پر بھی نظر رکھے گا اور اگر یہ نظریہ قائم کر لے کہ بس یہی زندگی ہے اور اس کے بعد کچھ نہیں ہے نہ حساب و کتاب ہے نہ زندگی کا احتساب نہ اطاعت کی جزا ہے اور نہ معصیت کی سزا تو اس کا طرزِ عمل ہر قید و بند سے آزاد ہوگا نہ اس کے لئے کوئی نیکی کا محرک رہے گا اور نہ بدی سے کوئی مانع اگرچہ معاشرہ کا خوف اور قانون کا ڈر ایک حد تک نیکیوں کا محرک اور برائیوں سے سدِ راہ ہوتا ہے مگر جہاں کوئی دیکھنے والا نہ ہو اور نہ قانون ہی اپنی گرفت میں لے سکتا ہو وہاں اخروی بازپُرس کا ڈر ہی برائیوں سے مانع ہو سکتا ہے اگر سزا کا خوف انسان کے ذہن پر محیط نہ ہو تو وہ برائیوں سے بچنے کی کوشش نہیں کرے گا اور جزاء کی توقع نہ ہو تو نیکیوں میں کوئی کشش باقی نہ رہے گی کہ گناہ کی وقتی لذتوں سے منہ موڑ کر ان نیکیوں کو اختیار کرے جن پر کوئی نتیجہ و اثر مرتب والا نہیں ہے

علیؑ اور قرآن

امیر المومنین علیہ السلام ترجمان قرآن اور پاسبان حریم کتاب اللہ تھے دونوں ایک منزل کے راہ سپار اور ایک مقصد کے علمبردار تھے اور اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ رہے کہ ایک لمحہ کے لئے بھی ان میں جدائی تجویز

خلافت میں منکرین تاویل مارقین قاسطین اور ناکثین سے مسلسل جنگیں لڑیں جنہوں نے قرآن کی صحیح تعلیمات کو نظرانداز کر کے اسے آلہ کار کے طور پر استعمال کیا چنانچہ پیغمبر اکرم کا ارشاد ہے۔

ان منکم من یقاتل علی تاویل القرآن — تم میں وہ بھی ہے جو تاویل قرآن پر جنگ کرے گا
کما قاتلت علی تنزیلہ (مسند احمد ابن حنبل ج ۳ ص ۸۲) — جس طرح میں نے تنزیل پر جنگ کی ہے۔

اس پر حضرت ابوبکر اور حضرت عمر نے کہا کہ کیا وہ ہم ہیں فرمایا نہیں بلکہ وہ ہے جو جوتیاں گانٹھ رہا ہے اور اس وقت حضرت علی پیغمبر اکرم کے جوتے گانٹھ رہے تھے۔

۲۔ تاویل کے لئے تنزیل سے آگاہی ضروری ہے کیونکہ علم تنزیل کے بغیر نہ ناسخ و منسوخ کا پتہ چل سکتا ہے اور نہ مجمل و مبین کا نہ عام و خاص کا علم ہو سکتا ہے اور نہ مطلق و مقید کا اگر علم تنزیل کے بغیر تاویل کی جائے گی تو تنزیل میں تحریف و تبدّل اور تاویل میں غلطی کا امکان رہے گا۔ لہذا جو تاویل سے تماماً و کمالاً آگاہ ہو گا وہ تنزیل سے بھی پوری طرح باخبر ہو گا۔ حضرت علی جو حسب ارشاد پیغمبر تاویل کے عالم تھے وہ تنزیل سے بھی پوری طرح آگاہ ہوں گے اگر ایک آیت ایک لفظ اور ایک حرف سے بھی بے خبر فرض کئے جائیں تو نہ ان کی تاویل قابل اعتماد قرار پائے گی اور نہ مکمل قرآن کا ساتھ باقی رہے گا۔ حضرت علم تنزیل کے سلسلہ میں فرماتے ہیں۔

سلونی عن کتاب اللہ فو اللہ مامن — کتاب اللہ کے متعلق مجھ سے پوچھو خدا کی قسم میں
آیۃ الا وانا اعلم ابلیل نزلت — قرآن کی ہر آیت کے بارے میں جانتا ہوں کہ وہ
ام بنہار ام فی سھل ام فی جبل — رات کو نازل ہوئی یا دن کو ہموار زمین پر نازل
(اتقان ج ۲ ص ۳۱۹) — ہوئی یا پہاڑ پر۔

۳۔ قرآن مجید تمام علوم پر حاوی ہے خواہ شریعت سے متعلق ہوں یا معیشت سے اخلاق سے متعلق ہوں یا سیاست سے چنانچہ ارشاد الٰہی ہے۔

و نزلنا علیک الکتاب تبیانا لکل شئی — ہم نے تم پر کتاب نازل کی جس میں ہر چیز کا واضح بیان ہے۔

لہذا امیرالمومنین جو عدیل قرآن ہیں ان کا دائرہ علم بھی قرآن کے دائرہ علم کی وسعتوں تک پھیلا ہوا ہو گا۔ اگر کسی علم کی حضرت سے نفی کی جائے تو قرآن کو بھی اس علم سے خالی ماننا پڑے گا حالانکہ قرآن تمام علوم کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ امیرالمومنین فرماتے ہیں۔

مامن شئی تطلبونہ الا وھو فی — کوئی چیز ایسی نہیں جس کی تمہیں تلاش ہو اور وہ
القرآن فمن اراد ذلک فیسألنی — قرآن میں نہ ہو لہذا جو اس کے بارے میں پوچھنا
عنہ (وسائل) — چاہے وہ مجھ سے پوچھ لے۔

۴۔ قرآن اللہ کا کلام اور رشد و ہدایت کا پیغام ہے اس میں نہ ضلالت کا شائبہ ہو سکتا ہے نہ خطا و لغزش کا گزر اور نہ غلطی کا امکان اور جو ہمہ وقت قرآن کے ساتھ ہو گا وہ بھی خطا و لغزش سے بری اور گناہ سے پاک ہو گا اگر

اس کے لئے خطا و بے راہروی تجویز کی جائے گی تو اسے قرآن سے جُدا ماننا پڑے گا لہذا جس طرح قرآن محفوظ عن الخطا ہے اسی طرح علی بھی محفوظ عن الخطا ہونگے اور دونوں طہارت و پاکیزگی اور عظمت و رفعت میں مساوی قرار پائیں گے۔

۵۔ قرآن پیغمبر اکرم کی صداقت کی دلیل اور ان کی نبوت کا زندہ جاوید معجزہ ہے اسی طرح علی برہان نبوت اور معجزہ رسُول ہیں نہ قرآن کی کوئی مثال ہوسکتی ہے اور نہ علی کی کوئی نظیر دونوں اعجازی لحاظ سے بے مثل و بے نظیر ہیں۔ شیخ شہاب الدین تحریر کرتے ہیں۔

امیر المومنین علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ وکرم اللہ وجھہ آیۃ من آیات اللہ ومعجزۃ من معجزات رسول اللہ

امیر المومنین علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ وکرم اللہ وجہہ اللہ کی آیتوں میں سے ایک آیت اور رسُول اللہ کے معجزوں میں سے ایک معجزہ تھے۔

(مستطرف ج ۱ ص ۱۲۱)

۶۔ قرآن مجید سراپا حق اور حق و باطل میں تمیز کرنے والا ہے چنانچہ ارشاد الہٰی ہے۔

وانزل التوراۃ والانجیل من قبل ھدی للناس وانزل الفرقان

اس نے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لئے توریت و انجیل نازل کی اور حق و باطل میں تمیز دینے والی کتاب اتاری۔

اسی طرح حضرت علی کی ذات ایمان و نفاق میں تمیز کرنے والی ہے۔ چنانچہ پیغمبر اکرم کا ارشاد ہے۔

لا یحبك الا مومن ولا یبغضك الا منافق

(مسند احمد ج ۱ ص ۹۵)

اے علی تمہیں دوست نہیں رکھے گا مگر مومن اور تمہیں دشمن نہیں رکھے گا مگر منافق۔

جابر ابن عبد اللہ انصاری کہتے ہیں۔

ماکنا نعرف المنافقین الا ببغض علی ابن ابی طالب (استیعاب ج ۳ ص ۴۷)

ہم علی ابن ابی طالب سے بغض و عناد کی وجہ سے منافقوں کو پہچان لیا کرتے تھے۔

۷۔ قرآن مجید انہی الفاظ و کلمات کا مجموعہ ہے جن سے عربوں کی زبان آشنا اور ان کے روزمرہ میں مستعمل تھے مگر اس کے اسلوب و انداز بیان میں جو بلاغت اور باطن میں جو حقائق و معارف مضمر ہیں ان کی گہرائیوں تک نہ پہنچا جاسکتا ہے اور نہ ان کی بے پایاں وسعتوں کو ناپا جاسکتا ہے چنانچہ امیر المومنین فرماتے ہیں۔

ان القرآن ظاھرہ انیق وباطنہ عمیق لاتفنی عجائبہ ولاتنقضی غرائبہ

قرآن کا ظاہر خوشنما اور باطن گہرا ہے نہ اس کے عجائبات مٹنے والے ہیں اور نہ اس کے لطائف ختم ہونے والے ہیں۔

اسی طرح حضرت علی کے ظاہر اوصاف کے لحاظ سے انہیں شجاع سخی زاہد عالم وغیرہ کہا جاتا ہے مگر ان اوصاف

فقد ورد عن علی انہ جمع القرآن علی ترتیب النزول عقب موت النبی (اتقان ج ۱ ص ۴۷)

حضرت علی سے وارد ہوا ہے کہ آپ نے پیغمبر اکرم کی رحلت کے بعد ترتیب نزول کے مطابق قرآن مجید جمع کیا۔

حضرت کا جمع کردہ قرآن یقیناً ان تمام فوائد کا حامل ہوگا جو کسی کتاب کی ترتیب کے برقرار رہنے پر مرتب ہو سکتے ہیں بہتر تو یہی تھا کہ اسی ترتیب کو قائم رکھا جاتا مگر اس کی ترویج خلاف مصلحت سمجھی گئی اور از سرِ نو اس کی ترتیب ضروری قرار دے لی گئی۔ حضرت نے اپنے جمع کردہ قرآن پر اصرار مناسب نہ سمجھا اور اس خیال سے کہ وحدت اسلامی کو دھچکا نہ لگے اسی کو واجب العمل قرار دیا چنانچہ اس قرآن کے بارے میں فرمایا۔

اعلموا ان ھذا القرآن ھو الناصح الذی لایغش والھادی الذی لا یضل والمحدث الذی لا یکذب (نہج البلاغہ)

یاد رکھو کہ یہ قرآن ایسا نصیحت کرنے والا ہے جو فریب نہیں دیتا اور ایسا ہدایت کرنے والا ہے جو گمراہ نہیں کرتا اور ایسا بیان کرنے والا ہے جو جھوٹ نہیں بولتا۔

یہ اور اس قبیل کے دوسرے توثیقات کے بعد موجودہ قرآن ہمارے لئے حجت و سند ہے خواہ اس کی ترتیب کچھ ہو کیونکہ ترتیب کے بدل جانے سے اعتبار و استناد پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور نہ معانی و مطالب میں چنداں فرق آتا ہے جبکہ وہ کمی و زیادتی سے پاک اور تحریف و تبدل سے محفوظ ہے اور یہی علماءِ شیعہ کا مسلک رہا ہے چنانچہ شیخ صدوق رحمہ اللہ تحریر کرتے ہیں۔

اعتقادنا ان القرآن الذی انزل اللہ تعالیٰ علی نبیہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ ھو مابین الدفتین وھو مافی ایدی الناس لیس باکثر من ذلک (اعتقادیہ ص ۱۵۰)

ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ وہ قرآن جو اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ پر نازل فرمایا وہ وہی ہے جو دو دفتیوں کے درمیان ہے اور عام لوگوں کے ہاتھوں میں ہے اس سے زائد نہیں ہے۔

اسی طرح شیخ الطائفہ ابو جعفر طوسی نے التبیان فی علوم القرآن میں سید مرتضیٰ علی الھدی نے مسائل طرابلسیات میں علامہ طبرسی نے مجمع البیان میں سید محسن بغدادی نے شرح وافیہ میں شیخ جواد بلاغی نے آلاء الرحمٰن میں اور دیگر اکابر محققین نے اپنے مصنفات میں عدم تحریف قرآن کی صراحت کی ہے۔

قراءت قرآن

قرآن مجید کی ایک ایک لفظ وحی منزل ہے جس کے حروف و الفاظ میں رد و بدل کا اختیار نہ پیغمبرِ اکرم کو ہے اور نہ کسی اور کو، چنانچہ ارشاد الٰہی ہے۔

قل ما یکون لی ان ابدلہ من تلقاء نفسی ان اتبع الا ما

اے رسول کہہ دو کہ مجھے یہ اختیار نہیں ہے کہ میں اپنی طرف سے قرآن کو بدل ڈالوں میں تو اسی کا تابع

یوحی الی ہوں جو مجھ پر وحی ہوتی ہے ۔

مگر قرآن مجید میں مختلف قراءتوں کے جواز سے رد و بدل کی گنجائش پیدا کر دی گئی یوں تو یہ قراءتیں متعدد ہیں مگر تیسری صدی ہجری میں ان قراءتوں کو سات میں محدود کر لیا گیا جو قراء سبعہ کی طرف منسوب ہیں اس کے جواز میں یہ حدیث نبوی پیش کی جاتی ہے کہ انزل القرآن علی سبعۃ احرف "قرآن مجید سات حرفوں پر نازل ہوا ہے"۔ ان سات حرفوں سے سات قراءتیں مراد لی جاتی ہیں اور ان ساتوں قراءتوں کو متواتر مانا جاتا ہے جو اللہ نے نازل فرمائیں اور پیغمبر اکرمؐ کی زبان پر جاری ہوئیں حالانکہ سات حرفوں سے سات قراءتیں مراد لینے کی کوئی سند نہیں ہے اور نہ ان کے تواتر پر کوئی دلیل قائم ہے اگر ایسا ہی ہوتا تو جب حضرت عثمان نے تمام مسلمانوں کو ایک قرأت پر جمع کر کے بقیہ قرآنوں کو جلا دیا تو اس پر صحابہ احتجاج کرتے اور ایک قراءت کی پابندی کے خلاف آواز اٹھاتے مگر کسی طرف سے اس کے خلاف کوئی آواز بلند نہیں ہوتی البتہ ان کے قرآن جلانے پر مسلمانوں کی ایک جماعت ضرور معترض ہوی۔ بہرحال یہ اختلاف تنزیلی نہیں ہے بلکہ یہ اختلاف اس لئے رونما ہوا کہ ان قاریوں کا طریقۂ تلفظ مختلف تھا جس سے ایک حرف دوسرے قریب المخرج حرف سے بدل جاتا تھا جیسے صراط اور سراط یا آواز کو ذرا کھینچنے سے ایک حرف کی کمی بیشی ہو جاتی تھی جیسے مالک یوم الدین اور ملک یوم الدین یا اس وجہ سے کہ اس دور میں قرآن کی کتابت نقطوں اور اعرابی حرکتوں سے معرا ہوتی تھی جس سے لفظ کی ہیئت میں فرق آجاتا تھا جیسے یَطْہُرْنَ اور یَطَّہَّرْنَ یا ان نسخوں میں کتابت کے اعتبار سے اختلاف ہو گا جو حضرت عثمان نے لکھوا کر مکہ مدینہ شام بصرہ کوفہ یمن اور بحرین بھجوائے تھے ان شہروں کے باشندے اپنے ہاں کے قاریوں کی قراءت پر اعتماد کرتے تھے اور انہی کی قرأت کے مطابق پڑھتے تھے چنانچہ اہل مکہ ابن کثیر کی قراءت کے اہل مدینہ نافع کی قراءت کے اہل شام ابن عامر کی قراءت کے اہل کوفہ حمزہ و عاصم کی قراءت کے اور اہل بصرہ ابوعمرو اور یعقوب کی قراءت کے پابند تھے۔ البتہ تیسری صدی کے آغاز میں ابن مجاہد نے یعقوب کے بجائے کسائی کی قراءت کو ترجیح دی۔

ان قراء میں سے اکثر کا سلسلۂ تلمذ امیر المومنین علیہ السلام تک منتہی ہوتا ہے چنانچہ ان میں سے ابوعمرو اور عاصم نے ابوعبدالرحمٰن سے قرأت حاصل کی اور ابوعبدالرحمٰن کہتے ہیں۔ قرأت القرآن کلہ علی علی ابن ابی طالب۔ "میں نے پورا قرآن علی ابن ابی طالب سے پڑھا" حمزہ اور کسائی ابن مسعود کی قراءت پر اعتماد کرتے تھے اور ابن مسعود کا قول ہے کہ ما رائت اقرأ من علی ابن ابی طالب "میں نے علی ابن ابی طالب سے بڑھ کر کوئی قاریٔ قرآن نہیں دیکھا" ابن کثیر نافع اور ابوعمرو کی اکثر قراءتیں ابن عباس تک منتہی ہوتی ہیں اور ابن عباس نے ابی ابن کعب اور علی ابن ابی طالب سے قرآن پڑھا تھا غرض ان قراء میں اکثر کی بازگشت حضرت کی طرف ہے چنانچہ ابن ابی الحدید معتزلی نے تحریر کیا ہے۔

اذا رجعت الی کتب القرآن وجدت آئمۃ القراء کلھم یرجعون الیہ

اگر ان کتابوں پر نظر کرو جو قرآن مجید کے سلسلہ میں لکھی گئی ہیں تو تم دیکھوگے کہ تمام آئمہ قراءت

کابی عمرو ابن العلا وعاصم ابن النجود وغیرھما لانھم یرجعون الی ابی عبدالرحمٰن ابن السلمی القاری وابوعبدالرحمٰن کان تلمیذہ وعنہ اخذ القرآن فقد صار ھذا الفن من الفنون التی ینتھی الیہ (مقدمہ شرح ص ۷)

حضرت علی کی طرف رجوع کرتے ہیں جیسے ابوعمرو ابن العلاء اور عاصم وغیرہ اس طرح کہ یہ قراء ابو عبدالرحمٰن کی طرف رجوع کرتے ہیں اور ابوعبدالرحمٰن حضرت کے شاگرد تھے اور انہی سے درس قرآن لیا تھا لہذا یہ فن بھی انہی فنون میں شمار ہوگا جو حضرت تک منتہی ہوتے ہیں۔

اگرچہ ان قراء میں اکثر کا سلسلۂ قرأت حضرت تک منتہی ہوتا ہے مگر ان کی قراءتوں کے اختلاف کو دیکھ کر یہ کہنا پڑے گا کہ انہوں نے وہی قراءتیں حضرت سے لی ہوں گی جن پر وہ متفق تھے اور کچھ قراءتوں کے سلسلہ میں دوسروں سے استفادہ کیا ہوگا یا اپنے اجتہاد ورائے سے کوئی قراءت مقرر کرلی ہوگی ایسا نہیں ہے کہ ان کی ہر قراءت حضرت سے نسبت رکھتی ہو اور ان سے سیکھی گئی ہو اس لئے کہ قرآن کی تنزیلی قراءت ایک ہی ہے جس میں متعدد قرأتوں کی صحت کی گنجائش نہیں ہے اور نہ متداول قراءت کے علاوہ دوسرے قراء کی قراءتوں پر اعتماد و وثوق صحیح ہے البتہ اگر آئمۂ معصومین میں سے کسی نے کسی قراءت کی توثیق کردی ہو تو وہ صحیح قرار دی جائے گی۔

نقاط و اعراب قرآن

پیغمبر اکرم کے زمانہ میں حروف منقوطہ پر نقطے دینے اور اعراب لگانے کا طریقہ مرسوم نہ تھا اور اس دور کی تمام تحریریں نقطوں سے عاری اور اعراب سے خالی ہوتی تھیں چنانچہ قرآن مجید کے حروف بھی نقطوں اور اعرابی علامتوں کے بغیر لکھے جاتے تھے۔ وہ لوگ جو کتابت قرآن پر مامور ہوتے تھے وہ نقطوں سے آگاہ ہی نہ تھے کہ ایک شکل وصورت والے حرفوں پر امتیاز کے لئے نقطے لگاتے اور نہ عربوں کو اس کی احتیاج تھی وہ نقطوں کی ضرورت محسوس کئے بغیر پڑھ لیتے تھے اور موقع ومحل سے سمجھ لیتے تھے کہ اس مقام پر کون سا حرف ہوگا اور اس کی اعرابی حرکت کیا ہونا چاہیئے مگر غیر عربوں کے لئے نقطوں کے بغیر قرآن مجید کی تلاوت کرنا انتہائی دشوار تھی کیونکہ منفرد شکل وصورت رکھنے والے حرفوں کے علاوہ متحدالاشکال حروف میں ان کے لئے اشتباہ کا ہونا ضروری تھا۔ جیسے ت اور ث، س اور ش، ص اور ض، ع اور غ وغیرہ ابوالاسود دئلی نے اس طرف توجہ کی اور قرآن مجید کے حروف پر نقطے لگائے۔ جلال الدین سیوطی تحریر کرتے ہیں۔

ابو الاسود اول من نقط المصحف (المزھر ج ۲ ص ۳۹۸)

ابوالاسود نے سب سے پہلے قرآن مجید پر نقطے لگائے۔

یہ نقطے متحدالاشکال حروف کے باہمی امتیاز کے لئے بھی ہوتے تھے چنانچہ وہ حروف جو ایک مخصوص اور

انفرادی شکل رکھتے ہیں جیسے ا ک ل م و ہ ان پر نقطوں کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی اور وہ حروف جو ایک ہی شکل وصورت رکھتے ہیں جیسے ب ت ث یا مرکب ہونے کی صورت میں ہم شکل ہو جاتے ہیں جیسے ف ق ان میں نقطوں کے ذریعہ امتیاز پیدا کیا گیا اور ی چونکہ غیر مخلوط ہونے کی صورت میں منفرد شکل رکھتی ہے اس لئے اس پر نقطے نہیں دئے جاتے اور مرکب ہونے کی صورت میں چونکہ اس کی شکل منفرد نہیں رہتی اس لئے نقطے لکھے جاتے ہیں۔ ب اور ی دو حرف ایسے ہیں جن کے نیچے نقطے دیئے جاتے ہیں کیونکہ اوپر نقطے لکھنے کی صورت میں ب اور ن میں فرق نہ رہتا اور ی اور ت میں امتیاز ختم ہو جاتا۔ اسی طرح زیر زبر اور پیش تینوں حرکتوں کو ظاہر کرنے کے لئے بھی انہوں نے اعرابی نقطوں کی تشکیل کی۔ اس طرح کہ جب انہوں نے دیکھا کہ ہر حرکت کے ادا کرتے وقت منہ کی ایک خاص شکل بن جاتی ہے تو اپنے کاتب سے کہا کہ تم میرے انداز تلفظ کو دیکھو اگر کسی حرف کے تلفظ میں میرا مُنہ کھل جائے تو تم اس حرف کے اوپر ایک نقطہ ڈال دینا اور جس حرف کے ادا کرنے میں میرے دونوں لب مل جائیں تو اس کے آگے ایک نقطہ لگا دینا اور اگر آواز کا رُخ نیچے کی طرف ہو تو اس حرف کے نیچے نقطہ لکھ دینا اس طرح بالترتیب زبر پیش اور زیر کی حرکتوں کو ان نقطوں سے واضح کیا اور بعد میں نقطوں کے بجائے اعرابی حرکات ـَ ـُ ـِ کی صورت میں یہ تینوں حرکتیں ظاہر کی گئیں۔ ان اعرابی اشکال کے موجد خلیل ابن احمد فراہیدی متوفی ۱۷۰ھ تھے۔

ابوالاسود کا یہ کارنامہ بھی امیرالمومنین کا کارنامہ ہے کیونکہ ابوالاسود نے یہ طریق کار حضرت ہی سے سیکھا تھا چنانچہ ابن حجر عسقلانی تحریر کرتے ہیں۔

اول من وضع العربیۃ و نقط المصاحف ابوالاسود و قد سئل عمن نھج لہ الطریق فقال تلقینہ عن علی ابن ابی طالب (اصابہ ج ۲ ص ۲۳۳)	جس نے سب سے پہلے علوم عربیہ وضع کئے اور قرآن پر نقطے لگائے وہ ابوالاسود تھے جب ان سے پوچھا گیا کہ تم نے یہ طریقہ کس سے سیکھا ہے تو انہوں نے کہا کہ میں نے اسے علی ابن ابی طالب سے حاصل کیا ہے۔

قرآن مجید کی زریں خدمات کے سلسلہ میں حضرت کی یہ خدمت بھی ایک بلند درجہ رکھتی ہے۔ آپ نے قرأت قرآن کی دشواریوں کو محسوس کرتے ہوئے اپنے شاگرد ابوالاسود کو نقاط کی تعلیم دی جس کی وجہ سے نہ صرف غیر عربوں کے لئے تلاوتِ قرآن کی راہیں کھلیں بلکہ خود عربوں کے لئے بھی آسانی وسہولت پیدا ہو گئی۔

کتابت و املاء قرآن

تحریر و املاء کا بنیادی ضابطہ یہ ہے کہ الفاظ کو اسی طرح ضبطِ تحریر میں لایا جائے جس طرح ان کا تلفّظ کیا جاتا ہے مگر عربی زبان میں بعض الفاظ کے رسم الخط میں ایک آدھ حرف زیادہ کر دیا جاتا ہے جو تلفّظ میں نہیں

میں نہیں آتا جیسے عمرو میں واؤ تاکہ لفظ عَمر اور عُمر میں فرق ہو سکے اسی طرح واو جمع کے بعد الف لکھ دیا جاتا ہے تاکہ واو جمع اور واو غیر جمع میں امتیاز کیا جا سکے۔ مگر قرآن مجید کے رسم الخط میں اس عام قاعدہ کی پابندی کہیں کہیں نہیں ہے چنانچہ بعض مقامات پر ایسی واؤ کے بعد بھی الف لکھ دیا گیا ہے جو واؤ جمع نہیں ہے۔ جیسے یدعوا اور کہیں واؤ جمع کے بعد الف نہیں لکھا گیا جیسے و باء و بغضب من اللہ یونہی لا اوضعوا اور لاأذبحنہ میں لا کے بعد الف زائد ہے اس لئے کہ یہ لائے نافیہ نہیں ہے بلکہ لام تاکید ہے جس سے فعل متصل ہے یہ الف بھی پڑھنے میں آتا۔ یونہی بعض جگہوں پر وہ "تا" جو حالت وقف میں ہا ہو جاتی ہے لمبی تا کی صورت میں لکھی ہوی ہے جیسے نعمت رحمت کلمت، حالانکہ وہ ہا کی صورت میں لکھی جاتی ہے۔

اس رسم الخط کا آغاز چونکہ قرن اوّل میں ہو چکا تھا اس لئے اس رسم الخط کی پابندی ضروری قرار دے لی گئی تاکہ قرآن مجید کے نسخوں میں خط و املاء کے اعتبار سے اختلاف نہ ہونے پائے۔ ابن خلدون تحریر کرتے ہیں:

رسم الصحابة بخطوطهم وكانت غير مستحكمة في الاجادة فخالف الكثير من رسومهم ما اقتضته رسوم صناعة الخط عند اهلها ثم اقتفى التابعون من السلف رسمهم فيها تبركا بما رسمه اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم (مقدمہ ص ۲۹۴)

صحابہ نے اپنے ہاتھ سے قرآن مجید کے نسخے قلم بند کئے لیکن ان کا خط فنّی اعتبار سے ناقص و کمزور تھا چنانچہ بہت سی جگہوں پر ان کا رسم الخط اہل فن کے رسم الخط کے خلاف ہے پھر بعد کے آنے والوں نے تبرکاً رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ہی کے رسم الخط کو اختیار کیا۔

قرآن مجید کو تحریری شکل میں لانے کا اہتمام و انصرام خود پیغمبر اکرم نے کیا تھا اور اسے لوگوں کی قوتِ حافظہ پر چھوڑ دینے کے بجائے احاطۂ تحریر میں لا کر ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دینا ضروری سمجھا چنانچہ آنحضرت نے چند پڑھے لکھے لوگوں کو کتابت وحی پر مامور فرمایا اور جو آیت نازل ہوتی اسے فوراً لکھوا دیتے۔ صدر اول میں چونکہ نوشت و خواند پر قدرت رکھنے والے چند ہی افراد تھے اس لئے کچھ لوگوں سے کتابت وحی اور تحریر مراسلات دونوں کام لئے جاتے اور کچھ لوگوں سے صرف خطوط و رسائل لکھوائے جاتے۔ بعض مؤلفین نے کاتبان وحی اور کاتبان رسائل و خطوط کو ایک ہی عنوان کے تحت درج کر دیا ہے جس سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ ان میں کاتب وحی کون تھا اور کاتب خطوط و رسائل کون، اسی سے کچھ لوگوں کو اشتباہ ہو گیا اور انہوں نے معاویہ ابن ابی سفیان کو جو خطوط و رسائل لکھتے تھے اور وہ بھی گاہے گاہے کاتب وحی قرار دے لیا حالانکہ ان کا کاتب وحی ہونا واقعات کی روشنی میں بعید معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ وہ فتح مکہ کے موقع پر اسلام لائے اور اسلام لانے کے بعد مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کے بجائے مکہ ہی میں رہے اور نزول قرآن کا آغاز ابتدائے بعثت سے ہو چکا تھا البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ کبھی کبھار مدینہ آتے ہوں اور ان سے خطوط و رسائل کے سلسلہ میں تحریری کام بھی لیا جاتا ہو۔ چنانچہ مؤرخین نے انہیں صرف کاتب رسائل و خطوط ہی لکھا ہے۔ علامہ سیوطی تحریر کرتے ہیں۔

وکان احد الکتاب لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (تاریخ الخلفاء ص ١٣٦)

معاویہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتبوں میں سے ایک کاتب تھے۔

ابن حجر عسقلانی نے تحریر کیا ہے۔

قال المدائنی کان زید ابن ثابت یکتب الوحی وکان معاویۃ یکتب للنبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فیما بینہ وبین العرب (اصابہ ج ٣ ص ٤١٣)

مدائنی کہتے ہیں کہ زید ابن ثابت کتابت وحی کرتے تھے اور معاویہ آنحضرت اور عربوں کے درمیان مراسلات کے سلسلہ میں تحریری کام کرتے تھے۔

محمد ابن عبدوس جہشیاری نے تحریر کیا ہے۔

وکان خالد ابن سعید ابن العاص ومعاویۃ ابن ابی سفیان یکتبان بین یدیہ فی حوائجہ (کتاب الوزراء والکتاب ص ١٢)

خالد ابن سعید ابن عاص اور معاویہ ابن ابی سفیان آنحضرت کے حوائج و ضروریات کے سلسلہ میں تحریری خدمت بجالاتے تھے۔

علامہ عقاد تحریر کرتے ہیں۔

تتفق الاخبار علی کتابتہ للنبی ولا تتفق علی کتابتہ للوحی (معاویہ ابن ابی سفیان فی المیزان ص ١٦٤)

اس پر روایات کا اتفاق ہے کہ معاویہ پیغمبر اکرم کا تحریری کام کرتے تھے مگر ان کے کاتب وحی ہونے پر روایات متفق نہیں ہیں۔

مسعودی تحریر کرتے ہیں۔

کتب لہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قبل وفاتہ بشہور فاشادوا من ذکرہ ورفعوا من منزلتہ بان جعلوہ کاتبا للوحی (مروج الذہب ج ٢ ص ٤٧)

معاویہ نے پیغمبر اکرم کی وفات سے چند ماہ قبل آپ کا کچھ تحریری کام کیا مگر عوام نے ان کا ذکر اتنا اچھالا اور ان کا درجہ اتنا بلند کر دیا کہ انہیں کاتب وحی قرار دے لیا۔

ابن عبد ربہ الاندلسی نے عقد الفرید میں حضرت عثمان کو بھی کاتب وحی لکھ دیا ہے لیکن دوسرے ماخذ طبری اصابہ استیعاب سیرۃ حلبیہ وغیرہ میں اس کا تذکرہ نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی اسی طرح کی خود ساختہ بات ہے جس طرح معاویہ کا کاتب وحی ہونا بے اساس ہے۔ تاہم جنہوں نے کتابت وحی کے سلسلہ میں کام کیا ان کے نام کتب تاریخ میں درج ہیں۔ مگر ان میں کوئی فرد ایسا نہیں ہے جس نے آنحضرت کی زبان مبارک سے سن کر تماماً وکمالاً قرآن تحریر کیا ہو بلکہ سبھی متفرق آیتوں کے کاتب تھے البتہ امیر المومنین جو اکثر اوقات آنحضرت کی خدمت میں موجود رہتے تھے اور جب بھی کوئی آیت نازل ہوتی تھی آنحضرت انہیں لکھوا دیتے تھے اور اگر نزول وحی کے موقع پر موجود نہ ہوتے تو دوسرے موقع پر انہیں لکھوا دیا کرتے تھے۔ ابن شہر آشوب تحریر کرتے ہیں۔

کان النبی اذا نزل علیہ الوحی لیلا لم

جب نبی اکرم پر رات کو وحی نازل ہوتی تو صبح

یصبح حتی یخبر بہ علیا واذا نـزل — ہونے سے پہلے علی کو بتا دیتے اور جب دن کو وحی
علیہ نہار الم یمس حتی یخبر بہ علیا (مناقب) — نازل ہوتی تو شام سے پہلے علی کو آگاہ کر دیتے۔

امیر المومنین نے آنحضرت کی زندگی میں کتابت وحی کا فریضہ انجام دیا اور آپ کی رحلت کے بعد قرآن کی نزولی ترتیب قائم کی اور صحت کتابت کی طرف خصوصی توجہ دی چنانچہ کاتبان قرآن کو متنبہ کرتے رہتے کہ تحریر واضح اور اصول کتابت کے مطابق ہو تاکہ پڑھنے میں آسانی رہے اور الفاظ میں اشتباہ نہ ہونے پائے۔

ابو حکیمہ بیان کرتے ہیں کہ

کنت اکتب المصاحف فمر بی علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ فقال اجلل قلمك فقصمت من قلمی قصمۃ فقال ھکذا نورہ کما نورہ اللہ (عقد الفرید ج ۳ ص ۲۷)

میں قرآن مجید تحریر کیا کرتا تھا ایک مرتبہ علی ابن ابی طالب کا میری طرف سے گزر ہوا آپ نے فرمایا قلم کو جلی رکھو میں نے قلم کی نوک کاٹ ڈالی فرمایا کہ جس طرح اللہ نے اسے روشن کیا ہے اسی طرح تم بھی اسے روشن و نمایاں کرو۔

انصار لفظ تابوت کی آخری تا کو ھا اور قریش تا پڑھتے تھے۔ علامہ سیوطی تحریر کرتے ہیں۔

قال القاسم ابن معین لم تختلف لغۃ قریش والانصار فی شئی من القرآن الا فی التابوت فلغۃ قریش بالتاء ولغۃ الانصار بالھاء (المزہر ج ۲ ص ۷۳)

قاسم ابن معین کہتے ہیں کہ لغت قرآن کے سلسلہ میں قریش اور انصار میں کوئی اختلاف نہ تھا سوائے لفظ تابوت کے قریش اسے تا کے ساتھ پڑھتے تھے اور انصار ھا کے ساتھ۔

ایک مرتبہ زید کاتب نے حضرت کے سامنے لفظ تابوت کو ھا کے ساتھ پڑھا تو آپ نے فرمایا کہ اسے لانبی تا کے ساتھ التابوت لکھو تاکہ اسے ھا نہ پڑھا جائے۔

امیر المومنین نے قرآن مجید کے متعدد نسخے اپنے ہاتھ سے قلمبند کئے اور بعض اجزاء دستبرد زمانہ سے اب تک محفوظ چلے آرہے ہیں چنانچہ مکتبۂ رضویہ مشہد میں چند سورتوں پر مشتمل ایک مجموعہ ہے جس کے ۹۲ اوراق ہیں اور ایک مجموعہ سورۂ ھود سے سورۂ کہف تک ہے جس کے ۶۸ اوراق ہیں اور اس کے نیچے کتبہ علی ابن ابی طالب تحریر ہے اسی طرح مکتبۂ نجف میں ایک قرآن مجید موجود ہے جس کے آخر میں تحریر ہے۔

کتبہ علی ابن ابی طالب فی سنۃ اربعین من الھجرۃ (اعیان الشیعہ ج ا ص ۲۷۶)

علی ابن ابی طالب نے سنہ ۴۰ھ میں تحریر کیا۔

علامہ رافعی نے لکھا ہے۔

فی فہرست لابن الندیم انہ رأی عند ابی یعلی حمزۃ الحسنی مصحفا بخط

ابن ندیم نے فہرست میں لکھا ہے کہ انہوں نے ابو یعلی حمزہ حسنی کے پاس قرآن مجید کا ایک نسخہ

علی بیتوارثہ بنوحسن
(اعجاز القرآن ص ۳۲)

جو حضرت علی کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا اور وہ اولادِ حسن میں وراثتاً منتقل ہوتا رہتا ہے۔

تفسیرِ قرآن

قرآن مجید انہی الفاظ و کلمات پر مشتمل ہے جو عرب میں رائج اور زبانوں پر جاری و ساری تھے مگر لفظوں کی ترتیب و ترکیب اور بیان کے طرز و اسلوب میں وہ حسن کارفرما ہے جس نے اسے اعجازی حیثیت دے دی اور عرب کے سخن طراز و سحر بیان اس کی قوت اعجاز سے انکار نہ کر سکے۔ قرآن مجید صرف لفظوں کی ترتیب و تنظیم اور بلاغت کے اعتبار ہی سے معجزہ نہیں ہے بلکہ جس پہلو سے دیکھا جائے معجزہ اور انسانی قدرت سے بالاتر ہے۔ فصحاء و بلغاء کے لئے بلاغت کے اعتبار سے معجزہ ہے۔ حکماء کے لئے حکمت اور طریق استدلال کے لحاظ سے معجزہ ہے۔ قانون دانوں کے قانون کی آفاقیت و ہمہ گیری کے اعتبار سے معجزہ ہے۔ سیاست دانوں کے لئے سیاسی اصولوں کی نوعیت کے اعتبار سے معجزہ ہے۔ اسی طرح اخلاقی تعلیمات تشریعی نظریات اور علمی انکشافات کے لحاظ سے معجزہ خالدہ ہے۔

قرآن مجید کے انہی مطالب و مضامین کی توضیح اور اس کی لفظی و معنوی تشریح کا نام تفسیر ہے۔ ایک عربی داں الفاظِ قرآن کے معانی تو سمجھ سکتا ہے مگر اس کے مجملات اور دقائق و نکات کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ احادیث پیغمبر سے روشنی حاصل کی جائے یا ان ہستیوں کے آثار سے استفادہ کیا جائے جو اس سرچشمۂ نبوت سے براہ راست سیراب ہوئے اور حاملان علم کتاب قرار پائے۔ اگر ان سے بے نیاز رہ کر تفسیر کی جائے گی تو وہ ذاتی آراء کا مجموعہ ہو گی تفسیر نہ ہو گی۔ اس لئے کہ تفسیر نام ہے مراد الٰہی کی توضیح کا اور ظن و رائے سے مراد الٰہی تک پہنچا نہیں جا سکتا۔

پیغمبر اکرم کے دور میں اگرچہ چند صحابہ قرآنی مطالب پر نظر رکھتے تھے مگر حضرت علی کے بارے میں اتفاق رائے ہے کہ وہ تفسیر میں یکتا اور قرآن فہمی میں یگانۂ روزگار تھے اور صحابہ میں کوئی بھی ان کا ہم پایہ و ہمسر نہ تھا کیونکہ فہم قرآن کے صحیح ذوق کے ساتھ درسگاہ نبوت میں تعلیم و تربیت پانے اور پیغمبر کے فیوض سے مستفید ہونے کا جتنا موقع انہیں ملا وہ کسی اور کو نہ مل سکا آپ قرآن کے محل نزول تاریخ نزول عام و خاص مطلق و مقید مجمل و مبین ناسخ و منسوخ اور محکم و متشابہ سے پوری طرح آگاہ اور اس کے اسرار و غوامض اور دقائق و معارف پر کماحقہ حاوی تھے۔ آپ اپنے خطبات میں بھی ان مطالب پر روشنی ڈالتے اور انہیں تحریر میں بھی لائے چنانچہ پیغمبر اسلام کی رحلت کے بعد جو قرآن مرتب کیا وہ ایک تفسیری حیثیت رکھتا تھا اور تنزیلی و تاویلی تشریحات پر مشتمل تھا۔ محمد ابن سیرین کہتے ہیں۔

لو اصبت ذلك الكتاب كان فيه   اگر وہ کتاب مجھے مل جاتی تو اس سے علم کا ایک

العلم (تاریخ الاسلام ذہبی ج ۲ ص ۱۹۹) ذخیرہ دستیاب ہوتا۔

اس تفسیر کے دسترس سے باہر ہونے کے باوجود کتب تفاسیر میں آپ کے تفسیری کلمات اس کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ اس دور کے مسلمانوں میں سے کسی ایک سے بھی اتنے اقوال مروی نہیں ہیں۔ علامہ سیوطی تحریر کرتے ہیں۔

ولا احفظ عن ابی بکر رضی اللہ عنہ الا آثار اقلیلۃ جد الا تکاد تجاوز العشرۃ واما علی فروی عنہ الکثیر (اتقان ج ۲ ص ۳۲۸)

میں تفسیر کے سلسلہ میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کے آثار بہت ہی کم پاتا ہوں اور جو ہیں وہ کسی صورت میں دس سے زیادہ نہیں ہیں البتہ حضرت علی سے بہت زیادہ تفسیری اقوال مروی ہیں۔

دوسرے خلفاء کے بارے میں تحریر کرتے ہیں۔

والروایۃ عن الثلاثۃ نزرۃ جدا (اتقان ج ۲ ص ۳۲۸)

خلفاء ثلثہ سے تفسیر کی روایات بہت کم ہیں۔

بہر حال امیر المؤمنین کو جہاں تفسیر میں نمایاں امتیاز حاصل ہے وہاں اس کی تدوین میں بھی تقدم حاصل ہے اور وہ افراد جنہوں نے تفسیر کی تدوین کی یا تفسیر میں شہرت پائی ان کا سلسلۂ تلمذ بھی آپ تک منتہی ہوتا ہے۔ چنانچہ ان میں سے ایک مشہور مفسر ابن عباس ہیں جنہیں پیغمبر نے یہ دعا دی تھی کہ

علمہ الحکمۃ و تاویل الکتاب (طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۳۶۵)

خدایا اسے حکمت اور کتاب کی تاویل کا علم عطا کر

ابن عباس کی طرف منسوب ایک تفسیر تنویر المقباس مطبوعہ صورت میں موجود ہے مگر یہ خود ان کی مدون کردہ نہیں ہے بلکہ جو تفسیری روایات ان کی طرف منسوب ہیں انہیں ابو طاہر محمد ابن یعقوب فیروز آبادی متوفی ۸۱۷ھ نے جمع کر دیا ہے۔ ابن عباس کا قول ہے۔

کلما تکلمت بہ فی التفسیر فانما اخذ تہ عن علی کرم اللہ وجہہ (سیرت حلبیہ ج ۲ ص ۴)

میں نے تفسیر کے سلسلہ میں جو کچھ بیان کیا ہے وہ میں نے حضرت علی سے اخذ کیا ہے۔

دوسرے میثم ابن یحییٰ تمار ہیں جنہوں نے امیر المومنین سے قرآن پڑھا اور علم تاویل سیکھا۔ چنانچہ انہوں نے ایک موقع پر ابن عباس سے کہا۔

یا ابن عباس سلنی ما شئت من تفسیر القرآن فان قرأت تنزیلہ علی امیر المومنین فعلمنی تاویلہ (بحار الانوار ج ۹ ص ۶۳۰)

اے ابن عباس تفسیر قرآن کے بارے میں جو پوچھنا چاہو مجھ سے پوچھو میں نے امیر المومنین سے قرآن پڑھا ہے اور انہوں نے مجھے تاویل قرآن کی تعلیم دی ہے۔

ابن عباس نے قلم دوات طلب کر کے ان کے افادات کو قلمبند کر لیا۔

جابر ابن عبداللہ انصاری اور ابی ابن کعب نے بھی حضرت سے استفادہ کیا اور طبقۂ اولی کے مفسرین میں سے سعید ابن جبیر ابوصالح بصری اور طاؤس ابن کیسان یمانی، ابن عباس کے واسطہ سے حضرت کے فیوض علمیہ سے مستفید ہوکر علم تفسیر میں نامور ہوئے۔

ذیل میں حضرت کے کلمات کی روشنی میں سورۂ فاتحہ کا ایک تفسیری خاکہ درج کیا جاتا ہے۔

تفسیر سورۂ فاتحہ

سورۂ فاتحہ قرآن مجید کا پہلا سورہ ہے جو فاتحۃ الکتاب ام القرآن اور سبع مثانی کے نام سے موسوم ہے اسے فاتحۃ الکتاب قرآن مجید کا افتتاحیہ ہونے کی بنا پر کہا گیا ہے اور ام القرآن اس لئے کہ یہ سورہ تمام مطالب قرآنی کا خلاصہ اپنے اندر رکھتا ہے اور سبع مثانی (سات دہرائی جانے والی آیتیں) اس وجہ سے کہ ہر نماز کی پہلی اور دوسری رکعت میں اس کا دہرانا واجب ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔

ولقد آتیناک سبعا من المثانی — ہم نے تمہیں سات دہرائی جانے والی آیتیں دی ہیں۔

امیرالمومنین کا ارشاد ہے۔

السبع المثانی فاتحۃ الکتاب — سبع مثانی سے مراد سورۂ فاتحہ ہے۔

بعض مفسرین نے اس سورہ کو مدنی لکھا ہے اور بعض کا قول یہ ہے کہ یہ سورہ ایک دفعہ مکّہ میں نازل ہوا، اور ایک دفعہ مدینہ میں اور اسی تکرار نزول کی وجہ سے اسے سبع مثانی کہا گیا ہے لیکن اکثر کے نزدیک یہ سورہ مکّی ہے اور یہی امیرالمومنین سے مروی ہے چنانچہ ابن جوزی نے تحریر کیا ہے۔

انها مکیۃ وھو مروی عن علی ابن ابی طالب (زادالمسیر ج ۱ ص ۱۰) — سورہ فاتحہ مکّی ہے اور یہ قول علی ابن ابی طالب سے مروی ہے۔

حضرت کا یہ قول ہی مشہور و معتبر ہے اور اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ سبعا من المثانی جس سے مراد سورۂ فاتحہ ہے۔ سورۂ حجر کی آیت ہے اور سورۂ حجر بالاتفاق مکّی ہے لہٰذا سورۂ فاتحہ کو بھی مکی ہونا چاہیئے اور اس لئے بھی کہ سورۂ فاتحہ نماز کا لازمی جزو ہے اور نماز مکہ ہی میں شروع ہو چکی تھی۔

یہ سورہ سات آیتوں پر مشتمل ہے اور پہلی آیت بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ہے۔ علامہ سیوطی تحریر کرتے ہیں۔

انہ سئل عن السبع المثانی فقال الحمد للہ رب العالمین فقیل لہ انما ھی ست آیات فقال بسم اللہ الرحمن الرحیم آیۃ (اتقان ج ۱ ص ۷۹) — حضرت علی سے سبع مثانی کے بارے میں پوچھا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ اس سے مراد سورۂ الحمد ہے کہا گیا کہ اس سے چھ آیتیں ہیں فرمایا کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم بھی تو ایک آیت ہے۔

پیغمبر اکرم بھی بسم اللہ کو سورۂ فاتحہ کا جزو قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

فاتحۃ الکتاب سبع آیات اولھن بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (تفسیر بیضاوی ص ۳)

سورۂ فاتحہ کی سات آیتیں ہیں اور ان میں کی پہلی آیت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہے۔

جو لوگ بسم اللہ کو سورۂ فاتحہ کا جزو نہیں سمجھتے وہ سات آیتوں کی گنتی اس طرح پوری کرتے ہیں کہ صراط الذین انعمت علیھم کو چھٹی آیت اور غیر المغضوب علیھم ولا الضالین کو ساتویں آیت قرار دیتے ہیں اور جو اسے جزو سورہ سمجھتے ہیں ان کے نزدیک یہ ایک ہی آیت ہے اور یہی صحیح ہے جیسا کہ حدیث نبوی سے ظاہر ہے کہ بسم اللہ سورۂ فاتحہ کی پہلی آیت اور اس کا جزو ہے بلکہ دوسرے سوروں میں بھی اس کی حیثیت جزو سورہ اور مستقل آیت کی ہے چنانچہ امیر المومنین کا ارشاد ہے۔

والتسمیۃ فی اول کل سورۃ آیۃ منھا وانما کان یعرف انقضاء السورۃ بنزولھا (صافی)

ہر سورہ میں بسم اللہ اس سورہ کی ایک آیت ہے اور اس کے نازل ہونے ہی سے معلوم ہوتا تھا کہ پہلا سورہ ختم ہو گیا ہے۔

البتہ سورۂ برائت کے شروع میں بسم اللہ نہیں ہے چنانچہ امیر المومنین کا ارشاد ہے۔

لم ینزل بسم اللہ الرحمٰن الرحیم علی راس سورۃ براءۃ لان بسم اللہ للامان والرحمۃ ونزلت براءۃ لرفع الامان وللسیف (جوامع الجامع طبرسی)

سورۂ براءت کے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہیں ہے اس لئے کہ بسم اللہ امان و رحمت کے لئے ہے اور سورۂ براءت امان کی برطرفی اور تلوار کے لئے نازل ہوا ہے۔

بہر حال بسم اللہ سورۂ فاتحہ کا ایک جزو ہے جسے نماز میں سورہ فاتحہ کے ساتھ پڑھنا ضروری ہے کیونکہ سورۂ فاتحہ نماز کا لازمی جزو ہے جیسا کہ حدیث میں وارد ہے کہ لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب (سورۂ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی) اور بسم اللہ سورۃ فاتحہ کی ایک آیت ہے جس کے بغیر سورت کی تکمیل نہیں ہوتی۔ امیر المومنین نے کچھ لوگوں کے بارے میں سنا کہ وہ سورۂ فاتحہ کے ساتھ بسم اللہ نہیں پڑھتے۔ آپ نے اس پر بگڑ کر فرمایا۔

ھی آیۃ من کتاب اللہ انساھم ایاھا الشیطان (تفسیر برہان)

بسم اللہ قرآن کی آیت ہے اور شیطان نے یہ آیت انہیں بھلا دی ہے۔

صحابہ بسم اللہ کو نہ صرف سورۂ فاتحہ بلکہ سورۂ براءت کے علاوہ ہر سورت کا جزو سمجھتے تھے اور فرادی و باجماعت نمازوں میں برابر پڑھتے اور سنتے آئے تھے اس لئے جب معاویہ نے مدینہ میں نماز بالجہر پڑھائی اور سورۂ فاتحہ کے بعد دوسرا سورہ بغیر بسم اللہ کے پڑھ دیا تو ہر طرف سے انصار و مہاجرین کی آوازیں آئیں کہ

یامعاویۃ اسرقت الصلوٰۃ ام نسیت (مستدرک حاکم ج ۱ ص ۲۳۳)

اے معاویہ تم نے نماز میں چوری کی ہے یا بھول کر ایسا کیا ہے۔

امیر المومنین تمام نمازوں میں وہ جہری ہوں یا اخفاتی بسم اللہ بلند آواز سے پڑھتے تھے۔ فخر الدین رازی تحریر کرتے ہیں۔

ان علیا کان مذھبہ الجھر ببسم اللہ فی جمیع الصلوات (تفسیر کبیر ج ا ص ۱۶۹)	حضرت علی کا مسلک جہر تھا اور وہ تمام نمازوں میں بسم اللہ بلند آواز سے پڑھتے تھے ۔

یہی پیغمبر اکرم کا مسلک اور ان کا طرزِ عمل تھا چنانچہ ابوہریرہ روای کہتے ہیں ۔

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ یجھر ببسم اللہ الرحمن الرحیم (مستدرک حاکم ج ا ص ۲۳۲)	رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم بسم اللہ الرحمن الرحیم بلند آواز سے پڑھتے تھے ۔

ابن عباس کہتے ہیں ۔

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یجھر ببسم اللہ الرحمن الرحیم (مستدرک حاکم ج ا ص۲۰۸)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بسم اللہ الرحمن الرحیم اونچی آواز سے پڑھتے تھے ۔

انس ابن مالک کہتے ہیں کہ

صلیت خلف النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وخلف ابی بکر وخلف عمر وخلف عثمان وخلف علی فکلھم کانوا یجھرون بقراءۃ بسم اللہ الرحمن الرحیم (مستدرک حاکم ج ا ص ۲۳۴)	میں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے نمازیں پڑھی ہیں اور ابوبکر عمر عثمان اور حضرت علی کی بھی اقتداء کی ہے وہ سب کے سب بسم اللہ الرحمن الرحیم بلند آواز سے پڑھتے تھے ۔

سورۂ فاتحہ اگرچہ سات آیتوں کا مختصر سا سورہ ہے مگر ان تمام تعلیمات پر حاوی ہے جو قرآن مجید میں بہ تفصیل بیان ہوئے ہیں ۔ قرآن مجید کی تعلیمات کا بنیادی نقطہ اعتقاد اور عمل ہے ۔ اعتقاد کا تعلق مبداء و معاد سے ہے ۔ اور عمل کا تعلق عبادت و استمداد سے ہے چنانچہ الحمد للہ میں مبداءِ کائنات کا ذکر ہے جو اپنے صفات جمالیہ و کمالیہ کی بنا پر ہر ستائش کا سزاوار ہے اور رب العالمین میں اس کی صفت ربوبیت کا اور الرحمن الرحیم میں اس کی صفت رحمت کا اور مالک یوم الدین میں اس کی صفت عدالت اور جزاؤ مکافات کے قانون کا تذکرہ ہے اور ایاک نعبد و ایاک نستعین میں اس کی عبادت و پرستش اور اس سے استعانت کا اعتراف ہے اور اھدنا الصراط المستقیم میں اس سے ہدایت و استقامت کی طلب و خواہش ہے کیونکہ وہی ہدایت کی توفیق دیتا اور رہنمائی کا سروساماں کرتا ہے ۔ پھر اطاعت و عصیان کے اعتبار سے انسانوں کے تین گروہوں کا ذکر کیا ہے ۔ پہلا گروہ وہ جو راہِ راست پر ثابت قدم ہے ۔ یہ انعام یافتہ گروہ ہے کیونکہ ہدایت اور ہدایت پر ثبات سب سے بڑا انعام ہے اور دوسرا گروہ وہ جو ہوائے نفس کے زیر اثر عمداً حق سے روگرداں ہے ۔ یہ گروہ وہ ہے جو اپنی کجروی و کج ذہنی کے نتیجہ میں غضب الٰہی کا مستحق ہے اور تیسرا گروہ وہ جو اپنی کوتاہی کی بنا پر گمراہی میں پڑا ہوا ہے ۔ پہلے گروہ کی طرف صراط الذین انعمت علیھم سے اور دوسرے گروہ کی غیر المغضوب علیھم سے اور تیسرے گروہ کی طرف ولا الضالین سے اشارہ کیا ہے ۔ اس طرح اعتقاد و عمل اور ان پر مرتب ہونے والے نتائج و اثرات کا اس میں ذکر آ گیا ہے اور یہی اعتقاد کی پختگی اور عمل کی درستی قرآن کا بنیادی مقصد ہے جو اس سورہ میں اجمالاً بیان

کر دیا گیا ہے۔ امیر المومنین نے اس سورہ کی جامعیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

علم القرآن کلہ فی سورۃ الفاتحۃ (بحارالانوار) قرآن کا پورا علم سورۂ فاتحہ میں سمو دیا گیا ہے۔

سورۂ فاتحہ میں قرآنی معارف راز سربستہ کی صورت میں موجود ہیں مگر عام اہل علم ظواہر الفاظ کی حد تک معانی کی نقاب کشائی کر سکتے ہیں اور اس کے بواطن کی عمیق گہرائیوں تک پہنچ کر اس کے حکم و اسرار کا استخراج ان کے بس کی بات نہیں ہے یہ راسخون فی العلم اور وارثان علم نبوت کا کام ہے کہ وہ ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف سے علوم و معارف کے دفتر ترتیب دیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ ابن عباس رات کے وقت امیر المومنین کے ہاں آئے اور تفسیر قرآن کے متعلق کچھ سمجھنا چاہا۔ حضرت نے فرمایا کہ قرآن کا پہلا سورہ کون سا ہے کہا سورۂ فاتحہ فرمایا سورۂ فاتحہ کی ابتدا کیا ہے کہا بسم اللہ فرمایا بسم اللہ کی ابتداء کیا ہے کہا بسم فرمایا بسم کی ابتدا کیا ہے کہا باء اس کے بعد حضرت نے با کی تفسیر کرنا شروع کی یہاں تک کہ صبح ہو گئی اور یہ کہہ کر سلسلۂ بیان ختم کیا کہ

لو زادنا اللیل لزدنا (تفسیر برہان) اگر رات میں اور گنجائش ہوتی تو ہم اور بیان کرتے

حضرت کا مشہور قول ہے کہ

لو شئت لاوقرت سبعین بعیرا من تفسیر فاتحۃ الکتاب (احیاء العلوم ج ۱ ص ۲۶۰) اگر میں سورۂ فاتحہ کی تفسیر بیان کروں تو ستّر اونٹوں کے بار کے برابر ہو جائے۔

اب اس سورہ کی ہر آیت کے ذیل میں حضرت کا ایک ایک تفسیری قول درج کیا جاتا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ "خدا کے نام سے شروع کرتا ہوں جو رحمٰن و رحیم ہے" آیت کے شروع میں با حرف جار اور اسم مجرور ہے۔ کلام عرب میں جار و مجرور کا کوئی نہ کوئی متعلق ضرور ہوتا ہے یہاں لفظ ابتدأ قرار دیا گیا ہے اسی متعلق کی بنا پر بسم اللہ کا ترجمہ "اللہ کے نام پر شروع کرتا ہوں" کیا جاتا ہے۔ حضرت نے اس کی تفسیر کے سلسلہ میں فرمایا۔

استعین علی اموری کلھا باللہ الذی لا تحق العبادۃ الا لہ المغیث اذا استغیث والمجیب اذا دعی (صافی)

میں ہر کام میں اس اللہ سے مدد مانگتا ہوں جس کے علاوہ کوئی عبادت کا سزاوار نہیں ہے جب اس سے فریاد کی جاتی ہے تو فریاد کو پہنچتا ہے اور جب اسے پکارا جاتا ہے تو سنتا ہے۔

الحمد للہ "تمام تعریف اللہ کے لئے ہے" حمد کے معنی توصیف و ثناء کے ہیں اور اللہ کی ان گنت نعمتوں اور بے پایاں احسانوں کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی تحمید و ستائش کی جائے اور یہ حمد و ستائش ایک طرح سے اعتراف ہے اس کے انعامات و احسانات کا چنانچہ ایک شخص نے حضرت سے الحمد للہ کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا۔

ان اللہ عرف عبادہ بعض نعمہ اللہ نے اپنے بندوں کو اپنی نعمتیں اجمالی طور پر

علیھم جملا اذ لا یقدرون علی معرفۃ جمیعھا بالتفصیل لانھا اکثر من ان تحصی او تعرف فقال قولوا الحمد للہ علی ما انعم بہ علینا (صافی)

پہنچائی ہیں اور یہ بات ان کے بس میں نہیں ہے کہ اس کی تمام نعمتوں کو بالتفصیل پہچان سکیں اسلئے کہ نہ ان کا شمار ہو سکتا ہے اور نہ انہیں جانا جا سکتا ہے لہٰذا اس نے فرمایا کہ تم یہ کہو کہ تمام حمد اللہ کے لئے ہے ان انعامات کے مقابلہ میں جو اس نے ہمیں دئیے ہیں۔

اللہ اس اَن دیکھی اور غیر محسوس ہستی کا اسم ذات ہے جس کے ادراک سے بشری عقول عاجز اور انسانی حواس درماندہ ہیں وہ ہمارے ادراک سے بالاتر ہے اور جوں جوں اس ذات مجرّد کے بارے میں غور وخوض کیا جاتا ہے حیرت وسرگشتگی بڑھتی ہی جاتی ہے۔ حضرت فرماتے ہیں۔

اللہ معناہ المعبود الذی یالہ فیہ الخلق (توحید صدوق)

اللہ سے مراد وہ معبود ہے جس کے بارے میں کائنات حیران وسرگرداں ہے۔

اگرچہ وہ تعقل وادراک کے حدود سے باہر ہے مگر انسان کائنات کو دیکھ کر خالق کائنات کا شعوری احساس رکھتا ہے اور اسے آخری امیدگاہ سمجھ کر اپنی حاجتیں اس سے وابستہ کرتا ہے۔ حضرت فرماتے ہیں۔

ھو الذی یتالہ الیہ کل مخلوق عند الحوائج والشدائد اذا انقطع الرجاء من کل من دونہ وتقطع الاسباب من جمیع من سواہ (صافی)

جب سب سے امیدیں منقطع ہو جاتی ہیں اور کوئی وسیلہ وذریعہ باقی نہیں رہتا تو اللہ وہ ہے جس کی طرف ہر مخلوق حاجت روائی ومشکل کشائی میں رجوع کرتی ہے۔

رب العالمین "وہ تمام جہانوں کا پالنے والا ہے" رب صفت مشبہ بمعنی اسم فاعل ہے جس کے معنی پرورش کرنے والے کے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ وہی تمام خلق کائنات کا پالنے والا اور ہر ایک کے حسب حال و حسب ضرورت زندگی و بقا کا سامان مہیا کرنے والا ہے۔ حضرت نے لفظ رب کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

مالکھم وخالقھم وسائق ارزاقھم الیھم من حیث یعلمون ولا یعلمون (برہان)

وہ تمام خلائق کا مالک خالق اور جانی اور انجانی جگہوں سے رزق پہنچانے والا ہے۔

عربی زبان میں مالک کے لئے رب کی لفظ عام طور پر استعمال ہوتی ہے اللہ کے لئے اس کا استعمال اضافت کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور بغیر اضافت کے بھی اور اللہ کے علاوہ دوسروں کے لئے اس کا استعمال اضافت کے ساتھ ہوگا۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے

قال ارجع الی ربک

(یوسف نے) کہا اپنے مالک کے پاس پلٹ جاؤ۔

پیغمبر اکرم نے ایک شخص سے کہا۔

ارب غنم انت ام رب ابل

کیا تم بکریوں کے مالک ہو یا اونٹوں کے

ایک عرب شاعر نے کہا ہے۔

فاذا انتشیت فاننی رب الخورنق والسدیر

جب میں نشہ کی حالت میں ہوتا ہوں تو میں اپنے کو شاہان حیرہ کے خورنق وسدیر کا مالک سمجھتا ہوں۔

واذا صحوت فاننی رب الشویھۃ والبعیر

اور جب میں ہوش میں آتا ہوں تو بکریوں اور اونٹوں کا مالک رہ جاتا ہوں۔

مالک کو رب اس لئے کہا جاتا ہے کہ مالک ہی اپنی زیر ملکیت اشیاء کی دیکھ بھال کرتا اور ان کی زندگی و بقا کا نگران ہوتا ہے۔ دوسری لفظ خالق ہے۔ بظاہر خلق اور ربوبیت دو الگ الگ صفتیں ہیں اور خلق سے ربوبیت کا مفہوم نہیں نکلتا مگر حقیقت یہ ہے کہ جہاں تخلیق کسی مقصد کے پیش نظر ہوگی وہاں ربوبیت کی کارفرمائی بھی لازمی ہوگی چنانچہ یہ صفت ربوبیت ہی کا تقاضا تھا کہ اس نے کائنات کو پیدا کیا تاکہ اس کی ربوبیت کا فیضان جاری و ساری ہو اور ہر اعلیٰ و ادنیٰ اس سے بہرہ یاب ہو لہٰذا اللہ کی صفت تخلیق سے ربوبیت کو اور ربوبیت سے تخلیق کو الگ نہیں کیا جاسکتا۔ تیسری لفظ رازق ہے رزق سے مراد ہر وہ چیز ہے جس سے زندگی و وجود کی بقا اور نشو و نما کی تکمیل وابستہ ہے۔

ان چیزوں کے مہیا کرنے کا نام رازقیت ہے اور ان اشیاء کے تسلسل کا نام ربوبیت ہے لہٰذا جو رزق رسانی سے تربیت و پرورش کا سلسلہ جاری کئے ہوئے ہے وہ رازق بھی ہوگا۔

الرحمٰن الرحیم "جو رحمٰن اور رحیم" دونوں کا ماخذ رحم ہے جو اللہ کی صفت رحمت کا پتا دیتے ہیں۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ رحمٰن اس رحمت کو بتاتا ہے جو عام اور سب کو شامل ہے اور رحیم اس رحمت کی خبر دیتا ہے جو مومنین سے مخصوص ہے۔ امیر المومنین کا ارشاد ہے۔

الرحمٰن الذی یرحم ببسط الرزق علینا الرحیم بنا فی ادیاننا و دنیانا وآخرتنا (توحید صدوق)	رزق کے پھیلاؤ کی بنا پر وہ رحمٰن ہے اور دین و دنیا میں توفیق دینے اور آخرت کی کامیابی عطا کرنے کی بنا پر وہ رحیم ہے۔

خداوند عالم کی وہ رحمت جو دنیا میں جاری و ساری ہے عمومیت کی حامل ہے۔ چنانچہ اس نے دنیوی سامان معیشت کو طبیعی قوانین کے تابع رکھا ہے اور ان قوانین کے نتائج سب کے لئے یکساں قرار دئے ہیں خواہ کوئی کافر ہو یا مسلمان مطیع ہو یا نافرمان دنیوی نعمتوں سے استفادہ کا موقع جس طرح ایک مومن و مسلم کو حاصل ہے اسی طرح ایک کافر کو بھی میسر ہے دونوں کیلئے سروسامان زندگی موجود اور رزق و روزی کے اسباب فراہم ہیں اور اس کی عمومی رحمت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ بلا امتیاز کفر و اسلام سب کی پرورش کا سروسامان کرے اور اس کی خصوصی رحمت مومنین تک محدود ہے کہ دنیا میں انہیں ایمان و عمل صالح کی توفیق بخشی اور آخرت میں فوز و کامرانی ان کے پائے نام کی اگرچہ دنیا میں انہیں تکالیف و شدائد کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے مگر یہ رنج و زحمت اور دنیوی خوشحالی سے محرومی اللہ کی

غضبناکی کا نتیجہ نہیں ہے کہ انہیں اخروی رحمت سے محروم قرار دے لیا جائے اور کفار پر دنیوی نعمتوں کی فراوانی ان سے خوشنودی کا اظہار نہیں ہے کہ آخرت میں اس کے غضب سے بچ جائیں۔ خداوند عالم کی ذات غضب و رحمت دونوں کی مظہر ہے اسے ایک جگہ رحمت کے تقاضوں کو بروئے کار لانا دوسری جگہ غضب کے اظہار سے مانع نہیں ہوتا اور ایک جگہ غضب کی نمود دوسری جگہ رحمت کی کارفرمائی سے عناں گیر نہیں ہوتی۔ چنانچہ امیر المومنین فرماتے ہیں۔

لا یشغلہ غضب عن رحمۃ و لا تلھیہ رحمۃ من عقاب (نہج البلاغہ)

غضب کے تراسے اسے رحمت کے فیضان سے روکتے نہیں ہیں اور نہ رحمت کی فراوانی اسے سزا و عقاب سے غافل کرتی ہے۔

مالک یوم الدین "وہ روز جزاء کا مالک ہے" دین کے معنی جزاء و مکافات کے ہیں اور یوم الدین سے مراد یوم حشر ہے جس میں اچھے کاموں کی جزا اور بُرے کاموں کی سزا دی جائے گی۔ اس دن تمام اختیارات اللہ کو ہوں گے اور ہر چیز اسی کے قبضۂ قدرت میں ہوگی یوں تو دنیا و آخرت میں اللہ ہی مالک و مختار ہے مگر آیت میں یوم آخرت کی تخصیص اس بنا پر ہے کہ دنیا میں اللہ کے علاوہ انسان بھی مالک کہلاتے اور سمجھے جاتے ہیں اگرچہ ان کی ملکیت چند روزہ اور عارضی ہوتی ہے اور آخرت میں تو صرف اللہ ہی ہر لحاظ سے مالک ہوگا اور اس کے علاوہ نہ کوئی مالک ہوگا اور نہ کوئی صاحب اختیار و مقدرت چنانچہ امیر المومنین کا ارشاد ہے۔

انہ یملک نواصی الخلق یوم القیامۃ (بحار)

قیامت کے دن تمام مخلوقات اسی کے قبضہ قدرت میں جکڑی بندھی ہوگی۔

ایاک نعبد و ایاک نستعین "ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں" اس آیت میں عبادت و استعانت دونوں کا حصر اللہ کی ذات میں کیا گیا ہے یعنی صرف وہی عبادت کا سزاوار ہے اور بس اسی سے مدد مانگی جاسکتی ہے اگر اس کی مدد کا سلسلہ منقطع ہو جائے تو نہ عبادت ہوسکتی ہے اور نہ کوئی نیک کام انجام دیا جاسکتا ہے اگرچہ انسان اپنے ارادہ و اختیار سے عبادت کرتا ہے مگر اعضاء و جوارح اور قوت و طاقت اسی کی دی ہوئی ہے اور عمل خیر کی توفیق بھی اسی کی طرف سے ہوتی ہے لہذا عبادت کے ساتھ استعانت کے پیوند کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم اسی کی عبادت کرتے ہیں اور اس عبادت کے بجا لانے کی توفیق اور قوت و طاقت کی بحالی بھی اسی سے طلب کرتے ہیں کیونکہ اس کی توفیق و اعانت نہ ہو تو نہ شیطان کے وسوسوں اور نفس کی چیرہ دستیوں سے بچا جاسکتا ہے اور نہ عبادت و اعمال خیر کو اتمام تک پہنچایا جاسکتا ہے۔ اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھے کہ وہ مستقلاً اعمال و عبادات بجا لاتا ہے اور اس میں اللہ کی مدد و توفیق کا کوئی عمل دخل نہیں ہے وہ مفوضہ کے طریق کار کا پیرو ہوگا اور جو معبود حقیقی کی پرستش میں دوسروں کو بھی شریک کرے وہ شرک کا مرتکب قرار پائے گا چنانچہ امیر المومنین اس آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں فرماتے ہیں۔

انا نعبد اللہ و لا نشرک بہ شیئا

ہم اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور کسی چیز کو اس کا

وانا نستعین باللہ عزوجل علی الشیطان الرجیم | شریک نہیں ٹھہراتے اور شیطان مردود کے خلاف اس سے مدد چاہتے ہیں۔

اھدنا الصراط المستقیم "ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت فرما" ہدایت کے معنی رہبری ورہنمائی کے ہیں اور صراطِ مستقیم سے مراد دین اسلام ہے جو ٹیڑھی میڑھی راہوں میں سیدھی راہ ہے اور اسی راہ کی طرف ہدایت ورہنمائی کی ہر نماز میں دُعا مانگی جاتی ہے اس ہدایت طلبی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ دعا مانگنے والا صراطِ مستقیم پر نہیں ہے یا اسے صراط مستقیم پر ہونے میں شبہ ہے بلکہ یہاں ہدایت کے معنی ثبات واستقامت کے ہیں۔ اگر ایک شخص دوسرے آدمی سے جو بیٹھا ہوا ہو یہ کہے کہ میرے واپس آنے تک بیٹھے رہو تو اس کے یہ معنی نہیں لئے جائیں گے کہ وہ بیٹھا ہوا نہیں ہے بلکہ مقصد یہ ہوگا کہ جس طرح بیٹھا ہے اسی طرح بیٹھا رہے اسی طرح اللہ سے طلب ہدایت کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح تونے پہلے ہماری رہنمائی کی ہے اسی طرح ہر لمحہ وہر آن ہماری ہدایت کا سلسلہ جاری رکھ اور ہمیں راہِ حق پر ثبات کی توفیق دے چنانچہ امیر المومنین نے اس آیت کی تفسیر ان الفاظ میں کی ہے۔

ادم لنا توفیقک الذی اطعناک بہ فی ماضی ایامنا حتی نطیعک فی مستقبل اعمارنا (صافی) | اپنی اس توفیق کا سلسلہ ہمیشہ جاری رکھ جس کے ذریعہ ہم نے اپنے گزشتہ دنوں میں تیری اطاعت کی یہاں تک کہ ہم اپنی زندگی کے آنے والے دنوں میں تیری اطاعت کرتے رہیں۔

اس معنی کی شاہد یہ آیت قرآنی ہے۔

وان ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیلہ | اور یہی میرا سیدھا راستہ ہے تم اسی پر چلتے رہو اور دوسری راہوں پر نہ چلنے لگو کہ وہ تمہیں خدا کی راہ سے ہٹا کر پراگندہ ومنتشر کر دیں۔

اللہ نے پہلے صراط مستقیم کے متعلق یہ بتایا کہ وہ سیدھا راستہ ہے جس میں کوئی کجی الجھاؤ اور پیچیدگی نہیں ہے اور پھر اس کی پیروی کا حکم دیا اور پیروی کے معنی یہی ہیں کہ اس پر ثبات قدم کے ساتھ جما جائے تاکہ ٹیڑھی ترچھی راہوں میں بھٹکنے سے محفوظ رہیں۔

صراط الذین انعمت علیھم "ان لوگوں کا راستا جن پر تونے انعام کیا ہے" آیت کے اس جزو میں صراطِ مستقیم کی نشاندہی کی گئی ہے کہ وہ ان لوگوں کا راستا ہے جن پر اللہ کے انعامات ہوئے یہ انعامات مال وزر جاہ وحشم اور شاہی وفرمانروائی کی صورت میں نہ تھے کہ دولت مندوں اور شہنشاہوں کے طریق کار کی روشنی میں صراط مستقیم کا سراغ لگایا جائے بلکہ یہ نبیوں راستبازوں شہیدوں اور نیک بندوں کی شاہراہ ہے۔ چنانچہ امیر المومنین فرماتے ہیں۔

ھم الذین قال اللہ تعالیٰ من | وہ وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے

يطع الله والرسول فاولئك مع الذين انعم الله عليهم من النبيين والصديقين والشهداء والصالحين وحسن اولئك رفيقا

فرمایا ہے کہ جنہوں نے اللہ اور رسول کی اطاعت کی وہ تو ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا ہے یہ انعام یافتہ گروہ نبیوں صدیقوں شہیدوں اور نیکو کاروں کا ہے اور یہ لوگ کیا ہی اچھے ساتھی ہیں۔

غیر المغضوب علیھم ولا الضالین" نہ ان کا راستا جن پر غضب ہوا اور نہ ان کا جو گمراہ ہوئے" یہ صراط مستقیم کی دوسری پہچان ہے یعنی سیدھی راہ وہ ہوگی جو موردِ غضب قرار پانے والوں اور گمراہ ہونے والوں کی راہ نہ ہو مغضوبین سے مراد وہ گروہ ہے جو حق کو جاننے پہچاننے کے باوجود حق کو ماننے سے انکار کرے اور ضالین کا گروہ وہ ہے جو حق کو پہچاننے کی کوشش ہی نہ کرے اور تحقیق حق کے بجائے جس عقیدہ پر ہے اسی عقیدہ پر جما رہے پہلا گروہ یہود کا ہے جن کا رویہ اسلام کے خلاف ہمیشہ معاندانہ رہا اور حق کو سمجھنے کے باوجود عمداً حق سے انحراف کرتے رہے اور اسی انکار و عناد کے نتیجہ میں غضب الٰہی کے مستحق قرار پائے اور دوسرا گروہ نصاریٰ کا ہے جن کا طرز عمل اگرچہ معاندانہ نہ تھا مگر وہ عصبیت کا شکار ہو گئے اور راہِ حق سے بھٹک کر گمراہی میں پڑے رہے۔ یہ دونوں گروہ مغضوبین وضالین کا واضح مصداق ہیں چنانچہ قیصرِ روم نے امیرالمومنین سے دریافت کیا کہ سورہ فاتحہ میں جنہیں مغضوبین اور ضالین کہا گیا ہے وہ کون لوگ ہیں حضرت نے جواب دیا کہ مغضوبین سے مراد یہود ہیں جیسا کہ اللہ نے ان کے بارے میں فرمایا ہے۔

وباء و بغضب من الله — اور وہ اللہ کے غضب میں گرفتار ہو گئے۔

اور ضالین سے مراد نصاریٰ ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔

وضلوا عن سواء السبيل — وہ سیدھی راہ سے بھٹک گئے۔

حضرت نے مغضوبین وضالین کے تحت یہود و نصاریٰ کا ذکر ان کے مغضوبیت و گمراہی میں نمایاں ہونے کی وجہ سے کیا ہے یہ مقصد نہیں کہ مغضوبین سے مراد صرف یہود اور ضالین سے مراد صرف نصاریٰ ہیں بلکہ جو بھی حق کو سمجھنے کے باوجود حق سے منہ موڑ لے وہ مغضوب ہوگا اور جو بھی حق کو تلاش کرنے کے بجائے باطل عقیدہ پر جما رہے وہ گمراہ ہوگا چنانچہ حضرت کا ارشاد ہے۔

كل من كفر بالله فهو مغضوب عليهم وضال عن سبيل الله (صافی)

جو بھی اللہ کے ساتھ کفر اختیار کرے وہ غضب الٰہی کا مستحق اور اللہ کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے۔

اس سورہ کے معانی جو حضرت کے ارشادات کی روشنی میں درج کئے گئے ہیں وہ سرچشمہ و ماخذ ہیں ان تمام بنیادی مطالب اور تفصیلات کا جو کتب تفاسیر میں تحریر ہیں۔

تنویع قرآن

امیر المومنین علیہ السلام جو پیغمبر اکرم کے بعد قرآن مجید کے علوم و معارف اور آیات کے معانی و مطالب پر سب سے زیادہ گہری نظر رکھتے تھے انہوں نے جہاں ترتیب نزول کے مطابق قرآن کی جمع آوری فرمائی وہاں معانی و مطالب کے لحاظ سے آیات کی تبویب و تدوین بھی فرمائی اور ناسخ و منسوخ عام و خاص مطلق و مقید رخص و عزائم محکم و متشابہ عبر و امثال مجمل و مبین وغیرہ کے تحت مندرجات قرآن کے الگ ابواب ترتیب دیئے اور قرآنی علوم شرح و بسط سے بیان کئے چنانچہ قرآن مجید کے بنیادی اقسام کے سلسلہ میں فرمایا ۔

ان اللہ تبارك و تعالیٰ انزل القرآن علیٰ سبعۃ اقسام کل قسم منہا کاف شاف وھی امر وزجر و ترغیب و ترھیب وجدل ومثل وقصص (صافی)

خداوند تبارک و تعالیٰ نے قرآن مجید کو سات قسموں پر نازل کیا ہے اور ہر قسم اپنے مقام پر کافی و شافی ہے اور وہ سات قسمیں یہ ہیں امر، نہی ترغیب، تخویف، مجادلہ، امثال اور قصص

اس اجمالی تقسیم کے بعد آیات کی ساٹھ قسمیں بیان فرمائی ہیں چنانچہ محمد بن ابراہیم ابن جعفر کی تفسیر جو حضرت کے ارشادات پر مشتمل ہے اور بحار الانوار کی انیسویں جلد میں چھبیس صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے ان ساٹھ اقسام کا تفصیلی بیان موجود ہے مثلاً قرآنی آیات میں کہاں لفظ عام اور معنی خاص ہیں اور کہاں لفظ خاص اور معنی عام ہیں کہاں پر لفظ واحد اور معنی جمع کے ہیں اور کہاں پر لفظ جمع ہے اور معنی واحد کے ہیں کہاں پر لفظ ماضی ہے اور معنی مستقبل کے ہیں کہاں پر الفاظ مختلف اور معانی متفق ہیں اور کہاں پر الفاظ متفق اور معانی مختلف ہیں اس طرح کہ ایک آیت میں ایک لفظ کے معنی کچھ اور ہیں ..... اور دوسری آیت میں کچھ اور مثلاً لفظ خلق مختلف جگہوں پر چار معنوں میں لفظ فتنہ پانچ معنوں میں لفظ نور چھ معنوں میں لفظ وحی سات معنوں میں اور لفظ قضا دس معنوں میں وارد ہوا ہے یونہی لفظ امت ضلال ظلم شرک وغیرہ کے مختلف معانی ان کے مواقع استعمال کے لحاظ سے بیان فرمائے ہیں اور ہر معنی کے سلسلہ میں ایک یا چند آیتیں بطور استشہاد پیش کی ہیں اسی طرح مختلف فرقوں بت پرست مجوس نصاریٰ یہود ملاحدہ جبریہ دہریہ وغیرہ کے عقائد باطلہ کی رد میں جو آیتیں وارد ہوئی ہیں انہیں الگ الگ عنوان کے تحت بیان کیا ہے بلاشبہ قرآنی آیات کی تنویع اور معانی و مطالب کے اعتبار سے ان کی تقسیم کی بنیاد آپ کے ہاتھوں پڑی اور جن لوگوں نے معانی قرآن علوم قرآن اور احکام قرآن کے سلسلہ میں کام کیا ہے ان سب پر آپ کو تقدم حاصل ہے ۔

علم التجوید

اصطلاح قراء میں تجوید کے معنی یہ ہیں کہ الفاظ قرآن کو اس طرح پڑھا جائے کہ حروف اپنی صوتی کیفیت کے ساتھ اپنے مخارج سے ادا ہوں اور جس مقام پر وقف ہونا چاہیئے وہاں وقف کیا جائے اور جہاں وقف نہ ہونا

چاہیئے وہاں وقف نہ کیا جائے۔ یہ علم اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ دنیا کے ہر مسلمان کے لئے وہ عرب کا باشندہ ہو یا عجم کا نماز میں قرآن کی تلاوت صحیح تلفظ کے ساتھ ضروری ہے اگر ادائے حروف میں صوتی کیفیت اور مخارج کا لحاظ نہ کیا جائے تو بعض حروف دوسرے حروف سے مشتبہ ہو جائیں گے جیسے ط اور ت، ھ اور ح، ض اور ذ وغیرہ جس سے یا تو معنی میں تغیّر پیدا ہو جائے گا یا لفظ ہی بے معنی ہو جائے گا اس لئے نماز کی صحت اور قرآن کی لفظی و معنوی تحفّظ کے لئے حروف کی صحیح ادائیگی اور وقف شناسی ضروری ہے۔

وقف یہ ہے کہ کسی کلمہ کے آخری حرف پر سانس روک کر ٹھہرا جائے یا متحرک کو ساکن کر دیا جائے یا گول ۃ کو ہ سے یا تنوین مفتوح کو الف سے بدل دیا جائے۔ ایسے کلمہ پر وقف کرنا جسے اپنے مابعد سے نہ لفظی تعلق ہو اور نہ معنوی وقف تام کہلاتا ہے جیسے اولئک ھم المفلحون اگر مابعد سے معنوی تعلق ہو اور لفظی تعلق نہ ہو تو یہ وقف کافی ہے جیسے لاریب فیہ اگر مابعد سے صرف لفظی تعلق ہو تو وقف حسن ہے جیسے الحمد للہ اور اگر مابعد سے لفظی و معنوی دونوں طرح کا تعلق ہو تو یہ وقف قبیح ہے جیسے الحمد پر وقف کیا جائے۔ تلاوت میں یہ امر ملحوظ ہونا چاہیئے کہ کہاں پر وقف لازم ہے کہاں پر اولی کہاں پر جائز اور کہاں پر قبیح تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ یہاں پر آیت تمام ہے یا ناتمام ہے۔

امیرالمومنین حفظ قرآن کے ساتھ ادائے حروف وصحت تلفّظ پر پورا اقتدار رکھتے اور اوقاف کی پابندی کرتے تھے اور ترتیل قرآن کے معنی بھی یہی ہیں کہ تلاوت میں ان امور کا لحاظ رکھا جائے چنانچہ آپ سے رتل القرآن ترتیلا (قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھو) کے معنی دریافت کئے گئے تو آپ نے فرمایا۔

ھو حفظ الوقوف وبیان الحروف (صافی)	ترتیل کے معنی اوقاف کی پابندی اور حروف کی صحیح ادائیگی کے ہیں۔

حفظ وقوف سے مراد وقف تام و وقف حسن کی پابندی ہے اور بیان حروف سے مراد یہ ہے کہ جن حروف کے تلفظ میں بھرپور آواز نکالنے کی ضرورت ہے انہیں بھرپور آواز سے نکالا جائے اور جن میں ہلکی اور باریک آواز نکالنے کی ضرورت ہے ان میں باریک آواز نکالی جائے اور جہاں زبان کو اوپر اٹھانے کی ضرورت ہے وہاں وہاں اوپر اٹھائی جائے اور جہاں نیچے لانے کی ضرورت ہے وہاں نیچے لایا جائے اور تمام حروف کو ان کے مخارج سے اس طرح ادا کیا جائے کہ ان کے صفات و کیفیات پورے طور پر نمایاں ہو جائیں اور ایک حرف دوسرے حرف سے مشتبہ نہ ہونے پائے۔

آداب تلاوت

قرآن مجید حکم و معارف اور عبر و مواعظ کا معدن اور اخلاق و آداب اور شرعی احکام کا ماخذ ہے اس لئے اس کے تعلیمات کو تازہ رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی تلاوت و تکرار کا سلسلہ جاری رہے چنانچہ ارشادِ باری ہے۔

فاقرءوا ما تیسر من القرآن — جتنا قرآن بآسانی پڑھ سکو پڑھ لیا کرو۔

قرآنِ مجید کی تلاوت عبادات میں شامل ہے اور دوسرے عبادات کی طرح اس کی تلاوت کے بھی کچھ آداب ہیں جنہیں ملحوظ رکھنا ضروری ہے تاکہ قرآن کی تلاوت اور دوسری کتابوں کے پڑھنے میں فرق و امتیاز رہے یہ آداب کچھ قاریٔ قرآن سے متعلق ہیں کچھ عمومی تلاوت سے کچھ مخصوص سورتوں اور آیتوں کی تلاوت سے اور کچھ ختم قرآن سے ذیل میں حضرت کے چند ارشادات آداب تلاوت کے سلسلہ میں درج کئے جاتے ہیں۔

قاریٔ قرآن کو چاہیئے کہ وہ وضو و طہارت کے ساتھ تلاوت کرے کیونکہ قرآن مجید کے حروف کو بغیر وضو کے چھونا جائز نہیں ہے اور اس کی حرمت و تقدیس کا تقاضا بھی یہی ہے چنانچہ حضرت کا ارشاد ہے۔

لا یقرء العاقل القرآن اذا کان علی غیر طهر حتی یتطهر له (تحف العقول) — جب تک کوئی عاقل و ذی شعور طہارت و پاکیزگی کی حالت میں نہ ہو قرآن کی تلاوت نہ کرے۔

حروف و الفاظ قرآن صاف ادا کرے اس طرح کہ مد قصر غنہ وغیرہ نمایاں ہوں اور اتنا تیز نہ پڑھے کہ الفاظ خلط ملط ہو جائیں اور نہ اتنا رک رک کر کہ مرتبط الفاظ کی کڑیاں الگ ہو جائیں۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

بینه تبیینا ولا تهذه هذ الشعر ولا تنثره نثر الرمل ولکن فزعوا قلوبکم القاسیة ولا یکن هم احدکم آخر السورة (مقدمہ صافی) — قرآن کے الفاظ کو واضح طور پر ظاہر کرو اور شعروں کی طرح جلد جلد نہ پڑھو اور نہ اس کے الفاظ کو ریت کے ذرّوں کی طرح بکھیرو بلکہ اپنے سخت دلوں میں خوف کا جذبہ پیدا کرو اور یہ طے نہ کر لو کہ بہر حال سورہ کو ختم کرنا ہے۔

قرآن کی تلاوت کے ساتھ اس کے معانی پر نظر رکھے اور اس کے مطالب و مقاصد میں غور و خوض کرے چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالها — کیا یہ لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہیں۔

جب مسبحات اخیرہ سورۂ حدید حشر صف جمعہ تغابن اور اعلی پڑھے تو سبحان اللہ الاعلی کہے اور جب سورۂ والتین پڑھے تو آخر میں ونحن علی ذلك من الشاهدین کہے اور جب قولوا آمنا باللہ پڑھے تو آمنا باللہ کہے اور جب آیۂ ان اللہ وملئکته یصلون علی النبی پڑھے تو جس حالت میں ہو درود پڑھے اور جب قرآن ختم کرے تو دعائے ختم قرآن پڑھے۔ امیرالمومنین ختم قرآن کے بعد یہ دعا پڑھتے تھے۔

اللهم اشرح بالقرآن صدری واستعمل بالقرآن بدنی ونور بالقرآن بصری واطلق بالقرآن لسانی — بار الہا قرآن کے ذریعہ میرا سینہ کشادہ کر قرآن کے ذریعہ میرے بدن کو مصروف عمل رکھ قرآن کے ذریعہ میری آنکھوں کو روشن کر اور قرآن

واغنی علیہ ما ابقیتنی فانہ لاحول ولا قوۃ الا بک (بحار الانوار)

میرا ورد زبان قرار دے اور جب تک تو مجھے زندہ رکھے اس سلسلہ میں میری مدد فرما کیونکہ قوت و توانائی کا سہارا ہے تو تو ہے۔

قرآنی استخراج و استنباط

امیر المومنین قرآن مجید سے اخذ و استنباط احکام میں حیرت انگیز دستگاہ رکھتے تھے اور جب کسی پیچیدہ مسئلہ میں ذہنی قوتیں سپر انداختہ اور فہم و فراست کی طاقتیں مضمحل ہو جاتی تھیں تو آپ کا ذہن فوراً قرآن کی طرف پلٹتا اور مشکل سے مشکل مسئلہ کو قرآن کی روشنی میں حل کر دیتے اس طرح کہ نہ کسی کو لب کشائی کی جرأت ہوتی اور نہ قوت استدلال کے سامنے سوال و جواب کی نوبت آتی گویا قرآن مجید کا ایک ایک مخفی گوشہ اپنے تمام حقائق و معارف کے ساتھ آپ کی نظروں کے سامنے اس طرح روشن تھا جس طرح چشم بینا کے سامنے آفتاب کا طلوع اور سپیدۂ سحر کی نمود۔ اس سلسلہ کے چند واقعات درج کئے جاتے ہیں جن سے آپ کے ذہنی استحضار اور قرآن پر ہمہ جہتی عبور کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ایک شخص نے آپ سے کہا کہ یا امیر المومنین جن لوگوں سے ہم برسر پیکار ہیں انہیں کس نام سے یاد کریں جبکہ ہم اور وہ ایک ہی نبی کی امت ہیں ہمارا روزہ و نماز ایک اور حج ایک ہے فرمایا اسی نام سے یاد کرو جس نام سے اللہ نے انہیں اپنی کتاب میں یاد کیا ہے کہا کہ مجھے تو کتاب اللہ کی ہر بات کا علم نہیں ہے فرمایا کیا تم نے یہ ارشادِ خداوندی نہیں سنا۔

ولوشاء اللہ ما اقتتل الذین من بعد ما جائتھم البینات ولکن اختلفوا فمنھم من آمنا ومنھم من کفر

اگر خدا چاہتا تو وہ لوگ آپس میں نہ لڑتے بعد اس کے کہ ان کے پاس روشن معجزے آچکے تھے مگر انہوں نے آپس میں اختلاف کیا ان میں سے بعض ایمان لائے اور بعض کافر ہوئے۔

ابن کواء نے حضرت سے پوچھا کہ کیا حضرت موسیٰ سے پہلے بھی اللہ کسی سے ہمکلام ہوا ہے فرمایا کہ ہاں اللہ نے ہر نیک و بد سے کلام کیا ہے اور سب نے جواب بھی دیا ہے کہا کہ وہ کیسے فرمایا کیا تم نے قرآن مجید میں یہ آیت نہیں پڑھی۔

واذا اخذ ربک من بنی آدم من ظھورھم ذریتھم واشھدھم علی انفسھم الست بربکم قالوا بلی شھدنا

اے رسول لوگوں کو وہ وقت یاد دلاؤ جب تمہارے پروردگار نے بنی آدم سے یعنی ان کی پشتوں سے پیدا ہونے والی نسلوں سے عہد لیا اور انہیں خود ان کے نفسوں پر گواہ بنایا کہ کیا میں تمہارا پروردگار

نہیں ہوں سب نے کہا ہاں، ہم اس کے گواہ ہیں۔

حضرت نے ایک مرتبہ فرمایا کہ نماز سے فارغ ہو کر آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر دُعا مانگو اس پر ایک شخص نے کہا کہ کیا اللہ ہر جگہ موجود نہیں ہے فرمایا ہاں وہ ہر جگہ ہے کہا کہ پھر کیا ضرورت ہے کہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی جائے فرمایا کیا تم نے اس آیت کی تلاوت نہیں کی۔

وفی السماء رزقکم — آسمان میں تمہارا رزق ہے اور وہ چیزیں جن کا
وما توعدون — تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔

جب رزق اور ان چیزوں کا جن کا اللہ نے وعدہ کیا ہے محل آسمان ہے تو رزق اور وعدہ کی ہوی چیزیں بھی وہیں سے طلب کی جائیں گی۔ قیصر روم نے معاویہ سے دریافت کیا کہ لاشئے کیا ہے انہیں کوئی جواب نہ سوجھا تو عمرو ابن عاص نے کہا کہ یہ علی ہی بتاسکیں گے تم کسی شخص کو ایک گھوڑا دے کر ان کے پاس بھیجو اور وہ ان سے یہ کہے کہ یہ گھوڑا فروخت کے لئے ہے اور جب وہ قیمت دریافت کریں تو وہ لاشئے بتائے اور وہ جو جواب دیں گے اس سے مسئلہ حل ہو جائے گا چنانچہ ان کا ایک آدمی گھوڑا لے کر حضرت کے پاس آیا اور بیچنے کا ارادہ ظاہر کیا آپ نے قیمت پوچھی تو اس نے کہا لاشئے حضرت نے قنبر سے کہا کہ گھوڑا لے لو اور اسے صحرا میں لے جا کر سراب (وہ چمکتی ہوی ریت جس پر پانی کا دھوکا ہوتا ہے) دکھا دو کہ وہ لاشئے ہے اور یہ آیت پڑھی۔

یحسبہ الظمان ماء حتی اذا — پیاسا اسے پانی خیال کرتا ہے یہاں تک کہ جب
جاءہ لم یجدہ شیئا — اس کے پاس آیا تو اسے کچھ بھی نہ پایا۔

حضرت سے ایک شخص نے دردِ شکم کی شکایت کی فرمایا کہ تم اپنی بیوی سے کچھ رقم لو اور اس سے شہد خریدو اور اس میں بارش کا پانی ملا کر پیو پھر فرمایا کہ قرآن مجید میں بارش کے پانی کے بارے میں ارشاد ہے۔

وانزلنا من السماء ماء مبارکا — ہم نے آسمان سے بابرکت پانی اُتارا ہے۔

اور شہد کے بارے میں ارشاد ہے۔

یخرج من بطونها شراب مختلف — مکھیوں کے پیٹ سے پینے کی چیز نکلتی ہے جو
الوانه فیه شفاء للناس — مختلف رنگوں کی ہوتی ہے اس میں لوگوں کے لئے شفا ہے۔

اور بیوی سے اس کی رضامندی سے لی ہوئی رقم کے بارے میں ارشاد ہے۔

وان طبن لکم عن شئ — اگر تمہاری عورتیں دلی رضامندی سے تمہیں اپنے
منه نفسا فکلوا هنیئا مریئا — مال میں سے کچھ دیں تو اسے پاکیزہ و گوارا سمجھ کر کھاؤ برتو۔

لہذا جب کسی گوارا چیز کے ساتھ برکت اور شفا شریک ہوگی تو تم انشاء اللہ شفایاب ہو جاؤ گے۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ عذاب خدا سے دو چیزیں باعث امان تھیں۔ ایک ان میں سے اٹھ گئی مگر دوسری تمہارے پاس موجود ہے لہذا اسے مضبوطی سے تھامے رہو وہ امان جو اٹھالی گئی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔

وما کان اللہ لیعذبھم و انت فیھم — اللہ ان لوگوں پر عذاب نہیں کرے گا جب تک تم ان میں موجود ہو۔

اور وہ امان جو باقی ہے وہ توبہ و استغفار ہے جیسا کہ اللہ نے فرمایا ہے۔

وما کان اللہ معذبھم وھم یستغفرون — اللہ ان لوگوں پر عذاب نہیں کرے گا جبکہ یہ لوگ توبہ و استغفار کر رہے ہوں گے۔

علامہ سید رضی نے کہا ہے کہ یہ بہترین استخراج ہے۔

راس الجالوت نے حضرت سے دریافت کیا کہ تمام اشیاء کی اصل کیا ہے فرمایا پانی اور اس آیت کی تلاوت کی۔

وجعلنا من الماء کل شئی حی — ہم نے ہر ذی حیات کو پانی سے پیدا کیا ہے۔

خواص سور و آیات

قرآن مجید اپنے اسلوب بیان اور حقائق آفرین مطالب کے اعتبار ہی سے معجزہ نہیں ہے بلکہ اپنے گوناگوں خواص و اثرات کے لحاظ سے بھی اعجازی شان کا حامل ہے اور موثر حقیقی نے جس طرح ہر چیز کا کوئی نہ کوئی خاصہ قرار دیا ہے اسی طرح قرآن کے الفاظ و حروف میں خواص و اثرات ودیعت کئے ہیں چنانچہ اس کے سور و آیات ہر مصیبت کی سپر ہر دکھ کا مداوا اور ہر درد کی دوا ہیں۔ امیر المومنین کا ارشاد ہے۔

خیر الدواء القرآن (اتقان ص ۵۱۸) — بہترین دوا قرآن ہے۔

امیر المومنین نے جہاں قرآن کے معانی و مطالب اور تفسیری نکات پر روشنی ڈالی ہے وہاں سور و آیات کے خواص و اثرات بھی بیان فرمائے ہیں۔ ان میں سے چند خواص تحریر کئے جاتے ہیں۔

اگر کوئی شخص رات کو سوتے وقت سورۂ اخلاص پڑھے تو اللہ اپنے فرشتوں کے ذریعہ اس کی حفاظت و نگہداشت کرے گا اگر کوئی فقیر و نادار ہو تو جب اپنے گھر میں قدم رکھے تو گھر والوں پر سلام کرے اور اگر گھر میں کوئی نہ ہو تو السلام علینا من ربنا کہے اور سورۂ قل ھو اللہ احد کی تلاوت کرے انشاء اللہ فقر و تنگدستی سے نجات پائے گا۔ اگر کوئی شخص ہر جمعہ کو سورۂ نساء کی تلاوت کرے تو فشار قبر سے محفوظ رہے گا۔ اگر کوئی سفر پر جائے تو سوار ہوتے وقت سورۂ زخرف کی یہ آیت پڑھے انشاء اللہ سفر پر امن رہے گا۔

سبحان الذی سخر لنا ھذا — پاک ہے وہ خدا جس نے اسے ہمارے تابع فرمان

وماکنا لہ مقرنین وانا الی ربنا لمنقلبون
کیا حالانکہ ہم ایسے نہ تھے کہ اس پر قابو پاتے اور ہمیں یقیناً اپنے پروردگار کی طرف پلٹنا ہے۔

اگر کسی شخص کو کوئی حاجت درپیش ہو تو وہ پنجشنبہ کے دن صبح کے وقت گھر سے نکلے اور سورۂ عمران کے آخری رکوع کی اس آیت ان فی خلق السموٰت والارض واختلاف اللیل والنھار کی تلاوت انک لاتخلف المیعاد تک کرے اور اس کے بعد آیۃ الکرسی سورۂ قدر اور سورۂ فاتحہ پڑھے انشاء اللہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گا۔

اگر کسی کی آنکھ دکھنے میں آئے تو آیۃ الکرسی کی تلاوت کرے۔

اگر کوئی شخص سورۂ اعراف کی آیت انّ ولی اللہ الذی نزل الکتاب وھو یتولی الصالحین کی تلاوت کرے تو وہ ڈوبنے اور جلنے سے محفوظ رہے گا۔

اگر کوئی شخص سورۂ ہود کی یہ آیت پڑھے تو ڈوبنے سے محفوظ رہے گا۔

بسم اللہ مجریھا ومرسٰھا ان ربی لغفور رحیم
اللہ ہی کے نام سے اس کا بہنا اور ٹھہرنا ہے بیشک میرا پروردگار غفور ورحیم ہے۔

اگر کوئی شخص سورۂ والصّٰفّٰت کی یہ آیت پڑھے تو بچھو وغیرہ کے ڈسنے سے محفوظ رہے گا۔

سلام علی نوح فی العالمین کذلک نجزی المحسنین انہ من عبادنا المومنین
تمام جہانوں میں نوح پر سلام ہے ہم نیکی کرنے والوں کو جزائے خیر دیتے ہیں بیشک نوح ایماندار بندوں میں سے تھے۔

اگر کوئی شخص سوتے وقت سورۂ بنی اسرائیل کی آیت قل ادعوا اللہ اوادعوا الرحمٰن ایا ما تدعوا فلہ الاسماء الحسنی کی تلاوت کبرہ تکبیرا تک کرے تو چوری سے محفوظ رہے گا۔

جو شخص طلوع آفتاب سے پہلے گیارہ مرتبہ سورۂ اخلاص اور گیارہ مرتبہ سورۂ قدر پڑھے وہ اس دن گناہوں سے بچ کر رہے گا۔

اور اگر کوئی شخص سورۂ توبہ کی یہ آیت پڑھے تو درندوں کے حملہ سے محفوظ رہے گا۔

لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیہ عنتم حریص علیکم بالمومنین رؤف رحیم فان تولوا فقل حسبی اللہ لا الہ الا ھو علیہ توکلت وھو رب العرش العظیم
تم ہی میں سے ایک رسول تمہارے پاس آیا جسے تمہارا تکلیف اٹھانا شاق گزرتا ہے وہ تمہاری بھلائی کا انتہائی خواہشمند اور ایمانداروں پر بہت شفیق و مہرباں ہے اگر یہ لوگ تم سے منہ پھیر لیں تو ان سے کہہ دو کہ میرے لئے اللہ کافی ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں میں نے اسی پر

بھروسا کیا ہے اور وہی عرش عظیم کا مالک ہے۔

اگر کوئی شخص سورۂ یونس کی آیت ان ربکم الذی خلق السموات والارض کی تلاوت تبارک اللہ رب العالمین تک کرے تو وہ پرخطر صحراؤں میں آفات سے محفوظ رہے گا۔

اگر کوئی جانور منہ زوری دکھائے تو اس کے دائیں کان میں سورۂ آل عمران کی یہ آیت پڑھی جائے۔

ولہ اسلم من فی السموات والارض طوعا وکرھا والیہ یرجعون

جو مخلوق آسمانوں میں ہے اور جو لوگ زمین میں ہیں خوشی سے ہو یا ناخوشی سے سب اس کے آگے سرنگوں ہیں اور آخر سب اسی کی طرف پلٹیں گے۔

تدوین حدیث

قرآن مجید کی طرح احادیث بھی شرعی اوامر و نواہی کا سرچشمہ اور دینی احکام کا اہم ماخذ ہیں اگر حدیث کو قابل عمل اور درخور اعتناء نہ سمجھا جائے تو قرآن کی افادیت بھی مضمحل ہو جائے گی اس لئے کہ قرآن کے اکثر احکام مجمل اور شرح طلب ہیں جنہیں احادیث ہی کے ذریعہ سمجھا جا سکتا ہے اگر احادیث کو نظر انداز کر کے قرآن کے مفہوم کو اپنی رائے سے متعین کرنے کی اجازت ہوتی تو نماز روزہ حج وغیرہ احکام کی کوئی واضح صورت ہی باقی نہ رہتی اور نہ اسلامی اصطلاحات کا کوئی خاص مفہوم متعین ہوتا بلکہ ہر شخص ان اصطلاحات کی من مانی تشریح کر کے یہ سمجھ لیتا کہ وہ قرآن کے اوامر پر عمل پیرا ہے اور اس کے احکام سے عہدہ برآ ہو چکا ہے۔ بیشک قرآن ایک جامع دستاویز ہے مگر اس میں اکثر احکام اجمالاً بیان ہوئے ہیں اور ان کی تشریح و تفصیل پیغمبر اکرم سے متعلق کی گئی ہے چنانچہ ارشاد الٰہی ہے۔

وانزلنا الیك الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم

ہم نے تم پر قرآن اتارا تاکہ جو احکام لوگوں کے لئے نازل کئے گئے ہیں تم انہیں واضح طور سے بیان کرو۔

قرآن کے اسی اجمال و ابہام کی بنا پر جب امیرالمومنین نے ابن عباس کو خوارج سے گفتگو کے لیے بھیجا تو ان سے فرمایا

لا تخاصمھم بالقرآن فان القرآن حمال ذو وجوہ تقول ویقولون ولکن حاججھم بالسنۃ فانھم لن یجدوا عنھا محیصا

(نہج البلاغہ)

تم ان سے قرآن کی رو سے بحث نہ کرنا کیونکہ قرآن بہت سے معانی کا حامل ہوتا ہے اور بہت سی وجہیں رکھتا ہے تم اپنی کہتے رہو گے اور وہ اپنی کہتے رہیں گے بلکہ تم حدیث سے ان کے سامنے استدلال کرنا وہ اس کے بعد گریز کی کوئی راہ نہ پا سکیں گے۔

بہرحال احادیث کی اہمیت و افادیت ناقابل انکار ہے اور اس اہمیت کا تقاضا یہ تھا کہ قرآن کی ترتیب و تدوین کے ساتھ احادیث کی بھی جمع آوری کی جاتی اور یہ دورِ نبوی کے مسلمانوں ہی کا فریضہ تھا کہ وہ احادیثِ نبویہ کے حفظ کا سروسامان کرتے اور انہیں ضبطِ تحریر میں لاکر ہمیشہ کیلئے محفوظ کر دیتے مگر ادھر متوجہ ہونے کے بجائے ان کی توجہ ملکی فتوحات پر مرکوز ہو گئی اور کچھ لوگوں نے انفرادی طور پر احادیث کو قلمبند کیا ہو تو کیا ہو مگر اجتماعی طور پر کوئی کام نہ ہو سکا بلکہ یہ اختلاف اُٹھ کھڑا ہوا کہ آیا احادیث کو تحریری شکل میں لانا چاہیئے یا نہیں یہ اختلاف صحابہ میں بھی تھا اور تابعین میں بھی آخر تابعین کے آخری دور میں یہ اختلاف برطرف ہوا اور اس پر اتفاق رائے ہوا کہ احادیث کو عوام کے حافظہ پر چھوڑنے کے بجائے تحریر میں لانا مستحسن عمل ہے۔ ان لوگوں میں جو تحریر حدیث کی مخالفت میں پیش پیش تھے ایک حضرت عمر بھی تھے چنانچہ جب صحابہ نے انہیں احکام و سنن نبوی کی تدوین کا مشورہ دیا تو انہوں نے کہا۔

انی اردت ان اکتب السنن و انی ذکرت قوما کانوا قبلکم کتبوا کتبا فاکبوا علیھا و ترکوا کتاب اللہ وانی واللہ لا البس کتاب اللہ بشئ ابدا (تدریب الراوی ج ۲ ص۶۷)	میرا ارادہ تھا کہ میں سنن نبویہ کو تحریر میں لاؤں مگر مجھے پہلے لوگ یاد آگئے جنہوں نے کتابیں لکھیں اور ہمہ تن انہی کتابوں کے ہو کر رہ گئے اور اللہ کی کتاب کو چھوڑ دیا خدا کی قسم میں کوئی چیز تحریر میں لاکر کتاب اللہ کو مشتبہ نہیں ہونے دوں گا۔

بلکہ انہوں نے روایت حدیث پر بھی بڑی حد تک پابندی عائد کر دی تھی اور ابن مسعود، ابوالدرداء اور ابوذر غفاری کو اس جرم میں کہ وہ احادیث پیغمبر بیان کرتے ہیں قید کر دیا تھا اور ابو ہریرہ کو روایت حدیث پر شہر بدر کر دینے کی دھمکی دی تھی۔

حضرت ابوبکر نے کچھ حدیثیں جمع کی تھیں مگر انہیں ضائع کر دیا چنانچہ حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ میرے والد نے پانچ سو حدیثیں قلمبند کی تھیں ایک رات میں نے دیکھا کہ وہ بڑے بے چین ہیں میں نے کہا کہ آپ کو کوئی تکلیف ہے یا کوئی پریشان کن خبر سنی ہے انہوں نے اس وقت تو کچھ نہ کہا جب صبح ہوئی تو مجھے بلا کر کہا۔

ای بنیۃ ھلمی الاحادیث التی عندک فجئتہ بھا فدعا بنار فحرقھا فقلت لما احرقتھا قال خشیت ان اموت وھی عندی فیکون فیھا احادیث من رجل قد قد ائتمنتہ ووثقت ولم یکن کما حدثنی	اے بیٹی وہ حدیثیں لاؤ جو تمہارے پاس ہیں، میں وہ حدیثیں لے کر آئی تو انہوں نے آگ منگوائی اور انہیں جلا دیا۔ میں نے کہا کہ آپ نے انہیں کیوں جلایا ہے کہا کہ مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ میں مر جاؤں اور یہ حدیثیں جو میرے پاس رہیں اور ان میں ایسی حدیثیں بھی ہوں جو مجھ سے قابل اعتماد لوگوں نے بیان کی ہوں مگر وہ ویسی نہ ہوں جیسے انہوں

(تذکرۃ الحفاظ ذہبی ج ۱ ص ۵) نے روایت کی ہوں۔

حضرت ابوبکر نے اس مجموعہ میں وہی احادیث درج کی ہوں گی جنہیں پیغمبر اکرم سے بالمشافہ سنا ہو گا یا ان لوگوں سے سماعت کی ہو گی جنہوں نے پیغمبر اکرم سے سنا ہو گا اور وہ سب صحابہ ہی تھے جن کی عدالت و راست گوئی پر حرف رکھنا مسلک جمہور کے خلاف ہے پھر خدا جانے انہوں نے کیوں ان کی روایت کردہ احادیث کو قابل وثوق و اعتماد نہ سمجھا اور انہیں جلا کر نا پید کر دینا ضروری خیال کیا۔

حضرت ابوبکر کے نواسے عروہ ابن زبیر نے حدیثوں کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا مگر اسے بھی بے ضرورت سمجھ کر جلا دیا چنانچہ ابن حجر عسقلانی تحریر کرتے ہیں۔

قال معمر عن هشام ان اباه حرق كتبا فيها فقه (تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۱۸۳)

معمر کہتے ہیں کہ مجھ سے ہشام نے بیان کیا کہ ان کے باپ عروہ نے دینی علوم کی تمام کتابیں جلا دیں۔

عروہ خود کہتے ہیں۔

كنا نقول لا نتخذ كتابا مع كتاب الله فمحوت كتبى (تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۱۸۳)

ہم یہ کہا کرتے تھے کہ ہمیں کتاب اللہ کے ساتھ کوئی اور کتاب نہ رکھنا چاہیئے چنانچہ میں نے تمام نوشتوں کو مٹا دیا۔

جب روایت حدیث کی اجازت ہی نہ تھی اور جو چند ایک مجموعے تھے وہ بھی ضائع کئے جا رہے تھے تو پھر تدوین حدیث کی مزید گنجائش کیسے نکل سکتی تھی۔

امیرالمومنین جہاں تنزیل و تاویل قرآن پر عبور تام رکھتے تھے وہاں احادیث سے بھی پوری طرح باخبر تھے کیونکہ اقوال و ارشادات نبوی کے براہ راست سننے اور ان سے مستفید ہونے کے جتنے مواقع انہیں ملے وہ کسی اور کو میسر نہیں ہوئے چنانچہ آپ سے پوچھا گیا کہ کیا وجہ ہے کہ آپ سب سے زیادہ احادیث رسول بیان کرتے ہیں فرمایا

انى كنت اذا سئلته انبأنى واذا سكت ابتدأنى (طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۳۳۸)

میں آنحضرت سے کوئی چیز دریافت کرتا تو وہ مجھے بتاتے اور خاموش رہتا تو وہ خود مجھ سے بیان کرتے۔

حضرت اس خیال سے کہ احادیث و آثار نبوی مٹنے نہ پائیں اور یہ علم و ہدایت کا سرمایہ زندہ و پائندہ رہے لوگوں کو یہ تاکید کرتے تھے کہ

تذاكروا الحديث فانكم الا تفعلوا يندرس (مستدرک حاکم ج ۱ ص ۹۵)

ایک دوسرے سے احادیث بیان کرتے رہو اگر تم نے ایسا نہ کیا تو حدیث کے آثار مٹ جائیں گے۔

اس کے علاوہ انہیں ضبط تحریر میں لانا بھی ضروری سمجھتے تھے تاکہ ان کے حفظ و بقا کا ساماں ہو سکے چنانچہ قرآن مجید کی جمع آوری کے ساتھ حدیث کی ترتیب و تدوین کا بھی اہتمام کیا اگرچہ ابورافع ابوذر غفاری سلمان فارسی رضی اللہ عنہم اور چند دوسرے افراد نے کچھ حدیثیں قلمبند کیں مگر اس میں سبقت و تقدم کا شرف آپ ہی کو حاصل ہے آپ

(تذکرۃ الحفاظ ذہبی ج ۱ ص ۵) نے روایت کی ہوں۔

حضرت ابو بکر نے اس مجموعہ میں وہی احادیث درج کی ہوں گی جنہیں پیغمبر اکرم سے بالمشافہہ سنا ہو گا یا ان لوگوں سے سماعت کی ہوگی جنہوں نے پیغمبر اکرم سے سنا ہو گا اور وہ سب صحابہ ہی تھے جن کی عدالت و راست گوئی پر حرف رکھنا مسلک جمہور کے خلاف ہے پھر خدا جانے انہوں نے کیوں ان کی روایت کردہ احادیث کو قابل وثوق و اعتماد نہ سمجھا اور انہیں جلا کر نا پید کر دینا ضروری خیال کیا۔

حضرت ابو بکر کے نواسے عروہ ابن زبیر نے حدیثوں کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا مگر اسے بھی بے ضرورت سمجھ کر جلا دیا چنانچہ ابن حجر عسقلانی تحریر کرتے ہیں۔

قال معمر عن هشام ان اباه حرق كتبا فيها فقه (تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۱۸۳)

معمر کہتے ہیں کہ مجھ سے ہشام نے بیان کیا کہ ان کے باپ عروہ نے دینی علوم کی تمام کتابیں جلا دیں۔

عروہ خود کہتے ہیں۔

كنا نقول لا نتخذ كتابا مع كتاب الله فمحوت كتبي (تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۱۸۳)

ہم یہ کہا کرتے تھے کہ ہمیں کتاب اللہ کے ساتھ کوئی اور کتاب نہ رکھنا چاہیئے چنانچہ میں نے تمام نوشتوں کو مٹا دیا۔

جب روایت حدیث کی اجازت ہی نہ تھی اور جو چند ایک مجموعے تھے وہ بھی ضائع کئے جا رہے تھے تو پھر تدوین حدیث کی مزید گنجائش کیسے نکل سکتی تھی۔

امیر المومنین جہاں تنزیل و تاویل قرآن پر عبور تام رکھتے تھے وہاں احادیث سے بھی پوری طرح باخبر تھے کیونکہ اقوال و ارشادات نبوی کے براہ راست سننے اور ان سے مستفید ہونے کے جتنے مواقع انہیں ملے وہ کسی اور کو میسّر نہیں ہوئے چنانچہ آپ سے پوچھا گیا کہ کیا وجہ ہے کہ آپ سب سے زیادہ احادیث رسُول بیان کرتے ہیں فرمایا

انی كنت اذا سألته انبأني واذا سكت ابتدأني (طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۳۳۸)

میں آنحضرت سے کوئی چیز دریافت کرتا تو وہ مجھے بتاتے اور خاموش رہتا تو وہ خود مجھ سے بیان کرتے۔

حضرت اس خیال سے کہ احادیث و آثارِ نبوی مٹنے نہ پائیں اور یہ علم و ہدایت کا سرمایہ زندہ و پائندہ رہے لوگوں کو یہ تاکید کرتے تھے کہ

تذاكروا الحديث فانكم الا تفعلوا يندرس (مستدرک حاکم ج ۱ ص ۹۵)

ایک دوسرے سے احادیث بیان کرتے رہو اگر تم نے ایسا نہ کیا تو حدیث کے آثار مٹ جائیں گے۔

اس کے علاوہ انہیں ضبطِ تحریر میں لانا بھی ضروری سمجھتے تھے تاکہ ان کے حفظ و بقا کا ساماں ہو سکے چنانچہ قرآن مجید کی جمع آوری کے ساتھ حدیث کی ترتیب و تدوین کا بھی اہتمام کیا اگرچہ ابو رافع ابوذر غفاری سلمان فارسی رضی اللہ عنہم اور چند دوسرے افراد نے کچھ حدیثیں قلمبند کیں مگر اس میں سبقت و تقدم کا شرف آپ ہی کو حاصل ہے آپ

نے پیغمبر اکرم کی زندگی ہی میں حدیث کی تدوین شروع کر دی تھی اور احادیث نبویہ پر مشتمل ایک صحیفہ قلمبند کیا تھا اس صحیفہ کا تذکرہ صحیح بخاری و مسلم میں بھی ہے چنانچہ محمد ابن اسمٰعیل بخاری نے تحریر کیا ہے۔

عن ابی جحیفۃ قال قلت لعلی ھل	ابو جحیفہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علی سے کہا کہ
عندکم کتاب قال لا الا کتاب	کیا آپ لوگوں کے پاس کوئی کتاب ہے فرمایا اللہ
اللہ اوفھم اعطیہ رجل مسلم او ما	کی کتاب ہے یا وہ قوت فہم ہے جو ایک مرد مسلمان
فی ھذہ الصحیفۃ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۶۹)	کو عطا کی گئی ہے یا وہ جو اس صحیفہ میں تحریر ہے۔

یہ حدیثیں خود رسول اللہ لکھواتے تھے اور آپ قلمبند کرتے تھے چنانچہ شیخ صدوق نے تحریر کیا ہے کہ محمد ابن زکریا غلابی نے ایک طویل حدیث کے بارے میں شعیب ابن واقد مزنی سے دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ امام جعفر صادق نے اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد فرمایا تھا کہ

انہ جمع ھذا الحدیث من الکتاب	انہوں نے یہ حدیث اس کتاب سے لی ہے جو
الذی ھو املاء رسول اللہ وخط علی ابن	رسول اللہ نے لکھوائی اور علی ابن ابی طالب
ابی طالب (امالی صدوق ص ۲۶۰)	کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔

حضرت کا یہ تحریر کردہ صحیفہ دنیائے اسلام کا پہلا مجموعہ حدیث ہے چنانچہ آغائے بزرگ محسن طہرانی رحمۃ اللہ نے تحریر کیا ہے۔

ھذا اول کتاب کتب فی الاسلام من	یہ دنیائے اسلام میں کلام بشر کی پہلی کتاب ہے
کلام البشر واملاء النبی وخط الوصی	جسے نبی اکرم نے لکھوایا اور آپ کے وصی علی
(الذریعہ ج ۲ ص ۳۰۹)	ابن ابی طالب نے قلمبند کیا۔

امیر المومنین کی یہ کتاب ائمہ اہلبیت کے پاس موجود رہی ہے اور امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام نے مختلف مواقع پر مسائل شرعیہ کے سلسلہ میں اس کا حوالہ دیا ہے اور اسے کتاب علی صحیفۃ الفرائض اور جامعہ کے نام سے یاد کیا ہے چنانچہ امام جعفر صادق کا ارشاد ہے۔

ان عندنا لصحیفۃ یقال لھا الجامعۃ	ہمارے پاس ایک صحیفہ ہے جسے جامعہ کہا جاتا ہے
ما من حلال او حرام الا وھو فیھا (فصول ص ۹۳)	اور اس میں ہر حلال اور ہر حرام کا ذکر ہے۔

تنویع حدیث

حدیث کا نشر و شیوع رواۃ حدیث کے واسطہ سے ہوا اس طرح کہ فلاں نے فلاں سے سنا اور فلاں نے فلاں سے بیان کیا۔ اس نام بنام سلسلۂ رواۃ کو سند کہا جاتا ہے۔ یہ سلسلۂ سند ہی وہ معیار ہے جس پر حدیث کو پرکھا اور صحیح وسقیم کو جانچا جا سکتا ہے اگر حدیث کے رواۃ ثقہ و راست گو ہوں گے تو حدیث بھی قابل وثوق و اعتماد

قرار پائے گی اور اگر ان کی عدالت مشتبہ اور صدق بیانی مشکوک ہو گی تو حدیث بھی اعتماد و وثوق کے پایہ سے گر جائے گی اس لئے ہر حدیث کو ایک سطح پر سمجھا نہیں جاسکتا بلکہ کچھ قابل اعتماد و وثوق ہوں گی اور کچھ متروک و ساقط الاعتبار اس کی صحت یا عدم صحت پر اس وقت تک حکم نہیں لگایا جاسکتا جب تک سلسلہ سند کے رواۃ کو پرکھ نہ لیا جائے چنانچہ امیرالمومنین لوگوں کو یہ ہدایت کرتے تھے کہ وہ متن حدیث کے ساتھ راوی یا رواۃ کا بھی ذکر کریں تاکہ حدیث کی صحت کو پرکھا جاسکے۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

اذا حدثتم بحديث فاسندوه الى الذى حدثكم فان كان حقا فلكم وان كان كذبا فعليه (وسائل الشیعہ ج ۳ ص ۳۷۷)	جب حدیث بیان کرو تو جس نے تم سے وہ حدیث بیان کی ہے اس کی سند کا بھی ذکر کرو اگر وہ صحیح ہو گی تو تمہیں فائدہ پہنچے گا اور جھوٹ ہو گی تو اس کا مظلمہ بیان کرنے والے پر ہو گا۔

حدیث کو بیان کرتے وقت یہ اطمینان ہونا چاہیئے کہ راوی دروغ گو اور غلط کار تو نہیں ہے تاکہ صحیح و غلط میں تفریق اور موضوع احادیث کے نشر کا سدِ باب ہو سکے چنانچہ امیرالمومنین کسی حدیث کو اس کے راوی کی صدق بیانی پر اطمینان کئے بغیر قبول نہ کرتے تھے۔ امام ذہبی تحریر کرتے ہیں۔

كان على كرم الله وجهه اماما متحريا فى الاخذ بحيث انه يستحلف من يحدثه الحديث (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۰)	حضرت علی کرم اللہ وجہہ پورا اطمینان کرنے کے بعد حدیث کو قبول کرتے تھے اس طرح کہ وہ حدیث بیان کرنے والے سے قسم لے لیتے تھے۔

علماء متقدمین کے نزدیک صحت و سقم کے لحاظ سے حدیث کے مراتب میں تفریق مسلم تھی مگر انہوں نے اقسام حدیث کے لئے کوئی خاص اصطلاحی نام وضع نہیں کئے۔ علماءِ متاخرین میں سب سے پہلے السید جمال الدین الحسنی متوفی ۶۷۳ھ نے احادیث کو راوی کے ایمان عدالت اور قوت حفظ و ضبط کے اعتبار سے چار بنیادی قسموں پر تقسیم کیا اور انہیں صحیح حسن موثق اور ضعیف کے نام سے موسوم کیا۔

صحیح وہ ہے جس کے سلسلۂ سند میں تمام رواۃ ثقہ و معتمد اور امامی المذہب ہوں۔

حسن وہ ہے جس کے سلسلۂ سند میں تمام رواۃ امامی المسلک اور ممدوح ہوں مگر ان کی عدالت حدِ وثوق تک نہ پہنچی ہو۔

موثق وہ ہے جس کے سلسلۂ سند میں تمام یا بعض عقیدۃً امامی نہ ہوں مگر ان کی صدق بیانی پر اعتماد ہو۔

ضعیف وہ ہے جس کے رواۃ میں مذکورہ بالا تینوں قسموں کے شرائط نہ پائے جاتے ہوں۔

اس تنویع حدیث کی بنیاد بھی امیرالمومنین کے ہاتھوں قائم ہوئی اور آپ نے رواۃ حدیث کے حالات و اوصاف پر ایک جامع تبصرہ فرماتے ہوئے انہیں چار قسموں پر تقسیم کیا ہے یہ تبصرہ سلیم ابن قیس ہلالی کی روایت سے نہج البلاغہ اور کافی باب اختلاف الحدیث میں درج ہے۔ اس تبصرہ کے چند اقتباسات درج کئے جاتے ہیں۔

رجل منافق مظهر للایمان متصنع بالاسلام لا یتاثم ولا یتحرج یکذب علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ متعمدا

ایک تو وہ جس کا ظاہر کچھ ہے اور باطن کچھ وہ ایمان کی نمائش کرتا ہے اور مسلمانوں کی سی وضع قطع بنا لیتا ہے نہ گناہ کرنے سے گھبراتا ہے اور نہ کسی افتاد میں پڑنے سے جھجکتا ہے وہ جان بوجھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ پر جھوٹ باندھتا ہے۔

ورجل سمع من رسول اللہ شیئا لم یحفظہ علی وجھہ فوھم فیہ ولم یتعمد کذبا فھو فی یدیہ ویرویہ و یعمل بہ ویقول انا سمعتہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

دوسرا شخص وہ ہے جس نے تھوڑا بہت رسول اللہ سے سنا لیکن جوں کا توں اسے یاد نہ رکھ سکا اور اس میں اسے سہو ہوگیا یہ جان بوجھ کر جھوٹ نہیں بولتا یہی کچھ اس کے دسترس میں ہے اسے ہی دوسروں سے بیان کرتا ہے اور اسی پر خود بھی عمل پیرا ہے اور کہتا بھی یہی ہے کہ میں نے رسول اللہ سے سنا ہے

ورجل ثالث سمع من رسول اللہ علیہ والہ وسلم شیئا یامر بہ ثم نھی عنہ وھو لا یعلم او سمعہ ینھی من شئی عن شئی ثم امر بہ وھو لا یعلم

تیسرا شخص وہ ہے کہ جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے سنا کہ آپ نے ایک چیز کے بجا لانے کا حکم دیا ہے پھر پیغمبر نے اس سے روک دیا لیکن یہ اسے معلوم نہ ہو سکا یا یوں کہ اس نے پیغمبر کو ایک چیز سے منع کرتے ہوئے سنا پھر آپ نے تو اس کی اجازت دے دی لیکن اس کے علم میں یہ چیز نہ آسکی۔

واخر رابع لم یکذب علی اللہ ولا علی رسولہ مبغض للکذب خوفا من اللہ وتعظیما لرسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم ولم یھم بل حفظ ما سمع علی وجھہ فجاء بہ علی ما سمعہ لم یزد فیہ ولم ینقص منہ

چوتھا شخص وہ ہے کہ جو اللہ اور اس کے رسول پر جھوٹ نہیں باندھتا وہ خوف خدا اور عظمت رسول کے پیش نظر کذب سے نفرت کرتا ہے اس کی یادداشت میں غلطی واقع نہیں ہوئی بلکہ جس طرح سنا اسی طرح اسے یاد رکھا اور اسی طرح اسے بیان کیا نہ اس میں کچھ بڑھایا اور نہ اس میں کچھ گھٹایا۔

حدیث کے سلسلۂ سند کو دیکھنے کے ساتھ یہ بھی دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ حدیث قرآن کے کسی حکم کے منافی تو نہیں ہے یا کسی مشہور و معتبر حدیث سے متعارض تو نہیں ہے یا شریعت کے کسی مسلمہ اصول کے خلاف تو نہیں ہے یا عقل کے قطعی فیصلہ کے مخالف تو نہیں ہے یا اس سے انبیاء و ائمہ کی عظمت و تقدیس پر حرف تو نہیں آتا یہ

وجوہ بھی صحیح و سقیم میں امتیاز کا ایک ذریعہ ہیں لہٰذا حدیث کو روایۃً پرکھنے کے ساتھ درایۃً بھی اس پر نظر کرنے کی ضرورت ہے تاکہ صحیح و غلط میں تفریق کی جاسکے۔ امیرالمومنین کا ارشاد ہے۔

اعقلوا الخبر اذا سمعتموہ عقل رعایۃ لا عقل روایۃ فان رواۃ العلم کثیر و رعاتہ قلیل (نہج البلاغہ)	جب کوئی حدیث سُنو تو اسے عقل کے معیار پر پرکھ لو صرف نقل الفاظ پر بس نہ کرو۔ کیونکہ علم کے نقل کرنے والے تو بہت ہیں اور اس میں غور و فکر کرنے والے کم ہیں۔

کلیاتِ فقہیہ

اسلام ایک مکمل اور دائمی شریعت ہے جس کے احکام و قوانین ہر دور کے عصری تقاضوں پر پورے اُترنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور جس طرح آج سے چودہ سو برس پہلے قابلِ عمل و نفاذ تھے اسی طرح آج بھی ہیں۔ اور آئندہ بھی رہیں گے کیونکہ یہ آخری شریعت ہے جس کی تکمیل آخری نبی کے ذریعہ ہوئی اب نہ کوئی نئی شریعت آئے گی اور نہ کوئی نبی اور رسول مبعوث ہوگا جو شریعت کو تبدیل کرکے نئے احکام کا اجرا کرے۔ اگرچہ زمانہ تشریع کے بعد کثرت سے جدید مسائل پیدا ہوئے اور امتدادِ زمانہ کے ساتھ پیدا ہوتے رہیں گے یہ تو ممکن نہ تھا کہ ہر جزئی مسئلہ کا تفصیلی حکم بیان کیا جاتا مگر شریعت اسلام نے ایسے قواعد و کلیات بیان کردئے ہیں جن سے ان جزئیات اور پیش آمدہ مسائل میں عملی رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے اور موقع و محل کے اعتبار سے احکام اخذ کئے جاسکتے ہیں۔ اس اخذ و استنباط کا تعلق علم فقہ سے ہے۔ فقہ کے لغوی معنی فہم و دانش کے ہیں اور قرآن مجید میں یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے۔

فما لھولاء القوم لا یفقھون حدیثا ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ کوئی بات سمجھتے ہی نہیں ہیں۔

اور اصطلاح شرع میں شرعی مدارک و مآخذ سے فروعی احکام کے استخراج کا نام ہے۔ یہ اخذ و استنباط کی قوت چند افراد تک محدود اور اس کی ضرورت کسی خاص دور سے مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر زمانہ میں اس کی احتیاج رہی ہے اور آئندہ بھی رہے گی تاکہ زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات اور روز افزوں ضروریات کا حل اسلام کی روشنی میں تلاش کیا جاسکے اور فکری تعطل اور فقہی جمود پیدا نہ ہونے پائے۔ ان فقہی احکام کے آخذ چار ہیں۔ قرآن حدیث عقل اور اجماع۔

قرآن مجید ان فقہی و اسلامی احکام کا سب سے اہم ماخذ ہے اس میں عبادات و معاملات حدود و تعزیرات حقوق اللہ و حقوق العباد اوامر و نواہی اور انسانی زندگی کی رہنمائی کے تمام اصول و ضوابط درج ہیں جو ناقابلِ ترمیم اور ہر مسلمان کے لئے واجب العمل ہیں۔ امیرالمومنین فرماتے ہیں۔

علیك بقراءة القرآن والعمل بما فیه ولزوم فرائضه وشرائعه وحلاله وحرامه وامره ونهیه

تمہارے لئے ضروری ہے کہ قرآن پڑھو اس کے تعلیمات پر عمل کرو اور اس کے فرائض واحکام حلال وحرام اور امر و نہی کے پابند رہو۔

قرآن مجید کی کچھ آیتیں مجمل ومبہم ہیں اور کچھ آیتوں کے معنی واضح اور متعین ہیں وہ آیتیں جن کے معنی مجمل اور محتاج تشریح ہیں ان کی تفسیر وتاویل احادیث واقوال معصومین کی روشنی میں کی جائے گی۔ اپنی رائے سے معنی کا متعین کرنا درست نہیں ہے اور وہ آیتیں جن کے معنی متعین ہیں ان کے ظاہر مفہوم پر عمل کیا جائے گا۔ امیرالمومنین کا ارشاد ہے۔

کل آیة محکمة نزلت فی تحریم شئ من الامور المتعارفة التی کانت فی ایام العرب تاویلها فی تنزیلها فلیس یحتاج فیها الی تفسیر اکثر من تاویلها (فصول حر عاملی ص ۸۴)

ہر وہ محکم آیت جو عرب میں متعارف اور جانی پہچانی ہوئی چیزوں میں سے کسی چیز کو حرام قرار دینے کے لئے نازل ہوی ہو اس کا مفہوم قرآنی الفاظ ہیں موجود ہے لہٰذا اس کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے اس کے معنی کا جاننا کافی ہے۔ کسی تفسیر کی احتیاج نہیں ہے۔

حدیث اس قول یا فعل یا کسی فعل پر رضامندانہ سکوت کا نام ہے جو رسولِ خدا یا آئمہ اہلبیت میں سے کسی امام سے منقول ہو۔ ہر وہ حدیث جو باعتبار سند متواتر ہو یا اس کے رواۃ ثقہ و راست گو ہوں یا اس کی صحت کے قرائن موجود ہوں وہ حجت وسند ہے لیکن وہ حدیث جو قول مشہور کے خلاف یا علماء نے اس سے اعراض کیا ہو یا اس کے رواۃ پایۂ اعتبار سے ساقط ہوں اسے دلیل کا درجہ نہیں دیا جائے گا۔

امیرالمومنین کا ارشاد ہے۔

فان تنازعتم فی شئ فردوه الی الله والرسول فالرد الی الله الاخذ بمحکم کتابه والرد الی الرسول الاخذ بسنته الجامعة غیر المتفرقة (وافی)

اگر تم کسی بات میں جھگڑا کرو تو اس میں اللہ اور رسُول کی طرف رجُوع کرو۔ اللہ کی طرف رجوع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی محکم آیتوں پر عمل کیا جائے اور رسُول کی طرف رجوع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے ان متفق علیہ ارشادات پر عمل کیا جائے جن میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

عقل اس قوت کا نام ہے جو دیکھی بھالی چیزوں سے ان دیکھی چیزوں پر حکم لگاتی اور اچھی اور بُری باتوں میں امتیاز کرتی ہے۔ اگرچہ شرع کا کوی حکم خلافِ عقل نہیں ہوتا۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ عقل ہر حکم شرعی کی حکمت ومصلحت کا احاطہ کر سکے۔ بلکہ اکثر احکام عقل کی دسترس سے باہر ہیں اور عقل ان پر حکم لگانے سے قاصر ہے۔ اس طرح کے احکام، احکام تعبدی کہلاتے ہیں

جو شارع کے ذریعہ معلوم کئے جاتے ہیں ۔ جیسے نماز کی مخصوص ہیئت رکعتوں کی تعداد اور قیام وقعود اور رکوع و سجود کی کیفیت البتہ جن چیزوں کی اچھائی یا برائی پر عقل حکم لگاتی ہے ۔ ان کے بارے میں عقل کا فیصلہ قطعی سمجھا جائے گا جیسے صدق بیانی ایفائے عہد اور امانت داری کا اچھا اور قابل تعریف ہونا اور خیانت غصب اور دروغ گوئی کا برا اور لائق نفرین ہونا ۔

اجماع یہ ہے کہ کسی حکم شرعی پر فقہاء امت کا اتفاق رائے ہو ۔ اگر کسی مسئلہ پر ان کا اتفاق ہوگا تو اس اتفاق کو سند سمجھا جائے گا اگرچہ کتاب وسنت سے اس کا ماخذ معلوم نہ ہوسکے ۔ کیونکہ یہ اتفاق فقہاء اس امر سے کاشف ہے کہ امام بھی اس رائے سے متفق ہیں چنانچہ اگر ایک ہی استاد کے شاگرد کسی امر پر متفق ہوں اور یہ بھی علم ہو کہ وہ استاد کی رائے کے خلاف نہیں جاتے تو ان سب کا ایک رائے ہونا اس امر کا ثبوت ہوگا کہ ان کے استاد کا مسلک بھی یہی رہا ہوگا اور اجماع کے استناد کا اصل محور یہی کشف و یقین ہے ۔ گویا اجماع خود دلیل نہیں ہے بلکہ کشف رائے معصوم کا ایک ذریعہ اور دلیل کی طرف رہنمائی کرنے والا ہے ۔

اگر ان ماخذ میں سے کسی شے کا حکم معلوم نہ ہوسکے اور ترک و عمل میں تردد ہو تو اس صورت میں اصول عملیہ استصحاب احتیاط براءت اور تخییر میں سے کسی ایک ضابطہ سے رہنمائی حاصل کی جائے گی ۔ یہ قواعد وضوابط اگرچہ قطعی و یقینی نہیں ہیں مگر ان کے اعتبار واستناد پر ادلۂ قطعیہ قائم ہیں ۔

استصحاب یہ ہے کہ کسی شے کو اس کے سابقہ حکم پر جبکہ اس کے خلاف کا علم نہ ہو باقی و برقرار رکھا جائے مثلاً کسی شے کی طہارت کا یقین ہو اور پھر طہارت میں شک پیدا ہو تو اس شک کی طرف التفات نہ کیا جائے اور اسے سابقہ حکم طہارت پر علی حالہ باقی سمجھا جائے ۔ امیر المومنین نے اس اصل وضابطہ کے بارے میں فرمایا ہے ۔

من کان علی یقین فشك فلیمض علی یقینه فان الشك لا ینقض الیقین (فصول حرعاملی)	جس شخص کو کسی بات کا یقین ہو اور پھر شک سے دوچار ہو تو اسے اپنے علم و یقین پر باقی رہنا چاہیئے اس لئے کہ شک یقین کو زائل نہیں کرسکتا ۔

احتیاط یہ ہے کہ ایسا طرز عمل اختیار کیا جائے جس سے تکلیف شرعی سے عہدہ برآ ہونے کا یقین ہوجائے مثلاً کسی امر میں شک ہو کہ وہ واجب ہے یا مستحب تو اسے بجالایا جائے یا کسی امر میں شک ہو کہ وہ حرام ہے یا مباح تو اسے ترک کیا جائے ۔ امیر المومنین کا ارشاد ہے ۔

اخوك دینك فاحتط لدینك بما شئت (امالی مفید)	تمہارا دین تمہارے لئے بمنزلہ بھائی کے ہے لہٰذا جس طرح ہو دین میں احتیاط سے کام لو ۔

براءت یہ ہے کہ کسی شے کے بارے میں یہ علم نہ ہو کہ اس پر عمل کرنا چاہیئے یا اسے ترک کرنا چاہیئے ۔ تو اس صورت میں عدم دلیل کو دلیل نفی قرار دے کر اسے مورد تکلیف نہ قرار دیا جائے اور اسے جائز ومباح سمجھا جائے ۔ امیر المومنین کا ارشاد ہے ۔

سکت لکم عن اشیاء ولم یدعها نسیانا فلا تتکلفوها (نہج البلاغہ)	اللہ نے جن چند چیزوں کا حکم بیان نہیں کیا انہیں بھولے سے نہیں چھوڑا لہٰذا ان کا بار اٹھانے کی کوشش نہ کرو ۔

تخییر یہ ہے کہ شارع کی طرف سے فعل یا ترک کی پابندی کا یقین ہو مگر یہ علم نہ ہو کہ یہ پابندی فعل کی صورت میں ہے یا ترک کی صورت میں اور احتیاط کی بھی کوئی صورت نہ ہو تو پھر اختیار ہے کہ ان دونوں صورتوں میں سے جس صورت پر چاہے عمل کرے۔

ایک گروہ نے قیاس و رائے اور استحسان و استصلاح ایسے خودساختہ اصول کو بھی ماخذ کا درجہ دے دیا ہے۔ ان میں قیاس سرفہرست ہے اور اکثر پیش آئند مسائل کا ماخذ اسے قرار دے لیا گیا ہے۔ قیاس کو منطقی اصطلاح میں تمثیل کہا جاتا ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک شے کا حکم دوسری شے پر جاری کر دیا جائے اس بنا پر کہ ان دونوں میں ایک مشترک وصف پایا جاتا ہے جو بظاہر علت حکم ہے۔

اس قیاس کے اعتبار و استناد پر کوئی دلیل شرعی نہیں ہے اور نہ امر مشترک کو علت حکم قرار دینے کا کوئی جواز ہے کیونکہ شرع اسلام میں دو متماثل چیزوں کے احکام جُدا جُدا بھی ہوتے ہیں جیسے چوری اور غصب دونوں غیر کا مال ہتیا لینے میں متماثل ہیں مگر چوری میں ہاتھ کاٹنے کا حکم ہے اور غصب میں یہ حکم نہیں ہے۔ اور دو مختلف چیزوں کا حکم ایک بھی ہوتا ہے جیسے زنا محصنہ اور ارتداد دو الگ چیزیں ہیں مگر ان دونوں کا حکم ایک ہے اور وہ سزائے موت ہے۔ لہٰذا وصف میں اشتراک حکم میں اشتراک کو اور حکم میں اشتراک وصف میں اشتراک کو مستلزم نہ ہوگا۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ امر مشترک کو علت حکم ٹھہرا کر قیاس ایسی غیر یقینی چیز کو شرعی حکم کا مدرک قرار دے لیا جائے جبکہ کسی حکم کو اس وقت تک حکم شرعی تسلیم نہیں کیا جا سکتا جب تک وہ خود قطعی نہ ہو یا اس کے اعتبار و استناد پر دلیل قطعی قائم نہ ہو۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

لا تقف ما لیس لك به علم	جس چیز کا تمہیں علم نہ ہو اس پر عمل کی بنیاد نہ رکھو۔

ائمہ اہلبیت نے دین میں قیاس آرائی و رائے زنی سے بشدت منع کیا ہے چنانچہ امیرالمومنین کا ارشاد ہے۔

لا تقیسوا الدین فان من الدین ما لا یقاس وسیاتی اقوام یقیسون فھم اعداء الدین و اوّل من قاس ابلیس (وسائل الشیعہ)	دین میں قیاس نہ کرو اس لئے کہ دین میں قیاس کا دخل نہیں ہے۔ البتہ ایک گروہ ایسا آئے گا جو قیاس سے کام لے گا وہ دین کا دشمن ہے جس نے سب سے پہلے قیاس کیا وہ ابلیس تھا۔

فقہ اسلامی میں عبادات عقود ایقاعات اور احکام سے بحث کی جاتی ہے۔ عبادت کے معنی بندگی و پرستش کے ہیں جیسے نماز روزہ وغیرہ عقود وہ ہیں جن میں دو طرف سے مخصوص الفاظ کی ضرورت پیش آتی ہے جیسے نکاح اور بیع و شراء وغیرہ ایقاعات وہ ہیں جن میں ایک ہی طرف سے مخصوص الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے جیسے طلاق اور احکام وہ ہیں جن میں الفاظ کی احتیاج نہیں ہوتی جیسے میراث دیت وغیرہ۔

ذیل میں فقہی عناوین کے تحت امیرالمومنین کے جستہ جستہ اقوال اور مختلف قضایا درج کئے جاتے ہیں۔ یہ اقوال ماخذ کا اور قضایا نظائر اور رہنما اصول کا درجہ رکھتے ہیں۔

باب الطہارت

یوں تو ہر مذہب اور ہر معاشرہ میں صفائی و پاکیزگی کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا جاتا ہے مگر اسلام نے طہارت و پاکیزگی کو نہ صرف معاشرتی اعتبار سے اہمیت دی ہے بلکہ اسے عبادات کا جزو قرار دیا ہے چنانچہ اکثر عبادات و اعمال کی صحت کے لئے طہارت شرط اور ان کی بجا آوری کیلئے لباس جسم اور جگہ کی پاکیزگی لازمی ہے۔ خداوند عالم کا ارشاد ہے۔

ان اللہ یحب التوابین و یحب المتطہرین — خدا توبہ کرنے والوں اور پاک و پاکیزہ رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

امیرالمومنین طہارت کو اسلام کا شعار اور ایمان کا جزو سمجھتے تھے۔ چنانچہ حجر[1] ابن عدی کا ایک غلام بیان کرتا ہے کہ میں نے حجر سے کہا کہ میں نے آپ کے بیٹے کو دیکھا کہ وہ بیت الخلاء میں داخل ہوا اور طہارت کے بغیر باہر نکل آیا حجر نے کہا کہ تم طاقچہ پر سے فلاں صحیفہ اٹھا لاؤ۔ میں نے وہ صحیفہ پیش کیا تو انہوں نے اس صحیفہ میں سے پڑھا۔

ھذا ما سمعت علی ابن ابی طالب یذکر الطھور نصف الایمان (طبقات ابن سعد ج ۶ صفحہ ۲۲) — میں نے علی ابن ابی طالب کو فرماتے سنا کہ طہارت نصف ایمان ہے۔

پانی نجاست کو دور کرنے کا ذریعہ ہے اور قابل تطہیر اشیاء کو پاک کرتا ہے۔ اگر وہ کم از کم اتنی جگہ گھیرے جس کا طول عرض اور گہراؤ ہر ایک ساڑھے تین بالشت ہو تو وہ نجس شئے کے ملنے سے نجس نہیں ہوگا اور اگر اس کا رنگ یا بو یا ذائقہ متاثر ہو جائے تو وہ نجس قرار پائے گا چنانچہ امیرالمومنین نے ایسے پانی کے بارے میں فرمایا ہے۔

یتوضأ منه ویشرب منه مالم یتغیر اوصافه طعمه ولونه وریحه (مستدرک الوسائل) — جب تک اس کا ذائقہ رنگ اور بو متغیر نہ ہو اس سے وضو بھی کیا جا سکتا ہے اور پیا بھی جا سکتا ہے۔

وہ پانی جو زمین سے ابلتا رہتا ہے جیسے کنواں چشمہ دریا وغیرہ۔ اگر نجس شئے کے ملنے سے اس میں تغیر پیدا نہ ہو تو وہ نجس نہیں ہوگا خواہ مذکورہ بالا مقدار سے کم ہو۔ حضرت کا قول ہے۔

الماء الجاری لا ینجسه شئی (مستدرک الوسائل) — آب جاری کو کوئی چیز نجس نہیں کرتی۔

---

[1] حجر نام اور ابو عبدالرحمٰن کنیت تھی۔ پیغمبر اکرم کے صحابی اور ان کے تربیت یافتہ تھے۔ ابن عبدالبر نے تحریر کیا ہے۔

کان حجر من فضلاء الصحابه (استیعاب) — حجر پیغمبر کے افاضل صحابہ میں سے تھے۔

کوفہ کے رہنے والے اور امیرالمومنین کے ثقہ اصحاب اور رواۃ حدیث میں سے تھے۔ ابن سعد نے تحریر کیا ہے۔

وکان ثقة معروفا لم یروعن غیر علی شیئا (طبقات ج ۶ ص ۲۲۰) — حجر معتمد علیہ اور جانی پہچانی شخصیت ہیں انہوں نے حضرت علی کے علاوہ کسی اور سے نقل روایت نہیں کی۔

سنہ ۵۱ھ میں معاویہ نے حضرت علی سے وابستگی کے جرم میں انہیں قتل کروا دیا اور دمشق سے چھ میل کے فاصلہ پر مقام مرج عذراء میں دفن ہوئے۔

غسل کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے سر و گردن کو دھویا جائے پھر جسم کا دایاں حصہ اور پھر بایاں حصہ یا حوض وغیرہ میں ایک دم غوطہ لگایا جائے۔ غسل کی دو قسمیں ہیں۔ غسل واجب اور غسل مسنون۔ اغسال واجبہ میں سے ایک غسل جنابت ہے جو مادہ منویہ کے نکلنے سے واجب ہوتا ہے خواہ مباشرت سے نکلے یا احتلام کے ذریعے سوتے میں نکلے یا جاگتے میں قصداً نکلے یا بغیر قصد و ارادہ کے بلکہ زن و مرد کے اعضاء اگر اس طرح ملیں کہ سر حشفہ تک دخول ہو جائے جب بھی غسل واجب ہو گا خواہ مادہ منویہ کا اخراج نہ ہو چنانچہ ایک مرتبہ عمر ابن خطاب نے یہ مسئلہ صحابہ کے سامنے پیش کیا اور پوچھا کہ اگر کوئی شخص مباشرت کرے اور مادۂ منویہ خارج نہ ہو تو کیا اس پر غسل واجب ہو گا کسی نے کچھ کہا اور کسی نے کچھ۔ آخر میں امیرالمومنین سے دریافت کیا گیا آپ نے فرمایا۔

اتوجبون علیه الجلد و الرجم ولا توجبون علیه صاعا من ماء فقد وجب علیه الغسل (وافی)

تم ایسے شخص کے لئے دروں اور سنگساری کی سزا تو تجویز کرتے ہو اور غسل کے لئے ایک صاع پانی ضروری نہیں سمجھتے اس پر غسل واجب ہے۔

اگر کوئی شخص خواب میں یہ دیکھے کہ وہ محتلم ہوا ہے اور بیدار ہونے پر جسم یا لباس میں تری نہ پائے تو اس پر غسل واجب نہیں ہو گا چنانچہ حضرت کا ارشاد ہے۔

انما الغسل من الماء الاکبر فاذا رای فی منامه و لم یر الماء الاکبر فلیس علیه الغسل (وافی)

غسل مادہ منویہ کے خارج ہونے سے عائد ہوتا ہے اگر کوئی شخص خواب میں یہ دیکھے کہ وہ محتلم ہوا ہے اور بیدار ہونے پر کچھ نہ دیکھے تو اس پر غسل واجب نہیں ہے۔

دوسرا غسل مس میت ہے جو میت کو غسل سے قبل اور سرد ہونے کے بعد چھونے سے واجب ہوتا ہے۔ اہلسنت کے نزدیک غسل مس میت واجب نہیں ہے مگر فرقۂ امامیہ کے نزدیک واجب ہے۔ چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ جب امیرالمومنین نے رسُولِ خدا کو غسل دیا تو کیا خود بھی غسل کیا آپ نے فرمایا۔

النبی طاهر مطهر و لکن امیرالمومنین فعله وجرت به السنته (وافی)

پیغمبر اکرم پاک و پاکیزہ تھے۔ اس کے باوجود امیرالمومنین نے غسل کیا اور (ان کے اوصیاء کے بارے میں بھی) یہی سُنّت جاری و ساری ہے۔

اغسال مسنونہ متعدد ہیں ان میں سے غسل جمعہ کے بارے میں بڑی تاکید وارد ہوئی ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین کسی کو اس کی سُستی و سہل انگاری پر تنبیہ کرتے تو فرماتے۔

و الله لانت اعجز من تارك الغسل یوم الجمعة (وافی)

خُدا کی قسم تم تو اس شخص سے بھی گئے گزرے ہو جو جمعہ کے دن بھی غسل نہیں کرتا۔

تیمم یہ ہے کہ اگر وضو یا غسل کے لئے پانی نہ ہو یا پانی ہو اور وضو یا غسل کے لئے کافی نہ ہو یا کوئی امر استعمال سے مانع ہو تو دونوں ہاتھ مٹی وغیرہ پر مار کر پیشانی اور دونوں ہاتھوں پر مسح کرے۔ اگر اثنائے سفر میں وضو یا غسل کے لئے

پانی نہ ہو تو پانی کی جستجو کرے اس طرح کہ اگر زمین پتھریلی اور ناہموار ہو تو چاروں سمتوں میں اتنی دور تک جائے جتنی دور کمان سے رہا کیا ہوا تیر جاتا ہے اور اگر زمین ہموار ہو تو اس سے دوگنی مسافت تک جائے۔ امیرالمومنین کا ارشاد ہے۔

یطلب الماء فی السفر ان کان الحزونۃ فغلوۃ و ان کانت سھولۃ فغلوتین (وسائل الشیعہ)	سفر میں پانی کی تلاش کی جائے اگر زمین سنگلاخ و ناہموار ہو تو ایک تیر کے فاصلہ تک اور نرم و ہموار ہو تو دو تیروں کے فاصلہ تک۔

تیمم اجزائے زمینی مٹی پتھر ریت اور گچ پر کیا جاسکتا ہے چنانچہ امیرالمومنین سے پوچھا گیا کہ کیا گچ اور چونے پر تیمم کیا جاسکتا ہے۔ فرمایا ہاں۔ پھر پوچھا کہ کیا راکھ پر بھی تیمم ہوسکتا ہے فرمایا۔

لا لانہ لا یخرج من الارض انما یخرج من الشجر (وسائل الشیعہ)	نہیں اس لئے کہ وہ زمین سے نہیں نکلتی بلکہ درخت (کی لکڑی کے جلنے) سے بنتی ہے۔

اگر ہر طرف کیچڑ ہی کیچڑ ہو اور ان چیزوں میں سے کوئی چیز دستیاب نہ ہوسکے تو پھر کپڑوں اور دوسری چیزوں کو جھاڑ کر غبار جمع کرے اور اس پر تیمم کرے۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

من اخذتہ السماء شدیدۃ والارض مبتلۃ واراد ان یتیمم فلینفض سرجہ او اکافہ فیتیمم بغبارہ (مستدرک الوسائل)	اگر شدید بارش کی وجہ سے زمین تر بتر ہو جائے اور تیمم کا ارادہ ہو تو زین جھول کو جھاڑ کر غبار اکٹھا کرے اور اس پر تیمم کرے۔

اگر کسی عذر کی بنا پر یا پانی نہ ملنے کی وجہ سے تیمم کرے تو جب عذر برطرف ہو جائے یا پانی مل جائے تو تیمم باطل ہو جائے گا۔ حضرت کا قول ہے۔

اذا مر بالماء او وجدہ انتقض تیممہ (مستدرک الوسائل)	جب پانی کے قریب سے گذرے یا پانی پالے تو تیمم ٹوٹ جائے گا۔

اگر تیمم سے نماز شروع کر دے اور پہلی رکعت میں رکوع سے پہلے پانی نظر آجائے تو نماز کو قطع کر دے اور وضو کرکے از سرِ نو نماز پڑھے اور اگر رکوع میں پہنچ گیا ہو تو نماز کو اختتام تک پہنچائے۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

ان دخل فی الصلوٰۃ ثم وجد الماء فلینصرف فتوضأ ویصلی ان لم یکن رکع فان رکع مضی فی صلوتہ (مستدرک الوسائل)	اگر نماز شروع کر دے اور پھر پانی پالے تو اگر اس نے رکوع نہیں کیا تو وضو کرے اور نماز پڑھے اور اگر رکوع کر لیا ہے تو نماز کو جاری رکھے۔

اگر پانی کے مل جانے کی توقع ہو تو نماز کو آخر وقت کے لئے اٹھا رکھے اگر پانی مل جائے تو بہتر ورنہ تیمم سے نماز ادا کرے حضرت کا ارشاد ہے۔

لا ینبغی ان یتیمم من لم یجد الماء الا فی آخر الوقت (مستدرک الوسائل)	جسے پانی نہ ملے اسے چاہیئے کہ نماز کے آخر وقت تیمم کرے۔

باب الصلوٰۃ

صلوٰۃ اس عبادت کو کہتے ہیں جو قیام و قعود رکوع و سجود اور قراءت سور و اذکار سے صورت پذیر ہوتی ہے اور نماز کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ نماز تمام عبادات میں سے سب سے اہم عبادت اور اعمال میں سب سے بہتر عمل ہے۔ چنانچہ امیر المومنین فرماتے ہیں۔

اوصیکم بالصلوٰۃ وحفظھا فانھا خیر العمل وھی عمود دینکم (مستدرک الوسائل)

میں تمہیں نماز اور اس کی پابندی کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ یہ بہترین عمل اور تمہارے دین کا ستون ہے۔

نماز کے لئے ضروری ہے کہ لباس اور جگہ غصبی نہ ہو۔ اگر یہ چیزیں شرعی جواز کے بغیر حاصل کی گئی ہوں گی تو ان میں نماز صحیح نہ ہوگی۔ امیر المومنین کا ارشاد ہے۔

انظر فیما تصلی وعلی ما تصلی ان لم یکن من حلہ و وجھہ فلا قبول (فصول حر عاملی)

یہ دیکھو کہ تم کس چیز میں اور کس چیز پر نماز پڑھتے ہو اگر یہ چیزیں حلال اور صحیح طریق سے حاصل نہ کی گئی ہوں گی تو نماز قابل قبول نہ ہوگی۔

نماز سے پہلے اذان و اقامت کہنا مستحب ہے۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

من صلی باذان و اقامۃ صلی خلفہ صفان من الملٰئکۃ و من صلی باقامۃ صلی خلفہ صف (فصول حر عاملی)

جو شخص اذان و اقامت کے ساتھ نماز پڑھے اس کے پیچھے فرشتوں کی دو صفیں نماز ادا کرتی ہیں اور جو شخص صرف اقامت کے ساتھ نماز پڑھے اس کے پیچھے فرشتوں کی ایک صف نماز پڑھتی ہے۔

جب موذن اذان دے رہا ہو تو اس کے ساتھ ساتھ کلمات اذان کو دُہرانا چاہیئے۔ امیر المومنین کا ارشاد ہے کہ اس سے رزق میں وسعت آتی ہے اور تنگدستی دُور ہو جاتی ہے۔

اگر کوئی شخص مسجد میں اس وقت آئے جب نماز جماعت ختم ہو چکی ہو اور ابھی صفیں منتشر نہ ہوئی ہوں تو اس صورت میں اذان و اقامت ساقط ہے۔ حضرت فرماتے ہیں۔

اذا دخل رجل المسجد و قد صلی اھلہ فلا یوذنن ولا یقیمن (وسائل الشیعہ)

جب کوئی شخص مسجد میں آئے اور نمازی نماز پڑھ چکے ہوں تو وہ اذان و اقامت نہ کہے۔

نمازوں کو ان کے مقررہ اوقات میں ادا کرنا چاہیئے اس طرح کہ نہ وقت سے پہلے پڑھے اور نہ وقت گزار دے حضرت کا ارشاد ہے۔

صل الصلوٰۃ لوقتھا الموقت لھا ولا تعجل وقتھا لفراغ ولا توخرھا عن وقتھا لاشتغال (نہج البلاغہ)

نماز کو اس کے مقررہ وقت پر ادا کرو اور فراغت حاصل کرنے کے لئے قبل از وقت نہ پڑھو اور نہ مشغولیت کی وجہ سے اس میں تاخیر کرو۔

اگر کسی وجہ سے نماز میں تاخیر ہو جائے اور صرف ایک رکعت کے ادا کرنے کا وقت رہ جائے تو ادا کی نیت سے نماز پڑھے۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

من ادرك من الصلوٰة ركعة قبل طلوع الشمس فقد ادرك الصلوٰة تامة (فصول)

جس نے سورج کے طلوع ہونے سے پہلے ایک رکعت پڑھ لی اس کی نماز پوری ہو گئی۔

ہر مسلمان پر شب و روز میں ظہر عصر مغرب عشاء اور صبح کی نمازیں واجب ہیں۔ حضرت نے ان نمازوں کے اوقات فضیلت اور تعداد رکعات کے بارے میں فرمایا ہے۔

ان فرض صلوٰة الظهر اربع و وقتها بعد زوال الشمس و وقت صلوٰة العصر آخر وقت الظهر الى وقت مهبط الشمس وان المغرب ثلث ركعات و وقتها حين وقت الغروب الى ادبار الشفق والحمرة وان وقت صلاة العشاء الاخرة هي اربع ركعات و اوّل وقتها حين اشتباك النجوم وغيبوبة الشفق وانبساط الظلام الى ثلث الليل والصبح ركعتان و وقتها طلوع الفجر الى اسفار الصبح (وسائل الشيعه)

نمازِ ظہر کی چار رکعتیں ہیں اور اس کا وقت زوال آفتاب کے بعد ہے اور نماز عصر کا وقت ظہر کے وقت آخر سے سورج کے افق مغرب کی طرف جھکاؤ تک ہے اور مغرب کی تین رکعتیں ہیں اور اس کا وقت غروب آفتاب سے شفق کے اوجھل اور مغرب کی سرخی کے زائل ہونے تک ہے اور عشاء کی چار رکعتیں ہیں اور اس کا وقت ستاروں کے جال بچھنے مغرب کی سمت کی سُرخی کے غائب ہونے اور تاریکی کے پھیلاؤ سے تہائی رات تک ہے اور صبح کی دو رکعتیں ہیں اور اس کا وقت طلوعِ فجر سے مشرق کی سمت سے سرخی کے ظاہر ہونے تک ہے۔

یہ پانچوں نمازیں سترہ رکعتوں اور پچانویں تکبیروں پر مشتمل ہیں۔ حضرت فرماتے ہیں۔

خمس وتسعون تكبيرة في اليوم والليلة للصلوات منها تكبير القنوت (فصول)

ہر شب و روز میں نمازوں کی پچانویں تکبیریں ہیں ان میں قنوت کی تکبیریں بھی شامل ہیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ صبح کی دو رکعتوں میں گیارہ تکبیریں ظہر کی چار رکعتوں میں اکیس عصر کی چار رکعتوں میں اکیس مغرب کی تین رکعتوں میں سولہ اور عشاء کی چار رکعتوں میں اکیس اور پانچ تکبیریں پانچ قنوتوں کی یہ کل پچانوے تکبیریں ہوئیں۔ نماز کی پہلی تکبیر سے جسے تکبیرۃ الاحرام کہتے ہیں۔ نماز شروع ہوتی ہے اور سلام پر ختم ہو جاتی ہے۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

تحريمها التكبير وتحليلها التسليم (وسائل الشيعه)

نماز کی پابندی کا آغاز تکبیر سے ہوتا ہے اور سلام سے پابندی برطرف ہو جاتی ہے۔

تکبیرۃ الاحرام اور دوسری تکبیروں کے وقت دونوں ہاتھوں کو کانوں تک اٹھانا چاہیئے۔ چنانچہ حضرت نے وانحر کی تفسیر میں فرمایا ہے۔

النحر رفع اليدين في الصلاة نحو الوجه (مستدرک الوسائل)

نحر سے مراد یہ ہے کہ نماز میں دونوں ہاتھوں کو چہرے کی طرف بلند کیا جائے۔

اور اسے عبودیت کا شعار قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے۔

رفع الیدین فی التکبیر ھو العبودیۃ (وسائل)
تکبیر کے وقت دونوں ہاتھوں کو اٹھانا عبودیت کا اظہار ہے۔

تکبیرۃ الاحرام کے وقت جسم میں جھکاؤ نہ ہونا چاہیئے بلکہ بالکل سیدھا روبقبلہ کھڑا ہونا چاہیئے۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

من لم یقم صلبہ فی الصلوٰۃ فلا صلواۃ لہ (وسائل الشیعہ)
جو شخص کمر کے جھکاؤ کے بغیر سیدھا کھڑا نہیں ہوتا اس کی نماز نہیں ہے۔

حالت قیام میں سورۂ فاتحہ اور ایک دوسرا سورہ پڑھے۔ امیر المومنین اکثر سورۂ اخلاص پڑھتے تھے۔ چنانچہ عمران ابن حصین بیان کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ نے ایک لشکر حضرت علیؑ کی قیادت میں بھیجا جب لشکر پلٹ کر آیا تو آنحضرت نے حضرت علی کے بارے میں پوچھا ان لوگوں نے کہا کہ اور تو تمام باتیں معمول کے مطابق تھیں مگر یہ بات نئی تھی کہ آپ جب بھی نماز پڑھاتے تو سورۂ اخلاص ضرور پڑھتے تھے آنحضرت نے حضرت علی سے اس کے بارے میں پوچھا تو آپ نے کہا کہ میں اس سورہ کو دوست رکھتا ہوں۔ آنحضرت نے فرمایا۔

ما احببتھا حتی احبک اللہ (مجمع البیان)
تم اسے اس لئے دوست رکھتے ہوں کہ اللہ تمہیں دوست رکھتا ہے۔

قیام کے بعد رکوع کرے اس طرح کہ دونوں ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھ کر اتنا جھکے کہ سر کمر کے جھکاؤ کے برابر ہوجائے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

ان علیا کان یعتدل فی الرکوع مستویا حتی یقال لوصب الماء علی ظھرہ لاستمسک (وسائل الشیعہ)
امیر المومنین رکوع میں اتنا جھکتے کہ کمر کی سطح بالکل برابر ہوجاتی یہاں تک کہ یہ کہا جاتا کہ اگر پشت پر پانی ڈالا جائے تو وہ وہیں پر رک جائے۔

رکوع میں ذکر واجب ہے اگر عمداً ترک کرے گا تو نماز باطل ہوگی اور اگر بھولے سے ایسا ہو تو نماز صحیح ہے۔ چنانچہ حضرت سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے رکوع کیا مگر ذکر رکوع بھول گیا کیا اس کی نماز ہوگئی فرمایا۔

تمت صلاتہ (وسائل الشیعہ)
ہاں اس کی نماز ہوگئی۔

رکوع کے بعد سیدھا کھڑا ہو اور پھر دو سجدے بجا لائے اور دوسرے سجدہ کے بعد سیدھا اٹھنے کی بجائے کچھ وقفہ کے لئے بیٹھے اور پھر کھڑا ہو۔ اصبغ ابن نباتہ کہتے ہیں۔

کان امیر المومنین اذا رفع راسہ من السجود قعد حتی یطمئن ثم یقوم (وسائل الشیعہ)
امیر المومنین جب سجدہ سے سر اٹھاتے تو سکون و اطمینان سے بیٹھتے پھر کھڑے ہوتے۔

جب سجدتین سے فارغ ہو کر کھڑا ہونے لگے تو بحول اللہ وقوتہ اقوم واقعد (میں اللہ کی دی ہوئی قوت و طاقت سے اٹھتا بیٹھتا ہوں کہتا امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔

کان امیر المومنین یبرء من القدریۃ
امیر المومنین فرقہ قدریہ سے اظہار براءت کرتے ہوئے

فی کل رکعۃ و یقول اللہ و قوتہ اقوم و اقعد و اقعد (وسائل الشیعہ)
ہر رکعت میں بحول اللہ و قوتہ اقوم و اقعد پڑھتے۔

دوسری رکعت میں رکوع میں جانے سے پہلے ہاتھ اُٹھا کر دُعائے قنوت پڑھے۔ عبدالرحمٰن ابن اسود کاہلی کہتے ہیں۔

صلی بنا علی ابن ابی طالب علیہ السلام فی مسجد بنی کاھل الفجر فقنت بنا (مستدرک الوسائل)
علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے مسجد بنی کاہل میں نماز پڑھائی اور اس میں دُعائے قنوت پڑھی۔

جب نماز ختم کرے تو تسبیح فاطمہ (سلام اللہ علیہا) پڑھے۔ امیرالمومنین فرماتے ہیں کہ ہمیں رسُول اللہ نے تعلیم دی کہ ہم ہر نماز کے بعد ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر ۳۳ مرتبہ الحمد للہ اور ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ پڑھا کریں۔ اس ارشادِ نبوی کے بعد میں نے اسے کبھی ترک نہیں کیا۔

تسبیح و تعقیبات سے فارغ ہو کر دُعا مانگے۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

اذا فرغ احدکم من الصلوٰۃ فلیرفع یدیہ الی السماء و لینصب فی الدعاء (مستدرک الوسائل)
جب تم میں سے کوئی نماز سے فارغ ہو تو اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے اور دُعا مانگے۔

دُعا کے بعد سجدہ شکر بجا لائے۔ میثم تمار کہتے ہیں کہ امیرالمومنین نے مسجد جعفی میں نماز ادا کی اور تسبیح و دُعا کے بعد

سجد و عفر و قال العفو مائۃ مرۃ (مستدرک الوسائل)
آپ نے خاک پر پیشانی رکھ کر سجدہ کیا اور سو مرتبہ العفو کہا۔

نماز کے چند مبطلات ہیں چنانچہ اگر دورانِ نماز میں ریح وغیرہ صادر ہو تو نماز باطل ہو جائے گی لہذا پھر سے وضو کر کے نماز پڑھے۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

من احدث فی صلواتہ فلیقطع و لیبدئ (مستدرک الوسائل)
اگر نماز میں حدث صادر ہو تو نماز کو قطع کر دے اور ازسرِنو نماز پڑھے۔

اگر نماز پڑھتے ہوئے آنکھ لگ جائے تو نماز باطل ہو جائے گی۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

اذا غلبتک عینک و انت فی الصلوٰۃ فاقطع و نم (وسائل الشیعہ)
جب نماز میں تمہاری آنکھوں میں نیند کا غلبہ ہو جائے تو نماز قطع کر دو اور سو جاؤ۔

اگر نماز میں قرآن یا دُعا کے علاوہ کوئی دو حرفی لفظ خواہ بامعنی ہو یا بے معنی یا یک حرفی لفظ جو بامعنی ہو زبان سے نکالے تو نماز باطل ہو جائے گی۔ حضرت فرماتے ہیں۔

من تکلم فی صلواتہ اعاد (مستدرک الوسائل)
جو نماز میں کلام کرے وہ پھر سے نماز پڑھے۔

نماز میں قہقہہ لگا کر ہنسنے سے نماز باطل ہو جاتی ہے۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

لا یقطع الصلوٰۃ التبسم و یقطعھا القھقھہ (بحار ج ۱۰ ص ۱۰۷)
تبسم سے نماز باطل نہیں ہوتی البتہ قہقہہ لگانے سے نماز باطل ہو جاتی ہے۔

نماز میں ہاتھوں کو نہ باندھے۔ چنانچہ حضرت کا ارشاد ہے۔

لا یجمع المسلم یدیہ فی صلواتہ وھو قائم بین یدیہ یتشبہ باھل الکفر یعنی المجوس (وسائل الشیعہ)

مسلمان کا یہ شیوہ نہیں کہ وہ نماز میں ہاتھ باندھے اور مجوسیوں کے سے طرز عمل کے ساتھ اللہ کے سامنے کھڑا ہو۔

ان چیزوں کے علاوہ بھی چند چیزیں ایسی ہیں جن سے اگرچہ نماز باطل نہیں ہوتی تاہم ان کے مکروہ ہونے کی بنا پر ان سے اجتناب کرنا چاہیئے۔ ان مکروہات میں سے ایک یہ ہے کہ نماز میں سر کو ادھر اُدھر حرکت نہ دے اور نہ دائیں بائیں دیکھے۔ حضرت فرماتے ہیں۔

الالتفات فی الصلوٰۃ اختلاس من الشیطان فایاکم والالتفات فی الصلوٰۃ (وسائل الشیعہ)

نماز میں ادھر اُدھر مڑنا شیطان کے تسلط کا نتیجہ ہے لہذا اس سے اجتناب کرو۔

نماز میں بے معنی و بیکار حرکات سے اجتناب کرے اس لئے کہ یہ چیز خضوع و خشوع اور رجوع الی اللہ کے منافی ہے۔ حضرت فرماتے ہیں۔

لا یعبث الرجل فی صلواتہ بلحیتہ ولا بما یشغلہ عن صلواتہ (وسائل الشیعہ)

آدمی نماز میں ڈاڑھی سے نہ کھیلے اور نہ ایسی حرکت کرے جو اس کی توجہ نماز سے ہٹادے۔

اگر نماز پڑھتے ہوئے انسان یا حیوان سامنے سے گزرے تو اگرچہ اس سے نماز میں خلل پیدا نہیں ہوتا۔ تاہم جہاں تک ہوسکے اس کی روک تھام کرے چنانچہ حضرت سے کسی نے پوچھا کہ ایک شخص نماز پڑھتا ہے اور اس کے سامنے سے عورت مرد اور جانور سب گزرتے ہیں اسے کیا کرنا چاہیئے فرمایا۔

ان الصلوٰۃ لا یقطعھا شئی ولکن ادرؤا ما استطعتم (فصول حر عاملی)

(ان چیزوں میں سے) کوئی چیز نماز کو باطل نہیں کرتی لیکن جہاں تک ہوسکے انہیں روکنے کی کوشش کرو۔

لوہے کے ہتھیار تلوار وغیرہ سج کر نماز نہ پڑھے اور نہ تلوار اپنے سامنے رکھے۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

لا یصلی احدکم وبین یدیہ سیف فان القبلۃ امن (علل الشرائع)

تم میں سے کوئی شخص نماز کے دوران تلوار اپنے سامنے نہ رکھے اس لئے کہ سمت قبلہ امن کا نشان ہے۔

نماز کے چند آداب ہیں کچھ ظاہر سے تعلق رکھتے ہیں اور کچھ باطن سے۔ ظاہری آداب یہ ہیں کہ تمام اعمال وارکان سکون و طمانیت سے بجالائے۔ اِدھر اُدھر جھانکنے کی بجائے نظر جائے سجدہ پر رکھے نماز کے لئے متبرک مقامات مساجد یا مشاہد کا انتخاب کرے اور پاک و پاکیزہ اور بقدر وسعت اچھا لباس پہنے۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

النظیف من الثیاب یذھب الھم

نظیف و پاکیزہ لباس غم و حزن کو دور کرتا ہے اور

والحزن وھو طھور للصلوٰۃ — نماز کے لیے پاکیزگی کا باعث ہے۔

باطنی آداب یہ ہیں کہ صرف الفاظ کے دُہرانے پر اکتفا نہ کرے بلکہ ان کے معانی کو سمجھے اور حضورِ قلب کے ساتھ تمام ارکان بجالائے۔ خیالات کو اِدھر اُدھر بھٹکنے نہ دے۔ عجز و فروتنی کی کیفیت پیدا کرے اور یہ تصوّر کرے کہ وہ اس سلطان السلاطین کے روبرو کھڑا ہے جو ظاہر کو بھی دیکھتا ہے اور باطن پر بھی نظر رکھتا ہے کوئی چیز اس سے ڈھکی چھپی ہوئی اور اس کے دائرہ اختیار و اقتدار سے باہر نہیں ہے اگر نماز میں توجہ و یکسوئی نہ ہو تو وہ درحقیقت نماز ہی نہیں ہے اس لئے کہ نماز صرف سیدھا کھڑا ہونے رکوع میں جھکنے اور سجدہ میں سر رکھنے کا نام نہیں ہے بلکہ جب تک ان اعمال و اذکار کے پیکر میں روحِ اخلاص کارفرما نہ ہوگی وہ نماز نماز کہے جانے کے قابل نہ ہوگی۔ چنانچہ حضرت کا ارشاد ہے۔

لیست الصلوٰۃ قیامك وقعودك انما الصلوٰۃ اخلاصك — نماز تمہارے اُٹھنے بیٹھنے کا نام نہیں ہے بلکہ نماز وہ ہے جس میں خلوص نیت ہو۔

~~خشوع و نیّت اخلاص روحِ اعمال است — عمل چو دور شد از روح طاعتش مشمار~~

خشوع و نیّت اخلاص روحِ اعمال است — عمل چو دور شد از روح طاعتش مشمار

امیرالمومنین سے نماز کے مختلف اعمال کے بارے میں دریافت کیا جاتا تو آپ ان کی ظاہری ہیئت و صورت کے بیان کرنے پر اکتفا نہ کرتے بلکہ ان کے اسرار و حکم کی بھی نشان دہی کرتے چنانچہ آپ سے تکبیرۃ الاحرام کے معنی پوچھے گئے تو آپ نے فرمایا۔

الله اکبر یعنی الواحد الاحد الذی لیس کمثلہ شئی ولا یلتبس بالاجناس ولا یدرك بالحواس (علل الشرائع) — اللہ اکبر کے معنی یہ ہیں کہ وہ واحد و یکتا ہے نہ اس کے مانند کوئی شے ہے نہ کسی جنس سے اس کا اشتباہ ہو سکتا ہے اور نہ وہ حواس سے جانا جا سکتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ وہ اس اعتبار سے بزرگ و برتر ہے کہ نہ اس کا کوئی شریک ہے نہ کوئی مثیل نہ حواس سے جانا جا سکتا ہے اور نہ آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے اگر وہ کسی کے مشابہ ہوگا یا کوئی اس سے مماثل ہوگا تو وہ اسکی سطح پر آجائے گا اور یہ اس کی بزرگی و کبریائی کے منافی ہے۔

آپ سے پوچھا گیا کہ رکوع میں گردن کو خم کرنے کا مطلب کیا ہے فرمایا کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ

آمنت بوحدانیتك ولو ضربت عنقی (علل الشرائع) — میں اللہ کی وحدت و یکتائی پر ایمان لایا ہوں (اور اس سے منحرف نہیں ہوں گا) خواہ میری گردن کاٹ دی جائے۔

آپ سے دریافت کیا گیا کہ سجدہ کا مطلب کیا ہے فرمایا کہ پہلا سجدہ اس امر کا اعتراف ہے کہ اللھم انك منھا خلقتنا "بارالٰہا تونے ہمیں زمین سے پیدا کیا ہے" اور سجدہ سے سر اُٹھانے کے معنی یہ ہیں۔ منھا

والحزن وهو طهور للصلوٰۃ — نماز کے لیے پاکیزگی کا باعث ہے۔

باطنی آداب یہ ہیں کہ صرف الفاظ کے دُہرانے پر اکتفا نہ کرے بلکہ ان کے معانی کو سمجھے اور حضورِ قلب کے ساتھ تمام ارکان بجالائے۔ خیالات کو اِدھر اُدھر بھٹکنے نہ دے۔ عجز و فروتنی کی کیفیت پیدا کرے اور یہ تصوّر کرے کہ وہ اس سلطان السلاطین کے روبرو کھڑا ہے جو ظاہر کو بھی دیکھتا ہے اور باطن پر بھی نظر رکھتا ہے کوئی چیز اس سے ڈھکی چھپی ہوئی اور اس کے دائرہ اختیار و اقتدار سے باہر نہیں ہے اگر نماز میں توجہ و یکسوئی نہ ہو تو وہ درحقیقت نماز ہی نہیں ہے اس لئے کہ نماز صرف سیدھا کھڑا ہونے رکوع میں جھکنے اور سجدہ میں سر رکھنے کا نام نہیں ہے بلکہ جب تک ان اعمال و اذکار کے پیکر میں روحِ اخلاص کارفرما نہ ہوگی وہ نماز نماز کہے جانے کے قابل نہ ہوگی۔ چنانچہ حضرت کا ارشاد ہے۔

لیست الصلوٰۃ قیامك وقعودك انما الصلوٰۃ اخلاصك — نماز تمہارے اُٹھنے بیٹھنے کا نام نہیں ہے بلکہ نماز وہ ہے جس میں خلوص نیت ہو۔

خشوع و نیّت اخلاص روحِ اعمال است — عمل چو دور شد از روح طاعتش مشمار

امیرالمومنین سے نماز کے مختلف اعمال کے بارے میں دریافت کیا جاتا تو آپ ان کی ظاہری ہیئت و صورت کے بیان کرنے پر اکتفا نہ کرتے بلکہ ان کے اسرار و حکم کی بھی نشان دہی کرتے چنانچہ آپ سے تکبیرۃ الاحرام کے معنی پوچھے گئے تو آپ نے فرمایا۔

الله اکبر یعنی الواحد الاحد الذی لیس کمثلہ شئی ولا یلتبس بالاجناس ولا یدرك بالحواس (علل الشرائع) — اللہ اکبر کے معنی یہ ہیں کہ وہ واحد و یکتا ہے نہ اس کے مانند کوئی شے ہے نہ کسی جنس سے اس کا اشتباہ ہوسکتا ہے اور نہ وہ حواس سے جانا جاسکتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ وہ اس اعتبار سے بزرگ و برتر ہے کہ نہ اس کا کوئی شریک ہے نہ کوئی مثیل نہ حواس سے جانا جا سکتا ہے اور نہ آنکھوں سے دیکھا جاسکتا ہے اگر وہ کسی کے مشابہ ہوگا یا کوئی اس سے مماثل ہوگا تو وہ اسکی سطح پر آجائے گا اور یہ اس کی بزرگی و کبریائی کے منافی ہے۔

آپ سے پوچھا گیا کہ رکوع میں گردن کو خم کرنے کا مطلب کیا ہے فرمایا کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ

آمنت بوحدانیتك ولو ضربت عنقی (علل الشرائع) — میں اللہ کی وحدت و یکتائی پر ایمان لایا ہوں (اور اس سے منحرف نہیں ہوں گا) خواہ میری گردن کاٹ دی جائے۔

آپ سے دریافت کیا گیا کہ سجدہ کا مطلب کیا ہے فرمایا کہ پہلا سجدہ اس امر کا اعتراف ہے کہ اللھم انك منھا خلقتنا "بارالہا تو نے ہمیں زمین سے پیدا کیا ہے" اور سجدہ سے سر اُٹھانے کے معنی یہ ہیں۔ منھا

اخرجتنا "اسی زمین سے تونے ہمیں نکالا ہے" اور دوسرے سجدہ کے معنی یہ ہیں۔ والیھا تعیدنا "اسی زمین کی طرف تو ہمیں پلٹائے گا" اور اس سے سر اٹھانے کے معنی یہ ہیں۔ و منھا تخرجنا تارۃ اخری "اسی زمین سے تو ہمیں دوبارہ اٹھائے گا۔ حضرت نے ان جوابات میں قرآن مجید کی اس آیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

منھا خلقناکم وفیھا نعیدکم و منھا نخرجکم تارۃ اخری	ہم نے اسی زمین سے تمہیں پیدا کیا ہے اور اسی کی طرف پلٹائیں گے اور اسی سے دوسری بار تمہیں نکالیں گے۔

آپ سے پوچھا گیا کہ تشہد میں دایاں پیر بائیں پیر پر کیوں رکھا جاتا ہے۔ فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ

اللھم امت الباطل واقم الحق	خدایا باطل کو نیست و نابود کر اور حق کو قائم و برقرار رکھ۔

پوچھا گیا کہ آخر نماز میں السلام علیکم کا مطلب کیا ہے فرمایا کہ امام جماعت اللہ کی اس نوید کی ترجمانی کرتا ہے کہ

امان لکم من عذاب اللہ یوم القیامۃ (الفقیہ)	قیامت کے دن تمہارے لئے عذاب سے امان و سلامتی ہے۔

باب الصوم

ماہ رمضان میں ہر بالغ و عاقل مسلمان پر طلوع صبح صادق سے غروب آفتاب تک روزہ رکھنا واجب ہے۔ روزہ ایک طرح سے زکوٰۃ بدن ہے جو قوتِ صبر ضبطِ نفس اور ترکِ خواہشات ایسے اوصاف کی تخلیق میں قوی ترین موثر ہے۔ روزہ خداوند عالم کی خوشنودی کا باعث اور عذابِ جہنّم سے بچاؤ کا ذریعہ ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین کا ارشاد ہے۔

صوم شھر رمضان جنۃ من النار (مستدرک الوسائل)	ماہ رمضان کے روزے جہنّم کی آگ سے سپر کا کام دیں گے۔

ماہِ رمضان کا چاند رویت سے یا شعبان کے تیس دن پورے ہونے سے ثابت ہوگا۔ لہٰذا جب ماہ رمضان کا چاند نظر آئے روزہ رکھا جائے اور جب شوال کا چاند دکھائی دے روزہ چھوڑ دیا جائے۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

صم لرویتہ و افطر لرویتہ وایاک والشک والظن فان خفی علیکم فاتموا الشھر الاول ثلثین (وسائل الشیعہ)	چاند دیکھو تو روزہ رکھو اور چاند دیکھو تو روزہ چھوڑ دو اور شک وظن پر بنا نہ کرو اگر رویت مخفی رہے تو پہلے مہینے کے تیس دن پورے کرو۔

اگر تیس دن پورے نہ ہوں اور چاند بھی نہ دیکھے تو دو عادل گواہوں کی شہادت پر رویت تسلیم کی جائے گی۔ حضرت فرماتے ہیں۔

لا تجوز شھادۃ النساء فی رویۃ الھلال ولا یجوز الا شھادۃ رجلین عدلین (وافی)	رویت ہلال کے سلسلہ میں دو عادل مردوں کی گواہی معتبر ہے اور عورتوں کی گواہی قابل قبول نہ ہوگی۔

اگر ان چیزوں میں سے کسی ایک سے رویت ثابت نہ ہو اور عمومی شہرت بھی نہ ہو تو ماہِ رمضان کی نیت سے روزہ

رکھنے کا جواز نہیں ہے البتہ قضا یا استحباب کی نیت سے روزہ رکھا جاسکتا ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین سے یوم الشک کے روزہ کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا۔

لان اصوم یوما من شعبان احب الی من ان افطر یوما من شهر رمضان (وافی)

شعبان کا ایک روزہ رکھ لینا مجھے اس سے کہیں زیادہ پسند ہے کہ میں ماہِ رمضان میں ایک دن بغیر روزہ کے رہوں۔

مطلب یہ ہے کہ یوم الشک کا روزہ آخر شعبان کی نیت سے رکھنا بے روزہ رہنے سے بہتر ہے۔ اس لئے کہ اگر آخر شعبان کی نیّت سے روزہ رکھا جائے اور واقع میں بھی آخر شعبان ہو تو وہ روزہ مستحبی قرار پائے گا اور اگر روزہ نہ رکھا جائے اور واقع میں ماہ رمضان شروع ہوچکا ہو تو ماہِ رمضان کے روزوں میں سے ایک روزہ چھوٹ جائے گا۔ اگرچہ اس کے چھوٹنے پر کوئی گرفت نہ ہوگی کیونکہ ماہِ رمضان کے شروع ہونے کا علم نہیں ہوسکا اور احکام شرعیہ علم ویقین پر مترتب ہوتے ہیں۔ لہذا شعبان کے ختم ہونے اور ماہِ رمضان کے شروع ہونے کا علم ہوجائے ماہِ رمضان کی نیت سے روزہ صحیح نہیں ہوگا بلکہ بعد میں اگر یہ ثابت بھی ہوجائے کہ واقع میں ماہِ رمضان شروع ہوچکا تھا جب بھی روزہ باطل ہوگا اور قضا واجب ہوگی۔

اگر روزہ دار روزہ میں بھولے چوکے سے کچھ کھا پی لے تو اسے یہ سمجھ کر کہ اب تو کھا پی چکا ہوں۔ روزہ کو ختم نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ روزہ میں بھول چوک معاف ہے۔ چنانچہ حضرت کا ارشاد ہے۔

من صام فنسی فاکل و شرب فلا یفطر من اجل انه نسی فانما هو رزق رزقه الله فلیتم صومه (وافی)

جو شخص روزہ رکھے اور بھول کر کھا پی لے تو اسے اس خیال سے روزہ نہیں چھوڑنا چاہیئے کہ وہ بھول گیا یہ تو ایک رزق تھا جو اللہ نے اسے دیا اسے روزہ پورا کرنا چاہیئے۔

روزہ کی حالت میں مسواک کی جاسکتی ہے بلکہ بہتر ہے۔ چنانچہ کتب احادیث میں ہے کہ

کان علی یستاك وهو صائم فی اوّل النهار وفی آخره فی شهر رمضان (وسائل)

حضرت علی ماہِ رمضان میں روزہ کی حالت میں صبح و شام دونوں وقت مسواک کرتے تھے۔

حضرت دودھ سے روزہ افطار کرنا پسند کرتے تھے اور جب روزہ افطار کرتے تھے تو یہ دُعا پڑھتے تھے۔

بسم الله اللهم لك صمنا وعلى رزقك افطرنا فتقبل منا انك انت السميع العليم (وافی)

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں۔ اے اللہ ہم نے تیرے لئے روزہ رکھا اور تیرے رزق سے افطار کیا تو اسے قبول فرما بیشک تو (دعاؤں کا) سننے والا اور (نیتوں) کا جاننے والا ہے۔

باب الحج

حج چند اعمال کے مجموعہ کا نام ہے جو مکۂ معظمہ میں مخصوص دنوں میں بجا لائے جاتے ہیں۔ مکّہ اور اطرافِ مکّہ کے رہنے والوں پر حج افراد اور حج قران واجب ہے اور جو مکّہ اور اطراف مکّہ کے رہنے والے نہ ہوں ان پر حج تمتع واجب ہے جس میں عمرہ حج ہی کا ایک جزو ہوتا ہے۔ حج تمتع میں پہلے عمرہ تمتع کی نیت سے احرام باندھا جاتا ہے اور طواف وسعی اور تقصیر کے بعد احرام کھول دیا جاتا ہے اور پھر آٹھ ذی الحجہ کو حج کی نیت سے احرام باندھا جاتا ہے اور وقوف عرفات ومشعر الحرام اور رمی جمرات وغیرہ اعمال حج بجا لائے جاتے ہیں۔ اس حج تمتع کے بارے میں ارشاد الٰہی ہے۔

فمن تمتع بالعمرة الی الحج فما استیسر من الهدی — جو شخص حج تمتع کا عمرہ بجا لائے تو جیسی قربانی ممکن ہو کرے۔

پیغمبر اکرم نے اس آیت کے نازل ہونے کے بعد حجۃ الوداع کے موقع پر حکم دیا کہ جن لوگوں کے ہمراہ قربانی کے جانور نہیں ہیں وہ احرام کھول دیں اور حج تمتع بجا لائیں اور عمرہ کو حج میں شامل کرنے کا حکم دیا۔ ترمذی نے لکھا ہے کہ آنحضرت نے فرمایا۔

دخلت العمرة فی الحج الی یوم القیامة — اب قیامت تک عمرہ حج میں شامل کر دیا گیا ہے۔

(صحیح ترمذی ج ۱ ص ۱۴۴)

کچھ لوگوں کی طبیعتوں پر یہ حکم گراں گزرا اور کچھ لوگوں نے علانیہ اس کی مخالفت کی کیونکہ قبل اسلام حج ماہ ذی الحجہ میں اور عمرہ ماہ رجب میں بجا لایا جاتا تھا اور وہ اسی سابقہ طرز عمل سے مانوس تھے جسے چھوڑنا نہ چاہتے تھے۔ آنحضرت کے بار بار کہنے سے احرام تو کھول دئے مگر آپ کے بعد کھل کر اس کی مخالفت کی گئی ان مخالفت کرنے والوں میں حضرت عمر پیش پیش تھے جنہوں نے حکم پیغمبر کے خلاف حرمت کا فتویٰ صادر کر دیا۔ حضرت عثمان نے بھی انہی کا تتبع کیا اور اس سے مانع ہوئے حالانکہ امیر المومنین نے انہیں ارشاد پیغمبر کی طرف متوجہ کرتے ہوئے اس کی خلاف ورزی سے منع کیا مگر وہ اپنی رائے پر جمے رہے۔ چنانچہ محمد ابن اسماعیل بخاری تحریر کرتے ہیں۔

اختلف علی وعثمان بعسفان فی المتعة فقال علی ما ترید ان تنهی عن امر فعله رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال عثمان دعنی عنك (صحیح بخاری پارہ ۶ ص ۸۲)

حضرت علی اور حضرت عثمان نے مقام عسفان میں حج تمتع کے بارے میں اختلاف کیا۔ حضرت علی نے فرمایا تمہارا مقصد کیا ہے کہ تم اس امر سے منع کرتے ہو جسے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انجام دیا۔ حضرت عثمان نے کہا کہ اس ذکر کو چھوڑیئے۔

ایک شخص نے عبداللہ ابن عمر سے حج تمتع کے بارے میں پوچھا انہوں نے کہا کہ جائز ہے اس نے کہا کہ آپ کے والد حضرت عمر تو اس سے منع کرتے تھے عبداللہ نے کہا

ارائیت ان کان ابی نهی عنها وصنعها — تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر میرے باپ نے حج تمتع

رسول اللہ امر ابی یتبع ام امر رسول اللہ فقال الرجل بل امر رسول اللہ فقال لقد صنعها رسول اللہ (ترمذی ج ۱ ص ۱۳۲)

سے منع کیا اور رسول اللہ نے اس کا حکم دیا تو میرے باپ کی پیروی کی جائے گی یا رسول اللہ کے فرمان کی۔ کہا کہ پیروی تو حکم رسول ہی کی ہوگی۔ عبداللہ ابن عمر نے کہا کہ پھر حج تمتع رسول اللہ کے حکم سے نافذ ہوا۔

اعمال حج میں پہلا عمل یہ ہے کہ میقات پر پہنچ کر عمرہ تمتع کی نیت سے احرام باندھا جائے اور صدائے تلبیہ بلند کی جائے۔ امیرالمومنین فرماتے ہیں۔

جاء جبرئیل الی النبی فقال له ان التلبیة شعار المحرم فارفع صوتك للتلبیة (الفقیہ)

جبرئیل پیغمبر اکرم کے پاس آئے اور کہا کہ احرام باندھنے والے کا شعار تلبیہ ہے لہذا بلند آواز سے تلبیہ کہو۔

اور اگر گونگا ہو تو زبان کو حرکت دے اور ہاتھ سے اشارہ کرے۔ حضرت فرماتے ہیں۔

یجزیه تحریك لسانه واشارته باصبعه (مستدرک الوسائل)

اس کے لئے زبان کو حرکت دینا اور انگلی سے اشارہ کرنا کافی ہے۔

احرام کی حالت میں چند چیزیں ممنوع وحرام ہیں حضرت فرماتے ہیں۔

ان المحرم ممنوع من الصید والجماع والطیب ولبس الثیاب المخیطة (مستدرک الوسائل)

احرام باندھنے والے کے لئے شکار کرنا عورت کے قریب جانا خوشبو لگانا اور سلے ہوئے کپڑے پہننا منع ہے۔

صید سے مراد صحرائی جانوروں کا شکار ہے چنانچہ احرام کی حالت میں شکار کرنا شکار کے سلسلہ میں مدد دینا شکار بتلانا اور اس کا گوشت کھانا حرام ہے خواہ شکار کرنے والا احرام باندھے ہوئے نہ ہو۔ علامہ مجلسی نے بحار میں مسند احمد ابن حنبل سے نقل کیا ہے کہ حضرت عثمان اور ان کے چند ساتھی احرام باندھے ہوئے تھے کہ ایک عراقی نے چند بھنے ہوئے تیتر ان کے سامنے پیش کئے حضرت عثمان نے اپنے ہمراہیوں سے کھانے کے لئے کہا مگر انہوں نے انکار کیا۔ حضرت عثمان نے کہا کہ بیشک یہ شکار ہے مگر شکار کرنے والا احرام باندھے ہوئے نہ تھا اور نہ ہم نے اسے شکار کرنے کے لئے کہا تھا۔ ان لوگوں نے کہا کہ حضرت علی اسے جائز نہیں سمجھتے چنانچہ حضرت کی طرف رجوع کیا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ تم میں ضرور کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو اس واقعہ کی گواہی دیں گے کہ جب رسول خدا احرام باندھے ہوئے تھے تو کچھ

۱؎ جامۂ احرام سفید ہو یا رنگین دونوں میں احرام باندھا جا سکتا ہے چنانچہ حضرت عمر نے عبداللہ ابن جعفر کو رنگین احرام باندھے دیکھا تو اس پر اعتراض کیا۔ امیرالمومنین نے فرمایا ہمیں سنن واحکام کی تعلیم دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ رنگین لباس میں احرام باندھا جا سکتا ہے اور اس پر اعتراض غلط ہے۔

لوگ ایک وحشی جانور کی ران آنحضرت کے پاس لائے آپ نے فرمایا کہ ہم محرم ہیں یہ ان لوگوں کو دو جو احرام باندھے ہوئے نہیں ہیں۔ اس واقعہ کی بارہ صحابیوں نے گواہی دی۔ حضرت عثمان سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ پیچ و تاب کھا کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے خیمہ میں چلے آئے۔

محرم کے لئے صحرائی جانوروں کے انڈے اٹھانا اور انہیں کھانا بھی حرام ہے خواہ وہ حدود حرم میں داخل ہوا ہو یا داخل نہ ہوا ہو۔ محمد ابن زبیر کہتے ہیں کہ میں نے جامع دمشق میں ایک بوڑھے آدمی کو دیکھا اور اس سے کہا کہ تم نے ایک زمانہ دیکھا ہے کوئی دیکھا سنا واقعہ بیان کرو اس نے کہا کہ ہم ایک مرتبہ حج کے لئے گئے اور احرام باندھنے کے بعد شتر مرغ کے کچھ انڈے اٹھالئے۔ جب فریضۂ حج سے فارغ ہو کر واپس آئے تو حضرت عمر سے اس کا ذکر کیا۔ وہ ہمیں حضرت علی کے پاس لے گئے اور ان سے کہا کہ ان لوگوں نے احرام باندھنے کے بعد شتر مرغ کے انڈے اُٹھالئے تھے ان کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں۔ حضرت علی نے فرمایا کہ انہوں نے جتنے انڈے اٹھائے تھے اتنے نر اونٹوں کو اونٹنیوں پر چھوڑیں اور ان سے جو بچے پیدا ہوں وہ کفارہ میں دے دیں۔ حضرت عمر نے کہا کہ ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ اونٹنی گابھن نہیں ہوتی۔ فرمایا کہ انڈے بھی تو گندے نکل آیا کرتے ہیں۔

محرم پر صرف صحرائی جانوروں کا شکار کرنا اور کھانا حرام ہے۔ اگر دریائی جانور کا شکار کرے یا کھائے تو اس میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ حضرت فرماتے ہیں۔

لاباس ان یصید المحرم الحیتان — اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ محرم مچھلی کا شکار کرے۔
(مستدرک الوسائل)

عورت سے جہاں مباشرت حرام ہے وہاں نکاح پڑھنا اور نکاح کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ حضرت فرماتے ہیں۔

المحرم لا ینکح ولا ینکح فان نکح فنکاحہ باطل (مستدرک الوسائل) — محرم نہ نکاح پڑھے اور نہ خود نکاح کرے اگر نکاح کرے گا تو نکاح باطل ہوگا۔

خوشبو لگانا جہاں ممنوع ہے وہاں خوشبو سونگھنا اور عطر فروش کے پاس جہاں عطر کی خوشبو آرہی ہو بیٹھنا بھی ممنوع ہے چنانچہ حضرت سے پوچھا گیا کہ کیا حالت احرام میں عطر فروش کے پاس بیٹھا جا سکتا ہے فرمایا۔

لا الا ان یکون مارا (مستدرک الوسائل) — نہیں مگر اس کی طرف سے گذر سکتا ہے۔

احرام کی حالت میں ناخن اور بال کاٹنا منع ہے۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

ان المحرم ممنوع من تقلیم الاظفار وحلق الراس (مستدرک الوسائل) — محرم کے لئے ناخن کاٹنا اور سر مونڈنا منع ہے۔

احرام کی حالت میں گالی گلوچ بکنا لڑائی جھگڑا کرنا اور اپنی برتری جتلانا جائز نہیں ہے۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

التنزہ عن کل شئی نہی اللہ عنہ من الرفث والفسوق والجدال — محرم کو ان چیزوں سے بچنا چاہیئے جن سے اللہ سبحانہٗ نے منع کیا ہے نہ عورت کے قریب جائے نہ گناہ

وان لا یماری به رفیقا وغیرہ (مستدرک الوسائل)

و فسق کے کام کرے اور نہ لڑائی جھگڑا کرے اور نہ اپنے ہمراہی اور نہ کسی اور پر اپنی برتری جتلائے۔

جب محرم مکّہ میں وارد ہو تو عمرۂ تمتع کی نیت سے طواف کرے۔ طواف کی صورت یہ ہے کہ خانہ کعبہ کے گرد سات چکر لگائے اور چکر کا آغاز حجر اسود سے کرے اگر کوئی شخص بھولے سے سات چکروں سے آگے بڑھ جائے تو اگر آٹھواں چکر تمام کرنے کے بعد اسے یاد آئے تو چاہے تو اس زیادتی کو شمار نہ کرے اور طواف تمام کر دے اور چاہے تو طواف مستحب کی نیّت سے چھ چکر اور لگائے۔ اس طرح پہلے سات چکر طواف واجب کے ہوں گے۔ اور دوسرے سات چکر طواف مستحب کے شمار ہوں گے۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

اذا طاف الرجل بالبیت ثمانیۃ اشواط الفریضۃ فاستیقن ثمانیۃ اضاف الیھا ستا (وافی)

جب کوئی شخص خانہ خدا کے گرد طواف واجب کے (سات کے بجائے) آٹھ چکر لگائے اور اسے چکروں کے آٹھ ہونے کا یقین ہو جائے تو چھ چکر اور لگالے۔

طواف کے بعد نماز طواف پڑھے اور سعی و تقصیر کے بعد احرام کھول کر عمرہ تمام کر دے پھر آٹھ ذی الحجہ کو حج کی نیت سے احرام باندھے اور نو ذی الحجہ کو عرفات میں غروب آفتاب تک وقوف کرے۔ حضرت فرماتے ہیں۔

ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم دفع من عرفۃ حین غربت الشمس (مستدرک الوسائل)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب سورج غروب ہوا تو عرفات سے روانہ ہوئے۔

عرفات سے روانہ ہو کر مزدلفہ میں طلوعِ آفتاب تک وقوف کرے اور وہیں پہ مغرب و عشاء کی نمازیں ایک ساتھ پڑھے۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

لما دفع رسول اللّٰہ صلے اللّٰہ علیہ وآلہ من عرفات مرحتی اتی المزدلفۃ فجمع بھا بین الصلواتین باذان واقامتین (مستدرک الوسائل)

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ عرفات سے مزدلفہ میں آئے تو آپ نے دونوں نمازوں کو جمع کیا اور دونوں کیلئے ایک اذان اور دو اقامتیں کہیں۔

دس ذی الحجہ کو مزدلفہ سے منیٰ میں آئے اور جمرہ عقبہ پہ رمی کرنے کے بعد قربانی دے۔ قربانی کے جانور کو لاغر کمزور اور عیب دار نہ ہونا چاہیئے چنانچہ حضرت نے

نھی عن الاضحیۃ بمکسورۃ القرن والعرجاء البین عرجھا والمھزولۃ البین ھزالھا والمقطوعۃ الآذان المصطلمۃ (مستدرک الوسائل)

اس جانور کی قربانی سے منع فرمایا ہے جس کا سینگ ٹوٹا ہوا ہو یا نمایاں طور پر لنگڑاتا ہو یا نمایاں طور پہ لاغر و کمزور ہو یا کان کٹا ہوا ہو۔

جب قربانی کر چکے تو اگر اس سے پہلے حج کر چکا ہے تو تھوڑے سے بال کٹوا لینا کافی ہے اور اگر پہلا حج ہو تو سر منڈوانا واجب ہے اور اگر سر پہ بال نہ ہوں تو پھر بھی سر پر استرا پھیر لینا چاہیئے۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

الاقرع یمر الموسیٰ علی راسہ (وافی) — گنجا آدمی اپنے سر پر استرا پھیر لے۔

اسی دن یا اعمال منیٰ سے فارغ ہو کر مکہ معظمہ میں آئے اور طواف زیارت و نماز طواف بجا لائے چنانچہ حضرت نے آیۂ قرآنی

ولیطوفوا بالبیت العتیق — ان لوگوں کو چاہیئے کہ وہ خانہ کعبہ کا طواف کریں۔

کی تفسیر میں فرمایا۔

ھو طواف الزیارۃ بعد الذبح والحلق (مستدرک الوسائل) — اس سے مراد طواف زیارت ہے جو قربانی اور سر منڈوانے کے بعد کیا جاتا ہے۔

طواف کے بعد صفا و مروہ کے درمیان سعی کرے اور طواف النساء دو رکعت نماز سمیت بجا لائے اور پھر منیٰ میں پلٹ آئے اور گیارہویں اور بارہویں رات منیٰ میں گزارے چنانچہ حضرت نے

نھی ان یبیت احد من الحجیج لیالی منی الا بمنی (مستدرک الوسائل) — اس سے منع فرمایا ہے کہ کوئی شخص منیٰ کی راتوں میں سے کوئی رات منیٰ سے باہر گزارے۔

گیارہویں اور بارہویں ذی الحجہ کو رمی جمرات کرے اور بارہویں ذی الحجہ کو ظہر کے بعد منیٰ سے چل دے جس کے بعد حج تمام ہو جائے گا۔

باب الزکوٰۃ

زکوٰۃ ایک مالی عبادت ہے جو ہر صاحب نصاب پر مقررہ مقدار میں واجب ہے۔ یہ اسلام کے فرائض میں سے ایک اہم فریضہ ہے اس کا تارک فاسق اور منکر دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں:۔

ان الزکوٰۃ جعلت مع الصلوٰۃ قربانا لاھل الاسلام ومن لم یعطھا طیب النفس بھا یرجو بھا من الثمن ما ھو افضل منھا فانہ جاھل بالسنۃ مغبون الاجر ضال العمر طویل الندم بترک امر اللہ عزوجل والرغبۃ عما علیہ صالحو عباد اللہ (وافی)

اہل اسلام کے لئے نماز کے ساتھ زکوٰۃ کو تقرب خداوندی کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے جو شخص بہتر اجر کی امید رکھتے ہوئے قلبی رضامندی کے ساتھ زکوٰۃ ادا نہیں کرتا وہ حکم خدا کی خلاف ورزی اور اللہ کے نیک بندوں کے طریق کار سے روگردانی کی وجہ سے سنت سے بے خبر اجر کے اعتبار سے نقصان رسیدہ گمراہی میں عمر کھونے والا اور طویل ندامت و پشیمانی اٹھانے والا ہے۔

زکوٰۃ نو چیزوں پر واجب ہے۔ سونا چاندی، گیہوں، جو، کشمش، کھجور، اونٹ، گائے، بیل اور گوسفند (بھیڑ، بکری، دنبہ) سونے چاندی اور چوپایوں پر زکوٰۃ اس وقت عائد ہوگی جب وہ گیارہ مہینے ایک آدمی کی ملکیت میں رہیں اور بارھواں مہینہ شروع ہوگا تو زکوٰۃ دی جائے گی۔ حضرت کا ارشاد ہے

لیس فی مال مستفاد زکواۃ حتی یحول علیہ الحول (مستدرک الوسائل) — حاصل کردہ مال پر زکوٰۃ نہیں ہے جب تک اس پر حول نہ گزرے۔

سونے اور چاندی کے لئے ضروری ہے کہ وہ سکہ کی صورت میں ہوں اگر سونے کا سکہ ہو تو اس کا پہلا نصاب بیس دینار (پانچ تولے ساڑھے سات ماشے) ہے اور چاندی کا سکہ ہو تو اس کا پہلا نصاب دو سو درہم (اناتالیس تولے ساڑھے دس ماشے) ہے اگر اس مقدار سے کم ہوں تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

من کان عندہ ذھب لا یبلغ عشرین دینارا او فضۃ لا تبلغ مأتی درھم فلیس علیہ زکواۃ (مستدرک الوسائل) — جس کے پاس سونے کے بیس دینار یا چاندی کے دو سو درہم نہ ہوں اس پر زکوٰۃ نہیں ہے۔

جب سونے یا چاندی کے سکے بقدر نصاب ہوں تو ۱/۴۰ زکوٰۃ کے طور پر دینا واجب ہے۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

ان کان مالہ فضل علی مأتی درھم فلیعط خمسۃ دراھم (مستدرک الوسائل) — جس کا مال دو سو درہم تک بڑھ جائے وہ پانچ درہم (بطور زکوٰۃ) دے۔

اگر کسی کے پاس سونے اور چاندی کے سکے ہوں اور وہ اپنے مقررہ نصاب سے کم ہوں تو ان پر زکوٰۃ نہیں ہے اگرچہ ان دونوں کی مجموعی مالیت بقدر نصاب ہو یا نصاب سے بڑھ جاتی ہو چنانچہ حضرت کا ارشاد ہے۔

لا یجب علیہ ان یضم الذھب الی الفضۃ (مستدرک الوسائل) — زکوٰۃ دینے والے کے لئے ضروری نہیں ہے کہ وہ سونے کو چاندی سے منضم کرے۔

گیہوں جَو کشمش اور خرما پر زکوٰۃ اسوقت واجب ہوگی جب وہ بقدر نصاب ہوں اور ان کا نصاب ۳۰۰ صاع یعنی اکیس من چوبیس سیر ہے۔ اگر یہ چیزیں بارش یا سیلاب سے سینچی گئی ہوں تو زکوٰۃ ۱/۱۰ ہوگی اور اگر ڈول رہٹ وغیرہ سے آبپاشی کی گئی تو زکوٰۃ ۱/۲۰ ہوگی۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

ماسقت السماء او سقی سیحا ففیہ العشر وما سقی بالغرب او الدالیۃ ففیہ نصف العشر (مستدرک الوسائل) — جو بارش یا زمین پر بہنے والے پانی سے سیراب ہو اس کی زکوٰۃ دسواں حصہ ہے اور جو ڈول یا رہٹ سے سیراب کی جائے اس کی زکوٰۃ بیسواں حصہ ہے۔

چوپاؤں میں حول و نصاب کے علاوہ دو شرطیں زائد ہیں ایک یہ کہ وہ سال بھر چراگاہوں میں چریں اور مالک پر ان کی خوراک کا بار نہ ہو اور دوسرے یہ کہ ان سے باربرداری کھیتی باڑی آب کشی وغیرہ کا کام نہ لیا جاتا ہو۔

اونٹوں کا پہلا نصاب پانچ ہے۔ پانچ اونٹوں پر ایک بھیڑ یا بکری دی جائے گی۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

اذا بلغ مالہ خمسا من الابل ففیھا شاۃ (مستدرک الوسائل) — جب اونٹوں کی تعداد پانچ تک پہنچ جائے تو ایک بکری بطور زکوٰۃ دی جائے گی۔

گائے بیل کا پہلا نصاب تیس ہے۔ تیس گائے بیلوں پر ایک بچھڑا یا ایک بچھڑی جو دوسرے سال میں داخل ہو

چکی ہو بطور زکوٰۃ دی جائے گی۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

لیس فی البقر شیئ حتی یبلغ ثلثین فاذا بلغت ثلثین وکانت سائمۃ لیست من العوامل ففیھا تبیع او تبیعۃ (مستدرک الوسائل)

جب تک گائے بیل کی تعداد تیس نہ ہو جائے ان پر زکوٰۃ نہیں ہے اور جب ان کی گنتی تیس ہو جائے اور وہ چرائی پر بسر کرتی ہوں اور بیکار ہوں تو ان کی زکوٰۃ ایک بچھڑا یا ایک بچھڑی ہے جو دوسرے سال میں داخل ہو چکی ہو۔

بھیڑ بکریوں کا پہلا نصاب چالیس ہے۔ چالیس بھیڑوں پر ایک بھیڑ زکوٰۃ میں دی جائے گی۔

باب الخمس

خمس بھی ایک مالی فریضہ ہے جس کی ادائیگی لازم و واجب ہے۔ خمس اولاد عبدالمطلب ہی کو دیا جائے گا۔ کیونکہ شارع نے ان کے لئے زکوٰۃ کو حرام کیا ہے اور اس کا عوض خمس کی صورت میں دیا ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین کا ارشاد ہے۔

نحن واللہ عنی بذوی القربی والذین قرنھم اللہ بنفسہ ونبیہ فقال فان للہ خمسہ وللرسول ولذی القربی والیتمٰی والمساکین وابن السبیل مناخاصۃ ولم یجعل لنا فی سھم الصدقۃ نصیبًا اکرم اللہ نبیہ واکرمنا ان یطعمنا اوساخ ایدی الناس (وافی)

خدا کی قسم (قرآن مجید میں) ذوی القربی سے ہم ہی مراد ہیں جنہیں اللہ نے اپنے اور اپنے نبی کے ساتھ (خمس میں) شریک کیا ہے چنانچہ اللہ کا ارشاد ہے "مال کا پانچواں حصہ اللہ رسول اور قرابتداروں یتیموں مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے" یہ سب ہم ہی میں سے ہیں۔ اللہ نے ہمارے لئے صدقہ میں حصہ نہیں رکھا اور ہمیں اس سے بالاتر قرار دیا ہے کہ ہمیں لوگوں کے ہاتھوں کا میل کھلائے۔

خمس جنگ کے ذریعہ حاصل ہونے والے اموال کانوں سے نکلنے والی اشیاء دفینوں اور سمندر میں غوطہ لگا کر دستیاب ہونے والی چیزوں پر واجب ہے۔ امیرالمومنین کا ارشاد ہے۔

الخمس یجری من اربعۃ وجوہ من الغنائم التی یصیبھا المسلمون من المشرکین ومن المعادن ومن الکنوز ومن الغوص (وسائل الشیعہ)

خمس چار وجوہ پر عائد ہوتا ہے اس مال پر جو مسلمانوں کو (جنگ کے دوران) مشرکوں سے دستیاب ہو اور کانوں اور دفینوں سے جو چیزیں ملیں اور غوطہ لگا کر جو اشیاء حاصل ہوں۔

ان اشیاء کے علاوہ ذرائع کسب و معیشت سے سال کے اخراجات وضع کرنے کے بعد جو بچے اور اس زمین سے جو کافر ذمی مسلمان سے خریدے اور اس مال میں سے جس میں حلال و حرام ملا جلا ہو خمس نکالنا ضروری ہے چنانچہ ایک شخص نے امیرالمومنین سے عرض کیا کہ یا امیرالمومنین میں حلال و حرام کا امتیاز کئے بغیر کمائی کرتا رہا ہوں اور اب میں

تائب ہوچکا ہوں اور میرے پاس مال حلال بھی ہے اور مال حرام بھی مگر میں ان دونوں میں امتیاز نہیں کرسکتا۔ اب مجھے کیا کرنا چاہیئے حضرت نے فرمایا۔

اخرج خمس مالك فان الله عزوجل قد رضی عن الانسان بالخمس وسائر المال كله لك حلال (الفقیر)

اپنے مال میں سے خمس نکال ڈالو باقی مال تمہارے لئے حلال ہے اس لئے کہ خدائے بزرگ و برتر خمس دینے پر آدمی سے راضی ہوجاتا ہے۔

خمس کی تقسیم اس طرح ہوگی کہ اس کے چھ حصے کئے جائیں گے۔ تین حصے اللہ رسول اور امام کے یہ حصے سہم امام کہلاتے ہیں۔ اور تین حصے اولاد عبدالمطلب کے یتیموں مسکینوں اور مسافروں کے یہ حصے سہم سادات کہلاتے ہیں پہلے تینوں حصوں کا مالک امام زمانہ ہے اور ان کی غیبت میں یہ تینوں حصے مجتہد جامع الشرائط کے سپرد کئے جائیں گے تاکہ وہ ان موارد پر صرف کرے جن سے دین کو نشر و فروغ حاصل ہو اور بقیہ تین حصے بنی ہاشم کے یتیموں فقیروں اور راہ مسافروں کو جو مسافرت میں ضرورت مند ہوگئے ہوں دئے جائیں گے حضرت کا ارشاد ہے

هذا الخمس علی ستة اجزاء فياخذ الامام منها سهم الله وسهم الرسول وسهم ذی القربی ثم يقسم الثلثة السهام الباقية بين يتامی آل محمد مساكينهم وابناء سبيلهم (وسائل الشیعہ)

خمس کے چھ حصے ہیں اللہ رسول اور ذی القربی کا حصہ یہ تینوں حصے امام لے گا اور باقی تین حصے سادات کے یتیموں مسکینوں اور مسافروں پر تقسیم کئے جائیں گے۔

باب الجہاد

کفار و مشرکین اور امام برحق سے بغاوت کرنے والوں کے خلاف حرب و پیکار کا نام جہاد ہے۔ یہ ایک ایسا فریضہ ہے جس سے حوزۂ اسلام کو دشمن کی تاخت و تاراج سے محفوظ رکھا جاسکتا ہے اور اسلام کی ترقی و ترویج کی راہیں ہموار کی جاسکتی ہیں اگر دشمن کی قوت و طاقت کو کچلا اور ان کے شرانگیز اقدامات کو روکا نہ جائے تو نہ دین فروغ پاسکتا ہے اور نہ امن و امان بحال ہوسکتا ہے۔ امیرالمومنین کا ارشاد ہے۔

والله ما صلحت دنيا ولا دين الا به (وافی)

خدا کی قسم جہاد کے بغیر نہ دنیا سدھر سکتی ہے اور نہ دین۔

جہاد کے صحیح مورد و محل کی تشخیص نبی یا امام ہی کرسکتا ہے اس لئے پیغمبر اکرم کے بعد اذن امام ضروری ہے۔ تاکہ غلط کشت و خون سے محفوظ رہا جاسکے۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

يا كميل لا غزو الا مع امام عادل (مستدرک الوسائل)

اے کمیل جہاد امام عادل ہی کے ساتھ ہوکر کیا جاسکتا ہے۔

جہاد صرف بالغ اور آزاد مردوں پر واجب ہوتا ہے اور غلاموں عورتوں اور بچوں پر سے ساقط ہے۔ حضرت فرماتے ہیں۔

ليس على العبيد جهاد ما استغنوا عنهم

غلاموں پر جبکہ ان کے بغیر کام نکل سکتا ہو اور عورتوں

ولا علی النساء ولا علی من لم یبلغ الحلم (مستدرک الوسائل)
اور نابالغ بچوں پر جہاد واجب نہیں ہے۔

جہاد سے منہ موڑنا غضب الٰہی کا باعث اور میدان جنگ سے فرار کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

الفرار من الزحف من الکبائر (مستدرک الوسائل)
جنگ سے فرار کبائر میں داخل ہے۔

امیرالمومنین نے فرار کو کفر سے بھی تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ جنگ احد میں جب رسول اللہ نے لوگوں کو میدان چھوڑتے دیکھا تو حضرت علی سے کہا اے علی تم ان بھاگنے والوں کے ساتھ کیوں نہیں گئے آپ نے کہا۔

یا رسول اللہ ارجع کافر بعد اسلامی (مستدرک الوسائل)
یا رسول اللہ کیا اسلام کے بعد میں کفر کی طرف پلٹ جاتا۔

یونہی دشمن کے آگے ہتھیار ڈالنا اور اپنے کو اس کے حوالے کر دینا حمیت اسلامی کے خلاف ہے۔ ایسے لوگوں کو قید و بند سے آزاد کرانے کے لئے فدیہ بیت المال سے نہیں دیا جائے گا۔ امیرالمومنین فرماتے ہیں۔

من استاسر من غیر جراحۃ مثقلۃ فلا یفدی من بیت المال ولکن یفدی من مالہ ان احب اہلہ (وافی)
جو شخص شدید زخمی ہوئے بغیر خود کو دشمن کے قبضہ میں دے دے تو اسے آزاد کرانے کے لئے فدیہ کی رقم بیت المال سے نہیں دی جائے گی البتہ اس کے گھر والے چاہیں تو اس کے مال میں سے دے سکتے ہیں۔

جن لوگوں کے مقابلہ میں محاذ جنگ قائم کیا جاتا ہے وہ تین گروہوں پر منقسم ہیں۔

پہلا گروہ کفار و مشرکین کا ہے ان کے مقابلہ میں اترنے سے پہلے ضروری ہے کہ انہیں اسلام لانے کے لئے کہا جائے اگر وہ دعوتِ اسلام رد کر دیں تو پھر ان سے جنگ کا جواز پیدا ہو جائے گا۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

لا یغزی قوم حتی یدعوا (مستدرک الوسائل)
جب تک کفار کو دعوت اسلام نہ دی جائے ان سے جنگ نہیں کی جائے گی۔

امیرالمومنین فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ نے مجھے یمن روانہ فرمایا تو فرمایا۔

یا علی لا تقاتلن احدا حتی تدعوہ الی الاسلام (وافی)
اے علی جب تک اسلام کی دعوت نہ دے لو کسی سے جنگ نہ چھیڑو۔

اسلام نے جنگ و قتال میں ان حربوں سے بشدت منع کیا ہے جو دورِ جاہلیت میں بروئے کار لائے جاتے تھے چنانچہ دشمن کی ہلاکت و تباہی کے لئے کنوؤں چشموں اور جانوروں کو سیراب کرنے والے تالابوں میں زہر کی آمیزش کر دی جاتی تھی۔ اسلام نے اس کی قطعاً اجازت نہیں دی ہے چنانچہ امیرالمومنین فرماتے ہیں کہ

نھی رسول اللہ ان یلقی السم فی بلاد المشرکین (وافی)
رسول اللہ نے مشرکین کے شہروں میں زہر ڈالنے سے منع فرمایا ہے۔

زمانہ جاہلیت میں حریف کے لاشہ کو عریاں کر کے گھسیٹا جاتا اور ناک کان اور دوسرے اعضاء کاٹ کر گلے میں آویزاں کئے جاتے۔ اسلام اس قسم کے بہیمانہ حرکات کی اجازت نہیں دیتا چنانچہ امیرالمومنین فرماتے ہیں۔

لا تکشفوا عورۃ ولا تمثلوا بقتیل (وافی)
کسی کی پردہ دری نہ کرو اور نہ مرنے کے بعد کسی کے اعضاء و جوارح کاٹو۔

دشمن کو امان دینے اور جان کے تحفظ کا وعدہ کرنے کے بعد اس پر ہاتھ اٹھانا ناجائز ہے۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

من ائتمن رجلا علی دمہ ثم خاس بہ فانا من القاتل بری وان کان المقتول فی النار (وافی)
جو کسی کو امان دے اور پھر دھوکے سے اسے قتل کر دے تو میں اس سے بیزار ہوں اگرچہ مقتول دوزخ ہی میں جائے گا۔

دوسرا گروہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ اور مجوس) کا ہے۔ اگر یہ دعوت اسلام قبول کر لیں تو بہتر ورنہ ان پر جزیہ عائد کیا جائے گا اگر جزیہ سے انکار کر دیں یا جزیہ قبول کرنے کے بعد اس کی خلاف ورزی کریں تو ان سے جنگ کی جائے گی اور درصورتیکہ معاہدہ کے پابند رہیں ان کے جان و مال کی حفاظت کی جائے گی اور ان سے جنگ کرنا جائز نہ ہوگا حضرت کا ارشاد ہے۔

اوفوا بعہد من عاہدتم (مستدرک الوسائل)
جن سے کوئی معاہدہ کیا ہو اس معاہدہ کو پورا کرو۔

تیسرا گروہ ان باغیوں کا ہے جو امام برحق کے خلاف آمادہ بغاوت ہو کر میدان جنگ میں اتر آئیں۔ ان باغیوں میں سے ایک گروہ وہ ہے جس کے پیچھے فوجی طاقت کا ذخیرہ نہ ہو جیسے اصحاب جمل کہ ان کے پیچھے نہ قوت و طاقت تھی اور نہ انہیں تسلط و اقتدار حاصل تھا کہ وہاں سے انہیں کمک پہنچ سکتی۔ ان کے بارے میں حضرت کا طرز عمل یہ رہا کہ جب تک ان کی طرف سے ابتداء نہیں ہوی۔ آپ نے اپنی سپاہ کو لڑنے کی اجازت نہیں دی اور اسے ہدایات دیتے ہوے فرمایا۔

لا تقاتلوھم حتی یبدؤکم فانکم بحمد اللہ علی حجۃ وترککم ایاھم حتی یبدؤکم حجۃ اخری لکم علیھم (مستدرک الوسائل)
جب تک وہ پہل نہ کریں تم ان سے جنگ نہ کرنا کیونکہ تم بحمد اللہ دلیل و حجت رکھتے ہو اور تمہارا انہیں چھوڑ دینا کہ وہ پہل کریں یہ ان پر دوسری حجت ہو گی۔

ان باغیوں کے پسپا ہونے کے بعد بھاگنے والوں کا تعاقب کرنے زخمیوں کو ٹھکانے لگانے اور اسیروں کو قتل کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے چنانچہ حضرت نے جنگ کے فوراً بعد اعلان کیا۔

لا تجیزوا علی جریح ولا تتبعوا مدبرا ومن اغلق بابہ فھو آمن ومن القی سلاحہ فھو آمن (وافی)
کسی زخمی پر ہاتھ نہ اٹھانا کسی پیٹھ پھرانے والے کا پیچھا نہ کرنا جو دروازہ بند کرے اور جو ہتھیار رکھ دے وہ محفوظ ہے۔

قلبی تنفر اگرچہ نہی عن المنکر کا ادنیٰ درجہ ہے مگر یہ بھی اثر انداز ہوتا ہے چنانچہ اگر کسی کے احساسات مردہ نہ ہوں تو دوسروں کی پیشانیوں کی شکنیں اوران کا متنفرانہ رویہ دیکھ کر اپنے اندر محاسبہ کا ایک جذبہ پیدا کرتا ہے جو ایک وقت اسے برائیوں سے دستبردار ہونے پر آمادہ کر دیتا ہے۔ اسی بنا پر امیرالمومنین نے عصیاں کاروں سے خندہ روئی و کشادہ پیشانی سے پیش آنے سے منع فرمایا ہے تاکہ ان کا ضمیر انہیں جھنجھوڑے اور گناہ کے ارتکاب کی جرأت و جسارت نہ بڑھے۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

ادنی الانکار ان تلقی اھل المعاصی بوجوہ مکفھرۃ (تہذیب)	نہی عن المنکر کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ بدکرداروں سے تیوریاں چڑھا کر پیش آؤ۔

ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فائدہ ہی کیا جبکہ ہر شخص اپنے افعال و اعمال کا خود جواب دہ ہے اگر کوئی اچھا کام کرتا ہے تو اس کا فائدہ اسی کو پہنچتا ہے اور کوئی بُرے کام کا مرتکب ہوتا ہے تو وہ خود ہی اس کی پاداش سے دوچار ہوتا ہے نہیں نہ کسی کے اچھے کاموں سے فائدہ پہنچتا ہے اور نہ کسی کے بُرے کاموں سے نقصان، لہٰذا کسی کو اچھائی کا حکم دے کر یا بُرائی سے منع کرکے اس کے کاموں میں دخل در اندازہونے اور اس کی خفگی و ناراضگی مول لینے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ یہ نظریہ سراسر غلط ہے اس لئے کہ ایک غلط معاشرہ میں انسان خود بھی بے راہ ہوئے بغیر نہیں رہتا اور اگر برائیوں کی آلودگیوں سے پاک وصاف رہنا بھی چاہے تو اس کے لئے معاشرہ کے گرد و پیش کے اثرات سے بچ نکلنا انتہائی مشکل ہوگا اس لئے کہ اچھی زندگی اچھے ماحول میں پروان چڑھتی ہے اور غیر اخلاقی ماحول میں اخلاقی زندگی کی سانسیں اکھڑ جاتی ہیں اور اچھا معاشرہ اسی صورت میں تشکیل پذیر ہو سکتا ہے جب اپنی سود و بہبود کے ساتھ دوسروں کی فلاح و اصلاح کی بھی فکر کی جائے اور نیکی کو فروغ دینے اور برائی کو ختم کرنے کے لئے امکانی مساعی سے دریغ نہ کیا جائے تاکہ جس معاشرہ میں وہ زندگی بسر کر رہا ہے وہ اخلاقی برائیوں سے پاک و صاف رہے۔ اگر نیکی کی طرف دعوت دینے اور برائی سے روکنے کا سلسلہ ختم ہو جائے تو پھر برائیوں کے سیل رواں پر بند نہ باندھا جا سکے گا اور ہر قسم کی بُرائی اپنے عروج پر پہنچ جائے گی اور جس معاشرہ میں برائیاں عام ہو جائیں وہ قانون فطرت کے ماتحت تباہ و برباد ہوئے بغیر نہیں رہتا اور ظالم حکمرانوں کے شکنجے میں جکڑ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین کا ارشاد ہے۔

لا تترکوا الامر بالمعروف والنھی عن المنکر فیولی اللہ امورکم شرارکم ثم تدعون فلا یستجاب لکم دعاؤکم (مستدرک الوسائل)	امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ترک نہ کرو ورنہ تم میں سے بدترین لوگوں کو اللہ تم پر مسلط کر دے گا۔ پھر دعائیں مانگتے رہو گے اور تمہاری دعائیں شرف قبولیت حاصل نہ کریں گی۔

ولایت و براءت

ولایت کے معنی یہ ہیں کہ دوستان خدا (انبیاء و آئمہ) سے محبت و دوستی رکھی جائے اور براءت کے معنی یہ ہیں کہ دشمنان خدا (کفار و منافقین) سے نفرت و بیزاری کا اظہار کیا

جائے۔ اس ولایت وبراءت کو تولا و تبرا سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں اسلئے کہ دوستانِ خدا و دشمنانِ خدا دونوں ایک دوسرے .... کی ضد اور ان کے اطوار و اعمال ایک دوسرے کے مخالف و متضاد ہیں اس لئے ایک سے وابستگی کا تقاضا یہ ہے کہ دوسرے سے علیحدگی اختیار کی جائے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک سے دوستی کا دم بھرا جائے اور اس کے دشمن سے بھی دوستی کی پینگیں بڑھائی جائیں بلکہ ایک سے ملا جائے گا تو دوسرے کو چھوڑنا پڑے گا کیونکہ دوست کا دشمن اور دشمن کا دوست، دوست نہیں ہو سکتا کہ دونوں سے رابطۂ اتحاد و الفت قائم رکھا جاسکے۔ امیرالمومنین کا ارشاد ہے۔

اصدقاؤك ثلاثة واعداؤك ثلاثة فا صدقاؤك صديقك وصديق صديقك وعدو عدوك واعداؤك فعدوك وعدو صديقك وصديق عدوك (نہج البلاغہ)

تین قسم کے تمہارے دوست ہیں اور تین قسم کے دشمن، دوست یہ ہیں تمہارا دوست تمہارے دوست کا دوست اور تمہارے دشمن کا دشمن، اور دشمن یہ ہیں تمہارا دشمن تمہارے دوست کا دشمن اور تمہارے دشمن کا دوست۔

ایک شخص نے امیرالمومنین سے کہا کہ میں آپ کو بھی دوست رکھتا ہوں اور فلاں شخص کو بھی آپ نے یہ سنا تو فرمایا۔

الآن انت اعور، اما ان تعمى واما ان تبصر

اس صورت میں تم یک چشم ہو یا دوسری آنکھ کو پھوڑ کر نابینا ہو جاؤ یا دونوں آنکھوں سے دیکھو۔

مقصد یہ تھا کہ اگر میرے ساتھ میرے دشمن و مخالف کو بھی دوست رکھتے ہو تو مجھے بھی دشمن رکھو اور اس طرح مکمل طور پر اندھے ہو جاؤ یا صرف مجھے دوست رکھو اور پورے بینا و بالبصیرت ہو جاؤ۔

ایک طبقہ سے دوستی اور اس کے حریف و مخالف طبقہ سے اظہار بیزاری میں یہ حکمت مضمر ہے کہ انسان جس کو دوست رکھتا ہے اس کے طرز بود و ماند رفتار و گفتار اور عمل و کردار کو بھی دوست رکھتا ہے اور جس کی طرف سے تنفر رکھتا ہے اس کے حرکات و سکنات کو بھی نفرت کی نگاہوں سے دیکھتا ہے لہٰذا جسے دوست رکھے گا اس کے اخلاق و عادات اور افعال و اعمال کی پیروی بھی کرے گا اور جس سے متنفر ہوگا اس کے طور طریقوں سے بھی اجتناب برتے گا۔

اسلام میں اہلبیت رسولؐ سے محبّت و وابستگی کا حکم اسی لئے دیا گیا ہے کہ ان کے قول و فعل کا اتباع کیا جائے اور ان کے مخالفین کے طرزِ عمل سے علیحدگی اختیار کی جائے کیونکہ محبّت کا تقاضا اتباع ہے۔ اگر ہم محبّت اہلبیت کا دعویٰ کریں اور ان کے احکام کی پابندی نہ کریں یا ان کے دشمنوں سے اظہار نفرت کریں اور طرز عمل انہی کا سا اختیار کریں تو ہم نے نہ محبّت کے تقاضوں کو پورا کیا اور نہ نفرت و بیزاری کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہوئے۔ اس لئے کہ اتباع ہے تو محبت و دوستی بھی ہے اور اتباع نہیں ہے تو محبّت و دوستی بے سند ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین نے اتباع کو محبت کا معیار قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے۔

من احبنا فليعمل بعملنا

جو ہمیں دوست رکھتا ہے اسے چاہیئے کہ ہمارے اعمال کے مطابق عمل کرے۔

ولا تبع قفیزا من حنطة بقفیزین من شعیر (وافی)	سے دو اور ایک ہاتھ سے لو اور گیہوں کی ایک مقدار کو جو کی دوگنی مقدار کے عوض فروخت نہ کرو۔

حضرت نے گیہوں اور جو کے تبادلہ کا ذکر فرمایا ہے اور گیہوں اور جو سودی معاملات میں ایک ہی جنس شمار ہوتے ہیں چنانچہ کافی میں ہے۔

کان امیر المومنین یعد الشعیر بالحنطة	امیر المومنین گیہوں اور جو کو ایک ہی جنس شمار کرتے تھے۔

اگر سونے کو سونے یا چاندی کے عوض یا چاندی کو چاندی یا سونے کے عوض فروخت کیا جائے تو یہ معاملہ اس صُورت میں صحیح ہو گا جب بائع و مشتری ایک دوسرے سے الگ ہونے سے پہلے مال ایک دوسرے کے سپرد کر دیں۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

لا یبتاع رجل فضة بذهب الایدا بید ولا یبتاع ذهبا بفضة الایدا بید (وافی)	کوی چاندی کو سونے کے بدلے اور سونے کو چاندی کے عوض نہ خریدے مگر موقع ہی پر ایک ہاتھ سے دے اور ایک ہاتھ سے لے۔

اگر خریدار قیمت ادا کر دے اور مال کچھ عرصہ کے بعد دینا قرار پائے تو یہ بیع سلف ہے جو اس صورت میں صحیح ہے جب مال کی مقدار اور مال دینے کی مدت متعین ہو اگر مدت کی تعیین نہ ہو۔ مثلاً یہ کہہ دیا جائے کہ جب فصل کٹے گی یا جب فصل اٹھائی جائے گی تو مال دیا جائے گا تو یہ مدت مبہم ہو گی اور معاملہ صحیح نہ ہو گا حضرت کا ارشاد ہے۔

لا باس بالبیع السلف بکیل معلوم الی اجل معلوم ولا یسلم الی دیاس اوحصاد (وافی)	بیع سلف میں کوئی مضائقہ نہیں ہے مگر مال کی مقدار اور مدت مقرر ہونا چاہیئے۔ فصل کے کٹنے یا بالیوں سے دانوں کے نکلنے پر نہ چھوڑا جائے۔

اگر بائع مقررہ وقت پر مال مہیّا نہ کر سکے اور خریدار مزید توقف کرنا چاہتا ہو تو وہ اپنی دی ہوی رقم واپس لے سکتا ہے اور اگر بائع بازار کے اتار چڑھاؤ کے پیش نظر اس رقم پر کچھ اضافہ کر کے دینا چاہے تو وہ اضافہ ربا میں شمار ہو گا لہٰذا اس کا لینا جائز نہ ہو گا۔ چنانچہ امیر المومنین فرماتے ہیں۔

من اشتری طعاما او علفا الی اجل فان لم یجد شرطه واخذ ورقا لا محالة قبل ان یاخذ شرطه فلا یاخذ الا راس ماله (استبصار)	جو شخص مدت کی تعیین کے ساتھ غلہ یا چارہ خریدے اور وقت پر یہ چیزیں حسب معاہدہ مہیّا نہ ہو سکیں اور مزید توقف نہ کرنا چاہتا ہو تو وہ صرف اصل رقم کے واپس لینے کا مجاز ہو گا۔

اگر خریدار بائع کو پابند کرنے کے لئے کچھ رقم پیشگی دے تو یہ رقم قیمت میں وضع ہو گی اور معاملہ صحیح قرار پائے گا۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

لا یجوز العربون الا ان یکون ھذا من الثمن (تھذیب)	پیشگی دی ہوی رقم اسی صورت میں جائز ہو گی جب وہ قیمت میں شامل کی جائے ۔

باب الودیعہ کسی کے پاس کوی چیز بطور امانت رکھنا ودیعت کہلاتا ہے ۔ جب امین اس کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کرتے تو اس پر اس کی حفاظت لازم اور مالک کے طلب کرنے پر فوراً واپس کرنا ضروری ہے خواہ امانت رکھوانے والا مسلمان ہو یا کافر ۔ امیر المومنین کا ارشاد ہے ۔

لا ایمان لمن لا دیانۃ لہ (مستدرک الوسائل)	جس میں امانتداری نہیں وہ ایمان سے عاری ہے ۔

اگر حفاظت کے سروسامان کے باوجود وہ چیز ضائع ہو جائے تو امانت رکھنے والا اس کا ضامن نہ ہو گا چنانچہ امیر المومنین کا ارشاد ہے ۔

لیس علی المؤتمن ضمان (مستدرک الوسائل)	امانت رکھنے والا کھو جانے کی صورت میں ضامن نہیں ہے ۔

ایک مرتبہ امیر المومنین غسل کے لئے حمام میں گئے اور کپڑے حمام کے مالک کے پاس رکھ دئے جب نہا کر باہر نکلے تو دیکھا کہ کپڑے غائب ہیں آپ نے فرمایا کہ کپڑے حمام والے کے پاس بطور امانت تھے لہذا وہ ضامن نہیں ہے ۔

دو آدمیوں نے کسی کے پاس کچھ رقم امانت رکھوائی ۔ ایک کا ایک دینار تھا اور دوسرے کے دو دینار تھے ۔ ان میں سے ایک دینار کھو گیا ۔ یہ معاملہ حضرت کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ جس کے دو دینار تھے اسے ایک دینار دے دیا جائے اور دوسرا دینار دونوں میں آدھوں آدھ تقسیم کیا جائے ۔

حضرت نے یہ فیصلہ اس بنا پر کیا کہ یہ معلوم نہ ہو سکتا تھا کہ ایک دینار والے کا دینار ضائع ہوا ہے یا دو دینار والے کا ۔ مگر ایک دینار بہر حال دو دینار والے کا تھا اس لئے ایک دینار اسے دے دیا گیا اور دوسرے دینار کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ ان دونوں میں سے کس کا ہے لہذا وہ دونوں میں آدھوں آدھ بانٹ دیا گیا کیونکہ تقاضائے عدل کو بروئے کار لانے کی اس کے علاوہ کوئی صورت نہ تھی ۔

دو آدمیوں نے ایک قرشیہ عورت کے پاس سو دینار بطور امانت رکھے اور کہا کہ اگر ہم دونوں ایک ساتھ آئیں تو یہ امانت واپس کی جائے اور اگر ہم میں سے ایک آئے تو اسے یہ رقم نہ دی جائے ۔ جب اس امانت پر ایک سال کا عرصہ گزرا تو ان میں سے ایک اس قرشیہ کے پاس آیا اور کہا کہ میرا ساتھی انتقال کر چکا ہے لہذا وہ امانت مجھے واپس کر دی جائے ۔ اس قرشیہ نے کہا کہ یہ معاہدہ کے خلاف ہے اور رقم کے دینے سے انکار کیا ۔ جب اس نے اصرار کیا اور اس قرشیہ کے عزیز و اقارب سے بھی کہلوایا تو اس نے وہ دینار اس کے حوالے کر دئے ۔ اس واقعہ کے ایک سال بعد دوسرا آدمی اس قرشیہ کے پاس آیا اور امانت کی واپسی کا مطالبہ کیا اس نے کہا کہ تمہارا ساتھی یہ کہہ کر امانت واپس لے جا چکا ہے کہ تم مر چکے ہو ۔ کہا کہ میں تمہارے سامنے زندہ و سلامت موجود ہوں وہ دینار میرے حوالے کرو ۔ جب جھگڑا بڑھا

تو تصفیہ کے لئے حضرت عمر کے پاس آئے۔ حضرت عمر نے اس قرشیہ کے خلاف فیصلہ کیا اور اسے ادائے امانت کا ذمہ دار قرار دیا اس قرشیہ نے کہا کہ آپ اس کا فیصلہ حضرت علی کے سپرد کریں وہ جو فیصلہ کریں گے مجھے منظور ہو گا۔ جب یہ معاملہ حضرت کے سامنے پیش ہوا تو آپ سمجھ گئے کہ ان دونوں نے دوبارہ رقم وصول کرنے کے لئے یہ کھیل کھیلا ہے آپ نے اس شخص سے کہا کہ کیا تم نے یہ طے نہیں کیا تھا کہ تم دونوں ایک ساتھ آؤ گے تو امانت کے واپس لینے کے حقدار ہو گے کہا کہ ہاں یہ طے پایا تھا فرمایا کہ پھر تم اپنے ساتھی کو لاؤ اور اپنی امانت واپس لے جاؤ۔ وہ یہ دیکھ کر کہ اس کے فریب کا پردہ چاک ہو چکا ہے اپنے دعوی سے دستبردار ہو گیا۔

باب الوصیۃ وصیت یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی میں ایسی چیز کی سفارش کر جائے جس پر اپنے مرنے کے بعد عملدرآمد چاہے۔ اس وصیت کا تعلق کبھی کسی کام کی انجام دہی سے ہوتا ہے جیسے تجہیز و تکفین ادائے صوم و صلوٰۃ وغیرہ اور کبھی مال سے تعلق ہوتا ہے جیسے یہ کہ اس کے مرنے کے بعد فلاں شخص کو اتنا مال دیا جائے۔ اسلام نے امور خیر کے سلسلہ میں اگرچہ وصیت کو بڑی اہمیت دی ہے مگر اس کے ساتھ وارثوں کے مالی حقوق کا تحفظ بھی ملحوظ رکھا ہے اس طرح کہ ترکہ کی ایک تہائی سے زائد کی وصیت کو ناقابل عمل قرار دیا ہے چنانچہ امیرالمومنین کا ارشاد ہے۔

من اوصی بوصیۃ نفذت من ثلثہ (مستدرک الوسائل)	جو شخص وصیّت کرے تو وہ اس کے ترکہ کے تہائی حصہ میں نافذ ہوگی۔

البتہ اگر وارث اجازت دے دیں تو ایک تہائی سے زائد میں بھی وصیت کا نفاذ ہو سکتا ہے اور درصورتیکہ مرنے والے کا کوئی وارث ہی نہ ہو تو وہ تمام مال کی وصیت کر سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت نے اس شخص کے بارے میں جس کا دور و نزدیک کا کوئی رشتہ دار نہ تھا فرمایا۔

یوصی بمالہ حیث شاء من المسلمین فی المساکین وابن السبیل (مستدرک الوسائل)	وہ مسلمانوں کے ناداروں اور مسافروں کے لیے جہاں چاہے اپنے مال کے بارے میں وصیت کرے۔

اگر میت کے ذمہ قرض ہو تو مخارج تجہیز و تکفین اور ادائے قرض کے بعد وصیت پر عمل کیا جائے گا۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

اول مایبداء من ترکۃ المیت بعد الکفن بالدین ثم الوصیۃ ثم المیراث (مستدرک الوسائل)	دفن و کفن کے اخراجات کے بعد میت کے ترکہ میں سے پہلے قرض ادا کیا جائے گا پھر وصیت پر عمل ہو گا اور پھر میراث کی نوبت آئے گی۔

اگر وصیت کرنے والا تہائی مال کی وصیّت کرے اور پھر غلطی سے کسی کے ہاتھوں قتل ہو جائے تو اس کی دیت کے تہائی حصہ میں بھی وصیت نافذ ہوگی چنانچہ ایک ایسے شخص کے بارے میں حضرت نے فرمایا۔

ثلث دیتہ داخل فی وصیتہ (مستدرک الوسائل)	دیت کا تہائی حصہ بھی وصیت میں داخل ہو گا۔

اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ مرنے والا میرے لئے اتنے مال کی وصیت کر گیا ہے تو اس کا دعویٰ دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں یا چار عورتوں کی گواہی سے ثابت ہوگا اور اگر تین عورتیں گواہی دیں تو تین چوتھائی میں دو عورتیں

گواہی دیں تو نصف میں اور ایک عورت گواہی دے تو ایک چوتھائی میں وصیّت نافذ ہوگی۔ چنانچہ امیرالمومنین کے سامنے وصیت کا ایک دعویٰ پیش ہوا اور وصیت کی گواہی ایک عورت نے دی۔ آپ نے ایک چوتھائی میں وصیت نافذ کی اور تین چوتھائی میں اسے کالعدم قرار دیا۔

اگر وصیت مبہم الفاظ میں ہو اس طرح کہ واضح طور پر مال کی مقدار معین کرنے کے بجائے یہ کہے کہ میرے مال میں سے ایک سہم (حصہ) یا ایک جزو یا ایک شئے صدقہ کردی جائے یا فلاں شخص کو دی جائے تو پہلی صورت میں مال کا آٹھواں حصہ حسبِ وصیّت صرف کیا جائے گا چنانچہ ایک شخص نے وصیّت کی کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے مال کا ایک حصہ صدقہ کردیا جائے مگر حصّہ کا تعیّن نہ کیا اس کے وارثوں نے حضرت کی طرف رجوع کیا آپ نے فرمایا کہ مال کا آٹھواں حصہ صدقہ میں دے دیا جائے اور اس آیت کی تلاوت کی۔

انما الصدقات للفقراء والمساکین والعاملین علیها والمولفة قلوبهم وفی الرقاب والغارمین و فی سبیل الله وابن السبیل	صدقہ فقیروں محتاجوں اور اس کے کارندوں کے لئے ہے اور ان کے لئے جن کی دلجوئی مقصود ہے اور غلاموں کو چھڑانے قرضداروں کا قرضہ چکانے خدا کی راہ میں صرف کرنے اور پردیسیوں کے لئے۔

پھر فرمایا کہ اس آیت میں صدقات کے آٹھ حصے بیان کئے گئے ہیں لہذا مال کا ایک حصہ اس کا آٹھواں حصہ ہوگا۔

دوسری صورت میں ساتواں حصّہ دیا جائے گا چنانچہ ایک شخص نے اپنے مال کے ایک جز کی وصیت کی مگر اس جزء کی مقدار بیان نہ کی اس کے مرنے کے بعد اس کے وارثوں میں جزء کے بارے میں اختلاف ہوا جب کسی نتیجہ پر نہ پہنچے تو حضرت سے استفسار کیا آپ نے فرمایا کہ اس کے مال کا ساتواں حصہ وصیت کے مطابق صرف کیا جائے اور یہ آیت پڑھی۔

لها سبعة ابواب لکل باب منهم جزء مقسوم	اس کے سات دروازے ہوں گے ان میں سے ہر گروہ کے حصہ میں ایک دروازہ آئے گا۔

پھر فرمایا کہ اس آیت میں ساتویں حصے پر جزء کا اطلاق ہوا ہے۔

تیسری صورت میں چھٹا حصہ دیا جائے گا چنانچہ امام زین العابدین علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص نے اپنے مال میں سے شئے کی وصیت کی ہے اس شئے کا اطلاق کتنی مقدار پر ہوگا آپ نے فرمایا۔

الشئ فی کتاب علی واحد من ستة (الفقیہ)	کتاب علی میں شئے سے مراد چھٹا حصہ ہے۔

ایک شخص نے وصیت کی کہ میرے بعد میرے قدیم غلاموں کو آزاد کردیا جائے مگر وارث یہ طے نہ کرسکے کہ کتنی مدت کے گزرنے پر وہ قدیم کہے جاسکتے ہیں۔ انہوں نے حضرت کی طرف رجوع کیا آپ نے فرمایا کہ ہر وہ غلام آزاد کردیا جائے جو چھ مہینے تک اس کی ملکیت میں رہ چکا ہو اور اس آیت کی تلاوت فرمائی۔

والقمر قدرناه منازل حتی	ہم نے چاند کی منزلیں مقرر کردی ہیں یہاں تک کہ

عاد کالعرجون القدیم   وہ کھجور کی پرانی ٹہنی کے مانند پلٹ آتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ قدیم کا اطلاق چھ ماہ کے گزرنے پر ہوتا ہے چنانچہ شاخ خرما کو قدیم کہا گیا ہے اور اس پر سے پھل اتار لینے کے بعد اس کے خشک ہونے اور ہلالی صورت اختیار کرنے میں چھ ماہ لگتے ہیں۔

امام محمد باقر علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص نے وصیت کی کہ اس کے غلاموں میں سے ایک تہائی غلام آزاد کر دئیے جائیں ان میں سے کسے آزاد کیا جائے اور کسے غلامی میں رہنے دیا جائے فرمایا کہ

کان علی علیہ السلام یسھم بینھم (ارشاد)   حضرت علی اس صورت میں ان میں قرعہ ڈالتے تھے۔

ایک شخص نے اپنے ایک رفیق کو دس ہزار درہم دیئے اور اسے وصیت کی کہ جب میرا بیٹا بالغ ہو جائے تو جو تم چاہو وہ اسے دے دینا۔ جب وہ بچہ بالغ ہوا تو اس نے حضرت سے فیصلہ چاہا آپ نے وصی کو بلا کر دریافت کیا کہ تم اسے کیا دینا چاہتے ہو کہا ایک ہزار درہم۔ فرمایا کہ اس کے معنی یہ ہوئے کہ تم نو ہزار چاہتے ہو اور اس کے باپ کی وصیت یہ تھی کہ جو تم چاہو وہ اسے دینا لہذا نو ہزار درہم اسے دو اور ایک ہزار درہم تم لو۔

باب المیراث

قبل اسلام عرب میں میراث کا حقدار صرف بڑے لڑکے کو سمجھا جاتا تھا اور دوسری اولاد محروم رہتی تھی اور جس دولت کو مختلف ہاتھوں میں بٹنا چاہیئے تھا وہ ایک ہاتھ سے نکل کر پھر ایک ہاتھ میں جمع ہو جاتی تھی جس سے سرمایہ داری کی ہمت افزائی ہوتی تھی اور معاشرتی برائیاں فروغ پاتی تھیں اور بیویوں کو میراث دیئے جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا اس لئے کہ خود ان کا شمار متروکہ اموال میں ہوتا تھا جن پر مرنے والے کے ورثہ قابض و متصرف ہو جاتے تھے بعض دوسرے مذاہب میں بھی صرف اولاد نرینہ وارث ہوتی ہے اور لڑکیوں کو ورثہ نہیں دیا جاتا۔ مگر اسلام کا طریق کار ان مذاہب کے طریق کار سے مختلف ہے اور گردش زر کے اصول پر مبنی ہے۔ تاکہ ایک متوازن و معتدل معاشی نظام تشکیل پا سکے۔ اس نے کسی کو حق میراث سے محروم نہیں کیا عورت کو باپ کا ترکہ بھی دلوایا ہے اور شوہر کا بھی اور اولاد چھوٹی ہو یا بڑی، لڑکا ہو یا لڑکی سب کا حصہ رکھا ہے اور کسی کو نظر انداز نہیں کیا کیونکہ تمام اولاد تعلق اور قرابت کے اعتبار سے برابر ہوتی ہے اور قرابت ہی سے میراث کا استحقاق پیدا ہوتا ہے۔ قرابت کے درجات مختلف ہوتے ہیں کوئی قریب ہوتا ہے اور کوئی قریب تر اسی تفاوت اور قرابت کے درجات کے اعتبار سے وارثوں کے طبقے مقرر کئے ہیں اور میراث کے ضوابط ترتیب دیئے ہیں البتہ چند امور ارث سے محرومی کا باعث ہوتے ہیں ان امور کو موانع ارث سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

پہلا مانع کفر ہے اگر وارث غیر مسلم ہو تو وہ مسلمان کا ورثہ نہیں پائے گا البتہ مسلمان غیر مسلم کا وارث ہوگا۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

المسلم یرث الذمی والذمی لا یرث المسلم (مستدرک الوسائل)   مسلمان کافر کا وارث ہوگا اور کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوگا۔

دوسرا مانع غلامی ہے اگر وارث غلام ہو تو وہ ورثہ سے محروم رہے گا اور درصورتیکہ غلام کے علاوہ کوئی وارث نہ ہو

تو مورث کے مال سے خرید کر اسے آزاد کر دیا جائے گا اور پھر بقیہ مال اسے ورثتہً دیا جائے گا چنانچہ حضرت سے ایک شخص کے بارے میں جس کا وارث فقط ایک غلام تھا دریافت کیا گیا آپ نے فرمایا۔

یشتری من ترکتہ فیعتق و یعطی باقی الترکۃ (مستدرک الوسائل)
مرنے والے کے ترکہ میں سے اسے خرید کر آزاد کر دیا جائے اور باقی ترکہ اسے دے دیا جائے۔

اگر میراث کے تقسیم ہونے سے پہلے کافر مسلمان ہو جائے یا غلام آزاد کر دیا جائے تو انہیں میراث دی جائے گی چنانچہ حضرت سے ان کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا۔

لھما حظھما منہ وان کان ذلک بعد موت المیت مالم یقسم المیراث فاذا قسم فلا حظ لھما فیہ (مستدرک الوسائل)
وہ دونوں ترکہ میں سے حصہ پائیں گے اگرچہ ان کا اسلام اور آزادی مورث کے مرنے کے بعد ہو بشرطیکہ میراث تقسیم نہ ہوئی ہو اور اگر تقسیم ہو چکی ہو تو پھر ان کا حصہ نہیں ہوگا۔

تیسرا مانع قتل ہے اگر وارث اپنے مورث کو عمداً قتل کر دے تو وہ ورثہ سے محروم قرار پائے گا چنانچہ حضرت کا ارشاد ہے۔

القاتل لا یرث ممن قتلہ (مستدرک الوسائل)
قاتل مقتول کا وارث نہیں ہوگا۔

اگر قتل غلطی سے واقع ہوا ہو تو اس صورت میں ورثہ سے محروم نہیں کیا جائے گا چنانچہ ایک شخص نے اپنی ماں کو قتل کر دیا حضرت سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا۔

ان کان خطاء فان لہ میراثھا وان کان قتلھا متعمدا فلا یرثھا (استبصار)
اگر ماں کو غلطی سے قتل کر دیا ہے تو اس کا وارث ہوگا اور اگر جان بوجھ کر قتل کیا ہے تو وارث نہیں ہوگا

قرابت و عزیزداری کی بنا پر ورثہ پانے والوں کے تین طبقے ہیں۔

پہلے طبقہ میں ماں باپ اور بیٹا بیٹی ہیں اور اگر بیٹا بیٹی نہ ہو تو ان کی اولاد ان کی قائم مقام ہوگی۔ ان میں سے کسی ایک فرد کے ہوتے ہوئے کوئی اور ترکہ کا حقدار نہ ہوگا۔ البتہ بیوی شوہر کے ترکہ میں سے اور شوہر بیوی کے ترکہ میں سے مقررہ حصہ لے گا۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

لا یرث مع الولد الا الابوان والزوج والمراءۃ (وافی)
اولاد کے ساتھ ماں باپ بیوی اور شوہر کے علاوہ اور کوئی ورثہ نہ پائے گا۔

اگر مرنے والے کا صرف ایک لڑکا ہو تو تمام مال اسے ملے گا۔ حضرت فرماتے ہیں۔

ان لم یترک غیر ولد واحد فالمیراث کلہ لہ (مستدرک الوسائل)
اگر مرنے والا ایک لڑکے کے علاوہ کوئی وارث نہ چھوڑے تو وہ لڑکا تمام مال کا وارث ہوگا۔

اگر مرنے والے کی اکیلی لڑکی ہو تو اسے آدھا ترکہ مقررہ حصہ کی بنا پر اور آدھا حصہ قرابت کی بنا پر دیا جائے گا۔ حضرت فرماتے ہیں۔

ان ترك بنتا واحدة فللا بنته النصف بالميراث المسمي ويرد عليها النصف الثاني بالرحم (مستدرک الوسائل)

اگر مرنے والا ایک لڑکی چھوڑ جائے تو اسے نصف مقررہ حصّہ کی بنا پر اور بقیہ نصف قرابت کی بنا پر ملے گا۔

اگر دو یا دو سے زیادہ لڑکیاں ہوں تو انہیں ترکہ میں سے دو تہائی مقررہ حصہ کی بنا پر اور بقیہ ایک تہائی قرابت کی بنا پر دی جائے گی حضرت کا ارشاد ہے۔

ان ترک ابنتين فلكل واحدة منهما الثلث بالميراث كما قال الله عزوجل ويرد عليهما الثلث الباقي بالرحم (مستدرک الوسائل)

اگر دو بیٹیاں چھوڑ جائے تو ان میں سے ہر ایک کو ایک ایک تہائی مقررہ حصہ کی بنا پر جیساکہ قرآن مجید میں دی جائے گی اور بقیہ ایک تہائی قرابت کی بنا پر۔

اہلسنّت کے نزدیک ایک لڑکی کو اس کا مقررہ حصہ نصف اور دو یا دو سے زیادہ لڑکیوں کو ان کا مقررہ حصہ دو تہائی دینے کے بعد بقیہ پدری رشتہ داروں میں تقسیم کیا جائے گا اس کا نام تعصیب ہے جو مذہب شیعہ میں باطل ہے حضرت فرماتے ہیں۔

اذا كان وارث ممن له فريضة فهو احق بالمال (وافی)

اگر کسی کے وارث کا حصہ مقرر ہو تو فریضہ سے زائد کا بھی وہی حقدار ہوگا۔

اگر کسی کے اولاد نہ ہو اور وارث صرف ماں باپ ہوں تو ترکہ کو تین حصّوں پر تقسیم کرکے دو تہائی باپ کو اور ایک تہائی ماں کو دیا جائے گا۔

حضرت فرماتے ہیں کہ

ان رسول الله صلى الله عليه وآله قال في الرجل اذا ترك ابويه فلامه الثلث وللاب الثلثان (مستدرک الوسائل)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کا ارشاد ہے کہ جب کوئی شخص ماں باپ چھوڑ جائے تو ماں کا حصہ ایک تہائی اور باپ کا حصہ دو تہائی ہوگا۔

اگر ماں باپ کے ساتھ مرنے والے کے دو بھائی یا چار بہنیں یا ایک بھائی اور دو بہنیں حقیقی یا پدری ہوں تو اگرچہ ماں باپ کی موجودگی کی وجہ سے انہیں کچھ نہیں ملے گا مگر ان کا وجود ماں کے لئے تہائی ترکہ سے مانع ہوگا۔ اس صورت میں ماں کو چھٹا حصہ اور باپ کو بقیہ پانچ حصے دئے جائیں گے حضرت کا ارشاد ہے۔

لا يحجب الام عن الثلث الا الولد والاخوة (وافی)

مرنے والے کی اولاد اور بھائی ماں کے لئے ایک تہائی سے مانع ہوتے ہیں۔

اگر کوئی شخص ایک لڑکی اور ماں باپ چھوڑے تو ترکہ کو پانچ حصوں پر تقسیم کیا جائے گا تین حصے لڑکی کو ایک حصہ ماں کو اور ایک حصہ باپ کو دیا جائے گا۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

يقسم المال على خمسة اسهم فما

مال کو پانچ حصّوں پر تقسیم کیا جائے گا تین حصّے لڑکی

اصاب ثلثۃ فللابنتہ وما اصاب سھمین فللا بوین (وسائل الشیعہ) — کو ایک حصّہ باپ کو اور ایک حصّہ ماں کو ملے گا۔

اگر کوئی شخص ایک لڑکی اور باپ چھوڑے تو ترکہ کو چار حصّوں پر تقسیم کیا جائے گا تین حصے لڑکی کو اور ایک حصّہ باپ کو دیا جائے گا۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

یقسم المال علی اربعۃ اسھم فما اصاب ثلثۃ فللابنتہ وما اصاب سھما فللاب (وسائل الشیعہ) — مال کو چار حصوں پر تقسیم کیا جائے گا تین حصے لڑکی کو اور ایک حصہ باپ کو ملے گا۔

اگر کوئی شخص ایک لڑکی اور ماں چھوڑے تو ترکہ کو چار حصوں پر تقسیم کر کے تین حصے لڑکی کو اور ایک حصہ ماں کو دیا جائے گا حضرت کا ارشاد ہے۔

یقسم المال علی اربعۃ اسھم فما اصاب ثلثۃ اسھم فللابنتہ وما اصاب سھما فللام (وسائل الشیعہ) — ترکہ کو چار حصوں پر تقسیم کیا جائے گا تین حصے لڑکی کو اور ایک حصہ ماں کو ملے گا۔

اگر کوی عورت، شوہر ماں اور باپ چھوڑے تو اس کے ترکہ کو چھ حصّوں پر تقسیم کیا جائے گا تین حصّے شوہر کو اور دو حصے ماں کو ملیں گے اور باقی ایک حصہ باپ کو دیا جائے گا حضرت کا ارشاد ہے۔

امرأۃ ماتت وترکت زوجھا و ابویھا فللزوج النصف ثلثۃ اسھم وللام الثلث تاما سھمان وللاب السدس سھم (وافی) — جو عورت مر جائے اور اپنے پیچھے شوہر اور ماں باپ چھوڑ جائے تو اس کے ترکہ میں سے شوہر کو چھ حصوں میں سے آدھا ماں کو تہائی اور باپ کو چھٹا حصہ ملے گا۔

اگر وارثوں میں ماں باپ اور دو یا دو سے زیادہ لڑکیاں اور شوہر یا بیوی ہو تو شوہر کو اس کا چوتھائی حصہ یا بیوی کو اس کا آٹھواں حصّہ اور ماں اور باپ ہر ایک کو چھٹا حصہ دیا جائے گا اور باقی لڑکیوں میں برابر تقسیم کر دیا جائے گا چنانچہ عبیدہ سلمانی کہتے ہیں کہ

انہ اعطی الزوج الربع مع الا بنتین وللابوین السدسین والباقی رد علی البنتین (وسائل الشیعہ) — حضرت نے دو لڑکیوں کی موجودگی میں شوہر کو چوتھائی حصہ اور ماں اور باپ کو چھٹا چھٹا حصہ دیا اور باقی دونوں لڑکیوں کو دے دیا۔

ان حصص کی تقسیم کا طریقہ یہ ہوگا کہ ترکہ کو چوبیس حصوں میں تقسیم کیا جائے گا چھ حصے شوہر کو چار حصے باپ کو چار حصے ماں کو اور دس حصے دونوں لڑکیوں کو دیئے جائیں گے جو ان میں مساوی تقسیم ہوں گے اور اگر شوہر کے بجائے بیوی ہو تو چوبیس حصوں میں سے تین حصے بیوی کو چار حصے باپ کو چار حصے ماں کو اور باقی تیرہ حصے دونوں لڑکیوں میں برابر

اگر میت کے بھائی بہن نہ ہوں تو ان کی اولاد وہ حصہ لے گی جو ان کے ماں باپ کا تھا۔ چنانچہ امام جعفر صادق فرماتے ہیں۔

ان علیا علیہ السلام کان یورث ابن الاخ من الجد میراث ابیہ (وافی)	علی علیہ السلام دادا کے ساتھ بھتیجے کو اس کے باپ کا حصہ دلواتے۔

اگر دادا کے ساتھ ایک مادری بھائی یا بہن ہو تو اسے چھٹا حصہ دیا جائے گا اور باقی دادا کو اور اگر متعدد ہوں تو انہیں ایک تہائی دی جائے گی اور دو تہائی دادا کو۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

ان الاخوۃ من الام یرثون مع الجد الثلث (وسائل الشیعہ)	دادا کے ساتھ مادری بھائیوں کو ایک تہائی ترکہ دیا جائے گا۔

تیسرے طبقہ میں چچا پھوپھی ماموں اور خالہ ہیں اگر پہلے اور دوسرے طبقہ کے وارث نہ ہوں تو انہیں میراث ملے گی۔
اگر مرنے والے کے وارث صرف چچا اور ماموں ہوں تو دو تہائی ترکہ چچا اور ایک تہائی ماموں کو ملے گا چنانچہ حضرت سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص مرگیا اور اس نے چچا اور ماموں چھوڑے اس کا ترکہ کیسے تقسیم ہوگا فرمایا۔

للعم الثلثان وللخال الثلث (مستدرک الوسائل)	دو تہائی چچا کو اور ایک تہائی ماموں کو دی جائے گی۔

اگر مرنے والے کے وارث پھوپھی اور خالہ ہوں تو دو تہائی پھوپھی اور ایک تہائی خالہ کو دی جائے گی حضرت کا ارشاد ہے۔

للعمۃ الثلثان وللخالۃ الثلث (مستدرک الوسائل)	دو تہائی پھوپھی اور ایک تہائی خالہ پائے گی۔

اگر مرنے والے کے چچا پھوپھی ماموں اور خالہ نہ ہوں تو ان کا حصہ ان کی اولاد کو ملے گا البتہ اگر کسی کا باپ کی طرف سے چچا ہو اور ایسے چچا کی اولاد بھی ہو جو ماں باپ دونوں کی طرف سے چچا ہوتا ہے تو اس صورت میں ترکہ صرف سگے چچا کی اولاد کو ملے گا چنانچہ حضرت کا ارشاد ہے۔

اعیان بنی الام اقرب من بنی العلات (وسائل الشیعہ)	پدری و مادری رشتہ دار پدری رشتہ داروں سے زیادہ نزدیک ہوتے ہیں۔

شوہر اور بیوی ہر طبقہ میں ایک دوسرے کے وارث ہوتے ہیں اگر شوہر کی اولاد ہو تو اس کے ترکہ میں سے بیوی کو آٹھواں حصہ اور اولاد نہ ہو تو چوتھائی حصہ دیا جائے گا حضرت کا ارشاد ہے۔

لا یزاد الزوج علی النصف ولا ینقص من الربع ولا تزاد المرأۃ علی الربع ولا تنقص الثمن (وسائل الشیعہ)	شوہر کا حصہ نصف ترکہ سے زائد نہیں ہوتا اور ایک چوتھائی سے کم نہیں ہوتا اور عورت کا حصہ ایک چوتھائی سے زائد اور آٹھویں حصہ سے کم نہیں ہوتا۔

اگر بیویاں متعدد ہوں تو چوتھے یا آٹھویں حصہ کو ان پر مساوی طور پر تقسیم کیا جائے گا حضرت کا ارشاد ہے۔

ان کن اربعا او دون ذلک فھن فیہ	اگر بیویاں چار یا اس سے کم ہوں ان کے مقررہ

سواء (وسائل الشیعہ) حصہ میں سب کا حصہ مساوی ہوگا۔

اگر بیوی کے علاوہ کوئی وارث نہ ہو تو بیوی صرف اپنا مقررہ حصّہ لے گی اور باقی تین چوتھائی حق امام ہے اور اگر وارث صرف شوہر ہو تو وہ تمام ترکہ لے گا چنانچہ حضرت کا ارشاد ہے۔

الزوج یحوز المال کله اذا لم یکن غیرہ (وافی) اگر شوہر کے علاوہ کوئی اور وارث نہ ہو تو وہ تمام مال لے گا۔

اگر شوہر نے بیوی سے مجامعت نہ کی ہو جب بھی شوہر بیوی کا اور بیوی شوہر کی وارث ہوگی چنانچہ حضرت سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص مرگیا اور غیر مدخولہ بیوی چھوڑ گیا کیا وہ عدہ رکھے گی فرمایا۔

نعم علیها العدۃ ولها المیراث کاملا (مستدرک الوسائل) ہاں وہ عدہ بھی رکھے گی اور پوری میراث بھی پائے گی۔

اگر طلاق رجعی واقع ہونے کے بعد شوہر یا بیوی مدت عدہ کے اندر مرجائے تو دونوں میں جو زندہ ہو وہ دوسرے کا وارث ہوگا چنانچہ حضرت کا ارشاد ہے۔

ھی ترث وتورث ما کانت فی الدم فی التطلیقتین الاولتین (مستدرک الوسائل) جب تک عورت پہلی یا دوسری طلاق کے عدہ کے اندر ہو شوہر کی وارث ہوگی اور شوہر بھی اس کا وارث ہوگا۔

ایک مرتبہ ایک عورت اپنی سوت کے ساتھ حضرت عثمان کے پاس آئی اور کہا کہ میرے شوہر نے مجھے طلاق دی تھی اور طلاق کے تھوڑے عرصہ بعد انتقال کر گیا میری مدت عدہ ابھی ختم نہیں ہوئی لہذا اس کے ترکہ میں سے مجھے حصہ ملنا چاہیئے۔ حضرت عثمان کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکے کہا کہ اس کے بارے میں حضرت علی سے دریافت کیا جائے۔ جب حضرت کی طرف رجوع کیا گیا تو آپ نے اس عورت کا دعویٰ سننے کے بعد فرمایا کہ اس سے قسم لی جائے کہ اس نے طلاق کے بعد تین حیض نہیں دیکھے اگر یہ قسم کھائے تو اسے ترکہ میں سے اس کا حصہ دیا جائے۔ اس عورت نے قسم کھانے سے انکار کیا اور میراث سے دستبردار ہوگئی۔

بیوی کو باغ کھیت مکان وغیرہ کی زمین سے کچھ نہیں ملے گا۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

ان النساء لیس لهن من عقار الرجل اذا توفی عنهن شئی (وسائل الشیعہ) شوہر اگر بیوہ چھوڑ کر مرجائے تو اسے شوہر کی زمین سے ترکہ نہیں ملے گا۔

اگر وارثوں میں کوئی ہیجڑا ہو اور یہ معلوم نہ ہوسکے کہ وہ مردوں میں شامل ہے یا عورتوں میں تو اگر وہ مردانہ عضو سے پیشاب کرتا ہے تو اسے مرد قرار دے کر مردوں والا حصہ دیا جائے گا اور زنانہ عضو سے پیشاب کرتا ہو تو اسے عورتوں والا حصہ دیا جائے گا چنانچہ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔

کان امیر المومنین یورث الخنثی من امیر المومنین ہیجڑے کو جس عضو سے پیشاب کرتا تھا

حیث یبول (وسائل الشیعہ) اس کے اعتبار سے میراث دیتے تھے۔

ایک مرتبہ چند شامی حضرت کے پاس آئے اور عرض کیا کہ ہم ایک الجھن میں پڑے ہوئے ہیں آپ سے اس کا حل چاہتے ہیں فرمایا وہ الجھن کیا ہے کہا کہ ہمارا باپ مال کثیر چھوڑ کر مر گیا ہے اور ہم چند بھائی ہیں ان میں سے ایک کے اندر عورت و مرد دونوں کی علامتیں موجود ہیں ہم نے اسے دوسرے بھائیوں سے آدھا حصہ دینا چاہا مگر وہ مصر ہے کہ اسے دوسرے بھائیوں کے مساوی حصہ دیا جائے فرمایا کہ تم نے اس کا حل معاویہ سے بھی دریافت کیا ہے کہا کہ ہم ان کے پاس گئے تھے مگر وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکے اور ہمیں مشورہ دیا کہ ہم آپ کی طرف رجوع کریں اور یہ ظاہر نہ کریں کہ ہم ان کے ایماء سے آپ کے ہاں آئے ہیں حضرت نے یہ سنا تو فرمایا۔

لعن اللہ قوما یرضون بقضاءنا ویطعنون علینا فی دیننا (مستدرک الوسائل) ان لوگوں پر اللہ کی پھٹکار جو ہمارے فیصلوں پر تو راضی ہو جاتے ہیں اور دین کے سلسلہ میں ہم پر طعن و تشنیع کرتے ہیں۔

تم ایسا کرو کہ اپنے بھائی سے کہو کہ وہ پیشاب کرے اگر پیشاب مردانہ عضو سے نکلے تو اسے مرد قرار دے کر پورا حصہ دو اور اگر زنانہ عضو سے پیشاب کرے تو اسے آدھا حصہ دو جب ایسا کیا گیا تو اس نے مردانہ عضو سے پیشاب کیا جس پر حضرت نے اسے دوسرے بھائیوں کے برابر میراث کا حقدار قرار دیا۔

اگر مردانہ و زنانہ دونوں جگہوں سے پیشاب نکلتا ہو تو پھر جس عضو سے پہلے پیشاب نکلتا ہو اسکے مطابق اسے میراث دی جائیگی حضرت کا ارشاد ہے۔

اذا بال منھما جمیعا ورث بایھما سبق (مستدرک الوسائل) اگر دونوں جگہوں سے پیشاب کرے تو اس عضو کا اعتبار کیا جائے گا جس سے پہلے پیشاب نکلے۔

اگر ان علامات سے تشخیص نہ ہو سکے اور یہ طے نہ کیا جا سکے کہ وہ مردوں کے زمرہ میں شمار ہوتا ہے یا عورتوں کے تو ایک دفعہ اسے مرد فرض کر کے اور ایک دفعہ عورت فرض کر کے حصہ نکالا جائے اور پھر ان دونوں حصوں کا نصف اسے دیا جائے مثلاً کسی کا وارث ایک لڑکا اور ایک ہیجڑا ہو تو اس ہیجڑے کو لڑکا ہونے کی صورت میں بارہ حصوں میں سے چھ حصے ملتے اور لڑکی ہونے کی صورت میں چار حصے ملتے۔ لہٰذا پہلے اسے چھ حصوں کا نصف یعنی تین حصے دئے جائیں گے اور پھر چار حصوں کا نصف یعنی دو حصے اسے دئے جائیں گے اسطرح لڑکے کو سات حصے اور ہیجڑے کو پانچ حصے ملیں گے۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

فان خرجا جمیعا ورث نصف میراث الرجل ونصف میراث المراۃ (مستدرک الوسائل) اگر دونوں جگہوں سے ایک ساتھ پیشاب نکلتا ہو تو اسے آدھا حصہ مرد کی میراث کا اور آدھا حصہ عورت کی میراث کا دیا جائے گا۔

اگر ہیجڑا پیدا ہونے کے بعد مر جائے اور پیشاب کرنے کی نوبت ہی نہ آئے تو اس صورت میں بھی عورت و مرد دونوں کے حصے کا نصف نصف اس کی طرف منتقل کیا جائے گا حضرت کا ارشاد ہے۔

فان لم یبل من واحد منھما حتی اگر کسی ایک جگہ سے بھی پیشاب نہ کرے یہاں تک کہ

یموت فنصف میراث المرأۃ ونصف میراث الرجل (وسائل الشیعہ)	مرجائے تو آدھی میراث عورت کے اعتبار سے اور آدھی میراث مرد کے اعتبار سے اس کی طرف منتقل کی جائے گی۔

اگر کسی مولود کے دو سر اور ایک دھڑ ہو تو اگر دونوں سر ایک ساتھ بیدار ہوں تو ایک کی ورنہ دو کی میراث پائے گا چنانچہ حضرت کے دورِ خلافت میں ایک بچہ پیدا ہوا جس کے دو سر تھے آپ سے دریافت کیا گیا کہ وہ میراث کے سلسلہ میں ایک تصور ہوگا یا دو فرمایا کہ جب وہ سوئے تو شور مچا کر اسے بیدار کرو اگر ان میں سے ایک سوتا ہے اور ایک جاگ اُٹھے تو دو کی میراث پائے گا اور اگر دونوں سر بیک وقت بیدار ہوں تو ایک کی میراث پائے گا۔

اگر دو یا چند افراد جن میں باہمی توارث ہو ڈوب کر یا کسی دیوار کے نیچے دب کر مرجائیں اور یہ معلوم نہ ہو سکے کہ پہلے کون مرا ہے تو انہیں آپس میں ایک دوسرے کا وارث قرار دے کر ان کا مقررہ حصہ ان کی طرف منتقل کر دیا جائے گا جو مرنے والوں کے زندہ وارثوں میں تقسیم ہوگا چنانچہ ایک مرد اور اس کی بیوی گھر کی چھت بیٹھنے سے ہلاک ہو گئے۔ حضرت سے ان کی میراث کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا۔

یرث کل واحد منهما زوجہ (وسائل الشیعہ)	دونوں ایک دوسرے کے وارث ہوں گے۔

یہ باہمی توارث صرف اس مال میں ہوگا جو مرنے سے پہلے ان کی ملکیت میں تھا اور وہ مال جو اب ان کی طرف منتقل ہوا ہے اس میں توارث نہیں ہوگا چنانچہ ایک ہی گھر کے چند افراد دریا میں غرق ہو گئے۔ حضرت سے ان کی میراث کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا۔

یورث هولاء من هولاء وهولاء من هولاء ولا یرث هولاء مما ورثوا من هولاء شیئا ولا یورث هولاء مما ورثوا من هولاء شیئا (وسائل الشیعہ)	ان میں ہر ایک دوسرے کا وارث ہوگا لیکن جو مال اب ان کی طرف منتقل ہوا ہے اس میں ایک دوسرے کا وارث نہیں ہوگا۔

اگر یہ معلوم نہ ہو سکے کہ پہلے کون مرا ہے لیکن آثار و قرائن سے یہ ظاہر ہو کہ ان میں سے فلاں پہلے مرا ہوگا اور فلاں بعد میں تو بعد میں مرنے والے کو وارث قرار دیا جائے گا چنانچہ ایک مرد اور ایک عورت طاعون میں مبتلا ہو کر ایک بستر پر مردہ پائے گئے اس صورت میں کہ مرد کے ہاتھ پیر عورت کے اوپر تھے حضرت نے اس عورت کی میراث مرد کی طرف منتقل کی اور فرمایا۔

انہ مات بعد (وسائل الشیعہ)	مرد عورت کے بعد مرا ہے۔

یہ بظاہر اس لئے کہ مرد کے ہاتھ پیر کا عورت کے اوپر ہونا اس امر کا قرینہ تھا کہ وہ بعد میں مرا ہے۔

حضرت نے ایک مورد پر قرعہ سے بھی کام لے کر وارث کی تعیین کی ہے چنانچہ یمن میں ایک مکان کی چھت بیٹھ گئی اور گھر کے تمام افراد اس کے نیچے دب کر ہلاک ہو گئے مگر دو بچے زندہ بچ رہے ان میں ایک آزاد تھا اور ایک غلام مگر آزاد

اور ایک غلام کی تمیز نہ ہو سکی حضرت کے سامنے یہ قضیہ پیش ہوا آپ نے قرعہ ڈالا اور ایک کو آزاد قرار دے کر وارث ٹھہرایا اور دوسرے کو آزاد کر دیا۔

باب الیمین

یمین کے معنی قسم و سوگند کے ہیں۔ قسم کبھی کسی امر کے وقوع کی یقین دہانی کے لئے اور کبھی کسی فعل یا ترک کی پابندی اپنے اوپر عائد کرنے کے لئے کھائی جاتی ہے۔ وہ قسم جو کسی واقعہ کی یقین دہانی کے لئے ہو اگر خلاف واقع ہو تو قسم کھانے والا گنہگار ہو گا اس لئے کہ سچی قسم کھانا مکروہ اور جھوٹی قسم کھانا حرام ہے۔ امیر المومنین کا ارشاد ہے۔

ان الیمین الکاذبۃ وقطیعۃ الرحم تذران الدیار بلاقع من اھلھا

جھوٹی قسم اور قطع رحمی گھروں کو ان کے رہنے والوں سے خالی و ویران کر دیتی ہے۔

(مستدرک الوسائل)

اور وہ قسم جس کے ذریعہ انسان مستقبل میں اپنے کو پابند کرتا ہے اگر اس کی پابندی نہ کرے تو اس پر کفارہ عائد ہو گا کفارہ یہ ہے کہ غلام آزاد کرے یا دس مسکینوں کو کھانا کھلائے یا کپڑا پہنائے اور یہ نہ ہو سکے تو تین روزے رکھے یہ قسم یمین العقد کہلاتی ہے اور صرف اللہ اور اس کے مخصوص اسماء ہی سے منعقد ہوتی ہے اگر اللہ کے اسماء کے علاوہ کسی اور نام کی قسم کھائی جائے یا صرف یہ کہا جائے کہ میں قسم کھاتا ہوں یا حلف اٹھاتا ہوں تو قسم منعقد نہ ہو گی امیر المومنین فرماتے ہیں۔

اذا قال الرجل اقسمت او حلفت فلیس بشیٔ حتی یقول اقسمت باللہ او حلفت باللہ

جب کوئی شخص یہ کہے کہ میں قسم کھاتا ہوں یا حلف اُٹھاتا ہوں تو یہ قسم نہ ہو گی قسم اس وقت کی ہو گی جب یہ کہے کہ میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں یا اللہ کے نام پہ حلف اُٹھاتا ہوں۔

(وافی)

قسم کے انعقاد کے لئے ضروری ہے کہ قسم کے الفاظ زبان پر جاری کئے جائیں لیکن قسم کھانے والا گونگا ہو تو اشارہ سے قسم کھائی جا سکتی ہے۔ امیر المومنین دعاوی و خصومات میں گونگے سے اس طرح قسم لیتے تھے کہ کاغذ کے پرزہ پر قسم کے الفاظ تحریر کرتے اور اسے پانی میں گھول دیتے اور اسے پینے کے لئے کہتے اگر وہ پی لیتا تو اسے قسم قرار دیتے اور پینے سے انکار کرتا تو اسے قسم سے انکار سمجھتے چنانچہ ایک شخص نے امیر المومنین کے سامنے ایک گونگے کو پیش کیا اور کہا کہ اس نے مجھ سے کچھ رقم بطور قرض لی تھی اور اب قرضہ سے انکار کرتا ہے۔ حضرت نے قرض خواہ سے ثبوت طلب کیا مگر اس کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا اس صورت میں گونگے پر قسم عائد ہوتی تھی۔ حضرت نے اس گونگے کے بھائی کو بلا کر اس کے پاس بٹھا دیا اور قرآن مجید طلب کر کے اس گونگے سے پوچھا کہ یہ کیا ہے اس نے سر آسمان کی طرف اٹھایا اور اشارہ سے بتایا کہ یہ کتاب اللہ ہے پھر آپ نے کاغذ کے پرزے پر قسم کے الفاظ تحریر کئے اور اسے پانی سے دھویا اور اس سے کہا کہ یہ پانی پی لو اس نے پینے سے انکار کیا حضرت نے فرمایا کہ یہ قسم سے انکار ہے لہٰذا قرضہ اس کے ذمہ واجب الادا ہے۔ قسم کے تبرکاً انشاء اللہ کہنا مستحب ہے اور قسم کے موقع پر انشاء اللہ نہ کہے تو جب یاد آئے کہے حضرت کا ارشاد ہے۔

الاستثناء فی الیمین متی ما ذکر بعد وان کان بعد اربعین صباحا (نحو تلا هذه الآیة) واذکر ربك اذا نسیت (مستدرک الوسائل)

جب بھی یاد آئے قسم کے سلسلہ میں انشاء اللہ کہے اگرچہ چالیس دنوں کے بعد یاد آئے (پھر اس آیت کی تلاوت کی) اپنے پروردگار کا ذکر کرو جب تم بھول جاؤ۔

اگر انشاء اللہ بطور تبرک نہ کہے بلکہ واقعاً قسم کو مشیت الٰہی پر معلق کرے تو اس صورت میں قسم کی خلاف ورزی پر کفارہ نہ ہوگا حضرت کا ارشاد ہے۔

من استثنی فی الیمین فلا حنث ولا کفارة (وسائل الشیعہ)

جو شخص قسم کو اللہ کی مشیت سے وابستہ کرے وہ قسم شکنی کا مرتکب نہ سمجھا جائے گا اور نہ اس پر کفارہ عائد ہوگا۔

باب النذر والعهد

نذر یہ ہے کہ انسان کسی ایسی چیز پر عمل پیرا ہونے یا اس سے اجتناب کرنے کی پابندی مخصوص الفاظ کے ذریعہ اپنے اوپر عائد کرے جس کا کرنا اور نہ کرنا اس کی دسترس میں ہو اور اس میں شرعاً رجحان بھی پایا جاتا ہو لہٰذا کسی مستحب و واجب کے ترک کرنے یا کسی مکروہ وحرام کے بجالانے کی نذر مانی جائے گی تو نذر صحیح نہ ہوگی امیرالمومنین کا ارشاد ہے۔

لا نذر فی معصیة (وسائل الشیعہ)

معصیت کے کاموں میں نذر نہیں مانی جائے گی۔

ایک شخص نے حضرت سے کہا کہ میں نے منت مانی تھی کہ اگر میں فلاں کام سے باز نہ رہا تو اپنے بیٹے کو مقام ابراہیم پر ذبح کروں گا مگر میں اس فعل کا مرتکب ہوا ہوں اب مجھے کیا کرنا چاہیئے فرمایا کہ تم ایک مینڈھا ذبح کرو اور اس کا گوشت مسکینوں اور ناداروں پر صدقہ کردو۔

صاحب استبصار و وسائل نے تحریر کیا ہے کہ اسے استحباب پر محمول کیا جائے گا کیونکہ یہ فعل ناجائز تھا اور فعل ناجائز میں نذر منعقد نہیں ہوتی۔

ایک عورت نے نذر مانی کہ وہ اپنے چاروں ہاتھ پیروں پر چل کر طواف کرے گی۔ حضرت سے اس کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ وہ سات چکر اپنے دونوں ہاتھوں کے لئے اور سات چکر اپنے دونوں پیروں کے لئے لگائے۔

یہ حکم بھی استحباب پر محمول کیا جائے گا کیونکہ یہ صورت طواف غیر مشروع ہے جو نذر کے انعقاد سے مانع ہے۔

نذر کا اسی طرح ادا کرنا واجب ہے جس طرح مانی گئی ہو لہذا کوئی شخص حج یا زیارت کے لئے پیادہ پا جانے کی نذر مانے تو اسے پیادہ پا ہی جانا ہوگا اگر سوار ہو کر جائے گا تو نذر سے عہدہ برآ نہ ہوگا البتہ اگر راہ میں دریا حائل ہو جائے جسے کشتی کے بغیر عبور نہ کیا جا سکتا ہو تو کشتی پر سوار ہو سکتا ہے مگر جہاں تک ممکن ہو کشتی میں کھڑا رہے چنانچہ حضرت سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص نے پیادہ پا حج کرنے کی نذر مانی تھی مگر راستے میں نہر پڑتی ہے اس صورت میں اسے کیا کرنا چاہیئے فرمایا کہ وہ کشتی میں کھڑا ہو کر نہر کو عبور کرے۔

یہ اس صورت میں جب اسے یہ علم نہ ہو کہ راستے میں نہر یا دریا سے واسطہ پڑے گا اور اگر اسے یہ معلوم ہو کہ راستے میں دریا پڑتا ہے اور اسے کشتی کے بغیر عبور نہیں کیا جا سکتا اور خشکی کا کوئی متبادل راستہ بھی نہیں ہے تو یہ نذر منعقد نہ ہوگی کیونکہ نذر کے لئے ضروری ہے کہ اس پر مقدرت ہو۔

اگر روزہ نماز یا صدقہ کی نذر مانے اور تعداد یا مقدار کا تعین نہ کرے تو اتنی مقدار یا تعداد میں اسے ادا کرے جس پر روزہ نماز یا صدقہ صادق آسکے مثلاً روزہ کی نذر مانے اور عدد کا تعین نہ کرے تو ایک روزہ رکھنا یا نماز کی نذر مانے تو دو رکعت نماز پڑھ لینا یا صدقہ کی منت مانے تو کسی مسکین کو ایک روٹی دے دینا۔ نذر سے عہدہ برآ ہونے کیلئے کافی ہے اور اگر صرف نذر مانے اور کسی شے کا تعین نہ کرے تو اس صورت میں مذکورہ چیزوں میں سے کسی ایک پر عمل کرنا کافی ہے۔ چنانچہ امیر المومنین سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص نے نذر مانی اور کسی چیز کا تعین نہیں کیا اسے کیا کرنا چاہیئے فرمایا۔

ان شاء صلی رکعتین وان شاء صام یوما وان شاء تصدق برغیف (وسائل الشیعہ) — چاہے دو رکعت نماز پڑھے چاہے ایک دن روزہ رکھے اور چاہے ایک روٹی صدقہ کر دے۔

صاحب وسائل نے اسے استحباب پر محمول کیا ہے

ایک شخص نے نذر مانی کہ ان یصوم حینا (وہ ایک حین (وقت) تک روزہ رکھے گا) مگر حین کی تعیین نہ کی۔ حضرت نے فرمایا کہ وہ چھ ماہ روزے رکھے اور اس آیت کی تلاوت کی۔

توتی اکلھا کل حین باذن ربھا — وہ اپنے پروردگار کے حکم سے ہر وقت پھل دیتا ہے۔

اور یہ چھ مہینے کا عرصہ ہوتا ہے۔

عہد یہ ہے کہ اللہ کے نام پر کسی کام کے انجام دینے اور ترک کرنے کی پابندی اپنے اوپر عائد کرے اگرچہ وہ امر مباح ہو اس لئے کہ عہد میں رجحان کا اعتبار نہیں ہے تاہم جس چیز کا عہد کیا جائے اس کی سمت مخالف کو اس سے اولیٰ و بہتر نہ ہونا چاہیئے۔

عہد کے احکام بھی وہی ہیں جو نذر کے ہیں اور اس کی پابندی بھی اسی طرح لازم ہے جس طرح نذر کی پابندی واجب ہے حضرت کا ارشاد ہے۔

من دلائل الایمان الوفاء بالعھد (مستدرک الوسائل) — ایمان کی علامتوں میں سے ایک علامت وفائے عہد ہے۔

اگر کوئی شخص اپنے ارادہ و اختیار سے نذر یا عہد پر عمل نہ کرے تو اس پر کفارہ عائد ہوگا۔

باب الصید

اسلام نے غذائی ضروریات کے پیش نظر شکار کی اجازت دی ہے کیونکہ بعض علاقوں میں غذا کا انحصار ہی شکار پر ہوتا ہے لہذا ضرورت کی بنا پر شکار کیا جا سکتا ہے لیکن اسے مشغلہ یا تفریح طبع کے طور پر اختیار نہ کرنا چاہیئے اس لئے کہ بے مقصد اتلاف جان غیر مستحسن عمل ہے۔

شکار صرف سدھائے ہوئے کتوں اور چھری تلوار اور تیر ایسے کاٹنے والے ہتھیاروں سے ہو سکتا ہے چنانچہ امیر المومنین سے آیۂ قرآنی وما علمتم من الجوارح مکلبین (وہ شکاری جانور جو تم نے شکار کے لئے سدھائے ہوں) کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا۔

ھی الکلاب (مستدرک الوسائل) — شکاری جانوروں سے مراد کتے ہیں۔

کتوں کے شکار کئے ہوئے جانور ان شرائط کے ماتحت حلال ہوتے ہیں جو کتب فقہ میں درج ہیں ان میں سے ایک شرط یہ ہے کہ کتے کو شکار کے پیچھے چھوڑنے والا مسلمان ہو خواہ اس کا سدھانے والا غیر مسلم ہو حضرت کا ارشاد ہے۔

ان ارسله المسلم جاز اکل ما امسك وان لم یکن علمه (مستدرک الوسائل) — اگر مسلمان کتے کو شکار پر چھوڑے تو اس شکار کا کھانا جائز ہوگا اگرچہ سدھانے والا مسلمان نہ ہو۔

اگر کتا شکار پر جھپٹے اور مالک کے پہنچنے پر وہ زندہ ہو تو اگر ذبح کرنے کا وقت ہو تو اسے ذبح کئے بغیر کھانا جائز نہیں ہے اور اگر دم توڑ چکا ہو تو حلال ہے۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

ما امسکت الکلاب المعلمة اکل وان قتلته (مستدرک الوسائل) — سدھائے ہوئے کتوں کا کیا ہوا شکار کھایا جا سکے گا اگرچہ اسے جان سے ختم کر دیا ہو۔

اگر شکرہ عقاب باز چیتا تیندوا وغیرہ کے ذریعہ کسی جانور کا شکار کیا جائے اور دم توڑنے سے پہلے اسے ذبح کر لیا جائے تو وہ حلال ہوگا اور ذبح کرنے سے پہلے مر جائے تو حرام ہوگا۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

ما اخذ البازی والصقر فقتل فلا تاکل منه الا ما ادرکت ذکوته (وسائل الشیعہ) — جو شکار باز یا شکرہ کرے اور اسے مار ڈالے وہ نہ کھاؤ مگر یہ کہ تم اسے زندہ پاؤ اور اسے ذبح کر لو۔

اسی طرح اگر شکار جال میں پھنس کر دم توڑ دے تو وہ حلال نہ ہوگا اور اگر اسے زندہ نکال کر ذبح کر لیا جائے تو اس کا کھانا حلال ہوگا۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

ما اخذت الحبالة من صید فقطعت منه یدا او رجلا فذروه فانه میت وکلوا مما ادرکتم حیا وذکرتم اسم الله علیه (وسائل الشیعہ) — جو شکار جال میں پھنس جائے اور اس کا ہاتھ یا پیر ٹوٹ کر الگ ہو جائے تو اسے چھوڑ دو وہ مردار ہے اور اگر اسے زندہ پاؤ اور اللہ کا نام لے کر اسے ذبح کرو تو اس میں سے کھاؤ۔

اگر کسی جانور کا شکار ہتھیار سے کیا جائے تو اسے دھار دار ہونا چاہیئے اور ایسے اوزار سے شکار حلال نہ ہوگا جو کاٹنے کے بجائے کچل دینے والا ہو خواہ وہ اینٹ پتھر ہو یا ایسی گولی جو کاٹنے کے بجائے کچل دینے والی ہو البتہ اگر اسے زندہ پکڑ کر ذبح کر لیا جائے تو وہ حلال ہوگا۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

لا تاکل ما قتل الحجر والبندق والمعراض الا ما ذکیت (وسائل الشیعہ) — وہ شکار جو پتھر غلیل یا بے پھل کے تیر سے کیا جائے وہ اسی صورت میں حلال ہوگا جب اسے زندہ پا کر ذبح کر لو۔

اگر کسی جانور پر تیر چلایا جائے اور وہ لڑکھڑا کر بلندی سے نیچے گرے یا پانی یا آگ میں جا پڑے تو زندہ ہونے کی صورت میں اسے ذبح کر لیا جائے تو حلال ہوگا اور مر جائے اور یہ شک ہو کہ اس کی موت صرف تیر سے نہیں ہوئی تو اس کا کھانا جائز نہ ہوگا چنانچہ حضرت نے ایسے شکار کے بارے میں فرمایا۔

لا یؤکل الا ان یدرک ذکواتہ — اس کا کھانا جائز نہیں ہے مگر یہ کہ اسے ذبح کر لیا جائے۔ (مستدرک الوسائل)

جب ٹڈی کو زندہ پکڑ لیا جائے تو بے روح ہونے کے بعد اس کا کھانا حلال ہے یا مچھلی کو زندہ پانی سے نکال لیا جائے یا خود بخود پانی سے باہر نکل آئے اور اسے زندہ پکڑ لیا جائے تو اس کا کھانا جائز ہے کیونکہ ٹڈی کو زندہ پکڑ لینا اور مچھلی کو زندہ پانی سے نکال لینا ہی ان کے لئے ذبح ہے۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

الجراد ذکی والحیتان ذکی کلہ وما ھلک فی البحر فلا تا کل (وسائل الشیعہ) — ٹڈی اور مچھلی کا پکڑا جانا ہی ان کا ذبح ہونا ہے لہٰذا انہیں کھاؤ اور جو مچھلی پانی میں مر جائے وہ نہ کھاؤ۔

اگر کسی پرندے کے پَر کٹے ہوئے ہوں تو یہ اس امر کی علامت ہے کہ اس کا کوئی مالک ہے لہٰذا اسے پکڑ لیا جائے اور اس کے مالک کا علم ہو جائے تو اس کے سپرد کرنا ضروری ہے اور اگر اس کے پَر صحیح و سالم ہوں اور یہ علم نہ ہو کہ وہ کسی کی ملکیت ہے تو وہ حلال ہے۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

ان الطائر اذا ملک جناحیہ فھو صید وھو حلال لمن اخذہ (وسائل الشیعہ) — وہ پرندہ جو پرواز کر سکتا ہو وہ شکار ہے اور جو اسے پکڑے وہ اس کے لئے حلال ہے۔

اگر کوئی شخص کسی پرندے کا پیچھا کرے تو جب تک اسے پکڑ نہ لے اس کی ملکیت میں داخل نہیں ہوگا چنانچہ ایک شخص نے ایک پرندے کو دیکھا اور اسے پکڑنے کے لئے اس کا پیچھا کیا وہ پرندہ ایک درخت پر بیٹھ گیا اور ایک دوسرے آدمی نے اسے پکڑ لیا پہلے شخص نے کہا کہ یہ میرا شکار ہے اسلئے کہ میں نے اسے پکڑا ہے اور دوسرے نے کہا کہ یہ میرا شکار ہے کیونکہ میں نے اسے پکڑا ہے۔ یہ قضیہ حضرت کے سامنے پیش ہوا تو آپ نے فرمایا۔

للعین ما رأت ولليد ما اخذت (وسائل الشیعہ) — آنکھ کا حصہ وہ ہے جو اس نے دیکھا اور ہاتھ کا حصہ وہ ہے جو اس نے پکڑا۔

باب الاطعمۃ والاشربہ

یہ امر مشاہدہ و تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ انسانی طبائع پر غذائی اثرات طاری ہوتے ہیں اور وہ جس قسم کی غذا کھاتا ہے اسی قسم کے اچھے یا بُرے اثرات ظہور میں آتے ہیں اگر غذا صاف ستھری اور پاک ہوگی تو صحت و اخلاق پر اچھا اثر پڑے گا اور غلیظ و ناپاک ہوگی تو بُرے اثرات مرتب ہوں گے چنانچہ شراب جسے اسلام نے حرام کیا ہے انتہائی مضر و مہلک ثابت ہو چکی ہے اور طب جدید نے الکوہل کو جو شراب کا اہم جزو ہے زہر قاتل قرار دیا ہے جو زندگی کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیتا ہے اسی طرح خنزیر کا گوشت کھانے سے ایسے خلیوں کی تولید ہوتی ہے جو بے حیائی و بے غیرتی کے محرک ہوتے ہیں اور مزاج

جانور یا ایسے حیوان کا گوشت کھانے سے جس کا گلا گھونٹا گیا ہو ایسے خلیے پیدا ہوتے ہیں جو اعضاء بدن کے لئے مضر و نقصان دہ ہوتے ہیں کیونکہ ایسے جانوروں میں دوران خون رک جاتا ہے اور خون کے کثیف ذرے رگوں میں منجمد ہو کر رہ جاتے ہیں جو گوشت کو مسموم کر دیتے ہیں اس کے برعکس ذبیحہ جانور کا خون چونکہ ٹھنڈا ہونے سے پہلے ہی نکل جاتا ہے اس لئے گوشت مضر اور سمی اجزاء سے پاک و صاف رہتا ہے یونہی گوشت خوار حیوانوں کا گوشت کھانے سے نظام ہضم درہم و برہم ہو جاتا ہے کیونکہ گوشت خوار جانوروں کے گوشت میں عفونت و گندگی پیدا ہو جاتی ہے اور انسانی معدہ اسے قبول نہیں کرتا۔ چنانچہ انسان تو انسان گوشت خوار حیوان بھی گوشت خوار جانوروں کی طرف رخ نہیں کرتے اور عموماً انہی جانوروں کا گوشت کھاتے ہیں جو سبزی خوار ہوتے ہیں۔

اسلام نے انہی چیزوں کو حلال قرار دیا ہے جن سے جسم کی صحیح نشوونما ہوتی ہے اور انہی اشیاء کو حرام کیا ہے جن میں ضرر و نقصان مضمر ہوتا ہے ایسا نہیں ہے کہ اس نے مفاد و مضرت کو نظر انداز کر کے جس چیز کو چاہا حلال کر دیا ہو اور جس چیز کو چاہا حرام کر دیا ہو کیونکہ یہ اسلام کی حکمت پسندی و مصلحت بینی کے منافی ہے۔ اسلام میں بہت سی چیزیں حرام ہیں اور بہت سی اشیاء ایسی ہیں جن کے کھانے پینے کی اجازت ہے اور اکثر حلال و حرام چیزوں کو بیان کر دیا ہے اور جن چیزوں کی حلت و حرمت پر نص نہیں کی ان کے واضح علامات بیان کر دیئے ہیں جن سے حلال و حرام اور جائز و ناجائز میں امتیاز ہو جاتا ہے۔ ذیل میں امیرالمومنین کے ارشادات کی روشنی میں چند حلال و حرام چیزوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

دریائی جانوروں میں صرف مچھلی حلال ہے اور وہ بھی وہ جس پر چھلکے ہوں امیرالمومنین کا ارشاد ہے۔

الا لا تاکلوا ولا تبیعوا مالم یکن له قشر (وسائل الشیعہ)	خبردار وہ مچھلی نہ کھانا اور نہ بیچنا جس پر چھلکے نہ ہوں۔

وہ مچھلی جو مچھلی کے پیٹ سے نکلے حلال ہے چنانچہ امیرالمومنین سے اس کے بارے میں پوچھا گیا آپ نے فرمایا کہ دونوں کا کھانا حلال ہے۔

وہ مچھلی جو پانی کے اندر مر جائے حرام ہے خواہ اس پر چھلکے ہوں چنانچہ حضرت سے منقول ہے کہ

انه نهى عن الطافی (مستدرک الوسائل)	حضرت نے اس مچھلی کے کھانے سے منع فرمایا ہے جو

(حاشیہ از صفحہ گذشتہ) زندگی کی اکائی کو جس میں مادۂ حیات سمویا ہوتا ہے خلیہ کہا جاتا ہے یہ خود بھی ایک زندہ جسم ہے اور تمام زندہ اجسام انہی خلیوں کی ترکیب و ترتیب سے وجود میں آتے ہیں ان خلیوں میں مسلسل تغیرات ہوتے رہتے ہیں اور تعمیر و تخریب کا عمل جاری رہتا ہے اگر ٹوٹنے والے خلیوں کی جگہ دوسرے خلیے پیدا نہ ہو تو نشوونما کا سلسلہ رک جائے اور زندگی کی لو دم توڑ دے ان خلیوں کی تولید ہوا پانی اور غذا سے وابستہ ہے اگر ہوا پانی اور غذا میسر نہ آئے تو نہ ان خلیوں کی تخلیق ہوگی اور نہ قوت و توانائی اور زندگی برقرار رہے گی کیونکہ یہ خلیے ہی وٹامن اور پروٹین حاصل کر کے جسم کو توانا اور صحت مند رکھتے ہیں۔

پانی کے اندر مر جائے۔

صحرائی حیوانوں میں ہرن گائے وغیرہ کے علاوہ دوسرے جانور حرام ہیں چنانچہ امیرالمومنین سے ہاتھی ریچھ اور بندر کے گوشت کے بارے میں پوچھا گیا آپ نے فرمایا۔

لیس هذه من بهیمة الانعام التی توکل (وسائل الشیعہ)	یہ ان چوپاؤں میں داخل نہیں ہیں جن کا گوشت کھایا جاتا ہے۔

اسی طرح وہ درندے جو ناخنوں اور دانتوں سے چیر پھاڑ دیتے ہیں اور وہ پرندے جو چنگال رکھتے ہیں جیسے باز شکرہ شاہین وغیرہ حرام ہے حضرت کا ارشاد ہے۔

اتقوا کل ذی ناب من السباع ومخلب من الطیر (وسائل الشیعہ)	دانتوں سے چیرنے پھاڑنے والے درندوں اور چنگال رکھنے والے پرندوں کے گوشت سے اجتناب کرو۔

وہ پرندے جن کی حلت وحرمت پر نص نہ ہو ان کی حلت وحرمت کو دو علامتوں سے جانا جا سکتا ہے پہلی علامت یہ ہے کہ اگر پرواز کے وقت اپنے پروں کو پھیلاتے ہوں اور یہ پھیلاؤ پروں کے پھڑ پھڑانے سے زیادہ ہو تو وہ حرام ہیں اور اگر پروں کو پھڑ پھڑاتے ہوں اور یہ پھڑ پھڑانا پروں کو پھیلانے سے زیادہ ہو تو وہ حلال ہیں چنانچہ حضرت کا ارشاد ہے۔

کل ما دف ولا تاکل ما صف (وسائل الشیعہ)	جو اڑتے ہوئے پروں کو پھڑ پھڑائیں وہ کھاؤ اور جو پروں کو پھیلائیں وہ نہ کھاؤ۔

دوسری علامت یہ ہے کہ اگر اس میں پوٹا یا سنگدانہ ہو یا اس کے پیروں کے عقبی حصہ میں کانٹا سا ہو تو وہ حلال ہے اور اگر ان علامتوں میں سے کوئی علامت نہ ہو تو وہ حرام ہے۔ حضرت فرماتے ہیں۔

تنزهوا عن اکل الطیر الذی لیست لہ قانصة ولا صیصیة ولا حوصلة (وسائل الشیعہ)	ان پرندوں کے گوشت سے اجتناب کرو جن میں سنگدانہ یا پیروں کے عقبی حصہ میں کانٹا اور پوٹا نہ ہو۔

بعض صورتوں میں حلال جانور بھی حرام ہو جاتا ہے اس حرمت کے تین سبب ہیں۔

پہلا سبب یہ ہے کہ بھیڑ بکری گائے یا اونٹ کا بچہ مادہ خنزیر کا دودھ اتنی مقدار میں پئے جس سے گوشت پیدا ہو اور ہڈیوں میں مضبوطی آئے۔ حضرت فرماتے ہیں۔

لا تاکل من لحم حمل رضع من لبن خنزیرة (وسائل الشیعہ)	اس بھیڑ بکری کے بچے کا گوشت نہ کھاؤ جس نے سورنی کا دودھ پیا ہو۔

اگر اتنی کم مقدار میں پئے کہ جس سے ہڈیوں میں مضبوطی نہ آئے تو اس کا گوشت اور دودھ مکروہ ہے۔ یہ کراہت استبراء سے زائل ہو جاتی ہے۔ اس استبراء کی صورت یہ ہے کہ اگر وہ دودھ کے بغیر رہ سکتا ہو تو سات دن تک اسے چارہ وغیرہ دیا جائے اور اگر دودھ کے بغیر نہ رہ سکتا ہو تو اسے بکری وغیرہ کے تھنوں پر چھوڑا جائے چنانچہ حضرت

سے ایسے جانور کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا۔

قیدوہ واعلفوہ الکسب والنوی والشعیر والخبز ان کان استغنی عن اللبن وان لم یکن استغنی عن اللبن فیلقی علی ضرع شاۃ سبعۃ ایام ثم یؤکل لحمہ (وسائل الشیعہ)	اسے بند رکھو اگر اسے دودھ کی احتیاج نہ ہو تو اسے کھل گٹھلیاں جو روٹی کھانے کو دو اور اگر اسے دودھ کی ضرورت ہو تو اسے سات دن تک بکری کے تھن پر چھوڑ دو پھر اس کا گوشت کھایا جاسکتا ہے۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ انسان اس کے ساتھ وطی کا مرتکب ہو جب وطی ثابت ہو جائے تو اس کا گوشت اور دودھ حرام ہو جاتا ہے چنانچہ امیرالمومنین سے ایسے چوپائے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا۔

حرام لحمھا و لبنھا (وسائل الشیعہ)	اس کا گوشت اور دودھ حرام ہے۔

تیسرا سبب یہ ہے کہ اس کی غذا انسانی فضلہ ہو ایسا جانور اس وقت تک حلال نہیں ہوتا جب تک اتنا عرصہ نہ گزر جائے کہ نجاست کے اثرات زائل ہو جائیں۔ یہ عرصہ جسے شرعی اصطلاح میں استبراء کہا جاتا ہے مختلف جانوروں کی جسامت کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے چنانچہ امیرالمومنین کا ارشاد ہے۔

الدجاجۃ الجلالۃ لا یؤکل لحمھا حتی تقید ثلثۃ ایام والبطۃ الجلالۃ بخمسۃ ایام والشاۃ الجلالۃ عشرۃ ایام والبقرۃ الجلالۃ عشرین یوما والناقۃ الجلالۃ اربعین یوما (وسائل الشیعہ)	نجاست خوار مرغی بطخ بکری گائے اور اونٹنی کا گوشت اس وقت تک نہیں کھایا جائے گا جب تک ان نجاست خوار جانوروں کو بالترتیب تین پانچ دس بیس اور چالیس دن تک بند نہ رکھا جائے۔

امیرالمومنین کا یہ ارشاد اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ نجس غذا اپنا اثر چھوڑتی ہے اور وہ ایسا اثر ہے جو غذا کے تحلیل ہونے سے زائل نہیں ہوتا بلکہ اس کا ازالہ اس غذا سے پیدا ہونے والے اثرات یعنی خلیوں کے ازالہ پر منحصر ہے اور اس ازالہ کی مدت مختلف حیوانات کی جسامت اور غذا کی مقدار کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے جو حضرت کے ارشاد کے مطابق تین دن سے لے کر چالیس دن تک ہے ظاہر ہے کہ اس مدت سے تحلیل غذا کی مدت مراد نہیں لی جاسکتی کیونکہ وہ چند گھنٹوں سے زائد نہیں ہوتی بلکہ غذا سے پیدا ہونے والے خلیوں کے بارے ہی میں ہو سکتی ہے جن کے ٹوٹنے اور ان کی جگہ پر نئے خلیوں کے پیدا ہونے میں تین دن سے لے کر چالیس دن تک کا عرصہ درکار ہوتا ہے۔ حضرت نے اس دور میں ان غیر مرئی خلیوں کی نشاندہی کی ہے کہ جب نہ خلیوں کا کسی کو علم تھا اور نہ ان کا کوئی تصور پیدا ہوا تھا۔

حلال جانوروں میں چند چیزیں حرام بھی ہوتی ہیں جن سے اجتناب کرنا چاہیئے چنانچہ ایک مرتبہ امیرالمومنین کوفہ کے بازار میں آئے اور قصابوں کو خون غدود حرام مغز خصیتین قضیب اور تلی وغیرہ کے فروخت کرنے سے منع کیا اس پر ایک شخص نے کہا کہ یا امیرالمومنین تلی اور کلیجی میں فرق ہی کیا ہے دونوں ایک ہی تو ہیں۔ فرمایا کہ ایسا نہیں ہے پھر ان دونوں کا فرق ظاہر کرنے کے لئے دو برتن منگوائے ایک میں کلیجی کو اور دوسرے میں تلی کو رکھا اور ان دونوں پر پانی

ڈالا کچھ دیر کے بعد یہ دیکھا گیا کہ تلی خون بن کر پانی میں مخلوط ہوگئی ہے اور بالائی پوست اور رگوں کے سوا اس میں کچھ نہیں رہا اور کلیجی کے اجزاء جوں کے توں باقی ہیں صرف اس کی رنگت سفید ہوگئی ہے فرمایا کہ ان دونوں میں یہی فرق ہے کہ کلیجی گوشت ہے اور تلی خون ہے حضرت کا ارشاد ہے کہ

لا تا کلوا الطحال فانه بیت الدم الفاسد (وسائل الشیعہ) — تلی نہ کھاؤ اس لئے کہ یہ فاسد خون ہے جو منجمد ہو گیا ہے۔

شراب خواہ انگور سے بنائی گئی ہو یا کھجور سے یا جو سے اس کا پینا کشید کرنا بیچنا سب حرام ہے امیرالمومنین کا ارشاد ہے۔

مد من الخمر یلقی اللہ حین یلقاہ کعابد وثن (وسائل الشیعہ) — شراب خوار جب اللہ کے حضور میں آئے گا تو بت پرستوں میں شمار ہوگا۔

حضرت سے کہا گیا کہ آپ کا خیال یہ ہے کہ شراب نوشی زنا اور چوری سے بڑھ کر جرم ہے فرمایا کہ ہاں ایسا ہی ہے اسلئے کہ زانی زنا تک محدود رہتا ہے اور شراب خور جب نشہ میں مست ہوتا ہے تو زنا چوری اور قتل تک کا ارتکاب کر گزرتا ہے۔

انگور کا پانی جسے عصیر عنبی کہا جاتا ہے جب جوش کھا جائے تو اس وقت تک اس کا استعمال جائز نہیں ہے جب تک کہ اس کا دو تہائی حصہ جل نہ جائے چنانچہ امیرالمومنین اسود ابن قرطبہ کو تحریر فرمایا۔

واطبخ للمسلمین قبلك من الطلا ما یذهب ثلثاہ ویبقی ثلثه (بحارالانوار) — انگور کا پانی مسلمانوں کے لئے جوش دو اس طرح کہ اس کے دو حصے جل جائیں اور ایک حصہ باقی رہ جائے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ دو تہائی حصہ جلنے کے بعد وہ شیرہ ہو جائے گا اور دو تہائی حصے کے خشک ہونے سے پہلے اسے رکھا رہنے دیا جائے تو اس میں نشہ آور کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

باب النکاح

انسان طبعاً اجتماعی زندگی کا محتاج ہے اس کے بغیر نہ معاشرہ وجود میں آسکتا ہے اور نہ متمدن زندگی کی تشکیل ہوسکتی ہے اس اجتماعی حیات کا ابتدائی مقام گھر ہے اور گھر کی تشکیل عائلی زندگی سے وابستہ ہے اسی سے اولاد کنبہ اور قوم و قبیلہ وجود میں آتا ہے اور نسل انسانی کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے بیشک ازدواجی زندگی سے ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں مگر ان ذمہ داریوں کے ساتھ جو ماحول اس کے گرد و پیش تعمیر ہوتا ہے وہ اسے ان ذمہ داریوں کی تلخی کا احساس نہیں ہونے دیتا اور وہ خوشدلی سے اہل و عیال کی کفالت اور اولاد کی تربیت کا بار اٹھانے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اگر انسان تجرد کی زندگی بسر کرے تو وہ ذہنی پراگندگی و پریشاں خیالی کا شکار ہو جاتا ہے اور عبادات و فرائض میں دل جمعی و یکسوئی پیدا نہیں کر سکتا۔ اسی لئے اسلام نے متاہل کی عبادت کو غیر متاہل کی عبادت پر فوقیت دی ہے اور بقائے نسل کے لئے ازدواجی زندگی پر زور دیا ہے اس کے ساتھ چند پابندیاں بھی عائد کی ہیں اور جائز و ناجائز اور حلال و حرام کی حد بندی کر دی ہے تاکہ خواہشات کی تکمیل ہو تو مقررہ حدود کے اندر اور احکام کی پابندی کے ساتھ۔ ان احکام میں سے چند احکام تحریر کئے جاتے ہیں۔

اگر باپ یا دادا اپنے نابالغ لڑکے یا لڑکی کا نکاح کر دے تو وہ عقد لازم ہوگا اور لڑکے اور لڑکی کو بالغ ہونے کے بعد اس نکاح کو رد کرنے کا اختیار نہ ہوگا۔ امیر المومنین کا ارشاد ہے۔

تزویج الآباء علی البنین والبنات جائز اذا کانوا صغاراً ولیس لھم خیار اذا کبروا (مستدرک الوسائل)

باپ دادا کا اپنے لڑکے اور لڑکیوں کو بیاہ دینا جائز ہے جبکہ وہ نابالغ ہوں اور بالغ ہونے کے بعد انہیں عقد کو ختم کرنے کا اختیار نہ ہوگا۔

اگر لڑکی بالغ ہو تو اس سے پوچھے بغیر باپ کو اس کا عقد نہ کرنا چاہیئے۔ حضرت فرماتے ہیں۔

لا ینکح احدکم ابنته حتی یستأمرھا فی نفسھا فھی اعلم بنفسھا۔ (مستدرک الوسائل)

کوئی شخص اپنی لڑکی کا نکاح اس وقت تک نہ کرے جب تک لڑکی سے اس کی آزادانہ رائے دریافت نہ کرلے کیونکہ وہ اپنے حالات سے زیادہ واقف ہے۔

اگر کوئی عورت دو آدمیوں کو اپنا وکیل نکاح قرار دے اور ان میں سے ایک ایک سے اور دوسرا دوسرے شخص سے اس کا نکاح پڑھ دے تو پہلا نکاح صحیح ہوگا اور دوسرا باطل۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

اذا وکلت المرأۃ الولیین وفوضت الیھما فانکحھا کل واحد منھما رجلا فالنکاح للاول (مستدرک الوسائل)

جب کوئی عورت دو آدمیوں کو نکاح کا اختیار سونپ کر اپنا وکیل بنائے اور وہ دونوں اس کا نکاح کر دیں تو پہلے آدمی سے نکاح صحیح ہوگا۔

اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق رجعی دے دے تو مدت عدہ کے اندر اس کی بہن سے نکاح نہیں کر سکتا۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

اذا طلق الرجل المرأۃ لم یتزوج اختھا حتی تنقضی عدتھا (مستدرک الوسائل)

جب کوئی شخص اپنی عورت کو طلاق دے دے تو اس کا عدہ گزرنے سے پہلے اس کی بہن سے نکاح نہیں کر سکتا۔

اگر کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کرے اور پھر وفات پا جائے یا اسے طلاق دے دے تو وہ عورت اس مرد کے بیٹوں پر حرام رہے گی خواہ ہم بستری ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

اذا نکح الرجل امرأۃ ثم توفی عنھا اوطلقھا لم تحل لاحد من ولدہ کان دخل بھا اولم یدخل (مستدرک الوسائل)

جب کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کرے پھر مر جائے یا اسے طلاق دے دے تو وہ اس شخص کی اولاد پر حلال نہ ہوگی خواہ اس نے ہم بستری کی ہو یا نہ کی ہو۔

اگر کوئی شخص کسی عورت سے عقد کرے تو اس عورت کی ماں اس شخص پر حرام ہو جائے گی خواہ ہم بستری کی نوبت نہ آئی ہو اور اس کی بیٹی بھی حرام رہے گی در صورتیکہ اس سے ہم بستری ہو چکی ہو۔

ایک مرتبہ ابن مسعود سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے ایک عورت سے عقد کیا اور ہم بستری کی نوبت نہ آئی تھی کہ

اگر باپ یا دادا اپنے نابالغ لڑکے یا لڑکی کا نکاح کر دے تو وہ عقد لازم ہوگا اور لڑکے اور لڑکی کو بالغ ہونے کے بعد اس نکاح کو رد کرنے کا اختیار نہ ہوگا۔ امیر المومنین کا ارشاد ہے۔

تزویج الآباء علی البنین والبنات جائز اذا کانوا صغاراً ولیس لهم خیار اذا کبروا (مستدرک الوسائل)

باپ دادا کا اپنے لڑکے اور لڑکیوں کو بیاہ دینا جائز ہے جبکہ وہ نابالغ ہوں اور بالغ ہونے کے بعد انہیں عقد کو ختم کرنے کا اختیار نہ ہوگا۔

اگر لڑکی بالغ ہو تو اس سے پوچھے بغیر باپ کو اس کا عقد نہ کرنا چاہیئے۔ حضرت فرماتے ہیں۔

لا ینکح احدکم ابنته حتی یستامرها فی نفسها فهی اعلم بنفسها۔ (مستدرک الوسائل)

کوئی شخص اپنی لڑکی کا نکاح اس وقت تک نہ کرے جب تک لڑکی سے اس کی آزادانہ رائے دریافت نہ کرلے کیونکہ وہ اپنے حالات سے زیادہ واقف ہے۔

اگر کوئی عورت دو آدمیوں کو اپنا وکیل نکاح قرار دے اور ان میں سے ایک' ایک سے اور دوسرا دوسرے شخص سے اس کا نکاح پڑھ دے تو پہلا نکاح صحیح ہوگا اور دوسرا باطل۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

اذا وکلت المرأة الولیین وفوضت الیهما فانکحها کل واحد منهما رجلا فالنکاح للاول (مستدرک الوسائل)

جب کوئی عورت دو آدمیوں کو نکاح کا اختیار سونپ کر اپنا وکیل بنائے اور وہ دونوں اس کا نکاح کر دیں تو پہلے آدمی سے نکاح صحیح ہوگا۔

اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق رجعی دے دے تو مدت عدہ کے اندر اس کی بہن سے نکاح نہیں کر سکتا۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

اذا طلق الرجل المرأة لم یتزوج اختها حتی تنقضی عدتها (مستدرک الوسائل)

جب کوئی شخص اپنی عورت کو طلاق دے دے تو اس کا عدہ گزرنے سے پہلے اس کی بہن سے نکاح نہیں کر سکتا۔

اگر کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کرے اور پھر وفات پا جائے یا اسے طلاق دے دے تو وہ عورت اس مرد کے بیٹوں پر حرام رہے گی خواہ ہم بستری ہوی ہو یا نہ ہوی ہو۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

اذا نکح الرجل امرأة ثم توفی عنها اوطلقها لم تحل لاحد من ولده کان دخل بها اولم یدخل (مستدرک الوسائل)

جب کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کرے پھر مر جائے یا اسے طلاق دے دے تو وہ اس شخص کی اولاد پر حلال نہ ہوگی خواہ اس نے ہم بستری کی ہو یا نہ کی ہو۔

اگر کوئی شخص کسی عورت سے عقد کرے تو اس عورت کی ماں اس شخص پر حرام ہو جائے گی خواہ ہم بستری کی نوبت نہ آئی ہو اور اس کی بیٹی بھی حرام رہے گی درصورتیکہ اس سے ہم بستری ہو چکی ہو۔

ایک مرتبہ ابن مسعود سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے ایک عورت سے عقد کیا اور ہم بستری کی نوبت نہ آئی تھی کہ

انتقال کر گئی . کیا وہ شخص اس کی ماں سے نکاح کر سکتا ہے کہا کہ ہاں اس میں کوئی حرج نہیں ہے اس کے بعد وہ امیرالمومنین کے پاس آئے اور صورت مسئلہ اور اپنا جواب بیان کیا حضرت نے فرمایا کہ تم نے یہ حکم کہاں سے اخذ کیا ہے کہا قرآن مجید کی اس آیت سے .

وامهات نساءکم وربائبکم اللاتی فی حجورکم من نساءکم اللاتی دخلتم بهن فان لم تکونوا دخلتم بهن فلا جناح علیکم	(تم پر حرام کی گئی ہیں) تمہاری بیویوں کی مائیں اور وہ لے پالک لڑکیاں جو تمہاری ان بیویوں سے ہوں جن سے تم ہم بستری کر چکے ہو اور اگر تم نے ان بیویوں سے ہم بستری نہ کی ہو تو ان لڑکیوں سے نکاح کرنے میں تم پر کوئی گناہ نہیں .

حضرت نے فرمایا کہ لے پالک لڑکیوں کے بارے میں تو آیت میں یہ قید ہے کہ وہ اس صورت میں حرام ہوں گی جب ان کی ماؤں سے ہم بستری ہو چکی ہو مگر بیویوں کی ماؤں کے بارے میں تو یہ قید نہیں ہے لہذا بیویوں کے عقد میں آجانیکے بعد ان کی مائیں حرام ہو جائیں گی . خواہ ہم بستری ہوی ہو یا نہ ہوی ہو .

اگر کوئی عورت ایسے مرد سے عقد کر لے جو اپنے کو آزاد ظاہر کرے اور اس کے بعد یہ معلوم ہو کہ وہ غلام ہے تو عورت کو فسخ نکاح کا حق ہے . چنانچہ ایک غلام نے اپنے کو آزاد ظاہر کر کے ایک آزاد عورت سے عقد کر لیا جب اس کا انکشاف ہوا تو اس نے امیرالمومنین کی طرف رجوع کیا . آپ نے فرمایا کہ عورت چاہے تو نکاح کو فسخ کر سکتی ہے .

اگر کسی لڑکی کا ولی اس کے ایسے عیب کو چھپا کر جو موجب فسخ ہوتا ہے کسی شخص سے نکاح کر دے تو وہ شخص اس عورت کے ولی سے مہر کی واپسی کا حق رکھتا ہے کیونکہ اس نے فریب و تدلیس کاری سے کام لیا ہے چنانچہ ایک لڑکی کے ولی نے یہ جانتے ہوئے کہ لڑکی مبروص ہے ایک شخص سے بیاہ دی جب اسے علم ہوا تو اس نے حضرت کی طرف رجوع کیا آپ نے فرمایا کہ اس عورت کا مہر اس کے ولی کے ذمہ ہے .

اگر کوی شخص خواستگاری کے موقع پر ایسے الفاظ کہے جن سے تبادر کچھ اور ہوتا ہو اور مراد وہ ہو جس کی طرف تبادر نہیں ہوتا مگر الفاظ اسے بھی شامل ہوں تو اس پر تدلیس کا حکم جاری نہ ہوگا چنانچہ ایک شخص نے ایک اجنبی قبیلہ میں خواستگاری کی تو انہوں نے پوچھا کہ تم کیا کاروبار کرتے ہو کہا کہ میں چوپاؤں کی خرید و فروخت کا دھندا کرتا ہوں جب نکاح ہو چکا تو معلوم ہوا کہ وہ بلیاں بیچتا ہے . یہ معاملہ امیرالمومنین کے سامنے پیش ہوا آپ نے فرمایا کہ بلیاں بھی چوپاؤں میں داخل ہیں .

اس مبحث کے ذیل میں چند مسائل جو ولادت اور اولاد سے تعلق رکھتے ہیں درج کئے جاتے ہیں .

اگر کسی عورت کے ہاں مباشرت کے چھ ماہ بعد بچہ پیدا ہو تو وہ اسی کے شوہر کا قرار پائے گا اور چھ ماہ کی مدت سے قبل اس طرح پیدا ہو کہ نمو کا کوئی درجہ باقی نہ ہو تو اس کے شوہر کا قرار نہیں دیا جائے گا اس لئے کہ حمل کی کم از کم مدت چھ ماہ ہے چنانچہ امیرالمومنین کا ارشاد ہے .

لا تلد المرأۃ لاقل من ستۃ اشھر (وسائل الشیعہ)   عورت چھ ماہ سے کم مدت میں بچہ نہیں جنتی۔

ایک مرتبہ حضرت عمر کے پاس ایک عورت کو لایا گیا جس کے ہاں نکاح کے چھ ماہ بعد بچہ پیدا ہوا تھا۔ حضرت عمر نے اسے سنگسار کرنے کا حکم دیا۔ امیرالمومنین کو معلوم ہوا تو آپ نے حضرت عمر سے کہا کہ اس عورت کو غلط کار قرار دے کر سنگسار نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت عمر نے وجہ پوچھی تو فرمایا کہ حمل اور دودھ بڑھائی کی مدت تیس مہینے ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔

وحملہ وفصالہ ثلثون شھرا   اس کے پیٹ میں رہنے اور اس کی دودھ بڑھائی کی مدت تیس مہینے ہے۔

اور دودھ پلانے کی مدت دو سال یعنی چوبیس مہینے ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔

والوالدات یرضعن اولادھن حولین کاملین   مائیں اپنے بچوں کو دو سال کامل دودھ پلائیں۔

جب تیس مہینوں سے چوبیس مہینے دودھ پلائی کے منہا کئے جائیں گے تو باقی چھ مہینے بچیں گے۔ اور یہ حمل کی کم سے کم مدت ہے لہذا یہ بچہ اسی عورت کے شوہر کا ہے۔

اگر شوہر مباشرت کر چکا ہو اور بچے کا الحاق اس سے ہو سکتا ہو تو اسی کا بچہ قرار دیا جائے گا چنانچہ ایک بوڑھے شخص نے ایک جوان عورت سے عقد کیا اور مقاربت کی حالت میں مر گیا وہ عورت حاملہ ہو گئی اور نو مہینے کے بعد بچہ جنا جب اس بچے نے ہوش سنبھالا تو اس بوڑھے کے دوسرے بیٹوں نے حضرت عمر کے پاس مرافعہ دائر کیا اور کہا کہ یہ بچہ ان کے باپ کا نہیں ہے بلکہ اس کی ماں نے غلط کاری کے نتیجہ میں اسے جنا ہے اور چند گواہ بھی پیش کر دئے۔ حضرت عمر نے اسے سنگسار کرنے کا حکم دیا اس عورت نے یہ حکم سنا تو امیرالمومنین سے فریاد کی اور اپنے عقد اور ازدواجی تعلق کی کیفیت بیان کی۔ حضرت نے فرمایا کہ یہ عورت ہر چیز واضح طور سے بتاتی ہے لہذا اسے سزا دینے میں جلدی نہ کی جائے۔ دوسرے دن آپ نے چند بچوں کو جمع کیا اور اس بچے سے کہا کہ تم ان بچوں کے ساتھ مل کر کھیلو جب وہ بچے کھیلنے لگے تو آپ نے ایکدم حکم دیا کہ سب بیٹھ جائیں وہ بچے اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ ان کے بیٹھتے ہی پھر حکم دیا کہ کھڑے ہو جائیں تمام بچے فوراً کھڑے ہو گئے مگر اس بچے نے اپنے دونوں ہاتھ زمین پر ٹیکے اور ہاتھوں کا سہارا لے کر کھڑا ہوا حضرت نے فرمایا کہ یہ اسی مرنے والے بوڑھے کا بیٹا ہے لہذا اس کے ترکہ میں سے اسے حصہ دیا جائے اور اس کے بھائیوں کو افترا پردازی کی سزا دی جائے۔ حضرت عمر نے کہا کہ آپ نے یہ فیصلہ کس بنا پر کیا ہے فرمایا کہ اس کا ہاتھ ٹیک کر کھڑا ہونا بتاتا ہے کہ یہ اسی کمزور اور ضعیف باپ کا بیٹا ہے۔

حضرت نے اس بچے کی کمزوری و ناتوانی کو اس بوڑھے کی اولاد ہونے کے ثبوت میں پیش کیا۔ یہ صرف ان لوگوں کو مطمئن کرنے کے لئے تھا ورنہ قول پیغمبرؐ الولد للفراش (بچہ اسی کا ہوگا جس کے بستر پر پیدا ہو) اس امر کی واضح دلیل ہے کہ وہ بچہ اسی بوڑھے کا ہے۔

اگر کوئی شخص مادۂ منویہ باہر پھینکے اور پیشاب کئے بغیر پھر اسی عورت سے مقاربت کرے اور بچہ پیدا ہو جائے

تو وہ اسی کا بچہ ہوگا کیونکہ یہ احتمال موجود ہے کہ پہلی مباشرت کے نتیجہ میں کچھ اجزاء منویہ نالی کے اندر رہ گئے ہوں جو انعقاد حمل کا باعث ہوے ہوں چنانچہ ایک شخص نے حضرت سے عرض کیا کہ میں مقاربت کے موقع پہ مادۂ منویہ باہر پھینکتا تھا مگر اس کے باوجود اس کے ہاں بچہ پیدا ہوا ہے آپ نے فرمایا کہ تم نے مقاربت کے بعد دوبارہ مقاربت کی تھی کہا کہ ہاں فرمایا کہ کیا دوسری مقاربت سے پہلے پیشاب کیا تھا کہا نہیں فرمایا کہ وہ بچہ تمہارا ہے۔

اگر ماں باپ اور بچے کی رنگت میں فرق ہو تو بچے کو ناجائز اولاد قرار نہیں دیا جائے گا۔ اس لئے کہ بعض اوقات خارجی اسباب کے زیر اثر رنگت میں تفاوت ہو جاتا ہے چنانچہ ایک حبشی مرد اپنی حبشیہ بیوی کو لے کر حضرت عمر کے پاس آیا اور کہا کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں سیاہ فام ہوں اور میری بیوی بھی سیاہ فام ہے اس نے ایک بچہ جنا ہے جو سرخ رنگ کا ہے۔ حضرت عمر کے پوچھنے پر اس عورت نے کہا کہ میں کسی خیانت کی مرتکب نہیں ہوئی یہ لڑکا اسی کا ہے حضرت عمر حیران و پریشان ہوئے اور کوئی فیصلہ نہ کر سکے آخر امیرالمومنین کی طرف رجوع کیا گیا آپ نے اس مرد سے کہا کہ میں تم سے کچھ پوچھوں تو تم صحیح صحیح جواب دو گے اس نے کہا کہ ہاں فرمایا کہ تم نے اپنی بیوی سے حالت حیض میں مقاربت تو نہیں کی اس نے اس کا اعتراف کیا فرمایا کہ جب نطفہ خون کے ساتھ ملا تو اس سے ایسا بچہ پیدا ہوا جو سرخ رنگت لئے ہوئے ہے لہذا تم اس کے بیٹا ہونے سے انکار نہ کرو یہ تمہاری غلطی کا نتیجہ ہے اس میں تمہاری بیوی کا کوئی گناہ نہیں ہے۔

حضرت نے بعض صورتوں میں طبعی آثار کی بنا پر بھی اولاد کا فیصلہ کیا ہے چنانچہ ایک شخص قاضی شریح کے پاس آیا اور کہا کہ فلاں آدمی دو عورتیں ایک آزاد اور ایک کنیز میرے پاس چھوڑ گیا ان دونوں کے ہاں ولادت ہوئی ایک کے ہاں لڑکا پیدا ہوا اور ایک کے ہاں لڑکی، مگر وہ دونوں لڑکی سے انکار کرتی ہیں اور ہر ایک یہ کہتی ہے کہ اس کی کوکھ سے لڑکا پیدا ہوا ہے۔ شریح کوئی فیصلہ نہ کر سکے اور حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ واقعہ بیان کیا۔ حضرت نے ایک تنکا زمین سے اٹھایا اور فرمایا کہ اس کا فیصلہ اس تنکے کے اٹھانے سے بھی آسان تر ہے پھر آپ نے ان دونوں عورتوں کو طلب کیا اور ان سے کہا کہ وہ الگ پیالیوں میں اپنا دودھ نکالیں جب انہوں نے دودھ نکالا تو حضرت نے دونوں کا دودھ الگ الگ تولا ایک کا دودھ بھاری اور دوسری کا دودھ ہلکا نکلا جس کا دودھ بھاری تھا اس کے حوالے لڑکا کیا اور جس کا دودھ ہلکا تھا اسے لڑکی دی اور فرمایا کہ جس طرح لڑکی لڑکے کے مقابلہ میں میراث و دیت شہادت اور عقل میں کمتر ہوتی ہے اسی طرح اس کے دودھ کا وزن بھی لڑکے کے دودھ سے ہلکا ہوتا ہے۔

بچے کی ولادت کے سلسلہ کے چند احکام و آداب یہ ہیں۔

بچے کی ولادت سے پہلے ہی اس کا نام تجویز کر دینا چاہیئے۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

سموا اولادکم قبل ان یولدوا (وسائل الشیعہ) اپنی اولاد کا نام ان کی پیدائش سے پہلے رکھ دو۔

سر مونڈتے وقت سر کے وسط یا کنارے میں چوٹی کی صورت میں بال نہ چھوڑے۔ حضرت فرماتے ہیں۔

لاتحلقوا الصبیان القزع (وسائل الشیعہ) بچوں کے وسط سر میں کچھ بال چھوڑ کر نہ مونڈو۔

ساتویں دن عقیقہ کرے خواہ لڑکا ہو یا لڑکی۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

عفوا عن اولادکم یوم السابع (وسائل الشیعہ) ساتویں دن اپنے بچوں کا عقیقہ کرو۔

بچوں کا ختنہ کروائے حضرت فرماتے ہیں۔

اختنوا اولادکم یوم السابع لا یمنعکم حر ولا برد فانہ طھور للجسد (وسائل الشیعہ) سردی کا موسم ہو یا گرمی کا ساتویں دن اپنے بچوں کا ختنہ کرو اس لئے کہ یہ جسم کی پاکیزگی کا باعث ہے۔

بچے کو اس کی ماں کا دودھ پلوائے یہ دودھ بچے کی نشوونما کے لئے زیادہ موثر اور مفید ہے کیونکہ یہ اسی خون کی ایک بدلی ہوئی صورت ہے جو شکم مادر میں اس کی غذا فراہم کرتا رہا ہے۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

ما من لبن رضع بہ الصبی اعظم برکۃً علیہ من لبن امہ (وسائل الشیعہ) بچے کے لئے اس کی ماں کا دودھ ہر دودھ سے زیادہ بابرکت ہے۔

اگر ماں کے علاوہ کسی اور عورت کا دودھ پلوانا پڑجائے تو ایسی عورت کا انتخاب کیا جائے جو خوش اطوار اور عقلمند ہو حضرت فرماتے ہیں۔

توقوا علی اولادکم لبن البغی من النساء والمجنونۃ فان اللبن یعدی (بحارالانوار) اپنی اولاد کو فاحشہ اور دیوانی عورت کا دودھ نہ پلاؤ اس لئے کہ دودھ طبیعت پر اثر انداز ہوتا ہے۔

باب الطلاق

رشتۂ زوجیت کو قطع کرنے کا نام طلاق ہے اگرچہ یہ مستحسن عمل نہیں ہے تاہم ازدواجی زندگی میں ایسی صورتیں پیدا ہوجاتی ہیں کہ زن و مرد میں یک جہتی باقی نہیں رہتی اور مرد کو عورت سے اور عورت کو مرد سے علیحدگی کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا اور ان کی فلاح و بہبود اسی میں ہوتی ہے کہ وہ احسن طریق سے نکاح کے بندھن کو توڑ دیں اور ایک دوسرے سے علیحدہ ہوجائیں۔ صحت طلاق کیلئے ضروری ہے کہ طلاق دہندہ طلاق کا قصد و ارادہ رکھتا ہو اور جس عورت کو طلاق دی جارہی ہو وہ حیض و نفاس سے پاک وصاف ہوچکی ہو اور پاک ہونے کے بعد اس سے مباشرت واقع نہ ہوئی ہو اور اجرائے طلاق کے وقت دو عادل گواہ موجود ہوں چنانچہ امیرالمومنین کا ارشاد ہے۔

لا یکون الطلاق طلاقا حتی یجتمع الحدود الاربعۃ فاولھا ان تکون المرأۃ طاھرۃ من غیر جماع یقع بھا من بعد خروجھا من طمثھا الذی طھرت فیہ والثانی ان یکون الرجل مریدا بالطلاق غیر مکرہ ولا مجبر علیہ والثالث ان یحضر شاھدین عدلین فی وقت تطلیقہ ایاھا والرابع ان ینطق لسانہ عند الشاھدین بالطلاق (مستدرک الوسائل)

اس وقت تک طلاق واقع نہ ہوگی جب تک چار شرطیں جمع نہ ہوجائیں پہلی شرط یہ ہے کہ عورت خون سے پاک ہو اور خون حیض سے پاک ہونے کے بعد اس سے مباشرت واقع نہ ہوئی ہو دوسری یہ کہ بغیر کسی جبر و اکراہ کے طلاق کا ارادہ کرے تیسری یہ کہ طلاق دیتے وقت دو عادل گواہ موجود ہوں چوتھی یہ کہ ان دو گواہوں کے روبرو صیغۂ طلاق اپنی زبان پر جاری کرے۔

الثلاث واحدة فقال عمر ابن الخطاب ان الناس قد استعجلوا فی امر کانت لھم فیہ اناۃ فلو امضیناہ علیھم فامضاہ علیھم

(صحیح مسلم ج ۱ ص ۴۷۷)

حضرت عمر نے کہا کہ لوگوں نے ایسے امر میں جلد بازی شروع کردی ہے جس میں ان کے لئے مہلت فراہم کی گئی تھی۔ اب اگر اسی کو نافذ کردیا جائے تو کیا ہرج ہے چنانچہ انہوں نے ایک ساتھ دی ہوی تین طلاقوں کو تین طلاقیں قرار دینے کا حکم جاری کردیا۔

اس حکم کی تائید نہ قرآن سے ہوتی ہے اور نہ سنّتِ رسُول سے بلکہ قرآن وسنّت دونوں نے اس کی نفی کی ہے مگر اس کے باوجود سوادِ اعظم کا اسی پر عملدرآمد ہے۔ بہرحال قرآن وسنّت اور آئمہ اہلبیت کے اقوال کی روشنی میں ایک ساتھ تین طلاقیں کہہ دینے سے تین طلاقیں واقع نہیں ہوتیں بلکہ پہلی اور دُوسری اور دوسری اور تیسری طلاق کے درمیان رجوع کی صورت پیدا ہو تو تین طلاقیں ہوں گی۔

اگر کسی آزاد عورت کا شوہر غلام ہو تو وہ بھی تین طلاقوں کے بعد اسی طرح حرام ہوجائے گی جس طرح آزاد سے بیاہی ہوی آزاد عورت حرام ہوجاتی ہے چنانچہ حضرت سے غلام سے بیاہی ہوی آزاد عورت کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ وہ کتنی طلاقوں کے بعد حرام ہوگی فرمایا۔

الطلاق والعدۃ بالنساء (وافی) طلاق اور عدہ میں دوسری عورتوں کے برابر ہوگی۔

یعنی تیسری طلاق کے بعد حرام ہوجائے گی اور اس کی مدت عدہ بھی تین طہر ہے۔

اگر عورت کنیز ہو تو دوسری طلاق کے بعد حرام ہوجائے گی۔ چنانچہ دو آدمیوں نے حضرت عمر سے کنیز کی طلاق کے بارے میں پوچھا وہ ان دونوں کو لے کر امیرالمومنین کے پاس آئے اور کنیز کی طلاق کے بارے میں پوچھا آپ نے انگلیوں کے اشارے سے بتایا کہ دو یعنی دو طلاقوں کے بعد وہ اپنے شوہر پر حرام ہوجائے گی۔

اگر کوی شخص مباشرت کے بعد اپنی بیوی کو طلاق دے تو وہ پورے مہر کی ادائیگی کا ذمہ دار ہوگا اور اگر مباشرت سے پہلے طلاق دے تو عورت نصف مہر کی حقدار ہوگی۔ چنانچہ حضرت سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص نے کنیز کو مہر قرار دے کر ایک عورت سے عقد کیا اور مباشرت سے پہلے اسے طلاق دے دی اب ادائے مہر کی کیا صورت ہوگی فرمایا کہ وہ کنیز کی آدھی قیمت اس عورت کو بطور مہر ادا کرے۔ اسی طرح ایک شخص نے اپنی کنیز کی آزادی کو مہر قرار دے کر اس سے عقد کیا اور مباشرت سے قبل اسے طلاق دے دی فرمایا کہ وہ کنیز محنت مزدوری کرکے اپنی نصف قیمت اس شخص کو واپس کرے۔

باب العدہ

عورت کو طلاق کے ملنے یا بیوہ ہونے پر کچھ عرصہ کے لئے نکاحِ ثانی سے توقف کرنا ضروری ہے کیونکہ ایک رشتہ کے ختم ہوتے ہی دُوسرا رشتہ قائم کرلیا جائے تو اس سے ازدواجی رشتہ بے وقعت و بے وزن ہوکر رہ جاتا ہے۔ علاوہ بریں اس میں یہ مصلحت بھی کارفرما ہے کہ یہ امر

واضح طور پر معلوم ہو جائے کہ عورت حاملہ تو نہیں ہے اور یہ معلوم ہونا اس لئے ضروری ہے کہ اگر رشتہ کے قطع ہونے یا شوہر کے مرنے کے فوراً بعد دوسرا نکاح کرلے گی تو حمل کے ظاہر ہونے کی صورت میں یہ پتہ نہ چل سکے گا کہ یہ حمل پہلے شوہر سے ہے یا دوسرے شوہر سے کیونکہ ابتدائے حمل میں حمل کا احساس نہیں ہوتا اور ہوتا ہے تو غیر یقینی طور پر۔ اسی بنا پر جن عورتوں میں حمل کا امکان نہیں ہوتا جیسے صغیرہ یائسہ اور غیر مدخولہ ان پر سے عدہ ساقط کردیا گیا ہے اور وہ طلاق کے بعد جب چاہیں عقد ثانی کر سکتی ہیں البتہ عدۂ وفات ان پر بھی ہے کیونکہ ازدواجی روابط میں تفریق کے باوجود شوہر کی موت کا صدمہ سب کو یکساں ہوتا ہے اور غم کے اثرات جب تک تازہ رہتے ہیں انسان فطرتاً خوشی کی کسی تقریب کو گوارہ نہیں کرتا اور اسلام کا ہر قانون چونکہ فطرت کے عین مطابق ہے اس لئے اس نے بیوہ کو سوگوارانہ طرز عمل اختیار کرنے کی ہدایت کی ہے اور بے ضرورت گھر سے باہر نکلنے زیور اور رنگین لباس پہننے اور زینت کرنے سے منع کیا ہے اور اس کی ایک حد بھی مقرر کردی ہے تاکہ زندگی کے معمولات میں ناقابل برداشت عرصہ تک خلل رونما نہ ہو۔ اس مقررہ حد کا نام عدہ ہے جس میں مطلقہ ہو یا بیوہ عقد ثانی نہیں کرسکتی۔

اگر عورت طلاق یافتہ ہو تو اس کا عدہ تین طہر ہیں اس میں وہ طہر بھی شامل ہے جس میں طلاق واقع ہوئی ہو قرآن مجید میں ہے۔

والمطلقات یتربصن بانفسھن ثلثۃ قروء	جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو وہ تین طہروں تک اپنے کو نکاح سے روکیں۔

قروء قرء کی جمع ہے اس کے معنی حیض کے بھی ہیں اور طہر کے بھی طہر سے مراد دو حیضوں کا درمیانی عرصہ ہے اور آیت میں قرء سے مراد یہی پاکیزگی کے ایام ہیں چنانچہ امیرالمومنین کا ارشاد ہے۔

انما القرء مابین الحیضتین (وسائل الشیعہ)	قرء سے مراد دو حیضوں کا درمیانی عرصہ ہے۔

لہٰذا جب تیسرے طہر کے بعد خون حیض دیکھے گی تو اس کے ساتھ ہی مدت عدہ ختم ہو جائے گی۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

اذا رأت الدم من الحیضۃ الثالثۃ فقد انقضت عدتھا (وسائل الشیعہ)	جب عورت تیسرا خون حیض دیکھے گی تو اس کی مدت عدہ ختم ہو جائے گی۔

اگر مطلقہ حاملہ ہو تو مدت عدہ وضع حمل ہے خواہ طلاق کے تھوڑی دیر بعد بچہ پیدا ہو جائے وقت پر پیدا ہو یا قبل از وقت گر جائے۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

اما المطلقۃ الحامل فاجلھا کما قال اللہ عزوجل ان تضع حملھا وکل شئ وضعتہ یستبین انہ حمل تم اولم یتم فقد انقضت بہ عدتھا۔ (مستدرک الوسائل)	مطلقۂ حاملہ کی مدت عدہ فرمان الٰہی کے مطابق وضع حمل ہے اور وہ جو کچھ جنے اس سے یہ ظاہر ہو کہ وہ حمل تھا خواہ جو جنا ہے وہ تمام ہو یا نا تمام اس کا عدہ ختم ہو جائے گا۔

اس منصب کا تقاضا یہ ہے کہ انسان جو فیصلہ کرے پوری دیانت داری سے کرے اور بے جا رو رعایت جنبہ داری اور خیانت و بے راہروی سے کنارہ کش رہے۔ حضرت نے رفاعہ ابن شداد کو اہواز میں قاضی مقرر کیا تو انہیں ہدایات دیتے ہوئے تحریر فرمایا۔

ان هذه الامارة امانة فمن جعلها خیانة فعلیه لعنة الله الی یوم القیامة (مستدرک الوسائل)

یہ منصب ایک امانت ہے جو اس میں خیانت کا مرتکب ہوگا وہ قیامت تک اللہ کی لعنت کا مستحق قرار پائے گا۔

قضا کے سلسلہ میں رشوت لینے کا کوئی جواز نہیں ہے خواہ فیصلہ صحیح ہی کرنا ہو۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

ومن السحت الرشوة فی الحکم (مستدرک الوسائل) فیصلہ کے سلسلہ میں رشوت حرام ہے۔

رشوت کبھی تحفہ و ہدیہ کے نام سے بھی پیش کی جاتی ہے۔ لہٰذا ان لوگوں سے جنہوں نے اس کے ہاں کوئی مرافعہ دائر کر رکھا ہو تحفہ و تحائف کے قبول کرنے کا بھی جواز نہیں ہے۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

ایاك وقبول التحف من الخصوم (مستدرک الوسائل) داد خواہوں سے کوئی تحفہ قبول نہ کرو۔

جب تک دعویٰ و جواب دعویٰ سن کر معاملہ کی تہہ تک نہ پہنچے فیصلہ نہ کرے۔ حضرت کا ارشاد ہے

لا یدخل فی اعجاب یکتفی بادنی فهم دون اقصاه (مستدرک الوسائل)

اپنی معاملہ فہمی پر مغرور نہ ہو کہ تھوڑا بہت سمجھنے پر اکتفا کرے بلکہ اصل معاملہ کی پوری چھان بین کرے۔

غصہ اور اونگھ کی حالت میں فیصلہ نہ کرے۔ حضرت فرماتے ہیں۔

لا تقض وانت غضبان ولا من النوم سکران (مستدرک الوسائل)

غصہ کی حالت میں اور نیند کی مدہوشی میں فیصلہ نہ کرو۔

قضا کے سلسلہ میں مشورہ و رائے نہ لے اس لئے کہ دین کے احکام و ضوابط مشورہ کے محتاج نہیں ہیں اور نہ ہی قیاس و رائے سے طے پاتے ہیں چنانچہ حضرت کا ارشاد ہے۔

لا تشاور فی القضاء فان المشورة فی الحرب ومصالح العاجل والدین لیس بالرای انما هو الاتباع (مستدرک الوسائل)

قضا کے سلسلہ میں مشورہ نہ کرو اسلئے کہ مشورہ جنگ اور دنیوی مصالح کے سلسلہ میں ہوتا ہے اور دین رائے کے تابع نہیں ہے بلکہ (احکام شرع کے) اتباع کا نام ہے۔

فریقین میں سے ایک فریق کو اپنی توجہ کا مرکز قرار نہ دے بلکہ دونوں سے یکساں رویہ رکھے۔ امیرالمومنین کا ارشاد ہے۔

من ابتلی بالقضاء فلیواس بینهم فی الاشارة وفی النظر وفی المجلس (وسائل الشیعہ)

جس شخص پر قضا کا بار آپڑے اسے چاہیئے کہ اشارہ نظر اور جائے نشست میں سب سے یکساں برتاؤ کرے۔

امیرالمومنین کی ذات والاصفات میں صحیح علمی ذوق اور قوت فیصلہ کے امتزاج نے واقعات سے اخذ نتائج کا ملکہ بدرجہ اتم پیدا کردیا تھا اور آپ ان پیچیدہ گتھیوں کو جنہیں سلجھانے میں دوسرے عاجز و درماندہ ہوجاتے تھے اس طرح حل کر دیتے کہ اصل واقعہ کا ایک ایک گوشہ بے نقاب ہو کر سامنے آجاتا۔ یہ حضرت کا وہ امتیازی وصف تھا جس میں کوئی آپ کا مثل و نظیر نہ تھا۔ چنانچہ اکابر صحابہ حل قضایا و فصل خصومات میں آپ سے رابطہ قائم کرتے اور آپ کے فیصلہ پر مطمئن ہوجاتے۔

حضرت علی کی قوت فیصلہ اور مہارت قضا کے بارے میں پیغمبر اکرم کا ارشاد ہے۔

اعلم امتی بالسنۃ والقضاء بعدی علی ابن ابی طالب (کفایۃ الطالب ص ۱۹۰)

میری امت میں میرے بعد سب سے بڑھ کر سنت و قضا کے جاننے والے علی ابن ابی طالب ہیں۔

حضرت عمر کا قول ہے۔

علی اقضانا (صواعق محرقہ ص ۱۲۶)

علی ہم سب سے بہتر فیصلہ کرنے والے ہیں۔

ابن مسعود کہتے ہیں۔

کنا نتحدث ان اقضی اھل المدینۃ علی (استیعاب ج ۳ ص ۴۱)

ہم یہ تذکرہ کیا کرتے تھے کہ اہل مدینہ میں علی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والے ہیں۔

ابوسعید خدری اور قتادہ انصاری کہتے ہیں۔

اقضاھم علی (فتح الباری ج ۸ ص ۱۳۶)

سب لوگوں سے بڑھ کر فیصلہ کرنے والے علی ہیں۔

حضرت کے سامنے جو قضایا پیش ہوتے آپ ان کا فیصلہ قرآن و سنت کی روشنی میں کرتے۔ امام جعفر صادق فرماتے ہیں۔

ما رایت علیا قضی قضاء الا وجدت لہ اصلا فی السنۃ (امالی مفید)

میں نے علی علیہ السلام کے جس فیصلہ پر نظر کی اس کی اصل و بنیاد سنت میں موجود پائی۔

حضرت کا ہر فیصلہ چونکہ قرآن و سنت کی بنیاد پر ہوتا تھا اس لئے وہ حرف آخر کی حیثیت رکھتا تھا جس میں نہ رد و بدل کی گنجائش ہوتی تھی اور نہ ترمیم و تنسیخ کی چنانچہ حضرت خود فرماتے ہیں۔

لو اختصم الی رجلان فقضیت بینھما ثم مکثا احوالا کثیرۃ ثم اتیانی فی ذلک الامر لقضیت بینھما قضاء واحدا لان القضاء لا یحول ولا یزول ابدا (مستدرک الوسائل)

اگر میرے پاس دو شخص کوئی جھگڑا نمٹانے کے لئے آئیں اور میں کوئی فیصلہ کروں اور پھر ایک طویل مدت کے بعد دوبارہ اسی قضیہ کو لے کر آئیں تو میرا فیصلہ وہی ہوگا جو پہلے تھا کیونکہ فیصلہ میں نہ رد و بدل ہوتا ہے اور نہ حکم کبھی برطرف ہوتا ہے۔

فصل خصومات کے سلسلہ میں امیرالمومنین کا طریق کار یہ تھا کہ اگر ایک چیز کی ملکیت کے دو دعویدار ہوتے

اور دونوں کا قبضہ ہوتا یا ان میں سے کسی ایک کا قبضہ نہ ہوتا تو دونوں کو نصف نصف کا مالک قرار دیتے چنانچہ دو آدمیوں نے ایک اونٹ کے بارے میں دعویٰ کیا اور دونوں نے اپنی ملکیت کے گواہ پیش کئے حضرت نے دونوں کو نصف نصف کا مالک قرار دیا۔

اگر دو دعویداروں میں سے ایک کا قبضہ ہوتا تو قبضہ کو دلیل ملکیت قرار دے کر اس کے حق میں فیصلہ فرماتے چنانچہ دو شخصوں نے ایک چوپایہ کے بارے میں دعویٰ کیا اور دونوں نے اپنی اپنی ملکیت کے گواہ پیش کئے حضرت نے اس شخص کے حق میں فیصلہ دیا جس کا قبضہ تھا اور فرمایا کہ اگر اس کا قبضہ نہ ہوتا تو میں ان دونوں کو نصف نصف کا مالک قرار دیتا۔

اگر دونوں کے پاس برابر کے گواہ ہوتے تو ان دونوں سے دوسرے کے حق کی نفی کے سلسلہ میں قسم بھی لیتے چنانچہ دو آدمیوں نے ایک چوپایہ کی ملکیت کا دعویٰ کیا اور دونوں نے گواہ پیش کئے۔ حضرت نے ان دونوں سے قسم کا مطالبہ کیا ان میں سے ایک نے قسم کھانے سے انکار کیا اور دوسرے نے قسم کھائی۔ آپ نے وہ چوپایہ قسم کھانے والے کے حوالے کر دیا۔

اگر دونوں گواہ پیش کرتے مگر ان کی تعداد میں فرق ہوتا تو ان کی کمی بیشی کے اعتبار سے فیصلہ کرتے چنانچہ دو شخصوں نے ایک خچر کی ملکیت کا دعویٰ کیا ایک نے پانچ گواہ اور دوسرے نے دو گواہ ملکیت کے ثبوت میں پیش کئے حضرت نے پانچ گواہ پیش کرنے والے کو پانچ حصوں کا اور دو گواہ پیش کرنے والے کو دو حصوں کا مالک قرار دیا۔

اگر کوئی پیچیدہ صورت پیش آتی تو قرعہ سے کام لیتے چنانچہ یمن میں ایک چھت کے بیٹھنے سے گھر کے افراد دب کر ہلاک ہو گئے مگر دو کمسن بچے زندہ بچ رہے ان میں سے ایک آزاد تھا اور ایک غلام، مگر آزاد اور غلام میں تمیز نہ ہو سکی۔ حضرت کے سامنے یہ قضیہ پیش ہوا آپ نے قرعہ ڈالا اور ایک کو آزاد قرار دے کر وارث ٹھہرایا اور دوسرے کو آزاد کر دیا۔

باب الشہادہ

عدلیہ کے رُوبرو کسی واقعہ کو ثابت یا رد کرنے کے لئے جو بیان دیا جائے شہادت کہلاتا ہے تاکہ حاکم اس شہادت کی روشنی میں مجرم کو اس کے جُرم کی سزا دے یا کسی کا حق متاثر ہوتا ہو تو اس کی حق رسی کرے لہٰذا اگر کسی واقعہ یا حق کا اثبات کسی کی شہادت پر منحصر ہو اور اسے گواہی کے لئے طلب کیا جائے تو اسے اپنے علم و مشاہدہ کے مطابق گواہی دینا چاہیئے اور اس سے پہلو تہی نہ کرنا چاہیے چنانچہ ارشاد باری ہے۔

ولا یاب الشھداء اذا ما دعوا ۔ جب گواہ (گواہی کے لئے) طلب کئے جائیں تو انکار نہ کریں۔

اسلام میں گواہ کے لئے عادل اور صحیح العقیدہ ہونا ضروری ہے تاکہ اس کی گواہی پر اعتماد کیا جا سکے اور کسی کی حق تلفی نہ ہونے پائے۔ اگر وہ فاسد العقیدہ اور غیر عادل ہو گا تو اس کی گواہی قابلِ قبول نہ ہو گی چنانچہ امیر المومنین کا ارشاد ہے۔

لا یجوز شهادة حروری ولا قدری ولا مرجئ ولا اموی ولا ناصب ولا فاسق
خارجی قدری مرجئ اموی ناصبی اور فاسق کی گواہی صحیح نہیں ہے۔
(مستدرک الوسائل)

البتہ اگر فاسق صدق دل سے تائب ہو چکا ہو تو اس کی گواہی قبول کی جائے گی. چنانچہ امیر المومنین کے سامنے ایک ایسے شخص نے گواہی دی جس کا ایک ہاتھ اور پیر چوری کے جرم میں کاٹا جا چکا تھا حضرت نے اس کی گواہی کو قابل قبول سمجھا کیونکہ وہ صدق دل سے توبہ کر چکا تھا اور لوگوں نے اس کی نیک چلنی کی تصدیق کی تھی۔ اگر گواہ غلام ہو مگر عادل ہو تو یہ غلامی گواہی کے قبول کرنے سے مانع نہ ہو گی چنانچہ امیر المومنین کا ارشاد ہے۔

لاباس فی شهادة المملوك اذا كان عدلا (وسائل الشیعہ)
غلام کی گواہی میں کوئی ہرج نہیں جبکہ وہ عادل ہو۔

ایک مرتبہ عبد اللہ ابن قفل تیمی کا گزر حضرت کی طرف ہوا آپ نے اس کے پاس ایک زرہ دیکھی جو بصرہ میں مال غنیمت کے یکجا ہونے سے پہلے اس نے اٹھا لی تھی آپ نے بلا کر فرمایا کہ یہ طلحہ کی زرہ ہے جس پر تم نے ناجائز قبضہ کر رکھا ہے عبد اللہ نے کہا کہ یہ میری زرہ ہے اور آپ چاہیں تو قاضی شریح سے اس کا فیصلہ کرالیں۔ حضرت نے قاضی شریح کو فیصلہ پر مامور کیا اور اس سے فرمایا کہ میرا یہ دعویٰ ہے کہ یہ طلحہ کی زرہ ہے جو مال غنیمت میں خیانت کر کے حاصل کی گئی ہے۔ قاضی شریح نے ثبوت طلب کیا حضرت نے امام حسنؑ کو بطور گواہ پیش کیا جنہوں نے شہادت دی کہ واقعاً یہ طلحہ کی زرہ ہے۔ شریح نے کہا کہ یہ ایک گواہی ہے اور ایک گواہی کافی نہیں ہے۔ حضرت نے قنبر کو طلب کیا انہوں نے بھی گواہی دی کہ یہ طلحہ کی زرہ ہے۔ شریح نے کہا کہ یہ غلام ہے اور غلام کی گواہی قابل قبول نہیں ہے۔ اب حضرت کے تیور بدلے چہرے پر غیظ و غضب کے آثار ظاہر ہوئے اور شریح سے فرمایا کہ تم نے اس مقام پر تین غلطیاں کی ہیں۔ پہلی غلطی یہ کہ تم نے گواہ طلب کئے حالانکہ پیغمبر اکرم کا ارشاد ہے کہ اگر مال غنیمت میں کسی نے چوری چھپے کچھ اٹھا لیا ہو تو وہ بغیر گواہوں کی گواہی کے واپس لے لیا جائے گا دوسری غلطی یہ کہ میں نے حسنؑ کو بطور گواہ پیش کیا اور تم نے یہ کہہ کر ان کی گواہی رد کر دی کہ وہ اکیلے گواہ ہیں حالانکہ رسول اللہ ایک گواہ اور قسم پر فیصلہ کر دیا کرتے تھے اور تیسری یہ کہ میں نے قنبر کو پیش کیا اور تم نے غلام ہونے کی بنا پر ان کی گواہی قبول نہ کی۔ حالانکہ گواہ عادل ہو تو اس کی گواہی قابل قبول ہوتی ہے اور پھر یہ کہ زرہ تو ایک معمولی چیز ہے اور امام المسلمین پر بڑی سے بڑی چیز میں اعتماد و اطمینان کیا جا سکتا ہے۔ اگر دو گواہوں کی گواہی میں اختلاف ہو تو اسے رد کر دیا جائے گا اور اگر دونوں شہادتوں کا عنوان تو مختلف ہو مگر ان میں باہمی تلازم ہو تو وہ قابل قبول ہوں گی چنانچہ حضرت عمر کے سامنے قدامہ ابن مظعون کو پیش کیا گیا اور عمرو تیمی اور معلی ابن جارود نے گواہی دی کہ اس نے شراب پی ہے ان میں سے ایک نے کہا کہ میں نے اسے شراب پیتے دیکھا

یا وہ خود اقرار جرم کرے اگر بینہ و شہادت سے جرم ثابت ہو جائے تو پھر حد کے اجراء میں تاخیر روا نہیں چنانچہ حضرت کے پاس تین آدمیوں نے گواہی دی کہ فلاں شخص زنا کا مرتکب ہوا ہے فرمایا کہ چوتھا گواہ کہاں ہے کہا کہ وہ ابھی آیا چاہتا ہے فرمایا

لیس فی الحدود نظرۃ ساعۃ (وسائل الشیعہ) — حدود کے سلسلہ میں ایک ساعت کا بھی انتظار نہیں کیا جا سکتا اور ان تینوں پر حد قذف جاری کرنے کا حکم دیا۔

یونہی سفارش کی بنا پر عفو و درگذر کا بھی جواز نہیں ہے۔ چنانچہ امیر المومنین کا ارشاد ہے۔

لا یشفعن احد فی حد اذا بلغ الامام فانہ لا یملکہ (وسائل الشیعہ) — جب معاملہ امام تک پہنچ جائے تو حد کے بارے میں کوئی شخص سفارش نہ کرے کیونکہ امام اس (کے ردوبدل) پر اختیار نہیں رکھتا۔

چنانچہ ایک مرتبہ بنی اسد کا ایک آدمی کسی جرم میں ماخوذ ہوا اس کے قبیلہ کے کچھ لوگ حضرت حسینؑ ابن علیؑ کی خدمت میں آئے اور کہا کہ آپ ہمارے آدمی کے بارے میں امیر المومنین سے سفارش کریں مگر آپ نے انکار کر دیا اب وہ لوگ امیر المومنین کے پاس آئے اور کہا کہ ہم اپنے آدمی کی سفارش کرنے کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں حضرت نے فرمایا کہ جو چیز میرے بس میں ہوگی میں اس سے دریغ نہیں کروں گا وہ لوگ یہ سمجھ کر کہ ان کی سفارش موثر ثابت ہوئی ہے خوش خوش واپس پلٹے واپسی پر امام حسینؑ سے ملاقات ہوئی تو ان سے کہا کہ امیر المومنینؑ نے ہماری سفارش قبول فرما لی ہے آپ نے فرمایا کہ شاید اس عرصہ میں اس پر حد جاری ہو چکی ہو یہ سن کر وہ لوگ دوبارہ امیر المومنین کے پاس آئے دیکھا کہ اس پر حد کی جا رہی ہے ان لوگوں نے کہا کہ یا امیر المومنین کیا آپ نے یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ جو چیز میرے اختیار میں ہوگی اس سے دریغ نہیں کروں گا فرمایا

قد وعدتکم ما املک و ھذا شئ للہ لست املکہ (مستدرک الوسائل) — میں نے تو اس چیز کے لئے وعدہ کیا تھا جس پر مجھے اختیار ہوگا اور یہ چیز صرف اللہ کے لئے ہے جس پر مجھے اختیار نہیں ہے۔

شرع نے جن جرائم کے ارتکاب پر مختلف حدود کے اجراء کا حکم دیا ہے ان میں سے چند حدوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

حدِ زنا: زنا ایک ایسا عمل شنیع ہے جو ہر قوم و ملت میں انتہائی بُرا سمجھا جاتا ہے اور کوئی مذہب جو اخلاقی قدروں کا پاس رکھتا ہو اس کی اجازت نہیں دیتا اور اسلام میں اسے گناہائے کبیرہ میں شمار کیا گیا ہے قرآن مجید میں ہے۔

لا تقربوا الزنا انہ کان فاحشۃ وساء سبیلا — زنا کے قریب نہ جاؤ یہ سراسر بے حیائی اور بد چلنی ہے۔

زنا کے ثبوت کے لئے چار گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے اگر یہ تعداد پوری ہو جائے تو اسے سو کوڑوں یا رجم کی سزا دی جائے گی۔ امیر المومنین کا ارشاد ہے۔

لا یرجم رجل ولا امرأة حتی یشهد علیه اربعة شهود علی الایلاج والاخراج (وسائل الشیعہ)	کسی مرد یا عورت کو اس وقت تک سنگسار نہیں کیا جائے گا جب تک چار گواہ وقوع فعل کی عینی شہادت نہ دیں۔

اگر گواہ نہ ہوں اور وہ خود چار مرتبہ اس فعل کے ارتکاب کا اقرار کرے تو اس صورت میں بھی اسے کوڑوں یا رجم کی سزا دی جائے گی چنانچہ امیر المومنین فرماتے ہیں۔

اذا اقر الرجل علی نفسه بالزنا اربع مرات وکان محصنا رجم (مستدرک الوسائل)	اگر کوئی شخص چار مرتبہ زنا کا اقرار کرے اور بیوی رکھتا ہو تو اسے سنگسار کیا جائے گا۔

ایک شخص امیر المومنین کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ یا امیر المومنین میں فعل زنا کا مرتکب ہوا ہوں مجھے شرعی سزا دے کر پاک کر دیا جائے۔ حضرت نے فرمایا کیا تمہارا توازن درست ہے۔ کہا ہاں فرمایا کیا قرآن کی تلاوت کر سکتے ہو کہا ہاں فرمایا کس قبیلہ سے ہو کہا قبیلۂ جہینہ سے فرمایا تم اس وقت جاؤ میں لوگوں سے تمہارے بارے میں دریافت کروں گا حضرت نے اس کے بارے میں لوگوں سے دریافت کیا تو بتایا گیا کہ وہ صحیح العقل اور مسلمان ہے جب وہ دوبارہ آیا اور اقرار زنا کے بعد اجرائے حد کی خواہش ظاہر کی تو آپ نے پوچھا کیا تم بیوی رکھتے ہو کہا ہاں فرمایا کیا تم اس تک پہنچ سکتے تھے یا وہ کسی دور دراز جگہ پر تھی کہا کہ وہ گھر میں موجود تھی فرمایا جاؤ ہم تمہارے بارے میں مناسب فیصلہ کریں گے جب وہ تیسری مرتبہ آیا اور مثل سابق اقرار کیا تو حضرت نے پھر اسے واپس جانے کے لئے کہا آخر چوتھی بار حاضر ہوا اور زنا کا اعتراف کیا۔ جب حضرت نے یہ دیکھا کہ یہ چار مرتبہ اقرار کر چکا ہے جس کے بعد حد کا اجراء ضروری ہو گیا ہے تو آپ نے اسے زیر حراست رکھنے کا حکم دیا اور اعلان فرمایا کہ کل اس پر حد شرعی جاری ہو گی جو آنا چاہے وہ آئے اور گھر سے اس طرح نکلے کہ ایک دوسرے کو پہچان نہ سکے۔ دوسرے دن امیر المومنین منہ اندھیرے گھر سے نکلے دو رکعت نماز ادا کی اور ایک گڑھا کھود کر اس میں اسے کھڑا کیا اور لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اے لوگو یہ اللہ کا حق ہے اس کام کے لئے وہ آگے بڑھے جس کے ذمہ خود اس حق کا مطالبہ نہ ہو کیونکہ جس پر خود حد عائد ہوتی ہو اسے حد جاری کرنے میں حصہ نہ لینا چاہیئے۔ یہ سن کر کچھ لوگ پلٹ گئے اور کچھ پیچھے ہٹ گئے۔ حضرت نے چار مرتبہ تکبیر کی آواز بلند کرنے کے بعد پتھر پھینکا پھر حسن اور حسین علیہما السلام نے پتھر پھینکے جب اس نے دم توڑ دیا تو حضرت نے اسے گڑھے سے باہر نکالا نماز جنازہ پڑھی اور اسے دفن کر دیا۔ لوگوں نے کہا کہ آپ نے اسے غسل نہیں دیا فرمایا کہ اس کا غسل یہی تھا جس نے اسے ہمیشہ کے لئے پاک کر دیا ہے۔ اس کے بعد حضرت نے فرمایا۔

من اتی من القاذورة فلیتب الی الله تعالیٰ فیما بینه وبین الله فوالله توبته الی الله فی السر افضل من	جو شخص کسی فعل قبیح کا مرتکب ہو تو وہ اس معاملہ میں جو اس کے اور اللہ کے مابین ہے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرے خدا کی قسم در پردہ اللہ

انی استکرھت (مستدرک الوسائل) کا اظہار کرے اس پر حد نہیں ہے۔
چنانچہ حضرت کے پاس ایک مرد اور عورت کو لایا گیا جو زنا کرتے دیکھے گئے تھے حضرت کے دریافت کرنے پر اس عورت نے کہا کہ یا امیر المومنین میں رضامندی سے اس فعل پر آمادہ نہیں ہوی بلکہ مجھے مجبور کر دیا گیا حضرت نے اس پر حد جاری نہ کی اور اسے چھوڑ دیا۔
اگر کوی کافر ذمی کسی مسلمان عورت کے ساتھ زنا کرے تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔ چنانچہ حضرت عمر کے سامنے پانچ آدمی پیش کئے گئے جو زنا میں ماخوذ تھے حضرت عمر نے حکم دیا کہ ان پانچوں پر حد زنا جاری کی جائے۔ امیر المومنین وہاں موجود تھے آپ نے فرمایا کہ ان سب کا حکم یکساں نہیں ہے حضرت عمر نے کہا کہ پھر آپ ہی ان کی سزا تجویز کریں آپ نے فرمایا کہ ان میں سے ایک کو قتل اور ایک کو سنگسار کیا جائے ایک کو سو کوڑے اور ایک کو پچاس کوڑے مارے جائیں اور پانچویں کو تعزیر کر کے چھوڑ دیا جائے اس پر حضرت عمر متعجب ہوے اور دوسرے لوگوں کو بھی حیرت ہوی کہ ایک ہی جرم کی مختلف سزائیں کیوں حضرت عمر نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ پہلا مجرم کافر ذمی ہے اس نے ایک مسلمان عورت سے زنا کیا جس کی وجہ سے وہ ذمی ہونے سے خارج ہو گیا لہذا اسے قتل کی سزا دی جائے گی دوسرا شخص بیوی رکھتا ہے اس لئے اسے سنگسار کیا جائے گا تیسرا بیوی نہیں رکھتا اس لئے اسے سو کوڑے لگائے جائیں گے چوتھا غلام ہے اس لئے اسے نصف سزا دی جائے گی اور پانچواں مخبوط الحواس ہے اس لئے اسے تعزیر کر کے چھوڑ دیا جائے گا۔
اگر کوی حالت دیوانگی میں زنا کا مرتکب ہو تو اس پر نہ حد جاری ہوگی اور نہ اسے سنگسار کیا جائے گا چنانچہ ایک دیوانی عورت جو زنا میں ماخوذ تھی حضرت عمر کے پاس لائی گئی جب شہادت سے زنا ثابت ہو گیا تو حضرت عمر نے اسے کوڑے لگانے کا حکم دیا امیر المومنین نے اسے کچھ لوگوں کے حصار میں جاتے دیکھا تو پوچھا کہ یہ کون ہے اور واقعہ کیا ہے بتایا کہ یہ فلاں قبیلہ کی دیوانی عورت ہے جسے حضرت عمر نے کوڑے لگانے کا حکم دیا ہے حضرت نے فرمایا کہ اسے واپس لے جاؤ اور عمر سے کہو کہ

اما علمت ان ھذہ مجنونۃ آل فلان وقال النبی رفع القلم عن المجنون حتی یفیق (وسائل الشیعہ)

کیا تمہیں معلوم نہیں کہ یہ فلاں قبیلہ کی دیوانی عورت ہے اور پیغمبر اکرم کا ارشاد ہے کہ دیوانہ مرفوع القلم ہے یہاں تک کہ دیوانگی زائل ہو۔

اگر عورت حاملہ ہو تو جب تک بچہ پیدا نہ ہو جائے اسے سنگسار نہیں کیا جائے گا چنانچہ ایک شوہر دار عورت نے اپنے کو بے شوہر ظاہر کر کے ایک دوسرے قبیلہ میں نکاح کر لیا جب اس کا انکشاف ہوا تو حضرت نے فرمایا کہ جب وہ بچہ جن لے تو اسے سنگسار کیا جائے۔
حضرت عمر کے پاس ایک حاملہ عورت کو لایا گیا جو زنا کی مرتکب ہوی تھی انہوں نے حکم دیا کہ اسے سنگسار کر دیا جائے امیر المومنین کو معلوم ہوا تو آپ نے حضرت عمر سے کہا کہ یہ عورت تو اپنے جرم کی وجہ سے سزا کی مستحق ہے مگر اس بچے کا کیا قصور ہے جو اس کے شکم میں ہے جب اس کے بچہ پیدا ہو جائے اس وقت اسے سنگسار کیا جائے۔

اگر کوئی عورت زنا سے حاملہ ہو کر بچہ جنے اور پھر اسے مار ڈالے تو اسے دوہرے جرم کی وجہ سے دوہری سزا دی جائے گی چنانچہ حضرت کے سامنے ایسی عورت کو پیش کیا گیا جس نے زنا کے ارتکاب کے بعد بچے کو مار ڈالا تھا آپ نے فرمایا کہ اسے سو کوڑے لگائے جائیں اور پھر سنگسار کر دیا جائے۔

اگر کوئی شوہر دار عورت نابالغ بچے سے زنا کرائے تو اس بچے کو تعزیر کی جائے گی اور عورت کو رجم کے بجائے سو کوڑے لگائے جائیں گے چنانچہ ایک شوہر دار عورت کو جو ایک نابالغ بچے سے بدکاری کی مرتکب ہوئی تھی حضرت عمر کے پاس لایا گیا انہوں نے حکم دیا کہ اسے سنگسار کر دیا جائے حضرت نے فرمایا کہ اسے سنگسار نہیں کیا جائے گا بلکہ اس پر حد جاری ہو گی اس لئے کہ جس بچے سے یہ مرتکب زنا ہوئی ہے وہ ابھی بلوغ کی عمر کو نہیں پہنچا

اگر غلام زنا کا مرتکب ہو تو اسے ہر صورت میں پچاس کوڑوں کی سزا دی جائے گی چنانچہ امام محمد باقر ؑ راوی ہیں

قضی امیر المومنین فی العبید اذا زنی احدھم ان یجلد خمسین جلدة وان کان مسلما او کافرا او نصرانیا ولا یرجم ولا ینفی

(وسائل الشیعہ)

امیر المومنین نے غلاموں کے بارے میں یہ فیصلہ فرمایا کہ اگر ان میں سے کوئی زنا کا مرتکب ہو تو اسے پچاس کوڑے لگائے جائیں خواہ مسلمان ہو یا کافر یا نصرانی اسے نہ سنگسار کیا جائے گا اور نہ شہر بدر کیا جائے گا۔

اگر ایسا شخص زنا کرے جس کا کچھ حصہ آزاد ہو چکا ہو اور کچھ حصہ غلام ہو تو آزاد حصہ کے بقدر اس پر پوری حد اور غلام حصہ کے بقدر نصف حد جاری کی جائے گی مثلاً نصف آزاد ہو اور نصف غلام تو آزاد حصہ کے حساب سے پچاس کوڑے اور غلام حصہ کے حساب سے پچیس کوڑے لگائے جائیں گے۔

حضرت عثمان کے دور میں ایک کنیز جو تین چوتھائی آزاد ہو چکی تھی زنا کی مرتکب ہوئی۔ حضرت عثمان نے اس کے بارے میں امیر المومنین سے دریافت کیا آپ نے فرمایا کہ اسے تین چوتھائی آزادی کے حساب سے اور ایک چوتھائی غلامی کے حساب سے سزا دی جائے گی۔ زید ابن ثابت نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ اسے صرف غلامی کے حساب سے سزا ملنا چاہیئے۔ حضرت نے فرمایا کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے جبکہ چار حصوں میں سے تین حصے آزاد ہو چکے ہیں اور صرف ایک حصہ غلامی میں ہے کہا کہ پھر اسے میراث بھی آزادی کے بقدر ملنا چاہیئے فرمایا کہ ہاں ایسا ہی ہے اور اسے میراث بھی آزادی کے بقدر ملے گی شیخ مفید رحمہ اللہ نے تحریر کیا ہے۔

خالف عثمان امیر المومنین وصار الی قول زید ولم یصغ الی ماقال بعد ظھور الحجة علیہ

(ارشاد ص ۱۰۰)

عثمان نے امیر المومنین کے قول کی مخالفت کرتے ہوئے زید کے قول پر عمل کیا اور حضرت کی بات پر کان نہ دھرا حالانکہ ان پر دلیل و حجت واضح ہو چکی تھی۔

اگر وقوع زنا میں شبہ کی گنجائش ہو تو شک کا فائدہ مجرم کو دیتے ہوئے حد جاری نہیں کی جائے گی حضرت

ادرؤ الحدود بالشبہات (وسائل الشیعہ)   شک وشبہہ کی صورت میں حدود ساقط کردو۔

چنانچہ ایک مرد اور عورت کو زنا کا ارتکاب کرتے دیکھا گیا اور انہیں حضرت کے سامنے پیش کیا گیا آپ نے اس مرد سے دریافت کیا تو اس نے کہا کہ یہ میری بیوی ہے اور اس عورت سے پوچھا تو وہ خاموش رہی کچھ لوگوں نے اس عورت سے کہا کہ ہاں کہ دو اور کچھ لوگوں نے کہا کہ انکار کردو اس عورت نے کہا کہ ہاں یہ میرا شوہر ہے حضرت نے اس احتمال کی بنا پر کہ شاید یہ اس کی بیوی ہو حد ساقط کردی اور اس مرد سے کہا کہ جب تک تم نکاح کا ثبوت پیش نہ کروگے یہ عورت تم سے علیحدہ رکھی جائے گی۔

حد قذف: کسی بالغ و عاقل مسلمان پر زنا یا لواطت کی تہمت رکھنا یا اسے ولدالزنا کہنا قذف کہلاتا ہے اسلام نے جس طرح مسلمان کے مال و جان کا تحفظ کیا ہے اسی طرح اس کی عزت و آبرو کا بھی نگہبان ہے۔ وہ شہادت کے علاوہ جبکہ نصاب شہادت مکمل ہو قطعاً اس کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی کی عصیاں کاری کا پردہ چاک کرکے یا کسی پر بہتان تراشی کرکے اسے معاشرہ میں بدنام و رسوا کیا جائے۔ اس رسوائی پر یہ اثر بھی مرتب ہوتا ہے کہ انسان گناہ کے ارتکاب میں جسور و بیباک ہو جاتا ہے اور اگر گناہ ڈھکا چھپا رہتا ہے تو اپنے معاشرتی وقار کو بحال رکھنے کے لئے اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔

اسلام نے اس جرم کی سنگینی کے پیش نظر جب دو گواہوں کی گواہی یا اقرار سے قذف ثابت ہو جائے تو اسی کوڑوں کی سزا تجویز کی ہے چنانچہ امیرالمومنین فرماتے ہیں۔

ان المفریۃ ثلث اذا رمی الرجل بالرجل بالزنا واذا قال ان امہ زانیۃ واذا دعی لغیر ابیہ فذلك فیہ حد ثمانون (وسائل الشیعہ)

بہتان تراشی تین طرح کی ہوتی ہے ایک یہ کہ کسی کو زناکار کہے یا یہ کہے کہ اس کی ماں زانیہ ہے یا باپ کے علاوہ کسی اور کی طرف منسوب کرے اس کی سزا اسی کوڑے ہے۔

قذف کی یہ سزا آزاد ہو یا غلام مرد ہو یا عورت سب کے لئے یکساں ہے چنانچہ ایک عورت نے اپنی سوت کو غلط کار ثابت کرنے کے لئے اس کے بستر پر انڈے کی سفیدی ڈال دی اور اپنے شوہر سے کہا کہ ایک اجنبی مرد اس کے ہاں شب باش ہوا ہے اس کے بستر کا جائزہ لو جب اس نے بستر پر نظر کی تو اسے سفیدی نظر آئی جس سے اسے اپنی بیوی بے راہ ہونے کا یقین ہو گیا اس نے حضرت عمر سے اس کا ذکر کیا انہوں نے اسے سزا دینے کا حکم دیا۔ امیرالمومنین کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو آپ نے اس بستر کو دیکھنا چاہا جب بستر پر نظر ڈالی تو فرمایا کہ اس پر کھولتا ہوا گرم پانی ڈالو جب پانی ڈالا گیا تو سفیدی پھول کر ابھر آئی فرمایا کہ اس نے اپنی سوت کو متہم کرنے کے لئے یہ چال چلی ہے لہذا اسے الزام تراشی کی سزا دی جائے چنانچہ اس پر حد قذف جاری کی گئی۔

اگر کوئی نابالغ لڑکے یا لڑکی یا دیوانے پر تہمت لگائے تو اس پر حد جاری کرنے کی بجائے تعزیر

کی جائے گی حضرت سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا۔

لاحد لمن لاحد لہ ولکن القاذف اثم (مستدرک الوسائل)

جس پر خود حد جاری نہ ہوتی ہو اس پر تہمت لگانے سے بھی حد جاری نہ ہوگی البتہ تہمت لگانے والا گنہگار ہے۔

اگر باپ بیٹے پر تہمت لگائے تو اس پر حد جاری نہیں ہوگی اور اگر بیٹا باپ پر تہمت باندھے تو اس پر حد جاری کی جائے گی حضرت کا ارشاد ہے۔

یحد الولد ولا یحد الوالد اذا قذف الولد (مستدرک الوسائل)

بیٹے پر حد جاری ہوگی اور باپ پر حد نہ ہوگی جب وہ بیٹے پر تہمت لگائے۔

اگر کوئی شخص متعدد آدمیوں پر اجتماعی طور پر تہمت لگائے تو اس پر ایک ہی حد جاری ہوگی چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

قضی امیر المومنین فی رجل افتری علی نفر جمیعا فجلدہ حدا واحدا (وسائل الشیعہ)

امیرالمومنین نے اس شخص پر جس نے ایک جماعت پر تہمت لگائی تھی ایک ہی حد کا فیصلہ فرمایا۔

اگر کوئی عورت یہ کہے کہ فلاں آدمی مجھ سے زنا کا مرتکب ہوا ہے تو وہ دوہری سزا کی مستحق ہوگی ایک سزا اقرار زنا کی بنا پر اور دوسری قذف کی بنا پر چنانچہ حضرت سے ایک ایسی ہی عورت کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا۔

حدنا ھا حدین حد لفریتھا علی المسلم وحد باقرارھا علی نفسھا (مستدرک الوسائل)

ہم اس پر دو حدیں جاری کریں گے ایک مرد مسلم پر افتراء باندھنے کی اور دوسری اقرار زنا کی۔

ایک شخص نے اپنی بیوی کو زانیہ کہا اس کے جواب میں اس نے کہا کہ تو مجھ سے زیادہ زناکار ہے یہ معاملہ حضرت عمر کے سامنے پیش ہوا انہوں نے حکم دیا کہ دونوں کو قذف کی پاداش میں کوڑے لگائے جائیں امیرالمومنین نے یہ حکم سنا تو فرمایا کہ جلدی نہ کی جائے اس عورت پر ایک کے بجائے دو حدیں جاری ہوں گی ایک حد اس بات کی کہ اس نے مرد کو یہ کہہ کر کہ تو مجھ سے زیادہ زناکار ہے اس پر زنا کی تہمت لگائی ہے اور دوسری حد اس امر کی کہ اس نے اپنے زنا کا اقرار کیا ہے اسی اقرار کی بنا پر مرد پر سے حد ساقط ہو جائے گی اور عورت کو بھی زنا کی پوری سزا نہیں دی جائے بلکہ تعزیر پر اکتفا کی جائے گی (یہ اس لئے کہ زنا کی حد کے لئے چار مرتبہ اقرار ضروری ہے اور اس نے ایک ہی مرتبہ اقرار کیا تھا)

اگر کوئی شخص کسی پر زنا کی تہمت لگائے اور پھر اس کی تردید کر دے تو اس پر سے حد ساقط نہیں ہوگی

چنانچہ ایک عورت نے اپنے شوہر کو حضرت کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اس نے میری کنیز سے زنا کیا ہے ۔ اس شخص نے کہا کہ یہ صحیح ہے کہ میں نے اس کنیز سے مقاربت کی ہے مگر اس نے وہ کنیز مجھے ہبہ کر دی تھی حضرت نے اس سے ہبہ کا ثبوت طلب کیا وہ کوئی ثبوت پیش نہ کر سکا تو حضرت نے اسے سزا دینے کا حکم دیا جب اس عورت نے یہ دیکھا کہ اس کا شوہر سزا سے نہیں بچ سکتا تو اس نے ہبہ کا اعتراف کیا حضرت نے حکم دیا کہ اس عورت پر حد قذف جاری کی جائے۔

اگر دو آدمی ایک دوسرے پر تہمت لگائیں تو ان پر سے حد ساقط ہو گی البتہ انہیں تعزیر کی جائے گی، چنانچہ حضرت کے پاس دو آدمیوں کو لایا گیا جنہوں نے ایک دوسرے پر زنا کی تہمت لگائی تھی آپ نے ان پر حد جاری کرنے کے بجائے انہیں تعزیر کر کے چھوڑ دیا۔

اگر کوئی شخص حد قذف جاری ہونے کے بعد یہ کہے کہ میں نے وہی بات کہی تھی جو صحیح تھی تو اس پر دوبارہ حد جاری نہیں کی جائے گی چنانچہ حضرت عمر کے دور کا واقعہ ہے کہ مغیرہ ابن شعبہ جو ان کی طرف سے حاکم بصرہ تھا قبیلۂ بنی ہلال کی ایک عورت ام جمیل بنت محجن کے ہاں اکثر آتا جاتا تھا ایک دن ابوبکرہ نے اسے جاتے دیکھا تو پوچھا کہ تم اکیلے کہاں جا رہے ہو کہا کہ میں اپنے بعض دوستوں کی ملاقات کیلئے جا رہا ہوں کہا کہ دوستوں کو تمہارے پاس آنا چاہیئے نہ یہ کہ تم ان کے پاس جاؤ ابوبکرہ کے دل میں شک گزرا اور اس نے مغیرہ کا تعاقب کیا مغیرہ گرد و پیش سے بے خبر ام جمیل کے گھر میں داخل ہوا ابوبکرہ نے یہ دیکھا تو وہ ساتھ والے مکان کی چھت پر چڑھا اور ام جمیل کے مکان کی طرف نظر دوڑائی دیکھا کہ وہ مغیرہ کے پہلو میں بیٹھی ہے وہ وہاں سے اٹھا اور شبل ابن معبد نافع ابن حارث اور زیاد ابن سمیہ کو لے کر اسی جگہ پر آیا ان چاروں نے جھانک کر دیکھا تو دونوں کو ناگفتہ بہ حالت میں پایا اس واقعہ کے بعد ابوبکرہ مدینہ آیا اور حضرت عمر سے کہا کہ مغیرہ زنا کار ہے، حضرت عمر نے کہا کہ کیا تم نے اسے زنا کرتے دیکھا ہے کہا کہ ہاں اور میرے ساتھ شبل نافع اور زیاد نے بھی دیکھا ہے حضرت عمر نے مغیرہ اور ان تینوں آدمیوں کو مدینہ طلب کیا سب سے پہلے ابوبکرہ نے گواہی دی اور پھر نافع اور شبل نے شہادت دی۔ آخر میں زیاد ابن سمیہ گواہی کے لئے کھڑا ہوا حضرت عمر نے دیکھا کہ اگر اس نے بھی پہلے گواہوں کی طرح عینی شہادت دی تو مغیرہ رجم سے بچ نہ سکے گا انہوں نے زیاد سے مخاطب ہو کر کہا۔

واللہ انی لاری وجہا خلیفا ان	خدا کی قسم میں ایک ایسا چہرہ دیکھ رہا ہوں جو اس
لایخزی علیہ الیوم رجل من	لائق ہے کہ ایک صحابئ رسولؐ کی رسوائی کا باعث نہیں
اصحاب محمد (انساب الاشراف ج ۱ ص ۴۹۱)	ہو گا۔

حضرت عمر کے ان الفاظ سے زیاد سمجھ گیا کہ گواہی کیسی ہونی چاہیئے چنانچہ اس نے گواہی دیتے ہوئے کہا کہ میں ان دونوں کو یکجا دیکھا سانسوں کی آوازیں بھی سنیں مگر جو خصوصی کیفیت سابقہ گواہوں نے بیان کی ہے میں نے نہیں دیکھی اس بیان سے مقدمہ کا رخ پلٹ گیا مغیرہ کی بن آئی اور وہ تلوار لے کر ابوبکرہ اور پہلے

دونوں گواہوں پر جھپٹا۔ حضرت عمر نے اسے روک دیا اور تینوں گواہوں کو اسی اسی درے لگوائے جب درے لگوا چکے تو ان سے توبہ کے لئے کہا دو نے تو توبہ کر لی مگر ابوبکرہ نے کہا کہ میں کبھی سچی بات کو جھوٹ نہیں کہ سکتا حضرت عمر نے چاہا کہ اسے پھر کوڑے لگوائیں۔ حضرت علی کو معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ اگر ابو بکرہ کو دوبارہ کوڑے لگائے گئے تو ہم مغیرہ کو رجم کریں گے۔ مقصد تو یہ تھا کہ گواہی تو ہو چکی جس پر اسے سزا دی گئی ہے۔ اگر ان الفاظ کو بھی گواہی کا درجہ دے دیا گیا تو چار شہادتیں مکمل ہو جائیں گی اور مغیرہ رجم کا سزاوار ہو گا اور اگر یہ صرف پہلی شہادت کی صحت کا اظہار ہے تو اس پر حد جاری نہیں ہو سکتی۔

اگر کوئی شخص کسی سے بدزبانی کرے اور اسے گدھا خنزیر فاسق فاجر خبیث ایسے الفاظ کہے تو اسے تعزیر کی جائے گی چنانچہ حضرت فرماتے ہیں۔

ففی هذا کله ادب لا یبلغ به الحد (مستدرک الوسائل) — ایسے الفاظ پر تعزیر کی جائے گی جو حد کی سزا سے کم ہوگی۔

حد شراب نوشی: شراب نوشی وہ مذموم عادت ہے جو دوسری قبیح عادتوں اور مہلک بیماریوں کو اپنے ساتھ لے کر آتی ہے اور کیا جسمانی اور کیا اخلاقی ہر اعتبار سے تباہ و برباد کر دیتی ہے۔ ایک طرف شراب خور اپنی صحت و توانائی کو مینا و جام کی نذر کر دیتا ہے چنانچہ اس کے سمی ذرات پہلے خون میں سرایت کرتے ہیں اور پھر تمام جسم میں پھیل کر رعشہ فالج دماغی اختلال تشنج اور دوسرے اعصابی امراض کی تولید کا باعث ہوتے ہیں، اور دوسری طرف اخلاقی اعتبار سے اتنا گر جاتا ہے کہ شرم و حیا عزّت و آبرو اور غیرت و ناموس کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے اور ایسے ناشائستہ افعال کر گزرتا ہے جو عادی زندگی میں اس سے سرزد نہ ہوتے کیونکہ افعال قبیحہ سے مانع عقل اور اخلاقی وجدان ہوتا ہے اور نشہ و بدمستی میں نہ عقل کام کرتی ہے اور نہ اخلاقی وجدان ساتھ دیتا ہے اس لئے بے جھجک نفسانی و شہوانی خواہشات کی رو میں بہتا چلا جاتا ہے اور آخر اپنے ہاتھوں خود اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتا ہے۔

اسلام نے جس کے اوامر و نواہی کی بنیاد مصالح و مفاسد واقعیہ پر ہے انہی مفاسد کے پیش نظر ہر قسم کی شراب کو وہ پھلوں سے بنائی گئی ہو یا غلوں سے قطعی طور پر حرام قرار دیا ہے اور اس کے لئے اسی کوڑوں کی سزا تجویز کی ہے چنانچہ حضرت عمر کے سالے قدامہ ابن مظعون پر شراب نوشی ثابت ہوگئی تو انہوں نے امیرالمومنین سے سزا کے بارے میں دریافت کیا آپ نے کہا کہ اسے اسی کوڑے لگائیں قدامہ نے کہا کہ مجھ پر حد جاری نہیں ہو سکتی کیونکہ قرآن مجید میں ہے۔

لیس علی الذین آمنو وعملوا الصالحات جناح فیما طعموا — جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے وہ جو کچھ کھا پی چکے ان پر کوئی گناہ نہیں ہے۔

حضرت نے فرمایا۔

لست من اھلھا ان طعام اھلھا لھم حلال لیس یاکلون ولا یشربون الا ما احل اللہ لھم (وسائل الشیعہ)

تم اس آیت کے مصداق نہیں ہو۔ اس آیت کے مصداق وہ ہیں جن کا کھانا پینا حلال ہوتا ہے اور وہ وہی چیزیں کھاتے پیتے ہیں جو اللہ نے ان کے لئے حلال کی ہیں۔

اگر کوئی شخص شراب نوشی کے ساتھ شعائر اسلامی کی توہین کا بھی مرتکب ہو تو اس سے جرم سنگین تر ہوجائے گا چنانچہ حارثی نجاشی اور ابوسماک اسدی نے ماہ رمضان میں شراب پی اور نشہ میں دھت ہو کر غل غپاڑہ مچایا حضرت کو اطلاع دی گئی تو آپ نے چند آدمیوں کو بھیجا جنہوں نے ان کو گھیرے میں لے لیا ابوسماک تو بھاگ نکلا اور نجاشی کو پکڑ لیا گیا جب اسے حضرت کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ نے اسے اسی کوڑے لگائے اور رات بھر بند رکھا اور دوسرے دن پھر بیس درے لگائے اس نے کہا کہ اسی درے تو لگ چکے یہ بیس درے کیوں؟ فرمایا

ھذا لجرأتک علی شرب الخمر فی شھر رمضان (الفقیہ)

یہ اس لئے کہ تم نے ماہ رمضان میں شراب پینے کی جسارت کی ہے۔

حد شرعی کے اجراء کے لئے ضروری ہے کہ شراب خوار کے اقرار یا دو گواہوں کی متفقہ شہادت سے شراب نوشی ثابت ہو جائے اگر گواہوں کے بیان میں اختلاف ہو گا تو حد جاری نہیں ہوگی۔ البتہ اگر یہ اختلاف اس نوعیت کا ہو جس سے وقوع فعل مشتبہ نہ ہوتا ہو تو حد جاری کی جائے گی، چنانچہ حضرت عمر کے سامنے عمرو تمیمی اور معلی ابن جارود نے گواہی دی کہ قدامہ ابن مظعون نے شراب پی ہے ان میں سے ایک نے کہا کہ میں نے اسے شراب پیتے دیکھا ہے اور دوسرے نے کہا کہ میں نے اسے شراب کی قے کرتے دیکھا ہے حضرت عمر نے امیرالمومنین سے دریافت کیا کہ آپ اس کے بارے میں کیا فرماتے ہیں جبکہ ان دونوں گواہوں کی گواہی مختلف ہے فرمایا کہ گواہی میں کوئی اختلاف نہیں ہے اس نے شراب پی ہے جب ہی تو شراب کی قے کی ہے حضرت عمر نے کہا کیا خصی کی شہادت قابل قبول ہے (عمرو تمیمی خصی تھا) فرمایا۔

ما ذھاب انثیہ الا کذھاب بعض اعضائہ (الفقیہ)

خصیوں کا نہ ہونا ایسا ہی ہے جیسے کوئی عضو بدن جاتا رہے۔

یہ حد سب کے لئے یکساں ہے خواہ مرد ہو یا عورت آزاد ہو یا غلام کافر ہو یا مسلم چنانچہ امام جعفر صادق ؑ فرماتے ہیں۔

کان علی یجلد الحر والعبد والیھودی والنصرانی فی الخمر ثمانین (وسائل الشیعہ)

حضرت علی ؑ شراب نوشی کے جرم میں آزاد غلام یہودی نصرانی سب کو اسی کوڑے لگاتے تھے۔

اگر کسی کو شراب نوشی کی پاداش میں دو دفعہ حد لگ چکی ہو تو تیسری دفعہ کوڑوں کے بجائے اسے قتل کی سزا

دی جائے گی امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں ۔

کان امیر المومنین یجلد فی قلیل النبیذ کما یجلد فی قلیل الخمر ویقتل فی الثالثۃ من النبیذ کما یقتل فی الثالثۃ من الخمر (وسائل الشیعہ)	امیر المومنین جس طرح تھوڑی سی خمر (شراب انگوری) کے پینے پر کوڑے لگاتے تھے اسی طرح نبیذ (شراب خرما) کے پینے پر کوڑے لگاتے تھے اور جس طرح تیسری مرتبہ خمر کے پینے پر قتل کرتے تھے اسی طرح نبیذ کے پینے پر قتل کرتے تھے ۔

اگر کوئی شخص نیا مسلمان ہوا ہو یا اسلامی شہروں سے دور رہتا ہو اور اسے یہ معلوم ہی نہ ہو سکے کہ شراب حرام ہے تو اس پر شراب نوشی کی حد جاری نہیں ہوگی چنانچہ حضرت ابوبکر کے پاس ایک شخص کو لایا گیا جس نے شراب پی تھی حضرت ابوبکر نے اس سے پوچھا کہ کیا تو نے شراب پی ہے اس نے کہا کہ ہاں کہا کیوں پی ہے جبکہ اسلام نے اسے حرام قرار دیا ہے کہا کہ میں ان لوگوں میں رہتا ہوں جو شراب پیتے ہیں اور اسے حلال سمجھتے ہیں مجھے یہ معلوم ہی نہ تھا کہ شراب حرام ہے کہ اس سے اجتناب کرتا حضرت ابوبکر نے حضرت عمر سے اس کے بارے میں پوچھا انہوں نے کہا کہ اس مسئلہ کو علی ابن ابی طالب ہی حل کر سکتے ہیں چنانچہ یہ دونوں اس شخص کو لے کر حضرت کے پاس آئے اور واقعہ بیان کیا آپ نے فرمایا کہ اسے مہاجرین و انصار کے پاس لے جاؤ اور ان سے پوچھو کہ کسی نے تحریم خمر کی آیت اس کے سامنے پڑھی ہے اگر کسی نے پڑھی ہو تو یہ عقوبت کا سزاوار ہے اور اگر کسی نے نہ پڑھی ہو تو یہ قابل مواخذہ نہیں ہے جب اسے مہاجرین و انصار کے سامنے پیش کیا گیا تو ان میں سے کسی ایک نے بھی یہ نہ کہا کہ میں نے اس کے روبرو یہ آیت پڑھی تھی چنانچہ اسے چھوڑ دیا گیا ۔

حد سرقہ : کسی کا مال چوری چھپے اٹھا لینا سرقہ کہلاتا ہے یہ وہ مذموم عادت ہے جس سے نفس کی دنائت اور اخلاقی معیار کی پستی ظاہر ہوتی ہے چنانچہ ایک بلند نفس انسان یہ گوارا نہیں کرتا کہ وہ دوسرے کی کمائی ہوئی دولت لے اڑے اسے بے دردی سے ضائع کرے اور معاشرہ میں ذلیل نگاہوں سے دیکھا جائے بیشک کچھ لوگ اپنی ضروریات کے پورا کرنے کے لئے جب کوئی چارہ نہیں پاتے تو چوری ایسے جرم کے مرتکب ہو جاتے ہیں لیکن ہر موقع پر چوری کا ارتکاب ضرورت و احتیاج کی بنا پر نہیں ہوتا بلکہ شروع میں کسی جائز یا ناجائز ضرورت کی بنا پر چوری کی جاتی ہے پھر رفتہ رفتہ اس کی عادت پڑ جاتی ہے اور ضرورت ہو یا نہ ہو عادت کی تسکین کے لیے چوری کا ارتکاب کیا جاتا ہے بہرحال یہ ایک اخلاقی و معاشرتی جرم ہے جس کی روک تھام کے لئے اسلام نے کہیں پر حد اور کہیں پر تعزیری عقوبت تجویز کی ہے تاکہ معاشرہ میں امن و سکون کی فضا پیدا کی جا سکے چنانچہ قرآن مجید میں ہے ۔

والسارق والسارقۃ فاقطعوا ایدیھما — چور مرد ہو یا عورت تم ان کے ہاتھ کاٹ ڈالو ۔

لفظ ایدی ید کی جمع ہے اور ید کا اطلاق انگلیوں سے گٹے کہنی اور کاندھے کے جوڑ تک سب پر ہوتا ہے اور صرف انگلیاں بھی مراد لی جاتی ہیں چنانچہ فخر الدین رازی تحریر کرتے ہیں ۔

ان الید اسم یتناول الاصابع فقط الا تری انہ لوحلف لا یمس فلانا بیدہ فمسہ باصابعہ فانہ یحنث فی یمینہ (تفسیر کبیر ج ۱۱ ص ۲۲۴)

لفظ ید کا اطلاق فقط انگلیوں پر بھی ہوتا ہے چنانچہ اگر کوئی شخص قسم کھائے کہ فلاں کو ہاتھ سے مس نہیں کرے گا اور وہ انگلیوں سے مس کرے تو وہ قسم شکنی کا مرتکب قرار پائے گا۔

اسی بنا پر فقہی مکاتب میں ید کے معنی مراد میں اختلاف ہے بعض گٹے تک بعض کہنی تک اور خوارج کاندھے تک قطع کی سزا تجویز کرتے ہیں مگر ائمہ اہلبیت کے نزدیک صرف داہنے ہاتھ کی چار انگلیاں قطع کی جائیں گی۔ اور یہی قرین صواب ہے کیونکہ چوری میں زیادہ تر دخل انگلیوں ہی کا ہوتا ہے چنانچہ

ان امیر المومنین علیہ السلام قطع السارق من مفصل الاصابع وترک ابہامامع الکف (مستدرک الوسائل)

امیر المومنین علیہ السلام چور کی انگلیاں جڑ سے کاٹتے اور انگوٹھے کو ہتھیلی سمیت باقی رہنے دیتے۔

اگر کسی کا ہاتھ چوری کے جرم میں قطع ہو چکا ہو اور وہ پھر چوری کرے تو اس کا بایاں پیر وسط سے کاٹ دیا جائے گا اور اس سزا کے بعد تیسری مرتبہ چوری کرے تو اسے حبس دوام کی سزا دی جائے گی چنانچہ امیر المومنین کے پاس ایک شخص کو لایا گیا جس نے چوری کی تھی آپ نے اس کا ہاتھ کاٹ دیا پھر دوبارہ چوری کے جرم میں ماخوذ ہوا حضرت نے اس کا بایاں پیر وسط سے قطع کیا پھر تیسری مرتبہ چوری کا مرتکب ہوا حضرت نے اسے حبس دوام کی سزا دی اور فرمایا۔

ھکذا صنع رسول اللہ لا اخالفہ (وسائل الشیعہ)

رسولؐ اللہ کا یہی طریق کار تھا میں اس کی خلاف ورزی نہیں کروں گا۔

ایک مرتبہ حضرت عمر کے سامنے ایک شخص کو پیش کیا گیا جو سرقہ کا مرتکب ہوا تھا حضرت عمر نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا پھر دوبارہ چوری کے جرم میں پکڑا گیا انہوں نے اس کا بایاں پیر کاٹنے کا حکم دیا پھر تیسری مرتبہ چوری کی حضرت عمر نے اس کا دوسرا ہاتھ کاٹنا چاہا امیر المومنین کو معلوم ہوا تو فرمایا کہ اب اس کا ہاتھ یا پیر کاٹا نہیں جائے گا بلکہ اسے قید کی سزا دی جائے گی۔

اگر کوئی شخص چوری کے جرم میں قید کی سزا بھگت رہا ہو اور قید خانہ میں چوری کا مرتکب ہو تو اسے سزائے قتل دی جائے گی چنانچہ

کان امیر المومنین اذا اتی بہ فی الثالثۃ بعد ان قطع یدہ ورجلہ فی المرتین خلدہ فی السجن وانفق علیہ من فئ المسلمین فان سرق فی

امیر المومنین کے پاس چور کو تیسری مرتبہ لایا جاتا جبکہ پہلی دو چوریوں میں اس کا ہاتھ اور پیر قطع کر چکے ہوتے تو آپ اسے حبس دوام کی سزا دیتے اور اس کا خرچہ بیت المال پر ڈالتے

السجن قتلہ (مستدرک الوسائل) اور اگر قید خانہ میں چوری کرتا اسے قتل کر دیتے۔

اگر غلطی سے کسی کا بایاں ہاتھ کاٹ دیا جائے تو پھر اس کا دایاں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا چنانچہ حضرت نے ایک شخص کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ مگر داہنے ہاتھ کے بجائے اس کا بایاں ہاتھ کاٹ دیا گیا جب ہاتھ کاٹنے والوں کو اپنی غلطی کا علم ہوا تو انہوں نے حضرت سے کہا کہ ہم نے غلطی سے اس کا بایاں ہاتھ کاٹ ڈالا ہے کیا اب اس کا دایاں ہاتھ بھی کاٹ دیا جائے۔ آپ نے فرمایا۔

لا تقطع یمینہ قد قطعت شماله (وسائل الشیعہ) اس کا دایاں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا جبکہ اس کا بایاں ہاتھ کاٹا جا چکا ہے۔

شرع اسلام نے ہر سرقہ پر قطع ید کی سزا تجویز نہیں کی بلکہ اس پر چند شروط وقیود عائد کر کے اسے محدود کر دیا ہے لہذا انہی موارد پر یہ سزا دی جائے گی جہاں یہ شرائط پائے جائیں اور جہاں یہ شرائط نہ ہوں وہاں صرف تادیب و تعزیر پر اکتفا کیا جائے گا۔ حد شرعی کے اجراء میں جن امور کا اعتبار کیا گیا ہے وہ یہ ہیں۔

پہلے یہ کہ چوری کی گواہی دو عادل مرد دیں یا چور خود اقرار کرے اگر بینہ موجود نہ ہو اور نہ وہ اقرار کرے تو اس صورت میں حد جاری نہیں ہوگی۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

من عرف فی یدہ سرقة فقال اشتریتها و لم یقر بالسرقة ولم یقم علیه البینة لم تقطع (مستدرک الوسائل) جس کے ہاتھ میں چوری کی کوئی چیز دیکھی جائے اور وہ یہ کہے کہ میں نے اسے خریدا ہے اور چوری کا اقرار نہ کرے اور اس کے خلاف شہادت بھی نہ ہو تو اس کا ہاتھ قطع نہیں کیا جائے گا۔

اگر دو گواہوں کی گواہی سے چوری ثابت ہو جائے تو امام کو حق عفو نہیں ہے اور اگر کوئی چوری سے تائب ہو کر چوری کا اقرار کرے اور اس کے خلاف گواہی نہ ہو تو اس صورت میں امام کو حق عفو حاصل ہے چنانچہ ایک شخص نے حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر چوری کا اقرار کیا آپ نے فرمایا کہ کیا تمہیں قرآن مجید میں سے کچھ یاد ہے کہا کہ ہاں، سورۂ بقرہ یاد ہے فرمایا کہ

قد وهبت یدك لسورة البقرة (وسائل الشیعہ) میں سورۂ بقرہ کی وجہ سے تمہیں قطع ید سے معاف کرتا ہوں۔

اس پر اشعث ابن قیس نے کہا کہ آپ کو اللہ کے مقررہ حدود کے معطل کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے فرمایا تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ جب شہادت سے چوری ثابت ہو تو امام کو حق عفو نہیں ہے اور اگر کوئی خود اقرار کرے تو امام کو اختیار ہے کہ وہ قطع ید کرے یا معاف کر دے۔

دوسرے یہ کہ ایک چوتھائی دینار یا اس سے زیادہ کی چوری ہو اور اس سے کم کی چوری پر ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ

ان امیر المومنین کان یقطع السارق فی ربع دینار (وسائل الشیعہ)
امیر المومنین چوتھائی دینار کی چوری میں چور کا ہاتھ قطع کر دیتے تھے۔

تیسرے یہ کہ چوری کرنے والا بالغ ہو نا بالغ پر حد جاری نہیں کی جائے گی۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

الغلام لا یجب علیہ الحد حتی یحتلم (مستدرک الوسائل)
بچہ اگر نابالغ ہو تو اس پر حد جاری نہیں کی جائے گی۔

ایک مرتبہ حضرت کے پاس ایک نابالغ لڑکی کو لایا گیا جس نے چوری کی تھی۔ آپ نے اسے تعزیری سزا دی مگر اس کا ہاتھ نہ کاٹا۔

چوتھے یہ کہ عاقل ہو۔ دیوانے اور مخبوط الحواس پر حد جاری نہیں کی جائے گی۔ چنانچہ حضرت کے پاس ایک دیوانے کو لایا گیا جس نے چوری کی تھی آپ نے اسے چھوڑ دیا اور فرمایا کہ

لا قطع علی مجنون (مستدرک الوسائل)
دیوانے کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

پانچویں یہ کہ کسی محفوظ اور بند جگہ سے چوری کرے اگر ایسی جگہ سے کوئی چیز اٹھائے جہاں آنے جانے کی عام اجازت ہوتی ہے جیسے حمام مسجد سرائے وغیرہ تو حد جاری نہیں کی جائے گی حضرت فرماتے ہیں۔

کل مدخل یدخل فیہ بغیر اذن فسرق منہ السارق فلا قطع فیہ (وسائل الشیعہ)
اگر چور ایسی جگہ سے چوری کرے جس میں داخل ہونے کے لئے اجازت کی ضرورت نہ ہو تو اس کا ہاتھ قطع نہیں کیا جائے گا۔

اگر کوئی شخص کسی کو اپنے گھر میں مہمان ٹھہرائے اور وہ اس کے ہاں سے چوری کرے تو اس کا ہاتھ قطع نہیں کیا جائے گا بشرطیکہ مال کسی محفوظ جگہ میں بند نہ ہو حضرت کا ارشاد ہے۔

لا قطع علی ضیف (مستدرک الوسائل)
مہمان کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

بیرونی لباس کی جیب بھی غیر محفوظ جگہ متصور ہوتی ہے لہذا اس میں سے کوئی چیز نکال لی جائے تو اس پر قطع ید کی سزا نہیں دی جائے گی۔ چنانچہ حضرت کے سامنے ایک جیب تراش کو پیش کیا گیا جس نے ایک شخص کی جیب سے کچھ درہم نکال لئے تھے آپ نے فرمایا۔

ان کان طر من قمیصہ الاعلی لم اقطعہ وان کان طر من قمیصہ الاسفل قطعتہ (وسائل الشیعہ)
اگر اس نے اوپر والے لباس سے درہم نکالے ہیں تو اسے قطع ید کی سزا نہیں دوں گا اور اگر اندرونی جامہ سے درہم نکالے ہیں تو اس کا ہاتھ کاٹ دوں گا۔

اگر کوئی شخص امانت میں خیانت کرے تو اس پر بھی حد سرقہ جاری نہیں ہو گی۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

لا قطع علی من ائتمن علی شئی
جسے کسی شے کا امین بنایا گیا ہو اور وہ

فخان فیہ (مستدرک الوسائل)

اس میں خیانت کرے تو اسے قطع ید کی سزا نہیں دوں گا۔

چھٹے یہ کہ چور چوری کا مال گھر سے باہر نکالے اگر تالہ توڑے یا نقب لگائے اور مال باہر نکالنے سے پہلے پکڑا جائے تو اس پر حد جاری نہیں ہو گی۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

لیس علی السارق قطع حتی یخرج بالسرقۃ من البیت (وسائل الشیعہ)

چور کو ہاتھ کاٹنے کی سزا اس وقت تک نہیں دی جائے گی جب تک وہ چوری کا مال گھر سے باہر نہ نکالے۔

ساتویں یہ کہ چوری چھپے مال اٹھائے اگر علانیہ اور سینہ زوری سے مال چھینے تو اسے قطع ید کی سزا نہیں دی جائے گی البتہ اسے تعزیر کی جائے گی۔ چنانچہ ایک شخص نے بھرے بازار میں ایک دوکان پر سے ایک پارچہ اٹھا لیا۔ حضرت سے کہا گیا کہ اس نے چوری کی ہے لہذا اس کا ہاتھ کاٹ دینا چاہیئے آپ نے فرمایا۔

لیس علی الطرار والمختلس قطع (وسائل الشیعہ)

جیب کترے اور جھپٹا مار کر چھین لینے والے کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

ایک شخص ایک لڑکی کے کانوں سے گوشوارے اتار کر بھاگ نکلا لوگوں نے اسے پکڑ لیا اور حضرت کے سامنے پیش کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اس نے چھپ چھپا کر تو چوری نہیں کی کہ اس کا ہاتھ کاٹا جائے البتہ اسے تعزیر کی جائے گی۔ چنانچہ زد و کوب کے بعد اسے قید کر دیا۔

آٹھویں یہ کہ مسروقہ مال میں خود اس کا حصّہ نہ ہو اگر حصہ ہو اور اپنے حصہ کے بقدر یا اس سے کم کی چوری کرے تو اس پر حد جاری نہیں ہو گی چنانچہ ایک شخص نے بیت المال میں سے کچھ اُٹھا لیا جب اسے حضرت کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ نے فرمایا۔

لا یقطع فان لہ فیہ نصیبا (وسائل الشیعہ)

اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ بیت المال میں اس کا بھی حصّہ ہے۔

ایک شخص نے مالِ غنیمت میں سے ایک خود چوری کر لیا حضرت سے کہا گیا کہ اس نے چوری کی ہے لہذا اس کا ہاتھ کاٹ دینا چاہیئے آپ نے فرمایا۔

انی لا اقطع احد الہ فیما اخذ شرک (وسائل الشیعہ)

میں کسی ایسے شخص کا ہاتھ نہیں کاٹوں گا جس نے اس مال میں سے چوری کی ہو جس میں وہ حصّہ دار ہو۔

نویں یہ کہ مجبور و مضطر نہ ہو اگر قحط سالی میں بھوک کے ہاتھوں تنگ آ کر چوری کرے تو اسے قطع ید

فخان فیہ (مستدرک الوسائل) — اس میں خیانت کرے تو اسے قطع ید کی سزا نہیں دوں گا۔

چھٹے یہ کہ چور چوری کا مال گھر سے باہر نکالے اگر تالہ توڑے یا نقب لگائے اور مال باہر نکالنے سے پہلے پکڑا جائے تو اس پر حد جاری نہیں ہو گی۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

لیس علی السارق قطع حتی یخرج بالسرقۃ من البیت (وسائل الشیعہ) — چور کو ہاتھ کاٹنے کی سزا اس وقت تک نہیں دی جائے گی جب تک وہ چوری کا مال گھر سے باہر نہ نکالے۔

ساتویں یہ کہ چوری چھپے مال اٹھائے اگر علانیہ اور سینہ زوری سے مال چھینے تو اسے قطع ید کی سزا نہیں دی جائے گی البتہ اسے تعزیر کی جائے گی۔ چنانچہ ایک شخص نے بھرے بازار میں ایک دوکان پر سے ایک پارچہ اٹھا لیا۔ حضرت سے کہا گیا کہ اس نے چوری کی ہے لہذا اس کا ہاتھ کاٹ دینا چاہیئے آپ نے فرمایا۔

لیس علی الطرار والمختلس قطع (وسائل الشیعہ) — جیب کترے اور جھپٹا مار کر چھین لینے والے کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

ایک شخص ایک لڑکی کے کانوں سے گوشوارے اتار کر بھاگ نکلا لوگوں نے اسے پکڑ لیا اور حضرت کے سامنے پیش کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اس نے چھپ چھپا کر تو چوری نہیں کی کہ اس کا ہاتھ کاٹا جائے البتہ اسے تعزیر کی جائے گی۔ چنانچہ زد و کوب کے بعد اسے قید کر دیا۔

آٹھویں یہ کہ مسروقہ مال میں خود اس کا حصّہ نہ ہو اگر حصہ ہو اور اپنے حصّہ کے بقدر یا اس سے کم کی چوری کرے تو اس پر حد جاری نہیں ہو گی چنانچہ ایک شخص نے بیت المال میں سے کچھ اُٹھا لیا جب اسے حضرت کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ نے فرمایا۔

لا یقطع فان لہ فیہ نصیبا (وسائل الشیعہ) — اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ بیت المال میں اس کا بھی حصّہ ہے۔

ایک شخص نے مالِ غنیمت میں سے ایک خود چوری کر لیا حضرت سے کہا گیا کہ اس نے چوری کی ہے لہذا اس کا ہاتھ کاٹ دینا چاہیئے آپ نے فرمایا۔

انی لا اقطع احد الہ فیما اخذ شرک (وسائل الشیعہ) — میں کسی ایسے شخص کا ہاتھ نہیں کاٹوں گا جس نے اس مال میں سے چوری کی ہو جس میں وہ حصّہ دار ہو۔

نویں یہ کہ مجبور و مضطر نہ ہو اگر قحط سالی میں بھوک کے ہاتھوں تنگ آ کر چوری کرے تو اسے قطع ید

کی سزا نہیں دی جائے گی۔ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ

کان امیر المومنین لا یقطع السارق فی ایام المجاعۃ (وسائل الشیعہ)
امیر المومنین قحط کے دنوں میں چور کا ہاتھ نہیں کاٹتے تھے۔

دسویں یہ کہ پرندوں کے علاوہ دوسری اشیاء کی چوری کرے اگر پرندوں کی چوری کرے تو قطع ید کی سزا نہیں دی جائے گی۔ چنانچہ کوفہ میں حضرت کے پاس ایک شخص کو لایا گیا جس نے کسی کے ہاں سے کبوتر چرائے تھے آپ نے اس کا ہاتھ کاٹنے سے انکار کیا اور فرمایا۔

لا اقطع فی الطیر (وسائل الشیعہ)
میں پرندوں کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹوں گا۔

گیارہویں یہ کہ غلام اپنے مالک کے علاوہ کسی اور کی چوری کرے اگر مالک کے مال کی چوری کرے تو اسے قطع ید کی سزا نہیں دی جائے گی۔ حضرت فرماتے ہیں۔

عبدی اذا سرقنی لم اقطعہ وعبدی اذا سرق غیری قطعتہ (وسائل الشیعہ)
اگر میرا غلام میری چوری کرے تو اس کا ہاتھ قطع نہیں کروں گا اور کسی اور کے ہاں چوری کرے تو اس کا ہاتھ قطع کروں گا۔

اسی طرح اگر بیت المال کا غلام بیت المال میں سے چوری کرے تو اس کا ہاتھ قطع نہیں کیا جائے گا چنانچہ حضرت کے سامنے دو آدمیوں کو پیش کیا گیا جنہوں نے بیت المال میں چوری کی تھی ایک ان میں بیت المال کی ملکیت تھا اور دوسرا کسی دوسرے کی ملکیت میں تھا۔ آپ نے بیت المال کے غلام کے بارے میں فرمایا۔

اما ھذا فمن مال اللہ ولیس علیہ شئی مال اللہ اکل بعضہ بعضا (وسائل الشیعہ)
یہ اللہ کا مال ہے اس پر حد نہیں ہے کیونکہ اللہ کا مال اللہ کے مال ہی نے کھایا ہے۔

ان موارد میں سے جہاں قطع ید کی سزا دی جاتی ہے دو مورد یہ بھی ہیں۔

ایک یہ کہ کفن کی چوری کی جائے چنانچہ حضرت کے دور میں ایک شخص نے کفن چوری کیا آپ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ آپ مُردے کا مال چوری کرنے پر بھی یہ سزا تجویز کرتے ہیں۔ فرمایا

انا نقطع لاموتنا کما نقطع لاحیاءنا (وسائل الشیعہ)
جس طرح ہم زندوں کی چوری پر ہاتھ کاٹتے ہیں اسی طرح مُردوں کی چوری پر بھی یہ سزا دیتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ کسی آزاد مرد یا عورت کو غلام یا کنیز کہہ کر بیچ دیا جائے۔ چنانچہ حضرت کے پاس ایک شخص کو لایا گیا جس نے ایک آزاد مرد کو غلام کہہ کر فروخت کر دیا تھا آپ نے حکم دیا کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔

امیرالمومنین جن لوگوں کے ہاتھ چوری کے جرم میں کاٹتے تھے ان کی دیکھ بھال کا بھی حکم دیتے اور علاج کی سہولتیں بھی بہم پہنچاتے چنانچہ حرث ابن حضیرہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے مدینہ میں ایک دست بریدہ حبشی کو پانی بھرتے دیکھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تمہارا ہاتھ کس نے کاٹا ہے اس نے کہا کہ ہم آٹھ آدمیوں نے مل کر چوری کی اور اس جرم میں ہمیں امیرالمومنین کے سامنے پیش کیا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ کیا تمہیں معلوم تھا کہ چوری حرام ہے۔ ہم نے کہا کہ ہاں فرمایا کہ پھر تم سزا کے مستحق ہو چنانچہ سب کی چار چار انگلیاں کاٹ دیں اور انگوٹھے چھوڑ دیئے پھر چند دنوں تک ہماری دیکھ بھال کی گئی زخموں کی مرہم پٹی کی گئی اور اچھے سے اچھا کھانا دیا گیا۔ جب ہمارے زخم بھر گئے تو ہمیں عمدہ قسم کے کپڑے دئے اور فرمایا کہ اگر تم نے توبہ کی اور نیکی کی راہ اختیار کی توبہ تمہارے لئے بہتر ہوگا اور اگر ایسا نہ کیا تو آگ میں جھونک دیئے جاؤ گے۔

باب القصاص

اسلام کا ہر قانون عدل و انصاف کی بنیادوں پر استوار ہے اور کوئی قانون ایسا نہیں ہے جس سے عدل کے تقاضے مجروح ہوتے ہوں۔ اسی بنیادی تقاضے کے پیش نظر قانون قصاص کا اجراء کیا گیا ہے جو قیام عدل میں اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ قصاص کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو قتل کرے یا جسمانی گزند پہنچائے تو اسے بھی ویسی ہی سزا و عقوبت دی جائے چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

ان النفس بالنفس والعین	جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ
بالعین والانف بالانف والاذن	ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان
بالاذن والسن بالسن والجروح	اور دانت کے بدلے دانت اور زخموں کے
قصاص	بدلے ویسا ہی بدلہ ہے۔

بعض ترقی پسند عناصر اسلام کے قانون قصاص پر اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ قصاص جرم کے مقابلہ میں جرم کا اعادہ ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص وقتی ہیجان کے نتیجہ میں قتل یا کسی اور جنایت کا ارتکاب کر گزرتا ہے تو اسے تادیبی سزا تو دی جاسکتی ہے مگر قتل کی سزا دے کر جرم قتل کا اعادہ نہ کرنا چاہیئے۔ چنانچہ بعض ممالک میں قتل کی سزا قتل کی صورت میں نہیں دی جاتی بلکہ صرف قید و بند پر اکتفا کی جاتی ہے لیکن ایک مختصر مدت کیلئے سلب آزادی کی سزا قطع حیات ایسے سنگین جرم کی قرار واقعی سزا نہیں ہوسکتی اس سے نہ عدل کا تقاضا پورا ہوتا ہے اور نہ اسے انسداد جرائم کے لئے موثر قرار دیا جاسکتا ہے اور یہ اعتراض کہ قصاص اعادۂ جرم ہے کوئی وزن نہیں رکھتا اس لئے کہ ایک ہی چیز بعض حالتوں میں مذموم ہوتی ہے اور بعض حالتوں میں مستحسن قرار پاتی ہے مثلاً تکبر بری چیز ہے مگر متکبر کے مقابلہ میں ہو تو اچھی چیز ہے ہمدردی ایک اچھی صفت ہے مگر کسی ظالم و سفاک سے

امیرالمومنین جن لوگوں کے ہاتھ چوری کے جرم میں کاٹتے تھے ان کی دیکھ بھال کا بھی حکم دیتے اور علاج کی سہولتیں بھی بہم پہنچاتے چنانچہ حرث ابن حضیرہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے مدینہ میں ایک دست بریدہ حبشی کو پانی بھرتے دیکھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تمہارا ہاتھ کس نے کاٹا ہے اس نے کہا کہ ہم آٹھ آدمیوں نے مل کر چوری کی اور اس جرم میں ہمیں امیرالمومنین کے سامنے پیش کیا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ کیا تمہیں معلوم تھا کہ چوری حرام ہے۔ ہم نے کہا کہ ہاں فرمایا کہ پھر تم سزا کے مستحق ہو چنانچہ سب کی چار چار انگلیاں کاٹ دیں اور انگوٹھے چھوڑ دیئے پھر چند دنوں تک ہماری دیکھ بھال کی گئی زخموں کی مرہم پٹی کی گئی اور اچھے سے اچھا کھانا دیا گیا۔ جب ہمارے زخم بھر گئے تو ہمیں عمدہ قسم کے کپڑے دیئے اور فرمایا کہ اگر تم نے توبہ کی اور نیکی کی راہ اختیار کی تو یہ تمہارے لئے بہتر ہوگا اور اگر ایسا نہ کیا تو آگ میں جھونک دیئے جاؤ گے۔

باب القصاص

اسلام کا ہر قانون عدل و انصاف کی بنیادوں پر استوار ہے اور کوئی قانون ایسا نہیں ہے جس سے عدل کے تقاضے مجروح ہوتے ہوں۔ اسی بنیادی تقاضے کے پیش نظر قانون قصاص کا اجراء کیا گیا ہے جو قیام عدل میں اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ قصاص کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو قتل کرے یا جسمانی گزند پہنچائے تو اسے بھی ویسی ہی سزا و عقوبت دی جائے چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

ان النفس بالنفس والعین	جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ
بالعین والانف بالانف والاذن	ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان
بالاذن والسن بالسن والجروح	اور دانت کے بدلے دانت اور زخموں کے
قصاص	بدلے ویسا ہی بدلہ ہے۔

بعض ترقی پسند عناصر اسلام کے قانون قصاص پر اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ قصاص جرم کے مقابلہ میں جرم کا اعادہ ہے۔ لہذا اگر کوئی شخص وقتی ہیجان کے نتیجہ میں قتل یا کسی اور جنایت کا ارتکاب کر گزرتا ہے تو اسے تادیبی سزا تو دی جاسکتی ہے مگر قتل کی سزا دے کر جرم قتل کا اعادہ نہ کرنا چاہیئے۔ چنانچہ بعض ممالک میں قتل کی سزا قتل کی صورت میں نہیں دی جاتی بلکہ صرف قید و بند پر اکتفا کی جاتی ہے لیکن ایک مختصر مدت کیلئے سلب آزادی کی سزا قطع حیات ایسے سنگین جرم کی قرار واقعی سزا نہیں ہو سکتی اس سے نہ عدل کا تقاضا پورا ہوتا ہے اور نہ اسے انسداد جرائم کے لئے موثر قرار دیا جاسکتا ہے اور یہ اعتراض کہ قصاص اعادۂ جرم ہے کوئی وزن نہیں رکھتا اس لئے کہ ایک ہی چیز بعض حالتوں میں مذموم ہوتی ہے اور بعض حالتوں میں مستحسن قرار پاتی ہے مثلاً تکبر بری چیز ہے مگر متکبر کے مقابلہ میں ہو تو اچھی چیز ہے ہمدردی ایک اچھی صفت ہے مگر کسی ظالم و سفاک سے

ہمدردی کی جائے تو بری سمجھی جائے گی اسی طرح قتل وجنایت کا ارتکاب ابتداءً ہو یا قصاصاً۔ اگرچہ دونوں صورۃً برابر ہیں مگر دونوں کو ایک سطح پر سمجھنا صحیح نہیں ہے اس لئے کہ عقل سلیم کا قطعی فیصلہ ہے کہ بلاوجہ قتل قبیح ہے اور قتل کے عوض قتل مذموم نہیں ہے بلکہ ایک حد تک ضروری ہے اس لئے کہ معاشرتی امن اور قتل وخونریزی کا انسداد اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب مجرم کو یقین ہو کہ جس ظلم وجور کا وہ مرتکب ہو رہا ہے اسے بھی ویسی ہی عقوبت سے دوچار ہونا پڑے گا اور قصاص کا مقصد بھی یہی ہے۔ کہ پاداش عمل کا ڈر ارتکاب جرم سے مانع ہو اور شر پسند عناصر کی تخریبی کاروائیوں کا سدباب کرے امیرالمومنین کا ارشاد ہے۔

من خاف القصاص کف عن ظلم الناس (تحف العقول)	جسے قصاص کا ڈر ہوتا ہے وہ لوگوں پر ظلم کرنے سے باز رہتا ہے۔

قصاص کا تعلق صرف اس قتل سے ہوتا ہے جو جان بوجھ کر کیا جائے اور اگر ورثۂ مقتول چاہیں تو دیت لے کر یا بغیر دیت کے درگزر بھی کر سکتے ہیں چنانچہ امیرالمومنین کا ارشاد ہے۔

ولی الدم بالخیار ان شاء قتل وان شاء قبل الدیۃ وان شاء عفا (مستدرک الوسائل)	مقتول کے ورثہ کو اختیار ہے چاہے قتل کریں چاہے دیت لے لیں چاہے معاف کر دیں۔

اگر ارادۂ قتل کے بغیر قتل واقع ہو جائے اس طرح کہ کسی کو لاٹھی وغیرہ سے اس طرح پیٹے کہ موت واقع ہو جائے مگر جان سے مارنے کا قصد نہ ہو یا غلطی و اشتباہ سے قتل ہو جائے اس طرح کہ تیر وغیرہ سے کسی جانور کو نشانہ بنائے اور وہ کسی انسان کے لگ جائے تو ان دونوں صورتوں میں ورثۂ مقتول کو قصاص کے بجائے صرف دیت کا حق ہو۔ قصاص اس لئے نہیں کہ پہلی صورت میں اگرچہ فعل کا وقوع عمداً ہے مگر قتل کا قصد نہیں ہے اور دوسری صورت میں نہ فعل کا وقوع قصداً ہے اور نہ قتل کا ارادہ ہے اور دیت اس لئے ہے کہ اسلام یہ گوارا نہیں کرتا کہ کسی کا خون رائیگاں جائے، خواہ قتل کا ارادہ ہو یا نہ ہو چنانچہ امیرالمومنین کا ارشاد ہے۔

لا یبطل دم امرء مسلم (وسائل الشیعہ)	کسی مسلمان کا خون رائیگاں نہیں ہوگا۔

قصاص کا جواز اسی صورت میں ہے جب مندرجہ ذیل شرائط پائی جائیں۔

پہلی شرط یہ ہے کہ مقتول آزاد ہو اگر مقتول غلام ہو تو اس کے قصاص میں آزاد کو قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ اس سے غلام کی قیمت وصول کی جائے گی اور اسے سزا بھی دی جائے گی چنانچہ حضرت سے اس آزاد کے بارے میں جس نے ایک غلام کو قتل کر دیا تھا دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا۔

انما ھو سلعۃ تقوم علیہ قیمتہ عدل ولا وکس ولا شطط و یعاقب	غلام ایک متاع ہے جس کی صحیح صحیح قیمت لگائی جائے گی اس طرح کہ نہ کم ہو اور نہ زیادہ

(مستدرک الوسائل) اور قاتل کو سزا بھی دی جائے گی۔

اگر کوی شخص اپنے غلام کو مار ڈالے تو اس سے غلام کی قیمت لے کر تصدق کر دی جائے گی اور اسے سزا بھی دی جائے گی چنانچہ حضرت کے سامنے ایک شخص کو پیش کیا گیا۔ جس نے اپنے غلام کو اتنا مارا کہ اس نے دم توڑ دیا۔ آپ نے اس سے غلام کی قیمت وصول کر کے تصدق کر دی اور اسے سو تازیانے لگوائے اور قید کی سزا دی۔

اگر غلام اپنے آقا کو قتل کر دے تو اسے قصاصاً قتل کیا جائے گا چنانچہ صدوق رحمہ اللہ نے تحریر کیا ہے۔

اذا اقتتل عبد مولاه قتل به فان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وعلی علیہ السلام قضیا بذلك (مستدرک الوسائل)

جب غلام اپنے آقا کو قتل کر ڈالے تو اس کے عوض اسے بھی قتل کر دیا جائے گا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور علی علیہ السلام نے یہی فیصلہ فرمایا ہے۔

اگر کوئی شخص اپنے غلام سے کسی کو قتل کروائے تو اس شخص کو قتل کی اور غلام کو حبس دوام کی سزا دی جائے گی چنانچہ ایک غلام نے اپنے مالک کے کہنے سے ایک شخص کو قتل کر دیا۔ حضرت نے فرمایا۔

هل عبد الرجل الا كسوطه وكسيفه يقتل السيد ويستودع العبد السجن (وسائل الشیعہ)

غلام کی حیثیت تو تازیانے اور تلوار کی ہے آقا کو قتل کیا جائے اور غلام کو قید خانہ میں ڈال دیا جائے۔

دوسری شرط اسلام ہے لہذا اگر کوی مسلمان کسی کافر کو قتل کر دے تو اسے کافر کے قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا اور اگر کافر کافر کو قتل کر دے تو اسے قصاصاً قتل کیا جا سکتا ہے۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

يقتص اليهودي والنصراني والمجوسي بعضهم من بعض يقتل بعضهم ببعض اذا اقتتلوا عمدا (مستدرک الوسائل)

اگر یہودیوں نصرانیوں اور مجوسیوں میں سے بعض، بعض کو جان بوجھ کر قتل کر ڈالیں تو انہیں بھی قصاص میں قتل کیا جائے گا۔

تیسری شرط یہ ہے کہ قاتل مقتول کا باپ نہ ہو اگر باپ بیٹے کو قتل کر دے تو اسے قصاصاً قتل نہیں کیا جائے گا اور اگر بیٹا باپ کو قتل کر دے تو اسے قتل کیا جائے گا۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

لا يقتل والد بولده اذا قتله و يقتل الولد بالوالد اذا قتله (وسائل الشیعہ)

اگر باپ بیٹے کو قتل کر دے تو باپ کو اس کے عوض قتل نہیں کیا جائے گا اور اگر بیٹا باپ کو قتل کر دے تو اسے قتل کیا جائے گا۔

چوتھی شرط عقل و بلوغ ہے اگر دیوانہ یا بچّہ کسی کو قتل کر دے تو ان سے قصاص کے بجائے ان کے اقرباء سے دیت لی جائے گی۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

ما قتل المجنون المغلوب علی عقلہ والصبی فعمد ھما خطاء علی عاقلتھا (مستدرک الوسائل)

دیوانے اور بچّے کو قتل نہیں کیا جائے گا اس لئے کہ ان کا عمداً ارتکاب قتل بھی غلطی و اشتباہ کے حکم میں ہے لہذا مقتول کی دیت ان کے اقرباء پر عائد ہو گی۔

پانچویں شرط یہ ہے کہ مقتول ارتداد حد یا قصاص کے سلسلہ میں قتل نہ کیا گیا ہو اور درصورتیکہ اس کا خون بہانا شرعاً جائز ہو اس پر نہ قصاص ہے اور نہ دیت چنانچہ حضرت کا ارشاد ہے۔

من مات فی حد او قصاص فھو قتیل القرآن فلا شئی علیہ (مستدرک الوسائل)

جو شخص حد یا قصاص کے سلسلہ میں مارا جائے اس پر (دیت یا قصاص) کوئی چیز نہ ہو گی۔

اگر کسی شخص پر کوئی حملہ کرے اور وہ بچاؤ کے لئے حملہ آور کو قتل کر دے تو اس قتل کا نہ قصاص ہوگا اور نہ دیت۔ حضرت کا ارشاد ہے

من شھر سیفہ فدمہ ھدر (مستدرک الوسائل)

جو شخص تلوار کھینچ کر حملہ آور ہوگا اس کا خون رائیگاں قرار پائے گا۔

اگر ایک آدمی کسی کو جکڑے اور دوسرا اسے قتل کر دے اور تیسرا دیکھ رہا ہو اور اسے بچانے کی فکر نہ کرے تو قاتل کو قتل کیا جائے گا اور جکڑنے والے کو حبس دوام کی سزا دی جائے گی اور دیکھنے والے کی آنکھیں پھوڑ دی جائیں گی۔ چنانچہ حضرت کے سامنے تین آدمی پیش کئے گئے جو قتل کے جرم میں ماخوذ تھے ان میں سے ایک نے مقتول کو جکڑے رکھا اور دوسرے نے اسے قتل کر دیا اور تیسرا دیکھ رہا تھا مگر قتل سے مانع نہ ہوا۔ آپ نے حکم دیا کہ جکڑنے والے کو عمر قید کی سزا دی جائے اور قاتل کو قتل کیا جائے اور دیکھنے والے کی دونوں آنکھیں پھوڑ دی جائیں۔

اگر دو یا دو سے زیادہ مرد کسی مرد کو قتل کر دیں تو ان سب کو قتل کیا جا سکتا ہے لیکن قتل کی صورت میں ولی مقتول کو ایک سے زائد افراد کی دیت بھی دینا ہو گی چنانچہ دو آدمی کسی کو قتل کر دیں اور ان دونوں کو قصاصاً قتل کر دیا جائے تو ایک آدمی کی دیت دینا ہو گی۔ جو دونوں قاتلوں کے ورثہ میں نصف نصف تقسیم کر دی جائے گی اور اگر ان دو میں سے ایک کو قتل کیا جائے تو دوسرا شریک قتل اس مقتول کے ورثہ کو نصف دیت دے گا اور اگر تین قاتل ہوں اور ان میں سے ایک کو قتل کیا جائے تو باقی دو قاتلوں سے دو تہائی دیت لی جائے گی جو قصاصاً قتل ہونے والے کے ورثہ کو دی جائے گی۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

ان کانوا ثلاثۃ فقتل احدھم بالقود ردا لاثنان الباقیان علی اولیائہ ثلثی الدیت و یوجعان عقوبۃ۔ (مستدرک الوسائل)

اگر قاتل تین ہوں اور ان میں سے ایک قصاصاً قتل کیا جائے تو باقی دو افراد قصاصاً قتل ہونے والے کے وارثوں کو دو تہائی دیت دیں گے اور انہیں عقوبت بھی کی جائے گی۔

اگر کوئی مرد کسی عورت کو قتل کر دے تو چونکہ عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف ہوتی ہے۔ اس لیے عورت کے وُرثاء چاہیں تو قاتل کے وُرثاء کو آدھی دیت دے دیں اور اسے قتل کر دیں اور چاہیں تو آدھی دیت لے کر اس کی جان بخشی کر دیں۔

چنانچہ حضرت کا ارشاد ہے:

یخیر اولیاء المرأۃ ان یقتلوا الرجل و یعطوا اولیاءہ نصف الدیت او ان یاخذوا نصف الدیت من الرجل۔ (مستدرک الوسائل)

عورت کے وُرثاء کو اختیار ہے کہ وہ مرد کو قتل کر دیں اور اس کے وارثوں کو آدھی دیت دیں یا یہ کہ مرد قاتل سے نصف دیت لے لیں۔

اگر مقتول کے وُرثاء نابالغ ہوں تو ان کے بالغ ہونے کے بعد قصاص، دیت یا عفو کا فیصلہ ہوگا۔

چنانچہ حضرت کا ارشاد ہے:

انتظروا الذین قتل ابوھم ان یکبروا فاذا بلغوا خیروا فان احبوا قتلوا او عفوا او صالحوا۔ (وسائل الشیعہ)

جن بچوں کا باپ قتل کر دیا گیا ہو ان کے بالغ ہونے کا انتظار کیا جائے جب وہ حدِ بلوغ کو پہنچ جائیں تو انہیں اختیار ہوگا کہ چاہے وہ قاتل کو قتل کریں یا معاف کر دیں یا مصالحت کر لیں

اگر مقتول کے وارث دو ہوں اور ان میں سے ایک قصاص چاہے اور دوسرا عفو کرنا چاہے، تو قصاص کی صورت میں طالب قصاص آدھی دیت قاتل کے وُرثاء کو دے گا چنانچہ حضرت کے سامنے دو آدمی پیش ہوئے، ان میں سے ایک قصاص کا طالب تھا اور دوسرا عفو کرنا چاہتا تھا۔ آپ نے فرمایا:

ان اراد الذی لم یعف ان یقتل ورد نصف الدیت علی اولیاء المقتول المقاد منہ۔ (وسائل الشیعہ)

جو عفو کے بجائے قتل کرنا چاہے اگر قتل کرے تو مقتول کے وُرثاء کو آدھی دیت دے

اگر کسی کو قصاصاً قتل کرنے کے لیے ضرب لگائی جائے اور یہ سمجھ لیا جائے کہ وہ مر گیا ہے۔ مگر بعد میں معلوم ہو کہ وہ مرا نہ تھا تو پھر اس صورت میں اسے قتل کیا جا سکتا ہے جب ضرب لگانے والے کی ضرب کا

البتہ ناگوار بات کہنے اور جواب دینے والے کو تادیب کی جائے گی۔ چنانچہ ایک شخص نے کسی کو پاگل کا بیٹا کہا۔ اس نے بھی جواباً یہی الفاظ کہے۔ امیر المؤمنین سے اس کی شکایت کی گئی تو آپ نے پہلے کو دوسرے سے اور دوسرے کو پہلے سے بیس بیس تازیانے لگوائے حالانکہ سخت الفاظ کا بدلہ سخت الفاظ میں چکایا جا چکا تھا۔

باب الدیہ

قتل یا اعضاء بدن کو نقصان پہنچانے کے نتیجہ میں جو مال بطور معاوضہ دیا جاتا ہے، دیت کہلاتا ہے اگر قتل کا وقوع عمداً ہو تو قصاص سے دست بردار ہو کر دیت لینے کا جواز ہے اور اگر قتل غلطی سے ہو اس طرح کہ کسی کو ایسی چیز سے مارا جائے جس سے عام طور پر موت واقع نہیں ہوتی مگر اتفاقیہ موت ہو جائے یا تیر وغیرہ سے کسی جانور کو نشانہ بنایا جائے اور وہ کسی آدمی کے لگ جائے تو ان دونوں صورتوں میں صرف دیت لینے کا حق ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

من قتل مومنا خطأً فتحریر رقبۃ مومنۃ و دیۃ مسلمۃ الی اھلہ الا ان یصدقوا۔

جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے تو ایک مومن غلام آزاد کرے اور مقتول کے قرابت داروں کو دیت ادا کرے گا مگر یہ کہ وہ معاف کر دیں

دیت چھ چیزوں میں سے کوئی ایک چیز مقررہ مقدار میں دی جاتی ہے۔ چنانچہ امیر المؤمنین کا ارشاد ہے:

الدیۃ الف دینار والدینار عشرۃ دراھم وعلی اھل الذھب الف دینار وعلی اھل الورق عشرۃ الاف دراھم وعشرۃ الاف لاھل الامصار ولاھل البوادی الدیۃ مائۃ من الابل و لاھل اسواد مائتا بقرۃ او الف شاۃ

(الفقیہ)

دیت کی مقدار ایک ہزار دینار ہے اور ایک دینار[1] دس درہم کے مساوی ہے جو سونا رکھتے ہوں وہ ہزار دینار دیں اور جو چاندی رکھتے ہوں وہ دس ہزار درہم دیں، شہری باشندوں کیلئے دس ہزار درہم ہیں، بادیہ نشینوں کے لیے سو اونٹ اور دیہاتوں یا قصبوں کے رہنے والوں کے لیے دو سو گائیں یا ہزار بکریاں

محدث کبیر شیخ حر عاملی نے تحریر کیا ہے کہ:

رواہ فی المقنع مرسلا الی قولہ مائتی حلۃ۔

صدوق رحمۃ اللہ علیہ نے مقنع میں اس حدیث کو دو سو حلوں تک روایت کیا ہے۔

(وسائل الشیعہ)

---

[1] دینار سونے کا سکہ ہے جو ایک مثقال کے برابر ہوتا ہے اور مثقال کا وزن ۱۸ چنوں کے مساوی ہے اور درہم چاندی کا سکہ ہے جو ۶/۱۲ چنوں کے ہم وزن ہے۔

اگر جان بوجھ کر قتل کیا گیا ہو تو ایک سال کے اندر دیت ادا کی جائے گی اور اگر غلطی یا اشتباہ سے قتل واقع ہوا ہو تو تین سال کے اندر دیت دی جائے گی۔ حضرت کا ارشاد ہے:

تستادی دیة الخطأ فی ثلاث سنین وتستادی دیة العمد فی سنة۔ (الفقیہ)

جو قتل غلطی سے ہو اس کی دیت تین سال کی مدت میں ادا کی جائے گی اور جو قتل قصداً ہو اس کی دیت ایک سال میں ادا کی جائے گی۔

اگر قصداً قتل کیا ہو یا قصد قتل کے بغیر زدوکوب سے موت واقع ہو گئی ہو تو قاتل خود دیت ادا کرے گا اور اگر محض غلطی سے ایسا ہوا ہو تو قاتل کے اقربا پر دیت عائد ہو گی۔ چنانچہ حضرت فرماتے ہیں:

لیس علی العاقلة دیة العمد انما علیھم دیة الخطأ۔ (مستدرک الوسائل)

قاتل کے اقربا پر قتل عمد کی دیت نہیں ہے اگر غلطی سے قتل واقع ہوا ہو تو البتہ ان پر دیت کی ذمہ داری ہو گی۔

حضرت عمر نے ایک حاملہ عورت کے بارے میں ایک ناگوار بات سنی تو اسے طلب کرنے کیلئے آدمی بھیجا اور اسے اس قدر ڈرایا دھمکایا گیا کہ وہ ہراساں ہو گئی اور اس خوف وہراس کی وجہ سے اسے درد شروع ہو گیا۔ اس نے قریب ہی ایک گھر میں بچہ جنا جو زندہ پیدا ہونے کے بعد مر گیا۔ حضرت عمر نے صحابہ سے اس کے بارے میں پوچھا۔ سب نے باتفاق رائے کہا کہ آپ پر کوئی مظلمہ عاید نہیں ہوتا۔ حضرت علی سے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ اگر ان لوگوں نے تمہاری رورعایت کرتے ہوئے یہ فیصلہ کیا ہے تو تمہیں فریب دیا ہے اور اگر واقعًا ان کی یہ رائے ہے تو انہوں نے غلط رائے قائم کی ہے۔

الدیة علی عاقلتک۔ (وسائل الشیعہ)

اس کی دیت تمہارے اقربا پر عائد ہوتی ہے۔

حضرت عمر کو خود ہی یہ فیصلہ کر لینا چاہیے تھا کہ جب یہ حادثہ خوف وہراس کی وجہ سے رونما ہوا ہے تو ہراساں کرنے والا اس کی ذمہ داری سے بری قرار نہیں پا سکتا اور وہ تو معمولی قسم کے واقعات میں بھی دیت دے دیا کرتے تھے۔ چنانچہ امام شعرانی نے کشف الغمہ میں تحریر کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر حجام سے لبیں کٹوا رہے تھے کہ کسی بات پر بگڑ کر اسے اتنا ڈانٹا کہ اس کی ریح صادر ہو گئی۔ حضرت عمر نے کہا کہ اس حد تک ڈرانے کا تو ہمارا ارادہ نہ تھا لہٰذا ہم اس کی دیت دیں گے۔ چنانچہ اسے ایک بکری اور چالیس درہم دیے۔

اگر کوئی شخص قاضی کے غلط فیصلہ کے نتیجہ میں مارا جائے یا اسے جسمانی ضرر و نقصان پہنچے تو اس کی

لے کر کہیں غائب ہو گئی اور یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس نے بچے کا کیا کیا ہے۔ حضرت نے حکم دیا کہ پہلی دایہ ضامن ہے کیوں کہ اسی نے بچے کو ماں کی گود سے لیا تھا لہٰذا وہ اس کی دیت ادا کرے۔

ایک غلام نے ایک آزاد کو غلطی سے قتل کر دیا۔ جب وہ قتل کا مرتکب ہوا تو اس کے آقا نے اسے آزاد کر دیا۔ امیر المؤمنین نے اس کی آزادی کو صحیح قرار دیا اور قتل کی دیت غلام پر عاید کی کیوں کہ اب وہ آزاد ہو چکا تھا۔

ایک شخص کسی کے گھر میں داخل ہوا اور اسے صاحب خانہ کے کتے نے کاٹ لیا۔ حضرت سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا کہ اگر وہ صاحب خانہ کی اجازت کے بغیر داخل ہوا تو صاحب خانہ ذمہ دار نہیں ہے اور اگر اس کی اجازت سے داخل ہوا تو صاحب خانہ ضامن ہے۔

ایک شخص نے حضرت عمر سے شکایت کی کہ فلاں شخص کے بیل نے اس کے اونٹ کا پیٹ چاک کر دیا ہے۔ حضرت عمر نے کہا کہ اس پر نہ دیت ہے اور نہ قصاص امیر المؤمنین نے یہ فیصلہ سُنا تو فرمایا کہ اگر اس شخص نے بیل کو اونٹ کی گزر گاہ میں باندھ رکھا تھا تو وہ اس کا ضامن ہو گا ورنہ نہیں۔ چنانچہ محل وقوع کا جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ بیل کہیں باہر سے لایا تھا اور اسے اونٹ کے راستہ میں باندھ دیا تھا۔ حضرت عمر نے آپ کی رائے پر عمل کرتے ہوئے بیل کے مالک سے اسے اونٹ کی قیمت دلوا دی۔

ایک شخص پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں ایک شخص کو لے کر آیا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ اس شخص کے بیل نے میرے گدھے کو ہلاک کر ڈالا ہے۔ آنحضرتؐ نے انہیں پہلے حضرت ابوبکر اور پھر حضرت عمر کے پاس بھیجا ان دونوں کا جواب یہ تھا کہ جانور پر نہ دیت ہے نہ قصاص پھر انہیں حضرت علی کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر بیل نے گدھے کے استھان پر پہنچ کر اسے ہلاک کیا ہے تو بیل کا مالک ضامن ہو گا اور اگر گدھا بیل کی جگہ پر چلا آیا تو بیل کا مالک ضامن نہیں ہو گا۔ وہ دونوں یہ فیصلہ سُن کر آنحضرتؐ کی خدمت میں آئے آپؐ نے یہ فیصلہ سُن کر فرمایا:

الحمد للہ الذی جعل من اھل بیتی من یحکم بحکم الانبیاء۔ (وسائل الشیعہ)	تمام حمد و ثنا اس اللہ کے لیے ہے جس نے میرے اہل بیت میں وہ افراد رکھے جو انبیا کی مانند فیصلہ کرتے ہیں۔

ایک مرتبہ پیغمبر اکرمؐ کا خچر جو ادھر ادھر چرتا رہتا تھا اور اسے کوئی روکتا ٹوکتا نہ تھا۔ سرکنڈوں کے ایک انبار میں گھس گیا۔ بنی مدلج کے ایک آدمی نے تیر چلا کر اسے ہلاک کر دیا۔ امیر المؤمنین نے اسے طلب کر کے فرمایا:

واللہ لا تفارقنی حتی تدیھا (وسائل الشیعہ)	خدا کی قسم تم اس جگہ سے جا نہیں سکتے جب تک اس کی قیمت ادا نہ کر دو

چنانچہ اس نے چھ سو درہم ادا کیے۔

ایک شخص کا گھوڑا تھان سے بھاگ نکلا اور دوڑتے ہوئے ایک آدمی کو لات ماری اور اسے ختم کر دیا۔ اس آدمی کے وارث گھوڑے کے مالک کو پکڑ کر حضرت کے پاس لائے اور دیت کا مطالبہ کیا۔ گھوڑے کے مالک نے کہا کہ یہ خود ہی تھان سے بھاگ نکلا تھا اور چند گواہ بھی پیش کیے۔ حضرت نے فرمایا کہ اس صورت میں، گھوڑے کے مالک پر دیت عائد نہیں ہوتی۔

ایک شخص کے دو اونٹ آوارہ ہو کر صحرا کی طرف نکل گئے ایک شخص نے انہیں پکڑ لیا اور دونوں کو ایک رسی سے باندھ دیا ان میں سے ایک گلا گھٹنے کی وجہ سے مر گیا۔ حضرت نے فیصلہ فرمایا کہ یہ شخص ضامن نہیں ہے کیوں کہ:

انما اراد الاصلاح	اس نے تو بھلائی کرنے کا ارادہ کیا تھا۔

(وسائل الشیعہ)

اعضاء بدن میں سے کسی عضو کو قطع یا مجروح یا بیکار کر دینے سے بعض صورتوں میں دیت قتل کی دیت کے مساوی ہوتی ہے اور بعض صورتوں میں کم جو جرم کی سنگینی و ہلکی کے اعتبار سے مختلف ہوتی رہتی ہے۔ اس نقصان و ضرر رسانی پر عائد ہونے والی چند دیتیں تحریر کی جاتی ہیں۔

اگر کوئی شخص کسی کی دونوں آنکھیں پھوڑ کر نابینا کر دے تو اسے پوری دیت دینا ہوگی اور اگر ایک آنکھ پھوڑے تو آدھی دیت۔ حضرت کا ارشاد ہے:

فی العینین الدیۃ وفی کل واحد منھما نصف الدیۃ۔	دونوں آنکھوں میں پوری دیت ہے اور ایک آنکھ میں آدھی دیت

(وسائل الشیعہ)

اگر کسی کی ایک آنکھ پہلے ہی سے پھوٹی ہوئی ہے تو اس کی صحیح آنکھ کے پھوڑنے پر پوری دیت دی جائیگی حضرت کا ارشاد ہے:

اذا نتفت اشفار العین کلھا فلم تنبت ففیھا الدیۃ کاملۃ وفی کل واحد منھا ربع الدیۃ۔	اگر آنکھوں کی تمام پلکیں کاٹ دی جائیں اور وہ دوبارہ نہ اگیں تو پوری دیت دی جائے گی اور ہر پلک کی دیت ایک چوتھائی ہوگی۔

(مستدرک الوسائل)

اگر کسی کی آنکھ کے دونوں پپوٹے کاٹ دیے جائیں تو آدھی دیت اور ایک پپوٹا کاٹا جائے تو چوتھائی دیت دینا ہوگی۔ حضرت کا ارشاد ہے:

فی جفون العینین فی کل واحد منھما ربع الدیۃ۔ (مستدرک الوسائل)	آنکھ کے دونوں پپوٹوں میں سے ہر پپوٹے کی دیت ایک چوتھائی ہے۔

کی دیت پچیس دینار ہوگی۔ حضرت کا ارشاد ہے :

کل سن من المقادیم اذا کسرحتی یذھب خمسون دینارا یکون ذلک ستمائۃ دینار ودیۃ کل سن من المواخر اذا کسرحتی یذھب علی النصف من دیۃ المقادیم خمسۃ وعشرون دینارا۔

جب سامنے کے دانتوں میں سے کوئی دانت اس طرح توڑا جائے کہ جڑ سے اکھڑ جائے تو دانت کی دیت پچاس دینار ہوگی اور ان کی مجموعی دیت چھ سو دینار بنے گی اور پچھلی طرف کے دانتوں کو توڑنے کی صورت میں ہر دانت کی دیت سامنے والے دانتوں کی دیت سے نصف یعنی پچیس دینار ہوگی۔

(وسائل الشیعہ)

اگر کوئی شخص کسی کی داڑھی کے بال اس طرح مونڈے یا اکھیڑے کہ دوبارہ نہ اُگیں تو پوری دیت دینا ہوگا اور اگر اُگ آئیں تو ایک تہائی دیت چنانچہ سکونی سے روایت ہے کہ :

ان علیا علیہ السلام قضی فی اللحیۃ اذا حلقت فلم تنبت بالدیۃ کاملۃ فاذا نبتت فثلث الدیۃ۔

جب کسی کی داڑھی کے بال اس طرح مونڈ دیے جائیں کہ دوبارہ نہ اگیں تو حضرت علیؑ نے پوری دیت کا فیصلہ فرمایا۔

(الفقیہ)

اگر کسی کا شانہ توڑ دیا جائے تو سو دینار دیت ہوگی۔ حضرت کا ارشاد ہے :

دیۃ المنکب اذا کسر خمس دیۃ الید مائۃ دینار۔

شانہ کی دیت سو دینار ہے جو ہاتھ کی دیت کا پانچواں حصّہ ہے۔

(مستدرک الوسائل)

اگر کسی کے دونوں ہاتھ گٹ سے کاٹ دیے جائیں تو پوری دیت اور ایک ہاتھ کاٹا جائے تو آدھی دیت دینا ہوگی۔ حضرت کا ارشاد ہے :

فی الیدین الدیۃ وفی کل واحد منھما نصف الدیۃ۔

دونوں ہاتھوں کی پوری دیت ہے اور ایک ہاتھ کی آدھی دیت۔

(مستدرک الوسائل)

اگر کسی کی دسوں انگلیاں کاٹ دی جائیں تو پوری دیت دینا ہوگی اور ایک انگلی کاٹی جائے تو دیت کا دسواں حصّہ دیا جائے گا۔ حضرت کا ارشاد ہے :

فی الاصبع عشر من الابل۔

ایک انگلی کی دیت دس اونٹ ہے۔

(مستدرک الوسائل)

اگر انگلی کی ایک پور کاٹی جائے تو انگلی کی دیت کا تیسرا حصہ دیا جائے گا اور انگوٹھے کی پور کاٹی جائے تو انگلی کی دیت سے آدھی دیت دی جائے گی۔ چنانچہ سکونی سے روایت ہے کہ:

ان امیر المؤمنین یقضی فی کل مفصل من الاصابع بثلث عقلی تلک الاصابع الا الابھام فانہ کان یقضی فی مفصلہا بنصف عقلی تلک الابھام لان لہا مفصلین۔ (الفقیہ)	امیر المومنین کا یہ فیصلہ تھا کہ انگلی کی ہر پور کی دیت انگلی کی دیت کی ایک تہائی ہوگی لیکن انگوٹھے کی پور کی دیت انگوٹھے کی دیت کا نصف ہوگی، کیوں کہ اس میں دو ہی پوریں ہوتی ہیں۔

اگر کسی کی کمر اس طرح توڑ دی جائے کہ وہ بیٹھ نہ سکے تو پوری دیت دینا ہوگی۔ چنانچہ امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں:

قضی امیر المؤمنین فی رجل کسر صلبہ فلا یستطیع ان یجلس ان فیہ الدیۃ۔ (وسائل الشیعہ)	امیر المومنین نے اس شخص کے بارے میں جس کی کمر توڑ دی گئی تھی اور وہ بیٹھ نہ سکتا تھا پوری دیت کا فیصلہ فرمایا۔

اگر عورت کے دونوں پستان قطع کر دیے جائیں تو پوری دیت اور ایک پستان قطع کیا جائے تو نصف دیت ہوگی۔ چنانچہ امام باقرؑ فرماتے ہیں کہ:

قضی امیر المؤمنین فی رجل قطع ثدی امرأتہ قال اذن اغرمہ لہا نصف الدیۃ۔ (وسائل الشیعہ)	امیر المومنین نے اس شخص کے بارے میں جس نے اپنی عورت کا ایک پستان کاٹ ڈالا تھا فرمایا کہ میں اس مرد سے عورت کو آدھی دیت دلواؤں گا۔

اگر کسی کو اس طرح ضرب لگائی جائے کہ پیشاب رکنے نہ پائے تو اسے پوری دیت دی جائے گی۔

ان علیا قضی فی رجل ضرب حتی سلس ببولہ بالدیۃ کاملۃ۔ (وسائل الشیعہ)	حضرت علی نے اس شخص کے بارے میں جس کا چوٹ لگنے کی وجہ سے پیشاب نہ رکتا تھا پوری دیت کا فیصلہ فرمایا۔

اگر کسی کے دونوں خصیے کاٹ دیے جائیں تو اسے پوری دیت دی جائے گی اور اگر ایک خصیہ کاٹا گیا ہو تو آدھی دیت۔ حضرت کا ارشاد ہے:

فی البیضتین الدیۃ وفی کل واحد منہما نصف الدیۃ۔ (مستدرک الوسائل)	دونوں خصیوں کی سالم دیت ہے اور ایک کی آدھی دیت۔

اگر کسی کے دونوں پیر ٹخنوں سے کاٹ دیے جائیں تو پوری دیت ہو گی۔ حضرت کا ارشاد ہے:

والرجلین جمیعا الف دینار۔ — دونوں پیروں کی دیت ہزار دینار ہے

(مستدرک الوسائل)

اگر پاؤں کی دسوں انگلیاں کاٹ دی جائیں تو پوری دیت دینا ہو گی اور ہر انگلی کی دیت، دیت کا دسواں حصہ ہو گی۔ حضرت کا ارشاد ہے:

فی کل اصبع اصابع الرجلین مائۃ وفی کل انملۃ بحسابھا۔ — پیروں کی انگلیوں میں سے ہر انگلی کی دیت سو دینار ہے اور ہر پور کی دیت اسی تناسب سے ہو گی۔

(مستدرک الوسائل)

اگر کوئی شخص کسی کے منہ پر تھپڑ مارے تو ڈیڑھ دینار سے چھ دینار تک تاوان دینا ہو گا۔ صدوق رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

انہ قضی فی اللطمۃ بالوجہ تسود ان ارشھا ستۃ دنانیر فان اخضرت فارشھا ثلثۃ دنانیر فان احمرت فارشھا دینار و نصف۔ — حضرت علی نے یہ فیصلہ فرمایا کہ اگر طمانچے سے چہرہ سیاہ ہو جائے تو چھ دینار اور سرخ ہو جائے تو ڈیڑھ دینار، نیلا ہو جائے تو تین دینار تاوان دیا جائے گا۔

(مستدرک الوسائل)

اگر کوئی شخص کسی کے سر یا چہرے پر ضرب لگائے اور خون نکل آئے تو دیت ۱/۱۰۰ دے گا۔

ان علیا علیہ السلام قضی فی الدامیۃ بعیرا۔ — حضرت علی علیہ السلام نے خون نکالنے والی چوٹ پر ایک اونٹ دیت کا فیصلہ کیا۔

(مستدرک الوسائل)

اگر کھال کے ساتھ تھوڑا سا گوشت بھی چیر دے تو دیت کا ۲/۱۰۰ دیا جائے گا۔

قضی فی الباضعۃ بعشرین دینارا۔ — حضرت علی نے اس ضرب میں جو تھوڑا سا گوشت بھی چیر دے بیس دینار دیت کا فیصلہ کیا۔

(مستدرک الوسائل)

اگر زیادہ مقدار میں گوشت چیر دے تو دیت کا ۳/۱۰۰ دیا جائے گا۔

قضی فی المتلاحمۃ بثلثین دینارا — حضرت علی نے اس ضرب میں جو گوشت کے اندر تک اتر جائے تیس دینار دیت کا فیصلہ کیا۔

(مستدرک الوسائل)

اگر چوٹ کا اثر ہڈی کے نازک پردے تک پہنچ جائے تو ۴/۱۰۰ دیت دی جائے گی۔

ان علیا قضی فی السحاق اربعۃ — حضرت علی نے اس ضرب میں جو ہڈی کے پردے

ابعرا و قیمتھا من الذھب والورق — تک پہنچ جائے چار اونٹ یا ان کی قیمت کے مساوی سونا اور چاندی کی دیت کا فیصلہ کیا۔

(مستدرک الوسائل)

اگر ہڈی نظر آنے لگے تو ۱۰۰/۵ دیت دی جائے گی۔

ان علیاً علیہ السلام قضی فی الموضحۃ بخمس من الابل او قیمتھا من الذھب والورق۔ — حضرت علی علیہ السلام نے اس ضرب میں جس سے ہڈی دکھائی دینے لگے پانچ اونٹ یا ان کی قیمت کے برابر سونا اور چاندی کی دیت کا فیصلہ کیا۔

(مستدرک الوسائل)

اگر ہڈی ٹوٹ جائے تو دیت کا ۱۰۰/۱۰ دیا جائے گا۔ چنانچہ سکونی سے روایت ہے کہ:

قضی امیر المؤمنین فی الھاشمۃ بعشر من الابل۔ — امیر المؤمنین نے اس ضرب میں جس سے ہڈی ٹوٹ جائے دس اونٹوں کی دیت کا فیصلہ کیا۔

(الفقیہ)

اگر ہڈی کے ذرّے الگ ہو جائیں تو ۱۰۰/۱۵ دیت دی جائے گی۔

قضی فی المنقلۃ خمسۃ عشر من الابل۔ — حضرت علی نے ہڈی کے ذرّوں کے الگ ہونے کی صورت میں پندرہ اونٹوں کی دیت کا فیصلہ کیا۔

(مستدرک الوسائل)

اگر ضرب جوفِ دماغ یا بھیجے کے پردہ تک پہنچے تو ایک تہائی دیت دی جائے گی۔

ان علیاً علیہ السلام قضی فی الجائفۃ وفی المامومۃ ثلث الدیۃ۔ — حضرت علی علیہ السلام نے جوفِ دماغ اور ہڈی کے پردے تک پہنچنے والی ضرب میں ایک تہائی دیت کا فیصلہ کیا۔

(مستدرک الوسائل)

اگر کوئی شخص ایسا کام کرے جس سے کسی زنِ مسلمہ کا حمل ساقط ہو جائے تو جسمانی ساخت کے منازل کے اعتبار سے اس کی دیت بیس دینار سے ایک ہزار دینار تک ہوگی۔ چنانچہ ایک شخص نے ایک حاملہ عورت کو اس طرح زدوکوب کیا کہ اس کا حمل جو بندھے ہوئے خون کی صورت میں تھا ساقط ہو گیا۔ امیر المؤمنین سے اس کی دیت کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اس کی دیت چالیس دینار ہوگی اور اس آیت کی تلاوت فرمائی:

ولقد خلقنا الانسان من سلالۃ من طین ثم جعلناہ نطفۃ فی قرار مکین ثم جعلنا النطفۃ علقۃ فجعلنا العلقۃ — ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا پھر ہم نے ایک ٹھہراؤ کی جگہ میں اسے نطفہ کی صورت میں رکھا پھر اس نطفہ کو بندھا ہوا خون بنایا پھر

مضغة فجعلنا المضغة عظاما فكسونا العظام لحما ثم انشاناه خلقا آخر فتبارك الله احسن الخالقين ۔

بندھے ہوئے خون کو گوشت کا لوتھڑا بنایا پھر لوتھڑے میں ہڈیوں کا ڈھانچہ تیار کیا۔ پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا پھر (اس میں روح پھونک کر) اسے دوسری شکل وصورت دے دی تو بابرکت ہے وہ خدا جو ہر بنانے والے سے بہتر بنانے والا ہے ۔

پھر فرمایا کہ نطفہ کی دیت بیس دینار، بندھے ہوئے خون کی چالیس دینار، لوتھڑے کی ساٹھ دینار اور ہڈیوں کی تخلیق کے بعد اسّی دینار اور صورت کی تکمیل کے بعد سو دینار اور روح پڑنے کے بعد ہزار دینار ہوگی ۔ اگر کسی یہودی نصرانی یا مجوسی عورت کا بچہ ساقط کر دیا جائے تو اس کی دیت اس کی ماں کی دیت کا دسواں حصّہ ہوگی ۔ چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ :

ان امیر المؤمنین قضی فی جنین الیھودیة والنصرانیة والمجوسیة عشر دیة امہ ۔

امیر المؤمنین نے یہودیہ نصرانیہ اور مجوسیہ عورت کے بچے کے ساقط کرنے کی دیت اس کی ماں کی دیت کا دسواں حصّہ قرار دی ۔

(وسائل الشیعہ)

مسائلِ مُشکلہ

امیر المؤمنین مشکل سے مشکل مسائل اور پیچیدہ سے پیچیدہ نزاعات کے حل کرنے میں حیرت انگیز دستگاہ رکھتے تھے اور جن مسائل کا حل تلاش کرنے میں اہل نظر کی فکری قوتیں اور ذہنی کاوشیں بیکار ہو جاتی تھیں آپ کا ذہن رسا انہیں فوراً حل کر دیتا تھا۔ اگرچہ علماء وفقہاء نے مسائل مشکلہ کے عنوان سے بہت سی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھایا ہے مگر اس منزل کے پہلے راہ پیما آپ ہیں اور آپ ہی کے افکار ونظریات کی روشنی نے اس منزل کی طرف رہنمائی کی ہے ۔ ذیل میں اس سلسلہ کے چند قضایا و مسائل درج کیے جاتے ہیں ۔

ایک شخص نے حضرت ابوبکر سے پوچھا کہ وہ شخص کون ہو سکتا ہے جس نے صبح کے وقت ایک عورت سے عقد کیا شام کو اس کے ہاں بچہ پیدا ہوا اور اس کے بعد وہ شخص مر گیا اور بیوی اور یہ نومولود بچہ اس کے وارث قرار پائے ۔ حضرت ابوبکر کوئی جواب نہ دے سکے ۔ امیر المؤمنین نے سُنا تو فرمایا کہ وہ عورت اپنے آقا کی حاملہ کنیز تھی ۔ آقا نے اسے آزاد کر دیا اور پھر اس سے نکاح کر لیا صبح کو عقد ہوا اور شام کو ولادت ہوئی اور اس کے مرنے کے بعد یہی دونوں اس کے وارث ہوں گے ۔

عقبہ ابن ابی عقبہ وفات پا گیا۔ حضرت چند لوگوں کے ہمراہ اس کے جنازہ میں شریک ہوئے۔ تشیع جنازہ کے دوران آپ نے ایک شخص سے فرمایا کہ عقبہ مر گیا ہے لہٰذا تمہاری بیوی تم پر حرام ہو گئی ہے۔ حضرت عمر وہاں موجود تھے۔ انہوں نے کہا کہ یہ عجیب بات ہے کہ ایک شخص مر جاتا ہے اور دوسرے شخص کی بیوی اس پر حرام ہو جاتی ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ یہ عقبہ کا غلام ہے اور اس کے نکاح میں ایک آزاد عورت ہے جو عقبہ کے ورثاء میں شامل ہے اور اس غلام میں بھی اس کا حصہ ہے اور عورت اپنے غلام پر حرام ہوتی ہے لہٰذا وہ بھی اپنے شوہر پر حرام ہو جائے گی۔

ایک عورت نے حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ کیا آپ اسے جائز قرار دیتے ہیں کہ ایک جوان شوہر دار عورت اپنے باپ سے اجازت لے کر دوسرا شوہر کر لے لوگ اس سوال پر متعجب ہوئے مگر امیرالمومنین فوراً سمجھ گئے کہ شوہر کے ہوتے ہوئے دوسرے شوہر کی خواہش کے معنی اس کے سوا کیا ہو سکتے ہیں کہ اس کا شوہر عورت کے قابل نہیں ہے۔ آپ نے اس کے شوہر کو طلب کیا اور فرمایا کہ تم اسے طلاق دے دو۔ اس نے بغیر کسی حیل وحجت کے طلاق دے دی اور آپ نے عدہ کا انتظار کیے بغیر اس کا عقد ایک دوسرے شخص سے کر دیا کیوں کہ ایسی صورت میں عدہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اسی طرح کا ایک واقعہ حضرت عمر کو بھی پیش آیا اور وہ یہ کہ ایک عورت نے ان سے کہا کہ:

ان زوجی یقوم اللیل ویصوم	میرا شوہر رات کو نمازیں پڑھتا ہے اور دن کو
النہار وانا اکرہ ان اشکوہ	روزہ رکھتا ہے مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ میں
الیک وھو یعمل بطاعۃ اللہ۔	آپ سے اس کا گلہ کروں جب کہ وہ اللہ کا اطاعت
(استیعاب)	گزار ہے۔

حضرت عمر نے کہا کہ پھر تو وہ بہت اچھا آدمی ہوا۔ خدا اسے جزائے خیر دے کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میں اسے منع کر دوں کہ وہ دن کو روزہ نہ رکھے اور رات کو نماز نہ پڑھے۔ کعب ابن سور وہاں بیٹھا تھا اس نے کہا کہ اس عورت کا مقصد یہ ہے کہ اس کا شوہر ہمہ وقت عبادت میں لگا رہتا ہے اور بیوی کے حقوق ادا کرنے کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ حضرت عمر نے کہا کہ تم خوب سمجھے اب تمہی اس کا فیصلہ کرو۔ اس نے کہا کہ مرد کو چار عورتیں کرنے کی اجازت ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ چار راتوں میں سے ایک رات اس کے حصہ میں آتی ہے لہٰذا وہ چار راتوں میں سے تین راتیں عبادت میں صرف کرے اور ایک رات اس کے لیے مخصوص کر دے۔ حضرت عمر کو کعب کا یہ فیصلہ پسند آیا اور اسے بصرہ کا قاضی مقرر کر دیا۔ جہاں وہ جنگ جمل میں اونٹ کی مہار تھامنے پر کسی کا تیر لگنے سے ہلاک ہو گیا۔

ایک شخص نے اپنی کنیز جس سے اس کا ایک لڑکا بھی تھا اپنے ایک غلام سے بیاہ دی اس شخص کا انتقال ہوا تو وہ لڑکا اس کا وارث قرار پایا اور وہ کنیز اپنے لڑکے کی طرف منتقل ہونے کی بنا پر آزاد قرار دے دی گئی کیوں کہ ماں اپنے بیٹے کی غلامی میں نہیں آ سکتی۔ پھر وہ لڑکا مر گیا اور وہ عورت اس کے ترکہ

کی وارث قرار پائی۔ اس ترکہ میں وہ غلام بھی شامل تھا جس سے اس کا عقد ہوا تھا۔ اب وہ عورت یہ کہتی تھی کہ یہ میرا غلام ہے اور غلام یہ کہتا تھا کہ یہ میری بیوی ہے جب کوئی تصفیہ نہ کر سکے تو حضرت عثمان کے سامنے پیش ہوئے مگر وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکے۔ امیر المومنین اس پر مطلع ہوئے تو آپ نے اس عورت سے کہا کہ وہ تیرا غلام ہے چاہے تو اسے آزاد کر یا اپنی غلامی میں رکھ یا بیچ ڈال۔ اگر وہ تیری طرف منتقل ہونے کے بعد زن شوئی کے تعلقات قائم کرتا تو سزا کا مستحق ہوتا۔

ایک عورت حضرت کے پاس آئی اور کہا کہ میں عقبہ ابن عامر جہنی کی بیوی ہوں جو مال کثیر چھوڑ کر مر گیا ہے مگر عقبہ کے چچازاد بھائیوں نے اس کے ترکہ پر قبضہ کر لیا ہے حالانکہ میں حاملہ ہوں اور پیدا ہونے والا بچہ ہی اس کا صحیح وارث ہے اور اپنے اس دعوی کے ثبوت میں عقبہ کے دو غلاموں سالم اور میمون کو پیش کیا جنہیں عقبہ کے بعد اس کے چچازاد بھائیوں نے آزاد کر دیا تھا۔ حضرت نے فرمایا کہ اگر اس کے ہاں بچہ پیدا ہو تو نہ اسے کچھ ملے گا اور نہ اس کے بچے کو اور اگر اس کے ہاں بچہ پیدا نہ ہو تو اسے ترکہ میں سے چوتھا حصہ دیا جائیگا۔ اس کی توجیہہ یہ بیان فرمائی کہ بچہ پیدا ہونے کی صورت میں اس کی زوجیت اور بچے کی فرزندی کی گواہی دینے والے اس کے دعوی کی بنا پر غلامی پر باقی ہوں گے کیونکہ عقبہ کے چچازاد بھائی نہ وارث ہیں اور نہ انہیں آزاد کرنے کا حق پہنچتا ہے اور غلام کی گواہی اس موقع پر کافی نہیں ہے اور بچہ نہ ہونے کی صورت میں چچازاد بھائی وارث ہوں گے اور وارثوں ہی نے ان دونوں کو آزاد کیا ہے لہذا آزادی کی بنا پر ان کی گواہی زوجیت کے بارے میں قابل قبول ہوگی۔

ایک نوجوان حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یا امیر المومنین میرا باپ چند آدمیوں کے ہمراہ سفر پر گیا وہ تو سب کے سب واپس آ گئے مگر میرا باپ پلٹ کر نہیں آیا۔ میں نے ان سے پوچھا تو یہ جواب دیا کہ وہ سفر کے دوران مر گیا اور اس کے مال کے بارے میں پوچھا تو جواب دیا کہ اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ حالانکہ میرے علم میں ہے کہ وہ مال کثیر لے کر نکلا تھا مجھے شبہ ہے کہ انہوں نے اسے قتل کر دیا ہے اور اس کا مال آپس میں تقسیم کر لیا ہے۔ میں قاضی شریح کی عدالت میں پیش ہو چکا ہوں مگر اس نے میرا دعوی مسترد کر دیا ہے۔ اب میں آپ کے پاس فریاد لے کر آیا ہوں۔

حضرت اسے اور ان آدمیوں کو لے کر شریح کے پاس آئے اور فرمایا اے شریح تم نے کس بنیاد پر اس نوجوان کے دعوی کو مسترد کیا ہے۔ اس نے کہا کہ میں نے اس نوجوان سے گواہ طلب کیے مگر یہ کوئی گواہ پیش نہ کر سکا۔ لہذا میں نے ان لوگوں سے حلف لے کر اس کا دعوی مسترد کر دیا۔ فرمایا کہ اے شریح کیا اس طرح کے دعووں کا یوں فیصلہ کیا جاتا ہے۔ پھر حضرت نے اس کا فیصلہ اس طرح کیا کہ ان لوگوں کو الگ الگ بٹھایا اور ہر ایک پر ایک ایک آدمی نگران مقرر کر دیا اور ان میں سے ایک کو بلایا اور اس سے پوچھا کہ تم کس دن نکلے تھے مہینہ اور سال کونسا تھا۔ مرنے والے کا مرض کیا تھا، کتنے دن بیمار رہا، غسل وکفن کس نے دیا، نماز کس نے پڑھائی اور قبر میں کون اترا۔ اس نے جو جوابات دیے عبید اللہ ابن ابی رافع انہیں حضرت کے حکم سے قلمبند کرتے رہے جب تمام متعلقہ

امور پوچھ چکے تو آپ نے بلند آواز سے اللہ اکبر کہا اور گرد و پیش بیٹھے ہوئے لوگوں نے بھی صدائے تکبیر بلند کی پھر دوسرے آدمی کو بلایا اس نے اس خیال سے کہ پہلے آدمی نے اعتراف جرم کر لیا ہے کہا کہ یا امیرالمومنین میں ان لوگوں کے ساتھ شریک جرم ہونا نہ چاہتا تھا مگر مجھے کہہ سن کر شریک کر لیا گیا اور ہم سب نے مل کر اسے قتل کیا اور اس کا مال آپس میں بانٹ لیا اس کے بعد دوسروں کو ایک ایک کر کے بلایا انہوں نے انکار کی گنجائش نہ پا کر اپنے جرم کا اعتراف کر لیا جب وہ اعتراف کر چکے تو آپ نے انہیں مقتول کے خون کا مجرم اور اس کے مال کا ذمہ دار قرار دیا۔

ایک شخص نے اپنے غلام کو حضرت کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ یہ میرا غلام ہے اور اس نے مجھ سے اجازت حاصل کیے بغیر عقد کر لیا ہے فرمایا کہ تم اسے اس عورت سے الگ کر دو اس نے غلام سے مخاطب ہو کر کہا کہ تم اس عورت کو طلاق دے دو۔ حضرت نے یہ سنا تو فرمایا کہ تم نے طلاق کا حکم دے کر اپنی رضامندی کا اظہار اور نکاح کے جواز کا اقرار کیا ہے لہٰذا اب اسے اختیار ہے چاہے طلاق دے یا نہ دے۔

حضرت کے پاس ایک شخص کو لایا گیا جس نے یہ قسم کھائی تھی کہ اگر وہ رمضان کے مہینہ میں اپنی بیوی سے ہمبستری نہ کرے تو اسکی بیوی کو تین طلاقیں ہو جائیں گی۔ حضرت نے فرمایا کہ وہ اسے لے کر سفر پر روانہ ہو جائے اور پھر دن کے وقت ہمبستری کرے۔

امیرالمومنین نے یہ ان لوگوں کے لیے چھٹکارے کی ایک صورت تجویز کی ہے جو قسم کے ذریعہ طلاق کو صحیح سمجھتے ہیں۔

ایک شخص نے حاضر خدمت ہو کر کہا کہ میرے سامنے چند خرمے رکھے ہوئے تھے۔ میری بیوی نے ایک خرما اٹھا کر منہ میں رکھ لیا میں نے قسم کھائی کہ وہ نہ اسے پھینکے اور نہ اسے نگلے فرمایا وہ آدھا کھا لے اور آدھا پھینک دے تم قسم سے بری الذمہ ہو جاؤ گے۔

متفرق سوالات اور ان کے جوابات

امیرالمومنین سے یہود و نصاریٰ کے علماء و احبار مختلف قسم کے سوالات کرتے تھے کبھی علمی آزمائش مقصود ہوتی تھی اور کبھی علمی استفادہ۔ آپ ان کے ہر سوال پر کان دھرتے اور اس کی نوعیت کچھ بھی ہوتی بغیر کسی ذہنی دباؤ کے ایسا جواب دیتے کہ وہ مطمئن ہو کر خاموشی اختیار کر لیتے یا حلقہ بگوش اسلام ہو جاتے۔ ذیل میں آپ کے چند جوابات درج کیے جاتے ہیں:

ایک یہودی نے آپ سے سوال کیا کہ:

اخبرنی عما لیس للہ وعما لیس عند اللہ وعما لا یعلمہ	مجھے بتائیے کہ وہ کیا چیز ہے جو اللہ کے لیے نہیں ہے اور وہ کیا چیز ہے جو اللہ کے ہاں نہیں

اللہ۔ ہے اور وہ کیا چیز ہے جس کا اسے علم نہیں ہے

(توحید صدوق)

فرمایا کہ وہ چیز جسے اللہ نہیں جانتا وہ تمہارا یہ قول ہے کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور اللہ نہیں جانتا کہ اس کا کوئی بیٹا ہے چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

قل اتنبئون اللہ بما لا یعلم۔ اے رسول تم ان سے کہو کہ کیا تم اللہ کو ایسی چیز کی خبر دیتے ہو جسے وہ نہیں جانتا۔

اور وہ چیز جو اللہ کے لیے نہیں ہے وہ شریک ہے اور جو چیز اس کے ہاں نہیں ہے وہ ظلم ہے۔ اس یہودی نے یہ جواب سنا تو کلمہ پڑھ کر دائرۂ اسلام میں داخل ہو گیا۔

ایک نصرانی نے حضرت سے کہا کہ اخبرنی عن وجہ الرب "مجھے اللہ کے چہرے کے بارے میں بتایئے حضرت نے کچھ لکڑیاں منگوا کر آگ روشن کی جب شعلے بھڑک اٹھے تو فرمایا این وجہ ھذہ النار "اس آگ کا چہرہ کس طرف ہے"، اس نے کہا کہ آگ کا رُخ چاروں طرف یکساں ہوتا ہے فرمایا کہ یہ آگ جو ہماری روشن کی ہوئی ہے اس کا رُخ متعین نہیں کیا جا سکتا تو اللہ جو کسی چیز سے مشابہت نہیں رکھتا اس کا رُخ کیسے متعین کیا جا سکتا ہے پھر اس آیت کی تلاوت فرمائی۔

وللہ المشرق والمغرب فاینما تولوا فثم وجہ اللہ۔ پورب اور پچھم اللہ ہی کے لیے ہیں لہذا جدھر رُخ کر لو گے وہیں اللہ کا سامنا ہے۔

ایک شخص نے پوچھا کہ وہ کونسی عبادت ہے کہ اگر بجالائی جائے تو عقوبت اور ترک کی جائے تو عقوبت فرمایا کہ وہ نماز ہے جو نشہ کی حالت میں پڑھی جائے کیوں کہ نشہ میں نہ نماز درست ہے اور نہ تکلیف ساقط۔

سلطان روم کے ایک قاصد نے پوچھا کہ اس آدمی کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں جو نہ جنّت کا خواہشمند ہے نہ دوزخ سے ہراساں نہ اللہ سے ڈرتا ہے اور نہ سجدہ و رکوع کرتا ہے خون اور غیر ذبیحہ جانور کا گوشت کھاتا ہے بن دیکھے گواہی دیتا ہے، فتنہ کو دوست رکھتا ہے اور حق سے کراہت کرتا ہے فرمایا جو نہ جنّت کا طالب ہے نہ دوزخ سے ہراساں اور نہ اللہ سے خائف وہ اللہ کا دوست ہے اس لیے کہ وہ جنّت کی خواہش اور دوزخ کے خوف سے بالاتر رہ کر اللہ کی اطاعت کرتا ہے اور اللہ سے ڈرتا ہے تو اس کے عدل کی بنا پر اور ظلم کی بنا پر نہیں ڈرتا اس لیے کہ اسے یقین ہے کہ اللہ ظالم نہیں ہے اور رکوع و سجود نہیں کرتا تو نماز جنازہ میں اسلئے کہ اس میں نہ رکوع ہے اور نہ سجود۔ ٹڈی اور مچھلی کا گوشت کھاتا ہے اور ان دونوں کو ذبح نہیں کیا جاتا اور کلیجی کھائی جاتی ہے وہ خون ہی خون ہوتی ہے اور اولاد کو دوست رکھتا ہے اور قرآن مجید میں اولاد کو فتنہ سے تعبیر کیا گیا ہے

انما اموالکم واولادکم فتنۃ "تمہارا مال اور اولاد فتنہ ہے"

جنت و دوزخ کی گواہی دیتا ہے حالاں کہ اس نے نہ جنت کو دیکھا ہے اور نہ دوزخ کو اور موت ناگوار معلوم

ہوتی ہے اور وہ سراسر حق ہے۔

یہودیوں کی ایک جماعت نے چند سوالات کے ضمن میں پوچھا کہ وہ کون تھا جس نے اپنی قوم کو ڈرایا اور وہ نہ انسانوں میں سے تھا اور نہ جنوں میں سے۔

فرمایا وہ چیونٹی تھی جس نے حضرت سلیمانؑ کے لشکر کو دیکھ کر کہا:

یاایھا النمل ادخلوا مساکنکم	اے چیونٹیو! اپنے اپنے بلوں میں گھس جاؤ ایسا
لایحطمنکم سلیمان وجنودہ	نہ ہو کہ سلیمان اور ان کا لشکر تمہیں کچل ڈالے اور
وھم لایشعرون۔	انہیں خبر بھی نہ ہونے پائے۔

پوچھا وہ کون سی جگہ تھی جس پر ایک ہی مرتبہ سورج چمکا اور پھر اس پر سورج کی شعاعیں نہیں پڑیں۔

فرمایا وہ رود نیل کی نچلی سطح ہے جس پر سے بنی اسرائیل گذرے اور فرعون اور اس کا لشکر موجوں کی لپیٹ میں آیا

پوچھا کہ مخلوقات میں وہ کون کون جاندار ہیں جو ماں کے شکم سے پیدا نہیں ہوئے۔

فرمایا وہ حضرت آدمؑ جناب حوّا حضرت موسیٰ کا اژدہا، حضرت صالح کی اونٹنی، اور حضرت ابراہیم کے ہاتھ سے ذبح ہونے والا مینڈھا اور وہ پرندہ جس کا ڈھانچہ حضرت عیسیٰ نے بنایا اور وہ اللہ کے حکم سے پرواز کرنے لگا۔

ایک شخص نے خطبہ کے دوران پوچھا کہ وہ کونسا جاندار ہے جو دوسرے جاندار کے شکم سے نکلا مگر ان دونوں میں کوئی قرابت نہ تھی؟

فرمایا وہ یونس ابن متی تھے جو مچھلی کے پیٹ سے نکلے۔

پوچھا گیا کہ وہ کونسا درخت تھا جسے پانی سے سیراب نہیں کیا گیا۔ فرمایا کہ وہ درخت جو حضرت یونس پر سایہ ڈالنے کے لیے اگا۔ قرآن مجید میں ہے:

وانبتنا علیہ شجرۃ من یقطین۔	ہم نے ان کے سر پر (سایہ کے لیے) کدو کا درخت اگایا۔

پوچھا گیا کہ وہ کون ذی روح ہے جو جماد سے پیدا ہوا؟ فرمایا وہ ناقۂ صالح ہے۔

ایک شخص نے پوچھا کہ وہ کون ہے جو زندگی میں پانی سے سیراب ہوتا رہا اور مرنے کے بعد کھاتا ہے۔

فرمایا وہ عصائے موسیٰ تھا۔ جب تک وہ درخت کا جزو رہا پانی سے سیراب ہوتا رہا اور جب شاخ سے الگ ہو کر مردہ ہو گیا تو جادوگروں کی رسیوں اور چھڑیوں کو نگل گیا۔

ایک یہودی عالم راس الجالوت نے آپ سے پوچھا کہ تمام چیزوں کی اصل و بنیاد؟ فرمایا پانی جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

وجعلنا من الماء کل شیء حی۔	ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے پیدا کیا ہے۔

خطابی و اقناعی جوابات

امیر المومنین کے بعض جوابات کی نوعیت خطابی و اقناعی ہوتی تھی۔ ایسے جوابات کا موقع و محل وہاں ہوتا ہے جہاں تحقیقی و تحلیلی جواب سائل کی ذہنی سطح سے بلند تر ہو اور اسے ایک لطیف و شگفتہ جواب دے کر اس کی ذہنی تسکین کا سامان کرنا مقصود ہو۔ چنانچہ اس قسم کے جوابات دلآویز و خوش آئند ہونے کی وجہ سے فوراً ذہن میں اتر جاتے ہیں اور سائل کو بڑی حد تک مطمئن کر دیتے ہیں۔ حضرت کے اس قسم کے چند جوابات درج کیے جاتے ہیں جو اقناعی ہونے کے باوجود حقیقت و واقعیت سے الگ بھی نہیں ہیں۔

آپ سے پوچھا گیا کہ اگر کسی شخص کو گھر میں بند کر دیا جائے اور وسائل معاش روک دیے جائیں تو اس کی روزی کدھر سے آئے گی؟ فرمایا جدھر سے اس کی موت آئے گی۔ مطلب یہ ہے کہ روزی رساں ظاہری اسباب و ذرائع کا محتاج نہیں ہے۔ جو ذات پتھر اور ریشم کی تاروں میں لپٹے ہوئے کیڑے کی روزی کا سامان کرتی ہے وہ انسان کی رزق رسانی کا بھی سامان کر سکتی ہے اگرچہ بظاہر رزق کے دروازے مسدود ہوں۔

پوچھا گیا کہ خداوند عالم اس ان گنت مخلوق کا حساب کیونکر کرے گا فرمایا جس طرح مخلوق کے ان گنت ہونے کے باوجود اسے روزی دیتا ہے۔ پھر پوچھا گیا کہ وہ حساب کیوں کر لے گا جب کہ انسان اسے دیکھے گا نہیں فرمایا جس طرح انہیں روزی دیتا ہے اور وہ اسے دیکھتے نہیں۔

پوچھا گیا کہ پانی کا ذائقہ کیا ہے فرمایا "طعم الحیاۃ" "جو زندگی کا ذائقہ ہے"۔

پوچھا گیا کہ مشرق و مغرب کے درمیان کتنا فاصلہ ہے۔ فرمایا جتنا سورج ایک دن میں طے کرتا ہے۔

پوچھا گیا کہ زمین و آسمان کا درمیانی فاصلہ کتنا ہے فرمایا اتنا کہ آنکھ اسے طے کر سکے اور مظلوم کی دُعا وہاں تک پہنچ سکے۔ اس سوال کا جواب اس سے بہتر نہیں ہو سکتا اس لیے کہ زمین و آسمان کا فاصلہ اس وسیع کائنات کے حدود تک پھیلا ہوا ہے جس کی حد بندی تو ہو نہیں سکتی البتہ ایک مظلوم کی دعائے مستجاب اس کی وسعتوں پر چھا سکتی ہے کیوں کہ دعا کو شرف قبولیت بخشنے والا اس کائنات پر محیط ہے۔ حضرت کے اس ارشاد میں کہ "آنکھ اسے طے کر لے" آسمان کے حدِ نظر ہونے کا بھی اشارہ ہو سکتا ہے۔

پوچھا گیا کہ جھوٹ اور سچ میں کتنا فاصلہ ہے فرمایا چار انگلیوں کا (یعنی کان اور آنکھ کا درمیانی فاصلہ) مطلب یہ ہے کہ ہر سُنی سنائی بات پر اس وقت تک اعتماد صحیح نہیں ہے جب تک قابلِ اعتماد ذرائع سے اس کا علم و یقین نہ ہو جائے۔

کعب ابن اشرف نے کہا کہ قرآن مجید میں ہے وجنۃ عرضھا السمٰوٰت والارض "جنت کی وسعت آسمان و زمین کے برابر ہے" تو پھر دوزخ کہاں پر ہے۔ فرمایا:

اذا جاء اللیل این یکون النھار واذا جاء النھار این یکون اللیل ۔	جب رات آتی ہے تو دن کہاں ہوتا ہے اور جب دن آتا ہے تو رات کہاں جاتی ہے ۔

کہا اللہ کے علم میں فرمایا کہ پھر جنت بھی اللہ کے علم میں ہے ۔

حاضر جوابی

حاضر جوابی انسان کی فطری ذہانت کی آئینہ دار ہے اور برجستہ و برمحل جواب سوچ بچار کے بعد دیے جانے والے جواب سے زیادہ مؤثر ثابت ہوتا ہے اگرچہ اس میں مخاطب کی بات کی ایک طرح سے تردید ہوتی ہے مگر جواب کی شگفتگی و برجستگی ناگواری کا احساس نہیں ہونے دیتی اور مخاطب بھی خندہ زیر لب کے ساتھ داد تحسین دیے بغیر نہیں رہتا ۔ حضرت کا ارشاد ہے نعم الناصر الجواب الحاضر ، برجستہ جواب بہترین مددگار ہے ۔

امیر المومنین کی گوناگوں صفات میں ایک حاضر جوابی بھی ہے ۔ آپ خوش طبعی کے موقع پر خوش طبعی کے انداز میں اور طنز کے موقع پر طنزیہ انداز میں ایسا نپا تلا جواب دیتے جو اپنی دلآویزی سے بہار آفریں فضا پیدا کر دیتا یا سننے والوں کی زبانوں پر خاموشی کا پہرہ بٹھا دیتا ۔ ذیل میں حضرت کے چند جوابات درج کیے جاتے ہیں جن سے آپ کے ذہنی استحضار اور طبعی شگفتگی کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔

ایک یہودی عالم نے پیغمبر اسلام کے بعد مسلمانوں کے طرز عمل پر اعتراض کرتے ہوئے حضرت سے کہا کہ :

ما دفنتم نبیکم حتی اختلفتم فیه ۔	تم لوگ اپنے نبی کو دفن بھی نہ کر چکے تھے کہ ان کے بارے میں اختلاف شروع کر دیا ۔

حضرت نے فرمایا :

انما اختلفنا عنه لا فیه ۔	ہم نے ان کے بارے میں اختلاف نہیں کیا بلکہ ان کی نیابت کے سلسلہ میں اختلاف ہوا ۔

پھر فرمایا کہ تمہاری حالت یہ تھی کہ جب تمہیں مصر سے نکالا گیا اور ابھی تمہارے پیر دریا کی تری سے سوکھنے نہ پائے تھے کہ تم بے راہ ہو گئے اور حضرت موسیٰ سے کہنے لگے کہ

اجعل لنا الٰھا کما لھم الھۃ فقال انکم قوم تجھلون ۔	ہمارے لیے بھی ایک ایسا خدا بنا دیجیے جیسے ان لوگوں کے خدا ہیں اس پر موسیٰ نے کہا کہ بے شک تم ایک جاہل قوم ہو ۔

اس یہودی کا مقصد تو یہ تھا کہ مسلمان یہودیوں پر تو یہ اعتراض کرتے ہیں کہ انہوں نے شریعت میں تغیر و تبدل کر کے اختلافات کی بنیاد رکھی مگر مسلمان کب اختلافات سے بچ سکے ان میں تو نبی کے دفن ہونے سے پہلے ہی اختلاف د

ہونے کے اعتبار سے ان امور پر بھی اطلاع رکھتے تھے جو دائرہ محسوسات سے باہر اور پردۂ غیب میں نہاں تھے اور اسی علم سے مستقبل میں واقع ہونے والے امور کا انکشاف کرتے تھے۔ البتہ عام معاملات زندگی میں متعارف طریقوں سے حاصل ہونے والے علم پر عمل پیرا ہوتے تھے۔ اب امیرالمومنین کی ان گنت پیشین گوئیوں میں سے چند پیشین گوئیاں درج کی جاتی ہیں جس سے یہ امر واضح ہو جائے گا کہ آپ مستقبل میں رونما ہونے والے واقعات پر مشاہدات و محسوسات کی طرح نظر رکھتے تھے۔

عبداللہ ابن رزین غافقی نے بیان کیا کہ:

سمعت علیا یقول یا اهل العراق ستقتل منکم سبعة نفر بعذراء مثلهم کمثل اصحاب الاخدود فقتل حجر واصحابه۔

میں نے حضرت علی کو فرماتے سنا کہ اے اہل عراق تم میں سے سات آدمی عنقریب مرج عذراء میں قتل کیے جائیں گے ان کی مثال اصحاب اخدود کی ہوگی چنانچہ حجر اور ان کے اصحاب قتل کیے گئے۔

(البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۵۵)

حجر ابن عدی کندی جو حجر الخیر اور حجر الادبر کے نام سے بھی یاد کیے جاتے ہیں اپنے بھائی ہانی ابن عدی کے ہمراہ مدینہ آئے اور پیغمبر اکرم کی خدمت میں باریاب ہو کر اسلام لائے آپ کا شمار افاضل صحابہ میں ہوتا ہے۔ زہد و تقویٰ میں نمایاں امتیاز رکھتے اور امیرالمومنین کے خاص اصحاب میں محسوب ہوتے تھے۔ جمل وصفین کی جنگوں میں حضرت کے ہمرکاب رہے اور ہر معرکہ میں پوری سرگرمی سے حصہ لیا۔ امیرالمومنین اور ان کی اولاد کی محبت رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھی اور اسی محبت و وابستگی کی بنا پر اموی کارندوں کے مظالم کا نشانہ بنے اور آخر بے جرم و خطا قتل کر دیے گئے۔

اموی عمال کا وتیرہ تھا کہ وہ علانیہ حضرت علی اور ان کی اولاد پر سب و شتم کرتے تھے اور یہی ہدایات انہیں مرکز کی طرف سے دی جاتی تھیں چنانچہ معاویہ نے جب مغیرہ ابن شعبہ کو کوفہ کا حاکم بنا کر بھیجنا چاہا تو اسے بلا کر کہا کہ:

ولست تارکا ایصاءک بخصلة لا تترک شتم علی وذمه والترحم علی عثمان والاستغفار له والعیب لاصحاب علی والاقصاء لهم والاطراء بشیعة عثمان والادناء لهم۔

میں ایک بات تمہیں کہے بغیر نہیں رہ سکتا وہ یہ کہ تم علی پر سب و شتم اور ان کی مذمت اور عثمان کے لیے دعائے رحمت و مغفرت کو اپنا معمول بنانا اور اس کے ساتھ علی کے دوستوں کی خوردہ گیری اور انہیں دور رکھنے اور عثمان کے ہمنواؤں کی مدح سرائی اور انہیں قریب تر کرنے کو کسی صورت میں ترک نہ کرنا۔

(تاریخ کامل ج ۳ ص ۲۳۴)

مغیرہ نے کوفہ پہنچ کر ہر خطبہ میں علی و آلِ علی پر لعن طعن شروع کر دی۔ حجر اپنی عقیدت وارادت کی بنا پر اسے گوارا نہ کر سکتے تھے وہ اس دشنام طرازی کے خلاف احتجاج کرتے اور بھرے اجتماع میں مغیرہ کو ٹوک دیتے مغیرہ، حجر ابن عدی سے مصلحۃً کوئی خاص تعرض تو نہ کرتا مگر اپنی روش سے دستبردار بھی نہ ہوتا۔ کچھ درباری لوگوں نے اسے مشورہ دیا کہ حکومت کی یہ نرم روی حکومت کے وقار کو مجروح کیے دے رہی ہے لہٰذا ان کے خلاف تادیبی کاروائی کی جائے مغیرہ نے کہا کہ میرے بعد جو شخص یہاں کا والی ہو کر آئے گا اگر اس سے بھی ان کا یہی طرزِ عمل رہا تو وہ انہیں قتل کیے بغیر نہیں رہے گا۔ مجھے ضرورت نہیں کہ میں ان کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین کروں۔ معاویہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے اسے امارت کوفہ سے الگ کر دیا اور اس کی جگہ زیاد ابن سمیہ کا تقرر کر دیا۔

زیاد کا تقرر طوفان کا ایک پیش خیمہ تھا اس نے کوفہ میں وارد ہوتے ہی شیعیانِ علی کو ڈرانا دھمکانا اور علی و اولادِ علی کو سب و شتم کا ہدف بنانا شروع کر دیا۔ حجر اسے بھی ملامت کرنے سے نہ چوکتے اور غلط بات پر بے دھڑک ٹوک دیتے چنانچہ ایک مرتبہ زیاد نے خطبۂ جمعہ کو اتنا طول دیا کہ نماز کا وقت تنگ ہو گیا۔ حجر نے اسے نماز کی طرف متوجہ کیا مگر اس نے خطبہ جاری رکھا۔ حجر نے دیکھا کہ نماز کا وقت گزرا جا رہا ہے تو وہ نماز کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے ساتھ اور لوگ بھی کھڑے ہو گئے۔ زیاد نے اس صورتحال سے معاویہ کو آگاہ کیا اور حجر کے بارے میں ان کی رائے طلب کی۔ معاویہ نے جواب دیا کہ انہیں پابند سلاسل کر کے دمشق روانہ کر دو۔ زیاد تو چاہتا ہی تھا کہ ان سے پیچھا چھوٹے۔ فوراً چند آدمی ان کی طلبی کے لیے بھیجے۔ جب یہ آدمی حجر کے ہاں پہنچے اور انہیں زیاد کے پاس چلنے کے لیے کہا تو حجر کے ساتھیوں نے کہا کہ ہم زیاد کے حکم کی کوئی حیثیت و وقعت نہیں سمجھتے۔ حجر کسی صورت میں اس کے ہاں نہیں جائیں گے۔ جب یہ لوگ ناکام پلٹے تو زیاد نے دوبارہ سپاہیوں کو بھیجا جنہوں نے حجر کے ساتھیوں پر لاٹھیاں برسا کر کئی ایک کو زخمی کر دیا۔ حجر نے گرفتار کرنے والوں کی کثرت و قوت دیکھی تو گھر کا رُخ کیا جہاں ان کے اور ساتھی بھی جمع ہو گئے۔ زیاد کے آدمی یہاں بھی پہنچ گئے۔ حجر کے ساتھیوں نے کچھ دیر ان کا مقابلہ کیا مگر زیادہ دیر تک یہ سلسلہ جاری نہ رکھ سکے۔ آخر بچ بچا کر نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ صرف قیس ابن یزید حکومت کی گرفت میں آ گئے۔ حجر نے اپنے ساتھیوں کو یہ کہہ کر کہ تم اس جمعیت کا مقابلہ نہیں کر سکتے رخصت کر دیا اور خود بنی حرب کے محلہ کی طرف چلے گئے اور سلیم ابن یزید کے گھر پناہ لے لی۔ زیاد کے سپاہیوں کو خبر ہوئی تو انہوں نے ادھر کا رُخ کیا۔ سلیم نے انہیں بڑھتے دیکھا تو تلوار سونت کر مقابلہ کے لیے آمادہ ہو گئے۔ حجر نے انہیں روکا اور کہا کہ خدا تمہیں اس حمایت و پاسداری کی جزا دے تم یہ کرو کہ اگر یہاں سے نکل جانے کا کوئی مخفی راستہ ہو تو مجھے بتا دو تا کہ میں ادھر سے نکل جاؤں اور میری وجہ سے تم پر کوئی افتاد نہ پڑے۔ چنانچہ حجر ایک مخفی راستے سے نکلے اور قبیلہ بنی نخع کے ہاں پہنچ کر عبداللہ ابن حارث نخعی کے گھر میں داخل ہوئے اور وہیں ٹھہر گئے مگر زیاد کے سپاہی سُن گن پا کر یہاں بھی پہنچ گئے۔ حجر کو خطرہ منڈلاتا نظر آیا تو وہ رات کے اندھیرے میں قبیلہ بنی ازد کے ہاں پہنچ کر ربیعہ ابن ناجد ازدی کے گھر میں چلے آئے اور سپاہی انہیں ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

زیاد جب بے دست و پا ہو گیا تو اس نے محمد ابن اشعث کو بلا کر حکم دیا کہ جس طرح ہو سکے حجر کو تلاش کرو اگر تم نے

تین دن کے اندر اسے میرے سامنے پیش نہ کیا تو تم اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے حجر کو یہ معلوم ہوا تو انہوں نے محمد ابن اشعث کو پیغام بھجوایا کہ میں خود تمہارے پاس آنے کو تیار ہوں تاکہ تم مجھے زیاد کے سامنے پیش کر سکو مگر اتنا کرو کہ زیاد سے یہ عہد و پیمان لے لو کہ وہ مجھے امان دے اور معاویہ کے ہاں بھجوا دے پھر وہ جانیں اور ان کا کام۔ محمد ابن اشعث کو کچھ ڈھارس ہوئی اور وہ چند آدمیوں کو لے کر زیاد کے پاس آیا اور اسے امان دینے اور معاویہ کے پاس بھجوانے پر رضامند کر لیا۔ جب حجر کو اس امان دہی کی اطلاع دی گئی تو وہ زیاد کے پاس چلے آئے۔ زیاد نے انہیں کڑے تیوروں سے دیکھا اور کہا کہ میرا دل تو یہ چاہتا ہے کہ تمہاری شاہ رگ کاٹ دوں مگر مجھے اپنے عہد کا پاس ہے۔ اس کے بعد انہیں چند دن کے لیے قید خانہ میں رکھا اور پھر ان کے خلاف گواہیوں کا ایک پلندہ جمع کر کے شہاب ابن کثیر اور وائل ابن حجر کی زیر نگرانی انہیں دمشق روانہ کر دیا۔ ان گواہوں میں بیشتر لوگ وہ تھے جو حجر سے دشمنی و عناد رکھتے تھے۔ اور کچھ لوگ وہ تھے جن کے نام خود سے درج کر دیے گئے تھے۔ چنانچہ ان گواہوں میں شریح ابن حانی حارثی کا بھی نام تھا انہیں پتہ چلا تو انہوں نے ایک خط معاویہ کے نام لکھا اور وائل ابن حجر کے ہاتھ معاویہ تک پہنچا دیا۔

خط یہ تھا:

امابعد فانه بلغنی ان زیاد اکتب الیک بشهادتی علی حجرابن عدی و ان شهادتی علی حجر انه ممن یقیم الصلوٰة و یؤتی الزکوٰة و یدیم الحج والعمرة یامر بالمعروف و ینهی عن المنکر حرام الدم والمال فان شئت فاقتله و ان شئت فدعه۔

مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ زیاد نے حجر ابن عدی کے خلاف میری گواہی بھی تحریر کی ہے۔ حجر کے بارے میں میری گواہی یہ ہے کہ وہ نماز گزار، زکوٰۃ کے پابند اور برابر حج و عمرہ بجا لاتے رہتے ہیں وہ اچھی باتوں کا حکم دیتے اور بری باتوں سے روکتے ہیں ان کا خون بہانا اور مال چھیننا حرام ہے اب آگے آپ کی مرضی چاہے اسے قتل کریں چاہے چھوڑ دیں۔

(تاریخ طبری ج ۴ ص ۲۰۳)

جب حجر اور ان کے ساتھی دمشق سے چھ میل کے فاصلے پر مرج عذرا میں پہنچے تو منزل کرنے کے لیے ٹھہر گئے معاویہ کو ان کے گرفتار کر کے لائے جانے کی اطلاع ہو چکی تھی۔ انہوں نے ہدبہ ابن فیاض قضاعی، حصین ابن عبداللہ کلابی اور ابو شریف البدی کو وہاں بھیجا جنہوں نے حجر اور اسکے ساتھیوں سے کہا کہ امیر معاویہ کے پاس ایسی ناقابلِ تردید شہادتیں پہنچی ہیں جن سے حکومت کے خلاف تمہاری بغاوت و سرکشی ثابت ہوتی ہے اور تمہارے قتل کے جواز میں کوئی شبہ نہیں رہتا لیکن

انا قد امرنا ان نعرض علیکم البراءة من علی و اللعن له فان فعلتم ترکناکم

ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم تم سے علی سے بیزاری اور ان پر لعنت کا مطالبہ کریں۔ اگر تم ایسا کرو تو

وان ابیتم قتلناکم۔ ہم تمہیں چھوڑ دیں اور انکار کرو تو تمہیں قتل کر دیں۔

(تاریخ طبری ج ۴ ص ۲۰۵)

حجر اور ان کے ساتھیوں نے کہا کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم اپنی جانوں کے بچاؤ کے لیے امیرالمؤمنین کے بارے میں کوئی ناسزا لفظ کہیں یا ان سے اظہار بیزاری کریں۔ اب انہوں نے موت کو سر پر منڈلاتے دیکھ کر مصلے بچھا دیے اور تمام رات نمازوں میں گزار دی۔ جب صبح ہوئی تو معاویہ کے آدمیوں نے تلواریں نیاموں سے کھینچ لیں۔ حجر نے کہا کہ مجھے وضو اور دو رکعت نماز پڑھنے کی مہلت دی جائے۔ جب مہلت ملی تو انہوں نے وضو کیا اور دو رکعت نماز پڑھی اور کہا کہ خدا کی قسم میں نے اپنی زندگی میں اتنی مختصر نماز کبھی نہیں پڑھی۔ میں چاہتا تھا کہ حسب معمول نماز کو طول دوں مگر اس خیال سے ایسا نہیں کیا کہ تم یہ نہ سمجھو کہ میں موت سے ڈر گیا ہوں۔ میری وصیت یہ ہے کہ مجھے ہتھکڑیوں اور بیڑیوں سمیت خاک و خون میں غلطاں دفن کیا جائے تاکہ میں کل اللہ کے روبرو اسی حالت میں معاویہ سے اپنے خون کا محاسبہ کروں۔

ہدیہ ابن فیاض قضاعی نے آپ کی گردن پر تلوار ماری کچھ دیر لاشہ تڑپا اور روح طیب جسد عنصری سے پرواز کر گئی۔ آپ کے ساتھیوں میں سے شریک ابن شداد حضرمی، صیفی ابن فسیل شیبانی، قبیصہ ابن ضبیعہ عبسی، محرز ابن شہاب منقری اور کدام ابن حیان عنزی بھی شہید کیے گئے اور عبدالرحمن ابن حسان عنزی کو قس ناطف میں زندہ گاڑ دیا گیا اور اس طرح امیرالمؤمنین نے جو پیشین گوئی فرمائی تھی ۵۱ھ میں معاویہ کے دور حکومت میں پوری ہوئی۔

حجر اور ان کے اصحاب کے بے گناہ قتل نے بہت سی آنکھوں کو اشکبار کیا اور خود معاویہ کو بھی اس قتل کی سنگینی اور پاداش عمل کا احساس تھا چنانچہ جب ان کا وقت آخر آیا تو ان کی زبان پر یہ الفاظ جاری ہوئے۔

یومی منک یا حجر طویل۔ حجر تمہارے قتل سے میرا یوم حساب طویل ہوگا۔

(تاریخ کامل ج ۳ ص ۲۴۳)

ابو سالم میثم ابن یحییٰ تمار کے بارے میں فرمایا:

انک توخذ بعدی وتصلب وتطعن بحربة فاذا کان الیوم الثالث ابتدر منخراک وفمک دما فتخضب لحیتک فانتظر ذلک الخضاب وتصلب علی باب دار عمرو ابن حریث۔

تم میرے بعد گرفتار ہو گے سولی پر لٹکائے جاؤ گے اور ایک بھالے سے تمہیں چھیدا جائے گا جب تیسرا دن ہوگا تو تمہارے دونوں نتھنوں سے اور منہ سے خون جاری ہو جائے گا جس سے تمہاری ڈاڑھی رنگین ہو جائے گی لہٰذا اس خضاب کے منتظر رہو۔ تمہیں عمرو ابن حریث کے گھر کے دروازے پر سولی دی جائے گی۔

(اعلام الوریٰ)

میثم کوفہ کے ایک تجارت پیشہ خاندان کے فرد تھے اور کھجوروں کے کاروبار کی وجہ سے تمار (خرما فروش) کہلاتے تھے آپ امیر المؤمنین کے ان تلامذہ واصحاب میں شمار ہوتے ہیں جو اسرار امامت کے امین تنزیل و تاویل قرآن کے عالم اور معارفِ دینی کے خزینہ دار تھے۔ ابن ابی الحدید نے تحریر کیا ہے:

کان میثم قد اطلعہ علی علیہ السلام علی علم کثیر واسرار خفیۃ من اسرار الوصیۃ	علی علیہ السلام نے میثم کو علوم کثیرہ اور وصیت کے مخفی اسرار پر مطلع کیا تھا۔

(شرح ابن ابی الحدید ج ۱ ص ۲)

جب میثم نے امیر المؤمنین سے اپنے بارے میں شہادت کی خبر سنی تو کہا یا امیر المؤمنین مجھے کس جرم کی پاداش میں سولی پر لٹکایا جائے گا۔ فرمایا کہ تم سے مطالبہ کیا جائے گا کہ اگر جان بخشی چاہتے ہو تو مجھ سے اظہار بیزاری کرو کہا کہ میں ہر مصیبت سہہ لوں گا اور ہر ظلم و اذیت برداشت کر لوں گا مگر آپ سے اظہار بیزاری نہیں کرونگا۔

اگر سنگ جفا ریزد و گر تیر بلا بارد
دل از کویت نخواہم کند تا جاں در بدن دارم۔

جب ابن زیاد کے دور میں شیعان علی کا استیصال کیا جانے لگا تو جناب میثم کی تلاش شروع ہوئی اور ان کے میر محلہ کو حکم دیا گیا کہ وہ انہیں گرفتار کر کے لائے۔ میر محلہ کو معلوم ہوا کہ میثم حج کے لیے مکہ جا چکے ہیں۔ اس نے ابن زیاد سے کہا کہ ان کی واپسی تک مجھے مہلت دی جائے جب وہ آئیں گے تو انہیں پیش کر دیا جائے گا۔ جب میثم حج سے فارغ ہو کر واپس آئے تو انہیں ابن زیاد کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے پوچھا کیا تم میثم ہو کہا ہاں میثم ہوں۔ کہا کہ تم ابو تراب سے اظہار بیزاری کرو۔ کہا کون ابو تراب کہا علی کہا کہ اگر میں ان سے اپنی نفرت و بیزاری کا اعلان نہ کروں تو پھر کیا ہوگا؟ کہا کہ تمہیں قتل کر دیا جائے گا کہا کہ میرے مولیٰ و آقا مجھے خبر دے گئے تھے کہ تمہیں عمرو ابن حریث کے گھر کے سامنے سولی دے دی جائے گی۔ میں اس ساعت کا منتظر ہوں چنانچہ انہیں کچھ دن قید میں رکھ کر عمرو ابن حریث کے مکان کے سامنے سولی پر لٹکا دیا گیا انہوں نے سولی پر سے کہنا شروع کیا کہ اے لوگو تم میں سے جو پیش آئند حوادث کے بارے میں امیر المؤمنین کی احادیث سننا چاہے وہ آئے۔ ابن زیاد کو معلوم ہوا تو اس نے حکم دیا کہ ان کے منہ پر لگام چڑھا دی جائے چنانچہ لگام چڑھا دی گئی اور وہ بولنے سے مجبور ہو گئے۔ جب سولی پر لٹکے تین دن گزر گئے تو ان کے منہ اور نتھنوں سے خون جاری ہو گیا ڈاڑھی اور چہرہ خون سے رنگین ہو گیا اور اسی دن غروب آفتاب سے پہلے ان کی روح ملاء اعلیٰ کی طرف پرواز کر گئی۔ یہ واقعہ سید الشہداء امام حسین کے وارد عراق ہونے سے دس دن پہلے کا ہے۔

رشید ہجری سے فرمایا:

کیف صبرک اذا ارسل الیک دعی بنی امیۃ فقطع یدیک ورجلیک	اس وقت تمہارے صبر کی کیا حالت ہوگی جب بنی امیہ سے ملحق کیا ہوا ایک شخص تمہیں بلوا بھیجے گا اور

ولسانک ۔ تمہارے ہاتھ پیر اور زبان کاٹے گا۔

(امالی شیخ)

رشید نے سنا تو کہا کہ اس کا ثمرہ تو پھر جنت ہی ہے فرمایا ہاں۔

انت معی فی الدنیا و الاخرۃ — تم دنیا میں بھی میرے ساتھ رہے اور آخرت میں بھی میرے ساتھ ہوگے۔

(رجال کشی)

آخر اس پیشین گوئی کے پورا ہونے کا وقت آیا اور ابن زیاد نے انہیں بلا کر کہا کہ تم علی سے اپنی بیزاری کا اعلان کرو انہوں نے کہا کہ میرے آقا مجھے یہ خبر دے گئے تھے کہ مجھ سے اظہار بیزاری کے لیے کہا جائے گا اور میرے انکار پر میرے ہاتھ پیر اور زبان کاٹ دی جائے گی۔ ابن زیاد نے کہا کہ میں ان کی بات کو سچا ثابت نہیں ہونے دوں گا۔ تمہارے ہاتھ پیر تو کاٹے جائیں گے مگر زبان نہیں کاٹی جائے گی۔ چنانچہ ان کے ہاتھ اور پیر کاٹ دیے گئے۔ جب انہیں اٹھا کر گھر میں لایا گیا تو ان کی بیٹی قنوار بنت رشید نے پوچھا کہ بابا آپ درد تو شدت سے محسوس کرتے ہوں گے کہا کہ بس اتنا کہ جیسے کوئی ہجوم میں گھر کر رہ گیا ہو پھر کہا کہ کاغذ قلم لاؤ میں تمہیں پیش آئند حوادث لکھوا دوں۔ ابن زیاد کو اس کی خبر دی گئی تو اس نے حکم دیا کہ ان کی زبان کاٹ دی جائے چنانچہ زبان بھی کاٹ دی گئی اور وہ اسی رات شہادت کی منزل پر فائز ہو کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔

ابو العالیہ کہتے ہیں کہ مزرع ابن عبداللہ نے بیان کیا کہ انہوں نے حضرت علی ابن ابی طالب کو یہ کہتے ہوئے سنا:

لیؤخذن رجل فیقتلن و لیصلبن — ایک شخص گرفتار ہوگا اور اس مسجد کے کنگروں میں سے

بین شرفتین من شرف ھذا المسجد — دو کنگروں کے درمیان اسے سولی پہ آویزاں کیا جائے گا۔

(بحار الانوار)

ابو العالیہ کہتے ہیں کہ میں نے ان سے کہا کہ اب تو آپ غیب کی خبریں دینے لگے کہا کہ میں نے اسے امیر المؤمنین ایسے عظیم راست گو سے سنا ہے۔ ابو العالیہ کہتے ہیں کہ ابھی ایک ہفتہ نہ گزرا تھا کہ مزرع گرفتار کر لیے گئے اور قتل کے بعد مسجد کے دو کنگروں کے درمیان سولی پر آویزاں کیے گئے۔

جویریہ ابن مسہر عبدی کے بارے میں فرمایا:

لیقتلنک العتل الزنیم و لیقطعن — تمہیں ایک تند خو اور بدذات قتل کرے گا اس طرح کہ

یدک و رجلک ثم انہ لیصلبنک — پہلے تمہارے ہاتھ پیر کاٹے گا پھر تمہیں سولی پر لٹکائے گا۔

(تنقیح المقال)

جویریہ امیر المؤمنین کے ثقہ و معتمد صحابی تھے حضرت انہیں دیکھتے تو محبت و شفقت کا اظہار فرماتے اور سفر میں ہم رکاب رکھتے تھے۔ جب معاویہ کے دور اقتدار میں دوستداران آل محمد پر مظالم توڑے جانے لگے اور شیعان علی میں سے کسی کو شہر بدر اور کسی کو قتل کیا جانے لگا تو زیاد ابن سمیہ نے جویریہ کے ہاتھ پیر کاٹے اور پھر ایک درخت

کے تنے پر انہیں لٹکا دیا۔

عمرو ابن الحمق الخزاعی سے فرمایا:

راسک اول راس یشھر فی الاسلام من بلد الی بلد۔

اسلام میں تمہارا سر پہلا سر ہوگا جو ایک شہر سے دوسرے شہر میں پھرایا جائیگا۔

(تنقیح المقال)

عمرو ابن حمق پیغمبر اکرم کے بلند مرتبت صحابی اور حافظ احادیث و آثار تھے ان کا شمار امیر المؤمنین کے مخلص اور جانباز دوستوں میں ہوتا ہے۔ جنگ جمل و صفین اور نہروان میں حضرت کے ہمرکاب رہ کر داد شجاعت دی۔ حضرت فرمایا کرتے تھے:

لیت ان فی شیعتی مائۃ مثلک۔

کاش میرے شیعوں میں تم ایسے سو ہوتے۔

(تنقیح المقال)

عمرو کوفہ میں سکونت پذیر تھے جب زیاد ابن سمیہ نے حجر ابن عدی اور ان کے ساتھیوں کی گرفتاری کا حکم دیا تو آپ حجر کی طرف سے دفاع کرتے رہے اور اس پکڑ دھکڑ میں بکر ابن عبید کی لاٹھی سے زخمی ہو گئے۔ ابوسفیان ابن عویمر اور عجلان ابن ربیعہ انہیں عبد اللہ ابن مالک کے گھر میں اٹھا لائے۔ آپ چند دن وہاں رہے پھر موصل چلے گئے جہاں گرفتار کر کے حاکم موصل عبد الرحمن ثقفی کے سامنے پیش کیے گئے اس نے انہیں پہچان لیا اور معاویہ سے ان کے بارے میں رائے طلب کی معاویہ نے لکھا کہ عمرو عثمان کے قاتلوں میں سے ہے لہٰذا اس پر اتنے وار کیے جائیں جتنے اس نے عثمان پر کیے تھے چنانچہ ان پر نو وار کیے گئے حالاں کہ وہ پہلے یا دوسرے وار میں دم توڑ چکے تھے۔ اس کے بعد حاکم موصل نے ان کا سر قطع کیا اور زیاد کے پاس بھجوا دیا زیاد نے وہ سر معاویہ کے پاس بھیج دیا اور اس طرح ان کا سر موصل سے کوفہ اور کوفہ سے دمشق تک پھرایا گیا۔ ابن قتیبہ نے تحریر کیا ہے:

اول راس حمل من بلد الی بلد راس عمرو ابن الحمق الخزاعی۔

پہلا سر جو ایک شہر سے دوسرے شہر میں پھرایا گیا وہ عمرو ابن حمق خزاعی کا سر تھا۔

(المعارف ص ۲۴۱)

قنبر مصری کہتے ہیں کہ:

لقد اخبرنی امیر المؤمنین ان منیتی تکون ذبحا ظلما بغیر حق۔

مجھے امیر المومنین نے خبر دی تھی کہ میری موت اس طرح ہوگی کہ میں تیغ جفا سے ناحق ذبح کیا جاؤں گا۔

(ارشاد شیخ مفید)

قنبر قبیلۂ مضر سے تعلق رکھتے تھے۔ امیر المؤمنین کے جاں نثار و وفادار غلام تھے۔ ہمہ وقت حاضر خدمت رہتے اور آپ سے والہانہ محبت رکھتے تھے اور حضرت بھی انہیں اولاد کی طرح سمجھتے اور اولاد کا سا برتاؤ کرتے تھے۔ اس وابستگی کے جرم میں گرفتار کر کے حجاج ثقفی کے سامنے پیش کیے گئے اس نے دیکھا تو کہا کہ تم علی کے غلام قنبر ہو کہا کہ

ہاں میں علی کا غلام ہوں اور وہ میرے ولی نعمت تھے کہا کہ تم ان کے دین سے علیحدگی اختیار کرو کہا کوئی ایسا دین بتاؤ جو ان کے دین سے بہتر ہو کہا کہ میں بہرحال تمہیں قتل کروں گا کہا کہ میں شہادت کے درجہ پر فائز ہو کر سعادت ابدی حاصل کروں گا اور تم شقی و بدبخت قرار پاؤ گے کہا کہ یہ بتاؤ کہ تم کس طرح قتل ہونا پسند کرو گے کہا کہ جس طرح تم چاہو مجھے قتل کرو اور یاد رکھو کہ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے چنانچہ ان کا گلا کاٹ کر ذبح کر دیا گیا۔

جب امیرالمؤمنین صفین کی طرف جاتے ہوئے سرزمین کربلا سے گزرے تو حادثۂ فاجعہ کربلا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

ههنا مناخ ركابهم وههنا	اس سرزمین پر آل محمد کے جوانوں کو قتل کیا جائے گا
موضع رحالهم وههنا مهراق	جن پر آسمان بھی روئے گا اور زمین بھی۔ یہ جگہ ان کی
دمائهم فتية من آل محمد يقتلون	سواریوں کی ہے اور یہ ان کے ساز و سامان کی اور
بهذه العرصة تبكي عليهم السماء والارض	یہ مقام وہ ہے جہاں ان کا خون بہے گا۔

(صواعق محرقہ ص ۱۹۳)

حادثۂ کربلا اپنی نوعیت کے اعتبار سے تاریخ عالم کا منفرد واقعہ ہے جو ۶۱ھ کے ماہ محرم کے پہلے عشرہ میں رونما ہوا اور ہر سال ان دنوں میں اس معرکۂ حق و باطل کی یاد تازہ کی جاتی ہے جو فرزند رسول حسین نے اپنی اور اپنے اعزہ و رفقاء کی قربانی سے سر کیا۔ ایک طرف بیعت پر اصرار تھا اور دوسری طرف بیعت سے انکار۔ حسین اور ان کے ہمراہیوں نے دشمن کی کثرت و قوت کو نظر انداز کر کے دل بادل فوجوں کے مقابلہ میں بیعت سے انکار کر دیا اور آخر دم تک اس انکار پر قائم رہے اور دنیا سے اپنی خودداری، استقامت اور اصول پرستی کا لوہا منوا لیا۔

امیرالمؤمنین کی پیشین گوئی میں جن جوانان آل محمد کی شہادت کا تذکرہ ہے تاریخ ان کی تعداد اٹھارہ بتاتی ہے۔ ان میں چھ امیرالمؤمنین کے فرزند تھے سید الشہداء امام حسین، ابوالفضل العباس، عبداللہ، جعفر، عثمان اور محمد الاصغر، اور امام حسن کے تین فرزند قاسم، عبداللہ اور ابوبکر، اور امام حسینؑ کے دو بیٹے تھے علی اکبر اور علی اصغر، اور عقیل کے دو بیٹے تھے عبدالرحمٰن اور جعفر اور عبداللہ ابن جعفر کے دو فرزند تھے محمد اور عون اور مسلم ابن عقیل کے دو بیٹے تھے عبداللہ اور محمد اور ابوسعید ابن عقیل کے ایک فرزند تھے محمد، ان کے علاوہ گنے چنے چند اصحاب تھے جنہوں نے خون آشام تلواروں کے سامنے گردنیں خم کر دیں مگر طاغوتی طاقت کے آگے سر تسلیم خم کرنا گوارا نہ کیا۔

اصبغ ابن نباتہ کہتے ہیں کہ سعد ابن ابی وقاص سے فرمایا:

ان في بيتك لسخلا يقتل الحسين ابني۔	تمہارے گھر میں ایک بچہ ہے جو میرے فرزند حسین کو قتل کرے گا۔

یہ بچہ عمر ابن سعد تھا جو ابن زیاد کے حکم سے چار ہزار کے لشکر کے ساتھ کربلا آیا اور امام حسین اور ان کے رفقاء کے قتل سے اپنے جذبۂ خون آشامی کی تسکین کی۔

سوید ابن غفلہ کہتے ہیں کہ ایک شخص حضرت کے پاس آیا اور کہا کہ خالد ابن عرفطہ مر گیا ہے آپ اس کے لیے دُعا فرمائیں۔ حضرت نے فرمایا:

انه لم یمت ولا یموت حتی یقود جیش ضلالة صاحب لوائه حبیب ابن جماز۔

وہ نہیں مرا اور اس وقت تک نہیں مرے گا جب تک وہ ایک ضلالت و گمراہی کے لشکر کی قیادت نہیں کرتا اس کے لشکر کا جھنڈا اٹھانے والا حبیب ابن جماز ہو گا۔

(ارشاد)

مجمع میں سے ایک شخص کھڑا ہوا اور کہا یا امیرالمؤمنین میں آپ کا دوست اور فرمانبردار ہوں پوچھا کون ہو کہا میں حبیب ابن جماز ہوں۔ فرمایا میں تمہیں متنبہ کیے دیتا ہوں کہ تم وہ جھنڈا نہ اُٹھانا مگر تم اُٹھاؤ گے اور باب الفیل کی طرف سے مسجد میں داخل ہو گے۔ چنانچہ جب ابن زیاد نے عمر ابن سعد کی قیادت میں کربلا کی جانب لشکر روانہ کیا تو خالد ابن عرفطہ مقدمۃ الجیش کا سردار اور حبیب ابن جماز حامل لواء تھا۔

اسمٰعیل ابن زیاد کہتے ہیں کہ ایک دن امیرالمؤمنین نے براء ابن عازب سے فرمایا:

یا براء یقتل ابنی الحسین و انت حی لا تنصره۔

اے براء میرا فرزند حسین قتل کیا جائے گا اور تم زندہ ہو گے اور ان کی مدد نہیں کرو گے۔

(ارشاد)

چنانچہ براء ابن عازب بڑی حسرت و ندامت کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ امیرالمؤمنین نے سچ فرمایا تھا حسین شہید کر دیے گئے اور میں ان کی مدد کو نہ پہنچ سکا۔

امام علی ابن موسیٰ الرضا کے بارے میں فرمایا:

سیقتل رجل من ولدی بارض خراسان بالسم ظلما اسمه اسمی و اسم ابیه موسی ابن عمران۔

میری اولاد میں سے ایک فرد سرزمین خراسان میں زہر سے ظلماً مارا جائے گا اس کا نام میرے نام پر اور اس کے باپ کا نام موسیٰ ابن عمران کے نام پر ہو گا۔

(امالی صدوق)

علوی حکومت کے قیام کی آڑ میں اموی حکومت کا تختہ اُلٹا گیا تو علویوں کے بجائے عباسیوں نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ اس کا طبعی نتیجہ یہی ہونا تھا کہ علویوں کو یہ اقتدار کھٹکتا اور وہ حکومت سے متصادم ہوئے چنانچہ عباسیوں کے خلاف بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جب مامون رشید برسر اقتدار آیا تو علویوں کی سرگرمیوں میں کمی واقع نہ ہوئی اس نے علویوں کے جوش و خروش کو دبانے کے لیے امام علی الرضا علیہ السلام کو اپنے دارالخلافہ مرو میں آنے کی دعوت دی اور انہیں لانے کے لیے اپنے ماموں رجاء ابن ضحاک کو مدینہ بھیجا۔ امام مدینہ چھوڑنا نہ چاہتے تھے

مگر جب مجبور کر دیے گئے تو نیشاپور سے ہوتے ہوئے مرو میں تشریف فرما ہوئے۔ مامون نے بڑی سرگرمی سے استقبال کیا اور آپ کو ولیعہد سلطنت قرار دینے کا اظہار کیا۔ آپ نے اس سے بچنے کی پوری کوشش کی اور انکار پر انکار کرتے رہے۔ آخر اس کے انتہائی اصرار سے مجبور ہو کر چند شرائط کے ساتھ اسے منظور فرما لیا۔ آپ کے اعلان ولیعہدی سے علوی تو مطمئن ہو گئے مگر بنی عباس کو خلافت اپنے خاندان سے باہر جاتی نظر آئی تو انہوں نے بغداد میں ہنگامہ کھڑا کر دیا اور مامون کو معزول قرار دے کر ابراہیم ابن مہدی عباسی کی بیعت کر لی۔ اب مامون کے لیے دو طرفہ مصیبت تھی۔ اگر اس اعلان ولیعہدی کو منسوخ کرتا ہے تو علویوں کی بغاوت کے ابھرنے کا اندیشہ ہے اور اگر برقرار رکھتا ہے تو عباسیوں کی شورش پر قابو پانا اس کے اختیار سے باہر ہے۔ اس نے یہ تدبیر سوچی کہ کسی طرح امام رضا کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے اور اسے طبعی موت قرار دے کر علویوں کو خاموش رکھا جائے اور عباسیوں کو ہمنوا بنا لیا جائے۔ چنانچہ وہ بغداد جاتے ہوئے طوس کے قصبہ سناآباد میں اترا اور امام کو پیغام بھیجا کہ میں ملاقات کرنا چاہتا ہوں آپ آئیں یا مجھے آنے کی اجازت دیں۔ امام خود اس کے ہاں جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ جب اس کے ہاں پہنچے تو اس نے انگور جن میں زہر کی آمیزش تھی آپ کے سامنے پیش کیے آپ نے کھانے سے انکار کیا مگر اس نے اصرار کیا تو آپ نے چند دانے کھائے جن کے کھاتے ہی زہر کا احساس ہوا۔ آپ نے ہاتھ کھینچ لیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ مامون نے پوچھا کہ آپ کہاں جا رہے ہیں فرمایا جہاں تم بھیجنا چاہتے تھے۔ جب اپنی قیامگاہ پر آئے تو حالت دگرگوں ہو گئی اور تین دن موت و حیات کی کشمکش میں رہنے کے بعد ۱۷ صفر ۲۰۲ھ کو پچپن برس کی عمر میں انتقال فرما گئے اور قریہ سناآباد میں جو اب مشہد الرضا کے نام سے موسوم ہے دفن کیے گئے۔

دعبل خزاعی نے آپ کے مرثیہ میں کہا ہے:

یا أرض طوس سقاك الله رحمته ‏‏ ما ذا ضمنت من الخيرات يا طوس

اے سرزمین طوس خدا تجھے اپنی رحمت کے چھینٹوں سے سیراب کرے تو اپنے دامن میں نیکیوں کا خزانہ سمیٹے ہوئے ہے۔

طابت بقاعك في الدنيا وطاب بها ‏‏ شخص ثوى بسناآباد مرسوس

دنیا جہان میں تیری سرزمین کا کونہ کونہ پاک و صاف ہے اور وہ ہستی بھی طیب و طاہر ہے جو سناآباد میں منزل گزیں اور مدفون ہے۔

معاویہ ابن ابی سفیان کے بارے میں فرمایا:

الا وانه سيأمركم بسبي والبراءة مني۔ ‏ وہ تمہیں حکم دے گا کہ مجھے گالیاں دو اور مجھ سے بیزاری کا اظہار کرو۔ (نہج البلاغہ)

چنانچہ معاویہ نے اپنے عمال سلطنت کو مامور کیا کہ وہ جمعہ و عیدین اور دوسرے اجتماعات میں حضرت پر علانیہ سب و شتم کریں۔ حالانکہ امام حسن نے شرائط صلح میں ایک شرط یہ بھی رکھی تھی کہ کم از کم آپ کے روبرو حضرت پر لعن طعن نہ کی

جائے مگر اس کا پاس نہیں کیا گیا۔ چنانچہ ابن اثیر تحریر کرتے ہیں کہ شرائط صلح میں ایک شرط یہ تھی کہ :

ان لا یشتم علیا فلم یجبہ الی الکف عن شتم علی فطلب ان لا یشتم وھو یسمع فاجابہ الی ذلک ثم لم یف لہ بہ ایضا۔

وہ حضرت کو گالی گلوچ نہ دے مگر وہ علی پر سب وشتم سے دست برداری پر آمادہ نہ ہوا پھر امام حسن نے یہ خواہش کی کہ ان کے سامنے گالیاں نہ دی جائیں۔ معاویہ نے اس کا وعدہ کیا مگر اسے پورا نہ کیا۔

(تاریخ کامل ج ۳ ص ۲۰۳)

مروان ابن حکم کے بارے میں فرمایا :

اما ان لہ امرۃ کلعقۃ الکلب انفہ وھو ابو الاکبش الاربعۃ و ستلقی الامۃ منہ ومن ولدہ یوما احمر۔

دیکھو یہ بھی اتنی مدت کہ کتا اپنی ناک چاٹنے سے فارغ ہو حکومت کرے گا اور اس کے چار بیٹے بھی حکمران ہوں گے اور امت اس کے اور اس کے بیٹوں کے ہاتھوں سختیوں کے دن دیکھے گی۔

(نہج البلاغہ)

چنانچہ معاویہ ابن یزید کے مرنے کے بعد اہل شام نے جابیہ دمشق میں اس کی بیعت کی اور نو مہینے برسر اقتدار رہنے کے بعد مر گیا اور اس کے بیٹوں میں سے عبدالملک خلیفہ ہوا اور عبدالعزیز مصر کا بشر کوفہ و بصرہ کا اور محمد جزیرہ کا والی قرار پایا اور اسی نے ابراہیم ابن مالک اشتر اور مصعب ابن زبیر کو دیر جاثلیق میں قتل کیا۔

عبداللہ ابن زبیر کے بارے میں فرمایا :

خب ضب یروم امرا ولا یدرکہ ینصب حبالۃ للدین لاصطیاد الدنیا وھو بعد مصلوب قریش۔

(بحار الانوار)

فریب کار اور جاہ طلب، حکومت کے لیے تگ و دو کرے گا مگر اسے حاصل نہ کر سکے گا دنیا کا شکار کرنے کے لیے دین کا جال بچھائے گا اور آخر قریش کے ہاتھوں سولی پر لٹکایا جائے گا۔

عبداللہ ابن زبیر یزید کی بیعت سے انکار کرنے کے بعد مکہ میں آکر مقیم ہو گیا اور اقتدار کے لیے راہ ہموار کرنا شروع کر دی۔ جب یزید مر گیا تو اس نے کچھ لوگوں کے تعاون سے حجاز میں اپنی حکومت کا پرچم بلند کر دیا اور حجاز کے علاوہ یمن، عراق اور خراسان کے باشندوں نے بھی اس کی بیعت کر لی لیکن بنی امیہ اور بنی ہاشم اس کی بیعت کے لیے آمادہ نہ ہوئے جس پر اس نے بنی امیہ کے سرکردہ افراد کو جن میں مروان اور عبدالملک بھی شامل تھے مدینہ سے باہر نکال دیا اور محمد ابن حنفیہ، عبداللہ ابن عباس اور بنی ہاشم کے چوبیس نمایاں افراد کو قید خانہ میں بند کر دیا اور انہیں یہ دھمکی دی کہ اگر بیعت نہیں کریں گے تو انہیں قتل کر دیا جائے گا۔ عبداللہ ابن زبیر بنی ہاشم کو اپنا حریف تصور کرتا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ ان سے بیعت لیے بغیر اقتدار کی بنیادیں مستحکم نہیں ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ اس نے بیعت لینے میں

کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا اور سارے جتن کر ڈالے مگر بیعت کے حصول میں کامیاب نہ ہو سکا۔ آخر سختی و تشدد پر اتر آیا اور ان پر مظالم توڑنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

ابن واضح یعقوبی نے تحریر کیا ہے:

تحامل عبد الله ابن الزبیر علی بنی هاشم تحاملا شدیدا و اظهر لهم العداوة والبغضاء حتی بلغ ذلك منه ان ترك الصلواة علی محمد فی خطبته

عبداللہ ابن زبیر نے بنی ہاشم پر سخت مظالم توڑے اور علانیہ ان سے دشمنی کا مظاہرہ کیا۔ اس کی دشمنی کی حد یہ تھی کہ اس نے خطبہ میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ پر درود ترک کر دیا۔

(تاریخ یعقوبی ج ۳ ص ۸)

جب بنی ہاشم کو قید خانہ میں سختیاں جھیلتے کچھ عرصہ گذر گیا تو مختار ابن عبید نے ان کی مدد کے لیے چار ہزار سواروں کا ایک لشکر بھیجا جس نے قید خانہ کا دروازہ توڑ کر انہیں باہر نکالا۔ بنی ہاشم نے قید سے آزاد ہو کر ابن زبیر کے ارادوں کو ناکام بنانے کا تہیہ کر لیا۔ ادھر مروان نے مدینہ سے نکل کر شام کا رخ کیا اور شام کے حدود میں پہنچ کر اپنی بیعت لینا شروع کر دی اور ابن زبیر کو ایک لمحہ کے لیے بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ مروان مر گیا تو اس کے بیٹے عبدالملک نے چالیس ہزار شامیوں کو حجاج ابن یوسف کی سرکردگی میں روانہ کیا جنہوں نے مکہ کو محاصرہ میں لے لیا اور آمد و رفت کے تمام راستے بند کر دیے۔

ابن زبیر نے اپنے لشکر کی صف بندی کی اور مقابلہ کے لیے میدان میں اتر آیا۔ جب اس کے ساتھیوں نے دشمن کی کثرت و قوت دیکھی تو کچھ میدان سے منہ موڑ کر گھروں میں چھپ کر بیٹھ گئے اور کچھ لوگوں نے حجاج کے دامن میں پناہ لے لی۔ ابن زبیر نے اپنے باقی ماندہ لشکر کی ہمت بندھائی اور اسے جنگ میں جھونک دیا۔ دونوں فریق میں خون ریز جنگ ہوئی۔ میدان لاشوں سے پٹ گیا ابن زبیر قتل کر دیا گیا اور اس کی بچی کھچی فوج تتر بتر ہو گئی۔ عبدالملک کے آدمیوں نے اس کی لاش کو مقام تنعیم میں سولی پر لٹکا دیا جو کئی دنوں تک لٹکی رہی ایک دن عبداللہ ابن عمر ادھر سے گذرے تو انہوں نے لاش سے مخاطب ہو کر کہا:

یرحمك الله یا ابا خبیب لو لا ثلث کن فیک لقلت انت انت الحادک فی الحرم و مسارعتک الی الفتنة و بخل بکفک

اے ابا خبیب اللہ تم پر رحم کرے اگر تم میں تین باتیں نہ ہوتیں تو میں یہ کہتا کہ تم تم ہی ہو ایک یہ کہ تم نے حرم میں الحاد و بے دینی کا ارتکاب کیا، دوسرے فتنہ کی طرف تیزی سے بڑھے اور تیسرے کنجوسی کرتے رہے۔

(تاریخ یعقوبی ج ۳ ص ۱۴)

ایک شخص نے آپ پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے مال کی تقسیم میں عدل و مساوات کا اصول پیش نظر نہیں رکھا فرمایا کہ اگر تم جھوٹ کہتے ہو تو اللہ اس وقت تک تمہیں موت نہ دے جب تک بنی ثقیف کا ایک شخص تمہیں اپنی گرفت میں نہ لے لے لوگوں نے پوچھا کہ وہ کون ہے۔ فرمایا:

کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا اور سارے جتن کر ڈالے مگر بیعت کے حصول میں کامیاب نہ ہو سکا۔ آخر سختی و تشدد پر اتر آیا اور ان پر مظالم توڑنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔

ابن واضح یعقوبی نے تحریر کیا ہے:

تحامل عبد الله ابن الزبير على بنى هاشم تحاملا شديدا و اظهر لهم العداوة و البغضاء حتى بلغ ذلك منه ان ترك الصلواة على محمد فى خطبته

عبداللہ ابن زبیر نے بنی ہاشم پر سخت مظالم توڑے اور علانیہ ان سے دشمنی کا مظاہرہ کیا۔ اس کی دشمنی کی حد یہ تھی کہ اس نے خطبہ میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ پر درود ترک کر دیا۔

(تاریخ یعقوبی ج ۳ ص ۸)

جب بنی ہاشم کو قید خانہ میں سختیاں جھیلتے کچھ عرصہ گذر گیا تو مختار ابن عبید نے ان کی مدد کے لیے چار ہزار سواروں کا ایک لشکر بھیجا جس نے قید خانہ کا دروازہ توڑ کر انہیں باہر نکالا۔ بنی ہاشم نے قید سے آزاد ہو کر ابن زبیر کے ارادوں کو ناکام بنانے کا تہیہ کر لیا۔ ادھر مروان نے مدینہ سے نکل کر شام کا رُخ کیا اور شام کے حدود میں پہنچ کر اپنی بیعت لینا شروع کر دی اور ابن زبیر کو ایک لمحہ کے لیے بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ مروان مر گیا تو اس کے بیٹے عبدالملک نے چالیس ہزار شامیوں کو حجاج ابن یوسف کی سرکردگی میں روانہ کیا جنھوں نے مکہ کو محاصرہ میں لے لیا اور آمد و رفت کے تمام راستے بند کر دیے۔

ابن زبیر نے اپنے لشکر کی صف بندی کی اور مقابلہ کے لیے میدان میں اُتر آیا۔ جب اس کے ساتھیوں نے دشمن کی کثرت و قوت دیکھی تو کچھ میدان سے منہ موڑ کر گھروں میں چھپ کر بیٹھ گئے اور کچھ لوگوں نے حجاج کے دامن میں پناہ لے لی۔ ابن زبیر نے اپنے باقی ماندہ لشکر کی ہمت بندھائی اور اسے جنگ میں جھونک دیا۔ دونوں فریق میں خون ریز جنگ ہوئی۔ میدان لاشوں سے پٹ گیا ابن زبیر قتل کر دیا گیا اور اس کی بچی کھچی فوج تتر بتر ہو گئی۔ عبدالملک کے آدمیوں نے اس کی لاش کو مقام تنعیم میں سولی پر لٹکا دیا جو کئی دنوں تک لٹکی رہی ایک دن عبداللہ ابن عمر ادھر سے گذرے تو انہوں نے لاش سے مخاطب ہو کر کہا:

يرحمك الله يا ابا خبيب لولا ثلث كن فيك لقلت انت انت الحادك فى الحرم و مسارعتك الى الفتنة و بخل بكفك

اے ابا خبیب اللہ تم پر رحم کرے اگر تم میں تین باتیں نہ ہوتیں تو میں یہ کہتا کہ تم تم ہی ہو ایک یہ کہ تم نے حرم میں الحاد و بے دینی کا ارتکاب کیا۔ دوسرے فتنہ کی طرف تیزی سے بڑھے اور تیسرے کنجوسی کرتے رہے۔

(تاریخ یعقوبی ج ۳ ص ۱۴)

ایک شخص نے آپ پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے مال کی تقسیم میں عدل و مساوات کا اصول پیش نظر نہیں رکھا فرمایا کہ اگر تم جھوٹ کہتے ہو تو اللہ اس وقت تک تمہیں موت نہ دے جب تک بنی ثقیف کا ایک شخص تمہیں اپنی گرفت میں نہ لے لے لوگوں نے پوچھا کہ وہ کون ہے۔ فرمایا:

رجل لا یدع للہ حرمۃ الا انتھکھا۔ — وہ ایسا آدمی ہے جو ہر اس چیز کی بے حرمتی کا مرتکب ہو گا جو اللہ کے نزدیک عزت و حرمت رکھتی ہے۔

(احتجاج طبرسی)

یہ حجاج ابن یوسف ثقفی تھا جس نے کوہ ابوقبیس پر منجنیق نصب کر کے خانہ کعبہ پر سنگ باری کی اور شعائر اللہ کی توہین کا مرتکب ہوا اور مدینہ منورہ میں جابر ابن عبداللہ، انس ابن مالک، سہل ابن سعد اور دوسرے صحابہ کی تذلیل کے لیے ان کے ہاتھوں اور گردنوں کو گرم سیسہ سے داغا جس طرح ذمیوں کو داغا جاتا تھا اور اتنی خون ریزیاں کیں کہ ان کا شمار نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ جلال الدین سیوطی تحریر کرتے ہیں:

قد قتل من الصحابۃ و اکابر التابعین ما لا یحصی فضلا عن غیرھم (تاریخ الخلفاء ص ۱۵۴) — اس نے اتنے صحابہ اور بزرگ تابعین قتل کیے کہ ان کا شمار نہیں ہو سکتا چہ جائیکہ دوسرے مقتولین کا شمار ہو سکے۔

نضر ابن شمیل کہتے ہیں کہ:

سمعت ھشاما یقول احصوا من قتل الحجاج صبرا فوجد وھم مائۃ وعشرین الفا۔ — میں نے ہشام کو کہتے سنا کہ حجاج کے ان مقتولین کی تعداد جنہیں اس نے جکڑ باندھ کر قتل کیا ایک لاکھ بیس ہزار تھی۔

(عقد الفرید ج ۳ ص ۲۶۰)

حضرت نے اپنے ایک خطبہ میں جسے علامہ مجلسی قدس سرہ نے بحار الانوار ج ۹ ص ۵۸۷ میں درج کیا ہے حکومت عباسیہ کے قیام کی پیشین گوئی کی ہے اور خلفاء عباسیین کے بعض نمایاں صفات و عادات کا تذکرہ فرمایا ہے۔ چنانچہ ابوالعباس سفاح اور منصور دوانیقی کے بارے میں فرمایا:

اولھما أرأفھم وثانیھما افتکھم — ان میں کا پہلا مہربان ہو گا اور دوسرا قاتل و سفاک۔

ابوالعباس ۱۳۲ھ میں برسراقتدار آیا اور چار سال آٹھ مہینے حکومت کرنے کے بعد ۱۳۶ھ میں مر گیا۔ اس کا یہ مختصر دور بنی امیہ کے استیصال اور مختلف بغاوتوں کے فرو کرنے میں گزرا۔ اس عرصہ میں بنی ہاشم سے کوئی تعرض نہیں کیا بلکہ مصلحۃً ان سے حسن سلوک بھی کرتا رہا اور منصور نے اپنے اقتدار کے استحکام کے لیے بے دریغ خون بہایا۔ اور جس کے متعلق بھی یہ شبہ ہوا کہ وہ اس کے اقتدار کے لیے خطرہ ثابت ہو سکتا ہے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ خصوصاً حسنی سادات پر مظالم کے پہاڑ توڑے کسی کو پابہ زنجیر قید و بند میں رکھا اور کسی کو قتل کر کے اس کے سر کی تشہیر کی۔ چنانچہ عبداللہ المحض کے بیٹوں محمد اور ابراہیم کو گرفتار کرنے کے لیے لشکر بھیجا اور انہیں قتل کروانے کے بعد محمد کا سر مختلف شہروں میں پھرایا اور ابراہیم کا سر ان کے والد بزرگوار کے پاس جو قید خانہ میں زندگی گزار رہے تھے بھجوایا۔ جلال الدین سیوطی تحریر کرتے ہیں:

فقتلهما وجماعة كثيرة من آل البيت فانا لله وانا اليه راجعون۔ (تاریخ الخلفاء ص ۱۴۸)	منصور نے محمد و ابراہیم اور اہل بیت کے کثیر افراد کو قتل کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ہارون رشید کے متعلق فرمایا:

وخامسهم كبشهم۔	ان میں کا پانچواں اونچے درجہ کا سردار ہوگا۔

ہارون رشید صاحب سطوت و جبروت تھا۔ اس نے جنگوں میں سرگرم عمل اور رومیوں سے برسر پیکار رہنے کے باوجود علوم و فنون کی ترقی میں حصہ لیا اور یونانی و سنسکرت زبان کی کتابوں کے عربی میں تراجم کرائے۔ رفاہ عامہ کے سلسلہ میں شفا خانے تعمیر کیے مگر ان خوبیوں کے باوجود امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو زندان میں زہر سے شہید کر کے اپنے نامۂ اعمال کو سیاہ کیا۔

مامون رشید کے متعلق فرمایا:

وسابعهم اعلمهم۔	ان میں کا ساتواں ان سب سے بڑھ کر عالم ہوگا۔

چنانچہ مامون فلسفہ تاریخ وقائع ایام فقہ اور فنونِ عربیہ میں مہارتِ تامہ رکھتا تھا۔ علمی مباحث میں دلچسپی لیتا۔ اکابر علماء سے مختلف موضوعات پر مناظرے کرتا اور انہیں لاجواب کر دیتا۔ بلاشبہ خلفاء میں اس سے بڑھ کر کوئی ذی علم نہ تھا۔ سیوطی نے لکھا ہے:

ولم يل الخلافة من بني العباس اعلم منه۔ (تاریخ الخلفاء ص ۲۱۳)	خلفاء بنی عباس میں اس سے بڑھ کر کوئی صاحب علم نہ تھا۔

مگر اس علم و فضل کے باوجود اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے امام رضا علیہ السلام کے خون سے اپنے دامن کو داغدار کیا۔

متوکل عباسی کے بارے میں فرمایا:

عاشرهم اكفرهم يقتله اخصهم به۔	ان میں کا دسواں بڑا کافر ہوگا اور اس کے قریبی لوگ ہی اسے قتل کریں گے۔

متوکل آلِ محمد سے انتہائی بغض و عناد رکھتا تھا اور اسی دشمنی کی بناء پر اسے کافر کہا ہے اسے نہ صرف اولادِ علی سے بغض تھا بلکہ جو انہیں دوست رکھتا تھا اسے زندہ نہ چھوڑتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ اس نے یعقوب ابن السکیت سے جو علومِ عربیہ کے امام اور اس کے بیٹوں کے معلم تھے پوچھا کہ میرے بیٹے معتز اور موید تمہیں زیادہ عزیز ہیں یا فرزندانِ علی حسن و حسین۔ انہوں نے کہا کہ حسین و حسن تو ایک طرف رہے میں علی کے غلام قنبر کو بھی ان دونوں سے بہتر سمجھتا ہوں۔ یہ سننا تھا کہ متوکل کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس نے ابن سکیت کی زبان گدی سے کھچوا دی اور وہ تڑپ تڑپ کر جاں بحق ہو گئے۔ غرض اس نے دوستدارانِ آلِ محمد کی تذلیل اور ساداتِ بنی فاطمہ کی ایذا رسانی

میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ قبر سید الشہداء کو منہدم اور اس پر ہل چلانے کا حکم دیا اور آپ کے مرقد کی زیارت سے مانع ہوا۔ علامہ سیوطی نے تحریر کیا ہے:

امر بھدم قبر الحسین وھدم ماحولہ من الدور وان یعمل مزارع ومنع الناس من زیارتہ وخرب وبقی صحراء وکان المتوکل معروفا بالنصب۔

اس نے حکم دیا کہ حسین (علیہ السلام) کی قبر اور جتنے گھر اس کے گرد و پیش ہیں سب گرا دیے جائیں اور ان پر کھیتی باڑی کی جائے اور لوگوں کو زیارت سے منع کیا یہاں تک کہ وہ جگہ منہدم ہو کر چٹیل میدان ہو گئی۔ متوکل آلِ محمد کی دشمنی میں شہرت رکھتا تھا۔

(تاریخ الخلفاء ص ۲۴۱)

متوکل کے اس اقدام سے عامہ مسلمین کے جذبات بھڑک اُٹھے۔ ہر طرف سے اس پر لعن طعن کی بوچھاڑ ہونے لگی اور مسجدوں اور دیواروں پر اس کے خلاف دشنام آمیز تحریریں لکھی جانے لگیں اور شعراء نے اس کی مذمت میں اشعار کہے۔ چنانچہ ایک شاعر نے کہا ہے:

تاللہ ان کانت امیۃ قد اتت قتل ابن بنت نبیھا مظلوما

خدا کی قسم اگر بنی امیہ اپنے نبی کے دختر زادے پر ظلم ڈھاتے ہوئے ان کے قتل کے مرتکب ہوئے

فلقد اتاہ بنو ابیہ بمثلہ ھذا لعمری قبرہ مھدوما

تو بنی عباس نے جو ان کے ہم جد تھے ویسا ہی ان پر ظلم کیا مجھے اپنی زندگی کی قسم یہ حسین ہی کی قبر ہے، جو ان کے ہاتھوں منہدم ہوئی ہے۔

متوکل کی غلط اور متشددانہ روش سے اس کی اولاد بھی تنگ آ چکی تھی چنانچہ اس کے بیٹے منتصر نے اس کے قتل کا تہیہ کیا اس کی وجہ بظاہر یہ تھی کہ اس نے پہلے منتصر کو اپنا ولیعہد نامزد کیا مگر کچھ دنوں کے بعد اس کی رائے بدل گئی اور منتصر کے بجائے معتز کو اپنا ولیعہد مقرر کرنا چاہا اور منتصر سے کہا کہ وہ ولیعہدی سے دست بردار ہو جائے مگر وہ نہ مانا اور ان دونوں میں سخت کشیدگی پیدا ہو گئی۔ آخر منتصر نے متوکل کے چند ترک غلاموں کو اس کے قتل پر آمادہ کیا۔ وہ تو چاہتے ہی تھے کہ اس کا کام تمام ہو چنانچہ انہوں نے ہتھیار سنبھالے اور رات کے وقت جب کہ وہ مجلس طرب آراستہ کیے ہوئے تھا اچانک اس پر ٹوٹ پڑے اور تلواروں سے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اس کے بعد منتصر مسندِ خلافت پر بیٹھا اور چھ[1] ماہ کی حکومت کے بعد وفات پائی۔

---

[1] واقعات شاہد ہیں کہ جنہوں نے تخت و تاج کے لیے اپنے باپ کو راستے سے ہٹایا انہیں بھی زیادہ عرصہ تک حکومت کرنا نصیب نہیں ہوا اور موت نے جلد ہی انہیں تخت و تاج سے محروم کر دیا۔ چنانچہ نظام شاہی حکمرانوں میں میران حسین نے اپنے باپ مرتضیٰ نظام کو گرم حمام میں بند کر کے مروا ڈالا مگر اسے بھی دو ماہ تین دن کے بعد (باقی برصفحہ آئندہ)

معتمد کے بارے میں فرمایا:

وخامس عشرھم کثیر الغناء قلیل الغناء

ان میں کے پندرھویں کو الجھنوں سے واسطہ زیادہ ہوگا اور مالی استطاعت کم ہوگی۔

معتمد ابن متوکل مہتدی کے قتل کے بعد مسند فرماں روائی پر بیٹھا اس نے اپنے بھائی موفق کو وزارت دفاع اور مختلف صوبوں کی امارت کا عہدہ سپرد کیا۔ معتمد کو اپنے دورِ خلافت میں گوناگوں مشکلات سے دوچار ہونا پڑا چنانچہ حبشی غلاموں نے علی ابن محمد کی سرکردگی میں بصرہ اور اس کے اطراف میں قتل و غارت کا بازار گرم کیا جن سے موفق نے متعدد جنگیں لڑیں۔ حجاز و عراق میں ایسا سخت قحط پڑا کہ لوگ دانے دانے کو ترس گئے اور نہر عیسیٰ کے بند کے ٹوٹ جانے سے بغداد میں اتنا شدید سیلاب آیا کہ محلہ کرخ کے سات ہزار مکان منہدم ہو گئے۔ معتمد اگرچہ تیئیس برس تک بساطِ خلافت پر متمکن رہا مگر وہ ایک طرح سے موفق کے ہاتھ میں کھلونا بنا رہا اور وہی سلطنت کے تمام امور سرانجام دیتا تھا۔ ابن اثیر نے تحریر کیا ہے:

وکان فی خلافتہ محکوما علیہ قد تحکم علیہ اخوہ ابواحمد الموفق

معتمد اپنے دورِ خلافت میں حاکم کے بجائے محکوم تھا اس کا بھائی ابواحمد موفق اس پر مسلط تھا اور

(حاشیہ صفحہ سابقہ)

قتل کر دیا گیا۔ میرزا عبداللطیف نے اپنے باپ الغ بیگ ابن میرزا شاہرخ ابن امیر تیمور کو ۸۵۳ھ میں قتل کروایا مگر وہ چھ ماہ بھی حکومت نہ کر سکا اور ایک شخص باباحسین نامی نے اسے قتل کر دیا۔ شیرویہ نے امراء سلطنت کے ساتھ مل کر اپنے باپ خسرو پرویز کو قتل کیا مگر چھ مہینے کے بعد طاعون میں مبتلا ہو کر مر گیا۔ اسی طرح منتصر کو بھی حکومت راس نہ آئی چنانچہ مؤرخین نے لکھا ہے کہ جب منتصر نے زمام خلافت اپنے ہاتھوں میں لی تو اس نے ایک مجلس طرب منعقد کی اور اسے فرش فروش اور دیبا و حریر کے پردوں سے سجایا اور خود ایک زریں قالین پر بیٹھا جس پر ایک شخص کی تصویر بنی ہوئی تھی جو ایک گھوڑے پر سوار اور سر پر تاج رکھے ہوئے تھا۔ منتصر نے غور سے دیکھا تو اس تصویر کے نیچے ایک عبارت لکھی ہوئی نظر آئی مگر فارسی زبان ہونے کی وجہ سے وہ سمجھ نہ سکا۔ حکم دیا کہ کسی ایسے شخص کو بلایا جائے جو یہ تحریر پڑھ سکے۔ اور اس کے معنی بتا سکے۔ چنانچہ ایک شخص کو ڈھونڈ کر لایا گیا اس نے وہ تحریر پڑھی تو خاموش ہو گیا۔ منتصر نے پوچھا کہ کیا لکھا ہے کہا کہ کچھ نہیں صرف عجمیوں نے اپنی حماقت کا مظاہرہ کیا ہے اور بتانے سے پہلو بچا لیجانا چاہا۔ جب اس پر زور ڈالا گیا تو کہا کہ اس پر یہ عبارت تحریر ہے۔

انا شیرویہ ابن کسریٰ ابن ھرمز قتلت ابی فلم امتع بالملک الا ستۃ اشھر (تاریخ بغداد ج ۲ ص ۱۲۰)

میں کسریٰ ابن ہرمز کا بیٹا شیرویہ ہوں میں نے اپنے باپ کو قتل کیا مگر صرف چھ مہینے حکومت سے بہرہ ور ہو سکا۔

منتصر نے یہ سنا تو اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا مجلس برخواست کر کے اٹھ کھڑا ہوا اور چھ مہینے کے بعد دنیا سے چل بسا۔

وضیق علیہ حتی انہ احتاج الی ثلثمائۃ دینار فلم یجدھا۔ (تاریخ کامل ج۶ ص۴۷)

اور اسے تنگدستی کی حالت میں رکھتا تھا یہاں تک کہ اگر اسے تین سو دینار کی ضرورت پڑتی تو وہ بھی اسے میسر نہ ہوتے۔

معتضد ابن موفق کے بارے میں فرمایا:

سادس عشر ھم اقضاھم للذمم واوصلھم للرحم۔

ان میں کا سولہواں سب سے بڑھ کر ادائے حقوق اور صلہ رحمی کرنے والا ہے۔

عباسی خلفاء نے ہر دور میں سادات علویہ کو اپنا حریف سمجھتے ہوئے مظالم کا نشانہ بنایا اور انہیں قتل و غارت کیا جاتا رہا البتہ معتضد نے قرابت و صلہ رحمی کا کچھ پاس و لحاظ کرتے ہوئے ان پر تشدد گوارا نہ کیا اور نہ ان کے ساتھ حسن سلوک کیے جانے سے مانع ہوا۔ چنانچہ ابن جریر طبری نے تحریر کیا ہے کہ والی طبرستان محمد ابن زید علوی نے مخفی طور پر بتیس ہزار دینار محمد ابن ورد عطار کے پاس بھیجے تاکہ وہ بغداد کوفہ مکہ اور مدینہ کے سادات پر انہیں تقسیم کریں۔ رئیس شرطہ بدر کو معلوم ہوا تو اس نے محمد ابن ورد کو طلب کیا اور اس رقم کے بارے میں باز پرس کی۔ اس نے کہا کہ مجھے والی طبرستان ہر سال اتنی رقم بھیجتا ہے اور جہاں جہاں وہ کہتا ہے میں تقسیم کر دیتا ہوں۔ بدر نے معتضد سے اس کا ذکر کیا اور اس کی رائے دریافت کی۔ معتضد نے کہا کہ تمہیں وہ خواب یاد ہو گا جو میں نے تم سے بیان کیا تھا کہا کہ مجھے یاد نہیں ہے کہا کہ میں نے خواب دیکھا کہ لاؤ لشکر کے ساتھ نہروان کے اطراف میں راہ پیما ہوں۔ اس دوران میں میری نظر ایک ٹیلے پر پڑی جس پر ایک شخص نماز پڑھ رہا تھا جب وہ نماز سے فارغ ہوا تو اس نے شاہی جلوس اور اس کے شکوہ و جلال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا کہ آگے بڑھ کر میرے سامنے آؤ۔ میں آگے بڑھا تو کہا کہ مجھے پہچانتے ہو کہ میں کون ہوں میں نے کہا کہ کبھی آپ کو دیکھا نہیں کہا کہ میں علی ابن ابی طالب ہوں۔ پھر ایک بیلچے کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا کہ اسے اٹھاؤ اور زمین پر مارو میں نے چند ضربیں لگانے کے بعد ہاتھ روک لیا فرمایا:

انہ سیلی من ولدک ھذا الامر بعدد الضربات فاوصھم بولدی خیرا۔ (تاریخ طبری ج۸ ص۸۰)

تم نے جتنی ضربیں لگائی ہیں تمہاری اولاد میں اتنے ہی مسند حکومت کے وارث ہوں گے لہٰذا انہیں یہ وصیت کر جا کہ وہ میری اولاد سے حسن سلوک کریں

یہ خواب بیان کرنے کے بعد کہا کہ تم محمد ابن ورد سے کہدو کہ وہ محمد ابن زید کو لکھے کہ چوری چھپے مال بھیجنے کی ضرورت نہیں وہ علانیہ مال بھیجے اور جہاں چاہتا ہے بے جھجک تقسیم کرے۔

علامہ طبری نے یہ بھی لکھا ہے کہ ۲۸۴ھ میں معتضد نے اس ارادہ کا اظہار کیا کہ ہر نماز جمعہ کے بعد منبروں پر کھڑے ہو کر معاویہ ابن ابی سفیان پر لعنت کی جائے اور ایک نوشتہ[1] جو امیر المؤمنین علی ابن ابی طالب کے فضائل و مناقب اور معاویہ

---

[1] یہ نوشتہ تاریخ طبری جلد۸ صفحہ ۱۸۳ تا ۱۸۹ میں درج ہے اور اس کے نیچے معتضد کے وزیر (باقی حاشیہ برصفحہ آئندہ)

کے نقائص و معایب پر مشتمل تھا پڑھ کر لوگوں کو سنایا جائے۔ جب اس کے وزیر عبداللہ ابن سلیمان کو معلوم ہوا تو وہ حضرت علی سے انحراف کی بنا پر قاضی یوسف ابن یعقوب کے پاس آیا اور اسے معتضد کے ارادہ سے مطلع کیا اور کہا کہ کوئی ایسی تدبیر کیجیے کہ وہ اپنے ارادہ کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ چنانچہ قاضی یوسف معتضد کے پاس آیا اور کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کا ارادہ ہے کہ نماز جمعہ کے بعد معاویہ پر برملا لعنت کی جائے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس سے عوام کے جذبات آپ کے خلاف بھڑک اٹھیں گے اور ایسا فتنہ اٹھ کھڑا ہو گا کہ اس کا دبانا آپ کے بس سے باہر ہو جائے گا کہا کہ مجھ میں اتنا دم خم ہے کہ میں اسے دبا سکوں اور کوئی ہنگامہ کھڑا نہ ہونے دوں۔ کہا کہ پھر ان علویوں کے بارے میں کیا کیجیے گا جو خروج پر تلے بیٹھے ہیں۔ جب عوام آل محمد کے مآثر و فضائل سے آگاہ ہوں گے تو وہ ان کی طرف مائل ہو جائیں گے جس سے انہیں تقویت پہنچے گی اور وہ اپنے مؤقف کے حق بجانب ہونے میں اسے بطور حجت و برہان پیش کریں گے۔ اس پر معتضد خاموش ہو گیا اور اپنا ارادہ بدل دیا۔

مقتدر کے بارے میں فرمایا:

کانی اری ثامن عشر ہم تفحص	میں ان میں کے اٹھارویں کو گویا دیکھ رہا ہوں کہ وہ اپنے
رجلاہ فی دمہ بعدان یاخذہ جندہ	خون میں ایڑیاں رگڑ رہا ہے جب کہ اس کا لشکر
بکظمہ من ولدہ ثلث رجال	اس کا گلا دبوچ چکا ہو گا اس کے بیٹوں میں سے تین
سیرتھم سیرۃ الضلال۔	وہ ہیں جن کا طور طریقہ گمراہوں کا ہو گا۔

مقتدر ابن معتضد تیرہ برس کی عمر میں مسند خلافت پر بیٹھا اور پچیس سال برسر اقتدار رہنے کے بعد قتل کر دیا گیا صورت یہ پیش آئی کہ مونس المظفر جو امیر الامراء کے منصب پر فائز تھا اسے عبداللہ ابن حمدان اور نازوک حاجب نے یہ بتایا کہ مقتدر اسے معزول کر کے اپنے ماموں زاد بھائی ہارون ابن غریب کا اس کی جگہ تقرر کرنا چاہتا ہے۔ مونس نے یہ سنا تو امراء اور فوجی دستوں کے ساتھ قصر شاہی پر دھاوا بول دیا مقتدر کو گھر سے باہر نکال کر اپنے گھر میں زیر حراست رکھا اور محمد ابن معتضد کو القاہر باللہ کا لقب دے کر مسند خلافت پر بٹھا دیا جب بیعت کی تکمیل ہو گئی تو لشکریوں نے اپنے سالانہ وظائف اور حق بیعت کا مطالبہ کیا مگر بروقت یہ مطالبہ پورا نہ کیا جا سکتا تھا۔ انہیں انتظار کرنے کے لیے کہا گیا اس پر وہ بگڑ گئے اور ہلڑ ہنگامہ کرتے ہوئے مونس کے مکان پر آئے اور اس کے ہاں سے مقتدر کو باہر لائے اور قصر میں لا کر اسے دوبارہ مسند اقتدار پر بٹھا دیا مقتدر نے فوج کو سالانہ وظائف کے ساتھ عطایا و انعامات دیے۔ ابھی اس واقعہ کو دو ہی سال کا عرصہ گذرا ہو گا کہ مونس و مقتدر میں پھر کسی بات پر کشیدگی پیدا ہو گئی۔ مونس موصل چلا آیا اور ترکوں اور بربریوں پر مشتمل ایک فوج تیار کی اور بغداد کا رخ کیا۔ مقتدر کو معلوم ہوا تو اس نے بھی فوجیں میدان میں اتار دیں اور خود ایک بلندی پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں میں جنگ چھڑ گئی۔ مقتدر کی فوج کے جرنیلوں نے اسے میدان میں لا کر کھڑا کرنا چاہا تا کہ فوج کی ہمت بڑھے مگر

(حاشیہ بقیہ صفحہ سابقہ) ابوالقاسم عبداللہ ابن سلیمان کا نام کاتب کی حیثیت سے مرقوم ہے۔

کے نقائص و معایب پر مشتمل تھا پڑھ کر لوگوں کو سنایا جائے۔ جب اس کے وزیر عبد اللہ ابن سلیمان کو معلوم ہوا تو وہ حضرت علی سے انحراف کی بنا پر قاضی یوسف ابن یعقوب کے پاس آیا اور اسے معتضد کے ارادہ سے مطلع کیا اور کہا کہ کوئی ایسی تدبیر کیجیے کہ وہ اپنے ارادہ کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ چنانچہ قاضی یوسف معتضد کے پاس آیا اور کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کا ارادہ ہے کہ نماز جمعہ کے بعد معاویہ پر برملا لعنت کی جائے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس سے عوام کے جذبات آپ کے خلاف بھڑک اٹھیں گے اور ایسا فتنہ اُٹھ کھڑا ہو گا کہ اس کا دبانا آپ کے بس سے باہر ہو جائے گا کہا کہ مجھ میں اتنا دم خم ہے کہ میں اسے دبا سکوں اور کوئی ہنگامہ کھڑا نہ ہونے دوں۔ کہا کہ پھر ان علویوں کے بارے میں کیا کیجیے گا جو خروج پر تلے بیٹھے ہیں۔ جب عوام آل محمد کے مآثر و فضائل سے آگاہ ہوں گے تو وہ ان کی طرف مائل ہو جائیں گے جس سے انہیں تقویت پہنچے گی اور وہ اپنے مؤقف کے حق بجانب ہونے میں اسے بطور حجت و برہان پیش کریں گے۔ اس پر معتضد خاموش ہو گیا اور اپنا ارادہ بدل دیا۔

مقتدر کے بارے میں فرمایا:

كأني ارى ثامن عشر هم تفحص	میں ان میں کے اٹھارویں کو گویا دیکھ رہا ہوں کہ وہ اپنے
رجلاه في دمه بعد ان ياخذه جنده	خون میں ایڑیاں رگڑ رہا ہے جب کہ اس کا لشکر
بكظمه من ولده ثلث رجال	اس کا گلا دبوچ چکا ہو گا اس کے بیٹوں میں سے تین
سيرتهم سيرة الضلال۔	وہ ہیں جن کا طور طریقہ گمراہوں کا ہو گا۔

مقتدر ابن معتضد تیرہ برس کی عمر میں مسند خلافت پر بیٹھا اور پچیس سال برسر اقتدار رہنے کے بعد قتل کر دیا گیا صورت یہ پیش آئی کہ مونس المظفر جو امیر الامراء کے منصب پر فائز تھا اسے عبد اللہ ابن حمدان اور نازوک حاجب نے یہ بتایا کہ مقتدر اسے معزول کر کے اپنے ماموں زاد بھائی ہارون ابن غریب کا اس کی جگہ تقرر کرنا چاہتا ہے۔ مونس نے یہ سنا تو امراء اور فوجی دستوں کے ساتھ قصر شاہی پر دھاوا بول دیا مقتدر کو گھر سے باہر نکال کر اپنے گھر میں زیر حراست رکھا اور محمد ابن معتضد کو القاہر باللہ کا لقب دیکر مسند خلافت پر بٹھا دیا جب بیعت کی تکمیل ہو گئی تو لشکریوں نے اپنے سالانہ وظائف اور حق بیعت کا مطالبہ کیا مگر بروقت یہ مطالبہ پورا نہ کیا جا سکتا تھا۔ انہیں انتظار کرنے کے لیے کہا گیا اس پر وہ بگڑ گئے اور ہلڑ ہنگامہ کرتے ہوئے مونس کے مکان پر آئے اور اس کے ہاں سے مقتدر کو باہر لائے اور قصر میں لا کر اسے دوبارہ مسند اقتدار پر بٹھا دیا مقتدر نے فوج کو سالانہ وظائف کے ساتھ عطایا و انعامات دیے۔ ابھی اس واقعہ کو دو ہی سال کا عرصہ گذرا ہو گا کہ مونس و مقتدر میں پھر کسی بات پر کشیدگی پیدا ہو گئی۔ مونس موصل چلا آیا اور ترکوں اور بربریوں پر مشتمل ایک فوج تیار کی اور بغداد کا رُخ کیا۔ مقتدر کو معلوم ہوا تو اس نے بھی فوجیں میدان میں اتار دیں اور خود ایک بلندی پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں میں جنگ چھڑ گئی۔ مقتدر کی فوج کے جرنیلوں نے اسے میدان میں لا کر کھڑا کرنا چاہا تاکہ فوج کی ہمت بڑھے مگر

(حاشیہ بقیہ صفحہ سابقہ) ابو القاسم عبد اللہ ابن سلیمان کا نام کاتب کی حیثیت سے مرقوم ہے۔

مقتدر پر اتنا خوف وہراس طاری تھا کہ وہ نیچے اترنے پر آمادہ نہ ہوا آخر زور دینے پر اترا مگر اس وقت جب مونس نے عباسی فوجوں کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا تھا اس کی فوج کا ایک سردار اس کے پاس آیا اور کہا کہ آپ واپس جائیے مقتدر واپس جانا چاہتا تھا کہ مونس کی فوج نے اس پر حملہ کر دیا۔ ایک بربری نے اس پر بھالا مارا اور وہ زمین پر گر پڑا اس کا سر تن سے علیحدہ کرنے کے بعد نیزہ پر بلند کیا گیا اور جسم پر سے لباس اتار کر عریاں کر دیا گیا جسے ایک شخص نے گھاس پھونس سے ڈھانپا۔ اس کے بارہ بیٹوں میں سے راضی، متقی اور مطیع مختلف ادوار میں خلیفہ ہوئے جن کے عادات وخصائل اپنے پیشروؤں کے عادات سے مختلف نہ تھے۔

مستعصم کے بارے میں فرمایا:

لکانی اراہ علی جسر الزوراء قتیلا۔ گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ بغداد کے پل پر مقتول پڑا ہے۔

مستعصم خلفاء بغداد میں کا آخری تاجدار تھا جس پر عباسی اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ سلطنت عباسیہ پر یہ زوال دفعۃً طاری نہیں ہوا بلکہ ان حالات کا طبعی نتیجہ تھا جو صدیوں پہلے سے رونما ہو رہے تھے چنانچہ حنبلیوں اور اشعریوں کے آئے دن کے بکھیڑے اور شیعہ سنیوں کے جھگڑے حکومت کی بنیادوں کو گھن کی طرح اندر ہی اندر چاٹ رہے تھے اور حکمرانوں کی تن آسانیاں اور ارکان دولت کی باہم آویزیاں تباہی وبربادی کی راہ ہموار کرتی جا رہی تھیں اور آخری دور میں تو سیاسی و عسکری قوت دم توڑ چکی تھی اور خلفاء بے بس اور دیلمی وسلجوقی امراء کے دست نگر ہو کر رہ گئے تھے اور ہر قدم پر ان کے اشارۂ چشم وابرو کے منتظر رہتے تھے مگر ان حالات میں بھی اسلامی ممالک آزادی وخود مختاری کے باوجود برائے نام ہی مرکز خلافت سے وابستہ تصور ہوتے تھے اور یہی وابستگی اسے باقی وبرقرار رکھے ہوئے تھی لیکن ایک شکستہ وبوسیدہ عمارت کو اڑانوں کے سہارے کب تک باقی رکھا جا سکتا تھا ایک نہ ایک دن اسے دھڑام سے گرنا ہی تھا۔ چنانچہ تاتاریوں کے ہاتھوں سقوط بغداد کا حادثہ پیش آیا۔ اس المیہ کی ذمہ داری خواہ کسی کے سر ڈالنے کی کوشش کی جائے مگر خود خلیفۂ وقت کو اس سے بری قرار نہیں دیا جا سکتا اس نے سلطنت کے نظم ونسق سے آنکھیں بند رکھیں اور اپنی ناعاقبت اندیشی سے دشمن کو تاخت وتاراج کا موقع فراہم کیا۔ حملہ تاتار کا قوی ترین محرک یہ تھا کہ چنگیز خاں کے پوتے منکو خاں کے دور اقتدار میں باطنیوں نے جو بحیرۂ خزر کے جنوب میں پہاڑی علاقوں میں سکونت پذیر تھے، امن عامہ کو خطرہ میں ڈال دیا تھا۔ منکو خاں نے اپنے بھائی ہلاکو خاں کو ایران کی حکومت کا پروانہ دے کر ان کی سرکوبی پر مامور کیا ہلاکو خاں نے اطراف و جوانب کے سربراہوں اور مستعصم سے مدد کی درخواست کی مگر مستعصم نے اس کی درخواست کو درخور اعتنا نہ سمجھا اور کوئی مدد نہ دی۔ جب ہلاکو خاں نے باطنیوں پر قابو پا لیا اور ان کے قلعے فتح کر لیے تو مستعصم کو ایک خط میں لکھا کہ تم نے میرے ساتھ تعاون کرنے سے گریز کیا اب اس کی تلافی کی یہی صورت ہے کہ تم ہماری بالادستی تسلیم کر کے اطاعت قبول کرو مگر مستعصم کے سر میں ہوائے غرور بھری ہوئی تھی اس نے اس کا سخت الفاظ میں جواب دیا اور پیغامبر کو بھی ذلیل کیا گیا اس نے یہ نہ سوچا کہ اس کے پاس نہ باقاعدہ فوج ہے نہ آزمودہ کار سپاہ اور جو ہے وہ ناکارہ اور آرام طلب

جس میں نہ ہلاکو خاں کی دل بادل فوجوں سے مقابلہ کرنے کی جرأت ہے اور نہ میدان میں جم کر لڑنے کی ہمت، للٰذا نرم رویہ اختیار کرنا قرینِ مصلحت ہوگا۔ غرض اس تحکمانہ طرزِ عمل سے ہلاکو خاں کے تیور بدلے۔ تاتاری خون نے جوش مارا اور وہ دو لاکھ تاتاریوں کے ساتھ بغداد پر حملہ کے ارادہ سے نکل کھڑا ہوا۔ مستعصم کی پاشان و پریشاں فوج کے بس کا روگ نہ تھا کہ وہ اس سیلابِ بلا کے آگے بند باندھ سکے۔ کچھ دیر تک مدافعانہ جنگ لڑی اور آخر تاتاریوں کے پر زور حملہ سے پسپا ہو کر شہر میں واپس آگئی۔ تاتاریوں نے پیش قدمی کر کے بغداد کا محاصرہ کر لیا۔ جب مستعصم نے دیکھا کہ اس کی قوت دفاع دم توڑ چکی ہے تو وہ اعزہ و امراء کو لے کر ہلاکو خاں کے پاس چلا آیا۔ ہلاکو نے اسے اپنی گرفت میں لے کر اپنی فوجوں کو قتلِ عام کا حکم دے دیا۔ تاتاریوں نے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور ایک ایک گھر اور شاہی خزانہ کو لوٹ لیا اور چالیس دن تک ان کی تلواریں اہلِ بغداد کے سروں پر چلتی رہیں اور صرف وہی لوگ بچے جو کسی طرح ان کی نظروں سے اوجھل رہ سکے۔ مستعصم کو بھی ایک چٹائی میں لپیٹ کر اس طرح روندا گیا کہ اس نے دم توڑ دیا اور اس کے عزیز و اقارب بھی موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ یہ واقعہ محرم ۶۵۶ھ میں پیش آیا اور سوا پانچ صدیوں تک قائم رہنے والی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

محمد ابن عبداللہ المحض کے بارے میں فرمایا:

انہ یقتل عند احجار الزیت — وہ احجار زیت کے نزدیک قتل کیے جائیں گے

سانحہ کربلا کے بعد اموی حکومت کے خلاف نفرت کا جذبہ پوری شدت سے ابھر آیا تھا جس نے ایک عام بے چینی اور غیر اطمینانی کیفیت پیدا کر دی اور حکومت کی تبدیلی ناگزیر سمجھی جانے لگی۔ چنانچہ بنی امیہ کے دورِ آخر میں عباسیوں اور علویوں نے اموی اقتدار کا تختہ الٹ کر حکومت پر قابض ہونے کا تہیہ کر لیا اور آلِ رسول کے حق کی فوقیت کا اعلان کر کے انقلابی تحریک کو آگے بڑھایا اور ماہ ذی الحجہ ۱۳۱ھ میں ایک مجلسِ شہادت قائم کر کے یہ طے کیا کہ اموی اقتدار کے خاتمہ پر محمد ابن عبداللہ المحض کو جو حسن مثنیٰ کے پوتے اور زہد و ورع کی بنا پر نفسِ زکیہ کے نام سے یاد کیے جاتے تھے مسندِ خلافت پر بٹھا دیا جائے اور ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے اس معاہدہ کی تکمیل کر لی گئی۔ ان بیعت کرنے والوں میں منصور دوانیقی بھی شامل تھا۔ جب ۲۶ ذی الحجہ ۱۳۲ھ کو مروان ثانی کے قتل کر دیئے جانے پر اموی حکومت کا خاتمہ ہو گیا تو عباسیوں نے معاہدہ کو بالائے طاق رکھ کر خلافت کے نام پر زمامِ اقتدار اپنے ہاتھوں میں لے لی اور محمد ابن عبداللہ کے بجائے ابو العباس سفاح کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ سفاح نے محمد ابن عبداللہ اور ان کے ہمنواؤں سے کوئی تعرض نہ کیا اور اپنی پوری توجہ بنی امیہ کے استیصال پر مرکوز کر دی۔ جب اس کے بعد منصور مسندِ خلافت پر متمکن ہوا تو اسے محمد ابن عبداللہ کی طرف سے یہ اندیشہ ہوا کہ وہ معاہدہ کی خلاف ورزی کے پیشِ نظر حکومت کے خلاف نہ اٹھ کھڑے ہوں اور محمد ابن عبداللہ کو بھی یہ خطرہ نظر آ رہا تھا کہ منصور انہیں اپنے راستے سے ہٹانے کی کوشش کرے گا۔ چنانچہ وہ اور ان کے بھائی ابراہیم پہاڑوں میں روپوش ہو گئے۔ اس روپوشی سے منصور کے اس شبہہ کو اور تقویت پہنچی کہ وہ اپنی خلافت کے لیے کوشاں ہیں۔ اس نے زیاد ابن عبیداللہ کو ان کی گرفتاری پر متعین کیا۔ زیاد نے انہیں امان کے وعدہ پر طلب کیا۔ جب وہ آئے تو انہیں چھوڑ دیا،

اور خود قید خانہ میں چلا گیا پھر ان کی گرفتاری پر محمد ابن خالد کو مقرر کیا اس نے گھروں تک کی تلاشی لی مگر انہیں گرفتار کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ آخر رباح ابن عثمان کو مدینہ کا حاکم مقرر کیا گیا اور اسے تاکید کی کہ جس طرح بن پڑے محمد اور ابراہیم کو تلاش کیا جائے جب وہ بھی ناکام ہوا تو منصور نے حکم دیا کہ تمام حسنی سادات کو گرفتار کر لیا جائے۔ چنانچہ انہیں زنجیروں میں جکڑ کر مدینہ سے کوفہ لایا گیا اور تنگ و تاریک قید خانوں میں ڈال دیا گیا اور عبداللہ المحض کو بھی پابند سلاسل کر کے زندان کے تہہ خانہ میں رکھا گیا اور ان پر اتنے مظالم کیے گئے جو کسی طرح اموی مظالم سے کم نہ تھے۔ کسی شاعر نے صحیح کہا ہے:

واللہ ما فعلت امیۃ فیھم معشار ما فعلت بنو العباس

خدا کی قسم بنی عباس نے ان پر جو مظالم کیے ان کے مقابلہ میں بنی امیہ کے مظالم دسواں حصہ ہوں گے۔

جب محمد کو ان حالات کا علم ہوا تو وہ ان مظالم کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے ماہ رجب ۱۴۵ھ میں ایک مختصر سی جمعیت کے ساتھ مدینہ آئے اور اہل مدینہ کو اپنے ساتھ ملا کر حکومت کے خلاف ایک محاذ قائم کر لیا۔ منصور کو اطلاع دی گئی تو اس نے اپنے بھتیجے عیسیٰ کی قیادت میں چار ہزار سوار اور دو سو پیادے بھیجے اور اس کے عقب میں محمد ابن قحطبہ کو ایک عظیم لشکر کے ساتھ اس کی مدد کے لئے روانہ کیا۔ دونوں فریق میں خونریز جنگ ہوئی۔ محمد، حمید ابن قحطبہ کے ہاتھ سے مارے گئے اور ان کے ساتھی بھی سب ایک ایک کر کے قتل کیے گئے۔ ابن قحطبہ نے محمد کا سر کاٹ کر منصور کے پاس بھجوایا جس نے مختلف شہروں میں اس کی تشہیر کی۔ یہ واقعہ امیرالمومنین کی پیشین گوئی کے مطابق مدینہ کے نزدیک احجار زیت میں پیش آیا۔

ابراہیم ابن عبداللہ المحض کے بارے میں فرمایا:

بباخمری یقتل بعد ان یظھر یاتیہ	وہ باخمری میں پہلے تو دشمن پر غالب آئیں گے پھر
سھم غرب یکون فیہ منیتہ فیابوس	قتل کر دیے جائیں گے اس طرح کہ کسی نامعلوم شخص کا تیر
الرامی شلت یدہ ووھن عضدہ	انہیں لگے گا جو جان لیوا ثابت ہو گا برا ہو اس تیر پھینکنے والے کا کاش اسکے ہاتھ شل اور بازو ناکارہ ہو جاتے۔

منصور، محمد ابن عبداللہ کے بھائی ابراہیم کی تلاش میں بھی تھا مگر وہ ایک جگہ قیام نہ کرتے تھے اس لیے ان کا پتہ نہ چلتا تھا۔ آخر میں وہ بصرہ میں وارد ہوئے اور شہر کے عمائد و اکابر ان کے ہمنوا ہو گئے۔ انہوں نے حاکم بصرہ سفیان ابن معاویہ کو بے دست و پا کر کے بصرہ پر تسلط حاصل کر لیا اور بیت المال کی جمع جتھا فوج پر تقسیم کر دی۔ اس اثنا میں محمد ابن عبداللہ کے مارے جانے کی اطلاع آ گئی۔ آپ نے فارس و اہواز کے لوگوں پر مشتمل ایک لشکر ترتیب دیا اور یکم شوال ۱۴۵ھ کو بصرہ میں خروج کر دیا۔ منصور نے یہ خبر سنی تو بہت سٹپٹایا۔ اس نے فوراً شام افریقہ اور خراسان میں پھیلی ہوئی فوجوں کو جمع کر کے ان کے مقابلہ میں صف بندی کا حکم دیا۔ ابراہیم ابھی محاذ جنگ کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ اہل کوفہ کی ایک جماعت ان کے پاس آئی اور کہا کہ کوفہ میں ایک لاکھ شمشیر زن آپ کے پرچم کے نیچے لڑنے کے لیے تیار ہیں۔ آپ یہاں سے کوفہ تشریف لے چلیے۔ ابراہیم نے اہل کوفہ کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے کوفہ کی طرف حرکت

کی جب کوفہ اور واسطہ کے درمیان مقام باخمریٰ میں پہنچے تو منصور کا لشکر بھی وہاں پہنچ گیا۔ ابراہیم کی سپاہ نے دشمن کے لشکر کو دیکھ کر تلواریں نیاموں سے کھینچ لیں اور بڑی بے جگری سے حملہ کر دیا فوج مخالف اس حملہ کی تاب نہ لا سکی اس کے قدم اکھڑ گئے اور پسپا ہو کر کوفہ کے حدود تک پہنچ گئی صرف سو آدمی میدان میں رہ گئے۔ ان کے قدم بھی اکھڑا چاہتے تھے کہ ایک سنسناتا ہوا تیر آیا جو ابراہیم کے حلق میں لگا آپ نے سنبھلنا چاہا مگر سنبھل نہ سکے زمین پر گرے اور دم توڑ دیا ان کے ہمراہی منتشر ہو گئے۔ فوج مخالف کے سردار عیسیٰ ابن موسیٰ نے ان کا سر کاٹ کر منصور کے پاس بھجوا دیا۔ یہ واقعہ ماہ ذی الحجہ ۱۴۵ھ میں پیش آیا علی ابن محمد اور اسکی حبشی فوج کے بارے میں فرمایا

کانی بہ قد سار بالجیش الذی لا یکون لہ غبار و لا لجب و لا قعقعۃ لجم و لا حمحمۃ خیل یثیرون الارض باقدامھم کانھا اقدام النعام۔	میں اس شخص کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ ایک ایسے لشکر کو لے کر بڑھ رہا ہے جس میں نہ گرد و غبار ہے نہ شور و غوغا نہ لگاموں کی کھڑکھڑاہٹ اور نہ گھوڑوں کے ہنہنانے کی آواز وہ لوگ زمین کو اپنے پیروں سے جو شتر مرغ کے پیروں کے مانند ہیں روند رہے ہوں گے۔

(نہج البلاغہ)

علی ابن محمد قبیلہ عبد قیس کا ایک فرد اور خوارج کے فرقہ ازارقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ امرا سلطنت کی مجلسوں میں آتا جاتا اور ان کے عطیوں پر گذر بسر کرتا تھا۔ سر میں سیادت و پیشوائی کا سودا تو رکھتا ہی تھا اپنے متبعین کی ایک جماعت تشکیل دینے کے لیے ۲۴۹ھ کو بغداد سے بحرین میں آیا اور کچھ لوگوں کو اپنا معتقد بنا لیا۔ بحرین میں پانچ سال گذارنے کے بعد اپنے چند عقیدت مندوں کے ساتھ بصرہ آیا۔ حاکم بصرہ محمد ابن رجاء نے اس کے طور طریقے دیکھے تو اس کی گرفتاری کا حکم دیا مگر یہ بھاگ کر بصرہ سے بغداد آگیا اور جب محمد ابن رجاء کی حکومت ختم ہو گئی تو بصرہ واپس آگیا اور یہاں پہنچ کر اعلان کیا کہ جو غلام میرے پاس چلا آئے گا وہ آزاد قرار پائے گا۔ غلام اپنے آقاؤں کے ظلم و ستم سے تنگ آئے ہوئے تو تھے ہی اس آواز پر لبیک کہتے ہوئے ہزاروں کی تعداد میں اس کے گرد جمع ہو گئے۔ جب اس نے حبشی غلاموں کی اچھی خاصی جمعیت بہم پہنچائی تو ملک میں شورش برپا کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور عراق کے مختلف شہروں میں لوٹ مار شروع کر دی اور تھوڑے ہی عرصہ میں واسط و رامہرمز ایسے متعدد شہروں پر قابض ہو گیا۔ مرکزی حکومت کی طرف سے اس کی سرکوبی کے لیے لشکر بھیجے جاتے مگر اس کے جیالے سپاہی ان کے قدم ٹکنے نہ دیتے اور انہیں جنگ سے دست بردار ہو کر پسپا ہونے پر مجبور کر دیتے۔ ۲۵۲ھ میں ابلہ پر چڑھائی کی اور وہاں کے باشندوں کو تہ تیغ کر کے شہر میں آگ لگا دی اور اہواز تک کا علاقہ اپنے قبضہ میں لے لیا۔

۲۵۷ھ میں اس کے ایک سردار لشکر علی ابن ابان مہلبی نے بصرہ پر متعدد حملے کیے ہر حملہ میں ہزار آدمیوں کو قتل کیا اور محلوں کے محلے جلا دیے۔ جب بصرہ کے کشت و خون کی مرکز میں معتمد کو اطلاع ہوئی تو اس نے مولد کی سرکردگی میں ایک لشکر بھیجا جو دس دن تک لڑتا رہا۔ آخر حبشیوں نے اس کی فوج پر شب خون مارا اور اسے میدان

چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد ۹ برس تک جنگوں کا سلسلہ جاری رہا مگر حبشی سپاہ کو شکست نہ دی جا سکی ۲۶۶ھ میں معتمد نے ابوالعباس معتضد کو اس مہم پر متعین کیا۔ ابوالعباس دس ہزار کے لشکر کے ساتھ روانہ ہوا اور دشمن کا سامنا کرتے ہی اس پر ٹوٹ پڑا۔ کچھ دیر مقابلہ کیا اور پھر پیچھے کو ہٹا۔ حبشی اسکی پسپائی کو دیکھکر بہت خوش ہوئے اور جوش میں آکر آگے بڑھے۔ اتنے میں ایک فوجی دستہ نے جو ابوحمزہ نصیر کی قیادت میں کشتیوں کے ذریعہ پہنچا تھا عقب سے حملہ کر دیا۔ اس کے ساتھ ابوالعباس نے بھی پلٹ کر حملہ کیا۔ جب حبشی دو طرفہ گھر گئے تو ان میں بھگدڑ مچ گئی اور جدھر جس کا منہ آیا ادھر بھاگ کھڑا ہوا۔ چند دنوں کے بعد انہوں نے مجتمع ہو کر پھر حملوں کا آغاز کر دیا۔ ۲۶۷ھ میں ابوالعباس کا باپ موفق بھی ایک لشکر کثیر کے ساتھ پہنچ گیا اور ابوالعباس کے ساتھ مل کر میدان کارزار گرم کیا۔ آخر ۲۷۰ھ میں علی ابن محمد کے مارے جانے سے جنگوں کا سلسلہ رکا۔ ان جنگوں میں مقتولین کی صحیح تعداد کا اندازہ نہیں کیا جا سکا۔ سیوطی نے لکھا ہے کہ پندرہ لاکھ مسلمان تہ تیغ ہوئے اور بصرہ میں صرف ایک دن کے اندر تین لاکھ افراد مارے گئے۔ ہزاروں خاندانوں کی عزت و ناموس پامال ہوئی اور واسط، کوفہ اور اس کے اطراف کی بیس ہزار عورتوں اور بچوں کو حبشیوں کے پنجے سے چھڑایا گیا۔

ایران سے نکلنے والے تیل کے چشموں کے بارے میں فرمایا:

ویحا للطالقان فان للہ تعالی بھا کنوزا لیست من ذھب و لا فضۃ	طالقان میں اللہ کے ایسے خزانے ہیں جو نہ سونے کے ہیں اور نہ چاندی کے۔

(بحار الانوار)

داعیان طبرستان کے بارے میں فرمایا:

دعاۃ حتی تقوم باذن اللہ فتدعوا الی دین اللہ۔	چند داعی اللہ کے حکم سے کھڑے ہوں گے جو اللہ کے دین کی طرف دعوت دیں گے۔

بنی عباس نے جب علوی سادات کو اپنے مظالم کا نشانہ بنایا تو ان میں کا ایک خاندان طبرستان کے پہاڑی علاقہ میں آ کر آباد ہو گیا۔ ابتداء میں یہ لوگ مذہبی رہنماؤں کی حیثیت سے متعارف ہوئے اور مختلف مقامات پہ مبلغ و داعی بھیج کر تبلیغی فرائض انجام دیتے رہے۔ جب دعوت و تبلیغ کے نتیجہ میں ایک معتدبہ جمیعت ان کے ساتھ ہو گئی تو سیاست میں دخیل ہو گئے اور ۲۵۰ھ میں داعی کبیر حسن ابن زید کو حکمران منتخب کر کے طبرستان میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ حسن فقیہ، ادیب، شاعر اور شاعر نواز تھا۔ چنانچہ شعراء اس کے دربار میں قصائد پڑھتے اور انعام و اکرام حاصل کرتے۔ ایک مرتبہ ایک شاعر کو قصیدۂ مدحیہ پر دس ہزار درہم دیئے جو اس دور میں بہت بڑا انعام تھا۔ ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ ایک شاعر نے قصیدہ پڑھا جس کا ایک مصرعہ یہ تھا:

اللہ فرد و ابن زید فرد	اللہ یکتا ہے اور ابن زید بھی یکتا ہے۔

اس پر اس نے بگڑ کر کہا کہ اے دروغ گو تیرے منہ میں خاک تو نے یہ کیوں نہ کہا:

اللہ فرد و ابن زید عبد	اللہ یکتا ہے اور ابن زید ایک بندہ ہے۔

حسن نے انیس سال آٹھ مہینے چھ دن حکومت کرنے کے بعد ۲۷۰ھ میں وفات پائی۔

حسن کی وفات کے بعد اس کا بھائی محمد ابن زید قائم بالحق کے لقب سے برسر اقتدار آیا یہ بھی اپنے بھائی کی طرح علوم دینیہ و عربیہ کا ماہر تھا۔ اس کا تاریخی کارنامہ یہ ہے کہ اس نے کربلا میں صرف کثیر سے روضۂ سید الشہداء اور شہر پناہ تعمیر کرائی ابن اثیر نے تاریخ کامل میں لکھا ہے کہ دو آدمی آپس کا جھگڑا نمٹانے کے لیے اس کے سامنے پیش ہوئے۔ اس نے ان کے نام پوچھے تو ایک نے معاویہ بتایا اور دوسرے نے علی۔ اس نے یہ نام سنے تو کہا کہ بس فیصلہ ہو گیا۔ علی کے مقابلہ میں معاویہ حق بجانب نہیں ہو سکتا۔ معاویہ نے کہا کہ آپ ناموں پر فیصلہ نہ کیجیے ان ناموں میں ایک مصلحت پوشیدہ ہے کہا وہ کیا کہا کہ میرا باپ مخلص شیعہ تھا۔ اس نے نواصب کے شر سے بچنے کیلئے میرا نام معاویہ رکھا اور میرے اس حریف کا باپ ناصبی تھا۔ اس نے شیعوں اور علویوں کے ڈر سے اس کا نام علی رکھ دیا۔ محمد اس کی حاضر جوابی پر مسکرایا اور اسے اپنے مصاحبین میں شامل کر لیا۔

محمد کی حکومت اگرچہ طبرستان جرجان رے اصفہان اور کاشان تک پھیلی ہوئی تھی مگر اس نے عمرو بن لیث کی خراسان سے برطرفی کی خبر سنی تو اپنی مملکت کو وسعت دینے کے لیے خراسان پر حملہ کے ارادہ سے نکل کھڑا ہوا۔ جب جرجان کے قریب پہنچا اسمٰعیل ابن احمد سامانی نے جو خراسان پر قبضہ کر چکا تھا اسے پیغام بھجوایا کہ وہ واپس چلا جائے مگر اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہ رکے آخر دونوں میں جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ میں محمد شدید زخمی ہو گیا اور انہی زخموں کی وجہ سے ۲۸۷ھ میں انتقال کیا اور سامانیوں نے طبرستان پر قبضہ کر لیا۔

۳۰۱ھ میں علوی خاندان کا ایک فرد حسن ابن علی اطروش جو ناصر الحق کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، طبرستان پر حملہ آور ہوا اور سامانیوں کو وہاں سے باہر نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ ناصر الحق نے علوی حکومت تو دوبارہ قائم کر دی مگر خود اس جنگ میں مارا گیا اس وقت اس کی عمر ۹۷ برس تھی۔

ناصر الحق کی وفات کے بعد اس کے داماد حسن ابن قاسم کو طبرستان کی حکومت سپرد کی گئی مگر ناصر الحق کے بیٹوں ابو الحسین احمد حاکم جرجان اور ابو القاسم والی گیلان نے اسے حکومت سے بے دخل کر دیا۔ ابو الحسین احمد نے ۳۱۱ھ میں وفات پائی تو اس کا بیٹا ابو علی محمد طبرستان کے صدر مقام آمل میں مسند اقتدار پر بیٹھا مگر ماکان ابن کالی دیلمی نے آمل پر حملہ کر کے ابو علی محمد کو گرفتار کر کے جرجان بھیج دیا جہاں اس نے اپنی حکومت قائم کر لی۔ جب ابو علی محمد گھوڑے سے گر کر جاں بحق ہو گیا تو اس کے بھائی ابو جعفر حسن نے حکومت سنبھال لی مگر حسن ابن قاسم نے ماکان ابن کالی کے تعاون سے آمل پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا اور ابو جعفر حسن جرجان کی طرف چلا گیا۔ اس دوران میں اسفار ابن شیرویہ جو ابو جعفر حسن کی طرف سے ساریہ کا حاکم تھا حسن ابن قاسم پر حملہ آور ہوا۔ حسن ابن قاسم جو نوے برس کی عمر کا تھا لڑتا ہوا مارا گیا۔ ابو جعفر حسن کے بعد اس کا بھائی الثائر کا لقب اختیار کر کے حکمران ہوا جب الثائر کا ۳۵۵ھ میں انتقال ہوا تو اس کا بھائی حسن الناصر حکمران قرار پایا اور اس پر علوی حکومت کا اختتام ہو گیا۔

سلطنت فاطمیہ کے بانی عبید اللہ المہدی کے بارے میں فرمایا:

ثم یظهر صاحب القیروان الغض　　پھر قیروان کا فرماں روا ظاہر ہو گا جس کا جسم تر و تازہ اور

البض ذو النسب المحض المنتجب — نرم و نازک ہو گا صحیح نسب کا حامل اور اس کی اولاد میں سے ہو گا

من سلالة ذی البداء المسجی بالرداء — جس کے لیے بدا واقع ہو گا اور جسے چادر میں لپیٹ کر رکھا جائیگا

امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنی زندگی میں جناب اسمٰعیل کی امامت کا اظہار کیا تھا مگر جب وہ آپ کی زندگی ہی میں وفات پا گئے تو ان کی امامت کا سوال پیدا نہ ہوتا تھا اس لیے امام علیہ السلام نے رفع اشتباہ کے لیے ان کی میت کو ایک چادر میں لپیٹ کر رکھ دیا تھا اور اعیان و اکابر شیعہ کو ان کی میت دکھا دی تھی تاکہ انہیں موت کا یقین ہو جائے اور امامت کے سلسلہ میں بدا کے واقع ہونے میں کوئی شبہ نہ رہے مگر ایک گروہ نے اسمٰعیل کی وفات کے باوجود انہیں امام تسلیم کر لیا اور پھر ان کی اولاد میں سلسلہ امامت کے اجراء کے قائل ہو گئے چنانچہ اسمٰعیل کے بعد جعفر المصدق پھر محمد المکتوم پھر محمد الحبیب اور پھر عبید اللہ کو امام مانا جانے لگا۔ اس سلسلہ امامت کے قائل اسمٰعیلیہ کہلاتے ہیں ان کے نزدیک اسمٰعیل امام ہفتم تھے پھر تین امام مخفی ہوئے اور ان مخفی آئمہ کے بعد ائمہ ظاہر کا سلسلہ شروع ہوا اور عبید اللہ ابن محمد الحبیب پہلا امام قرار پایا۔ بعض مؤرخین نے عبید اللہ کی سیادت سے انکار کیا ہے مگر اکثر مؤرخین نے جن میں ابن خلکان اور ابن خلدون بھی شامل ہیں اسے صحیح النسب فاطمی سید تسلیم کیا ہے

فرقہ اسمٰعیلیہ کے مبلغ و داعی مختلف علاقوں میں اپنے نظریات کی تبلیغ کے لیے متعین کیے جاتے تھے چنانچہ ابو عبد اللہ حسن ابن محمد کو شمالی افریقہ کا داعی مقرر کیا گیا وہ پہلے حج کے دنوں میں مکہ آیا تاکہ افریقی لوگوں سے جو حج کے لیے آیا کرتے تھے راہ و رسم پیدا کرے اور ان کے ساتھ افریقہ کی راہ لے چنانچہ اس نے اہل کتامہ سے جو شمالی افریقہ میں واقع ہے روابط بڑھائے۔ اور حج سے فارغ ہو کر ان کے قافلہ کے ہمراہ کتامہ پہنچ گیا اور کچھ عرصہ اس علاقہ میں قیام کرنے سے اہل کتامہ کو اپنا گرویدہ بنا لیا اور پھر ان کے تعاون سے لشکر کشی کی اور مختلف شہروں کو فتح کرنے میں کامیاب ہو گیا جب اس نے شمالی افریقہ کے معتدبہ حصہ پر قبضہ کر لیا تو اپنے بھائی ابو العباس کو حمص کے علاقہ میں سلمیہ بھیجا تاکہ عبید اللہ کو عزت و احترام کے ساتھ یہاں لائے اور زمام حکومت اس کے ہاتھوں میں دے دی جائے۔ جب ابو العباس سلمیہ پہنچا تو عبید اللہ اس کے ہمراہ نکل کھڑا ہوا۔ المکتفی باللہ کو اس کی نقل و حرکت کی خبر دی گئی تو اس نے اس کی گرفتاری کا فرمان جاری کیا۔ عبید اللہ نے اس کی پرواہ نہ کی اور اپنے بیٹے ابو القاسم نزار کے ہمراہ غیر معروف راستوں پر ہو لیا اور مصر ہوتا ہوا طرابلس پہنچ گیا اور وہاں سے ابو العباس کو ابو عبد اللہ کی اطلاع دینے کیلیے کتامہ روانہ کر دیا۔ ابو العباس کتامہ جاتے ہوئے جب قیروان پہنچا تو وہاں کے حاکم زیادۃ اللہ نے اسے گرفتار کر کے قید خانہ میں ڈال دیا اور طرابلس کے عامل کو لکھا کہ وہ عبید اللہ کو گرفتار کر لے۔ عبید اللہ گرفتاری کی خبر سن کر سلجماسہ کی طرف چل دیا مگر یہاں بھی مرکزی حکومت کی طرف سے اس کی گرفتاری کا حکم پہنچ چکا تھا چنانچہ اسے گرفتار کر لیا گیا۔ ادھر ابو عبد اللہ نے لشکر کشی کا سلسلہ برابر جاری رکھا اور ۲۹۶ھ میں قیروان کو فتح کر کے اپنے بھائی ابو العباس کو زندان سے نکال کر سلجماسہ کو محاصرہ میں لے کر عبید اللہ اور اس کے بیٹے نزار کو قید سے رہا کیا اور انہیں رہائی دلانے کے بعد ربیع الثانی ۲۹۷ھ کو قیروان واپس پلٹ آیا اور اقتدار عبید اللہ کے سپرد کر کے اس کی فرمانروائی کا اعلان کیا۔ عبید اللہ نے شمالی افریقہ میں سلطنت عبیدیہ کی بنیاد رکھی اور چوبیس سال ایک ماہ اور بیس دن حکومت کرنے کے بعد ۳۲۲ھ میں فوت ہو گیا اس کے بعد اس کا بیٹا ابو القاسم نزار مسند حکومت پر بیٹھا اور جب اس کے تیسرے جانشین المعز لدین اللہ نے ۳۵۹ھ میں مصر پر قبضہ کیا تو مصر کو دار الحکومت قرار دے لیا سلطنت عبیدیہ

۲۷۶ برس تک قائم رہی۔

سلاطین دیالمہ کے بارے میں فرمایا:

یخرج من دیلمان بنو الصیاد ثم یستقوی امرھم حتی یملکوا الزوراء ویخلعوا الخلفاء۔	دیلم سے ایک شکاری کی اولاد میدان میں نکلے گی جس کا اقتدار اتنا مضبوط ہوگا کہ وہ بغداد پر چھا جائیگی اور خلفاء کو برطرف کرے گی۔

زمانہ سابق میں بحر خزر کا جنوبی علاقہ دیلم کہلاتا تھا اور وہاں کے باشندے بھی دیلم اور دیالمہ کے نام سے پکارے جاتے تھے یہاں ایک شخص بویہ نامی مقیم تھا جس کی کنیت ابوشجاع تھی اگرچہ وہ شاہان فارس کی اولاد میں سے تھا مگر غربت و ناداری کی بنا پر بحیرہ کیسپین میں مچھلیاں پکڑ کر گذر بسر کرتا تھا۔ اس کے تین لڑکے تھے علی، حسن اور احمد جو اپنے حسن تدبر اور سعی پیہم سے فارس کے تمام صوبوں پر قابض ہو گئے اور عماد الدولہ، رکن الدولہ اور معز الدولہ کے لقب سے مشہور ہوئے۔ ان کا دائرۂ اختیار و اقتدار اتنا وسیع تھا کہ بغداد کا مرکز خلافت بھی ان کے زیر اثر ہو گیا۔ دربار خلافت میں خلیفہ کے پہلو بہ پہلو بیٹھتے اور خلیفہ کے نام کے ساتھ ان کا نام بھی سکوں پر لکھا جاتا بلکہ خلیفہ کی معزولی اور بحالی ان کے اختیار میں تھی اور جسے چاہتے مسند خلافت پر بٹھا دیتے اور جسے چاہتے اتار دیتے۔

چنانچہ جب معز الدولہ کو یہ معلوم ہوا کہ مستکفی باللہ ترکوں کی مدد سے اسے قتل یا بغداد سے باہر نکال دینا چاہتا ہے تو اس کے فرستادہ چند دیلمی مستکفی کے دربار میں آئے اور اس کی طرف بڑھے وہ یہ سمجھا کہ درباری دستور کے مطابق دست بوسی کا شرف حاصل کرنا چاہتے ہیں اس نے ہاتھ آگے کر دیا انہوں نے اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر اسے نیچے اتار لیا اور گھسیٹتے ہوئے معز الدولہ کے پاس لے آئے اس نے اسے قید کر دیا اور المطیع للہ کو مسند خلافت پر بٹھا دیا۔ اسی طرح رکن الدولہ کے پوتے ابونصر بہاء الدولہ ابن عضد الدولہ کے حکم سے الطائع للہ کو بھرے دربار میں تخت خلافت سے نیچے اتار لیا گیا وہ چیختا چلاتا رہا مگر اس کی حمایت میں نہ کسی کو زبان کھولنے کی جرأت ہوئی اور نہ تلوار کو حرکت دینے کی ہمت۔ بہاء الدولہ نے اسے معزول کرنے کے بعد چند آدمیوں کو متقی کے بیٹے قادر باللہ کے پاس بھیجا جو طائع کے خوف سے بطیحہ میں مقیم تھا تاکہ طائع کی جگہ پر اسے مسند خلافت پر بٹھایا جائے۔

ابن اثیر جزری نے تحریر کیا ہے کہ ہبۃ اللہ ابن عیسیٰ نے بیان کیا کہ جب قادر باللہ بطیحہ میں مقیم تھا تو میں ہفتہ میں دو مرتبہ اس کے ہاں آتا تھا۔ وہ میرا احترام کرتا اور خندہ پیشانی سے پیش آتا۔ ایک مرتبہ میں اس کے ہاں گیا تو وہ اس خندہ روئی سے پیش نہ آیا جو اس کا معمول تھا میں نے کہا کہ آج آپ کی پذیرائی کا انداز کچھ بدلا ہوا ہے۔ اگر مجھ سے کوئی لغزش ہوئی ہو یا کوئی ناگوار بات کہی ہو تو معذرت چاہتا ہوں کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ میں نے رات ایک خواب دیکھا ہے جس کا میرے دل و دماغ پر اثر ہے اور میں کچھ کھویا سا گیا ہوں۔ میں نے کہا کہ وہ خواب تو بیان کیجیے کہا کہ میں نے دیکھا کہ ایک وسیع و عریض دریا ہے جس کا پاٹ دجلہ سے کئی گنا بڑا ہے۔ میں اس دریا کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ آگے بڑھ کر ایک بلند و بالا پل نظر آیا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اتنے بڑے دریا پر اتنا اونچا اور مضبوط پل کس نے بنایا ہے۔ ابھی میں حیران و ششدر کھڑا تھا

۲۷۴ برس تک قائم رہی۔

سلاطین دیالمہ کے بارے میں فرمایا:

یخرج من دیلمان بنو الصیاد ثم یستقوی امرھم حتی یملکوا الزوراء ویخلعوا الخلفاء۔	دیلم سے ایک شکاری کی اولاد میدان میں نکلے گی جس کا اقتدار اتنا مضبوط ہوگا کہ وہ بغداد پر چھا جائیگی اور خلفاء کو برطرف کرے گی۔

زمانہ سابق میں بحر خزر کا جنوبی علاقہ دیلم کہلاتا تھا اور وہاں کے باشندے بھی دیلم اور دیالمہ کے نام سے پکارے جاتے تھے یہاں ایک شخص بویہ نامی مقیم تھا جس کی کنیت ابو شجاع تھی اگرچہ وہ شاہان فارس کی اولاد میں سے تھا مگر غربت و ناداری کی بنا پر بحیرہ کیسپین میں مچھلیاں پکڑ کر گذر بسر کرتا تھا۔ اس کے تین لڑکے تھے علی، حسن اور احمد جو اپنے حسن تدبر اور سعی پیہم سے فارس کے تمام صوبوں پر قابض ہو گئے اور عماد الدولہ، رکن الدولہ اور معز الدولہ کے لقب سے مشہور ہوئے۔ ان کا دائرۂ اختیار و اقتدار اتنا وسیع تھا کہ بغداد کا مرکز خلافت بھی ان کے زیر اثر ہو گیا۔ دربار خلافت میں خلیفہ کے پہلو بہ پہلو بیٹھتے اور خلیفہ کے نام کے ساتھ ان کا نام بھی سکوں پر لکھا جاتا بلکہ خلیفہ کی معزولی اور بحالی ان کے اختیار میں تھی اور جسے چاہتے مسند خلافت پر بٹھا دیتے اور جسے چاہتے اتار دیتے۔

چنانچہ جب معز الدولہ کو یہ معلوم ہوا کہ مستکفی باللہ ترکوں کی مدد سے اسے قتل یا بغداد سے باہر نکال دینا چاہتا ہے تو اس کے فرستادہ چند دیلمی مستکفی کے دربار میں آئے اور اس کی طرف بڑھے وہ یہ سمجھا کہ درباری دستور کے مطابق دست بوسی کا شرف حاصل کرنا چاہتے ہیں اس نے ہاتھ آگے کر دیا انہوں نے اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر اسے نیچے اتار لیا اور گھسیٹتے ہوئے معز الدولہ کے پاس لے آئے اس نے اسے قید کر دیا اور المطیع للہ کو مسند خلافت پر بٹھا دیا۔ اسی طرح رکن الدولہ کے پوتے ابو نصر بہاء الدولہ ابن عضد الدولہ کے حکم سے الطائع للہ کو بھرے دربار میں تخت خلافت سے نیچے اتار لیا گیا وہ چیختا چلاتا رہا مگر اس کی حمایت میں نہ کسی کو زبان کھولنے کی جرأت ہوئی اور نہ تلوار کو حرکت دینے کی ہمت۔ بہاء الدولہ نے اسے معزول کرنے کے بعد چند آدمیوں کو متقی کے بیٹے قادر باللہ کے پاس بھیجا جو طائع کے خوف سے بطیحہ میں مقیم تھا تاکہ طائع کی جگہ پر اسے مسند خلافت پر بٹھایا جائے۔

ابن اثیر جزری نے تحریر کیا ہے کہ ہبۃ اللہ ابن عیسیٰ نے بیان کیا کہ جب قادر باللہ بطیحہ میں مقیم تھا تو میں ہفتہ میں دو مرتبہ اس کے ہاں آتا تھا۔ وہ میرا احترام کرتا اور خندہ پیشانی سے پیش آتا۔ ایک مرتبہ میں اس کے ہاں گیا تو وہ اس خندہ روئی سے پیش نہ آیا جو اس کا معمول تھا۔ میں نے کہا کہ آج آپ کی پذیرائی کا انداز کچھ بدلا ہوا ہے۔ اگر مجھ سے کوئی لغزش ہوئی ہو یا کوئی ناگوار بات کہی ہو تو معذرت چاہتا ہوں کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ میں نے رات ایک خواب دیکھا ہے جس کا میرے دل و دماغ پر اثر ہے اور میں کچھ کھویا سا گیا ہوں۔ میں نے کہا کہ وہ خواب تو بیان کیجیے کہا کہ میں نے دیکھا کہ ایک وسیع و عریض دریا ہے جس کا پاٹ دجلہ سے کئی گنا بڑا ہے۔ میں اس دریا کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ آگے بڑھ کر ایک بلند و بالا پل نظر آیا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اتنے بڑے دریا پر اتنا اونچا اور مضبوط پل کس نے بنایا ہے۔ ابھی میں حیران و ششدر کھڑا تھا

کہ ایک شخص کو دیکھا جو بڑے غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کیا تم اس دریا کو عبور کرنا چاہتے ہو؟ میں نے کہا ہاں۔ اس نے وہیں سے ہاتھ بڑھایا اور مجھے پکڑ کر دریا کے اس پار اتار دیا۔ میں نے اس کی یہ غیر معمولی قوت وطاقت دیکھی تو مجھ پر ہیبت طاری ہو گئی۔ میں نے پوچھا کہ آپ کون ہیں کہا:

علی ابن ابی طالب وھذا الامر صائر الیک ویطول عمرک فیہ فاحسن الی ولدی وشیعتی۔ (تاریخ کامل ج ۷، ص ۱۴۸)

میں علی ابن ابی طالب ہوں۔ یہ حکومت تمہاری طرف پلٹے گی۔ اور تمہاری طویل عمر ہوگی۔ لہٰذا میری اولاد اور میرے شیعوں سے نیک برتاؤ کرنا۔

ہبۃ اللہ کہتا ہے کہ ادھر اس نے خواب ختم کیا۔ ادھر باہر سے شور سنائی دیا۔ جھانک کر دیکھا تو دروازہ پر لوگوں کا ہجوم تھا۔ اور تہنیت وتبریک کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ وجہ پوچھی تو بتایا گیا کہ بہاء الدولہ کے آدمی آئے ہیں جو قادر باللہ کو بغداد لے جانا چاہتے ہیں تاکہ تخت وتاج خلافت اس کے سپرد کیا جائے۔ قادر باللہ نے یہ سنا تو دم بخود ہو کر رہ گیا اور اسی وقت بہاء اللہ کے آدمیوں کے ساتھ بغداد روانہ ہو گیا۔ جب بغداد پہنچا تو بہاء اللہ، ارکان دولت اور رؤسائے شہر نے اس کا پرجوش استقبال کیا اور اپنے جلو میں لے کر قصر خلافت میں اتارا۔ قادر باللہ نے اکتالیس برس تین ماہ کا طویل عرصہ حکومت کی۔

تاتاریوں اور ان کی خونریزیوں کے بارے میں فرمایا:

کانی اراھم قوما کان وجوھھم المجان المطرقۃ یلبسون السرق والدیباج ویعتبقون العتاق ویکون ھناک استحرار قتل حتی یمشی المجروح علی المقتول ویکون المفلت اقل من الماسور

میں ایسے لوگوں کو دیکھ رہا ہوں کہ جن کے چہرے ان ڈھالوں کی طرح ہیں کہ جن پر چمڑے کی تہیں منڈھی ہوئی ہوں۔ وہ ابریشم ودیبا کے کپڑے پہنتے ہیں اور اصیل گھوڑوں کو عزیز رکھتے ہیں اور وہاں کشت وخون کی گرم بازاری ہوگی اور بچ کر بھاگ نکلنے والے اسیر ہونے والوں سے کم ہوں گے۔

☆ ☆ ☆ ☆

قبیلہ تاتار منگولیا کے صحرائے گوبی میں متمدن دنیا سے الگ تھلگ وحشیانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ ان لوگوں کے سینے چوڑے چہرے چپٹے اور خدوخال ترکوں سے ملتے جلتے تھے۔ ایک نسل سے ہونے کے باوجود مختلف شاخوں اور ٹولیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ہر شاخ کا ایک سردار ہوتا تھا جو اپنے قبیلہ کی سود وبہبود کا نگران سمجھا جاتا تھا۔

۲۰ ذی قعدہ ۵۴۹ھ میں شمالی علاقہ کے سردار کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام تموچین (فولادی ٹکڑا) رکھا گیا۔ ابھی یہ بچہ تیرہ برس ہی کا تھا کہ اس کا باپ زہر سے ہلاک کر دیا گیا۔ یہ بچہ جس نے بعد میں قاآن اعظم چنگیز خاں کے نام سے شہرت پائی اپنے باپ کی جگہ پر سردار قرار پایا اگرچہ اس کی مخالفت میں آوازیں اٹھیں مگر اس نے خود اعتمادی کا سہارا لے کر مخالف آوازوں کو خاموش کر دیا اور اپنے حسن تدبر اور زور بازو سے آس پاس کے علاقوں کو فتح کر لیا اور اپنی طاقت اتنی بڑھالی کہ ایک تاتاری سردار نے اپنی لڑکی اسے بیاہ دی اور آپس میں معاہدہ صلح کر لیا۔ جب وہ مر گیا تو چنگیز خاں نے اس کے علاقہ پر بھی قبضہ کر لیا اور پراگندہ ومنتشر ریاستوں کو ختم کر کے ایک مستحکم ووسیع مملکت تشکیل دے لی۔ اسی چنگیز خاں کی قیادت میں تاتاریوں نے

اسلامی مملکتوں پر تاخت کی اور آبادیوں کو بے نشان شہروں کو ویران اور لاکھوں آدمیوں کو تہ تیغ کر کے اپنی فرمانروائی کا پرچم بلند کیا۔ اس مار دھاڑ اور قتل و غارت کا آغاز اس طرح ہوا کہ اس کے ہمسایہ ملک خوارزم کے چند تاجر تاتاریوں کے علاقہ میں آئے جن کے پاس عمدہ ریشمیں کپڑے تھے۔ چنگیز خاں عمدہ کپڑوں کی تلاش میں رہتا تھا اس نے حسب پسند کپڑے خریدے اور مزید خریداری کے لیے اپنے ہاں کے آدمی ان تاجروں کے ہمراہ خوارزم بھیجے تاکہ وہ کپڑا اور دوسری چیزیں خرید کر لائیں۔ جب یہ لوگ واپسی پر خوارزم کے سرحدی گاؤں اترار میں پہنچے تو والیٔ اترار نے خوارزم شاہ کے حکم سے ان کا مال ضبط کر لیا اور ان آدمیوں کو جو کئی سو تھے قتل کر دیا۔ حالانکہ دونوں مملکتوں میں تاجروں کے آزادانہ آنے جانے کا معاہدہ ہو چکا تھا۔ چنگیز خاں کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے خوارزم شاہ کو ایک ایلچی کے ذریعہ پیغام بھیجا کہ وہ والیٔ اترار کو قصاص کے لیے اس کے حوالے کرے مگر اس نے ناعاقبت اندیشی سے نہ صرف والیٔ اترار کو اس کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا بلکہ ایلچی کو قتل کر کے اعلانِ جنگ کر دیا اور ایک لشکرِ جرار تاتاریوں کی سرحد پر اتار دیا۔

چنگیز خاں کا بیٹا جوجی خاں لشکر لے کر نکلا اور خوارزم کے لشکر کو پسپا کر دیا۔ خوارزمیوں کی پسپائی سے تاتاریوں کے حوصلے بڑھ گئے اور وہ ایران کے مختلف شہروں پر حملہ آور ہونے کے لیے نکل کھڑے ہوئے اور چنگیز خاں کے بیٹوں چغتائی خاں اور اکتائی خاں نے اترار کے قلعہ کو محاصرہ میں لے کر والیٔ اترار کو زندہ گرفتار کر لیا اور اس کی آنکھوں اور کانوں میں پگھلی ہوئی چاندی انڈیل کر اسے ہلاک کر دیا اور خود چنگیز خاں ایک عظیم لشکر کے ساتھ بخارا کی طرف روانہ ہوا اور وہاں کی آبادی کو قتل کر کے شہر میں آگ لگا دی اور بچے کھچے لوگوں کو غلام بنا لیا۔ بخارا کو تباہ کرنے کے بعد سمرقند کا رخ کیا۔ یہاں کے لوگوں نے مقابلہ کے لیے ہاتھ پیر مارے مگر چنگیزی فوجوں کے آگے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ یہاں بھی تاتاریوں نے قتل عام کیا اور باقی ماندہ زن و مرد کو کنیز و غلام بنا کر ساتھ لے لیا پھر خوارزم پر حملہ آور ہوئے۔ شاہ خوارزم دار الحکومت چھوڑ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ سر چھپاتا پھرتا تھا۔ اہل شہر نے دیکھا کہ تاتاریوں کا لشکر مختصر ہے۔ انہیں آسانی سے پسپا کیا جا سکتا ہے چنانچہ وہ مقابلہ کے لیے باہر نکل آئے ان کے باہر نکلتے ہی تاتاریوں نے جو ادھر ادھر کمین گاہوں میں چھپے ہوئے تھے یکبارگی حملہ کر دیا۔ ایک لاکھ آدمیوں کو قتل کر کے شہر کو لوٹ لیا اور دریا کا بند توڑ کر اسے تہ آب کر دیا۔

خوارزم کو تباہ کرنے کے بعد خراسان کا رخ کیا اور بے دریغ انسانی خون بہایا۔ خراسان کے بعد بدخشان کو برباد کیا یہاں سے بلخ کی طرف بڑھے اور پوری آبادی کو تہ تیغ کر دیا پھر بامیان اور طالقان پر فوج کشی کی اور پوری طرح خون آشامی کا مظاہرہ کیا۔ پھر نسا کا رخ کیا اور زن و مرد کو موت کے گھاٹ اتارا۔ اسی طرح سبزوار، نیشاپور، مرو، ہرات اور دوسرے شہروں کو لوٹا۔ شاہ خوارزم کا بیٹا جلال الدین غزنین کی طرف جا چکا تھا۔ چنگیز خان نے اس کا تعاقب کیا مگر وہ غزنین چھوڑ چکا تھا۔ اس نے تعاقب جاری رکھا اور دریائے سندھ کے کنارے پر اسے گھیر لیا۔ جلال الدین نے گھوڑا دریا میں ڈال دیا اور موجوں سے ٹکراتا ہوا دوسری سمت نکل گیا۔ چنگیز خان نے اس کے بال بچوں کو قتل کر دیا اور غزنہ اور غور پر قبضہ کر لیا۔ غرض تاتاریوں نے وسطِ ایشیا سے روس تک تہلکہ مچا دیا۔ شہروں کو کھنڈر، آبادیوں کو ویران اور میدانوں کے میدان لاشوں سے پاٹ دیے۔

تعمیر بغداد کے بارے میں فرمایا:

تبنی لهم مدینة یقال لها الزوراء بین دجلة ودجیل

بنی عباس کے لیے دریائے دجلہ اور نہر دجیل کے درمیان ایک شہر کی بنیاد رکھی جائے گی جسے زوراء کہا جائے گا۔

٭ ٭ ٭

زوراء بغداد کا دوسرا نام ہے۔ اس کی بنیاد عباسیین کے دوسرے حکمران منصور دوانیقی نے ۱۴۴ھ میں رکھی اس نے ماہر مہندسین سے اس کا نقشہ بنوایا۔ مختلف جگہوں سے معمار و کاریگر جمع کیے اور ہر روز ایک لاکھ معماروں اور مزدوروں نے کام کر کے اس کو تکمیل تک پہنچایا۔ وسطِ شہر میں قصرِ شاہی اور امرائے سلطنت کے محلات تعمیر کیے گئے اور باب خراسان باب البصرہ باب الکوفہ اور باب الشام سے اس کی حد بندی کی گئی۔

اصبغ ابن نباتہ نے بیان کیا کہ صفین کی طرف جاتے ہوئے امیر المؤمنین ایک اونچے ٹیلے پر کھڑے ہوئے اور اس ٹیلے اور بابل کے درمیان سرکنڈوں کے ایک جنگل کی طرف اشارہ کر کے فرمایا "شہر ہے اور کیا شہر ہے"۔ میں نے عرض کیا کہ یا امیر المؤمنین کیا یہاں کبھی کوئی شہر آباد تھا جس کے کھنڈر دیکھ کر آپ یہ فرما رہے ہیں۔ فرمایا:

لا ولکن ستکون مدینة یقال لها الحلة السیفیة۔

نہیں بلکہ یہاں ایک شہر آباد ہوگا جسے حلہ سیفیہ کہا جائے گا۔

چنانچہ سیف الدولہ صدقہ ابن منصور نے سلطان ملک شاہ کی اولاد کی باہم آویزیوں سے کنارہ کش رہنے کے لیے ۴۹۵ھ میں اس سرزمین پر قیام کیا اور اپنے اہل و عیال اور لشکر کے لیے متعدد مکانات تعمیر کرائے جس کے بعد لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی اور سیف الدولہ کی زندگی ہی میں ایک شہر سا آباد ہو گیا جو حلہ سیفیہ کے نام سے موسوم ہوا۔

امیر المؤمنین اپنے چند اصحاب کے ہمراہ بیرونِ کوفہ تشریف فرما ہوئے اور ایک جانب اشارہ کر کے فرمایا:

لا تذهب الایام حتی یحضر ههنا نهر یجری فیه الماء۔

کچھ عرصہ کے بعد یہاں نہر کھودی جائے گی جس میں پانی رواں ہوگا۔

کچھ لوگوں نے کہا کیا ایسا بھی ہوگا فرمایا کہ ہاں چنانچہ اب کوفہ کے پہلو میں نہر رواں ہے اور نہر آصفی کے نام سے موسوم ہے۔

امیر المؤمنین نے بصرہ جاتے ہوئے ذی قار میں منزل کی تو فرمایا کوفہ سے پورے ایک ہزار آدمی آئیں گے نہ ایک زیادہ ہوگا نہ ایک کم۔ وہ مرنے اور جان دینے کا معاہدہ کریں گے اور اس معاہدہ پر ثابت قدم رہیں گے۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ مجھے یہ خدشہ ہوا کہ کہیں اس تعداد میں کمی یا بیشی نہ ہو جائے ورنہ ساتھ والے شک و شبہ میں پڑ جائیں گے چنانچہ میں نے آنے والوں کو شمار کرنا شروع کیا۔ جب آنے والوں کی تعداد نو سو ننانوے تک پہنچی تو ان کا سلسلہ رک گیا۔ میں نے دل میں کہا کہ حضرت نے یہ کہا ہی کیوں تھا کہ نہ ایک کم ہوگا نہ زیادہ۔ ابھی میں اسی پریشان خیالی میں تھا کہ ایک شخص کو آتے دیکھا جو اون کا کرتہ پہنے اور تلوار زرہ اور ایک مشکیزہ لیے ہوئے تھا۔ اس نے حضرت کے قریب پہنچ کر کہا کہ ہاتھ بڑھائیے تاکہ میں آپ کی بیعت کروں فرمایا کس بات پر بیعت کرو گے۔ کہا جہاد اور پیمانِ اطاعت پر۔ پوچھا کہ تمہارا نام کیا ہے کہا اویس قرنی۔ حضرت نے یہ نام سنا تو بلند آواز سے تکبیر کہی اور فرمایا

کہ میرے حبیب اور اللہ کے رسول مجھے یہ خبر دے گئے تھے کہ میں ایک ایسے شخص سے ملاقات کروں گا جو اللہ کے گروہ میں شامل اور شہادت و شفاعت کے درجہ پر فائز ہو گا۔

دورِ آخر کے علائم و آثار کے سلسلہ میں فرمایا:

یاتی علی الناس زمان یرتفع فیہ الفاحشۃ ولتصنع و ینتھک فیہ المحارم ویعلن فیہ الزنا ویستحل فیہ اموال الیتمی ویوکل الربو ا ویطفف فی المکاییل والموازین ویستحل الخمر بالنبیذ والرشوۃ بالھدیۃ والخیانۃ بالامانۃ ویتشبہ الرجال بالنساء والنساء بالرجال ویستخف بحدود الصلواۃ ویحج فیہ لغیر اللہ۔ (بحار الانوار)

لوگوں پر ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا جس میں بدکاری وسعت معاش کے لیے بطور پیشہ اختیار کی جائے گی۔ اللہ کے حدود توڑے جائیں گے۔ زنا کھلے بندوں ہو گا۔ یتیموں کا مال حلال سمجھا جائے گا۔ سود کھایا جائے گا۔ ناپ تول میں کمی کی جائے گی۔ شراب کو آبِ انگور، رشوت کو ہدیہ اور خیانت کو امانت کی صورت میں حلال قرار دیا جائیگا مرد عورتوں کی اور عورتیں مردوں کی مشابہت اختیار کریں گی۔ نماز کے حدود و شرائط کو سبک سمجھا جائیگا اور حج اللہ کے علاوہ اور مقاصد کے لیے کیا جائے گا۔

تاریخ عالم شاہد ہے کہ جس قوم نے تقوٰی و پرہیزگاری کی شاہراہ اختیار کی۔ راست بازی کو اپنا شعار بنایا اور حدود الٰہیہ کا احترام ملحوظ رکھا وہ پھلی پھولی اور برگ و بار لائی اور جس نے معصیت و سرکشی اختیار کی وہ اس کے نتائج سوء سے بچ نہ سکی۔ امیر المومنین نے اسلام کے دورِ انحطاط کے علائم میں انہی بداعمالیوں کو سرِ فہرست جگہ دی ہے۔ ان علائم کی جھلک عصرِ حاضر میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ چنانچہ راگ رنگ رقص و سرود اور اس قسم کے محرمات کو تہذیب و ثقافت کا نام دیا جاتا ہے۔ زنا و غنا کاروبار کے طور پر اختیار کیا جاتا ہے۔ حیلے حوالوں اور غلط تاویلوں کا سہارا لے کر سندِ جواز مہیا کی جاتی ہے۔ رشوت ہدیہ سمجھ کر وصول کی جاتی ہے اور شراب آبِ انگور، آبِ جو اور دوسرے ناموں سے بے جھجک استعمال کی جاتی ہے اور اس تبدیلیٔ اسم کو وجہ جواز قرار دے لیا جاتا ہے۔ اسی طرح سود کو ایک طرح کا لین دین کہہ کر جائز سمجھ لیا جاتا ہے۔ حالاں کہ سود اور تجارت دو الگ الگ چیزیں ہیں کاروبار میں نفع و نقصان دونوں کی گنجائش ہوتی ہے اور سود میں نقصان کا پہلو نہیں ہوتا بلکہ نفع ہی نفع ہوتا ہے جو دوسروں کی مجبوری و بے بسی سے فائدہ اٹھا کر سمیٹا جاتا ہے۔ موجودہ معاشرہ میں ناپ تول میں کمی اور امانت میں خیانت ایسی برائیاں بھی کم نہیں ہیں اور یہ بھی ہر رہگذر پر مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ مرد حرکات و سکنات، رفتار و گفتار اور وضع و لباس میں عورتوں کی نقالی کرتے اور عورتیں مردوں کی چال ڈھال کا چربہ اتارتی نظر آتی ہیں اور بعض اوقات تو یہ تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ جسے ہم دیکھ رہے ہیں وہ مرد بصورت زن ہے یا زن بصورت مرد ہے۔ رہے اسلامی فرائض تو انہیں چنداں اہمیت نہیں دی جاتی۔ اگر ان کی اہمیت کا احساس ہوتا تو ان حدود پر بھی توجہ مرکوز ہوتی جو ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہیں۔ چنانچہ نماز پڑھی جاتی ہے تو نہ وضو کی صحت و عدم صحت پر نظر کی جاتی ہے نہ جگہ کی اباحت اور جسم و لباس کی طہارت کا خیال کیا جاتا ہے حالانکہ ان شرائط کو پورا نہ کیا جائے تو نماز کا پڑھنا اور نہ پڑھنا دونوں برابر ہو جاتے ہیں اور حج میں سیر و سیاحت، شہرت اور تجارت

ایسے مقاصد بھی شامل کر لیے جاتے ہیں حالانکہ حج وہ ہے جو خالصۃً اللہ کے لیے ہو اور اس میں کوئی دنیوی مقصد کار فرما نہ ہو۔

بَد دُعا کے فوری اثرات

انبیاء، آئمہ اور خاصانِ خدا کی دعائیں وہ کسی کے حق میں ہوں یا خلاف، بارگاہِ الٰہی میں مستجاب ہوتی ہیں اور خداوند عالم ان کے مرتبہ ومقام اور تقرب کے پیش نظر ان کی کسی دُعا کو مسترد نہیں کرتا کیوں کہ وہ جس کے حق میں دعا کرتے ہیں وہ اس دعا کا سزاوار ہوتا ہے اور بد دعا کرتے ہیں تو اس کے لیے جس کا رویہ معاندانہ وجارحانہ ہوتا ہے اور وہ سچ کو سچ سمجھتے ہوئے اس کے جھٹلانے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس ضد اور کد کا پھر یہی علاج رہ جاتا ہے کہ اسے بد دُعا کا ہدف بنایا جائے اور اس کی تنبیہ وسرزنش کے لیے قدرت کی گرفت کو للکارا جائے۔

امیر المؤمنین بھی انہی اولیاء اللہ اور خاصانِ خدا میں سے تھے جن کی کوئی دُعا شرفِ قبولیت حاصل کیے بغیر نہ رہتی تھی اور دُعا کے الفاظ منہ سے نکلتے ہی قبولیت سے ہمکنار ہو جاتے تھے۔ ابن مسعود کہتے ہیں:

لا تتعرضوا الدعوۃ علی فانھا لا ترد — علی کی بد دُعا نہ لینا اس لیے کہ ان کی دُعا رد نہیں ہوتی۔

(مناقب)

استجابتِ دعا کے سلسلہ میں چند واقعات درج کیے جاتے ہیں۔

علی ابن زاذان کہتے ہیں کہ حضرت علی نے ایک حدیث بیان فرمائی تو ایک دریدہ دہن نے اس کی تکذیب کی۔ آپ نے فرمایا کہ میں تمہارے لیے بدُعا کروں گا۔ اگر میں جھوٹا ہوں گا تو بد دعا کا کوئی اثر نہ ہوگا اور اگر میں سچا ہوں گا تو بد دعا اثر کیے بغیر نہیں رہے گی۔ اس نے کہا اگر آپ سچ کہتے ہیں تو بد دعا کیجیے۔ آپ نے بد دعا کی اور اس کی آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔

جمیع ابن عمیر بیان کرتے ہیں کہ عیزار نامی ایک شخص معاویہ کو عراق کے حالات سے آگاہ کیا کرتا تھا۔ حضرت کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے اسے بلا کر کہا، کہ میں نے تمہارے بارے میں سُنا ہے کہ تم شامیوں کے جاسوس ہو۔ کیا تم قسم کھا کر مجھے مطمئن کر سکتے ہو کہ تم نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی۔ اس نے قسم کھا کر کہا کہ آپ کو میرے بارے میں غلط اطلاع دی گئی ہے۔ آپ نے فرمایا:

ان کنت کاذبا فاعمی اللہ بصرک۔ — اگر تم جھوٹے ہو تو اللہ تمہیں نابینا کرے۔

اس واقعہ کو ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ وہ بصارت سے محروم ہو گیا۔

ایک مرتبہ امیر المؤمنین نے بھرے مجمع میں فرمایا کہ تم میں کون ہے جس نے پیغمبر اکرم کا یہ ارشاد سنا ہے۔

من کنت مولاہ فعلی مولاہ اللھم — جس کا میں مولا ہوں اس کے علی بھی مولا ہیں اے اللہ

وال من والاہ وعاد من — جو علی کو دوست رکھے تو بھی اسے دوست رکھ اور

عادا کا۔ جو انہیں دشمن رکھے تو بھی اسے دشمن رکھ۔

کچھ لوگوں نے اس حدیث کی صحت کی گواہی دی مگر انس بن مالک چپ رہے۔ حضرت نے فرمایا کہ اے انس تم بھی تو غدیر کے موقع پر موجود تھے۔ کیا تم نے آنحضرت کی زبان سے یہ الفاظ نہیں سنے کہا کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں میرا حافظہ کام نہیں کرتا۔ حضرت نے یہ سُنا تو فرمایا:

ان کنت کاذبا فضربک اللہ ببیضاء لا معتہ لا تواریھا العمامۃ (المعارف)

اگر تم جھوٹ کہتے ہو تو خدا تمہیں ایسے برص میں مبتلا کرے جسے عمامہ بھی نہ چھپا سکے۔

چنانچہ وہ برص میں مبتلا ہو گئے جس کے بعد وہ اپنا چہرہ ہمیشہ ڈھانپے رکھتے تھے۔

ایک مرتبہ حسن بصری ایک جدول کے کنارے وضو کر رہا تھا کہ ادھر سے امیرالمومنین کا گذر ہوا۔ آپ نے اسے وضو کرتے دیکھا تو فرمایا اعضاء وضو کو اس طرح دھوؤ کہ کوئی جزو خشک نہ رہ جائے اس نے کہا کہ کل تو آپ نے ان لوگوں کو تہ تیغ کر دیا جو پوری طرح وضو کرتے تھے۔ فرمایا کیا تم ان کے قتل پر رنجیدہ و غمگین ہو کہا ہاں۔ فرمایا:

فاطال اللہ حزنک (بحار الانوار)

تو اللہ تمہیں ہمیشہ غمگین رکھے۔

ایوب سجستانی کہتے ہیں کہ میں نے جب بھی اسے دیکھا اسے افسردہ و غمگین پایا گویا اپنے کسی عزیز کو دفن کر کے پلٹا ہے میں نے اس کی وجہ پوچھی تو کہا:

عمل فی دعوۃ الرجل الصالح (بحار الانوار)

یہ ایک مرد صالح کی بددعا کا نتیجہ ہے۔

جب بسر ابن ابی ارطاۃ نے عبیداللہ ابن عباس کے دو کمسن بچوں کو ان کی ماں ام الحکم جویریہ کے سامنے ذبح کر دیا تو حضرت نے بددعا کرتے ہوئے فرمایا:

اللھم اسلبہ دینہ وعقلہ

خدایا بسر سے دین اور عقل سلب کر لے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا اس کا دین بھی جاتا رہا اور عقل بھی جاتی رہی اور آخر عمر میں اس کی دیوانگی کی یہ کیفیت تھی کہ لوگوں نے لکڑی کی ایک تلوار اسے دے دی جسے وہ مشک پر جس میں ہوا بھری ہوئی تھی دن بھر چلاتا اور یوں اپنے جذبۂ خون آشامی کو تسکین دیتا یہاں تک کہ موت نے اسے جکڑ لیا۔

حضرت کوفہ میں بنی مراد کے ایک زیر تعمیر مکان کی طرف سے گذر رہے تھے کہ اس مکان پر سے اینٹ کا ایک ٹکڑا گرا جس نے آپ کے سر کو زخمی کر دیا آپ نے فرمایا:

ما یوبی من مراد بواحد اللھم لا ترفعھا۔

مجھے بنی مراد سے ایک نہیں بہت سے دنوں سے واسطہ پڑنا ہے اے خدا اسے بلند نہ ہونے دینا۔

لوگوں کا بیان ہے کہ خدا کی قسم ہم جب بھی اس مکان کی طرف سے گذرے تو دوسرے مکانوں کے پہلو میں یوں دکھائی دیتا تھا جیسے سینگ والے بکروں کے درمیان ایک بے سینگ کی بکری ہو۔

❁ ❁ ❁ ❁ ❁ ❁ ❁

علمِ کلام

علم کلام وہ علم ہے جس میں اسلامی عقائد کی صحت کا عقلی دلائل سے اثبات اور زنادقہ ملاحدہ اور فرق باطلہ کے نظریات کا ابطال کیا جاتا ہے۔ اسلامی عقائد کی بنیاد عقل پر استوار ہے اور کوئی عقیدہ ایسا نہیں ہے جس کی تائید عقل سے نہ ہوتی ہو اسی لیے اسلام نے کورانہ تقلید کے بجائے دلیل و برہان کی روشنی میں جانچ پرکھ کر رائے قائم کرنے کا حکم دیا ہے تاکہ عقل کی رہنمائی سے صحیح نظریات تک پہنچا جا سکے۔ انہی نظریات و عقاید کا فکری و عقلی جائزہ لینے اور دلیل و برہان سے کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لیے علمِ کلام کی تدوین کی گئی اور علماء و متکلمین نے عقاید کے سلسلہ میں تفصیلی مباحث ترتیب دیے اور مخالفین کے شبہات کا دلائل سے رد کیا مگر متقدمین میں ایک گروہ کو اپنے خود ساختہ نظریات معیارِ عقل پر پورے اترتے نظر نہ آئے تو اس نے فکر و نظر اور عقلی استدلال کو خطرناک سمجھتے ہوئے اس علم کی بھرپور مخالفت کی۔ چنانچہ امام شافعی، امام مالک، امام احمد ابن حنبل، سفیان ثوری اور محدثین نے اس کے خلاف آواز بلند کی اور حکماء و متکلمین کو ملحد و زندیق کے ناموں سے یاد کیا اور علمی سوال و جواب کو بدعت قرار دیتے ہوئے قابلِ تعزیر جرم ٹھہرالیا۔ حضرت عمر بھی عقائد کو عقل کے معیار پر پرکھنے کے خلاف تھے اور علمی و عقلی مسئلہ پوچھنے پر سزا سے بھی درگزر نہ کرتے تھے۔ چنانچہ امام غزالی نے تحریر کیا ہے:

وهوالذی سد باب الکلام والجدل وضرب ضبیعا بالدرة لما اورد علیه سوالا فی تعارض آیتین من کتاب الله وهجره وامر الناس بهجره

(احیاء العلوم ج ۱ ص ۲۱)

حضرت عمر نے علم کلام و جدل کا دروازہ بند کیا اور ضبیع تمیمی نے جب دو آیتوں کے باہمی اختلاف کے بارے میں ان سے سوال کیا تو انہوں نے اسے دُرّہ مارا اور اس سے قطع تعلق کر لیا اور دوسروں کو بھی اس سے قطع سلام کا حکم دیا۔

اس مخالفت اور انتہائی مخالفت کے باوجود یہ علم برگ و بار لایا اور اس کی استدلالی قوت کے سامنے اربابِ ظاہر کو ہتھیار ڈالنے پڑے اور آج اسلامی مکاتبِ فکر میں سے کوئی بھی اس کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کرتا۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے معتزلہ نے عقلی استدلال کا دروازہ کھولا اور مذہب و عقل میں تطبیق پیدا کر کے علم کلام کی بنیاد رکھی مگر حقیقت یہ ہے کہ اس علم کا سرچشمہ خود پیغمبر اکرم کی ذات گرامی تھی چنانچہ آپ نے مختلف ادیان و مذاہب کے مقابلہ میں اسلام کی صداقت و برتری کا اثبات دلائل و براہین سے فرمایا اور وہ دلائل عقلی معیار اور منطقی طرزِ استدلال پر پورے اترتے ہیں اور آنحضرت کے بعد آئمہ اہل بیت نے اسی سرچشمۂ نبوت سے سیراب ہو کر اس علم کی آبیاری کی خصوصاً امیرالمؤمنین نے اس کے نشر و ارتقاء میں سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اسلامی عقاید و نظریات کو عقلی انداز میں پیش کیا چنانچہ توحید، عینیت، صفات، رسالت، معاد، قضاء و قدر اور جبر و اختیار کے سلسلہ میں آپ کے خطبات اور یہود و نصاریٰ اور زنادقہ کے مقابلہ میں آپ کے احتجاجات اس کا روشن ثبوت ہیں۔ علماء متکلمین نے آپ کے

کے کلمات سے طریق استدلال کے رموز سیکھے اور آپ ہی کے افادات کی بنیادوں پر علم کلام کی عمارت کھڑی کی۔ امام رازی تحریر کرتے ہیں:

قد جاء فی خطب امیر المؤمنین علی ابن ابی طالب من اسرار التوحید والعدل والنبوة والقضاء والقدر واحوال المعاد مالم یأت فی کلام سائر الصحابة وایضاً فجمیع فرق المتکلمین ینتهی آخر نسبتهم فی هذا العلم الیه۔

امیر المؤمنین علی ابن ابی طالب کے خطبات میں توحید، عدل، نبوت اور قضاء و قدر کے اسرار اور معاد کے حالات اتنے بیان ہوئے ہیں کہ تمام صحابہ کے مجموعی کلام میں بھی نظر نہیں آتے۔ اس علم میں متکلمین کے تمام گروہوں کا آخری نقطۂ انتساب آپ ہی پر منتہی ہوتا ہے۔

(اربعین۔ ص ۴۶۷)

مصری مؤرخ عقاد اس علم میں حضرت کی اقدمیت کا اعتراف کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

عنه اخذ الحکماء الذین شرعوا علم الکلام قبل ان یتطرق الیهم علم فارس او علم یونان

وہ حکماء جنہوں نے علم کلام کا آغاز کیا انہوں نے یہ علم حضرت ہی سے حاصل کیا قبل اس کے کہ فارس یا یونان کا علم ان تک پہنچے۔

(العبقریات الاسلامیہ ص ۸۵۶)

لہٰذا اس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اس علم کے بانی امیر المؤمنین تھے آپ ہی نے اس کی داغ بیل رکھی اور آپ ہی نے اسے نقطۂ عروج پر پہنچایا۔

علامہ محسن الامین نے تحریر کیا ہے:

امیر المؤمنین علی ابن ابی طالب علیه السلام مقتدی الشیعة وامامهم واول من سن ما یسمی علم الکلام والاحتجاج فی الاسلام۔

امیر المؤمنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام جو شیعوں کے مقتداء امام ہیں اور وہ پہلے فرد ہیں جنہوں نے اس علم کی داغ بیل ڈالی جو علم کلام و احتجاج کے نام سے موسوم ہے۔

(اعیان الشیعہ ج ا ص ۲۲۴)

علم مناظرہ و احتجاج

علم مناظرہ وہ علم ہے جس میں اثبات مدعا اور طریق استدلال یا ابطال دعوی اور رد استدلال کے اصول و آداب سے بحث کی جاتی ہے۔ مناظرہ اگر حدود مناظرہ میں رہ کر کیا جائے تو اس پر نتیجہ خیز اثرات مرتب ہو سکتے ہیں اور باہمی

سوال و جواب اور جواب الجواب سے صحیح اور غلط نظریہ کا امتیاز ہو جاتا ہے اور مناظرہ کا مقصد بھی یہی امتیاز حق و باطل ہے لہٰذا ہر فریق کے لیے ضروری ہے کہ آداب مناظرہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے حقیقت طلبی کے جذبہ کے ساتھ گفت گو کرے۔ فریق مخالف کی بات ضبط و سکون اور فراخ حوصلگی سے سُنے سخت اور درشت لہجے میں جواب دینے کے بجائے متانت و سنجیدگی کے انداز میں جواب دے خارج از موضوعات کوئی بات نہ چھیڑے۔ اوچھے ہتھیاروں پہ اترنے اور ذاتیات پر حملہ آور ہونے سے اجتناب برتے اور دوسرے فریق کو معقول دلائل سے قائل کرنے اور اسی کے مسلمات سے مطمئن کرنے کی کوشش کرے۔ اگر دلائل اور فریق ثانی کے مسلمات کو نظر انداز کر کے سخن پروری و کج بحثی سے کام لے گا اور وقتی ہار جیت ہی کو پیش نظر رکھے گا تو وہ مناظرہ نہ ہوگا مکابرہ ہوگا جس کا مقصد صرف مدمقابل کو الجھاووں میں ڈال کر نیچا دکھانا اور اپنی ہمہ دانی و چرب زبانی کا سکہ بٹھانا ہوتا ہے جو کسی طرح ممدوح و قابل ستائش نہیں ہے اور نہ ایک غیر جانبدار و معاملہ فہم انسان اس سے متاثر ہو سکتا ہے۔ قرآن مجید میں آداب مناظرہ کی رہنمائی کے سلسلہ میں ارشاد ہے:

ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن۔	تم لوگوں کو حکمت و پسندیدہ موعظت کے ذریعہ اپنے پروردگار کی راہ کی طرف بلاؤ اور بحث و مباحثہ کرو تو عمدہ اور شائستہ طریقہ سے۔

دنیائے اسلام میں سب سے پہلے امیر المؤمنین نے مخالفین و مبتدعین سے بحث و مباحثہ کی طرح ڈالی۔ ان کے شکوک و شبہات کا ازالہ کیا اور اسلام کی صداقت کے نقوش ان کے ذہن نشین کیے چنانچہ امام غزالی تحریر کرتے ہیں۔

واوّل من سن دعوۃ المبتدعۃ بالمجادلۃ الی الحق علی ابن ابی طالب۔	جس نے سب سے پہلے فرق ضالہ کو بحث و مباحثہ کے ذریعہ حق کی دعوت دی وہ علی ابن ابی طالب تھے۔

(احیاء العلوم ج ۱ ص ۸۵)

علامہ مجلسی نے تحریر کیا ہے:

وان اوّل من سن دعوۃ المبتدعۃ بالمجادلۃ الی الحق علی وقد ناظرہ الملاحدۃ فی مناقضات القرآن واجاب مشکلات مسائل الجاثلیق حتی اسلم۔	جس نے سب سے پہلے بحث و جدل کے ذریعہ مذاہب باطلہ کو حق کی دعوت دی وہ حضرت علی تھے۔ چنانچہ ملحدوں نے قرآنی اختلافات کے بارے میں ان سے مناظرے کیے اور جاثلیق کے مشکل سوالات کے جوابات دیے جس کے نتیجہ میں وہ اسلام لے آیا۔

(بحار الانوار ج ۹ ص ۴۶۳)

امیر المؤمنین جب بھی کسی سے مناظرانہ رنگ میں گفت گو کرتے تو اسے دلائل کے زور سے خاموش کر دیتے اور جواب الجواب کی نوبت نہ آنے دیتے چنانچہ خوارج کے مختلف نمائندوں اور یہود و نصاریٰ کے عالموں سے جو مختلف مواقع پر مباحثے کیے یا معترضین کو جواب دیے وہ ان کے لیے قفل دہن ثابت ہوئے۔ علامہ مجلسی نے کتاب ابو بکر ابن مردویہ کے حوالے

سے تحریر کیا ہے کہ:

ماحاج علی احداً الاحجہ — حضرت علی نے کسی سے استدلالی گفتگو نہیں کی مگر یہ کہ اسے لاجواب کر دیا۔

(بحار الانوار ج ۹ ص ۴۶۳)

ذیل میں حضرت کی چند احتجاجی گفتگوئیں تحریر کی جاتی ہیں۔

ایک مسیحی سے الوہیت مسیح کے سلسلہ میں گفتگو کرتے ہوئے فرمایا:

لولا تمرد عیسیٰ عن عبادة الله لصرت علی دینہ۔ (عیون الاخبار) — اگر عیسیٰ اللہ کی عبادت سے گریز نہ کرتے تو میں ان کا دین اختیار کر لیتا۔

اس مسیحی نے کہا کہ حضرت عیسیٰ کی طرف عبادت سے گریز کی نسبت صحیح نہیں ہے کیوں کہ یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ وہ ہمہ وقت عبادت میں منہمک رہتے تھے فرمایا کہ اگر تمہارے عقیدہ کے مطابق حضرت عیسیٰ خود خدا تھے تو وہ عبادت کس کی کرتے تھے جب کہ عبادت بندے کے شایان شان ہے نہ خدا کے۔

امیر المومنین نہروان سے واپس پلٹ کر کوفہ تشریف لائے تو کچھ لوگوں نے کہا کہ آپ نے جس طرح طلحہ، زبیر اور معاویہ سے جنگ کی اسی طرح ابوبکر و عمر سے جنگ کیوں نہ کی فرمایا:

لم ازل مظلوما مستاثرا علی حقی (احتجاج طبرسی ص ۱۰۱) — میں ہمیشہ مظلوم رہا اور میرے حق پر دوسروں کو ترجیح دی جاتی رہی۔

اس پر اشعث ابن قیس نے کہا تو پھر اس کا واحد حل یہ تھا کہ آپ تلوار اٹھاتے اور اپنے حق کا مطالبہ کرتے فرمایا اے اشعث اگر تم نے یہ بات کہی ہے تو اس کا جواب بھی سن لو میں اس خاموشی کے سلسلہ میں چھ نبیوں کے طریق کار پر عمل پیرا رہا۔ ان میں ایک حضرت نوح ہیں جن کے بارے میں ارشاد قرآنی ہے:

فدعا ربہ انی مغلوب فانتصر — نوح نے اپنے پروردگار سے دعا مانگی کہ میں ان لوگوں کے مقابلہ میں کمزور ہوں لہٰذا تو ہی ان سے بدلہ لے۔

٭ ٭ ٭

دوسرے حضرت لوط ہیں جنہوں نے کہا:

لو ان لی بکم قوة او آوی الی رکن شدید — کاش تمہارے مقابلہ کی مجھ میں طاقت ہوتی یا میں کسی مضبوط قلعہ میں سر چھپا سکتا۔

تیسرے حضرت ابراہیم ہیں جنہوں نے کہا:

واعتزلکم وما تدعون من دون الله — میں تم سے اور ان بتوں سے جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہو الگ ہو جاؤں گا۔

چوتھے حضرت موسیٰ ہیں جنہوں نے کہا:

ففررت منکم لما خفتکم — میں جب تم لوگوں سے ڈرا تو بھاگ کھڑا ہوا۔

پانچویں حضرت ہارون ہیں جنہوں نے کہا:

یابن ام ان القوم استضعفونی وکادوا یقتلوننی۔ — اے میرے ماں جائے قوم نے مجھے کمزور و ناتواں پایا اور بعید نہ تھا کہ وہ مجھے قتل کر دیتے۔

چھٹے خیر البشر محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ ہیں جنہوں نے قریش سے خطرہ محسوس کیا تو آمادہ ہجرت ہوئے اور مکّہ سے نکل کر غارِ ثور میں پناہ لی اور مجھے اپنے بستر پر سونے کا حکم دے گئے۔

اگر یہ کہا جائے کہ ان انبیاء کرام اور پیغمبر اکرم کو کوئی ڈر خوف نہ تھا تو یہ صریحاً غلط اور قرآنی آیات کے خلاف ہے۔ لہٰذا جب ظاہری اسباب اور تاب مقاومت نہ ہونے کی صورت میں انبیا تک مقابلہ سے اجتناب کرتے رہے تو یار و مددگار نہ ہونے کی صورت میں وصیِ پیغمبر کو بھی معذور سمجھنا چاہیے۔

حضرت ابوبکر مہاجرین وانصار کے حلقہ میں بیٹھے ہوئے تھے کہ امیر المومنین تشریف لائے اور ابوبکر سے مخاطب ہو کر کہا کہ تم نے دخترِ رسول فاطمہ کو فدک دینے سے کیوں انکار کیا ہے جبکہ رسول اللہ اپنی زندگی میں انہیں ہبہ فرما چکے تھے ابوبکر نے کہا کہ فدک عامۂ مسلمین کا مال ہے اگر فاطمہ گواہ پیش کریں تو ان کا حق تسلیم کر لیا جائے گا ورنہ یہ مسلمانوں ہی کا مال قرار پائے گا اور حکومت وقت کی تحویل میں رہے گا فرمایا کہ اگر کوئی چیز مسلمانوں کے قبضہ میں ہو اور میں یہ دعویٰ کروں کہ یہ میری ملکیت خاصہ ہے تو تم گواہوں کا مطالبہ کس سے کرو گے۔ کہا آپ سے۔ فرمایا کہ پھر تم فاطمہ سے کس بناء پر گواہوں کا مطالبہ کر سکتے ہو جبکہ فدک رسول اللہ کے زمانۂ حیات سے ان کے قبضہ میں چلا آرہا ہے۔ پھر یہ بتاؤ کہ اگر چند افراد فاطمہ کے بارے میں کسی ایسے امر کے ارتکاب کی گواہی دیں جس پر حد شرعی عاید ہوتی ہو تو تم کیا قدم اٹھاؤ گے۔ کہا کہ میں حد شرعی جاری کروں گا فرمایا کہ اگر تم نے ایسا ارادہ کیا تو دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاؤ گے۔ کہا، کس طرح؟ فرمایا کیا تم نے قرآن مجید میں یہ آیت پڑھی ہے:

انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا۔ — اے اہلِ بیت اللہ کا یہ ارادہ ہے کہ تم سے ہر پلیدی کو دور رکھے اور تمہیں ایسا پاک و پاکیزہ کرے جیسا پاک و پاکیزہ کرنے کا حق ہے۔

٭ ٭ ٭ ٭

کہا ہاں پڑھی ہے۔ فرمایا کیا فاطمہ بھی اہل بیت میں شامل ہیں کہا ہاں شامل ہیں فرمایا کہ پھر ان پر حد جاری کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ نے ان کی طہارت و پاکیزگی کی جو گواہی دی ہے تم نے اسے رد کر دیا اور اللہ کے مقابلہ میں چند جہلا کی گواہی قبول کر لی یاد رکھو کہ تم نے فدک کے بارے میں اللہ کی گواہی کو بھی قابلِ اعتماد نہیں سمجھا اور پیغمبر کے اس ارشاد کو بھی نظر انداز کر دیا کہ:

البینۃ علی المدعی والیمین علی المدعیٰ علیہ۔ — بیّنہ و گواہی مدعی کے ذمہ ہے اور مدعا علیہ پر قسم عائد ہوتی ہے۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

علم الادب

زبان وبیان کی تمام خوبیوں کے ساتھ خیالات وافکار کی ترجمانی کا نام ادب ہے۔ ادب صرف معنی آفرینی وفکر پیمائی ہی سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے اسلوب بیان کی شگفتگی طرز ادا کی دلآویزی اور لفظوں کے در و بست کی حسن آفرینی بھی ضروری ہے اگرچہ الفاظ سے مقصود معنی ہی ہوتے ہیں مگر معانی براہ راست دوسروں کے ذہن میں منتقل نہیں کیے جا سکتے ان کے لیے الفاظ کا سہارا لینا ہی پڑتا ہے کیوں کہ معانی ومطالب کے ابلاغ کا یہی ایک ذریعہ ہیں ان کے بغیر نہ معانی کی منتقلی عمل میں آسکتی ہے اور نہ افہام وتفہیم کا مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر الفاظ بھونڈے ترتیب گنجلک اور اسلوب الجھا ہوا ہوگا تو معنی دھندلے اور اثر کمزور پڑ جائے گا۔ اس کے برعکس اگر الفاظ شستہ، لسانی قواعد کے مطابق اور موقع ومحل کے اعتبار سے مناسب ہوں گے تو معنی واضح اور کلام پُر اثر ہوگا اور ادب کا مقصد ہی یہ ہے کہ افکار وخیالات کو دل نشیں لفظوں کے قالب میں ڈھال کر دوسروں کے ذہن میں اتارا جائے اور الفاظ کے حسن وشکوہ سے سحر آگیں فضا پیدا کر کے احساس وشعور کو متاثر کیا جائے۔

یہ علم اپنی افادیت کے اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کیوں کہ اس سے فکر ونظر اور علم وفن کی زندگی وبقا وابستہ ہے۔ چنانچہ گزشتہ اقوام وملل کے تہذیبی واخلاقی اور سیاسی ومعاشرتی حالات کا اندازہ ان کے علمی وادبی ذخائر ہی سے ہوتا ہے اور ہر قوم کا ادب اس کی اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی زندگی کی تصویر اور اس کے عادات ورسوم کا آئینہ ہوتا ہے۔ ادب سے جہاں مختلف قوموں کی تمدنی ومعاشرتی تہذیبوں کا پتہ چلتا ہے وہاں لفظ کو معنی سے ہم آہنگ کرنے، لطیف احساسات کو لفظی جامہ پہنانے اور انہیں پُر اثر بنانے کا ملکہ بھی حاصل ہوتا ہے اور اس طرح زبان نکھر سنور کر ارتقائی منازل طے کرتی اور فروغ پاتی ہے۔ یوں تو ہر زبان میں ادب کے بہتر سے بہتر نمونے موجود ہیں مگر عربی زبان اپنی لطافت شیرینی اور متوازن الفاظ کے اعتبار سے ادبی تخلیق کے لیے نہایت موزوں واقع ہوئی ہے اسی لیے ہر دور میں اس کا دامن نظم ونثر کے ادب پاروں سے مالامال رہا ہے اور کوئی زبان ادبی لطافتوں اور بلاغت آفرینیوں میں اس کے مقابلہ پر نہ آسکی۔

عربی ادب کے ارتقاء اور اسے اوج وعروج کے بام بلند تک پہنچانے میں امیر المؤمنین کے خطبات ونگارشات کا حصہ سب سے زیادہ رہا ہے۔ آپ نے زبان کو نئے اسلوب وآہنگ دیے، اظہار بیان کو نیا سلیقہ بخشا، فصاحت وبلاغت کی راہیں کھولیں زبان کے اصول وقواعد تعلیم کیے اور ادب کے ہر شعبہ میں ایسے درخشاں نقوش چھوڑ گئے جنہیں راہروان وادیٔ ادب نے علمی دستاویز وادبی سند قرار دے کر مشعل راہ بنایا۔

ادب کے ذیل میں صرف ونحو لغت عروض وقوافی قراءت وکتابت نظم ونثر اور معانی بیان اور بدیع سے بحث کی جاتی ہے ان میں سے ہر شعبہ مستقل علم کا درجہ رکھتا ہے۔ لہٰذا ہر شعبہ کو الگ الگ عنوان کے تحت درج کیا جاتا ہے۔

علم صرف ونحو

عربی زبان میں لفظ کی ہیئت وحرکت کی تبدیلی سے معنی میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ جس علم کے ذریعہ لفظ کی ہیئت کا علم حاصل ہوتا ہے اسے علم صرف اور جس علم کے ذریعہ حرکات (زیر، زبر، پیش) کا علم حاصل ہوتا ہے اسے علم نحو کہا جاتا ہے۔ انہی حرکات کے ذریعہ مختلف معانی میں امتیاز اور معنی مقصود کی تعیین ہوتی ہے

اگر حرکتِ اعرابی میں غلطی واقع ہو گی تو معنی کچھ کے کچھ ہو جائیں گے مثلاً ما احسن زیدٌ کو اگر ما احسن زیدُ پڑھا جائے تو معنی بدل جائیں گے اس لیے کہ پہلے جملہ کے معنی یہ ہیں کہ زید کتنا اچھا ہے اور دوسرے جملہ کے معنی یہ ہیں کہ زید نے کوئی اچھائی نہیں کی۔ عرب اہلِ زبان تھے۔ انہیں اعرابی صحت کے لیے قواعد و ضوابط کا سہارا لینے کی ضرورت نہ تھی بلکہ خود ان کی بول چال سے ضوابط کا استخراج کیا جاتا تھا مگر موالی و متعربین اعرابی غلطیوں کا شکار ہو جاتے تھے جو اہلِ زبان کی قوتِ سامعت پر گراں گزرتی تھیں۔ چناں چہ ایک مرتبہ ایک شخص نے پیغمبر اکرم کے سامنے اعرابی غلطی کی تو آپ نے فرمایا:

ارشدوا اخاکم فقد ضل (المزہر ج ۲ ص ۳۹۶) اپنے بھائی کی غلطی کی اصلاح کرو یہ بھٹک گیا ہے

آنحضرت کے بعد جب فتوحات کا دور آیا تو عربوں اور عجمیوں کے آپس کے میل جول بڑھے۔ اس میل ملت اور باہمی بات چیت کے نتیجہ میں زبان کا متاثر ہونا بھی طبعی امر تھا چنانچہ بول چال میں اعرابی غلطیاں ہونے لگیں۔ امیر المؤمنین کو اس کا احساس ہوا کہ اگر زبان کی حفاظت کا سامان نہ کیا گیا تو عجمی اثرات سے اس کی صورت بگڑ جائے گی لہٰذا اس کے گرد اگرد قواعد کی ایک محکم باڑ باندھ دینا چاہیے تاکہ اس کی صحت برقرار رہے۔ چنانچہ آپ نے لسانی قواعد کے اصول وضع کیے اور ابو الاسود دئلی کو ان کی ترتیب و تدوین پر مامور کیا۔

ابو الاسود بیان کرتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ امیر المؤمنین کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ آپ سر جھکائے خاموش بیٹھے ہیں گویا کچھ سوچ رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ یا امیر المؤمنین آپ کس فکر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ فرمایا کہ عجمیوں کے آنے جانے اور ان کے اختلاط سے ایسے کلمات سننے میں آتے ہیں جو اعرابی اعتبار سے غلط اور استعمالاتِ عرب کے خلاف ہوتے ہیں اگر تصحیحِ زبان کی طرف توجہ نہ کی گئی تو لفظ و معنی کی سمتیں بدل جائیں گی اور کوئی بات صحیح طور پر سمجھی نہ جا سکے گی اس لیے میں نے سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ عربی زبان کے قواعد منضبط کر دوں تاکہ صحیح و غلط میں امتیاز ہو سکے اور کلام میں غلطی واقع ہونے نہ پائے۔ میں نے کہا کہ اگر آپ ایسا کر جائیں گے تو عربی زبان ہمیشہ کے لیے زندہ ہو جائے گی ورنہ غلط استعمالات کے نشر و شیوع سے زبان کے خط و خال مسخ ہو جائیں گے اور رفتہ رفتہ قرآن و حدیث کی زبان سے دوری ہو جائے گی۔ ابو الاسود کہتے ہیں کہ تین دن کے بعد میں پھر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے کاغذ کا ایک پرزہ میری طرف بڑھایا جس پر تحریر تھا:

الکلام کلہ اسم و فعل و حرف الاسم ما انبأ عن المسمی والفعل ما انبأ عن حرکۃ المسمی والحرف ما انبأ عن معنی لیس باسم ولا فعل۔

کلام کی تین قسمیں ہیں اسم فعل اور حرف، اسم وہ ہے جو کسی مسمّٰی کا پتا دے اور فعل وہ ہے جو مسمّٰی کے عمل و حرکت کا پتا دے اور حرف وہ ہے جس میں نہ اسم کے معنی ہوں اور نہ فعل کے۔

پھر آپ نے فرمایا:

واعلم یا ابا الاسود ان الاشیاء ثلثۃ ظاہر و مضمر و شیٔ لیس بظاہر ولا

اے ابو الاسود تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اشیاء کی تین قسمیں ہیں ظاہر مضمر اور وہ جو نہ ظاہر نہ مضمر جیسے

مضمر — (معجم الادباء ج ۱۳ ص ۴۹) — اسم اشارہ)۔

اس کے بعد آپ نے معرفہ و نکرہ و وجوہ اعراب رفع نصب جر اور چند دوسرے اصول بیان فرمائے اور فرمایا

انح هذا النحوة — تم یہ طریقہ اختیار کرو۔

حضرت کے اس قول سے ان قواعد کا نام نحو قرار پا گیا۔ ابو الاسود کہتے ہیں کہ میں نے حضرت کی ہدایت کے مطابق کچھ قواعد مرتب کر کے اصلاح کے لیے آپ کی خدمت میں پیش کیے اور جب حروف ناصبہ اِنّ، اَنّ، لیت، لعل اور کان گنوائے تو آپ نے فرمایا کہ لکنّ کو تو چھوڑ گئے۔ میں نے کہا میرا خیال تھا کہ لکنّ حرفِ ناصبہ میں سے نہیں ہے۔ فرمایا ایسا نہیں ہے یہ بھی ان میں داخل ہے چنانچہ میں نے اسے بھی بڑھا دیا۔

ابو الاسود نے اس سلسلہ میں جو کچھ سیکھا امیر المؤمنین ہی سے سیکھا۔ علامہ سیوطی تحریر کرتے ہیں:

کان ابو الاسود اخذ ذلک عن امیر المؤمنین علی رضی الله عنه۔	ابو الاسود نے علم نحو امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ سے حاصل کیا۔

(المزہر ج ۲ ص ۳۹۷)

ابو الاسود سے ان کے فرزند عطاء ابن ابی الاسود، یحیٰی ابن یعمر، میمون الاقرن اور عنبسہ ابن عیدان نے یہ فن سیکھا اور دوسروں کو سکھایا اس کے بعد خلیل ابن احمد فراہیدی متوفی ۱۷۵ھ اور ان کے شاگرد اخفش مجاشعی متوفی ۲۱۵ھ نے اس کے قواعد منضبط کیے اور اس کے فروغ میں نمایاں حصہ لیا۔ بیشک ان لوگوں کی محنت و عرق ریزی سے یہ علم پایۂ تکمیل تک پہنچا مگر ایک علم کو تشریحات و توضیحات سے تکمیل تک پہنچانا اور ہے اور اس کی ایجاد اور بنیاد رکھنا اور ہے۔ علامہ عقاد تحریر کرتے ہیں:

حصة الامام من علم النحو عظيمة لان الابتداء بها اصعب من تحصيل المجلدات انفخام التی دونها النحاة بعد تقدم العلم و تكثر الناظرين فيه	علم نحو میں حضرت علی کا بہت بڑا حصہ ہے اس لیے کہ اس کی ایجاد و تاسیس اس سے کہیں زیادہ مشکل تھی کہ نحو کی ضخیم کتابیں تصنیف کر دی جائیں جب کہ نحویوں کی تدوین سے پہلے یہ علم ایجاد ہو چکا تھا اور اس پر بحث و نظر کرنے والوں کی بھی کثرت تھی۔

(عبقریۃ الامام ص ۱۸۶)

یہ واضح رہے کہ علم صرف علم نحو ہی کا ایک شعبہ ہے اور دونوں کا موضوع کلمہ و کلام ہے۔ فرق یہ ہے کہ اگر صحت و اعتدال کے لحاظ سے بحث کی جائے تو علم صرف ہے اور ترکیب و اعراب کے اعتبار سے بحث کی جائے تو علم نحو ہے اس لیے یہ دونوں علم علوم عربیہ کے ذیل میں یکجا بیان کیے جاتے رہے ہیں۔

ابو عثمان مازنی متوفی ۲۴۹ھ نے اسے نحو سے الگ کیا اور پھر مستقلاً علم صرف پر کتابیں تحریر کی جانے لگیں۔ بہر حال علم صرف کی تاسیس علم نحو کے ساتھ ساتھ ہوئی لہٰذا جو علم نحو کا موجد ہو گا وہی علم صرف کا موجد قرار پائے گا اور علم نحو کے ایجاد کا سہرا بلاشبہ حضرت کے سر ہے جس میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔ کچھ لوگوں نے عبد الرحمٰن ابن ہرمز اعرج

کو اور کچھ لوگوں نے نصر ابن عاصم کو نحو کا موجد قرار دینے کی کوشش کی ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے اس لیے کہ ان دونوں نے نحو کے ابتدائی اصول ابوالاسود سے سیکھے اور ابوالاسود اس فن میں امیر المؤمنین کے شاگرد تھے۔

علم اللّغت

علم اللغۃ کے معنی زبان دانی کے ہیں۔ زبان دانی کے لیے اصلی اور دخیل، مترادف اور متباین، مشترک اور متشابہ الفاظ اور ان کی ہیئت و ساخت کا جاننا ضروری ہے تاکہ تلفظ محل استعمال اور حقیقی و مجازی معنی کی تشخیص میں غلطی نہ ہونے پائے۔ ہر زبان میں حسب ضرورت الفاظ کا سرمایہ پایا جاتا ہے۔ ابتدا میں ضروریات محدود ہوتی ہیں اس لیے الفاظ کا ذخیرہ بھی محدود ہوتا ہے اور جوں جوں ضروریات بڑھتی جاتی ہیں الفاظ کا دائرہ بھی پھیلتا چلا جاتا ہے اس طرح کہ یا تو نئی اشیاء اور جدید معانی کے لیے نئے الفاظ وضع کیے جاتے ہیں یا دوسری زبان کی لفظوں کو اپنے لب و لہجہ کے سانچے میں ڈھال کر اپنی زبان کے حدود میں داخل کر لیا جاتا ہے۔ عربی زبان بھی تعمیر و ساخت اور شکست و ریخت کے انہی مرحلوں سے گزر کر اور ریگزار عرب کے وسیع دامنوں میں پل کر پروان چڑھی اور متمدن زبانوں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ عربی زبان ارتقاء کی راہ پر اس وقت گامزن ہوئی جب حضرت اسمٰعیل نے مکہ میں طرح اقامت ڈالی اور قحطان کی ایک شاخ بنی جرہم میں رشتۂ ازدواج قائم کیا۔ اس طرح دو خاندانوں کے اختلاط اور عربی و عبرانی کی آمیزش سے زبان میں توسیع ہوئی اور الفاظ کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو گیا۔ اس وسعت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس میں چھیالیس ہزار چار سو متروک الفاظ کے علاوہ چھ کروڑ پانچ لاکھ بیس ہزار الفاظ مستعمل ہیں حالاں کہ کسی معیاری زبان کا سرمایۂ الفاظ ساڑھے چار لاکھ سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ عربی زبان میں ایک ایک شے کے لیے اس کی مختلف حالتوں اور کیفیتوں کے پیش نظر متعدد الفاظ وضع کیے جاتے رہے ہیں مثلاً شیر کے لیے پانچ سو، سانپ کے لیے دو سو اور کتے کے لیے ستر الفاظ مستعمل ہیں۔ ایک مرتبہ عرب کا مشہور شاعر ابوالعلاء معری، علم الہدیٰ سید مرتضیٰ کے ہاں حاضر ہوا جب دروازہ پر پہنچا تو کسی چیز سے ٹھوکر کھائی۔ ایک شخص کی زبان سے نکلا من ھذا الکلب "یہ کتا کون ہے"، ابوالعلاء نے کہا کہ کتا وہ ہے جو کتے کے ستر اسماء سے ناواقف ہو۔ سید مرتضیٰ نے یہ سنا تو اسے بلایا اور جب اس سے بات چیت کی تو معلوم ہوا کہ وہ زبان عرب پر عبور تام رکھتا ہے۔ غرض دنیا کی کوئی ترقی یافتہ زبان عربی زبان کی وسعت کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور نہ کوئی ایسی لغت تدوین کی جا سکی ہے جو تمام الفاظ امثال اور محاورات عرب پر حاوی ہو اگرچہ خلیل ابن احمد فراہیدی متوفی ۱۷۵ھ نے کتاب العین، ابوبکر ابن درید متوفی ۳۲۱ھ نے جمہرہ، ابوالحسن احمد ابن فارس متوفی ۳۹۰ھ نے مجمل، ابونصر اسمٰعیل جوہری متوفی ۳۹۸ھ نے صحاح، ابوغالب تمام ابن غالب قرطبی متوفی ۴۳۶ھ نے تلقیح العین، ابن سیدہ اندلسی متوفی ۴۵۸ھ نے المحکم، ابن منظور افریقی متوفی ۷۱۱ھ نے لسان العرب، مجدالدین فیروز آبادی متوفی ۸۱۷ھ نے قاموس اور دوسرے لغویین نے بےشمار کتابیں لغت میں ترتیب دیں اور اب تک تدوین و تالیف کا سلسلہ جاری ہے مگر کسی کتاب کے متعلق یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ تمام الفاظ عرب کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

امیر المؤمنین زبان عرب پر پوری دسترس رکھتے تھے چنانچہ آپ کے خطب خطوط فرامین اور کلمات حکمیہ میں لفظوں کا اتنا وافر سرمایہ ہے کہ اس دور کے ادباء و فصحاء کا مجموعی کلام بھی اتنے الفاظ پر محیط نہیں ہے۔ آپ تحریر و تقریر میں الفاظ پر الفاظ

لاتے الفاظ کی سریع تصویر کھینچتے حرف وصوت میں حقائق و معارف سموتے کلام میں تفنن و بوقلمونی پیدا کرتے اور کسی موقع پر ثقیل اور نامانوس الفاظ کا سہارا نہ لیتے بلکہ ہر لفظ نکھری سنوری اور فصاحت کے سانچہ میں ڈھلی ہوئی ہوتی۔ استاد محی الدین محشی نہج البلاغہ میں تحریر کرتے ہیں۔

املکھم لغۃ یدیرھا کیف یشاء۔	وہ لغت عرب پر سب سے زیادہ اقتدار رکھتے تھے اور جس صورت سے چاہتے اسے گردش دیتے تھے۔

آپ جس لفظ کا جس طرح تلفظ کرتے وہ اس کی صحت کی سند قرار پاجاتا۔ چنانچہ نضر بن شمیل بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ میں مامون رشید عباسی کے ہاں گیا۔ مامون نے بر سبیل تذکرہ یہ حدیث بیان کی۔

حدثنا ھشیم عن الشعبی عن ابن عباس قال رسول اللہ اذا تزوج الرجل المرأۃ لدینھا وجمالھا کان فیھا سداد من عوز (المزہر)	ہم سے ہشیم نے اس نے شعبی سے اور شعبی نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ جو شخص کسی عورت سے اس کے دین اور جمال کی وجہ سے عقد کرے وہ اسے تنگدستی واحتیاج سے بچالے جائے گی۔

مامون نے لفظ سَداد بفتح سین پڑھی نضر نے کہا کہ ہمیں یہ حدیث امیر المؤمنین علی ابن ابی طالب کے سلسلہ روایت سے پہنچی ہے اور آپ نے سِداد بکسر سین فرمایا تھا اور اس مقام پر سِداد ہی صحیح ہے۔ مامون نے کہا کہ اس کے معنی یہ ہوئے کہ میں نے غلط پڑھا ہے کہا کہ یہ آپ کی غلطی نہیں ہے بلکہ ہشیم کی غلطی ہے اور آپ نے تو جیسا سنا ویسا بیان کر دیا مامون نے کہا کہ سَداد اور سِداد میں کیا فرق ہے کہا کہ سَداد کے معنی صحت و درستی کے ہیں اور سِداد کے معنی کسی نقصان کی تلافی یا کسی شے کے تدارک کے ہیں۔ کہا کہ کلام عرب میں اس کا کوئی شاہد ہے کہا ہاں اور عبداللہ ابن عمرو عرجی کا یہ شعر پڑھا:

اضاعونی و ای فتی اضاعوا
لیوم کریھۃ و سِداد ثغر

"انہوں نے مجھے اپنے ہاتھوں سے کھو دیا جنگ کے دن اور سرحدوں کی حفاظت کے موقع پر انہیں احساس ہوگا کہ انہوں نے کیسے جوان کو کھویا ہے۔"

عربی زبان بھی دوسری زبانوں کی طرح جذب و قبول کی صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہے۔ چنانچہ اس میں فارسی رومی نبطی حبشی قبطی عبرانی اور سریانی زبانوں کے الفاظ بھی سموئے ہوئے ہیں جیسے سندس، قسطاس، زنجبیل وغیرہ یہ اور اس قسم کے دوسرے الفاظ مزاج و ساخت کے اعتبار سے عربی لفظوں میں گھل مل گئے ہیں۔ حضرت نے بھی توسیع زبان کے لیے غیر عربی الفاظ استعمال کیے ہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے قاضی شریح سے پوچھا کہ اگر ایک عورت کو طلاق دی گئی ہو اور وہ یہ دعویٰ کرے کہ اسے ایک مہینہ میں تین مرتبہ خون آتا ہے تو تم اس کے عدہ کے بارے میں کیا فیصلہ کرو گے۔ شریح

نے کہا کہ اگر اس کے گھر والے اس کی تصدیق کریں تو اس کے قول کو صحیح سمجھا جائیگا۔ حضرت نے فرمایا قالون یہ رومی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ تم نے صحیح کہا۔ (لسان العرب)

ایک مرتبہ کچھ لوگوں کو دامن لٹکائے چلتے دیکھا تو فرمایا:

کانھم الیھود خرجوا من فھورھم (شرح ابن ابی الحدید ج ۴ ص ۳۷۶) گویا یہ یہودی ہیں جو اپنی درس گاہوں سے باہر نکل رہے ہیں۔ فھور، فھر کی جمع ہے۔ ابو عبید نے کہا ہے کہ یہ نبطی یا عبرانی زبان کا لفظ ہے اس کی اصل بھر ہے جس کے معنی یہودیوں کی درس گاہ یا اس مقام کے ہیں جہاں وہ عید کے لیے جمع ہوتے تھے۔ محیط میں ہے کہ فھر فوریم کا معرب ہے اور فوریم یہودیوں کی ایک عید کا نام ہے جو ماہ آذر کی ۱۴ یا ۱۵ تاریخ کو ہوتی ہے۔

عرب جب عجمی الفاظ کو معرب کرتے تھے تو ان لفظوں کو جہاں اپنے لب و لہجہ کے سانچے میں ڈھالتے وہاں ان سے اور صیغے بھی بنا لیا کرتے تھے۔ چنانچہ عرب کا ایک شاعر کہتا ہے:

وقد اقلتنا المطایا الضمر

مثل القسی عاجھا المقمجر

"ہمیں ان لاغر اندام اونٹوں نے اٹھالیا جو ان کمانوں کے مانند تھے جنہیں کمان گر نے ٹیڑھا کیا ہو"

شاعر نے پہلے کمانگر کو قمنجر کی صورت میں بدلا اور پھر اسے عربی قاعدہ کے مطابق اسم فاعل کی صورت دے دی۔

حضرت نے بھی اسی نہج پر الفاظ سے الفاظ ڈھالے چنانچہ ایک مرتبہ نوروز کے موقع پر آپ کے سامنے حلوا پیش کیا گیا۔ آپ نے پوچھا کہ آج کیا بات ہے کہا گیا کہ آج نوروز ہے۔ آپ نے خوش طبعی کے طور پر فرمایا:

نوروزوا لنا کل یوم (المزہر)	تو پھر ہمارے لیے ایسا نوروز ہر روز منایا کرو

نوروز فارسی زبان کا لفظ ہے اس کا عربی میں تلفظ نَوْرُوز اور نَیْرُوز ہوتا ہے۔ حضرت نے اسی لفظ نوروز سے نوروزوا امر کا صیغہ مشتق کیا ہے۔

بعض الفاظ قریب المعنی ہوتے ہیں مگر مترادف و ہم معنی نہیں ہوتے اس معنوی تفریق کی وجہ سے ان کا محل استعمال بھی مختلف ہوتا ہے۔ حضرت نے اس تفریق معنوی کی طرف بھی رہنمائی فرمائی ہے۔ چناں چہ آپ سے دریافت کیا گیا کہ اکراہ و اجبار میں کیا فرق ہے۔ فرمایا:

الاکراہ من السلطان والاجبار من الزوجۃ والابن (قضایا قمی)	اکراہ وہ ہے جو بادشاہ کی طرف سے ہو اور اجبار وہ ہے جو زوجہ اور فرزند کی طرف سے ہو۔

مطلب یہ ہے کہ جو بات حکماً منوائی جائے وہ اکراہ ہے اور جس میں حکم کارفرما ہو وہ اجبار ہے۔

آپ سے دریافت کیا گیا کہ خوف اور غم میں کیا فرق ہے۔ فرمایا:

الخوف قبل وقوعہ والغم ما یلحق الانسان من وقوعہ (الف کلمہ)	کسی امر ناگوار کے واقع ہونے سے پہلے جو کیفیت طاری ہوتی ہے وہ خوف ہے اور جو کیفیت واقع

ہونے کے بعد طاری ہوتی ہے وہ غم ہے۔

اجر اور عوض میں فرق یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے جو ابتلاء و آزمائش ہو جیسے دکھ درد بیماری وغیرہ اس کے بدلے میں جو کچھ اللہ کی طرف سے ملے وہ عوض ہے اور انسان کے اعمال کے نتیجہ میں جو حاصل ہو وہ اجر ہے چنانچہ حضرت نے اس فرق کو ایک مریض کی عیادت کرتے ہوئے واضح کیا:

ان المرض لا اجر فیہ ولکنہ یحط السیات ویحتھا حت الاوراق و انما الاجر فی القول باللسان والعمل بالایدی والاقدام۔

مرض میں اجر نہیں ہے البتہ وہ گناہوں کو مٹاتا اور انہیں اس طرح جھاڑ دیتا ہے جس طرح درخت سے پتے جھڑتے ہیں۔ ہاں اجر اس میں ہوتا ہے کہ کچھ زبان سے کہا جائے اور کچھ ہاتھ پیروں سے کیا جائے۔

(نہج البلاغہ)

معانی الفاظ کے سلسلہ میں حضرت کا قول حرف آخر سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ آیۂ قرآنی واذا الموؤدۃ سئلت (جس وقت زندہ درگور لڑکی سے پوچھا جائے گا) میں لفظ موؤدۃ کے متعلق صحابہ میں اختلاف رائے ہوا تو آپ نے فرمایا:

انھا لا تکون موؤدۃ حتی یاتی علیھا التارات السبع۔ (درۃ الغواص)

زندہ درگور لڑکی پر لفظ موؤدۃ اس وقت صادق آتی ہے جب وہ سات مرحلوں سے گذر چکی ہو۔

حضرت نے آیۂ قرآنی لقد خلقنا الانسان من سلالۃ میں خلقت انسانی کے جو مراتب بیان کیے ہیں ان کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جب لڑکی ولادت کے بعد روئے پیچھے اور پھر اسے زندہ دفن کر دیا جائے وہ موؤدۃ ہے۔

حضرت ابوبکر سے لفظ کلالہ کے معنی دریافت کیے گئے انہوں نے کہا:

ھو من مات ولم یدع ولدا ولا والدا ھذا قولی فیھا برائی فان کان صوابا فمن اللہ (کشف الغمہ ج۲ص۵۹)

وہ جس کے نہ بیٹا ہو اور نہ باپ۔ یہ میری اپنی رائے ہے۔ اگر صحیح ہو تو اللہ کی جانب سے ہے۔

امیر المؤمنین کے سامنے اس کا ذکر ہوا تو فرمایا کہ یہ رائے سے کام لینے کا محل نہیں ہے۔ قرآن مجید میں کلالہ کا اطلاق سگے بھائی بہن اور پدری بھائی بہن یعنی باپ ایک اور مائیں مختلف ہوں اور مادری بھائی بہن یعنی ماں ایک اور باپ مختلف ہوں سب پر ہوا ہے چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

یستفتونک قل اللہ یفتیکم فی الکللۃ ان امرؤ ھلک لیس لہ ولد ولہ اخت فلھا نصف ما ترک وھو

لوگ تم سے کلالہ کے بارے میں پوچھتے ہیں کہہ دو کہ اللہ تمہیں کلالہ کے بارے میں یہ حکم دیتا ہے کہ اگر کوئی شخص مرجائے اور اس کے کوئی اولاد نہ ہو اور صرف

يرثها ان لم يكن لها ولد
ایک بہن ہو تو آدھا ترکہ اس کا ہوگا اور اگر بہن مرجائے اور اس کے کوئی اولاد نہ ہو تو بھائی سارے مال کا وارث ہوگا۔

٭ ٭ ٭

اس آیت میں کلالہ سے حقیقی اور پدری بھائی بہن مراد ہیں۔

دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

وان كان رجل يورث كللة او امرأة وله اخ او اخت فلكل واحد منهما السدس فان كانوا اكثر من ذلك فهم شركاء في الثلث۔
اگر کوئی مرد یا عورت مادری بھائی یا بہن کو اپنا وارث چھوڑ جائے تو ان میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہوگا اور اگر ایک سے زیادہ ہوں وہ ایک تہائی میں برابر کے شریک ہوں گے۔

اس آیت میں کلالہ سے مراد مادری بھائی بہن ہیں۔

حضرت ابوبکر سے آیۂ قرآنی فاكهة وابا کے معنی دریافت کیے گئے کہا کہ فاکھۃ کے معنی تو میں جانتا ہوں مگر ابا کے معنی مجھے معلوم نہیں حضرت نے سُنا تو فرمایا الاب هو الكلاء والمرعى (اب، کے معنی گھاس اور چراگاہ کے ہیں)۔

ابن قتیبہ دینوری نے ادب الکاتب میں تحریر کیا ہے کہ حضرت علی نے فرمایا کہ آیۂ قرآنی وفار التنور (تنور جوش مارنے لگا) میں تنور کے معنی سطح زمین کے ہیں۔ فیروز آبادی نے بھی قاموس میں یہ معنی تحریر کیے ہیں۔ حضرت سے مروی ہے کہ جبرئیل آنحضرت کے پاس آئے اور کہا کہ:

مر اصحابك بالعج والثج۔
اپنے اصحاب کو عج اور ثج کا حکم دیجیے۔

(معانی الاخبار)

پھر حضرت نے فرمایا کہ عج کے معنی صدائے تلبیہ بلند کرنے کے ہیں اور ثج کے معنی جانور کے ذبح کرنے کے ہیں۔

حضرت سے حنان اور منان کے معنی پوچھے گئے فرمایا کہ حنان وہ ہے جو روگردانی کرنے والے پر بھی نظر کرم رکھے اور منان وہ ہے جو بن مانگے دے۔

ایک عورت نے اپنے شوہر کو سفلہ کہا شوہر نے کہا کہ اگر میں سفلہ ہوں تو میری طرف سے تجھے طلاق ہے یہ معاملہ حضرت کے سامنے پیش ہوا آپ نے فرمایا:

ان كنت لا تبالى ما قلت وما قيل لك فانت سفلة والا فلا شئ عليك
اگر تجھے اس کی پروا نہیں ہے کہ تو نے کیا کہا اور تیرے بارے میں کیا کہا جاتا ہے تو سفلہ ہے اگر ایسا نہیں ہے تو یہ بات بے نتیجہ ہے۔

(تہذیب الاحکام)

آپ سے پوچھا گیا کہ نوسمۃ کے معنی کیا ہیں فرمایا:

الذی لا یدری الناس ما فی نفسہ — وہ جس کے دل کی بات لوگ نہ جان سکیں۔

(معانی الاخبار)

آپ سے پوچھا گیا کہ قسی کس کپڑے کو کہتے ہیں فرمایا اس مصری یا شامی کپڑے کو جس کی لکیروں سے چار خانے بنتے ہوں۔

ضربُ الامثال

ضرب المثل اس مختصر سے مختصر فقرہ کو کہتے ہیں جو اپنی لفظی لطافت اور معنوی افادیت کی بنا پر بے تکلف زبانوں پر آ گیا ہو۔ اگر مثل کا استعمال برمحل ہو تو اس سے کلام کا حسن اور اثر آفرینی بڑھ جاتی ہے۔ کیوں کہ مثل میں کسی تجربہ و مشاہدہ کا نچوڑ یا کسی واقعہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے لہٰذا جس واقعہ کے سلسلہ میں اسے بیان کیا گیا ہوگا۔ اس سے ملتے جلتے ہوئے واقعہ کی تصویر نظروں کے سامنے آجائے گی اور اس کی روشنی میں موجودہ واقعہ کے اچھے یا برے نتائج پر حکم لگایا جا سکے گا۔ ابراہیم نظام کا قول ہے کہ مثل میں چار خوبیاں ایسی ہوتی ہیں جو کسی کلام میں یکجا نہیں ہوتیں۔ لفظی اختصار، معنیٰ مقصود سے ہم آہنگی، حسین تشبیہ اور لطیف استعارہ انہی خوبیوں کی بنا پر مثلیں زبانوں پر چڑھتی اور فروغ عام پاتی ہیں۔

امیرالمؤمنین کے خطبات و تحریرات میں کثرت سے مثلیں استعمال ہوئی ہیں ان میں سے چند ایک کا ذکر کیا جاتا ہے:

ھیھات بعد اللتیا والتی — افسوس اب یہ بات جب کہ میں چھوٹی بڑی مصیبت جھیل چکا ہوں۔

اللتیا، التی کی تصغیر ہے اس مثل کی ابتدا یوں ہوئی کہ ایک شخص نے ایک پستہ قد عورت سے عقد کیا جو آئے دن اس کے لیے کوئی نہ کوئی مصیبت کھڑی کر دیتی اس نے تنگ آکر اسے طلاق دے دی اور ایک ایسی عورت سے نکاح کر لیا جو دراز قامت تھی مگر یہ اس کے لیے پہلی سے زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوئی اس نے اسے بھی طلاق دے دی اور کہا بعد اللتیا والتی لا اتزوج ابدا (میں اس چھوٹی اور بڑی کے بعد کبھی شادی نہیں کروں گا) اس کے بعد اس سے چھوٹی اور بڑی مصیبت مراد لی جانے لگی۔

لو کان یطاع لقصیر امر — کاش کہ قصیر کی بات مان لی جاتی۔

یہ مثل اس موقع پر استعمال کی جاتی ہے جہاں کسی مشورہ دینے والے کا مشورہ رد کر دیا جائے اور بعد میں پچھتایا جائے یہ جملہ سب سے پہلے جذیمہ ابن ابرش کے غلام قصیر نے کہا اور پھر مثل کے طور پر استعمال ہونے لگا۔

عند الصباح یحمد القوم السری۔ — صبح کے وقت ہی لوگ رات کی راہ پیمائی کی تعریف کرتے ہیں۔

یہ مثل اس موقع پر کہی جاتی ہے جب زحمت و مشقت کے نتیجہ میں راحت و آرام میسر آئے۔ یہ جملہ سب سے پہلے خالد ابن ولید نے کہا اور پھر بطور مثل استعمال ہونے لگا۔

کم من اکلۃ منعت اکلات — بسا اوقات ایک دفعہ کا کھانا بہت دفعہ کے کھانوں سے مانع ہو جاتا ہے۔

یہ جملہ ضرورت سے زیادہ شکم پری کے موقع پر استعمال ہوتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ انسان کو ضرورت سے زیادہ نہ کھانا چاہیے کیوں کہ کھانے کی حرص مختلف بیماریوں کا پیش خیمہ ہے جس کے نتیجہ میں انسان کو بہت سے کھانوں سے محروم ہونا پڑتا ہے یہ جملہ سب سے پہلے عامر ابن ظرب عدوانی نے کہا اور پھر مثل کے طور پر استعمال ہونے لگا۔

ابوالفضل میدانی نے مجمع الامثال میں لکھا ہے کہ ایک موقع پر امیرالمومنین حضرت علی نے تمثیلاً بیان فرمایا کہ ایک جنگل میں ایک شیر اور تین بیل سفید، سیاہ اور سرخ مل کر رہتے تھے۔ شیر انہیں کھا جانا چاہتا تھا مگر ان کے ایک ساتھ رہنے کی وجہ سے اسے حملہ کا موقع نہ ملتا تھا۔ ایک دن اس نے کالے اور سرخ بیل سے کہا کہ مجھے اس سفید بیل کی طرف سے اندیشہ ہے کیوں کہ سفید ہونے کی وجہ سے وہ دور سے دکھائی دے جاتا ہے ایسا نہ ہو کہ شکاری اسے دیکھ کر یہاں پہنچ جائے اور ہم سب اس کی وجہ سے مارے جائیں اگر تم مجھے اجازت دو تو میں اسے کھا جاؤں تاکہ ہمارے لیے کوئی خطرہ نہ رہے دونوں بیلوں نے اس کی رائے سے اتفاق کیا اور شیر اسے چیر پھاڑ کر کھا گیا پھر ایک دن اس نے سرخ بیل سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا کہ تمہارا رنگ تو میرے رنگ سے ملتا جلتا ہے مگر یہ کالا بیل ہمیں ایک نہ ایک دن لے ڈوبے گا اگر تم کہو تو میں اسے بھی کھا جاؤں تاکہ ہم یہاں بے خوف و خطر رہ سکیں۔ اس نے کہا کہ بہتر ہے اسے بھی کھا جاؤ جب اسے کھا چکا تو سرخ بیل سے کہا کہ اب میں تمہیں بھی کھاؤں گا اس نے کہا کہ اب میں اکیلا اور بے بس ہوں تم جب چاہو مجھے کھا سکتے ہو مگر مجھے اتنی مہلت دو کہ میں اپنا پیغام دوسروں تک پہنچا سکوں شیر نے اسے مہلت دی اور اس نے بلند آواز سے کہا:

الا انی اکلت یوم اکل الثور الابیض — میں تو اسی دن لقمہ بن گیا تھا جس دن سفید بیل کو کھایا گیا تھا۔

اس مثل سے مراد یہ ہے کہ جو شخص دوسرے کی ہلاکت پر رضامند ہو جاتا ہے اسے بھی ہلاکت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

میدانِ جنگ میں حضرت سے کہا گیا کہ آپ زرہ خود پہنے بغیر دشمن سے بھڑ جاتے ہیں۔ فرمایا

احرز امرأ اجله۔ — موت کا لمحہ انسان کو حفاظت میں لیے ہوئے ہے۔

اس جملہ کے بارے میں میدانی نے لکھا ہے کہ:

هذا اصدق مثل ضربته العرب — یہ عربی مثلوں میں سب سے سچی ضرب المثل ہے۔

(مجمع الامثال)

ایک مرتبہ عید کے موقع پر متعدد کھانے آپ کے سامنے جمع ہو گئے۔ آپ نے ان کھانوں کو ملا کر ایک کر لیا اور فرمایا

اجعلها باجا۔ — میں انہیں یکرنگ کیے لیتا ہوں۔

علامہ مجلسی نے لکھا ہے کہ صارت کلمته مثلاً حضرت کا یہ کلمہ ضرب المثل بن گیا ہے۔

ماعدا مما بدا؟ — آخر اس تبدیلی کا کیا سبب ہے۔

علامہ سید رضی نے تحریر کیا ہے کہ یہ جملہ جو بطور مثل استعمال ہوتا ہے اور سب سے پہلے آپ ہی سے سنا گیا ہے۔

جعلت فداك — میں تم پر قربان جاؤں۔

شیخ علاء الدین نے تحریر کیا ہے کہ:

اوّل من قال جعلت فداک علی رضی اللہ عنہ۔ (محاضرۃ الاوائل) — جس نے سب سے پہلے جعلت فداک کہا وہ حضرت علی تھے۔

حضرت کے چند کلمات اور درج کیے جاتے ہیں جو اپنے اختصار اور جامعیت کی وجہ سے ضرب المثل بن چکے ہیں:

لا رای لمن لا یطاع	اس کی رائے ہی کیا جس کی بات نہ مانی جائے۔
القلب مصحف البصر	دل آنکھ کا صحیفہ ہے۔
الھم نصف الھرم	غم آدھا بڑھاپا ہے۔
خیر البلاد ما حملک	بہترین شہر وہ ہے جو تمہارا بوجھ اٹھائے
الحرمان خیر من الامتنان	احسان مند ہونے سے محروم ہونا بہتر ہے
من صارع الحق صرعہ	جو حق سے ٹکرائے گا حق اسے پچھاڑ دے گا
الامانی تعمی اعین البصائر	امیدیں چشم بصیرت کو کور کر دیتی ہیں۔
کل مقتصر علیہ کاف	جس پر قناعت کر لی جائے وہ کافی ہے۔
رسولک ترجمان عقلک	تمہارا قاصد تمہاری عقل کا ترجمان ہے۔
بطن المرء عدوہ۔	انسان کا شکم اس کا دشمن ہے۔
ثبات الملک بالعدل	ملک کا ثبات و قیام عدل سے وابستہ ہے۔
جلیس المرء مثلہ	آدمی کا ہمنشیں ویسا ہوتا ہے جیسا وہ خود ہوتا ہے
رسول الموت الولادۃ	پیدائش موت کی پیغامبر ہے۔
عاقبۃ الظلم وخیمۃ۔	ظلم کا انجام سخت ہے۔
صمت الجاھل سترہ	جاہل کی خاموشی اس کی پردہ پوش ہے
اشرف الغنی ترک المنی	امیدوں سے دست برداری بہترین ثروت ہے

لاکھ دینے کا ایک دینا ہے
دلِ بے آرزو دیا تو نے

من لم یثق لم یوثق بہ۔	جو دوسروں پر اعتماد نہیں کرتا اس پر بھی اعتماد نہیں کیا جاتا
ضعف العقل امان من الغم	عقل کی کمزوری غم سے امان دلاتی ہے۔

چنداں کہ عقل بیش غم روزگار بیش

اوّل رای العاقل آخر رای الجاھل	عاقل کی رائے جو شروع میں ہوتی ہے وہی جاہل کی رائے آخر میں ہوتی ہے۔

واشتغلتنا واستهوتنا
واستلهتنا واستغوتنا
قد ضیعنا دارا تبقیٰ
واستوطنا دارا تفنیٰ
تفنی الدنیا قرنا قرنا
کلا موتی کلا موتی
کلا فیها موتی موتی
کلا موتی کلا دفنا
نقلا نقلا دفنا دفنا
یا ابن الدنیا مهلا مهلا
زن ما یاتی وزنا وزنا
لسنا ندری ما فرطنا
الا فیها یوما متنا
لولا جهلی ما ان کانت
عندی الدنیا الا سجنا
یا ابن الدنیا جمعا جمعا
یا ابن الدنیا مهلا مهلا
یا ابن الدنیا دقا دقا
یا ابن الدنیا وزنا وزنا
خیرا خیرا سیئا سیئا
سیئا سیئا حسنا حسنا
یا ذا من ذا کم ذا هذا
لسنا نرجو ننجو نخشی
عجل قبل الفوت الوزنا
ما من یوم یمضی عنا
الا اوهن منا رکنا
ان المولی انذرنا

غافل اس نے ہم کو بنایا
اپنی راہ پہ ہم کو ڈالا
گھر عقبیٰ کا ہم نے اُجاڑا
گھر دنیا کا ہم نے بسایا
ہر دم رو بفنا ہے دُنیا
موت سے کس کو ہے چھٹکارا
کس کو سدا ہے یاں پر رہنا!
سب کو ہے ہر حال میں مرنا
یاں سے اک دن کوچ ہے کرنا
دنیا والے رُک جا تھم جا
رتی، رتی، تولہ، تولہ!
عیش میں سارا وقت گنوایا
جس دن موت نے آن دبوچا
بے خبری کا کھرا اچھا یا!
چشم بصیرت کھول کے دیکھا
دنیا والے کر لے اکٹھا
دنیا والے یا ابن الدنیا
دنیا والے بندۂ دنیا
دنیا والے کام ہو تیرا
نیکی کا بدلہ نیک کمایا
بد انجام ہے بد کاموں کا
کیا ہے دنیا کتنی دُنیا
بخشش کا اب کیا ہے سہارا
موت سے پہلے جلدی کرنا
جو دن گزرا ایسا گزرا
موت کے آگے بس ہے کس کا
مالک نے ہر چند ڈرایا

راہِ ہوس پہ اس نے لگایا
حق کی راہ سے دور ہٹایا
جس میں سدا ہے جا کے رہنا
جو ہے فانی اور لاتبقیٰ
ختم ہے اک دن کھیل یہ سارا
ایک نہ اک دن سب کو مرنا
رفتہ رفتہ سب کو مرنا
اُجڑے گھر میں جا کے بسنا
زیرِ لحد ہے تنہا رہنا
سوچ سمجھ کر آگے بڑھنا
کام ہو سارا تولا ناپا!
غفلت میں انجام نہ سوچا
اس دن آنکھ سے اُٹھا پردہ
کچھ نہ سوجھے کیا ہے دُنیا
صورتِ زنداں اس کو پایا
بھر لے اپنا خالی پیالہ
کچھ تو کر احساس زیاں کا
اس کا در کھٹکاتے رہنا
وزن میں پورا ٹھیک اُترتا
شر کا بدلہ شر ہے پایا
نیک عمل کا نیک نتیجہ!
آنکھیں کھول کے دیکھ ذرا سا
خوف و رجا سے کام نہ رکھا
ہاتھ سے اپنے وزن عمل کا
جیسے ڈھلتا گھٹتا سایہ
ہر دن کوئی نہ کوئی ہے مرتا
خوف نہ اس کا ہم نے کھایا

اسی طرح ایک مرتبہ ایک طنبورہ نواز کو طنبورہ بجاتے اور اس پر جھومتے دیکھا تو آپ نے آگے بڑھ کر طنبورہ توڑ دیا اور اس سے یہ عہد لیا کہ آئندہ وہ یہ کام نہیں کرے گا پھر فرمایا کہ تمہیں معلوم ہے کہ اس طنبورہ سے کیا آواز نکلتی ہے کہا یہ تو میں نہیں جانتا فرمایا کہ اس میں سے یہ صدا آتی ہے:

ستندم ستندم ایا صاحبی

ستدخل جهنم ایا ضاربی

اے میرے ساتھی تم جلد شرمندگی و ندامت اُٹھاؤ گے اور اے میرے بجانے والے تم عنقریب جہنم داخل ہوگے۔

فنِ شعر

شعر اس کلام کا نام ہے جس میں جذبات کی عکاسی اور احساسات کی ترجمانی مؤثر و دلکش پیرایہ میں کی گئی ہو اگرچہ ابتدا میں شعر کے لیے وزن ضروری نہ سمجھا جاتا تھا مگر شعرائے عرب نے کلام کی خوبی و دلآویزی کے لیے وزن کا التزام کیا اور اب ہر زبان میں وزن و آہنگ کی پابندی لازمی قرار دے لی گئی ہے اگر وزن کے ساتھ تشبیہ و استعارہ اور تخییل و محاکات کی لطافتیں بھی ہوں تو اس سے شعر کی دلفریبی و اثر انگیزی اور بڑھ جاتی ہے اور سننے والے کلام کے حسن سے متاثر و مسحور ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ یوں تو دنیا کے ہر خطہ میں ذوقِ شعری پایا جاتا ہے اور شعر و سخن کی محفلیں جمتی ہیں مگر سرزمین عرب ہمیشہ شاعری کا گہوارہ رہی ہے اور ہر دور میں ایک سے ایک بہتر شاعر پیدا کیا ہے جن کا احاطہ و شمار نہیں ہو سکتا اس کی وجہ عربوں کا فطری جوش اور زبان کی موزونیت ہے چنانچہ جتنے متوازن اور معنی سے ہم آہنگ الفاظ اس زبان میں ہیں وہ کسی اور زبان میں نہیں ہیں۔ عربی شاعری صرف قلبی واردات کی ترجمانی تک محدود نہ تھی بلکہ دشمن کو للکارنے، غیرتِ قومی کو جھنجھوڑنے، انتقامی جذبات کو ابھارنے اور نسلی افتخار و برتری کے اظہار کے لیے شعر ہی سے کام لیا جاتا تھا۔ یہ تو کہا نہیں جا سکتا کہ دورِ جاہلیت کی شاعری اخلاقیات سے یکسر تہی دامن تھی جب کہ اس میں سخاوت، شجاعت اور خودداری کے درس بھی ملتے ہیں لیکن ایسے مضامین کی بھی کمی نہ تھی جو برائی کو پرکشش بنا کر بے راہروی کی تحریک کرتے تھے۔ اسلام جس کا مقصد اخلاقیات کی تربیت و تکمیل تھا وہ یہ گوارا نہ کر سکتا تھا کہ اس قسم کی مخربِ اخلاق شاعری کو فروغ حاصل ہو۔ چنانچہ قرآن مجید ایسے تخریب کار شعراء کی مذمت میں کہتا ہے۔

الشعراء یتبعهم الغاوون الم تر	شاعروں کی پیروی گمراہ لوگ کرتے ہیں کیا تم نہیں دیکھتے
انهم فی کل واد یهیمون وانهم یقولون	کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں اور جو کہتے ہیں وہ
ما لا یفعلون۔	کرتے نہیں ہیں۔

یہ انہی شعراء کے بارے میں ہے جو نفسانی جذبات کو ابھارتے شر و فساد کو ہوا دیتے اور لوگوں کی عزت و ناموس کو ہدف بناتے تھے اور جہاں تک نفسِ شاعری کا تعلق ہے تو اسلام نے اس پر کوئی پابندی عاید نہیں کی نہ شعر کہنے سے منع کیا اور نہ شعر سننے سے روکا چنانچہ پیغمبر اکرم کے روبرو اشعار پڑھے جاتے تھے اور آپ نہ صرف سنتے بلکہ بعض مواقع پر صلہ و تحسین

ابو احمد عبد العزیز ابن یحییٰ جلودی متوفی حدود ۳۳۰ھ نے آپ کے اشعار کو جمع کیا اور نجاشی نے ان کے مؤلفات میں کتاب شعر علی کا ذکر کیا ہے۔

محمد ابن عمران مرزبانی متوفی ۳۸۴ھ نے آپ کے مختلف مواقع کے اشعار یکجا کیے۔

علی ابن احمد فنجکردی متوفی ۵۱۳ھ نے آپ کے منظوم کلام کا ایک مجموعہ مدون کیا۔

ابو البرکات ہبۃ اللہ ابن علی متوفی ۵۴۲ھ نے ایک مجموعہ آپ کے اشعار پر مشتمل مرتب کیا۔

محمد ابن الحسین الکیدری متوفی حدود ۵۷۶ھ نے دو مجموعے آپ کے کلام پر مشتمل ترتیب دیے ایک کا نام انوار العقول اور دوسرے کا نام الحدیقۃ الانیقہ ہے۔

سید محسن امین عاملی صاحب اعیان الشیعہ متوفی ۱۳۷۱ھ نے حروفِ تہجی کی ترتیب پر آپ کے اشعار کی تدوین کی۔

ان مجموعوں کے علاوہ متعدد اعلام نے اپنی کتابوں میں آپ کے مختلف اشعار درج کیے ہیں چنانچہ محمد ابن سلامہ مغربی نے کتاب دستور معالم الحکم میں سبط ابن جوزی نے تذکرہ میں نصر ابن مزاحم نے کتاب الصفین میں ابن صباغ مالکی نے فصول المہمہ میں مبرد نے کامل میں اور دوسرے مؤلفین نے اپنے مؤلفات میں آپ کے مختلف مواقع کے اشعار نقل کیے ہیں۔ ان مجموعوں اور ان میں اشعار کی کثرت کو دیکھتے ہوئے یہ رائے قطعاً صحت سے عاری اور واقعیت سے دور ہے کہ آپ نے اپنی زندگی میں صرف دو شعر کہے۔ سعید ابن مسیب کہتے ہیں۔

کان ابو بکر شاعراً و عمر شاعراً و علی اشعر الثلثۃ۔	حضرت ابو بکر اور حضرت عمر دونوں شاعر تھے اور حضرت علی ان سے بڑھ کر شاعر تھے۔

(عقد الفرید ج ۳ ص ۳۹۶)

شعبی کا یہ قول متعدد کتابوں میں درج ہے۔

کان ابو بکر یقول الشعر و کان عمر یقول الشعر و کان عثمان یقول الشعر و کان علی اشعر الثلثۃ۔	حضرت ابو بکر حضرت عمر اور حضرت عثمان شعر کہا کرتے تھے مگر حضرت علی کی شاعری کا پایہ ان تینوں سے بلند تر تھا۔

(تاریخ الخلفاء ص ۱۲۸)

اس دور میں شاید ہی کوئی فرد ایسا ہو جس نے اپنی زندگی میں ایک آدھ شعر نہ کہا ہو مگر ایسے لوگوں کو کبھی شعراء میں شمار نہیں کیا گیا اگر امیر المؤمنین نے اپنی زندگی میں صرف دو شعر کہے ہوتے تو انہیں شاعر بھی نہیں کہنا چاہیے تھا چہ جائیکہ اشعر (بہت بڑا شاعر) کہا جائے۔ حضرت علی کا خلفاء ثلثہ سے تقابل اور ان کے مقابلہ میں انہیں اشعر کہنا غیر موزوں سی بات ہے اس لیے کہ اولاً تو ان خلفاء کا کلام کہیں دیکھنے سننے میں نہیں آتا اور کچھ تھوڑا بہت ہو تو ہو مگر اتنا بہر حال نہیں ہے کہ انہیں صف شعراء میں شمار کیا جا سکے بلکہ تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ ان میں سے بعض کو شعر کا مفہوم سمجھنے کے لیے دوسروں کی رہنمائی کی ضرورت ہوتی تھی چنانچہ ایک مرتبہ زبرقان ابن بدر نے حضرت عمر سے شکایت کی کہ حطیئہ نے اس کی ہجو میں یہ شعر کہا ہے

دع المکارم لاتنهض لبغیتها
واقعد فانک انت الطاعم الکاسی

"بزرگیوں کو چھوڑ اور ان کے پیچھے نہ بھاگ اپنی جگہ پر بیٹھا رہ تجھے تو کھانے اور پہننے سے مطلب ہے"

حضرت عمر نے کہا کہ اس میں تو ہجو کی کوئی بات نہیں ہے کیا تم کھاتے اور پہنتے نہیں ہو۔ زبرقان نے کہا کہ اس سے بڑھ کر ہجو کیا ہو سکتی ہے کہ اس نے میری زندگی کا مقصد ہی کھانا پینا اور پہننا قرار دے لیا ہے۔ حضرت عمر اس پر مطمئن نہ ہوئے اور حسان ابن ثابت کو بلایا اور پوچھا کہ کیا اس میں ہجو کا کوئی پہلو ہے انہوں نے کہا:

ما هجاہ ولکن سلح علیہ۔ — ہجو ہی نہیں کہی بلکہ اس پر غلاظت پھینک دی ہے

(عقد الفرید ج ۳ ص ۱۶۲)

احمد حسن الزیات اس واقعہ کے ذیل میں تحریر کرتے ہیں:

لم یفطن الی موضع الهجاء فیه لدقته حتی دله علیه حسان۔ — حضرت عمر شعر کی باریکی کی بناء پر ہجو کے پہلو کو نہ سمجھ سکے یہاں تک کہ حسان نے انہیں بتایا۔

(تاریخ الادب العربی)

قبیلۂ بنی عجلان نے حضرت عمر سے شکایت کی کہ نجاشی نے ان کی ہجو کہی ہے حضرت عمر نے کہا کہ میں بھی سنوں کہ وہ ہجو کیا ہے۔ انہوں نے یہ شعر پڑھا۔

اذا الله عادی اهل لوم ودقة — فعادی بنی عجلان رهط ابن مقبل

اگر اللہ کمینے اور ذلیل لوگوں کو دشمن رکھتا ہے تو قبیلۂ ابن مقبل کی شاخ بنی عجلان کو بھی دشمن رکھے۔

حضرت عمر نے کہا کہ یہ تو ہجو نہیں ہے بلکہ بد دعا ہے اگر وہ مظلوم ہے تو اس کی دعا قبول ہوگی ورنہ رد کر دی جائیگی انہوں نے کہا کہ اس کے بعد یہ شعر بھی کہا ہے۔

قبیلة لا یغدرون بذمة — ولا یظلمون الناس حبة خردل

یہ قبیلہ کسی سے عہد شکنی کا مرتکب نہیں ہوتا اور نہ کسی پر رائی برابر ظلم کرتا ہے (یعنی وہ کمزور و بزدل ہیں)۔

حضرت عمر نے یہ شعر سُن کر کہا:

لیت آل الخطاب مثل هؤلاء۔ — کاش خطاب کی آل اولاد بھی ایسی ہوتی!

(عقد الفرید)

انہوں نے کہا کہ اس کے بعد یہ شعر کہا ہے:

ولا یردون الماء الا عشیة — اذا صدر الوراد عن کل منهل

یہ لوگ رات کے وقت چشمہ پر آتے ہیں جب دوسرے لوگ اپنے اونٹوں کو سیراب کر کے واپس چلے جاتے ہیں۔

حضرت عمر نے کہا کہ بھیڑ بھاڑ سے بچنا اچھی بات ہے یہ تو کوئی ہجو نہیں ہے حالاں کہ شاعر کا مقصد یہ تھا کہ وہ ذلیل و

کمزور ہیں اور انہیں اونٹوں کو پانی پلانے کی اجازت اس وقت ملتی ہے جب تمام لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلا کر واپس چلے جاتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ شعر بھی تو کہا ہے:

وما سمی العجلان الا لقولهم   خذ القعب ایها العبد واعجل

بنی عجلان کا نام عجلان اس لیے پڑا کہ لوگ اسے یہ کہتے تھے کہ اے غلام پیالہ اٹھا اور جلدی سے دودھ دوہ لے۔ حضرت عمر نے کہا کہ اس میں کیا برائی ہے قوم کا سردار قوم کا خدمت گزار ہوتا ہے۔ غرض ان ہجویہ اشعار سے ہجو کے پہلو کی طرف متوجہ نہ ہو سکے۔

امیر المؤمنین الفاظ کی گہرائیوں میں جھانک کر شعر کے حسن وقبح کو پرکھنے کا ملکہ تام رکھتے تھے اور کلام عرب پر احاطہ کرنے کے بعد شعر کی قدر وقیمت اور شعراء کے مرتبہ ومقام کو بخوبی پہچانتے تھے چنانچہ اسی شعری شعور اور وسیع النظری کی بنا پر آپ سے دریافت کیا گیا کہ عرب میں سب سے بڑا شاعر کون ہے فرمایا:

ان القوم لم یجروا فی حلبة تعرف الغایة عند قصبتها فان کان ولابد فالملك الضلیل۔

شعراء کی دوڑ ایک روش پر نہ تھی کہ گوئے سبقت لے جانے سے ان کی آخری حد کو پہچانا جائے اگر ترجیح دینا ہی ہے تو پھر گمراہ فرماں روا (امرء القیس) ہے۔

(نہج البلاغہ)

حضرت نے پہلے تو کسی ایک کی تعیین کرنے سے پہلو تہی کی اور اس کی وجہ بیان فرمائی کہ شعراء کے کلام میں موازنہ کر کے اشعر کی تعیین اس صورت میں ہو سکتی ہے جب ان کے اشعار کی نوعیت ایک ہو اور جب اصناف شعر میں سے ہر صنف کا ایک مخصوص لب ولہجہ ہے اور ایک مخصوص مزاج ہے تو ان میں نقد کیسا مثلاً جو الفاظ اظہار شجاعت کے لیے موزوں ہوتے ہیں وہ تغزل کے لیے موزوں ومناسب نہیں ہوتے اور جو غزل کے لیے مناسب ہوتے ہیں وہ شجاعت وبسالت کے لیے مناسب نہیں سمجھے جاتے اس لیے کہ لفظ ومعنی کا ربط اس کا متقضی ہے کہ حماسات کے الفاظ میں سختی وخشونت اور تغزل کے الفاظ میں نرمی ونزاکت ہو لہذا جب کلام کی سمت بدلی ہوئی ہو گی تو ایسی موازنہ بے محل قرار پائے گا۔ اس ایک گونہ معذرت کے بعد امراء القیس ابن حجر کندی کو ترجیح دی، اور اس ترجیح پر ایک موقع پہ یہ بیان فرمائی ہے:

رأیته احسنهم نادرة واسبقهم بادرة وانه لم یقل لرغبة ولا لرهبة۔

میں نے اسے ہی آفرینی میں سب سے بہتر اور بدیہہ گوئی و برجستہ گوئی میں سب سے آگے پایا ہے۔ اس نے نہ رغبت کی بنا پر شعر کہے اور نہ خوف وہراس کے پیش نظر۔

(المزہر ج ۲ ص ۴۷۸)

حضرت نے رغبۃ اور رہبۃ کی لفظوں سے عرب کے شاعر اعشیٰ اور نابغہ کی جانب اشارہ کیا ہے کہ اعشیٰ کو کسی شے کی طلب وخواہش ہوتی تو اس کی طبیعت میں روانی آتی اور نابغہ کو خوف دامن گیر ہوتا تو اس کے جذبہ شعری میں ارتعـ

پیدا ہونا۔

امیرالمومنین کے اس اجمالی تبصرہ سے نقد و نظر کے بنیادی ضوابط کی طرف رہنمائی ہوتی ہے پہلا ضابطہ یہ ہے کہ کلام کی نوعیت یکساں ہو جب موازنہ برمحل ہوگا اور اگر کلام کا موضوع و آہنگ بدلا ہوا ہو تو تقابل صحیح نہ ہوگا۔ چنانچہ مثنوی کا موازنہ رباعی سے اور مرثیہ کا موازنہ غزل سے برمحل نہ سمجھا جائے گا۔ دوسرا ضابطہ یہ ہے کہ شعر میں جدت جودت اور ندرت ہونا چاہیے اگر صرف لفظوں کا تانا بانا بنا گیا ہو تو اس کی کوئی قدر و قیمت نہ ہوگی چنانچہ اسی ندرت پسندی و جدت طرازی کی وجہ سے امراءالقیس کو دوسرے شعراء پر ترجیح دی ہے تیسرا ضابطہ جو امراءالقیس کی شاعرانہ خصوصیات سے مستخرج ہے یہ ہے کہ معنی کے ساتھ لفظوں کی ترکیب و ترتیب اور در و بست میں حسن سلیقہ کارفرما ہو چنانچہ شعر کی خوبی کا انحصار صرف مضمون آفرینی پر نہیں ہے بلکہ اس میں اسلوب و طرز بیان کو بھی دخل ہے اس لیے کہ معنی کتنے ہی بلند اور لطیف کیوں نہ ہوں اگر انہیں موزوں و مناسب لفظوں میں پیش نہ کیا جائے تو معنی کا حسن کچلا کر رہ جائے گا اور اگر معنی میں کوئی خاص ندرت نہ ہو مگر انہیں عمدہ الفاظ میں بیان کیا جائے تو پامال مضمون میں بھی رعنائی و تازگی پیدا ہو جائے گی چنانچہ امراءالقیس جس میں رندی و سرمستی کا عنصر نمایاں تھا۔ ایک عام اور مبتذل بلکہ اخلاقی سطح سے گرے ہوئے مضمون کو کہیں استعارہ و تشبیہ اور کہیں حسن ترکیب کا سہارا دے کر خوش آہنگ بنا دیتا ہے اور اس کی اسی خصوصیت خاصہ کی بنا پر حضرت نے اسے بزم شعراء کا صدر نشین قرار دیا ہے۔

امیرالمومنین یگانۂ روزگار ادیب و نقاد تو تھے ہی اس کے ساتھ شاعر نواز اور ادیب پرور بھی تھے اور ادبی شہپاروں کو پرکھتے اور ان کی قدر افزائی فرماتے چنانچہ ایک مرتبہ ایک اعرابی آپ کے پاس آیا اور کہا کہ میں ایک حاجت لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ اگر آپ میری حاجت روائی فرمائیں گے تو میں اللہ کی حمد و ستائش کروں گا اور آپ کا شکر گزار ہوں گا آپ نے فرمایا کہ تم اپنی حاجت زمین پر تحریر کر دو۔ اس نے لکھا انی فقیر "میں غریب و نادار ہوں" آپ نے قنبر سے فرمایا کہ فلاں حلہ اسے دے دو۔ اس نے حلہ لے لیا اور برجستہ یہ اشعار پڑھے:

کسوتنی حلۃ تبلی محاسنہا　　فسوف اکسوک من حسن الثنا حللا

آپ نے مجھے وہ حلہ پہنایا ہے جس کا رنگ روپ مٹ جائے گا اور میں اس کے عوض آپ کو بہترین مدح و ثنا کے حلے پہناؤں گا۔

ان الثناء لیحیی ذکر صاحبہ　　کالغیث یحیی نداہ السہل والجبلا

مدح و ثنا ممدوح کے ذکر کو زندہ جاوید بنا دیتی ہے جس طرح برسنے والے ابر کی پھوار پہاڑوں اور میدانوں کی رگ رگ میں زندگی کی رو دوڑا دیتی ہے۔

لا تزہد الدہر فی عرف بدأت بہ　　فکل عبد سیجزی بالذی فعلا

جو حسن سلوک اور نیکی آپ نے کی ہے اس کا سلسلہ ہمیشہ جاری رکھیے کیوں کہ ہر بندے کو اس کے کیے کا بدلہ ملے گا۔

پیدا ہونا۔

امیر المومنین کے اس اجمالی تبصرہ سے نقد و نظر کے بنیادی ضوابط کی طرف رہنمائی ہوتی ہے پہلا ضابطہ یہ ہے کہ کلام کی نوعیت یکساں ہو جب موازنہ برمحل ہوگا اور اگر کلام کا موضوع و آہنگ بدلا ہوا ہو تو تقابل صحیح نہ ہوگا۔ چنانچہ مثنوی کا موازنہ رباعی سے اور مرثیہ کا موازنہ غزل سے برمحل نہ سمجھا جائے گا۔ دوسرا ضابطہ یہ ہے کہ شعر میں جدت جودت اور ندرت ہونا چاہیے اگر صرف لفظوں کا تانا بانا بنا گیا ہو تو اس کی کوئی قدر و قیمت نہ ہوگی چنانچہ اسی ندرت پسندی و جدت طرازی کی وجہ سے امراء القیس کو دوسرے شعراء پر ترجیح دی ہے۔ تیسرا ضابطہ جو امراء القیس کی شاعرانہ خصوصیات سے مستخرج ہے یہ ہے کہ معنی کے ساتھ لفظوں کی ترکیب و ترتیب اور در و بست میں حسن سلیقہ کارفرما ہو چنانچہ شعر کی خوبی کا انحصار صرف مضمون آفرینی پر نہیں ہے بلکہ اس میں اسلوب و طرز بیان کو بھی دخل ہے اس لیے کہ معنی کتنے ہی بلند اور لطیف کیوں نہ ہوں اگر انہیں موزوں و مناسب لفظوں میں پیش نہ کیا جائے تو معنی کا حسن کجلا کر رہ جائے گا اور اگر معنی میں کوئی خاص ندرت نہ ہو مگر انہیں عمدہ الفاظ میں بیان کیا جائے تو پامال مضمون میں بھی رعنائی و تازگی پیدا ہو جائے گی چنانچہ امرا القیس جس میں رندی و سرمستی کا عنصر نمایاں تھا۔ ایک عام اور مبتذل بلکہ اخلاقی سطح سے گرے ہوئے مضمون کو کہیں استعارہ و تشبیہ اور کہیں حسن ترکیب کا سہارا لے کر خوش آہنگ بنا دیتا ہے اور اس کی اسی خصوصیت خاصہ کی بنا پر حضرت نے اسے بزم شعرا کا صدر نشین قرار دیا ہے۔

امیر المومنین یگانۂ روزگار ادیب و نقاد تو تھے ہی اس کے ساتھ شاعر نواز اور ادیب پرور بھی تھے اور ادبی شہپاروں کو پرکھتے اور ان کی قدر افزائی فرماتے چنانچہ ایک مرتبہ ایک اعرابی آپ کے پاس آیا اور کہا کہ میں ایک حاجت لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ اگر آپ میری حاجت روائی فرمائیں گے تو میں اللہ کی حمد و ستائش کروں گا اور آپ کا شکر گزار ہوں گا آپ نے فرمایا کہ تم اپنی حاجت زمین پر تحریر کر دو۔ اس نے لکھا انی فقیر "میں غریب و نادار ہوں" آپ نے قنبر سے فرمایا کہ فلاں حلہ اسے دے دو۔ اس نے حلہ لے لیا اور برجستہ یہ اشعار پڑھے:

کسوتنی حلۃ تبلی محاسنھا   فسوف اکسوک من حسن الثنا حللا

آپ نے مجھے وہ حلہ پہنایا ہے جس کا رنگ روپ مٹ جائے گا اور میں اس کے عوض آپ کو بہترین مدح و ثنا کے حلے پہناؤں گا۔

ان الثناء لیحیی ذکر صاحبہ   کالغیث یحیی نداہ السھل والجبلا

مدح و ثنا ممدوح کے ذکر کو زندہ جاوید بنا دیتی ہے جس طرح برسنے والے ابر کی پھوار پہاڑوں اور میدانوں کی رگ رگ میں زندگی کی رو دوڑا دیتی ہے۔

لا تزھد الدھر فی عرف بدأت بہ   فکل عبد سیجزی بالذی فعلا

جو حسن سلوک اور نیکی آپ نے کی ہے اس کا سلسلہ ہمیشہ جاری رکھیے کیوں کہ ہر بندے کو اس کے کیے کا بدلہ ملے گا۔

حضرت اس کی برجستہ گوئی سے خوش ہوئے اور قنبر سے فرمایا کہ اسے پچاس دینار بھی دے دو پھر اس اعرابی سے مخاطب ہو کر فرمایا:

اما الحلۃ فلمسئلتک و اما الدنانیر فلادبک — تمہارے سوال پر تمہیں حلہ دیا گیا ہے اور تمہارے ادب کے پیش نظر یہ دینار دیے جا رہے ہیں۔ (عمدہ ابن رشیق ج ۱ ص ۲۹)

فن نثر امیر المومنین کی نثری تخلیقات علم و ادب کا عظیم سرمایہ ہیں جن میں سائنسی انکشافات علمی انکشافات اور فلسفہ و حکمت کے نکات سمٹے ہوئے ہیں۔ حضرت کو زبان و بیان پر اتنا اقتدار حاصل تھا کہ طویل سے طویل تحریریں میں روانی، تسلسل، صفائی اور سبک روی میں فرق نہیں آتا اور مختصر سے مختصر جملوں میں معانی و مطالب کی وسعت کے باوجود ادائے مطلب میں خلل واقع نہیں ہوتا اور لفظوں کی دروبست جملوں کی ساخت اور بندش کی تازگی سے نثر کو اس انتہا تک پہنچا دیا جس کے بعد اعجاز کی حد شروع ہو جاتی ہے اور انسانی زور فصاحت دم توڑتا نظر آتا ہے جنچی تلی لفظیں موقع و محل کے اعتبار سے کہیں ہلکی پھلکی اور کہیں گونجتی گرجتی معنی سے ہم آہنگ اور شگفتگی سے ہمکنار کیف و رنگ میں ڈوبے ہوئے جملے زنجیر کی کڑیوں کی طرح مربوط فقرے اور قرآن و حدیث کے اسلوب میں ڈھلی ہوئی تحریریں آپ کی انشاء پردازی کا خاص جوہر ہیں۔ الہیات کے دقیق مسائل کو ادبی اسلوب بیان کے امتزاج سے اتنا دلکش اور جاذب نظر بنا دیا ہے کہ نظریں کلام کی لفظی و معنوی خوبیوں پر جم کر رہ جاتی ہیں اور فلسفہ ادب پارہ کے روپ میں نظر آنے لگتا ہے اور اخلاقی مواعظ کو اس تاثیری انداز میں پیش کیا ہے کہ موعظت کی تلخی کا احساس نہیں ہونے پاتا اور بات دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے اور جہاں موت کی ہولناکی، نزع کی بے چینی، قبر کی تنہائی، تیمارداروں کی مایوسی اور دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ کھینچا ہے، وہاں موت پوری ہولناکیوں کے ساتھ آنکھوں کے سامنے کھڑی نظر آتی ہے اور جہاں اپنے کلک گہربار سے طاؤس کی خوش رنگی و خوش خرامی اجالوں میں چیونٹی کی نقل و حرکت اور گھپ اندھیروں میں چمگادڑ کی اڑان اور ٹڈی دل کی تگا پو کی تصویر کشی کی ہے وہاں صانع عالم کے حسن آفرینش کا نقشہ نظروں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ حسن زیارت نے آپ کی ان نگارشات کے بارے میں لکھا ہے:

تعد من معجزات اللسان العربي۔ — ان کا شمار عربی ادب کے معجزوں میں ہوتا ہے۔

(تاریخ الادب العربی)

اسی طرح ہر دور کے ادباء و فصحاء نے آپ کی غیر معمولی قدرت اظہار اور زبان و بیان اور طرز ادا کی ندرت کا اعتراف کرتے ہوئے کلام خدا اور رسول کے بعد آپ کے کلام کو ہر کلام سے فصیح تر قرار دیا اور عظیم قلمکاروں نے آپ کے طرز نگارش کے تتبع سے تحریر و انشاء کا سلیقہ سیکھا چنانچہ عبد الحمید ابن یحیی متوفی ۱۳۲ھ ابن مقفع متوفی ۱۴۲ھ ابن نباتہ متوفی ۳۷۴ھ ایسے بلند پایہ انشاء پردازوں نے اپنی اعلیٰ ادبی صلاحیتوں کا سرچشمہ آپ کے خطبات و تحریرات کو قرار دیا اور آپ کے اسلوب نگارش کی رہنمائی سے ادبی شاہکار تخلیق کیے۔ ابن ابی الحدید تحریر کرتے ہیں۔

ومنه تعلم الناس الخطابة و الكتابة۔ — آپ ہی سے لوگوں نے خطابت و انشاء پردازی کا فن سیکھا۔

قلائد الحکم و فرائد الکلم :۔ اس کے جامع قاضی ابو یوسف اسفرائنی ہیں۔

تحف العقول :۔ یہ ابو محمد حسن ابن علی ابن شعبہ کی تالیف ہے اس میں امیرالمؤمنین کے خطبات وکلمات کے علاوہ دوسرے آئمہ اطہار کے ارشادات بھی درج ہیں۔

کتاب مطلوب کل طالب من کلام علی ابن ابی طالب :۔ اس کے جامع ابو اسحاق وطواط انصاری ہیں۔

صحیفۂ علویہ :۔ اس کے مرتب عبداللہ ابن صالح ابن جمعہ متوفی ۱۱۳۵ھ ہیں۔

الف کلمہ :۔ اس کے جامع ابن ابی الحدید معتزلی شارح نہج البلاغہ ہیں۔

مائۃ کلمہ :۔ اس کے جامع ابو عثمان جاحظ ہیں۔

نظم الغرر و نضد الدرر :۔ اس کے جامع میرزا عبدالکریم ابن محمد یحیٰی قزوینی ہیں۔

عیون الحکم والمواعظ :۔ اس کے جامع شیخ علی ابن محمد واسطی ہیں۔

اکسیر السعادتین :۔ اس کے جامع اسعد ابن عبدالقاہر اصفہانی ہیں

علم القراءۃ والکتابہ

حرفوں کی ترکیبی وغیر ترکیبی شکلوں اور مختلف الاشکال حروف کی امتیازی علامتوں کو پہچاننے کا نام علم القراءۃ اور انہیں قلمبند کرنے کے طریق کار کا نام علم الکتابۃ ہے۔ اس نوشت و خواند کی ایجاد ضرورت کے زیر اثر ہوئی اور اپنی افادیت کی بناء پر دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئی۔ تحریر ہی سے علوم و فنون کو بقاء و دوام حاصل ہوتا ہے اور دانش مندوں کے تجربات و مشاہدات دستبرد زمانہ سے محفوظ کیے جاتے ہیں۔ ابتداء میں تصاویر و نقوش کے ذریعہ مختلف واقعات ظاہر کیے جاتے تھے اور یہ تصویریں حروف تہجی کا کام دیتی تھیں۔ یہ تصویری تحریریں آشور، بابل اور مصر میں ہیکلوں، معبدوں اور مقبروں پر ثبت کی جاتی تھیں اور اس طرح اہم واقعات تاریخی اعتبار سے محفوظ کر لیے جاتے تھے۔ امیرالمؤمنین نے بھی اس تصویری رسم الخط کی طرف اشارہ فرمایا ہے چنانچہ آپ سے دریافت کیا گیا کہ اہرام[1] مصر کی بنا کب رکھی گئی آپ نے فرمایا کہ کیا اس پر کوئی تصویر بنی ہوئی ہے بتایا گیا کہ اس پر گدھ کی تصویر ہے جس کے پنجہ میں کیکڑا جکڑا ہوا ہے فرمایا:

بنی الھرمان والنسر فی السرطان — اہرام کی بنیاد اس وقت رکھی گئی جب ستارہ نسر برج سرطان میں تھا۔ (غیاث اللغات ص ۴۹۴)

ستارۂ نسر کی صورت نسر (گدھ) کی سی ہوتی ہے اس لیے اسے گدھ کی صورت میں پیش کیا گیا ہے اور برج سرطان کی

---

[1] اہرام مصر فراعنۂ مصر کے مقبرے ہیں ان میں بڑا اہرام خوفو نے اپنے دفن کے لیے تعمیر کیا تھا۔ یہ ایک وسیع رقبہ میں ۴۸۵ فٹ کی بلندی پر واقع ہے اور اس کے قریب خافرع اور منکاؤرع میں دو اہرام ہیں جو بلندی اور پھیلاؤ میں اس سے چھوٹے ہیں اہرام کبیر کی تعمیر ایک لاکھ انسانوں کی محنت شاقہ کے نتیجہ میں بیس سال کے عرصہ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

علمائے ادب نے نثر کی چار قسمیں کی ہیں۔ مرصع، مسجع، مرجز اور عاری۔ ذیل میں ان قسموں کے اصطلاحی معنی اور حضرت کے کلام سے ان کی ایک ایک مثال درج کی جاتی ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ آپ ان چاروں قسموں پر یکساں اقتدار رکھتے تھے۔

نثر مرصع یہ ہے کہ دو فقروں کے تمام الفاظ متحد الوزن اور آخری الفاظ ہم قافیہ ہوں۔ حضرت فرماتے ہیں:

بعید الجولة عظیم الصولة — وہ دور تک بڑھ جانے والا اور بڑے زور سے حملہ کرنے والا ہے۔

* * *

اس جملہ میں بعید اور عظیم ہم وزن اور جولہ اور صولہ ہم قافیہ ہیں۔

نثر مسجع یہ ہے کہ دو فقروں کے آخری الفاظ ہم قافیہ ہوں جیسے:

اخلاقکم دقاق وعهدکم شقاق۔ — تم پست اخلاق اور عہد شکن ہو۔

اس میں دقاق اور شقاق ہم قافیہ ہیں۔

نثر مرجز یہ ہے کہ دو فقروں کے اکثر الفاظ ہم وزن ہوں جیسے:

سراج لمع ضوئه وشهاب سطع نوره۔ — وہ ایسا چراغ ہے جس کی روشنی لو دیتی ہے اور ایسا روشن ستارہ ہے جس کا نور ضیاء پاش ہے۔

اس میں سراج اور شہاب لمع اور سطع ہم وزن ہیں۔

نثر عاری وہ ہے جس میں وزن و قافیہ کی پابندی نہ کی گئی ہو جیسے:

ولیکن احب الامور الیک اوسطها فی الحق واعمها فی العدل واجمعها لرضی الرعیة۔ — تمہیں سب طریقوں میں سے وہ طریقہ پسند ہونا چاہیے جو حق کے اعتبار سے بہترین انصاف کے لحاظ سے سب کو شامل اور رعایا کے زیادہ سے زیادہ افراد کی مرضی کے مطابق ہو۔

حضرت کے نثری کلمے جو آپ کی زبان سے سنے گئے یا قلم سے صفحۂ قرطاس پر آئے متعدد کتابوں میں جمع کیے گئے ہیں ان میں سے اہم مجموعے یہ ہیں۔

نہج البلاغہ:۔ علامہ شریف رضی متوفی ۴۰۶ھ کی مشہور ترین تالیف ہے جس میں حضرت کے خطبات، مراسلات اور کلمات حکیمہ منتخب کر کے ترتیب دیے ہیں۔

مستدرک نہج البلاغہ:۔ اس کے جامع شیخ ہادی ابن شیخ عباس نجفی ہیں۔

دستور معالم الحکم:۔ اس کے جامع ابو عبداللہ محمد ابن سلامہ قضاعی ہیں۔

نثر اللآلی:۔ اس کے جامع ابو علی الطبرسی صاحب تفسیر مجمع البیان ہیں۔

غرر الحکم و درر الکلم:۔ اس کے جامع عبدالواحد آمدی تمیمی ہیں۔

صورت سرطان (کیکڑا) سے ملتی جلتی ہے۔ نسر دو ہزار سال میں ایک برج سے دوسرے برج میں منتقل ہوتا ہے۔ لہذا یہ دیکھ کر کہ ستارۂ نسر کس برج میں ہے۔ اس کے زمانۂ تعمیر کی مدت متعین کی جا سکتی ہے۔

اس تصویری خط کے بعد مختلف آوازوں کے لیے مختلف علامتیں وضع کی گئیں جنہیں حروف کہا جاتا ہے۔ ان حروف کے ذریعہ تحریر کا کام آسان اور مختصر ہو گیا اور تصویری خط کی ضرورت ختم ہو گئی۔ اس حروفی تحریر میں مصریوں اور چینیوں کو تقدم حاصل ہے۔ مصریوں نے یہ فن فینیقیوں سے سیکھا جو شام کے مغربی ساحل پر حکمران تھے۔ انہی سے مغربی دنیا نے سیکھا اور یونانیوں نے انہی کے حروف تہجی پر اپنے ہاں کے حروف کی بنیاد رکھی۔ ظہور اسلام سے کچھ عرصہ قبل حجاز میں تحریر و کتابت کا رواج نہ تھا۔ جب اہل حجاز کو تجارت کے سلسلہ میں شام و عراق جانا پڑا اور وہاں نوشت و خواند کا رواج پایا تو ان میں سے چند لوگوں کو تحریر کی ضرورت کا احساس ہوا اور انہوں نے وہاں کے لوگوں سے نبطی و سریانی خط سیکھا اور حجاز میں محدود پیمانے پر تحریری کام ہونے لگا۔ اس خط نبطی سے خط نسخ نے جنم لیا اور خط سریانی سے ایک دوسرے خط کی بنیاد پڑی جو کوفہ میں نشو و نما پانے کی وجہ سے خط کوفی کے نام سے موسوم ہوا۔

امیر المومنین فن تحریر میں مہارت تامہ رکھتے تھے آیات قرآنیہ کی کتابت اور پیغمبر اکرم کے بیشتر تحریری خدمات آپ ہی سے متعلق تھے آپ نے جہاں اعرابی علامتوں اور نقطوں کی طرف رہنمائی فرمائی وہاں کتابت کے اصول بھی وضع کیے حرفوں کے جوڑ ملانے تحریر کے نوک پلک سنوارنے اور واضح و خوشخط لکھنے کی طرف توجہ دلائی۔ چنانچہ اپنے کاتب عبد اللہ ابن ابی رافع سے فرمایا:

الق دواتک واطل جلفۃ قلمک وفرج بین السطور وقرمط بین الحروف فان ذلک اجدر بصباحۃ الخط۔	دوات میں صوف ڈالا کرو اور قلم کی زبان لانبی رکھو سطروں کے درمیان فاصلہ زیادہ چھوڑو اور حرفوں کے جوڑ ساتھ ملا کر لکھو کہ یہ خط کی دیدہ زیبی کے لیے مناسب ہے۔

خط کی عمدگی و پاکیزگی کی ترغیب دلاتے ہوئے فرمایا:

علیکم بحسن الخط فانہ من مفاتیح الرزق۔	خوش خط لکھو اس لیے کہ خط کی زیبائی رزق کی کنجی ہے۔

خوشخطی ہر طبقہ کے لیے نتیجہ خیز و ثمر آور ہے۔ حضرت فرماتے ہیں:

حسن الخط للفقیر مال وللغنی جمال وللعالم کمال۔	خط کی پاکیزگی فقیر کے لیے مال دولت مند کے لیے جمال اور عالم کے لیے کمال ہے۔

بچوں کو لکھنے کی تعلیم دینے کے بارے میں فرمایا:

علموا اولادکم الکتابۃ۔	اپنے بچوں کو لکھنے کی تعلیم دو۔

علم معانی

علم معانی وہ علم ہے جو الفاظ کو معنی سے ہم آہنگ بنانے کے اصولوں کی طرف رہنمائی کرتا ہے تاکہ دوسروں کے ذہنوں تک صحیح طریق سے معانی منتقل کیے جاسکیں۔ انہی اصولوں پر فصاحت و بلاغت کو پرکھا اور فصیح و غیر فصیح میں امتیاز کیا جاسکتا ہے۔ فصاحت کا تعلق الفاظ سے ہوتا ہے اور بلاغت کا تعلق معنی سے وہ کلام جو لسانی قواعد کے مطابق ثقیل و ناموس الفاظ سے مبرا اور ترتیب کے الجھاؤ سے پاک ہو فصیح کہلاتا ہے اور اگر ان اوصاف کے ساتھ مخاطب کی ذہنی کیفیت اور موقع و محل کی مطابقت بھی ملحوظ رکھی گئی ہو تو اسے بلیغ کہا جاتا ہے۔

مخاطب کی ذہنی کیفیت مختلف موارد پر مختلف ہوتی ہے کبھی وہ خالی الذہن ہوتا ہے کبھی متردد اور کبھی منکر لہذا ان موقعوں کے لحاظ سے کلام کا انداز بھی مختلف ہونا چاہیے چنانچہ مخاطب خالی الذہن ہو تو کلام میں تاکیدی الفاظ سے زور پیدا کرنے کی ضرورت نہ ہوگی جیسے امیر المؤمنین کا یہ ارشاد:

مرارة الدنیا حلاوة الاخرة وحلاوة الدنیا مرارة الاخرة۔	دنیا کی تلخی آخرت کی خوشگواری ہے اور دنیا کی خوشگواری آخرت کی تلخی ہے۔

اگر مخاطب تردد و شک کی حالت میں ہو تو تاکید کا لانا مستحسن ہے تاکہ اس کا شک برطرف ہو جائے جیسے حضرت کا یہ ارشاد:

اما واللہ ما اتیتکم اختیارا و لکن جئت الیکم سوقا۔	بخدا میں تمہاری طرف بخوشی نہیں آیا بلکہ حالات سے مجبور ہو کر آگیا۔

اگر مخاطب کو سرے سے انکار ہو تو تاکید کا لانا ضروری ہے تاکہ اس کے انکار کو اقرار میں بدلا جا سکے جیسے حضرت کا یہ قول:

انھم واللہ لم ینفروا من ولم یلحقوا بعدل۔	خدا کی قسم وہ ظلم سے نہیں بھاگے اور عدل سے جا کر نہیں چمٹے۔

اگر مخاطب کا انداز منکر کا سا ہو اگرچہ اسے انکار نہ ہو تو اسے بھی منکر قرار دے کر کلام میں تاکید لائی جاسکتی ہے جیسے حضرت کا یہ ارشاد:

واعلموا عباد اللہ انکم وما انتم فیه من ھذہ الدنیا علی سبیل من قد مضی۔	اے خدا کے بندو اس بات کو جان لو کہ تمہیں اور اس دنیا کی چیزوں کو جن میں تم ہو انہی لوگوں کی راہ پر گزرنا ہے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔

یہ کلام موکد ہے حالاں کہ کوئی بھی اس سے انکاری نہیں ہے کہ پہلے لوگوں کی طرح بعد میں آنے والوں کو بھی مرنا ہے مگر ان لوگوں کی غفلت اور دنیا طلبی میں انہماک یہ ظاہر کرتا ہے کہ گویا انہیں ہمیشہ دنیا میں رہنا ہے اور موت سے دوچار ہونا نہیں ہے لہذا ان کے طور طریقہ کو ایک طرح کا انکار قرار دے کر تاکید لائی گئی ہے۔

کبھی منکر کو غیر منکر قرار دے لیا جاتا ہے جب کہ وہ ایک ایسی حقیقت ثابتہ کا انکار کرے جو ہر شک و شبہہ سے بالاتر

ہو تو ایسے موقع پر اگرچہ کلام کو موکد ہونا چاہیے مگر ایسے انکار کو بے وزن اور ناقابل اعتناء ٹھہراتے ہوئے تاکید ترک کر دی جاتی ہے جیسے اہل بیت کے بارے میں حضرت کا یہ ارشاد:

وفیھم الوصیۃ والوراثۃ — انہی کے بارے میں پیغمبر کی وصیت اور انہی کیلئے وراثت ہے۔

غرض الفاظ کی موزوں ترتیب کے ساتھ مقتضائے حال کی مطابقت وہم آہنگی کا نام بلاغت ہے۔ اگر مقتضائے حال کی رعایت ملحوظ نہ رکھی گئی ہو تو خواہ اجزائے کلام کی ترتیب شگفتہ بندش عمدہ اور الفاظ سلیس و سادہ کیوں نہ ہوں کلام میں بلاغت پیدا نہ ہو گی۔

علم معانی کی رعایت سے کلام کو مقتضائے حال کے مطابق ڈھالا اور لفظوں کی تقدیم و تاخیر اور حسن ترتیب سے بلاغت کا جوہر پیدا کیا جا سکتا ہے ان بلاغت کے اصولوں کا سرچشمہ فصحاء و بلغاء کا کلام ہے چنانچہ قدیم فصحائے عرب کے کلام میں بلاغت کے اصناف و اسالیب کارفرما تھے حالاں کہ اس وقت نہ معانی و بیان کا فن وجود میں آیا تھا اور نہ بلاغت کے اصول ترتیب دیے گئے تھے ان کا ذوق سلیم خود ہی فصیح وغیر فصیح میں امتیاز اور بلاغت اور اس کے مراتب کی تشخیص کر لیتا تھا۔ دور اسلام کے ادیبوں اور انشاء پردازوں نے انہی اسالیب کی روشنی میں فن بلاغت کی تدوین کی اور کلام کے لفظی و معنوی محاسن کے پرکھنے کے پیمانے مقرر کیے۔

عرب کے مختلف علاقوں میں اگرچہ عربی ہی بولی جاتی تھی مگر ہر علاقہ کا تلفظ طرز ادا اور لب ولہجہ مختلف ہوتا تھا اور ہر ملک میں ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے کہ ہر تھوڑے فاصلہ پر معاشرت کی تبدیلی کے ساتھ زبان بھی قدرے بدل جاتی ہے اور تلفظ اسلوب بیان اور لب ولہجہ میں فرق آ جاتا ہے مگر ہر علاقہ اور خطہ کی زبان مستند معیاری اور فصیح نہیں سمجھی جاتی بلکہ جو لہجہ کی لطافت و شیرینی لفظوں کی سلاست و روانی اور جملوں کی ترکیب و ساخت کے اعتبار سے سبک و دلآویز ہوتی ہے وہی زبان مستند قرار پاتی ہے چناں چہ عرب میں سات زبانیں رائج تھیں جو قریش ہذیل ثقیف ہوازن کنانہ تمیم اور یمن کی طرف منسوب تھیں مگر ان تمام لہجوں اور زبانوں میں قریش کی زبان کو معیاری سمجھا جاتا تھا اور انہی کی زبان تمام عرب میں فصیح و بلیغ سمجھی جاتی تھی بلکہ نزول قرآن کے بعد اپنی صحت و بلند معیاری کی بنا پر جزیرہ نمائے عرب میں عام ہو گئی اور دوسرے لہجے رفتہ رفتہ متروک قرار پا گئے۔ قریش اور عرب کے دوسرے قبائل کے لہجوں میں ذیل کی چند مثالوں سے فرق واضح ہو جاتا ہے۔ قریش مرد سے خطاب کے موقع پر کاف مفتوح اور عورت سے خطاب کے موقع پر کاف مکسور کلمہ کے آخر میں لاتے تھے اور قبیلۂ ربیعہ و مضر کاف مفتوح کے آخر میں سین کا اور کاف مکسور کے آخر میں شین کا اضافہ کر دیتے تھے قبیلۂ قضاعہ یائے نسبتی کے آخر میں جیم بڑھا دیتا تھا اور مصری کی جگہ مصریج بولتا تھا قبیلۂ ازد اور ہذیل عین ساکن کو نون سے بدل دیتے تھے اور اعرابی کی جگہ انرابی کہتے تھے۔ قبیلۂ بازن و ربیعہ با کو میم سے اور میم کو با سے تبدیل کر دیتے تھے اور بکر کی جگہ مکر اور ما اسمک کی جگہ با اسمک بولتے تھے قبیلۂ حمیر الف لام کو الف میم سے بدل دیتا تھا اور السلام کی جگہ امسلام بولتا تھا اور بنی طے بعض الفاظ کا ادھورا تلفظ کرتے تھے مثلاً السلطان کہنا ہو تو السلطا کہتے۔ ان مثالوں سے قریش کی زبان کے اعلیٰ معیار کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ قریش کو اگرچہ تجارت کے سلسلہ

میں شام، یمن، حبشہ اور فارس تک جانا پڑتا تھا اور مختلف زبانوں سے مختلف الفاظ سنتے تھے اور حج و طواف کے لیے آنے والے قبائل کی زبانوں سے بھی اجنبی اور نامانوس الفاظ ان کے گوش گذار ہوتے تھے مگر وہ اپنے لہجہ اور زبان کے معیار کو برقرار رکھتے اور الفاظ کی صحت و سلاست اور لہجے کی نفاست کو اجنبی آوازوں سے متاثر نہ ہونے دیتے اور اگر دوسری زبان کی لفظیں استعمال کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی تو وہ اپنے ذوق سلیم اور لب و لہجہ کے مطابق ان کے نوک پلک کی درستی و اصلاح کر کے استعمال کرتے اور جو الفاظ ثقیل و ناتراشیدہ ہوتے اور ان کے معیار پر پورے نہ اترتے انہیں اپنی زبان پر نہ آنے دیتے اس طرح زبان کی نفاست و رعنائی بھی برقرار رہتی اور الفاظ کا سرمایہ بھی بڑھتا رہتا۔ قریش کو زبان کے نکھارنے میں ان میلوں ٹھیلوں سے بھی بڑی مدد ملی جو مکہ کے اطراف میں عکاظ، ذوالمجاز اور ذوالمجنہ میں ہوتے تھے۔ ان میلوں میں خرید و فروخت کے علاوہ ادبی و ثقافتی اجتماعات بھی ہوتے تھے اور مختلف قبیلوں کے خطباء و شعراء زباں آوری کے جوہر دکھاتے اور اظہار و ابلاغ کے نئے اسلوب سننے میں آتے ان اجتماعات میں قریش بھی شریک ہوتے اور ادبی محفلوں میں پوری سرگرمی سے حصہ لیتے اور اس طرح مکہ میں زبان پرورش پاتی اور پھلتی پھولتی رہی اور جہاں زبان نشوونما پاتی اور نکھرتی سنورتی ہے وہیں کی زبان مستند اور معیاری سمجھی جاتی ہے۔

امیرالمؤمنین نے بھی مکہ کی لسانی برتری کا اظہار کیا ہے چنانچہ کچھ لوگوں نے آپ سے کہا کہ ہم نے آپ سے بڑھ کر فصیح اور زباں آور نہ دیکھا ہے نہ سنا ہے آپ نے فرمایا:

وما یمنعنی وانا مولدی بمکۃ۔ — ایسا کیوں نہ ہو جب کہ میرا مولد مکہ ہے۔

جورج جرداق مسیحی نے تحریر کیا ہے:

قد نشأ فی المحیط الذی تسلم فیہ الفطرۃ و تصفو (الامام علی) — حضرت نے ایک ایسے خطہ میں نشوونما پائی جس میں طبیعت نکھرتی اور سنورتی ہے۔

اس علم و ادب کی بہار آفریں سرزمین پر نشوونما پانے کا یہ اثر تو ہونا ہی تھا کہ آپ میں زبان و بیان کی وہ تمام خوبیاں موجود ہوں جو اہل زبان کی زبان کا جوہر ہیں لیکن ان تمام خوبیوں کے علاوہ آپ نے اپنے ذوق سلیم اور وجدان سے ادب کے مزید خد و خال نکھارے اور ایسے اسلوب وضع کیے جن سے بلاغت کی نئی راہیں کھلیں اور زبان و بیان میں ادبی لہریں رواں دواں ہوئیں۔ آپ ہی کے زور بیان نے قریش کا ادبی معیار بلند کیا اور بلاغت کے نئے اسلوب ان کے ذہن نشین کیے۔ معاویہ ابن ابی سفیان کا قول ہے کہ:

واللہ ما سن الفصاحۃ لقریش غیرہ۔ — خدا کی قسم قریش کے لیے فصاحت کی راہیں آپ ہی نے ہموار کیں۔

آپ کی طبیعت میں فصاحت و بلاغت اس طرح رچی بسی ہوئی تھی کہ آپ کی ہر تقریر مختصر ہو یا طویل بلاغت کا نادر نمونہ ہوتی تھی اور ہر تحریر ادب کا لافانی پارہ نہ کبھی تراش خراش کی نوبت آئی اور نہ کانٹ چھانٹ کی ضرورت محسوس ہوئی بلکہ جو کہا ارتجالاً کہا اور جو لکھا قلم برداشتہ لکھا۔ اس کے باوجود فصاحت کا وہ معیار قائم کیا جو فصحائے عالم کی پرواز سے

بلند تر رہا۔ محمد حسن الزیات لکھتے ہیں :

لا نعلم بعد رسول اللہ فیمن سلف وخلف افصح من علی (تاریخ الادب العربی)	رسول اللہ کے بعد اگلے پچھلے لوگوں میں علی سے فصیح تر کوئی تھا ، نہ ہے ۔

ہر وہ شخص جو اسلوب کلام عرب سے واقف ہو آپ کے خطبات و تحریرات پر نظر کرنے کے بعد فیصلہ کر سکتا ہے کہ آپ کا کلام لفظوں کی شگفتگی جملوں کی برجستگی اسلوب کی لطافت اور مقتضائے حال کی رعایت میں مثل و نظیر نہیں رکھتا اور عرب کے بلند پایہ ادیبوں اور انشاء پردازوں نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے حضرت کے خطب و مکاتیب سے استفادہ کر کے تحریر کے اسلوب سیکھے اور آپ کے طرز نگارش سے بلاغت کے اصول اخذ کیے ۔ علامہ شریف رضی نے تحریر کیا ہے :

کان امیر المؤمنین مشرع الفصاحۃ وموردھا ومنشأ البلاغۃ ومولدھا ومنہ علیہ السلام ظھر مکنونھا و اخذت قوانینھا ۔	امیر المؤمنین فصاحت کا سرچشمہ اور بلاغت کا مخرج و منبع تھے ۔ فصاحت و بلاغت کی چھپی ہوئی باریکیاں آپ ہی سے ظاہر ہوئیں اور آپ ہی سے اس کے اصول و قواعد سیکھے گئے ۔

علمِ بیان

علم بیان وہ علم ہے جس میں معنی مجازی کے استعمال کے مختلف پیرائے اور اسلوب زیر بحث لائے جاتے ہیں اگرچہ وضع الفاظ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لفظوں کو ان کے حقیقی و وضعی معنی میں استعمال کیا جائے مگر بعض معانی و افکار اتنے دقیق و لطیف ہوتے ہیں کہ الفاظ اپنے وضعی معنی کے ذریعہ انہیں اپنی گرفت میں نہیں لے سکتے اس لیے معنی مجازی کا سہارا لینا پڑتا ہے ۔ اس سے جہاں دقیق معانی کی نقاب کشائی ہوتی ہے وہاں اظہار بیان میں تفنن و بوقلمونی بھی پیدا ہوتی ہے جس سے کلام کا حسن اور اس کی تاثیر بڑھ جاتی ہے ۔ اس علم میں تشبیہ استعارہ مجاز مرسل اور کنایہ سے بحث کی جاتی ہے ۔

تشبیہ یہ ہے کہ ایک چیز کی صفت کو دوسری چیز کی صفت کے مثل و مانند ظاہر کیا جائے جس کو تشبیہ دی جائے اسے مشبہ اور جس سے تشبیہ دی جائے اسے مشبہ بہ اور جو وصف مشبہ و مشبہ بہ میں مشترک ہوتا ہے اسے وجہ شبہ اور جس کے ذریعہ مشابہت کا اظہار کیا جاتا ہے اسے حرف تشبیہ کہا جاتا ہے ۔

مشبہ اور مشبہ بہ میں سے جو کسی ظاہری حاسہ سے معلوم کیا جا سکے اسے حسی اور جو حاسوں کے بجائے عقل سے جانا جائے اسے عقلی کہا جاتا ہے ۔ کبھی دونوں حسی ہوں گے کبھی دونوں عقلی اور کبھی مشبہ عقلی اور مشبہ بہ حسی ہوگا اور کبھی مشبہ حسی اور مشبہ بہ عقلی ۔ ان کی مثالیں حضرت کے کلام سے درج کی جاتی ہیں ۔

۱ ۔ ومخرج عنقہ کالابریق ۔	مور کی گردن کا پھیلاؤ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے صراحی ۔

مور کی گردن مشبہ اور صراحی مشبہ بہ ہے اور یہ دونوں حسی ہیں ۔

۲ ۔ انتقم من الحرص بالقناعۃ کما تنتقم من العدو بالقصاص ۔	قناعت کے ذریعہ حرص سے اس طرح انتقام لو جس طرح قصاص کے ذریعہ دشمن سے انتقام لیتے ہو ۔

قناعت کے ذریعہ حرص کے دبانے کو قصاص کے ذریعہ دشمن کو کچلنے سے تشبیہ دی ہے اور یہ چیزیں عقلی ہیں۔

(۳) سیاتی علیکم زمان یکفأ فیه الاسلام کما یکفأ الاناء بما فیه۔ — وہ زمانہ تمہارے سامنے آنے والا ہے جس میں اسلام کو اس طرح اوندھا کر دیا جائے گا جس طرح برتن کو ان چیزوں سمیت جو اس میں ہوں۔

اس میں مشبہ اسلام کی واژگوں کیفیت ہے جو عقلی ہے اور مشبہ بہ وہ برتن ہے جسے اوندھا کر دیا گیا ہو اور وہ حسی ہے۔

(۴) اشهود کغیاب۔ — کیا تم موجود ہوتے ہوئے غائب ہونے والوں کے مانند ہو۔

یہاں حاضر مشبہ اور غائب مشبہ بہ ہے مشبہ حسی اور مشبہ بہ عقلی ہے۔

مشبہ اور مشبہ بہ کے اعتبار سے تشبیہ کی کئی قسمیں ہیں۔

۱۔ مشبہ اور مشبہ بہ دونوں مفرد ہوں اس کی چند صورتیں ہیں۔

پہلی صورت یہ ہے کہ دونوں ہر قسم کی تقیید سے آزاد ہوں جیسے حضرت کا ارشاد:

الکاهن کالساحر۔ — کاہن مثل جادوگر کے ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ معنی کی تکمیل کے لیے دونوں میں کوئی قید ہو جیسے امیر المؤمنین کا ارشاد:

الولد العاق کالاصبع الزائد ان ترکت شانت و ان قطعت آلمت۔ — نافرمان بیٹا زائد انگلی کے مانند ہے۔ اگر اسے رہنے دیا جائے تو بدزیب معلوم ہوتی ہے اور کاٹا جائے تو تکلیف دیتی ہے۔

اس جملہ میں فرزند کے ساتھ عاق کی اور انگلی کے ساتھ زائد کی قید لگی ہوئی ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ مشبہ آزاد ہو اور مشبہ بہ مقید ہو جیسے حضرت کا ارشاد:

مادوا کما یمید الشجر یوم الریح العاصف — وہ اس طرح کانپتے رہتے تھے جس طرح تیز جھکڑ والے دن درخت تھرتھراتے ہیں۔

خوف سے کانپنا مشبہ اور درخت کا ہلنا مشبہ بہ ہے جس کے ساتھ طوفانی ہوا کی قید ہے۔

۲۔ مشبہ اور مشبہ بہ دونوں مرکب ہوں جیسے حضرت کا یہ قول:

کثرة الآراء مفسدة کالقدر لا تطیب اذا کثر طباخوها۔ — رایوں کی کثرت اس ہنڈیا کے مانند ہے جس کے پکانے میں بہتوں کا ہاتھ ہو نہ وہ رائیں خرابی سے بچتی ہیں اور نہ ہنڈیا خوش ذائقہ ہوتی ہے۔

ؒ ؒ ؒ

اس میں مشبہ اور مشبہ بہ دونوں کی ہیئت مرکب ہے۔

۳۔ مشبہ اور مشبہ بہ میں سے ایک مفرد ہو اور ایک مرکب جیسے مور کی تشبیہ دیتے ہوئے فرمایا:

فھو کفصوص ذات الوان نطقت باللجین المکلل۔ — وہ رنگ برنگ کے ان نگینوں کی طرح ہے جو مرصع بجواہر چاندی میں دائروں کی صورت میں پھیلا دیے گئے ہوں۔

٭ ٭ ٭

اس میں مشبہ مفرد اور مشبہ بہ مرکب ہے۔

تشبیہ کی ایک تقسیم یہ ہے کہ مشبہ متعدد اور مشبہ بہ ایک ہو یا مشبہ ایک اور مشبہ بہ متعدد ہوں۔ جیسے حضرت کا یہ ارشاد:

المصطنع الی اللئیم کمن طوق الخنزیر تبرا و قرط الکلب درا والبس الحمار وشیا و القم الافعی شھدا۔ — کسی دنی و ذلیل سے نیکی کرنے والا ایسا ہی ہے جیسے خنزیر کی گردن میں سونے کا ہار ڈالنے والا یا کتے کے کانوں میں موتی لٹکانے والا یا گدھے کو بیل بوٹے دار لباس پہنانے والا یا سانپ کو شہد چٹانے والا۔

اس میں مشبہ ایک اور مشبہ بہ چار ہیں۔

وجہ شبہ یعنی وصف مشترک کے اعتبار سے تشبیہ کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ وہ وصف مشبہ و مشبہ بہ میں واقعاً ثابت ہو جیسے:

وایم اللہ لتجدن بنی امیۃ لکم ارباب سوء بعدی کالناب الضروس۔ — خدا کی قسم میرے بعد تم بنی امیہ کو اپنے لیے بدترین حکمران پاؤ گے۔ وہ ایک بوڑھی اور سرکش اونٹنی کے مانند ہیں۔

٭ ٭ ٭

اس میں بنی امیہ کو کاٹنے والی بوڑھی ناقہ سے تشبیہ دی ہے اور وجہ شبہ منہ زوری و تند خوئی ہے اور یہ صفت دونوں میں واقعاً پائی جاتی تھی۔

۲۔ وہ وصف مشترک مشبہ و مشبہ بہ دونوں میں یا ایک میں فرض کر لیا گیا ہو۔ جیسے

فتن کقطع اللیل المظلم۔ — وہ ایسے فتنے ہوں گے جیسے اندھیری رات کے ٹکڑے۔

٭ ٭ ٭

اس میں فتنے مشبہ اور تاریک رات مشبہ بہ ہے اور وجہ شبہ تاریکی ہے جو مشبہ میں فرض کر لی گئی ہے۔

حرف تشبیہ کے اعتبار سے تشبیہ کی دو قسمیں ہیں، موکد اور مرسل:

تشبیہ مؤکد کی ایک صورت یہ ہے کہ حرف تشبیہ محذوف ہو جیسے:

لاضطربتم اضطراب الارشیۃ فی الطوی البعیدۃ۔ — تم اس طرح پیچ و تاب کھانے لگے جس طرح گہرے کنوؤں میں رسیاں لرزتی اور تھرتھراتی ہیں۔

اس میں لوگوں کی بے چینی کو کنوئیں میں رسیوں کے لڑکھڑانے سے تشبیہ دی ہے اور حرف تشبیہ محذوف ہے

فھو کفصوص ذات الوان نطقت باللجین المکلل۔
وہ رنگ برنگ کے ان نگینوں کی طرح ہے جو مرصع بجواہر چاندی میں دائروں کی صورت میں پھیلا دیے گئے ہوں۔

٭ ٭ ٭

اس میں مشبہ مفرد اور مشبہ بہ مرکب ہے۔
تشبیہ کی ایک تقسیم یہ ہے کہ مشبہ متعدد اور مشبہ بہ ایک ہو یا مشبہ ایک اور مشبہ بہ متعدد ہوں۔ جیسے حضرت کا یہ ارشاد:

المصطنع الی اللئیم کمن طوق الخنزیر تبرا و قرط الکلب درا والبس الحمار وشیا والقم الافعی شھدا۔
کسی دنی و ذلیل سے نیکی کرنے والا ایسا ہی ہے جیسے خنزیر کی گردن میں سونے کا ہار ڈالنے والا یا کتے کے کانوں میں موتی لٹکانے والا یا گدھے کو بیل بوٹے دار لباس پہنانے والا یا سانپ کو شہد چٹانے والا۔

اس میں مشبہ ایک اور مشبہ بہ چار ہیں۔
وجہ شبہ یعنی وصف مشترک کے اعتبار سے تشبیہ کی دو قسمیں ہیں۔
۱۔ وہ وصف مشبہ و مشبہ بہ میں واقعاً ثابت ہو جیسے:

وایم اللہ لتجدن بنی امیۃ لکم ارباب سوء بعدی کالناب الضروس۔
خدا کی قسم میرے بعد تم بنی امیہ کو اپنے لیے بدترین حکمران پاؤ گے۔ وہ ایک بوڑھی اور سرکش اونٹنی کے مانند ہیں۔

٭ ٭ ٭

اس میں بنی امیہ کو کاٹنے والی بوڑھی ناقہ سے تشبیہ دی ہے اور وجہ شبہ منہ زوری و تندخوئی ہے اور یہ صفت دونوں میں واقعاً پائی جاتی تھی۔
۲۔ وہ وصف مشترک مشبہ و مشبہ بہ دونوں میں یا ایک میں فرض کر لیا گیا ہو جیسے

فتن کقطع اللیل المظلم۔
وہ ایسے فتنے ہوں گے جیسے اندھیری رات کے ٹکڑے۔

٭ ٭ ٭

اس میں فتنے مشبہ اور تاریک رات مشبہ بہ ہے اور وجہ شبہ تاریکی ہے جو مشبہ میں فرض کر لی گئی ہے۔
حرف تشبیہ کے اعتبار سے تشبیہ کی دو قسمیں ہیں، موکد اور مرسل؛
تشبیہ مؤکد کی ایک صورت یہ ہے کہ حرف تشبیہ محذوف ہو جیسے:

لاضطربتم اضطراب الارشیۃ فی الطوی البعیدۃ۔
تم اس طرح پیچ و تاب کھانے لگے جس طرح گہرے کنوؤں میں رسیاں لرزتی اور تھرتھراتی ہیں۔

اس میں لوگوں کی بے چینی کو کنوئیں میں رسیوں کے لڑکھڑانے سے تشبیہ دی ہے اور حرف تشبیہ محذوف ہے

دوسری صورت یہ ہے کہ حرف تشبیہ کو حذف کرکے مشبہ بہ کو مشبہ کی طرف مضاف کر دیا جائے جیسے :

ومصابیح کواکبھا ۔ چراغوں کی طرح چمکتے ہوئے ستارے آویزاں کیے ۔

ستارے مشبہ اور چراغ مشبہ بہ جو مشبہ کی طرف مضاف ہیں ۔

۲۔ تشبیہ مرسل یہ ہے کہ حرف تشبیہ مذکور ہو جیسے :

الداعی بلا عمل کالرامی بلا وتر ۔ جو عمل نہیں کرتا اور دعا مانگتا ہے وہ ایسا ہے جیسے بغیر چلہ کمان کے تیر چلانے والا ۔

استعارہ یہ ہے کہ کسی لفظ کو اس کے اصل معنی کے بجائے کسی اور معنی میں استعمال کیا جائے جب کہ ان دونوں معنوں میں تشبیہ کا تعلق ہو۔ تشبیہ اور استعارہ میں فرق یہ ہے کہ تشبیہ میں مشبہ و مشبہ بہ دونوں کا ذکر ہوتا ہے ، مگر استعارہ میں مشبہ کا ذکر نہیں ہوتا بلکہ مشبہ بہ کا ذکر کرکے اس سے مشبہ مراد لیا جاتا ہے اسمیں مشبہ کو مستعار لہ مشبہ بہ کو مستعار منہ اور وجہ شبہ کو وجہ جامع کہا جاتا ہے ۔ مستعار لہ مستعار منہ اور وجہ جامع کے اعتبار سے استعارہ کی چھ قسمیں ہیں ۔ یہ اقسام اور ان کے امثلہ حضرت کے کلام سے درج کیے جاتے ہیں ۔

۱۔ مستعار لہ مستعار منہ اور وجہ جامع سب حسی ہوں جیسے :

فاجری فیھا سراجا مستطیرا ۔ ان میں ضو پاش چراغ رواں کیا ۔

اس میں سورج مستعار لہ چراغ مستعار منہ اور روشنی و ضیاء وجہ جامع ہے اور یہ سب حسی ہیں ۔

۲۔ طرفین استعارہ حسی اور وجہ جامع عقلی ہو جیسے :

احتجوا بالشجرۃ و اضاعوا الثمرۃ ۔ انہوں نے شجرہ ایک ہونے سے تو استدلال کیا لیکن اس کے پھلوں کو ضائع و برباد کر دیا ۔

اس میں مستعار لہ آپ کی ذات اور مستعار منہ ثمر ہے اور وجہ جامع تعلق اور لگاؤ ہے یعنی جس طرح ثمر کو شجر سے لگاؤ ہوتا ہے اسی طرح آپ کو پیغمبر اکرم سے تعلق اور لگاؤ تھا اس میں طرفین استعارہ حسی اور وجہ جامع عقلی ہے ۔

۳۔ طرفین استعارہ عقلی ہوں اور وجہ جامع بھی عقلی ہو جیسے :

و فی ضیق المضجع وحیدا ۔ اسے خواب گاہ کے ایک تنگ گوشہ میں تنہا چھوڑ دیا گیا ۔

اس میں قبر کو خواب گاہ سے تعبیر کرکے خواب سے موت کا استعارہ کیا ہے ۔ موت مستعار لہ اور خواب مستعار منہ اور وجہ جامع بے حسی و بے حرکتی ہے اور یہ سب چیزیں عقلی ہیں ۔

۴۔ مستعار لہ عقلی اور مستعار منہ حسی اور وجہ جامع عقلی ہو جیسے :

طفقت ارتای بین ان اصول بید جذاء ۔ میں نے سوچنا شروع کیا کہ اپنے کٹے ہوئے ہاتھوں سے حملہ کروں ۔

اس میں دست شکستہ ہونا مستعار منہ ہے جو حسی ہے اور بے یار و مددگار ہونا مستعار لہ اور کمزوری و ناتوانی وجہ جامع ہے اور یہ دونوں عقلی ہیں۔

۵۔ مستعار لہ حسی اور مستعار منہ اور وجہ جامع عقلی ہو جیسے:

وبادت من نخوة باوه واعتلائه — اس کے اٹھلانے اور سر اٹھانے کے غرور اور تکبر سے
وشموخ انفه وسمو غلوائه۔ — ناک اوپر چڑھانے اور بہاؤ میں تفوق و سر بلندی دکھانے کا خاتمہ کر دیا۔

٭ ٭ ٭

اس میں مستعار لہ موجوں کی طغیانی ہے جو حسی ہے اور مستعار منہ فخر و سربلندی ہے اور وجہ جامع تکبر و ترفع ہے اور یہ دونوں عقلی ہیں۔

۶۔ مستعار لہ اور مستعار منہ دونوں حسی ہوں اور وجہ جامع مرکب ہو یعنی ایک پہلو سے حسی اور ایک پہلو سے عقلی ہو جیسا کہ آل محمد کے بارے میں حضرت کا یہ ارشاد:

اذا خوی نجم طلع نجم۔ — جب ایک ستارہ ڈوبتا ہے تو دوسرا ستارہ ابھر آتا ہے

اس میں آل محمد مستعار لہ اور ستارہ مستعار منہ ہے اور یہ دونوں حسی ہیں اور وجہ جامع منظر کی دلکشی اور مرتبہ کی بلندی ہے۔ حسن منظر حسی اور بلندی مرتبت عقلی ہے۔

مستعار لہ اور مستعار منہ کے اعتبار سے استعارہ کی دو قسمیں ہیں وفاقیہ اور عنادیہ:

استعارہ وفاقیہ وہ ہے جس میں مستعار لہ اور مستعار منہ کا ایک شے میں اجتماع ممکن ہو جیسے:

البصیر منها متزود والاعمی — بابصیرت اس دنیا سے آخرت کے لیے زاد حاصل
لها متزود۔ — کرتا ہے اور بے بصیرت اسی کے سروسامان میں لگا رہتا ہے۔

٭ ٭ ٭

اس میں لفظ بصیر سے عاقل کا اور لفظ اعمیٰ سے جاہل کا استعارہ کیا ہے اور بصارت و عقل کا اجتماع ممکن ہے اس طرح کہ ایک شخص دیکھ بھی سکتا ہو اور عقل بھی رکھتا ہو اسی طرح اندھے پن اور جہل کا اجتماع ممکن ہے اس طرح کہ ایک شخص اندھا بھی ہو اور جاہل بھی ہو۔

استعارہ عنادیہ وہ ہے جس میں مستعار لہ اور مستعار منہ کا اجتماع ناممکن ہو جیسے:

فذلک میت الاحیاء۔ — وہ تو زندوں میں (چلتی پھرتی ہوئی) لاش ہے۔

اس میں زندہ کو مردہ سے استعارہ کیا ہے اور موت و حیات کا اجتماع ناممکن ہے۔

وجہ جامع کے اعتبار سے استعارہ کی چار قسمیں ہیں۔

پہلی قسم یہ ہے کہ وجہ جامع مستعار لہ اور مستعار منہ کے معنی کا جزو ہو جیسے:

ان شرار الناس طائرون الیک — شریر لوگ بری باتیں تم تک پہنچانے کے لیے اڑ

باقاویل السوء۔	کر پہنچا کریں گے۔

یہاں دوڑنا مستعار لہ اور اڑنا مستعار منہ ہے اور وجہ جامع قطع مسافت ہے جو دونوں کے مفہوم میں داخل ہے۔

دوسری قسم یہ ہے کہ وجہ جامع مستعار لہ اور مستعار منہ کے مفہوم سے خارج ہو جیسے اشعث ابن قیس کے بارے میں حضرت کا ارشاد:

حائک ابن حائک	جولاہا جولاہے کا بیٹا۔

اس میں مستعار لہ مرد احمق اور مستعار منہ حائک ہے اور وجہ جامع حماقت ہے جو دونوں کے مفہوم سے خارج ہے اس لیے کہ حائک موضوع ہے اس کے لیے جس کا پیشہ کپڑا بننا ہو اور مرد موضوع ہے مذکر کے لیے اور حماقت دونوں کے مفہوم میں داخل نہیں ہے۔

تیسری قسم یہ ہے کہ وجہ جامع ظاہر و واضح ہو اور اس کے سمجھنے میں غور و فکر کی احتیاج نہ ہو جیسے:

وایم اللہ لا فرطن لھم حوضا انا ماتحہ۔	خدا کی قسم میں ان کے لیے ایک ایسا حوض چھلکاؤں گا جس کا پانی نکالنے والا میں ہوں۔

اس میں لشکر کی جمع آوری کا استعارہ حوض کے چھلکانے سے کیا ہے اور وجہ جامع سمیٹنا اور یکجا کرنا ہے اور ابتدائے نظر میں اسے سمجھا جاسکتا ہے۔

چوتھی قسم یہ ہے کہ وجہ جامع کو غور و فکر کے بغیر سمجھا نہ جاسکے جیسے:

لو وھب ما تنفست عنہ معادن الجبال۔	وہ چیزیں جنہیں باہر نکالنے کے لیے پہاڑوں کے معدن سانسیں لیتے ہیں بخش دے۔

یہاں کانوں سے سونے چاندی کے نکلنے کا پہاڑوں کے سانس لینے سے استعارہ کیا ہے اس میں وجہ جامع وہ حرکت ہے جو کسی شئے کو اندر سے باہر نکالنے میں ہوتی ہے یہ استعارہ سطحی نظر میں سمجھ میں نہیں آتا بلکہ غور و فکر کے بعد ہی سمجھا جاسکتا ہے۔

استعارہ میں وجہ جامع کبھی مفرد ہوتی ہے جیسے:

تد فی الارض قدمک۔	اپنے قدم زمین میں گاڑ دینا۔

اس میں مضبوطی سے قدم جمانے کا استعارہ قدموں کے گاڑنے سے کیا ہے اور وجہ جامع ثبات و استقرار ہے جو امر واحد ہے۔

اور کبھی وجہ جامع چند چیزوں کی مجموعی ہیئت سے مستخرج ہوتی ہے جیسے:

فان الشیطان کامن فی کسرہ للوثبۃ یدا و اخر للنکوص رجلا۔	شیطان اسی کے ایک گوشہ میں چھپا بیٹھا ہے جس نے ایک طرف تو حملے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہوا ہے اور

دوسری طرف بھاگنے کے لیے قدم پیچھے ہٹا رکھا ہے۔

اس میں امیر شام یا عمرو ابن عاص کی متردد انہ کیفیت کو اس شخص کی متذبذبانہ حالت سے تشبیہ دی ہے جو کسی کام کے کرنے میں متردد ہو اور کبھی آگے بڑھتا ہو اور کبھی قدم پیچھے ہٹاتا ہو۔

ان اقسام کے علاوہ استعارہ کی تین قسمیں اور ہیں۔ مطلقہ، مجردہ اور مرشحہ۔

استعارہ مطلقہ یہ ہے کہ اس میں نہ مستعار لہ کے مناسبات مذکور ہوں اور نہ مستعار منہ کے جیسے:

حائك ابن حائك۔ جولاہا جولاہے کا بیٹا۔

اس میں مرد احمق مستعار لہ اور حائک مستعار منہ ہے اور ان دونوں کے مناسب کوئی لفظ نہیں ہے۔

استعارہ مجردہ یہ ہے کہ اس میں مستعار لہ کے مناسبات مذکور ہوں جیسے پیغمبر اکرم کے بارے میں حضرت کا ارشاد:

ارسله بالدین المشهور والعلم المأثور۔ انہیں شہرت یافتہ دین منقول شدہ نشان کے ساتھ بھیجا۔

اس میں شرع مستعار لہ اور علم (پہاڑ) مستعار منہ ہے اور لفظ ماثور (منقول) شرع کے مناسبات سے ہے۔

استعارہ مرشحہ یہ ہے کہ اس میں مستعار منہ کے لوازم و مناسبات مذکور ہوں جیسے:

ان بنی تمیم لم یغب لھم نجم الاطلع لھم نجم اٰخر۔ بنی تمیم تو وہ ہیں کہ جب بھی ان کا کوئی ستارہ ڈوبتا ہے تو اس کی جگہ دوسرا ابھر آتا ہے۔

اس میں قبیلہ بنی تمیم کے سرداروں کو ستاروں سے استعارہ کیا ہے۔ ستارہ مستعار منہ ہے اور طلوع و غروب اس کے مناسبات سے ہے۔

استعارہ کی ایک قسم استعارہ بالکنایہ ہے اس میں مستعار لہ (مشبہ) مذکور اور مستعار منہ (مشبہ بہ) محذوف ہوتا ہے اور مشبہ بہ کے بعض لوازم مشبہ کے لیے ثابت کیے جاتے ہیں جیسے:

وعضت الفتنة ابناءها بانيابها فتنوں نے اپنے دانتوں سے دنیا والوں کو کاٹنا شروع کر دیا۔

ث ث ث

اس میں فتنہ کو درندہ جانور سے تشبیہ دی ہے جو محذوف ہے اور مشبہ کو مشبہ بہ کی جنس میں سے قرار دے کر مشبہ بہ کا لازم یعنی دانتوں سے کاٹنا مشبہ کے لیے ثابت کیا ہے۔

مجاز مرسل یہ ہے کہ لفظ کو غیر وضعی معنی میں استعمال کیا جائے اور معنی وضعی و غیر وضعی میں تشبیہ کے علاوہ کوئی اور علاقہ پایا جائے اس لیے کہ اگر تشبیہ کا علاقہ ہو گا تو وہ استعارہ ہو گا اور کوئی علاقہ نہ ہو گا تو لفظ کا غیر وضعی معنی میں استعمال غلط ہو گا۔ یہ علاقے کئی طرح کے ہوتے ہیں ان میں سے چند علاقے حضرت کے کلمات سے درج کیے جاتے ہیں۔

لفظ کل کے لیے وضع ہو اور اس سے جزو مراد لیا جائے جیسے:

دوسری طرف بھاگنے کے لیے قدم پیچھے ہٹا رکھا ہے۔

اس میں امیر شام یا عمرو ابن عاص کی متردداسانہ کیفیت کو اس شخص کی متذبذبانہ حالت سے تشبیہ دی ہے جو کسی کام کے کرنے میں متردد ہو اور کبھی آگے بڑھتا ہو اور کبھی قدم پیچھے ہٹاتا ہو۔

ان اقسام کے علاوہ استعارہ کی تین قسمیں اور ہیں۔ مطلقہ، مجردہ اور مرشحہ۔

استعارہ مطلقہ یہ ہے کہ اس میں نہ مستعار لہ کے مناسبات مذکور ہوں اور نہ مستعار منہ کے جیسے:

حائک ابن حائک۔ جولاہا جولاہے کا بیٹا۔

اس میں مرد احمق مستعار لہ اور حائک مستعار منہ ہے اور ان دونوں کے مناسب کوئی لفظ نہیں ہے۔

استعارہ مجردہ یہ ہے کہ اس میں مستعار لہ کے مناسبات مذکور ہوں جیسے پیغمبر اکرم کے بارے میں حضرت کا ارشاد:

ارسله بالدین المشهور والعلم المأثور۔ انہیں شہرت یافتہ دین منقول شدہ نشان کے ساتھ بھیجا۔

اس میں شرع مستعار لہ اور علم (پہاڑ) مستعار منہ ہے اور لفظ ماثور (منقول) شرع کے مناسبات سے ہے۔

استعارہ مرشحہ یہ ہے کہ اس میں مستعار منہ کے لوازم و مناسبات مذکور ہوں جیسے:

ان بنی تمیم لم یغب لهم نجم الاطلع لهم نجم آخر۔ بنی تمیم تو وہ ہیں کہ جب بھی ان کا کوئی ستارہ ڈوبتا ہے تو اس کی جگہ دوسرا ابھر آتا ہے۔

اس میں قبیلہ بنی تمیم کے سرداروں کو ستاروں سے استعارہ کیا ہے۔ ستارہ مستعار منہ ہے اور طلوع و غروب اس کے مناسبات سے ہے۔

استعارہ کی ایک قسم استعارہ بالکنایہ ہے اس میں مستعار لہ (مشبہ) مذکور اور مستعار منہ (مشبہ بہ) محذوف ہوتا ہے اور مشبہ بہ کے بعض لوازم مشبہ کے لیے ثابت کیے جاتے ہیں جیسے:

وعضت الفتنة ابناء ها بانیابها فتنوں نے اپنے دانتوں سے دنیا والوں کو کاٹنا شروع کر دیا۔

٭ ٭ ٭

اس میں فتنہ کو درندہ جانور سے تشبیہ دی ہے جو محذوف ہے اور مشبہ کو مشبہ بہ کی جنس میں سے قرار دے کر مشبہ بہ کا لازمہ یعنی دانتوں سے کاٹنا مشبہ کے لیے ثابت کیا ہے۔

مجاز مرسل یہ ہے کہ لفظ کو غیر وضعی معنی میں استعمال کیا جائے اور معنی وضعی و غیر وضعی میں تشبیہ کے علاوہ کوئی اور علاقہ پایا جائے اس لیے کہ اگر تشبیہ کا علاقہ ہوگا تو وہ استعارہ ہوگا اور کوئی علاقہ نہ ہوگا تو لفظ کا غیر وضعی معنی میں استعمال غلط ہوگا۔ یہ علاقے کئی طرح کے ہوتے ہیں ان میں سے چند علاقے حضرت کے کلمات سے درج کیے جاتے ہیں۔

لفظ کل کے لیے وضع ہو اور اس سے جزو مراد لیا جائے جیسے:

لا تخاصمهم بالقرآن۔ تم ان سے قرآن کی رو سے بحث نہ کرنا۔

لفظ قرآن تمام آیات کے مجموعہ کے لیے وضع ہے اور یہاں وہ آیات مراد ہیں جن سے اثبات مدعا کیا جا سکتا ہے۔

لفظ جزء کے لیے وضع ہو اور اس سے کل مراد لیں جیسے:

ووحدته الشفاه۔ ہونٹ اس کی یکتائی کا اقرار کرتے ہیں۔

یہاں ہونٹ سے مراد منہ ہے اور ہونٹ منہ کا ایک جزء ہے۔

سبب سے مسبب مراد لیں جیسے:

اجهز علیه عمله و کبت به بطنته۔ اس کی بداعمالیوں نے اس کا کام تمام کر دیا اور شکم پُری نے اسے منہ کے بل گرایا۔

ہلاکت کی نسبت بدعملی اور شکم پُری کی طرف دی ہے اور یہ دونوں ہلاکت کا سبب ہیں۔

محل و ظرف بول کر وہ چیز مراد لیں جو اس میں واقع ہے جیسے:

حتی اسهرت لیالیهم واظمأت هواجرهم۔ یہاں تک کہ ان کی راتیں جاگتی رہیں اور تپتی ہوئی دوپہریں پیاسی رہیں۔

اس میں بیداری کی نسبت راتوں کی طرف اور پیاس کی نسبت دوپہروں کی طرف دی ہے اس لیے کہ یہ بیداری راتوں میں ہوئی اور پیاس گرم دنوں میں جھیلی گئی۔

کسی چیز کے واسطہ کا ذکر کریں اور اس سے وہ چیز مراد لیں جس کا وہ واسطہ ہے جیسے:

لم یدفعواعنه بلسان۔ زبان سے اس کی روک تھام نہ کی

زبان اصل وضع کے اعتبار سے آلۂ گویائی کا نام ہے اور یہاں حرف و سخن مراد ہے جو زبان کے واسطہ سے گوش گزار ہوتی ہے۔

کنایہ یہ ہے کہ کسی لفظ سے اس کے لازم معنی مراد لیے جائیں۔ کنایہ اور مجاز میں فرق یہ ہے کہ کنایہ میں حقیقی معنی کے خلاف قرینہ نہیں ہوتا اس لیے حقیقی معنی بھی مراد لیے جا سکتے ہیں اور مجاز میں حقیقی معنی مراد نہیں لیے جا سکتے کیوں کہ اس میں حقیقی معنی کے خلاف قرینہ قائم ہوتا ہے۔ کنایہ کی مثال یہ ہے:

وثقلت فی الارض وطأته۔ زمین میں اس کی پامالیاں سخت سے سخت ہو گئیں۔

زمین کی پامالی کنایہ ہے ظلم و جور سے۔ لیکن حقیقی معنی بھی مراد لیے جا سکتے ہیں۔

کنایہ کی چار قسمیں ہیں۔ تعریض، تلویح، رمز اور ایما، و اشارہ۔

تعریض یہ ہے کہ کنایہ میں موصوف مذکور نہ ہو لیکن ایسا قرینہ موجود ہو جس سے وہ واضح طور پر سمجھ میں آ جائے۔ جیسے:

دلیلها مکیث الکلام بطئ القیام اس پر چم کی طرف رہنمائی کرنے والا وہ ہے جو بات

سریع اذا قام۔ — کہنے میں جلدبازی نہیں کرتا اور نہ اقدام میں تاخیر کرتا ہے اور جب کسی امر کو لے کر کھڑا ہو جائے تو پھر تیز گام ہے۔

اگرچہ ان صفات کے موصوف کا صراحتہً ذکر نہیں ہے مگر محل و مقام سے سمجھا جا سکتا ہے کہ حضرت نے اپنی ذات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

تلویح یہ ہے کہ لازم سے ملزوم تک کثرت سے وسائط ہوں جیسے:

لود معاویۃ انہ ما بقی من بنی ھاشم نافخ ضرمۃ الا طعن فی نیطہ۔ — معاویہ تو یہ چاہتا ہے کہ بنی ہاشم میں سے کوئی آگ میں پھونکنے والا نہ رہے مگر یہ کہ اس کے دل کی رگوں کو نیزہ کا نشانہ بنا دیا جائے۔

یہ کنایہ ہے بنی ہاشم کے مکمل خاتمہ سے اس طرح کہ جب کوئی آگ میں پھونکنے والا نہ رہے گا تو آگ کے جلنے کی نوبت نہ آئے گی اور آگ جلنے کی نوبت اس لیے نہیں آئے گی کہ کوئی باقی رہا ہی نہیں کہ آگ جلائے اور کھانا پکائے۔ اس میں ملزوم تک متعدد وسائط ہیں۔

رمز یہ ہے کہ اس میں وسائط زیادہ نہ ہوں مگر تھوڑی بہت پوشیدگی ہو جیسے:

ھذا الشخص المعکوس والجسم المرکوس — یہ ٹیڑھا ڈھانچہ اور اوندھا جسم۔

یہ معاویہ کی بے راہروی سے کنایہ ہے۔ اس طرح کہ راست قامت ہونا انسان کا اور سر افگندہ ہونا حیوان کا وصف ہے۔ اسی لیے قرآن مجید میں راست رو کو راست قامت اور کج رو کو سرنگوں ہو کر چلنے والا کہا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

افمن یمشی مکبا علی وجھہ اھدی امن یمشی سویا علی صراط مستقیم۔ — کیا وہ شخص زیادہ ہدایت یافتہ ہو گا جو اپنے منہ کے بل چلے یا وہ شخص جو برابر سیدھے راستے پر چل رہا ہو۔

اس آیت کے پیش نظر راست قامتی کے لیے ہدایت اور سر افگندگی کے لیے ضلالت کو لازم قرار دیتے ہوئے جسم کی کجی سے عقیدہ کی بے راہروی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

ایما و اشارہ یہ ہے کہ نہ متعدد واسطے ہوں اور نہ کوئی پوشیدگی ہو جیسے:

نافجا حضینہ بین نثیلہ و معتلفہ — وہ پیٹ پھلائے سرگین اور چارے کے درمیان کھڑا ہوا۔

یہ اشارہ ہے شکم پُری اور بسیار خوری کی طرف اور اس میں کوئی پوشیدگی نہیں ہے۔

علمِ بدیع

بدیع وہ علم ہے جس میں ان امور کو بیان کیا جاتا ہے جو کلام میں حسن و دلآویزی پیدا کرتے ہیں۔ یہ حسن اسی صورت میں پیدا ہوتا ہے جب کلام بلاغت کے معیار پر پورا اترتا ہو۔ اگر بلاغت کے جوہر سے عاری ہوگا تو ان چیزوں سے حسن پیدا نہ ہوگا بلکہ اس کی مثال اس بوسیدہ عمارت کی سی ہوگی جس پر میناکاری کی گئی ہو یا اس کریہہ و بدصورت کی سی ہوگی جسے سامانِ زیبائش سے نظر فریب بنانے کی کوشش کی گئی ہو۔ یہ حسن و خوبی الفاظ میں بھی ہوتی ہے اور معنی میں بھی۔ اس لیے اس کی دو قسمیں ہوں گی، معنوی اور لفظی، معنوی خوبیوں کو بدائع معنویہ کہا جاتا ہے اور لفظی خوبیوں کو صنائع لفظیہ۔ بعض اوقات پوری توجہ صنائع پر مرکوز کر دی جاتی ہے اور اس کثرت سے ان کو برتا جاتا ہے کہ مقصود و مدّعا صنعتوں کے انبوہ میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس سے کلام میں حسن تو کیا پیدا ہوگا معانی کا سرشتہ بھی ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ امیر المومنین فرماتے ہیں:

من اشتغل بتفقد اللفظة وطلب السجعة نسی الحجة۔ — جو شخص لفظ کی فکر اور سجع کی تلاش میں کھو جاتا ہے وہ دلیل و برہان بھول جاتا ہے۔

حضرت کے کلام میں جہاں معانی و مطالب کی گہرائیاں اور حُسنِ بیان کی نادرہ کاریاں اپنے انتہائی عروج پر نظر آتی ہیں وہاں موقع و محل پر لفظی و معنوی صنائع بھی کارفرما ہیں اور یہ صنائع اس برجستگی سے استعمال ہوئے ہیں کہ نہ آورد کا شائبہ ہے اور نہ تکلّف کی جھلک۔ ذیل میں صنائع کی یہ دونوں قسمیں اور ان کے امثلہ حضرتؑ کے کلام سے تحریر کیے جاتے ہیں۔ صنائع معنویہ یہ ہیں:

طباق: صنعت طباق یہ ہے کہ کلام میں دو ایسے لفظ یکجا کیے جائیں جو متضاد و مخالف ہوں خواہ دونوں اسم ہوں۔ جیسے:

الصادق علی شرف منجاة وکرامة — راست گفتار نجات اور بزرگی کی بلندیوں پر ہے

والکاذب علی شفا مهواة ومهانة — اور دروغ گو پستی و ذلت کے کنارے پر ہے۔

اس میں صادق اور کاذب متضاد ہیں اور کرامت اور مہانت میں تضاد ہے اور یہ سب اسم ہیں۔

خواہ دونوں فعل ہوں، جیسے:

یعیشون جهالا ویموتون ضلالا — وہ زندہ رہے تو جاہل اور مر گئے تو گمراہ

اس میں یعیشون اور یموتون میں تضاد ہے اور یہ دونوں فعل ہیں۔

خواہ ایک اسم اور ایک فعل ہو، جیسے:

قد امر فیها ما کان حلوا — دنیا کے شیریں (مزے) تلخ اور صاف و شفاف

وکدر ما کان صفوا — (دلمے)، مکدر ہو گئے۔

اس میں امر اور حلوا میں اور کدر اور صفوا میں تضاد ہے۔ امر اور کدر فعل اور حلوا اور صفوا دونوں اسم ہیں۔

خواہ دونوں حرف ہوں جیسے :

ما یدریک ما علی مما لی — تجھے کیا معلوم کہ کونسی چیز میرے حق میں ہے اور کونسی چیز میرے خلاف ۔

علی ضرر کے لیے اور لام انتفاع کے لیے ہوتا ہے اور ضرر و انتفاع میں تضاد ہے ۔

کبھی دو لفظوں میں حقیقی معنی کے اعتبار سے تضاد ہوتا ہے جیساکہ مذکورہ بالا مثالوں سے ظاہر ہے اور کبھی حقیقی معنی کے اعتبار سے بھی تضاد ہوتا ہے اور مجازی معنی کے اعتبار سے بھی جیسے :

فالبصیر منها شاخص و الاعمی الیها شاخص ۔ — دیکھنے والا اس سے نکلنا چاہتا ہے اور اندھا اسی پر نظریں جمائے رہتا ہے ۔

اس میں بصیر اور اعمی میں اپنے حقیقی معنی کے اعتبار سے بھی تضاد ہے اور مجازی معنی کے اعتبار سے بھی۔ اس طرح کہ بصیر کے مجازی معنی عالم و دانا کے ہیں اور اعمی کے معنی جاہل و بے خبر کے ہیں اور علم و جہل میں تضاد ہے

اثبات و نفی کے اعتبار سے طباق کی دو قسمیں ہیں ایجابی اور سلبی، طباق ایجابی وہ ہے جس میں حرف نفی نہ ہو۔

مذکورہ بالا مثالیں اسی طباق ایجابی کی ہیں اور طباق سلبی وہ ہے جس میں ایک مصدر کے دو فعل اس طرح ذکر کیے جائیں کہ ایک مثبت ہو اور ایک منفی جیسے :

و تغزون و لا تغزون ۔ — وہ تم سے لڑ بھڑ رہے ہیں اور تم جنگ سے جی چراتے ہو ۔

یا ایک امر ہو اور ایک نہی جیسے :

فکونوا من ابناء الآخرة ولا تکونوا من ابناء الدنیا ۔ — تم فرزندانِ آخرت بنو ابناء دنیا نہ بنو ۔

کبھی تضاد کی صورت یہ ہوتی ہے کہ دو متقابل لفظوں میں سے ایک لفظ دوسرے لفظ کا متضاد یا یں معنی ہوتا ہے کہ وہ معنی متضاد کا سبب ہے جیسے :

فالهدی خامل و العمی شامل ۔ — ہدایت گمنام اور کور چشمی ہمہ گیر تھی

اس میں ہدایت اور اندھے پن میں اگرچہ تضاد نہیں ہے مگر یہ اندھا پن گمراہی کا سبب ہے اور ہدایت و گمراہی میں تضاد ہے ۔

یا تضاد کی یہ صورت ہوتی ہے کہ ایک لفظ دوسرے لفظ کے متضاد معنی سے لزوم کا تعلق رکھتا ہے جیسے

فانه والله الجد لا اللعب و الحق لا الکذب ۔ — خدا کی قسم وہ چیز سراسر حقیقت ہے ہنسی کھیل نہیں اور سرتاپا حق ہے جھوٹ نہیں

کی جائے جیسے:

ان اخوف ما اخاف علیکم	مجھے تمہارے بارے میں سب سے زیادہ دو باتوں کا ڈر
اثنتان الحرص و طول الامل	ہے ایک حرص اور دوسرے امیدوں کا پھیلاؤ

صنعت التفات یہ ہے کہ کلام میں تنوع پیدا کرنے کے لیے کلام کے طرق سہ گانہ تکلم خطاب اور غیبت میں سے کسی ایک طریق سے دوسرے طریق کی طرف رجوع کیا جائے جیسے:

والذی نفس ابن ابی طالب بیده	اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں ابن ابی
لالف ضربة بالسیف اهون علی	طالب کی جان ہے کہ بستر پر اپنی موت مرنے سے
من میتة علی فراش۔	تلوار کے ہزار وار کھانا مجھے آسان ہیں

یہ غیبت سے تکلم کی طرف التفات ہے۔

لف و نشر یہ ہے کہ پہلے چند چیزیں ذکر کی جائیں اور پھر ان چیزوں کے مناسبات و متعلقات بلا تعیین بیان کیے جائیں۔ ان اشیاء کو لف اور ان کے متعلقات کو نشر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگر نشر کی ترتیب لف کے مطابق ہو تو اسے لف و نشر مرتب کہتے ہیں جیسے:

ولیختبر بذلك الشکر و الصبر	تاکہ وہ اس طرح مالدار اور فقیر کے شکر اور صبر کو
من غنیها و فقیرها۔	جانچے۔

شکر کا تعلق غنی سے اور صبر کا تعلق فقیر سے ہے اور دونوں کی ترتیب یکساں ہے۔

اگر ترتیب میں فرق ہو تو اسے لف و نشر غیر مرتب کہتے ہیں جیسے:

خلق الخلق حین خلقهم غنیا	اللہ نے مخلوقات کو جب پیدا کیا تو ان کی اطاعت سے
عن طاعتهم آمنا من معصیتهم	بے نیاز اور ان کے گناہوں سے بے خطر ہو کر انہیں
لانه لا تضره معصیة من	پیدا کیا کیوں کہ اسے نہ کسی معصیت کار کی معصیت
عصاه و لا تنفعه طاعة من	سے نقصان اور نہ کسی فرماں بردار کی اطاعت سے فائدہ
اطاعه۔	پہنچتا ہے۔

اطاعت کا تعلق اللہ کی بے نیازی سے اور معصیت کا تعلق بے خوفی سے ہے۔ یہاں لف و نشر میں ترتیب نہیں ہے۔

تاکید المدح بما یشبہ الذم یہ ہے کہ صفت مدح کے بعد جب حرف استثناء لا کر ایک اور صفت مدح کا ذکر کیا جائے اس سے مدح میں زور پیدا ہو جاتا ہے کیوں کہ مدح کے بعد جب حرف استثناء آئے گا تو یہ خیال پیدا ہو گا کہ اب کوئی صفت ذم آئے گی مگر جب صفت ذم کے بجائے صفت مدح آتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تلاش و تفحص کے باوجود کوئی صفت ذم نہیں مل سکتی اور اس طرح مدح بالائے مدح سے مدح میں

تاکید پیدا ہو جاتی ہے جیسے محمد ابن ابی بکر کی خبر وفات سن کر فرمایا:

ان حزننا علیه علی قدر سرورهم به الا انهم نقصوا بغیضاونقصنا حبیبا۔

ہمیں ان کے مرنے کا اتنا ہی رنج و قلق ہے جتنی دشمنوں کو اس سے خوشی ہے مگر یہ کہ ان کا ایک دشمن کم ہوا اور ہم نے ایک دوست کو کھو دیا۔

صنعت تجرید یہ ہے کہ کسی موصوف سے اسی کے مانند دوسرے موصوف کا استخراج کیا جائے یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ اس صفت میں ایسا کامل ہے کہ اس سے اس کے مانند ایک دوسرا حاصل ہو سکتا ہے، جیسے:

یا اهل الکوفة منیت منکم بثلاث و اثنین صم ذووا اسماع و بکم ذووا کلام و عمی ذووا ابصار لا احرار صدق و لا اخوان ثقة۔

اے اہل کوفہ میں تمہاری تین اور ان کے علاوہ دو باتوں میں مبتلا ہوں وہ یہ کہ تم کان رکھتے ہوئے بہرے ہو اور بولنے چالنے کے باوجود گونگے ہو اور آنکھیں رکھتے ہوئے اندھے ہو اور پھر یہ کہ نہ تم جنگ کے موقع پر جوانمرد ہو اور قابل اعتماد بھائی ہو

حضرت نے اہل کوفہ سے بہرے گونگے اور اندھے لوگوں کا انتزاع کیا ہے۔ یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ ان اوصاف سے پوری طرح متصف ہیں۔

تعریض یہ ہے کہ کلام اپنے ظاہر معنی کے علاوہ ایک دوسرے معنی کی طرف بھی مبہم سا اشارہ کرے۔ جیسے:

لم تکن بیعتکم ایای فلتة۔

تم نے میری بیعت اچانک بے سوچے سمجھے نہیں کی تھی۔

ٗ ٗ ٗ

یہ حضرت ابو بکر کی بیعت پر تعریض ہے جن کے بارے میں حضرت عمر نے کہا تھا۔

ان بیعة ابی بکر کانت فلتة

ابو بکر کی بیعت بے سوچے سمجھے ناگہانی طور پر ہوئی

اقتباس یہ ہے کہ عبارت میں آیت یا جزو آیت کو اس طرح لایا جائے کہ وہ عبارت کا جز شمار ہونے لگے جیسے

و انتم الاعلون و الله معکم و لن یترکم اعمالکم۔

تم ہی غالب ہو اور خدا تمہارے ساتھ ہے وہ تمہارے اعمال کو ضائع و برباد نہیں ہونے دے گا۔

ایجاز یہ ہے کہ اظہار مقصد کے لیے کم از کم الفاظ استعمال کیے جائیں بشرطیکہ ادائے مقصد میں خلل پیدا نہ ہوتا ہو۔ امیرالمؤمنین کا قول ہے کہ:

اذا کان الایجاز کافیا کان الاکثار عیا و اذا کان الایجاز مقصرا کان الاکثار واجبا۔

جب اختصار کافی ہو تو طول زبان پر اقتدار کی کمزوری ہے اور اختصار ادائے مطلب سے قاصر ہو تو الفاظ میں اضافہ ضروری ہے۔

حضرت کے کلام کی یہ خصوصیت ہے کہ تھوڑے سے لفظوں میں بہت سے معانی و مطالب سمٹ آتے تھے جیسے:

تخففوا تلحقوا۔ ہلکے پھلکے رہو تاکہ آگے بڑھنے والوں کو پا سکو

علامہ سید رضی نے اس جملہ پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی جملہ سننے میں نہیں آیا جس کے الفاظ کم اور معنی بہت ہوں۔

براعت استہلال یہ ہے کہ ابتدار کلام میں ایسے الفاظ لائے جائیں جن سے بیان کیے جانے والے مضمون کی طرف اشارہ ہوتا ہو۔ جیسے:

الحمد لله و ان اتی الدهر بالخطب الفادح و الحدث الجلیل۔ ہر حالت میں اللہ کے لیے حمد و ثنا ہے اگرچہ زمانہ ہمارے لیے مصیبتیں اور صبر آزما حادثے لے کر آیا ہے۔

اس ابتدار سے معلوم ہو جاتا ہے کہ آگے بیان ہونے والا مضمون حوادث و آلام زمانہ کے سلسلہ میں ہے

ایغال یہ ہے کہ کسی نکتہ کے پیش نظر کلام کو ایسے الفاظ پر ختم کیا جائے جن کے بغیر بھی کلام ناتمام نہیں رہتا۔ جیسے:

نحن علی موعود من الله و الله منجز وعده ہم سے اللہ کا ایک وعدہ ہے اور وہ اپنا وعدہ پورا کرنے والا ہے۔

اس میں یہ جملہ کہ اللہ اپنے وعدہ کو پورا کرنے والا ہے۔ صرف مزید اطمینان کے لیے ہے کیوں کہ یہ امر واضح و ظاہر ہے کہ اللہ اپنے وعدہ کو پورا کرتا ہے۔

صنائع لفظیہ یہ ہیں۔

تجنیس یہ ہے کہ کلام میں ایسے دو مختلف المعنی لفظ لائے جائیں جو تلفظ یا کتابت میں متشابہ و ہم شکل ہوں اس کی متعدد قسمیں ہیں ان میں سے چند قسمیں یہ ہیں:

تجنیس تام یہ ہے کہ دونوں لفظوں کے حروف عدد و ترتیب اور حرکت و سکون میں یکساں ہوں۔ جیسے:

فالبصیر منها شاخص و الاعمی الیها شاخص۔ نگاہ رکھنے والا اس سے نکلنا چاہتا ہے اور اندھا اسی پر نظریں جمائے رہتا ہے۔

پہلے شاخص کے معنی کوچ کرنے والے کے ہیں اور دوسرے شاخص کے معنی ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے والے کے ہیں۔

تجنیس محرف یہ ہے کہ دونوں لفظوں کی ہیئت میں فرق ہو۔ یہ فرق یا اختلاف حرکات کی بنا پر ہوگا جیسے:

فان التقوی فی الیوم الحرز و الجنة و فی غد الطریق الی الجنة۔ تقویٰ آج (دنیا میں) پناہ و سپر ہے اور کل (آخرت میں) جنت کی راہ ہے۔

ساق کے معنی پنڈلی کے ہیں اور سیاق ساق لیوق کا مصدر ہے۔

ردالعجز علی الصدر یہ ہے کہ جو لفظ اوّل کلام میں ہو وہی آخر کلام میں ہو یا ان دونوں لفظوں میں تجنیس ہو یا صنعت اشتقاق یا شبہ اشتقاق، جیسے:

و استهديه قريبا هاديا ، اس سے ہدایت چاہتا ہوں چونکہ وہ قریب تر اور ہادی ہے۔

سجع مرصع یہ ہے کہ دونوں جملوں کے تمام یا اکثر الفاظ ہم وزن اور آخری الفاظ ہم قافیہ ہوں جیسے:

الحمد لله الذی علا بحوله و دنا بطوله۔ تمام حمد اس اللہ کے لیے ہے جو اپنی طاقت کے اعتبار سے بلند اور اپنی بخشش کے لحاظ سے قریب ہے۔

⁂

سجع مطرف یہ ہے کہ دونوں جملوں کے آخری الفاظ متوافق اور وزن عروضی میں مختلف ہوں، جیسے

اتخذوا الشيطان لامرهم ملاكا و اتخذهم له اشراكا انہوں نے اپنے کاموں کا کرتا دھرتا شیطان کو بنا رکھا ہے اور اس نے ان کو اپنا آلۂ کار بنا لیا ہے۔

سجع متوازی یہ ہے کہ دونوں جملوں کے صرف آخری الفاظ وزن و قافیہ میں متفق ہوں جیسے:

من جری فی عنان امله
عثر باجله

لزوم مالایلزم یہ ہے کہ آخری لفظ کے حرفِ آخر سے پہلے کسی حرفِ معین کا التزام کیا جائے جیسے

فانه ارجح ما وزن و افضل ما خزن۔ اس کا پلہ ہر وزن کی جانے والی چیز سے بھاری اور ہر گنج گرانمایہ سے بہتر و برتر ہے۔

اس میں ز کا التزام کیا ہے حالاں کہ اس کی پابندی کے بغیر بھی کلام میں سجع پیدا کیا جا سکتا ہے۔

حذف یہ ہے کہ متکلم اپنے کلام میں کسی ایک حرف کو ترک کرنے کا التزام کرے۔ چناں چہ اس سلسلہ میں امیرالمومنین کا ایک طویل خطبہ ہے جو آپ نے ارتجالاً فرمایا۔ اس خطبہ میں الف نہیں ہے، اس کی ابتدا اس طرح ہے:

حمدت من عظمت منته و وسعت نعمته و سبقت رحمته غضبه وتمت كلمته و بلغت مشيته۔ اس کی حمد کرتا ہوں جس کا احسان عظیم نعمت وسیع اور جس کی رحمت اس کے غضب سے سبقت لے گئی ہے۔ اس کی بات پوری اور مشیت نافذ ہے۔

صنعت غیر منقوطہ یہ ہے کہ کلام ایسے الفاظ پر مشتمل ہو جو نقطوں سے خالی ہو، اس سلسلہ میں بھی حضرت کا ایک طویل خطبہ ہے اس کے ابتدائی کلمات یہ ہیں۔

الحمد لله الملك المحمود و المالک الودود مصور کل مولود و مال کل مطرود

تمام حمد اس اللہ کے لیے جو ذی اقتدار اور قابلِ ستائش ہے مالک اور دوست رکھنے والا ہے۔ مولود کا صورت گر اور ہر دھتکارے ہوئے کا سرمایہ ہے۔

صنعتِ تعمیہ یہ ہے کہ الفاظ یا حروف میں کوئی نام اس طرح پوشیدہ کیا جائے کہ اس کی طرف لفظی اشارہ تو ہو مگر بظاہر معلوم نہ ہو مثلاً یہ شعر

چشم بکشا زلف بشکن جانِ من
بہر تسکین دل بریانِ من!

اس شعر کے ظاہر معنی یہ ہیں کہ آنکھ کھول زلف لہرا تاکہ میرے دل تپیدہ کو سکون و قرار حاصل ہو۔
اس میں تعمیہ کی صورت یہ ہے کہ چشم بکشا کا عربی ترجمہ افتح العین ہے جس کے ایک معنی یہ ہیں کہ آنکھ کھول کر اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ حرف عین کو فتح (زبر) دو اور زلف بشکن کے ایک معنی یہ ہیں کہ زلف لہرا اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ زلف سے لام مراد لیا جائے اس لیے کہ جب زلف بل کھاتی ہے تو اس کی ہیئت لام کی سی ہو جاتی ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے:

لام نستعلیق کا ہے اس بت خوش خط کی زلف!
ہم تو کافر ہوں اگر بندے نہ ہوں اسلام کے

اور بشکن کا عربی میں ترجمہ اکسر ہے اور اکسر کے ایک معنی یہ ہیں کہ کسرہ (زیر) دو اور دوسرے مصرع میں دل بریاں سے مراد "ی" ہے کیوں کہ وہ لفظ بریاں کے وسط میں واقع ہے اور تسکین کے ایک معنی تسلی دینے کے ہیں اور دوسرے معنی ساکن کرنے یعنی جزم دینے کے ہیں۔ لہٰذا اس معنی مضمر کی رو سے جب "عین" کو زبر، ل کو زیر اور "ی" کو جزم دی جائے گی تو یہ علی کے نام کا معما ہو جائے گا۔

امیر المومنین اس صنعتِ تعمیہ سے بے خبر نہ تھے۔ چنانچہ آپ سے کسی نے پوچھا کہ کیا قرآن مجید میں تعمیہ پایا جاتا ہے۔ فرمایا کہ ہاں سورۂ ہود میں ارشاد ہے:

ما من دابۃ الا ھو آخذ بنا صیتھا۔

روئے زمین پر چلنے پھرنے والے جتنے ہیں ان سب کی پیشانی اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

اس میں معما کی صورت یہ ہے کہ لفظ دابہ کا ناصیہ (پیشانی) دال ہے اور جب ھو اسے اپنی گرفت میں لیگا تو ھو دال کے ملنے سے "ہود" ہو جائے گا اور سورۂ ہود کی یہ آیت حضرت ہود کے نام کا معما بن جائے گی۔

قمی نے سفینۃ البحار میں اور دوسرے اعلام شیعہ نے اس کی صحت سے انکار کیا ہے۔ چنانچہ یہ خطبہ نہ نہج البلاغہ میں ہے اور نہ مستدرک نہج البلاغہ میں۔ شیخ جواد مغنیہ نے اس کی وضعیت پر دلائل کرنے کے بعد تحریر کیا ہے۔

لا اعرف اسم الشخص الذی وضع خطبة البیان ولکنها بالاسرائیلیات اشبه۔

مجھے اس شخص کا نام معلوم نہیں جس نے خطبۃ البیان وضع کیا۔ البتہ یہ اسرائیلی روایات سے بہت مشابہ ہے

(مجلہ الھادی سال ۲ نمبر ۴ صفحہ ۶۴)

تصنیف و تالیف

قبل اسلام عربوں میں لکھنے پڑھنے کا رواج نہ تھا اور نہ اسے اچھی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ اس لیے نہ معلومات کو تحریری صورت میں لانے کا سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ جمع و تالیف کا۔ ان کا سرمایہ معلومات جو انساب عرب وقائع و حوادث اور نظم و نثر کے ادب پاروں تک محدود تھا ان کے ذہنوں میں محفوظ رہتا تھا۔

ظہور اسلام کے بعد خطوط و مراسلات اور قرآنی آیات کو ضبط تحریر میں لانے کے لیے اس کی ضرورت کا احساس ہوا اور کچھ لوگوں نے ادھر توجہ کی۔ اس کے علاوہ دینی علوم اور اسلامی احکام کے تحفظ کے لیے بھی ضروری تھا کہ انہیں ضبط تحریر میں لا کر محفوظ کر لیا جائے اور عوام کے حافظہ پر نہ چھوڑا جائے۔ پیغمبر اکرم نے جہاں قرآن مجید کے قلمبند کرنے کا سامان کیا وہاں دوسرے علوم کی تدوین و تحریر کی طرف توجہ دلائی۔ چنانچہ آپ کا ارشاد ہے:

العلم صید و الکتابة قید قیدو ارحمکم الله علومکم بالکتابة

علم شکار ہے اور تحریر زنجیر ہے۔ خدا تم پر رحم کرے اپنے علوم کو کتابت کی زنجیروں میں جکڑ لو۔

(کشف الظنون ج ۱ ص ۲۲)

امیر المومنین بھی اسلامی تعلیمات کے حفظ و بقا کے لیے تدوین و تالیف کو بڑی اہمیت دیتے تھے اسی اہمیت کے پیش نظر جمع قرآن و تدوین حدیث کو دوسرے امور پر ترجیح دی اور دوسروں کو بھی اس کی ضرورت و افادیت کی طرف توجہ دلاتے رہتے۔

ابن سعد نے طبقات میں تحریر کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علی نے خطبہ کے دوران فرمایا کہ تم میں کون ہے جو ایک درہم صرف کر کے علم کا ذخیرہ حاصل کرے۔ حارث ابن عبد اللہ اعور نے یہ سنا تو ایک درہم کے کاغذ خرید کر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے ان پر مختلف علمی مطالب تحریر فرمائے اور اس طرح تحریر علوم کی افادیت کو واضح کیا۔ حضرت دنیائے اسلام کے پہلے مصنف ہیں اور آپ ہی کے ہاتھوں تصنیف و تالیف کی بنیاد پڑی۔ ابن شہر آشوب نے تحریر کیا ہے:

ان اول من صنف فی الاسلام

جس نے سب سے پہلے اسلام میں تصنیف کا آغاز کیا، وہ

امیرالمومنین علی علیہ السلام — امیرالمومنین علی علیہ السلام تھے۔

(مناقب)

حضرت کے چند تصنیفات یہ ہیں۔

کتاب علی : یہ کتاب مسائل و احکام پر مشتمل تھی اگرچہ کتابی صورت میں موجود نہیں ہے مگر اس کے مندرجات کتب احادیث میں متفرق طور پر پائے جاتے ہیں۔ محمد ابن اسمٰعیل بخاری نے بھی اپنی صحیح باب کتابۃ العلم میں اس کا ذکر کیا ہے۔

کتاب الجفر و کتاب الجامعہ : یہ دونوں کتابیں بھی حضرت کی تصنیف کردہ ہیں۔ بستانی نے تحریر کیا ہے :

الجفر و الجامعہ کتابان لعلی کرم اللہ وجہہ۔ — جفر اور جامعہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تصنیف کردہ دو کتابیں ہیں۔

(دائرۃ المعارف ج ۶ ص ۴۷۸)

تفسیر نعمانی : یہ ایک تفسیری تبصرہ ہے جو اپنے راوی محمد ابن ابراہیم ابن جعفر النعمانی کی نسبت سے تفسیر نعمانی کہلاتا ہے۔ یہ تفسیر بحار الانوار کی انیسویں جلد میں مرقوم ہے۔

امیرالمومنین نے خود بھی تصنیف و تالیف کا کام انجام دیا اور اپنے اصحاب و تلامذہ میں سے بھی مصنفین کی ایک جماعت پیدا کر دی جنہوں نے آپ کے خطب و قضایا قلمبند کرنے کے ساتھ مختلف اسلامی موضوعات پر کتابیں لکھیں ان کتب کا تذکرہ رجال نجاشی، رجال کشی اور فہرست ابن ندیم میں موجود ہے۔ ان مصنفین میں سے چند قلمکار یہ ہیں :

ابو رافع : پیغمبر اکرم کے آزاد کردہ غلام، امیرالمومنین کے کاتب اور بیت المال کے خازن تھے۔ انہوں نے کتاب السنن والاحکام والقضایا مرتب کی۔

عبید اللہ ابن ابی رافع :۔ انہوں نے ایک کتاب ترتیب دی جو ان لوگوں کے اسماء اور اجمالی تعارف پر مشتمل تھی جنہوں نے امیرالمومنین کے ہمراہ مختلف غزوات میں شرکت کی تھی۔ یہ علم رجال کی پہلی کتاب تھی جو عالم اسلام میں ظاہر ہوئی۔

علی ابن ابی رافع : انہوں نے فقہ کے مختلف ابواب تحریر کیے۔

ربیعہ ابن سمیع : انہوں نے حضرت علی سے جو مسائل زکوٰۃ سنے انہیں تحریری صورت میں لائے

سلیم ابن قیس ہلالی : حضرت کے رواۃ حدیث میں سے تھے انہوں نے رسول اللہ کے بعد پیش آنے والے واقعات کے سلسلہ میں ایک کتاب لکھی جو کتاب سلیم کے نام سے مشہور اور مطبوعہ صورت میں موجود ہے۔

امیر المومنین علی علیہ السلام تھے۔

(مناقب)

حضرت کے چند تصنیفات یہ ہیں۔

کتاب علی: یہ کتاب مسائل واحکام پر مشتمل تھی اگرچہ کتابی صورت میں موجود نہیں ہے مگر اس کے مندرجات کتب احادیث میں متفرق طور پر پائے جاتے ہیں۔ محمد ابن اسمٰعیل بخاری نے بھی اپنی صحیح باب کتابۃ العلم میں اس کا ذکر کیا ہے۔

کتاب الجفر و کتاب الجامعہ: یہ دونوں کتابیں بھی حضرت کی تصنیف کردہ ہیں۔ بستانی نے تحریر کیا ہے:

الجفر و الجامعہ کتابان لعلی کرم اللہ وجہہ۔

جفر اور جامعہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تصنیف کردہ دو کتابیں ہیں۔

(دائرۃ المعارف ج ۶ ص ۴۷۸)

تفسیر نعمانی: یہ ایک تفسیری تبصرہ ہے جو اپنے راوی محمد ابن ابراہیم ابن جعفر النعمانی کی نسبت سے تفسیر نعمانی کہلاتا ہے۔ یہ تفسیر بحار الانوار کی انیسویں جلد میں مرقوم ہے۔

امیر المومنین نے خود بھی تصنیف و تالیف کا کام انجام دیا اور اپنے اصحاب و تلامذہ میں سے بھی مصنفین کی ایک جماعت پیدا کر دی جنہوں نے آپ کے خطب و قضایا قلمبند کرنے کے ساتھ مختلف اسلامی موضوعات پر کتابیں لکھیں ان کتب کا تذکرہ رجال نجاشی، رجال کشی اور فہرست ابن ندیم میں موجود ہے۔ ان مصنفین میں سے چند قلمکار یہ ہیں:

ابو رافع: پیغمبر اکرم کے آزاد کردہ غلام، امیر المومنین کے کاتب اور بیت المال کے خازن تھے۔ انہوں نے کتاب السنن والاحکام والقضایا مرتب کی۔

عبید اللہ ابن ابی رافع: انہوں نے ایک کتاب ترتیب دی جو ان لوگوں کے اسماء اور اجمالی تعارف پر مشتمل تھی جنہوں نے امیر المومنین کے ہمراہ مختلف غزوات میں شرکت کی تھی۔ یہ علم رجال کی پہلی کتاب تھی جو عالم اسلام میں ظاہر ہوئی۔

علی ابن ابی رافع: انہوں نے فقہ کے مختلف ابواب تحریر کیے۔

ربیعہ ابن سمیع: انہوں نے حضرت علی سے جو مسائل زکوٰۃ سنے انہیں تحریری صورت میں لائے

سلیم ابن قیس ہلالی: حضرت کے رواۃ حدیث میں سے تھے انہوں نے رسول اللہ کے بعد پیش آنے والے واقعات کے سلسلہ میں ایک کتاب لکھی جو کتاب سلیم کے نام سے مشہور اور مطبوعہ صورت میں موجود ہے۔

اصبغ ابن نباتہ: انہوں نے حضرت کے مرتب کردہ دستور حکومت اور وصیت نامہ کو جو اخلاقی تعلیمات پر مشتمل ہے قلمبند کیا۔ یہ دونوں تحریریں نہج البلاغہ میں درج ہیں۔

سلمان فارسی: انہوں نے امیر المؤمنین کے احتجاجات قلمبند کیے۔

ابو ذر غفاری: ان کی ایک کتاب وصایا النبی ہے جس کی شرح علامہ محمد باقر مجلسی نے عین الحیاۃ کے نام سے تحریر کی ہے۔

ابو الاسود دئلی: انہوں نے حضرت سے نحو کے ابتدائی قواعد سن کر انہیں تحریری صورت میں منضبط کیا۔

علم الطّب

اسلام سے قبل کچھ لوگ امراض کو ارواحِ خبیثہ کی اثر اندازی کا نتیجہ سمجھتے تھے اور ان کے دفعیہ کے لیے کاہنوں، جادوگروں اور جھاڑ پھونک کرنے والوں کی طرف رجوع کرتے تھے اور کچھ لوگ علاج معالجہ بھی کرتے تھے۔ یہ علاج معالجہ داغنے، پچھنے لگانے، ٹونے ٹوٹکوں اور چند جڑی بوٹیوں تک محدود ہوتا تھا جن کے خواص تجربہ سے معلوم کیے گئے تھے۔ رفتہ رفتہ ان تجربات کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور صدیوں کے مسلسل تجربوں اور مشاہدوں کی اساس پر جو علم مدون ہوا اسے علم طب کہا گیا۔ طب کے لغوی معنی زیرکی و دانائی اور سحر و جادو کے ہیں اور اصطلاحاً اس علم کو کہتے ہیں جو انسانی مزاج کی تعدیل، ازالۂ امراض اور حفظ صحت کی تدابیر کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ یہ علم اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ مختلف امراض کا ازالہ اسی پر منحصر ہے اور اسی کے ذریعہ صحت و تندرستی بحال کی جاسکتی ہے۔ امیر المؤمنین بھی اس علم کی افادیت کی بنا پر اسے بڑی اہمیت دیتے تھے۔ چنانچہ آپ کا ارشاد ہے:

العلم علمان علم الادیان وعلم الابدان — علم دو ہیں ایک علمِ دین اور دوسرا علمِ طب

علم طب کے چند شعبے ہیں۔ تشریح و منافع اعضاء، تشخیصِ امراض، دستور معالجات، تدابیر حفظانِ صحت، اور خواص مفردات۔

تشریح اعضاء

جسم کے مختلف اعضاء اور ان کے افعال کے علم کا نام تشریح اعضاء یا علمِ بدن ہے۔ خداوندِ عالم نے انسانی جسم میں ۲۴۸ ہڈیاں، ۵۱۸ عضلات، ۵۷ اعصاب، ۱۰۰ متحرک اور ۸۰ ساکن رگیں اور مختلف اعضاء اور ان میں گوناگوں حواس و قویٰ ودیعت کیے ہیں جو ہمہ وقت اپنے وظائف کی انجام دہی میں مصروف رہتے ہیں۔ اگر جسم کی ساخت اور اس کے نظام پر نظر کی جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک عظیم کائنات اس کے اندر سمٹ آئی ہے۔ امیر المؤمنین نے جسم کی ساخت اور اعضاء کے نظم و ارتباط پر نظر کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

اتزعم انک جرم صغیر و فیک انطوی العالم الاکبر

کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ تو ایک چھوٹا سا جسم ہے حالانکہ تیرے اندر ایک بڑا عالم سمو دیا گیا ہے

انسانی جسم کی بنیاد غیر مرئی خلیوں پر قائم ہے۔ ان خلیوں کے اجتماع سے بافت بنتے ہیں اور بافتوں سے اعضاء کی تشکیل ہوتی ہے اور اعضاء کا مجموعہ جسم کہلاتا ہے۔ گویا انسانی جسم ایک کتاب ہے جس میں خلیے حروف کی اور بافت الفاظ کی اور اعضاء جملوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ امیر المومنین فرماتے ہیں:

وانت الکتاب المبین الذی باحرفہ یظھر المضمر

تو وہ روشن کتاب ہے جس کے حرفوں سے چھپی ہوئی چیزیں ظاہر ہوتی ہیں۔

انسان کے جسم میں قدرت نے مختلف قسم کے حاسے اور قوٰی ودیعت کیے ہیں۔ جب یہ حاسے اپنے مخصوص محرکات کے ذریعہ متحرک و متاثر ہوتے ہیں تو ان سے مختلف اثرات ظہور میں آتے ہیں۔ امیر المومنین نے ان قوتوں اور حاسوں کو کمیل ابن زیاد کے ایک سوال کے جواب میں بیان فرمایا ہے۔ انہوں نے حضرت سے نفس کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ کس نفس کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہو کہا کہ کیا ایک نفس کے علاوہ اور بھی نفس ہیں فرمایا کہ ہاں نفس کی متعدد قسمیں ہیں۔ ان میں سے ایک نفس نامیہ ہے جس سے جسم کی نشو و نما وابستہ ہے اور ایک نفس حیوانیہ ہے جو حواس ظاہرہ کا مرکز ہے۔ نفس نامیہ پانچ قوتوں کا سرچشمہ ہے ماسکہ، جاذبہ، ہاضمہ، دافعہ اور مربیہ، قوت ماسکہ وہ ہے جو فضلات کو روکے رکھتی ہے۔ قوت جاذبہ وہ ہے جو غذا کو اندر کی طرف جذب کرتی ہے۔ قوت ہاضمہ وہ ہے جو غذا کو ہضم کر کے جزو بدن بننے کے قابل بناتی ہے۔ قوت دافعہ وہ ہے جو فضلات کو باہر نکالتی ہے اور قوت مربیہ وہ ہے جو جوہر غذا کو تمام اعضاء میں حسب ضرورت تقسیم کرتی ہے۔

یونہی نفس حیوانیہ میں پانچ قوتیں کارفرما ہیں۔ سامعہ، باصرہ، شامہ، ذائقہ اور لامسہ، قوت سامعہ وہ ہے جس کے ذریعہ انسان مختلف آوازیں سنتا ہے۔ قوت باصرہ وہ ہے جس کے ذریعہ دیکھتا اور مختلف اشیاء کے اشکال و الوان میں امتیاز کرتا ہے۔ قوت شامہ وہ ہے جس کے ذریعہ سونگھتا اور خوشبو اور بدبو میں تمیز کرتا ہے۔ قوت ذائقہ وہ ہے جس کے ذریعہ مختلف اشیاء کی شیرینی، تلخی وغیرہ مزوں کا احساس ہوتا ہے اور قوت لامسہ وہ ہے جس کے ذریعہ گرمی و سردی اور سختی و نرمی محسوس کرتا ہے۔

مختلف اعضاء کے افعال و خواص کے سلسلہ میں فرمایا:

العقل فی الدماغ والضحک فی الکبد والرافۃ فی الطحال والصوت فی الرئۃ۔

عقل کا تعلق دماغ سے، ہنسی کا جگر سے، نرمی و رافت کا تلی سے اور آواز کا پھیپھڑے سے ہے۔

(عقد الفرید)

تشخیص امراض

علم طب میں تشخیص مرض کو بنیادی حیثیت حاصل ہے کیوں کہ اسی پر علاج کے مؤثر و کارگر ہونے کا انحصار ہے۔ اگر تشخیص صحیح نہ ہوگی تو علاج بھی مفید ثابت نہ ہوگا۔ اگرچہ

بعض امراض کے علائم واضح ہوتے ہیں مگر بعض امراض کی علامتیں مشترک نوعیت کی ہوتی ہیں جن میں خفیف سا فرق ہوتا
ہے اور ایک حاذق و ماہر طبیب کی دوررس نظریں ہی اس فرق کو محسوس کر سکتی ہیں اس لیے طبیب کے لیے فراست
و دانائی اور نظر کی گہرائی ازبس ضروری ہے۔ امیر المومنین علیہ السلام اگرچہ طبیب نہ تھے مگر فصل خصومات کے سلسلہ میں
مختلف عوارض کے جو علامات بیان کیے ہیں اس سے فن تشخیص میں آپ کی حذاقت و فنی مہارت کا واضح ثبوت ملتا
ہے۔ ذیل میں اس سلسلہ کے چند واقعات درج کیے جاتے ہیں۔

عرب کی ایک بادیہ نشین لڑکی جوہڑ میں نہا رہی تھی کہ اثنائے غسل میں ایک جونک اس کے شکم میں داخل ہو گئی
اور اس کے بڑھاؤ سے پیٹ بھی بڑھنے لگا۔ جب اس لڑکی کے بھائیوں نے یہ دیکھا تو اسے بدچلن سمجھ کر قتل کرنا چاہا
مگر انہی میں سے دو ایک نے کہا اسے امیر المومنین کے سامنے پیش کرنا چاہیے تاکہ وہ اسے مناسب سزا دیں۔
چنانچہ اسے حضرت کے سامنے پیش کیا گیا۔ آپ نے جب شکم کے بڑھاؤ کے علاوہ کوئی اور علامت حمل کی نہ پائی
تو ایک طشت میں گیلی مٹی منگوائی اور فرمایا کہ اسے علیحدگی میں اس پر بٹھا دیا جائے چنانچہ اسے بٹھا دیا گیا ابھی اسے بیٹھے
ہوئے کچھ دیر گزری ہو گی کہ جونک مٹی کی بو پا کر باہر آگئی اور پیٹ کا بڑھاؤ ختم ہو گیا۔ جب اس کی پاکدامنی ظاہر ہو
گئی تو وہ خوش خوش اپنے بھائیوں کے ساتھ چلی گئی۔ جن جن لوگوں نے یہ واقعہ سنا وہ حضرت کی حذاقت
و فراست پر دنگ رہ گئے۔

اس قسم کا ایک واقعہ مشہور طبیب ابوبکر رازی متوفی ۳۱۱ھ کو بھی پیش آیا۔ ہوا یہ کہ ایک شخص بغداد سے رے آ
رہا تھا کہ اس کے منہ سے خون آنا شروع ہو گیا۔ جب وہ رے پہنچا تو رازی کے پاس علاج کے لیے آیا اس نے نبض
اور قارورہ دیکھنے اور مرض کا جائزہ لینے کے بعد کوئی ایسی علامت نہ پائی جس سے سل یا اندرونی زخم کا فیصلہ کرتا اس
نے کچھ دیر غور کرنے کے بعد پوچھا کہ تمہیں راستہ میں کن کن جگہوں سے پانی پینا پڑا۔ اس نے کہا صاف و شفاف پانی
کے علاوہ تالابوں اور جوہڑوں کا گدلا پانی بھی پیتا رہا ہوں۔ وہ سمجھ گیا کہ کسی جوہڑ سے پانی پیتے ہوئے جونک اس کے
پیٹ میں داخل ہو گئی جس کی وجہ سے منہ سے خون آ رہا ہے۔ کہا کہ میں اس شرط پر تمہارا علاج کروں گا کہ تم اپنے غلاموں
سے کہو کہ وہ علاج کے سلسلہ میں میرا ہر حکم مانیں۔ اس نے کہا کہ ایسا ہی ہو گا اور دوسرے دن اپنے غلاموں کو لے کر یہاں
پہنچ گیا۔ رازی نے کائی کے بھرے ہوئے دو لگن منگوائے اور اسے کھانے کے لیے کہا۔ اس نے جبر کر کے تھوڑی
سی کائی چکھی اور پھر ہاتھ کھینچ لیا اور کہا کہ اب اس سے زیادہ نگل نہیں سکتا۔ رازی نے اس کے غلاموں کو حکم دیا کہ وہ
اسے زمین پر لٹا کر زبردستی اس کے منہ میں ٹھونستے جائیں۔ جب کائی کا ایک بھرا ہوا لگن اس کے پیٹ میں ٹھونس
دیا گیا تو اسے قے آئی اور کائی میں لپٹی ہوئی جونک باہر آ گئی اور وہ شفایاب ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کیا بعید ہے کہ رازی
کے پیش نظر امیر المومنین کا مذکورہ بالا واقعہ رہا ہو اور اسی سے اس کا ذہن ادھر متوجہ ہوا ہو کہ جوہڑوں سے پانی
پیتے ہوئے جونک بھی پیٹ میں داخل ہو سکتی ہے۔

آنکھوں کی بینائی کا جدید طریقہ تشخیص یہ ہے کہ مریض کے سامنے ساڑھے چار فٹ کے فاصلہ پر ایک چارٹ

لٹکا دیا جاتا ہے جس میں اوپر کی سطر جلی بعد کی سطر کم جلی اور اسی طرح بعد کی سطریں بالترتیب خفی ہوتی جاتی ہیں اور آنکھوں پر مختلف نمبر کے شیشے لگا کر بینائی کی جانچ کی جاتی ہے۔ اگر ایک آنکھ کا امتحان لینا ہو تو دوسری آنکھ کے آگے سیاہ شیشہ لگا دیا جاتا ہے۔ یہ چارٹ سنیلن کی ایجاد ہے اس لیے اسے سنیلن چارٹ کہا جاتا ہے۔ امیر المومنین کے دور میں نہ سنیلن چارٹ ایجاد ہوا تھا اور نہ جدید آلات ہی تھے اس وقت آپ نے بینائی کے امتحان کے سلسلہ میں جو طریق کار اختیار کیا اسے موجودہ ترقی پذیر صورت کا نقطۂ آغاز کہا جا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں دو واقعے درج کیے جاتے ہیں

دو شخص آپس میں لڑ پڑے اور ایک نے دوسرے کی آنکھ پر ضرب لگائی جس سے اس کی آنکھ کی بینائی میں فرق آ گیا۔ یہ معاملہ حضرت کے سامنے پیش ہوا تو آپ نے فرمایا کہ اس کی صحیح آنکھ پر پٹی باندھو اور ایک انڈا لے کر اس کے سامنے کھڑے ہو جاؤ اور اس سے دریافت کرو کہ انڈا اسے نظر آتا ہے اگر وہ ہاں کہے تو اور پیچھے ہٹ کر دریافت کرو یہاں تک کہ اتنے فاصلے پر پہنچ جاؤ کہ وہ یہ کہے کہ اب نظر نہیں آتا پھر صحیح آنکھ کھول کر مضروب آنکھ پر پٹی باندھو اور اسی طرح انڈا اس کے بالمقابل کر کے دریافت کرو یہاں تک کہ اتنے فاصلے پر پہنچ جاؤ کہ یہ کہے کہ اب نظر نہیں آتا۔ اس کے بعد دونوں فاصلوں کو ناپ لو اور جتنا فرق نکلے اس کے مطابق بینائی کم ہوئی ہو گی اور اسی حساب سے دیت کا حقدار ہو گا۔

ایک شخص نے دوسرے شخص کی آنکھوں پر ضرب لگائی جس سے اس کی دونوں آنکھوں کی بینائی میں فرق آ گیا حضرت نے اس کے سامنے انڈا رکھ کر دریافت کیا کہ تمہیں یہ نظر آتا ہے اس نے کہا کہ ہاں۔ پھر اتنی دور پیچھے ہٹ گئے کہ اس نے کہا کہ اب نظر نہیں آتا۔ یونہی چاروں سمتوں کی طرف گھوم کر اس سے پوچھا اور پھر چاروں سمتوں کے فاصلہ کو ناپا۔ جب ہر سمت کا فاصلہ یکساں نکلا تو فرمایا کہ تم نے صحیح کہا ہے اور غلط بیانی سے کام نہیں لیا۔ پھر اسی سن و سال کے ایک شخص کو بلایا اور اسی طرح اس کی بینائی کو جانچا اور دونوں شخصوں کے فاصلہ میں جو تفاوت نکلا اس کے مطابق اس کی بصارت کی کمی کا فیصلہ کیا۔

ایک شخص نے دوسرے شخص کے سر پر چوٹ لگائی جس سے اس کی بینائی اور قوت گویائی جاتی رہی اور قوت شامہ بھی جواب دے گئی۔ حضرت کے سامنے یہ قضیہ پیش ہوا تو آپ نے فرمایا کہ اگر یہ سچ کہتا ہے تو ان تینوں چیزوں کی الگ الگ دیت پانے کا حقدار ہو گا۔ لوگوں نے کہا کہ یہ کیسے معلوم ہو کہ یہ سچ کہتا ہے۔ فرمایا کہ قوت شامہ کا امتحان اس طرح لو کہ شدید قسم کی کوئی بدبودار چیز اس کی ناک کے قریب لے جاؤ اگر یہ سر کو پیچھے کی طرف جھٹکا دے اور اس کی آنکھوں میں پانی بھر آئے تو یہ جھوٹا ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو یہ سچا ہے اور بینائی کو اس طرح جانچو کہ اسے سورج کے سامنے کھڑا کرو۔ اگر اس کی آنکھیں بند ہو جائیں تو یہ جھوٹا ہے اور کھلی رہیں تو سچا ہے اور گویائی کا امتحان اس طرح لو کہ اس کی زبان میں سوئی چبھو کر دیکھو۔ اگر سرخ خون نکلے تو جھوٹا ہے اور سیاہ خون نکلے تو سچا ہے۔

ایک شخص نے یہ ادعا کیا کہ وہ ازالہ بکارت پر قادر نہیں۔ حضرت نے اس سے کہا کہ تم نرم زمین پر پیشاب کرو اور قنبر سے فرمایا کہ دیکھو اگر پیشاب سے زمین میں گڑھا سا پڑ گیا ہو تو یہ جھوٹا ہے اور اگر گڑھا نہ پڑا ہو تو سچا ہے

لا تنال الصحة الا بالحمية — تم پرہیزی سے صحت یاب ہو سکتے ہو

حفظانِ صحت کا اولین اصول یہ ہے کہ مضرِ صحت اشیاء سے پرہیز کیا جائے اور کھانے پینے میں احتیاط برتی جائے کیوں کہ اکثر بیماریاں کھانے پینے میں بے احتیاطی سے پیدا ہوتی ہیں۔ حضرت فرماتے ہیں:

المعدة بيت الداء و الحمية راس الدواء — معدہ بیماریوں کا گھر ہے اور پرہیز سو دواؤں کی ایک دوا ہے

معدہ کے عمل کو متوازن رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ بے ضرورت نہ کھایا جائے اور جب کھانے بیٹھے تو نہ زیادہ پیٹ بھرے اور نہ بھوکا رہے اس لیے کہ زیادہ خوری پھیپھڑوں کے لیے مضر ہے اور بھوک قوتِ حیات کو کم کر دیتی ہے۔

حضرت کا ارشاد ہے:

لا تجلس على الطعام الا وانت جائع ولا تقم عن الطعام الا وانت تشتهيه وجود المضغ و اذا نمت فاعرض نفسك على الخلاء فاذا استعملت هذا استغنيت عن الطب۔ — جب بھوک ہو اس وقت کھانے کے لیے بیٹھو اور ابھی کچھ بھوک باقی ہو کہ اٹھ کھڑے ہو۔ کھانا خوب چبا کر کھاؤ اور سونے سے پہلے حوائج ضروریہ سے فارغ ہو جاؤ۔ جب اس پر عمل کرو گے تو علاج معالجہ سے مستغنی ہو جاؤ گے۔

کھانے کی ابتدا نمک سے کرنا چاہیے۔ حضرت فرماتے ہیں:

ابدؤا بالملح فی اول طعامکم فلو یعلم الناس ما فی الملح لاختاروہ علی الدریاق المجرب۔ — کھانے کی ابتدا نمک سے کرو۔ اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس میں کیا کیا فوائد ہیں تو اسے تریاقِ آزمودہ پر ترجیح دیں۔

نمک انسانی جسم کی نشوونما کے لیے ضروری ہے جب یہ معدہ میں پہنچتا ہے تو اس سے نمک کا تیزاب بنتا ہے جو دوسرے اجزا کے ساتھ مل کر کھانے کو ہضم کرتا ہے۔

رات کو خالی شکم نہ سونا چاہیے۔ حضرت کا ارشاد ہے:

ترک العشاء خراب البدن۔ — رات کو نہ کھانا خرابیٔ بدن کا باعث ہوتا ہے۔

کھانا ٹھنڈا ہونے پر کھانا چاہیے۔ حضرت فرماتے ہیں:

اقروا الحار حتی یبرد۔ — کھانے کو رکھا رہنے دو یہاں تک کہ ٹھنڈا ہو جائے

ایک وقت میں مختلف کھانوں سے اجتناب کرنا چاہیے۔ حضرت کا ارشاد ہے:

الالوان یعظمن البطن۔ — رنگا رنگ کے کھانوں سے پیٹ بڑھ جاتا ہے۔

گوشت کثرت سے استعمال نہ کرنا چاہیے۔ حضرت فرماتے ہیں:

لا تجعلوا بطونکم قبور الحیوان — اپنے شکموں کو جانوروں کا گورستان نہ بناؤ

دن کو کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کرنا چاہیے۔ اس سے اعصابی کھچاؤ کم ہوتا ہے اور قوت عمل عود کر آتی ہے اور رات کے کھانے کے بعد چہل قدمی کرنا چاہیے اس لیے کہ چلنا پھرنا ہضم طعام میں معین ہوتا ہے حضرتؑ فرماتے ہیں:

یتمدد بعد الغداء و یتمشی بعد العشاء۔ — دوپہر کے کھانے کے بعد لیٹ جانا چاہیے اور رات کے کھانے کے بعد چلنا پھرنا چاہیے۔

شکم سیر ہونے کے بعد غسل کرنا مضر صحت ہے۔ حضرت فرماتے ہیں:

دخول الحمام علی البطنۃ من شر الداء — شکم سیر ہو کر حمام میں جانا مرض کا باعث ہے۔

تمام مشروبات میں پانی سب سے بہتر مشروب ہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے:

الماء سید الشراب فی الدنیا و الاخرۃ۔ — پانی دنیا و آخرت میں تمام مشروبات کا سردار ہے۔

پانی کم مقدار میں پینا چاہیے کیوں کہ زیادہ پانی پینے سے معدہ کے رطوبات بڑھ جاتے ہیں جس سے نظام ہضم میں خرابی پیدا ہوتی ہے۔ حضرت فرماتے ہیں۔

اشرب علی ظمأ و یقلل من شرب الماء۔ — پیاس ہو تو پانی پیو اور پانی کم پینا چاہیے

پانی انسانی زندگی کے لیے ضروری ہے۔ پانی اس حرارت کو جو خون کی آمد و شد سے پیدا ہوتی ہے حد اعتدال پہ رکھتا ہے۔ اگر دوران خون سے پیدا ہونے والی گرمی بڑھ جائے تو زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔ اگرچہ تنفس حرارت کو فرو کرنے میں معین ہوتا ہے مگر اس حد تک تسکین نہیں ہوتی جو زندگی کی بقا کے لیے ضروری ہے۔ یہ مقصد پانی ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ پانی ایک طرف حرارت کو فرو کرتا ہے اور دوسری طرف پسینہ اور پیشاب کے ذریعہ غلیظ مادوں کے اخراج کا باعث ہوتا ہے۔ اگر ان سمی مواد کا اخراج نہ ہو تو انسان ہلاکت سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا لیکن یہ فوائد صحیح طور پر اسی صورت میں حاصل ہو سکتے ہیں جب پانی پاک و صاف اور اپنی اصلی حالت پر ہو۔ کنوؤں، جوہڑوں اور تالابوں کا پانی عموماً کثافت سے آلودہ ہوتا رہتا ہے بلکہ نہروں اور دریاؤں میں بھی ایسی چیزوں کی آمیزش ہو جاتی ہے جو صحت کے لیے مضر ہوتی ہیں۔ البتہ بارش کا پانی تمام کثافتوں اور مولد امراض جراثیم سے پاک ہوتا ہے اس لیے بارش کا پانی دوسرے پانیوں سے بہتر ہے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں:

اشربوا ماء السماء فانہ یطھر البدن و یدفع الاسقام۔ — بارش کا پانی پیو، یہ بدن کی تطہیر اور امراض کو دور کرتا ہے۔

لا تجعلوا بطونکم قبور الحیوان — اپنے شکموں کو جانوروں کا گورستان نہ بناؤ

دن کو کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کرنا چاہیے۔ اس سے اعصابی کھچاؤ کم ہوتا ہے اور قوت عمل عود کر آتی ہے اور رات کے کھانے کے بعد چہل قدمی کرنا چاہیے اس لیے کہ چلنا پھرنا ہضم طعام میں معین ہوتا ہے حضرت فرماتے ہیں:

یتمدد بعد الغذاء و یتمشی بعد العشاء۔ — دوپہر کے کھانے کے بعد لیٹ جانا چاہیے اور رات کے کھانے کے بعد چلنا پھرنا چاہیے۔

شکم سیر ہونے کے بعد غسل کرنا مضر صحت ہے۔ حضرت فرماتے ہیں:

دخول الحمام علی البطنۃ من شر الداء — شکم سیر ہو کر حمام میں جانا مرض کا باعث ہے۔

تمام مشروبات میں پانی سب سے بہتر مشروب ہے۔ حضرت کا ارشاد ہے:

الماء سید الشراب فی الدنیا و الاخرۃ۔ — پانی دنیا و آخرت میں تمام مشروبات کا سردار ہے۔

پانی کم مقدار میں پینا چاہیے کیوں کہ زیادہ پانی پینے سے معدہ کے رطوبات بڑھ جاتے ہیں جس سے نظام ہضم میں خرابی پیدا ہوتی ہے۔ حضرت فرماتے ہیں۔

اشرب علی ظمأ و لیقل من شرب الماء۔ — پیاس ہو تو پانی پیو اور پانی کم پینا چاہیے

پانی انسانی زندگی کے لیے ضروری ہے۔ پانی اس حرارت کو جو خون کی آمد و شد سے پیدا ہوتی ہے حد اعتدال پر رکھتا ہے۔ اگر دوران خون سے پیدا ہونے والی گرمی بڑھ جائے تو زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔ اگرچہ تنفس حرارت کو فرو کرنے میں معین ہوتا ہے مگر اس حد تک تسکین نہیں ہوتی جو زندگی کی بقا کے لیے ضروری ہے۔ یہ مقصد پانی ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ پانی ایک طرف حرارت کو فرو کرتا ہے اور دوسری طرف پسینہ اور پیشاب کے ذریعہ غلیظ مادوں کے اخراج کا باعث ہوتا ہے۔ اگر ان سمی مواد کا اخراج نہ ہو تو انسان ہلاکت سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا لیکن یہ فوائد صحیح طور پر اسی صورت میں حاصل ہو سکتے ہیں جب پانی پاک و صاف اور اپنی اصلی حالت پر ہو۔ کنوؤں، جوہڑوں اور تالابوں کا پانی عموماً کثافت سے آلودہ ہوتا رہتا ہے بلکہ نہروں اور دریاؤں میں بھی ایسی چیزوں کی آمیزش ہو جاتی ہے جو صحت کے لیے مضر ہوتی ہیں۔ البتہ بارش کا پانی تمام کثافتوں اور مولد امراض جراثیم سے پاک ہوتا ہے اس لیے بارش کا پانی دوسرے پانیوں سے بہتر ہے۔ حضرت فرماتے ہیں:

اشربوا ماء السماء فانہ یطھر البدن و یدفع الاسقام۔ — بارش کا پانی پیو، یہ بدن کی تطہیر اور امراض کو دور کرتا ہے۔

لا تجعلوا بطونکم قبور الحیوان — اپنے شکموں کو جانوروں کا گورستان نہ بناؤ

دن کو کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کرنا چاہیے۔ اس سے اعصابی کھچاؤ کم ہوتا ہے اور قوتِ عمل عود کر آتی ہے اور رات کے کھانے کے بعد چہل قدمی کرنا چاہیے اس لیے کہ چلنا پھرنا ہضمِ طعام میں معین ہوتا ہے حضرت فرماتے ہیں:

یتمدد بعد الغداء و یتمشی بعد العشاء۔ — دوپہر کے کھانے کے بعد لیٹ جانا چاہیے اور رات کے کھانے کے بعد چلنا پھرنا چاہیے۔

شکم سیر ہونے کے بعد غسل کرنا مضرِ صحت ہے۔ حضرت فرماتے ہیں:

دخول الحمام علی البطنۃ من شر الداء — شکم سیر ہو کر حمام میں جانا مرض کا باعث ہے۔

تمام مشروبات میں پانی سب سے بہتر مشروب ہے۔ حضرت کا ارشاد ہے:

الماء سید الشراب فی الدنیا و الاخرۃ۔ — پانی دنیا و آخرت میں تمام مشروبات کا سردار ہے۔

پانی کم مقدار میں پینا چاہیے کیوں کہ زیادہ پانی پینے سے معدہ کے رطوبات بڑھ جاتے ہیں جس سے نظامِ ہضم میں خرابی پیدا ہوتی ہے۔ حضرت فرماتے ہیں۔

اشرب علی ظمأ و لیقل من شرب الماء۔ — پیاس ہو تو پانی پیو اور پانی کم پینا چاہیے

پانی انسانی زندگی کے لیے ضروری ہے۔ پانی اس حرارت کو جو خون کی آمد و شد سے پیدا ہوتی ہے حدِ اعتدال پر رکھتا ہے۔ اگر دورانِ خون سے پیدا ہونے والی گرمی بڑھ جائے تو زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔ اگرچہ تنفس حرارت کو فرو کرنے میں معین ہوتا ہے مگر اس حد تک تسکین نہیں ہوتی جو زندگی کی بقا کے لیے ضروری ہے۔ یہ مقصد پانی ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ پانی ایک طرف حرارت کو فرو کرتا ہے اور دوسری طرف پسینہ اور پیشاب کے ذریعہ غلیظ مادوں کے اخراج کا باعث ہوتا ہے۔ اگر ان سمی مواد کا اخراج نہ ہو تو انسان ہلاکت سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا لیکن یہ فوائد صحیح طور پر اسی صورت میں حاصل ہو سکتے ہیں جب پانی پاک و صاف اور اپنی اصلی حالت پر ہو۔ کنوؤں، جوہڑوں اور تالابوں کا پانی عموماً کثافت سے آلودہ ہوتا رہتا ہے بلکہ نہروں اور دریاؤں میں بھی ایسی چیزوں کی آمیزش ہو جاتی ہے جو صحت کے لیے مضر ہوتی ہیں۔ البتہ بارش کا پانی تمام کثافتوں اور مولدِ امراض جراثیم سے پاک ہوتا ہے اس لیے بارش کا پانی دوسرے پانیوں سے بہتر ہے۔ حضرت فرماتے ہیں:

اشربوا ماء السماء فانہ یطھر البدن و یدفع الاسقام۔ — بارش کا پانی پیو، یہ بدن کی تطہیر اور امراض کو دور کرتا ہے۔

دانتوں کی صفائی کے لیے مسواک کرنا چاہیے۔ حضرت فرماتے ہیں:

السواک یجلو البصر — مسواک سے آنکھیں روشن ہوتی ہیں۔

دانتوں کی بیماریوں سے تحفظ کے لیے دانتوں کی صفائی ازبس ضروری ہے اور صفائی کے لیے مسواک سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں۔ اس سے دانتوں کی صفائی بھی ہوتی ہے اور منہ کے غلیظ رطوبات بھی خارج ہو جاتے ہیں۔ مسواک دائیں جانب سے بائیں جانب اور بائیں جانب سے داہنی جانب کے بجائے اوپر کے دانتوں میں اوپر سے نیچے اور نیچے کے دانتوں میں نیچے سے اوپر کی جانب کرنا چاہیے تاکہ دانتوں کی دڑاڑوں سے غذا کے ذرات نکل آئیں اور ذرات کے تعفن سے جو امراض پیدا ہوتے ہیں ان سے محفوظ رہیں۔ امیر المومنین کے مسواک کرنے کا یہی طریقہ تھا اور آپ طولاً مسواک کرنے کے بجائے عرضاً مسواک کرتے تھے۔

دھوپ میں زیادہ دیر بیٹھنے سے جسم کمزور پڑ جاتا ہے۔ اگر بیٹھنا ہی ہو تو سورج کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھو موسم سرما کے آغاز میں سردی سے بچنا چاہیے اور آخر سرما میں سردی سے بچاؤ کی ضرورت نہیں ہے۔ حضرت کا ارشاد ہے:

توقوا البرد فی اولہ و تلقوہ فی آخرہ فانہ یفعل فی الابدان کفعلہ فی الاشجار اولہ یحرق و آخرہ یورق۔	شروع سردی میں سردی سے احتیاط کرو اور آخر میں اس کا خیر مقدم کرو کیوں کہ سردی جسموں میں وہی اثر کرتی ہے جو درختوں میں کرتی ہے کہ ابتدا میں درختوں کو جھلس دیتی ہے اور آخر میں سرسبز و شاداب کرتی ہے۔

❊ ❊ ❊

زر ابن حبیش کہتے ہیں:

قال امیر المؤمنین اربع کلمات فی الطب لو قالہا بقراط او جالینوس لقدم امامہا مائۃ ورقۃ ثم زینہا بہذہ الکلمات	امیر المومنین نے طب کے بارے میں یہ چار کلمے ایسے فرمائے ہیں کہ اگر بقراط یا جالینوس کہتے تو ان جملوں کے شروع میں سو ورق پیش لفظ کے طور پر تحریر کرتے اور پھر ان جملوں سے صفحہ کتاب کو آراستہ کرتے

(بحار الانوار ج ۱۴ ص ۵۴۷)

خواص مفردات

مفردات کے خواص و افعال کا علم بھی طب کا ایک اہم باب ہے اسی سے مختلف چیزوں کے امزجہ و اثرات کا علم ہوتا ہے اور مختلف طبائع کے اعتبار سے ان کے فائدہ بخش یا ضرر رساں ہونے کا حکم لگایا جاتا ہے۔ ذیل میں چند چیزوں کے خواص کے بارے میں حضرت کے ارشادات درج کیے جاتے ہیں۔

العسل شفاء من کل داء لا دواء — شہد ہر مرض کی بے ضرر دوا ہے جو بلغم کو چھانٹتی

فیه یقل البلغم و یجلو القلب	اور دل کو جلا بخشتی ہے۔
الخل یکسر المرہ ویطفی الصفراء	سرکہ سودا کا زور توڑتا اور صفرا کا جوش کم کرتا ہے
اکل السفرجل قوۃ للقلب الضعیف وتطییب المعدہ	بہی کمزور دل کو تقویت دیتی اور معدہ کی اصلاح کرتی ہے۔
کلوا التفاح فانہ نضوح المعدہ	سیب کھاؤ یہ معدہ کو قوی کرتا ہے۔
الکمثری یجلوا القلب و یسکن اوجاع الجوف	ناشپاتی دل میں جلا پیدا کرتی اور درد شکم کو دور کرتی ہے۔
کلوا الرمان بشحمہ فانہ دباغ للمعدہ۔	انار کو اس کی باریک جھلی کے ساتھ کھاؤ کیوں کہ یہ معدہ کو تقویت دیتی ہے
علیکم باکل التین فانہ نافع للقولنج۔	انجیر کھاؤ یہ قولنج کے لیے مفید ہے۔
العدس یرق القلب و یسرع الدمع	مسور دل کو نرم کرتا اور آنسو لاتا ہے
کلوا الدبا فانہ یزید فی الدماغ	کدو کھاؤ یہ دماغی قوت کو بڑھاتا ہے
لحم البقر داء و بسنها شفاء و سمنها دواء۔	گائے کا گوشت مرض، دودھ شفا اور گھی دوا ہے۔
لا قدمنوا اکل السمک فانہ یہک الجسد	بلا ناغہ مچھلی نہ کھاؤ۔ اس سے جسم کمزور ہو جاتا ہے۔
مضغ اللبان یشد الاضراس	کندر کا چبانا دانتوں کو مضبوط کرتا ہے۔
الزبیب یشید القلب و یذهب بالمرض ویطفی الحرارۃ ویطیب النفس۔	منقی دل کو قوی مرض کو زائل حرارت کو کم اور دل میں خوشی پیدا کرتا ہے۔
اکل الجوز فی شدۃ الحر یهیج الحر فی الجوف ویهیج القروح علی الجسد و اکلہ فی الشتاء یستخن الکلیتین و یدفع البرد	سخت گرمی میں اخروٹ کھانے سے اندرونی حرارت جوش مارتی ہے اور بدن پر پھوڑے پھنسیاں نکل آتی ہیں اور سردی میں کھانے سے گردوں کی حرارت بڑھتی اور سردی دور ہوتی ہے۔
کلوا التمر فان فیہ شفاء من الادواء	خرما کھاؤ یہ بہت سی بیماریوں سے شفا دیتا ہے۔

خرما بہت سی بیماریوں کی روک تھام کرتا ہے کیوں کہ اس میں وٹامن اے کافی مقدار میں پایا جاتا ہے اور وٹامن اے کا خاصہ ہے کہ قوتِ مدافعت کو کمزور نہیں ہونے دیتا۔ اگر جسم میں اس کی کمی ہو جائے تو خرما اس کمی کو پورا کرکے

کی تعداد ان جراثیم سے کم ہوتی ہے جو زندگی کے لیے کارآمد اور زمین میں اجزائے حیاتیہ شامل کر کے اسے زرخیز بناتے ہیں۔ یہ جراثیم عموماً ہر شے میں ہوتے ہیں اور پانی کے ایک قطرے اور ہوا کے ایک جھونکے میں بڑی تعداد میں دوڑتے پھرتے رہتے ہیں۔ امیر المومنین نے اس دور میں کہ جب جراثیم کا کوئی تصور نہ تھا پانی اور ہوا میں ان کی موجودگی کا پتہ دیا ہے۔ چنانچہ پانی میں اور کھلی چھت پر جہاں ہوا بے روک ٹوک چلتی ہے پیشاب کرنے سے منع کرنے کے بعد فرمایا:

فان للماء اهلا و للهواء اهلا۔ (تحف العقول ص۲۲)

اس لیے کہ پانی میں بھی مخلوق بستی ہے اور ہوا میں بھی

تحقیق جدید نے پیشاب کے تجزیہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ اس میں مختلف مواد اور نمکیات ہوتے ہیں جو ترکیبی صورت میں زہریلے اثرات کے حامل ہوتے ہیں خصوصاً یورک ایسڈ (تیزابی مادہ) اپنے اندر اتنی شدید سمیت رکھتا ہے کہ اگر اسے چھوا جائے تو زخم پڑ جائے اور کسی سنگین چیز پر ڈالا جائے تو اس میں سوراخ ہو جائے۔ جب تک پیشاب مثانہ کے اندر رہتا ہے اس کے سمی اثرات کمزور بلکہ نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں اور جب جسم سے نکل کر ہوا سے مس ہوتا ہے تو سمی اثرات شدید ہو جاتے ہیں۔ یہ سمی اثرات پانی اور ہوا پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں کیوں کہ جب پانی اور ہوا میں تیزابی مادے کی آمیزش ہو گی تو ہوا کے جراثیم بھی متاثر ہوں گے اور پانی کے جراثیم بھی کیوں کہ ایسڈ (تیزاب) ہو یا الکلی (سوڈا) اس میں جاندار زندہ نہیں رہ سکتے۔ اس کے علاوہ اگر پانی میں کمر تک ڈوب کر پیشاب کیا جائے تو پانی کے وہ جراثیم جو ایک قطرہ میں ہزاروں کی تعداد تک ہوتے ہیں پیشاب کی نالی میں داخل ہو کر تولید مرض کا باعث ہوں گے کیوں کہ پانی کے جراثیم کا خاصہ یہ ہے کہ وہ پانی کے بہاؤ کی مخالف سمت پیرتے ہیں۔

علمِ نفسیات

انسان کے خارجی اعمال اس کی باطنی کیفیت کی عکاسی کرتے ہیں اور اس کے شعور یا لاشعور میں پوشیدہ میلانات اس کی زبان کے کلموں، چشم و ابرو کے اشاروں اور ہاتھ پیر کی حرکتوں سے ظاہر ہو جاتے ہیں انہی افعال و اعمال اور حرکات و سکنات سے ذہنی کیفیت کے پرکھنے کا نام علم نفسیات ہے۔ یہ نفسیاتی حقائق تجربات سے حاصل کیے جاتے ہیں اور انسان اپنے ذہن اور اس کی کیفیات کو سامنے رکھ کر دوسروں کی ذہنی کیفیت پر حکم لگاتا اور ان کے افعال و حرکات سے ان کی اندرونی حالت کا جائزہ لیتا ہے چنانچہ ایک مسکراتے ہوئے چہرے کو دیکھ کر یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ خوش و خرم ہے اور ایک پژمردہ چہرے کو دیکھ کر یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ وہ کسی ذہنی تشویش میں مبتلا ہے۔ امیر المومنین کا ارشاد ہے:

ما اضمر احد شيئاً الا ظهر فى فلتات

جب کسی نے کوئی بات دل میں چھپا کر رکھنا چاہی

عذرِ لاعلمی کی بنا پر قانون اسے اپنی گرفت میں نہ لے سکا اور اسے چھوڑ دیا گیا۔

ایک شخص نے حضرت عمر سے اپنی ماں کی شکایت کی کہ وہ ماں ہونے سے انکاری ہے۔ حضرت عمر نے اس سے پوچھا کہ تمہارے پاس کوئی ثبوت ہے جس سے تم یہ ثابت کر سکو کہ وہ تمہاری ماں ہے اس نے کہا کہ میرے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے اور جب اس عورت سے دریافت کیا تو اس نے کئی گواہ پیش کیے کہ اس کی شادی ہی نہیں ہوئی۔ کہ اس کے ماں بننے کا سوال پیدا ہو۔ حضرت عمر نے حکم دیا کہ اس نوجوان کو زیر حراست رکھا جائے تاکہ اسے افترا پردازی کی سزا دی جا سکے۔ جب اسے زنداں کی طرف لے چلے تو امیرالمومنین نے دیکھ کر دریافت کیا کہ اس کا جرم کیا ہے۔ جب اس نے واقعہ بیان کیا تو آپ نے اس عورت کو بلا کر پوچھا کہ کیا یہ تمہارا بیٹا نہیں ہے، کہا کہ یہ میرا بیٹا نہیں ہے۔ حضرت نے اس نوجوان سے کہا کہ تم بھی اس کے ماں ہونے سے انکار کر دو۔ اس نے کہا کہ یا ابا الحسن یہ میری ماں ہے میں کیسے انکار کر دوں فرمایا کہ تم زبان سے کہہ دو کہ یہ میری ماں نہیں ہے۔ اس نے کہہ دیا کہ یہ میری ماں نہیں اور میں اس کا بیٹا نہیں۔ اس کے بعد حضرت نے اس عورت کے بھائیوں سے کہا کہ تم اس عورت کی تزویج کا مجھے اختیار دیتے ہو۔ انہوں نے کہا کہ آپ مختار ہیں جو چاہیں کریں اور اس عورت نے بھی اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ حضرت نے قنبر سے فرمایا کہ فلاں جگہ پر کچھ درہم رکھے ہیں وہ لے آؤ۔ جب قنبر درہم لائے تو آپ نے وہ درہم اس عورت کو دیے اور اس مجمع کو گواہ کر کے فرمایا کہ میں اس مہر پر اس کا عقد اس نوجوان سے کرتا ہوں۔ اس عورت نے یہ سنا تو چیخ کر کہا کہ:

یا ابا الحسن انه والله ابنی۔

اے ابوالحسن خدا کی قسم یہ میرا بیٹا ہے۔

اس کا باپ عجمی تھا۔ میرے بھائیوں نے اس سے میرا نکاح کر دیا تھا۔ اس بچے کی ولادت کے موقع پر اس کا باپ ایک جنگ میں مارا جا چکا تھا۔ میں نے اسے ایک دوسرے قبیلہ میں بھیج دیا جہاں اس نے پرورش پائی۔ اب میرے بھائی مجھے مجبور کرتے ہیں کہ میں اس کے بیٹا ہونے سے انکار کر دوں چنانچہ میں انکار کرتی رہی مگر اب صورت ایسی ہے کہ مجھے اعترافِ حقیقت کے سوا چارہ نہیں ہے۔

امیرالمومنین عورت کی اس فطرت کو سمجھتے تھے کہ وہ اپنی اولاد کے اولاد ہونے سے کسی دباؤ یا مصلحت کی بنا پر انکار تو کر سکتی ہے مگر اس سے تزویج پر کسی صورت میں آمادہ نہیں ہو سکتی چنانچہ آپ نے وہی طریق کار اختیار کیا جو اس کی فطرت کو جھنجھوڑ کر اسے امر واقع کے اعتراف پر مجبور کر دے۔

علم الحساب

ابتدائی دور میں جب چیزوں کے شمار کی ضرورت محسوس کی گئی تو ہاتھ کی انگلیوں سے مدد لی جاتی تھی اور چونکہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں دس ہیں اس لیے گنتی کی بنیاد دس پر رکھی گئی اور جب اس سے حساب و شمار کی ضرورت پوری نہ ہو سکی تو انگلیوں کی پوروں سے گنتی کا کام لیا جانے لگا۔ ان پوروں کی تعداد اٹھائیس ہے جن سے ایک

ہزار تک کی گنتی پوری کی جاتی تھی جیسے حروف تہجی ابجد ہوز وغیرہ سے جو تعداد میں اٹھائیس ہیں ایک ہزار تک کی گنتی کی جاتی ہے۔ ان پوروں پر شمار کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ داہنے ہاتھ کی چھنگلیا کی پہلی پور پر ایک، دوسری پور پر دو، تیسری پور پر تین اسی طرح شمار کرتے ہوئے انگشت شہادت کی پہلی پور پر دس تک کی گنتی پوری ہو جاتی ہے پھر انگشت شہادت کی دوسری پور پر بیس، تیسری پور پر تیس، انگوٹھے کی پہلی پور پر چالیس اور آخری پور پر پچاس شمار کیے جاتے پھر بائیں ہاتھ کی پہلی پور پر ساٹھ، دوسری پور پر ستر، تیسری پور پر اسی، چوتھی پور پر نوّے اور پانچویں پور پر سو تک کی گنتی ختم ہوتی ہے، پھر چھٹی پور پر دو سو، ساتویں پور پر تین سو اور اسی طرح آخری پور پر ہزار تک کی گنتی تمام ہو جاتی ہے۔ اس طریق شمار سے ایک ہزار تک کی گنتی کا کام تو نکل آتا تھا مگر طویل گنتی کے لیے یہ طریقہ ناکافی تھا۔ اس کے علاوہ اکائیوں، دہائیوں اور سیکڑوں کو الگ الگ بتانا پڑتا تھا۔ اس دشواری کو دیکھتے ہوئے مصریوں نے تصویروں کے ذریعہ تحریری اعداد کی بنیاد ڈالی اور اطالیہ والوں نے عددوں کو حرفوں کی صورت میں ظاہر کیا۔

عرب میں پہلی صدی ہجری کے اواخر میں ہندسوں کو حروف تہجی میں لکھنے کا رواج ہوا جو یونان میں پہلے سے رائج تھا اس طرح کہ جہاں ایک لکھنا ہوتا وہاں الف جہاں دو لکھنا ہوتا وہاں ب اور جہاں تین لکھنا ہوتا وہاں ج لکھ دیتے اور اسی طرح غ تک گنتی کو اختتام تک پہنچاتے۔ یہ طریقہ عرصہ تک مرسوم رہا اور اب بھی کہیں کہیں عددوں کے بجائے حروف لکھ دیے جاتے ہیں مگر عموماً عددوں کو ہندسوں کی صورت میں ہی لکھا جاتا ہے جو آریہ قوم کی ایجاد ہے۔

عربوں کا علم حساب گنتی تک محدود تھا اور ان میں سے بھی بعض سو سے اوپر کی گنتی سے ناآشنا تھے چنانچہ ابن طقطقی نے تاریخ فخری میں لکھا ہے کہ جب لشکر اسلام عجمیوں سے برسر پیکار تھا تو ایک عرب کے ہاتھ ایک گلوبند لگا جس کی قدر و قیمت سے وہ ناواقف تھا ایک عجمی نے وہ ہار دیکھا تو اس سے پوچھا کہ اسے فروخت کرو گے اس نے کہا کہ ہاں جب قیمت دریافت کی تو اس عرب نے ایک سو رائج الوقت سکہ مانگا اس نے فوراً وہ رقم نکال کر دے دی اور ہار لے لیا۔ جب وہ سو روپیہ لے کر خوش خوش اپنے ساتھیوں کے پاس آیا اور واقعہ بیان کیا تو اس کے ساتھیوں نے کہا کہ تم نے سو سے زیادہ کیوں نہ مانگے۔ اگر تم زیادہ مانگتے تو وہ زیادہ دے دیتا۔ کہا کہ کیا سو سے اوپر بھی گنتی ہوتی ہے۔ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا تو سو سے زائد مانگتا۔

ابن ابی الحدید نے تحریر کیا ہے کہ ابوہریرہ دوسی، ابوموسیٰ اشعری کے ہاں سے آٹھ لاکھ درہم لائے۔ حضرت عمر نے پوچھا کہ کتنی رقم لائے کہا آٹھ لاکھ۔ حضرت عمر نے بار بار اس رقم کو دہرایا اور پوچھا کہ کتنے آٹھ سو ہوں تو یہ رقم بنتی ہے ابوہریرہ نے سو ہزار کو آٹھ مرتبہ دہرایا کر آٹھ لاکھ کا مفہوم سمجھایا۔ حضرت عمر اس تفصیل سے سمجھے کہ بڑی کثیر رقم ہے۔ اسی حساب و کتاب کے لیے حضرت عمر کو ایک حساب داں کی ضرورت محسوس ہوئی اور انہوں نے والی شام کو لکھ کر روم کے ایک عیسائی کو مدینہ میں طلب کیا جو میراث کے مقررہ حصص کی تقسیم کر سکے۔ اسی طرح معاویہ نے بھی حساب کے نظم و انضباط کے لیے دفتر خراج کا افسر اعلیٰ ایک رومی عیسائی سرجون کو مقرر کر رکھا تھا۔

ان چند شواہد سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس دور میں علم حساب جس کے جاننے والے معدودے چند افراد تھے،

کی تعداد ان جراثیم سے کم ہوتی ہے جو زندگی کے لیے کارآمد اور زمین میں اجزائے حیاتیہ شامل کر کے اسے زرخیز بناتے ہیں۔ یہ جراثیم عموماً ہر شے میں ہوتے ہیں اور پانی کے ایک قطرے اور ہوا کے ایک جھونکے میں بڑی تعداد میں دوڑتے پھرتے رہتے ہیں۔ امیر المومنین نے اس دور میں کہ جب جراثیم کا کوئی تصور نہ تھا پانی اور ہوا میں ان کی موجودگی کا پتہ دیا ہے۔ چنانچہ پانی میں اور کھلی چھت پر جہاں ہوا بے روک ٹوک چلتی ہے پیشاب کرنے سے منع کرنے کے بعد فرمایا:

فان للماء اھلا و للھواء اھلا۔ (تحف العقول ص۲۲)

اس لیے کہ پانی میں بھی مخلوق بستی ہے اور ہوا میں بھی

تحقیق جدید نے پیشاب کے تجزیہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ اس میں مختلف مواد اور نمکیات ہوتے ہیں جو ترکیبی صورت میں زہریلے اثرات کے حامل ہوتے ہیں خصوصاً یورک ایسڈ (تیزابی مادہ) اپنے اندر اتنی شدید سمیت رکھتا ہے کہ اگر اسے چھوا جائے تو زخم پڑ جائے اور کسی سنگین چیز پر ڈالا جائے تو اس میں سوراخ ہو جائے۔ جب تک پیشاب مثانہ کے اندر رہتا ہے اس کے سمی اثرات کمزور بلکہ نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں اور جب جسم سے نکل کر ہوا سے مس ہوتا ہے تو سمی اثرات شدید ہو جاتے ہیں۔ یہ سمی اثرات پانی اور ہوا پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں کیوں کہ جب پانی اور ہوا میں تیزابی مادے کی آمیزش ہوگی تو ہوا کے جراثیم بھی متاثر ہوں گے اور پانی کے جراثیم بھی کیوں کہ ایسڈ (تیزاب) ہو یا الکلی (سوڈا) اس میں جاندار زندہ نہیں رہ سکتے۔ اس کے علاوہ اگر پانی میں کمر تک ڈوب کر پیشاب کیا جائے تو پانی کے وہ جراثیم جو ایک قطرہ میں ہزاروں کی تعداد تک ہوتے ہیں پیشاب کی نالی میں داخل ہو کر تولید مرض کا باعث ہوں گے کیوں کہ پانی کے جراثیم کا خاصہ یہ ہے کہ وہ پانی کے بہاؤ کی مخالف سمت پیرتے ہیں۔

علمِ نفسیات

انسان کے خارجی اعمال اس کی باطنی کیفیت کی عکاسی کرتے ہیں اور اس کے شعور یا لاشعور میں پوشیدہ میلانات اسکی زبان کے کلموں، چشم و ابرو کے اشاروں اور ہاتھ پیر کی حرکتوں سے ظاہر ہو جاتے ہیں انہی افعال و اعمال اور حرکات و سکنات سے ذہنی کیفیت کے پرکھنے کا نام علم نفسیات ہے۔ یہ نفسیاتی حقائق تجربات سے حاصل کیے جاتے ہیں اور انسان اپنے ذہن اور اس کی کیفیات کو سامنے رکھ کر دوسروں کی ذہنی کیفیت پر حکم لگاتا اور ان کے افعال و حرکات سے ان کی اندرونی حالت کا جائزہ لیتا ہے چنانچہ ایک مسکراتے ہوئے چہرے کو دیکھ کر یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ خوش و خرم ہے اور ایک پژمردہ چہرے کو دیکھ کر یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ وہ کسی ذہنی تشویش میں مبتلا ہے۔ امیر المومنین کا ارشاد ہے:

ما اضمر احد شیئا الا ظھر فی فلتات

جب کسی نے کوئی بات دل میں چھپا کر رکھنا چاہی

لسانه و صفحات وجهه — تو وہ اس کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ اور چہرے کے آثار سے نمایاں ہو جاتی ہے۔

امیرالمؤمنین کے زمانہ میں اگرچہ علم نفسیات باقاعدہ طور پر مدون نہ ہوا تھا مگر آپ اس میں بصیرت تامہ رکھتے تھے۔ اور انسان کے حرکات و سکنات سے اس کے مخفی جذبات و عواطف کی تہ تک پہنچ جایا کرتے تھے۔ علامہ عقاد تحریر کرتے ہیں۔

کان یفھم اخلاق الناس فھم العالم المراقب لخفایا الصدور و یشرحھا فی عظاته و خطباته شرح الادیب اللبیب۔ (العبقریات ص ۸۵۶)	حضرت علی ایک عالم و بالغ نظر کی طرح لوگوں کے اخلاق و عادات کو سمجھتے تھے اور ان کے سینوں میں چھپے ہوئے جذبات ان کے سامنے آئینہ تھے۔ جن پر اپنے خطبات و مواعظ میں روشنی ڈالتے تھے۔

اس سلسلہ میں چند واقعات درج کیے جاتے ہیں جس سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ آپ کس سرعت ذہنی کے ساتھ اصل حقیقت کو بھانپ لیا کرتے تھے۔

ایک شخص اپنے غلام کو ساتھ لے کر سفر حج پر روانہ ہوا۔ راستے میں غلام نے کوئی نازیبا حرکت کی جس پر مالک نے اسے سزا دی وہ غلام طیش میں آگیا اور مالک سے کہنے لگا کہ میں تیرا غلام نہیں ہوں بلکہ تو میرا غلام ہے۔ اس پر دونوں میں تکرار شروع ہو گئی اور وہ لڑتے جھگڑتے کوفہ میں امیرالمؤمنین کے پاس آئے اور یہ معاملہ ان کے سامنے پیش کیا آپ نے فرمایا کہ تم واپس جاؤ اور آپس میں تصفیہ کرنے کی کوشش کرو۔ اگر تصفیہ نہ کر سکو تو کل میرے پاس آنا۔ ان کے جانے کے بعد حضرت نے قنبر سے فرمایا کہ دیوار میں دو سوراخ اتنے بڑے کرو کہ ہر سوراخ میں ایک سر باسانی آسکے۔ دوسرے دن وہ لڑتے جھگڑتے اور ایک دوسرے کو جھٹلاتے ہوئے آئے اور کہا کہ ہم آپس میں کوئی تصفیہ نہیں کر سکے حضرت نے انہیں حکم دیا کہ وہ اپنے سر ان سوراخوں کے اندر داخل کریں۔ جب انہوں نے اپنے سر اندر داخل کیے تو قنبر سے کہا کہ میری تلوار لاؤ تاکہ میں اس غلام کی گردن اڑا دوں کیوں کہ اس نے آقا ہونے کا غلط دعویٰ کیا ہے۔ حضرت یہ سمجھتے تھے کہ ان میں سے جو غلام ہو گا وہ نفسیاتی طور پر مطمئن نہ ہو گا اس لیے وہ حکم قتل سنتے ہی سر باہر نکال لے گا چنانچہ یہی ہوا اور غلام نے فوراً سر باہر نکال لیا اور مالک بدستور اپنا سر سوراخ میں رکھے رہا۔ حضرت نے اس غلام سے کہا کہ تو تو یہ کہتا تھا کہ میں مالک ہوں پھر تو نے جلدی سے سر باہر کیوں نکالا جب اسے کوئی جواب نہ سوجھا تو اس نے غلامی کا اعتراف کر لیا اور حضرت نے اسے مالک کے حوالے کر دیا۔

ایک بچہ جو ابھی گھٹنیوں چلنے پایا تھا چھت پر کھیلتے ہوئے پرنالے میں سے نیچے جھانکنے لگا۔ ماں نے اس خیال سے کہ اگر بچے کو پیچھے ہٹانے کے لیے آگے بڑھی تو بچہ بھی آگے بڑھے گا اور زمین پر گر کر ہلاک ہو جائے گا اس نے چند آدمیوں کو مدد کے لیے بلایا انہوں نے باہر کی جانب زینہ لگایا مگر پرنالے کی بلندی تک نہ پہنچ سکے

وہ کوئی تدبیر سوچ ہی رہے تھے کہ امیر المومنین ادھر تشریف لے آئے۔ آپ نے یہ صورت دیکھی تو اسی سن و سال کا ایک بچہ طلب کیا اور اسے چھت پر لے جا کر اس بچے کے سامنے بٹھا دیا۔ جب اس نے اپنے ہم سن بچے کو دیکھا تو فوراً پرنالے سے باہر نکل آیا اور اس کی طرف لپکا اور اس طرح موت کے منہ سے بچ نکلا۔ حضرت نے بچے کے نفسیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ وہ اپنے ہم عمر بچوں سے مانوس ہوتا ہے اور ان کی طرف بڑھتا ہے۔ اسی کی عمر کے بچے کو اس کے سامنے رکھ کر اسے ہلاکت سے بچا لیا۔

حضرت عمر کے دور حکومت میں دو عورتیں ایک بچے کو لے کر دربار خلافت میں آئیں اور ان میں سے ہر ایک کا یہ دعویٰ تھا کہ یہ بچہ اس کا ہے مگر کسی کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا۔ حضرت عمر کوئی فیصلہ نہ کر سکے اور امیر المومنین کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا۔ جب وہ دونوں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو آپ نے انہیں سمجھایا بجھایا اور آخر میں انہیں ڈرایا دھمکایا مگر ان میں سے کوئی بھی اپنے دعوےٰ سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہ ہوئی۔ جب سمجھانے بجھانے کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو آپ نے حکم دیا کہ ایک آری لائی جائے۔ ان عورتوں نے پوچھا کہ آری کا کیا ہوگا۔ فرمایا کہ میں اس بچے کے دو ٹکڑے کروں گا اور تم دونوں میں آدھوں آدھ تقسیم کر دوں گا۔ ان میں سے ایک تو چپ رہی اور دوسری نے چیخ کر کہا یا امیر المومنین میں اپنے دعوےٰ سے دست بردار ہوتی ہوں۔ یہ بچہ اس کے حوالہ کر دیجیے۔ حضرت نے یہ سنا تو فرمایا کہ یہ بچہ تمہارا ہی ہے اگر اس کا بچہ ہوتا تو یہ چپ نہ رہتی بلکہ اس کا دل بھی تڑپتا اور مامتا کا تقاضا ایسا کرنے سے مانع ہوتا۔ حضرت نے ایک ماں کے نفسیات کو سمجھ لیا تھا کہ وہ یہ گوارا کرے گی کہ بچہ دوسرے کو مل جائے مگر یہ گوارا نہ کرے گی کہ اس کے دو ٹکڑے کیے جائیں۔ چنانچہ آپ نے یہی نفسیاتی طریقہ اختیار کیا جس سے صحیح اور غلط دعوےٰ کا فوراً پتہ چل گیا۔

حضرت عمر کے سامنے ایک عورت کو پیش کیا گیا جو زنا کی مرتکب ہوئی تھی۔ حضرت عمر نے اس سے پوچھا تو اس نے بے جھجک اس کا اقرار کیا۔ حضرت علی اس موقع پر موجود تھے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ اس طرح بانگِ دہل اقرار کر رہی ہے جیسے اسے معلوم ہی نہیں ہے کہ زنا حرام ہے اور اس کی سخت سزا ہے لہٰذا اس لاعلمی کی بنا پر اس پر حد جاری نہیں ہو سکتی۔ حضرت نے جب اس کو بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اقرار کرتے ہوئے دیکھا تو نفسیاتی حیثیت سے فوراً سمجھ گئے کہ یہ زنا کی حرمت سے بے خبر ہے ورنہ اس طرح کھل کر اقرار نہ کرتی۔ ابن قیم نے اس واقعہ کے ذیل میں لکھا ہے کہ:

هذا من دقيق الفراسة۔

یہ انتہائی دور رس فراست کا فیصلہ ہے۔

(الطرق الحكميه ص ۵۵)

اس قسم کا ایک واقعہ سلطان محمود شاہ بہمنی کے عہد حکومت میں بھی پیش آیا۔ چنانچہ صاحب تاریخ فرشتہ نے لکھا ہے کہ ایک عورت کو زنا کے جرم میں گرفتار کر کے عدالت میں لایا گیا۔ جب اس سے دریافت کیا گیا تو اس نے کہا میں یہ سمجھی تھی کہ جس طرح ایک مرد چار عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے اسی طرح عورت کو بھی یہ حق ہے کہ وہ چار مردوں سے تعلق رکھے مگر مجھے اب معلوم ہوا ہے کہ یہ بات شرعاً ناجائز ہے لہٰذا میں آئندہ اس کی مرتکب نہیں ہوں گی۔ اس